نقوش

لاہور نمبر

لاہور کی

سیاسی، ثقافتی، مذہبی اور علمی و ادبی تاریخ

۱

لاہور — تاریخ قدیم کی نظر میں
لاہور — تاریخ تاسیس اور وجہ تسمیہ
سیاسی اور ثقافتی تاریخ
چنار خوچکان مناظر
مآثر لاہور — باغات و مزارات
علمائے کرام، دینی مدرسے
انگریزی دور کی چند تعمیرات
شاہی قلعہ
عجائب گھر
چڑیا گھر
دروازے
منادر
گرجے
کالج
کتب خانے
فقیر گھرانے کے نوادر

۲

موسیقار
اکھاڑے
تکیے
میلے
خوش نویس
مصور
اطبا
ڈراما اور تھیئٹر
فلم

۳

مورخین لاہور
ادیب اور شاعر
چند بڑے ادیب
سیاسی تحریکیں
ادبی تحریکیں

۴

لاہور

حفیظ جالندھری	جسٹس کیانی
شاہد احمد دہلوی	نیاز فتحپوری
شوکت تھانوی	رشید احمد صدیقی
احسان دانش	خواجہ احمد عباس
راجہ مہدی علی خاں	ہوش ترمذی
مصطفےٰ زیدی	شیخ عبدالشکور
ڈاکٹر سید صفدر حسین	نصیر انور

اس نمبر کے قلمکار

غلام رسول مہر	شوکت تھانوی	عبدالحمید یزدانی	علم الدین سالک	شاہد احمد دہلوی	شیخ عبدالشکور
نیاز فتح پوری	خواجہ نور الٰہی	شہرت بخاری	رشید احمد صدیقی	شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی	مصطفیٰ زیدی
جسٹس کیانی	کسریٰ منہاس	حکیم موسیٰ خان	حفیظ جالندھری	ڈاکٹر عبدالسلام خورشید	ڈاکٹر صفدر حسین
محمد دین فوق	خواجہ احمد عباس	ہوش ترمذی	محمد عبداللہ قریشی	احسان دانش	مسعود نظامی
عابد علی عابد	عشرت رحمانی	وحید الحسن ہاشمی	احمد ندیم قاسمی	یوسف جمال انصاری	حافظ عباداللہ
ڈاکٹر محمد باقر	راجہ مہدی علی خان	فدا حسین اسیر	کرنل عبدالرشید	نصیر انور	احمد سعید
پروفیسر شجاع الدین	سراج نظامی	سردار خان	شورش کاشمیری	ملک شمس	عنایت اللہ

لاہور

ترتیب

مآثر لاہور (باغات و مزارات)، ۱۴۰

شباب لاہور۔ عہد مغلیہ میں

عہد حکومت خالصہ

سنہ ۱۸۵۷ء تا حال

علمائے کرام، دینی مدرسے، ۴۴۱

سنہ ۱۱۱۹ / ۱۷۰۷ تا حال

مساجد (عہدِ غزنوی سے زمانہ حال تک) ۵۳۹

ہلکی پھلکی موسیقی گانے والے

گانے والیاں

سارنگی نواز

طبلہ نواز

ستار نواز

قوال

میوزک ڈائرکٹر

کلارنٹ نواز

پیانو نواز

نے نواز

سرود نواز

اکھاڑے، ۷۴۱

اُردو صحافت، ۸۳۹

فارسی گو شعراء، ۸۵۹

فارسی شاعری میں لاہور کا ذکر، ۸۹۵

ادیب اور مصنّف، ۹۱۲

لاہور

محمد طفیل ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغ اردو، ایبک روڈ لاہور سے شائع کیا۔

طلوع

آج میں اس قابل ہوا ہوں کہ آپ کی خدمت میں لاہور نمبر پیش کر سکوں ـــــ الحمد للہ!

اگر میں اس نمبر کے بارے میں کچھ سچی باتیں بھی کہوں گا تو ایسے فقرے ضرور راہ پا جائیں گے۔ جن سے کچھ میری تعریف اور کچھ اس نمبر کی اہمیت کے پہلو نکلیں گے۔ ایسی صورت میں سبھی یہ کہیں گے ـــــ بنتا ہے ـــــ اس لیے مناسب یہ سمجھتا ہوں کہ خاکساری کا وہ انداز اختیار کروں جو سبھی کو بھائے۔ سو بندہ پرور! اس ہیچمدان کی طرف سے عرض ہے کہ اس عاجز، ناچیز اور پُر تقصیر انسان نے جو یہ "کارنامہ" سرانجام دیا ہے اُسے لمبے چوڑے دعووں کی زد میں لاکر آپ کو بد مزا کرنے کا ارادہ نہیں۔

میری ادنٰی سی کوششیں یہ تھیں کہ یہ نمبر اپنے مواد کے اعتبار سے لاہور پر موجود کتابوں سے زیادہ دقیع، زیادہ جامع اور زیادہ متنوع ہو۔ اب دیکھ لیجئے کہ میں اپنی کوششوں میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں۔ تکمیل کا دعویٰ مجھ ایسے ادارتی گنہگاروں کو زیب نہیں دیتا۔

اس نمبر میں جتنی بھی چیزیں پیش کی جا رہی ہیں۔ وہ سب کی سب غیر مطبوعہ ہیں۔ اگر چند سطریں مطبوعہ نظر آجائیں تو اپنے اس نیاز مند کو معاف کر دیجئے گا۔ اس لیے کہ میں اس جرم میں اہلِ قلم کا شریک نہیں ہوں۔

پہلے میں نے مکاتیب نمبر پیش کرتے ہوئے توبہ کی تھی یا اب یہ نمبر پیش کرتے ہوئے کی ہے۔ مکاتیب نمبر کا تو یہ تھا کہ اہلِ دل (جن خطوں میں ادیبوں نے اہلِ دل ہونے کا ثبوت دیا تھا وہ ابھی میرے پاس محفوظ ہیں) اور اہلِ قلم کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو جمع کرنا تھا۔ اس نمبر کے سلسلے میں ضخامت طلب موضوعات کو سمیٹنا تھا۔ جو موضوع جسے دیا وہ وہیں ٹھٹھک گیا، میں وہیں اٹک گیا۔

میرا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے سارے گناہ معاف کر دے گا۔ اس لیے کہ جتنی سزا مجھے خاص نمبروں کی ترتیب کے سلسلے میں ملتی ہے۔ وہی میرے گناہوں سے زیادہ ہے۔ گنہگار ضرور ہوں۔ مگر اتنا بھی نہیں!

میں آج ادب کی وادیوں سے نکل کر، تاریخ کے میدان میں آن پہنچا ہوں۔ بے شک راہیں پُر پیچ اور اَن جانی تھیں، مگر میرے جنون نے ہار ماننے سے انکار کر دیا۔ اب یہ فیصلہ وقت کرے گا کہ جنون اور تاریخ کے اس معرکے میں کون جیتا، کون ہارا۔

یوں تو ہر شہر، شہر ہی ہے، مگر بعض شہر، اپنی آغوش میں رہنے بسنے والوں کی پوری تہذیب و ثقافت کے امین ہوتے ہیں۔ لاہور بھی انہی شہروں میں سے ایک ہے۔ نقوش نے لاہور کا تاریخی اور تہذیبی سرمایہ محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے ـــــ دوسرے تاریخی شہر بھی "دیوانوں" کا منہ تک رہے ہیں۔

محمد طفیل

لاھور — تاریخ قدیم کی نظر میں

لیفٹیننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید

اللہ تعالٰے کے نام کا مادہ "لا" مذہبی دنیا کا قدیم ترین لفظ معلوم ہوتا ہے جو تمام مذاہب میں معمولی اختلاف سے مستعمل ہوتا رہا ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ قدیم تاریخ میں مشہور شہروں کے نام اسی مادہ سے ترکیب دیئے گئے ہیں۔ سید عبداللطیف اپنی تاریخ لاہور میں، لاہور کے نام کی مختلف شکلیں پیش کرتے ہیں جن کا بطور پس منظر پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ آئندہ مباحث میں یہ شکلیں ذہن نشین ہو کر پیش نظر رہیں۔ یہ تراکیب مندرجہ ذیل ہیں :-

اوّل :- لوہاور کے آباد کرنے والے کا نام "لوہ" تھا۔ یہ "لوہ" رام چندر جی کا بیٹا تھا۔

دوئم : وشنو بھاگا میں اس کا نام "لو پور" بھی آیا ہے۔

سوئم : راجپوتوں کی تاریخ میں اس کا نام "لوہ کوٹ" بھی لکھا گیا ہے۔

چہارم : فتوح البلدان کے مصنف نے اسے "الہاور" کہا ہے۔

پنجم : نزہت المشتاق فی اختیار الآفاق (مصنفہ ادریسی) میں اس کو "لہاور" کہہ کر پکارا گیا ہے۔

ششم : البیرونی نے اسے "لہاور" لکھا ہے جس کو ایلیٹ نے مختلف طریق سے پڑھا ہے، مثلاً لوھاور، لھاوور، لوھارو، اور لھور۔

ہفتم : امیر خسرو لاہور کو "لہانور" لکھتے ہیں۔ چنانچہ ان کا ایک شعر ہے۔

از حد سامانہ تا لہانور

ہیچ عمارت نیست مگر در قصور

ہشتم : سید عبداللطیف کا یہ بھی کہنا ہے کہ تھورنٹن (THORNTON) نے "لہانور" "لہانگر" کو لاہور کی بگڑی ہوئی شکل بتایا ہے۔

نہم : جامع التواریخ میں رشیدالدین اسے "لاہور" ہی لکھتا ہے۔

دہم : پٹولمی (PTOLOMEY) نے اسے "لوبوکلا" لکھا ہے۔ ممکن ہے لبوکلا سے "لوا" اور "لوہ" مراد ہو۔

بہر حال یہ مختصر سی فہرست ہے جو لطیف کی تصنیف لطیف میں ہمیں ملتی ہے۔ ان میں قدیم ترین ماخذ جو مسلمان مورخین

نے پیش کئے ہیں وہ ہماری نگاہ میں پنجاب کے دارالخلافہ لاہور سے متعلق نہیں۔ بلکہ ضلع مردان میں صوابی تحصیل کے لاہور سے متعلق ہیں۔ ہم اس کے متعلق آئندہ صفحات میں کچھ گذارشات پیش کریں گے۔ فی الحال ہم اس میں ایک اور حوالے کا اضافہ کر دینا مناسب سمجھتے ہیں وہو ھذا۔

یازدہم: لغت فرس میں اسدی طوسی "سداھرا" کے تحت لکھتے ہیں "نام باغی است بلہاور" اور پھر حقوری ہروی کا ایک شعر نقل کرتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے "حقوری گوید"———

ای سرو کشمری، سوئے باغ سداھرا
ہرگز دمی نیابی [و] یک روز نگذری

حقوری ہروی محمود غزنوی اور البیرونی کا ہم عصر تھا۔ یہ باغ سداھرا کہاں تھا اس کا کوئی سراغ لاہور (پنجاب) میں نہیں ملتا۔ البتہ اسے اگر "شاہدرا" کا ماخذ مان لیا جائے تو شاید کچھ بات بن جائے۔ کیونکہ یہاں ایک قدیم باغ کا پتہ ملتا ہے "سداھرا" اور "ساہدرا" کے حروف ایک ہی ہیں، ممکن ہے نقل کلمہ کی وجہ سے (METATHESIS) یہ تبدیلی واقع ہو گئی ہو۔ بہرحال یہ ایک دوسرا مسئلہ ہے۔

لاہور کے نام کی وجہ تسمیہ جو ہم یہاں پیش کرنے والے ہیں یہ ایک بالکل مختلف اور نیا نظریہ ہے جو آج تک کسی نے پیش نہیں کیا۔ اِلّا یہ کہ دو ایک بار خود ہم نے اپنے مضامین میں اس کا ذکر کیا ہے۔ مگر اس کی تفصیل آج یہاں پیش کی جائے گی یا اول اول ۱۹۴۵ء میں ندوۃ المصنفین کے مجلہ برہان میں ہمارا ایک مقالہ اس موضوع پر نکلا تھا اور اس کے بعد پھر ایک مضمون ہم نے پاکستان ہسٹری کانفرنس کے سالانہ اجلاس ۱۹۵۸ء میں پڑھا جو بعد میں اس کی روئداد میں شائع ہو گیا تھا۔

لاہور کے نام کا آغاز سمجھنے کے لیے ہمیں بہت دور تاریخ قدیم میں شرق الادوسا کی سیر کرنا ہو گی۔ یہ وہ وقت ہے جب مختلف قوموں کا انشعاب ایک سیلاب کی طرح امنڈتا ہوا دنیا میں پھیل رہا تھا۔

لاہور برعظیم کے قدیم ترین شہروں میں سے ہے۔ اس کا زمانہ موہنجو دارو اور ہڑپا کا زمانہ ہے۔ مگر لاہور کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ یہ متواتر چلا آیا ہے اور کبھی برباد نہیں ہوا۔ مورخین اور ماہرا آثریات (ASSYRIOLOGISTS) یہ کہتے ہیں کہ دنیا میں دو قدیم ترین شہر ہیں جو کبھی برباد نہیں ہوئے۔ اور مسلسل آباد چلے آتے ہیں۔ ایک ان میں کا دمشق ہے اور دوسرا اربیل ہے! ہمارا یہ کہنا ہے کہ لاہور بھی اسی زمانے کا قائم شدہ شہر ہے۔ اور یہ بھی کبھی برباد نہیں ہوا۔ جس طرح ہڑپا، موہنجو دارو، بابل، نینوا، آشور اور تخت جمشید وغیرہ تباہ و برباد و غیر آباد ہو گئے۔ لاہور کو ختماً یہ فخر حاصل ہے کہ وہ دنیا کے تین قدیم ترین شہروں میں سے ایک ہے جو کبھی برباد نہیں ہوا اور متواتر آبادی چلا آیا ہے۔ لاہور کی تاریخ تین ہزار ق م سے بھی پہلے پہنچتی ہے۔ ہم پہلے لاہور کی قدامت پر چند ایک شواہد پیش کریں گے۔

جو لوگ لاہور کے رہنے والے ہیں اور شہر کے اندر خوب گھومے پھرے ہیں وہ جانتے ہیں کہ لاہور کا پرانا شہر جو فصیل کے اندر ہے وہ ایک بلندی (ٹیلہ) پر واقع ہے۔ (MOUND)۔ یہ بات قلعہ کی طرف سے بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ خصوصاً جب ہم روشنائی دروازہ سے شیرانوالہ گیٹ کی طرف بڑھتے ہیں تو شہر کی اٹھان ہمیں نظر آتی ہے۔ اور پھر خود شہر کے اندر بھی

ایک مقامات ایسے ہیں جہاں تیس چالیس سیڑھیاں چڑھ کر جانا پڑتا ہے۔ اکثی ایک سڑکیں ایسی ہیں جن میں بڑا نشیب و فراز ہے۔ بلکہ سیتلا مندر کے سامنے جو نیا بازار ہے اس کے دائیں ہاتھ ایک مسجد ہے (شیریں مسجد) جو سڑک کی سطح سے پچاس فٹ نیچے ہے۔ اور اس کے میناروں کی بلندی سڑک کی سطح تک پہنچتی ہے۔ یہ تمام قرائن بتا رہے ہیں کہ لاہور ایک ٹیلے پر واقع ہے۔ درحقیقت لاہور شہر کے مضافات میں بھی ٹیلے نمایاں ہیں اور زمانہ قدیم میں شہر لاہور تین ٹیلوں پر واقع تھا جو اب گنجان آبادی کی وجہ سے نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ ان میں کا ایک ٹیلہ (MOUND) جو برجی ہے اور دوسرا بدھو کا آوا۔ لاہور اور اس کے گردونواح اس بات کی تصدیق کر رہے ہیں کہ یہاں قدیم ٹیلوں پر آبادیاں تھیں۔ اور ٹیلے اس بات کا اہم ثبوت ہیں کہ آبادیاں نہایت قدیم ہوں گی۔ اس امر کی تصدیق موہنجوداڑو، ہڑپا، اور بابل کے غیر آباد ٹیلوں سے ہو سکتی ہے۔ جن اصحاب نے مشرق وسطیٰ کی سیر کی ہے اور قدیم مقامات کے آثار دیکھے ہیں انھیں یہ بات سمجھنے میں دقت نہ ہو گی۔ اور وہ فوراً سمجھ جائیں گے کہ قدیم شہر یا ان کے آثار ہمیشہ بلند ٹیلوں پر واقع ہوتے ہیں۔ یہ بات کہ یہ ٹیلے کیونکر بنتے ہیں اور یہ آبادیاں ان پر کس طرح بس جاتی ہیں یہ علم آثار قدیم کا ایک اہم موضوع ہے۔ لاہور کی طرح شرق الادوسا میں بھی آباد شہر قدیم زمانے سے چلے آتے ہیں، مثلاً موصل، کرکوک، اربیل اور دمشق۔ یہ تمام بلندیوں پر واقع ہیں۔ حضرت یونس علیہ السلام کا مزار موصل کے قریب بلندی پر نینوا کی بغل میں واقع ہے۔ جب راسم اور بوتا نے (RASSAM AND BOTA) یہاں مکان خرید کر ان کے سردابوں میں کھدائی شروع کی تو ان کو کئی ایک خط میخی کے کتبے دستیاب ہوئے جو اس ٹیلے کی قدامت کا بین ثبوت تھے۔ مختصر یہ کہ ایک بستی پیشتر ہی سے موجود ہوتی تھی۔ زمانے کے حوادث کی وجہ سے نیست و نابود ہو جاتی، کبھی دشمن تباہ کر کے آگ لگا دیتا۔ کبھی بھونچال اس کو تباہ کر دیتے اور کبھی عذاب الٰہی سے نیست و نابود ہو جاتی۔ ہمارا ذاتی نظریہ ہے کہ جو بستی عذاب الٰہی سے تباہ و برباد ہو جاتی ہے وہ دوبارہ کبھی آباد نہیں ہوتی۔ دیگر حوادث کی وجہ سے تباہ شدہ بستیاں از سر نو آباد ہو جایا کرتی ہیں۔ عذاب الٰہی سے تباہ شدہ بستیاں مندرجہ ذیل تصور کی جا سکتی ہیں (۱) بابل (۲) نینوا (۳) آشور (۴) تخت جمشید (۵) ہڑپا (۶) موہنجوداڑو اور (۷) ٹیکسلا۔ ان کا دوبارہ آباد ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ اور جو بستیاں عذاب الٰہی سے تباہ نہیں ہوتیں وہ از سر نو آباد ہو جایا کرتی ہیں جو لوگ بعد میں آتے ہیں وہ ان بستیوں کے مناسب محل وقوع کو پسند کر کے یہاں آباد ہو جاتے ہیں اور اسی گری ہوئی بستی کی اینٹوں سے ایک نیا شہر تعمیر کر لیتے ہیں یہ سلسلہ متواتر کئی ہزار سال تک جاری رہتا ہے۔ یہ شہر گرتے اور بنتے رہتے ہیں پھر گرتے اور پھر بنتے ہیں۔ غرضیکہ اس اصول کے مطابق جو شہر آجکل ان قدیم جگہوں پر موجود ہیں وہ کچھ بلندی پر واقع نظر آتے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہوا کہ وہاں پہ پیشتر ہی سے کوئی ٹیلہ یا بلندی موجود تھی اور اس پہ معماروں نے شہر کی تعمیر شروع کر دی ہو۔ بلکہ یہ ایک ارتقائی امر ہے۔ البتہ جو بستیاں پہاڑوں کی بلندیوں پر آباد کی گئی تھیں ان کی نوعیت مختلف ہوتی ہے اور ان کا ان ٹیلوں سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ٹیلے مصنوعی ہوتے ہیں اور پہاڑ قدرتی طور پر تخلیق پاتے ہیں۔ اور ہم اس وقت میدانی بستیوں کا ذکر کر رہے ہیں۔

ہم نے مقالے کے شروع میں عرض کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے لفظ کا مادہ "لا" مذہبی دنیا کا قدیم ترین لفظ ہے۔ اس لیے جب کبھی بھی انسانوں کو مل کر بستیاں قائم کرنے کا موقعہ ملا تو انھوں نے اللہ کے نام پر ہی اس کا نام تجویز کیا اور کسی نہ

کسی شکل میں تخلیق پا گیا۔ اور کسی نہ کسی زبان میں اس کا مفہوم "بیت اللہ" نکل آیا! بابل کا اصل نام "باب ایل" تھا یعنی بیت اللہ۔ اربیل کا اصل نام "اربعہ ایلو" تھا یعنی یہاں چار دیوتاؤں کی پرستش ہوا کرتی تھی۔ یونانیوں نے اسے اربیلہ کہہ کر (ARABELA) پکارا۔ [اربعہ ایلو، یعنی چار دیوتاؤں کا شہر۔ یہاں تثلیث کے تصور سے پہلے چار دیوتا پوجے جاتے تھے۔ ان کے نام یہ ہیں (۱) اندرا (۲) ورونا (۳) منتھرا۔ اور (۴) آشورا۔ جب آرین اقوام برِ عظیم میں وارد ہوئیں تو آشور دیوتا کو پیچھے چھوڑ آئیں۔ یاد رہے کہ مہابھارت کی جنگ میں اس دیوتا کی اہمیت کم ہو گئی تھی۔ جو تثلیث آرین ساتھ لے کر آئے وہ یہ تھی (۱) اندرا (۲) ورونا۔ اور (۳) منتھرا۔ آہستہ آہستہ ان ناموں میں تبدیلی ہو گئی اور اڑھائی ہزار سال ق م میں جب زہرہ (VENUS) جو ایک دُم دار ستارہ تھا اس کا تصادم اس کرۂ زمین سے ہوا تو اس کی دُم جاتی رہی اور یہ ایک سیارہ (PLANET) بن گیا۔ تمام سیارگان کی تخلیق اسی طرح ہوئی ہے۔ جب زہرہ سیارہ بن گیا تو اس نے اپنا اثر روئے زمین کی مخلوق پر ڈالا، چنانچہ موسم اور فصلیں اس سے متاثر ہوئیں اور انسان نے یہ اثر محسوس کیا۔ اور اس کو دیوتا سمجھ کر اس کی پرستش شروع کر دی۔ اور یہ مذہبی عقائد میں متعارف ہوا۔ سب سے پہلے یونانیوں نے اسے وینس (VENUS) دیوتا بنا کر پوجا۔ اور بعدہٗ آرین اقوام نے اسے اپنی تثلیث میں شامل کر کے اس کو وشنو کا نام دیا۔ چنانچہ برِ عظیم میں جب آرین وارد ہوئے والے تھے تو ان کی تثلیث مندرجہ ذیل دیوتاؤں پر مشتمل تھی (۱) اندرا (۲) منتھرا۔ اور (۳) وشنو۔ یہ تثلیث بہت بعد میں موجودہ شکل میں آئی (۱) برہما (۲) وشنو اور (۳) مہیش ملاحظہ ہو۔

(WORLDS IN COLLISION BY EMANVAL VALINKOVSKY)

اسی طرح کئی ایک اور مقامات ہیں جن کی بنیاد مذہبی طور پر ان دیوتاؤں پر رکھی گئی۔ مثلاً حضرو کے قریب ایک مقام تربیلا ہے جہاں آج کل حکومت پاکستان دریائے سندھ پر ایک بند ترتیب دے رہی ہے۔ اس کا اصل نام تربیا ایلو تھا۔ (TRIBA ILV) یعنی تین دیوتاؤں کے پوجنے کی جگہ۔ اس مقام کے متصل دریائے سندھ کے پار، ریاست امب کا دار الخلافہ امبیلا ہے جس کا اصل نام امبا ایلو (AMBA ILV) تھا جہاں امبہ دیوی کی پوجا ہوتی تھی۔ اور غالباً یہ کہنا مبالغہ آمیز نہ ہو گا کہ بھارتی پنجاب کا انبالہ درحقیقت امبالہ یا امبا ایلو ہی تھا۔ شہروں کے ناموں میں اکثر تکرار دیکھی گئی ہے۔ گویا امبیلا اور انبالہ کا ماخذ امبہ دیوی ہے! حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ تبت کا دار الخلافہ لاسہ بھی بیت اللہ کے معنی میں مستعمل ہے۔ اور یہ شہر آرین تہذیب کا بڑا مرکز ہے۔ اسی طرح ہم سمجھتے ہیں کہ جب آرین اقوام کا ورود اس برِ عظیم میں ہوا۔ اور وہ وادی سندھ میں بڑھتے چلے آئے تو جب لاہور پہنچے تو انھوں نے اس کا نام "لا اُرہ" رکھ دیا۔ اس بات کو تقریباً پانچ ہزار سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ یہ ہمارا ذاتی فکر ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ یہ لفظ "اُرہ" کہاں سے اور کس طرح آیا اور اس کا کیا مطلب ہے، تو اس کی وضاحت ہم ذیل میں اختصاراً عرض کرتے ہیں۔

"تاریخ قدیم کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ آرین لوگوں کا سیلاب جب ایران پر امنڈا تو وہ بہت عرصہ تک جاری رہا۔ ایسا نہیں ہوا کہ وہ ایک ماہ یا ایک سال کے اندر وسط ایشیا یا قطب شمالی سے اٹھ کر ایران میں آ بیٹھا۔ (ARCTIC HOME IN THE VEDAS BY B.G-TILAK) بلکہ یہ سلسلہ ہجرت متواتر کئی

صدیوں تک جاری رہا۔ اور آرین اقوام کے کئی مختلف گروہ مختلف وقتوں میں مختلف راستوں سے آتے رہے چنانچہ ان کا ایک گروہ اناطولیہ میں داخل ہوا جس کو تاریخ میں حتی (HITTITES) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کے ساتھ ایک اور گروہ بھی تھا جو اگرچہ اناطولیہ میں داخل تو نہیں ہوا مگر اناطولیہ کے جنوب مشرق میں آباد ہو گیا۔ جو علاقہ انھوں نے قبضے میں لیا اس کا حدود اربعہ وہی ہے جو یونانیوں نے میڈیا (MEDIA) یا [ماوا] کا بتایا ہے۔ اس گروہ کا نام میتانی (MITANI) تھا۔ یہی وہ لوگ تھے جو آگے چل کر تاریخ میں ہوری (HURRIS) کہلائے۔ بعض مورخین کا کہنا ہے کہ میتانی قوم ہوری قوم کی اولاد سے تھی۔ (EARLY ANATOLIA BY SETON LLOYD) بہرحال یہ لوگ دجلہ تک پھیل گئے۔ اور ہلال خصیب (FERTILE CRESCENT) کے شمالی علاقہ پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ ان کی اصل راجدھانی جو میڈیا سے مطابقت رکھتی ہے کردستان کا علاقہ ہے۔ گویا کردوں کے آباؤ اجداد ہوری قوم کے لوگ تھے میتانی اور ہوری قوم کے تہذیب و تمدن میں ایک گونہ مماثلت ثابت کی جا چکی ہے۔ بوغاز کوئی (BOGAZKUI) سے خطِ میخی (CUNCIFORM INSCRIPTION) کی جو خط و کتابت برآمد کی جا چکی ہے اور جس کو تل العمرنا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے (TELL EL AMARNA) اور جو اس وقت برٹش میوزیم میں محفوظ ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ راجہ دسترتھ اسی قوم سے تھا چنانچہ اس کا تفصیلی حوالہ (THE MAKERS OF CIVILISATION IN RACEAND HISTORY BY L. A. WADDELL) میں دیا گیا ہے۔ یہ خط و کتابت مصر کے فرعون اخناطون (AKHNATON) اور راجہ دسترتھ کے مابین ہوئی اور اس کا موضوع یہ تھا کہ فرعون مصر نے راجہ دسترتھ کی لڑکی اپنے بیاہنے کے لیے مانگی تھی۔ تاریخ یہ بھی ثابت کرتی ہے کہ خود اخناطون بھی ایک میتانی عورت کے بطن سے تھا۔ نہ ہی صرف یہ بلکہ اس بات کے بھی شواہد مل چکے ہیں کہ مصر کا اولین بادشاہ جس نے اپنے آپ کو فرعون کہہ کر پکارا، راجہ دسترتھ کا بیٹا رام چندر تھا! اس کا نام خطِ میخی کے کتبوں سے امر سین یا ترم سین تشخیص کیا گیا ہے۔ یہ مثال بطور نقل کلمہ (METATHESIS) کے پیش کی جاتی ہے سین کے معنی میتانی زبان میں "چندر" ہی کے ہیں۔ اس امر سین نے اپنا لقب "پارو" رکھا۔ چونکہ عربی میں حرف "پ" نہیں ہوتا اس لیے اس کو بعد میں بالترتیب "فارو" "فارع" اور "فرعون" کہا گیا جس کو یونانیوں نے "فیرو" (PHAROAH) بنا دیا۔ ویڈل صاحب نے اس موضوع پر مفصل بحث کی ہے۔ پارو کا نام ان کا تجزیہ کردہ ہے باقی ترتیب فرعون کے لفظ کے ارتقا پر ہماری اپنی ہے۔

اگر یہ سب کچھ درست ہے تو کرو قوم کورو ہوئی۔ اور مہابھارت کا کورو استھان یا کورو کشیتر کردستان ہوا جو قدیم میڈیا یا ماوا کے حدود اربعہ سے مطابقت اور مماثلت رکھتا ہے۔ اور مہابھارت کی یہ مشہور جنگ پانی پت کے گرد و نواح کی بجائے شرق الادسا کے اس اہم خطہ میں وقوع پذیر ہوئی۔

یہی ہوری قوم جب جنوبی ہلال خصیب میں وارد ہوتی ہے (یہ اس برِ عظیم کے ورود سے پیشتر کا واقعہ ہے) تو ہور (R و H) کہلاتی ہے۔ اور اس نے اپنا دارالخلافہ "ہور" یا "اُر" کلدانی بنایا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش ہوئی۔ چنانچہ اس ہوری قوم نے اپنی تثلیث میں ایک اور اضافہ کیا اور منظرا کو گرا کر ابراہیمؑ

علیہ السلام کے نام پر برہما ملا دیا۔ اور بعد میں یہ قوم جب وادیٔ سندھ میں وارد ہوئی تو اس کی تثلیث یوں مرکب تھی
(۱) برہما (۲) وشنو اور (۳) اندرا۔

چنانچہ ورود وادیٔ سندھ کے وقت یہ قوم ہور کہلاتی تھی۔ اور یہ قوم آج تک سندھ کے علاقے میں موجود ہے۔ بڑھتے بڑھتے یہ لوگ ہڑپا اور لاہور تک پہنچے۔ اور لاہور کے مقام پر قابض ہو کر اس مقام کا نام انھوں نے "لاہور" رکھ دیا یا "لاآر" دونوں میں بہت کم فرق ہے۔ "آر" کا مطلب "آباد ہونے والا" یعنی (SETTLERS) ہے۔ کیا یہ بات قرینِ قیاس نہیں کہ جو قوم ہلال خصیب سے بڑھ کر موہنجو دارو اور ہڑپا تک پہنچ سکتی ہے وہ لاہور تک نہ آسکتی تھی؟ اسی قوم نے لاہور کی بنیاد رکھی اور اسی قوم کے نام پر لاہور کا اصل نام "لاآر" رکھ دیا گیا۔ اس ترکیب کے معنی بھی بیت اللہ ہی کے ہیں۔ لاہور کا نام اوّل روز سے ہماری دانست میں یہی چلا آتا ہے جو زبان کے اختلاف کی وجہ سے بدلتا رہا ہے اور آرین اقوام کا قدیم ترین مرکز اس برّ عظیم میں جو اس وقت آباد ہے یہی لاہور ہے۔ جس طرح لاسہ کا مطلب بیت اللہ ہے اسی طرح لاآر کا معنی بھی بیت اللہ ہی ہے۔ اگر تحت اللفظ لاہور کا ترجمہ کیا جائے تو اس کے معنی بھی بیت اللہ ہی نکلتے ہیں یعنی اللہ کا آباد کیا ہوا۔ تو پھر اللہ کا ہی گھر ہوا؟ اکبر اعظم نے پراباگ کا نام الہ آباد رکھا۔ یہ پراباگ کا ترجمہ تھا۔ پارو اور پرا ایک ہی لفظ ہے دونوں کا مطلب اللہ ہی ہے یا (LORD) جس طرح سنسکرت کا پرا بھگو۔ اس کے معنی بھی (LORD OF THE LAND) ہی ہیں۔ ان ہوروں کا ذکر سکندر مقدونی کا مورخ پلوٹارک (PLUTARCH) بھی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہندوستان میں سب سے زیادہ بہادر اور جنگجو قوم یہی ہے۔

اب ہم قدیم مسلم مورخین کے "لوہاور" کو بغور دیکھتے ہیں کہ یہ کہاں پر واقع ہے۔ فتوح البلدان، ادریسی اور البیرونی بالترتیب لاہور کو "لوہاور"، "الہاور" اور "لہاور" لکھتے ہیں۔ ان سب کا زمانہ آج سے تقریباً ایک ہزار سال کا ہے۔ عتبی تاریخ یمینی کا مصنف جو محمود غزنوی کا مورخ تھا، لکھتا ہے کہ محمود غزنوی نے اپنی پہلی تین مہموں میں دریائے چناب کو عبور نہیں کیا! ہم پوچھتے ہیں کہ اگر اس نے دریائے چناب کو عبور نہیں کیا تو وہ لاہور (پنجاب) کس طرح پہنچ گیا؟ عتبی یہ بھی کہتا ہے کہ انندپال کی فوجیں محمود غزنوی کے مقابلے کے لیے لوہاور سے آگے بڑھیں جو کہ انندپال کا گرمیوں کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ بڑی ہی عجیب بات ہے لاہور (پنجاب) گرمیوں کا ہیڈ کوارٹر ہو حالانکہ اس کا دارالخلافہ ہنڈ تھا۔ اسے پنجاب آنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس لوہاور کا ذکر پینینی (PANINI) جو کہ بدھوں کا ایک بہت بڑا صرف و نحو کا عالم تھا کرتا ہے، وہ بھی یہاں ایک عرصہ تک رہا۔ لاہور (پنجاب) بدھوں کا کبھی بھی مرکز نہیں رہا۔ درحقیقت یہ لوہاور آج بھی موجود ہے اور آباد ہے، یہ ایک ٹیلہ پر واقع ہے اور ضلع مردان کی تحصیل صوابی کا ایک قصبہ ہے جو ہنڈ سے تقریباً دس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہی البیرونی اور دیگر مسلمان مورخین کا لوہاور اور لہاور اور الہاور ہے۔ ڈاکٹر ناظم مرحوم نے ایک خط میں جو انھوں نے ڈاکٹر محمد باقر کو لکھا اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے اور یہ خط ڈاکٹر محمد باقر صاحب نے اپنی کتاب LAHORE PAST AND PRESENT میں بطور ضمیمہ شامل کر دیا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ہمارا مقالہ محمود غزنوی کی مہموں پر مطبوعہ روئداد پاکستان ہسٹری کانفرنس ۱۹۵۵ء ص ۱۲۳۔

ہم نے عرض کیا تھا کہ لاہور ایک ٹیلہ پر واقع ہے۔ ہمارا قیاس کہتا ہے کہ اگر اس ٹیلے کے وسط میں کسی ایک مقام پر عملِ تنقیب کے ذریعہ (EXCAVATIONS) کھدائی کی جائے اور اسے پچاس ساٹھ فٹ گہرائی تک لے جایا جائے تو کئی ایک تہذیبوں کے آثار مل سکتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا کہ لاہور کے قلعہ کے اندر کھدائی شروع کروائی گئی تھی جب یہ کئی ایک جانب سے بلا وجہ ہے شُدے ہوئی مگر اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ ابھی تک ہمیں معلوم نہیں ہو سکا۔ ہمارا یقین ہے کہ قلعہ بھی چونکہ ایک ٹیلہ ہے اگر اس کو گہرا کھدوا جائے تو بالترتیب اس میں سے مندرجہ ذیل تہذیبیں برآمد ہو سکتی ہیں۔

(۱) سکھ

(۲) مسلم

(۳) ہندو

(۴) بُدھی

جب یہ تمام حقائق منظرِ عام پر آ جائیں گے تو جو کچھ ہم نے کہا ہے وہ سب کچھ پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے گا۔ ع

بر افگن پردہ تا معلوم گردد
کہ یاران دیگرے را می پرستند

لاہور

(تاریخ تاسیس اور وجہ تسمیہ)

پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر

لاہور کی قدیم تاریخ پر روایات، قیاسات اور حکایات کی دھند کچھ اس طرح چھائی ہوئی ہے کہ کوشش کے باوجود علمی اور یقینی طور پر یہ معلوم کرنا ناممکن ہے کہ اس شہر کا نام کب اور کیسے رکھا گیا؟ لیکن تحقیق کاوش سے [illegible] جو مواد مہیا ہو سکا ہے وہ پیش خدمت ہے۔

میری تحقیق کے مطابق لاہور کا ذکر سب سے پہلے چوتھی صدی ہجری کی ایک تالیف حدود العالم میں ملتا ہے۔ اس کتاب کے مصنف کا نام معلوم نہیں ہو سکا لیکن اس کی تاریخ تصنیف ۳۷۲ھ ہجری (۹۸۲ء عیسوی) ہے۔ اس کتاب میں درج ہے:

"لھور شہریست با ناحیت بسیار و سلطانش از دست امیر ملتانست
و اندرو بازارہا و بتخانہا ست و اندرو درخت چلغوزہ و بادام و جوز ہندی
بسیار ست و ہمہ بت پرستند و اندر وی ہیچ مسلمان نیست" (حدود العالم ص ۱۴۲)

ابوریحان محمد بن احمد البیرونی کئی سال تک ہندوستان میں رہا اور محمود غزنوی کے حملوں کے وقت یعنی گیارھویں صدی عیسوی میں وہ ہندوستان کا آنکھوں دیکھا حال قلمبند کر رہا تھا۔ وہ اپنی مشہور تالیف تاریخ الہند میں لکھتا ہے کہ لاہور ایک شہر نہیں بلکہ ایک علاقے کا نام ہے جس کا دار الخلافہ مندھوکور ہے:

"ثم فیما بین المغرب والشمال الی آدت ھو رتسعة
والی جبنبر سنة والی مندھوکور قصبة لوھاور علی
شرق نھر ا براوہ غنبة" (تاریخ الہند ص ۱۰۲)۔

کنہیا لال کے بقول شیخ احمد زنجانی نے اپنی تصنیف تحفۃ الواصلین میں لاہور کا ذکر کیا ہے۔ اور یہ رسالہ ۴۳۵ھ ہجری (۱۰۴۳ء عیسوی) میں لکھا گیا ہے۔ کنہیا لال اپنی تصنیف "تاریخ لاہور" میں لکھتے ہیں:

"شیخ احمد زنجانی صاحب رسالہ تحفۃ الواصلین جس نے وہ کتاب ۴۳۵ھ ہجری

عہد سلطان مسعود غزنوی بمقام لاہور اس کے علماء و فضلا کے حال میں لکھی ہے۔"
(تاریخ لاہور، ص ۹)۔

افسوس ہے یہ رسالہ کوشش کے باوجود مجھے کسی معروف کتاب خانے سے دستیاب نہیں ہو سکا۔

ابو سعید عبدالحی بن الضحاک بن محمود گردیزی نے اپنی تصنیف زین الاخبار (۴۴۰ھ / ۱۰۴۸ء) میں ترتیب دی۔ وہ کشمیر پہ محمود غزنوی کے حملے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

" وچوں سنۃ اثنی عشرہ واربعمائۃ اندر آمد قصد کشمیر کرد و حصار لوھرکوت را اندر پیچید و یک ماہ آنجا قیام کرد۔ و از آنچہ قلعہ بغایت منیع و محکم بود نتوانست کشاد۔ و اندرین سال امیر نصر بن ناصر الدین رحمۃ اللہ فرمان یافتہ بود و امیر یوسف بن ناصر الدین رحمۃ اللہ با یمین الدولہ رفتہ بود۔ وچوں لوھرکوت گشادن ممکن نگشت از آن درہ بیرون آمد بر جانب لوھور تا کیشمر برفت " (زین الاخبار، ص ۷۹)۔

جب سلطان مسعود اپنے بیٹے مجدود کو لاہور کا والی بنا کر بھیجتا ہے تو یہی مصنف صوبے کا نام لاہور بتاتا ہے:

" پس امیر مجدود بن مسعود را رحمہما اللہ ولایت لاہور داد و طبل و علم داد و او را با حشم و حاشیت سوی لاہور بفرستاد و خود سوی غزنین آمد" (زین الاخبار، ص ۱۰۴)۔

سید علی ہجویری (داتا گنج بخش) گیارھویں صدی عیسوی کے مشہور عالم اور بزرگ گزرے ہیں۔ آپ ۴۰۰ھ (۱۰۰۹ء) اور ۴۶۵ھ (۱۰۷۲ء) کے درمیان فوت ہوئے۔ آپ اپنی گرانقدر تصنیف کشف المحجوب میں رقمطراز ہیں:

" من اندر دیار ہند در بلدہ لہانور کہ از مضافات ملتان است در میان ناجنساں گرفتار شدہ بودم" (کشف المحجوب، برگ ۵۶ ب)۔

گیارھویں صدی عیسوی کے مشہور ایرانی مورخ ابوالفضل محمد بن حسین بیہقی نے تین جلدوں میں غزنویوں کی تاریخ مرتب کی ہے۔ وہ اپنی اس تالیف تاریخ بیہقی میں ۴۲۵ھ (۱۰۳۳ء) کے واقعات کے ضمن میں مندکگور کے قلعے کے ساتھ لاہور کا ذکر کرتا ہے۔ مندکگور اسی لفظ کی دوسری شکل ہے جسے بیرونی نے مندھوکور لکھا ہے:

" و نیمۂ این ماہ (رمضان سن خمس و عشرین و اربعمائۃ) نامہ رسید از لھور کہ احمد ینالتگین با بسیار مردم آنجا آمد و قاضی شیراز و جملہ مصلحان در قلعۂ مندکگور رفتند" (تاریخ بیہقی، ص ۵۲۳)۔

ابوالفرج رونی غزنوی عہد کا مشہور شاعر ہے۔ وہ سلطان محمود کے پوتے سلطان ابراہیم کا قصیدہ مدحیہ لکھتے ہوئے لاہور کا نام لوہاور بتاتا ہے:

"کشید رایت منصور سوی لوہاور
زطالعی کہ ترا کند بدو تقویم"

(دیوان رونی، ص ۹۶)

مشہور عرب جغرافیہ دان ابوعبداللہ محمد بن محمد بن عبداللہ الادریسی اپنی تصنیف **نزہتہ المشتاق فی اختراق الآفاق** میں شہر کا نام لھاور لکھتا ہے۔

مشہور ایرانی عالم اور طبیب شرف الزمان طاہر مروزی نے اپنی تالیف طبائع الحیوان چھٹی صدی ہجری (گیارھویں صدی عیسوی) میں مرتب کی۔ وہ شہر کا نام لوھور لکھتا ہے:

"فی اراضی لوھور مدینۃ یقال لھا رامیان فیھا
صنم مضطجع وحولہ اصنام قیام وفیھا صنم من
حفر مموہ بالذھب وھو صنمھم..." (طبائع الحیوان ص ۳۹)

خالص ادبی کتابوں کی طرف توجہ کرتے ہوئے ہمیں سب سے پہلے سابقہ پنجاب کے مشہور فارسی گو شاعر مسعود سعد سلمان کے اشعار دستیاب ہوتے ہیں جو اس نے گیارھویں صدی کے اواخر اور بارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں لکھے ہیں۔ اور جن میں اس نے شہر کا نام لوھور، لھاوور، لاوھور، لوھاور، اور لاہور نظم کیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

دردلیشی دلیسی ز لوھور ——— برکندہ بحضرتم فرستاد

رسید عید و من از روی حور دلبر دور
چگونہ باشم بی روی آن بہشتی حور
مرا کہ گوید کای دوست عید فرخ باد
نگار من بہ لھاوور و من بہ نیشابور

ای لاوھور ویحک بی من چگونہ ای
بی آفتاب تابان روشن چگونہ ای

محملی باید از خداوندم ——— کہ اندروی لوھور آید
کہ ہمی زآرزوی لوھاور ——— جان و دل در تنم ہمی ناید

گرما بہ سہ داشتم بلاہور ——— وین نزد ہمہ کسی عیان است

(دیوان مسعود سعد سلمان)

ابی الحسن علی بن زید بیہقی الملقب با بن فندق نے اپنے وطن بیہق کی ایک تاریخ ۵۶۳ھ (۱۱۶۸ء) میں لکھی۔ اس میں غزنویوں کی حدود سلطنت بیان کرتا ہوا وہ لکھتا ہے:

"ملک ایشان از دیار خراسان و عراق منقطع گشت و با غزنی افتاد فی شہر ثمان وعشرین وار بعمائۃ، و از غزنین منقطع شدہ است و با دیار لوھاوور و برشاوور و آن طرف افتادہ از سنہ خمس و خمسین و خمسائۃ"

(تاریخ بیہقی، ص ۷۱)

یاقوت بن عبداللہ نے اپنی عظیم الشان تصنیف معجم البلدان ۶۲۱ھ (۱۲۲۴ء) میں مکمل کی۔ وہ اسے لوھور اور لھاور کے ناموں سے یاد کرتا ہے:

"لوھور بفتح اولہ وسکون ثانیہ والھاء واخرہ راء و المشھور من اسم ھذا البلد لھاوور وھی مدینۃ عظیمۃ مشھورۃ فی بلاد الھند"

(معجم البلدان، جلد چہارم، ص ۳۷۱)۔

لاہور کی تاسیس کی روایتی تاریخ سنیے۔ تاریخی طور پر یہ پہلی دستاویز ہے جو لاہور کی تاریخ تاسیس کا ذکر کرتی ہے اور اسے شریف محمد بن منصور نے ضمنی طور پر اپنی مشہور تالیف آداب الحرب والشجاعہ میں درج کیا ہے۔ یہ کتاب سلطان التمش کے زمانے (۶۲۱ء ـ ۱۲۳۶ء) میں فن حرب پر لکھی گئی تھی۔ شریف محمد بیان کرتا ہے:

"در تاریخ چنین آمدہ است کہ جج بن کھند راکہ والی لوھور بود و بنای لوھور او نہادہ است او بگذشت۔ پسری بود اورا ہزت نام مردی عادل۔ روزگاری آرمیدہ داشت و آنجا در لوھور مسجد خشتی است بتخانہ کرد۔ و صورتی از سنگ بفرمود تا بتراشیدند و آنرا آفتاب نام کردہ بود و مذہب او آفتاب پرستی بود و عمری دراز یافتہ بود، نود و سہ سال از آنجملہ ہفتاد و پنج سال امیر لوھور بود"

(آداب الحرب والشجاعہ، برٹش میوزیم کا خطی نسخہ، برگ ۱۲۲)

مشہور ہندی شاعر امیر خسرو نے اپنی مثنوی قران السعدین میں ۶۸۸ھ (۱۲۸۹ء) میں مغل کے حملے کا ذکر کرتے ہوئے شہر کا نام لاوھور درج کیا ہے:

از قدم شوم مغل آن بلاد	نام و نشان زعمارت نداد
از حد سامانہ وتا لاوھور	ہیچ عمارت نہ مگر در قصور

مشہور مورخ رشید الدین نے اپنی تصنیف جامع التواریخ میں شہر کا نام لوھاور بتایا ہے:

"پس آنچہ میان شمال و مغرب است تا اوت ھور ندو تا جنہیر شش، و تا مندھوکور قصبۂ لوھاور بر شرق نہرا یراوہ ہشت فرسنگ ......"

(جامع التواریخ، برگ ۶۶۱ ب)

ہمایوں کے عہد میں حیدر میرزا دوغلت نے کشمیر فتح کیا۔ وہ بعد میں اس ملک کا خود مختار حاکم بن گیا۔ اُس نے ۹۵۰ھ/۱۵۴۴ء بـ ۹۵۴ھ/۱۵۴۷ء کے درمیان اپنی تصنیف **تاریخ رشیدی** مرتب کی۔ تبت کے مختلف علاقوں کا ذکر کرتا ہوا وہ لاہور کے محل وقوع کو بھی یوں زیر بحث لاتا ہے:

"چنانچہ عقبہ بالا شدن از جانب یارکند ساجو است و عقبہ فرود آمدن بر جانب کشمیر عقبہ انشکار دو است۔ ازاں تا این عقبہ بیست روزہ راہ باشد و ہم چنین بر مغرب زمستان ختن بعضی از بلاد ہند واقع است، چوں لاہور و سلطانپور و باجوارہ" (تاریخ رشیدی پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا خطی نسخہ، برگ ۴۰۶)۔

جمال الدین حسین انجو جہانگیر کا درباری تھا۔ اُس نے فارسی کا ایک ضخیم لغت ۱۰۱۷ھ (۱۶۰۸ء) میں ترتیب دیا اور اپنے محسن جہانگیر کے نام سے منسوب کر کے اس کا نام **فرہنگ جہانگیری** قرار دیا۔ اس فرہنگ میں اُس نے شہر لاہور کی جو مختلف شکلیں گنائی ہیں وہ درج ذیل ہیں۔ ان شکلوں کے استناد کے لیے اُس نے ایرانی اور ہندی فارسی گو شعرا کے شعر بھی شہادت کے لیے پیش کیے ہیں:

لاوھور و لاہور و لوھاور و لوھور و لہاور و لہاوار و لہانور نام شہر یست زملک ہندوستان کہ بلاہور اشتہار دارد:

ابوالفرج رونی:

بلاوھور در آمد میان موکب خویش
بنزہتی کہ برآید شب چہاردہ ماہ

امیر خسرو فرماید:

از حد سامانہ تا لاہور ‖ ہیچ عمارت نیست مگر در قصور

انہ ابوالفرج رونی است:

کشید رایت منصور سوی لوھاور ‖ بطالعی کہ تو لاکند بد و تقویم

حکیم ثنائی منظوم ساختہ:

ای بزرگان غزنہ و لوھور ‖ چشم بد زین زمانہ بادا دور

شیخ نظامی راست:

ندیم خاص بودش نام شاپور ‖ جہان گشتہ ز مشرق تا لہانور

یہ سادہ اور مستند تاریخ ہے جو شہر لاہور، اس کے نام اور اس کی تاریخ کے متعلق مجھے دستیاب ہوئی ہے اور میں نے اسے من و عن درج کر دیا ہے۔ اس پر غور کرنے سے ہم مندرجہ ذیل نتائج اخذ کرتے ہیں:

(۱) لاہور کا اوّلین ذکر ۳۷۲ھ / ۹۸۲ء میں کتاب حدود العالم میں ملتا ہے۔ اس سے پہلے کسی مورخ، جغرافیہ دان یا سیاح نے لاہور کا ذکر نہیں کیا۔

(۲) لاہور کے نام کی مختلف شکلیں مختلف مصنفوں کے ہاں ملتی ہیں اور ان کی فہرست یہ بنتی ہے:

لھوّر

لوہاوَر

لوھُوپر

لہانُور

لوھاوُور

لھاوُور

لاوھُور

لھاوَر

لانہور

لھاوار

لاہور

(۳) مندھکور، مندکور یا مندکگور کا شہر صوبۂ لاہور کا دارالخلافہ تھا۔ لیکن یہ شہر لاہور سے الگ شہر تھا۔

(۴) ۳۷۲ھ / ۹۸۲ء میں لاہور پر حاکم ملتان کا نمائندہ حکومت کرتا تھا اور ۴۶۵ھ / ۱۰۷۲ء میں لاہور ملتان کے توابع میں سے تھا۔ یعنی اس وقت تک لاہور کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہ ہوئی تھی۔

(۵) کم از کم ۳۷۲ھ / ۹۸۲ء تک اس شہر میں کوئی مسلمان موجود نہ تھا اور یہاں صرف ہندو آباد تھے۔

(۶) کوئی ایسی معاصر شہادت موجود نہیں جس سے حتمی طور پر یہ معلوم ہو سکے کہ فلاں آدمی نے اسے فلاں موقع پر فلاں تاریخ کو آباد کیا تھا۔ روایت اس کی تاسیس کو مختلف ناموں سے منسوب کرتی ہے جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

(الف) راجہ پریچھت جو پانڈوؤں کی اولاد میں سے تھا۔

(ب) لوہار چند جو راجہ دیپ چند کا بھتیجا تھا۔

جیسے کہ ابھی بیان کیا گیا ہے یہ لاہور کے عہد اسلامی کی وہ تاریخ ہے جس کا سراغ کتابوں میں ملتا ہے۔ یہ تاریخ نہ تو شہر کی معین تاریخ تاسیس تک راہنمائی کرتی ہے نہ اس کے موسس تک۔ لاہور دفعتہً نویں صدی عیسوی کے اواخر میں تاریخی کتابوں میں نمودار ہوتا ہے۔ اور یہ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ اس سے پیشتر کے تاریخی شواہد ہمیں نہیں ملتے اس لیے ہمیں اُن قیاسات کو بھی

زیر بحث لانا پڑتا ہے جو شہر کے نام اور تاریخ تاسیس کے متعلق کیے گئے ہیں۔ میں ان پر تاریخی تقدم و تاخر سے بحث کروں گا۔

۱۹۵۳ء میں میں کتاب خانہ ملی تہران میں چند علما کی صحبت میں موجود تھا۔ لاہور کے نام کی وجہ تسمیہ کی بحث چل نکلی تو تہران ریڈیو کے مشہور افسانہ خوان آقای صبحی نے کہا: میرا خیال یہ ہے کہ "لاہور" ایک مرکب لفظ ہے اور دو لفظوں سے مل کر بنا ہے۔ یہ دو لفظ "لاد" اور "ھور" ہیں۔ لغت ہای محلی میں ایران میں "لاد" کے معنی شہر کے ہیں۔ اور "ھور" سورج کے معنوں میں عام استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سعدی کے اس شعر میں:

نور گیتی فروز چشمۂ ھور
سخت آید بچشم موشک کور

اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ "لاہور" کے معنی "سورج کا شہر" ہے۔

یہ توجیہہ صحیح ہو یا نہ ہو لیکن میں نے صبحی جیسے عالم کی قیاس آرائی کی داد دی۔

برنیر (BERNIER) فروری ۱۶۶۵ء میں موسیو دی مرویلز (MONSIEUR DE MERVEILLES) کو ایک خط میں لکھتا ہے: میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ لاہور قدیم بوسیفیلوس (BUCEFALOS) ہے یا نہیں۔ سکندر یہاں کافی معروف ہے اور اُسے بر سکندر فیلقوس یعنی سکندر ابن فلپ پکارتے ہیں۔

خلاصۃ التواریخ کا مصنف سجان سنگھ دبیر ۱۱۰۷ھ/۱۶۹۵ء میں عام طور پر مشہور روایت کا ذکر کرتا ہے۔ کہ لاہور کو رام چندر کے بیٹے لو نے بسایا تھا۔ اور یہ کہ جب لاہور برباد ہوا تو سیالکوٹ پنجاب کا دارالخلافہ بنا دیا گیا تھا:

"لاہور مصر یست متقدمین بر کنار دریای راوی۔ آبادی آن از بہ لو خلف
راجہ رام چند نسبت مہیہ مہند۔ در بعضی تواریخ لہور و لہاور نیز منوبیسندہ چوں
از گردش دوار بعد امتداد ادوار در ارکان آبادی آن انہدام رو داد قلیلی نشان
معموری ماند دار الحکومت این ولایت شہر سیالکوٹ گردید"

(خلاصۃ التواریخ، ص ۶۴)

ایک پنجابی شاعر خیر اللہ فدا کا خیال ہے کہ ایاز لاہور کا بانی تھا۔ وہ اپنی مثنوی: مرزا صاحباں میں ۱۱۵۵ھ/۱۷۴۲ء میں لکھتا ہے:

نیست در ہیچ کشوری شہور	شہر دیگر بخوبی لاہور
زین بنا حسن و عشق مقصود ست	بانی او ایاز محمود ست

(مثنوی مرزا صاحباں، میرے کتاب خانے کا خطی نسخہ، برگ ۶۲)

حدیقۃ الاقالیم کے مصنف مرتضےٰ حسین نے اپنی تصنیف میں ۱۲۰۲ھ/۱۷۸۷ء میں تقریباً سجان سنگھ دبیر کے بیان کو دہرا دیا ہے:

"لاہور شہر یست در ہندوستان بر ساحل دریای راوی۔ مؤلف خلاصۃ التواریخ

بنویسند کہ ہندوان آنرا بخلف رام چندر کہ لہور نام داشت نسبت میدہند"
(حدیقۃ الاقالیم، پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا خطی نسخہ، برگ ۸)۔

مندرجہ ذیل مصنفین نے رام چندر کے لڑکے لو کو لاہور کا بانی قرار دیا ہے:

جیمز ٹاڈ (۱۸۳۸ء):

"رام کے دو لڑکے تھے: لو اور کش۔ رانا کا خاندان اوّل الذکر کو اپنا مورثِ اعلیٰ مانتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے لاہور تعمیر کیا تھا"
(ٹاڈ راجستھان، جلد اوّل، ص ۲۵۲)۔

بوٹے شاہ (۱۲۵۸ھ/۱۸۴۷ء):

"شہر لیست باستانی کہ بنای آنرا بہ لو پسر راجہ رام چندر پسر جسرت نسبت میکنند" (تاریخ پنجاب، کتابخانہ دانشگاہ پنجاب کا خطی نسخہ، برگ ۱۶)

چشتی (۱۸۶۷ء):

"راجہ رام چندر کے دو بیٹے ایک کشو اور دوسرا لوہو تھے۔ لوہو نے شہر لاہور آباد کیا" (تحقیقات چشتی، ص ۷۹۳)۔

کنہیا لال (۱۸۸۲ء):

"عموماً مشہور ہے کہ مہاراجہ رام چندر اوتار کے فرزند مسمی لو نے یہ شہر آباد کیا اور لو پور نام رکھا تھا۔ صدہا بلکہ ہزارہا سال کی مدت گذرنے کے سبب لو پور کا لفظ بگڑ کر لاہور مشہور ہو گیا"

(تاریخ لاہور، ص ۷)۔

سر رچرڈ ٹمپل (۱۸۸۴ء):

"لاہور کا نام لاہا وار (یا لاہ کا قلعہ) سے بنایا گیا ہے جو عموماً لو سے منسوب کیا جاتا ہے جو رام چندر کا بیٹا تھا"
(پنجاب نوٹس اینڈ کویریز، مارچ ۱۸۸۴ء، ص ۶۸)۔

گلاب سنگھ (۱۸۸۴ء):

"لاہور کو مختلف ناموں لہاور، لاہار، لہارو، لوہاور، اور لاہاور سے پکارا گیا ہے۔ ہندو روایت کے مطابق اس کا نام رام چندر کے لڑکے لو سے منسوب ہے۔ جب بعد میں اس شہزادے کی حکومت کو زوال ہوا تو دارالخلافہ سیالکوٹ منتقل کر دیا گیا۔ سلطان محمود غزنوی کے عہدِ حکومت میں اس کے

محبوب ملک ایاز نے شہر کو دوبارہ آباد کیا اور یہاں ایک محکم قلعہ تعمیر کیا۔"

(پنجاب نوٹس اینڈ کویریز، فروری [illegible]، ص ۵۷)۔

یونانی کلاسیکی ادب میں ہمیں سکندر کے ساتھ لاہور کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ گو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سکندر ضرور اس راستے سے گذرا ہے اور اُس نے راوی کو موجودہ شہر کی زمین کے قریب سے ہی عبور کیا ہوگا۔ قیاس کہتا ہے کہ اگر سکندر کے زمانے میں اس شہر کی کوئی اہمیت یا عظمت ہوتی تو تاریخ کی کتابوں میں اس کا نام ضرور محفوظ ہوتا۔ لہٰذا ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہیں کہ پہلی صدی عیسوی تک یہ شہر آباد نہیں ہوا تھا۔ اسی طرح ہمیں مشہور جغرافیہ دان اسٹرابو کے ہاں لاہور کا ذکر نہیں ملتا۔ گو سٹرابو نے اپنی تصنیفات ۶۰ قبل مسیح اور ۱۹ بعد مسیح کے درمیان مرتب کی ہیں۔ پلینی نے اٹک سے الٰہ آباد تک جانے والی شاہراہ کی تفصیل ۲۳ اور ۷۹ عیسوی صدی کے درمیان قلمبند کی ہے۔ اس میں بھی لاہور کا ذکر نہیں ملتا۔

لیکن دوسری صدی عیسوی میں بطلیموس نے جو جغرافیہ مرتب کیا ہے۔ اُس میں ایک مقام لبوکلا کا ذکر موجود ہے جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے قدیم جغرافیہ دانوں میں بیانات کے صحت کے اعتبار سے بطلیموس کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا ہے، یہ مشہور جغرافیہ دان ۱۵۰ عیسوی میں سکندریہ میں زندہ تھا۔ اور اس نے اپنے جغرافیہ میں ایک علاقے کسپیرا (کشمیر؟) کا ذکر کیا ہے جس کی حدود دریائے بداستاس (جہلم) سندابل (چندر بھاگا یا چناب) اور ایدریس (راوی) تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اور اس علاقے میں اٹک اور پالی بوتھرا کے درمیانی راستے پر لبوکلا کا شہر موجود ہے۔ مشہور مستشرق ولفرڈ (WILFORD) اس شہر کے محل وقوع اور نام کی قریبی مشابہت سے اسی لبوکلا کو لاہور کا شہر قرار دیتا ہے۔ مشہور جغرافیہ دان اور ماہر آثار کنگھم[1] بھی ولفرڈ سے اتفاق کرتا ہے۔ اگر ہم ان لوگوں کی آراء سے اتفاق کریں تو لاہور کی تاریخ تاسیس دوسری صدی عیسوی کا آغاز قرار پاتا ہے۔

واکر (WALKER)، ہنٹر (HUNTER) اور انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں لاہور کے مقالہ کا مصنف بیان کرتا ہے کہ مشہور چینی بدھ زائر ہیوانگ چوانگ (جسے عام طور پر غلطی سے ہیون سانگ لکھا جاتا ہے) ۶۳۰ عیسوی میں پنجاب آیا تھا اور اُس نے اپنے سفرنامہ میں لاہور کا ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ کنگھم نے چینی سیاح کے سفرنامہ کی جو تفاصیل شائع کی ہیں اُن میں لاہور کا ذکر نہیں ملتا۔ البتہ ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہیوانگ چوانگ نے جس شہر کو "برہمنوں کا عظیم شہر" کے نام سے یاد کیا ہے ممکن ہے وہ لاہور ہی ہو۔ ہیوانگ چوانگ کہتا ہے کہ میں اس شہر سے جالندھر گیا اور راستے میں پٹی کے شہر سے گذرا۔ چنانچہ پٹی اب بھی اس راستے پر موجود ہے۔ لیکن یہ صرف قیاس ہی قیاس ہے۔ ہیوانگ چوانگ کا گذر لاہور کی بجائے قصور سے بھی ہو سکتا ہے۔ اور پھر بھی اُس کی بتائی ہوئی تفاصیل مکمل ہو جاتی ہیں۔ اس لیے یہ بوثوق نہیں کہا جا سکتا کہ ہیوانگ چوانگ لاہور سے گذرا ہوگا۔ اس لیے ہم یقینی طور پر صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہیوانگ چوانگ کے زمانے یعنی ساتویں صدی عیسوی تک بھی لاہور کا یقینی ذکر کہیں نہیں ملتا۔

---

[1] ملاحظہ ہو کنگھم کا جغرافیہ، ص ۲۲۵ – ۲۲۸، ولفرڈ کا ہندوستان کا تقابلی جغرافیہ، ص ۲۰ –

ایک انگریز مصنف کے بقول لاہور کی تاریخ تاسیس اور وجہ تسمیہ کے متعلق یہ ایک منفی سی تحقیق ہے جو میں آپ کے سامنے پیش کر سکا ہوں۔ لیکن اس تحقیق سے مندرجہ ذیل نتائج ضرور اخذ کئے جا سکتے ہیں :

۱۔ لاہور مختلف شکلوں کے ناموں سے پکارا جاتا رہا۔

۲۔ بطلیموس کا لبوکلا (شاید لاہور) دوسری صدی عیسوی کے آغاز میں موجود تھا۔

۳۔ لاہور کا ذکر معین طور پر قرن صدی عیسوی میں پہلی مرتبہ ملتا ہے۔

۴۔ گیارھویں صدی عیسوی میں محمود غزنوی کے حملوں سے پہلے اس شہر کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔ گویا اس کی مشہوری کا زمانہ نو سو سال سے زیادہ نہیں۔

سیاسی اور ثقافتی تاریخ

پروفیسر محمد شجاع الدین

غزنوی دور میں ایک مسلمان محقق علامہ ابوریحان البیرونی وارد ہند ہوئے۔ انھوں نے بہت سی عالمانہ کتابیں لکھیں جن میں قانون مسعودی اور کتاب الہند بہت مشہور ہیں۔ موخر الذکر کتاب بے حد مقبول ہے۔ انگریزی اور اردو کے علاوہ دنیا کی متعدد زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کتاب میں علامہ مذکور نے ہندو علوم و فنون کا ذکر کیا ہے۔ اور ہندوستان کے چشم دید حالات قلم بند کیے ہیں۔

علامہ ابوریحان البیرونی المتوفی ۴۴۰ھ مدتوں ہندوستان میں مقیم رہے۔ انھوں نے بھیس بدل کر سنسکرت زبان اور ہندو علوم سیکھے۔ کیونکہ برہمن اپنے علوم اور زبان کسی غیر برہمن کو پڑھانے کے روادار نہ تھے۔ مسلمان تو چھوا ور ناپاک تھا ہی۔ خود ہندو قوم کی اکثریت کے لیے لکھنا پڑھنا ایک مہا پاپ تھا۔ کسی اچھوت اور شودر کے کان میں سنسکرت کے کسی لفظ کے پڑ جانے کا کفارہ یہ تھا کہ پگھلا ہوا سیسہ اُس کے کان میں ڈالا جاتے۔ بہر حال ایک مسلمان محقق کا علمی ذوق ملاحظہ ہو کہ بھیس بدل کر اور ہفت خوان رستم طے کر کے ہندو علوم سے واقفیت حاصل کی اور ایک ایسی کتاب تالیف کی جسے آج بھی محققانہ کتب میں خاص وقعت حاصل ہے۔ مشہور جرمن مستشرق زاخو مترجم کتاب ہذا کے قول کے مطابق یہ کتاب غیر جانبدارانہ تحقیق کا شاہکار ہے۔ (دیکھو "الہند" کے انگریزی ترجمہ کا دیباچہ اور OXFORD HISTORY OF INDIA صفحہ ۱۹۴ جلد اول)

علامہ موصوف کا بیان ہے۔ کہ ہندوستان بہت سی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا جو ایک دوسرے کی حریف تھیں۔ اُن میں جذبہ ملی مفقود تھا۔ اور مشترک خطرے کے وقت بھی متحد نہ ہوتی تھیں۔ رعایا شکایات تحریری صورت میں پیش کرتی تھی۔ اور مقدموں کا فیصلہ نہایت دقیانوسی اور بھدے طریقوں سے کیا جاتا تھا۔ خواہ جرم کی نوعیت کچھ ہی ہو۔ قانون برہمن کو کسی قسم کی سزا کا مورد ٹھہرانے کا روادار نہ تھا۔ برہمن ہر طرح کے ٹیکسوں کی ادائیگی سے مستثنےٰ تھے۔ جرائم کی سزا کے طور پر اعضا کی قطع و برید رائج تھی۔ لوگ بُت پرست اور توہم پسند تھے۔ ستی کی وحشیانہ رسم کا عام رواج تھا۔ اور ذات پات کی غیر فطری تقسیم کے سبب لوگ مختلف جماعتوں میں بٹے ہوئے تھے۔ معمولی ضروریات زندگی سے بھی اُنھیں محروم رکھا جاتا تھا۔ اور اُن کی حالت بہائم سے بھی بدتر تھی۔ لوگوں میں کیمیا گری اور بوڑھوں کو جوان بنانے والی دوائیوں کی تلاش کا شوق پایا جاتا تھا۔

مسلمانوں نے سرزمین پنجاب پر قدم رکھا تو اس خطّہ کی حالت یہی تھی۔ کسی فرد یا کسی قوم کا دوسرے مُلک کو فتح کرنا۔ یا

نقلِ مکانی کے بعد اس میں جا آباد ہونا جُرم نہیں۔ اگر ہم اس امر کو جُرم قرار دیں تو دُنیا کے تمام بڑے بڑے فاتح اور جرنیل مجرم ہوں گے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ فاتح قوم نے مفتوحہ قوم کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اور مفتوحہ ممالک کی حالت سُدھارنے اور اُس کے تہذیب و تمدن کی ترقی کے سلسلے میں کیا قدم اُٹھایا۔

اِس میں شک نہیں کہ لاہور ایک قدیم بستی ہے۔ لیکن ہم بوثوق یہ نہیں کہہ سکتے کہ کب اور کس کے ہاتھوں اس کی بنیاد رکھی گئی۔ سرزمین پنجاب مدتوں دوسرے ممالک سے نقلِ مکانی کر کے آنے والے قبیلوں اور غیر ملکی حملہ آوروں کی تاخت کا ہدف بنی رہی ہے۔ اس لیے اس کے شہر اور قصبے ہمیشہ آباد اور برباد ہوتے رہے ہیں۔ اسی طرح لاہور بھی مسلمانوں کے دَور سے قبل کئی بار آباد اور برباد ہُوا۔ لیکن جہاں تک اِس شہر کی آبادی اور شہرت کا تعلق ہے مسلمانوں کی آمد سے قبل اس کی وہ اہمیت نہ تھی۔ جو سلاطینِ اسلامیہ کے زیر اقتدار اسے حاصل ہوئی۔ اسلامی دَور سے قبل جو سیاح بھی واردِ پنجاب ہوئے وہ اس کا ذکر نہیں کرتے۔

لاہور غزنوی دَور میں

اسلامی دَور سے قبل پنجاب پر راجہ جے پال برسرِ اقتدار تھا۔ اس کی حکومت پشاور سے پرے ملتان تک تھی۔ الپتگین نے اپنے آقا منصور سامانی سے علیحدہ ہو کر غزنی میں ایک الگ سلطنت کی بنیاد ڈالی تو راجہ جے پال نے اپنی سرحد کے پاس ہی ایک نئی سلطنت کے قیام کو خطرے کی نگاہ سے دیکھا اور اس کی تباہی کے درپے ہُوا۔ جلد ہی الپتگین کا انتقال ہو گیا اور امرائے دولت نے اُس کے غلام سبکتگین کو امیر منتخب کیا۔

اسی اثنا میں راجہ جے پال نے غزنوی سلطنت پر حملہ کیا۔ ملتان کے قریب راجہ اور سبکتگین کی فوجیں آمنے سامنے ہوئیں۔ شدتِ سرما راجہ کی فوج کی ہزیمت کا باعث بنی۔ راجہ نے ادائیگی خراج کا وعدہ کر کے جان بچائی اور غزنوی کے چند اُمرا کو اس لیے ہمراہ لے کر واپس ہُوا۔ کہ خراج کی رقم لے آئیں۔ مگر اپنے دارالسلطنت میں پہنچ کر اُس نے عہد شکنی کی اور امرائے غزنی کو نظر بند کر دیا۔ اس کا نتیجہ ایک اور جنگ کی صورت میں رُونما ہُوا جس میں پھر راجہ کو شکست ہوئی اور وہ گرفتار ہو گیا۔ مگر مسلمان حکمران کی دریا دلی، بلند حوصلگی اور عالی ہمتی دیکھیئے کہ باج گذاری اور اطاعت شعاری کا وعدہ لے کر راجہ کو پھر چھوڑ دیا۔ اسی اثنا میں امیر مذکور راہی ملکِ عدم ہُوا اور زمامِ اقتدار اُس کے فرزند محمودؔ کے ہاتھ آئی۔

محمود کو نوجوان اور ناتجربہ کار خیال کر کے راجہ جے پال نے ایک بار پھر بخت آزمائی کا فیصلہ کیا اور فوج لے کر اس کی مملکت پر حملہ کیا۔ مگر جواں سال اور جواں ہمت محمودؔ سے منہ کی کھائی۔ راجہ جے پال تین بار پے درپے ایک ہی غنیم سے شکست کھا چکا تھا اس لیے ملک کے رواج کے مطابق بطورِ کفارہ زندہ چتا میں جل گیا۔

جے پال کے مرنے کے بعد اُس کا فرزند انند پال تخت نشین ہُوا۔ اُس نے باپ کی شکستوں کا داغ مٹانے کے لیے ایک تجویز سوچی اور تمام ہندوستان کے راجاؤں سے گٹھ جوڑ کر کے ایک لشکرِ عظیم جمع کیا اور پشاور کی راہ لی۔ درہ خیبر کے متصل دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے۔ باوجودیکہ تعدادِ سپاہ، سامانِ جنگ اور زر و مال کے حساب سے راجہ انند پال محمودؔ سے بڑھا ہُوا تھا۔ مگر اللہ کے فضل سے قدرت نے محمودؔ کو فتح دی۔ شکست کے بعد انند پال نے پھر باجگذاری کا عہد کیا اور واپس چلا آیا۔

ابوالفتح حاکم ملتان باطنی مذہب کا پیرو تھا اور اسلام کے سوادِ اعظم کا باغی تھا۔ محمود اُسے سزا دینے کے لیے نکلا تو اُس نے راجہ انند پال کو کہلا بھیجا کہ چونکہ تم ہمارے باجگذار ہو اس لیے ہمارے لشکر کی امداد کرو۔ مگر راجہ نے محمودؔ کے حکم

کو ماننے کی بجائے ابوالفتح کی حمایت شروع کر دی۔ محمود نے ملتان کی مہم سے فارغ ہو کر آنند کی طرف رُخ کیا۔ راجہ شکست کھا کر کشمیر کی طرف بھاگ گیا۔ اب محمود کے لیے موقع تھا کہ وہ پنجاب پر قبضہ کر لیتا۔ مگر اُس نے پھر قدیم ہندو خاندان کی حکومت کو بحال کر دیا اور انند پال کے لڑکے جے پال ثانی کو حاکم لاہور بنا دیا۔

مگر یہ بھی اپنے باپ دادا سے کم نہ نکلا۔ جب محمود کانگڑہ کے پہاڑی راجاؤں کی گوشمالی کر رہا تھا یہ فتنہ و فساد پر اُتر آیا۔ محمود نے یہ خبر سنی تو فی الفور لاہور کی سمت آیا۔ نواحِ شہر میں ایک جنگ ہوئی جس میں راجہ کو شکست ہوئی اور وہ شہر میں محصور ہو گیا۔ محمود نے شہر کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ چند ماہ بعد مقابلہ کی تاب نہ لا کر راجہ بھاگ نکلا اور لاہور پر محمود کا قبضہ ہو گیا یہ واقعہ ۱۰۲۲ء کا ہے۔ (تاریخ فرشتہ صـ۱۴ - زین الاخبار صـ۷۹)

کنہیا لال تاریخ لاہور میں لکھتے ہیں کہ فتح لاہور کے بعد محمود غزنوی نے اپنے چہیتے غلام ایاز کو پنجاب کا حاکم مقرر کیا۔ اُس نے لاہور کو از سرِ نو آباد کیا۔ مرتضےٰ حسن کی کتاب "حدیقۃ الاقالیم" سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

اسی طرح اورنگ زیب کے عہد کا مؤرخ سجان رائے بٹالوی بیان کرتا ہے کہ ایاز نے لاہور میں قلعہ پختہ تعمیر کرایا اور اسے از سرِ نو آباد کیا۔ (خلاصۃ التواریخ صـ۶۲) عام ادبی روایات بھی ایاز ہی کو لاہور کا بانی قرار دیتی ہیں۔ چنانچہ خیر اللہ فدا لاہوری اپنی مثنوی سسّی پنوں میں لکھتا ہے :-

بانیٔ او ایاز و محمود است

زیں بنا حسن و عشق مقصود است

مگر ہم عصر فارسی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ فتح لاہور کے بعد محمود نے ایاز کو لاہور کا حاکم مقرر نہیں کیا بلکہ وہ اس عہدے پر ۱۰۳۷ء میں فائز ہوا۔

۱۰۲۱ء تک غزنوی سلاطین کی یہی خواہش رہی کہ پنجاب میں مقامی ہندو راجپوت راجہ برسرِ اقتدار رہے لیکن جب الحاقِ پنجاب ناگزیر ہو گیا تو محمود نے پنجاب کو اپنی مملکت کا باقاعدہ جزو قرار دے دیا۔ اور یہاں اپنے حاکم مقرر کیے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ محمود نے لاہور کے متصل محمود پور نام ایک قلعہ بنوایا جو کچی اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ اس میں اس کے حکام رہتے تھے۔ اس قلعہ میں ٹکسال بھی تھی۔ سید محمد لطیف نے تاریخ لاہور (بزبان انگریزی) میں مسلمان بادشاہوں کے سکّوں کی عبارتیں نقل کی ہیں۔ وہ سلطان محمود کے ایک سکّے کی عبارت بھی درج کتاب کرتے ہیں۔ جو ۱۰۲۹ء میں بمقام محمود پور مضروب ہوا۔ (کتاب ہذا صـ۳۹۷)۔

غزنوی دور کے مشہور محقق علامہ ابوریحان البیرونی کتاب الہند میں (لوآور) لاہور کا ذکر بطور ایک صوبہ کے کرتے ہیں جس کا تخت قلعہ مندھوکور تھا۔ (دیکھئے کتاب الہند عربی متن مطبوعہ لندن ۱۸۸۷ء صـ۱۰۱۔ کتاب مذکور انگریزی ترجمہ مرتبہ زاخو جلد اول صـ۲۰۶)

قلعہ مذکور دریائے ایراوا (راوی) کے کنارے جانب شرق واقع تھا۔ کنگھم صاحب اپنی کتاب جغرافیہ ہند قدیم (بزبان انگریزی) میں رقمطراز ہیں کہ مندھوکور محمود پور کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ لیکن یہ امر درست معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ البیرونی جو محمود کا ہم عصر

تھا اپنی کتاب میں محمود پور کی بجائے مندھوکور کیوں نہ لکھتا۔ اوّل تو خود محمود کے زمانے میں نام کا بگڑنا قرین قیاس نہیں۔ دوسرے البیرونی جو فارسی عربی زبانوں کا فاضل اجل اور ترکی الاصل تھا اصلی نام کی بجائے بگڑا ہوا نام نہ لکھتا۔ اور اگر لکھتا تو اس امر کی وضاحت کر کے اصلی نام بھی لکھتا۔

تھامسن صاحب کا خیال ہے کہ مندھوکور سے مراد مان کوٹ ہے جو سیالکوٹ کے متصل ایک قلعہ ہے۔ (لاہور بزبان انگریزی صفحہ ۱۱۳) مگر یہ امر بھی درست نہیں۔ کیونکہ البیرونی نے اس قلعہ کا طول بلد اور عرض بلد دیا ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قلعہ موجودہ لاہور کے قریب جانب شمال واقع تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی بستی لاہور کے متصل واقع ہوگی جو فوج کی چھاؤنی اور حکام کے قیام کے سبب سے مشہور ہو گئی۔

ایاز کے زمانے میں قلعہ لاہور تعمیر ہوا تو غالباً اس جگہ چھاؤنی نہ رہی اس لیے ایاز کے عہد اور اس کے بعد کے زمانے کی تاریخ میں مندھوکور کا نام نہیں ملتا۔

سنہ ۱۰۴۰ء مطابق ۴۳۲ھ میں شہزادہ مودود نے لاہور پر چڑھائی کی تو شہزادہ مجدود لاہور کے قلعہ میں محصور ہو گیا (تاریخ فرشتہ صفحہ ۴۴) ایاز نے ۱۰۳۷ء میں لاہور کے امور کی زمام تھامی۔ اور قلعہ شہر پناہ اور شہر لاہور کی تعمیر شروع کرائی معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۴۰ء میں یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔

غزنوی دور میں پنجاب کی سرحد سرہند اور ہانسی تک تھی۔ ابوالفضل بیہقی کی کتاب تاریخ مسعودی سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام پنجاب کو مختلف اقطاع میں تقسیم کیا گیا تھا۔ اور ہر قطع کا حاکم مقطع کہلاتا تھا۔ جالندھر دوآب، جہلم، ملتان وغیرہ مختلف اقطاع پنجاب میں شامل تھے۔ (ملاحظہ ہو تاریخ مسعودی صفحہ ۲۹۶۔ صفحہ ۳۲۷)

دارالسلطنت میں دو حاکم تھے ایک سپہ سالار اور دوسرا قاضی کہلاتا تھا۔ سپہ سالار کے فرائض میں غیر ممالک کا فتح کرنا، ملک کو حملہ آوروں سے بچانا اور ماتحت راجاؤں اور رئیسوں سے خراج وصول کرنا شامل تھا۔ قاضی تمام مالی امور اور اندرونی معاملات کا جن میں محکمہ عدالت بھی شامل تھا ذمہ دار تھا۔ دونوں کی حیثیت مستقل تھی۔ وہ ایک دوسرے کے اثر سے آزاد اور صرف سلطان کے سامنے جواب دہ تھے۔

سب سے پہلے قاضی کے عہدے پر ابوالحسن علی شیرازی اور سپہ سالار کے عہدے پر عبداللہ قراتگین کا تقرر ہوا۔ اس دوعملی کا مقصد یہ تھا کہ کوئی حاکم آمر مطلق بن کر سرکشی اور بغاوت پر آمادہ نہ ہو جائے۔ لیکن عملی طور پر یہ نظام ناکارہ ثابت ہوا۔ اور مختلف معاملات میں یہ دونوں حاکم ایک دوسرے سے دست بگریباں رہنے لگے اور ملک میں گڑبڑ مچی رہی۔

تاریخ مسعودی (صفحہ ۶۴۳) سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان مسعود بن محمود غزنوی نے ۱۰۳۷ء میں اپنے فرزند امیر مجدود کو حاکم لاہور مقرر کیا۔ بقول فرشتہ (صفحہ ۴۴) اپنے باپ کے شہرۂ آفاق غلام ایاز کو اس کا اتالیق مقرر کیا۔ امیر مجدود ابھی بچہ تھا اس لیے عملی طور پر ایاز ہی حاکم لاہور تھا۔ جیسا کہ سطور بالا میں بیان ہو چکا ہے ایاز نے شہر لاہور کو از سر نو آباد کیا۔ قلعہ اور فصیل بھی بنوائے۔ ملک کی ترقی اور بہتری کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ (ایاز کے مکمل حالات کے لیے ضمیمہ اورینٹل کالج میگزین لاہور بابت اگست و نومبر ۱۹۴۳ء میں مشتاق احمد بھٹی کا تحقیقی مقالہ دیکھیے)۔

پنجاب ۱۱۸۶ء تک غزنوی سلاطین کے زیرِ سایہ رہا۔ اس دور میں ہمیشہ بہت مقتدر لوگ یا شاہی خاندان کے افراد حکومت لاہور پر متعین کئے جاتے تھے۔ پنجاب پر غزنوی قبضہ اس قدر مستحکم ہوا کہ غزنی اس خاندان کے احاطۂ اقتدار سے پہلے نکلا اور لاہور بعد میں۔ اس خانوادہ کے آخری تین بادشاہوں نے لاہور کو صدر مقام قرار دے کر یہیں اقامت اختیار کی۔

غزنوی دور کی معارف پروری اور علم نوازی کی داستانیں زبان زدِ انام ہیں۔ اس عہد میں غزنی، علما و فضلا کا مسکن و ماویٰ بن چکا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ غزنوی سلطنت کا دوسرا شہر اور صوبہ پنجاب کا صدر مقام ہونے کے سبب لاہور بھی علم و فضل کا مرکز بن گیا۔ یہاں کے حکام کے درباروں میں علما کی تعدادِ کثیر نظر آنے لگی۔ اس زمانہ میں بے شمار مسلمان خاندان دوسرے ممالک سے تلاشِ معاش، سرکاری ملازمت یا تبلیغ وغیرہ مقاصد کے لیے لاہور میں آباد ہو گئے۔ مقامی باشندے بھی جوق در جوق مسلمان ہونے لگے اور یہاں ایک مسلم سوسائٹی عالمِ وجود میں آ گئی۔

غزنوی دور میں جو علما و فضلا لاہور میں مقیم تھے ان میں مخدوم علی ہجویری المتوفی ۴۶۵ھ، فخر الدین حسین زنجانی المتوفی ۴۳۱ھ، سید اسماعیل محدث و مفسر المتوفی ۴۴۸ھ، مسعود سعد سلمان المتوفی ۵۱۵ھ اور ابو الفرج رونی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اوّل الذکر تین بزرگوں کے مزارات اب تک لاہور میں زیارت گاہ انام ہیں۔ شیخ علی ہجویریؒ نے لاہور ہی میں اپنی شہرۂ آفاق کتاب "کشف المحجوب" تالیف کی۔ یہ کتاب فارسی نثر میں علم تصوف پر غالباً سب سے پہلی تالیف ہے۔ اور اس میں تصوف اور درویشی کے رموز و اسرار نہایت عالمانہ انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔

مسلمان اُمرا نے ترویجِ علوم کے لیے بہت سی درسگاہیں لاہور میں قائم کیں۔ جن سے لوگ بلا امتیاز مذہب و ملت بہرہ ور ہوتے تھے۔ اس قسم کے مدارس میں خانقاہِ بونصر قابلِ ذکر ہے۔

غزنوی دور کا شہرۂ آفاق شاعر مسعود سعد سلمان لاہور میں پیدا ہوا۔ یہیں اس نے تعلیم حاصل کی اور اسی جگہ وہ پروان چڑھا۔ عنفوانِ شباب میں وہ حاکمِ پنجاب شہزادہ سیف الدولہ محمود کا ندیم بن گیا۔ اسی اثنا میں شہزادہ سے اس کا باپ سلطان ابراہیم غزنوی ناراض ہو گیا تو اس نے محمود کے ساتھ مسعود کو بھی بغاوت کے شک میں دس سال تک نظر بند رکھا۔ وہ خود لکھتا ہے:

ہفت سالم بکوفت سو و دہک
پس از آنم سہ سال قلعۂ نای

مسعود کی رہائی کے فوراً بعد سلطان ابراہیم فوت ہو گیا۔ اور اس کا فرزند علاء الدولہ مسعود تختِ حکومت پر جلوہ گر ہوا۔ اس نے اپنے فرزند شیر زاد کو حاکمِ پنجاب اور ابونصر فارسی کو نائب حاکم اور سپہ سالار مقرر کیا۔ ابونصر نے جو کہ جوہر شناس بھی تھا مسعود کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے جالندھر دوآب کا حاکم مقرر کیا۔ یہ علاقہ بہت زرخیز ہے اور ہمیشہ صوبہ لاہور کا حصہ رہا ہے اس تعین پر مسعود نے ایک قصیدہ بونصر کی مدح میں لکھا جس کا مطلع یہ ہے:

ملکا حالِ خویش خواہم گفت
نیک دانم کہ آیدت باور

کچھ عرصہ بعد بونصر فارسی مغضوب بارگاہِ سلطانی ہو گیا اور اس کے تمام متعلقین مسعود سعد سلمان سمیت نظر بند کر دیئے گئے۔ مسعود کو قلعہ مرنج میں بھیج دیا گیا۔ (واضح رہے کہ تمام قلعے جو بطور شاہی قید خانہ استعمال کیے جاتے تھے کوہ سلیمان کی پہاڑیوں میں واقع تھے) اس نظر بندی پر مسعود لکھتا ہے ؎

آتشِ شعلِ من بجستہ ہنوز
دودِ عـــزلم بر آمد از روزن

وداع کردم را دولتِ نکردہ سلام
فراق جُست ز من پیش از آنکہ بود وصال

تین سال کے قریب وہ قلعہ مرنج میں قید رہا۔ آخر ثقۃ الملک طاہر بن علی کی سفارش سے اُسے رہائی ملی اور زندگی کے بقیہ ایام اس نے لاہور میں گزارے۔

شہر لاہور ہمیشہ مرکزِ اسلام رہا ہے اور مسلمانوں کو یہ شہر بہت ہی عزیز ہے۔ اور آج سے آٹھ سو سال پہلے مسعود سعد سلمان کو لاہور سے جو اُنس تھا وہ اُن اشعار سے ظاہر ہے جو اس نے ایام نظر بندی میں لاہور سے دور قلمبند کئے۔

غزنوی دور سے لے کر نواب معین الملک کے زمانے تک جو علاقے صوبہ لاہور کا جزو رہے ہیں اُن سے آج بھی مسلمانوں کو اسی طرح محبت ہے جس طرح آج سے آٹھ سو سال قبل مسعود سعد سلمان کو لاہور سے تھی۔ خدا جانے سلطان محمود غزنوی نے کس مبارک وقت ملتان سے لے کر سرہند اور بھٹنڈا تک کا علاقہ اپنی سلطنت میں باقاعدہ طور پر شامل کیا کہ یہ علاقہ آج بھی اپنے دامن میں ہزاروں مسجدوں مقبروں اور اسلامی یادگاروں کو لیے ہوئے ہے اور اسی میں مملکتِ پاکستان قائم ہوئی ہے۔

لاہور غوریوں کے دور میں — ۱۱۸۶ء میں سلطان معز الدین سام محمد غوری نے غزنوی خاندان کے آخری بادشاہ خسرو ملک سے لاہور لے لیا اور اس طرح پنجاب اُس کے مقبوضات میں شامل ہو گیا۔ ۱۱۹۲ء میں بمقام تراوڑی رائے پتھورا کو شکست دینے کے بعد اُس نے دہلی اور اجمیر پر قبضہ کر لیا۔ اس سے ایک سال بعد جے چند کو شکست دے کر قنوج اور بنارس پر بھی تسلط جما لیا۔ سلطان نے اپنے وفا کیش غلام قطب الدین ایبک کو مفتوحہ علاقوں کا حاکم مقرر کیا۔ ۱۲۰۶ء تک ایبک بطور نائب السلطنت ہند اس ملک پر حکمران رہا۔ اس دوران اس نے مشرق میں بنگال اور بہار تک اور جنوب میں کالنجر اور گوالیار تک تقریباً تمام شمالی ہندوستان پر تسلط جما لیا۔ اور نہایت دیانتداری سے اپنے فرائض انجام دیئے۔

ملک معز الدین سام محمد غوری لاولد تھا اس نے ایبک کی وفا شعاری اور معاملہ فہمی کے پیشِ نظر فیصلہ کیا کہ اس کی وسیع ہندوستانی سلطنت کو اس کی وفات کے بعد سنبھالنے کا ایبک سے زیادہ اور کوئی شخص اہل نہیں۔ ۶۰۲ھ مطابق ۱۲۰۶ء میں سلطان آخری بار دورۂ ہند پر آیا تو اُس نے لاہور میں ایک عظیم الشان جشن کا اہتمام کیا جس میں تمام اعیانِ دولت اور ارکانِ سلطنت نے شرکت کی۔ اس موقعہ پر سلطان معز الدین نے قطب الدین ایبک کو ملک کا خطاب دیا جو عموماً اُمرا اور شاہی خاندان کے افراد کو ملا کرتا تھا۔ اور اسے ہندی مقبوضات میں اپنا ولی عہد مقرر کیا۔ سلطان کا یہ فیصلہ ہر لحاظ سے مستحسن اور مناسب تھا۔ کیونکہ یہ تمام

علاقہ ایبک ہی کی سعی سے فتح ہوا تھا۔ اور علاوہ ازیں ایبک ایک بیدار مغز اور رعایا پرور حاکم تھا (دیکھئے تاریخ فخر الدین مبارک شاہ ص ۲۸-۲۹ تاریخ مبارک شاہی ص ۱۲-۱۳)

محمد غوری کی شہادت

مذکورہ صدر جشن کے بعد سلطان معز الدین سام محمد غوری غزنی واپس جا رہا تھا کہ جہلم کے نواح میں دمیک کے مقام پر باغی کھوکھروں نے اسے شہید کر دیا۔ جشن ولی عہدی کے بعد ملک قطب الدین ایبک دہلی چلا گیا تھا۔ اور یہ زہرہ گداز خبر اس نے وہیں سنی۔ لازمی طور پر اسے اپنے محسن کی وفات پر بہت رنج ہوا۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اصلاح مملکت اور خیر خلق خدا کو اپنے ذاتی غم پر مقدم سمجھا اور فی الفور لاہور کا رخ کیا۔ بروز منگل بتاریخ ۱۸ ذی قعدہ ۶۰۲ھ مطابق ۱۹ رجون ۱۲۰۶ء ایبک لاہور کے نواح میں پہنچا۔ اہالیان لاہور کو اس کی آمد کی اطلاع ملی تو شہر میں مسرت و انبساط کی لہر دوڑ گئی۔ اور لوگ بلا امتیاز مذہب و ملت اس کے استقبال کی تیاریاں کرنے لگے۔ ایبک ۲۵ رجون بروز پیر بڑے تزک و احتشام سے لاہور میں داخل ہوا۔ اور قصر ہمایوں میں اقامت اختیار کی۔ دوسرے روز جشن تخت نشینی منعقد ہوا اور سلطان قطب الدین ایبک ہندوستان کا فرمانروا بن گیا۔ (تاریخ فخر الدین مبارک شاہ ص ۳۰-۳۱۔ تاج المآثر روٹو گراف یونیورسٹی لائبریری ورق ۸ ب)

ایبک کا دور

سطور بالا کے مطالعہ سے قارئین کرام پر یہ امر واضح ہو چکا ہو گا کہ ایبک کے زمانہ میں لاہور کو کیا اہمیت حاصل تھی۔ تمام جشن یہیں منعقد ہوا کرتے تھے اور یہ شہر مسلمان علما و فضلا کا مرکز تھا۔

تاج الدین حسن بن نظامی صاحب تاج المآثر لکھتا ہے۔ (روٹو گراف ورق الف ۸۲) کہ اس زمانہ میں یہ شہر "مرکز اہل بر و تقویٰ و منشاء اصحاب فضل و فتویٰ و مامن زہاد و عباد و مسکن اقطاب و اوتاد" بن چکا تھا۔ اور یہاں کی نوے فیصدی آبادی زیور علم سے مزین تھی۔ اس جگہ فخر مدبر مبارک شاہ اور تاج الدین حسن نظامی جیسے محققین اور مورخین۔ شیخ عبد العزیز مکی المتوفی ۶۱۲ھ۔ سید احمد توختہ ترمذی المتوفی ۶۰۳ھ۔ اور شیخ یعقوب زنجانی المتوفی ۶۰۴ھ جیسے علما اور اصفیا مقیم تھے۔ علاوہ ازیں بیشمار ادیب، شاعر اور فاضل یہاں موجود تھے جن میں سے چند ایک کے حالات لباب الالباب عوفی کے اوراق میں محفوظ ہیں۔

فخر مدبر نے اپنی کتاب شجرۂ انساب یا بحر الانساب بارہ سال کی محنت اور ایک ہزار کتابوں کے مطالعہ کے بعد بمقام لاہور تالیف کی۔ یہ کتاب اس نے سلطان قطب الدین ایبک کی خدمت میں پیش کی۔ سلطان یہ کتاب دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اس نے مؤلف کو انعام و اکرام سے نوازا۔ اور حکم دیا کہ اس کا ایک نسخہ خاص اہتمام سے شاہی کتب خانہ کے لیے تیار کیا جائے۔ (تاریخ فخر الدین مبارک شاہ ص ۱۴ تا ۱۵)

یہ واقعہ جہاں سلطان قطب الدین ایبک کی معارف پروری کی ایک درخشاں مثال ہے۔ وہاں اس امر کا بھی ایک بین ثبوت ہے۔ کہ اس زمانے میں لاہور میں اس قدر کتب خانے موجود تھے۔ کہ فخر مدبر کو اپنے مطلب کی ایک ہزار کتابوں سے متمتع ہونے کا موقع مل گیا۔

اس وقت تمام شمالی ہند مسلمانوں کے زیر نگین تھا۔ اور لاہور "مرکز اسلام ہند" شمار کیا جاتا تھا۔ (تاریخ مذکور ص ۳۵) ملک میں جا بجا مسجدیں، مدرسے اور خانقاہیں تھیں (تاریخ فخر الدین مبارک شاہ ص ۲۶) سلطان کی رعایا پروری اور معدلت گستری کا یہ عالم تھا کہ ملازمان شاہی میں سے کوئی شخص رعایا کو ستانے یا ان سے زبردستی کچھ لینے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ (تاریخ مذکور ص ۳۳)

ہم بیان کر چکے ہیں کہ قطب الدین ایبک کا جشنِ ولی عہدی لاہور میں منعقد ہوا - اسی شہر میں وہ سریر آرائے سلطنت ہوا۔ ۶۰۷ھ مطابق ۱۲۱۰ء میں وہ چوگان کھیلتا ہوا گھوڑے سے گر کر اسی شہر میں راہی ملکِ عدم ہوا - (طبقاتِ ناصری ص ۱۲۰-۱۲۱) اور اسی شہر میں اسے دفن کیا گیا - (تاج المآثر از حسن نظامی نیشاپوری - روٹوگراف پنجاب لائبریری فولیو نمبر ب ۸۶)

سلطان کی قبر پر ایک نہایت عالیشان مقبرہ سلطان شمس الدین التمش نے تعمیر کرایا (تاریخ مبارک شاہی ص ۱۵) یہ عالیشان مقبرہ ہر زمانہ میں زیارت گاہِ انام رہا - مُلّا عبدالقادر بدایونی کے زمانے میں بھی یہ مزار "زیارت گاہِ مردم" تھا (منتخب التواریخ - نول کشور ایڈیشن ص ۱۶ رائل ایشیاٹک سوسائٹی ایڈیشن ص ۵۶) دورِ مغلیہ میں شہر کی توسیع ہوئی تو اس مقبرہ کے متصل جو محلہ آباد ہوا وہ بقول مفتی تاج الدین محلہ قطب غوری کے نام سے موسوم ہوا - (میگزین اورینٹل کالج بابت نومبر ۱۹۴۲ء ص ۴۲) اس زمانے میں سلطان کے مقبرہ پر ہر سال ۱۴ رجب کو ایک عرس منعقد ہوا کرتا تھا (ضمیمہ میگزین ہذا بابت فروری ۱۹۴۷ء ص ۱۰) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مقبرہ کو مسلمانوں کی نظروں میں ایک خاص تقدس حاصل ہے اس مقبرہ پر نہایت عمدہ سنگِ مرمر کا دو منزلہ گنبد تھا جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں مع دیگر متعلقہ عمارات کے مسمار کرا دیا گیا (تحقیقاتِ چشتی ص ۲۳۹)

انگریزی دور میں اس نواح میں آبادی ہو گئی تو قبر ایک رہائشی مکان کی چھت کے نیچے آ گئی - محکمہ آثارِ قدیمہ نے یہ مکان مسمار کرا دیا ہے اور اب سلطان کی قبر کھلی جگہ میں آسمان کی چھت کے نیچے ہے - جون ۱۹۶۱ء میں عمارتِ مقبرہ کی بنیادیں دیکھنے کے لیے اس محکمہ کے کارکنوں نے قبر کے اردگرد کھدائی کی مگر انھیں بنیادوں کے آثار نہیں ملے - اسی لیے بعض حلقوں میں قبر کے محلِ وقوع کے متعلق شک کا اظہار کیا جا رہا ہے۔

لاہور سلاطینِ دہلی کے دور میں

سلطان قطب الدین ایبک کے جانشینوں کے عہد میں بھی لاہور کی علمی و تمدنی روایات قائم رہیں - لیکن بدقسمتی سے ۱۲۱۵ء سے پنجاب پر چنگیزی منگولوں کے حملوں کا سلسلہ شروع ہو گیا - یہ لوگ آئے دن پنجاب اور سندھ پر یلغار کرتے رہتے تھے - اور ان کے حملوں کا سلسلہ دو صدیوں تک جاری رہا - ان کے حملوں نے پنجاب کے مختلف شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی - دسمبر ۱۲۴۱ء میں منگولوں نے ملک معز الدین بہرام شاہ کے عہد میں حملہ کیا - مقابلہ کی تاب نہ لا کر حاکم شہر ملک . . . . کرہ کش دہلی کی طرف بھاگ گیا -

منگولوں نے شہر کو خوب تاراج کیا - اس واقعہ کے بعد شہر لاہور کا دورِ زوال شروع ہو گیا - (طبقاتِ ناصری انگریزی ترجمہ از میجر ریورٹی ص ۶۵۵ جلد اوّل)

منگولوں کے استیصال کے لیے شاہانِ دہلی میں سے سلطان غیاث الدین بلبن، سلطان علاؤ الدین خلجی اور سلطان محمد تغلق نے جو مساعی کیں وہ تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتیں - پاکستان کو کافر منگولوں کی تاخت سے بچانے کے لیے جا بجا چھاؤنیاں مقرر کی گئیں - اور وقت کے بہترین جرنیلوں کو پنجاب میں سرحدوں کا محافظ متعین کیا جاتا تھا۔

عام طور پر منگول پنجاب پر درۂ بولان، سندھ اور ملتان کی راہ سے تاخت کیا کرتے تھے - حاکم پنجاب اس وقت ملتان یا دیپال پور میں رہا کرتا تھا - تاکہ ان کا راستہ روکنے میں آسانی رہے - علاوہ ملتان یا دیپال پور کے سامانہ، سنام، پٹھان کوٹ اور ہانسی وغیرہ مختلف مقامات میں فوجی چھاؤنیاں تھیں - تاکہ منگولوں کو مستقرِ حکومت دہلی کی طرف جانے سے روکا جائے - ان

اسباب کی بنا پر شہر لاہور کی رونق اور عظمت جو غزنوی اور غوری سلاطین کے زمانے سے اوجِ کمال پر پہنچی ہوئی تھی خاک میں مل گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت لاہور ایک معمولی قصبہ تھا جسے سیاسی نقطہ نظر سے کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔ اور نہ اس دور کی سیاسی تاریخوں میں اس کا ذکر آیا ہے۔ اس دور کی ہمعصر فارسی تاریخوں میں لاہور کا سب سے زیادہ ذکر یحییٰ سرہندی کی کتاب تاریخ مبارک شاہی میں ملتا ہے۔ مگر یہ شخص بھی لاہور کا ذکر اکثر بطور صوبہ یا علاقہ کے کرتا ہے۔ ظاہر ہوتا ہے کہ سیاسی اہمیت ختم ہونے کے باوجود شہر لاہور علماء و فضلا کا مسکن رہا۔ چونکہ یہ شہر منگولوں کے راستہ میں نہ پڑتا تھا اور دارالحکومت ملتان اور دیپال پور منتقل ہو جانے کے سبب اس شہر پر منگولوں کی تاخت کے امکانات بھی کم ہو گئے تھے۔ اس لیے اہل علم اس گوشہ تنہائی کو غنیمت سمجھتے ہوئے یہاں پناہ گزیں ہوتے رہے۔ اس دور کے اُن بزرگوں میں جن کے مزار لاہور میں اب بھی موجود ہیں۔ سید مٹھا المتوفی ۶۹۱ھ۔ پیر بلھی (مدفون بازار کشمیری) سید اسحاق گازرونی (مدفون صحن مسجد وزیر خان المتوفی ۷۸۶ھ) شیخ سراج الدین عرف پیر سراجی قابلِ ذکر ہیں۔

مشہور سیاح ابن بطوطہ شمالی افریقہ، مصر، شام، حجاز، عراق، ایران سے ہوتا ہوا ۱۳۳۴ء میں دہلی پہنچا۔ اس نے ہندوستان کے اکثر شہروں کی سیر کی۔ وہ پنجاب میں بھی آیا۔ لیکن اس نے اپنے سفرنامہ میں نہ لاہور کا ذکر کیا ہے اور نہ وہ اس شہر کو دیکھنے آیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت لاہور ایک معمولی قصبہ تھا اور اسے کوئی شہرت حاصل نہ تھی۔

محمد تغلق اور فیروز تغلق کے زمانے میں بھی لاہور کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔ فیروز تغلق کی وفات کے بعد ملک میں بدامنی اور طوائف الملوکی پھیل گئی۔ تو پنجاب میں جسرت کھوکھر اور شیخا کھوکھر نے سر اٹھایا۔ یہ دونوں بھائی غیر مسلم تھے۔ اور انھوں نے دیپال پور، لاہور، جالندھر وغیرہ پنجاب کے مختلف قصبوں کو تاخت و تاراج کیا۔ دسمبر ۱۳۹۸ء میں تیمور ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ تو لاہور پر یہ دونوں بھائی قابض تھے۔ مغل فاتح کی آمد پر انھوں نے اس کی اطاعت قبول کر لی اور دہلی تک اُس کے ہمراہ گئے۔ فتح دہلی کے بعد وہ امیر تیمور سے یہ وعدہ کر کے لاہور چلے آئے کہ باشندگانِ شہر سے چندہ جمع کر کے وہ سلطان کی خدمت میں نذرانہ پیش کریں گے۔ لاہور آ کر انھوں نے یہ وعدہ بھلا دیا۔ بلکہ سمرقند جاتے ہوئے چند مغل سردار نواح لاہور سے گزرے تو انھیں بہت تنگ کیا۔ اس پر تیمور نے اپنے پوتے پیر محمد کی سرکردگی میں ان کی تادیب کے لیے ایک لشکر بھیجا۔ شہزادے کو اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی اور وہ معقول نذرانہ وصول کر کے واپس چلا گیا۔ تیمور نے سید خضر خان کو ہندوستان کی حکومت سپرد کی۔ یہ بھی انتشار کا زمانہ تھا۔ اس خاندان کے ایک تاجدار سید مبارک شاہ نے پنجاب میں امن قائم کرنے کے لیے پوری کوشش کی۔ اس نے لاہور کو از سرِ نو آباد کیا۔ وہ ۱۴۲۱ء میں لاہور آ کر ایک ماہ تک دریائے راوی کے کنارے خیمہ زن رہا۔ قلعہ اور شہر پناہ کو تعمیر کرایا۔ اور ملک الشرق محمود حسین (تاریخ مبارک شاہی یحییٰ سرہندی ص ۱۹۷) کو حاکم پنجاب مقرر کر کے لاہور میں رہنے کا حکم دیا۔ اس دن سے لاہور کی ترقی کا دور شروع ہوا۔

لودھیوں کا دور

سادات کے بعد لودھیوں کی حکومت قائم ہوئی۔ ترقی کا وہ سلسلہ جو سید مبارک شاہ کے دور میں شروع ہوا تھا۔ اس خاندان کے تاجداروں کے زمانہ میں جاری رہا۔ یہاں بہت سے مدرسے اور خانقاہیں قائم ہوئیں۔ جن میں مدرسہ کا کو شاہ چشتی۔ مدرسہ سید فیروز گیلانی اور خانقاہ حضرت عبدالجلیل قابلِ ذکر ہیں۔

علاوہ ان بزرگوں کے یہاں شیخ موسیٰ آہن گر اور بایزید ہاشمی بھی مقیم تھے۔ موخرالذکر کا خستہ حال مقبرہ نولکھا چرچ کی حدود میں ہے اور ضرورت ہے کہ اسے یادگار محفوظ قرار دیا جائے۔ اس دور میں دولت خاں لودھی نے باؤلی اور باغ وغیرہ بہت سی عمارتیں بنوائیں۔

لاہور دورِ مغلیہ میں

عہد ظہیر الدین محمد بابر

خانوادۂ تیموریہ کا چشم و چراغ بابر عمر شیخ مرزا کا فرزند تھا۔ اس کی والدہ قتلغ نگار خانم یونس خاں کی بیٹی تھی جو چنگیز خاں کی اولاد سے تھا۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کی رگوں میں وسطِ ایشیا کے دو نامور اور خون آشام فاتحین کا خون تھا۔ ان میں سے چنگیز خاں تو کافر تھا مگر تیمور مسلمان تھا۔ اول الذکر منگول تھا اور موخرالذکر چغتائی ترک۔ ان دونوں کی کشور کشائی اور جہاں بانی کی داستانیں زیبِ اوراقِ تاریخ ہیں۔ چنگیز خاں اور اس کے منگولوں کی دہشت اور بربریت کی خوفناک کہانیاں قاری کو لرزہ براندام کر دیتی ہیں۔ قبولِ اسلام کے بعد منگول مہذب و متمدن ہو گئے۔ ان کی گندی عادتیں نفاست میں بدل گئیں۔ اور کردار کی بلندی نے بداخلاقی کی جگہ لے لی۔

تیمور کی وفات کے بعد وسطِ ایشیا میں اس کے اخلاف نے چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر لیں۔ ان ریاستوں کے حکمران اکثر برسرِ پیکار رہتے تھے۔ ان میں فرغانہ کی ریاست بھی تھی جس کا دارالحکومت اندجان ایک سرسبز و شاداب پہاڑ کے دامن میں چھوٹا سا دلفریب شہر تھا۔ جس کی نہریں پھلواریاں اور پھلوں کے باغات عجب خوش منظر تھے۔

۱۴۹۴ء میں عمر شیخ مرزا ایک حادثہ کا شکار ہو کر راہیِ ملکِ عدم ہوا۔ باپ کی وفات کے بعد گیارہ سال کی عمر میں بابر فرغانہ کے تخت پر بیٹھا مگر ترکستان کے سیاسی حالات نے اسے چین سے حکومت نہ کرنے دی اور اپنے بیک جدیوں کی سنگدلی اور ناخدا ترسی کی وجہ سے وہ چند جاں نثاروں کی معیت میں دشوار گزار پہاڑوں میں مارا مارا پھرتا رہا۔ ان حوادث نے بابر کو جفاکش مستقل مزاج اور بہادر بنا دیا۔ تقدیر نے ۱۵۰۴ء میں اس بادیہ گرد نوجوان ترک کے سر پر کابل کی حکومت کا تاج رکھا۔

اس وقت دہلی میں سکندر لودھی برسرِ اقتدار تھا۔ جس نے ۱۴۸۸ء سے ۱۵۱۷ء تک حکومت کی۔ اس کا جانشین ابراہیم لودھی ناتجربہ کار اور تیز طبیعت نوجوان تھا۔ جس نے پٹھان سرداروں کو ناراض کر لیا۔ ہندوستان میں آباد ہونے والے پٹھان سرداروں میں ابھی قبائلی نظام کی خصوصیات موجود تھیں۔ بہلول لودھی اور سکندر لودھی کی بارگاہ میں وہ بے تکلف چلے جاتے تھے اور وہ بھی اپنے درباری امرا اور معاون سرداروں سے بے جھجک ملتے جلتے تھے۔

ابراہیم یہ چاہتا تھا کہ درباری امرا اس کے پاس شاہی آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے آئیں اور درباداری کی رسوم کے مطابق اس سے یوں خطاب کریں جیسے بادشاہوں سے رعایا کرتی ہے۔ اس امر نے سرداروں کو مایوس اور ناراض کر دیا اور وہ اسے اپنی ذلت خیال کرنے لگے۔ اس مایوسی اور بے اطمینانی کی فضا میں جو امرا نے کابل کے چغتائی تاجدار ظہیر الدین محمد بابر

کو ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی دعوت دی ان میں بادشاہ کا چچا عالم خان اور اس کا ہم قبیلہ دولت خان لودھی صوبہ دار پنجاب شامل تھے۔ دولت خان کے دو لڑکے غازی خان اور دلاور خان تھے۔

یہ دعوت نامہ بابر کے لیے ہندوستان پر حملہ کرنے کا بہانہ بن گیا۔ بابر نے پانچ بار اس برصغیر پر یلغار کی مغربی پاکستان پر بابر کا قبضہ پہلے چار حملوں ہی میں مکمل ہو چکا تھا مگر اپریل ۱۵۲۶ء کے آخری حملہ میں اس نے ابراہیم لودھی کو پانی پت کی پہلی لڑائی میں شکست دے کر دہلی آگرے پر قبضہ کیا۔ اور ہندوستان کا تاجدار بن گیا۔

۱۵۲۴ء میں بابر لاہور پر قبضہ کرنے کے لیے وارد پنجاب ہوا۔ راولپنڈی ڈویژن کے گکھڑوں کو مسخر کرتا ہوا وہ لاہور پہنچا۔ تو بہار خان لودھی۔ مبارک خان لودھی اور بعض دوسرے اُمرا نے جو سلطنتِ دہلی کے وفادار تھے۔ اور دولت خان کی تادیب کے لیے لاہور آئے ہوئے تھے۔ اس کا راستہ روکا۔ پٹھان لشکر بہت زیادہ تھا۔ اس ٹڈی دل اور چغتائی لشکر میں نواحِ لاہور میں معرکہ کارزار گرم ہوا۔ جس میں کافی کشت وخون کے بعد میدان بابر کے ہاتھ رہا۔ فاتح لشکر نے لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد اسے خوب لوٹا اور بازاروں کو نذرِ آتش کیا۔

لاہور میں صرف چار دن قیام کر کے بابر دیپال پور کی طرف متوجہ ہوا۔ وہاں کی محافظ فوج نے مزاحمت کی۔ مگر فاتح نے انھیں شکست دے کر دیپال پور پر قبضہ کر لیا۔ دیپال پور میں دولت خان اپنے بیٹوں سمیت بابر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ لوگ بہار خان لودھی اور مبارک خان لودھی کی قیادت میں آنے والی فوج کے ڈر سے بلوچوں کے پاس پناہ گزین تھے۔ بابر کا ارادہ دیپال پور سے دہلی پر حملہ آور ہونے کا تھا۔ دولت خان نے مشورہ دیا کہ وہ کچھ فوج بھیج کر تہارہ پر حملہ کرے جہاں اسمٰعیل خان جلوانی فوج لیے پڑا تھا۔ تاکہ بابر کے دہلی کی طرف کوچ کرتے وقت وہ اسے نقصان نہ پہنچائے۔ بابر نے تہارہ پر حملہ کی تیاری شروع کر دی۔ ایک روز دلاور خان نے اُسے خلوت میں بتایا کہ اس مشورہ سے دولت خان کا مقصد اس کی فوج کو دو حصّوں میں تقسیم کرنا ہے۔ ایک حصّہ تہارہ پر حملہ کرے اور دوسرا دیپال پور میں اس کے پاس رہے۔ تاکہ بابر کی طاقت بٹ جائے تو وہ پنجاب کو اپنے قبضہ میں لے آئے۔ اس پر بابر نے دولت خان اور غازی خان کو نظر بند کر لیا مگر جلد ہی بعض اُمرا کے سمجھانے پر انھیں رہا کر کے جالندھر دوآب میں سلطان پور کے مقام پر جاگیر عطا کی۔ اور خود مشرقی پنجاب کی طرف بڑھا۔ مگر جلد ہی اُسے خبر ملی کہ دولت خان اور غازی خان نے سلطان پور میں جنگی تیاریاں کر کے شوالک کی پہاڑیوں کی راہ لی ہے۔ دولت خان جیسے سردار کا باغیانہ رویہ ایک بہت بڑے خطرے کا پیش خیمہ بن سکتا تھا۔ اس پر بابر نے دہلی کا ارادہ ترک کیا اور دلاور خان کو بلا کر اس پر انعامات کی بارش کی خان خاناں کا خطاب دیا اور جاگیر عطا کی۔ بعد ازاں بابر لاہور آیا۔ لیکن جلد اُسے کابل جانا پڑا۔ اس مہم میں اگرچہ وہ دہلی نہ پہنچ سکا۔ لیکن پنجاب کا بہت سا حصّہ اُسے مل گیا۔ اس لیے اس خطّہ کو مختلف اضلاع میں تقسیم کر کے وہاں اپنے حاکم مقرر کیے اور میر عبدالعزیز کو ناظم صوبہ لاہور مقرر کیا۔ کلانور محمد علی تاجک کے۔ سیالکوٹ خسرو کوکلتاش کے اور دیپال پور سلطان علاؤالدین کے حوالے کیا۔ موخرالذکر ابراہیم لودھی کا عزیز اور تختِ دہلی کیلیے اس کا حریف تھا۔ باباخشکہ لقب ایک دلاور ترک سپاہی کو علاؤالدین کے طریقِ کار کی نگرانی کے لیے چھوڑا اور کابل کی راہ لی۔

بابر کے منہ موڑتے ہی دولت خان اور غازی خان شوالک کی پہاڑیوں سے نکلے اور سلطان پور کی جاگیر پر قبضہ کر کے

دلاور خاں کو قید کر دیا۔ اس کے بعد وہ دیبال پور کی طرف بڑھے۔ بابر کے مقرر کردہ حاکم علاؤالدین کو شکست دے کر شہر پر قبضہ کر لیا۔ علاؤالدین کابل کو بھاگا اور تمام ماجرا کہانی بابر کے گوش گزار کی۔

یہ سنتے ہی ۱۷ نومبر ۱۵۲۵ء کو بابر کابل سے روانہ ہوا۔ اور دسمبر ۱۵۲۵ء میں گکھڑوں سے نبٹتا ہوا سیالکوٹ پہنچا۔ وہاں سے اس نے شاہم بیگ اور نور بیگ کو لاہور کے بیگوں یعنی بابر کے متعینہ ترک سرداروں کے پاس بھیجا۔ تاکہ وہ دشمن کی طاقت کا اندازہ لگا کر اُسے اطلاع دیں۔ یہاں علاؤالدین لودھی محمد علی حاکم کلانور اور خواجہ حسین اُسے آ ملے۔

دولت خاں اور غازی خاں چالیس ہزار فوج لیے لاہور کے متصل راوی دریا کے کنارے پڑے تھے مگر انھیں بابر سے لڑنے کی جرأت نہ ہوئی۔ دولت خاں نے ملوٹ کے قلعہ میں پناہ لی اور غازی خاں شوالک کے پہاڑوں میں جا چھپا۔ بابر نے ملوٹ کے قلعہ پر حملہ کر کے دولت خاں سے ہتھیار رکھوا لیے۔ اس واقعہ سے چند روز قبل دولت خاں دو دو تلواریں لٹکائے لاف زنی کرتا اور بابر کا تمسخر اُڑاتا پھرتا تھا۔ بابر نے حکم دیا کہ دونوں تلواریں گلے میں لٹکائے وہ اس کے سامنے پیش ہو چنانچہ اس ہیئت کذائی میں وہ بابر کے سامنے لایا گیا۔ اس کے کرتوتوں کے باوصف بابر نے اُسے معاف کر دیا اور اس پر نوازشات کیں۔ اس کے بعد بابر غازی خاں کی طرف متوجہ ہوا۔ اور اُسے شکست دی۔ وہ بھاگ کر دہلی ابراہیم لودھی کے پاس چلا گیا۔ اسی اثنا میں دلاور خاں بھی جسے باپ اور بھائی نے قید کر رکھا تھا۔ بھاگ کر بابر کے پاس آنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس واقعہ کے بعد بہت جلد دولت خاں لودھی راہیِ ملکِ عدم ہوا۔ اور ان اُلجھنوں سے نجات پائی۔

پنجاب کے انتظامات سے فراغت پا کر بابر دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ اور اپریل ۱۵۲۶ء میں پانی پت کی پہلی لڑائی میں ابراہیم کے جمِ غفیر کو شکست دے کر ہندوستان کا تخت و تاج حاصل کیا۔

بابر نے اگرچہ پانی پت کے میدان میں اپنے حریف کو شکست دے کر مرکزِ حکومت پر قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن اس فیصلہ کن جنگ میں فتح پانی اس کے مصائب میں اضافے کا موجب بنی۔ ہندوستان میں دو جنگجو قومیں راجپوت اور پٹھان تھے [illegible] راجپوتوں کی بہت سی ریاستیں تھیں۔ مگر میواڑ کا تاجدار رانا سنگرام سنگھ عرف رانا سانگا بلا کا بہادر اور خون آشام جرنیل تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ بھی بابر کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دینے والوں میں شامل تھا۔

رانا سانگا کا خیال تھا کہ تیمور کی طرح اس کا یہ حلیف بھی سلطنتِ دہلی کو تباہ و برباد کر کے واپس چلا جائیگا۔ اور پھر اس کے کھنڈروں پر اُسے راجپوت سلطنت کا قصرِ رفیع تعمیر کرنے کا موقع مل جائے گا۔

جب پانی پت کی جنگ کے بعد اُس نے کابل جانے کا نام نہ لیا تو رانا سانگا کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ اور وہ کھلم کھلا جنگ کی تیاریاں کرنے لگا۔

راجپوتوں کے علاوہ ہندوستان کے پٹھان جو پشاور سے لے کر سہسرام تک تمام شمالی ہندوستان میں آباد تھے بابر اور اُس کے مغل سرداروں کو اپنا حریف سمجھتے ہوئے انھیں ہندوستان سے نکالنے کے لیے کمربستہ ہو گئے۔

مزید برآں ہندوستان کی گرم آب و ہوا اس ملک کے اجنبی لوگ اور اُن کی عجیب و غریب رسوم و عادات مغل امرا کو ناپسند تھیں اور وہ چاہتے تھے کہ بابر جس قدر بھی جلد ممکن ہو مالِ غنیمت سمیٹ کر کابل واپس چلا جائے۔ اگرچہ بابر خود بھی ہندوستان کی آب و ہوا

یہاں کے باشندوں کی طرزِ معاشرت اور عادات کو ناپسند کرتا تھا اور تزکِ بابری میں اس جگہ بہت سی ضروری چیزوں کے فقدان کا رونا بھی رویا ہے اس کے باوصف اُس نے ہندوستان میں مقیم رہنے اور یہاں ایک وسیع سلطنت قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وادیٔ سندھ اور بالخصوص وادیٔ گنگا و جمنا کی زرخیزی نے اُس کے دامن کو تھام لیا۔ ان حالات میں بابر کی اقامتِ ہند کا تمام وقت زیادہ تر راجپوتوں اور پٹھانوں کے خلاف جنگی مہموں میں گزرا اُس نے انھیں پے درپے شکستیں دے کر شمالی ہند کے بہت سے حصّے پر قبضہ جما لیا خونریزی و تیغ زنی کے اِن مشاغل کے باوصف بابر اپنی تزک کی ترقیم میں مصروف رہا۔ علاوہ ازیں انتظامِ سلطنت اور تعمیرِ عمارات کی طرف بھی توجہ دی۔

بابر کا وطن اندی جان دامن کوہ میں ایک خوبصورت شہر تھا۔ جہاں چشموں کے پانی کی بہتی ہوئی نہریں، سرو صنوبر کے بلند و بالا درخت اور گل و لالہ کے نکہت بار تختے فردوسِ بریں کا منظر پیش کرتے تھے۔

پردیس میں وطن کا سا سماں باندھنے اور گرمیوں کی جھلس دینے والی دوپہروں کو آرام سے بسر کرنے کے لیے آگرہ میں بابر نے ایک باغ لگوایا۔ جسے دَورِ مغلیہ کے آفاقی باغوں کے سلسلہ کی پہلی کڑی کہنا چاہیے۔

افسوس ہے کہ بابر کو ہندوستان میں اپنی خداداد قابلیت کے جوہر دکھانے اور کاکلِ سلطنت سنوارنے کا موقع نہ ملا۔ دسمبر ۱۵۳۰ء میں وہ راہیٔ ملکِ عدم ہوا۔ اُس کی لاش پہلے آگرہ کے باغ میں بطور امانت دفن کی گئی اور بعد ازاں کابل میں تدفین کے لیے بھجوا دی گئی۔ بابر کی قبر کابل میں اب تک زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔

عہدِ نصیر الدین ہمایوں

آگرہ میں ہمایوں باپ کی رحلت کے بعد ۱۵۳۰ء میں سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس کی وصیت کے مطابق بھائیوں کو شریکِ سلطنت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسی اثنا میں کامران نے جو کابل اور قندھار کا گورنر تھا۔ پنجاب کا رُخ کیا۔ بظاہر اُس کا ارادہ بھائی کو تخت نشینی کی مبارک باد دینے کا تھا۔ لیکن فی الواقع اس کی نیّت حصولِ تخت و تاج کے موقع کی تلاش تھی۔ کامران عسکری کو اپنے علاقہ کے انتظام کے لیے چھوڑ آیا تھا۔

ہمایوں نے یہ خبر سُنی تو کامران کو کہلا بھیجا کہ اس کی جاگیر میں پشاور اور لمغان کے علاقے بھی شامل کر دیئے گئے ہیں۔ کامران اِس پیش کش سے مطمئن نہ ہوا اور وہ لشکرِ جرّار کی معیّت میں لاہور کی طرف بڑھتا رہا۔ میر یونس علی جسے بابر نے لاہور کا گورنر مقرر کیا تھا ہمایوں کا طرفدار تھا۔ کامران نے لاہور پر حملہ کرنے کی بجائے حکمتِ عملی سے اس پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

کامران کے دربار میں قراچہ بیگ نام ایک معتمد امیر تھا۔ کامران نے اُسے دربار میں ڈانٹا اور اظہارِ ناراضگی کیا۔ بیگ مذکور اس پر بددل ہو کر اپنے ساتھیوں سمیت لاہور میں پناہ گزین ہوا۔ میر یونس علی کو یہ معلوم ہوا تو وہ شہر سے باہر اُس کے استقبال کے لیے گیا اور اُسے بڑے اعزاز سے شہر میں لایا اور بے حد مدارات سے کام لیا۔ اِس سارے قصّہ میں بناوٹ تھی۔ مقصد یہ تھا کہ کسی بہانے قراچہ بیگ لاہور میں گھس جائے اور موقعہ پا کر شہر پر قبضہ کرے۔ ایک شب محفلِ نشاط و انبساط دیر تک قائم رہی۔ محفل کے اختتام پر میر یونس علی کے سپاہی گھروں کو جا چکے تھے۔ قراچہ بیگ نے موقعہ سے فائدہ اُٹھایا اور اپنے آدمیوں کی مدد سے

میر یونس علی کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔ اس کے بعد کراچہ بیگ کے آدمیوں نے دروازوں پر قبضہ کر کے راتوں رات کامران کو اطلاع دے دی۔ جو اسی انتظار میں تھا۔ دوسرے روز وہ فوج کثیر لیے بڑے تزک و احتشام سے شہر میں داخل ہوا۔ اور بغیر کسی رکاوٹ کے اس پر قابض ہو گیا۔ میر یونس علی کو رہا کر کے اجازت دے دی گئی کہ وہ ہمایوں کے پاس چلا جائے۔ لاہور پر کامران کا قبضہ دریائے ستلج تک تمام پنجاب پر تسلط کا پیش خیمہ بنا۔ ہمایوں نرم مزاج اور رحمدل تو تھا ہی۔ اس نے کابل اور قندھار کے علاوہ پنجاب پر بھی بھائی کا قبضہ تسلیم کر لیا۔

ہمایوں کے اس طرزِ عمل پر مرزا کامران نے بطورِ شکریہ اسے بیش بہا تحائف بھیجے۔ اس کے بعد وہ خط و کتابت میں بڑی انکساری سے اپنے آپ کو ہمایوں کا نیاز مند ظاہر کرتا۔ لیکن یہ انکساری اور عقیدت وقتی تھی۔ موقعہ ملنے پر کامران نے بھائی کو نقصان پہنچانے سے مطلق دریغ نہ کیا۔

محمد زمان مرزا کا حملہ

محمد زمان مرزا سلطان حسین مرزا والئے خراسان کا پوتا تھا۔ ازبکوں نے ان کی سلطنت پر قبضہ کر لیا تو یہ بابر کے دربار میں چلا آیا۔ بابر بڑے احترام سے پیش آیا اور اپنے دربار میں اسے ایک بلند منصب دیا۔ اور اپنی ایک بیٹی سے ان کی شادی بھی کر دی۔ اس اعتبار سے وہ ہمایوں اور کامران کا بہنوئی تھا۔ ۹۳۵ھ میں وہ پنجاب آیا اور لاہور کا محاصرہ کر لیا۔ مرزا کامران اس وقت قندھار کی جانب کسی مہم پر گیا ہوا تھا۔ یہ خبر سنتے ہی وہ لوٹا۔ اس کی آمد پہ محمد زمان مرزا محاصرہ اٹھا کر بھاگ نکلا۔

کامران فنونِ لطیفہ کا دلدادہ۔ شاعری کا رسیا اور فنِ تعمیر کا شیدائی تھا۔ اس نے اپنے مقبوضات کا انتظام بڑی تندہی سے کیا۔ لاہور میں اس نے ایک عالیشان باغ وسطِ ایشیا کے باغات کے نمونہ پر لگوایا۔ تاکہ گرمیوں کے ایام میں تمازتِ آفتاب سے پناہ لینے کے کام آئے اور علاوہ اس کے موسمِ بہار اور موسمِ سرما میں بھی شعر و ادب کی محفلیں اور راحت و عشرت کے جشن یہاں منعقد کیے جا سکیں۔ برِصغیر پاک و ہند میں آگرہ کے باغ کے بعد یہ دوسرا مغلیہ باغ تھا۔ خدا معلوم کس مبارک ساعت میں اس باغ کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ کہ اس کے بعد مغلوں کے دورِ اقتدار میں بے شمار باغات یہاں عالمِ وجود میں آئے۔ ان میں ہر باغ نزہت و طراوت اور رعنائی و دلکشی میں دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھا۔ اس کے باوجود شہرِ باغات و چمن یعنی لاہور کا یہ پہلا باغ شاہجہان کے دور تک مقبول رہا۔ شاہجہانی دور کا منصب دار اور شاعر ظفر خاں احسن یوں رقمطراز ہے:

بکامِ دل چو احسن تا توانی
بباغِ کامران کن کامرانی

کامران جیسے صاحبِ ذوق شہزادے کے باغ کی تزئین و نزہت کا جو عالم ہو گا وہ آج ہم چشمِ تصور سے بھی نہیں دیکھ سکتے۔ اس باغ کی ایک ٹوٹی پھوٹی بارہ دری جو آج سے سال بھر پہلے دریا کے دائیں کنارہ پہ تھی آج اس کے وسط میں ایک جزیرہ میں[۱] اس وقت کا انتظار کر رہی ہے جب حالتِ سیلاب میں پانی کا کوئی تیز ریلا اسے بہا کر لے جائے گا۔

---

[۱] نومبر ۱۹۶۱ء میں بارہ دری دریا کے بائیں کنارے پر ہے اور پانی اس کے دائیں جانب بہہ رہا ہے۔

بیاد نقش عمارات شہر یاراں بیں
کہ ایں سپہر جفا پیشہ چوں بہ لبست و شکست

عہدِ جلال الدّین محمد اکبر

۱۵۵۶ء میں ہمایوں حادثہ کا شکار ہو کر راہیِ ملکِ عدم ہوا۔ تو اس وقت اکبر پنجاب میں کلانور کے مقام پر خیمہ زن تھا۔ اس وقت اکبر کی عمر ۱۳ سال، دو چار ماہ کی تھی۔ اور وہ اپنے اتالیق اور اپنے خاندان کے جانثار جرنیل بیرم خاں کی معیت میں افغان باغیوں کے استیصال کے لیے مقیم تھا۔ یہ خبر ملتے ہی اکبر کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا گیا۔ کلانور مغلیہ دور میں صوبہ لاہور کا ایک اہم شہر تھا۔ عبدالقادر بدایونی منتخب التواریخ میں رقمطراز ہیں کہ اکبر نے اس شہر میں بعدازاں عالی شان عمارات تعمیر کرائیں مگر اب وہ تعمیرات مرورِ زمانہ سے برباد ہو چکی ہیں۔ صرف پکی اینٹوں کا ایک چبوترہ باغ میں باقی ہے۔ اور یہ اُس مقام پر تعمیر کیا گیا ہے جہاں اکبر کی تخت نشینی کا اعلان کیا گیا تھا۔ کلانور آج ضلع گورداسپور کی ایک تحصیل کا صدر مقام ہے۔

شاہ ابوالمعالی کی بغاوت

شاہ ابوالمعالی سادات کاشغر میں سے تھا۔ وہ دلاوری کے علاوہ متناسب الاعضا اور خوبصورت بھی تھا۔ ہمایوں کی وفات کے وقت وہ لاہور میں مقیم تھا۔ اگرچہ سکندر سور اور دیگر پٹھان باغیوں کے استیصال کے لیے اکبر کو پنجاب کی طرف بھیجتے وقت لاہور کی صوبہ داری اُس کے حوالے کر دی گئی تھی۔ مگر ابوالمعالی ابھی تک لاہور میں مقیم تھا۔ اکبر کی تخت نشینی پر کلانور میں ایک جلسۂ عام کا انعقاد قرار پایا۔ اس میں شرکت کے لیے شاہ ابوالمعالی کو بھی دعوت دی گئی۔ اُس نے جواب میں کہلا بھیجا کہ ابھی میں مرحوم شہنشاہ[1] کا سوگ منا رہا ہوں۔ لہٰذا کسی ایسی تقریب میں میری شرکت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بالفرض اگر میں اس تقریب میں شرکت کروں تو بادشاہ سلامت میرے ساتھ کیسا سلوک روا رکھیں گے مجھے اُس اجتماع میں کہاں جگہ دی جائے گی اور میرے استقبال کے لیے کیا انتظام ہوں گے۔

بہرحال اسے دربار میں طلب کیا گیا اور بیرم خاں نے تولک خاں قوچین کے ذریعہ اُسے گرفتار کرا لیا۔ بیرم خاں کا خیال یہ تھا کہ اس مغرور اور گستاخ انسان کو تلوار کے گھاٹ اُتار دیا جائے۔ مگر اکبر اس امر پر رضامند نہ ہوا۔ بہرحال اُسے آہنی سلاسل میں باندھ کر لاہور لایا گیا۔ اور پولیس کے افسرِ اعلیٰ ذکو توال، پہلوان گل گز کے سپرد کر دیا گیا۔ کوتوال کی لاپروائی کہیئے یا نمک حرامی شاہ ابوالمعالی بندی خانے سے بھاگ نکلا۔ اس پر کوتوال کو زیرِ حراست لے لیا گیا۔ شاہی عتاب کے ڈر اور ذلت کے خوف سے کوتوال نے خودکشی کر لی۔

خضر خواجہ خان صوبہ دار لاہور

خضر خواجہ خاں ہمایوں کی ہمشیرہ گلبدن بیگم کا شوہر تھا۔ گلبدن اپنے بھائیوں کی طرح شعر و ادب کی شیدائی اور زیورِ علم سے پیراستہ تھی۔ اُس نے بعدازاں اکبر کے ایما پر اپنے بھائی کے حالات پر مشتمل ایک کتاب ہمایوں نامہ تالیف کی تھی اس کتاب کا متن اور انگریزی ترجمہ ۱۹۰۲ء میں

---

[1] ہمایوں شاہ ابوالمعالی کا بے حد احترام کرتا تھا۔ اکبر شاہی تقاریب میں اُسے اپنے قریب جگہ دیتا تھا اور "فرزند" کے خطاب سے نوازا تھا۔

ایک فاضل برطانوی خاتون مسز بیورج نے شائع کرایا تھا۔ گلبدن بیگم کا شوہر خضر خواجہ خان ایک قابل ترک امیر تھا۔ اکبر نے اسے لاہور کا گورنر مقرر کر کے سکندر سوری کے استیصال کے لیے خاص ہدایات دیں اور خود اپنے اتالیق اور درباری اُمرا سمیت دہلی کا رُخ کیا۔

لشکر شاہی ابھی جالندھر میں تھا کہ پرچہ لگا کہ ہیموں بقال نے دہلی اور آگرہ پر قبضہ کر کے شاہی کارکنوں کو اُس شہر سے نکال دیا ہے۔ چنانچہ بادشاہ ہیموں کے استیصال کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اسی اثنا میں سکندر سوری پٹھانوں اور پہاڑی راجاؤں پر مشتمل ایک لشکرِ جرار لے کر پہاڑوں سے نکلا اور لاہور کا رُخ کیا۔ خضر خواجہ نے بہ عجلت تمام فوج لے کر چھیاڑی[۱] کے مقام پر خیمہ زن ہوا۔ دشمن وہاں سے صرف دس کوس دُور تھا۔ حاکم لاہور نے دو ہزار منتخب سپاہیوں پر مشتمل ایک فوج بطور ہراول دشمن کی طرف بھیجی۔ سکندر نے فی الفور اُس پر حملہ کر کے اُسے برباد کر دیا۔ اِس شکست کے بعد خضر خواجہ لاہور لوٹ آیا۔ سکندر سوری نے مغل لشکر کا تعاقب کیا مگر جلد ہی ان کے تعاقب کو ترک کر کے اُس علاقے کے زمینداروں سے مالیہ اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔

اکبر کی لاہور میں آمد

چھیاڑی کے حادثہ کی خبر اکبر کو ملی تو اُس نے خضر خواجہ خان کی مدد کے لیے اپنے ایک درباری سکندر خان کو خانِ عالم کا خطاب اور سیالکوٹ بطورِ جاگیر عطا کر کے لاہور کی طرف بھیجا۔ ۵ نومبر ۱۵۵۶ء کو اکبر نے ہیموں کو پانی پت کے تاریخی میدان میں شکست دی۔ اور امورِ دہلی سے فراغت پا کر سات دسمبر ۱۵۵۶ء کو اپنے اتالیق اور سرپرست بیرم خان کی معیت میں عازم لاہور ہوا۔ اکبر کے جالندھر پہنچنے کی خبر ملی تو سکندر سوری نواح لاہور سے بھاگا اور مانکوٹ کے پہاڑی قلعہ میں پناہ لی۔ شاہی فوجوں نے اس کا تعاقب کیا اور ضلع ہوشیار پور میں دسوہہ کے مقام پر خیمے لگا دیے۔ بعد ازاں مان کوٹ کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرے نے طوالت پکڑی اور محصورین کے لیے مقابلہ مشکل ہو گیا۔ خوراک کی کمی کے باعث لوگ بھوک سے مرنے لگے۔ تو ایک ایک کر کے سکندر سوری کے بہت سے ساتھی جواں سال بادشاہ سے جا ملے۔ اس پر سکندر سوری نے اپنے بیٹے عبدالرحمٰن اور غازی خان سوری کو بطورِ تحفہ کچھ ہاتھی دے کر بادشاہ کے پاس بھیجا اور صلح کا ملتجی ہوا۔ اتکہ خان اور پیر محمد خان کی کوشش سے صلح ہو گئی۔ سکندر سوری نے قلعہ بادشاہ کے حوالے کر کے ہتھیار ڈال دیے۔ یہ واقعہ ۱۳ر جولائی ۱۵۵۷ء کا ہے۔ اس صلح کے بعد فوج خوشی خوشی لاہور کی طرف بڑھی۔ اکبر چار مہینے اور چودہ دن لاہور میں رہا۔ اِس دوران صوبہ لاہور کی انتظامیہ کو منظم کیا اور تخت مل نام ایک پہاڑی سردار کو بجرم سرکشی سزائے موت دی۔ اسی زمانے میں بیرم خان کے ہاں ایک فرزند تولّد ہوا جس نے بعد ازاں اکبر اور جہانگیر کے زمانے میں عبدالرحیم خانِ خاناں کے نام سے

۱؎ چھیاڑی ضلع امرتسر کا ایک مشہور قصبہ ہے۔ یہاں کے خربوزے بہت مشہور ہیں۔ اور تقسیم پنجاب ۱۹۴۷ء سے قبل لاہور میں بے حد مقبول تھے۔ چھابڑی والے خاص طور پر یہ آواز لگاتے تھے "خربوزے چھیاڑی دے" چھیاڑی لاہور کے شمال مشرق میں ۳۵ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

۲؎ ابوالفضل اکبر نامہ جلد دوم صفحہ ۴۴ تا ۶۰ بدایونی جلد دوم ص ۱۸ تا ۲۰۔

شہرت پائی۔ لاہور کو یہ شرف حاصل ہے کہ شعر و ادب کا یہ سرپرست اور نادرۂ روزگار فن کار یہاں پیدا ہوا۔

حسین خان ٹکریہ

سات دسمبر ۱۵۵۸ء کو بادشاہ عازم دہلی ہوا اور لاہور میں مہدی قاسم خاں کے بھانجے اور داماد حسین خان کو گورنر مقرر کیا۔ یہ شخص ذات کا پٹھان اور بلا کا بہادر تھا۔ مان کوٹ کے محاصرے میں بہادری کے جوہر دکھائے۔ اس کے بھائی حسن خان نے تو اس معرکہ میں ناموس سلطنت تیموریہ پہ جان قربان کر دی۔ حسین خان تیغ زنی کی دھاک بٹھائے صحیح سلامت میدانِ جنگ سے لوٹے اور خدمت گزاری کے صلہ میں لاہور کی صوبہ داری حاصل کی۔

حسین خان راسخ العقیدہ اور دین دار انسان تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ لاہور کی صوبہ داری کے زمانہ میں جب انھیں دنیا کی ہر نعمت میسر تھی جَو کی روٹی کھاتا اور سادہ بستر پہ سوتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت پر عمل پیرا ہو۔ لمحاتِ فرصت علما و سادات اور مشائخ کی صحبت میں گزارتا تھا۔ تہجد کی نماز کبھی قضا نہ کی۔ بے شمار مقابر اور مساجد تعمیر اور مرمت کرائیں۔

ایک بار ایک دراز ریش اور معزز انسان اس کے دربار میں آیا۔ اسے کوئی عالم یا شیخ خیال کرتے ہوئے یہ "تعظیماً" کھڑا ہو گیا۔ مزاج پرسی کے بعد معلوم ہوا کہ وہ ہندو ہے۔ اس پہ یہ بہت جز بز ہوئے اور حکم دیا کہ ہندو اپنے لباس پر کندھے کے پاس ایک رنگین کپڑے کا ٹکڑا سلوا لیا کریں۔ اس حکم پہ باشندگانِ لاہور جن کی شگفتہ مزاجی اور زندہ دلی ہر زمانے میں مسلّم رہی ہے اُسے حسین خان ٹکریہ کہنے لگے۔

بیرم خاں کا زوال

بیرم خاں، ہمایوں، اکبر اور ان کے خاندان کا جانثار اور وفادار تھا۔ اُس کی وفاداری پر کبھی بھی شک نہیں کیا جا سکتا۔ ہمایوں کو ہندوستان کے تخت پہ دوبارہ بٹھانے والا اور سلطنتِ اکبری کی جڑیں اِس سرزمین میں مضبوط کرنے والا یہی شخص تھا۔ شخصی حکومتوں میں امرا اور درباریوں کی رقابتیں اور سازشیں جو گل کھلاتی ہیں اُس کی داستان بہت عبرتناک ہے۔ ہیموں اور سکندر سوری کے ہنگاموں سے فرصت ملی تو اربابِ غرض نے بیرم خاں کو اپنے عزائم کے راستے کا سنگِ گراں خیال کرتے ہوئے جواں سال بادشاہ سے اُسے ٹکرا دیا۔ اس سازش میں بادشاہ کو بچپن میں دودھ پلانے والی خواتین بی بی انگہ اور ماہم انگہ پیش پیش تھیں۔ ترکی زبان میں دودھ پلانے والی دایہ کو انگہ کہتے ہیں۔ اُس کے شوہر کے لیے لفظ اتکہ یا انگہ آتا ہے۔ بی بی انگہ کا شوہر شمس الدین انگہ شاہی دربار میں متقدر رہتا۔ اُس کا لڑکا مرزا عزیز کوکلتاش بعد میں اعلٰے مدارج پہ پہنچا۔ ماہم انگہ کا بیٹا ادھم خان تھا۔ ان دونوں عورتوں کے تمام اعزہ اور متوسلین کو مجموعی طور پر تاریخوں میں انگہ خیل کا نام دیا جاتا ہے۔

بیرم خاں طبیعت کا سخت تھا۔ بدامنی اور جنگوں کے عبوری دَور میں اُس کی حزم درسی اور سخت گیری استحکامِ حکومت کے لیے سود مند تھی مگر امن کے دَور میں جب حاسد اور دشمن مستعد کار ہوں بیرم خاں کی حکمتِ عملی ناکام رہی۔ بیرم خاں بادشاہ کی نظروں سے گرا تو شمس الدین انگہ کو فرمان ملا کہ لاہور پہنچ کر اُس شہر میں میر محمد خانِ کلاں کو متعین کرے اور خود بارگاہِ شاہی میں پہنچو۔

شمس الدین انگہ اس وقت بھیرہ میں تھا۔ اُس نے فی الفور احکامِ خسروی پر عمل کیا۔ میر محمد خان کلاں کو غالباً

حسین خاں ٹکریہ کی معزولی کے بعد مقرر کیا گیا جو بیرم خاں کا ہوا خواہ تھا۔ شمس الدین اتکہ جب بارگاہِ سلطانی میں پہنچا تو اُسے اُن اعزازات و انعامات سے نوازا کہ اُس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھے۔ اور صوبہ لاہور میں نائب السلطنت مقرر کیا۔ اور اُسے خاص ہدایات دے کر لاہور کا صوبہ دار مقرر کیا۔ تاکہ خان خاناں اس علاقہ میں فتنہ پردازی کرنا چاہیں تو اُنھیں روک دیا جائے۔ اور اس صوبہ میں امن بحال رکھا جائے۔ ان کے عازمِ لاہور ہوتے ہی اکبر خود بھی اتکہ خاں کے لشکر کے عقب میں روانہ ہوا۔ اکبر لدھیانہ میں مقیم تھا۔ کہ اُسے بیرم خاں خان خاناں کے اتکہ خاں سے شکست کھا کر شوالک کے پہاڑوں کی طرف فرار ہو جانے کی خبر ملی۔ اور اسی اثنا میں شمس الدین اتکہ خان قیدیوں کو لیے دربارِ شاہی میں باریاب ہوا۔ اُسے خانِ اعظم کا خطاب ملا اور پنجاب میں وسیع علاقے بطور جاگیر اُسے اور اُس کے متوسلین کو ملے۔[1]

نومبر ۱۵۶۱ء میں شمس الدین محمد اتکہ خان لاہور سے بارگاہِ خسروی میں خراجِ عقیدت ادا کرنے گیا اور بہت سے تحائف پیش کیے۔ بادشاہ نے اُسے وزیرِ اعظم کا عہدہ عطا کیا اور صوبہ لاہور کے امورِ سلطنت کی نگہبانی خانِ کلاں قطب الدین محمد خان کے سپرد ہوئی۔ تین برس کے عرصہ میں خانِ کلاں کے علاوہ اور بھی لوگ اس عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوتے رہے۔

مرزا حکیم کا حملہ

۱۵۶۴ء میں میر محمد خان کو لاہور کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ اکبر کے سوتیلے بھائی محمد حکیم مرزا نے اسی کے زمانہ میں لاہور پر حملہ کیا تھا۔ اکبر نے حکیم مرزا کو کابل کی حکومت عطا کر رکھی تھی۔ ۱۵۶۶ء میں وہ پنجاب میں آیا۔ اور بھیرہ کے نواح میں غارت گری شروع کی۔ اس کے بعد وہ بڑی تیزی سے سفر کرتا ہوا لاہور پہنچا اور مہدی قاسم خان کے باغ میں خیمہ زن ہوا۔ یہ باغ شہر سے باہر دریا کے کنارے واقع تھا۔ اس پر میر محمد خان صوبہ دار لاہور نے پنجاب کے جاگیرداروں کو جن میں اتکہ خیل کے اراکین کی اکثریت تھی مدد کے لیے بلایا اور قلعہ کو فوجوں سے بھر لیا۔ مرزا حکیم نے قلعہ پر حملہ کیا مگر منہ کی کھائی۔ اور باغ میں واپس آ گیا۔ اکبر کو خبر ملی تو وہ دہلی اور سرہند کے راستے عازمِ لاہور ہوا۔ اُس کی آمد کی خبر سُن کر مرزا حکیم پریشان ہو کر کابل کو بھاگا۔ فروری ۱۵۶۷ء کے آخر میں اکبر لاہور پہنچا اور قطب الدین محمد خان اور کمال خان گکھڑ کو مرزا حکیم کے تعاقب میں بھیجا۔ انھوں نے کچھ دور مرزا کا تعاقب کیا اور یہ دیکھ کر کہ اس کا ارادہ کہیں رُکنے کا نہیں واپس چلے آئے۔

شکارِ قمرغہ

مرزا حکیم کے قضیہ سے فراغت پا کر اکبر نے شکارِ قمرغہ کا انتظام لاہور سے پانچ کوس کے فاصلہ پر کیا۔ قمرغہ ترکی لفظ ہے اور اس شکار کا انتظام یوں کیا جاتا تھا کہ بہت سے لوگ دائرہ کی صورت میں جنگل کے بہت سے علاقے کو گھیرے میں لے لیتے تھے۔ اس طرح بہت سے جنگلی جانور محصور ہو جاتے تھے۔ دائرے کو آہستہ آہستہ تنگ کیا جاتا اور محصور جانوروں کا شکار کیا جاتا۔ پندرہ ہزار کے قریب جنگلی جانور اس موقع پر شکار کیے گئے۔ بادشاہ کے بعد اُمرا اور اس کے بعد عوام کو شکار کی اجازت دی گئی۔ ابوالفضل کا بیان ہے کہ اس موقع پر قیامِ لاہور کے دوران بادشاہ نے امورِ دولت میں بے حد دلچسپی لی۔ اور زمینداروں کے وفد اُس سے ملتے رہے۔ محمد باقی حاکمِ ٹھٹھہ کا سفیر بھی اسی موقع پر اکبر کی مجلس میں باریاب ہوا۔ مارچ ۱۵۶۷ء میں شہنشاہ نے صوبہ لاہور کی حکومت پھر میر محمد خان اتکہ کے سپرد کی۔ یہ شخص شمس الدین محمد خاں اتکہ

---

[1] ابوالفضل اکبرنامہ جلد دوم صفحہ ۱۱۱ تا ۱۱۴۔ منتخب التواریخ بدایونی جلد دوم صفحہ ۴۳۔

کا بڑا بھائی تھا۔ جو پہلے بھی اس صوبہ کا حاکم رہ چکا تھا۔ اور خود بادشاہ آگرے کو روانہ ہوا۔

انگہ خیل کا تبادلہ

اکبر نے اپنی حکومت کے تیرھویں برس کے وسط ۱۵۶۸ء میں یہ فیصلہ کیا کہ پنجاب میں جس قدر انگہ خیل کے لوگ ہیں انھیں پنجاب کی حکومت سے علیحدہ کر دیا جائے اور حسین قلی خاں کو لاہور کا صوبہ دار مقرر کیا جائے۔ اُسے خانِ جہاں کا خطاب دیا گیا۔ ابوالفضل (اکبر نامہ ابوالفضل جلد دوم صفحہ ۳۳۲۔۳۳۳) اس کی وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ جب ایک ہی گروہ کے مختلف لوگ ایک مقام پہ جمع ہو جائیں تو اُن کا اور قوم کا فائدہ اسی میں ہوتا ہے کہ انھیں وہاں سے منتشر کر دیا جائے۔ اکبر کے تدبر اور دُور اندیشی نے اُسے مشورہ دیا کہ سیاسی مصلحت اسی میں ہے کہ انگہ خیل کے وفا شعار افراد جو مدتوں سے ایک ہی صوبے کی انتظامی مشینری کے اجزا بن چکے ہیں شاہی دربار میں آئیں اور دوسرے صوبوں میں اعلیٰ عہدوں پہ تعیناتی کے فرمان حاصل کریں۔ یہ لوگ اگست ۱۵۶۹ء میں مقام آگرہ بارگاہِ اکبری میں حاضر ہوئے۔

انگہ خیل کی معزولی کے بعد حسین قلی خاں اور اُس کا بھائی اسمٰعیل قلی خاں صوبۂ لاہور کے انتظامات میں مصروف ہو گئے (طبقات اکبری نظام الدین احمد صفحہ ۲۸۶)

اکبر پاک پٹن میں

اکبر نے مارچ ۱۵۷۱ء میں حضرت فرید الدین شکر گنج کے مزارِ مبارک کی زیارت کے لیے اجودھن کا سفر اختیار کیا۔ آج کل اس شہر کو پاکپٹن کہتے ہیں۔ شہر اور حضرت فرید الدین کا روضہ ایک بلند ٹیلے پر واقع ہے کیونکہ دریائے ستلج کبھی اس شہر کے متصل بہتا تھا اس لیے اسے پتن شیخ فرید یا پاک پٹن کہنے لگے معلوم ہوتا ہے کہ اجودھن بہت قدیم تاریخی شہر ہے۔ جو کئی بار اجڑا اور کئی بار بسا۔ اور شہر کے بلند ٹیلے کے نیچے کئی آبادیوں اور کئی تہذیبوں کے آثار مدفون ہیں۔

اکبر کو سلسلہ عالیہ چشتیہ کے بزرگوں سے بے حد عقیدت تھی اور یہی عقیدت اُسے بارگاہِ فریدیہ میں لے گئی۔
پاکپٹن اس وقت خانِ اعظم مرزا عزیز کوکہ کی جاگیر میں تھا۔ اُس نے بادشاہ کے اعزاز میں ایک شاہانہ دعوت کا انتظام کیا۔ پاکپٹن سے نکل کر اکبر سیر و شکار سے دل بہلاتا اور دیپالپور ہوتا ہوا ۱۷ مئی ۱۵۷۱ء کو لاہور پہنچا حسین قلی خاں صوبہ دار نے رسومِ "ارادت و خدمت" ادا کیں۔ لاہور میں صوبہ دار کی درخواست پر اکبر نے اُس کی تعمیر کردہ عمارات کو دیکھا حکومت لاہور کے معائنہ کے بعد اکبر نے حصار کی راہ لی۔

۱۵۷۳ء میں لاہور کے اُمرا اور اکابر دربار شاہی میں ہدیۂ عقیدت و مروت پیش کرنے کے لیے آگرہ گئے حسین قلی خاں اس جماعت کا سربراہ تھا۔ اکبر نے ان کی ارادت کو تحسین کی نگاہ سے دیکھا اور انھیں شاہی اعزازات سے نوازا۔ حسین قلی خاں کو خانِ جہاں[1] کا خطاب ملا۔

۱۵۷۵ء میں خانِ جہان کو بنگال کی مہم پر روانہ کیا گیا۔ اور لاہور کا صوبہ دار شاہ قلی خاں[2] محرم کو مقرر کیا گیا۔ جو بہادر اور

---

[1] بدایونی منتخب التواریخ جلد دوم صفحہ ۱۶۵۔ اکبر نامہ جلد سوم صفحہ ۴۰۔

[2] اکبر نامہ جلد سوم صفحہ ۲۳۰۔ بدایونی جلد دوم صفحہ ۲۱۸۔

ذی فہم امیر تھا۔

شاہ قلی محرم کی معزولی ۱۵۷۸ء میں ممالکِ محروسہ کا دورہ کرتے ہوئے صوبۂ لاہور میں پہنچا۔ کھوکھووال کے قریب دریائے بیاس کو عبور کر کے دوآبہ باری میں داخل ہوا تو بہت سے فریادی یہ شکایت لیکر بارگاہِ خسروی میں حاضر ہوئے کہ شاہ قلی محرم صوبہ دار لاہور ستمگروں اور جفاکاروں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے میں تساہل سے کام لیتا ہے۔ اور اسی باعث نظامِ حکومت کا شیرازہ بکھر رہا ہے۔ رعایا نواز تاجدار نے ستم زدوں کی دلجوئی کی۔ شاہ قلی محرم عتابِ شاہی کا شکار ہو کر اپنے عہدے سے معزول کر دیا گیا۔ اور اس کی جگہ سعید خان صوبہ دار لاہور مقرر ہوا اُسے رعایا پروری اور مظلوموں کی دادرسی کے لیے خاص ہدایات دی گئیں۔

مرزا حکیم کا دوسرا حملہ محرم ۹۸۹ھ مطابق فروری ۱۵۸۱ء میں اکبر کا سوتیلا بھائی مرزا حکیم پھر لاہور پر حملہ آور ہوا۔[1] یہ حملہ اُس نے معصوم کابلی اور اپنے ماموں فریدون خان کی ترغیب پر کیا۔ اُس کا مقصد ہندوستان کے تخت و تاج کو اپنے تصرف میں لانا تھا۔ اُس کے ہراول دستوں کے سردار شادمان خان کو دریائے سندھ کے کنارے مان سنگھ نے جو اکبر کا راجپوت سردار تھا شکست دے کر مار ڈالا۔ مگر مرزا حکیم دریائے سندھ کو عبور کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اکبر کو اطلاع ملی تو اُس نے سپاہ کو آٹھ ماہ کی تنخواہ پیشگی دے کر لاہور کا رُخ کیا۔ دہلی پہنچنے پر معلوم ہوا کہ مرزا حکیم اپنے لاؤ لشکر سمیت لاہور پہنچ کر مہدی قاسم خاں کے باغ میں مقیم ہے۔

مرزا کے لاہور پہنچنے پر سعید خان صوبہ دار لاہور اور بھگوان داس۔ مان سنگھ۔ سید حمید محمد زمان وغیرہ امرائے لاہور نے شہر کے دروازے بند کر دیئے اور جنگ کی تیاریاں شروع کیں۔ مرزا کے امرا شیر خواجہ خداداد علی زدجیہ اور میر سکندر وغیرہ شہر پر حملہ کرتے مگر وہ اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس دوران میں مرزا لاہور پر اپنے امرا کی لاف زنی کے باعث قابض نہ ہو سکنے پر بہت پریشان ہوتا رہا۔ اور اپنے متعلقین سے اُلجھتا رہا۔ اسی اثنا میں اکبر کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا اور مرزا حکیم ۲۷ فروری ۱۵۸۱ء کو راہ پیمائے کابل ہوا۔[2] اس موقعہ پر مرزا حکیم اکیس روز لاہور میں مقیم رہا۔

راجہ بھگونت سنگھ صوبہ دار لاہور جنوری ۱۵۸۴ء میں سعید خان کی جگہ راجہ بھگونت سنگھ کو لاہور کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ ۱۵۸۴ء میں راجہ بھگونت سنگھ مرزا شاہ رخ کی معیت میں بادشاہ سے ملاقات کے لیے فتح پور سیکری گیا۔ اکبر نے اُن کے استقبال کے لیے شیخ ابراہیم چشتی اور راجہ دانیال کو بہت سے دوسرے امرا کی معیت میں بھیجا۔ جو انھیں بصد احترام شاہی دربار میں لائے۔ ۱۹ فروری ۱۵۸۵ء کو بڑے تزک و احتشام سے شہزادہ سلیم کی شادی بھگونت سنگھ کی لڑکی سے ہوئی۔[1] ۱۵۸۶ء میں راجہ بھگونت سنگھ کو حکم ہوا کہ وہ راجہ مان سنگھ کو فوجی مدد دے۔ جو یوسف زئی پٹھانوں سے برسرِ پیکار تھا۔ دریائے سندھ پار کر کے وہ خیر آباد کی سرائے میں فوج لاہور کا انتظام کر رہا تھا کہ یکایک

---

[1] اکبر نامہ جلد سوم صفحہ ۳۰۳ ۔ فریدون خان مرزا حکیم کی والدہ ماہ چوچک بیگم کا بھائی تھا۔

[2] اکبر نامہ جلد سوم صفحہ ۳۵۱ ۔ بدایونی جلد دوم صہ ۲۹۱ ۔

باگل ہو گیا۔ اسے کابل لے گئے۔ سامان خان نام ایک طبیب ایک روز اس کی نبض پکڑے اس کا طبی معائنہ کر رہا تھا کہ راجہ بھگونت سنگھ نے خنجر نکال اپنے آپ کو زخمی کر لیا۔ اکبر کو علم ہوا تو اس نے چند اطبا کو جن کے نام حکیم حسن، حکیم مہادیو اور دولت خاں تھے راجہ کے پاس بھیجا تاکہ اس کے اعزہ جسے مناسب سمجھیں راجہ کے علاج کے لیے متعین کر دیں۔ انھوں نے یہ خدمت مہادیو کے سپرد کی۔ جس کے علاج سے ایک طویل مدت کے بعد راجہ کو افاقہ ہوا۔

اسماعیل قلی صوبہ دار لاہور

راجہ بھگونت سنگھ کی علالت پر اسمٰعیل قلی کو لاہور کا گورنر مقرر کیا گیا۔ لیکن بہت جلد ناتجربہ کاری اور لالچ کے سبب وہ ہر دلعزیزی کھو بیٹھا۔ اور اکبر کی نگاہِ التفات سے محروم ہو گیا۔ بادشاہ نے اسے معزول کر کے حج پر جانے کا حکم دیا۔

اکبر کی لاہور میں اقامت

مئی ۱۵۸۶ء میں اکبر نے لاہور کو دارالحکومت مقرر کیا اور یہاں اقامت اختیار کی تاکہ شمال مغربی سرحد اور افغانستان کی مہموں کی نگرانی ایک قریبی مقام سے کی جائے۔ علاوہ ازیں کشمیر اور سندھ کی فتح کی طرف توجہ مبذول کی جا سکے۔ مزید برآں اپنے آبائی وطن ترکستان کی بازیابی کا خیال مغل حکمرانوں کے دل سے کبھی نہ گیا تھا۔ انھوں نے بلادِ ہند میں رشکِ فردوس باغ فلک رفعت محلات اور ترکی حمام بنوائے اور اپنے وطن کی سی فضا پیدا کی۔ وسیع علاقے مسخر کیے اور وہ خزائن جمع کیے کہ قارون کا خزانہ بھی ان کے سامنے ہیچ تھا مگر فرغانہ کی یاد ابل بابر کے دل سے نہ گئی۔ چنانچہ اکبر کے قیام لاہور کے مقاصد میں کشمیر، پٹھان قبائل اور سندھ کی فتح کے علاوہ وسط ایشیا کی تسخیر بھی شامل تھی۔

لاہور پہنچ کر اکبر راجہ بھگونت داس کی حویلی میں مقیم ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ لاہور کا قلعۂ شاہی اس قابل نہیں تھا کہ وہاں اقامت اختیار کی جائے۔ ۱۵۸۶ء کے اختتام تک اکبر کشمیر پر تسلط جما چکا تھا۔ اسی سال اس نے مختلف صوبوں کے حکام کے تبادلوں کا فیصلہ کیا۔ اور یہ طے کیا کہ ہر صوبہ میں دو دو ایک ہی قابلیت کے حاکم مقرر کیے جائیں تاکہ اگر ان میں سے ایک دربار شاہی میں آیا ہوا ہو یا کسی مہم میں مصروف ہو تو دوسرا انتظامِ ملک کی طرف متوجہ رہے۔ علاوہ ازیں مرکز سے بھی ایک دیوان اور ایک بخشی بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ لاہور میں راجہ بھگونت داس کو دوبارہ صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ رائے پال سنگھ اس کا نائب متعین ہوا (ابوالفضل۔ اکبر نامہ جلد سوم صفحہ ۵۱۱)

مرزا رستم صفوی کی آمد

اکبر ابھی لاہور میں مقیم ہوا ہی تھا کہ مرزا رستم نام ایک ایرانی شہزادہ جو شاہ اسمٰعیل صفوی والئ ایران کا پوتا تھا۔ ناراض ہو کر لاہور چلا آیا۔ اور اکبر سے پناہ کا طالب ہوا۔ بادشاہ نے اس کے استقبال کے لیے حکیم عین الملک خانِ خاناں اور زین خاں کوکہ کو بھیجا جنھوں نے شہر سے چار کوس دور اس کا شاہانہ استقبال کیا۔ اور کمال اعزاز سے اسے شہر میں لائے۔ بادشاہ نے اسے شرفِ ملاقات بخشا اور دلاسا دیا۔ سکونت کو مناسب مکان اور متعلقہ ساز و سامان کے علاوہ ایک کروڑ ٹنکہ نقد اور پنج ہزاری منصب عطا کیا۔ کچھ عرصہ مرزا رستم لاہور کا گورنر بھی رہا۔ ۷۲ سال کی عمر میں اس نے شاہجہاں کے دور میں وفات پائی۔ اس کی ایک بیٹی دارا شکوہ کی بیوی تھی۔

مرزا نظام الدین کا انتقال

۱۵۸۶ء میں مرزا نظام الدین احمد سینتالیس سال کی عمر میں بمقام لاہور راہئ ملکِ عدم

ہوئے اور انھیں اپنے باغ میں دفن کیا گیا۔ آج نہ اُس مقبرے کا اور نہ ہی باغ کا کوئی سراغ ملتا ہے۔ بدایونی کا بیان ہے کہ باشندگانِ لاہور میں شاید ہی کوئی آنکھ ایسی ہوگی جو اس سانحہ پہ اشک بار نہ ہوئی ہو۔ مرزا ایک نقید المثال عالم اور مؤرخ تھا۔ اس کی کتاب طبقاتِ اکبری ہمعصر واقعات کا ایک مستند ماخذ ہے۔

لاہور قیام شاہ کے سبب دارالحکومت بن چکا تھا۔ اس لیے مرکزی دیوان اور بخشی ہی صوبائی حکومت کے ان عہدوں کے فرائض انجام دیتے رہے۔

ٹوڈرمل اور بھگونت داس کی وفات

نومبر ۱۵۸۹ء میں اکبر صوبہ کابل میں دورہ کر رہا تھا کہ اُسے راجہ ٹوڈرمل اور راجہ بھگونت داس کی وفات کی خبر ملی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ لاہور میں راجہ ٹوڈرمل کا انتقال ہوا۔ شمشان بھومی میں اُسے جلا کر واپس آئے تو راجہ بھگونت (بھگوان) داس صوبہ دار کو قے ہوئی اور وہ بھی چل بسا۔

ٹوڈرمل اور بھگوان داس معتمد امرائے دربار میں سے تھے۔ ابوالفضل کا بیان ہے کہ لاہور سے ٹوڈرمل نے بادشاہ کو اُن کے دورۂ کابل کے زمانہ میں لکھا کہ بیماری اور بڑھاپے نے سازش کر کے زندگی پر حملہ کیا ہے۔ موت کا زمانہ قریب نظر آتا ہے۔ اجازت ہو تو گنگا جی چلا جاؤں اور وہیں زندگی کے آخری سانس لوں۔ بادشاہ نے پہلے تو اجازت دے دی مگر بعد ازاں اُسے کہلا بھیجا کہ آخری دم تک اپنے فرائض منصبی کو انجام دیتے رہو۔ کیونکہ اس سے بڑی عبادت کوئی نہیں۔

اجازت نامہ ملنے پہ ٹوڈرمل لاہور سے روانہ ہو گیا تھا۔ دوسرا فرمان اُسے لاہور سے پندرہ میل دور اپنے تعمیر کردہ تالاب کے کنارے ملا جہاں وہ خیمہ زن تھا۔ اس دیانت دار جفاکش اور وفا کیش سردار کی اطاعت شعاری ملاحظہ ہو کہ فرمان اکبری ملتے ہی اُلٹے پاؤں لاہور واپس آیا اور یہاں جان جانِ آفریں کے سپرد کی۔

ٹوڈرمل ذات کا کھتری اور چونیاں کا باشندہ تھا۔ جو اب ضلع لاہور کی ایک تحصیل کا صدر مقام اور ایک قدیم تاریخی قصبہ ہے۔ وہاں اب بھی چند پرانی عمارتیں اور ٹوڈرمل کی حویلیاں موجود ہیں۔ لاہور میں بھی ٹوڈرمل نے عمارتیں بنوائیں۔ اس نے اکبر کے محکمۂ مالیات کی از سر نو تنظیم کی اور اس میں نئی نئی اصلاحات جاری کر کے حکومت کے مواجبات کی وصولی کا بہتر انتظام کیا۔ لاہور میں ٹوڈرمل کی حویلی بھاٹی دروازے کے اندر تھی۔ غالباً یہ وہی حویلی ہے جس میں آجکل لاہور کے مشہور علم دوست بزرگ فقیر سید مغیث الدین قیام پذیر ہیں۔

ٹوڈرمل کا تالاب

ٹوڈرمل نے نواح لاہور میں آب پاشی کے نظام کو بہتر بنانے کے لیے چند تالاب بنوائے تاکہ ان میں بارش یا سیلاب کا پانی جمع رہے اور سال بھر اُس نواح کے زمینداروں کے کام آئے۔

ٹوڈرمل کا مذکورہ صدر تالاب کاہنا کاچھا ریلوے سٹیشن سے تقریباً ایک میل دور کاہنا گاؤں کے متصل واقع ہے تالاب کافی وسیع و عریض ہے مغلئی اینٹوں اور سفید چونے کا بنا ہوا ہے۔ اس میں ہڈیارہ نالہ کا فالتو پانی بارش کے دنوں میں جمع کر لیا جاتا تھا۔ ہڈیارہ اب بھی تالاب اور ریلوے لائن کے درمیان بہہ رہا ہے۔ تالاب میں بارش اور سیلاب کا پانی اب بھی جمع رہتا ہے۔ لیکن آج اس کی حیثیت آثارِ قدیمہ سے زیادہ نہیں ہے۔ کیا خوب ہو کہ محکمہ آثارِ قدیمہ اسے محفوظ کر لے۔ اور

محکمۂ سیاحت تالاب اور ہڈیارہ نالہ کے نواح کو ایک سیرگاہ بنا دے۔ "عظیم تر لاہور" کی ایک اہم ضرورت اس سے پوری ہو سکتی ہے۔ مغلیہ دور کے نظام آبپاشی کے مطالعہ کے لیے اس کی حفاظت ضروری ہے۔

قلیچ خاں صوبہ دار لاہور

صوبہ دار لاہور بھگوان داس اور دیوان سلطنت ٹوڈر مل کی وفات کے بعد قلیچ خان اندی جانی نے صوبۂ لاہور کی باگ ڈور سنبھالی۔ بادشاہ نے مادھو سنگھ (ابوالفضل جلد سوم صفحہ ۵۷۰۔ منتخب التواریخ جلد دوم صفحہ ۳۷۱ - ۳۷۲) کو اس کی نیابت کے لیے روانہ کیا۔

قلیچ خان تین برس تک اس عہدے پر فائز رہا۔ یہ شخص ترکی امرا میں سے تھا اور اندی جان کا باشندہ ہونے کے سبب بادشاہ کا ہم وطن تھا۔ لاہور میں دریا کے کنارے اس کا باغ تھا۔

خواجہ شمس الدین خوافی

۱۵۹۲ء میں اکبر نے صوبوں کے انتظام کے لیے ایک نیا نظام رائج کیا۔ اس کے تحت ۱۲ فروری ۱۵۹۲ء کو پنجاب، ملتان اور کابل کے صوبوں کو شمس الدین خوافی کے سپرد کیا۔ یہ شخص ترکستان کے ایک مردم خیز شہر خوات کا باشندہ اور دربار اکبری کا ایک معتمد رکن تھا۔ دو سال بعد ۱۵۹۴ء میں اسے لاہور کی ٹکسال کا افسر اعلیٰ مقرر کر دیا گیا۔ اس نے سکہ سازی کی اصلاح اور سکوں کے اوزان کے تعین کا انتظام کیا۔ لاہور میں ایک ٹکسال شہر کے شمالی جانب ٹکسالی دروازے کے اندر تھی۔ شہر کے وسط میں رنگ محل کے قریب ایک گلی بنام ٹکسال بازار موسوم ہے۔ یہاں بھی کبھی ٹکسال رہی ہوگی۔ ایاز کی قبر اسی گلی کے متصل ہے

عرفی کی وفات

فارسی زبان کا نقیدالمثال شاعر عرفی ۱۵۹۰ء میں بمقام لاہور راہیٔ ملک عدم ہوا۔ فصیل شہر کے متصل ایک تکیہ میں اسے دفن کیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد کوئی شخص غلطی سے اپنے کسی عزیز کی قبر سمجھ کر اس کی ہڈیاں نجف اشرف لے گیا اور جوانمرگ شاعر کا اپنا فرمودہ سچ ثابت ہوا۔

بکاوشِ مژہ از گور تا نجف بروم
اگر بہ ہند ہلاکم کنند وگر بہ تتار

شیخ مبارک کی وفات

۱۷ ذیقعدہ ۱۰۰۱ھ (۱۵۹۲ء) کو دور اکبری کے مقتدر علما فیضی، ابوالفضل اور ابوالخیر کے والد شیخ مبارک بمقام لاہور راہیٔ ملک عدم ہوئے۔ اس کی تاریخ ملا عبدالقادر بدایونی نے "شیخ کامل" سے نکالی ہے (منتخب التواریخ جلد سوم)

شیخ مبارک اپنے دور کے بلند پایہ عالم اور کامیاب مصنف تھے۔ چار جلدوں میں تفسیر قرآن بعنوان منبع العیون لکھی۔ آگرے میں ان کا مدرسہ تھا جہاں ان کے فرزندوں اور ملا عبدالقادر بدایونی کے علاوہ اور بہت سے ارباب علم نے تعلیم حاصل کی۔ اکبر کے قیام لاہور کے سبب یہ بھی لاہور میں تھے۔ کہ نشانۂ تیر اجل ہوئے۔ لاہور میں ان کی حویلی جو مبارک حویلی کے نام سے موسوم ہے موچی دروازے کے اندر واقع ہے۔ اس وقت یہاں امام باڑہ ہے جسے لاہور کے مشہور قزلباش خاندان نے وقف کیا تھا۔ اگرچہ اس حویلی کی وجہ تسمیہ کے متعلق کنہیا لال[1] نے ایک مختلف روایت بیان کی ہے مگر میں نے جو کچھ بچپن میں بڑے

---

[1] تاریخ لاہور ص ۳۳۷

بڑھوں سے سنا تھا لکھ دیا ہے۔ شیخ مبارک کی لاش کو تدفین کے لیے آگرہ لے جایا گیا۔

اکبری جہاز

مئی ۱۵۹۴ء میں اکبر نے لاہور میں راوی کے کنارے ایک جہاز[1] بنوایا جو ۳۵ گز لمبا تھا جس میں سال اور بلوط کی مضبوط لکڑی کے ۲۹۳۶ تختے خرچ ہوئے۔ اس کی تیاری پر شہنشاہ بنفسِ نفیس اسے دیکھنے گئے اور راوی کے راستے اسے لہری بندر بھیجا گیا۔ دورِ مغلیہ میں راوی میں عام کشتی رانی ہوتی تھی۔ امرا کی سیر و تفریح کی سجی سجائی کشتیوں کے علاوہ بار برداری کی کشتیاں بھی چلتی تھیں اور لہری بندر تک سامان آتا جاتا تھا۔

بعض دیگر واقعات

اکبر کے قیام لاہور کے واقعات میں ایک تو راجہ کلیان مل کے بیٹے رائے سنگھ کی لڑکی سے شہزادہ سلیم کی شادی ہے[2] دوسرا عبداللہ ازبک حاکم توران نے اکبر کو خط لکھا جس میں اس کے الحاد کو ہدفِ اعتراض بنایا۔ اس کے جواب میں اکبر نے ایک وفد اس کے دربار میں بھیجا جو میراں صدر جہاں اور حکیم ہمام پر مشتمل تھا۔ علاوہ ازیں ملک الشعرا فیضی نے کچھ عربی اشعار لکھے ؎

قیل ان الالہ ذو ولد ۔۔۔ قیل ان الرسول قد کھنا
ما نجا اللہ والرسول معا ۔۔۔ من لسان الوری فکیف انا

فیضی کی وفات

۱۵۹۵ء میں دربارِ اکبری کا نامور عالم فیضی جو شاعر، مفسر اور عالم ہونے کے علاوہ ایک کامیاب سیاستدان اور نامور شاہی مشیر تھا لاہور میں فوت ہوا۔ مرض الموت میں خود اکبر سرہانے گیا۔ وفات کے بعد اس کی لاش بھی باپ کی طرح تدفین کے لیے آگرہ لے جائی گئی۔

اکبر کی لاہور سے روانگی

۱۵۹۹ء تک اکبر نے لاہور[3] کو دارالحکومت بنائے رکھا۔ اس سال دکن کی مہموں کے سلسلہ میں اکبر لاہور سے روانہ ہو گیا۔ اپنی زندگی کے آخری ایام اس نے آگرہ میں گزارے۔ لاہور سے روانگی پر اکبر نے بیگمات اور شہزادہ خرم کو یہیں چھوڑا۔ جو ایک سال بعد آگرہ گئے۔ شہزادہ خرم ۱۵۹۱ء (۱۰۰۰ھ) میں بمقام لاہور پیدا ہوا اور آٹھ نو برس کی عمر تک یہیں رہا۔ اس کی پرورش اور ابتدائی تربیت نامور دادا کی نگرانی میں ہوئی۔

خواجہ شمس الدین خوافی کی وفات

۱۶۰۰ء میں خواجہ شمس الدین خوافی صوبہ دارِ لاہور کا انتقال ہوا۔ یہ شخص ایک اچھا منتظم اور تجربہ کار رکن تھا۔ اکبر کو اس کی موت کا بہت صدمہ ہوا۔ لاہور میں اس نے اپنی حویلی۔ حمام اور باغ وغیرہ تعمیر کرائے تھے۔ اس کی عمارات کا علاقہ جس میں اس کے اعزہ ملازمین اور شاگرد پیشہ رہتے تھے۔ محلہ خوافی پورہ کے نام سے مشہور ہوا۔ جہاں اس کے خاندان کے لوگ زوالِ دولت تیموریہ تک آباد رہے۔ شمس الدین یہیں اپنے خاندانی قبرستان میں مدفون ہوئے۔

شمس الدین کی وفات کے بعد اس کے بھائی مومن خاں کو صوبہ دار لاہور مقرر کیا گیا۔ ۱۶۰۲ء میں اس اس عہدے پر قلیج خاں

---

[1] اکبر نامہ جلد سوم صفحہ ۶۵۱۔
[2] اکبر نامہ جلد سوم صفحہ ۳۲۶ ۔ [3] اکبر نامہ جلد سوم صفحہ ۵۱۴

کو دوبارہ متعین کیا گیا اور اکبر کی وفات تک وہی اس عہدے پر فائز رہا۔

عہد نورالدین جہانگیر

اکبر اعظم کی وفات کے بعد اُن کا چہیتا بیٹا سلیم ۳۸ سال کی عمر میں سریر آرائے سلطنت ہُوا۔ اُس نے صوبۂ لاہور کی باگ ڈور سعید خان کے سپرد کی جو معتمد اُمرا میں سے تھا۔ صوبہ دار آگرہ سے لاہور روانہ ہونے لگا تو شاہِ عادل نے اُسے کہا "میرا انصاف کبھی ظلم کو برداشت نہیں کریگا خواہ ظالم کوئی ہو۔ ہماری نظر میں چھوٹا بڑا سب برابر ہیں۔ اگر تم نے یا تمھارے کارکنوں نے ظلم یا ناجائز سختی سے کام لیا تو بغیر کسی لحاظ کے تمھیں سزا دی جائے گی" شہنشاہ کی یہ نصیحت نہ صرف سعید خان بلکہ تمام درباریوں نے آویزۂ گوش بنائی۔

خسرو کی بغاوت

جہانگیر کو تخت نشین ہوئے ابھی چھ ماہ نہ گزرے تھے کہ اُس کے بڑے بیٹے خسرو نے بغاوت کردی جہانگیر کی رائے ہے کہ جوانی کے خمار اور ناتجربہ کاری نے اور نالائق مصاحبوں کی فتنہ پردازی نے خسرو کو اس کام پر آمادہ کیا۔ ۱۶ اپریل ۱۶۰۶ء کو وہ اکبر کے مقبرے کی زیارت کے بہانے قلعۂ آگرہ سے نکلا۔ اور اپنے خیرخواہ ساڑھے تین سو سواروں کے ہمراہ بھاگ گیا۔ جہانگیر کو خبر ملی تو وہ فی الفور اُس کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ متھرا میں اُسے حسین بیگ بدخشانی ملا جو بدخشاں سے بارگاہِ شاہی میں آ رہا تھا۔ خسرو نے نامعلوم بہلا پھسلا کر اُسے کیا سبز باغ دکھائے کہ شیشے میں اُتار لیا۔ اس کے ہمراہ ایماق قبیلے کے دو سو بدخشانی نوجوان تھے۔ سیاہ بختوں کا یہ گروہ جہاں جاتا سوداگروں اور عام مسافروں کے قافلے لوٹ لیتا۔ ہوڈل پہنچ کر جہانگیر نے شیخ فرید کو چیدہ سواروں کے ایک دستے کے ہمراہ ہراول کے طور پر بھیجا۔

جہانگیر کے دہلی پہنچنے پر خسرو پانی پت کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ دلاور خان نے جو بادشاہ کا وفادار تھا خسرو سے پیشتر لاہور کا رُخ کیا تاکہ راستے میں تمام تاجروں اور شاہی ملازموں کو اس حادثہ کی خبر اور ہوشیار رہنے کی تلقین کرے۔ چنانچہ اس پروگرام کے مطابق وہ خسرو سے قبل لاہور پہنچا۔ اور شہر کے دفاع کے انتظامات درست کئے۔ شاہی ملازمین اور باشندگانِ شہر نے بہ کمالِ وفاداری اُس کا ہاتھ بٹایا۔ اس کے دو روز بعد خسرو لاہور پہنچا اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ اُس نے حکم دیا کہ جنگ کی تیاری کی جائے اور شہر کے کسی ایک دروازے کو جلا کر شہر میں گھسنے کا راستہ بنایا جائے۔ اُس نے اپنے ہمراہیوں سے وعدہ کیا کہ شہر پر قابض ہونے کے بعد دو سات روز تک اسے لوٹنے کی اجازت دے گا۔ آخر کار خسرو کے ساتھی قلعے کا ایک دروازہ جلانے میں کامیاب ہو گئے مگر دلاور خان حسین بیگ دیوان اور نورالدین قلی کوتوال شہر کی مساعی سے فی الفور قلعہ شاہی کے دروازے کے پیچھے دیوار بنا دی گئی۔

سعید خان کشمیر کی مہم سے واپس آتے ہوئے چناب پر خیمہ زن تھا۔ یہ خبر سنتے ہی وہ ایک دم لاہور روانہ ہو گیا۔ راوی کے کنارے پہنچ کر اُس نے قلعہ بند سرداروں کو پیغام بھیجا کہ اُسے شہر میں داخل کر لیا جائے۔ چنانچہ شب کی سیاہی میں اُسے چند ہمراہیوں سمیت قلعہ میں لے گئے۔

خسرو نے ابھی نوروز تک ہی اپنے محاصرے کو جاری رکھا تھا۔ کہ لشکرِ جہانگیری کے پہنچنے کی خبر ملی۔ یہ سنتے ہی باغی لشکر کے پاؤں اکھڑ گئے اور انھوں نے محاصرہ اٹھا کر شاہی لشکر کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور خسرو جالندھر کی طرف روانہ ہوا۔ جہانگیر کی آمد سے قبل اہالیانِ شہر نے دس بارہ ہزار سواروں کی مستعد فوج مرتب کر لی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ فوج اکثر و بیشتر رضاکاروں پہ مشتمل تھی۔ بھیروال کے مقام پر جو جالندھر اور امرتسر کے درمیان دریائے بیاس کے دائیں کنارے واقع ہے شاہی فوج اور خسرو میں جنگ ہوئی۔ شیخ فرید اور ساداتِ بارہہ نے وفاداری اور جاں نثاری کے جوہر دکھائے۔ اور خسرو کو شکست دی۔ جہانگیر سلطان پور سے روانہ ہو کر گوبند وال کے پل پر تھا کہ شمسی توشک چی نے فتح کی خوش خبری سنائی اور بادشاہ سے "خوش خبر خان" کا خطاب پایا۔ توشک چی بادشاہ کے بستر وغیرہ سامانِ استراحت کا بندوبست کرنے والے افسر کو کہتے تھے۔ شیخ فرید نے تھوڑی سی فوج کے ساتھ باغیوں کے بہت بڑے لشکر کو جو بدخشانی سواروں[1] پہ مشتمل تھا شکست دی۔ خسرو نے شکست کے بعد کابل جانے کا فیصلہ کیا مگر سودھرا کے مقام پر دریائے چناب کو عبور کرتا ہوا گرفتار ہو گیا۔ اسی اثنا میں جہانگیر لاہور آ کر مرزا کامران کے باغ میں مقیم ہو چکا تھا۔ لاہور میں مرزا کامران کا ایک باغ تو وہ تھا جس کی یادگار ایک شکستہ حال بارہ دری کی، اب حالات کی سنگ دلی کا مقابلہ کر رہی ہے۔ اس کا دوسرا باغ موجودہ ریلوے اسٹیشن کے نواح میں واقع تھا اور بقول لطیف[2] باغ دلکشا کہلاتا تھا مؤخر الذکر باغ کا اب کوئی نشان باقی نہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ جالندھر کی جانب سے لاہور آتے ہوئے جہانگیر اسی باغ میں خیمہ زن ہوا۔ اول الذکر باغ میں راوی کے اس پار جا کر خیمہ زن ہونا خلافِ واقعہ معلوم ہوتا ہے۔

جہانگیر کا بیان ہے کہ ۳، محرم ۱۰۱۵ھ کو باغ کامران میں خسرو کو ہتھکڑی اور بیڑی میں جکڑ کر چنگیزی قانون کے مطابق اس کی بائیں جانب سے سامنے لایا گیا۔ حسین بیگ اور عبدالرحیم اس کے ساتھیوں کو علی الترتیب اس کے دائیں اور بائیں کھڑا کیا گیا۔ خسرو تھر تھر کانپ رہا تھا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ حسین بیگ کو گائے کی تازہ کھال اور عبدالرحیم کو گدھے کی تازہ کھال میں بند کر کے گدھوں پر رکھ کر شہر میں پھرایا جائے تاکہ فتنہ پرداز عبرت حاصل کریں۔ چونکہ گائے کی کھال پہلے خشک ہو گئی اس لیے حسین بیگ چار پہر زندہ رہ کر دم گھٹنے سے مر گیا۔ گدھے کی کھال دیر میں خشک ہوتی ہے اور عبدالرحیم کے بعض ہوا خواہ اسے باہر سے تر بھی کرتے رہے اس لیے وہ زندہ بچ گیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ باغ کامران سے قلعہ تک سڑک کے دو طرفہ سولیاں نصب کی جائیں اور ان پر خسرو کے ساتھیوں کو جن کی تعداد سات سو کے قریب تھی پھانسی دے دیا جائے۔ بادشاہ نے یہ منظر قلعۂ لاہور کے شاہ برج سے دیکھا جو اکبر نے ہاتھیوں کی لڑائی دیکھنے کے لیے بنوایا تھا۔ خسرو کو ایک ہاتھی پہ بٹھا کر ان سولیوں کے درمیان سے گزارا گیا۔ اور ایک گرزبردار از روئے تمسخر اسے کہتا جاتا تھا کہ اپنے متبعین کی سلامی قبول فرمائیے۔ خسرو آہنی زنجیروں میں جکڑا پریشان حال، اداس و ملول بادلِ بریاں و دیدۂ گریاں یہ ہولناک منظر دیکھتا گزر گیا۔ جن لوگوں نے خسرو کی سرکوبی میں کارہائے

---

[1] تزکِ جہانگیری انگریزی ترجمہ جلد اول صفحہ ۶۷-۶۹۔ اردو ترجمہ از سلیم واحد سلیم صفحہ ۸۱-۹۶
اقبال نامہ جہانگیری معتمد خاں رائل سوسائٹی ایڈیشن صفحہ ۱۴-۱۷

[2] سید محمد لطیف لاہور صفحہ ۴۳

نمایاں انجام دیئے تھے انھیں انعامات سے نوازا گیا۔ مثلاً شیخ فرید بخاری کو مرتضٰی خان کا خطاب دیا گیا اور بھیروال بطور جاگیر عطا ہوا۔ اور جن لوگوں نے باغی شہزادے کی مدد کی تھی انھیں سخت سزائیں دیں۔ بدقسمتی سے سکھوں کے پانچویں گرو ارجن دیو بھی اس لپیٹ میں آ گئے۔ گرو صاحب کا قیام بیاس کے کنارے گوبندوال میں تھا جہاں لوگ حصولِ خیر و برکت کے لیے اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ جب باپ کا باغی خسرو لاہور کی جانب آتا ہوا گوبندوال کے پاس ٹھہرا تو گرو جی نے نہ صرف اُس کی مالی امداد کی بلکہ اُس کے ماتھے پر زعفران کا ٹیکا لگاتے ہوئے اُسے اشیرباد دی ظاہر ہے اس سے گورو جی کے تمام معتقد خسرو کے ہوا خواہ بن گئے۔ بادشاہ نے خسرو کے زوال کے بعد ان کی تمام جائیداد ضبط کر دی اور انھیں قتل کرا دیا۔

باغیوں کو سزا دینے کے بعد بادشاہ کامران کے باغ سے قلعۂ شاہی میں چلا آیا۔ اور وہاں تقریباً ایک سال ٹھہرا اس کے بعد صوبۂ کابل کے دورے اور سیر و شکار کی نیت سے ۱۹ مارچ ۱۶۰۷ء کو قلعہ سے نکلا اور راوی کے دوسرے کنارے باغ دل آمیز میں چار دن ٹھہرا۔ یہاں اُس نے لاہور کی حکومت قلیج خاں کے سپرد کی اور اُسے ہدایت کی کہ میراں صدر جہاں اور میر شریف آملی کے مشورے سے امور حکومت کو انجام دے۔

کابل کی سیاحت سے بادشاہ سلامت بخیریت تین دسمبر ۱۶۰۷ء کو لوٹے اور تقریباً دو ہفتے یہاں قیام کر کے آگرہ کو رخصت ہوئے۔ شب برات کا تہوار لاہور میں منایا گیا اور یہاں قوام الدین کو دیوان شیخ یوسف کو بخشی اور جمال الدین کو کوتوال مقرر کر کے انھیں حسب حیثیت خلعت عطا کئے گئے۔ صوبہ داری پر قلیج خاں ہی قائم رہے۔

شیخ فرید صوبہ دار لاہور

۱۶۱۱ء میں قلیج خاں کو چھ ہزار ذات اور پانچ ہزار سوار کا منصب دے کر صوبۂ کابل میں بھیج دیا تاکہ شرپسند باغیوں کا قلع قمع کر کے وہاں امن قائم کرے اور مرتضٰی خاں شیخ فرید بخاری کو لاہور کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ شیخ فرید بخاری نے لاہور میں اپنی عمارات (حویلی۔ باغ۔ حمام وغیرہ) بنوائیں۔ اور اُن کے متصل ایک عالیشان مسجد تعمیر کرائی۔ یہ عمارات بھاٹی دروازے کے باہر لوئر مال پر اُس نواح میں واقع تھیں جہاں آج ڈسٹرکٹ کورٹس اور تحصیل وغیرہ کی عمارتیں بن گئی ہیں۔ شیخ فرید کی عمارتیں سکھ گردی میں تباہ و برباد ہو گئیں۔ شیخ فرید نے بادشاہ کی اجازت سے قلعۂ کانگڑہ پر حملہ کیا۔

اگرچہ قلعہ بعد میں فتح ہو گیا لیکن ۱۶۱۶ء میں شیخ فرید بخاری کا انتقال ہو گیا۔ جہانگیر نے تزک[1] میں مرحوم کی خدمات کا ذکر کر کے اظہارِ تحسین فرمایا ہے۔

لاہور میں وبا

اسی سال ملک بھر میں وبا پھوٹ پڑی۔ یہ وبا پنجاب کے بعض علاقوں سے شروع ہو کر لاہور پہنچی جس کی وجہ سے بے شمار لوگ لاہور میں ہلاک ہو گئے۔ لاہور سے یہ وبا سرہند۔ دوآب گنگ و جمن اور دہلی تک گئی۔ اس کی وجہ سے شہروں کے شہر اُجڑ گئے اگرچہ تزک میں جہانگیر نے اس بیماری کا نام نہیں لیا مگر قرائن سے کہا جاتا

---

[1] تزکِ جہانگیری۔ انگریزی ترجمہ جلد اول صفحہ ۳۲۴-۳۲۵- اُردو ترجمہ صفحہ ۳۴۲-۳۴۴۔

ہے کہ یہ وبا طاعون تھی۔

تزکِ جہانگیری کے اُردو مترجم سلیم واحد سلیم صاحب کا خیال ہے کہ یہ بیماری ملیریا تھی۔ یہ وبا آٹھ سال تک مغلیہ ہند کے شہروں میں تباہی پھیلاتی رہی[1]۔

مرزا غیاث صوبہ دارِ لاہور مرتضےٰ خان شیخ فرید بخاری کی وفات کے بعد مرزا غیاث بیگ (نور جہاں کے والد) کو لاہور کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ آغا فاضل کو اُن کا نائب بنایا گیا اور ایک سال بعد ۱۶۱۷ء میں آغا فاضل کو فاضل خاں کا خطاب اور اعتماد الدولہ کو بادشاہ کے خاصہ کے ہاتھیوں میں جگجوت نام ایک ہاتھی بطورِ انعام دیا گیا۔

۱۶۱۸ء میں اعتماد الدولہ مدار الملک یعنی وزیرِ اعظم مقرر ہوئے۔ اور ان کی سفارش پر صوبۂ لاہور کی حکومت قاسم خان کے سپرد کی گئی۔ یہ پہلے احدیوں کے بخشی تھے۔ قاسم خان اعتماد الدولہ کا داماد اور نور جہاں کی بڑی بہن منیجہ بیگم کا شوہر اور بادشاہ کا ہم زلف تھا۔

بادشاہ شیخوپورہ میں ۱۶۲۰ء مطابق ۱۰۳۰ھ میں کشمیر سے واپسی پر بادشاہ نے جہانگیر آباد (موجودہ نام شیخوپورہ) اور شاہی شکارگاہ ہرن مینار میں شکار کھیلا۔ جہانگیر لکھتا ہے کہ شاہزادگی کے زمانے میں یہ جگہ اُس کی شکارگاہ تھی۔ اور اُس نے اپنے نام پر ایک گاؤں آباد کر کے ایک عمارت تعمیر کرائی تھی اور اسے سکندر معین کے سپرد کیا تھا۔ اس وقت نام شیخوپورہ تھا تخت نشینی کے بعد بادشاہ نے جہانگیر آباد رکھ دیا مگر وہ رائج نہ ہو سکا۔ تخت نشینی کے بعد یہ گاؤں سکندر معین کو بطورِ جاگیر دیا گیا اور حکم دیا کہ یہاں ایک تالاب، مینار اور دولت خانہ (یعنی قلعہ) تعمیر کرائے۔ اُس کی وفات کے بعد یہ جاگیر ارادت خان کو ملی جس نے ان عمارات کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ ڈیڑھ لاکھ کے خرچ سے یہ عمارات مکمل ہوئیں۔ بقولِ جہانگیر یہ شکارگاہ بادشاہوں کے شایانِ شان ہے۔ اس جگہ حاکمِ لاہور نے حاضرِ خدمت ہو کر شرفِ حضوری حاصل کیا اور بطورِ نذر پچاس مہریں پیش کیں۔ یہاں سے رخصت ہو کر بادشاہ دریائے راوی کے کنارے مومن عشقباز[2] کے باغ میں خیمہ زن ہوا۔ یہ باغ دریائے راوی کے کنارے تھا اور اس میں چنار اور سرو کے نہایت عمدہ پیڑ تھے بادشاہ نے تزک[3] میں باغ کی تعریف کی ہے مگر آج نہ کوئی مومن عشقباز کو جانتا ہے اور نہ اُس نواح میں اس باغ کا محلِ وقوع بتا سکتا ہے۔

کوس میناروں کی تعمیر چودھویں[4] سالِ جلوس یعنی ۱۶۱۸ء میں بادشاہ نے حکم دیا کہ آگرہ سے لاہور تک شاہراہِ اعظم پر کوس کوس کے فاصلے پر ایک مینار تعمیر کیا جائے اور ہر تین کوس کے فاصلے پر ایک

---

[1] اقبال نامہ جہانگیری صفحہ ۸۸، ۸۹ - تزک انگریزی ترجمہ جلد اول صفحہ ۳۳۰ - اردو ترجمہ صفحہ ۳۴۸ -
[2] "عشقباز" دورِ مغلیہ میں بطورِ اصطلاح کبوتر باز کے لیے استعمال ہوتا تھا۔
[3] تزک انگریزی ترجمہ جلد دوم صفحہ ۱۸۲، ۱۸۳ - اردو ترجمہ صفحہ ۶۵۳ - اقبال نامہ جہانگیری صفحہ ۱۷۱
[4] تزکِ جہانگیری اُردو ترجمہ صفحہ ۵۷۳ -

کنویں کھدوا جائیں۔ تاکہ مسافران کنوؤں سے فائدہ اٹھائیں۔ جہانگیر تزک میں رقمطراز ہے کہ اس سے قبل اُس کے حکم سے آگرہ سے دریائے اٹک تک سڑک کے دونوں طرف درخت لگائے گئے تھے۔ آگرہ سے بنگال تک اس سے قبل اسی طرح درخت لگائے جا چکے تھے۔ ان انتظامات کے بعد مغلیہ سلطنت میں سفر کرنا بے حد آرام دہ ہو گیا۔ جہانگیر کے بنوائے ہوئے کوس مینار اب بھی پرانی شاہی سڑک پر لاہور اور آگرہ کے درمیان ملتے ہیں۔ لاہور میں ایک کوس مینار ریلوے اسٹیشن سے مشرق کی جانب جہاں ملتان اور امرتسر کی طرف جانے والی ریلوے لائنیں ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتی ہیں۔ دونوں لائنوں کے درمیان اُس جرنیلی سڑک کے متصل جو گڑھی شاہو سے مغل پورہ کے کارخانوں کی طرف جاتی ہے واقع ہے۔ یہ مینار فنِ تعمیر کا نادر نمونہ ہے اگرچہ اس کوس مینار کے متصل اس وقت پرانی شاہراہ کے آثار نہیں ملتے مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سے مغلیہ دور کی شاہراہ گذرتی ہوگی۔ یہ شاہراہ شہر کے دہلی دروازے سے نکل کر محلہ چوک دارا سے ہوتی ہوئی محلہ مغل پورہ میں آجاتی تھی اور مغل پورہ سے ہوتی ہوئی دہلی کی جانب چلی جاتی تھی۔

جہانگیر قلعۂ لاہور میں

پیر کے روز ۵ محرم سنہ ۱۰۳۰ھ مطابق ۳۰ نومبر سنہ ۱۶۲۰ء کو جہانگیر اندر نام ایک ہاتھی پر سوار ہو کر شہر میں گیا اور سارا راستہ سڑک پر سیم و زر کے سکّے لوگوں میں لٹاتا گیا۔ اور چار بجے بعد دوپہر قلعے میں داخل ہوا۔

بادشاہ نے قلعہ کی اُس قیام گاہ میں نزولِ اجلال فرمایا جو معمور خان کے زیرِ اہتمام حال ہی میں تعمیر ہوئی تھی۔ بادشاہ لکھتا ہے کہ دلکش محلوں اور روح افزا نشیمن گاہوں کو یگانۂ روزگار معماروں نے تعمیر کیا ہے اور چابک دست مصوروں نے بکمالِ نفاست منقش کیا ہے اور در و دیوار کو تصویر کشی سے زینت بخشی ہے۔ علاوہ ازیں سرسبز و شاداب باغیچوں سے جو محل سے متصل ہیں اعلیٰ قسم کے پھولوں کا نظارہ دلفریب و دلکش ہے۔

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

ان عمارتوں پر سات لاکھ کے قریب روپیہ خرچ ہوا تھا۔ شہنشاہ نے شہزادہ خرم کے نئے محل کو ملاحظہ فرمایا۔ قاسم خان حاکم لاہور کی دعوت پر بادشاہ اس کے باغ میں گئے۔

۱۶۲۳ء میں قاسم خان کی جگہ صادق خان[1] کو چار ہزار ذات اور تین ہزار سوار کا منصب دے کر صوبہ دار لاہور مقرر کیا۔

۱۶۲۵ء میں کابل سے واپسی پر بادشاہ لاہور ٹھہرا اور یمین الدولہ آصف خان کو صوبہ دار[2] لاہور مقرر کیا۔ علاوہ ازیں وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ بھی اُسے پیش کیا گیا۔

---

[1] تزک انگریزی ترجمہ صفحہ ۲۲۸، ۲۳۰، ۲۵۹، اردو ترجمہ صفحہ

[2] معتمد خان۔ اقبال نامہ جہانگیری ۲۷۸۔ مآثر الامرا انگریزی ترجمہ جلد اول صفحہ ۲۸۷

جہانگیر کی وفات

اکیسویں سالِ جلوس (۲۶-۱۶۲۵ء) کے آخری ایام میں بادشاہ راہ پہلے کشمیر ہوا اور بائیسویں سالِ جلوس کے آغاز تک وہاں مقیم رہا۔ لاہور سے روانگی کے وقت ان کی طبیعت ناساز تھی۔ اقامتِ کشمیر سے بھی کوئی افاقہ نہ ہوا بلکہ بیماری بڑھتی رہی اور بادشاہ کمزور ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ وہ گھوڑے پر بھی سوار نہ ہو سکتا تھا اور پالکی میں اِدھر اُدھر جاتا تھا۔ آخر موسم سرما کے آغاز کے وقت بادشاہ نے لاہور آنے کے لیے رختِ سفر باندھا۔ اسی اثنا میں بیرم کلہ پہنچ کر شکار کا پرانا شوق عود کر آیا۔ مگر ایک ایسا حادثہ رونما ہوا جس نے حضرتِ شہنشاہی کی طبع رنجور کو اور اداس کر دیا۔ ایک پہاڑی لڑکا جو شکار کے جانوروں کو گھیر کے نشانہ کی زد میں لاتا تھا۔ ایک بلند چٹان پر سے پھسل کر نیچے گرا۔ اس نے ایک جھاڑی کو پکڑ کر جان بچانے کی کوشش کی لیکن جھاڑی جڑ سے اُکھڑ گئی اور وہ فضا میں معلق ہو کر زمین پر آ گرا۔ اور راہیِ ملکِ عدم ہوا۔ اس واقعہ کے بعد اُن کی بے قراری اور بے چینی بڑھتی گئی اور راجوری پہنچ کر حالت بگڑنے لگی۔ اور تنفس میں دشواری پیدا ہو گئی۔ صبح کے قریب اُن کی سانس اُکھڑنی شروع ہوئی۔ ۲۸ صفر ۱۰۳۷ھ مطابق ۸ نومبر ۱۶۲۷ء کو صبح کے وقت بادشاہ کی روح اُن کے وجودِ خاکی کو الوداع کہہ کر عالمِ بقا کو روانہ ہو گئی۔[1]

لاش لاہور لا کر دریائے راوی کے اُس پار نور جہاں کے باغ میں دفن کی گئی۔ جہاں شاہ جہاں نے وہ نادرۂ روزگار مقبرہ بنوایا جو آج تک زیارت گاہِ خلق ہے۔

عہدِ شہاب الدین شاہجہان

گوسفندِ قربانی مرزا داور بخش

راجوری میں جہانگیر کا انتقال ہوا تو شاہجہان دکن میں تھا۔ اُس کا خسر یعنی ملکہ ممتاز محل کا باپ آصف خاں شاہی لشکر کے ہمراہ تھا۔ بادشاہ کے انتقال پر اُس نے فی الفور بنارسی نام ایک ہرکارے کو دکن روانہ کیا۔ خط لکھنے کا وقت نہ تھا اس لیے اپنی مہر کی انگشتری بطور ثبوت ہرکارے کے سپرد کی۔ راجوری میں خسرو کا بیٹا داور بخش بحالتِ نظربندی لشکرِ شاہی کے ہمراہ تھا۔ آصف خاں نے ایک سیاسی چال چلی اور خانِ اعظم ارادت خاں کو اعتماد میں لے کر داور بخش کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ جب وزیر سلطنت آصف خاں نے اُسے یہ خوش خبری سُنائی تو اُسے یقین نہ آیا۔ آخر اُسے گھوڑے پر بٹھا شاہی چتر لگا کر لشکر میں لے جایا گیا تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ داور بخش زیب دہِ تخت و تاج ہو گئے ہیں۔ اور مغلیہ سلطنت کا تخت خالی نہیں۔

اسی اثنا میں نور جہاں نے بارہا بھائی کو ملاقات کے لیے بلایا مگر وہ کسی نہ کسی بہانے ٹالتا رہا اور بہن سے نہ ملا۔ نور جہاں نے جہانگیر کے ایک فرزند شہزادہ شہریار سے اپنی دختر لاڈلی بیگم کی شادی کی ہوئی تھی۔ یہ لاڈلی بیگم اُس کے پہلے شوہر شیر افگن سے تھی۔ شہریار اس وقت لاہور میں تھا۔ نور جہاں کی خواہش شہریار کو تاجدارِ ہند بنانے کی تھی۔ تاکہ اُس کا اقتدار قائم رہے۔ آصف خاں نے اپنی لڑکی ارجمند بانو کی شادی شہزادہ خرم شاہجہان سے کی ہوئی تھی۔ اُس کی چال یہ تھی

---

[1] اقبال نامہ جہانگیری۔ معتمد خان صفحہ ۲۹۰ – ۲۹۴۔

کہ شاہجہان باپ کا جانشین بنے اور اُس کی بیٹی ملکۂ ہندوستان کہلائے۔ اس لیے اس نے معتمد کارکنوں کو یہ حکم دیا کہ وہ ملکہ پر کڑی نگرانی رکھیں اور اُسے کسی سے ساز باز نہ کرنے دیں۔

بیچارے داور بخش کی حیثیت گوسفند قربانی سے زیادہ نہ تھی۔ اور وہ بیچارہ شاہجہان کے پہنچنے تک شاہِ شطرنج بنایا گیا تھا۔ بھمبر کے قریب پہنچ کر نماز جمعہ کا وقت آیا تو داور بخش کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔

لاہور میں شہریار کو باپ کے انتقال کی خبر ملی تو اُس نے اپنی بیوی لاڈلی بیگم کے مشورے سے بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ لاہور میں جو شاہی خزائن وغیرہ تھے اُن پر قبضہ کر لیا۔ امرا اور عوام کو اپنا حامی بنانے اور فوج جمع کرنے کے لیے اُس نے بے دریغ روپیہ اُڑانا شروع کر دیا اور ایک ہفتہ میں ۷۰ لاکھ کے قریب روپیہ خرچ کر دیا۔ جہانگیر کے بھائی دانیال کا بیٹا مرزا بایسنغر بھی اس سے مل گیا۔ جسے سالارِ فوج مقرر کیا گیا۔ شہریار نے دریا کے کنارے اپنی فوج پھیلا دی۔ آصف خاں یہ خبر سن کر فوج کی معیت میں داور بخش کو شاہی ہاتھی پر سوار کر کے اور خود دوسرے ہاتھی پر بیٹھے لاہور کی طرف بڑھا۔ شہر سے تین کوس کے فاصلے پر گجرات کی طرف جانے والی سڑک پر شہریار کی فوجوں سے مقابلہ ہوا۔ پہلے ہی حملہ میں شہریار کی سپاہ تتر بتر ہو گئی۔ شہریار خود دو تین ہزار سواروں کی معیت میں شہر سے متصل اس جنگ کے نتیجہ کا انتظار کر رہا تھا کہ ایک ترکی غلام نے شکست کی خبر سنائی۔ جسے سنتے ہی شہریار گھبرا گیا اور دشمن سے مقابلہ کرنے کا کوئی پروگرام نہ بنا سکا۔ اور گھبرا کر قلعہ میں گھس گیا۔ اگلے روز شاہی لشکر لاہور پہنچا اور اُس نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ محافظین قلعہ سے آصف خاں کی ساز باز ہو گئی اور راتوں رات خان اعظم ارادت خان قلعہ میں گھس گیا۔ اگلے روز باقی امرا اور فوج قلعہ پر قابض ہو گئی۔ شہریار حرم سرا میں چھپ گیا مگر ایک خواجہ سرا اُسے پکڑ لایا اور داور بخش کے حضور پیش کر دیا جس نے اُس کی نظر بندی کے احکام نافذ کئے۔ اور دو تین روز بعد اُسے اندھا کر دیا گیا۔ آصف خاں نے خفیہ طور پر ان تمام واقعات کی رپورٹ لاہور سے شاہجہان کو بھیج دی۔

شاہجہان کی تخت نشینی

بنارسی نام ہندو ہرکارہ جسے آصف خاں نے کشمیر سے دکن بھیجا تھا۔ ۲۰ دن کے بعد ۲۳ نومبر ۱۶۲۷ء کو جنیر کے مقام پر شاہزادے سے جا ملا۔ باپ کے انتقال کی خبر سُن کر شاہجہان نے رسوم ماتم ادا کیں اور ۳ دسمبر کو شمال کی طرف روانہ ہوا۔ اسی اثنا میں شاہجہان کی بادشاہت کا اعلان کر دیا گیا اور اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ داور بخش عرف مرزا بلاقی جو کل تک شہنشاہِ ہندوستان تھا اپنے بھائی گرشاسپ سمیت قید کر دیا گیا۔[1] اور چند روز بعد یہ دونوں بھائی شہریار اور شہزادہ دانیال کے بیٹے طہمورث اور ہوشنگ لاہور ہی میں قتل کر دیئے گئے۔

شاہجہان کی تخت نشینی کے فوراً بعد خدمت پرست خان رضا بہادر کو لاہور کا حاکم بنایا گیا۔ مگر جلد ہی یہ عہدہ آصف خاں کے سپرد کیا گیا۔ چونکہ اُس کے سپرد وزارت کا عہدہ اور دیگر اہم فرائض تھے۔ اُس کی جگہ ۱۶۲۸ء ہی میں

۱؎ اقبال نامہ جہانگیری معتمد خاں ص ۳۰۳۔

قلیچ خان کو مقرر کیا گیا۔ مگر ایک سال بعد اُس کا تبادلہ الہ آباد ہو گیا اور اُس کی جگہ عنایت یزدی کو حاکم لاہور مقرر کیا گیا۔ مگر ۱۶۳۲ء میں اُسے نااہلی کی وجہ سے اس عہدہ سے علیحدہ کر دیا گیا اور اُس کی جگہ وزیر خان کو لاہور کا گورنر مقرر کیا گیا۔

شاہجہان کا زمانہ ثقافتی اور صنعتی ترقی کا دور ہے۔ اس دور میں بہت کم سیاسی واقعات اور جنگی مہمیں وقوع پذیر ہوئیں۔

دارا شکوہ کی علالت

شاہجہان اپنے ساتویں سال جلوس یعنی ۱۶۳۳ء میں لاہور آتے ہوئے بیاس کے کنارے خیمہ زن تھا۔ کہ دارا شکوہ کی بڑی صاحبزادی کا انتقال ہو گیا۔ اس واقعہ کا اثر شہزادے کی طبیعت پر ہوا۔ اس کی صحت رنج والم سے خراب ہو گئی۔ اور آخر کار اُسے تپ محرقہ ہو گیا۔ اس بنا پر نہ صرف شہنشاہ بلکہ جہاں آرا کو بھی بے حد قلق ہوا۔ ہم سفر اطبّا شہزادے کی تشخیصِ مرض نہ کر سکے اس پر بادشاہ نے وزیر خان کو بلایا جو فنِ حذاقت میں ماہر اور شہزادوں کی طبیعت سے واقف تھا۔ شاہی فرمان ملتے ہی وزیر خان کیمپ میں پہنچا اور شہزادے کا کامیابی سے علاج کیا۔ اُس کی تندرستی کے بعد شاہی قافلہ لاہور کی طرف بڑھا۔ اور شہر سے متصل خواجہ ہوشیار کے تالاب کے کنارے ۱۵ اپریل ۱۶۳۴ء کو خیمہ زن ہوا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ خواجہ ہوشیار کا تالاب کہاں تھا۔

شاہ جہان لاہور میں

اگلے روز بادشاہ سلامت ہاتھی پر سوار ہو کر شہر کی طرف گئے۔ وزیر خان صوبہ دار لاہور نے عمائد و اکابر شہر کو ساتھ لے کر بادشاہ کا استقبال بڑے تزک و احتشام سے کیا۔ بادشاہ سلامت قلعہ میں داخل ہوئے اور وزیر خان نے زر و جواہر نقرئی و طلائی ظروف۔ قالین اور گھوڑے، اونٹ تمام سامان جو تقریباً چار لاکھ روپے کی مالیت کا ہو گا بادشاہ کی نذر کیا۔[۲]

۲۰ اپریل ۱۶۳۴ء کو شہنشاہ اور شاہزادگان کو یمین الدولہ آصف خان نے اپنے نئے محل میں مدعو کیا۔ اس دعوت پر آصف خان نے اپنے دل کے تمام حوصلے نکالے۔ بعض مورخوں کا خیال ہے کہ یہ محل قلعہ کے نواح میں تھا اور شاہی مسجد کے جنوب کی طرف نخاس کا میدان تھا۔ میں اس رائے سے متفق نہیں ہوں۔ نخاس دہلی دروازے کے باہر موجودہ لنڈا بازار کے نواح میں تھا۔ نخاس سرائے کی طرح ایک عمارت ہوتی تھی جس میں چاروں طرف کمرے اور دکانیں ہوتی تھیں ان میں تاجر اپنا مال فروخت کرتے تھے۔ درمیان میں وسیع میدان تھا۔ اس میدان میں بھی سوداگر فروختنی اجناس لاتے تھے جن میں لونڈی غلام اور ہاتھی گھوڑے اونٹ سے لے کر سوئی سلائی تک ہر چیز شامل ہوتی تھی۔ لاہور میں بیرون دہلی دروازہ جو نخاس تھا اُس کا کاشی کار صدر دروازہ جو بہت خوب صورت تھا۔ انگریزی دور کے آغاز تک موجود تھا۔ میاں سلطان ٹھیکیدار نے سرائے اور لنڈا بازار کی تعمیر کے وقت حویلی آصف خان چوک دارا وغیرہ عمارات کے کھنڈروں کو صاف

---

[۱] بادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری جلد اول صفحہ ۱۲۱، ۱۲۵۔ شاہ جہان نامہ محمد صالح کمبوہ جلد اول صفحہ ۳۰۵ و ۲۷۱

[۲] ملاّ محمد صالح کمبوہ۔ شاہجہان نامہ (عملِ صالح) جلد دوم صفحہ ۳، ۴، ۵

بادشاہ نامہ۔ عبدالحمید لاہوری جلد اول حصہ دوم صفحہ ۱۰۹۔

کر کے اینٹیں حاصل کیں تو اس دروازے کو بھی مسمار کرا دیا۔ آصف خاں کی حویلی اسی نواح میں واقع تھی اور اس بنگلے سمیت بیس لاکھ روپے کے صرف سے دس سال کی مدت میں تعمیر ہوئی تھی۔[1]

تعمیرِ عمارات

اقامتِ لاہور کے زمانہ میں شاہجہان نے قلعہ کی عمارات کی مرمت کرائی اور بہت سی نئی عمارتیں تعمیر کرائیں۔ بعض عمارتیں پرانی عمارتوں کو مسمار کرانے کے بعد از سرِ نو بنوانی پڑیں۔ چنانچہ جہانگیر کے تعمیر کردہ شاہ برج کو یمین الدولہ آصف خان کے ذوق کے مطابق اُس کی نگرانی میں از سرِ نو بنوایا گیا۔ وزیر خان کی نگرانی میں غسل خانہ اور خواب گاہ کی عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ اِس دعوت کے بعد شہنشاہ نے شیخوپورہ کے ہرن مینار میں سیر و تفریح کے سلسلہ میں تین دن گزارے۔ یہاں بھی تالاب کی درمیانی بارہ دری جو جنت مکانی جہانگیر کی تعمیر کردہ تھی مسمار کرا کے از سرِ نو بنوانے کا حکم دیا اور اُس پر ۸۰ ہزار روپیہ خرچ کیا۔

درویشوں سے ملاقات

اسی دوران میں بادشاہ نے حضرت میاں میر سے ملاقات کی۔ جو سلسلہ قادریہ کے ایک مقتدر بزرگ تھے۔ اُن کی علمی اور روحانی عظمت کی بہت دھوم تھی۔ چونکہ حضرت میاں میر کو دنیاوی زر و جواہر کی پرواہ نہ تھی۔ اس سبب بادشاہ نے ان کی خدمت میں ایک تسبیح اور ایک سفید پگڑی بطور نذرانہ پیش کی۔

علاوہ حضرت میاں میر کے بادشاہ نے شاہ بلاول سے بھی ملاقات کی جو زہد و تقدس کے باعث لاہور اور نواح شہر میں بے حد ہر دلعزیز تھے۔

زیارتِ مقبرۂ جہانگیر

اسی دوران میں شاہ جہان اپنے باپ کے مقبرے کی زیارت کو بھی گیا اور وہاں حاجتمندوں میں دس ہزار روپیہ متوفی کی روح کو ایصالِ ثواب کے لیے تقسیم کیا۔

وزیر خاں کا تبادلہ

بارھویں سالِ جلوس (۱۰۴۹ھ مطابق ۱۶۳۹ء) میں شاہ جہان کابل سے لاہور آ رہا تھا کہ اُسے یہ شکایت ملی کہ وزیر خاں حاکم لاہور سے کچھ نامناسب حرکات سرزد ہوئی ہیں اور لوگ اُس سے ناراض ہیں۔ بادشاہ نے اُس کے تبادلے کے احکام صادر فرمائے اور اُس کی جگہ معتمد خان کو لاہور کا صوبہ دار مقرر کیا۔

علی مردان خاں کی آمد

شہنشاہِ ایران کی طرف سے علی مردان خان قندھار کا گورنر تھا۔ اگرچہ وہ حکمران خاندان کے رشتہ داروں میں سے تھا تاہم اُس کے تعلقات شاہ اور اُس کے وزیر سے خراب ہو گئے۔ اُس نے مغلوں سے ساز باز کر کے قندھار اُن کے حوالے کیا۔ شاہجہان نے علی مردان خان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اُس کی بڑی عزت افزائی کی اور اُسے اپنے اعلیٰ منصب داروں میں جگہ دی۔ علی مردان خان پہلی بار لاہور میں شاہجہان سے ملا۔ وہ قلعہ میں پہنچا تو معتمد خان میر بخشی اور تربیت خان نے اس کا استقبال کیا۔ خان نے شہنشاہ کے حضور پیش کرنے کی ایک ہزار مہریں نذر کیں۔ شہنشاہ نے اُسے خلعتِ فاخرہ مرصع جیغہ اور جڑاؤ خنجر ڈھال تلوار سمیت عطا کیا۔ اور اپنا خاص ہاتھی کوہ شکن نام بطور تحفہ دینے کے علاوہ چھ ہزار کا منصب بخشا۔ اعتماد الدولہ کی حویلی وقتی طور پر سکونت کے لیے دی۔ علاوہ ازیں ۱۰ لاکھ روپیہ بطور سفر خرچ

---

[1] عمل صالح جلد دوم صفحہ ۸ ۔ بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم صفحہ ۱۳

اور ۲۰ ہزار روپیہ ملازموں کے لیے عطا کیا۔ الغرض علی مردان خان کو اپنے ملک سے غداری کا اچھا صلہ مل گیا۔ مغلیہ سلطنت کو فائدہ یہ ہوا۔ کہ قندھار کے علاوہ ایک باتدبیر اور سمجھ دار منصب دار مل گیا جس نے لاہور میں عالیشان عمارات بنوائیں مغلپورہ میں علی مردان خان نے اپنی والدہ کا ایک بڑا مقبرہ بنوایا۔ بعد ازاں وہ خود بھی اسی مقبرہ میں دفن ہوا۔ سکھ گردی میں اس مقبرہ کا بہت سا پتھر اکھڑوا لیا گیا۔ اس سے عمارت کو بہت نقصان پہنچا۔ اس کی تزئین و آرائش ختم ہو گئی۔ یہ شکستہ حال مقبرہ کہ مغل فنِ تعمیر کی ایک اہم مثال ہے۔ اور جس سے مغلیہ عظمت کے مٹتے ہوئے آثار نمایاں ہیں ریلوے سٹورز اور کیرج شاپ کے درمیان موجود ہے۔

علی مردان خان ایک سرد ملک سے تازہ تازہ آیا تھا شاہجہان نے اُسے کشمیر کا گورنر مقرر کیا۔ اور اُس کے متعلقین کو بھی اعلیٰ عہدے دیئے۔

لاہور میں شاہ جہان کے مشاغل

قیام لاہور کے زمانے میں شاہجہان بارہا جہانگیر کے مقبرے کی زیارت کے لیے گیا اور وہاں ہزاروں روپے فقیروں، مسکینوں، عالموں، حافظوں اور اُن لوگوں میں تقسیم کیے جو مقبروں کے متعلقہ اداروں سے وابستہ تھے۔ معراج شریف اور بارہ وفات کے موقعوں پر بھی بے انتہا روپیہ مسکینوں میں تقسیم کیا گیا۔ لاہور میں بادشاہ اور امرا کی طرف سے جن میں آصف خان۔ علی مردان خان۔ وزیر خان اور افضل خان شامل تھے۔ عیش و نشاط کی ایسی ایسی محفلیں ترتیب دی گئیں کہ چشمِ فلک نے ان کی نظیر نہ دیکھی ہو گی۔

تیرھویں سالِ جلوس میں (۱۰۴۹ھ مطابق ۱۶۳۹ء) علی مردان خان نے بادشاہ کے حضور درخواست دی کہ اس کے متعلقین میں ایک شخص ہے جو نہریں نکالنے کے فن میں ماہر ہے۔ اُسے اجازت دی جائے کہ وہ وادی سے ایک نہر اس مقام سے نکالے جہاں وہ میدان میں داخل ہوتا ہے اور اس نہر کا پانی بادی دوآب کو سیراب کرنے کے علاوہ نواحِ لاہور کے باغات کی آب پاشی کے لیے استعمال کیا جائے۔ اس ماہر کا نام بعض روایتوں میں جانی بیگ بیان کیا جاتا ہے۔ اس کا مقبرہ شالامار کے قریب موجودہ باغبان پورہ کی حدود میں واقع تھا۔ انگریزی دور میں اُسی شخص نے جس کی تحویل میں یہ مقبرہ تھا اسے مسمار کر کے جگہ اپنے مکان میں شامل کر لی۔ مقبرے کے نواح میں جو محلہ آباد ہے اُس کا نام محلہ جانی بیگ رکھا گیا ہے۔

شاہ نہر اور شالامار باغ کی تعمیر

شاہجہان نے نہر کی تعمیر کی اجازت دے کر اس کام کے لیے ایک لاکھ روپیہ مرحمت فرمایا۔ راجپور کے مقام سے یہ نہر نکالی گئی جو شاہ نہر کہلائی مگر اس کی تعمیر میں کچھ نقائص رہ گئے تھے جو مُلّا علاء الملک تونی نے بادشاہ کے حکم سے دُور کیے۔ نہر کی تکمیل پر بادشاہ نے حکم دیا۔ کہ ایک عدیم النظیر باغ کی بنیاد رکھی جائے۔ چنانچہ ۳ ربیع الاول ۱۰۵۱ھ مطابق ۱۲ جون ۱۶۴۱ء کو اس کی بنیاد رکھی گئی اور خلیل اللہ خان کو اس کام کی تکمیل کے لیے نامزد کیا گیا۔ ۷ شعبان ۱۰۵۲ھ مطابق ۳۱ اکتوبر ۱۶۴۲ء کو شاہ جہان نے اس باغ کی رسمِ افتتاح ادا فرمائی۔ یہ باغ چھ لاکھ روپے کے خرچ سے وجود میں آیا۔ یہ لاہور کا شالامار باغ ہے۔ اس کے تین قطعے ہیں۔ بلند ترین طبقہ باغ فرح بخش کہلایا۔ اور نیچے کے دو طبقے فیض بخش کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ شمال مغربی سرحد سے فارغ ہو کر بادشاہ ۵ نومبر ۱۶۴۲ء کو ان باغوں سے جہاں ان کی تعمیر کے بعد سے وہ مقیم تھا آگرہ کی جانب روانہ ہوا

اور روانگی سے ایک روز قبل سعید خان[1] بہادر ظفر جنگ کو لاہور کا حاکم مقرر کیا گیا۔

۱۶۴۴ء میں بادشاہ نے سعید خان بہادر ظفر جنگ کو قندھار کا گورنر مقرر کیا اور لاہور میں اس کی جگہ قلیچ خان کو متعین کیا۔

نورجہاں کا مقبرہ

۱۸ دسمبر ۱۶۴۵ء کو ملکہ نورجہاں راہیِ ملکِ عدم ہوئی۔ آپ کو ۲ لاکھ روپے سالانہ پنشن ملتی تھی جو وہ مسکینوں اور حاجت مندوں میں تقسیم کر دیتی تھی۔ اور اس کا زیادہ حصہ مفلوک الحال لوگوں کی جوان سال ناکتخدا لڑکیوں کی شادی پر خرچ ہوتا تھا۔ ملکہ کو اپنے تعمیر کردہ مقبرہ میں دفن کیا گیا۔ اس مقبرہ کا شکستہ حال ڈھانچہ شاہدرہ میں ریلوے لائن کے متصل واقع ہے۔ نورجہاں جیسی نفیس طبع خاتون کا تعمیر کردہ مقبرہ خدا جانے کس رنگینی اور رعنائی کا مرقع ہوگا۔ اور کس اہتمام سے یہ تعمیر ہوا ہوگا۔ سکھ گردی نے اس کی تمام نفاست و نزہت ختم کر دی۔

جعفر خان اور قاضی افضل

اپریل ۱۶۴۶ء میں جعفر خان کو لاہور کا گورنر اور اس کے بھائی بہرام کو بخشی اور وقائع نویس مقرر کیا گیا۔ سر انداز خان لاہور کا قلعہ دار متعین ہوا۔ جعفر خان ۲۹ مئی ۱۶۳۹ء کو کابل کے مقام پر بادشاہ سے ملا۔ اور وہ خزانہ جو راجہ جے سنگھ اکبر آباد (آگرہ) سے لاہور لایا تھا بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ خزانہ ایک کروڑ بیس لاکھ روپے اور تین لاکھ اشرفیوں پر مشتمل تھا۔ بادشاہ نے اُسے خلعت فاخرہ سے نوازا اور میر بخشی کے عہدے پر فائز کیا۔ اور اس کی جگہ لاہور کا گورنر قاضی افضل کو مقرر کیا۔

دارا شکوہ اور لاہور

۱۶۵۲ء میں دارا شکوہ کو ملتان۔ لاہور اور کابل کے صوبوں کا نائب السلطنت مقرر کیا گیا۔ تاکہ وہ ان صوبوں کے ذرائع کو استعمال میں لا کر قندھار پر حملے کی تیاریاں مکمل کرے۔ اس نے بہت بڑا توپ خانہ۔ سپاہ اور سامان رسد تیار کیا۔ ان تیاریوں کی تفصیل مُلا محمد صالح کمبوہ کی کتاب عمل صالح (جلد سوم صفحہ ۱۵۳ تا ۱۵۶) میں ملتی ہے۔

قاضی افضل خان کے بعد ۱۶۵۱ء میں شیخ عبدالکریم کو لاہور کا حاکم مقرر کیا گیا۔ ان کے بعد ۱۶۵۵ء میں خواجہ معین خان اس عہدہ پر متعین ہوئے اور ۱۶۵۶ء میں بہادر خان کو یہ عہدہ ملا۔ شاہجہان کے دَور کا آخری حاکم لاہور سید عزت خان تھا۔ مذکورہ صوبوں کا نائب السلطنت ہونے کے باوصف دارا شکوہ شاہی دربار میں رہتا تھا۔ اور گاہے گاہے اس خطہ میں آیا کرتا تھا۔ تمام امورِ حکومت کا انتظام مقامی حکام کرتے تھے۔

عہدِ اورنگ زیب عالمگیر

فرزندانِ شاہ جہاں میں جنگِ تخت نشینی

ستمبر ۱۶۵۷ء میں شاہ جہان بیمار ہوا۔ بیماری نے آپ کو اس قدر نڈھال کر دیا کہ مارے نقاہت کے وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا۔ دارا شکوہ جو باپ کا لاڈلا بیٹا تھا اور اکثر دربار میں رہتا تھا امورِ جہانبانی کو اپنے تصرف میں لے آیا جس طرح دارا کو ۱۶۵۲ء

---

[1] بادشاہ نامہ جلد دوم صفحہ ۳۱۱، ۳۱۷ - عمل صالح صفحہ ۳۷۳، ۳۷۷ -

میں شمالی مغربی صوبجات کا (یعنی اُس خطہ کا جسے آج کی اصطلاح میں مغربی پاکستان کہا جاتا ہے) نائب السلطنت مقرر کیا گیا تھا اسی طرح شجاع کو بنگال کا اور اورنگ زیب کو دکن کا اور مراد کو گجرات کا نائب السلطنت مقرر کیا گیا۔ باپ کے بیمار ہونے پر دارا نے دارالسلطنت سے صوبجات کی طرف جانے والی سڑکوں کو بند کر دیا اور بھائیوں کے وکیلوں کو نظر بند کر دیا۔ اس پر شاہزادوں نے یہ سمجھا کہ باپ کا انتقال ہو گیا ہے اور دارا شکوہ اس خبر کو چھپا کر مرکزِ حکومت میں اپنی طاقت مستحکم کر رہا ہے۔

سب سے پہلے مراد نے بادشاہت کا اعلان کیا۔ اور اس کے بعد یہی حرکت شجاع نے کی۔ آخر کار اورنگ زیب اور مراد میں معاہدہ ہو گیا کہ دارا شکوہ کو بادشاہ نہ بننے دیا جائے۔ دونوں اپنی فوجیں لے کر شمال کی طرف بڑھے۔ نربدا کے کنارے دھرمت کے مقام پر مرکزی حکومت کی فوجوں سے اُن کی لڑائی ہوئی۔ راجہ جسونت سنگھ (سردار جودھ پور) اور قاسم خان مرکزی حکومت کی فوجوں کے سالار تھے۔ انہیں شکست ہوئی اور شاہزادوں کی فوجیں آگرہ کی جانب بڑھیں۔ سامو گڑھ کے مقام پر جو آگرہ سے جانب مشرق ۱۰ میل کے فاصلہ پر دارا اور اورنگ زیب کی فوجوں میں فیصلہ کن لڑائی ہوئی جس میں دارا شکوہ کو شکست ہوئی اور وہ دہلی کی طرف بھاگا۔ اورنگ زیب نے اُس کا تعاقب کیا۔

دارا شکوہ فی الفور لاہور پہنچا اور ۱۵ / جولائی ۱۶۵۸ء کو شہر پر قابض ہو گیا۔ اُس نے اُمرا اور اکابر کو بے دریغ روپیہ دیا اور اپنے گرد بیس ہزار سوار جمع کر لیے۔[1]

اسی اثنا میں اورنگ زیب کے لاہور کی طرف بڑھنے کی خبر گرم ہوئی۔ وہ لوگ جو روپے اور منصب کے لالچ میں دارا کے گرد جمع ہو گئے تھے فاتح سامو گڑھ اورنگ زیب سے مرعوب ہو کر اُس کا ساتھ چھوڑنے لگے۔ یہاں تک کہ مایوس ہو کر دارا شکوہ تین چار ہزار کے قریب سوار اور کچھ توپیں لے کر ٹھٹھہ اور ملتان کی طرف بڑھا۔ لاہور میں اُس نے داؤد خاں کو چھوڑا تاکہ اورنگ زیب کا راستہ روکے اور کشتیوں کو تباہ کر دے۔ کشتیوں کی بربادی کی صورت میں عالمگیر کے لیے پنجاب کے دریاؤں کو عبور کرنا مشکل ہو جاتا۔

دریائے ستلج کو عبور کر کے اورنگ زیب نے اپنے فرزند شاہزادہ محمد اعظم کو لاہور پر قبضہ کرنے کے لیے بھیجا اور خود ملتان کی طرف دارا کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ مگر ملتان میں بھی دارا کے اپنے آدمیوں نے اُس کی کوئی مدد نہ کی اور حوصلہ ہار بیٹھے دارا کو ملتان چھوڑ کر آگے بڑھنا پڑا۔ اورنگ زیب نے صف شکن خان کو اُس کے تعاقب میں روانہ کیا۔ اور خود لاہور چلا آیا۔ لاہور پہنچ کر اُس نے شالامار باغ میں اقامت اختیار کی اور ۲۳ / اکتوبر ۱۶۵۸ء کو شاہزادہ محمد اعظم اُمرائے لاہور کی معیت میں بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے ان لوگوں کی معیت میں قلعہ جا کر استحکامات کا معائنہ کیا اور امان اللہ خان قلعہ دار کو ہدایات دیں۔ قلعہ سے شالامار واپس آتے ہوئے بادشاہ نے مسجد وزیر خان میں نمازِ ظہر با جماعت ادا کی۔ اور شام کو شالامار واپس پہنچا۔

اورنگ زیب نے خلیل اللہ خان کو لاہور کا حاکم مقرر کیا اور اسے ایک کروڑ سالانہ کی مالیت کی جاگیر عطا کی۔ لشکر خان سابق حاکم کشمیر کو حاکم ملتان اور خواجہ اسمٰعیل کرمانی کو دیوانِ لاہور مقرر کیا۔ ان انتظامات سے فراغت پا کر اورنگ زیب

---

[1] عالمگیر نامہ۔ منشی محمد کاظم صفحہ ۱۷۸

دہلی (عالمگیر نامہ صفحہ ۱۴۲) روانہ ہو گیا۔

شاہجہان کے فرزندوں کی رزم آرائی کی تفصیلات ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ مختصر یہ کہ اورنگ زیب کو اپنے بھائیوں اور بھتیجوں پر فتح ہوئی اور وہ زیب دہ اورنگ ہندوستان ہوا۔ شاہجہان کو پیرانہ سالی میں تخت و تاج سے محروم ہو کر قلعہ آگرہ میں نظر بندی کی زندگی بسر کرنا پڑی۔

خلیل اللہ خاں کا انتقال

۱۶۶۲ء میں خلیل اللہ خاں عالمگیر سے ملاقات کرنے عازم دہلی ہوا کہ راستے ہی میں بیمار ہو گیا۔ دہلی پہنچ کر اسے بادشاہ کی طرف سے حکم ملا کہ کچھ عرصہ آرام کریں تقرب خان وغیرہ شاہی اطبا اس کا علاج کرتے رہے مگر وہ ۱۲ فروری ۱۶۶۲ء کو راہی ملک عدم ہوا۔ بادشاہ اس کے ہاں ماتم پرسی کے لیے بنفس نفیس تشریف لے گئے۔ خلیل اللہ کی بیوہ حمیدہ بانو بیگم بادشاہ کی خالہ زاد بہن تھیں۔

عالمگیر کا سفر کشمیر

۱۰۷۳ھ مطابق ۱۸ دسمبر ۱۶۶۲ء بادشاہ سفر کشمیر کے ارادے سے نکلا۔ اور لاہور کی راہ لی۔ اور ۱۰ فروری ۱۶۶۳ء کو لاہور پہنچ کر شالامار باغ میں اس نے ایک ہفتہ قیام کیا ۱۸ فروری کو بادشاہ اور شاہزادہ محمد معظم ایک ہی ہاتھی پر سوار شہر کی طرف گئے اور قلعہ میں قیام فرمایا۔ اگلے روز جمعہ تھا۔ بادشاہ نے فیروز خاں کی مسجد میں نماز جمعہ ادا کی۔ مآثر عالمگیری کا بیان ہے کہ یہ مسجد "در فضائے بیرون قلعہ نزدیک بدر وازۂ ہتیہ پول" واقع تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی قدیم مسجد قلعہ کے مغرب میں واقع ہو گی جو موجودہ شاہی مسجد کی تعمیر کے وقت مسمار کر کے اس کی جگہ بھی شاہی مسجد میں شامل کر لی گئی ہو گی۔ معلوم نہیں کہ مسجد کے بانی فیروز خان کون تھے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ ہمیشہ اسی دھوم دھام سے یہاں نماز جمعہ ادا ہو۔

اڑھائی مہینے لاہور میں قیام کرنے کے بعد بادشاہ ۳ مئی ۱۶۶۳ء کو کشمیر جانے کے ارادہ سے لاہور سے نکلا اور راوی کے پار باغ دلکشا میں مقیم ہوا۔ یہاں اس نے ایک جشن منعقد کیا اور اس کے بعد گجرات۔ بھمبر اور راجوری کے راستے کشمیر روانہ ہوا۔ اس موقع پر مشہور فرانسیسی سیاح برنیر بھی شاہی کیمپ کے ہمراہ سفر کر رہا تھا۔

بارشوں کی شدت اور کثرت کی وجہ سے لاہور میں بہت سے مکان گر گئے تھے۔ علاوہ ازیں راوی میں طغیانی بھی آتی رہتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے شہر کی عمارتوں کو بے حد نقصان پہنچا تھا۔

کشمیر روانہ ہونے سے قبل بادشاہ نے لاہور کو راوی کی سرکش موجوں سے بچانے کے لیے ایک مضبوط بند بنانے کا حکم دیا تاکہ شہر محفوظ رہے۔ چنانچہ شالامار باغ کے نواح سے لے کر قلعہ تک بند تعمیر ہوا۔ یہ بند مغلیہ دور کی چھوٹی اینٹوں اور چونے سے بنوایا گیا۔ دریا کی جانب جا بجا سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ اور اس کے عقب میں باغات تھے۔ بند پر جا بجا امرا نے بارہ دریاں اور سیر گاہیں بنوائیں اور مغلیہ دور کے نفاست پسند طبائع نے اسے ایک نہایت خوب صورت سیر گاہ میں تبدیل کر دیا

ہم عصر مورخ سجان رائے بٹالوی لکھتا ہے کہ اس بند کی تعمیر سے جسے سدِ سکندری کہنا چاہیئے بادشاہ "لب دریا را مانند لب خوباں بیار است"۔ اس بند نے برسوں لاہور کی عمارات کو راوی کے سیلاب سے بچایا حتیٰ کہ راوی نے اپنی یہ گذرگاہ ترک کر دی۔ انگریزی دور کے آغاز میں لاہور کے زمینداروں نے بند کے اُن حصوں کو جو اُن کی زرعی زمینوں میں آ گئے تھے مسمار

کرکے اینٹیں شہر میں فروخت کردیں۔ یا اپنے سکونتی مکانوں کی تعمیر میں صرف کرلیں۔ آج سے پچیس تیس سال قبل اس بند کے کچھ حصے کی بنیادیں موضع چاہ میراں کے متصل نظر آتی تھیں مگر اب اس نواح میں نئی آبادی عالمِ وجود میں آگئی ہے۔

شاہی مسجد کی تعمیر

۱۸ مئی ۱۶۷۰ء کو محمد امین خان کو لاہور کی حکومت سے علیحدہ کرکے حاکم کابل متعین کیا گیا معلوم ہوتا ہے[1] کہ اس کے بعد فدائی خان کوکہ جو عالمگیر کا دودھ شریک بھائی تھا لاہور کا صوبہ دار مقرر ہوا۔ اس کے زمانے ۱۰۸۴ھ مطابق ۱۶۷۳ء میں شاہی مسجد کی بنیاد رکھی گئی۔ خلاصۃ التواریخ کے بیان کے مطابق اس پر چھ لاکھ روپے سے زیادہ خرچ ہوا۔ اس مسجد کی تعمیر سے بادشاہ کا مقصد یہ تھا کہ شہر سے متصل دریا کے کنارے ایک ایسی مسجد تعمیر کرائی جائے جس میں لاہور کے تمام مسلمان بیک وقت نماز ادا کرسکیں۔

امانت خاں کا دور

ستمبر ۱۶۷۵ء میں سید احمد کو امانت خاں کا خطاب دے کر لاہور کا صوبہ دار مقرر کیا گیا جو ڈیڑھ سال تک اس عہدۂ جلیلہ کے فرائض انجام دیتے رہے اور اس کے بعد انھیں اجمیر کا صوبہ دار بنا دیا گیا۔ امانت خان کی یادگار ایک سرائے پرانی شاہراہِ اعظم پر لاہور اور امرتسر کے درمیان واقع ہے۔ اس میں ایک گاؤں آباد ہے جو "سرائے" کہلاتا ہے۔ اور اب ہندوستان کی حدود میں آگیا ہے۔ امانت خان کے بعد قوام الدین خان کو لاہور کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔

اناج کی کمی

ستمبر ۱۶۷۸ء میں لاہور میں اناج کی کمی کے سبب سامان خوراک کی قیمتیں بہت بڑھ گئیں۔ حکومت کی طرف سے[2] مناسب کارروائی کی گئی۔

تیرہ برس کے واقعات

۱۶۸۰ء میں صوبۂ لاہور کے حکام دو گروہوں میں بٹ گئے۔ سید علی اکبر قاضیٔ لاہور اور ان کے بھتیجے سید فاضل ایک طرف اور قوام الدین خان صوبہ دار لاہور اور نظام الدین کوتوال دوسری طرف۔ اس جھگڑے میں سید علی اکبر جو بہت دیانت دار تھے مارے گئے۔ بادشاہ کو اطلاع ملی تو اس نے کوتوال کو موت کی سزا دی اور صوبہ دار کو اجمیر اپنی بارگاہ میں طلب کرلیا۔

عالمگیر نے اس واقعہ کے بعد ۱۶۸۰ء میں شہزادہ محمد اعظم کو لاہور کا صوبہ دار مقرر کیا تاکہ مذکورہ بالا جھگڑوں سے جو فضا میں تکدّر پیدا ہوگیا تھا دور کیا جاسکے۔ شہزادہ اعظم کے بعد مکرّم خان لاہور کے حاکم بنے اور ان سے سپاہ دار خان نے جو خانِ جہان بہادر کا لڑکا تھا۔ نومبر ۱۶۸۶ء میں حکومتِ لاہور کا چارج لیا مگر جلد ہی اسے اس عہدۂ جلیلہ سے علیحدہ ہونا پڑا اور شہزادہ محمد اعظم کے کارندے امورِ حکومت کا انتظام کرتے رہے۔ اپریل ۱۶۹۱ء سے ۱۶۹۳ء تک خانِ جہان بہادر صوبہ دارِ لاہور رہے۔

ابراہیم مہابت خاں

اورنگ زیب نے دکن سے ابراہیم خاں کو مہابت خاں کا خطاب دے کر حاکم لاہور نامزد کیا۔ مگر وہ

---

[1] مستعد خاں مآثر عالمگیری صفحہ ۱۵۰

[2] مآثر عالمگیری صفحہ ۱۸۸

تھوڑے ہی عرصہ بعد فوت ہو گیا۔ باغبان پورہ میں مہابت خان کا باغ ہے جس کے کچھ حصّہ پر جدید سکونتی مکانات بن گئے ہیں۔ باغ کے وسط میں ایک وسیع چبوترہ پر مہابت خان کی قبر ہے۔ علاوہ اس کے باغ کی فصیل کا کچھ حصّہ اور چند کمرے بھی باقی ہیں۔ یہ مکان اسی ابراہیم مہابت خان کی آخری آرام گاہ ہے۔ مہابت خان دورِ مغلیہ میں ایک خطاب تھا جو مختلف زمانوں میں مختلف اُمرا کے نام کا جزو رہا ہے۔ جہانگیری دَور کا مہابت خان تاریخ میں زیادہ مشہور ہے۔ لہٰذا عام طور پہ یہ باغ اور مقبرہ اُسی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ مگر جیسا کہ بیان ہو چکا ہے یہ باغ اور مقبرہ ابراہیم مہابت خان عالمگیری کا ہے۔[1]

نواب میاں خان

سنہ ۱۶۹۶ء میں مکرم خان اور نصر خان یکے بعد دیگرے ایک ہی سال میں لاہور کے حاکم بنے۔ ان کے بعد غالباً حفظ اللہ خان المعلقب بہ میاں خان جو شاہجہان کے شہرۂ آفاق وزیر اعظم سعد اللہ خان کے فرزند ارجمند تھے لاہور کے حاکم بنے۔ ان کی وسیع حویلی میاں خان رنگ محل اور قلعی خانہ شہر کے وسط میں تھے۔ حویلی کا تو صرف صدر دروازہ ہی باقی ہے۔ باقی حصّے پر ایک وسیع محلہ آباد ہو گیا ہے جو حویلی میاں خان کہلاتا ہے۔ حویلی کی عمارات کے بعض حصے محلے کے چند مکانات کے اندر اب تک موجود ہیں۔ اسی محلے میں کوٹھڑی عزیز الدین ہے جس کا راستہ مسجد چینیاں والی کے قریب ہے۔ اس کوٹھڑی کے مقام پر نواب میاں خان کا حمام تھا۔ جو دورِ مغلیہ کے ترکی حماموں کی طرز پر بنوایا گیا تھا۔ رنگ محل میں انگریزی حکومت کے قیام پر فارمن نام ایک پادری ماہرِ تعلیم نے مشن ہائی سکول قائم کیا تھا۔ عمارت کہنہ ہو جانے کے سبب بعد ازاں اسے مسمار کرا کے سکول کی موجودہ عمارت تعمیر کی گئی جس میں سکول اب تک قائم ہے اور ایک صدی سے زیادہ ہو گیا ہے کہ اس مدرسہ کے ذریعہ پادری صاحبان باشندگانِ شہر کو جدید تعلیم سے بہرہ ور کر رہے ہیں۔ لاہور کی ثقافتی تاریخ میں اِس سکول کا مقام بہت اہم ہے۔

نواب میاں خان کا باغ اور مقبرہ موجودہ محلہ سنگھ پورہ کے سامنے بھوگی وال کے پاس نہایت عبرت ناک حالت میں ہے

شاہزادہ معظم صوبہ دارِ لاہور

فروری سنہ [illegible]ء میں صوبۂ لاہور شاہزادہ محمد معظم کے حوالے کر دیا گیا۔ اور اورنگ زیب کی وفات تک شاہزادہ موصوف کے کارندے یہاں حکومت کرتے رہے۔ بطور صوبہ دار یا نائب السلطنت شاہزادے کا نام لیا جاتا تھا اور اُس کا نمائندہ نائب ناظم یا نائب صوبہ دار کہلاتا تھا۔ ایسے نائب ناظموں میں منعم خان قابلِ ذکر ہے، جو کسی زمانے میں دیوانِ صوبۂ کابل بھی رہ چکا تھا۔

عالمگیر کا انتقال

۳ مارچ سنہ ۱۷۰۷ء کو دکن میں اورنگ زیب کا انتقال ہو گیا اور اُسے دولت آباد کے متصل خلد آباد میں شیخ زین الدین اور دیگر اکابرِ ملت کے مقبروں کے قریب دفن کیا گیا۔ بادشاہ کی وصیت کے مطابق اُس کی قبر سادہ رکھی گئی۔

برسرِ گورِ غریباں گنبدِ گردوں بس است

لاہور جانشینانِ اورنگ زیب کے زمانے میں

اورنگ زیب نے سنہ [illegible]ء کے قریب شاہزادہ معظم کو

---

[1] مفصل حالات کے لیے راقم الحروف کا مقالہ "مہابت خان کا باغ اور مقبرہ" رسالہ معارف اعظم گڑھ بابت جون سنہ ۱۹۴۳ء میں دیکھیے۔ یہاں یہ بیان کر دینا نامناسب نہ ہو گا کہ اسلامیہ کالج (لاہور) میگزین (CRESCENT) کے بعد یہ میرا پہلا مضمون تھا جو کسی ادبی مجلہ میں چھپا۔

لاہور، کابل اور ملتان وغیرہ کے صوبوں کا نائب السلطنت مقرر کر کے شمال مغربی سرحد پہ بھیج دیا تھا تاکہ ان علاقوں کے انتظام میں کوئی کمی نہ آنے پائے۔ اورنگ زیب کی وفات کے وقت شاہزادہ کابل میں تھا اور اُس کا معتمد کارندہ منعم خاں لاہور میں متعین تھا بتاریخ ۲۲ مارچ ۱۷۰۷ء شہزادے کو بمقام پشاور باپ کی وفات کی خبر ملی اور اس نے فی الفور روانگی کی تیاری کی۔ اگلے روز اُسے منعم خاں کا خط ملا جس نے شہزادے کو تخت نشینی کی مبارک باد دی اور اُسے فی الفور دکن کی طرف روانہ ہونے کا مشورہ دیا۔ شہزادہ معظم جسے اب شاہ عالم بہادر شاہ اول کے نام سے یاد کیا جائے گا۔ لاہور پہنچا تو منعم خاں نے شہر سے کچھ فاصلے پر اس کا خیر مقدم کیا۔ اور چالیس لاکھ روپیہ اُسے بطورِ نذرانہ پیش کیا۔ شاہ عالم نے فوج توپ خانہ اور دیگر سامانِ حرب کا معائنہ کیا۔ منعم خاں کو شاہ عالم نے وزیر مقرر کیا۔ اور لاہور ہی میں اپنے نام کا سکہ ضرب کرایا اور اپنے نام کا خطبہ پڑھنے کا حکم دیا۔

اپنی بادشاہت کا اعلان وہ لاہور پہنچنے سے قبل پل شاہ دولہ پہ کر چکا تھا۔ یہ پل لاہور سے جانب شمال چوبیس میل کے فاصلہ پر ڈیک نالہ پہ گجرات کے مشہور بزرگ شاہ دولہ نے تعمیر کرایا تھا۔ منعم خاں نے اپنے آقا کی مدد کے لیے جو تیاریاں کی تھیں اور صوبہ لاہور کے تمام ذرائع کو متوقع جنگِ تخت نشینی کی تیاریوں کے لیے وقف کر دیا تھا اُس کے پیشِ نظر وزیر کے عہدے کے لیے بے حد موزوں تھا۔

پنجاب کی فوجوں اور خزینوں کے ہمراہ بہادر شاہ اول دہلی پہنچا اور وہاں کے خزانوں اور فوجوں کو حاصل کر کے آگرہ کا رُخ کیا۔ اُس کا فرزند شہزادہ عظیم الشان بنگال اور بہار کا حاکم تھا۔ اُسے وفات سے کچھ عرصہ قبل اورنگ زیب نے دکن طلب کیا تھا۔ ابھی وہ اپنے علاقے کی حدود ہی میں تھا کہ دادا کی وفات کی خبر ملی اور وہ بنگال کے تمام خزانے اور چالیس ہزار سپاہیوں کے ہمراہ آگرہ کی طرف بڑھا۔ اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ بہادر شاہ کی آمد پر شاہ باقی خاں قلعہ دار آگرہ نے اطاعت قبول کر لی۔ اب گویا تمام شمالی ہند اور مرکزِ حکومت یعنی دہلی اور آگرہ کے ذرائع آمدنی شاہ عالم کے تصرف میں تھے۔

دکن میں شہزادہ اعظم نے احمد نگر کے کیمپ میں ۱۴ مارچ کو اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا۔ اُس کی سب سے بڑی مشکل دکن میں روپے کی کمی تھی۔ مرہٹوں کے خلاف جنگوں کی وجہ سے تمام روپیہ خرچ ہو چکا تھا اور فوج کی تنخواہیں بھی واجب الادا تھیں تورانی اُمرا نظام الملک کی سرکردگی میں اس سے علیحدہ رہے۔ مگر ایرانی اُمرا اسد خان اور اُس کے فرزند نصرت جنگ کی قیادت میں شہزادہ اعظم سے مل گئے اور اُس نے مرہٹوں کی جنگوں کے آزمودہ کار مگر بد دل سپاہیوں کی معیت میں شمال کا رُخ کیا۔ آگرہ سے کچھ فاصلہ پر ساموگڑھ کے قریب جاجو کے مقام پر اعظم اور معظم میں جنگ ہوئی۔ اعظم کے ہاں توپوں کی کمی تھی اور معظم نے اپنے بھاری توپ خانہ سے گولہ باری کر کے دکنی فوجوں کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ اس جنگ میں اعظم اور اُس کا لڑکا بیدار بخت مارے گئے اور اُس کا بیٹا والاجاہ بُری طرح زخمی ہوا۔ اِس فتح کے بعد بہادر شاہ نومبر تک آگرہ میں آرام کرتا رہا اور پھر راجپوتانے کا رُخ کیا۔ اسی اثنا میں اُسے خبر ملی کہ اُس کے بھائی کام بخش کی حرکات اُس کی توجہ خصوصی کی مقتضی ہیں۔ اگرچہ بادشاہت کا اعلان کرنے کے بعد دکن کا کافی حصہ اُس کے قبضے میں تھا مگر اُس کے طفلانہ اور ظالمانہ طرزِ عمل نے اُس کے متوسلین کو بے حد خائف کر دیا تھا۔ بہادر شاہ دکن پہنچا اور ۱۳ جنوری ۱۷۰۹ء کو حیدر آباد سے کچھ فاصلے پر شاہی فوج کے ایک دستے نے جس کی قیادت منعم خاں کر رہا تھا۔ کام بخش کا مقابلہ کیا۔ اُس وقت صرف ساڑھے تین سو آدمی اُس کے ہمراہ تھے۔ شہزادہ مہلک طور پر زخمی ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بہادر شاہ کی دکن میں

آمد پر کام بخش کے نام ہوا خواہ یا تو دشمن سے مل گئے اور یا عزلت گزیں ہو گئے تھے۔

شمالی ہند کو واپسی

اسی اثنا میں راجپوتانے سے وحشت ناک خبریں موصول ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ اور شاہ عالم کو فی الفور اجمیر جانا پڑا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد راجپوتوں نے مغلیہ سیادت کا جوا اتار پھینکنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ اجمیر میں بادشاہ کو صوبۂ لاہور سے بندہ بیراگی کی سفاکی اور فتنہ پردازی کی روداد ملی اور بادشاہ نے لاہور آنے کا ارادہ کیا۔

بندہ سنگھ کا خروج

لاہور سے رخصت ہوتے وقت شاہ عالم نے صوبۂ لاہور اپنے فرزند معز الدین جہاں دار شاہ کے حوالے کیا تھا۔ وہ خود تو باپ کی معیت میں روانہ ہوا اور لاہور میں سید اسلم خاں کو نائب ناظم اور کاظم خاں کو دیوان مقرر کر گیا تھا۔ شاہی فوجوں کو جنگ تخت نشینی میں مصروف اور صوبۂ لاہور کو فوج سے خالی پا کر سکھوں کے مشہور لیڈر اور گورو گوبند سنگھ صاحب کے مبینہ نائب بندہ سنگھ بیراگی نے سکھ رضا کاروں کو جمع کر کے نہ صرف مغلیہ حکومت بلکہ پنجاب کی مسلم آبادی کے خلاف بھی اعلان جنگ کر دیا۔

بندہ بیراگی سنہ ۱۶۷۰ء میں ریاست پونچھ کے قصبہ راجوری میں پیدا ہوا۔ اس کا اپنا نام لچھمن دیو اور اس کے باپ کا نام رام دیو تھا وہ ڈوگرہ راجپوت خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ پہلے یہ بیراگی بنا اور مادھوداس اور بندہ بیراگی کے لقب سے سادھوؤں کے ہمراہ گھومتا ہوا دکن پہنچا جہاں اس کی ملاقات گورو گوبند سنگھ سے ہوئی اور وہ اُن کا معتقد بن گیا۔ بستر مرگ پر گورو گوبند سنگھ نے اُسے کچھ نصیحتیں کیں اور مغلیہ حکومت کے خلاف سکھوں کی رہنمائی کے لیے پنجاب کی طرف روانہ کیا۔

بندہ بیراگی جسے سکھ "بابا بندہ سنگھ بہادر" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ ایک سفاک اور ستم گر انسان تھا۔ عام ڈوگروں کی طرح مسلمانوں کی دشمنی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس نے نہ صرف مغلوں کی سرکاری فوجوں سے جنگ کی بلکہ جہاں کہیں بھی اُسے مسلمانوں کی بستی نظر آئی اُسے تاخت و تاراج کر دیا۔ حالانکہ گورو گوبند سنگھ صاحب کا طرز عمل یہ نہ تھا۔ وہ صرف حکومت کی فوجوں سے لڑتے تھے۔ بندہ نے مشہور کر دیا کہ اُس کے پاس ایک ایسا جادو ہے جس کے اثر سے کوئی فوج اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ بندہ بیراگی کے لشکر میں راسخ العقیدہ سکھوں کے علاوہ (جو پنتھ کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہو کر حکومت سے نبرد آزما تھے) بہت سے لٹیرے۔ اوباش اور جرائم پیشہ قسم کے لوگ لوٹ مار کے لالچ سے آ شریک ہوئے۔ شوالک کی پہاڑیوں میں بندہ بیراگی نے اپنا اڈہ بنایا۔ وہاں سے نکل کر اُس نے ستلج اور جمنا کے درمیانی علاقے میں دھاوا بولا ۔ سنام۔ سمانہ اور سرہند وغیرہ مختلف شہروں کو برباد کر دیا۔ اس کے بعد جمنا پار کر کے سہارن پور۔ گنگوہ اور نانوتہ وغیرہ بہت سی اسلامی بستیاں لوٹ لیں۔ اس سے فارغ ہو کر اُس نے جالندھر دوآب کا رُخ کیا اور اس شاداب اور آباد خطے کو تاراج کرنا شروع کر دیا۔

بندہ کا طریق کار یہ تھا کہ جس خطے پر حملہ کرنا ہوتا پہلے وہاں کے لوگوں میں جاسوسوں کے ذریعہ اپنی جادوگری کی داستانیں مشہور کر کے لوگوں کو پست ہمت بنا دیتا۔ مغلوں کے تعیش پسند سپاہی اور سالار توہم پرستی کے سبب جادوگری اور شعبدہ بازی

سے ڈر کر میدانِ جنگ سے بھاگ جاتے تھے۔ بندہ بیراگی کے سورما کسی بستی کو مسخر کرنے کے بعد اُسے بے دریغ لوٹتے۔ انسانوں کے خون سے ہاتھ رنگنا۔ عورتوں کی آبرو ریزی کرنا اور حاملہ عورتوں کے پیٹ کاٹ کر تڑپتے بچوں کو نکالنا اور انھیں نوکِ نیزہ پر اچھالنا اُن کا من پسند مشغلہ تھا۔ ہم عصر مورّخ خوافی خاں کی کتاب "منتخب اللباب" کے علاوہ مآثر الامرا اور سیر المتاخرین کے اوراق بندہ بیراگی کی سفاکیوں کی المناک داستان سے بھرے پڑے ہیں۔ غیر مسلم مورخ پروفیسر گنڈا سنگھ بھائی پرمانند اور لالہ دولت رام وغیرہ بھی ان مظالم کا اقرار کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے زیرِ حکومت ۰۰ے سال تک بے عزتی اور غلامی کی زندگی بسر کرنے کے بعد جوشِ انتقام اور حصولِ آزادی کے جذبے نے بندہ بیراگی کے طرزِ عمل کو غیر متوازن بنا دیا تھا اور وہ عام بے گناہ اور پُرامن مسلم آبادی کو ہدفِ مظالم بنا کر گویا محمد بن قاسم سے لے کر اورنگ زیب تک تمام مسلمان بادشاہوں کی فتوحات کا بدلہ لے رہا تھا۔

جالندھر دوآب کی پامالی کے بعد بندہ نے باری دوآب کا رُخ کیا۔ بٹالہ کا مردم خیز قصبہ جو صدیوں سے علم و حکمت کا مخزن اور علما و فضلا کا مسکن چلا آ رہا تھا برباد کر دیا اور اس کے مدرسوں اور کتب خانوں کو آگ لگا دی۔ بندہ بیراگی کے غارت گروں نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں اور شالامار باغ سے پرے پرے مضافاتِ لاہور کو بھی لوٹ لیا۔

حیدری فوج کی تشکیل

لاہور میں سنسنی پھیل گئی۔ نواحی دیہات سے لٹے ہوئے لوگ شہر میں آنے لگے۔ یہ لوگ طرح طرح کی کہانیاں اپنے ہمراہ لاتے اور شہر میں مختلف قسم کی افواہوں نے لوگوں کو ہراساں کر دیا انھیں اس امر کا یقین ہو گیا کہ بندہ لاہور پر یلغار کرنے والا ہے۔ مغلوں کے زیرِ سایہ یہ شہر دو سو سال سے فتنہ و فساد سے محفوظ چلا آ رہا تھا۔ اور یہاں کے لوگ بے حد خوش حال اور متمول تھے۔ باغی لشکر کی دلی آرزو تھی کہ اسے تاراج کیا جائے۔ اُس وقت سید محمد اسلم نائب ناظمِ صوبۂ لاہور اور کاظم خاں دیوانِ لاہور تھا۔ فوج کی شہر میں کمی کے باعث یہ لوگ حالات پر قابو نہ پا سکے۔ اگرچہ شاہ عالم اول کو پنجاب کی صورتِ حال کی اطلاعات مل چکی تھیں۔ مگر اُس کے جلد پہنچنے کا کوئی امکان نہ تھا۔

ان حالات میں لاہور کے دفاع اور باشندگانِ لاہور کے حوصلے کو قائم رکھنے کے لیے ایک رضاکار فوج کی تشکیل کی گئی اور اس کا نام حیدری فوج رکھا گیا۔ اس فوج کا مقصد یہ تھا کہ نوجوانانِ لاہور کو جمع کر کے فوجی تنظیم اور جنگی قواعد سے آشنا کیا جائے اس کی تنظیم کا کام میر تقی۔ محمد عنایت خاں۔ تجار بیگ اور مصطفےٰ خاں نے اپنے ذمے لیا۔ اس کے لیے باشندگانِ لاہور سے مالی امداد بھی لی گئی۔ بعض منصف مزاج اور امن پسند ہندو بھی جو مغلیہ حکومت کے مداح تھے اور بندہ کی انسانیت سوز حرکات کو ناپسند کرتے تھے۔ اس تحریک کی پشت پر تھے۔ ان ہندوؤں میں لاہور کے ایک مقتدر امیر راجہ بہار مل بھی تھے۔ جو اکبر کے مشہور درباری اور معتمد دیوان راجہ ٹوڈر مل کے اخلاف میں سے تھے۔ فوج کی تنظیم و تربیت کا کام بڑی مستعدی سے کیا گیا۔ علما نے بندہ بیراگی کے خلاف جہاد کا فتوےٰ دیا۔ تاریخ میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ سکھوں کو اسلام کا دشمن اور خلقِ خدا کا رہزن قرار دے کر علما نے اُن کے خلاف جنگ کا فتوےٰ دیا۔

حیدری علم

اس اعلان کے بعد جہاد کا سبز ہلالی پرچم عیدگاہ میں نصب کر دیا گیا۔ اس جھنڈے کو علمِ حیدری کہا جاتا تھا۔ یہ عیدگاہ جہانگیر کے دور میں بنائی گئی تھی۔ اس کا محلِ وقوع موجودہ پل گڑھی شاہو کے قریب تھا۔ اس مسجد کے

متصل ایک بازار تھا جو بازار تر پولیہ کہلاتا تھا۔ حیدری فوج کی تشکیل اور اعلانِ جہاد کے بعد مسلمانوں میں جوش و خروش بے حد بڑھ گیا لیکن شہر کے اندر بسنے والے پُر امن غیر مسلموں میں سے کسی کا انھوں نے بال تک بیکا نہ کیا۔ حیدری فوج علی مرتضےٰ خلیفۂ رسول اللہ سے منسوب تھی اور اس کا نعرۂ جہاد "فضلِ پنج تن یا علی" تھا۔

دوآبہ باری کے سکھ جتھے

دوآبہ باری کے دیہات میں بسنے والے سکھوں نے اپنے جتھوں کو خوب منظم کیا ہوا تھا۔ ان کا ایک چوتھائی حصہ لاہور کی تاخت کے لیے الگ کر دیا گیا تھا۔ تاکہ بندہ بیراگی کے "جنغصِ نفیس" لاہور پر تاخت کرنے سے پہلے یہ لوگ مضافاتِ شہر اور بیرونی محلوں پر حملے کر کے مسلمانوں کے حوصلے پست کر دیں یہ جماعت شہر سے کچھ دُور راوی کے کنارے موضع بھرت میں مقیم تھی۔ اور قلعہ ٹھگوٹ نامی پر قبضہ کر چکی تھی۔ اس قلعے سے نکل کر سکھ جتھے نواحِ شہر کو تاراج کرتے اور لوٹ کا مال لے کر پھر اس قلعہ میں جا گھستے تھے حیدری فوج کے غازیوں کا ایک دستہ موضع بھرت گیا اور ان غارت گروں کی تادیب کے بعد واپس چلا آیا۔

کوٹلہ بیگم کا معرکہ

اسی اثنا میں خبر ملی کہ بہت سے سکھ کوٹلہ بیگم نام ایک گاؤں میں جمع ہو رہے ہیں۔ یہ گاؤں موضع چھیاری کے متصل تھا۔ حیدری فوج ان کے استیصال کے لیے روانہ ہوئی۔ لاہور سے چل کر مجاہدین نے موضع بھیلووال میں قیام کیا۔ وہاں چند رضاکاروں کو جو فوج کے نظم و ضبط کی پروا نہ کرتے ہوئے راستے میں نامناسب حرکات کے مرتکب ہوئے تھے سزا دی گئی۔ اس کے بعد حیدری فوج نے آگے بڑھ کر کوٹلہ بیگم کا محاصرہ کر لیا۔ اب ایک طرف سکھ تھے جو جنگ چپاول کے اصولوں کے ماہر تھے اور جنگلوں اور پہاڑوں میں زندگی بسر کرنے کے سبب بہت جفاکش ہو چکے تھے۔ دوسری طرف لاہور کے مسلمان تھے جو کئی پشتوں سے شہر میں امن و امان اور راحت و آسائش کی زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ تاہم جوشِ جہاد اور محبتِ اسلام میں انھوں نے کمالِ پامردی اور دلاوری سے محاصرہ جاری رکھا۔ سکھ بھی جم کر لڑتے رہے۔

اسی اثنا میں غازی فوج کے کچھ حصہ میں بے دلی کے آثار نمایاں ہوئے۔ اور بعض لوگ راہِ فرار اختیار کرنے لگے۔ سرِ شام ایک زبردست آندھی آئی اور زور کی بارش ہونے لگی۔ شہر کے لوگوں کے لیے جنگل میں یہ ہنگامہ بادو باراں طوفانِ نوح سے کم نہ تھا۔ وہ سراسیمہ ہو کر اِدھر اُدھر بھاگنے لگے اور آخر محاصرہ اٹھا کر انھوں نے بھیلووال کا رُخ کیا۔ اس جگہ ایک چھوٹا سا قلعہ تھا۔ باقاعدہ فوج اس قلعہ میں گھس گئی اور عام غازیوں نے باہر میدان میں خیمے لگا لیے۔ کچھ سکھ ان کے تعاقب میں آئے اور رات بھر بھیلووال کی متصلہ جھاڑیوں اور درختوں میں چھپے رہے۔ صبح ہوتے ہی انھوں نے اچانک بے خبر حیدری فوج کے کیمپ پر ہلہ بول دیا جس سے بے حد سراسیمگی پھیلی۔ بہت سے مجاہد شہید ہوئے اور بقیۃ السیف رضاکار بمشکل لاہور پہنچے۔ جو زعما اس جنگ میں کام آئے ان میں مرتضےٰ خان اور راجہ بہار مل قابلِ ذکر ہیں[1]۔

---

[1] دیکھیے۔ عبرت نامہ از سید محمد قاسم عبرت لاہوری۔ مخطوطۂ پنجاب یونیورسٹی لائبریری۔ چہار گلشن پنجاب۔ تاریخ گورو خالصہ۔ تاریخِ پنجاب (انگریزی) سید محمد لطیف۔ بندہ سنگھ بہادر از سردار گنڈا سنگھ۔

حیدری فوج کی اس ناکامی کا سبب بظاہر تو طوفانِ باد و باراں معلوم ہوتا ہے مگر حیدری فوج میں اور بھی بہت سی خامیاں تھیں۔ جو شکست کا سبب بنیں۔ سید محمد قاسم نے عبرت نامہ میں حیدری فوج کے طرزِ عمل کی بہت مذمت کی ہے اور کربلا بیگم کی جنگ کی ذمہ داری انھیں پر ڈالی ہے جہاں تک حیدری فوج کی مساعی کا تعلق ہے۔ ان سے باشندگانِ لاہور کو فائدہ یہ ہوا۔ کہ بندہ بیراگی نے لاہور کو مسلح اور مضبوط خیال کرتے ہوئے اس شہر پر حملہ نہ کیا۔ اور یہ مقام بربادی سے بچ گیا۔

خطبۂ جمعہ

گیارہ اگست ۱۷۱۱ء کو شاہ عالم اول لاہور پہنچا ایسے حالات میں جب پنجاب میں سکھ۔ ہند میں جاٹ اور راجپوت اور دکن میں مرہٹے مسلمانوں کی حکومت اور سطوت تو کیا اُن کی ہستی مٹانے کے درپے تھے۔

بادشاہ نے یہ حکم دیا کہ جمعہ کے خطبہ میں حضرت علیؓ کے نام کے ساتھ "وصیِ رسول اللہ" کے الفاظ کا اضافہ کیا جائے۔ واضح رہے کہ جمعہ کے روز نماز سے پہلے امام خطبہ پڑھتا ہے جس کے آخر میں اہلِ سنت کی مساجد میں نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین اور حضرات حسنین کے نام لیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد بادشاہِ وقت کے لیے دعا کی جاتی ہے۔ مغلیہ دور میں خلفا اور بزرگانِ دین کے بعد بادشاہِ وقت کا شجرہ امیر تیمور تک پڑھا جاتا تھا۔ اثنا عشری شیعوں کے ہاں چہاردہ معصومین کے اسمائے گرامی کا ذکر ہوتا ہے۔ اسماعیلی شیعہ اپنے اماموں کے اسماء خطبہ میں لاتے ہیں۔ مورخین کا بیان ہے کہ بادشاہ شیعہ بن گیا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر بادشاہ شیعہ مذہب سے وابستگی کی وجہ سے یہ حکم دیتا تو خطبہ میں پہلے تین خلیفوں کے ناموں کو حذف کرا دیتا اور اثنا عشری اماموں کے اسما کا اضافہ کرنے کا حکم دیتا۔ لیکن مورخین نے نماز اور خطبہ میں "وصیِ رسول اللہ" کے الفاظ کے اضافہ کے سوا خطبہ میں کسی تبدیلی کا ذکر نہیں کیا۔ بادشاہ کا خیال یہ تھا کہ چونکہ اکثر احادیث میں حضرت علی کے لیے اِن الفاظ کا ذکر ملتا ہے اس لیے خطبہ میں اُن کے دیگر القاب کے ساتھ اِن کا بھی اضافہ کر دیا جائے۔

بادشاہ کی اس تجویز کو بعض فقیہوں نے ناپسند کیا۔ چنانچہ احمد آباد اور کشمیر وغیرہ میں فسادات بھی ہوئے اور خطیب مارے گئے۔ لاہور میں فقیہوں نے فیصلہ کیا کہ کوئی خطبہ نہ پڑھا جائے۔ لاہور پہنچنے پر بادشاہ نے حاجی یار محمد، محمد مراد اور بعض دیگر عالموں کو دربار میں طلب کر کے کئی روز ان سے مناظرہ کیا آخر حاجی یار محمد کی جرأت اور بے باکی سے متاثر ہو کر بادشاہ نے اپنا حکم واپس لے لیا اور اجازت دے دی کہ خطبہ اسی طرح پڑھا جائے۔ جس طرح اورنگ زیب کے زمانے میں پڑھا جاتا تھا۔ اِس سے یہ فتنہ فرو ہوا۔

بہادر شاہ کی وفات

جنوری ۱۷۱۲ء کے وسط میں بادشاہ کی صحت خراب ہو گئی اور ۲۷ر فروری ۱۷۱۲ء کو اُس کا انتقال ہو گیا۔ مولوی مراد اللہ محفوظ خاں اور مولوی عبدالقادر نے لاش کی تجہیز و تکفین کی مگر گیارہ اپریل تک لاش اسی طرح کیمپ میں پڑی رہی۔ جنگِ تخت نشینی کے فیصلے کے بعد ملکہ مہر پرور اور چین قلیچ محمد خان کی نگرانی میں دہلی بھیجی گئی اور حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے روضہ کے متصل ایک مسجد کے صحن میں دفن کی گئی۔

شاہ عالم اول کے بعد پھر کسی مغل بادشاہ کو لاہور آنا نصیب نہ ہوا۔

فرزندانِ شاہ عالم اوّل میں جنگِ تخت نشینی

مغلیہ خاندان میں انتہائی شائستگی علمی اور سیاسی سربلندی کے باوصف یہ کمزوری تھی کہ وہ کوئی اصولِ جانشینی متعین نہ کر سکے اُن کے خاندان نے یہی روایت قائم کی کہ اپنے پیش رو کا وارث بقولِ لین پول اپنے عزیزوں کے خون میں سے گذر کر تختِ حکومت تک پہنچتا تھا۔ تقریباً

ہر بادشاہ کو اپنے نہایت قریبی رشتہ داروں کے خون سے ہاتھ رنگنے پڑے۔

بہادر شاہ اول کے قیامِ لاہور کے دنوں میں جب اس کی صحت دن بدن گر رہی تھی اُس کے چاروں بیٹے تختِ حکومت کے لیے تگ و دو کرنے لگے۔ اُن کی باہمی بے اعتمادی اور خصومت بڑھنے لگی۔ اور امرا اِن شہزادوں سے ساز باز کر کے اِس دشمنی کی آگ کو ہوا دینے لگے۔ سب سے بڑا لڑکا جہاندار شاہ اِن سب میں مقابلتاً تہی دامن تھا۔ اُس کے پاس بمشکل ایک سو کے قریب سوار ہوں گے۔ اُس کا ارادہ تھا کہ باپ کی وفات کے بعد ملتان چلا جائے جہاں وہ حاکم رہ چکا تھا اور جہاں عمائدِ شہر اُس سے مانوس تھے۔ وہ اُن کی مدد سے اس خانہ جنگی میں حصّہ لینا چاہتا تھا۔

دوسرا لڑکا عظیم الشان اپنے دادا اورنگ زیب کے دورِ حکومت کے آخری برسوں میں کم و بیش دس سال تک بنگال اور بہار کا حاکم رہ چکا تھا۔ جاجاؤ کی جنگ میں وہ باپ کے پاس آیا اور پھر شاہی دربار اور کیمپ ہی میں رہا اور اپنے صوبے میں اپنے فرزند فرخ سیر کو بطورِ حاکم چھوڑ آیا تھا۔ روپے کی فراوانی کے سبب اُمرا اور عمائد اور سپاہ اُس کی مٹھی میں تھے۔ اور سب کا خیال تھا کہ یہ شہزادہ جو عقل و دانش اور فہم و فراست میں بھی اپنے بھائیوں سے ممتاز ہے تخت و تاج کا مالک بنے گا۔ اسی لیے بھائی اُس سے حسد کرتے تھے۔ تیسرا لڑکا رفیع الشان باپ کا لاڈلا تھا اور قیامِ کابل کے زمانے میں اُس کا سب سے اہم مشیر تھا۔ چوتھا بھائی جہان شاہ باپ کے اعتماد میں رفیع الشان کا شریک تھا۔ باپ کے زمانۂ حکومت میں علیل رہنے کے سبب امورِ سلطنت میں نمایاں دلچسپی نہ لے سکا تھا۔

ذوالفقار خان وزیر نے بھی عظیم الشان کے حضور باریابی حاصل کرنے کی کوشش کی مگر اُس کے ایک اونے درباری شیخ قدرت اللہ کی بدتمیزی نے وزیر کو عظیم الشان سے دُور کر دیا اور وہ جہاندار شاہ سے آس لگا بیٹھا۔ ذوالفقار خان نے تینوں بھائیوں کو عظیم الشان کے خلاف منظم کر دیا۔ اُن کے درمیان معاہدہ ہُوا اور اُس پر کاربند رہنے کے حلف اُٹھائے گئے۔ اس معاہدے کی رو سے جہاندار شاہ کو شہنشاہِ ہند بننا تھا۔ خطبہ و سکہ اُس کے نام کا چلنا تھا۔ کابل، ملتان اور ٹھٹھہ کے صوبے جہان دار شاہ کو اور نربدا کے جنوب میں دکن کا علاقہ جہان دار شاہ کو ملنا تھا۔ مالِ غنیمت تینوں بھائیوں میں یکساں تقسیم ہونا تھا۔ یہ خفیہ معاہدہ ذوالفقار خان نے دونوں شہزادوں کو غافل کرنے کے لیے کرایا تھا۔ اسی قسم کا ایک معاہدہ دارا شکوہ کے خلاف اورنگ زیب، مراد اور شجاع میں بھی ہُوا تھا۔ مگر اس کا بھی وہی حشر ہُوا۔ جو اِن کے دادا کے معاہدے کا ہُوا تھا۔

لاہور کے نواح میں بادشاہ اور شہزادے خیمہ زن تھے۔ بادشاہ کی وفات کی خبر گرم ہوتے ہی امرا چاروں شہزادوں میں سے کسی ایک سے جا ملے۔ کیمپوں کے مختلف تاجر اور شاگرد پیشہ بال بچوں کو سنبھالے شہر میں چلے گئے۔ شاہی کیمپ اور حرم اور بادشاہ کی نعش کی حفاظت کے لیے صرف چند امرا اسلام خان میر آتش حمید الدین خان اور دربار خان وغیرہ رہ گئے۔ اگر یہ لوگ بھی بھاگ جاتے تو یقیناً شاہی کیمپ لُٹ جاتے۔ شاہی کیمپ اور شہر کے درمیان شالامار کے قریب بہت سے لٹیرے اور بدمعاش جمع تھے۔ انھوں نے لوٹ مار مچا دی۔ شہر میں پناہ لینے والوں کو سر چھپانے کی جگہ نہ ملتی تھی۔ امرا کو موت اور بربادی نظر آ رہی تھی۔ سپاہ نے تنخواہوں کا بقایا وصول کرنے کے لیے خزانچیوں اور بخشیوں کے کیمپوں کو گھیرے میں لے لیا۔ اور جو کچھ ملا اُسے غنیمت سمجھا۔ کیمپ کے علاوہ شہر کے باشندے بھی ہراساں تھے۔ اور شہر کے نواح میں چاروں شہزادوں کی لاؤ لشکر سمیت موجودگی کی صورت میں جنگ لازمی تھی۔ الغرض بادشاہ کی موت نے قیامتِ صغریٰ کا نقشہ پیش کر دیا۔

عظیم الشان نے دریا کے کنارے اپنے کیمپ کے گرد توپیں لگا دیں اور اس طرح اپنے آپ کو محصور کر لیا۔ چار پانچ روز تینوں بھائیوں نے تیاری کر کے عظیم الشان کے خلاف سازشوں میں صرف کر دیئے۔ ذوالفقار خاں وزیر نے ان تیاریوں میں نمایاں حصہ لیا اور عظیم الشان کی توپوں کا مقابلہ کرنے کے لیے قلعہ اور فصیل شہر سے بڑی بڑی توپیں اتروائیں اور میدان جنگ میں لے گیا۔ ان میں سے تین توپیں اس قدر بڑی تھیں کہ ان میں سے ہر ایک کو کھینچنے کے لیے ۲۵۰ بیلوں اور پانچ چھ ہاتھیوں کی ضرورت تھی۔ ان تیاریوں کے بعد تینوں بھائیوں نے اپنے پرانے کیمپوں کو چھوڑ دیا اور ایک دوسرے کے قریب کھلے میدان میں خیمہ زن ہو گئے۔ اس دوران عظیم الشان نے غلطی یہ کی کہ اپنے کیمپ سے باہر نکل کر بھائیوں پر حملہ نہ کیا۔ اس کے حامی امرا میں سے مرزا شاہ نواز خاں صفوی۔ امین الدین خاں۔ نعمت اللہ خاں۔ راجہ لکھن سنگھ کھتری۔ راجہ راج سنگھ بہادر اسے سمجھاتے تھے کہ کھلے میدان میں نکل کر حریفوں پر ہلہ بول دینا چاہیئے۔ مگر شہزادہ انھیں یہی جواب دیتا کہ "اندکے باشید" یعنی کچھ انتظار کیجئے۔ اس سے امرا کافی بے دل ہو گئے۔

عظیم الشان کو اپنی دولت پر بہت اعتماد تھا۔ اگرچہ اسے اپنے حامیوں اور سپاہ پر خرچ کرنے میں بخل سے کام لیا تھا۔ علاوہ ازیں اس نے اناج فروش بنجاروں سے عہد لیا ہوا تھا کہ وہ اس کے کیمپ میں غلے کی کمی نہ ہونے دیں گے۔ اس کا خیال تھا کہ حریفوں کے لشکر افلاس اور اناج کی کمی کے باعث میدان سے بھاگ نکلیں گے۔ ان تمام چیزوں کے باوصف عظیم الشان کا کیمپ سے باہر نہ نکلنا اور بھائیوں کو تیاری کی مہلت دے دینا اس کے لیے مہلک ثابت ہوا۔ ذوالفقار خاں کا عظیم الشان کے خلاف ہو جانا بھی بہت نقصان دہ تھا۔ ۱۴ مارچ ۱۷۱۲ء کو تینوں بھائی عظیم الشان کے مورچوں کے بالمقابل پہنچ گئے۔ دونوں طرف سے دلاوروں کے چھوٹے چھوٹے گروہ نکلتے اور مردانگی کے جوہر دکھا کر واپس چلے جاتے۔ ایک دوبار عظیم الشان کے مورچوں پر شبخون بھی مارے گئے جو سلیمان خاں پنی اور شاہ نواز خاں صفوی کی مساعی سے ناکام رہے۔ ۱۵ مارچ کو محصورین نے توپوں سے گولہ باری کی جس سے اگرچہ حریفوں کے چھکے چھڑا دیئے مگر انھوں نے مقابلہ جاری رکھا۔ اور شمالی جانب سے عبدالصمد خاں ترکی بہ ترکی جواب دیتے رہے۔ شاہ نواز خاں شہزادے کی اجازت کے بغیر دو ہزار سوار لے کر حصار سے باہر نکل گیا۔ عبدالصمد خاں اور جانی خاں نے اس کو روکا۔ جہاں دار شاہ کی سپاہ بھاگنے کو تھی کہ جہان شاہ فوج لیے آنکلا۔ اور شاہ نواز خاں کو پسپا کر دیا۔

اس معرکہ میں شاہزادہ قدرے زخمی ہوا اور شاہ نواز خاں کو جانی خاں نے پشت پر تلوار کے دو زخم لگائے۔ مختار خاں نے خوب بہادری کے جوہر دکھلائے۔ اس معرکہ میں عظیم الشان کے حامیوں میں سے رضا خاں اور کریم خاں مارے گئے۔ دوسرے روز رفیع الشان پانچ ہزار سوار لیے حریف پر حملہ آور ہوا۔ اس حملے کا جواب توپوں کے گولوں سے دیا گیا۔ مگر رفیع الشان کے سواروں کے مسلسل حملوں نے ان کے منہ پھیر دیئے۔ اسی اثنا میں جہاندار شاہ کے سپاہی ایک طرف سے عظیم الشان کے حفاظتی مورچوں پر چڑھ گئے اور اندر تیر پھینکنے شروع کر دیئے۔ سلیمان خاں پنی ۵۰۰ پٹھان سپاہی لیے ان کے مقابلے پر آ گیا۔ شاہ نواز خاں کی فوج کے ۲۰۰ سپاہی گل خان کی قیادت میں ان کی مدد کو آ گئے اور دشمن کو بھگا دیا۔ سلیمان خاں نے ان کا تعاقب کیا اور رفیع الشان کی فوج کے قلب کے سامنے آ گیا۔ اور عام معرکہ آرائی شروع ہوئی۔ رفیع الشان کی مدد کو ذوالفقار خاں

آ گیا۔ اسی اثنا میں گل خان کو ایک تیر گلے پر لگا اور وہ مارا گیا۔ سلیمان خان بھاگ کر مورچوں کے پیچھے آ گیا اور دشمن پر گولہ باری شروع کر دی۔ اُس روز فریقین کے بہت سے آدمی مارے گئے۔

ایک شب شاہ نواز خان نے کچھ قلماق غلام جہاندار شاہ کو خفیہ طور پر اُس کے خیمے میں جا کر اُسے قتل کر دینے پر مامور کئے۔ یہ لوگ رات کو خیمے کے اندر گھسے تو ایک خواجہ سرا نے ٹوکا جسے انھوں نے قتل کر دیا۔ اُس کی لاش خیموں کے رسّوں پر گری جو ہل گئے۔ علاوہ ازیں مرنے سے قبل اُس کی ایک چیخ بھی نکلی۔ اس پر حرم کی ایک قلماق ملازمہ رحیمن نام باہر نکلی خواجہ سرا کی لاش اور چند اجنبی دیکھ کر اس نے شور مچا دیا۔ اس پر وہ آدمی بھاگے رحیمن نے اُن کا تعاقب کیا۔ اُن میں سے ایک شخص کا پاؤں رسّے میں اُلجھا اور وہ گر پڑا۔ رحیمن نے خنجر سے اُس کا کام تمام کر دیا اور خود بھی قدرے زخمی ہوئی۔ اتنے میں بہت سے پہرہ دار آ گئے۔ اور اس بھیڑ میں بقیہ آدمی بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔

جنگ تخت نشینی کے خاتمے پر جب جہاندار خان نے جشن منایا تو رحیمن کو "رستمِ ہند" کا خطاب دیا۔

تیسرے دن شاہزادوں نے اپنی توپیں جو شہر سے میدانِ جنگ میں پہنچ گئی تھیں۔ پڑاؤوں پر نصب کر لیں جن کی گولہ باری سے محصورین بہت گھبرائے۔ اِس سے تنگ آ کر بہت سے اُمرا نے محاصرے سے نکلنا چاہا لیکن ناکام رہے۔ علاوہ اس کے دست بدست لڑائی بھی جاری رہی جس میں محصورین کی طرف سے سلیمان خان پنی۔ شاہ نواز خان۔ کیسری سنگھ۔ راجہ دیا بہادر ناگر نے اپنی اپنی سپاہ کی مدد سے حصّہ لیا اور حملہ آوروں کی طرف سے راجہ پرتھی راج بندیلہ۔ عبدالصمد خان۔ فتح اللہ خاں وغیرہ نے بہادری دکھائی۔ اسی اثنا میں یہ افواہ مشہور ہوئی کہ عظیم الشان میدانِ جنگ سے بھاگ جانے کا ارادہ کر رہا ہے۔

تین دن کی جنگ کوئی فیصلہ نہ کر سکی تو ذوالفقار خان کو نئی ترکیب سوجھی۔ بہت سے اُمرا فوجیں لیے دریا کی ریتی میں پڑے تھے اور وہ تقریباً غیر جانبدار تھے۔ اگرچہ اُن کے کیمپوں میں گاہے گاہے متحارب لشکروں سے توپوں کے گولے آ گرتے تھے۔ ذوالفقار خان نے بہادر شاہ اوّل کی وفات کے بعد سپاہی متعین کر دیئے تھے کہ کوئی شخص باہر نہ جانے پائے۔ دریا کے مختلف گھاٹوں پر بہت سخت پہرہ تھا۔ ذوالفقار خان کے دل میں خیال آیا کہ اگر گھاٹوں پر سے پہرہ اُٹھا لیا جائے تو یہ اُمرا اپنے متوسلین سمیت خطرہ کے پیشِ نظر بھاگ جائیں گے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ خود عظیم الشان کے لشکر سے بہت سے لوگ بال بچوں کو محفوظ مقام پر پہنچانے کے بہانے بھاگ گئے۔ ان لوگوں کو حریفوں نے کچھ نہ کہا بلکہ آسانی سے نکل جانے دیا۔ اس سے بھگوڑوں کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ بھاگنے والے اُمرا میں مہابت خان اور خانِ زمان (جو مرحوم منعم خان وزیر کے بیٹے تھے) اور حمیدالدین خان عالمگیری بھی تھے۔ جو راوی پار چلے گئے۔ بقولِ قاسم خان عبرت لاہوری انھوں نے شاہی مسجد میں پناہ لی۔ چوتھے روز چھ گھنٹے متواتر جنگ ہوئی۔ کیسری سنگھ مارا گیا۔ عبدالصمد خان نے کمال جرأت اور بہادری کا ثبوت دیا۔

شاہ نواز خاں بری طرح زخمی ہوا اور اُسے سترہ تیر لگے بعد ازاں انھیں زخموں کی وجہ سے وہ فوت ہو گیا۔ شاہ نواز خاں[1] صفوی خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ اِس کا شجرۂ نسب چھ واسطوں سے شاہ اسمٰعیل صفوی والیٔ ایران تک پہنچتا تھا جنھوں نے ۱۵۰۲ء سے ۱۷۳۶ء تک حکومت کی تھی۔ یہ خاندان کئی پشتوں تک اعلیٰ عہدوں پر ممتاز رہا۔ مغلیہ شاہی خاندان سے ان کی رشتہ داریاں بھی

---

[1] ذخیرۃ الخوانین جلد اوّل از شیخ فرید بھکاری (کراچی ۱۹۶۱ء ایڈیشن مرتبہ ڈاکٹر سید معین الحق صفحہ ۹۹ تا ۱۰۱۔ اس خاندان کے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہوئیں اور وقتاً فوقتاً اس دودمانِ عالیہ کی سات عفت شعار بیٹیاں خانوادۂ تیموریہ کے مختلف شاہزادوں کے محلوں کی زینت بنیں۔ شاہ نواز خان کے بعد اس خاندان کا کوئی فرزند ناموری حاصل نہ کر سکا۔ نام لیوا تو اس خاندان کے برصغیر میں اب بھی کہیں نہ کہیں ضرور ہوں گے۔

پرتھی راج اور عبدالصمد خان دشمن کو دبلتے ہوئے آگے بڑھتے رہے اور آخرکار جہاندار شاہ کی فوجیں عظیم الشان کے مورچوں میں گھس گئیں حتیٰ کہ عظیم الشان کا بڑا بیٹا محمد کریم میدان سے بھاگ کر راوی کے پار ایک غریب دھنیے کے گھر میں جا چھپا۔ جہاں سے اُسے بعد ازاں گرفتار کیا گیا۔ محمد قاسم عبرت کا بیان ہے کہ اُس نے محلہ تلبغہ (تل بگہ) میں جو ٹکسالی دروازے کے باہر تھا ایک جولاہے کے گھر میں پناہ لی۔ اُس کے بہت سے سپاہی بھی بھاگ کر شہر میں جا چھپے۔ یہاں تک کہ ساٹھ ستر ہزار فوج میں سے آخری روز شاہزادہ کے گرد بمشکل دو ہزار سپاہی ہوں گے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اُس روز عظیم الشان کے ذاتی جنگی ہاتھی نے اُسے سوار نہ ہونے دیا اور مہاوت کے قابو نہ آیا اُس کی جگہ دوسرا ہاتھی لایا گیا۔ آغازِ جنگ کے بعد تیز آندھی چلنے لگی اور کنارِ راوی کی ریت بادلوں کی طرح اُڑنے لگی۔ سوائے تاریکی کے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اور سوائے توپوں کی آوازوں کے کچھ سنائی نہ دیتا تھا شاہزادہ کے ہاتھی پر بھی گولے گرنے لگے۔ بعض خیر خواہوں نے اُسے بھاگ کر بنگال یا دکن چلے جانے کا مشورہ دیا مگر اُس نے ایک نہ مانی۔ اِسی اثنا میں ایک گولہ ہاتھی کی سونڈ پر لگا اُس کی سونڈ زخمی ہو گئی اور وہ خوفزدہ ہو کر بھاگا۔ امین الدین خان نے گھوڑے پر تعاقب کیا مگر ہاتھی اس رفتار سے بھاگا کہ گھوڑا پیچھے رہ گیا۔ حتیٰ کہ ہاتھی دریا میں گھس گیا اور سوار سمیت دلدل میں غرق ہو گیا۔ جب امین الدین خان کنارے پر پہنچا تو نیچے ملتی ہوئی دلدل میں ہاتھی کی خوفناک چنگھاڑ اور سوار کی آخری چیخوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ اور اس طرح تخت کے بہترین اور سب سے طاقتور وارث کا خاتمہ ہو گیا۔ امین الدین کو اس حادثہ کا اس قدر صدمہ ہوا کہ تن تنہا ساری رات درخت کے نیچے گزار دی۔ اور اگلے روز شہر میں چلا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حادثہ موجودہ گاؤں لکھو ڈہیر کے قریب شالامار باغ سے غالباً دس میل دور وقوع پذیر ہوا تھا۔

اس واقعہ کے بعد ذوالفقار خان بہت مغرور ہو گیا اور اُس نے چھوٹے دونوں شہزادوں جہان شاہ اور رفیع الشان کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ اُس کا مقصد یہ تھا کہ ان دونوں کا بھی خاتمہ کر دیا جائے۔ مالِ غنیمت کی تقسیم پر اختلافات شروع ہوئے اور ان کی خلیج دن بدن وسیع ہوتی گئی۔ ذوالفقار کے ارادوں کو بھانپ کر دونوں بھائیوں نے جنگ کی تیاری کا آغاز کیا اور عظیم الشان

دیگر افراد کے حالات کے لیے دیکھئے صمصام الدولہ شاہ نواز خان کی کتاب مآثر الامرا جلد دوم صفحہ ۷۰۰ جلد سوم صفحہ ۲۹۶، ۶۷۷، ۶۹۲۔

[1] بیان کیا جاتا ہے کہ شہزادہ کریم نے ایک روز خوراک وغیرہ ضروریات کا انتظام کرنے کے لیے ایک ہیرا جولاہے کو دیا۔ وہ غریب آدمی ایک بیش بہا ہیرا فروخت کرتا ہوا گرفتار کر لیا گیا تفتیش پر اُس نے ساری کہانی بیان کر دی۔ اور شاہزادے کو پکڑ کر ہدایت کیش واقعہ نگارِ کل جہاندار کی خدمت میں لے گیا۔ اُس نے شہزادے کو ذوالفقار خان کے حوالے کر دیا جس نے اُسے دو روز قید رکھ کر مروا ڈالا۔ کہتے ہیں کہ قتل سے قبل شاہزادے نے آنکھوں میں آنسو بھر کر یہ کہا کہ وہ تین دن کا بھوکا پیاسا ہے اُسے تھوڑا سا پانی اور روٹی دے دی جائے مگر کسی نے بھی اُس کی التجا کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور اُس پر مطلق رحم نہ کھایا۔ شہزادہ محمد کریم کی لاش جہانگیر کے مقبرے میں دفن کر دی گئی۔ مقبرے کے سامنے باغ میں دو احاطے قبروں کے ہیں انھیں میں محمد کریم کی قبر بھی ہے۔

کے سپاہیوں کو فوج میں بھرتی کرنا شروع کر دیا۔ ۲۶ مارچ ۱۷۱۲ء کو جہاں شاہ اپنے پرانے کیمپ سے جو مزار حضرت میاں میرؒ کے قریب تھا آگے بڑھا اور موضع ہانڈو گوجر کے متصل جہان شاہی شکارگاہ تھی خیمے لگا دیئے۔ جہاں دار شاہ نے کوکلتاش خان اور عبدالصمد خان کو جو اب میر آتش کے عہدہ پر فائز ہو چکا تھا اُس کے خلاف بھیجا۔ جنگ توپوں کے مقابلہ تک محدود رہی۔ جہان شاہ کا میر آتش رستم دل خان تھا۔ اگلے روز ۲۷ مارچ کو لُو اور گرمی کے باوصف جہان شاہ نے رستم دل خان، جانی خان اور مخلص خان اپنے جرنیلوں کو حریف پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ رستم دل خان نے جہاندار شاہ کے ہراول دستوں کو بھگا دیا اور جلد اُس کے قلب میں پہنچ گیا۔ اور جہاندار شاہ کے بڑے لڑکے عزالدین کو گرفتار کر لیا۔ اس سے تھوڑی دور ایک چھوٹا جنگی خیمہ تھا جہاں جہاندار شاہ نے اپنی محبوبہ لال کنور کی معیت میں رات گزاری تھی۔ اس اچانک حملے کی خبر سن کر وہ ہاتھی پر سوار ہو کر میدان میں نکلا اور لال کنور شہر کی طرف بھاگی اور دارا شکوہ کی حویلی میں جو اب اُسے مل چکی تھی پناہ لی۔

رستم دل خان نے دشمن کو دھکیل کر جہاں دار شاہ کے ہاتھی کے پاس پہنچنے کی کوشش کی۔ شہزادے کے محافظین دلیر دل خان، لطف اللہ خان اور رائے صورت سنگھ ملتانی نے اپنے آقا کی حفاظت کی پوری کوشش کی۔ شہزادے نے بھی اپنی عماری کے گوشے میں چھپ کر جان بچانے کی اس طرح کوشش کی کہ دشمن دھوکے میں آ گیا کہ عماری خالی ہے اور شہزادہ اُتر کر کہیں چلا گیا ہے۔ اسی اثنا میں خبر ملی کہ جہان شاہ مارا گیا ہے۔ اس اطلاع نے رستم دل خان کے چھکے چھڑا دیئے۔

جہان شاہ لڑتا لڑتا گرد و غبار کے سبب اپنی فوج سے علیحدہ ہو گیا اور چند ساتھیوں اور سپاہیوں کے ہمراہ ایک جڑے ہوئے گاؤں کے پاس جا پہنچا جس میں جہاندار شاہ کے کچھ بندوقچی بھاگ کر چھپے ہوئے تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ دشمن کے سپاہی آن پہنچے ہیں تو انھوں نے بندوقیں چلانی شروع کر دیں جس پر جہان شاہ کے آدمیوں نے سمجھا کہ دشمن کی بہت سی فوج مقابلے میں ہے۔ وہ حوصلہ ہار کر بھاگنے لگے۔ سپاہیوں کی بزدلی پر جھلا کر جہان شاہ نے ہاتھی کو آگے ریلا۔ حتٰی کہ چند دلیر جاں بازوں کے جھرمٹ میں وہ لڑتا لڑتا اپنے بیٹے فرخندہ اختر سمیت مارا گیا۔ اُدھر جہاندار شاہ مایوس ہو کر میدانِ جنگ سے نکلا ہی چاہتا تھا کہ ذوالفقار خان اُس کے حریف بھائی کا سر لے کر اُس کی خدمت میں پہنچا اور اُسے مبارک باد دی۔

رفیع الشان کا خاتمہ

جہاں شاہ اور جہاندار شاہ کے معرکہ میں رفیع الشان میدانِ جنگ سے دو کوس دور اپنی فوجیں لیے نتیجے کا منتظر کھڑا تھا۔ نجومیوں نے اسے علیحدہ رہنے کا مشورہ دیا تھا کہ انجام کار وہی کامیاب ہو گا۔ جہان شاہ کے خاتمے کی اطلاع ملتے ہی اس نے اپنا خواجہ سرا یہ معلوم کرنے کے لیے بھیجا کہ جہاندار شاہ کا اس کے متعلق کیا ارادہ ہے۔ خواجہ سرا کیمپ میں پہنچا تو سارا دن کی جنگ کے بعد جہاندار شاہ اور اس کا وزیر سو چکے تھے۔ البتہ کوکلتاش خان نے جو بخت بیوقوف انسان تھا خواجہ سرا سے کہا "شاید آپ جہان شاہ سے ملنے تشریف لائے ہیں۔ وہ دیکھئے سامنے میدان میں باپ بیٹے کی لاشیں پڑی ہیں۔ رفیع الشان سے کہئے کہ اگر وہ لڑنا چاہتا ہے تو اس کا بھی یہی انجام ہو گا۔" خواجہ سرا نے واپس آ کر اپنے آقا کو بتایا کہ جہاندار شاہ کے عزائم خطرناک ہیں۔ اسی وقت مجلس مشاورت طلب کی گئی مگر وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ دن چڑھے ۲۸ مارچ ۱۷۱۲ء کو رفیع الشان نے جہان قلی خان اور منعم خان کو توپخانہ لیکر آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ فتح اللہ خان جسے بادشاہ نے بہت سا روپیہ دیا تھا اور وہ سپاہی جو زبردست خان (نبیرہ علی مردان خان) کی قیادت میں لڑنے کے لیے بھیجے گئے تھے دشمن سے جا ملے۔ ناتجربہ کار نئے سپاہی میدان سے بھاگ گئے۔ شمشیر خان، حاتم خان، کاظم خان، نجم ثانی، انوپ سنگھ مارے گئے اور اس کے گیارہ عزیز اور نور خان افغان شہزادے کے ہاتھی کے سامنے لڑتے ہوئے مارے گئے۔ رفیع الشان آخر کار تلوار ہاتھ میں لیے ہاتھی سے اُترا اور دست بدست جنگ کرتا ہوا مارا گیا۔

جہاں دار شاہ کا دورِ حکومت

یکے بعد دیگرے سب حریفوں کو ختم کرنے کے بعد جہاندار شاہ سریر آرائے سلطنت مغلیہ ہوا۔ ۲۹ مارچ ۱۷۱۲ء کو میدانِ جنگ ہی میں خیمے لگا لیے گئے اور ضروری رسوم کی ادائیگی کے بعد جہاندار شاہ کی بادشاہت کا اعلان کر دیا گیا۔

نئے بادشاہ کے وفاداروں، معاونوں اور اُس کے بھائیوں سے غداری کرنے والے ابن الوقت اور موقعہ شناس امرا کو انعامات اور اعلیٰ عہدے دیے گئے۔ زبردست خاں کو اُس کے دادا کا لقب علی مردان خاں بطور خطاب عطا کر کے لاہور کا گورنر بنایا گیا۔ رستم دل خاں کو جو اسیروں میں تھا انتہائی مظالم کا ہدف بنا کر قتل کر دیا گیا اور اس کی ضبط شدہ جائداد جو بیس لاکھ روپیہ کی مالیت کی تھی عبدالصمد خاں کو عطا کی گئی۔

یکم مئی ۱۷۱۲ء کو جہاندار شاہ لاہور سے دہلی روانہ ہوا۔ وہ عظیم الشان فوج جسے لے کر بہادر شاہ اوّل بندہ بیراگی کے استیصال کے لیے واردِ پنجاب ہوا تھا، بھائیوں کی خانہ جنگی میں برباد ہو گئی۔ جہاندار شاہ باپ کے مشن کو بھلا کر بقیۃ السیف فوج اور امرا کے ہمراہ لاہور سے ایسے وقت چلا کہ اُس کے بعد پھر کسی مغل تاجدار کو لاہور آنا نصیب نہ ہوا۔ اس کی فوج کے ہمراہ بہادر شاہ اول جہاں شاہ اس کے فرزند فرخندہ اختر اور رفیع الشان کے تابوت تھے جنھیں دہلی میں سپردِ خاک کرنے کے لیے لے جایا جا رہا تھا۔ دہلی جا کر بادشاہ اور اس کی محبوبہ لال کنور عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے لگے۔

اسی اثنا میں عظیم الشان کا دوسرا لڑکا فرخ سیر جو بہار میں تھا باپ کا بدلہ لینے اور دہلی کا تخت حاصل کرنے کے لیے اٹھا۔ ساداتِ بارہہ کے سردار سید عبداللہ اور سید حسین علی خاں اُس سے مل گئے۔ اور آخر کار فرخ سیر چند معرکوں کے بعد دہلی پر قابض ہو گیا۔ ۱۱ فروری ۱۷۱۳ء کو جہاں دار شاہ دس مہینے اور ۲۵ دن حکومت کرنے کے بعد نہ صرف تخت و تاج بلکہ جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔ اور اسے ہمایوں کے مقبرے میں دفن کر دیا گیا۔

عبدالصمد خاں ناظم لاہور

اسی اثنا میں لاہور کا حاکم زبردست خاں (علی مردان خاں) فوت ہو گیا اور اُس کی جگہ عبدالصمد خاں کو لاہور کا حاکم ۲۲ فروری ۱۷۱۳ء کو مقرر کیا گیا۔ اُس کا سوتیلا بھائی اعتمادالدولہ محمد امین خاں بہادر مرکزی حکومت کا بخشی ثانی مقرر ہوا تھا۔ یہ محمد امین خاں چین قلیچ خاں (مآثر الامرا جلد اوّل صفحہ ۳۴۶) (نظام الملک اول بانی سلطنت حیدرآباد دکن) کا چچا زاد بھائی تھا۔ عبدالصمد خاں پنجاب میں آیا تو اسے معلوم ہوا کہ بہادر شاہ اول کی وفات کے بعد اس کے فرزندوں میں جنگِ تخت نشینی، جہاں دار شاہ کے عیش و عشرت اور فرخ سیر سے اس کی جنگوں کے سبب بندہ بیراگی کو اپنی پہاڑی پناہ گاہوں سے نکل کر میدانی علاقوں کو تاخت و تاراج کرنے اور مسلمانوں کو بے پناہ نقصان پہنچانے کا موقعہ مل چکا تھا۔ بندہ اب پہلے سے زیادہ مضبوط اور خونخوار ہو چکا تھا۔ سادھورے کے قریب بندہ نے ایک مضبوط قلعہ بنوایا اور وہاں مقیم تھا۔ عبدالصمد خاں نے اپنے فرزند زکریا خاں فوجدار جموں اور زین الدین احمد خاں فوجدار سرہند کی مدد سے بندہ کو کئی معرکوں میں شکست دی۔ تقریباً آٹھ ماہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ آخر گورداسپور کے قریب لوہگڑھ کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا گیا جہاں بندہ بیراگی مقیم تھا۔ مقابلے کی تاب نہ لا کر بندہ بیراگی نے ہتھیار ڈال دیے اور شاہی حکام نے ۷ دسمبر ۱۷۱۵ء کو اُسے گرفتار کر لیا۔ ان خون آشام اسیروں کو زکریا خاں اور قمرالدین خان کی

نگرانی میں دہلی بھجوا دیا گیا۔ بندہ کو آہنی پنجرہ میں بند کر کے بھیجا گیا۔ ان اسیروں کی تعداد ۷۴۰ تھی۔

بندہ اور اس کے ساتھی دہلی میں ابراہیم خاں میر آتش اور سربراہ خاں کوتوال کے حوالے کر دیے گئے جو انھیں بہادر شاہ اول کے مرقد کے پاس لے گئے اور جس طرح بندہ سنگھ بہادر نے ہزاروں بے گناہ مسلمان مرد عورت اور بچوں کا خون بہایا تھا اُسے اور اس کے ساتھیوں کو کیفر کردار تک پہنچا دیا گیا۔ (منتخب اللباب خوافی خاں جلد دوم ص ۷۶۶)

بندہ بیراگی کا خاتمہ عبدالصمد خاں کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

بندہ بیراگی کی جادوگری اور شعبدہ بازی کی کہانیوں نے عام مسلمان سپاہیوں کو اُس سے مرعوب کر دیا تھا۔ عبدالصمد خاں حضرت عبیداللہ احراری کی اولاد سے تھا اور خود زاہد و متقی اور عابدِ شب زندہ دار تھا۔ دن اس کا گھوڑے کی پشت پر دشمنانِ اسلام سے شمشیر زنی میں بسر ہوتا اور رات مصلّٰئ عبادت پر۔ خدا نے اس کی دعاؤں کو شرفِ قبولیت بخشا اور اسلامی آبادیوں کو نذرِ آتش کرنے والے بندہ کا جادو خانوادۂ نقش بند کے اسی درویش شمشیر زن کی مساعی کے سامنے باطل ہو گیا۔ اور پنجاب میں امن و امان اور خوشحالی و فارغ البالی کا دور شروع ہوا۔

فرخ سیر کی موت

دہلی میں امرا کی طاقت بڑھ گئی وہ مختلف جماعتوں میں بٹ کر اپنے خود غرضانہ عزائم کی تکمیل میں مصروف ہو گئے۔ بادشاہ گر سید بھائی فرخ سیر کو تنگ کرنے لگے اور آخر کار اُسے ۲۸ فروری ۱۷۱۹ء کو معزول کر دیا گیا۔ تقریباً دو ماہ کی قید کے بعد ستائیس اور اٹھائیس اپریل کی درمیانی شب کو اُسے مروا دیا گیا۔ اور اُس کی لاش ہمایوں کے مقبرے میں دفن کر دی گئی۔

ایک برس میں تین تاجدار

اس واقعہ کے بعد سید بھائیوں کا زور بہت بڑھ گیا اور ۱۷۱۹ء میں انھوں نے یکے بعد دیگرے رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ (شاہجہان ثانی) کو تخت پر بٹھایا۔ آگرے میں نکو سیر نے کوسِ شہنشاہی بجایا۔ مگر یہ بیل منڈھے نہ چڑھی۔ آخر کار قرعۂ فال محمد شاہ کے نام پڑا۔ اور وہ تختِ حکومت پر بٹھایا گیا۔ یہ دونوں شہزادے بیوہ خانے سے لیے گئے تھے۔ اور بیس اکیس سال ان کی عمر تھی۔ دونوں دق کا شکار تھے۔ افیون کی عادت نے صحت اور خراب کر دی تھی۔ مگر خود غرضوں نے ان کی صحت کا خیال نہ کیا اور یہ دونوں برس کے اندر اندر فوت ہو کر قطب مینار کے نزدیک درگاہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے قریب دفن ہوئے۔

محمد شاہ کا دور

۲۸ ستمبر ۱۷۱۹ء کو بہادر شاہ اول کے بیٹے جہاں شاہ کا فرزند روشن اختر محمد شاہ کے لقب سے دہلی میں تخت نشین کیا گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ قلعہ سلیم گڑھ کے بیوہ خانے میں جب سید بھائیوں کے نمائندے اسے بادشاہ بنانے کے لیے لینے گئے تو اس کی ماں ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی کہ "مجھ بیوہ پر رحم کرو اور میرے یتیم بچے کو بادشاہ نہ بناؤ۔ اور اس کی جوانی پر رحم کھاؤ۔"

۱۷۱۹ء میں گویا مغلیہ حکومت اس مقام پر پہنچ چکی تھی کہ تاجپوشی خونریزی کا پیش خیمہ سمجھی جاتی تھی۔

شاہی خاندان کے افراد کی خود غرضیوں اور خانہ جنگیوں نے امرا کو اپنی طاقت بڑھانے اور اپنی اغراض کے لیے شاہی خاندان کو ناکارہ بنانے اور حکومت کو نقصان پہنچانے کا موقعہ دے دیا تھا۔ بہر حال محمد شاہ نے ۲۹ سال حکومت کی۔ اُس کے دورِ حکومت کے تمام واقعات سے ہمیں سروکار نہیں کیونکہ ربع صدی کے طویل دورِ حکومت میں وہ ایک بار بھی لاہور نہ آیا۔ اور اُس کا زیادہ وقت لال قلعہ دہلی کی سنگین دیوار

کے امرا، گو وزرا محمد امین خاں کی سعی اور بادشاہ کی دور اندیشی نے ملک کو بادشاہ گر سید بھائیوں سے نجات دلائی۔ اس کے بعد اگر محمد شاہ اپنی وسیع مملکت کے مختلف حصوں کا دورہ کرتا رہتا جس سے حکومت کے اہلکاروں اور منصب داروں کا احتساب ہوتا اور سرحدوں کی حفاظت اور ساحل بحری کی نگرانی کا خاطر خواہ انتظام کرتا تو یقین ہے کہ مغلوں کا گرتا ہوا وقار سنبھل جاتا اور نظام حکومت کا بکھرتا ہوا شیرازہ درست ہو جاتا لیکن عالم یتیمی میں بیوہ خانے کے اندر پلا ہوا نوجوان حکومت کے تقاضوں کو کماحقہ نہ سمجھ سکا۔ اس کے نورانی وزرا محمد امین خان، نظام الملک آصف جاہ اور قمر الدین خاں نے حالات کی اصلاح کی طرف توجہ کی مگر ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کے حملے نے حکومت کی کمزوری اور نظام سلطنت کی پراگندگی کو بالکل واشگاف کر دیا۔ اور مغل شہنشاہیت کا بھرم کھل گیا۔

ناظمان لاہور

جہاں تک صوبۂ لاہور کا تعلق ہے یہاں ۱۷۱۳ء سے ۱۷۲۶ء تک عبدالصمد خان دلیر جنگ اور ۱۷۲۶ء سے ۱۷۴۵ء تک اُن کا فرزند زکریا خان ناظم رہے۔ ۱۷۲۶ء سے ۱۷۳۷ء تک عبدالصمد خاں صوبۂ ملتان کا ناظم رہا اور اُن کی وفات کے بعد صوبۂ ملتان بھی زکریا خان کو مرحمت ہوا۔ اس دور میں صوبجات کے ناظموں کو اپنے اپنے علاقوں کی اندرونی حکومت کے سلسلہ میں مکمل اختیار تھا۔ اور نظامتیں اور صوبہ داریاں موروثی بن گئی تھیں۔ یہ لوگ شہنشاہ دہلی کی وفاداری کا دم ضرور بھرتے تھے۔ سکہ اور خطبہ انھیں کے نام کا تھا اور صوبہ دار انھیں کے نام پر اپنی مرضی اور قابلیت کے مطابق حکومت کرتا تھا۔

عبدالصمد خاں اور زکریا خاں بیدار مغز حکمران تھے۔ انھوں نے صوبجات لاہور و ملتان کا انتظام اس قابلیت سے کیا کہ اس کی مثال اس صدی کی تاریخ پاکستان و ہند میں بمشکل ملے گی۔ ۱۷۱۳ء سے کر لاہور پر بھنگی مثل کے سکھ سرداروں کے قبضے تک لاہور کی تاریخ صوبائی ناظموں کے عروج و زوال کی تاریخ ہے۔ موجودہ انجنیئرنگ کالج کے عقب میں محلہ بیگم پورہ عبدالصمد خاں کی بیوی بیگم جان ہی کا آباد کیا ہوا ہے۔ اس کے جر گوشے میں اس خاندان کے فلک رفعت محلات، خوبصورت باغات اور قیمتی مقبرے تھے جن کا سلسلہ باغبانپورہ سے جاہ میراں تک پھیلا ہوا تھا۔ ۲۶ جولائی ۱۷۳۷ء کو عبدالصمد خاں اور ۱۷۴۵ء میں زکریا خاں فوت ہو کر بیگم پورہ ہی میں دفن ہوئے۔ عبدالصمد خاں کی کاشی کار مسجد، بیگم جان، بالو بیگم، شرف النسا اور ملکہ زمانی وغیرہ کی چند قبور، بعض حویلیوں اور حماموں کے کھنڈرات اب تک وہاں موجود ہیں۔ بندہ بیراگی کا خاتمہ عبدالصمد خاں کے ہاتھوں ہوا تھا۔ اس کے بعد بھی ناظمان لاہور نے سکھوں کو پے در پے شکستیں دی تھیں اس لیے سکھ انتقامی جذبے سے بار بار بیگم پورہ پر حملے کرتے اور اسے لوٹتے تھے۔ ان کی لوٹ مار اور آتش زنی سے بیگم پورہ کی عمارتوں کو بہت نقصان پہنچا۔ بیگم پورہ کے مفصل تاریخی حالات ذیل کی مستند کتب میں دیکھے جا سکتے ہیں:۔

"بدائع وقائع" از آنند رام مخلص بعصر مورخ مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری ورق ۲۲۰ (الف)

عبرت نامہ مفتی علی الدین روٹو گراف پنجاب یونیورسٹی لائبریری ورق ۲۶ (الف)

تحقیقات چشتی صفحات ۴۴۴ - ۶۴۱

تاریخ لاہور رائے بہادر کنہیا لال صفحہ ۹۴ تا ۷۴

ہسٹری آف لاہور از سید محمد لطیف صفحہ ۱۲۸

لاہور عہد مغلیہ میں از منشی محمد الدین فوق مرحوم

نواب زکریا خاں

نواب زکریا خاں اپنے والدین کے چہیتے فرزند تھے اور نواب عبدالصمد خاں نے انھیں بے حد لاڈ پیار سے پالا پوسا اور پروان چڑھایا تھا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ وہ کس سال کتم عدم سے عالم وجود میں آئے لیکن ۱۷۱۵ء کے واقعات کے ضمن میں وہ بھی بندہ بیراگی کے خلاف معرکوں میں حصہ لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس وقت

آپ کی عمر بیس سال کے لگ بھگ ہو۔ آپ کا انتقال ۱۷۴۵ء میں ہوا۔ انند رام مخلص اور دیگر ہم عصر مورخین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ان کی عمر چنداں زیادہ نہ تھی، اور ان کا انتقال ایک بے موقع حادثہ تھا۔ اگر اس وقت نواب کی عمر پچاس سال کے قریب تصور کر لی جائے تو اُن کی پیدائش ۱۶۹۵ء کے قریب عالمگیر کے عہد میں ہوئی۔

نواب زکریا خاں کے اطوار و اخلاق اور طریق حکمرانی کے بغور مشاہدے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ کی تعلیم و تربیت کا انتظام کمال اہتمام سے کیا گیا تھا۔ اور علاوہ علوم مروجہ و اسلامیہ کے آپ کو فنونِ حرب سے بھی واقف کرایا گیا۔ نواب زکریا خاں کی شادی نواب محمد امین خاں وزیر دہلی کی صاحبزادی سے ہوئی۔ جو اُن کے سوتیلے چچا تھے اور جن کی بیگم آپ کی حقیقی خالہ تھیں۔

نواب زکریا خاں کی زوجہ کو محل میں بہو بیگم کا خطاب حاصل تھا۔ صفحات تاریخ میں آپ کے دو فرزندوں کا ذکر ملتا ہے۔ جن کے اسمار نواب یحییٰ خاں اور نواب شاہ نواز خاں تھے۔

نواب زکریا خاں ۱۷۲۶ء سے ۱۷۴۵ء تک انیس سال صوبۂ لاہور کے ناظم رہے۔ ان کی عدالت پروری اور رعایا پروری اور ترقی تاریخ میں اپنی نظیر آپ ہے۔ بقول غلام علی نقوی صاحب "عماد السعادت" ان کے عدل و انصاف کے سامنے نوشیرواں کا عدل و انصاف فسانۂ بے اصل معلوم ہوتا ہے۔

ان کے عہد میں لاہور کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں کئی بار چپقلش ہوئی۔ مگر انھوں نے کمال رواداری سے کام لیتے ہوئے فریقین میں صلح کرا دی اور یہی امر ان کی حکومت کی کامیابی اور ہر دلعزیزی کی دلیل ہے۔

ہرنام سنگھ نے "سعادتِ جاوید" میں ان کے عدل کی ایک نہایت دلچسپ داستان بیان کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اکثر بھیس بدل کر شہر میں گشت لگایا کرتے تھے۔ اور ہر مقدمے کا فیصلہ جو ان کے پاس آتا تھا کمال غور و فکر سے کیا کرتے تھے۔

اس دور میں پنجاب کے مختلف شہر صنعت و حرفت کے مراکز تھے اور پنجاب کی مصنوعات کی دُور دُور تک مانگ تھی۔ رعایا خوشحال اور زمیندار مالا مال تھے۔ یوں تو تمام صوبہ لاہور ہی معراج ترقی پر فائز تھا۔ مگر جالندھر دوآبہ اور چار محال کے علاقے خاص طور پر ممتاز تھے (چار محال سے مراد گجرات، پسرور، اورنگ آباد اور سیالکوٹ کا علاقہ تھا)

اس وقت بے شمار علماء و فضلاء پنجاب کے مختلف شہروں میں مقیم تھے جو ترویج علوم میں مشغول تھے۔ لاہور، گجرات، سیالکوٹ اور جالندھر تو گویا رشک خطۂ یونان تھے۔ حضرت حامد قادری جن کا مدرسہ محلہ مغلپورہ لاہور میں تھا۔ اور حضرت شاہ محمد غوث جن کا مزار باغ بیرون دہلی دروازہ میں واقع ہے۔ اس دور کے ممتاز اور مقتدر علماء میں سے تھے۔

دیوان لکھپت رائے:۔ دور مغلیہ میں ہندو ہمیشہ اعلیٰ عہدوں پر فائز نظر آتے ہیں۔ چنانچہ نواب زکریا خاں کے دور میں بھی دیوان یعنی مہتمم مالیات کا عہدہ دیوان لکھپت رائے کے پاس تھا۔ اس کا بھائی جسپت رائے بھی سرکار لاہور میں کسی عہدے پر متمکن تھا۔ یہ لوگ لاہور کے ایک مقتدر کھتری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ نواب صاحب ان پر بے حد اعتماد کرتے تھے۔ ان کی سر بفلک حویلیاں شاہ عالمی دروازے کے اندر واقع تھیں۔ دیوان لکھپت رائے نے کوٹ لکھپت نام ایک گاؤں لاہور کے متصل آباد کیا جو اب تک موجود ہے۔

نواب زکریا خاں اور نادر شاہ

۱۷۳۸ء میں ایران کا بادشاہ نادر شاہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ صوبہ کابل کے گورنر ناصر خاں نے دہلی کی مرکزی حکومت کو امداد کے لیے بارہا لکھا۔ مگر وہاں

ارباب اقتدار عیش و نشاط اور نشۂ مے پندار میں مست تھے۔ انھوں نے ان درخواستوں کی طرف توجہ نہ کی۔ اور نادر شاہ صوبۂ کابل کی فتح کے بعد دریائے اٹک عبور کرکے صوبۂ لاہور میں داخل ہو گیا۔ نواب زکریا خاں نے بھی دہلی کے ارباب حل و عقد کو متعدد مراسلے لکھے۔ مگر وہاں سے کوئی جواب نہ ملا۔ اور حملہ آور کا مقابلہ کرنے کے لیے اس نے تیاری شروع کر دی اور شہر لاہور کی فصیل پر توپیں چڑھا کر بچاؤ کا خوب انتظام کیا۔ نادر شاہ کا لشکر بے حد تجربہ کار اور جنگجو سپاہ پر مشتمل تھا۔ نواب زکریا خاں نے دیکھا کہ وہ تن تنہا مرکزی حکومت کی امداد کے بغیر اس کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔ لہٰذا اس نے فیصلہ کیا کہ حملہ آور سے صلح کر لی جائے۔ چنانچہ صلح کے بعد وہ نادر شاہ سے خود ملا جو اس کی دانائی، معاملہ فہمی اور دور اندیشی پر بہت خوش ہوا۔ اور بیس لاکھ روپیہ بطور نذرانہ وصول کرکے دہلی کی طرف چلا گیا۔ نواب زکریا خاں کی دور اندیشی نے بیس لاکھ روپے کے عوض لاہور کے پانچ لاکھ باشندوں کو اس تباہی و بربادی سے بچا لیا جو امرائے دہلی کی باہمی رقابت اور عاقبت نا اندیشی کے سبب دہلی کے مقدر میں لکھی جا چکی تھی۔

دہلی کی بربادی کے بعد نادر شاہ وطن کی جانب جاتے ہوئے پنجاب میں نواب زکریا خاں سے ملا۔ اور اس دلبستگی کی بنا پر جو اُسے نواب سے تھی۔ یہ کہا کہ آپ مجھ سے جو فرمائش کرنا چاہتے ہیں۔ بلا توقف کیجئے۔ وہ پوری کی جائے گی۔ نواب زکریا خاں کی خدا ترسی اور نیک دلی ملاحظہ ہو۔ جواب دیا کہ آپ وہ ہزارہا ہندوستانی اسیر اور اہل فن جو اپنے لشکر کے ہمراہ ایران لیے جا رہے ہیں۔ رہا کر دیں۔ نادر شاہ نواب زکریا خاں کی نیک نیتی اور رعایا پروری سے اس قدر خوش ہوا کہ اس نے تمام اسیروں کو رہا کر دیا۔ اور یہ لوگ نواب صاحب کے جان و مال کو دعائیں دیتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

نواب زکریا خاں کے دور کی بغاوتیں

صوبہ پنجاب جنگجو قبائل کا مستقر ہونے کے سبب اکثر فتنہ و فساد کا شکار ہوتا رہا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب بھی کوئی بڑا زمیندار یا جاگیردار کسی ناظم سے ناراض ہوتا تھا۔ جھٹ علم بغاوت بلند کرکے اور خم ٹھونک کر میدان میں آجاتا تھا۔ نواب عبدالصمد خاں دلیر جنگ کو بندہ بیراگی کے فتنے کے استیصال کے علاوہ عیسیٰ خاں منج اور حسین خاں خویشگی کے خلاف معرکہ آرا ہونا پڑا اور سخت خونریز جنگوں کے بعد ان کی بغاوتیں فرو ہوئیں۔ نواب زکریا خاں کے دور میں بھی صوبہ لاہور میں چند سرکشوں نے فتنے برپا کیے۔ مگر نواب نے کمال تدبر و حکمت سے ان کی سرکوبی کی اور اس صوبے میں امن و امان قائم رکھا۔ ذیل میں ان بغاوتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

جنگ پناہ بھٹی بقول صاحب "مآثر الامرا" "مفسدانِ تمرد پیشہ" سے تھا۔ اور حسن ابدال سے لے کر دریائے راوی کے کنارے تک تاخت و تاراج کیا کرتا تھا۔ نواب زکریا خاں نے اس کے استیصال کے لیے اپنے ایک معتمد راجہ کوڑا مل کو بھیجا۔ جس نے جنگ پناہ کو میدان جنگ میں ہی موت کے گھاٹ اتار دیا۔

میر مار ایک مقتدر زمیندار تھا۔ جنگ پناہ کے استیصال کے بعد اس نے سر اٹھایا۔ اور باری دوآب میں لوٹ مار کا بازار گرم کیا۔ اس کی سرکوبی کے لیے ایک ترکی الاصل جرنیل قزاق بیگ کو روانہ کیا گیا۔ اس نے باغی مذکور کو شکست دے کر زندہ گرفتار کر لیا اور لاہور میں اُسے بغاوت کے جرم میں پھانسی دے دی گئی۔

راجگان جموں کا دستور تھا کہ جب لاہور میں کوئی دلیر اور جری حاکم ہوتا تو وہ شاہ دہلی کے باج گزار بن جاتے۔ اور جب کوئی کمزور صوبے دار برسر اقتدار آتا تو بغاوت اور سرکشی اختیار کر لیتے۔ نواب عبدالصمد خاں کے دور میں دھوپ دیو والیٔ جموں نے بغاوت کی۔

نواب نے اس کی کماحقہ گوشمالی کی۔ اور اس نے ادائیگی خراج کا وعدہ کر کے اطاعت قبول کر لی۔ نواب صاحب کے ملتان تشریف لے جانے پر اس نے پھر بغاوت کی۔ یہ خبر ملتے ہی نواب زکریا خاں فوج جرار کی معیت میں اس کی تادیب کے لیے روانہ ہوا۔ اُدھر سے آدینہ بیگ خاں حاکم جالندھر دوآب ان کی امداد کے لیے آ گیا۔ نواب عبدالصمد خاں بھی ملتان سے جموں پہنچے۔ ایک زبردست معرکہ کے بعد راجہ جموں کو شکست ہوئی۔ راجہ نے تاوان جنگ اور خراج دے کر صلح کر لی۔ جب تک نظامت پنجاب مضبوط ہاتھوں میں رہی۔ والئ جموں کو سرکشی کی جرأت نہ ہوئی لیکن ۱۷۵۳ء میں نواب معین الملک کی اچانک موت کے بعد جب پنجاب میں ہلچل مچ گئی۔ تو راجہ دھوپ دیو کے فرزند رنجیت دیو نے پھر سرکشی اور خودسری اختیار کر لی۔

نواب زکریا خاں کی وفات

نواب زکریا خاں کا انتقال لاہور میں یکم جولائی ۱۷۴۵ء کو ہوا۔ اس رعایا پرور اور معدلت گستر حاکم کی وفات عوام کے لیے صدمۂ جاں ستاں سے کم نہ تھی۔ چنانچہ اس خبر کے مشہور ہوتے ہی شہر میں کہرام مچ گیا۔ بقول سید محمد قاسم نواب صاحب کے جنازے کے ہمراہ خلق خدا بلا امتیاز مذہب و ملت تا مرکنار تھی۔ آنند رام مخلص اپنی کتاب "بدائع وقائع" میں لکھتا ہے کہ نواب صاحب کے جنازے پر اس قدر پھول برسائے گئے کہ شہر میں اس وقت پھول نایاب ہو گئے۔ اور کسی قیمت پر نہ ملتے تھے۔ نواب زکریا خاں کو بیگم پورہ میں مقبرہ حضرت ایشاں کے قریب کاشی کار مسجد کے شمالی جانب خاندانی احاطہ قبور میں باپ کی قبر کے متصل دفن کیا گیا۔

حضرت ایشاں خواجہ محمود خاوند المتوفی ۱۰۵۲ھ کا لقب ہے۔ آپ جہانگیری اور شاہ جہانی دور کے ایک مقتدر بزرگ تھے آپ کا موجودہ ثریا بوس گنبد نواب زکریا خاں ہی نے بنوایا تھا۔ علاوہ ازیں انھوں نے حضرت مادھو لال حسین کے مزار کے متصل ایک مسجد بنوائی اس پر بہت سے کاشی کار کتبے ہیں یہ مسجد اب اگرچہ از سرِ نو تعمیر ہو چکی ہے لیکن کاشی کار کتبے اب تک باقی ہیں۔

زکریا خاں کا انصاف

اس جگہ ہم زکریا خاں کے عدل کی ایک داستان زیب قرطاس کرتے ہیں اس واقعہ کو ایک ہم عصر غیر مسلم مورخ "ہرنام سنگھ" نے "سعادت جاوید" میں بیان کیا ہے اور کتاب مذکور کے اس اقتباس میں شامل ہے جو ایلیٹ اور ڈاؤسن کی انگریزی تاریخ "ہندوستان کی کہانی اس کے اپنے مورخین کی زبانی" میں درج ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ زکریا خاں کے دورِ نظامت میں لاہور کے کسی محلہ میں ایک نیک نہاد ہندو عورت رہتی تھی جو حسن و جمال میں یگانۂ روزگار تھی اور ایک زمانہ اس کی عفت شعاری کا معترف تھا۔ ایک اوباش طبع مسلم نوجوان بھی لاہور میں مقیم تھا۔ لوگ اسے آغا کے لقب سے مخاطب کرتے تھے۔ اس کا کام یہ تھا کہ جہاں کوئی ماہ جبین نازنین پر نظر پڑی۔ اسے کسی نہ کسی طرح ورغلا کر اس کے گلشن عفت کو پامال کر ڈالا۔

اتفاق سے ایک روز اس ظالم نے مذکورہ صدر ہندو عورت کو دیکھا۔ اور اسے دامِ تزویر میں پھنسانے کے لیے بے قرار ہو گیا اس نے بہت سے پاپڑ بیلے۔ مگر کسی طرح بھی وہ اس پری کو شیشہ میں نہ اتار سکا۔ آخر کار اس نے ایک عجیب جال اس عفیفہ کو پھنسانے کے لیے بچھایا۔ ایک روز اس نے اپنے احباب کو دعوت دی کہ فلاں ہندو کی بیوی نعمتِ اسلام سے بہرہ ور ہو کر میرے حبالۂ نکاح میں آ رہی ہے۔ اس لیے احباب میرے غریب خانہ پر رونق افروز ہوں۔ اس تقریب پر اس نے علاوہ اپنے دوستوں کے بہت سے معززینِ شہر کو بھی مدعو کیا۔ مقررہ وقت پر حاضرین کے روبرو ایک عورت مکلف لباس میں ملبوس چادر میں منہ چھپائے لائی گئی۔ ایک مولوی نے پہلے اسے کلمہ پڑھا کر

مشرف بہ اسلام کیا۔ بعد ازاں آغا مذکور سے اس کا نکاح پڑھ دیا اور مہمانوں نے ضیافت کے بعد ہنسی خوشی اپنے اپنے گھروں کی راہ لی۔

دوسرے روز آغا اوباش طبع نوجوانوں کی معیت میں اس ہندو کے مکان پر پہنچا اور اسے کہا کہ تمہاری بیوی اسلام قبول کرنے کے بعد میرے نکاح میں آچکی ہے وہ اب تمہارے ہاں نہیں رہ سکتی لہٰذا اسے میرے ساتھ روانہ کر دو۔ یہ سن کر اس ہندو پر سکتہ کا عالم طاری ہو گیا۔ اس نے فرطِ تحیر سے آغا کو کہا کہ میری زوجہ گھر سے باہر نہیں نکلی۔ وہ تمہارے مکان پر جا کر مسلمان کس طرح ہوئی اور نکاح کب پڑھا گیا۔ اس پر آغا نے وہ لوگ پیش کیے جو اس واقعہ کو اپنی آنکھ سے دیکھ چکے تھے۔ اب تو ہندو مذکور بہت گھبرایا اور اس کے تمام احباب و اقربا بھی بہت نادم ہوئے۔ ایک دو سمجھدار آدمیوں کے مشورے پر لالہ نے اپنی زوجہ سے کہا کہ وہ اس معاملہ پر روشنی ڈالے یہ کہانی سن کر اس عورت کی عجیب کیفیت ہوئی۔ اس نے شوہر سے کہا کہ جب میں گھر سے نکلی تک نہیں اس شخص کا دعویٰ کیسے درست ہو سکتا ہے۔ میں مرنا قبول کروں گی مگر اس کے ہمراہ نہ جاؤں گی۔

اس پر عورت کے اقربا کا حوصلہ بڑھا اور انھوں نے یہ حکایت باور کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ دیکھ کر آغا نے ہندوؤں سے کہا کہ بات بڑھانے سے کیا فائدہ۔ جس قدر یہ جھگڑا طول پکڑے گا۔ اسی قدر آپ کی بدنامی ہو گی۔ آپ اپنے گھر کی تلاشی لیں۔ اگر آپ کے کپڑوں کے صندوقوں سے مسلمان عورتوں کے پہننے کا لباس عروسی جسے زیب تن کر کے عورت مذکور نے مجھ سے نکاح پڑھوایا تھا برآمد ہو جائے تو میں سچا ورنہ دروغ گو۔ بھلا بلا ثبوت اس دعوے کی جرأت کیسے ہو سکتی ہے۔

ہندوؤں نے گھر میں خوب اچھی طرح دیکھ بھال کی تو ان کے ایک صندوق میں واقعی مسلمان دلہنوں کے پہننے کا لباس مل گیا۔ جسے دیکھ کر وہ سب سناٹے میں آگئے تاہم ان کی غیرت نے اجازت نہ دی کہ عورت کو اس کی مرضی کے بغیر مسلمانوں کے حوالے کر دیں۔ آغا کے لئے چپ چاپ واپس آنے اور قاضی کی عدالت میں لالہ کے خلاف دعوےٰ دائر کرنے کے سوا اور کوئی طریق کار نہ تھا۔ قاضی نے فریقین کے بیان لے کر اور یہ سننے کے بعد کہ ہندو عورت کے کپڑوں میں مسلمان عورتوں کے لباس کا سا عروسی جوڑا مل گیا اور بعض لوگوں کی اس گواہی پر کہ ہمارے سامنے عورت مشرف بہ اسلام ہو کر آغا کے نکاح میں آئی یہ فیصلہ کیا کہ چونکہ زنِ مذکور اسلام قبول کر کے ایک مسلمان کے حبالۂ نکاح میں آچکی ہے اب اسے کسی حالت میں اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ مرتد ہو کر ایک مشرک کی زوجہ بن جائے۔

قاضی کے فیصلے کے خلاف ہندوؤں نے صوبہ دار کی عدالت میں اپیل کی تمام واقعہ نواب زکریا خاں کے گوش گزار ہوا تو وہ ششدر و پیچ میں پڑ گئے۔ نواب کا دستور تھا کہ وہ شام کے بعد بھیس بدل کر بیگم پورہ کے محلوں سے نکلا کرتے تھے اور شہر میں گھوم کر رعایا کے حالات سے آگاہی حاصل کرتے تھے۔ اس روز وہ حسب معمول بیگم پورہ سے نکلے تو پہلے ہندو مذکور کے محلے میں گئے۔ وہاں انھوں نے چند ہندوؤں کو باتیں کرتے سنا کہ اس عورت کو تو ہم ایک مدت سے جانتے ہیں۔ اس کے اطوار میں ہم نے سوائے نیک چلنی اور پاک دامنی کے اور کچھ نہیں دیکھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک پارسا عورت جو گھر سے بھی بہت کم باہر نکلتی ہے۔ دوسرے محلے میں مسلمانوں کے ہاں جا کر اپنا مذہب تبدیل کر کے ایک مسلمان سے شادی کرے یہ بات بہت عجیب معلوم ہوتی ہے۔

عورت کے محلے میں اس قسم کی باتیں سن کر نواب زکریا خاں نے آغا کے محلے کی راہ لی وہاں انھوں نے لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ آغا بڑے حد مکار اور عیار ہے اس نے ضرور چالبازی کی ہے اور اس پری کو کسی نہ کسی طرح شیشہ میں اتارنا چاہا ہے۔ ہم نے چادر میں لپٹی ہوئی ایک عورت کو مولوی صاحب کے سامنے آتے اور کلمہ پڑھتے دیکھا تو ضرور ہے مگر خدا جانے اس میں کیا عیاری ہے۔

اس کے بعد نواب صاحب سیدھے بیگم پورہ اپنے محل میں واپس آ گئے انھیں عورت کی شرافت اور آغا کی شرارت کی شہادت تو مل گئی مگر یہ حاصل نہ ہوا کہ اسلامی طرز کا لباس عروسی اس عورت کے کپڑوں سے کیسے ملا۔ اور وہ کس طرح وہاں پہنچا۔ وہ نادیر اس معاملہ پر غور کرتے رہے کہ کپڑوں کے خیال نے ان کا ذہن دھوبن کی طرف منتقل کیا۔

صبح ہوتے ہی نواب زکریا خاں نے اس دھوبن کو دربار میں طلب کیا جو اس ہندو عورت کے گھر کے کپڑے دھویا کرتی تھی اور اس سے یہ معلوم کرنا چاہا کہ اس ڈرامہ میں اس کا کس قدر حصہ ہے پہلے تو وہ عورت انکار کرتی رہی مگر جب ذرا سختی کی گئی تو اس نے اقرار کر لیا کہ آغا کے لالچ دینے اور بہکانے پر میں نے ہی وہ لباس ہندو عورت کے گھر میں اس کی نظر بچا کر رکھ دیا تھا۔ اور نکاح والے دن بھی میں ہی جا در میں لپٹی ہوئی مولوی صاحب کے روبرو آئی تھی۔ اور انھوں نے مجھے ہندو عورت قرار دیتے ہوئے کلمہ پڑھا کر مسلمان کیا تھا۔ اور آغا سے نکاح پڑھ دیا تھا۔

یہ سنتے ہی ناظم پنجاب نے حکم دیا کہ آغا اور دھوبن دونوں کو پھانسی کی سزا دی جائے جن کی اس حرکتِ قبیح نے نہ صرف شہر کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں کشیدگی پیدا کی بلکہ احکامِ شرعی کی بھی توہین کی۔ اس طرح بیگم پورہ کے نواب زکریا خاں نے اپنی بیدار مغزی اور عدالت پژوہی سے سماج کو ان خبیث روحوں سے نجات دلائی جن کا مشغلہ شرفا آزاری اور حرامکاری تھا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ہر مقدمہ میں نواب صاحب اسی طرح نہایت کاوش سے تحقیقات کر کے فیصلہ کیا کرتے تھے تاکہ نہ کوئی بے گناہ مارا جائے اور نہ کسی کے ساتھ زیادتی ہو۔ اور ان کی اسی سعی اور احتیاط کا نتیجہ تھا کہ ملک میں جرائم کا خاتمہ ہو گیا۔ اور لوگ خوشحالی و فارغ البالی سے زندگی بسر کرنے لگے۔

احمد شاہ درانی

احمد شاہ صوبہ ہرات کے سدوزئی افغانوں کے ایک خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ ان کا خاندان "ابدالی" کہلاتا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ابدالی درحقیقت "عبد علی" تھا جو بگڑ کر ابدالی بن گیا۔ خلیفہ رسول علی مرتضےٰ سے عقیدت کی بنا پر یہ لوگ "عبد علی" کہلاتے تھے۔ "ابدالی" کی ایک اور وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ان کے مورثِ اعلیٰ کا نام ابدال تھا۔

احمد شاہ کا باپ زمان خان ہرات سے ملتان چلا آیا تھا۔ اور احمد شاہ کی پیدائش ملتان میں ہوئی تھی۔ بعد ازاں یہ خاندان ہرات واپس چلا گیا جہاں احمد شاہ کے بڑے بھائی ذوالفقار خان نے خاصی اہمیت حاصل کر لی۔ ایران پر نادر شاہ کا تسلط ہوا۔ تو اس نے ابدالیوں کو نواحِ قندھار میں آباد کیا۔ احمد شاہ اس کی فوج میں شامل ہو گیا۔ اور اس نے بہت جلد اپنی دلاوری اور بہادری کے سبب نادر شاہ کے دربار میں بلند مقام حاصل کر لیا۔ وہ اس کے ذاتی محافظ دستے کا جو چھ ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ سالار مقرر ہوا۔

۱۷۴۷ء میں نادر شاہ کے ایرانی قزلباش سپاہیوں نے اس کے خلاف بغاوت کی اور سازش کر کے ۹ جون ۱۷۴۷ء کی رات کو شاہی کیمپ میں نادر شاہ کو قتل کر دیا۔ ان کا ارادہ دوسرے روز افغان سپاہ پر حملہ کر کے انھیں نقصان پہنچانے کا تھا۔ لیکن احمد شاہ کی سعی سے افغان سپاہی قتل و غارت سے بچ گئے۔ احمد شاہ نے مقتول شہنشاہ کے خزانے اور ذخائر کے بیشتر حصے پر قبضہ کر لیا۔ کوہِ نور ہیرا بھی اس کے ہاتھ لگا۔ یہ ہیرا نادر شاہ دہلی سے لے گیا تھا۔ اور افغان سپاہ کی مدد سے اس نے نادر شاہ کی سلطنت کے مشرقی حصہ پر جو کہ اکثر و بیشتر موجودہ افغانستان پر مشتمل تھا قبضہ کر لیا۔

تاجِ حکومت سر پر رکھتے ہی احمد شاہ نے مغلیہ ہندوستان کی طرف نگاہ دوڑائی۔ وہ نادر شاہ کے ہمراہ ۱۷۳۹-۱۷۴۰ء میں یہاں آیا تھا

یہاں کی حکومت کی کمزوری اور اکابر حکومت کی آرام طلبی کی بنا پر اُسے یقین تھا۔ کہ ذرا سی دوڑ دھوپ کے بعد وہ بآسانی نہ صرف مغلوں کے حکمرانوں کا وارث بن سکتا ہے۔ بلکہ تمام ہندوستان پر تسلط جما سکتا ہے۔ اس نے جلد ہی صوبہ کابل کو ناصر خان سے چھین لیا۔ اور دریائے سندھ سے لے کر خراسان تک تمام علاقے کا فرمانروا بن گیا۔

احمد شاہ نے جلد پنجاب پر یلغار کرنے کا ارادہ کیا۔ کیونکہ وہ افغان سپاہ کی توجہ سازشوں اور اندرونی جھگڑوں سے ہٹا کر بیرونی جنگوں کی طرف مبذول کرنا چاہتا تھا۔ لاہور کے حالات یہ تھے کہ ۱۷۴۵ء تک یہاں زکریا خان برسرِ اقتدار رہا۔ اس کی زندگی میں یہاں کے حالات بالکل درست رہے۔ لیکن یکم جولائی ۱۷۴۵ء کو زکریا خان کی آنکھ بند ہوتے ہی بیگم پورہ کی سیاسی فضا مکدر ہو گئی۔

نواب زکریا خان کے تین فرزند تھے۔ یحییٰ خان شاہ نواز خان اور میر باقی۔ یہ تینوں بھائی ایک ہی ماں کے شکم سے تھے۔ ان کی والدہ نواب زکریا خان کے سوتیلے چچا نواب محمد امین خان کی بیٹی اور وزیر قمر الدین کی بہن تھی۔ ان میں بڑا بھائی یحییٰ خان اپنے ماموں میر قمر الدین خان کا داماد بھی تھا۔ نواب زکریا خان کی وفات کے وقت یحییٰ خان دہلی گیا ہوا تھا۔ میر قمر الدین نے اسے بادشاہ کے حضور پیش کیا۔ اور سفارش کی کہ اسے ناظم لاہور و ملتان مقرر کر دیا جائے۔ مخالف جماعتوں کے اثر سے محمد شاہ شہنشاہ دہلی اس امر کو پسند نہ کرتا تھا۔ کہ زکریا خان کے بعد اس کے فرزند کو ہی ناظم لاہور و ملتان مقرر کیا جائے۔ اس لیے اس نے وزیر کی درخواست پر کسی فرصت کے وقت غور کرنے کا وعدہ کر کے معاملے کو ٹال دیا۔ قمر الدین خان نے یحییٰ خان کو لاہور روانہ کیا۔ تاکہ وہ نظامت سنبھالے اور خود شاہی فرمان کے حصول کی کوشش کرنے لگا۔ آخر بڑی تگ و دو کے بعد ۳ جنوری ۱۷۴۶ء کو اس امر کا فرمان ملا کہ ناظم پنجاب تو وزیر قمر الدین ہو گا۔ لیکن وہ دہلی میں رہ کر امور وزارت انجام دے گا۔ لیکن پنجاب میں اس کا نائب یحییٰ خان حکومت کرے گا۔

شاہ نواز خان باپ کی زندگی میں جالندھر دوآب کا حاکم تھا۔ اسے باپ کی وفات کی خبر ملی تو وہ ۲۱ نومبر ۱۷۴۵ء کو بیگم پورہ چلا آیا۔ اسی اثنا میں یحییٰ خان دہلی سے آ کر حکومت لاہور پر قابض ہو چکا تھا۔ شاہ نواز نے باپ کے ترکہ سے اپنے حصے کا مطالبہ کیا۔ اور کئی ماہ تک دونوں بھائیوں میں بحث و تکرار رہی۔ آخر کار ان کی سپاہ میں جھڑپیں ہونے لگیں۔ ایک فیصلہ کن معرکہ میں شاہنواز خان شکست کھا کر بٹالہ کی طرف بھاگا اور مختلف مقامات پر اس نے قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ اس پر یحییٰ خان نے اس کے خلاف وسیع پیمانہ پر فوجی کاروائی کرنے کی تیاریاں شروع کیں۔ یہ اطلاع پا کر شاہنواز سیدھا لاہور آیا اور بیگم پورہ کے متصل خیمہ زن ہوا۔ ۷ ا مارچ ۱۷۴۶ء کو دونوں بھائیوں میں بیگم پورہ کے قریب ایک جنگ ہوئی۔ شاہنواز خان کے رفیق آدینہ بیگ نے یحییٰ خان کی فوج پر حملہ بول دیا اور اس کے جرنیل مومن خان کو اس کی ماتحت فوج سمیت ان کی خندقوں سے بھگا دیا۔ دوسرے روز شاہنواز خان نے خود فوج کی کمان کی اور مومن کو شکست دے کر گرفتار کر لیا۔

۲۱ مارچ ۱۷۴۶ء کو شاہنواز بیگم پورہ میں داخل ہوا۔ اور نظامت پنجاب پر قبضہ کر لیا۔ اس نے دیوان لکھپت رائے کو معزول کر کے اس کی جگہ کوڑا مل کو اپنا دیوان مقرر کیا۔ اور آدینہ بیگ خان کو جالندھر دوآب کا حاکم متعین کیا۔ لاہور کی حکومت پر یہ غاصبانہ قبضہ مغلیہ مرکزی حکومت کی بے عزتی تھی۔ لیکن وزیر قمر الدین شاہنواز خان کے خلاف فوجی کاروائی کرنے سے قبل اپنے داماد یحییٰ خان کو رہا کرانا چاہتا تھا۔ مبادا شاہنواز اُسے موت کے گھاٹ اتار دے۔ وزیر نے شاہنواز کو کئی خط لکھے۔ سب پہلے نرم اور شفقت آمیز پھر سخت۔ لیکن اس نے یحییٰ خان کی رہائی کی یہی شرط پیش کی۔ کہ اُسے حکومت لاہور کا شاہی فرمان عطا کیا جائے۔ خوش قسمتی سے یحییٰ خان چند ماہ کی قید کے بعد اپنی پھوپھی مُرواز بیگم زوجہ نواب جانی خان کی مدد سے قید سے نکل کر دہلی بھاگ جانے میں کامیاب

ہو گیا۔ اب شاہنواز بہت گھبرایا۔ اور اُسے اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ اس نے اپنے سفیر دہلی بھیجے تاکہ وہ شہنشاہ سے حکومت لاہور کا فرمان حاصل کر لیں۔ لیکن یہ سفارت ناکام رہی۔۔۔۔۔۔۔

شاہ نواز کا احمد شاہ دُرّانی سے معاہدہ

انھیں ایام میں آدینہ بیگ نے اسے مشورہ دیا کہ وہ قندھار کے فرمانروا احمد شاہ درانی سے مدد لے۔ احمد شاہ درانی کو جب یہ پیغام ملا کہ لاہور اور ملتان کا ناظم اسے اپنا حکمران ماننے کو تیار ہے تو وہ بہت ہی خوش ہوا۔

آدینہ بیگ بہت خودغرض، مکار اور فتنہ پرواز شخص تھا۔ ادھر اس نے شاہنواز کو اس بکھیڑے میں پھنسایا۔ اور ادھر دہلی یہ پیغام بھیجا کہ ناظم لاہور مغلیہ سلطنت سے غداری پر آمادہ ہے۔ وزیر قمرالدین یہ سُن کر بہت گھبرایا۔ اس نے اپنے بھانجے کو ایک طویل خط لکھا کہ ہمارا خانوادہ مدتوں سے مغلیہ حکومت کا معتمد چلا آرہا ہے۔ ہمارے لیے یہ باعث ننگ ہے کہ ہم نمک حرامی کریں۔ بہتر ہے کہ تم اپنی سلطنت کے وفادار رہ کر احمد شاہ دُرّانی کو مغلیہ ہندوستان کی سرحدوں میں گھسنے سے روکو۔ بلکہ کابل کا مغل صوبہ بھی دُرّانی تسلّط سے آزاد کراؤ۔

ماموں کی ان مشفقانہ نصیحتوں کا اثر شاہنواز پر یہ ہوا کہ اس نے احمد شاہ درانی کو ہندوستان میں بڑھنے سے روکنے کا ارادہ کر لیا۔ حالانکہ اسی کے کہنے پر وہ اس ملک میں آرہا تھا۔

احمد شاہ دُرّانی نے شاہنواز کے سفیر سے دوستی اور تعاون کی شرائط طے کیں۔ عہد نامہ لکھا گیا۔ جس پر تمام مقتدر درانی اعیان دولت نے دستخط کئے اور وہ اٹھارہ ہزار سپاہ کے ساتھ پنجاب کی طرف بڑھا۔ پشاور سے اس نے ہارون خان سدوزئی کو شاہنواز خان کے پاس بھیجا تاکہ اس سے نئے سیاسی حالات کی تفاصیل پر بات چیت کر لے۔ ہارون خاں لاہور پہنچا۔ تو یہاں کا عالم ہی بدلا ہوا تھا۔ یہ حالات دیکھ کر ہارون فی الفور واپس درانی لشکر میں پہنچا۔ جو اس وقت رہتاس کے پاس تھا۔ اور تمام حالات احمد شاہ کے گوش گزار کئے۔ اس نے لاہور پر حملہ کر کے شاہنواز کو اس بدعہدی کی سزا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن صابر شاہ نے اُسے روکا۔ اور بادشاہ سے کہا کہ میں اپنے آبائی شہر لاہور کی بربادی پسند نہیں کر سکتا۔ مجھے اجازت دو کہ لاہور جا کر میں خود شاہنواز کو سمجھاؤں۔

صابر شاہ

صابر شاہ ایک نیم مجذوب درویش تھا۔ لاہور اس کا آبائی وطن تھا۔ اس کا دادا جس کا نام یا غالباً لقب استا حلال خور بیان کیا جاتا ہے۔ کابل میں گھوڑوں کے امراض کا طبیب تھا۔ اس نے بعد ازاں دنیا ترک کر کے درویشی اختیار کر لی اور اس کے زہد و اتقا کی بنا پر اُسے لوگ عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ اس کا لڑکا یعنی صابر شاہ کا باپ حسین شاہ بھی فقیر تھا۔ صابر شاہ نے اسی ماحول میں پرورش پائی اور اس پر سُکر غالب تھا۔ نادر شاہ کی زندگی ہی میں حضرت امام رضا کے صاحبزادے حضرت سلطان ابوالحسن علی کے روضہ پر مشہد میں صابر شاہ کی احمد شاہ سے ملاقات ہوئی۔ اور اس درویش نے احمد شاہ کو بادشاہت کی بشارت دی۔ صاحب تخت و تاج بننے کے بعد بادشاہ صابر شاہ کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اور بہ کمال احترام پیش آتا تھا۔

صابر شاہ لاہور پہنچا۔ تو یہاں کے بے فکروں نے یہ بے پر کی اُڑائی کہ چونکہ احمد شاہ درانی کے پاس توپ خانہ کم ہے اس لیے اس نے اپنا جادوگر بھیجا ہے تاکہ جادو کے زور سے ناظم لاہور کا توپ خانہ بیکار کر دے۔ شاہنواز خاں نے صابر شاہ کو دربار میں بلایا۔ اور اس سے لاہور آنے کا مقصد پوچھا۔ صابر شاہ نے شاہ نواز کو احمد شاہ دُرّانی سے اپنا پہلا معاہدہ نبھانے اور اپنی بات پر قائم رہنے کو کہا۔ اور اسے یہ بتایا کہ بصورتِ دیگر احمد شاہ کے عساکر لاہور کو پامال کر دیں گے۔ اور تم باشندگانِ شہر کو بربادی سے بچا نہ سکو گے شاہنواز خاں

ایک بد دماغ اور عاقبت نااندیش نوجوان تھا۔ اس نے درویش کی بے باکانہ گفتگو کو اپنے حضور گستاخی قرار دیا اور حکم دیا۔ کہ اس زبان دراز کے گلے میں پگھلی ہوئی گرم چاندی ڈالی جائے اس سزا کو درویش برداشت نہ کر سکا۔ اور گرم سیال چاندی کے گلے میں اترتے ہی اس کا دم نکل گیا۔ ارباب خرد کو صابر شاہ کی موت کے پردہ میں بیگم پورہ کی بربادی نظر آنے لگی۔ شاہنواز خان نے صابر شاہ کی لاش بے گور و کفن پھنکوا دی۔ جسے بعد ازاں افغانوں نے شاہی مسجد کے عقب میں دفن کیا۔ جہاں ایک تکیہ میں جو شاہی مسجد کے غربی جانب لیڈی ولنگٹن ہسپتال اور سڑک کے درمیان واقع ہے۔ اس کی قبر اب تک موجود ہے۔ لاہور کا یہ خیر خواہ جو باشندگان شہر کو بربادی سے بچانے کے لیے اپنی جان گنوانے کے باوجود انھیں تباہی سے نہ بچا سکا۔ اب اسی شہر میں ابدی نیند سو رہا ہے۔

احمد شاہ دُرّانی کا حملہ

احمد شاہ درّانی ۸ جنوری ۱۷۴۸ء کو شاہدرہ پہنچا۔ اسے صابر شاہ کا انجام معلوم ہوا تو مارے غم و غصہ کے بید مجنوں کی طرح کانپنے لگا۔ اس نے شاہدرہ سے شمال کی طرف بڑھ کر دریا پار کیا اور شالامار باغ کے متصل خیمہ زن ہوا۔ شاہنواز نے بیگم پورہ[1] کی فصیلوں پر توپیں چڑھائیں۔ اور اس کے دفاع کا مناسب بندوبست کیا۔ اس کے پاس ستر ہزار فوج اور بہت سی توپیں تھیں۔ توپ خانہ کا نگران اعلیٰ میر نعمت خاں بخاری تھا۔ اسلحہ اور تعداد سپاہ کے اعتبار سے احمد شاہ درانی کسی طرح بھی ناظم لاہور کا ہم پلہ نہ تھا۔ لیکن یہ نااہل اور نالائق حکمران احمد شاہ جیسے زیرک اور جفاکش جرنیل کا مقابلہ نہ کر سکا۔

۱۱ جنوری کو مزار شاہ بلاول کے قدیم محل و قوع کے پاس جہاں بعد میں راجا شیر سنگھ کی سمادھ بنی۔ دریائے راوی کی پرانی گزرگاہ کے کنارے دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا جس میں شاہ نواز کا دست راست حشمت اللہ خاں مارا گیا۔ قصور کا افغان سردار جملہ خاں اپنے لشکر سمیت اس کا ساتھ چھوڑ کر احمد شاہ درّانی سے مل گیا اور شام کے قریب ناظم لاہور کی فوج تتر بتر ہو کر شہر کے مختلف محلوں کی طرف بھاگ گئی۔ دہلی سے ابھی تک کوئی کمک نہ پہنچی تھی۔ نہ وہاں سے کسی مدد کی توقع ہو سکتی تھی۔ باشندگانِ شہر کو تقدیر کے حوالے کر کے شاہنواز راتوں رات چند معتبر و معتمد ساتھیوں کی معیت میں خزانے کا بہت سا روپیہ لے کر دہلی بھاگ گیا۔

بیگم پورہ کی بربادی

۱۲ جنوری ۱۷۴۸ء کو احمد شاہ درانی بیگم پورہ میں داخل ہوا۔ اور لوٹ مار اور قتل عام کا حکم دیا۔ افغان سپاہ کو بیگم پورہ کے محلوں سے بے اندازہ دولت ملی اور زر و جواہر کے وہ ذخیرے جو ربع صدی سے جمع ہو رہے تھے۔ آن واحد میں لٹ گئے۔ خلق خدا بے دریغ نذر تیغ ہوئی۔ اور بڑی بڑی عالی نژاد خواتین بے آبرو ہوئیں۔ آخر میر مومن خاں۔ سید جمیل الدین۔ میر نعمت خاں بخاری۔ دیوان لکھپت رائے اور دیوان صورت سنگھ وغیرہ اکابر لاہور بصورت وفد احمد شاہ درانی کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ اور تیس لاکھ روپیہ نذرانہ پیش کر کے رحم کی درخواست کی جو مقبول ہوئی۔ قتل و غارت کا سلسلہ بند ہوا۔ بے گناہ درویش کی موت کا انتقام ختم ہوا اور باشندگانِ بیگم پورہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ بیگم پورہ سے درّانی سپاہ کو اس قدر مال و دولت اسلحہ، توپیں اور ہاتھی گھوڑے ملے کہ انھوں نے لاہور کے باقی محلوں کی طرف کہ جن کا سلسلہ اس زمانے میں میلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ آنکھ اٹھا کر

---

[1] واضح رہے کہ اس دور میں بیگم پورہ کے فلک بوس مکانات، محلات، باغات شاہی دفاتر اور بازاروں کا سلسلہ دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ اور ان کے گرد ایک مضبوط فصیل دفاع کے لیے تھی۔

بھی نہ دیکھا۔

احمد شاہ درانی تقریباً ایک ماہ بیگم پورہ میں مقیم رہا۔ اس نے اپنا سکہ جاری کیا۔ اور پنجاب کے تمام سرداروں کو مطیع کیا۔ ۱۹ فروری کو قصور کے افغان سردار جملہ خان کو لاہور کا ناظم مقرر کر کے وہ دہلی کی طرف بڑھا۔ لیکن سرہند کے قریب میر معین الملک خان نے جو وزیر قمر الدین خاں کا جوان بخت و جواں ہمت فرزند تھا۔ اسے شکست دی۔ وہ لاہور واپس آیا اور یہاں سے اس نے کابل کا رخ کیا۔

میر معین الملک ناظم لاہور (۱۷۴۸ء ـــ ۱۷۵۳ء)

سرہند کی لڑائی میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد میر معین الملک کو ناظم لاہور مقرر کیا گیا مگر یہ نظامت اس کے لیے کانٹوں کا تاج ثابت ہوئی۔ احمد شاہ کے حملوں کی وجہ سے سکھوں کو اپنی طاقت بڑھانے کا موقع مل چکا تھا۔ انھوں نے امرتسر کے قریب رام راؤنی نام ایک قلعہ تعمیر کیا اور جسا سنگھ کلال نے جو اس وقت سکھوں میں سربرآوردہ تھا خالصہ دل نام سکھوں کی ایک تنظیم قائم کی۔ خالصہ دل کا مطلب سکھ فوج ہے۔ (عمدۃ التواریخ۔ سوہن لال سوری جلد اول صفحہ ۱۲۸-۱۲۷)

میر معین الملک جسے عرف عام میں میر منّو کہا جاتا تھا۔ ایک بیدار مغز اور دور اندیش حاکم تھا۔ اس نے حکومت سنبھالتے ہی پنجاب میں قیام امن کی کوششیں شروع کر دیں۔ اس نے سکھوں کی غیر قانونی سرگرمیوں کو ختم کرنے کے لیے پروگرام بنایا۔

اسی اثنا میں راجہ کوڑا مل دیوان لاہور کی سعی سے کچھ عرصہ کے لیے حکومت اور سکھوں میں خوشگوار تعلقات قائم ہو گئے۔

احمد شاہ دُرانی کا دُوسرا حملہ (۱۷۴۹ء ـــ ۱۷۵۰ء)

سرہند کی شکست کی خفت مٹانے کے لیے احمد شاہ درانی نے ۱۷۴۹ء کے موسم سرما میں قندھار سے اپنی فوج کے ہمراہ کوچ کیا۔ اس نے دسمبر کے وسط میں دریائے سندھ عبور کیا۔ معین الملک کو صوبہ لاہور کے دفاع کے لیے مرکز سے کوئی امداد نہ مل سکتی تھی۔ احمد شاہ تیموری ایک کمزور اور آرام طلب حکمران تھا۔ وزیر صفدر جنگ ایرانی پارٹی کا رکن ہونے کی وجہ سے معین الملک کی مدد نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ اُن کی حریف تورانی پارٹی کا رکن تھا۔ میر معین الملک نے اپنے ذاتی وسائل سے حملہ آور کو روکنے کی کوشش کی۔ سید عوض خاں اور دیوان لکھپت رائے کو لاہور میں امورِ حکومت کی نگرانی کے لیے چھوڑا اور خود فوج لے کر سودھرا کے مقام پر وزیر آباد سے چار میل جانب مشرق چناب کے کنارے خیمہ زن ہوا۔ احمد شاہ درانی چناب کے دوسرے کنارے پہنچ کر وہیں رُک گیا۔ دونوں میں گفت و شنید شروع ہوئی۔ احمد شاہ درانی نے مطالبہ کیا کہ چار محال[1] کا مالیہ ہر سال اُسے دیا جائے۔ میر منّو نے اِدھر گفت و شنید کو طول دیا۔ اُدھر شہنشاہ کے پاس فوجی مدد کے لیے ایک خط دہلی روانہ کیا۔ مگر فوجی امداد کی بجائے یہ جواب ملا کہ احمد شاہ درانی کا مطالبہ مان لیا جائے۔ چنانچہ احمد شاہ درانی سے صلح کر لی گئی۔ اور حملہ آور ڈیرہ غازی خان اور قلات کے راستے قندھار واپس چلا گیا۔

اگرچہ راجہ کوڑا مل کی سعی سے سکھوں کے تعلقات حکومت کے ساتھ خوشگوار تھے مگر میر منّو کے قیام سودھرا کے زمانے میں

---

[1] دور مغلیہ میں صوبۂ لاہور کے دو خطّے جالندھر دوآب اور چار محال بے حد زرخیز شمار کیے جاتے تھے۔ چار محال میں سیالکوٹ، پسرور، گجرات اور اورنگ آباد کے اضلاع شامل تھے۔

سکھوں نے موقع پاکر لوٹ مار شروع کردی اور مضافات لاہور کو بھی لوٹ لیا۔ احمد شاہ درانی کی روانگی کے بعد اس نے سکھوں کی تادیب کی طرف توجہ دی۔

احمد شاہ درانی کا تیسرا حملہ (۱۷۵۱ء۔۱۷۵۲ء)

حسب وعدہ میر منو نے سال کے اختتام پر چار محال کی آمدنی احمد شاہ کو نہ بھیجی۔ اس پر درانی نے پھر پنجاب پر فوج کشی کا ارادہ کیا اور پشاور پہنچ کر باڑو خاں کو بطورِ سفیر معین الملک کے دربار میں بھیجا کہ خراج کی ادائیگی کی یاد دہانی کرائے۔ معین الملک نے جواب دیا کہ حالات کی خرابی کے باعث مالیہ جمع نہیں ہو سکا۔ جونہی کہ رقم اکٹھی ہوگی بھیج دی جائے گی۔ اس کے بعد درانی نے راجہ سکھ جیون مل کو بطورِ سفیر بھیجا اور روپے کا مطالبہ کیا۔ معین الملک نے نو لاکھ روپیہ بھیج دیا اور یہ وعدہ کیا کہ بقایا احمد شاہ درانی کے فوجیں ہٹا کر واپس چلے جانے پر دے دیا جائے گا۔ درانی یہ روپیہ لے کر بھی آگے بڑھتا رہا۔ اس پر معین الملک پچاس ہزار سپاہی اور چار سو چھوٹی توپیں جنھیں "جزائر" کہتے ہیں لے کر آگے بڑھا اور شہر سے ۲۲ میل دور پل شاہ دولہ[1] پر دشمن کو روکنے کے لیے مورچے لگا لیے۔ احمد شاہ درانی نے یہ راستہ ترک کر دیا اور جنوبی سمت اس مقام سے دور سفر کرتا ہوا راوی کے کنارے بمقام غازی پور پہنچ گیا۔ یہاں سے راوی کو عبور کرکے وہ موضع نیاز بیگ کے راستے لاہور پہنچا۔ اور چکر کاٹ کر بیگم پورہ سے کچھ فاصلے پر شاہ بلاول کے مزار کے متصل ڈیرے ڈال دیے۔

معین الملک لاہور پہنچا اور شہر کے دفاعی انتظامات درست کیے۔ درانی نے شہر کا محاصرہ کر لیا جو چار ماہ تک جاری رہا اور شہر کے چاروں طرف پچاس پچاس میل تک کا علاقہ برباد ہو گیا۔ کنوؤں میں پانی تک ختم ہو گیا اور شہر میں جانوروں کا چارہ اور انسانوں کی خوراک کمیاب بلکہ نایاب ہو گئی۔ شہر کی صفائی کا انتظام بھی درہم برہم ہو گیا۔ شہر کی خندقوں اور فوجی چھاؤنیوں میں ہر طرف غلاظت اور بدبو تھی۔ اس نازک وقت پر بھی دہلی سے کوئی امداد نہ آئی۔

ان حالات میں معین الملک نے کیمپ کو دس میل دور لے جانے کا فیصلہ کیا مگر یہ بھید کھل گیا۔ پانچ مارچ ۱۷۵۲ء کو جب معین الملک کی فوجیں مورچوں سے نکلیں تو درانی سپاہ نے ان پر ہلہ بول دیا۔ معین الملک اس بہادری اور دلاوری سے لڑا کہ خود احمد شاہ درانی جو ایک بہادر اور جنگجو سردار تھا عش عش کر اٹھا۔ راجہ کوڑا مل دیوان صوبہ ملتان اور آدینہ بیگ فوجدار جالندھر دوآب بھی معین الملک کی امداد پر تھے۔ شالامار باغ کے متصل محمود بھٹی نام ایک گاؤں ہے جسے آج کل محمود بوٹی کہتے ہیں۔ اس آبادی سے متصل ایک پرانا اینٹوں کا بھٹا تھا۔ میر منو نے اس پر بھی مورچے جما دیے۔ اس معرکے میں راجہ کوڑا مل مارا گیا اور آدینہ بیگ بمشکل جان بچا کر بھاگا۔ شام کے قریب معین الملک بھی پسپا ہو کر قلعۂ لاہور میں چلا گیا۔ درانی نے اس فتح کے بعد شالامار باغ میں ڈیرے لگا دیے۔

---

[1] شاہ دولہ نام ایک مشہور ولی اللہ گجرات میں مدفون ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کئی پل بنوائے جن میں یہ پل بھی شامل ہے جو نالہ ڈیک پر ہے۔ اگر شاہدرہ سے پرانی سڑک کے راستے امین آباد جائیں تو شاہدرہ سے اٹھارہ میل کے فاصلے پر یہ پل آتا ہے۔ شکستہ حالت میں یہ پل اب تک موجود ہے اور دورِ مغلیہ کے پلوں کے فنِ تعمیر کا ایک نمونہ ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کی مرمت پرانے فنِ تعمیر کے مطابق کرا کر اسے یادگارِ محفوظ قرار دے دیا جائے۔

دوسرے روز جہاں خاں وزیر کے ذریعہ شالامار باغ میں احمد شاہ درانی اور میر معین الملک کی ملاقات ہوئی۔ درانی نے اس کی بہادری دلاوری عزم اور جنگی صلاحیتوں کی دل کھول کر تعریف کی۔ اسے رستم ہند اور فرزند خاں کا خطاب دے کر خلعت عطا کیا۔ اور ایک کثیر رقم بطور تاوان جنگ لے کر اپنی طرف سے صوبجات لاہور و ملتان کا ناظم مقرر کیا۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ احمد شاہ درانی نے اس ملاقات میں معین الملک سے پوچھا کہ وہ اپنے فاتح سے کس سلوک کی توقع رکھتا ہے میر معین الملک نے فی الفور جواب دیا۔ کہ وہی سلوک جس کی ایک بہادر سپاہی دوسرے بہادر سپاہی سے توقع کر سکتا ہے۔ اس جواب سے احمد شاہ درانی بہت محظوظ ہوا اور اُس نے بعد ازاں یہ دریافت کیا کہ اگر اس جنگ میں معین الملک فاتح ہوتا تو وہ اس سے کیا سلوک کرتا۔ معین الملک نے جواب دیا کہ ''آپ کو گرفتار کر کے دہلی اپنے آقا کے پاس بھیج دیتا۔''

اس کے بعد احمد شاہ درانی نے اپنے سفیر قلندر بیگ کو اپنے ہم نام احمد شاہ تیموری کے دربار میں دہلی بھیجا کہ صوبجات لاہور و ملتان کو احمد شاہ درانی کے حوالے کر دے۔ بادشاہ نے سفیر کو دیوانِ عام میں شرفِ باریابی بخشا اور عہد نامے پہ مہر لگا کر سفیر کے حوالے کر دیا اور پنجاب بادشاہِ دہلی کی سلطنت سے نکل کر احمد شاہ درانی کی قلمرو میں شامل ہو گیا۔ اسی دوران احمد شاہ درانی نے عبداللہ خاں کو ایک فوج دے کر کشمیر کی تسخیر کے لیے بھیجا جس نے مغل حاکم ابو القاسم خاں کو شکست دے کر کشمیر پہ قبضہ کر لیا۔ احمد شاہ نے سکھ جیون مل کو کشمیر کا حاکم اور عبداللہ خاں کو اُس کا نائب مقرر کیا۔

اب معین الملک احمد شاہ درانی کی طرف سے پنجاب پر حکومت کرنے لگا۔ پنجاب اور کشمیر سے بھی جب تک درانی کو خراج ملتا رہا اس نے ان صوبوں کے اندرونی نظم و نسق کو بحال رکھا۔ عملی طور پر صوبائی نظام میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ اس کے بعد معین الملک کوئی ڈیڑھ سال کے قریب زندہ رہا یہ وقت اس نے سکھوں کی تادیب اور پنجاب میں امن قائم کرنے میں گزارا۔ سکھ غارت گروں کی سرگرمیاں اب جنگ محمود بوٹی کے بعد بہت بڑھ گئی تھیں۔ مگر وہ لوگ میر منو کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ بہر حال اُن کے عزم اور دلولے کا اندازہ ذیل کے شعر سے بخوبی ہو سکتا ہے جو اُن دنوں سکھوں میں زبانِ زدِ عوام تھا

منو ساڈی داتری اسی منو دے سوئے ———

جوں جوں سانوں وڈھدا اساں تیوں تیوں ڈونے ہوئے

یا

میر منو دے سوئے اُتوں اُتوں لا پڑے ——— بھیوں ڈونے ہوئے

۱۷۵۳ء کے آخر میں پرچہ لگا کہ سکھوں نے نواح لاہور میں لوٹ مار شروع کر دی ہے۔ میر منو کل فوج لے کر شہر سے نکلا اور سات کوس دُور دریا کے کنارے ملک پور کے متصل خیمے لگا دیے۔ سکھوں نے یہ سنا تو منتشر ہو کر ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔ میر منو نے اُن کے تعاقب میں چھوٹے چھوٹے دستے بھیجنے شروع کیے جو سکھوں کا تعاقب کر کے انھیں پکڑ لاتے۔ ایک روز اس نے خواجہ مرزا خاں کو اور چند دوسرے مغل جمعداروں کو سکھوں کے استیصال کے لیے بھیجا۔ بعد ازاں وہ خود سوار ہو کر شکار کے لیے نکلا۔ شکار سے واپسی پر وہ موضع آدان کے نو تعمیر قلعے میں ٹھیرا۔ یہ قلعہ اُس نے خود بنوایا تھا اور وہاں کچھ سپاہی مقیم تھے۔ وہاں میر منو نے کھانا کھایا اور تھوڑی دیر آرام کیا۔

تین بجے کے قریب اُٹھ کر وضو کیا۔ ظہر کی نماز ادا کی۔ سبز رنگ کی ساٹن کا لباس پہن کر گھوڑے پر سوار ہوا اور قلعہ سے باہر نکلا۔ اسی اثنا میں خواجہ مرزا سکھ مقتولوں کے سر لایا اور ناظم کے سامنے پیش کیے۔ معین الملک نے ان سپاہیوں کو انعامات دیے۔ اور گھوڑے

کو دوڑاتا ہوا اپنی لشکر گاہ کو روانہ ہوا۔ وہاں پہنچ کر وہ یکلخت بیمار ہو گیا۔ اطبا نے جو لشکر کے ہمراہ تھے علاج میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا مگر آدھی رات کے قریب وہ راہیِ ملک عدم ہوا۔ (تذکرہ از طہماس قلی مسکین۔ کتاب غیر مطبوعہ ہے۔ اس کا قلمی نسخہ برٹش میوزیم لائبریری لنڈن میں ہے (ورق ۸۸۔۸۷) اس نسخے سے میر منو کی وفات کے حالات مجھے انگلستان سے ایک عزیز دوست اور شاگرد محمد اسلم چندہ پال نے بھیجے ہیں۔ اس کتاب سے سر جادو ناتھ سرکار اور ڈاکٹر ہری رام گپتا نے بھی استفادہ کیا ہے)۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ وہ گھوڑے سے گر کر زخمی ہوا اور مر گیا مگر اس سلسلے میں طہماس قلی مسکین کا بیان زیادہ معتبر ہے۔ طہماس قلی نواب معین الملک کے متوسلین میں سے تھا اور اس کی وفات کے وقت موقعہ پر موجود تھا۔ لہٰذا اس کی رائے زیادہ معتبر ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اس کا انتقال زہر خورانی سے ہوا۔

معین الملک خان کی وفات کی خبر مشہور ہوتے ہی لشکر گاہ میں کہرام مچ گیا۔ اس موقعہ پہ اُن کی بیوی مغلانی بیگم نے بڑی ہوشمندی سے کام لیا۔ نواب کی لاش معتمد آدمیوں کے سپرد کر کے اُس نے تین دن تک سپاہ میں تنخواہ تقسیم کی جو برسوں سے واجب الادا چلی آ رہی تھی۔ بیگم کا ارادہ یہ تھا کہ فوج کو خوش کر کے خود حکومتِ لاہور پر قبضہ کرے۔ اسی اثنا میں لاہور کے نائب ناظم بھکاری خان نے اپنے ۵۰۰ آدمی نواب کی لاش کے گرد کھڑے کر دیے اور اُسے تدفین کے لیے دہلی لے جانا چاہا۔ اُس کا مقصد یہ تھا کہ مرحوم نواب کی لاش سمیت بیگم ہما جیم اور دیگر افرادِ خانہ کو دہلی پہنچائے اور دربارِ شاہی سے صوبۂ لاہور کا فرمان اپنے لیے حاصل کرے۔ بیگم کا ارادہ لاش کو لاہور لا کے دفن کرنے اور اپنے شیر خوار بیٹے محمد امین خاں کے نام پر حکومت کرنے کا تھا۔ تمام ہندوستانی فوجی سردار بیگم کے ساتھ تھے۔ تورانی سپاہی اور سردار بھکاری خاں کے ہمنوا تھے۔ بیگم نے قاسم خان کو مامور کیا کہ وہ تورانی سرداروں کو انعام و اکرام کا لالچ دے کر بیگم کے پاس لائے۔ بیگم نے طہماس قلی مسکین کو نواب کی لاش کی حفاظت کے لیے بھیجا اور اس کے پہنچتے ہی بھکاری خاں کے آدمی الگ ہو گئے۔ قاسم خاں سوائے خواجہ مرزا خاں کے باقی تمام تورانی اور مغل سرداروں کو بیگم کی خدمت میں لے آیا۔ صرف خواجہ مرزا تین سو سواروں کے ساتھ بھکاری خاں کا ہمنوا رہا۔ اس کے بعد بیگم نے نواب کے جنازے کو لے کر لاہور کا رُخ کیا۔

لاہور لا کر نواب کا تابوت بیگم پورے میں حضرت ایشاں کے روضے کے قریب نواب عبدالصمد خاں کے تعمیر کردہ "احاطۂ قبورِ خاندانِ ناظماں" میں دفن کر دیا گیا۔

نوٹ:۔ جن مورخین نے یہ لکھا ہے کہ میر معین الملک دورانِ شکار میں گھوڑے سے گر کر زخمی ہوا اور مر گیا۔ اُن میں ——— W. FRANCKLIN فرینکلن بھی شامل ہے جس کی کتاب HISTORY OF THE REIGN OF SHAH ALAM لنڈن سے ۱۷۹۸ء میں شائع ہوئی۔ ملاحظہ ہو اُس کا صفحہ ۵۔

شیر سنگھ کے زمانہ میں (سید محمد لطیف کے قول کے مطابق راجہ ہیرا سنگھ کی وزارت کے ایام میں) ایک ہندو سنیاسی نے مشہور کیا کہ شہید گنج کے قریب (موجودہ ریلوے سٹیشن کے نواح میں) ایک قدیم مقبرہ میر منو کا ہے۔ اور اس کی لاش وہاں طلائی تابوت میں مدفون ہے۔ سکھوں کو مغل بادشاہوں۔ لاہور کے ناظموں اور خاص کر میر منو سے بے حد نفرت تھی۔ انھوں نے مبینہ مزار کو کھود ڈالا اور انھیں اس میں سے کچھ بھی نہ ملا۔ انگریزی دور کے آغاز میں انگریزی شراب کے ایک سکھ تاجر نے مقبرے کی عمارت میں دوکان کھول لی۔ اب اس مقبرے کا صحیح محلِ وقوع معلوم نہیں ہو سکا۔ غالباً مسمار ہو چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مقبرہ مغلیہ دور کے کسی اور مقتدر فرد کا مدفن تھا۔ طہماس قلی مسکین جو ان کی وفات کے واقعات کا عینی شاہد ہے یہ بیان کرتا ہے کہ انھیں بیگم پورے کے احاطہ قبور میں دفن کیا گیا تھا۔

معین الملک خاں کے دور کی عید

بیگم پورہ کے محلات میں عید کی آمد سے کئی روز قبل اس تہوار کو پوری شان سے منانے کی تیاریاں شروع ہو جاتیں۔ ہر سمت فضا میں مسرت و انبساط جلوہ گر نظر آتی۔ محلات کی آرائش و زیبائش اپنا جواب نہ رکھتی تھی۔ عید کی رات سب کی آنکھوں میں کٹتی۔ سرکاری اہل کار اپنے اپنے فرائض کی بجا آوری میں سرگرم نظر آتے مبادا کوئی کمی رہ جائے۔

عید کے روز صبح کی نماز اور اوراد و وظائف سے فارغ ہو کر نواب معین الملک زنانہ محل میں تشریف لاتے۔ جہاں ان کی بیگم عید کے البسۂ فاخرہ میں ملبوس ان کا استقبال کرتیں۔ وہ سویّوں اور دیگر شیریں ماکولات و مشروبات سے کام و دہن کی ضیافت کرنے کے بعد محافظ دستہ کی معیت میں عید گاہ کا رخ کرتے۔

ناظمانِ پنجاب کے دور میں نمازِ عید جامع جہانگیری میں ہوا کرتی تھی۔ یہ مسجد شہنشاہ جہانگیر نے بازار ترپولیہ میں بنوائی تھی۔ جو کافی وسیع اور زرنگار و کاشی کار تھی۔ مغلیہ سطوت و حکومت کے زوال کے بعد بازار لٹ گیا۔ اُجڑی ہوئی مسجد میں رنجیت سنگھ کے عہد میں توپیں بنانے کا کارخانہ قائم کیا گیا۔ انگریزی دور کے آغاز میں اسے محکمہ ریلوے کے کسی افسر نے سکونتی کوٹھی کے طور پر استعمال کیا اور آخر اسے مسمار کر دیا گیا۔

یہ مسجد موجودہ ریلوے گودام کے نواح میں چونگی والے چوک کے پاس واقع تھی۔ بیگم پورہ کے قریب ہونے کے سبب ناظمانِ پنجاب یہاں نمازِ عید ادا کیا کرتے۔ عمائد و اکابر لاہور بھی اسی جگہ نماز کے لیے جمع ہوتے۔ عام باشندگانِ لاہور بھی یہاں گروہ در گروہ کھنچ آتے یہاں تک کہ اس وسیع مسجد میں تِل دھرنے کو جگہ نہ رہتی۔ نماز و خطبہ کے بعد جو شخص بھی پنجاب کے خوش خصال ناظم کے پاس آتا آپ اس سے بلا امتیاز مقام و مرتبہ خندہ پیشانی سے مصافحہ کرتے۔

نماز کے بعد نواب معین الملک، اپنے محافظ دستہ کی معیت میں کہ بلند بالا و رعنا ترکی و خراسانی نوجوانوں پر مشتمل ہوتا تھا بیگم پورہ کی راہ لیتے۔ باشندگانِ شہر شوقِ دید میں سڑک کے دورویہ کھڑے سواری کے جلوس کا نشاط و انبساط کے نعروں سے خیر مقدم کرتے۔

کھانا کھانے کے بعد جناب بیگم صاحبہ کی معیت میں فیل خاص پر سوار ہو کر نواب معین الملک خاں پریڈ کے میدان کی راہ لیتے جہاں فوج کا معائنہ ہوتا۔ فوجی جوان نشانہ بازی کے مقابلوں میں شریک ہوتے اور اپنی عسکری مہارت کے کارنامے دکھا کر انعام حاصل کرتے۔

عصر کے بعد نواب درگاہ حضرت شاہ ابو المعالی پر حاضر ہوتے۔ آپ سلسلۂ عالیہ قادریہ کے ایک مقتدر اور خدا رسیدہ شیخ تھے۔ ان کا مزار آج بھی مرجع انام اور زیارت گاہِ عوام ہے۔ دورِ ناظماں میں عید کے روز ایک عظیم الشان میلہ یہاں لگتا تھا۔ لاہور کے لوگ بہ کمالِ اشتیاق و ارادت یہاں جمع ہوتے تھے۔ دُور دُور تک دکانیں لگ جاتی تھیں۔ جن میں چہار دانگ عالم کے نوادر اور قسم قسم کی مٹھائیاں بکتی تھیں۔ طرح طرح کی دلچسپیاں اور مختلف نوع کی دلفریبیاں لوگوں کو شادمانی کی فضا میں مسحور و مخمور رکھتی تھیں۔ مختصر یہ کہ نواب معین الملک اور بیگم صاحبہ ایک دوسرے کی معیت میں اس یومِ سعید کی خوشیوں سے بہرہ اندوز ہوتے۔

نواب میر معین الملک کے عہد میں میر منشی کے عہدہ پر سید محمد قاسم عبرتؔ لاہوری فائز تھے۔ آج کل کی اصطلاح میں انھیں چیف سیکرٹری پنجاب گورنمنٹ سمجھیے۔ آپ لاہور کے ایک مقتدر علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کی تالیف "عبرت نامہ" کے مخطوطات مشرق و مغرب کے مختلف کتب خانوں میں ملتے رہے۔

عبرتؔ کی بیاض بھی پراگندہ و بوسیدہ حالت میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔
سید محمد قاسم کا دستور تھا کہ وہ عید کے موقع پر نواب صاحب کی خدمت میں قصیدہ تہنیت پیش کیا کرتے تھے سنہ ۱۱۶۲ھ مطابق ۱۷۴۹ء میں عید الفطر ۳ ستمبر اتوار کے روز منعقد ہوئی۔ اس عید پر سید صاحب نے ذیل کا قصیدہ بارگاہ ناظم میں پیش کیا۔ نواب صاحب اور بیگم صاحبہ دونوں نے اسے بہت پسند فرمایا۔ اور سید صاحب کو خلعت اور انعام سے نوازا ؎

شکر اللہ بس مبارک عید رمضاں آمدہ	وقت عیش و خورمی ہنگام احساں آمدہ
ایں خجستہ عید بر نواب صاحب سال و مہ	باد فرخندہ کہ ہاتف مژدہ گویاں آمدہ
آں معین الملک غازی رستم ہندوستاں	کز نہیب تیغ تیزش برق لرزاں آمدہ
رفت رمضاں شد قبول از فضل حق صوم و صلوٰۃ	موسم خوش وقتی و سیر گلستاں آمدہ
سرو استادہ بخدمت سبزہ ہا سر بر قدم	گل شگفتہ ہر طرف بلبل غزل خواں آمدہ
ہم زمین خیر نوا ہے ہرج دریائے فیض	بہر سیرابی عالم ابر و باراں آمدہ

میر قاسم منشی سرکار از صدق و صفا
روز و شب بہر دعایت سبحہ گرداں آمدہ

میر منو کی وفات

انبساط و نشاط کی یہ محفلیں تا دیر قائم نہ رہ سکیں۔ حوادث روزگار کی بجلیوں نے مغلیہ سطوت کی یہ آخری محفل جلا کر راکھ کر دی۔ سنہ ۱۷۵۳ء میں نواب میر معین الملک خاں اچانک فوت ہو گئے۔ بیگم صاحبہ نے زمام اختیار سنبھالنے کی کوشش کی مگر ان کی مساعی بار آور نہ ہوئیں۔ اس متلاطم فضا میں جب امرائے دولت خود غرض تھے اور ہر طرف سکھوں نے لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ ایک طرف درانی عساکر اور دوسری طرف مرہٹہ سپاہ پنجاب کے دروازے کھٹکھٹا رہی تھی۔ حکومت پنجاب کا سنبھالنا ایک پردہ نشین خاتون کے بس کا روگ نہ تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ملک میں ہر طرف بربادی، تباہی اور افراتفری پھیل گئی۔ اور سکھ پنجاب پر قابض ہو گئے۔ لاہور کی تمام مسجدیں حکومت کے قبضے میں چلی گئیں۔ شاہی مسجد میں ہاتھی گھوڑے بندھے تھے۔ بازار ترپولیہ والی عیدگاہ میں توپیں ڈھلنے کا کارخانہ تھا۔ عید کی نماز ہوتی تو کہاں ہوتی۔ نہ اسلامی تفوق کا زمانہ رہا اور نہ عید کی خوشیاں۔ ع

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

پنجاب کا شیر خوار ناظم

شہر سے دور فوجی کیمپ میں معین الملک خاں کی اچانک موت سے مغلانی بیگم کے سر پہ مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا مگر اس بہادر خاتون نے اپنے ذاتی غم پر قابو پا کر عنان حکومت سنبھالنے کی کوشش کی اور بھکاری خاں کی سازش کو ناکام بنایا۔ اس نے دہلی خط بھیج کر احمد شاہ تیموری سے اپنے شیر خوار دو سالہ بچے کے لیے فرمان حکومت حاصل کرنا چاہا۔ احمد شاہ تیموری نے باوجود اس امر کے کہ وہ صوبجات لاہور و ملتان اس سے قبل احمد شاہ درانی کے حوالے کر چکا تھا۔ میر منو کی وفات کی خبر ملتے ہی دیوان خاص (قلعہ دہلی) میں ایک خاص تقریب منعقد کی اور اپنے سہ سالہ فرزند محمود خاں کو ان صوبوں کا نائب السلطنت مقرر کیا اور نواب مرحوم معین الملک کے دو سالہ فرزند محمد امین خاں کو اس کا نائب نامزد کیا اور میر جمیل الدین خاں کے ہاتھ محمد امین خاں کے لیے ایک شاہی خلعت ارسال کیا۔ امور سلطنت کا انتظام میر مومن خاں کے سپرد تھا۔ لیکن عملی طور پر حکومت مغلانی بیگم کے

بالطہ تہی۔

میر مومن خان ایک نیک دل انسان تھے۔ امورِ حکومت کا وسیع تجربہ رکھتے تھے۔ ان کی قبر دربار حضرت داتا گنج بخش کی مسجد کے صحن میں ہے۔ اس وقت قبر کا مقام صحنِ مسجد کے خشتی فرش میں سنگ مرمر کی ایک سل ظاہر کرتی ہے جس پر کوئی کتبہ نہیں۔ یہ ضروری ہے کہ اس سل پر میر مومن خان کا نام کندہ کرا دیا جائے۔ مسجد کی توسیع پر ۱۳۲۹ھ / ۱۹۲۱ء میں میر صاحب کی قبر جو پہلے ایک بلند چبوترے پر تھی مسمار کر دی گئی اور نشان کے لیے اس مقام پر فرش میں سفید پتھر لگا دیا گیا۔

مغلانی بیگم نواب جانی بیگ کی صاحبزادی تھیں جو تورانی امرا میں سے تھے اور صوبہ لاہور کی حکومت میں کسی اعلیٰ عہدے پر ممتاز تھے۔ جانی بیگ کی بیوی دردانہ بیگم نواب عبدالصمد خان کی صاحبزادی تھیں۔ جانی بیگ کا مقبرہ باغبانپورہ جاتے ہوئے دروازہ گلابی باغ سے آگے بڑھ کر دائیں ہاتھ کھیتوں میں واقع ہے۔ مقبرہ چوکور ہے اور اس کے اندر ٹوٹی قبروں کے چند نشانات ہیں۔ جانی بیگ سید علیم اللہ چشتی صابری حسنی بلخی مدفون جالندھر کا مرید تھا اور سید صاحب مذکور لاہور آنے پر اکثر اس کے ہاں قیام فرمایا کرتے تھے۔ مغلانی بیگم اور میر مومن محض احمد شاہ تیموری کے فرمان سے مطمئن نہ تھے۔ فی الواقعہ صوبجات ملتان و لاہور ۱۱۶۵ھ سے احمد شاہ درانی کی سلطنت کا حصہ تھے۔ چنانچہ درانی کے حاکم پشاور جہان خاں کی وساطت سے احمد شاہ درانی سے یہ اجازت حاصل کی گئی کہ محمد امین خان پنجاب کا ناظم ہوگا اور میر مومن خان اس کا نائب۔

بھکاری خان میر معین الملک خان کے زمانے میں بقول سیر المتاخرین "مختار و مدار المہام سرکار معین الملک بود" (جلد سوم ص ۵) اس کا باپ روشن الدولہ طرہ باز خاں محمد شاہ کے زمانے کے مقتدر امرا میں سے تھا اور میراں سید بھیک مدفونِ کہرام کے مریدوں میں سے تھا۔ اس نے چاندنی چوک دہلی میں کوتوالی کے قریب سنہری مسجد تعمیر کرائی۔ بھکاری خاں کو یہ نام میراں سید بھیک سے نسبت کی بنا پر باپ نے دیا۔

قیام لاہور کے زمانے میں بھکاری خاں کی یہی کوشش رہی کہ وہ ناظم لاہور بن جائے۔ چنانچہ باشندگانِ شہر میں ہر دلعزیز ہونے کے لیے ۱۱۶۶ھ کے آغاز میں اس نے لاہور کے ڈبی بازار میں جو اس وقت بھی تجارت کا مرکز تھا سنہری مسجد تعمیر کرائی۔ اس مسجد کے تین سنہری گنبد اس نواح کی زینت کو دوبالا کر رہے ہیں۔

طہماس قلی مسکین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ میر معین الملک کو بھکاری خان ہی کی سازش سے زہر دیا گیا تھا تاکہ میدان خالی ہو تو وہ اطمینان سے نظامت کا عہدہ حاصل کر کے دادِ حکومت دے۔ مگر بیگم نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ بیگم اور اپنے حریف میر مومن خاں کو برسرِ اقتدار دیکھ کر وہ انگاروں پر لوٹتا تھا۔ اس نے وزیرِ دہلی انتظام الدولہ سے سازباز کی۔ انتظام الدولہ میر معین الملک کا بھائی تھا اور وہ اپنی بھابی کو ناپسند کرتا تھا۔ اس نے اپنے دستخطوں سے ایک فرمان جاری کیا۔ بھکاری خاں کو نائب ناظم مقرر کیا مگر مغلانی بیگم نے اس فرمان کو کوئی وقعت نہ دی۔ اس پر بھکاری خان نے زبردستی لاہور پر قبضہ کر لینے کا پروگرام بنایا۔ اس نے دربار میں جانا بند کر دیا۔ اپنی حویلی پر توپیں نصب کر لیں اور فوج جمع کرنی شروع کی جس میں زیادہ تر قصور کے پٹھان تھے۔

بیگم نے فوجی سرداروں کی تنخواہیں بڑھا دیں۔ حتیٰ کہ بھکاری خان کے حامی خواجہ مرزا خان کو بھی اس سے علیحدہ کر لیا۔ جسے امین آباد کا فوجدار مقرر کیا گیا۔ بیگم نے سازش کر کے بھکاری خان کو گرفتار کر لیا اور خواجہ سعید خان کی نگرانی میں اس کی حویلی کے اندر نظر بند

کر دیا۔ بھکاری خاں کے بعد پٹی کے فوجدار قاسم خاں نے بغاوت کی مگر وہ بھی گرفتار کر لیا گیا۔

محمد امین خاں کی وفات

مغلانی بیگم ان مصائب کا مقابلہ کر رہی تھی کہ مئی ۱۷۵۴ء میں اُسے ایک اور صدمہ پہنچا۔ لاہور کے شیر خوار ناظم محمد امین خاں کا انتقال ہو گیا اور اُس کی وفات کے بعد بھی باپ کی طرح چہرے سے لے کر ناف تک بدن کا رنگ سیاہ ہو گیا جو زہر خورانی کا نتیجہ تھا۔ اگرچہ یہ صدمہ جانکاہ تھا مگر بیگم نے ہمت نہ ہاری اور اپنے سفیر دہلی اور قندھار بھیجے تاکہ درّانی اور مغل دونوں فرمانرواؤں سے اپنے لیے فرمانِ حکومت حاصل کرے۔ سفیر دہلی پہنچا تو احمد شاہ تیموری اور وزیر عماد الملک میں جھگڑا چل رہا تھا۔ اس لیے سفیر کی طرف کسی نے توجہ نہ کی۔ اسی اثنا میں احمد شاہ کو معزول کر دیا گیا۔ اور عالمگیر ثانی کو جو جہاندار شاہ کا فرزند تھا دہلی کے تخت پر بٹھا دیا گیا۔ اُس نے ۲۵ اکتوبر ۱۷۵۴ء کو میر مومن خاں کو لاہور اور ملتان کے صوبجات کا ناظم مقرر کیا۔ مگر بیگم نے حکومت اُس کے حوالے نہ کی۔

انتشار و بدامنی کا دَور

ان حالات میں انتظامِ حکومت بہت بگڑ گیا۔ ملتان میں احمد شاہ درّانی نے الگ گورنر مقرر کر دیا۔ حسن ابدال وغیرہ کے علاقے اُس کے حاکم پشاور کے ماتحت تھے۔ چار محال میں رستم خاں حاکم تھا جو براہِ راست درّانی کے ماتحت تھا۔

امرتسر، بٹالہ، کلانور اور پٹھانکوٹ وغیرہ کے شمالی علاقے سکھوں کا گڑھ بن چکے تھے۔ کانگڑہ اور شوالک کے پہاڑی علاقوں کے ہندو راجے خود مختار ہو گئے تھے۔ جالندھر دوآب میں آدینہ بیگ خان تقریباً خود مختار تھا۔ اور بیگم کی حکومت نواحِ لاہور کے چند اضلاع تک محدود تھی۔ اور اُن پر بھی مغل اور ترک فوجی سردار قابض تھے۔ لاہور میں حکومت کا یہ عالم تھا کہ دیوان اور بخشی وغیرہ اعلیٰ عہدیدار صبح سویرے میر مومن خان کے ہاں جمع ہوتے اور وہاں سے سب لوگ مغلانی بیگم کی حویلی کی ڈیوڑھی پر پہنچتے اور آداب بجا لاتے۔ بیگم امورِ حکومت کے متعلق اپنے احکام خواجہ سراؤں کے ذریعے انھیں بھیجتی۔ خواجہ سراؤں میں تین آدمی میاں خوش فہم، میاں ارجمند اور میاں حمایت ممتاز تھے۔ یہی لوگ بیگم کے مشیر اور ہم راز تھے مگر ان کی آپس میں نہ بنتی تھی اور اکثر متضاد احکام لایا کرتے تھے ؎

گفتہ خواجہ سرایان ہر کجا شد پیش رفت
کی برآید کام مرداں زاں گروہِ نامراد

انھیں دنوں بیگم کے دشمنوں نے اُسے بدنام کرنا شروع کیا اور مختلف لوگوں سے اُس کے خراب تعلقات کی خانہ ساز حکایتیں وضع کر کے شہر کے اوباش اور غیر ذمہ دار لوگوں میں پھیلانی شروع کر دیں۔

اسی اثنا میں بھکاری خان نے نظر بندی کے باوصف خواجہ محمد سعید خان سے جو خواجہ مرزا خاں کا بھائی تھا ساز باز کی۔ خواجہ مرزا خاں ایک ازبک ترک سوار تھا۔ اپنے ہم وطن تین سو سواروں کے ساتھ معین الملک خان کے دربار میں ملازمت حاصل کی۔ اور اسے سکھ باغیوں کے استیصال کے لیے متعین کیا گیا۔ نواب کی وفات پر یہ بھکاری خان سے مل گیا۔ لیکن بیگم کے تدبر نے اسے خان مذکور سے علیحدہ کر لیا۔ اور خان کا خطاب دے کر امین آباد کا فوجدار مقرر کیا۔ اسی اثنا میں پانچ چھ ہزار تازہ وارد ترکی سپاہی اُس کے ایک بھائی خواجہ قاضی کی قیادت میں اس سے آ ملے۔ اس سے خواجہ مرزا خاں کی طاقت بڑھ گئی۔ اس نے اپنے علاقہ میں سکھوں کا قلع قمع کر کے امن قائم کیا۔ خواجہ مرزا خاں کی مدد سے بیگم کو محروم اقتدار کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔ خواجہ مرزا امین آباد سے فوج لے کر لاہور کی طرف بڑھا اور بآسانی

شہر پر قابض ہو گیا۔ بیگم کو جبراً اس کی حویلی سے دوسرے مکان میں منتقل کر کے اُسے لوٹ لیا گیا۔ ترک سپاہیوں نے خواجہ مرزا کی مخالفت نہ کی۔ مگر بیگم کی نظربندی اور اس کی حویلی کی تاراجی کی خبر سُن کر سات آٹھ ہزار پور بیہ سپاہی خواجہ مرزا خاں کے لشکر پر ٹوٹ پڑے مگر شکست کھائی۔ خواجہ مرزا نے صوبہ دار لاہور ہونے کا اعلان کر دیا۔ چند روز وہ ٹھاٹ سے حکومت کرتا رہا اور ترک امرا نے اُس سے خوب تعاون کیا۔ عاشور علی خاں۔ یالاباش خاں۔ فرمان بیگ خاں۔ ابراہیم خاں وغیرہ امرا کے علاوہ خود بھکاری خاں اُس کے حضور سلام کو حاضر ہوتے۔ کچھ عرصہ بعد ان سرداروں کی باہمی رقابتیں پھر اُبھر آئیں اور خواجہ مرزا خاں اپنی قلمرو میں امورِ حکومت کو کماحقہٗ انجام نہ دے سکا۔

مغلانی بیگم نے نظربندی ہی کے دوران اپنے ماموں خواجہ عبداللہ خاں کو جو عبدالصمد خاں دلیر جنگ کا چھوٹا لڑکا اور نواب زکریا خاں کا چھوٹا بھائی تھا، احمد شاہ درانی کے دربار میں بھیجا اور لاہور کے ترک سرداروں کے خلاف شکایت کی کہ انھوں نے مغلانی بیگم کو جو شاہ کی مقرر کردہ صوبہ دار تھی نظربند کر کے ناجائز طور پر زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی ہے۔ یہ سنتے ہی شاہ نے پشاور کے درانی گورنر جہاں خاں کے چھوٹے بھائی امان خاں کو حکم دیا کہ وہ دس ہزار سپاہ لے کر لاہور پہنچے اور بیگم کو لاہور کی حکومت واپس دلائے۔ جہاں خاں نے خواجہ مرزا کو شکست دے کر قید کر لیا۔ بہت سے دوسرے ترک امرا بھی اسیر ہوئے اور لاہور کو امان خاں کے سپاہیوں نے خوب لوٹا۔ بیگم لاہور کی ناظمہ مقرر کی گئی اور خواجہ عبداللہ اس کے نائب بنے۔

بھکاری خاں کا انجام

نظامت لاہور کے حصول کے بعد بیگم نے بھکاری خاں کی مشکیں کسوا کر اپنے حضور طلب کیا اور محل کی کنیزوں اور خواجہ سراؤں سے اسے جوتے لگوائے یہاں تک کہ وہ نیم بے ہوش ہو گیا۔ بیگم نے اپنے ہاتھ سے اُسے خنجر کے دو زخم لگائے جس سے بھکاری خاں کا دم نکل گیا۔ بیگم نے اُس کی لاش شہر سے باہر خندق میں پھنکوا دی۔ یہ واقعہ اپریل ۱۷۵۳ء کا ہے۔

بعض مورخین نے یہ لکھا ہے کہ بھکاری خاں بڑا خوبرو، متقی اور عالم تھا۔ بیگم نے معین الملک کی وفات کے بعد بُری نیت سے اُس پر ڈورے ڈالنے چاہے مگر اسے شیشے میں نہ اتار سکی۔ اس ناکامی پر ناراض ہو کر بھکاری خاں کو مروا دیا۔ یہ کہانی طہماس قلی مسکین کے بیانات کی روشنی میں بالکل غلط ثابت ہوتی ہے۔ اور خان مذکور کا قتل سیاسی واقعات کا نتیجہ تھا۔

حکومت نواب عبداللہ

امان خاں واپسی پر خواجہ مرزا خاں اور دوسرے خود سر ترک مغل امرا کو اپنے ساتھ قندھار لے گیا تھا۔ اُس کی واپسی پر خواجہ عبداللہ نے میدان خالی پا کر پندرہ بیس ہزار پیادے اور سوار جمع کیے اور نظامت لاہور پر قبضہ کرنا چاہا۔ بیگم کو معلوم ہوا تو اُس نے انعام و اکرام کا لالچ دے کر اُس کے سپاہیوں کو ورغلانا چاہا مگر خواجہ عبداللہ نے میر مومن خاں اور درانی ایجنٹ ہادی خاں کی مدد سے بیگم کو نظربند کر دیا اور خود جولائی ۱۷۵۳ء میں زمامِ حکومت سنبھال لی۔ اُسے سپاہ کو مطمئن رکھنے کے لیے روپے کی بے حد ضرورت تھی۔ خزانہ خالی تھا۔ اُس نے جبر و تشدد سے روپیہ جمع کرنا شروع کیا۔ ایک روز اُس نے شہر کے دروازے بند کر کے باشندگان لاہور کو بلاتمیز مذہب و ملت لوٹنا شروع کر دیا۔ بہانہ یہ بنایا کہ وہ بھکاری خاں کے حامی تھے۔ اس گیرو دار میں بہت سے لوگ مارے گئے۔ اسی زمانے میں لاہور میں یہ ضرب المثل مشہور ہوئی۔

حکومت نواب عبداللہ۔ نہ رئی چکی نہ رہیا چلھا (چولھا)

ان حالات میں غلہ اور اجناس خوردنی بے حد مہنگے ہو گئے اور لوگ بھوکے مرنے لگے۔

آدینہ بیگ کا لاہور پر قبضہ

آدینہ بیگ ذات کا ارائیں اور شرق پور کا باشندہ تھا۔ یہ وہ شرقپور نہیں جو لاہور کے قریب راوی کے دائیں کنارے ضلع شیخوپورہ میں واقع ہے۔ بلکہ یہ شرق پور جالندھر کے قریب واقع تھا۔ اور اب شرپور کہلاتا ہے۔ آدینہ بیگ نے ایک مغل گھرانے میں پرورش پائی اور شاہی ملازمت اختیار کی۔ اور رفتہ رفتہ جالندھر دوآب کا فوجدار مقرر ہو گیا۔ معین الملک کی وفات کے بعد اس کا تعلق لاہور سے بالکل برائے نام رہ گیا اور یہ جالندھر دوآب کا عملی طور پر خود مختار حاکم بن گیا۔ اپریل ۱۷۵۵ء میں اُس نے قطب خاں روہیلہ فوجدار سرہند کو شکست دے کر اس سرکار پر بھی قبضہ کر لیا۔ اور بیاس سے لے کر جمنا تک کا علاقہ اس کے زیرِ تصرف آ گیا۔ قطب خاں شہنشاہ دہلی کا باغی تھا۔ اور اس اقدام سے اس نے دربارِ دہلی کی خوشنودی بھی حاصل کر لی تھی۔

لاہور کے حالات نے آدینہ بیگ خاں کو اپنا حلقۂ اقتدار وسیع کرنے کا ایک درخشاں موقع دیا۔ خواجہ عبداللہ سے لوگ نفرت کرتے تھے۔ کوئی اور حریف میدان میں نہ تھا۔ آدینہ بیگ نے لاہور پر فوج کشی کی۔ خواجہ عبداللہ مقابلہ کئے بغیر سندھ کی طرف بھاگ گیا۔ اور آدینہ بیگ شہر پر قابض ہو گیا۔ مگر وہ تھوڑا عرصہ یہاں رہ کر جالندھر واپس چلا گیا اور صادق بیگ خاں کو اپنا نائب مقرر کیا۔

ان حالات میں مغلانی بیگم نے دہلی کے وزیر غازی الدین خاں عماد الملک کو مدد کے لیے خط لکھا۔ یہ شخص میر معین الملک کا بھانجا تھا اور مغلانی بیگم کی بیٹی عمدہ بیگم کی اس سے منگنی ہو چکی تھی۔ عماد الملک نے موقع کو غنیمت جانا اور پنجاب کی سیاسیات میں دخیل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ وزیر کو اُس وقت روپے کی ضرورت تھی۔ اور اس کا خیال تھا کہ لاہور سے اُسے کافی روپیہ مل جائے گا۔

اس موقع پر مغلانی بیگم نے عمدہ بیگم کی رخصتی کا وعدہ بھی کیا تھا۔ اگرچہ عماد الملک اُس وقت دہلی کی ایک ذہین و فطین خاتون گنا بیگم سے شادی کر چکا تھا تاہم وہ عمدہ بیگم کی رخصتی کا بھی متمنی تھا جو اس کے مرحوم ماموں کی بیٹی تھی۔ گنا بیگم علی قلی خاں ہفت ہزاری کی بیٹی تھی جو عالمگیر ثانی کا درباری امیر تھا۔ گنا بیگم حسن و جمال میں بے مثال۔ اور شعر و سخن میں باکمال تھی۔ بڑے بڑے اکابر جن میں لکھنؤ کے نواب وزیر شجاع الدولہ بھی تھے۔ اُس سے شادی کے متمنی تھے۔ مگر اس کی قسمت میں عماد الملک کی بیوی بننا لکھا تھا۔ یہ انتخاب بہت ہی بُرا ثابت ہوا کیونکہ ۱۷۵۷ء میں جب احمد شاہ درانی نے دہلی پر قبضہ کیا تو گنا بیگم کو مغلانی بیگم کے حوالے کر دیا۔ اور اس نے گنا بیگم کو اپنی کنیز بنا لیا

(FALL OF THE MUGHAL EMPIRE, J.N. SARKAR, VOL. III. P.108 – 109)

شکار کے بہانے عماد الملک ۱۵ جنوری ۱۷۵۶ء کو ولی عہد سلطنت شہزادہ عالی گہر کو ہمراہ لئے دہلی سے نکلا۔ اُس کے ساتھ دس ہزار سپاہ تھی۔ سرہند کے مقام پر اُسے آدینہ بیگ کا پیغام ملا "آپ سرہند ہی ٹھہریے اور کسی خواجہ سرا کو دو تین ہزار سپاہیوں کے ساتھ میرے پاس بھیج دیجئے میں اپنے سپاہ کی مدد سے لاہور پر اُس کا قبضہ کرا دوں گا۔ اگر آپ خود وہاں گئے تو کام مشکل ہو جائے گا۔"

چنانچہ عماد الملک نے نسیم خاں خواجہ سرا کو کچھ سپاہ کے ساتھ جالندھر بھیجا اور ستلج کے کنارے ماچھی واڑہ کے مقام پر بقیہ فوج کے ساتھ قیام کیا۔ آدینہ بیگ نے صادق بیگ خاں کو اپنے دس ہزار سپاہیوں کی معیت میں وزیر کی فرستادہ فوج کے ساتھ لاہور بھیج دیا۔ اس فوج نے شاہ گنج قیام کیا اور پھر تمام لشکر مغلانی بیگم کے ہاں سلام کے لیے گیا۔ واپسی پر یہ لوگ خواجہ عبداللہ کے پاس گئے اور اس نے صادق بیگ خاں کو خلعت عطا کیا۔ مگر اس کے باوجود وہ خوفزدہ ہو کر جموں کی طرف بھاگ گیا۔

مغلانی بیگم کی گرفتاری

وزیر کا خط مغلانی بیگم کو دیا گیا جس میں کہ اُس نے عمدہ بیگم کی رخصتی کے لیے درخواست کی ہوئی تھی۔ بیگم نے پھر زمام حکومت سنبھالی اور عمدہ بیگم کی رخصتی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ایک ماہ بعد عمدہ بیگم کو ایک نہایت اچھا جہیز دے کر جس میں اعلیٰ پوشاکیں، بیش قیمت زیورات، گھر کا تمام ساز و سامان، خواجہ سرا اور ملازم شامل تھے اعزاز کے ساتھ رخصت کیا۔ تین ہزار سپاہی دلہن کے ہمراہ بھیجے گئے اور چار مارچ ۱۷۵۶ء کو وہ بمقام ماچھی واڑہ وزیر کے کیمپ میں پہنچ گئی۔

عماد الملک کا اگلا قدم مغلانی بیگم کی گرفتاری کی تدبیر تھی۔ اُس نے سید جمال الدین خان، نثار محمد خان، شیر جنگ، حکیم عباد اللہ خان اور خواجہ سعادت یاب خان کو آدینہ بیگ کے پاس بھیجا کہ بیگم کو بھی وزیر کے کیمپ میں لے آنے کی تدبیر کی جائے۔ آدینہ بیگ بھی مغلانی بیگم کا لاہور سے اخراج پسند کرتا تھا۔ اس نے ان اکابر کو کچھ فوج کے ہمراہ لاہور بھیجا۔ ان لوگوں نے اُس کی حویلی کا محاصرہ کر لیا چند خواجہ سرا اندر گئے بیگم کو جگایا اور ایک پالکی میں ڈال کر باہر لے آئے اور یہ پالکی فی الفور شہر سے باہر لشکرگاہ میں پہنچا دی گئی۔

مغلانی بیگم ۲۸ مارچ کو بحالت اسیری ماچھی واڑہ پہنچی۔ عماد الملک اس کے استقبال کو آیا۔ جونہی دونوں کی ملاقات ہوئی بیگم نے انتہائی غصے کے عالم میں یہ دھمکی دی کہ "تمہارا طرز عمل سلطنت دہلی اور امرائے دولت کی بربادی کا سبب بنے گا اور میری بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے بہت جلد احمد شاہ درانی دہلی پہنچے گا۔"

عماد الملک نے تیس لاکھ روپیہ سالانہ خراج کے عوض آدینہ بیگ خان کو لاہور اور ملتان کا صوبہ دار مقرر کیا۔ سید جمیل الدین خان کو لاہور میں اس کا نائب نامزد کیا اور ۹ مئی ۱۷۵۶ء کو وزیر کا کیمپ دہلی کی طرف روانہ ہوا۔

خواجہ عبد اللہ لاہور میں

سید جمیل الدین ایک بہادر اور باحوصلہ انسان تھا۔ وہ لاہور پہنچا تو اس نے شہر کو برباد اور رعایا کو قلاش پایا۔ وسائل کی کمی کے باوصف اُس نے انتظام حکومت درست کرنے کی کوشش کی اور اجناس کی قیمت معمول پر لانے کے لیے منڈیوں کے چودھریوں پر سختی کی۔ اس کی بہادری کے سلسلے میں مسکین لکھتا ہے۔

"ایک بار میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ سید جمیل الدین سیر و شکار کے لیے شہر قصور کی جانب جا نکلا۔ دس بارہ ہزار سکھوں پر مشتمل ایک جمعیت نے اس پر حملہ کر دیا۔ اُس کے ہمراہ تقریباً ایک ہزار سپاہی تھے۔ اتنی قلیل سپاہ کے باوصف اُس نے دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اُسے بھگا دیا۔" اللہ اللہ ہمارے دورِ زوال میں بھی کیسی کیسی نادر روزگار ہستیاں پیدا ہوئیں۔ اگر ہماری منتشر طاقتیں ایک مرکز پر جمع رہتیں۔ تو کبھی بھی پنجاب میں سکھوں کی حکومت قائم نہ ہوتی اور ہماری مرکزی حکومت کا شیرازہ نہ بکھرتا ؎

قوموں کے لیے موت ہے مرکز سے جدائی
ہو صاحبِ مرکز تو خودی کیا ہے خدائی

سید جمیل الدین کا دورِ اقتدار بہت ہی مختصر ثابت ہوا ؎

خوش درخشید و لے دولتِ مستعجل بود

خواجہ عبد اللہ جموں سے سیدھا قندھار گیا اور تمام داستان احمد شاہ درانی کو سنائی کہ دربارِ دہلی نے آدینہ بیگ کو لاہور اور ملتان کا صوبہ دار مقرر کر دیا ہے اور مغلانی بیگم کو قید کر کے عماد الملک دہلی لے گیا ہے۔ درانی کے لیے یہ خبر ناقابل برداشت تھی۔ وہ لاہور اور ملتان کو ۱۷۵۲ء کے معاہدۂ شالامار کے بعد اپنی قلمرو کا حصہ شمار کرتا تھا اور مغلانی بیگم کو اپنی صوبہ دار سمجھتا تھا۔ اس نے ایک فوج دے کر

جنگ باز خاں کو خواجہ عبداللہ کے ہمراہ بھیجا۔ وہ اپنے ساتھ خواجہ مرزا وغیرہ ترک جمعداروں کو بھی لے آیا۔ جو درانی کے پاس نظر بند تھے۔ سید جمیل الدین نے آدینہ بیگ کو امداد کے لیے لکھا۔ مگر اُسے جواب یہ ملا کہ درانی کے عساکر سے لڑنا فضول ہے۔ آپ جالندھر چلے آئیں دونوں مل کر کوئی پروگرام بنائیں گے۔ سید جمیل کے لاہور سے چلے جانے کے بعد باشندگانِ شہر میں سے بھی اکثر لوگ جدھر کسی کے سینگ سمائے بھاگ نکلے۔ جنگ باز خاں ۱۴ اکتوبر ۱۷۵۶ء کو لاہور میں داخل ہوا۔ خواجہ عبداللہ خاں کو ناظم اور خواجہ مرزا خاں کو اُس کا نائب مقرر کیا۔ درانی سپاہ نے شہر کو خوب لوٹا۔ نئے حاکموں کو اطمینان سے حکومت کرنا نصیب نہ ہوا اور سکھوں نے جو اُس وقت تک بہت طاقتور ہو چکے تھے انہیں بے حد پریشان کیا۔

احمد شاہ درّانی کا چوتھا حملہ
جنوری تا اپریل ۱۷۵۷ء

مغلانی بیگم نے دہلی سے احمد شاہ درّانی کو خط لکھا کہ وزیر دہلی نے پنجاب کی حکومت اُس سے چھین لی ہے اور اُسے میر مومن۔ آدینہ بیگ اور سید جمیل کی غداری نے تباہ کیا ہے۔ آپ اس کا بدلہ لینے کے لیے دہلی پر حملہ کریں۔ وہاں کے حالات دگرگوں ہیں اور فتح و نصرت آپ کے قدم چومے گی۔ میرے خسر وزیر قمرالدین خاں کے محل میں کروڑوں روپے کا اثاثہ ہے۔ یہی حال دوسرے امرا کا ہے۔ یہ سب مال و دولت اپنی ملکیت سمجھیے۔

احمد شاہ درّانی ایسا موقع ہاتھ سے کب دے سکتا تھا۔ اس نے قلندر بیگ خاں کو بطورِ سفیر شہنشاہ دہلی عالمگیر ثانی کے دربار میں بھیجا کہ وہ وزیر کے اس طرزِ عمل کی وضاحت کرے کہ اس نے لاہور اور ملتان کے صوبوں پر مغل ناظم مقرر کر دیے ہیں حالانکہ ۱۷۵۲ء سے یہ صوبے درّانی مقبوضات میں شامل ہیں۔ مگر اس سفارت کا خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ احمد شاہ درّانی قندھار سے پشاور آیا اور اپنے ہراول دستے جہاں خان سپہ سالار اور اپنے فرزند تیمور شاہ کی قیادت میں روانہ کیے۔ یہ لشکر اٹک۔ حسن ابدال اور گجرات ہوتا ہوا ایمن آباد پہنچا۔ آدینہ بیگ خان اُس وقت باری دوآب میں جلال آباد کے مقام پر خیمہ زن تھا۔ درّانی لشکر کی آمد کی خبر سُن کر وہ صادق بیگ اور سید جمیل کو لے کر دریائے بیاس پار کر کے سرائے نور محل میں چلا گیا۔ وہاں سے تہارا اور ہریانہ ہوتا ہوا کانگڑہ کی پہاڑیوں میں کالی بلوان نام ایک جگہ پناہ گزیں ہوا جو ہوشیار پور سے ستر میل کے فاصلے پر شمال مغرب کی طرف واقع ہے۔ جہاں خان نے جالندھر دوآب میں آدینہ بیگ کا پیچھا کیا۔ مگر اُسے پکڑ نہ سکا۔ اس بار احمد شاہ درّانی بغیر کسی رکاوٹ کے پنجاب کو روندتا ہوا دہلی کے دروازوں تک پہنچ گیا۔ عماد الملک نے شہر کے دفاع کے لیے کوئی انتظام نہ کیا اور ایسے درویشوں کی تلاش میں رہا جن کی دعا سے بغیر لڑے دشمن قابو میں آ جائے۔ درّانی کے سرہند پہنچنے کی خبر ملی تو اُس نے مغلانی بیگم کو ۵۰۰ سواروں کی معیت میں احمد شاہ درّانی کے پاس بھیجا تاکہ وہ سمجھا بجھا کر اُس کا غصہ ٹھنڈا کرے اور دہلی کو تباہی سے بچائے۔ بیگم کرنال کے مقام پر اُس سے جا ملی اور احمد شاہ درّانی اُسے ہمراہ لے کر آگے بڑھتا گیا۔ نریلا کے مقام پر نجیب الدولہ اور عماد الملک یکے بعد دیگرے درّانی کے کیمپ میں پہنچے اور اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔

۲۸ جنوری ۱۷۵۷ء کو درانی دہلی میں داخل ہوا۔ اس کی سپاہ نے شہر کو بے دریغ لوٹا۔ مغلانی بیگم کی نشان دہی پر بڑے بڑے قدیم خاندانی امرا کی حویلیاں تاراج ہوئیں اور بالخصوص اُس کے خسر قمرالدین خاں کے خاندان کو لوٹا گیا۔ مغلانی بیگم کی ساس شولاپوری بیگم کو قید کر کے بڑی اذیت پہنچائی گئی۔ اور اس کا تمام زر و مال لوٹ لیا گیا۔ لوٹ مار کے دوران بہت سے لوگ مارے گئے۔ اس دوران میں درّانی نے اپنے بیٹے تیمور شاہ کی شادی عالمگیر ثانی کی بیٹی زہرہ بیگم سے کی۔ اس نے خود مرحوم بادشاہ محمد شاہ کی سولہ سالہ گلفام اور پری اندام لڑکی

حضرت بیگم سے زبردستی شادی کی۔ مغلانی بیگم کی کارگزاری سے احمد شاہ درانی اس قدر خوش ہوا کہ اُسے سلطان مرزا کا خطاب دیا اور یہ کہا کہ اب تک میں تمہیں بیٹی سمجھتا تھا۔ آج سے تمہیں اپنا بیٹا شمار کروں گا۔ اور اسے خلعتِ شاہانہ بھی عطا کیا۔

دہلی سے واپسی پر احمد شاہ درانی نے تیمور شاہ کو پنجاب میں اپنا نائب السلطنت مقرر کیا اور جہان خاں کو اس کے پاس چھوڑا۔ مغلانی بیگم پنجاب کی حکومت یا کم از کم پنجاب میں ایک بڑی جاگیر کی متمنی تھی۔ مگر اُس کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی اور اُسے صرف تیس ہزار روپے سالانہ وظیفے پر ٹرخا دیا گیا۔

جہان خاں نے اقامتِ لاہور کے زمانے میں حصولِ زر کے لیے بہت سختی کی۔ ایک بار مغلانی بیگم کو بھی پیٹا۔ آدینہ بیگ خاں کو جالندھر دوآب کا حاکم مقرر کیا گیا تھا۔ اسے ادائیگی خراج کے لیے تنگ کرنا شروع کیا۔ درانیوں کے طرزِ عمل سے تنگ آ کر آدینہ بیگ خاں نے مرہٹوں کو پنجاب پر حملے کے لیے بلایا۔ مرہٹوں کی آمد پر جہان خاں پہلے لاہور سے شاہدرہ چلا گیا اور کچھ عرصہ وہاں مقیم رہ کر اپنی فوج سمیت پشاور کی راہ لی۔ مرہٹوں نے لاہور پر قبضہ کر لیا اور ۷۵ لاکھ روپے سالانہ خراج پر آدینہ بیگ کو پنجاب میں نائب السلطنت مقرر کیا۔ وہ خود لاہور میں مقیم ہونا پسند نہ کرتا تھا۔ اُس نے خواجہ مرزا خاں کو صوبائی دارالحکومت میں چھوڑا اور خود بٹالہ میں اقامت اختیار کی۔ خواجہ مرزا خاں مغلانی بیگم کی سازشوں سے بہت ڈرتا تھا۔ اُس نے آدینہ بیگ خاں سے درخواست کی کہ وہ بیگم کو اپنے ہمراہ بٹالہ لے جائے۔ بٹالہ کے قریب آدینہ بیگ نے آدینہ نگر نام ایک قصبہ بسایا جو آج دینہ نگر کہلاتا ہے۔ آدینہ بیگ بیگم کو اپنے ہمراہ دینانگر لے گیا۔ اور بڑے احترام سے اُسے اپنے پاس رکھا۔ بعد ازاں بیگم جموں میں جا کر آباد ہو گئی۔ اور وہیں ۱۷۷۹ء میں اس کا انتقال ہوا۔

احمد شاہ درانی کا پانچواں حملہ
۱۷۵۹ء ـ ۱۷۶۱ء

چوتھے حملے کے بعد احمد شاہ درانی نے لاہور اور ملتان کے صوبوں کے علاوہ سرہند سرکار کو بھی (جو صوبہ دہلی کا حصہ تھی) اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔ اُسے مرہٹوں کے لاہور پر قابض ہو جانے کی خبر ملی تو وہ غیض و غضب سے بھرا ۱۷۵۹ء کے موسم خزاں میں فوجِ کثیر لے کر لاہور پہنچا۔ اس کی آمد پر مرہٹے پنجاب خالی کر کے دہلی چلے گئے۔ شاہ نے شاہ ولی خاں کے بھتیجے کریم داد خاں کو پنجاب کا حاکم مقرر کیا اور خود سرہند کی راہ لی۔ وزیر عماد الملک نے اس خوف سے کہ بادشاہ عالمگیر ثانی اور انتظام الدولہ (برادرِ میر معین الملک) کہیں اس کے خلاف احمد شاہ درانی سے نہ مل جائیں۔ دونوں کو یکے بعد دیگرے ۲۹ اور ۳۰ نومبر ۱۷۵۹ء کو مروا ڈالا۔ اور ایک شہزادے کو شاہ جہان ثانی کے لقب سے تختِ دہلی پر بٹھا دیا۔ اس بار احمد شاہ درانی زیادہ عرصہ ہندوستان میں مقیم رہا اور اس نے مرہٹوں کے خلاف کارروائی کی۔

پانی پت کی یہ تیسری جنگ تاریخ کی مشہور فیصلہ کن لڑائیوں میں سے تھی۔ لشکرِ اسلام نے احمد شاہ درانی کی قیادت میں جس بہادری اور دوراندیشی سے جنگ لڑی وہ اوراقِ تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ ۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء کو آخری معرکہ ہوا اور سداشو بھاؤ اور اس کا بھتیجہ وشواس راؤ جو پیشوا کا بیٹا تھا، ہزارہا مرہٹہ سپاہیوں کے ساتھ میدانِ جنگ میں کام آئے۔ باقیماندہ مرہٹہ سورما سراسیمگی کے عالم میں میدانِ جنگ سے بھاگ نکلے۔ ۲۰ ہزار مرہٹہ سپاہی مارے گئے۔ ۲۲ ہزار قید ہوئے۔ دو لاکھ مویشی کئی ہزار اونٹ ۵۰۰ ہاتھی اور بے انتہا زر و جواہر درانی لشکر کے ہاتھ لگے۔ اس شکست کا مرہٹہ حکمران بالاجی باجی راؤ کو اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ غم سے گھل گھل کر ۶ ماہ کے اندر راہیٔ ملکِ عدم ہوا۔

فتح کے اگلے روز احمد شاہ درّانی پوشاکِ فاخرہ زیبِ تن کیے، زرہ اور دیگر ہیرے پہنے تاج لگائے حضرت بو علی قلندر کے مزار پر فاتحہ کے لیے گیا۔ اور وہاں بہت سا روپیہ بطورِ خیرات تقسیم کیا۔ بعد ازاں شاہی لشکر دہلی گیا اور دو ماہ وہاں آرام کرنے کے بعد ۲۲ مارچ ۱۷۶۱ء کو عازمِ قندھار ہوا۔

احمد شاہ درّانی کا چھٹا حملہ (۱۷۶۲ء)

۱۷۶۱ء کے موسم گرما کے آغاز میں قندھار جاتے ہوئے احمد شاہ درانی نے زین خاں کو سرہند میں صادق خاں آفریدی کو جالندھر دوآب میں خواجہ عبید خاں کو لاہور میں اور خواجہ مرزا خاں کو چار محال میں حاکم مقرر کیا۔ جب تک احمد شاہ درانی یہاں رہا سکھ شوالک کی پہاڑیوں میں چھپے رہے۔ احمد شاہ کے اٹک پار جاتے ہی یہ لوگ حشرات الارض کی طرح اپنی کمین گاہوں سے نکل آئے اور تاخت و تاراج شروع کر دی۔ رچنا دوآب میں، ۴۰ ہزار سکھوں نے خواجہ مرزا خاں کو بھگا دیا اور سرہند میں زین خان کا محاصرہ کر لیا۔ اس جگہ مالیر کوٹلہ کے پٹھان سردار بھیکن خاں نے نہایت پامردی سے اُن کا مقابلہ کیا۔ سکھوں نے اُس کی جاگیر کو تباہ و برباد کر دیا۔ احمد شاہ درّانی کے لیے یہ خبر بہت روح فرسا تھی اس نے نور الدین خان کو افواج دے کر پنجاب بھیجا جسے لاہور پہنچنے سے پہلے ہی سکھوں کی مُسکر چکیہ مثل کے سردار چڑت سنگھ نے (جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کا دادا تھا) شکست دے کر بھگا دیا۔ اس پر خواجہ عبید خاں حاکم لاہور نے ہمت کر کے چڑت سنگھ کے شہر گوجرانوالہ کا محاصرہ کر لیا مگر بُری طرح شکست کھائی اور بمشکل جان بچا کر لاہور پہنچا۔

لاہور پر سکھوں کا قبضہ اور اُن کا پہلا سکّہ (۱۷۶۱ء)

ان تمام مذکورہ صدر واقعات نے سکھوں کا حوصلہ بڑھایا اور جسا سنگھ کلال اہلووالیہ سردار کپورتھلہ کی قیادت میں سکھوں نے لاہور پر حملہ کیا[1] خواجہ عبید خاں کو شکست دے کر مار ڈالا اور لاہور پر قبضہ کر لیا۔ بقول لشادپسرری

بلاہور سگ بے شعور یا قسمت

دل خالصہ نے جسا سنگھ کی بادشاہت کا اعلان کر دیا یعنی اب پنجاب کا بادشاہ احمد شاہ درانی کی بجائے جسا سنگھ تھا۔ اس موقعہ پہ سکھوں نے پہلی بار اپنا سکّہ بھی لاہور کی ٹکسال میں ضرب کیا۔ جس پر ذیل کے الفاظ تھے:۔

سکہ زد در جہاں بفضلِ اکال　　ملکِ احمد گرفت جسا کلال

پنجاب کے مسلمان سرداروں نے یہ سکّے اور تمام واقعات کی تفصیل احمد شاہ درّانی کو لکھ بھیجی اور یہ سنتے ہی وہ اپنے عساکرِ قاہرہ لیے عازمِ پنجاب ہوا۔

احمد شاہ درانی اپنی فوجیں لیے عقاب کی طرح جھپٹا اور بہت جلد پنجاب پہنچ گیا۔ اُس نے سنا کہ سکھ لدھیانہ سے ۲۲ میل دور مالیر کوٹلہ کے پاس کپ کے مقام پر مقیم ہیں اور ان کی تعداد ۵۰ ہزار کے قریب ہے سکھوں کی عادت تھی کہ وہ شاہ کی آمد کی خبر سُن کر پہاڑوں اور جنگلوں میں جا چھپتے تھے اور کھلے میدان میں اُس کے عساکر کا مقابلہ کرنے سے احتراز کرتے تھے۔ اس بار شاہ نے اپنی نقل و حرکت کی خبر بے حد پوشیدہ رکھی اور غیر مانوس راستوں سے گزرتا ہوا سکھ کیمپ کے سامنے جا پہنچا۔ یہاں تک کہ سکھوں کو بھاگنے کی فرصت نہ ملی اور

---

[1] ۲۲ اکتوبر ۱۷۶۱ء کو سکھوں نے امرتسر میں دیوالی کا تہوار منایا اور مگورمتہ کر کے لاہور پر ہلّہ بول دیا۔ اور شہر پر قبضہ کر لیا۔

درانی فوج نے انھیں شکستِ فاش دی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ سکھ اور احمد شاہ درانی کھلے میدان میں باہم نبرد آزما ہوئے۔ کم از کم دس بارہ ہزار سکھ اس معرکہ میں کام آئے۔ کُپ کی جنگ کو سکھ لوگ لُو گھارا کے نام سے پکارتے ہیں۔ یعنی وہ تباہی انگیز جنگ جس میں ان کی قوم کو لہو میں نہلوا دی گئی۔ اس معرکے کے بعد احمد شاہ نے کچھ عرصہ قیام کیا اور سکھوں کی تادیب جاری رکھی۔

بارہ دسمبر ۱۷۶۲ء کو احمد شاہ لاہور سے قندھار روانہ ہوا۔ اور اس نے کابلی مل نام ایک ہندو کو لاہور کا ناظم مقرر کیا۔ جب تک وہ یہاں رہا سکھ کمین گاہوں میں چھپے رہے۔

احمد شاہ درّانی کا ساتواں حملہ

احمد شاہ درانی کی واپسی کے بعد سکھوں نے پنجاب میں لوٹ کھسوٹ و خون کا بازار گرم کر دیا۔ مئی ۱۷۶۴ء میں انھوں نے قصور پر حملہ کر کے پٹھان سرداروں کو شکست دی اور شہر کو لوٹ لیا۔ جون میں جالندھر دوآب کو تاراج کیا۔ درّانی کے سپہ سالار جہان خان کو نومبر کے وسط میں چناب کے کنارے شکست دے کر بھگا دیا۔ دسمبر میں مالیر کوٹلہ پر انھوں نے قبضہ کر لیا۔ ۱۴ جنوری ۱۷۶۴ء کو انھوں نے سرہند پر حملہ کر کے زین خان حاکم شہر کو مار ڈالا اور فروری میں دوآب گنگ و جمن پر جو نجیب الدولہ کا علاقہ تھا ہلّہ بول دیا اور سہارنپور اور میرٹھ کے ضلعوں کو تاخت و تاراج کر دیا۔ اس کے بعد سکھوں نے لاہور کا محاصرہ کر لیا اور کابلی مل سے مطالبہ کیا کہ ذبیحۂ گاؤ بند کیا جائے اور قصابوں کو قتل کر دیا جائے۔ کابلی مل نے بہانہ سازی سے کام لیا مگر اس کی پیش نہ گئی۔ آخر کار اس نے چند قصابوں کے ناک اور ہاتھ کاٹ کر شہر سے باہر نکال دیا۔ اس پر سکھ محاصرہ اٹھا کر چلے گئے۔

سکر چکیہ مثل کے سردار چڑت سنگھ نے جہلم تک تمام علاقے کو تاراج کر کے قلعہ رہتاس پر قبضہ کر لیا۔ احمد شاہ درانی کو جب رہتاس سے لے کر روہیل کھنڈ تک تمام علاقے میں سکھوں کی تخریبی کارروائیوں کی اطلاع ملی تو اس نے پنجاب پر حملہ کر کے سکھوں کے خلاف جہاد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ۱۸۰۰۰ فوج جمع کی اور بلوچستان کے سردار نصیر خاں کو لکھا کہ وہ جہاد میں اس کا ساتھ دے۔ نصیر خاں حج کی تیاریاں کر رہا تھا لیکن پنجاب اور شمالی ہند کے مسلمانوں کو سکھوں کے مظالم سے بچانے کے لیے اُس نے حج کا ارادہ ملتوی کیا اور جہاد کی نیت سے بلوچ رضاکاروں کے دستے لے کر احمد شاہ درانی سے آملا۔ اس کے ہمراہ ۱۲۰۰۰ سپاہی تھے۔ احمد شاہ درانی پہلے روانہ ہو چکا تھا اور نصیر خاں اسے ایمن آباد میں آملا تھا۔ اس کے بعد دونوں سردار لاہور پہنچے۔ راستے میں نصیر خاں ایک رات شاہدرہ ٹھہرا۔ لاہور پہنچ کر احمد شاہ نے قلعہ لاہور کے دیوانِ عام میں دربار کیا اور لاہور کے عمائد کو اس میں صلاح مشورے کے لیے بلایا۔ سب نے نصیر خاں کی تجویز کو پسند کیا اور ملکی جنگل پر جہاں کچھ سکھ چھپے ہوئے تھے حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگلے روز یہ خبر ملی کہ سکھوں نے قراول پر حملہ کر دیا ہے۔ قراول سپاہیوں کے اُس دستے کو کہتے تھے جو سازو سامان۔ عورتوں۔ بچوں اور شاگرد پیشہ کیمپوں کی حفاظت کے لیے مقرر کیا جاتا تھا۔ یہ خبر سنتے ہی جوشِ جہاد میں نصیر خاں خود ایک فوج کے ہمراہ لڑنے کے لیے نکلا اور میدانِ کارزار میں مرنے سے بال بال بچا۔ احمد شاہ درّانی اور نصیر خاں کچھ عرصہ پنجاب کے مختلف حصوں میں سکھوں کے خلاف لڑنے کے بعد واپس ہوئے۔ رہتاس

نوٹ: کُپ سے فتح مند لشکر ۳ مارچ ۱۷۶۲ء کو لاہور پہنچا اور ۱۲ دسمبر تک احمد شاہ لاہور میں مقیم رہا۔ اس دوران میں جولائی کا مہینہ اس نے ضلع گورداسپور کے تاریخی شہر کلانور میں گرمی سے بچنے کے لیے گزارا۔

کے قلعے تک دونوں اکٹھے گئے۔ وہاں سے احمد شاہ اٹک اور پشاور کے راستے عازم کابل ہوا اور نصیر خاں نے ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے مقام پر اسمٰعیل خاں کی مدد سے دریائے سندھ کو عبور کیا اور ڈیرہ جات میں سے گزرتا ہوا قلات جا پہنچا۔ احمد شاہ درانی کے اس حملے کے حالات اور سکھوں کے خلاف بلوچوں اور پٹھانوں کی ترک تازکے حالات قاضی نور محمد نے فارسی نظم میں قلمبند کیے ہیں۔ کتاب چھپ چکی ہے۔ قاضی نور محمد نصیر خاں بلوچ کے لشکر کے ہمراہ قلات سے آیا تھا۔ اس حملے کا مقصد سکھ غارت گروں کا قلع قمع کر کے پنجاب میں امن کی فضا قائم کرنا اور مسلمان رعایا کو غارت گری سے بچانا تھا۔ مگر چند ماہ سکھوں کے خلاف لڑنے کے بعد یہ دونوں مجاہد واپس چلے گئے اور پنجاب میں سیاسی فضا کو مسلمانوں کے لیے سازگار بنانے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

احمد شاہ درانی کا آٹھواں حملہ

اپریل ۱۷۶۵ء میں احمد شاہ واپس ہوا تو سکھوں نے تقریباً ایک ماہ بعد لاہور پر قبضہ کر لیا۔ ۱۷۶۶ء کے موسم خزاں میں احمد شاہ درانی نے آٹھویں بار پنجاب پر فوج کشی کی جہلم کے قریب بلم سنگھ آٹھ ہزار سپاہی لیے مقابلے پر آیا مگر شکست کھا کر مارا گیا۔ ۱۲ دسمبر کو احمد شاہ لاہور کے قریب فاضل آباد پہنچا۔ اس پر سوبھا سنگھ۔ لہنا سنگھ۔ گوجر سنگھ لاہور کے تین حاکم اور ہیرا سنگھ اور رعجب سنگھ جو لاہور میں تھے شہر چھوڑ کر بھاگ گئے حالانکہ ان کے پاس آٹھ دس ہزار فوج تھی۔ گوجر سنگھ اور لہنا سنگھ قصور چلے گئے۔ عجب سنگھ اور سوبھا سنگھ پاک پٹن چلے گئے۔ ۲۲ دسمبر کو وہ لاہور پہنچا۔ اس واقعہ کے بارے میں پنجاب میں یہ شعر مشہور ہوا ؎

سوبھے دی سوبھا گئی۔ گجر دا گیا مال
لہنے نوں دینا آیا۔ تینوں ہوئے کنگال

اسی اثنا میں لاہور کے لوگوں کا ایک وفد شاہ سے ملا۔ اور انھوں نے بادشاہ سے درخواست کی کہ وہ لہنا سنگھ کو پنجاب کا گورنر مقرر کر دے کیونکہ وہ دوسرے سکھ سرداروں کے مقابلے میں زیادہ نیک دل اور رعایا کا خیر خواہ ہے۔ بادشاہ نے اسے لاہور بلا کر پنجاب میں اپنا نائب مقرر کرنے کا ارادہ کیا مگر لہنا سنگھ نے احمد شاہ درانی کے ماتحت یہ عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ اس سے دوسرے سکھ سردار ناراض ہو جائیں گے۔ اس نے شاہ کا ارسال کردہ خشک میوہ بھی واپس کر دیا۔ اور اسے کہلا بھیجا کہ یہ میوے تو غریب دیہاتی زمینداروں کے کھانے کی چیز نہیں۔ ہماری خوراک تو جوار اور باجرہ وغیرہ ہے۔

لاہور سے احمد شاہ درانی نے سرہند کا رخ کیا۔ اس سفر میں چڑت سنگھ اور لہنا سنگھ نے شاہ کے لشکر کے سامان پر حملہ کیا اور کچھ لوٹ مار کر کے بھاگ گئے۔ یہ لوگ پندرہ سے پچیس میل کے دائرے میں شاہ کے لشکر کے گرد منڈلاتے رہے۔ انھوں نے کہیں جم کر مقابلہ نہ کیا بلکہ جہاں موقع ملتا چھاپہ مار کر شاہی لشکر کو نقصان پہنچاتے۔

۷ جنوری ۱۷۶۷ء کو چڑت سنگھ۔ ہیرا سنگھ۔ لہنا سنگھ اور گوجر سنگھ نے جہان خاں پر حملہ کیا جو اس وقت بمقام امرتسر مقیم تھا۔ تین گھنٹے تک لڑائی ہوئی۔ پانچ چھ ہزار کے قریب سپاہی زخمی ہوئے یا مارے گئے۔ شاہ جو سرہند کی طرف جا رہا تھا اور امرتسر سے زیادہ دور نہ تھا۔ یہ خبر سنتے ہی امرتسر پہنچا اور سکھوں کو بھگا دیا۔ جب احمد شاہ سفر کرتا ہوا دریائے ستلج کے کنارے ماچھی واڑہ کے گھاٹ پر پہنچا تو سکھوں نے اس پر پھر حملہ کیا۔ اور لشکر کو کچھ نقصان پہنچا کر بھاگ گئے۔

سرہند کے مقام پر پھولکیاں مثل کے سردار امر سنگھ کو احمد شاہ نے خلعت۔ علم۔ راجہ راجگان کا خطاب اور سرہند کی صوبیداری

کا پروانہ دیا۔ اور اُسے کہا کہ وہ سالانہ خراج کی رقم شاہ کو پہنچا دیا کرے۔ یہاں سے اُس نے واپسی کا پروگرام بنایا۔ واپسی پر وہ ڈیڑھ ماہ تک ماچھی واڑہ میں مقیم رہا اور جہاں سکھوں کے اجتماع کے متعلق سنتا وہاں فوج روانہ کرتا۔ ان ایام میں پتہ لگا کہ سکھوں کی ایک جماعت نے نجیب الدولہ کے علاقے گنگا دوآب پر حملہ کر کے نانوتہ، انبیٹہ، میرٹھ اور بارہہ سادات کو لوٹ لیا۔ احمد شاہ نے جہان خان کو ان کے تعاقب میں بھیجا اور اس نے تقریباً سوا سو میل کا فاصلہ تین دن میں طے کر کے ان غارت گروں کو اچانک جا لیا۔ سکھوں کو اس کی اچانک آمد کا خیال تک نہ تھا۔ بہرحال شاملی اور کیرانہ کے درمیان جنگ ہوئی اور سکھوں کو شکست دے کر بھگا دیا گیا۔

احمد شاہ درانی کا نواں حملہ (۱۷۶۸ – ۱۷۶۹ء)

دسمبر ۱۷۶۸ء میں احمد شاہ درانی نے سکھوں کی تسخیر کے لیے پنجاب کا رُخ کیا۔ اس کے ہراول دستے ایمن آباد پہنچ چکے تھے اور وہ خود چناب کے کنارے تھا کہ وہ اپنے لشکر میں گڑبڑ کی وجہ سے واپس چلا گیا۔

احمد شاہ درانی کا دسواں حملہ (۱۷۶۹ – ۱۷۷۰ء)

دسمبر ۱۷۶۹ء میں احمد شاہ ایک بار پھر اپنے ہندی مقبوضات میں امن قائم کرنے اور سکھوں کو قابو میں لانے کے لیے عازمِ ہند ہوا مگر اس بار پشاور ہی سے اُسے واپس جانا پڑا۔

احمد شاہ درانی ایک بہادر سپاہی اور قابل جرنیل تھا۔ اس کے ہندوستان پر حملے اور وسط ایشیا میں اُس کی فوجی مہموں نے اُس کی سپاہ گری کی دھاک بٹھا دی تھی۔ اگرچہ اس کی ہندوستانی فتوحات کا اُس کے خاندان یا مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہ پہنچا تاہم بہرطور اُس کا شہرہ بولتا رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۷۶۸ء کے بعد غالباً بڑھاپے کی وجہ سے اُس کا اپنے لشکر پر وہ قابو نہ رہا جو اس سے قبل اسے حاصل تھا۔

جہان خان سپہ سالار ۴ مارچ ۱۷۷۰ء کو فوت ہوا اور اس سے دو سال ایک ماہ بعد اپریل کی ۱۴ تاریخ کو ۱۷۷۲ء میں احمد شاہ درانی بھی راہیِ ملکِ عدم ہوا۔ احمد شاہ درانی کو قندھار میں دفن کیا گیا اور ۹۰ ہزار روپے کی لاگت سے ایک عالیشان مقبرہ اس کی قبر پر تعمیر کیا گیا۔

احمد شاہ کے بعد اس کا بیٹا تیمور شاہ بادشاہ بنا جس نے ۱۷۷۲ء سے ۱۷۹۳ء تک حکومت کر کے وفات پائی۔

لاہور سکھوں کے عہد میں

یوں تو بندہ بیراگی کے زمانے ہی میں پہلی بار سکھوں نے مضافات لاہور کو لوٹ لیا تھا مگر میر منو کی وفات کے بعد جب درانی کے پیہم حملوں اور مقامی امرا کی خود غرضی سے حکومتِ لاہور کا شیرازہ بکھر گیا تو پنجاب کے دوسرے شہروں کے ساتھ ساتھ لاہور کی تاراجی کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔

شاہ کی آمد پر سکھ چھپ جاتے اور اس کی غیر حاضری میں مسلمانوں کی بستیوں کو لوٹتے اور قتل و غارت کا بازار گرم کر دیتے۔ اس زمانے میں اسلامیانِ لاہور نے شہر کے دفاع کے لیے حیدری فوج بھی مرتب کی۔ لاہور اس دور میں ایک وسیع شہر بن گیا تھا۔ دور دور تک اس کی آبادی پھیلی ہوئی تھی۔ شہر پناہ کے گرد دور تک یعنی محلوں پر مشتمل تھا جن میں سے صرف [illegible] اکبری دور کی بنا کردہ فصیل کے اندر پرانے شہر میں

تھے باقی ستائیس گز راس شہر کے مشرق اور جنوب اور شمال مشرق میں دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ علاوہ ان محلوں کے باغات اور مقابر اور بزرگان دین کے مزارات تھے جو مختلف محلوں کے درمیانی علاقوں میں موجود تھے۔ بڑے بڑے محلوں کے گرد الگ فصیلیں تھیں شہر کے نواح میں ان محلوں سے پرے میلوں تک سبزیوں اور اناج کے زرخیز اور لہلہاتے ہوئے کھیت تھے۔ شہر میں جا بجا سر بفلک عمارتیں تھیں۔ مسجدوں کے آسمان سے باتیں کرتے ہوئے مینار سر بفلک گنبد نکہت و نور کے پیکر اولیائے کرام کے مزارات تھے۔ لاہور کی اس عظمت و نزہت کو احمد شاہ درّانی کے حملوں اور سکھوں کی یورشوں نے خاک میں ملا دیا۔

ساتویں حملے کے بعد ۱۷۶۵ء میں احمد شاہ درانی واپس ہوا تو لہنا سنگھ اور گوجر سنگھ نے جو بھنگی مثل سے تعلق رکھتے تھے۔ دو ہزار سپاہیوں کے ساتھ لاہور کا رخ کیا۔ اور بیگم پورہ کے نواح میں ڈیرے ڈال دیے۔ کابلی مل حاکم لاہور شہر میں نہ تھا۔ اس کا بھتیجا امیر سنگھ چچا کی غیر حاضری میں اس کے فرائض منصبی انجام دے رہا تھا۔ بھنگی سرداروں نے پہلے اُن پوربیوں سے ساز باز کی۔ جو قلعہ لاہور میں ملازم تھے پھر قلعہ میں کام کرنے والے مسلمان باغبانوں کو انعام و اکرام کے لالچ میں اپنے ساتھ ملا لیا۔ ان لوگوں نے پروگرام یہ بنایا کہ باغبان قلعہ کی دیوار میں ایک سوراخ بنا دیں گے تاکہ سکھ اندر جا سکیں۔ چنانچہ گوجر سنگھ اپنے منتخب سپاہیوں کے ساتھ قلعے میں اکبری ایوان کے راستے جو قالین خانہ کے متصل تھا غداروں کے بنائے ہوئے شگاف سے قلعے میں گھس گیا اور ہتھیا پول دروازہ کھول دیا اس نے لہنا سنگھ اور اپنے دیگر ساتھیوں کو اس کامیابی کی اطلاع دینے کے لیے قلعے کے ایک چوبی مکان کو آگ لگا دی۔ یہ دیکھ کر بقیہ سکھ بھی قلعہ میں گھس آئے اور اس طرح بھنگی بآسانی قلعے پر قابض ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بھنگی قلعے کے شمال مشرقی گوشے سے اندر گھسے تھے۔ قلعے کے شمال میں جو بیرونی فصیل ہے۔ وہ رنجیت سنگھ نے تعمیر کرائی تھی۔ اس لیے ہتھیا پول دروازہ کے باہر دریا کے کنارے وسیع ریتلا میدان تھا۔ جہاں کچھ فاصلے پر گوجر سنگھ کے ساتھی مقیم تھے۔ اگلے روز امیر سنگھ بخشی حاکم لاہور پانچ ہزار بندوقچی لے کر قلعے کی طرف بڑھا۔ علاوہ ازیں اس نے اس بڑی توپ سے قلعے پر قبضہ کرنے والے سکھوں پر گولہ باری کی جو مستی دروازے کے ملحقہ برج پر تھی۔

اسی اثنا میں تارا سنگھ جو مزنگ پر قابض تھا شہر میں آن گھسا۔ اس پر امیر سنگھ کی فوج میں سراسیمگی پھیل گئی اور وہ بھاگ گئے۔ تارا سنگھ امیر سنگھ کو اسیر کر کے مزنگ لے گیا۔ اسی روز بعد دوپہر نیاز بیگ کا سکھ سردار سوبھا سنگھ بھی آن پہنچا اور شاہ عالمی دروازے کے اندر دیوان لکھپت رائے کے بھتیجے میگھ راج کھتری کی حویلی میں آ اُترا۔ ان تینوں سرداروں کے سپاہیوں نے جن کے ساتھ نواح لاہور کے دیہاتی بھی آن ملے تھے شہر کو خوب تاراج کیا۔ اکابر لاہور کی ایک جماعت جو چودھری روپا۔ لالہ بشن سنگھ اور مہاراج سنگھ (نبیرگان دیوان صورت سنگھ مقیم اندرون موری دروازہ) میر نتھو شاہ حافظ قادر بخش اور میاں محمد عاشق وغیرہ پر مشتمل تھی قلعے میں جا کر گوجر سنگھ اور لہنا سنگھ سے ملی۔ انھوں نے لوٹ مار کے خلاف شہر کی حفاظت کے لیے اپیل کی۔ انھوں نے کہا کہ لاہور گورو کا کو بھاد مکان کہلاتا ہے۔ اسی شہر میں گورو رام داس جی پیدا ہوئے پلے اور پروان چڑھے۔ اسے برباد کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ اس پر حکام نے شہر کے دروازے بند کروا دیے اور لوٹ مار کو ختم کرنے کے لیے گوجر سنگھ اور لہنا سنگھ خود سوار ہو کر شہر میں گھومنے لگے اور لوٹ مار ختم کر کے امن قائم کیا۔ اس طرح گورو صاحب کے احترام نے شہر کو لوٹ مار سے بچا لیا۔ لاہور کی ملکیت میں سوبھا سنگھ بھی ان کا شریک تھا۔ اُسے لاہور کا جنوبی حصہ جس میں نیاز بیگ، مزنگ، اچھرہ اور چوبرجی شامل تھے دیا گیا۔ اُس نے دورِ مغلیہ کے ایک قدیم باغ میں جو اورنگ زیب

کی لڑکی زیب النساء کے نام منسوب کیا جاتا ہے اقامت اختیار کی اور اس کی مضبوط دیواروں کے اندر نواں کوٹ نام ایک بستی آباد کی۔ اور اسے اپنا دارالحکومت قرار دیا۔ نواں کوٹ کی آبادی اب تک موجودہ ملتان روڈ پر موجود ہے۔ گوجر سنگھ کو شہر کا مشرقی حصہ، کابلی مل کی حویلی سے لے کر شالامار باغ تک دیا گیا۔ اس نے قلعہ گوجر سنگھ آباد کیا۔ جو آج موجودہ میکلوڈ روڈ پر شہر کا ایک آباد محلہ ہے۔ گوجر سنگھ کا تعمیر کردہ قدیم دروازہ اور کچھ قدیم مکانات اب تک موجود ہیں۔ لہنا سنگھ کو شہر کا مرکزی حصہ، قلعہ، شاہی مسجد اور مستی، کشمیری اور شیرانوالا دروازے کا علاقہ ملا۔

شکر چکیہ مثل کے سردار چڑت سنگھ والی گوجرانوالہ نے جب ان سرداروں کے لاہور پر قابض ہونے کی خبر سنی تو وہ بھی چلا آیا اور مالِ غنیمت سے اپنا حصہ طلب کیا۔ یہ لوگ چڑت سنگھ کو ناراض بھی نہیں کرنا چاہتے تھے اور مالِ غنیمت سے اُسے کچھ دینا بھی نہ چاہتے تھے۔ انھوں نے کافی سوچ و بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ چڑت سنگھ کو زم زمہ توپ پیش کی جائے۔ اُن کا خیال تھا کہ بیل موجود نہ ہونے کے سبب وہ توپ لے جا نہ سکے گا۔ چڑت سنگھ ایک باہمت شخص تھا۔ اُس نے اپنے دو ہزار سپاہیوں کو جو ہمراہ لایا تھا توپ کھینچنے پر لگا دیا اور وہ اسے گوجرانوالہ لے گئے۔ (سوہن لال سوری عمدۃ التواریخ جلد دوم صـ۱۲)۔ زمزمہ توپ وہی ہے جسے ہم آج مال روڈ پر عجائب گھر کے متصل دیکھتے ہیں۔ یہ توپ احمد شاہ درّانی نے پانی پت کی تیسری لڑائی سے پہلے لاہور میں بہت سی دوسری توپوں کے ساتھ بنوائی تھی اور مرہٹوں کے خلاف اس جنگ میں استعمال کی تھی۔ واپسی پر وہ اسے لاہور چھوڑ گیا تھا۔ چڑت سنگھ اسے قلعے کے شاہ برج سے اتروا کر لے گیا تھا۔

سنہ ۱۷۶۷ء کے بعد یہ سہ حاکمان بغیر کسی مخالفت کے لاہور پر حکومت کرتے رہے۔ ان کا دورِ حکومت وحشت اور بربریت کی ایک گھناؤنی یادگار ہے۔ یہ حاکم مغلیہ دور کی عمارات سے سنگِ مرمر اور دیگر قیمتی پتھر اور دھاتیں اتار کر فروخت کرنے میں بھی عار محسوس نہ کرتے تھے۔ آخر موت کے سنگدل ہاتھ نے انھیں اقتدار سے محروم کر دیا۔ گوجر سنگھ سنہ ۱۷۹۱ء میں اپنے رفقاء سے پہلے راہئ ملک عدم ہوا اور اُس کی جگہ اُس کے فرزند صاحب سنگھ نے لی۔ سنہ ۱۷۹۷ء میں سوبھا سنگھ فوت ہوا اور اُس کا لڑکا مہر سنگھ اُس کا جانشین بنا۔ آخر کار سنہ ۱۷۹۷ء میں لہنا سنگھ بھی دنیا سے رخصت ہوا اور اس کی جگہ اُس کے فرزند چیت سنگھ نے لی۔

سنہ ۱۷۹۳ء میں تیمور شاہ فوت ہوا اور اس کی جگہ اس کا فرزند زماں شاہ تخت نشین ہوا۔ تیمور شاہ اپنے نامور باپ کے مقابلے میں ایک آرام طلب حکمران تھا۔ اُس نے سکھوں کی سرکوبی کے لیے کوئی مناسب کارروائی نہ کی زماں شاہ ایک دلیر بہادر اور جری نوجوان تھا۔ اُس نے اپنے دادا کے مقبوضات کو سکھوں سے پاک کرنے کا تہیہ کیا اور چار بار پنجاب پر فوج کشی کی جن میں دو بار وہ لاہور تک آیا۔ زماں شاہ کے طریق کار میں خامی یہ تھی کہ قندھار میں اپنے آپ کو مضبوط کیے بغیر اُس نے پنجاب پر فوج کشی کی اور ہر بار قندھار اور کابل کے صوبوں میں بدامنی اور گڑبڑ کی خبریں سن کر اُسے واپس جانا پڑا۔ سنہ ۱۷۹۵ء میں اُسے رہتاس کے قلعے سے واپس جانا پڑا۔ سنہ ۱۷۹۶-۹۷ء میں وہ لاہور تک آیا۔ اس بار سکھ مثلوں کے سرداروں کو آزادانہ اپنے اپنے علاقوں پر حکومت کرتے پچیس تیس برس گزر چکے تھے۔ مگر ابھی تک اُن میں اتنی جرأت اور خود اعتمادی پیدا نہ ہوئی تھی کہ وہ اس جواں سال حکمران کا مقابلہ کرتے۔ اس کی آمد کی خبر سن کر اکثر سکھ سردار جن میں لاہور کے تینوں حاکم شامل تھے شہر چھوڑ کر جنگلوں میں جا چھپے۔ زماں شاہ نے اپنے وزیر شیر محمد خاں کی مدد سے سکھ سرداروں کو اطاعت قبول کرنے اور خراج کی ادائیگی کے عوض اپنے اپنے مقبوضات پر حکومت کی اجازت کے لیے راضی کرنا شروع کیا۔ اس اثنا میں شاہ زماں کو اپنے

بھائی شاہ محمود کی بغاوت کی خبر ملی اور وہ بغیر کوئی انتظام کئے لاہور سے واپس چلا گیا۔

۱۷۹۸ء میں زماں شاہ آخری بار لاہور آیا حسب معمول سرداران شہر چھوڑ کر بھاگ گئے اور وہ بغیر کسی رکاوٹ کے لاہور پر قابض ہو گیا۔ اس نے قلعے کی دیواروں کے نیچے راوی کے کنارے کیمپ لگایا اور ایک ماہ یہاں مقیم رہا۔ زماں شاہ درانی کا وزیر شیر محمد خاں اور وفادار خاں اس دوران اس مسئلے پر بحث کرتے رہے کہ سکھوں کے بارے میں کیا حکمت عملی اختیار کی جائے۔ وفادار کا خیال تھا کہ سکھوں کو بالکل برباد کر دیا جائے۔ وزیر شیر محمد خاں کا خیال تھا کہ سکھوں کو اس طرح ختم کرنا آسان کام نہ ہو گا۔ بہتر یہی ہے کہ ان میں سے جو سردار ہماری اطاعت قبول کرنے پر تیار ہو جائیں انہیں ساتھ ملا لیا جائے۔ اسی دوران میں قصور کا پٹھان سردار نظام الدین خاں بھی شاہ زماں سے آملا۔ اس کی رائے تھی کہ سالانہ خراج کے عوض پنجاب اس کے حوالہ کر دیا جائے اور اسے پنجابی مسلمانوں پر مشتمل ایک فوج تیار کرنے کے لیے کچھ روپیہ دیا جائے تاکہ وہ سکھوں کو قابو میں رکھ کر پنجاب میں ایک بار پھر اسلامی حکومت قائم کر دے۔ معاملہ ابھی تجاویز تک ہی تھا اور پیشتر اس کے کہ شاہ کوئی فیصلہ کرتا کہ اسے اپنے بھائی شاہ محمود کی بغاوت کی خبر ملی اور اسے یکدم واپس جانا پڑا۔ اس کے بعد پھر شاہ زماں کو واپس لاہور آنے کا موقع نہ ملا۔

واپسی پر شاہ زماں اس قدر جلدی میں تھا کہ سیلاب کی وجہ سے وہ اپنی کچھ توپیں جہلم کے کنارے چھوڑ گیا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ وہ پار کرتے وقت کشتیوں کا پل ٹوٹ جانے کے سبب دریا میں گر کر پھنس گئی تھیں۔ اور بادشاہ اس قدر جلدی واپس جانا چاہتا تھا کہ انہیں نکلوا کر ہمراہ نہ لے جا سکا۔ شکرچکیہ مثل کے سردار رنجیت سنگھ نے بارہ میں سے آٹھ توپیں نکلوا کر کابل بھجوا دیں۔ شاہ زماں نے اس خدمت پر خوش ہو کر اسے لاہور پر حکومت کرنے کا اجازت نامہ بھیج دیا۔

رنجیت سنگھ کا دورِ حکومت

(۱۷۹۹ء تا ۱۸۳۹ء)

شاہ زماں سے سندِ حکومت لے کر رنجیت سنگھ نے لاہور پر قبضہ کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کئے۔ اس نے اپنے ایک اعتمادی کارکن قاضی خان کو لاہور بھیجا تاکہ وہ یہاں کے ارائیں چودھریوں سے بات چیت کر کے رنجیت سنگھ کے بارے میں ان کی رائے معلوم کرے۔ وہ لاہور آ کر مختلف ارائیں اکابر سے جن میں حکم دین بھی شامل تھا ملا۔ اس نے مشورہ دیا کہ اتنے بڑے مقصد یعنی حصولِ لاہور کے لیے محض ارائیوں کی امداد پر بھروسہ کرنا مناسب نہیں۔ لاہور میں بسنے والی دیگر برادریوں کے چودھریوں سے بھی بات چیت کر لینی چاہیے۔

زماں شاہ درانی کے جانے کے بعد اگرچہ سرداران لاہور شہر میں واپس آ گئے تھے مگر ہر طرف بے اطمینانی اور پریشانی کے آثار تھے۔ مسلمان بالخصوص بہت مضطرب تھے کیونکہ شاہ کی واپسی کے بعد اسلامی حکومت کے قیام کے امکانات ختم ہو گئے تھے۔ اسی اثنا میں نظام الدین خاں والی قصور نے لاہور کے بہت سے مسلمان اکابر سے ساز باز کر کے شہر پر قبضہ کرنا چاہا۔ اس وقت اسلامیانِ پنجاب میں یہ شخص بہت اہم تھا اور اس تگ و دو میں تھا کہ پنجاب میں پھر سے اسلامی حکومت قائم ہو جائے۔ اس نے شاہ کی واپسی پر خود لاہور پر قابض ہونے کی کوشش کی مگر ماجھے کے سکھ جاٹوں نے اس کا راستہ روک لیا۔ اگر اس محبِ ملت خاں کی مساعی بار آور ہو جاتیں تو ۱۷۹۹ء ہی میں مغربی پاکستان کا اسلامی صوبہ عالمِ وجود میں آ جاتا اور رنجیت سنگھ کو کبھی لاہور کا مہاراجہ بننے کا موقع نہ ملتا۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ رنجیت سنگھ نے قاضی خان کو لاہور خفیہ مشن پر بھیجا تھا۔ اس کے بعد قاضی عبدالرحمٰن رام نگری کو بھیجا۔ یہ شخص میاں محمد عاشق۔ میاں جان محمد۔ مہر محکم دین لواں کوٹی۔ عابد خان (اٹاری والا) محمد عظیم۔ حافظ محمد باغبان پورہ۔ مہر شادی قطار بند۔ احمد خاں بھنڈر۔ حکیم حاکم رائے۔ بھائی گربخش سنگھ۔ محمد باقر۔ محمد طاہر۔ مولوی محمد سلیم اور مفتی محمد مکرم سے ملا۔ ان میں دو کے سوا باقی سب مسلمان تھے۔ قاضی عبدالرحمٰن نے ان اکابر کے دستخطوں سے ایک یادداشت تیار کی جس میں رنجیت سنگھ سے وفاداری کا عہد کیا گیا تھا۔ حکیم حاکم رائے یہ یادداشت لے کر قاضی کے ہمراہ رنجیت سنگھ کے پاس گیا۔ قاضی کو اس کامیابی پر خلعت عطا ہوا۔ قرار یہ پایا کہ حملہ لاہوری دروازے کی طرف سے کیا جائے اور تھوڑی سی مدافعت کے بعد شہر کا دروازہ کھول دیا جائے۔

ان واقعات کے بعد رنجیت سنگھ بٹالہ اپنی ساس سدا کور کے پاس گیا جو کنہیا مثل کے سردار گوربخش سنگھ کی بیوہ تھی۔ اس کی مدد اور مشورے سے رنجیت سنگھ نے پانچ ہزار فوج اکٹھی کی اور لاہور کا رخ کیا۔ جبھیڑ کے مقام پر میاں محمد عظیم باغبان ملا جو لاہور کے حالات سے اُسے آگاہ کرنے کے لیے گیا تھا۔ لاہور کی طرف روانگی کی اطلاع پوشیدہ رکھی گئی اور یہ ظاہر کیا گیا کہ سردار دربار صاحب امرتسر کی زیارت کے لیے جا رہا ہے۔ راتوں رات سفر کرتے ہوئے چار جولائی ۱۷۹۹ء کو وہ دہلی دروازہ لاہور کے باہر جا پہنچا۔ دروازہ بند تھا۔ اور وہاں مدافعت کا سخت انتظام تھا۔ اس پر رنجیت سنگھ پیچھے ہٹا اور شاہ بلاول کے مزار کے قریب خیمہ زن ہوا۔ آدھی رات کو وہ نواب وزیر خاں کے باغ میں چلا آیا جس کی وسطی بارہ دری آج کل پنجاب پبلک لائبریری کی عمارات میں شامل ہے۔ اس باغ میں مہر محکم دین اُسے ملا اور مہر سنگھ دیکھے از سہ حاکمانِ شہر نے بطورِ ضیافت اُسے مٹھائی بھیجی۔ رنجیت سنگھ نے اسے کہلا بھیجا کہ وہ گوجرانوالہ جا رہا ہے اور راوی عبور کرنے کے لیے اُسے کشتیاں مہیا کی جائیں۔ چنانچہ کشتیوں کا انتظام کر دیا گیا۔ رنجیت سنگھ گھاٹ پر گیا اور ملاحوں کو انعام دے کر شام کو واپس چلا آیا۔ اکابرِ لاہور نے (جن سے رنجیت سنگھ کی ساز باز تھی) کہلا بھیجا کہ ہم لوہاری دروازہ کی بجائے خضری (موجودہ شیرانوالہ) اور کشمیری دروازوں کے درمیان فصیلِ شہر توڑ کر آپ کی فوجوں کے لیے راستہ بنا دیں گے۔ مگر اس نئے فیصلہ کی اطلاع رنجیت سنگھ کو بہت دیر سے ملی اور پانچ جولائی کی صبح کو پو پھٹے اس کے سپاہیوں نے لوہاری دروازے پر حملہ بول دیا تھا۔ اُن کی توقع کے خلاف دروازہ نہ کھلا اور نہ ہی فتح ہو سکا۔ ناکام ہو کر رنجیت سنگھ نے فوجوں کو واپس بلایا اور شاہ بلاول اپنے کیمپ میں چلا گیا۔ یہاں انھوں نے شہر کا محاصرہ کرنے کا فیصلہ کیا اور شہر میں اپنے حامیوں کو اس کی اطلاع بھیج دی۔ محاصرے کی تکالیف کا اندازہ کر کے وہ لوگ بہت پریشان ہوئے اور اگلے روز لوہاری دروازہ کھول دینے کا وعدہ کیا۔ چھ جولائی کو رنجیت سنگھ لوہاری دروازے کی طرف بڑھا۔ چیت سنگھ خود فوج لیے اُس کی حفاظت کو موجود تھا۔ رنجیت سنگھ نے مائی سدا کور والی بٹالوی فوج کو دہلی دروازے کے محاصرے کے لیے بھیج دیا۔ بعض سپاہیوں نے جو رنجیت سنگھ سے ملے ہوئے تھے۔ چیت سنگھ کو دہلی دروازے پر حملہ کی مبالغہ آمیز خبریں پہنچائیں۔ اور جب چیت سنگھ ادھر متوجہ ہوا تو اُس کی غیر حاضری میں لوہاری دروازہ کھول دیا گیا۔

دروازہ کھلتے ہی رنجیت سنگھ اندر گھسا اور آگے بڑھ کر حویلی دیوان لکھپت رائے پر حملہ کر دیا جو شاہ عالمی دروازے کے اندر واقع تھی اور اُس میں مہر سنگھ رہتا تھا۔ یہاں تھوڑی سی لڑائی بھی ہوئی اور مہر سنگھ نے بھاگ کر ایک بھُس فروش کے ہاں پناہ لی مگر گرفتار ہو کر رنجیت سنگھ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اُس سے نہایت اچھا سلوک کیا گیا اور اُسے اجازت دے دی گئی کہ اپنی جائداد منقولہ لے کر چلا جائے۔

اسی دوران مائی سدا کور نے دہلی دروازہ فتح کر لیا۔ چیت سنگھ بھاگ کر قلعہ میں چلا گیا۔ اس پر رنجیت سنگھ نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔

چیت سنگھ نے قلعہ کی دیواروں، شاہی مسجد کے برجوں اور میناروں سے محاصرین پر گولہ باری شروع کر دی جو دوپہر سے شام تک جاری رہی۔ اگرچہ اس کا توپ خانہ بہت معمولی تھا پھر بھی اس نے مائی سدا کور کے ذریعہ صلح کی گفت و شنید شروع کر دی۔ رنجیت سنگھ نے اُسے غنیمت جانا اور سات جولائی کو اُس نے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ چیت سنگھ کو جاگیر دے کر موضع وانکی بھیج دیا۔ اگلے روز اس نے قلعے میں دربار کیا جس میں اکابرِ لاہور جمع کئے گئے۔ معاونین کی خدمات کا خلعتوں اور انعاموں سے اعتراف کیا گیا۔ مہر محکم دین جس کی سعی سے لوہاری دروازہ کھولا گیا تھا "بابا" کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ بعض دوسرے لوگوں کو "صاحب" اور "مہربان" کے خطاب دیئے گئے۔ رنجیت سنگھ کی اس کامیابی نے اُسے پنجاب کے دوسرے سکھ اور غیر سکھ سرداروں سے ممتاز کر دیا۔ سب اُسے مرکزی شہر لاہور کا راجہ اور شاہ زمان کا نمائندہ خیال کرتے ہوئے بنظرِ احترام دیکھنے لگے۔

لاہور پر رنجیت سنگھ کے قبضے نے اُس کے حریفوں کے دلوں میں اُس کی مخالفت کا جذبہ بیدار کر دیا۔ نظام الدین قصوریہ، گلاب سنگھ بھنگی امرتسریہ اور صاحب سنگھ گجراتیہ اور جسا سنگھ رامگڑھیہ اپنی فوجوں کو اکٹھا کر کے لاہور کے قریب بھسین نام ایک گاؤں میں جمع ہو گئے۔ اگر یہ متحدہ فوج لاہور پر حملہ کر دیتی تو رنجیت سنگھ کے لیے اُن کا مقابلہ کرنا مشکل ہو جاتا مگر اُس کی خوش قسمتی سے ان میں جذبۂ رقابت بیدار ہو گیا اور وہ دو ماہ تک کچھ نہ کر سکے۔ اسی اثنا میں گلاب سنگھ بھنگی کثرتِ شراب نوشی کے سبب راہیٔ ملکِ عدم ہوا۔ اس کی موت کے بعد یہ لشکر تتر بتر ہو گیا اور رنجیت سنگھ خطرے سے بچ گیا۔

اس کے بعد رنجیت سنگھ نے فتوحات کا سلسلہ شروع کیا اور اپنی وفات تک وہ دریائے ستلج تک تمام پنجاب، کشمیر، پشاور، ہزارہ اور ڈیرہ جات کے علاقے اپنی قلمرو میں شامل کر چکا تھا اور وہ جمرود سے پھلور تک تمام علاقے کا بلا شرکتِ غیرے حاکم تھا۔ رنجیت سنگھ نے اپنے لیے "سرکار" کا لقب تجویز کیا اور اپنا سکہ لاہور کی ٹکسال سے جاری کیا۔

پچیس اپریل ۱۸۰۹ء کو بمقام امرتسر رنجیت سنگھ اور انگریزوں کے درمیان مذاکرات کی سعی سے دوستی کا معاہدہ ہوا اور رنجیت سنگھ نے وعدہ کیا کہ وہ ستلج پار کے علاقوں سے کوئی سروکار نہ رکھے گا۔ اس وعدہ کو رنجیت سنگھ نے تا زیست نبھایا۔ اور اپنی فتوحات کا رُخ مشرق کی بجائے شمال اور مغرب کی طرف بدل لیا۔

۱۸۱۲ء میں شاہ شجاع جو زمان شاہ کا بھائی تھا حکومت و حشمت سے محروم ہو کر لاہور پہنچا ——— رنجیت سنگھ نے اُسے اکبری دروازے کے اندر مبارک حویلی میں بطور مہمان ٹھہرایا مگر مہمانی کا حق اس طرح ادا کیا کہ اُس سے زبردستی کوہِ نور ہیرا چھین لیا۔

رنجیت سنگھ نے لاہور پر قبضہ کیا تو یہ شہر جو تقریباً نصف صدی قبل تہذیب و ثقافت کا ایک درخشاں مرکز تھا برباد ہو کر اُجڑ چکا تھا۔ کچھ لوگ اکبری دور کے "بارہ دروازوں" اور تیرھویں موری "والے شہر کے اندر آباد تھے۔ اور شہر سے باہر میلوں تک شکستہ عمارتوں، اُجڑے محلّوں اور شاہی عمارتوں کے کھنڈر تھے۔ ان کھنڈروں کے درمیان متعدد قومی یادگاریں رباطوں، مقبروں، مسجدوں اور خانقاہوں کی صورت میں موجود تھیں۔ رنجیت سنگھ نے لاہور کو اپنا دارالحکومت اور شاہی قلعے کو اپنی قیامگاہ قرار دیا۔ مغلیہ دور کی خالی اور متروکہ حویلیوں کو اپنے سرداروں کے حوالے کیا۔ شہر کے گرد دفاع کے لیے نہایت بلند دوہری فصیل تعمیر کرائی۔ بیرونی فصیل میں فوجی نقطۂ نظر سے اہم کونوں پر برج بنوا کر اُن میں توپیں رکھوائیں۔ دونوں فصیلوں کے درمیان خندق تھی۔ جس میں دریا سے پانی آتا تھا

رنجیت سنگھ کا چالیس سالہ دورِ حکومت خوشحالی کا ایک طویل زمانہ تھا۔ اس میں شہر کی آبادی بڑھی اور شہر میں بے شمار نئے مکانات

حویلیاں، مندر، گوردوارے اور سمادھیں تعمیر کی گئیں۔ فنِ تعمیر اور مصوری کے ایک نئے مکتبِ خیال کا ارتقا ہونے لگا۔ قلعے میں بھی رنجیت سنگھ نے اپنے ذوق کے مطابق ردّ و بدل کیا۔ شیش محل کے اوپر جو بے ڈھنگی سی عمارتیں ہیں۔ وہ رنجیت سنگھ ہی کی یادگار ہیں۔ اس سلسلہ میں رانی جنداں کا محل بھی توجہ طلب ہے۔ ان تمام تعمیرات کے لیے اور ان کے علاوہ دربار صاحب امرتسر، رام باغ اور دیگر عمارات کی تعمیر کے لیے بے شمار اینٹ پتھروں کی ضرورت تھی۔ چنانچہ نواحِ شہر کے کھنڈروں کو اینٹوں کی کان کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ اگر اس مقصد کے لیے کھنڈروں ہی کو استعمال کیا جاتا تو مناسب تھا۔ مگر اینٹ اور پتھر کے لالچ اور مسلمانوں کے خلاف قومی تعصب نے سکھوں کو مجبور کیا کہ بے شمار مقدس اور اہم قومی یادگاروں کو مسمار کر دیں۔

رنجیت سنگھ کے دور میں اگرچہ رعایا کے تمام طبقات امن کی زندگی بسر کرتے تھے مگر دربار میں سب سے زیادہ عزت سکھوں کو حاصل تھی۔ انھیں فوجوں میں بھرتی کیا جاتا تھا اور بیش بہا جاگیریں دی جاتی تھیں۔ اس کے بعد ہندوؤں کا درجہ تھا جو عام طور پر محکمہ مالیات اور دوسرے دفاتر میں تھے۔ دفتری زبان فارسی تھی۔ جو تمام طبقوں کے لوگ مسلمان مولویوں سے مسجدوں میں پڑھتے تھے۔ معاشرے میں بلا امتیاز مذہب و ملت استادوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

مسلمان عام طور پر معمولی شاگرد پیشہ یا نجی ملازم تھے۔ اگر کسی کام کے لیے کوئی آدمی نہ ملے تو یہ کام مسلمان کے سپرد کیا جاتا تھا۔ ہاں توپ خانہ اکثر و بیشتر مسلمانوں کی نگرانی میں تھا۔ الٰہی بخش کیدان، محمد شاہ اور غوثے خاں وغیرہ اسی توپ خانہ سے منسلک تھے۔ اگرچہ شہر میں کچھ مسجدیں آباد بھی تھیں اور چند نئی بھی تعمیر ہوئیں مگر اہم مساجد سے رنجیت سنگھ کا سلوک بے حد افسوسناک تھا۔ شاہی مسجد کے صحن میں اصطبل تھا جہاں فوجی گھوڑے بندھتے تھے۔ مسقف حصے میں فوجی گودام تھا اور بقول سید احمد بٹالوی مرکزی محراب میں بیت الخلا تھا۔ شہر سے باہر جو مسجدیں اور مقبرے تھے ان میں بھی فوجی گودام تھے۔ مسلمان اس قدر پس چکے تھے کہ باوجود احساس کے دم نہ مار سکتے تھے۔

رنجیت سنگھ کے زمانے میں رنڈی بازی زوروں پر تھی۔ شہر کے اکثر بازاروں میں چکلے تھے۔ ان رنڈیوں میں رقص و موسیقی کی ماہر فنکار بھی تھیں۔ ایک بار بسنت کے موقع پر شالامار باغ میں جشن ہو رہا تھا۔ مہاراجہ اور سب درباری بسنتی لباس میں ملبوس تھے۔ کئی طرحدار طوائفیں مصروفِ رقص تھیں۔ ایک قتالۂ روزگار رقاصہ پر جس کا نام موراں تھا مہاراجہ کا دل آگیا چنانچہ وہ مصاحب قرار پائی اور مہاراجہ صاحب خلوت و جلوت میں اسی کے ساتھ نظر آنے لگے۔ اس کے عزیز مالا مال ہو گئے۔ مہاراجہ اکثر بنفسِ نفیس اس کے گھر جایا کرتے تھے۔ اس کے نام کا موراں شاہی سکہ بھی جاری کیا گیا۔

موراں نے شاہ عالمی اور لوہاری دروازوں کے درمیانی بازار میں شہر کے اندر ایک مسجد بنوائی اور اس میں ایک مدرسہ جاری کیا۔ مسجد اب تک موجود ہے۔ موراں کی قبر گورستانِ میانی میں حضرت طاہر بندگی قدس سرہ کے احاطے میں ہے۔ مہاراجہ نے امرتسر کی ایک طوائف گل بہار بیگم عرف گل بیگم سے باقاعدہ شادی کی تھی۔ گل بیگم کی حویلی اور گلی اندرونِ شہر رنگ محل کے پاس واقع ہے۔ اس کا باغ اور مرقد گورستانِ میانی سے متصل اب تک موجود ہے۔ حال ہی میں اس باغ کے متصل گورستان کی زمین میں ایک وسیع محلہ آباد ہو گیا ہے جو باغ گل بیگم

---

[1] رنجیت سنگھ نے بہت سے کشمیری برہمن اور کائستھ کارکن ہندوستان سے منگوا کر اپنے دربار میں اعلیٰ عہدوں پر فائز کیے۔ یہ لوگ مغلیہ دربار اور دیگر درباروں میں انتظامِ ملکی کی تربیت حاصل کر چکے تھے۔ ان میں کشمیری برہمن بے حد مہذب اور شائستہ تھے۔ راجہ دینا ناتھ، دیوان گنگا رام اور اجودھیا پرشاد وغیرہ جلیل القدر لوگ اسی گروہ میں سے تھے۔

کہلاتا ہے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور کی حویلیوں میں سب سے اہم کنور نونہال سنگھ کی حویلی ہے جو سکھ دور کے فنِ تعمیر کا نادر نمونہ ہے۔ اس کی دیواروں پر مصوری کے چند دلچسپ اور قابلِ مطالعہ شہکار ہیں۔ کنور نونہال سنگھ کی شادی رنجیت سنگھ نے بڑے تزک و احتشام سے شام سنگھ اٹاری والے کی لڑکی سے کی تھی۔

اس دور میں جو خاندان برسرِ اقتدار آئے اُن میں فقیر نورالدین کا خاندان بھی تھا۔ یہ اور ان کے چھوٹے بھائی فقیر عزیزالدین اور اس خاندان کے بعض دوسرے افراد اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ فقیر صاحبان صوفی منش علم دوست، مخیر اور شریف مزاج لوگ تھے۔ ان کے والد فقیر غلام محی الدین سلسلۂ قادریہ نوشاہیہ کے ایک مقتدر شیخ تھے۔ اس خاندان کے اخلاف اب تک لاہور میں موجود ہیں جن میں فقیر سید مغیث الدین ہر طرح سلفِ صالحین کی یادگار ہیں۔

شہر سے باہر سکھ امرا نے باغ بھی لگوائے تھے۔ اگرچہ یہ باغ مغلیہ دور کے باغات کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے تاہم عظمت تھے۔ ان میں سے اکثر دستبردِ زمانہ سے مٹ گئے ہیں مگر چند ایک اب تک اپنے بانیوں کی یادگار باقی ہیں۔ اور ان کے مطالعہ سے سکھ دور کے امرا کی طرزِ زندگی کا پتہ چلتا ہے۔

حضرت سید احمد کا جہاد

یوں تو برِصغیر ہند و پاکستان میں گذشتہ ایک ہزار سال کے اندر بے شمار مجاہد و اکابر پیدا ہوئے۔ مگر سید احمد شہید اور ان کے رفقا مولانا اسمٰعیل شہید اور مولانا عبدالحیٔ کو ہماری ملی تاریخ میں منفرد مقام حاصل ہے۔ ان مجاہدین نے ایک ایسی تحریک شروع کی جس کا مقصد مسلمانوں کی معاشرتی اور مذہبی اصلاح کر کے انھیں جہاد و قربانی کا بھولا ہوا سبق یاد دلانا تھا۔ سید احمد شہید کو جب سکھوں کے مظالم کا علم ہوا کہ اُن کی مملکت میں صلوٰۃ و اذان تک کی اجازت نہیں، مسجدوں میں گھوڑے بندھتے ہیں اور مسلمانوں کی بیٹیاں جبراً سکھوں میں بیاہی جاتی ہیں تو انھوں نے رنجیت سنگھ کے خلاف اعلانِ جہاد کر دیا۔ مجاہدین مشرقی پنجاب، بہاولپور اور شکارپور کے راستے شمال مغربی سرحد پر پہنچے۔ سید صاحب کا ارادہ یہ تھا کہ کوہِ سلیمان، پشاور، ڈیرہ جات اور ہزارہ وغیرہ علاقوں کے مسلمانوں کو منظم کر کے رنجیت سنگھ کی فوج سے ٹکرایا جائے اور پنجاب کو آزاد کرانے کے بعد شمالی ہندوستان کو فتح کر کے یہاں شرعی نظام قائم کیا جائے۔

سید احمد کے جہاد نے رنجیت سنگھ اور اس کے سکھ سرداروں کو بہت پریشان کیا۔ پسے ہوئے مسلمان بھی آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے کہ یہ سید کہیں امام مہدی ہی نہ ہو۔ رنجیت سنگھ نے فقیر عزیزالدین کے ذریعے لاہور کے سیدوں اور پیروں کی فہرست تیار کرائی اور حکومت کی طرف سے اُن کے وظائف مقرر کر دیے۔ لاہور کی مشہور زیارت گاہ مزار مادھو لال حسین کے سجادہ نشین سے دوستانہ روابط استوار کیے اور بعض اسلامی درگاہوں پر چڑھاوے بھی چڑھائے تاکہ مسلمانوں کو وہ بزعمِ خود مطمئن کر سکے۔

رنجیت سنگھ اُس علاقے میں حکمران تھا جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اُس کی سلطنت کو اگر شمال مغرب سے پٹھانوں کے حملے کا ڈر تھا تو مشرق میں انگریزوں کا۔ مملکت کے اندر بھی رعایا کو قابو میں رکھنے اور متوقع بغاوتوں کو روکنے کے لیے زبردست فوج کی ضرورت تھی۔ رنجیت سنگھ نے اپنی فوج کو زیادہ مضبوط، منظم اور بہتر بنانے کے لیے بہت سے یورپین جرنیل ملازم رکھے۔ جن میں نپولین کے چار سابق فرانسیسی جرنیل بھی شامل تھے۔ ان کے نام ونتورا، ایلارڈ، کورٹ اور اوی ٹیبل تھے۔ ونتورا کی چھاؤنی موجودہ سول سیکرٹریٹ کے مقام پر تھی اور وہ خود "مقبرہ انارکلی"

میں رہتا تھا۔ ایلارڈ کی چھاؤنی موج دریا بخاری کے مزار کے متصل کمیدان تھا۔ ونتورا کی فوج پرانی انار کلی میں جا گزیں تھی جہاں اب انکم ٹیکس کے دفاتر ہیں۔ ایوی ٹیبل کی چھاؤنی بدھو کے آوا کے متصل تھی۔

جنرل کورٹ کی چھاؤنی مقبرہ نصرت خاں سے متصل اس جگہ تھی جہاں آج مغل پورہ میں ریلوے کیرج شاپ ہے۔ نصرت خاں کا مقبرہ کیرج شاپ کے اندر اب بھی موجود ہے اور کیرج شاپ کے ملازمین اس میں نماز ادا کرتے ہیں۔

رنجیت سنگھ کے جانشین

۲۷ جون ۱۸۳۹ء کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کا انتقال ہوا۔ اور کھڑک سنگھ اس کا بڑا لڑکا وارث تخت و تاج ہوا۔ اس نے محض ایک سال اور تقریباً چار ماہ حکومت کی ہو گی کہ اس کا انتقال ہو گیا۔ کھڑک سنگھ کی نعش کو ٹھکانے لگا کر واپس آ رہے تھے کہ حضوری باغ کے دروازے کی چھت کا کچھ حصہ غالباً متوفی مہاراجہ کے سوگ پر چلنے والی توپوں کے دھماکے سے گر پڑا۔ نو نہال سنگھ جسے اب باپ کا جانشین بننا تھا اور وزیر دھیان سنگھ کا بھتیجا ادھم سنگھ بری طرح زخمی ہو گئے۔ کنور نو نہال سنگھ ان زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسا۔ اس حادثہ کے بعد وزیر دھیان سنگھ نے شیر سنگھ کو بٹالہ سے بلا بھیجا کہ اُسے تخت نشین کیا جائے۔

شیر سنگھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا بیٹا اور ایک بہادر نوجوان تھا۔ مہاراجہ کی زندگی ہی میں اس نے یورپین جرنیلوں سے راہ و رسم پیدا کر لی تھی۔ سید احمد شہید کو شکست دینے والی فوجوں کا سالار یہی شہزادہ تھا اور اس کامیابی کے بعد تو اس کی خوب دھاک بیٹھ گئی تھی۔ کھڑک سنگھ اور نو نہال سنگھ کی وفات کے بعد اب تخت و تاج اُسی کا حق تھا۔ مگر اسی دوران میں کھڑک سنگھ کی بیوی چند کور نے جو نو نہال سنگھ کی والدہ تھی اور دیگر رانیوں کی طرح شوہر کے ساتھ ستی نہ ہوئی تھی حکومت پر قبضہ کر لیا۔ بہت سے سرداروں نے جن میں بھائی رام سنگھ، سردار عطر سنگھ اور اجیت سنگھ سندھاں والیہ شامل تھے رانی کا ساتھ دیا۔ رانی صاحبہ نے کمال دانشمندی سے امورِ حکومت کو سلجھایا۔ وزیر دھیان سنگھ نے شیر سنگھ سے خفیہ ساز باز جاری رکھی۔ کیونکہ رانی اُسے ناپسند کرتی تھی۔ شیر سنگھ نے افواجِ لاہور کے بعض دستوں کو انعام و اکرام کے لالچ میں اپنے ساتھ ملا لیا اور بٹالہ سے جہاں اس کی جاگیر تھی اپنی فوجوں کو لے کر ۱۴ جنوری ۱۸۴۱ء کو وہ لاہور پہنچا۔ اور بدھو کے آوا پر قیام کیا۔ یہاں آ کر اُسے معلوم ہوا کہ دھیان سنگھ جموں میں ہے۔ بہرحال اُس نے بڑھ کے قلعہ لاہور کا محاصرہ کر لیا۔ شیر سنگھ نے اپنے بندوقچیوں کو شاہی مسجد کے میناروں پر چڑھا دیا جہاں سے انھوں نے محصورین پر قلعہ میں گولہ باری کر کے انھیں کافی نقصان پہنچایا۔ اسی اثنا میں دھیان سنگھ بھی جموں سے آ گیا اور اُس نے شیر سنگھ کو سمجھایا کہ جنگ کا کوئی فائدہ نہیں ہے مقصد میں کامیابی کے لیے حکمتِ عملی کی ضرورت ہے۔ اس پر شیر سنگھ نے وزیر دھیان سنگھ کو مکمل اختیار دیا کہ وہ جس طرح چاہے کام کرے۔ دھیان سنگھ نے لڑائی بند کی اور ایک ایلچی اپنے بھائی گلاب سنگھ کے پاس بھیجا جو رانی کا طرفدار تھا۔ اور اُس سے گفت و شنید شروع کی۔ ان دونوں بھائیوں کی سعی سے راضی نامہ ہو گیا اور رانی نے غالباً اپنی پوزیشن کمزور پا کر راضی نامے کو قبول کر لیا۔ ۱۸ جنوری ۱۸۴۱ء کو شیر سنگھ کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا گیا۔ رانی کو بکمالِ احترام جاگیر عطا کر دی گئی۔ یہ خاتون نومبر ۱۸۴۰ء سے لے کر جنوری ۱۸۴۱ء تک کوئی ساڑھے تین مہینے پنجاب کی تاجدار رہی۔

شیر سنگھ نے سندھاں والیہ سرداروں سے بہت اچھا سلوک کیا اور ان کی جاگیریں بھی بحال رکھیں مگر اُن کا دل مہاراجہ کی طرف سے صاف نہ ہوا اور انھوں نے اُس کے خلاف خفیہ سازشیں جاری رکھیں۔

شیر سنگھ مردانہ کھیلوں کا بے حد شائق تھا اور اسے کُشتی کے فن سے بے حد دلچسپی تھی۔ وہ اکثر شہر سے باہر اپنے پہلوانوں کو لے جاتا

اور ان کی کشتیوں سے محظوظ ہوتا۔ چنانچہ قاسم خاں کے مقبرے کے متصل ایک وسیع اکھاڑہ تھا جہاں اس کے درباری پہلوان ورزش کرتے اور انعام اکرام حاصل کرتے۔ ان پہلوانوں میں ایک غریب اللہ یار کشمیری سلطان پہلوان بھی تھا جس نے بعد ازاں انگریزی دور کے آغاز میں سرکاری ٹھیکہ داری حیثیت سے بہت نام پیدا کیا۔ لاہور کے لوگ اسے میاں سلطان کے نام سے اب تک یاد کرتے ہیں۔ اس کی اپنی سکونتی حویلی دہلی دروازہ کے اندر ہے۔ اور دروازہ کے باہر لنڈہ بازار میں اس کی سرائے اور احاطہ واقع ہیں۔

اکھاڑے اور کشتیوں کی وجہ سے لوگ قاسم خاں کے گنبد کو کشتیاں والا گنبد کہنے لگے۔ بعد ازاں اس گنبد کے متصل جمعدار خوشحال سنگھ نے ایک کوٹھی تعمیر کرائی۔ انگریزی دور کے آغاز میں یہ مقام پنجاب کے حاکم اعلیٰ کی سکونت کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ بتدریج اس کے نواح میں نئی عمارات تعمیر ہوتی رہیں۔ اور ایک وسیع رقبہ اس کوٹھی میں شامل کر لیا گیا۔ انگریزی دور میں پنجاب کے تمام لفٹیننٹ گورنر اور گورنر اسی جگہ رہتے تھے۔ آج مغربی پاکستان کے گورنر عالی جناب ملک امیر محمد خاں اسی جگہ اقامت پذیر ہیں۔

سمت ۱۹۰۰ بکرمی میں یکم اسوج کو (مطابق ۱۵ ستمبر ۱۸۴۳ء) شیر سنگھ دریا کے کنارے بارہ دری شاہ بلاول میں فوجوں کا معائنہ کر رہا تھا کہ اجیت سنگھ سندھاں والیہ نے اسے ایک بندوق پیش کی کہ انگلستان سے کسی انگریزی فوج کے لیے آئی ہے۔ مہاراجہ نے دیکھنے کیلئے ہاتھ بڑھایا تو سنگدل سردار نے بندوق چلا دی۔ اس صدمے سے شیر سنگھ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ لہنا سنگھ سندھاں والیہ نے مہاراجہ کے خورد سال بیٹے کنور پرتاپ سنگھ کو بھی قتل کر دیا۔ اس کے بعد سازشی قلعہ کی طرف گئے اور وزیر دھیان سنگھ کو بھی قتل کر دیا۔ دھیان سنگھ کی حویلی شہر کے اندر قلعہ کے قریب ہیرا منڈی میں واقع ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کالج کی ابتدا اسی حویلی میں ہوئی۔ اخبار عام بھی پہلے پہل اسی جگہ سے نکلا۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے اس میں دیال سنگھ ہائی سکول تھا۔ اور اب سٹی مسلم لیگ ہائی سکول ہے۔ دھیان سنگھ کی سمادھ حویلی کے احاطے میں واقع ہے۔ ۱۹۵۹ء کے موسم گرما میں محکمہ آثار قدیمہ نے قلعہ لاہور میں کھدائی کرائی تو اس حویلی کے احاطے میں بھی مرمت کے لیے زمین کھودی۔ زمانۂ قبل از اسلام کی اینٹیں اور کچھ دیگر نوادر ملے جو سٹی مسلم لیگ ہائی سکول کے فرض شناس ہیڈ ماسٹر نے قلعہ میں محکمہ آثار قدیمہ کے پاس بھیج دیے۔ محکمہ مذکور کے کارکنوں نے یہاں کچھ کھدائی بھی کی مگر نہ قلعہ اور نہ اس حویلی سے برآمد ہونے والے نوادر کی کوئی سائنٹفک رپورٹ شائع کی۔

شیر سنگھ اور اس کے فرزند کی سمادھ بارہ دری شاہ بلاول کے متصل چاہ میراں کے قریب واقع ہے۔ انگریزی دور میں یہاں بسنت کو سکھ جمع ہو کر گرنتھ صاحب کا پاٹھ سنا کرتے تھے۔

وزیر دھیان سنگھ کا ایک فرزند ہیرا سنگھ تھا جسے مہاراجہ رنجیت سنگھ بہت عزیز رکھتے تھے۔ اسی کے نام پر ہیرا منڈی مشہور ہے۔ ہیرا سنگھ نے بوڑھے باپ کے ظالمانہ قتل کا واقعہ سنا تو قلعہ لاہور کا محاصرہ کر لیا۔ سندھاں والیہ سردار قلعہ کے اندر تھے۔ ہیرا سنگھ نے شاہی مسجد کے میناروں پر ہلکی توپیں جنھیں زنبورک کہتے تھے چڑھا دیں اور قلعہ پر گولہ باری شروع کر دی۔ گولے قلعہ کے محلات پر گرنے لگے۔ اگر ہم ہتھیا پول دروازے سے داخل ہوتے ہی بائیں طرف کی بڑی سیڑھیوں سے اوپر جائیں تو مثمن برج کی بیرونی دیواروں پر ان گولیوں کے نشان آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس معرکہ میں لہنا سنگھ مارا گیا اور اجیت سنگھ بھاگنے کی کوشش میں دیوار سے گر کر چل بسا۔ قلعہ پر ہیرا سنگھ کا قبضہ ہو گیا۔ اس نے سورگباشی مہاراجہ رنجیت سنگھ کے فرزند دلیپ سنگھ کو جو دائی جنداں کے بطن سے تھا تخت پر بٹھایا۔ اور خود وزیر بن کر داد حکمرانی دینے لگا۔

ہیرا سنگھ کے دو بڑے دشمن تھے۔ سچیت سنگھ جو اس کا چچا تھا اور سردار عطر سنگھ سندھاں والیہ جو تھانیسر میں مقیم تھا۔ سچیت سنگھ فوج لیکر لاہور آیا۔ ہیرا سنگھ نے اس کی سرکوبی کے لیے فوج بھیجی جس کی مدبھیڑ میاں وڈا کے قریب جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں دربار مذکور کی عمارتوں اور کتب خانے

کو بے حد نقصان پہنچا۔ آخر کار سچیت سنگھ مارا گیا اور چچا کی موت نے بھتیجے کو بغیر کسی رکاوٹ حکومت کرنے کا موقع دیا۔ اسی اثنا میں عطر سنگھ سندھاں والیہ تھانیسر سے عازم لاہور ہوا تاکہ ہیرا سنگھ سے حکومت کی باگ ڈور چھین لے۔ ۲ مئی ۱۸۴۴ء کو اس نے دریائے ستلج عبور کیا اور بھائی بیر سنگھ کے پاس چلا گیا۔ باوا صاحب دیہاتیوں میں اپنے زہد و اتقا کی بدولت بے حد مقبول تھا۔ اسی اثنا میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کا ایک اور بیٹا کشمیرا سنگھ ان سے آملا۔ ہیرا سنگھ نے سپاہیوں میں یہ بات پھیلا دی کہ عطر سنگھ انگریزوں کی امداد سے لاہور پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ اس پر خالصہ فوج جوش و خروش سے بڑھی اور عطر سنگھ پر حملہ کر کے اسے مار ڈالا۔ اس طرح ہیرا سنگھ نے اپنے حریفوں سے نجات پائی۔

وزیر ہیرا سنگھ کا ایک برہمن مشیر تھا جس کا نام پنڈت جلا تھا۔ یہ اس کا خاندانی پروہت اور استاد بھی تھا۔ اس نے ہیرا سنگھ کی وزارت کے زمانے میں بہت منہ زور ہو کر اپنی حدود سے تجاوز کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایک روز اس نے مہاراجہ دلیپ سنگھ کی والدہ رانی جنداں اور اس کے ماموں سردار جواہر سنگھ کا ذکر توہین آمیز الفاظ میں کیا۔ انھوں نے فوج کو ہیرا سنگھ اور پنڈت کے خلاف بھڑکایا۔ ۲۱ دسمبر ۱۸۴۴ء کو ہیرا سنگھ اور پنڈت جلا فوج کے ڈر سے بھاگ کھڑے ہوئے اور جموں کی راہ لی۔ جواہر سنگھ کی حامی فوج نے انھیں راستے ہی میں جا لیا اور ایک معرکہ میں دونوں مارے گئے۔

اس کے بعد دربار میں جواہر سنگھ اور لال سنگھ کا طوطی بولنے لگا۔ ۱۴ مئی ۱۸۴۵ء کو فوج اس سے بھی ناراض ہو گئی اور ۲۱ ستمبر کو اسے مار ڈالا۔ اس سانحہ کے بعد لال سنگھ وزیر اور تیجا سنگھ کمانڈر انچیف مقرر ہوئے۔

رانی جنداں نے اپنے بھائی سردار جواہر سنگھ کے قتل کا بدلہ لینے اور خود سر فوج کو سزا دینے کے لیے ۱۸۰۹ء کے معاہدۂ امرتسر کو بالائے طاق رکھتے ہوئے انگریزی علاقے پر ہلہ بول دیا۔ رانی نے فوج کو یہ یقین دلایا کہ انگریز خالصہ سرحد پر مقیم فوجوں کی تعداد دن بدن بڑھا رہے ہیں اور اس کا مقصد لاہور پر قبضہ کرنا ہے۔ ان حالات میں سکھ فوج نے بہتر یہی خیال کیا کہ انگریزوں کے حملے کا انتظار کرنے کی بجائے خود حملہ کر دیا جائے۔ سکھ فوج جو فرانسیسی جرنیلوں کی تربیت یافتہ تھی بے حد طاقت ور تھی اور کمپنی کی فوجوں کا آسانی کے ساتھ مقابلہ کر سکتی تھی، مگر موجودہ حالات میں اُن کی کامیابی مشکل تھی۔ ۱۷ نومبر ۱۸۴۵ء کو انگریزوں کے خلاف اعلانِ جنگ کیا گیا اور ۱۱ دسمبر کو سکھ فوج نے ہری کے پتن کے مقام پر دریائے ستلج کو عبور کیا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ خالصہ فوج کے کچھ دستے لاہور سے انگریزوں کے خلاف لڑنے جا رہے تھے کہ دربار داتا گنج بخش[۲۱] کے نواح سے گزرے۔ یہاں کوئی مجذوب کھڑا تھا جس نے فوج کو دیکھ کر کہا "برائے استقبالِ فرنگیاں می روند"۔ ستلج کے پاس مدکی، فیروز شہر، بدووال، علی وال اور سبراؤں کے مقام پر جنگیں ہوئیں۔ ان جنگوں میں بہادری سے لڑنے کے باوجود سکھوں کو شکست ہوئی اور رنجیت سنگھ کی کمال محنت سے تیار کی ہوئی فوج تباہ و برباد ہو گئی۔

ان پیہم شکستوں سے بددل ہو کر بعض سکھ سپاہیوں نے یہ ارادہ بھی کیا کہ لاہور پہنچ کر رانی جنداں اور راجہ دلیپ سنگھ کو قتل کر دیا جائے۔ اور اس کی جگہ کسی اور کو تخت پر بٹھا دیا جائے۔ مگر یہ ارادہ پروان نہ چڑھ سکا۔ بہر حال سکھ فوج کا شیرازہ بکھر گیا اور انگریزی فوجوں نے ۲۰ فروری ۱۸۴۶ء کو آگے بڑھ کر لاہور پر قبضہ کر لیا۔ ۹ مارچ کو عہد نامہ لاہور ہوا، جس کی رو سے انتظام سلطنت راجہ دلیپ سنگھ کے بالغ ہونے تک ایک کونسل کے سپرد کر دیا گیا۔ اس کونسل کو انگریزوں کی نگرانی میں کام کرنا تھا۔ سکھ فوج اس معاہدہ کو پسند نہ کرتی تھی۔ انھوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ کا فیصلہ کر لیا۔

۱۳ر جنوری ۱۸۴۹ء کو چیلیانوالہ کی لڑائی ہوئی۔ اس کے بعد ۲۱ر فروری کو گجرات کی جنگ ہوئی جس میں لارڈ گف نے سکھ فوج کو بالکل تباہ کر دیا۔ ملتان میں دیوان مولراج نے انگریزوں کے خلاف جنگ کی مگر شکست کھا کر اسیر ہوا۔ ۲۹ مارچ ۱۸۴۹ء کو انگریزوں نے دلیپ سنگھ کو معزول کر کے پنجاب پر قبضہ کر لیا۔ اُس روز فیروز پور سے لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل نے اعلان کیا کہ سکھ حکومت کا تمام علاقہ انگریزی قلمرو میں شامل کر لیا گیا ہے مگر سرکار انگریزی ہمیشہ دلیپ سنگھ کے ساتھ "بعزت و تعظیم" پیش آئے گی۔ اور اُن سکھ سرداروں کی جاگیریں جو انگریزوں سے نہیں لڑے محفوظ رہیں گی۔ پنجاب کی مسلمان، سکھ اور ہندو رعایا سے کوئی سروکار نہ رکھے گی۔ اور وہ سردار جو حکومتِ انگریزی سے لڑتے ہیں ان کی جاگیریں ضبط کر لی جائیں گی۔ پنجاب میں جو قلعے ہیں وہ گرا دیے جائیں گے۔ بلکہ "آنچناں تدبیر بہ عمل خواہد آمد کہ بعض مردم ملک پنجاب را قدرت بر جنگ و فساد با سرکارِ انگریزی نباشد۔"

خورد سال مہاراجہ دلیپ سنگھ کو حکومت کی نگرانی میں انگلستان لے جایا گیا اور ہزار پاؤنڈ سالانہ اُن کا وظیفہ مقرر ہوا۔ انھیں انگریزی تعلیم دی گئی اور عیسائی مذہب میں داخل کر لیا گیا۔

لاہور انگریزی دور میں

الحاقِ پنجاب کے بعد ایک انتظامی بورڈ قائم کیا گیا جو براہِ راست گورنر جنرل کے ماتحت تھا۔ اس بورڈ کے صدر کرنل ہنری لارنس تھے جنھیں بعد ازاں سر کا خطاب دیا گیا۔ ان کے ساتھیوں میں جان لارنس تھے جنھیں بعد ازاں لارڈ لارنس بنا دیا گیا۔ تیسرے رکن رابرٹ منٹگمری تھے جو بعد ازاں پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر بنے۔ ۱۸۵۳ء میں اس انتظامی بورڈ نے سر جان لارنس کو پنجاب کا پہلا چیف کمشنر مقرر کیا۔ اسی کے زمانے میں ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی ہوئی اور وہ سکھ جن کی سلطنت آٹھ سال پہلے انگریزوں نے چھینی تھی۔ اس جنگِ آزادی میں انگریزوں کے ماتحت دہلی کے مغل بادشاہ کے خلاف لڑنے پر تیار ہو گئے۔ ریاست ہائے پھولکیاں کے تمام ذرائع انگریزوں کے لیے وقف تھے۔ لارنس کی حکمتِ عملی کی کامیابی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گی کہ سکھ پرانے تاریخی واقعات کے پیشِ نظر بہادر شاہ ظفر کو سکھوں کا دشمن سمجھ کر اُس کے خلاف جوق در جوق انگریزی فوج میں داخل ہونے لگے۔ بادشاہ کو اعلان کرنا پڑا کہ وہ سکھوں کا دشمن نہیں۔ محاصرۂ دہلی کے دوران اور فتح دہلی کے بعد سکھوں نے ہر خوبرو نوجوان کو مغل خیال کرتے ہوئے بڑے جوش و خروش سے تہ تیغ کیا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ کے شعلے لاہور تک پہنچ چکے تھے۔ ۱۳ر مئی کی صبح کو قلعہ لاہور اور چھاؤنی دونوں جگہ بغاوت کا خطرہ تھا۔ اُس وقت قلعہ میں فوج رہتی تھی اور اس کے علاوہ یہاں خزانہ اور اسلحہ خانہ تھے۔ قلعہ شہر سے متصل تھا۔ اور اس پر قبضہ کا مطلب شہر کا باغیوں کے قبضہ میں چلا جانا تھا۔ مگر سازش کامیاب نہ ہوئی۔ صبح پانچ بجے گورا فوج قلعہ میں پہنچ گئی۔ دیسی فوج سے قلعہ کا چارج لے لیا۔ اور میاں میر چھاؤنی میں دیسی فوج سے ہتھیار رکھوا لیے گئے۔ اس سے لاہور میں بدامنی کا خدشہ جاتا رہا۔ اس اثنا میں فیروز پور چھاؤنی میں بعض دیسی فوجی دستوں کے انگریزوں کے خلاف ہو جانے کی خبریں اڑیں۔ اور یہ بھی سنا گیا کہ اُن دستوں نے ستلج پار کر کے لاہور کی طرف مارچ شروع کر دیا ہے۔ اس خبر نے لاہور کے فوجی اور ملکی حاکموں کو بہت پریشان کیا۔ مسٹر رابرٹ کمشنر، ایجرٹن ڈپٹی کمشنر، ایلیٹ اسسٹنٹ کمشنر اور لیفٹیننٹ گلبور بریگیڈیر کاربٹ وغیرہ بہت ہی مستعد رہے۔

۱۴ر مئی کو دوپہر کے قریب یہ خبر ملی کہ میاں میر چھاؤنی کے سپاہی بغاوت کی تیاری میں مصروف ہیں۔ اس سے لاہور کی انگریزی آبادی اور بالخصوص علاقہ انارکلی میں رہنے والے انگریزوں میں سراسیمگی پھیل گئی۔ لاہور کی انگریز فوج کی مستعدی سے یہ ہنگامہ دب گیا۔ جو سپاہی چھاؤنی سے بھاگے

انھیں ماجھے کے سکھوں نے گرفتار کر کے مسٹر طامس اسسٹنٹ کمشنر قصور کے حوالے کر دیا۔ یاد رہے کہ انگریزی حکومت کے خلاف علمِ جنگ بلند کرنے والے دیسی سپاہی زیادہ تر پوربیہ اور اودھ کے باشندے تھے اور انھیں گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کرنے والے وہ سکھ تھے جن سے انگریزوں نے صرف آٹھ برس پہلے حکومت چھینی تھی۔

لاہور پر انگریزوں نے قبضہ کیا تو شہر کے نواح میں چاروں طرف سکھ فوج کی بہت سی چھاؤنیاں تھیں جو انگریزوں نے ختم کر دیں۔ انارکلی کے وسیع علاقے میں جو لاہوری اور موری دروازے سے لے کر چوبرجی اور مزنگ تک پھیلا ہوا تھا اور جہاں دنقورہ اور ایلارڈ سمیت کئی جرنیلوں کی چھاؤنیاں تھیں۔ انگریزی فوج کی چھاؤنی قرار پایا۔ ۱۸۵۷ء میں انارکلی کے علاقے کو مختصر پا کر کچھ فوجی دستے میاں میر کے میدان میں متعین کیے گئے اور انارکلی کا علاقہ سول سٹیشن قرار پایا۔ لاہور کے قدیم شاہی قلعے میں اور شاہی مسجد میں بھی گورا فوج رہتی تھی۔ شاہی مسجد تو بعد میں واگذار کر دی گئی مگر قلعے میں ۱۹۲۴ء تک گورا فوج مقیم رہی۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں لاہور کے دفاع کے لیے حسبِ ذیل انتظامات کیے گئے۔

(۱) قلعہ شاہی میں اسلحہ جمع کیا گیا اور چار ہزار آدمیوں کے لیے چھ ماہ کی خوراک ذخیرہ کی گئی۔ صرف ایک دروازے (یعنی ہتھیا پول) کے سوا قلعے کے باقی تمام دروازے دیوار چن کر بند کر دیے گئے۔

(۲) ان تمام سپاہیوں کی چھٹی منسوخ کر دی گئی جو رخصت پر تھے اور انھیں کیپٹن ٹریورز کی کمان میں جمع ہونے کا حکم دیا گیا۔

(۳) انارکلی کے یورپین باشندوں نے ایک رضا کار فوج جمع کی جو ۱۳۰ رضاکاروں پر مشتمل تھی یہ لوگ انارکلی کے سول سٹیشن میں پہرہ دیتے تھے۔

(۴) خطرے کے سگنل متعین کیے گئے اور خطرے کے وقت عورتوں اور بچوں کو محفوظ مقامات پر پہنچانے اور خود ایک مقررہ جگہ جمع ہونے کا اہتمام کیا گیا۔

(۵) لاہور کی سڑکوں پر گھوڑا سوار پولیس متعین کر دی گئی۔

(۶) ۹ جون کو پچیسویں نیٹو انفنٹری کے دو آدمیوں کو انارکلی کی پریڈ گراؤنڈ میں توپوں سے اڑا دیا گیا۔ یہ سزا انھیں بغاوت کے جرم میں فوجی عدالت نے دی تھی۔

انفرادی نوعیت کے بعض واقعات رونما ہوئے جن میں بعض بے حد عجیب تھے۔ مثلاً ایک شخص ہاتھ میں تلوار لیے شہر کے ایک دروازے سے باہر نکلا اور دروازے کے سنتری کو قتل کر کے سرکلر روڈ سے ہوتا ہوا کشتیوں کے پل کی طرف جانے ہی والا تھا کہ ایک گھوڑ سوار سپاہی نے اسے گولی کا نشانہ بنا دیا۔ کئی لوگوں کو اس شک میں کہ ہندوستان کے ''باغیوں'' سے ان کی سازباز ہے گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ ۲۳ مئی کو مقامی اخباروں پر شدید سنسر (احتساب) عائد کیا گیا۔ ۲۹ جون کو لاہور کی ہندوستانی آبادی (اردو بولنے والے لوگ) جس میں سول حکام اور گھریلو ملازم شامل تھے غیر مسلح کر دیے گئے۔ ۲۳ اگست کو بیکار قسم کے ہندوستانیوں کی گنتی کی گئی تاکہ انھیں لاہور بدر کیا جائے۔ ہفتے میں دو بار ان کے قافلے ہری کے پتن پہ فوج کی نگرانی میں بھیجے جاتے تھے۔ چنانچہ چند ہفتوں میں ۲۵۳۶ ہندوستانیوں کو واپس بھیجا گیا۔

۱۰ جولائی کو چھبیسویں نیٹو انفنٹری نے میاں میر میں بغاوت کر دی۔ انھوں نے چند افسروں کو جن میں میجر سپنسر بھی شامل تھے مار ڈالا۔ اور تاریک آندھی میں جو اس وقت چلنے لگی تھی۔ بھاگنے میں کامیاب ہو گئے۔ امرتسر کے ڈپٹی کمشنر مسٹر کوپر نے انھیں راوی کے کنارے شکست دی۔ اس قسم کے واقعات کو روکنے کے لیے پولیس کی چوکیاں مقرر کی گئیں۔ ۷ ستمبر کو مسٹر ایجرٹن ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر لاہور ضلع کے

جنوب مغربی حصے میں گیا تاکہ پنجاب کے ایک مسلم قبیلہ کھرل کے "باغیوں" کو دیہات کی مسلم آبادی کو برگشتہ کرنے سے روکے۔ اس طرح حکام کو گوگیرہ بار دیہاتی علاقے کی نگرانی کے لیے جانا پڑا۔ لاہور کے دونوں جیلوں کو مضبوط کیا گیا۔ اور اُن پہ کڑی نگرانی کی جانے لگی تاکہ کوئی دیسی پلٹن جیل پہ حملہ کر کے قیدیوں کو اپنے ساتھ نہ ملا لے۔ اگرچہ دہلی اور لکھنؤ کی طرح لاہور جنگ آزادی کا اہم مرکز نہ بن سکا تاہم یہاں حالات مخدوش ہونے کا کافی خدشہ رہا۔ لاہور کے بہت سے لوگ جن میں سکھوں کی تعداد بہت زیادہ تھی دہلی، لکھنؤ اور دوسرے مراکز پہ مجاہدینِ وطن کے خلاف انگریزی فوجوں میں شامل ہو کر لڑے اور واپسی پر بہت سا روپیہ کما کر لائے۔

۱۸۵۸ء میں کمپنی کی حکومت کا خاتمہ ہوا اور برطانوی پارلیمنٹ نے براہ راست حکومت شروع کی۔ یکم جنوری ۱۸۵۹ء سے پنجاب ایک لیفٹیننٹ گورنر کے ماتحت کر دیا گیا۔ اور سر جان لارنس جو اس وقت پنجاب کا چیف کمشنر تھا پہلا لیفٹیننٹ گورنر مقرر ہوا۔ اسی سال فروری کے آخر میں جان لارنس خرابی صحت کی بنا پہ چھٹی لے کر انگلستان چلے گئے اور سر رابرٹ منٹگمری اس عہدہ پر مقرر ہوئے۔ ان کے زمانے میں پرانے شہر کی خندق بند کر دی گئی اور اس پر باغات لگا دیے گئے۔ شہر کے گرد جو دوہری فصیل تھی اس میں سے بیرونی فصیل بالکل مسمار کرا دی گئی اور اندرونی فصیل آدھی کر دی گئی تاکہ شہر میں تازہ ہوا بآسانی آ سکے۔ اس باغ کو کئی حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصہ شہر کو ایک رئیس کی نگرانی میں دے دیا گیا تاکہ وہ اسے شاداب اور آباد رکھے۔ اور ان میں زیادہ تر پھل دار درخت لگائے گئے۔ سر رابرٹ منٹگمری جنوری ۱۸۶۵ء میں اپنے عہدہ سے سبکدوش ہو کر انگلستان سدھارے اور ان کی روانگی پر پنجاب کے رؤسا نے چندہ کر کے بطور یادگار منٹگمری ہال تعمیر کرایا جو اب تک لارنس باغ (حال جناح باغ) میں ان کی یادگار موجود ہے۔ یہ باغ مال روڈ پر ایک وسیع قطعہ میں سر جان لارنس کے نام پہ لگوایا گیا تھا۔ اس میں جو مصنوعی پہاڑیاں ہیں وہ اینٹیں پکانے کے پرانے پژاوے ہیں۔ گول باغ اس سے پرانا ہے اور لارنس باغ کے وجود میں آنے سے پہلے انگریزوں کی سیرگاہ تھا۔

۱۸۶۵ء میں جوڈیشل کمشنر کا عہدہ منسوخ کر کے لاہور میں چیف کورٹ قائم کیا گیا۔ اس میں دو جج تھے۔ پہلی مرتبہ مسٹر ایچ اے رابرٹس اور مسٹر چارلس بال نوئس (BOULNOIS) چیف کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔

لاہور پر انگریزوں کا عمل دخل ہوا تو اس کی آبادی قدیم شہر تک محدود تھی۔ شہر کے اندر بازار اور گلیاں بہت تنگ تھیں اور آبادی بے حد گنجان تھی۔ جا بجا درباری امرا اور رؤسا کی حویلیاں تھیں۔ شہر کے چاروں طرف دوہری فصیل اور خندق تھی اور میلوں تک مغلیہ دور کے محلات کے کھنڈر تھے۔ جن کی اینٹیں جدید تعمیرات میں استعمال ہوتی تھیں۔ رنجیت سنگھ کے زمانے میں محلوں، حویلیوں اور شہر کی حویلیوں پر جو اینٹ صرف ہوئی وہ انھیں کھنڈروں سے حاصل کی گئی۔ ان کھنڈروں میں قدیم باغات، مقبرے، مزارات اور حمام بھی تھے۔ اینٹ اور پتھر کے لالچ میں اکثر اوقات مضبوط اور مستحکم تاریخی عمارات کو بھی برباد کر دیا جاتا تھا۔ رنجیت سنگھ کے امرا نے جا بجا کھنڈر صاف کر کے باغات لگوا دیے تھے۔ جس سے نہ صرف پھل پھول حاصل ہوتا تھا بلکہ نواحِ شہر کی فضا بھی شاداب ہو گئی تھی۔ علاوہ ان باغات کے میلوں تک سکھ فوج کی چھاؤنیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ سکھ دور کے باغات کے حالات دیوان امرناتھ اکبری نے اپنی کتاب ظفر نامہ رنجیت سنگھ[1] کے آخر میں دیے ہیں۔ علاوہ ازیں مفتی تاج الدین کی کتاب 'تاریخ ضلع لاہور' میں بھی ان باغوں اور چھاؤنیوں کے حالات مرقوم ہیں۔

---

[1] اس غیر مطبوعہ کتاب کا واحد معلوم شدہ نسخہ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع صاحب کے کتب خانے کی زینت ہے۔ راقم نے مدت ہوئی اس کی زیارت کی تھی۔ اور اس واقعہ کے تھوڑے عرصہ بعد مولوی صاحب ممدوح نے اس کے ضروری اقتباسات اورینٹل کالج میگزین میں شائع کرائے تھے۔ (میگزین مذکور نومبر ۱۹۴۳ء، فروری ۱۹۴۴ء)

انگریزی دور میں بھی برسوں ان کھنڈروں کی اینٹیں عمارتوں میں استعمال ہوتی رہیں حتیٰ کہ ان عمارتوں کی بنیادیں بھی کھود دی گئیں انگریزی دور کے آغاز میں اینٹیں زیادہ تر بنیادوں ہی سے حاصل کی گئیں۔ اس سے جابجا گڑھے پڑ گئے جو موسم برسات میں تالابوں کی صورت اختیار کر لیتے تھے۔ بند پانی میں عفونت پیدا ہوتی اور مچھر پرورش پاتے تھے حکومت نے انھیں بند کرا کے حکم دیا کہ کوئی شخص بغیر اجازت ان بنیادوں سے اینٹیں نہ نکالے اور جو اجازت سے کر اینٹیں نکالے وہ بعد ازاں مٹی یا ملبے سے گڑھوں کو ہموار کر دے۔ راقم کے مجموعہ نوادر تاریخی میں اس دور کی ایک عرضی ہے جو میرے پردادا (محمد نظام الدین) نے حکام لاہور کی خدمت میں پیش کی تھی کہ انھیں چوک دارا کے علاقے سے ([illegible]) اینٹیں نکالنے کی اجازت دی جائے اور اس میں یہ وعدہ کیا گیا ہے کہ بعد ازاں گڑھوں کو ہموار کر دیا جائے گا۔ ۱۸۴۹ء سے لے کر تقریباً ۱۸۸۰ء تک عمارات دور مغلیہ کی بنیادوں کی اینٹیں انگریزی دور کی سرکاری اور ذاتی عمارتوں میں استعمال ہوتی رہیں۔ اس کے بعد جدید طرز کے بھٹے قائم ہو گئے اور ڈبل اینٹیں بننے لگیں۔

آج سے تقریباً ایک صدی قبل باغبانپورہ، چاہ میراں، گڑھی شاہو، گنج، اچھرہ، مزنگ، قلعہ گوجر سنگھ وغیرہ تحصیل لاہور کے گاؤں شمار کیے جاتے تھے۔ اور مثال کے طور پر انھیں یوں لکھا جاتا تھا موضع مزنگ تحصیل و ضلع لاہور۔ مگر آج نہ صرف یہ بلکہ سوڈی وال، اعظم [illegible] بلکہ جلو تک بھی لاہور کے محلے ہیں۔ ۱۸۴۹ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک مختلف صورتوں میں یہاں انگریزوں کا عمل دخل رہا اور شہر کی وسعت بتدریج بڑھتی رہی۔ سرکاری دفاتر، ہائیکورٹ، ریلوے کے دفاتر اور کارخانے شہر کی رونق اور آبادی میں اضافے کا اہم ترین سبب ہے۔ زیادہ آبادی پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے زمانہ میں بڑھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شہر کی وسعت کسی خاص سکیم کے مطابق نہ ہوئی۔ اسی لیے بعض ایسے علاقے جن کی سطح بلند نہیں اور جہاں بارش کے وقت پانی کھڑا ہو جاتا ہے گنجان آباد ہو گئے۔ ایسی آبادیاں قدیم شہر کے اندرونی حصے کے گنجان محلوں سے زیادہ گندے اور تکلیف دہ ہیں۔ اندرون شہر کبھی بھی پانی ٹھہرا نہیں رہتا خواہ کتنی ہی زیادہ بارش کیوں نہ ہو۔ اس کے برعکس گوالمنڈی اور مصری شاہ کے علاقے ذرا سی بارش ہو تو نہر کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد ہندوستان کے مہاجرین اور دیہات و قصبات سے وارد لاہور ہونے والے مقامی باشندوں کی وجہ سے شہر اور وسیع ہو گیا ہے۔ اگر حالات ساز گار ہوں تو یہ شہر اور زیادہ وسیع ہو جائے۔ پاکستان کے قیام کے بعد گلبرگ، رحمن آباد اور شادباغ وغیرہ نئے محلے وجود میں آ گئے ہیں۔ یہ محلے خاص نظام اور سکیم کے ماتحت آباد کیے گئے ہیں اور صحیح معنوں میں قابل دید ہیں۔

۹ فروری ۱۸۷۰ء کو ملکہ وکٹوریہ کا دوسرا بیٹا ڈیوک آف ایڈنبرا لاہور آئے۔ اُن کے اعزاز میں گورنمنٹ ہاؤس، منٹگمری ہال وغیرہ میں سرکاری تقاریب منعقد ہوئیں۔ یکم جنوری ۱۸۷۶ء کو شہزادہ ویلز لاہور آئے۔ لاہور کے سٹیشن پر لیفٹیننٹ گورنر، فوجی اور ملکی حکام اور شہر کے سربرآوردہ بزرگوں نے شہزادے کا استقبال کیا۔ شہزادے کے اعزاز میں شہر کو خوب سجایا گیا اور اُن کے اعزاز میں اہم تقاریب منعقد ہوئیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ قلعہ لاہور میں شہزادہ نے سکھ دور کے ہتھیاروں کا معائنہ کیا۔ وہاں انھوں نے ایک چھوٹی سی توپ دیکھی جو مہاراجہ دلیپ سنگھ کے کھلونے کے طور پر بنائی گئی تھی اس کھلونے سے شہزادہ بہت محظوظ ہوا اور حکم دیا کہ اسے انگلستان بھیج دیا جائے۔ یکم جنوری ۱۸۷۷ء کو ملکہ وکٹوریہ نے قیصرہ ہند کا لقب اختیار کیا۔ ملکہ کو بحیثیت حکمران جو ہر دلعزیزی پنجاب میں حاصل ہوئی وہ شاید ہی کسی حکمران کو ہوئی ہو۔ لوگ سکھا شاہی سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ ملکہ کے دور میں ہر طرف امن و سلامتی کا دور شروع ہوا۔ لوگ آزادی سے اپنے مذاہب پر عمل کرنے لگے ضروریات زندگی سستی تھیں اور لوگ نیک نیت اور متوکل تھے صنعت و حرفت کی ترقی کے لیے انیسویں صدی میں نمائشیں بھی منعقد کی گئیں۔ چنانچہ ۱۸۶۴ء اور ۱۸۸۱ء کی نمائشیں بے حد کامیاب تھیں۔

۱۴ نومبر ۱۸۸۲ء کو پنجاب یونیورسٹی قائم ہوئی۔ ۲۱ دسمبر ۱۸۸۵ء کو پنجاب پبلک لائبریری قائم ہوئی۔ اس سے قبل بھی اس عمارت (بارہ دری نواب وزیر خاں) میں لائبریری تھی۔ ۱۸۸۶ء میں رؤسائے پنجاب کے بچوں کے لیے ایچی سن کالج قائم کیا گیا۔ لیڈی ایچی سن ہسپتال ۱۵ فروری ۱۸۸۷ء کو قائم ہوا۔ یہ ادارے اس وقت کے لیفٹیننٹ گورنر سر چارلس ایچی سن کے نام پر قائم کیے گئے تھے۔ ۱۸۸۸ء کے وسط نومبر میں لارڈ ڈفرن گورنر جنرل انڈیا لاہور آئے۔ جنوری ۱۸۹۰ء میں پرنس البرٹ وکٹر جو ملکہ وکٹوریہ کے پوتے اور شہزادہ ویلز کے بیٹے تھے لاہور تشریف لائے۔ اور ان کا شہر میں ہاتھی پر بٹھا کر جلوس نکالا گیا۔ ۳ فروری ۱۸۹۰ء کو انھوں نے عجائب گھر کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔ سر جیمز لائل لیفٹیننٹ گورنر نے شالامار باغ میں پارٹی کا انتظام کیا۔

انیسویں صدی عیسوی کے آخری برسوں میں شہر لاہور آریہ سماج، عیسائی مشن اور انجمن حمایت اسلام وغیرہ جماعتوں کی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ انھیں ایام میں انڈین نیشنل کانگریس قائم ہوئی۔ ۱۸۹۳ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا سالانہ جلسہ لاہور میں ہوا۔ اور سردار دیال سنگھ اس کی مجلس استقبالیہ کے چیئرمین تھے۔ انھیں دنوں سر سید احمد خاں بھی لاہور آ کر لوگوں سے خطاب فرماتے رہے۔ لاہور کے باشندے ان تمام انجمنوں اور افراد سے بہرہ ور ہوئے اور ان تقریروں نے ان کے سیاسی، مذہبی اور روحانی خیالات کی تشکیل اور ارتقا میں نمایاں حصہ لیا۔ جنگ طرابلس اور پہلی جنگ عظیم کے بعد لاہور کی سیاسی فضا متلاطم ہو گئی۔ اکابر اور قائدین کی پرجوش تقریروں نے ان کے طبائع کو بے حد متاثر کیا اور خلافت، احرار، کانگریس، خاکسار، لیگ، ہندو مہا سبھا اور اکالی دل وغیرہ سبھی جماعتیں یہاں فعال رہیں۔ اور لاہور کے در و دیوار ان ہنگاموں سے گونجتے رہے۔ ۱۹۲۹ء میں یہاں کنار راوی پر انڈین نیشنل کانگریس کا جلسہ ہوا۔ اور آزادی کامل کی قرارداد پاس کی گئی۔ جون، جولائی ۱۹۳۵ء میں مسجد شہید گنج اور مزار حضرت کاکو شاہ سکھوں نے مسمار کر دیے۔ مسلمانوں نے حکومت کو یہ یاد دلانے کی ناکام کوشش کی کہ ان کی کتاب آئین میں تحفظ آثار قدیمہ کا قانون بھی ہے۔ مگر انگریز کی سیاسی مصلحتیں آڑے آئیں اور مسلمانوں کو جانی اور مالی قربانیاں پیش کرنا پڑیں۔

یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو پنجاب میں صوبائی خود مختاری کے اصول کے تحت ۱۹۳۵ء کے قانون حکومت ہند کے مطابق آئینی وزارت قائم ہوئی۔ سکندر حیات خاں پہلے وزیر اعظم تھے۔ ان کے دور کا اہم واقعہ شاہی مسجد کی مرمت کا انتظام ہے۔ اور اسی انتظام کی رو سے یہ مسجد جو تقریباً کھنڈر بن چکی تھی گویا از سر نو تعمیر ہوئی۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو علامہ محمد اقبال فوت ہوئے اور شاہی مسجد کے صدر دروازے کے باہر جنوبی جانب انھیں دفن کیا گیا۔ ان کا مزار آج لاہور کی اہم ترین زیارت گاہ ہے۔ دسمبر ۱۹۴۲ء میں سردار سکندر حیات خاں فوت ہوئے اور انھیں مسجد کے باہر شمالی جانب دفن کیا گیا۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو قائد اعظم محمد علی جناح کی سیادت میں اسلامیان برصغیر کی مساعی رنگ لائیں اور پاکستان کی آزاد حکومت عالم وجود میں آئی۔ جس کا مستقبل بفضل ایزدی نہایت درخشاں ہے۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

فہرست فرمانروایانِ لاہور اور اُن کا عہدِ حکومت

خاندانِ چچ (؟ تا ۳۸۹ ہجری / ؟ تا ۹۹۹ عیسوی)

نمبر شمار	فرمانروا کا نام	سنین ہجری	سنین عیسوی
۱	چچ	؟	؟
۲	بنرت	؟	؟
۳	تھنرت	؟ — ۳۸۰	؟ — ۹۹۰
۴	چندرت	۳۸۰ تا ۳۸۹	۹۹۰ تا ۹۹۹

ہندو شاہیہ خاندان (بھٹی راجپوت) (۳۸۹ تا ۴۱۷ ہجری / ۹۹۹ تا ۱۰۲۶ عیسوی)

نمبر شمار	فرمانروا کا نام	سنین ہجری	سنین عیسوی
۱	جے پال	۲۸۹ تا ۳۹۳	۹۹۹ تا ۱۰۰۲-۳
۲	انند پال	۳۹۲ تا ۴۰۴	۱۰۰۲ تا ۱۰۱۳
۳	ترلوچن پال	۴۰۴ تا ۴۰۵	۱۰۱۳ تا ۱۰۱۴

نوٹ:۔ ترلوچن پال ۴۱۲ھ/۱۰۲۱ء میں فوت ہوا اور بھیم پال ۴۱۷ھ/۱۰۲۶ء میں۔ مگر انھوں نے ۱۰۱۴ء کے بعد لاہور پر حکومت نہیں کی۔

خاندانِ غزنویہ (۴۰۵ تا ۵۸۲ ہجری / ۱۰۱۴ تا ۱۱۸۶ عیسوی)

نمبر شمار	فرمانروا کا نام	سنین ہجری	سنین عیسوی
۱	محمود یمین الدولہ	۴۰۵ تا ۴۲۱	۱۰۱۴ تا ۱۰۳۰
۲	محمد جلال الدولہ	۴۲۱ تا ۴۲۱	۱۰۳۰ تا ۱۰۳۰
۳	مسعود اول ناصر الدین	۴۲۱ تا ۴۳۳	۱۰۳۰ تا ۱۰۴۲
۴	مودود شہاب الدولہ	۴۳۳ تا ۴۴۱	۱۰۴۲ تا ۱۰۴۹
۵	مسعود دوم	۴۴۱	۱۰۴۹
۶	علی ابوالحسن بہاء الدولہ	۴۴۱ تا ۴۴۳	۱۰۴۹ تا ۱۰۵۱
۷	عبدالرشید عزالدولہ	۴۴۳ تا ۴۴۴	۱۰۵۱ تا ۱۰۵۲
۸	طغرل	۴۴۴	۱۰۵۲ تا ۱۰۵۲
۹	فرخ زاد جمال الدولہ	۴۴۴ تا ۴۵۱	۱۰۵۳ تا ۱۰۵۹

نمبر	نام	ہجری	عیسوی
۱۰	ابراہیم ظہیر الدولہ	۴۵۱ تا ۴۹۲	۱۰۵۹ تا ۱۰۹۹
۱۱	مسعود سوئم علاء الدولہ	۴۹۲ تا ۵۰۸	۱۰۹۹ تا ۱۱۱۴
۱۲	شہزاد کمال الدولہ	۵۰۸ تا ۵۰۹	۱۱۱۴ تا ۱۱۱۵
۱۳	ارسلان سلطان الدولہ	۵۰۹ تا ۵۱۲	۱۱۱۵ تا ۱۱۱۸
۱۴	بہرام شاہ یمین الدولہ	۵۱۲ تا ۵۴۷	۱۱۱۸ تا ۱۱۵۲
۱۵	خسرو شاہ ظہیر الدولہ	۵۴۷ تا ۵۵۵	۱۱۵۲ تا ۱۱۶۰
۱۶	خسرو ملک تاج الدولہ	۵۵۵ تا ۵۸۲	۱۱۶۰ تا ۱۱۸۶

خاندانِ غور و خاندانِ غلاماں (۵۸۲ تا ۶۸۹ ہجری / ۱۱۸۶ تا ۱۲۸۹ عیسوی)

نمبر	نام	ہجری	عیسوی
۱	محمد غوری شہاب الدین	۵۸۲ تا ۶۰۲	۱۱۸۶ تا ۱۲۰۶
۲	قطب الدین ایبک	۶۰۲ تا ۶۰۷	۱۲۰۶ تا ۱۲۱۰
۳	آرام شاہ	۶۰۷	۱۲۱۰
۴	شمس الدین التمش	۶۰۷ تا ۶۳۳	۱۲۱۰ تا ۱۲۳۶
۵	رکن الدین فیروز شاہ	۶۳۳ تا ۶۳۴	۱۲۳۶
۶	رضیہ	۶۳۴ تا ۶۳۷	۱۲۳۶ تا ۱۲۳۹
۷	بہرام شاہ معز الدین	۶۳۷ تا ۶۳۹	۱۲۴۰ تا ۱۲۴۱
۸	مسعود شاہ علاؤ الدین	۶۳۹ تا ۶۴۴	۱۲۴۱ تا ۱۲۴۶
۹	محمود شاہ ناصر الدین	۶۴۴ تا ۶۶۴	۱۲۴۶ تا ۱۲۶۶
۱۰	بلبن غیاث الدین	۶۶۴ تا ۶۸۵	۱۲۶۶ تا ۱۲۸۶
۱۱	کیقباد معز الدین	۶۸۵ تا ۶۸۹	۱۲۸۶ تا ۱۲۸۹
۱۲	کیومرث شمس الدین	۶۸۹	۱۲۸۹

خاندانِ خلجی (۶۸۹ تا ۷۲۱ ہجری / ۱۲۸۹ تا ۱۳۲۱ عیسوی)

نمبر	نام	ہجری	عیسوی
۱	فیروز شاہ دوم جلال الدین	۶۸۹ تا ۶۹۵	۱۲۸۹ تا ۱۲۹۵
۲	ابراہیم شاہ رکن الدین	۶۹۵	۱۲۹۵
۳	محمد شاہ اول علاؤ الدین	۶۹۵ تا ۷۱۵	۱۲۹۵ تا ۱۳۱۵
۴	عمر شاہ شہاب الدین	۷۱۵ تا ۷۱۶	۱۳۱۵ تا ۱۳۱۶

۵ - مبارک شاہ قطب الدین	۷۱۶ تا ۷۲۱	۱۳۱۶ تا ۱۳۲۱
۶ - خسرو شاہ ناصر الدین	۷۲۱	۱۳۲۱

خاندان تغلق (۷۲۱ تا ۸۱۵ ہجری / ۱۳۲۱ تا ۱۴۱۲ عیسوی)

۱ - تغلق شاہ اول غیاث الدین	۷۲۱ تا ۷۲۵	۱۳۲۱ تا ۱۳۲۴
۲ - محمد تغلق	۷۲۵ تا ۷۵۲	۱۳۲۴ تا ۱۳۵۱
۳ - فیروز شاہ	۷۵۲ تا ۷۹۰	۱۳۵۱ تا ۱۳۸۸
۴ - تغلق شاہ	۷۹۰ تا ۷۹۱	۱۳۸۸ تا ۱۳۸۸
۵ - ابوبکر شاہ	۷۹۱ تا ۷۹۲	۱۳۸۸ تا ۱۳۸۹
۶ - محمد شاہ	۷۹۲ تا ۷۹۶	۱۳۸۹ تا ۱۳۹۳
۷ - سکندر شاہ	۷۹۶	۱۳۹۳
۸ - محمود شاہ	۷۹۶ تا ۷۹۷	۱۳۹۳ تا ۱۳۹۴
۹ - نصرت شاہ	۷۹۷ تا ۸۰۲	۱۳۹۴ تا ۱۳۹۹
۱۰ - تیمور کا حملہ	۸۰۱	۱۳۹۸
۱۱ - محمود شاہ	۸۰۲ تا ۸۱۵	۱۳۹۹ تا ۱۴۱۲
۱۲ - دولت خاں لودھی	۸۱۵ تا ۸۱۷	۱۴۱۲ تا ۱۴۱۴

خاندان سادات (۸۱۷ تا ۸۵۲ ہجری / ۱۴۱۴ تا ۱۴۴۸ عیسوی)

۱ - خضر خان	۸۱۷ تا ۸۲۴	۱۴۱۴ تا ۱۴۲۱
۲ - مبارک شاہ	۸۲۴ تا ۸۳۷	۱۴۲۱ تا ۱۴۳۴
۳ - محمد شاہ	۸۳۷ تا ۸۴۹	۱۴۳۴ تا ۱۴۴۵
۴ - علاؤالدین	۸۴۹ تا ۸۵۲	۱۴۴۵ تا ۱۴۴۸

خاندان لودھی (۸۵۲ تا ۹۳۲ ہجری / ۱۴۴۸ تا ۱۵۲۶ عیسوی)

۱ - بہلول	۸۵۲ تا ۸۹۴	۱۴۴۸ تا ۱۴۸۹
۲ - سکندر	۸۹۴ تا ۹۲۲	۱۴۸۹ تا ۱۵۱۷
۳ - ابراہیم	۹۲۳ تا ۹۳۲	۱۵۱۷ تا ۱۵۲۶
۴ - بابر کا حملہ	۹۳۲	۱۵۲۶

خاندانِ مغلیہ (۹۳۲ تا ۹۴۷ ہجری / ۱۵۲۶ تا ۱۵۴۰ عیسوی)

۱ ـ ظہیر الدین بابر	۹۳۲ تا ۹۳۷	۱۵۲۶ تا ۱۵۳۰
۲ ـ نصیر الدین محمد ہمایوں	۹۳۷ تا ۹۴۷	۱۵۳۰ تا ۱۵۴۰

افغان خاندانِ سوری (۹۴۷ تا ۹۶۲ ہجری / ۱۵۴۰ تا ۱۵۵۵ عیسوی)

۱ ـ شیر شاہ	۹۴۷ تا ۹۵۲	۱۵۴۰ تا ۱۵۴۵
۲ ـ اسلام شاہ	۹۵۲ تا ۹۶۰	۱۵۴۵ تا ۱۵۵۲
۳ ـ محمد شاہ	۹۶۰ تا ۹۶۱	۱۵۵۲ تا ۱۵۵۳
۴ ـ ابراہیم	۹۶۱ تا ۹۶۲	۱۵۵۳ تا ۱۵۵۴
۵ ـ سکندر شاہ	۹۶۲	۱۵۵۵

خاندانِ مغلیہ (۹۶۲ تا ۱۱۱۸ ہجری / ۱۵۵۵ تا ۱۷۰۷ عیسوی)

۱ ـ ہمایوں نصیر الدین محمد	۹۶۲ تا ۹۶۳	۱۵۵۵ تا ۱۵۵۶
۲ ـ جلال الدین اکبر	۹۶۳ تا ۱۰۱۴	۱۵۵۶ تا ۱۶۰۵
۳ ـ نور الدین جہانگیر	۱۰۱۴ تا ۱۰۳۷	۱۶۰۵ تا ۱۶۲۷
۴ ـ شہاب الدین شاہجہان	۱۰۳۷ تا ۱۰۶۸	۱۶۲۸ تا ۱۶۵۸
۵ ـ محی الدین عالمگیر اورنگ زیب	۱۰۶۸ تا ۱۱۱۸	۱۶۵۸ تا ۱۷۰۷

دورِ آخر کے مغل حکمران (۱۱۱۹ تا ۱۱۷۳ ہجری / ۱۷۰۸ تا ۱۷۵۹ عیسوی)

۱ ـ قطب الدین شاہ عالم اول بہادر شاہ اول	۱۱۱۹ تا ۱۱۲۴	۱۷۰۸ تا ۱۷۱۲
۲ ـ جہاندار شاہ	۱۱۲۴ تا ۱۱۲۴	۱۷۱۲ تا ۱۷۱۳
۳ ـ فرخ سیر	۱۱۲۵ تا ۱۱۳۱	۱۷۱۳ تا ۱۷۱۹
۴ ـ رفیع الدرجات	۱۱۳۱	۱۷۱۹
۵ ـ نکو سیر	۱۱۳۱	۱۷۱۹
۶ ـ رفیع الدولہ	۱۱۳۱	۱۷۱۹
۷ ـ محمد شاہ	۱۱۳۱ تا ۱۱۶۱	۱۷۱۹ تا ۱۷۴۸

	ہجری	عیسوی
۸ - محمد ابراہیم	۱۱۳۲ تا ۱۱۳۲	۱۷۲۰
۹ - احمد شاہ	۱۱۶۱ تا ۱۱۶۷	۱۷۴۸ تا ۱۷۵۴
۱۰ - عالمگیر دوم	۱۱۶۷ تا ۱۱۷۳	۱۷۵۴ تا ۱۷۵۹
۱۱ - احمد شاہ ابدالی	۱۱۷۳ تا ۱۱۸۲	۱۷۵۹ تا ۱۷۶۸

خاندان درانی (۱۱۶۵ تا ۱۲۱۴ ہجری / ۱۷۵۲ تا ۱۷۹۹ عیسوی)

	ہجری	عیسوی
۱ - احمد شاہ درانی	۱۱۶۵ تا ۱۱۸۵	۱۷۵۲ تا ۱۷۷۲
۲ - تیمور شاہ	۱۱۸۵ تا ۱۲۰۵	۱۷۷۲ تا ۱۷۹۲
۳ - زماں شاہ درانی	۱۲۰۵ تا ۱۲۱۱	۱۷۹۳ تا ۱۷۹۹

سکھوں کا دور (۱۱۸۲ تا ۱۲۶۵ ہجری / ۱۷۹۹ تا ۱۸۴۹ عیسوی)

	عیسوی
۱ - رنجیت سنگھ	۱۷۹۹ تا ۱۸۳۹
۲ - کھڑک سنگھ	۱۸۳۹ تا ۱۸۴۰
۳ - نونہال سنگھ	۱۸۴۰
۴ - چند کور	۱۸۴۰ تا ۱۸۴۱
۵ - شیر سنگھ	۱۸۴۱ تا ۱۸۴۳
۶ - دلیپ سنگھ	۱۸۴۳ تا ۱۸۴۹

انگریزی دور (۱۸۴۹ تا ۱۹۴۷ عیسوی)

	عیسوی
۱ - ایسٹ انڈیا کمپنی	۱۸۴۹ تا ۱۸۵۸
۲ - وکٹوریہ	۱۸۵۸ تا ۱۹۰۱
۳ - ایڈورڈ ہفتم	۱۹۰۱ تا ۱۹۱۰
۴ - جارج پنجم	۱۹۱۰ تا ۱۹۳۶
۵ - ایڈورڈ ہشتم	۱۹۳۶ تا ۱۹۳۶
۶ - جارج ششم	۱۹۳۶ تا ۱۹۴۷ (المتوفی ۱۹۵۲)

حکومت پاکستان (۱۹۴۷ عیسوی)

	عیسوی
۱ - قائداعظم محمد علی جناح	۱۹۴۷ تا ۱۹۴۸

۲ —	خواجہ ناظم الدین	۱۹۴۸ تا ۱۹۵۱
۳ —	ملک غلام محمد	۱۹۵۱ تا ۱۹۵۵
۴ —	سکندر مرزا	۱۹۵۵ تا ۱۹۵۸
۵ —	فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں	۱۹۵۸

لاہور کے حاکموں، ناظموں اور نائب السلطنتوں کی فہرست

نمبر شمار	نام حاکم	سنین ہجری	سنین عیسوی
۱ —	چچ	؟	؟
۲ —	بنرت	؟	؟
۳ —	تھنرت	؟ تا ۳۸۰	؟ تا ۹۹۰
۴ —	چندرت	۳۸۰ تا ۳۸۹	۹۹۰ تا ۹۹۹

ہندو شاہیہ خاندان (۳۸۹ تا ۴۱۷ ہجری / ۹۹۹ تا ۱۰۲۶ عیسوی)

۱ —	انندپال	۳۸۹ تا ۴۰۴	۹۹۹ تا ۱۰۱۳
۲ —	ترلوچن پال	۴۰۴ تا ۴۰۵	۱۰۱۳ تا ۱۰۱۴

خاندان غزنویہ (۴۰۵ تا ۵۸۲ ہجری / ۱۰۱۴ تا ۱۱۸۶ عیسوی)

۱ —	سارُوغ	۴۰۵ تا ؟	۱۰۱۴ تا ؟
۲ —	نامعلوم الاسم امیر	۴۱۲ تا ؟	۱۰۲۱ تا ؟
۳ —	عبداللہ قراتگین	؟	؟
۴ —	ابوالفتح دمغانی	؟	؟
۵ —	ابوالفرج کرمانی	؟	؟
۶ —	اریارق (الیارق)	؟ تا ۴۲۲	؟ تا ۱۰۳۱
۷ —	احمد نیالتگین	۴۲۲ تا ۴۲۵	۱۰۳۱ تا ۱۰۳۴
۸ —	نامعلوم الاسم امیر	۴۲۵ تا ۴۲۷	۱۰۳۴ تا ۱۰۳۷
۹ —	مجدود (زیر اتالیقیٔ ایاز)	۴۲۷ تا ۴۳۳	۱۰۳۷ تا ۱۰۴۱
۱۰ —	نامعلوم الاسم امیر	۴۳۳ تا ۴۴۰	۱۰۴۱ تا ۱۰۴۸

۱۱ ـ ابوالقاسم محمود	۴۴۰	تا	۴۴۱	۱۰۴۸	تا	۱۰۴۹
۱۲ ـ علی بن ربیع (خود مختار حکمران)	۴۴۱	تا	۴۴۳	۱۰۴۹	تا	۱۰۵۱
۱۳ ـ نشتگین حاجب	۴۴۳	تا	۴۴۴	۱۰۵۱	تا	۱۰۵۲
۱۴ ـ نامعلوم الاسم امیر	۴۴۴	تا	؟	۱۰۵۲	تا	؟
۱۵ ـ حاجب طغاتگین		؟			؟	
۱۶ ـ محمد بایلم	۵۰۹	تا	۵۱۲	۱۱۱۵	تا	۱۱۱۸
۱۷ ـ سالار حسین	۵۱۲	تا	؟	۱۱۱۸	تا	؟
۱۸ ـ خسرو ملک	۵۵۵	تا	۵۸۲	۱۱۶۰	تا	۱۱۸۶

خاندانِ غور و خاندانِ غلاماں (۵۸۲ تا ۶۸۷ ہجری / ۱۱۸۶ تا ۱۲۸۸ عیسوی)

۱ ـ علی کرماج	۵۸۲	تا	؟	۱۱۸۶	تا	؟
۲ ـ قطب الدین ایبک	۵۹۰	تا	۶۰۲	۱۱۹۴	تا	۱۲۰۵
۳ ـ محمد	۶۰۲	تا	۶۰۳	۱۲۰۶	تا	۱۲۰۷
۴ ـ ناصرالدین قباچہ	۶۰۳	تا	۶۱۴	۱۲۰۷	تا	۱۲۱۸
۵ ـ ناصرالدین محمود شاہ	۶۱۴	تا	؟	۱۲۱۸	تا	؟
۶ ـ ملک علاؤالدین شیر خانی	۶۲۴	تا	۶۲۴	۱۲۲۶	تا	۱۲۲۶
۷ ـ ملک عزالدین کبیر خانی	۶۲۴	تا	۶۲۷	۱۲۲۶	تا	۱۲۲۹
۸ ـ ملک اختیارالدین کرہ کش	۶۲۷	تا	۶۳۹	۱۲۲۹	تا	۱۲۴۱
۹ ـ معظم خان شیر خان	۶۳۹	تا	۶۵۱	۱۲۴۱	تا	۱۲۵۲
۱۰ ـ ارسلان خان	۶۵۱	تا	؟	۱۲۵۲	تا	؟
۱۱ ـ معظم خان شیر خان	؟	تا	۶۶۸	؟	تا	۱۲۷۰
۱۲ ـ قاآن الملک محمد	۶۶۸	تا	۶۸۵	۱۲۷۰	تا	۱۲۸۶
۱۳ ـ ملک ترکی	۶۸۵	تا	؟	۱۲۸۶	تا	؟

خلجی اور تغلق خاندان (۶۸۹ تا ۸۱۷ ہجری / ۱۲۸۹ تا ۱۴۱۴ عیسوی)

۱ ـ ارتکلی خان	۶۹۱	تا	؟	۱۲۹۲	تا	؟
۲ ـ غازی ملک	۷۰۴	تا	۷۲۱	۱۳۰۴	تا	۱۳۲۱

۲ — ملک تاتار خرد	؟ تا ۷۴۲	؟ تا ۱۳۴۲
۴ — شیخا کھوکھر	۷۹۶	۱۳۹۴
۵ — نصرت کھوکھر	۷۹۶	۱۳۹۴
۶ — عادل خان (ملک کاندھو)	۷۹۶ تا ۸۰۱	۱۳۹۴ تا ۱۳۹۸
۷ — شیخا کھوکھر	۸۰۱	۱۳۹۸
۸ — خضر خان	۸۰۱ تا ۸۱۷	۱۳۹۸ تا ۱۴۱۴

خاندان سادات (۸۱۷ تا ۸۵۲ ہجری / ۱۴۱۴ تا ۱۴۴۸ عیسوی)

۱ — ملک راجب	۸۲۴	۱۴۲۱
۲ — ملک محمود حسن	۸۲۵	۱۴۲۱
۳ — ملک سکندر تحفہ	۸۲۵ تا ۸۳۵	۱۴۲۱ تا ۱۴۳۲
۴ — شمس الملک	۸۳۵	۱۴۳۲
۵ — نصرت خاں گرگ انداز	۸۳۵ تا ۸۳۶	۱۴۳۲ تا ۱۴۳۳
۶ — اللہ داد کاکا لودھی	۸۳۶	۱۴۳۳
۷ — شیخ علی	۸۳۶	۱۴۳۳
۸ — شمس الملک	۸۳۶	۱۴۳۳
۹ — عماد الملک	۸۳۶ تا ۸۴۵	۱۴۳۳ تا ۱۴۴۱
۱۰ — بہلول خان لودھی	۸۴۵ تا ۸۵۲	۱۴۴۱ تا ۱۴۴۸

خاندان لودھی (۸۵۶ تا ۹۲۲ ہجری / ۱۴۴۸ تا ۱۵۲۶ عیسوی)

۱ — دولت خان	؟ تا ۹۳۰	؟ تا ۱۵۲۴
۲ — میر عبدالعزیز	۹۳۰ تا ۹۳۱	۱۵۲۴ تا ۱۵۲۵

خاندان مغلیہ (۹۳۲ تا ۹۴۷ ہجری / ۱۵۲۶ تا ۱۵۴۰ عیسوی)

۱ — میر یونس علی	؟ تا ۹۳۷	؟ تا ۱۵۳۰
۲ — میرزا کامران	۹۳۷ تا ۹۴۷	۱۵۳۰ تا ۱۵۴۰
۳ — حیدر میرزا	۹۴۷	۱۵۴۰

خاندانِ سُوری (۹۴۷ تا ۹۶۲ ہجری / ۱۵۴۰ تا ۱۵۵۵ عیسوی)

۱ ـ	خواص خان	۹۴۷ تا ۹۵۰	۱۵۴۰ تا ۱۵۴۳
۲ ـ	ہیبت خان نیازی	۹۵۰ تا ۹۵۴	۱۵۴۳ تا ۱۵۴۷
۳ ـ	تاتار خان کوسی	۹۵۴ تا ۹۶۲	۱۵۴۷ تا ۱۵۵۵

خاندانِ مغلیہ (۹۶۲ تا ۱۱۱۸ ہجری / ۱۵۵۵ تا ۱۷۰۷ عیسوی)

۱ ـ	شاہ ابوالمعالی	۹۶۲ تا ۹۶۳	۱۵۵۵ تا ۱۵۵۶
۲ ـ	خضر خواجہ خان	۹۶۳ تا ۹۶۵	۱۵۵۶ تا ۱۵۵۷
۳ ـ	حسین خان	۹۶۵ تا ۹۶۷	۱۵۵۷ تا ۱۵۶۰
۴ ـ	شمس الدین محمد خان اتکہ	۹۶۷ تا ۹۶۹	۱۵۶۰ تا ۱۵۶۱
۵ ـ	نامعلوم الاسم امیر	۹۶۹ تا ۹۷۲	۱۵۶۱ تا ۱۵۶۴
۶ ـ	خانِ کلاں میر محمد اتکہ	۹۷۲ تا ۹۷۶	۱۵۶۴ تا ۱۵۶۸
۷ ـ	خانِ جہاں حسین قلی خاں	۹۷۶ تا ۹۸۲	۱۵۶۸ تا ۱۵۷۵
۸ ـ	شاہ قلی خان محرم	۹۸۲ تا ۹۸۶	۱۵۷۵ تا ۱۵۷۸
۹ ـ	سعید خان	۹۸۶ تا ۹۹۱	۱۵۷۸ تا ۱۵۸۲
۱۰ ـ	راجہ بھگونت داس	۹۹۱ تا ۹۹۴	۱۵۸۲ تا ۱۵۸۶
۱۱ ـ	عصمت قلی	۹۹۴	۱۵۸۶
۱۲ ـ	راجہ بھگونت داس	۹۹۴ تا ۹۹۸	۱۵۸۶ تا ۱۵۸۹
۱۳ ـ	قلیچ خان	۹۹۸ تا ۱۰۰۰	۱۵۸۹ تا ۱۵۹۲
۱۴ ـ	خواجہ شمس الدین خوافی	۱۰۰۰ تا ۱۰۰۸	۱۵۹۲ تا ۱۶۰۰
۱۵ ـ	مومن	۱۰۰۸ تا ؟	۱۶۰۰ تا ؟
۱۶ ـ	قلیچ خان	۱۰۱۰ تا ۱۰۱۴	۱۶۰۲ تا ۱۶۰۵
۱۷ ـ	سعید خان چغتائی	۱۰۱۴ تا ۱۰۱۵	۱۶۰۵ تا ۱۶۰۷
۱۸ ـ	قلیچ خان	۱۰۱۵ تا ۱۰۱۸	۱۶۰۷ تا ۱۶۱۰
۱۹ ـ	مرتضٰے خان	۱۰۱۸ تا ۱۰۲۵	۱۶۱۰ تا ۱۶۱۶
۲۰ ـ	اعتماد الدولہ غیاث بیگ	۱۰۲۵ تا ۱۰۲۷	۱۶۱۶ تا ۱۶۱۸

۲۱ ـ قاسم خان	۱۰۲۷ تا ۱۰۳۲	۱۶۱۸ تا ۱۶۲۳
۲۲ ـ صادق خان	۱۰۳۲ تا ۱۰۳۵	۱۶۲۳ تا ۱۶۲۵
۲۳ ـ آصف خان	۱۰۳۵ تا ۱۰۳۷	۱۶۲۵ تا ۱۶۲۸
۲۴ ـ خدمت پرست خان	۱۰۳۷ تا ۱۰۳۸	۱۶۲۸ تا ۱۶۲۸
۲۵ ـ آصف خان	۱۰۳۸	۱۶۲۸
۲۶ ـ قلیچ خاں	۱۰۳۸ تا ۱۰۳۸	۱۶۲۸ تا ۱۶۲۹
۲۷ ـ عنایت اللہ یزدی	۱۰۳۸ تا ۱۰۴۱	۱۶۲۹ تا ۱۶۳۲
۲۸ ـ وزیر خان	۱۰۴۱ تا ۱۰۴۹	۱۶۳۲ تا ۱۶۳۹
۲۹ ـ معتمد خان	۱۰۴۹ تا ۱۰۵۲	۱۶۳۹ تا ۱۶۴۲
۳۰ ـ سعید خان بہادر ظفر جنگ	۱۰۵۲ تا ۱۰۵۴	۱۶۴۲ تا ۱۶۴۴
۳۱ ـ قلیچ خاں	۱۰۵۴ تا ۱۰۵۷	۱۶۴۴ تا ۱۶۴۷
۳۲ ـ جعفر خان	۱۰۵۷	۱۶۴۷
۳۳ ـ قاضی افضل	۱۰۵۸ تا ۱۰۶۲	۱۶۴۸ تا ۱۶۵۱
۳۴ ـ شیخ عبدالکریم	۱۰۶۲ تا ۱۰۶۶	۱۶۵۱ تا ۱۶۵۵
۳۵ ـ خواجہ معین خاں	۱۰۶۶ تا ۱۰۶۷	۱۶۵۵ تا ۱۶۵۶
۳۶ ـ بہادر خان	۱۰۶۷	۱۶۵۶
۳۷ ـ سید عزت خان	۱۰۶۷ تا ۱۰۶۸	۱۶۵۶ تا ۱۶۵۸
۳۸ ـ خلیل اللہ خان	۱۰۶۸ تا ۱۰۷۲	۱۶۵۸ تا ۱۶۶۲
۳۹ ـ ابراہیم خان	۱۰۷۲ تا ۱۰۷۸	۱۶۶۲ تا ۱۶۶۷
۴۰ ـ محمد امین خان	۱۰۷۸ تا ۱۰۸۰	۱۶۶۷ تا ۱۶۶۹
۴۱ ـ نامعلوم الاسم امیر	۱۰۸۰ تا ۱۰۸۶	۱۶۶۹ تا ۱۶۷۵
۴۲ ـ امانت خان (سید احمد خان)	۱۰۸۶ تا ۱۰۸۷	۱۶۷۵ تا ۱۶۷۶
۴۳ ـ نامعلوم الاسم امیر	۱۰۸۷ تا ۱۰۸۹	۱۶۷۶ تا ۱۶۷۸
۴۴ ـ قوام الدین خان	۱۰۸۹ تا ۱۰۹۱	۱۶۷۸ تا ۱۶۸۰
۴۵ ـ شہزادہ محمد اعظم	۱۰۹۱ تا ؟	۱۶۸۰ تا ؟
۴۶ ـ مکرم خان	؟ تا ۱۰۹۷	؟ تا ۱۶۸۵
۴۷ ـ سپہدار خان	۱۰۹۷ تا ؟	۱۶۸۵ تا ؟

نام	ہجری	عیسوی
۴۸ — شہزادہ محمد اعظم خاں کے ایجنٹ	؟ تا ۱۱۰۲	؟ تا ۱۶۹۰
۴۹ — خان جہان بہادر	۱۱۰۲ تا ۱۱۰۵	۱۶۹۰ تا ۱۶۹۳
۵۰ — مہابت خان ابراہیم	۱۱۰۵ تا ۱۱۰۸	۱۶۹۳ تا ۱۶۹۶
۵۱ — مکرم خان	۱۱۰۸	۱۶۹۶
۵۲ — ابونصر خان	۱۱۰۸ تا ؟	۱۶۹۶ تا ؟
۵۳ — ابراہیم خان	؟ تا ۱۱۱۱	؟ تا ۱۶۹۹
۵۴ — محمد معظم	۱۱۱۱ تا ؟	۱۶۹۹ تا ؟
۵۵ — زبردست خان	؟ تا ۱۱۱۶	؟ تا ۱۷۰۴
۵۶ — شہزادہ محمد معظم کے ایجنٹ	۱۱۱۶ تا ۱۱۱۸	۱۷۰۴ تا ۱۷۰۷
۵۷ — نائب گورنر منعم خان		

دورِ آخر کے مغل حاکم (۱۱۱۹ تا ۱۱۷۲ ہجری / ۱۷۰۸ تا ۱۷۵۹ عیسوی)

نام	ہجری	عیسوی
۱ — سید اسلم خان (نائب ناظم)	۱۱۱۹ تا ۱۱۲۴	۱۷۰۸ تا ۱۷۱۲
۲ — زبردست خان علی مردان خان	۱۱۲۴ تا ۱۱۲۵	۱۷۱۲ تا ۱۷۱۳
۳ — عبدالصمد خان بہادر (دلیر جنگ)	۱۱۲۵ تا ۱۱۵۰	۱۷۱۳ تا ۱۷۳۷
۴ — ذکریا خان (عزالدولہ خان بہادر)	۱۱۵۰ تا ۱۱۵۸	۱۷۳۷ تا ۱۷۴۵
۵ — یحییٰ خان	۱۱۵۸	۱۷۴۵
۶ — شاہنواز خان	۱۱۵۸ تا ۱۱۶۱	۱۷۴۵ تا ۱۷۴۸
۷ — جلہ خان	۱۱۶۱	۱۷۴۸
۸ — میر منو (معین الملک)	۱۱۶۱ تا ۱۱۶۷	۱۷۴۸ تا ۱۷۵۳
۹ — امین الدین خان	۱۱۶۷ تا ۱۱۶۹	۱۷۵۳ تا ۱۷۵۵
۱۰ — آدینہ بیگ خان	۱۱۶۹ تا ۱۱۷۰	۱۷۵۵ تا ۱۷۵۶
۱۱ — تیمور شاہ	۱۱۷۰ تا ۱۱۷۱	۱۷۵۷ تا ۱۷۵۸
۱۲ — آدینہ بیگ خان	۱۱۷۱	۱۷۵۸
۱۳ — خواجہ مرزا خان	۱۱۷۱ تا ۱۱۷۲	۱۷۵۸ تا ۱۷۵۹
۱۴ — سامانا (مرہٹہ)	۱۱۷۲	۱۷۵۹

خاندان درّانی کے عہد کے حاکم (۱۱۷۳ تا ۱۱۸۲ ہجری / ۱۷۵۹ تا ۱۷۶۸ عیسوی)

نام	ہجری	عیسوی
۱ - حاجی کریم داد خان	۱۱۷۳	۱۷۵۹
۲ - سربلند خان	۱۱۷۳ تا ۱۱۷۴	۱۷۶۰ تا ۱۷۶۱
۳ - خواجہ عبید خان	۱۱۷۴ تا ۱۱۷۵	۱۷۶۱ تا ۱۷۶۲
۴ - احمد شاہ خود لاہور میں مقیم رہا	۱۱۷۵ تا ۱۱۷۷	۱۷۶۲ تا ۱۷۶۳
۵ - کابلی مل	۱۱۷۷ تا ۱۱۸۱	۱۷۶۳ تا ۱۷۶۷
۶ - دادن خان	۱۱۸۱ تا ۱۱۸۲	۱۷۶۷ تا ۱۷۶۸

سکھ دور کے گورنر (۱۱۸۲ تا ۱۲۶۵ ہجری / ۱۷۶۸ تا ۱۸۴۹ عیسوی)

نام	عیسوی	
۱ - گوجر سنگھ	۱۷۶۸ تا	۱۷۹۱
۲ - لہنا سنگھ		۱۷۹۸
۳ - سوبھا سنگھ		۱۷۹۷
۴ - صاحب سنگھ	۱۷۹۹ تا	۱۷۹۱
۵ - چیت سنگھ		۱۷۹۸
۶ - مہر سنگھ		۱۷۹۷
۷ - رنجیت سنگھ	۱۷۹۹ تا	۱۸۳۹
۸ - کھڑک سنگھ	۱۸۳۹ تا	۱۸۴۰
۹ - نونہال سنگھ	۱۸۴۰ تا	۱۸۴۰
۱۰ - چند کور	۱۸۴۰ تا	۱۸۴۱
۱۱ - شیر سنگھ	۱۸۴۱ تا	۱۸۴۳
۱۲ - دلیپ سنگھ	۱۸۴۳ تا	۱۸۴۹

انگریزی دور کے گورنر (۱۸۴۹ تا ۱۹۴۷ عیسوی)

نام	
۱ - ہنری لارنس	انتظامیہ بورڈ کے اراکین
۲ - جان لارنس	
۳ - چارلس گرنوائل منسل	۱۸۴۹ تا ۱۸۵۳

۴ - سر جان لارنس ۱۸۵۳ تا ۱۸۵۹ (چیف کمشنر پنجاب)

انگریزی دور کے نائب گورنر (لیفٹیننٹ گورنر)

۱ -	سر رابرٹ منٹگمری	۱۸۵۹	تا	۱۸۶۵
۲ -	سر ڈانلڈ میکلوڈ	۱۸۶۵	تا	۱۸۷۰
۳ -	سر ہنری میرین ڈیورنڈ	۱۸۷۰	تا	۱۸۷۱
۴ -	سر رابرٹ ہنری ڈیوس	۱۸۷۱	تا	۱۸۷۷
۵ -	سر رابرٹ ایگزا یجرٹن	۱۸۷۷	تا	۱۸۸۲
۶ -	سر چارلس امفرسٹن ایچیسن	۱۸۸۲	تا	۱۸۸۷
۷ -	سر جیمز براڈ وڈ لائل	۱۸۸۷	تا	۱۸۹۲
۸ -	سر ڈینس فٹز پیٹرک	۱۸۹۲	تا	۱۸۹۷
۹ -	سر ڈبلیو۔ ایم۔ ینگ	۱۸۹۷	تا	۱۹۰۲
۱۰ -	سر سی۔ ایم ریواز	۱۹۰۲	تا	۱۹۰۵
۱۱ -	سر ڈی۔ سی۔ جے ایبٹسن	(قائمقام)		۱۹۰۵
۱۲ -	سر سی۔ ایم۔ ریواز	۱۹۰۵	تا	۱۹۰۷
۱۳ -	سر ڈی۔ سی۔ جے ایبٹسن			۱۹۰۷
۱۴ -	ٹی۔ جی۔ واکر	(قائمقام)		۱۹۰۷
۱۵ -	سر ڈی۔ سی۔ جے ایبٹسن	۱۹۰۷	تا	۱۹۰۸
۱۶ -	سر ٹی۔ جے واکر	(قائمقام)		۱۹۰۸
۱۷ -	سر ایل۔ ڈبلیو۔ ڈین	۱۹۰۸	تا	۱۹۱۱
۱۸ -	جے میک ڈونی	(قائمقام)		۱۹۱۱
۱۹ -	سر ایل۔ ڈبلیو۔ ڈین	۱۹۱۱	تا	۱۹۱۳
۲۰ -	ایم۔ ایف۔ اوڈوائر	۱۹۱۳	تا	۱۹۱۹

انگریزی دور کے گورنر

۲۱ -	سر ای۔ ڈی۔ میکلیگن	۱۹۱۹	تا	۱۹۲۴	(۳ جنوری ۱۹۲۱ سے اس عہدہ کا نام گورنر ہو گیا)
۲۲ -	سر ڈبلیو۔ ایم۔ ہیلی	۱۹۲۴	تا	۱۹۲۸	

۲۳ — سر جی۔ ایف۔ ڈی مونٹ مورنسی ۱۹۲۸ تا ۱۹۳۲
۲۴ — سکندر حیات خان (قائمقام) ۱۹۳۲
۲۵ — سر جی۔ ایف۔ ڈی مونٹ مورنسی ۱۹۳۲ تا ۱۹۳۳
۲۶ — سر ایچ۔ ڈبلیو ایمرسن (قائمقام) ۱۹۳۳ تا ۱۹۳۴
۲۷ — سکندر حیات خان (قائمقام) ۱۹۳۴
۲۸ — سر ایچ۔ ڈبلیو ایمرسن ۱۹۳۴ تا ۱۹۳۸
۲۹ — سر ایچ۔ ڈی کریک (قائمقام) ۱۹۳۸ تا ۱۹۴۱
۳۰ — سر بی۔ جے۔ گلینسی ۱۹۴۱ تا ۱۹۴۶
۳۱ — سر ای۔ ایم جنکنز ۱۹۴۶ تا ۱۹۴۷

دورِ پاکستان کے گورنر

۱ — سر رابرٹ فرانسس مودی ۱۹۴۷ تا ۱۹۴۹
۲ — سردار عبدالرب نشتر ۱۹۴۹ تا ۱۹۵۱
۳ — ابراہیم اسمٰعیل چندریگر ۱۹۵۰ تا ۱۹۵۳
۴ — میاں امین الدین ۱۹۵۳ تا ۱۹۵۴
۵ — مشتاق احمد گورمانی (وحدت مغربی پاکستان کا قیام) ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۴ تا ۱۹۵۷
۶ — اختر حسین ۱۹۵۷ تا ۱۹۶۰
۷ — ملک امیر محمد خان ۱۹۶۰ تا حال

مآثر لاہور

باغات و مزارات

مؤلفہ منشی محمد الدین فوق مرحوم
مرتبہ محمد عبداللہ قریشی

منشی محمد الدین فوق مرحوم مدیر اخبار کشمیری لاہور تاریخ اور صحافت کے مجمع البحرین تھے۔ انھوں نے اخبار نویسی کے ساتھ ساتھ بیشمار تاریخی کتابیں بھی لکھیں۔ مآثر لاہور ان کا آخری کارنامہ ہے جو انھوں نے اپنی وفات (۱۴ ستمبر ۱۹۴۵ء) سے ایک سال قبل انجام دیا۔ میں نے بڑی محنت سے ان اوراق کو جمع کیا، ان پر مفید حواشی لکھے، جہاں جہاں اضافے کی ضرورت تھی اضافہ کیا اور جن عنوانوں کے تحت وہ کسی وجہ سے لکھنا چھوڑ گئے تھے ان پر خود لکھا۔ (محمد عبداللہ قریشی)

ابتدائیہ

راقم (محمد الدین فوق) کے کئی مضامین لاہور کے ماہوار رسائل شباب اردو[1] اور قوس قزح[2] میں لاہور کے تاریخی حالات پر شائع ہوتے رہے۔ اکثر احباب کا تقاضا تھا کہ ان مضامین کو ایک کتاب کی صورت میں چھاپ کر محفوظ کر لیا جائے۔ چنانچہ ان مضامین کا مجموعہ ۱۹۲۷ء میں "لاہور عہد مغلیہ میں" کے نام سے طبع کر دیا گیا۔ اب نہ شباب اردو ہے نہ قوس قزح اور نہ مضامین لاہور کا مجموعہ ہی باقی ہے۔ اس لئے ۱۹۲۳ء میں لاہور کے باغات و مزارات پر جو مواد مزید جمع کیا گیا تھا، اس کی طباعت کے متعلق پھر احباب نے تحریک کی۔ خصوصاً مولانا محمد عبداللہ قریشی بی اے نے جو خود بھی اہل قلم ہیں اور جن کا ذوق تاریخ طبیعت ثانیہ بن چکا ہے، ان کی طباعت و حفاظت پر بہت زور دیا اور فرمایا کہ اگر سارا مواد طبع نہیں ہو سکتا تو لاہور کے باغات قدیم کا ذکر "باغوں کا شہر" کے نام سے ضرور چھاپ دیا جائے۔

لیکن لاہور کے قدیم شاہی باغات اور کئی دوسرے باغات مزاروں اور مقبروں کے ساتھ محو نظر آئے۔ اس لئے باغات کے ساتھ مقبروں کے ماضی و حال کی کیفیت کو نظر انداز کرنا مناسب معلوم نہ ہوا۔ بلکہ ایسے مزارات کا ذکر بھی کر دیا گیا جن کا تعلق کسی باغ سے نہ تھا۔ صرف مزار اور باغ ہی کا ذکر نہیں بلکہ صاحبان باغات اور صاحبان قبور کے جس قدر قابل ذکر حالات مل سکے وہ بھی لکھ دیئے گئے جس سے ان کے سوانح زندگی اور لاہور کے بعض تاریخی حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ ارض جیات نہ ہوتے تو کچھ بھی نہ تھا۔

بزرگان دین میں سے جن کا ذکر اس جگہ کیا گیا ہے، چند ایک کے حالات راقم نے اپنی ۱۹۰۴ء کی تصنیف "یاد رفتگان" میں بھی لکھے ہیں لیکن اب زیادہ تحقیق کے ساتھ دوبارہ ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اکثر مزارات پر فاتحہ خوانی اور زیارت قبور سے عبرت حاصل کرنے کی بجائے لہو و لعب، کھیل تماشہ، ناچ مجرا اور قوالی کی مجلسوں سے دل بہلایا جاتا ہے، افسوس! جو مقام عبرت حاصل

---

[1] یہ رسالہ خان احمد حسین خان کی ادارت میں شائع ہوتا تھا جو بیشمار کتابوں کے مصنف تھے اور جن کا انتقال نوے برس کی عمر میں یکم جنوری ۱۹۵۷ء کو لاہور میں ہوا۔ انھوں نے ساٹھ برس ادب و صحافت کی خدمت کی۔

[2] رسالہ قوس قزح کے مدیر وحید کیلانی اور مدیران اعزازی مولانا محمد علم الدین سالک اور محمد عبداللہ قریشی تھے جو مآثر لاہور کے مرتب و مکمل ہیں۔

کرنے اور موت سے غافل نہ ہونے کے لیے ہے، وہاں بھی خطِ نفس ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ بلکہ بعض مزاروں پر تو قمار بازی، شراب خوری اور بھنگ نوشی کی دکانیں کھل جاتی ہیں اور ان مسلمانوں سے جن کو خیر الامم کہا گیا ہے، اس قسم کی نامشروع اور خلافِ تہذیب حرکات سرزد ہوتی ہیں کہ ان کو مسلمان کہتے ہوئے ایک صحیح العقائد مسلم کو شرم اور ندامت محسوس ہوتی ہے۔

زیارتِ قبور کے متعلق بعض ضعیف و قوی احادیث کی وجہ سے علمائے اسلام میں اختلاف ہے تاہم موت کو یاد کرنے کے لیے زیارتِ قبور گناہ کا باعث نہیں۔ لیکن بزرگوں اور صوفیوں کے مزاروں پر جن لغویات و فواحشات سے کام لیا جاتا ہے، ان کو بدعت بلکہ گناہ قرار دینے میں کسی کو کوئی وجہِ اختلاف نہیں۔

علمِ تصوف و سلوک کے متعلق بحث کرنے کا یہ موقع نہیں۔ بقول علامہ سلیمان ندوی "طریق اور سلوک کے اسرار و رموز اس قدر دقیق اور نازک ہیں کہ اگر ان کے سمجھنے میں ذرا سی بے احتیاطی بھی کی جائے تو ہدایت کی بجائے وہ ضلالت کا ذریعہ بن جاتے ہیں .... احکامِ الٰہی کی با اخلاص تمام تعمیل و تکمیل ہی کا نام طریقت ہے دگر ہیچ اور جو اس کے علاوہ کچھ کرتا ہے وہ دین کی حقیقت سے جاہل اور حسنِ سلوک سے ناآشنا ہے۔"

غور کرو۔ حضرت علی ہجویری اور ان کے ہم عصر بزرگوں اور بعد کے صوفیائے کرام نے لاہور میں مذہب اور دین کی خدمت کچھ کم نہیں کی بلکہ عوام کو ایمان و ایقان کی دولت سے مالا مال کیا۔ لیکن آج ان کے مزاروں پر کیا ہوتا ہے؟ کوئی جبیں سائی کرتا ہے، کوئی ایسی دعا مانگتا ہے جو صرف خدائے واحد ہی سے اس کے حکم "ایاک نعبد وایاک نستعین" کے مطابق مانگی جا سکتی ہے۔ پھر عرس کے دنوں میں ایک میلہ سا لگ جاتا ہے۔ قوالی ہوتی ہے، تماشے ہوتے ہیں، پہلے طوائفوں کے ناچ بھی ہوتے تھے اور ان کے قدر دان ان پر روپے نچھاور کرتے تھے لیکن سابق پنجاب اسمبلی کے ایک قانون نے بزرگانِ دین کے مزاروں پر سے اس بدعت کو بند کر دیا ہے۔

سماع اور قوالی کا اب تک رواج ہے۔ اس میں بھی اختلاف ہے۔ لیکن صوفیائے چشت اور دیگر طریقے کے صوفیا انسان کی روح کو تین چیزوں کا مشتاق سمجھتے ہیں۔ عبادتِ الٰہی، خوش جمالی اور خوش آوازی۔ مگر قوالی کی شرطیں اس قدر کڑی اور قوال اور حاضرین کے لیے اس قدر پابندیاں ہیں کہ ہر کس و ناکس اس کے سننے کا اہل نہیں ہو سکتا اور طوائفوں اور بے ریش قوالوں اور مزامیر کی قوالی کو تو قطعاً حرام کہا گیا ہے۔ ان شرطوں پر غور کرو اور پھر اپنی قوالیوں کو دیکھو۔ ایک فرقہ تو سرے سے قوالی کا قائل ہی نہیں۔ لیکن جو گروہ قوالی کو غذائے روح تصور کرتا ہے کیا وہ نہیں دیکھتا کہ قوال یا حاضرین میں سے کوئی بھی ایسا ہے جو قوالی کی شرطیں پوری کرتا ہے؟ بلکہ آج کل کی قوالی تو اپنی بدعات و خرافات کی وجہ سے منکراتِ شرعیہ کی ایک کھلی ہوئی شہادت ہے۔

یہ چند سطور صرف اس لئے لکھی گئی ہیں کہ صاحبانِ قبور اور قبروں کے حالات لکھ کر قبر پرستی اور پیر پرستی کی دکانداری کو فروغ دینا مقصود نہیں بلکہ قبروں پر جو کچھ ہوتا ہے اس کی اصلاح کی ضرورت ہے۔

لاہور کے حالات میں مفتی غلام سرور، رائے بہادر کنہیا لال، سید محمد لطیف اور مولوی نور احمد چشتی نے بہت کچھ لکھا ہے۔[1]

---

[1] نوتی مرحوم نے جن بزرگوں کے نام لیے ہیں انھوں نے لاہور کے متعلق اپنی تاریخیں انیسویں صدی عیسوی کے آخر (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

...انھوں نے صرف اس قدر اضافہ کیا ہے کہ بعض اور بزرگوں کے حالات لکھ کر ان کا تکملہ ۱۹۴۲ء تک کر دیا ہے یا بعض مقامات پر ...بانر بھی نقطۂ نگاہ سے ان سے کچھ اختلاف کیا ہے۔ "مآثر لاہور" میں قدیم و جدید باغات لاہور کا ذکر ہے یا مسلمان بندگوں اور صوفیا و مشاہیر کے حالات اور ان کے مقبروں کی کیفیت درج ہے۔

عہد غزنویہ، غلامان تغلق، و لودیہ وغیرہ

ان خاندانوں کا طویل عہدِ حکومت ۴۱۲ھ / ۱۰۲۱ء سے لے کر ابراہیم لودھی کی شکست اور وفات کے زمانہ ۹۳۲ھ / ۱۵۲۶ء تک پانچ صدیوں میں ختم ہوتا ہے اس طویل عرصہ میں لاہور کو اکثر کیا بیشمار بزرگانِ دین کی اقامت اور ان کی آخری آرام گاہ ہونے کا فخر حاصل رہا ہے۔ ان میں سے کئی ایک کا ذکر لاہور کی تاریخوں اور مختلف کتابوں میں درج ہے۔ لیکن بہت کم ہیں جن کے مزار اور مقبرے اب تک سلامت رہ سکے ہیں۔

ان ایام میں باغات کا چنداں رواج اور شوق نہ تھا اور اگر کہیں باغات تھے بھی، تو انقلاب زمانہ نے ان کو ملیا میٹ کر دیا۔ اس طویل عہد میں تاریخوں سے صرف پانچ باغات کی کیفیت معلوم ہو سکی ہے اور آج ان کا بھی کہیں وجود نظر نہیں آتا۔ صرف وہ مقبرے اپنے تقدس اور احترام کی وجہ سے سلامت ہیں جن کے ساتھ باغات موجود تھے۔

شاہ حسینؒ زنجانیؒ

چاہ میراں میں ہے بیشک مرقدِ شاہ حسینؒ
اے فلک لیکن کہاں اب باغ زنجاں دیکھئے

زنجان، اندجان، سنجان، خراسان کی طرف کے مشہور قصبے ہیں۔ اندجان اور زنجان کے مردم خیز خطوں نے دین و دنیا میں نامور ہستیاں پیدا کی ہیں۔ شیخ فرخ زنجانی، شاہ حسینؒ زنجانی، سید یعقوب زنجانی بہت بڑے ظاہری و باطنی پیشوا گزرے ہیں۔ ان میں آخر الذکر دونوں بزرگوں کے مزار لاہور میں مرجع خلائق ہیں۔ ان کے علاوہ میر عبدالعزیز زنجانی عہد محمد شاہی میں لاہور کے مشہور عالم اور صاحب دیوان شاعر تھے۔ انھوں نے عرفی کے مشہور قصیدہ کے تتبع میں لاہور کے متعلق ایک طویل قصیدہ لکھا ہے جس کا کچھ حصہ تذکرۃ الاخبار (ایک قلمی کتاب) سے مئی ۱۹۲۵ء کے اورینٹل کالج میگزین لاہور میں طبع ہوا ہے۔

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) میں لکھی بلکہ بیسویں صدی عیسوی میں خود ان سے زیادہ شاید ہی کسی نے لکھا ہو۔ ڈاکٹر محمد باقر کی کتاب "لاہور پاسٹ اینڈ پریزنٹ" سید ہاشمی فرید آبادی کی کتاب "مآثر لاہور" اور محمد ولی اللہ خاں کی کتاب "لاہور کی عظیم یادگاریں" حضرت نوری کی وفات کے بعد حال ہی میں شائع ہوئی ہیں۔ کرنل بھولا ناتھ کی تاریخ لاہور جو پنجابی زبان میں ہے، ان سے کچھ پہلے کی تصنیف ہے ——— (مرتب)

شاہ حسینؒ زنجانی کی ورود گی لاہور کے متعلق لاہور کے تمام مورخ مختلف الرائے ہیں۔ ہسٹری آف لاہور (انگریزی) کے مصنف سید محمد لطیف نے تو ان کا ذکر بھی نہیں کیا۔ مولوی نور احمد چشتی مصنف تحقیقات چشتی لکھتے ہیں کہ "آپ سید یعقوب زنجانی صدر دیوان کے ہمراہ لاہور تشریف لائے"۔ اور صدر دیوان کے متعلق صفحہ ۲۳۷ پر آپ کا ارشاد ہے کہ وہ ۵۳۵ھ بعہد بہرام شاہ غزنوی اور صفحہ ۲۳۸ پر لکھتے ہیں کہ ۵۵۷ھ میں تشریف لائے تھے۔ اور پھر یہ بھی لکھتے ہیں کہ حضرت علی ہجویری ۴۳۱ھ میں لاہور آئے اور ان کے آنے سے ایک دن قبل شاہ حسینؒ زنجانی انتقال فرما چکے تھے۔ اور آپ ان کے جنازہ میں شامل ہوئے تھے یعنی ایک طرف ان کی آمد کا سال ۵۳۵ھ و ۵۵۷ھ بتاتے ہیں اور دوسری طرف اس سے زیادہ عجیب غلطی یہ کرتے ہیں کہ ۴۳۱ھ ہی میں ان کو واصل بحق کر دیتے ہیں۔

"تاریخ لاہور" کا مصنف رائے کنہیا لعل ان سے بھی دو قدم آگے چلتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ شاہ حسینؒ زنجانی سلاطین غوریہ کے زمانہ میں لاہور آئے۔ یہ زمانہ غزنوی خاندان کے آخری بادشاہ خسرو ملک کی گرفتاری ۵۸۲ھ سے شروع ہوتا ہے۔

ہسٹری آف لاہور کا مصنف گو ان کی ورود گی لاہور کا سال نہیں بتاتا۔ لیکن یہ لکھتا ہے کہ حضرت علی ہجویری ۴۳۱ھ میں لاہور آئے اور اسی سال شاہ حسینؒ زنجانی کا انتقال ہوا۔

مفتی غلام سرور بھی لاہور کے ایک قابل مصنف اور شاعر گذرے ہیں۔ انھوں نے بھی آپ کی آمد لاہور کا سال نہیں لکھا لیکن اتنا بتایا ہے کہ شاہ حسینؒ زنجانی اور سید یعقوب صدر دیوان لاہور میں اکٹھے ہی تشریف لائے تھے۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علی ہجویریؒ کی آمد اور شاہ حسینؒ کی وفات کا ایک ہی سال بلکہ ایک ہی یوم ہے۔

ان اختلافات اور ان عجیب غریب بیانات پر راقم اپنی تصنیف "سوانح داتا گنج بخش" میں کچھ بحث کر چکا ہے۔ بعد کے مطالعہ سے جو حالات معلوم ہوئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ امیر سبکتگین ۳۶۶ھ مطابق ۹۷۷ء میں غزنی کے تخت پر بیٹھا۔ اور مقامی شورشوں سے فارغ ہو کر اسی سال ہندوستان کی طرف متوجہ ہوا۔ اور صاحب تاریخ فرشتہ کے قول کے مطابق چند مقامات فتح کر کے اور ان میں مساجد تعمیر کرا کے واپس چلا گیا۔ یہ تمام علاقے راجہ جے پال والئے لاہور کی مملکت میں تھے۔ اس نے نہ صرف صلح کر لی بلکہ دس لاکھ درہم اور پچاس ہاتھی نذرانہ دینے کا وعدہ کیا۔ جب سلطان کے سفیر رقم موعودہ اور ہاتھی لینے کے لئے لاہور آئے۔ تو راجہ نے ان کو قید کر لیا۔ سبکتگین کو خبر ہوئی تو غم و غصہ کے ساتھ پھر ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ اس سال اس کا جواں مرد اور شجاع فرزند محمود بھی اس کے ساتھ تھا۔ ان کی فوجوں نے اپنی سرحد سے پار ہو کر راجہ کے مقبوضات ملتان و نواحات کو پامال کر کے پشاور تک قبضہ کر لیا۔ لیکن وہ لاہور تک نہ آ سکے۔ راجہ نے کسی نہ کسی طرح ان کو ٹال دیا۔ یہاں تک کہ ۳۸۷ھ مطابق ۹۹۷ء میں سبکتگین کا انتقال ہو گیا۔

اس کے چار سال بعد محمود نے ۱۰۰۰ء میں پہلی دفعہ اور ۱۰۰۲ء میں دوسری دفعہ ہندوستان پر حملہ کیا۔ اور پشاور اور ویہند تک جو دریائے اٹک کے کنارہ پر ہے پہنچا۔ ۱۰۰۴ء میں اٹک اور جہلم عبور کر کے بھیرہ کے راجہ کو شکست دی۔ اور یہاں راجہ جے پال کے نواسے سکھ پال کو جو مسلمان ہو چکا تھا۔ حاکم مقرر کیا۔ ۱۰۰۵ء میں ابوالفتح داؤد والئے ملتان اور راجہ

جے پال کے بیٹے انند پال کو شکست دی۔ اس کے چند سال بعد راجۂ لاہور کو کامل شکست دے کر اس نے پنجاب کو غزنی کا ایک صوبہ بنا لیا۔

مندرجہ صدر واقعات سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ محمود اپنی تخت نشینی سے آٹھویں سال یعنی سنہ ۱۰۰۴ء میں بھیرہ تک پہنچا اور دوسرے سال یعنی سنہ ۱۰۰۵ء میں لاہور میں داخل ہوا۔ پس جب سنہ ۱۰۰۵ء یعنی سنہ ۳۹۵ھ سے پہلے لاہور مسلمانوں کے قبضہ ہی میں نہیں آسکا تو مسلمان واعظ اور مبلغ وہاں کس طرح قیام رکھ سکتے تھے خصوصاً اس حالت میں جب کہ والیٔ لاہور اور والیٔ غزنی آپس میں سخت دشمن اور ایک دوسرے کی جان کے لاگو تھے۔ قیاس یہی ہے کہ لاہور میں آپ سنہ ۳۹۵ھ یا اس کے بعد تشریف لائے۔ اور سنہ ۴۳۱ھ میں جس پر سب مورخ متفق ہیں آپ کا وصال ہو گیا۔ یہ زمانہ تھا جب سلطان محمود کے فرزند سلطان مسعود کی حکومت اپنے آخری لمحے گزار رہی تھی۔

جس دن آپ کی وفات ہوئی اسی دن حضرت علی ہجویریؒ اپنے مرشد کے ارشاد کے مطابق لاہور پہنچے۔ اور آپ کے جنازہ میں شریک ہوئے۔ آپ دونوں پیر بھائی تھے۔ جیسا کہ حضرت علی ہجویریؒ کے حالات میں لکھا جا چکا ہے۔

شاہ حسینؒ زنجانیؒ قریباً ۲۶ - ۲۷ سال لاہور میں رہے اس طویل عرصہ میں ہزاروں غیر مسلم ان کے علمِ توحید کے نیچے آئے اور ہزارہا تشنگانِ حقیقت جامِ توحید سے سرشار ہوئے۔

دارا شکوہ نے سفینۃ الاولیاء میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حالات میں شاہ حسین زنجانیؒ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت خواجہ در سیاحی بہ شیخ حسینؒ ارزانیؒ رسیدہ آمدہ ۔ یہاں یہ امر غور طلب ہے کہ خواجۂ اجمیریؒ کا سال ولادت ۵۳۷ھ اور سالِ وفات سنہ ۶۳۳ھ ہے یہ کس طرح ممکن ہے کہ اس ظاہری دنیا میں حضرت خواجہ اجمیریؒ کی ملاقات اپنی ولادت سے بھی پہلے شیخ حسینؒ ارزانیؒ سے ہو چکی ہو۔ دونوں روحانی بزرگ تھے۔ باطنی ملاقات وہ بھی خواجۂ اجمیریؒ کی ولادت کے بعد ہوئی ہو تو تعجب کا مقام نہیں۔

دارا شکوہ سکینۃ الاولیاء[2] (ترجمہ صفحہ ۱۸) میں لکھتا ہے کہ حضرت میاں جیو (یعنی حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ) ایک دن زنجانی باغ میں بھی یادِ حق میں مشغول رہے۔ لیکن وہ زنجانی باغ یا باغ زنجان جو ان کے نام سے موسوم تھا۔ کہاں تھا؟ اس کا کوئی ذکر نہیں۔

آپ کا مزار چاہِ میراں[3] میں ہے۔ اور ایک طویل معروف باغ کے اندر ہے۔ یہ باغ سکھوں کے زمانہ میں آباد ہوا تھا۔

---

[1] دارا شکوہ سفینۃ الاولیاء کے خاتمہ پر لکھتا ہے " در شب بست و ہفتم ماہ رمضان المبارک سال یک ہزار و چہل و نہ (۱۰۴۹ھ) کہ سال بست و پنجم از سن این فقیر است بہ اتمام رسید۔" یعنی یہ کتاب اس نے بعمر پچیس سال لکھی تھی۔

[2] سکینۃ الاولیاء اس نے ۲۸ سال کی عمر میں لکھی تھی۔

[3] یہ مقام لاہور کی ویرانیوں کے بعد درندوں اور خوفناک جانوروں کا مسکن تھا۔ آج سے دو سو سال پیشتر لہنا سنگھ حاکم لاہور کے حکم سے ایک مسلمان نے اس کو آباد کیا تھا۔

ممکن ہے پرانی بنیادوں پر پھر احداث کیا گیا ہو۔ اور یہی وہ مقام ہو جو باغ زنجان کہلاتا تھا۔ اور آپ کے باغ ہی میں آپ کا مزار بنا یا گیا ہو۔

آپ کا مزار ایک قد آدم خشتی چار دیواری کے اندر ہے۔ مزار کے سرہانے خشتی چراغ دان ہے۔ مزار پر گنبد کوئی نہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مزار بہت قدیم زمانہ کا ہے اور شاہانِ مغلیہ یا امرائے مغلیہ سے بھی کسی نے اس مزار پر عالیشان گنبد بنانے کا خیال نہیں کیا۔ مزار کا دروازہ مشرق کی طرف ہے۔ شمال کی جانب ایک خشتی دالان ہے۔ چار دیواری کے باہر ایک پراہ چبوترہ اور اس کے پاس ہی چند قدیم قبروں کے آثار ہیں۔

میر عبدالعزیز عزیزؔ زنجانی "قصیدہ در صفت لاہور" میں آپ کے متعلق لکھتے ہیں ؎

بہ درگاہ شہنشاہ حسین شاہ زنجاں رو

کہ اسرار الٰہی در مزار او عیاں بینی

اس مزار کی حفاظت و نگہداشت کا تعلق سید یعقوب زنجانی عرف شاہ صدر دیوان کے مزار کے متولیوں کے ساتھ ہے۔ لیکن نہ اس مزار کے ساتھ کوئی معافی ہے نہ کوئی اراضی۔ نہ خانقاہ کا ہجوم یہاں رہتا ہے کہ چڑھاوے کی آمدنی آتی ہو اس لیے مزار کی حالت اچھی نہیں۔

شاہ اسمٰعیل

دیکھ کر پہلے مزار شاہ اسمٰعیل کو

غور سے کیجیے انقلاب چرخ گرداں دیکھیے

شاہ اسمٰعیل کا اصل وطن کسی نے نہیں لکھا۔ لیکن اس پر سب مورخین کا اتفاق ہے کہ آپ غزنوی عہد کی ابتدا میں لاہور آئے۔ آپ ہر جمعہ کو وعظ فرماتے تھے اور ہر وعظ میں بقول صاحب تحقیقات چشتی ڈھائی سو غیر مسلم مسلمان ہوا کرتے تھے۔ رائے بہادر کنہیا لال "تاریخ لاہور" کے صفحہ ۳۰۰ پر لکھتے ہیں کہ آپ کے وعظوں کی تاثیر سے ہزارہا لوگ جامۂ اسلام پہنتے تھے۔ حدیث و قرآن کے حافظ تھے۔ آواز ایسی اچھی تھی کہ جس کان میں پڑ جاتی کھنچی چلی آتی تھی۔

رائے بہادر کنہیا لال کے قول کے مطابق آپ ۴۱۲ھ میں اور صاحب تحقیقات چشتی کی رائے میں آپ ہندو راجگان کے آخری عہد میں اور صاحب خزینۃ الاصفیا کے بیان کی رو سے آپ ۳۹۵ھ میں بعہد سلطان محمود غزنوی لاہور آئے، مگر سب کے قریب قریب ایک ہی زمانہ بتایا ہے۔ اور قرین قیاس یہی ہے کہ آپ ۴۱۲ھ میں لاہور آئے ہیں۔ اسی سنہ میں سلطان محمود غزنوی فتح کشمیر کو اپنے احاطۂ قدرت سے باہر دیکھ کر لاہور کی طرف آیا تھا۔ اس وقت لاہور میں راجہ جے پال کا پوتا جے پال دوم جس کو فارسی مورخ پور جے پال لکھتے ہیں۔ پنجاب کا راجہ تھا۔ وہ محمود کے آنے کی خبر سن کر راجہ اجمیر کے پاس بھاگ گیا اور سلطان نے لاہور پر قبضہ کر کے اپنے نام کا خطبہ پڑھایا اور لاہور کو غزنی کے ماتحت ایک صوبہ قرار دیا۔ بادشاہی افواج کے ساتھ علما و فضلا کی ایک کثیر تعداد بھی ہوتی تھی۔ اور یہ بالکل ممکن ہے کہ مولانا شاہ اسمٰعیل غزنوی فوج کے ہمراہ لاہور آئے

ہوں اور خدمت دین و اشاعتِ اسلام کے لیے لاہور ہی کو انھوں نے اپنا وطن بنا لیا ہو۔ ان کے بیان میں وہ ملائمت اور ان کی زبان میں وہ تاثیر تھی کہ لوگ پروانوں کی طرح ان کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔

لاہور میں کامل چھتیس برس تک اسلام کا یہ زبردست مبلغ دین فطرت کی اشاعت میں سرگرم رہا۔ ۴۴۸ھ میں آپ نے وفات پائی۔ حضرت علی ہجویری عرف داتا گنج بخش ۴۳۱ھ میں لاہور تشریف لائے۔ آپ کی آمد سے پیشتر یہاں شاہ حسین زنجانیؒ موجود تھے۔ شاہ اسمٰعیل کی ان دونوں بزرگوں سے ضرور ملاقاتیں ہوئی ہوں گی لیکن کسی مصنف نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ کشف المحجوب بھی جو حضرت علی ہجویریؒ کی تصنیف ہے اس بارہ میں خاموش ہے۔

اس امر کا بھی کچھ پتہ نہیں چل سکا کہ آپ کس مسجد میں جمعہ پڑھاتے اور وعظ فرمایا کرتے تھے۔ چونکہ لاہور میں مستقل اسلامی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ اس لیے لشکر اسلام اور مسلمان حکام و عوام کے لیے سرکاری طور پر کوئی نہ کوئی مسجد محمود ہی کے زمانہ میں تعمیر ہو چکی ہو گی۔

اس زمانہ میں مغلیہ عہد کے سے گنبد نما عالیشان مقبروں کا رواج نہ تھا۔ اس لیے ان کا مقبرہ نہایت سادہ بنایا گیا۔ رائے بہادر کنہیا لال تاریخ لاہور کے صفحہ ۳۰۱۔ ۳۰۰ پر لکھتے ہیں "اس متبرک مقبرہ پر گنبد نہیں ہے مگر نہایت قدیم مکان ہے۔ مسلمانی سلطنت کے وقت مکان کے ساتھ بہت بڑا باغ بھی تھا اور مزار سے جانب غرب جو کنواں ہے اس پر چرخ چوب چلتا تھا۔" عہدِ مغلیہ اور سکھوں کے زمانہ میں اس باغ اور مزار کو جو حادثات پیش آئے ان کا ذکر "باغ ہمت کہار" میں دیکھیے جس کا ذکر عہدِ خالصہ کے باغات لاہور میں درج ہے۔ رائے بہادر کنہیا لال کے زمانہ ۱۸۸۴ء میں ان کے مزار کی زمین مجاور نے انگریزوں کے پاس فروخت کر دی تھی۔ انھوں نے اپنی کوٹھی میں شامل کر لی تھی۔ کنواں بھی اسی کوٹھی میں آ گیا۔

اس باغ اور مقبرہ کے ساتھ جو زمین بتائی جاتی ہے وہ ایک طرف پورہ مین گینھڈرل سکول اور رومن کیتھولک گرجا گھر کے وسیع احاطہ تک پھیلی ہوئی تھی جس کی پشت کا حصہ اس سڑک تک ہے جو ای پلومر کے دواخانہ سے ہو کر سیدھی مزنگ کو جاتی ہے۔ مشرق کی طرف اس مقبرہ کی جو حدود تھیں وہ ان کوٹھیوں تک پھیلی ہوئی تھیں جو پانی والے کنوئیں کے ساتھ ساتھ چلی جاتی ہیں۔ اس باغ کی چار دیواری جنوب کی طرف حیات برادرس فرنیچر میکرز کی دوکان سے بھی پرے تھی۔ راقم ۸ ر جنوری ۱۹۲۳ء کو مزار اور صاحب مزار کے حالات دریافت کرنے کے لیے وہاں گیا تو معلوم ہوا کہ اس کے ساتھ زمین بہت تھی متولی بیچ بیچ کر کھا گئے۔

صاحب خزینۃ الاصفیا جلد دوم میں (صفحہ ۲۳۰ پر) بحوالہ تحفۃ الواصلین لکھتے ہیں :-

"اول کسے از واعظان اسلام در لاہور تشریف آورد و خلق

سلہ راقم کے لڑکپن کے زمانہ میں یہاں چاہ روان رہتا تھا اور اس کے ساتھ زیر کاشت اراضی بھی تھی۔ یہاں اکثر مسلمان اور ہندو اپنے ان بچوں کو جو پھوڑے پھنسیوں سے بیمار رہتے تھے لا کر نہلایا کرتے تھے۔ جب سے یہاں کوٹھیاں تعمیر ہوئی ہیں اور زنانہ کالج بن گیا ہے کنواں بند ہو گیا ہے اور کنوئیں میں نلکہ لگا دیا گیا ہے۔ اب وہ بات تو نہیں رہی لیکن پھر بھی لوگ یہاں آتے جاتے ہیں۔ اس کا نام پنجابی زبان میں "پانی دانیاں دا کھوہ" ہے۔

را بہ نور اسلام روشن کرد۔ او بود .... و از کتب معتبرہ
و اقوال صحیحہ ثابت گشتہ کہ شخصے کہ اول در لاہور درس کلام مجید
خواند شیخ اسمٰعیل بود۔"

پنجاب میں اسلام کے اس مبلغ۔ درس قرآنیہ کے نامور مدرس۔ کلام الٰہی اور نو جیدو سنت سے واقف کرانے والے بزرگ کے مزار کے ساتھ نااہل مجاوروں اور دین فروش متولیوں کا یہ سلوک۔ ع

تفو بر تو اے چرخ گردان تفو

سچ کہا علامہ اقبالؒ نے ؎

قُم بہ اذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

اور وہ بھی بیچ کر کھا جانے والے۔

ہال روڈ کی طرف جاتے ہوئے سکول کی عمارت کے ساتھ ساتھ (جو درحقیقت اسی مزار کی زمین ہے) سڑک کے دائیں طرف چھوٹی چھوٹی سات سیڑھیاں طے کرنے کے بعد مزار آتا ہے۔ سنگ مرمر کہیں نہیں۔ البتہ مزار پختہ اینٹوں کا ہے پہرانے چراغدان بنے ہوئے ہیں، مزار اس قدر معمولی حالت میں ہے کہ سینکڑوں اور ہزاروں مسلمان ہر روز قبر کے پاس سے گزر جاتے ہیں اور اس بزرگ کی روح کو کوئی دو ہاتھ اٹھا کر دعائے خیر کے چند کلمات بھی نہیں کہتا جس کے ہر وعظ میں ہر جمعہ کو صدہا غیر مذہب کے لوگ مسلمان ہو جاتے تھے۔

وہ باغ جو خدا جانے کتنی بڑی وسعت رکھتا تھا اور وہ مقبرہ جس کی حدود دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھیں آج اس سمندر کی طرح ہے جو انقلاب زمانہ کے زبردست تھپیڑوں سے حلقہ گرداب میں آ کر نسو بن کر رہ گیا ہو، باغ کا تو اب یہاں کسی کو وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا، مقبرہ کے بلند چبوترہ کے سوا ایک چپہ زمین بھی اس مزار کے ساتھ نہیں، قریباً سو سال یا کچھ عرصہ سے دو درخت ایک نیم اور ایک پیپل کا اس مزار کو معہ ایک اور چھوٹے سے مزار کے ابر رحمت بن کر سایہ کئے ہوئے ہیں۔

ابوالنجم ملک احمد ایاز

کر دیا آباد جس نے از سر نو شہر کو
آج اس کا مقبرہ اور باغ ویران دیکھیے

ایاز[۱] سلطان محمود غزنوی کا محبوب غلام تھا۔ اس کا ذکر غزنوی عہد کی اکثر تاریخوں اور دربار محمودی کے اکثر شعراء

۱۔ ایاز پر ایک جامع مضمون لاہور کے نوجوان ریسرچ سکالر مسٹر مشتاق احمد بھٹی نے لکھا ہے جو اورینٹل کالج میگزین کے دو نمبروں میں چھپا ہے۔ فاضل مضمون نگار نے اس مضمون کے لئے بڑی کاوش کی ہے اور مندرجہ ذیل کتابیں ان کے زیر مطالعہ رہی ہیں۔ مجالس العشاق۔ منطق الطیر۔ طبقات ناصری۔ فرہنگ آنند راج۔ زین الاخبار گردیزی۔ فرشتہ۔ تاریخ بیہقی۔ مثنوی لالی۔ قصائد فرخی اور دیگر شعرا کا کلام۔ راقم نے اس مضمون سے بھی استفادہ کیا ہے۔

کے کلام میں ملتا ہے۔ زلالی نے جو مثنوی پونے پانچ سو صفحوں کی لکھی ہے۔ اس میں اس نے محمود و ایاز کے عشق کو انتہائی درجہ پر پہنچا کر ایک اچھا خاصا افسانہ بنا دیا ہے۔ لیکن دوسرے شعرا اور مورخین نے ایاز کے حسن و وفا کے ساتھ اس کی خدمات شاہانہ، شجاعت، جنگ آزمائی اور انتظامی و مدبرانہ قابلیت کا ذکر کر کے اس کو ایک بہادر جرنیل، منتظم حاکم اور اپنے بادشاہ کا محبوب اور جاں نثار غلام ظاہر کیا ہے۔

عہد عالمگیری کے مصنف منشی سجان رائے بھنڈاری نے اپنی کتاب خلاصۃ التواریخ میں ایاز کو کشمیری الاصل لکھ کر اور بھی غلط فہمی پیدا کر دی ہے۔ وہ لکھتا ہے :۔

" این ایاز خلف والیئے کشمیر بود۔ بہ نو دو سالی ہمراہ پدر خویش
در شکارگاہ رسید۔ جمع از عیاران آدم دزد بہ قابو یکہ یافتند
ایاز را بدست آوردہ ازاں ولایت بدر رفتند۔ و در بدخشان آں
لعل درج شاہی را بدست سوداگرے بہ قیمت خاطر خواہ فروختند"

اس کے بعد سوداگر بدخشاں سے غزنی آتا ہے اور ایاز کے حسن صورت کی شہرت محمود تک پہنچتی ہے۔ وہ اس کو دیکھتا ہے اور ہزار جان سے عاشق ہو کر سوداگر کی بتائی ہوئی قیمت سے بھی زیادہ قیمت پر اسے خرید لیتا ہے۔

خلاصۃ التواریخ کے ان افسانوی الفاظ میں زلالی کا رنگ پایا جاتا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس زمانہ میں اور اس کے بعد جب تک غلاموں کا رواج رہا۔ غلاموں کی اکثریت کس ملک سے آیا کرتی تھی۔ اور محمود کے زمانے میں کشمیر کی کیا حالت تھی۔ اور کیا کشمیر کی کوئی قدیم یا جدید مطبوعہ یا غیر مطبوعہ تاریخ خلاصۃ التواریخ کے متذکرہ صدر الفاظ کی تائید کرتی ہے

محمود ۳۸۷ھ (۹۹۷ء) میں تخت پر بیٹھا اور ۴۲۱ھ (۱۰۳۰ء) میں انتقال کر گیا۔ چونتیس ۳۴ سال کے اس عرصہ میں اس نے دو حملے کشمیر پر کئے۔ ایک ۱۰۱۵ء میں جبکہ کشمیر پر دیدا رانی حکمران تھی دوسرا حملہ ۲۲-۱۰۲۳ء میں کیا جب راجہ سنگرام[1] کشمیر کا راجہ تھا۔ مگر دونوں حملوں میں ناکام واپس آیا تھا۔ کشمیر کی کسی تاریخ میں کشمیر کے کسی راجہ کے فرزند کا چوروں یا بردہ فروشوں کے ہاتھ میں جانے اور شکارگاہ سے گم ہو جانے کا ذکر نہیں۔ نیز دیدا رانی ۹۷۶ء سے ۹۹۷ء تک دو بیٹوں اور ایک پوتے کی سرپراہ بن کر اور ۹۹۸ء سے ۱۰۱۶ء تک خود براہ راست کشمیر کی حکمران رہی ہے اس کے عہد میں اس کا کوئی بیٹا یا پوتا "عیاران آدم دزد" کے ہاتھ نہیں آیا۔ اور نہ کوئی شکار کو گیا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مصنف نے ایاز کے کشمیری الاصل ہونے کا ماخذ کہاں سے لیا ہے۔

ابو القاسم فرشتہ ایاز کو ختنی الاصل، مجالس العشاق کا مصنف اور نظامی عروضی اسے ترک لکھتے ہیں۔ فرخی اس کا نام ایاز بن اویماق لکھتا ہے۔ ایاز ترکی لفظ ہے اور اس کے معنے خوشگوار دھوپ یا صاف رات کی شبنم ہیں۔ اویماق بھی ترکی لفظ ہے

---

[1] مولوی محمد حبیب بی اے (آکسن) پروفیسر تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اپنی کتاب سلطان محمود غزنوی میں اس راجہ کا نام راجہ سالی لکھا ہے۔ جو غلط ہے۔ صحیح نام سنگرام ہے۔

معنے قبیلہ و انگشتانہ ۔فرہنگ آنندراج میں ایاز کو ایاس بھی لکھا ہے[1]۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ترکستان کی حدود وغزنی و ہندوستان تک پھیلی ہوئی تھیں اور ترکی غلام گھر گھر میں موجود تھے۔ بلکہ محمود کا باپ بھی ایک ترکی غلام تھا اور ہندوستان کے بادشاہوں میں بھی ترک غلاموں کا عام رواج تھا۔ اور ترک غلاموں نے عروج حاصل کر کے ہندوستان میں بادشاہت بھی کی ہے۔ اس لئے ایاز ترک بچہ تھا کشمیری بچہ نہ تھا مجالس العشاق کا مصنف لکھتا ہے :۔

"ہر یک نوبت صد و بیست غلام ترک آوردہ بودند۔ اکثر صاحب
جمال۔ و در حد اعتدال و ایاز یکے از ایشان بود چون آں کاروان
غلامان را بر غزنی رسانید مقربان ذوی البصیرہ را فرستادند
کہ آنچہ لائق باید جہت بادشاہ بخرند و باقی را گذارند کہ بہر کس
کہ خواہند۔ فروشند"

مجالس العشاق کے مصنف کی تحریر کے مطابق غلام فروشوں کی یہ جماعت ۳۹۶ھ میں غزنی میں آئی ہے اس کے بعد لکھا ہے کہ ایاز ان ایام میں بیمار اور نحیف و کمزور تھا۔ تمام غلام بادشاہ کے لیے خرید لیے گئے۔ لیکن ایاز کو کمزور اور نحیف دیکھ کر خریدنے سے انکار کر دیا گیا۔ ایاز اپنی بدقسمتی پر روتا تھا اور اس ذلت پر موت کو ترجیح دیتا تھا۔ محمود کو خبر ہوئی۔ اس نے میر قافلہ کو واپس بلوایا۔ ایاز کو بے کس دیکھ کر اس کی حالت پر رحم کیا۔ اور فرمایا۔ میں نے ایک سو انیس غلام اپنے لیے خریدے اور اس کو محض خدا کے لیے خریدتا ہوں۔ چنانچہ صاحب مجالس العشاق لکھتے ہیں :۔

"حالت او را در دل سلطان تاثیرے تمام کرد۔ بسے را دوانید و
ایشان را باز گردانید و فرمود کہ ایں یک صد و نوزدہ غلام را
برائے خود خریدم و ایں یکے را از بہر خدائے خرم او را تبریع
کنند"

اس زمانے میں غلاموں کو غلام نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ ان کو مختلف علوم و فنون سکھائے جاتے اور ان سے فرزندوں کا سا سلوک کیا جاتا تھا۔ کسی کو علوم دین پڑھائے جاتے کسی کو قرآن شریف حفظ کرایا جاتا۔ کسی کو فقیہہ و محدث بنایا جاتا۔ اور کسی کو کتابت کا کام سکھایا جاتا تھا۔ غلاموں کی زیادہ تعداد فوج خاص میں بھرتی کی جاتی جو بادشاہ کی خاص فوج سمجھی جاتی تھی۔ اور جو بادشاہ پر جان نثار کرنے کے لیے ہر وقت سر بکف رہتی تھی۔

غلاموں کا دفتر اور محکمہ الگ ہوتا تھا۔ اور اس محکمہ کا کوئی تعلق خزانہ یا وزارت سے نہ ہوتا تھا۔ ایاز غلاموں کے اسی شاہی دستہ کا سالار تھا۔ محمود نے ایاز کی تعلیم و تربیت[2] کا بھی خاص اہتمام کیا۔ فرخی نے ۴۲۲ھ کے قصیدہ مسعودیہ میں اور

---

[1] از مضمون مسٹر مشتاق احمد بھٹی۔ ایم۔ اے ریسرچ سکالر پنجاب یونیورسٹی۔ مندرجہ اورینٹل کالج میگزین۔
[2] مولانا سید سلیمان ندوی اپنی تصنیف "خیام" کے صفحہ ۲۴۲ کے حاشیہ میں ایاز کے متعلق لکھتے ہیں "ابن رازی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ابوالفرج رونی نے اپنے اشعار میں ایاز کی تیر اندازی اور شہسواری کے کمالات اور مختلف لڑائیوں میں اس کی شجاعت و نبرد آزمائی کا ذکر کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایاز نے آدابِ محفل، خدمت گذاری اور وفا شعاری کے علاوہ سپاہیانہ اوصاف میں بھی شہرت حاصل کر لی تھی۔

۴۲۱ھ میں محمود کی وفات کے وقت ایاز غزنی ہی میں تھا۔ محمود کے بعد اس کا فرزند محمد بعض امرا کی تحریک و اعانت سے تخت پر بیٹھ گیا۔ اس وقت محمود کا دوسرا فرزند غزنی سے باہر نئے مفتوحہ علاقوں میں تھا۔ محمد چار ماہ تک داد عیش دیتا رہا۔ وہ عالم بھی تھا علم نواز بھی تھا لیکن رات دن راگ رنگ کی محفلیں گرم رکھتا تھا۔ اور ایاز اور اس کی جماعت کے جاں باز جو فتوحات محمودی کا رنگ دیکھے ہوئے تھے ایک سرفروش اور قلعہ شکن بادشاہ کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ آخر ایاز اور اس کی جماعت کی کوششوں سے مسعود کامیاب ہو گیا۔ ایاز کے ساتھ ہندو فوج کے سپہ سالار سوندھر رائے یا سرہند رائے نے جنگ کی لیکن سرہند رائے کے واقعۂ قتل نے ایاز کو ظفر مند کر دیا۔ مسعود نے بادشاہ ہو کر اس کی بڑی قدر کی۔ چالیس خروار دینار کے عطیہ کے علاوہ بست کا صوبہ جاگیر میں دیا اور قزدار کا خراج عطا کیا۔ فرخی لکھتا ہے ؎

خداوند جہاں مسعود محمود	کہ او از زر ہمی بخشد بہ خروار
جز او را از ہمہ میران کرا داد	بہ یک بخشش چہل خروار دینار
بدو بخشند مال خطۂ بست	خراج خطۂ مکران و قزدار

تعجب یہ ہے کہ ایاز کی اس شجاعت اور وفاداری اور ان انعامات و عطایا کے باوجود جب احمد حسن میمندی وزیر سلطان مسعود سے کی گورنری کے لیے ایاز کا نام پیش کرتا ہے تو مسعود کہتا ہے :-

"ایاز از بس ناز و عزیز آمدہ است - ہر چند عاقبہ بدر ریاست از سرائے
... نہ بودہ گرم و سرد نہ چشیدہ است و بہ ہیچ تجربت نیفتادہ
است و ... را ہنرے باید کہ پیش ما باشد"

۴۲۲ھ میں ایاز کی عمر کا اندازہ چھبیس سال لگایا جاتا ہے۔ یہ تو صحیح ہے کہ اس عمر میں وہ کچھ زیادہ گرم و سرد چشیدہ نہ تھا۔ لیکن مسعود کے انکار کی ایک وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ وہ ایسے سرفروش اور جاں نثار فدائی کو تخت نشین ہوتے ہی مرکز سے دور بھیجنا پسند نہ کرتا تھا۔ چنانچہ ۳ ذی قعدہ ۴۲۷ھ کو (استقلال حکومت کاملہ کے بعد) جب اپنے فرزند امیر مجدود

نے ہفت اقلیم میں عوفی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ "ایاز بابا افضل کا شانی کا جو ایک فاضل حکیم، صوفی اور محمود غزنوی کا ہمعصر تھا۔ شاگرد تھا۔ سلطان نے جب ایک مرتبہ بابا افضل کو قید کر دیا تو بابا نے سلطان کی مدح میں جو قصیدہ لکھا وہ ایاز ہی کی وساطت سے پیش کیا۔ اور اسی کی سفارش سے اس نے رہائی پائی۔ ساتھ ہی علامہ سید سلیمان ندوی یہ بھی لکھتے ہیں کہ عوفی کی (ایک تصنیف) لب الالباب میں یہ بیان مجھے نہیں ملا۔ ممکن ہے ان کی کسی اور تصنیف میں ایاز اور بابا افضل کے تعلقات کا ذکر ہو۔

کو جو ابھی کم سن تھا صوبہ لاہور عطا کیا تو بقول فرشتہ وہ مجدود کا دست راست اور اتالیق تھا، اور سپہ سالار لاہور اور قاضی القضاۃ لاہور دونوں اس کے ماتحت تھے۔

لاہور کی از سرِ نو تعمیر درحقیقت اسی زمانہ میں ہوتی ہے البیرونی اور بیہقی پنجاب کا دار الحکومت مندھوکور نام ایک شہر کو لکھتے ہیں، وہ مندھوکور کہاں تھا؟ شیخ محمد لطیف اپنی کتاب تاریخ لاہور میں تھامس صاحب کے حوالہ سے اسے سیالکوٹ کے متصل بتاتے ہیں۔ بہرحال محمودی حملوں سے مندھوکور بالکل بے نشان ہو چکا تھا۔ اس لئے مسعود کے عہد کے بعد کی تاریخوں میں یہ نام کہیں نہیں ملتا۔ بلکہ اس کی بجائے لاہور کا نام آتا ہے جس کی بنیاد ایاز نے رکھی تھی۔ اور جس کے متعلق خیر اللہ فدا لاہور کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے ؎

بانئے او ایاز محمود است
زیں بنا حسن و عشق مقصود است

صاحب حدیقۃ الاقالیم و صاحب خلاصۃ التواریخ بھی لکھتے ہیں :-

"ملک ایاز بر آبادیئے آں کوشیدہ و شہرے بہ تجدید
و قلعہ پختہ تعمیر یافت"

ایاز اور مجدود پنجاب سے آگے بڑھ کر ہانسی اور تھانیسر قبضہ میں لا چکے تھے۔ اور دہلی فتح کر کے ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالنے کے خواب دیکھ رہے تھے کہ اس کو بڑے بھائی امیر مودود کے حملہ ہند اور باپ کے واقعہ قتل کی اطلاع ملی۔ یہ سنہ ۴۳۳ھ کے اواخر کا واقعہ ہے چنانچہ وہ ہانسی سے ۶ ذی الحجہ سنہ ۴۳۳ھ کو لاہور پہنچ گیا جہاں وہ عید الضحٰی کی صبح کو دفعتہً اپنے خیمہ میں مردہ پایا گیا۔ فرشتہ کے قول کے مطابق اس کے تھوڑے عرصہ کے بعد ہی ابو النجم ملک احمد ایاز بھی لاہور میں انتقال کر گیا۔

تاریخ ہندوستان میں مولوی ذکاء اللہ اور دوسرے کئی مصنفوں نے فرشتہ کے ان الفاظ "ایاز نیز دریں چند روز وفات کرد" کے مطابق اس کا سال وفات سنہ ۴۳۳ھ ہی لکھا ہے لیکن مسٹر مشتاق احمد بھٹی ایم اے نے اپنے قابلِ قدر مضمون میں فرہنگ آنندراج کے یہ الفاظ "ایاز عمر معقول دریافتہ ——— در چہار صد و چہل و نہ وفات یافتہ" لکھ کر اس کو بائیس سال کی طویل مدت تک لاہور کا ناظم قرار دیا ہے اور طبقات ناصری کے انگریزی مترجم ریورٹی کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ فرخ زاد بن مسعود کے عہد میں جن مشہور آدمیوں نے وفات پائی ان میں ایاز بھی تھا۔

مودود نے سنہ ۴۴۱ھ میں انتقال کیا۔ اور سنہ ۴۴۳ھ میں فرخ زاد کو غزنی کی حکومت نصیب ہوئی۔ سنہ ۴۳۳ھ سے سنہ ۴۴۳ھ تک ایاز کا نام تاریخ میں کہیں نظر نہیں آتا۔ اگر ریورٹی کا حاشیہ اور فرہنگ آنندراج کا متن دونوں صحیح ہیں یعنی اس عرصہ میں ایاز

---

[1] مآثر لاہور تالیف سید ہاشمی فرید آبادی کے صفحہ ۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن اثیر نے بھی اس کا سال وفات سنہ ۴۴۹ھ اور مہینہ ربیع الاول دیا ہے اور یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ (مرتب)

زندہ تھا تو اس کا مطلب یہ سمجھنا چاہیئے کہ سنہ ۴۲۱ھ کے بعد محمود کی اولاد میں جو خانہ جنگیاں شروع ہوئیں تو وہ ان کی وجہ سے خانہ نشین ہو چکا تھا۔

ایاز کی تعریف (شجاعت و وفاداری وغیرہ) کے متعلق عنصری۔ فردوسی۔ فرخی۔ اور غفاری وغیرہ شعراء نے قصائد لکھے ہیں اور محمود سے بارہا گراں قدر انعامات حاصل کیے ہیں۔ محمود نے فردوسی کو اسی کے ہاتھ شاہنامہ کا صلہ بھی بھیجا تھا۔ چونکہ وہ انعام حسب وعدہ طلائی سکوں میں نہ تھا۔ اس لیے فردوسی نے لٹا دیا۔ اور بادشاہ کے خوف سے غزنی سے اس حالت میں بھاگ گیا کہ ایک چادر اور عصا کے سوا اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ ایاز نے چوری چھپے اپنے آدمیوں کے ہاتھ کچھ نقدی اور سامان سفر اس کو بھجوا دیا۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ ایاز کے مقبرہ کے ساتھ ایک وسیع باغ تھا جس کا کچھ وجود سکھ حاکمان لاہور کے زمانہ میں بھی موجود تھا لیکن مہاراجہ رنجیت سنگھ نے جب وہاں سکے مضروب کرانے کے لیے ٹکسال بنایا اور چند عمارتیں تیار کرائیں تو باغ مٹ گیا۔ اسی ٹکسال کی وجہ سے جہاں یہ مزار واقعہ ہے اس کو ٹکسالی بازار کہتے ہیں۔ کسیرا بازار کے خاتمہ پر سامنے کی دو کانوں میں گوبند عطار کی مشہور دوکان کے پاس سے ایک مختصر اور تنگ سی گلی (بنام ٹکسال بازار) ملک ایاز کی قبر کو جاتی ہے جو پیچ کھاتے ہوئے سوہا بازار کو نکل جاتی ہے۔ ایاز کی قبر سطح زمین سے بلند ایک چبوترہ پر ہے جس کی لمبائی ۹ فٹ دس انچ اور چوڑائی سات فٹ چھ انچ ہے۔ احاطہ مزار میں داخل ہونے کے لیے ایک دروازہ ہے جو چھوٹے سے صحن میں کھلتا ہے۔

سنہ ۱۸۹۲ء[۱] میں اس کی قبر پر کھجور کا ایک درخت تھا۔ لیکن اب درخت کی بجائے وہاں ایک تھالیچہ کی بیل ہے جو مزار کی چوبی چھت پر چھائی ہوئی ہے۔ قبر کا تعویذ سیمنٹ کا ہے۔ اس پر غلاف پڑا رہتا ہے۔ مزار کے مغرب میں ایک چھوٹا سا مسجد نما برآمدہ ہے۔ اس کی چھت بالکل معمولی ہے جو غالباً مرمت کے وقت بعد میں ڈالی گئی ہے۔

سنہ ۱۸۸۴ء کا مصنف (رائے بہادر کنہیا لعل) اپنی تاریخ لاہور میں لکھتا ہے:۔

"اس مزار کے ساتھ بہت بڑا احاطہ اور باغیچہ تھا۔ جو
بسبب گذرنے عرصہ دراز کے ملیامیٹ ہو گئے اب بھی
بازار کی طرف کی کچھ دکانیں اس مزار سے متعلق ہیں"

آج سنہ ۱۹۲۴ء کا مصنف یعنی ناچیز راقم دیکھتا ہے کہ اس مزار کے ساتھ اس کے چھوٹے سے دروازہ کے پہلو میں ایک چھوٹی سی دکان ہے جہاں ایک درزی بیٹھتا ہے جو پانچ روپیہ ماہوار کرایہ دیتا ہے جس سے اس مزار کی مرمت وغیرہ ہوتی رہتی ہے۔

مزار کے سامنے الہ آباد بنک کا دفتر ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ بہت بڑا کنواں ہے جو غالباً اس کے باغ کی آبیاری کے لیے بنایا گیا تھا۔ وہ ہندوؤں کے قبضہ میں ہے۔ اس مزار کے گرد و پیش کوچہ دھوناں اور گلی بھنگیاں

۱؎ خان بہادر محمد لطیف اپنی ہسٹری آف لاہور مطبوعہ ۱۸۹۲ء میں اس درخت کا حوالہ دیتے ہیں۔

میں سب ہندو آبادی ہے۔[1]

گنجِ شہیداں

دیکھئے قرباں گہِ تسلیم کا منظر کبھی
دیکھئے لاہور میں گنجِ شہیداں دیکھئے

لاہور میں تین مقامات گنجِ شہیداں یا شہید گنج کے نام سے مشہور ہیں۔ ایک گنج شہیداں موچی دروازہ کے باہر مقبرہ حضرت شاہ ابوالمعالی کے جنوب رویہ ایک بلند ٹیلہ پر ہے۔ جو کسی زمانہ میں بلکہ آج سے سو سال پیشتر لاہور کا ایک بہت بڑا قبرستان تھا اور قبرستان گنجِ شہیداں کے نام سے موسوم تھا۔

اس گنجِ شہیداں کے متعلق تحقیقاتِ چشتی (صفحہ ۱۰۵) میں یہ عجیب روایت درج ہے کہ "محمد بخش، امام بخش کلے زئیاں چوبداران مہاراجہ کھڑک سنگھ کی قبروں کی چار دیواری کے پاس دو قبریں حضرت امام جعفر و حضرت امام صادق کی ہیں۔ یہ دونوں قبریں خام ہیں، یہ بزرگ عہد سلطان محمود غزنوی میں لاہور آئے تھے۔ کافروں سے لڑتے رہے اور شہید ہو گئے۔ پھر ان کا فروں نے کاٹ لیا اور باقی جسم یعنی دھڑ برابر لڑائی میں مصروف رہا، یہ دھڑ جب لڑتے لڑتے اس جگہ آیا جہاں ان کی قبریں ہیں تو لوگوں نے تعجب سے کہا دیکھیے سر بدن لڑنے چلے آرہے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ دونوں دھڑ گر پڑے۔"

یہ ایسا ہی دلچسپ مگر غلط واقعہ ہے جیسا بی بی پاک دامناں کے متعلق مشہور ہے۔ یہی واقعہ یعنی بے بدن لڑنے کی داستان حضرت پیر زکی رحمن کے نام پر (لاہور کا ذکی دروازہ لعد میں یکی دروازہ مشہور ہے) کے متعلق بھی زباں زد چلی آتی ہے حضرت امام جعفر اور حضرت امام صادق اور سلطان محمود غزنوی کا زمانہ اور لاہور کے راستے سے دونوں اماموں کی جنگ۔ اس کے متعلق ع

چہ خوش گفت سعدی در زلیخا

کے سوا کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔ اسی شہید گنج کی چار دیواری کے ساتھ مصنفِ تحقیقاتِ چشتی کے ننہال کا قدیمی قبرستان ہے۔ ان کی والدہ کی قبر پہ سرہانے کی طرف یہ اشعار تحریر ہیں ؎

سعید بیگم چوں آں شیریں مقال	زیں جہاں گردید مہمان بہشت
سال وصلش جست چوں چشتی زغیب	گفت ہاتف شاہ حوران بہشت

[1] یہ حالات حضرت فوق مرحوم نے ۱۹۳۲ء میں لکھے تھے۔ افسوس کہ اگست ۱۹۴۲ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ وہ اگر زندہ ہوتے تو ۱۹۴۷ء کے فرقہ وارانہ فسادات اور تقسیم ہندوستان سے پیدا شدہ حالات سے اس مزار اور اس کے ارد گرد کی عمارتوں کو جو نقصان پہنچا تھا اس کا بھی ذکر کرتے۔ سیلاب انقلاب جب آتا ہے تو بڑی بڑی سربفلک عمارتوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جاتا ہے۔ یہی حال یہاں بھی ہوا۔ اب نہ الہ آباد بنک کا دفتر ہے نہ ہندوؤں کی آبادی۔ مکانات راکھ کا ڈھیر ہو چکے ہیں۔ کنواں پٹ ہو کر سڑک کے نیچے دب چکا ہے۔ مزار کے ساتھ کی دکان ڈھے چکی ہے۔ احاطہ مزار وسیع ہو گیا ہے اور آس پاس بہت سی نئی عالی شان عمارات تعمیر ہو گئی ہیں۔ (مرتب)

ایک شہید گنج سکھوں نے ان سکھوں کے نام پر لاہور کے سٹیشن کے متصل چوک دارا شکوہ میں بنا رکھا ہے، جو نواب میر معین الملک عرف میر منو گورنر لاہور اور فرخ سیر بادشاہ ہند کے زمانہ میں اسی مقام پر قتل کیے گئے تھے، اس کا ذکر علیحدہ اپنے موقعہ پر ہوگا۔

تیسرا گنج شہیداں اس علاقہ میں ہے جو تکیہ سادھواں اور مسجد چینیاں والی تک پھیلا ہوا ہے اور مسلمانوں میں اصل گنج شہیداں اسی علاقہ کا نام ہے۔ اس گنج شہیداں کی قبریں کچھ تکیہ سادھواں میں تھیں کچھ مسجد چینیاں والی کے پاس اور کچھ بازار سریانوالہ عرف بازار علم دین شہید میں تھیں۔ اب تو صرف چار یا پانچ قبریں متفرق مقامات پر نظر آ رہی ہیں اور وہ بھی گلی کوچوں اور مکانات میں گھری ہوئی ہیں۔ یہ قبریں شہر کے اندر بہت قدیم زمانہ سے تھیں بلکہ کہا جاتا ہے کہ جب محمود نے لاہور شہر پر قبضہ کیا تو اس وقت جو مسلمان جہاں جہاں شہید ہوا وہیں اس کی قبر بنا دی گئی۔ چونکہ لاوارث تھیں۔ اس لیے مرورِ ایام سے ان قبروں کا انہدام شروع ہوا اور جس نے چاہا ان کی ہڈیوں پر اپنے مکانوں کی بنیادیں رکھ دیں۔

اس گنج شہیداں کا کچھ ذکر رائے بہادر کنہیا لعل نے تاریخ لاہور میں (صفحہ ۱۶۹ پر) اور مفتی غلام سرور لاہوری نے حدیقۃ الاولیا میں (صفحہ ۱۴۷ پر) کیا ہے۔ کنہیا لعل نے جو کچھ لکھا ہے وہ حدیقہ کے حوالہ سے لکھا ہے اور صاحب حدیقہ نے تحفۃ الواصلین کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ "مزار شہید گنج تکیہ سادھواں میں واقع ہے۔ اس مقام پر اگرچہ ایک قبر ہے مگر یہاں ہزارہا شہیدوں کی قبریں تھیں، بہرام شاہ غزنوی کے عہد میں جب پنجاب کی حکومت غزنی پر کمزور ہوگئی تو راجہ اننگ پال جو راجہ جے پال کا بیٹا تھا۔ راجگانِ ہند کی فوج لے کر لاہور پر چڑھ آیا۔ چھ مہینے تک شہر کے تمام لوگ لڑتے رہے ہندوؤں نے ہزارہا مسلمانوں کو تہ تیغ کیا۔ مسجدیں گرا دیں۔ اور بت خانے دوبارہ قائم کر دیے لیکن جب کچھ عرصہ کے بعد غزنی سے کمک آئی تو اننگ پال لاہور چھوڑ کر بھاگ گیا۔"

مندرجہ صدر الفاظ تاریخ لاہور میں حدیقہ اور حدیقہ میں تحفۃ الواصلین کے حوالہ سے درج ہیں۔ لیکن ان واقعات کا تاریخ سے بظاہر کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ بہرام شاہ (سالِ وفات ۵۴۷ھ) اپنی پینتیس یا چالیس سالہ طویل حکومت میں بے شک کئی دفعہ ہندوستان میں آیا۔ لیکن کسی ہندو راجہ سے اس نے اس عہد میں لڑائی نہیں کی۔ بلکہ اس عرصہ میں وہ اپنے ہی سپہ سالاروں کی سرکشیوں کو دبانے کے لیے آیا۔ ۵۱۱ھ میں اس نے محمد باہلیم سپہ سالار لاہور پر حملہ کیا۔ اور اس کا قصور معاف کر کے پھر اس کو لاہور کا سپہ سالار مقرر کر دیا لیکن چند سال کے بعد محمد باہلیم نے مزید قوت حاصل کر کے پھر بغاوت کی اور ملتان میں اس نے بادشاہی افواج کا مقابلہ کر کے اپنے بیٹوں سمیت شکست کھائی۔ (تاریخ ہندوستان ذکاء اللہ جلد اول صفحہ ۲۷۷)

البتہ اس سے سو سال یا کچھ زیادہ عرصہ پیشتر سلطان مودود بن سلطان مسعود بن سلطان محمود غزنوی کے زمانہ (وفات مودود ۴۴۱ھ) میں دہلی کے راجہ نے دو تین اور راجاؤں کو ساتھ ملا کر پہلے ہانسی اور تھانیسر کو فتح کیا پھر قلعہ نگر کوٹ پر قبضہ کر کے دس ہزار فوج کے ساتھ لاہور کا محاصرہ کر لیا، مسلمانوں پر بھی انھوں نے تشدد کیا۔ اور قریباً پانچ ہزار مسلمان انھوں نے گرفتار بھی کر لیے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سلطان مودود مغربی فتوحات میں مصروف تھا۔ اور پنجاب کے غزنوی امرا باہمی نااتفاقیوں سے

اپنی حکومت کو کمزور کر رہے تھے، لیکن ہندو راجاؤں کی اس عظیم یلغار نے امرائے غزنویہ کی آنکھیں کھول دیں اور سب نے متفق ہو کر مقابلہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو دن کی لڑائی کے بعد راجاؤں میں اختلاف پڑ گیا۔ اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اور مسلمانوں نے پانچ ہزار قیدی ان سے چھڑا لیے۔ (تاریخ ہندوستان ذکاء اللہ جلد اول صفحہ ۲۶۶)

اس لحاظ سے گنج شہیداں کے شہداء کا تعلق بہرام شاہ غزنوی کے عہد سے نہیں بلکہ سلطان مودود کے زمانہ سے ہے۔

سید احمد توختہ ترمذی

مٹ گیا ہوتا نشان قبر احمد توختہ
خدمت نامی سے پھر اس کو نمایاں دیکھئے

ترمذ ماوراء النہر میں ایک شہر ہے جس طرح اندراب کے سادات اندرابی مشہد کے مشہدی کہلاتے ہیں اسی طرح جو سادات ترمذ سے ہندوستان آئے وہ سادات ترمذی کہلائے۔ ترمذ میں سادات کی حکمرانی بھی رہی ہے آپ کا نام سید احمد تھا۔ ترمذ سے چونکہ ہندوستان میں آئے تھے۔ اس لیے ترمذی کہلاتے تھے۔ لیکن لاہور میں سید احمد توختہ کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ توختہ ترکی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنے کھڑا ہونے کے ہیں۔ چنانچہ پیر فرخ بخش لاہوری لکھتے ہیں[1]:۔

آں در زماں کہ پا بہ طلب در نہادہ بود
در حکم شیخ خویش بپا ایستادہ بود

"پا ایستادہ" رہنے کی توضیح میں لکھا ہے کہ ایک دن آپ کے مرشد نے آپ کو یاد فرمایا۔ آپ جب حاضر ہوئے تو شام کا وقت تھا۔ حجرہ کا دروازہ بند تھا۔ آپ نے اپنے آنے کی اطلاع یا دستک دینے کو خلاف ادب سمجھ کر ساری رات حجرہ کی دہلیز کے پاس کھڑے کھڑے گزار دی کہ شاید شیخ یاد فرمائیں۔ جب صبح ہوئی اور آپ کے مرشد نے حجرہ کا دروازہ کھولا اور آپ کو باہر ایستادہ پایا تو "توختہ" کہہ کر مخاطب فرمایا۔ اسی دن سے آپ کا نام سید احمد توختہ مشہور ہو گیا۔ صاحب تاریخ جلیلہ (نامی صاحب) صفحہ ۹۵ پر لکھتے ہیں کہ سید نصیر علی شاہ اجنالوی کے خاندانی نوشتوں کے مطابق کہ سید احمد توختہ کے والد سید احمد تختہ نشانی رسول شہاب الدین غوری کے زمانہ میں لاہور آئے بلکہ لکھا ہے کہ ان کا مزار بھی لاہور ہی میں ہے۔ لیکن لاہور میں نہ ان کے مزار کا کسی کو پتہ ہے اور نہ کسی نے ان کے ورود لاہور کو تسلیم کیا ہے۔ جیسا کہ سردار اعظم ملکان اور ان سے قبل لاہور کے مصنفین نے لکھا ہے کہ خود سید احمد توختہ لاہور تشریف لائے۔ تذکرہ مصنفین لاہور نے نہ ان کی اولاد ذکور کا کہیں ذکر کیا ہے نہ اولاد اناث کا۔ البتہ نامی صاحب مصنف تاریخ جلیلہ نے اپنی خاندانی غیر مطبوعہ کتابوں کے حوالہ سے ان کی جس اولاد کا ذکر کیا ہے اس کا کچھ بیان مزار بی بی پاک دامناں کے سلسلہ میں ہوگا۔

آپ کا مزار اکبری دروازہ کے اندر محلہ چلہ بی بیاں میں واقع ہے۔ چونکہ زمانہ قدیم میں عام قبرستانوں کے علاوہ شہر

---

[1] از تاریخ جلیلہ مصنفہ پیر غلام دستگیر نامی لاہوری ص ۹۳ - ۹۴ -

کے اندر بھی اکثر نعشیں دفن کی جاتی تھیں جیسا کہ آج بھی لاہور شہر کے اندر بیسیوں قبریں اپنی قدامت کا ثبوت دے رہی ہیں۔ اس لیے جس جگہ آپ مدفون ہیں وہاں یا تو آپ ہی کے زمانہ میں قبرستان تھا یا آپ کے دفن کیے جانے کے بعد وہاں قبرستان بن گیا۔ آپ کے ورود لاہور کا سال کسی نے بھی نہیں لکھا نہ آپ کی عمر کسی نے لکھی ہے۔ صرف صاحب حدیقۃ الاولیاء نے آپ کا سال وفات ۶۰۲ھ لکھا ہے۔ لیکن ماخذ نہیں بتایا کہ کہاں سے لیا ہے۔ مکران کے موجودہ سردار اعظم سردار بائے خان کے خط (مندرجہ تاریخ جلیلہ) سے واضح ہوتا ہے کہ سید احمد توختہ سلطان قطب الدین بادشاہ کیچ مکران کے زمانہ میں مکران میں کچھ عرصہ ٹھہر کر پھر لاہور آئے لیکن سلطان قطب الدین کس سنہ میں مکران کے بادشاہ تھے اس کا سردار اعظم کو بھی علم نہیں۔ البتہ ان کے پوتے شہزادہ حمید الدین حاکم کا جو سید احمد توختہ کے نواسے تھے سال پیدائش ۵۷۰ھ لکھا ہے۔ اور شاہزادہ کی والدہ بی بی حاج کا سال وفات ۵۷۳ھ بتایا ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ اسی دوران میں سلطان قطب الدین بھی انتقال فرما گئے، اس سے ان کا سال وفات ۵۷۳ھ سمجھنا چاہیے اور چونکہ سید احمد توختہ کچھ عرصہ مکران میں قیام کرکے اور اپنی بیٹی حاج بی بی کو شاہزادہ مکران کے عقد میں دے کر خود لاہور چلے آئے تھے اس لئے یہ لکھنا شاید غلط نہ ہوگا کہ وہ لاہور میں اس زمانہ میں آئے جب لاہور میں خسرو شاہ غزنوی (از اولاد محمود غزنوی) کی حکومت تھی۔ جو $\frac{۵۵۵ھ}{۱۱۶۰ء}$ سے ۵۹۸ھ تک رہی۔ اس لیے سید احمد توختہ کی آمد لاہور کا تعین ۵۶۰ھ کے قریب مناسب معلوم ہوتا ہے۔

سید احمد توختہ کے مزار کی شرقی جانب مستری فضل دین کا مکان ہے۔ یہیں بر سر کوچہ ایک پختہ قبر کسی نامعلوم الاسم کی اب تک موجود ہے۔ اس کے علاوہ تاجی صاحب تاریخ جلیلہ کے صفحہ ۹۸ پر لکھتے ہیں کہ ۱۹۴۶ء میں مستری فضل دین مذکور نے اپنا پرانا مکان گرانے کے لیے جب دیواریں گرائیں اور بنیادیں کھودیں تو ان بنیادوں سے بے شمار انسانی ہڈیاں برآمد ہوئیں۔ اور دو گنبدوں کے آثار بھی نکلے۔ آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ میرے لڑکپن کے زمانے میں حضرت توختہ کے مزار کے باہر جانب جنوب ایک غار سا پڑ گیا تھا جو بہت گہرا تھا اور تہ خانہ سا معلوم ہوتا تھا۔ میرے والد صاحب نے وہ غار بند کرا دیا۔ اس سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ ان کا مزار ضرور تہہ خانہ میں ہوگا اور یہ تعویذ بطور نشان اوپر بنا دیا گیا ہے۔

۱۹۱۳ء سے قبل یہ مزار نہایت خستہ حالت میں تھا۔ اندرونی و بیرونی دونوں فرش مٹ چکے تھے، دیواروں کا پلستر بھی اتر چکا تھا اور دروازہ بھی نہایت بوسیدہ تھا۔ پیر غلام دستگیر نامی نے اس کی مرمت کرائی۔ مزار کے حجرہ اور برآمدہ کو اچھی طرح مسقف کرایا اور ایک منزل بنا کر وہاں کتب خانہ رکھا۔ اور نیچے مہمانوں اور زائرین کی جائے آرام ۱۹۱۳ء میں ۲ صفر ۱۳۳۲ھ کو مزار پر ختم قرآن ہونے کے بعد تاجی صاحب کو دستار سجادہ نشینی باندھی گئی اور وہ اب تک اس مزار کی خدمت کرتے ہیں۔

بی بی پاک دامناں

گو ہیں پنہاں وہ نظر سے دل کی آنکھوں سے مگر
پاک دامن بی بیوں کے پاک داماں دیکھیے

بی بی پاک دامناں کا ذکر تحقیقات چشتی کے حوالہ سے راقم نے اپنی تصنیف یادِ رفتگاں (۱۹۰۲ء) میں تفصیل سے لکھا

تھا۔ اس وقت تک سب کا یہی خیال تھا کہ ان بی بیوں میں جن کی تعداد چھ بتائی جاتی ہے۔ ایک بی بی حاج نام حضرت علیؓ کی بیٹی تھی اور باقی پانچ بی بیاں ان کے بھائی حضرت عقیل کی صاحبزادیاں تھیں جو واقعہ کربلا کے بعد اپنی جان بچا کر لاہور آ گئیں اور لاہور میں چونکہ اس زمانہ میں ہندو راجگان کی حکومت تھی۔ اس لئے وہ ان کے خوف سے دعا کر کے زمین میں سما گئیں۔ راقم نے اپنی کتاب کے حاشیہ میں صاحب تحقیقات کی اس تحقیقات کو ناقابل یقین سمجھ کر اس پر شبہ ظاہر کر دیا تھا۔ اب مزید تفصیلی حالات (مندرجہ تاریخ جلیلہ) سے ظاہر ہوا ہے کہ ان بی بیوں میں جن کے نام تاج۔ حاج۔ حور۔ نور۔ گوہر اور شہباز تھے نہ کوئی حضرت علیؓ کی صاحبزادی تھی نہ حضرت عقیل کی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ واقعہ کربلا کے وقت جب لاہور میں کوئی مسلمان ہی نہ تھا تو ان کو اپنے وطن سے ہزارہا میل دور یہاں آنے کی ضرورت کیا تھی، اور پھر وہ عورتیں اپنی تنہائی اور بے کسی کے عالم میں اتنی دور صحیح سلامت کس طرح پہنچ گئیں وہ لاہور کی نسبت کوفہ۔ شام یا حرمین الشریفین میں جا کر زیادہ محفوظ رہ سکتی تھیں جو کربلا سے نزدیک تر مقامات تھے لاہور میں تو ان کی کوئی زبان بھی نہ سمجھتا تھا۔ پھر تاج۔ گوہر اور شہباز وغیرہ نہ عربی نام ہیں نہ اس زمانہ کے عربوں میں یہ نام مروج تھے۔

تاریخ جلیلہ (مصنفہ پیر غلام دستگیر نامی) میں جو خط سردار اعظم مکران کا درج ہے اس میں لکھا ہے کہ "حضرت سید احمد توختہ جب ترمذ سے کیچ مکران پہنچے تو ان کے ہمراہ ان کی دو صاحبزادیاں بی بی حاج اور بی بی تاج تھیں، بی بی حاج کا نکاح آپ نے شہزادہ مکران سلطان بہاء الدین (خلف سلطان قطب الدین) سے کر دیا اور اس کام سے فارغ ہو کر آپ لاہور روانہ ہو گئے"۔ آخر آپ مکران میں چند سال ٹھہرے ہوں گے۔ بادشاہ مکران نے آپ کی علمی فضیلت اور خاندانی بزرگی کی وجہ سے آپ سے رشتہ لینے کا سوال کیا ہوگا۔ اس وقت بی بی حاج کی عمر ۱۷-۱۸ سال سے کیا کم ہو گی۔ مورخین لاہور نے لکھا ہے کہ اس بی بی کے بطن سے سلطان حمید الدین حاکم ۵۷۶ھ میں پیدا ہوئے۔ اور سردار مکران اپنے خط میں اور صاحب تاریخ جلیلہ صفحہ ۴۴ پر لکھتے ہیں کہ ابھی وہ تین ہی سال کے تھے کہ بی بی حاج کا مکران ہی میں انتقال ہو گیا۔ لیکن قبر آپ کی لاہور میں بتائی جاتی ہے اور اور لاہور کے محلہ چلہ بی بیاں[1] کی آپ سرتاج بیان کی جاتی ہیں جو کسی طرح قرین قیاس نہیں۔

صاحب حدیقۃ الاولیاء اور صاحب تاریخ جلیلہ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ بی بی حاج اور تاج وغیرہ کا واقعہ کربلا سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ وہ حضرت علیؓ یا حضرت عقیل کی صاحبزادیاں ہیں۔ لیکن لاہور میں اس عام روایت کو وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ بی بیاں دشمنوں کے خوف سے اپنی عزت و عصمت کو بچانے کے لیے زمین میں زندہ سما گئیں۔ صاحب تاریخ جلیلہ صفحہ ۹۹ پر ان بی بیوں کے زمین میں سما جانے کا ذکر کرتے ہیں لیکن اس سے قبل صفحہ ۴۶ پر یہ بھی لکھتے ہیں کہ "سیادت پناہی بی بی حاج شہزادہ حمید الدین کو تین سال کی عمر میں چھوڑ کر انتقال فرما گئیں" نیز اپنی تاریخ میں وہ کیچ مکران کے موجودہ رئیس سردار بائے خان کا جو خط نقل کرتے ہیں اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بی بی حاج نے اس زمانہ میں انتقال کیا جب ان کے فرزند

---

[1] یہ محلہ اندرون اکبری دروازہ لکڑ منڈی کے متصل واقع ہے۔ اسی محلہ میں خانقاہ سید احمد توختہ اور پیر غلام دستگیر نامی کا مکان اور چلہ بی بیاں واقع ہیں۔ اسی محلہ میں خواجہ کمال الدین مسلم مشنری ووکنگ (انگلستان) اور خلیفہ ڈاکٹر عبدالحکیم ایم۔ اے پی ایچ ڈی کے قدیم مکانات تھے۔

حمید الدین کی عمر صرف تین سال کی تھی۔ اور چونکہ سید احمد توختہ اپنی صاحبزادی بی بی حاج کا نکاح شہزادہ بہاؤ الدین سے کرنے کے بعد لاہور چلے آئے تھے۔ اس لیے منکوحہ ہونے کی وجہ سے بی بی حاج کچھ مدت تک ان ہی میں رہیں اور وہیں ان کے ہاں چار فرزند ہوئے جن میں سب سے چھوٹے شہزادہ حمید الدین تھے۔ اور وہیں بی بی حاج کا انتقال ہو گیا۔ چونکہ سب نے شہزادہ حمید الدین کی ولادت ۵۷۰ھ لکھی ہے اور اس کے تیسرے سال بی بی حاج کا انتقال ہوتا ہے۔ اس لئے ان کا سال وفات ۵۷۳ھ سمجھنا چاہیئے۔

لیکن تعجب ہے کہ اس پر بھی ان کی قبر لاہور میں بتائی جاتی ہے اور ان کے متعلق یہ لکھا جاتا ہے کہ آپ زمین میں سما گئی تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ لاہور گڑھی شاہو میں "بی بیاں صاحب" کے نام سے ایک بہت قدیم قبرستان موجود ہے۔ داراشکوہ "سکینۃ الاولیاء" میں بی بی حاج تاج کے قبرستان کا ذکر کرتا ہے۔ اور وہ اس کا جائے وقوع شہر کے جنوب میں موضع بھیکووال کے نزدیک بتاتا ہے اور لکھتا ہے کہ اس قبرستان میں بیر کے ایک درخت کے نیچے حضرت میاں میر بیٹھا کرتے تھے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آج سے تین سو سال پیشتر بھی یہ مقبرہ بی بی حاج و تاج یا بیبی صاحبان کے نام سے مشہور تھا۔ لیکن ثابت نہیں ہوتا کہ بی بی حاج بھی یہیں دفن ہیں اور پھر زمین میں زندہ سما جانے کے واقعہ پر محض خوش عقیدہ اور کرامت پسند لوگوں کو ہی یقین آ سکتا ہے۔

حضرت علی ہجویری رح

جس غزنے سے ملی روحانیت اجمیر کو
آئیے لاہور میں وہ گنج عرفاں دیکھئے

حضرت علی ہجویری عرف داتا گنج بخش رح کے سوانح عمر حضرت فوق مرحوم کے قلم سے طبع ہو چکے ہیں۔ بلکہ یہ کتاب دو مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔ پہلی مرتبہ ۱۹۱۴ء میں طبع ہوئی دوسری مرتبہ ۱۹۳۱ء میں۔ قریباً پونے دو سو صفحے کی کتاب ہے لیکن اس غیر مطبوعہ کتاب میں جس کا نام "مآثر لاہور" ہے۔ چونکہ لاہور کے تمام مشہور مزاروں اور باغوں کا حال درج ہے۔ اس لیے مختصر طور پر اس میں بھی حضرت کے سوانح اور ان کے مزار کے حالات درج کئے گئے ہیں۔ خصوصاً گزشتہ تیس چالیس سال کے عرصے میں حضرت کے مزار کے ارد گرد بعض نئی تعمیرات نے جو اضافہ کر دیا ہے۔ ان کا ذکر ازدیاد معلومات اور یادگار کا باعث ہوگا۔ (مرتب)

حضرت کا اصل نام ابو الحسن علی بن عثمان الجلابی ہے۔ وطن غزنی تھا چونکہ غزنی کے محلہ ہجویر میں رہتے تھے۔ اس لیے ہجویری الغزنوی کہلاتے تھے۔ حضرت شیخ ابو الفضل بن حسن الختلی کے مرید تھے۔ اور انہی کے ارشاد کے مطابق پینتیس چالیس سال کی عمر تھی کہ ۴۳۱ھ[1] میں غزنی سے لاہور تشریف لائے۔ یہ زمانہ سلطان مسعود بن سلطان محمود کا تھا۔ آپ سے پہلے یہاں آپ کے

---

[1] حضرت علی ہجویری سلطان مسعود بن محمود کے زمانے میں اس کی وفات (۴۲۱ھ) سے قریباً دس سال بعد (بقیہ اگلے صفحہ پر)

پیر بھائی شاہ حسین زنجانیؒ جن کا مزار کھوئی میراں لاہور میں ہے، لوگوں کی ہدایت و تبلیغ اسلام کے لیے موجود تھے۔ لیکن جس دن آپ لاہور پہنچے۔ اسی دن ان کا انتقال ہوا۔ آپ ان کی نماز جنازہ میں شریک ہوئے۔ اس واقعہ کی تفصیل سکینۃ الاولیا۔ فوائد الفواد اور خزینۃ الاصفیا میں درج ہے۔ لکھا ہے کہ آپ کی تشریف آوری سے لاہور سے پہلے آپ کے پیر بھائی خواجہ حسین زنجانیؒ لاہور میں موجود تھے۔ لیکن آپ کے مرشد نے جب ایک دن آپ کو لاہور جانے کا حکم دیا تو آپ نے جواب میں عرض کیا۔

"برادرم حسین زنجانیؒ پیش ازیں در لاہور مامور است
حالا در مامور یے بندہ چہ حکمت است"

شیخ ابوالفضلؒ آپ کے مرشد نے فرمایا۔

"برو۔ درآں جا ساکن شو۔ ترا پرسیدنِ حکمت
چہ کار"

چنانچہ آپ حسب ایما مرشد لاہور آگئے۔ رات کا وقت تھا۔ آپ نے رات کہیں گزاری۔ صبح دیکھا کہ لوگ کثیر تعداد میں ایک جنازہ لیے جا رہے ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ شاہ حسین زنجانیؒ کا جنازہ ہے۔ یہ سن کر آپ مرشد کے فرمان کی حکمت اور رمز کو پہنچ گئے۔

لاہور میں آپؒ نے اپنی جائے اقامت کے پاس ایک مسجد تعمیر کرائی۔ شہزادہ دارا شکوہ نے سفینۃ الاولیاء میں لکھا ہے کہ "مسجدے کہ خود ساختہ بودند محراب آں نسبت بہ مساجد دیگر مائل بہ سمت جنوب است" یعنی جو مسجد آپ نے تعمیر کرائی اس کا محراب دوسری مساجد کی نسبت جنوب کی طرف مائل تھا۔ علمائے وقت نے اس پر اعتراض کیا۔ کہ قبلہ صحیح نہیں۔ آپ نے علما کو موقعہ پر آنے کی دعوت دی اور خود امام بن کر نماز پڑھائی۔ "بعد از نماز بہ حاضراں گفتند کہ نگاہ کنید کہ کعبہ بہ کدام سمت است۔ حجاب ہا از میان برخاست و کعبہ عیاں نمودار گشت" یعنی نماز کے بعد آپ نے حاضرین سے فرمایا کہ اب دیکھو کعبہ کس سمت ہے۔ تمام حجاب درمیان سے اٹھ گئے اور کعبہ سامنے نظر آنے لگا۔ غرض قبلہ کو اپنے سامنے بالمشافہ موجود پا کر تمام علما نے معذرت طلب کی۔ اور اس کرامت کی بدولت آپ کی شہرت دور و نزدیک سب جگہ پھیل گئی۔

آپ کا سلسلہ رشد و ہدایت اخیر دم تک جاری رہا۔ کشف المحجوب اور کشف الاسرار تصوف میں آپ کی دو مشہور کتابیں ہیں۔ رائے راجو ایک ہندو سلطان غزنوی کی طرف سے یہاں ایک معزز عہدے پر تھا۔ اس نے آپؒ کے دست مبارک پر اسلام قبول کیا۔ نام اس کا شیخ ہندی رکھا گیا۔ آپ کے روضہ کے موجودہ متولی اور مجاور اسی بزرگ کی اولاد سے ہیں۔ آپ کا لقب گنج بخش مشہور ہے۔ اس سے متعلق یہ روایت عام ہے۔ کہ جب حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ نے یہاں چلہ کاٹ کر اور

لاہور آئے اور سلطان ابراہیم کے زمانہ (۴۵۱ھ تا ۴۸۱ھ بقول بعض ۴۹۲ھ) میں وفات پا گئے۔ مسعود سے ابراہیم تک حسب ذیل بادشاہ غزنی کے تخت پر بیٹھے۔ امیر مودود۔ مسعود بن مودود (صرف چار یوم) بہاء الدولہ۔ ابوالحسن علی بن مسعود بن محمود (دو سال)۔ سلطان عبدالرشید بن محمود (ایک سال)۔ طغرل نمک حرام (۴۰ یوم)۔ فرخ زاد (۴۴۳ھ تا ۴۵۱ھ)۔ اس کے بعد ابراہیم۔

معتکف رہ کر فیض حاصل کیا۔ تو آپ نے یہ شعر پڑھا ؎

گنج بخش فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا
ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را راہنما

اس پر آپ کا نام گنج بخش مشہور ہو گیا۔ لیکن آپ کی کتاب کشف الاسرار سے ظاہر ہے کہ آپ کی زندگی ہی میں آپ کا یہ نام مشہور ہو چکا تھا چنانچہ آپ اس کتاب میں خود لکھتے ہیں :۔

"اے علی! خلقت تجھے گنج بخش کہتی ہے۔ حالانکہ تیرے
پاس ایک حبّہ بھی نہیں۔ گنج بخش تو اسی کو سزاوار ہے
جو مالک الملک ہے "

حضرت علی ہجویری کی وفات ۴۶۵ھ میں ہوئی۔ اس وقت سلطان ابراہیم غزنوی افغانستان اور پنجاب کا بادشاہ تھا۔ اسی بادشاہ نے آپ کا مقبرہ بھی تعمیر کرایا۔ شہزادہ دارا شکوہ لکھتا ہے۔ کہ "جمعہ کو خلقت انبوہ در انبوہ روضہ منورہ کی زیارت سے مشرف ہوتی ہے "گویا نوسو سال سے ہر جمعرات کو بے شمار مخلوق آپ کے مزار پر فاتحہ کے لیے جاتی ہے۔ اور اس دن مزار پر جسے عوام "دربار صاحب" کہتے ہیں میلہ سا لگ جاتا ہے۔

آپ کے احاطہ مزار کے اندر حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے حجرہ اعتکاف، اور مسجد کے علاوہ نواب امام الدین صوبہ کشمیر کی قبر اور کئی اور قبریں ہیں۔ بیرونی عمارتوں میں راجہ چند و لال کا تعمیر کردہ دالان، مقبرہ نواب میر مومن خان، زو تعمیر ڈیوڑھی، قبر نواب غلام محبوب سبحانی اور مسجد بنا کردہ میاں غلام رسول کٹھڑ والا قابل ذکر ہیں۔

آپ کے مزار پر پہلے گنبد نہیں تھا۔ ۱۲۷۸ھ میں حاجی نور محمد نام ایک بزرگ نے گنبد تعمیر کرایا اور مسجد قدیم کو گلزار شاہ فقیر کی حسنِ سعی سے دوبارہ مرمت نصیب ہوئی۔

حضرت خواجہ اجمیریؒ کے علاوہ حضرت فرید الدین گنج شکرؒ اور کئی دیگر مشائخ نامدار یہاں سے فیوض و برکات حاصل کر چکے ہیں شہنشاہ اکبر نے بھی اس مزار پر آ کر اپنی عقیدت کے پھول چڑھائے ہیں۔ میر عبدالعزیز زنجانی اس مزار کے متعلق لکھتے ہیں ؎

مزار در نثار شاہ ہجویری ندیدستی
کہ تخت آسمانہ پیر انوش جوش انس و جاں بینی
گدائے درگہش از منزلت شاہجہاں یابی
غلام خادمش از مرتبہ مخدوم جہاں بینی

مقبرہ کی طرف جانے کا راستہ اور فرش، دروازہ کا چوکھٹہ، اس کے دائیں بائیں کے چبوترے اکبر ہی کے تعمیر کرائے ہوئے ہیں۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ جس کے عہد میں بہت سے مقبرے اور مساجد منہدم ہو گئیں۔ اس مزار پر عرس کے دنوں جو ہر سال ۲۰ صفر المظفر کو ہوتا ہے۔ ایک ہزار روپیہ نقد بطور نذر بھیجا کرتا تھا اور اپنے طویل عہد میں اس نے چند بار اس مزار کی مرمت بھی کرائی

سمت ۱۸۹۵ء میں مہارانی چند کور رانی مہاراجہ کھڑک سنگھ نے احاطہ مزار کے اندر ایک شاندار دالان اپنے صرف سے تیار کرایا۔ جو اب تک موجود ہے۔

چند سال ہوئے میاں غلام رسول کھڈ نے یہاں ایک عالیشان مسجد قریباً ایک لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر کرائی۔

[اس مسجد کے دروازے پر علامہ اقبال کا یہ قطعہ تاریخ درج ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسجد ۱۳۴۲ھ میں از سر نو تعمیر ہوئی تھی —

سال بنائے حرم مومناں — خواہ ز جبریل و زہ اُلفت مجو
چشم بہ "المسجد الاقصیٰ" فگن — ۱۳۴۲ھ — "الذی بارکہ" ہم بگو

مادہ تاریخ میں قرآن کریم کے پندرھویں پارہ کی ابتدائی آیت کی طرف اشارہ ہے۔ "المسجد الاقصیٰ" اور "الذی بارکہ" دونوں ٹکڑوں کے عدد ملانے سے سال تاریخ ۱۳۴۲ھ حاصل ہوتا ہے۔

حضرت سید علی ہجویریؒ ان زندہ جاوید ہستیوں میں سے ایک ہیں جن کے عظیم علمی کارنامے پوری طرح محفوظ نہیں رہ سکے پھر بھی جو کچھ ہم تک پہنچ سکا۔ اس سے ان کی عظمت اس طرح آشکارا ہو جاتی ہے کہ صوفیہ متقدمین و متاخرین میں ان کی مثال تلاش کرنا آسان نہیں۔ ان کی علمی استعداد کے متعلق مصنفین اجمالاً ایک فقرہ لکھتے ہیں کہ "جامع بود میان علوم ظاہر و باطن" اور کشف المحجوب کے مطالعہ سے یہ حقیقت پوری طرح روشن ہو کر سامنے آجاتی ہے اگرچہ ملا جامی نے اپنی کتاب نفحات میں دارا شکوہ نے سفینۃ الاولیاء میں اور مفتی غلام سرور نے خزینۃ الاصفیا میں کشف المحجوب کی بے حد تعریف کی ہے مگر ان تمام اقوال سے زیادہ موثر اور جامع قول حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء دہلوی کا وہ ملفوظ ہے جو غیر مطبوعہ "درر نظامی" میں ملتا ہے فرماتے ہیں :۔

"کتب تصوف میں شیخ علی ہجویریؒ کی کتاب "کشف المحجوب"
کو وہ مرتبہ حاصل ہے کہ اگر کسی طالب صادق کو مرشد کامل نہ مل
سکے۔ اسی کتاب کو مطالعہ کرے۔ اس کی مراد پوری ہو جائے گی میں
نے خود اس کو اول سے آخر تک پڑھا ہے۔"

(بحوالہ تصوف اسلام از مولانا عبدالماجد دریابادی)

یہ ہے شیخ علی ہجویریؒ کا وہ کارنامہ جس کی وجہ سے آپ آسمان صدق وصفا پر مہر درخشاں کی طرح چمک رہے ہیں آپ نے اس کتاب کا آغاز ہی علم سے کیا ہے لیکن علم باطن یا طریقت کے ساتھ علم ظاہر یا شریعت کو نہایت ضروری قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

"علم ظاہر سے مراد معاملات کا علم ہے اور علم باطن سے مقصد نیت کا صحیح کرنا ہے۔ اگر کوئی چاہے کہ ان دو میں سے صرف ایک کو حاصل کرے تو وہ قطعی ناکام رہے گا کیونکہ ان دونوں کو حاصل کئے بغیر چارہ ہی نہیں۔ اگر علم ظاہر حاصل کر لیا اور باطن کی پروا

نہ کی تو یہ منافقت ہو گی اور اگر صرف باطن کے درپے ہوا۔ اور ظاہری علم سے بے نیاز رہا۔ تو یہ الحاد و زندیقیت ٹھہری۔ باطن کے بغیر صرف ظاہری شریعت نقص ہے اور ظاہری شریعت کے احکام کو سمجھے اور عمل کئے بغیر صرف باطن پر قناعت ہوا و ہوس ۔۔۔۔۔۔ انبیاء اور اولیاء کو بھی علم ہی کے ذریعے اللہ تعالےٰ کی معرفت حاصل ہوئی۔ کوئی شخص علم سے بے نیاز رہ کر وادیٔ عرفان و سلوک میں قدم نہیں رکھ سکتا۔"

" بقول محمد بن فضل علم کی تین قسمیں ہیں۔ علم من اللہ۔ علم مع اللہ۔ علم باللہ۔ آخری علم، علم معرفت ہے جس کے ذریعے انبیاء و اولیاء نے اللہ تعالےٰ کو پہچانا۔ اس کے بغیر وہ بھی اُس کو نہ جان سکے۔"

" علم من اللہ سے مراد علم شریعت ہے۔ یعنی اللہ تعالےٰ کے احکام و فرائض کا علم اور علم مع اللہ طریق حق کے مقامات اور اولیاء کے درجات کا علم ہے۔ اور شریعت کو قبول کئے بغیر معرفت درست ہو ہی نہیں سکتی جس کو معرفت کا علم نہیں ہوتا اس کا دل جہالت کی موت کا شکار ہے۔ اور جسے علم شریعت حاصل نہیں۔ وہ نادانی کے مرض میں مبتلا ہے۔"

ایک جگہ خدا رسیدہ بزرگوں کے آداب کی تصریح اس طرح فرماتے ہیں: "سالک وہ ہے جو ہر حال میں احکام الٰہی کی پیروی کرے۔ بندوں کا حق ادا کرے۔ کسی شیخ کا مرید ہو۔ کیونکہ اس کے بغیر اس کے لیے ہلاکت ہے۔ وہ ہر درویش کا بعزت خیر مقدم کرے۔ اس کا سفر یا تو بہ نیت حج ہو یا برائے جہاد یا تحصیل علم کے لئے یا کسی بزرگ کے مزار کی زیارت کے ارادہ سے۔ اس کا کھانا پینا حلال ہو اور اتنا جتنا مریض کھاتے ہیں۔ دنیا دار کی دعوت قبول نہ کرے۔ جب نیند کا غلبہ ہو تو سوئے۔ خاکساری اور تواضع سے چلے۔ رعونت اور تکبر سے کنارہ کش رہے۔ خاموشی اختیار کرے۔ کہ یہ گفتار سے بہتر ہے بولے تو زبان پر حق جاری ہو جو کچھ مانگے خدا سے مانگے۔ مجرّد رہنا سنت کے خلاف ہے۔ اور اس حالت میں نفسانی خواہشات کا غلبہ رہتا ہے۔ مگر جس سالک کا ارادہ خلقت سے دُور رہنے کا ہو۔ اس کے لیے مجرّد رہنا زینت ہے۔"

کشف المحجوب کے آخر میں سماع پر بحث ہے۔ حضرت ہجویریؒ کے نزدیک سماع جائز ہے مگر اس کے لیے حسب ذیل شرطیں ہیں:۔

سالک بلاضرورت سماع نہ سُنے اور طویل وقفہ کے بعد سُنے تاکہ اس کی تعظیم دل میں قائم رہے۔ محفل سماع میں مرشد موجود رہے۔ عوام شریک نہ ہوں۔ قوّال فاسق نہ ہوں۔ سماع کے وقت دل دنیاوی علائق سے پاک ہو۔ طبیعت لہو و لعب کی طرف مائل نہ ہو۔ اگر وجد کی کیفیت طاری ہو جائے تو اس کو تکلف کے ساتھ نہ روکے۔ اور یہ کیفیت جاتی رہے۔ تو تکلف کے ساتھ اس کے جذب کرنے کی کوشش نہ کرے۔ وجد کے وقت کسی سے مساعدت کی اُمید نہ رکھے۔ اور کوئی مساعدت کرے تو اس کو نہ روکے۔ قوّال کے گانے کی اچھائی اور بُرائی کا اظہار نہ کرے۔ محفل سماع میں لڑکے نہ ہوں۔

حضرت ہجویریؒ نے سماع کے وقت رقص کو کسی حال میں بھی پسند نہیں کیا۔

کشف المحجوب اور کشف الاسرار کے علاوہ حضرت کی تصنیفات سے حسب ذیل کتابوں کے نام ملتے ہیں:۔

(۱) منہاج الدین (اس میں اہل صفہ کے مناقب لکھے تھے) دوسری کتابوں کے مضامین ان کے نام سے ظاہر ہیں (۲) کتاب الفنا والبقاء (۳) اسرار الخرق والمؤنات (۴) کتاب البیان لاہل العیان (۵) بحر القلوب (۶) الرعایۃ لحقوق اللہ۔

لیکن ان کتابوں کا اب کہیں وجود نہیں۔ چونکہ آپ شہرت سے دُور بھاگتے تھے اس لئے جو کتابیں آپ نے اپنے نام کے

بغیر چھپوائیں مطلب پرستوں اور نااہل لوگوں نے انہیں اپنا لیا اور وہ اس طرح قعرِ گمنامی میں چلی گئیں ——— مرتب]

سید یعقوب زنجانیؒ

گو گذشتہ دور کی سی وہ اب نہیں رونق کوئی
پھر بھی فیضِ قبرِ شاہ صدر دیوان دیکھئے

تحقیقاتِ چشتی اور تاریخ لاہور (کنہیا لال) میں لکھا ہے کہ آپ ۵۳۵ھ میں بعہد سلطان بہرام[1] شاہ غزنوی سید شاہ حسین زنجانی اور شیخ المشائخ سید اسحاق[2] زنجانی کے ہمراہ لاہور تشریف لائے۔ عجیب بات یہ ہے کہ دونوں مصنفوں نے شاہ حسین کی وفات ۴۳۱ھ لکھی ہے۔ بلکہ ہسٹری آف لاہور (انگریزی) کے مصنف سید محمد لطیف اور راقم نے بھی سوانح داتا گنج بخشؒ میں شاہ حسین زنجانی کا سال وفات ۴۳۱ھ ہی لکھا ہے اور اسی پر سب مصنف متفق ہیں۔ لیکن تذکرہ صدر دونوں مصنفوں کا یہ بھی تسلیم کرنا کہ شاہ حسین زنجانی ۴۳۱ھ میں وفات پا گئے اور یہ بھی لکھنا کہ وہ ۵۳۵ھ میں بعہد سلطان بہرام شاہ لاہور آئے کس طرح درست ہو سکتا ہے بلکہ تحقیقات چشتی کے مصنف نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ "ان ہر سہ زنجانی بزرگوں کے ساتھ شیخ علی الحق بھی جن کا مزار سیالکوٹ میں ہے اور جو ان کے قریبی رشتہ دار تھے تشریف لائے تھے"۔ لیکن جب تاریخ کی چھان بین کی جائے تو یہ واقعہ بھی سراسر غلط نظر آتا ہے۔ اس لیے کہ سیالکوٹ کی تاریخوں میں امام علی الحق کی آمد کا ذکر سلطان فیروز شاہ تغلق کے زمانہ سے تعلق رکھتا ہے۔ سلطان فیروز شاہ بعمر پچاس سال ۷۵۲ھ میں دہلی کا بادشاہ ہوا۔ ۷۸۹ھ میں عالم پیری کی وجہ سے اپنی زندگی ہی میں اس نے اپنے فرزند کو سلطنت سونپ دی اور ۱۸ رمضان ۷۹۰ھ کو پیر نوے سالہ ہو کر اس نے انتقال کیا۔

شاہ یعقوب زنجانی اور ان کے ساتھی شاہ حسین زنجانی محمود یا مسعود اوّل کے زمانہ میں لاہور تشریف لائے۔ شاہ حسین زنجانی تو ۴۳۱ھ میں انتقال فرما گئے۔ شاہ یعقوب زنجانی کا سال وفات صاحب تحقیقات چشتی و صاحب تاریخ لاہور ۴۶۶ھ لکھتے ہیں جو قرین قیاس نہیں۔

تحقیقاتِ چشتی میں ان کے مزار کی متعلقہ عمارات و قبور کا مفصل حال درج ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مزار کا احاطہ بہت وسیع تھا۔ احاطہ مزار کی قبروں کے علاوہ یہاں داروغان مہاراجہ رنجیت سنگھ اور قاضیان لاہور کے قبرستان بھی تھے مزار کے مغرب کی طرف قصاب خانہ اور مزار کے متصل پہلوانوں کا اکھاڑہ تھا۔ قبر پر سنگ مرمر کا تعویذ تھا اور ایک نشست گاہ خواجہ معین الدین اجمیری کی بنی تھی جہاں انھوں نے مزار حضرت علی ہجویریؒ کی طرح اعتکاف کیا تھا۔ اس زمانہ میں (یعنی آج سے نوّے سال قبل) پرانی مسجد وں کے آثار باقی تھے۔ مشرقی جانب سبزی منڈی تھی جس کی وجہ سے یہاں بہت رونق رہتی تھی اسی طرف دیوان رتن چند داڑھی والے کا تالاب تھا اور اس نے بھی احاطہ مزار سے کچھ زمین لے لی تھی۔ خانقاہ کے محرابی دروازہ میں سنگ سیاہ تھا۔

---

[1] بہرام شاہ بن مسعود بن ابراہیم بن مسعود اوّل بن محمود غزنوی اپنے بھائی ارسلان شاہ کو قتل کرنے کے بعد ۵۱۱ھ میں بادشاہ بنا اور خوب حکومت کے بعد اس نے ۵۴۷ھ میں انتقال کیا۔ [2] سید اسحاق زنجانی کے نام سے لاہور میں کسی بزرگ کا کوئی مزار نہیں ملتا۔

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

اس کے بعد ۱۸۸۴ء کا مصنف رائے بہادر کنہیا لال لکھتا ہے "چبوترے کے غرب کی سمت پختہ عمارت ایک عالی شان مسجد بنی ہوئی ہے۔ اس کی تین محرابیں منقطع ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی وہاں کئی عمارتیں ہیں۔ پہلے ہر جمعرات کو یہاں میلہ ہوتا تھا۔ اب ہر سال ۱۹ رجب کو آپ کا عرس ہوتا ہے۔ لیکن اب کچھ چرچا نہیں۔ کیونکہ دونوں طرف سے لالہ رتن چند کے تالاب اور ان کی سرائے نے مزار اور اس کی متعلقہ عمارتوں کو چھپا دیا ہے"

اب معلوم نہیں اس مزار کی متعلقہ زمینیں متولیوں نے بیچ دیں یا لوگ خود بخود قابض ہوتے گئے۔ راقم نے ۱۹۰۲ء میں وہاں جو کچھ دیکھا آج (۱۹۴۲ء) میں وہ بھی نظر نہیں آیا۔ جنگلہ کا کٹہرا لکڑی کا تھا مسجد تو وہاں کوئی نہ تھی۔ لیکن معدوم سے آثار ضرور تھے۔ قصاب خانہ اور کشتی گیروں کے اکھاڑے نابود ہو چکے تھے۔ قصاب خانہ غالباً اس زمانہ میں یہاں سے اٹھایا گیا جب ۱۸۷۰ء میں میو ہاسپٹل اور میڈیکل کالج کی تعمیر شروع ہوئی۔ قبرستان بھی اس زمانہ میں بند ہو چکا تھا۔ احاطہ مزار کی جو زمین دیوان رتن چند کی سرائے اور تالاب سے بچ سکی وہ یار لوگوں کے کام آئی چنانچہ اب وہاں کئی مکانات موجود ہیں۔ انھیں میں خانقاہ کے متولی بھی رہتے ہیں۔ کچھ زمین زنانہ ہسپتال والوں نے لے لی۔ سرائے رتن چند ہی میں سبزی منڈی لگتی تھی۔ جب ۱۹۲۷ء میں لاہور میں ہندو مسلمانوں کا فساد عظیم ہوا تو ہندوؤں نے سبزی منڈی بیرون موچی دروازہ کا بائیکاٹ کر کے اس سرائے میں ایک ہندو سبزی منڈی قائم کر لی تھی۔ چونکہ وہ ہنگامی جوش تھا قائم نہ رہ سکی۔ اب وہاں ماڈل ٹاؤن اور دوسری بس کمپنیوں کا اڈا ہے۔

شاہ صدر دیوان کا مزار اب نظروں سے بالکل پوشیدہ ہے۔ میو ہسپتال کی شمالی دیوار کے سامنے ایک چھوٹی سی تنگ گلی ہے۔ اس گلی کے اوپر لکھا ہوا ہے "راستہ درگاہ حضرت سید یعقوب شاہ صدر دیوان" اس راستہ کے دائیں طرف سرائے رتن چند کی پشت اور بائیں ہاتھ کو شمالی و غربی جانب زنانہ ہسپتال کی طویل دیوار ہے۔

خانقاہ کے محرابی دروازہ سے گزر کر ایک پختہ چار دیواری کے اندر شاہ صدر دیوان کا ایک چبوترہ پر مزار ہے اس چبوترہ کا جنگلا اور چبوترہ کی قبروں کی مرمت اور چبوترہ کا فرش ایک کشمیری نے ۱۳۶۰ھ میں خشتی تعمیر کرایا تھا اس کا نام تاج دین ولد فضل الدین ونڈوالا تھا۔ چبوترہ پر پانچ قبریں ہیں تین قبروں کے بعد حضرت صدر دیوان کا مزار ہے اور ان کے بعد اسی چبوترہ پہ ایک اور قبر ہے آپ کی قبر دوسری قبروں سے ذرا بلند ہے۔ جنوب کی طرف ایک بوسیدہ سے چبوترہ پر گیارہ قدیم قبریں ہیں اور اور پرانے وَن کے درخت ہیں۔ پیپل کا درخت بھی حال ہی میں لگایا گیا ہے چار دیواری سے باہر خانقاہ کے دروازہ کے ساتھ ہی شمال کی طرف ایک کنواں ہے اور بڑ کا درخت ہے اس وقت آپ کے مزار کے ساتھ نہ کوئی مسجد ہے نہ کسی مسجد کے آثار ہی ہیں نہ خواجہ اجمیری کی اعتکاف گاہ ہے۔

جہاں آپ کا مزار ہے یعنی شاہ عالمی دروازہ کے باہر سرائے رتن چند اور زنانہ ہسپتال کے درمیان وہاں زمانہ قدیم میں تلہ یا طلا بخاری کے نام سے ایک متمول محلہ آباد تھا۔ تاریخ لاہور (مفتی تاج الدین) میر غلام علی آزاد بلگرامی صاحب خزانۂ عامرہ نے شاہ فقیر اللہ آفریں لاہوری کے ساتھ اسی محلہ میں ملاقات کی تھی۔ آفریں کے متعلق وہ لکھتے ہیں "در محلہ بخارائے لاہور سکونت داشت" صاحب تذکرۃ الاحباب در سیدنجم الدین

الملقب سید اسحاق گازرونی کا مزار مسجد وزیر خان کے صحن میں موجود ہے اور وہ شاہ حسین زنجانی کی وفات کے بعد بہت عرصہ بعد لاہور میں آئے۔ ان کے حالات علیحدہ لکھے گئے ہیں۔

[1] مسجد اب دوبارہ تعمیر ہو گئی ہے۔ (مرتب)۔ [2] یہ تذکرہ بزمانہ محمد شاہ ۱۱۴۵ھ میں لکھا گیا۔

المعروف بہ علی الاکبر علوی) لکھتے ہیں۔

"مزار پرُ انوار حضرت صدر شاہ زنجانی در بخارائے کہ در محلہ لاہور است الآں گذر بخارا نامند او آنجاست" میر عبدالعزیز بن عزیز زنجانی جو شاہ صدر دیوان ہی کے ہم وطن اور لاہور کے رہنے والے تھے۔ اپنے قصیدہ میں اس جگہ کو محلہ بخارا ہی لکھتے ہیں۔ ان کے اشعار ملاحظہ ہوں:-

بخارا خورد بہ لاہور است او بنگر نگر آنک
کہ از ابزد پرستان قبۂ اسلامیاں بینی
بہر سو تاجرے فاردر بسیاری مروی اطواری
کہ از روئے تلطف بر گدایاں مہرباں بینی
اگر در بارگاہ دیں پناہ صدر شاہ آئی
کہ خاک آستانش سرمہ روحانیاں بینی
زہے عکس جمال ایزدی یعقوب زنجانی
کہ اندر حضرتش طائف صف کروبیاں بینی

سید یعقوب زنجانی ہی کا دوسرا نام شاہ صدر زنجانی تھا۔

سلطان قطب الدین ایبک

جائے عبرت ہے کہ جس منزل کے اوپر پھر
اس کے نیچے مدفن شاہِ غلاماں دیکھئے

شہاب الدین غوری کی وفات (۶۰۲ھ) کے بعد اس کے تین غلاموں میں جو سب سے بڑے پایہ کے بادشاہ ہوئے۔ قطب الدین ایبک اس کا داماد اور متبنٰی بھی تھا۔ ایبک کی حقیقت یہ ہے کہ ترکستان کے ایک سوداگر نے اسے چھوٹی سی عمر میں خریدا تھا۔ جب وہ اسے نیشاپور میں لایا تو وہاں کے قاضی فخر الدین کوفی نے اسے خرید لیا۔ قاضی نے اپنی اولاد کے ساتھ اس کی تعلیم و تربیت کی۔ یہاں تک کہ چھوٹی عمر ہی میں حافظ قرآن ہو گیا، اور عربی و فارسی پر اس نے عبور حاصل کر لیا۔ ایک سوداگر نے اس ہونہار بچہ کو معقول قیمت دے کر قاضی سے خرید لیا۔

یہ نیا سوداگر اس غلام بچہ کو غزنی میں سلطان شہاب الدین کے پاس لے آیا۔ سلطان نے بہت سلیقہ سے اس کو اپنے لئے خرید لیا، ایبک اس کو اس لیے کہتے تھے کہ اس کی چھ انگلیاں تھیں اور چھنگلیا ٹوٹی ہوئی تھی۔ اس لیے اس کا نام ایبک[1] (شل) مشہور ہو گیا۔

---

[1] تازہ تحقیقات کے مطابق ایبک ایک ترکی قبیلہ کا نام ہے۔ یہ قطب الدین کے ساتھ خاص نہیں تھا۔ طبقات ناصری سے معلوم ہوتا ہے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ایبک شہاب الدین کے ہمراہ رہ کر ہر جنگ میں اپنی بہادری کے جوہر دکھاتا اور بادشاہ کی نظروں میں روز بروز عزت حاصل کرتا گیا۔ محمد غوری نے تھانیسر کی جنگ کے بعد ہندوستان میں اسے اپنا نائب مقرر کر دیا۔ اس نے اپنی نیابت (۱۱۹۳ء سے ۱۲۰۶ء تک) کے زمانے میں ہندوستان کے بڑے بڑے علاقے غزنی کی سلطنت میں شامل کر دیئے۔

بادشاہ کی چونکہ صرف ایک ہی لڑکی تھی۔ اس لیے اس نے ایبک کو شجاع و دلیر، سخی و فیاض اور فرمان پذیر دیکھ کر اپنی بیٹی کا اس سے نکاح کر دیا۔ ترکی نژاد ہونے کی وجہ سے شجاعت تو ماں کے پیٹ سے لے کے نکلا تھا۔ فیاضی میں بھی کسی سے کم نہ تھا۔ ایک مرتبہ بادشاہ نے اس کی خدمات سے خوش ہو کر اس کو بہت سا انعام و اکرام دیا۔ اس نے چشم زدن میں وہ تمام نقد و جنس فراشوں۔ ملازموں اور اپنے بھائی ترک نژادوں میں تقسیم کر دیا۔

یوں تو ہندوستان میں یہ برسوں تک رہا۔ لیکن بادشاہ کی وفات کے بعد صرف چار سال (۱۲۰۶ء لغایت ۱۲۱۰ء) بادشاہ رہا۔ اس کے زمانہ میں ہندوستان کو غزنی اور غور سے کوئی تعلق نہ رہا، اس لحاظ سے قطب الدین ایبک ہندوستان میں مسلمانوں کا پہلا خود مختار بادشاہ تھا۔

شہاب الدین غوری کے واقعہ قتل کے بعد جب اس کا برادر زادہ سلطان محمود غزنی اور غور کے تخت پر بیٹھا تو اس نے قطب الدین ایبک کو جو اس وقت ملک قطب الدین کہلاتا تھا۔ چتر۔ جلوس شاہی اور خطاب سلطانی اور ہندوستان کی حکومت کا حکم ارسال کر دیا۔ ان دنوں قطب الدین ایبک لاہور میں تھا اور بادشاہ ہو کر بھی عموماً لاہور ہی میں رہتا تھا۔ چنانچہ لاہور ہی میں منگل کے دن ۱۸ ذیقعدہ ۶۰۳ھ کو اس نے تاج شاہی سر پر رکھا اور سکہ اور خطبہ اپنے نام سے جاری کیا۔ منشی سجان رائے عالمگیری خلاصۃ التواریخ میں لکھتا ہے :-

"بازدہم ربیع الاول ۶۰۳ھ سکہ و خطبہ بنام خود کرد"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ ہونے کے ساڑھے تین ماہ بعد اس نے اپنا سکہ چلایا۔ لیکن یہ درست معلوم نہیں ہوتا۔ ہم

کہ اس زمانے میں کئی ترک امیر ایسے تھے جن کے ناموں کے بعد میں لفظ ایبک آتا تھا۔ مثلاً بہاؤ الدین ایبک وغیرہ۔ ترکستان میں اب بھی اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں شرکت کے لیے جو روسی وفد آیا تھا اس میں دو ترک ادیب بھی تھے جن میں سے ایک کا نام آغائے موسیٰ ایبک تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ نام اب بھی مستعمل ہے۔ وہ ایبک کو بطور تخلص استعمال کرتے ہیں۔

ایبک کا لفظ مفرد نہیں بلکہ مرکب ہے "ای" کے معنے چاند اور "بک" کے معنے خان ہیں۔ یعنی چاند خان۔ چنانچہ قطب مینار کے کتبہ میں بھی ای بک علیحدہ علیحدہ لکھے گئے ہیں۔ مرزا غالب اپنے متعلق لکھتے ہیں ؎

ایبکم از جماعت اتراک ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ در تمامی ز ماہ دہ چندیم

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا غالب جو ترک تھے ایبک ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے ایبک ترکوں کے کسی قبیلہ یا خاندان کا نام ہے۔ (مرتب)

قدر عرصہ تک خاموشی کا کیا مطلب؟

قطب الدین ایبک کی سخاوت و فراخ دستی اور سیر چشمی نے اس کو لکھ بخش اور لکھ داتا کا خطاب دلا رکھا تھا۔ قطب صاحب کی لاٹھ جس کو قطب مینار بھی کہتے ہیں اسی کی تعمیر کردہ ہے۔ اس کے قریب ہی اس نے ایک خوبصورت مسجد بھی بنوائی تھی جس کے آثار اب تک موجود ہیں۔ اس کو مسجد قوۃ الاسلام کہتے تھے۔[1]

جس بادشاہ نے بڑے جاہ و جلال سے ہندوستان میں حکومت کی جس نے لاکھوں اور کروڑوں روپے مستحقین کو دے دیئے۔ جس کے عدل و انصاف کے افسانوں سے تاریخوں کے اوراق لبریز ہیں جس کی شجاعت نے دشمنوں کو زیر اور جس کی سخاوت نے لوگوں کو محکوم اور جس کے عدل نے رعایا کے ہر طبقہ کو احسان مند اور شکر گزار بنا رکھا تھا۔ چشم بصیرت ہو تو دیکھو کہ جس شخص نے مخلوقِ خدا کو اپنی حکومت کے ایام میں اس قدر آرام دے رکھا تھا۔ اس کی آخری آرام گاہ کس حال میں ہے ؎

دوسرا رخ زندگی کا کتنا عبرت خیز ہے
چشم عبرت سے ذرا گورِ غریباں دیکھئے

قطب الدین ایبک کو چوگان (پولو) کا بڑا شوق تھا۔ لاہور میں ایک وسیع میدان چوگان کے لیے وقف تھا۔ کئی قسم کے عربی اور ترکی اور ہندی گھوڑے صرف چوگان کے لیے مخصوص تھے۔ سنہ ۱۲۱۰ء مطابق سنہ ۶۰۷ھ میں لاہور میں چوگان کھیل رہا تھا کہ گھوڑے سے گر کر انتقال کر گیا۔ اور یہیں دفن ہوا۔ تاریخ فرشتہ کا مصنف لکھتا ہے کہ لاہور میں چوگان بازی میں مصروف تھا کہ ناگاہ گھوڑے سے گرا اور زین کا اگلا حصہ جو لوہے کا بنا ہوا تھا اس کے سینہ پر اس زور سے لگا کہ وہ جاں بر نہ ہو سکا اور وہیں فوت ہو گیا۔ وہ چار برس بادشاہ رہا۔ اور فتح دہلی سے لے کر آخری دم تک ہندوستان میں اس کی عمر بیس برس چند مہینے تھی۔

تاریخ ہندوستان مصنفہ سید عبد القادر ایم اے میں صفحہ ۲۳۲ پر لکھا ہے:۔

"ابتدا میں اس کی قبر پر گنبد بنا ہوا تھا اور ہر سال یہاں میلہ لگتا تھا۔ لیکن مرور زمانہ سے گنبد گر گیا اور چبوترہ جس پر قبر واقع تھی منہدم ہو گیا۔"

قبر کی شان و عظمت گنبد تک ہی محدود نہ تھی۔ ہندوستان کا سب سے پہلا مسلمان بادشاہ ہو۔ یہ ناممکن ہے کہ اس کے بیٹے[2] آرام شاہ یا سلطان شمس الدین التمش نے جو اس کا غلام اور داماد تھا اور آرام شاہ کے بعد ہندوستان کا بادشاہ ہوا۔ اس کی قبر اور اس کے احاطے کو وسیع پیمانے پر تعمیر نہ کرایا ہو۔ مسلمانوں کی سلطنت کے زوال کے بعد اس جلیل القدر بادشاہ کی قبر

---

[1] چونکہ تحقیقات چشتی اور تاریخ لاہور میں اس بادشاہ کے متعلق کوئی ذکر نہ تھا اور ہسٹری آف لاہور میں تھا بھی تو بالکل مختصر اور اس کے مزار کے متعلق وہ بھی خاموش ہے۔ اس لیے قطب الدین ایبک کے حالات ذرا تفصیل سے لکھنے پڑے۔

[2] تاریخ مبارک شاہی سے پتہ چلتا ہے کہ سنہ ۶۱۵ھ میں جب سلطان شمس الدین التمش اپنے حریفوں کو شکست دے کر لاہور پہنچا

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

عرصۂ دراز تک کس مپرسی کے عالم میں رہی۔ یہاں تک کہ سکھوں کی عملداری میں اس مقبرہ کی تمام متعلقہ عمارات جن میں مسجد، باغ، فصیل، ڈیوڑھیاں اور دالان وغیرہ تھے مسمار کر دی گئیں۔

سلطان کی یہ قبر اس وقت انار کلی بازار میں ہسپتال روڈ پر ایک مختصر سی گلی میں واقع ہے اور یہ عظیم المرتبت بادشاہ ایک ذولت مند ہندو وکیل کے بالاخانے کے نیچے ہمیشہ کی نیند سو رہا ہے۔ اگر انگریزی حکومت کا محکمۂ آثار قدیمہ اس جلیل القدر شہنشاہ کی ٹوٹی پھوٹی قبر کی طرف توجہ نہ کرتا اور اس کی مرمت کرا کے اس کو محفوظ یادگاروں میں شامل نہ کر لیتا تو یہ معمولی آثار بھی نظر نہ آ سکتے۔ لاہور میونسپل کمیٹی (کارپوریشن) نے اس بازار اور گلی کا نام جہاں یہ مزار واقع ہے ایک اسٹریٹ رکھ کر اس کا نام تھوڑا بہت پھر زبانوں پر جاری کر دیا ہے[1]۔[2]

پیر مکی رح

پیر مکی کے مزار پاک کے انوار فیض
آنکھ لائق دیکھنے کے ہو تو ہاں دیکھیے

حضرت پیر مکی کا ذکر لاہور کی تاریخوں کے علاوہ خزینۃ الاصفیا میں بھی درج ہے۔ جو بزرگان دین کے حالات و سوانح میں ایک ضخیم فارسی تذکرہ ہے۔ صاحب خزینۃ الاصفیا نے جو کچھ لکھا ہے وہ تحفۃ الواصلین کے حوالے سے لکھا ہے جو راقم کو دستیاب نہیں ہو سکی۔

خزینۃ الاصفیا میں آپ کا نام سید شیخ عزیز الدین مکی درج ہے۔ صاحب تاریخ لاہور نے سید جلال الدین لکھا ہے۔ تحقیقات چشتی اور یادِ رفتگان (مصنفہ راقم) میں نام کی بجائے صرف پیر مکی لکھا ہوا ہے۔ صاحب خزینۃ الاصفیا نے آپ کا سالِ وفات ۴۱۲ھ لکھا ہے اور قطعہ تاریخ یہ درج کیا ہے۔

---

[1] تو اس نے حکم دیا کہ سلطان مرحوم کے مرقد پر اس کے شایانِ شان مقبرہ تعمیر کیا جائے۔ چنانچہ سنگ سفید کی ایک عظیم الشان عمارت عالمِ وجود میں آئی جو تیموریوں کے عہد تک زیارت گاہِ عوام تھی (منتخب التواریخ نولکشور ایڈیشن ص ۱۶) بلکہ مغلیہ سلطنت کی بربادی کے بعد ۱۷۷۳ء تک یہاں ۱۴ رجب کو ہر سال میلہ منعقد ہوتا تھا (ضمیمہ اورینٹل کالج میگزین لاہور بابت فروری ۱۹۴۷ء) (مرتب)

[2] یہ مضمون ۱۹۴۲ء میں لکھا گیا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے بعد حالات بدل گئے۔ ہندوؤں کی جگہ مسلمان مہاجرین نے لے لی اور عنانِ حکومت ان لوگوں کے ہاتھ میں چلی گئی جو غیر ملکی حکومت اور ہندوؤں کے طریق کار کے خلاف اس لیے برسرِ پیکار رہتے کہ ان کا طرزِ عمل مسلمانوں کے ملی حقوق اور تاریخی آثار کی حفاظت کے لیے سازگار نہ تھا۔ توقع تھی کہ یہ لوگ اپنے قول کی پاسداری کرتے ہوئے اسلامی آثار قدیمہ کی مناسب نگہداشت کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے لیکن ایسا نہ ہوا۔ آزادی کے بعد شدہ، قبر کی بے حرمتی پہلے سے زیادہ ہوتی رہی۔ اب محکمہ آثار قدیمہ نے کئی سال کی جدوجہد کے بعد قبر کے اوپر کا مکان گرا کر میدان صاف کرا لیا ہے۔ شاید باغیچہ وغیرہ بنانے کا منصوبہ زیر غور ہے (مرتب)

زو نیا چو شد در بہشت معلیٰ   شہ دین و شیخ زمن پیر مکیؒ
وصالش بگو آفتاب حسین   بخوان نیز پیر حسن پیر مکیؒ

۶۱۲ھ / ۱۲۱۵ء کا وہ زمانہ تھا جب تاج الدین یلدوز خوارزم شاہ سے شکست کھا کر کرمان اور سبوران سے ہوتا ہوا اور سلطان شمس الدین التمش کو للکارتا ہوا پنجاب دتھانیسر تک پہنچ گیا تھا۔ لیکن یہیں گرفتار ہو کر قید ہوا اور بدایوں میں اجل طبعی یا زہر خورانی سے وفات پا گیا۔ اس حساب سے آپ کی وفات سلطان شمس الدین التمش کے زمانہ میں ہوئی اور آپ کے مزار سے بھی اس واقعہ کی قدامت کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن صاحب تحقیقات چشتی نے "تذکرۃ الفقرا" کے حوالہ سے جو یہ لکھا ہے کہ حضرت سید الدین مکیؒ بعہد شاہجہان حضرت علی ہجویری معروف داتا گنج بخشؒ کے مزار پر معتکف ہونے کے لیے لاہور آئے اور چند برس رہ کر انتقال کر گئے۔ ان کا مزار شاہجہان کے حکم سے تعمیر ہوا۔ اور سال وفات آپ کا ۱۲ ربیع الثانی ۱۰۴۰ھ ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ مزار کی تعمیر سے کوئی علامت عہد شاہجہانی کی تعمیرات کی نظر نہیں آتی، مزار عہد شاہ جہانی سے بہت پہلے زمانہ کا ہے۔

صاحب تاریخ لاہور (صفحہ ۲۲۰ پر) لکھتے ہیں کہ آپ مکہ معظمہ سے لاہور آئے اور آپ ہی کے سامنے سلطان شہاب الدین غوری نے لاہور پر یورش کی۔ اس وقت پنجاب پر خسرو ملک غزنوی کی حکومت تھی۔ خسرو نے آپ سے دعا کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا۔ ابھی ایک سال تک کوئی خطرہ نہیں۔ چنانچہ دوسرے برس شہاب الدین نے لاہور پر اور بعد میں پرانے پرتھی راج کے دارالحکومت دہلی پر بھی قبضہ کر لیا۔

صاحب خزینۃ الاصفیاء نے بھی آپ کے قیام لاہور کے متعلق (ص ۲۵۶ پر) یہی واقعہ لکھا ہے۔ اور اس میں شہاب الدین کے حملۂ لاہور کا سال ۵۸۲ھ بتا کر حضرت پیر مکیؒ کی دعا کا ذکر کرتے ہوئے ایک سال کے خطرہ کی مدت کو چھ سال تک وسعت دی ہے۔ آپ لکھتے ہیں:۔

"آنحضرت دعا کرد و فرمود کہ از جانب حق تا شش سال
دیگر ترا امان است بعد از آں قبضۂ مملکت ایں اقلیم
بہ دست شاہان غور بہ دادہ اند شہاب الدین باز در
سال پانصد و ہشتاد (۵۸۶ھ) براہ سیالکوٹ
عزم لاہور کرد۔ و اول قلعہ سیالکوٹ تعمیر کردہ بہ محاصرہ
لاہور پرداخت و فتح نمود۔"

تاریخ ہندوستان جلد اول مولفہ ذکاء اللہ میں شہاب الدین غوری کی فتح لاہور کے حالات میں (ص ۲۹۰ پر) یہ درج ہے کہ سلطان ۵۷۶ھ / ۱۱۷۹ء میں لاہور آیا۔ خسرو ملک نے صلح صفائی اور اپنے فرزند خسرو شاہ کو یرغمال دے کر اپنا پیچھا چھڑایا۔ غالباً یہی سال ہے جس سال شہاب الدین لاہور سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ اور حضرت پیر مکیؒ نے خسرو ملک سے فرمایا تھا کہ اس سال یہ بلا ٹل جائے گی، سلطان ۵۸۲ھ میں پھر لاہور آیا اور اس نے ہندوستان میں خاندان غزنویہ کا خاتمہ کر دیا۔ خزینۃ الاصفیاء کے سنین کی نسبت تاریخ ہندوستان کے سنین جو بہت سی قدیم تاریخوں کے مطالعہ کے بعد مصنف نے لکھے ہیں۔ زیادہ قابل

اسناد ہیں۔

صاحب خزینۃ الاصفیاء کی تحریر کے مطابق آپ ۳۶ سال تک لاہور میں مقیم رہے اور بعد وفات یہیں دفن ہوئے۔ آپ نے زندگی بھر تدریس علوم کا سلسلہ جاری رکھا اور ہزارہا لوگ آپ کے وعظ و نصیحت سے مستفیض ہوتے رہے۔

تحقیقات چشتی میں یہ بھی لکھا ہے کہ کوئی ان کو حضرت علی ہجویریؒ کا استاد بتاتا ہے۔ کوئی کہتا ہے محمود غزنوی کے ساتھ لاہور آئے تھے، غرض جتنے منہ ہیں اتنی باتیں۔ صحیح حال کوئی نہیں بتا سکتا، زیادہ بھروسہ تحفۃ الواصلین کی تحریر پر ہے۔

پیر بلخیؒ

پیر بلخی چشم ظاہر میں تھے اک صوفی بزرگ
چشم باطن سے انھیں غازی مسلماں دیکھئے

پیر بلخیؒ کے حالات حدیقۃ الاولیاء میں مختصراً اور تاریخ لاہور میں بحوالہ تحفۃ الواصلین کسی قدر تفصیل سے درج ہیں لیکن دونوں نے ان کے اصل نام سے ناواقفیت کا اظہار کیا ہے۔ چونکہ اصل وطن بلخ تھا۔ اس لیے بلخی کہلاتے تھے۔

صاحب حدیقۃ الاولیاء کی تحریر (ص ۱۶۸) سے معلوم ہوتا ہے کہ چنگیز خان کے تصرف بلخ کے بعد آپ اپنا وطن ترک کر کے لاہور آ گئے۔ چونکہ بلخ شاہ خوارزم کے ماتحت تھا۔ اس لیے شاہ خوارزم بھی لاہور آ گیا جب اسے معلوم ہوا کہ چنگیز خانی فوج میرا تعاقب کر رہی ہے تو وہ لاہور سے دہلی چلا گیا۔ چنگیز خانیوں نے لاہور کا محاصرہ کر لیا۔ اور اسی محاصرہ میں پیر بلخیؒ اپنے شاگردوں اور مریدوں کے ہمراہ (کفار مغل و تاتار سے) جنگ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔

لیکن تاریخی واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ شاہ خوارزم کو لاہور آنے کا موقعہ ہی نہیں ملا۔ اور چونکہ وہ لاہور نہیں آیا۔ اس لیے تعاقب کنندگان بھی لاہور نہیں آئے۔ شاہ خوارزم کے ورود ہند کا واقعہ سلطان شمس الدین التمش کے عہد (۶۱۸ھ مطابق ۱۲۲۱ء) میں ہوا ہے۔ شاہ خوارزم جس کا نام سلطان جلال الدین تھا چنگیز خاں کے خوف سے جس کا مذہب یہ تھا کہ شہروں کو جلا کر خاک سیاہ کر دے اور جس کا ایمان یہ تھا کہ مفتوحہ ممالک کی نسلِ انسانی کو خاک و خون میں ملا دے۔ اپنا ملک تباہ و غارت کرا کے سندھ کی طرف نکل آیا۔ تاتاری اور مغل بھی اس کا تعاقب کرتے ہوئے پیچھے ہی پہنچے۔ سلطان شمس الدین التمش کو خبر ہوئی تو اس نے طوفان چنگیز خانی سے جو اپنے ہلاکت آفریں اثر کے لحاظ سے طوفانِ نوح سے کم نہ تھا نجات حاصل کرنے کے لیے شاہ خوارزم کو کہلا بھیجا کہ اس ملک کی آب و ہوا آپ کے مزاج کے موافق نہیں۔ وہ مطلب سمجھ گیا اور سیستان اور کیچ مکران کی راہ سے ہندوستان سے باہر چلا گیا۔ اور مغلوں کی فوج بھی واپس چلی گئی[۱]۔ تاریخی واقعات کی رو سے شاہ خوارزم نہ لاہور آیا ہے نہ لاہور سے دہلی گیا ہے اور نہ چنگیز خاں نے لاہور کا محاصرہ کیا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ پیر بلخی درویش صفت بزرگ تھے، وہ سندھ سے لاہور چلے آئے اور خوارزم شاہ کے ساتھ نہیں گئے جو چنگیز خان کے خوف سے مارا مارا پھر رہا تھا۔

---

[۱] تاریخ ہندوستان مصنفہ مولوی ذکاء اللہ مرحوم جلد اوّل۔ ص ۳۰۴، ۳۰۵۔

مصنف تاریخ لاہور پیر بلخی کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ لاہور میں آ کر مقیم ہو گئے، اور جب چنگیز خاں کے پوتے قلی خاں نے لاہور پر حملہ کیا تو بادشاہ دہلی کی فوج میں شامل ہو کر جن مقامی لوگوں نے دادِ شجاعت دی۔ ان میں پیر بلخی بھی تھے جو اسی لڑائی میں درجۂ شہادت کو پہنچے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ التمش کی وفات ۲۰ شعبان ۶۳۳ھ مطابق ۱۲۳۶ء کے بعد تاتاریوں اور مغلوں نے لاہور پر کب یورش کی۔ سلطان معز الدین بہرام شاہ اپنی بہن سلطانہ رضیہ کو پہلے گرفتار اور بعد میں قتل کرانے کے بعد ۶۳۹ھ ۱۲۳۹ء میں بادشاہ ہوا۔ تاریخ ہندوستان میں اس بادشاہ کے عہد کا جو سب سے عظیم واقعہ درج ہے وہ ترکوں کا حملۂ لاہور ہے۔ اس زمانے میں بہرام شاہ کی طرف سے لاہور (یعنی صوبہ پنجاب) کا گورنر قراقش نام ایک سردار تھا۔ چنگیز خانی مغلوں نے خراسان اور غزنی سے نکل کر لاہور کو گھیر لیا اور کئی مہینے تک لاہور کا محاصرہ کئے رکھا۔ لکھا ہے قراقش اپنی فوج کو لے کر کسی نہ کسی طرح نکل کر بعد جا دہلی چلا گیا۔ اس لیے ۱۶ جمادی الآخر ۶۳۹ھ کو مغلوں نے جو سب کے سب غیر مسلم تھے مسلمانوں اور عام باشندوں کو تہ تیغ کرنا شروع کیا۔[1]

گویا مغلوں نے التمش کے زمانہ (۶۱۸ھ) میں نہیں بلکہ اس کے فرزند بہرام شاہ کے زمانے (۶۳۹ھ) میں اکیس سال کے بعد لاہور کو غارت کیا ہے۔ اور چونکہ پیر بلخی ۶۱۸ھ کے زمانہ ہی سے لاہور میں مقیم تھے، اس لیے اس عرصہ میں ان کی عبادت و ریاضت کی وجہ سے اکثر لوگ ان کے ارادت مند ہو چکے ہوں گے۔ انھوں نے بھی اس جنگ میں جو مغل کفار اور مسلمانوں کے درمیان تھی مردِ غازی کی طرح شرکت کی اور درجۂ شہادت کو پہنچے۔

لاہور میں آپ کے مزار پر ایک طویل چوبی تختہ آویزاں رہتا ہے جس پر متولی خانقاہ ماسٹر محمد حسین خان موجد حسینی روشنائی منجّم و جفار و تاجر کتب کشمیری بازار نے آپ کے حالاتِ زندگی لکھوا رکھے ہیں۔ ان میں بھی وہی باتیں لکھی ہیں جو تاریخ لاہور اور حدیقۃ الاولیا میں درج ہیں۔ اور جن پر گذشتہ سطور میں تاریخی نکتہ نظر سے تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ اس تختہ چوبی پر آپ کا سن وفات ۱۲۱۱ء لکھا ہوا ہے۔ لیکن لاہور میں وہ ۱۲۲۱ء میں بزمانہ التمش آتے ہیں اور ۱۲۳۹ء میں بزمانہ بہرام شاہ جنگ مغولاں میں شہید ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ۱۲۱۱ء کو ان کا سال شہادت قرار دینا قطعاً غلط ہے۔

جس جگہ آج ان کا مقبرہ ہے اسی جگہ ان کا حجرہ تھا۔ یہیں ان کو دفن کیا گیا۔ اس واقعہ کے پانچ سو سال کے بعد نواب بھکاری خان رستم جنگ امیر الامرائے لاہور نے جب میر معین الملک عرف میر منو کے زمانہ میں سنہری مسجد تعمیر کرائی اور اس کی زینت کے لیے بازار کو سیدھا کرنا چاہا تو یہ مزار سرِ راہ آ گیا۔ مزار کا بہت سا حصہ تو گرا دیا گیا لیکن نواب نے حجرہ کو جس کے اندر پیر بلخی مدفون تھے محرابی دروازہ بنا کر پختہ کمرہ کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ چنانچہ آپ کا مزار کشمیری بازار میں سرِ راہ واقع ہے۔ اور دہلی دروازہ سے شہر میں جاتے ہوئے بائیں ہاتھ آتا ہے۔

آج سے پچاس سال قبل اس مزار کی عمارت میں ایک میوہ فروش کی دکان تھی اور کوئی شخص مزار کے اندر فاتحہ کے لیے

---

[1] تاریخ ہندوستان جلد اوّل مصنفہ مولوی ذکاء اللہ ص ۳۱۳۔

جاسکتا تھا۔ اور دوکان کی وجہ سے یہاں مزار کی موجودگی کا بھی کسی کو علم نہیں ہو سکتا تھا۔ قریباً پچیس سال گزرے ہیں کہ مسلمانان ... بڑی بازار نے مزار کے قابض پر عدالت میں اس بنا پر دعویٰ دائر کیا کہ یہاں ایک شہید ولی اللہ کا مزار ہے۔ اور اس دکان کی وجہ سے خلقِ خدا اس مزار پر فاتحہ خوانی کرنے سے محروم ہے۔ یہ مقدمہ کئی سال تک چلتا رہا۔ آخر ہائی کورٹ نے اس کا فیصلہ ... یہ قرار دے کر ہر مسلمان کو بے روک ٹوک مزار پر آنے اور فاتحہ پڑھنے کی اجازت دے دی۔

عرصہ دس بارہ سال سے اس خانقاہ کے متولی کی طرف سے ماسٹر محمد حسین خان ماہر علم جفر جن کی کتابوں کی دوکان مزار کے بالکل سامنے ہے۔ اس خانقاہ کے منتظم ہیں۔ آپ نے مزار کے بیرونی چبوترہ کے پاس پانی کا نل لگوا دیا ہے۔ ہر جمعرات کو چراغاں ہوتا ہے۔ ہر قمری مہینے کے پہلے جمعہ کو قرآن کریم کے ختم کے بعد تبرک تقسیم کیا جاتا ہے۔ سالانہ عرس بھی ہوتا ہے اور قوالی بھی۔ ماسٹر صاحب نے مزار کے چاروں طرف خوبصورت جنگلا کے علاوہ خوشنما مسہری لگوا رکھی ہے۔ اور مزار کے اندر اور باہر سیمنٹ کا فرش بنوا دیا ہے۔

[پیر بلخی کا سنگ مزار

میں حضرت فوقؔ مرحوم کے اس تحقیقی مضمون میں اتنا اضافہ ضروری سمجھتا ہوں کہ ہماری خوش قسمتی سے لاہور کے عجائب گھر میں ایک عربی کتبہ موجود ہے جس پر کوفی و نسخی خط میں مندرجہ ذیل عبارت کندہ ہے۔ یہ غالباً پیر بلخی کے مزار ہی کا پتھر ہے:-

"ھذا مقبرۃ الشہید الشیخ ابو المحامد الحسن ابن محمد الحسین ابوبکر الذکری
البلخی رحمۃ اللہ وقد عاش ثمانیہ و تسعین سنۃ وفات فی یوم الجمعۃ التاسع
من ذی الحجہ وھی یوم عرفہ من ثلثۃ و اربعین و ستمائۃ"

(یعنی یہ مقبرہ شیخ ابو المحامد الحسن بن محمد الحسین ابوبکر الذکری البلخی
رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ تحقیق وہ ۹۸ سال زندہ رہے اور ۶۴۳ھ میں جمعہ
کے روز ۹ ذی الحجہ کو جو عرفہ کا دن تھا شہید ہوئے)

اس کتبے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کا اسم گرامی حسن تھا اور کنیت ابو المحامد۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام محمد الحسین ابوبکر تھا۔ آپ بلخ کے رہنے والے تھے ۵۹۸ھ میں لاہور تشریف لائے اور یہیں ۶۴۳ھ میں جمعہ کے روز ۹ ذی الحج کو شہید ہوئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب لاہور میں سنہری مسجد تعمیر کی گئی اور وہاں تک پہنچنے کے لیے سڑک کو پیدا کرنے کی ضرورت پیش آئی تو مزار کو چھوٹا کیا گیا اور اسی شکست و ریخت میں کتبہ یہاں سے خرد برد ہو کر کسی طرح عجائب گھر میں پہنچ گیا۔ جہاں اب تک محفوظ ہے ——— مرتب]

میراں بادشاہ سید اسحاق گازرونی

عہدِ تغلق کے بزرگ اوّلیں لاہور میں
روضۂ اسحاق میں آنکھوں سے پنہاں ہو گئے

شہزادہ دارا شکوہ اپنی مشہور تصنیف سفینۃ الاولیاءؒ میں شیخ ابو اسحاق بن شہریار گازرونی کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے کہ "گازرون[1] کے رہنے والے تھے جو فارس میں واقع ہے"۔

یہ کسی نے نہیں لکھا کہ آپ کب آئے اور کس طرح آئے۔ لاہور میں ان کا کیا سلسلہ تھا، عمر کیا تھی اور اس وقت بادشاہ کون تھا؟ تاریخ لاہور کنہیا لال میں ان کا سال وفات ۷۸۶ھ درج ہے اور سید محمد لطیف کی ہسٹری آف لاہور انگریزی کے صفحہ ۲۱۶ پر لکھا ہے کہ آپ لاہور میں تغلق بادشاہوں کے زمانے میں آئے۔ ۷۸۶ھ میں (آپ کی وفات کے وقت) دہلی میں سلطان فیروز شاہ تغلق کی حکومت تھی۔ چونکہ اس نے بقول مختلف ۳۷ سے ۴۰ سال تک بادشاہت کی ہے۔ اس لیے خیال ہے کہ سید اسحاق اس کی طویل حکومت (۷۵۲ھ تا ۷۸۹ھ) کی ابتدا میں تشریف لائے ہوں گے۔

خزینۃ الاصفیاء میں بحوالہ اخبار الاخیار لکھا ہے کہ سید صفی الدین جو شہر اوچ در ریاست بہاولپور کے بانی تھے سید اسحاق گازرونی کے ہمشیرزادے تھے۔

لاہور میں سید اسحاق کا قیام اکثر وہیں رہتا تھا جہاں اب آپ کا مزار واقع ہے اور جو مسجد نواب وزیر خاں کے صحن میں ہے۔ شہر لاہور کے مسلمان آج تک ان کے نام کا احترام کرتے ہیں اور انھیں میراں بادشاہ کہتے ہیں۔ نواب وزیر خاں نے قلعہ کی تعمیرات کے بعد اپنے نام نیک کی یادگار رہنے کے لیے وسط لاہور میں اسی مقام کو پسند کیا جہاں آپ کا مزار واقع ہے۔

مصنف تاریخ لاہور لکھتے ہیں کہ "ان کی وصیت کے مطابق ان کے مزار کا احاطہ پختہ خشتی بنایا گیا۔ لیکن قبر خام بنائی گئی"۔ کچھ عرصہ کے بعد قبر پر ایک درخت پیدا ہو گیا۔ جس نے بڑھتے بڑھتے بیل کی طرح ساری قبر کو ڈھانپ لیا۔ چونکہ اس کے پتے اکثر لوگ متبرک سمجھ کر لے جایا کرتے تھے۔ اس لئے ان کا نام پیر سبز مشہور ہو گیا۔ جب نواب وزیر خاں نے اس جگہ مسجد بنانے کا ارادہ کیا تو چند ایک متصلہ مکانات بھی خریدے اور درخت کاٹ کر قبر پختہ بنا دی۔ گویا آپ کی وفات سے قریباً اڑھائی سو سال بعد آپ کا مزار اس ترکیب سے پختہ تعمیر کر دیا گیا کہ مسجد کے عین وسط میں حوض کے متصل آپ کی دوسری قبر تیار ہو گئی۔

مسجد وزیر خاں کے صحن میں جاتے ہی ایک چھوٹا سا دالان نظر آتا ہے اس کے سامنے آپ کا نقلی مزار پختہ موجود ہے۔ دالان کی چھت قدیم وضع کی منقش ہے۔ چھوٹی چھوٹی دس سیڑھیاں نیچے اتر کر اصلی یعنی زیر زمین مزار ایک بلند چبوترہ پر دکھائی دیتا ہے اس کے گرد سبز رنگ کی رنگی ہوئی لکڑی کا تنگ کٹہرہ ہے۔ سرہانے چراغدان ہے۔ روشنی کے لیے چھوٹے چھوٹے دریچے بھی موجود ہیں۔ قبر بہت لمبی ہے۔ اس پر سبز غلاف پڑا رہتا ہے۔ چوکھنڈی اور مزار کا فرش سیاہ و سفید خوبصورت چوگوشہ

---

[1] اصل نام کازرون ہے۔ شیراز سے تین دن کی مسافت پر آباد تھا۔ علامہ قطب الدین شیرازی مصنف درۃ التاج نعرۃ السراج کے والد شیخ ضیاء الدین مسعود ابن مصلح اسی وطنیت کے لحاظ سے کازرونی کہلاتے تھے۔ علامہ شیرازی کی پیدائش بماہ صفر ۶۳۴ھ اور وفات بعمر ۷۶ سال بماہ رمضان ۷۱۰ھ ہے (دیکھو رسالہ معارف اعظم گڑھ بابت جون ۱۹۴۴ء)

پتھروں کا ہے۔

۱۳-۱۴ رجب کو آپ کا سالانہ عرس ہوتا ہے جس میں ختم قرآن شریف اور نعت خوانی کے علاوہ جھنڈا رہ بھی ہوتا ہے چڑھاوے اور نذر و نیاز کی آمدنی میں کئی حصہ دار ہیں جن کی تقسیم باری باری سے ہوتی ہے۔ آج کل اس مزار کے متولی حاجی فخرالدین ہیں۔

سید صوفؒ

رہنمائے دین و دُنیا پیر سید سید صوف
کر گئے کیا کام پنہاں و نمایاں دیکھئے

یہ بزرگ شاہانِ تغلق کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا سالِ وفات ۷۸۶ھ ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغل سرحد ہندوستان عبور کر کے پنجاب میں آکر لوٹ مار کیا کرتے تھے۔ اور ان کی لوٹ مار اور غارت گری کا سلسلہ ایک سو سال قبل سے چلا آتا تھا۔ بلکہ دلی اور لاہور میں اکثر مغل آباد بھی ہو گئے تھے۔ لاہور میں انہی کی وجہ سے محلہ مغل پورہ قائم ہوا تھا۔ سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہد میں بھی بیرونی مغل برابر مار دھاڑ کرتے اور جو کچھ ملتا لوٹ کھسوٹ کر پھر واپس چلے جاتے سب سے زیادہ زور ان کا لاہور پر ہوتا تھا۔ یہ دولت مند شہر تھا اور دہلی کے عین رستے میں تھا۔

حضرت سید صوف جو ایک صوفی منش بزرگ تھے۔ فیروز شاہ تغلق کے زمانہ ہی میں لاہور آئے۔ اس زمانے کے صوفی اور علما آج کل کے بظاہر خلوت نشین مگر مریدوں کی گرداوری کرنے والے صوفیا کی طرح نہ تھے۔ وہ اہل دل بھی تھے۔ اہل درد بھی۔ اہل قلم بھی تھے اور اہل سیف بھی۔ جب مسلمانوں پر کوئی مصیبت آپڑتی تھی تو وہ شاملِ جہاد بھی ہو جایا کرتے تھے۔ غرض جب وہ مسندِ ارشاد پر متمکن ہوتے تو اپنے مواعظ حسنہ اور فیضِ صحبت سے لوگوں کے دلوں سے زنگ کدورت دُور کرتے اور جب دین کی حرمت اور لوگوں کے جان و مال اور آبرو بچانے کا موقع آتا تو اپنا خون بہانے کے لیے تیار ہو جاتے۔ ایسا ہی ایک موقعہ جب سلطان فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں آیا تو آپ دشمن کو للکار کر اس کے سامنے آگئے۔ اور میدان جنگ میں خاک و خون سے لتھڑ کر مرتبہ شہادت کو پہنچ گئے۔ یہ واقعہ ۷۸۶ھ میں سلطان فیروز شاہ کی وفات کے تیرہ سال بعد پیش آیا۔

جہاں آپ کا مقبرہ واقع ہے یہ مقام اس زمانے میں محلہ رڑہ کہلاتا تھا۔ آج اس کا نام چوک مسجد نواب وزیر خان ہے۔ ابتدا میں آپ کی قبر ایک چبوترہ پر تھی جس پر کوئی چھت وغیرہ نہ تھی۔ کئی سو سال تک یہی حال رہا۔ لودھی بادشاہوں کی حکومت کے زمانے میں نادر خان نام ایک امیر نے جب اپنی حویلی محلہ رڑہ میں اس قبر کے متصل تعمیر کرائی تو اس کے گرد ایک حجرہ خشتی تیار کرا کر اس کو اپنی حویلی کے وسیع احاطے کے اندر لے لیا۔ وہ حویلی شاہ جہان کے زمانہ تک موجود تھی۔ نواب وزیر خان نے اس کے وارثوں سے وہ حویلی خرید لی اور یہاں مسجد تعمیر کرائی۔ اور مزار کو نئے سرے سے تعمیر کرا کے موجودہ شکل دے دی لیکن قبر کی اس سادگی کے باوجود عوام یہاں کثرت سے آتے تھے اور فاتحہ پڑھ کر چلے جاتے تھے۔ سکھوں کے زمانے میں بھی یہاں کافی رونق ہوا کرتی تھی۔

تحقیقاتِ چشتی اور تاریخ لاہور کے مصنف لکھتے ہیں کہ حضرت سید صوف سید اسحاق گازرونی عرف میراں بادشاہ کے ہم عصر اور ہم عہد تھے۔ اور چونکہ دونوں کا زمانہ سلطان فیروز شاہ تغلق سے تعلق رکھتا ہے اور دونوں کا سالِ وفات بھی ایک ہی ہے۔ اس لیے ان کے ہم عہد و ہم جلیس ہونے میں کوئی کلام نہیں۔

آپ کی قبر بھی مزار میراں بادشاہ کی طرح مسجد وزیر خان سے بہت پہلے بنی ہوئی تھی۔ سکھوں کے عہد میں وزیر خان کے چوک میں اکثر لوگوں نے اپنے مکانات تعمیر کرا لیے تھے جس سے مسجد کی نمائش اور زیب و زینت میں فرق آ گیا تھا۔ اس لیے ۱۸۵۰ء میں چوک کے اندرونی مکانات سرکاری حکم سے گرا دیئے گئے اور چوک کو پھر ایک وسیع میدان بنا دیا گیا۔

کہا جاتا ہے کہ اس وقت کے ڈپٹی کمشنر میجر میکر یگر اس مزار کو بھی منہدم کرانا چاہتے تھے۔ لیکن لوگوں کے عرض معروض کرنے پر اور بقول بعض خود ہی ہیبت زدہ ہو جانے کے بعد اس ارادہ کو ترک کر دیا۔ ان ایام میں میاں محمد سلطان کاشمیری نے جو لاہور کا ٹھیکیدار اعظم تھا اور اسی محلہ کے قریب دہلی دروازہ کے اندر اپنی عالیشان حویلی میں رہتا تھا۔ آپ کے مزار پر گنبد تعمیر کرایا اور قبر کا تعویذ بھی نیا لگوایا۔ گنبد کی تعمیر سے مزار کی رونق اور بھی زیادہ ہو گئی۔ چنانچہ روضہ کی شمالی دیوار پر حسب ذیل عبارت سنگ مرمر کے ٹکڑے پر تحریر ہے:۔

"بصوابدید صاحب عالی مناقب میجر جارج میکر یگر صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر
ضلع لاہور مقبرہ منور کہ حضرت سید صوف قدس سرہٗ تعمیر کردہ شیخ سلطان
ٹھیکہ دار سرکار فیض آثار کمپنی انگریز بہادر دام اقبالہٗ سنہ ۱۸۵۱ء سمت ۱۹۰۸
سنہ ۱۲۶۸ھ بہ اتمام رسید۔"

اس مزار کے ساتھ نہ کوئی دکان ہے نہ کوئی معافی ہے جس کی آمدنی سے اس کی مرمت و حفاظت ہوتی ہے۔ نذر نیاز کی آمدنی اڑھائی تین سو روپیہ سالانہ بتائی جاتی ہے۔ آپ کا عرس ہر سال ۱۱ رجب کو ہوتا ہے۔ عرس پر نعت خوانی ہوتی ہے۔ ختم ہوتا ہے۔ لیکن زیادہ رونق قوالی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ جو یوم عرس کے علاوہ بھی کبھی کبھی ہوتی رہتی ہے۔

کس لیے آئے ، کیا کر چلے
تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے

اس مزار کی نگہداشت۔ اخراجات عرس اور مجاور کا انتظام ایک کمیٹی کے سپرد ہے۔ مزار کے باہر احاطہ مزار میں برنے کا وہ درخت ابھی تک موجود ہے جس کا حوالہ مولوی نور احمد چشتی نے ۱۲۸۴ھ میں اپنی کتاب تحقیقات چشتی میں دیا ہے۔ برنے کے ساتھ ایک چھوٹا سا حجرہ ہے جس میں مجاور کی رہائش ہے۔ احاطہ مزار کے باہر لیکن بالکل ملحق ایک کنواں ہے جو جاری ہے۔ احاطہ مزار سنگ [illegible] کے ایک چھوٹے سے جنگلہ سے گھرا ہوا ہے۔ مزار کا دروازہ جنوب کی طرف ہے۔ دروازہ کے اوپر یہ عبارت سنگ مرمر کی تختی پر لکھی ہوئی ہے:۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ"

"روضہ اقدس سلطان العارفین زبدۃ الکاملین منظور بارگاہ ایزد حضرت سید سید صوف فیض بخش عظیم انوار اللہ مرقدہ در عہد بادشاہ ابوالمظفر فیروز شاہ تغلق"

گنبد کے اندر شرقی غربی جانب کی دیواروں میں روشنی کے لیے پنجرے لگے ہیں ان کے علاوہ دیواروں میں چار محراب بھی ہیں۔ مزار سنگِ مرمر کے جنگلہ کے اندر ہے اور سرہانے عبارت کے ساتھ اشعار ذیل درج ہیں :-

"شیخ المشائخ حضرت پیر سخی سید سید صوف فیض بخش رحمۃ اللہ علیہ الحسنی سہروردی سنہ وصال ۷۸۶ھ

کس دلِ زندہ کی ہے یہ تربت عظمت نشاں ۔۔۔ خاک جس کی چومنے کو جھک رہا ہے آسماں

فیض بخش گنج وحدت مرشد فرخ جبیں ۔۔۔ صوفیٔ صافی نہاد و رہبرِ دنیا و دیں

غازۂ روئے شہادت زینت قوم و وطن ۔۔۔ سرفروش و غازی و شہداد کش مرحب فگن

سرخرو ہو کر جہادِ فی سبیل اللہ سے

مردِ مومن لے رہا ہے خوابِ شیریں کے مزے

بیرونی جنگلہ کے باہر ایک نوٹس قوالوں کے لیے آویزاں ہے جس پر لکھا ہے کہ قوالوں کے لیے وضو لازمی ہے۔ اور حقہ پینے کی سخت ممانعت ہے۔ چودھری عبدالرشید تبسم ایم اے کا یہ شعر کس قدر برمحل ہے ؎

خدا کے نام سے کرتا ہے دل آغازِ مے نوشی

تبسم دید کے قابل ہے اس کافر کی دینداری

سید بلندؒ

خویش و بیگانہ نے گو اکثر مٹا ڈالے مزار

ہو نہ جائے گل یہ شمعِ راہِ عرفاں دیکھئے

مصنفِ تحقیقاتِ چشتی[1] و تاریخ لاہور نے زبانِ خلق کے بھروسہ پر لکھا ہے کہ حضرت سید سید بلند میراں بادشاہ یعنی حضرت سید اسحاق گازرونی کے بھائی تھے۔ بھائی ہوں یا نہ ہوں دونوں کا مشرب اصلاح خلق اللہ تھا۔ اس لیے صحیح معنوں میں ہم خیال۔ ہم مشرب اور اس لحاظ سے کہ ان کا مزار بھی مسجد وزیر خان کی بنیاد سے بہت پہلے اسی محلہ میں موجود تھا ان کے ہم عصر

---

[1] مولوی نور احمد چشتی اور رائے بہادر کنہیا لال نے اپنی کتابوں میں کسی ماخذ کا حوالہ نہیں دیا۔ دوسری تاریخوں اور تذکروں کی ورق گردانی سے بھی ہم اس نتیجے پر نہیں پہنچے کہ دونوں بزرگ ہم عصر تھے۔ چونکہ دونوں کی زندگی کا مقصد ایک تھا اس لیے ہم ان کا روحانی رشتہ ہی قائم کر سکتے ہیں ——— (مرتب)

بھی تھے۔

مسجد وزیر خان کے شمالی دروازہ سے صرف بازار کے فاصلے پر پرانی کوتوالی کے چوک سے آتے ہوئے بائیں ہاتھ اور دہلی دروازہ کی جانب سے آتے ہوئے دائیں ہاتھ کو ایک کٹڑہ کے اندر آتا ہے۔ یہ کٹڑہ مسجد کے ساتھ ہی نواب وزیر خان نے ۱۰۵۱ھ میں تعمیر کرایا تھا۔ اور اس کی آمدنی کو مسجد کے لیے وقف کر دیا تھا۔

وزیر خان نے مزار کی تعمیر بھی کرا دی تھی اور اس کٹڑہ کے اندر کئی دکانیں آمدنی کے لئے بنا دی تھیں، ایک بہت بڑا کنواں بھی جس میں چوبچہ اور ٹونٹی کے آثار اب بھی قائم ہیں اور جس پر لوہے کی دو چرخیاں چلتی ہیں احداث کرایا تھا جو اب تک موجود ہے۔

اس کٹڑہ میں جانے کے لیے سب سے پہلے ایک قدیم ڈیوڑھی آتی ہے جس کی چھت اس زمانہ میں شاہجہانی عمارتوں کے نمونہ پر ہی ہوگی۔ لیکن آج گھاس پھوس اور بوسیدہ و بدنما لکڑیوں سے "مزین" نظر آتی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ ڈیوڑھی ہی سے گھر کی رونق پہچانی جاتی ہے تو ع

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

کٹڑہ کا میدان جس کے اندر کنواں ہے (اور جہاں پہلے لوہاروں کی دوکانیں ہوا کرتی تھیں اور بعد میں کپڑے کی مارکیٹ قائم ہو گئی تھی۔) اب بالکل خراب و خستہ نظر آتا ہے۔ حضرت کا مزار جو ڈیوڑھی کے اندر جاتے ہی مغرب کی جانب نظر آتا ہے۔ ایک تنگ و تار رستہ طے کرنے کے بعد دکھائی دیتا ہے۔ مزار سے شرق کی طرف متولی نے اپنا مکان بنا کر اس کو بالکل نظروں سے اوجھل کر دیا ہے۔ قبر کا تعویذ حضرت میراں بادشاہ کی قبر کے تعویذ کی طرح بہت طویل ہے اور لکڑی کے سبز جنگلہ کے اندر آپ ایک سبز غلاف کے نیچے خواب استراحت فرما رہے ہیں۔

تحقیقات چشتی (ص ۲۷۰) سے معلوم ہوتا ہے کہ سکھوں کے زمانے میں راجہ دینا ناتھ نے اس کٹڑہ کو اپنا اصطبل بنا لیا تھا۔ یہاں پنجشنبہ (جمعرات) کو اکثر لوگ آیا کرتے تھے، اب وہ بات تو نہیں رہی البتہ سالانہ عرس ہوتا ہے۔ قوالی نہیں ہوتی۔ نعت خوانی اور بھنڈارہ سے رونق ہو جاتی ہے۔

آپ کے مزار کی چھت کافی بلند ہے اور چونکہ چاروں طرف مکانات ہیں اس لیے روشنی کے لیے چھت میں روشندان رکھے ہوئے ہیں۔

پیر زکی شہید رح

بھی دروازے کے اندر حضرت پیر زکی
کس طرح اسلام پر ہوتے ہیں قرباں دیکھئے

لہ ۱۹۵۳ء میں مارشل لاء کے حکام کی مدد سے لاہور امپروومنٹ ٹرسٹ نے کپڑا مارکیٹ بھی یہاں سے اٹھا دی ہے۔ دکانیں اور مکانات بھی گرا دیئے ہیں۔ اب ڈیوڑھی کے اندر داخل ہوتے ہی مزار صاف نظر آتا ہے۔ (مرتب)

پیر زکی کا ذکر تحفۃ الواصلین کے حوالہ سے رائے کنہیا لال نے تاریخ لاہور (ص ۱۹۷) میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جن ایام میں مغلوں نے (ان مغلوں سے مراد نامسلم مغل ہیں) ساحل ہند کو عبور کر کے لاہور کو محاصرہ میں لیا۔ اور اہل لاہور نے شاہی فوجوں کے ساتھ مل کر ان سے جنگ کی۔ تو ان میں پیر زکی بھی شامل تھے۔ ان دنوں شہر لاہور کا ایک دروازہ وہیں تھا جہاں آج آپ کا مزار یکی دروازہ سے باہر سر راہ واقع ہے۔ یہیں آپ نے کافر مغلوں سے جنگ کی اور یہیں شہید ہوئے۔

لاہور میں یہ روایت مشہور ہے کہ جب آپ کا جسم آپ کے سر سے علیحدہ ہو گیا۔ تو آپ کا جسم بے سر ہو کر بھی دشمنوں سے لڑتا رہا۔ آخر جہاں وہ تھک کے رہ گیا وہیں آپ کے دھڑ یعنی جسم بے سر کی قبر بنی۔ جو ایک چار دیواری کے اندر یکی دروازہ سے شہر میں داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ آتی ہے اور آج بھی موجود ہے۔ سر چونکہ دروازہ کے باہر بلکہ دروازہ کے نیچے ہی (جہاں آپ کا قیام رہتا تھا) کٹ چکا تھا۔ اس لیے سر کی قبر دروازہ کے نیچے ہی بنا دی گئی۔

ہندوستان پر کافر مغلوں کے حملے سلطان رکن الدین فیروز شاہ بن سلطان شمس الدین التمش کے بیٹے سلطان علاؤ الدین مسعود کے زمانہ ۶۴۲ھ / ۱۲۴۴ء سے شروع ہوتے ہیں اور ان کا سلسلہ ۶۹۷ھ تک جاری رہا ہے۔ پچاس سال کے اس عرصہ میں ہندوستان پر سلطان ناصر الدین محمود۔ سلطان جلال الدین فیروز شاہ خلجی۔ سلطان علاؤ الدین خلجی اور سلطان فیروز شاہ تغلق نے حکومت کی۔ گو ہر حملہ میں مغل پسپا ہوتے رہے اور ہزاروں بلکہ لاکھوں کی جانیں بھی گئیں۔ مگر یہ سخت جان حملہ آور شمالی ہند کو پامال کر کے دہلی تک پہنچ جاتے تھے۔ لاہور۔ ملتان اور نواح دہلی بالخصوص اور بعض دوسرے مقامات ہمیشہ ان کی جولانگاہ بنے رہے۔ اس لیے پیر زکی کی شہادت کا واقعہ انہی پچاس برس کے اندر سمجھنا چاہیئے۔

پیر زکی کہاں سے آئے۔ کب آئے۔ وہ لاہور ہی کے تھے یا کسی اور مقام کے۔ لاہور میں ان کے کیا مشاغل تھے۔ وہ اصل پیر تھے یا بعد میں لوگوں نے ان کو پیر بنا دیا؟ اس کے متعلق تاریخ لاہور بالکل خاموش ہے۔

آپ کی قبر دو جگہ ہے اور دونوں جگہ عقیدت مند فاتحہ کے لیے جاتے ہیں۔ یکی دروازہ کے پہلو میں آپ کے سر کا چھوٹا سا مزار ہے۔ جب مہاراجہ رنجیت سنگھ نے شہر کے چاروں طرف پختہ اور گہری خندق کھدوائی تو ہر دروازے کے سامنے آمد و رفت کے لیے پل بھی بنوائے۔ آپ کی رہائش اور آپ کی آخری آرام گاہ ہونے کی وجہ سے اس دروازہ کا نام زکی دروازہ تھا جو بعد میں یکی دروازہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اس لیے یکی دروازہ پر بھی پل بنایا گیا۔ جب انگریزی عہد آیا تو یہ دروازہ چونکہ بوسیدہ اور کہنہ ہونے کی وجہ سے غیر مستحکم تھا۔ اس لیے گرا دیا گیا۔ اور قبر بالکل علیحدہ نظر آنے لگی۔

آجکل سائیں قمر الدین (عمر قریباً ساٹھ سال) اس مزار کا جاروب کش ہے۔ یکی دروازہ کے لوگوں نے باہمی چندہ سے مزار کی مرمت کرا دی ہے۔ عرس بھادوں کے تیسرے اتوار کو ہوتا ہے جس میں ختم قرآن شریف کے علاوہ قوالی بھی ہوتی ہے۔

دولت خاں لودھی

دولت آباد اور باغ دولت آباد اب کہاں
اس سے بڑھ کر جو دکھائے چرخ گرداں دیکھیے

سلطان ابراہیم لودھی بادشاہ دہلی کے زمانہ (۹۲۳ھ/۱۵۱۷ء تا ۹۳۲ھ/۱۵۲۵ء) میں اس کی طرف سے پنجاب کا حاکم دولت خان لودھی تھا۔ ابراہیم نے اپنے بڑے بڑے امیروں کو غرور و تکبر اور شک و شبہ کی وجہ سے ناراض کر رکھا تھا۔ بلکہ بقول صاحب حیات لودھی (حصہ سوم ص ۱۵۷ تا ۱۶۲) تیئیس امیروں کو قتل کرا کر ان کی لاشیں لٹکوا رکھی تھیں۔ دولت خان کے بیٹے غازی خان نے جب دہلی میں ان لاشوں کو لٹکتے ہوئے دیکھا اور ابراہیم کا نعرہ انا ولا غیری سنا۔ تو کانپ اٹھا۔ لاہور آکر باپ سے ساری کیفیت بیان کی اور کہا کہ اب جان کی خیر نظر نہیں آتی۔

دولت خان نے اپنے دوسرے بیٹے دلاور خان کو کابل میں بابر کے پاس بھیجا اور تخت دہلی پر قبضہ کرنے کی دعوت دی۔ امیر تیمور کے حملۂ ہند کے زمانہ (۸۰۱ھ/۱۳۹۸ء) سے مغربی پنجاب (بجیرہ۔ خوشاب۔ چناب۔ چنیوٹ) کا بہت سا ملک اولادِ تیمور بابر کے کسی نہ کسی کے قبضہ میں چلا آتا تھا۔ بابر اس دعوت کو فال نیک تصور کر کے کابل سے روانہ ہوا۔ لیکن اس عرصہ میں دولت خان کا خیال بدل چکا تھا۔ وہ اپنے بیٹے غازی خان کے ہمراہ چالیس ہزار فوج لے کر نکلا۔ لیکن بابر ۹۳۲ھ/۱۵۲۶ء میں لاہور میں داخل ہو گیا اور ۱۰ رجب ۹۳۲ھ کو پانی پت کے میدان میں اس نے سلطان ابراہیم سے جنگ کی۔ اسی جنگ میں کہ جمعہ کا دن تھا۔ ابراہیم مارا گیا اور سلطنت لودھی کا خاتمہ ہو گیا۔

دولت خان نے اپنے عہدِ حکومت میں لاہور کو بہت ترقی دی۔ اپنے نام سے اس نے ایک بہت بڑی سرائے تعمیر کرائی جس میں صدہا آدمیوں کی رہائش کا انتظام تھا۔ سرائے کے عین قرب میں ایک عالی شان باغ تعمیر کرایا۔ باغ اور سرائے کا آج کوئی نام بھی نہیں جانتا۔ داراشکوہ نے سکینۃ الاولیا میں ایک جگہ حضرت میاں میرؒ کے متعلق ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دولت خان کی باؤلی کے پاس پرانی عیدگاہ کے قریب احمد بیگ خان کی بہن کے مقبرہ کا گنبد ہے آپ وہاں بھی کبھی کبھی یادِ حق کیا کرتے تھے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ پرانی عیدگاہ کہاں تھی؟ جہانگیر نے اپنے زمانہ میں سب سے پہلے لاہور میں عیدگاہ تیار کرائی جہاں مسلمان عیدین کی نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ وقائع جہانگیری کے حوالہ سے صاحب تحقیقات چشتی (ص ۶۴۰ پر) لکھتے ہیں کہ عیدگاہ اور اس کی تعمیرات کے لیے جہانگیر نے بیس لاکھ روپیہ منظور کیا تھا [اس عیدگاہ میں کس قدر عمارتیں تھیں اور وہ کس طرح اور کس زمانہ میں تباہ ہوئیں؟ اس کا ذکر قدیم مساجد لاہور میں انشاء اللہ کیا جائے گا ——— مرتب]

خان بہادر جج محمد لطیف ہسٹری آف لاہور (ص ۵۵ پر) اس عیدگاہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شاہ جہان کو جب لاہور میں عید کا تہوار آتا تھا۔ تو وہ عیدگاہ کو جاتے ہوئے اور بعد از نماز وہاں سے آتے ہوئے غریبوں اور محتاجوں کو اپنے ہاتھی پر سے چاندی اور سونے کے سکے پھینکا کرتا تھا۔

صاحب تحقیقات چشتی لکھتے ہیں کہ اس شاہی عیدگاہ کی ایک عمارت کے گنبد میں محکمہ ریلوے کے ایک صاحب بہادر دروازہ بند کر کے وہاں رہا کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عیدگاہ ریلوے اسٹیشن کے قریب جا رہی تھی۔ اس عیدگاہ کے متصل ہی داراشکوہ نے دولت خان کی باؤلی کا پتہ بتایا ہے۔ اور چونکہ باؤلی کا تعلق بھی باغ یا سرائے ہی سے معلوم ہوتا ہے اس لیے قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ دولت خان کا باغ اور اس کی سرائے ریلوے اسٹیشن کے احاطہ سے لے کر بدھو کے آوے کے درمیان کہیں

ہو گئے۔

تحقیقات چشتی (ص ۵۸۲ و ۵۸۳ پر) لاہور کے ایک محلہ دولت آباد کا ذکر ہے جو بجائے خود ایک شہر تھا۔ اس کا محل وقوع سنت نگر، چیلی اور موضع مزنگ کے درمیان بتایا گیا ہے۔ دولت آباد کے گرد کئی قلعے تھے جو مختلف لوگوں کے نام سے مشہور تھے۔ یہاں سید عبدالقادر ثانی کا مزار بھی ہے۔ جو سنہ ۹۰۵ھ/۱۴۹۹ء میں بغداد سے لاہور آئے تھے۔ اور سنہ ۹۴۲ھ/۱۵۳۵ء میں وفات پا گئے تھے جب مغل حکومت کو زوال آیا تو ملک کی ویرانی کے ساتھ ہی دولت آباد، سرائے دولت خان اور باغ دولت خان اور قلعہ جات دولت آباد کسی کا نام بھی نہ رہا۔

شاہ عبدالجلیل رحمۃ اللہ علیہ چوہڑ بندگی

گنج عرفاں ہے کہ ہے درگاہ شاہ عبدالجلیل
آئیے ایمان کی شمع فروزاں دیکھئے

حضرت سید احمد توختہ اور بی بی پاک دامناں کے ذکر میں کچھ ملکان کے بادشاہ سلطان قطب الدین کا ذکر آیا ہے جس کے فرزند شاہزادہ بہاؤالدین کی مناکحت حضرت سید احمد توختہ کی صاحبزادی بی بی حاج سے ہو چکی تھی۔ اسی بی بی کے بطن سے سلطان عبدالدین حاکم پیدا ہوئے جن کو سلطان التارکین اس لئے کہتے ہیں کہ انھوں نے بیس سال کی حکومت کے بعد دنیا اور عیش و آرام دنیا کو ترک کر کے فقر اور درویشی کا جامہ پہن لیا تھا۔ ان کے دو فرزند تھے۔ فرزند خورد شیخ تاج الدین کی اولاد مئو مبارک۔ ریاست بہاولپور اور بعض دوسرے مقامات میں آباد ہے اور فرزند اوّل شیخ نور الدین کی اولاد تحصیل جھنگ، تحصیل شاہدرہ، تحصیل لاہور اور تحصیل چونیاں وغیرہ مقامات پنجاب میں آباد ہے۔ شیخ نور الدین کی پانچویں پشت میں شیخ عبدالجلیل پیدا ہوئے جو اپنے علم و عمل کی وجہ سے قطب العالم چوہڑ شاہ بندگی کہلائے۔

"چوہڑ شاہ بندگی" کے الفاظ کی وجہ تسمیہ میں مولانا نامی تاریخ جلیلیہ کے صفحہ ۱۰۷ پر لکھتے ہیں کہ چوہڑ ریاست بہاولپور میں جہاں سے آپ لاہور رونق افروز ہوئے عام نام ہے۔ اس لیے چوہڑ بندگی لقب ہوا۔ آپ علم ظاہر و باطن حاصل کر کے اپنے والد شیخ ابوالفتح کی وفات کے بعد طالبان حق کی رہنمائی میں مشغول ہوئے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد اشارۂ غیبی کے مطابق اور پاکپتن کی زیارت سے فیض روحانی حاصل کرتے ہوئے لاہور تشریف لے آئے اور اس مقام کو اپنی اقامت گاہ بنایا جو اس زمانہ میں کوٹ کروڑ کے نام سے موسوم تھا۔ یہ مقام آپ کی موجودہ خانقاہ کے پاس ہی لودھیوں کے زمانہ میں خاصا آباد تھا۔ اور شہر سے کچھ فاصلہ پر تھا۔ لیکن مغلوں کے عروج کے زمانہ میں جب لاہور کی آبادی بڑھنی شروع ہوئی تو یہ بستی شہر کا ایک حصہ بن گئی اور اس کا نام محلہ حاجی سوائے مشہور ہوا۔ لیکن اب بقول مولانا نامی نہ وہاں کوئی کوٹ کروڑ کا نام جانتا ہے نہ محلہ حاجی سوائے کا۔ اب تو یہ سارا علاقہ قلعہ گوجر سنگھ کے نام سے موسوم ہے۔

لاہور کے کسی قدیم مصنف بلکہ خاندان جلیلیہ کے قابل اہل قلم اصحاب میں سے بھی کسی نے یہ نہیں لکھا کہ آپ کس سنہ میں لاہور آئے صرف اتنا لکھا ہے کہ بہلول لودھی ۸۵۵ھ لغایت ۸۹۴ھ مطابق ۱۴۵۱ء لغایت ۱۴۸۸ء کا زمانہ تھا۔

حضرت قطب العالم کے چار اور بھائی بھی تھے۔ ان میں شیخ جمال الدین ابوبکر نے تذکرہ قطبیہ کے نام سے آپ کے سوانح لکھے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ صوفیا تذکرہ نویسوں کی طرح کرامت نویسی ہی کو سب سے زیادہ مد نظر رکھا ہے چنانچہ صاحب تاریخ جلیلہ نے تذکرہ قطبیہ کے حوالہ سے آپ کی ستر کرامتوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں ایک یہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ سکندر لودھی بادشاہ ہندوستان دولت خان لودھی اور دیگر اکابر سلطنت کے ہمراہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا کہ حسن سوری نام ایک افغان اپنے بیٹے کو مرید کرانے کے لیے آیا۔ آپ نے حسن سوری کے لڑکے کو جس کا نام فرید تھا۔ بادشاہ سے بھی اونچی جگہ پر بٹھایا۔ دولت خان اور بادشاہ کو یہ بات ناگوار خاطر ہوئی۔ آپ نے فرمایا۔ جو فعل فقیروں سے سرزد ہو وہ بے معنی نہیں ہوتا۔ افغان بچہ افغانوں کے نام کو روشن کرے گا اور پھر فرمایا ؎

قادرا قدرت تو داری ہر چہ خواہی آں کنی

ہر گدائے را کہ خواہی در دمے سلطاں کنی

چنانچہ یہی فرید سوری ۹۴۷ھ میں ہمایوں کو ملک سے نکال کر شیر شاہ سوری کے نام سے ہندوستان کا بادشاہ بنا۔ اور وہ سب سے پہلے آپ کے آستانے پر حاضر ہوا اور لنگر خانہ کے اخراجات کے لیے ایک ارشاد لکھ کر پھر کسی اور کام میں مصروف ہوا۔ لیکن ہندوستان کی تمام تاریخیں پڑھ جائیے وہ لودھیوں کے زمانہ کی ہوں یا مغلوں کے عہد کی ان میں اس واقعہ کا کہیں ذکر نہ ملے گا۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہے کہ سیاسی تاریخ لکھنے والوں کا کچھ اور مقصد ہوتا ہے اور صوفیا کے حالات اور کرامت نامے لکھنے والوں کے کچھ اور مد نظر ہوتا ہے۔

بہرحال آپ کے علم و فضل میں کسی کو کلام نہیں۔ پسلر یا بھٹی کھوکھر اور چوہان قوم کے اکثر راجپوت آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے آپ صاحب روحانیت تھے۔ قلب آسائش دنیا سے پاک تھا۔ حکم الٰہی کے ماتحت آپ کا صاحب کرامت ہونا بعید بھی نہیں۔ آپ نے ایک مرتبہ راہ چلتے ہوئے ایک شخص کو کوئی جانور ذبح کرتے ہوئے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ ایک ہمراہی نے عرض کی۔ یا شیخ جو چیز شرع میں حلال ہو اس سے منہ پھیر لینا کیا؟ آپ نے فرمایا ؎

بہ شرع گرچہ حلال است در مروت نیست

ہلاک صید کہ او نیز چوں تو جانور است

تذکرہ قطبیہ اور دیگر تاریخ ہائے لاہور میں لکھا ہے کہ سلطان بہلول لودھی نے آپ کی فضیلت و بزرگی دیکھ کر آپ سے اپنی بیٹی کا نکاح کر دیا تھا۔ باوجود اس کے اپنی روزی خود پیدا کرتے تھے اور غلہ خود پیسا کرتے تھے۔ اور کسی مرید یا ملاقاتی کو تکلیف نہ دیتے تھے۔ بلکہ تذکرہ قطبیہ میں تو یہاں تک بھی لکھا ہے کہ آپ اور آپ کی زوجہ جو سلطان زادی تھی اکثر اوقات مل کر غلہ پیسا کرتے تھے۔

قطب العالم شیخ العالم صاحب کشف و کرامات ایک بادشاہ وقت کے داماد ایک بادشاہ کے قابل احترام سینکڑوں اور ہزاروں مریدوں کے پیر صاحب علم و فضل اپنی روزی اپنے ہاتھ سے کماتے ہیں۔ محنت مشقت کرتے ہیں اور پیٹ پالتے ہیں۔ لنگر خانے کے اخراجات کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ کسی سے نذرانہ نہیں لیتے اپنے جائے قیام پر لوگوں کو درس قرآن و حدیث

رہتے ہیں۔ مریدوں کی گردآوری نہیں کرتے اور نہ شاہانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ کیا ان باتوں سے چودھویں صدی کے آرام طلب و دکاندار خرقہ پوشوں اور سجادہ نشینوں کے لیے سبق نہیں ہے۔ علامہ اقبال سچ کہہ گئے ہیں ؎

رہا نہ حلقۂ صوفی میں سوزِ مشتاقی
فسانہ ہائے کرامات رہ گئے باقی
خراب کوشکِ سلطان و خانقاہِ فقیر
فغاں کہ تخت و مصلےٰ کمالِ زرّاقی

غرّہ ماہ رجب سنہ ۹۱۰ھ مطابق ۸ دسمبر ۱۵۰۴ء کا دن تھا۔ آپ کے کئی ارادت مند جن میں شیخ موسیٰ آہن گر اور شیخ زین الدین خوافی بھی موجود تھے کہ آپ کی حالت بدل گئی اور سر سجدہ میں رکھ کر جانِ عزیز جان آفریں کے سپرد کر دی۔ سکندر لودھی اس وقت لاہور میں موجود تھا۔ غسل کے وقت وہ بھی حاضر تھا۔ آپ کا مقبرہ عہد شاہانِ لودھی کی یادگار ہے۔ مقبرہ اور اس کی عمدہ و مفصل حال تحقیقاتِ چشتی میں درج ہے۔ مزار کا احاطہ جو اس وقت ساڑھے چار کنال زمین کے اندر ہے میکلوڈ روڈ پر دفتر روزنامہ زمیندار کے عقب میں ہے ایک چار دیواری کے اندر ایک قدیم مسجد آپ ہی کی تعمیر کردہ اب تک موجود ہے مسجد کے ساتھ ایک تہ خانہ زمین دوز بھی ہے۔ مغربی جانب اس تہ خانہ کا دروازہ ہے۔ چند زینے اتر کر لبِ زینہ ایک ڈیوڑھی آتی ہے شمالی رو بہ زینے اتر کر مزار ہے اور یہ عبادت خانہ ہے۔ ڈیوڑھی اس تہ خانہ کی سردار کھڑک سنگھ سندھانوالیہ نے (بزمانہ حکومت خالصہ) غلام محی الدین قریشی کے زیر اہتمام تعمیر کرائی۔ غلام محی الدین شاہ آپ کی اولاد سے تھے۔ ڈیوڑھی کے بیرونی دروازہ پر یہ قطعہ تاریخ درج ہے ؎

مکانِ خانقاہ قطبِ عالم
چو از تعمیرِ نو زینت پذیرفت
بتاریخِ بنائش ہاتفِ غیب
بنائے از غلام محی دیں گفت
۱۲۶۴ھ

احاطہ مزار کی دیواروں اور اندرونی عمارتوں کی حالت کہنگی اور عدم توجہی کے سبب خراب و خستہ ہو رہی تھی ۱۹۰۹ء میں جب مزار حضرت عبدالجلیل کا انتظام و انصرام پیر غلام دستگیر نامی کے سپرد ہوا۔ تو انھوں نے ”نام نیک رفتگان ضائع مکن“ پر عمل کر کے ان کی مرمت کی طرف توجہ کی۔ بلکہ پرانے مکانات مسجد و مزار اور چاہ پختہ کی مرمت کے علاوہ مشرق کی جانب چند نئے مکانات بھی تعمیر کر دیئے۔

نامی صاحب نے آپ کی شان میں جو اشعار لکھے ہیں ان میں سے چند ایک درج ذیل کئے جاتے ہیں: ؎

تو مسلماں کردہ از یک نظر
کافراں را بے گماں عبدالجلیل
سیداں و راجپوتان و مغل
بودہ اندت خادماں عبدالجلیل

ہست ہر قومے ارادت مند تو
اندریں ہندوستان عبدالجلیل
روضۂ پاکت زیارت گاہِ خلق
نام تو وردِ زبان عبدالجلیل
ناؔمی احقر کہ از اولادِ تست
شد بہ مدحت تر زبان عبدالجلیل

آپ کی دو بیویاں تھیں۔ ایک سلطان بہلول لودھی کی لڑکی۔ دوسری ایک افغان سردار کی بیٹی تھی۔ دوسرا نکاح آپ نے سلطان زادی کے انتقال کے بعد کیا تھا۔ پہلی بی بی سے آپ کے فرزند ابوالفتح ثانی تھے۔ اور دوسری سے شیخ بہاؤالدین۔ ابوالفتح ثانی یعنی سلطان بہلول لودھی کے نواسے کی اولاد آپ کے مزار پر بالفعل چلی آتی ہے۔ حضرت ابوالفتح ثانی کی چھٹی پشت میں شیخ ابوالحسن ثانی بڑے جید بزرگ گزرے ہیں۔ ان کے پوتے پیر کرم شاہ المشہور پیر میسنا شاہ (واقعہ شہادت ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء) کے چار فرزند تھے، پیر وارث شاہ، پیر بلند شاہ، پیر سکندر شاہ، پیر فرخ بخش۔ ان چاروں بھائیوں نے اپنی تصانیف، اپنے علم و فضل، اپنے علم شریعت و طریقت سے اپنے خاندان کا نام پنجاب اور ہندوستان میں بھی مشہور کیا۔ ان کی تصانیف اور ان کی زندگیوں کے حالات ناؔمی صاحب نے تاریخ جلیلیہ میں تفصیل سے لکھے ہیں۔ پیر غلام محی الدین شاہ قریشی جنھوں نے ۱۲۶۴ھ/۱۸۴۷ء میں تہ خانہ کی ڈیوڑھی تعمیر کرائی تھی، پیر بلند شاہ ہی کے فرزند تھے۔ پیر غلام محی الدین کے دو فرزند اور تین بیٹیاں تھیں۔ بیٹوں میں پیر محمد اشرف شاہ کے اہتمام میں بزرگوں کے مزارات دربار پیران، لاہور رہے ہیں۔ آپ نے اپنی وصیت (۲۴ فروری ۱۹۱۶ء) کے مطابق موضع بھیٹے وڈ کی اراضی (قریب دو گھماؤں) خانقاہ پیر بلند شاہ کی حفاظت و تعمیر کے لیے اور چاہ موسومہ چوہڑ شاہ بزرگی معہ متعلقہ اراضی واقعہ ملحقہ گوجر سنگھ لاہور خانقاہ حضرت عبدالجلیلؒ کے اخراجات کے لیے علی الدوام وقف فرما کر تولیت ان کی پیر غلام دستگیر ناؔمی کے نام کر دی۔ ناؔمی صاحب نے جیسا کہ پیش ازیں ذکر ہو چکا ہے۔ ان خانقاہوں کی حفاظت و تعمیر میں نمایاں حصہ لینے کے علاوہ اس وقت سے اپنے خاندان کے لاہوری بزرگوں کی کئی کتابیں طبع کرائی ہیں۔ تاریخ جلیلیہ کے نام سے ایک ضخیم مصور تاریخ طبع کی ہے۔ ایک اخبار بھی الجلیل کے نام سے جاری کیا تھا۔ پیر غلام دستگیر ناؔمی، پیر مراد شاہ کے چھوٹے بھائی پیر فرخ بخش کے فرزند پیر حیدر شاہ کی دختر کے بطن سے ہیں۔

شاہ کاکو چشتیؒ

شاہ کاکو کا مزار اور باغ دونوں مٹ گئے
رو دیے جب تک در و دیوار سنگھاں دیکھیے

اکثر تذکرہ نویسوں نے اس بات کا رونا رویا ہے کہ صوفیا و صلحاء کے حالات لکھنے والوں نے کسی بزرگ کے سال پیدائش و وفات کا بہت کم ذکر کیا ہے اور ان بزرگوں کے حالات لکھنے میں زیادہ تر عقیدت مندانہ رنگ کا اظہار ہوتا ہے کسی واقعہ کے ساتھ سنہ کا لکھنا یا دیگر ان اور کرامتوں اور مافوق العادات کارناموں کو تفصیل سے ذکر کرنا ہی مناسب سمجھا جاتا ہے۔

راقم کو بھی اکثر بزرگوں کے حالات لکھنے میں اسی مشکل کا سامنا کرنا پڑا ہے اور یہی مشکل حضرت شاہ کاکوؒ کے حالات میں پیش آ رہی ہے۔ مثلاً لاہوری مصنفوں میں صاحب تحقیقاتِ چشتی اور صاحب تاریخ لاہور اور صاحب خزینۃ الاصفیاؒ کسی نے بھی آپ کا سالِ ولادت نہیں لکھا۔ نہ آپ کے وطن کا ذکر کیا ہے۔ نہ یہ لکھا ہے کہ کس بادشاہ کے عہد میں آپ گذرے ہیں۔ اور اگر کوئی واقعہ لکھا بھی ہے۔ تو اس پر غور نہیں فرمایا کہ اس واقعہ کو تاریخ سے بھی کوئی تعلق ہے یا نہیں۔ چنانچہ صاحب تحقیقات و صاحب تاریخ لاہور حضرت شاہ کاکو کے متعلق لکھتے ہیں کہ "آپ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ دہلی کے مرید اور خواجہ فرید الدین گنج شکر کے ملنے والوں میں تھے۔" لیکن بابا گنج شکرؒ جو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے پیر طریقت تھے۔ ۵۸۴ھ/۱۱۸۸ء میں پیدا ہوئے اور بعمر بچانوے سال ۵ محرم ۶۷۰ھ کو وفات پا گئے۔ اور خواجہ نظام الدین اولیاؒ صفر ۶۳۴ھ/۱۲۳۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸ ربیع الثانی ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء کو انتقال فرما گئے۔

صاحب تذکرہ شیخ جوہرؒ قطب العالم شاہ عبد الجلیل کے حوالہ سے صاحب خزینۃ الاصفیا اور صاحب تاریخ جلیلہ شیخ کاکو کا سالِ وفات ۸۴۲ھ/۱۴۳۸ء لکھتے ہیں۔ اس طرح شیخ کاکو جو خواجہ نظام الدین اولیاؒ سے ۱۱۷ سال اور بابا فرید الدین گنج شکر سے ۱۷۲ سال بعد فوت ہوئے ہیں۔ ان دونوں بزرگوں سے کس طرح مستفید ہو سکتے ہیں۔ صاحب خزینۃ الاصفیاؒ (ص ۴۰۰ جلد اوّل میں) یہ بھی لکھتے ہیں کہ "نسب شریف وے بہ چند واسطہ بہ حضرت فرید الحق والدین گنج شکر مے رسد" اس سے واضح ہوتا ہے کہ شیخ کاکو حضرت بابا صاحب کی تیسری چوتھی پشت میں تھے۔ اگر یہ صحیح ہے تو شیخ کاکو کا حضرت بابا صاحب اور خواجہ نظام الدین اولیاؒ سے مستفیض ہونا اور بھی مشکل نظر آتا ہے۔

غرض اس قسم کی فرو گذاشتیں ہیں۔ جن کو اولیائے کرام کے تذکرہ نویس ذہن میں نہیں رکھتے۔

حضرت شیخ کاکو شیخ نور الدین نام ایک بزرگ سے ابتدا میں تحصیلِ علم کرتے رہے۔ جب لاہور آئے تو شیخ پیر محمد چشتی سے فیض کامل حاصل کیا۔ اور پھر لاہور ہی میں ساری عمر گذار دی۔ بیشمار لوگ آپ کے فیض صحبت اور آپ کے ارشادات سے مستفیض ہوتے رہے ہیں۔ آپ ۸۴۲ھ/۱۴۳۸ء میں بزمانہ سلطان بہلول لودھی[1] لاہور میں وفات پا گئے۔ ان کے فرزندوں میں شیخ اسحاق صاحبِ حال و قال گذرے ہیں۔ شیخ عارف چشتی لاہوری جو شاہجہان کے زمانہ میں لاہور کے مشہور اہل اللہ بزرگ تھے شیخ اسحاق ہی کے مریدانِ باکمال میں تھے۔

جہاں حضرت شیخ کاکو کا مزار ہے وہیں آپ کی اقامت گاہ تھی۔ آپ ہی کے دم قدم کی بدولت اس محلہ کا نام گذر شاہ کاکو یا محلہ شاہ کاکو مشہور تھا۔ جب دارا شکوہ نے اپنی حویلی میں جس کے کھنڈروں پر اب سرائے میاں سلطان اور اس کے ملحقات آباد ہیں۔ اقامت اختیار کی تو اس محلہ کا نام محلہ دارا شکوہ اور چوک دارا شکوہ مشہور ہو گیا۔ اس مزار کے شمالی رو بہ محلہ جوہریاں اور جنوب رو بہ محلہ نخاس تھا جہاں پہلے سوداگران اسپ رہا کرتے تھے۔ بعد میں نواب عبد الصمد خان اور نواب معین الملک کی نظامت کے ایام میں سکھ لیڈروں اور باغیوں کو پھانسی ملا کرتی تھی۔ مزار کے شرقی رو بہ ایک بہت خوبصورت

---

[1] تخت نشینی بہلول لودھی ۱۷ ربیع الاول ۸۵۵ھ/۱۴۵۱ء۔ وفات ۸۹۴ھ/۱۴۸۸ء۔

باغ تھا جو نواب شاہنواز خاں گورنر لاہور اور احمد شاہ ابدالی بادشاہ کابل کی جنگ میں خراب وخستہ ہو کر برباد ہو گیا۔ ۱۸۶۱ء میں باغ کی زمین میں کاشت ہوا کرتی تھی۔ بلکہ حضرت کے مزار کے چاروں طرف زراعت ہی زراعت نظر آتی تھی۔

حضرت شاہ کاکو چونکہ مرفوع الحال تھے اور بالکل دنیا واروں کی طرح رہتے تھے۔ اس لیے بہت کم لوگ آپ کے روحانی کمالات سے آگاہ تھے۔ یہاں تک کہ حضرت میاں میر کے زمانہ تک بھی لوگ اس مزار کو کچھ اس کی سادگی اور کچھ صاحب مزار کے کمالات سے لاعلم ہونے کی وجہ سے معمولی مزار سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت میاں میر اس جگہ آئے اور فاتحہ پڑھ کر اپنے یاروں سے فرمایا کہ یہ مزار ایک کامل بزرگ اور بہت بڑے ولی کا ہے۔ اس زمانہ سے لوگوں کو آپ کے صاحب کمال ہونے کا علم ہوا۔ ان ایام میں نو مسلم شیوخ (کھوجہ برادری) نے اس مزار کی طرف توجہ کی اور چونکہ بعض منتیں پوری ہو جانے کی وجہ سے اس درگاہ سے ان کو خاص عقیدت ہو گئی تھی۔ اس لیے انھوں نے اس مزار پر ربیع الاول کی ہر بارھویں تاریخ کو عرس منانا شروع کیا۔ جس کا سلسلہ ساڑھے تین سو سال تک برابر جاری رہا۔

عرس کے ایام میں چراغاں اور قوالی کے علاوہ رقص و سرود کا بھی اہتمام ہوتا تھا۔ فاتحہ خوانی کے ساتھ نان حلوا بھی تقسیم ہوتا تھا اور فرش فروش سائبان اور قناتیں بھی لگائی جاتی تھیں، لیکن ان تکلفات کو دیکھ کر مزار کے اندر سے شعر و یہ خاموش صدا آتی ہوگی۔ ؎

تم اس کے واسطے بیکار کیوں زحمت اٹھاتے ہو
نہ مدفن مجھے کیا فائدہ ہوگا چراغاں سے

آپ کی رحلت سے کچھ عرصہ بعد مرقد کے متصل ایک اور مسجد اعلیٰ پیمانہ پر تعمیر ہوئی اور دارا شکوہ بن شاہ جہاں کے زمانہ میں اسی کے نام پر محلہ دارا شکوہ بھی آباد ہوا۔ جس کو چوک دارا شکوہ بھی کہتے تھے۔ جب مغل حکومت نادر شاہی اور احمد شاہی حملوں کے بعد رفتہ رفتہ کمزور ہونے لگی اور سکھوں نے رفتہ رفتہ بام عروج پر چڑھنا شروع کیا تو مسلمانوں کے مقبروں اور ان کی مسجدوں اور ان کی شاندار عمارتوں کی شامت آگئی۔ چنانچہ اس مسجد اور اس مقبرہ پر بھی سکھوں کا قبضہ ہو گیا۔ جب سکھوں کی سب سے بڑی بے آئین حکومت یعنی سہ حاکمان لاہور کے بعد ۱۷۹۸ء میں رنجیت سنگھ نے لاہور پر قبضہ کیا۔ تو اس نے بھی یہاں سکھوں کا قبضہ برقرار رکھا۔ ۱۸۴۹ء کے بعد جب پنجاب پر انگریزوں کا پرچم لہرایا تو مسلمانوں کو داد فریاد کا موقع ملا۔ دیوانی دعوے بھی وقتاً فوقتاً ہوتے۔ ۱۹۳۵ء کی کشمکش ہوئی گرمیوں میں جانی قربانیاں بھی ہوئیں۔ لیکن کچھ قانونی پیچیدگیوں کی وجہ سے اور کچھ مسلمانوں کی خود غرضانہ پارٹیوں کی بدولت ہر بار ناکامی ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ سکھوں نے مسجد کو گوردوارہ بنا لیا اور قبر اس کے چبوترہ اور اس کے قدیم درخت بیری کا نام و نشان تک نہ رہنے دیا۔ یہ المناک واقعہ جولائی ۱۹۳۵ء کے عشرہ اول میں سر ایمرسن کی گورنری اور سر سکندر حیات خاں کی وزارت کے ایام میں پیش آیا۔

۱۹۳۵ء سے اب تک کہ ۱۹۴۴ء ہے۔ لنڈا بازار کے سرے پر مسجد شہید گنج (اور اب گوردوارہ شہید گنج) کے سامنے چاہ میاں سلطان کے رُخ پولیس کے چند سپاہی رہتے ہیں۔ وہاں روزانہ گرنتھ صاحب کا پاٹھ ہوتا ہے بازار یعنی مغرب کی جانب ایک مضبوط، بلند اور پختہ خشتی دیوار کھڑی کر دی گئی ہے۔ گوردوارہ کے دو دروازے ہیں۔ ایک بازار شہید گنج کی طرف

دہلی دروازہ بازار کی طرف ٹیکنیکل سکول کی دیوار کے بالمقابل سڑک کا نام رنجیت روڈ ہے۔ دونوں دروازوں پر سکھوں اور پولیس کا پہرہ رہتا ہے اور کسی مسلمان کو گوردوارہ کے اندر جانے کی اجازت نہیں ہے[1]

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

شیخ موسیٰ آہن گرؒ[2]

[یہ بزرگ لودھی بادشاہوں کے زمانے میں یہاں موجود تھے اور اپنی روزی لوہار کا کام کرکے کماتے تھے۔ ابتدا میں شیخ شہر اللہ بن شیخ یوسف کے شاگرد اور مرید ہوئے جو حضرت بہاؤ الحق ملتانیؒ کے سجادہ نشین تھے۔ ان کی وفات کے بعد حضرت عبدالجلیل چوہڑ شاہ بندگیؒ کی خانقاہ میں حاضر ہوئے اور کچھ عرصہ ان کی تربیت میں رہے۔ شیخ ان کی علمی اور روحانی قابلیت سے اس قدر خوش ہوئے کہ اپنی خانقاہ کے متصل تین بیگھہ زمین ان کو عطا کر دی اور یہ وہاں رہنے لگے۔ یہ جگہ اس زمانے میں کوٹ کروڑ کہلاتی تھی۔ اسی جگہ قلعہ گوجر سنگھ کے متصل میکلوڈ روڈ پر آپ کا مزار واقع ہے۔

شیخ موسیٰ کی طبیعت جلالی تھی۔ مفتی غلام سرور لاہوری، رائے بہادر کنہیا لعل اور سید محمد لطیف کا بیان ہے کہ "ایک روز شیخ موسیٰ اپنی بھٹی کے پاس بیٹھے کام کر رہے تھے کہ ایک ہندو عورت اپنا تکلا سیدھا کرانے کے لیے آئی۔ آپ نے تکلا تو آگ میں ڈالا اور خود ٹکٹکی باندھے اس عورت کی طرف دیکھنے لگے۔ عورت نے خیال کیا کہ یہ شخص شاید بدنیتی سے اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ تلملا کے بولی کہ آپ اپنا کام کیوں نہیں کرتے۔ میری طرف کیوں دیکھ رہے ہیں؟ یہ سن کر شیخ موسیٰ جلال میں آ گئے اور آپ نے کہا "اے عورت! میرا دھیان تو صانع حقیقی کی صناعی پر تھا۔ میں یہ تکلا جو آگ کے انگارے کی طرح سرخ ہے اپنی آنکھوں میں پھیرتا ہوں۔ اگر میں نے تجھے بری نیت سے دیکھا ہو تو میری روشن آنکھیں بریاں ہو کر اندھی ہو جائیں" یہ کہہ کر آپ نے وہ تکلا اپنی آنکھوں میں پھیرا مگر آپ کو کوئی گزند نہ پہنچا بلکہ تکلا سونے کا ہو گیا۔ اس واقعہ سے وہ عورت بہت متاثر ہوئی۔ آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر کے ساری عمر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف رہی۔ اس کی قبر بھی شیخ موسیٰ کے احاطے کے شمال مشرقی گوشے میں واقع ہے۔"

شیخ موسیٰ کے سال وفات پر بحث کرتے ہوئے پروفیسر شجاع الدین لکھتے ہیں کہ "شیخ عبدالجلیلؒ سے کسب فیض کے بعد شیخ موسیٰؒ عمر بھر لاہور میں اقامت گزیں رہے۔ آپ کے ہادیٔ طریقت حضرت عبدالجلیل چوہڑ شاہ بندگی ۱۵۰۴ء میں فوت ہوئے تھے۔ حضرت موسیٰ آہنگر کا سال وفات خزینۃ الاصفیاء وغیرہ اولیاء کے تذکروں میں ۱۵۱۹ء مرقوم ہے۔ آئین اکبری اور ملا نظام الدین احمد کی کتاب طبقات اکبری میں آپ کی تاریخ وفات دورِ اکبری کا ابتدائی زمانہ بیان کی جاتی ہے۔ اکبر ۱۵۵۶ء میں سریر آرائے ہندوستان

---

[1] یہ قیام پاکستان سے پہلے کی باتیں ہیں۔ اب سکھ یہاں نہیں ہیں۔ گوردوارہ بند پڑا ہے۔ باہر مسلمان سپاہی پہرا دے رہے ہیں۔ یاتری سال کے سال آتے ہیں اور زیارت کر کے واپس چلے جاتے ہیں۔ مسلمان اب بھی اس جگہ کے دعویدار ہیں مگر حکومت خاموش ہے۔ (مرتب)

[2] شیخ موسیٰ آہن گر کے حالات مرتب کے قلم سے ہیں۔

ہوا۔ اس لحاظ سے شیخ کا سال وفات کم از کم ۹۵۰ھ/۱۵۴۳ء یا ۹۵۵ھ/۱۵۴۸ء سمجھنا چاہیئے۔ بظاہر یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنے شیخ کے بعد پچاس سال سے زیادہ عرصہ زندہ رہے ہوں۔ لیکن ابوالفضل اور نظام الدین احمد جیسے معتمد اور ثقہ ہم عصر مورخین کا متفقہ بیان بھی اس قابل نہیں کہ رد کر دیا جائے۔ پس اگر شیخ عبدالجلیل کی وفات کے وقت آپ کی عمر تیس پینتیس سال کی ہو تو آپ کا اسی پچاسی سال کی عمر پاکر دورِ اکبری کے آغاز میں فوت ہونا خلافِ تحقیق معلوم نہیں ہوتا۔[1]

شیخ موسیٰ لودھیوں کے بعد سوری بادشاہوں کے عہد میں بھی معزز رہے کیونکہ شیر شاہ سوری خود حضرت شیخ عبدالجلیل کا معتقد تھا۔ اور اس نے آپ کی خانقاہ کو جاگیر بھی عطا کی تھی۔

شیخ موسیٰ کا مقبرہ میکلوڈ روڈ پر قلعہ گوجر سنگھ کے قریب نو تعمیر مکانوں کے درمیان واقع ہے۔ گنبد ایک مختصر سے احاطے میں ہے جس کے نیچے ایک بلند چبوترے پر قبر ہے۔ مقبرہ سے ملحق ایک مسجد ہے۔ گنبد چوکور ہے۔ اس پر فیروزی رنگ کی نہایت خوبصورت گلکاری کی ہوئی ہے۔ یہ گنبد لاہور میں منبت کاری کا قدیم ترین نمونہ ہے۔ اس کی شکل مقبرہ سید فیروز گیلانی سے ملتی جلتی ہے جو ۱۵۲۵ء میں فوت ہوئے اور جن کا مزار نسبت روڈ پر واقع ہے۔

لاہور کی لوہار برادری کے علاوہ دوسرے لوگ بھی آپ کے معتقد ہیں۔ آپ کا عرس آپ کے عقیدت مند لوگ دو پارٹیاں سال میں دو موقعوں پر علیحدہ علیحدہ کرتی ہیں۔ ایک پارٹی ۱۷ ماہ صفر المظفر کو اور دوسری غیر معین تاریخوں میں۔[2] اب سے دو سو سال قبل آپ کا عرس ۲۲ ربیع الآخر کو ہوا کرتا تھا۔[3] ——— [مرتب]

پیر شیرازی

ان کا مزار لاہور کے محلہ چوڑے موری میں واقع ہے۔ نام ان کا پیر سراج الدین تھا مگر لوگ عام طور پر انھیں "پیر شیرازی" کہتے ہیں۔ یہ بزرگ سلطان محمد تغلق کے عہد میں بخارا سے آ کر لاہور میں مقیم ہوئے۔ بہت بڑے عالم اور عارف تھے۔ تدریس و تلقین کے لیے ہزارہا لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ بادشاہ نے شہرت سنی تو ان کو شہر کا قاضی مقرر کرنا چاہا۔ مگر انھوں نے یہ عہدہ قبول نہ کیا۔ بادشاہ سخت ناراض ہو کر ان کے درپے آزار ہوا۔ مگر انھوں نے تعلیم و تلقین کا دروازہ بند کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور وفات کے بعد بھی اسی حجرے میں دفن ہوئے۔ مزار ان کا پختہ بنا ہوا ہے اور عمارتوں میں گھر گیا ہے۔[4] ——— [مرتب]

---

[1] مضمون "حضرت شیخ موسیٰ آہنگر" مطبوعہ حمایت اسلام لاہور ۲ دسمبر ۱۹۴۸ء صفحہ ۲۔

[2] تاریخ جلیلیہ مصنفہ پیر غلام دستگیر نامی مطبوعہ ۱۹۳۷ء ص ۳۲۴۔

[3] ضمیمہ اورینٹل کالج میگزین فروری ۱۹۴۷ء ص ۲۹۔ [4] تاریخ لاہور کنہیا لال ص ۱۵۲۔

شبابِ لاہور

(عہدِ مغلیہ میں)

بن گئے گورِ غریباں کس طرح شاہی محل
آئیے یہ بھی طفیلِ چرخِ گرداں دیکھئے
درسِ تمہیدِ خزاں ہے اجلوۂ رنگِ بہار
چشمِ عبرت سے تماشائے گلستاں دیکھئے

بابر نے ۱۵۲۴ء سے ۱۵۲۶ء تک تین بار لاہور پر حملہ کیا۔ پہلے حملے میں اس نے برافروختہ ہو کر اپنی فوج کو شہر لوٹنے کی اجازت دی۔ فوج نے نہ صرف لوٹ مار ہی کی بلکہ شہر کا کچھ حصہ جلا بھی دیا۔ اس کے واپس چلے جانے کے بعد دولت خاں لودھی حاکم لاہور نے بابر کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ بابر دو مرتبہ آیا اور آخری مرتبہ تو لاہور اور سرہند سے گذر کر پانی پت پر افغانوں کے ساتھ ایک عظیم جنگ کی جس میں سلطان ابراہیم مارا گیا۔

مغلوں کی سلطنت ہندوستان میں کیا قائم ہوئی کہ دہلی۔ آگرہ وغیرہ مقامات کے ساتھ ہی لاہور کی قسمت بھی چمک اٹھی اور اس کا ستارۂ اقبال عروج پر آگیا۔ بابر کے جانشینوں کے عہد میں لاہور نے وہ رونق حاصل کی کہ اس کی آبادی اس زمانے کے مؤرخین کے قول کے مطابق نو سے بارہ میل کے اندر تھی۔

بابر کے جانشینوں کے زمانے میں جو کیفیت لاہور کی رہی ہے اس کا مجمل سا بیان یہاں کیا جاتا ہے:۔

دورِ ہمایونی

ہمایوں نے کابل، قندھار اور پنجاب اپنے چھوٹے بھائی شہزادہ کامران کو دے دیئے۔ کامران نے سب سے پہلے لاہور میں خوش نما عمارات کی طرح ڈالی۔ نقوش صاحب کے قول کے مطابق ایک عالی شان محل مع ایک وسیع باغ کے جو نولکھا سے راوی تک پھیلا ہوا تھا، تعمیر کرایا۔ اب اس باغ اور محل کا کہیں نشان تک نہیں۔ اس کے علاوہ دریا کے پار ایک عالی شان باغ اور خوبصورت بارہ دری کی بنیاد رکھی۔ اسی بارہ دری میں جہانگیر نے اپنے بیٹے خسرو کو ۱۶۰۶ء مطابق ۱۰۱۴ھ میں بغاوت کے جرم میں قید کیا تھا۔ اس بارہ دری کا کچھ حصہ اب تک موجود ہے جس کی شکستہ دیواریں دریا کی موجوں کے تھپیڑے کھا رہی ہیں۔

کامران مرزا نے اپنے عہد میں لاہور کو بے حد رونق دی۔ جب ۱۵۴۰ء میں شیر شاہ نے ہمایوں کو شکست دی تو وہ اپنے بھائی کے پاس لاہور چلا آیا۔ لیکن جب شیر شاہ کے خوف سے کامران کابل بھاگ گیا اور ہمایوں جودھپور اور راجستان کے جنگلوں اور ریگستانوں کی خاک چھانتا ہوا ایران چلا گیا تو شیر شاہ بلا شرکت غیرے تمام ہندوستان کا بادشاہ ہو گیا۔ اس نے اپنی پنجسالہ حکومت میں رفاہ عام کے بڑے بڑے کام کئے۔ مگر لاہور چونکہ مغلوں کا مرکز تھا اس لیے اسے لاہور سے خاص عداوت تھی۔ اس نے لاہور کو تباہ کر کے اس کی بجائے سیالکوٹ کو پنجاب کا دارالخلافہ مقرر کرنا چاہا مگر موت نے اسے مہلت نہ دی۔ بلکہ بیان کیا جاتا ہے کہ مرتے وقت اس نے اپنی خواہش کے پورا نہ ہونے پر دلی افسوس کا اظہار کیا[1]۔

عہدِ اکبری

چودہ سال کی جلاوطنی کے بعد ۱۵۵۵ء میں ہمایوں ایک فاتح کی حیثیت سے لاہور میں داخل ہوا۔ اہل لاہور نے اس کے واپس آنے پر دلی مسرت کا اظہار کیا اور اس شہر میں جسے شیر شاہ اور اس کا بیٹا خاک میں ملا نا چاہتے تھے، عظیم پیمانے پر چراغاں کیا گیا۔ ۱۵۵۶ء میں ہمایوں کے انتقال کے بعد اکبر تخت نشین ہوا۔ اس کے زمانے میں لاہور کو جو رونق ہر پہلو سے نصیب ہوئی، اس کے بعد عہد شاہجہانی کے سوا اور کسی عہد میں نہیں مل سکی۔

اکبر ۱۵۸۴ء سے ۱۵۹۸ء تک یعنی کامل پندرہ سال لاہور کی آبادی اور رونق کے لیے لاہور میں مقیم رہا۔ عہد اکبری کے یورپین اور ہندوستانی سیاحوں اور مورخین نے لاہور کی نسبت جو کچھ لکھا ہے اس کا اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔

مسٹر طامس ہربرٹ نامی ایک سیاح ۱۵۹۵ء میں لاہور آیا۔ اکبر ان دنوں لاہور میں مقیم تھا۔ وہ لکھتا ہے:

> لاہور کا مقابلہ اگر ہندوستان کے کسی شہر سے ہو سکتا ہے تو وہ صرف آگرہ ہی ہے۔ اس کی آب و ہوا سال کے آٹھ ماہ تک نہایت خوشگوار رہتی ہے۔ بازار اچھے بارونق اور پختہ ہیں۔ ان میں سے بعض سے دریائے راوی کے ذریعے جو شہر کے پاس ہی بہتا ہے صاف کیے جاتے ہیں۔ یہاں کی قابل دید عمارات میں قلعہ، محلات، حمام، تالاب، باغات اور بعض بہترین عمارات ہیں۔ قلعہ بہت بڑا ہے جسے اکبر نے اپنے قیام لاہور کے ایام میں پختہ خشتی بنوایا اور اس میں رفیع الشان عمارتیں تعمیر کرائیں۔ قلعہ کے بارہ چوبی دروازے ہیں جن میں سے تین کا منہ شہر کی طرف ہے اور نو کا باہر جنگل کی طرف[2]۔

---

[1] تاریخ پنجاب از محمد لطیف صفحہ ۲۵۔

[2] آجکل صرف ایک دروازہ کھلا رہتا ہے جو ڈیرہ گوروارجن دیو اور سمادھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بالمقابل ہے۔

ابوالفضل آئینِ اکبری میں لاہور کے متعلق لکھتا ہے :-

" لاہور بزرگ شہر لیست میان دو آبہ باری۔ در بزرگی و انبوہ مردم کم ہمالی۔ درین دولت ابد پیوند قلعہ وارک او از خشتِ پختہ ساختہ اند و چوں چندگاہ پایۂ تخت شدہ والا کاخہا برافروختہ آمد و دلکشا باغ ہا شادابی دیگر بخشید و گوناگوں مردم بر شہر راہ بیگاہ شد۔ دشگرف کارہا بہرساختند و در انبوہی و بزرگی از اندازہ گذشت "

لاہور میں شال بافی اور پشمینہ کا کام اس کثرت سے ہوتا تھا کہ لاہور اس زمانہ میں چھوٹا کشمیر معلوم ہوتا تھا۔ ابوالفضل آئینِ اکبری میں یہاں کی شال بافی کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے :-

" و از توجہ شاہنشاہی در لاہور از ہزار کارخانہ زیادہ شد "

اسی لاہور میں جہاں سولھویں صدی عیسوی میں ایک ہزار سے زیادہ شال بافی کے کارخانے تھے، وہاں آج بیسویں صدی میں ایک بھی نہیں۔

لاہور ہی سے اکبر نے کشمیر پر حملہ کیا اور اسی شہر میں بیٹھ کر اقوام سرحد کی گوشمالی کی۔ اسی شہر میں اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے خیرپورہ[1] اور دھرم پورہ کے نام سے دو عظیم الشان غریب خانے (POOR HOUSES) قائم کیے۔ اسی شہر میں اکبر نے ملا احمد ٹھٹھوی کو تاریخ الفی۔ شیخ عبدالقادر بدایونی کو رامائن۔ جامع رشیدی اور مہابھارت کے تراجم اور ملا محمد شاہ آبادی کاشمیری کو تاریخ کشمیر لکھنے کا حکم دیا۔ اسی شہر میں فیضی نے ۱۰۰۳ھ (۱۵۹۴ء) میں مثنوی نل دمن لکھی۔

۱۵۹۵ء میں اکبر لاہور ہی میں تھا کہ گوا سے پرتگیزی پادریوں کی ایک جماعت اس کے پاس آئی۔ ان پادریوں نے اپنے دلچسپ سفرناموں میں لاہور کی بہت تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ شہر ایسا بارونق اور آباد ہے اور اس میں شاہی محلات کے علاوہ امرا و وزراء کے ایسے ایسے عالی شان مکانات ہیں کہ ان کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ بادشاہ ان ایام میں راوی کے ایک جزیرہ میں رہتا تھا۔ جہاں اس کے رہنے کے لیے ایک خوشنما بنگلہ بنایا گیا تھا[2]

لاہور میں اکبر نے اپنے نام پر ایک منڈی بھی تعمیر کی۔ جسے آج تک اکبری منڈی کے نام سے پکارتے ہیں نیز ایک دروازہ بنایا جس کا نام اس کے نام پر اکبری دروازہ[3] رکھا گیا۔ ان دونوں عمارتوں کی موجودہ شکل بہت تبدیل ہو چکی ہے بلکہ یہ کہنا مناسب ہے کہ صرف نام ہی نام باقی رہ گیا ہے۔ عمارتوں کی وضع قطع اکبری عہد کی سی نہیں ہے۔

ابوالفضل نے لاہور میں ایک عظیم الشان مکان "فضل آباد" کے نام سے تعمیر کیا۔ اسی جگہ ابوالفضل اور فیضی کے

---

[1] خیرپورہ کی عمارت کا کچھ حصہ اب بھی دارانگر کے قریب سڑک میانمیرؒ کی بائیں جانب موجود ہے۔

[2] آج کل اس جزیرہ اور بنگلہ کا نشان تک نہیں۔

[3] اکبری دروازہ حال ہی میں مسمار کر دیا گیا ہے (قریشی)

باپ شیخ مبارک نے ۱۰۰۱ھ/۱۵۹۲ء میں انتقال کیا۔

ہمایوں کے زمانہ کے ایک بزرگ جنھوں نے سوری خاندان کے عہد میں بڑا عروج پایا تھا، اکبر کے وقت میں بھی پورے عروج پر تھے۔ نام مُلا عبداللہ اور خطاب مخدوم الملک تھا۔ ان کے املاک اور مکانات جو شاہی ایوانات سے بھی بڑھ چڑھ کر تھے لاہور میں تھے۔ ملّائے مذکور نے ان مکانات کے اندر بڑی بڑی قبریں بنوا رکھی تھیں جن پر سبز غلاف پڑے رہتے تھے اور دن ہی سے چراغ جلنے لگتے تھے۔ بادشاہ کو خبر ہوئی کہ یہ قبریں اور مزار نہیں بلکہ دفینے اور خزانے ہیں۔ جب ان قبروں کو کھدوایا گیا تو اس قدر زر و دولت برآمد ہوا کہ بادشاہ دنگ رہ گیا۔ یہ سب مال نقد کروڑ روپے کا تھا جو اینٹوں کی شکل میں صندوقوں میں بند کر کے رکھا گیا تھا۔ آخر یہ سب مال جو خلق خدا کے گلے گھونٹ گھونٹ کر جمع کیا گیا تھا، اکبری خزانے میں داخل کر لیا گیا۔

راجہ ٹوڈرمل اور راجہ بھگوان داس کے محلات دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتے تھے مگر اب ان کا کہیں نشان نہیں ملتا۔

اکبر کے اتالیق بیرم خاں کا بیٹا عبدالرحیم خان خاناں جس کی فیاضی و سخاوت نے حاتم کو بھی مات کر دیا تھا لاہور ہی میں پیدا ہوا تھا جہاں اس کے باپ کا رفیع الشان محل لاہور کے لیے باعث ناز تھا۔

[راجہ مان سنگھ، امیر قلیچ خاں، نظام الدین مصنف طبقات اکبری وغیرہ امرائے دربار اکبری کے باغات نے لاہور کو باغ ارم اور ان کے محلات نے اس کو عروس البلاد بنا رکھا تھا۔ بادشاہ کی فیاضی، سیر چشمی اور علمی قدر دانی نے شعراء، مصوّر، مورخ، علماء، فضلاء، اہل ہیئت، اہل قلم، صناع اور کئی قسم کے باکمال لاہور میں جمع کر دیئے تھے ـــــ مرتب]

حکیم ہمام کے بھائی حکیم علی گیلانی[1] کا حوض بھی لاہور میں تھا جسے اس قابل حکیم نے ۱۰۰۲ھ/۱۵۹۳ء میں اس حکمت کے ساتھ تعمیر کیا کہ بڑے بڑے انجینیر حیران رہ گئے۔ اس حوض میں یہ خوبی تھی کہ اس کی تہ تک ایک زینہ کے ذریعے جایا جاتا تھا اور وہ زینہ ایک ایسے حجرے یا کمرے میں جا کر ختم ہوتا تھا جو حوض کی تہ کے نیچے واقع تھا۔ یہ حجرہ رقبہ میں ۳۴ مربع گز تھا اور سنگین حوض کی تہ کے عین وسط میں واقع تھا۔ اس کی چھت پر ایک بلند مینار اور حجرہ کے چاروں طرف پُل تھے۔ حجرہ کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے تھے لیکن پانی اندر نہیں جا سکتا تھا۔

اکبر عجائبات کا عاشق تھا۔ اس نے بنفس نفیس اس حوض کو ملاحظہ فرمایا۔ کپڑے اتار کر غوطہ لگایا اور حجرہ میں داخل ہو گیا۔ اس حجرہ میں ایک تکیہ اور چند کتابیں مطالعہ کے لیے رکھی تھیں۔ حجرہ میں ہوا اور روشنی کا پورا انتظام تھا۔ بادشاہ کو مختصر سی حاضری بھی دی گئی جسے اس نے نہایت شوق سے نوش فرمایا۔ ہوا خواہ باہر تھے۔ دو ہی گھڑی گزرے تھے جب بادشاہ باہر آیا تو سب کو اطمینان ہوا۔ بادشاہ نے خوش ہو کر حکیم موصوف کو منصب پنج صدی عطا کیا۔

جہانگیر نے بھی اسی حوض کا اپنی تزک میں ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

" حجرہ نہایت روشن ہے جس کا راستہ اسی حوض میں ہے

---

[1] بحوالہ مآثر الامرا، تاریخ لاہور (انگریزی و اردو) دربار اکبری، تاریخ ذکاء اللہ۔

ہے۔ مگر پانی کی ایک بوند اندر نہیں جاتی۔ دس بارہ
آدمی حجرہ میں بآسانی بیٹھ سکتے ہیں۔" (ترجمہ)

جہانگیر نے حکیم علی گیلانی کو منصب دو ہزاری اور اس کے بیٹے حکیم عبدالوہاب کو پانصد سوار کا منصب عطا کیا۔

۱۰۱۹ھ/۱۶۱۱ء میں اسی نمونے پر ایک اور حکیم نے فتحپور سیکری میں ایک حوض بنانا چاہا مگر وہ کامیاب نہ ہوا۔

اکبر کے زمانے میں دریائے راوی نہایت جوش و خروش سے بہتا اور شاہانِ مغل کی قدم بوسی کرتا ہوا نکل جاتا تھا۔ ان دنوں اس کا پانی اس قدر گہرا تھا کہ اس میں جہاز چلا کرتے تھے۔ زندہ دل شہزادے، امرائے دربار، نفیس، دل آویز اور رنگین جھالردار کشتیوں میں بیٹھ کر دریا کی سیر کرتے اور گرمی کے موسم میں خنک اور مرطوب ہوا کا لطف اٹھایا کرتے تھے۔

"۱۰۰۲ھ/۱۵۹۳ء میں راوی کے کنارہ پر ایک چھوٹا سا جہاز تیار ہوا۔ ۳۵ گز الہٰی کا مستول تھا۔ ۴۳۶ ۲ شہتیر سال اور ناجو کے استعمال کیے گئے۔ اور ۴۶۸ من دو سیر لوہا خرچ ہوا۔ ۲۴۰ بڑھئی اور لوہار وغیرہ اس پر کام کرتے رہے۔ تیار ہو جانے پر ایک ہزار آدمیوں نے دس روز میں بڑی مشکل سے اسے دریا میں ڈالا۔ اور لاہری بندر (موجودہ روہڑی جو سکھر کے متصل دریائے سندھ پر واقع ہے) پہنچایا۔ جہاز وزنی تھا اور دریا میں پانی کم تھا، اس لیے جہاز کو جا بجا رُکنا پڑا۔ آخر بصد مشکل جہاز منزلِ مقصود پر پہنچا۔ اس زمانے میں ایسے ایسے روشن دماغ اور یہ سامان کہاں تھے جو دریا کا زور بڑھا کر گذرگاہ کو جہاز رانی کے قابل بنا لیتے۔ اس لیے آمد و رفت جاری نہ رہ سکی۔ شہنشاہ نے ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۵ء میں ایک اور جہاز تیار کر دیا۔ اس میں پانی کی کمی کا لحاظ رکھ کر جہاز کے وزن کی رعایت کی گئی۔ پھر بھی یہ جہاز ۵ ہزار من سے زیادہ بوجھ اٹھا سکتا تھا۔ یہ لاہور سے لاہری تک بآسانی جا پہنچا۔ اس کا مستول ۲۷ گز کا تھا اور ۳۳۲۱۸ روپے اس پر لاگت آئی تھی۔"[1]

زندہ دل بادشاہ نے جہاں جہاز چلا دیئے وہاں کشتیوں کا کیا شمار ہوگا۔ اور پھر جب امرا و وزرا اور خود شہنشاہ کشتیوں کی سیر کرتے ہوں گے اور عام لوگ بھی اپنی یا کرایہ کی کشتیوں میں دریا کی ٹھنڈی ہوا سے لطف اندوز ہوتے ہوں گے تو وہ وقت کیا فرحت افزا ہوتا ہوگا۔

۹۹۹ھ/۱۵۹۱ء کے اواخر میں اکبر نے مرزا جانی حاکم ٹھٹھہ (سندھ) پر یورش کی۔ سامانِ جنگ خشکی کے راستے کے علاوہ راوی کے ذریعے ٹھٹھہ بھیجا گیا۔ دربار اکبری میں لکھا ہے :-

"بادشاہ نے اس مہم میں ایک لاکھ روپیہ ایک مرتبہ، پچاس ہزار
ایک دفعہ، پھر لاکھ روپیہ اور ایک لاکھ من غلہ، سو بڑی توپیں
اور دیگر سامانِ جنگ راوی کے ذریعہ ٹھٹھہ کو بھیجا جہاں مرزا
جانی حاکم ٹھٹھہ سے کئی دن تک بحری جنگ ہوتی رہی۔ خان
خاناں مرزا عبدالرحیم اس مہم کا سپہ سالار تھا اور علاوہ دیگر

---

[1] دربار اکبری بحوالہ اکبر نامہ صفحہ ۱۱۲۔

کشتیوں کے کل پچیس[25] جنگی کشتیاں لے کر لاہور سے وہ چلا تھا
اور ۱۰۰۱ھ/۱۵۹۲ء کے جشن نوروزی میں مرزا جانی کو گرفتار کر کے
لاہور لے آیا تھا۔"

اکبر کے زمانے میں لاہور کو وہ عروج حاصل ہوا کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ شہنشاہ جو عجیب و غریب طبیعت لے کر آیا تھا۔ جر ثقیل اور طبیعات کے عمل کرنا۔ علم ہیئت کے آلات رکھنا۔ علم کیمیا کے شعبدے دیکھنا اور خود دکھانا، آگرہ کی طرح لاہور میں بھی آتشکدے تعمیر ہوئے۔ نوروز کی صبح کو کھلے بندوں سورج کی پرستش ہوتی۔ برہمن اپنے مذہبی تہوار دن میں اس کی پیشانی پر تلک لگاتے تھے۔ علمی جلسوں کی رونق اس زمانہ میں لاہور کی علمی زندگی کی روح تھی۔ شہنشاہ بڑے بڑے علما فضلا اور پنڈتوں کے مباحثے گرم کراتا تھا۔

اکبر نے شہر کا بہت سا حصہ اور قلعہ از سر نو تعمیر کرایا اور لاہور کو بہت رونق دی۔ اس کے طویل قیام کی وجہ سے لاہور کے باہر ایک اور لاہور تیار ہو گیا جسے بیرون شہر کی آبادی (CIVIL STATION) کہتے ہیں۔ شاہجہان کے زمانہ تک بیرون لاہور کی آبادی اندرون شہر سے بھی زیادہ ہو گئی تھی۔

اکبر کے زمانہ میں لاہور "شکار گاہ" بھی رہا ہے۔ ۹۹۴ھ/۱۵۸۶ء کا ذکر ہے کہ اکبر نے اپنے سوتیلے بھائی حکیم مرزا کی بغاوت فرو کرنے کے بعد لاہور میں قیام کیا اور ایران و توران کے بادشاہوں کے طریق پر "شکار قرغہ" یا جرگہ کا حکم دیا۔ اس موقعہ پر چالیس کوس کے دور سے بیسے قراول اور شکاری جانور گھیر کر لائے اور لاہور سے پانچ کوس پر شکار کا گھیرا ڈالا۔ خوب شکار ہوئے اور نیک شگون نظر آئے۔ اس زمانہ میں لاہور کے ارد گرد بے شمار جنگل تھے جو ایک طرف قصور، شرق پور اور شیخوپورہ اور دوسری طرف امرتسر تک پھیلے ہوئے تھے۔

اکبر نے اپنے قیام لاہور کے زمانے میں لاہور کو چھتیس حلقوں میں تقسیم کیا۔ ہر حلقے کو گذر کہتے تھے۔ نو گذر شہر کے اندر اور باقی شہر کے باہر تھے۔ مفتی تاج الدین نے اپنی کتاب لاہور قدیم میں ان کی تفصیل یوں دی ہے:۔

نام گذرہائے اندرون شہر لاہور

آبادی اندرون شہر کی نو گذروں پر منقسم تھی:۔

گذر چہچہ دیوانی۔ ابتدا اس کا موچی دروازہ اور منتہا اس کا رنگ محلہ مسید نظام بخاری اور پیپل وہڑہ اور حویلی میاں خان اور محلہ قاضی محمد اسلم اور محلہ اخوند محمد فاضل و کوچہ بلائے دشوار ع چپ و راست دروازہ شاہ عالمیں سے دروازہ اکبری تک اسی میں داخل تھی۔

گذر مچھی ہٹہ۔ مبتدا اس کا دروازہ شاہ عالمین اور منتہا اس کا وہی رنگ محلہ۔ چیلہ کوچہ ہائے بیبن دلیسا رای کا ضمیمہ ہیں۔

گذر وچھو والی۔ یہ گذر اوسط شہر میں ہے۔ وسط اس کا جہاں سردار صر ہر چند داس نے حویلی بنوائی۔ اور

جتنے کوچے اور شوارع اس کے دہنے باویں واقع ہیں۔ اسی کی شاخیں ہیں۔

گزر میار اخان ۔ ابتدا اس کا کوچہ ڈوگراں علاقہ شاہ عالمین دروازہ اور منتہا اس کا محلہ جوڑے موری اور لاہوری منڈی بلکہ اکثر لاہوری منڈی اور جس قدر راستے اور کوچے اس کے متصل ہیں۔ اس کے ساتھ متصل ہیں حتیٰ کہ بھاٹی دروازہ کی طرف شرقی اور ایک طاق دروازہ اسی میں شامل ہے۔

گزر تلواڑہ ۔ جس قدر عمارات بازار بھاٹی دروازہ کی جانب مغرب ہیں تا چوہ رستہ بازار ٹبی اسی میں داخل ہیں۔

گزر ددڑہ ۔ یہ گزر سا در گزروں سے بہت بڑا ہے جتنے محلے اور کوچے اور بازار اندرون دروازہ دہلی و زکی اور اکثر طرق و شوارع اندرون دروازہ اکبری ہیں۔ تا چوہ رستہ رنگ محل اسی کی شاخیں ہیں۔ ایام سلف میں بموقع کوتوالی کہ اوسط گزر مذکور ہے ایک گاؤں تھا۔ جس کو ددڑہ بولتے تھے۔ جب وہ وسط شہر میں آگیا۔ وہ بستی اسی نام پر موسوم رہی۔

گزر شیخ محمد اسحاق ۔ مبتدا اس کا خضری دروازہ اور منتہا اس کا چوہ رستہ متصل حویلی جنرل الٰہی بخش جس قدر طرق و شوارع چپ و راست میں ہیں، اس کے متعلق ہیں۔

گزر شہباز خان ۔ جس قدر آبادی زیر دیوار جنوبی قلعہ بادشاہی ہے تا چوہ رستہ جنرل الٰہی بخش مذکور اسی کا ضمیمہ ہے۔

گزر مانک چوک ۔ سید مٹھا سے لغایت فصیل دروازہ ٹکسالی و شاہ برج ٹکسال۔

تمام محلہ و بستیہائے بیرون فصیل شہر

آبادی بیرون حصار شہر ستائیس گزر پر منقسم تھی۔ اور ہر ایک گزر مبنی بچند محلہ و کوچہ و بڑی باد قلعہ ہا و شوارع و اسواق چونکہ بسبب نہ ملنے کسی کتاب معتبر کے مفصل حال نہیں لکھ سکتا، کہ کون کون گزر اور کون کون محلہ اور بستی متعلق فلاں فلاں گزر کے تھی، اس واسطے جو کچھ حال مجھ کو بملاحظہ صکوک دیرینہ معلوم ہوا۔ بموجب اس کے لکھا جاتا ہے۔

محلہ حاجی سوائے ۔ بیرون موچی دروازہ لغایت موقعہ آبادی قلعہ گوجر سنگھ۔ یہ قلعہ گوجر سنگھ سمت ۱۸۵۵ میں گوجر سنگھ حاکم لاہور نے تعمیر کرایا۔ پہلے یہاں حویلی گوجر مل نامی کھتری کی تھی، اور پاس اس کے ایک سرائے تھی۔

محلہ طلا بخاری ۔ بیرون دروازہ شاہ عالمین تھا، جس موقعے پہ چھجو بھگت کا چوبارہ ہے یہ جگہ اوسط میں تھی۔ پاس اس کے جانب جنوب ایک چوہ رستہ تھا۔

محلہ پیر عزیز مہر نگ ۔ چونکہ بالفعل موضع مزنگ مشہور ہے، پیر مہرنگ جلال الدین اکبر کے عہد میں فقیر بابرکت اور ایزدی عظمت تھا، اس نے اس موقعے پر مکان سکنی معمور کیا تھا، اسی واسطے اس بستی کا نام محلہ پیر مہرنگ مشہور ہوا، بعد ازاں کہ آبادی بیرون شہر ویران ہوئی یہ بستی بطور موضع شہر سے علیحدہ ہوگئی، اور بتدریج اس کی گرد چار میں اور چند بستیاں آباد ہوئیں بموجب تفصیل ذیل:۔ کوٹ عبداللہ شاہ، کوٹ مداہر، تاج پورہ۔ قلعہ مہرادہ۔ قلعہ

مہاڑ ترکھان - مبارک پورہ - بستی مہتراں - محلہ نزدیلی - کوڑی پورہ - بھونڈ پورہ - درآں حالیکہ لاہور میں تین حاکم تھے، یہاں بھاگ سنگھ پاسے لنگ حاکم تھا، اور مختصراً اس کا لاہور سے علیحدہ مہاراجہ صاحب کے عمل میں بھی اس کا مختصہ علیحدہ اور جمعدار خوشحال سنگھ کو تمام گاؤں بطور جاگیر مرحمت تھا۔

محلہ ابو اسحاق - جانب شرق چھڑ نگ ابو اسحاق فقیر نامی نبیرہ پیر عزیز چھڑنگ تھا۔ اس نے بعہد اکبر مرحوم ایک طرف محلہ پیر چھڑنگ کے حویلی بنوائی۔ اس واسطے جس قدر آبادی اس کے گرد و جوار میں ہوئی اسی کے نام موسوم ہوئی۔ مقبرہ اس کا ہنوز ایک گوشہ موضع چھڑنگ میں موجود ہے۔

کوٹ کروڑی - جانب مشرق محلہ حاجی سدلے جس موقع پر مقبرہ شیخ موسیٰ لوہار کا ہے۔ یہ جگہ درمیان محلہ مذکور سے تھی۔

محلہ دلاوری - گذشتہ شمال و جنوب محلہ پیر چھڑنگ کے تھا جس موقع پر مقبرہ سید چراغ بخاری کا ہے۔ وسط محلہ تھا۔

قطب غوری - لاہوری دروازہ سے باہر تھا جس جگہ قبر قطب غوری کی ہے۔ یہ جگہ درمیان محلہ مذکور کے تھی، واضح رہے کہ یہ قطب الدین وہ شخص ہے جس کو اہلِ تواریخ قطب الدین ایبک لکھتے ہیں جس نے سنہ ۶۰۲ھ میں بعد مرنے شہاب الدین محمد غوری کے تخت لاہور اور دہلی پر اجلاس فرمایا۔ جب وہ اس جگہ دفن کیا گیا، اس بستی کا نام محلہ قطب غوری قرار پایا۔

لکھی محلہ - لاہوری دروازہ کے باہر قطب غوری کی جانب مغرب تھا۔ اس جگہ ایک بازار عالی شان تھا۔ لاکھپتی بیٹھتے تھے۔ اسی واسطے اس بستی کو لکھی محلہ کہتے تھے۔

رسول پورہ - بامقبرہ سید شاہ چراغ بخاری کے اس محلہ میں اکثر سید رہتے تھے، اور انھوں ہی نے اس بستی کو آباد کرکے رسول پور نام رکھا۔

چوک دارا - شاہ برج موچی دروازہ سے جانب مشرق ایک گولی بندوق کی مسافت پر دارا شکوہ ابن شاہ جہاں نے بعہد شاہ جہاں اپنے رہنے کو حویلی عالی شان اور بازار مربع اور درمیان میں اس کے چوک مقطع اور ایک باغ بہت عمدہ اور وسیع اور ایک کٹڑہ مبنی بہ بیوت متعددہ بنوایا تھا۔ اس بینہ بعد اس کے اس بستی کا نام چوک دارا قرار پایا۔ از زمانہ تاوقتیکہ دارا شکوہ جیتا رہا۔ یہ قطعہ نمونہ بہشت رہا، بعد ویرانی ریاست زوی اسلام سکھوں نے یہاں سے لاکھوں روپیہ زیغفران زرگرں کا جو یہاں رہتے رہے پایا، اور عمارات دارا شکوہ سے ہزاروں روپیہ کا پتھر از قسم جواہر اور کارآمد مہاراجہ صاحب کے عہد میں اکثر اینٹ اس کی خندق پر لگی، بعد اس کے کشمیریوں نے بہت فائدہ اٹھایا۔ سالہا سالے دراز تک اینٹ بیچتے رہے۔ اور جن کو قسمت نے یاری دی ان کو کھنڈروں سے خزانہ ملا۔ اور جس موقعہ پر خاص حویلی دارا شکوہ کی تھی تا خاتمہ ریاست سکھاں اس جگہ بارود سرکاری بنتا رہا، اس عمل میں وہاں جیل زنانہ ہے۔ اور جس جگہ پہ باغ دارا شکوہ کا تھا۔ وہاں اب محمد سلطان نے سرائے پختہ بنوایا دکانیں نیز ایک طرف میں چھوٹا سا باغ بنوایا۔

محلہ جوہریاں - چوک دارا شکوہ کی جانب مشرق و جنوب میں جس کی جانب غرب و شمال میں محلہ حاجی سوائیے تھا۔

محلہ شاہ کاکو - بدیوار شرقی مسجد مقبوضہ بھائی گنڈا سنگھ گرنتھی الحال معروف شہید گنج سے محلہ نخاس تک کہ فاصلہ گولی بندوق پر گوشہ شرق و شمال میں تھا۔ شاہ کاکو ایک فقیر خدا پرست تھا، جس کی قبر زیر دیوار شرقی مسجد مذکور ہے۔ اس واسطے یہ بستی اسی کے نام پر موسوم رہی۔

نخاس - مکان سرکاری بہ شکل سرائے معمور تھا، جو شاہجہان کے دور میں یہاں گھوڑے بکتے تھے، بہ سبب ناموری مکان کے یہ بستی محلہ نخاس کہلاتی تھی، دروازہ نخاس کا جو کہ مانند دروازہ مسجد وزیر خان بہت عمدہ وضع پر مقطع اور بہ رنگ آمیزی کاشی و لیسنی و صنعت کاری و گلکاری مرجہ تھا۔ تاخاتمہ ریاست سکھاں قائم رہا۔ جب محمد سلطان نے سرائے بنوائی۔ وہ اینٹ یہاں کارآمد ہوئی۔

محلہ حاجی نالہ - دروازہ دہلی سے نخاس تک نولکھا۔ شاہ برج مرمدانہ کی کے نزدیک جانب شمال نواب علی مردان خان نے تخمیناً دو سو بیگھہ زمین پر باغ بنوایا تھا جس کا نام نولکھا رکھا۔ پس بہ سبب نامور باغ کے جس قدر آبادی اس کے پیرامن میں تھی اس کے نام پر موسوم ہوئی۔ اب بھی اس قطعہ زمین کو جس میں چند کنوئیں نور عین نولکھا کہتے ہیں مشخصہ بھی اس کا علیحدہ ہے اس باغ کی بارہ دری بھی اب تک موجود ہے جس کو راجہ دینا سنگھ مجیٹھیہ نے اپنی مرضی کے موافق ترمیم کر کے کوٹھی عالی شان بنوائی۔

سیدسر - جس موقعہ پر بالفعل اسٹیشن ریلوے ہے اس کے پاس ایک تالاب تھا جس کو ایک سید نامی معروف پیر مہنگا کے مریدوں نے بنوایا تھا۔ پیر مہنگا فقیر آدمی تھا۔ جس کے ہزاروں دولت مند مرید تھے، اصلی نام اس کا عبد الخالق تھا بعد تیاری اس تالاب کے جس کو ہندی میں سر کہتے ہیں اس بستی کا نام سیدسر قرار پایا (موجودہ نام گڑھی شاہو ہے)۔

کھوئی میراں - دہلی دروازہ سے جانب شمال فاصلہ ایک کوس پر اس جگہ پر ایک سید معروف میراں نے کھوئی لگوائی اور مکان بنوایا تھا جس کا نام کھوئی میراں مشہور ہوا۔ عمل چغتائیاں میں جب آبادی بیرون شہر اس موقعہ تک پہنچی اور متصل اس کے مکانات معمور ہو گئے۔ تو اسی نام سے اس بستی کا نام زبان زد عوام رہا۔ جن دنوں میں لاہور میں حکومت تین حاکموں کی تھی۔ لہنا سنگھ وغیرہ حکام مذکورہ نے اس کو بطور دمدمہ آباد کیا۔ اب بھی اس کا مشخصہ شہر سے الگ ہے۔

منڈی شہزادہ پرویز - کھوئی میراں سے تھوڑے فاصلے پر جانب مشرق میں شہزادہ پرویز نے جو کسی بادشاہ چغتائی کا بیٹا تھا بنام خود منڈی آباد کی تھی اور ایک بازار مربع اور حویلی عالی شان بنوائی اور اسی جگہ دفنایا گیا۔ اس واسطے اس بستی کا نام منڈی پرویز مشہور ہوا۔ چشتی اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ پرویز بیٹا شاہجہان کا تھا جو کہ خورد سالی میں مر گیا۔

چوہٹہ سوداں - کھوئی میراں سے جانب جنوب چوہٹہ بازار سوداں تھا۔ اور اس میں اکثر سود رہا کرتے تھے۔

دروازہ مندر - پاس پزاوہ بدھو کمہار کے جو کہ لاہور سے فاصلہ ڈیڑھ کوس تک جانب مشرق ہے ایک مندر ہنود کا تھا اور اس کا دروازہ بہت عمدہ وضع پر بنا ہوا تھا۔ پس جو بستی اس کے قرب و جوار میں تھی اس کے نام سے معروف تھی۔

بیگم پورہ - لاہور سے فاصلہ تین میل پر جانب شرق متصل موضع باغبانپورہ و بھوگی وال والدہ نواب خان بہادر

نے مکانات سکنی تعمیر کرائے اور پیرامن ان کے چار دیواری پختہ بنوائی تھی۔ بعد اس کے نواب خان بہادر نے لاکھوں روپیہ صرف کر کے کئی مسجدیں اور بازار اور چوک بنوائے اور چپ و راست میں اس کے لواحق اور اقارب و ذریات نے مکانات سکنی تیار کرائے۔ جن دنوں میں نواب خان بہادر صوبہ لاہور تھا، سب بستیوں سے اس بستی میں بہت رونق تھی اور دولت تھی۔ نخاس سے بیگم پورہ تک ایک بازار تھا جس میں لاکھ پتی بیٹھتے تھے اور پہلے اس سے جس موقعہ پر بیگم پورہ معمور ہوا، کوچہ نیلیاں تھا، اب بیگم پورہ ہے۔ زکوچہ نیلیاں۔ ٹوٹے پھوٹے ہوئے چند مقبرے اور آثار مکانات ہیں اور کچھ نہیں۔

محل مشکی۔ درمیان بیگم پورہ اور شالامار کے ایک مشکی مراسی مقرب اکبر مرحوم تھا۔ اس نے بموقع آبادی بھوگی وال حویلی بنوائی۔ بہ سبب ناموری اس کی اس تمام بستی کا نام محل مشکی قرار پایا۔

نیلی وہیڑہ۔ باغبان پورہ سے مغرب کی طرف اس میں اکثر نیلی رہتے تھے۔ اب اس جگہ میں گورستان نیلیاں ہے۔

بڑھی پھلواری۔ جانب مغرب نیلی وہیڑہ کے بڑھی اور ٹھٹھی اور گڑھی قلعہ کو کہتے ہیں۔

محلہ گنج۔ متصل اسٹیشن ریلوے میاں میر اس کی جانب شمال و مغرب میں مقبرہ بہادر خان کا کہ ہنوز ٹوٹا پھوٹا ہوا موجود ہے۔ محلہ مذکور کے درمیان ہی تھا۔ یہی محلہ جانب مشرق مبتدا آبادی شہر کا تھا۔ بعد زوال ریاست چغتائیاں ویران ہو کر بعد کئی برسوں کے پاس اس جگہ کے جانب مشرق بہ فاصلہ مسافت گولی بندوق از سر نو آباد ہوا۔ اب موضع کہلاتا ہے اور ملکیت اس کی ارائیوں کی ہے۔

ٹھٹھی ابوالخیر۔ الحال معروف گڑھی شاہو لاہور سے گوشہ شرق و جنوب میں بہ فاصلہ ایک کوس، ابوالخیر فقیر تھا۔ اس نے اس جگہ پر سکونت اختیار کی اور کوٹھی بنوائی۔ اس لیے اس بستی کا نام ٹھٹھی ابوالخیر پایا۔ ایام غدر سکھاں میں لوگ اٹھ گئے اور مکانات ویران ہو گئے۔ اس ویرانی کی حالت میں ایک راہی شاہو نامی نے یہاں رہنا اختیار کیا۔ بعد اس کے گوجر سنگھ حاکم لاہور نے اس ویرانہ کو بطور دہیہ آباد کیا اور ملکیت دہیہ کے ارائیوں کو دی۔ جب سے گڑھی شاہو مشہور ہوا۔

بستی میاں میرؒ۔ جانب شرق و شمال و مغرب مزار میاں میر صاحب مرحوم جس قدر آبادی تھی بستی میاں میر کہلاتی تھی۔ حال میاں میر صاحب کا بیان مقابر میں لکھا جاوے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

دولت آباد۔ جانب مشرق پیر مہر جگہ کے، ساتھ ساتھ محلہ ابو اسحاقؒ کے قلعہ دولت آباد تھا۔ تعمیر اور آبادی اس کی وارثان سید عبدالقادر ثانیؒ جس کا مقبرہ درمیان بستی مذکور کے تھا کرائی تھی۔ بعد اس کے بند یہ بٹ پاس اس کے سادات کرام نے اور چند قلعے آباد کئے۔ قلعہ میر محمودؒ۔ قلعہ میر ارشد خانؒ۔ قلعہ میر کفایت خانؒ زاں بعد بہ عہد حکومت نواب خان بہادر و فرزندان نواب خان بہادر دو اور قلعے تیار ہوئے۔ قلعہ میر نواب محمدؒ۔ قلعہ میر اکبرؒ۔ اب ان قلعوں اور بستیوں کا نام و نشان نہیں رہا مگر ایک چاہ ہے جس کو چاہ میر والا کہتے ہیں۔ پہلے ان قلعوں کی اس جگہ کو محلہ دراجہ بولتے تھے۔ قلعہ میر یعقوب۔ یہ قلعہ پاس دولت آباد مشرق و جنوب میں حاجی پورہ طرف جنوب قلعہ میر یعقوب، قلعہ غلام پورہ پاس تالاب کھوار کے مغرب و جنوب میں، بڑھی شاہ پور مغرب میں پھلے پور کے۔

خوجوں کا محلہ - پاس محلہ ابو اسحاق کی جانب شمال، بالفعل اس محلہ سے ایک مسجد ٹوٹی پھوٹی ہوئی ہے جس کو خوجوں کی مسجد بولتے ہیں۔

باغ نخلی - جس موقعہ پر تھانہ انارکلی اور عجائب گھر معمور ہے نواب وزیر خان امیر شاہ جہان نے باغ بنوایا جس میں ہزارہا اشجار بیر و رطب تھے اسی واسطے لوگ اس باغ کو نخلی بولتے تھے۔ اور اسی نام سے تمام بستی موسوم رہی۔ بالفعل اس باغ سے چند درخت خرما اور ایک بارہ دری موجود ہے جس کو حکام نے کتاب گھر قرار دیا۔ اس باغ کی جانب مغرب باغ زیب النسا تھا۔ اب اس موقع میں موضع نواں کوٹ آباد ہے اس باغ کے جانب شمال باغ انارکلی تھا جس قدر آبادی ان باغوں کے گرد و جوار میں تھی انھیں کے نام پر معروف تھی جانب شمال باغ انارکلی کے محلہ پیر بھاون تھا۔ اب اس موقعہ پر امام باڑہ ہے۔

شیش محل - جانب شمال محلہ پیر بھاون مزار مخدوم ہجویری کی، اس محلہ کی طرف جنوب میں تھی۔ کسی بیگم نے بعہد سلاطین چغتائی شیش محل بنوایا تھا۔ اس واسطے اس تمام بستی کا نام شیش محل قرار پایا۔ اب اس کا نام و نشان نہیں بلکہ نام رہا۔ حد بندی اس قلعہ کی لاہور سے علیحدہ ہے۔

تل بھوگا - جانب مشرق شیش محل کے تا دیوار فصیل غربی لاہور دروازہ ٹکسالی تک۔

محلہ شیخ اشرف - بھاٹی دروازہ سے تا بایں موقع بنائے دار العدالت ضلع، شیخ اشرف عہد عالمگیر میں بڑا بھاری عامل تھا۔ بیرون بھاٹی دروازہ اس نے مسجد عالی شان اور مکانات سکنی بنوائے۔ اس لیے اس بستی کا نام محلہ شیخ اشرف مشہور ہوا۔ جب وہ مر گیا تو قبر اس کی بھی اسی جگہ ہوئی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے وقت تعمیر خندق کے اس مسجد و دیگر عمارات شیخ اشرف کو بارود سے اڑا دیا اور نعش اس کی اس جگہ سے نکال کر میانی میں دفنائی۔

بند عالمگیری - مستی دروازہ سے تا محمود بوٹی واسطے روک دریا اور حفاظت شہر کے عالمگیر نے بند پختہ بنوایا تھا اور بحکم بادشاہ ہر ایک امیر نے اس پر مکانات سیر گاہ اور عقب مکانات باغ جانفزا تعمیر کرائے۔ اس واسطے جو عمارت اس بند پر اور متصل اس کے ہوئی بند عالمگیری مشہور ہوئی۔

محلہ فدائی خاں - بیرون دروازہ اکبری نیچے فصیل شہر کے تا دروازہ دہلی، فدائی خان امیر عالمگیر تھا جس کے اہتمام میں مسجد بادشاہی تیار ہوئی۔ اس نے اس موقع پر مکانات سکنی بنوائے تھے۔ اس لیے اس تمام بستی کا نام محلہ فدائی خان مشہور ہوا۔

پنڈ ڈھولاں - جہت شرق و شمال محلہ پیر مہر نگ موقع مکان چلہ شاہ مقیم درمیان آبادی کے تھا۔

میانی - جہت مغرب و جنوب محلہ پیر مہر نگ جس قدر آبادی تھی، میانی کہلاتی تھی۔ اگرچہ محلہ ہائے متعلقہ شہر سے الگ تھے مگر بطاہر حال ضمیمہ شہر تھا۔ مفصل حال اس کا بیان مقابر و امکنہ و دیرینہ میں لکھا جائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

کنبو واڑہ - جانب شمال آبادی شہر جس موقع پر اب کوٹھی ڈاکٹر (ڈاکٹر) ہنوی دکذا) صاحب کی ہے، بالفعل اس آبادی سے اب تالاب موجود ہے جس کو تالاب کنبواں بولتے ہیں۔ یہ آبادی بھی شہر میں داخل نہ تھی مگر الگ بھی نہ تھی۔

عہدِ جہانگیری

اکبر کے بعد ۱۶۰۵ء میں جہانگیر سریر آرائے سلطنت ہوا۔ لاہور جہانگیری عہد میں بھی ہندوستان کے کسی شہر سے کم نہیں رہا۔ ۱۶۲۶ء میں دو انگریزوں نے لاہور کو دیکھا۔ وہ لکھتے ہیں :-

"لاہور ہندوستان میں چوٹی کا شہر ہے۔ ہر چیز یہاں بافراط مل سکتی ہے۔ حقیقت میں ایسا خوبصورت اور ہموار اور ایسا آباد قطعۂ زمین کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ ہندوستان کے ہر حصہ کے سوداگر یہاں موجود ہیں تجارت کی گرم بازاری ہے۔ سندھ کے مشہور شہر ٹھٹھہ کے لیے سوداگر جہازوں میں اپنا مال لادتے ہیں اور دریا کے کنارے ایک عجیب رونق رہتی ہے۔ ہر سال بارہ چودہ ہزار اونٹ مال و اسباب سے لدے ہوئے قندھار کے راستے ایران کو جاتے ہیں۔"

اللہ اللہ! کیا زمانہ تھا اور کیا لوگ تھے!! راوی اور جہاز! یہ دونوں باتیں آج خواب و خیال معلوم ہوتی ہیں۔ پھر خشکی کی تجارت اور بارہ چودہ ہزار لدے ہوئے اونٹوں کی ہر سال ایران کو روانگی!! کیا آج بھی جبکہ تہذیب اور سائنس اپنی انتہائی منزل پر پہنچ چکی ہے یہ باتیں نظر آتی ہیں؟

جہانگیر کی تخت نشینی کے چوتھے ہی مہینے اہلِ لاہور کو ایک عجیب دردناک واقعہ دیکھنا پڑا۔ جہانگیر کی اپنے سب سے بڑے بیٹے خسرو سے ہمیشہ ان بن رہتی تھی۔ باپ کی تخت نشینی کے بعد چار ماہ تک تو خسرو خاموش رہا پھر دفعتہً آگرہ کے قلعہ سے نکل بھاگا اور دس ہزار سواروں کی معیت میں دہلی اور متھرا کو تاراج کرتا ہوا لاہور آ پہنچا۔ آتے ہی حکم دیا کہ قلعہ کو فتح کر کے سات روز تک شہر کو خوب دریغ لوٹو۔ بچہ، جوان، بوڑھا، عورت جو ملے اسے قتل کر دو اور شہر کو آگ لگا دو۔

فوج ایک دروازہ کو جلا کر شہر میں ابھی داخل ہی ہوئی تھی کہ جہانگیر بھی ایک کثیر فوج کے ساتھ آ پہنچا۔ خسرو نے مقابلہ کیا مگر شکست کھا کر کابل کی طرف بھاگ گیا۔ لیکن راستہ میں سوہدرہ (متصل وزیر آباد) کے قریب گرفتار ہو کر واپس لایا گیا۔ جہانگیر اس وقت مرزا کامران کی بارہ دری میں جو راوی کے کنارے واقع ہے مقیم تھا۔ اس وقت خسرو کے ہمراہ سات سو آدمی تھے جن میں حسن بیگ بدخشانی اس کا سپہ سالار اور عبد الرحیم دیوان لاہور بھی شامل تھے۔ جہانگیر نے بارہ دری سے قلعہ لاہور تک دو طرفہ لکڑی کی پھانسیاں گڑوائیں اور ان سات سو قیدیوں کو یکدم پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا۔ خسرو کو پابہ زنجیر ایک ہاتھی پر بٹھایا گیا اور جس راستے اس کے سات سو ہمراہی تختۂ اذیتوں سے مارے جا رہے تھے، اسی راستے سے قلعہ میں بھجوایا گیا تاکہ وہ اپنے باغی ہمراہیوں کا انجام دیکھ لے۔ اس کے علاوہ اس کے سپہ سالار حسن بیگ کو گائے کی کھال میں اور عبد الرحیم دیوان کو گدھے کی کھال میں زندہ بند کرا دیا اور یہ دونوں دم گھٹ کر مر گئے۔ خسرو اس کے بعد پانچ سال تک

قید رہا۔ آخر ۱۶۲۱ء میں نہایت ذلت و رسوائی کی حالت میں مر گیا۔ لاہور کے لوگوں پر اس واقعہ کا بڑا اثر ہوا۔ ایک ہی دن میں سات سو آدمیوں کا پھانسی پانا ایک نہایت ہی دل ہلا دینے والا واقعہ ہے۔

اکبر یورپین پادریوں کی بے حد عزت کرتا تھا لیکن جہانگیر اس سے بھی دو قدم آگے نکلا۔ اس نے گوا کے پادریوں کو لاہور میں سب سے پہلے ایک گرجا تعمیر کرنے کی اجازت دی اور ان کے لیے خزانہ لاہور سے معقول وظائف بھی مقرر کیے۔ شاہجہان نے جو اکبر اور جہانگیر کی نسبت شریعت کا زیادہ پابند تھا، تخت پر بیٹھتے ہی اس گرجا کو مسمار کرا دیا اور پادریوں کے وظیفے ضبط کر لیے۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں (۱۶۶۵ء میں) ایک فرانسیسی سیاح تھیونات لاہور آیا۔ اس وقت تک اس گرجا کے آثار باقی تھے لیکن اب معدوم ہو چکے ہیں۔

جہانگیر کے عہد میں لاہور میں گورو ارجن دیو اور دیوان چندو لال کا ایک قابلِ ذکر واقعہ گزرا۔ گورو ارجن دیو اور دیوان چندو لال کی آپس میں عداوت تھی۔ دیوان نے گورو کے خلاف گورنر لاہور کے کان بھرے اور کہا کہ گورو کی طاقت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ ایسے شخص کو یوں آزاد رکھنا خلافِ مصلحت ہے۔ گورو ارجن دیو قید کر لیے گئے اور وہ قید ہی میں انتقال کر گئے۔ جب ان کا بیٹا گورو ہرگوبند جوان ہوا تو اس نے دیوان کے خلاف بادشاہ کو ایسی پٹی پڑھائی کہ دیوان گورو ہرگوبند کے حوالے کر دیا گیا اور ہرگوبند نے اسے قتل کر کے باپ کا انتقام لیا۔

جہانگیر نے قلعہ میں بہت سی عالی شان عمارتوں کا اضافہ کیا اور اس کے امرا و وزرا نے کئی بے نظیر عمارات لاہور شہر میں بنائیں اور ان کے گرد وسیع باغات لگوائے۔

جہانگیر کو باپ کی طرح لاہور سے کمال اُنس تھا۔ ۱۶۲۲ء میں تو اس نے لاہور کو دارالسلطنت ہی بنا لیا اور ۱۶۲۷ء میں جب اس نے سفر کشمیر کے دوران راجوری کے قریب وفات پائی تو لاہور ہی میں دفن کیے جانے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ اپنی چہیتی بیگم نور جہاں کے باغ دلکشا میں دفن کر دیا گیا۔ اس کا عظیم الشان مقبرہ دریائے راوی کے دائیں کنارے پر قصبہ شاہدرہ کے پاس واقع ہے اور عجائبات عالم میں شمار ہوتا ہے۔

عہدِ شاہجہانی

جہانگیر کے انتقال کے وقت نور جہاں کا داماد اور جہانگیر کا بیٹا شہریار لاہور میں موجود تھا۔ اس نے سات دن میں سات لاکھ روپیہ خرچ کر کے بے فکروں کی ایک فوج جمع کی اور اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ شاہ جہان جو نور جہاں کے بھائی آصف جاہ کا داماد تھا، اس وقت دکن میں تھا۔ وہ آصف جاہ کے اشارہ سے پر لگا کر آگرہ میں پہنچا۔ ادھر آصف جاہ یہ چال چلا کہ خسرو مرحوم کے بیٹے شہزادہ داور بخش کو زندان خانہ سے نکال کر شہریار کے مقابلہ پر لا کھڑا کیا۔ اور سلطنت کی مبارکباد دی۔ داور بخش سمجھ گیا کہ نور جہاں اپنے داماد اور آصف جاہ اپنے داماد کو سلطنت دلانے کی فکر میں ہیں اور میں محض گوسفندِ قربانی ہوں۔ اس نے آصف جاہ کا شکریہ ادا کر کے تخت و تاج سے انکار کر دیا۔ لیکن آصف جاہ نے اس قدر قسمیں کھائیں اور ایسا یقین دلایا کہ وہ اجل گرفتہ شہزادہ آخر کار رضامند ہو گیا۔ وہ شہریار سے لڑا اور شہریار کو شکست

ہو گئی۔ آصف جاہ اور داور بخش فتح کے شادیانے بجاتے ہوئے قلعہ میں داخل ہوئے اور آصف جاہ نے شہریار کی آنکھیں نکلوا دیں۔ اس موقعہ پر بدنصیب شہریار نے فی البدیہہ یہ رباعی کہی ؎

نرگس گلاب ار چہ نتوان کشید
کشیدند از نرگس من گلاب
اگر از تو پرسند تاریخ من
بگو کور شد دیدۂ آفتاب

شاہجہان نے آگرہ پہنچ کر آصف جاہ کو کہلوا بھیجا کہ لاہور میں جس قدر شہزادے موجود ہیں سب کو ٹھکانے لگا دو۔ چنانچہ ۲ ربیع الآخر ۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۷ء بروز ہفتہ آصف جاہ نے داور بخش کو تخت سے اتار کر قید کر دیا اور شاہجہان کے نام کا خطبہ پڑھا۔ شہزادہ داور بخش نے آصف جاہ کو اس کے قول و قسم یاد دلائے مگر وہاں کون سنتا تھا۔ آخر جمادی الاولیٰ ۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۷ء کو مندرجہ ذیل شہزادے ایک ہی وقت میں تلوار کے گھاٹ اتار دیئے گئے :-

(۱) شہزادہ داور بخش (۲) اس کا بھائی گرشاسپ۔
(۳) شہریار داماد نورجہاں (۴) طہمورس اور (۵)
طہماسپ (پسران سلطان دانیال پسر اکبر)

شاہجہان نے بادشاہ ہو کر اپنے باپ جہانگیر کا عالی شان مقبرہ تعمیر کرایا (جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے) جو سالہا سال گزر جانے اور سکھوں کے زمانہ کی دستبرد کے بعد بھی ہندوستان کی لاجواب عمارتوں میں شمار ہوتا ہے۔ نورجہاں نے بھی ۱۶۴۶ء میں اسی عہدِ حکومت میں وفات پائی جس نے اپنا مقبرہ اپنی زندگی ہی میں روضۂ جہانگیر کے نمونہ پر "چار چمن" کے اندر تعمیر کرایا تھا۔

آصف جاہ نے بھی، جس کی کوششوں سے شاہ جہان کو تخت ہند نصیب ہوا، اسی کے عہدِ حکومت میں ۱۶۴۱ء میں وفات پائی۔ آصف جاہ کو آصف خان یمین الدولہ بھی کہتے ہیں۔ مآثر الامرا میں اس کے بہت سے حالات درج ہیں۔ بہت ہی بسیار خور تھا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ ایک من شاہجہانی خوراک دن رات میں کھاتا تھا۔ شاہجہان نے اس کا عظیم الشان مقبرہ تعمیر کرایا اور اس کے چاروں طرف ایک خوش وضع باغ بھی لگایا۔ یہ مقبرہ ٹوٹی پھوٹی حالت میں اب بھی موجود ہے۔

لاہور میں جہاں آج کل لنڈا بازار میں میاں سلطان کی سرائے اور اس کا ٹھنڈا کنواں اور باغ موجود ہے، وہاں آصف جاہ کی عالی شان حویلی آسمان سے باتیں کرتی تھی۔ عہد عالمگیری کے مؤرخ منشی سجان رائے بٹالوی نے اس حویلی کے متعلق لکھا ہے :-

" از عمارات منازل بادشاہزادگان و امرائے والاشان خصوص عمارت
آصف خان عرف ابوالحسن بن اعتماد الدولہ از دیاد آبادی گردیدہ"[1]

---

[1] خلاصۃ التواریخ صـ ۹۵

مآثر الامرا اور ظفر نامہ شاہجہان میں لکھا ہے کہ اس حویلی پر بیس لاکھ روپیہ لاگت آئی تھی۔ حویلی کیا تھی ؟ خاصا ایک قلعہ تھا۔ وطن بلڈنگ[1] کے عقب سے لے کر شہید گنج، سرائے میاں سلطان اور ریلوے ٹیکنیکل سکول تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے اندر حمام، مسجدیں، وضو خانے، تالاب، حوض، فوارے، باغ اور زنانہ مردانہ محلات تھے۔ شاہجہان اس میں کئی مرتبہ آیا تھا۔ دہلی، آگرہ اور کشمیر میں آصف جاہ کی جائداد کا جائزہ لیا گیا تو اڑھائی کروڑ روپیہ تک درج رجسٹر ہوا۔ بادشاہ نے اس کے انتقال کے بعد بیس لاکھ روپیہ اس کے تین بیٹوں اور پانچ بیٹیوں میں تقسیم کر دیا اور حویلی شہزادہ دارا شکوہ کو مرحمت فرمائی باقی تمام جائیداد بحق سرکار ضبط کی گئی۔

جہانگیر نے قلعہ لاہور میں کچھ عمارتیں تعمیر کرائی تھیں۔ لیکن شاہجہان کو پسند نہ آئیں۔ اس لیے نواب وزیر خاں بانیٔ "مسجد وزیر خاں" کو حکم ہوا کہ سب عمارات از سر نو تعمیر کرائی جائیں۔ ۱۶۳۹ء میں شاہجہان پھر آگرہ سے لاہور آیا۔ علی مردان خاں قندہاری بادشاہ کے حضور میں پیش ہوا۔ شاہجہان نے اسے پانچ لاکھ روپیہ نقد اور ایک خلعت فاخرہ انعام دے کر کشمیر کا گورنر مقرر کر دیا۔ علامی افضل خاں وزیر سلطنت تھے۔

شاہجہان ۱۶۳۹ء میں پھر لاہور آیا۔ علی مردان خاں اور دارا شکوہ پیشوائی کے لیے موجود تھے۔ علی مردان خاں نے اہل ایران کے طور و طریق پر شب برات کی روشنی کا تماشا بادشاہ کو دکھایا۔ مختلف شکلوں کے تختوں اور چھتوں پر طاق بندی کی۔ اہل لاہور نے اس قسم کی کیفیت پہلے نہیں دیکھی تھی۔ اسی شب بادشاہ نے دس ہزار روپیہ غربا میں تقسیم کیا اور اسی رات علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی اور ملا فاضل کو چار چار سو اشرفی انعام میں دی گئی[2]۔

لاہور میں شاہجہان کی سب سے بڑی یادگار شالامار باغ ہے جو نواب علی مردان خاں اور خلیل اللہ خاں کے اہتمام سے ایک سال چار ماہ اور پانچ یوم میں چھ لاکھ روپیہ کی لاگت سے تیار ہوا۔

شاہجہان کے عہد حکومت میں بھی کئی فرنگستانی سیر و سیاحت اور تبلیغ عیسائیت کی غرض سے ہندوستان میں آتے رہے۔ ۱۶۴۱ء میں سپین کا ایک پادری آگرہ سے ہوتا ہوا لاہور پہنچا۔ اس نے اپنے سفر نامہ میں لاہور کی تعریف اس طرح کی ہے :-

> (ترجمہ) "آگرہ سے روانہ ہوئے ہمیں اکیسواں دن تھا کہ مغلیہ سلطنت کا مشہور شہر لاہور نظر آیا جس میں آبادی اس قدر تھی کہ شہر کے باہر ڈیڑھ میل تک خوشنما خیموں اور نفیس عمارتوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس خوبصورت شہر کے بڑے بڑے دروازے ہیں اور ہر دروازے پر مختلف رنگوں کے گنبد ہیں (اب یہ گنبد نہیں ہیں۔ نقوش) شہر میں داخل ہونا معمولی بات نہ تھی۔ کچھ لوگ

---

[1] مولوی محمد انشاء اللہ خاں آنریری مجسٹریٹ و مالک و ایڈیٹر اخبار وطن لاہور کے مکان کا نام ہے۔

[2] تاریخ محمد شاہی (قلمی) مصنفہ خوشحال چند ساکی۔

پیادہ چل رہے تھے کچھ اونٹوں پہ تھے اور کچھ ہاتھیوں پر سوار تھے چھوٹی چھوٹی گاڑیاں بھی بکثرت تھیں۔ غرض کھوے سے کھوا چھلتا تھا اس لیے ہم واپس آ گئے۔ شہر کے دروازہ کے باہر بہت سے درخت تھے جہاں نان بائی اور مختلف دکاندار تھے۔ ہم وہاں چلے گئے۔ پھر ہم نے بھیڑ کم ہونے پر بازار کی سیر کی۔ بھیڑ بکری، گائے وغیرہ کے گوشت کے علاوہ پرندوں کا گوشت بھی مل سکتا تھا۔ البتہ خنزیر کے گوشت کی قطعی ممانعت تھی۔ بعض دوکاندار زندہ پرندے بھی بیچتے تھے۔ ہر قسم کی سبزی اور میوہ بافراط موجود تھا۔ ہم نے بازاروں میں چار قسم کی روٹیاں دیکھیں۔ ایک وہ جو لوہے کے توے پر پکائی جاتی ہیں۔ ایک مٹی کے بڑے بڑے برتنوں میں (یعنی تنوروں میں۔ نقوش) ایک قسم کی روٹی کا نام کلچہ ہے جو میدہ سے بنائی جاتی ہے۔ ایک قسم کا نام روغنی روٹی ہے جو آٹے اور گھی سے بنتی ہے۔ ایک آدمی اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کا کھانا دو وقتوں میں پانچ آنہ تک کھا سکتا ہے۔ اشیائے خوردنی کی افراط اور ارزانی اور بازاروں کی صفائی اور خوش سلیقگی سے ہم بے حد متاثر ہوئے خصوصاً اس بات سے کہ سکون و اطمینان اور امن و امان ہر شخص کے چہرے بلکہ در و دیوار سے ظاہر ہو رہا ہے۔ اور سوداگر لوگ نہایت آزادی اور بے فکری کے ساتھ تجارت میں مصروف تھے۔

لاہور کے ایک طرف دریا بہتا ہے جو مختلف علاقوں کو سیراب کرتا ہوا ملتان پہنچتا ہے اور وہاں سے سندھ میں چلا جاتا ہے۔ یہ شہر مغلیہ سلطنت میں دوسرے درجہ کا شہر ہے۔ یہاں کے خوبصورت باغ محلات، تالاب اور فوارے سیاح اور ناظر پر بڑا اثر ڈالتے ہیں۔ اس کے بڑے بازار کا نام "بازار دلکشا"[1] ہے۔ اس میں اس قدر دولت ہے کہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ یورپین منڈی کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

شاہجہان کے زمانہ میں جو ترقی لاہور کو ہوئی وہ اکبر کے زمانہ سے کہیں زیادہ تھی۔ لاہور کے باہر دور دور تک نئے محلے آباد ہو رہے تھے اور باغات و محلات کی کثرت نے لاہور کو گلزار ارم بنا رکھا تھا۔ نواب علیم الدین الملقب بہ وزیر خان نے اپنی

---

[1] "بازار دلکشا" معلوم نہیں کس جگہ واقع تھا۔ نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ خوب کشادہ اور آراستہ و پیراستہ ہوتا ہوگا۔

عالی شان مسجد شہر کے اندر بنائی جواب تک لاہور کی زینت کا باعث ہے۔ نواب وزیر خاں کا باغ۔ نواب سعد اللہ خاں وزیر اعظم کا فلک نما مکان جو آج "رنگ محل" میں حویلی میاں خاں کے نام سے موسوم ہے۔ نواب وزیر خاں کا مکان "پری محل" جس کے کھنڈر تا اب بھی شاہ عالمی دروازہ کے اندر نظر آتے ہیں۔ دائی لاڈو کے آسمان مرتبت ایوانات جو باغ مہاں سنگھ اور باغ رتن چند ڈاڑھی والا کے آس پاس تھے اور جہاں اب بھی دائی لاڈو کی مسجد موجود ہے۔ پھر محلہ دائی انگہ جو ریلوے اسٹیشن کے پاس تھا اور جہاں اب بھی مسجد دائی انگہ موجود ہے۔ مقبرہ و ڈیوڑھی نواب علی مردان خاں جسے محکمہ ریلوے نے اپنے قبضہ میں کر رکھا ہے۔ غرضیکہ اس قسم کے بیسیوں محلے لاہور کی زیبائش و شہرت کا باعث تھے۔

یہ شرف لاہور ہی کو حاصل ہے کہ نواب سعد اللہ خاں (وزیر شاہجہان) نے اپنی ابتدائی زندگی حصولِ علم میں اسی جگہ گزاری اور پھر جب بادشاہ کو اس کی قابلیت کا علم ہوا تو لاہور میں اسے شرف باریابی بخشا اور چار ہی سال کے اندر اس کو تمام ہندوستان کا مدار المہام بنا دیا اور پھر جب سعد اللہ خاں نے وفات پائی تو اس کے بڑے بیٹے لطف اللہ کو اعلیٰ منصب عطا کیا اور اس کے دو دوسرے بیٹوں اور متوسلین کے روزینے مقرر کر دیئے۔

دارا شکوہ چونکہ صوفی منش شہزادہ اور سلطنت کا ولی عہد تھا۔ اس لیے پنجاب کے لوگ اور خصوصاً اہالیان لاہور اس کے نہایت گرویدہ تھے۔ شہزادہ بھی ان سے بہت مانوس تھا۔ اس نے کئی عالی شان محلات تعمیر کرائے اور ایک پرفضا چوک اپنے نام سے اس جگہ قائم کیا جہاں لنڈا بازار میں آج کل "مسجد شہید گنج" واقع ہے۔ ایک مسجد[1] بھی تعمیر کرائی جس کی ایک بچی کھچی دیوار ریلوے ٹیکنیکل اسکول کی تعمیر کے زمانہ میں مسمار کر دی گئی تھی۔

دارا شکوہ کے دم سے لاہور میں بڑی رونق تھی۔ جس طرح وہ اسلامی تصوف کا دلدادہ تھا۔ اسی ذوق شوق سے ویدانت میں ڈوبا ہوا تھا۔ مجلس میں ایک طرف صوفیا بیٹھتے تھے اور دوسری طرف پنڈت اور جوگی۔ اکبر کی طرح مسلمان علما اور ہندو پنڈتوں کے مباحثے کراتا اور سنسکرت کی کتابوں کے فارسی میں ترجمے کراتا تھا۔

دارا شکوہ اور گورو ہرگوبند میں بہت مؤانست تھی۔ جب گورو جی امرتسر سے آتے تو مہینوں دارا شکوہ کے مہمان رہتے اور مسائل تصوف کے ذکر اذکار سے صحبت گرم رکھتے۔

[شاہی یادگاروں کے علاوہ امرا اور بیگمات کے محلات میں مینو سواد بستاں سرائے موجود تھے۔ ہر شہزادہ اور ہر امیر اپنا ایک نہ ایک محل رکھتا تھا جس میں باغ کے ساتھ آبشار، فوارے، حوض اور چھوٹی چھوٹی نہریں لازمی تھیں۔ پھر محلات کی کئی شاخیں ہوتی تھیں۔ زنانہ محل علیحدہ، مردانہ محل علیحدہ، درباری کمرے اور دیوان خانے الگ۔ باغات زنانہ و مردانہ الگ۔

اس زمانے میں امرائے لاہور کے اکثر مقبرے اور بزرگان دین کے اکثر مزار بھی باقاعدہ ان کے باغوں میں بنائے جاتے تھے یا ان مقبروں کی تعمیر کے ساتھ ہی باغ احداث کرائے جانے کا انتظام کیا جاتا تھا۔ بہرحال مقبرہ اور باغ قریباً لازم و ملزوم سمجھے جاتے تھے۔ دارا شکوہ نے اپنی تصنیف سکینۃ الاولیا میں بہت سے باغوں کا ذکر کیا ہے جو اس کے عہد میں موجود تھے اور اب نابود نا معلوم

---

[1] تاریخوں میں اس مسجد کا ذکر دارا شکوہ کی بیوی ستارہ بیگم کے نام سے آتا ہے۔ (مرتب)

ہیں۔ چند ایک کے نام یہ ہیں :-

باغ قاسم خاں ۔ یہ وہی قاسم خاں ہے جس نے ۹۹۴ھ/۱۵۸۶ء میں اکبر کے حکم اور اہلِ کشمیر کے ایک وفد کے مشورے سے کشمیر فتح کیا تھا۔ داراشکوہ لکھتا ہے :-

"حضرت میاں میرؒ اکثر اوقات اس درخت کے نیچے جو
قاسم خاں کے باغ کی دیوار کی پچھلی جانب چار دیواری
میں واقع ہے دن کو عبادتِ الٰہی میں مصروف رہا کرتے
تھے۔"

باغ جواہر خاں ۔ یہ باغ ایک جنگل کے متصل تھا۔ داراشکوہ کے زمانے میں وہ جنگل پانی کے نیچے دب کر نابود ہو چکی تھی۔

باغ محمد تقی دیوان بیوتات ۔ یہ امیر شہنشاہ جہانگیر کا دیوان بیوتات تھا معلوم نہیں یہ باغ کس جگہ واقع تھا۔ داراشکوہ نے صرف اتنا ہی لکھا ہے کہ "حضرت میاں میرؒ اس باغ میں کبھی کبھی دن کا کچھ حصہ گزارا کرتے تھے۔"

باغ ہوشیار خاں ۔ (ہسٹری آف لاہور ص ۵۴) داراشکوہ لکھتا ہے کہ "اس باغ سے مشرق کی طرف کندی درخت ہے۔ وہاں سبزی اگنے تک حضرت میاں میرؒ اکثر بیٹھا کرتے تھے۔"

غرض صدہا امراء، صلحاء، شعراء، اور شہزادے لاہور میں دفن تھے۔ ان کے مدفن نہایت عالی شان تھے۔ ان کی قبروں کے ساتھ اوقاف تھے۔ ان کے مقبروں کے گنبدوں سے ان کا جاہ و جلال ظاہر ہوتا تھا۔ وہ عبرت و بصیرت کی ایک زندہ تصویر بھی تھے۔ آج ان کی قبروں کا نشان تک بھی موجود نہیں۔ ان بے نشان مرقدوں کا نام بنام ذکر کہاں تک کیا جائے؟ — مرتب

عہدِ عالمگیری

اگرچہ باپ کو نظر بند کر کے عالمگیر (اورنگ زیب) ۱۶۵۸ء میں بادشاہ ہو گیا تھا۔ لیکن جب تک بھائی موجود تھا خصوصاً داراشکوہ جو ولی عہد تھا اس وقت تک اسے اطمینان نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے اس نے سب سے پہلے پنجاب کا رخ کیا جو داراشکوہ کی جاگیر میں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ داراشکوہ جہاں کہیں بھی ہوگا، بھاگ کر آخر لاہور ہی میں جائے گا اور وہاں سے تیار ہو کر مقابلہ کو نکلے گا۔ چنانچہ اس کا خیال ٹھیک نکلا۔ داراشکوہ بھاگ کر پہلے شالامار باغ میں پہنچا اور وہاں سے زمین دوز سرنگ کے ذریعے قلعہ میں داخل ہوا اور اپنا خزانہ جو ایک کروڑ روپیہ سے زیادہ کا تھا ہمراہ لے کر ملتان کے رستے بھکر اور سندھ کو چلا گیا۔ تقریباً چودہ ہزار سپاہی اس کے ساتھ تھے اور توپ خانہ اور کارخانجات شاہی یہ سب اس کے علاوہ تھے۔ بڑی بڑی کشتیوں میں یہ سب اسباب لدوا کر راوی میں ڈالا اور وہاں سے ملتان پہنچا۔ اس کے جانے کے بعد شہزادہ اعظم شاہ (اورنگ زیب کا بیٹا) ایک زبردست فوج لے کر لاہور پہنچا مگر خیریت گزری کہ لاہور والوں کو کوئی تکلیف نہ دی گئی۔ اس کے چند ماہ بعد اورنگ زیب بھی لاہور پہنچا اور شالامار باغ کے پہلے تختے میں قیام پذیر ہوا۔ دوسرے دن بادشاہ ہاتھی پر سوار

ہو کر لاہور میں داخل ہوا۔ قلعہ کی سیر کی اور واپسی پر مسجد وزیر خاں میں ظہر کی نماز پڑھی اور پھر باغ میں چلا گیا۔ مہمات پنجاب کا کام شہزادہ اعظم اور قلعہ دار اور خلیل اللہ خاں گورنر لاہور کو سپرد کر کے خود شجاع کے استیصال کے لیے واپس چلا گیا۔

عالمگیر کے زمانہ میں لاہور کی سیاسی لحاظ سے کوئی اہمیت نہ رہی۔ وہ صرف دو مرتبہ لاہور میں آیا۔ اس کی عمر کا بیشتر حصہ دکن اور راجپوتانہ کی لڑائیوں ہی میں گزر گیا۔ حالات و واقعات نے اسے اس قدر مہلت ہی نہ دی کہ وہ لاہور کی افزائش کی طرف متوجہ ہوتا۔

لاہور میں عہد عالمگیر کی تین یادگاریں ہیں جن میں سے دو تو مٹ گئی ہیں لیکن ایک موجود ہے اور انشاء اللہ تا قیامت موجود رہے گی۔ ان یادگاروں کا مختصر تذکرہ بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

۱۰۶۳ھ میں عالمگیر لاہور میں تھا کہ اس کے قابل اور دانا وزیر فاضل خاں نے ۲۷ ذیقعدہ کو ستر سال کی عمر میں لاہور میں انتقال کیا۔ اس نے اپنا عالی شان مقبرہ اپنی زندگی ہی میں تیار کرا لیا تھا۔

بادشاہ کے حکم سے وہیں دفن کیا گیا۔ بادشاہ اس موقعہ پر کوئی جشن کرنے کو تھا لیکن وزیر کی وفات پر اس نے وہ جشن ملتوی کر دیا۔ خدا جانے کس قدر عظیم الشان مقبرہ تھا مگر اب معلوم بھی نہیں کہ وہ کہاں واقع تھا۔

دوسری یادگار ایک بند تھا جو عالمگیر نے ۱۰۷۶ھ میں لاہور کو راوی کی دستبرد سے بچانے کے لیے باندھا تھا۔ اس بند کا ذکر لاہور کی اردو انگریزی تاریخوں میں کہیں کہیں نظر سے گزرتا ہے لیکن خلاصۃ التواریخ مصنفہ منشی سجان رائے بٹالوی میں اس کا مفصل ذکر موجود ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے :-

"در عہد حضرت محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی چوں
دریائے راوی بجانب شہر رو نہاد۔ و از صدمات آں بہ اکثر عمارات
و باغات آسیب رسید در سنہ چہارم جلوس والا برائے تعمیر
بند مستحکم کہ انہدام عمارات تواند بود حکم مقدس بصدور پیوست
فرماں پذیراں بند بہ درا تیبے دو کردہ بہ استحکام تمام بستند۔ و
بہ محافظت شہر بستہ عالمگیری بسان سد سکندری بروئے کار آوردند
و در اکثر جا مانند تالاب زینہ آراستہ لب دریا را بہ مثال لب
خوبان تقریب ساختند۔ و خوانین والا شان نشیمن ہائے دلکشا
و منازل فرح افزا اشرف بر دریا احداث نمودہ زینت افزائے
شہر شدند۔ و از ابتدائے سال چہارم نہایت حال کہ زیادہ
از چہل می گزرد۔ و در ہر سال ترمیم و تعمیر از سرکار بادشاہی بیشود
و برائے بندوبست مبلغ کلیہ بہ خرچ می رود"

اس روح افزا کیفیت کو ذرا ذہن میں لائیے جب کہ بند عالمگیری مکمل ہو چکا تھا اور اس کے کناروں پر تالاب

کی سیڑھیوں کی طرح بنائے اور سیر و تفریح کے لیے سیڑھیاں موجود تھیں اور امرائے والا شان نے وہاں خوشنما بنگلے دلفریب مناظر کی سیر کے لیے تعمیر کیے تھے اس زمانہ میں دریا کے کنارے پر کیا کچھ رونق نہ ہو گی! مگر آہ! آج وہ سب باتیں خواب و خیال ہیں۔

اس بند کے کچھ آثار آج بھی نظر آتے ہیں۔ ۱۹۰۲ء میں راقم الحروف کے اخبار پنجہ فولاد کا دفتر لنڈا بازار لاہور کے چنگڑ محلہ میں تھا۔ وہاں ایک شخص نے اپنا مکان بنانے کے لیے جب بنیادیں کھودیں تو اندر سے ایک طویل پختہ دیوار نکلی جو مسجد شہید گنج کی طرف سے آتی تھی اور علاقہ محال "نولکھا" کی طرف جاتی تھی۔ مالک مکان نے اس دیوار میں سے اس قدر اینٹیں نکالیں کہ اسے نئی اینٹیں خریدنے کی ضرورت ہی نہ رہی۔ مصری شاہ اور چاہ میراں[1] کے درمیان اب بھی اس بند کے آثار ملتے ہیں۔ ان کھنڈرات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بند ریلوے سٹیشن اور لنڈا بازار کے درمیان سے چاہ میراں کی طرف جو اس زمانہ میں دریا برد زمین تھی، نکل جاتا تھا۔ خلاصۃ التواریخ کا مولف اس بند کا طول دو کوس بتاتا ہے۔

عالمگیر کی تیسری یادگار لاہور کی شاہی مسجد ہے جو لاہور کی زینت کا باعث ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس مسجد کا پتھر در اصل دارا شکوہ نے اس غرض سے ہندوستان سے منگوایا تھا کہ چوک دارا شکوہ سے لے کر حضرت میاں میر رح کے مزار تک ایک پختہ سڑک بنوائے اور حضرت کا روضہ تعمیر کرائے جو صدہا سال تک یادگار رہے لیکن اس کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی اور وہ قتل کر دیا گیا۔ عالمگیر نے تمام سنگ مرمر ضبط کر کے لاہور میں جامع مسجد تعمیر کرا دی اور خدام میاں میر صاحب رح کی معروضات پر حضرت میاں میر رح کا مقبرہ بھی تعمیر کرا دیا جو آج تک قائم ہے۔ آج کل دریائے راوی اس مسجد سے تقریباً دو میل کے فاصلہ پر شمال مغرب میں بہتا ہے۔ لیکن اس زمانہ میں بادشاہی مسجد اور قلعہ کے بالکل متصل بہتا تھا۔ خلاصۃ التواریخ میں لکھا ہے:۔

"اگرچہ در ہر کوچہ و بازار مساجد بسیار از بسیار است اما بر کنارہ
دریا محاذی دولت خانہ والا حضرت عالمگیر بادشاہ مسجدے عالی
از سنگ بنا فرمودہ اند کہ زیادہ از پنج لک روپیہ بر آں صرف
شدہ"

عالمگیر کے زمانے میں لاہور کا ایک نامور شاعر ابو البرکات منیر کے نام سے گزرا ہے۔ عالمگیر کو اشرفی اور روپیہ کے لیے

---

[1] "چاہ میراں" جو عام طور پر "میراں دی کھوہی" کے نام سے مشہور ہے اسی علاقہ میں واقع ہے جہاں پہلے دریا بہتا تھا بند عالمگیری کی وجہ سے جب دریا یہاں سے ہٹ گیا تو یہ جگہ خشک ہو گئی اور رفتہ رفتہ یہاں ایک بن ہو گیا جس میں اکثر درندے رہتے تھے اور "پچاڈے" (جنگلی لوگ) جو لاہور اور مضافات پر ڈاکہ زنی کر کے اسی بن میں چھپ جاتے تھے۔ لہنا سنگھ حاکم لاہور نے سمت ۱۸۰۰ بکرمی میں یہاں ایک بستی قائم کی اور اس کے گرد ایک فصیل تعمیر کی۔ سب سے پہلے ایک میر صاحب نے یہاں ایک کھوئی (چاہ خورد) تعمیر کی انہی کے نام پر موضع کا نام "میراں دی کھوہی" یعنی چاہ میراں مشہور ہو گیا۔ سکھوں کے زمانہ میں یہاں بہت سے باغات لگائے گئے حضرت شاہ حسین زنجانی کا مزار بھی اسی جگہ ہے۔

شعروں کی ضرورت محسوس ہوئی تو ہندوستان کے بڑے بڑے نامی شعراء نے ابیات لکھے۔ انہی میں لاہور کا منیر بھی تھا۔ اس نے اشرفی کے لیے ذیل کا شعر کہا ہے

سکہ زد در جہاں چو مہر منیر
شاہ اورنگ زیب عالمگیر

اور روپیہ کے لیے یہ شعر ہے

سکہ زد در جہاں چو بدر منیر
شاہ اورنگ زیب عالمگیر

منیر نے انعام کی خواہش ظاہر کی مگر بادشاہ نے جواب دیا کہ یہ کیا کم بات ہے تمھارا نام میرے نام کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہے گا۔

ایک مشہور فرانسیسی جوہری نے ۱۶۴۱ء سے ۱۶۶۸ء کے درمیان اصفہان سے لے کر لاہور، دہلی اور آگرہ تک پاپیادہ سفر کیا ہے۔ وہ عالمگیر کے عہدِ حکومت کے اختتام پر لاہور آیا۔ جس کے متعلق وہ اپنے سفر نامہ میں لکھتا ہے :۔

(ترجمہ) " لاہور سلطنت کا دارالخلافہ ہے جو پنجاب کے پانچ دریاؤں میں سے ایک کے کنارے واقع ہے۔ دریا پہلے شہر کے متصل بہتا تھا مگر اب پون میل کے فاصلہ پر چلا گیا ہے اور اپنی طغیانی سے گرد و نواح کے علاقوں کو بہت نقصان پہنچاتا رہتا ہے۔ یہ شہر بہت بڑا ہے اس کی لمبائی ایک کوس سے زیادہ ہے۔ اس کی عالیشان عمارتیں جو آگرہ اور دہلی کی عمارتوں سے بھی زیادہ بلند ہیں عدم توجہی سے گرتی جاتی ہیں۔ برسات کے دنوں میں بہت مکانات منہدم ہو جاتے ہیں۔ قلعہ جس میں تخت گاہ شاہی ہے بہت اچھی حالت میں ہے اور چونکہ دریا اب اس سے بہت فاصلے پر ہے، اس لیے وہ بالکل محفوظ ہے "

ڈاکٹر برنیر جو عالمگیر کے عہد میں ۱۶۶۴ء میں لاہور میں آیا تھا لاہور کے متعلق لکھتا ہے :۔

(ترجمہ) " یہ ایک نفیس شہر ہے۔ اس کے بازار اور منڈیاں بہت بارونق ہیں۔ ہر جگہ "نے غم دزد نے غم کالا" کا عالم ہے۔ مکانات اپنی پختگی، خوبصورتی، بلندی اور شان و شوکت کے لحاظ سے آگرہ اور دہلی کی شاہی عمارات سے کم نہیں "

عالمگیر کی بیٹی زیب النساء بیگم نے جو قرآن شریف کی حافظہ اور نہایت عالمہ و فاضلہ شہزادی تھی لاہور میں ایک عالی شان باغ تعمیر کرایا جو اب تک "چوبرجی[1]" کے نام سے راجہ پونچھ کی موجودہ کوٹھی کے متصل "نواں کوٹ" کی طرف موجود

---

[1] چوبرجی باغ کے متعلق جدید تحقیق یہ ہے کہ یہ شاہ جہان کی بڑی بیٹی جہاں آرا نے بنوایا تھا۔ (مرتب)

ہے۔ بیگم نے اپنا مقبرہ بھی لاہور ہی میں اس باغ کے متصل تعمیر کرایا تھا اور اس کے گرد عظیم الشان چار دیواری کے اندر ایک ور وسیع باغ لگوایا تھا۔ لیکن دہلی کے حجیر نے شاہزادی کو لاہور میں دفن نہ ہونے دیا۔ سکھوں کے زمانہ میں اس چار دیواری کے اندر ٥ مہر عکم ؟ نے ایک موضع "نواں کوٹ" کے نام سے آباد کیا جواب تک موجود ہے۔[1]

[فدائی خان کوکہ مہتمم بادشاہی مسجد کے محلات و باغات بھی لاہور کی خوبصورتی میں اضافے کا باعث تھے۔ یہ اس مقام پر تھے جہاں آج کل حضرت شاہ محمد غوث کی درگاہ واقع ہے[2]۔

قدیم عالی شان عمارتوں، مزاروں اور باغوں کے آثار اب بھی لاہور میں کچھ نہ کچھ موجود ہیں جو زبان حال سے بتا رہے ہیں کہ "نااہل حاکموں، سنگ دل لٹیروں اور خشت فروشوں کے آہن گداز اوزاروں نے گو ان کی بیخ کنی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی پھر بھی شیشے ٹوٹ گئے، جی چھوٹ گئے، یہ نشان نہ مٹے پر نہ مٹے۔ بعض عمارات تو اس طرح معلوم ہوتی ہیں جیسے دیوؤں نے کوہ قاف سے ایک سنگ عظیم لا کر تراشا ہے اور پریوں نے اپنے نازک ہاتھوں سے اس پر پچی کاری و گل کاری کی ہے۔ ہر خشت سنگ سرشت اور ہر جوڑ لوہا توڑ نظر آ رہا ہے۔ شروع سے اخیر تک اور اوپر سے نیچے تک ایک جان ہے۔ تیشوں کے منہ پھر گئے مگر بے رحم انسانوں نے ان کو خاک میں ملانے سے دریغ نہ کیا۔"

جو باغ اور مزار جڑ بنیاد سے اکھیڑ دیئے گئے ہر چند وہ چشم ظاہر کو نظر نہیں آتے لیکن صفحۂ تاریخ پر ان کا وجود موجود ہے اور ان کی یاد ہر درد مند دل پر کالنقش فی الحجر ہے۔ لیکن ان کو مٹانے والے خود بینوں اور اپنے انجام سے غافل متکبروں پر آج چاروں طرف سے لعنت برس رہی ہے۔ چنانچہ مسٹر گھوشال ایم اے اپنے مضمون "شاہان مغلیہ کے باغات" میں لکھتے ہیں[3]:

"انہی مغلیہ باغات کے پتھروں کو اکھاڑ کر اٹھارھویں صدی
عیسوی میں سکھوں نے امرتسر میں رام باغ تیار کرایا تھا۔"

اس لوٹ کھسوٹ کے باوجود جب لارڈ ڈفرن وائسرائے ہند اور لیڈی ڈفرن اپریل ۱۸۸۸ء میں لاہور کی سیر کو آئے تو لیڈی ڈفرن نے سیر لاہور کی کیفیت خطوط[4] کے ذریعے اپنی ماں کو انگلستان روانہ کرتے ہوئے لکھا۔

"لاہور کے متعلق پہلی ہی نظر میں میری یہ رائے قرار پائی کہ وہ درختوں، پھولوں اور کھیتوں کا مخزن ہے۔ یہ ہرگز نہیں محسوس ہوتا کہ ہم کسی شہر

---

[1] اس موضع میں انجمن حمایت اسلام لاہور کی تعلیمی سرگرمیوں کی وجہ سے اب دار الشفقت اور ایک اسلامیہ ہائی سکول جاری ہے۔ پنڈت جنار دھن کا رام باغ جس کو نیا شالا باغ بھی کہتے ہیں اسی موضع کے متصل ہے۔ (مرتب)

[2] تاریخ لاہور از سید محمد لطیف صفحہ ۱۶۹۔

[3] از مضمون شاہان مغلیہ کے باغات مندرجہ اخبار دور جدید لاہور ۲۰ جنوری ۱۹۳۶ء

[4] ان خطوط کا خلاصہ لیڈی ڈفرن نے دو جلدوں میں بنام "ہماری وائسرائی زندگی ہند میں" چھاپ دیا تھا۔

ہیں ہیں بلکہ ہم باغوں میں سے گزرتے تھے اور ایسی ہی سڑکیں عبور کرتے
تھے جن کے دونوں طرف درختوں کی قطاریں تھیں۔ کھجور کے درخت،
گلاب کے تختے اور باڑ اور کھیت بھی نظر آتے تھے ...... مجھے کہنا
پڑتا ہے کہ لاہوری گلاب ایک ایسی چیز ہے کہ اس کی تعریف کے
گیت گائے جائیں۔ میں نے ایسی افراط کبھی اور کہیں نہیں دیکھی۔ اگر کوئی
ان تختوں پر سے گزرے تو ان کے بڑے بڑے جھنڈ یا کمانیں منفرد درخت
نظر آتے ہیں۔ مجھے تو یہ ایک حقیقی مدینۃ البساتین معلوم ہوتا ہے۔
یہاں بہت سے باغات ہیں جن میں گزرنے والا مسلسل نعرہ ہائے تکبیر
بلند کرتا اور گرویدگی کا اظہار کرتا رہتا ہے۔ ان سب سے الگ ایک
اور باغ ہے جو پانچ میل طویل اور شہر کی فصیلوں کو گھیرے ہوئے
ہے۔ غرض جب کبھی کوئی لاہوری اپنے بند مسکن اور تنگ گلی سے باہر
نکلنا چاہتا ہے تو وہ اپنے آپ کو پودوں یا گلاب، نارنج، آم اور پیپل
کے درختوں اور خوشنما پھولدار انار کے جنگلوں میں پاتا ہے۔"

غرض باغات کی کثرت نے لاہور کو "باغوں کا شہر" بنا رکھا تھا۔ اسی لحاظ سے بعض قدیم یورپین سیاحوں نے اس کو CITY OF GARDENS بجا طور پر کہا ہے۔

لاہور میں بزرگانِ دین کے مزاروں، امراء و مشائخ کی قبروں، شاہزادوں، بادشاہوں اور بیگمات کی آخری آرام گاہوں پر جو گنبد بنے ہوئے ہیں ان کا رواج مغل دور سے پہلے نہیں ملتا۔ گنبد کے اندر اور باہر گنبدوں کے سقف اور برآمدے جس قسم کے نقش و نگار سے آراستہ کیے جاتے تھے ان کی مثال نہ ان سے پہلے ملتی تھی نہ آج کہیں نظر آتی ہے۔ سنگ مرمر، سنگ موسیٰ، سنگ یشب غرض رنگین مرمر کے ٹکڑوں پر بیں وضع سے رنگین اور منقش کام کیا جاتا تھا اور جس عمدہ خط میں قبروں کے تعویذوں پر خدا کے ننانوے نام اور بعض دیگر آیات الٰہی لکھے جاتے تھے وہ اپنا جواب آپ تھے۔ یہ یادگاریں کئی سو سال بعد بھی عظمت و عبرت کا جو اثر پیدا کرتی تھیں وہ انقلاب زمانہ کے ہاتھوں بہت کچھ مٹ چکنے کے باوجود بھی کچھ نہ کچھ قائم رہا۔ چنانچہ ۱۸۸۵ء کے ایک خط میں لیڈی ڈفرن اپنی ماں کو لندن میں لکھتی ہیں:-

"ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر میں جالی دار مرمریں دروازوں، جڑاؤ کار
مرمریں فرش، اور . . . مرمریں میناروں، سنہری گنبدوں کی دنیا کی

ــــہ یہ . . . باغ . . . لاہور کے سوا کسی اور شہر میں نہیں۔ قدیم شہر جو بارہ دروازوں کے اندر آباد ہے اسی طرح باغ میں گھرا ہوا ہے اگرچہ اب آہستہ آہستہ اس کو ختم کیا جا رہا ہے۔ (قریشی)

قصروں سے آتاری ہوئی کمانوں اور بہترین رنگین ابلنشوں کا صرف تذکرہ
کروں اور یہ بیان نہ کروں کہ یہ دن اس طرح گزرا کہ ایک اچھی چیز
دیکھی جو خوشنما اور دلچسپ تھی - پھر ایک اور دیکھی جو اس سے بڑھ چڑھ
کر تھی تو بھی میں آپ کو عام نظاروں کے متعلق اپنی رائے سے متاثر
نہیں کر سکتی -"

مختصر یہ ہے کہ ہندوستان میں مغل حکومت کو ہندوستان کا زریں عہد سمجھا جاتا ہے اور کچھ شک نہیں کہ وہ اپنی جدت پسند طبیعتوں کی بدولت ہندوستان کو گلزار ارم بنا دینا چاہتے تھے۔ انھوں نے جا بجا نہریں کھدوائیں، جنگل کٹوا کر زمین صاف کرائی اور اسے زراعت کے قابل بنایا - ایران، ترکستان اور دیگر ہمسایہ ممالک سے اعلیٰ قسم کے میوہ جات اور ترکاریوں کے بیج منگوا کر نعمت ہائے گوناگوں سے اس ملک کو مالامال کر دیا۔ جس قدر باغات کشمیر، دہلی، آگرہ، فتح پور سیکری، ادوے پور، لاہور اور دیگر مشہور مقامات پر مغل حکومت میں تیار ہوئے نہ اس سے پہلے کبھی ہوئے اور نہ ان کے بعد اس شان سے تعمیر ہو سکے کہ ان میں نہریں بھی چلتی ہوں - فوارے بھی رواں ہوں، آبشاروں کا لطف بھی ہو اور سنگ مرمر کی نشست گاہوں کے علاوہ زنانہ و مردانہ شاہی عمارات بھی ہوں - باغ باہر سے ایک نظر آتا ہو لیکن اندر جا کر دیکھو تو مختلف قسم کے کئی باغ نظر آئیں اور پھر ہر ایک کی شان الگ ہو کسی میں لالہ زار کی ومک نظر آتی ہو - کسی میں گلاب ہی گلاب کھلے ہوں - کہیں انگور کی بیلیں سرور پیدا کر رہی ہوں اور کہیں کھجوروں کی کثرت سے نخلستان بنا ہو - کہیں بارہ دریاں اور ساون بھادوں لطف دے رہی ہوں اور کہیں بھول بھلیوں سے عقل حیران ہوتی ہو - چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ مغلوں کے عہد میں لاہور عروس البلاد بنا ہوا تھا۔

مغل وسط ایشیا سے آئے تھے اور اپنا تعمیراتی ذوق ساتھ لائے تھے - وہ جانتے تھے کہ عالی شان عمارتیں بقائے نام کے لیے ضروری ہیں - ان سے آنے والی نسلوں کو ان کے بانیوں کے ذوق، شوق، ظرف، فکر و عمل، رجحان اور کردار کا پتہ چلتا ہے - انہوں نے وسط ایشیا، ایران، توران اور ترکی طرز کی عمارتیں یہاں تعمیر کیں اور روپیہ پانی کی طرح بہایا - ان کی بدولت فن تعمیر کو حیرت انگیز ترقی ہوئی - ان کی بنائی ہوئی عمارتیں دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتی ہیں - اکبر نے اپنی عمارتوں میں سرخ پتھر کی لمبی لمبی سلیں استعمال کر کے ان کے نیچے منبت کار دیوارگیروں کا اضافہ کیا - جہانگیر کے وقت میں ایرانی طرز کا رواج شروع ہوا جو شاہ جہان کی ذاتی دلچسپی اور نفاست پسندی سے انتہائے کمال پر پہنچ گیا - اس کی عمارتیں زیادہ تر سنگ مرمر سے بنی ہیں اور پرچین کاری سے مزین ہیں - اورنگ زیب اور اس کے جانشین اس طرف زیادہ توجہ نہیں کر سکے - ان کے بعد تو لاہور کی بے شمار یادگاریں مٹ گئیں اور جو باقی ہیں ان کو بھی انہدام کا خطرہ لاحق ہے - یہ اینٹ چونے کا ڈھیر نہیں ہمارا تاریخی اور تہذیبی ورثہ ہیں - یہ ہمارے ماضی کی درخشندہ روایات اور اقدار کی امین ہیں - ان کا ایک ایک پتھر بلکہ ذرہ ذرہ ہماری قدیم شہری زندگی اور تہذیبی و ثقافتی ارتقا کے ان گنت مظاہر اور اسالیب کا آئینہ دار ہے - تاریخ کے طلبہ اور محققین کے لیے ان میں علم و تجسس کی تشنگی بجھانے کا وافر سرمایہ موجود ہے - اس عظیم سرمائے کا تحفظ ایک قومی فریضہ ہے - پورے لاہور میں مغلوں کے آثار قدیمہ پھیلے ہوئے ہیں جن کا تاریخی اور آنکھوں دیکھا حال آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمایا جا سکتا ہے ——— مرتب]

باغ نولکھا

دیکھنا ہو شوکتِ ویرانۂ دنیا اگر
باغ نولکھا کو وقتِ چرخِ گرداں دیکھئے

شہزادہ دارا شکوہ بن شاہ جہان اپنی تصنیف سکینۃ الاولیاء میں حضرت میاں میرؒ کے خوارق عادت بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے :۔

"حضرت میاں جیو صاحب کے اکثر یاروں سے میں نے سُنا ہے کہ ایک روز آپ نولکھا باغ
میں گئے ہوئے تھے آپ نے اپنے ایک یار سے فرمایا کہ اس درخت سے پوچھ کہ تُو کونسی
تسبیح پڑھتا ہے جب اس نے درخت کے پاس جا کر پوچھا تو درخت نے کہا "یا نافع"
کی تسبیح پڑھتا ہوں وہ سرس کا درخت تھا اور اب تک اس باغ میں موجود ہے۔"

چونکہ اپنے زمانہ کے چشم دید حالات کو روزمرہ کے معمولی واقعات سمجھ کر ان کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی جاتی اور شاید اُن کو آنے والے مؤرخوں کی موشگافیوں کے رحم پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس لیے دارا شکوہ نے یہ نہیں بتایا کہ اُس باغ کو کس نے کب اور کہاں احداث کرایا تھا۔

مصنف تحقیقات چشتی (۱۸۵۵ء سے ۱۸۶۰ء ص ۷۸۷ پر) لکھتے ہیں "یہ باغ نواب علی مردان خان نے تعمیر کرایا۔"

جج محمد لطیف اپنی تاریخ پنجاب اردو میں (ص ۲۳ پر) لکھتے ہیں یہ میرزا کامران کا باغ تھا۔ لیکن اس کے بعد جب وہ انگریزی میں لاہور کی ایک ضخیم تاریخ بنام ہسٹری آف لاہور ۱۸۹۲ء میں لکھتے ہیں تو اس میں نولکھا باغ کو نواب علی مردان خان سے منسوب کرتے ہیں اور اس کا محل وقوع شالامار کے جنوب میں بتاتے ہیں۔

رائے بہادر کنہیا لعل اپنی تاریخ لاہور (۱۸۸۴ء) میں مصنف تحقیقات چشتی ہی کی تائید کرتے ہوئے اس کو نواب علی مردان خان کا باغ بتاتے ہیں۔

ناچیز راقم نے اس باغ کے بانی کے متعلق تاریخوں کے مطالعے کے بعد جو رائے قائم کی ہے وہ سطور ذیل سے معلوم ہو سکے گی۔ نواب علیمردان خان ۱۰۴۸ھ/۱۶۳۸ء میں ایران سے لاہور آیا۔ شاہجہان اُن ایام میں لاہور ہی میں تھا اُس نے اس کو اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب عطا کیے ۱۰۴۹ھ/۱۶۳۹ء میں ہفت ہزاری امیر بنا کر لاہور کا گورنر بنایا۔

دارا شکوہ نے اپنے قول کے مطابق حضرت میاں میر کی وفات ۱۰۴۵ھ کے چھ سال بعد بعمر ۲۸ سال ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء میں سکینۃ الاولیاء کی تصنیف شروع کی۔ اور جب وہ یہ لکھتا ہے کہ حضرت دن کے وقت اپنے یاروں کے ساتھ اس باغ میں تشریف لایا کرتے تھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس باغ میں ان کی تشریف آوری کا زمانہ ۱۰۴۵ھ سے بہت قبل کا ہے۔ اور یہ وہ زمانہ تھا کہ علی مردان خان جس کو نولکھا باغ کا بانی بتایا جاتا ہے۔ شاہ ایران کی طرف سے قندھار کا گورنر تھا۔ اور شاہجہان کا مخالف تھا۔ اس لیے یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ ۱۰۴۸ھ سے پیشتر علیمردان خان نے لاہور میں اپنا کوئی باغ یا محل تعمیر کرایا ہو۔ بنا بریں تحقیقات چشتی، تاریخ لاہور اور ہسٹری آف لاہور (انگریزی) میں اس باغ کا بانی جو نواب علیمردان خان کو ظاہر کیا گیا ہے وہ بغیر تحقیق کے لکھا گیا ہے اور غلط ہے۔ البتہ

ہسٹری آف لاہور کے مصنف نے تاریخ پنجاب (اردو) میں اس باغ کو مرزا کامران سے جو منسوب کیا ہے وہ درست ہے لیکن اس کا محل وقوع درست نہیں بتایا۔ تھارنٹن صاحب کے حوالہ سے وہ خود ہی (ص ۴۴ پر) لکھتے ہیں کہ اس باغ اور اس کے محل کا دُور تک کنارے راوی تک پھیلا ہوا تھا اور پھر اسی کتاب کے ص ۲۴۳ پر ارقام فرماتے ہیں "اسی باغ میں جہانگیر نے اپنے فرزند سلطان خسرو کو کچھ روز نظر بند رکھ کر قلعہ میں اس کے مرتے دم تک اس کو محبوس رکھا" یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ان ایام میں دریا قلعہ کے نیچے بہتا تھا اور اس کی حدود شمال کی طرف فاروق گنج بیرون شیرانوالہ دروازہ کی نئی بستی اور شاہ [illegible]ل اور موضع جھگیاں میں اب بھی پرانے نالہ کی صورت میں نظر آرہی ہیں۔ یہ تو ممکن ہو سکتا ہے کہ نولکھا باغ کی حدود پرانے دریا کے نزدیک تک پہنچی ہوں لیکن یہ کسی طرح باور نہیں کیا جا سکتا کہ نولکھا باغ شہر سے بھی ملحق ہو۔ اور دریائے راوی کے پار بھی اس کی حدود پہنچی ہوں جہاں جہانگیر نے اپنے بیٹے کو سزا دی تھی۔

اس لیے صحیح یہی ہے کہ دریا کے پار میرزا کامران کا جو باغ تھا اُس کا نام نولکھا باغ نہیں تھا بلکہ نولکھا باغ اور بارہ دری میرزا کامران کے درمیان دریا واقع تھا۔ اور اس کا محل وقوع شہر سے شمال مشرق کی طرف تھا۔ ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۰ء بلکہ ۱۸۶۴ء تک اس باغ کی ایک بارہ دری موجود تھی اور کہیں کہیں خرابہائے خشتی بھی نظر آتے تھے[1]

جج محمد لطیف تاریخ پنجاب میں لکھتے ہیں "اب باغ کے محل کا نام و نشان بھی نہیں پایا جاتا" اس سے چار پانچ سال قبل کا مصنف رائے بہادر کنہیا لال ۱۸۸۴ء میں لکھتا ہے "ریلوے سٹیشن کے شمال کی طرف ڈیوڑھی باغ کی نہایت پختہ موجود ہے" لیکن جب راقم لکھنے بیٹھا ہے تو یہ باغ جس مقام پر واقعہ تھا آج وہاں کئی نو آبادیاں قائم ہو گئی ہیں۔ فیض باغ۔ کاچھو پورہ۔ بہارت نگر۔ سلطان پورہ۔ چاہ میراں اور روشن پورہ کی کچھ اراضیات باغ دیوان کرپا رام۔ مکان ڈوری شاہ سب اس برباد شدہ محل اور باغ کی حدود میں واقع ہیں۔

سکھ حکومت کے زمانہ میں اس باغ کی تباہی و بربادی انتہا کو پہنچ گئی۔ علاوہ ازیں اس کی خشت فروشوں نے گرائیں اور اینٹیں بیچ بیچ کر پیٹ کا دوزخ بھرتے رہے محل اور باغ کی دیگر عمارتوں میں جس قدر قیمتی پتھر تھا وہ مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنے کام میں لے آئے۔ زمینداروں نے زمین خالی دیکھ کر زراعت شروع کر دی اور کنوئیں بھی زراعت کے لیے بنوا لیے[2]۔ غرض ؎

بہار بے خزاں تھا کامراں کا باغ نولکھا — مگر اب حال اس کا حد گویائی سے باہر ہے
یہی خطہ بدور کامراں جنت کا ٹکڑا تھا — یہی ہے آج وہ خطہ جو بے دیوار و بے در ہے
وہاں اب خاک اڑتی ہے جہاں چلتے تھے فوارے — جہاں شاہی دفاتر تھے وہاں عبرت کا دفتر ہے
عمارات رفیع و آسماں پیما کی کیفیت — بجائے صفحۂ تاریخ اب تو لوح دل پر ہے

سکھوں کے عہد میں سرداران سندھانوالیہ نے اس پر قبضہ کر لیا اور ڈیوڑھی کے اوپر کچھ اور عمارت ایزاد کر کے اپنے رہنے کے لیے کوٹھی بنوا لی۔ ۱۸۸۴ء تک یہ کوٹھی موجود تھی اور اس میں محکمہ ریلوے کے "صاحبان عالیشان" سکونت رکھتے تھے۔ لیکن ۱۹۰۰ء میں راقم

---

[1] تحقیقات چشتی سال تصنیف اندازاً ۱۸۵۰ء/۱۸۶۰ء مطبوعہ ۱۸۶۴ء

[2] تاریخ لاہور مصنفہ رائے بہادر کنہیا لال ص ۳۶۳

نے اس کی ڈیوڑھی کی جو بلند سطح پر تھی ایک ٹوٹی پھوٹی دیوار سی دیکھی تھی اس کے ساتھ سرکی بندوں نے ایک دو جھونپڑیاں بنا رکھی تھیں جن میں وہ ٹوکریاں بنایا کرتے اور رہائش رکھا کرتے تھے ۔ ۱۹۲۳ء میں وہ دیوار بھی سر بسجود ہو کر ختم ہو چکی تھی ۔ ۱۹۰۱ء میں وہاں راقم کو بعض آدمیوں نے بتایا کہ ڈیوڑھی میں ایک تالاب نما حوض کے نشان بھی تھے ۔ جو کہ

ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

کا مصداق ہو چکے ہیں ۔

ان ایام میں یہاں کوئی آبادی نہ تھی ۔ زمیندار کھیتی باڑی کرتے تھے ۔ بید، مشک، آڑو، امرود، گلاب اور سنگترہ وغیرہ کے چند ایک باغات تھے ۔ ۱۹۰۳ء یا ۱۹۰۴ء میں یہاں زمینیں فروخت ہونا شروع ہوئیں ۔ آج نومبر ۱۹۲۳ء میں جیسا کہ گذشتہ سطور میں لکھا جا چکا ہے کئی نو آبادیاں قائم ہو گئی ہیں جن کی مردم شماری پچیس تیس ہزار سے کم نہ ہو گی ۔

نولکھا کی وجہ تسمیہ میں تحقیقات چشتی اور تاریخ لاہور دونوں کے مصنف اس بات پر متفق ہیں کہ اس باغ کی تیاری پر نو لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا یا یہ ایسا محال بن گیا تھا کہ اس کی آمدنی نو لاکھ روپیہ سالانہ تک تھی ۔ یہ دونوں باتیں قرین قیاس نہیں ہیں اس لیے کہ شالامار باغ جو پنجاب میں لاثانی باغ سمجھا جاتا ہے چھ لاکھ روپے کی لاگت میں تیار ہوا تھا اور باغ کی یا اس کے گرد و نواح کے محال سے نو لاکھ روپیہ کی سالانہ آمدنی کا یقین بھی بہت مشکل ہے نولکھا کی وجہ تسمیہ بتانے میں نقارمتین اور جج محمد لطیف دونوں خاموش ہیں ۔

دو موریا پل یا ریلوے پل سے جو شالامار باغ کو جاتا ہے پار ہو کر کوارٹرز آتے ہیں جن کا کثیر حصہ اسی باغ کے کھنڈروں پر بنایا گیا ہے ۔ ان کوارٹروں کے درمیان سے باغ کی ڈیوڑھی کو رستہ جاتا ہے اور اب تک بھی رستہ میں پختہ اینٹوں کے فرش کے کہیں کہیں نشان ملتے ہیں ۔

کاغذات بندوبست میں اسی علاقہ کا نام جس میں یہ تمام نئی بستیاں آباد ہیں محال نولکھا ہے اور ہر چند کہ نولکھا میں اب زراعتی زمین بہت کم ہے ۔ اور چاروں طرف مکانات نظر آ رہے ہیں لیکن مالکان مکانات سے اب بھی مالیہ اراضی لیا جا رہا ہے ۔

باغ دل افروز

یوں تو صحرا بھی ہے اکثر گلستاں بوستاں
بن گیا ہے جو بیاباں وہ گلستاں دیکھئے

اس باغ کا بانی کون ہے اس میں کیا کچھ تھا اور یہ کہاں واقع تھا؟ لاہور کی کسی تاریخ میں اس کا ذکر نہیں ۔ صرف جہانگیر نے اپنی توزک میں اس کا ذکر اس موقع پر کیا ہے ۔ جب وہ اپنے فرزند سلطان خسرو کی بغاوت فرو کرنے کے بعد ۱۰۱۵ھ ۱۶۰۶ء میں کابل کو روانہ ہوتا ہے ۔ چنانچہ وہ روانگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے :۔

"۱۳ ذی الحجہ ۱۰۱۵ھ کو میں قلعہ لاہور سے نکلا ۔ پہلی منزل دریائے راوی کے کنارہ پر باغ دل افروز میں کی اور چار روز وہاں توقف کیا ۔"[1]

جہانگیر ۱۶۰۵ء میں اکبر کے بعد تخت پر بیٹھا ہے اور تخت پر بیٹھتے ہی سب سے پہلے اس کو اپنے فرزند سلطان خسرو کی بغاوت سے واسطہ پڑتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ باغ اکبر یا ہمایوں نے تعمیر کرایا ہے۔

جہانگیر شاہان مغلیہ میں مناظر قدرت، تفریح و شکار اور سیر و سیاحت کا خاص شوقین تھا جب وہ باغ کے کسی گنبد یا شہ نشین یا کسی بارہ دری میں بیٹھا ہوگا اور دریا کی پُرلطف وجدانی شورش اور اس کی بے نکان و بے پناہ روانی کی موجیں دیکھتا ہوگا۔ تو خدا جانے اُس کے نظارہ پسند دل کے دریائے بے پایاں میں کیسی کچھ لہریں اُٹھتی ہوں گی۔ اُس باغ میں اس کا چار دن کا توقف ظاہر کرتا ہے کہ اُس زمانہ میں باغ کی رونق اپنے پورے جوبن پر ہوگی اُس میں اس قدر محلات و مکانات ہوں گے جہاں بادشاہ، بیگمات اور خدم و حشم سمیت سما سکتا تھا۔

جہانگیر لکھتا ہے اس باغ میں میں نے اپنے قابل امیروں کے منصبوں میں اضافے کئے۔ اور دو شنبہ کو باغ مذکور سے روانہ ہو کر موضع ہری پور میں کہ لاہور سے ۳½ کوس ہے آیا۔ ایک دن کے قیام کے بعد جہانگیر پور[1] میں جو میری مقررہ شکارگاہوں میں ہے اور جہاں میرے ہرن ہنس راج کی قبر میرے حکم سے بنائی گئی ہے میں نے قیام کیا۔

جس عالیشان باغ میں جہانگیر جیسا مظاہر قدرت کا عاشق بادشاہ چار دن قیام کرتا ہے آج کوئی اس کا پتہ نہیں بتا سکتا۔ یہاں تک کہ لاہور کی تاریخیں بھی اس کا نام لینے اور ذکر کرنے سے معذور نظر آتی ہیں ؎

اے مصحفی میں روؤں کیا اگلی صحبتوں کو
بن بن کے کھیل اپنے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

چونکہ یہ باغ دریا کے کنارہ پر تھا۔ اور اُس زمانہ میں سب باغات باغ و بارہ دری میرزا کامران کی طرح شاہدرہ اور شیخوپورہ کی سڑک کی طرف لب دریا ہی تھے۔ اس لیے دریا کا رُخ شہر اور قلعہ سے بدل کر جس طرح اور باغات کو تہ آب کر کے ملیامیٹ کر گیا اسی طرح یہ باغ بھی جو اپنی دل لبھانے والی دلکشیوں و دلفریبیوں اور دل افروزیوں کی وجہ سے جہانگیر کا دامن دل اپنی طرف کھینچتا تھا۔ دریائے راوی کی نہ تھکنے والی موجوں کی نذر ہو گیا۔ ان سب باغوں میں باغ میرزا کامران اپنا بہت کچھ مٹ چکنے کے باوجود اب تک اپنی سخت جانی کی بدولت موجود ہے۔

نیلہ گنبد

یہ مقبرہ اُس سڑک پر واقع ہے جو انارکلی کے چوراستہ سے سنٹرل بنک اور جنرل پوسٹ آفس کو نکلتی ہے۔ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج بھی اس کے سامنے ہی ہے۔ یہ بلند و کشادہ مقبرہ جو نیلے رنگ کی وجہ سے نیلہ گنبد کہلاتا ہے۔ دُور ہی سے

---

[1] جہانگیر کے بچپن کے نام شیخو بابا کی رعایت سے اکبر نے اس کا نام شیخوپورہ رکھا تھا جہانگیر نے بادشاہ ہو کر اس کا نام جہانگیر پور رکھا مگر وہ مشہور نہ ہو سکا اسی کے نواح میں عین جنگل کے وسط میں وہ ہرن مینار و ہرن کی قبر، موجود ہے جس کا جہانگیر نے ذکر کیا ہے۔ جہانگیر کے حکم سے یہاں کے جاگیردار سکندر معین نے قلعہ تعمیر کیا۔

نظر آتا ہے۔ گنبد کے نیچے شیخ عبدالرزاق مکی کی خاک پاک دفن ہے۔ ان کے ساتھ اس گنبد میں سات اور قبریں ہیں۔ قبریں بالکل معمولی خشتی ہیں اور اس بزرگ کی قبر بھی انہی معمولی قبروں میں شامل ہے۔ کسی قبر پر کسی کا نام درج نہیں۔ یہ بزرگ ہمایوں کے زمانے میں لاہور آئے اور جہاں آپ کا مقبرہ ہے وہاں ایک چھوٹا سا حجرہ تعمیر کرا کر اسی میں مصروف عبادت رہنے لگے۔

تاریخ لاہور میں (ص ۲۸۹) لکھا ہے کہ آپ لاہور آکر حضرت میراں سید محمد شاہ موج دریا بخاری کی خدمت میں رہے اور وہیں سے آپ نے فضیلت باطنی حاصل کی اور اس میں یہاں تک کمال حاصل کیا کہ خود حضرت موج دریا آپ کا احترام کیا کرتے تھے۔

عوام کے علاوہ شہر کے اکثر امراء آپ کے دلی عقیدتمند تھے۔ آپ کی وفات بقول مصنف تاریخ لاہور ۱۰۸۲ھ عہد عالمگیری میں ہوئی۔ آپ کی وصیت کے مطابق آپ کو آپ کے عبادت کدہ (حجرہ) ہی میں دفن کیا گیا۔ مقبرہ پر عرصہ تک کوئی گنبد تعمیر نہیں ہوا۔ یہاں یہ روایت عام مشہور تھی کہ ہر جمعرات کو ایک شیر آ کر دُم سے جھاڑو دیا کرتا تھا۔ لاہور میں اسی قسم کی روایت شاہ جمال کے مزار اور چند اور مزاروں کے متعلق بھی مشہور ہے۔ اسی طرح بعض بزرگوں کے متعلق یہ بھی شہرت ہے کہ وہ آنکھیں بند کرا کر اور پاؤں پہ پاؤں رکھ کر کسی کو مکہ مدینہ اور کسی کو ہردوار پہنچا دیا کرتے تھے۔ لیکن جب سے شاہ جمال یا شیخ عبدالرزاق مکی یا ایسے ہی اور بزرگوں کے مزار آبادی کے اندر آ گئے ہیں شیروں کا وجود خود بخود گم ہوتا چلا گیا ہے۔

ہسٹری آف لاہور میں لکھا ہے کہ ایک شب حضرت موج دریا بخاری نے مقبرے کے متولی کو خواب میں یہ حکم دیا کہ عبدالرزاق کی قبر پر ایک بہت بڑا گنبد تعمیر کرایا جائے۔

چونکہ اہل لاہور اس بزرگ کے دل و جان سے عقیدتمند تھے اس لیے آپ کے ارادتمندوں نے آپ کی قبر پر نہ صرف یہ گنبد تعمیر کرایا بلکہ ایک عالیشان باغ اور اس کے ساتھ ہی ایک وسیع مسجد بھی تعمیر کرائی۔ مصنف تاریخ لاہور رائے بہادر کنہیا لال لکھتے ہیں کہ "سکھوں کے عہد میں وہ عظیم الشان باغ بالکل برباد ہو گیا۔" مقبرہ اور مسجد کی عمارتوں میں چونکہ کوئی قیمتی پتھر نہ تھا اس لیے وہ بربادی سے تو بچ گئے۔ لیکن مقبرہ میں بارود کا ذخیرہ رکھا گیا اور مسجد توپ خانہ کے کوارٹروں کا کام دینے لگی۔ مسجد کے ساتھ ہی لوہاروں کے لیے بھی چند مکان بنائے گئے جن میں وہ بندوقیں بنایا کرتے تھے۔

آج وہ مقبرہ جس کے ساتھ ایک وسیع باغ بھی تھا شیخ رحیم بخش سوداگر کی سرائے کے اندر ہے۔ مقبرہ ایک پختہ خشتی چبوترہ پر ہے اور چاروں طرف مکانات سے گھرا ہوا ہے۔ سرائے بھی اب سرائے نہیں رہی بلکہ اس میں جو مکانات ہیں ان میں کرایہ دار رہتے ہیں۔

بارہ دری میرزا کامران

دل کا اک داغ اب اپنی جگہ ہے باغ باغ ۔۔ یوں تو دیکھے ہیں بہت یہ بھی گلستاں دیکھئے

لہ حضرت شیخ عبدالرزاق مکی ہمایوں کے زمانہ میں آئے اور صاحب تحقیقات چشتی (ص ۸۲) کی تحریر کے مطابق حضرت موج دریا اُچ سے اکبر کے زمانہ میں (۹۷۵ھ کے بعد) آئے۔ گویا مرشد اپنے مرید سے ۱۸-۲۰ سال کے بعد لاہور آئے۔

شہزادہ میرزا کامران، بابر بادشاہ کا بیٹا اور ہمایوں کا بھائی تھا۔ بھائیوں کو خانہ جنگیوں سے بچانے کے لیے بابر نے ہمایوں کو سلطنت سونپی اور دوسرے بیٹے میرزا کامران، تیسرے بیٹے میرزا ہندال اور چوتھے فرزند میرزا عسکری کو پنجاب اور کابل وغیرہ کے عظیم صوبے جاگیر میں دیئے۔

میرزا کامران پنجاب کا حکمران تھا۔ اس زمانہ میں دریائے راوی شہر لاہور کی دیواروں کے ساتھ ٹکرا کے بہتا تھا۔ آج بھی دریا کے اُس بہاؤ اور رُخ کے آثار "بڈھا دریا" یا "نالہ" کے نام سے موجود ہیں جو ریلوے سٹیشن بادامی باغ اور دریا کے موجودہ پل کے درمیان واقع ہے۔

قلعہ لاہور کی حالت اُس زمانہ میں کچھ اچھی نہ تھی۔ اس لیے میرزا کامران نے دریا کے پار اپنے لیے ایک عالیشان محل تعمیر کرایا۔ اور کہا جاتا ہے کہ مغلوں کی یہ سب سے پہلی عمارت ہے جو بابر کے زمانہ میں یا ہمایوں کے ابتدائی عہد کے وقت پنجاب بلکہ ہندوستان میں تعمیر ہوئی ہے۔ اس زمانہ کا اندازہ ہم بابر کی وفات (۹۳۷ھ/۱۵۳۰ء) سے کچھ پہلے یا ۹۴۰ھ/۱۵۳۳ء تک کا لگا سکتے ہیں۔ اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ جب شیر شاہ سوری کے حملوں سے بچنے کے لیے ہمایوں نے اپنے تینوں بھائیوں اور امرائے گرامی سے مشورہ کرنا چاہا تو میرزا کامران کی جاگیر میں ہونے کی وجہ سے پنجاب ہی سب سے بہتر محفوظ مقام تھا۔ چنانچہ اسی عمارت میں جو ایک وسیع و گل ریز باغ کے عین درمیان تھی باہمی مشورہ کے بعد ایک عہد نامہ مرتب ہوا۔ لیکن کامران ایک طرف بھائی سے ڈرتا تھا اور دوسری طرف اس کو یہ بھی اندیشہ تھا کہ شیر شاہ آندھی اور بگولے کی طرح بڑھتا آ رہا ہے۔ ایسا نہ ہو بھائی کا ساتھ دے کر پنجاب کی حکومت ہی سے ہاتھ دھو بیٹھوں۔ چنانچہ شیر شاہ کے خوف سے اور سب تو بھاگ گئے مگر کامران[1] نے نہ صرف اُس کے ایلچی کی خاطر تواضع کی بلکہ اپنے باغ میں ایک بہت بڑا جشن کیا۔ جس میں لاہور کے امراء و غرباء سب شامل تھے۔

تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد مغلیہ میں دریا کے پار شاہدرہ کے نواح میں اُمرائے مغلیہ نے بہت سے باغات و مکانات تعمیر کر لئے تھے مگر جب دریا نے محمد شاہ[2] بادشاہ کے زمانہ میں اپنا رُخ شہر کی طرف سے ہٹا کر شاہدرہ کی طرف کر لیا تو بہت سے باغات دریا بُرد ہو گئے اور جو باقی بچے وہ زمانہ کی دستبرد سے مِٹ گئے۔

میرزا کامران کا یہ باغ چونکہ نہایت وسیع تھا اس کے اندر دیوان خاص دیوان عام اور محلاّت زنانہ کے علاوہ ایک مستحکم و مضبوط بارہ دری بھی تھی۔ جس کی دونوں منزلیں اب تک کسی نہ کسی حالت میں موجود ہیں۔ جب راوی پر پیدل چلنے والوں کے لیے صرف کشتیوں کا پل تھا اُن ایام میں محکمہ نہر کے ایک افسر اس بارہ دری میں رہا کرتے تھے۔ اور مسافروں سے فی مسافر پیسہ یا دو پیسہ محصول گذر لیا جاتا تھا۔ جب ۱۹۱۵ء[3] میں بعہد سر اوڈوائر لفٹنٹ گورنر پنجاب پیدل چلنے والوں کے لیے موجودہ عالیشان پل تعمیر ہو گیا تو

---

[1] وفات ۹۶۴ھ/۱۵۵۷ء ۱۱ ذی الحجہ بہ ملک حجاز۔ بہ حالت نابینائی۔

[2] تخت نشینی ۷ ذی قعدہ ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء وفات ۲۷ ربیع الآخر ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء

[3] ۲۰ اپریل ۱۹۱۵ء کو اس پل پر سب سے پہلے پیدل چلنے والوں کی افتتاحی رسم عمل میں آئی اس پل کا محصول سرکار کی طرف سے معاف ہے۔ اس کا نام راوی روڈ برج ہے اور اس کے چیف انجینئر آر۔ ایس ملکنگن ہیں۔

کشتیوں کا کچا پل اکھاڑ دیا گیا اور بارہ دری بھی پبلک کی سیر و تفریح کے لیے خالی کرا کر محکمہ آثار قدیمہ کے سپرد کر دی گئی۔

کشتی سے اترتے ہی چند قدم کے فاصلہ پر سرِ راہ ایک عمارت آتی ہے جو ہے تو اسی زمانہ کی لیکن اس کی تباہی کے بعد پی۔ڈبلیو۔ڈی نے اب اس کی مرمت کرا دی ہے۔ اس عمارت میں کشتیوں کے پل کے زمانہ میں چنگی خانہ تھا۔ جب یہ پل اٹھا دیا گیا تو سال تک یہاں پولیس کی چوکی رہی اس کے بعد جب چوکی بھی اٹھا دی گئی تو کئی سال تک بے آباد اور ویران رہی اب دو سال سے پی ڈبلیو ڈی کے ماتحت ہے۔

دریا کا رُخ شہر کی طرف سے ہٹا کر سب سے پہلے بند عالمگیری نے شاہدرہ کی طرف پھیر دیا۔ اُس زمانہ میں میرزا کامران کا باغ قلعہ لاہور سے جس کے نیچے دریا بہتا تھا، دو ڈھائی میل کے فاصلہ پر تھا۔ محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ میں بند عالمگیری کی وجہ سے دریا کا بہاؤ باغ کی دیواروں تک آ پہنچا اور سکھوں کے زمانہ تک اس نے باغ کی دیواروں کو منہدم کر کے شاہی محلات کا صفایا بھی شروع کر دیا چنانچہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے آخری دس سالوں میں پانی کے بہاؤ نے بارہ دری کی قدم بوسی بھی شروع کر دی۔ یہ ۱۸۳۰ء سے ۱۸۲۲ء تک کے زمانہ کا ذکر ہے۔ ایک سو سال سے زیادہ عرصہ سے راوی کی بے باک لہریں اور اس کی تباہ کن طغیانیاں باغ کو برباد کرنے کے بعد بارہ دری کو ملیامیٹ کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ لیکن یہ عمارت ایسے پختہ مصالحہ کی بنی ہوئی ہے کہ ان تھپیڑوں کے باوجود اب تک سلامت ہے۔ بارہ دری کی محرابوں کے نیچے مختلف رنگوں کے جو نقش و نگار ہیں اب تک وہ نظر آ رہے ہیں۔ بارہ دری کی تمام عمارت قابلِ دید ہے لکڑی کا کہیں نام بھی نہیں۔

اکثر شوقین ہندو مسلمان اتوار کے دن یہاں سیر و سیاحت کو آتے ہیں۔ کالجوں کے طلبا اپنی اپنی کشتیاں لے کر دریائی سیر کا لطف اٹھاتے ہیں۔ ۱۸۹۴ء کی طغیانی نے دریا نے ایک دیوار گرا دی۔ یہ جگہ اٹھارہ بیس فٹ گہری بتائی جاتی ہے اور ہر سال گرمیوں کے ایام میں جب دریا اپنے پورے زور پر ہوتا ہے اسی جگہ سے کسی نہ کسی لڑکے کی غرقابی کی خبر ملتی ہے۔

اس باغ کی رونق اور بہار جہانگیر کے زمانہ تک پورے عروج پر تھی اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اور اس کے بعد بھی عروجِ مغلیہ کے ایام تک یہ باغ بادشاہوں کے لیے ہی مخصوص تھا چنانچہ جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد جب ۱۰۱۵ھ میں اس کا فرزند خسرو باپ سے باغی ہو کر پنجاب آتا اور اس کے عقب میں خود جہانگیر روانہ ہو کر لاہور پہنچتا ہے تو باغ میرزا کامران ہی میں فروکش ہوتا ہے اور یہیں سر صفر کو خسرو اور اُس کے دو معتمد اعلیٰ حسن بیگ بدخشانی اور عبدالرحیم دیوان۔ چنگیز خانی دستور کے مطابق اُس کے رُوبرو پابہ زنجیر حاضر کیے جاتے ہیں۔

اس باغ نے انہی ایام میں ایک نہایت خوفناک اور لرزہ براندام نظارہ دیکھا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ باغ میرزا کامران کے دروازہ سے لے کر قلعہ کے دروازہ تک دو رویہ پھانسیاں نصب کی جائیں اور خسرو کے تمام ساتھیوں کو جن کی تعداد رچ محمد لطیف نے اپنی تاریخ لاہور میں سات سو تک لکھی ہے۔ ان پھانسیوں پر لٹکا دیا جائے اور خسرو کو ہاتھی پر چڑھا کر ان پھانسیوں کے درمیان گذار کر پوچھا جائے تمہارے خوشامدی اور اہلِ خدمات کس طرح تم کو سلام کیا کرتے تھے[1]

---

[1] تاریخوں میں خسرو کی بغاوت کے عبرتناک انجام کا مفصل ذکر ہے۔

جہانگیر جب لاہور سے کشمیر روانہ ہوتا تھا تو اُس کی پہلی منزل عموماً اسی باغ میں ہوا کرتی تھی۔ دارا شکوہ بھی اپنی کتاب سکینۃ الاولیاء میں باغ میرزا کامران کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ حضرت میاں میر باغ کی اُس عمارت میں جو حوض کے درمیان بنائی گئی تھی، جو اب وہ پانی کے نیچے دب گئی ہے، بعض اوقات چند خاص مریدوں کے ہمراہ اقامت فرمایا کرتے تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس باغ میں پانی کا ایک اتنا بڑا حوض (یا تالاب) بھی تھا جس کے عین درمیان ایک عمارت تھی۔ اور وہ عمارت دارا شکوہ کے زمانہ میں غرقاب ہو چکی تھی۔

بارہ دری کا جو حصہ دریا سے ٹکرا رہا ہے۔ یہ یقیناً باغ کے نصف میں تھا، کیونکہ دوسری طرف بارہ دری سے جو رستہ خشکی کی طرف جاتا ہے۔ اس میں چھوٹی چھوٹی نہروں اور فواروں اور حوضوں کے نشان اور آثار حال ہی میں ظاہر ہوئے ہیں جو شاہدرہ والی سڑک سے جا کر ملتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ مغلوں کی عمارت ہو اور وہ اس بے ترتیبی سے ہو کہ ایک طرف تو حوض اور فوارے اور روشیں ہوں اور دوسرا کنارہ دریا سے ملا ہوا ہو۔ دوسری طرف کے فوارے اور حوض رفتہ رفتہ دریا کی نذر ہو کر نابود ہو گئے ہیں اور انہی میں وہ حوض بھی تھا جس کی اندرونی عمارت کا ذکر دارا شکوہ نے کیا ہے۔ بارہ دری کے اندر اور باہر پختہ فرش ہے۔ بیرونی فرش کی پختگی کے آثار اب تک نظر آ رہے ہیں۔ محکمہ آثار قدیمہ نے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بنا کر گل و گلزار کی کچھ کیفیت پیدا کر دی ہے۔ ایک قدیم آسمانی کنواں بھی موجود ہے جس سے ان چھوٹی چھوٹی کیاریوں کو پانی دیا جاتا ہے۔ کنوئیں سے کچھ آگے ایک مربع حوض کے آثار بھی نکلے ہیں۔ جو ۲۶ فٹ چوڑا اور اسی قدر لمبا ہے اس کی گہرائی یقیناً زیادہ ہوگی لیکن حوض کے اندر جو مٹی اور ملبہ ہے اس پر سے بھی گہرائی دو فٹ سے کم نہیں ہے۔

کشتی سے اُترتے ہی دائیں ہاتھ وہ عمارت آتی ہے جو آج پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے قبضہ میں ہے اس کے سامنے ہی پیپل کے درختوں کے نیچے پانی کے چوبچہ موگہ کے دو نشان ملتے ہیں۔ اس عمارت اور موگہ کے درمیان جو رستہ ہے اس کی دو شاخیں ہو جاتی ہیں، ایک سڑک جس کے دونوں کناروں پر سردار منگل سنگھ سردار فقیر سنگھ گارڈن" آباد ہے اور چند اور کوٹھیاں بھی ہیں شاہدرہ کو چلی جاتی ہے اور دوسری شاخ جس کو قدیم رستہ بتایا جاتا ہے۔ شیخوپورہ اور شرقپور کی طرف نکل جاتی ہے۔ اسی شاخ پر پرمانند سٹریٹ اور بخشی آشرم واقع ہیں۔ [قیام پاکستان کے بعد محلوں کے نام بدل گئے ہیں — مرتب]

بارہ دری کے مختلف حصوں کے آثار شاہدرہ جانے والی سڑک تک ملتے ہیں اور اس کے چاروں طرف کھجوروں کے جھنڈ کے جھنڈ کھڑے ہیں۔ یہ نخلستان ایک صاحب بصیرت "سیلانی" کے دل پر عجیب اثر پیدا کرتا ہے۔

پیر بُرہان

جن بزرگوں کے نہیں حالات کا کوئی پتہ
اُن بزرگانِ سلف میں پیر برہان دیکھئے

پیر برہان صاحب کا مزار بکی دروازہ کے باہر سرکلر روڈ کو عبور کر کے کوٹھی میاں عبدالعزیز بیرسٹر اور طویلہ نذر محمد کے درمیان ایک چھوٹی سی گلی میں واقع ہے۔ جس کا نام میونسپلٹی لاہور نے پیر برہان سٹریٹ عا رکھا ہے۔ یہ گلی پولیس لائن اور نئی میوہ منڈی کے

پاس سے ہوتی ہوئی دو موریا پل کے متصل سیدھی ریلوے سٹیشن کو چلی جاتی ہے۔

پیر برہان کا حال لاہور کی کسی تاریخ میں صحیح طور پر درج نہیں۔ مصنف تحقیقات چشتی نے (ص ۱۹۲ میں) مجاوروں کی زبانی صرف اتنا لکھا ہے کہ "آپ بخارا سے آئے تھے اکبر بادشاہ کے زمانہ میں وفات پا گئے" لیکن وہ مجاور کس قسم کے تھے لکھتے ہیں "مجہول مطلق محض بھنگی چرسی علم سے بے بہرہ" اس لیے وہ اور کچھ نہ بتا سکے۔ یہ آج سے ۸۴-۸۵ سال پیشتر کے مجاوروں کا بیان ہے۔ لیکن آج ۱۹۶۲ء میں پیر برہان کے متعلق ان کے مزار کے خدمت گذار یہ بیان کر رہے ہیں "یہ بخاری سید تھے۔ بی بی پاکدامنان کے زمانہ میں لاہور آئے۔ (بی بی پاک دامنان کے حالات اسی کتاب میں کسی دوسری جگہ درج ہیں) آپ یہاں زندہ سما گئے اور پھر چند سالوں کے بعد چنیوٹ میں جا کر ظاہر ہوئے۔ وہیں وفات پائی ایک قبر آپ کی چنیوٹ میں بھی ہے۔ جس طرح پیر زکی کے "بے جسم سر" کی لڑائی کا واقعہ ہم ظاہر بینوں کے لیے محیّر العقول ہے اور جس طرح بی بی پاک دامنان کے آج سے بارہ سو سال پیشتر کے اس واقعہ تک کہ وہ حادثہ کربلا کے بعد لاہور میں آئیں اور زندہ زمین میں سما گئیں۔ ہم جیسے ناقص الفہوم کا پایۂ یقین رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ اسی طرح پیر برہان کا لاہور میں زندہ سما جانا اور پھر چنیوٹ میں جا کر ظاہر ہونا ہم جیسے کم فہموں کو باور ہونا مشکل ہے۔

تحقیقات چشتی میں ان کے مزار کے متعلق لکھا ہے "سڑک کے کنارے ایک تکیہ ہے جس کے گرد چار دیواری پختہ ہے اس میں دو قبریں ہیں ایک پیر برہان صاحب بخاری کی۔ دوسری نامعلوم الاسم کی اس کے پاس ہی ایک نو گزہ قبر دم شہاب نام کی ہے جو پہلے خندق کے کنارے تھی۔ جب خندق کو باغ بنا دیا گیا۔ تو اس کے استخوان وہاں سے نکال کر یہاں دفن کیے گئے۔ قبر چونکہ طویل ہے اس لیے نو گزہ قبر کے نام سے مشہور ہے۔ پیر برہان صاحب کی قبر پہلے بہت خوبصورت تھی مگر کنور نونہال سنگھ نے مسمار کرا دی تھی اب امام الدین حجام نے از سر نو بنوا دی ہے"

خلیفہ امام الدین، مصنف تحقیقات چشتی کے زمانہ میں یعنی آج سے اسی پچاسی سال پیشتر زندہ تھے۔ اُن کا مکان کی دروازہ کے اندر تھا۔ انہی کی اولاد سے خلیفہ حکیم دین محمد جو لاہور کے مشہور جراح ہیں اور ان کے چچا زاد بھائی خلیفہ جلال دین کو اس مزار کی خدمت وراثتاً ملی ہے۔ چنانچہ قریباً بیس سال ہوئے ان دونوں بھائیوں نے مزار کی پھر مرمت کرائی ہے بارہ دری جو سنگ مرمر کی تھی اور جس کو کنور نونہال سنگھ نے تباہ کیا تھا از سر نو مسقف کی گئی۔ اور بارہ دری کے اندر اور باہر اور احاطہ مزار میں اینٹوں کا پختہ فرش لگایا گیا۔ مزار کی مرمت کے علاوہ اس کی حفاظت اور عرس کے اخراجات بھی انہی کی عقیدت مندیوں کی بدولت پورے ہو رہے ہیں۔

مصنف تحقیقات چشتی کے زمانہ میں چند فقیر لنگوٹ بند یہاں رہتے تھے۔ مزار کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی مسجد بھی ہے قبر کی بیرونی چار دیواری میں برگد (بڑھ) کا ایک قدیم درخت ہے۔ جو احاطہ مزار و مسجد پر سایہ کیے ہوئے ہے۔ مزار کی غربی دیوار کی جالی کے پاس برآمدہ کے نیچے ایک اور بہت پرانی قبر ہے جو پہلے خام تھی اور جس پر چھوٹے چھوٹے روڑے (سنگریزے) پڑے رہتے تھے جن لوگوں کو باری کا بخار ہوتا ہے وہ یہاں سے ان روڑوں کو عقیدتاً لے جایا کرتے ہیں۔

پیر برہان کا سالانہ عرس ماہ اسوج کے پہلے ہفتہ میں ہوتا ہے۔ رات کو چراغاں۔ نعت خوانی اور ختم قرآن شریف

کے علاوہ دن کو قوالی بھی ہوتی ہے۔

خلیفہ دین محمد نے اپنا بیت الجراحت یہیں جاری کر رکھا ہے اور کچھ عرصہ سے یہیں دوسری منزل میں ان کی رہائش ہے۔

ابواسحاق مزنگ

باعثِ برکات ہے روضہ ابواسحاق کا
دیکھ کر اس کو کبھی ! بھر جوشِ ایماں دیکھئے

شیخ ابواسحاق قادری شیخ داؤد کرمانی کے نامور خلفاء میں تھے۔ شیخ داؤد کرمانی شیر گڑھ کے ممتاز بزرگ تھے۔ شاہ ابوالمعالی قادری جن کا عالیشان مزار لاہور میں موجود ہے انہی شیخ داؤد کے برادرزادہ اور خلیفہ تھے۔

شیخ ابواسحاق کا اصل وطن بخارا تھا (تحقیقات چشتی ص ۹۴) سادات بخارا میں آپ کا خاندان ممتاز تھا۔ زمانہ قدیم میں یہ مقام جہاں موضع مزنگ آباد ہے لاہور کا ایک بیرونی محلہ تھا۔ اس محلہ کو پیر عزیز نام ایک مغل نے آباد کیا تھا۔ اسی کے نام پر یہ مقام محلہ پیر عزیز مزنگ کہلاتا تھا[1]

آپ لاہور آ کر اسی جگہ مقیم ہوئے بلکہ اُسی مقام پر جہاں آپ کا مزار بنا ہوا ہے۔ آپ اور شاہ ابوالمعالی پیر بھائی تھے۔ شاہ ابوالمعالی کو جب اُن کے چچا اور مرشد نے لاہور جانے کا حکم دیا تو آپ نے بھی اُس محبت کی بنا پر جو آپ کو شاہ ابوالمعالی کے ساتھ تھی لاہور جانے کی اجازت طلب کی۔ چنانچہ آپ بھی لاہور تشریف لے آئے۔

آپ کو ریاضت و مجاہدت اور صیام دوام و قیام مدام میں یکتا لکھا گیا ہے۔ سید شمس الدین قادری جن سے شاہ بلاول کو خرقہ ارادت و خلافت ملا ہے۔ آپ کے خلیفہ تھے۔

آپ کا قیام اس محلہ میں اتنی مدت تک رہا ہے کہ اس کا نام ہی محلہ شاہ ابواسحاق مزنگ مشہور ہو گیا تھا شاہ بلاول آپ کی خانقاہ کے حجرہ میں چند سال تک مقیم رہے ہیں اور یہیں قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ شاہ بلاول کے ہمسایہ میں ایک شخص کے گھر لڑکا پیدا ہوا۔ پنجاب کی رسم کے مطابق۔ نقال اور بھانڈ آ گئے۔ اور اُس وقت تک واپس نہ گئے جب تک صاحب خانہ سے کچھ لے نہ لیا۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب میں کسی نومولود بچہ کی ولادت پر خسرے اور نقال جو آج بھی آتے رہتے ہیں یہ زمانہ قدیم سے اسی طرح چلے آتے ہیں۔

شاہ ابواسحاق اپنے زمانہ کے بہت بڑے بزرگ تھے۔ جہاں آپ کا قیام تھا وہ جگہ لاہور سے قریباً دو میل کے

---

[1] بستی مزنگ میں محلہ پیر عزیز مزنگ کی موجودگی سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ تمام علاقہ ان کے نام پر مشہور ہوا۔ پیر عزیز مزنگ ۱۰۲۲ھ/۱۶۱۳ء میں فوت ہو کر اپنے آباد کیے ہوئے محلے میں دفن ہوئے مگر شیخ ابواسحاق مزنگ اس سے ۳۸ سال پہلے ۹۸۵ھ/۱۵۷۷ء میں انتقال فرما کر اس بستی میں دفن ہو چکے تھے۔ وہ پیر عزیز سے زیادہ معروف تھے۔ اس لیے یہ علاقہ ان کے نام پر پہلے ہی مزنگ کہلاتا تھا (مرتب)

فاصلہ پر تھی لیکن لوگ کھچے چلے آتے تھے۔ اور آپ کی صحبت اور آپ کی نصایح سے مستفیض ہوا کرتے تھے حدیقۃ الاولیاء میں (ص ۱۲ پر) لکھا ہے۔ صدہا لوگوں نے علوم فقہ و حدیث اور تفسیر کی تعلیم آپ سے حاصل کی۔ آپ بعہد اکبر بادشاہ ۵ محرم ۲۷ ربیع الاول ۹۸۵ھ کو وفات پا گئے۔ صاحب خزینۃ الاصفیا نے آپ کے قطعہ تاریخ وفات میں اپنے ذیل کے اشعار لکھے ہیں ؂

شد ز دار انقضا چو در جنت — شیخ دیں شاہ پیر بو اسحاق
گفت سرور بہ سال تاریخش — شاہ عالی فقیر بو اسحاق

۹۸۵ھ

آپ کا روضہ ایک گنبد کے نیچے ہے جس کا دروازہ جنوب کی طرف ہے۔ قریباً دو فٹ بلند چبوترہ پر آپ کی قبر کا تعویذ ہے۔ یہ چبوترہ اور تعویذ پختہ چونہ گچ ہیں۔ قبر کے سرہانے چراغ دان ہے جو تیل کی کثرت سے بالکل سیاہ اور بدنما ہو چکا ہے گنبد کے اندر چاروں طرف دیوار پر چھت سے سورۃ الملک عربی میں تحریر ہے۔

مولوی نور احمد چشتی تحقیقات چشتی میں (ص ۹۳ پر) لکھتے ہیں :۔

"ایک پنجرہ چوبی چار فٹ اونچا آپ کی قبر کے گرد ہے جس میں ایک چھوٹی سی کھڑکی اندر جانے کے لیے ہے۔ مقبرہ کی چار دیواری پختہ مگر شکستہ ہے۔ دروازہ کے پاس لب زینہ ایک بہت بڑا ون کا درخت ہے محراب متدائرہ غرب رویہ میں دو شعر تحریر ہیں جن میں سے صرف ایک حسب ذیل پڑھا جاتا ہے۔

حضرت شیخ شاہ ابو اسحاق
بود چوں از خدا، خدا بخشش

گوشہ شمال و مغرب میں سنہ ۹۸۵ھ تحریر ہے۔ آپ کے مزار کے دروازہ کے متصل پچاس قبریں اور بھی ہیں"۔

یہ حالات آج سے اسی سال پیشتر تھے۔ آج ۱۹۶۲ء میں نہ ون کا درخت ہے نہ چوبی پنجرہ۔ اور نہ پچاس قبریں۔ بلکہ دروازہ کے متصل صرف تین پختہ قبریں موجود ہیں اور خدا جانے وہ بھی کس طرح سلامت رہ گئی ہیں۔

مسجد سے بالکل ملحق ایک اور چھوٹا گنبد ہے اس کا دروازہ بھی جنوب کی طرف ہے۔ اس کے متعلق صاحب تحقیقات چشتی لکھتے ہیں :۔ اس میں تین قبریں ہیں جو آپ کے تینوں صاحبزادوں کی ہیں جن کے نام یہ ہیں۔ محمد حسین۔ ملک حسین۔ یار حسین۔ دیوار اندرونی مقبرہ پر سورۃ تبارک الذی بہ خط پیچیدہ عربی سفید رنگ سے تحریر ہے اور محراب غرب رویہ میں " اللہ۔ محمد۔ ابوبکر۔ عثمان۔ علی بہ خط پیچیدہ تحریر ہے۔ میانہ سقف مقبرہ میں ایک اور حلقہ مدور ہے جس میں تمام سورہ اخلاص یعنی قل ہو اللہ احد بہ خط ثلث گول دائرہ میں تحریر ہے۔ اس کے گرد چار اور مدور حلقے برنگ نافرمانی ہیں۔ جنوبی حلقہ میں یہ تحریر ہے۔ قال علیہ السلام المومن حی فی الدارین ان چاروں میں اسمائے الٰہی بھی نہایت خوبصورتی سے لکھے ہوئے ہیں۔ پنجرہ شمالی کے اوپر عربی میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم مرحوم سا پڑھا جاتا ہے۔ مشرقی جانب آیت سلام قولا من رب الرحیم تحریر ہے۔ گوشہ شمالی و مشرقی میں یہ تحریر ہے من کان

واعظاً فی الموت کفیٰ" جس مقبرہ کی اندرونی عبارتوں کی مصنف تحقیقات نے ستر اسی سال پیشتر کی یہ حالت لکھی ہے۔ آج وہاں سقف کے مدوّر قل ہو اللہ احد اور تین قبروں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ بیرونی چار دیواری کا کہیں نام تک نہیں آج سے بیس پچیس سال پیشتر ان سترہ قبروں میں سے جن کا حوالہ صاحب تحقیقات چشتی نے دیا ہے۔ پانچ چھ قبریں تو راقم نے خود بھی دیکھی تھیں۔ ان قبروں کے پاس ہی خاں صاحب شیخ عبدالعزیز مرحوم سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ و جنرل سیکرٹری انجمن حمایت اسلام لاہور کا مکان تھا اور آثار بتا رہے تھے کہ اس مکان کے بیرونی صحن کی زینت کے لیے یہ قبریں چند دنوں کی مہمان ہیں۔ چنانچہ آج اُن بوسیدہ قبروں کی ہڈیوں پر جن سے "سادمیاں ہم بھی کبھی تیری طرح انسان تھے" کی دردناک صدا آ رہی ہے ایک معمولی صحن نہیں بلکہ صحن چمن آباد ہے۔

آپ کا مقبرہ کسی بادشاہ نے نہیں بلکہ آپ کے ایک مرید نے جس کا نام عبداللہ بن عبدالقادر بتایا جاتا ہے اور جو لکھنؤ کا ایک بہت بڑا تاجر تھا۔ تعمیر کرایا ہے۔ اسی کی اولاد سے ایک شخص آج سے تقریباً ایک سو اسّی سال اور صاحب تحقیقات چشتی کے زمانہ میں ایک سو سال پیشتر لکھنؤ سے آیا اور اس نے آپ کے مقبرہ کی سفیدی اور مرمت کرائی۔

ہر سال ۵ ماہ محرم کو یہاں عرس ہوتا ہے۔ قرآن خوانی ہوتی ہے۔ قوالی اور ناچ رنگ کی یہاں سخت ممانعت ہے۔ البتہ بھنڈارہ تقسیم ہوتا ہے۔ تحقیقات چشتی میں لکھا ہے کہ ½ ۷ بیگھہ زمین ملحقہ دیوار مقبرہ زیر کاشت ہے جس کی آمدنی مجاور کھاتے ہیں۔ لیکن اس وقت تو یہ مقبرہ اور مسجد اور چھوٹے گنبد کا مقبرہ چاروں طرف آبادی سے گھرے ہوئے ہیں کوئی زمین زیر کاشت نہیں معلوم ہوتی ہے مجاوروں نے اونے پونے کر دی ہے۔

حضرت موج دریا

بحرِ عالم میں مزارِ موجِ دریا دیکھ کر
"کشتیٔ عمرِ رواں" کو غرقِ لرزاں دیکھئے

نام میراں سید محمد شاہ عرف موج دریا والد کا نام سید صفی الدین بن سید نظام الدین جن کا سلسلہ چھٹی پشت میں سید جلال الدین مخدوم جہانیاں تک پہنچتا ہے۔ ان کے آباؤ اجداد کا وطن اُوچ تھا جس کو اُوچ میراں بھی کہتے تھے۔ اُوچ آج کل ریاست بہاولپور میں واقع ہے۔ آپ نے وطن ہی میں علوم دینی و دنیوی حاصل کئے۔ علم کے ساتھ عمل کی نعمت بھی وراثت میں ملی تھی زہد و ورع اور تقویٰ و کرامت میں مشہور اور اپنے والد کی خانقاہ کے سجادہ نشین تھے۔

آپ کے لاہور تشریف لانے اور یہیں بود و باش رکھنے کا واقعہ صاحب تحقیقاتِ چشتی اس طرح لکھتے ہیں:۔

"اکبر کو جب مہم چتوڑ پیش آئی۔ اور امیران شجاع اور بہادران فوج کی جمعیت کے باوجود جب قلعہ فتح نہ ہو سکا۔ تو نجومیوں نے بیان کیا کہ اُوچ میں ایک بزرگ حضرت موج دریا بخاری رہتے ہیں وہ اگر آئیں تو قلعہ انہی کے قدم کی برکت سے فتح ہو گا۔ اکبر نے اپنے معتبر اُوچ میں آپ کے پاس بھیجا۔ اور بادشاہ کا پیغام سنایا۔ آپ نے فرمایا۔ تم سانڈنی لے کر چلو۔ ہم خود ہی چتوڑ پہنچ جائیں گے۔ معتبروں نے عرض کیا۔ ہمیں

کس طرح معلوم ہوگا کہ آپ تشریف لے آئے ہیں۔ آپ نے کہا جس روز تم بادشاہ کے لشکر میں پہنچو گے۔ اس روز بڑی تیز آندھی آئے گی۔ تمام قناتیں گر پڑیں گی خیمے اکھڑ جائیں گے۔ مشعلیں اور چراغ بجھ جائیں گے لیکن صرف ہمارا ڈیرہ ہوگا جہاں چراغ بجھنے نہ پائے گا۔ چنانچہ جب وہ لوگ چتوڑ واپس پہنچے اور بادشاہ کو آپ کا پیغام سنایا۔ تو معاً سر شام سخت اندھیری آئی۔ تمام شامیانے اور خیمے گر پڑے۔ ہوا کے زور سے شمعیں گل ہو گئیں۔ آخر تھوڑے سے وقفہ کے بعد بادشاہ ان کی تلاش کو نکلا تو دور سے ایک چراغ نظر آیا۔ بادشاہ پا برہنہ ان کے پاس پہنچا آپ نے فرمایا جاؤ۔ قلعہ انشاءاللہ تعالیٰ کل فتح ہو جائے گا آپ بھی قلعہ کے پاس گئے اور تین بار زبان مبارک سے بہ آواز بلند "اللہ" کہا۔ چنانچہ دوسرے روز قلعہ فتح ہو گیا۔

اقبال نامہ اکبری میں مہم چتوڑ کے تفصیلی حالات (ص ۲۶۵ سے ۲۶۷ تک) درج ہیں۔ لکھا ہے کہ بادشاہ وسط ربیع الاول ۹۷۵ھ میں چتوڑ کی مہم پر روانہ ہوا۔ پنج شنبہ ۱۷ ربیع الاول ۹۷۵ھ کو اہل قلعہ محاصرہ میں آ گئے۔ اور ۲۵ شعبان کو جے مل کے مارے جانے پر یہ قلعہ فتح ہو گیا۔ اس وقت اکبر کی عمر چھبیس سال کی تھی۔ گویا محاصرہ کی تاریخ سے لے کر فتح کے دن تک اکبر کو اس مہم میں پانچ ماہ اکیس یوم صرف کرنے پڑے۔

لیکن تعجب ہے کہ اقبال نامہ اکبری دربار اکبری اور طبقات اکبری وغیرہ میں کسی جگہ مہم چتوڑ کے ساتھ اس واقعہ کا ذکر نہیں۔ بہرحال ان کے تقدس کی وجہ سے یا اس واقعہ کی بدولت اکبر ان کا بڑا احترام کرتا تھا۔ چتوڑ سے واپس آ کر آپ لاہور میں مقیم ہو گئے۔ تحقیقات چشتی میں لکھا ہے کہ اکبر نے آپ کو نو لاکھ روپیہ کا علاقہ بٹالہ وغیرہ مقامات میں دیا تھا۔ صاحب تحقیقات یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان کی اولاد کے پاس فرمان عطائے جاگیر مہری و دستخطی اکبر بادشاہ موجود ہے۔ حدیقۃ الاولیاء اور تاریخ لاہور میں جاگیر کی رقم ایک لاکھ روپیہ درج ہے۔ بہرحال رقم نو لاکھ تھی یا ایک لاکھ۔ آپ نے اپنی عالیشان حویلی تعمیر کرائی۔ لنگر خانہ ایک بٹالہ میں، ایک بمقام خان فتا[1]، ایک پسیانوالہ اور ایک خاص لاہور میں جاری کیا۔ لاہور میں آپ کا لنگر خانہ آپ کے مزار کے متصل ہی تھا اور آپ کے مکانات بھی اسی نواح میں تھے لیکن اب کسی کا وجود نظر نہیں آتا۔ تحقیقات چشتی میں لکھا ہے کہ بٹالہ میں بھنڈاری اور مودی آپ کے لنگر خانہ کے منتظم تھے۔ اب تک ان کی اولاد انہی ناموں سے مشہور ہے۔

آپ کا مقبرہ آپ کی زندگی ہی میں ایک بلند ٹیلہ پر اکبر بادشاہ کے حکم سے تعمیر ہوا۔ اور آخر آپ اکبر بادشاہ کی وفات سے ایک سال پیشتر ۱۲ ربیع الاول ۱۰۱۳ھ کو بحکم "کل نفس ذائقۃ الموت" انتقال فرما گئے۔ آپ وفات کے وقت موضع خان فتا میں تھے جو بٹالہ سے تین کوس کے فاصلہ پر آپ کی جاگیر میں تھا۔ جس مقام پر آپ کو غسل دیا گیا عقیدتمندوں نے وہاں بھی ایک قبر بنا دی جو آج تک موجود ہے۔ آپ کے فرزند کلاں سید صفی الدین آپ کی نعش لاہور لے آئے۔ اور روضہ عالیہ میں جو بادشاہ کے حکم

---

[1] خان فتا اور پسیانوالہ دونوں آپ کی جاگیر میں تھے اور بٹالہ کے قرب و جوار میں تھے۔

سے پہلے ہی ۱۰۰۰ھ میں تیار ہو چکا تھا دفن کیے گئے۔

آپ کے روضہ کے اوپر بہت بڑا گنبد ہے۔ جو اندر کی طرف سے سیاہ پتھر کی لکیروں سے اب بھی پرانی نقاشی و صنعت کا ثبوت دے رہا ہے۔ شمال کی جانب چراغ دان کے اوپر دیوار میں جالی ہے اس کے علاوہ اور بھی روشن دان ہیں۔ روضہ کے اندر گیارہ قبریں ہیں جو آپ کے فرزندوں اور عزیزوں کی ہیں۔

اسی کے متصل ان کی عالیشان حویلیاں تھیں۔ وسیع لنگر خانہ تھا اور درویشوں اور مسافروں کے رہنے کے لیے قیام گاہیں موجود تھیں لیکن اب یہ وہی عالیشان درگاہ ہے جو چاروں طرف سے پراپرٹی بھارت بلڈنگ (سابق نام کپورتھلہ ہاؤس[1]) اور مہاراجہ پراپرٹی ڈیلنگ اور ایک لمبے چوڑے ورکشاپ کے شکنجہ میں آئی ہوئی ہے اور جس کو اس سڑک پر سے جو فتح چند گرلز کالج (سابق نام کوٹھی سرشاری لال) کو جاتی ہے ایک تنگ سی گلی میں سے رستہ نکلتا ہے۔ یہ روضہ دور سے نظر آتا تھا لیکن ہمارے دیکھتے دیکھتے جدید عمارات نے اس کو پس پردہ کر دیا۔ رائے بہادر کنہیا لال اپنی تاریخ لاہور (۱۸۸۴ء) میں اس روضہ کے اپنے مکانات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں اس مقبرہ کی چار دیواری کے متعلق بہت سی عمارات ہیں چنانچہ مسجد پختہ و مکان سکونت خادمان خانقاہ و چاہ وغیرہ سب پختہ عمارت کے موجود ہیں۔ لیکن آج ساٹھ سال کے بعد کیا حال ہے ؎

دل برباد میں اڑتی ہے اب خاک
یہ بستی غیرت جنت کبھی تھی

روضہ کے باہر مگر چار دیواری کے اندر داخل ہوتے ہی دائیں طرف قریباً بیس بائیس قدیم قبریں ایک بلند چبوترہ پر نظر آتی ہیں۔ اس چبوترہ کے اندر مسجد کے متصل ایک اور چبوترہ ہے ایک قبر اس پر بھی ہے[2]۔ بائیں طرف تین پرانی قبروں سے آگے ون کے ایک درخت کے نیچے روضہ کی سیڑھیوں کے متصل تین نئی قبریں ہیں۔ ان پر الفاظ ذیل درج ہیں۔

"سید انصار علی شاہ (وفات ۲۹ مارچ ۱۹۱۰ء)۔ ان کے والد سید حسین علی شاہ ولد سید محمد شاہ سجادہ نشین موج دریا (وفات ۲۹ اپریل ۱۹۱۸ء) زوجہ سید حسین علی شاہ (وفات ۱۴ مارچ ۱۹۳۲ء)۔ یہ تینوں قبریں حضرت موج دریا کی ذریات ہی سے تعلق رکھتی ہیں"

روضہ بھی ایک چبوترہ پر ہے جس کے اندر اور باہر پختہ فرش ہے۔ دروازہ کی پیشانی پر زرد حروف میں ایک پتھر پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے جو اب تک صاف پڑھی جاتی ہے:-

"روضہ مقدس زبدۃ الواصلین قدوۃ العارفین مقبول بارگاہ باری میران سید محمد شاہ موج دریا بخاری نور اللہ مرقدہ۔ در عہد اکبر بادشاہ تعمیر یافت"

---

[1] اسی باغ اور عمارت کا نام گڑھی باغ تھا۔ جس میں آج کل انکم ٹیکس کا دفتر واقع ہے۔ (مرتب)

[2] تاریخ لاہور میں ص ۲۸۲ پر لکھا ہے کہ یہ قبر جو مقبرہ کی حدود سے باہر ہے سید زندہ علی بن سید عبدالرحیم بن صفی الدین بن میراں محمد شاہ موج دریا کی ہے۔ زندہ علی بھی بڑے خدا پرست بزرگ تھے۔

تاریخ لاہور میں لکھا ہے کہ روضہ کے ہر ایک پہلو پر اشعار لکھے ہوئے ہیں لیکن اب کوئی شعر نظر نہیں آتا۔ ان کے ایک فرزند ان کی دوسری (غیر سیّد) بی بی سے شہاب الدین نہر ابھی تھے جن کا مزار موضع بھوگی وال کے متصل ہے وہ بھی صاحب کرامات بیان کیے جاتے ہیں۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ سالانہ نذر و پیشکش کے علاوہ اس خانقاہ کے اخراجات کے لیے چالیس روپے ماہوار دیا کرتے تھے۔ کہاں ایک لاکھ کی جاگیر کہاں چالیس روپے ماہوار اور کہاں آج کا زمانہ نہ لاکھ نہ چالیس۔ ان کی اولاد کا کچھ حصّہ بٹالہ میں ہے اور کچھ لاہور میں۔

مسلمانوں میں ایک ایسا طبقہ بھی ہے جو عرس کی رسم کو قطعاً ناجائز سمجھتا ہے۔ وہ کسی کی یادگار منانے ہی کے خلاف ہے لیکن ایک ایسا طبقہ بھی ہے جس کی اکثریت ہے اور جو عرس کو بُرا نہیں سمجھتا۔ وہ چاہتا ہے کہ بزرگان سلف کی یادگار قائم رہے اور ان کے حالات جو موجودہ اور آئندہ نسلوں کے دینی و دنیوی فواید کے لیے ہوں بیان کیے جائیں۔ عرس کے ایام میں اگر ان باتوں کی بجائے ڈھول ڈھمکہ۔ ناچ۔ مجرا۔ ہاؤ ہو۔ اور کھیل تماشہ ہو تو یقیناً سب مسلمان اس کے انسداد کے لیے متفق ہیں۔ لیکن ہماری بدنصیبی ہے کہ بزرگوں کے عرسوں میں زیادہ تر انہی باتوں اور انہی مشاغل کی وجہ سے رونق ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت موج دریا بخاری کے عرس پر بھی جو ہر سال ۱۷ ربیع الثانی کو ہوتا ہے، یہی شغل ہوا کرتا تھا جیسا کہ صاحب تحقیقات چشتی (ص ۸۶ پر) لکھتے ہیں "رات کو چراغاں اور جھنڈارہ اور صبح کو مجلس طوائفاں اور سرود قوالاں ہوتا ہے اور تماشائی کثرت سے شب باش ہوتے ہیں"

۱۶ - ۱۷ ربیع الثانی ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۰ - ۱۱ اپریل ۱۹۴۳ء کو بھی آپ کا عرس دھوم دھام سے ہوا۔ ۱۰ اپریل کو نماز مغرب کے بعد درگاہ کو غسل کرایا گیا۔ نعت خوانی ہوئی۔ میلاد شریف بھی ہوا۔ ۱۱ اپریل کو مجلس سماع یعنی قوالی نے سماں باندھا اور لنگر تقسیم ہوا۔ طوائفان لاہور کا ناچ اس لیے نہ ہو سکا کہ پنجاب میں مزاروں اور خانقاہوں پر طوائفوں کے ناچ مجرے کی قانوناً قطعاً ممانعت ہو چکی ہے۔ صاحب مزار یعنی حضرت موج دریا کی زندگی ان کے علم و فضل اور ان کی فیاضی و مسافر نوازی کے متعلق کوئی شخص بھی ایک کلمہ تک نہ کہہ سکا۔ اُس بزرگ کی روح جس کے وجود سے سینکڑوں اور ہزاروں مسلمانوں کو دینی و دنیوی فوائد پہنچے اپنے مزار پہ یہ ہنگامہ آرائی دیکھ کر کیا کہتی ہو گی۔

ع مرے تھے جن کے لیے وہ رہے وضو کرتے

خانِ اعظم

خانِ اعظم میرزا کوکہ کے اُجڑے باغ میں
دفترِ ہستی کے اوراق پریشاں دیکھیے

شمس الدین محمد اتگہ خاں غزنی کا رہنے والا تھا۔ پہلے میرزا کامران کے پاس رہا پھر قنوج کی لڑائی میں جو شیر شاہ اور ہمایوں کے درمیان ہوئی موجود تھا۔ ہمایوں شکست کھا کر دریا کے پار جا رہا تھا اور کنارہ چونکہ بلند تھا اس لیے باہر نکلنے کے لیے پریشان تھا۔ شمس الدین ساحل پر کھڑا تھا۔ اس نے بادشاہ کا ہاتھ پکڑ کر باہر کھینچ لیا بادشاہ نے نام پوچھا تو اس نے اپنا نام و پتہ بتایا۔ قدرت نے

یاوری کی۔ بادشاہ گو پریشان حال تھا لیکن اس نے اس کی بیوی کو اکبر کی اَنا (دایہ) بنا کر بی بی انگہ کا خطاب دیا۔

ہمایوں جب ایران سے واپس آیا تو اس نے اکبر کو حصار کی جاگیر اور شمس الدین کو اَتگہ خاں کا خطاب دے کر اُس کے ہمراہ کیا۔ رفتہ رفتہ اس کو پنجاب کی حکومت ملی۔ جب اس نے جالندھر کے قریب بیرم خان کو شکست دی تو اس کو اعظم خاں کا خطاب ملا۔ یوسف محمد خاں کوکلتاش اور میرزا عزیز کوکہ اس کے دو فرزند تھے۔ میرزا عزیز جس کو باپ کے بعد خان اعظم کا خطاب ملا۔ اکبر کا ہم عمر تھا اور اس کے ساتھ کھیلا تھا۔ اکبر اس کی ماں بی بی بیگم کی اپنی حقیقی ماں سے بھی زیادہ عزت کرتا تھا اسی وجہ سے میرزا ہمیشہ بادشاہ کے ساتھ گستاخیاں کرتا اور وہ ان گستاخیوں کے جواب میں یہی کہتا "میان من وخان اعظم دریائے شیر حائل است" جیسے اور خان اعظم عزیز کے درمیان ایک جوئے شیر بہتی ہے جس کو میں عبور نہیں کر سکتا۔

اکبر کی مذہبی ایجادوں بلکہ بدعتوں کا وہ ہمیشہ مخالف رہا۔ بادشاہ نے ۳۹ھ جلوس میں ایک دفعہ اصرار کے ساتھ بلایا تو جواب میں لکھا۔ عثمان و علی کی جگہ حضور نے فیضی و ابوالفضل کو مقرر کر رکھا ہے۔ باقیوں کے لیے کیا انتظام کیا ہے۔ یہ لکھ کر خود جہاز میں سوار ہو کر حجاز چلا گیا۔ شیخ عبدالقادر بدایونی نے تاریخ کہی ؎

بجائے راستاں شاہ خان اعظم	دے در زعم شاہنشاہ کج رفت
چو پرسیدم بہ دل تاریخ ایں سال	بگفتا میرزا کوکہ بہ حج رفت

میرزا نے حرمین میں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں روپے مستحقین کو دیئے ۱۰۰۳ھ/۱۵۹۴ء میں جب واپس آیا تو بادشاہ نے صوبہ بہار عنایت کیا۔ ۱۰۰۸ھ/۱۵۹۹ء میں جب جی جی بیگم اس کی والدہ کا انتقال ہوا تو بادشاہ نے خود اس کے تابوت کو کندھا دیا اور اظہار ماتم کے طور پر ہندوؤں کی طرح بھدرا کرایا۔ سر اور مونچھوں کے بال منڈائے اور اس کی تقلید میں جی جی انگہ کے فرزندوں کے علاوہ اور بہت سے اُمرا نے داڑھیاں مونچھیں اور سر کے بال منڈائے۔

شاہزادہ سلیم کا فرزند کلاں سلطان خسرو جو راجہ مان سنگھ کی بہن کا بیٹا تھا اس کا داماد تھا۔ دوسرا داماد شاہزادہ مراد اکبر کا بیٹا تھا جو ۳ محرم ۹۷۸ھ/۱۵۷۰ء [?] کو پیدا ہو کر ۲۸ - ۲۹ سال کی عمر میں ۱۰۰۷ھ [?] یا ۱۰۰۸ھ [?] کو دکن میں انتقال کر گیا۔ جہانگیر کبھی اس کی گستاخیوں کی وجہ سے اس پر ناراض ہوتا اور نظربند کر دیتا اور کبھی باپ کی عنایات قدیم کا لحاظ کر کے اس کو رہا کرتا اور پھر اس کا منصب بحال کر دیتا۔ جہانگیر کے جلوس ۱۸ھ [?] میں جب داور بخش فرزند خسرو کو گجرات کی صوبے داری ملی تو میرزا عزیز کوکہ خان اعظم اس کا اتالیق مقرر ہوا۔ اور وہیں احمد آباد میں ۱۰۳۳ھ/۱۶۲۴ء میں انتقال کر گیا۔

اکبر ۹۹۳ھ/۱۵۸۵ء [?] سے ۱۰۰۷ھ/۱۵۹۸ء تک لاہور میں رہا چودہ پندرہ سال کے عرصہ میں اس نے لاہور کا ستارہ عروج و اقبال کے کمال تک پہنچا دیا۔ قلعہ کی شاہی عمارتوں کے علاوہ اس کے امراء وزراء نے کئی عالیشان محل اور باغ لاہور میں تعمیر کرائے۔ انہی میں خان اعظم کا مکان اور باغ بھی تھا۔ مکان تو اب عدم پتہ ہونے کی وجہ سے لامکان ہے۔ داراشکوہ البتہ سکینۃ الاولیا میں لکھتا ہے کہ یہ باغ شیخ جوہر کے باغ اور مقبرہ کے متصل ہے۔ اب نہ شیخ جوہر کا مقبرہ کہیں نظر آتا ہے نہ اُس کا باغ۔

سکینۃ الاولیا میں لکھا ہے خان اعظم کے باغ میں شاہزادہ مراد مرحوم کا جو عالیشان محل ہے وہاں حضرت میاں میر کبھی کبھی دن کے وقت یادِ حق کیا کرتے تھے۔ چونکہ شاہزادہ مراد خان اعظم کا داماد تھا۔ اس لیے اُس نے اسی کے باغ میں محل تعمیر کرا لیا ہوگا

یا خان اعظم کے محل ہی میں رہتا ہوگا۔

خان اعظم کس پایہ کا امیر تھا؛ اکبر اور جہانگیر اس کی گستاخیوں کو نظر انداز کرنے پر مجبور تھے۔ بہت سی مہمات میں شامل رہا۔ دو شاہزادے اس کے داماد تھے۔ ایک کا اتالیق بنا پھر اس کے محل اور باغ کی زیب و زینت کو تصور میں لاؤ کس لاگت کثیر سے یہ بنے ہوں گے۔ آج ان کا کوئی نام بھی نہیں جانتا۔

نہ کوئی رہا ہے نہ کوئی رہے گا　　فقط ایک نام نکوئی رہے گا

قلیچ خاں اندجانی

ایک باغ اندجان پر پڑی تھیں جو نظر فلک ——
بستیاں آباد جو تھیں آج ویراں دیکھئے

قلیچ خاں اندجان کا رہنے والا تھا۔ آگرہ میں آ کر امرائے اکبری میں داخل ہوا۔ مختلف خدمات کے بعد جاگیرات اور مناصب حاصل کیے۔ جب اکبر نے راجہ بھگوان داس اور راجہ ٹوڈرمل کو کشمیر کے انتظام کے لیے آگرہ سے روانہ کیا تو قلیچ خان کو بھی ان کے ساتھ کشمیر جانے کا حکم ہوا لیکن لاہور پہنچا تھا کہ بادشاہ کے دوسرے حکم کے مطابق بعض مہمات ملکی کی انجام دہی کے لیے اُسے لاہور ہی میں قیام کرنا پڑا۔

[illegible] میں شاہزادہ دانیال کو جب الٰہ آباد کی صوبے داری ملی تو قلیچ خاں (کہ شاہزادہ کا خسر بھی تھا) اکبر کے حکم سے اس کا اتالیق مقرر ہوا۔ سال جلوس چہل و ششم ([illegible]) میں بادشاہ نے اُس کو لاہور کی حکومت (صوبیداری) عطا کی۔
جہانگیر کے زمانہ ([illegible] سال دوم جلوس) میں وہ پھر پنجاب آیا جہاں چھٹے سال جلوس تک وہ داد حکمرانی دیتا رہا۔
قلیچ خاں کے متعلق مآثر الامرا جلد سوم میں لکھا ہے کہ صاحب صلاح و تقویٰ تھا اپنے مذہب (تسنن) میں بڑا سخت بلکہ متعصب تھا۔ پنجاب کے لوگ جو ہوتے تھے یا جو طالبان علوم کو درس دیتا تھا۔ اس نے اپنے ذاتی خرچ سے ایک مدرسہ و مسجد بھی جاری کر رکھا تھا جہاں فقہ اور تفسیر و حدیث کی تعلیم ہوتی تھی۔ اس کی کوشش سے پنجاب کے مختلف اقطاع میں علوم شرعیہ کی بہت کچھ اشاعت ہوئی۔ وہ شاعر بھی تھا۔ الفتی اُس کا تخلص تھا۔ یہ رباعی اس سے یادگار ہے۔

عاشق ہمہ دم ہوس وصال در سر دارد　　صوفی زر تقوی زخرقہ در بر دارد
من بیچارہ ازیں کشمکش گرفتار شدم　　دائم دل گرم دیدۂ تر دارد

قلیچ خاں کے بیٹوں میں میرزا سیف اللہ اور میرزا چین قلیچ نہایت بلند مرتبہ اور نامی رئیس گزرے ہیں۔
نواب قلیچ خاں ناظم لاہور کی مدح میں طالب آملی شاعر نے ایک رات میں چوراسی بیت کا قصیدہ لکھا تھا چنانچہ وہ اپنی روانیٔ طبع پر ناز کرتا ہوا لکھتا ہے۔

منم کہ نیست چو من شاعرے بتا اہل سخن　　منم کہ نیست چو من قابلے ز اہل کلام
گواہ این دو سہ معنی بہین قصیدہ متین است　　کہ یافت از سر شب تا سپیدہ دم اتمام

پڑھو اور غور کرو۔ کہ ایسے جلیل القدر امیر اور حاکم ملک نے کس شان و شکوہ سے اپنے باغ کی تعمیر میں کس شوق و دلبستگی کا اظہار کیا ہوگا اور وہ باغ کس اعلیٰ پیمانہ پر ہوگا؛

لیکن آج حالت یہ ہے کہ لاہور کے لوگ باغ تو کجا اس کے بانی کے نام سے بھی ناواقف ہیں۔ اور بانی بھی وہ جو برسوں تک ان کا جلیل القدر حاکم رہا ہے۔ دارا شکوہ نے سکینۃ الاولیا میں صرف اتنا بتایا ہے کہ میرزا کامران نے اپنے باغ کے لیے جو نہر بنائی ہے قلیچ خاں اندجانی کا باغ اُس کے جنوب میں واقع ہے۔ اُس باغ کے اندر جو عمارت ہے اور جو آج کل خستہ حالت میں ہے حضرت میاں میر ان کو کبھی کبھی یاد الٰہی میں مشغول رہتے ہیں۔

جہانگیر کے زمانہ میں گو اس کے فرزند اعلیٰ مراتب پر ممتاز تھے لیکن دارا شکوہ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ قلیچ خاں کی وفات سے پچیس سال کے اندر ہی اس کے باغ اور اس کی اندرونی عمارات کی حالت خستہ ہو گئی تھی۔ اور اگر وہ اسی طرح کسمپرسی کی حالت میں رہا ہوگا تو دورِ عالمگیری تک وہ خاک میں مل چکا ہوگا۔

راجُو باغ

دیکھئے اندازہ جو یہ اسپنے گلزار راج
جب کہیں گلزار کوئی گل بداماں دیکھئے

جہانگیر صفر ۱۰۱۵ھ کے واقعات کا ذکر کرتا ہوا تزک میں لکھتا ہے۔

”خسرو (اس کا باغی فرزند) جب لاہور میں تھا۔ تو راجو اور راجنہ نے شہر میں بہت لوٹ مچائی تھی۔ راجو کو میں نے سولی پر چڑھایا اور راجنہ سے ایک لاکھ پندرہ ہزار روپیہ جرمانہ وصول کر کے شہر کے غربا اور ستم زدہ لوگوں میں تقسیم کیا۔“

جہانگیر کے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ راجو نے جس کا نام شاید راج محمد ہو۔ یہ باغ اکبر کے عہد میں تعمیر کیا تھا اور یہ دونوں شخص جو لاہور کے امرا میں تھے۔ خسرو کے طرف دار تھے۔ راجو سادات بارہ میں سے تھا۔ اکبر کے عہد میں ہزاری یا نصدی کا منصب دار تھا۔

دارا شکوہ سکینۃ الاولیا میں لکھتا ہے راجو کا باغ دولت آباد اور اچھرہ کے متصل ہے۔ اچھرہ تو موجود ہے جس کو لاہور قدیم بھی کہتے ہیں دولت آباد کا پتہ نہیں۔ شاید دولت خاں لودھی ناظم لاہور کے نام پر کوئی محلہ یا کوئی گاؤں لودھیوں کی حکومت کے زمانہ میں آباد ہوا ہو۔

ملک علی کوتوال

؎ حسرتِ گشتہ کا نظارہ اگر منظور ہو — کوتوالِ اکبری کا باغ ویراں دیکھئے

اکبر کے زمانہ میں ملک علی کے نام سے لاہور کا ایک زبردست کوتوال گذرا ہے۔ دارا شکوہ نے اس کے باغ کا ذکر کیا ہے

لیکن اس کا جائے وقوع نہیں بتایا نہ آج کوئی اس کا اور اس کے باغ کا نام جانتا ہے۔

تحقیقات چشتی نے ملک علی کوتوال کا کچھ ذکر کیا ہے۔ خطہ میانی کے گورکن کسی اور طریقہ سے بیان کرتے ہیں اور مصنف حقیقت الفقرا[1] (سید پیر محمد) کسی اور طرح بیان کرتا ہے۔ لیکن سب نے یہی لکھا ہے کہ وہ مادھو لال حسین کے زمانہ میں لاہور کے کوتوال تھے انھوں نے مادھو لال حسین (جن کا اصلی نام شیخ حسین تھا) کے ساتھ کچھ سختی کی تھی۔ اور انہی کی بددعا نے ان کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ آخر اکبر کے حکم سے ملک علی کوتوال قتل کیا گیا مگر جس طریقہ سے وہ قتل کیا گیا۔ ناقابل تسلیم ہے اور غالباً اسی لیے رائے کنہیا لال نے تاریخ لاہور میں اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا۔

ملک علی کوتوال اور اس کی بیوی اور اس کے رشتہ داروں کی قبریں خطہ میانی صاحب میں موجود ہیں۔ ان کی قبروں کے ساتھ دو مسجدیں بھی ہیں ایک زنانہ قبور کے ساتھ، ایک مردانہ کے ساتھ۔

باغ ویران اور ناپید ہے۔ مقبرہ موجود مگر کسمپرسی کی حالت میں۔

میرزا مومن

باغ مومن۔ بادشاہوں کا رہا جس میں قیام
اب وہی نابود برباد اور ویران دیکھئے

داراشکوہ سکینۃ الاولیا میں لکھتا ہے کہ حضرت میاں میر باغ مومن میں بھی کبھی کبھی اپنے یاروں کے ہمراہ دن کا کچھ حصہ گزارا کرتے تھے۔ خان بہادر سید محمد لطیف نے ہسٹری آف لاہور میں تزک جہانگیری کے حوالہ سے مومن کو میرزا مومن عشق باز لکھا ہے۔

اکبر کے زمانہ میں چند عشق باز گذرے ہیں جن کا ذکر اقبال نامہ اکبری میں درج ہے۔ میرزا مومن کا نام اُن میں نظر سے نہیں گذرا۔ بہرحال جہانگیر نے تزک میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ سکندر خان ہراول کی جاگیر اس کے مرنے کے بعد اراتِ خان کو دی گئی۔ جاگیر کے پاس ہی ایک شاندار شکارگاہ بنوائی گئی۔ جو بادشاہوں کے شایان شان تھی۔ جہانگیر لکھتا ہے۔

"ہم یہاں ہر جمعہ اور ہفتہ کو دو دن قیام کرتے اور مختلف شکاروں سے محظوظ ہوا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں قاسم خاں لاہور کا گورنر تھا اور وہ پچاس سنہری اشرفی نذر دیا کرتا تھا۔ ایک تختہ گھاس کے فاصلہ پر برلب دریائے راوی مومن عشق باز کا باغ ہے۔ اس باغ میں قسم قسم کے عمدہ عمدہ پودے اور طویل اور دلکش سرو کے درخت ہیں جو آم کے پودوں سے جو ابھی بار آور نہیں ہیں گھِرے ہوئے ہیں۔"

اس خوبصورت باغ میں بادشاہ نے اپنے شاہی خیمے لگا دیئے۔ چند روز کے قیام کے بعد محرم ۱۰۳۱ھ/۱۶۲۱ء میں اناررنامی ہاتھی

---

[1] سال تصنیف ۱۱۸۲ھ فارسی نظم! اس کتاب میں حضرت مادھو لال حسین اور ان کی کرامتوں کا ذکر ہے۔ مولوی نور احمد چشتی مصنف تحقیقات چشتی کی نظر سے یہ کتاب گذر چکی ہے۔ اب ناپید ہے۔

پر سوار ہو کر بادشاہ نے باغ مومن کو الوداع کہا اور بطور تصدق ہاتھی پر سے دولت بکھیرتے ہوئے طلوع آفتاب سے دو گھنٹے کے بعد شہر (لاہور) میں داخل ہوئے۔

بادشاہ کی عظیم الشان شکار گاہ شیخو پورہ کے متصل دریا کے پار تھی۔ اس شکار گاہ کے آثار اب بھی موجود ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا مومن کا باغ جس کی تعریف میں بادشاہ خود رطب اللسان ہے شاہدرہ اور شکار گاہ کے درمیان ہی تھا۔ آج اس باغ کا کوئی نام بھی نہیں جانتا نہ اس کا کوئی نشان باقی ہے۔

زین خاں کوکلتاش

زین خاں بھی مٹ گیا اور زین خاں کا باغ بھی
جس سے تھی لاہور کی زینت وہ ویراں دیکھئے

زین خاں کی ماں جیجی بان اکبر کی ایک انگہ تھی اس کے باپ کا نام خواجہ مقصود علی ہروی تھا جو صدق و دیانت کے ساتھ متصف تھا۔ وہ مریم مکانی (اکبر کی والدہ) کے معتبر و متدین ملازموں میں تھا۔ شاہزادہ سلیم (جہانگیر) خواجہ مقصود علی کے بھائی خواجہ حسن ہروی کا داماد تھا۔ سلطان پرویز اسی بیگم کے بطن سے ۹۹۸ھ (۱۵۸۹ء) میں پیدا ہوا تھا۔

زین خاں کوکہ کو اکبر نے سال ۳۱ جلوس کے آغاز میں پنج ہزاری منصب عطا کر کے کابل کی حکومت سپرد کی۔ مہمات یوسف زئی اور سوات و باجوڑ میں اس نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ جلالہ روشنائی (کابل) اور زابلستانی شورش کو فرو کرنے کے بعد اس کو لاہور کی حکومت پر تعینات کیا گیا۔

بادشاہ کے اکتالیسویں سال جلوس میں شاہزادہ سلطان سلیم (جہانگیر) جو زین خاں کے چچا خواجہ حسن کا داماد تھا۔ زین خاں کی بیٹی پر جو خوبصورتی میں شہرہ وافر رکھتی تھی عاشق ہو گیا۔ یہاں تک کہ صبر و قرار ہاتھ سے جاتا رہا۔ اکبر نے پہلے تو اس کو براہ راست منع کیا۔ پھر اوروں کے ذریعہ سمجھایا لیکن یہ مرض بڑھتا ہی گیا۔ آخر بادشاہ نے مجبور ہو کر سنہ ۱۰۰۵ھ (۱۵۹۶ء) میں حسب ازدواج منظور کیا۔ زین خاں کی ایک بیٹی میرزا انور خلف خان اعظم میرزا عزیز کوکلتاش کے بیٹے سے بیاہی گئی جو عہد جہانگیری میں دو ہزار کا منصب دار تھا۔

زین خاں کو راگ کا بڑا شوق تھا۔ اس نے کئی ساز خود ایجاد کئے۔ شاعر بھی تھا۔ شعر خوب کہتا تھا۔ یہ شعر اسی کا ہے:

آں رستم نمی دہد این چرخ کج خرام
تا رشتۂ مراد بہ سوزن در آورم

اس نے ایک مرتبہ لاہور میں اپنے مکان پر بادشاہ کی دعوت کی وہ برسوں تک لاہور میں کیا سارے ہندوستان میں یادگار رہی۔ اس نے آبنوس کی شاخوں کا جو اس زمانہ میں بہت کمیاب تھیں پچیس گز طول و عرض کا ایک چبوترہ بنایا۔ تین حوض بنائے ایک کو گلاب سے بھرا ایک کو زعفران کے رنگ سے ایک کو ارگجے کے عرق سے۔ ایک ہزار طوائف کو مدعو کیا اور ان سب کو ان حوضوں میں نہلایا۔ شیر و شکر کی ندیاں بہا دیں۔ حویلی کے وسیع صحن میں پانی کی بجائے گلاب کا چھڑکاؤ کرایا۔ پیش کش میں جواہر و مرصع

آلات اور ہاتھی دیئے۔ اس زمانہ میں قلیج خاں گھوڑوں کی کثرت سعید خاں خوبصورت خواجہ سراؤں کی افراط اور زین خاں ہاتھیوں کی بہتات کے لیے مشہور تھے۔

لاہور میں اس نے عالیشان مکانات تعمیر کرائے۔ اس کے اصطبل میں گھوڑوں اور ہاتھیوں کی کمی نہ تھی۔ اس کی حویلیاں اور املاک موچی دروازہ کے باہر جنوب کی طرف جہاں آج حضرت شاہ ابوالمعالی کا مزار اور قلعہ گوجر سنگھ کا جنوبی حصہ آباد ہے تھیں۔ اکبر کے زمانہ میں اس محلہ کا نام محلہ زین خاں تھا۔ زین خان نے اس علاقہ میں ایک باغ بھی تعمیر کرایا تھا جس میں ساون بھادوں کا نظارہ قابل دید تھا۔ چونکہ شاہجہان نے شالامار باغ اس کے کئی سال کے بعد لاہور میں تعمیر کرایا اس لیے گمان غالب ہے کہ باغ زین خاں کے ساون بھادوں کی نقل شالامار باغ کے ساون بھادوں میں کی گئی ہے۔ فوارے اور روشیں اور عراقیں باغ کی رونق و زینت کا باعث تھیں۔ ساون بھادوں سے شمال اور مغرب کی طرف ایک منزل کی اونچائی پر فواروں کا فیضان عام جاری تھا۔ اس باغ میں کئی حجرے کئی دالان اور کئی قالبوتی برآمدے منقش و مزین تھے۔ باغ کی چار دیواری کے دروازے کے متعلق مصنف تحقیقات چشتی لکھتے ہیں "ایک شخص چوہدری رکنا مجھ سے بیان کرتا ہے کہ وہ دروازہ میں نے دیکھا ہے پچیس تیس سال سے مسمار ہو گیا ہے۔ بہ الفاظ دیگر وہ دروازہ آج (۱۲۶۲ھ ۱۹۶۲ء) سے قریباً سوا سو سال پیشتر موجود تھا۔

باغ کی آبیاری اور ساون بھادوں اور ان کے تالاب کی رونق کے لیے بڑے بڑے کنوئیں موجود تھے۔

کئی لوگ احمد شاہ ابدالی اور اس کے بعد کی بدامنی کے ایام میں فصیل شہر کے اندر جا کر آباد ہو گئے تھے لیکن اس پر بھی محلہ خوب آباد تھا۔ سب سے پہلے اس پر جے سنگھ کا ہنیہ[1] نے دست تعدی دراز کرنا شروع کیا۔ اس زمانہ (۱۷۶۰ء تا ۱۷۷۰ء یا مابعد) میں زین خاں کا پوتا نور الدین خاں موجود تھا۔ ہر چند وہ نادر شاہی حملوں اور احمد شاہ ابدالی کی متواتر یورشوں اور سکھوں کی شورشوں میں بہت کچھ لٹ چکا تھا تاہم وہ زین خان کا پوتا تھا اس کی ساکھ ابھی قائم تھی اس نے جے سنگھ کنہیا کو دس ہزار روپیہ نقد جرمانہ دے کر اپنے محلہ والوں کو اس کے ظلم سے بچایا اور یہ تحریر لکھوائی کہ آئندہ کوئی سکھ اس محلہ پر دست درازی نہ کر سکے گا۔ لیکن منہ کو لہو لگ چکا تھا اور اس زر جرمانہ کی شہرت ہو چکی تھی۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد بھنگی مثل کے سردار جگت سنگھ نے اس محلہ پر دھاوا بول دیا۔ نور الدین خاں نے جے سنگھ کنہیہ کی سند دکھائی لیکن کچھ اثر نہ ہوا۔ آخر محلہ والوں نے بھی ہاتھ پاؤں ہلائے باقاعدہ جنگ ہوئی۔ لیکن پیش نہ گئی لوگ مکانات خالی کر کے ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ کچھ لوگ شہر میں آ گئے۔ کئی باہر دیہات میں چلے گئے۔ محلہ اجاڑ اور برباد ہو گیا۔ بعد میں لوگ لاوارث سمجھ کر اینٹوں تک اکھاڑ کر لے گئے۔

اس بربادی کی وجہ سے محلہ زین خاں کا نام مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ابتدائی حکومت میں بلکہ اس سے قبل ہی میدان زین خاں مشہور ہو گیا۔ مہاراجہ کے زمانہ میں حویلی زین خان کی کچھ دیواریں۔ پختہ حمام اور تہ خانہ موجود تھا۔ مگر اسی کے زمانہ میں یہ بھی نیست و نابود ہو گئے۔

---

[1] سکھوں کی بارہ مثلوں میں یہ ساتویں تھی۔ جے سنگھ اس مثل کا بانی تھا چونکہ وہ موضع کاہنا متصل لاہور کا رہنے والا تھا اس لیے یہ مثل کاہنیہ یا کنہیہ کے نام پر مشہور ہوئی باہمی تقسیم کے بعد اس کو امرتسر اور پہاڑوں کا درمیانی قطعہ لوٹ مار کے لیے ملا۔

زین خان کے پوتے نورالدین خان کے باپ کا نام مصنف تحقیقات چشتی نے نہیں لکھا۔ نہ نورالدین خاں کا انجام بتایا ہے البتہ زین خاں کے بڑے بھائی سیف خاں کوکہ کے متعلق اقبال نامہ اکبری میں درج ہے کہ وہ چار ہزاری منصب پر سرفراز تھا۔ احمد آباد کی لڑائی میں بادشاہ پر جان نثار کر گیا۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ شیر افگن خاں و امان اللہ خاں بادشاہ نے دونوں کو اعلیٰ منصب دیئے۔

زین خاں کارفرما بھی تھا۔ کارکن بھی تھا مگر شراب کثرت سے پیتا تھا۔ [illegible] میں آگرہ میں تھا کہ پیمانۂ زندگی وہیں لبریز ہو گیا۔

جب زین خان کا باغ اور اس کے مکانات تباہ و منہدم ہو کر میدان زین خاں بن گئے۔ تو اس وسیع میدان میں لوگوں نے کاشت کاری بھی شروع کر دی چنانچہ [illegible] تک بھی (بزمانہ رائے کنہیا لال مصنف تاریخ لاہور) اس میں کچھ زمین مزروعہ تھی اور کچھ زمین پر قبریں بننا شروع ہو گئی تھیں۔

شاہ بلاول

رنگ لائی داغہائے اشکِ پُرخوں کی بہار
کھینچ گئی دامن پہ تصویرِ گلستاں دیکھئے

شاہ بلاول قادریہ سلسلہ کے ایک بزرگ تھے۔ ان کے والد کا نام سید عثمان اور دادا کا نام سید عیسیٰ تھا۔ سید عیسیٰ ہمایوں بادشاہ کے ساتھ ہرات سے ہندوستان آئے۔ بادشاہ نے وہ علاقہ جاگیر میں دیا جہاں آج قلعہ شیخوپورہ مع ملحقات آباد ہے۔ شاہ بلاول یہیں پیدا ہوئے اور اکبر کے زمانہ میں لاہور آ گئے۔ یہاں آ کر آپ نے مولوی ابوالفتح[1] سے علوم ظاہری اور شیخ شمس الدین قادری[2] (وفات [illegible]) سے علوم باطنی حاصل کئے۔ بعمر ستر سال [illegible][3] میں بعہد شاہجہان انتقال کر گئے۔

موضع بھوگیوال کے متصل دریا کے کنارے دفن ہوئے۔ عالیشان گنبد ان کے مزار پر بنایا گیا۔ باغ بھی مزار کے ساتھ ہی تعمیر ہوا۔

مہاراجہ رنجیت کے عہد میں دریا نے رُخ بدل کر مقبرہ کی ایک دیوار گرا دی۔ مہاراجہ کے حکم سے فقیر نورالدین نے ان کی لاش جو صندوق میں تھی قبر سے نکلوا کر راجہ دینا ناتھ کے باغ کے متصل دفن کرا دی۔ لکھا ہے کہ جس دن ان کا تابوت قبر سے نکالا گیا۔ ہزارہا مسلمان زیارت کو گئے۔ دو سو سال کے بعد بھی نعش بدستور ویسی کی ویسی تھی۔ دوبارہ نماز جنازہ پڑھی گئی[4]۔

---

[1] صاحب خزینۃ الاصفیا نے جلد اول میں صفحہ ۱۶۱ پر مولوی ابوالفتح کا نام مولوی فتح محمد لکھا ہے۔

[2] مرید حضرت شاہ ابو اسحاق جن کا مزار مزنگ میں مرجع خلایق ہے۔ [3] وقت عشا شب دوشنبہ ۲۸ شعبان

[4] صاحب خزینۃ الاصفیا نے جلد اول کے صفحہ ۱۶۳ میں ان کی قبر کے متعلق یہ عجیب واقعہ لکھا ہے کہ ان کا مقبرہ زمانہ سابق میں دریائے راوی کے کنارے تھا جب [illegible] میں دریا کا رُخ مقبرہ کی طرف ہو گیا تو مزار کے انہدام کے خوف سے صندوق نعش کا نکال کر دوسری جگہ دفن کیا۔ اور اب ان کا مزار پُرانوار بیرون دہلی دروازہ واقع ہے لیکن دہلی دروازہ کے باہر نزدیک تر شاہ بلاول کا کوئی مزار نہیں ہے۔ راجہ دینا ناتھ کا باغ بھی چونکہ دہلی دروازہ کے باہر ہی کافی فاصلہ پر ہے اور شاہ بلاول کا مزار جدید بھی چونکہ دینا ناتھ کے متصل ہی ہے۔ غالباً اس لحاظ سے اس کو بیرون دہلی دروازہ لکھا ہو گا۔

یہ وہی باغ ہے جہاں ۵ ستمبر ۱۸۴۳ء کو مہاراجہ شیر سنگھ اور اُس کا بارہ سالہ خوبصورت فرزند (پرتاب سنگھ) بے رحم سندھانوالیوں کے خونیں ہاتھوں سے تہ تیغ ہوئے۔

شاہ بلاول کے دوبارہ دفن کئے جانے کے قریباً نصف صدی بعد کا مصنف رائے بہادر کنہیا لال ۱۸۸۴ء میں مزار شاہ بلاول کے متعلق لکھتا ہے۔

"چار دیواری[1] پختہ ہے مکان کا دروازہ شالامار باغ کے پرانے رستہ میں جنوب کی طرف ہے۔ اس کے اندر وسیع میدان ہے اور یہ سب زمین خانقاہ کے متعلق ہے اس کے وسط میں ایک اور چار دیواری ہے جس کا دروازہ جنوب کی طرف ہے اندر پختہ فرش ہے۔ اس میں مزار اور مزار کا تعویذ بھی پختہ ہے۔ لیکن عدم مرمت اور عدم خبر گیری کے باعث دیواریں گر گئیں اور چار دیواری کے اندر مکانات خستہ و شکستہ ہو رہے ہیں۔"

یہ بھی لکھا ہے کہ ہر سال ۲۸ شعبان کو یہاں میلہ ہوتا ہے اور رات کو لاہور کے ہندو مسلمان بکثرت آتے اور اکثر آتش بازی چھوڑا کرتے تھے۔

اللہ اکبر! کیا زمانہ تھا اور کیسے لوگ تھے۔ مسلمان بزرگ کی لاش کو دریا برد ہونے سے بچانے کے لیے اس کی قبر ایک سکھ بادشاہ کسی اور جگہ نئے سرے سے تعمیر کراتا اور وہیں اس کو دفن کراتا ہے اور اُس قبر اور احاطہ قبر کی چار دیواری ایک ہندو رئیس اپنی گرہ سے تعمیر کرتا ہے اور پھر اُس کے عرس پر ہندو مسلمان اور سکھ سب جمع ہوتے ہیں۔ ع

خواب و خیال ہو گئیں اگلی حکائتیں

محبوب الواصلین کے حوالہ سے مصنف تحقیقات چشتی نے ان کی بہت سی کرامتیں لکھی ہیں۔ شاہجہان۔ آصف جاہ۔ دارا شکوہ اور اکثر امرا ان کی خدمت میں آیا کرتے تھے۔ اسی زمانہ میں حضرت میاں میر بھی لاہور میں تھے۔ دونوں بزرگوں کا ایک دلچسپ واقعہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

ایک مرتبہ بادشاہ نے حضرت میاں میر کی خدمت میں نقد نیاز پیش کی انھوں نے انکار کیا۔ پھر بادشاہ شاہ بلاول کے پاس گئے۔ انھوں نے روپیہ لے لیا۔ اور خادم مطبخ سے کہا اللہ تعالےٰ روزی رساں ہے اس سے کچھ دن لنگر خانہ کا کام چلتا رہے گا۔ بادشاہ نے کہا حضرت میاں میر نے میری پیش کش قبول نہ کی اور آپ نے قبول کر لی اس کا کیا باعث ہے آپ نے فرمایا حضرت میاں میر کی صفات ہیں ان کی توجہ حکام دنیا کی طرف نہیں ہے۔ ہمارے ہاں درویش اور مسافر آرام پاتے ہیں اور لنگر خانہ میں جو موجود ہو وہ ان کو کھانے کو ملتا ہے اس لیے ہمیں روپیہ کی بھی ضرورت رہتی ہے۔ بادشاہ پھر حضرت میاں میر کے پاس گئے۔ ان سے بھی عرض کیا آپ نے میری پیش کش قبول نہ فرمائی اور حضرت شاہ بلاول نے قبول فرمائی۔ حضرت میاں میر

---

[1] چار دیواری اُس مزار کی راجہ دینا ناتھ نے تعمیر کرائی تھی (تحقیقات چشتی صفحہ ۱۶۲)

نے فرمایا وہ بزرگ ولی کامل اور دریا کی مانند ہیں۔ میں ان کے سامنے ایک معمولی تالاب ہوں۔ دریا میں اگر کوئی پلید چیز پڑ جائے تو وہ پلید نہیں ہوتا لیکن تالاب پلید ہو جاتا ہے۔

بادشاہ یہ سن کر جب قلعہ میں گیا تو سجدات شکر بجا لایا اور کہا الحمد للہ کہ میرے زمانہ میں ایسے ایسے بزرگ بھی موجود ہیں۔

لیکن تاریخ ہندوستان جلد ہفتم ظفر نامہ شاہجہان میں مولانا ذکاء اللہ دہلوی سنہ ۱۰۴۲ھ کے واقعات جلوس ششم میں لکھتے ہیں :۔

"شاہجہان جب سے بادشاہ ہوا تھا نہ لاہور گیا تھا نہ کشمیر۔ وہ ۲۰ شعبان سنہ ۱۰۴۳ھ کو اکبر آباد سے پنجاب روانہ ہوا۔ ۲۳ کو دہلی ۱۶ رمضان کو اس کے بعد ۱۰ شوال کو لاہور داخل ہوا۔ ملکی نظم و نسق کے بعد وہ میاں محمد میر کی ملاقات کو گیا۔ ان کے کمال صوری و معنوی مقبول خلائق تھے۔ اُن کی خانقاہ کے خدام کو دو ہزار روپیہ دیا اور حضرت میاں میر کو ایک تسبیح اور ایک دستار سفید پیش کی۔"

دارا شکوہ نے سفینۃ الاولیا میں ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "ایں فقیر یک مرتبہ بخدمت ایشاں رسیدہ آثار ریاضت و مجاہدت بسیار از بشرۂ شیخ ظاہر شد"

حضرت شاہ بلاول کا لنگر بڑا وسیع تھا یہاں تک کہ ایک داروغہ مطبخ موجود تھا لیکن وہ خود نان جویں اور ساگ چولائی کے چند نوالوں کے سوا کچھ نہ کھاتے تھے۔ بڑے عبادت گزار تھے۔ حاجت مندوں کی سفارشیں امراء وزراء بلکہ بادشاہ تک کرتے تھے اور لوح سفارش نامہ پر اللہ بس باقی ہوس تحریر فرمایا کرتے تھے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے باغ شاہ بلاول میں بارہا مختصر سے دربار اور جشن کیے ہیں ان کا مفصل ذکر عمدۃ التواریخ کے مختلف دفتروں میں درج ہے۔ دفتر سوم حصہ اول میں لکھتے ہیں :۔

"در عین بارش باراں سرکار والا اقتدار صبح در شاہ بلاول تشریف شریف آوردند و در تمام گھوڑا چڑھ بلائے (سواراں) خاص ارشاد شد کہ ملبس بہ لباس بسنتی از قسم کم خواب وغیرہ بیروں و اندروں قلعہ مبارک بہر دو طرف ایستادہ صف بستہ ایستادہ شوند...... باز سرکار از باغ شاہ بلاول مراجعت ساختہ......" (ص ۹۱)

پھر اسی دفتر کے حصہ دوم (ص ۱۲۴) میں جشن ہولی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"تاکید بہ فراشاں جہت انتصاب خیام فرحت انجام در باغ شاہ بلاول و زیبائش فرش، فروش جلوہ صدور بخشید۔ طوائف رقاصہ ملبس بہ لباس شایاں حاضر و بہرہ یاب شدند"

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ایک ارشاد (مندرجہ عمدۃ التواریخ دفتر دوم ص ۳۴۹) سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو باغ

شالامار کی طرح اس باغ کی آرائش و زیبائش کا خاص خیال تھا۔ جیسا کہ الفاظ ذیل سے معلوم ہوگا۔

"باغبانان شاہ بلاول و شالا باغ را ایماے گزیدہ کہ با غات صدر را بہ خوب ترین آئین مصفا
و پاکیزہ باید ساخت۔ و سرکار دولتمدار بتاریخ نوزدہم ماہ مذکور باز بموضع تزگرہ انتہاض رایات
عالیات ساختہ وارد باغ شاہ بلاول وا نان جا در شالہ باغ رونق بخش شدند"

باغ و مزار شاہ بلاول کے پاس ہی شکار گاہ بھی تھی۔ مہاراجہ اکثر شکار کھیلنے کے لیے آتے اور یہیں آرام فرمایا کرتے تھے۔
شاہ بلاول کا مزار اب دو جگہ ہے ایک تو گھوڑے شاہ اور باغ راجہ دینا ناتھ کے پاس۔ جو بعد میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے
حکم سے تعمیر ہوا۔ اور ایک وہاں ہے جہاں مہاراجہ شیر سنگھ کی قتل گاہ ہے یہیں دراصل پہلا مزار تھا۔ اب وہاں ایک چھوٹی سی قبر نشان کے
طور پر موجود ہے جو شیشم کے دو درختوں کے درمیان چھپی ہوئی ہے۔

میرزا نظام الدین احمد

جس کے اک اک برگ پر تھی داستانِ رنگ و بُو
بے نشاں وہ آج سب حسنِ گلستاں دیکھیے

ان کے باپ کا نام محمد مقیم تھا۔ ہروی کہلاتے تھے۔ طبقات اکبری جیسی عظیم کتاب کے مصنف تھے۔ یہ جامع تاریخ
فارسی زبان میں آپ نے ۱۰۰۲ھ (۱۵۹۳ء) میں مکمل کی۔ یہ تاریخ عہد اکبری کی ایک مشہور تاریخ ہے۔ بادشاہ اس قسم کے جواہر گرانمایہ کو جب
صحرائے ظہور و شہرت میں نشو و نما کے قابل پاتا تو مرحمت و اعتماد کے چھینٹوں سے ان نونہالوں کی آبیاری کرتا۔

لاہور میں اکثر قیام رہتا تھا یہیں مکان تھا اور یہیں ایک باغ بھی لگوایا تھا جہاں اپنے احباب کے ساتھ بہار و خزاں
کے مدّ و جزر دیکھا کرتے تھے۔

معلوم ہوتا ہے ان کی خدمات کا تعلق فوج کے ساتھ بھی تھا۔ چنانچہ ان کی وفات کی کیفیت میں دربار اکبری اور تاریخ ہند
مولوی ذکاء اللہ میں لکھا ہے کہ ۱۰۰۳ھ (۱۵۹۴ء) کے صفر کے مہینہ میں بیمار ہو کر لشکر سے واپس آ رہے تھے اور دریائے راوی کے کنارے پہنچے
ہی تھے کہ ۲۲ صفر کو سفینۂ حیات موت کے کنارے جا لگا۔

ذوق اس بحرِ جہاں میں کشتیِ عمرِ رواں
جس جگہ پر جا لگی وہ ہی کنارا ہو گیا

بالکل نوجوان تھے۔ پینتالیس سال کی عمر تھی۔ اگر زندگی وفا کرتی تو خدا جانے ان کی قابلیت اور کیا کیا جوہر دکھاتی۔ اس سے زیادہ ان کے
باغ کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ خدا جانے کہاں تھا۔ کیسا تھا۔ کس محنت اور شوق سے لگایا گیا تھا۔ اب تو کھنڈروں کا بھی
پتہ نہیں ملتا۔ البتہ اس زمانہ کے حالات پر نظر ڈال کر یہی کہہ سکتے ہیں کہ دریا کے پار شاہدرہ کے نواح میں کہیں ہوگا۔

ماٰثر الامرا جلد اول (ص ۶۶۱) میں ان کے حالات میں لکھا ہے کہ اکبر کے ۳۴ ویں سال جلوس ۹۹۸ھ میں جب یہ
خان اعظم (صوبہ گجرات) کے پاس تھے تو بادشاہ نے ان کو لاہور میں یاد کیا۔ وہ ستر سواروں کی ایک جمعیت کے ساتھ چھ سو کوس

کا فاصلہ بارہ دن میں طے کرکے لاہور اس وقت پہنچے جب بادشاہ تئیسویں سال جلوس کی تیاریاں کر رہا تھا چونکہ اس قدر فاصلہ کا اتنی تھوڑی مدت میں طے کر لینا عجیب بات تھی۔ اس لیے بادشاہ نے حکم دیا کہ نظام الدین اپنی شتر سوار جماعت سمیت ہمارے پیش ہو۔ اس کے بعد خواجہ پر روز بروز اعتماد زیادہ ہوتا گیا۔ صاحب مآثر لکھتے ہیں "در راستی و درستی یگانۂ وقت و در کاردانی و معاملہ فہمی سرآمد اقران بود"

مادھو لال حسین

باغباں پوری وہ قصبہ جہاں لے اہل دل ‎ ‎ ‎ روبروئے عشق عقل کل کو حیراں دیکھئے
زندگی میں جلوہ ہے من تو شدم تو من شدی ‎ ‎ ‎ بعد مرنے کے بھی اک قالب میں دو جاں دیکھئے

(مادھو لال حسین[1] کے متعلق تین کتابیں بہت ہی پرانی ہیں جو فارسی زبان میں ہیں۔ ایک تو رسالہ بہاریہ ہے جس کے مصنف منشی بہار خاں تھے۔ یہ سب سے قدیم تصنیف ہے جو اکبر بادشاہ کے عہد میں لکھی گئی۔ منشی بہار خاں کو شاہ حسین سے خاص عقیدت تھی۔ شہزادہ سلیم (جہانگیر) نے انھیں شاہ حسین کا روزنامچہ لکھنے پر مقرر کر رکھا تھا۔ شہزادہ دارا شکوہ نے اپنی کتاب حسنات العارفین میں اور مولوی نور احمد چشتی نے تحقیقات چشتی میں اس رسالہ کا ذکر کیا ہے۔

دوسری قدیم کتاب حقیقت الفقرا ہے جو شاہ حسین کے خلیفہ شیخ مادھو کے مرید شیخ پیر محمد نے فارسی نظم میں لکھی تھی۔ یہ کتاب شاہجہان کے عہد کی ہے۔

تیسری کتاب دارا شکوہ کی مشہور تصنیف حسنات العارفین ہے جس میں دو تین جگہ شاہ حسین کا ذکر آتا ہے۔ یہ کتاب طبع ہو چکی ہے۔ اور اس کا اردو ترجمہ بھی بازار میں ملتا ہے۔ باقی دونوں کتابیں آج ناپید ہیں۔ مولوی نور احمد چشتی نے اپنی کتاب تحقیقات چشتی ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۷ء میں تصنیف کی۔ اس وقت یہ دونوں کتابیں ان کے مطالعہ میں آئی تھیں۔ ممکن ہے اب بھی کہیں ہوں۔ انہی کتابوں کی مدد سے چشتی نے مادھو لال حسین کے حالات مرتب کیے تھے۔

مفتی غلام سرور لاہوری نے بھی اپنی تالیف خزینۃ الاصفیا جلد اول میں صفحہ ۱۴۱ پر اور حدیقۃ الاولیاء کے صفحہ ۱۴۵ پر ان کتابوں کے حوالے دیئے ہیں۔ ہو سکتا ہے ان کی نظر سے بھی یہ کتابیں گزر چکی ہوں۔

سید محمد لطیف جج اور رائے بہادر کنہیا لال کی تواریخ لاہور کے بعد اردو میں منشی محمد الدین فوق مرحوم نے ۱۹۰۸ء میں ایک مختصر سا رسالہ "شالامار باغ کی سیر" لکھا جس میں ضمناً مادھو لال حسین کے حالات پر بھی روشنی ڈالی۔ اس کتاب کا آخری ایڈیشن ترمیم و اضافے کے بعد "تاریخ شالامار باغ" کے نام سے ۱۹۲۴ء میں چھپا۔ اس سے زیادہ معتبر کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۳۲ء کے انڈین آرکیالوجیکل رسالہ میں جو سر جے مارشل کی ادارت میں چھپتا تھا مصر کے ایک انگریز کیپٹن کرسول کا مضمون شائع ہوا ہے جس میں اس چھوٹی سی کتاب کو تاریخ پنجاب کا ایک اہم جزو تسلیم کیا گیا ہے۔

مادھو لال حسین کے کچھ حالات فوق صاحب کی کتاب یادرفتگاں میں بھی ملتے ہیں جو ۱۹۰۶ء کی تصنیف ہے اور آج کل نایاب ہے۔ البتہ راقم الحروف کے پاس ایک نسخہ موجود ہے۔

---

[1] یہ حالات مرتب نے لکھے ہیں۔

۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۳ء میں ڈاکٹر موہن سنگھ صاحب دیوانہ ایم۔اے پی ایچ۔ڈی نے جو اُس وقت پنجاب یونیورسٹی میں پنجابی کے لیکچرار تھے شاہ حسین کا پنجابی کلام چھاپا اور ان کے حالات بھی گورمکھی، پنجابی اور اُردو میں لکھے۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب کے پیشِ نظر ایک خاص تعلیمی مقصد تھا۔ اس لیے انھوں نے حالات کی نسبت زیادہ زور ان کی کافیوں اور بیتوں پر دیا اور ان کے کلام کی خوبیاں گنوائیں۔

میرے مضمون کے ماخذ یہی آخرالذکر کتابیں ہیں جو چھپ چکی ہیں اور ان ہی سے میں نے استفادہ کیا ہے۔

شاہ حسین کے جدِ اعلیٰ کلس رائے یا کلس رائے لاہور کے ایک کھتری بزرگ تھے۔ ذات ان کی ڈاھڈا تھی۔ فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں مسلمان ہو گئے تھے۔ وہ ہندو رہنے کی حالت میں اور مسلمان ہونے کے بعد کیا کاروبار کرتے تھے؛ اس کے متعلق سب خاموش ہیں۔ البتہ ان کے فرزند شیخ عثمان کے متعلق سب تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ ان کا پیشہ بافندگی تھا۔ اسی بنا پر شیخ عثمان کے بیٹے شیخ حسین بھی "حسین جولاہا" کے نام سے مشہور ہیں۔

شیخ حسین ۹۴۵ھ/۱۵۳۸ء میں پیدا ہوئے۔ اس وقت ان کے والد شیخ عثمان تل بگھ نام ایک محلے میں رہتے تھے جو ٹکسالی دروازہ کے باہر دریا کے قریب واقع تھا۔ تل یا تلہ ٹیلے کا بگڑا ہوا نام ہے۔ تل بگھ کی مسجد میں حافظ ابوبکر ایک بزرگ امامت بھی کرتے تھے اور بچوں کو پڑھایا بھی کرتے تھے۔ وہ بگھ کے مردم خیز قصبہ کے رہنے والے تھے جو تحصیل پنڈ دادنخان ضلع جہلم میں واقع ہے اور جہاں آج بھی عالم اور فاضل موجود ہیں۔ شاید انہی بزرگوں کے نام پر یہ محلہ تلِ بگھ کے نام سے مشہور ہو گیا ہو۔ حسین کو اسی محلے کی مسجد میں حافظ ابوبکر کے پاس بٹھایا گیا اور انھوں نے چھوٹی سی عمر میں چھ پارے حفظ کر لیے۔

اسی اثنا میں شیخ بہلول دریائی اس مسجد میں تشریف لائے۔ اس وقت شیخ حسین ساتواں پارہ حفظ کر رہے تھے۔ شیخ بہلول نے ان سے وضو کے لیے پانی طلب کیا اور کہا کہ دریا نزدیک ہے، وہیں سے لے آؤ۔ آپ دریا پر گئے۔ وہاں ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ جنھوں نے ایک نظر ڈال کر سارا قرآن حفظ کرا دیا۔ شیخ حسین پانی لے کر واپس آ گئے۔ شیخ بہلول نے وضو کیا اور نماز پڑھائی۔ تھوڑے دنوں بعد ماہ رمضان آ گیا۔ شیخ حسین نے نماز تراویح پڑھائی اور سارا قرآن مجید ستائیس راتوں میں سنا دیا۔ اسے شیخ بہلول کی کرامت پر محمول کیا گیا۔ اس سے شیخ حسین کی بھی شہرت ہو گئی۔

شیخ بہلول موضع چنیوٹ کے رہنے والے تھے جو لاہور سے سات میل کے فاصلے پر واقع تھا، شیخ حسین نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ واقعہ ۹۵۵ھ/۱۵۴۸ء کا ہے۔ چنانچہ حقیقت الفقرا کا مصنف لکھتا ہے ؎

درزمانے کہ شیخ سوئے حسین	آمد از بہر جستجوئے حسین
وقت خوش بود ساعتے مسعود	سال پنجاہ و پنج نہصد بود

سال تاریخ اوست بے تاخیر
حق شدہ ہادی حسین فقیر

رسالہ بہاریہ اور حقیقت الفقرا چونکہ اعتقادی رنگ کی کتابیں ہیں، اس لیے ان میں صدہا کرامتیں آپ کے متعلق درج ہیں۔ لکھا ہے کہ شیخ حسین نے چھبیس سال زہد و ریاضت میں گزارے۔ قرآن و حدیث پر انھیں پورا عبور تھا۔ نماز گزار کیا

تہجد گزار تھے۔ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں پورا قرآن مجید ختم کر دیتے تھے۔ بارہ سال متواتر پابندی کے ساتھ مزار حضرت علی ہجویری عرف داتا گنج بخش پہ حاضری دیتے رہے۔ ایک روز شیخ سعد اللہ سے جو لاہور کے نامور عالم تھے علم تفسیر پڑھ رہے تھے۔ تفسیر مدارک کا درس تھا جب آیت وما الحیوٰۃ الدنیا الا لہوٌ و لعب آئی تو استاد نے اس کے معانی میں بیان کیا کہ دنیا کی زندگی ناپائدار اور محض لہو و لعب ہے۔ شیخ حسین نے کہا مجھے قال نہیں بلکہ حال دکھائیے۔ آخر لہو و لعب کہنے سے اللہ تعالیٰ کا مطلب کیا ہے۔ جب وہ خود دنیا کی زندگی کو لہو و لعب کہتا ہے تو ہم اس کا کہنا کیوں نہ مانیں اور صفت میں مردود مطلق کیوں ہوں؟

رسالہ بہاریہ میں لکھا ہے اس وقت آپ کی عمر چھتیس سال تھی، آپ تلاوت کرتے ہوئے مسجد سے باہر نکلے اور تفسیر کی کتاب کنوئیں میں پھینک دی، جب دوسرے ہم سبق طلبہ نے برا مانا تو کتاب کو کنوئیں سے باہر آنے کا حکم دیا۔ کتاب اچھل کر باہر آگئی دیکھا تو وہ بالکل خشک تھی۔

دارا شکوہ لکھتا ہے کہ شیخ حسین ڈھڈا ایک مجلس میں موجود تھے۔ وہاں ایک کتاب پڑی تھی، پوچھا کونسی کتاب ہے؟ جواب میں دیوان حافظ کا نام لیا گیا۔ آپ نے دیوان اٹھا کر کھولا تو یہ شعر نکلا ہے

چشمہ چشم مرا اے گل خنداں دریاب
کہ بہ امید تو خوش آب روانے دارد

آپ نے یہ شعر پڑھ کر کتاب زمین پہ دے ماری اور کہا کہ حافظ بھی بوڑھی عورتوں کی طرح روتا ہی مر گیا۔ اس واقعہ کا ذکر دارا شکوہ نے اس موقع پر کیا ہے جہاں منا صلی اور بایزید بسطامی جیسے بزرگوں کے یہ اقوال درج کئے ہیں کہ سب لوگ وہم اور امید کا سہارا لیتے رہے ہیں۔ یہی بات شیخ حسین نے حافظ شیرازی کا یہ شعر پڑھ کر کہی۔

دارا شکوہ نے شیخ حسین کو ملامتیوں کے گروہ کا سردار لکھا ہے لیکن جہاں تک مشائخ طریقت کے اس گروہ کا تعلق ہے، تصوف کی مشہور کتاب کشف المحجوب میں اس کی تین صورتیں بتائی گئی ہیں:۔

پہلی صورت یہ ہے کہ ایک شخص سیدھی راہ چلتا ہے، نیک نیتی سے اپنا کام کرتا ہے، خود احکام خداوندی بجا لاتا اور دینی معاملات میں دین پروری کی رعایت کرتا ہے۔ اس پر لوگ اس کو ملامت کرتے ہیں مگر وہ اس کی کچھ پروا نہیں کرتا۔ ایسے مومنوں کی صفت قرآن کریم میں یہ بیان فرمائی گئی ہے:۔

ولا یخافون لومۃ لائم۔ ذٰلک فضل اللہ یوتیہ من
یشاء واللہ واسع علیم ٥

ترجمہ:۔ یعنی خاصان خدا ملامت سے نہیں ڈرتے یہ صفت اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ کا علم بڑا وسیع ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص لوگوں میں ہر دلعزیز اور صاحب عزت ہو اس کی طبیعت اس میں لگ جائے مگر وہ اپنا دل اس طرف سے موڑ کر خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرے اور تکلف سے ایسا طریق اختیار کرے جس سے لوگ متنفر ہو کر اس سے الگ ہو جائیں اور اسے برا بھلا کہنے لگیں۔ لیکن شریعت کو اس سے کچھ نقصان نہ ہو۔

تیسری صورت یہ ہے کہ کسی کو طبعی کفر اور گمراہی دامن گیر ہو۔ اس سبب سے وہ شریعت کی متابعت ترک کرے اور کہے کہ یہ ملامتی طریقہ ہے جو میں نے اختیار کیا ہے۔ وہ ہر حال میں اپنی رائے پر عمل کرے اور لوگ خواہ اسے کچھ کہیں، کسی نام سے پکاریں، وہ پروا نہ کرے۔ اس قسم کی ملامت ریاکاری ہے اور تارک فرض دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔

شیخ حسین عالم و فاضل تھے ایک آیت قرآنی کی تفسیر کے الٹ پھیر نے ان کی کایا پلٹ دی۔ انھوں نے ملامتیہ طریق اختیار کیا اور ڈنکے کی چوٹ اس کا اظہار کیا۔ وہ اعلانیہ شراب پیتے تھے۔ گانا سنتے تھے۔ طوائفیں ان کی مجلس میں آتی تھیں اور رقص و سرود سے ان کی محفل گرماتی تھیں۔ وہ داڑھی مونچھ منڈواتے تھے اور ان کے حلقہ نشین بھی سب اسی رنگ میں رنگے ہوتے تھے۔ نماز روزہ سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔ جب تک کوئی شخص داڑھی مونچھ کا صفایا نہ کرا دیتا۔ اس وقت تک ان کا مرید نہ ہو سکتا تھا۔ وہ اپنے مرید کو داڑھی مونچھ صاف کرانے کے بعد اپنے ہاتھ سے شراب کا پیالہ دیتے تھے۔ اگر وہ پی لیتا تو مریدوں میں شامل سمجھا جاتا۔ نہیں تو مجلس سے باہر نکال دیا جاتا۔

کہتے ہیں ایک مرتبہ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی ان کے پاس گئے اور کہا مجھے بھی اپنے مریدوں میں داخل کر لیجئے۔ شیخ حسین نے جواب میں جو کچھ کہا، اس کا مطلب یہ تھا کہ ملا! کیوں مجھے رسوائے عالم کرنا چاہتے ہو۔ تم میرے کام کے آدمی نہیں ہو۔ اس لیے میں تمہیں اپنا مرید نہیں کر سکتا، نہ تم ڈاڑھی منڈواتے ہو نہ شراب پیتے ہو۔ ملا عبدالحکیم نے کہا۔ اگر دلیل سے قائل کر دوگے تو جو کہو گے مانوں گا۔ شیخ نے کہا۔ نہیں تم خشک ملا ہو۔ تم کبھی نہ مانو گے۔ جاؤ اپنا کام کرو اور ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو۔

ان ظاہری بدعتوں اور خلاف شرع باتوں کے باوجود شہزادہ دارا شکوہ نے حسنات العارفین میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کی زبانی شیخ حسین کی دو چشم دید کرامتیں بیان کی ہیں جن کا ذکر یہاں ضروری معلوم نہیں ہوتا۔

شیخ حسین کے مرشد شیخ بہلول کو جب آپ کی ان حرکات کا علم ہوا تو وہ فوراً لاہور تشریف لائے اور شیخ حسین سے فرمایا کہ آج میرے ساتھ نماز پڑھو اور نماز ہی میں سارا قرآن ختم کر دو چنانچہ آپ نے نماز شروع کی۔ جب سورہ "الم نشرح لک صدرک" پر پہنچے تو بے اختیار ہنس پڑے اور نماز ختم کر دی۔ دارا شکوہ کا خیال ہے کہ شاہ حسین نے شاید اس سورۂ پاک کا مفہوم یہ سمجھا تھا کہ کیا ہم نے تیرے سینے کو توحید اور معرفت سے نہیں کھولا اور تجھ پر وہم اور انانیت کا بار نہیں ڈالا جو تیری پشت کو پست کرتا ہے اور کیا ہم نے تجھ کو ذکر سے مذکور تک نہیں پہنچایا۔ اس لیے کہ ہر فنا کے بعد بقا ہے اور بے شک جس کو ہم نے فنا بخشی، اسے بقا دے کر ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیا۔ پس جب تو نے انانیت اور ہستیٔ موہوم سے فراغت حاصل کر لی ہے تو ہماری ہستی پر قائم ہو جا اور اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہو جو ظاہر اور باطن کا رب ہے۔

اس واقعہ کے بعد وہ کبھی اپنے مرشد سے نہ ملے۔

اکبر کے زمانے میں مخدوم الملک مولانا عبداللہ سلطان پوری شیخ الاسلام تھے۔ وہ اکبر کے مذہبی خیالات کے مخالف اور ابوالفضل کے دشمن تھے اور اس کو تمام فتنوں کا بانی سمجھتے تھے۔ وہ سنہ ۹۹۰ھ (۱۵۸۲ء) میں مکہ معظمہ سے حج کر کے واپس آئے اور گجرات پہنچ کر انتقال کر گئے۔ بہت مالدار تھے مگر اتنے کنجوس کہ مرنے کے بعد ان کے خزانے سے تین کروڑ روپیہ نکلا۔

اکبر کے قیام لاہور کے ایام میں یہ بھی لاہور میں تھے۔ خزینۃ الاصفیا میں بحوالہ معارج الولایت لکھا ہے کہ ایک دفعہ الفضول نے شیخ حسین کو ساز و نواز کے ساتھ بازار میں جاتے دیکھا جس دھوم دھڑکے اور بینڈ گذائی سے وہ جا رہے تھے، اس کو شیخ الاسلام نے شریعت کے خلاف سمجھا۔ انھوں نے شیخ حسین کو سزا دینا چاہی اور شاید کچھ سوال جواب بھی کئے۔ شیخ الاسلام گھوڑے پر سوار تھے۔ شیخ حسین نے آگے بڑھ کر ان کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور کہا۔ اسلام کے پانچ رکن ہیں۔ کلمۂ توحید اور اقرار رسالت میں ہم تم برابر کے شریک ہیں۔ لیکن حج اور زکوٰۃ سے تو فارغ ہے اور نماز روزہ میں نے ترک کر رکھا ہے۔ پھر مجھ میں اور تجھ میں فرق کیا ہے۔ میں سزا کا کیوں مستحق ہوں اور تم کیوں نہیں؟

شیخ الاسلام نے اس وقت تک فی الواقع حج نہ کیا تھا اور اس قدر دولت مند ہو کر کبھی زکوٰۃ و خیرات بھی نہ دی تھی۔ اس لیے اپنا سا منہ لے کر رہ گئے اور حسین کو ان کے حال پر چھوڑ کر آگے چلے گئے۔

شیخ حسین کا مشرب یہ تھا کہ صبح سے شام تک گانے بجانے والے ان کے ہمراہ رہتے تھے۔ ان کے حواری و مرید سب داڑھی مونچھ منڈا کر مست الست پھرا کرتے تھے۔ وہ قرآن کے حافظ، حدیثوں کے شیخ اور علم میں صاحب کمال تھے۔ لیکن اُن کا عمل قرآن و حدیث کے سراسر خلاف تھا۔ اس پر بھی لوگ انھیں صاحب کرامت جانتے تھے۔ دارا شکوہ لکھتا ہے کہ شہزادہ سلیم اور حرم سرائے اکبری کی اکثر بیگمات شیخ حسین کی عقیدت مند تھیں۔

صاحب حقیقۃ الفقراء نے آپ کے خادموں کی تعداد نو ہزار اور مریدوں کی ایک لاکھ پچیس ہزار بتائی ہے جن میں سولہ خلیفے بہت نامور ہوئے ہیں۔ ان میں چار تو غریب کے خطاب سے مخاطب کئے جاتے تھے، چار کا خطاب دیوان، چار کا خاکی اور چار کا بلاول تھا۔ دیوانوں میں پہلے دیوان حضرت کے محبوب شیخ مادھو، دوسرے گورکھا، تیسرے اللہ دیوان تھے۔ یہ سب لاہور میں دفن ہیں۔ چوتھے دیوان بخش کی قبر بیجاپور میں ہے۔

پہلا شاہ غریب وزیرآباد سے تین کوس کے فاصلے پر مقام رتی ٹھیٹھ مدفون ہے۔ دوسرا موضع لنگو والی (وزیرآباد) میں، تیسرا جیاپور علاقہ دکن میں اور چوتھے شاہ غریب کی قبر شاہ حسین کی قبر کے پاس لاہور میں ہے۔

خاکیوں میں پہلے خاکی مولا بخش اور دوسرے خاکی شاہ لاہور میں بجوار مزار حسین مدفون ہیں۔ تیسرے خاکی شاہ وزیرآباد میں اور چوتھے حیدر بخش خاکی دکن میں پیوند زمیں ہیں۔

بلاول نام کے خلیفوں میں پہلے شاہ رنگ بلاول، دوسرے بڈھو بلاول، تیسرے شاہ مست بلاول لاہور میں اور چوتھے شاہ بلاول دکن میں مدفون ہیں۔

شاہ حسین سے ملنے والوں کا حلقہ بھی بہت وسیع تھا۔ ان کے دوستوں میں مولانا اسمٰعیل عرب کا نام لیا جاتا ہے جو ہمایوں بادشاہ کے قائم کردہ مدرسہ دہلی کے مدرس اعلیٰ تھے۔ وہ جب کبھی لاہور آتے شیخ حسین سے ضرور ملتے۔ ان کا شمار صاحب ثروت لوگوں میں ہوتا تھا۔ وہ چوروں کے ہاتھوں دہلی میں قتل ہو گئے۔

کہتے ہیں کہ شیخ حسن طبیب[1] سرہندی نے بھی حافظ شیخ حسین کو دیکھا تھا اور ان کے کئی قول ان کو یاد تھے۔ وہ اکثر

---

[1] حسنات العارفین کے اردو ترجمہ میں کہیں "طبیب" کی جگہ غلطی سے "طیب" چھپ گیا تھا۔ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ نے اس کو "شیخ طیب سرہندی" بنا دیا۔ لیکن ابوالفضل کے حوالہ سے اقبال نامہ اکبری کے مصنف نے جس طبیب شاہی کا ذکر کیا ہے وہ یہی شیخ حسن طبیب سرہندی تھے جو شیخ حسین سے ملا کرتے تھے۔

شیخ حسین کے پاس آمد و رفت رکھا کرتے تھے۔ شیخ بینا یا شیخ بلیا اسی شیخ سرہندی کے فرزند تھے جن کو فن جراحی اور ہاتھیوں کے علاج میں کمال حاصل تھا۔ اکبر کو ایک مرتبہ شکار کھیلتے ہوئے ہرن نے جو زخم لگایا تھا وہ انہیں کے علاج سے اچھا ہوا تھا۔

پہلے تو حسین نو مسلم زادہ ہونے کی وجہ سے شیخ حسین، حافظ قرآن ہونے کی وجہ سے حافظ حسین، باپ کے پیشہ بافندگی کی وجہ سے حسین جولاہا اور درویش صفت ہونے کے لحاظ سے شاہ حسین کہلاتے تھے۔ لیکن اب ایک ایسا دور آیا کہ اس نے پہلے تمام ناموں پر خط تنسیخ کھینچ کر ان کا نام مادھو لال حسین مشہور کر دیا۔ چنانچہ آج تک وہ اسی نام سے مشہور رہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے :۔

مادھو یا مادھو لال شاہدرہ کا ایک برہمن زادہ تھا جو بقول تحقیقات چشتی ۹۸۲ھ میں پیدا ہوا۔ اس وقت حافظ شیخ حسین کی عمر ۳۸ سال تھی۔ صاحب تحقیقات لکھتے ہیں کہ مادھو کی عمر تین برس کی تھی جب وہ شاہ حسین کے منظور نظر ہوئے۔ لیکن صاحب خزینۃ الاصفیاء جلد اول صفحہ ۱۶۶ پر لکھتے ہیں :۔

"روزے سوارے رفت کہ شیخ حسین را نظر بر جمال وے افتاد۔ و بہ ہزار جان مفتون محبت وے گشت۔ و در شاہدرہ سکونت اختیار کرد"

ان ایام میں مادھو کے والدین شاہدرہ میں دریا کے پار رہتے تھے اور شیخ حسین کا مسکن لاہور کے ٹکسالی دروازہ کی بیرونی حدود میں تھا۔ یہ تو ممکن ہو سکتا ہے کہ مادھو گھوڑے پر سوار ہو کر لاہور آیا ہو، شیخ کے مکان کے پاس سے گزرا ہو اور شیخ نے اس کو مہر و محبت کی نگاہ سے دیکھا ہو۔ لیکن اس بات کا امکان بہت مشکل ہے کہ مادھو نے تین سال ہی کی عمر میں جبکہ وہ اپنی ماں کی گود میں تھا اور لاہور سے دور رہتا تھا، شیخ حسین کو فریفتہ کر لیا ہو۔ بہر حال اس زمانے میں شیخ حسین قلندرانہ وضع اختیار کر چکے تھے اور ملامتیہ طریقہ رکھتے تھے۔ ہر بات میں ان کا وظیفہ یہ تھا ؎

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں
ما نمی خواہیم ننگ و نام را

آپ اس برہمن زادے کا نام پتہ اور حسب نسب دریافت کر کے خود بھی شاہدرہ میں جا بیٹھے۔ اس وقت مادھو کی عمر اٹھارہ سال تھی اور وہ شادی شدہ تھا۔ آپ کی توجہ سے متاثر ہو کر مادھو نے بھی آپ کے پاس آنا جانا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ وہ شراب نوشی میں بھی ان کا شریک رہنے لگا۔

یہ قصہ بہت طویل ہے۔ اور تحقیقات چشتی کے مصنف نے خوب مزے لے لے کر بیان کیا ہے۔ یہ کہنا درست ہے کہ مادھو اور شیخ حسین کے عشق و محبت کے افسانوں میں بہت سی بے سروپا باتیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن مادھو کے وجود سے انکار کرنا اور پھر دونوں کے تعلقات کو جھٹلانا کسی واقعہ نگار کے بس کا روگ نہیں۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شیخ حسین کو مادھو سے محبت تھی۔ اس کی شکل دیکھے بغیر انہیں کل نہ پڑتی تھی۔ چونکہ

لے منتخب التواریخ بدایونی جلد سوم صفحہ ۱۶۹-۱۷۰۔

سچی اور پاک محبت تھی۔ اس لیے مادھو پر بھی اس کا اثر ہوا اور آخر وہ مسلمان ہو کر ان کا مرید ہو گیا۔ اس جگہ شاہ حسین کے ان پنجابی شعروں کا اندراج شاید بے محل نہ ہو گا :-

تسیں رل مل دیو مبارکاں[1] میرا سوہنا سجن گھر آئیا ہی
جس سجن نوں میں ڈھونڈھدی وناں سو سجن میں پائیا ہی
ویہڑا تاں آنگن میرا لجئیا سہاوناں ماتھے نور سہائیا ہی
کہے حسین فقیر نماناں مرشد[2] دوست[3] ملائیا ہی

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ نے اپنی کتاب میں ڈاکٹر لاجونتی، باوا بدھ سنگھ اور منشی مولا بخش کشتہ غرض جس کسی نے بھی شاہ حسین کے متعلق کچھ لکھا ہے، سب کو لتاڑ ڈالا ہے۔ کسی پر کوئی اعتراض کیا ہے اور کسی پر کوئی۔ لیکن اپنی آنکھ کا شہتیر بالکل نہیں دیکھا۔ ڈاکٹر لاجونتی کے متعلق آپ نے لکھا ہے کہ :-

"اس نے بڑا ظلم کیا ہے کہ شیخ حسین کا نام ہی مادھو لال حسین لکھ دیا ہے اور ادھر ادھر کی کرامتوں اور گپوں سے حسین کو ملوث کر دیا ہے اور دارا شکوہ کی تصنیفات (حسنات العارفین) نہیں دیکھی۔"

"مادھو برہمن کا قصہ بھی محض گپ ہے اور حسین کے تصوف کو بدنام کرنا ہے۔ حسین کی کافیوں میں مادھو کا کہیں نام نہیں ہے ـــ وغیرہ وغیرہ"

اب ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ کا اپنا طرز عمل دیکھئے۔ آپ نے ۱۹۴۲ء میں "مکمل کلام شاہ حسین لاہوری" مرتب کر کے پنجابی زبان اور فارسی رسم الخط میں شائع کیا۔ اس کتاب میں واقعی آپ نے مادھو کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ نہ اس کے برہمن ہونے کا نہ بعد میں مسلمان ہونے کا اور نہ حسین سے اس کا کوئی تعلق ظاہر کیا ہے۔ لیکن ۱۹۴۳ء میں آپ نے ایک اور تصنیف "حالات و کافیاں مادھو لال حسین" شائع کی۔ اس کتاب کا نام ہی آپ نے مادھو لال حسین تجویز کیا۔ پھر دیباچے کے صفحہ اول پر لکھا :-

"لاہور میں جو ہمارے صوفی اور شاعر کا مولد ہے آپ مادھو لال حسین کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ مادھو آپ کے خلفا سے ایک شخص کا نام تھا۔ اس کے ہندو ہونے کی طرف مادھو اور حسین کی باہمی دوستی کے قصوں میں خاصا واضح اشارہ موجود ہے۔ مادھو یا مادھو لال آپ کا مرید ہو کر مشرف بہ اسلام ہوا"

---

[1] مبارکاں [2] گورو [3] خدا

مطلب یہ ہے کہ میں جس محبوب کی تلاش میں در در کی خاک چھانتا پھرتا تھا وہ میرے گھر آگیا ہے۔ تم سب مل کر مجھے مبارک دو۔ اس کی پیشانی سے نور کی شعاعیں پھوٹ رہی ہیں۔ گھر آنگن اس کی آمد سے جگمگا اٹھا ہے۔ مسکین حسین جانتا ہے کہ یہ وصال مرشد کامل کی توجہ سے میسر آیا ہے۔

اس طرح جو اعتراض آپ نے ڈاکٹر لاجونتی پر کیا تھا اس کا خود بھی اعادہ کیا۔ آپ کہیں گے تو سہی کہ ؎

یہ عذر امتحان جذب دل کیسا نکل آیا
میں الزام اس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

مگر جب آپ کو خود ہی ان سب باتوں کا اقبال ہے تو اس پر مزید حاشیہ آرائی بے سود ہے۔ البتہ ثبوت کے لیے شاہ حسین کے ایسے اشعار کا اندراج نامناسب نہ ہوگا جن میں گو مادھو کا نام نے کر انھوں نے اس کے ہندو یا برہمن ہونے یا دریا پار (یعنی شاہدرہ) رہنے کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن اشاروں کنایوں میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ کہتے ہیں ؎

پوتھی کھول دکھا بھائی باہمناں
پیارا کدوں ملیسی سانا

اس بیت سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ محبوب دوسری طرف یعنی دریا پار رہتا ہے۔ اور دوسرے ہندوؤں میں عام دستور ہے کہ وہ کسی کام کو شروع کرنے سے پہلے برہمنوں سے شگون لے لیا کرتے ہیں۔ یہ خالص ہندوانہ رسم ہے۔ چونکہ شاہ حسین کا منظور نظر ہندو تھا اس لیے وہ یہاں ہندو رسم و رواج کا ذکر کرتے ہیں۔

پھر دوسری جگہ اس کا پتہ نشان اس طرح بتاتے ہیں ؎

من اٹکیا بے پرواہ نال — اوہ دین دنی دے شاہ نال
قاضی ملاں متیں دیندے — کھرے سیانے راہ دسیندے
عشق کی لگے راہ نال

ندیوں پار رانجھن دا ٹھانا — کیتا قول ضرورت جانا
منتاں کراں ملاح نال

اس کافی کے دوسرے بند سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ حسین کا محبوب ندی کے اُس پار رہتا ہے جسے ملنے کیلئے دریا عبور کرنا ضروری ہے اور دریا ملّاح کی مدد کے بغیر عبور نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اس کی منتیں کی جا رہی ہیں۔ اس طرح انھوں نے ندی، ملاح اور رانجھن کے کنایوں سے اپنے معشوق کے ٹھکانے کی طرف اچھا خاصا اشارہ کر دیا ہے۔

مندرجہ ذیل کافیوں میں لال کا لفظ مادھو لال کے نام کی صحیح غمازی کرتا ہے ؎

پیارے لال کیا بھرواسا[1] دم[2] دا
اُڈیا بھور، ہِتھیا پردیسی۔ اگے راہ اگم[3] دا
کوڑی دنیا کوڑ[4] پسارا[5]۔ جیوں موتی شبنم[6] دا
جنہاں میرا شوہ[7] رجھایا۔ تنہاں نہیں بھو جم[8] دا
کہے حسین فقیر سائیں دا۔ چھوڑ سریر[9] بھسم دا

[1] تکیہ، بھروسہ، یقین [2] سانس [3] غیب [4] جھوٹا [5] تریل [6] یار [7] ملک الموت کا ڈر [8] خاکی جسم

یعنی پیارے لال! زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔
جب روح تن سے نکل گئی تو آدمی دوسری دنیا کا ہو گیا۔ جہاں کا حال کسی کو معلوم نہیں۔
یہ دنیا اور اس کا تمام کھیل جھوٹا ہے۔ شبنم کے قطرے کی طرح اس کی کوئی حقیقت نہیں۔
جس نے اپنے مولا کو راضی کر لیا، اسے موت کا کوئی ڈر نہیں رہا۔
فقیر حسین کہتا ہے کہ خاکی جسم تج کر روحانی زندگی اختیار کر۔

دوسری جگہ شاہ حسین پھر لال کی تکرار کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

ماۓ نی کینوں آکھاں درد وچھوڑے دا حال
دھواں دُھکھے میرے مرشد والا جاں پھولاں تاں لال
سُولاں مار دِوانی کیتی برہوں پیا ساڈے خیال
دُکھاں دی روٹی سُولاں دا سالن آہیں دا بالن بال
کہے حسین فقیر نماناں شہ ملے تاں تھیواں نہال

یعنی اے ماں! میں اپنے دردِ فراق کا حال کسے سناؤں؟ مرشد کے عشق نے آگ لگا رکھی ہے۔ دھواں اٹھ رہا ہے۔ چھیڑنے سے شعلے اٹھتے ہیں۔ سوز و کرب نے دیوانہ کر دیا ہے۔ محبت کر کے روگ لگا بیٹھا ہوں۔ خونِ دل پینے کو اور لختِ جگر کھانے کو ملتا ہے۔ ہر دم آہ و زاری سے کام ہے۔ آتشیں آہیں نکلتی ہیں۔ جنگل جنگل ڈھونڈتا پھرتا ہوں مگر لال نہیں ملتا۔ مل جائے تو جان میں جان آئے، زندگی سنور جائے۔

ڈاکٹر موہن سنگھ کا ارشاد ہے کہ حسین اور مادھو کی محبت کا ذکر کر کے حسین کے تصوف کو بدنام کر دیا گیا ہے۔ اول تو معلوم نہیں وہ کس قسم کا تصوف ہے جس میں دن رات شراب کا دَور چلتا ہے۔ پھر پیر و مرشد کے تعلق میں مولانا روم اور ان کے مرشد شمس تبریز، امیر خسرو اور ان کے مرشد حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء اور اسی طرح بعض دیگر صاحبانِ سلوک کے درمیان جو محبت عشق کے درجہ تک پہنچی ہوئی تھی اس کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔ اس قسم کی پاک محبت سے نہ تصوف کبھی بدنام ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر موہن سنگھ کو حسین کی شراب نوشی سے بھی انکار ہے۔ فرماتے ہیں :۔

"کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ شیخ حسین کو اکبر کے روبرو مواخذہ میں لایا گیا تھا۔ کیونکہ وہ داڑھی منڈواتا اور کھلم کھلا شراب خوری کرتا تھا۔ مگر یہ محض افسانہ ہے۔ اس بارے میں کوئی مصدقہ شہادت بہم نہیں کی گئی۔ دارا شکوہ کے بیانات کو ہم بجا طور پر معتبر سمجھتے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ حسین صوفیہ کے فرقہ ملامتیہ سے تھا۔"

پھر خود ہی دوسری جگہ لکھتے ہیں :۔

"شیخ کی روش عجیب تھی۔ صبح سے شام تک گانے بجانے والوں کے ساتھ مونچھ داڑھی سے شہری مست الست رندانہ چکر کاٹتے رہتے۔ کبھی کسی کے داؤ پیچ میں

نہ آئے۔ بہت سی کرامات اور خارق فطرت امور آپ سے ہویدا ہوئے۔"

اس کے بعد ان واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ بھی فرماتے ہیں:—

"شراب نوشی، ریش تراشی اور کرامات کی صحت و عدم صحت کی ذمہ داری راویوں پر ہے۔ مگر یہ تو ہم صاف دیکھ سکتے ہیں کہ کلام میں کہیں شراب کا نام تک نہیں۔ نہ صاحب اعجاز ہونے کا دعویٰ ہے نہ ہی احکام شرع سے تجاوز کی تحریک و ترغیب ہے۔ یہاں تک کہ رندی و مستی، ناز و انداز کا بھی کہیں مظاہرہ نہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ شیخ صاحب شراب کا استعمال کرتے تھے اور ڈاڑھی منڈوانے پر زور دیتے تھے۔ اس صورت میں بھی ان پر کوئی اتہام والزام عاید نہ ہونا چاہیئے کیونکہ ان کے یہ کام نفس پروری کے لیے نہیں بلکہ نفس کشی کے لیے تھے۔ نفس کا آخری اور سب سے زبردست عیب غرور و شہرت پسندی ہے اور غرور و شہرت پسندی کے عیب دُور کرنے کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ ایسے کام دیدہ و دانستہ کیے جائیں جن سے ہر طرف سے بدنامی، لعنت وملامت کے آوازے کسے جانے لگیں۔ اس متواتر ملامت کی برداشت سے نفس یقیناً حلیم ہو جائے گا اور دنیا سے بھاگ کر سیدھا خدا کی آغوش میں پناہ لے گا۔ نفس کو اس بات کا یقین ہو جائیگا کہ دنیا ظاہر پرست ہے۔ کسی کے باطن کی پاکی سے اسے کوئی غرض نہیں۔

شیخ صاحب کو دارا شکوہ ایسے نکتہ شناس مرد نے اپنے عصر کے گروہ ملامتیہ کا امام بے وجہ نہیں کہا۔"

دارا شکوہ نے حسین کی شراب نوشی اور داڑھی مونچھ منڈانے کے علاوہ ان کی چند ایک کرامتوں ہی کا ذکر کیا ہے اس کے سوا شیخ حسین کے متعلق دارا شکوہ کی شطحیات میں اور کچھ نہیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ڈاکٹر صاحب اس کتاب کو سب سے معتبر سمجھ کر اس کے مندرجہ واقعات اپنی دوسری کتاب "حالات و کافیاں مادھو لال حسین" میں درج بھی کرتے ہیں اور پھر شراب نوشی، ریش تراشی اور کرامات کی صحت و عدم صحت کی ذمہ داری راویوں پر ڈالتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ شاہ حسین کی کافیوں میں شراب کا کہیں نام نہیں آیا مگر کون کہہ سکتا ہے کہ ان کا کلام ان کے مطبوعہ اشعار سے زیادہ نہ ہوگا۔ پھر بھی انھوں نے اپنی بے اعتدالیوں کا اکثر جگہ اظہار کیا ہے۔ کیا کونڈی ڈنڈا، بھنگ، صافی، مرچ، رنگ، پوست، بالٹی، مٹکا اور کھانڈ (چینی) کا اہتمام کرنے کے بعد بھی شراب کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ ملاحظہ ہو:—

دنیا والے نوں دنیا دا مانا، ننگاں[1] نوں ننگ مٹی

ناں اسیں ننگ نہ دنیا والے ہسدی[2] جنی کھنی

---

[1] دنیاداروں کو دنیا پر مان ہوتا ہے مگر زندہ مستوں کو رندی پر ناز ہے۔

[2] ہمارے حال پر عورتیں تک ہنستی ہیں۔

دنیا چھوڑ فقیر تھئیے[1] سے جاگی پریم کئی
کہے حسین فقیر سائیں دا جانے آپ دھنی[2]

اور دیکھئے فقیر کی تمنا کیا ہے۔ کوئی حسرت رہ نہ جائے سے

گوڈا دئیں سوٹا دئیں کوٹھی دئیں بھنگ دی
صافی دئیں مرچاں دئیں بے[3] ہنتی دئیں رنگ دی
پوست دئیں باٹی دئیں چاچ[4] دئیں کھنڈ دی
گیان دئیں دھیان دئیں مہان پھسادھو سنگ دی
شاہ حسین فقیر سائیں دا ایہہ دعا ملنگ[5] دی

ڈاکٹر موہن سنگھ کو باوا بدھ سنگھ سے بھی شکایت ہے۔ ان کے متعلق لکھتے ہیں :۔

"یہ غلط ہے کہ شیخ حسین کی پریت ہندوؤں کے ایک لڑکے مادھو لال سے تھی۔
اس کو باواجی نے ہیر رانجھے کا قصہ بنا دیا ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ باوا بدھ سنگھ نے نہیں بلکہ شاہ حسین نے خود ہی اس واقعہ کو اپنے مختلف اشعار میں ہیر رانجھے کا قصہ بنا دیا ہے۔ وہ انہی دو لفظوں کے ہیر پھیر میں اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں اور ان کی تقریباً پندرہ بیس کافیوں میں ہیر رانجھے کے الفاظ موجود ہیں۔ چند ایک ملاحظہ ہوں سے

ماہی ماہی کوکدی میں آپے رانجھن ہوئی
رانجھن رانجھن مینوں سبھ کو ئی آکھو ہیر نہ آکھو کوئی

یعنی رانجھے کے نام کا ورد کرتے کرتے میں خود رانجھا بن گئی۔ اب مجھے کوئی ہیر کے نام سے نہ پکارے۔

ڈولی پائے لے چلے کھیڑے نا کیتوں عذر نہ زور
رانجھن ساتوں کنڈیاں پائیاں دل وچ لگیا زور
مجھی وانگوں پئی تڑپھاں ہتا در دے سجن ڈور
کہے حسین فقیر سائیں دا کھیڑیاں دا کوڑا شور

---

[1] ہم نے دنیا چھوڑ کر فقر اختیار کیا۔ اس سے محبت جاگ اٹھی۔
[2] اب اللہ بہتر جانتا ہے ہمارا حشر کیا ہوگا۔
[3] بے اندازہ
[4] صحبت صالح کی عظمت
[5] ملنگ درویشوں کا ایک فرقہ ہے جسے ننگ و ناموس کی پروا نہیں ہوتی۔

اس کافی میں ہیر کی شادی، کھیڑوں کا ڈولی لے جانا اور اس موقعہ پر ہیر کا تلملانا اور بے قراری ظاہر کرنا دکھایا گیا ہے اور آخر میں سب کچھ خدا کے ہاتھ سونپ کر دل کو تسلی دی گئی ہے۔

ہاتھی عشق مہاوت رانجھا۔ انکس دے دے ہوڑیئے
کہے حسین فقیر سائیں دا لگڑی پریت نہ توڑیئے

اس میں ہاتھی کو عشق، مہاوت کو رانجھا اور منزل کی دشواریوں کو کھونٹے سے تشبیہ دے کر محبت نبھانے کی استدعا کی گئی ہے۔

جے ٹک رانجھا درس دکھاوے تاں ہیر عذابوں چھُٹے ۔۔۔۔ شاہ حسین فقیر سادے رانجھے باجھوں برہوں ستاوے

جے ملساں تاں شانت آوے

اس میں بھی ہیر کا ماہئ سے آپ کی طرح رانجھے کے فراق میں تڑپنا دکھا کر اپنے ہجر کی مجبوری اور لذت وصال کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔

جنگل بیلے پھرا ڈھونڈھیندی رانجھن میرے سنگے
حسین آئیاں میرا ڈھول نہ آیا ہیر کوکے وچ جھنگے

یہاں رانجھے کا ہیر کے باپ کی ملازمت اختیار کر کے جنگل میں بھینسیں چرانے کی طرف اشارہ ہے۔

منشی مولا بخش کشتہ کے متعلق ڈاکٹر دیوآنہ لکھتے ہیں: —

"منشی مولا بخش کشتہ نے اپنی کتاب "پنجاب دے ہیرے" میں لکھا ہے کہ حسین پنجابی کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے لیکن نہ اس اطلاع کا ماخذ بتایا ہے اور نہ ہی ان کا فارسی کا کوئی شعر ہی لکھا ہے۔ اس لیے یہ بالکل غلط ہے۔"

کشتہ صاحب نے چونکہ اپنی کتاب پنجابی زبان اور گورمکھی حروف میں لکھی تھی اس لیے ہو سکتا ہے کہ انھوں نے شاہ حسین کے فارسی اشعار کا اندراج مناسب نہ سمجھا ہو لیکن یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ شاہ حسین عربی فارسی دونوں زبانوں کے عالم تھے۔ اگر وہ پنجابی میں شعر کہہ سکتے تھے تو فارسی زبان میں شعر کہنا ان کے لیے کیا مشکل تھا۔ البتہ جس طرح ان کے اکثر پنجابی اشعار بے وزن اور قافیہ ردیف کی قید سے آزاد ہیں اسی طرح ان کے فارسی اشعار بھی ہیں۔ اور چونکہ وہ اپنی موج اور بے خودی و مستی کے عالم میں شعر کہتے تھے اس لیے وہ علم عروض کا چنداں خیال نہ رکھتے تھے، ان کے بعض فارسی اشعار تحقیقات چشتی میں ایک بہت ہی قدیم بیاض سے نقل کیے گئے ہیں جو آج سے ایک صدی قبل اس زمانے کے سجادہ نشین مزار مادھو لال حسین کے پاس موجود تھی۔ بخوف طوالت ان کے صرف دو شعر جن کا وزن قافیہ درست ہے۔ نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں ؎

شاہدے خود را چو دیدم مست مست ۔۔۔۔ تا لب لعلش رسیدم مست مست
ما ہمہ دردیم و درماں نیز ہم ۔۔۔۔ بادہ صافیم و مستاں نیز ہم

افسوس کہ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوآنہ نے اپنی کتاب میں سب سے چوکھی جنگ لڑی مگر ان کا کوئی تیر نشانے پر نہ بیٹھا اور یہ ثابت ہو گیا کہ ؎

دیوانگی ہے عقل نہیں ہے کہ خام ہو ۔۔۔۔ دیوآنہ ہر لحاظ سے دیوانہ چاہیئے

شاہ حسین ۱۰۰۸ھ/۱۵۹۹ء میں شہنشاہ اکبر کی وفات سے سات سال قبل فوت ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر ۶۳ برس تھی۔ صاحب حقیقت الفقرا نے "مست عشق ازل" اور "مے محبت مست" سے آپ کی تاریخ وفات نکالی ہے۔ مفتی غلام سرور لاہوری نے خزینۃ الاصفیا میں آپ کی تاریخ وفات کا قطعہ یوں درج کیا ہے ؎

طالب عشق و عاشق جانباز — ماہ عالم حسین نور العین

گشت خوشحال دل (۹۴۵) بتولیدش — نیز سلطان سید الثقلین

ہم رقم شد انیس دیں سرمست — طرفہ تولید او بزینت و زیں

گفت سرور محقق سرمست — سال ترحیل آں شہ کونین

شیخ محمود (۱۰۰۸) و نیز شیخ زماں (۱۰۰۸) — رحلتش ہست شمع عشق حسین

ہست فیض حسین (۱۰۰۸) وصالش ہم

اہل دل بے نیاز خلق حسین

ایضاً

شاہنشہ دیں حسین مخدوم — خورشید زمیں حسین مخدوم

درسال ولادتش رقم کن — ہادی و امیں (۹۴۵) حسین مخدوم

درسال وصال او بفرما

ہادیٔ یقیں (۱۰۰۸) حسین مخدوم

ابتدا میں مزار آپ کا شاہدرہ کے پاس بنایا گیا مگر جب دریائے راوی نے اپنا رُخ بدلا تو آپ کا صندوق نکال کر باغبانپورہ کے شمال میں اس جگہ دفن کیا گیا جہاں اب آپ کی خانقاہ واقع ہے۔ ۱۰۵۶ھ/۱۶۴۶ء میں جب آپ کا خلیفہ مادھو فوت ہوا تو وہ بھی آپ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ احاطہ مزار کی چار دیواری پختہ ہے۔ دروازہ کلاں جس سے آمد و رفت ہوتی ہے بجانب غرب ہے۔ احاطے کے درمیان میں اونچے چبوترے پر قبر کے تعویذ ہیں۔

شاہان چغتائی میں سے جو بادشاہ لاہور آتا وہ آپ کے مزار پر حاضر ہو کر نذریں چڑھاتا اور مجاوروں اور سجادہ نشینوں کی پرورش کرتا۔ نادرشاہ اور احمد شاہ ابدالی جیسے حملہ آور بھی اس درگاہ پر آ کر جھکے۔ ناظمان لاہور بھی آپ کے عقیدت مند تھے۔ نواب زکریا خاں نے آپ کی خانقاہ سے مغرب کی جانب ایک مسجد بنوائی جو اب تک موجود ہے۔ معز الدین جہاندار شاہ جب اپنے بھائیوں اور دیگر رشتہ داروں کے ہاتھ سے تنگ آ کر آپ کے مزار پر آیا تو اس نے عہد کیا کہ اگر خداوند کریم نے مجھے بادشاہی عطا کی تو میں آپ کے مزار پر طلائی چوبوں کا سائبان اور روپیہ اشرفی سے بھری ہوئی دو دیگیں نذر کروں گا۔ چنانچہ جب وہ دوبارہ تخت نشیں ہوا تو اس نے دلی خلوص اور عقیدت مندی سے اپنا وعدہ پورا کیا۔ جس سے مزار کا احاطہ اور چار دیواری حضرت بلاول کی سعی سے بہت عمدہ تیار ہو گئی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے آپ کی کرامات کا حال سُن کر خانقاہ کی مرمت اور سالانہ عُرسوں کے اخراجات کے لیے مفصلہ ذیل معافیاں عطا کیں :-

(۱) چاہ موراں والہ جس کی زمین ۲۴۳ بیگھہ تھی۔
(۲) چاہ مان والا جس کی اراضی ۲۰ بیگھہ تھی۔
(۳) چاہ پیرو والا جس کا رقبہ ۴۳ بیگھہ تھا۔
(۴) چاہ لکینم جس کی زمین ۶۶ بیگھہ تھی۔
(۵) ضلع امرتسر میں ایک چاہ جس کی زمین ۱۰ بیگھہ تھی۔
(۶) موضع فتح گڑھ ضلع لاہور میں ایک بیگھہ زمین۔
(۷) اٹاری ضلع امرتسر میں سات بیگھہ زمین۔
(۸) موضع کوٹ بیگم میں تین بیگھہ زمین۔

ان کے علاوہ مہاراجہ خاص عرس اور بسنت کے دن بھی بہت کچھ امداد دیا کرتے تھے۔ وہ بسنت کا دربار یہیں لگاتے اور یہیں نذریں وصول کرکے امرا کو خلعتیں بخشتے تھے۔ مہاراجہ دلیپ سنگھ کے عہد تک یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا مگر سکھوں کی سلطنت کے زوال کے ساتھ سارا کھیل بگڑ گیا اور آمدنی بند ہو گئی۔

عرس سال میں ایک بار اب بھی ہوتا ہے۔ پہلے قمری حساب سے یکم رجب کو ہوتا تھا۔ اس صورت میں عرس کی تاریخ کبھی سردیوں میں اور کبھی گرمیوں میں پڑتی تھی۔ اور نزدیک و دور سے آنے والوں کو موسم کے ادل بدل سے تکلیف ہوتی تھی۔ ۱۸۶۲ء سے قمری تاریخ بدل کر مارچ کا آخری ہفتہ مقرر کر دیا گیا۔ اس رات مزار اور اس کے تمام احاطے میں چراغ جلائے جاتے ہیں۔ اس بنا پر عوام میں یہ عرس میلہ چراغاں کے نام سے مشہور ہو گیا ہے۔ چراغاں کی بہار دیکھنے اور مزار پر فاتحہ پڑھنے کے بعد لوگ تفریح کے لیے شالامار باغ میں چلے جاتے تھے جو بالکل ہی قریب واقع ہے۔ آہستہ آہستہ عرس کو تو لوگ بھول گئے اور اسے شالامار باغ کا میلہ ہی سمجھنے لگے۔ یہ میلہ پنجاب کا ایک قومی تہوار بن گیا ہے۔ جس میں شہری اور دیہاتی یکساں دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔ ۱۸۸۰ء سے اس موقعہ پر مال مویشی کی منڈی بھی لگتی ہے اور اس میلہ کو ایک تجارتی حیثیت حاصل ہو گئی ہے ــــ مرتب]

شاہ ابوالمعالیؒ

دید کے قابل ہے شہ ابوالمعالی کا مزار
جس جگہ ہر اہل دل کو فاتحہ خواں دیکھئے

آپ کا اصل نام شاہ خیرالدین محمد اور مشہور شاہ ابوالمعالی تھا۔ سلسلۂ قادریہ کے نامی بزرگ تھے۔ غربتی اور معالی تخلص تھا۔ فارسی اور عربی میں شعر کہتے تھے۔ صوفیانہ عقائد کی کئی کتابوں کے مصنف اور صاحب دیوان تھے۔ رسالہ غوثیہ حضرت غوث الاعظم کی منقبت میں اور تحفۂ قادریہ ان کی کرامتوں کے اظہار میں لکھا۔ حلیۂ سرور دو عالمؐ گلدستہ باغ ارم۔ مونس جاں اور زعفران زار بھی آپ کی یادگار ہیں۔ علاوہ ازیں پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ایک قلمی نسخہ ہشت محفل نام موجود ہے جس میں آپ کے وہ ملفوظات ہیں جو آپ کے صاحبزادے محمد باقر نے جمع کیے تھے۔

[آپ کے بزرگ سادات کرمان سے تھے۔ اس لیے آپ کرمانی بھی کہلاتے تھے۔ ہسٹری آف لاہور کے مصنف سید محمد لطیف نے (صفحہ ۲۰۳ پر) پنجاب میں آپ کا وطن بھیرہ ضلع شاہ پور لکھا ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے نسبت اویسی رکھتے تھے آپ نے ان کا مرتبہ "اولیائے اوّلین و معصرین و آخرین" میں سب سے بلند و بالا دکھایا ہے۔ لکھتے ہیں ؂

جز دم قادریم نیست بر خاطر حاضر
ہست در خیر و نوشتم بزبان بافت در

بلکہ آپ نے حضرت غوث پاکؒ کی شان میں ایک قصیدہ لکھا ہے۔ بقول صاحب مقامات معالیہ اکثر مشائخ قادریہ چشتیہ سہروردیہ اس کا ورد کرتے رہتے ہیں۔ یہ بھی لکھا ہے کہ جب کسی کو کوئی مشکل پیش آئے تو مغرب کے بعد اس قصیدہ کو پڑھے۔ کشائش رزق اور روشن ضمیری کے علاوہ ہر ایک مصیبت سے نجات پائے گا۔ اس قصیدہ کا نام مفرح الازاح ہے۔ اگر کوئی خود نہ پڑھ سکتا ہو تو قصیدہ ہاتھ میں لے کر کھڑا رہے اور اگر خواندہ ہے تو بھی کھڑا ہو کر پڑھے۔ قصیدہ کے چند ابیات حسب ذیل ہیں ؂

ہست دائم در طواف کعبۂ کویش دلم ۔۔۔ در رہِ صدق و صفا ایں است حج اکبرم
چشم من تا از ہوائے خلد کویش کوثر است ۔۔۔ آب حسرت می خورد رضواں ز حوضِ کوثرم
چند روزے شد کہ محرومم ازاں رو مردہ ام ۔۔۔ جلوۂ جاں پرورم فرما کہ تا جاں پرورم
اے صبا از من بہ آں سلطان جیلانی بگو ۔۔۔ سوختم اکنوں بیا بر بادۂ خاکسترم
بے جمالِ جاں فزایت زندگانی مشکل است ۔۔۔ رحمتے در نہ تن و ایں حسرتہ باہم میبدرم
نیست یا غوثے بہ من جرمم و گنہ از ہیچ رو ۔۔۔ رو مکش از من کہ بیں بیدل خراب و اخترم

چیست در پیش کرم ہائے تو جرم غربتی
الکرم یا غوث الاعظم بالترحم الکرم

داراشکوہ نے سفینۃ الاولیا میں اور حضرت کے فرزند کلاں سید شاہ محمد باقر نے فوائد دو جہانی میں آپ کی فضیلت اور آپ کی کرامتوں کا ذکر کیا ہے۔ آپ ۱۰ ذی الحجہ عید الضحیٰ کے دن ۹۶۰ھ/۱۵۵۳ء کو پیدا ہوئے اور ۱۶ ربیع الاول ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء کو بعہد جہانگیر وفات پا گئے۔ تاریخ لاہور کے مصنف نے آپ کا انتقال بعہد شاہجہان لکھا ہے۔ وہ صحیح نہیں۔ آپ کے والد کا نام سید رحمت اللہ تھا جن کے دو اور بھائی تھے۔ ایک حضرت شیخ داؤد بندگیؒ جن کا مزار شیر گڑھ میں نہایت شاندار گنبد نما ہے۔ دوسرے سید جلال الدین جن کا مزار سندھ میں ہے۔ شاہ ابوالمعالیؒ اپنے چچا حضرت شیخ داؤد بندگیؒ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ انہی کے ارشاد سے شیر گڑھ کو خیر باد کہہ کر اکبر کے زمانہ میں لاہور آئے۔ عمارات و تعمیرات کا بہت شوق تھا۔ شیر گڑھ سے لاہور تک اکثر مقامات میں آپ نے کنوئیں، تالاب اور باغ تعمیر کرائے۔ اس وقت بھی شیر گڑھ سے لاہور کے درمیان اکثر عمارات پختہ آپ سے یادگار ہیں۔ چنانچہ صاحب خزینۃ الاصفیا (صفحہ ۱۴۹ پر) لکھتے ہیں :۔

"از شیر گڑھ تا لاہور چند جا مقامات و سے نہ عمارت پختہ اند و چھوک ہائے شاہ ابوالمعالی اشتہار دارند"

آپ کے فرزندوں میں شاہ محمد باقر صاحب علم و فضل گزرے ہیں۔ ان کی تصنیف فرائد دو جہانی زیادہ تر شاہ ابوالمعالیؒ کی کرامتوں اور پیری و مریدی کے تعلقات ہی سے وابستہ ہے۔ صاحب تذکرۃ العارفین نے بھی آپ کی اکثر کرامتیں درج کی ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت ملا شاہ بدخشانی کے دل میں جو دارا شکوہ کے مرشد تھے ایک دن خیال گزرا کہ میں دل و جان سے حضرت غوث الاعظمؒ کا معتقد ہوں۔ حضرت پیران دستگیرؒ کو بھی میرے اس اعتقاد کی خبر ہے کہ نہیں۔ رات کو خواب میں دیکھا کہ ایک لق و دق بیابان میں اکیلے کھڑے ہیں۔ اتنے میں حضرت پیران پیر تشریف لائے۔ ایک دستار سفید عنایت فرما کر کہا: "اے ملا شاہ! ہم تمہارے حال سے بے خبر نہیں۔ اس کے ثبوت میں تمہارا سر برہنہ دیکھ کر یہ دستار تم کو عنایت کرتے ہیں۔ حضرت ملا شاہ فرماتے ہیں کہ جب میں صبح کے وقت خواب سے بیدار ہو کر گھر سے باہر نکلا تو حضرت شاہ ابوالمعالیؒ کا ایک خادم مجھے بلانے کے لیے آ رہا تھا۔ جب میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے ایک دستار سفید مجھ کو عنایت فرمائی اور کہا "یہ دستار رات کو حضرت غوث الاعظمؒ نے آپ کو بخشی تھی۔" ـــــ مرتب]

شاہ ابوالمعالیؒ کی وفات ۸۵ سال کی عمر میں ہوئی، اپنی زندگی ہی میں آپ نے اپنے مقبرہ کی تعمیر شروع کر دی تھی جس کی تکمیل آپ کی وفات کے بعد آپ کے فرزند شاہ محمد باقر کے ہاتھوں ہوئی۔ شاہ محمد باقر ہی نے آپ کے مزار کا گنبد حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے روضۂ مبارک کی طرز پر تعمیر کرایا۔ مقبرہ کے دو دروازے ہیں۔ ایک شمالی ایک جنوبی، جنوب رویہ دروازہ پر بہ خط عربی " اِنَّ اَولیاءَ اللّٰہِ لَا یَمُوتُونَ بَل اَحیاءٌ وَّ لٰکِن لَا یَشعُرُونَ " لکھا ہوا ہے۔ مقبرہ کے آٹھ در کشادہ، چار بند کل بارہ جن میں سات کھڑے لگے ہیں۔ بلند چبوترہ پر قبر ہے جو زمین مقبرہ سے ۲ فٹ اونچی ہے۔ چبوترہ پر تین قبریں اور بھی ہیں۔ ایک شاہ ابوالمعالیؒ کے فرزند کلاں شاہ محمد باقر کی۔ ایک شاہ محمد رضا خلف شاہ محمد فاضل آپ کے پوتے کی۔ تیسری آپ کے نواسہ حاجی شاہ محمد فاضل کی ہے۔ اس سے علیحدہ ایک چار دیواری ہے جس میں حضرت کے عزیزوں کی قبریں ہیں۔

عہد شاہان سلف سے اس مزار کے ساتھ دو چاہ معہ اراضی ایک موضع سیالاں تحصیل چونیاں میں اور دوسرا موضع خان پور ضلع شیخوپورہ میں بطور معافی واگذار ہیں۔ ان کے علاوہ موضع ملن وال میں بھی کچھ اراضی ہے اور یہ سب ان کی اولاد کی ذاتی جائداد تصور کی جا رہی ہے۔

حضرت شاہ ابوالمعالیؒ کے ارادت مندوں کی تعداد ہزارہا تک تھی۔ وہ ان کی زندگی میں بھی ان کی خدمت کرتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد مزار پر چڑھاوے بھی شروع رہے اور ان کے جانشینوں کی خدمت گزاری بھی ہوتی رہی۔ مزار کے چڑھاووں کی آمدنی ان کی اولاد ذکور و اناث میں تقسیم ہوتی ہے وہ اس طرح کہ نواسے چودہ ایام کی آمدنی کے حقدار ہیں۔ باقی ایام ان کے پوتوں کے حصے میں آتے ہیں۔

آپ کے مزار پر عرصہ دراز سے چار میلے ہوتے ہیں۔ ایک عرس کا میلہ جو نواسوں کی طرف سے ۵ ربیع الاول اور پوتوں کی طرف سے ۱۶ ربیع الاول کو ہوتا ہے۔ پھر عیدین پر بھاری میلے لگتے ہیں جن میں بے شمار خلقت جمع ہوتی ہے۔ ایک میلہ شب برات کو بھی ہوتا ہے۔ ان ایام میں قوالی کا بھی خوب چرچا رہتا ہے۔ لوگ کثرت سے جمع ہوتے ہیں۔ قوالی کے علاوہ اس مزار پر عیدین اور عرس کے دنوں میں طوائفوں کا ناچ بھی ہوتا تھا جس میں عوام کے علاوہ خواص بھی شریک ہوتے تھے بلکہ نہایت

کہ خود مہاراجہ رنجیت سنگھ بھی آتا رہا ہے۔

ایک مرتبہ عید الفطر کے دن نواب مظفر خاں شہید والی ملتان کے فرزند نواب سرفراز خاں کو جو اپنے بھائی نواب ذوالفقار خاں کے ہمراہ لاہور میں مقیم تھے۔ مہاراجہ نے شرق پور کا علاقہ جاگیر میں دے کر سہ پہر کے وقت روضۂ شاہ ابوالمعالی کی طرف کوچ کیا اس کی کیفیت صاحب عمدۃ التواریخ دفتر دوم کے صفحہ ۲۲۵ پر لکھتے ہیں:۔

"دو بتاریخ مذکور وقت سہ پہر سرکار دو لتمدار بنابر مشاہدہ اجتماع خلائق بہ تزک و تجمل مالا کلام بہ طرف روضۂ شاہ ابوالمعالی متوجہ شدہ۔ در مسجد بنا کردہ غوثہ خاں قیام فرحت ارتسام آوردہ۔ تا سہ پاس بہ ملاحظہ تماشائے طوائف رقاصہ مشغول شدند"

یہ فتح ملتان ۱۸۱۸ء کے بعد کا واقعہ ہے۔

رائے بہادر کنہیا لال تاریخ لاہور مطبوعہ ۱۸۸۴ء میں (جس کو آج ۱۹۴۴ء میں بوقت تحریر مضمون ساٹھ سال کا عرصہ ہو چکا ہے) صفحہ ۲۸۸ پر لکھتے ہیں کہ عرس کے دنوں میں خلقت کا بے پناہ ہجوم رہتا ہے۔ پہلے روز رات کو چراغاں ہوتا ہے اور طوائف رقاصہ آکر ناچتی ہیں۔ دوسرے دن قوالی ہوتی ہے۔

لیکن خدا بھلا کرے وزارت سکندری کا جس میں خانقاہوں اور مزاروں پر طوائفوں کے گاتے بجانے کے خلاف قانون پاس ہو گیا ہے۔ ورنہ اس سے پہلے اکثر بزرگان دین کے مزاروں پر طوائفوں کی وہ دھاچوکڑی ہوتی تھی اور ان کے دل پھینک قدر دانوں کی بدولت روپیہ کی بارش نہیں بلکہ ژالہ باری سے دین و ایمان اور شریعت اسلامیہ کی کھیتیاں تباہ ہو جاتی تھیں۔ چنانچہ قوالی کا سلسلہ تو اب بھی موجود ہے۔ لیکن مزارات کو ان بدعات اور تماشوں سے نجات مل چکی ہے۔

آج (۱۹۴۴ء) سے پچیس سال پیشتر حضرت شاہ ابوالمعالی کی اولاد سے ان کے سجادہ نشین سید طالب محی الدین عرف سید جناب شاہ قادری نے "کمالات قادریہ عرف مقامات معالیہ" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جو راقم کو بھی تحفۃً ملی تھی۔ اس کتاب میں بھی اولیاء اللہ کی کرامات۔ وظیفہ "شیئاً للہ" کی برکات۔ طالب و مرشد کے روحانی تعلقات اور پیری و مریدی کی ضرورت کا ذکر ہے۔ اور جو لوگ ان باتوں کے منکر ہیں ان کے دلوں اور کانوں اور آنکھوں پر مہر الٰہی (ختم اللہ علیٰ قلوبہم) ثبت کر کے ان کو گمراہ بیان کر کے مادرزاد اندھے لکھا گیا ہے۔

حضرت شاہ ابوالمعالی کے مزار پر بے شمار کبوتر رہتے ہیں۔ ان کی رسم سب سے پہلے آپ کے ایک صاحبزادے شاہ محمد درویش المشہور برقعہ پوش نے ڈالی تھی۔ رفتہ رفتہ رواج ہو گیا اور وہ جہانگیر کے زمانہ سے اب تک چلا آتا ہے۔

مقبرہ سے مغرب کی جانب آپ کی تعمیر کردہ ایک مسجد ہے جس کو سکھوں کے زمانہ میں غوثی خاں افسر توپ خانہ نے دوبارہ تعمیر کرایا تھا۔ مقبرہ کے اندر جو چوبی پنجرہ ہے وہ نور ایمان والہ سکنے زئی زین فروش نے آج (۱۹۴۴ء) سے ایک سال قبل بنوایا تھا۔ اس کے علاوہ بعض اور لوگوں نے بھی دالان اور کمرے مختلف اوقات میں تعمیر کرائے۔

مزار کا گنبد مختلف قبروں سے گھرا ہوا ہے۔ جنوبی دروازہ کے اندر دائیں طرف حکیم مفتی سلیم اللہ خاں استاد الاطبا (وفات ۹ جنوری ۱۹۲۷ء مطابق ۵ رجب ۱۳۴۵ھ) کی قبر ہے۔ ان کے پاس ہی چودھری عزیز الدین کی قبر پر اشعار ذیل درج ہیں:

یہ اشعار سید محمد حسین شاہ ساکن سجادہ نشین آلو مہار ضلع سیالکوٹ کے کہے ہوئے ہیں۔ شاہ صاحب جالکے ضلع سیالکوٹ میں میرے ہم درس تو نہ تھے البتہ ہم مدرسہ تھے۔ صاحبزادہ فیض الحسن احراری انھیں کے فرزند ہیں ؎

حیف صد حیف چودھری عزیز الدین   از مریداں خاص شاہ امین
بہر حکم قضائے رب قدیر   رخت بستہ بسوئے خلد برین
بہر سال تبدلئے کرد سروش   از و صالیش فل شدہ بزمین
۱۳۲۹ھ

ان قبروں سے مشرق کی سمت ایک اور قدیم احاطہ ہے جس میں کئی قبریں ہیں۔

شاہ ابو المعالیؒ کے مزار کے قرب و جوار میں بہت بڑا قبرستان تھا۔ یہیں زین خاں کے محلات تھے۔ انھی محلات کے انہدام پر یہ مقام میدان زین خاں کہلایا۔ اسی میدان کو لوگوں نے قبرستان بنا دیا۔ راقم نے قبرستان اور اس کے میدان میں بارہا عیدین کے میلے دیکھے ہیں۔ اب قبرستان کو مٹا مٹا کر پھر یہاں گلی کوچے اور مکانات بن گئے۔ صرف حافظ ولی اللہ محدث کاشمیری کا مزار چوک میوہ منڈی سے ذرا آگے فلیمنگ روڈ پر ایک معمولی سی چار دیواری میں سلامت رہ گیا ہے۔ اس چار دیواری میں پانچ سات قبریں ہیں۔ ایک علنگ جاروب کش کرزنی تعیش وہاں رہتا ہے۔ سنا ہے اس مزار کی خدمت اور حافظ صاحب کا عرس حاجی قادر بخش مرحوم کے خاندان کی طرف سے ہوتا ہے۔

چوک شاہ ابو المعالیؒ میں سرراہ ایک قدیم چار دیواری ہے جس کے اندر اور باہر نشیب میں ایوب شاہی خاندان کی قبریں ہیں۔ نشیب کی قبروں میں ایک قبر سلطان اسمٰعیل جان۔ ان کی اہلیہ اور شاہزادہ والا گوہر بیرسٹر (وفات ۲۲ فروری ۱۹۲۶ء) کی قبور ہیں۔ سلطان اسمٰعیل جان کی قبر کے تعویز پر علامہ اقبالؔ علیہ الرحمۃ کی طرف سے یہ قطعہ سال وفات درج ہے ؎

از جہاں شہزادہ اسماعیل رفت   آں امیر ابن امیر ابن امیر
از فلک آمد بگوشِ من ندا   سالِ آں مغفور از مغفور گیر
۱۳۲۹ھ

شاہ شمس الدین

شاہ شمس الدین کے روضہ کا باغ خوشنما
بن گیا ہے آج جس عبرت کا ساماں دیکھئے

شاہ شمس الدین سلسلۂ قادریہ کے سادات میں حضرت شاہ ابو اسحاق (مزنگ) کے مرید اور شاہ بلاول کے پیر بھائی تھے۔ اکبر اور جہانگیر کے زمانہ میں لاہور کے صوفیائے عظام میں شمار ہوتے تھے۔ جہانگیر ان کا بڑا احترام کرتا تھا اور شاہزادہ خرم (شاہجہاں) بھی ان کا ارادت مند تھا۔ ۱۲ رجب ۱۰۲۱ھ کو بزمانہ جہانگیر وفات پا گئے۔ شاہجہان نے کہ ان دنوں شاہزادہ تھا آپ کا روضہ تعمیر کرایا۔ روضہ کے چاروں گوشوں پر چار مینار تھے جو مسمار ہو کر پیوند خاک ہو چکے ہیں۔ قبر کا تعویز جس پر سبز غلاف پڑا رہتا ہے۔ اشتر کار ہے۔ اور اس پر یہ دو شعر بخط نستعلیق تحریر ہیں ؎

چو شمس الملل زیں جہاں رخت بست   بیاراست ایزد برائش بہشت
بہ جستم ز پیر خرد سال او   بگفت از سر لطف جائش بہشت

جب جہانگیر کو خبر ہوئی کہ حضرت کا انتقال ہو گیا ہے اور شاہزادہ خرم کے حکم سے ان کا مزار تعمیر ہو رہا ہے تو بادشاہ نے روضہ کے گرد ایک عالیشان باغ احداث کرایا۔ جو عہد محمد شاہی تک آباد تھا۔ اس کے بعد یہ باغ طوائف الملوکی اور شورش سکھاں کے ایام میں ناپید ہو گیا۔ مقبرہ ابھی تک موجود ہے اور گورنمنٹ ہاؤس اس مقبرہ کے قریب ہی ہے۔

باغ دلکشا[1] و مقبرۂ جہانگیر

غنچۂ دِل کھِل گیا کھِلتے ہی پھر مُرجھا گیا
دل کُشا میں فرحت و عبرت کا ساماں دیکھئے

یہ باغ دراصل نواب مہدی قاسم خان نے جو اکبر کے معزز اور نامی سرداروں میں تھا، ۹۶۵ھ/۱۵۵۸ء کے قریب دریائے راوی کے پار تعمیر کرایا۔ ان کے اقتدار کا اس سے اندازہ کر لو۔ کہ ان کا بھانجا حسین خان ٹکریہ لاہور کا گورنر رہا ہے۔

اس باغ کا کوئی خاص نام نہ تھا۔ اپنے بانی کے نام سے باغ مہدی قاسم خان ہی اس کا نام تھا۔ نواب چونکہ اولاد نرینہ سے محروم تھا اس لیے مہرالنساء بیگم جب نور محل سے نور جہاں بنی تو اس نے اس باغ پر قبضہ کر لیا اور نام اس کا دلکشا[2] رکھا اور دل کھول کر اس میں عمارات کا اضافہ کیا اور اس کو وہ رونق دی کہ شالا مار باغ سے پہلے اس کے مقابلہ کا کوئی باغ اُس وقت لاہور میں نہ تھا۔

جب باغ دلکشا میں جہانگیر دفن کیا گیا تو رفتہ رفتہ لوگ باغ دلکشا کا نام بھول گئے۔ اور اس کا نام مقبرہ جہانگیر مشہور ہو گیا آج لاہور میں بہت کم لوگ ہیں جن کو یہ علم ہے کہ مقبرہ جہانگیر جس چار دیواری کے اندر واقع ہے اس کا نام کبھی باغ مہدی قاسم خان اور باغ دلکشا بھی تھا۔

چار دیواری کے اندر باغ کی زمین ایک سو بیگھہ ہے۔ تیس بیگھہ زمین عمارتی ہے۔ باغ کے اندر پختہ روشیں اور سڑکیں موجود ہیں۔ یہ عالیشان باغ خیابانوں فواروں حوضوں اور بارہ دریوں سے آراستہ ہے اور بلند و پختہ چار دیواری میں محدود ہے۔ غربی دیوار میں بہت بڑا دروازہ ہے جس میں سے ہاتھی معہ عماری گذر سکتا ہے۔ چار دیواری کے باہر چار بہت بڑے وسیع کنوئیں موجود تھے جن میں سے ایک کے متعلق رائے بہادر کنہیا لال (۱۸۸۴ء میں) لکھتے ہیں دریا بُرد ہو چکا ہے۔ غربی دیوار کی طرف جو کنواں ہے وہ اب تک موجود ہے۔ اس کنوئیں میں اب ٹیوب ویل لگا دیا گیا ہے۔ جس سے باغ سیراب ہوتا ہے۔ یہ بڑا دروازہ جس میں سے ہاتھی معہ عماری گذر سکتا تھا ہمارے دیکھتے دیکھتے بند ہو گیا ہے۔ باغ کا اصل دروازہ یہی تھا۔ اس دروازہ کی عمارت سنگ سرخ کی تھی جس پر سنگ مرمر سے گل کاری کی گئی تھی۔ اوپر اللہ کا نام کندہ تھا۔ یہ دروازہ دو منزلہ ہے اور پچاس فٹ بلند ہے۔ اس کے چاروں گوشوں پر چھوٹے چھوٹے چار مینار ہیں۔ اس دروازے کے بالمقابل ایک بارہ دری تھی جو آج نابود ہے۔

---

[1] مفصل حالات کے لیے دیکھو راقم کی تصنیف "لاہور عہد مغلیہ میں"

[2] جج محمد لطیف نے ہسٹری آف لاہور صفحہ ۲۵۰ پر اس باغ کا نام باغ دل آمیز یا باغ دلکشا لکھا ہے۔

باغ کی مشرقی دیوار اور اس دیوار کی بارہ دری کو دریا نے برباد کر دیا۔

اس باغ کے اندر بارہ حوض تھے۔ ہر حوض میں فوارے پانی کی اچھل کود سے دل بہلاتے تھے۔ ایک حوض دریا برد ہو چکا ہے۔

اس باغ کے قدیم درختوں میں چند ایک درخت پیپل و برگد وغیرہ موجود ہیں۔ کھجوروں کے درخت بھی نسلاً بعد نسلاً قدیم نخلستان کی یاد دلاتے چلے آ رہے ہیں۔ مگر اب نئے فیشن اور انگریزی طرز کے مطابق بہت سی نئی روشیں بھی بن گئی ہیں اور نئی قسم کے گل و گلزار بھی وہاں دکھائی دیتے ہیں۔

عہد محمد شاہی کا ایک شاعر میر عبدالعزیز زنجانی لاہوری اپنے ایک طویل قصیدہ میں جو لاہور کے باغات اور محلوں اور گلی کوچوں کے متعلق ہے۔ دلکشا کے متعلق لکھتا ہے ؎

به گلگشت نعیم ار عبره خواہی دلکشا باغیست — که هر گل از نظاره رشک روئے حوریاں بینی

چو لیلیٰ لاله را خنداں و مفتوں وار چیماں بینی — چو مجنوں بید مجنوں را دل افگار و نواں بینی

بیان سبزه را ایں لاله را ایں سایه و ایں گل

ندارد آں لطافت ها که وصفش در بیاں بینی

فصیل باغ کی دیواروں پر چاروں طرف ایک مسقف غلام گردش بنی ہوئی ہے جو شاہی باڈی گارڈ کے سپاہیوں اور خدام سلطنت کے قیام کے لیے مخصوص تھی۔

جہانگیر نے ۱۰۳۶ھ مطابق ۱۶۲۷ء میں وفات پائی۔ باغ دلکشا کے عین وسط میں شاہجہان کے حکم سے اس کا مقبرہ تعمیر کیا گیا جس پر دس لاکھ روپے لاگت آئی۔ اس کے مصارف کے لیے جاگیر مقرر ہوئی۔ قرآن پڑھنے والے پانچ سو ملازم رکھے گئے۔ جو نوبت بہ نوبت جہانگیر کے مزار پر قرآن شریف پڑھا کرتے تھے۔ جب زوال سلطنت مغلیہ کے بعد سکھ حکومت کے عروج کا زمانہ آیا تو نہ جاگیر رہی نہ قرآن خواں حافظ رہے۔ مسلمانوں کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ وہ مزاروں کا کیا خیال رکھتے۔

مزار ہشت پہلو اندر سے گنبد نما ہے۔ درمیانہ میں ایک چبوترہ سنگ مرمر کا عرضاً ۹ فٹ، طولاً ۱۳ فٹ اور ارتفاعاً ½ ۱ فٹ ہے۔ اس چبوترہ پر قبر کا تعویز سنگ مرمر کے ایک ٹکڑہ کا ہے۔ جو ½ ۲ فٹ بلند، پونے دو گز لمبا اور ڈیڑھ گز چوڑا ہے۔ چبوترہ اور قبر پر سنگ عقیق۔ سنگ لاجورد۔ سنگ سلیمانی نیلم۔ زہر مہرہ۔ سنگ مرجان۔ سنگ ابری وغیرہ قیمتی پتھروں سے گلکاری کی ہوئی ہے۔ تعویز کے دائیں بائیں باری تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں۔ سرہانے کی طرف بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھ کر یہ آیت درج ہے "ھو الغفار الذنوب قال اللہ تبارک وتعالیٰ یا عبادی الذین اسرفوا علیٰ انفسھم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا انہ ھو الغفور الرحیم۔ ایک طرف کل نفس ذائقۃ الموت کی تمام آیت تحریر ہے۔ سر کی طرف لکھا ہے:۔ ھو اللہ الذی لا الٰہ الا ھو عالم الغیب والشھادۃ ھو الرحمٰن الرحیم۔ پائینتی کی طرف یہ تحریر ہے۔ مرقد منور اعلیٰ حضرت غفران پناہ نورالدین محمد جہانگیر بادشاہ ۱۰۳۶ھ۔

مقبرہ کا اندرونی فرش سنگ مرمر۔ سنگ مریم۔ سنگ موسیٰ۔ سنگ ابری وغیرہ کے مختلف پتھروں سے مزین ہے۔

جس طرح اس مقبرہ کی عمارت عالیشان تھی اور شاہی شان و شوکت کا اس سے اظہار ہوتا تھا ویسا ہی سکھوں نے اس کے ساتھ سنگدلی کا ثبوت دے کر اس کو عبرت انگیز بنا دیا۔ اس مقبرہ کو کس قدر صدمے پہنچے اور اس کے ساتھ سکھ حکومت نے کیا سلوک کیا۔ اس کی کیفیت رائے بہادر کنہیا لال کی تاریخ لاہور کے صفحات ۲۲۱ تا ۲۲۶ میں درج ہے۔ یہاں کچھ مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔

مقبرہ کی منڈیروں پر سنگ مرمر کی جالیوں کے علاوہ شمع جلانے کے جو مرمریں ستون تھے۔ وہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حکم سے اکھاڑ کر امرتسر پہنچائے گئے۔ اور دربار صاحب کے پل پر لگائے گئے۔ پھر اور مقامات سے جس قدر قیمتی پتھر اُتروائے گئے وہاں چونے کا پلستر کرا دیا گیا۔ مقبرہ کا دروازہ مغرب کی جانب ہے اور مقبرہ کا کمرہ اوپر سے مسقف ہے۔ اس سقف کے اوپر بالائی چبوترہ پر پھر سنگ مرمر کی قبر بنائی گئی تھی جو نشان کے طور پر تھی۔ یہ دونوں چھتیں سنگ مرمر کی تھیں۔ بعض کہتے ہیں کہ چھت کے اوپر بارہ دری تھی جو مہاراجہ کے حکم سے اتروالی گئی۔ بعض کے خیال میں سوبھا سنگھ یا لہنا سنگھ حاکم لاہور نے یہ سلیں اتروالیں اور چونکہ اس طرح سے قبر بے پردہ ہو گئی تھی اور جب کبھی بارش ہوتی تھی تو قبر اور اس کی عمارت کو نقصان پہنچتا تھا، اس سبب اس نے اس پر چوبی چھت بنوا دی۔[1]

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حکم سے ارجن سنگھ پسر ہری سنگھ نلوہ بھی اس جگہ کچھ عرصہ مقیم رہا۔ اس کے ایام قیام بھی اس عمارت کے لیے ہولناک زلزلہ سے کم نہ تھے۔ اس نے کئی جگہ سے سنگ مرمر کی جالیاں اکھڑوا لیں۔ پھر مہاراجہ نے یہ مقبرہ اپنے فرانسیسی فوجی افسر جنرل امائز کو رہنے کے لیے دیا۔ جس کی وفات کے بعد ایک وقت ایسا آیا کہ مسلمانوں ہی نے مسلمانوں کی اس فلک پایہ نگاہ عمارت کو برباد کرنا شروع کیا۔ یعنی جب امیر دوست محمد خاں والیٔ افغانستان کا بھائی سردار سلطان محمد خاں بھائی سے ناراض ہو کر لاہور آیا تو مہاراجہ نے اس کو شاہدرہ جاگیر میں دے کر یہ باغ اور مقبرہ اس کے حوالے کر دیا۔ وہ چند سال اس باغ اور مقبرہ کی عمارتوں میں رہا۔ اندر کی دیواروں میں جس قدر نگینے تھے اس کے ہمراہی وحشی افغانوں نے پتھر توڑ کر ان کو نکال لیا اور باغ کو اپنی بے تمیزی اور گھوڑوں اور جانوروں کا اصطبل بنا کر خراب کر دیا۔

ان صدمات کے باوجود مقبرہ اور اس کی عمارت کی خوش اسلوبی، استقامت، پائداری اور سنگینی دیکھ کر معمار خود حیران رہ جاتا ہے۔

مقبرہ کے اوپر جانے کے لیے چاروں طرف سنگ سرخ کے زینے بنے ہوئے ہیں۔ چاروں گوشوں پر چار برج ہیں اور ہر برج پر ایک ایک مینار۔ ہر مینار سو فٹ بلند ہے اور اس میں اکسٹھ سیڑھیاں ہیں۔ ہر مینار کی ہر ایک کھڑکی میں جو ہوا اور روشنی کے لیے ہے۔ سنگ مرمر کے جالی دار کٹہرے تھے۔ وہ بھی مہاراجہ نے اکھڑوا لیے اور ان کی جگہ خشتی چونے کے کٹہرے بنوا دیئے۔

مقبرہ کی عمارت ایک سنگین مربع چبوترے پر ہے جس کا ہر ضلع ۲۴۰ فٹ ہے۔ یہ پانچ فٹ بلند ہے۔

---

[1] یہ چوبی چھت نہایت بدنما تھی اور ایسی نفیس عمارت میں بڑی بدمذاقی کا ثبوت دیتی تھی۔ اس لیے محکمہ آثار قدیمہ نے ۱۹۰۶ء میں اسے گرا دیا اور چھت کو سنگ مرمر کی سلوں سے ڈھک دیا۔ (مرتب)

الحاق پنجاب کے بعد انگریز حکام نے ۹۰-۱۸۸۹ء میں مقبرہ کی مرمت کرائی جس پر ساڑھے بارہ ہزار روپیہ صرف ہوا۔ اس کے بعد بھی مرمت کا کام جاری رکھنے کے لیے اکتالیس ہزار چھ سو روپیہ کی منظوری دی گئی۔ انھوں نے چھت کی منڈیروں پر سنگ مرمر کی جالیاں لگوائیں۔ باغ از سر نو آباد کیا۔ مقبرہ کی بالائی چھت جو لکڑی کی بنائی گئی تھی، بالکل خراب ہو گئی تھی۔ رائے بہادر کنہیا لال انگزکٹو انجینئر و مولف تاریخ لاہور کی معرفت کئی ہزار روپے کی لاگت سے مرمت کرائی گئی۔ جب دریا اس باغ اور مقبرہ کی چار دیواری سے ٹکرانے لگا تو گورنمنٹ انگریزی نے کئی ہزار روپیہ خرچ کر کے ایک بند بنوایا جس سے مقبرہ آئندہ کے لیے غرقابی کے اندیشہ سے بچ گیا۔

لیڈی ڈفرن نے جب وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن کے ہمراہ اپریل ۱۸۸۵ء میں لاہور کی سیاحت کی تو اس نے مقبرہ کے متعلق اپنی والدہ کو خط میں لکھا :-

> "مقبرہ بھی ایک بڑی مربع عمارت ہے جس کے کونوں پر چار بلند مینار ہیں۔ اس کے سقف اور برآمدے نقش و نگار سے خوب آراستہ ہیں اور مقبرہ میں داخل ہونے کے تمام راستوں میں تراشے ہوئے اور جالی دار مرمریں دروازے ہیں۔ قبر سفید ہے اور اس میں اطالوی وضع پر رنگین مرمر کے ٹکڑوں کا کام کیا گیا ہے۔ اس عمارت کی چھت بھی مرمریں ہے۔ پھر ہم اس سے اور بھی اوپر ایک مینارے کی آخری حد تک شہر کے نظارے کے لیے پہنچے۔ یہ واقعی ہمارے لیے ایک ناشائستہ اور نازیبا امر تھا کہ جہانگیر کی قبر کے اوپر ہم چائے نوشی کرتے لیکن ہم نے ایسا کیا اور اس نظارے سے لطف اندوز ہوئے۔"

[قیام پاکستان کے بعد ہماری اپنی حکومت نے اس مقبرہ کی مرمت کے لیے پونے دو لاکھ روپیہ کی منظوری دی۔ لیکن چونکہ سنگ مرمر، سنگ احمر، سنگ خطوط، سنگ بدل اور سنگ سیاہ پاکستان میں دستیاب نہ ہوتے تھے۔ اس لیے یہ ہندوستان سے درآمد کیے گئے۔ ان کے پہنچنے میں کچھ دیر لگی۔ اس دوران مقبرہ کے مینار کا ایک چھجا خود بخود گر گیا جس کی وجہ سے سیر کرنے والوں میں سے ایک مرد ایک عورت ہلاک اور پانچ چھ افراد مجروح ہو گئے۔ محکمہ آثار قدیمہ نے اس کے بعد میناروں میں داخلہ بند کر دیا اور خطرے کے نشانات بھی نصب کر دیے۔ اب مرمت کے بعد یہ مینار اپنی اصلی حالت پر آ گئے ہیں اور مقبرہ کے دوسرے حصوں میں کافی اصلاح ہوئی ہے۔

اس باغ میں ہر سال بار کا میلہ نہایت دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ یہ عام طور پر گرمیوں میں آتا ہے۔ جب آفتاب کی حدت جوبن پر ہوتی ہے۔ دھوبی اور شہر کے بے فکرے اس میں بکثرت حصہ لیتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہر اتوار کو اکثر شرفا اور سیاحت پسند لوگ پارٹیاں بنا کر تفریح طبع کے لیے اس باغ میں آتے ہیں اور دوپہر کا کھانا اسی جگہ کھا کر شام کو واپس جاتے ہیں۔ اہل اخبارات میں سے کارخانہ پیسہ اخبار لاہور کا برسوں تک یہ معمول رہا کہ وہ ہر سال اپنے عملے اور کارخانہ کے ملازمین کو مقبرہ جہانگیر میں ایک شاندار دعوت دیتا۔ اب چند برسوں سے اخبار کے ساتھ یہ دستور بھی بند ہے۔

۷؍ جنوری ۱۹۲۳ء کی سہ پہر کو اس باغ میں ایک عظیم الشان گارڈن پارٹی منعقد ہوئی جس میں چھ سات سو معزز اصحاب لاہور، امرتسر، گوجرانوالہ اور شیخوپورہ وغیرہ مقامات سے مدعو تھے۔ سرجان مینارڈ، لارڈ میکلیگن گورنر پنجاب معہ اپنے وزرا کے، پرنسس دلیپ سنگھ (مہاراجہ رنجیت سنگھ کی پوتی) ہائی کورٹ کے جج، اعلیٰ عہدیدار، خطاب یافتہ رؤسا، راجے، نواب، پنجاب کونسل کے ممبر، ڈاکٹر، وکیل، مدیران اخبارات، شعرا، غرض ہر قسم کے لوگ موجود تھے۔ یہ پارٹی معززین لاہور نے حکیم الامت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کو نائٹ (سر) کا معزز خطاب ملنے کی خوشی میں دی تھی۔

اب مقبرہ جہانگیر اور اس قسم کی دوسری شاہی عمارتوں اور باغوں میں تفریحی پارٹیوں کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی بلکہ کئی قسم کی پابندیاں لگا دی گئی ہیں ——— مرتب]

شیخ حسین جامی

جس کا اک ادنیٰ سا خادم تھا شہ ہندوستان
قبر اس جامی کی عبرت گاہ انساں دیکھیے

جہانگیر کے عہد میں یہ بزرگ لاہور کے نامور علماء میں شمار ہوتے تھے ان کا درس بھی جاری تھا۔ جہانگیر نے تزک جہانگیری میں بڑے ادب کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"میری تخت نشینی سے چھ مہینے قبل (۱۰۱۴ھ میں) شیخ حسین جامی نے جو درویش شیرازی کے مریدوں میں ہے اور اس وقت مسند درویشی پر متمکن ہے۔ مجھے لکھا تھا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ اولیائے بزرگ اور دوسرے حضرات نے سلطنت ہندوستان کا بوجھ آپ کے کندھوں پر رکھا ہے۔ آپ اس خوش خبری سے قوی دل اور مطمئن ہو کر فتوح غیب کے منتظر رہیں۔"

یہ وہ زمانہ تھا جب سلیم نے باپ سے ناراض ہو کر بغاوت پر کمر باندھی ہوئی تھی اور الہ آباد میں مقیم تھا۔ اس کے ساتھ ہی مولانا جامی نے بادشاہ کو یہ بھی لکھا کہ جب خداوند کریم آپ کو سلطنت عطا کرے تو خواجہ زکریا جو سلسلہ احرار سے ہے اس کی تقصیرات پر عفو کا قلم پھیر دیا جائے۔

جب جہانگیر تخت نشین ہو گیا تو اس کو اپنے فرزند خسرو کی بغاوت اور شورش دبانے کے لیے آگرہ سے لاہور تک آنا پڑا۔ وہ یہاں آ کر حسین جامی سے بھی ملا۔ وہ لکھتا ہے:۔

"کابل جانے سے پیشتر میں نے شیخ حسین جامی سے ملاقات کی اور چونکہ اس نے مجھے خواب کے ذریعہ تخت کی بشارت دی تھی اور اس کی خواہش بھی ظاہر ہوا کرتی تھیں اس لیے میں نے اس کی خانقاہ کے لنگر خانہ کے لیے بیس لاکھ درم جو چالیس ہزار روپیہ کے قریب ہوتے تھے مقرر کیے۔"

جہانگیر کے ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولینا جامی صرف مولوی اور مدرس ہی نہیں تھے بلکہ صاحب دل اور روشن ضمیر درویش بھی تھے اور اُن کے ہاں ایک لنگر خانہ بھی تھا جہاں فقرا اور مسافروں کا قیام رہتا تھا۔

ان کی تاریخ وفات کا کہیں ذکر نہیں۔ تحقیقات چشتی (ص ۱۷۵) کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قبر قبرستان میانی کی ایک چار دیواری کے اندر زمین دوز ہے۔ اس کے گوشہ شمالی و مشرقی میں ایک چبوترہ دیوار مسجد ہے جس کے ساتھ ایک کنواں چرخی دار بہت قدیمی اور غالباً اسی زمانہ کا ہے۔ مولینا جامی کی قبر حضرت طاہر بندگی کی چار دیواری سے شمال و مشرق کی جانب ہے اور ایک محراب دار دیوار مسجد کے نشان سے ذرا آگے ہے۔

فیض باغ[1]

باغ کے مٹنے پہ روتے ہیں زمین آسماں
سیل دریا دیکھئے اور ابر گریاں دیکھئے

داراشکوہ نے سکینۃ الاولیاء میں صرف اتنا لکھا ہے۔ "فیض کے باغ میں جہاں اب دل آرام کی دایہ کا مقبرہ ہے باؤلی کے اُوپر حضرت میاں میر یادِ حق میں مشغول ہوا کرتے تھے۔" اس سے زیادہ اس باغ کے متعلق اور کچھ نہیں معلوم۔ فیض کون تھا؟ دل آرام کون تھی؟ جس کی دایہ بھی اتنی مشہور تھی کہ شہنشاہ ہندوستان کا ولی عہد اس کا حوالہ دیتا ہے۔ پھر اس کا مقبرہ؟ یقیناً اس کی عمارت شاہجہانی یا جہانگیری عہد کی یادگار ہو گی۔ وہ باغ وہ مقبرہ کہاں تھا؟ اللہ اکبر ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

دل آرام کے متعلق کتابوں میں ایک غیر مستند واقعہ درج ہے۔ کسی نے اس کو شاہ اسمٰعیل صفوی شاہ ایران کی بیوی لکھا ہے لیکن مصنف مشاہیر نسواں (مولانا محمد عباس ایم۔ اے) تذکرہ بہار کے حوالہ سے اس کو جہانگیر کی ایک بیگم لکھتے ہیں اور اس کے ساتھ وہ واقعہ منسوب کرتے ہیں۔ جس میں جہانگیر کسی شاہزادہ کے ساتھ اس شرط پر شطرنج کھیلتا ہے کہ جو ہار جائے وہ اپنی بیوی دوسرے کے حوالے کردے۔ یہ واقعہ پایۂ ثبوت سے گرا ہوا ہے نہ جہانگیر سے اس قسم کی توقع ہو سکتی ہے۔ اور نہ کسی مستند تاریخ میں اس کا ذکر ہے۔ البتہ دلچسپی کے طور پر اخباروں اور رسالوں سے نقل ہوتا ہوا بعض کتابوں میں درج ہو گیا ہے۔[2]

نواب مرتضیٰ خاں

جس کے گل بوٹے کبھی رشک بہار تھے
آج وہ ناپید ہے باغ مرتضیٰ خاں دیکھئے

اصل نام شیخ فرید بخارا وطن تھا اس لیے فرید بخاری کہلاتے تھے۔ اکبر کے زمانہ میں ہزار و پانصدی کے منصب دار تھے۔

---

[1] فیض باغ کے نام سے جو بستی شہر لاہور سے مشرق کی طرف ریلوے پل کے پار نئی آباد ہوئی ہے اس کا ذکر علیحدہ درج ہوگا۔
[2] ملاحظہ ہو کتاب زمانہ حاضر جواہیاں مطبوعہ لاہور ۱۹۲۲ء

جہانگیر ان کے متعلق لکھتا ہے :۔

"شیخ فرید میرے باپ کے عہد میں میر بخشی تھا۔ میں نے ۲۱ر محرم ۱۰۱۵ھ کو اُسے پنجاب کا صوبہ جو تمام ممالک محروسہ میں سب سے بڑا صوبہ ہے مقرر کیا اور شال خاصہ عنایت کی۔"

کارنامہ جہانگیری میں لکھا ہے کہ جہانگیر نے اس کو خلعت و شمشیر مرصع و دوات قلم مرصع عنایت کرنے کے علاوہ یہ کہہ کر بھی اس کی سرافرازی کی کہ میں تجھ کو صاحب السیف والقلم تصور کرتا ہوں۔

اور حقیقت یہ ہے کہ شیخ فرید دونوں باتوں کی اہلیت رکھتا تھا چنانچہ خسرو (فرزند جہانگیر) کی بغاوت میں جو شجاعت اور پامردی اُس نے دکھائی اور جس طرح وہ خسرو کو گرفتار کر کے بادشاہ کے پاس جو باغ مرزا کامران میں مقیم تھا لایا اس فتح عظیم پر بادشاہ نے اس کو مرتضےٰ خاں کے خطاب کے علاوہ پنج ہزاری منصب اور نقارہ اور علم اور اسپ مع ساز و کمر بند مرصع عنایت کیا۔

۱۰۲۰ھ / ۱۶۱۱ء کے واقعات میں جہانگیر لکھتا ہے کہ قلیچ خاں کو پنجاب کی صوبیداری سے واپس بلا کر میں نے پھر مرتضیٰ خاں کو پنجاب کی نظامت دینے کا حکم جاری کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے درمیان میں وہ کسی اور خدمت پر مامور کیا گیا تھا۔ ۱۰۲۵ھ / ۱۶۱۶ء کے واقعات میں لکھا ہے کہ مرتضیٰ خاں حاکم پنجاب نے ایک سو سے کچھ زیادہ زربفت کے تھان اور عراقی اور ترکی گھوڑے لاہور سے بھیجے۔ اسی سال کہ سنہ ۱۱ جلوس جہانگیری تھا۔ مرتضیٰ خاں کو فتح کانگڑہ کا حکم دیا گیا۔ وہ فوج قاہرہ لے کر کانگڑہ پہنچا لیکن ابھی مہم سر نہ ہوئی تھی کہ وہ اسی دوران میں انتقال کر گیا۔

جہانگیر اس کی وفات پر لکھتا ہے :۔

"۳ر ربیع الاول کو مجھے مرتضیٰ خاں کے انتقال کی خبر ملی۔ وہ میرے قدیمان دولت میں سے تھا میں نے اس کا منصب شش ہزاری ذات اور پنج ہزار سوار تک پہنچایا تھا۔ اور اس کو پنجاب کا ناظم مقرر کیا تھا مجھے اس کی وفات کی خبر ناخوش سے بہت صدمہ ہوا۔"

نواب مرتضیٰ خاں نے اپنی عمر کا کافی حصہ لاہور میں گزارا یہاں اُس نے ایک عظیم الشان باغ بھی تیار کیا تھا۔ دارا شکوہ سکینۃ الاولیا میں لکھتا ہے یہ باغ ہوشیار خان کے باغ کی مشرقی جانب۔ شیخ عبدالرحمٰن درویش کی قبر کے نزدیک واقع ہے۔ لیکن اب اُسے باغ وزیر خاں کہتے ہیں۔

مرتضیٰ خاں نے اپنا باغ عہد جہانگیری میں تعمیر کرایا لیکن معلوم ہوتا ہے وہ لاولد مرا۔ اُس کی کسی اولاد کا نہ جہانگیر نے ذکر کیا ہے اور نہ کسی اور نے۔ اس لیے باغ لاوارث ہو کر شاہجہان کے زمانہ میں نواب وزیر خاں کے قبضے میں آ گیا۔

چونکہ عہد موجودہ میں پنجاب پبلک لائبریری بارہ دری نواب وزیر خاں کا دوسرا نام ہے اور یہ بارہ دری باغ وزیر خاں کے عین وسط میں ہے اور باغ وزیر خان۔ باغ مرتضیٰ خاں کے کھنڈروں پر آباد ہے اس لیے باغ مرتضیٰ اسی جگہ تھا جہاں آج پبلک لائبریری ہے۔ باغ ہوشیار خان کے محل وقوع کا علم نہیں ہو سکا نہ یہ معلوم ہے کہ وہ کون تھا یہ نام اس قسم

کا ہے کہ عہد مغلیہ کا ایک خطاب معلوم ہوتا ہے غالباً اصل نام اور کچھ ہوگا۔

شہزادہ پرویز

جب کلی ہنستی ہوئی یا گُل کو خنداں دیکھئے
میرے ویراں باغ میں شبنم کو گریاں دیکھئے

شاہزادہ پرویز جہانگیر[1] کا بیٹا اور شاہجہان کا بھائی تھا۔ باپ کے حکم سے راجپوتانہ اور دکن کی مہمات میں سپہ سالاری کرتا رہا۔ جب شاہجہان نے بعالم شاہزادگی کہ اُس وقت شاہزادہ خرم کہلاتا تھا چغتائی وراثت کا ثبوت دیا یعنی باپ سے بغاوت کی۔ تو جہانگیر نے پرویز کو چالیس ہزار فوج۔ بہت بڑا توپ خانہ اور بیس لاکھ کا خزانہ دے کر اُس کی تنبیہ کے لیے بھیجا۔ دارا شکوہ جو پرویز کا بھتیجا اور داماد تھا[2]۔ سکینۃ الاولیا میں شاہزادہ مذکور کے ایک باغ کا ذکر کرتا ہے اور لکھتا ہے۔ اس باغ کی عمارت میں حضرت میاں میر کبھی کبھی تشریف لاتے اور یادِ حق میں مشغول ہوتے تھے۔

تحقیقات چشتی اور تاریخ لاہور کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ موضع کوٹ خواجہ سعید (متصل لاہور) میں شاہزادہ پرویز نے ایک نادر باغ لگایا تھا اور یہاں رفتہ رفتہ اس قدر رونق ہو گئی تھی کہ باغ کا منصلہ علاقہ محلہ سے ترقی کر کے ایک موضع کہلا رہا تھا اور یہاں جو منڈی تھی[3] وہ پرویز آباد کہلاتی تھی۔

تحقیقات چشتی میں مولوی نور احمد چشتی اور تاریخ لاہور میں رائے بہادر کنہیا لعل لکھتے ہیں کہ موضع خوجہ سعید میں شاہزادہ پرویز کا یہ مقبرہ اندر باہر سے سنگ مرمر کا بنا ہوا تھا اس کے فرش میں بھی سنگ مرمر ہی تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حکم سے یہ تمام سنگ مرمر اُتار کر دربار صاحب امرتسر بھیجا گیا۔ اور یہاں معمولی اینٹوں سے مرمت کرادی گئی۔ رائے کنہیا لال لکھتے ہیں چونکہ یہ مرمت بھی قابل مرمت ہو چکی تھی اس لیے سرکار نے میری معرفت اس کی مرمت کرائی۔

یہ تو صحیح ہے کہ یہ مقبرہ نہایت عالیشان تھا۔ اور یہ عمارت عہد شاہجہانی کی یادگار ہے۔ لیکن یہ غلط ہے کہ اس مقبرہ میں شاہزادہ پرویز دفن ہے۔ اس کے علاوہ مصنف تاریخ لاہور لکھتے ہیں۔ پرویز باپ (جہانگیر) کی وفات کے بعد سفر کشمیر سے واپس آ رہا تھا اور لاہور پہنچا ہی تھا کہ آصف جاہ نے اُسے قتل کرادیا۔ تحقیقات چشتی کا مصنف سنہ وفات اس شاہزادہ کا سنہ ۱۰۸۱ھ (بعہد عالمگیر) لکھتا ہے یہ دونوں باتیں واقعات کے خلاف ہیں۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ ۱۰۳۵ھ (۱۶۲۵ء) میں جب جہانگیر کابل

---

[1] مصنف تحقیقات چشتی نے صفحہ ۵۵۸ میں پرویز کو شاہجہان کا فرزند لکھا ہے۔ جو غلط ہے۔

[2] دارا شکوہ کی شادی ۱۰۴۲ھ میں پرویز کی لڑکی سے ہوئی تھی۔

[3] باغ راجہ تیجا سنگھ عرف باغ راجہ شیخوپورہ کے متصل اب بھی چھوٹے چھوٹے ٹیلے نظر آتے ہیں جن پر ٹوٹے ہوئے برتنوں کے ریزوں اور ٹوٹی ہوئی اینٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کسی زمانہ میں کچھ آبادی تھی۔ یہیں ایک قدیم چاہ ہے جس کی اندرونی دیواروں میں ایک برگد (بڑھ) کا اور ایک پیپل کا درخت ہے کنواں غیر آباد ہے۔

سے آگرہ کی طرف روانہ ہوا تو اُس کو دکن کی تحریروں سے شاہزادہ پرویز کے متعلق یہ خبریں ملیں کہ بکثرت شراب کی وجہ سے وہ درد قولنج میں کچھ عرصہ مبتلا رہ کر آخر ۶ صفر ۱۰۳۵ھ کو انتقال کر گیا[1]۔ شاہزادہ پرویز اس کی تاریخ وفات ہے۔ ۱۰۰۰ھ کی پیدائش کے مطابق اُس کی عمر اس وقت ۳۵ سال کی تھی۔ دکن سے لاش اس کی آگرہ میں لائی گئی جہاں اپنے باغ میں وہ دفن کیا گیا[2]۔ غرض نہ اُس کی قبر لاہور میں ہے اور نہ وہ ۱۰۸۱ھ میں مرا ہے اور نہ لاہور میں وہ فوت ہوا ہے۔ یہ بھی اسی قسم کی ایک دلچسپ "مؤرخانہ" غلطی ہے جس طرح شہزادی زیب النساء کا مقبرہ اب تک نواں کوٹ (لاہور) میں بیان کیا جا رہا ہے۔ جیساکہ تحقیقاتِ چشتی وغیرہ میں درج ہے حالانکہ اس کا مقبرہ دہلی کے تیس ہزاری باغ میں ہے۔

یہ دونوں مصنف اپنی تاریخوں میں شاہزادہ کا مقبرہ لاہور میں بتاتے ہیں حالانکہ وہ لاہور میں نہیں ہے لیکن اُس کے باغ لاہور کا پتہ نہیں بتاتے جو درحقیقت آگرہ کی طرح لاہور میں بھی تھا۔ دارا شکوہ جو شاہزادہ کا داماد اور شاہجہان کا فرزندِ اکبر تھا اپنی کتاب میں اس کے عالیشان باغ اور اس کی عمارات کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے "حضرت میاں جیو صاحب (یعنی حضرت میاں میر) دن کے وقت اپنے آدمیوں کے ساتھ باغیچہ موافق اجل کی عمارت میں بھی جایا کرتے تھے جو سلطان پرویز کے باغ کے نزدیک ہے۔ پرویز شہنشاہ ہندوستان کا فرزند تھا۔ جوانی کا عالم۔ مناظرِ قدرت کا عاشق۔ دولت کی افراط۔ اقبالِ جہانگیری کا سایہ اس سے سمجھ لو۔ باغ کس پایہ کا ہوگا اور اس میں کیسی کیسی خوشنما عمارتیں تعمیر ہوئی ہوں گی جن کا آج نشان تک بھی وہاں نظر نہیں آتا۔

اس مقبرہ سے جس کے کچھ آثار باقی ہیں۔ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے اندر کوئی عالی جاہ ہستی اپنی آخری آرام گاہ سمجھ کر لیٹی ہوئی ہے۔ لیکن اُس رفیع المنزلت ہستی کا نام کیا ہے اس کے متعلق کسی کو کوئی علم نہیں۔ راقم نے ۱۹۲۳ء میں اور اس سے قبل اس گنبد کو بارہا دیکھا ہے۔ گنبد ہشت پہلو ہے۔ قبر کچی ہے اور تعویزِ قبر جو سنگِ مرمر کا تھا غائب ہے۔ قبر تک جانے کے لیے مشرق کی طرف شمالاً جنوباً سیڑھیاں ہیں جنوب کی طرف سات اور شمال کی طرف پانچ اور وہ بھی شکستہ۔ مقبرہ کا چبوترہ سطح زمین سے پانچ فٹ بلند ہے۔ سیڑھیوں کے سامنے شمال کی طرف دور تک ایک پختہ فرش کے نشان نظر آتے ہیں۔ چبوترہ کے نیچے چاروں طرف زمین نشیب میں ہے۔ ایک پختہ نہر کے آثار بھی موجود ہیں جو باغ راجہ تیجا سنگھ تک چلی جاتی ہے۔

راقم ۲۲ مارچ ۱۹۴۴ء کو پھر اس نامعلوم ہستی کے مقبرہ کو دیکھنے کے لیے گیا۔ ۱۹۲۳ء کے زمانہ سے حالات بالکل مختلف تھے۔ قبر جو سنگِ مرمر کے آثار سے جانے سے خراب حالت میں تھی۔ چوہدری محمد حسین سکنہ خاص سحانہ ضلع گوجرانوالہ نے اس کی مرمت کرا کر اس کے سرہانے سنگِ مرمر کی تختی پر یہ عبارت لکھوا رکھی تھی:۔

"دارا شکوہ بھائی عالمگیر۔ شاہجہان کا بیٹا۔ خاندان قادری ۱۰۶۹ھ"

گنبد کے اندر کا فرش بھی اس دردمند شخص نے پختہ بنوا دیا ہے۔ لیکن گنبد کے باہر جو قدیم پختہ فرش ہے اس کی حالت بہت خستہ و خراب ہے۔ ۱۹۲۳ء میں جو سیڑھیاں نظر آتی تھیں ۱۹۴۴ء میں ان کا کوئی وجود نظر نہ آیا۔ گنبد زراعتی زمین سے گھرا ہوا ہے اور یہ زمین گنبد کی سطح سے کافی نشیب میں ہے۔

---

[1]،[2] کارنامہ جہانگیری جس کا حوالہ مولوی ذکاء اللہ کی تاریخ ہندوستان جلد ششم صفحہ ۲۲۲ سے لیا گیا ہے۔

چوہدری محمد حسین نے "صاحب قبر" کا نام دارا شکوہ بتانے اور لکھنے میں سخت تاریخی غلطی کی ہے۔ ان کو شاید معلوم نہیں کہ دارا شکوہ دہلی میں قتل کیا گیا اور وہیں مقبرہ ہمایوں میں وہ دفن کیا گیا۔ اس گنبد میں جو عالی جاہ ہستی دفن ہے وہ ضرور خاندان شاہی سے تعلق رکھتی ہے لیکن نام اس کا معلوم نہیں ہو سکا اور غالباً اسی سبب یہ مقبرہ محکمہ آثار قدیمہ کی حفاظت میں نہیں آ سکا۔ اس گنبد کے سامنے ایک اور گنبد نظر آتا ہے جو اس سے کچھ بڑا ہے۔ اس کے چار بڑے بڑے محرابی در ہیں۔ گنبد کے اندر پختہ فرش اب تک موجود ہے۔ قبر بھی پختہ ہے لیکن بالکل شکستہ اور بوسیدہ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے گرد جو سنگ مرمر تھا اس کو اتارتے ہوئے قبر کی اینٹوں کو بھی توڑ دیا گیا۔ گنبد کی اندرونی دیواروں پر اب تک قدیم نقوش کے کچھ نہ کچھ آثار موجود ہیں۔ گنبد کا بیرونی چبوترہ نابود ہو رہا ہے۔ گنبد کے اوپر چاروں طرف چھوٹی چھوٹی چار میناریاں ہیں۔ یہ گنبد بھی موضع کوٹ خواجہ سعید کی حدود میں واقع ہے۔ لوگوں کا بیان ہے کہ یہ مقبرہ دارا شکوہ کی دائی کا ہے۔ لیکن اس کا کوئی ثبوت تاریخ سے نہیں ملتا۔ نہ کوئی معتبر روایت اس کے متعلق کسی اور سے سُنی ہے۔

یہ دونوں گنبد جو عہد جہانگیری و شاہجہانی کی یادگار ہیں اور جن کے اندر یقیناً معزز ہستیاں آرام کر رہی ہیں — اگر محکمہ آثار قدیمہ کے ماتحت آجاتے۔ تو تھوڑی سی لاگت سے ہمیشہ کے لیے محفوظ رہ سکتے تھے۔ لیکن اب تو حوادث روزگار سے زیادہ دیر تک بچتے نظر نہیں آتے۔

انار کلی

ذرہ ذرہ آئینہ ہے انقلاب دہر کا
چشم عبرت سے اگر دنیا کو اے جاں دیکھئے

انار کلی کا نام زمانہ اکبری کے یوروپین سیاحوں کے علاوہ لاہور کے مصنفوں میں مصنف تحقیقات چشتی مصنف تاریخ لاہور اور مصنف ہسٹری آف لاہور نے لکھا۔ ان کے بعد سب سے پہلے ۱۸۹۹ء میں راقم نے انار کلی کے نام سے ایک ناول لکھا اسی ناول کی بنیاد پر ڈھاکہ کے ایک بنگالی ڈرامہ نویس نے ایک تھیٹر کے لیے ڈرامہ تصنیف کیا اور سب سے آخر سید امتیاز علی تاج نے اپنے مخصوص انداز میں اس پر ایک ضخیم ڈرامہ لکھا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود محققین کے نزدیک انار کلی کے متعلق جو کچھ لکھا گیا اس کی حقیقت ایک افسانہ سے زیادہ نہ تھی۔

اس افسانہ کی بنیاد سب سے پہلے عہد اکبری و جہانگیری کے یورپین سیاحوں نے رکھی جن میں ولیم فنچ - ایڈورڈ ٹیری اور ہربرٹ خاص طور پر مشہور ہیں۔ ہربرٹ لکھتا ہے "اکبر کی ایک چہیتی بی بی کا نام انار تھا۔ جہانگیر نے اس سے کچھ چھیڑ چھاڑ کی اکبر کو خبر ہوئی بڑا طیش آیا۔ لیکن جہانگیر (سلیم) کے معافی مانگنے پر معاف کر دینے کا وعدہ کر کے بادشاہ اس کو حرم سرا میں لے آیا حرم سرا میں آتے ہی پھر طیش آگیا اور بیٹے کو ایسے مُکے مارے کہ وہ گر پڑا اور کہا اے احمق اور گدھے تو نے کس طرح میرے وعدے پر یقین کر لیا" یہ انگریز ۱۶۲۶ء میں یعنی وفات اکبر سے اکیس سال بعد ہندوستان آیا تھا۔

ولیم فنچ جو ۱۶۱۱ء میں اکبر کی وفات سے چھ سال کے بعد ہندوستان آیا۔ ہربرٹ سے بھی دو قدم آگے چلتا ہے۔

وہ لکھتا ہے :-

"شیخ فرید کی مسجد کے پاس شہر کے باہر ایک بہت بڑی عمارت کھڑی ہے یہ شاہزادہ دانیال کی ماں کا مزار ہے جس کا نام انارکلی تھا اور اکبر کی بی بی تھی۔ شہزادہ سلیم کی نیت اس کے متعلق کچھ اچھی نہ تھی بادشاہ نے اس کو محل کی دیوار میں زندہ چنوا دیا۔ اور اس پر جہانگیر نے بادشاہ ہو کر اپنی محبت کی یاد میں ایک بہت عالیشان مقبرہ تعمیر کرایا۔"

بعض مصنفوں نے انارکلی کا اصل نام نادرہ بیگم یا شرف النساء بیگم لکھا ہے۔ اور انارکلی کی وجہ تسمیہ میں رقم طراز ہیں کہ اکبر کی بیجے پوری رانی (امبیر رانی) نے اس کا رقص دیکھ کر اس کو انارکلی کا خطاب دیا۔ بعض نے لکھا ہے کہ خود بادشاہ نے اس کو انارکلی کا خطاب دیا تھا۔

ان مصنفوں کے ایک ایک لفظ کی تردید پنجاب کے مشہور محقق و مورخ مولینا علم الدین سالک ایم۔ اے نے بڑی قابلیت سے کی ہے۔ ان کی تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے کہ عہد اکبری کے معاصر مورخین ابوالفضل۔ عبدالقادر بدایونی اور بخشی نظام الدین احمد کسی نے بھی اس واقعہ کے متعلق کوئی اشارہ تک نہیں کیا۔ ان میں عبدالقادر بدایونی بے باک نویسی میں تیغ برہنہ تھا۔ وہ ابوالفضل اور فیضی اور ٹوڈرمل اور بیربر تو کجا بادشاہ تک کو بھی اپنی شمشیر قلم اور تیغ زبان سے گھائل کر جاتا تھا۔ دربار اکبری کا یہ نکتہ چین مورخ اس قسم کا واقعہ دیکھ کر کہ اکبر ایک عورت ذات کو محبت کی پاداش میں دیوار میں زندہ چنوا دے کس طرح خاموش رہ سکتا تھا۔

پھر قریب العہد مورخین میں بزمانہ جہانگیر مصنف اقبال نامہ جہانگیری مصنف مآثر جہانگیری مصنف ریاض الشعراء والہ داغستانی اور خوافی خاں وغیرہ کئی مصنف گذرے ہیں کسی نے اس انسانیت سوز واقعہ کا ذکر نہیں کیا۔ ان میں خوافی خان اور والہ داغستانی دونوں جہانگیر کے مخالف تھے۔ جہانگیر نے اپنی تزک میں اپنا نامۂ اعمال دل کھول کر بیان کیا ہے اور کسی واقعہ پر اس نے سیاسی ملمع کاری سے کام نہیں لیا۔ اس نے اپنے ہر عیب کو ڈنکے کی چوٹ ظاہر کیا ہے۔ لیکن ساری کتاب پڑھ جاؤ۔ اس واقعہ کا ذکر کہیں نہیں پاؤ گے۔

پھر اکبر کے حالات پر نظر ڈالو۔ اس کی پچاس سالہ حکومت کے عہد میں چھان پھٹک کر دیکھو۔ اس کو رحم دلی کا مجسمہ پاؤ گے۔ اس نے کئی باغیوں کو معاف کر کے آغوش محبت میں لیا۔ جب جہانگیر نے ایک موقع پر خادم درگاہ کی کھال کسی جرم میں کھچوا دی تو اُسے سخت ڈانٹ ڈپٹ کی۔ کوئی تاریخ اس بات کی شہادت نہیں دیتی کہ اکبر نے کسی عورت پر اس قسم کا ظلم ڈھایا ہو۔

یوروپین سیاحوں نے اس قسم کی غلط بیانیاں کر کے مغل حکومت کو بدنام کرنے کی بہت ناکام کوششیں کی ہیں۔ ان لوگوں نے انارکلی کی وفات ۱۵۹۹ء (۱۰۰۸ھ) لکھی ہے۔ گویا انہی ایام میں اکبر اور جہانگیر لاہور میں تھے۔ یہیں اکبر نے جہانگیر کو ٹکے مارے اور یہیں اس نے قلعہ کے شیش محل میں بیٹھ کر انارکلی کا رقص دیکھا۔ یہیں سلیم نے انارکلی کو کنکھیوں سے دیکھا اور مسکراہٹ بھی ظاہر کی۔ اور یہیں اکبر نے اس کو دیوار میں زندہ چنوائے جانے کا حکم دیا۔ لیکن کیا تاریخ اس واقعہ کی شہادت دیتی اور اس کی تائید کرتی ہے؟ تاریخ سے تو علی الاعلان ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۰۰۸ھ میں جو انارکلی کے زندہ چنوائے جانے کا سال ہے نہ اکبر لاہور میں تھا نہ جہانگیر۔ اکبر مہمات دکن میں اور جہانگیر رانا کے چتوڑ کی مہم میں مصروف تھا۔ جہانگیر نے یہ دیکھ کر کہ باپ دارالحکومت آگرہ سے صدہا کوس کے فاصلہ پر لڑائی میں مصروف ہے چتوڑ کی مہم کو ناتمام چھوڑ کر بغاوت پر آمادہ ہو کر آگرہ پر قبضہ کر لینا چاہا اکبر کو

خبر ہوئی تو وہ مہم دکن کو چھوڑ کر ۱۶۰۱ء میں سیدھا آگرہ پہنچ گیا۔ جہانگیر کو آگرہ آنے کی ہمت تو نہ ہوئی البتہ الہ آباد پر قابض رہ کر ۱۶۰۲ء تک باپ کو پریشان کرتا رہا۔

اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ ۱۰۰۸ھ بلکہ ۱۰۰۷ھ ہی سے ۱۰۱۱ھ تک اکبر اور سلیم میں ملاقات نہیں ہو سکی نہ لاہور میں کسی اور جگہ۔ ان تاریخی شہادتوں کی موجودگی میں شیش محل ہی میں باپ کے سامنے جہانگیر کا انارکلی سے آنکھیں لڑانا، اکبر کا طیش میں آکر اس کو گھونسے مارنا اور احمق اور گدھا کہنا، یورپین مصنفوں کے اختراعات کا کمال سمجھنا چاہیئے۔

دارا شکوہ اپنی تصنیف سکینۃ الاولیاء[1] میں حضرت میاں میر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے آپ (یعنی حضرت میاں میر) شہر کے جنوب کی طرف باغ انارکلی کے اُس گنبد میں جو باغ مذکورہ کی جنوبی دیوار کے کونے میں ہے دن کو کبھی کبھی جایا کرتے تھے۔

عہد مغلیہ کے قدیم مصنفوں میں دارا شکوہ ہی پہلا مصنف ہے جس نے آج سے تین سو سال قبل انارکلی کا نام لکھا ہے۔ لیکن اس کے لکھنے سے بھی یہ معلوم نہیں ہوتا کہ انارکلی کسی عورت کا نام تھا یا اس باغ کو باغ انارکلی کیوں کہتے تھے۔ اسی بنا پر مولینا سالک نے انارکلی کے وجود ہی سے انکار کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں انارکلی لاہور کا مقبرہ اور انارکلی بٹالہ[2] کی عمارت تعمیرات کی ایک قسم ہیں جو ظاہری شکل و شباہت میں انار کی کلیوں سے ملتی جلتی ہیں۔

---

[1] یہ کتاب دارا شکوہ نے بعمر ۲۸ سال ۱۰۴۹ھ سے ۱۰۵۰ھ کے مختلف اوقات میں لکھی تھی۔ یعنی واقعۂ انارکلی کے چوالیس سال کے بعد۔

[2] انارکلی بٹالہ کے متعلق میرے مشفق مکرم خان بہادر میاں الطاف حسین خاں ریٹائرڈ ایس ڈی او۔ رئیس بٹالہ ۱۲ جنوری ۱۹۴۶ء کے گرامی نامہ میں لکھتے ہیں:-

"شہر بٹالہ کے مشرق رویہ شمشیر خان کروڑی (حاکم بٹالہ) نے ایک وسیع تالاب تعمیر کرایا۔ اور اس کے متصل ایک حجرہ بنوا کر اس میں اپنی قبر بنوائی اور وہیں وہ دفن ہوا۔ اس کی مشرقی جانب ایک چونہ گچ عمارت واقع ہے۔ جس کو مہاراجہ شیر سنگھ نے اپنی شاہزادگی کے زمانہ میں تعمیر کرا کر لاہور کی انارکلی کے نام پر اس کا نام انارکلی رکھا۔ عمارت بڑی مضبوط ہے تمام سقف اور صحن چونہ گچ ہے لکڑی کا کہیں نام تک نہیں۔ اس عمارت کی کرسی تین چار فٹ کی بلندی پر ہے۔ پادریوں نے یہ عمارت ۹۹ سالہ LEASE پر لے رکھی ہے۔ تیس پینتیس سال LEASE میں سے رہتے ہیں مشن سکول جس کا نام اس کے بانی پادری کے نام پر BARING SCHOOL (بیرنگ اسکول) تھا۔ پہلے اسی عمارت میں تھا۔ اب وہ سکول تو وہاں سے ہٹا کر شہر میں لے آئے ہیں وہاں اب مشن کالج قائم کرنے کی تجویز ہو رہی ہے۔ انارکلی کے آس پاس مشن والوں نے کچھ کوٹھیاں بنائی ہوئی ہیں۔ پادری لوگ ان میں رہتے ہیں۔ مسٹر ایس۔ پی سنگھا رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی نے بھی تالاب کے کنارے شہر کی جانب ایک باغ اور کوٹھی اپنی رہائش کے لیے خرید کی ہے۔ تالاب اور انارکلی شہر کی تفریح گاہیں ہیں مستورات اور مرد مان شہر ہر شام کو بہ تعداد کثیر آتے ہیں۔ انارکلی کے ساتھ پادریوں نے ایک گرجا بھی بنا رکھا ہے۔ ان سب کو بھٹیوں کی آبادی کہ انارکلی کہتے ہیں۔ ریلوے سٹیشن سے یہ مقام آدھ میل کے فاصلہ پر ہے۔" عمدۃ التواریخ۔ دفتر پنجم ص ۹۷ میں انارکلی بٹالہ کی اس عمارت کے متعلق لکھا ہے کہ بڑے صاحب نے دیوان ٹیک چند کو حکم دیا کہ "بارہ دری و قلعہ بٹالہ مسمار سازند و آنچہ اسباب اندرونی بارہ دری بودہ باشد نیلام سازند"

مولینا نے لکھا ہے کہ بٹالہ اور لاہور کی "انارکلیوں" میں بہت حد تک مماثلت ہے اور دونوں کا افسانہ بھی بہت کم اختلاف کے ساتھ ایک ہی قسم کا ہے۔ راقم کے خیال میں مماثلت کی وجہ تو یہ ہے کہ مہاراجہ شیر سنگھ نے جب بٹالہ اس کی جاگیر میں تھا۔ انارکلی لاہور کی عمارت کے نمونہ پر بٹالہ میں انارکلی کی عمارت تعمیر کرائی تھی اور افسانہ کی مماثلت تو محض افسانہ ہی ہے

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس مقبرہ کے ساتھ جو باغ تعمیر کیا گیا تھا۔ یا مقبرہ بننے سے پیشتر اس جگہ جو باغ تھا۔ اس میں اناروں کے درخت بکثرت تھے یا وہ باغ ہی اناروں کا تھا اور شاید اس کا نام باغ انار یا انار باغ ہو۔ اور وہ رفتہ رفتہ انارکلی باغ کے نام سے موسوم ہو گیا ہو۔ لاہور میں انگوری باغ، گلابی باغ اور بید مشک باغ بھی اسی طرح اپنی اپنی مخصوص پیداوار کے لحاظ سے مشہور رہے ہیں۔ یہ قیاسات تو باغ انارکلی کی وجہ تسمیہ کے متعلق ہیں لیکن آخر یہ مقبرہ کس کا ہے۔ جو قبر انارکلی کے نام سے مشہور ہے جس کے فراق میں جہانگیر نے اپنے جذبات دلی کا اظہار مندرجہ ذیل پُر درد شعر میں جو تعویز قبر پر کندہ ہے کیا ہے۔

آہ گر من باز بینم روئے یار خویش را
تا قیامت شکر گویم کردگار خویش را

مولینا سالک لکھتے ہیں یہ قدسی نقش خاتون سلطان پرویز کی والدہ زین خاں کوکہ کی دختر اور جہانگیر کی چہیتی بیوی تھی۔ اسی بیگم کے بطن سے ۹۹۷ھ میں بمقام کابل سلطان پرویز پیدا ہوا تھا۔ اکبر اس شادی کے خلاف تھا جیسا کہ زین خاں کوکہ کے حالات میں قبل ازیں لکھا جا چکا ہے لیکن اکبر نے بیٹے کا عشق بلکہ جنون دیکھ کر شادی کی اجازت دے دی تھی۔ یہ بیگم ۱۰۰۸ھ میں لاہور ہی میں انتقال کر گئی۔ جہانگیر جو اس وقت شاہزادہ تھا لاہور سے باہر ایک مہم پہ گیا ہوا تھا اور اکبر مہمات دکن میں مصروف تھا۔

سلیم نے اس کی آخری آرامگاہ پہ ایک عظیم الشان مربع مقبرہ تعمیر کرایا۔ سرہانے کی طرف باری تعالےٰ کے ننانوے نام بہ حروف عربی خط جلی لکھے ہوئے ہیں۔ اس کے پہلوؤں پر جہانگیر کا وہ پُر درد شعر درج ہے جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ سرہانے کی طرف ہی "مجنوں سلیم اکبر" کے الفاظ درج ہیں۔ یہ شعر اور یہ الفاظ ایک مغموم و محزون دل کے گہرے صدمے کو ظاہر کر رہے ہیں۔ قبر کے تعویز پر مندرجہ بالا الفاظ کے علاوہ وفات ۱۰۰۸ھ (۱۵۹۹ء) اور ۱۰۲۴ھ (۱۶۱۵ء) سال تعمیر درج ہے۔ اس گنبد نما مقبرہ کی دو منزلیں ہیں۔ دونوں منزلوں کے آٹھ آٹھ دروازے ہیں۔ کئی کھڑکیاں اور کئی روشندان ہیں۔ گنبد کے گرد آٹھ برجیاں ہیں اور ہر برجی میں ایک ایک دروازہ ہے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ۱۵ ماگھ سمت ۱۸۷۳ب کو باغ انارکلی میں شہزادہ کھڑک سنگھ کو ولی عہدی کا خلعت دینے کے لیے ایک بہت بڑا جشن کیا۔ سارا باغ اور اس کی چار دیواری راجوں اور سرداروں کے خیموں اور فوج کی نمائش اور ہزارہا تماشائیوں کے جمگھٹے سے بھر گیا اور کئی روز تک یہاں ہنگامہ عیش و عشرت گرم رہا۔

لالہ سوہن لال سُوری جو مہاراجہ کے درباری تھے عمدۃ التواریخ کے دفتر دوم صفحہ ۱۹۲ میں اسی جشن کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"سوم ماہ ذی القعدہ سرکار دولتمدار در گنبد انارکلی تشریف بُردہ خیمہ کلاں مکلف خاصہ برپا و نصب کنانیدہ و صاحبزادۂ موصوف را بر فرش عالی مسند ریاست و سرداری جلوس

میمنت مانوس ساختہ وجمیع سرکردگان را بالمشافہ طلبیدہ نذرہا دہانیدند۔ وبعد ازاں
تمام اہل کاراں ودفتریاں ووکیلاں ومنشیاں وکارداراں موافق رتبہ وطاقت
خودہا بہ ادائے نذرانہ پرداختند۔ بعد ازاں وقت سہ پہری سرکار دولتمدار صاحبزادہ
موصوف را بہ اتفاق یکدگر بہ فیل نشاندہ بتزک وشان بیکراں تشریف در
قلعہ بُردند"

اس کے بعد جب الارڈ صاحب و ونتورا صاحب فرانسیسی باشندے مہاراجہ کے پاس آکر ملازم ہوئے تو ان کا ڈیرہ گنبد انارکلی میں رکھا گیا اور ایک سو پیادہ سکھ فرانسیسی طرز جنگ کی تعلیم کے لیے ان کے سپرد کیا گیا۔ مہاراجہ تعلیم کے نتائج دیکھنے کے لیے خود انارکلی آئے اور فوج کا معائنہ اور ان کے کام دیکھ کر خوش ہوئے۔ دو ہزار روپیہ فرانسیسی افسروں کو پانچ سو روپیہ سکھ سپاہیوں کو انعام دے کر ایک ہزار روپیہ چھاؤنی انارکلی کی عمارت کے لیے دیا۔

۷ ماہ ساون سمت ۱۸۹۵ب کو مہارانی نکائین (والدہ شہزادہ کھڑک سنگھ) کا انتقال ہو گیا اسی دن پچھلے پہر ان کا بیان اٹھایا گیا اور انارکلی کے باغ میں اس کو آگ لگائی گئی۔ شہزادہ کھڑک سنگھ پا پیادہ حویلی نکیں سے بیان کے ہمراہ باغ انارکلی تک آیا۔ غرض سکھوں کے زمانہ میں باغ بالکل برباد ہو گیا چار دیواری کی اینٹیں خشت فروشوں نے ختم کر دیں بلکہ بنیادوں تک اُکھاڑ لے گئے۔ مقبرہ کا چبوترہ سنگ مرمر کا تعادہ مہاراجہ نے اتروا لیا۔ قبر کا تعویز جس پر اسمائے الٰہی اور اشعار وغیرہ تحریر تھے ناکارہ سمجھ کر پھینک دیا گیا۔

انگریزوں کا زمانہ آیا تو انھوں نے مقبرہ کو گرجا گھر بنا کر نام اس کا سینٹ جیمس چرچ رکھ دیا اور بُرج کلاں پر سنگ سُرخ کی دو فٹ طویل ایک صلیب لگا دی جو آج تک موجود ہے۔ اور قبر کے مرمریں تعویز کو جس کو سکھ حکومت کے عہد میں ناکارہ سمجھ کر پھینک دیا گیا تھا ایک گوشہ میں رکھ کر بند کر دیا۔

صلیب اس وقت بھی گنبد انارکلی پر موجود ہے[1] لیکن اس عمارت کو اب بطور گرجا گھر نہیں بلکہ بطور ریکارڈ آفس دفتر فنانشل کمشنر استعمال کیا جا رہا ہے اور اس میں حسب ضرورت بہت کچھ تبدیلیاں ہو چکی ہیں ـــــ

سرائے شاہجہان

مٹ مٹا کر پھر بھی ہے قائم سرائے شاہجہاں
راہ پر آ ہی گئی رفتار دوراں دیکھئے

مقبرہ جہانگیر اور مقبرہ آصف جاہ کے درمیان۔ مقبرہ جہانگیر سے بالکل ملحق شہنشاہ شاہجہان کی تعمیر کرائی ہوئی ایک وسیع سرائے ہے۔ مقبرہ جہانگیر کا مغربی دروازہ سرائے کے اندر نکلتا ہے۔ یہ سرائے عام مسافروں کے لیے وقف تھی۔ درمیان میں وسیع میدان ہے اور چاروں طرف مسافروں اور راہگذروں کے آرام کے لیے حجرے بنے ہوئے ہیں۔ اُسی زمانہ کا ایک ہشت پہلو کنواں بھی موجود ہے۔ عمارت نہایت پختہ ہے۔ ہر حجرہ یا کوٹھڑی کے آگے ایک پختہ قالبوتی برآمدہ ہے۔ مشرق کی طرف پچاس

---

[1] اب یہ صلیب وہاں سے اتار کر لاہور کیتھیڈرل کے احاطے میں بطور یادگار محفوظ کر دی گئی ہے۔ (مرتب)

کوٹھڑیاں ہیں بڑا دروازہ مقبرہ جہانگیر کی طرف نکلتا ہے۔ اس دروازے کے دونوں جانب پچیس پچیس کوٹھڑیاں ہیں۔ سرائے کے شمال اور جنوب کی طرف تیس تیس کوٹھڑیاں ہیں۔ یہ سرائے طول و عرض اور استحکام میں شاہجہانی عمارتوں کا ایک نمونہ ہے اس سرائے میں اسی عہد کی ایک مسجد بھی ہے۔ (جس کا ذکر لاہور کی مسجدوں کے سلسلہ میں دوسری جگہ درج ہے۔ (مرتب)

اس سرائے کے دو دروازے ہیں ایک جنوب کی طرف دوسرا شمال کی طرف۔ ان دونوں دروازوں سے ہاتھی معہ ہودج گزر سکتا ہے۔

[مغل بادشاہوں کے عہد تک تو اس سرائے یا جلو خانہ کو شاہی گارڈ کے سپاہیوں اور باغ کے ملازموں کی رہائش کے لیے استعمال کیا جاتا رہا لیکن سکھوں نے اس کو چھاؤنی بنا لیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں جنرل ونتورا، ادی تویلہ اور مسٹر کارن کے علاوہ اور کئی فرنگی افواج خالصہ میں نوکر تھے۔ انہی میں ایک موسیٰ نامی فرنگی بھی تھا جس کے متعلق لالہ سوہن لال عمدۃ التواریخ دفتر دوم (ص ۲۵۴ میں) لکھتے ہیں:۔

"موسیٰ نامی فرنگی کہ مختار در بعضے امورات می باشد، او را تاکید مزید صورت بست
کہ معہ پلاٹن متعینہ خود کو چیدہ ملحق بہ ڈیرہ صاحبزادہ موصوف (یعنی شہزادہ شیر سنگھ
باید شد"

صاحب عمدۃ التواریخ کے ان الفاظ سے کہ "تجویز مامور یئے فرانسیسیاں پیش نہاد فیض مآثر می باشد" معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی فرانسیسی تھا۔

موسیٰ فرنگی کئی لڑائیوں میں شامل رہا ہے۔ اس کا قیام اپنی پلٹنوں سمیت اسی سرائے میں رہتا تھا۔ سمت ۱۸۸۵ب کے بعد کے واقعات میں صاحب عمدۃ التواریخ دفتر دوم (ص ۲۶۹ میں) لکھتے ہیں:۔

"موسیٰ فرنگی کہ از چندے بمرض اسہال مبتلا بود بتاریخ یازدہم ماہ ربیع الاول روز
چہار شنبہ بوقت یک پہر روز باقی ماندہ از بار ہستی سبکدوش گردیدہ کوس رحلت
از عالم فانی بہ جہان جاودانی بہ نواخت۔ خلیفہ نور الدین وغیرہ اہل کاراں در
چھاؤنی آنروئے آب راوی واقع اندرون سرائے مقبرہ مشارٌ الیہ را بہ کمال
اعزاز مدفون ساختند"

موسیٰ فرنگی کی پلٹنوں کے قیام اور مصنف عمدۃ التواریخ کے الفاظ "چھاؤنی سرائے مقبرہ" سے صاف ظاہر ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں جس طرح باغ و مقبرہ انارکلی اور میدان میاں میر اور باغ بیگم پورہ مقبرہ نواب ابوالحسن وغیرہ لاہور میں کئی چھاؤنیاں تھیں؛ اسی طرح سرائے شاہجہانی کو جو مقبرہ جہانگیر کے اندر واقع ہونے کی وجہ سے سرائے مقبرہ کہلاتی تھی، چھاؤنی بنا لیا گیا تھا ——— مرتب]

۱۸۵۹ء میں جب لاہور میں ریل کا کارخانہ اور ریلوے اسٹیشن بنانے کی تجویز ہوئی، تو اس سرائے میں پتھر کے کوئلہ اور لکڑی کے اس قدر انبار جمع کیے گئے کہ جن کی کچھ انتہا نہ تھی۔ کوئلہ کی بدولت تمام میدان سیاہی مائل نظر آتا تھا۔ لیکن آخر یہ تجویز

مسترد کر دی گئی اور سرائے اور مقبرہ آصف جاہ اور مسجد شاہجہانی ریلوے حکام کے قبضے میں آنے سے بچ گئے۔

اپریل ۱۸۸۵ء میں لیڈی ڈفرن اس سرائے کا ذکر کرتی ہوئی لکھتی ہیں کہ ۔

"جہانگیر کے مقبرہ کے پاس ہمیں ایک سرائے نظر آئی جو انسانوں اور چارپایوں کی میزبانی کے لیے ایک بہت بڑا گھر ہے۔ یہ عمارت تباہ حالت میں تھی۔"

راقم نے ۱۸۹۴ء میں ۱۸۵۹ء کے کوئلہ کے کچھ کچھ نشانات اس سرائے میں دیکھے تھے۔ ۱۸۹۶ء میں غلام پہلوان اور کیکر سنگھ کی مشہور کشتی کے لیے جس میں غلام پہلوان فتح یاب ہو کر رستم ہند کہلایا تھا، اس سرائے کی صفائی ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے محکمہ آثار قدیمہ نے دیگر آثار قدیمہ کی طرح اس کی حفاظت اور صفائی بھی اپنے ذمے لے رکھی ہے۔ سرائے کا میدان اب ایک خوشنما سیرگاہ اور تفریح کا ایک دلچسپ مقام ہے اور صدر دروازے میں محکمہ آثار قدیمہ نے اپنا دفتر قائم کر رکھا ہے۔

آصف[1] جاہ

مقبرہ بھی باغ بھی دونوں تباہ حالت میں ہیں

سرنوشت روضۂ آصف کا عنوان دیکھئے

[لاہور کی تاریخ میں مغل بادشاہوں سے زیادہ کسی نے فن تعمیر کی طرف اتنی توجہ نہیں کی۔ ان کے طفیل لاہور کو بہت سی خوبصورت عمارتیں اور نفیس باغ نصیب ہوئے۔ شاہدرہ کی سرزمین جو طول و عرض میں ایسی وسیع نہیں۔ اس معاملے میں سب سے زیادہ خوش قسمت ہے کہ اس کی خاک میں ہندوستان کا ایک پُرشوکت شہنشاہ۔ ایک عالی دماغ ملکہ اور ایک نہایت زبردست وزیر باتدبیر دفن ہیں۔ اور ان کے عالیشان مقبروں کو آثار قدیمہ کے ایسے حیرت انگیز اور نادر نمونے ہونے کا فخر حاصل ہے جو فنی اعتبار سے خاص درجہ رکھتے ہیں۔ جہانگیر کے مقبرہ میں مغلیہ طرز تعمیر کی تمام خصوصیتیں اپنی پوری پاکیزگی، عظمت و شان اور دلکشی کے ساتھ جمع ہیں۔ نورجہاں بیگم کا مزار نہایت سادگی اور لطافت کے ساتھ جہانگیر کی چہیتی ملکہ نورجہاں اور اس کی پیاری بیٹی لاڈلی بیگم کو اپنی آغوش میں سلائے گل فسردہ کی طرح بہار شباب میں اپنے لٹ جانے پر ماتم کناں ہے اور زبان بے زبانی سے ملکہ کو مخاطب کر کے کہہ رہا ہے ۔

دریا تری ہمت نے مرکر بھی بہا ڈالے
مرقد نے ترے معبد غیروں کے سجا ڈالے

آصف جاہ کا ہشت پہلو مقبرہ جس کا حباب آسا گنبد کبھی لاہور کے سب سے خوبصورت اور رفیع الشان گنبدوں میں شمار ہوتا تھا۔ اپنی خوشنما چینی کاری کی وجہ سے سارے عالم میں مشہور تھا۔

ان کے علاوہ یہاں سے کچھ فاصلہ پر لاہور کے سب سے پہلے مغل حاکم میرزا کامران کی بارہ دری بھی اپنی ویرانی

---

[1] اس عنوان کے تحت شعر تو توفیق صاحب کا ہے لیکن باقی سارا مضمون مرتب کا لکھا ہوا ہے۔

اور کسمپرسی کے باوجود دریائے راوی کے کنارے ہی نہیں بلکہ درمیان زمین میں اپنے پیر مضبوطی سے جمائے نہایت وقار و تمکنت سے کھڑی کئی سو سال سے پانی کے تھپیڑوں کا مقابلہ کر رہی ہے۔

تاریخی اور جمالیاتی نقطۂ نظر سے اب بھی ان عمارتوں کو وہ اہمیت اور فوقیت حاصل ہے کہ کوئی سیاح لاہور میں آکر انھیں دیکھے بغیر آگے قدم نہیں بڑھا سکتا۔ اور ان کے نظاروں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اس وقت آصف جاہ اور اس کا مقبرہ ہمارا موضوع بحث ہے۔ جاننے ہو یہ آصف جاہ کون تھا؟ اس کے متعلق اتنا ہی بتا دینا کافی ہے کہ یہ اعتماد الدولہ میرزا غیاث کا لڑکا۔ نور جہاں کا بھائی۔ ملکہ ممتاز محل کا باپ اور شہنشاہ شاہجہان کا سپہ سالار تھا اور اس کا اصل نام میرزا ابوالحسن تھا۔ جہانگیر نے اسے مختلف مراتب، و مناصب سے ترقی دے کر ۱۰۳۵ھ / ۱۶۲۵ء میں لاہور کا گورنر بنایا اور ہفت ہزاری ذات اور ہفت ہزار سوار کا منصب اور آصف جاہ کا خطاب دیا۔

یہ آصف جاہ ہی تھا جس کی ہمت و تدبیر سے شاہجہان کو ہندوستان کے تخت پر بیٹھنا نصیب ہوا۔ اگر وہ جہانگیر کی وفات کے بعد اپنی بہن نور جہاں کو فی الفور نظر بند نہ کر لیتا۔ شہزادہ داور بخش پسر سلطان خسرو خلف جہانگیر کو "گوسفند قربانی" بنا کر ہندوستان کا برائے نام بادشاہ نامزد نہ کرتا اور سلطنت کے دوسرے دعویداروں کو مٹا کر اس کے لیے رستہ صاف نہ کر دیتا، تو نہ جانے شاہجہان کو ہندوستان کا تخت و تاج حاصل کرنے میں کتنی دشواریاں پیش آتیں اور کس قدر دقتوں کا سامنا ہوتا۔ شاہجہان بھی اس بات کو اچھی طرح جانتا تھا۔ ہمیشہ اس کا احسان مانتا اور حسب مقدور ملتا اس کا بدلہ اتارنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ بزرگوں کی طرح اس کی عزت و تکریم کرتا۔ اور اس جوہر قابل کی طرح قدر و منزلت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا۔ وہ اپنے دل میں اس کے متعلق ادب و احترام کے کس قدر جذبات رکھتا تھا۔ اس کا اندازہ شاہجہان کے اُس خط سے ہو سکتا ہے جو اس نے تخت پر بیٹھتے ہی اپنے دست خاص سے لکھ کر اپنے معتمد خاص کے ہاتھ اسے بھیجا تھا۔ اس خط میں بادشاہ نے ان القاب سے اسے مخاطب کیا تھا:۔

> "دانائے رموزِ سلطنتِ عظمیٰ۔ واقف اسرار جلالت کبریٰ۔ سر خیلِ یکہ تازانِ وفاداری
> سالار یکہ جہتانِ حق گزار۔ کار فرمائے اربابِ سیف و قلم۔ مدبرِ امورِ عالم، زبدۂ
> خوانینِ عالی شان۔ قدوۂ امرائے بلند مکان عضد الخلافہ یمین الدولہ۔ عموئے
> دانا آصف خاں"

اور پھر لکھا تھا کہ:۔

> "وہ خلعت جو جلوس کے دن پہنا تھا آپ کے لیے بھیجتا ہوں۔ آپ عمو کو
> بالفعل منصب ہشت ہزاری ذات و ہشت ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ عنایت کرتے
> ہیں اور بندر لاہری بطریق انعام مرحمت کرتے ہیں۔ آپ اس منصب سے بھی
> زیادہ کے مستحق ہیں۔ لیکن سر دست ہماری یہ عنایتیں آپ کو مبارک ہوں"

جہانگیر کے انتقال سے کچھ پہلے اور شاہجہان کے ابتدائی عہد میں آصف جاہ لاہور اور ملتان دونوں صوبوں کا گورنر تھا۔ ۱۰۴۲ھ میں جب وہ شہزادہ اورنگ زیب، شجاع اور دارا شکوہ کو ہمراہ لے کر لاہور سے آگرہ روانہ ہوا اور وہاں

دوشنبہ ۱۲ رجب کو نوروز کی تقریب پر بادشاہ کے جشن قمری میں شامل ہوا تو قدردان بادشاہ نے اس کو پچاس لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر اور منصب نہ ہزاری ذات و نُہ ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ عطا فرمایا۔ یہ جلیل القدر منصب اور عروج و اقتدار اس وقت تک دوسرا کوئی تیموری امیر یا شہزادہ حاصل نہ کر سکا تھا۔

یکم ربیع الاول ۱۰۴۲ھ/۱۶۳۲ء کو شاہ جہان نے اپنی اکتالیسویں سالگرہ کے موقعہ پر یمین الدولہ آصف جاہ خان خاناں کا خطاب اور تمام ہندوستانی افواج کی سپہ سالاری کا عہدہ عطا کیا۔ اس حیثیت سے وہ دکن میں جا کر گلبرگہ اور بیجاپور کی اکثر لڑائیوں میں شامل ہوا اور مرتے دم تک اسی عہدہ پر مامور رہا۔

آصف جاہ عہد شاہجہانی کا امیر الامرا تھا۔ اس کی تنخواہ آج کل کے حساب سے ساڑھے چالیس لاکھ روپیہ سالانہ تھی۔ اس کی دولت و امارت کا کچھ شمار نہ تھا۔ اس کے تمام عزیز و اقارب اور فرزند حکومت کے اعلیٰ عہدوں اور منصبوں پر ممتاز تھے۔ وہ بادشاہ سے اکثر کہا کرتا تھا کہ روپیہ جمع کرنے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ فرزندوں اور قرابت داروں کی عمر آرام و آسائش سے گذرے۔ اور چونکہ میرے سب عزیز مراحم خسروانہ سے خوشحال ہیں۔ میری تمام دولت اور جاگیر حضور ہی کی ہے۔ اس نے ایک وصیت نامہ بھی لکھا جس میں اپنا سب مال و زر بادشاہ پر نثار کر دیا۔

آصف جاہ اپنے باپ اعتماد الدولہ مرزا غیاث کی طرح ٹھوس علمی قابلیت کا مالک تو ضرور تھا۔ مگر اس کی کوئی علمی یادگار موجود نہیں۔ وہ بسیار خوری میں بہت زیادہ شہرت رکھتا تھا۔ فن تعمیرات سے اسے خاص دلچسپی تھی۔ اس نے بیس لاکھ روپیہ کی لاگت سے دس سال کے عرصہ میں ایک عالیشان حویلی لاہور کے میدان نخاس میں تیار کرائی۔ ۱۰۴۳ھ/۱۶۳۴ء میں جب بادشاہ لاہور آیا۔ تو یمین الدولہ نے اس حویلی میں اس کی دعوت کی۔ اور چھ لاکھ روپیہ نذر پیش کیا۔ یہ میدان نخاس دہلی دروازہ کے باہر تھا۔ جہاں آجکل سرائے میاں سلطان۔ لوہا بازار۔ لنڈا بازار اور شہید گنج واقع ہیں۔ حویلی کیا تھی؛ خاصا قلعہ تھا۔ وطن بلڈنگ کے عقب سے لے کر شہید گنج اور ٹیکنیکل سکول تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے اندر حمام۔ مسجدیں۔ دفاتر۔ تالاب۔ حوض۔ فوارے۔ باغ اور زنانہ و مردانہ محلات تھے۔ آصف جاہ کے انتقال کے بعد یہ حویلی شہزادہ دارا شکوہ کے حصے میں آئی۔ اور وہ اس میں رہنے لگا۔ اسی وجہ سے اس علاقے کو اب چوک دارا شکوہ کہتے ہیں۔ مگر حویلی کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا۔

۱۷ شعبان ۱۰۵۱ھ/۱۶۴۱ء کو لاہور میں سلطنت کا یہ زبردست ستون صرصر اجل کے ایک ہی جھونکے سے گر پڑا ؏ زہے افسوس آصف خاں ؒ سے اس کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔ بادشاہ کو اس کی وفات سے بڑا صدمہ پہنچا۔ اس نے آصف جاہ کے بڑے بیٹے شائستہ خاں کو جو صوبۂ بہار کا گورنر تھا ماتمی خلعت اور فرمان تسلی بھیجا۔ اور اس کے دوسرے بیٹے بیٹیوں، بیگم اور دیگر متوسلین و متعلقین کو بڑے بڑے مراتب اور بیش بہا خلعت دے کر ان کی دلجوئی کی اور حکم دیا کہ اسے جہانگیر کے پہلو میں دفن کیا جائے۔ مقبرہ کے چاروں طرف ایک بلند چار دیواری کے اندر باغ بنایا جائے اور اس کی تربت پر ایک ایسا عالیشان گنبد تعمیر کیا جائے جو اس کے نام کی طرح بلند۔ اس کے کارناموں کی طرح بے عیب اور اپنی ساخت میں بے نظیر اور یادگار ہو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور چار سال کے عرصہ میں بیس لاکھ روپے کی لاگت سے مقبرہ آصف جاہ تعمیر ہوا۔

لاہور میں آصف جاہ کا مقبرہ ایک عظیم تاریخی عمارت ہے۔ اور اس دور سرخوشی کی ایک درخشاں یادگار جیسے ہندوستان

کی بہار و خزاں شاہجہان کے ہاتھ میں تھی، اور وہ داد حکمرانی دینے کے علاوہ اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرنے اور اسے جنت نشاں بنانے میں اپنے بہترین صنعتی ذوق کا ثبوت دے رہا تھا۔ آج انقلاب زمانہ سے اس کی صورت اتنی مسخ ہو چکی ہے کہ چند واقف حال لوگوں کے سوا کوئی یہ بھی نہیں جانتا کہ اس کی تر و تازگی کا عالم پہلے کیا تھا اور اب کیا رہ گیا ہے۔ بنانے والوں نے اسے کسی محبت و دلسوزی سے بنایا اور سنوارا تھا۔ لیکن بگاڑنے والوں نے اسے کیسی بے دردی سے تاراج و پامال کر دیا ہے۔ اس کی بہار کیسی گل بداماں تھی اور اس کا جوبن کسی طرح خزاں کے ہاتھوں لٹ گیا ہے۔

آپ خود ہی انصاف سے کہیئے کہ جب سینکڑوں برساتیں گزر جانے کے بعد بڑھاپے میں اس کی مقبولیت اور دلفریبی کا یہ حال ہے تو شباب میں اس کی کیا کیفیت ہو گی۔ اور وہ آنکھوں کو کس طرح مسرور اور دل و دماغ کو کس طرح مسحور نہ کرتا ہو گا۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ فنون لطیفہ میں فن تعمیر کی حیثیت شاعری، مصوری اور موسیقی سے بالکل مختلف ہے۔ اور اس کی ترقی سیاسی قوت کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ مثلاً اقبال یا ٹیگور کے لیے تو یہ ممکن ہے کہ بادشاہ کی سرپرستی کے بغیر چند غیر فانی نظمیں لکھ دیں اور قوم سے اپنی دماغی محنت کی داد پا کر اپنے ادبی ذوق کی تسکین کر لیں۔ لیکن معمار یا مصور یہ نہیں کر سکتے کہ تن تنہا اٹھیں اور لاکھوں روپے اپنی جیب سے صرف کر کے لاہور کے پہلو میں کوئی بادشاہی مسجد کھڑی کر دیں یا مقبرہ جہانگیر یا شالامار باغ کے نمونے کی کوئی خوبصورت عمارت بنا دیں۔ اس کے لیے سیاسی طاقت۔ شاہی دولت۔ حکومت کی سرپرستی اور فنون لطیفہ کے پاکیزہ ذوق کی موجودگی اور یکجائی نہایت ضروری ہے۔ جب تک کسی ملک کے حکمرانوں کا ذوق ایک خاص لطافت۔ ایک خاص نفاست اور ایک خاص نزاکت کی حد تک نہ پہنچ جائے۔ اور وہ اس کے لیے روپیہ پانی کی طرح نہ بہائیں اس وقت تک اچھا فن تعمیر پیدا نہیں ہوتا۔ مغلوں کو خدا نے ان چیزوں سے بہرہ وافی عطا کیا تھا۔ اور وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کے اظہار میں کبھی بخل سے کام نہ لیتے تھے۔

دنیا جانتی ہے کہ آصف جاہ کی بیٹی کے لیے تاج محل تعمیر کرانے میں شاہجہان نے اپنی بہترین محبت صرف کی۔ لیکن آصف جاہ کے لیے اس کے دل میں شکر گذاری کے جو جذبات تھے ان کا صحیح عکس یہ مقبرہ تھا جو فرش سے لے کر گنبد تک سفید سنگ مرمر کا تھا۔ مقبرہ کے اندر کا فرش یا ہشت پہلو چبوترہ کا فرش، قبر کا تعویز۔ حوضوں کے کنارے یہاں تک کہ عالیشان دروازے کی ڈیوڑھی کا فرش بھی سنگ مرمر کا تھا۔ مقبرہ کے آٹھ دروازے اور آٹھ دہلیزیں اور باہر غلام گردشوں پر ہر جگہ سنگ سرخ اور اس کے دور دیہ کاشی کا کام تھا۔

مقبرہ میں سونے چاندی کی قندیلیں اور بیش قیمت جھاڑ فانوس تھے۔ قرآن پڑھنے والوں کے لیے ایک حافظ خانہ، ایک مطبخ خانہ اور چند دیگر مکانات تھے جن میں چوکیدار اور محافظ وغیرہ رہا کرتے تھے۔ جب پنجاب کی حکومت سکھوں کے قبضے میں آئی تو انھوں نے پتھر کے لالچ میں یہ تمام عمارتیں گرا دیں۔ سونے چاندی کا سامان لوٹ لیا۔ اس کا پُر فضا چمن اجاڑ دیا اور باغ کے درختوں کو کاٹ کر کف دست میدان بنا دیا ؎

شکست شیشۂ دل را اگر صدائے نیست
کہ ایں صدا بہ قیامت بلند خواہد شد

یہ کچھ سکھوں پر ہی موقوف نہیں۔ سیلاب انقلاب جب بھی آتا ہے تو اس کی سطح پر سربفلک عمارتیں حُباب کی طرح تیرتی نظر آتی ہیں۔ دنیا کی تاریخ نے ہر زمانے میں اس قسم کی دردناک مثالیں بکثرت پیش کی ہیں۔ بخت نصر اٹھا اور بیت المقدس کو برباد کر گیا۔ ایرانی آئے اور بابل کے قدیم تمدن کو تاراج کر کے چلے گئے۔ رومی نکلے اور کارتھیج کی سرزمین کو آگ اور خون سے بھر دیا۔ سکندر یونان سے نکلا اور ایران کی در و دیوار کے ایک ایک نقش کو مٹا آیا۔ تاتاری اُبھرے اور بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا کر اس کے قدیم آثار و تہذیب کو دجلہ میں ڈبو گئے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے حضوری باغ لاہور کی بارہ دری اور دربار صاحب امرتسر کی تعمیر کے وقت کئی اسلامی عمارتوں کو تباہ و برباد کیا۔ مقبرہ جہانگیر اور نورجہاں کی طرح اس عالیشان مقبرہ کو بھی نقصان پہنچایا اور قبر کے تعویز کو چھوڑ کر جس پر باری تعالیٰ کے ننانوے نام اور قرآنی آیات کندہ تھیں اور جو ان کے کسی کام نہ آ سکتا تھا۔ سنگ مرمر کا ایک ٹکڑہ بھی اس پر نہ رہنے دیا اور عمارت کو بالکل کھنڈر بنا کر اس کا سارا غرور خاک میں ملا دیا۔ مشہور انگریز سیاح ولیم مورکرافٹ جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی زندگی ہی میں ہندوستان کی سیر و سیاحت کے لیے آیا تھا اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ :-

> "مہاراجہ رنجیت سنگھ نے حضوری باغ میں جو نشست گاہ بنائی ہے۔ اس میں اور
> مقبروں کے علاوہ نورجہاں کے بھائی آصف جاہ کے مقبرہ کا پتھر بھی اس کے
> فرش اور گنبد سے اکھاڑ کر لگایا ہے۔"

اس مقبرہ کے چبوترہ پر جو چار فوارہ دار حوض ہیں۔ اور وہ ہشت پہلو نہر جو مقبرہ کے گرد چکر لگاتی ہے۔ آج سے کچھ عرصہ پیشتر مٹی کے بڑے بڑے تودوں اور انباروں کے نیچے دبی ہوئی تھی، اور لاہور کے لوگوں کو اس کا بالکل علم نہ تھا۔ باغ کا کچھ حصہ بھی شاہدرہ کے ایک سکھ خاندان کے قبضہ میں تھا۔ حکومت انگلشیہ نے قابضوں کو معاوضہ دے کر اسے پھر باغ کے ساتھ شامل کیا اور حوضوں اور نہروں کو صاف کر کے باغ اور مقبرہ کی رونق و زیبائش کو بحال کیا۔

۱۸۸۰ء میں گورنمنٹ پنجاب نے رائے بہادر کنہیا لال ایگزیکٹو انجینئر لاہور ڈویژن کی معرفت اس عالیشان مقبرہ کی کچھ مرمت کرائی اور یہ اسی مرمت کا نتیجہ ہے۔ کہ یہ رعب دار اور ہیبت ناک عمارت گرنے سے بچ گئی۔ اور اس وقت سے اب تک حوادث دہر کا مقابلہ کر رہی ہے۔

۱۹۰۲ء میں لارڈ کرزن وائسرائے ہند و گورنر جنرل کی توجہ سے جب محکمہ آثار قدیمہ قائم ہوا تو مقبرہ کے گنبد کی سیڑھیاں جو پتھر اکھاڑتے وقت بالکل توڑ دی گئی تھیں۔ از سر نو بنائی گئیں اور سنگ مرمر کا تعویز جو باری تعالےٰ کے ننانوے ناموں کی وجہ سے بیکار سمجھ کر ایک طرف پھینک دیا گیا تھا۔ ایک دفعہ پھر اپنی اصلی جگہ پر نصب کیا گیا۔ اس تعویز پر دو طرف تو باری تعالےٰ کے ننانوے نام ہیں۔ سرہانے کی طرف هو الله الذی لا اله الا هو عالم الغیب والشهادة هو الرحمٰن الرحیم اور پائے تعویز کل نفس ذائقة الموت لکھا ہوا ہے۔ حروف کئی جگہ سے اکھڑ گئے ہیں۔

سرحاکمان لاہور کے زمانے میں سکھوں نے مقبرہ کے چونہ گچ چبوترہ کے دونوں پہلوؤں پر پیپل کے دو بڑے بڑے درخت لگا کر اپنی بدمذاقی کا ثبوت دیا تھا۔ یہ تین حاکم سردار لہنا سنگھ، سوبھا سنگھ اور گوجر سنگھ تھے جو احمد شاہ ابدالی کی واپسی کے بعد

لاہور پر قابض ہو گئے تھے۔ اور اسے تین برابر حصوں میں تقسیم کر کے اپنے اپنے حصے کے حاکم بن بیٹھے تھے۔ چونکہ یہ مقبرہ کی خوبصورتی کے لیے بہت بڑی روک تھے۔ اس لیے اب یہ درخت اکھاڑ دیے گئے ہیں۔

مقبرہ کے بالکل محاذ میں مغرب کی سمت جو پختہ مسجد ہے۔ یہ بھی طوائف الملوکی کے زمانے میں اُجڑ چکی ہے۔ اور عہد برطانیہ میں ۱۸۸۰ء سے پیشتر محکمہ ریلوے کے کسی انگریز ملازم کی کوٹھی کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ اب نہ وہاں کوٹھی ہے۔ نہ صاحب بہادر۔ مسجد کے آثار البتہ نظر آ رہے ہیں۔

اس مقبرہ کی موجودہ عبرت ناک حالت دیکھ کر افسوس آتا ہے کہ بنانے والوں نے تو لاکھوں روپے صرف کر کے اسے ایک یادگار بنایا۔ مگر بگاڑنے والوں کو ذرا ترس نہ آیا۔ اس عمارت کا حسن اگرچہ لُٹ چکا ہے۔ مگر شاہجہان کے جذبات شکر گذاری نے جو رفعت اسے بخشی ہے۔ وہ آج تک قائم ہے۔ ننگی اینٹوں کے اس گنبد کی چوٹی پر اب اکثر گدھ بسیرا کرتے ہیں۔ لیکن اس کے لاجواب سڈول پن میں ایک ایسی کیفیت ہے کہ بار بار دیکھئے تب بھی دل سیر نہیں ہوتا۔

آصف جاہ کے گنبد سے بہتر گنبد پنجاب نے پھر نہیں دیکھا۔ اس کا جواب اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ شاہجہانی دور کے مشہور انجنیئر نواب علی مردان خاں کے مقبرہ کا گنبد ہے۔ جو مغلپورہ میں ہے۔ مقبرہ کی بیرونی دیواروں پر اب بھی نبت کاری کے رنگین ٹکڑے جو زمانے کی دست برد سے بچ رہے ہیں۔ کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ ان کا رنگ روغن اب بھی اسی طرح نکھرا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے آج ہی بنے ہیں۔

آصف جاہ کی زندہ یادگاروں میں نشاط باغ کشمیر اپنی خوبصورتی کی وجہ سے اب بھی مشہور ہے۔ یہ شالامار باغ کشمیر سے کچھ فاصلہ پر جنوب کی جانب ڈل کے کنارے واقع ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اسم بامسمیٰ ہے۔ "گلزار نشاط و عیش دنیا" ۱۰۴۴ھ سے اس کی تاریخ تعمیر برآمد ہوتی ہے۔

اس کے بارہ چبوترے جو برج آسمانی کی طرز پر بنے ہیں۔ ڈل کے مشرقی ساحل سے بتدریج پہاڑ کی بلندی تک چلے گئے ہیں۔ باغ کے درمیان سے ندی سبزہ خوابیدہ کو بیدار کرتی۔ پھولوں کو شادابی بخشتی نہر تختے کے خاتمہ پر ایک آبشار بناتی باغ کے باہر ایک حوض میں گر کر ڈل میں شامل ہونے کے لیے اس تندی اور تیزی سے سفر طے کرتی ہوئی جاتی ہے کہ جا بجا جھاگ کے تودے لگ جاتے ہیں۔ اوپر سے نیچے تک نہر کی تمام لمبائی میں فواروں کی ایک قطار چنی گئی ہے۔ ان کے چلنے سے باغ کی زندگی بہجت و انبساط اور مسرت و شادمانی سے لبریز ہو جاتی ہے۔ پھولوں کی کیاریاں، گلاب اور دیگر رنگا رنگ کے گل بوٹوں کے تختے سرمۂ تسخیر بن کر دیکھنے والوں کے دلوں میں اترنے لگتے ہیں اور باغ نشاط و مسرت کا ایک مخزن جادو بن جاتا ہے۔
قدسی مشہدی کہتا ہے ؎

دلت را گر ہوائے انبساط است — نشاط عمر در باغ نشاط است

اور گو یہ تین سو سال سے انقلابات دہر کا مقابلہ کر رہا ہے۔ مگر آج بھی اس کا منظر اس قدر حسین اور دلآویز ہے کہ کسی طرح نگاہ سیر نہیں ہوتی۔ سبز پوش مخملی تختوں کا زاویۂ نگاہ کی ہر تبدیلی پر ایک جدید جنت نگاہ پیش کرنا، ایک ایک ذرے سے طراوت و خورمی کا اُبل پڑنا، لطافت ہوا کا بدن میں ایک نئی روح پھونکنا اور پانی کا ہر پیچ و خم پہ ایک نیا لوچ دل میں پیدا کرنا۔ ایسی

چیزیں نہیں جنھیں انسان کبھی فراموش کر سکے۔ یہاں پہنچ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم کسی ایسی سرزمین میں پہنچ گئے ہیں جہاں کی ہر ہر چیز ہم سے خراج شباب طلب کرتی ہے ——— مرتب]

نور جہاں بیگم

اب کہاں نور جہاں بیگم کے وہ چاروں چمن
مقبرہ بھی صورت گور غریباں دیکھئے

نور جہاں کون تھی اس کی پیدائش کس مسافرت اور بیکسی کے عالم میں ہوئی۔ پرورش کہاں پائی۔ کن محلوں میں پروان چڑھی۔ ایران سے آگرہ اور آگرہ سے علی قلی خاں عرف شیر افگن خاں کی بیگم بن کر کس جاہ و جلال کے ساتھ بردوان پہنچی۔ پھر کن حسرت ناک حالات میں بیوہ ہو کر آگرہ واپس آئی۔ اور آخر شہنشاہ جہانگیر کی نظروں میں چڑھ کر کس طرح ملکۂ ہند کہلائی؟ ان تمام حالات سے ہر پڑھا لکھا خصوصاً مدرسہ کا ہر طالب علم آگاہ ہے۔

نور جہاں نے جہانگیر کے دل و دماغ پر قبضہ کر رکھا تھا جو کچھ وہ کہتی تھی بادشاہ وہی کرتا تھا اور جو کچھ وہ چاہتی تھی وہی ہوتا تھا۔ اس کا بھائی میرزا ابوالحسن آصف جاہ شاہجہان کا خسر اور جہانگیر کا وزیر اور سپہ سالار تھا۔ اس کا خالو ابراہیم خان بنگال کا گورنر اور ابراہیم خاں کا بھتیجہ ـــ احمد بیگ کٹک کا حاکم تھا۔ غرض نور جہاں کے تمام عزیز اور رشتہ دار جہانگیر کے دربار میں بڑے بڑے عہدوں اور منصبوں پر فائز تھے۔

نور جہاں کے بطن سے جہانگیر کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ نور جہاں کی صرف ایک بیٹی شیر افگن خاں سے تھی اور وہ جہانگیر کے فرزند شہریار سے بیاہ دی گئی تھی۔ آصف جاہ نے اپنی بیٹی نواب[1] عالیہ بیگم کا نکاح شاہزادہ خرم سے کیا ہوا تھا۔ یہی عالیہ بیگم بادشاہ بیگم ہو کر ممتاز الزمانی ممتاز محل کہلائی اور یہی شاہزادہ خرم بادشاہ ہو کر شاہجہان کہلایا۔

معاملات سلطنت میں باپ بیٹے اور بہن بھائی کی محبت میں عجیب انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ جہانگیر دمہ کی بیماری کی وجہ سے عموماً بیمار رہتا تھا۔ نور جہاں اور آصف جاہ دونوں اس کو چراغ سحری سمجھے رہے تھے۔ اب آصف جاہ کی یہ خواہش تھی کہ اس کے مرنے کے بعد اس کا داماد شاہجہان تخت پر بیٹھے اور نور جہاں اپنے داماد شہریار کو سلطنت دلانا چاہتی تھی۔ چنانچہ نور جہاں نے بادشاہ کو کہہ سن کر نہ صرف شاہجہان سے ناراض کرا دیا بلکہ اُس کے وکیل کی دربار میں آمد و رفت بند کرا کر اس کی کئی جاگیروں کو شہریار کے نام منتقل کرا دیا۔ شہزادہ خرم نے بڑے بڑے معتمد جہانگیر کے پاس اپنی بے گناہی کے اسباب دریافت کرنے کے لیے بھیجے۔ انھوں نے بہت کچھ کہا سنا بھی۔ لیکن جہانگیر نے کوئی توجہ نہ کی اور آخر شاہجہان نے تنگ آ کر اعلانیہ مخالفت بلکہ بغاوت شروع کر دی اور ۱۰۳۲ھ / ۱۶۲۲ء سے ۱۰۳۵ھ / ۱۶۲۵ء تک باپ بیٹوں کی لڑائیوں میں بڑے بڑے نامور اور معتبر افسر

---

[1] منگنی کی رسم ۱۰۱۵ھ / ۱۶۰۶ء میں ہوئی اور شادی کی رسم ربیع الاول ۱۰۲۱ھ / ۱۶۱۲ء میں۔ اس وقت بیگم کی عمر ۱۹ سال ۲۱ روز شمسی اور شاہزادہ کی عمر ۲۰ سال ایک ماہ آٹھ یوم شمسی تھی (ظفر نامہ شاہجہان ص ۵)

مارے گئے۔ نورجہاں کا خالو ابراہیم خان بھی جو بادشاہ کی طرف سے شاہزادہ کی فوجوں سے جنگ آزما تھا انہی لڑائیوں میں کام آیا۔

۳ جمادی الثانی ۱۰۳۵ھ / ۱۶۲۵ء کو شاہجہان نے اپنے دو فرزند دارا شکوہ اور عالمگیر دو لاکھ روپیہ کی پیش کش کے ساتھ جہانگیر کے پاس عفو تقصیرات کے لیے بھیجے۔ اور ملک میں امن و امان کی صورت پیدا ہوئی۔

۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۷ء میں جہانگیر کشمیر میں تھا اور شاہجہان مہمات دکن میں مصروف تھا۔ آصف جاہ، اس کا بیٹا شائستہ خاں، نورجہاں، شہریار اور دیگر امراء و وزراء سب بادشاہ کے ہمراہ تھے۔ انہی دنوں شہریار بادشاہ سے اجازت لے کر اپنی بیماری کے علاج کیلئے لاہور چلا آیا۔ اُدھر کشمیر سے واپس آتے ہوئے جب رستے ہی میں جہانگیر کا انتقال ہو گیا[1] تو آصف جاہ نے بہن کے طرفداروں پر پہرے بٹھا دیئے اور شاہجہان کے پاس بادشاہ کی وفات اور فوراً آگرہ پہنچنے کا پیغام بھیجا۔ اور شہزادہ داور بخش پسر سلطان خسرو عرف بلاقی کو جو اس کی قید میں تھا برائے نام بادشاہ بلکہ قربانی کا بکرا بنا کر لاہور کی طرف روانہ ہوا۔ جہاں باپ کی وفات کی خبر سُن کر شہریار نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا۔ شہریار نے بایسنغر خاں خلف شاہزادہ دانیال کو جو جہانگیر کی وفات کے وقت آصف جاہ کی قید سے بھاگ آیا تھا۔ سپہ سالار اور میر افضل خان میر سامان جہانگیر کو مہمات کل و جزو کا افسر بنا رکھا تھا۔ افضل خان درپردہ شاہجہان کا طرفدار تھا اور بظاہر شہریار کے ساتھ تھا۔ ۱۱ ربیع الاول ۱۰۳۷ھ کو لاہور سے تین کوس پر لڑائی ہوئی۔ شہریار کی سپاہ کو شکست ہوئی وہ دوڑ کر قلعہ میں آ گیا۔ آصف جاہ کے آدمیوں نے شہریار اور اس کی بیوی لاڈلی بیگم کو جو نورجہاں کی بیٹی تھی شاہی محل سے نکال کر قلعہ کے ایک محفوظ مقام میں نظر بند کیا اور دوسرے روز شہریار کی آنکھوں میں سلائی پھروا دی۔ اسی موقعہ پر شہریار نے یہ رباعی کہی تھی ؎

زنرگس گلاب ار چہ نتواں کشید — کشیدند از نرگس من گلاب

اگر از تو پرسند تاریخ من — بگو کور شد دیدۂ آفتاب

جب شاہجہان دکن سے آگرہ پہنچ گیا تو اُس نے اپنا ایک دستخطی فرمان سید امانی رضا بہادر مخاطب بہ خدمت پرست خاں کے ہاتھ یمین الدولہ آصف خاں آصف جاہ کے نام لاہور بھیجا کہ ناشدنی (شہریار کو کہتے تھے) بلاقی بگرشاسپ اور فرزندان دانیال طہمورث و ہوشنگ کی آنکھوں میں سلائیاں پھروا دو۔ اور ہو سکے تو ہمارے پاس بھجوا دو۔ ورنہ ٹھکانے لگا دو۔ ۲۱ جمادی الاول ۱۰۳۷ھ کو یہ فرمان آصف جاہ کے پاس پہنچا اسی دن منبر پر شاہجہان کے نام کا لاہور میں خطبہ پڑھا گیا اور ۲۵ جمادی الاول کو پانچوں شہزادے موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے ؎

شربت سلطنت بجاہ چناں شیریں است — کہ از پیۓ آں خون برادر ریزند

---

[1] غالباً بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہو گا کہ جہانگیر کے نام سے اس کی ایک قبر مقام چنگس میں بھی ہے جو کشمیر کے رستے میں راجوری اور تھنہ کے درمیان ایک مقام ہے جس کے ایک طرف سرسبز پہاڑ ہے اور دوسری طرف ایک نالہ ہے۔ یہ قبر ڈاک بنگلہ اور پولیس چوکی چنگس کے متصل ہے اس پر ایک سبز جھنڈا اور تعویز قبر پر سبز غلاف رہتا ہے۔ قبر خاصی لمبی ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہاں جہانگیر کی انتڑیاں دفن کی گئی تھیں۔ اگر انتڑیاں بھی ہوتیں تو بھی یہاں ضرور کوئی شاہی عمارت ہوتی۔

نورجہاں لاہور میں تھی اور یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی داماد کے نابینا ہونے کا واقعہ سُنا۔ پھر اس کے قتل کی خبر بھی سُنی۔ لیکن بھائی کی قید میں ہونے کی وجہ سے دم نہ مار سکتی تھی۔ اور بادشاہ کے مرنے کے بعد وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔

جہانگیر کی وفات اور اپنے داماد کی موت کے بعد جب تک وہ زندہ رہی لاہور ہی میں رہی اُس کے پاس باپ (اعتماد الدولہ) کی دولت تھی۔ خود بھی امیر کبیر تھی اور اپنا علیحدہ شاہانہ دربار رکھتی تھی۔ جہانگیر کے بعد یہ بالکل خانہ نشین ہو گئی۔ شاہجہان نے دو لاکھ روپیہ سالانہ اس کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ وہ اپنے خاوند کے بعد اٹھارھویں سال ۲۹ شوال ۱۰۵۵ھ / ۱۶۴۵ء کو انتقال کر گئی۔

نورجہاں جب تک زندہ رہی مستحقین اور سفید پوشوں کے علاوہ غربا، یتامیٰ، بیوہ عورتوں اور غریب گھرانوں کے لیے اس کا دم سرچشمہ حیات تھا۔ اس نے سینکڑوں بلکہ ہزاروں غریب لڑکیوں کی شادیاں کرائیں ان کے جہیز کا سامان اپنے پاس سے دیا۔ اہل علم کی قدردانی کی۔ اور کوئی حاجت مند اُس کے دروازہ سے خالی نہ گیا۔ دِل کُشا اسی کا باغ تھا۔ لیکن اس میں اس کا خاوند دفن تھا۔ پھر اسی باغ کی وسیع حدود میں یمین الدولہ آصف جاہ (وفات ۷ ارشعبان ۱۰۵۱ھ مطابق ۱۶۴۱ء) کا مقبرہ بن چکا تھا۔ اس لیے اُس نے اپنے لیے اس مقبرہ کی چاردیواری کے باہر اپنا رہائشی محل تعمیر کرایا اور اس کے چاروں طرف چار چھوٹے چھوٹے باغ لگا کر نام ان کا چار چمن رکھا۔ ہر چمن کا طول و عرض سو سو گز تھا۔ مکانات جن میں خدمت گار عورتیں اور دیگر ملازمین کی رہائش تھی سب مٹ گئے۔ بلکہ اس کے اپنے رہائشی محل کا بھی کہیں نام نشان نہیں اور نہ ان کی کہیں کیفیت نظر آئی۔ اس لیے مقبرہ نورجہاں بیگم کی جو کیفیت ظفر نامہ شاہجہان میں بحوالہ شاہجہان نامہ درج ہے پہلے اس کو بالاختصار لکھتا ہوں پھر اس کی موجودہ حالت کا ذکر کروں گا :۔

> "یہ مقبرہ روضۂ جہانگیر کے جلو خانہ کے غرب میں واقع ہے اس کا گنبد سطح سے بلندی تک مثمن تھا۔ قطر اس کا پندرہ گز۔ اضلاع ہشتگانہ اندر کی طرف آٹھ نشیمن اور باہر کی طرف آٹھ پیش طاق۔ ہر طاق طول میں سات، عرض میں چار اور ارتفاع میں گیارہ گز۔ بطرز نیم مثمن۔ عمارت کے اندر سنگ مرمر۔ اور باہر سنگ ابری۔ سنگ مرمر۔ سنگ زرد اور طرح طرح کے قیمتی پتھر لگے ہوئے ہیں۔ مقبرہ کے بلند چبوترہ اور قبر کی اندرونی عمارت میں انواع و اقسام کے رنگین پتھروں سے پرچین کاری ہے۔ آیاتِ قرآنی اور اسمائے الٰہی بطریق پرچین کاری اس میں منقش ہیں۔ عمارت کے اندر جو فرش ہے۔ اس میں قسم قسم کے خوبصورت پتھر گرہ بندی کے طریق پر لگے ہوئے ہیں۔ گنبد کے گرد جو مثمن چبوترہ ہے۔ اس کا قطر ساٹھ گز ہے۔ اور وہ سرتاپا سنگ سُرخ کا بنا ہوا ہے۔ اس چبوترہ کے چاروں طرف حوض ہیں۔ ہر حوض کا طول نو اور عرض ساڑھے سات گز ہے۔ اس مقبرہ اور روضۂ جہانگیر کی شرقی دیوار مشترک ہے یعنی جو دیوار مقبرہ جہانگیر اور سرائے اور مقبرہ آصف جاہ

کے گرد پھیلی ہوئی ہے۔ یہی دیوار چار چمن اور مقبرہ نور جہاں کو روضہ جہانگیر سے ملحق کرتی ہے۔ اس مقبرہ کے غربی ضلع میں ایک مسجد ہے اور اس کے مشرق میں ایک خوبصورت بنگلہ نما عمارت ہے۔ باغ سے جنوب کی سمت ایک دروازہ ہے۔ یہ تمام عمارت اور اپنا مقبرہ اور باغ نور جہاں نے اپنی زندگی میں تین لاکھ روپیہ کی لاگت اور چار سال کی طویل مدت میں تعمیر کرایا تھا۔"

یہ اُس مصنف عنایت خاں آشنا خلف ظفر خاں احسن گورنر کشمیر کے الفاظ ہیں جو نور جہاں کی موت کے بعد بھی دیر تک زندہ رہا ہے۔

چار چمن اُجڑ گئے، کھجوروں کے چند درخت کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ مقبرہ اور اس کی دیگر عمارات کبھی قابل دید سیرگاہیں تھیں سکھوں کے زمانہ میں اور ان کے بعد اُن کی یہ حالت تھی کہ کوئی سیاح کوئی شاعر اور کوئی اہل دل ایسا نہ تھا جو یہاں آیا ہو۔ اور اپنے حساس دل کو مجروح کر کے نہ گیا ہو۔ شاعروں نے بڑے بڑے درد انگیز اور عبرت خیز اشعار نور جہاں کے مزار خستہ پر لکھے ہیں۔ جس مقبرہ کی دیواریں روضۂ جہانگیر اور مقبرہ آصف جاہ کے ساتھ مشترک تھیں اُس کو ۱۸۶۰ء کے پس و پیش ریلوے والوں نے ریلوے لائن بنا کر بالکل علیحدہ کر دیا ہے۔ چنانچہ اب مقبرہ آصف جاہ و مقبرہ نور جہاں کے درمیان ریلوے لائن حد فاصل ہے۔ آج اس مقبرہ پر کوئی گنبد نظر نہیں آتا۔ سیدھی سادی چھت ہے۔ مقبرہ کے چار چمن اور چار فوارہ دار حوض تو سہ حاکمان لاہور کے زمانہ (۱۷۶۵ء تا ۱۷۹۹ء) ہی میں تباہ ہو چکے تھے۔ سکھوں کی باقاعدہ سلطنت بھی اسلامی عمارات کے لیے کچھ مفید ثابت نہ ہوئی۔ سنگدلی و شقاوت قلبی نے یہاں تک جرأت کی کہ زنانہ قبروں کی حرمت بھی اُن سے نہ ہو سکی۔ ملکۂ ہند کی قبر کی دیواروں اور اس کے دروازوں کا سنگ مرمر تو الگ فرش کے خوبصورت پتھر بھی اُن کی بے نگاہوں سے نہ بچ سکے۔

نور جہاں کی قبر پر نہ آیات قرآنی ہیں نہ اسمائے الٰہی ہیں نہ دیواروں پر رنگ برنگ پتھروں سے کچھ لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ ان مرمریں پتھروں کو کیا اُکھاڑا کہ چند سال کے بعد اپنی ہی جڑیں اُکھڑ گئیں ؎

دیدی کہ خون ناحق پروانہ شمع را
چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

۱۸۸۲ء کا مصنف جس نے رنجیت سنگھ کا زمانہ دیکھا تھا اس مقبرہ کی خستہ حالی کا ذکر کرتا ہوا تحقیقات چشتی میں (ص ۴۷۹) لکھتا ہے :-

"مرقد نور جہاں کے گرد بڑا باغ تھا۔ اب زراعت ہوتی ہے اور چند درخت خرما کے موجود ہیں۔ سکھ تمام پتھر اکھاڑ کر لے گئے۔ اب مقبرہ کی عمارت خشتی ہے۔ نہ سنگ مرمر ہے نہ سنگ سرخ۔ قبروں کے نشان اوپر ہیں۔ نیچے تہ خانہ ہے جس میں صرف تعویز قبر خشتی کھڑا کر رکھا ہے۔"

۱۸۸۴ء کا مصنف رائے بہادر کنہیا لال تاریخ لاہور (ص ۳۲۰، ۳۲۱ پر) اس کے متعلق لکھتا ہے :-

"مقبرہ کی تمام عمارت قابو تی ہے۔ چبوترہ کے اوپر دو قبریں ہیں۔ ایک نور جہاں کی ایک اُس کی بیٹی کی۔ جنوب کی طرف اوپر جانے کا زینہ ہے۔ نیچے ایک مکلف تہ خانہ ہے۔ جس کا رستہ سلامی کے طور پر جنوب کی سمت ہے۔ دونوں قبریں سنگ مرمر کی تھیں۔ باہر کی دیواروں پر سنگ سرخ اور فرش پر سنگ ابری تھا۔ جب اس کے بھائی آصف جاہ کے مقبرہ کا پتھر اتارا گیا تو اس کی باری بھی آ گئی۔ مہاراجہ کے حکم سے تہ خانہ کا دروازہ کھلوایا گیا۔ تو اس میں دو نعشوں کا آبنوسی صندوق دو مرمریں ہودوں میں رکھے ہوئے نظر آئے۔ سنگ مرمر تو اکھاڑ لیا گیا اور نعشوں کے صندوق زمین میں دفن کر دیے گئے۔ اور مقبرہ کی مرمت اینٹ اور چونہ سے کرا دی گئی۔ چبوترہ اور اس کے تعویذ خشتی بن گئے۔ بالائے سقف خشتی فرش لگ گیا۔ اس کی منڈیریں بھی بن گئیں لیکن تہ خانہ کا دروازہ بند نہ کیا گیا۔ وہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اکثر لوگ میلا (پاخانہ) کر جاتے ہیں۔"

آج سے قریباً پینتالیس سال پیشتر ۱۸۹۹ء میں راقم نے اس مقبرہ کی جو حالت دیکھی تھی اُس میں اور ۱۸۸۲ء کی حالت میں چنداں فرق نہ تھا۔ گرمیوں کے دن تھے مال مویشی چرانے والے چرواہے اور ان کے چوپائے جگہ جگہ لیٹے پڑے تھے۔ ان کے پیشاب اور گوبر کی کثرت سے عفونت آ رہی تھی۔ فرش کے سنگ ابری کی جگہ خاک اڑ رہی تھی۔ دیواروں پر سنگ مرمر کی جگہ چونہ کی لپائی تھی۔ تہ خانہ کے اندر جہاں ملکۂ ہندوستان اور اس کی بیٹی کی قبریں تھیں اور جو بالکل بے نشان تھیں۔ دیہاتیوں، چرواہوں اور بدتمیزوں نے پردہ کی جگہ دیکھ کر پاخانہ بھرا ہوا تھا۔

۱۹۰۵ء میں یا اس سے ایک دو سال قبل مہاراجہ بردوان کہ اُن کے آباؤ اجداد کا اصل وطن لاہور ہی ہے۔ لاہور آئے شالامار باغ مقبرہ جہانگیر اور مقبرہ آصف جاہ کے بعد جب انھوں نے نور جہاں بیگم کے پُرحسرت انجام پر ایک نظر کی تو دل پکڑ کر رہ گئے انھوں نے گورنمنٹ پنجاب کو اس مقبرہ کی نگرانی و مرمت کے لیے پانچ ہزار روپیہ دیا۔ اس کے بعد جب لارڈ کرزن وائسرائے ہند نے محکمہ آثار قدیمہ قائم کیا تو لاہور کی کئی قدیم عمارات کے ساتھ یہ مقبرہ بھی سرکاری نگرانی میں آ گیا۔ چنانچہ اب مقبرہ کے گرد ایک آہنی خاردار جنگلہ لگا دیا گیا ہے اور اس کے چاروں طرف چھوٹی چھوٹی سرسبز و شاداب روشیں بنا کر چار چمن کی یاد تازہ کر دی گئی ہے اور قبر کا تعویذ اور چبوترہ بھی سنگ مرمر کا بنا دیا گیا ہے۔

قبروں کے پاس ہی شرقی دیوار کے ساتھ حکیم حافظ محمد اجمل خاں دہلوی حاذق الملک بہادر مرحوم کی طرف سے سنگ مرمر کی ایک لوح نصب ہے جس پر ذیل کے اشعار درج ہیں :۔

تاریخ وفات ملکہ نور جہاں

پس از فراق دہ و ہشت سال شد یک جا — روان مہر نسا بیگم و ملک بہ جہاں
بہ یاد بانوئے ہندوستاں سروشم گفت — سنین ہجرت و تاریخ عیسوی توأماں
ہزار و پنجہ و ہیج رفتہ از ہجرت — بلے بہ ہیش جہانگیر رفتہ نور جہاں

حاذق الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں در ۱۹۱۲ء مطابق ۱۳۳۱ھ
ایں لوح را نصب کردند

اب سرکار کی توجہ سے اس مقبرہ پر ایک سرکاری آدمی بھی موجود رہتا ہے۔ مقبرہ نور جہاں کے متصل ہی سڑک کلاں کے کنارے تھانہ شاہدرہ کے پاس تحصیل شاہدرہ قائم ہونے سے اس آسودۂ آغوشِ راوی کے مزار پر اکثر لوگوں کی روزانہ آمد و رفت رہتی ہے اور سیاح بھی دور دور سے اسے دیکھنے کے لیے آتے ہیں:۔

حضرت میاں میرؒ

روضۂ شیخ محمد میر باصفا کو | بہر بیماریٔ درد و روح درماں دیکھیے
شیخ نتھا[1] بھی ہیں خواجہ بہاری[2] بھی ہیں | باصفا یاروں کی بزمِ خلد ساماں دیکھیے

اصل نام میر محمد[3] اور لقب میاں میر یا شاہ میر تھا۔ دارا شکوہ سکینۃ الاولیاء میں میر محمد کی جگہ میاں میر نام مشہور ہونے کی وجہ یہ لکھتا ہے کہ ہندی زبان میں "میاں" صاحب کو کہتے ہیں اور "جی" تعظیم کا لفظ ہے۔ اس لیے سب آپ کو حضرت میاں جی کہتے ہیں۔

حضرت میاں میر ۹۳۸ھ میں سیوستان میں پیدا ہوئے جو ٹھٹھہ اور بھکر کے درمیان واقع ہے۔ آپ کے تین بھائی اور تھے۔ ایک بڑا اور دو چھوٹے۔ ان کے نام یہ تھے۔ قاضی بولن۔ قاضی عثمان اور قاضی طاہر۔ دو بہنیں بھی تھیں جن میں جمال خاتون

---

[1] شیخ نتھا حضرت میاں میر کے محبوب مریدوں میں تھے۔ ۱۰۲۷ھ میں آپ وفات پا گئے۔ حضرت میاں میر آپ کے جنازہ میں شامل تھے اور آبدیدہ ہو کر فرماتے تھے "اس فقیر خانے کا فقر میاں نتھا لے گئے۔ اس لیے جب ہمارا وقت آئے تو ہمیں بھی ان کے پاس ہی دفن کرنا۔ میاں نتھا صاحب کشف و کرامات تھے۔ جن، جمادات اور نباتات تک آپ سے ہم کلام ہوتے تھے۔ سکینۃ الاولیاء میں دارا شکوہ نے آپ کے حالات میں بہت کچھ لکھا ہے۔

[2] خواجہ بہاری نے لاہور کے ایک فاضل ملا فاضل نام سے علوم ظاہری اور حضرت میاں میر سے علوم باطن حاصل کیے۔ تجرید، توکل اور تفرید میں ممتاز تھے۔ کوئی مرید پکی ہوئی روٹی لے آتا تو کھا لیتے۔ نقود و جنس کو قبول نہ کرتے۔ حضرت میاں میر کی وفات کے بعد آپ کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ دارا شکوہ لکھتا ہے جب ۱۰۵۰ھ میں صفی میرزا والیٔ ایران نے قندھار پر چڑھائی کا ارادہ کیا تو میں ان کی خدمت میں دعا کے لیے حاضر ہوا۔ فرمایا اس کی کیا طاقت ہے کہ وہ آنکھ اٹھا کر بھی ادہر دیکھ سکے۔ اگر ایسا ہوا تو میں اپنے ہاتھ سے اسے قتل کروں گا۔ چنانچہ ایک ماہ کے بعد خبر آئی کہ اس کو کسی نے زہر دے کر ہلاک کر دیا۔

[3] آپ کے حالات مندرجہ ذیل کتب میں میری نظر سے گزرے ہیں:۔

سکینۃ الاولیاء۔ تحقیقات چشتی۔ خزینۃ الاصفیاء۔ تاریخ لاہور۔ ہسٹری آف لاہور (انگریزی) یادرفتگاں۔ تاریخ جلیلہ۔ چونکہ سب مصنفوں کا ماخذ سکینۃ الاولیاء ہی ہے۔ اس لیے راقم بھی جو کچھ لکھ رہا ہے دارا شکوہ کی خوشہ چینی کے طفیل ہے لیکن خذ ما صفا کے مطابق ہے۔

صاحب کشف و کرامات گزری ہیں۔ آپ کے والد کا نام قاضی سائیں دتا اور دادا کا نام قاضی قلندر فاروقی تھا جو بقول بعض اٹھائیسویں پشت میں حضرت فاروق اعظمؓ سے ملتے ہیں۔ حضرت میاں میر سیوستان کے ایک بزرگ شیخ خضر سے بیعت تھے۔

پچیس سال کی عمر تھی کہ اکبر کے زمانہ میں آپ لاہور تشریف لائے۔ آپ نے اس مسجد میں قیام کیا جہاں مولانا سعد اللہ اور کبھی کبھی ان کی عدم موجودگی میں ان کے شاگرد مولانا نعمت اللہ کا حلقہ درس ہوا کرتا تھا۔ دارا شکوہ ان استاد شاگرد کے متعلق لکھتا ہے "زمانہ بھر کے عالم فاضل اور باطنی علوم سے آراستہ تھے" دارا شکوہ کے اُستاد علوم ظاہری حضرت اخوند میرک شیخ تھے۔ اور اخوند میرک کے استاد مولانا نعمت اللہ تھے۔ دارا شکوہ لکھتا ہے "میرے استاد فرماتے تھے کہ ہمارے استاد مولانا نعمت اللہ نے فرمایا کہ کئی سال تک حضرت میاں میر نے ہم سے علم تحصیل کیا اور ہم انہیں پڑھاتے رہے لیکن ان کے باطنی صاحب کمال ہونے سے ہم مطلق بے علم ہیں۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں آپ علوم معقول و منقول میں اپنے ہم سبقوں پر فوقیت لے گئے۔

علوم سے فارغ ہو کر باغوں اور جنگلوں میں نکل جاتے یا بزرگان دین کے مزارات کی زیارت کیا کرتے۔ ایک دن جو موج آئی تو لاہور سے یکدم سیدھے سرہند جا پہنچے۔ وہاں پہنچ کر گھٹنے کے درد میں مبتلا ہو گئے، حاجی نعمت اللہ سرہندی ایک بزرگ آپ کی تیمارداری کرتے یہاں تک کہ آپ کے فضلہ کو اپنے ہاتھ سے اٹھاتے۔ اس خدمت کے عوض آپ نے اس کو اپنا مرید کیا اور آپ کے مریدوں میں سب سے پہلا مرید یہی حاجی نعمت اللہ تھا جس نے بعد میں سلوک و تصوف میں درجۂ کمال حاصل کیا۔

سرہند سے آپ پھر لاہور تشریف لائے اور محلۂ باغبانان میں جسے دارا شکوہ کے زمانہ میں محلہ خوافی پورہ[1] کہتے تھے مقیم ہوئے اور پھر اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک اسی محلہ میں رہے۔

آپ بہت کم لوگوں کو مرید کیا کرتے تھے جو ان کے تجربہ میں درست اترتا تھا اور جس میں کامل اہلیت دیکھتے تھے اسی کو مرید کرتے تھے اور چونکہ ان کی شرط اول یہ شعر ہوتا تھا ؎

شرطِ اول در طریق معرفت دانی کہ چیست
ترک کردن ہر دو عالم را و پشتِ پا زدن

اس کے بعد اس کو کم کھانے کم بولنے اور کم سونے کے علاوہ اور کئی ریاضتیں بتائی جاتیں اس لیے عوام کو مرید ہونے کی جرأت بھی نہ ہوتی تھی۔ آپ کا اصل مقصد یہ ہوتا تھا کہ مرید کو ارشاد اور تربیت کا فائدہ پہنچے، یہ مقصد تو نہیں تھا کہ بعض مشائخ کی طرح جو نذر نیاز اور شہرت کے لیے پیری مریدی کو اپنا پیشہ بنا لیتے ہیں۔ ارشاد و سلوک کو دکانداری کا ذریعہ بنا لیں۔ جیسے وہ پیر ہوتے ہیں ویسے ہی ان کے مرید بھی ہوتے ہیں۔ ملا شاہ بدخشانی لکھتے ہیں ؎

کسانیکہ حضرت بنام اندر اند	چہ حضرت ز حسرت ز پا تا سر اند
ہمہ خضر وقت اند در رنگ و بو	ازیں خضرہا خود حذر ہا نکو
سر بوریائے کہ دارند جا	کجا بوریا جملہ بوئے ریا

---

[1] صاحب تحقیقات چشتی لکھتے ہیں محلہ خوافی پورہ وہیں تھا جہاں آج صدر بازار انار کلی ہے۔

مریداں فزوں تر ز دیو و دد اند چہ دانم مریدند یا مرتد اند

سر سفرہ ہر صبح تا بہ شام
بہ خردار خروار خوردہ طعام

آپ کو لاہور آئے ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا۔ یا کم سے کم آپ کی کچھ زیادہ شہرت نہ تھی۔ انہی ایام میں آپ کا بھائی اپنے وطن سے ان کی تلاش میں آیا۔ آپ فرماتے ہیں میں اُس کو کھانا کھلانے کے لیے متفکر تھا۔ اس لیے کہ میرے پاس کچھ نہ تھا۔ میں نے بھائی کو تو حجرے میں بٹھایا اور آپ باغ میں گیا وہاں وضو کر کے دو رکعت نماز ادا کی اور خدا سے دعا مانگی کہ اے پروردگار میرے پاس مہمان آیا ہے اور تیرے سوا میرا کوئی پروردگار نہیں کہ جس پر میں بھروسہ رکھوں میرے پاس تو کچھ بھی نہیں فرماتے ہیں غیب سے ایسی آواز آتی ہوئی معلوم ہوئی کہ دعا مانگنے سے پہلے ہی ہم نے تیری خواہش کو پورا کر دیا ہے۔ چنانچہ میں ڈیرے پر آیا تو ایک شخص موجود تھا طعام کے علاوہ وہ نقدی بھی لایا تھا۔ نام پوچھا تو کہا خدا کا بندہ ہوں اور ہمارے کھانا کھا چکنے کے بعد خالی برتن لے کر اور سلام کہہ کر چلا گیا۔

آپ صرف ایک قسم کا طعام کھایا کرتے اور وہ بھی مٹی کے برتن میں۔ اور پھر اپنے ارادت مندوں کو بھی اس میں شامل کرتے۔ اور شیخ محمد لاہوری کے ہاں اس بنا پر کہ وہ عیال دار ہے۔ اس کا حصہ بھجوا دیا کرتے۔ دارا شکوہ لکھتا ہے۔ غذا بہت کم کھاتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ وہ غذا صرف زندہ رہنے اور یاد الٰہی میں مصروف رہنے کے لیے کھاتے تھے نہ کہ پیٹ بھرنے کے لیے۔ اگر کوئی شخص پے در پے کھانا پکا کر لاتا تو اُسے منع کرتے۔ کسی نے سبب پوچھا تو کہا اس سے توکل جاتا رہتا ہے اور دل میں ہر وقت امید سی لگی رہتی ہے۔

آپ اپنے گرد زیادہ جمگھٹا پسند نہیں کرتے تھے۔ سارا دن جنگلوں، باغوں اور قبرستانوں میں بسر کرتے۔ آپ کے عقیدت مند جو آپ کے ہمراہ ہوتے، وہ بھی الگ بیٹھتے لیکن جب نماز کا وقت آتا تو سب اکٹھے ہو جاتے اور باجماعت نماز پڑھتے۔ شام کی نماز کے بعد حجرے کو اندر سے زنجیر لگا کر کواڑ بند کر لیا کرتے اور جب کوئی ملاقات کے لیے ضد کرتا تو دروازہ کھول کر اندر آنے کی اجازت دیتے اور اس کے حق میں دعا کر کے کہتے "تمھیں بھی آخر کوئی کام ہے اور ہمیں بھی ہے۔ بیکار بیٹھنے سے کیا حاصل۔ تم اپنا کام کرو ہم اپنا کام کرتے ہیں۔"

جہانگیر کی وفات (۲۸ صفر ۱۰۳۷ھ بعمر ۶۰ سال) کے بعد شہریار داماد نور جہاں نے لاہور میں بادشاہت کا مدعی ہو کر ۷۵ لاکھ روپے ایک ہفتہ میں خرچ کر کے پندرہ ہزار فوج جمع کر لی اور علماء و فضلا کو خوش کر کے اپنا طرفدار بنا لیا۔ آصف جاہ برادر نور جہاں نے شہزادہ داور بخش پسر خسرو خلف جہانگیر کو برائے نام بادشاہ بنا کر مقابلہ کیا اور شہریار کو شکست دے کر اندھا کرا دیا۔

شہریار نے اپنی چند روزہ بادشاہی کے دوران حضرت میاں میر کے پاس اپنا آدمی بھیجا کہ آپ خود میرے پاس آئیں یا اپنی دستار مبارک بطور تبرک ارسال کریں۔ آپ نے دونوں باتوں سے انکار کرتے ہوئے کہلا بھیجا کہ فقیروں کو بادشاہوں سے کیا مطلب اور کیا تعلق؟ شہریار کو یہ جواب پسند نہ آیا۔ اس نے ایک اور معتبر کو آپ کے پاس بھیجا کہ جس طرح بھی ہو آپ کی دستار مبارک حاصل کر کے لائے۔ دارا شکوہ لکھتا ہے کہ حضرت نے آخر نہایت ناراضگی کے عالم میں دستار مبارک اپنے سر سے اتار کر زمین پر دے ماری اور کہا "لے جاؤ" ایک مہینہ بھی نہ گزرا تھا کہ وہ ناخلف اندھا کر کے مار ڈالا گیا۔

جہانگیر، شاہجہان اور دارا شکوہ نے آپ سے کئی ملاقاتیں کی ہیں۔ دارا شکوہ آپ کے خلیفہ ملا شاہ بدخشانی کا مرید تھا لیکن آپ سے بھی حسن عقیدت رکھتا تھا۔ اس نے سکینۃ الاولیا آپ کے حالات میں لکھی ہے۔ جہانگیر پر ان کی باتوں کا ایسا اثر ہوا کہ وہ دنیاوی تعلقات کو چھوڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ آپ نے فرمایا "تمہارا وجود خلق اللہ کی پاسبانی کے لیے ہے اور تمہارے عدل کی برکت سے فقرا تک دل جمعی سے اپنے کام میں مشغول ہیں۔ پہلے تم اپنے جیسا خلقت کی نگہبانی کے لیے کوئی پیدا کرو۔ پھر ترک دنیا کا خیال دل میں لاؤ"
جہانگیر نے ان کو دو عریضے بھی لکھے جن میں اپنی نیازمندی کا اظہار کیا۔

شاہجہان بھی لاہور میں دو مرتبہ آپ سے ملا۔ دارا شکوہ بھی ساتھ تھا۔ وہ لکھتا ہے۔ جب ہم آپ کے حجرہ میں داخل ہوئے تو آپ نے سلام دعا کے بعد بادشاہ سے فرمایا "عادل بادشاہ کو اپنی رعیت اور سلطنت کی خبر گیری کرنی اور اپنی تمام ہمت اپنی ولایت کی آبادی و سرسبزی میں صرف کرنی چاہیے۔ کیونکہ اگر رعیت آسودہ اور ملک آباد رہے تو سپاہ آسودہ اور خزانہ پُر رہے گا"
اس کے بعد مذہبی گفتگو ہوتی رہی۔ پھر بادشاہ سے میری علالت کی کیفیت سُن کر مجھے پانی دم کر کے دیا جس سے ایک ہفتہ کے اندر مجھے صحت کامل ہو گئی۔

دوسری مرتبہ جب شاہجہان آپ سے ملنے کو آیا تو شال کی دستار اور کھجوروں کی تسبیح نذر کو لایا اور عرض کی کہ آپ چونکہ دنیاوی مال سے کنارہ کش ہیں اس لیے یہ نذر قبول فرمائیں۔ آپ نے دستار تو واپس کر دی لیکن تسبیح قبول فرما کر چند دنوں کے بعد دارا شکوہ کو عنایت کر دی۔ دارا شکوہ لکھتا ہے کہ "تسبیح خوانی آپ کو پسند نہ تھی بلکہ تسبیح جب کسی کے ہاتھ میں دیکھتے تو ہندی کا ایک شعر پڑھتے جس کا مضمون حسب ذیل رباعی نے خوب ادا کیا ہے" ؎

تسبیح بہ من عجب درآمد بزبان   گفتا کہ مرا چرا کنی سرگرداں
گر دل بہ عوض ہمے بگردانی تو   دانی کہ برائے چیست خلق انساں

دارا شکوہ کو آپ سے بے حد عقیدت تھی یہاں تک کہ وہ آپ کے چبائے ہوئے اور پھینکے ہوئے لونگ بھی کھا لیتا اور جب بالاخانے پر آپ کے پاس جاتا تو جوتی اتار کر ننگے پاؤں جاتا۔ وہ لکھتا ہے۔ بعض حاضرین کو یہ امر ناگوار گزرتا تھا لیکن میں کمال ارادت و خلوص سے اس کو اپنی سعادت مندی سمجھتا تھا۔ آپ کو بھی دارا شکوہ سے کمال الفت تھی۔ ایک مرتبہ ایک شخص سلام کو آیا۔ پوچھا کیا نام ہے اور کیا کام کرتے ہو؟ اس نے اپنا نام بتایا اور کہا۔ سرکار! دارا شکوہ کا ملازم ہوں۔ یہ سُن کر اپنے پاس بٹھایا اور فرمایا

ع۔ اے گل بتو خورسندم تو بوئے کسے داری

آپ فرماتے تھے۔ لباس اس قسم کا ہونا چاہیے کہ کوئی شخص پہچان نہ سکے کہ یہ درویش ہے، صوفی ہے، فقیر ہے یا کیا ہے۔ شیخ ابوالحسن خرقانی کا قول نقل کر کے فرمایا کرتے کہ صوفی وہ شخص ہے جو نہ ہو لیکن میں کہتا ہوں اگر ہو تو بھی نہ ہو۔ اسی بنا پر آپ اپنے مرید خاص شیخ نتھا لاہوری کو "نہ تھا" (نا بود) کہا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک مطلب پرست دنیادار سے کہا "تم لوگ کوئی نیک عمل کرنے کے بغیر درویشوں سے اپنی مشکلات آسان کرانی چاہتے ہو۔ یہ ٹھیک نہیں۔ تم بھوکے کا پیٹ بھرو۔ ننگے کو کپڑا دو۔ حاجتمندوں کی حاجتیں اللہ کے دیے ہوئے مال سے پوری

کرو۔ وہ تمہاری حاجتیں پوری کرے گا۔"

آپ گودڑی، جُبّہ اور خرقہ سب کو محض دکھلاوا اور نمائش سمجھتے تھے۔ آپ کے سر پر کم قیمت کپڑے کی پگڑی اور بدن پر موٹے کپڑے کا کرتہ ہوتا تھا۔ کپڑے جب میلے ہو جاتے تو دریا پر جا کر خود اپنے ہاتھ سے صاف کرتے۔ البتہ کپڑے ہمیشہ صاف اور ستھرے رکھتے اور اپنے اصحاب کو بھی صفائی کی تاکید کرتے۔

فقیر خانے کے تکلفات کا اندازہ اسی سے لگائیے کہ گھر میں نئے بھی نہیں پرانے بوریے کا فرش رہتا تھا۔ اسی فرش پر شہنشاہ جہانگیر، شاہجہان، شہزادے اور امراء بیٹھا کرتے تھے۔

علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی اور کئی اور علماء و فضلاء بھی آپ کے پاس اکثر آتے رہتے تھے۔ ان کا کچھ ذکر "سکینۃ الاولیاء" میں موجود ہے۔ آپ علماء کو بھی اور اپنے یاروں کو بھی اکثر اس حدیث پر عمل کرنے کی تاکید فرماتے :۔

لاصلوٰۃ الابحضور القلب (یعنی قلب کی حضوری کے بغیر نماز نہیں ہوتی)

اور کہتے کہ اگر یہ نہیں تو نماز تنہا کیا اور با جماعت کیا، بے کار ہے۔ دارا شکوہ لکھتا ہے :عالم و فاضل اور صوفی کامل ہونے کے باوجود آپ نے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی۔ لیکن جب کبھی آپ کسی حدیث یا آیت یا بزرگوں کے مشکل اشعار و اقوال کے معنے بیان کرتے تو حاضرین جن میں علماء و فضلا بھی ہوتے دنگ رہ جاتے۔

دارا شکوہ یہ بھی لکھتا ہے کہ آپ نغمہ و راگ سنا کرتے لیکن نہ آپ نے کسی قوال کو کبھی بلایا نہ کسی قوال کو کبھی ہمراہ رکھا اور نہ سماع کے دوران کبھی وجد و رقص کیا۔ قوال جب کبھی خود بخود آتے اور مجلس سماع گرم ہوتی تو اس وقت آپ کے چہرے سے کمال سرور ظاہر ہوتا۔ ریش مبارک کا ایک ایک بال کھڑا ہو جاتا اور چہرہ چمکنے لگتا لیکن وقار و تمکنت کی وجہ سے کوئی حرکت آپ سے ظہور میں نہ آتی۔

آپ فرمایا کرتے۔ انسان تین چیزوں نفس، دل اور روح کا مجموعہ ہے ان میں سے نفس کی اصلاح شریعت سے، دل کی طریقت سے اور روح کی حقیقت سے ہوتی ہے لیکن سب سے بڑا مرتبہ شریعت کا ہے۔

آپ ساٹھ سال سے زیادہ عرصہ تک لاہور میں رہے۔ آخر وہ وقت آ گیا جس سے نہ کوئی پیغمبر بچ سکا ہے نہ کوئی ولی بزرگ۔ بڑھاپے کی وجہ سے آپ اکثر بیمار رہتے تھے لیکن نماز کسی حالت میں ترک نہ کرتے تھے۔ پاؤں میں ایک مرتبہ شدت کا درد رہا تو بیٹھ کر ہی نماز پڑھ لیا کرتے۔ اخیر عمر میں بصارت میں بھی فرق آ گیا تھا۔ موت سے قبل پانچ روز مرض اسہال میں مبتلا رہے۔ آخر ۷ ربیع الاول [illegible]ھ کو منگل کے روز محلہ خوافی پورہ میں اپنے حجرے کے اندر آپ کا مرغ روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا۔

وفات سے ایک روز قبل نواب وزیر خاں حاکم صوبہ پنجاب عیادت کو آیا۔ بڑی مشکل سے اس کو حجرے کے اندر آنے کی اجازت ملی۔ نواب نے کہا۔ ایک حکیم حاذق کو ہمراہ لایا ہوں۔ اجازت ہو تو وہ علاج کرے۔ آپ نے فرمایا "اب حکیم مطلق ہی کافی ہے"۔

جب دوسرے دن نواب وزیر خاں نے انتقال کی خبر سنی تو روساء و علمائے شہر کے ہمراہ نماز جنازہ میں شامل ہوا چونکہ آپ کی وصیت تھی کہ جہاں ہمارے دوست میاں نتھا وغیرہ دفن ہیں۔ وہیں ہم کو بھی دفن کرنا۔ اس لیے آپ کے فرمان کے مطابق آپ

مقام پر جو شہر لاہور سے آدھ کوس کے فاصلہ پر گوشۂ جنوب مشرق میں اور موضع دارا پور المشہور بہ ہاشم پور کے متصل ہے آپ کو دفن کیا گیا۔ اسی مقام کا نام آپ کے نام پر آج میاں میر ہے۔ ایک فاضل شخص ملا فتح اللہ نے یہ تاریخ لکھی۔

میاں میر سر دفتر عارفاں　　　　کہ خاک درش رشک اکسیر شد

سفر جانب شہر جاوید کرد　　　　چوں زیں محنت آباد دلگیر شد

خرد بہر سال وصالش نوشت

بہ فردوس والا میاں میر شد

۱۰۴۵ھ

آپ نے آخری لمحوں میں فرمایا۔ الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللہ الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللہ۔ یہاں تک کہ دم چھوٹ گیا اور سانس سینے میں چلا گیا پھر دو مرتبہ آہستہ آہستہ اللہ اللہ کہا اور اللہ ہی کے پاس چلے گئے۔ سکینۃ الاولیا میں دارا شکوہ نے اپنی چشم دید اور حضرت کے مریدوں سے سن کر آپ کی کئی کرامتیں لکھی ہیں۔ اور کچھ شک نہیں کہ رحمت ایزدی جس کے شامل حال ہو اور قلب جس کا آفتاب سے زیادہ روشن، شیشہ سے زیادہ صاف اور آلائش دنیا سے پاک ہو۔ ان کے صاحب کرامت ہونے میں کون شک وشبہ کر سکتا ہے۔

دارا شکوہ لکھتا ہے حضرت میاں جیو رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے وفات کے بعد مجھے شور زمین میں دفن کرنا تاکہ میری ہڈیوں کا نام و نشان تک باقی نہ رہے اور میری قبر کو بھی سادہ رکھنا کیونکہ ؎

صورت قبرم ز بعد مرگ ویراں خوشتر است

نیستی مانند من با خاک یکساں خوشتر است

پھر فرمایا۔ دیکھنا میری ہڈیوں کو نہ بیچنا اور میری قبر پر دوسروں کی طرح دوکان نہ بنا لینا۔

آپ کے ارادت مندوں میں حضرت ملا شاہ بدخشانی۔ حاجی نعمت اللہ سرہندی۔ میاں نتھا لاہوری۔ خواجہ بہاری۔ ملا محمد سیالکوٹی۔ حاجی مصطفےٰ سرہندی۔ ملا حامد گجر۔ ملا روحی مسمی بہ ابراہیم۔ ملا خواجہ بہلاں لاہوری۔ حاجی صالح کاشمیری۔ شیخ ابوالمکارم ملا محمد سعید کاشمیری۔ میاں مفتی محمد مراد لاہوری وغیرہ کئی اصحاب بہت مشہور ہیں جن کی تفصیل سکینۃ الاولیا میں درج ہے۔ ان میں سے کئی ایک کی قبریں گورستان حضرت میاں میر میں موجود ہیں۔ آپ کے مقبرہ سے مغرب کی طرف سڑک چھاؤنی میاں میر جو سیدھی ریلوے سٹیشن سے آتی ہے اور مشرق کی جانب ریلوے لائن ہے جو ملتان کو جاتی ہے۔ پہلے میاں میر چھاؤنی کے نام سے ریلوے سٹیشن تھا لیکن اب چند سال سے حکام ریلوے نے اس سٹیشن کا نام لاہور کنٹونمنٹ (چھاؤنی) رکھ دیا ہے۔ مقبرہ کے گرد بلند اور پختہ چار دیواری ہے جس کے اندر مغرب کی جانب تین گنبدوں والی ایک عالیشان مسجد ہے۔ چار دیواری کے اندر سنگ سرخ کا فرش ہے۔ فرش کے درمیان سنگ مرمر کا ایک چبوترہ پانچ فٹ مرتفع ہے۔ عرس کے ایام میں اکثر زائرین اس چبوترہ پر آرام کرتے ہیں۔

آپ کا عرس ہر سال ہفتم ربیع الاول کو ہوتا ہے۔ ایک دن اور ایک رات کے لیے ہزارہا آدمی دور و نزدیک سے آ جاتے ہیں۔ دروازہ آمد و رفت سے لے کر چبوترہ سنگ مرمر تک دو رویہ دکانیں لگ جاتی ہیں۔ صاحب تحقیقات چشتی (ص ۲۶۱) پر آج سے تقریباً سو سال پہلے کی حالت بیان کرتے ہوئے) لکھتے ہیں "بیرونی دروازہ کے باہر غرب کی جانب ایک دوکان شراب کی بھی کھل جاتی ہے اور

کئی اکھاڑے چرسیوں اور ساقیوں (حقہ پلانے والوں) اور ساقنوں کے لگ جاتے ہیں۔"

اللہ اکبر یہ اس بزرگ کے مزار کا حال ہے۔ جو شریعت کو سب پر مقدم سمجھتے تھے۔ جو حضورِ قلب کے بغیر ہر نماز کو نماز نہ سمجھتے تھے۔ جنھوں نے آخری وقت میں ہدایت کی تھی کہ میری قبر کو دوکان نہ بنا لینا۔ جو حتی الامکان عوام کو آزمائش کے بغیر مرید نہ کرتے تھے۔ جو ہمیشہ نماز باجماعت ادا کیا کرتے تھے۔ ان کے مزار پر شراب نوشی کی دکان اور بھنگیوں اور چرسیوں کا اجتماع۔ تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے دربار صاحب امرتسر رام باغ امرتسر اور بارہ دری حضوری باغ کی تعمیر اور زینت کے لیے جب لاہور کے مزارات سے پتھر اکھڑوانے شروع کیے تو سنگ سرخ کی ضرورت کے لیے حضرت میاں میر کے روضہ پر آئے اور حکم دیا کہ جس قدر اس مقبرہ اور اس کے نواح میں موجود ہیں سب اکھاڑ کر امرتسر پہنچائے جائیں بلکہ یہ بھی حکم دیا کہ فلاں جگہ فلاں پنجرہ اور فلاں پتھر فلاں دالان میں لگایا جائے لیکن یہ حکم دے کر آپ ابھی باہر نکلے ہی تھے اور اپنی دل پسند گھوڑی لیلی پر سوار ہوئے ہی تھے کہ گھوڑی بیخ پا ہو گئی۔ مہاراجہ نے ہر چند سنبھلنے کی کوشش کی لیکن سنبھل نہ سکے اور آخر گر پڑے کچھ چوٹیں بھی آئیں۔ تھوڑی دیر تک بے ہوش بھی رہے ہوش آیا تو کہا ہم کو اس بزرگ پیر کے مقبرہ کی بے حرمتی کرانے کی کافی سزا مل گئی ہے۔ ہمارے تمام احکام اس بارہ میں منسوخ سمجھے جائیں ہم نے اب توبہ کی ہے یہ کہہ کر مزار پر پیدل واپس آئے۔ پانچ سو روپیہ مزار پر نذر کا رکھا اور توبہ کی اور مزار پر سفیدی کئے جانے کا حکم دیا۔ صاحب عمدۃ التواریخ لالہ سوہن لال سوری نے اپنی تاریخ میں گو مہاراجہ کے گھوڑی سے گرنے اور مزار کو گرانے کا حکم دینے کا ذکر نہیں کیا لیکن تاریخ کے دفتر سوم حصہ دوم کے صفحہ ۲۹۸ پر مزار کے مرمت کرانے اور نذرانہ دینے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"مبلغ پانصد روپیہ درباب تیاری شکست و ریخت مکان میاں میر صاحب حوالہ فرمودند
و بہ خلیفہ نورالدین جہت درستی آں عمارت ارشاد صادر گردیدہ"

اس کے بعد ہر سال مزار پر آتے اور نذر گذارتے۔ ان کی دیکھا دیکھی امرا و وزرا بھی آتے اور سجادہ نشین اور مجاوروں اور درویشوں کو کافی روپیہ دے جاتے بلکہ امرا و وزرا میں سے اکثر ہر روز حاضری دیا کرتے۔ صاحب تحقیقات چشتی لکھتے ہیں۔ مجاور خاصے دولتمند ہو گئے۔ خوب چین اڑاتے رہے۔ مقررہ درویشوں کے علاوہ ارد گرد سے بھی گدا اور فقیر آتے اور شام کو جیبیں بھر کر لے جاتے۔

سنگ سرخ کی وجہ سے حضرت میاں میر کے روضہ اور بادشاہی مسجد کا بہت کچھ باہمی تعلق بنایا جاتا ہے۔ عام روایت یہی ہے اور اسی کو مصنف تاریخ لاہور، تحقیقات چشتی اور ہسٹری آف لاہور نے بھی لکھا ہے کہ دارا شکوہ نے اپنے پیشوا حضرت میاں میر کے مزار کی تعمیر کے لیے جو سنگ سرخ جمع کیا تھا جب عالمگیر نے دارا شکوہ کا خاتمہ کر دیا تو اس نے یہ پتھر یہاں سے اٹھوا کر شاہی مسجد کی عمارت میں صرف کر دیا۔ لیکن یہ روایت اس لیے غلط ہے کہ حضرت میاں میر کا انتقال ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء میں ہوا تھا۔ دارا شکوہ کا قتل ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۹ء کے اواخر میں ہوتا ہے۔ کیا ہم ۲۴-۲۵ سال کے عرصہ میں وہ ان کا مزار تعمیر نہ کرا سکا تھا اور پتھر وہاں اس نے یونہی رکھ چھوڑا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت میاں میر کا مزار دارا شکوہ کی زندگی میں اسی کے اہتمام سے تیار ہو چکا تھا جیسا کہ لاہور کے نامور محقق مولانا علم الدین سالک ایم۔ اے لکھتے ہیں "اس عمارت کی وضع بالکل شاہجہانی عمارات سے ملتی ہے۔ وہی نقش و نگار ہیں۔ وہی

رنگ آمیزیاں ہیں۔ ایسی حالت میں یہ لکھنا کہ مزار حضرت میاں میر کا تمام پتھر بادشاہی مسجد کی عمارت میں صرف کیا گیا حقیقت سے بعید ہے۔"

شہزادی نادرہ بیگم

خانۂ دل میں لگا رکھی ہے داغوں نے اک آگ
آیئے اور شوق سے سیر چراغاں دیکھئے

نادرہ بیگم کی کیفیت جو لاہور کی تاریخوں میں درج ہے وہ بہت زیادہ حیرت انگیز ہے اس کے متعلق تحقیقات چشتی تاریخ لاہور۔ ہسٹری آف لاہور (انگریزی) ان تینوں تاریخوں میں ایک ہی مضمون کو سب نے نقل در نقل کیا ہے۔ یہاں ہسٹری آف لاہور (ص ۱۷۷) سے مختصر سا اقتباس درج کیا جاتا ہے:۔

"نادرہ بیگم داراشکوہ کی بہن تھی۔ وہ بچپن ہی میں حضرت میاں میر کے پاس رہا کرتی تھی نو سال کی عمر میں حضرت کو نماز ظہر کے وقت وضو کرایا کرتی تھی جب گیارہ سال کی عمر کو پہنچی تو حضرت نے فرمایا۔ بیٹی اب تم جوان ہو۔ اب وضو نہ کرایا کر وہ شاہزادی کو اس خدمت سے معزول ہونے کا سخت قلق ہوا۔ اور وہ اسی صدمہ سے رات کو انتقال کر گئی[1] اور حضرت کے حکم سے یہیں دفن ہوئی۔ داراشکوہ نے اس کی یادگار میں اس کی قبر پر عالیشان بارہ دری تعمیر کرائی۔"

لیکن بادشاہنامہ عالمگیری کے مصنف نے (ص ۸۷ [2]) پر نادرہ بیگم کی موت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کی کیفیت ذیل کی سطور سے معلوم ہو گی۔

"جب اواخر ۱۰۶۹ھ میں ملک جیون زمیندار دھاندر نے داراشکوہ کو اپنا مہمان بنا کر گرفتار کر لیا۔ انہی دنوں داراشکوہ کی بیگم نادرہ بیگم جو اپنے اور اپنے خاوند کے مصائب کی وجہ سے بیمار تھی اور ان مصیبت خیز ایام میں اس کے ساتھ ہی تھی۔ اسہال کی وجہ سے وہیں انتقال کر گئی۔ اس کی وصیت کے مطابق داراشکوہ نے اس کی لاش لاہور بھیجی جو حضرت میاں میر کے احاطہ میں دفن کی گئی۔ مرحومہ کے تابوت کے ہمراہ اس بیکسی کے عالم میں بھی ستر آدمی تھے۔"

شاہجہان کی چودہ اولادوں میں چھ شاہزادیاں تھیں۔ حورالنسا بیگم۔ ثریا بانو بیگم۔ حسن آرا بیگم تو بچپن ہی میں بن کھلے مرجھا گئی تھیں۔ جہاں آرا بیگم (جس کا خطاب بادشاہ بیگم یا بیگم صاحب تھا) اور روشن آرا بیگم۔ باپ کے بعد بھی زندہ رہیں اور چھٹی شاہزادی

---

[1] یہ واقعہ ۱۰۴۲ھ/۱۶۳۲ء کا ہے بلکہ مصنف تحقیقات نے تو لکھا ہے کہ شوال کی چودہ تاریخ کو وہ دفن ہوئی۔

[2] تاریخ ہندوستان از مولوی ذکاء اللہ دہلوی جلد ہشتم ایڈیشن اول۔

گوہر آرا بیگم تھی جس کی ولادت پر ذیقعد ۱۰۴۰ھ میں شاہجہان کی بیگم ممتاز محل انتقال کر گئی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ نادرہ بیگم کے نام سے شاہجہان کی کوئی اولاد نہ تھی اور اس لیے وہ دارا شکوہ کی ہمشیرہ بھی نہ تھی

پھر وہ کون تھی؟ اس کے لیے ہمیں ظفر نامہ[1] شاہجہان کا صفحہ ۹۴ دیکھنا چاہیے جس میں ۱۰۴۲ھ کے واقعات میں لکھا ہے۔

> شعبان ۱۰۴۲ھ میں سلطان پرویز[2] (خلف جہانگیر) کی بیٹی سے شاہزادہ دارا شکوہ کا نکاح ہوا بزم نشاط و چراغاں سے آرائش پائی اور آتش بازی کے عجائبات ہوئے شاعروں نے تہنیت نامے لکھے اور تاریخ ہوئی۔ ع
>
> قِران کردہ سعدین ببرج جلال
>
> اس شادی پر بہ تفصیل ذیل ۳۲ لاکھ روپیہ خرچ ہوا۔ سرکار خالصہ کا ۶ لاکھ، بیگم صاحب یعنی دارا شکوہ کی بہن جہاں آرا بیگم کا ۱۶ لاکھ اور دلہن کی والدہ کا دس لاکھ۔

مختصر یہ ہے کہ بارہ دری جو نادرہ بیگم کے نام سے مشہور ہے اور جس کے اندر ایک قبر بھی ہے وہ ضرور نادرہ بیگم ہی کی ہے جو سلطان پرویز کی بیٹی جہانگیر کی پوتی۔ شاہجہان کی بھتیجی اور دارا شکوہ کی بیوی تھی۔ لیکن نہ یہ وہ نادرہ بیگم ہے جس کا ذکر لاہور کی تاریخوں میں درج ہے اور نہ دارا شکوہ نے اس کی عمارت تعمیر کرائی ہے۔ چونکہ دارا شکوہ نے اپنے عروج کے زمانہ میں احاطہ حضرت میاں میر میں اکثر عمارات شروع کرا رکھی تھیں جو اس کے زوال اور اس کی موت کی وجہ سے بند ہو گئیں اور انہی ایام میں نادرہ بیگم کی نعش بھی لاہور آکر دفن ہو چکی تھی اور چونکہ اکثر کتب سے یہ بھی ثابت ہے کہ بعد میں عالمگیر نے اس احاطہ کی نامکمل عمارات کو تکمیل تک پہنچایا اس لیے قیاس صحیح معلوم ہوتا ہے کہ نادرہ بیگم کی بارہ دری اور اس کا ملحقہ تالاب اور پل بھی عالمگیر ہی کے حکم سے تیار ہوا۔

تالاب کے عین درمیان یہ بارہ دری اب بھی موجود ہے۔ تالاب کی اینٹیں چھاؤنی میاں میر کی تعمیر کے دوران میں میاں محمد سلطان ٹھیکہ دار کے ذریعہ اکھاڑی گئیں[3]۔ تالاب کا اب کہیں نشان تک بھی نہیں البتہ اس کی نشیبی زمین موجود ہے جو اس مٹے ہوئے تالاب کا پتہ بتا رہی ہے اور جہاں اب زراعت اور کاشت ہوتی ہے۔ اس کا پل جس کے ۱۳ میں سے تیس محراب موجود ہیں۔

---

[1] ظفر نامہ شاہجہان جو مولوی ذکاء اللہ دہلوی کی تصنیف ہے جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں عہد شاہجہانی کی مندرجہ ذیل تاریخوں کا نچوڑ ہے۔ بادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری۔ عمل صالح محمد صالح کمبوہ۔ پادشاہ نامہ محمد امین قزوینی۔ شاہجہان نامہ عنایت خاں آشنا۔

[2] پرویز جہانگیر کے حکم سے دکن اور الہ آباد کی مہمات پر رہا۔ جب شاہجہان نے بعالم شاہزادگی باپ سے بغاوت کی تو جہانگیر نے پرویز ہی کو اس کی تنبیہ کے لیے بھیجا۔ شراب بکثرت پیتا تھا بعمر ۳۸ سال دکن ہی میں انتقال کر گیا۔ ۱۰۳۵ھ تاریخ وفات ہے۔ ۶ صفر ۱۰۳۶ھ کو آگرہ میں اپنے باغ میں دفن ہوا۔

[3] تحقیقات چشتی (ص ۲۷۵ پر) میں لکھا ہے کہ ان اینٹوں کی قیمت محبوب شاہ سجادہ نشین درگاہ حضرت میاں میر کو میجر مکگر ڈپٹی کمشنر لاہور کی عدالت سے دو سو پچاس روپے ملی۔

پختہ چونہ کچھ ابھی تک نظر آرہا ہے۔ بارہ دری میں جس قدر سنگ مرمر تھا وہ عہد مہاراجہ رنجیت سنگھ میں اکھاڑ لیا گیا۔ نادرہ بیگم کی قبر حسام موجود ہے۔

منہدم بلکہ غیر موجود تالاب کے شمالاً جنوباً دو نہایت بلند ڈیوڑھیاں تھیں جن میں ہزار ہزار آدمی سما جاتا تھا۔ تالاب کے چاروں کونوں پر سنگ سرخ کے ہشت پہلو چار بنگلے تھے۔ جن کے نشان ۱۸۶۴ء تک موجود تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت کچھ تھا۔ اب اس کہنہ بارہ دری کے علاوہ ہر جگہ خاک کے ڈھیر نظر آتے ہیں ؎

واہ کیا نیرنگ ہیں افلاک کے
ڈھیر دیکھے گُل رخوں کی خاک کے

مخدومہ بیگم و نواب ابوالحسن خاں

ہر قدم پر آبلے وحشی کے روتے ہیں لہو
خارزار دشت میں رنگ گلستاں دیکھئے

اس باغ و مقبرہ کی کیفیت اور ابوالحسن خاں کے حالات کی ترتیب کے لیے مندرجہ ذیل کتب سے مدد لے رہا ہوں:۔

۱۔ ہسٹری آف لاہور۔ خاں بہادر سید محمد لطیف جج
۲۔ تحقیقات چشتی۔ مولوی نور احمد چشتی
۳۔ تاریخ لاہور۔ رائے بہادر کنہیا لال ہندی۔
۴۔ کارنامۂ جہانگیری جلد ششم ـ تاریخ مولوی ذکاء اللہ
۵۔ ظفر نامہ شاہجہان جلد ہفتم ـ ″
۶۔ بادشاہ نامہ عالمگیری جلد ہشتم ـ ″
۷۔ تاریخ کشمیر جلد دوم مصنفہ فوقؔ
۸۔ متفرق مضامین

تحقیقات چشتی میں صفحہ ۳۷۷ پر "مقبرہ ابوالحسن خاں بن آصف خاں" کے عنوان سے لکھا ہے:۔

"ابوالحسن خاں بن آصف خاں بن اعتماد الدولہ طہرانی کے مقبرہ کا گنبد بہت بڑا تھا۔ بعہد مہاراجہ شیر سنگھ ۷ ساون سمت ۱۸۹۹ ب کو بجلی کے صدمہ سے گر کر خراب ہو گیا۔"

پھر یہ بھی لکھا ہے:۔

"یہ آصف خاں ابوالحسن بن اعتماد الدولہ غیاث بیگ خاں طہرانی تھا اور نور جہاں کا حقیقی بھائی تھا۔ ۱۰۵۱ھ میں بعہد شاہجہاں انتقال کر گیا۔"

نیز لکھا ہے:۔

"شاہدرہ میں جہانگیر کے مقبرہ کے پاس جس آصف خاں ابوالحسن کا مزار ہے ——— "

آصف خاں ابوالحسن جہانگیری تھا اور یہ آصف خاں ابوالحسن شاہجہانی ہے جس کو شاہجہاں نے یمین الدولہ عمدی بجان برابر خان خاناں وغیرہ کے خطابات دیے تھے۔ آصف خاں خطاب شاہی تھا اور ہر عہد میں آصف خاں ہوتے رہے ہیں۔"

یہ تو واقعی صحیح ہے کہ آصف خاں شاہی خطاب تھا اور ہر عہد میں کسی نہ کسی کو یہ خطاب ملتا رہا ہے۔ چنانچہ بزمانہ جہانگیر ایک آصف خاں جعفر کے نام سے بھی گزرا ہے (دیکھو ظفر نامہ شاہجہان صفحہ ۲۰) لیکن یہ عجیب تحقیقات ہے کہ جو آصف خاں یا آصف جاہ مقبرہ جہانگیر اور مقبرہ نورجہاں کے درمیان دفن ہے اس کو تو جہانگیری بتایا گیا ہے اور جس ابوالحسن آصف خاں کا پتہ تین میل کے فاصلے پر شالامار باغ کی سڑک کے دائیں ہاتھ دیا جاتا ہے۔ اس کو نورجہاں کا بھائی اور شاہجہان کا وزیر بتایا جاتا ہے۔ حالانکہ تمام تاریخ دان جانتے ہیں کہ شاہجہان نے ہی جس وزیر اور سپہ سالار کو یمین الدولہ اور عمدی بجان برابر کا خطاب دیا تھا۔ وہ اُس کے حکم سے جہانگیر کے مقبرہ کے پاس دفن کیا گیا تھا۔ ہسٹری آف لاہور کا مصنف (ص ۱۰۸ میں) لکھتا ہے :۔

"آصف خاں یا آصف جاہ میرزا ابوالحسن برادر نورجہان کا مقبرہ، مقبرہ جہانگیر کے سامنے مغرب کی طرف واقع ہے۔ اس کی وفات ۱۰۵۱ھ/۱۶۴۲ء میں ہوئی۔"

کارنامہ جہانگیری (ص ۲۹۲ پر) لکھا ہے :۔

"۷ ارشعبان ۱۰۵۱ھ کو یمین الدولہ آصف خاں خان خاناں سپہ سالار نے وفات پائی اس کی وفات سے شاہجہان کا عیش مکدر ہو گیا اُس نے حکم دیا کہ اس کو جہانگیر کے روضہ کی غربی جانب مدفون کریں اور اس کی تربت پر ایک گنبد عالی تعمیر ہو۔ یمین الدولہ ۱۰۳۹ھ/۱۶۲۹ء میں سپہ سالار مقرر ہوا تھا۔"

مصنف تحقیقات چشتی نے جو شجرہ لکھا ہے وہ بھی درست نہیں وہ لکھتے ہیں ابوالحسن خاں بن آصف خاں بن اعتماد الدولہ طہرانی حالانکہ صحیح یہ ہے کہ خواجہ محمد شریف طہرانی کے دو فرزند تھے۔ ایک طاہر۔ دوسرا میرزا غیاث بیگ جو بعہد اکبر ہندوستان آیا اور جس کی لڑکی مہر النساء بیگم کو جہانگیر نے ملکۂ ہند بنانے کے بعد اعتماد الدولہ کا خطاب دیا۔ اعتماد الدولہ جب گردش روزگار کی بدولت ہندوستان آیا تو اُس وقت اُس کے ہمراہ بیوی کے علاوہ دو لڑکیاں اور ایک فرزند ابوالحسن تھا۔ نورجہاں ہندوستان ہی میں پیدا ہوئی تھی۔ جہانگیر نے مہر النساء کو نورمحل اور نورمحل سے جب نورجہاں بنایا تو اُس کے باپ کے ساتھ ہی اس کے بھائی کو بھی مناصب و مراتب عطا کئے۔ اور یہی ابوالحسن جب شاہجہان کا خسر بنا تو یمین الدولہ عمدی بجان برابر۔ دانائے رموز سلطنت عظمیٰ۔ مدبر امور عالم۔ کار فرمائے ارباب سیف و قلم۔ زبدہ خوانین عالیشان وغیرہ القاب سے سرفراز کیا گیا۔

رائے کنہیا لال مصنف تاریخ لاہور نے بھی تحقیقات چشتی ہی کا تتبع کیا ہے۔ نام میں تھوڑا سا فرق رکھا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں "ابوالحسن یوسف خاں بن اعتماد الدولہ نورالحسن خان طہرانی۔ یہ ابوالحسن نورجہاں بیگم کا حقیقی ماموں تھا۔ اور امرائے عہد جہانگیری میں ممتاز تھا۔"

ابوالحسن یوسف خاں اور اعتماد الدولہ نورالحسن خان کے نام اب تک کسی تاریخ میں نظر سے نہیں گذرے اور نہ نورجہان کے کسی ماموں کا نام کہیں نظر آیا ہے۔ عجیب تماشہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ لکھنے کے بعد آپ لکھتے ہیں یہی ابوالحسن یوسف خاں شاہجہان کے زمانے میں

"یمین الدولہ برادر بجان برابر خان خاناں بازوئے راست دولت چغتائی" کہلایا۔ یا بہ الفاظ دیگر یہی ابوالحسن نورجہاں کا بھائی بھی تھا اور ماموں بھی۔ اس کے مقبرے کا جائے وقوع رائے کنہیا لال نے بھی وہی بتایا ہے جو مصنف تحقیقات چشتی نے لکھا ہے اور جس کی تصحیح سطور مسبوق الذکر میں کی جاچکی ہے۔

رسالہ معارف اعظم گڑھ کے جنوری ۱۹۴۵ء کے پرچہ میں مقبرۂ ابوالحسن تربتی کے متعلق جو مضمون چھپا ہے۔ اس میں بھی راقم مضمون نے مورخین لاہور کی ان پریشان اور مختلف البیان تحریروں کے متعلق لکھا ہے :۔

"صاحب تحقیقات چشتی اپنی کتاب میں ابوالحسن کے مقبرہ کا ذکر تو کرتے ہیں مگر کسی جگہ اس کو ابوالحسن آصف خاں برادر نورجہاں سے خلط ملط کیا ہے اور کبھی ان کا فرزند بتایا ہے۔ ایک جگہ صرف اتنا لکھا ہے کہ یہ ابوالحسن آصف خاں سے علیحدہ کوئی اور ابوالحسن تھا۔ . . . . . رائے کنہیا لال مصنف تاریخ لاہور (اردو) کے بیان کے مطابق صاحب مقبرہ ابوالحسن یوسف خاں طہرانی نورجہاں کے ماموں تھے۔ سید محمد لطیف اس مقبرے کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ بھی اس کو ابوالحسن آصف برادر نورجہاں سے علیحدہ کوئی اور ابوالحسن بتاتے ہیں مگر نہ چشتی اور نہ لطیف یہ بتاتے ہیں کہ آخر یہ کون ابوالحسن تھا؟"

جس مقام پر یہ مقبرہ واقع ہے وہاں کسی زمانے میں لاہور کا مشہور اور دولتمند محلہ مغل پورہ آباد تھا جس کی شوکت گذشتہ اور عظمت رفتہ کی دل دوز داستان اب بھی لاہور کی تاریخوں سے معلوم ہو سکتی ہے۔ اس محلہ میں عالیشان محلات اور باغات تھے۔ اب اس محلہ کا بہت سا حصہ ریلوے جنرل سٹور اور سڑک شالامار باغ اور بیگم پورہ میں سمٹ کر رہ گیا ہے۔ یہیں نواب ابوالحسن خاں کا مقبرہ ہے جو اس وقت ریلوے احاطہ میں آچکا ہے اور شہر سے شالامار باغ کو جاتے ہوئے دائیں طرف آتا ہے۔ اس مقبرہ کی پہلے کیا حالت تھی، اب کیا ہے اور صاحب مقبرہ کون ابوالحسن ہے؟ یہ کیفیت سطور ذیل سے معلوم ہو سکے گی۔

کارنامۂ جہانگیری اور ظفر نامۂ شاہجہان میں جو جہانگیر اور شاہجہان کے عہد کی تاریخوں کا نچوڑ ہیں تین ابوالحسن نظر آتے ہیں۔ سب سے پہلے تو وہی ہے جو نورجہاں کا بھائی اور ممتاز محل (ارجمند بانو بیگم) کا باپ ہے اور جس کو شاہجہان نے یمین الدولہ آصف خاں (المشہور آصف جاہ) وغیرہ کے خطابات دیے تھے۔ دوسرا ابوالحسن مشہدی تھا جس کو جہانگیر نے لشکر خاں کا خطاب دیا اور شاہجہان نے اس کو کابل کا گورنر مقرر کیا۔ تیسرا ابوالحسن خاں وہ ہے جس کو جہانگیر نے اپنے باغی بیٹے سلطان خسرو کی محافظت و نگہبانی پر مقرر کیا۔ اسی خواجہ ابوالحسن خاں سے ابوالحسن لشکر خاں نے نظامت کابل کا چارج لیا تھا۔ ۱۰۴۰ھ کے اواخر میں شاہجہان نے اسی خواجہ ابوالحسن خاں کو جو اپنے مناصب و اعزاز اور جاگیرات کی وجہ سے شاہانہ ٹھاٹھ رکھتا تھا، ناظم کشمیر مقرر کیا۔ وہ چونکہ اب ضعیف العمر تھا، اس لیے اس نے اپنے فرزند ظفر خاں کو جس کا اصل نام احسن اللہ اور خطاب ظفر خاں تھا اپنا قائم مقام بنا کر کشمیر روانہ کیا اور ۱۰۴۲ھ میں جب خواجہ ابوالحسن خاں کا انتقال ہو گیا، تو بادشاہ نے ظفر خاں کو کشمیر کا مستقل گورنر کر دیا۔

یمین الدولہ ابوالحسن آصف جاہ کا مقبرہ تو مزار نورجہاں و جہانگیر کے قرب میں دریا کے پار موجود ہے ــــ دوسرے

ابوالحسن خاں مشہدی عرف لشکر خاں کا زیادہ حال معلوم نہیں ہو سکا۔ تیسرا خواجہ ابوالحسن خاں[1] پہلے خسرو باغی کا لاہور میں نگہبان رہا پھر جہانگیر نے اس کو مختلف ممالک میں باہر بھیجا۔ وہ اور اس کا فرزند ظفر خاں احسن زیادہ عرصہ کابل میں (بہ حیثیت گورنر یا نائب گورنر) اور لاہور ہی میں رہے۔ ظفر خاں کو چند سال تک باپ کی وفات کے بعد نظامت کشمیر کی وجہ سے کشمیر بھی رہنا پڑا۔ اس نے اپنی مثنوی میں بھی لاہور کابل اور کشمیر ہی کا ذکر کیا ہے۔ چونکہ اس کا باپ ۱۰۴۱ھ میں بوجہ ضعیفی خانہ نشین ہو چکا تھا اور چونکہ دیگر امرا کی طرح اس کے عالیشان مکانات بھی لاہور میں موجود تھے۔ اس لیے اس نے اپنے آخری ایام بہ آرام بسر کرنے کے لیے لاہور ہی میں اقامت پسند کی اور غالباً اس لیے بھی کہ اس کا فرزند ظفر خاں احسن کشمیر کا نائب گورنر تھا اور دہلی اور آگرہ کی نسبت لاہور سے کشمیر بہت نزدیک تھا اور نیز اکثر امرا لاہور میں مستقل طور پر اقامت رکھتے تھے[2]

لاہور کی تاریخوں کے سوا اس کا خطاب آصف خاں اور کہیں نظر نہیں آیا۔ لاہور ہی میں ابوالحسن خاں نے ۱۰۴۲ھ میں وفات پائی اور یہیں دفن ہوا جیسا کہ صاحب مآثر الامراء جلد دوم (ص ۷۶۵ پر) اس کے فرزند ظفر خاں احسن گورنر کشمیر کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"در لاہور بساط ہستی در نوردید و در مقبرۂ پدر مدفون گشت"

ان الفاظ سے نہ صرف نواب ابوالحسن خاں کا مدفن ہی لاہور میں پایا جاتا ہے بلکہ اس کے فرزند نواب ظفر خاں احسن کی آخری آرام گاہ بھی لاہور ہی معلوم ہوتی ہے۔

مصنف تحقیقات چشتی اور مصنف تاریخ لاہور دونوں نے نواب خواجہ ابوالحسن خاں کا سال وفات ۱۰۵۱ھ لکھا ہے۔ حالانکہ یہ سال وفات یمین الدولہ نواب آصف خاں (ابوالحسن) کا ہے نواب خواجہ ابوالحسن خاں کا سال وفات جیسا کہ قبل ازیں لکھا جا چکا ہے ۱۰۴۲ھ ہے۔

ابوالحسن خاں کے مقبرہ کا گنبد بہت بڑا اور دو منزلہ تھا۔ اس کے چاروں طرف آٹھ کمرے تھے۔ انہی کمروں کی چھت بطور گنبد دور دور سے نظر آتی تھی۔ گنبد سنگ سرخ کا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں جنرل ڈوی ٹیلہ فرانسیسی نے یہاں میگزین (بارودخانہ) بہ زیر نگرانی کمیدان بھوپ سنگھ قائم کیا ہوا تھا۔ مہاراجہ شیر سنگھ کے عہد حکومت (۷ ساون سمت ۱۸۹۹ب) کو بجلی کے حادثہ سے میگزین اڑ گیا۔

---

[1] مسٹر شجاع الدین ایم۔ اے (لاہور) اپنے مضمون مقبرۂ ابوالحسن تربتی مندرجہ معارف اعظم گڑھ جنوری ۱۹۴۵ء میں لکھتے ہیں۔ "اس کا وطن تربت حیدری تھا جو خراسان کے دارالحکومت مشہد مقدس سے جنوب کی سمت مائل بہ مغرب تقریباً پچھتر میل کے فاصلے پر آباد ہے۔ وہ اکبر کے زمانے میں ہندوستان آیا۔"

[2] نواب ابوالحسن خاں کے حالات راقم نے ۸ رنومبر ۱۹۴۳ء کو لکھے تھے۔ جنوری ۱۹۴۵ء میں "مقبرۂ ابوالحسن تربتی" کے متعلق اعظم گڑھ کے رسالہ معارف میں مسٹر شجاع الدین ایم اے (لاہور) کا جو مضمون چھپا ہے۔ اس میں وہ بھی لکھتے ہیں "لاہور کی آب و ہوا دہلی اور آگرہ سے بہتر اور ایران و خراسان سے مقابلۃً نزدیک تر ہونے کی وجہ سے اکثر غریب الوطن امرائے عہد مغلیہ نے اسی شہر کو اپنا وطن قرار دے کر یہاں فلک بوس محلات، رشک فردوس باغات اور عالی شان مساجد و مقابر بنوا کر اس شہر کی گوناگوں خوبیوں کو چار چاند لگا دیے تھے۔"

اور اپنے ساتھ کئی آدمیوں کو مجروح کرکے آٹھ دس آدمیوں کو بھی اڑا کر لے گیا۔
لیکن اس صدمہ عظیم کے باوجود گنبد ابھی تک کھڑا ہے مصنف تحقیقات چشتی کے زمانہ ۱۸۶۰ء اور مصنف تاریخ لاہور کے زمانہ ۱۸۸۱ء تک اس گنبد کے نقش و نگار کچھ نہ کچھ موجود تھے۔ مقبرہ کے اندر بھی عہد شاہجہانی کے تمام آثار پائے جاتے تھے۔
۱۸۶۴ء کے بعد محکمہ نزول (سرکار انگریزی) نے اس مقبرہ کی ٹوٹی پھوٹی عمارت کو نیلام کر دیا۔ اور خشت فروشوں نے اس کی بنیادوں کو ایسا کھود ڈالا کہ نشان تک باقی نہ رکھا۔

لاہور میں مغل شہزادوں اور مغل امراء کے جس قدر مزار نظر آتے ہیں ہر ایک کے ساتھ کوئی نہ کوئی باغ بھی ہوتا تھا۔ وہ باغ یا تو اس امیر یا شہزادہ نے پہلے ہی احداث کرایا ہوا ہوتا یا اس کی وفات کے بعد اس کے مقبرہ کے گرد وہ باغ تعمیر کیا جاتا۔ مقبرہ ابوالحسن خان کے چاروں طرف بھی ایک وسیع باغ تھا۔ اور اس کے گرد اس کی اپنی بنائی ہوئی کئی عمارتیں تھیں تحقیقات چشتی میں لکھا ہے یہ عمارتیں عہد مہاراجہ رنجیت سنگھ تک موجود تھیں چونکہ کوئی محافظ نہ تھا۔ لوگوں نے اینٹیں اکھاڑ لیں۔
اس گنبد کے غرب رویہ ایک مدور چاہ کلاں ۱۸۸۲ء تک موجود تھا۔ یہ اتنا بڑا کنواں ہے کہ اس پر دس بارہ چرخ چوب (رہٹ) بہ آسائش و فراغت چل سکتے ہیں۔ اسی عظیم کنوئیں سے معلوم ہوتا ہے۔ باغ ابوالحسن خان کو پانی ملا کرتا تھا۔ اس کنوئیں کے اندر ایک محرابی دریچہ بھی تھا۔ جو اس سرد خانہ سے ملتا تھا جو مقبرہ کے نیچے بنایا گیا تھا۔
اسی احاطہ کے اندر نواب مخدومہ بیگم کے مقبرہ کا گنبد بھی ہے۔ یہ بیگم نواب ابوالحسن خاں کی بیوی تھی۔ خاوند کی وفات کے بعد ۱۰۶۶ھ میں انتقال کر گئی۔ اس نے اپنا مقبرہ اسی باغ کے اندر اپنی زندگی ہی میں بنوا لیا تھا۔ خاوند کے ادب و احترام کے لحاظ سے اس نے اپنے مقبرہ کا گنبد ذرا چھوٹا بنوایا تھا۔ یہ مقبرہ مربع صورت کا ہے اس کے چاروں طرف چار قالبوتی دروازے ہیں اندر کاشی کا کام ہے۔ قبر اور قبر کا تعویذ سنگ مرمر کا تھا لیکن سکھ عہد حکومت کی نذر ہو گیا۔[1] تحقیقات چشتی (ص ۲۷۸ پر) لکھا ہے کہ یہ عورت بڑی قابل اور شاعرہ تھی۔ اس نے اپنے خاوند کی قبر پر ایک ہزار حافظ قرآن۔ قرآن خوانی کے لیے مقرر کر رکھے تھے اور صدہا کنوئیں خرید کر اس مزار کے ساتھ وقف کر رکھے تھے۔ عہد محمد شاہ بادشاہ میں حضرت حامد قاری اس کارخانہ عبادت کے مہتمم تھے۔ یعنی اس مزار کے متعلق جس قدر مصارف ہوتے تھے وہ انہی کی معرفت تقسیم ہوا کرتے تھے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ نواب خان بہادر زکریا خاں ناظم لاہور کے زمانہ تک حفاظ کا سلسلہ برابر قائم رہا۔ لیکن اب کیا ہے؟

دلی برباد میں اڑتی ہے اب خاک
یہ بستی غیرت جنت کبھی تھی

راقم نے دیکھا کہ اس رشک فردوس باغ، ان عالیشان مکانات اور ان سنگ مرمریں مقبروں کی جگہ زمیندار حقہ پی رہے ہیں۔ ہل چل رہے ہیں۔ گل و بلبل کی جگہ زاغ و زغن کا بسیرا ہے اور وہ بلند ترین منقش گنبد جن سے شان و شوکت کا اظہار ہوتا تھا۔ اب عبرت کا ایک دردناک مجسمہ بنے ہوئے ہیں جہاں بہت سے حفاظ قرآن خوانی کے لیے موجود رہتے تھے وہاں آج کوئی اشک حسرت

---

[1] تاریخ لاہور رائے بہادر کنہیا لال صفحہ ۲۶۳

بہلانے والا بھی نہیں ؎

از خزاں پامالی کرد افسوس گردوں باغ را جائے بلبل داد لے حسرت زمانہ زاغ را

خواجہ ایاز

باغ و مسجد کے در و دیوار سے آئی ندا
گھر خدا کا دیکھ کر سوئے گلستاں دیکھئے

مولوی نور احمد چشتی تحقیقات چشتی (ص ۷۵۶) میں لکھتے ہیں :-

"خواجہ ایاز نواب علی مردان خاں کے متعلقین میں ایک امیر کبیر تھا شالامار باغ کی تیاری کا حال سن کر اس نے مہر جہانگا کو روپیہ بھیجا کہ میرے نام سے لاہور میں ایک باغ تعمیر کرائے۔ مہر مذکور نے شالامار باغ کے مشرق روپیہ اس روپیہ سے ایک باغ تعمیر کرایا اور جو روپیہ بچا اس سے مسجد بنوادی۔ خواجہ ایاز نہ خود یہاں آیا نہ اس نے باغ دیکھا اور نہ مسجد دیکھی"

رائے بہادر کنہیا لال اپنی تاریخ لاہور (ص ۲۸۱، ۲۸۲) میں لکھتے ہیں :-

"خواجہ ایاز شاہجہان کے عہد میں ایک امیر کبیر آدمی تھا اور شالامار باغ کے کارخانہ عمارت میں نواب علی مردان خاں کے ماتحت کام کیا کرتا تھا۔ وہ شالامار باغ کا میر عمارت تھا۔ اس نے مسجد کے علاوہ ایک باغ بھی اپنے نام سے شالامار باغ سے بجانب مشرق تعمیر کرایا۔"

یہ تو مشکل سے باور کیا جا سکتا ہے کہ خواجہ ایاز نہ خود لاہور آئے نہ اپنی تعمیرات دیکھے مگر لاہور سے اُسے کوئی تعلق ہو۔ اور وہ دہلی یا آگرہ سے ہزار ہا روپیہ ایک واقف یا ناواقف شخص کو لاہور میں تعمیر باغ کے لیے ارسال کر دے۔ البتہ رائے کنہیا لال کی تحریر اس لیے قابل وثوق معلوم ہوتی ہے کہ ۱۰۵۰ھ مطابق ۱۶۴۱ء موافق تیرہ ۱۳ سال جلوس میں جب شاہجہان نے لاہور میں شالامار باغ کی تعمیر کا حکم دیا تو نواب علی مردان خاں صوبہ پنجاب کا گورنر تھا۔ اس نے بادشاہ سے عرض کیا میرے ہمراہ ایک شخص ہے جو نہروں کی کھدائی میں کمال رکھتا ہے وہ کہتا ہے کہ میں دریائے راوی کے اس مقام سے جہاں وہ کوہستان سے نکل کر ہموار زمین پر بہتا ہے ایک نہر نکال کر لاہور تک لا سکتا ہوں۔ بادشاہ نے اس نہر کے بنے جس کا نام بعد میں شاہ نہر رکھا گیا ایک لاکھ روپیہ علی مردان خاں کو عطا کیا۔"

نواب علی مردان خان کے ان الفاظ سے کہ میرے ہمراہ ایک شخص ہے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس کے متعلقین یا متوسلین ہی سے تھا۔ علی مردان خان قندھار سے آکر ۵ رجب ۱۰۴۸ھ کو بمقام لاہور شاہ جہان کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور دوسرے ہی سال اس کو پنجاب کی نظامت عطا ہوتی ہے، اس لیے کوئی تعجب نہیں اگر اس نے اپنے ایک متوسل کو جو اپنے فن میں قابل و لائق تھا۔ بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا ہو۔ گو لاہور کے علاوہ دوسرے مورخوں نے اس کا نام نہیں لکھا لیکن اکثر مقامی اور جزوی امورات تاریخوں میں تفصیل سے

نہیں ہوئے البتہ وہ شالامار باغ کا میر عمارت تھا نہ مہتمم۔ مہتمم خلیل اللہ خاں تھا اور میر عمارت استاد حاجی جس کا مقبرہ بھی اسی کی نواح میں موجود ہے اور جس کا ذکر تحقیقات چشتی میں ہے وہ صرف شاہ نہر کا بانی تھا۔ جو لاہور سے قریباً پچاس کوس (جربی) کے فاصلہ سے لائی گئی تھی۔

باغ خواجہ ایاز کی بہاریں تو بانی کے کچھ عرصہ بعد ہی بادِ صرصر میں تبدیل ہونا شروع ہو گئیں لیکن اس کی سخت جانی کی بدولت اس کی پختہ چاردیواری جس کے اندر چند عمارتیں بھی اُسی زمانہ کی ہیں۔ اب تک موجود ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پہلے تو اس باغ کو لاوارث قرار دے کر خالصہ میں شامل کیا پھر سردار شمشیر سنگھ سندھانوالیہ کو بخش دیا۔ اور اب اس کی اولاد اس پر قبضہ میں ہے۔

خواجہ ایاز کی خوبصورت مسجد پر مہر سنگا کی اولاد کا قبضہ ہے۔ مسجد کے تین گنبد برنگ سیاہ ۱۸۶۴ء تک موجود تھے۔ میانہ میں ایک مربع حوض جو طولاً و عرضاً دس دس گز اور ارتفاعاً ایک گز ہے موجود ہے۔ اندرون مسجد کی دیواریں استرکاری منقش اور رنگ کاری ہیں۔ مسجد کی سنگ مرمر کی سِل پر عربی الفاظ کے علاوہ "بندۂ درگاہ خواجہ ایاز" کے الفاظ بھی تحریر تھے۔ اس مسجد کے نزدیک ہی شمال رویہ خانقاہ مادھو لال حسین ہے۔ یہ مسجد مقفل رہتی تھی۔ اب آباد کر دی گئی ہے۔

نواب خاں دوراں نصرت جنگ بہادر

مقبرہ و باغ نصرت خاں بہادر کو خستہ اں
کر گئی ہے کس طرح پامال و ویراں دیکھئے

خواجہ حصاری نقشبندی کا پوتا اور خواجہ صابر کا بیٹا تھا (مآثر الامرا جلد اول) شاہ جہاں نے اس کو ماہی مراتب کے علاوہ خان دوراں کا خطاب دیا۔ مصنف تحقیقات چشتی لکھتے ہیں:—

"۱۰۵۵ھ ۱۶۴۵ء میں بعہد عالمگیر وفات پائی اور اسی کے حکم سے ۱۰۷۶ھ ۱۶۶۶ء میں اس کا گنبد نما مقبرہ بنا۔"

ہسٹری آف لاہور کے مصنف نے سال وفات ۱۰۵۲ھ مطابق ۱۶۴۲ء لکھا ہے۔ یہ زمانہ شاہجہان کا ہے عالمگیر کا نہیں۔ مآثر الامراء جلد اول میں لکھا ہے:—

"وہ ہفتم جمادی الاول کی رات کو ۱۰۵۵ھ ۱۶۴۵ء میں بمقام لاہور انتقال کر گیا۔"

اور یہی درست معلوم ہوتا ہے۔ شاہجہان اس وقت کشمیر میں تھا۔ وہیں اس کو اس کی وفات کی خبر ملی۔ اس کی وفات کے متعلق لکھا ہے کہ ایک کشمیری برہمن بچہ (نو مسلم) نے جو اس کے ذاتی خدمتگاروں میں تھا، ایک جمدھر اس کے پیٹ میں گھونپ کر اس کو ہلاک کر دیا۔ نواب کے خدام نے یہ کیفیت دیکھ کر اور شور سن کر اس لڑکے کو وہیں ڈھیر کر دیا۔ صاحب مآثر الامراء لکھتے ہیں:—

"۱۸ سال جلوس میں شاہجہان نے اس کو دکن سے لاہور بلایا اور پھر اپنے ہمراہ کشمیر لے گئے۔ کشمیر ہی سے اس کو لاہور کی صوبیداری پر نامزد کیا۔ لاہور میں ایک کشمیری برہمن زادہ اسلام قبول کر کے اس کے معتمد خدمتگاروں میں شامل ہو گیا تھا۔ خان ایک رات سویا ہوا تھا اور جامۂ خواب میں تھا کہ اس برہمن پسر کشمیری نے اس کے پیٹ میں جمدھر کے

کئی وار کیے۔ کہتے ہیں کہ ۲ اٹانکے لگے لیکن اس کے ابرو پر بل تک نہ آیا۔ اس کے
ہوش وحواس برقرار تھے۔"

وہ ایک دن اور دوسری رات کا کچھ حصہ زندہ رہا۔ اس نے اپنی تمام جائداد کا جائزہ لیا اور لڑکے لڑکیوں کے حصے مقرر کر کے اپنے ہاتھ سے وصیت نامہ لکھا۔ پھر بادشاہ کے نام ایک عرضداشت لکھی جس میں تاکید کی کہ میری جائداد میری وصیت کے مطابق میری اولاد کو تقسیم کی جائے۔ جو باقی بچے وہ سرکار کی دولت ہے۔ چنانچہ بادشاہ نے اس کی وصیت کے مطابق اس کی جائداد نقد، جنس، عمارات، باغات اس کی اولاد میں تقسیم کر دی اور ساٹھ لاکھ روپیہ جو باقی بچا وہ خزانہ شاہی میں داخل کر لیا۔ بلکہ صاحب مآثر کے قول کے مطابق بادشاہ نے اس کی وصیت سے بھی زیادہ اس کے فرزندوں کو دیا۔ پھر بھی ساٹھ لاکھ روپیہ بچ رہا۔

خواجہ کا سرکاری خطاب "یمین الدولہ خان دوراں بہادر نصرت جنگ" اور منصب ہفت ہزاری اور ہفت ہزار سوار تھا۔

نواب خان دوراں فوج اور لشکر کی سرداری، معرکہ آرائی، سخت گیری اور قلعہ کشائی میں ہمیشہ بے نظیر افسر ثابت ہوتا رہا ہے۔ ۱۰۳۵ھ مطابق ۱۶۲۵ء میں اس نے ججھار سنگھ بندیلہ والیٔ اوڑچھا (ٹیکم گڈھ) کو جو علامہ ابوالفضل کے قاتل کا بیٹا تھا۔ بڑی سخت لڑائیوں کے بعد نہ صرف شکست دی بلکہ اُس کو اور اُس کے بیٹے بکرماجیت کے سر اور ان کی انگوٹھیاں نشان فتح کے طور پر بادشاہ کے پاس بھجوائیں اس کے باقی فرزندوں اور پوتوں میں تین مسلمان ہو گئے اور دو تلوار کے گھاٹ اترے۔ رانیوں میں رانی پہ بتی جس کو جوہر کے طور پر راجہ ججھار سنگھ نے خود زخمی کر دیا تھا تھوڑے دنوں کے بعد مر گئی اور باقی عورتیں مسلمان ہو کر محل کے پرستاروں میں داخل کر دی گئیں۔

۱۰۵۲ھ / ۱۶۴۲ء میں جب دارا شکوہ کی سازش اور بادشاہ کی ناراضگی کی وجہ سے اورنگ زیب نے گوشہ نشینی اختیار کرنے کے ارادے سے تلوار کھول دی تو بادشاہ نے اس کی جاگیر ضبط کر کے خان دوراں کو دکن کی صوبیداری عنایت کی اور منصب میں پنج ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ کا اضافہ کیا۔

اسی سال راجہ سنگرام گونڈ کے مرنے پر جب اس کے ایک غلام مارد گونڈ نے راجہ کے بیٹے کو ریاست سے محروم کر کے خود راجگی لے لی اور بادشاہ سے سرکشی اختیار کی تو خان دوراں خاں اس کے استیصال کے لیے فوراً اُس کے سر پر پہنچا سارد تھوڑی سی لڑائی کے بعد اواخر محرم ۱۰۵۳ھ / ۱۶۴۳ء میں اطاعت اختیار کر کے اس کی پناہ میں آگیا۔ خان دوران خان اپنے بھائی محمد صالح کو پانچ سو سوار اور سات سو پیادے دے کر اور اس کا محافظ مقرر کر کے آپ واپس چلا آیا۔ یہ محرم کا ذکر ہے اس کے تیسرے مہینہ کے بعد ۶/ جمادی الاول کو جیسا کہ قبل ازیں لکھا گیا ہے اپنے ایک خادم کے ہاتھ سے اس کی ہلاکت ہو جاتی ہے۔

اس کا ایک بھائی تھا جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ تین بیٹے تھے ایک سید محمد جو ججھار سنگھ کی جنگ میں باپ کے ساتھ تھا دوسرے کا نام سید محمود تھا۔ بادشاہ نے ان دونوں کو منصب ہزاری ذات و ہزار سوار دیا اور عبدالنبی تیسرے بیٹے کو جو بارہ برس کا تھا منصب پانصدی دو سو سوار عطا کیا۔

بیٹے خود امیر تھے امیر زادے تھے۔ اپنے جلیل القدر باپ کا مقبرہ انھوں[1] نے اس کی شان اور اپنی حیثیت کے مطابق تیار کرایا۔

---

[1] چونکہ عالمگیر کی تخت نشینی سے چودہ سال پہلے اس کا انتقال ہو گیا تھا اس لیے عالمگیر کا اس کے مقبرہ سے کوئی تعلق نہیں اور چونکہ شاہجہان کا بھی کہیں ذکر نہیں اس لیے اس کے فرزندوں نے ہی تعمیر کرایا — (مرتب)

تحقیقاتِ چشتی سے معلوم ہوتا ہے کہ مقبرہ کی چار دیواری کے اندر چالیس کنال زمین تھی۔ اس میں ایک مسجد بھی ہے۔ دو اصطبل بھی ہیں۔ مقبرہ کا عالی شان گنبد بھی ہے، ایک چاہ کلاں بلکہ کلاں تر مگر بے چرخ چوب ہے۔ صرف دو چیزیں یہاں نہیں ہیں ایک باغ اور دوسرے قبر کا نشان۔

یہ مقبرہ جو گنبد نصرت خاں یا مقبرہ نصرت خاں کے نام سے مشہور ہے، مقبرہ ابو الحسن سے شرقی رویہ مائل بہ جنوب واقع ہے۔ دروازہ کلاں کی سقف گنبد نما ہے۔ گنبد اور اس کے متصلہ مکانوں میں کئی ڈیوڑھیاں، کئی زینے، کئی شاہ نشین، کئی غلام گردشیں اور کئی برجیاں ہیں۔ مصنف تحقیقاتِ چشتی لکھتے ہیں :—

"غلام گردش اندر کی طرف سے تمام سفید اور منقش اور سقف محرابی گل کار دیواروں پر نقاشی مع تصاویر جانوراں"

جانوروں کی تصویریں یا انسانی تصویریں کوئی مسلمان اپنی عمارت یا قبر پر نہیں بنوا سکتا۔ معلوم ہوتا ہے یہ سکھوں کے زمانے کی یادگار ہیں۔ کیونکہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں جرنیل کورٹ صاحب نے اس مقبرہ کو اپنا مسکن بنایا اور اپنی کوٹھی بھی اسی کے احاطے کے اندر تعمیر کی۔ وہ مہاراجہ کے توپ خانے کا افسر تھا۔

صاحب تحقیقاتِ چشتی، مصنف تاریخ لاہور اور مصنف ہسٹری آف لاہور نے یہی لکھا ہے کہ نواب خان دوراں نصرت جنگ لاہور میں مدفون ہیں۔ ان تینوں کتابوں کے مصنف آج سے قریباً ایک صدی پیشتر کے زمانہ میں گزرے ہیں۔ لیکن آج سے قریباً اڑھائی سو سال پیشتر کا مصنف نواب صمصام الدولہ شاہنواز خاں اپنی کتاب مآثر الامرا جلد اول میں صفحہ ۷۵ پر لکھتا ہے :—

"اس کا آبائی قبرستان گوالیار میں تھا۔ اس کی لاش کو وہاں لے گئے"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس کا انتقال ضرور لاہور میں ہوا لیکن اس کی لاش کچھ عرصہ کے بعد گوالیار لے گئے اور وہیں اس کو دفن کیا گیا۔ لاہور میں ممکن ہے بطور امانت دفن کیا گیا ہو۔ چونکہ اس کی اولاد لاہور ہی میں تھی اس لیے ممکن ہے بعد میں ان میں سے کسی کو انتقال کے بعد یہاں دفن کیا گیا ہو اور مقبرہ نواب نصرت جنگ ہی کے نام سے مشہور رہا ہو۔

خان دوراں نصرت جنگ نے حکومت دکن کے ایام میں وہاں کئی عمارات تعمیر کرائیں۔ کئی سرائیں بنوائیں۔ لاہور میں جو ان دنوں عروس البلاد کا درجہ رکھتا تھا، اس کے شوق تعمیرات سے کس طرح خالی رہ سکتا تھا، کیا عجب ہے اس جگہ اس کا محل ہو اور اسی کے کسی حصہ کا یہ گنبد ہو۔ یا اگر مقبرہ ہی ہو تو اس میں وہ خود دفن نہیں بلکہ اس کا کوئی فرزند دفن ہوگا۔

صاحب مآثر لکھتے ہیں رعایا اس کی سخت گیری اور تشدد سے نالاں رہتی تھی۔ جب اس کے انتقال کی خبر برہان پور پہنچی تو لوگوں نے بڑی خوشی منائی اور مسرت کا اظہار کیا "شیرینی و قند و شکر در دوکان ہا نماند کہ مردم بہ شکرانہ بخش نہ کردند"

مقبرہ کے آٹھوں پہلوؤں کی عمارت دو منزلہ تھی۔ کئی محراب سے تھے اور ہر محراب قالبوتی، گنبد نہایت بلند، وسیع اور خوشنما، اس کے عین درمیان نواب نصرت جنگ یمین الدولہ کی قبر تھی۔ جرنیل کورٹ صاحب نے بہت سی جدید عمارتیں بنا کر اس کی صورت ہی تبدیل کر دی۔ قبر کو بالکل مٹا کر وہاں پختہ فرش بنوا دیا۔ بلکہ مسجد کو بھی اپنی جدید کوٹھی میں شامل کر لیا۔

باغ بہت وسیع تھا مگر زوال مغلیہ کے بعد جب لاہور کی بیرونی آبادی برباد ہو گئی تو یہ باغ بھی اجڑ گیا۔ صرف مقبرہ

رہ گیا۔ اس کے ساتھ جرنیل کورٹ صاحب نے وہ سلوک کیا جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

جب انگریزی راج آیا تو سرکار نے کوٹھی بھی فروخت کر دی۔ اینٹیں اس کی لالہ میلا رام ٹھیکہ دار (بعد میں رائے بہادر) لے گئے بلکہ جو مدور و وسیع کنواں تھا اس کی اینٹیں بھی نکال لی گئیں۔ حکومت نے ۱۸۸۲ء سے پیشتر اس مقبرہ کی مرمت رائے بہادر کنہیا لال مصنف تاریخ لاہور کی معرفت کرائی تھی۔

حضرت ملّا شاہ بدخشی

مقبرہ در باغ ملّا شاہ بدخشانی کا حشر
صورت بیر نگیٔ رنگ گلستاں دیکھئے

آپ کا اصل نام شاہ محمد، لسان اللہ لقب۔ باپ کا نام ملا عبدی (عبد محمد) تھا جو اپنے وطن موضع ارکسا علاقہ روستاق ولایت بدخشاں کے قاضی تھے۔ جیسا کہ خود ایک شعر میں فرماتے ہیں ؎

ملک من از ملک ہا ملک بدخشاں آمدہ
از بلاد و از روستاق اختیارے از ارکسا

بدخشی یا بدخشانی کے نام سے زیادہ مشہور تھے۔ وطن سے آ کر تین سال کشمیر رہے۔ پھر آگرہ گئے۔ وہاں سنا کہ لاہور میں حضرت میاں میرؒ ایک بہت بڑے بزرگ ہیں جن سے جہانگیر بھی عقیدت مند رہا ہے اور شاہجہان بھی۔ آپ آگرہ سے ۱۰۲۳ھ ۱۶۱۴ء میں لاہور آئے۔ حضرت میاں میر کو صاحب کمال دیکھ کر ان کے ارادتمندوں میں داخل ہو گئے۔ لیکن حضرت نے آپ کو اس وقت تک مرید نہ کیا جب تک تین سال مختلف ریاضتوں میں آپ کو آزما نہ لیا۔ [ایک دن آپ نے فرمایا "ملا! تو امتحان میں پورا اترا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ تجھے علم باطن سکھایا جائے۔ جا۔ اپنے کپڑے دھو کر آ۔"

ملا خوشی خوشی اٹھے۔ دریا پر آئے اور کپڑے دھونے میں مصروف ہو گئے۔ اتنے میں آپ نے دیکھا کہ ایک شخص سینے تک پانی میں ڈوبا دریا میں کھڑا ہے اور پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ کپڑے میرے حوالے کر دو تا کہ میں دھو دوں۔ چونکہ ملاّ اس کو پہچانتے نہ تھے۔ اس لیے اس کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ کپڑے دھو کر آپ حضرت میاں میر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا تمہارے کپڑے خضر دھونے کو مانگتا تھا، تم نے اسے کیوں نہ دیئے۔ اس دن سے حضرت میاں میر نے اپنی خاص توجہ آپ کی طرف مبذول کی اور مس خام کو کندن بنا دیا۔ — مرتب]

ملا شاہ تیس سال تک حضرت میاں میر کی خدمت میں رہے۔ آپ نے اپنے وقت کا بیشتر حصہ عبادت الٰہی میں گزارا اور بہت کم آرام کیا۔ چونکہ سرد ملک کے رہنے والے تھے، مرشد کی اجازت سے گرمیوں میں کشمیر اور سردیوں میں لاہور رہا کرتے تھے۔ سدا سکھ لکھتا ہے کہ کشمیر میں آپ کا قیام قلعہ اکبری (ناگر نگر) کے درمیان کوہ ہری پربت پر ہوتا تھا۔ اس پر فضا مقام سے سری نگر کا اکثر حصہ دکھائی دیتا ہے ؎

کوہ ماراں بکمر لعل بدخشاں دارد　　این چنین بخت کجا تخت سلیماں دارد

دارا شکوہ کے علاوہ اس کی بڑی بہن جہاں آرا بیگم عرف بیگم بادشاہ یا بیگم صاحب بھی ملا شاہ کے عقیدتمندوں میں شامل تھی۔ بادشاہ بیگم کے نام آپ کے چند مکتوب بھی سکینۃ الاولیاء میں درج ہیں۔ اسی عقیدت مندی کی بنا پر شہزادی نے قلعہ کی چاردیواری کے اندر زیارت مخدوم صاحب کے پہلو میں ملا شاہ کی عبادت و ریاضت کے لیے چالیس ہزار روپیہ میں ایک مسجد اور حمام اور بیس ہزار روپیہ میں ان کے خدام اور ملاقاتیوں کے لیے چند اور عمارتیں تعمیر کرائیں جن کی تاریخ تکمیل اس مصرع سے نکلتی ہے ؎

یک جائے وضو آمد و یک جائے نماز

۱۰۵۹ھ ——— ۱۶۴۹ء

شاہجہان جب کشمیر میں تھا تو عمارات کی تکمیل کے بعد ۱۲ جمادی الثانی ۱۰۶۱ھ / ۱۶۵۱ء کو ملا شاہ کی ملاقات کو گیا۔ باغ ملا شاہی کے نام سے آپ کا ایک باغ گاندر بل تحصیل سری نگر میں بھی تھا۔ باغ تو ویران ہے۔ البتہ باغ کی اندرونی عمارتیں کے آثار اب تک موجود ہیں۔ یہاں ڈوگرہ شاہی راج میں عرصہ دراز تک نائب تحصیلدار کی کچہری رہی ہے۔

[قیام کشمیر کے دوران آپ اکثر قرآن پاک کا درس دیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ آپ نے تصوف کے رنگ میں تفسیر شروع کی۔ ابھی پارہ اوّل بھی ختم نہ ہونے پایا تھا کہ آپ پر جذبہ طاری ہو گیا اور آپ کو درس بند کرنا پڑا ——— مرتب]

[حضرت ملّا شاہ جب کبھی بادشاہ کے آنے کی خبر سنتے تو عصا ہاتھ میں لے کر خیابان کی سیر میں مشغول ہو جاتے۔ اس طرح آپ بادشاہ کی تعظیم کے لیے کھڑا ہونے سے بچ جاتے۔ جب دیکھتے کہ بادشاہ جانے کی تیاری کر رہا ہے تو پہلے ہی اٹھ کر ادھر ادھر ٹہلنا شروع کر دیتے ——— مرتب]

آپ اپنے حجرہ میں کبھی چراغ نہیں جلاتے تھے۔ ایک مرتبہ لاہور میں رات کے وقت شہزادہ دارا شکوہ آپ سے ملنے کے لیے آیا۔ آپ نے چراغ مٹی کا منگوا کر جلایا اور شاہزادہ سے کہا کہ آج تم آئے تو ہمارا حجرہ بھی روشن ہو گیا اور یہ شعر پڑھا ؎

تو چراغ است دریں خانہ ویرانۂ ما

روشن از آتش عشق تو شدہ خانۂ ما

آپ نماز روزہ کے سختی سے پابند تھے۔ کراموں کے متعلق کسی نے پوچھا تو فرمایا۔ امت محمدیہ کے اولیاء کو لازم ہے کہ توحید پھیلانے، حقیقی ایمان کی کیفیت بیان کرنے، مردہ دلوں کو زندگی بخشنے، بند قفلوں کو کھولنے اور خستہ جانوں کو شفا دینے کا شغل جاری رکھیں، کیونکہ مردہ دلوں میں زندگی کی لہر دوڑانے، بندھی ہوئی گرہوں کو کھولنے اور یاد خدا سے غافل لوگوں کو جگانے کے سوا نہ کوئی کرامت ہے، نہ کوئی کشف اور نہ کوئی اولیائی۔

حضرت ملّا شاہ بڑے عالم اور کامل شاعر تھے۔ دارا شکوہ نے لکھا ہے وہ صاحب دیوان ہیں۔ ان کے مجموعہ میں مکتوبات، مثنویات، رباعیات بھی ہیں۔ تخلص شاہ ہے۔ صاحب خزینۃ الاصفیاء جلد اول میں (ص ۱۷۴ پر) لکھتے ہیں:۔

"دیوان ولی و دیوان ملا شاہ و دیوان دارا شکوہ کہ ہر سہ کتاب معدن مضامین توحید اند

بہ نظر ایں احقر گذشتہ اند"

[ملّا شاہ کی کلیات کے قلمی نسخے برٹش میوزیم لندن اور بانکی پور لائبریری پٹنہ میں موجود ہیں۔ پہلی جلد مندرجہ ذیل رسائل پر

مشتمل ہے :۔

(۱) قرآن پاک کی چند سورتوں کی تفسیر جسے تفسیر شاہ یا شاہ تفسیر کے تاریخی نام سے موسوم کیا گیا ہے یہ ۱۰۵۶ھ / ۱۶۴۶ء میں لکھی گئی۔ اس میں سورۂ فاتحہ سورۂ بقر، سورۂ آل عمران اور سورۂ یوسف کی تفسیر درج ہے۔

دوسری جلد منظومات پر مشتمل ہے ۔ اس میں مندرجہ ذیل رسائل ہیں :

(۲) رسالہ بسم اللہ ۔ اس کی بحر وہی ہے جو نظامی کی مخزن اسرار کی ہے ۔ مثنوی کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے ؎

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
خال و خط و زلف و قد مستقیم

(۳) رسالہ حمد و نعت و منقبت
(۴) یوسف زلیخا
(۵) رسالہ دیوانہ
(۶) رسالہ مرشد
(۷) رسالہ ولولہ
(۸) رسالہ ہوش
(۹) رسالہ تعریفات خانہا و باغات و منازل کشمیر
(۱۰) رسالہ نسبت

جلد سوم میں مندرجہ ذیل رسائل ہیں :۔

(۱۱) رسالہ شاہیہ
(۱۲) دیوان اوّل
(۱۳) دیوان دوم
(۱۴) شرح رباعیات
(۱۵) رقعات
(۱۶) قصائد عربی ——— مرتب]

سکینۃ الاولیاء میں آپ کی اکثر رباعیاں اور غزلیں تبرکاً درج ہیں ۔ یہاں بھی چند اشعار دیے جاتے ہیں ؎

شکر کہ امروز شد دولت فرمائے ما   رتبۂ اعلیٰ گرفت ہمت والائے ما
رشتۂ تسبیح یار رشتۂ زنار شد   رہ سوئے میخانہ دارد مرشد دانائے ما
قید غلامی نماند از نگہ رحم او   قاضی و مفتی نگر رحمت مولائے ما

آرے ایں راست کہ غم شدے سیر غم   دام ما ناچہ بود تا چہ بود دانۂ ما
شکوہ در پیچ افسون گر فنائے عشق   آتش سینہ گوشش بود افسانۂ ما

در رہ عشق آنکہ مارا کشت   خیر ما کس نبود قاتل ما
از میاں جہت پردہ حائل   شاہ خود بندہ بود حائل ما

کار ما بد کرد گو فرزند پیغمبر بود   گو حسب نبود نباشد سود ازیں انتساب

این ریاضات سلوک از بہر توحید است و بس ... چون بمنزل شد برا گشت بیداری و خواب
دست عارف فوق ایدیہم ید اللہ آمدہ — از ترانی گوش مشو ور لن ترانی رو متاب

جزو و کل گردد، شود کل جزو، جزو و کل یکے ست
جزو و کل از یک دگر این نیست مستثنیٰ شود
ذرہ خورشید است و خورشید است ہر یک ذرہ
بر چنین سر چشم گر بینا شود بینا شود
نیست پستی گر پستے بالائے درو ست
ہر کہ بالا دید ہر پستی و بالا شود

حضرت میاں میر اور ان کے خلفاء ملا شاہ، میاں نتھا، خواجہ بہاری وغیرہ اور دیگر لوگ جہاں مدفون ہیں اس کے قریب ہی میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مواضعات ہاشم پورہ، غیاث پور، دارا پور، عالم گنج اور جنت پورہ آباد تھے۔ حضرت میاں میر کی قبر کے مقام کا ملا عبد الحمید لاہوری بادشاہ نامہ میں حوالہ دیتا ہوا غیاث پور اور عالم گنج کا نام بدیں الفاظ لیتا ہے:۔

"قبر گرامیش در موضع غیاث پور است نزدیک بہ عالم گنج دار السلطنت لاہور"

ان میں موضع ہاشم پورہ کو دارا شکوہ نے برباد کرادیا کیونکہ وہاں کے جاٹ زمیندار حضرت میاں میر کے فقراء کے ساتھ جھگڑتے رہتے اور ان کے مال مویشی اور گھوڑے چھین کے لے جایا کرتے تھے۔ جب سرکار انگریزی نے چھاؤنی میاں میر کی تعمیر شروع کرائی تو باقی گاؤں بھی یہاں سے اٹھا دیئے گئے اور ان سب دیہات کی زمین میدان میاں میر کہلانے لگی۔

دارا شکوہ نے اپنی کتاب سکینۃ الاولیاء ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء سے ۱۰۵۶ھ/۱۶۴۶ء کے درمیان لکھی۔ اس میں حضرت میاں میر، ملا شاہ اور میاں نتھا وغیرہ کے حالات اور ان کی کرامتوں کا ذکر ہے۔ اس میں وہ حضرت ملا شاہ کی عمر کے بارے میں جو اس کے مرشد تھے، لکھتا ہے:۔

"آپ کی عمر اس وقت ۵۷ برس ہے۔ سخت سے سخت ریاضتیں کرنے کے باوجود ان کا رنگ سرخ ہے اور وہ قوی الجثہ اور ہشاش بشاش ہیں"

مصنف ہسٹری آف لاہور نے ملا شاہ کی وفات کا سال ۱۰۷۲ھ/۱۶۶۱ء لکھا ہے۔ فہرست کتب بانکی پور لائبریری میں ۱۰۷۲ھ/۱۶۶۱ء ظاہر کیا گیا ہے۔ صاحب تحقیقات چشتی، مصنف خزینۃ الاصفیا اور مخبر الواصلین ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۹ء لکھتے ہیں۔

اس کے ساتھ یہ سب مصنف یہ بھی لکھتے ہیں کہ ملا شاہ کا مقبرہ ان کے مرید دارا شکوہ نے قیمتی پتھروں سے تعمیر کرایا۔ دارا شکوہ اور عالمگیر کے واقعات بتاتے ہیں کہ شاہ جہان ۱۰۶۸ھ/۱۶۵۸ء میں تخت و تاج سے محروم ہو جاتا ہے اور عالمگیر اپنے بھائی دارا شکوہ کو ۲۹ یا ۳۰ ذی الحجہ ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۹ء اور بقول بعض یکم محرم ۱۰۷۰ھ/۱۶۵۹ء کو قتل کرانے کے بعد غرہ جمادی الاول ۱۰۶۸ھ/۱۶۵۸ء سے غرہ رمضان ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۸ء تک اپنے جلوس کا سال اول شمار کرتا ہے۔ جمادی الاول ۱۰۶۸ھ میں شاہ جہان کی نظربندی کے ساتھ ہی دارا شکوہ کی بے اطمینان

زندگی بلکہ اس کی خرابی و تباہی کے ایام شروع ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اگر ملا شاہ کی وفات ۱۰۶۹ھ یا ۱۰۷۰ھ بھی تصور کر لی جائے تو دارا شکوہ ان کی قبر کس طرح تعمیر کرا سکتا تھا جو ۱۰۶۹ھ کے اواخر میں خود بھی قتل ہو چکا تھا اور جمادی الاول ۱۰۶۸ھ سے کر اپنی گرفتاری کے ایام تک مارا مارا پھر رہا تھا۔ اس لیے حضرت ملا شاہ کا مزار دارا شکوہ کے بعد تعمیر ہوا ہے۔

بادشاہنامہ عالمگیری کے مصنف مولوی ذکاء اللہ دہلوی مرحوم (ص ۸۳ ایڈیشن اول پر) لکھتے ہیں حضرت ملا شاہ اپنے مرید دارا شکوہ کی شہادت کے بعد بھی زندہ تھے اور کشمیر میں گوشہ نشین تھے بلکہ لکھا ہے کہ جب عالمگیر تخت پر بیٹھا تو انھوں نے بادشاہ کے جلوس پر ذیل کا قطعہ بھی لکھا ہے

صحن دل من چوں گل خورشید شگفت	کامد حق و غبار باطل را رفت
تاریخ جلوس شاہ حق آگہ را	ظل الحق گفت الحق این الحق گفت

مولانا ذکاء اللہ لکھتے ہیں اس رباعی میں تصوف کا انداز ہے اور مرید کامل کے ابطال ارادت کی طرف اشارہ ہے۔ دارا شکوہ سفینۃ الاولیاء میں حضرت ملا شاہ کو "ظاہر و باطن میں کامل" "سالک راہ طریقت" "واقف رموز حقیقت" "مقتدائے زمانہ" لکھنے کے علاوہ صفحوں کے صفحے ان کے فضائل اور ان کی کرامتوں کے بیان میں لکھ کر ان کے مرید اور حلقہ بگوش ہونے پر فخر کا اظہار کرتا ہے۔ حضرت ملا شاہ بھی آپ پر بڑی شفقت فرمایا کرتے تھے دارا شکوہ جب اول ہی اول آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے اس کا ہاتھ بطور مصافحہ پکڑ کر فرمایا "اے عزیز میں نے اپنے کسی مرید یا دوست سے اس قسم کا مصافحہ نہیں کیا۔ میں تجھے دل و جان سے پیار کرتا ہوں میں انشاء اللہ آخرت میں بھی تیری امداد کروں گا۔" تعجب ہے کہ ایسا شفیق و مہربان پیر ایسے اخلاص مند مرید کے متعلق ابطال ارادت کا اشارہ کرے اور اس کے دشمن اور قاتل کو شاہ حق آگاہ کہے۔ معلوم نہیں مصنف بادشاہنامہ عالمگیری نے یہ واقعہ کہاں سے لیا ہے ممکن ہے عالمگیر کے خوف سے حضرت ملا شاہ نے اپنی جان بچانے کے لیے یہ رباعی کہہ دی ہو۔

دارا شکوہ کے بعد حضرت ملا شاہ کشمیر سے لاہور چلے آتے ہیں اور تھوڑے عرصے کے بعد بعمر ۱۰۷ سال وفات پا جاتے ہیں "ملا شاہ جان داد در توحید" سے ان کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔

ملا شاہ کے مزار پر اور احاطہ حضرت میاں میر کے اندر جو اور چند خاص خاص قبریں ہیں۔ ان پر سنگ سرخ کا استعمال بکثرت ہے اور یہ وہی سنگ سرخ ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ دارا شکوہ نے یہاں جمع کیا تھا اور جس کا کثیر حصہ بادشاہی مسجد کی تعمیر میں صرف ہوا۔

ریلوے سڑک اور مزار خواجہ بہاری سے غرب رویہ اور روضہ حضرت میاں میر سے بجانب غرب و جنوب ایک وسیع باغ کے اندر حضرت ملا شاہ کا مزار واقع ہے۔ جب زوال مغلیہ کی وجہ سے اہل لاہور کو لٹیروں نے لوٹنا شروع کیا۔ تو روضہ حضرت میاں میر و ملا شاہ کے نواحی دیہاتیوں نے اس باغ کو اس کی مضبوط خشتی بلند و بالا اور ۲۰ اگز لمبی دیوار کی وجہ سے جائے پناہ بنا لیا۔ اور اپنے مسکنی مکانات سے ہجرت کر کے یہاں آ گئے۔ رفتہ رفتہ یہ باغ ایک گاؤں بن گیا۔ اور آج وہی باغ میاں میر کے نام سے موسوم ہے۔

باغ کے اندر حوض مسدود۔ مگر نشان موجود۔ اس باغ کے چاروں گوشوں پر چار برجیاں تھیں ان کے علاوہ اور بھی کئی برج تھے جو مسمار ہو گئے۔ ایک برج پر ایک سجادہ نشین حنیف شاہ نے قلعہ نما دو رہ عمارت تعمیر کرا کر اس میں ایسے طاقچے رکھوائے جن میں سے بندوق کا نشانہ مارا جا سکتا تھا اس برج کے باہر چرخ چوب والا آسمانی کنواں تھا جس کے پانی سے باغ کو سیراب کیا

جاتا تھا فصیل باغ کے ساتھ بھی کئی لوگوں نے مکانات تعمیر کرا لیے اور چار دیواری کے برجوں پر بھی کئی مکان تعمیر ہو گئے۔

مزار کی تمام سنگین عمارات انقلابی دور کے ہاتھوں ملیا میٹ ہو گئیں۔ ایک گوشے میں ایک مسجد خشتی ہے جس کے فرش کے میانہ میں ایک چبوترہ ایک فٹ بلند اور قریباً ۴ فٹ لمبا تھا جس میں سنگ سرخ کے سوا اور کوئی پتھر نہ تھا۔ اس چبوترہ پر ایک عمارت تھی جس کے ستون سنگ سیم کے تھے۔ بعہد حکومت خالصہ چبوترہ، عمارت، ستون، سنگ سرخ سب سنگین دلی کی نذر ہو گئے۔

خانقاہ کے اوپر تابوتی چھت کا ایک مکان ہے زیر سقف تمام فرش سنگین بہ سنگ ابری جس میں خط کاری اور رنگ کاری نے عجب بہار بنا رکھی ہے۔ قبر کا تعویز سنگ مرمر کا تھا اب چونہ گچ ہے۔ غرض اس مقبرہ میں سنگ مرمر کی جس قدر سلیں تھیں اور سنگ مرمر کے جس قدر پتھر تھے۔ اور سنگ موسیٰ، سنگ ابری اور سنگ سرخ کے جو قیمتی پتھر تھے وہ یہاں سے اتروا کر رام باغ امرتسر کی بارہ دری کے لیے بھجوا دیے گئے۔

حضرت شاہ چراغ

نور بخش مہر دل وجاں روضۂ شاہ چراغ
جو نہ بجھنے پائے وہ شمع فروزاں دیکھیے

ان کا اصل نام سید عبدالرزاق تھا۔ والد کا نام عبدالوہاب بن سید عبدالقادر ثالث بن محمد غوث بالا پیر سادات گیلان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے بزرگ قصبہ اوچ (بہاول پور) سے ست گھرہ (منٹگمری) میں آئے۔ ست گھرہ سے ان کے جد امجد محمد غوث بالا پیر پہنچے۔ یہ زمانہ غالباً ہمایوں بادشاہ کا تھا۔ آپ نے شہر سے باہر جنوب مشرق کی طرف قیام کیا۔ اور اپنے علاقہ کا نام (بقول صاحب تحقیقات چشتی) رسول پورہ رکھا۔ لیکن جب ہمایوں نے لنگر خاں بلوچ کو لاہور میں جاگیر دی اور لنگر خاں نے یہاں اپنے عالیشان مکانات تعمیر کر لیے اور رفتہ رفتہ یہاں ایک محلہ آباد ہو گیا تو رسول پورہ کی جگہ محلہ لنگر خان کے نام نے لے لی۔ اب نہ رسول پورہ ہے نہ محلہ لنگر خان۔ نہ عالیشان مکانات کے کوئی آثار۔

جب سید عبدالرزاق پیدا ہوئے تو ان کے جد امجد صاحب حیات تھے۔ انھوں نے فرمایا "از خانہ چراغے پیدا شدہ است کہ خانہ خاندان ما را منور گرداند" اس لیے شاہ چراغ کے خطاب سے مشہور ہو گئے اور یہ نام کچھ ایسا مشہور ہوا کہ عوام اصل نام کو بھی بھول گئے۔

آپ ظاہری و باطنی علوم میں صاحب کمال ہوئے۔ شاہجہان ان کے خاص عقیدتمندوں میں تھا۔ اور چونکہ بادشاہ کو بھی عقیدت تھی اس لیے شہر کے امراء و شرفاء سب ان کے خدمت گزار تھے۔ بلکہ صاحب تحقیقات چشتی نے (ص ۸۸ میں) اور صاحب خزینۃ الاصفیاء نے (جلد اول ص ۲۷ میں) لکھا ہے کہ بادشاہ آپ کے ساتھ اپنی ایک لڑکی کی شادی بھی کرنا چاہتا تھا لیکن آپ نے منظور نہ فرمایا۔ صاحب تحقیقات نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ حالات میں نے خادم درگاہ فقیر موجی شاہ سے سنے ہیں جو درگاہ کی خدمت بھی کرتا ہے اور آمدن بھی لیتا ہے اور چونکہ خزینۃ الاصفیاء تحقیقات چشتی سے بعد کی تصنیف ہے۔ اس لیے دونوں کا ماخذ اس

لہ حدیقۃ الاولیاء میں بھی یہی الفاظ درج ہیں لیکن خزینہ اور حدیقہ دونوں ایک ہی مصنف مفتی غلام سرور مرحوم کی تصانیف ہیں۔

روایت کے متعلق خادم درگاہ کی زبان ہی ہے جو خادم کے بے علم ہونے کی وجہ سے اور بھی ناقابلِ قبول ہے۔

بہرحال حضرت شاہ چراغ کی دینی عظمت اور دنیوی وجاہت اس روایت کے بغیر بھی مسلّمہ ہے۔ وہ سیاحت کے بھی بڑے شوقین تھے۔ اور زیارت حرمین شریفین سے بھی مشرف ہو چکے تھے۔

آپ ۲۲ ذی قعدہ سنہ ۱۰۶۸ھ (سنہ ۱۶۵۸ء) کو وفات پا گئے۔ صاحب خزینۃ الاصفیاء نے لکھا ہے کہ آپ کا مقبرہ شاہجہان نے تعمیر کرایا۔ صاحب تاریخ لاہور و صاحب تحقیقات چشتی لکھتے ہیں۔ عالمگیر کے حکم سے یہ روضہ تعمیر ہوا۔ اور صحیح یہی ہے کہ یہ روضہ عالیہ عالمگیر کے عہد میں یا عالمگیر کے حکم ہی سے تعمیر ہوا ہے۔ اس لیے کہ سنہ ۱۰۶۸ھ (سنہ ۱۶۵۸ء) میں تو شاہجہان آگرہ کے قلعہ میں نظر بند تھا اور موت ہی نے اس نظر بندی سے اس کو رہائی دلائی تھی۔

روضہ کی عمارت مربع صورت میں پختہ چونہ گچ بنی ہوئی ہے۔ دروازہ اس کا جنوب کی طرف ہے۔ دروازہ میں داخل ہوتے ہی دائیں بائیں اس وقت تیئیس قبریں[1] موجود ہیں۔ جن میں چار پانچ ایسی ہیں کہ شاید دو چار سال تک ان کی صفائی ہو جائے گی ون کے قدیم درخت بھی چھ سات[2] موجود ہیں۔

روضہ کے اوپر بہت بڑا گنبد ہے۔ گنبد کے نیچے آٹھ قبریں ہیں۔ ایک شاہ چراغؒ کی، ایک ان کے صاحبزادے زین العابدین کی اور تیسری سید عبدالقادر ثانی کی۔ باقی ان کے اور عزیزوں کی ہیں۔ قبروں پر سفیدی کا پلستر ہے۔ کسی کا نام درج نہیں۔ گنبد کے اوپر کا حصہ قدیم نقش و نگار کا ایک خوبصورت مرقع ہے۔

مزار سے شرقی سمت چرخی دار چاہ کے پاس ایک قدیم درخت ون کے نیچے جس کا فرش بھی پختہ ہے نواب خان بہادر خان (گورنر لاہور) کے والد کی قبر بتائی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔

[مسجد کلاں سنہ ۱۷۱۶ء میں نواب زکریا خاں نے اپنی والدہ بیگم جان کی وصیت کے مطابق اس کے زیورات بیچ کر تعمیر کرائی۔ اس کے مشرق کی طرف ایک چھوٹا سا بلند چبوترہ ہے۔ اس چبوترہ پر چار قبریں ہیں۔

مولوی نور احمد چشتی کی مندرجہ ذیل عبارت سے جو تحقیقات چشتی کے صفحہ ۸۹ پر درج ہے یہ غلط طور پر مشہور ہو گیا ہے کہ ان میں بڑی قبر نواب زکریا خاں کی والدہ کی ہے:۔

"روضہ شاہ چراغ کی دیوار شرقی کے متصل قبر والدہ خان بہادر نواب کی نقشی زیر درخت ون موجود ہے۔"

حالانکہ مولوی نور احمد چشتی نے اپنی اسی کتاب کے صفحہ ۴۴۶ پر بیگم پورہ کا ذکر کرتے ہوئے اپنی اس تحریر کی خود ہی تردید کر دی ہے:۔

"...... مشرق کی طرف میانہ باغ میں ایک گز زمین سے بلند مربع ایک چبوترہ

---

[1]، [2] صاحب تحقیقات چشتی ص ۸۹ پر لکھتے ہیں کہ ۳۹ قبریں اس وقت موجود ہیں اور گوندنی اور ون کے درختوں کی تعداد ۲۵ ہے لیکن اب درختوں کو کٹوا کر اور چند قبروں کے انہدام سے تھوڑا سا میدان احاطہ مزار کے اندر بنا لیا گیا ہے۔

اس کے میانہ میں ایک مشت بلند اور چبوترہ تمام سنگ مرمر کا تھا مگر جوالا سنگھ وغیرہ اکھیڑ کے لے گئے۔ اس پہ دو قبریں تھیں ایک بہو بیگم زوجہ اور دوسری بیگم جان والدہ نواب خان بہادر کی۔"

بیگم جان کو چونکہ حضرت شاہ چراغ سے خاص عقیدت تھی اور مسجد شاہ چراغ بھی اسی کی وصیت کے مطابق تعمیر ہوئی تھی، اس لیے چشتی کو یہ غلط فہمی ہوئی۔ حالانکہ بیگم جان کا مزار بیگم پورہ کی بستی کے جنوب میں مسجد زکریا خاں کی شرقی جانب چند گز کے فاصلے پر موجود ہے۔ چنانچہ سید محمد لطیف نے تاریخ لاہور میں صفحہ ۱۳۸ پر لکھا ہے :—

"مسجد (زکریا خاں) کی شرقی جانب چبوتروں پر دو اور قبریں ہیں۔ یہ بہو بیگم اور بیگم جان کی قبریں ہیں۔ اول الذکر نواب خان بہادر کی بیوی اور دوسری ان کی والدہ تھیں۔"
(نواب زکریا خاں کی بیوی کا نام فخر النساء بیگم تھا جو نواب قمر الدین خاں وزیر دہلی کی بہن تھی)

رائے کنہیا لال تاریخ لاہور میں صفحہ ۲۰۱ پر لکھتے ہیں :—

"اس چبوترہ پر دو قبریں زنانہ زوجہ و والدہ نواب خان بہادر کی تھیں۔ چونکہ یہ عمارت بیگم جان والدہ نواب خان بہادر نے اپنی حین حیات میں بنوائی تھی۔ اس سبب سے اس کا نام بیگم پورہ مشہور ہے۔ الحمد للہ کہ نام اب تک باقی ہے۔ اگرچہ قبریں اکھڑ گئی ہیں۔ مرمت بذریعہ مؤلف کتاب سرکار نے کرائی" ——— مرتب]

سکھوں کے زمانے میں مقبرہ شاہ چراغ اور اس کی متصلہ قدیم عالی شان مسجد شاہ چراغ میگزین کا کام دیتی تھی۔ انگریزوں کی عملداری (۱۸۴۹ء میں) آئی تو مقبرہ اور مسجد میں چھوٹی سی دیوار بندی ہو گئی۔ مقبرہ کو تو مقبرہ ہی رہنے دیا گیا لیکن مسجد کو کوٹھی کی شکل میں تبدیل کر کے ڈپٹی کمشنروں کی اقامت گاہ بنا دیا گیا۔ ڈپٹی کمشنروں کے بعد یہ جگہ دفتروں میں تبدیل ہو گئی اور سیشن جج کی عدالت یہاں لگنے لگی۔

آج سے چند سال پیشتر یہ جگہ بالکل اجاڑ اور غیر آباد سی تھی۔ احاطے میں جھاڑیاں اور درخت اُگے ہوئے تھے۔ چار دیواری خستہ حال تھی۔ لیکن ۱۹۳۵ء میں مسجد شہید گنج کی ایجی ٹیشن کے بعد جب مسجد شاہ چراغ مسلمانوں کو مل گئی اور سرکار نے اپنا قبضہ اس پر سے اٹھا لیا تو اس اجاڑ جگہ ریزرو بنک کی عالیشان عمارت تعمیر ہو گئی اور اس چار دیواری کو جس میں والدہ نواب خان بہادر کی قبر بیان کی جاتی ہے، از سرِ نو تعمیر کر کے اس کے گرد جنگلہ لگا دیا گیا۔

آج سے ستر اسی سال کی تصنیف تحقیقات چشتی میں لکھا ہے کہ معلوم ہوتا ہے اس چار دیواری کے گرد ایک چھوٹا سا باغ تھا۔ اس لیے کہ اس جگہ اب بھی پختہ خیابان کے آثار نظر آتے ہیں۔ درختوں کے جھنڈ جن میں وَن کے درخت زیادہ نہ تھے۔ راقم نے بھی یہاں دیکھے تھے۔ بہر حال اب مقبرہ شاہ چراغ مسجد شاہ چراغ اور اس مختصر سی چار دیواری کی حالت نسبتاً بہتر ہے۔ جمعہ اور جماعت کی نمازوں میں اچھی خاصی رونق ہوتی ہے۔

باغ چوبرجی بادشاہ بیگم

بادشاہ بیگم نے رکھی تھی بنا جس باغ کی — آج اس کو خستہ اور اتنا پریشاں دیکھیے
ایک ڈیوڑھی کے سوا باقی نہیں کوئی نشاں — اس نشاں میں غور سے عبرت کا ساماں دیکھیے

اس باغ کی بنا اور بانیہ کے متعلق لاہور کے مورخوں اور ان کی تقلید میں بعض اور مصنفوں نے عجیب و غریب غلط بیانیوں سے کام لیا ہے۔ سب سے پہلے مولوی نور احمد چشتی نے تحقیقات چشتی میں یہ افسانہ لکھا کہ میاں بائی جس کے متعلق چوبرجی کے مغربی دروازے پر یہ شعر منقوش ہے ؎

ساخت میاں بائی فخر نساء
روضۂ عالی ارم احتشام

اورنگ زیب کی فاضل بیٹی زیب النساء کی کنیز تھی۔ اسی کی زیر نگرانی زیب النساء نے یہ عالیشان باغ تعمیر کرایا۔ باغ کی تکمیل کے بعد جب شاہزادی اس کے ملاحظہ کے لیے روانہ ہوئی تو راستے میں سب لوگوں سے یہی کہتے سنا کہ شاہزادی میاں بائی کا باغ دیکھنے جا رہی ہے۔ چونکہ باغ کی شہرت ان کی کنیزک کے نام پر ہو چکی تھی اور شاہزادی اپنے کانوں سے سن چکی تھی، اس لیے ملاحظہ و معائنہ کے بعد اس نے میاں بائی کی خدمات سے خوش ہو کر یہ باغ، جس پر اس کا کئی لاکھ روپیہ صرف ہو چکا تھا اسی کو بخش دیا اور اپنے لیے اس نے ایک نیا باغ اس سے کچھ فاصلے پر، جہاں اب نواں کوٹ آباد ہے، بنوایا۔ اسی داستان کو بعد میں ہسٹری آف لاہور، تاریخ لاہور اور ایجوکیشن ان مسلم انڈیا کے مصنفوں نے دہرایا بلکہ راقم نے خود بھی اپنی کتاب "لاہور عہد مغلیہ" (۱۹۲۷ء) میں باغ چوبرجی کی بانیہ زیب النساء بیگم ہی کو قرار دیا۔ لیکن خدا بھلا کرے پروفیسر محمد علم الدین سالک ایم اے اور ان کے بعد مولانا عبداللہ قریشی بی۔ اے کا جنھوں نے بڑی چھان بین کے بعد حقیقت کو افسانے سے جدا کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ زیب النساء کا اس باغ کی تعمیر سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مولانا محمد عبداللہ قریشی کا مضمون اس قابل ہے کہ اسے من و عن نقل کیا جاتا ہے: ۔

[لاہور سے ملتان کو جاتے ہوئے یونیورسٹی گراؤنڈ سے ذرا آگے چل کر سڑک کے مغرب کی جانب ایک عالیشان عمارت کا دروازہ آتا ہے جس کے شکستہ در و دیوار اور کاشی کار نقش و نگار سے صنادید پاک و ہند کے آثار کا پتہ چلتا ہے۔ عمارت دو منزلہ ہے۔ اوپر نیچے کئی ہوادار کوٹھریاں بنی ہوئی ہیں۔ اس کے چاروں کونوں پر چار خوبصورت ہشت پہلو مقطع برج (مینار) بھی تھے جن کی مناسبت سے

اسے "چوبرجی" کہتے ہیں۔ سنہ ۱۸۴۳ء کے بعد اس کا ایک مینار گر گیا اور اب صرف تین مینار باقی رہ گئے ہیں۔ محکمہ آثار قدیمہ نے اس کے گرد لوہے کا جنگلہ لگا کر باقی آثار کو محفوظ کر دیا ہے اور اس کی حفاظت کا بندوبست کر کے اسے تباہ ہونے سے بچا لیا ہے۔

اس عمارت میں دور شاہجہانی کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ ساری عمارت قالبوتی ہے اور اس کے مختلف حصوں میں ایسا تناسب پایا جاتا ہے جو اسلامی فن تعمیرات کا ایک نمایاں جوہر ہے۔ اس میں سبز، نیلے اور زرد رنگ کی خوشنما ٹائلیں لگی ہیں اور ٹائلوں سے نہایت نفیس گلکاری اور نقاشی کی گئی ہے۔ نقش و نگار کی تازگی ابھی تک باقی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنانے والا ابھی بنا کر ہٹا ہے۔ صدیاں گزر چکیں۔ کیسے کیسے انقلابات آئے۔ زمانہ نے سینکڑوں رنگ بدلے۔ حکومتیں تبدیل ہوئیں مگر یہ نقش و نگار ہر قسم کے تغیر و تبدل کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ نسلوں اور موسموں کا ردوبدل بھی انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکا۔ ان کا رنگ روغن جیسا آج سے سینکڑوں برس بیشتر تھا ویسا ہی آج بھی ہے۔ اتنا ضرور ہوا ہے کہ امتداد زمانہ سے اس عمارت کا شمالی مغربی مینار گر چکا ہے اور اس کے گنبد کسی قدر بوسیدہ ہو گئے ہیں۔

اس دروازے کے جنوب کا نشیبی حصہ کھیت بن گیا ہے اور باقی اطراف میں بہت سی نئی عمارتیں تعمیر ہو گئی ہیں جن میں پونچھ ہاؤس کا وسیع احاطہ بھی شامل ہے۔ پونچھ ہاؤس کا عالیشان بنگلہ پہلے پہل سنہ ۱۸۴۹ء میں مہاراجہ دلیپ سنگھ کے عہد میں لارڈ لارنس کی قیام گاہ کے طور پر اس وقت تعمیر ہوا تھا جب وہ سکھ فوج کی گوشمالی کے لیے گورا فوج کے ساتھ لاہور میں مقیم تھا۔ اس کے بعد یہ بنگلہ چارلس بولنوائس (CHARLES BOULNOIS) کے قبضے میں چلا گیا جو چیف کورٹ پنجاب کے پہلے بیرسٹر تھے۔ پھر سر میریڈتھ پلوڈن (SIR MEREDITH PLOWDEN) کے تصرف میں رہا جو چیف جج تھے۔ اس احاطے میں میاں بائی کا مقبرہ بھی تھا جو سکھوں کے عہد حکومت میں مسمار ہو کر نابود ہو گیا۔

کہتے ہیں کہ "چوبرجی" کی تاریخی عمارت کسی باغ کی ڈیوڑھی تھی جو اپنی وسعت اور خوبصورتی و نقاشی کی بدولت شالامار باغ سے دوسرے درجہ پر تھا۔ اس پر کئی لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا۔ اس کی ایک حد نواں کوٹ کی چار دیواری اور میانی صاحب سے ملتی تھی، تو دوسری حد مزار حضرت علی ہجویری عرف داتا گنج بخشؒ اور پیر مکی تک پہنچی تھی۔ اس کی مغربی دیوار کے نیچے دریائے راوی بہتا تھا جس نے باغ کی عمارات کو بہت نقصان پہنچایا۔ آج سے تقریباً سو سال پہلے جب ۱۲۸۲ھ میں مولوی نور احمد چشتی اپنی کتاب "تحقیقات چشتی" لکھ رہے تھے، تو اس باغ کی چار دیواری اور اس کے متعلقہ مکانات کی بعض بنیادوں کے ٹوٹے پھوٹے آثار موجود تھے۔ مگر اب ان کا کوئی نشان باقی نہیں۔ صرف یہ دروازہ ہی زمانہ کی دست برد سے محفوظ رہ گیا ہے جس سے اس کے بانی کی یاد تازہ ہوتی ہے۔

دروازے کی پیشانی پر مشرق کی جانب نیلے حروف میں بخط جلی آیت الکرسی منقوش ہے اور آیت الکرسی کے آخر میں "سنہ ۱۰۵۶ھ" درج ہے جو اس عمارت اور باغ کا سنہ تعمیر ہے۔

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل دو شعر درج ہیں جن سے اس باغ کے بانی کا پتہ چلتا ہے۔ پہلے شعر کا پہلا مصرع مٹ چکا ہے ؎

بفضل قادر و قیوم و خالق دوراں — بنا پذیر شد ایں باغ روضۂ رضوان

بگشت مرحمت ایں باغ بر میاں بائی — ز لطف صاحب زیندہ بیگم دوراں

(ترجمہ :۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے جو قادر و قیوم اور زمانے کا پیدا کرنے والا ہے، بہشت کا نمونہ یہ باغ تیار ہوا اور زمانے کو آراستہ کرنے والی "بیگم صاحب" نے از روئے لطف و کرم یہ باغ میاں بائی کو بخش دیا)

مغربی دروازے پر یہ شعر منقوش ہے ؎

ساخت میاں بائی فخر نساء
روضۂ عالی ارم احتشام

درمیانی محراب کے ہر دو جانب شمال اور جنوب والی چھوٹی محرابوں میں دائرے کے درمیان "اللہ" کا لفظ بخط نسخ منقوش ہے۔

مقامی روایات کے مطابق بیان کیا جاتا ہے کہ میاں بائی اورنگ زیب کی بیٹی زیب النساء کی کنیز یا کھلائی تھی۔ زیب النساء نے جب اس جگہ باغ احداث کرنا شروع کیا تو اس کا تمام انتظام و انصرام اپنی عزیز کنیز میاں بائی کے سپرد کیا۔ جب باغ مکمل ہو گیا تو شہزادی ملاحظہ کے لیے روانہ ہوئی۔ راستے میں اسے معلوم ہوا کہ لوگ اس باغ کو میاں بائی کا باغ کہتے ہیں۔ اس نے یہ سن کر کہ باغ نے ایک کنیز کے نام سے شہرت پائی ہے، ارادہ کر لیا کہ میں یہ باغ میاں بائی کو دے دوں گی۔ جب وہ باغ میں داخل ہوئی تو میاں بائی جھک کر آداب بجا لائی اور شہزادی کو درازیٔ عمر کی دعائیں دینے لگی۔ شہزادی نے دروازے سے اس وقت تک قدم آگے نہیں بڑھایا جب تک یہ اعلان نہ کر دیا کہ میں نے تمہاری قابلیت اور خدمات سے خوش ہو کر یہ باغ تمہیں بخش دیا ہے۔ اس کے بعد اس نے اپنے لیے ایک نیا باغ اس سے کچھ فاصلے پر نواں کوٹ میں بنوایا۔[1]

یہ دلچسپ افسانہ جسے تاریخ لاہور کی تقریباً ہر کتاب میں بڑی آب و تاب سے جگہ دی گئی ہے۔ بظاہر جتنا دلچسپ ہے اصل میں اتنا ہی بے سروپا اور حقیقت سے دور بھی ہے۔ پروفیسر محمد عظم الدین سالک پہلے مورخ ہیں جنھوں نے اپنی کتاب "دختران ہند" میں بڑی چھان بین کے بعد اصلیت سے پردہ اٹھایا ہے اور حقیقت کو افسانے سے جدا کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ زیب النساء کا اس عمارت اور باغ کی تعمیر سے کوئی تعلق نہ تھا۔

زیب النساء ۲۰ شوال ۱۰۴۷ھ/۱۶۳۸ء کو پیدا ہوئی تھی اور ۱۰۵۶ھ/۱۶۴۶ء میں جب یہ باغ تعمیر ہو رہا تھا۔ اس کی عمر آٹھ نو سال سے کسی صورت میں بھی زیادہ نہ تھی۔ ایک کم سن بچی کو خواہ کتنی ہی ہوشیار اور غیر معمولی قابلیت کی مالک کیوں نہ ہو رفاہ عامہ سے اس قدر دلچسپی لینے اور اتنا بڑا ایثار کرنے کا خیال بھی نہیں آ سکتا۔ پھر اس وقت زیب النساء کا باپ شہزادہ اورنگ زیب اپنے بھائی دارا شکوہ کی سازشوں سے تنگ آ کر اپنے منصب سے مستعفی ہو چکا تھا اور ترک دنیا کے متعلق سوچ رہا تھا۔ بادشاہ اس سے ناراض تھا۔ دربار میں اسے کوئی رسوخ حاصل نہ تھا۔ ایسے پر آشوب زمانے میں اس کی کم سن بیٹی سے کسی باغ کی تعمیر کی توقع کیسے ہو سکتی ہے؟

اگرچہ محکمہ آثار قدیمہ کی طرف سے جو قطعہ عمارت کی دیوار پر آویزاں ہے اس پر لکھا ہے کہ "زینبدہ بیگم" کوئی تاریخی شخصیت نہ تھی مگر بعض مورخوں نے "زینبدہ بیگم" ہی کو ایک مستقل شخصیت بنا کر اس کے گرد ایک اچھا خاصا تاریخی اور ادبی ہنگامہ کھڑا کر دیا ہے۔

---

[1] تاریخ لاہور انگریزی مصنفہ جج محمد لطیف صفحہ ۱۸۸–۱۹۰

جج محمد لطیف مولوی نور احمد چشتی اور رائے بہادر کنہیا لال کے خیال میں یہ زیب النساء بیگم ہی کا دوسرا نام تھا لیکن مسٹر ایس ایم جعفر نے اپنی تصنیف "ایجوکیشن ان مسلم انڈیا" کے ایک باب میں تعلیم یافتہ بیگمات کا ذکر کرتے ہوئے "زینت بیگم" کے متعلق لکھا ہے کہ وہ شاہجہان کی بیٹی تھی۔ اس کی نظموں کا ایک بہت بڑا مجموعہ موجود ہے وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ شاہجہان کی سات بیٹیوں حور النساء، جہاں آرا، روشن آرا، ثریا بانو بیگم، گوہر آرا بیگم وغیرہ میں سے جہاں آرا اور روشن آرا کے سوا کسی کو سن بلوغ تک پہنچنا نصیب نہیں ہوا۔ ان دونوں کے علاوہ کسی نے ملکی سیاست اور علمی و ادبی سرگرمیوں میں حصہ بھی نہیں لیا نیز زینت بیگم کے نام سے اس کی کوئی بیٹی ہی نہ تھی۔

اس عمارت کی پیشانی پر جو کتبہ موجود ہے اس پر غور کرنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ خوبصورت باغ شاہ جہان کی قابل اور فاضل بیٹی جہاں آرا نے بنوایا تھا جسے شاہجہان نے پچاس لاکھ سالانہ کی جاگیر اور بے شمار زر و جواہر عطا کر کے اس کی الگ سرکار مقرر کر دی تھی۔ جہاں آرا کو اس زمانے میں "بیگم صاحب" کہتے تھے۔ تیموریوں میں یہ دستور تھا کہ وہ اپنے حرم کی خواتین کو اصل نام کی بجائے کسی خاص لقب سے یاد کرتے تھے۔ چنانچہ اس وقت کی تاریخوں میں جہاں کہیں جہاں آرا بیگم کا نام ہے وہاں "بیگم صاحب" ہی کے لقب سے کام لیا گیا ہے۔ اس کی بعض یادگاروں کے نام بھی کچھ ایسے ہی ہیں جیسے کشمیر میں "صاحب آباد" اور اجمیر شریف میں بیگمی دالان وغیرہ۔ "زینت دوراں" فقط شاعرانہ ستائش ہے جس کے معنی زمانے کو زیب و زینت دینے والی یا آراستہ کرنے والی کے سوا کچھ نہیں۔ اس لحاظ سے یہ باغ جہاں آرا نے بنوایا اور اپنی کنیز یا کھلائی میاں بائی کو مرحمت کیا۔

اُس دور کی کسی تاریخ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ زیب النساء نے لاہور میں کوئی باغ بنوایا تھا۔ لاہور کے باغوں کا ذکر تاریخوں کے علاوہ بعض دوسری کتابوں میں بھی ملتا ہے جن میں ملا محمد صالح کمبو کی کتاب "بہارستان سخن" شہزادہ داراشکوہ کی کتاب "سکینۃ الاولیاء" اور منشی چندر بھان برہمن کی کتاب "چہار چمن" خاص شاہجہانی دور میں لکھی گئی ہیں۔ سکینۃ الاولیاء ۱۰۵۲ھ کی تصنیف ہے۔ اس میں یوں تو حضرت میاں میرؒ کے ملفوظات اور ان کے مشہور خلفا کا تذکرہ ہے مگر ایک باب ایسا بھی ہے جس میں ان تمام عمارات اور باغات کا ذکر ہے جہاں حضرت میاں میرؒ دن کے وقت نکل جایا کرتے تھے۔ اور یکسوئی سے عبادت کیا کرتے تھے۔ اس باب کے مطالعہ سے لاہور کی اکثر عمارتوں اور باغوں کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن اس طویل فہرست میں جہاں آرا کے کسی باغ کا ذکر نہیں ملتا۔ البتہ چندر بھان برہمن کی مشہور کتاب "چہار چمن" میں جو اس کے بعد لکھی گئی، لاہور کے مشہور باغوں میں سے باغ دلکشا، باغ دل آمیز، باغ کامران، باغ نولکھا اور باغ شالیمار کے علاوہ "ناموس العالم بیگم صاحب جہاں آرا بیگم" کے ایک باغ کا ذکر موجود ہے لیکن زیب النساء کے کسی باغ کا ذکر نہیں ———— جس سے ثابت ہوتا ہے کہ زیب النساء نے اس وقت تک لاہور میں کوئی باغ نہیں بنایا تھا۔ البتہ جہاں آرا بیگم کا باغ تعمیر ہو چکا تھا اور یقیناً وہ یہی باغ تھا جس کی عمارت پر ۱۰۵۶ھ/۱۶۴۶ء تحریر ہے۔

اس کی تائید و تصدیق اورنگ زیب کے ایک رقعہ سے بھی ہوتی ہے۔ جو اس نے ان ہی دنوں شہزادگی کے عالم میں اپنی بہن جہاں آرا کے نام لاہور سے لکھا تھا۔ اورنگ زیب ۲۰ ذی الحجہ ۱۰۵۶ھ/۱۶۴۶ء کو بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے لاہور پہنچا۔ بادشاہ نے جو اس سے پہلے لاہور پہنچ چکا تھا۔ دوسرے ہی دن اسے شہزادہ مراد بخش کی جگہ بلخ اور بدخشاں کا صوبہ دار مقرر کر کے حکم دیا کہ وہ فی الفور وہاں چلا جائے۔

اورنگ زیب ۱۵ محرم ۱۰۸۵ھ تک لاہور میں مقیم رہا اور اس کے بعد افغانستان کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس عرصہ میں اس نے لاہور کے تمام باغات دیکھے اور ان پر تبصرہ کیا۔ جہاں آرا کا باغ جو اس چوبرجی باغ کے سوا کوئی نہ تھا۔ اس وقت زیر تعمیر تھا۔ اورنگ زیب نے اس کی تعریف کی اور اس میں چند مناسب تبدیلیاں کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے لکھا:-

"ہم نے کچھ عرصہ سرکار علیا کے باغ کی سیر کی۔ ہماری طبیعت بہت خوش ہوئی۔ اس کے تالاب اور عمارتیں جو ابھی ابھی بنی ہیں، دیکھ کر ہمیں بے حد مسرت ہوئی۔ یہ جگہ نہایت عمدہ تفریح گاہ ہے۔ اگر فراست[1] خاں کی عمارت کو گرا کر محل کے طریقے پر نہایت قرینے سے ایک نشیمن بنا لیا جائے اور بعض دوسرے تصرفات کر لیے جائیں تو یہ ایک بے نظیر سیرگاہ بن سکتی ہے۔"[2]

اس باغ میں تالاب وغیرہ بھی تھے اور اس کے پاس فراست خاں کی کوئی عمارت بھی ہو گی۔ لیکن اب نہ تالاب باقی ہیں نہ آبشار، نہ کوئی بارہ دری اور نہ باغ کی چار دیواری ہی قائم ہے۔ صرف یہ ڈیوڑھی باقی رہ گئی ہے جس کے نقش و نگار زبان حال سے کہہ رہے ہیں ؎

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی　　بجز بنائے محبت کہ خالی از خلل است

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ جہاں آرا بیگم کی وفات کے بعد عالمگیر نے اپنے عہد حکومت میں اس کی جائداد زیب النساء کی جاگیریں دے دی تھی جیسا کہ دہلی کے تیس ہزاری باغ اور کشمیر کے صاحب آباد کے متعلق تاریخی شواہد ملتے ہیں اس لیے بعد میں یہ باغ اسی کے نام سے مشہور ہو گیا —— مرتب]

زیب النساء کا مقبرہ[3]

[یہ مسئلہ مدت سے زیر بحث ہے کہ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی بڑی بیٹی شہزادی زیب النساء کی قبر لاہور میں ہے یا دہلی میں؟

ایک جماعت اس امر کی دعویدار ہے کہ زیب النساء نے اپنی زندگی میں اپنی قبر لاہور میں بنوائی تھی اور وفات کے بعد وہ اسی میں دفن کی گئی۔ چنانچہ نواں کوٹ لاہور میں جو مقبرہ زیب النساء کے نام سے مشہور و موجود ہے وہ اس کا بدیہی ثبوت ہے۔

دوسری جماعت اس کے خلاف یہ کہتی ہے کہ زیب النساء قلعہ سلیم گڑھ میں فوت ہوئی تھی اور اسے دہلی میں دفن کیا گیا تھا۔

---

[1] فراست خاں اس زمانے میں کوئی امیر ہو گا اور یہ نام اس کی دانائی کی وجہ سے شاہی خطاب معلوم ہوتا ہے۔

[2] رقعات عالمگیری نمبر ۱۴۵

[3] یہ مضمون مرتب کے قلم سے ہے۔

جہاں تک اس مسئلے کے متعلق تحقیق کی گئی ہے، یہی نتیجہ نکلا ہے کہ زیب النساء واقعی سلیم گڑھ میں فوت ہوئی تھی جو لال قلعہ دہلی ہی کے ایک حصے کا نام تھا اور بادشاہ کے حکم سے اسے تیس ہزاری باغ دہلی میں دفن کیا گیا تھا جو جہاں آرا بیگم کا متروکہ تھا اور اس وقت زیب النساء کے قبضے میں تھا۔ عالمگیر ان دنوں دکن کے معرکوں میں مصروف تھا۔ اسے وہاں اطلاع بھیجی گئی چنانچہ مآثر عالمگیری کا مصنف جو عالمگیر کا معاصر مورخ تھا اور جس کے بیان میں غلطی کا احتمال نہیں ہو سکتا، ۱۱۱۲ھ (۱۷۰۲ء) کے واقعات میں لکھتا ہے۔

"دارالخلافہ کی اطلاع سے معلوم ہوا کہ نواب تقدس جناب زیب النساء بیگم اللہ تعالیٰ کی رحمت سے پیوست ہو گئیں۔ بادشاہ کا دل اس خبر سے بھر آیا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ وہ بے طاقتی کی وجہ سے بے قرار تھا۔ صبر کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ بادشاہ نے سید امجد خاں، شیخ عطا اللہ، حافظ خاں (جو تذکرہ بغتائیہ کا مصنف حافظ خاں عرف نور محمد لکھتا ہے) کو حکم دیا کہ وہ شہزادی کے نام پر صدقات اور خیرات غریبوں میں تقسیم کریں اور بیگم کا مقبرہ باغ سی ہزاری میں بنوائیں جو اسی کا متروکہ تھا۔"[1]

زیب النساء کی قبر پر ایک شاندار عمارت تعمیر کی گئی اور یہ مقبرہ ایک مدت تک لوگوں کی زیارت گاہ بنا رہا چنانچہ مرزا سنگین بیگ اپنی کتاب سیر المنازل میں لکھتا ہے:۔

"کابلی دروازہ کے باہر شارع عام پر تکیہ بھولو شاہ فقیر کے شمال کی جانب زیب النساء کا مقبرہ اور لال بنگر کی مسجد ہے۔"

اس عمارت کی ایک دیوار پر خط ثلث میں یہ عبارت کندہ تھی:

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ

هذا المرقد البنت الكبرى للعبد المذنب العاصي المغفور
برحمة الرحيم الكريمة الحافظة زيب النساء المرجو
من عباد الله الصالحين ٥ ان يدعوا لها بالغفران والرضوان
وتاريخ فوتها قوله سبحانه "وادخلي جنتي"

۱۱۱۳ھ (مطابق ۱۷۰۲ء)

سرسید احمد خاں نے اپنی مشہور کتاب آثار الصنادید دہلی ۱۸۵۳ء میں تصنیف کی۔ اس کے صفحات ۴۲، ۷۷ کے مطالعہ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ لیکن افسوس کہ ۱۸۸۵ء میں جب راجپوتانہ ریلوے تعمیر ہوئی تو یہ مقبرہ مسمار کر دیا گیا۔ چنانچہ مسٹر بیل لکھتا ہے کہ زیب النساء کا مزار کابلی دروازہ کے پاس دہلی میں تھا۔ لیکن راجپوتانہ ریلوے بناتے وقت اسے منہدم کر دیا گیا۔[2]

---

[1] مآثر عالمگیری کلکتہ اڈیشن صفحہ ۴۶۲

[2] دیکھو بیل صفحہ ۴۲۸

اس سلسلے میں رسالہ پنجاب نوٹس اینڈ کوریز بابت ماہ اپریل ۱۸۸۵ء بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے جس کے صفحہ ۱۲۲ پر اس کے نامہ نگار نے اس افسوس ناک واقعہ کی اطلاع دی ہے۔ اس کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اس واقعہ کو بھول گئے اور زیب النساء کی قبر کے رہے سہے نشانات بھی لوگوں کی بے توجہی کا شکار ہو گئے۔

تیموریوں میں بہت کم ایسا ہوا ہے کہ وفات کے بعد ان کی نعش ایک مقام سے اکھاڑ کر دوسرے مقام پر دفن کی گئی ہو یا ایک جگہ سے ہٹا کر کسی ایسی جگہ پہنچائی گئی ہو جو سینکڑوں کوس کے فاصلے پر ہو۔ بابر اور ممتاز محل کی نعشیں امانت کے طور پر آگرہ اور زین آباد باغ میں دفن کی گئی تھیں مگر زیب النساء کے متعلق کسی تاریخ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس کی نعش امانت کے طور پر پہلے دہلی میں دفن کی گئی اور بعد میں لاہور لائی گئی۔

دراصل زیب النساء کے مزار کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں دورِ حاضرہ کے سوانح نگاروں نے پیدا کی ہیں جن میں شمس العلماء خان بہادر سید محمد لطیف جج۔ رائے بہادر کنہیا لال ہندی۔ مولوی نور احمد چشتی۔ مرزا حیرت دہلوی۔ محمد دین خلیق اور مولوی احمد دین بی۔ اے کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے زیادہ تر اپنے قیاس سے کام لیا ہے یا بازاری افسانوں کو تاریخی روایات کا درجہ دے دیا ہے۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ زیب النساء کا مزار دہلی میں ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ نواں کوٹ لاہور کا مزار جو زیب النساء کے نام سے مشہور ہے اور اس کے گرد و نواح کی باقی عمارات آخر کس کی ہیں؟ کم از کم ان کے بارے میں یہ کہنا تو سراسر غلط ہے کہ یہ زیب النساء کی تعمیر کی ہوئی ہیں۔

جہاں تک مقبرہ کا تعلق ہے اس کی قبر کی ساخت ایسی ہے کہ اسے کسی عورت کا مزار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ تیموریوں میں یہ عام دستور تھا کہ وہ خواتین کی قبر دو منزلی بناتے تھے۔ یعنی اصل قبر نیچے تہ خانے میں ہوتی تھی اور خالی تعویذ اوپر کی سطح پر ہوتا تھا۔ جس پر ایک تختی کا نشان بھی بنایا جاتا تھا۔ نور جہاں کا مقبرہ اور ممتاز محل کا روضہ اس کی مثال ہیں۔ نواں کوٹ لاہور کی قبر نہ دو منزلی ہے نہ اس پر تختی کا نشان ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کسی ایسے مرد کی قبر ہے جو شاہجہان کے عہد میں فوت ہوا۔

نواں کوٹ کا علاقہ تیموریوں کے عہد میں ایک اہم سول اسٹیشن تھا۔ اس کی چار دیواری۔ باغوں کے برج۔ بارہ دریاں۔ محلات کے نشان اور گرد و نواح کی قبور اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس وقت یہاں اچھی خاصی رونق تھی۔ یہ تمام عمارتیں ایک ایک دو دو سال کے وقفے میں تیار ہوئی ہیں اور ان میں شاہجہانی دور کے فنِ تعمیر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ زیب النساء کے مقبرہ کا گنبد اور فرش بھی عالمگیری دور کی خصوصیات کا حامل نہیں جس سے ظاہر ہے کہ وہ عالمگیر کے عہد کا نہیں بلکہ شاہجہانی دور کی یادگار ہے۔

تاریخوں کی ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ شاہجہان کے عہد میں چار جلیل القدر امیر لاہور میں فوت ہوئے پہلا علی مردان خان۔ دوسرا آصف جاہ۔ تیسرا نصرت خاں اور چوتھا افضل خاں علامی۔ ان میں اول الذکر ہر سہ کے مقبرے تو لاہور میں موجود ہیں مگر افضل خاں علامی کا مقبرہ موجود نہیں۔ وہ ۱۰۴۹ھ میں فوت ہوا۔ بادشاہ اس وقت کابل گیا ہوا تھا۔ واپسی پر وہ لاہور میں افضل خاں کے رشتہ داروں کے پاس تعزیت کے لیے گیا۔ بہت ممکن ہے کہ افضل خاں علامی کے محلات نواں کوٹ میں ہوں اور اسے وفات کے بعد یہاں دفن کیا گیا ہو۔

بج محمد لطیف اور بعض دوسرے بزرگوں نے آگرہ کی تاریخ لکھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ افضل خاں کی قبر جمنا کے اس پار چینی کے روضہ میں ہے۔ مگر ای ڈبلیو سمتھ صاحب کا خیال ہے کہ اگر اس روضہ کو گہری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس کا طرز تعمیر دور عالمگیری سے ملتا جلتا ہے۔ اسے شاہجہانی دور کی عمارت قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اس کے علاوہ چینی کے روضہ میں دو قبریں ہیں۔ ایک زنانہ اور دوسری مردانہ۔ افضل خاں علامی کی بیوی اس سے بہت پہلے فوت ہو چکی تھی۔ اس کے کوئی لڑکی بھی نہ تھی۔ جسے اس روضہ میں دفن کیا گیا ہو۔ پس لاہور میں جو مقبرہ زیب النساء کے نام سے مشہور ہے وہ افضل خاں علامی کا ہو سکتا ہے۔

ان حالات میں یہ بات تو پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ زیب النساء دہلی میں فوت ہو کر تیس ہزاری باغ میں دفن ہوئی — نواں کوٹ لاہور کے مقبرہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس کی ملحقہ عمارات بھی اس کی بنائی ہوئی نہیں بلکہ یہ افضل خاں علامی کی یادگار ہیں۔ چونکہ اس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ عالمگیر کے عہد میں اس کی جائداد زیب النساء کو مل گئی ہو۔

ذیل میں "زیب النساء کی قبر" کے عنوان سے ایک نظم پیش کی جاتی ہے جو مہاراج بہادر برقؔ دہلوی نے آج سے چالیس سال قبل اس وقت کہی تھی جب محکمہ آثار قدیمہ نے خاک کے تودوں کو ہٹا کر زیب النساء کی قبر برآمد کی تھی ؎

زیب النساء کی قبر جو تھی خاک میں نہاں
صدیوں کے بعد اس کا ملا گم شدہ نشاں

مشہور ہے جو تیس ہزاری کے نام سے
تھا گنج بے بہا اسی میدان میں نہاں

مٹی میں مل رہا تھا دُرِ شاہوار حیف
اوجھل نظر سے خاک کے تودوں کے درمیاں

شاید یہی فنا یہ تخلص کا تھا اثر
مخفی کی قبر بھی جو خفا میں رہی نہاں

اگلا ہے خود بخود یہ دفینہ زمین نے
ممنونِ جستجو نہیں روداد بے گماں

تصویر و متبرد حوادث ہے سر بسر
اُبھرا ہے فرشِ خاک پہ جو نقش رائیگاں

گنبد ہے مقبرہ ہے نہ لوحِ مزار ہے
تعویذِ قبر کا بھی ہے مٹتا ہوا نشاں

نے شمع ہے نہ چادر گل ہے نہ قبر پوش
مٹی کا ایک ڈھیر ہے عبرت کی داستاں

ویرانیٔ لحد ہے مجاور سر فراز
زائر ہجومِ یاس تباہی ہے پاسباں

ہے گرد سے اٹا ہوا انبار خاک کا
سبزہ تو کیا کہ شکل نمو بھی نہیں عیاں

اڑتی ہے خاک اور برستی ہے تیرگی
چھایا ہوا ہے حسرت و اندوہ کا سماں

روتی ہے بے کسی سرہانے کھڑی ہوئی
تربت پہ کسمپرسی کا عالم ہے نوحہ خواں

بادِ صبا چڑھاتی ہے چادر غبار کی
ہیں ذرہ ہائے ریگ بیاباں گہر فشاں

ہے اس کی خوابگہ یہ شبستان خاک اب
زیبندہ جس کے دم سے تھے قصر فلک نشاں

جو دخت ماہوش شہ ہندوستاں کی تھی
تھا مصدر سخاوت و کرم جس کا آستاں

روشن چراغ بزم سخن جس کے دم سے تھا
مشہور تھی جو شاعرۂ فیض ترجماں

اس کو نہیں فنا ہے یہ دنیا محل نصیب ——— دامن کو جس کے گرد سرِ راہ تھی گراں
سچ ہے نہیں زمانے کو یک وضع پر قرار ——— نیرنگ روزگار چنیں ہے سگے چناں
برحق کہ بے ثبات ہیں اسباب ظاہری ——— سچ ہے کہ انقلاب کی تصویر ہے جہاں
ہے امتیازِ شاہ و گدا تا بہ زندگی ——— ہے زیرِ خاک پست و بلندی عز و شاں

وہ آج غرق خوں ہیں جو کل محو ناز تھے
وہ آج سرنگوں ہیں جو کل سرفراز تھے

[مرتب ———]

شاہی خشت پز بدھو

جس پژاوہ پر رہا شاہی مکاں آراستہ ——— آئیے اور آج اس کو "مرگ میداں" دیکھیے
جس پژاوہ سے ہوئی قائم بنائے شالا باغ ——— واں مزارات مسیحی و مسلماں دیکھیے

جہانگیر کے زمانہ میں لاہور کا ایک کمہار سدھو نام اس مقام پر جہاں بدھو کا آوا مشہور ہے اور جو سڑک شالا مار باغ کے کنارے واقع ہے۔ چھوٹا سا پژاوہ بنا کر اینٹیں پکانے کا کام کیا کرتا تھا۔ جب بزمانہ شاہجہان شالا مار باغ کی تعمیر شروع ہوئی۔ تو سدھو کے بیٹے بدھو کو اینٹیں بہم پہنچانے کا حکم ملا۔ اس باغ کی چار دیواری اور اس کی عمارات کے لیے لاکھوں کروڑوں اینٹوں کی کھپت تھی اس لیے آوے کی حدود بہت دور تک پھیل گئیں اور بدھو اب بدھو کمہار نہ رہا بلکہ شاہی خشت پز کہلانے لگا۔ اور امرار اور حاکم صوبہ تک اس کی رسائی ہو گئی۔

روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت میاں میر کا ایک مرید عبدالحق نام بارش کی شدت میں سردی سے ٹھٹھرتا ہوا آگ کی تلاش میں یہاں آیا۔ بدھو کے ملازموں اور خود بدھو نے استہزاء سے کام لے کر اس کو جوتے مار کر نکلوا دیا۔ کہتے ہیں کہ اس مرتبہ آوے کو پکانے کے لیے خس و خاشاک۔ کوڑا کرکٹ اور لکڑیوں کے ہزارہا من صرف ہو گئے۔ لیکن اینٹیں پختہ نہ ہو سکیں۔ بدھو اسی غم میں بیمار ہو گیا۔ اس نے ایک رات باپ کو خواب میں دیکھا جو اس کو غم و غصہ کی حالت میں کہہ رہا تھا کہ اگر تو اپنی بہتری چاہتا ہے تو اس فقیر سے اپنی تقصیر معاف کرا۔

بدھو دو چار دن کی تلاش کے بعد درویش عبدالحق سے ملا اس کے پاؤں پر گر پڑا اور معافی کا خواستگار ہوا۔ درویش نے کہا حکم الٰہی ایسا ہی تھا۔ اب اینٹوں کا پختہ ہونا تو ناممکن ہے البتہ یہ ہم پخت اور شری کچی اینٹیں بھی پختہ اینٹوں کے نرخ پر فروخت ہو جائیں گی۔ چنانچہ انہی ایام میں لاہور میں اس کثرت سے عمارات شروع ہوئیں کہ اس کی تمام اینٹیں اصلی نرخ پر فروخت ہو گئیں۔

درویش عبدالحق کا انتقال ۱۰۸۲ھ/۱۶۷۱ء میں بعہد عالمگیر ہوا۔ بدھو نے اس کی قبر گنبد بہادر خاں کے شمال کی طرف تعمیر کرائی۔ چند برس کے بعد جب بدھو کا اپنا انتقال ہوا تو اس کی قبر بھی اس درویش کے متصل ہی تعمیر کی گئی۔ اس قبر کے جنوبی چونہ گچ چبوترہ پر پانچ نامعلوم الاسم قبریں بنی ہوئی ہیں ان قبروں کے آثار کا پتہ مورخین لاہور ۱۸۹۲ء تک برابر دیتے آئے ہیں۔

لیکن ۱۹۰۹ء یا اس کے قریب ریلوے حکام نے جب ریلوے جنرل سٹور کی عظیم الشان اور وسیع عمارت اور اس کی طویل و بلند دیوار بنائی۔ تو بہت سے مقبرے جنرل اسٹور کی حدود میں آ گئے۔ جنرل اسٹور کی شمالی دیوار سڑک شالامار باغ کے ساتھ ساتھ شہزادہ بدھو کے میچی قبرستان سے شروع ہو کر مقبرہ علی مردان سے بھی جو جنرل اسٹور ہی میں اب شامل ہے بہت آگے چلی گئی ہے۔ اس دیوار کی بیرونی جانب سڑک شالامار کے کنارے شاہجہانی طرز کا ایک گنبد نظر آتا ہے جس کے شمالی محراب پر ایک تختی بحکم ڈپٹی کمشنر لاہور اس مضمون کی چسپاں ہے کہ

"اس مقبرہ کو خراب کرنے والے کے ساتھ قانونی سلوک کیا جائے گا۔ جرمانہ یا قید۔
یا دونوں سزائیں دی جائیں گی۔ یہ حکم ۲ اگست ۱۹۱۶ء کا مجریہ ہے۔"

راقم الحروف نے ۱۹۲۳ء میں روضہ حضرت ایشاں کے ایک ضعیف العمر خادم سائیں کامل دین سے جو چالیس سال سے اسی درگاہ میں رہتے ہیں اور بعض اور لوگوں سے "صاحب مقبرہ" کا نام دریافت کیا چند ایک نے لاعلمی ظاہر کی لیکن سائیں کامل دین اور دیگر اصحاب نے کہا کہ مشہور یہی ہے کہ یہ قبر بدھو کی ہے جس کے نام پر بدھو کا آوا ہے۔

اس مقبرہ کے اندر دو قبریں ہیں۔ غربی جانب جو قبر ہے وہ ذرا چھوٹی ہے۔ اور شرقی جانب کی قبر ذرا بلند ہے مقبرہ کی عمارت شاہجہانی عمارتوں کا نمونہ ہے۔ گنبد پر منقش چینی کا کام ہے۔ جو ہر چند بہت کچھ مٹ گیا ہے تاہم ابھی اس کے آثار باقی ہیں چاروں محرابوں پر اس اعلیٰ کاریگری کے نشانات ابھی تک مٹی ہوئی شکل میں نظر آ رہے ہیں جو کاسنی اور گلابی خطوط کی لکیروں اور مختلف بیل بوٹوں سے ظاہر ہو رہی ہے۔

مقبرہ کا بیرونی چبوترہ پندرہ پندرہ قدم مربع ہے وہ اکثر جگہ سے شکستہ ہے۔ مقبرہ کے دریچوں پر جو عمارت چاروں طرف بڑھی ہوئی ہے وہ بالکل گر گئی ہے۔ ایک بہت بڑا کریر کا درخت چبوترہ کے غربی جنوبی گوشہ پر موجود ہے۔ اس مقبرہ کے گرد اور بھی سات آٹھ درخت کریر کے موجود ہیں۔

اس گنبد سے قریباً پچاس ساٹھ قدم کے فاصلہ پر مشرق کی طرف اُسی زمانہ کا ایک کنواں شکستہ و تباہ حالت میں ہے۔ مقبرہ کا دروازہ شمال یعنی سڑک شہلا باغ کے رُخ پر تھا چنانچہ ایک طویل چبوترہ کے آثار اب تک نظر آ رہے ہیں۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے فوجی افسروں میں ادی طبیلہ (AVITABILE) فوجی افسر ہونے کے علاوہ وزیر آباد اور پشاور کا گورنر بھی رہا ہے۔ یہ ۱۸۳۳ء میں ملازم ہوا۔ اس کی تنخواہ ۱۶۶۶ روپے ماہوار تھی۔ اس نے بڑاوہ بدھو کی بلندی پر یورپین طرز کی ایک کوٹھی بنائی تھی۔ جس کو بیل بوٹوں اور گملوں سے سجا رکھا تھا۔ کوٹھی پر جانے کے لیے بڑاوہ پر ایک سڑک بھی بنا رکھی تھی۔ کئی لوگ اس کوٹھی کو بارہ دری اور بنگلہ بھی کہتے تھے۔ جنرل ادی طبیلہ اسی مقام پر سپاہ کے پنچ صلاح مشورہ کے لیے طلب کرتا تھا۔ اور یہاں بڑی رونق رہتی تھی اُس زمانہ میں اپنی بلندی کی وجہ سے یہ مقام فرحت بخش تصور کیا جاتا تھا۔

۱۸۴۱ء میں جب راجہ دھیان سنگھ کے ایما سے شہزادہ شیر سنگھ اپنی جاگیر بٹالہ سے لاہور آیا۔ تو ۱۴ جنوری کو اس نے اسی کوٹھی میں قیام کیا اسی جگہ فوج کے وہ افسر اور پنچ جو شہزادہ شیر سنگھ کے طرفدار تھے جمع ہوئے اور اسی مقام پر توپوں کی سلامی سے اہل شہر اور اہل قلعہ کو شہزادہ شیر سنگھ کے مہاراجہ پنجاب ہونے کی اطلاع دی گئی۔

جب سرداران سندھانوالیہ نے مہاراجہ شیر سنگھ اور اس کے وزیر مہاراجہ دھیان سنگھ اور ولی عہد پنجاب شہزادہ پرتاپ سنگھ کو قتل کر دیا۔ تو اسی مقام پر راجہ ہیرا سنگھ نے چالیس ہزار فوج کے سامنے سندھانوالیوں کے خلاف ایک پر جوش اور اشتعال انگیز تقریر مہاراجہ اور وزیر کا انتقام لینے کے بیبے کی۔

سکھ حکومت کے خاتمہ (۱۸۴۹ء) کے بعد اس پژاوہ کی کھدائی شروع ہو گئی بلکہ مسمار ہو گیا۔ روشیں مٹ گئیں۔ ۱۹۰۱ء میں اس آوے کی کھدائی سے بہت سی زمین نکل آئی تھی لیکن آوے کے آثار ابھی قائم تھے۔ ۱۹۲۳ء میں جب راقم اس طرف گیا تو اس ٹیلہ کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا بلکہ جو زمین اس پژاوہ کو مٹانے سے برآمد ہوئی تھی اس میں عیسائیوں کا قبرستان بنا دیا گیا تھا۔

اب نہ بدھو کا آوا ہے نہ سکھ حکومت کے زمانہ کا بنگلہ۔ مسیحی قبرستان اور گنبد بدھو کے درمیان جنرل اسٹور کی دیوار کے ساتھ گورنمنٹ نے ایک گول سا چبوترہ بنا کر اس پہ ایک دیوار چار فٹ کھڑی کر دی ہے جس پر سنگ مرمر کی تختی میں یہ انگریزی عبارت درج ہے:۔

"THE SITE BUDHU KA AWAH AND THE HOUSE OF GENERAL AVITABILE"

مقام یا موقع بدھو کا آوا و کوٹھی جنرل اوی طویلہ

یہ چبوترہ شالا باغ کو جاتے ہوئے دائیں ہاتھ کو آتا ہے اس کے گرد لوہے کی ایک زنجیر لگی ہوئی ہے۔

پژاوۂ بدھو کے متصل دو قبرستان ہیں اور دونوں سرراہ واقع ہیں۔ پہلے اسلامی قبرستان آتا ہے جہاں ایک مسجد قدیم۔ چاہ۔ وضو خانہ اور غسل خانہ موجود ہے۔ اب چند سال سے مسجد کے عقب میں ایک جنازہ گاہ بھی پختہ اینٹوں کے فرش سے تیار ہو گئی ہے اکثر لوگوں نے قبرستان میانی صاحب کی طرح یہاں بھی اپنے اپنے احاطے بنا لیے ہیں۔ اس قبرستان میں اس قدر مردے دفن ہوتے ہیں کہ ہر قبر کھودنے پر کسی نہ کسی لاش کا کوئی نہ کوئی نشان مل جاتا ہے۔ قبرستان کی عام حالت ردی ہے۔ چند ایک پرانی قبریں بھی موجود ہیں۔

اس کے ساتھ ہی مسیحی قبرستان ہے جس کے گرد ایک طویل چار دیواری چار چار فٹ تک بلند ہے۔ بہت سی قبریں بالکل خام ہیں بہت سی قبروں پر صلیب کے نشان ہیں۔ کئی ایک پر سنگ مرمر کی تختیاں نصب ہیں جن پر مرنے والے کی عمر، تاریخ وفات اور اُس کا نام درج ہے۔ جس طرح اسلامی قبروں پر قرآنی آیات یا عبرت انگیز اشعار لکھے ہوئے ہوتے ہیں اسی طرح مسیحی مقبرے بھی چند درد انگیز الفاظ سے قبرستان کا نظارہ کرنے والوں کو عبرت کا سبق دیتے ہیں۔ چند قبروں کی عبارتیں مسیحی مذاق دکھانے کیلئے ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

ایک عورت (ستیندرو کمار سنگھا بنگالی عیسائی لیڈی) کی قبر پر اس کی عمر ۲۳ سال پانچ ماہ اور تاریخ وفات ۔ ار نومبر ۱۹۰۹ء درج کرنے کے بعد لکھا ہے:۔

"تیرے نوکر، تیرے شاندار کام اور تیرے فرزند موجود ہیں اور تیری عزت بڑھا رہے ہیں"

آٹھ سال کے ایک بچہ کی قبر پر لکھا ہے:۔

"نوخیز اور شیریں پھول جو ابھی غنچہ ناشگفتہ تھا۔ توڑ ڈالا گیا۔ جو ابھی دنیا کے رنج و عیش سے قطعی ناآشنا تھا۔ ابھی اس نے اپنے والدین کی محبت کا پھل نہیں چکھا تھا۔ کہ آسمان پر اٹھا لیا گیا"

اسی مضمون کو ایک اُردو شاعر نے کس خوبی سے ادا کیا ہے ؎

پھول تو دو دن بہار جانفزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

ایک چھبیس سالہ نوجوان کی قبر پر یہ الفاظ مندرج ہیں :۔

"تیری محبت میرے دل میں قائم ہے اور وہ قائم رہے گی کیونکہ محبت کا قائم رکھنا عیسائیت کا فرض ہے۔"

ایک ۴۹ سال کی عمر والے کی قبر پر ذیل کے الفاظ ہیں :۔

"اے خدا اس کو بہشت میں جگہ دے اور اس کی نیکیوں کو ہماری مغفرت کا ذریعہ بنا۔"

مسٹر فضل بھی جو پنجاب بائیبل سوسائٹی کے مشہور سیکرٹری لاہور کے علم دوست نوجوان اور اعلیٰ مترجم تھے اسی جگہ دفن ہیں۔ وہ بیالیس سال کی عمر میں ۲۷ اگست ۱۹۲۸ء کو وفات پا گئے۔ ان کی قبر ان کی بیوی نے بنوائی ہے۔ رنگ مرمر کا سالم تختہ جس کے گرد لوہے کا جنگلہ ہے قبر پر نصب ہے اُس پر لکھا ہے :۔

"اپنے پیارے خاوند کی یاد میں" "مبارک ہیں وہ جو اپنے مالک کی خدمت کرتے ہوئے جان دے دیتے ہیں اور اپنی جانفشانیوں اپنی محنتوں اور اپنی شاندار خدمات کے بعد جن کی اوروں کو بھی پیروی کرنی چاہیئے دائمی آرام گاہ میں چلے جاتے ہیں وہ مر نہیں گئے صرف قبل از وقت ہم سے جدا ہو گئے ہیں۔"

ایک اکیس سالہ نوجوان کی قبر پر جس نے ایسٹر کے دنوں میں انتقال کیا مندرجہ ذیل عبارت درج ہے :۔

"ایسٹر کی خوشی دلانے والی صبح کو تمام مُردوں کی روحیں اپنے باپ کو اپنی بہن کو بچے کو اور ماں کو ملنے کے لیے اپنی اپنی قبروں سے نکلتی ہیں۔"

حضرت ایشاںؒ

باغ ہے گو حضرت ایشاں کا پامال خزاں
مقبرہ کی اب بھی تقدیس نمایاں دیکھئے

اصل نام سید خواجہ خاوند محمود ہے حضرت ایشاں (آں نشان یا آں جناب) ادب کی وجہ سے کہتے ہیں۔ آپ کے مفصل حالات کشمیر کی تاریخوں اور کتاب رضوانی میں درج ہیں۔ رسالہ رضوانی آپ کے فرزند خواجہ معین الدین احمد نقشبندی کی تصنیف ہے۔ تحقیقات چشتی میں (ص ۴۰۴ پر) لکھا ہے :۔

"آپ محمد حسین آخری بادشاہ کشمیر کے زمانہ میں کشمیر آئے چونکہ آپ کے پند و نصائح اور موعظ حسنہ سے اکثر شیعہ سنیوں کی جماعت میں داخل ہو رہے تھے۔ اور بادشاہ خود

شیعہ تھا اس لیے اس نے آپ کو کشمیر سے نکل جانے کا حکم دیا۔ آپ نے ایک ماہ کی
مہلت مانگی لیکن اسی دوران میں اکبر نے کشمیر پر حملہ کر دیا۔ محمد حسین بھاگ گیا۔ اس کا
بیٹا جنگ میں مارا گیا اور اکبری افواج نے کشمیر پر قبضہ کر لیا۔"

ایسے ہی الفاظ آپ کے ورود کشمیر اور حکم اخراج کے متعلق رائے کنہیا لال نے بھی لکھے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کشمیر میں کوئی بادشاہ محمد حسین کے نام سے نہیں گزرا۔ البتہ چک خاندان سے حسین شاہ چک ۹۷۱ھ سے ۹۷۸ھ تک کشمیر میں حکومت کرتا رہا ہے۔ وہ اور اس کی اولاد جو ۱۶ ذی قعدہ ۹۹۴ھ/۱۵۸۶ء تک کشمیر میں حکمران رہی ہے، ضرور شیعہ تھی۔ لیکن حضرت ایشاں ان کے زمانہ میں کشمیر نہیں آئے۔ بلکہ بقول صاحب تاریخ کبیر کشمیر (ص ۶۲) ۹۷۱ھ/۱۵۶۴ء میں تو وہ پیدا ہی ہوئے تھے۔ اس لیے صحیح یہ ہے کہ آپ اکبر کے آخری ایام میں کشمیر تشریف لائے۔ اور یہی ہسٹری آف لاہور کے مصنف نے بھی لکھا ہے۔

بخارا آپ کا وطن تھا اور وہیں مدرسہ سلطانیہ سے بیس سال کی عمر میں آپ نے دستارِ فضیلت حاصل کی۔ سیلانی طبع تھے۔ سمرقند، ہرات، قندھار، کابل سے ہوتے ہوئے اور وہاں ارادتمندوں کو علومِ ظاہری و باطنی کا فیض پہنچاتے ہوئے آپ کشمیر میں رونق افروز ہوئے۔

تحقیقاتِ چشتی میں یہ بھی درج ہے کہ کشمیر کے سُنی شیعہ فساد میں آپ شیعوں کے خلاف اور اہلِ سنت والجماعت کے مددگار تھے اور اس فساد کی وجہ سے سری نگر میں بدامنی کا اندیشہ تھا اس لیے جہانگیر کے حکم سے آپ آگرہ میں بلائے گئے۔ لیکن محمد شاہ بادشاہ دہلی کے عہد (۱۱۴۸ھ) کا مصنف خواجہ محمد اعظم دیدہ مری اپنی تاریخ المشہور تاریخ اعظمی میں (ص ۱۳۸، ۱۳۹) پر لکھتا ہے:۔

"جملہ واقعات شدیدہ کہ در عہد ظفر خاں (ناظم کشمیر بعہد شاہجہان) کہ در کشمیر رو داد قضیہ مردم
اہلِ تسنن با مردم اہلِ تشیع است .... ظفر خاں در ضمن شکایت بہ مبالغہ و لفاظت
بہ حضور برنگاشت حکم پادشاہی بہ طلب حضرت خواجہ صدور یافت۔ مجرد ورود حکم از
خانہ حرکت فرمودند....... بعد زیارت بزرگان شاہجہان آباد بہ امر سلطان در لاہور
توطن فرمودند"

یہ ۱۰۴۳ھ/۱۶۳۳ء کا واقعہ ہے۔

شاہجہان نے آپ کو ایک لاکھ سنہری ٹنکہ عطا کیا جس سے آپ نے باغ اور مسجد کے علاوہ اپنا مقبرہ بھی تیار کرایا۔ تاریخ کبیر کشمیر کا مصنف لکھتا ہے۔ امرائے شاہجہانی میں سعید خاں[1] ایک نامور امیر تھا۔ اُس نے آپ کا مقبرہ بنوایا۔ نواب وزیر خاں بھی آپ کا

---

[1] سعید خاں چار ہزاری ذات دو ہزار و پانصد سوار کا منصب رکھتا تھا۔ بادشاہ کے جلوس سوم ۱۰۳۹ھ/۱۶۲۹ء میں اس نے پشاور اور سرحد میں افغانوں کی شورش دبائی۔ اس لڑائی میں شادمان خاں والیٔ پکھلی اور خضر خاں گکھڑ بھی اس کے معاون تھے۔ ذیقعدہ ۱۰۴۷ھ/۱۶۳۷ء میں سعید خاں نے قزلباشوں کے حملہ سے ایک عظیم جنگ کے بعد بصوابدید علی مردان خاں قندھار کو بچایا۔ بادشاہ نے سعید خاں اور جنگ کے کارگزاروں کو خلعت، منصب اور انعامات عطا کیے۔

عقیدت مند تھا۔ ممکن ہے نواب سعید خاں اور نواب وزیر خاں یا دونوں میں سے کسی ایک نے تعمیر مقبرہ میں آپ کی خدمت کی ہو۔

آپ کے دو فرزندوں کا کشمیر کی تاریخوں میں ذکر ہے۔ ایک خواجہ معین الدین نقشبندی جو آپ کے ہمراہ ۱۰۴۴ھ/۱۶۳۴ء میں لاہور آئے تھے اور پھر حضرت نے ان کو خانقاہ فیض پناہ سری نگر اور لنگر کی خدمت گذاری اور دین اسلام کی خدمت کے لیے بادشاہ سے واپس کشمیر جانے کی اجازت لے دی تھی خواجہ معین الدین کئی کتابوں کے مصنف اور صاحب علم و فضل تھے۔ تاریخ کبیر کشمیر میں (ص ۲۴۶ پر) ان کے متعلق لکھا ہے۔ —— صبیۂ خواجہ عبدالرحیم دہ بیدی از بطن خواہر عالمگیر بادشاہ غازی در عقد نکاح ایشاں بود" عالمگیر کی بہنوں کا ذکر اسی کتاب میں ایک دو جگہ ہو چکا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اس کی چار بہنیں سات سال کے اندر اندر ہی انتقال کر گئی تھیں اور اس کی بہن جہاں آرا بیگم عرف بیگم صاحب اور روشن آرا بیگم نے شادیاں ہی نہیں کیں۔ اس کی کسی ساتویں بہن کا ذکر ہندوستان کی کسی تاریخ میں نہیں ہے۔

خواجہ معین الدین احمد نے بعمر ۷ سال محرم ۱۰۸۵ھ/۱۶۷۴ء میں تین فرزند چھوڑ کر انتقال کیا۔ ان کی اولاد آج تک کشمیر میں آباد اور موجود ہے۔ ان کی ذریات میں خواجہ نورالدین محمد آفتاب (ولادت ۱۰۸۵ھ وفات ۱۱۵۶ھ) اور خواجہ کمال الدین شہید (شہادت ۱۰ رجب ۱۱۸۵ھ) کشمیر میں بہت مشہور ہو کر گزرے ہیں۔

حضرت ایشاں اور حضرت میاں میر کے درمیان صوفیانہ بحث مباحثہ بذریعہ تحریر بھی ہوتا رہا ہے۔ آپ ہر جمعہ کو اپنی مسجد میں وعظ فرمایا کرتے تھے۔ نواب زکریا خاں گورنر لاہور چونکہ آپ ہی کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس لیے اس کی زندگی تک آپ کے مزار پر بہت رونق رہی وہ ہر آٹھویں دن مستحقین اور خدام درگاہ کو کھانا اور نقدی تقسیم کیا کرتا تھا۔

حضرت نے باغ بڑے شوق سے تعمیر کرایا تھا۔ اور وہ آپ کے روضہ کے متصل شمال کی جانب کنوئیں کے پاس تھا۔ گلاب سنگھ بھونڈیہ نے جب بعہد مہاراجہ رنجیت سنگھ بیگم پورہ اور گنبد نواب خان دوراں میں چھاؤنی قائم کی تو اس باغ کی چار دیواری کو گرا کر اس کو برباد کر دیا۔ روضہ اور مسجد اور باغ کے ساتھ نواب زکریا خاں نے جو ارا ‌ں وقف کی ہوئی تھی وہاں چھاؤنی کے گھوڑے اور بیل اور گدھے باندھے گئے۔

آپ کا مزار بہت بلند سنگین پختہ چونہ گچ ہشت پہلو صورت کا ہے۔ ہر پہلو پر قالبوتی محراب اور سقف پر عالیشان گنبد جس پر چڑھنے کے لیے سیڑھیاں موجود ہیں۔ روضہ کے اندر عین وسط میں آپ کی قبر ہے اس کے مشرق و جنوب میں ایک قبر ہے وہ ان کے فرزند خواجہ بہاء الدین[1] کی بتائی جاتی ہے۔

سکھوں کے زمانہ میں چونکہ روضہ کے اندر بارود بھری رہتی تھی اس لیے ہمیشہ مقفل رہتا تھا۔ جب انگریزی دور آیا تو بارود خانہ اس روضہ سے نکلوا کر دریا میں پھینکوا دیا گیا اور یہ روضہ اور مسجد سرکار نے شامل نزول کر لی چونکہ اکثر اسلامی مقامات شامل نزول ہو کر نیلام ہو چکے تھے۔ اس خوف سے سید محمود آغا صاحب متولی کی تحریک سے مسلمانان لاہور نے بہ سرکردگی انجمن اسلامیہ پنجاب

---

[1] کشمیر کی تاریخوں میں آپ کے صرف دو فرزندوں کا ذکر ہے خواجہ معین الدین احمد نقشبندی اور خواجہ تاج الدین البتہ آپ کی اولاد و احفاد کثیر تعداد میں ہے۔

معرفت خان بہادر ڈپٹی محمد برکت علی خان مرحوم گورنمنٹ سے حضرت ایشاں کے مقبرہ کی واگذاری کا مطالبہ کیا جو گورنمنٹ نے منظور کر لیا چنانچہ ۲۱ مئی ۱۹۱۶ء کو ٹاؤن ہال لاہور میں ایک دربار منعقد ہوا جس میں مسٹر ڈونلڈ سابق کمشنر پنجاب نے اعلان کیا کہ "حضرت ایشاں صاحب جن کی مسلمانان لاہور بڑی عزت و تکریم کرتے ہیں اور جو محکمہ نزول میں اب تک شامل تھی گورنمنٹ نے مہربانی فرما کر اس کو اراضی نزول کی بجائے انجمن خانقاہ مسلمانان پنجاب کے حوالے کر دی ہے"

خان بہادر ڈپٹی محمد برکت علی خان مرحوم اور میاں محمد شاہ دین ہمایوں بیرسٹر ایٹ لا (بعد میں جج چیف کورٹ پنجاب) نے مسلمانوں کی طرف سے گورنمنٹ کی اس عنایت کا شکریہ ادا کیا چنانچہ آج (۱۹۶۲ء میں) اڑتالیس سال سے یہ متبرک مکان مسلمانوں کے قبضہ میں ہے۔

سجاد کا حوض، مسجد اور روضہ سب کسمپرسی کی حالت میں تھے۔ رائے بہادر کنہیا لال تاریخ لاہور (ص ۲۴۴) پر لکھتے ہیں:-

"درگاہ سکھوں کے عہد میں یہاں تجارتی بنا کر اس عالی جاہ مکان کو برباد کر دیا۔ چار دیواری
گرا دی، باغ اجاڑ دیا، مسجد کے صحن اور متفرق قبروں کی اینٹیں خشت فروشوں نے نکال
لیں، مزار کے اندر ولی احاطے میں بارود رکھ کر مزار کا تمام سنگ مرمر اتار لیا۔"

خواجہ عبدالاحد کاشمیری جو حضرت خواجہ خاوند محمود کی اولاد سے تھا، سر ہنری لارنس ریزیڈنٹ پنجاب کے زمانہ (۱۸۴۶ء) میں کشمیر سے لاہور آیا۔ اس نے اپنے عالیشان جد امجد کے روضہ کی جب افسوسناک حالت دیکھی تو سر ہنری لارنس سے اس کی مرمت کی اجازت لے کر اس پر بہت سا روپیہ خرچ کیا۔ مزار اندر کا دوبارہ تعمیر کرایا۔ باہر سے مزار بھی درست کرائے اور مسجد کی مرمت بھی کرائی۔

چونکہ اخراجات مرمت کے لیے کوئی صورت مستقل نہ تھی اس لیے رفتہ رفتہ یہ مکان پھر غیر آباد ہو گیا۔ ۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۰ء کے درمیان سرکار انگریزی نے رائے کنہیا لال کی معرفت اس کی دوبارہ مرمت کرائی پھر ۱۹۰۱ء میں حضرت سید محمود آغا صاحب (وفات ۱۸۸۲ء) کے برادر خورد حضرت میر جان شاہ نے ۱۹۱۹ء میں صحن مسجد و روضہ کی دیوار اور روضہ کے گنبد بلکہ کلس تک کو بھی درست کرایا۔ حوض کے چاروں طرف پختہ فرش ہے۔ مسجد کے حجرے دو منزلہ ہیں۔ ایک حجرہ شمال کی طرف ہے، ایک جنوب کی طرف، درمیان میں مسجد کے پانچ دروازے ہیں جن میں وسط کا دروازہ سب سے بڑا ہے۔

۱؎ خشت فروش سب مسلمان تھے ؎ جورے کہ تو می کنی بہ اسلام — در ملت کافرے ندیدم

۲؎ حضرت ایشاں کے مزار کا دروازہ مغرب کی طرف ہے اس کے سامنے ہی مسجد اور مسجد کا حوض ہے۔ دروازہ کے اوپر سنگ مرمر کی تختی پر عبدالرشید سجادہ نشین خانقاہ کی طرف سے الفاظ ذیل درج ہیں۔ تاریخ وفات حضرت ایشاں ۱۲ شعبان المعظم ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء۔ مزار حضرت میر جان صاحب مرحوم ؎

کاملاں را نور دیدہ جان جاناں عارفاں — نور چشم خواجگان نام پاکش میر جاں

مزار حضرت سید محمود ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء ان تینوں بزرگوں کے مزار گنبد کے اندر ہیں۔

حاجی میر جان شاہ اور سید محمود آغا کی قبریں حضرت ایشاں کے مزار کے شرقی پہلو میں ہیں۔ جنوب کی طرف روضہ کے اندر ہی اور کچھ قبریں ہیں روضہ کا فرش پختہ ہے اور دیواروں پر گل کاری اور بیل بوٹوں کا کام ہے۔

۱۹۲۳ء میں سائیں کامل دین نے جو چالیس سال سے یہاں کے خدمت گزار اور ضعیف العمر بزرگ ہیں، راقم کو بتایا کہ اس روضہ کے ساتھ ننانوے کنال زمین وقف ہے جس میں زیارت، مسجد ملحقہ مکانات مزروعہ وغیر مزروعہ رقبہ سب شامل ہے۔ قریباً دو تین سال ہوئے گورنمنٹ نے میکلگن ٹیکنیکل کالج (موجودہ نام پنجاب انجینئرنگ کالج) کے لیے اکتیس بگھہ زمین اس وقف سے لے کر معاوضہ میں بیگم پورہ سے صرف ۲۵ کنال اراضی دی ہے۔

یہاں سال میں دو عرس ہوتے ہیں ایک شعبان کی تیسری شب اور دوسرے دن کو جو میر جان شاہ صاحب کے وصال کا یوم ہے۔ دوسرا ۱۲ ذی الحجہ کو جو سید محمود آغا صاحب کا یوم وفات ہے۔ عرس میں ختم خواجگان ہوتا ہے وعظ خوانی اور رات کو پر تکلف کھانے کی وجہ سے بھی اکثر لوگ آجاتے ہیں۔

صحن مسجد کے پاس جنوب کی طرف ایک چوبی مسقف تخت پوش ہے جس پر نقاشی کے کام کے علاوہ آئینہ بندی بھی ہے یہاں حضرت میر جان شاہ اعتکاف کیا کرتے تھے۔

حضرت ایشاں کے روضہ اور بیگم پورہ سے شمال کی طرف ایک بلند ٹیلہ کھڑا ہے۔ یہ پژادہ (آوا) ہے یہیں آپ کے روضہ اور اس کی متعلقہ عمارات کے لیے اینٹیں پختہ ہوتی تھیں اور یہیں بیگم پورہ کے محلات، مکانات اور مسجد کے لیے اینٹیں پختہ ہوتی رہیں۔ اس پژادہ میں سے کچھ زمین کالج والوں نے نکال لی ہے اور کچھ اب محکمہ جرائم پیشہ اپنی نو آبادی کے لیے نکال رہا ہے۔

دروازہ کلاں کے سامنے دونوں طرف شہزادگان کابل کی قبریں ہیں۔ مزار گنبد سے جنوب کی طرف خانصاحب مولوی فیروز الدین مالک فیروز پرنٹنگ ورکس کا خاندانی قبرستان ہے جس میں چھوٹی بڑی ۲۸ قبریں ہیں انہی میں آپ کے بھائی مولوی فتح دین بسمل اڈیٹر اخبار پنجاب پنچ، مولوی فضل دین ایڈیٹر اخبار رفادار اور منشی دین محمد ایڈیٹر اخبار میونسپل گزٹ کی قبریں بھی ہیں۔ اس احاطہ مزار کے دروازہ پر یہ رباعی درج ہے ؎

اس خواب حیات کی عدم ہے تعبیر — ہر شخص کو مرنا ہے جواں ہو یا پیر
نیچے اوپر زمیں کے ہیں نقش و نگار — یہ صفحۂ خاک ہے دو رویہ تصویر

نواب وزیر خاں

ہر طرف چھائی اداسی گر گئے در و دیوار — باغ کہتے تھے جسے اب اس کو میداں دیکھئے
رہ گئی بارہ دری یا رب سلامت اشکر ہے — اب نہ صبح عیش کو شام غریباں دیکھئے

[اصل نام[1] حکیم علیم الدین انصاری اور لقب نواب وزیر خاں تھا۔ چنیوٹ (ضلع جھنگ) کے رہنے والے تھے چنیوٹ وہی مردم خیز خطہ ہے جس کی خاک سے شاہ جہان بادشاہ کا وزیر اعظم علامی سعد اللہ خاں جیسا زبردست فاضل پیدا ہوا۔ یہاں

---

[1] از مرتب

نواب وزیر خاں اور سعد اللہ خاں کی بہت سی یادگاریں اب بھی موجود ہیں۔ نواب وزیر خاں کے محلات کے آثار شہر کے جنوب مشرق میں ایک نہایت مضبوط اور پختہ فصیل کے اندر واقع ہیں۔ مقامی لوگ اس کو "ریختی" کہتے ہیں۔ آج کل ان بوسیدہ حجروں میں دھوبی اور لوہار آباد ہیں۔

حکیم علیم الدین انصاری شیخ عبداللطیف کے بیٹے اور شیخ حسام الدین کے پوتے تھے۔ ان کے حالات لکھنے میں ہمارے مورخوں نے بڑی بے اعتنائی سے کام لیا ہے۔ تاریخ ولادت کے متعلق بھی کوئی پتہ نہیں چلتا۔ ہاں اتنا معلوم ہوتا ہے کہ عربی اور فلسفہ کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ طبابت کی طرف متوجہ ہوئے اور اس فن میں کمال حاصل کرنے کے لیے اس وقت کے مشہور حکیم داوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور تکمیل کے بعد بیس برس کی عمر میں قسمت آزمائی کے ارادے سے لاہور کا رخ کیا۔ اس لحاظ سے قیاساً آپ کی پیدائش کا سال ۱۰۰۵ھ/۱۵۸۰ء ہو سکتا ہے۔ اس وقت ہندوستان پر جہانگیر حکمران تھا۔

کچھ عرصہ لاہور ٹھہرنے کے بعد حکیم علیم الدین دہلی روانہ ہو گئے۔ مگر جب وہاں بھی کوئی خاطر خواہ انتظام نہ ہو سکا تو اکبر آباد چلے گئے جہاں تھوڑے ہی عرصہ میں کام چل نکلا اور آپ کی شہرت نے شہزادہ خرم (شاہجہان) کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اور اس نے اپنے ملازموں کی سلک میں منسلک کر لیا۔[1]

تھوڑے ہی دنوں میں آپ شہنشاہ، شہزادگان اور بیگمات حرم کے مزاج شناس ہو گئے۔ خلوص نیت اور رسوخ ارادت نے دیوان بیوتات کے رتبے تک پہنچایا اور امانت و دیانت نے اس سے بھی بڑھا کر اول میر سامان اور بعد میں دیوان کے بلند پایہ عہدے پر فائز کر دیا۔

شہزادہ خرم آپ کی دل و جان سے عزت کرتا اور ہر ج مرج کے دنوں میں اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ مآثر الامرا کا بیان ہے کہ حکیم صاحب نے کبھی کسی چیز کی فرمائش نہیں کی بلکہ اس عرصہ میں جو کچھ کمایا اس میں سے بھی دس بارہ لاکھ روپیہ شاہی ضرورت کی دواؤں پر صرف کر دیا۔[2]

حقیقت میں جس واقعہ نے حکیم علیم الدین کو نوابی کے بلند مرتبے پر پہنچایا وہ ملکہ نور جہاں کا حیرت انگیز علاج تھا۔ چنانچہ جب ملکہ نے لاہور آ کر غسل صحت کیا تو حکیم صاحب کو ایک لاکھ روپے کا خلعت عطا کیا اور سات لاکھ روپے نقد پیش کیے۔ ملکہ نے اپنا زیور اتار کر حکیم کی نذر کیا۔ اس پر حرم کی تمام کنیزوں نے اپنا زیور اتار کر ملکہ پر تصدق کیا۔ ملکہ نے وہ زیور بھی حکیم کو بخش دیا۔ اس طرح حکیم صاحب نے ایک دن میں بائیس لاکھ روپے حاصل کیے۔

۱۰۳۶ھ/۱۶۲۸ء میں جب شہزادہ خرم شاہجہان کے لقب سے سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس نے حکیم علیم الدین کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں خلعت فاخرہ اور خنجر مرصع مرحمت فرمایا۔ ایک گھوڑا با زین مطلا، ایک اونٹ، ایک علم، ایک نقارہ اور ایک لاکھ روپیہ نقد انعام دیا اور پانچ ہزار ذات اور سہ ہزار سوار کے جلیل القدر منصب پر سرفراز کیا۔[3]

---

[1] مآثر الامرا، جلد سوم ص ۹۲۳ — بادشاہ نامہ جلد اول حصہ اول ص ۲۴۶

[2] مآثر الامرا جلد سوم ص ۹۲۴۔

[3] ایضاً بادشاہ نامہ جلد اول حصہ اول ص ۱۱۷۔

پنجم سال جلوس میں جب فتح خاں دولت آبادی نے خراج دینا بند کر دیا تو شاہجہان نے حکیم علیم الدین کے سواروں میں اضافہ کرکے ان کا منصب پنج ہزاری ذات اور پنج ہزار سوار کر دیا۔ اور انھیں قلعہ دولت آباد کی تسخیر اور فتح خاں کی سرکوبی پر مامور کرکے ہزار سواروں کے ساتھ برہانپور سے رخصت کیا۔ فتح خاں اس بات کی خبر سن کر ڈر گیا اور اس نے اپنے بڑے بیٹے کو بہت سے قیمتی تحائف دے کر درگاہ معلیٰ میں روانہ کر دیا۔ حکیم موصوف بھی راستے سے لوٹ کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بادشاہ ان کی اس کارگزاری پر اتنا خوش ہوا کہ انھیں نواب وزیر خاں کا لقب دے کر صوبہ پنجاب کا ناظم مقرر کر دیا۔ چنانچہ حکیم صاحب متواتر سات سال یہ خدمت بڑے اچھے طریقے سے انجام دیتے رہے[1]

سنہ ۱۰۴۳ھ (۱۶۳۳ء) میں بادشاہ نے کشمیر جاتے ہوئے قلعہ لاہور کی عمارات میں شاہ برج، دولت خانۂ خاص اور آرام گاہ دولتخانہ کو جو جہانگیر کے زمانے میں بنی تھیں ناپسند کرکے وزیر خاں کو ان کی تجدید کا حکم دیا اور انھوں نے اپنی نگرانی میں انھیں دوبارہ بنوایا۔

سنہ ۱۰۴۴ھ (۱۶۳۴ء) میں وزیر خاں نے لاہور میں اپنی رہائش کے لیے ایک عالیشان حویلی تعمیر کرائی۔ یہ حویلی شاہ عالمی دروازے کے اندر تھی۔ اسے پری محل کہتے تھے جسے ۲۷ جمادی الثانی کو شاہجہان نے اپنے ورود سے مشرف کیا۔ وزیر خاں نے پا اندازی کی رسم ادا کرنے کے بعد بے شمار روپیہ بادشاہ پر سے نچھاور کیا۔ اس کے بعد عراق کا گھوڑا، عراق کی مخمل، گجرات کی ساٹن اور سونے کا تخت طاؤس جس کی قیمت پچاس ہزار روپیہ تھی بادشاہ کی خدمت میں ہدیۃً پیش کئے۔ بادشاہ نے اس میں فقط دو لاکھ کی اشیاء قبول کیں[2]

۲۷ شعبان سنہ ۱۰۵۰ھ (۱۶۴۰ء) کو جب شاہ جہان دارالسلطنت لاہور سے گزر رہا تھا تو وزیر خاں نے نہایت قیمتی تحائف اس کی خدمت میں پیش کیے۔ بادشاہ نے اسی وقت ایک خلعت خاصہ، ایک گھوڑا طلائی ساز و سامان کے ساتھ اور ایک ہاتھی انھیں عنایت کرکے معتقد خاں کی جگہ دارالخلافہ اکبر آباد کا صوبیدار نامزد کر دیا[3]

نواب وزیر خاں اکبر آباد میں دس ماہ سے زیادہ حکومت نہ کر سکے۔ وہ ۲۱ جمادی الاول سنہ ۱۰۵۱ھ (۱۶۴۱ء) کو اکبر آباد میں بعارضہ قولنج فوت ہو گئے۔ بادشاہ کو جب ان کی وفات کی خبر ملی تو اس نے درگاہ ایزدی میں ان کی مغفرت کی دعا کی اور ان کے فرزندوں (سعید خاں اور صلاح الدین خاں میر توزک) کو طلب کرکے شاہانہ الطاف سے نوازا[4]

نواب وزیر خاں نہایت سلیم الطبع، بے حد متقی اور پرہیزگار تھے۔ انھوں نے تمام عمر نہایت سادگی اور بے تکلفی میں بسر کی اور نماز عصر کبھی بغیر سنت کے ادا نہ کی۔ ان کا ذاتی خرچ بہت کم تھا۔ اس لیے انھوں نے بہت سامال و اسباب جمع کیا لیکن وہ بخشش اور جود کی نعمت سے محروم تھے۔ ادنیٰ ادنیٰ سی باتوں پر ان کا حال بدل جاتا اور رحم غصہ سے منقلب ہو جاتا تھا۔ وہ فرط ارادت سے شاہی کاموں کی انجام دہی میں خاص خوشی محسوس کرتے تھے[5]

---

[1] بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم ص ۲۴۷ – مآثر الامرا جلد سوم ص ۹۲۵

[2] بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم ص ۶۶

[3] بادشاہ نامہ جلد دوم ص ۲۱۵

[4] بادشاہ نامہ جلد دوم ص ۲۴۱

[5] مآثر الامرا جلد سوم ص ۹۲۶

"نواب وزیر خاں گورنر رفاہ عام کے کاموں سے خاص دلچسپی رکھتا تھا چنانچہ لاہور میں مسجد وزیر خاں کے علاوہ حمام، بازار، محلات، سرائے، باغ، بارہ دری اور دکانیں سب اسی کا ذوق تعمیر ہیں۔ مگر ان میں سے بہت سی چیزیں امتداد زمانہ کے ہاتھوں نیست و نابود ہو چکی ہیں مگر اب بھی بہت سی عمارتیں ان کا نام زندہ رکھنے کے لیے باقی ہیں۔ انھوں نے وزیر آباد بسایا اور اس میں بھی اپنی یادگاریں چھوڑیں جن میں سے بعض اب بھی موجود ہیں —— مرتب]

نواب وزیر خاں نے لاہور میں اس مقام پر جہاں آج پنجاب پبلک لائبریری ہے اپنا وسیع باغ تعمیر کرایا جو نخلیہ وزیر خاں یا نخلستان وزیر خاں کے نام سے مشہور تھا۔ اب بھی کھجور کا کوئی نہ کوئی درخت وہاں نظر آجاتا ہے۔ باغ کے درمیان ایک عالیشان دو طبقہ بارہ دری تعمیر کرائی جس کے چاروں طرف ایک بلند چبوترہ خشتی واقع ہے۔

جب احمد شاہ نے زمان شاہ بادشاہ کابل کے فرمان کے بموجب ۱۷۹۹ء میں رنجیت سنگھ کو لاہور پر قبضہ کرنے کی اجازت دے دی اور اندرون شہر کے رؤسا [1] نے بھی جو سہ حاکمان لاہور کے ظلم و ستم اور ان کی لوٹ کھسوٹ سے تنگ آچکے تھے اس کا ساتھ دیا تو وہ سب سے پہلے نواب وزیر خاں کے اس باغ ہی میں فروکش ہوا۔ باغ میں اس کی فوجوں نے ڈیرے ڈال کر اس کو تباہ کرنا شروع کیا اور بارہ دری میں رنجیت سنگھ نے بذات خاص قیام کیا۔ یہیں سے وہ ۷ جولائی ۱۷۹۹ء بمطابق ۱۸۵۶ بکرمی کو معہ فوج سوار ہو کر لوہاری دروازہ کے رستے شہر میں داخل ہو گیا۔

۱۷۹۹ء سے ۱۸۴۹ء تک جب تک کہ سکھوں کا راج رہا۔ بارہ دری اور باغ دونوں سکھوں کی چھاؤنی کہلاتے رہے۔ باغ تو ویران ہو گیا اور بارہ دری میں چونکہ حکام قیام رکھتے تھے اس لیے سلامت رہ گئی۔

جب سرکار انگریزی کا عمل دخل ہوا۔ تو سکھوں کی تقلید میں گورے سپاہیوں کے لیے یہ چھاؤنی بنائی گئی۔ جب چھاؤنی میاں میر میں منتقل ہو گئی تو یہاں محکمہ بندوبست والوں نے اپنا اڈہ قائم کیا۔ ان کے بعد محکمہ تار نے اس پر قبضہ کیا۔ ان سے خالی ہوئی تو عجائب خانہ کے سامان کے لیے اس کو مال گودام بنایا گیا۔ غرض وہ بارہ دری جہاں نواب وزیر خاں گورنر پنجاب اپنی کچہری کیا کرتے تھے برسوں تک مختلف لوگوں اور محکموں کا فٹ بال بنی رہی۔

اب اس بارہ دری میں ابتدائے ۱۸۶۲ء سے پنجاب پبلک لائبریری یعنی کتاب گھر ہے۔ پنجاب گورنمنٹ نے اعلیٰ پیمانہ پر اس کی مرمت بھی کرائی ہے چونکہ یہ لائبریری مقبول عام ہے اور بڑے وسیع پیمانہ پر قائم ہے اور طالبان علوم کثرت سے آتے ہیں اس لیے اب اس کے دو حصے کر دیے گئے ہیں انگریزی زبان کا لٹریچر بارہ دری کی دونوں منزلوں کے علاوہ نئی دو منزلہ عمارت میں ہے اور مشرقی لٹریچر کی کتابوں کے لیے علیحدہ مکان اسی احاطہ میں تعمیر کیا گیا ہے۔ جو یک منزلہ ہے۔

داراشکوہ کی تصنیف (سکینۃ الاولیاء) سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب وزیر خاں کے باغ سے پہلے بھی یہاں ایک باغ تھا چنانچہ لکھا ہے کہ حضرت میاں میر اپنے یاروں بمعیت کبھی کبھی دن کا کچھ حصہ مرتضٰے خاں کے باغ میں بھی گذارا کرتے تھے۔ جسے اب وزیر خاں کا باغ کہتے ہیں۔ اسی باغ کے متصل شیخ عبدالرحمٰن درویش کی قبر ہے اور اس قبر کے غربی جانب ہوشیار خاں کا باغ ہے۔

---

[1] مفتی محمد اکرم۔ لالہ حاکم رائے۔ محمد طاہر۔ مفتی محمد باقر۔ مہر محکم دین وغیرہ۔

حضرت میاں میر کی وفات ۱۰۴۵ھ / ۱۶۳۵ء میں ہوئی ہے۔ اور دارا شکوہ نے اپنی کتاب ۱۰۵۲ھ / ۱۶۴۲ء میں شروع کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت میاں میر کی وفات کے بعد نواب وزیر خاں نے مرتضیٰ خاں کے باغ کی بنیادوں پر اپنا باغ مع بارہ دری تعمیر کرایا ہے۔

پرانی انار کلی کے تھانہ کے آگے سے سول سیکریٹریٹ کے دفاتر کی طرف جائیں تو بارہ دری نواب وزیر خاں یعنی لائبریری کے متصل ہی دائیں ہاتھ بلند چبوترہ پر ایک بہت پرانی قبر موجود ہے۔ شاید یہی شیخ عبدالرحمٰن درویش کی قبر ہو۔ اب مرتضےٰ خاں اور ہوشیار خاں کے باغات کا کیا پتہ چلے گا۔ انقلاب زمانہ کی صرصر نے سب کی جڑیں اُکھیڑ دیں۔

لاہور کے لوگوں کو معلوم ہے کہ جب ڈھولی گلے میں ڈھول ڈال کر ضلع ڈیرہ غازی خاں کی طرف سخی سرور کی خانقاہ پر جاتے ہیں تو ان کے جھنڈوں کے جھنڈ لاہور کی سڑکوں، بازاروں اور کوچوں میں نظر آتے ہیں ان کو اصطلاح عام میں "سنگ" کہتے ہیں یہ لوگ ڈھول بجاتے ہوئے کچھ بے معنی اور بے تال سے گیت گاتے ہیں۔ لوگوں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو گود میں لیتے ہیں اور "پھمنیاں" (ملتے لوری دیتے) اور اپنی داڑھیوں سمیت ناچتے اور کودتے ہیں۔ بچوں کے والدین پیسہ دو پیسہ یا غلّہ دیتے ہیں لاہور میں سے جب یہ لوگ گذرتے ہیں تو یہاں ان کا میلہ لگ جاتا ہے سکھوں کے زمانہ سے پیشتر یہ میلہ باغ نواب وزیر خاں میں لگتا تھا۔ جب سکھوں نے یہاں چھاؤنی بنالی۔ تو میلہ کو ذرا پرے جگہ مل گئی۔ انگریزی چھاؤنی کے ایام میں بھی یہی حال رہا۔ مصنف تحقیقات چشتی لکھتے ہیں "مخلوقات ارذل اور عورات فاحشہ اس میلہ پر بکثرت جاتی تھیں۔ لوہاری دروازہ سے لے کر باغ وزیر خاں تک شیطان کا بازار بڑا گرم رہتا تھا"

سمت ۱۸۸۰ بکرمی سے جس کو آج سمت ۲۰۰۰ بکرمی میں سوا سو سال ہونے کو ہے میلہ کا رُخ بدل گیا ہے۔ اب میلہ صرف تین دروازوں (لوہاری، موچی اور دہلی) پر ہوتا ہے مگر رونق بڑی رہتی ہے اور جُہلا اس میں کثرت سے شامل ہوتے ہیں اس میلہ پر جو ہر منگل کے دن تین دروازوں پر ہوتا ہے۔ مٹی کے برتن کثرت سے فروخت ہوتے ہیں۔ اس کو قدموں کا میلہ کہتے ہیں۔

بدر الدین شاہ عالم بخاری

دل ہے اور اس میں فقط دو چار مردہ حسرتیں
گلشن شاداب کو اب خانہ ویراں دیکھئے

اس بزرگ کا مزار لاہور میں پرانی تحصیل کے پاس مزار سبز گنبد کے نام سے مشہور ہے۔ آپ سادات بخاری سے تھے شاہجہان کے زمانہ میں وفات پائی۔ نواب سعد اللہ خاں ان کے ارادتمندوں میں تھے۔ انھوں نے سبز گنبد کا مقبرہ تعمیر کرایا عمارت اس گنبد کی نہایت مستحکم چینی کا رہے پھر مقبرہ کے طویل احاطہ اور میدان کے چاروں طرف ایک عالیشان باغ نصب کرایا۔ پرانی تحصیل کے اندر جو بہت بڑا کنواں ہے وہ اسی باغ کے متعلق تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں جب راجہ سوچیت سنگھ ڈوگرہ نے قلعہ کے نزدیک اپنی حویلی بنانے کا ارادہ کیا، تو اس باغ اور مقبرہ کے سوا اس کو کوئی اور جگہ نہ ملی۔

مقبرہ پر تو نظر عنایت ہی رہی البتہ احاطہ مزار کے دوسرے مکانات اور باغ کو منہدم کرا کر ایک عالیشان حویلی تعمیر کر دی گئی۔ یہ باغ اور مقبرہ تو پھر بھی دو سو سال تک سلامت رہے بلکہ مقبرہ تو اب بھی سلامت ہے۔ لیکن وہ حویلی پچیس سال تک بھی سلامت

نذرہ سکی۔ ۱۸۴۹ء میں سرکار انگریزی نے پنجاب پر قبضہ کر لیا اور یہ حویلی بھی سرکاری قبضہ میں آگئی۔ سب سے پہلے لاہور کی تحصیل یہیں قرار پائی۔ اور سالہا سال تک تحصیلدار کی یہاں کچہری ہوتی رہی۔ جب نئی تحصیل بن گئی تو یہاں پولیس مقرر ہوئی جو اب تک چلی آتی ہے۔ اسی جگہ کئی سال تک آنریری مجسٹریٹ بھی کچہری کرتے رہے۔ باغ کے کچھ ٹوٹے پھوٹے آثار پولیس چوکی کے سامنے سربازار موجود ہیں۔ چونکہ مزار کا احاطہ بہت وسیع تھا اس لیے اب اس میں چند محلے آباد ہو گئے ہیں۔

مقبرہ کے اردگرد عمارتیں اور مکانات بن گئے ہیں ایک تنگ سی گلی سے مقبرہ کو رستہ جاتا ہے۔ آج سے پچیس تیس سال پیشتر وہاں قوالی کی چند مجلسیں راقم نے بھی دیکھی ہیں۔

حضرت سیّد محمود

گُل کو خنداں دیکھئے بُلبل کو گریاں دیکھئے
باغِ عالم میں طلسمِ رنگ امکاں دیکھئے

سید محمود کون بزرگ تھے۔ اصل وطن کہاں تھا۔ لاہور میں ان کے کیا مشاغل تھے۔ لاہور کی کوئی تاریخ ان سب باتوں کا جواب دینے میں خاموش ہے۔ البتہ اتنا پتہ چلتا ہے کہ بعہد شاہجہان ۱۰۵۰ھ (۱۶۴۰ء) میں فوت ہوئے۔ اس مقبرہ کے غربی جانب ایک باغ بھی کہ بہت کم باغات لاہور میں اس کی ٹکر کے تھے، زوال حکومت مغلیہ تک موجود تھا۔ وہ باغ انھوں نے خود احداث کرایا تھا یا ان کی وفات کے بعد ان کے مزار کے ساتھ تعمیر کیا گیا اس کے متعلق بھی سب تاریخیں خاموش ہیں۔

سہ حاکمان لاہور کے زمانہ میں جو درحقیقت نامی ڈاکوؤں کی حکومت کا عہد تھا جہاں اور اسلامی عمارات و باغات پر تباہی آئی۔ وہاں یہ باغ بھی نیست و نابود ہو گیا۔

شیخ طاہر بندگی

شیخ طاہر بندگی کے مرقدِ پُر نور کو
خطۂ میانی میں شمعِ بزمِ عرفاں دیکھئے

شیخ محمد طاہر نام تھا۔ ۹۸۴ھ (۱۵۷۶ء) میں بعہد اکبر بادشاہ پیدا ہوئے ابتدا میں شاہ اسکندر بن شاہ کمال کیتھلی کے مرید ہوئے پھر حضرت شیخ احمد کابلی سرہندی المشہور مجدد الف ثانی کے صاحبزادگان شیخ محمد معصوم و شیخ احمد سعید کے اتالیق مقرر ہوئے۔ حضرت مجدد کے ہم صحبت تھے اور بعد میں ان کے مرید بھی ہو گئے تھے۔ ایک دن حضرت مجدد نے یاران محفل سے فرمایا کہ حاضرین مجلس میں سے جو سب کے سب مسلمان ہیں ایک شخص کی پیشانی پر "ہو الکافر" لکھا ہوا ہے۔ آپ کے سب اخلاص مند مرید اپنی اپنی جگہ خوفزدہ ہو گئے اور سب نے عرض کیا کہ یا حضرت وہ کون بدنصیب ہے جو اسلام کی نعمت ترک کر کے کفر کا زنار گلے میں پہنے گا ہم سب پریشان و متفکر ہیں۔ آپ نے شیخ محمد طاہر کا نام لیا۔ اس پر سب دم بخود ہو گئے۔ کیونکہ شیخ طاہر نہایت عالم فاضل اور صاحبزادگان حضرت مجدد کے استاد تھے اور کسی کو اس بات کا یقین نہ آتا تھا کہ ایسا ہو کے رہے گا۔

ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ سرہند کی ایک ہندو عورت پر جو ہر روز مندر میں "متھا ٹیکنے" کے لیے جایا کرتی تھی آپ فریفتہ ہو گئے۔ اور جب بات چیت کا کوئی موقعہ ہاتھ نہ آیا تو بھیس بدل کر اور زنار گلے میں ڈال کر اور پیشانی پر قشقہ لگا کر مندر کے پوجاری بن بیٹھے۔

حضرت مجدد کی اس پیشین گوئی کا بڑا چرچا ہوا۔ لیکن سب اپنی اپنی جگہ حیران و پریشان تھے کہ ایسا شخص جس کے سینہ میں علم کا دریا نہیں سمندر بہ رہا ہے کس طرح راہ راست سے بھٹک گیا ہے۔ خود حضرت مجدد کو بھی کم فکر نہ تھا۔ آخر انھوں نے شیخ طاہر کے راہ ہدایت پہ آنے اور طریق دین متین اختیار کرنے کی دعا مانگی جو درگاہ الٰہی میں مقبول ہوئی اور پھر حضرت مجدد کے حلقہ بگوشوں میں شامل ہو گئے۔

حضرت مجدد نے آپ کو لاہور رہنے کا حکم دیا۔ آپ نے لاہور آ کر محلہ شیخ اسحاق میں جو فصیل لاہور کے اندر تھا رہائش اختیار کی۔ اسی محلہ کے کھنڈروں پر جمعدار خوشحال سنگھ نے قلعہ نما حویلی تیار کی جو آج راجہ شجو پورہ کے نام سے موسوم ہے۔ موتی بازار اور چونہ منڈی بھی اسی محلہ میں شامل ہے۔

آپ یوں تو پہلے ہی فاضل اجل اور عالم تبحر تھے لیکن حضرت مجدد کی توجہ خاص نے آپ کو تھوڑے ہی عرصہ میں مراتب عظمیٰ تک پہنچا دیا۔ لاہور میں آپ کے علم و فضل اور آپ کے زہد و اتقا کی شہرت گلی گلی پہنچ گئی۔ آپ بھی رات دن طالبان حق کی تلقین میں مصروف رہتے تھے۔

اُس زمانہ میں خطۂ میانی[1] کے رئیس حافظ عثمان محمد تھے۔ حافظ صاحب بہ منت آپ کو میانی صاحب میں لے آئے۔ یہاں بھی وہی رونق اور وہی علمی و دینی شغل جاری رہا۔ آپ کسی معاوضہ کے بغیر وعظ و تدریس کا کام کرتے تھے۔ اور کسی سے ایک حبہ تک نہ لیتے تھے۔ اور بقول صاحب خزینۃ الاصفیا

> وجہ معیشت آں داشت کہ کتب فقہ و حدیث بہ خط خود نوشتہ و محشی ساختہ و تصحیح نمودہ۔ می فروخت وازاں وجہ حلال قوت خود می کرد" (ص ۶۱۹)

روحانیت کے مدارج اعلیٰ پر پہنچ کر بھی حضرت مجدد سے جو آپ کی عقیدت تھی اس میں روز بروز اضافہ ہی ہو رہا تھا چنانچہ صاحب تذکرہ آدمیہ (شیخ آدم بنوری) آپ کا ایک خط نقل کرتے ہیں جو آپ نے لاہور آ کر اُن کی خدمت میں لکھا تھا اس میں وہ لکھتے ہیں کہ جب میں سرہند سے لاہور آیا تو اپنے آپ سے کہتا تھا:۔

> "اے نادان مقصود راد ر سرہند گذاشتہ کجا می روی۔ اما از غیب ندا شد کہ راہی شو و توقف مکن آخر کشاں کشاں در لاہور آورد و بگوشہ مسجدے حیران و پریشاں نشستم"

شیخ آدم مجددی نقشبندی بنوری حالانکہ خود صاحب مدارج تھے لیکن وہ بنور سے پیدل چل کر لاہور آپ کی خدمت میں آئے اور نسبت قادریہ میں فیض کامل آپ سے حاصل کر کے واپس گئے۔

---

[1] تحقیقات چشتی میں (ص ۱۶۷ پر) لکھا ہے کہ بزمانہ اکبر بادشاہ یہاں ایک گاؤں آباد تھا جس میں عام طور پر علماء یعنی عالم لوگ ہی رہتے تھے اور چونکہ پنجابی زبان میں علماء کو ملوانا یا میاں کہتے ہیں اس لیے اس محلہ یا گاؤں کا نام میانی صاحب مشہور ہو گیا۔

حافظ جان محمد کے بعد ان کے فرزند ابو محمد قادری رئیس میانی قرار پائے لیکن ایک شرعی مسئلہ نے علماء میں ایسا تفرقہ عظیم پیدا کیا کہ بہت سے لوگ فتنہ و فساد کے خوف سے یہاں سے چلے گئے۔ اور میانی میں وہ رونق نہ رہی۔ اس اثناء میں کھڈ سے میر علی نام ایک بزرگ یہاں آئے۔ انھوں نے ابو محمد قادری کے ساتھ جو شیخ طاہر بندگی کے مریدوں میں سے تھے۔ میانی کے حصے بخرے کر لیے۔ اور میانی کو از سر نو آباد کیا۔ میر علی نے کھڈ سے اپنے پانچ بزرگوں کی قبریں کھدوا کر اور ان کی نعشوں کے صندوق نکلوا کر یہاں منگوا لیے۔ اور ان کو از سر نو نئی قبروں میں دفن کرایا۔ اس زمانہ سے میانی کا نام پنج ڈھیرا قرار پایا لیکن یہ نام زیادہ شہرت حاصل نہ کر سکا۔

اسی میانی میں آپ [illegible]ھ میں بعمر ۹۶ سال ۸ محرم کو جمعرات کے دن وفات پا گئے۔ آپ کا مزار میانی صاحب کے طویل و عریض شہر خاموشاں (قبرستان) کے لیے باعث برکات ہے۔ اور آپ کے احاطہ مزار بلکہ آپ کے قرب و جوار میں دفن ہونا باعث برکت و نجات سمجھا جاتا ہے۔

ہمیں ہیں کی جنھوں نے روشنی گور غریباں ہیں
وگرنہ مٹ کے ویرانہ کو کون آباد کرتا ہے

آپ کا مزار سب سے پہلے شیخ ابو محمد یہاں کے رئیس اور آپ کے مرید (وفات ۱۰۸۰ھ) نے تعمیر کرایا۔ آج سے قریباً ۱۴۱ سال پیشتر شاہزادہ غلام محمد ایوب شاہی نے چبوترہ بنوایا اور سمت ۱۸۹۹ بکرمی میں فقیر فضل دین ملازم راجہ دھیان سنگھ نے چار دیواری بنوا دی۔ آپ کی چار دیواری کے اندر اور باہر بہت سی قبریں ہیں وہ خطہ میانی جو علماء و صلحا کا مسکن تھا۔ رفتہ رفتہ قبرستان بن گیا۔ اب وہاں صاحب حیات تو کوئی عالم نہیں ہے۔ البتہ یہ خطہ صدہا بلکہ ہزارہا علماء و صلحا کا مدفن ہے۔

آپ کے احاطہ مزار کے پاس مشہور قبروں میں میاں پیارا شاعر کی قبر بھی ہے جو لاہور میں پنجابی زبان کا مشہور شاعر تھا۔ اس کے قریب ایک اور چار دیواری میں موراں طوائف معشوقہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی قبر ہے۔ یہ وہ ہی موراں ہے جس کے نام کا لاہور میں سکہ چلتا رہا ہے۔

آپ کی دو بیبیاں تھیں لیکن اولاد کسی سے نہیں ہوئی۔ دونوں کی قبریں موجود ہیں۔ البتہ آپ کی معنوی اولاد میں ہزارہا لوگ ہیں جن میں پانچ بڑے نامور خلیفہ گذرے ہیں جن کے ارادتمندوں کا سلسلہ آج تک جاری ہے ان بزرگوں میں سب سے پہلے ابو محمد قادری لاہوری کا نام آتا ہے جن کا مزار آپ کی چار دیواری کے گوشہ جنوبی میں ایک پختہ چبوترہ پر ہے۔ دوسرے سید موتی (مزار دہلی) تیسرے حضرت آدم بنوری جو حضرت مجدد کے علاوہ آپ سے بھی فیض یافتہ ہیں (مزار مدینہ) چوتھے شیخ لکھن مست یا کھلن مست جن کی قبر موری دروازہ کے باہر میونسپل باغ کے اندر ہے۔ یہ قبر نواب غلام محبوب سبحانی رئیس لاہور نے تیار کرائی تھی۔ پانچویں شیخ ابو القاسم (مدفن جدہ)

نواب علی مردان خاں

باغ کے غم میں ہے بڈھی باغ کی نوحہ کناں　　اور اب کیا رنگ لائے چرخ گرداں دیکھیے
فاعتبروا یا اولی الابصار کو پڑھتے ہوئے　　قبر نواب علی مردان خاں ہاں دیکھیے

ایران کا ایک امیرزادہ گنج علی خاں ۱۰۳۲ھ/۱۶۲۲ء میں شاہ ایران کی طرف سے قندھار کا ناظم تھا۔ بادشاہ اس کا بڑا ادب کرتا تھا۔

ور اسی کو بابا کہا کرتا تھا اس کے انتقال پر اس نے اس کے بیٹے علی مردان خاں کو ناظم قندھار مقرر کر کے "بابائے ثانی" کا خطاب دیا۔
لیکن ہر شخص کا کوئی نہ کوئی دشمن ضرور ہوتا ہے۔ گو بادشاہ مہربان تھا لیکن امرائے دربار میں علی مردان خان کے نامہربانوں کی کمی نہ تھی
چنانچہ رفتہ رفتہ امرائے حاسد نے بادشاہ کو اس سے بدظن کر دیا اور کہا کہ وہ تو خود سری اور سرکشی پر آمادہ ہے۔ بادشاہ نے امتحان
کے لیے اس کو لکھا کہ اپنا بیٹا ہمارے پاس بھیج دو۔ علی مردان کی نیت صاف تھی اس نے اپنے سترہ سالہ فرزند محمد علی خاں کو بادشاہ
کی خدمت میں بھیج دیا لیکن بادشاہ کی بدگمانی علی مردان خاں کے دشمنوں نے پھر بھی کم نہ ہونے دی بلکہ ایسا برافروختہ کیا کہ شاہ طہماسپ
صفوی نے اس کے قتل کا حکم دے دیا۔

یہ دیکھ کر علی مردان خاں نے سعید خاں سے ساز باز کی جو شاہجہان کی طرف سے کابل کا گورنر تھا۔ سعید خاں نے شاہجہان
کو لکھا وہ اپنے باپ کے زمانہ میں قندھار کے ہاتھ سے چلے جانے اور واپس لانے کے لیے بے قرار رہتا تھا۔ اس نے علی مردان
کو خلعت ارسال کیا اور دو لاکھ روپے اس کے لیے اور ایک لاکھ روپیہ اس کے عزیزوں اور خادموں کے لیے ارسال کیا چنانچہ
علی مردان خاں نے ۲۷ شوال ۱۰۴۷ھ/۱۶۳۷ء کو قندھار میں شاہجہان کے نام کے سکے مسکوک کرائے اس کے نام کا خطبہ پڑھوا دیا۔ اور
قندھار شاہجہانی امرا کے حوالہ کر کے آپ ۱۰ رجب ۱۰۴۸ھ/۱۶۳۸ء کو لاہور پہنچ گیا جہاں بادشاہ اس وقت مقیم تھا۔

[مذکورہ بالا انعامات کے علاوہ قندھار سے چل کر لاہور آنے کا تمام خرچ شاہی خزانے سے ادا ہوا۔ اس خرچ کا
اندازہ ایک لاکھ روپیہ بتایا جاتا ہے اور بیس ہزار روپے کا انعام اس کے نوکروں میں تقسیم کیا گیا۔ ان میں حسین بیگ اور علی بیگ جو
علی مردان خاں کے قریبی رشتہ دار تھے، نقد انعام کے علاوہ خلعت فاخرہ و خنجر مرصع اور جلیل القدر عہدے بھی تفویض ہوئے۔[1]
اسی سال بروز یک شنبہ بتاریخ دوم رجب شاہجہان کا دربار لاہور میں منعقد ہوا۔ علی مردان خاں نے اس تقریب پر اہل ایران کے
طور و طریق کے مطابق جشن چراغاں کا اہتمام کیا۔ اس نے صحن خاص و عام اور تمام در و بام پر مختلف شکلوں میں طاق بندی کر کے سارے
علاقے کو بقعۂ نور بنا دیا۔ بادشاہ نے جھروکۂ درشن میں بیٹھ کر خود اس کا تماشا کیا اور مبلغ دس ہزار روپیہ غربا و مساکین میں تقسیم کیا۔
اسی شب ملا عبدالحکیم اور ملا فاضل کو چار سو اشرفی انعام ملی تھی۔[2] ——— مرتب]

بادشاہ نے علی مردان خاں کو شش ہزاری شش ہزار سوار کا منصب دے کر ۲۴ رجب کو ناظم کشمیر نامزد کر کے اس کے
ایک رشتہ دار علی بیگ کو اس کی نیابت پر کشمیر روانہ کیا۔ بادشاہ نے اس موقعہ پر علی مردان خاں کو پاندان سنہری عطا کر کے کہا۔ اس
ملک کا سب سے بڑا تحفہ پان ہے اس کی عادت ڈالو۔ ۱۱ شعبان کو اسے پانچ لاکھ روپیہ اور بنگالہ کی ململ اور دوسرے ملکوں کے کپڑے
دس بقچوں میں عنایت کیے۔ ۱۰۴۹ھ/۱۶۳۹ء میں اس کو امیر الامرا بنا کر اور ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار کا منصب دے کر پنجاب کی صوبیداری
عنایت کی۔ پھر ۱۰۵۶ھ/۱۶۴۶ء میں شاہ ایران کو تہنیت و تعزیت کا خط لکھ کر اور دو لاکھ روپے کے تحائف دے کر اس کے بیٹے محمد علی خاں
کو بھی ہندوستان میں منگوا لیا۔

---

[1] عمل صالح قلمی نسخہ ورق ۴۴۶ – ۴۴۷

[2] عمل صالح قلمی نسخہ ورق ۴۵۳

مآثر الامرا جلد دوم میں لکھا ہے :۔

"علی مردان خاں در صوبہ داری لاہور فقرائے تارک صلوٰۃ وصوم را کہ خود را بے قید نامند و مرتکب اقسام فسق و فجور مے شوند مقید نمودہ بہ کابل فرستاد"

اس کی حکومت کے ایام میں کوئی مشٹنڈا فقیر اور ملنگ درویش بے نماز نظر نہ آتا تھا۔ ایک مرتبہ اُس نے بادشاہ کی دعوت کی جس میں ایک سو خوان معہ طلائی سرپوش اور تین سو نقرئی تھے۔ اس کے چار بیٹے تھے۔ ایک ابراہیم خاں جس کے نام پر سودھرہ کا نام ابراہیم آباد رکھا گیا۔ دوسرے عبداللہ بیگ جس کو بعہد عالمگیر گنج علی خاں کا خطاب ملا۔ تیسرے اور چوتھے اسحٰق بیگ و اسمٰعیل بیگ جو دارا شکوہ کی ایک جنگ میں مارے گئے۔ ابراہیم خاں بزمانہ عالمگیر کشمیر اور لاہور کا گورنر بھی رہا ہے۔ ابراہیم خاں کے دو بیٹے تھے ایک زبردست خاں جو اودھ اور اجمیر میں گورنر رہا۔ دوسرا یعقوب خاں جو عالمگیر کے عہد میں آصف الدولہ صوبہ لاہور کا نائب تھا اور جس کو باپ کی وفات کے بعد ابراہیم خان کا خطاب ملا۔

۱۰۵۶ھ/۱۶۴۶ء میں جب شاہزادہ اورنگ زیب کو بلخ و بدخشاں کی مہم سپرد ہوئی۔ تو علی مردان کو بھی اس کے ساتھ ہی بھیجا گیا۔ ان لڑائیوں میں علی مردان خاں نے ازبکوں کے ساتھ اس جلادت و شجاعت سے جنگ کی کہ شاہزادہ نے اس کو مرحبا اور آفریں کہہ کر گلے سے لگا لیا۔

شاہجہان کے جلوس کی ۳۱ ویں ۱۰۶۷ھ/۱۶۵۷ء میں امیرالامرا نواب علی مردان خاں بمرض اسہال بیمار ہوا۔ چونکہ کشمیر کی آب و ہوا اس کی طبیعت کے موافق تھی اس لیے بادشاہ سے رخصت لے کر وہ کشمیر چلا گیا۔ لیکن رستہ ہی میں ۱۲ رجب ۱۰۶۷ھ مطابق اپریل ۱۶۵۷ء کو انتقال کر گیا اور اس کی نعش لاہور میں اس کی ماں کی قبر کے پہلو میں جو امیرالامرا کے باغ میں واقع تھی دفن کی گئی۔ ایک شاعر نے اس کی تاریخ وفات اس طرح کہی ہے ؎

امیر صاحب دولت مشیر صاحب حشمت — ثنا گوئے علی و مرد حق آگاہ مردان خاں
سفر چوں کرد زیں دنیائے دوں سوئے بقا آخر — ندا آمد بتاریخش کہ حق آگاہ مردان خاں

۱۰۶۷ھ

بادشاہ کو اس کے مرنے سے کمال ملال ہوا اُس نے اس کی اولاد اور اُس کے نوکروں اور خویشوں کو ان کی لیاقت کے مطابق عہدے دیئے۔ اس کا کُل اثاثہ ایک کروڑ روپیہ نکلا جس میں سے بادشاہ نے تیس لاکھ اُس کے بیٹے ابراہیم علی خاں کو بیس لاکھ، اُس کے دوسرے تین بیٹوں میں تقسیم کر کے باقی پچاس لاکھ روپیہ ضبط سرکار کر لیا۔

نواب علی مردان خاں ایک زبردست انجینئر تھا۔ اسے باغات و عمارات کا بڑا شوق تھا۔ اس نے کابل و کشمیر میں انہار جاری کرائیں باغات بنوائے۔ دہلی کی نہر جو شہر اور قلعہ کے درمیان پھرتی ہے اسی کی یادگار ہے۔ نہر فیروز پور جو دہلی سے حصار کو جاتی ہے۔ اس کی درستی اسی کے ہاتھوں ہوئی۔ مادھو پور کے قریب جو نہر راوی سے نکل کر شالامار باغ کو سیراب کرتی ہے اسی کے ماتحت جاری ہوئی کشمیر میں باغ علی مردان خاں کے کھنڈر بڑشاہی تعمیرات کے کھنڈروں پر دچارناگ میں اب بھی نظر آ رہے ہیں۔ پشاور اور کابل اور نملہ میں بھی (کابل سے اسی میل جنوب مشرق کی طرف) باغات و عمارات کی صورت میں اس کی

یادگاریں موجود ہیں۔

ان حالات کو پڑھ کر اندازہ لگاؤ کہ لاہور میں جہاں اس کا اکثر قیام رہتا تھا بلکہ شاہجہان اس کی عالیشان حویلی میں خود رہا کرتا تھا۔ اس نے جو باغ بنایا وہ کس شان اور کس شوق سے بنایا ہوگا۔ آج اس باغ کا صرف ایک ڈیوڑھی کے سوا کہیں نام بھی نہیں ہے۔ مؤرخوں کا بیان ہے کہ اس ڈیوڑھی کے شمال رو بہ ایک اور ڈیوڑھی تھی۔ ایک قد آدم حوض اس باغ کے اندر ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء تک (آج سے ۹۰ سال قبل) موجود تھا مگر گردش ایام نے اس کو بھی میاں محمد سلطان کی معرفت مسمار کرا دیا۔ آہ ع

حرف سیاہیٹ شیئے نام و نشاں کے تو نے

ڈیوڑھی کے درمیان باہر کی طرف ایک بہت بڑا محراب ہے جس پر نہ جو رنگی رنگینی اور سبز و سفید رنگ کا کاشی کار کام ہے۔ اس محراب کے اندر ایک اور محرابی دروازہ ہے جس کو گوردت سنگھ کرنیل پیٹن مصراں نے بعہد مہاراجہ رنجیت سنگھ ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۲ء میں بند کرا کے اپنا مسکن بنا لیا تھا۔ ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء تک اس ڈیوڑھی کی نچلی منزل میں کچھ لوگ بے کرایہ رہتے تھے۔ اوپر کی منزل خالی تھی لیکن معلوم ہوتا ہے اس کے کچھ عرصہ بعد محکمہ نزول نے نچلی منزل بھی خالی کرا لی تھی۔ اس لیے کہ رائے کنہیا لال نے اپنی تاریخ لاہور میں جو ۱۲۸۰ھ کے بیس سال بعد لکھی گئی ہے ان منزلوں کے بالکل خالی ہونے کا ذکر کیا ہے اور اب تک کہ ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء ہے خالی پڑی ہیں۔

ڈیوڑھی کے اوپر کئی دالان۔ کئی کمرے۔ کئی کوٹھڑیاں اور کئی کھڑکیاں ہیں۔ سقف قالبوتی۔ استرکاری اور منقش۔ فرش اور زینے پختہ۔ یہ بیرونی ڈیوڑھی کا حال تھا۔ اندر کی ڈیوڑھی جس کا اب نشان تک بھی نہیں خدا جانے اپنے اندر کیا کچھ صنعتی خوبیاں رکھتی تھی۔ باغ کے فوارے۔ حوض اس کی اندرونی عمارتیں یہاں تک کہ اس کی چار دیواری آج سب بے نام و نشان ہیں۔ ریلوے حکام نے اچھا کیا کہ مسلمانوں کی گذشتہ عظمت و شوکت کی اس ٹوٹی پھوٹی علامت کو بھی جنرل سٹور کی بلند و بالا دیواروں کے اندر چھپا دیا کہ مسلمان کیا کوئی بھی اس کو نہ دیکھ سکے ؎

چشم ما دیدہ کند ہمہ از دست تماشا ہنر شد

تا نہ تمیز کہ کند عیب جہت ندا رسیدے ما

اب آیئے اس کے مقبرہ کی عالیشان مگر مٹی ہوئی عمارت کی طرف۔ جو باغ ہی کے اندر ڈیوڑھی سے جنوب کی طرف چند قدم کے فاصلہ پر بصورت ہشت پہلو واقع ہے۔ اس کے چاروں طرف بڑے بڑے بلند آٹھ محرابی در تھے۔ جن میں گلاب سنگھ بھوونڈیہ نے بیگم پورہ کی طرح میگزین رکھ کر سات در بالکل بند کر دیئے تھے اور صرف ایک در کھلا رہنے دیا تھا۔ محرابوں کے اندر اور باہر جو گلکاریاں تھیں انھوں نے از رنگ چونے کے نیچے مستور کر رکھا تھا۔

مقبرہ کے گرد چاروں طرف چونہ گچ پختہ ایک چبوترہ بنا ہوا ہے جو سطح زمین سے تین چار فٹ بلند ہے۔ ۱۹۲۳ء میں راقم نے دیکھا کہ یہ چبوترہ بوسیدہ ہو کر مسمار ہو رہا تھا۔ ہر چند لاہور کی قدیم عمارات کی صنعت اور نقش و نگار کا انحطاط اور آخری آرام گاہوں یعنی مقبروں کی عبرتناک کیفیت بھی ان عمارتوں کو خراب اور برباد کرنے والے سنگدلوں پر کوئی اثر نہ ڈال سکی تاہم اس مقبرہ کی دیواروں پر نقش اور بچی کھچی عمارات کی طرح سنگ سرخ اور سنگ ابری کے قیمتی پتھر نظر آ رہے ہیں۔

گنبد کے نیچے تہ خانہ ہے اور اس میں تین قبریں ہیں۔ ایک قبر پختہ ہے دو قبریں خام ہیں ایک نواب علی مردان کی اور

ایک اس کی والدہ کی ہے۔ تیسری قبر اُس کے کسی فرزند یا خویش کی ہوگی سنہ ۱۸۸ء میں سرکار انگریزی کے حکم سے رائے کنہیا لال نے اس مقبرہ کی مرمت کرائی۔ سیڑھیاں درست کرا کر تہ خانہ صاف کرایا گیا لیکن سنہ ۱۹ء میں قبروں کی اینٹیں بکھری ہوئی پڑی تھیں۔ تہ خانہ نا صاف تھا۔ تہ خانہ تک جانے کے لیے جو سیڑھیاں تھیں وہ شکستہ حالت میں تھیں۔ تہ خانہ دراصل اس گنبد کی منزل اول ہے اور کافی وسیع ہے۔ سقف اس کا قالبوتی اور فرش پختہ ہے۔ اکثر محرابوں میں گلکاری سنہ ۱۹ء تک صاف نظر آتی تھی۔ تہ خانہ میں روشندانوں کی وجہ سے کافی روشنی آتی ہے۔ اس مقبرہ کی دوسری منزل وہ ہے جو چار فٹ بلند چبوترہ کی سطح کے برابر ہے اور جس پر قبر کا تعویذ ہے اسی کے نیچے تہ خانہ ہے جو ایک روشندان سے صاف نظر آتا ہے۔ اس منزل کے متعلقہ مکانات کو گرا کر گلاب سنگھ بھونڈیہ نے چھاؤنی کی تعمیر کی تھی۔

تیسری منزل یعنی گنبد تک پہنچنے کے لیے دو راستے ہیں۔ دونوں راستوں کے زینے تہ خانہ کے زینوں کی طرح اس ردی حالت میں تھے کہ بڑی مشکل سے ان کو طے کرکے راقم ایک مرتبہ سنہ ۱۹ء میں وہاں تک پہنچا تھا۔ چھت گنبد کی پختہ چونہ گچ ہے مگر لمبی لمبی خودرو گھاس نے اس کو اپنے نیچے دبا رکھا تھا۔ اس چھت سے جب سطح زمین کی طرف ذرا جھک کر دیکھیں تو خوف سا معلوم ہوتا ہے۔ ہر منزل پر چھوٹے چھوٹے خوش وضع گنبد روشنی کے لیے موجود ہیں لیکن بالکل شکستہ حالت میں ہیں۔ ان قبروں کے تعویذ سنگ مرمر کے تھے فرش پر سنگ سرخ اور سنگ ابری کی بڑی بڑی سلیں نصب تھیں، وہ سب سنگین دلوں نے اتار لیں۔

انگریزی عملداری کی ابتدا میں زمیندار لوگ اس زمین پر جو باغ اور عمارات سے گھری ہوئی تھی اور سکھوں کے عہد میں اجاڑ اور بنجر ہو گئی تھی کاشت اور زراعت کرنے لگے۔ مقبرہ کے اندر وہ بھوسہ، چارہ اور لکڑیاں رکھا کرتے۔ اور کوئی نہ کوئی ٹوٹی پھوٹی چارپائی بھی وہاں موجود رہتی۔ راقم نے یہ کیفیت اپنی آنکھوں سے وہاں سنہ ۱۹ء میں دیکھی ہے۔ اس مقبرہ کی شان و عظمت اس کے نقش و نگار اور اس کی صنعت کاری اور عمارت کی پختگی ہی سے ظاہر نہیں ہوتی۔ بلکہ بقول رائے کنہیا لال و مولوی نور احمد چشتی کسی بڑے سے بڑے مقبرہ کا بھی گنبد اتنا بلند و بالا نہیں ہے۔

علی مردان خاں کے باغ کی ڈیوڑھی اور اس کے مقبرہ کا گنبد چونکہ ساتھ ہی ساتھ ہیں اس لیے حکام ریلوے نے ڈیوڑھی کی طرح گنبد کو بھی ریلوے جنرل سٹور کی حدود میں شامل کرکے اس کے گرد قد آدم سے بھی اونچی دیوار کھڑی کر دی ہے ؎

یادگارِ ہستیٔ ناپید تھا دنیا میں تو ۔۔۔ تجھ میں مل جاتا تھا لوگوں کو نشانِ آرزو
اک جہانِ آرزو تھا دیدۂ بینا میں تو ۔۔۔ تجھ میں تھا سویا ہوا اک کاروانِ آرزو

شالامار باغ

یادگار شاہجہاں لاہور میں ہے شالامار
جس کا ہر تختہ گلستاں در گلستاں دیکھئے

شالامار باغ کے متعلق راقم نے سب سے پہلے ایک چھوٹا سا پمفلٹ فروری سنہ ۱۹ء میں لکھا جو ۱۹۲۴ء تک بہت سے اضافہ اور مزید مضامین کے ساتھ کئی بار چھپا۔ ۱۹۲۴ء کے آخری اڈیشن میں اس کا حجم ۹۶ صفحہ تک تھا۔ اس جگہ بھی شالامار باغ کے متعلق

کچھ لکھا جاتا ہے اس لیے کہ باغات لاہور کا ذکر شالامار باغ کے تذکرہ کے بغیر ہمیشہ نامکمل رہے گا۔

لفظ شالامار کی وجہ تسمیہ کے متعلق چونکہ زمانہ شاہجہان کے مؤرخ عبدالحمید لاہوری نے کوئی ذکر نہیں کیا۔ اس لیے بعد کے تمام مصنفین قیاس آرائیوں سے کام لے کر کبھی تو لکھتے ہیں اصل نام شعلہ ماہ ہے اس لیے کہ نادر شاہی مورخوں نے اس کا یہی نام لکھا ہے کبھی لکھتے ہیں کہ چونکہ شالامار باغ کشمیر کی تقلید میں یہ باغ احداث ہوا تھا اس لیے اس تقلید کے سوا اصل وجہ کوئی اور نہیں ہے۔ اب شالامار باغ کشمیر کی وجہ تسمیہ میں کہا جاتا ہے کہ اگنی پوران میں ایک پھول کا نام شالی مالی ہے جو دیوتاؤں کو چڑھایا جاتا ہے چونکہ یہ پھول اس علاقہ میں کثرت سے ہوتا تھا اس لیے اس کا نام شالی مالی ہی مشہور ہو گیا۔ اس زمانہ میں کشمیر پر راجہ پر دسین (سنہ ۱۶۲ء) کی حکومت تھی اور اس نے اور اس کے امراء نے بھی وہاں اپنے محلات تعمیر کرا لیے تھے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر اس باغ کا نام سنہ ۱۶۲ء میں شالی مالی تھا اور یہ کشمیر کے مشہور باغوں میں تھا تو پنڈت کلہن نے راج ترنگنی میں جو آج سے قریباً نو سو سال قبل کی تصنیف ہے اس کا نام کیوں نہ لکھا۔ سب سے پہلے شالی مار کا نام ابوالفضل نے لکھا ہے۔ چنانچہ اکبر کے زمانے میں سنہ ۹۹۷ھ سے سنہ ۱۰۱۱ھ تک ہم شالی مالی یا شالی مار کے نام سے اکبر کا احداث کیا ہوا ایک باغ دیکھتے ہیں جہانگیر کے عہد میں بھی اس کا نام شالی مار ہی تھا۔ چنانچہ جہانگیر کا درباری شاعر مرزا محمد سلیم لکھتا ہے ؎

شنیدم شاہ روشن دل جہانگیر	زعشرت شد چو رونق بخش کشمیر
چو شد داماں دریا جلوہ گاہش	بسوئے شالی مار افتاد راہش

شاہجہان کے زمانہ میں شالیمار کا نام شالامار ہو چکا تھا چنانچہ عہد شاہجہان کا گورنر کشمیر ظفر خاں احسن جو دو دفعہ کشمیر کا گورنر رہا ہے اپنی مثنوی میں لکھتا ہے ؎

بوصف شالامار آں خلد ثانی
ملک ہر گوشہ در گوہر فشانی

بعض نے شالامار کو ترکی زبان کا لفظ بتایا ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں شالامار باغ کی جگہ اس کا نام شہلا باغ مشہور ہو گیا اور آج تک وہی نام زبانوں پر جاری ہے بہرحال یہ باغ جو پنجاب میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ کشمیر ہی کے شالامار باغ کے نمونہ پر تیار کیا گیا تھا۔ یہ باغ شاہجہان نے نواب علی مردان خاں کی زیر نگرانی سنہ ۱۰۴۲ھ میں تیار کئے جانے کا حکم دیا جیسا کہ ذیل کے قطعہ تاریخ سے معلوم ہو گا ؎

چوں شاہجہاں پادشاہ حامئے دیں	آراستہ شالامار با طرز متیں
تاریخ بنائے ایں ز رضوان جستم	گفتا کہ بگو "نمونۂ خلد بریں"

ان چار مصرعوں پر بادشاہ نے شاعر کو خلعت فاخرہ کے علاوہ دس ہزار روپیہ نقد دیا۔ اس باغ کی تعمیر پر چھ لاکھ اور اس کی شاہ نہر

؎ شالامار باغ اور جھیل ہارون کے درمیان ہارون کو جاتے ہوئے دائیں ہاتھ کی بلند پہاڑی پر زمانہ قدیم کے محلات محکمہ آثار قدیمہ نے برآمد کئے ہیں اور راقم ان کو دیکھ چکا ہے۔

پر دو لاکھ کل آٹھ لاکھ روپیہ ایک سال چار ماہ اور پانچ یوم میں صرف ہوا۔

شاہجہان باغ اور اس کی عالیشان عمارات اور اس کے فواروں اس کی آبشار اور اس کے ساون بھادوں اور تالاب اور روشوں کی تیاری کے بعد سب سے پہلے ۲۰ شعبان ۱۰۵۲ھ (۱۶۴۲ء) کو اس باغ میں داخل ہوا۔

بادشاہ جب کبھی لاہور آتا اور اس کے حرم ساتھ ہوتے تو باغ میں کثرت عمارات کی وجہ سے خیموں کی ضرورت پیش نہ آتی تھی۔ اس باغ کے سات تختے یا طبقے تھے اور ہر طبقہ کا علیحدہ علیحدہ نام تھا مثلاً مہتابی باغ۔ گلابی باغ۔ انگوری باغ۔ عنایت باغ۔ اب یہ چار طبقے ناپید ہیں۔ مندرجہ ذیل تین طبقے موجود ہیں۔ باغ فیض بخش۔ باغ حیات بخش۔ باغ فرح بخش۔ اب انہی طبقوں کا نام شہلا باغ ہے اور انہی کے اندر۔ ساون بھادوں۔ آبشار کلاں۔ فوارے۔ بارہ دری کلاں (جس کے نیچے آبشار کلاں ہے) تخت سنگ مرمر۔ سردخانہ۔ حوض سنگ یشب۔ شاہی حمام۔ خواص پورہ۔ خواب گاہ۔ نگار خانہ یا نگاہ خانہ وغیرہ ہیں۔

عہد محمد شاہی کا ایک شاعر (میر عبدالعزیز زنجانی لاہوری) اپنے ایک طویل قصیدہ میں باغ شالامار کے متعلق لکھتا ہے ؎

ارم را گر ندیدی شالہ مار شاہ را بنگر ۔۔۔ کہ یک یک چمن صد صد چو رضوان باغبان بینی

سحر ہر روز پر گلہائے الوان سنگری زاں ساں ۔۔۔ کہ وقت شام پر شب پُر زانجم آسماں بینی

اس وقت جن طبقوں کا نام شہلا باغ ہے ان کی لمبائی مجموعی طور پر اڑھائی صد گز اور چوڑائی ۲۴۰ گز ہے۔ باغ کے ہر سہ جانب بارہ دریاں ہیں اور بیچ میں ایک چبوترہ ہے جس پر سے لوگ ایک پُل پر سے ہو کر گذرتے ہیں۔ مغلیہ باغات میں آبپاشی کا بہت خیال رکھا جاتا تھا اسی لیے جو روشیں یا سڑکیں باغ میں بنائی جاتی تھیں وہ پھولوں کی کیاریوں کی سطح سے اونچی ہوتی تھیں اور باغ میں جو مربع قطعات زمین ہوتے تھے وہ دو تین فٹ اور نشیب میں ہوتے تھے اور ان میں اونچے اونچے اور بڑے میوہ دار درخت لگائے جاتے تھے۔

شالامار باغ کے بالائی طبقہ کی نہر بیس فٹ چوڑی ہے اور ہر طبقہ کی نہر میں چھوٹے چھوٹے فوارے جاری ہیں۔ اس باغ میں جو آبشار کلاں ہے وہ قلعہ دہلی کی آبشار کے نمونہ پر بنائی گئی ہے۔ سنہ ۱۸۲۰ء کا ایک انگریز سیاح (بزمانہ مہاراجہ رنجیت سنگھ) اپنے سفرنامہ میں اس باغ کے منظر ساون بھادوں کے متعلق لکھتا ہے:۔

> "اس مکان کے فرش میں ہزارہا سوراخ ہیں جن سے پانی جاری رہتا تھا۔ دیواروں میں شمع رکھنے کے لیے طاق بنوائے گئے ہیں اور چھت کے اوپر پانی کی چادر گرتی تھی بڑی نہر کے اخیر پر بارہ دری کلاں ہے جس کے نیچے سے ہو کر پانی آبشار کی صورت میں تالاب کلاں میں جاتا ہے جس میں ۱۴۴ فوارے پدم کے پھول کی طرح تھے۔ آبشار کے پاس دو فٹ اونچا سنگ مرمر کا جو تخت ہے اسی پر بیٹھ کر بادشاہ باغ اور فواروں کے لطف اندوز نظارہ سے محظوظ ہوا کرتا تھا۔"

بارہ دری کلاں کو آج جس پلستر میں ملبوس دیکھتے ہو وہ شاہان مغل کے زمانہ میں ایک یادگار عمارت تھی۔ رائے بہادر کنہیا لعل تاریخ لاہور ص ۲۵۵ میں لکھتے ہیں "رنجیت سنگھ نے بارہ دری کلاں سے جو بالائے آبشار ہے سنگ مرمر کی سلیں اور پتھر جالیوں سمیت

اتروا کر دربار صاحب امرتسر میں بھجوا دیا۔ بعد میں سفیدی سے درستی کرا دی۔ باغ کے اندر جو عمارتیں تھیں اور جہاں جہاں سنگ مرمر تھا کچھ سکھ حاکمان لاہور نے جو رنجیت سنگھ سے پہلے سہ حاکمان لاہور کے نام سے لاہور کے حکمران تھے۔ اتروا لیا اور رہا سہا رنجیت سنگھ نے ختم کر دیا۔ تخت سنگ مرمر کے اکھاڑنے جانے کی بھی بہت کوشش کی گئی۔ لیکن جب اس کا ثابت اکھڑنا اور پھر قائم ہونا مشکل نظر آیا تو رنجیت سنگھ نے ارادہ ترک کر دیا چنانچہ تخت کی وہ ٹوٹی ہوئی جگہ جس کو بعد میں لوہے کے شکنجہ سے جکڑ دیا گیا ہے اب تک موجود ہے۔

شاہجہان کے بعد عالمگیر بھی اس باغ میں چند مرتبہ آیا ہے۔ دارا شکوہ تو اکثر آیا کرتا۔ زیب النساء بیگم تو دنوں نہیں مہینوں تک اس باغ کی پُرکیف بہار سے بہرہ اندوز ہوتی رہی ہے۔ عالمگیر کے بعد بہادر شاہ عالم اول اپنی شاہزادگی کے زمانہ میں بھی اور پھر حصول سلطنت کے بعد بھی باغ میں آتا رہا ہے اس کی وفات بھی (۱۷۱۲ء میں) لاہور ہی میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد کسی مغل بادشاہ کو شالامار باغ دیکھنا اور لاہور تک آنا نصیب نہیں ہو سکا۔

نادر شاہ نے جب لاہور اور اس کے بعد دہلی پر حملہ کیا ہے تو اسی باغ میں قیام کیا اور یہیں ناظم لاہور نواب زکریا خاں نے نادر شاہ سے معذرت خواہ ہو کر اور نذر دے کر صلح کر لی تھی نادر شاہ نے یہ دربار بارہ دری کلاں میں کیا تھا۔ پھر نواب معین الملک عرف میر منو کے زمانہ میں احمد شاہ ابدالی اپنے حملوں میں اسی باغ میں دربار اور جشن کیا کرتا۔

رنجیت سنگھ نے بھی اپنے پوتے شہزادہ نونہال سنگھ کی شادی (اوائل مارچ ۱۸۳۷ء) کی تقریب پر بہت بڑا جشن جو کئی دن تک جاری رہا اسی باغ میں کیا۔ اس جشن میں برطانوی کمانڈر انچیف اور کئی انگریزوں کے علاوہ پنجاب اور کوہستان کے سب راجے بھی شامل تھے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ اور اس کے پیش رو سکھ سہ حاکمان لاہور نے اس باغ کے قیمتی پتھروں کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس کا ذکر تاریخوں میں موجود ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ رنجیت سنگھ نے اس کی بند شدہ نہر کو از سرِ نو جاری کرایا۔ وہ جب کبھی امرتسر کے درشنوں کو جاتا اور بالعموم جاتا ہی رہتا تو اس کی پہلی منزل شالامار باغ میں ہوا کرتی۔ چنانچہ ۱۲۲۱ھ / ۱۸۰۶ء میں اس نے باغ کی بند شدہ نہر کو دوبارہ جاری کرنے کا حکم دیا اور نہر کھودنے والوں کو انعام و اکرام دیے۔ صاحب عمدۃ التواریخ دفتر دوم کے ص ۶۴ میں مہاراجہ کے امرتسر سے واپس آنے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

”و من بعد رونق بخش باغ شعلہ ماہ المشہور شالامار و شالا باغ شدند۔ شاہ نہر بہ اہتمام ہنسلی
کہ پیش از تشریف سرکار دولتمدار در تالاب شالا باغ افتادہ بود از معائنہ آں بسیار
منفرح و منشرح گردیدہ یک راس اسپ و جوڑے کڑہ طلائی بہ نہر کناں مرحمت و عنایت
فرمودہ در دار السلطنت لاہور رونق افروز شدند“

اس نہر کے دوبارہ جاری ہونے سے جو قریباً نصف صدی سے خراب و خستہ ہو کر بند پڑی تھی۔ شالامار باغ میں نئے سرے رونق اور آبادی ہو گئی چنانچہ اس رونق و زینت کا ذکر مصنف عمدۃ التواریخ پھر صفحہ ۶۹ پر یوں الفاظ کرتا ہے:۔

”سرکار فیض آثار از امرتسر بہ سواری فیل کوہ تمثیل در شالہ باغ رونق بخش شدند

"...... شالا باغ بہ نازگی صورت آرائش و پیرائش یافتہ و نشاہ نہر یعنی نہر سلسلی بہ کمال لطافت و نزاکت جاری بساری و تمام حیاض و خیابان و آبشار ہائے در ساون بھادوں در جمیع اوقات مملو از آب سے باشد۔ و نظارگیاں را از مشاہدۂ آں انواع انواع راحت و اقسام اقسام مسرت شامل اوقات فرخندہ آیات سے گردد"

۱۸۲۰ء میں جب ولیم مور کرافٹ ایک انگریز سیاح لاہور آیا تو مہاراجہ نے اس کو شالا باغ ہی میں ٹھہرایا مور کرافٹ نے اپنے سفرنامہ (مطبوعہ ۱۸۳۶ء) میں اس باغ کا اور اس میں اپنی اقامت چند روزہ کا ذکر کیا ہے پہلے ہی تختہ میں کنوئیں کے ساتھ جو بارہ دری ہے۔ وہاں سیاح مذکور کا نام لکھا ہوا ہے۔ یہیں اس کے لیے خیمہ لگایا گیا تھا۔ مہاراجہ مور کرافٹ کو سو روپیہ روزانہ "در وجہ ضیافت" بھیجا کرتا تھا۔

۱۸۳۸ء مطابق سمت ۱۸۹۵ میں کپتان صاحب نے لالہ کشن چند کی زبانی مہاراجہ صاحب سے کہلا بھیجا کہ شالا باغ راحت افزا مقام ہے لیکن بعض مقامات سے اس کی شکست و ریخت نے اس کو خراب کر رکھا ہے۔ نواب گورنر جنرل آپ کی ملاقات کے لیے آنے والے ہیں۔ اگر سرکار اس کی تعمیر و ترمیم سے نئے سرے سے کرا دیں تو زمانہ میں ایک یادگار رہے گی چنانچہ ۷ ار ہاڑ کو مہاراجہ نے خلیفہ نور الدین کو باغ کی آرائش و زیبائش اور مرمت وغیرہ کا حکم صادر کیا۔

[۱۸۰۰ء کا واقعہ ہے کہ ایک روز مہاراجہ اپنے درباریوں سمیت اس باغ کی سیر کر رہا تھا کہ شالا مار کی وجہ تسمیہ پر بحث چھڑ گئی۔ ہر ایک نے کسی نہ کسی کا قول نقل کر کے اپنے خیال کے مطابق اس کی وجہ تسمیہ بیان کی۔ لیکن مہاراجہ نے کہا کہ اس کا نام "شالا مار" اس لیے نہیں ہو سکتا کہ پنجابی زبان میں اس لفظ کے معنی خدا کی مار یا لعنت و پھٹکار کے ہیں۔ جس جگہ سے انسان زندگی کا حظ اٹھائے اسے اس نام سے کیوں پکارا جائے۔

کسی نے کہا کہ یہ لفظ ترکی زبان کا ہے جس کا مطلب خوشی کا مقام ہے مگر رنجیت سنگھ نے کہا۔ اگر ایسا ہوتا تو مرزا مہدی ایرانی کو تاریخ جہانکشائے نادری میں شالا مار کی بجائے شعلہ ماہ کا لفظ وضع کرنے کی ضرورت کیوں پیش آتی؟ آج سے اس باغ کا نام "شہلا باغ" ہوگا اور آئندہ اسے اسی نام سے پکارا جائے[1] چنانچہ یہ نام لوگوں کی زبانوں پر چڑھ گیا اور عوام آج تک اسے شہلا باغ یا شالا باغ ہی کہتے ہیں —— مرتب]

الحاق پنجاب (۲۹ مارچ ۱۸۴۹ء) کے بعد سرکار انگریزی نے اس کی مرمت کی طرف توجہ کی جنوری ۱۸۷۶ء میں پرنس آف ویلز (ایڈورڈ ہفتم آنجہانی) ۱۸۸۵ء میں لارڈ ڈفرن ۱۸۹۴ء میں لارڈ ایلجن اور ۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن جو وائسرایان ہند تھے اس باغ میں آتے رہے ہیں بلکہ جو وائسرائے بھی لاہور آیا اس نے جب تک مقبرہ جہانگیر اور شالا مار باغ کو نہیں دیکھ لیا اپنی سیاحت کا لطف نہیں اٹھایا۔ امیر حبیب اللہ خاں والئے افغانستان بھی ۴ مارچ ۱۹۰۷ء کو اس باغ میں آئے تھے۔ ملک معظم جارج پنجم بھی بزمانہ شہزادگی یہاں رونق افروز ہوئے تھے۔

---

[1] مہاراجہ رنجیت سنگھ از سیتارام کوہلی ص ۹۷-۹۸

لارڈ ڈفرن اور لیڈی ڈفرن اپنے سٹاف کے ہمراہ اپریل ۱۸۸۵ء میں لاہور آئے تھے۔ لیڈی ڈفرن نے اس سیاحت میں شالامار باغ کے متعلق جو خطوط[1] اپنی ماں کو انگلستان میں لکھے ان کا تھوڑا سا ذکر ناظرین کی دلچسپی کے لیے ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

بدھ (چہار شنبہ) ۱۵ اپریل ۱۸۸۵ء

"ہم نے شالامار باغ کے لیے (جہاں ہمارے اعزاز میں ڈنر دیا جاتا تھا) پانچ میل کی مسافت (گورنمنٹ ہوس سے) طے کی۔ اور یہ پوری سڑک مشعلوں سے منور اور روشن تھی۔ باغ کی دیوار جو ستر ایکڑ پر محیط ہے ایک مسلسل روشنی کے باعث ممتاز ہوتی نظر آئی۔ جب ہم گاڑی میں سے ایک کمان کے پاس اترے تو ہمیں ایک حقیقی مدینۃ النور نظر آیا۔ ہمارے سامنے پانی کا ایک راستہ دکھائی دیا جس کے وسط میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر فوارے اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ اس پرستان کی نہر کے دونوں طرف چوڑے آتشی تختے اور روشیں اور بلند درختوں کے عظیم جھنڈ تھے جن میں مختلف قسم کے چینی کے چراغ اور رنگ برنگ کی روشنیاں متداخل و متقاطع نظر آتی تھیں آگ اور پانی کی یہ قطاریں باغ کو ہر سمت میں قطع کرتی گزرتی تھیں اور پہلے چبوترہ کے اختتام پر درختوں کا ایک قسم کا قلعہ سا نظر آیا۔ جہاں ڈنر کی میزیں بچھی پڑی تھیں۔ اس کے دوسری جانب پانی کا ایک منور حوض ہمیں نظر آیا۔ یہ حد سے زیادہ دلفریب تھا۔ پانی پہلے باغ میں سے عین اس مقام سے گزرتا تھا جس کے اوپر ہم بیٹھے ہوئے تھے اور یہ نہر ایک آبشار کی صورت میں دوسری جانب نچلے چبوترے کے پاس گرتی تھی۔ اگر کوئی شخص اس منور کوشک میں گھومتا اور ٹھہر کر دیکھتا تو حاضرین اس کو اس سلسلۂ فن کی آخری لڑی بنتے اور اس منظر کو مکمل کرتے نظر آتے۔ غرض ہمارا ماحول بالکل شاعرانہ حیثیت رکھتا تھا۔

میں یہ معلوم کرنے کے لیے کہ روشنی کا انتظام کس طرح کیا گیا ہے باغ میں گھومنے لگی۔ میں نے دیکھا کہ پانی کے نزدیک ہزاروں لاکھوں مٹی کی چھوٹی چھوٹی کٹوریاں تھیں جن میں تیل ڈال کر فتیلے روشن کیے گئے تھے۔ تمام عمارتوں کے گرد اسی قسم کی روشنی کی قطاریں تھیں۔

اس دلفریب منظر سے جدا ہوتے وقت واقعی ہم نے بڑی کلفت محسوس کی۔"

[قیام پاکستان کے بعد سے اس وقت تک بے شمار بادشاہوں دنیا کے مشہور لوگوں اور غیر ملکی سیاحوں نے اس باغ کی سیر کا لطف اٹھایا ہے۔ ہز امپیریل مجسٹی محمد رضا شاہ پہلوی شہنشاہ ایران کو ان کی آمد لاہور کے موقعہ پر اہل شہر کی طرف سے ایک نہایت شاندار استقبالیہ

---

[1] یہ خطوط "ہماری وائسرائی زندگی ہندوستان میں" کے نام سے چھپ چکے ہیں (از مضمون حمید اللہ صاحب مخزن جولائی ۱۹۱۲ء)

جمعرات ۹ مارچ ۱۹۵۵ء کو اسی باغ میں دیا گیا۔ شہنشاہ کی نشست کا انتظام دوسرے تختے کے تالاب کے درمیان کی بارہ دری میں تھا۔

اس کے بعد جمعہ ۱۹ مارچ ۱۹۵۷ء کو امیر فیصل ثانی شاہ عراق اور پرنس عبدالالہ۔ ۲۱ اپریل ۱۹۵۴ء کو شاہ سعود بن عبدالعزیز ولیعہد حجاز۔ ۲۲ فروری ۱۹۵۵ء کو جمہوریہ ترکیہ کے صدر جلال بایار۔ ۱۰ مارچ ۱۹۵۵ء کو جارڈن (اُردن) کے شاہ حسین اور ملکہ زین الشرف۔ ۲ ستمبر ۱۹۵۵ء کو مصر کے ڈپٹی پرائم منسٹر ونگ کمانڈر جمال سلیم۔ ۲۰ مارچ ۱۹۵۷ء کو جمہوریہ ترکیہ کے وزیراعظم عدنان مندریس۔ بدھ ۲۶ دسمبر ۱۹۵۶ء کو عوامی (سرخ) چین کی ریاستی کونسل کے وزیراعظم اور وزیر امور خارجہ چو این لائی۔ منگل ۱۰ فروری ۱۹۵۹ء کو ڈیوک آف ایڈنبرا پاکستان کے مہمان کی حیثیت سے اس باغ میں تشریف لائے اور اہل شہر کی طرف سے ان کا شایان شان خیر مقدم ہوا۔

ان کے علاوہ پنڈت جواہر لعل نہرو وزیراعظم بھارت۔ امریکہ کے پریذیڈنٹ آئزن ہاور انگلستان کی ملکہ الزبتھ اور جاپان کے وزیراعظم کے مسٹر اکیدا کو اہل شہر کی طرف سے اسی باغ میں استقبالیہ دعوت دی گئی۔ غرض دنیا کا کوئی سیاح پاکستان کی سیر کو اس وقت مکمل نہیں سمجھتا جب تک اس عظیم الشان باغ کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ لیتا۔ ——— مرتب]

گلابی باغ

آبشاریں۔ حوض۔ فوارے ہوئے سب بے نشان
رنگ کیا لایا ہے باغ بیگ سلطاں دیکھئے

لاہور سے شالا مار باغ کو جاتے ہوئے بائیں ہاتھ پر گلابی باغ کے نام سے ایک عالیشان منقش و گل کار دروازہ اپنے بانی کی یاد میں نوحہ کناں نظر آتا ہے۔ یہ دروازہ اُس باغ کی ڈیوڑھی سے تعلق رکھتا ہے جو میرزا غیاث بیگ ایرانی کے عمزاد بھائی میرزا سلطان بیگ نے ۱۰۶۶ھ / ۱۶۵۶ء میں تعمیر کرایا۔

صاحب تحقیقات چشتی (ص ۷۴۳) لکھتے ہیں "سلطان بیگ حسب الطلب شاہجہان ایران سے ۱۰۶۶ھ میں ہندوستان آیا اور اپنے بھائی میرزا غیاث بیگ کی سفارش سے جو شاہجہان کی بیٹی سلطان بیگم کا داماد تھا پنجاب کا میر بحر مقرر ہوا اور اسی سال اس نے یہ باغ لاہور میں تعمیر کرایا۔

صاحب "تاریخ لاہور" نے یہ تو نہیں لکھا کہ میرزا سلطان بیگ ہندوستان میں کب آیا البتہ اس نے بھی صاحب تحقیقات کے ان الفاظ سے اتفاق کیا ہے کہ اُس کا بھائی میرزا غیاث بیگ شاہجہان کا داماد اور اس کی بیٹی سلطان بیگم کا خاوند تھا۔

لاہور کی انگریزی تاریخ ہسٹری آف لاہور کا مصنف میرزا غیاث بیگ کو اپنے دونوں پیش رو مصنفوں کی طرح بادشاہ کا داماد تو تسلیم کرتا ہے مگر میرزا سلطان بیگ کے ورود ہند کا سال ۱۰۵۹ھ مطابق ۱۶۴۹ء بتاتا ہے۔ جو صحیح معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ میرزا سلطان بیگ ۱۰۶۶ھ میں ہندوستان وارد ہو کر اسی سال لاہور میں ایک عظیم الشان باغ تعمیر نہیں کر سکتا تھا۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کیا اُس کا چچا زاد بھائی میرزا غیاث بیگ فی الواقعہ بادشاہ کا داماد اور شہزادی سلطان بیگم کا خاوند تھا۔ اور سلطان بیگم کے نام سے بادشاہ کی کوئی لڑکی بھی تھی یا نہیں؟

عہد شاہجہانی کی قریباً تمام تاریخوں میں شاہجہان کی اولاد ذکور و اناث کے نام درج ہیں۔ ظفر نامہ شاہجہان (ص ۱۲۷) کے

حوالہ سے جو عہد شاہجہانی کی تمام فارسی تاریخوں کا عطر مجموعہ ہے یہاں بادشاہ کی تمام لڑکیوں کے نام مع سنہ ولادت و وفات لکھے جاتے ہیں:

حور النساء بیگم	ولادت ۸ر صفر ۱۰۲۱ھ		وفات بعمر ۳ سال یک ماہ
جہاں آرا بیگم عرف بادشاہ بیگم	"	۲۱ر صفر ۱۰۲۳ھ	اس نے تمام عمر شادی نہیں کی
روشن آرا بیگم	"	۲ر رمضان ۱۰۲۶ھ	اس نے تمام عمر شادی نہیں کی
ثریا بانو بیگم	"	۲ر رجب ۱۰۳۰ھ	وفات بعمر سات سال ۲۳ر شعبان ۱۰۳۷ھ
حسن آرا بیگم	"	۱۰ر رمضان ۱۰۲۹ھ	وفات بعالم شیر خواری
گوہر آرا بیگم	"	۱۷ر ذیقعد ۱۰۴۰ھ	اسی کی پیدائش پر ممتاز محل کا انتقال ہو گیا تھا۔

شاہجہان کی چھ شاہزادیوں میں دو شاہزادیوں (جہاں آرا بیگم و روشن آرا بیگم) کے سوا باقی سب چھوٹی عمر ہی میں چل بسی تھیں اور ان دونوں شہزادیوں نے جن میں اول الذکر دارا شکوہ کی معاون اور مؤخر الذکر اورنگ زیب کی ہوا خواہ تھی شادیاں ہی نہیں کیں۔ پھر معلوم نہیں سلطان بیگم بادشاہ کی کونسی لڑکی تھی۔ میرزا غیاث بیگ جس کا خاوند تھا۔ اس لیے ان تمام مصنفوں کا یہ لکھنا کہ وہ بادشاہ کا داماد تھا قطعاً غلط ہے۔ البتہ ایران کے شاہی خاندان سے منسلک ہونے کی وجہ سے وہ بادشاہ کا مقرب ضرور تھا۔

میرزا سلطان بیگ کو بادشاہ نے ایک انگریزی رائفل بطور تحفہ عنایت کی تھی۔ میرزا ایک دن ہرن مینار (شیخوپورہ) کی طرف شکار کو گیا۔ بھری ہوئی بندوق ہاتھ میں تھی خدا جانے کیا واقعہ ہوا کہ وہ اس کے ہاتھ میں پھٹ گئی اور وہ اسی صدمہ سے بدھ کے دن ۷ر شوال ۱۰۶۸ھ کو خود ہی قضا کا شکار ہو گیا۔ اس واقعہ سے ۲۷ دن پیشتر ۲۱ر رمضان ۱۰۶۸ھ کو شاہجہان نظر بند ہو چکا تھا۔

میرزا سلطان بیگ لاہور ہی میں دفن ہوا لیکن کتاب تحقیقات چشتی جو لاہور کی سب سے پرانی تاریخ ہے اس کی قبر کا صحیح پتہ بتانے سے معذور ہے۔ صرف اتنا لکھا ہے کوئی کوٹ خواجہ سعید میں بتاتا ہے اور کوئی متصل باغ۔ اختتام باغ کا سال ۱۰۶۶ھ ہے چونکہ باغ کا بچا کھچا دروازہ ہی اس کی مٹی ہوئی شان و شوکت ظاہر کر رہا ہے اس لیے خیال ہے کہ باغ کے احداث اور اس کی اندرونی عمارتوں کی تکمیل میں پانچ چار سال ضرور لگ گئے ہوں گے۔

باغ کی وسعت کا اندازہ یہیں سے لگ سکتا ہے کہ اس کے چاروں گوشوں پر چار ڈیوڑھیاں تھیں اور ہر ڈیوڑھی عالیشان، خوبصورت اور منقش تھی۔ بڑی ڈیوڑھی کے اندر جو شالامار باغ کو جاتے ہوئے سر راہ ہر راہ رو کی توجہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور جو گلابی باغ کے نام سے موسوم ہے۔ ایک بہت بڑا کنواں آب رسانی کے لیے موجود تھا جس کو راقم نے بھی ۱۹۰۱ء میں دیکھا تھا۔ تحقیقات چشتی (ص ۲۴۶) سے ظاہر ہوتا ہے کہ شرقی و شمالی گوشہ میں بھی قریباً بیس قدم کے فاصلہ پر ایک چاہ کلاں تھا۔ آج یہ دونوں کنویں نابود ہیں۔

باغ کی اندرونی عمارات۔ ان کی بارہ دریاں۔ محرابی اور قالبوتی دروازے، چونہ گچ فرش اور نشست گاہیں اس کے اعلیٰ مذاق کی شاہد تھیں۔ جس ڈیوڑھی کا نام اب گلابی باغ ہے وہ اس باغ کی جنوبی ڈیوڑھی ہے۔ باغ کی اس ڈیوڑھی کے بیرونی دروازہ پر کاشی کار کام ایسا خوبصورت اور مضبوط ہے۔ جو تین سو سال گذر جانے کے باوجود ہنوز تر و تازہ مگر اپنی گذشتہ عظمت کا مرثیہ خواں ہے۔ اس دروازہ پر بہت سے کتبے ہیں بطور یادگار ان سب کو یہاں درج کیا جاتا ہے:۔

بڑے کتبہ میں لکھا ہے "افضل الذکر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ"۔ محراب کی پیشانی پر لاجوردی رنگ سے اشعار ذیل

بقلم جلی تحریر ہیں ؎

بانیٔ باغ سخاوت فاتح باب کرم — آنکہ از دارائے گردوں ساخت باغ چوں ارم
اہل معنے بردو اکش خواستند از حق دعا — بیگ سلطاں را الٰہی دار دائم محترم

اس کے نیچے یہ تاریخی رباعی درج ہے ؎

خوشا باغے کہ دارد لالہ داغش — گل خورشید مہ زیبد چراغش
ز تقویم خرد پرسید غازی — گلابی باغ شد تاریخ باغش

۱۰۶۶ھ

شرق رویہ محراب کی منزل دوم پر بخط نستعلیق یہ شعر درج ہے ؎

محمد عربی کہ آبروئے ہر دو سرا ست
کسے کہ خاک درش نیست خاک بر سر اُو

یہ خوبصورت دروازہ میلہ شالامار باغ کے تین دنوں میں پولیس چوکی کا کام دیتا ہے۔

باغ کے اندرونی حصہ میں صرف ایک عمارت جو بارہ دری مقبرہ دائی انگہ کے نام سے موسوم ہے، موجود ہے۔ باغ کی دیگر تمام عمارتیں غارت گروں نے پتھر نکال نکال کر اور اینٹیں بیچ بیچ کر خاک میں ملا دیں۔

۱۹۰۰ء میں احاطہ باغ کے اندر چونہ پیسنے اور اینٹیں بنانے کی چکیاں تھیں جگہ جگہ غلاظت اور سنگریزوں کے ڈھیر تھے۔ مزدوروں کا ایک چھوٹا سا جھونپڑا بھی تھا۔ ۲۸ جنوری ۱۹۲۳ء کو راقم جب پھر وہاں گیا تو دیکھا کہ گلابی باغ کی ڈیوڑھی سے لے کر بارہ دری مقبرہ دائی انگہ کے چبوترہ تک ایک سڑک قریباً چھ فٹ چوڑی بن چکی ہے۔ جس کے دونوں طرف یوکلپٹس کے درخت لگے ہوئے ہیں ۱۹۳۶ء میں دیکھا کہ ڈیوڑھی کے پاس ہی ایک خوشنما کوٹھی بنی ہوئی ہے۔ جو ذیلدار باغبانپورہ کی ملکیت بتائی گئی۔ اس میں کوئی انگریز مسٹر پام رہتے ہیں جو ریلوے کارخانہ میں فورمین ہیں۔ یہ کوٹھی اور اس کے نوکر خانے سب اسی باغ کی زمین میں ہیں۔ بلکہ بارہ دری کے علاوہ شمال کی طرف جو کھیت ہیں وہ بھی اسی احاطہ میں تھے۔ تاریخوں میں باغ کے جن مکانات کا ذکر ہے اُن میں آج بارہ دری کے علاوہ جس کی کیفیت آئندہ سطور میں لکھی جائے گی۔ کوئی قدیم عمارت نظر نہیں آتی۔ البتہ بارہ دری سے آگے ایک چھوٹی سی نہر گزر کر قریباً پانچ چھ فٹ بلند ایک طویل و عریض ٹیلہ نظر آتا ہے۔ جو منہدم عمارتوں کا پتہ دیتا ہے اور اس پر جو فرد ختی نشانات (پختہ حد بندیوں کی صورت میں) لگے ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ٹیلہ مختلف گاہکوں کے پاس فروخت ہو چکا ہے یا فروخت ہونے کے لیے باقی ہے۔

بارہ دری مقبرہ دائی انگہ

قبر کا تعویز بھی اور سنگ مرمر بھی نہیں — سینکڑوں منظر ہیں اس منظر میں پنہاں دیکھیے

گلابی باغ کے منقش دروازہ کے عین سامنے یوکلپٹس درختوں سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گھری ہوئی ایک چھوٹی سی سڑک آتی ہے۔ جو بارہ دری مقبرہ دائی انگہ کے چبوترہ تک جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی چھ سیڑھیاں طے کرنے کے بعد بارہ دری کا پختہ چبوترہ آتا ہے

بہت کم لوگ ہیں جو صاحب مقبرہ کے نام سے واقف ہیں۔

ہسٹری آف لاہور میں جج محمد لطیف (ص ۱۴۳ پر) اور تاریخ لاہور میں رائے بہادر کنہیا لال (ص ۲۱۰ پر) لکھتے ہیں "گلابی باغ سے چند قدم شمال کی طرف دایہ انگہ کی قبر ہے جو سلطان بیگم کی دایہ تھی۔ سلطان بیگم نے یہ باغ اپنی دایہ کو بخش دیا تھا" گذشتہ سطور میں لکھا جا چکا ہے کہ شاہجہان کی کسی بیٹی کا نام سلطان بیگم نہ تھا اس لیے دایہ انگہ اس کی دایہ بھی نہ تھی۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ میرزا سلطان بیگ لاولد انتقال کر گیا ہوگا۔ اُس زمانہ میں اُمرائے دربار کی جائدادوں کا کثیر حصہ بادشاہوں کو بازگشت ہو جایا کرتا تھا جس کی اکثر مثالیں مغلوں کے دور حکومت میں ملتی ہیں اس لیے ممکن ہے عہد عالمگیری میں یہ باغ دایہ انگہ کو جو دائی لاڈو کی طرح واقعی شاہی دایہ تھی عنایت ہو گیا ہو۔

دایہ انگہ کا اصل نام زیب النسا تھا شاہجہان کے عہد میں اس کا بڑا عروج رہا ہے اس کی ایک عالیشان مسجد "مسجد دائی انگہ" کے نام سے لاہور ریلوے سٹیشن کے پاس موجود ہے۔ جو برسوں تک ضبط سرکار رہی سنہ ۱۹۰۵ء سے آزاد ہے اور مسلمان اس میں نماز پڑھتے ہیں۔

اس مربع بارہ دری کے اندر جس کے باہر چاروں طرف پختہ اینٹوں کا فرش اب تک اس کی قدامت کا پتہ دے رہا ہے دو قبریں ہیں جن میں سے ایک دائی انگہ کی ہے اور دوسری قبر کے متعلق لاہور کی تاریخیں خاموش ہیں۔ ان دونوں قبروں کا سنگ مرمر اور سنگ مرمر کے تعویذ غارتگروں نے اتار لئے اور قبروں کو مسمار کر دیا۔ رائے بہادر کنہیا لال مصنف تاریخ لاہور (ص ۲۱۱ پر) لکھتے ہیں "اس مقبرہ کی مرمت اب سرکار نے بذریعہ مولف کتاب کے کرائی ہے۔ جس سے پھر بارونق ہو گیا ہے" یہ سنہ ۱۸۸۰ء کا واقعہ ہے جب راقم سنہ ۱۹۰۹ء میں گیا تو مقبرہ کی حالت اچھی نہ تھی۔ تہ خانہ کی چھت کا ایک گوشہ پھٹا ہوا تھا۔ اکثر مقامات سے اینٹیں اور چونہ اکھڑا ہوا تھا۔ اور بارہ دری کسمپرسی کی حالت میں تھی۔

بارہ دری کا اندرونی احاطہ جس میں قبریں ہیں دونوں طرف سے سات سات قدم ہے۔ اس کے چار دریچے ہیں۔ دیواروں پر گل کاری کے دھندلے سے نشان اب بھی نظر آتے ہیں۔ دریچوں کے باہر چاروں طرف ایک پختہ قالبوتی غلام گردش ہے جس کے نقش و نگار ماند پڑ گئے ہیں۔ قبروں کی اندرونی دیواروں پر چاروں طرف دو دو سطروں میں نہایت خوشنما عربی حروف میں سورہ ان فتحنا لکھی ہوئی ہے لکھنے والے کا نام محمد صالح ہے۔ جو اس طرح ہے "کتبہ محمد صالح غفر اللہ ذنوبہ و ستر عیوبہ سنہ ۱۰۸۲ھ" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دایہ انگہ کا انتقال ۱۰۸۲ھ مطابق سنہ ۱۶۷۱ء میں ہوا ہے۔

تحقیقات چشتی میں (ص ۵۴۳ پر) لکھا ہے "محرابوں کے باہر شمال رویہ سقف پر فوارہ کے نشان موجود ہیں۔ بارہ دری کے اندر قد آدم محراب پر "یا اللہ یا اللہ" تحریر ہے۔ یہ سنہ ۱۸۶۰ء کا ذکر ہے۔ سنہ ۱۸۸۰ء میں رائے کنہیا لال نے ان کا ذکر نہیں کیا اور سنہ ۱۹۴۲ء میں راقم نے بھی ان کو نہیں دیکھا سنہ ۱۹۲۳ء میں یا اس سے کچھ پہلے جب محکمہ آثار قدیمہ نے گلابی باغ کی حالت درست کی تو اس مقبرہ کی بھی کچھ مرمت کی گئی۔ بڑے گنبد کے علاوہ چھوٹی گنبدیاں بھی اکثر جگہ سے مرمت کی گئی تھیں۔ بارہ دری کے بیرونی فرش کے چاروں طرف اب لوہے کا جنگلہ ہے اور ڈپٹی کمشنر لاہور کی طرف سے یہاں اور گلابی باغ کی ڈیوڑھی پر ایک حکم چسپاں ہے جس کے مطابق ان عمارات کے خراب کرنے والے کو سزائے قید یا جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جا سکتی ہیں۔

بارہ دری سے مغرب کی طرف آہنی جنگلہ کے باہر ایک جھلار ہے جس سے کھیتوں کو پانی دیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ چند معمولی درجہ کے نئے مکانات بھی کچھ عرصہ سے بن گئے ہیں۔ جھلار کے باہر اُن عمارتوں کے کھنڈروں کے نشانات نظر آتے ہیں جو اس باغ کے اندر واقع تھیں۔

شیخ محمد اسمٰعیل عرف میاں وڈا

فیضِ روحِ شیخ اسمٰعیل کی برکات سے
ہو رہا ہے آج بھی واں حفظِ قراں دیکھئے

شیخ محمد اسمٰعیل حافظ قرآن وحدیث، صاحب تدریس، جامع علوم اور مشائخ اہل یقین تھے۔ ۹۹۵ھ (۱۵۸۷ء) میں بزمانہ شہنشاہ اکبر موضع جبہ باجیفہ (برلب دریائے چناب) میں پیدا ہوئے۔ باپ کا نام فتح اللہ تھا۔ ذات کے کھوکھر زمیندار تھے۔ باپ دادا زراعت کاری کرتے تھے۔ آپ کے والد میاں فتح اللہ جو زراعت کے علاوہ علم فقہ و حدیث میں بھی واقفیت کامل رکھتے تھے۔ آپ کی پیدائش کے بعد نقل مکانی کر کے موضع لنگر مخدوم شیخ عبدالکریم میں چلے آئے۔ جو طریقہ سہروردیہ کے متشرع فاضل اور عارف کامل تھے۔ پانچ سال کی عمر میں میاں اسمٰعیل علوم دینی کی تعلیم کے لیے شیخ عبدالکریم کی درس گاہ میں آ گئے۔

جب آپ بارہ سال کے ہوئے تو استاد نے درویشان درس کے لیے آٹا بہم پہنچانے کی خدمت آپ کے سپرد کی۔ چند سال تک یہ کام چلتا رہا۔ ایک دن آٹے کو دیر ہو گئی۔ مہتمم مطبخ شیخ کے پاس پہنچا۔ آپ نے ایک درویش کو تاخیر کا باعث دریافت کرنے کے لیے بھیجا۔ درویش جب چکی خانہ میں آیا تو دیکھا کہ اسمٰعیل سر بسجود ہیں اور چکی خود بخود چل رہی ہے۔ وہ حیران و متحیر ہو کر شیخ کے پاس دوڑا آیا۔ شیخ یہ سن کر خود وہاں گئے۔ "دید کہ آسیا بحکم غیب در گردش است و اسمٰعیل سر بمراقبہ[1] انداختہ از دنیا و ما فیہا خبر ندارد۔" آپ بھی یہ حال دیکھ کر واپس چلے آئے۔ جب تھوڑی مدت کے بعد اسمٰعیل آٹا لے کر آئے تو شیخ نے کہا آج سے چکی پیسنے کی خدمت تم سے چھڑائی جاتی ہے۔ اس لیے کہ اس کام کی خاطر تم کو تکلیف دینا در حقیقت فرشتوں کو تکلیف دینا ہے۔

آپ علم باطنی میں صاحب کمال ہو کر بیالیس سال کی عمر میں لنگر مخدوم سے لاہور آئے اور آتے ہی چالیس دن تک مزار حضرت علی مخدوم گنج بخش ہجویری پر معتکف رہے۔

آپ نے اپنا مستقل قیام محلہ نیل پورہ میں رکھا۔ محلہ نیل پورہ زمانہ قدیم میں اسی جگہ آباد تھا جہاں اب آپ کا مزار ہے۔ وہاں ایک مسجد زمانہ قدیم سے تھی لیکن ایک ہندو جوگی کا اس پر قبضہ تھا۔ وہ مسجد آپ نے اس سے واگذار کرائی اور وہیں درس و ہدایت خلق کا شغل اختیار کیا۔ اس مسجد کی مرمت بعد میں زمانہ شاہجہان کی کسی شاہی دایہ نے کرائی تھی۔ یہ مسجد آپ کے مزار کے احاطہ میں واقع ہے اور اس زمانہ سے کر اب تک کہ سوا تین سو سال گذر چکے ہیں درس قرآن برابر جاری ہے اور ان شاء اللہ ہمیشہ رہے گا۔

حضرت شیخ محمد اسمٰعیل فرمایا کرتے تھے کہ حفظ قرآن کا فیض خدا چاہے تو میرے بعد بھی جاری رہے گا۔ چنانچہ نہ صرف آپ کی اولاد و احفاد میں قرآن کے حفاظ اب تک چلے آ رہے ہیں بلکہ آج تک آپ کی درس گاہ سے ہزاروں اور لاکھوں بینا و نابینا قرآن حفظ

---

[1] صاحب تحقیقات چشتی (ص ۲۹۴) پر لکھتے ہیں۔ آپ اس وقت تلاوت قرآن شریف میں مشغول تھے۔

کر چکے ہیں۔ سنہ ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۲ء میں آپ کی درگاہ و درس کے متولی حافظ احمد الدین موجود تھے۔ مصنف خزینۃ الاصفیا مفتی غلام سرور نے آپ کو اور آپ کے والد حافظ شرف الدین (وفات سنہ ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء) کو دیکھا ہے۔

۵ شوال سنہ ۱۰۸۵ھ/۱۶۷۴ء کو بعہد عالمگیر حضرت شیخ اسمٰعیل وفات پا گئے۔ آپ کے دروازہ مزار پر یہ قطعہ تحریر ہے:

شنو تاریخ آں دریائے معنی کہ عمرش گشت در عشق خدا صرف

دل و جاں کرد ستہ بان الٰہی کہ اسماعیل ثانی بُود بے حرف

عالمگیر نے آپ کا فیضان عام دیکھ کر سات مزروعہ چاہات جو مسجد کے گرد و نواح میں تھے۔ آپ کے لنگر اور طلبا اور درویشوں کے اخراجات کے لیے معافی میں دیئے۔

لاہور میں مشہور ہے کہ اگر کسی کا ذہن کند ہو اور وہ آپ کی قبر پر سے گھاس کا تنکا کھا لے تو اس کو قرآن شریف جلدی حفظ ہو جاتا ہے۔ اب بھی اس خانقاہ کے ساتھ دو چار مزروعہ (اراضی اسی بیگھہ) عطیۂ مہاراجہ رنجیت سنگھ موجود ہے۔ مہاراجہ خود بھی حافظ شرف الدین متولی کے زمانہ میں اس خانقاہ میں حاضر ہو کر نذر دیتے رہے ہیں۔ ایک قدیمی چاہ شاہان مغلیہ کے زمانہ کا بھی اس مزار کے ساتھ ہے۔ صاحب تحقیقات چشتی کے زمانہ میں یہاں ۲۷ نابیناؤں، یتیموں، لنگڑوں اور تندرستوں کو جو حفظ قرآن میں مصروف رہتے تھے، دو وقتہ خوراک کے علاوہ لباس بھی ملتا تھا اور رہائش بھی ان کی یہیں ہوتی تھی۔

مہاراجہ شیر سنگھ اور اس کے وزیر راجہ دھیان سنگھ کے قتل کے بعد مہاراجہ دلیپ سنگھ کے ابتدائی ایام (سنہ ۱۸۴۴ء) میں راجہ ہیرا سنگھ وزیر خلف راجہ دھیان سنگھ اور راجہ سوچیت سنگھ برادر راجہ دھیان سنگھ کے درمیان جو لڑائی درس میاں وڈا کے متصل ہوئی اس میں خانقاہ کو بہت نقصان پہنچا۔ کئی قرآن شریف ضائع ہو جانے کے علاوہ دینی علوم کا کتب خانہ بھی ضائع ہو گیا۔ اُس وقت حافظ شرف الدین متولی زندہ تھے۔ انھوں نے راجہ سوچیت سنگھ سے بار بار کہا کہ یہ جگہ آپ کے لیے محفوظ نہیں ہے۔ آپ شالامار باغ میں چلے جائیں وہ جگہ محفوظ ہے۔ راجہ سوچیت سنگھ نے کہا کہ ہم تمہاری خدمت کریں گے کوئی فکر نہ کرو۔ اس وقت صرف پچاس آدمی اُس کے ہمراہ تھے۔ راجہ ہیرا سنگھ کو خبر ہوئی وہ پنڈت جلّا کے ہمراہ توپ خانہ اور فوج لے آیا۔ افسران فوج نے راجہ ہیرا سنگھ سے کہا کہ یہ فقیروں اور درویشوں کا مکان ہے توپ کے گولوں سے تباہ ہو جائے گا۔ راجہ ہیرا سنگھ نے کہا ہم اس کی مرمت کرا دیں گے۔ راجہ سوچیت سنگھ نے جو احاطہ خانقاہ کے اندر تھا۔ درویشوں کو بطور تصدق پچیس روپے عطا کئے اسی اثنا میں گولہ باری شروع ہو گئی جس کے صدمہ سے مزار کی ایک دیوار گر پڑی اور لڑائی دست بدست شروع ہو گئی۔ آخر راجہ سوچیت سنگھ مارا گیا۔

اس کے بعد راجہ ہیرا سنگھ کے حکم سے خانقاہ کی مرمت تو ہوئی لیکن کتابوں کا نقصان کسی طرح پورا نہ ہو سکا۔ درس اب بھی جاری ہے۔

شیخ سعدی بخاری

قبر سعدی تو سلامت ہے کسی صورت مگر گلشن سعدی ہے گلشن یا بیاباں دیکھئے

شیخ سعدی شاہجہان اور عالمگیر کے زمانہ میں لاہور کے ایک بزرگ تھے۔ تاریخ لاہور میں (ص ۲۰۱ پر) لکھا ہے کہ

کتاب بخاریہ میں ان کی سینکڑوں کرامتیں درج ہیں۔ پہلے فوج شاہجہانی میں ملازم رہے۔ لیکن طبیعت میں چونکہ استغراق تھا اس لیے نوکری چھوڑ کر پہلے شیخ اسداللہ کے مرید ہوئے لیکن جب شیخ نے ان کا استغراق دیکھا تو وہ اپنے مرشد حضرت شیخ آدم بنوری خلیفہ حضرت مجدد الف ثانی کے پاس لے گئے۔

شیخ آدم بنوری بیت اللہ جاتے ہوئے ان کو لاہور چھوڑ گئے یہاں چالیس سال آپ رہے یہیں آپ نے ۱۰۸۰ھ/۱۶۷۰ء میں بعہد عالمگیر انتقال کیا۔ آپ کی نظر فیض اثر سے آسیب زدہ مریضوں کو بہت جلد آرام آجاتا تھا۔ خزینۃ الاصفیا اور مناقب سید آدم بنوری میں بھی آپ کے حالات درج ہیں۔ آپ کی وصیت کے مطابق آپ کی قبر پر گنبد تو نہ بنایا گیا مگر احاطہ مزار میں اور بہت سی مکلف عمارتیں تعمیر کرائی گئیں خصوصاً ایک وسیع باغ نے جو احاطۂ قبر کے گرد کافی دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس جگہ کو بہت رونق دی۔

آپ کی قبر جو پختہ خشتی چونہ گچ ہے دو فٹ بلند چبوترہ پر واقع ہے قبر کے گرد ایک چار دیواری بطور بارہ دری تھی۔ باغ کی آبیاری کے لیے دو بڑے بڑے کنوئیں بھی تھے۔ ایک سکھوں کے زمانہ میں باغ کے ساتھ ہی اُجڑ گیا۔ دوسرے کنوئیں پر مزنگ کے ہدایت خاں بلوچ نے قبضہ کر لیا جس نے باغ کی زمین پر زراعت شروع کر دی چنانچہ اب اس کی اولاد اس پر قابض ہے۔

اب صرف مزار اور اس کی چار دیواری باقی ہے۔

مہابت خاں

مقبرہ و باغ دونوں نے یہ حل کر دی ندرا

آئینۂ تصویر محرومیئے ارماں دیکھئے

مورخین لاہور میں مولوی نور احمد چشتی اور مفتی غلام سرور لاہوری نے سب سے پہلے لاہور اور اس کے نواحی حالات پر خامہ فرسائی کی۔ ان میں بھی مولوی نور احمد چشتی کی کتاب تحقیقات چشتی زیادہ مشہور ہے۔ ان کے بعد رائے بہادر کنہیا لال اور جج محمد لطیف نے تاریخ لاہور پر ضخیم کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں ہسٹری آف لاہور (انگریزی) مصنفہ جج محمد لطیف کا درجہ بہت بلند ہے۔

مہابت خاں کے مقبرہ کے متعلق لاہور کی قدیم تاریخوں میں جو کچھ لکھا ہے پہلے ان کا اقتباس درج کرتا ہوں۔ مصنف تحقیقات چشتی (ص ۶۶۲ پر) اسرار الامرا[1] کے حوالہ سے لکھتے ہیں:۔

"اصل نام ان کا مہابت خاں خان خاناں، باپ کا نام غیور بیگ کابلی تھا۔ عوام محبت خاں کہتے ہیں۔ انھوں نے اپنا مقبرہ اور باغ اپنی عین حیات تعمیر کرایا ــــ ہفت ہزاری منصب رکھتے تھے۔ شاہجہان نے ان کو خطاب اور جاگیر اور ماہی مراتب عطا کر رکھا تھا۔ ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء میں بمقام لاہور بمرض تپ انتقال کر گئے اور اپنے باغ کے اندر اپنے بنائے ہوئے مقبرہ میں دفن ہوئے۔"

---

[1] مآثر الامرا تو ایک مشہور ضخیم کتاب تین جلدوں میں ہے۔ معلوم نہیں اسرار الامرا کونسی کتاب ہے؟

مصنف ہسٹری آف لاہور لکھتے ہیں :-

"اس کا حقیقی نام زمان بیگ اور اس کے باپ کا نام غیور بیگ کابلی تھا۔ جہانگیر اپنی توزک میں اس کے متعلق لکھتا ہے۔ میری ولی عہدی کے زمانے میں زمان بیگ احدی کی خدمات انجام دیتا تھا اور پانصدی کے منصب پر تھا۔ میں نے تخت نشینی کے بعد اسے مہابت خاں کا خطاب اور ڈیڑھ ہزاری منصب دیا اور محلات کا بخشی بنایا۔"

جہانگیر نے پھر اس کو ہفت ہزاری منصب دے کر افواج کا کمانڈر انچیف بنایا۔ جب شاہجہان نے جہانگیر سے بغاوت کی تو مہابت خاں کو اس کی اصلاح و تنبیہ کے لیے بھیجا گیا۔ پھر ایک ایسا وقت آیا کہ مہابت خاں نے طاقت حاصل کر کے جہانگیر کو اپنی حراست میں لے لیا۔ آخر نور جہاں نے بڑی شکست ہمیون اور خون خرابے کے بعد اس کو مہابت خاں کی قید سے رہائی دلائی۔ اس کے بعد مہابت خاں کو دکن کا صوبہ ملا جہاں اس نے کئی فتوحات حاصل کیں۔ خان خاناں اس کا خطاب تھا۔ وہ ۱۰۴۴ھ میں وفات پا گیا۔ پھر حاشیہ (ص ۱۵۰) میں لکھتے ہیں :-

"مہابت خاں اپنی موت سے کچھ عرصہ پہلے دکن بھیجا گیا تھا۔ وہیں بمقام برہان پور بعارضہ ناسور انتقال کر گیا"

اس لیے لاہور میں جو باغ اور مقبرہ شالامار باغ سے مغرب اور باغبانپورہ سے جنوب کی طرف سڑک شالامار باغ کے متصل واقع ہے وہ اس مہابت خاں کا نہیں جس کا نام زمان بیگ تھا اور جس کو جہانگیر نے خان خاناں کا خطاب دیا تھا اور جس نے جہانگیر کو کابل جاتے ہوئے دریائے جہلم کے کنارے اپنے پانچ سو جان باز راجپوتوں کے ساتھ نظر بند کر دیا تھا۔

زمان بیگ کا فی الواقعہ برہان پور میں انتقال ہو چکا تھا جس کی تصدیق لطیف اور بادشاہ نامہ شاہجہان سے بھی ہوتی ہے۔ اس کی وفات کی اطلاع ۷ جمادی الاول ۱۰۴۴ھ کو بادشاہ کو ملی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس مہینے کے ابتدائی حصہ ہی میں فوت ہوا تھا۔ لکھا ہے کہ مہابت خاں خان خاناں کو بھگندر (ناسور) کا عارضہ ایک عرصہ سے تھا۔ اس کے اسی دیرینہ رفیق نے اس کی جان لی۔ متعلقین نے برجستہ تاریخ کہی۔ "زمانہ آرام گرفت"

لہ "زمانہ آرام گرفت" سے ۱۰۴۴ھ سال وفات نکلتا ہے۔ بادشاہ نامہ کے حوالہ سے جج محمد لطیف ۱۶۳۴ء لکھتے ہیں۔ ظفر نامہ شاہجہان میں مولوی ذکاء اللہ (صفحہ ۹۰) جلوس ہفتم شاہجہانی یعنی ۱۰۴۳ھ/۱۶۳۴ء کے واقعات میں ذکر کرتے ہیں :-

"خان زماں ۷ جمادی الاول ۱۰۴۴ھ کو اپنے باپ کی درشت خوئی اور آزار جوئی سے تنگ آ کر بادشاہ کے پاس چلا آیا۔ اسی تاریخ کو بادشاہ کو برہان پور میں مہابت خاں کے انتقال کر جانے کی اطلاع ملی۔ انگریزی ۱۶۳۴ء ہجری سال ۱۰۴۴-۴۳ کے مطابق ہے۔ لیکن قطعہ تاریخ سال وفات ۱۰۴۴ھ ظاہر کرتا ہے۔ حالانکہ بادشاہ کو اس کی خبر ۱۰۴۳ھ میں ملی ہے۔ ممکن ہے تاریخی قطعہ کے مصرع اول میں دو عدد کے تخرجہ کا اشارہ ہو۔

۱۹۲۲ء میں جب راقم اس مقبرہ اور باغ کو دیکھنے کے لیے دوبارہ گیا تو کوئی اس باغ کو محبت خاں، کوئی مہابت خاں اور کوئی داراشکوہ کا باغ بتاتا تھا۔ چونکہ یہ باغ میاں فیملی باغبانپورہ کے قبضے میں تھا، راقم نے میاں حق نواز مرحوم بیرسٹر کو اصلیت کی تحقیق کیلئے خط لکھا۔ انھوں نے ۱۲ فروری ۱۹۲۳ء کو جواب لکھا کہ :۔۔۔

"باغ مذکور اس وقت میاں شاہنواز[1] صاحب بیرسٹر ایٹ لا اور دوازنان میاں ظہورالدین کی ملکیت میں ہے۔ غالباً داراشکوہ نے اس کو تعمیر کرایا۔ میاں کریم بخش مرحوم کی زبانی ایک دفعہ سُنا تھا کہ اس کے وسط میں جو قبر تھی وہ مہابت خاں کی تھی۔"

چونکہ تاریخ میں ایک ہی مہابت خاں جہانگیر اور شاہجہان کے زمانے سے مشہور چلا آتا ہے جس کا ذکر گذشتہ سطور میں ہو چکا ہے۔ اس لیے لاہور میں یہی مشہور ہے کہ یہ اسی مہابت خاں کی قبر ہے جس نے جہانگیر کو قید کیا تھا لیکن اس کی وفات چونکہ برہانپور (دکن) میں ہوئی، اس لیے جج محمد لطیف نے اس قبر کو زمانہ بیگ مہابت خاں کی قبر لکھنے میں وہ غلطی نہیں کی جو مولوی نور احمد چشتی نے اپنی تحقیقات میں کی لیکن یہ نہیں بتایا کہ آخر یہ کس مہابت خاں کی قبر ہے۔

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے مہابت خاں کا اصل نام زمان بیگ یا زمانہ بیگ تھا۔ خطاب مہابت خاں اس کو جہانگیر نے دیا تھا اور اس زمانہ میں عمدۃ الملک، حمیدۃ الملک، نصرت جنگ، فیروز جنگ، اعتمادالدولہ وغیرہ کے علاوہ اس قسم کے خطابات کا جن کے آگے خان کا لفظ آتا تھا، زیادہ چرچا تھا۔ چنانچہ بہرہ مند خاں، مقرب خاں، آصف خاں، وزیر خاں، امانت خاں، خوش خبر خاں، محمد قلی خاں، اعتماد خاں، معتمد خاں، سعادت خاں، لشکر خاں، خانہ زاد خاں بہت سے خطابات خدمات کے عوض ملا کرتے تھے۔ انہی میں مہابت خاں بھی ایک خطاب تھا۔ چنانچہ اس کے تین بیٹوں میں سب سے بڑے لہراسپ خاں کو مہابت[2] خاں ثانی اور دوسرے کو جس کا اصل نام معلوم نہیں ہو سکا، خانہ زاد خاں کا خطاب ملا اور تیسرے بیٹے امان اللہ کو جہانگیر نے الہ داد خاں پسر جلال افغان کی شورش (۱۰۲۸ھ ۱۶۱۹ء) دور کرنے پر شمشیر خاصہ عنایت کی۔[3]

اسی طرح دکن کے ایک نامور شخص محمد ابراہیم خاں کو جو ابوالحسن تاناشاہ والیٔ گولکنڈہ کی فوج کا سپہ سالار اور خلیل اللہ خاں کے خطاب سے ممتاز تھا، عالمگیر نے فتح گولکنڈہ کے بعد ۱۰۹۷ھ (۱۶۸۶ء) میں مہابت خاں کا خطاب اور ہفت ہزاری شش ہزار

---

[1] ۱۳۵۸ھ / ۱۹۳۹ء میں میاں شاہنواز کی والدہ نے مسجد کی مرمت بھی کرائی۔

[2] بادشاہ نامہ عالمگیری (جلد ہشتم تاریخ ہندوستان ذکاء اللہ) میں ص ۲۷۷، ۲۷۸ پر لکھا ہے کہ مہابت خاں بادشاہ (عالمگیر) کی خدمت میں بڑا گستاخ تھا اور اس سے سر دربار بعض ایسی حرکات ہو جاتی تھیں جو بادشاہ کو ناگوار گزرتی تھیں۔ چنانچہ بادشاہ نے اس کو مہم دکن پر روانہ کیا تو جعفر خاں وزیر سے خلوت میں کہا کہ مہابت خاں کو سمجھاؤ کہ سر دربار ایسے لغو کلمات عرض نہ کیا کرے۔

[3] کارنامہ جہانگیری مولوی ذکاء اللہ دہلوی صفحہ ۱۲۸

سوار کا منصب[1] دیا۔ اسی مہابت خاں کو جس کا نام محمد ابراہیم اور حیدر آبادی خطاب خلیل اللہ خاں تھا، دو سال کے بعد بادشاہ نے لاہور کا گورنر مقرر کیا۔

مہابت خاں محمد ابراہیم صوبہ دار لاہور کے زمانے کا ایک دلچسپ واقعہ مآثر الامراء جلد دوم میں درج ہے۔ لکھا ہے کہ اس زمانے میں عاقل خاں میر عسکری خوافی الاصل (دکن) سے لاہور آیا۔ چونکہ عاقل خاں عالمگیر کا پروردہ تھا اس نے بادشاہ سے قلعہ لاہور دیکھنے کی اجازت مانگی۔ بادشاہ نے صوبہ دار مہابت خاں کے نام پروانہ لکھا کہ اس کو قلعہ دیکھنے کی اجازت دی جائے لیکن مہابت خاں نے بادشاہ کو جواب میں لکھا "میں بعض وجوہات سے نہ اس کو قلعہ دیکھنے کی اجازت دے سکتا ہوں اور نہ اس کو ملاقات کے لیے اپنے پاس بلا سکتا ہوں۔ اوّل یہ کہ حیدر آبادی اس قابل نہیں ہیں کہ ان کو سیر و تماشا کے بہانہ سے شاہی عمارات دکھائی جائیں۔ دوسرے یہ کہ ملاقات میں جس قسم کے سلوک کا وہ مجھ سے متمنی اور خواہش مند ہے وہ مجھ سے ادا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ عاقل خاں قلعہ کی سیر سے محروم رہا۔ لکھا ہے کہ وہ بڑا بد مزاج اور آزاد منش تھا۔ ۱۱۰۸ھ میں انتقال کر گیا۔ شاعر تھا۔ رازی اس کا تخلص تھا۔ یہ شعر اسی کا ہے ؎

عشق چہ آساں نمود آہ چہ دشوار بود   ہجر چہ دشوار بود یار چہ آساں گرفت

راقم یہاں تک لکھ چکا تھا کہ اعظم گڈھ کے رسالہ معارف بابت جون ۱۹۴۳ء میں مہابت خاں کے باغ اور مقبرہ کے متعلق (محمد شجاع الدین ایم۔ اے لاہور کا) ایک مضمون نظر سے گزرا۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:۔

"مہابت خاں زمانہ بیگ کا انتقال برہان پور میں ہوا لیکن اس کی وصیت کے مطابق اسے دہلی میں شاہ مرداں علی مرتضیٰ کی قدم گاہ کے قریب دفن کیا گیا۔"

اس کے بعد وہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ "مہابت خاں چونکہ لاہور کا گورنر ہو چکا تھا اور رقعات عالمگیری نولکشور ایڈیشن رقعہ نمبر ۱۴۵ میں مرقوم ہے کہ "مہابت خاں حیدر آبادی ظاہر اور لاہور گذشت۔ غیر از نبیرہ کہ پدرش بحضور پدر رحلت کردہ ورثہ دیگر ندارد۔ دیوان بیوتات آں جا بہ نگارد۔ . . . ." اور چونکہ ایران کو خیر باد کہے مدت گزر چکی تھی، حیدر آباد سے بھی اب کوئی تعلق نہ تھا۔ اس لیے اغلب گمان ہے کہ لاہور ہی میں وہ سپرد خاک کیا گیا ہو اور لاہور میں جو مزار مہابت خاں کے نام سے منسوب ہے وہ اسی حیدر آبادی مہابت خاں کا ہو۔"

مہابت خاں چونکہ ضعیف العمر تھا، ممکن ہے اس نے لاہور آکر اپنی زندگی ہی میں مقبرہ اور مقبرہ کے ساتھ اس زمانہ کے رواج کے مطابق باغ بھی احداث کرا لیا ہو اور چونکہ لاہور میں ایک سال ہی کے اندر ۱۰۹۳ھ میں اس کا انتقال ہو گیا تھا،

---

[1] ابوالحسن (مدن پنڈت (مادنا برہمن) اور اس کے بھائی اکنہ کی ہر بات کو وحی آسمانی سمجھا جاتا تھا اور دونوں مسلمانوں کے سخت دشمن تھے۔ جب شاہزادہ عالمگیر (شاہ عالم) نے مدنا اور اکنا کو شکست دی تو انھوں نے ابوالحسن کو خلیل اللہ کے خلاف بہکا کر اس کے قتل کا حکم لکھوا لیا۔ خلیل اللہ خاں کو علم ہوا تو وہ بھاگ کر شہزادہ کی فوج میں چلا آیا اور اس کی معرفت عالمگیر کے پاس پہنچا تو بادشاہ نے اسے خطاب و منصب کے علاوہ پچاس ہزار روپیہ نقد بھی دیا۔

اس لیے یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی موت کے بعد اس کے نبیرہ (پوتے) نے باغ اور مقبرہ کی عمارت کی تکمیل کی ہو۔

تحقیقات چشتی میں لکھا ہے کہ باغ کی کل زمین دو بیگھہ سوا تین کنال تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ باغ بہت بڑا نہیں تھا۔ لیکن صاحب تحقیقات چشتی نے باغ کی عمارات کی جو تفصیل لکھی ہے وہ اس مختصر سے باغ کو باغ دلکشا ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے۔ باغ کی عمارات اپنے خورد و کلاں محرابوں نشست گاہوں، طاقچوں، برجوں اور چبوتروں، بارہ دریوں، فواروں، حوضوں کی وجہ سے اکثر قدیمی باغات پر فوقیت رکھتی تھیں۔ باغ کی دو قد آدم بلند دیوار کے اندر ایک آسمانی کنواں بھی تھا جو موجود تو ہے مگر اب آسمانی نہیں رہا۔ ایک خوبصورت چھوٹی سی مسجد بھی اسی زمانہ کی ہے۔

مہابت خاں کی قبر ایک خشتی چبوترہ پر تھی۔ چبوترہ کے چاروں طرف ۱۸۹۰ء تک چوسر کی شکل میں چار خیابان بھی تھے۔ بادشاہ گردی کے زمانے میں محمود نام ایک زمیندار نے اس پر قبضہ کر کے زراعت شروع کر دی۔ جب رنجیت سنگھ کا زمانہ آیا تو اس نے یہ باغ فقیر عزیز الدین کو دے دیا[1]۔ فقیر عزیز الدین نے از سر نو اس کو آباد کیا۔ ان کی وفات کے بعد ان کا فرزند فقیر چراغ الدین بھی اس کی مرمت ریخت اور غور پرداخت کرتا رہا۔ لیکن ۱۸۵۶ء میں یا اس کے پس و پیش وارثان فقیر چراغ الدین نے جہانگیر اینڈ کمپنی پارسی سوداگران کے پاس اس کو صرف نو سو روپیہ میں فروخت کر دیا۔

پارسی سوداگران کی ملکیت کی وجہ سے یہ باغ پارسی سیٹھوں کا باغ کے نام سے مشہور ہو گیا اور قریباً ۴۰-۴۲ سال تک یہ باغ اسی نام سے مشہور رہا۔ اس دوران پارسی لوگ مسجد اور قبر کا بہت ادب و احترام کرتے رہے۔ قبر پر ہر جمعرات کو ان کی طرف سے چراغ جلایا جاتا اور مسجد کو کوڑا کرکٹ سے صاف کیا جاتا تھا۔

۱۸۹۰ء میں یا اس کے قریب میاں ظہور الدین مرحوم باغبانپوری نے میاں میر کے ایک پارسی سے چھ ہزار روپیہ میں یہ باغ خرید لیا۔ اب یہ باغ انہی کے ورثار کی ملکیت ہے۔

۱۹۴۳ء میں باغ اور مقبرہ کی موجودہ کیفیت یہ ہے کہ دیوار بیرونی تو ابھی تک نیم شکستہ حالت میں موجود ہے۔ صدر دروازہ جو مغرب کی جانب ہے بند رہتا ہے اس کے اوپر پارسیوں نے ایک منزل اپنی رہائش کے لیے تعمیر کرائی تھی یہ ان کے عہد کی یادگار سمجھنی چاہیئے۔ چھوٹے سے چبوترہ پر جو درمیان میں کچا ہے مہابت خاں کی قبر تھی، اب وہ قبر امتداد زمانہ سے مٹ چکی ہے ؎

بے نشانی سے نہیں احساں کسی کا بعد مرگ
پاک ہیں یاروں کی رسم فاتحہ خوانی سے ہم

باغ کی شمالی جانب درخت ہیں اور مشرق کی طرف کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ بقول محمد شجاع الدین صاحب کے معلوم ہے کہ اس ویرانے میں

---

[1] ہسٹری آف لاہور میں یہ باغ دارا شکوہ کے نام سے درج ہے۔ لکھا ہے کہ مہاراجہ شیر سنگھ نے یہ باغ سردار دیال سنگھ مجیٹھیہ کو دے دیا اور اس کے بیٹے نے اس کی عمارتیں اور دیواریں گرا کر اس کی اینٹیں فروخت کر دیں۔ پھر لکھا ہے کہ اس باغ کی دس ایکڑ زمین مولوی ظہور الدین وکیل باغبانپوری کے قبضہ میں ہے۔ مصنف ہسٹری آف لاہور کی اور باتیں تو صحیح ہیں۔ لیکن یہ غلط ہے کہ یہ باغ دارا شکوہ نے احداث کرایا تھا۔

خودرو گھاس اور جھاڑیوں کے درمیان مٹی اور اینٹوں کے ڈھیر کے نیچے ابوالحسن قطب شاہ والیٔ گولکنڈہ کا سپہ سالار عالمگیر کے عہد کا ایک ہفت ہزاری امیر اور پنجاب کا سابق حاکم محو خواب ہے۔

باغبانپورہ کی انجمن تبلیغ الاسلام نے فروری ۱۹۴۲ء سے باغ کے ایک مختصر دالان میں ایک مکتب جاری رکھا ہے جس میں بچے پڑھتے ہیں۔ باغ کے قرب و جوار میں "نئی آبادی" نے کچھ رونق پیدا کر دی ہے۔

نواب میاں خاں

دیکھنا ہو باغ عالم میں اگر رنگ فنا
آیئے پھر باغِ نواب میاں خاں دیکھئے

نواب سعد اللہ خاں وزیر شاہجہان کا فرزند تھا حکومت لاہور کی نیابت پر بھی فائز رہا۔ اس کی فلک رفعت حویلی اب بھی لاہور میں "حویلی میاں خاں" کے نام سے رنگ محل لاہور کے متصل اپنے باقیماندہ دروازہ کی ڈیوڑھی سے اپنی شان و شوکت اور رفعت و وسعت کا ثبوت دے رہی ہے۔ حویلی کے وسیع احاطہ میں تو صدہا لوگ اپنے اپنے نو تعمیر مکانات میں رہائش پذیر ہیں البتہ دروازہ کی بیرونی دیوار میں جو عین بازار میں واقع ہے سرکار انگریزی نے سنگ مرمر کی ایک تختی لگا کر اور اس پر حویلی مذکور کی کچھ کیفیت لکھ کر اس کو محکمہ آثار قدیمہ میں داخل کر لیا ہے۔

نواب میاں خاں پنجاب کا نائب ناظم اور اس باپ کا بیٹا تھا جس کی ہر ادا پر شاہجہان قربان ہوتا تھا اس لیے نقلے نام کے لیے اس نے لاہور میں اس عالیشان حویلی کے علاوہ ایک بے نظیر باغ بھی تعمیر کرایا۔ جو اپنے فواروں، حوضوں، نہروں، آبشاروں اور مختلف طبقوں کے لحاظ سے ایک بہترین یادگار تھا۔ لاہور کی تاریخوں سے اس باغ کے انقلابی دور کے جن مصائب کی کچھ کیفیت معلوم ہو سکی ہے، وہ سطور ذیل سے ظاہر ہے:—

باغ کے جنوب کی طرف ایک ڈیوڑھی کلاں مع دروازہ چوکھٹ چوبی موجود تھی۔ اس کے آگے پھر ایک اور مختصری ڈیوڑھی تھی جس کے چند زینے طے کرنے کے بعد باغ میں پہلا قدم رکھا جاتا تھا۔ باغ کے عین درمیان جنوب کی طرف ایک مربع حوض تھا اس کے سر پر شمالی دیوار کے ساتھ آبشار "سرا بہ رنگ میزی" کا لطف دکھاتی تھی۔ ڈیوڑھی کے اوپر ایک خوشنما منقش منزل تھی جس کی بارہ دری پر بیٹھ کر دُور دُور کی کیفیت نظر آیا کرتی تھی۔ جگہ جگہ سنگ سیاہ کا فرش تھا زینے بھی سنگ سیاہ ہی کے تھے۔ باغ کے بالمقابل دو مسجدیں "مسجد اور جواب مسجد" تھیں۔ یہ مسجدیں گو ویران ہیں لیکن اب بھی موجود ہیں اور شاید دنیا میں اپنی قسم کی پہلی ایجاد ہے کہ مسجد کے مقابل ایک اور مسجد صرف خوشنمائی اور زینت کے لیے بنا دی گئی ہو۔

نواب میاں خاں کے غلام مشکی نام کی زیر نگرانی یہ باغ اور اس کے مکانات جو حقیقتاً محلات ہی کا نمونہ تھے تعمیر کرائے گئے تھے۔ اس لیے اس باغ کو "مشکی محل" بھی کہتے ہیں اس تعمیر کے ساتھ ہی غلام کا نام بھی صفحات تاریخ میں زندہ رہ گیا ہے یہ باغ جس میں نواب میاں خاں کا مقبرہ بھی اُس کی وفات (۱۰۸۲ھ) کے بعد تعمیر ہوا ہے موضع بھوگیوال نزیل لاہور کے غربی جانب ہے۔ اور بھوگیوال اور اس باغ کے درمیان صرف ایک ہی سڑک ہے۔

راقم ۲۲ جنوری ۱۹۲۳ء کو بسنت کے دن جب مواضعات چاہ میراں، بھوگی وال، سمادھ حقیقت رائے اور باغبانپورہ کے بعض "آثار قدیمہ لاہور" دیکھنے کے لیے گیا۔ تو باغ میاں خاں کی عبرت ناک حالت سے بھی بڑا متاثر ہوا۔

باغ میاں خان پر جس کی عمارات اور جس کے عالیشان مقبرہ کی تعمیر خدا جانے کتنے عرصہ میں ہوئی ہوگی اور کتنی عظیم لاگت اس پر صرف ہو چکی ہوگی سناٹا چھایا ہوا تھا۔ آموں کے درخت جو غالباً مابعد زمانہ کے تھے موجود تھے۔ چار دیواری عہد قدیم کی جو بہت دور تک تھی۔ معدوم تھی، زمانہ مابعد کی چار دیواری بھی تین طرف سے گر چکی تھی صرف جنوبی غربی گوشہ کی دیوار کا کچھ ٹکڑا موجود تھا شمالی اور غربی جانب درختوں کے متصل باغ کی موجودہ حدود ہی میں زراعت کا کام جاری تھا۔

اس باغ نے اپنی زندگی میں کئی دَور دیکھے ہیں۔ پہلا دور تو نواب میاں خاں کی زندگی کا ہے۔ اس دور میں فوارے چلتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی آبشاریں جاری تھیں۔ ہر روش پھولوں کی کیاری اور ثمردار درختوں کی شاخ۔ شاخ ثمردار تھی۔ نواب کبھی حوض کے کنارے باغ کی بہار دیکھتا۔ کبھی ڈیوڑھی کی بالائی منزل پر اپنے مصاحبوں سمیت مجلس گرم کرتا۔ یہ باغ اُس دور میں روح افزا تھا۔ اور روح کی یہ افزائش اُس کے بعد بھی اُس کے سید منجیؔ کی اولاد کی فارغ البالی کے زمانہ تک رہی۔ لیکن جونہی مغل حکومت کو زوال آیا سکھ سُورماؤں نے جنگلوں، جھاڑیوں اور جھنگیوں سے سر نکال کر نہ صرف اہل لاہور اور نواحی مضافات کو لُوٹا۔ بلکہ عمارات قدیمہ کو بھی تہس نہس کر دیا۔ ان ظالموں نے باغ کے مکانات (ڈیوڑھیاں، بارہ دریاں وغیرہ) برباد کر دیں۔ اینٹیں خشت فروش لے گئے۔ اور بیش قیمت پتھر جس بڑے ڈاکو کے ہاتھ لگے وہ لے گیا۔

سمت ۱۸۹۰ب کا زمانہ تھا کہ تیسرے دور میں یہ باغ سوچیت سنگھ کے قبضہ میں آیا۔ اس نے قبر کے تعویز سنگ سیاہ پر ہاتھ مارا اور قبر کو بالکل بے نشان کر دیا۔ دونوں بالمقابل مسجدوں کے درمیان جن کا صحن آٹھ سیڑھیاں طے کرنے کے بعد آتا ہے ایک وسیع بارہ دری ہے۔ اس کی دیواروں پر اس نے سکھ گروصاحبان کی تصاویر کھچوائیں۔ بہت سی قدیم عمارتیں اس نے گرا دیں چند ایک نئی تعمیر کرائیں۔ باغ کی چار دیواری کو مضبوط کرایا۔ اس زمانہ میں اس کا نام "باغ راجہ سوچیت سنگھ" تھا۔

چوتھا دور اس پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے آخری زمانہ میں آیا۔ یہ باغ اُس نے شیخ امام الدین صوبہ کشمیر کو دے دیا۔ نواب شیخ امام الدین گو مسلمان تھا۔ لیکن جس ماحول میں اُس کی سیاسی پرورش ہو رہی تھی اس میں اسلامی عمارات کا ادب واحترام مدفضوں میں داخل تھا۔ چنانچہ اُس نے بھی مقبرہ کے بڑے چبوترہ سے پتھر کی بہت سی سلیں اُکھڑوا کر اپنی حویلی (واقعہ سُوتر منڈی) میں استعمال کیں۔ مقبرہ کے چبوترہ کی یہ جگہ اب تک خالی پڑی ہوئی ہے۔

پانچواں دور اس باغ پر نواب صاحبان قزلباش کے زمانہ میں آیا۔ سکھ حکومت کی تباہی کے بعد انگریزی عملداری میں بہت سے اسلامی مقبرے اور باغات نقشہ نزول میں درج ہو کر نیلام ہوتے رہے۔ انہی میں باغ میاں خاں بھی نیلام ہو گیا جس کو ۱۲۷۰ھ ۱۸۵۳ء میں یا اس کے قریب نواب رضا علیؔ خان قزلباش نے ۲۲۰۰ سو روپیہ میں خرید لیا۔ چنانچہ اب اس کا نام باغ نواب رضا علی خاں ہے۔ ۱۸۸۴ء تک قدیم عمارت میں سے جنوبی سمت کی ڈیوڑھی کے علاوہ حوض مربع اور آبشار کے کچھ آثار بھی موجود تھے۔ ۱۹۲۳ء میں نہ

ؔ وفات نواب رضا علی خاں جون ۱۸۶۵ء

کہیں ڈیوڑھی کا نشان ہے اور نہ حوض اور آبشاری کا کہیں وجود ہے ؎

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

شیخ جان محمد لاہوری

دیکھئے گنجینۂ علم حدیث و فقہ و دیں ‎ ‎ ‎ ‎ روضۂ جان محمد کو بھی اے جاں دیکھئے

شیخ اسماعیل عرف میاں کلاں (میاں وڈا) کے اعظم ترین بلکہ محبوب ترین خلفاء میں تھے۔ لاہور کے محلہ پرویز آباد میں جو بیرون لاہور کی آبادی کا ایک مشہور محلہ تھا سکونت رکھتے تھے۔ وہیں شیخ عبدالمجید مرید حضرت شیخ اسماعیل میاں وڈا سے الف بے شروع کی اور وہیں لکھنے پڑھنے کا ہوش سنبھالا۔ ایک دن اپنے اُستاد کے ساتھ حضرت میاں وڈا کی خدمت میں گئے۔ میاں صاحب نے آپ کے چہرہ سے بچپن میں ہی آثار ستارۂ بلندی دیکھ کر فرمایا کیوں بے لڑکے! جب اپنے استاد سے علم حاصل کر کے فاضل ہو جاؤ گے۔ تو کبھی کبھی تکرار حدیث کے لیے ہمارے پاس بھی آجایا کرو گے؟

جان محمد اُس وقت ابھی بچہ ہی تھے ادب اور شرم کی وجہ سے جواب نہ دے سکے۔ شیخ عبدالمجید آپ کے اُستاد نے کہا۔ بیٹا کہو اگر آپ کی توجہ سے مجھے علم کی دولت نصیب ہو گئی۔ تو میں خدمت اقدس میں ضرور حاضر ہوا کروں گا۔ جان محمد نے حضرت میاں صاحب کی خدمت میں یہی الفاظ عرض کیے اس پر میاں صاحب نے ہاتھ اٹھا کر خدائے علیم و خبیر کی جناب میں آپ کے ازدیادِ علم اور خدمات دین حقہ کے لیے دعا مانگی۔

چنانچہ ابھی زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ جان محمد نے علوم ظاہری میں استعداد کامل حاصل کر لی۔ اور فقہ و حدیث میں اُسے اتنے مسائل ازبر ہو گئے اور اس کا ذہن رسا بعض مشکل نکات کی تہ کو اس قدر جلد پہنچ جاتا کہ وہ اس کے پڑھانے سے عاجز آگیا چنانچہ شیخ عبدالمجید فرماتے ہیں کہ "جان محمد از من زیادہ تر قوت علمی حاصل کردہ است و ہنوز طائر ہمتش بلند پرواز است" چنانچہ شیخ عبدالمجید نے آپ کو شیخ تیمور کے سپرد کیا جو لاہور کے نامور علماء میں تھے اور جن کی درس گاہ سے نامور عالم پیدا ہوتے رہے۔ شیخ حامد قادری سہروردی بھی شیخ تیمور ہی کے شاگرد و مرید تھے۔ جن کو صاحب خوارق و کرامات بھی بیان کیا جاتا ہے۔ شیخ تیمور بھی آپ کی قابلیت کا لوہا مان گئے۔ چنانچہ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ آپ نے درس گاہ تیموریہ سے بھی دستار فضیلت حاصل کر لی۔

اب شیخ جان محمد بالکل فارغ التحصیل تھے۔ اور آپ کو بچپن کا وہ وعدہ بھی یاد تھا جو حضرت میاں وڈا کے ساتھ آپ نے اُن کی درس گاہ میں حاضر ہونے کے لیے کیا تھا۔ چنانچہ ایک روز کہ وہ روز سعید تھا آپ حضرت کی خدمت میں گئے۔ حجرہ کے پاس پہنچے، آواز دی، حضرت نے اندر بلایا اور بغل گیر ہو کر ملے اور اپنی مسرت کا اظہار کیا اس کے بعد شیخ جان محمد ہر دو شنبہ اور جمعہ کے دن حضرت کی درس گاہ میں آتے۔ اور تکرار حدیث سے استفادہ کرتے۔ اور جہاں شبہ ہوتا دریافت کرتے۔ جب تک حضرت میاں صاحب زندہ رہے۔ شیخ جان محمد نے اپنے وعدہ میں ایک دن کا بھی ناغہ نہیں کیا۔

چونکہ سنہ پیدائش کا کہیں ذکر نہیں اس لیے معلوم نہیں کس عمر میں آپ نے انتقال کیا۔ البتہ بزمانہ بہادر شاہ شاہ عالم اوّل

خلف عالمگیر ۱۱۲۰ھ/ ۱۷۰۸ء میں آپ وفات پاگئے۔ پہلے پرویز آباد میں کہ آپ کا مسکن تھا آپ کو دفن کیا گیا۔ چند سال کے بعد اس محلے کے نمبردار کے خواب میں جو آپ کا مرید بھی تھا۔ آئے اور فرمایا میری نعش کو یہاں سے نکال کر حضرت میاں صاحب کے مزار کے پاس لے جا کر دفن کرو۔ خواب کے بعد نمبردار نے قبر سے آپ کی نعش کا صندوق نکالا اور حضرت میاں صاحب کے مزار کے پاس دفن کیا۔ آپ کے مزار پر ذیل کے اشعار ثبت ہیں ؂

جہان معنے و جان محمد | کہ از عشق محمد گشت محمود
خرد از فضل حق تاریخ سالش | وصال عاشق معشوق فرمود

خزینۃ الاصفیا (جلد دوم (ص ۱۰۴) میں ایک اور شیخ جان محمد سہروردی کا ذکر ہے۔ وہ شیخ اسمٰعیل المشہور میاں وڈا (میاں صاحب کلاں) کے مرید تھے۔ اور عالم و فاضل اور جامع کمال ظاہر و باطن تھے۔ مسجد قصاب خانہ میں جو آبادی شہر کے باہر ہے درس دیا کرتے تھے ہزار ہا لوگ ان کے چشمہ درس و تدریس سے فیض یاب ہوئے لیکن آپ نے کبھی کسی کے آگے دست سوال دراز نہ کیا۔ اور نہ کوئی اجرت کبھی طلب کی۔ چکی پیس کر گذارہ کیا کرتے تھے۔ شیخ اسمٰعیلؒ کو خبر ہوئی پوچھا گذارہ کی کیا صورت ہے۔ کہا بہر حال شکر ہے "دو بہ آرام تمام سے گذرد" حضرت شیخ اسمٰعیل نے فرمایا مجھے معلوم ہے کہ آپ چکی پیس کر بسر اوقات کرتے ہیں۔ درس بھی اور اس قدر شاقہ محنت بھی۔ یہ مناسب نہیں ہے۔ صاحب خزینۃ الاصفیا لکھتے ہیں کہ شیخ اسمٰعیل نے ایک تعویز فراخی رزق حلال کے لیے لکھ کر دیا۔ آپ تھوڑے ہی دنوں میں دنیا کی نعمتوں سے مستغنی ہو گئے لیکن ان سے عرض کیا کہ مجھے دولت عقبیٰ چاہیے اس دولت کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ اسی وقت آپ حضرت شیخ کے مریدوں میں داخل ہو گئے۔ ۱۰۸۰ھ / ۱۶۶۹ء میں آپ انتقال فرما گئے۔ لاہور سے باہر شرق رویہ مسجد قصاب خانہ قدیم کے متصل آپ کا مزار ہے۔

تحقیقات چشتی میں بھی (ص ۲۴۲ تا ۲۴۶) ان کا حال درج ہے۔ وہاں لکھا ہے کہ آپ مسجد قصاب خانہ کے امام تھے اور چکی پیس کر امامت کرتے اور طلبا کو درس دیتے تھے۔ ۱۰۶۰ھ میں یہ مسجد تعمیر ہوئی۔ لوگوں کی درخواست پر حضرت شیخ اسماعیل نے اپنے مرید شیخ جان محمد کو وہاں درس و امامت کے لیے بھیجا۔ تحقیقات میں سال وفات آپ کا ۱۰۸۲ھ / ۱۶۷۱ء لکھا ہے۔ میاں جان محمد صاحب اولاد تھے۔ ان کی اولاد موضع چک مجاہد (غرب رویہ دریائے چناب) رہتی ہے۔ ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۴ء میں ان کی اولاد سے ایک شخص حافظ درویش یہاں آیا تھا اور وہ میاں احمد الدین سجادہ نشین درس میاں وڈا کو اس مزار کا متولی بنا گیا تھا۔ یہ مسجد اور مزار اب سجادہ نشینان درس میاں وڈا کے ماتحت ہے۔

پیر محمد خاں عدالتی

کر دیا تھا جس نے ویرانہ کو بھی رشک بہار
آج وہ رشک بہار خلد ویراں دیکھئے

جن دنوں نواب شاہ نواز خاں خلف شہر یار الدولہ نواب زکریا خاں حاکم لاہور تھا۔ ان ایام میں پیر محمد خاں عدالتی بہت مشہور شخص گزرا ہے جو اہل لاہور کے دیوانی و فوجداری مقدمات کے فیصلے کیا کرتا تھا۔ اسی لیے وہ عدالتی کے نام سے زیادہ مشہور تھا۔ پیر محمد خاں نے

[illegible]ھ میں ایک وسیع باغ تعمیر کرایا پھر باغ کے اندر ہی اپنا مقبرہ بھی بنوایا جس پر ایک بلند گنبد اب تک اُس کی یادگار موجود ہے۔ [illegible] ہر سال نذرِ خزاں ہوتا تھا اور ہر سال فصلِ بہار پھر اُس کو سرسبز و شاداب کر جاتی تھی لیکن سکھوں کے عہد میں بادِ صرصر کی بجائے [illegible] حوادث کا مقابلہ یہ باغ نہ کر سکا۔ اور آخر تباہ ہو کر بے نشان ہو گیا۔ البتہ مقبرہ ایک خام بدرو کے کنارہ لاٹ صاحب کی کوٹھی گورنمنٹ ہاؤس کے شرق رویہ اس سڑک پر موجود ہے۔ جو میاں میر کی طرف نکل جاتی ہے۔

نواب جانی خاں

ابر گریاں دیکھئے گلہائے خنداں دیکھئے
ہر طرح نیرنگئے گردون گرداں دیکھئے

انتظام الدولہ نواب جانی خاں نواب میر معین الملک کا بھائی اور نواب قمر الدین خاں وزیر احمد شاہ بادشاہ دہلی کا بیٹا تھا جس طرح میر معین الملک کو عام لوگ میر منّو کہتے تھے اسی طرح ممکن ہے جانی خاں کا اصل نام جان محمد خاں ہو۔

بادشاہ کی طرف سے نواب معین الملک پنجاب کا حاکم تھا اور صوبۂ لاہور کہلاتا تھا۔ اس کا بھائی نواب جانی خاں افواج پنجاب کا سپہ سالار تھا۔ احمد شاہ درّانی نے جو حملہ ۱۱۶۲ھ میں لاہور پر کیا ہے۔ اُس کا محاذ بیگم پورہ۔ باغبانپورہ اور حضرت ایشاں تک پھیلا ہوا تھا۔ اسی لڑائی میں نواب جانی خاں ۲۰ رجب کو اپنے ملک کی حفاظت کرتا ہوا نثار ہو گیا۔

معین الملک نے بھائی کا عالیشان مقبرہ تعمیر کرایا۔ مغلوں کے دستور کے مطابق مقبرہ کے چاروں طرف ایک وسیع و عریض باغ بھی تعمیر کیا۔ مقبرہ کی عمارت مربع تھی۔ اندر باہر سے استر کاری اپنے خوبصورت نقش و نگار سے یہ عمارت شاہانِ مغلیہ کی عمارات کی یاد دلاتی تھی۔

لیکن آج پونے دو سو سال کے بعد باغ اور مقبرہ کی کیا حالت ہے۔ مقبرہ کے احاطہ میں ہر چند زمیندار بھوسہ وغیرہ ڈالتے رہتے ہیں لیکن اس بُری بھلی حالت میں بھی وہ موجود ہے۔ لیکن باغ اُس خزاں کی نذر ہو چکا ہے جس کے بعد بہار کا کوئی موسم نہیں آتا۔ جو زمین تختۂ گلزار بنی ہوئی تھی جہاں رنگ برنگ کے گل بوٹے اور قسم قسم کے ثمردار درخت تھے۔ وہاں اب زمینداروں کے ہل چلتے ہیں۔ اور کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ صرف باغ کی پختہ ڈیوڑھی نوحہ خوانی کے لیے موجود ہے۔ سکھوں کے بعد سرکارِ انگریزی نے یہ ڈیوڑھی نزول میں لے لی۔ اور ۱۲۸۲ھ میں یعنی نوے سال کے بعد ہی یہ عالیشان ڈیوڑھی شیرا نامی ایک زمیندار نے ایک سو ایک روپیہ میں خرید لی۔

یہ حشر ہے اُس جلیل المرتبت شخص کی قبر اور اُس کے مقبرہ کے باغ کا جس کے ہاتھ میں تمام صوبہ پنجاب کی کمان تھی اور جس نے لاہور کو اغیار کے حملوں سے بچانے کے لیے اپنی زندگی کو چمکتی ہوئی تلواروں، بال سے باریک نیزہ کی انی اور گرجتی ہوئی توپوں کی نذر کر دیا۔

امیر الامرا بادشاہ گر

شادی و غم باغِ ہستی میں نظر آتے ہیں ساتھ
گُل کو خنداں دیکھیے شبنم کو گریاں دیکھیے

مقبرہ نواب جانی خاں اور مقبرہ پیر سید سراج الدین کے متصل ہی ایک بزرگ حضرت شاہ بخاری[2] کے نام سے آسودہ ہیں۔ اُن کے قریب ہی چند اور قبریں بھی ہیں۔ یہیں ایک ایسے جلیل القدر شخص کا باغ تھا۔ جو اپنے بھائی سید عبداللہ خاں کی طرح بادشاہ تو نہیں تھا مگر تمام ہندوستان کی بادشاہت جس کو وہ چاہتا تھا دے سکتا تھا۔ بہادر شاہ اول بن عالمگیر کے بعد محمد شاہ رنگیلے تک پانچ بادشاہ تخت ہند پر متمکن ہوئے۔ اور ہر بادشاہ کو انہی دونوں بھائیوں کی مدد سے تخت نصیب ہوا۔ یہاں تک کہ محمد شاہ کو بھی جس کا نام بعالم شہزادگی روشن اختر تھا۔ انہی دونوں بھائیوں نے تخت و تاج کا مالک بنایا۔

امیر الامرا کا نام سید حسین علی خاں تھا۔ عہد عالمگیری میں اس کا عروج ہوا۔ عہد فرخ سیر میں ہفت ہزاری امیر الامرا کا خطاب ملا۔ اور سنہ ۱۱۳۲ھ / ۱۷۲۱ء میں دکن کے رستہ میں ایک گہری سازش کی وجہ سے جس میں محمد شاہ بادشاہ بھی شامل تھا قتل ہو گیا۔

جہاں باغ تھا وہاں اب زراعت ہوتی ہے زمیندار ہل چلاتے اور کاشتکاری کرتے ہیں۔ صرف باغ کے اندرونی حصہ کی تین گنبدوں والی ایک مسجد موجود ہے۔ صحن مسجد میں فرش خشتی ہے باغ کی زمین کی وسعت سات بیگھہ تک بیان کی جاتی ہے۔

باغ عالمگیری عہد میں بنا یا اس کے بعد۔ اس کا کچھ پتہ نہیں ملتا۔ حسین علی خاں کی جاہ و منزلت کو دیکھو۔ اور پھر غور کرو کہ اُس باغ کی جہاں اب خاک اُڑ رہی ہے کیا کچھ شان و شوکت ہو گی۔

بیگم پورہ

"باغ بیگم پُر" کی ویرانی کو بھی کیجیے گا یاد
فصل گل میں جب کہیں گلہائے خنداں دیکھیے
بن گئے شاہی محل کس طرح سے عبرت محل
آئیے اور انقلاب حشر ساماں دیکھیے

شاہ عالم بہادر شاہ اوّل کے عہد (سنہ ۱۱۱۹ھ / ۱۷۰۷ء سے ۱۱۲۴ھ / ۱۷۱۲ء) میں بخارا سے ایک نوجوان عبد الصمد خان نام اپنے بزرگ حضرت خواجہ خاوند محمود عرف حضرت ایشاں کے مزار کی زیارت کے لیے وارد پنجاب ہوا۔ یہاں لوگوں نے اس کی بڑی عزت کی۔ وہ علم و فضل کے ساتھ سپاہیانہ اوصاف بھی رکھتا تھا اور بقول صاحب تحقیقات چشتی (ص ۴۴۶) جب وہ لاہور آیا تو اس کے ساتھ بیس سوار

---

[1] یہ پختہ گنبد دار مقبرہ ابھی موجود ہے۔ قبر کے نیچے تہ خانہ میں ہے گنبد کے نیچے تعویذ قبر ہے۔ سنہ ۱۱۴۰ھ / ۱۷۲۷ء میں بعہد محمد شاہ بادشاہ آپ نے وفات پائی۔

[2] اسی روضہ کے متصل بلند کرسی پر شاہ بخاری (وفات سنہ ۱۱۵۰ھ / ۱۷۳۷ء) کی قبر ہے۔

بھی تھے۔

تھوڑا عرصہ لاہور ٹھہر کر وہ دہلی گیا۔ بادشاہ نے اُس کی قدر دانی کی۔ فوج میں اُس کو خاص اعزاز بخشا۔ اور ۱۱۲۲ھ (۱۷۱۰ء) میں بندہ بیراگی کی تنبیہہ کے لیے اُس کو افواج پنجاب کا سپہ سالار بنایا۔ فرخ سیر کے زمانہ (۱۱۲۳ھ (۱۷۱۱ء) تا ۱۱۳۰ھ (۱۷۱۸ء)) میں اُس نے بندہ بیراگی کو گرفتار کر کے دہلی بھیجا۔ محمد شاہ کے زمانہ میں جب اس نے حسین خاں خویشگی (حاکم نواح قصور) کو قتل کر کے اس کی شورش کا قرار واقعی علاج کیا تو نواب عبدالصمد خاں دلیر جنگ کے پہلے خطاب پر سیف الدولہ کے خطاب کا اضافہ ہوا۔ یہی نواب عبدالصمد خان ۱۱۳۲ھ (۱۷۲۰ء) سے ۱۱۳۶ھ (۱۷۲۴ء) تک کشمیر کا گورنر بھی رہا ہے۔

چونکہ حضرت ایشاں اس کے جدِ اعلیٰ تھے۔ اس نے اپنے محلات مزار حضرت ایشاں کے قُرب ہی میں تعمیر کرلیے اُس زمانہ میں یہ مقام شہر لاہور کا ایک بیرونی محلہ تھا اور اس کا نام مغلپورہ تھا۔ اور امرائے شہر کے مکانات زیادہ تر اسی نواح میں تھے۔ اس کی موت ملتان میں ہوئی اور دفن اس کو بیگم پورہ میں کیا گیا۔

اس کے دو فرزند تھے بڑے کا نام نواب زکریا خاں تھا جو باپ سے ناراض ہو کر دہلی چلا گیا تھا اور وہاں سے باپ کے نام نظامت ملتان اور اپنے نام نظامت لاہور کا شاہی حکم محمد شاہ کے دربار سے لے کر آیا تھا۔ زکریا خاں کا پورا نام شہر یار الدولہ خاں بہادر نواب زکریا خاں ہے مگر وہ زیادہ تر نواب خان بہادر خاں اور نواب زکریا خاں کے نام سے مشہور ہے۔ نواب زکریا خاں نواب قمرالدین خاں وزیر احمد شاہ بادشاہ (خلف محمد شاہ) کا داماد اور نواب میر معین الملک عرف میر منو[1] کا جو بعد میں لاہور کا گورنر بھی رہا ہے نانا تھا۔ ۱۱۵۸ھ میں فوت ہو کر باپ کے پہلو میں دفن ہوا۔ اس کی والدہ کا نام نواب بیگم جان تھا۔ اسی کے نام پر بیگم پورہ آباد ہے۔ دوسرے فرزند کا نام نواب خواجہ عبداللہ[2] خاں تھا۔ یہ محمد شاہ اور احمد شاہ کے زمانہ میں گورنر لاہور رہا ہے۔ احمد شاہ[3] ابدالی نے ۱۱۶۱ھ میں جب پنجاب پر حملہ کیا ہے تو لاہور میں اس کو شکست دی تھی۔ اس کی والدہ کا نام نواب شرف النسا بیگم تھا۔ مقبرہ سرو والا میں جو بیگم پورہ کے متصل واقع ہے یہ بیگم دفن ہے۔ نواب بیگم جان نے یہ محل نہیں بلکہ قلعہ تعمیر کرایا۔ محل کا دَور بہت لمبا چوڑا ہے۔ اس کی فصیل کا کچھ حصہ جو دستبرد زمانہ سے محفوظ رہ سکا ہے۔ مقبرہ سرو والا کی طرف کچھ کھنڈروں کی صورت میں اور کچھ دیوار کی صورت میں زبان حال سے کہہ رہا ہے ؎

تعلق کی نہیں لیتے ہم ایسے کتنے ہم ایسے تھے
مگر ہم جیسے تھے ذی جاہ دنیا میں کہ ایسے تھے

بیگم پورہ کے اندر جو عمارات تھیں اور باغ بیگم جان اُس قلعہ نما محل کے اندر جس شان میں تھا ان سب کی مفصل کیفیت تحقیقات چشتی میں درج ہے۔

---

[1] اسی میر منو کے متعلق سکھوں کا یہ پنجابی شعر مشہور ہے ؎

میر منو ساڈی داتری اسی منو دے سوئے — جیوں جیوں سانوں وڈ دا اسی دُونے دُونے ہوئے

[2] اسی نواب کے متعلق لاہور میں یہ زبان زد خلائق ہے ؎

حکومت نواب عبداللہ — نہ چکی رہی نہ چُولہا

[3] احمد شاہ ابدالی نے اس حملہ میں لاہور کو اس قدر لوٹا کہ اس کا ایک ایک سپاہی مالا مال ہو کر گیا۔ مشہور ہے ؎

جو کچھ کھادا لاہ دا — باقی احمد شاہ دا

محلات بیگم پورہ کے دو حصے تھے ایک مردانہ ایک زنانہ۔ دونوں حصوں میں نواب عبدالصمد خاں اور ان کے فرزندوں اور اولاد در اولاد کی قبریں ہیں جو سالہا سال تک لاہور ہی کے نہیں بلکہ مملکت پنجاب کے ناظم یعنی گورنر رہے ہیں۔ اور ایسے بااختیار اور ذی اقتدار کہ کسی پارلیمنٹ کسی کونسل اور کسی اسمبلی کے ماتحت نہ تھے، جو چاہتے تھے سیاہ و سفید کرتے تھے۔ آج ان کے محلات ان کی قبروں ان کی یادگاروں اور ان کی اولادوں کا حال دیکھ کر درد مند دل چوٹ کھائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

گلگونہ اشکے ہیں در دیدۂ خوں بارے
ایں لالہ نے روید در دامن کہسارے

راقم خود بھی تین چار مرتبہ بیگم پورہ اور اس کے نواحات میں گیا ہے۔ گلابی باغ بھی، مقبرہ دائی انگہ بھی دیکھا۔ نواب شرف النساء بیگم کا بلند مقبرہ سرو والا بھی دیکھا۔ دو تین اور حجرے اور مزار اور پرانے آثار بھی دیکھے جن میں ایک حجرہ نواب عبدالصمد خاں کے مرشد کا بھی ہے۔ باقیوں کے نام تک کسی سے معلوم نہ ہو سکے۔ بیگم پورہ کی فصیل کا بیرونی حصہ دیکھا۔ اس کے اندر اس کا بے نام و نشان باغ۔ اس کے بوسیدہ چبوترے اس کے ٹوٹے ہوئے مقبرے، عالیشان مسجد اس کا حوض۔ آسمانی کنواں۔ حمام اور محلات اور ان کی موجودہ بستیوں پر ایک نظر ڈالی اور شکستہ دیواروں، پھٹی ہوئی قبروں ٹوٹے ہوئے چبوتروں۔ اجڑے ہوئے باغ اور پرانے سخت جان چونہ اور مصالح غرض بیگم پورہ کے چپہ چپہ سے دردناک آواز آئی ؎

چند لمحوں کے لیے یہ ساز عشرت روک کر
آپ سن لیں داستان خانہ ویرانی مری

اس داستان خانہ ویرانی کا خلاصہ یہ ہے کہ باغ آج سے دو سو سال قبل اپنے پورے جوبن پر تھا۔ پھول اور میوے شاخوں پر جھومتے اور مہوشان پری رو صبح و شام گھومتے تھے۔ آج وہاں زراعت ہوتی ہے۔ اور کسی کے گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی کہ یہاں کبھی وہ باغ تھا جس کو اس کی بانیہ نے بہار بے خزاں بلکہ سدا بہار سمجھ کر احداث کرایا تھا۔ اور جس کی آبیاری کی یادگار آسمانی کنواں اب بھی ایک دیوار کی اوٹ میں جھاڑیوں، اور کانٹوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ اور جس کے عین درمیان وہ مسجد منقش مرگ کا راہی تک موجود ہے۔ جس کے چار شان دار مینار گو بے درد ہاتھوں نے گرا دیے، لیکن درمیانی بلند گنبد کے اندر سے اب بھی صدائے اللہ اکبر بلند ہو رہی ہے۔

مسجد کے باہر تمام چینی کا کام ہے۔ حوض کے مشرق کی طرف باغ کے اندر ایک چبوترہ تھا جو سفید سنگ مرمر کا تھا اس مرمریں چبوترہ پر ایک قبر نواب بیگم جان کی اور ایک نواب بہو بیگم نواب زکریا خاں کی بیگم کی تھی۔ سردار جوالا سنگھ سنگ مرمر کا تختہ اکھاڑ کر لے گیا۔ قبریں مٹی ہی رہ گئیں۔

سہ حاکمان لاہور کے زمانہ میں بیرون لاہور کی آبادی لوٹ مار کی وجہ سے ہمیشہ معرض خطر میں رہتی تھی اس لیے بیگم پورہ اجاڑ ہو گیا۔ نواب معین الملک اور نواب عبدالصمد خاں نے بندہ بیراگی اور اس کی معتقد جماعت کا چونکہ قرار واقعی انتظام کیا تھا اور ان کو چن چن کر مارا تھا اس لیے جب احمد شاہ بادشاہ دہلی کی موت ۱۷ شعبان ۱۱۶۷ھ مطابق جولائی ۱۷۵۴ء کے بعد مغل حکومت کی رہی سہی ساکھ بھی جاتی رہی تو پنجاب میں سکھوں نے پھر سر نکالا۔ اور لاہور تین سکھ سرداروں (لہنا سنگھ، گجر سنگھ، سوبھا سنگھ) کے ماتحت آگیا اور ان کا نام سہ حاکمان لاہور لکھا جانے لگا۔ سکھ اور بندہ چونکہ نواب معین الملک اور نواب عبدالصمد خاں سے جلے ہوئے تھے اور ان کو میر منو اور

ابو صمد خاں کہا کرتے تھے۔ اس لیے نواب عبدالصمد خاں کی اولاد سے جو لوگ لاہور میں تھے سکھوں نے ان کو تنگ کرنا شروع کیا۔ چنانچہ کئی لوگ لاہور سے باہر چلے گئے۔ ان میں نواب عبداللہ خاں کا فرزند نواب خواجہ عنایت اللہ کابل کو جائے پناہ تصور کر کے وہاں چلا گیا۔ لیکن وطن اور اپنے محلات و مکانات اور جائداد کثیر کی یاد بے چین رکھتی تھی آخر وہاں سے امیر کابل یا کسی وزیر امیر کی سفارش لے کر گجر سنگھ احد الحاکم لاہور کے پاس آیا۔ گجر سنگھ نے سفارش تو مان لی۔ لیکن وہ اس کا لاہور میں رہنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس لیے اس نے اس کو اپنا وکیل حاضر دربار کابل بنا کر واپس روانہ کر دیا۔

میاں خزانہ باحتیاط پورہ کے دو زمیندار دن خدا بخش و مراد بخش کو بیگم پورہ اور اس کی اراضیات آباد کرنے کے لیے لے آیا۔ پھر اور لوگ بھی آئے خدا بخش نے جو کنواں کھدوایا تھا۔ بیگم پورہ کی فصیل کے کھنڈر دروں اور مقبرہ سرو والا کے درمیان اب بھی وہ قدیم مگر بے آباد چاہ ڈول کی صورت میں موجود ہے۔

جب راجہ سنسار چند کٹوچ کانگڑہ والے کو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے لاہور بلایا تو بیگم پورہ کے محلات اُس کو رہنے کے لیے عطا ہوئے سمت ۱۸۷۵ ب میں سنسار چند نے بیگم پورہ جس کا مالیہ سالانہ اُس وقت صرف ایک سو روپیہ تھا اپنے برہمنوں کو دے دیا۔ لہنا سنگھ مجیٹھیہ کے بیٹے دیسہ سنگھ نے بیگم پورہ کے محلات دیکھے تو مچل اٹھا سنسار چند کے برہمن پہاڑ کے رہنے والے تھے دیسہ سنگھ نے اُن کو پہاڑ میں سو روپے کی جاگیر مہاراجہ سے دلوا کر بیگم پورہ پر آپ قبضہ کر لیا۔

اس اثنا میں نواب عنایت اللہ خاں سفیر کابل کا فرزند کلاں نواب غازی خاں کابل سے لاہور آیا۔ سردار دیسہ سنگھ چونکہ ان ایام میں لاہور میں نہ تھا، اس لیے اس نے آتے ہی بیگم پورہ میں سکونت اختیار کر لی۔ لیکن یہ قبضہ زیادہ دیر تک نہ رہا۔ بقول شاعرؔ

ہم نے راحت بھی اگر پائی تو اک آن کی آن

اختر بخت جو چمکا بھی تو جگنو کی طرح

سمت ۱۸۹۵ بکرمی میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حکم سے یہاں چھاؤنی مقرر ہوئی۔ گلاب سنگھ بھونڈیہ کی چار پلٹنوں ایک رجمنٹ سوارن اور سات توپوں نے یہاں اودھم مچایا۔ اس نے یہاں کئی شاہی محلات گرائے اور کئی نئی عمارتیں اپنے مطلب کی بنوائیں۔ اپنا مکان اس نے مسجد کے اوپر بنایا۔ اس مسجد میں جہاں پانچ وقت خدا کا نام لیا جاتا تھا۔ رات دن گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں آنے لگیں[۲] جہاں کہیں سنگ مرمر

---

[۱] اس کے فرزند اول نواب زکریا خاں ناظم لاہور کے دو بیٹے تھے ایک حیات اللہ خاں جس کو بادشاہ نے شاہنواز خاں کا خطاب دے کر ملتان کا نواب بنایا تھا۔ لاہور میں بھی یہ گورنر رہا ہے اس کی رہائش بھی بیگم پورہ ہی میں تھی۔ مدفن اس کا ملتان میں ہے۔ دوسرے فرزند کا نام نواب یحییٰ خاں ہے وہ بھی لاہور کا گورنر رہا ہے۔ ضلع لاہور میں یحییٰ نگر (عرف آبا نگر) اسی کا آباد کردہ ہے۔ وہ بھائی کے خوف سے حیدر آباد دکن چلا گیا سا اس کی اولاد وہیں آباد ہے نواب شاہنواز خاں کی اولاد بھی لاہور میں نہیں ہے اس لیے سکھوں اور ہندوؤں کا سارا زور نواب خواجہ عبداللہ خاں ناظم لاہور کی اولاد پر تھا جو لاہور میں موجود تھی۔

[۲] مسجد کے پانچ کلاں دہرے ہیں۔ رنگ روغن بالکل تر و تازہ معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ بیگم پورہ چھوٹا سا گاؤں ہے۔ مرد و زن کی آبادی سو ڈیڑھ سو سے زیادہ نہیں۔ اس لیے میں جب ۱۳ نومبر ۱۹۴۲ء کو وہاں گیا تو کوئی رونق نظر نہ آئی۔ نماز عصر میں امام کے مقتدی صرف

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نظر آیا، اکھاڑ لیا گیا۔ باغ کو اجاڑ کر میدان بنا دیا گیا۔ ان ایام میں بیگم پورہ چھاؤنی گلاب سنگھ بھوونڈیہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔ خدا بخش نمبردار کو سرقہ بندوقاں کی تہمت لگا کر یہاں سے نکال دیا گیا اور ایک چھوٹے سے باغیچہ کی باغبانی اور حفاظت کے لیے کریم بخش کو ملازم رکھ لیا گیا۔ مولوی نور احمد چشتی مصنف تحقیقات چشتی ۱۸۶۰ء میں اپنی کتاب میں اس باغیچہ اور کریم بخش کی نمبرداری کی موجودگی کا ذکر کرتے ہیں لیکن ۱۹۶۰ء میں راقم نے اس باغیچہ کا کوئی نشان نہیں دیکھا۔ البتہ کریم بخش نمبردار کی اولاد[1] بیگم پورہ میں موجود ہے۔

نواب غازی خاں کے پاس صدہا قبالہ جات اپنی آبائی جائداد خرید کردہ نواب زکریا خاں کے موجود تھے۔ اکثر مکانات پر اس نے قبضہ بھی کیا لیکن کوشش کے باوجود بیگم پورہ کا قبضہ اس کو نہ مل سکا۔ لوگ اس کا بہت ادب کرتے تھے۔ وہ ایک سو سال کی عمر پا کر ۱۲۷۳ھ ۱۸۵۶ء میں فوت ہو گیا۔

چار آدمی تھے۔ ان میں بھی تین مسافر تھے۔ اور واقعی اس مختصر سے گاؤں میں جس کو درحقیقت زبردستی گاؤں بنا لیا گیا ہے۔ وہ رونق کہاں ہو جو لاہور کی دوسری مسجدوں میں ہے ؎

اک زیب چمن اک زیب گلو اور اک پرِ شبنم کے موتی
صحرا میں جو کھل کر مرجھائے اس پھول کی قسمت کیا کہیے

لیکن غیرت الٰہی اس کو اور زیادہ دیر آباد نہ دیکھ سکی اور اس کی آبادی و رونق کا اس مرد خدا کو ذریعہ بنایا جس کے متعلق بیگم پورہ کی یہ مسجد اپنی دھیمی مگر اخلاص بھری آواز میں کہہ رہی تھی۔ ؏

مرد ے از غیب بروں آید و کارے بکند

یہ مرد خدا چوہدری فخرالدین احمد ہیں جو یتیم خانہ و مدرسہ تعلیم الفرقان کے بانی و منیجر ہیں۔ انھوں نے یتیم خانہ کے لیے یہاں دو کنال زمین خرید کر اڑھائی منزل عالیشان عمارت تعمیر کی ہے۔ یہ عمارت مسجد کے بالکل متصل ہے۔ یتیم خانہ میں قریباً سو سوا سو یتیم ہیں۔ ان کی تعلیم کا سلسلہ بھی ہے۔ ان کے لیے استاد بھی ہیں اب یہ تمام یتیم اور یتیم خانہ کا عملہ اس مسجد میں پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہے۔ یا یتیم خانہ کو مخاطب کر کے یہ عالیشان مگر بے رونق مسجد دل ہی دل میں شکر گذاری کے جذبات کے ساتھ کہتی ہو گی ؎

میں ہجر میں مرنے کے قریب ہو ہی چکی تھی
تم وقت پہ آپہنچے نہیں ہو ہی چکی تھی

[1] میاں کریم بخش کے فرزند کا نام الٰہی بخش تھا۔ وہ بھی نمبردار تھا۔ یہ اولاد نرینہ سے محروم تھا۔ اس کی دختر کی اولاد ذکور و اناث کو بیگم پورہ ملا۔ اس کی لڑکی کے تین فرزند چوہدری فقیر محمد، ملک محمد شریف نمبردار، بابو محمد اقبال ہیں۔ تینوں بھائیوں نے فصیل کے اندر اپنی اپنی کوٹھیاں بنائی ہیں مغرب کی طرف جو مکانات ہیں وہ ان کی ہمشیرگان کے حصے میں آئے ہیں۔ درمیانی کوٹھی جس کے سامنے ایک طویل پختہ چبوترہ ہے اور جس پر تین قبریں بھی ہیں بابو محمد شریف نے تعمیر کرایا ہے۔ اسی کے پاس آٹھ در والا ایک چھوٹا سا گنبد تھا جس کے اندر "قدم رسول" تھا جو نواب زکریا خاں کہیں سے لائے تھے سکھوں کے زمانے میں کہیں غائب کر دیا گیا۔ بابو محمد اقبال کی کوٹھی دروازہ کلاں کے متصل ہے۔ ڈیوڑھی بھی انہی کے قبضے میں ہے جس میں سے ہاتھی مع ہودج گزر سکتا ہے اور جس کے اوپر نہایت اچھی نشست گاہ ہے۔ چوہدری فقیر محمد کی کوٹھی زنانہ محل میں بنائی گئی ہے اور اس کے ساتھ ایک خوشنما برآمدہ تعمیر کر کے اس کو وسعت دی گئی ہے۔ اس محل کے اوپر ایک حوض کے نشان ہیں۔ اس کے ساتھ ہی آسمانی کنواں بند پڑا ہے۔ میاں کریم بخش باغبانپورہ کے رہنے والے تھے۔ ان سہ برادران کے دادا کا نام میاں قادر بخش تھا۔ ان کی جائداد بیگم پورہ کے علاوہ باغبانپورہ کوٹ خواجہ سعید میں بھی ہے۔

نواب زکریا خاں اور نواب عبد الصمد دلیر جنگ کی قبروں والے تقرطہ (چبوترہ) سے مغرب کی طرف ایک اور چبوترہ ہے جس پر مندرجہ ذیل پانچ خشتی قبریں ہیں :۔

(۱) نواب خواجہ عنایت اللہ (۲) قلندر شاہ فرزند دوم نواب عنایت اللہ (۳) نواب غازی خاں فرزند اول نواب عنایت اللہ خاں (۴) مائی سہاگن بیگم اہلیہ نواب غازی خاں (۵) صاحب بیگم دختر نواب غازی خاں

نواب خواجہ عبد اللہ خاں کی قبر بھی شرقی رویہ بیگم پورہ موجود ہے۔ وہاں اور بھی دو تین قدیم مقبرے ہیں لیکن شرف النسا بیگم کے مقبرہ کے سوا کسی کا صحیح پتہ نہیں ملتا۔

تحقیقات چشتی میں ۱۸۶۶ء تک نواب زکریا خاں کی اولاد اور اس کی ذریات کا جو ذکر کیا ہے بڑا عبرت ناک ہے۔ ان میں کوئی سلائی کر کے پیٹ پالتا تھا۔ کوئی کوچوانی کرتا تھا کوئی میاں محمد سلطان ٹھیکیدار کے دفتر میں منشی تھا۔ فوجوں میں ملازم ہونے کی وجہ سے چند ایک سفید پوش بھی تھے مگر خاندان کی عام حالت عبرت انگیز تھی ؏

نشان عظمت ایں خاندان چہ می پرسی

بر د کہ آنچہ تو دیدی بجز خیال نماند

بیگم پورہ کا سالانہ مالیہ جو رنجیت سنگھ کے زمانے میں ایک سو روپیہ تھا۔ اب ہزار بارہ سو روپیہ کے قریب ہے۔ دروازہ کلاں کے سامنے ہی شمال کی طرف ایک بہت بڑا ٹیلہ ہے جو درحقیقت بیگم پورہ کی عمارات کا آوا ہے۔ یہ ٹبہ یا ٹیلہ آج محکمہ نزول کے ماتحت ہے اور اس کے دامن میں اقوام جرائم پیشہ کی آبادی ہے جس کے لیے سرکار نے مکانات بنا دیئے ہیں۔ یہ لوگ ریلوے کارخانوں میں نوکر ہیں اور محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ ان کی باقاعدہ نگرانی ہوتی ہے۔ ان کے سپرنٹنڈنٹ اور ان کا عملہ بھی زیریں بڑاوہ کی پختہ عمارات میں رہتا ہے۔

شرف النساء بیگم

مٹ گیا شرف النسا کا باغ بھی تالاب بھی

قبر کا کچھ کچھ نشاں باچشم حیراں دیکھئے

"تیغ و قرآں را جدا از من مکن" تو نے کہا — کاش ان آنکھوں سے پھر وہ تیغ و قرآں دیکھئے

نیرنگ خیال کے اقبال نمبر میں جاوید نامہ پر ایک قابل اہل قلم جناب "چودھری" نے ۲۵ صفحہ میں ایک سیر حاصل اور نکتہ رس مضمون لکھا ہے جس میں شرف النساء بیگم اور اس کی قبر کا ذکر بھی ہے جو درحقیقت مسلمانان پنجاب کی تاریخ کا ایک دردناک منظر ہے۔ شرف النساء بیگم کون تھی اس کے خیالات کیا تھے۔ اس کی قبر کے ساتھ بعد کے حاکموں نے کیا سلوک کیا اس کو جناب چودھری نے نثر میں اور سر محمد اقبال مرحوم نے نظم میں واضح طور پر لکھا ہے۔

لیکن اس مضمون میں ایک تاریخی غلطی ہو گئی ہے۔ جناب چودھری نے شرف النساء بیگم کو جس کا مقبرہ لاہور میں مقبرہ سرو والا کے نام سے مشہور ہے نواب خان بہادر زکریا خاں کی بیٹی اور نواب عبد الصمد خاں کی پوتی لکھا ہے۔ یہ غلط ہے نواب عبد الصمد خاں کے صرف

دو بیٹے تھے نواب خان بہادر زکریا خاں و نواب عبداللہ خاں۔ بیٹی کوئی نہ تھی۔ نواب زکریا خاں کے بھی صرف دو فرزند تھے نواب شاہنواز خاں و نواب یحییٰ خاں۔ شرف النساء بیگم نواب عبدالصمد خاں کی دوسری بیوی اور اُن کے دوسرے فرزند نواب عبداللہ خاں کی والدہ تھی۔ نواب عبدالصمد خاں اور ان کے دونوں بیٹے شاہ عالم بہادر شاہ۔ فرخ سیر اور محمد شاہ کے زمانہ میں باوقات مختلف لاہور کے گورنر رہے ہیں۔ اور ان ایام میں پنجاب کا گورنمنٹ ہاؤس وہ جگہ تھی جہاں آج بیگم پورہ آباد ہے۔ اس گورنمنٹ ہاؤس کی عمارتوں کے کھنڈروں اور اس کی قبروں اور مسجدوں کا حال بیگم پورہ کی تفصیلات میں قبل ازیں لکھا جا چکا ہے۔ انہی میں ذرا فاصلے پر نواب شرف النساء بیگم کا مقبرہ بھی سرو والا مقبرہ کے نام سے موجود ہے۔

یہ مقبرہ ایک بلند چبوترہ پر ہے۔ اس سے مغرب کی جانب بیگم پورہ کی منہدم فصیل ہے۔ جس کے دس محرابی درے اب تک سلامت ہیں۔ فصیل کی دیوار میں ان محرابوں کے کھلے رہنے کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی۔ کوئی کہتا ہے چونکہ اس طرف زنانہ محلات تھے اس لیے فصیل کے اندرونی حصہ میں بھی باغ تھا اس باغ کا ذکر مؤرخین لاہور نے بھی کیا ہے۔ اور فصیل سے باہر بھی چونکہ تالاب اور باغ تھا اس لیے فصیل کے یہ محرابی درجو آج تک چشم حیراں کی طرح کھلے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف کی آمد و رفت کے لیے رکھے گئے تھے۔

اسی طرف شرف النساء بیگم نے اپنے چھوٹے سے باغیچہ میں جس کے پہلو میں ایک تالاب بھی تھا۔ اپنا چبوترہ عبادت الٰہی کے لیے تعمیر کرایا۔ سیڑھی لگا کر وہ اس چبوترہ پر جا بیٹھتی اور ہر روز صبح کی نماز کے بعد وہیں تلاوت کرتی۔ وہ اپنے پاس ہمیشہ ایک مرصع تلوار بھی رکھا کرتی۔ وہ تیغ یا قرآن اور قرآن یا تیغ کو نہ صرف اپنا بلکہ ہر مسلمان کی نجات کا ذریعہ سمجھتی تھی۔ تلاوت کے بعد وہ قرآن شریف اور تلوار وہیں چھوڑ کر آپ چبوترہ سے نیچے اُتر آتی۔ اس متقی اور شجاع عورت نے آخری دم تک اپنا یہی معمول رکھا۔ جب اُس نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا تو اس کی وصیت کے مطابق اسی چبوترہ میں اس کو تیغ و قرآن کے ساتھ دفن کیا گیا۔

اس کی وفات کے بعد اس کی قبر پر گنبد تعمیر کیا گیا۔ جس پر کلمات الٰہی بھی درج ہیں۔ گنبد کی تین اطراف بند کر کے اُن پر سبز رنگ میں سرو کے درخت بنائے گئے ہیں جن سے اس مقبرہ کا نام سرو والا مقبرہ مشہور ہو گیا۔ گنبد کاشی کار اور منقش ہے۔ اس مقبرہ کے مغرب کی طرف پانی کی ایک کھائی اور سرکنڈے ہیں۔ جہاں باغ اور تالاب تھا۔ وہاں اب زراعت ہوتی ہے۔ چبوترہ کے متصل صرف ایک شیشم کا درخت کھڑا ہے۔

حکومت مغلیہ کی کمزوری اور افغانی حملہ آوروں کی یلغاروں اور امرائے دربار کی باہمی آویزشوں سے جب پنجاب میں بدامنی کا دورہ شروع ہوا تو جس طرح اور اسلامی عمارات و قبور کی شامت آئی شرف النساء بیگم کا مقبرہ بھی اس خیال سے کھودا گیا کہ اس کا چبوترہ جو بلند ہے تو اس کی کوئی خاص وجہ ہے اور یہاں ضرور خزانہ چھپا ہے لیکن یہاں تلوار اور قرآن اور نعش کے سوا کیا رکھا تھا۔ ناخدا ترسوں نے قبر کو پھر بند کر دیا۔ اور معلوم نہیں تلوار خصوصاً قرآن کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ گورنمنٹ انگریزی نے ۸۲-۱۸۸۱ء میں ازسرنو اس کی مرمت کرائی۔ سرکار انگریزی نے جس طرح دیگر قدیم شاہی عمارات اور مقبروں پر ان کی حفاظت کے لیے بورڈ لگا رکھے ہیں۔ یہاں بھی ایک بورڈ لگا ہوا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ اس مقبرہ کو خراب کرنے والا سزا اور قید دونوں کا مستحق ہوگا لیکن ؎

اب کیا رہا ہے جس پہ رقیبوں کو غم کریں

علامہ اقبال مرحوم نے جاوید نامہ میں شرف النساء کا جو محل جنت میں دکھایا ہے وہ لعل ناب سے تعمیر ہوا ہے جو اپنی ضو فشانی میں آفتاب سے خراج وصول کرتا نظر آتا ہے فرماتے ہیں ؎

قلزم ما ایں چنیں گوہر نہ زاد ہیچ مادر ایں چنیں دختر نہ زاد

خاک لاہور از مزارش آسماں کس نداند راز اُو را در جہاں

اقبال مرحوم نے یہ نظم بڑی طویل اور بڑے دل نشین اور موثر انداز و الفاظ میں لکھی ہے۔ ماں کو جو آخری وصیت اس نے کی اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے ؎

برلب او چوں دمِ آخر رسید ۔۔۔ سوئے مادر دید و مشتاقانہ دید
گفت اگر از رازِ من داری خبر ۔۔۔ سوئے ایں شمشیر و ایں قرآں نگر
ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند ۔۔۔ کائناتِ زندگی را محور اند
اندریں عالم کہ میرد ہر نفس ۔۔۔ دخترت را ایں دو محرم بود و بس
وقتِ رخصت با تو دارم ایں سخن ۔۔۔ تیغ و قرآں را جدا از من مکن
مومناں را تیغ با قرآں بس است ۔۔۔ تربتِ ما را ہمیں ساماں بس است

پھر مولانا روم کی زبان سے فرماتے ہیں : ؎

عمرہا در زیرِ ایں زرّیں قباد ۔۔۔ بر مزارش بود شمشیر و کتاب
مرقدش اندر جہانِ بے ثبات ۔۔۔ اہلِ حق را داد پیغامِ حیات
تا مسلماں کرد با خود آنچہ کرد ۔۔۔ گردشِ دوراں بساطش در نورد
مردِ حق از غیرِ حق اندیشہ کرد ۔۔۔ شیرِ مولا روبہی را پیشہ کرد
از دلش تاب و تبِ سیماب رفت ۔۔۔ خود بداں آنچہ در پنجاب رفت
خالصہ شمشیر و قرآں را ببرد ۔۔۔ اندراں کشور مسلمانی بمرد

حضرت شاہ محمد غوث

شہ محمد غوث کی ہے بارگہ وہ جائے امن
خفتگانِ قبر جس کے زیرِ داماں دیکھئے

حضرت شاہ محمد غوث کا شجرہ نسب سترھویں پشت تک حضرت سید محی الدین عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے۔ آپ کے دادا سید عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ گیلان سے مختلف ممالک اسلامیہ کی سیر کرتے ہوئے پشاور آ کر مقیم ہو گئے۔ آپ کے فرزند سید حسن اسی لحاظ سے پشاوری کہلاتے ہیں اور سید حسن پشاوری کے فرزند اول حضرت شاہ محمد چونکہ مختلف ممالک کی سیاحت کے بعد لاہور ہی میں اقامت اختیار کر چکے تھے اس لیے وہ لاہوری کہلائے اور حضرت سید حسن کے فرزند دوم شاہ محمد فاضل نے جن کا مزار سری نگر کے محلہ خانیار میں زیارت دستگیر کے اندر ہے کشمیر میں سکونت کر لی تھی اس لیے وہ اور ان کی اولاد سب کشمیری کہلا رہے ہیں۔

رسالہ غوثیہ حضرت شاہ محمد غوث کی تصنیف ہے اس میں آپ لاہور آنے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "چوں من بہ تلاش حق در لاہور رسیدم شب در مقبرہ عالیہ میاں میر لاہوری کہ پیر لاہور است مے گذرانیدم۔ شبے حضرت میاں میر بر من ظاہر شدند و توجہ مصروف فرمودہ شغلے عطا کردند" پھر حضرت کے ارشاد غیبی کے مطابق آپ دوسرے دن حضرت شیخ حامد کے پاس پہنچے جو مزار حضرت علی ہجویری

معروف داتا گنج بخش کے متصل رہا کرتے تھے اور لاہور کے خدا رسیدہ بزرگ تھے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ بزمانہ شاہجہان ۱۰۴۵ھ (۱۶۳۵ء) (یعنی وفات حضرت میاں میر) کے بعد لاہور میں تشریف لائے ہیں۔ حضرت شاہ دولہ جن کے نام پر پنجاب میں شاہ دولہ کے چوہے مشہور ہیں آپ کے ہمعصر تھے۔ حضرت شاہ دولہ (وفات ۱۰۷۵ھ (۱۶۶۴ء) یا ۱۰۸۰ھ (۱۶۶۹ء)) کا مزار گجرات میں مرجع خلائق ہے۔ حضرت شاہ محمد غوث کی وفات کا سال تحقیقات چشتی میں ۱۰۷۷ھ (۱۶۶۶ء) تاریخ لاہور اور خزینۃ الاصفیاء میں ۱۱۵۲ھ (۱۷۳۹ء) درج ہے۔ تحقیقات چشتیہ میں قطعہ بھی سال وفات کا درج ہے۔

که بُد در سیدان دیں مرتاض ... محمد غوث پیر رہنمائے

ندا آمد کہ "سید پیر فیاض" ... بتاریخ وصال آں شہِ دیں

سید پیر فیاض سے ۱۰۷۷ھ نہیں بلکہ ۱۱۷۶ھ (۱۷۶۲ء) برآمد ہوتے ہیں کتابت کی غلطی نے ۱۱۷۶ھ کو ۱۰۷۷ھ بنا دیا ہے خزینۃ الاصفیاء میں بھی سال وفات کا حسب ذیل قطعہ درج ہے جس سے ۱۱۵۲ھ نکلتے ہیں ؎

سالِ وصل آں وصیِ متقی ... چو محمد غوث رفت از سے

ہم بہ فرما راہ بر سید سخی ... عارف مخدوم سالک کن رقم

اور لطف یہ ہے کہ یہ دونوں تاریخی قطعات مفتی غلام سرور مصنف خزینۃ الاصفیاء کے طبعزاد ہیں۔ معلوم نہیں اس یک بام و دو ہوا کا کیا باعث ہے۔

مصنف تحقیقات چشتی (ص ۱۵۲) لکھتے ہیں حضرت کی وفات کو آج ایک سو چار سال کا عرصہ گذر چکا ہے۔ مصنف[1] نے اپنی یہ کتاب ۱۲۸۲ھ میں تصنیف کی ہے۔ ۱۲۸۲ھ سے ۱۰۴ سال منہا کرنے کے بعد ۱۱۷۸ھ برآمد ہوتے ہیں اور جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے مصنف مذکور نے ان کا سال وفات ۱۱۷۶ھ لکھا ہے۔ راقم کی کتاب یادرفتگاں میں بھی آپ کا سال وفات ۱۱۷۶ھ درج ہے۔ ایک سال کا فرق کچھ زیادہ نہیں ہے۔ بہر حال سال وفات ۱۱۷۶ھ ہے یا ۱۱۷۷ھ لیکن ۱۰۷۷ھ یا ۱۱۵۲ھ غلط ہے۔ آپ کی وفات شاہ عالم ثانی کے زمانہ میں ہوئی ہے۔

تحقیقات چشتی میں یہ بھی لکھا ہے کہ جہاں آپ کا مزار ہے وہاں فدائی خاں[2] کو کہ عالمگیری کی حویلی تھی۔ فدائی خاں کا انتقال ۱۰۸۹ھ (۱۶۷۸ء) میں ہوتا ہے۔ یہ وہی فدائی خاں ہے جس کے اہتمام سے ۱۰۸۴ھ (۱۶۷۳ء) میں لاہور کی بادشاہی مسجد تعمیر ہوئی تھی۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ۱۰۸۴ھ یا فدائی خاں کی وفات (۱۰۸۹ھ) سے حضرت شاہ محمد غوث کی وفات ۱۱۷۶ھ کے

---

[1] مولوی نور احمد چشتی سال پیدائش ۱۲۴۴ھ سال تصنیف تحقیقات چشتی بعمر ۳۸ سال ۱۲۸۲ھ طباعت کتاب بار اوّل بعد از وفات مصنف ۱۲۸۶ھ طباعت بار دوم ۱۳۲۴ھ۔

[2] اصل نام مظفر حسین تھا۔ دور شاہجہانی میں اس نے عروج حاصل کرنا شروع کیا۔ سنہ ۲۳ جلوس میں شاہجہان نے اس کو فدائی خاں کا خطاب عطا کیا۔ عالمگیر کے زمانہ میں کوکلتاش (کوکہ) ہونے کی وجہ سے اس کا ستارہ اقبال اور بھی چمکا۔ پھر دارا شکوہ اور سلیمان شکوہ کی مہم پر عالمگیر نے اس کو بھیجا۔ سنہ ۱۳ جلوس عالمگیری میں وہ لاہور کا گورنر ہوا۔ سنہ ۱۲ جلوس میں بنگال کا اور سنہ ۱۹ جلوس میں بہار کا گورنر مقرر ہوا اور یہیں ۹ ربیع الآخر ۱۰۸۹ھ کو انتقال کر گیا۔

درمیان فدائی خاں کی حویلی جس میں عہد مغلیہ کے بعض گورنر رہائش بھی رکھتے تھے۔ زوال مغلیہ اور نادر شاہی اور احمد شاہی حملوں کی وجہ سے بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ چکی ہوگی اور یہیں حضرت نے اپنے ڈیرے ڈال لئے ہوں گے اور یہیں بعد وفات آپ کا مزار بھی بنا۔

حضرت شاہ محمد غوث علوم ظاہر و باطن میں صاحب کمال تھے۔ ان کے وجود مبارک سے مسلمانوں کو یقیناً دینی و دنیوی نعمتیں حاصل ہوئی ہوں گی اور آپ کے اخلاق اور آپ کی تعلیمات سے یقیناً بہت لوگوں نے اسلام قبول کیا ہوگا۔ لیکن آپ کے تذکرہ نویسوں نے ان کی چند کرامتوں کے سوا ان کے سوانح زندگی کے متعلق اور کچھ نہیں لکھا۔

ان کی ایک کرامت جو مفتی غلام سرور مصنف خزینۃ الاصفیا اور مولوی نور احمد مصنف تحقیقات چشتی نے ان کی وفات کے بعد اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے وہ ذیل میں درج کی جاتی ہے: —

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے پوتے اور مہاراجہ کھڑک سنگھ کے ولی عہد کنور نونہال سنگھ نے ایک فرنگی ونٹورا یا ڈلاروس کی صلاح سے بیرون شہر کے متصلہ مکانات اور بیرونی درختوں کو منہدم کرانا اور کٹوانا شروع کر دیا۔ اس زمانہ میں مہاراجہ کھڑک سنگھ اپنے فرزند کنور نونہال سنگھ اور وزیر جموں دھیان سنگھ کے ہاتھوں بے دست و پا تھا اور نونہال سنگھ ہی سب کا سیاہ و سفید کرتا تھا۔ چنانچہ اس کے حکم سے بہت سی عمارتیں منہدم ہو گئیں اور ہزارہا درخت جڑ بنیاد سے قطع کر دیئے گئے۔ اسی سلسلہ میں حضرت کے مزار کی بیرونی چار دیواری بھی منہدم کر دی گئی۔ مسلمانوں نے بہت واویلا کیا اور درخواستیں دیں کہ اس متبرک خانقاہ کے انہدام سے مسلمانوں کا دل نہ دکھایا جائے۔ لیکن مسلمانوں کے شور و پکار کی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ ابھی اندرونی چار دیواری کے گرانے کی نوبت نہ آئی تھی کہ مہاراجہ کھڑک سنگھ جو در اصل اپنے ناخلف فرزند کی قید میں تھا اور اسی کے اشارے سے اس کی موت بھی واقع ہوئی انتقال کر گیا۔ دوسرے دن جب کنور نونہال سنگھ اپنے باپ کی نعش سپرد آتش کر کے واپس آ رہا تھا تو روشنائی دروازہ متصل قلعہ سے دیوار کا کچھ حصہ اور ایک سنگ عظیم کنور نونہال سنگھ اور میاں اودھم سنگھ خلف مہاراجہ گلاب سنگھ کے سر پر گرا جس سے دونوں اسی رات کو انتقال کر گئے۔

یہ واقعہ اتفاقیہ تھا جیسا کہ بعض کے خیال میں ماتمی توپوں کی آواز سے دیوار ہل گئی تھی۔ یا کسی سازش کا نتیجہ تھا جس میں مہاراجہ گلاب سنگھ کو بھی متہم کیا جاتا ہے۔ بہرحال حضرت کا مزار انہدام سے بچ رہا بلکہ قطع درختاں و انہدام عمارات کا کارخانہ ہی درہم برہم ہو گیا اور اس بات کی ایک عام شہرت ہو گئی کہ وہ نونہال باغ نوجوانی اس بزرگ کے مزار کی گستاخی کی سزا بھگت کر حکمرانی و بادشاہی کی ہزاروں حسرتیں دل میں لیے ہوئے اس دنیا سے ناشاد و نامراد گیا۔

رنجیت سنگھ کے عہد میں جب لاہور کے گرد گہری خندق بنی تو آپ کا مزار اب خندق آ گیا جب انگریزی عہد میں خندق بھری گئی تو خندق کی جگہ باغ بنا دیا گیا۔ تحقیقات چشتی میں لکھا ہے کہ اب یہ مزار گول سڑک (سرکلر روڈ) اور باغیچہ مختار الدولہ دیوان اجودھیا ناتھ کے باغ کے درمیان واقع ہے۔ اور گول سڑک سے مغرب کی سمت ہے۔ دیوان اجودھیا ناتھ کے باغ کا جو حضرت شاہ محمد غوث کے مزار کے ساتھ تھا۔ اب کوئی پتہ نہیں ہے۔ تحقیقات چشتی کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ مزار کی کاہ ن چار دیواری کی غربی دیوار کے ساتھ باغیچہ دیوان کی چار دیواری تھی۔

مشرق کی طرف اس مزار کے احاطہ کے تین دروازے ہیں درمیانہ دروازے کے جنوب میں چاہ چرخی دار اور اس کے ساتھ مسافروں اور زائرین کے لیے ایک کمرہ ہے۔ اس دروازے کے سامنے پانی کا مربع حوض ہے۔ جو عرصہ سے بند تھا۔ میاں غلام نبی کاشمیری کو خیبر سوداگر پشمینہ

نے اس کو نئے سرے سے آراستہ کرا کر اس کے درمیان فوارہ نصب کرایا۔ حوض[1] کے ساتھ ایک پختہ مسجد تعمیر کرائی جس کا صحن بھی کھلا ہے اور جس کے اندر بھی تین طویل صفیں نمازیوں کی آسکتی ہیں۔ مسجد کے درمیانہ طاق پر سطر اول میں "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" لکھا ہوا ہے۔ اس کے نیچے یہ دو شعر ہیں ؎

سالِ بنا گفت دلِ از روئے دیں | مسجد زیبائے غلام نبی
پئے تعمیر مسجد گشت تاریخ | عبادت خانۂ زیبائے اعلیٰ

شاہ ابوالمعالی کے مزار کی طرح یہاں بھی کافی تعداد میں کبوتر رہتے ہیں۔ مزار کی اندرونی چار دیواری کا دروازہ کلاں جنوب اور دروازہ خورد مشرق کی طرف ہے۔ حضرت کا مزار ایک بلند چبوترہ پر واقع ہے۔ اس چار دیواری کے اندر سنگِ مرمر کا فرش ہے۔ مزار کے گرد ہشت پہلو پنجرہ سنگِ مرمر کا ہے۔ دو مزار ہیں جو مزار کسی قدر بلند ہے وہ آپ کا ہے دوسرا مزار آپ کی اہلیہ محترمہ کا ہے۔ دونوں قبروں پر غلاف پڑے رہتے ہیں۔ مزار کے سرہانے چند اشعار تحریر ہیں۔ مغرب کی جانب زائرین کے بیٹھنے اور ورد وظائف کے لیے تین دروں والا ایک حجرہ ہے اور شمال کی طرف چار دروں والا دوہرہ کمرہ ہے۔ جہاں اکثر لوگ قرآن شریف کی تلاوت کیا کرتے ہیں۔ مسجد کے پاس سے شمالی جانب ایک تنگ سا راستہ آتا ہے اس کے آگے ایک احاطہ میں افغانی شہزادوں کی قبریں ہیں۔ اور دوسرے احاطہ میں جو ذرا بلندی پر ہے ——— خان بہادر ڈپٹی محمد برکت علی خاں مرحوم[2] اور ان کے اعزہ کی قبریں ہیں۔ شہزادوں میں ایک قبر سردار احمد علی خاں ولد سردار محمد علی خاں درانی اولاد میر شیر علی خاں مرحوم والیٔ افغانستان کی ہے۔ تعویذ قبر پر کلمات اللہ درج ہیں۔ مشرقی جانب ۱۲ اشعار ہیں۔ تین اشعار ذیل میں درج ہیں ؎

سفر کرد سردار احمد علی | ازیں دارِ حادث بہ ملکِ قدم
ز ابنِ محمد علی خاں بدانست | جدش شیر علی خان والا ہمم
بر آمد بہ فالِ حسن سالِ حالی | کہ احمد علی خاں امیرِ ارم

ایک قبر سردار ولی محمد خاں خلف امیر دوست محمد خاں درانی (وفات ۹ جمادی الاولیٰ ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۹ء) کی ہے۔ جس پر آیات کے علاوہ مغرب کی سمت کچھ شعر بھی ہیں۔ ایک قبر سردار محمد اسمٰعیل خاں خلف سردار محمد امین خاں والیٔ قندھار ولد امیر دوست محمد خاں مرحوم فرمانروائے افغانستان کی ہے جس پر لکھا ہے درزمان حبس بمقام برج ثمن قلعہ لاہور یوم شنبہ ۱۷ صفر ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے نظر بندی کی حالت میں وفات پائی تھی۔

مزار سے مشرق کی طرف جہاں کبوتر خانہ ہے عام قبرستان ہے۔ ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۷ء میں یا اس سے قبل بقول صاحب تحقیقات چشتی چوالیس قبریں سادات وغیرہ کی موجود تھیں اور پچاس درخت بیری گوندی، کیکر وغیرہ کے تھے لیکن اب تو صرف ایک درخت برگد کا موجود ہے۔ برگد کا ایک اور بہت بڑا درخت ہمارے دیکھتے دیکھتے کاٹ دیا گیا۔ اس قبرستان میں عام مُردے دفن نہیں ہوتے بلکہ خاص خاص

---

[1] یہ حوض پہلے کھلے صحن کے درمیان میں تھا اور سطح زمین سے گہرا ہونے کی وجہ سے صفائی کے وقت پانی نکالنے میں دقت پیش آتی تھی۔ اب متولیوں نے اسے ایک گوشے میں کر کے قدرے اونچا کر دیا ہے ——— مرتب

[2] سال ولادت ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۰ء وفات دوشنبہ ۵ جمادی الثانی ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء بعمر ۸۷ سال

لوگوں کو اور وہ بھی بدقت جگہ ملتی ہے پرانی قبروں میں سے چند قبریں موجود ہیں جن میں چار قبریں ایک چھوٹے سے احاطہ میں ہیں دو پر نام بھی درج ہیں۔ ایک پر خواجہ سید محمد شاہ صاحب نقشبندی وفات ۱۲۵۶ھ اور یہ شعر درج ہے ؎

جبریل خرد ہے وہ آتش پر خوش آورد   فردوس بریں است وطن گاہ محمد

دوسری قبر ان کے فرزند خواجہ سید عبدالرحمٰن نقشبندی وفات ۱۲۸۹ھ / ۱۸۷۲ء کی ہے۔ دونوں قبروں کے تعویذ جن پر یہ کتبے درج ہیں مرمریں ہیں۔ اس قبرستان کی چار اور قبریں قابل ذکر ہیں۔ ایک قبر شاہزادہ محمد قشمشم رسالدار میجر خلف شاہزادہ سلطان سعد نبیرہ احمد شاہ درانی کی ہے جس پر شاہزادہ سلطان علی سلطان کے بارہ شعر درج ہیں۔ چار حسب ذیل ہیں ؎

محمد قشمشم جوان رشید   زضرب تفنگ غارد شد شہید
بہ ہنگام شب سلوت ہشت بود   کہ در لکھنؤ ہم چو بسمل طپید
بہ تاریخ ہشتم ز ماہ مئی   ز دنیا بہ سوئے جناں آرمید
یکایک ز ہاتف ندا شد بلند   کہ مغفور شد آں جوان سعید
۱۳۲۶ھ (۱۹۰۸ء)

ایک قبر حاجی معراج الدین پتھر والہ کی والدہ اور ایک اُن کی اپنی ہے۔ والدہ کی قبر پر سرہانے کی طرف کتبہ کی جانب یہ شعر ہے ؎

ہُو کا عالم ہے وہاں ہائے خیلہ گاہ تیرے بغیر   ہائے کیا سنسان ہے وہ گھر ترا تیرے بغیر

حاجی معراج الدین (وفات ۱۰ مئی ۱۹۴۳ء) کی قبر پر علامہ اقبال کے اشعار کے علاوہ ذیل کے دو شعر بھی ہیں ؎

مرنے والے ہو تجھے گلشن فردوس نصیب   ہر گھڑی فضل خداوند رہے تیرے قریب
شامل حال ہمیشہ ہو عنایت اس کی   تیری تربت پہ برستی رہے رحمت اس کی

سید بہادر شاہ عجائب روزگار (قلمی کتابیں اور فرمان شاہی بیچنے والے، وفات ۱۳۱۲ھ) اور مولانا محمد اشرف علی امام مسجد حضرت شاہ محمد غوث وفات ۴ اگست ۱۹۴۳ء کی قبریں بھی یہیں ہیں۔ ان کے علاوہ خانصاحب مولوی محمد الدین کاشمیری بی۔ اے ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ و فیلو پنجاب یونیورسٹی کی قبر بھی اسی جگہ ہے۔ مولینا نہایت ہمدرد ہیڈ ماسٹر اور محکمہ تعلیم پنجاب کے لیے باعث فخر تھے۔ ۲ صفر ۱۳۴۹ھ مطابق ۴ جولائی ۱۹۳۰ء کو وفات پا گئے۔ آپ کے مزار پر اشعار ذیل درج ہیں ؎

محمد دین خانصاحب ثناخواں   قدم بکشاد برآواز رضواں
چو بودہ رکن دار العلم پنجاب   رسانیدے بہ ملک خویش فیضاں
محمد دیں ہے دین محمد   نمودہ جان و دل بر ذات قرباں
حلیم الطبع صالح نیک کردار   بجان و دل ہی خواہ عزیزاں
تعجب نیست کز درد جگر مرد   کہ عمرے بود ہمدرد مسلماں
خدایا اجر اعمالش عطا کن   بفردوس بریں دارش مہماں
رقم زد کلک ہاتف سال رحلت   رضی اللہ عنہ عبد یزداں
۱۳۴۹ھ

ان کے علاوہ اور بھی چند اشعار ہیں۔

خان بہادر چوہدری رحمت اللہ خاں لاہور شہر کے نیک نام اور ہر دلعزیز کوتوال تھے۔ ۲ جمادی الثانی ۱۳۳۲ھ مطابق ۲۸ مئی ۱۹۱۴ء کو انتقال فرما گئے۔

ان کی قبر پر ذیل کے اشعار درج ہیں ؎

آہ ناگہ زجام دہر کشید	شربت کل من علیہا فان
در جنت شتاب بکشادند	رفت یکدم بہ سوئے باغ جناں
تیرگی در جہاں ہویدا شد	رُخ بہ پوشید نیّر رخشاں
در سر جاں گذشت صدافسوس	ہست تاریخ "سیر جنت ایں خاں" ۱۳۲۲ھ

[اسی احاطے میں میاں فیروزالدین احمد کی آخری آرام گاہ ہے۔ وہ مشہور قومی کارکن اور نڈر سپاہی تھے بچپن سے وفات تک مسلمانوں کی خاطر رشتا اور ہر آڑے وقت میں ان کے کام آتے رہے۔ وہ تحریک خلافت کے زمانے میں علی برادران کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے ایک رضاکار کی حیثیت سے میدان عمل میں اس وقت کودے جب ابھی بالغ بھی نہیں ہوئے تھے۔ علماء نے فوج اور پولیس کی نوکری کو حرام قرار دیا تو وہ نہایت جرأت اور بے باکی سے فوجی چھاؤنی میں فتوے تقسیم کرنے چلے گئے اور بغاوت پھیلانے کے جرم میں قید کر دیئے گئے۔

۱۹۲۱ء میں ان کو پنجاب خلافت کمیٹی کا سیکرٹری اور آل انڈیا خلافت ورکنگ کمیٹی کا رکن منتخب کیا گیا۔ لاہور کے بریڈلا ہال میں جمعیت العلمائے ہند کانفرنس ہوئی تو مولانا ابوالکلام آزاد نے میاں فیروزالدین احمد کو مولانا محمد علی رجمنٹ کے نام سے رضاکاروں کی ایک جمعیت مرتب کرنے اور اجلاس کو کامیاب بنانے کا پہلا انعامی تمغا عطا کیا۔

۱۹۲۸ء میں علی برادران نے ان کو خلافت اور کانگرس کے مشترکہ اجلاس کلکتہ کو کامیاب بنانے کے لیے لاہور سے مدعو کیا۔ نہرو رپورٹ کے خلاف انھوں نے اپنے رفقاء کے ساتھ لاہور میں چھپن فیصدی حقوق کا مطالبہ شروع کیا اور آخر نہرو رپورٹ کو دریائے راوی میں غرق کر کے چھوڑا۔ لکھنؤ قیصر باغ کی آل انڈیا یونٹی کانفرنس میں وہ مولانا ظفر علی خاں کے ساتھ پنجاب کی طرف سے شریک ہوئے۔

شہید گنج تحریک میں بھی وہ پیش پیش تھے۔ باغ بیرون موچی دروازہ کے پبلک جلسوں میں آپ نے سر ہربرٹ ایمرسن گورنر پنجاب کو ان کی سکھ دوستی کی وجہ سے "سر ایمر سنگھ" کا خطاب دیا اور اس سلسلے میں جیل بھیج دیئے گئے۔ ایک مرتبہ انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک متحدہ پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے لیے مجلس اتحاد ملت کی بنیاد رکھی۔ یہ مجلس انگریزی حکومت کی اس حکمت عملی کا جواب تھی کہ "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو"۔ یہ ہندوؤں کے لیے بھی ایک زبردست ہوا تھی۔

جب قائداعظم محمد علی جناح نے مسلم لیگ میں نئی روح پھونکنے کی مہم چلائی تو لکھنؤ کے اجلاس میں میاں فیروزالدین ہی نے پہلی دفعہ "قائداعظم محمد علی جناح" کا نعرہ لگایا جسے سب نے پسند کیا اور محمد علی جناح کی منظوری سے یہ خطاب ان کے نام کا جزو بنا دیا گیا۔ اسی بنا پر میاں فیروزالدین احمد کو "نقیب ملت" کہا جاتا تھا۔ مگر ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۲ء کو ملت کے اس نقیب کی آواز ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔ میاں فیروزالدین احمد اب ہم میں موجود نہیں مگر ہر پاکستانی کے دل کے ساز میں ان کی گرمی آواز موجود ہے اور جب تک قائداعظم کا نام زندہ ہے میاں فیروزالدین احمد کا نام بھی زندہ رہے گا۔

حضرت شاہ محمد غوثؒ کے مزار کے مغرب کی طرف شاہزادگان کابل کی قبروں کے پاس میونسپل پرائمری سکول ہے جہاں رات کو علوم شرقیہ کی پڑھائی ہوتی ہے۔ اس سکول اور دارالعلوم السنہ شرقیہ کا دروازہ اور برآمدہ میونسپل باغ کے اندر ہے۔ اب اس کے آگے پختہ سڑک بن گئی ہے۔

مزار کے شمال کی طرف کسی زمانے میں مولانا محمد حسین آزاد دہلوی کا کتب خانہ تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد وہاں مسلمانوں کے مشہور انگریزی اخبار پنجاب آبزرور (بعد میں ابزرور) کا دفتر قائم ہوا جس کی ادارت میں سر شیخ عبدالقادر اور ملک برکت علی شریک رہے ہیں۔ یہ عمارت دو منزلہ تھی جو عرصے سے منہدم ہو چکی ہے۔ اب اس کی جگہ یک منزلہ عمارت ہے جس میں میونسپل ریڈنگ روم اور لائبریری قائم ہے ——— مرتب]

عہدِ حکومتِ خالصہ

[احمد شاہ ابدالی کے پے در پے حملوں کے بعد جب سلطنتِ تیموریہ کا شیرازہ بالکل بکھر گیا، مرہٹوں کی طاقت پانی پت کے مقام پر مغلوب ہو چکی اور پنجاب میں کوئی ایسی شخصیت نہ رہی جو سکھوں کی بڑھتی ہوئی قوت کا مقابلہ کر سکتی، تو بارہ سر بر آوردہ سکھ سرداروں نے اپنے اپنے جتھے قائم کر کے بغیر کسی مزاحمت کے پنجاب کے مختلف حصوں پر اپنا تسلط جما لیا اور ۱۷۶۹ء کے قریب دریائے جہلم سے سہارنپور تک تمام میدانی علاقے میں خالصہ راج قائم ہو گیا۔ صرف ملتان، سندھ اور کشمیر مسلمانوں کے قبضے میں تھے۔ جموں اور کانگڑہ کے پہاڑی علاقوں پر ہندو راجپوت حکمران تھے۔

سکھوں کے جتھے چونکہ مساوات کے اصول پر قائم ہوئے تھے، اس لیے برابری کے خیال سے انھیں مثل کہا جاتا تھا۔ یہ مثلیں اپنے بانی کے نام وطن یا کسی اور وصف کی بنا پر جدا جدا ناموں سے یاد کی جاتی تھیں۔ مثلاً بھنگی مثل[2]۔ رام گڑھیہ۔ کنہیا۔ اہلووالیہ۔ سکرچکیہ۔ نکئی۔ ڈلی والی۔ نشان والیہ۔ کروڑ سنگھیہ۔ شہید یا نہنگ۔ فیض اللہ پورہ اور پھلکیاں۔

سکھوں کی متحدہ طاقت تقریباً ستر ہزار سوار تھی مگر ان کی کوئی مرکزی حکومت نہ تھی جو مختلف سرداروں کو قابو میں رکھ سکتی۔ ہر سردار اپنے دائرۂ حکومت میں خود مختار تھا۔ جو کسی کے جی میں آتا کرتا، کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ وہ آپس میں بھی دست و گریباں ہونے سے پس و پیش نہ کرتے۔ البتہ کسی بیرونی حملے کے وقت یہ سب سردار مل جاتے اور خالصہ کے جھنڈے تلے جمع ہو کر پنتھ کی حفاظت کے لیے لڑتے اور جب وہ خطرہ ٹل جاتا تو پھر خانہ جنگی میں مبتلا ہو جاتے۔ غرض ہر طرح بد انتظامی تھی اور یہ دور سکھا شاہی کہلاتا تھا۔ اسی لاقانونی کے زمانے میں ۱۳ نومبر ۱۷۸۰ء کو گوجرانوالہ میں سکرچکیہ مثل کے سردار مہاں سنگھ کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا

---

[1] اضافہ از مرتب۔

[2] اس مثل کا بانی سردار چھجا سنگھ جاٹ تھا جو موضع پنجوار ضلع امرتسر کا رہنے والا تھا۔ چھجا سنگھ کے بعد اس مثل کی باگ سردار جگت سنگھ نے سنبھالی جو بھنگ کا عادی تھا۔ اس وجہ سے یہ بھنگی مثل کے نام سے مشہور ہو گئی۔ سردار گوجر سنگھ، سوبھا سنگھ اور لہنا سنگھ جنھوں نے ۱۷۶۵ء میں لاہور پر قبضہ کر کے اس کو تین حصوں میں تقسیم کر لیا، اسی مثل کے سردار تھے۔ ان کے نام پر قلعہ گوجر سنگھ قلعہ سوبھا سنگھ اور قلعہ لہنا سنگھ آج تک آباد ہیں۔ ان کو سہ حاکمانِ لاہور بھی کہا جاتا ہے۔

جس کا پیدائشی نام بدھ سنگھ تھا مگر اس کے باپ نے رسول نگر فتح کرنے کی خوشی میں اس کا نام رن جیت سنگھ رکھا۔ یہی رنجیت سنگھ باپ کے مرنے کے بعد ۴ اپریل ۱۷۹۲ء کو دس سال کی عمر میں گدی کا مالک بنا۔ اس نے مار دھاڑ کر کے کئی مثلداروں کو ختم کیا۔ اور باقیوں کو پناہ دے کر اپنا مطیع بنا لیا۔ آخر اپریل ۱۸۰۱ء میں بیساکھی کے موقعہ پر اس نے لاہور میں ایک عظیم الشان دربار منعقد کر کے مہاراجہ کا لقب اختیار کیا۔ اور اپنے نام کا سکہ چلایا۔

رنجیت سنگھ نے لوگوں کے باہمی تنازعات کے فیصلے کے لیے پنچائتیں مقرر کیں۔ مسلمانوں کے فیصلے شریعت کے مطابق کئے جانے کا اعلان کیا۔ قاضیوں، مفتیوں اور عالموں کی باقاعدہ تنخواہیں مقرر کیں۔ چنانچہ لاہور کا پہلا قاضی نظام الدین، مفتی محمد شاہ اور سعد اللہ چشتی تھے۔

اس نے شہر کو محلوں میں تقسیم کر کے ہر محلے اور برادری کا چوہدری مقرر کیا جو کہ بگڑا اور ضائع سکھوں کی لوٹ مار کے ڈر ادھر ادھر منتشر ہو گئے تھے، انھیں واپس بلا کر اپنی اپنی جگہ پھر سے بسایا چنانچہ کوچہ لوہاراں، کوچہ تیر گراں، کوچہ کمان گراں، کوچہ قاضی خانہ، گجر گلی، کوچہ نقاشاں، کوچہ نقارچیاں، کوچہ درزیاں، کوچہ دھوبیاں، کوچہ ماشکیاں، کوچہ چابک سواراں، کوچہ نیزہ بیاں، کوچہ کوٹھی داراں، کوچہ کندی گراں، کوچہ دریائی بافاں، کوچہ میخ کشاں، کوچہ دان وٹاں، کوچہ سر کی بندان، کوچہ ہڈی ماراں، کوچہ ٹھاریاں، بازار سادہ کاراں، کوچہ پتنگیاں، کوچہ دفتری کشاں، کوچہ خراسیاں، کوچہ پھلیریاں، کوچہ ہواگراں، کوچہ گھنگرو سازاں، کوچہ مٹی پٹاں، کوچہ کمہاراں، کوچہ سراجاں، کوچہ چنگڑاں، کوچہ ڈوگراں، کوچہ ڈبیاں، کوچہ کاغذیاں، ڈرہ تیلیاں، کٹڑہ پوربیاں، کوچہ ڈفالیاں، کوچہ پٹ رنگاں، کٹڑہ تارکشاں، کوچہ لکڑ ہارا، کاچھو پورہ، کوچہ کوفت گراں، ہیرا بازار، کوچہ نائیاں، کوچہ جوگیاں، کوچہ مفتیاں، تکیہ سادھواں، کناری بازار اور بازار شیشہ موتی وغیرہ بعض محلے اس زمانے اور کچھ اس سے پہلے کی یادگار ہیں۔

شہر کی حفاظت کے لیے رنجیت سنگھ نے کوتوالی اور پولیس تعینات کی چنانچہ پہلا کوتوال امام بخش خر سوار تھا حفظان صحت کے اصولوں کے مطابق مریضوں کے لیے خیراتی شفاخانے کھولے جن میں یونانی طریق سے علاج کیا جاتا تھا۔ حکیم نور الدین شفاخانوں کے افسر اعلیٰ تھے۔ شہر کے گرد نئی فصیل بنوائی، کھائی کھدوائی جس پر ایک لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ اس طرح رعایا آرام سے زندگی بسر کرنے لگی اور آئے دن کی خانہ جنگیوں کا دور ختم ہو گیا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے چالیس سال بڑے ٹھاٹھ سے حکومت کی۔ ۲۷ جون ۱۸۳۹ء کو اس کی وفات[1] کے وقت

---

[1] ایک شاعر نے تاریخ وفات یوں کہی ہے —

چوں مہاراجہ بہادر شیر دل رنجیت سنگھ　　کوچ کرد از ملک دنیا جانب دار البقا

سال تاریخش عطا از راہ در رسم تعمیہ　　زد رقم بر تختۂ اندوہ با درد و اعنا

بے سرو پا گشت آہ از مرگ او در روزگار　　فضل و خیرات و شجاعت ثروت و جود و سخا

آخری مصرع کے چھ صفاتیہ الفاظ کے پہلے اور آخری حرف نکال دینے کے بعد باقی ماندہ حروف ض/۸۰۰ ۔ ی/۱۰ ۔ ر/۲۰۰ ۔ ا/۱ ۔ ج/۳ ۔ ا/۱ ۔ ع/۷۰ ۔ ر/۲۰۰ ۔ ث/۵۰۰ ۔ ہ/۵ ۔ خ/۶۰۰ کے اعداد ۱۸۹۶ ہوتے ہیں۔ جو بکرمی سمت ہے۔

اس کی وسیع سلطنت کا رقبہ تقریباً ایک لاکھ چالیس ہزار مربع میل تھا جس کی ایک حد لداخ، اسکردو اور تبت سے ٹکراتی تھی۔ دوسری درۂ خیبر سے چل کر کوہ سلیمان کی پہاڑیوں سے ملتی تھی۔ جنوب میں شکار پور سندھ تک پہنچتی تھی اور مشرق میں انگریزوں کے ساتھ دریائے ستلج مقرر ہو چکی تھی۔ اس کے خزانے میں کروڑوں روپیہ نقد، بیشمار سونے کی مہریں اور تقریباً بیس لاکھ روپیہ مالیت کے ہیرے جواہرات موجود تھے۔ ان کے علاوہ دنیا کا بہترین اور بے مثال ہیرا کوہ نور بھی اس کے توشہ خانے کو چار چاند لگا رہا تھا۔

بقول منشی محمد الدین فوق مرحوم "مہاراجہ رنجیت سنگھ فتوحات کے لحاظ سے ایک طرف سکندر اعظم کا اقبال، درباری نورتنوں کی وجہ سے مغل اعظم شہنشاہ اکبر کی قسمت اور داد عیش و عشرت دینے کے لیے رنگیلے بادشاہوں کی طبیعت لے کر آئے تھے، لیکن دوسری طرف ملک گیری کی ہوس میں دوست، دشمن، ہندو مسلمان اپنے پرائے کسی کا لحاظ نہ کرتے تھے۔

ان سب باتوں کے باوجود مناظر قدرت اور انواع و اقسام کے باغات و چمنستان اور پھل پھلواڑیوں کا وہ شوق تھا کہ دہلی دروازہ سے لے کر شالا مار باغ تک جو پانچ میل کا فاصلہ ہے دو رویہ سبزہ زار، کھیتوں کی بہار اور باغات کی کثرت سے ہرا بھرا دکھائی دیتا تھا۔ یہ اس رستہ کا ذکر ہے جو سلطان پورہ اور مزار گھوڑے شاہ سے ہو کر باغبانپورہ اور بھوگیوال سے دامن بچاتا ہوا شالا مار باغ کو نکل جاتا ہے۔ یہی رستہ قدیم بادشاہی رستہ کہلاتا تھا۔ ان ایام میں کہیں سبزہ لہلہاتا نظر آتا، کہیں دور دور تک گل و گلزار کے تختے دکھائی دیتے۔ جب ۱۸۳۸ء میں سر ہنری فین سپہ سالار افواج ہند، مہاراجہ کی دعوت پر لاہور آیا، تو مہاراجہ اس کے ساتھ شالا مار سے اسی رستے قلعہ میں آیا۔ سر ہنری فین سبزہ زار کی یہ روح افزا کیفیت دیکھ کر بہت محظوظ ہوا اور مہاراجہ کی اس جدت کی اس نے بہت تعریف کی۔

باغ دیوان کرپا رام، باغ راجہ دینا ناتھ اور بہت سے باغات اسی رستے پر تھے اور چونکہ یہی قدیم رستہ تھا، اس لیے مہاراجہ کا حکم تھا کہ اس رستے میں کبھی خشک زمین کا کوئی قطعہ نظر نہ آئے۔ اس لحاظ سے یہ باغ اور اس علاقے کے سبزہ زار بہت بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ مہاراجہ نے خود بھی کئی باغات لاہور میں احداث کرائے، ہر باغ میں ایک مکان دل کشا بنوایا۔ جہاں وہ فراغت و فرصت کے دنوں میں جاتا اور سیر و تفریح سے دل بہلاتا۔

خالصہ عہد میں تخریب کا جتنا کام ہوا تعمیر کا اتنا نہیں ہوا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے بھی بہت سی اسلامی عمارات کو مٹایا لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اس نے اور اس کی بعض رانیوں نے کئی ایک مزارات کی مرمت بھی کرائی، مجاوروں کے روزینے مقرر کیے مسجدیں تعمیر کرائیں اور مسلمان فقرا کی قدمبوسی کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کو بہت بڑی سعادت سمجھا۔

بسنت کے دن مہاراجہ مزار مادھو لال حسین پر سلام کو جاتا اور گیارہ سو روپیہ نقد اور دو دوشالے خانقاہ پر چڑھاتا۔ مہاراجہ نے اس مزار کے لیے بہت سی معافیاں واگذار کیں اور زبانی فرمایا:۔

"میں شاہان چغتائی کی برابری کے لائق تو نہیں مگر حتی المقدور مدد خرچ برائے فقیران خانقاہ واگذار کرتا ہوں۔"

مہاراجہ کے عہد میں اس خانقاہ کے گدی نشین سائیں صوبے شاہ تھے۔ مہاراجہ کو ان پر بڑا اعتقاد تھا۔ جب تک سائیں صوبے شاہ

زندہ رہے، مہاراجہ ہر مہم پر جانے سے پیشتر ان سے اجازت طلب کرتا۔

رسول شاہی فقیروں میں شاہ فدا حسین بہت نامی فقیر گزرے ہیں۔ وہ سر سید احمد خاں کے نانا نواب دبیر الملک کے سگے بھائی تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ ان کو دو سو روپیہ ماہانہ بطور نذر دہلی بھجوایا کرتا تھا۔

روضہ حضرت داتا گنج بخش کی چار دیواری بوسیدہ ہو جانے کی وجہ سے سمت ۱۸۹۸ بکرمی میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے مع سقف ہائے از نو تیار کرائی۔

لاہور میں مستان شاہ ایک مجذوب فقیر تھے جن کی قبر خطۂ مبانی میں ہے۔ مہاراجہ ان کا بہت ادب کرتے تھے اور خزانہ سے ایک روپیہ یومیہ بطور نذرانہ ان کی خدمت میں بھجوایا کرتے تھے۔

حضرت یعقوب زنجانی صدر دیوان کا مزار تالاب رتن چند داڑھی والا کے متصل ہے۔ تحقیقات چشتی میں لکھا ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ اس مکان کی خبر گیری رکھتے تھے اور کبھی کبھی خود بھی حاضر ہوا کرتے تھے۔

قلعہ کے قریب پریڈ کے میدان میں (جسے پہلے منٹو پارک اور اب اقبال پارک کہتے ہیں) ایک مکان جھنگی چراغ شاہ کے نام سے موسوم ہے۔ یہ چراغ شاہ، سید علی شاہ گیلانی دکنی کے مرید تھے۔ سید علی شاہ ۱۲۰۰ھ میں ملک دکن سے لاہور تشریف لائے اور ۱۲۲۷ھ میں انتقال کر گئے۔ تحقیقات چشتی میں لکھا ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کئی دفعہ شاہ صاحب کے پاس بمراد عقدہ کشائی مہمات آتے اور نذریں پیش کیا کرتے، لیکن حضرت نے ایک دفعہ بھی ان کی نذر قبول نہ کی۔ مہاراجہ نے یہ بے طمعی دیکھ کر اپنے ایک مصاحب حکما سنگھ کو حکم دیا کہ وہ شاہ صاحب کے پاس بیٹھے اور سرکار میں اطلاع دے کہ واقعی یہ لا طمع ہیں یا صرف ہم کو دکھانے کے لیے ہے اور جس چیز کی انھیں ضرورت ہوا کرے وہ سرکاری رسد خانے سے مہیا کی جایا کرے۔

حکما سنگھ کئی مہینے آتا جاتا رہا لیکن شاہ صاحب نے کسی سے کوئی فرمائش نہ کی۔ نہ اس سے کچھ طلب کیا۔ صرف دو وقت روٹی کھا لیتے اور بس۔

یہ سن کر مہاراجہ اور بھی معتقد ہو گیا۔ ایک مرتبہ بہاں دریا چڑھ آیا۔ سب لوگ بھاگ گئے۔ مہاراجہ نے چند کشتیاں بھیجیں کہ شاہ صاحب کو سوار کر کے قلعہ میں لے آئیں۔ انھوں نے واپس کر دیں اور کہا کہ پانی کا زور صرف آج کے دن تک ہے کوئی اندیشے کی بات نہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

مہاراجہ کے عہد میں مائی بھاگی ایک مجذوبہ تھی۔ لاہور کے قریب موضع خواجہ سعید میں رہتی تھی۔ مہاراجہ اس کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پانچ سو روپیہ نذر پیش کیا لیکن وہ ترش روئی سے پیش آئی۔ مہاراجہ کی دیکھا دیکھی امیر وزیر بھی آنے لگے۔ مائی بھاگی ان سب کو گالیاں دیتی اینٹیں اور پتھر مارتی۔ تحقیقات چشتی میں لکھا ہے کہ امرا اور خود مہاراجہ اینٹیں کھاتے اور اس کے آگے آگے چلتے۔

سمت ۱۸۸۰ بکرمی میں مہاراجہ سخت بیمار ہو گئے۔ راجہ دھیان سنگھ اور راجہ سوچیت سنگھ بہت سا نقد و جنس لے کر مائی بھاگی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ مہاراجہ صاحب بیمار ہیں اور آپ کو یاد کرتے ہیں۔ لیکن اتنے بڑے جلیل القدر عہدہ داروں کو ناکام لوٹنا پڑا۔ آخر مہاراجہ نے اپنے بیٹے شہزادہ کھڑک سنگھ کو بھیجا جو منت خوشامد کر کے اس کو اپنے ساتھ لائے

مائی بھاگی گیارہ روز تک سرکار کے پاس رہی۔ مہاراجہ کی طبیعت رفتہ رفتہ بحال ہونے لگی یہاں تک کہ گیارھویں روز بالکل آرام آگیا۔ بحالیِ صحت کے شکرانے میں مہاراجہ نے بصرفِ زرِ کثیر مائی بھاگی کو ایک عالی شان حویلی بنوا دی اور وقتاً فوقتاً اس کے تکیہ اور لنگر کی خدمت کرتے رہے ——— مرتب]

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے طویل عہدِ حکومت میں اور اس کے بعد کے مختصر دور میں سکھ سرداروں نے لاہور میں بہت سے باغ تعمیر کرائے جن کی فہرست بہت طویل ہے۔ یہاں صرف چند باغات کا ذکر کیا جاتا ہے:۔

بادامی باغ

فقیر سید عزیز الدین امرائے رنجیت سنگھ میں سب سے زیادہ معتمد اور دانا وزیر و مشیر اور اپنے علم و فضل کی وجہ سے دربار میں ممتاز ترین ہستی تھے۔ اس دور کے متعلق ان کی ہر بات سند کا درجہ رکھتی ہے۔ خان بہادر فقیر سید قمر الدین آنریری مجسٹریٹ ان کے فرزند تھے۔ انھوں نے اپنے باپ سے جو کچھ سنا اور بیان کیا، اس کی بنا پر خان بہادر سید محمد لطیف "تاریخ لاہور" میں لکھتے ہیں:۔

"جس جگہ کا نام اب بادامی باغ ہے یہ جگہ ایّامِ قدیم میں شہزادی "گل بادام"[1] کے نام سے مشہور تھی جس کا مزار مستی دروازہ اور خضری دروازہ (موجودہ نام شیرانوالہ دروازہ) کے درمیان واقع تھا۔ اس مزار پر سنگِ مرمر کا بیش قیمت پتھر تھا۔ سکھ سرحاکمان لاہور کے زمانے میں یہ عالی شان خوب صورت مقبرہ اور اس کا ملحقہ باغ تباہ و برباد ہو گیا۔"

اس تباہی و بربادی کے باوجود اس شہزادی کے نام میں کچھ ایسی جاذبیت تھی کہ وہ جگہ اسی کے نام سے بادامی باغ مشہور ہو گئی۔ رنجیت سنگھ نے اپنے عہد میں جو سہ حاکمان لاہور کے زمانے سے بدرجہا غنیمت تھا، اس باغ کو دوبارہ رونق دی اور امرود، انار، نارنگی، رنگترہ، چکوترہ، جامن، ناشپاتی، آم اور آڑو وغیرہ ثمردار درختوں کے علاوہ باداموں کے بوٹے بھی بکثرت لگوائے تاکہ بادامی باغ صحیح معنوں میں بادامی باغ کہلائے۔

[منشی سوہن لال نے عمدۃ التواریخ میں کئی جگہ اس باغ کا نام "باغ پائین قلعہ" لکھا ہے۔ چنانچہ دفتر دوم کے صفحہ ۳۴۰ پر لکھتے ہیں کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ

---

[1] مغلوں کے زمانے میں کسی شہزادی کا نام گل بادام نظر سے نہیں گزرا۔ نہ جہاں آج بادامی باغ واقع ہے وہاں کوئی میدان تھا۔ بلکہ یہاں آج بھی زمین کھودنے سے ریگ بکثرت نکلتی ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ یہاں پہلے دریا بہتا تھا۔ ممکن ہے گل بادام کا نام انارکلی اور گل بکاؤلی کی طرح محض افسانہ ہو یا اس کا کچھ تعلق مہاراجہ کی ایک رانی گل بیگم یا گل بہار سے ہو جس کا مقبرہ گل بیگم کے باغ میں موجود ہے جو قبرستان میانی میں واقع ہے۔ (مرتب)

شالہ باغ اور باغ شاہ بلاول کی سیر کے بعد" باغ پائیں دیوار قلعہ" میں رونق بخش ہوئے۔ پھر باغ کی بہار کے متعلق لکھتے ہیں" و خیام فرحت ارتسام بر آں رشئہ آب منتصب کنانیدہ بہ سیر گل گشت شگوفہ و گلزار شبو کہ بہ ایوان مختلف و اشکال متنوعہ الاوضاع و بہ صنایع و بدایع باغباں مرتب شدہ بود، متوجہ شدند" ——— مرتب]

مہاراجہ شیر سنگھ کے زمانہ (۱۸۴۲ء) میں جب لارڈ آکلینڈ وائسرائے ہند نے اس شرط پر امیر دوست محمد خاں کو انگریزی علاقہ سے کابل میں بھیجنا منظور کر لیا کہ اس کے بدلے میں جنرل سیل اور دیگر انگریز قیدیوں کو افغان باعزاز تمام ہندوستان روانہ کر دیں تو مہاراجہ شیر سنگھ کے مشورہ سے ان معزز قیدیوں کے تبادلے کا مقام لاہور ہی قرار پایا اور ان شرائط کی تکمیل کی ذمہ داری مہاراجہ نے خود قبول کی۔ یہ معزز مہمان ہولیوں کے ایام میں لاہور پہنچے۔ مہاراجہ نے ہولیوں کے دربار کے لیے بادامی باغ ہی کو پسند کیا جس کے دلکش سبزہ زاروں پر مستی دروازہ سے باہر نکلتے ہی اہل لاہور کی نگاہ سب سے پہلے پڑتی تھی۔

مہاراجہ کے حکم سے بادامی باغ کو خیابانوں میں تقسیم کر کے وسط میں ایک خوبصورت عارضی بنگلہ بنایا گیا۔ موزوں اور مناسب مقامات پر آبشار بنائے گئے۔ ہر خیابان میں پانچ پانچ فوارے نصب کیے گئے جن میں پانی کی جگہ عطر اچھلتا تھا۔

پھاگن کی ۲۹ تاریخ تھی کہ صبح کے نو بجتے ہی قلعہ سے توپوں کی آواز بلند ہوئی۔ رسالے اور پلٹنیں زرق برق وردیوں میں ملبوس راجہ زادوں کی معیت میں اس سڑک پر سے گزرنے لگیں جو بادشاہی مسجد سے باغ کے عارضی بنگلے تک بنائی گئی تھی۔ مہاراجہ چھ گھوڑوں کی گاڑی پر سوار ہو کر اپنے معزز مہمانوں کے ساتھ باغ میں داخل ہوا اور سنگ مرمر کے فرش پر جہاں طلائی کرسیاں موجود تھیں سب بیٹھ گئے۔ نغمہ سرائیوں، ناچ مجروں اور اراکین سلطنت سے تعارف کرانے کے بعد یہ عظیم الشان جلسہ ختم ہوا۔ ایک کہن سال بزرگ کا بیان ہے کہ" اس تقریب پر اس قدر عطر خرچ ہوا کہ پانچ چھ سال تک باغ کی مٹی سے عطر کی خوشبو آتی رہی"[1]

انگریزوں کی عملداری کے آغاز (۱۸۴۹ء) تک یہ مشہور و معروف باغ قلعہ کے شمال کی طرف موجود تھا۔ "انگریز صاحبان مع میم صاحبات" یا والوگوں کے ہمراہ شام کے وقت اس باغ کی سیر سے دل بہلایا کرتے تھے۔ اس وقت باغ میں انگریزی باجا بجتا تھا اور صدہا تماشائی جمع ہو جاتے تھے۔

۱۸۶۰ء میں اس باغ کا نام کمپنی باغ رکھا گیا اور اس کے منتظم لاہور کے سب سے پہلے روزانہ انگریزی اخبار لاہور کرانیکل کے ایڈیٹر مسٹر ہنری کوپ قرار پائے۔ چونکہ یہ مقام شہر کے بالکل متصل تھا اور انگریزوں کی آمد و رفت یہاں بکثرت تھی، اس لیے انگریزوں نے دلچسپیوں سے قدرے فاصلے پر رہنے کے لیے اس باغ کو فروخت کر کے اس کے بدلے لارنس گارڈن تعمیر کر لیا۔ جس سے اس باغ کی عظمت و خصوصیت جاتی رہی اور اسے پوچھنے والا کوئی نہ رہا۔ یہاں تک کہ جھاڑ جھنکار اگ آئے اور یہ جنگل

---

[1] خالصہ اخبار لاہور ۷ ارمئی ۱۹۱۸ء۔

کا نمونہ بن گیا۔

۱۸۵۹ء میں اجرائے ریل کے لیے ریلوے کارخانوں کی ابتدا ہوئی۔ ۱۸۶۱ء میں پہلی مرتبہ لاہور سے امرتسر تک گاڑی روانہ ہوئی۔ ۱۸۸۰ء میں یا اس کے لگ بھگ لاہور سے وزیر آباد تک ریلوے لائن بنی جس سے بادامی باغ کی بہت سی زمین ریلوے لائن اور اسٹیشن کے احاطے میں آ گئی۔

تقریباً ساٹھ سال کا عرصہ ہوا کہ ریلوے لائن کے پار باداموں کے چند درخت موجود تھے۔ اب نہ "گل بادام" ہے نہ اس کا مزار اور باغ۔ البتہ لوہے کے کارخانے اور رہائشی مکانات بن گئے ہیں اور غلہ منڈی کے لیے جگہ مختص کر دی گئی ہے

گیا حسن خوبان دل خواہ کا
ہمیشہ رہے نام اللہ کا

باغ مہاراجہ رنجیت سنگھ

[ایک انگریز مورخ نے مہاراجہ کے ایک باغ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ لاہور میں ہر دوار کا ایک جوگی آیا اور اس نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ ایک صندوق میں بند ہو کر بغیر خورد و نوش کے زمین کے اندر جتنا عرصہ مقرر کیا جائے اتنے عرصے تک زندہ رہ سکتا ہے۔ مہاراجہ کو قدرتی طور پر اس کے دعوے پر یقین نہ آیا اور اس نے ارادہ کر لیا کہ اس کا امتحان لیا جائے۔

اس کے لیے ایک دن مقرر کیا گیا اور فقیر نے مہاراجہ کے باغ میں تیاری شروع کر دی۔ چنانچہ مہاراجہ اور ان کے بڑے بڑے سرداروں کی موجودگی میں فقیر نے اپنا کمال دکھایا۔ اس نے اپنے نتھنے، کان اور منہ کے سوا باقی تمام سوراخ جن کے راستے اس کے جسم میں ہوا داخل ہو سکتی تھی، بند کر دیئے اور اپنے آپ کو برہنہ کر کے کپڑے کے ایک تھیلے میں ڈال دیا۔ جس وقت اس کی زبان لوٹا کر اس کے حلق کو بند کیا گیا تو وہ فوراً بے ہوش ہو گیا اور اس پر غفلت و بے حسی طاری ہو گئی۔ اس کے بعد تھیلا بند کیا گیا اور اس پر مہاراجہ کی خاص مہر لگا دی گئی۔ پھر اس کو چھوٹے سے لکڑی کے صندوق میں رکھ کر مقفل و سر بہ مہر کیا گیا۔ اس بکس کو ایک تہہ خانے میں رکھا گیا اور اوپر مٹی ڈال کر جو بو دیئے گئے۔ اس تہہ خانے کے اوپر مکان تھا اس کا دروازہ بھی مقفل کیا گیا۔ چار دیواری مکان کے گرد موجود تھی۔ اس کے دروازے کو بھی اینٹوں سے چن کر بند کر دیا گیا۔ مکان کے باہر سپاہیوں کا پہرا لگا دیا گیا تاکہ کوئی شخص اس جگہ کے قریب نہ پھٹکنے پائے۔

چالیس دن اور رات نہایت سخت نگہبانی اور محافظت کی گئی۔ اس عرصہ کے گزر جانے کے بعد فروری ۱۸۳۷ء کی کسی تاریخ کو مہاراجہ اپنے تبرہ کنور نونہال سنگھ اور چند سرداروں نیز جرنیل ونتورہ، کپتان ویڈ اور ڈاکٹر ہبیکر برگ کے ہمراہ اس جگہ فقیر کو نکالنے کے لیے آئے۔ ان کے علاوہ بھی ہزارہا لوگ یہ تماشا دیکھنے جمع ہو گئے۔ باہر کی اینٹیں اور مٹی علیحدہ کی گئی۔ مکان کا قفل کھولا گیا اور تہہ خانے سے صندوق نکال کر باہر کھلی ہوا میں لایا گیا۔ ڈاکٹر ہبیکر برگ کا بیان ہے :-

"ہم نے دیکھا کہ فقیر ایک سفید چادر میں لپٹا ہوا تھا اور جب اس چادر

کر اٹھایا تو اس آدمی کو بیٹھا ہوا پایا۔ اس کے ہاتھ اور بازو پسلیوں کے ساتھ لگے ہوئے اور وہ دو زانو بیٹھا تھا۔ جوگی نے مقفل ہونے سے پیشتر اپنے ہوش میں آنے کا جو علاج بتایا تھا، اُس کے مطابق پہلی تدبیر یہ کی گئی کہ اس کے سر پر گرم پانی ڈالا گیا۔ اس کے بعد آٹے کی گرم روٹی اس کے سر کی چوٹی پر رکھی گئی۔ پھر موم کی ایک گولی اس کے نتھنے میں سے نکالی گئی۔ اس پر اس نے زور سے دم لیا۔ اب اس کا منہ کھولا گیا اور زبان جو تالو کے ساتھ لگائی گئی تھی اصلی جگہ پر لائی گئی۔ پھر گھی سے اس کی مالش کی گئی اور ہونٹوں پر بھی گھی لگایا گیا۔

اس وقت تک مجھے کلائی میں نبض کی کوئی حرکت محسوس نہ ہوتی تھی۔ اگرچہ جسم کی حرارت صحت کے معمولی درجے سے بھی زیادہ تھی۔ ٹانگوں اور بازوؤں کو سیدھا کر کے آنکھیں کھولی گئیں۔ ٹانگوں پر خوب مالش کی گئی اور آنکھوں پر کسی قدر گھی چھڑکا گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں کے ڈھیلے مدھم اور پھیلے ہوئے ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے کسی مردہ آدمی کے ہوتے ہیں۔ اس وقت فقیر نے ایسی علامت ظاہر کی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ جان پڑ رہی ہے۔ نبض چلنے لگی اور جسم کی غیر طبعی حرارت بھی فوراً کم ہو گئی۔ اس نے ایک دو دفعہ بولنے کی کوشش کی مگر ضعف کے سبب سے اس کی آواز نہ نکل سکی۔ آخر چند لفظ اس کے منہ سے نکلے مگر آواز ایسی نرم اور کمزور تھی کہ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ رفتہ رفتہ اس کی آواز قائم ہوتی گئی اور اس نے بعض آدمیوں کو جو کھڑے تھے پہچان لیا۔ اس کے بعد وہ مہاراجہ سے جو سامنے بیٹھے اس کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کر رہے تھے، ہم کلام ہوا۔

جس وقت فقیر گفتگو کرنے کے قابل ہو گیا تو اس مرحلہ کی کامیابی کو مشتہر کرنے کے لیے توپیں سر کی گئیں اور دوسری طرح سے بھی اظہار مسرت کیا گیا۔ مہاراجہ نے ایک بھاری طلائی زنجیر اس کے گلے میں ڈالی، ہاتھوں کے جڑاؤ طلائی کڑے، شال دوشالے اور اسباب گرانقدر بھی اس کو انعام دیا۔"

جس باغ میں حبسِ دم کا یہ واقع پیش آیا تھا اور جہاں بے اندازہ مخلوق یہ تماشا دیکھنے جمع ہوئی تھی، وہ رنجیت سنگھ

کے نام سے موسوم تھا اور قلعہ کے سامنے حضوری باغ کے اس دروازہ کے متصل تھا جو شمال کی طرف ہے اور آجکل بند رہتا ہے۔ آج سے چالیس پچاس سال پیشتر اس دروازے کے اوپر مہر ناظر حسین ناظم لکھنوی کا مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ یہیں سے مہاراجہ کی سمادھ کو بھی رستہ جاتا تھا۔ یہ باغ بادشاہی مسجد کی شمالی دیوار کے نیچے جنوب کی طرف چلا جاتا تھا۔

اسی باغ میں مہاراجہ کو نذر آتش کیا گیا اور یہیں ان کی سمادھ بنائی گئی۔ چنانچہ عمدۃ التواریخ کے دفتر سوم حصہ پنجم کے ص ۱۵۶ پر لکھا ہے:-

> "در باغیچہ سرکار والا متصل دروازہ زیر مسجد بادشاہی حضور والا را بعد از اشنان در حطب صندل بنشانیدند و سرکار دات پر کرما دجیسن سائی ساختہ شال سوز سرکار کنگوجن سر مبارک را بر زانوئے خود نہاد۔ تمامی سرداران سر بہ سجدہ فرود آوردند۔ باز روغن زرد انداختہ و چھپرخس نہادہ آتش دادند"

آج پورا ڈیڑھ سو سال بھی نہیں گزرا کہ اس باغ کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ اور صرف کتابوں میں اس کا تذکرہ رہ گیا۔ ع

انقلابات ہیں زمانے کے ——— مرتب[1]]

حضوری باغ

[نہ جانے ایسی کتنی عظیم یادگاریں زمین کے سینے میں دفن ہیں جنہیں انسان نے ہزاروں تمناؤں کے ساتھ تعمیر کیا تھا[2] یہ ایک دردناک حقیقت ہے۔ لیکن اس سے بھی دردناک یہ بات ہے کہ تاریخ کے جو قیمتی نشانات زمانے کی دست برد سے محفوظ رہ گئے ہیں ان کی حقیقت سے بھی ہم پوری طرح واقف نہیں۔

تاریخ کی انہی یادگاروں میں ایک لاہور کا حضوری باغ بھی ہے۔ جو پنجاب کے دل لاہور میں ایک ایسے مقام پر ہے جو بذات خود تاریخ کے ایک اہم باب کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ باغ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس وقت بنوایا جب اس نے کابل کے بدنصیب حکمران شاہ شجاع سے دنیا کا اہم ترین ہیرا کوہ نور چھیننے کے بعد لاہور میں ایک جشن عام منعقد کیا اور خوشی منائی۔

یہ تو سب جانتے ہیں کہ مہاراجہ زروجواہر کا بڑا مشتاق تھا اور اس کا یہ اشتیاق لالچ کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ قریری سنہ ۱۸۱۳ء میں جب وہ اس کوشش میں مصروف تھا کہ متوفی چودھ سنگھ والئے وزیر آباد کے مقبوضات اپنے تصرف میں لائے تو اسے یہ خبر پہنچی کہ شاہ شجاع والئے کابل اپنے حریف دوست محمد خاں سے شکست کھا کر اس کے ملک میں پناہ لینے آرہا ہے۔ اور اگرچہ

---

[1] یہ مضمون مرتب نے از سر نو تفصیل سے لکھا ہے۔

[2] حضوری باغ کے حالات مرتب کے قلم سے ہیں۔

اس کی بہت عزت اور خاطر مدارات کی گئی۔ مگر وہ اس وقت زیادہ عرصہ یہاں قیام نہ کر سکا اور جلد ہی واپس چلا گیا۔

مارچ ۱۸۱۳ء میں وہ پھر لاہور آگیا۔ اور اس کی بیوی نے جو پہلے سے یہاں موجود تھی۔ اسے بتایا کہ مہاراجہ نے دوستی کا حق ادا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ لیکن ابھی چند دن بھی نہ گزرے تھے کہ مہاراجہ کی طرف سے یہ تقاضا شروع ہو گیا کہ کوہ نور ہیرا اسے دے دیا جائے اور اس کے عوض میں جاگیر لے لی جائے۔

یہ مشہور اور نایاب ہیرا جو ڈیڑھ انچ لمبا اور ایک انچ چوڑا تھا۔ دہلی میں تختِ طاؤس کی زینت رہ چکا تھا۔ وہاں سے وہ نادر شاہ کے ہاتھ آیا۔ جس کے انتقال کے بعد احمد شاہ نے اپنے باپ کے ورثہ میں اسے پایا۔ اور اب یہ شاہ شجاع کے قبضے میں تھا۔ چونکہ یہ الماس نہایت قیمتی تھا۔ اس لیے مہاراجہ کی خواہش تھی کہ جس طرح بن پڑے یہ ہیرا اس کے پاس آجائے۔ ادھر شاہ شجاع چاہتا تھا کہ یہ نادر چیز اس کے ہاتھ سے نہ جائے مگر دونوں فریقوں کی موجودہ حالت ایک جیسی نہ تھی۔ مہاراجہ با اختیار تھا اور شاہ شجاع بے بس اور لٹا ہوا مہرہ۔

مہاراجہ نے بادشاہ کی ضد پر غالب آنے کے لیے سختی تک کی اور ہیرا اپنے قبضہ میں لانے کے لیے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ بادشاہ نے پہلے تو انکار کیا کہ الماس اس کے پاس نہیں ہے۔ مگر جب کسی حجت سے کام نہ چلا تو مجبوراً کوہ نور دینے پر راضی ہو گیا یکم جون ۱۸۱۳ء کو مہاراجہ کوہ نور ہیرا لینے کی خاطر شاہ شجاع کی خدمت میں گیا۔ وہ اس وقت مبارک حویلی میں مقیم تھا۔ جو آج کل قزلباش خاندان کے قبضے میں ہے اور موچی دروازہ کے اندر چوک نواب صاحب میں واقع ہے۔ بادشاہ نے مہاراجہ کی بڑی تعظیم و تکریم کی اس کو عزت و توقیر سے بٹھایا۔ اور ایک گھنٹے تک دونوں بڑی متانت کے ساتھ خاموش بیٹھے رہے۔ اس کے بعد مہاراجہ بے تاب ہو گیا اس نے ایک مصاحب کو اشارہ کیا کہ وہ بادشاہ کو اس ملاقات کا مقصد یاد دلائے اس کا جواب تو کچھ نہ ملا مگر بادشاہ نے اپنی آنکھوں سے ایک خواجہ سرا کو کچھ اشارہ کیا جو اسی وقت جا کر ایک چھوٹا سا ڈبہ اٹھا لایا اور اسے قالین پر دونوں کے درمیان رکھ دیا۔ مہاراجہ نے اس ڈبے کو کھولنے کا حکم دیا۔ ایک ہی نظر میں اس نے الماس کو پہچان لیا۔ اسے اٹھایا اور واپس آگیا۔

اس کے کچھ عرصہ بعد بادشاہ نے بیس ہزار روپے اور کئی دیگر قیمتی جواہر دے کر رہائی حاصل کی اور بہت سی مصیبتیں اٹھانے کے بعد انگریزی حکومت کی پناہ لی۔ یہاں اس کا معمولی وظیفہ مقرر ہو گیا۔ اور وہ اس پناہ میں اس وقت تک لدھیانہ میں رہا جب تک اسے دوبارہ تخت کابل حاصل ہو گیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے اس بدنصیب مہمان سے "کوہ نور" ہیرا چھیننے کے بعد لاہور میں ایک عظیم الشان جشن عام منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور حکم دیا۔ کہ سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں اپنے خرچ سے چراغاں کریں اور خوشیاں منائیں۔ سارا شہر مہاراجہ کے حکم سے خوشیاں منا رہا تھا۔ صرف شاہ شجاع کی "مبارک حویلی" ماتم کدہ بنی ہوئی تھی۔

اسی جشن کے موقعہ پر مہاراجہ نے حکم دیا کہ لاہور کے قلعہ اور بادشاہی مسجد کے درمیان جو وسیع چبوترہ اور کھلا میدان موجود ہے۔ اس میں ایک باغ لگایا جائے۔ چنانچہ منشی سوہن لال اپنی مشہور کتاب عمدۃ التواریخ دفتر دوم کے صفحہ ۱۳۹ پر سمت ۱۸۶۹ بکرمی کے واقعات میں لکھتا ہے:۔

"سرکار دولت مدار کا واجب الاطاعت حکم ممالک محروسہ کے
کارپردازوں کے نام صادر ہوا کہ ایک نیا باغ مسجد اور قلعہ

کے درمیان جس قدر جلد ہو سکے بنایا جائے۔ اس لیے
ماہر باغبان نئے باغ کی تیاری میں مستعدی کے ساتھ سرگرم
ہو گئے۔"

مہاراجہ کے حکم کی فوراً تعمیل کی گئی ۱۸۶۹ب / ۱۸۱۳ء میں فقیر عزیز الدین کی نگرانی میں یہ باغ احداث ہوا۔ اور اس کا نام حضوری باغ رکھا گیا۔ مہاراجہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

اس موقعہ پر جمعدار خوشحال سنگھ نے جو مہاراجہ کی ڈیوڑھی کا جمعدار تھا۔ عرض کیا کہ باغ کے درمیان ایک بارہ دری بھی نشست شاہی کے لیے سنگ مرمر کی بنی چاہیئے۔ مہاراجہ نے کہا۔ بات تو ٹھیک ہے مگر پنجاب میں سنگ مرمر کہاں سے آئے گا؟ جمعدار نے کہا سرکار کو اتنا تردد کرنے کی ضرورت نہیں۔ لاہور کا تمام شہر مقبروں اور مزاروں کے پتھروں کی بدولت سنگ مرمر کی کان بنا ہوا ہے۔ سرکار جس قدر چاہیں اس کان سے پتھر نکلوا سکتے ہیں اور اپنے کام میں لا سکتے ہیں چنانچہ بارہ دری کی تجویز منظور ہو گئی۔ اور خلیفہ نور الدین کے نام پروانہ جاری ہوا کہ حضوری باغ کے روبرو شاہی مسجد کے چبوترہ پر ایک سنگین اور متین بارہ دری بنائی جائے۔ اس بنا پر سرکار عالی کی تاکید کے بموجب کامل معماروں کو اس کے بنانے اور ترمیم کرنے میں لگایا گیا۔" عمدۃ التواریخ دفتر دوم صفحہ ۳۵۶)

اس بارہ دری کی تعمیر اور زیب و زینت کے لیے مقبرہ زیب النساء (نواں کوٹ) مقبرہ شاہ شرف (متصل بھاٹی دروازہ) مقبرہ نورجہاں۔ مقبرہ آصف جاہ اور مقبرہ جہانگیر وغیرہ سے پتھر اکھڑوایا گیا۔ اور دو سال کے عرصہ میں یہ باغ۔ اس کی بارہ دری اور فوارے سب درست ہو گئے۔

"اس بارہ دری کی عمارت سہ منزلہ ہے۔ نیچے کی منزل یعنی تہ خانہ میں پندرہ سیڑھیاں اتر کر جاتے ہیں۔ زینہ سرخ پتھر کا ہے سیڑھیوں کے آگے ڈیوڑھی ہے جس کے تین طرف سنگ مرمر کی دہلیزیں لگی ہیں۔ تہ خانہ کے وسط میں ایک قالبوتی بارہ دری ہے۔ جو اب تک چونے سے بنی ہے۔ اس کے چاروں طرف غلام گردش ہے جس میں روشندانوں کے ذریعے سے روشنی آتی ہے جو اوپر کی منزل میں رکھے گئے ہیں۔

اس بارہ دری کی دوسری منزل تین حصوں میں منقسم ہے۔ ایک حصہ باہر کا کھلا ہوا سنگ مرمر کا چبوترہ ہے۔ جو بارہ دری کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے، یہ چبوترہ آٹھ فٹ چوڑا اور تین فٹ زمین سے اونچا ہے اس کے وسط میں چاروں طرف ایک ایک فٹ اونچا ایک چبوترہ ہے جو اصلی چبوترے کی دیوار سے کچھ بڑھا کر بنایا گیا۔ اس چھوٹے سے مربع چبوترہ کو شہ نشین کہتے ہیں۔ بارہ دری میں دربار کرتے وقت مہاراجہ رنجیت سنگھ کی نشست اسی شہ نشین پر ہوتی تھی۔ اس چھوٹے بڑے چبوترے پر سنگ مرمر کا فرش ہے۔ جس میں دوہرے رنگدار پتھر بھی لگائے گئے ہیں۔ بڑے چبوترے پر جانے کے لیے ہر سمت دو دو سیڑھیاں سنگ مرمر کی ہیں۔ جن کے چار چار زینے ہیں۔

" بڑے چبوترے سے گزر کر بارہ دری کی اصلی عمارت شروع ہوتی ہے۔ جو چبوترے سے دو فٹ بلند ہے اس میں تین تین وہیں قالبوتی مرغولی چاروں طرف رکھے گئے ہیں۔ دوہرے دوہرے ستون نہایت خوشنما ہیں جن پر منبت کاری کی گئی ہے۔ تینوں دروں کے بغل میں ایک ایک دروازہ ہے جس پر سنگ مرمر کی چوکھٹیں لگی ہیں۔ ان دروں سے جب اندر جائیں تو دس فٹ زمین غلام گردش

کی چھوڑ کر دوسری بارہ دری آتی ہے جس کے اوپر تیسری منزل ہے۔ اس میں بھی بارہ در ہیں مگر ستون اکہرے ہیں۔ چھتیں ہر منزل کی سنہری منبت کار آئینہ وار منقش ہیں۔ باہر کی طرف چھت کے برابر سنگ مرمر کا چھجہ بنایا گیا ہے جس پر بطور منڈیر سنگ مرمر کی جالیاں جڑی ہیں۔ تیسری منزل پر جانے کے لیے سنگ مرمر کا زینہ ہے جس میں سولہ سیڑھیاں ہیں (خلاصہ تاریخ لاہور از رائے بہادر کنہیا لعل)۔

مشہور سیاح ولیم مورکرافٹ اپنے سفر نامہ مطبوعہ لندن ۱۸۳۷ء کے صفحہ ۳۹ پر حضوری باغ کی بارہ دری کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے:۔

"اس باغ کے اندر ایک چھوٹی سی سہ منزلہ عمارت ہے
جس کی درمیانی منزل میں لکڑی کا خوبصورت کام ہے اور
جس کی رنگین و منقش چھت میں چھوٹے چھوٹے شیشے جڑے
ہیں۔ بارہ دری کے باہر ایک خوبصورت فوارہ ہے جو
ہر وقت چلتا رہتا ہے۔ اس میں خس کی ٹٹی لگا کر گرمی کے دنوں
میں بارہ دری سے خواب گاہ کا کام لیا جاتا ہے۔"

اس بارہ دری میں مہاراجہ اکثر جشن عیش و نشاط منایا کرتا تھا۔ منشی سوہن لعل عمدۃ التواریخ کے صفحہ ۲۰۶ پر لکھتا ہے:۔

"ہولی کے جشن کی محفل عیش و نشاط حضوری باغ میں منعقد
ہوئی اور مہاراجہ نے اس میں جلوس فرمایا۔ تمام سرکردہ
اہل کار، راجے اور اطراف و اکناف کے ذیل ہولی کے
اس جشن میں شریک ہوئے۔"

حضوری باغ کے جنوب مشرق کی طرف ایک گلاب خانہ بھی تھا جس میں شراب کشید کی جاتی تھی اور مہاراجہ کے لیے اس کے لائق اور قابل درباری حکیم فقیر نور الدین ادویہ تیار کرتے تھے۔

ڈاکٹر مارٹن جو جون ۱۸۳۱ء کی ابتدائی تاریخوں میں پہلی دفعہ لاہور پہنچے اور کئی سال تک رنجیت سنگھ کے دربار میں رہے،[1] اس گلاب خانے کا ذکر کرتے ہوئے اپنے سفر نامے میں لکھتے ہیں کہ "اس کو گلاب خانہ اس لیے کہتے ہیں کہ یہاں گلاب اور بید مشک وغیرہ کشید کیا جاتا ہے۔" یہیں انھوں نے سب سے پہلے اپنا مطب جاری کیا اور یہیں وہ فقیر عزیز الدین اور فقیر نور الدین کو جو رنجیت سنگھ کے مشہور مشیران کار تھے، دوا سازی کے طریقے اور کیمیاگری کے گر بتایا کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسی جگہ رنجیت سنگھ کے لیے کابلی انگوروں سے شراب بنائی جاتی تھی۔ یہ شراب ہندو اور سکھ بناتے تھے، مسلمانوں اور عیسائیوں کو نزدیک آنے کی اجازت نہیں تھی تاکہ وہ کہیں شراب کو بھرشٹ نہ کر دیں۔[2]

اس کے بعد مارٹن لکھتا ہے کہ "سرکاری دواخانہ بھی حکیم نور الدین کے سپرد تھا جہاں ہی مہاراجہ کو خوش کرنے کے لیے

---

[1] یہ منزل ۱۹ جولائی ۱۹۳۲ء کو بادوباراں کے صدمے سے اچانک گر گئی اور اب تک اس کی مرمت نہیں ہو سکی۔

[2] ڈاکٹر مارٹن رنجیت سنگھ کے دربار میں، از سید عبد القادر مطبوعہ الطبیب لاہور نومبر ۱۹۴۲ء۔

قسم قسم کی مسک ادویہ اور کشتہ جات تیار کیا کرتا تھا۔ اس وجہ سے وہ مجھ سے بہت خوش تھے۔"

جنوری ۱۸۴۱ء میں حضوری باغ، قلعہ اور بادشاہی مسجد کے گرد ایک عظیم جنگ ہوئی۔ مہاراجہ گلاب سنگھ، سرداران سندھانوالیہ، جمعدار خوشحال سنگھ اور رانی چند کور جو قلعہ کے اندر تھے، ایک طرف تھے اور شہزادہ شیر سنگھ جسے سپاہ خالصہ نے پنجاب کا مہاراجہ تسلیم کر لیا تھا، دوسری طرف تھا۔ اس کے ہمراہ ستر ہزار پیدل فوج تھی۔ اور پچاس ہزار متعلقین فوج تھے۔ ان ایام میں بادشاہی مسجد سے اصطبل کا کام لیا جاتا تھا۔ شیر سنگھ حضوری باغ کی بارہ دری میں بیٹھ کر اپنے افسروں کو مقامات جنگ پر جانے کا حکم دیتا تھا۔ جب اس کی دو سو بیس توپیں ایک دم چلائی جاتی تھیں تو دیوار و در دہل جاتے تھے اور بہادر سے بہادر نوجوانوں کے کلیجے دہل جاتے تھے۔ اس کے باوجود بہت سی جھڑپوں کے بعد شیر سنگھ کو حضوری باغ چھوڑنا پڑا۔ محاصرہ کے سات دن بعد جب شیر سنگھ کی فوج نے بادامی باغ، میدان برہانہ، اور حضوری باغ سے اپنی لاشیں اٹھانی شروع کیں تو ۲۸۶ آدمی، ۱۰۶ گھوڑے اور ۳۰۲ بیل مردہ پائے گئے۔

جب سبراؤں کی جنگ (۱۰ فروری ۱۸۴۶ء) کے بعد نابالغ مہاراجہ دلیپ سنگھ نے ۱۸ فروری کو لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند کے پاس بمقام للیانی (قصور) حاضر ہو کر سکھ فوج کی حماقتوں کی پاداش میں معافی مانگی۔ اور وائسرائے نے معافی دینے کے بعد انگریزی فوج کی حفاظت میں اسے ۲۰ فروری کو قلعہ لاہور میں داخل کیا تو سر ہنری گف کمانڈر ان چیف سپاہ انگلشیہ ایک دستہ فوج لے کر بادشاہی مسجد اور حضوری باغ پر قابض ہو گیا۔ آخر ۱۲ مارچ ۱۸۴۶ء کو انگریزی فوج باغ انارکلی اور بارہ دری نواب وزیر خاں میں چلی گئی۔ اور حضوری باغ اور بادشاہی مسجد کو انگریزوں نے واگذار کر دیا۔ (بارہ دری نواب وزیر خاں لاہور کے عجائب گھر کے عقب میں واقع ہے۔ اس میں آجکل پبلک لائبریری قائم ہے۔)

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں جو باغ، فوارے اور حوض بارہ دری کے گرد بنائے گئے تھے، قریباً ایک سو سال کے عرصہ میں نہ صرف وہ مٹی میں دب گئے بلکہ بارہ دری کی دو زمین سیڑھیاں بھی زمین نگل گئی۔ یہاں تک کہ لاہور کے لوگ بھول گئے کہ یہاں کوئی فوارہ تھا۔ اور سیڑھیاں بھی موجودہ سیڑھیوں سے زیادہ تھیں۔ قریباً چالیس پچاس برس ہوئے لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند کے عہد میں ایک انگریز ماہر آثار قدیمہ نے کسی پرانے نقشہ کے مطابق گم شدہ سیڑھیوں، فواروں اور حوض کا پتہ بتایا چنانچہ تھوڑی سی زمین کھودنے پر یہ سب کچھ برآمد ہو گیا اور باغ اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔ بقول حضرت فوق مرحوم ؎

تمہارے تیر کے زخموں کے شاید کچھ نشاں نکلیں
ہمارے دل کے آثار قدیمہ کی کھدائی میں

اس موقعہ پر لاہور کے اکثر لوگ یہ گم شدہ حوض، فوارے اور سیڑھیاں دیکھنے جاتے تھے۔ اور حیران ہوتے تھے کہ زمین کس طرح اپنے دفینے اُگل رہی ہے۔

باغ کا نظارہ دلفریب ہے۔ عیدین کے دنوں میں اور بعض خاص خاص تقریبوں پر باغ میں بہت رونق ہوتی ہے۔ فوارے چھوٹتے ہیں۔ گرمی کے دنوں میں اکثر لوگ بارہ دری میں آ کر بیٹھتے اور باغ کی تفریح سے اپنا دل بہلاتے ہیں۔ باغ کے سامنے بادشاہی مسجد کی سیڑھیوں کے ایک طرف علامہ سر محمد اقبال کا خوبصورت مزار ہے اور دوسری طرف سر سکندر حیات خاں وزیر اعظم

پنجاب کی فخر ہے ـــــــ مرتب]

باغ راجہ دھیان سنگھ

راجہ دھیان سنگھ راجۂ راجگان کہلاتا تھا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کا وزیر اعظم تھا۔ اس نے نالے یعنی پرانے دریا کے کنارے ایک عالی شان باغ تعمیر کرایا۔ جس میں جامن اور آم کے درخت خصوصیت سے بہت زیادہ تھے۔ اس کی چار دیواری بڑی مضبوط تھی۔ لیکن انقلاب کے زبردست ہاتھوں سے کوئی آہنی دیوار بھی محفوظ نہیں رہ سکتی۔ چار دیواری موجود نہیں البتہ واٹر ورکس کے عقب میں قلعہ اور مستی دروازہ کے باہر سرکلر روڈ کو طے کرنے کے بعد جامن اور آم کے درخت نظر آتے ہیں۔ باغ کے زیادہ حصے میں اب کھیتی باڑی ہوتی ہے۔

راجہ سوچیت سنگھ، راجہ ہیرا سنگھ، میاں اودھم سنگھ اور تمام ڈوگرہ سرداروں کی سمادھیاں اسی باغ میں واقع ہیں۔ جب نو ماہ کی وزارت پنجاب کے بعد رانی جنداں کے بھائی راجہ جواہر سنگھ کو پوہ سمت ۱۹۰۱ ب میں فوج خالصہ نے قتل کر دیا تو اس کی آخری وصیت کے مطابق اسی باغ میں سادھو راجہ سوچیت سنگھ کے متصل اس کی سمادھ بھی بنائی گئی۔ رانی جنداں اسی مقام پر آکر اپنے بھائی کے ماتم میں سینہ کوبی کرتی اور بآواز بلند رویا کرتی اور سنگھ فوج کے افسروں کو گالیاں دیا کرتی۔ اسی باغ میں راجہ جواہر سنگھ کے ساتھ اس کی چار رانیاں ستی ہوئیں۔ جنھوں نے چتا پر بیٹھ کر سکھوں کو بد دعائیں دیں اور ان کی سلطنت کے تباہ ہو جانے کی دعائیں مانگیں۔ اب یہ سمادھیں باوامی باغ کے ریلوے مال گودام کے متصل ہیں۔

> ["۹ ر پوہ سمت ۱۹۰۳ ب کو صاحب کلاں (ریذیڈنٹ) نے کارداروں کے نام پروانہ جاری کیا کہ فوج انگریزی آ رہی ہے۔ گذر دریا وال سے لاہور تک جو پلٹن انگریزی آئے اس کے لیے ہر منزل پر رسد، دانہ، گھاس، لکڑی، چارپائی وغیرہ خدمات کا مکمل انتظام کیا جائے اور یہ تمام سامان باغ بیرون قلعہ میں جہاں سمادھ اودھم سنگھ و راجہ سوچیت سنگھ ہے جمع رکھا جائے۔"
> (عمدۃ التواریخ دفتر پنجم ص ۲۹)۔ چونکہ یہ باغ راجہ گلاب سنگھ کے قبضے میں تھا اس لیے اس تمام سامان کی ذمہ داری قاضی حکم دین وکیل راجہ گلاب سنگھ کو سونپی گئی ـــــــ مرتب]

مہاراجہ رنبیر سنگھ خلف مہاراجہ گلاب سنگھ اور مہاراجہ پرتاپ سنگھ خلف راجہ رنبیر سنگھ ان سمادھوں پر متھا ٹیکنے کے لیے آیا کرتے تھے اور گرنتھیوں کو نذر نیاز دے جایا کرتے تھے۔

باغ دیوان کرپا رام

دیوان کرپارام مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں ایک نامی امیر کبیر گزرا ہے۔ یہ کنجاہ ضلع گجرات کا رہنے والا،

دیوان موتی رام گورنر کشمیر کا بیٹا اور دیوان حکم چند کا پوتا تھا۔ راجہ دھیان سنگھ کی عداوت کی وجہ سے ۱۸۳۱ء میں اسے کشمیر کی نظامت سے واپس بلا کر نظر بند کر دیا گیا۔ آخر اس نے نو لاکھ روپیہ دے کر اس قید سے رہائی پائی۔ لیکن راجہ دھیان سنگھ نے پھر بھی اس کو چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ چنانچہ وہ مہاراجہ کی اجازت کے بغیر بنارس چلا گیا جہاں ۱۸۴۲ء میں انتقال کر گیا۔ پنجاب میں وہ چار لاکھ روپیہ سالانہ کا جاگیردار تھا۔

لاہور میں موری دروازہ کے اندر اس کی عالی شان حویلیاں تھیں۔ اس قدیم شاہی رستہ پر جو لاہور سے شالامار باغ کو جاتا ہے، دیوان کرپا رام نے ایک قلعہ نما عمارت تعمیر کرا کے اس کے اندر عالی شان باغ ثمردار درختوں کا لگایا۔ شوالہ بھی بنوایا بلکہ باغ کی چار دیواری کے باہر ایک وسیع تالاب بھی کھدوایا جس کی پختہ سیڑھیوں کے نشان اب تک نظر آتے ہیں۔ تالاب کے عین درمیان میں ایک بارہ دری بھی تعمیر کرائی جو اس وقت شکستہ حالت میں ہے۔

اس مقام پر جہاں یہ باغ اور اس کے طفقات تھے، دوری شاہ کا مزار تھا جو شاہجہان کے زمانے میں فوت ہوئے تھے۔ اس کے ارد گرد گل بوٹے اور اشجار نصب تھے۔ دیوان کرپا رام نے خانقاہ کی تمام متعلقہ زمین اپنے باغ کے وسیع احاطے میں شامل کر لی۔

اسی باغ کی چار دیواری کے اندر اب موضع سلطان پورہ آباد ہے۔ سلطان کمبوہ دیوان کرپا رام کے باغ کا مالی تھا۔ اسی نے سب سے پہلے یہاں مکان بنایا اور اسی کے نام پر یہ باغ سلطان پورہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔ باغ کی چار دیواری کے اندر جو باہر سے ایک طویل طویل قلعہ نما عمارت معلوم ہوتی ہے آج سے نصف صدی پہلے پچاس ساٹھ گھروں کی آبادی تھی۔ تالاب کی دوسری طرف بھی قریباً اسی قدر آبادی موجود ہے۔ باغ کے جنوب میں ایک بازار بھی بنام بازار کرپا رام آباد تھا لیکن اب نہ باغ ہے نہ بازار، نہ دیوان کرپا رام کا کوئی نام لیتا ہے۔ نام ہے تو اس مالی سلطان کا جو اس کی نگاہ میں بالکل بے حقیقت تھا۔ یہ باغ جو اب موضع سلطان پورہ کے نام سے مشہور ہے لاہور کے محال نولکھا میں شامل ہے۔

باغ مصر دیوان چند ظفر جنگ بہادر

مصر دیوان چند کو ان کی خدمات کی وجہ سے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ظفر جنگ بہادر کا خطاب دے رکھا تھا۔ پھر ان کو کشمیر کی نظامت کا جلیل القدر عہدہ عطا کیا۔ جس طرح مہاراجہ کے اور درباریوں نے لاہور میں اپنے مکانات تعمیر کرائے تھے، اسی طرح مصر دیوان چند کا بھی ایک وسیع مکان یہاں موجود تھا۔

مصر دیوان چند نے دیگر امرائے دربار کی طرح لاہور میں ایک باغ بھی تعمیر کرایا جس میں مختلف اقسام کے ثمردار بوٹے لگائے گئے تھے۔ جب مصر دیوان چند کا ۱۹ / جنوری ۱۸۲۵ء کو انتقال ہوا تو اسی باغ کے جنوب رویہ ان کی سمادھ تعمیر ہوئی۔ یہیں حضرت شادی شاہ (وفات ۹ / شعبان ۱۲۰۶ھ) کا مزار ہے۔

جب انگریز ریذیڈنٹ کے ماتحت مہاراجہ دلیپ سنگھ کی نابالغی کی وجہ سے دربار لاہور میں کونسل بنی تو ۳ / مارچ ۱۹۰۲ء کو صاحب عالیشان ریذیڈنٹ نے سرداران خالصہ سے پوچھا کہ متصل مزار گنج بخش بطرف مغرب کس شخص کا باغ ہے سرداروں نے

عرض کیا یہ باغ بنا کردہ مصرولیان چند سرگباشی ہے۔ ریذیڈنٹ نے پوچھا کہ اب اس کا کوئی وارث باقی ہے۔ جواب دیا گیا کہ اس کا ایک حقیقی بھائی تھا وہ بھی مر چکا ہے اب اس کا برادر زادہ موجود ہے مگر وہ کسی قابل نہیں قصبہ گوندلاں والا متصل گجرات القصہ اس کو قوت لایموت اور عیال و اطفال اور متعلقین کی پرورش کے لیے سرکار سے ملا ہوا ہے وہیں وہ رہتا ہے۔ صاحب نے فرمایا کہ باغ اب صاحب لوگوں کو ملنا چاہیے تاکہ گورہ لوگ یہاں سیر و سیاحت کیا کریں۔ سرداروں نے عرض کیا " تمام ملک و مال و اسباب صاحبان عالیشان است " چنانچہ صاحب نے اس باغ پر قبضہ کر لیا۔

پنجاب میں سکھوں کی اپنی خام خیالیوں، خود سریوں اور مہاراجہ دلیپ سنگھ کی صغیر سنی کی وجہ سے یہ حال تھا۔ کہ لاہور میں انگریزی فوج کے بغیر امن قائم ہونا مشکل تھا۔ اور دربار پر انگریزوں کی ہیبت اس قدر چھا گئی تھی۔ کہ بڑے بڑے سردار، صاحب ریذیڈنٹ سے اختلاف رائے کی جرأت نہ کر سکتے تھے بلکہ ہر بات پر ہر سردار اور ہر وزیر و امیر کی طرف سے یہی جواب ملتا تھا "خوب صلاح است۔ بہتر و انسب است۔ بہتر و احسن است۔ بسیار خوب است۔ ہمیں طور خواہد شد۔ خوب است۔ درست است "

آخر ۱۸۴۹ء میں جب انگریزی عملداری کو یہاں کامل استحکام ہو گیا۔ تو اس باغ کا نام کمپنی باغ رکھ دیا گیا۔ اور اس میں ایک تالاب اور ایک گیند گھر بھی بنایا گیا اور انگریزی قسم کے بیل بوٹے لگائے گئے۔ لیکن ۱۸۶۲ء میں سرکار انگریزی نے تالاب۔ گیند گھر اور مقبرہ کو چھوڑ کر باقی باغ اور اس کی زمین اکاسی سو روپیہ میں نیلام کے ذریعے فروخت کر دی۔

باغ ونتورہ یا کڑی باغ

[جرنیل ونتورہ سکھ فوج کے نامی گرامی افسروں میں تھا۔ وہ اٹلی کا باشندہ تھا۔ نپولین کی نظر بندی کے بعد روزی کی تلاش میں یہاں پہنچا اور کئی ماہ کی کوشش کے بعد خالصہ فوج کو یورپین طریقے پر قواعد سکھانے کے لیے ۱۸۲۲ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمرۂ ملازمین میں شامل ہوا۔ دو ہزار پانچ سو روپیہ ماہوار تنخواہ تھی ـــــــ مرتب] مہاراجہ کی پیادہ فوج اسی کے زیر نگرانی قواعد دان فوج بنی تھی۔ یہ قریباً بیس برس تک خالصہ دربار میں رہا۔

۱۸۲۵ء میں لدھیانہ کے مقام پر جرنل ونتورہ کی شادی ایک انگریز خاتون سے ہوئی جس کا انتظام کپتان ویڈ نے کیا۔ مہاراجہ نے ونتورہ کو اس تقریب پر دس ہزار اور دوسرے روساء و امراء نے تیس ہزار روپیہ بطور تمبول دیا۔

پشاور کا وہ مشہور گھوڑا جس کا نام لیلیٰ تھا اور جس کی خواہش سلطان روم اور شاہ ایران کو بھی تھی، جرنیل ونتورہ ہی ۱۸۲۳ء میں پشاور کے حاکم سردار سلطان محمد خاں سے فوج کشی کر کے اور کئی جانیں گنوا کے لایا تھا۔ جب یہ گھوڑا لاہور آیا تو مہاراجہ بہت خوش ہوا اور اس نے جرنیل ونتورہ کو دو ہزار کا قیمتی خلعت عطا کیا۔

جرنیل ونتورہ مہاراجہ کے مقرب و معتمد افسروں میں تھا۔ جب انگریزی سفارت نے دریائے سندھ کے رستے لاہور آنے کا ارادہ ظاہر کیا، تو مہاراجہ، جو بڑا زود فہم تھا، سفارت کا اصل مقصد سمجھ گیا۔ اس نے فوراً جرنیل ونتورہ کو ایک دستہ فوج دے کر ڈیرہ غازی خاں اس غرض سے بھیجا کہ نواب بہاول پور کے ساتھ اس کا اجارہ ختم کر کے ڈیرہ غازی خاں کو براہ راست سکھ سلطنت میں شامل کر لے۔ چنانچہ جرنیل ونتورہ نے فوراً اس پر عمل کیا۔

ایک مرتبہ ایک ضرب بندوق و دنالی پر ایک طرف مہاراجہ کا نام اور دوسری طرف ونتورہ کا نام انگریزی اور فارسی حروف میں کندہ کرایا گیا۔

[جرنیل ونتورہ کو پہلے انارکلی کے مقبرہ میں جگہ دی گئی۔ پھر اس نے قریب ہی شہر سے جنوب کی طرف زمین لے کر اپنا ایک وسیع باغ تعمیر کرایا۔ جو ونتورہ باغ کے نام سے مشہور ہو گیا۔ یہ باغ پرانی انارکلی میں ایڈورڈ روڈ پر حضرت موج دریا بخاری کے روضہ کے بالکل متصل اس جگہ احداث ہوا تھا جہاں آجکل انکم ٹیکس کا دفتر اور منشی چیمبرس واقع ہیں۔ اور ایک وسیع مسجد بھی بن رہی ہے جسے مدینہ مسجد کہتے ہیں ـــــــ مرتب]

جرنیل ونتورہ کے ہمراہ ایک اور فرانسیسی افسر جرنیل الارڈ بھی آئے تھے اور چونکہ دونوں ایک ہی دن مہاراجہ کے ہاں ملازم ہوئے تھے اور تنخواہ بھی دونوں کی یکساں یعنی اڑھائی ہزار روپیہ ماہوار تھی، اس لیے دونوں اسی باغ میں ایک کوٹھی بنا کر رہا کرتے تھے۔

[جرنیل الارڈ فرانس کا رہنے والا اور نپولین بونا پارٹ کی فوج کا اعلیٰ عہدہ دار تھا۔ جنگ واٹرلو کی شکست کے بعد ونتورہ کے مشورے سے پٹھانوں کے بھیس میں ایران اور افغانستان سے ہوتا ہوا مارچ ۱۸۲۲ء میں لاہور پہنچا۔ کچھ ٹوٹی پھوٹی فارسی جانتا تھا۔ مہاراجہ نے ملازم رکھ لیا۔ سکھوں کے قواعد دان رسالے اسی نے تیار کیے تھے۔

۵ اپریل ۱۸۲۷ء کو جرنیل الارڈ کی لڑکی میری شارلوٹ (MARIE CHARLOTTE) کا انتقال ہوا اور وہ اسی باغ کے ایک اونچے آوے (ٹیلے) پر دفن کی گئی۔ اس صدمے سے جرنیل الارڈ کی صحت خراب رہنے لگی اور وہ کچھ عرصہ کے بعد رخصت لے کر بیوی بچوں سمیت فرانس چلا گیا جہاں سے قریباً اٹھارہ ماہ بعد پھر لاہور واپس آیا۔ مہاراجہ نے خوب آؤ بھگت کی۔

جنوری ۱۸۳۹ء میں اس بہادر جرنیل کا پشاور میں یکایک حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ اس کی لاش لاہور لائی گئی اور فوجی اعزاز کے ساتھ اس کی لڑکی کی قبر کے پاس دفن کی گئی۔ چنانچہ باغ کی پرانی جنوبی دیوار کے ساتھ درختوں کے گھنے جھنڈ میں احاطہ باغ کے اندر ہشت پہلو طبہ ر چبوترے پر چھوٹے سے گنبد کے نیچے باپ بیٹی دونوں کی قبریں موجود ہیں۔ گنبد کے اندر فرش پر فرانسیسی زبان میں اور گنبد کے باہر دروازے پر فارسی حروف میں کتبے نصب ہیں۔ فارسی کتبے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گنبد موسیو الارڈ نے

اپنی لڑکی میری شارلوٹ کے انتقال کے بعد اس آرزو کے ساتھ خود بنوایا تھا کہ
"الٰہی جائشش زیر بہشت بریں باد"
اس پر میری شارلوٹ کے انتقال کی تاریخ ۲۲ سلطہ ۱۲۴۲ھ (۱۸۲۷ء) مطابق سمت ۱۸۸۴
بھی درج ہے ——— مرتب]

مفتی تاج الدین نے اپنی کتاب حالاتِ ضلع لاہور میں اور مولوی نور احمد چشتی نے تحقیقاتِ چشتی میں لکھا ہے کہ جب جنرل ونتورہ فرانسیسی کی دختر مر گئی تو اس زمانے میں لاہور میں چونکہ عیسائیوں کا کوئی قبرستان نہ تھا، اس لیے اپنی ہی کوٹھی کے ایک ٹیلے پر اس کو دفن کر دیا گیا۔ پنجابی زبان میں چھوٹی عمر کی لڑکی کو کڑی کہتے ہیں اس لیے اس دن سے اس کوٹھی و باغ کا نام باغ ونتورہ کی بجائے کڑی باغ مشہور ہو گیا۔

[اوّل تو کتبوں[1] کی موجودگی میں یہی بات سرے سے غلط ہے کہ وہ جرنیل ونتورہ کی لڑکی تھی جو فوت ہونے کے بعد یہاں دفن کی گئی۔ صاحب عمدۃ التواریخ نے دفتر سوم کے حصہ سوم میں صفحہ ۳۵۰ پر) لکھا ہے:۔

"۱۸۳۶ء میں جب جنرل ونتورہ نے مہاراجہ کی خدمت میں بطور پیش کش ایک گھوڑا، پانچ ہزار نقد اور ایک شغان مخملی پیش کیا۔ اس وقت اس کی لڑکی بھی اس کے ہمراہ تھی۔ اس نے بھی چند اشرفیاں بطور نذر پیش کیں۔ مہاراجہ نے جنرل ونتورہ سے اس کے گھر کے حالات پوچھے اور اس کی لڑکی کے نام پانچ ہزار روپیہ کی جاگیر عطا کی۔"

پھر یہ کہنا بھی کسی طرح درست نہیں کہ "اس وقت لاہور میں عیسائیوں کا کوئی قبرستان نہ تھا" حالانکہ اکبر کے وقت میں گوا سے جو جیسوٹ مشن آیا تھا، اس نے اپنا گرجا مدرسہ اور قبرستان یہاں بنا رکھا تھا۔ ۱۰۲۱ھ (۱۶۱۲ء) میں موضع مہری پھلواری مہر نگ سے بارہ بیگھے مزروعہ زمین خرید کر اس قبرستان میں اور شامل کی گئی۔ یہ قبرستان کتھیڈرل اسکول اور گرجا سے ملحق رنگ محل سینما کے سامنے واقع ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ موسیو جنرل الارڈ نے محض محبت کی بنا پر اس کا مرقد اپنی کوٹھی کے احاطے میں بنوایا ———

---

[1] دیکھو تاریخ لاہور از سید محمد لطیف ص ۱۹۶ جس میں فرانسیسی کتبہ نقل کیا گیا ہے۔ اس کتبے میں موسیو جنرل الارڈ اور اس کی دختر میری شارلوٹ کے نام درج ہیں۔

یوں دفن میرے ساتھ دل بے قرار ہو
چھوٹا سا اک مزار کے اندر مزار ہو

ونتورہ باغ کے کرڑی باغ مشہور ہونے کی وجہ بھی دل کو نہیں لگتی۔ دراصل مہاراجہ کے حکم سے ان کے ماتحت راجگان اور انگریز مہمان جب کبھی لاہور آتے تھے اسی باغ میں اقامت گزیں کیے جاتے تھے اور مہمانوں کی آمد و رفت کے لیے خلیفہ نور الدین کو اس باغ کی آرائش و زیبائش کا حکم ہوتا رہتا تھا۔ مہاراجہ کی وفات کے بعد ۱۸۴۸ء میں سر فریڈرک کرڑی لاہور کے انگریز ریذیڈنٹ مقرر ہوئے۔ وہ جب تک یہاں رہے اسی باغ میں مقیم رہے۔ یہ وجہ اس کے کرڑی باغ مشہور ہونے کی ہے ——— مرتب]

معلوم نہیں اس باغ نے جنرل ونتورہ اور جنرل الارڈ کے بعد کتنے انقلاب دیکھے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک یہ باغ مع کوٹھی ریاست کپورتھلہ کے قبضے میں رہا اور کوٹھی اہلو والیہ یا کپورتھلہ ہاؤس کہلاتا رہا۔ ریاست نے اس کی حالت و حیثیت کو برقرار رکھا۔

۱۸۸۴ء میں جب سر سید احمد خاں لاہور آئے تو ۲ فروری کو اسی باغ میں ان کا لکچر ہوا جس میں انھوں نے اہلِ پنجاب کو "زندہ دلانِ پنجاب" کا خطاب دیا۔

[قیامِ پاکستان سے دس پندرہ سال پہلے یہ جگہ مہاراجہ کپورتھلہ نے بھارت انشورنس کمپنی کے ہاتھ بیچ دی جس نے اس کے ایک حصے میں جدید طرز کے چند رہائشی فلیٹ تعمیر کرلیے۔ پھر بھی عمارات کے آگے ایک وسیع میدان موجود تھا۔ اب کوٹھی انکم ٹیکس کے دفتر کے طور پر استعمال ہوتی ہے میری شارٹو اور جنرل الارڈ کی قبروں کے بلند گنبد کے آگے ملٹی سٹوریز کی رفیع الشان عمارت کھڑی ہوگئی ہے اور ایک گوشے میں عظیم الشان مسجد بن رہی ہے جس کا نام مدینہ مسجد رکھا گیا ہے ——— مرتب]

باغ سردار جوالا سنگھ

سردار جوالا سنگھ، مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بارسوخ درباری سردار مت سنگھ بھڑانیہ کا بیٹا تھا۔ مت سنگھ مہم کشمیر بار اول ۱۸۱۳ء میں مارا گیا تھا۔ جوالا سنگھ کو مہاراجہ نے اس کے باپ سے الگ سوا لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر دی ہوئی تھی۔ اس سردار نے ملتان۔ کشمیر اور منکیرہ کی لڑائیوں میں نمایاں خدمات انجام دیں۔

بھڑانہ میں چونکہ ان کی جاگیر تھی اس لیے بھڑانیہ یا بھڑانیہ کہلاتے تھے۔ مہاراجہ کے دربار میں سردار جوالا سنگھ

کا بڑا رسوخ تھا۔ جب سردار تیج سنگھ (بعہد انگریزاں راجہ تیج سنگھ) کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ تو مہاراجہ نے پہلے دن سردار جوالا سنگھ کو اپنی طرف سے ماتمی خلعت۔ دوشالہ۔ تھان کمخواب اور دستار وغیرہ پارچات دے کر ماتم پرسی کے لیے بھیجا۔ اور دوسرے دن خود گئے۔

ایک مرتبہ تھانہ دار کانگڑہ کو اس کی بعض حرکات دشکایات کی بنا پر مہاراجہ موقوف کرنا چاہتا تھا لیکن اس خیال سے کہ کہیں شورش زیادہ نہ ہو جائے اُس نے دیوان بھوانی داس اور سردار جوالا سنگھ کو خفیہ ہدایات اور کچھ فوج دے کر وہاں بھیجا جنھوں نے اُس کو بے خبری ہی میں جا دبوچا۔

چونکہ لاہور میں اکثر امرا و وزرا نے اپنی عالی شان حویلیاں تعمیر کرا رکھی تھیں اور مہاراجہ کو باغات کا شوق تھا بلکہ امرائے دربار کو باغات کی تعمیر کے لیے کہا بھی کرتا تھا اس لیے اکثر سرداروں اور وزیروں نے اپنی اپنی جاگیروں کے علاوہ لاہور میں بھی باغات تعمیر کرا رکھے تھے۔ چنانچہ سردار جوالا سنگھ نے بھی شالا مار باغ کی سڑک پر ایک باغ اعلیٰ پیمانہ پر تعمیر کرایا۔ ابھی باغ تیار ہی ہو رہا تھا کہ ۵ر ماگھ کو مہاراجہ اسے دیکھنے کے لیے آئے اور آرائش باغ کی تاکید کر گئے۔ باغ کے پاس ہی شکارگاہ تھی، مہاراجہ اکثر آتے اور یہیں خیمہ وغیرہ نصب کراتے۔

ایک مرتبہ مہاراجہ مع کپتان صاحب ہاتھی پر سوار ہو کر سہ پہر کے وقت باغ میں آئے اور پلٹن کی قواعد کا باغ میں ملاحظہ فرمایا۔

ایک مرتبہ صاحبان عالیشان کے ساتھ مہاراجہ نے باغ جوالا سنگھ ہی میں ملاقات کی اور فرشی دربار کی بجائے کرسیوں کا ایک مختصر دربار منعقد فرمایا۔

مہاراجہ ایک مرتبہ بیمار ہو گئے۔ کپتان صاحب (قائم مقام گورنر جنرل) نے لدھیانہ سے پنج ہزار سردارنہ ارسال کیا۔ مہاراجہ نے غسل صحت کے لیے باغ جوالا سنگھ ہی کو منتخب کیا۔ یہ اتنا بڑا باغ تھا کہ اس میں ایک اچھا خاصا دربار ہو سکتا تھا۔ چنانچہ عمدۃ التواریخ دفتر سوم حصہ دوم ص ۲۰۱ میں مرقوم ہے۔

"تمام سرکردگان عالی شان و دفتریان و منشیان و وکیلان
اطراف و اکناف در باب گذرانیدن نذرات سعادت
دو جہاں حاصل ساختند"

مہاراجہ دلیپ سنگھ اور صاحبان انگریز کے اقتدار لاہور کے زمانہ میں یہ باغ سمت ۱۹۰۴ب میں بطریق دھرم ارتھ دیہ بھان برہمن کو ملا۔ چنانچہ صاحب کلاں نے ۱۳ ربیساکھ سمت مذکور کو اس باغ کا نقشہ ملاحظہ فرمایا۔ لیکن ۱۴ ساون سمت ۱۹۰۵ب کو یہ باغ مہاراجہ دلیپ سنگھ کے سیر و شکار کے لیے محفوظ کر دیا گیا۔

باغ دیوان رتن چند داڑھی والا

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار کا یہ قابل منشی حضور ڈیوڑھی کے معزز عہدہ پر سرفراز تھا۔ پہلے دیوان خطاب ملا۔ پھر

نی داڑھی کی وجہ سے مہاراجہ نے داڑھی والا کا خطاب دیا اور یہ خطاب ایسا مقبول ہوا کہ اصل نام کا ایک جزو ہو گیا۔ ۱۸۴۷ء میں انتقال کر گئے۔

دیوان رتن چند کو عمارات کا بہت شوق تھا شہر کے اندر ایک عالی شان حویلی تعمیر کرائی۔ شاہ عالمی دروازہ کے باہر ایک تالاب۔ باغ اور شوالہ تعمیر کرایا۔ جس جگہ یہ باغ واقع ہے وہاں محلہ دائی لاڈو کے عالیشان مکانات اور عظیم الشان عمارات کی بنیادیں اور کھنڈرات اب تک موجود چلے آتے تھے۔ ۱۸۴۲ء میں بزمانہ مہاراجہ دلیپ سنگھ انہی کھنڈروں پر باغ کی کھدائی اور تعمیر شروع ہوئی۔ خشت فروش قدیم دیواروں کی بنیادوں کو لاوارث دیکھ کر کھود کھود کے گڑھے بناتے اور اینٹیں فروخت کیا کرتے تھے۔ دیوان رتن چند نے اس زمین کو صاف اور ہموار کرایا۔ اور یہاں ایک وسیع اور عالیشان مکان و باغ بنا کر اپنی یادگار قائم کی۔

انگریزی حکومت کے ابتدائی دور میں چونکہ پنجاب کے والیانِ ریاست نے اپنے مکانات لاہور میں تعمیر نہیں کرائے تھے اس لیے مہاراجہ کشمیر۔ مہاراجہ پٹیالہ اور بعض دوسرے والیانِ ریاست جب کبھی لاہور آتے تھے تو اسی باغ میں ٹھہرا کرتے تھے۔

۱۹۴۳-۴۴ء میں جب یہ سطور لکھی جا رہی ہیں اس کی کیفیت یہ ہے کہ باغ کے چاروں کونوں پر چار پختہ مکانات بنے ہوئے ہیں۔ جن میں دیوان رتن چند کے جانشینوں نے بہت کچھ ترمیم اور ایزادی کر دی ہے۔ درمیانی بارہ دری دو منزلہ ہے اور اس میں ایک بڑا وسیع سرد خانہ ہے۔ بارہ دری کی دیواروں میں فوارے ہیں اور صحن میں ایک بڑا کشتی نما حوض بنا ہوا ہے۔ جس کے گرد فواروں کی موج بہار عجب لطف دیتی ہے۔ باغ کے دروازہ کی ڈیوڑھی چار منزلہ ہے اور اپنی گولائی کی وجہ سے بہت خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ اندر نگاہ پڑتے ہی دور تک سروؤں کی دو رویہ قطار دکھائی دیتی ہے۔ باغ کا رقبہ سات ایکڑ کے قریب ہے۔ ایک بلند اور طویل دیوار نے جس کا ارتفاع بارہ تیرہ فٹ سے کم نہیں باغ کے احاطہ کو اپنی آغوش میں لیا ہوا ہے۔

باغ کی زمین سخت ہے۔ جہاں جہاں کھدائی ہوتی ہے۔ وہاں سے اینٹیں نکلتی ہیں جو پتہ دیتی ہیں کہ یہاں کسی زمانہ میں عمارتیں موجود تھیں۔ پرانے درختوں میں پیپل۔ نیم۔ شیشم۔ جامن۔ املی وغیرہ موجود ہیں۔ چونکہ زمین سخت ہے اس لیے کھاد ڈالنے سے موسمی پھول اور چھوٹی جڑھوں والے درخت بکثرت ہوتے رہتے ہیں۔

تمام پرانے باغات میں یہ باغ سب سے بہتر حالت میں ہے اس کے اندر ایک مردانہ ہائی سکول اور ایک زنانہ کالج بھی ہے۔ اس باغ کے ایک طرف میو ہسپتال اور ایک طرف ٹربیون کا دفتر اور مسجد دائی لاڈو واقع ہے۔

[۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان عالم وجود میں آیا اور حالات ایسے پیدا ہوئے کہ آبادی کا تبادلہ شروع ہو گیا۔ ہندو اور سکھ یہاں سے ہندوستان چلے گئے اور وہاں کے مسلمان یہاں آنے پر مجبور ہو گئے۔ اس وقت قادیان سے مرزا بشیر الدین محمود احمد اور ان کی جماعت کے اکثر افراد نے لاہور پہنچ کر اس علاقے کی اکثر عمارتوں پر قبضہ کیا۔ رتن باغ اور اس کی ملحقہ کوٹھی مرزا بشیر الدین محمود کے حصے میں آئی مگر باغ کی دیکھ بھال میں کوئی خاص توجہ نہ دی گئی۔

جب شہر کی بڑھتی ہوئی آبادی اور ضروریات کے پیش نظر میو ہسپتال کی توسیع لازمی ہو گئی اور مغربی پاکستان کے قیام کے بعد سرکاری ملازمین اور بیرونی مریضوں کے لیے یونٹ ہسپتال قائم کرنے کی تجویز عمل میں لائی گئی تو رتن باغ سب سے پہلے اس منصوبے کی زد میں آیا۔ چنانچہ اسے صاف کر کے اس کی جگہ ون یونٹ ہسپتال بنا دیا گیا۔ اب باغ اور اس کی چار دیواری کا کوئی وجود باقی نہیں۔ البتہ کوٹھی شکست و ریخت سے بچ گئی ہے اور اسے ڈاکٹروں کے استعمال کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔

اخبار ٹربیون کا دفتر بھی ۱۹۴۷ء میں یہاں سے انبالہ منتقل ہو گیا تھا اور اب وہاں پاکستان ٹائمز پریس قائم ہے جہاں سے پاکستان ٹائمز، امروز، لیل و نہار اور سپورٹ ٹائمز وغیرہ اخبار اور رسالے نکلتے ہیں ——— مرتب]

باغ راجہ دینا ناتھ

راجہ دینا ناتھ کو پنڈت گنگا رام نے جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے فوجی دفتر کے دیوان تھے ۱۸۱۵ء میں لاہور بلوایا۔ ۱۸۲۶ء میں کشمیری خاندان کے اس چشم و چراغ کو مہاراجہ نے دیوان کا خطاب دیا۔ ملکی دفاتر کا افسر اعلیٰ اور اعلیٰ جاگیردار بنایا۔ حکومت خالصہ کے بعد سرکار انگریزی نے بھی دیوان دینا ناتھ کی خدمات و قابلیت کے اعتراف میں راجہ کا خطاب عطا کیا۔ اور کلانور کا علاقہ جاگیر میں دیا۔ دیوان امرناتھ اکبری تخلص اور دیوان رام ناتھ اصغری تخلص آپ ہی کے فرزند تھے۔

آپ کی عالیشان حویلی دہلی دروازہ کے اندر اب تک موجود ہے۔ آپ نے شالامار باغ کے پرانے رستہ پر ہزار گھوڑے شاہ کے متصل جہاں سے کوٹ خواجہ سعید کو رستہ جاتا ہے اپنا باغ تعمیر کرایا۔ اس باغ کی چار دیواری نیرہ چودہ فٹ بلند تھی باغ کی شرقی جانب عین شاہی رستہ پر اس دیوار کے کچھ آثار موجود ہیں اسی جگہ دیوار کی بغل میں ایک کنواں بھی ہے یہاں راجہ دینا ناتھ کے زمانہ میں ہر راہرو اور مسافر کو گرمیوں کے دنوں میں سبیل لگا کر پانی پلایا جاتا تھا۔

مشرقی دروازہ جس کا اب کوئی نشان نہیں آمد و رفت کے لیے تھا۔ باغ کے اندر بارہ دریاں، شہ نشین، چبوترے، حوض ایسے خوب صورت تھے کہ یہ باغ اپنی سرسبزی اور خوبی عمارات میں بے نظیر تصور کیا جاتا تھا۔ لاہور کے صدہا بلکہ ہزارہا لوگ راجہ دینا ناتھ کی زندگی تک اس باغ میں سیر و تفریح کے لیے آتے تھے اور بڑی رونق رہتی تھی۔ اس باغ کے جنوب رویہ جو بارہ دری تھی وہ نہایت خوب صورت اور پختہ تھی اب وہ بے مرمت اور خراب حالت میں ہے فوارے اور حوض بھی مٹ مٹا گئے ہیں۔

باغ کنہیا لعل کمپو والا

جہاں بھارت بلڈنگس کے دفاتر اور دفتر اخبار ٹریبیون (اب پاکستان ٹائمز اور امروز) اور باغ دیوان رتن چند داڑھی والا (جس کی جگہ اب ڈن یونٹ ہسپتال بن گیا ہے) اور باغ مہان سنگھ کا احاطہ اور ملحقہ کوٹھیاں اور بورڈنگ میڈیکل کالج واقع ہیں۔ وہاں شاہجہان کے زمانہ میں اُس کی دائی لاڈو کا بارونق اور آباد محلہ موجود تھا۔ چھٹے سال جلوس شاہجہانی یعنی ۱۰۴۲ھ میں دائی لاڈو نے سب سے پہلے یہاں ایک مسجد تعمیر کرائی۔ جو اس وقت تک موجود ہے اور انجمن اسلامیہ پنجاب (کی بجائے اب اوقاف کمیٹی کے) اہتمام میں ہے۔ لیکن اب مسجد اور اس کا احاطہ بالکل مختصر رہ گئے ہیں۔ چاہ کلاں قدیمی کنہیا لعل کمپو والا نے گرا دیا۔ اس کی اینٹیں نکلوا کر زمین کنوئیں کی اپنے باغ میں شامل کر لی مسجد کا حوض جس میں بہت بڑا فوارہ بھی تھا اب بالکل بند ہے۔

تحقیقات چشتی میں لکھا ہے۔ کہ اس مسجد اور محلہ کی کچھ زمین لے کر کنہیا لعل کمپو والا نے شمال کی طرف ایک باغ تعمیر کرایا بلکہ اس زمانہ میں کنہیا لعل نے اپنی طرف سے ایک سادھو کو مسجد میں بٹھا دیا سکھا شاہی زمانہ تھا مسلمان بچارے دم نہ مار سکے۔ جنوبی سمت دو کانوں کے درمیان جو چھوٹا سا کنواں ہے وہ اسی سادھو لبسنت گر کا بنا یا ہوا ہے۔ صحن مسجد کے ایک گوشہ میں مائی لاڈو اور اس کے خاوند محمد اسمٰعیل کی قبر ہے۔

کنہیا لعل نے باغ تو تعمیر کرایا لیکن اس کی رونق اُس کے دم تک ہی رہی اب اُس کا کوئی نام بھی نہیں جانتا ایک آندھی تھی کہ آئی اور چلی گئی۔ دائی لاڈو کا نام ہر کہ و مہ کی زبان پر آج بھی موجود ہے۔

باغ بھائی مہاں سنگھ

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے خاص الخاص اور مقرب ترین مصاحبوں میں بھائی گوربخش سنگھ ایک ممتاز رئیس تھے۔ پیر مرد ہونے کے باوجود نہایت خوش گو اور ظریف طبع تھے اور مہاراجہ کی بزم عیش و سرور میں برابر کے شریک تھے مصنف عمدۃ التواریخ ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ جب سرکار کسی پر مہربان ہوتے یا کسی کی تعریف کیا کرتے تھے تو بھائی گوربخش سنگھ بھی چار لکھے اپنی طرف سے کہہ کر مہاراجہ کی تائید کر دیا کرتے تھے۔ اور اگر وہ کسی پر ناراض ہوتے۔ تو گوربخش سنگھ اُس کے اور بھی کردہ ناکردہ عیب گن گن کر بتا دیتے بلکہ لکھا ہے کہ گلستان کے اس شعر پر ان کا صحیح عمل ہوتا تھا۔

اگر شہ روز را گوید شب است ایں
بباید گفت اینک ماہ و پرویں

بھائی گوربخش سنگھ جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو اس کی موت سے ایک دو دن پیشتر مہاراجہ اُس کی عیادت کے لیے اُس کے مکان پر گئے۔ اُس کے چار فرزند تھے۔ بھائی دل سنگھ جو ایک جنگ میں مارے گئے تھے۔ مہاں سنگھ۔ بھاگ سنگھ۔ سرجن سنگھ۔ مہاراجہ نے ان کے باپ کی وفات کے بعد ان کے عہدوں کو بحال رکھا اور ان پر وقتاً فوقتاً اپنی

نوازشوں کا اظہار کیا۔

ان میں سب سے زیادہ شہرت بھائی وہاں سنگھ نے حاصل کی جس کا نام آج تک بھی باغ بھائی وہاں سنگھ کی وجہ سے زندہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سکھوں کے زمانہ عروج و اقبال میں جو باغ لاہور میں سب سے پہلے بنا وہ باغ وہاں سنگھ ہی ہے۔ اور اس کا کچھ ثبوت مصنف عمدۃ التواریخ کے انتخاب دفتر سوم ص ۴ سے بھی ملتا ہے جہاں لکھا ہے کہ

" بھائی وہاں سنگھ باغ دلفریب متصل چوبارہ چھجو بھگت
جی تیار کنا بندہ "

کم سے کم باغ رتن چند داڑھی والا اس باغ کے بعد بنا ہے اگر اس باغ سے پہلے اس کا وجود ہوتا تو مصنف متصل چوبارہ چھجو بھگت کی بجائے جو نسبتاً زیادہ فاصلہ پر ہے متصل باغ رتن چند لکھتا۔

یہ باغ ایسے اعلیٰ پیمانہ پر تھا کہ روزمرہ سینکڑوں لوگ اس کو دیکھنے کے لیے آتے تھے۔ اس کے فوارے، عمارات، حوض، بارہ دریاں، روشیں سب قابل دید تھیں۔ بھائی وہاں سنگھ ہر روز باغ میں آتے تھے اور تماشائیوں کا ہجوم دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔

یہ باغ جس کی لمبی چار دیواری اب بھی اس کی قدامت کا ثبوت دے رہی ہے شاہ عالمی دروازہ کے باہر مسجد دائی لاڈو کے قریب اور بورڈنگ میڈیکل کالج کے بالمقابل واقع ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ جس طرح باغ رتن چند داڑھی والا محلہ دائی لاڈو کے کھنڈروں پر آباد کیا گیا تھا اسی طرح اس باغ کی بنیادیں بھی دائی لاڈو کے قدیم آثار پر ہی کھڑی کی گئی ہیں۔

بھائی وہاں سنگھ کے انتقال کے ساتھ ہی باغ کی تر و تازگی خزاں کی نذر ہو گئی۔ چند سال کے بعد بھائی سوایا سنگھ نے یہ باغ پادریوں کے پاس فروخت کر دیا۔ تا حال وہ باغ پادریوں کے قبضہ میں ہے۔ چار دیواری اسی زمانے کی موجود ہے۔ باغ کی شکل بہت کچھ بدل گئی ہے۔ بلکہ اب یہ باغ یورپین پادریوں اور دیسی عیسائیوں کی آبادی کی وجہ سے اچھی خاصی نو آبادی معلوم ہوتا ہے۔ مکانات اکثر نئی وضع کے بن گئے ہیں۔ البتہ باغ کا نام اب تک باغ وہاں سنگھ ہی ہے۔

باغ سردار لہنا سنگھ سندھانوالیہ

رنجیت سنگھ کے بک جدی۔ مہاراجہ شیر سنگھ اور اس کے فرزند شہزادہ پرتاپ اور اس کے وزیر راجہ دھیان سنگھ کے قاتل سردار لہنا سنگھ کا باغ۔ باغ شاہ بلاول کے کھنڈروں پر آباد ہے۔

جب اجیت سنگھ نے مہاراجہ شیر سنگھ اور راجہ دھیان سنگھ کو ۱۵ ستمبر ۱۸۴۳ء کو۔ اور لہنا سنگھ نے اسی تاریخ کو شاہزادہ پرتاپ سنگھ کو قتل کیا۔ تو یہ مقام جہاں یہ سانحہ پیش آیا۔ باغ و بارہ دری شاہ بلاول کے نام سے موسوم تھا۔ اسی باغ میں مہاراجہ شیر سنگھ اور اس کے فرزند پرتاپ سنگھ کی سمادھیاں موجود ہیں۔

اس واقعہ کے بعد سندھانوالیے سرداروں نے نابالغ شہزادہ دلیپ سنگھ کو مہاراجہ اور لہنا سنگھ کو وزیر اعظم بنایا۔

لہنا سنگھ نے اس باغ کی چار دیواری از سر نو تعمیر کرائی۔ اور اس کو خوب رونق دی۔ اپنے عروج کے زمانہ میں وہ ضرور اس باغ کو اور رونق دیتا۔ لیکن خون ناحق نے بہت جلد اس کو کیفر کردار تک پہنچا دیا یعنی لہنا سنگھ بھی قتل ہو گیا۔

دیدی کہ خون ناحق پروانہ شمع را
چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

باغ ابھی تک موجود ہے اس میں آموں کے درخت بکثرت ہیں۔

باغ راجہ تیجا سنگھ

چاہ میراں سے شمال مشرق اور مقبرہ شہزادہ پرویز سے شمال کی جانب یہ باغ واقع ہے۔ راجہ تیجا سنگھ جمعدار خوشحال سنگھ کا بھائی تھا اس نے بڑے شوق اور بہت بڑی لاگت سے یہ باغ جو نہایت وسیع اور کئی عالی شان مکانات سے گھرا ہوا ہے تعمیر کرایا تھا۔ اس کی چار دیواری بلند مضبوط اور مستحکم تھی جو ۱۹۳۰ء تک برابر قائم تھی۔ درختان ثمردار میں سے اب صرف آم باقی ہیں جن کی تعداد حد شمار سے باہر ہے۔ بڑی بارہ دری کی کرسی زمین سے دو فٹ بلند ہے چبوترہ کا فرش پختہ ہے اور اس کے چاروں گوشوں پر ایک ایک شہ نشین بنا ہوا ہے۔ اس بارہ دری کے کئی کمرے ہیں چھتیں ان کی کشمیر کی چھتوں کی طرح منقش ہیں عمارت سہ منزلہ ہے۔

اس کے متصل ایک اور بارہ دری ہے جس کا دروازہ گؤن گھر کی طرح بنا ہوا ہے۔ اس کی سیڑھیاں اس کا فرش اور اس کے مختلف برآمدے سنگ مرمر سے مزین ہیں جو معلوم نہیں کس مقبرہ یا مسجد سے اتارا گیا ہے۔

"۱۷ ہاڑ سمت ۱۹۰۵ ب کو صاحب کلاں (ریذیڈنٹ) باغ سردار (بعد میں راجہ) تیجا سنگھ میں تشریف لے گئے۔ سردار نے میوہ جات کی ڈالیوں کے علاوہ ایک گھوڑا مع سازِ طلائی، مرواریدی، کلغی اور دوشالہ نذر دیا۔ صاحب نے گھوڑا واپس کر دیا اور فرمایا کہ ۱۸ ہاڑ کو ایک پلٹن گورہ اور چار پلٹن گورہ مع دس ضرب توپ روانہ ملتان ہو رہی ہے۔ لازم ہے کہ چند منزل کشتی اور پانصد اعراب تیار رکھو۔ سردار نے عرض کیا کشتی یک صد دوں گا اور اعراب جس قدر بہم ہو سکے گا۔" (عمدۃ التواریخ)

اس کی وسیع و عریض چار دیواری میں سے صرف مغربی دیوار ناممکل سی موجود ہے۔ پرانا دریا ایک نالہ کی صورت میں اس باغ کے شمال مغرب کی طرف چند ہی قدم کے فاصلہ پر ہے۔ اس باغ میں باغ و مقبرہ شہزادہ پرویز کے متصل سے ایک قدیم نہر بھی آتی ہے جس کی وجہ سے باغ سر سبز رہتا ہے۔ اس باغ میں کنوئیں کے علاوہ بجلی سے بھی پانی آتا ہے اور کھیتوں میں پانی پہنچانے کے لیے بڑے بڑے نل لگے ہوئے ہیں۔

باغ کے اندر بہت سی عمارتیں میں ایک قدیم لنگر خانہ بھی ہے جس کے اندر ایک غیر آباد کنواں بھی ہے۔ لنگر خانہ کی عمارت

بالکل شکستہ اور بے سقف ہے۔ بارہ دری کلاں کے سامنے ایک حوض نما تالاب ہے۔ باغ کے بڑے کنوئیں اور راجہ شیر سنگھ صاحب کی سماوھی کے ساتھ باغ کے کلاں دروازہ سے باہر برگد (بڑھ) کا ایک اتنا بڑا درخت ہے۔ کہ اس سے کلاں درخت آج تک راقم کی نظر سے نہیں گزرا۔ باغ کی کل زمین جس میں زراعتی زمین بھی شامل ہے ایک سو دس بیگھہ بیان کی جاتی ہے۔

افسوس ہے باغ کی حالت اچھی نہیں۔ یہ باغ راجہ صاحب شیخوپورہ (موجودہ راجہ صاحب کا نام راجہ دھیان سنگھ) کی ملکیت ہے۔ ان کی عالی شان قلعہ نما حویلی لاہور میں موجود ہے۔ لیکن انھوں نے جیسا کہ معلوم ہوا ہے اپنی رہائش کے لیے شہر سے باہر ایک کوٹھی لے رکھی ہے۔ اس باغ میں وہ کبھی بھولے بھٹکے آنکلتے ہیں۔ اگر اس باغ کی آرائش و زیبائش کا ان کو خیال ہو۔ تو یہ لاہور کی ایک بہترین سیرگاہ بن سکتا ہے۔

اس باغ سے چند قدم کے فاصلہ پر مغربی جانب نامعلوم گنبد کے نزدیک جس کو دارا شکوہ کی دائی کا گنبد کہتے ہیں حال ہی میں مندر دریا گر کے نام سے ایک عالی شان عمارت تیار ہوئی ہے۔ یہ عمارت آٹھ کنال سولہ مرلہ میں ہے اور اس کے دو حصے ہیں۔ ہر حصہ کی چار دیواری پختہ ہے اور علیحدہ علیحدہ ہے دونوں حصوں کے درمیان قریباً آٹھ دس فٹ کی سڑک ہے جس حصہ میں باوا دریا گر کی سماوھی ہے اس کے دروازہ پر ذیل کی عبارت درج ہے:

"مندر دریا گر۔ باوا رام ناتھ او مگڑ پیر جی کے آپکار کے ساتھ
سیٹھ کالو رام دہری رام لپیرا ان ٹھاکر دھیان سنگھ راجپوت
پردھان پردیسی دھارمک سبھا لاہور نے سیوا کرائی ۱۹۴۲ء"

اس کے نیچے یہ الفاظ ہیں "استھان باوا دریا گر جی مہاراج" ایک طرف یہ بھی لکھا ہے "غیر مذہب کے لوگوں کا اندر آنا منع ہے"۔ اس حصہ میں ایک مندر اور کئی عمارتیں ہیں۔ راقم باوا رام ناتھ سے بھی ملا جس کو پیر جی بھی کہتے ہیں۔ بالکل ننگے دھڑنگے۔ کمر بند لنگوٹ باندھے ہوئے۔ سر، داڑھی مونچھ بلکہ ٹانگوں کے بال تک صفا چٹ۔ تیل کی مالش کر رہے تھے۔ خوب موٹے تازے۔ پہلوان معلوم ہوتے تھے۔ باوا دریا گر کا سال وفات سمت ۱۸۵۶ ب بتاتے ہیں یہ بھی کہتے ہیں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ان کو موضع خوجہ سعید میں جہاں ان کی سماوھی ہے کچھ جاگیر بھی دے رکھی تھی۔

ابتدا میں سماوھی معمولی تھی۔ کوئی مندر بھی نہ تھا معمولی کٹیا تھی اب (۱۹۴۴ء میں) خاصی رونق ہے۔ سیٹھ صاحبان کی طرف سے لنگر جاری ہے۔ چند ایک سادہ سنت موجود رہتے ہیں دوسرے حصہ میں چند ثمر دار درخت لگائے گئے ہیں۔ سبزی وغیرہ کی کاشت ہوتی ہے۔ اور ایک نہایت خوبصورت چھوٹا سا مندر تعمیر ہو رہا ہے۔ دوسرے حصہ کی چار دیواری کے ساتھ ہی مسلمانوں کا قبرستان ہے اور چونکہ دیوار کے ساتھ ہی تین چار کچی قبریں ہیں اندیشہ ہے کہ ان کی ضرور کسی دن صفائی ہو جائے گی۔

باغ جمعدار خوشحال سنگھ

جمعدار خوشحال سنگھ کنکھل ضلع سہارن پور کا ایک قبول صورت (گوڑ) برہمن تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کو خوش کرنے کے لیے سکھ ہو گیا۔ کچھ عرصہ تک یہ کشمیر کا ناظم بھی رہا۔ مگر جب اہلِ کشمیر اس کے ظلم و تشدد سے تنگ آ گئے تو مہاراجہ نے اس کو کشمیر سے واپس

بکہ لیا لاہور میں اس کی عالیشان حویلی اور وسیع و خوشنما باغ بہت مشہور تھا۔

مہاراجہ خود بھی اس باغ میں آیا کرتے اور جمعدار کی عزت افزائی کیا کرتے تھے چنانچہ جب ۱۹ محرم ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۷ء) کو اس باغ میں آئے تو جمعدار نے ایک خوب صورت اور قیمتی گھوڑا بہ طریق نذر پیش کیا۔ اور دوسری دفعہ جب ۸ محرم ۱۲۳۷ھ (۱۸۲۱ء) مطابق سمت ۱۸۷۸ب کو دسہرہ کے دن یہاں آئے تو دربار بھی یہیں منعقد ہوا۔ صاحب عمدۃ التواریخ دفتر دوم میں (صفحہ ۲۹۱ پر) لکھتے ہیں:

"وکیلان ہر طرف و سرکردگان عالیشان برادائے نذر و نیاز
پرداختند۔ وقت سہ پہری قواعد پلاٹن مشاہدہ و معاینہ
فرمود۔ و انعام حوالہ بعضے کساں ساختہ"

اسی باغ میں اس کے بیٹے رام سنگھ اور اس کے بھائی راجہ نیجا سنگھ اور اس کی اپنی سمادھ ہے۔ یہ باغ لاہور کے مشہور و معروف باغوں میں تھا مگر جب ۱۸۴۱ء میں مہاراجہ شیر سنگھ نے رانی جنداں سے قلعہ لے کر لاہور پر قبضہ کر لیا۔ تو سکھ فوج جمعدار خوشحال سنگھ سے انتقام لینے کے لیے اس کی حویلی کی طرف روانہ ہوئی۔ جمعدار بھی بے خبر نہ تھا اس نے حویلی کی دونوں جانب توپیں لگا رکھی تھیں وہ اپنی حفاظت کے مکمل انتظام اور اپنی قلعہ نما حویلی کے استحکام کے باعث بچ گیا۔ سکھ فوج یہاں سے ناکام ہو کر اس کے باغ واقعہ بیرون مستی دروازہ کی طرف گئی اور چشم زدن میں درخت کاٹ کر اور عمارت گرا کر ہرے بھرے باغ کو کفِ دست میدان بنا آئی۔

چند دنوں کے بعد جمعدار نے باغ کی چار دیواری اور بارہ دری دوبارہ تعمیر کرائی۔ درخت جو کٹے ہوئے تھے چونکہ جڑوں سے نہیں کاٹے گئے تھے کچھ تو وہی سرسبز ہو گئے۔ اور کچھ نئے لگا لیے گئے ۱۸۴۴ء میں جمعدار خوشحال سنگھ کا انتقال ہو گیا۔

[باغ کی موجودہ حالت نہایت افسوسناک ہے سمادھوں کی چار دیواری بھی بالکل شکستہ ہے۔ اور باغ کی چار دیواری کا تو کہیں وجود ہی نظر نہیں آتا۔ اس باغ کے شمال کی طرف ریلوے لائن ہے جنوب کی طرف واٹر ورکس۔ قلعہ اور حکیم نیر واسطی کی نیر منزل ہے۔ باغ کے کثیر حصے میں زراعت اور کھیتی کا کام ہوتا ہے یہ باغ بھی راجہ صاحب شیخوپورہ کی ملکیت میں تھا۔ اب پتہ نہیں کون مالک ہے ـــــ مرتب]

باغ سردار رتن سنگھ گرجاکھیہ

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ابتدائی زمانہ میں رتن سنگھ گرجاکھیہ نے شاہ عالمی دروازہ کے باہر ایک باغ تعمیر کیا اور اس کی نہایت پختہ چار دیواری بنوائی اور اس میں کئی قسم کے ثمر دار اور بے ثمر درخت لگوائے لیکن جب دیوان رتن چند داڑھی والے کا مہاراجہ کے دربار میں عروج ہوا۔ تو اس ساری زمین پر جس طرح بھی ہو سکا اس نے قبضہ کر لیا اور انگریزی عملداری میں جس کی ابتدا پنجاب میں ۱۸۴۹ء سے ہوتی ہے اس نے ایک سرائے تعمیر کرائی اور ایک تالاب بنوایا چنانچہ سرائے کی چار دیواری اب بھی وہی ہے جو رتن سنگھ نے اپنے باغ کے لیے بنوائی تھی البتہ اس کو کچھ بلند کر دیا گیا ہے۔ سرائے میں جو کنواں ہے وہ بھی رتن سنگھ کے باغ

کی یادگار ہے۔ تالاب ابھی تک موجود ہے۔ اس کے اردگرد کئی مکانات بن چکے ہیں۔ اس کے مشرق کی طرف جو سڑک ہسپتال سے ہو کر مزنگ کو جاتی ہے۔ اس پر بہت سی دکانیں راجکمار بلڈنگس کے نام سے بن چکی ہیں اور تالاب کو بچانے کا یہاں بڑا دروازہ بھی ہے۔ تالاب کے شمال کی طرف دیوان رتن چند کی سمادھ بھی ہے۔ اب سرائے میں مختلف لاریوں اور بسوں کے اڈے ہیں۔

باغ ہری سنگھ نلوہ

محلہ مسجد دائی لاڈو نے بڑے بڑے انقلاب دیکھے ہیں۔ اس کی وسعت، آبادی اور رونق کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگ سکتا ہے۔ کہ باغ کنہیا لال کمیدان والا۔ باغ بھائی دھیان سنگھ۔ باغ رتن چند داڑھی والا۔ باغ رتن سنگھ گرجاکھیہ سب اسی محلہ اور احاطہ کے ملحقات اور کھنڈروں پر آباد تھے۔ آج جہاں لاہور میڈیکل کالج اور میو ہسپتال ہے۔ وہ بھی اسی احاطہ کا ایک حصہ ہے۔

سب سے پہلے یہاں سردار ہری سنگھ نلوہ نے جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مشہور جرنیلوں میں تھا۔ زمین کو ہموار کرا کے ایک عالیشان باغ تعمیر کرایا اس میں بہتر سے بہتر ثمر دار درخت نصب کرائے اور ایک بہت بڑا کنواں تعمیر کرایا جس سے باغ کو سیراب کیا جاتا تھا۔ لیکن اس باغ کی عمر ابھی پندرہ بیس سال ہی کے قریب ہوئی تھی۔ کہ سکھوں کے طرز عمل نے پنجاب ان کے قبضہ سے نکلوا کر انگریزوں کے سپرد کر دیا۔

۱۸۴۹ء میں انگریز پنجاب پر قابض ہوئے۔ ۱۸۶۷ء میں جب سرکار نے یہاں ہسپتال بنانے کی تجویز کی تو اس کی عمارت کے لیے باغ ہری سنگھ کی وسیع زمین ہی پسند کی گئی۔ چنانچہ وہ باغ جو ایک نامور اور دولت مند مسلمان محلہ کی عمارتوں کے کھنڈروں پر بڑی دھوم دھام اور شان و شوکت سے تیار ہوا تھا۔ برباد ہونا شروع ہوا۔ اس کی تمام اندرونی عمارتیں مسمار کر دی گئیں۔ اس ہسپتال کے اندر پیپل کے قدیم درختوں کے پاس جو بہت بڑا کنواں ہے وہ باغ ہری سنگھ کی واحد یادگار ہے۔ یہ ہسپتال ۱۸۷۰ء میں تکمیل کو پہنچا۔ ۱۹۱۰ء میں ایڈورڈ ہفتم کی وفات کے بعد اس کی عمارتوں میں لاکھوں روپے کی لاگت سے اور بھی توسیع کی گئی۔

باغ موراں والا

موراں لاہور کی ایک مشہور حسینہ و جمیلہ طوائف تھی جس کا نام اس کے غیر معمولی عروج و اقبال اور اس کی شاندار عمارات کی وجہ سے ابھی تک اہلِ لاہور کے دلوں سے فراموش نہیں ہوا۔ وہ آسں عیش دوست مہاراجہ رنجیت سنگھ کی محبوبہ تھی جو شیر پنجاب کہلانے کے باوجود شاہی خدم و حشم کے ساتھ موراں کے مکان پر جاتا اور اہلِ دربار کو حکم دیتا کہ موراں کے دربار میں سلام کر کے ہمارے دربار میں آیا کرو۔ موراں کا عروج اس سے زیادہ کیا ہو گا کہ مہاراجہ کے حکم سے موراں شاہی گز۔ موراں شاہی باٹ اور موراں شاہی سکے تیار ہو گئے۔

مہر محکم دین جس نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کو لاہور کا قبضہ دلایا اور جس کو مہاراجہ باپو کہہ کر پکارا کرتا تھا خاص دربار میں تھا۔ موضع نواں کوٹ جہاں غلط طور پر زیب النساء بیگم کا مقبرہ بیان کیا جاتا ہے اسی محکم دین کا آباد کردہ ہے۔ اس معزز

اور نامور شخص کو اسی طوائف نے بھرے دربار میں مہاراجہ سے ذلیل کرایا اور اس کی تمام جائداد ضبط کرا دی۔

سمت ۱۸۷۴ب میں موراں کا انتقال ہو گیا۔ مہاراجہ کے حکم سے اس کی قبر نہایت پختہ اور عالی شان بنائی گئی۔ مہاراجہ خود اس کی قبر پر گئے۔ موراں کی بہن مولاں بھی وہاں موجود تھی۔ اس کو چار کنوئیں جن کے ساتھ سینکڑوں بیگھہ اراضی بھی عطا کر آئے۔

موراں نے ایک قرآن شریف کسی اعلیٰ خوشنویس سے لکھوایا تھا جس پر اس نے کئی سو روپیہ کا نب کر دیا تھا وہ قرآن شریف اس نے ۱۲۵۱ھ / ۱۸۳۵ء میں مزار حضرت داتا گنج بخش کی نذر کر دیا۔ پاپڑ منڈی (شاہ عالمی دروازہ) اور چوک متی کے درمیان ۱۲۲۴ھ / ۱۸۰۹ء میں اس نے جو مسجد تعمیر کرائی وہ اب تک موجود ہے۔ اس مسجد کی امامت اور آبادی کے لیے مہاراجہ نے ذاتی طور پر کوشش کی تھی۔ مندر ٹھاکر ٹھان بھیرو کی تعمیر میں جو موضع اچھرہ کے قریب ہے موراں نے اس کے سلوک جوالا ناتھ کو جس نے موراں کی والدہ بیگم کا آسیب دور کیا تھا چالیس ہزار اینٹ اور بہت سا روپیہ مندر کی تعمیر کے لیے دیا۔

موراں نے اپنے عروج و اقتدار کے زمانہ میں دیگر رؤسائے دربار کی طرح موری دروازہ کے باہر اپنا ایک عالی شان باغ بھی تعمیر کیا۔ جس کی چار دیواری قدِ آدم تھی جس کا بڑا دروازہ (مین گیٹ) نہایت خوب صورت اور نقش و نگار اور تصاویر بوقلموں سے مرصع تھا۔ اس باغ کے متصل پرانے کھنڈروں پر باوا دھونا داس نامی ایک سادھو نے مندر بنانا شروع کیا موراں اس کی عقیدت مند تھی اس نے مندر کی تعمیر میں بہت مدد دی۔ مندر کا کنواں اور سر راہ جو نشست گاہ ہے وہ موراں ہی کی تعمیر کردہ ہے۔ باغ کا کہیں نشان تک نظر نہیں آتا۔ لوگوں نے وہاں کچھ مکانات بنا لیے ہیں اور کچھ زمین اس سڑک میں آ گئی ہے۔ جو رائے میلا رام کے کارخانہ سے رائے گلاب سنگھ کے چھاپہ خانہ کی طرف آکر بڑی سڑک کے ساتھ مل جاتی ہے۔

باغ رانی گل بیگم

موراں کی وفات کے بعد امرتسر کی ایک خوب صورت طوائف گل بیگم کی قسمت چمکی یہاں تک کہ اس کے چھوٹے بڑے رشتہ دار سب مہاراجہ کی عنایات خسروانہ کے شجر ثمردار سے بار آور ہو گئے۔

مہاراجہ کو تعلق تو اس کے ساتھ تھا ہی لیکن وہ اس کے ساتھ باقاعدہ شادی کرنے کے لیے بھی بے تاب رہتا تھا۔ گل بیگم کا مہاراجہ پر اس قدر اثر تھا کہ پسران منشی شیو دیال کے تمام جرائم اس کی سفارش سے معاف ہو گئے۔ اور ان کو نظر بندی اور حبس سے نجات ملی۔

آخر شادی کا دن بھی آ گیا۔ مہاراجہ خود امرتسر میں آیا اس وقت اس کی عمر (۱۳ نومبر ۱۷۸۰ء کی پیدائش کے مطابق) اکیاون سال تھی۔ شادی کی تاریخ سمت ۱۸۸۸ب (۱۸۳۱ء) کے ماہ اسوج کی چودہ کو قرار پائی۔ مہاراجہ نے ہاتھوں میں مہندی لگائی۔ پھر دربار صاحب۔ ہر مندر جی۔ ٹنگہ بھائی صاحبان اور بھائی گوبند رام کے درشن کو گئے۔ اس کے بعد رام باغ میں آئے جہاں ہر قسم کا سامانِ عیش و نشاط مہیا و مرتب تھا۔ بڑے بڑے سرداروں۔ ماتحت راجگان۔ امراء و زراء بلکہ صاحبان انگریز تک نے قبول کیے اور اس تقریب میں شمولیت کی۔

اسی تاریخ کو سہ پہر کے وقت زیورات و جواہرات کے ساتھ زعفرانی لباس پہنا۔ اور فراشوں کو حکم دیا کہ بنگلہ نقرہ میں خیمے اور قناتیں اور شامیانے لگا دیں اور چونکہ ایک رقاصہ اور طوائف کے ساتھ شادی کا انتظام ہو رہا تھا اس لیے لاہور اور امرتسر کی تمام ناچنے اور گانے والی طوائفوں کو اس نقرئی بنگلہ میں حاضر ہونے کی دعوت دی گئی۔ شراب اور اکل و شرب کا خاص اہتمام کیا گیا۔ اور دف نوازوں اور سازندوں اور مطربوں کو جو رقاصہ طوائفوں کے ساتھ حاضر تھے تیار رہنے کا حکم دیا گیا۔ گل فروشوں نے گل ہائے رنگا رنگ سے بنگلہ کو چمنستان بنا دیا۔ ہر شخص لباس فاخرہ پہنے ہوئے موجود تھا۔

راجۂ راجگان راجہ دھیان سنگھ کو جو راجہ کلاں کے نام سے موسوم تھے بقول شاعر یہ حکم ہوا ؎

آتی ہے چمن میں مرے گلرو کی سواری
اے بادِ صبا خاک اُڑانا نہیں اچھا

چنانچہ مہاراجہ کے ارشاد اور راجۂ کلاں کے ایما پر بنگلہ کے اندر سب کی آمد و رفت بند ہو گئی۔ کوئی افسر کوئی سردار اور کوئی ادنیٰ آدمی بنگلہ کے اندر نہیں جا سکتا تھا۔ اسی اثناء میں ایک منقش پنیس میں سوار ہو کر گل بیگم بسنتی لباس پہنے ہوئے "در دست و پا حنا کردہ و از سرتاپا بہ زیورات طلائی مرصعی آراستہ و پیراستہ شدہ درون بنگلہ وارد گشت" (عمدۃ التواریخ دفتر سوم حصہ دوم ص ۱۵۱)

اس کے بعد خود مہاراجہ بنگلہ میں داخل ہوئے اور بنگلہ کے باہر طوائفوں نے صفیں باندھ کر ناچنا اور گانا شروع کیا۔ سرداروں اور متوسلین نے سرکار پر روپے نچھاور کئے۔ مہاراجہ نے طوائفوں کو سات ہزار روپیہ انعام دیا۔ ان کو رخصت کرنے کے بعد ایک طلائی گدی پر مہاراجہ بیٹھے اور دوسری پر گل بیگم نے اجلاس کیا۔ مہاراجہ کو سہرا باندھا گیا اور اس میں عقد مروارید لگایا گیا۔ اور گل بیگم کی ناک میں طلائے مروارید ڈالنے کے بعد آوازۂ مبارک بادی سے آسمان گونج اٹھا۔ شام کو آتش بازی کے تماشا سے جگمگا رہا۔

گل بیگم اب باقاعدہ مہاراجہ کی رانی بنی اس کا نام گل بہار گل بیگم رکھا گیا۔ اور پروانے لکھے گئے کہ کاغذات میں اس کا نام "بیگم صاحبہ" لکھا جائے۔

مہاراجہ بکرمی سمت ۱۸۸۹ میں جب کٹاس گئے تو گل بیگم ہمراہ تھی کٹاس سے واپسی پر ۲ ہاڑ کو گل بیگم کے ہمراہ عین بارش باراں کے وقت باغ چھوٹا رام میں آکر قیام کیا جب بارش تھم گئی تو سہ پہر کو یہاں سے مع بیگم صاحبہ ہاتھی پر سوار ہو کر مستی دروازہ آئے۔ اور چونکہ گل بیگم کے ساتھ لاہور میں یہ پہلا داخلہ تھا۔ اس لیے مستی دروازہ سے جلوس کی شکل میں روانہ ہوتے۔ اور موتی بازار ٹکسالی بازار۔ ہتھیارا (کسیرا) بازار۔ پاپڑ منڈی۔ حویلی شہزادہ کھڑک سنگھ اور سید مٹھا سے ہوتے ہوئے حضوری باغ آئے۔ رستہ میں محتاجوں۔ غریبوں اور تماشائیوں کے لیے ہاتھی پر سے ہزار ہا روپیہ بطور زر افشانی لٹاتے آئے۔ دف نواز اور باجے والے بھی ہمراہ تھے۔ حضوری باغ میں قدم رکھتے ہی توپوں کی سلامی نے آسمان میں ایک گونج پیدا کر دی۔

گل بیگم کے آتے ہی مہاراجہ کے حرم میں کیا منہ بند کلیاں اور کیا شگفتہ پھول جس قدر تھے سب مرجھا گئے۔ اس کے رہنے کے لیے الگ محل تعمیر ہوا جس کا وجود "حویلی گل بیگم" کے نام سے رنگ محل اور حویلی میاں خاں کے درمیان کوچہ گل بیگم میں اب

تک بھی موجود ہے۔

۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۶ء میں گل بیگم نے خطۂ مبانی میں مزنگ کے متصل اپنے عالی شان باغ کی بنیاد رکھی۔ باغ کا دروازہ جس کی پیشانی نقش و نگار کے جھومر سے آراستہ ہے غربی جانب سے دو منزلہ اور بہت اونچا ہے۔ بالاخانہ کے تین دریچے بھی منقش اور رنگین ہیں دروازہ باہر سے محرابی ہے۔ جس کے وسط میں چند اشعار نیلے رنگ سے لکھے ہوئے ہیں جو متمم باغ کے نام اور فرزند رانی گل بیگم اور باغ کے سالِ تعمیر پر روشنی ڈالتے ہیں ملاحظہ ہوں:-

بفضلِ قادرِ بے چوں زدستِ گل بیگم	کہ ہست رانیٔ دوران و ملکۂ عالم
بنا پذیر شد ایں باغ رشکِ خلدِ بریں	بہ اہتمام علی بخش اہلِ جود و کرم
خوشا نصیب کہ فرزند خوش خلف دارد	کہ مشتہر شدہ سردار خان چو حاتم
زہے است باغ کہ از بوئے خلد مے آید	از یں ست سال بنائش نہے ز باغ ارم
ظہورِ سال ز آباد باغ رانی شد	عطارد از سر ارقام چوں گرفت قلم
فریدِ خبیر بنا را آنکہ کہ تاریخش	فرشتہ گفت عمل آباد باغ گل بیگم
چو سیرگاہ خود ش ساخت رانیٔ دوراں	برائے سال بنا گفت باغ سیر رقم ۱۲۷۳
بدستِ کاری و معمار ہے غلام علی	بنا شد است خوش ایں باغ مرجع عالم

ان کے علاوہ حسب ذیل دو اشعار بھی ہیں :-

سالِ تاریخ بنائے باغ چوں جستم بگفت	بلبلم آباد باغ رانی گل بیگم است
از سرِ آباد قمری سال سمت راچہ خوش	گفت نو آباد باغ رانی گل بیگم است

باغ میں کئی قسم کے ثمردار اشجار تھے۔ کئی مکانات۔ بالاخانے۔ حوض۔ چاہ۔ فوارے۔ آبشاریں۔ سڑکیں اور روشیں۔ غسل خانے۔ گنبد کلاں گنبد خورد جن میں سے کئی ایک کی دیواریں اور چھت منقش استرکار اور چونہ گچ تھے۔ اب چاروں طرف سناٹا ہے خاک سی اڑ رہی ہے۔ چاہ کلاں کے اندر جس کا علق بہت دور تک ہے سنگ مرمر کی ایک تختی پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے:

"مالک ایں چاہ رانی گل بیگم صاحبہ بنت شیخ محمد اکبر زوجہ
مہاراجہ رنجیت سنگھ صاحب سرگباشی"

باغ کے جنوب رویہ ایک بڑا چبوترہ پختہ چونہ گچ ہے جس کی متصلہ عمارتوں کی درمیانی برجی کے محراب میں ایک ٹکڑا سنگِ مرمر کا لگا ہوا ہے جس پر ذیل کے اشعار تحریر ہیں ؎

باغ با آب و تاب گل بیگم	بر زمیں تازہ چوں بہشتِ بریں

ؔ۔ یہ الفاظ صاف نہیں پڑھے گئے نام مولوی فریدالدین وطن مزنگ وفات ۱۸۸۴ء بعمر قریباً سو سال۔ مزنگ کا شاعر مولوی پارس علی پارس انہی کا فرزند تھا۔

ہست سردار خاں بانی باغ ــــ خلعت مستطاب گل بیگم
سال تعمیر باغ خورم[1] گفت ــــ امن باغ جناب گل بیگم

باغ کی جنوبی حدود میں رانی گل بیگم کا مقبرہ ہے جو باغ کی تعمیر کے ساتھ ہی اس نے اپنی زندگی میں بنوالیا تھا۔ گل بیگم ۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۵ء میں انتقال کر گئی۔ قبر سیاہ پتھر کے چبوترہ پر ہے۔ قبر کا تعویذ سنگِ مرمر کا ہے۔ جب اس کا متبنی بیٹا سردار خاں مرگیا تو وہ بھی اسی جگہ دفن کیا گیا۔ سردار خاں کے زمانہ میں قبر پر کمخواب کا غلاف اکثر پڑا رہتا تھا اور چار باغبان باغ کی حفاظت سرسبزی اور مکانات متعلقہ باغ کی نگہداشت کے لیے اپنے عملہ سمیت ہر وقت موجود رہتے تھے۔

اب باغ کا تو کہیں وجود نظر نہیں آتا۔ البتہ پختہ دیواریں کھڑی ہیں۔ گنبد بھی دور سے دکھائی دیتا ہے بعض دیواروں کے آثار اور نشان بھی موجود ہیں۔

الحاق پنجاب کے بعد جب کھ رانیوں کی پنشنیں سرکار انگریزی نے مقرر کیں تو رانی گل بیگم بھی چونکہ بیاہتا رانی تھی اور رانی جنداں کی جلاوطنی کے بعد بھی سب سے زیادہ استحقاق رکھتی تھی اس لیے سب سے زیادہ پنشن بارہ سو روپے ماہوار اسی کو ملی۔ اس کی اپنی جاگیر بھی معقول تھی۔ وہ بڑی مالدار تھی اس کا اپنا عملہ اور دفتر تھا۔ اس کے خاندانی حکیم، حکیم کریم اللہ داد اس کے دیگر ملازمین اور متعلقین کی قبریں اس کی قبر کے متصل ہی اسی باغ میں ہیں۔

باغ ہمت کہار

مال روڈ پر جہاں باغ و مقبرہ حضرت شاہ اسماعیل کی چار دیواری تھی مرورِ زمانہ سے ایک ایسا وقت آیا کہ اس چار دیواری کے متصل بلکہ باغ و مقبرہ کی زمین کے کچھ حصہ میں بھی بڑے بڑے ساہوکاروں، تاجروں اور متمول لوگوں کے عالیشان مکانات تعمیر ہو گئے۔ اور ان دولت مندوں کی وجہ سے اس محلہ کا نام لکھی محلہ مشہور ہو گیا۔

پھر وہ وقت آیا کہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے دنوں میں جب لوٹ مار ہونے لگی۔ تو کچھ لوگ فصیلِ شہر کے اندر چلے آئے۔ کچھ جموں کی طرف چلے گئے جو کہیں نہ جا سکے۔ وہ مال و اسباب سمیت غارت گروں کی نذر ہو گئے۔ یہاں تک کہ جب رنجیت سنگھ کا زمانہ آیا۔ تو سہ حاکمانِ لاہور کے ظلم کی بدولت یہاں کے عالیشان مکان کھنڈروں میں تبدیل ہو چکے تھے اسی زمانہ میں جمعدار خوشحال سنگھ کے ایک اہل کار ہمت قوم کہار نے جو مواضعات مزنگ و اچھرہ کا مستاجر بھی تھا بہت سا حصہ ہموار کرایا اور یہاں ایک دلکش باغ اور اس کے ساتھ کئی پختہ مکانات تعمیر کرا لیے۔

تاریخ لاہور میں لکھا ہے کہ جب خشت فروش بنیادیں کھودتے اور زمین صاف کرتے تھے تو اکثر دفینے نکلتے تھے۔ ایک مرتبہ محمد شاہی روپیہ کا بھرا ہوا دیگچہ نکلا تھا۔

---

[1] نام مولوی غلام حسن تخلص خورم۔ وطن لاہور۔ فارسی کے علاوہ ریختہ میں بھی کہتے تھے۔ ان کی پنج گنج ایک مشہور تصنیف ہے جو غیر مطبوعہ ہے۔

انگریزی عملداری کے وقت ہمت کے کم ہمت پوتے حاکم نام نے وہ باغ میاں محمد سلطان ٹھیکہ دار کے پاس فروخت کر دیا۔ محمد سلطان نے باغ کو صاف کرا کر وہاں ایک کوٹھی تعمیر کرائی۔ جہاں اُس زمانہ کے ڈپٹی کمشنر ہال صاحب نے رہائش اختیار کی اور اُسی کے نام پر وہ ہال صاحب کی کوٹھی مشہور ہو گئی بلکہ اُس سڑک کا نام بھی جو سیدھی مزنگ کو جاتی ہے چوک ہر جس تک ہال روڈ ہی مشہور ہے۔ سڑک کے ایک طرف رومن کیتھلک گرجا۔ یورو پین کیتھڈرل سکول اور قبر شاہ اسماعیل ہے اور دوسری طرف یعنی بائیں جانب چاہ دانتیاں اور رومن کالج ہے[1]۔ کسی کے خواب میں بھی یہ بات نہیں آسکتی کہ یہاں کبھی کوئی باغ بھی تھا۔

باغ چھاؤنی جمعدار خوشحال سنگھ

سید بدر الدین گیلانی ایک بزرگ شاہجہان کے زمانہ میں لاہور کے اس مقام پر رہتے تھے جہاں آجکل گورنمنٹ ہاؤس واقع ہے اسی جگہ ان کی عالیشان مسجد تھی اور اسی جگہ ان کے نام سے ایک محلہ آباد تھا۔ ۱۰۷۲ھ / ۱۶۶۱ء میں بعہد عالمگیر ان کا انتقال ہو گیا۔ مقبرہ کی عمارت تعمیرات شاہی کا پتہ دیتی ہے۔

یہ محلہ مع مسجد و مقبرہ دیر تک آباد رہا۔ سر حاکمانِ لاہور کے زمانہ میں جب بیرون لاہور کی بستیاں ویران ہونے لگیں تو رنجیت سنگھ کے زمانہ میں شہر کے پہلوانوں نے گنبد کے متصل کشتیوں کا اکھاڑہ بنا لیا اور یہ گنبد کشتی والا گنبد کے نام سے مشہور ہو گیا۔

رنجیت سنگھ کے اواخر عہد میں فوج کی چھاؤنی جمعدار خوشحال سنگھ کے ماتحت گنبد کے متصلہ میدان میں مقرر ہوئی۔ جمعدار نے گنبد کو گرا کر ہشت پہلو کوٹھی بنوائی اور اس کے ساتھ ہی ایک باغ چھوٹے پیمانہ پر مگر نہایت دیدہ زیب تعمیر کرایا۔

سرکار انگریزی کے عہد میں ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت کے مطابق پہلے لورنگ صاحب ڈپٹی کمشنر پھر میجر میک گریگر ڈپٹی کمشنر پھر منٹگمری صاحب کمشنر (بعد میں لاٹ صاحب) یکے بعد دیگرے اس باغ اور کوٹھی میں مقیم رہے۔ منٹگمری صاحب کے زمانہ میں اس باغ اور کوٹھی پر راجہ تیجا سنگھ برادر جمعدار خوشحال سنگھ کا قبضہ تھا۔ لاٹ صاحب نے یہ باغ راجہ تیجا سنگھ سے لے لیا اور اس کے عوض سیالکوٹ میں اس کو وہاں حاکم رائے کی حویلی دے دی۔ چنانچہ اُسی زمانہ سے وہ کوٹھی گورنمنٹ ہاؤس چلی آتی ہے۔ کوٹھی کے بیرونی حصے میں نہایت مکلف اور وسیع باغ ہے جس میں طرح طرح کے ثمردار اور بے ثمر درخت نصب ہیں۔ بے شمار گملوں سے باغ کی زینت بڑھائی گئی ہے۔ باغ میں ایک عمیق حوض ہے۔ اور اس سارے رقبے کو ایک پختہ دیوار محیط کئے ہوئے ہے۔ ہر سال اس کوٹھی میں اور اس وسیع اراضی میں اس قدر اضافہ ہوتا رہتا ہے کہ جمعدار خوشحال سنگھ کے زمانہ کی کوئی عمارت وہاں موجود نہیں۔ البتہ سید بدر الدین گیلانی کا مقبرہ کوٹھی کی زیریں منزل میں بدستور موجود ہے۔

باغ ٹھاکر دوارہ بھوری سرکار

یہ باغ اُس مندر اور ٹھاکر دوارہ کے ساتھ ملحق ہے جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ایک رانی بھوری سرکار نام نے مہاراجہ شیر سنگھ

---

[1] گورنمنٹ کالج فار ومن یہاں سے تبدیل ہو کر کسی دوسری جگہ چلا گیا ہے اور اب وہاں انسپکٹر آف سکولز کا دفتر ہے۔

کے زمانہ میں تعمیر کرایا تھا۔ یہ باغ بڑھے دریا کے کنارہ پر نالہ کے پل سے پار واقع ہے باغ نہایت وسیع تھا اور اس کے ساتھ بہت سی زرعی زمین بھی تھی اس میں مکانات بھی تھے جہاں باغبان اور کاشت کار رہتے تھے اور کئی کنوئیں بھی تھے۔ سنہ ۱۸۸۴ء تک اس باغ میں بہت رونق تھی کئی پختہ مکانات موجود تھے۔ سادھ سنت بھی رہتے تھے اور لنگر خانہ کے لیے آٹا پیسنے کا ایک خراس بھی تھا۔

نالہ سے پار مغرب کی طرف نزدیک آموں کے درختوں کے درمیان مندر اور ٹھاکر دوارہ کی عمارتیں تو موجود ہیں مگر باقی عمارتیں کچھ شکستہ ہیں کچھ مسمار ہو چکی ہیں۔ باغ کی چار دیواری بھی نہیں ہے۔ البتہ آموں کے درخت موجود ہیں۔

باغ پچھو بھگت

جہانگیر اور شاہ جہان کے عہد میں پچھو بھگت ایک بہت بڑے فقیر کامل گزرے ہیں۔ ان کا مکان شاہ عالمی دروازہ کے باہر اُس جگہ تھا۔ جہاں میو ہسپتال لاہور کا بڑا دروازہ ہے۔ اور دروازہ سے آگے چند قدم کے فاصلہ پر بائیں طرف ان کی سمادھ بھی موجود ہے۔

صاحب عمدۃ التواریخ انتخاب دفتر دوم کے صفحہ ۱۱ میں لکھتے ہیں کہ چالیس سال سے یہاں ایک بزرگ مہاتما پرشوتم داس رہا کرتے تھے بڑے صاحب یمن و برکت اور ریاضت کش تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ پرشوتم داس کا قاعدہ تھا کہ سرکار کی طرف سے جو کچھ ان کو نقد و جنس ملا کرتا وہ محتاجوں اور مسکینوں کو بانٹ دیا کرتے۔

ان کے بعد باوا دوارکا داس جو پرشوتم داس کا چیلہ تھا گدی پر بیٹھا۔ اس کو عمارات و باغات کا شوق تھا چنانچہ مہاراجہ کی طرف سے جو کچھ اس کو ملتا تھا وہ تعمیرات میں صرف ہو جاتا تھا اس نے جنوب کی سمت ایک باغ تعمیر کرایا اور اس میں شاندار عمارات تیار کرائیں۔ سمت ۱۸۸۰ ب / ۱۸۲۳ء میں باوا دوارکا داس بھی انتقال کر گیا۔

باوا دوارکا داس کے بعد اس باغ اور ان مکانات پر تقریب کا وہ حال ہوا جو مولانا حالی کے اس شعر کے مطابق نظر آتا ہے ؎

ان کے جاتے ہی بدل جاتی ہے گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

چنانچہ سمت ۱۸۸۷ ب / ۱۸۳۰ء یعنی دوارکا داس کی وفات سے سات ہی سال کے بعد کے واقعات میں صاحب عمدۃ التواریخ لکھتے ہیں کہ باغ اور مکانات سب رہن ہو گئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوارکا داس کا جو جانشین تھا وہ فضول خرچ اور عیش پرست تھا۔

جب انگریزوں کا راج آیا۔ اور انھوں نے لاہور میں میڈیکل کالج بنانے کا ارادہ کیا۔ تو باغ اور باغ کے مکانات کی صفائی ہو گئی اور صرف باوا پچھو بھگت کی سمادھ باقی رہ گئی۔ جو کالج کے احاطہ میں اب تک محفوظ و سلامت چلی آتی ہے۔

فیض باغ راجہ دینا ناتھ

سکھوں کے عہد میں ایک درویش سائیں بادی شاہ کے نام سے مشہور تھے۔ راجہ دینا ناتھ ان کا بڑا معتقد تھا۔ اُس نے ان

کے لیے چاہ میراں کے رستے میں ایک باغ تعمیر کرایا۔ اس میں پختہ مکانات بھی بنوائے اور باغ کی چار دیواری بھی پختہ کرائی۔ راجہ دینا ناتھ ہر دوسرے چوتھے دن ہادی شاہ کے سلام کو آتا تھا چونکہ امیر الامرا تھا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار کا رکن تھا اس لیے اس کی دیکھا دیکھی اور بہت سے لوگ بھی یہاں آنے لگے۔

اس باغ کے ساتھ کافی زمین تھی جہاں کاشت بھی ہوتی تھی اور ایک کنواں بھی تھا جس سے اس باغ کی آبیاری ہوا کرتی تھی۔ راجہ نے فیضانِ عام پہنچانے کے لیے اور اس خیال سے بھی کہ اُن کو اپنے اعتقاد کے مطابق یہاں سے فیض پہنچا رہتا تھا اس باغ کا نام فیض باغ رکھا۔

آج سے پچاس سال قبل دیوار بندی کے شکستہ سے آثار موجود تھے اور گو فیض باغ کی زمین میں کاشت ہوتی تھی لیکن اس کی شرقی جانب بید مشک، گلاب، سنگترے اور کھٹے میٹھے درختوں کے باغات تھے۔ اور کہیں کہیں کاشت بھی ہوتی تھی یہ سب باغات فروخت ہو کر مکانات کی صورت میں آباد ہو گئے۔ چنانچہ آج فیض باغ ایک باغ کا نام نہیں بلکہ ایک نو آبادی کی صورت میں آباد ہے۔

ہادی شاہ کی قبر بھی اسی باغ میں ہے۔ اس کی قبر ذرا بلند چبوترے پر ہے اور بڑ کا ایک گرانڈیل درخت اُس پر سایہ کناں ہے۔ اس کے پاس ہی کمہاروں کا ایک چھوٹا سا پژاوہ ہے جہاں برتن وغیرہ بنتے اور پکائے جاتے ہیں۔ مکانات جو باغ کے اندر تھے ابھی تک موجود ہیں وہاں زمیندار اور مزدور لوگ رہتے ہیں۔

یکی دروازہ کے باہر سے جو سڑک ریلوے پُل کے نیچے سے ہو کر چاہ میراں کو جاتی ہے اور جس کا نام سڑک نواب میاں خاں ہے یہ اس باغ کے مکانات کے پاس سے ہو کر گزرتی ہے۔

ہادی شاہ نے پہلی بیوی عالم بی بی کے مرنے کے بعد دوسرا نکاح پناہ بی بی نام ایک عورت سے کیا جس سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جو عالم شاہ نام ایک شخص سے بیاہی گئی۔ عالم شاہ نے بھاٹی دروازہ کے ایک شخص کے ساتھ اپنی بیٹی کا نکاح کر دیا۔ عالم شاہ کے مرنے کے بعد اس کے داماد اور اس کی لڑکی نے یہ باغ اور اس کی زمین اور مکانات وغیرہ سب فروخت کر دیئے[1]۔

---

[1] یہ حالات راقم کو میاں شہاب الدین مرحوم زرگر ساکنہ اندرون دہلی دروازہ لاہور نے بتلائے تھے جنہوں نے قریباً سو سال کی عمر میں ۱۹۳۴ء میں وفات پائی ہے۔

سنہ ۱۸۵۰ء تا حال

میاں محمد سلطان

گردشِ افلاک نے جس کو کیا خانہ بدوش
عزم و ہمت کی بدولت اس کو "سلطان" دیکھیے

میاں سلطان ایک بیوہ ماں کا بیٹا اور ایک مفلوک الحال اور غریب الوطن کا شمیری خاندان کا نونہال تھا۔ اس کے تفصیلی حالات مشاہیر کشمیر اور تاریخ اقوام کشمیر جلد دوم میں درج ہیں۔ اس نے محنت مزدوری بھی کی، صابن اور چونہ کا کام بھی کیا۔ اینٹوں کا پزادہ بھی قائم کیا۔ کشتی گیری بھی کی بلکہ اپنی پہلوانی کی بدولت مہاراجہ شیر سنگھ خلف مہاراجہ رنجیت سنگھ سے انعام و اکرام کے علاوہ ایک گھوڑا بھی حاصل کیا اور آخر اس کی نیک نیتی اور اس کے عزم راسخ اور اس کے استقلال نے اس کو رفتہ رفتہ وہ عروج دکھایا کہ اپنی دولتمندی، فیاضی اور اپنی ہر دلعزیزی سے وہ لاہور کا بے تاج بادشاہ کہلاتا رہا۔

چونکہ خورد سالی ہی میں اس پر مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا اور ماں اس کی بیوہ تھی اس لیے اس کی تعلیم کا کوئی بندوبست نہ ہو سکا۔ اس کا سارا کاروبار اہل کاروں کے ہاتھ میں تھا جن کی خیانت و بددیانتی کا شک کی رہنے کے باوجود وہ ہمیشہ چشم پوشی سے کام لیتا رہا۔ اہل کاروں کے ہاتھ رنگنے کے ساتھ ہی اس کی اپنی سخاوت اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ قدر بین لوگوں کو اس کے انجام سے ہمیشہ خطرہ رہتا تھا۔ اس نے اپنی فیاضی میں ہندو مسلمان سکھ کی تمیز کبھی روا نہیں رکھی۔ وہ سب کو بلا تفریق مذہب و ملت دیتا تھا اور ہر ایک کی بے دریغ مدد کرتا تھا۔

[۵ر فروری سنہ ۱۸۵۵ء کے اخبار کوہ نور لاہور میں ایک خبر درج ہے جس کے مطالعے سے میاں سلطان کی عالی حوصلگی، منکسر المزاجی، انتہا درجہ کی نیک سیرتی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے آقا و مولا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ والہانہ شیفتگی کا پتہ چلتا ہے۔ وہ خبر یہ ہے :۔

اخبار ہفتہ گذشتہ میں لکھا گیا تھا کہ آج (یعنی منگل گذشتہ کو) میاں سلطان ٹھیکیدار کو بہ دستے خوشنودی سرکار خلعت ملے گا۔ سو اسی دن معز الیہ کو دربار چیف کمشنری میں خلعت ہفت پارچہ مع جوڑی کڑہ طلائی و خطاب مندرجہ ذیل

عطا ہوا:

"زبدۃ الاقران لائق العنایت محمد سلطان"

کہتے ہیں کہ وقت عطائے خلعت کے جناب چیف کمشنر بہادر نے بزبان خاص اوّل چند کلمات موجب خوشنودی سرکار کے ان کی نیک کرداری و خوش رفتاری کے فرمائے اور بعد اس کے فرمایا کہ جملہ حکام آپ کو آئندہ چوکی دیں گے اور ہماری خوشی ہے کہ آپ کو خطاب نوابی کا دیا جائے کہ اس کو انھوں نے بمقتضائے عادت خوشی اپنی کے نامنظور کیا۔ پھر فرمایا کہ نواب کا خطاب اگر قبول نہیں فرماتے تو "خانی" کا خطاب دیں؟ اس پر بھی وہی لفظ فرمایا کہ مجھے اس سے بھی معاف رکھیے اور آخر کار حسب فرمائش صاحب ممدوح کے یہ درخواست کی کہ میرے نام کے ماقبل صرف نام محمد کا کافی ہے۔ امیدوار ہوں کہ سرکار بھی نام منظور کرے۔ چنانچہ یہی درخواست منظور ہوئی اور اس ادا سے اور بھی زیادہ موجب خوشنودی صاحب ممدوح ہوا۔

محمد سلطان کی نیک نامی و خوش خلقی کا بیان طول ہے۔ ان کی حوصلہ افزائی کے موافق اگر ان کو حاتم سے نسبت دیں تو بجا ہے۔ اس بزرگ نے ایک عالی شان سرائے بیرون دہلی دروازہ بنائی ہے کہ جس کے وسط میں ایک بڑی پر تکلف مسجد بنائی ہے اور ہر طرف مکانات پختہ آسائش مسافرین کے واسطے بنائے ہیں۔ اسی ہزار روپے سے زیادہ اب تک لگ چکے ہیں اور آئندہ تعمیر جاری ہے اس سرائے میں رعایت احسن صالحانہ یہ شروط ہے کہ کسی مسافر سے ایک پیسہ تک نہیں لیا جاتا، اور غربا و مساکین کو کھانا اور گزارہ ملتا ہے۔ ایسے مخیر اور صاحب ہمت اشخاص دنیا میں بہت کم ہوں گے۔ خدائے کریم ان کی نیک تربیت میں برکت دے اور اجر خیر کا جزائے خیر بخشے"۔ ــــ [مرتب]

میاں سلطان کو پرانے مقبروں اور شکستہ مسجدوں کی اینٹوں کے ٹھیکے ملتے تھے۔ اس سبب سے کئی مقبرے اور کئی مسجدیں اس کے مزدوروں کے ہاتھوں بے نام و نشان ہو گئیں۔ پری محل جو نواب وزیر خان نے شاہ عالمی دروازے کے اندر بنایا تھا، رنگ محل جو نواب میاں خان کی حویلی کا حصہ تھا اور مسجد ستارہ بیگم عرف قدسیہ بیگم کے انہدام کا ذمہ دار بھی اسی کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اس نے کئی مزارات کی مرمت بھی کرائی اور مساجد بھی تعمیر کرائیں۔ کئی کنوئیں کھدوائے۔ دہلی دروازہ کے اندر اس کی عالی شان حویلی اور دہلی دروازہ کے باہر لنڈا بازار سرائے میاں سلطان اب تک اس کی یادگار ہیں۔

[لاہور کا ریلوے اسٹیشن ابتدا میں اسی کے ہاتھوں تعمیر ہوا۔ ہسٹری آف لاہور

میں لکھا ہے کہ

"اس عمارت کا نقشہ مسٹر ڈبلیو برٹن سی ای نے بنایا اور اسے جلیل القدر ٹھیکیدار بارک ماسٹری محمد سلطان نے تعمیر کیا۔ سنگِ بنیاد سرجان لارنس (بعد میں لارڈ لارنس) لفٹننٹ گورنر پنجاب نے ۱۸۵۹ء میں رکھا اور عام پبلک کے لیے پہلی ٹرین ۱۸۶۲ء میں لاہور سے امرتسر تک چلی۔ تمام عمارت قلعہ نما اور نہایت نفیس ہونے کے علاوہ خشت کاری کا ایک پائدار نمونہ ہے۔ اس پر تقریباً پانچ لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا" — مرتب]

اٹک کا پل بھی اسی نے بنوایا۔ لیکن ان دونوں ٹھیکوں میں افسروں کے اختلاف رائے کی وجہ سے اس کو بہت کچھ زیر بار ہونا پڑا۔ اور آخر ایک موضع اور اپنی حویلی کے سوا اسے اپنی تمام جائداد مہاراجہ رنبیر سنگھ فرمانروائے جموں و کشمیر کے پاس پانچ چھ لاکھ روپیہ میں رہن رکھنی پڑی۔ مہاراجہ نے اس کی زندگی تک پانچ سو روپیہ ماہوار اس کے لیے مقرر کر دیا۔ آخر لاہور کا یہ لکھ پتی مزدور ستر اسی سال کی عمر پا کر ۴ فروری ۱۸۷۶ء مطابق ۷ ماہ رمضان ۱۲۹۴ھ کو وفات پا گیا۔ اس کی قبر احاطہ طاہر بندگی کے باہر سڑک کے کنارے جو سیدھی چوبرجی تک جاتی ہے۔ بالکل سادہ حالت میں ہے۔

۱۹۰۳ء میں مسٹر سی ایچ اٹکنسن ڈپٹی کمشنر لاہور نے ازسرِ نو اس کی قبر کی مرمت کرائی۔ اور قبر کے سرہانے ایک پتھر پر حسب ذیل الفاظ لکھوائے:

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

میاں محمد سلطان مرحوم بانیٔ سرائے سلطان و لنڈا بازار۔ تاریخ وفات ۴ فروری
۱۸۷۶ء مطابق ۲۷ ماہ رمضان ۱۲۹۴ھ

بحکم جناب مسٹر سی۔ ایچ اٹکنسن صاحب ڈپٹی کمشنر لاہور ۱۹۰۳ء

قبر کے گرد سرخ پتھر کا جنگلہ ہے جو دس گیارہ فٹ لمبا اور چھ سات فٹ چوڑا ہے۔ تعویذ سنگ مرمر کا ہے۔ سرہانے جس پتھر پر نام ہے وہ مرمر ہے لیکن کئی حرفوں سے سیاہی اڑ گئی ہے اور اس کی غربی و جنوبی جانب لکیر آ گئی ہے جنگلہ کا پتھر بھی جنوبی سمت سے اکھڑ رہا ہے۔ سرہانے ایک لال ٹین بھی بوسیدہ اور شکستہ آویزاں ہے جو غالباً ۱۹۰۳ء ہی سے چلی آتی ہے۔

اس قبر کے بالکل مقابل جنوب کی طرف اس کے عزیز رشتہ دار میاں محمد بوٹا پہلوان رستمِ ہند کی قبر ہے جس نے ۹۰ سال کی عمر میں ۱۷ اپریل ۱۹۰۴ء مطابق ۳۰ محرم ۱۳۲۲ھ کو لاہور میں انتقال کیا۔ اس کی قبر پر نواب فصیح الملک بہادر میرزا داغ دہلوی استاد راقم الحروف کا قطعہ ذیل درج ہے:

وہ دلاور زور دہ شہ زور دنیا سے گیا
جس کی شہ زوری سے تھا شہرِ جہان منفعل
داغ نے یہ مصرعۂ تاریخ برجستہ کہا
رستمِ ہند آہ بوٹا پہلوان دہلوی (۱۳۲۲ھ)

ان قبروں سے ذرا فاصلے پر عین سڑک کے کنارے آس رستہ پر جو سیدھا دڑاں والے چھپر کے قبرستان کو جاتا ہے۔ مولانا محبوب عالم اور ان کے بھائی منشی عبدالعزیز مالکان پیسہ اخبار کی قبریں ہیں۔ مولانا محبوب عالم کے حالات " اخبار نویسوں کے حالات " مطبوعہ ۱۹۱۲ء میں مختصر طور پر درج ہو چکے ہیں اور اب ان کی مفصل سوانح عمری ان کے صاحبزادے منشی عبدالمجید اڈیٹر پیسہ اخبار لاہور شائع کر رہے ہیں۔ مولینا مرحوم کے سب سے بڑے فرزند مسٹر عبدالحمید جو برسوں انگلستان اور افریقہ میں رہ چکے ہیں اور وہاں سے واپسی پر بمبئی سے ایک نہایت کامیاب اخبار خاتون نکالتے رہے ہیں آج کل لاہور میں ہیں۔ آپ ایسٹرن ٹائمز ایک انگریزی اخبار کے مالک و اڈیٹر ہیں جو پہلے ہفتہ وار تھا لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں آپ نے اس کو روزانہ کر دیا۔ مارچ ۴۴ء کے آخری اور اپریل کے ہفتہ اول میں جب مسٹر محمد علی جناح لاہور میں تھے تو انھوں نے اس اخبار کو مسلم لیگ اور پاکستان کے پراپگنڈا کے لیے ایک لاکھ روپیہ میں خرید لیا۔ مولینا مرحوم کے تیسرے فرزند مسٹر عبدالرشید تجارتی کاروبار میں مصروف ہیں۔

مولانا مرحوم ۱۲ فروری ۱۸۶۵ء کو پیدا ہوئے اصل وطن فیروز والہ ضلع گوجرانوالہ ہے۔ ۱۸۸۹ء میں آپ نے لاہور میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ آپ نے پیسہ اخبار کے علاوہ اور بھی کئی اخبار اور رسالے جاری کئے۔ آپ کی لائبریری ایک لاکھ روپیہ سے زیادہ قیمت کی تھی۔ آخر دم تک آپ نے مطالعہ کا شغل جاری رکھا کئی کتابوں کے مصنف تھے اور کئی اڈیٹران اخبارات نے آپ کے ہاں ٹریننگ حاصل کی جن میں ایک راقم الحروف بھی تھا۔

آپ بعمر ۶۷ سال ۲۳ مئی ۱۹۳۳ء کو وفات پا گئے۔ آپ کے جنازہ کے ہمراہ سر میاں محمد شفیع، سر میاں فضل حسین، ڈاکٹر شیخ محمد اقبال (بعد میں سر) اور کئی معززین شامل تھے۔

آپ کی قبر کا چبوترہ سنگِ مرمر کا ہے۔ تعویذ پر سفید حروف میں کلام الٰہی درج ہے۔ قبر کے سرہانے جو مرمریں پتھر ہے اس پر ذیل کی عبارت تحریر ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

کل نفس ذائقۃ الموت

خوابگاہ خلد آشیاں خادم اسلام حاجی مولوی محبوب عالم مرحوم مغفور

سحر گاہے بگورستاں رسیدم — دراں گورے پر از انوار دیدم

محلّی تربت محبوب عالم — ز ہاتف سال تاریخش شنیدم

ان کی قبر کے بالکل متصل مغربی جانب ان کے دست راست یعنی ان کے بھائی منشی عبدالعزیز مالک و منیجر پیسہ اخبار کی قبر ہے جن کی قبر کے تعویذ کے سرہانے یہ تحریر ہے۔

میاں عبدالعزیز مرحوم سابق مالک و مہتمم پیسہ اخبار خلف الصدق میاں الٰہ دین مرحوم

۸ شعبان ۱۳۳۷ھ مطابق ۹ مئی ۱۹۱۹ء بروز جمعہ بوقت سہ پہر

خدا نے جگہ ان کو جنت میں دی = ۱۳۳۷ھ

۶

لاہور کے مشہور محقق مسٹر محمد حفیظ حفظ العلوم والے آپ ہی کے عزیز ہیں۔

باغ چھوٹا لال[1]

[انگریزوں کے ابتدائی عہد میں لالہ چھوٹے لال دہلی کے ایک نامی رئیس لاہور میں بستے تھے انھوں نے نہایت شوق، محنت اور صرف زرِ کثیر سے ایک نہایت خوب صورت باغ لاہور میں اس سڑک پر تعمیر کرایا جو گورنمنٹ ہاؤس سے میاں میر کی طرف جاتی ہے۔ یہ باغ گورنمنٹ ہاؤس کے متصل ہی تھا اور رقبہ میں گو بہت بڑے باغوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا مگر خوب صورتی اور دلآویزی میں اس کی شہرت کسی اور باغ سے اپنے زمانے میں کم نہ تھی۔

اس کے دروازے کے قریب ایک خوب صورت نشست گاہ تھی جس کی دیواروں میں سنگ مرمر استعمال کیا گیا تھا۔ باغ کے مغرب کی جانب ایک بارہ دری تعمیر کی گئی جس کی چھت خوب صورت بیش قیمت پتھر کے ستونوں سے آراستہ تھی، بارہ دری کے جنوب میں ایک خوبصورت تالاب تھا۔ باغ کے جنوبی حصے میں ایک اور بارہ دری تھی جس کے اندر کی دیواروں میں قدِ آدم تصویریں عجب لطف دیتی تھیں۔

پھولوں کے پودے اس باغ میں بکثرت تھے اور سیر و تفریح کے لیے یہ چھوٹا سا باغ نہایت پر فضا معلوم ہوتا تھا۔ دروازے پر بڑے بڑے لفظوں میں لکھا ہوا تھا:-

"چھوٹا لال کا باغ"

راوی کا پل بن جانے کی وجہ سے صبح کی سیر کے وقت لوگوں کا رخ عموماً دریا کی طرف ہو گیا، سیر کے شائقین شہر کے گرد جو چاروں طرف باغات ہیں وہاں چکر لگانے لگے۔ چھوٹا لال کے وارثوں نے بھی باغ کی طرف وہ توجہ نہ کی جو بانی خود رکھا کرتا تھا۔ اس لیے اگلی پود کو اس باغ کے وجود کا بھی علم نہ رہا ——— مرتب]

مولانا آزاد دہلوی

نیند سے جو نظمِ حسن و عشق کی آزاد تھا

آج زندانِ لحد میں وہ سخنداں دیکھئے

آپ اُس باپ کے نامور فرزند تھے جس نے ہندوستان میں دہلی شہر سے سب سے پہلے اُردو میں "دہلی اخبار" کے نام سے ایک اخبار جاری کیا جس کو شہنشاہانِ مغل کے آخری (برائے نام) تاجدار ابوظفر بہادر شاہ بھی پڑھا کرتے تھے۔ آپ کے والد کا نام مولوی محمد باقر تھا۔ آپ ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۴۵ھ/۱۸۲۸ء کو بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ عربی کالج دہلی میں آپ نے تعلیم پائی۔

---

[1] از مرتب۔

حافظ ڈپٹی مولوی نذیر احمد ایل ایل ڈی ۔ مولانا محمد ذکاء اللہ مؤلف تاریخ ہندوستان آپ کے ہم جماعتوں میں تھے اور اپنی قابلیت سے تینوں ہی شمس العلما کے خطاب سے نوازے گئے ۔

آپ ایام غدر (۱۸۵۷ء) کے بعد ۱۸۶۵ء میں کہ عین جوانی کا عالم تھا ۔ دہلی سے لاہور آ گئے ۔ اس زمانہ میں سر ڈانلڈ مکلاؤڈ پنجاب کے لفٹنٹ گورنر تھے ۔ ان کے ایما سے آپ نے بلخ بخارا اور ایران تک کا سفر کیا ۔

۱۸۶۷ء میں آپ نے لاہور میں ایک مشاعرہ کی بنیاد ڈالی ۔ اس میں غزلوں کے علاوہ اخلاقی اور نیچرل نظمیں بھی پڑھی جاتی تھیں ۔ آپ نے اس مشاعرہ میں جو غزل سب سے پہلے پڑھی اس کا مطلع ملاحظہ فرمایئے ؂

جہازِ عمرِ رواں پر سوار بیٹھے ہیں
سوادِ خاک میں بے اختیار بیٹھے ہیں

لیکن آپ کی توجہ زیادہ تر نیچرل شاعری کی طرف رہی اور غالباً اس غزل کے سوا آپ نے مشاعرہ میں کوئی اور غزل نہیں پڑھی ۔ درحقیقت اسی مشاعرہ نے پنجاب اور بعد میں تمام ہندوستان میں اخلاقی شاعری کی بنیاد رکھی ۔ مولانا حالی ۔ مولانا الطاف حسین نفیس ۔ لالہ رام چند بدطوری ۔ الٰہی بخش رفیق ۔ لالہ تارا چند تارا سوہن حلوا فروش ۔ مولانا فیض الحسن ادیب اور کئی اور اصحاب اس مشاعرہ کی روح رواں تھے ۔

آزاد پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اُردو شاعری کو گل و بلبل کے پھندوں سے آزاد کیا ۔ اور اس میں حقیقی اثر کوٹ کوٹ کر بھر دیا ۔ آپ کا مجموعہ نظم طبع ہو چکا ہے اور وہ حسن و عشق کی قید سے آزاد ہے ۔ شام کی آمد اور رات کی کیفیت ایک طویل نظم میں جس طرح بیان کی ہے ۔ وہ فی الحقیقت محویت اور وجد کا مرقع ہے ۔ اسی نظم میں ایک شعر ہے ۔

عالم تمام بسترِ راحت پہ خواب میں
آزاد سر جھکا کے خدا کی جناب میں

آزاد ۔ ذوق کے شاگرد تھے ۔ مگر ان کے حالات بمقابلہ اور شعرا خصوصاً حکیم مومن خاں مومن انھوں نے آبِ حیات میں بہت تفصیل سے لکھے بلکہ بقول معترضین بڑھا چڑھا کر لکھے ۔ لیکن شاعری میں استاد کا رنگ انھوں نے اختیار نہیں کیا ۔ ان کی شاعری سلیس سادہ اور آسان ہے اور قصائد کے دفاتر سے پاک ہے ۔

مولینا شبلی کی ان سے چشمک رہتی تھی ۔ مکاتیب شبلی میں ان کا خط ۳۶ اس کا مظہر ہے لکھتے ہیں " آزاد کی کتاب آج دلیو آئی ۔ جانتا تھا کہ وہ تحقیق کے میدان کا مرد نہیں ۔ تاہم وہ ادھر اُدھر کی گپیں بھی ہانک دیتا تو دل چسپ معلوم ہوتا ۔" یہ اشارہ مولینا آزاد کی کتاب سخندانِ پارس سے متعلق ہے ۔ پھر مولانا شبلی خط ۱۶۲ میں لکھتے ہیں " آزاد کا سخندانِ پارس حصہ دوم نکلا سبحان اللہ ۔ لیکن الحمد للہ میرے شعر العجم کو ہاتھ نہیں لگایا ہے آزاد نے نظم کا حصہ تذکرۃ الشعرا کے لیے اُٹھا رکھا ہے جو اسی قدر ضخیم ہے اور چھپ رہا ہے " یہ ان کے بیٹے (مولینا محمد ابراہیم مصنف) کے خط سے معلوم ہوا ہے ۔ یہ خط ۴ ارمئی ۱۹۰۷ء کا لکھا ہوا ہے ۔

لیکن ان باتوں کے باوجود ان کے کمال انشا پردازی کے معترف تھے ۔ حیاتِ شبلی (ص ۸۰۹) میں لکھا ہے " مولینا

محمد حسین آزاد سے تعلقات نہ تھے ان سے صرف ایک بار لاہور میں ملاقات ہوئی تھی جبکہ ان کا دماغ خراب ہو چکا تھا۔ مولانا ان کو اُردو کا سب سے بڑا انشا پرداز مانتے تھے اور فرماتے تھے کہ آزاد اُردو ئے معلی کا ہیرو ہے اس کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں وہ اصلی معنوں میں ایک زبردست انشا پرداز ہے۔"

آپ کی نثر کا بے ساختہ پن لاجواب ہے۔ نیرنگِ خیال ہو یا آبِ حیات۔ دربارِ اکبری ہو یا سخندانِ پارس جس کتاب کو ایک دفعہ پڑھو۔ اُسے بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے ؎

اُٹھا اور رکھ کے سو سو بار اس کو
اگر دیکھو تو سو سو بار دیکھو

شمس العلما مولینا شبلی، شمس العلما مولینا آزاد سے جب لاہور میں ملے ہیں تو ان کے ساتھ دو اور شمس العلما بھی تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ آزاد کا دماغ ان کو جواب دے چکا تھا۔ اس ملاقات کا مختصر سا ذکر افاداتِ مہدی (ص ۲۴۲) میں بھی ہے۔ مہدی (وفات ۲۱ر نومبر ۱۹۲۱ء) مرحوم لکھتے ہیں:۔

"پروفیسر آزاد اس قدر بلند خیال اور استادانہ دل و دماغ رکھتے تھے کہ ان کے ہاں بھی جہاں تک معاصرین کا تعلق ہے "چشمک" کا گزر نہیں۔ ایک واقعۂ دلچسپ اہلِ ذوق کی ضیافتِ طبع کے لیے لکھتا ہوں:

لاہور میں پہلی دفعہ (غالباً ۱۸۹۴ء یا ۱۸۹۵ء کا ذکر ہے) جب ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ ہوا تو پروفیسر آزاد زندہ تھے۔ گو دماغ کسی حد تک متاثر ہو چکا تھا۔ نذیر احمد (شمس العلما) ملنے کے لیے گئے حالی (شمس العلما) اور غالباً شمس العلما شبلی بھی ساتھ تھے۔ نذیر احمد کا لکچر ہونے والا تھا جو طبع شدہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ آزاد رسالہ کی طرف متوجہ ہوئے تو نذیر احمد نے یہ کہہ کر آگے بڑھا دیا کہ ایک نظر دیکھ لیجئے۔ کانفرنس میں پیش کرنا ہے۔ آزاد فوراً قلم سنبھال کر بیٹھ گئے اور کانٹ چھانٹ شروع کر دی۔ نذیر احمد۔ آزاد کی اس بے تکلفی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ جوشِ محبت سے آنکھیں نم ہو گئیں۔ ان کو قدرتی طور پر یہ خیال آیا۔ کہ ابھی ان کے دائرہ میں ایک شخص ایسا موجود ہے جو ایک "بوڑھے بچّہ" کی مشقِ سخن پر نظرِ ثانی کر سکتا ہے۔"

مہاراجہ سر رنبیر سنگھ والیئے جموں و کشمیر خود عالم تھے اور عالموں کے قدر دان تھے ان کے مدار المہام دیوان کرپارام بھی صاحبِ تصانیف تھے۔ ایسے قدر دان مہاراجہ اور ایسے فاضل مدار المہام کی نظروں سے مولینا آزاد کب تک پوشیدہ رہ سکتے تھے چنانچہ فروری مارچ ۱۸۸۳ء کے ایام میں آپ کو جموں سے تاریخ کشمیر لکھنے کی تحریک ہوئی۔ اور تنخواہ پوچھی گئی آپ نے عدیم الفرصتی کا عذر کر کے ٹال دیا لیکن پھر ایک خاص آدمی آیا اور اس نے دربار کی طرف سے مستقل ملازمت کی تحریک کی۔ لیکن آپ نے اُس کو

یہی صاف جواب دے دیا۔ اس پر آپ میجر سید حسن صاحب بلگرامی مرحوم (حیدر آباد دکن) کو اپنے ۸ راپریل ۱۸۸۳ء کے خط میں لکھتے ہیں:-

"میری اپنی کتابیں ناتمام پڑی ہیں کہ لوگوں کی آنکھیں اور میری جان انہی میں لگی ہے۔ میں کسی کی کتاب کیا لکھوں طمع کا منہ کالا ہے"[1]

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ کشمیر کی تاریخ لکھتے۔ تو دربار اکبری کی طرح دربار شاہی اس شان سے سجاتے کہ کشمیر کی اسلامی حکومت کا نقشہ دلوں پر نقش ہو جاتا۔

آپ گورنمنٹ کالج اور اورینٹل کالج میں بیس پچیس سال تک عربی اور فارسی کے پروفیسر رہے۔ آپ کے صدہا شاگرد اعلیٰ عہدوں پر ممتاز رہے ہیں اور ان میں اچھے اچھے شاعر اور ادیب ہوئے ہیں۔

آپ کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۸۷ء میں بھی آپ سرکاری ملازم تھے انہی ایام میں آپ نے دربار اکبری کو مکمل کیا تھا لیکن نظر ثانی باقی تھی۔ صدمات و ضعف کے متعلق لکھتے ہیں۔

ضعف دماغ نے مجھے نکما کر دیا ہے رات کو بالکل لکھ پڑھ نہیں سکتا۔ مقتضائے سن ہے آزاد بچارا بڈھا ہو گیا اور صدمات زمانہ نے توڑ دیا۔ اپنے مسودے بستوں میں بند پڑے ہیں دیکھتا ہوں اور ترستا ہوں کہ ہائے نظر ثانی نہیں کر سکتا"[2]

رفتہ رفتہ ضعف دماغ نے خلل دماغ تک نوبت پہنچا دی شہر کے باغوں اور شہر کی سڑکوں پر گھومتے رہتے تھے۔ لوگ جو ان کو جانتے تھے دیکھتے تھے اور پہروں نظر حسرت سے دیکھتے رہتے تھے اور آپ کا اس پر عمل تھا ؎

دیوانہ باش تا غم تو دیگراں خورند
آں را کہ عقل بیش غم روزگار بیش

راقم نے بھی شہر کے بیرونی باغوں اور سڑکوں پر اکثر دفعہ آپ کی زیارت کی ہے۔ تین چار دفعہ گفتگو کا موقع بھی ملا ہے مگر وہ گفتگو ؎ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

کا مصداق ہوتی تھی۔ جنوری ۱۹۱۰ء مطابق ۹ محرم الحرام ۱۳۲۸ھ کو یہ عظیم القدر ہستی اس جہان فانی سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی۔ عمر آپ کی تراسی سال کی تھی۔ آپ کے شاگرد مولانا سید ناصر نذیر فراق دہلوی نے تاریخ رحلت میں لکھا۔ ؎

ع ہوشیاں گفتند رفتہ او بہ خلد

ہر چند قریباً پندرہ بیس سال سے ان کا دماغ اور قلم دونوں معطل تھے لیکن ان کا وجود محسن اُردو اور اپنی طرز تحریر کا موجد ہونے کے لحاظ سے بسا غنیمت سمجھا جاتا تھا۔ ان کی وفات کا سارے ہندوستان میں جہاں جہاں اُردو جاننے اور سمجھنے والے تھے ماتم منایا گیا۔ تعزیتی جلسے ہوئے۔ اخبارات نے مضامین لکھے۔ مولانا شبلی کو خبر ہوئی تو اسی وقت مدرسہ بند کرا دیا۔ اور تعزیت کا ایک جلسہ

---

[1] از مکتوبات آزاد۔ ص ۶۲ ۔ [2] مکتوبات آزاد۔ خط بنام ناصر نذیر فراق دہلوی۔

کرایا جس میں سب سے پہلے خود انھوں نے تقریر کی۔ اس تقریر کے وقت نہ صرف ان کے چہرے سے بلکہ ایک ایک لفظ سے شدتِ غم کا اثر محسوس ہوتا تھا (حیاتِ شبلی ص ۴۰۹)

[مولانا آزاد کی قبر امام باڑہ گامے شاہ لاہور میں ہے جہاں مجلسِ یادگارِ آزاد ہر سال یومِ آزاد کے موقع پر پھول چڑھاتی اور فاتحہ خوانی کرتی ہے ——— مرتب]

رام باغ عرف نیا شالا باغ

انیسویں صدی کے اواخر میں رائے پنڈت خیار دھن لاہور کے بہت بڑے رئیس گزرے ہیں۔ موری دروازہ کے باہر ہر سال موسم سرما میں غریبوں اور محتاجوں کو کمبل اور لحاف تقسیم کیا کرتے تھے اور عموماً سفید پوش غربا بھی ان کی فیاضیوں سے مستفیض ہوا کرتے تھے۔ اولادِ نرینہ سے محروم تھے لیکن بقائے نام کے لیے ذوق کا یہ شعر ان کو یاد تھا ؎

نام منظور ہے گر فیض کے اسباب بنا
پل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا

چنانچہ ۱۸۹۰ء میں انھوں نے قران کوٹ سے مغرب کی طرف لاہور سے چار میل کے فاصلہ پر پانچ سو کنال کے رقبہ میں ایک وسیع و عالیشان باغ کی بنیادیں کھدوانی شروع کیں۔

آج ۱۹۴۴ء میں یورپ کی جنگِ عظیم کی وجہ سے اور ملکوں کے علاوہ ہندوستان میں ہر چیز گراں بلکہ گراں تر ہو رہی ہے اسی سلسلہ میں مزدور کی یومیہ اُجرت دو روپیہ اور راج معمار کی یومیہ اُجرت تین سے چار روپے کے درمیان ہے۔ لیکن ۱۸۹۰ء میں ایک مزدور کی اُجرت اڑھائی آنہ یومیہ اور راج معمار کی اُجرت آٹھ آنہ سے زیادہ نہ تھی[1]۔ پنڈت خیار دھن اپنی طبعی فیاضی کی بدولت ہر مزدور کو نہ صرف دو پیسہ یومیہ زیادہ دیا کرتے تھے بلکہ اُن کے حکم سے ان کے مزدوروں کو غلہ گندم بھی بازار کے نرخ سے سیر دو سیر فی روپیہ زیادہ ملا کرتا تھا۔ اُن کے برادر زادہ پنڈت ہری کشن نے جو دو سال سے باغ کے انچارج ہیں راقم الحروف کو بتایا ہے کہ "اس باغ پر اُن کاغذات کے مطابق جو ہمارے پاس محفوظ ہیں بیس لاکھ روپیہ لاگت آچکی ہے"۔

۱۸۹۸ء تک باغ میں اس قدر رونق ہو گئی تھی کہ شہر اور گرد و نواح کے لوگ اس کو دیکھنے کے لیے آتے تھے۔ پنڈت خیار دھن اس زمانہ میں زندہ تھے۔ وہ خود باغ میں موجود رہتے تھے اور لوگوں کو دیکھ کر باغ باغ ہوتے تھے راقم السطور نے سب سے پہلے ۱۸۹۸ء ہی میں اس باغ کی سیر کی ہے اور اسی سال بانیٔ باغ پنڈت خیار دھن سے ملاقات بھی کی ہے۔

۱۹۰۶ء میں اس چمنستان کے بانی کی بہارِ عمر کو صرصرِ موت نے ختم کر دیا۔ اس کی سمادھ بھی اسی باغ میں جہاں اس

---

[1] ۱۸۹۰ء میں اس کے قریب بلکہ بیسویں صدی کے اوائل تک گندم ایک روپیہ کی بیس چوبیس سیر آتی تھی اور گھی ایک روپے کا ڈیڑھ دو سیر، دودھ ۲۰ سیر اور گوشت چار پانچ آنہ سیر ہوتا تھا لیکن آج ۱۹۴۴ء و ۱۹۴۵ء میں گندم فی من دس روپے گھی فی روپیہ ۳-۴ چھٹانک گوشت سوا روپیہ سے ڈیڑھ روپیہ سیر اور دودھ آٹھ آنہ سیر ملتا ہے۔ (اور اب تو اشیا کی قیمتیں اور بھی گراں ہو گئی ہیں ——— مرتب)

کے پرائیویٹ مکانات تھے۔ موجود ہے۔

اب اس وسیع و عریض باغ کے مالک آنجہانی کے بھائی پنڈت رکھی کیش ہیں اور مہتمم باغ پنڈت ہری کشن ہیں جو آنجہانی کے برادرزادہ ہیں۔ پنڈت ہری کشن اپنے بزرگ خاندان کی اس دائمی یادگار کو ترقی و رونق دینے میں ساعی رہتے ہیں اور دُور دُور سے بُوٹے اور درخت منگواتے رہتے ہیں اور خود باغ میں موجود رہتے ہیں۔

بانیٔ باغ نے باغ کا نام "رام باغ" رکھا۔ سنگِ مرمر کی ایک تختی پر انگریزی حروف میں بانیٔ باغ کے نام کے ساتھ یہی نام تحریر ہے مگر عوام میں اس نام نے کوئی شہرت حاصل نہ کی۔ یہاں تک کہ ان کی زندگی ہی میں بلکہ ۱۸۹۸ء ہی میں جبکہ باغ کی افتتاحی رسم عمل میں آئی تھی اس باغ کا نام نیا شالامار باغ مشہور ہو چکا تھا اور ہزارہا آدمی جو اس باغ کی سیر کے لیے جایا کرتے تھے اسے نیا شالا باغ ہی کہتے تھے۔ اس باغ کا دوسرا نام باغ پنڈت جنار دھن بھی ہے مگر نیا شالا باغ کی شہرت کے مقابلہ میں اس نام کو بھی فروغ نہ ہو سکا۔

نیا شالا باغ مشہور ہونے کی وجہ یہ تھی کہ شالامار باغ کے سوا لاہور کے تمام دیگر باغات سے جو موجود ہیں یا نابود ہیں اس باغ کی زمین بہت زیادہ ہے۔ پھر اس میں جگہ جگہ فوارے۔ حوض۔ تالاب اور آبشاریں ہیں اور کئی مکانات آباد ہیں اور یہ طرز تکلف چونکہ شالامار باغ کے سوا لاہور کے اور کسی باغ میں نہیں ہے اس لیے عوام نے اس کو نیا شالامار باغ کہنا شروع کر دیا۔

اُس طویل سرزمین کا رقبہ جہاں باغ۔ سڑکیں۔ فوارے۔ روشیں۔ تالاب۔ مکانات۔ چبوترے سبھی کچھ شامل ہیں پانچ سو کنال بتایا جاتا ہے باغ کے جنوبی و غربی بیرونی گوشہ میں سوا دو سو کنال زمین ابھی خالی پڑی ہے یہاں صرف زراعت ہوتی ہے۔ راقم الحروف کو پنڈت ہری کشن مہتمم باغ ہذا نے بتایا کہ یہ تمام زمین عنقریب باغ کے ساتھ ہی شامل کر لی جائے گی۔ اور یہاں ثمردار درخت لگائے جائیں گے۔ اور فی الواقعہ اگر یہ زمین باغ کے ساتھ شامل کر دی گئی تو کچھ شک نہیں کہ اس کی وسعت اصلی شالامار باغ سے بھی بڑھ جائے گی۔ گو شاہجہانی باغ کے ڈیزائن اُس کے طبقات۔ اُس کی عمارات کی عمدگی و پختگی۔ بڑے تالاب کی رونق۔ اُس کے فواروں کی لہر بہر۔ آبشاروں کے لطف۔ ساون بھادوں کی موج بہار۔ تختِ سنگ مرمر وغیرہ کے مقابلہ میں اس باغ کی اُس کے آگے کچھ حقیقت نہیں۔

اس قدر عظیم رقبہ کے لیے حقیقتاً ایک نہر کی ضرورت تھی مگر معلوم ہوتا ہے نہر کا کوئی انتظام نہیں ہو سکا اور بظاہر اس کا انتظام مشکل بھی تھا۔ کیونکہ دریائے راوی اس باغ سے دو میل کے فاصلہ پر ہے ایک میل موضع باجوسا جوا اور ایک میل اس سے آگے دریا ہے۔ دو میل سے نہر کاٹ کر لانا اور زمینداروں سے دو میل تک نہر کے لیے زمین حاصل کرنا اور پھر حکومت کی اجازت یہ سب باتیں ٹیڑھی کھیر نظر آتی تھیں۔

آب پاشی کے لیے باغ کے اندر نو چاہات کا انتظام کیا گیا۔ یہ کنوئیں عموماً چلتے رہتے ہیں۔ چند کنوئیں باغ کی چار دیواری سے باہر بھی ہیں۔ باغ کے بڑے حصہ میں جو عوام کی سیر و تفریح کے لیے وقف ہے ایک آسمانی کنواں ہے جس کے ذریعہ فواروں میں پانی جاتا ہے اب موجودہ مہتمم باغ پنڈت ہری کشن چاہ کلاں کے سرے پر جس کی گہرائی سطح آب سے بھی بیس فٹ نیچے ہے چالیس گھوڑے کی طاقت کا ایک انجن لگا رہے ہیں۔

باغ دو حصوں پر منقسم ہے ایک حصہ پرائیویٹ باغ کہلاتا ہے۔ جہاں رائے پنڈت جنار دھن خود رہتے تھے دوسرا عوام کے لیے ہے جو پرائیویٹ باغ سے رقبہ و وسعت اور عمارات و اشجار میں بہت بڑا ہے دونوں باغوں کو ایک سڑک جدا کرتی ہے جو باغ ہی کی زمین سے ہو کر موضع سانده کی طرف چلی جاتی ہے پرائیویٹ باغ بائیں جانب ہے اور وقف عام باغ دائیں جانب ہے دونوں باغوں کی چار دیواری کہیں پختہ قدِ آدم ہے کہیں بنیاد پختہ بنا کر ان پہ لکڑیاں لگا دی گئی ہیں دونوں باغوں میں جانے کے لیے یوں تو کئی ایک رستے ہیں مگر اصل رستے دو ہی ہیں جن کے بڑے بڑے پھاٹک ہیں۔

بڑے باغ یا وقف عام باغ میں داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ چھوٹے چھوٹے فوارے آتے ہیں جو سنگ مرمر کی مورتیوں کی شکل میں ہیں ان میں کئی ایک مورتیاں ٹوٹ گئی ہیں بعض مورتیوں پر زنگ اس قدر غالب آ گیا ہے کہ سنگ مرمر نظر ہی نہیں آتا۔ اس باغ میں بہت سی سڑکیں۔ روشیں۔ خیابان۔ گل بوٹے۔ درختان بے ثمر و ثمردار۔ حوض۔ فوارے۔ کمرے۔ بارہ دریاں۔ آسمانی کنویں۔ تختِ سنگِ مرمر۔ دو شیر۔ قدِ آدم محافظ سپاہیوں کی تصویریں۔ فواروں کے لیے پانی جمع کرنے کے تالاب۔ مختلف نشست گاہیں سیر کرنے والے کے دل کو فرحت دیتی ہیں۔

آسمانی کنویں کے ساتھ ایک چھوٹی سی بارہ دری ہے جس کا فرش سفید و سیاہ سنگِ مرمر کا ہے۔ اس کے نیچے ایک خوب صورت سی آبشار ہے جس پر پانی لہریں مارتا ہوا پانچ فواروں والے حوض میں جاتا ہے جس کا وسطی فوارہ دوسرے فواروں سے بڑا ہے۔

اسی باغ کے اس حصہ میں جو سڑک کے کنارے ہے دو شیروں کی تصویروں کے پاس رنگین فوارے ہیں فواروں کی شکل بھی رنگ دار ہے۔ اور جب ہولی کے دن آتے ہیں تو ان سے پانی بھی رنگدار ہی نکلتا ہے۔ اور شور و شر اور ہاؤ ہو کے بغیر عبیر و گلال کے پھینکے جانے کا لطف آتا ہے۔

اس باغ میں مالٹا۔ آڑو۔ آلوچہ۔ سنگترہ۔ رنگترہ۔ نارنگی۔ آم (سبیندوری۔ قلمی۔ کاٹھے۔ چینڈول وغیرہ) امرود۔ انار۔ لیموں میٹھا۔ کھٹا۔ گل گل کئی درخت ہیں۔ ان کے علاوہ سفیدہ۔ ماجو کے درخت اور کئی قسم کے اور درخت مختلف پھولوں کی بہار دکھلانے والے بھی ہیں۔ ان کے علاوہ ایک ایسے گلاب کے بھی وہاں بوٹے ہیں جس کو ہرا گلاب کہتے ہیں جس کے پتے بھی ہرے ہوتے ہیں جس کی کلی بھی ہمیشہ ہری اور جس کا پھول بھی ہمیشہ ہرا رہتا ہے اور جو نہایت بھلا اور خوب صورت معلوم ہوتا ہے۔

رنگین فواروں کے پاس ہی سڑک کے پاس ایک چھوٹا سا دروازہ ہے۔ جس کے دونوں طرف قدِ آدم محافظ سپاہیوں کی مع ان کی بندوقوں کے تصویریں ہیں دروازے کے سامنے سنگ مرمر کا ایک چبوترا ہے جس پر سنگ مرمر ہی کا ایک تخت ہے۔ تخت کا خالی بازو موجود ہے بایاں شکستہ صورت میں الگ پڑا ہوا ہے۔

جس طرح تخت کے دروازے کے ساتھ پانچ بڑے فوارے ہیں اسی طرح اس کے سامنے جو تالاب ہے وہاں بھی سنگ مرمر کے پانچ کلاں فوارے موجود ہیں۔ سنگِ سرخ کی آٹھ سیڑھیوں کے بعد تالاب کا دروازہ آتا ہے۔ دروازے سے تالاب تک چند قدم کا جو رستہ ہے وہاں بھی سنگ سرخ ہے۔ بلکہ اس تالاب کے گرد جو چبوترہ ہے اور چبوترہ پر چاروں طرف جو مسقف برآمدے ہیں ان کے ستون اور چھت سب سنگ سرخ کے ہیں۔ تالاب قدِ آدم گہرا ہے اور مستطیل ہے۔ اس کے

چاروں طرف دروازے ہیں جو عورتوں کے نہانے کے وقت بند کر دیئے جاتے ہیں۔

تالاب کی ایک طرف بڑی آبشار ہے جس کا اصل راستہ تو سڑک سے ملحق ہے لیکن جس کا ایک دروازہ تالاب کی طرف سے بھی ہے۔ آبشار سے تین طرف مسقف بڑے بڑے برآمدے ہیں ہر برآمدہ میں پانچ پانچ در ہیں۔ برآمدوں کا فرش سنگِ سرخ کا ہے آبشار کے گرد چاروں طرف سیاہ و سفید سنگِ مرمر کے خطوط اپنی خوب صورتی کی بہار دکھاتے ہیں۔ آبشار کے نیچے آٹھ سیڑھیوں کے بعد ایک حوض آتا ہے جس میں تیس چالیس فوارے ہیں اور جن کا درمیانی فوارہ نہایت خوب صورت اور بلند ہے۔ اس پر جانوروں اور آدمیوں کی کئی تصویریں ہیں یہ سب فوارے سنگ مرمر کے ہیں مگر پانی نے ان کو زنگ آلودہ کر دیا ہے بہت سے فوارے شکستہ حالت میں ہیں۔ مہتمم صاحب نے توقع دلائی تھی کہ ان فواروں کی بہت جلد مرمت ہونے والی ہے۔

آبشار کلاں کے تینوں برآمدوں کی چھت نقش و نگار سے آراستہ ہے کہیں کہیں شیشے بھی چھت میں لگے ہوئے ہیں۔

جس طرح بادشاہی شالا مار باغ میں آبشار کے اوپر ایک وسیع بارہ دری ہے۔ اسی طرح اس باغ میں بھی آبشار کے اوپر بارہ دری بنائی گئی ہے گو اس شوکت و عظمت کو نہیں پہنچتی لیکن پھر بھی بانی باغ کی خوش مذاقی کی داد دینی پڑتی ہے سنگ سرخ کی پندرہ سیڑھیاں طے کرنے کے بعد یہ مختصر سی بارہ دری آتی ہے۔ جس کے بارہ محرابی در ہیں۔ فرش پر سیاہ و سفید دونوں قسم کا سنگ مرمر ہے مگر ستون صرف سفید سنگ مرمر کے ہیں یہاں سے غربی جانب کے کھیتوں کا سبزہ زار ایک دلچسپ نظارہ پیش کرتا ہے۔

بارہ دری اور آبشار کے عقب میں وہ نہایت ہی عمیق کنواں ہے جس سے پنڈت جنار دھن کے زمانہ میں انجن کے ذریعہ پانی نکالا جاتا تھا۔ اور جس کو اب موجودہ مہتمم نے بہت بڑا انجن منگوا کر اور بھی وسعت دے دی ہے۔ اسی کے ساتھ بجلی کا ایک کارخانہ بھی تیار ہو رہا ہے۔ جو اسی انجن کے ذریعہ چلا کرے گا۔ اسی جگہ وہ حوض ہے جہاں گرمیوں میں نہایا جاتا ہے اور جس کی چھت میں ایک عظیم فوارہ لگا ہوا ہے۔

پرائیویٹ باغ کے بھی کئی دروازے ہیں مگر بڑا دروازہ وہی ہے جو بڑے باغ کے دروازہ کے سامنے ہے۔ اس میں سیب۔ ناشپاتی۔ الیچی۔ بادام۔ انار۔ سنگترے۔ بارہ ماسی نارنگی۔ گلاب جامن آم وغیرہ کے بکثرت درخت ہیں بائیں طرف ایک خوشنما حوض آتا ہے۔ جس کے گرد چند ایک عمارتیں ہیں پھر لنگر خانہ کے مکانات ہیں جن کے ساتھ زنانہ و مردانہ عالیشان سہ منزلہ مکانات بنے ہوئے ہیں انہی مکانات میں پنڈت جنار دھن خود رہا کرتے تھے۔ مکانات کے سامنے ایک وسیع تالاب تیس فٹ لمبا اور اسی قدر چوڑا ہے جس کی گہرائی سات آٹھ فٹ تک ہے اس کے چاروں طرف لال ٹینیں ہیں ان کی روشنی کا عکس جب پانی میں پڑتا تھا تو عجب لطف آتا تھا۔ بانیٔ باغ کی وفات کے بعد یہ تالاب مٹی سے بھروا کر اس کے اوپر پختہ فرش کر دیا گیا ہے۔

اس باغ کے دو پودے قابلِ ذکر ہیں ایک گلاب جامن جس کا پھل دو آتشہ گلاب کا ذائقہ دیتا ہے ایک بارہ ماسی نارنگی جو بارہ مہینے پھل دیتی رہتی ہے اور سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ایک ہی درخت میں کسی جگہ نارنگی پختہ ہو کر سرخ ہو چکی ہے کہیں خام ہے اور سبز ہے۔ کہیں کلیاں پھوٹ رہی ہیں۔ کہیں شگوفے نکل رہے ہیں کسی شاخ پر پت جھڑ کا موسم ہے اور کوئی

ٹھنی موسم بہار کا لطف دے رہی ہے اس قسم کی نارنگیاں بیر کے برابر ہوتی ہیں بعض اس سے بھی کم۔ ذائقہ ترش ہوتا ہے اس لیے کھانے کے کام کم آتی ہیں۔ بارہ ماسی درخت کا پھل اہلِ بصیرت کو پیدائش سے لے کر موت تک کی تمام منازل کی دلچسپ مگر عبرت انگیز کیفیت دکھاتا ہے۔

آبشار کلاں کے متصل باغ کے مالیوں اور دیگر ملازموں کے جن کی تعداد تیس نفر تک ہے رہنے کے لیے کوارٹر بنے ہوئے ہیں یہ کوارٹر بانیٔ باغ کے زمانہ میں خصوصاً جن دنوں یہاں صدہا مزدور اور راج کام کیا کرتے تھے ایک بارونق بازار کا کام دیتے تھے۔ یہیں سودا سلف بھی فروخت ہوتا تھا۔

دونوں باغوں میں ثمردار درختوں کی تعداد چار پانچ ہزار کے قریب بتائی جاتی ہے۔ باغ کا کل سالانہ خرچ بارہ ہزار اور آمدنی آٹھ ہزار بیان کی جاتی ہے۔ اتوار کو باغ میں اچھی رونق ہو جاتی ہے۔ مہتمم صاحب نے کہا ہے کہ نئے انجن کے لگ جانے سے ہر اتوار کو فوارے جاری ہوا کریں گے اس وقت اور بھی زیادہ رونق ہو گی۔

[مگر ؎ یہ باتیں ہیں جب کی کہ آتش جواں تھا
تقسیم ملک کے وقت اس باغ کے پھلوں کا ٹھیکہ لالہ کرم چند مدیر ہفتہ وار اخبار پارس لاہور اور ان کے بھائی کے پاس تھا۔ وہ اس کی خوب دیکھ بھال کرتے تھے۔ ان کے لاہور سے چلے جانے کے بعد اس باغ کی جو درگت ہوئی اور لاوارث سمجھ کر جس طرح اس کی بوٹیاں نوچی گئیں، اس کا ذکر لاحاصل ہے ——— مرتب]

شاہ نظام الدین بودیانوالہ [1]

خطۂ میانی کے قبرستان کے گنبد میں اب
پیر سید بودیا نوالے کو نہاں دیکھئے

شاہ نظام الدین بودیانوالہ خاندان قادریہ عالیہ سے صاحب شریعت و طریقت گزرے ہیں۔ لاہور کا محلہ پیر گیلانیاں انہی کے نام پر مشہور ہے جہاں ان کی حویلی اب تک موجود ہے۔

اس خاندان میں کئی پشتوں سے فیض طریقت جاری تھا۔[2] چنانچہ ایوب صابر[3] مہران خلف سید مبارک حقانی گیلانی رح تک ان کا سلسلہ اس طرح ملتا ہے :۔

---

[1] ان کے حالات مرتب نے لکھے ہیں۔

[2] حدیقۃ الاولیا صفحہ ۱۵۱-۱۵۲۔

[3] ان کا مزار قبرستان میانی (لاہور) میں ہے۔

"سید نظام الدین بودبا نوالہ بن سید احمد شاہ بن سید قائم شاہ
بن سید جانی شاہ بن سید احمد شاہ بن سید رسول شاہ بن سید المشہور
بالو شاہ بن سید عبدالواحد بن سید نظام الدین حسن بن سید ابو صابر
میر میراں رحمۃ اللہ علیہم اجمعین"

گورستان میانی صاحب کی جنازگاہ سے چند قدم آگے بائیں ہاتھ ایک بہت بڑا احاطہ ہے جس میں پختہ چار دیواری کے اندر اس خاندان کے بہت سے بزرگوں کی قبریں ہیں۔ پیر نظام الدین بودبا نوالہ کے روضہ کا عالی شان گنبد بھی اسی چار دیواری میں ہے۔ ان کا انتقال ۹۱ برس کی عمر پا کر ۲۲ رجب بروز جمعہ ۱۳۱۱ھ / ۱۸۹۴ء کو ہوا۔ مگر روضہ کی عمارت پیر سید اصغر علی شاہ سجادہ نشین نے ۱۳۴۶ھ (۱۹۲۷ء) میں تعمیر کرائی۔ گنبد کا کلس سنہری اور دروازہ جنوب کی طرف ہے۔ باقی تین طرف جالی دار محرابیں ہیں۔ چھ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد گنبد کے نیچے ایک نفیس چونہ گچ چبوترہ پر دو قبریں ہیں۔ جن میں سے ایک پیر بودبا نوالہ کی اور دوسری پیر جانن امام کی ہے۔ پیر نظام الدین کی قبر کے سرہانے یہ کتبہ نصب ہے ؎

مرقد پُر نور حضرت پیر گیلانی ولی — شاہ نظام الدین سید بودبا نوالہ سخی
کرد از یں دنیا بعمر نود و یک سالش سفر — روز جمعہ بست و دو ماہ رجب وقت سحر
بہر سال ہجری آں ماہ جبین مومنیں — گفت شائق ماہ جبیں شد رونق خلد بریں
۱۳۱۱ھ

شد بنا ایں روضہ در عہد جناب محترم
پیر سید حضرت اصغر علی شاہ ذی کرم
در ۱۳۴۶ھ

گنبد کے اندر دوسری قبر شاہ نظام الدین کے فرزند پیر جانی شاہ کی ہے۔ وہ ۱۳۴۲ھ میں فوت ہوئے۔ پیر اصغر علی شاہ جنھوں نے روضہ کی عمارت بنوائی انھی کے خواہرزادے تھے۔ ان کے مرقد کے سرہانے یہ کتبہ نصب ہے ؎

مرقد پُر نور حضرت سید عالی مقام — ہادیٔ حق پیر سید بادشاہ جانن امام
یوسف حضرت پیر جانی شاہ گیلانی ولی — ابن حضرت پیر سید شاہ نظام الدین ولی
در سن ہفتاد و نہ عمرش نمود از ما سفر — روز شنبہ ہفدہم ذی قعدہ و قبل از سحر
۷۹

جست شائق سال فوت آں امام متقیں
قدسیان خلد گفتند ادخلوہا خالدین
۱۳۴۲ھ

روضہ کی دیواروں پر اسمائے الٰہی اور کلمہ طیبہ لکھے ہیں۔ فرش خوب صورت سیاہ و سفید ٹائیلوں کا ہے۔ لوہے کی ایک پیٹی نذر نیاز کے لیے رکھی ہے۔ بجلی کی روشنی کا انتظام بھی ہے۔ ایک مجاور دن رات وہاں موجود رہتا ہے۔ گنبد کے باہر ایک اور چبوترہ ہے جس پر اس خاندان کے دوسرے افراد کی قبریں ہیں۔ مسجد بھی ہے اور کنواں بھی۔ پہلے یہاں ہر سال عرس کے موقع پر بڑا بھاری میلہ لگتا تھا جس میں قوالی بھی ہوتی تھی اور پتنگ بازی بھی۔ طوائفیں بھی سلام اور مجرا کو آتی تھیں مگر پیر اصغر علی شاہ

کی وفات کے بعد سے یہ سلسلہ بند ہے۔ اب پاک پٹن سے ہی بیاں سال کے سال حویلی پیر گیلا نیاں میں آتی ہیں اور عرس کر کے چلی جاتی ہیں۔

پیر عبدالغفار شاہ

عمر جن کی کٹ گئی عشقِ رسول اللہ میں
اُن کی قبروں پر فرشتے فاتحہ خواں دیکھئے

کشمیر میں شیخ مسعود نروری اپنے علم و عمل اور زہد و اتقا کی وجہ سے بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں۔ ان کے اسلاف بغداد سے ملتان اور ملتان سے لاہور آئے۔ شیخ مسعود اپنے خاندان کے پہلے فرد ہیں جو لاہور سے کشمیر تشریف لے گئے اور سری نگر کے محلہ نرورہ میں رہنے کی وجہ سے نروری کہلائے۔ شیخ الحدیث علامہ دہر مولانا محمد انور شاہ کاشمیری دیوبندی جو شیخ مسعود ہی کی ذریات سے ہیں مکتوبات الخطیئۃ میں اپنے بزرگوں کے وارد ہند ہونے کا الفاظ ذیل میں ذکر کرتے ہیں: "وفی المکتوبات الخطیئۃ عند خلف الشیخ ان سلفہ جاء ومن بغداد الی الهند ودخلوا ملتان ثم ارتحلوا الی بلدۃ لاهور ثم الی الکشمیر واللہ اعلم"

یہ خاندان پشت ہا پشت سے اہل علم و اہل اللہ چلا آتا ہے۔ اس خاندان کی شاخیں کشمیر، مظفر آباد، دیوبند، پونچھ اور لاہور تک پھیلی ہوئی ہیں۔

شیخ مسعود کی ذریات سے جو شاخ لاہور میں ہے اس کے بزرگ پیر مصطفیٰ شاہ تھے جن کا سلسلہ شیخ مسعود تک آٹھ پشتوں[1] کے بعد ملتا ہے۔ آپ بڑے سیلانی طبع تھے۔ ہندوستان کے اکثر شہروں کے علاوہ بغداد تک پہنچے اور جب واپس آئے تو بار علاقہ ملتان کے جنگل میں قیام فرمایا۔ اور وہیں یادِ حق میں مصروف رہتے۔ لوگ اس بیابان میں آپ کے پاس آتے اور فیوض و برکات حاصل کرتے۔ یہ آپ ہی کے بابرکت قدم کا نتیجہ تھا۔ کہ حکومت نے یہاں نہر جاری کی اور جہاں ویرانہ تھا وہاں ایک گاؤں بنام چک ۵/۱۵ ایل آباد ہو گیا۔ آبادی کے آٹھ نو سال کے بعد آپ انتقال فرما گئے۔ اس علاقہ کے لوگ آپ کو قطب زماں اور صاحب کرامات تصور کرتے ہیں آپ کا مزار مرجع خلائق ہے۔ اور اس مزار کی سجادہ نشینی پیر محمد اشرف بن پیر عبدالغفار شاہ بن احمد پیر بن پیر مصطفےٰ شاہ کے سپرد ہے۔

پیر مصطفےٰ شاہ خود تو پنجاب میں تھے لیکن ان کے فرزند احمد پیر یا پیر احمد شاہ کشمیر ہی میں تھے۔ آخر ان کو بھی پنجاب کی کشش کشمیر سے لاہور لے آئی۔ ان ایام میں ان کے فرزند پیر عبدالغفار کی عمر گیارہ سال تھی۔ لاہور ہی میں پیر عبدالغفار نے علوم دین

---

[1] مصطفےٰ[۱] شاہ بن نور[۲] شاہ بن فاضل[۳] شاہ بن عبدالوہاب[۴] بن عبدالقادر[۵] شاہ بن طاہر[۶] شاہ بن یعقوب[۷] شاہ بن شیخ عبداللہ[۸] بن شیخ مسعود[۹]۔ عبدالقادر شاہ کا مزار ترگر پورہ علاقہ حمل تحصیل ہندواڑہ میں ہے۔ یہ شاخ ترگھوری بھی کہلاتی ہے۔

حاصل کیے۔ یہیں آپ کا نکاح ایک سادات خاندان میں ہوا۔ لیکن دو ہی سال کے بعد بیوی کا انتقال ہو گیا پھر آخر دم تک اپنی زندگی بصورتِ مجرّد گزار دی۔ صرف ایک فرزند پیر محمد اشرف آپ کی یادگار ہیں۔

۱۳۲۹ھ (۱۹۰۰ء) میں آپ نے ایک دینی مدرسہ مسجد تکیہ سادھواں میں بنام مدرسہ غوثیہ قائم کیا۔ جس میں قرآن، حدیث، فقہ اور صرف و نحو وغیرہ عربی علوم کی تعلیم کے لیے آپ نے باعمل عالموں سے مدد لی اور مثنوی مولانا روم کا درس اپنے ذمے رکھا۔ آپ کی درس گاہ سے طلبا کو کتابیں مفت ملتی تھیں اور ان کی رہائش و خوراک کا انتظام بھی آپ ہی کے ذمہ تھا۔ درود شریف کے عاشق تھے۔ مختلف قسم کے درود شریف ہزارہا کی تعداد میں چھپوا کر مفت تقسیم کرتے تھے۔

پیر عبد الغفار بڑے متوکل اور بابرکت بزرگ تھے۔ اپنی تمام زندگی میں نہ کسی کے پاس گئے اور نہ کبھی دستِ سوال کسی کے آگے دراز کیا۔ اس کے باوجود آپ کا دسترخوان دوست دشمن فقیر امیر، مسافر مقیم کے لیے یکساں کشادہ تھا۔ بالخصوص خطۂ کشمیر کے نوواردوں کے لیے آپ کا مسکن ان کی فرودگاہ تھا۔ آپ دینی کاموں، صوفیانہ رسالوں اور اسلامی اخباروں کی زرِ نقد سے بھی امداد فرمایا کرتے تھے۔ آپ خود پیر تھے عالم تھے لیکن آپ نے کبھی کسی کو مرید نہیں بنایا البتہ آپ کے ارادت مندوں کی تعداد لاہور، امرتسر، جموں، پونچھ، کشمیر کے علاوہ افغانستان اور دور دور تک تھی۔ آپ کبھی لاہور سے باہر نہیں گئے نہ کبھی مریدوں کی گرداوری کی۔

آپ زمانہ ساز اور بدنام پیروں اور عالموں کی اصلاح کے بہت بڑے متمنی تھے خصوصاً کشمیر کے نام نہاد اور بعض ٹربا زپیروں اور واعظوں کے افسوسناک حالات آپ سنتے تو آپ کو بہت صدمہ ہوتا۔

آپ صرف سادہ کشمیری ٹوپی اور پیرہن تہمد زیب تن فرماتے۔ اکثر طریقِ عمل یہ تھا کہ جب جی چاہا۔ علی الصبح چند مخلصین کو ہمراہ لے کر حضرت علی ہجویری عرف داتا گنج بخشؒ یا حضرت میاں میرؒ۔ یا حضرت ایشانؒ یا شاہ حسین زنجانیؒ کے مزارات پر چلے جاتے۔ اجزائے کلام اللہ اور دلائل الخیرات وغیرہ وظائف کا صندوقچہ۔ خوشبو اگر کی بتیاں۔ اور سامانِ چاء ساتھ ہوتا اور تین گھنٹہ تک دلجمعی و یکسوئی کے ساتھ ختم پڑھتے اور ارواح بزرگان سے استفادہ کرتے۔

آپ نے کبھی گرفتارانِ مراسم اور شیدائیانِ نمائش کی طرح جبہ و قلہ اور تسبیح اور سبز و سرخ لباس سے اپنے آپ کو آراستہ نہیں کیا۔ زندگی ہمیشہ صحیح معنوں میں درویشانہ بسر کی۔ جو کچھ ہاتھ آتا۔ کسی مستحق کو دے دیتے یا درویشوں اور طلبہ کو کھلا دیتے۔ اپنے لیے نہ کوئی مکان بنوایا نہ کوئی سامان و اسباب ڈھیری بہم پہنچایا۔ ساری عمر مسجد کے بالائی حجرہ میں گذار دی۔ وفات ۱۰ جمادی الثانی چہارشنبہ ۱۳۴۰ھ (۱۹۱۱ء) کے وقت آپ کی جیب سے صرف چار روپے چند آنے نکلے۔ جو لنگرخانہ کے خرچ کے لیے موجود تھے۔ آپ کی عمر ۶۳۔۶۴ سال کے قریب تھی۔

آپ کے وصال کا واقعہ حیرت ناک ہے۔ آپ نمازِ عشا کے لیے اپنی مسجد ہی میں وضو کر رہے تھے اور بایاں پاؤں دھونا باقی تھا کہ یکایک آپ کو اختلاجِ قلب کا دورہ ہوا۔ ڈاکٹر محمد الدین ناظر کا مکان پاس ہی تھا اُن کو اطلاع ہوئی وہ آئے اور دوا بیلتے آئے لیکن آپ نے ہزار کوشش کے باوجود بھی دوا نہ پی اور پونے دو گھنٹہ کے اندر ہی واصل بحق ہو گئے۔

ڈاکٹر محمد الدین ناظر نے تاریخ وفات میں ذیل کا قطعہ لکھا

بشنو حالِ وصالِ عبد اللہ   پیر عبد الغفار عالی جاہ

در وضو نماز وقت عشا ناگہاں داد جاں بحکم الٰہ
بہر سال ذِ صالِ آں ناظر گفت سرمست جام عشق الٰہ

نماز جنازہ درگاہ حضرت شاہ محمد غوث کے غربی باغ میں پڑھی گئی۔ حاضرین کی تعداد کا اندازہ بیس پچیس ہزار سے کم نہ تھا جن میں مسلمانوں کے جملہ فرقوں کے لوگ شامل تھے۔

[آپ پہلے پہل مسجد سادھواں ہی کے ایک گوشہ میں بطور امانت دفن کئے گئے۔ بعد میں جب آپ کا شاندار روضہ گل بیگم کے باغ کے متصل تعمیر ہو گیا تو نعش کا صندوق وہاں منتقل کر دیا گیا۔ آپ کے فرزند پیر اشرف شاہ کا مکان بھی روضے کے قریب ہی ہے اس لیے روضے کی دیکھ بھال ہر وقت ہوتی رہتی ہے ——— مرتب]

شمس العلماء مولینا حائری[1]

ہائے جن کی تھی نبات اور وعظ۔ وعظ دلنشیں
آج اُن کو زینت شہر خموشاں دیکھئے

[آپ کا اصل وطن شہر قم مملکت ایران تھا۔ سلسلۂ نسب امام علی رضا علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ اسی لیے رضوی کہلاتے ہیں۔ آپ کے جدِ امجد سید حسین القمی ایران سے وارد کشمیر ہوئے اور پشمینہ کا کاروبار کرنے لگے۔ آپ کی ایک شاخ اب تک کشمیر میں آباد ہے۔

سید حسین کی چوتھی پشت میں پھر آغا سید حسین ہوئے جو نہایت ہوشیار تاجر تھے۔ وہ پنجاب اور ہندوستان کا دورہ کرتے ہوئے لکھنؤ پہنچے اور نواب واجد علی شاہ کی قدر دانیوں سے مستفید ہوئے۔

۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳ء میں فرخ آباد کے مقام پر علامہ سید علی حائری کے والد ابوالقاسم سید محمد پیدا ہوئے جنھوں نے تجارت کا خیال چھوڑ کر علم حاصل کیا۔ ادب فقہ، اصول، عقائد اور علم تفسیر و حدیث وغیرہ میں وہ نام پیدا کیا کہ شاہ اودھ کے دربار سے مجتہد اعلیٰ، سلطان العلماء اور فاضل ابوالقاسم وغیرہ خطابات حاصل کئے۔

نواب علی رضا خاں قزلباش کے زمانے میں مولانا سید ابوالقاسم اپنے والدین کے ہمراہ لاہور پہنچے۔ یہاں ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ آپ کے علم و فضل سے متاثر ہو کر نواب نوازش علی خاں اور نواب ناصر علی خاں قزلباش حج بیت اللہ اور کربلائے معلیٰ کی زیارت کو جاتے ہوئے ارکان و مناسک حج کی تعلیم کی غرض سے آپ کو اپنے ہمراہ لے گئے۔ عراق میں آپ نے مفتی شیخ مرتضیٰ انصاری سے بعض علمی مباحث کئے جن کی وجہ سے آپ "فاضل ہندی" کے نام سے پکارے جانے لگے۔ مجتہدین ایران میں سے اکثر نے آپ کو اجتہاد کی سندیں عطا فرمائیں۔

---

[1] آپ کے حالات مرتب نے لکھے ہیں۔

حج و زیارت سے واپس آنے پر نوابوں نے آپ کو کشمیر کی بجائے لاہور رہنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ آپ نے یہاں مقیم ہو کر مذہب شیعہ کی تعلیم کے لیے مدرسہ امامیہ جاری کیا جس کے تمام مصارف نواب نوازش علی خاں نے اپنے ذمے لیے۔

۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء میں مولانا ابوالقاسم نے کوچہ شیعاں میں امامیہ جامع مسجد تعمیر کرائی جس میں نماز جمعہ، عیدین اور نماز خمسہ کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ مولانا اپنے وعظوں میں احکام شرع اور حقائق قرآن مجید کمال تہذیب اور بے تعصبی سے بیان فرمایا کرتے تھے۔

عمر کی چھہتر منزلیں طے کی تھیں اور تفسیر لوامع التنزیل کی بارہ جلدیں تکمیل تک پہنچی تھیں کہ ۴ محرم الحرام ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء کو انتقال فرما گئے۔ اور حسب وصیت امام بارگاہ گامے شاہ لاہور میں دفن کیے گئے۔

علامہ سید علی حائری آپ ہی کے فرزند اکبر اور جانشین تھے جو ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ء میں بمقام لاہور پیدا ہوئے۔ فقہ، اصول فقہ، علم تفسیر و حدیث اپنے والد ماجد سے پڑھے۔ پھر بغرض تکمیل علوم عتبات عالیات (عراق و عرب) کو روانہ ہوئے۔ سامرہ میں عرصہ تک سرکار مرزا محمد حسن شیرازی اور مرزا حبیب اللہ رشتی نجفی کے درس میں شریک رہے اور ان دونوں بزرگوں کے علاوہ آقا سید کاظم طباطبائی، آقا مازندرانی، ملا محمد کاظم خراسانی اور سید ابوالقاسم طباطبائی نے آپ کو اجازے مرحمت فرمائے۔

پنجاب اور سندھ کے علاقوں میں آپ کے مقلد بہت زیادہ تھے۔ باقی ہندوستان میں بھی آپ کے مقلدوں کی کمی نہ تھی۔

دسمبر ۱۹۱۱ء میں شہنشاہ جارج پنجم کی تاجپوشی کے موقعہ پر آپ پنجاب کے شیعوں کی طرف سے دربار دہلی میں مدعو کیے گئے۔

۱۹۱۴ء میں آل انڈیا شیعہ کانفرنس کا اجلاس لکھنؤ میں ہوا تو آپ اس کے صدر قرار پائے۔ آپ کے صدارتی خطبہ نے کانفرنس کی کایا پلٹ دی۔ شیعہ کالج لکھنؤ کے قیام کے سلسلے میں بھی آپ متعلقہ اجلاس کے روح رواں تھے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام کی خاطر جب سر آغا خاں چندہ جمع کرنے کی غرض سے وفد لے کر لاہور آئے تو علامہ حائری کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے۔ انھوں نے ایک بہت بڑی رقم حضرت علامہ کی خدمت میں بطور نذر پیش کی۔ مولانا نے بخوشی وہ تمام رقم اپنی طرف سے چندہ میں عطا فرما دی۔

مولانا نہایت وجیہہ، بے حد جاذب اور بہت ہی خوش گلو تھے۔ جب خطبہ پڑھتے تھے تو سامعین پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ آپ کی تقریر قرآن و حدیث کے تحت نہایت مدلل ہوا کرتی تھی۔ جس میں جملہ مذاہب کے لوگ شامل ہوا کرتے تھے۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں بھی آپ کے وعظ کافی رونق کا باعث ہوتے تھے۔ آپ کی ہردلعزیزی دیکھ کر انگریزی حکومت نے آپ کو شمس العلماء کا خطاب عطا کیا۔

مولانا اردو، فارسی، عربی کی ۲۷ کتابوں کے مصنف تھے۔ آپ کے والد مرحوم فارسی زبان میں قرآن مجید کی جو تفسیر "لوامع التنزیل و سواطع التاویل" تیس جلدوں میں لکھنے کی داغ بیل ڈال گئے تھے، مولانا نے اس میں پندرہ جلدوں کا اضافہ کیا ستائیسویں پارہ کی تفسیر لکھ رہے تھے کہ بلاوا آ گیا اور آپ ۲۸ رجون ۱۹۴۱ء کو اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔ مرحوم کا جنازہ

علم ہائے مانی کے ساتھ اُٹھا لیا گیا۔ مدارس بلتے اسلامیہ و کالج بند کر دیئے گئے اور آپ کو کربلائے گامے شاہ بیرون بھاٹی دروازہ میں دفن کیا گیا۔

آپ پہلے اندرونِ شہر چوک نواب صاحب متصل مسجد نواب صاحب قزلباش رہا کرتے تھے ۱۹۳۰ء میں آپ نے شہر سے باہر دسن پورہ میں اپنا مکان تعمیر کرا لیا اور وہیں ایک وسیع مسجد بھی بنوائی جسے جامعہ حائری کہتے ہیں۔ اس میں جمعہ اور جماعت کی نماز باقاعدہ ہوتی ہے۔

علامہ مرحوم اپنے پیچھے ایک بہت بڑا دینی کتب خانہ چھوڑ گئے ہیں جس میں عربی، فارسی، اُردو کی سینکڑوں مطبوعہ اور نایاب قلمی کتابیں موجود ہیں۔ آپ کی اولاد نے انگریزی تعلیم حاصل کر کے ملازمتیں اختیار کر لیں جس سے علم و عرفان کا یہ سلسلہ بظاہر آپ کی ذات پر ختم ہو گیا ——— مرتب]

علم دین شہید

پہلے کچھ ذرّے چمک اُٹھے جبینِ حشر پر
پھر صدا آئی کہ اب خاکِ شہیداں دیکھئے

غازی علم الدین شہید ۳ دسمبر ۱۹۰۸ء کو لاہور بازار سرفروشاں[1] کے ایک متوسط الحال گھرانے میں پیدا ہوا۔ باپ کا نام طالع محمد تھا۔ ذات سے شیخ تھے اور کام نجاروں کا کیا کرتے تھے۔ علم الدین اپنے والد کا دوسرا فرزند تھا۔ فرزند اوّل کا نام محمد الدین ہے اور وہ کارخانہ میں ملازم ہے۔

علم الدین اپنے بھائی کی طرح ناخواندہ تھا لیکن قدرت نے جس بصیرت حمیت اور غیرتِ اسلامی کا سبق اس کو دیا تھا اس سے ہزاروں اور لاکھوں تعلیم یافتہ محروم تھے۔

۱۹۲۸ء کا ذکر ہے۔ گڑھی شاہو کے مشہور عبادت گذار بزرگ مولانا تاج الدین کے انتقال اور ان کے جنازہ کی اہمیت نے اس کے دل میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کر دیا۔ اس وقت اُس کی عمر بیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ اس چھوٹی سی عمر میں اس واقعہ سے بظاہر اس خام طبع لڑکے نے جو اثر قبول کیا اُس پر ہزاروں پختہ مغزانِ عقل نثار کئے جا سکتے ہیں۔ غازی مرحوم کے چچا حاجی نوردین کا بیان ہے۔ کہ وہ بار بار یہی کہتا تھا کہ زندگی ہو تو ایسی ہو اور موت ہو۔ تو ایسی ہو جس سے کسی کو کچھ نصیحت و عبرت حاصل ہو سکے۔ مولانا تاج الدین کے جنازہ میں ہزارہا لوگ شامل تھے اور خصوصاً کارخانہ ریلوے کے مسلمان ملازم تو اُمڈ کر چلے گئے تھے۔ اس اجتماع عظیم نے اس کے معصوم دل پر جو اثر کیا اُس کا مفہوم شاید اس شعر سے کچھ ادا ہو سکے ؎

خوش حیات است کسے را کہ پس از جاں دادن
دوستاں بر سرِ خاکش بہ زیارت آیند

---

[1] اس بازار کا پنجابی نام بازار سریاں والا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں ذبیحہ بکروں کے سر اور پائے فروخت ہوتے ہیں چونکہ علم دین شہید اسی محلہ کا رہنے والا تھا اس لیے مسلمانوں نے اس کی یادگار میں اس بازار کا نام اس کے نام پر بازار علم دین شہید رکھ دیا ہے۔

انہی دنوں لاہور کے ایک آریہ کتب فروش راجپال نام نے ایک سخت بدنام، شر انگیز، دشمن امن اور دل آزار کتاب رنگیلا رسول کے نام سے چھاپی تھی جس پر مسلم پریس اور مسلم پبلک اپنی تحریروں اور جلسوں تقریروں کے ذریعہ اظہارِ ناراضگی کر رہے تھے۔

علم الدین گو ناخواندہ محض تھا۔ لیکن عشقِ رسولؐ میں ڈوبا ہوا تھا۔ رنگیلا رسول کے متعلق جو جلسے ہوتے تھے ان میں وہ شامل ہوتا تھا اور جب واپس آتا تھا تو گہرے خیالات میں ڈوبا رہتا تھا۔

ایک دن سہ پہر کا وقت تھا۔ جو کچھ اس نے سوچا تھا اس کے انجام سے بے خبر ہو کر وہ بے خوف و خطر راجپال کی دکان کی طرف گیا ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اور جاتے ہی اس کی گردن پر چھری پھیر کر باہر آ گیا۔ لیکن ابھی تھوڑی دور آیا تھا کہ پھر واپس گیا۔ اس اثنا میں ایک شورِ عظیم پیدا ہو چکا تھا۔ گرفتار ہو گیا۔

اس واقعۂ قتل پر ہندو مسلم اخبارات میں دیر تک چرچا رہا۔ خیر خواہانِ وطن اور حامیانِ امن نے مصنفوں اور پبلشروں کو بانیانِ مذاہب اور مقدس روحانی بزرگوں کے احترام کی ہدایت کی اور گورنمنٹ نے اس قسم کی امن شکن دل آزار اور فتنہ انگیز تحریروں کے لیے ایک خاص قانون کے ذریعہ سزائیں مقرر کیں۔

راجپال کا قصہ تو ختم ہو چکا تھا۔ اب علم الدین کو قانون اور ہندو تختہ دار پر لٹکانے کے لیے بیتاب ہو رہے تھے۔ چنانچہ ایک سال یا اس سے کچھ کم عرصہ تک مقدمہ چلتا رہا۔ بعض مسلمان وکلاء نے اپنی خدمات جمعیت اسلامی کے جوش میں مفت پیش کیں۔ لیکن یہ واقعہ دن دہاڑے ہوا تھا۔ اور علم الدین جس کی عمر اپنے مقدمہ کے آخری ایام میں اکیس سال سے زیادہ نہ تھی موت کو لبیک کہنے کے لیے تیار رہتا تھا۔ آخر اس کو پھانسی کا حکم سنایا گیا۔ اور اس اندیشے کے پیشِ نظر کہ لاہور میں فساد ہو جائے گا حکام اس کو میانوالی میں لے گئے۔

اس واقعہ سے چونکہ سارا ہندوستان بالخصوص پنجاب متاثر ہو رہا تھا اس لیے علم الدین کے میانوالی جیل میں آتے ہی مسلمانوں کے جگہ جگہ جلسے ہونے لگے۔ اس کے والدین اور دوسرے رشتہ دار بھی میانوالی آ گئے۔ مسلمانانِ میانوالی نے نہایت فراخدلی سے اپنے پریشان خیال میز بانوں کی خاطر تواضع کی۔

آخر وہ وقت آ گیا کہ علم الدین شہید کی آخری ملاقات کے لیے اس کے ورثا جیل میں بلائے گئے علم الدین کے چچا حاجی نور الدین کا بیان ہے کہ اس نے سب کو نماز کی تاکید کی۔ یہ خبر سارے شہر میں بجلی کی طرح پھیل گئی۔ لوگ دیہات سے ڈھول بجا بجا کر نکلتے تھے اور ٹولیوں کی ٹولیاں میانوالی میں جمع ہو رہی تھیں کہا جاتا ہے کہ شہر سے جیل تک دو میل کے فاصلہ میں آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ اس خبر کے سننے کے باوجود کہ آج غازی علم الدین کی شہادت کا واقعہ ہونے والا ہے مسلمانوں کے جذبات قابو میں تھے۔ پولیس کا بھی معقول انتظام تھا کسی قسم کا کوئی فساد نہ ہوا۔

میاں علم الدین کے چچا حاجی نور الدین بیان کرتے ہیں کہ جب جلاد (مہتر) اس کے گلے میں رسہ ڈالنے کے لیے آیا۔ تو اس نے رسہ کو خود پکڑ لیا اُس کو بوسہ دیا اور اپنے گلے میں خود ڈال لیا۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔ حکام نے اس کی لاش جیل کے متصل ہی دفن کر دی۔ لیکن لاہور میں اس کی لاش کو لاہور لانے کے لیے ایک شورِ عظیم اٹھا۔ آخر سر میاں محمد شفیع، سر محمد اقبال اور دوسرے معززین نے امن و امان کا ذمہ لیا اور پندرہ دن کے بعد لاش کو لاہور لانے کی اجازت ملی۔ سر محمد شفیع خود میانوالی گئے اور لاش کو اپنے ہمراہ لائے۔

چوبرجی کے پاس چاند ماری کا جو وسیع میدان ہے۔ وہاں مولوی شمس الدین بخاری نے جو حافظ اور قاری بھی تھے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ جنازہ میں ایک لاکھ سے بھی زیادہ آدمی شامل تھے اس شان کا جنازہ آج تک لاہور میں چشمِ فلک نے نہیں دیکھا۔ انتہا یہ ہے کہ اکثر دفتروں اور محکموں کے مسلمان کلرک افسرانِ مجاز کی اجازت کے بغیر خود بخود شاملِ جنازہ ہو گئے تھے۔ جنازہ گاہ میں پولیس کا کوئی آدمی نہ تھا۔ لیکن سڑکوں اور شاہراہوں پر مِلٹری پولیس کافی تعداد میں موجود تھی۔

اتنا بڑا جنازہ۔ جذبات میں اس قدر تلاطم۔ فرزندانِ اسلام میں یہ جوش و خروش۔ اتنا عظیم اژدہام۔ لیکن کسی قسم کی کوئی بدامنی نہ ہونے پائی۔ سہ پہر کا وقت تھا کہ اس غیرت و حمیّتِ اسلامیہ کے تو خیز پتلے کو حضرت میانی کے عظیم و عریض قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

علم الدین شہید کے مزار کی تعمیر میں عوام کی امداد کے علاوہ سب سے زیادہ حصہ حاجی مستری الٰہی بخش نے لیا جو اپنے آپ کو "خادم گیارھویں شریف" لکھا کرتے ہیں۔ یہ مزار۔ مزار پیر لودیا نوالہ سے چند قدم آگے قبرستان کی اندرونی سڑک کے کنارے واقع ہے۔ مزار کی شرقی دیوار میں پانچ جالیاں ہیں۔ جالی ملہ کے متصل یہ شعر درج ہے ؎

خواجہ بسے اجمیر میں اور غوث بسے بغداد

دونوں سانچے پیر ہو۔ رکھیو میری لاج

جالی ملہ کے متصل یہ مصرعہ لکھا ہوا ہے۔ ع

سینوں میں رہے جذبہ سدا عشقِ محمد کا

جالی ملہ درمیانی جالی ہے اس کی دیوار کے اوپر "یا حضرت شیخ سید عبد القادر جیلانی شیئاً للّٰہ" درج ہے۔ اس جالی کے دائیں طرف یہ عبارت درج ہے۔ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم۔ ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللّٰہ اموات بل احیاء و لکن لا تشعرون۔ ؎

عشق میں جاں سے گذرتے ہیں گذرنے والے

مر کے زندہ ہیں رہِ یار پہ مرنے والے

جالی ملہ کے ساتھ یہ مصرع درج ہے۔ ع

قیامت تک رہے آباد ساقی تیرا میخانہ

ملہ کے اوپر جلی قلم سے لکھا ہے "مزارِ منور غازی علم الدین شہید" ؎

؎ جو عاشق ہیں نہیں ڈرتے کسی سے
کٹاتے ہیں سرِ بازار گردن

؎ کوچۂ عشق ہے یہ رہگذرِ عام نہیں

جالی ۴ ، ۵ کے درمیان ذیل کے دو شعر قابلِ مطالعہ ہیں ؎

بشر رازِ دلی کہہ کر ذلیل و خوار ہوتا ہے
نکل جاتی ہے جب خوشبو تو گل بیکار ہوتا ہے
مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے

مزار کا دروازہ جنوب کی طرف ہے۔ اس دروازہ کے شرقی حصّہ کی دیوار میں چار جالیاں ہیں۔ پہلی جالی کے پاس یہ الفاظ درج ہیں "عاشقِ رسول غازی علم الدین شہید" پھر یہ عبارت اور اشعار درج ہیں :-

آقائے دوجہاں (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان سے گریز کرنے والو۔ کیا حضور کے نام پر شہید ہونے والے کی عزت کا نظارہ اس کے جنازہ سے معلوم نہیں ہوا اگر دین و دنیا میں بھلائی چاہتے ہو۔ تو محبوبِ خدا پر جان قربان کرو۔ اور عاشقانِ مصطفٰے کی چوکھٹ پکڑو۔ جو منکر ہے وہ کافر ہے۔ ؎

اسلام کے جھنڈے کو جب غازی اُٹھا لیں گے
تکبیر کے نعروں سے دُنیا کو ہلا دیں گے
اسلام زمانے میں دبنے کو نہیں آیا
اتنا ہی یہ اُبھرے گا جتنا وہ دبا دیں گے
مسلم کو حقیقت میں تم سمجھے ہو کیا لوگو
یہ مٹتے مٹاتے بھی دُنیا کو مٹا دیں گے

؎ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے جو تری محفل میں ہے

مزار کے دروازہ کی پیشانی پر یہ الفاظ درج ہیں :

یا اللہ　　　غازی علم الدین شہید　　　یا محمد

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

سنگِ بنیاد دستِ مبارک الحاج حضرت پیر سیّد جماعت علی شاہ علی پوری
متولی و سجادہ نشین میاں طالع محمد والد بزرگوار میاں علم الدین شہید

قبر کے سرہانے سنگِ مرمر کا جو پتھر ہے اس پر ذیل کی عبارت درج ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

مرقد غازی علم الدین

تاریخ پیدائش ۴ دسمبر ۱۹۰۸ء تاریخ شہادت ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۹ء

اس کے نیچے کچھ بے ڈھنگے سے پنجابی اور کشمیری زبان کے اشعار ہیں۔ جن میں سے مندرجہ ذیل شعر صحیح نظر آتا ہے ؎

جامِ اُلفت پیجیے سرِ راہِ حق میں دیجیے

مال و زر اور زندگی قربان اس پر کیجیے

قبر بے سقف ہے۔ اس قبر کے علاوہ اس مزار کے گرد و پیش چار اور قبریں ہیں جن میں ایک پختہ قبر غازی شہید کے تایا مہر بخش (وفات ۱۴ اپریل ۱۹۳۶ء) کی ہے۔

غازی شہید کی قبر کا تعویذ سنگِ مرمر کا ہے۔ قبر سے غربی جانب مسجد نما ایک درہ ہے جس کے درمیان لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ تحریر ہے شمال اور مشرق کی طرف بھی برآمدے ہیں۔ دروازہ کے ساتھ ہی شرقی جانب ایک چھوٹی سی کوٹھڑی ہے پانی کا نل احاطہ مزار کے باہر موجود ہے۔ جس کے ساتھ ہی ایک عیال دار مجاور کا مکان بھی ہے۔ درگاہ کے خادم کو ماہانہ ملا کرتا ہے۔

غازی علم الدین شہید کے والد میاں طالع محمد ان ایام میں مقروض ہو گئے تھے۔ لوگوں نے غازی مرحوم کی شہادت کے بعد ان کی اعانت کی۔ ان کا تمام قرضہ اتر گیا۔ اور چونکہ وہ خود ہی اپنے فرزند کی قبر کے سجادہ نشین تھے۔ اس لیے چڑھاوا اور نذر نیاز میں کافی رقوم آتی تھیں۔ میاں طالع محمد اور مرحوم شہید کی والدہ بھی اپنے فرزند کی شہادت کے کچھ عرصہ کے بعد فوت ہو چکے ہیں ان کی قبریں بھی اسی مزار کے اندر ہیں۔ باپ کیسا خوش نصیب تھا کہ خدا نے اس کو وہ فرزند دیا جس کا دل عشقِ رسولؐ اور حمیتِ اسلامی سے گداز تھا۔ جو اپنی عاقبت بھی سنوار گیا اور باپ کا قرضہ بھی اتار گیا۔

ہر سال شہید غازی کا عرس ہوتا ہے قرآن شریف پڑھا جاتا ہے اور مرحوم کے ورثاء کی طرف سے جن کے سرکردہ اب حاجی نور الدین ہیں فقرا کو کھنڈارہ تقسیم ہوتا ہے۔

حسن دین شہید

زندگی کچھ قوم نے پائی ہے جن کی موت سے

خطۂ میانی میں وہ گنج شہیداں دیکھیے

تحصیل اجنالہ ضلع امرتسر کے ایک گاؤں کوٹلی سے ۱۹۰۶ء یا ۱۹۰۸ء میں مولا بخش نام ایک شخص ترکِ وطن کر کے لاہور آ گیا۔ لاہور میں اس نے سفر گری کا کام شروع کیا۔ اس کے فرزند کلاں کا نام محمد شفیع ہے۔ جو لاہور اندرون یکی دروازہ میں فلور مل کا مالک ہے۔ اس سے تین چار سال چھوٹا اس کا بھائی حسن الدین تھا۔ جو ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوا۔ اور اپنے بھائی کے پاس آہنگری کا کام کرتا رہا۔

حسن الدین اپنی شادی کے بعد مصری شاہ میں جو لاہور کے شمالی حصہ کی ایک وسیع مسلم نو آبادی ہے اپنے سسرال کے ہاں رہا کرتا تھا۔ چونکہ اس کی شہادت کا تعلق مسجد شہید گنج لاہور کے واقعۂ ہائلہ سے ہے اس لیے اس واقعہ پر کچھ اجمالی نظر ڈالی جاتی ہے۔

مسجد شہید گنج لاہور ۸ رجولائی ۱۹۳۵ء کو سکھوں نے گرا دی۔ ان کے اس فعل سے (بقول مولانا مخدوم مرید حسین قریشی سجادہ نشین حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتان) مسلمانانِ لاہور کے دلوں میں جو ہیجان عظیم پیدا ہوا اس سے تمام صوبے کے مسلمانوں کا متاثر ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ مسلمان خواندہ تھے یا ناخواندہ، جاہل تھے یا عالم۔ جوان تھے یا بوڑھے۔ مسجد کے انہدام کی تفصیلات روزانہ اخباروں میں پڑھتے تھے اور بے چینی سے پوچھتے تھے کہ آخر سکھوں نے خانۂ خدا کو (جو ہر چند کہ سالہا سال سے انہی کے قبضہ میں تھا) کیوں گرایا ؟ اور جبکہ ان کی طرف سے ایسا دل آزار فعل ظہور میں آچکا ہے تو مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے ؟

ذمہ دار لوگ خاموش تھے۔ اور نوجوان اس وقتی جوش و غصہ سے بے قابو ہوئے جاتے تھے۔ باہر دیہات سے اور شہر کے اکثر حصوں سے جن میں دہلی دروازہ اور ریکی دروازہ کے عوام کی کثرت تھی لوگ جوق جوق چلے آتے تھے۔ اور مسجد شہید گنج تک پہنچنے کی کوشش کرتے تھے لیکن حکومت نے امن و آشتی قائم رکھنے اور لاہور کیا بلکہ سارے پنجاب کو فرقہ وارانہ جنگ سے محفوظ رکھنے کے لیے مسجد منہدمہ کے چاروں طرف پولیس اور فوج کا پہرہ قائم کر رکھا تھا۔

اسی اثنا میں دفعتہً واقعات نے ایک اور نازک صورت اختیار کر لی: چار مقامی لیڈر خارج البلد کر دیئے گئے جس سے حالات زیادہ پیچیدہ ہو گئے۔ اور عوام ان واقعات سے اور بھی زیادہ بھڑک اٹھے مسلمان سکھوں پر اور سکھ مسلمانوں پر اکے دکے حملے کرنے لگے۔

حسن دین بھی جس کی عمر اس وقت چوبیس سال کی تھی انہی نوجوان جوشیلے لڑکوں میں شامل تھا۔ جو خانۂ خدا کی اس بے حرمتی کو مسلمانوں کی اور اسلام کی توہین سمجھ رہے تھے اور انتقام لینے کے لیے بے تاب ہو رہے تھے۔ لیکن مسجد شہید گنج کن قانونی پیچیدگیوں کی بدولت اب تک مسلمانوں کو نہ مل سکی وہ ان سے قطعی لاعلم تھے۔ نومبر کے ابتدائی ایام کا ذکر ہے حسن دین جیسا کہ اس کے بھائی مستری محمد شفیع کا بیان ہے۔ ایک خواب سے پریشان اور بے تاب ہو کر کلہاڑی ہاتھ میں لے کر گھر سے باہر نکلا۔ اور مصری شاہ کے علاقہ میں جہاں اس کا مکان تھا اس نے دو راہگیر سکھوں پر کلہاڑی سے حملہ کر دیا۔ جن میں ایک تو زخمی ہو کر بچ گیا مگر دوسرا جاں بر نہ ہو سکا۔ اس کے والدین اور گھر کے سب لوگ اس واقعہ سے قطعاً بے خبر تھے۔ آخر وہ گرفتار ہو کر سیشن سپرد ہوا جہاں ۱۹ دسمبر کو صاحب سیشن جج نے اس کی موت کا حکم صادر کیا۔ ہائی کورٹ میں اپیل ہوئی۔ لیکن موت کا وقت چونکہ مقرر ہو چکا تھا اس لیے سزا کا حکم بحال رہا۔ ۲۹ رجون ۱۹۳۶ء کو یہ نوجوان لڑکا جو مذہبی غیرت کی وجہ سے انجام سے قطعاً بے خبر تھا۔ تختۂ دار پر لٹکا یا گیا۔

اس کا والد بیٹے کے غم میں ایک ہی سال کے اندر ۱۹۳۷ء میں چل بسا۔ جب عوام میاں علم الدین شہید کی قبر پر آتے ہیں تو اس قبر پر بھی جو اس کے ساتھ ہی ہے فاتحہ پڑھ جاتے ہیں۔

غازی علم الدین شہید کے مزار کے بالمقابل جنوب کی طرف ایک چھوٹے سے احاطۂ مزار کے بعد غازی حسن الدین شہید

کی قبرآئی ہے۔ چھوٹی چھوٹی تین سیڑھیاں طے کرنے کے بعد مزار کا پختہ چبوترہ آتا ہے جس کے عین درمیان سنگِ مرمر کے اندر خام قبر ہے اور مزار کے سرہانے شمال کی طرف ایک مرمریں تختی پر یہ الفاظ تحریر ہیں :-

یا اللہ　　بسم اللہ الرحمٰن الرحیم　　یا محمد

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات ط بل احیاءٌ

ولٰکن لا تشعرون۔

بنا کردند خوش رسمے بہ خون و خاک غلطیدن ؎

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

مرقد مبارک

غازی حسن الدین شہید رحمۃ اللہ کہ بتاریخ ۹ ربیع الثانی ۱۳۵۵ھ

مطابق ۲۹ جون ۱۹۳۶ء بر تختۂ دار جامِ شہادت نوشید

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ؎　　ہر زماں از غیب جانے دیگر است

اِنّا لِلّٰہ و اِنّا الیہ راجعون

حکیم الامت سر اقبال

کر گیا مُردوں کو زندہ جس کا پیغامِ حیات

آج وہ اقبال زیرِ خاک پنہاں دیکھئے

شیخ محمد اقبال[1] ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو صوبہ پنجاب کے مردم خیز شہر سیالکوٹ میں ایک معزز کشمیری خاندان کے ہاں پیدا ہوئے۔ ان کے اسلاف پشت ہا پشت سے صوفی منش اور درویش صفت بزرگ چلے آتے تھے۔ سب سے پہلے ان کے اسلاف میں ایک بزرگ نے جو برہمن تھا اور ذات سے سپرو۔ سنہ ۹۰۰ھ یا اس کے قریب اسلام قبول کیا ان کا وطن کشمیر میں موضع جسکو تحصیل کولگام تھا اور ان کا مزار چرار شریف میں مزار احاطہ شیخ نور الدین ولی میں اب تک موجود ہے۔

شیخ محمد اقبال کے والد کا نام شیخ نور محمد تھا راقم کو ان سے بمقام سیالکوٹ شرف ملاقات کی عزت حاصل رہی ہے ان کی صوفیانہ مجلسیں آج بھی کئی لوگوں کو یاد ہیں شیخ محمد اقبال کے دادا شیخ محمد رمضان مصنف بھی تھے اور کہا جاتا ہے کہ انھوں نے فارسی میں چند ایک کتابیں بھی لکھی تھیں اور تصوف ان کو وراثت میں ملا تھا۔

شیخ محمد اقبال نے ایف۔ اے تک سیالکوٹ میں تعلیم حاصل کی اور بی اے اور ایم اے کے امتحانات گورنمنٹ کالج لاہور

---

[1] ڈاکٹر سر محمد اقبال کے مفصل حالات مشاہیر کشمیر اور تاریخ اقوام کشمیر جلد دوم مصنفہ راقم سے معلوم ہو سکتے ہیں۔

سے پاس کیے۔ اپنے اسلاف کی طرح تصوف ان پر بھی غالب تھا۔ سیالکوٹ ہی میں بزمانہ طالب علمی شعر کہتے تھے۔ لاہور میں آکر علمی ترقیوں کے ساتھ شاعری کو اور بھی جلا ہوئی۔ ۱۸۹۹ء میں جبکہ راقم کی عمر بائیس سال اور ان کی عمر چھبیس سال تھی راقم نے بہارِ گلشن نامی غزلوں کی ایک کتاب میں ان کی چند ایک غزلیں شائع کیں۔ اور سب سے پہلے ان کے حالات کے متعلق اسی کتاب میں چند سطور لکھیں۔ ایم اے پاس کرنے کے بعد اس زمانہ میں وہ گورنمنٹ کالج میں اسسٹنٹ عربک پروفیسر تھے۔

وہ موسیقی اور قوالی کے دلدادہ تھے۔ اور بزرگانِ دین کے حالات سے انھیں دلچسپی تھی۔ چنانچہ جب ۱۹۰۴ء میں راقم نے یادِ رفتگان اپنی ایک تصنیف ان کے پاس سیالکوٹ بھیجی جہاں وہ گرما کی رخصتوں کی وجہ سے مقیم تھے تو مجھے اخیر ستمبر کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"بعض بعض باتوں نے جو آپ نے اس چھوٹی سی کتاب میں درج کی ہیں
مجھے اتنا رلایا کہ میں بے خود ہو گیا۔ خدا کرے آپ کی توجہ اس طرف لگی رہے
زمانہ حال کے مسلمانوں کی نجات اسی میں ہے کہ اہل اللہ کے حیرت ناک
تذکروں کو زندہ کیا جائے۔ میں سمجھتا ہوں مسلمانوں کے زوال کی اصل علت
حسنِ ظن کا دور ہو جانا ہے۔ بھائی فوقؔ ۔ خود بھی اس گوہر نایاب کی تلاش میں
رہو۔ جو بادشاہوں کے خزانوں میں نہیں مل سکتا بلکہ کسی خرقہ پوش کے پاؤں
کی خاک میں اتفاقیہ مل جاتا ہے"

اسی زمانہ کی ایک غزل میں انھوں نے اس مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے۔

تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے سفینوں میں
نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی! ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

۱۹۰۵ء میں جب وہ بیرسٹری کا امتحان پاس کرنے کے لیے ولایت روانہ ہوئے تو دہلی میں حضرت محبوبِ الٰہی نظام الدین اولیاء کے روضہ پر حاضر ہو کر فاتحہ کے بعد دیر تک دعا مانگتے رہے اور اس تقریب پر جو انھوں نے حضرت نظام الدین اولیاؒ کی شان میں نظم لکھی اس سے ان کی بے انتہا عقیدت اور صوفیائے کرام سے لازوال ارادت کا اظہار ہوتا ہے چند اشعار ملاحظہ طلب ہیں:۔

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب تری۔ فیض عام ہے تیرا
تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی
مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا
چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانہ سے
شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو
دلوں کو چاک کرے مثلِ شانہ جس کا اثر
تری جناب سے ایسی ملے فغاں مجھ کو

پھر آ رکھوں قدم مادر و پدر پہ جبیں — کیا جنھوں نے محبت کا راز داں مجھ کو
وہ شمع بارگہِ خاندانِ مرتضوی — رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی — بنایا جس کی مروّت نے نکتہ داں مجھ کو
دعا یہ کر کہ خداوندِ آسمان و زمیں — کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھ کو

شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے
یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

آپ بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے ۲۵ جولائی ۱۹۰۸ء کی رات کو دہلی پہنچے۔ علی الصبح اپنے احباب کے ساتھ خانقاہ حضرت نظام الدین اولیاؒ میں حاضر ہوئے اُسی شوق و عقیدت کے ساتھ۔ جو ولایت روانہ ہونے کے وقت آپ سے ظاہر ہوئی تھی۔ حضرت کے مزار کے پہلو میں کھڑے ہو کر دیر تک دست بہ دعا رہے۔ سارا دن یہیں قیام کیا۔ قوالی کا لطف بھی اُٹھایا۔ شام کو میرزا غالب کی قبر پہ بھی گئے۔ میر نیرنگ اور مقبول احمد نظامی نے آمدِ اقبال پر نظمیں پڑھیں۔

صوفیائے کرام اور اولیائے عظام کا احترام آپ کی رگ و پے میں سما چکا تھا۔ آپؒ کا عقیدہ تھا کہ صوفیائے محض حسنِ عمل اور اخلاقِ محمدی کے ذریعہ اسلام کو وہ رونق دی ہے کہ ہندوستان نے سات آٹھ کروڑ مسلمان یقیناً انہی بزرگوں کے فیوض و برکات کا نتیجہ ہیں۔ تصوف کا مقصد تزکیۂ نفس اور اصلاحِ باطن ہے۔ وہ رہبانیت کے خلاف ہے وہ گھر بار اور اہل و عیال کو ترک کر جنگلوں اور بیابانوں کی زندگی کو ناپسند کرتا ہے۔ یکسوئی حاصل کرنے کے لیے بیشک خلوت اور عزلت نشینی کی ضرورت ہے لیکن ہر شخص اس کا اہل نہیں ہوتا۔

میں کرامتوں کا قائل ہوں اور میرا خیال ہے کہ وہ پاک نفوس جن کو اللہ تعالےٰ نے تزکیۂ نفس میں صاحبِ کمال کیا ہے وہ تیرِ از کمان رفتہ اور آب از جُو رفتہ واپس لا سکتے ہیں ؎

اولیا راہست قدرت از الٰہ
تیرِ جستہ باز گرداند ز راہ

اس بارہ میں ان کا اپنا شعر بھی ہے ؎

جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس ان کی
الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں

صاحبانِ قبور سے حاجات طلب کرنا جس طرح خدا کو حاضر ناظر سمجھ کر کی جاتی ہیں سخت ترین گناہ ہے۔ یہاں تک البتہ درست ہے کہ فاتحہ پڑھی جائے عبرت حاصل کی جائے اور موت کو یاد کیا جائے بلکہ میں تو اس بات کا بھی قائل ہوں کہ کسی صاحبِ دل کے مزار پر جانے سے صفائے باطنی بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ ؎

---

[1] از رسالہ طریقت لاہور جولائی ۱۹۱۴ء

ترستی ہے نگاہ نارسا جس کے نظارے کو
وہ رونق انجمن کی ہے انہی خلوت گزینوں میں

پیر کی صحبت سے بشرطیکہ وہ پیر دکاندار نہ ہو۔ مرید اپنے اخلاق و اعمال سنوار سکتا ہے۔ لیکن پیر روشن ضمیر اور اہل اللہ ہو اور مرید اہل دل اور اہل درد ہو۔ اور اس کے قلب میں گرمی اور اس کی روح میں تڑپ ہو۔

شاد اقبال میں مہاراجہ کشن پرشاد کے نام آپ کے چند ایسے خطوط بھی ہیں جن میں آپ نے اہل اللہ بزرگوں کے متعلق اپنی عقیدت مندی کا اظہار کیا ہے۔ ۶ دسمبر ۱۹۱۶ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں: "دیار پیر سنجر" کی ضرور زیارت کیجئے۔ میں بھی ایک روز تخیلات کی ہوا میں اڑتا ہوا وہاں پہنچا تھا۔ فضائے آسمانی سے یہ آواز آ رہی تھی سے

فرشتوں نے کانوں سے جس کو سنا تھا
ہم آنکھوں سے وہ زیر و بم دیکھتے ہیں

۵ جنوری ۱۹۱۷ء کے خط میں ایک پنجابی پیر کے متعلق مہاراجہ کشن پرشاد کو ان کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں: "وہ بڑے ہشیار آدمی ہیں۔ اور پیری مریدی کے فن کو خوب سمجھتے ہیں بے اعتنائی ان لوگوں کی بالعموم مصنوعی ہوتی ہے اور اس میں سینکڑوں اغراض پوشیدہ ہوتی ہیں۔"

۷ مارچ ۱۹۱۷ء کے خط میں لکھتے ہیں: "آج کل لاہور میں سلطان کی سرائے میں ایک مجذوب نے بہت لوگوں کو اپنی طرف کھینچ رکھا ہے کسی روز ان کی خدمت میں بھی جانے کا قصد ہے۔

۲۰ جون ۱۹۱۷ء کے خط میں لکھتے ہیں: "ایک اور بزرگ لاہور کے قریب ہیں ذرا بارش ہو۔ تو اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر طالب دعا ہونگا۔"

۱۶ فروری ۱۹۱۹ء کے خط میں لکھتے ہیں: "۲۸ فروری کو دہلی جانے کا قصد ہے۔ وہاں سے ممکن ہوا تو سرکار خواجہ (اجمیر)[1] میں بھی حاضر ہونگا اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے خواجہ حسن نظامی رفیق راہ ہو گئے تو کیا عجب کہ سے

دل بے تاب جا پہنچے دیار پیر سنجر میں
میسر ہے جہاں درمان درد ناشکیبائی

۲۹ مارچ ۱۹۱۹ء کے خط میں دہلی جانے اور اجمیر تک نہ پہنچ سکنے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "دہلی گیا دو دفعہ روضہ حضرت خواجہ نظام الدین کی درگاہ پر بھی حاضر ہوا مگر افسوس کہ پیر سنجر کے دربار میں حاضر نہ ہو سکا۔ انشاء اللہ پھر جاؤں گا اور اس آستانے کی زیارت سے شرف اندوز ہو کر واپس آؤں گا۔ دہلی میں خواجہ حسن نظامی صاحب نے بہت اچھی قوالی سنائی۔ سرکار بہت یاد آئے۔"

ڈاکٹر اقبال نے ۲۰ جنوری ۱۹۱۸ء کے طویل خط میں جس کا پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے مہاراجہ کشن پرشاد کو ایک جگہ

---

[1] یعنی اجمیر شریف۔

لکھا ہے: "دو سال کا عرصہ ہوا میں نے تصوف کے بعض مسائل سے کسی قدر اختلاف کیا تھا اور وہ اختلاف ایک عرصے سے صوفیائے اسلام میں چلا آتا ہے کوئی نئی بات نہ تھی۔"

مگر اس بحث نے بہت طول کھینچا۔ نثر و نظم میں ڈاکٹر صاحب کے خلاف اخباروں اور رسالوں میں مضامین لکھے گئے۔ اور کہا گیا ہے

وائے بر ایں پختگان عقل خام　　　اولیا را میش و بُزکردند نام
از دم کرشتگان الحذر　　　الحذر از بدسگالان الحذر

مخالفانہ مضامین کے جواب میں ڈاکٹر اقبال نے ایک طویل مضمون "سرِ اسرارِ خودی" کے نام سے لکھا جس میں ظاہر کیا کہ "میرا مذہب یہ ہے کہ اسلام نے دین و دنیا کے فرائض کو یکجا کیا ہے۔ اور اس طرح بنی نوع انسان کے لیے ایک معتدل راہ قائم کی ہے۔ جہاں یہ سکھایا ہے کہ تمہارا مقصود اعلیٰ اعلائے کلمۃ اللہ ہے وہاں یہ بھی تعلیم دی ہے کہ "لاتنس نصیبک فی الدنیا (دنیا میں اپنا حصہ فراموش نہ کر) دنیا ہیچ است و کار دنیا ہمہ ہیچ اسلام کی تعلیم نہیں بلکہ صحیح اسلامی تعلیم یہ ہے کہ "ترک الاسباب جہالتہ والاعتماد علیہا شرک"۔ یعنی اسباب دنیا کا ترک کرنا جہالت ہے اور ان پر اعتماد کرنا شرک ہے۔ اسلام نے دنیا میں جس حصہ کو حاصل کرنے کی تاکید کی ہے اس کا جو طریق بتایا ہے اسی کا نام شریعت اسلامیہ کا وہ حصہ ہے جو معاملات سے تعلق رکھتا ہے۔

عجمی تصوف (عجمی اس لیے کہ اس کے مدوّن کرنے والوں میں بیشتر عجمی تھے) سے اور وحدت الوجود کے مسئلہ سے اسلام کو کوئی تعلق نہیں ہے یہ ایک قسم کی رہبانیت ہے جس کے اثر سے اسلامی اقوام میں سے قوتِ عمل مفقود ہو گئی ہے۔ تصوف کا تو لفظ بھی رسول اکرم صلعم کے زمانہ میں نہ تھا اس کا استعمال سب سے پہلے ۱۵۰ھ میں شروع ہوا۔ اس کے عجمی حامیوں نے آخر اس کو مسلمانوں کی بربادی کا باعث بنا دیا۔"

ڈاکٹر صاحب اپنے ایک اور مضمون "اسرارِ خودی اور تصوف" میں لکھتے ہیں:

"میں اگر صوفیا کا مخالف ہوں تو صرف اس گروہ کا جس نے محمد عربی کے نام پر بیعت لے کر دانستہ یا نادانستہ ایسے مسائل کی تعلیم دی ہے جو مذہب اسلام سے تعلق نہیں رکھتے حضرات صوفیہ میں جو گروہ رسول اللہ صلعم کی راہ پر قائم ہے اور سیرت صدیقی کو اپنے سامنے رکھتا ہے میں اس گروہ کا خاک پا ہوں اور ان کی محبت کو سعادتِ دارین کا باعث تصور کرتا ہوں۔ مجھے اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی شرم نہیں کہ میں ایک عرصہ تک ایسے عقائد و مسائل کا قائل رہا جو بعض صوفیا کے ساتھ خاص ہیں اور جو بعد میں قرآن شریف پر تدبر کرنے سے قطعاً غیر اسلامی ثابت ہوئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرا مذہب یہ ہے کہ خدا تعالےٰ نظام عالم میں داری و ساری نہیں بلکہ وہ نظامِ عالم کا خالق ہے اور اس کی ربوبیت کی وجہ سے یہ نظام قائم ہے جب وہ چاہے گا اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔

تصوف کے مقاصد سے مجھے کیونکر اختلاف ہو سکتا ہے کوئی مسلمان ہے جو ان لوگوں کو برا سمجھے جن کا نصب العین محبتِ رسولؐ ہے اور جو اس ذریعے سے ذاتِ باری سے تعلق پیدا کر کے اپنے اور دوسروں کے ایمان کی پختگی کا باعث ہوتے ہیں اگر میں تمام صوفیا کا مخالف ہوتا تو مثنوی میں ان کی حکایات و مقولات سے استدلال نہ کرتا۔"

حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر اقبال جیسا کہ انھوں نے بار بار اقرار کیا ہے۔ تصوف اسلامیہ کے خلاف نہیں تھے بلکہ وہ مسئلہ وحدت الوجود کو جس نے تمام اسلامی اقوام کو ذوقِ عمل سے محروم کر دیا تھا۔ اسلام کا سب سے بڑا دشمن اور ہر وحدت الوجودی کو زندیق سمجھتے تھے۔ اور فی الواقعہ اکثر اہلِ تصوف اسی مسئلہ کی طرف رغبت رکھتے ہیں۔ اس مسئلہ کا اقتضا یہ ہے کہ ہستی مطلق مختلف مظاہر میں رونما ہے اور اس کے علاوہ دیگر تمام ہستیاں محض تخیل اور وہم ہیں۔ اس مسئلہ نے علما و اہلِ فلسفہ کے علاوہ اہلِ دل اور اہلِ درد کے دربار میں بھی قبولیت حاصل کر لی۔ فارسی شعرا کے کلام اور اہلِ وجد کی مجلسوں میں اس مسئلہ کو سر آنکھوں پر جگہ دی گئی چنانچہ اسی مسئلہ کی بدولت جس کو شعرائے ایران اور ہندوستان کے فارسی شعرا اور اہلِ وجد کی محفلوں نے زیادہ فروغ دیا۔ کارِ دنیا ہمہ ہیچ سمجھا جانے لگا۔ اعمال و افعال کی پابندی۔ نیک و بد کی ذمہ داری سب کچھ ذاتِ باری کو سونپ دی گئی نتیجہ یہ کہ بقول مولانا محمود علی ایم اے یہ فلسفہ کہ جو رفقا و قوم کے کاہل اور عیش پسند افراد نے کہ انہی کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے اپنے تئیں اس پتہ سے بھی حقیر سمجھا جو درخت سے ٹوٹ کر ہوا کے زور سے اڑتا پھرتا ہے۔ اور قوتِ عمل کے ہر ایک جذبہ اور تہذیب نفس کی ہر ایک کوشش سے بیگانہ رہ گئے۔

اقبال لکھتے ہیں زندگی نام ہی دکھ اٹھانے اور دکھ پہنچانے کی قوت کا ہے زندگی کا مقصد زندگی ہے نہ کہ موت اور وحدت الوجود اور سکر کا مسئلہ موت سے بھی بدتر ہے۔ وحدت الوجودی ایک تنکا اس لیے نہیں توڑ سکتا کہ تنکے کو دکھ پہنچے گا۔ اسی مسئلہ نے خودداری اور خودشناسی اور قوتِ عمل سے مسلمان کو محروم کر دیا۔ ایک پٹھان وجید خان جو ایک ہندو جوگی کا مرید اور فلسفہ ویدانت و وحدت الوجود کا قائل تھا اس عقیدہ کا نتیجہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے ؎

تھے ہم پوت پٹھان کے دل سکتے دل دیں موڑ

شرن پڑے رگناتھ کے سکیں نہ تنکا توڑ

یعنی میں پٹھان تھا اور فوجوں کے منہ موڑ سکتا تھا مگر جب سے رگناتھ جی کے قدموں میں آیا ہوں اب ایک تنکا تک بھی نہیں توڑ سکتا اسی لیے وہ مسلمانوں کی بربادی کا بوجھ ایک حد تک ایسے ہی صوفیوں اور شاعروں پر ڈالتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے

فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

اقبال کو کسی سے خواہ مخواہ ضد نہ تھی وہ ظاہر نما صوفیوں اور بے مصرف شاعروں کی طرح اس زمانہ کے ظاہر پرست ملاؤں سے بھی اس لیے ناراض تھے کہ انھوں نے اپنے پیٹ کے لیے مذہب کا تماشا بنا رکھا ہے بحث و تکرار، بدگوئی و غیبت ان کی طبیعتِ ثانیہ بن چکی ہے۔ ان کی نظروں میں وسعت نہیں ان کے دلوں میں حرارت اور ان کے کلام میں اخلاص نہیں وہ ان کے متعلق اپنے نرالے انداز بیان میں کس جلے دل سے کہتے ہیں ؎

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبطِ سخن کر نہ سکا
حق سے جب حضرتِ ملا کو ملا حکمِ بہشت

عرض کی میں نے الٰہی مری تقصیر معاف
خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب و لبِ کشت

نہیں فردوس مقامِ جدل و قال و اقوال
بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت

ہے بہا آموزیئے اقوام وملل کام اس کا
اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت

ڈاکٹر اقبال خود صوفی تھے۔ درویش منش تھے۔ مولانا روم کو پیر طریقت سمجھتے، بزرگوں کا بے حد ادب کرتے اور اولیا اللہ کی کرامتوں کے قائل تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

رمز و ایما اس زمانہ کے لیے موزوں نہیں — اور آتا بھی نہیں مجھ کو سخن سازی کا فن
قم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے — خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

البتہ اُن کو موجودہ دَور کی پیری مریدی اور آجکل کے خانقاہی مشرکانہ مذہب سے نفرت تھی وہ موجودہ پیروں کو جو سالہا سال بھر غریب مریدوں کی گداوری کرتے اور دعوتیں اُڑاتے اور ان سے نذرانے لیتے رہتے ہیں۔ قوم کے لیے وبال جان تصور کرتے تھے۔ فرماتے ہیں:

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی — گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن
شہری ہو دہاتی ہو مسلمان ہے سادہ — مانند بتاں پجتے ہیں کعبہ کے برہمن
نذرانہ نہیں سود ہے پیران حرم کا — ہر خرقہ سالوس کے اندر ہے مہاجن

میراث میں آئی ہے انہیں مسند ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

علامہ اقبال نے تمام عمر درویشانہ زندگی بسر کی اور اس درویشی میں وہ مرتبہ حاصل کیا کہ ایک طرف تو سرکار نے اُن کو سر کا معزز خطاب عطا کیا اور دوسری طرف دُنیا کے بڑے بڑے شاعروں اور فلسفیوں کے ساتھ ان کا نام لیا جانے لگا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ قوم مُردہ کو اپنی نظموں کے ذریعہ ایسا پیغام دے گئے، کہ آج ہر مسلمان کا منجمد خون حرکت میں آ رہا ہے:

اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد
چشم خود بربست و چشم ما کشاد

اقبال نے شاعری کی پرانی ڈگر سے ہٹ کر اپنے خیالات کی دُنیا الگ بسائی، ان کے کلام میں جو قوت و توانائی ہے وہ مشرق کے کسی اور شاعر کے کلام میں نہیں انھوں نے فلسفہ میں فلسفہ خودی کے اچھوتے تصور کا اظہار کیا اور اُس مُردہ تصوف میں جو ایک طویل زمانہ سے ہماری خودداری زندگی کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہا تھا۔ نئی رُوح پھونک دی۔ انھوں نے نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ سکون وجمود کی ہر دلدادہ قوم کو عمل وحرکت کی تعلیم دے کر حیات جاوداں کا پیغام سنایا۔

مثنوی مولانا روم اکثر آپ کے زیر مطالعہ رہتی اُس کے اکثر اشعار و نتائج پر آپ کی حالت متغیر ہو کر بے اختیار آپ کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے تھے۔

قرآن شریف کی تلاوت ایسے ذوق وشوق ایسے درد ومحبت اور ایسے سوز وگداز سے کرتے تھے کہ آنسوؤں کا تار بندھ جاتا نہا دیتے جاتے تھے اور پڑھتے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ زندگی کے آخری دنوں میں جب بیماری کا زور بڑھ گیا اور گلا خراب ہو جانے کے

باعث آواز میں بھی لگ گئی۔ تو ڈاکٹروں کے منع کرنے سے آپ کا یہ طریق تلاوت بھی چھوٹ گیا۔

رسولِ اکرم صلعم کی ذات اقدس سے آپ کو والہانہ عشق تھا۔ ان کے کلام سے عشق رسول صلعم کی ادنیٰ سی جھلک نظر آتی ہے۔ وفات سے کچھ عرصہ پہلے ایک رباعی لکھی کہ بارِ الٰہا قیامت کے دن میرے گناہوں کی پرسش سے درگذر کر۔ لیکن اگر تو ایسا نہ کر سکے تو کم از کم نبی اکرم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نگاہوں کے سامنے میرا مواخذہ نہ ہو۔ فرماتے ہیں ؎

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روزِ محشر عذرہائے من پذیر
یا اگر بینی حسابم ناگزیر
از نگاہ مصطفےٰ پنہاں بگیر

خدا ہی کو اس بات کا علم ہے کہ اُن کے سینہ میں عشق و عرفان کا کیسا تلاطم خیز چشمہ نہیں سمندر تھا۔ بقول مدیر رسالہ البیان (دسمبر ۱۹۳۸ء) اُن کے دل میں درد تھا اُن کے لبوں پر آہیں تھیں اور اُن کی آنکھوں میں آنسو۔ انھوں نے ملّتِ مرحومہ کے غم میں جس ساز کو چھیڑا ہے اُس سے ماتم سرائی کی آوازیں بھی نکلتی ہیں اور اُمید و رجا کے نغمے بھی بلند ہوتے ہیں وہ قوم کے بہترین نبّاض اور قرآن کے بہترین مبلغ تھے اُن کے نزدیک ملتِ اسلامیہ کا صحیح اور اصلی مرض ترک قرآن ہے اور اس کا صحیح اور اصلی علاج ارجعوا الی القرآن۔

آخر یہ مردِ حق آگاہ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی صبح کو پینسٹھ سال دو ماہ کی عمر میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گیا۔ جنازہ میں ساٹھ ستر ہزار سے کم مخلوق نہ تھی۔ ان کے ماتم کی وجہ سے تمام اسلامی مدارس بند ہو گئے۔ ان کے جنازہ کے آگے آگے انہی کے اشعار پڑھے جاتے تھے۔ بہت سے ہندو اور سکھ بھی ان کو ان کی آخری آرام گاہ تک پہنچانے کے لیے جنازہ کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ پنجاب کے تمام وزرا اور وزیر اعظم (سر سکندر حیات) اور دیگر بڑے بڑے لوگ بھی جنازہ میں شامل تھے۔ جنازہ بادشاہی مسجد میں پڑھا گیا۔ اور رات کے گیارہ بجے ہندوستان کے اس فلاسفر شاعر اور صوفی اور علامہ دہر کو مسجد کی سیڑھیوں کے پاس بائیں طرف سپردِ خاک کیا گیا۔ آپ کے عالمگیر ماتم پر شعرائے ہند و پنجاب نے اس قدر نظمیں لکھیں کہ اُن کی گنتی دشوار ہے۔ آپ کے متعلق کچھ ماتمی نظمیں ایک کتاب کی صورت میں بھی طبع ہو چکی ہیں۔

[حکیم الامت علامہ اقبال کا مزار سرخ پتھر سے نہایت خوبصورت بنایا گیا ہے۔ عمارت شاعر مشرق کی وفات کے تیرہ سال بعد مکمل ہوئی۔ اس کے جنوب کی طرف دروازہ اور باقی تین طرف جالیاں ہیں۔ تعویذ کا پتھر افغانستان کی حکومت نے سردار صلاح الدین سلجوقی افغان کونسل کی تحریک پر تحفتہً دیا تھا۔ یہ اسی قسم کا قیمتی پتھر ہے جیسا بابر کی قبر پر بھی لگا ہوا ہے۔ روشنی میں اس سے لاجوردی رنگ کی شعاعیں پھوٹتی ہیں۔ قبر کے سرہانے قرآن پاک کی آیات اور اقبال کے یہ دو شعر ہیں جو افغانستان والوں نے منتخب کر کے کندہ کرائے تھے

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم
چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است
کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

اندرونی دیواروں پر زبورِ عجم کی ایک غزل کے یہ شعر نہایت خوش خط نقش ہیں جو اقبال کے پیغام کا نچوڑ ہیں ـــــ

دمِ مرا صفتِ بادِ فرودیں کردند
گیاہ را ز سرشکم چو یاسمیں کردند
نمود لالۂ صحرا نشیں ز خونابم
چنانکہ بادۂ لعلے بساتگیں کردند
بلند بال چنانم کہ بر سپہرِ بریں
ہزار بار مرا نوریان کمیں کردند
فروغِ آدمِ خاکی ز تازہ کاری ہاست
مہ و ستارہ کنند آنچہ پیش ازیں کردند
چراغِ خویش بر افروختم کہ دستِ کلیم
دریں زمانہ نہاں زیرِ آستیں کردند
درا بسجدہ و یاری ز خسروان مطلب
کہ روزِ فقر نیاگانِ ما چنیں کردند

مقبرہ کی تعمیر پر تقریباً ایک لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ اپنے ملک کے لوگوں کے علاوہ بیرونی ممالک کا کوئی سیاح، کوئی سرکاری مہمان، کوئی سیاسی یا ثقافتی مشن یا وفد لاہور آ کر علامہ کی قبر پر حاضر ہوئے بغیر نہیں رہتا ــــــــ [مرتب]

سر سکندر حیات خاں

جو گورنر بھی رہا اور جو منسٹر بھی رہا
آج وہ زیرِ لحد مشہورِ دوراں دیکھیے

خان بہادر نواب سر سکندر حیات خاں کھٹڑ خاندان کے نامور فرزند تھے۔ کھٹڑ خان شہاب الدین غوری کے حملۂ ہند کے ایام میں اس کے ساتھ ہی افغانستان سے آیا تھا۔ اس کے چھ فرزندوں میں چوتھا فرزند فیروز خان تھا جس کی اولاد فیروزال کہلاتی ہے۔ فیروزال سے پھر اور کئی شاخیں دریک۔ رتنال۔ بلوان۔ کھرل اور عیسیال نکلتی ہیں جن کا مفصل ذکر تاریخِ رئیسانِ

کتاب ایڈیشن اول (صفحہ ۵۷۳ تا ۵۷۷) میں درج ہے۔

فیروز خان کی اولاد سے کئی پشتوں کے بعد جمال خان نے اپنے بیٹے جلال خان کے نام سے جلال سر ایک گاؤں جنگل میں جہاں درخت اور سبزہ زار بکثرت تھے آباد کیا۔ لیکن شاہجہان جب کابل کو جاتے ہوئے حسن ابدال کے پاس سے گذرا تو اس نے اس گاؤں کے قریب ۱۰۲۵ھ / ۱۶۴۵ء میں ایک سرائے اور ایک محل تعمیر کرایا۔ اور اس کے خوشنما منظر اور بہتے ہوئے پانی اور دلفریب درختوں کے جھنڈ کو دیکھ کر بے ساختہ واہ کہا اور آخر میں جلال سر کی بجائے اس موضع کا نام واہ ہی مشہور ہو گیا۔ اور اسی نام سے ککھڑ خاندان کی یہ شاخ واہ والی شاخ کے نام سے موسوم ہے۔ جلال خان کی چوتھی پشت میں محمد حیات خان ایک نامور شخص گذرا ہے۔ جس نے اپنی شجاعت اور وفاداری اور اپنے تدبر اور اپنی انتظامی قابلیت سے اس خاندان کو چار چاند لگا دیئے۔ راقم کو جموں میں جب وہ کونسل جموں و کشمیر کے ممبر تھے ۱۸۹۴ء یا ۱۸۹۵ء میں نیاز بھی حاصل رہا۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ ہمیشہ ان کو "باپو" کہا کرتے تھے۔

نواب محمد حیات خان نے غدر ۱۸۵۷ء میں اور اس سے قبل کپتان ایبٹ اور جنرل نکلسن کے ہمراہ بڑی خدمات انجام دی ہیں آپ کو خان بہادر سی آئی ای اور نواب کا ذاتی خطاب ملا۔ اسسٹنٹ کمشنر۔ کابل فیلڈ فورس کے پولیٹیکل افسر اور صوبہ پنجاب میں ڈویژنل جج رہے۔ چھ فرزند چھوڑ کر آپ ۱۹۰۱ء میں وفات پا گئے۔

آپ نے بنوں میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر رہنے کے ایام میں "حیات افغانی" ایک کتاب افغان قبائل کی تشریحات اور علاقہ سرحد و بنوں کے حالات میں لکھی ہے جو مستند سمجھی جاتی ہے اور آجکل نایاب ہے۔

آپ کے فرزندوں میں آپ کے دوسرے فرزند سکندر حیات خان نے نہ صرف پنجاب اور ہندوستان بلکہ انگلستان میں بھی لازوال شہرت حاصل کی ہے۔

آپ ۵ رجون ۱۸۹۲ء کو ملتان میں جہاں آپ کے والد نواب محمد حیات خان ڈویژنل جج تھے پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم کے بعد آپ علی گڑھ کالج میں داخل ہو گئے۔ جہاں میٹرک پاس کیا۔ تھوڑا عرصہ کالج میں رہے تھے کہ ڈاکٹری تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے۔ ابھی دو ہی سال کا عرصہ وہاں گذرا تھا کہ برادر بزرگ خان محمد اسلم حیات خان کی وفات کی وجہ سے آپ کو واپس آنا پڑا۔

آپ کا خاندان سپاہیانہ اوصاف کا مالک ہے ۱۹۱۴ء کی جنگ یورپ میں اور تیسری افغان لڑائی میں آپ شامل رہے اور گورنمنٹ برطانیہ کی خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۹۲۰ء میں آپ نے سیاسیات میں حصہ لینا شروع کیا۔ اور ضلع اٹک کی طرف سے کونسل کے ممبر منتخب ہو گئے۔ ۱۹۲۵ء میں یا اس کے بعد چند ماہ تک بہاولپور کے وزیر اعظم بھی رہے۔ ۱۹۲۹ء میں آپ سر فضل حسین کی جگہ ریونیو ممبر بنے۔ ۱۹۳۲ء و ۱۹۳۴ء میں دو مرتبہ قائم مقام گورنر پنجاب مقرر ہوئے اور آپ سب سے پہلے پنجابی تھے جن کو یہ جلیل القدر عہدہ ملا۔ ریزرو بنک کے ڈپٹی گورنر بھی رہے۔ اور آپ پہلے ہندوستانی تھے جنھوں نے یہ اعزاز حاصل کیا۔ جب ہندوستان میں وزارتوں کا آئین قائم ہوا۔ تو آپ پنجاب کے سب سے پہلے وزیر اعظم قرار پائے اور اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک وزارت عظمیٰ کے فرائض کامیابی کے ساتھ ادا کرتے رہے۔

آپ کے زمانہ وزارت میں جماعت خاکساراں اور مہاسبھا دل اور مجلس احرار اور کئی اور تحریکوں کا بڑا زور تھا۔ آپ کی سیاسی دانشمندی اور انتظامی لیاقت ان تحریکوں پر غالب آتی رہی آپ ہی کی وزارت اور سر ایمرسن کی گورنری کے زمانہ میں مسجد شہید گنج صحیح معنوں میں شہید ہوئی۔ اس مسجد کے حصول میں بہت سی قانونی پیچیدگیاں تھیں اس لیے مسلمان کامیاب نہ ہو سکے۔ اور سکھوں نے مسجد کے ساتھ وہ سلوک کیا۔ جو ان کو اخلاقاً اور احتراماً نہ کرنا چاہیئے تھا۔ لیکن سر سکندر حیات کی کوششوں سے لاہور کی ایک اور عظیم الشان مسجد۔ بنام مسجد شاہ چراغ جو مدت دراز سے سرکاری قبضہ میں چلی آتی تھی۔ مسلمانوں کو مل گئی۔ جس کے ساتھ آمدنی کے کافی ذرائع بھی ہیں اور جہاں باقاعدگی سے جمعہ ہوتا ہے۔

لاہور میں شہنشاہ عالمگیر کی تعمیر کی ہوئی مسجد جو بادشاہی مسجد کے نام سے موسوم ہے عرصہ سے مرمت طلب تھی۔ آپ کی ذاتی کوششوں اور آپ کے مذہبی جذبہ کے طفیل گورنمنٹ پنجاب۔ حضور نظام دکن اور زمینداران پنجاب نے قریباً دس گیارہ لاکھ روپیہ اس کی مرمت کے لیے دیا۔ چنانچہ انجمن اسلامیہ پنجاب کی نگرانی میں اس مسجد کی مرمت ہو رہی ہے۔

پہلی جنگ یورپ کی طرح دوسری عالمگیر جنگ میں بھی جو ستمبر ۱۹۳۹ء سے تادم تحریر (۱۳ مارچ ۱۹۴۴ء) جاری ہے آپ نے قابل قدر مدد دی۔ آپ ہی کی مساعی پیہم سے کئی لاکھ پنجابی نوجوان فوج میں بھرتی ہوئے۔ اسی جنگ میں آپ دو مرتبہ مصر کے مشرقی محاذ پر بھی گئے جہاں آپ نے ہندوستانی فوجوں کا بچشم خود معائنہ کیا۔ علاوہ ازیں آپ نے اپنے فرزند سردار میجر شوکت حیات خاں (ولادت ۲۳ دسمبر ۱۹۱۵ء) کو فوجی کالج ڈیرہ دون میں تعلیم دلانے کے بعد فوج میں بھجوایا۔ جہاں وہ عالمگیر جنگ میں مشرق وسطیٰ کی فوجوں کے ساتھ ۱۹۴۰ء سے دسمبر ۱۹۴۲ء تک رہے بلکہ اسی اثنا میں پانچ ماہ تک جنگی قیدی بھی دشمن کے پاس رہے۔ بعد میں آپ وزارت پنجاب کے سب سے کم عمر وزیر بھی ہوئے۔

آپ کے انتقال کا واقعہ نہایت رقت خیز۔ درد انگیز اور عبرت نما ہے۔ ۲۶ و ۲۷ دسمبر ۱۹۴۲ء کو آپ کے فرزند اور صبیحہ کی شادیاں تھیں۔ ہفتہ کی شام کو آپ نے شادیوں سے فراغت پائی۔ نو بجے کے قریب آپ نے پیٹ اور قلب کے پاس تکلیف محسوس کی۔ اجزائن اور فروٹ سالٹ کا استعمال کیا۔ جس سے آپ کو کچھ افاقہ معلوم ہوا۔ گیارہ بجے کے قریب آپ اپنے عزیزوں اور بچوں کے ساتھ آخری بات چیت کر کے اپنی خواب گاہ میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ کی بیگم صاحبہ اور آپ کے فرزند میجر شوکت حیات خاں نے (جو صرف تین چار روز پیشتر رخصت پر آئے تھے) آپ کو بستر پر بے ہوش پایا۔ ٹیلی فون پر اسی وقت تین ڈاکٹروں کو بلایا گیا۔ لیکن وہ ابھی پہنچنے نہ پائے تھے۔ کہ دل کی حرکت بند ہو جانے سے آپ اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ یہ المناک واقعہ جس میں غافل انسانوں کے لیے صدہا سبق ہیں صرف چند منٹوں میں ختم ہو گیا ؎

اجل کا وقت مقرر سہی مگر یارب
یہ ایک کھیل ہے یا شان کردگاری ہے

چشم زدن میں آدھی رات کے قریب یہ عشرت کدہ ماتم سرا بن گیا۔ ابھی شامیانے قناتیں اور میز کرسیاں اور تمام ساز و سامان اسی طرح پڑا تھا اور مبارک باد کے تاروں اور خطوط اور مہمانوں کی آمد کا تانتا بندھا ہوا تھا اور ابھی سہرے باسی ہار بھی نہیں ہوئے تھے۔ کہ صرصر موت نے چراغ زیست کو ہمیشہ کے لیے بجھا دیا۔

وہ سہرے جن کی مہک سے رہی فضا لبریز ـــــ
پڑے ہیں خاک پہ پژمردہ خزاں ہو کر

۲۶ر دسمبر کے آفتاب کا چراغ جھلملا کر خاموش ہو رہا تھا کہ اس ممتاز سیاستدان اور نامور مدبّر و منتظم شخصیت کو جامع عالمگیری کی دیوار کے سایہ میں سپرد خاک کیا گیا۔ آپ کی عمر پچاس سال چند ماہ تھی ۔ اللہ اکبر! اسی شامیانہ کے نیچے جہاں شادمانی کے سارے سامان علیٰ حال موجود تھے اور ابھی مہمان رخصت بھی نہ ہونے تھے کہ وہیں آپ کی میّت رکھی گئی۔ آپ کا جنازہ پورے فوجی اعزاز کے ساتھ اٹھایا گیا۔ جس میں ہندو۔ مسلمان۔ سکھ۔ عیسائی انگریز سب موجود تھے ۔ جنازہ روانہ ہونے کے وقت پولیس آن ڈیوٹی نے سلامی دی ۔ پنجاب اسمبلی اور عجائب گھر کے قریب بھی سلامیاں دی گئیں اس ماتمی جلوس کے ہمراہ بہت خلقت تھی ۔ بادشاہی مسجد کے سامنے جب جنازہ آیا تو فوجی گوروں نے سلامی دی ۔ گورنر پنجاب بھی اس وقت موجود تھے ۔ بے شمار خلقت مسجد کے اندر اور باہر سیڑھیوں پر موجود تھی ۔ راقم بھی جنازہ میں شامل تھا ۔ تقریباً ایک لاکھ آدمیوں نے نماز جنازہ پڑھی ۔ شام کے ۶ بج کر پچاس منٹ ہوئے تھے کہ رسم تدفین عمل میں آئی ۔

ان تقریبوں پر مبارک بادیوں کے تار بھی آ رہے تھے کہ ماتمی تاروں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا ۔ وائسرائے ہند ۔ مسٹر چرچل وزیر اعظم انگلستان ۔ مسٹر ایمری وزیر ہند ۔ جنرل ویول موجودہ وائسرائے ہند جو اس زمانہ میں کمانڈر انچیف تھے ۔ قائد اعظم مسٹر جناح ۔ فرمانروایان بھوپال ۔ رام پور ۔ بہاولپور ۔ نظام دکن ۔ نواب چھتاری ۔ گورنر پنجاب سے علاوہ سدہا تار آپ کی موت پر آئے تھے ۔

علامہ سر محمد اقبال کے مزار کے عین مقابل بادشاہی مسجد کے دہنے بازو میں پنجاب کی اس ممتاز ترین ہستی کی آخری آرام گاہ ہے ۔ اور کہا جاتا ہے کہ ملت اسلامیہ کی ان دو مختلف ممتاز ہستیوں کے مقبرے ایک ہی نقشہ کے مطابق تعمیر کئے جائیں گے ۔

مرحوم کی سیاست سے یقیناً کئی لوگوں کو اختلاف رہا ہے ۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کی کشادہ دلی ۔ فراخ حوصلگی ۔ بے تعصبی ۔ بے غرضی اور منکسر المزاجی کی وجہ سے تمام لوگ ان کی عظمت و ہر دلعزیزی کے قائل تھے ۔

مرحوم گورنر پنجاب ۔ ڈپٹی گورنر ریزرو بنک ۔ ریونیو ممبر ۔ وزارت عظمیٰ کے اعلیٰ ترین عہدوں تک پہنچ کر بھی حقوق اللہ اور حقوق العباد کا پورا خیال رکھتے تھے ۔ مولانا عبد المجید سالک مدیر انقلاب یکم جنوری ۱۹۴۳ء کے انقلاب میں لکھتے ہیں چونکہ صبح سے ۵ بجے اور اس کے بعد بھی کار سرکار اور ملاقاتیوں کے ہجوم سے انھیں فرصت نہ ملتی تھی ۔ بلکہ بعض وقت کھانا بھی وقت پر نہ کھا سکتے تھے اس لیے نماز ظہر کے اکثر قضا ہو جانے سے انھیں بہت تکلیف ہوا کرتی تھی ایک دفعہ جب سالک صاحب نے عرض کیا کہ مہمات امور کی مصروفیت میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اکثر ظہر و عصر جمع کی ہیں کہنے لگے حضورؐ کے مہمات امور اور ہمارے کاروبار دنیوی میں بڑا فرق ہے ۔ خدا جانے مجھے یہ نمازیں جمع کرنے کا حق ہے یا نہیں ۔ روزوں کے سختی سے پابند تھے سفر میں بھی انھوں نے روزہ کبھی ترک نہیں کیا ۔ ماہ رمضان میں ایک دفعہ آپ نے دیکھا کہ کوٹھی کے پھاٹک پر پہرہ دار سپاہی دوپہر کے وقت کچھ کھا رہے ہیں ۔ آپ نے انسپکٹر جنرل پولیس کو حکم دیا کہ ان آدمیوں کو فوراً واپس بلا لو میری کوٹھی کے احاطہ کے اندر ماہ مبارک کی بے حرمتی ناقابل برداشت ہے ۔ چنانچہ وہ آدمی فوراً وہاں سے ہٹا دیئے گئے ۔

سر سکندر حیات مرحوم کو بزرگان دین سے گہری عقیدت تھی۔ دہلی یا حیدر آباد جانے کا اتفاق ہوتا تو سب سے پہلے اولیائے کرام کے مزاروں پر فاتحہ پڑھتے اور ان کے فضائل کا تذکرہ فرماتے۔ لاہور میں حضرت علی ہجویری عرف داتا گنج بخشؒ کے مزار پر بھی آتے رہتے ہیں۔ راقم کے ایک دوست ملازم ریلوے کی ڈیوٹی آپ کی ریزرو ریلوے گاڑی کے ساتھ عموماً رہتی تھی، ان کا بیان ہے کہ میں نے بارہا ان کو گاڑی میں بھی نماز و وظائف پڑھتے دیکھا ہے۔ "ہائے سکندر اعظمؒ" سے آپ کا سال وفات برآمد ہوتا ہے۔

جناح باغ

[مال روڈ کے دائیں طرف، گورنمنٹ ہاؤس کے سامنے، لارنس ہال اور منٹگمری ہال کے آگے ایک بہت وسیع و عریض باغ ہے جس کا رقبہ ایک سو بارہ ایکڑ ہے۔ ۱۸۶۰ء تک یہ جگہ بالکل اجاڑ اور ویران پڑی تھی۔ ۱۸۶۱-۶۲ء میں انگریزوں نے چندہ جمع کر کے لارڈ لارنس کی یادگار کے طور پر یہاں لارنس ہال اور ۱۸۶۶ء میں ہندوستانی رئیسوں کے عطیات سے منٹگمری ہال تعمیر کیا اور ان کے آگے ایک مختصر سا باغ لگایا۔ مگر ۱۸۶۸ء میں انھوں نے بادامی باغ کی زمین فروخت کر کے اس کی آمدنی سے یہاں اور زمین خریدی۔

ابتدا میں اس باغ کا نام لارنس باغ تھا جس کی تاریخ مردان علی رعنا نے ۵، جولائی ۱۸۶۲ء کے ہفتہ وار اخبار کوہ نور لاہور میں اس طرح لکھی تھی ؎

لفٹنٹ پنجاب تھے سر جان لارنس   تھے نیک نام بسکہ وہ صاحب دل و دماغ

باغ جہاں میں نام رہے تا کہ تا بہ حشر   لاہور میں یہ ان کا بنا یادگار باغ

رعنا نے نام باغ سے پڑھ لیے عدد   روشن مسیح ہوا صورت چراغ

اس وقت سے اب تک اس باغ کا ایک حصہ محکمہ زراعت و باغبانی کی نگرانی میں "بستان العقاقیر" یعنی نباتاتی تجربہ گاہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے، ایک حصہ چڑیا گھر کے قبضہ و تصرف میں ہے اور ایک حصہ پبلک کی سیر و تفریح کے لیے وقف ہے، جس کا انتظام لاہور کارپوریشن کے ہاتھ میں ہے۔ اس باغ کی نہر باری دو آب کی ایک شاخ سیراب کرتی ہے۔

باغ میں کم و بیش اسی ہزار درخت اور مختلف قسم اور نوع کے پودے اور گل بوٹے ہیں۔ برعظیم پاک و ہند میں پیدا ہونے والے پیپل، بڑ، جامن، آم اور دوسرے عام درختوں کے علاوہ اس میں آسٹریلیا، اسپین، شام اور جنوبی یورپ سے کئی قسم کے خوب صورت درخت لا کر لگائے گئے ہیں جن میں چیل، چنار، شمشاد، یوکلپٹس، لیچی، کارد اور خرد بہ وغیرہ بھی ہیں۔

اس باغ میں کرکٹ، ٹینس اور ہاکی کی متعدد گراؤنڈیں بھی ہیں۔ کرکٹ کی گراؤنڈ غالباً سارے پاکستان میں اپنی نظیر آپ ہے۔ نیشنل اسٹیڈیم کی تعمیر سے پہلے کرکٹ کے بین الاقوامی مقابلے اسی گراؤنڈ میں ہوتے تھے۔ بچوں کی تفریح کے لیے منٹگمری ہال کے مشرق کی جانب بہت اچھا انتظام ہے۔ اس کے علاوہ اوپن ایئر تھیٹر بھی اسی باغ میں واقع ہے۔ ایک پہاڑی نما ٹیلے پر بڑی عمدہ سیرگاہ ہے۔ جیم خانہ کلب کی سرپرستی میں ایک لائبریری بھی قائم ہے۔ جس میں ہزارہا کتابیں ہیں۔

پاکستان بننے کے بعد اس باغ کا نام لارنس باغ کی بجائے جناح باغ ہو گیا ہے۔ اسی کے ایک حصے کو نہایت خوب صورتی سے آراستہ کر کے قائد اعظم کی ہمشیرہ کے نام پر گلستان فاطمہ کہتے ہیں۔ اب اس کے قریب جدید طرز کی ایک مسجد بھی تعمیر ہو گئی ہے جو باغ کی خوبصورتی میں اضافہ کرنے کے علاوہ تفریح کرنے والوں کو خدا کا نام یاد دلاتی رہتی ہے ——— مرتب]

علمائے کرام، دینی مدرسے

محمد علم الدین سالک

یوں تو پاک و ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی اسلامی علوم و فنون کی اشاعت شروع ہو گئی تھی کیونکہ مسلمان جہاں جاتا ہے علم کی مشعل ہاتھ میں لے کر جاتا ہے اور استقلال حاصل کرتے ہی علم و عرفان کی دولت لٹانی شروع کر دیتا ہے لیکن تیموریوں کا زمانہ دراصل علوم و فنون کی اشاعت کا زریں دور ہے۔ لاہور ان کے زمانے میں دوسرا بغداد، قرطبہ اور شیراز بنتا ہے اور اسے اتنی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے کہ دلی اور آگرہ بھی اس پر رشک کرتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان کے زمانے میں ملک امن و امان کا گہوارہ تھا، لوگ فارغ البالی کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے اور بیرونی حملوں اور اندرونی خلفشار سے ملک کو نجات حاصل ہو چکی تھی۔ اس لیے اہلِ فضل و کمال پوری دلجمعی کے ساتھ اشاعت علوم میں مشغول تھے اور طالب علم بڑی آسانی کے ساتھ ان کی صحبت میں بیٹھ کر دلی مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے تھے۔

اگرچہ اس سے پہلے بھی لاہور ایک بڑا شہر تھا اور وقتاً فوقتاً اس سے علم و عرفان کے چشمے پھوٹتے اور کچھ عرصہ کے لیے ہندوستان کے اکثر حصوں کو سیراب کر جاتے تھے مگر منگولوں کی پیہم یورشیں اور خود ملک کی لامرکزیت ان حالات کو تادیر قائم نہ رہنے دیتی تھی۔ اس لیے یہ سلسلہ ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا۔ سلطانی دور میں بعض نامور عالم ضرور پیدا ہوئے جنھوں نے باہر کی دنیا میں بڑا نام پیدا کیا مگر ان کی تعداد اتنی کم ہے کہ وہ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ مشرق میں ہر قسم کی سرگرمیوں کا مرکز دربار اور بادشاہ کی ذات ہوتی ہے۔ سارے سلطانی دور میں شاذ ہی دلی کے کسی سلطان کو لاہور آنے اور یہاں قیام کرنے کا موقع ملا ہوگا۔ اس لیے اس دور میں دلی اور آگرہ ہی ہر قسم کی ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز بنے رہے۔

اس مقالہ میں ہم نے تیموریوں کی آمد سے لے کر عالمگیر کی وفات تک کا زمانہ خاص طور پر سامنے رکھا ہے۔ بعد کے دور پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی ہے۔ کیونکہ اس کے بعد یہاں افراتفری اور اختلال پیدا ہو جاتا ہے، امن و امان لٹ جاتا اور عوام کے حالات اتنے خراب ہو جاتے ہیں کہ لاہور کی رونق آدھی بھی نہیں رہتی۔ شہر مختلف صدموں کا شکار ہوتا ہے۔ مرہٹے اور سکھ عوام کو دھڑی دھڑی کر کے لوٹتے، آبادیوں کو تباہ کرتے اور مکانوں کو نذرِ آتش کر دیتے ہیں۔ اس پریشان ماحول میں بھی علم کی جوت جلتی رہتی ہے اور علما تمام مخالف قوتوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ چنانچہ ۱۸۴۹ء میں جب انگریزوں نے لاہور کو اپنے تسلط میں لے لیا اور ان کے حکم سے ۱۸۵۰ء میں لاہور کے تحصیلدار لالہ اجودھیا پرشاد نے مردم شماری کی تو معلوم ہوا کہ مسلمانوں نے سب چیزوں سے

بڑھ کر علم و عرفان کے مرکزوں کو محفوظ رکھا ہے ذیل کا گوشوارہ ہمارے اس بیان کی تصدیق کے لیے کافی ہو گا:۔

شہر کی آبادی	پچاس ہزار تین سو پانچ
دکانیں اور مکان	اٹھائیس ہزار چھ سو چورانوے
ہاتھی	چون
اونٹ	تین سو اٹھارہ
گھوڑے	پندرہ سو پچانوے
بیل	چھبیس سو ستاسی
گائے	تیئیس سو پندرہ
بھینس	چھ سو چالیس
فارسی سکول	ایک سو سولہ
عربی سکول	چھبیس
عربی فارسی مشترکہ سکول	چوالیس
شاستری سکول	اڑتیس
باغات	تیس

مسلمانوں کی علمی سرگرمیوں کو سمجھنے کے لیے ان کے نظریہ تعلیم کی وضاحت ضروری ہے۔ آج تعلیم کو اقتصادی قدر و قیمت کی نگاہ سے جانچا جاتا ہے۔ پہلے مسلمانوں کے نزدیک تعلیم کی غرض و غایت بالکل مختلف تھی۔ تعلیم میں قرآن پاک اور اس کی تفسیر کو مرکز کی حیثیت دی جاتی تھی۔ دوسرے علوم محض قرآن پاک کو سمجھنے کے لیے حاصل کئے جاتے تھے۔ فقہ، حدیث، عقائد، صحبت اور بیعت کے ذریعے ناکردہ کار نوجوانوں میں سیرت کی پختگی، کردار کی بلندی اور ان سب سے بڑھ کر اخلاص باللہ کا جذبہ پیدا کرنا مقصود ہوتا تھا۔ اسلامی تعلیم کی یہی اساس تھی۔ ہر اسلامی ملک میں نظام تعلیم انہی بنیادوں پر استوار کیا جاتا تھا۔ آج ہم بلاخوف تردید اسے آزاد تعلیمی نظام کہہ سکتے ہیں۔ اس نظام کی تشکیل میں امام الحرمینؒ۔ امام غزالیؒ۔ امام فخرالدین رازی، نصیرالدین طوسی، قطب شیرازی، علامہ جلال الدین دوانی۔ قطب الدین رازی، میر فتح اللہ شیرازی اور ان کے بعد ملا نظام الدین فرنگی محلی، شاہ ولی اللہ اور علامہ بحرالعلوم نے حصہ لیا۔ آج یہ نظام ختم ہو چکا ہے۔ اس کی داستان اورانی پارینہ ہو کر گلدستۂ طاقِ نسیاں ہو گئی ہے۔ اس کے نشانات تک محو کر دیئے گئے ہیں مگر روایات سے جن باتوں کا پتہ چلتا ہے ان سے اس نظام کی عظمت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

اس نظام میں اُستاد کو ایک خاص اہمیت حاصل تھی اور اس میں خاص خاص اوصاف کا ہونا لازمی تھا۔ اُستاد ایک متحرک یونیورسٹی ہوتا تھا۔ اس کی نقل و حرکت علمی وقار کا پہلو لیے ہوتی تھی۔ اس کی زندگی اور زندگی کا ہر پہلو طالب علم کے لیے علمی نمونہ تھا جس کی تقلید کرنے پر طالب علم مجبور ہوتا تھا۔

تاریخ میں بعض بعض مقامات پر اس قسم کے فقرے ملتے ہیں کہ فلاں امیر یا بادشاہ نے مدرسہ تعمیر کرایا۔ اس سے ہرگز یہ

مراد نہیں کہ اس وقت مدارس کی عمارتیں اسی طریقے پر تعمیر کی جاتی تھیں جس طرح آج کل کی جاتی ہیں۔ بلکہ واقعات ہمیں بتلاتے ہیں کہ اس قسم کی تعمیرات سے ان کی غرض وغایت اپنے جمالیاتی ذوق کی تسکین ہوتی تھی۔ اگر انھیں کوئی مقام پسند آتا، وہاں کی فضا دل میں گھر کر جاتی یا پس منظر اس کا تقاضا کرتا کہ وہاں کوئی عمارت تعمیر کی جائے تو وہ بسا اوقات محلات اور سیر گاہوں کی بجائے مدارس کی عمارت کھڑی کر دیا کرتے تھے ورنہ جہاں تک درس گاہوں کا تعلق ہے ہندوستان میں ہر مقبرہ، ہر خانقاہ اور ہر مسجد مدرسے کا کام دیتی تھی اور اہلِ دول ان کی سرپرستی کرتے تھے۔

بابر کے اجداد

بابر کی اولاد نے صدیوں برعظیم پاک و ہند پر بڑی شان سے حکومت کی۔ ان کی حکومت اپنی شوکت و عظمت اور ثقافتی سرگرمیوں کی وجہ سے آج بھی ہر ایک سے خراجِ تحسین حاصل کرتی ہے۔

آلِ بابر تیمور کے جانشین اور وارث تھے ——— وہ تیمور جو دنیا کی نگاہوں میں ایک سفاک اور جابر حکمران، خونخوار انسان اور ظالم و سنگدل فاتح تھا۔ اس کی تصویر میں کشت وخون، لوٹ مار اور جبر و تشدد کے نشانات خاص طور پر نمایاں کیے جاتے ہیں۔ مورخ کہتے ہیں کہ وہ جہاں جاتا، آگ اور خون کا کھیل کھیلتا، لوٹ مار کرتا اور انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکتا اور جب چاہتا انھیں ذبح کر کے ان کی کھوپڑیوں سے مینار کھڑے کر دیتا۔ وہ شہروں کو لوٹتا اور انھیں نذرِ آتش کر دیتا۔ اس کے جلو میں آگ اور خون کے دریا بہتے اور جہاں اس کا قدم جاتا مظلوموں کی چیخ و پکار سنائی دیتی۔

مگر یہ اس کی تصویر کا فقط ایک رُخ ہے۔ تیمور ملک گیری، کشور کشائی اور جہانگیری کے ساتھ ساتھ علوم و فنون کی بھی سرپرستی کرتا تھا اور اس میں بھی ہمیں وہی جوش وخروش نظر آتا ہے جو ہم اس کی ملک گیری کے معرکوں میں دیکھتے ہیں۔ گبن کہتا ہے:

> "تیمور اپنے خاص الخاص دوستوں میں بہت متین اور سنجیدہ ہوتا تھا۔ گو وہ عربی
> زبان سے ناواقف تھا مگر ترکی اور فارسی بڑی بے تکلفی اور روانی سے بولتا تھا
> وہ مشہور علماء کے ساتھ تاریخ اور دوسرے علمی مضامین پر گفتگو کرنے میں بڑی مسرت
> محسوس کرتا تھا۔"[1]

تیمور علوم و فنون کا قدردان تھا اور اہلِ کمال کی دل کھول کر سرپرستی کرتا تھا۔ اس کی داد و دہش کا یہ اثر ہوا کہ اس دور کے بڑے بڑے عالم، شاعر اور فاضل خود بخود اس کے دربار میں کھنچ آتے اور اس طرح سمرقند اور بخارا دنیا کے بہترین ثقافتی، علمی اور ادبی مرکز بن گئے۔ اس کے قائم کیے ہوئے مدارس اور کتب خانوں کی گرتی ہوئی عمارتیں آج بھی اکثر شہروں میں ملتی ہیں۔ اس نے اشاعت علوم و فنون میں جس سرگرمی کا اظہار کیا وہ کسی اور فاتح کی تاریخ میں نظر نہیں آتا۔

تیمور ہر وقت اور ہر موقعہ پر، بزم ہو یا رزم، میدانِ جنگ ہو یا محفلِ طرب، علما و فضلا کی ایک زبردست جماعت اپنے ساتھ رکھتا تھا جنگ سے فارغ ہونے کے بعد وہ ان کی خدمت میں ایک سچے طالب علم کی طرح بیٹھتا۔ علم و حکمت کے موتی چُنتا اور بڑی عقیدتمندی کے ساتھ ان کی باتوں سے مستفیض ہوتا۔ ہندوستان کے حملے میں جب دہلی کے شہنشاہ سلطان محمود سے معرکہ آرائی ہوتی تو اس وقت بھی بڑے

---

[1] گبن تاریخ عروج و زوال روما باب ۵۵۔

بڑے عالم اس کے ساتھ تھے ۔ امیر تیمور نے ان سے پوچھا " آپ کا مقام کہاں ہونا چاہیئے ؟ " وہ ہاتھیوں سے بہت ڈرے ہوئے تھے ۔ اس لیے انھوں نے کہا کہ ہماری صفیں بیگمات کے خیموں کے پیچھے آراستہ کی جائیں ۔ چنانچہ امیر تیمور نے ایسا ہی کیا۔[1]

دہلی جاتے ہوئے امیر تیمور کو تلنبہ (ضلع ملتان) میں ایک معرکہ پیش آیا ۔ مگر معمولی سی جھڑپ کے بعد شہر پر قبضہ ہو گیا ۔ تیمور اپنی توزک میں لکھتا ہے :-

" میرے وزرا نے تلنبہ کے باشندوں پر دولاکھ روپیہ تاوان ڈالا اور اسے وصول کرنے کے لیے کارندے مقرر کئے ۔ شہر میں سادات بھی آباد تھے جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد سے تھے اور علمائے اسلام بھی جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث کہلاتے ہیں ۔ سادات اور علما میرے دربار میں ہمیشہ تعظیم اور احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں اس بنا پر میں نے حکم دیا کہ ان دونوں جماعتوں سے کسی قسم کا تاوان وصول نہ کیا جائے ۔ بلکہ میں نے انھیں اپنے حضور میں طلب کر کے خلعت اور عربی گھوڑے عطا کیے "[2]

تیمور اپنی توزک میں ایک اور جگہ لکھتا ہے کہ یہ میرا حکم تھا کہ جو لوگ طبقہ سادات اور علما سے تعلق رکھتے ہوں ان کا احترام کیا جائے ، ان کی ہر ضرورت پوری کی جائے ۔ اور ان کے ساتھ پوری پوری رعایت برتی جائے "[3]

ملا شرف الدین علی یزدی امیر تیمور کے کردار پر تبصرہ کرتا ہوا لکھتا ہے کہ :-

" صاحبقران کے ساتھ سفر و حضر میں سادات ، علما ، فضلا ، اہل فضل و دانش برابر رہتے تھے ۔ اس کے حکم کے مطابق وہ روز مرہ کے واقعات قلم بند کرتے صاحبقران کے افعال و اقوال ، ملک و ملت کے احوال پوری تحقیق کے ساتھ لکھتے ، ان میں نہ تصرف کرتے نہ اضافہ ۔ ۔ ۔ ۔ حتیٰ کہ صاحبقران کی شجاعت و بسالت میں بھی انھیں مبالغہ کرنے کی اجازت نہ تھی "[4]

امیر تیمور کی یہ معارف پروری اور علم نوازی اس کی نسل میں منتقل ہوتی رہی ۔ اس کا پوتا الغ بیگ ریاضی ، علم ہیئت اور نجوم کا بہت بڑا ماہر تھا ۔ الغ بیگ کے دونوں بیٹے حقیقی معنوں میں صاحب سیف و قلم تھے اور نظم و نثر پر پوری پوری قدرت رکھتے تھے ۔ شاہ رخ میرزا ایک بلند پایہ شاعر تھا ۔ سلطان حسین میرزا والیٔ ہرات کا دربار اپنی علمی ذوق و ثقافتی سرگرمیوں کی وجہ سے اس زمانے میں بے نظیر تھا ۔ میران شاہ ، محمد سلطان ، بائیسنغر اور عمر شیخ وغیرہ کے نام بھی دنیا کی علمی و ادبی تاریخ میں آفتاب و ماہتاب

---

[1] ظفر نامہ جلد دوم صفحہ ۱۰۱ ۔ [2] ایلیٹ جلد سوم صفحہ ۴۱۴ ۔
[3] توزک تیموری صفحہ ۲۱۱ ۔
[4] ظفر نامہ جلد اول صفحہ ۲۴ - ۲۵

کی طرح چمک رہے ہیں۔ ایک بہت بڑا مستشرق کہتا ہے :-

"ان کے دورِ حکومت نے ترکوں کے نام کو زندۂ جاوید کر دیا۔ ان کی شہرت چمک اٹھی۔ ان کی سرگرمیوں نے ادباء اور علماء کے گروہ کے گروہ اپنی طرف کھینچ لیے جن کے علمی و ادبی کارناموں نے ایک دفعہ پھر بڑوں کے تمدنی و ثقافتی کارناموں کی یاد تازہ کر دی شاہ رخ میرزا ایک بلند پایہ شاعر تھا۔ الغ بیگ نے ریاضی اور علم نجوم جیسے دقیق مضامین کے مطالعہ میں نام پیدا کیا۔ اس خاندان کی تاریخ شعراء، فلاسفر، علماء اور فضلاء کی وجہ سے شہرت عام کی مالک بن گئی اور آج مشرق میں ہر جگہ ان کا نام بڑی عزت اور احترام سے لیا جاتا ہے" ؎۱

بابر کا باپ عمر شیخ میرزا اپنی علمی اور ادبی حیثیت سے فرغانہ کی روح و رواں سمجھا جاتا تھا۔ بابر اپنی تزک میں اس کی تصویر کشی کرتا ہوا یوں لکھتا ہے :-

"عمر شیخ میرزا حنفی مذہب رکھتا تھا۔ وہ خوش عقیدہ تھا۔ پانچوں وقت کی نماز باقاعدہ پڑھتا۔ بیشتر وقت تلاوت قرآن پاک کرتا۔ وہ خواجہ عبیداللہ احرار کا مرید تھا۔ خواجہ احرار اسے فرزند کہتے تھے۔ وہ خاصا پڑھا لکھا آدمی تھا۔ خمسہ نظامی، مثنوی مولانا روم، خمسہ خسرو۔ تاریخ کی بیشتر کتابیں اس کے مطالعہ میں رہتی تھیں۔ شاہنامہ سے اسے خاص شغف تھا۔ طبیعت اگرچہ موزوں تھی مگر شعر نہ کہتے تھے"

یہ تھے بابر کے والد عمر شیخ میرزا۔ بابر کی والدہ قتلق نگار خانم بھی اکثر علوم میں کافی دسترس رکھتی تھی۔ وہ تاشقند کے مشہور سردار یونس میرزا کی بیٹی تھی جو فارسی کا زبردست انشا پرداز اور اسلامی علوم کا بہت بڑا فاضل تھا۔ اس نے اپنی بیٹیوں کو خود تعلیم و تربیت دی تھی۔ اس کی دوسری بیٹی خوب نگار خانم میرزا حیدر دوغلات صاحب تاریخ رشیدی کی ماں تھی۔ میرزا حیدر تاریخ رشیدی میں اپنے نانا یونس خان کی علمی تصویر یوں پیش کرتا ہے :-

"خان موصوف بارہ برس تک مولانا شرف الدین علی یزدی کی صحبت میں رہے اور ہر قسم کے فضائل حاصل کیے۔ ان کے پایہ کا خان نہ ان سے پہلے ہوا ہے نہ ان کے بعد۔ جب مولانا یزدی کا انتقال ہو گیا تو خان موصوف یزد سے عراق، فارس اور آذربائیجان کی طرف چلے گئے۔ وہاں بھی تحصیل علوم کی۔ پھر شیراز پہنچے۔ وہاں کی علمی صحبتوں میں بھی شریک رہے۔ یہاں تک کہ لوگ تعظیم و تکریم کی بنا پر انھیں استاد یونس کے نام سے یاد کرتے تھے"

؎۱ ہارٹ آف ایشیا صفحہ ۱۷۹ - ۱۸۰ -

"خان موصوف بہت سے فضائل کے مالک تھے۔ قرآن کی قرأت خوب کرتے، موسیقی اور مصوری میں بھی کافی مہارت تھی، ان کی طبیعت بھی موزوں تھی"[1]

عہد ظہیر الدین بابر ۸۹۹ھ / ۱۴۹۴ء تا ۹۳۷ھ / ۱۵۳۰ء

بابر ان سب سے متاثر تھا۔ بالخصوص اپنی نانی ایسان دولت اور والدہ قتلق نگار خانم سے۔ تزک میں وہ اس کا اعتراف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے بابر بنانے والی میری ماں اور میری نانی ہیں یہ ہر حالت میں سائے کی طرح میرا ساتھ دیتی رہیں۔ بابر زبردست شاعر اور نادر الکلام نثر نگار تھا۔ اس کی تزک چغتائی ترکی ادبیات کا شاہکار ہے۔ بابر سادہ فطرت تھا اس کا سب سے بڑا ثبوت اس کی تزک کی سادہ نگاری ہے۔ اس کا سینہ محبت، شفقت اور انسانی ہمدردی کا خزینہ تھا۔ اس نے بڑے بڑے انقلابات دیکھے۔ عسرت و تنگدستی میں دن گزارے۔ شان و شوکت کے ساتھ تخت شاہی پر بھی جلوس کیا مگر اس کی طبیعت کی درویشی اور شعار دوست پروری ہر حالت میں قائم رہی۔ اس کی تزک سے اس زمانے کی علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا ایک دلکش مرقع تیار ہو سکتا ہے۔

قدرت نے بابر کو ہندوستان میں زیادہ دن رہنے کا موقع نہ دیا۔ ورنہ وہ اسے وسط ایشیا اور ایران کا مدِ مقابل بنا دیتا۔ بہرحال اس نے یہاں پہنچ کر علماء کی قدردانی کی اور انھیں موقع دیا کہ وہ اطمینانِ قلب کے ساتھ علم و ادب کی خدمت میں مصروف ہو جائیں۔ ملا زین الدین خوافی وسط ایشیا سے اس کے ساتھ آئے تھے۔ انھوں نے آگرہ میں مدرسہ قائم کیا۔ بابر نے دل کھول کر اس کی سرپرستی کی۔ یہاں کے قدیم مدرسے جو سیاسی افراتفری کی وجہ سے بہت حد تک ناکارہ ہو چکے تھے بابر کی سرپرستی سے ان میں پھر رونق پیدا ہونی شروع ہوئی۔

بابر کو لاہور میں زیادہ دیر ٹھہرنے کا موقع نہ ملا۔ ورنہ وہ یہاں بھی علم و ادب کی آبیاری کرتا اور اپنی معارف پروری کا ثبوت دیتا، اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ جب لاہور اس کے قبضے میں آیا تو دولت خاں لودھی والئے لاہور کا عظیم الشان کتب خانہ اس کے ہاتھ آیا۔ اس میں کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ بابر نے چند قلمی نوادرات اپنے پاس رکھے، کچھ کامران اور کچھ ہمایوں کو دے دیئے۔ جو کتابیں باقی بچیں وہ اپنے خاص خاص امیروں اور لاہور کے نامور علماء میں بانٹ دیں۔

عہد نصیر الدین ہمایوں ۹۳۷ھ / ۱۵۳۰ء تا ۹۶۳ھ / ۱۵۵۶ء

بابر کے چاروں بیٹوں نے علم و ادب کے مختلف شعبوں میں نام پیدا کیا۔ بالخصوص کامران نے شاعری میں اور ہمایوں نے ریاضی اور علم نجوم میں مگر بابر کے بعد ہمایوں تخت و تاج کا وارث ہوا۔ اس میں باپ کی ساری خوبیاں موجود تھیں البتہ وہ عزم صمیم کی دولت سے محروم تھا اور اس کی طبیعت میں مروت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی جس کی وجہ سے اسے ساری عمر

---

[1] تاریخ رشیدی انگریزی ترجمہ صفحہ ۴۷۔

پریشانی میں مبتلا رہنا پڑا۔ اس کے دشمن اور بھائی اس کے لیے یکساں وبالِ جان تھے مگر ان پریشانیوں کے باوجود اس نے علم کی مشعل کو روشن رکھا۔ اسے جب موقعہ ملتا اپنی تسکینِ قلب و روح کے لیے علما کی بزم آرائی کرتا۔ ملا نظام الدین ہروی کے قول کے مطابق اس کی صحبت میں عالم، فاضل اور بڑے بڑے امیر ہر وقت موجود رہتے تھے۔ اس کی علمی محفلیں رات کے پہلے حصے میں شروع ہوتیں اور صبح تک جاری رہتیں۔ ان محفلوں میں آدابِ نشست و برخاست کا خاص خیال رکھا جاتا، اور علمی موضوعات پر گفتگو ہوتی[1]

ایک دن کا ذکر ہے کہ دربار خاص منعقد تھا۔ ہمایوں کے تمام امیر اور مقربین اس میں موجود تھے۔ بیرم خان خاناں بھی شریک تھا۔ ہمایوں اسی کو خطاب کر رہا تھا۔ رات زیادہ گذر چکی تھی، بیرم خاں کئی راتیں جاگ جاگ کر بسر کر چکا تھا اس لیے نیند کے مارے اس کا بُرا حال تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہو ہو جاتی تھیں۔ اچانک بادشاہ کی نگاہ اس پر پڑی۔ اس نے بیرم کو اس حالت میں دیکھ کر کہا۔

"بیرم! من بہ شما می گویم"

بیرم خاں چونک پڑا۔ آداب بجا لایا۔ اور عرض کی۔ قربانت شوم۔ بزرگوں سے یہ سنا ہے کہ تین مقامات پر تین چیزوں کی حفاظت واجب ہوتی ہے، بادشاہ کے حضور میں آنکھوں کی، درویشوں کے حضور میں دل کی اور علما کے سامنے زبان کی۔ میں حضور کی ذات میں تینوں صفات موجود پاتا ہوں۔ اس لیے سوچ رہا ہوں کہ کس کس کی حفاظت کروں۔ اس جواب سے ہمایوں خوش ہو گیا اور تکدر کے تمام آثار اس کے چہرے سے غائب ہو گئے۔ (مآثر الامرا جلد اول)

بیرم خاں اس دور کی سبب سے بڑی شخصیت ہے۔ وہ ہمایوں کا دوست، سپہ سالار، مشیر اور وزیر تھا۔ دونوں کے دونوں علم پرور اور ادب نواز تھے۔ ان کی آپس میں علمی اور ادبی موضوعات پر خط و کتابت بھی ہوتی رہتی تھی۔ جب ہمایوں کی قسمت نے پلٹا کھایا اور اس کا ستارہ عروج پر آنے لگا تو اس نے فوج کی نئے سرے سے تنظیم کی۔ کامران کے خلاف مہم جاری کی اور قندھار پر حملہ کیا۔ بیرم خاں اس وقت کسی اور مہم میں مصروف تھا۔ ہمایوں نے بڑی سمجھداری سے فوج کو لڑایا اور قندھار کو محاصرے میں لے لیا۔ یہ قلعہ بہت مضبوط تھا۔ اس کی فصیل سات گز چوڑی تھی۔ اس لیے بعض امیروں کا خیال تھا کہ اس کا تسخیر ہونا کچھ آسان بات نہیں مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد قندھار پر شاہی پرچم لہرانے لگا۔ ہمایوں کو اس سے بے پایاں مسرت حاصل ہوئی۔ اس نے اس خوشی میں اپنے دیرینہ رفیق اور وفادار سپہ سالار کو بھی شریک کرنا چاہا۔ اور ایک خط میں فتح کی اطلاع دیتے ہوئے اپنی یہ نظم جو اسی واقعہ کے متعلق تھی بیرم خاں کے پاس روانہ کی ہے

باز فتحِ ز نصیب دُشمنے نمود — کہ دل دوستاں از و بکشود

شکر للہ کہ باز شادانیم — بہ رُخِ یار و دوست خندانیم

دشمنان را بکامِ دل دیدیم — میوۂ باغِ فتح را چیدیم

---

[1] طبقات اکبری جلد دوم صفحہ ۸۴ - ۸۵۔

روز نو روز بیرم است امروز — دل احباب بے غم است امروز
ہمہ اسباب عیش آمادست — دل بفکر وصالت افتادست
گوش خرم شود ز گفتارت — دیدہ روشن شود ز دیدارت
بعد از آں فکر کار ہند کنیم — عزم تسخیر ملک سند کنیم

ہر درے بستہ کشادہ شود
ہر چہ خواہیم از آں زیادہ شود

اس خط کے حاشیے پر اپنی یہ رباعی بھی درج کی :–

اے آنکہ انیس خاطر محزونی
چوں طبع لطیف خویشتن موزونی
بے یاد تو نیستم زمانے ہرگز
آیا تو بہ یاد من محزوں چونی

بیرم خاں نے خط پڑھا۔ اس کا جواب لکھا اور آخر میں اپنی یہ رباعی درج کی :–

اے آنکہ بذات سایۂ بے چونی
از ہر چہ ترا وصف کنم افزونی
چوں می دانی کہ بے تو چوں می گذرد
چوں می پرسی کہ در فراقم چونی

ہمایوں کو علم نجوم اور ریاضی کے مطالعہ کا بے حد شوق تھا۔ اس نے ایک طالب علم کی طرح یہ علوم حاصل کئے اور ان کا مطالعہ زندگی کے آخری سانس تک جاری رکھا۔ چرخیات اور فلکیات کے اس مذاق کی بدولت ملک میں علم ہیئت کو بڑی ہر دلعزیزی حاصل ہوئی۔ اس کے مطالعہ میں اکثر لوگ دلچسپی لینے لگے اور ان علوم کا چرچا شاہی دربار سے نکل کر ملک میں عام ہو گیا۔ ہمایوں نے عملی طور پر تجربات کئے۔ کرے اور اصطرلاب بنوائے۔ اس کے بعد ان کا رواج مدارس میں عام ہو گیا۔ وہ خود بھی ایک خاص قسم کے اصطرلاب کا موجد ہے جسے اصطرلاب ہمایونی کہتے ہیں۔

ہمایوں کے زمانے میں لاہور اصطرلاب سازی کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ یہاں کے بنے ہوئے کرے اور اصطرلاب آج بھی بعض عجائب خانوں میں محفوظ ہیں۔ چنانچہ ندوۃ العلما کی لائبریری میں ۱۰۴۹ھ کا بنا ہوا ایک اصطرلاب موجود ہے جس پر یہ کتبہ کندہ ہے :–

"عمل ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ بن شیخ
الہ داد اصطرلابی ہمایونی لاہوری ۱۰۵۹ھ"

اس خاندانی اصطرلاب کے بارے میں تاریخ کی ورق گردانی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ آئین اکبری سے فقط اتنا معلوم ہوتا ہے کہ

جنت آشیانی ہمایوں کے زمانے میں مولانا مقصود ہروی مشہور اصطرلاب ساز تھے۔ یہ اصطرلاب، کرہ اور دوسرے ہیئت اور نجوم کے آلات کی تجارت کرتے تھے۔ ان میں بعض اصطرلاب ایسے بھی ہوتے تھے جو لوگوں کو حیرت میں ڈال دیتے تھے۔ ضیاء الدین اور اس کے خاندان کے بنائے ہوئے اصطرلاب اور کرے ہندوستان کے بعض اور کتب خانوں کی بھی زینت ہیں۔ چنانچہ نواب سالار جنگ بہادر حیدرآباد دکن کے کتب خانے میں ایک اصطرلاب ہے جس پر یہ عبارت کندہ ہے :-

"صنعت استاذ الہداد اصطرلابی لاہوری سنہ ۹۷۵ھ"

استاد الہداد کا زمانہ اس کتبے کی رو سے اکبر کا دور حکومت ہے۔ اس مشہور استاد کے پوتے ملا قائم محمد کا بنایا ہوا اصطرلاب کلکتہ میں قاضی عبیداللہ داری کے پاس تھا۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے اسے خود دیکھا تھا۔ اس پر یہ عبارت درج ہے :-

"عمل قائم محمد بن عیسیٰ بن الہداد اصطرلابی ہمایونی سنہ ۱۰۳۲ھ"

قائم محمد کا تیار کیا ہوا کرہ بانکی پور کے مشہور کتب خانے میں اب تک محفوظ ہے۔ یہ ۱۰۴۷ھ / ۱۶۳۷ء میں تیار ہوا تھا۔ اس کے دوسری طرف یہ کتبہ منقوش ہے :-

"تمت این کرہ مکمل مشتمل بیک ہزار و بست و دو کواکب کہ جمیع ازاں چہل و ہشت
صورت مرصودہ نمودہ اند۔ اہل (۹) علماء و حکماء تنجیم چنانچہ مرصودہ در رصد مرزا الغ بیگ
است در تقویم ہر کوکب تا ہذہ سنہ درجہ زیادہ کردہ ایم بحساب حکماء و علمائے این
فن تا این تاریخ سنہ ۱۰۴۷ھ"

یہ کرہ خالص پیتل کا بنا ہوا ہے اور ہر ستارہ اور برج کے نزدیک چاندی کی میخ ہے۔

قائم محمد کے بیٹے ضیاء الدین کے بنائے ہوئے کرے اور اصطرلاب بھی ادھر ادھر مل جاتے ہیں۔ پھلواری شریف میں اس کا بنایا ہوا کرہ مولوی یوسف صاحب کے کتب خانے میں ہے۔ اس کا وزن سوا پونڈ ہے۔ یہ کرہ اس خاندان کے قبضے میں ۱۲۳۶ھ / ۱۸۲۲ء سے چلا آتا ہے۔

نواب صدر یار جنگ بہادر حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے کتب خانہ حبیب گنج میں (جو اب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں منتقل ہو چکا ہے) ۱۰۶۴ھ / ۱۶۵۴ء کا بنا ہوا ایک اصطرلاب ہے۔

اسی طرح طبیہ کالج علی گڑھ میں بھی اس کا بنایا ہوا ایک کرہ موجود ہے جو ۱۰۶۴ھ / ۱۶۵۴ء میں تیار ہوا تھا۔ ۱۰۷۱ھ کا بنا ہوا ایک کرہ برلین کے عجائب خانے میں ہے۔ اس کے علاوہ یورپ اور ہندوستان کے بعض اور کتب خانوں میں بھی لاہور کے اس مشہور اصطرلاب ساز خاندان کی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔ اس خاندان کا اقتدار شیخ الہداد کے زمانے سے شروع ہوتا ہے جس کا تعلق ہمایوں بادشاہ سے تھا۔ اس کا بیٹا ملا عیسیٰ تھا جو اپنے وقت کا فاضل اور عالم تھا۔ علم کی دولت کے ساتھ ساتھ اسے اپنے خاندانی فن سے بھی خاصا لگاؤ تھا۔ اس خاندان کا آخری فرد جسے کرہ اور اصطرلاب سازی میں ناموری حاصل ہوئی وہ ضیاء الدین محمد تھا۔ وہ قائم محمد کا بیٹا تھا اور ملا عیسیٰ کا پوتا۔ اس نے شاہجہان اور عالمگیر کا زمانہ پایا۔ اس خاندان کی بدولت کرہ سازی اور اصطرلاب سازی کے فن کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ (اسلامک کلچر ۱۹۳۵ء)

ہمایوں کے اس مذاق کو دیکھ کر شعرا نے ان علوم و فنون کی اصطلاحات کو اپنے قصیدوں میں بڑی بے تکلفی سے استعمال کرنا شروع کیا۔ چنانچہ بیرم خاں نے ہمایوں کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا جس میں یہ مصطلحات بڑی بے تکلفی سے استعمال کی ہیں۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے اس قصیدے کا ایک حصہ ہمارے لیے اپنی کتاب میں محفوظ کر دیا ہے ؎

آں چرخ چیست کامدہ بر محورش مدار
آں بدر کز میانہ شہابش کند گذار
با آنکہ می کند بہ و خور برابری
آمد بجاں ز حلقہ گوشان شہریار
نا ردہ بہ چشم کرکبہ آفتاب را
چوں مہچہ لوای شہنشاہ نامدار
پیوستہ آسمان و زمیں زیر حکم اوست
ہمچوں نگین خاتم شاہ جم اقتدار
برکف نہادہ خوان زری پر ز اشرفی
تا بر قدوم اشرف شاہاں کند نثار
شاہ بلند قدر ہمایوں کہ از شرف
بر در گہش سپہر نہد روی انقیاد

اس ترقی اور ہمایوں کی سرپرستی کے باوجود اس دور کے مدارس اور علما کا حال بہت کم دستیاب ہوتا ہے کیونکہ ہمایوں جب تک ہندوستان میں رہا اسے چین سے ایک جگہ بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ تاہم لاہور ایک علمی مرکز ضرور بنا رہا۔ اس دور کے جن عالموں نے اشاعت علوم و فنون میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان کا حال درج ذیل ہے :-

سید عبداللہ لاہوری

ہمایوں کے زمانے میں لاہور کے حالات بڑے پر آشوب تھے۔ ان حالات میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھنا کسی کے لیے ممکن نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود بعض علما نے اس مشعل کو روشن رکھا اور بڑے سکون اور اطمینان کے ساتھ اپنے فرائض ادا کیے۔ ان میں سید عبداللہ لاہوری کا نام سر فہرست ہے۔ آپ سید عبدالخالق بھاکری کے فرزند رشید اور سلسلہ قادریہ سے وابستہ تھے۔ معقولات اور منقولات میں بڑا اونچا درجہ رکھتے تھے۔ صاحب تذکرہ علمائے ہند لکھتے ہیں کہ

"تمام عمر شریف خود در تعلیم و تدریس فقہ و حدیث و تفسیر بسر بردہ"[1]

آپ نے دولت دنیا کی کبھی پروا نہ کی، نہ کسی امیر اور وزیر کے سامنے دست سوال دراز کیا مگر اپنے دروازے سے کسی سائل کو خالی ہاتھ نہ جانے دیا۔ آپ ۹۴۳ھ/۱۵۳۶ء میں فوت ہوئے اور آپ کا مزار شیخ جان محمد لاہوری کے مزار کے پاس واقع ہے۔

---

[1] علمائے ہند ص ۱۰۳ ۔

شیخ حمید سنبھلی آپ سنبھل کے جلیل القدر فرزند ہیں۔ وقت کے علامہ اور تفسیر میں یکتائے روزگار تھے قرآن کریم کی باریکیوں کو خوب کھول کھول کر بیان کرتے تھے۔ اس معاملے میں اللہ تعالیٰ نے آپ کا سینہ کھول دیا تھا۔ ہمایوں آپ کا بہت معتقد تھا۔ جب ہمایوں شاہ طہماسپ صفوی کی مدد سے ہندوستان کو دوبارہ مسخر کرنے کے لیے تیاریوں میں مصروف تھا تو آپ اسے ملنے کے لیے کابل گئے۔ راستے میں کچھ عرصہ لاہور ٹھہرے تفسیر اور قرآن کے عاشق آپ کے گرد پروانوں کی طرح جمع ہو گئے آپ نے ان کے اصرار پر کچھ عرصہ یہاں قیام کیا اور انہیں پڑھایا، یہاں سے چل کر آپ کابل پہنچے۔ بادشاہ سے ملاقات کی۔ ایک دن آشفتہ ہو کر بادشاہ سے کہا :-

" بادشاہم! تمام لشکر شمارا رافضی دیدیم "

بادشاہ نے پوچھا۔ یہ آپ کیسے کہہ رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا :

" ہر جا نام لشکریان شما یار علی، گفش علی، حیدر علی
یافتم و ہیچ کس را ندیدم کہ بنام یاران دیگر بودہ باشد "[1]

بادشاہ کو غصہ آیا۔ قلم اس کے ہاتھ میں تھا۔ اسے زمین پر پھینکا اور کہا کہ میرے دادا کا نام عمر شیخ ہے۔ مجھے اور کسی کا پتہ نہیں۔

عہد جلال الدین اکبر ۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء تا ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء

ہندوستان میں علوم و فنون کی ترویج و اشاعت کرنے اور مدارس کو فروغ دینے والا اکبر ہی ہے۔ اس کی تخت نشینی کے ساتھ علوم و فنون کی تاریخ ایک نیا ورق الٹتی ہے اور تعلیم کو غیر معمولی طور پر اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ مگر ہمیں یہاں اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ اس دور میں تعلیم کو جس قدر فروغ حاصل ہوا اس میں سیاسی اغراض کو قطعاً دخل نہ تھا۔ تعلیم آزاد تھی۔ اس پر کسی قسم کی پابندی نہ تھی۔ نہ حکومت اس میں دخل دینا گوارا کرتی تھی نہ اہل تعلیم اسے برداشت کر سکتے تھے کہ تعلیم اس طرح ہو جس طرح حاکم وقت چاہتا ہے۔

اکبر کے بارے میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ امّی محض تھا مگر یہ دعویٰ بالکل بے اصل معلوم ہوتا ہے۔ پھر اس صورت میں کہ ہمایوں خود عالم و فاضل تھا۔ علم اس خاندان کی میراث تھا اس نے بیٹے کی تعلیم کے لیے پورا پورا بندوبست کیا، جب بھی اکبر کے کسی معلم سے کسی قسم کی کوتاہی سرزد ہوئی ہمایوں نے اسے ہٹا کر دوسرا عالم مقرر کر دیا۔ اس حد تک تو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اکبر کھیل کود اور سیر و شکار کا زیادہ شوقین تھا۔ پڑھنے لکھنے میں اس کا دل نہ لگتا تھا۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ اکبر حرف شناسی تک نہ جانتا تھا۔ ہاں جب ہم اس کا مقابلہ اس خاندان کے دوسرے شہزادوں سے کرتے ہیں تو وہ علم کی دولت کے لحاظ سے بالکل بے مایہ نظر آتا ہے۔ اور اگر اس بنا پر یہ کہہ دیا جائے کہ وہ جاہل و امّی تھا تو کوئی بات نہیں۔ پھر بھی ہمیں یہ ضرور دیکھنا چاہیئے کہ اکبر نے یہاں کی تعلیم کے سلسلے میں جو کچھ کیا، کیا کوئی جاہل یا امّی انسان کر سکتا ہے؟ ابوالفضل آئین اکبری میں لکھتا ہے۔

---

[1] دربار اکبری۔

"بادشاہ نے حرف آموزی کا ایک ایسا طریقہ اختیار کیا تھا جس کی بدولت بچے برسوں کی تعلیم مہینوں میں ختم کر لیتے تھے" [1]

اکبر نے بادشاہ بننے کے بعد اپنی تعلیمی کمی کو کئی صورتوں سے پورا کر لیا تھا وہ علوم و فنون کا سرگرم حامی اور بہت زیادہ شوقین اور قدر دان تھا۔ اس سلسلے میں رتبے سے بڑا فاضل بادشاہ بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے فارسی ادب کی تمام مشہور اور معیاری کتابیں سنیں ان میں سے چند ایک کا ذکر ہمیں آئین اکبری میں ملتا ہے۔ مثلاً: بزم نامہ۔ حدیقہ حکیم سنائی۔ کیمیائے سعادت۔ گلستان اور بوستان۔ شاہنامہ فردوسی۔ خمسۂ نظامی، مثنوی مولانا روم، جام جم۔ خمسۂ امیر خسرو۔ کلیات جامی۔ کلیات خاقانی۔ دیوان انوری، مکتوبات شرف الدین یحییٰ منیری اور تاریخ کی تقریباً تمام مستند کتابیں، ان کتابوں میں سے ہر روز اسے کوئی نہ کوئی کتاب پڑھ کر سنائی جاتی۔ یہ ایسا معمول تھا جس میں اکبر نے کبھی فرق نہ آنے دیا۔ جہاں پڑھنے والا کتاب کو ختم کرتا وہاں اکبر اپنے ہاتھ سے نشان بنا دیتا اور جب کتاب ختم ہو جاتی تو اپنی جیب سے پڑھنے والے کو انعام دیتا۔ نقیب خاں عام طور پر اسے تاریخ سنایا کرتا تھا۔ اس طرح کتابیں سن سن اس کا مطالعہ بہت وسیع ہو گیا تھا۔ کوئی تاریخی واقعہ ہو یا علم و فن کی بات، فقہ کا مسئلہ ہو یا علم و حکمت کے نکات، فلسفہ ہو یا الٰہیات اکبر ان پر مربوط تقریر کرتا۔ ہر پہلو سے بحث اٹھاتا۔ اور اس میں پورے انہماک اور سرگرمی سے حصہ لیتا۔

اکبر کی خوش قسمتی تھی کہ اس کے زمانے میں بعض یگانۂ روزگار ہستیاں اس کے گرد و پیش جمع ہو گئی تھیں۔ سیاسی طور پر اس کا زمانہ کتنا ہی پرعظمت کیوں نہ ہو مگر درحقیقت یہ زمانہ علمی اور فنی حیثیت سے اپنی مثال آپ تھا اور اسی بنا پر اکبر کی شہرت نزدیک و دور پھیل گئی تھی۔ ہندوستان میں آلِ بابر کی حکومت علم پروری، معارف نوازی کی ایک مسلسل تاریخ ہے لیکن عجیب تر بات یہ ہے کہ اس عظیم الشان سلطنت کا یہ قصر رفیع اکبر جیسے کم سواد بادشاہ کے عہد میں تعمیر ہوا۔ اس کی توجہ، تیز بینا نہ سرپرستی اور قدر دانی کی بدولت ایک طرف تو سنسکرت اور عربی زبان کی مشہور کتابوں کے تراجم فارسی میں ہوئے، دوسری طرف فارسی زبان میں بے شمار کتابیں لکھی گئیں۔ ان تصانیف کی کثرت کو دیکھ کر ایک فاضل مستشرق ڈاکٹر لیتھے اسے "فارسی ادب کی ہندی بہار" کے نام سے یاد کرتا ہے۔

اس عہد میں اسلامی علوم و فنون کی ترویج و اشاعت کے لیے جا بجا مدارس قائم ہوئے اور تعلیم میں نئے نئے تجربات کیے گئے۔ یہ اکبر کی طبیعت کی اپج کہیئے یا جدت طرازی کا جذبہ کہ اس نے انسان کی حقیقی زبان معلوم کرنے کے لیے گنگ محل قائم کیا۔ اکبر نے پہلی مرتبہ یہ کوشش کی کہ تعلیم عام ہو۔ اس نے اس سلسلے میں پوری توجہ مرکوز کی، پورے خلوص کے ساتھ تعلیم کو عام کرنے کا بیڑا اٹھایا اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا یہ اس کا سب سے بڑا کارنامہ ہے جس کے مقابل میں اس کی ساری فتوحات اور سرگرمیاں ہیچ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس کے زمانے میں عام سکولوں کا رواج ہوا۔ مشترکہ سکول جاری ہوئے جن میں ہندو اور مسلمان ایک ہی استاد کی خدمت میں بیٹھ کر تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اس نے مختلف طلباء کے لیے مختلف قسم کے نصاب

---

[1] آئین اکبری جلد اوّل آئین ۲۵۔

مقرر کیے گئے۔ چنانچہ ہندوؤں کے لیے بھی ایک خاص نصاب مقرر ہوا۔ اس پر بحث کرتے ہوئے، علامی ابوالفضل لکھتا ہے :۔

"اخلاق، حساب، سیاق، فلاحت، مساحت، ہندسہ، نجوم، رمل، تدبیر منزل، سیاست مدن، طب، منطق، طبیعیات، ریاضی، تاریخ مرتبہ بہ مرتبہ پڑھیں اور ہندی علوم میں سے بیاکرن، نیائے، بیدانت، پاتنجلی کا مطالعہ بھی کریں"[۱]

یہ قسم کے قوانین نے مدرسوں اور مکتبوں میں ایک نیا رنگ پیدا کر دیا، اور یہی سلطنت کی رونق کا باعث بن گئے۔ چنانچہ ابوالفضل بڑے فخر کے ساتھ لکھتا ہے :۔

"ازیں طرز آگہی مکتب را رونق دیگر گرفت و مدرسہ را فروغ تازہ یافت"[۲]

دورِ حاضر کا ایک ہندو فاضل اکبر کے اس اقدام کو سراہتا ہوا یوں رقم طراز ہے :۔

"یہ اکبر کی دُور اندیشی اور منظم حکمت عملی تھی کہ اس کی بدولت ہندی علوم و فنون کی حفاظت کا انتظام ہو گیا اور ہندو نوجوانوں کی تعلیم کا ان کی اپنی تہذیبی روایات کے مطابق خاطر خواہ بندوبست ہو گیا۔ اور پھر اکبر نے ہندو اور مسلمان طالب علموں کے لیے مشترکہ تعلیم بھی رائج کی۔ اس نے عبادت خانہ بنوایا جہاں ہندو علماء کے ساتھ بحث و مناظرہ کا سلسلہ جاری ہوا۔ اس نے ہندوؤں کی قدیم کتب کے ترجمے کا حکم دیا جس سے یہ بات بخوبی معلوم ہوتی ہے کہ وہ ہندو تہذیب کا بڑا قدردان تھا اور اس کی اشاعت کے لیے بڑے جوش و خروش سے کوشاں تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے ممتاز علماء اور فضلا کو جو فنون لطیفہ مثلاً موسیقی اور مصوری میں خاص طور پر مشہور تھے شاہانہ سرپرستی میں لے کر ان کی تربیت کی"[۳]

اکبر کے عہدِ حکومت میں ایک اور بڑا انقلاب آیا جس نے اس ملک کی تہذیبی اور ثقافتی روایات پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ تعلیم ثقافت کا سب سے بڑا مظہر ہے اس لیے اس کا متاثر ہونا بھی ضروری تھا۔ سنہ ۹۹۰ھ/سنہ ۱۵۸۲ء میں راجہ ٹوڈرمل نے اپنی مشہور آفاق اصلاحات کا ڈھانچہ پیش کیا۔ اکبر نے انھیں تسلیم کرتے ہوئے ان کے بارے میں ایک فرمان جاری کیا۔ اس فرمان کی ایک شق یہ تھی کہ تمام مملکت کے طول و عرض میں فارسی زبان کو دفتری زبان قرار دیا جاتا ہے۔ آئندہ سے ہر مقام، ہر جگہ اور ہر دفتر میں ہر قسم کی کارروائی فارسی زبان میں ہوا کرے گی۔ اس سے قبل دفتر کا تمام کام ہندی زبان میں ہوتا تھا۔ اب ہندی کو یک قلم ترک کر کے فارسی کو اختیار کیا گیا۔

فارسی کو سرکاری درباری زبان بنانے کے لیے سب سے پہلا کام کشمیر کے نیک نہاد سلطان زین العابدین عرف بڈشاہ نے

---

[۱] [۲] - آئینِ اکبری جلد اول صفحہ ۲۰۲۔

[۳] N-N-LAW, PROMOTION OF LEARNING UNDER MOHAMMADAN RULE, P.171 -

اُٹھایا تھا۔ چونکہ اس کی نیت نیک تھی اس لیے اسے خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ شمالی ہندوستان میں سلطان سکندر لودھی نے فارسی کو رائج کرنے کی کوشش کی مگر خود اس کے افغان امیر اس اقدام کے خلاف تھے۔ اس لیے ایک محدود طبقے کے سوا کسی نے بھی اس سلسلے میں سلطان سے تعاون نہ کیا۔ اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جن لوگوں نے فارسی کو اختیار بھی کیا وہ بھی اپنے دفتروں کا تمام ریکارڈ ہندی میں رکھتے تھے۔ اکبر کے فرمان کا یہ اثر ہوا کہ ہندی کی جگہ فارسی کو دے دی گئی اور دفتری زبان تبدیل کرنے میں کسی قسم کی دقت پیش نہ آئی کیونکہ فارسی دان پہلے سے موجود تھے۔ ہندی میں وہ ریکارڈ پہلے سے رکھ رہے تھے۔ اس لیے آناً فاناً سارا ریکارڈ فارسی میں منتقل ہو گیا۔

فارسی زبان اختیار کرنے کا ایک اثر یہ ہوا کہ سوا اعلیٰ تعلیم کے باقی ساری تعلیم فارسی میں ہونے لگی۔ ہندوؤں نے فارسی سیکھی جس کی وجہ سے وہ مسلمانی تمدن و معاشرت سے متاثر ہوئے۔ تنگ نظری، تنگ دلی جن کا شکار وہ صدیوں سے چلے آتے تھے ان میں کسی حد تک کمی واقع ہونے لگی۔ اس کے علاوہ ایک نئی ثقافت عالم وجود میں آئی جس کی بنا ایک زبان پر تھی جسے ہندو اور مسلم پڑھا لکھا طبقہ بولتا، اسی میں اظہارِ خیال کرتا اور اسی میں تصنیف و تالیف کا کام کرتا تھا۔ اسی ثقافت کو وہ اپنی میراث سمجھتا اور اسی کا دلدادہ تھا۔ آخر ۱۸۰۰ء میں انگریزنے "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے اصول پر عمل کرتے ہوئے یک زبانی تہذیب کی بجائے سہ زبانی تہذیب ملک میں رائج کی۔ اور فورٹ ولیم کالج کلکتہ قائم کیا جس کے بعد ہندی اُردو تنازعہ پیدا ہوا اور اسی میں پھر بنگالی بھی شریک ہو گئی۔

فارسی کی بدولت ہندوؤں کے ہاں ادب کا بڑا شستہ مذاق پیدا ہوا۔ اکبر کے زمانے میں منوہر، جو راجہ لون کرن والیٔ سانبر کا بیٹا تھا بڑے عمدہ شعر کہتا تھا۔ وہ کبھی اپنے آپ کو میرزا منوہر اور کبھی محمد منوہر کہتا اور اس پر فخر کرتا۔ اس کا ایک شعر سننے کے قابل ہے [1]

یگانہ بودن و یکتا شدن ز چشم آموز
کہ ہر دو چشم جدا جدا نمی نگرند

تعلیم کے سلسلے میں اکبر نے کچھ نئے تجربات بھی کیے۔ ان میں سے سب سے اہم تجربہ بچّوں کی تعلیم کا ہے۔ بچوں کی تعلیم ہر قوم میں بڑی اہم رہی ہے اور اس کے بارے میں اکثر تجربات ہوتے رہے ہیں اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ اکبر نے جو طریقہ ایجاد کیا وہ آجکل کی ابتدائی تعلیم سے کسی حد تک ملتا جلتا ہے۔ اس زمانے میں ملک کی آبادی کا بیشتر حصّہ ہندوؤں پر مشتمل تھا جن کی زبان ہندی تھی اور اس زبان کو مسلمانوں کی زبانوں کے خلاف بائیں سے دائیں طرف لکھا کرتے تھے۔ حروف تہجی بھی بہت حد تک مختلف تھے۔ اس لیے فارسی حروف ہندو بچّوں کو سکھانا اور ذہن نشین کرانا قدرے دشوار تھا۔ چنانچہ حروف شناسی کو آسان بنانے کے لیے اکبر نے یہ ہدایت کی کہ استاد شروع شروع میں بچوں کو مفرد حروف کی شناخت کرائے۔ پھر اعراب اور مرکب حروف بتائے اس کے بعد چھوٹے چھوٹے جملے سکھائے۔ بعد میں اشعار اور لمبی لمبی عبارتیں پڑھوائے۔ جب یہ طریقۂ تعلیم آزمایا گیا تو اس میں بہت کامیابی حاصل ہوئی۔ بچے جو چیز برسوں میں حاصل کرتے تھے وہ اب مہینوں اور ہفتوں میں حاصل ہونے لگی۔ ابوالفضل

---

[1] بدایونی جلد سوم صفحہ ۲۰۱ - ماثر الامرا جلد سوم ص ۱۷۱

اس آئین کو بڑی تفصیل کے ساتھ یوں لکھا ہے :-

"تمام ممالک میں عموماً اور ہندوستان میں خصوصاً بچے سالہا سال مکتب میں گزارتے ہیں اس طویل مدت کے بعد وہ صرف حروف مفردات اور چند اعراب کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ بچوں کی عمر کا ایک معتدبہ حصہ صرف اور ضائع ہو جاتا ہے۔

"جہاں پناہ نے حکم دیا کہ پہلے لڑکوں کو حروف تہجی لکھنا سکھایا جائے اور اس امر کی کوشش کی جائے کہ وہ حروف کی مختلف شکلوں اور کششوں سے بخوبی واقف ہو جائیں اس طرح لڑکے ابتدا میں فقط حرف کی شکل اور اس کا نام یاد کریں دو روز میں تمام حروف تہجی ختم کرکے وہ حروف کے جوڑ اور پیوند لکھنا اور پڑھنا سیکھیں۔

"ایک ہفتہ اس پر عمل کرنے کے بعد طالب علم میں اس قدر استعداد اور واقفیت ہو جاتی ہے کہ وہ کسی نثر یا نظم کا ایک حصہ یاد کر لیتا ہے۔ اس امر کی بجد کوشش کی جانی چاہیئے کہ بچہ خود بخود حروف کا جوڑ بند پہچانے اور انھیں ملا کر الفاظ کو نکالے اور بخوبی سمجھ کر سکے۔ ان امور میں استاد کو بہت کم مدد دینا چاہیئے۔ اُستاد ہر روز پانچ امور پر توجہ رکھے اور ان کی نگہداشت کرتا رہے۔ حروف کی شناخت۔ الفاظ کے معنے مصرع، شعر اور آموختہ، غرضکہ اس طریقۂ تعلیم کے مطابق ایک سال کا نصاب ایک مہینے میں ختم ہو گیا۔ اور اہل علم حیرت زدہ ہوئے۔" [1]

اکبر کے آخری ایام کا ایک فاضل شاہ عبدالحق محدث دہلوی اپنی ابتدائی تعلیم کا تذکرہ کرتا ہوا بتاتا ہے۔ کہ یہ تعلیم کیسے شروع ہوئی مجھے کس طرح ابتدائی مراحل طے کرائے گئے اور پھر کس طرح میں نے علم کی منزلِ مقصود کو پایا۔ وہ اپنی مشہور کتاب اخبار الاخیار کے آخر میں مجمل طور پر یوں فرماتے ہیں کہ

"حروف تہجی کی تعلیم کے بغیر براہ راست قرآن پاک کے مرکب حروف سے میری تعلیم کا آغاز ہوا میرے والد روزانہ قرآن کریم کی چند سطریں لکھ کر مجھے پڑھاتے میں نے اس طریقے سے حروف تہجی کی شناخت کے بغیر مرکب الفاظ سے تعلیم شروع کی اور اس میں میرے والد کو بہت کامیابی حاصل ہوئی۔ انھوں نے اس طریقہ سے مجھے قرآن کریم کے دو تین جز پڑھائے۔ ان کی بدولت قرآن پڑھنے کا ملکہ مجھ میں اچھی طرح پیدا ہو گیا۔ قرآن پاک جسے عام طور پر بچے برس ڈیڑھ برس سے زیادہ عرصے میں ختم کرتے ہیں میں نے اسے دو تین مہینوں میں ختم کر لیا۔" [2]

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بجائے اس کے بچوں کو حروف تہجی رٹائے جائیں اور اس کے بعد انھیں ا ب ت کی شکلیں بتائی جائیں کیوں نہ ان کے سامنے الحمد، اللہ وغیرہ الفاظ لکھ کر ان کی پہچان کرائی جائے۔ یہ

[1] آئین اکبری جلد اول آئین ۲۵ صفحہ ۱۴۳ - [2] اخبار الاخیار صفحہ ۳۱۱ -

بات تجربات چاہتی ہے۔ حضرت محدث کے والد اسے آزما چکے ہیں اپنے مدارس میں اس کا تجربہ کرنا چاہیئے شاید یہی طریقہ مفید ہو۔

اکبر کے زمانے سے پہلے دنیائے اسلام میں اور خاص کر ہندوستان میں تعلیم اور نصاب تعلیم میں بہت بڑا انقلاب آچکا تھا۔ قرآن اور قرآنی علوم کے ساتھ ساتھ معقولات، فلسفہ، منطق اور کلام کا مطالعہ ہونے لگا۔ سکندر لودھی کے زمانے میں تلنبہ (ضلع ملتان) کے دو فاضل مولانا عبداللہ تلنبی اور مولانا عزیز اللہ تلنبی سلطنت کے انقلاب کی وجہ سے بھاگ کر دہلی آ گئے۔ مولانا عبداللہ دہلی میں اور مولانا عزیز اللہ سنبھل میں بیٹے۔ دونوں نے مسند علم بچھائی۔ علم کے پیاسے خود بخود کھنچے ہوئے وہاں پہنچے۔ یہ دونوں بزرگوار معقولات کے بڑے ماہر تھے اور انہی پر زیادہ زور دیتے تھے۔ اب ان کی بدولت معقولات کا چرچا ہونے لگا۔ علما کی توجہ بھی قرآن اور علوم قرآنی سے ہٹ کر فلسفہ، منطق اور علم کلام کی طرف ہو گئی۔ چنانچہ ملا بدایونی لکھتے ہیں کہ

"فقہ و تفسیر و حدیث و خوانندہ آں مطعون و مردود و نجوم و حکمت و طب و حساب و شعر و تاریخ
و افسانہ رائج و مفروض"[1]

ان حالات میں حکمت اور فلسفہ کا ایک طوفان اٹھ کر ایران و توران سے بھی ہندوستان میں داخل ہوا۔ کیونکہ وہاں کے حکمرانوں نے فلسفہ وغیرہ کا پڑھنا اور پڑھانا حکماً روک دیا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اہل منطق و فلسفہ نے ایسی ایسی خبیث حرکتیں کیں جو نہ صرف علما کی متانت اور علم کے وقار کے منافی تھیں بلکہ ان سے صریحاً اسلام کا استہزا ہوتا تھا۔ یہ منطقی اور معقولی لوگ جب کسی نیک طینت، صاحب دل کو دیکھتے تو اس کا مذاق اڑاتے اور کہتے "یہ گدھا ہے"۔ اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں یہ منطقی دلیل پیش کرتے کہ لاحیوان ہے اور حیوان عام ہے۔ انسان خاص ہے۔ جب حیوانیت اس میں نہیں تو انسانیت جو اس سے بھی خاص ہے وہ بھی نہیں۔ پھر یہ گدھا نہیں تو اور کیا ہے!

جب اس قسم کی حرکتیں حد سے بڑھ گئیں تو مشائخ اور علما نے توران کے بادشاہ عبداللہ خان ازبک سے استدعا کی کہ وہ منطق کا پڑھنا حرام قرار دے اور اس کے پڑھنے پڑھانے والوں کو ملک سے نکال دے۔ چنانچہ کئی معقولی جیسے قاضی ابوالمعالی، ملا مرزاجان، ملا عصام الدین، وغیرہ وہاں سے نکالے گئے اور ان میں سے اکثر ہندوستان چلے آئے[2]

جب یہ لوگ ہندوستان آئے تو ایران کے علمائے متاخرین جیسے محقق جلال الدین دوانی، میر صدر الدین، میر غیاث الدین منصور اور میرزاجان کی تصانیف اپنے ساتھ لائے اور یہاں درس جاری کئے جن میں لوگ بڑی کثرت سے شامل ہوئے، اس طرح منطق اور معقولات کا رواج یہاں عام ہو گیا۔

امیر فتح اللہ شیرازی

اکبر کے زمانے میں میر فتح اللہ شیرازی اس سلسلے میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔ وہ ایک طرف اکبر کے مشیر مالیات تھے تو دوسری طرف وہ راجہ ٹوڈرمل کو سلطنت کا میزانیہ تیار کرنے میں مفید مشورے بھی دیا کرتے تھے، ان کاموں سے جو وقت بچتا وہ درس و تدریس میں صرف کرتے تھے، امیروں کے بچوں کو وہ خاص طور پر ان کے گھر جا کر پڑھاتے تھے۔ ویسے بھی کوئی ان کے پاس پڑھنے کے لیے آتا تو وہ دریغ نہ کرتے، اکبر نے ان کی خدمات سے خوش ہو کر عضد الملک کا خطاب عطا کیا۔ میر فتح اللہ شیرازی کو کام کرنے کا بہت کم وقت ملا کیونکہ وہ کشمیر سے واپس آتے ہوئے تپ محرقہ میں مبتلا ہو کر فوت ہو گئے۔

---

[1] بدایونی جلد دوم صفحہ ۳۰۶ - ۳۰۷ - [2] تاریخ بدایونی جلد سوم صفحہ ۱۵۰ -

حکیم الملک گیلانی

معقولات اور منطق جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں لودھیوں کے زمانے میں ایک خاص انداز سے رواج پذیر ہوئے مگر ان کا دائرہ چند کتابوں تک محدود تھا۔ ان کی ترقی کا زمانہ تیموریوں کا عہد حکومت ہے۔ اس میں انھیں اس قدر فروغ حاصل ہوا کہ صوفیوں کی خانقاہوں میں بھی اس قسم کی بحثیں چل نکلیں۔ چنانچہ ایک دن شیخ سلیم چشتی کی خانقاہ میں ایک مجلس برپا ہوئی اس میں حکیم الملک گیلانی بھی شریک تھے۔ حکیم موصوف نے شروع میں مذہب، تفسیر، فقہا کے مقام پر گفتگو شروع کی۔ بڑھتے بڑھتے اس نے حکماً کے طریقہ کی تعریف کی اور پھر علم حکمت کی عظمت کا تذکرہ کیا، اسی دوران میں اس نے شیخ بو علی سینا کے بارے میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اس کا مقام فقہا اور علمائے دین سے بہت اونچا ہے۔ یہ زمانہ بھی بڑا پُر آشوب تھا۔ کیونکہ ملک بھر میں علماً اور حکماً ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو رہے تھے۔ ہر روز ان میں جھگڑے ہوتے، مناقشات پیدا ہوتے اور مجادلے تک نوبت پہنچتی۔ ملا بدایونی ابھی نئے نئے دربار اکبری سے وابستہ ہوئے تھے۔ وہ بھی اس محفل میں موجود تھے۔ انھوں نے حکیم الملک کی تقریر سنی اور حکما کی مذمت میں شیخ شہاب الدین سہروردی کے تین عربی شعر پڑھے اور آخر میں انھوں نے مولانا جامی کی مشہور مثنوی تحفۃ الاحرار کا یہ شعر پڑھ کر سب کو خاموش کرا دیا[1]

نور دل از سینۂ سینا مجو

روشنی از چشم نابینا مجو

شیخ نے ملا کی داد دی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ یہ معرکے خوب گرم رہے۔ مدرسے، مسجدیں، خانقاہیں اور دربار شاہی ان معرکوں کی صدائے بازگشت سے ایک مدت تک گونجتے رہے۔ آخر حکیم الملک نے اپنا مسلک تبدیل کر لیا اور مذہب کی حمایت شروع کی۔ ۹۸۶ھ/۱۵۷۹ء میں اسی موضوع پر اس کا مجادلہ ابوالفضل سے ہوا۔ حکیم نے ابوالفضل کی کج بحثی سے تنگ آ کر اسے "فضلہ" کہا۔ ابوالفضل کی شکایت پر اکبر نے حکیم کو حج کے لیے روانہ کر دیا[2]

حکیم الملک جن کا نام شمس الدین تھا اکبر کے دربار میں طبیب، عالم اور منصب دار شاہی تھے۔ وہ اکبر کے معالج خصوصی بھی تھے۔ طب کے علاوہ ان کا محبوب مشغلہ بقول علمائے ہند[3]

"پیوستہ طلبہ را درس گفتے و بے ایشاں طعام نہ خوردے"

اکبر کے زمانے میں معلمی اور مدرسی میں کتنی کشش تھی کہ بڑے بڑے منصب دار اور مقربان شاہی اپنے فرائض کی ادائگی کے بعد فالتو وقت اسی مشغلے میں صرف کرتے۔ وہ طلبہ کو بغیر معاوضے کے تعلیم دیتے اور پھر اسی پر اکتفا نہ کرتے بلکہ انھیں اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتے اور اپنے گھر سے کھلاتے اور ان کا اتنا خیال رکھتے کہ ان کے بغیر کھانا نہ کھاتے۔ یہ ایثار آج آپ کو نہ کسی درسگاہ میں نظر آئے گا اور نہ کسی یونی ورسٹی میں، ہاں قدیم طرز کی درس گاہوں میں اکثر ایسا دیکھنے میں آتا ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی

ان تشویشناک حالات میں جب کہ دربار شاہی میں اسلامی علوم و فنون کی کوئی حیثیت نہ تھی اس زمانے کے علما اگر قرآن اور حدیث کی طرف رجوع بھی کرتے تو وہ اس غرض کے لیے ہوتا تھا کہ وہ اپنی خواہش کے مطابق اس کی تفسیر کریں اور جو اقدام وہ کر چکے ہیں اس کا جواز قرآن پاک اور حدیث سے نکالیں، اسی

[1] بدایونی جلد سوم ص ۴۱ ۔ [2] بدایونی جلد دوم صفحہ ۲۷۵ ۔ [3] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۰۵۔

رنگ میں تفسیریں لکھی گئیں۔ اسی انداز میں احادیث کو معانی پہنائے گئے۔ مدارس کے اندر یہی سلسلہ جاری تھا۔ فلسفہ اوجِ شباب پر تھا۔ اور قرآن اور حدیث کا درجہ ثانوی تھا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی دنیائے اسلام سے علوم و فنون کی سندِ فراغت لے کر ہندوستان واپس آ چکے تھے اور درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کر چکے تھے۔ انھوں نے ان تشویشناک حالات کو دیکھا۔ ان پر غور کیا۔ آخر انھوں نے ہمت کی اور نصابِ تعلیم میں جو انقلاب آ رہا تھا اسے روکنے کا تہیہ کیا۔ وہ کافی غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ پہلے کی طرح قرآن پاک اور حدیث کو علومِ دین کی اساس اور بنیاد قرار دیا جائے اور علومِ دین کے ہر طالب علم پر یہ حدیث نقش کر دی جائے کہ جس شخص نے قرآنِ کریم کی تفسیر میں اپنی رائے کو دخل دیا پس اس نے کفر کیا۔

انہی خطرناک حالات کا احساس حضرت مجدد الف ثانی کو بھی ہوا۔ انھوں نے بھی اپنے بعض دوستوں کو لکھا کہ ہم اور تم اپنے عقائد کتاب و سنت کے مطابق اس طور پر کہ علمائے حق نے کتاب اور سنت سے سمجھے اور اخذ کیے ہیں صحیح کریں کیونکہ ہمارا اور تمھارا سمجھنا اگر ان حضرات کی رائے کے مطابق نہ ہو تو قابلِ اعتبار نہیں۔ اس لیے کہ ہر بدعتی اور گمراہ اپنے خیالات کی بنیاد قرآن و حدیث پر ہی رکھتا ہے اور وہیں سے انھیں اخذ کرتا ہے۔[1]

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے دینی نصابِ تعلیم میں پھر سے قرآن و حدیث کو سب سے مقدم قرار دینے کے لیے کام کرنا شروع کیا۔ آپ نے بڑے زور و شور سے اعلان کیا کہ علم فقط وہی ہے جو دین و ملت کی تقویت اور بقا کا موجب ہو اگر وہ یہ مقصد پورا نہیں کرتا تو وہ کچھ نہیں۔ چنانچہ آپ نے اس اعلان کے ساتھ یہ شعر بھی درج کیا جو ان کے دلی جذبات کی ترجمانی کرتا ہے ؎

علم دیں فقہ ست و تفسیر و حدیث
ہر کہ خواند غیر ازیں گردد خبیث

چنانچہ آپ نے اپنے مدرسہ میں اسی پر عمل کرنا شروع کیا اور ہر طالب علم اور دین دار پر یہ بات واضح کی کہ اگر علم حاصل کرنے کی غایت معاشی پریشانیاں دور کرنا اور مال و دولت کمانا ہے تو پھر علم کی بجائے زراعت، تجارت اور معماری وغیرہ کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ انھوں نے نصاب میں اہم تبدیلیاں کیں اور دوسرے علمائے حق کو اپنے ساتھ ملا کر اس نصاب کو کامیاب کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ایک مرتبہ پھر مدارس میں علومِ قرآنی پڑھائے جانے لگے اور ان کی طرف خاص توجہ مبذول ہو گئی۔ ان درس گاہوں میں یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ جس قدر طالب علم یہاں سے فارغ ہوتے، ان کے سامنے ایک خاص مسلک ہوتا جس سے سرِ مو تجاوز کرنا وہ پسند نہ کرتے تھے۔ کیونکہ اس تعلیم نے ان کے دلوں میں خدا کا خوف، آنکھوں میں حیا اور سینوں میں نورِ قرآن بھر دیا تھا۔ وہ فرض کو فرض سمجھتے اور اس کا بجا لانا عبادت سے زیادہ ضروری خیال کرتے۔ غیرت و حمیت، خودی و خودداری ان کے کردار کے نمایاں پہلو ہوتے۔ خلوص، للہیت اور ایثار وہ بلند مقاصد تھے جنھیں وہ برسوں ان مدارس میں پاک دل، پاک منش، خدا ترس اور خدا پرست اساتذہ کی زیرِ تربیت رہ کر حاصل کرتے۔ وہ ہر کام اپنے ہاتھ سے کرتے۔ اس میں کسی قسم کی عار یا شرم محسوس نہ کرتے۔ اس کی بدولت انھیں اپنی ذات پر پورا پورا بھروسہ ہوتا۔ وہ ہر قدم پورے اعتماد کے ساتھ اٹھاتے اور یہ اسی اعتماد کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے نہ مشکل کو

---

[1] مکتوبات مجدد الف ثانیؒ دفتر اول مکتوب نمبر ۱۵۸۔

مشکل سمجھا نہ اس کے ڈر سے جو قدم آگے بڑھایا اسے واپس لیا۔ اس ملک کی آزادی میں انہی علماء نے سب سے بڑھ کر کام کیا اور ہر تحریک میں انہی کا ہاتھ کام کرتا نظر آتا ہے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ہو یا سید احمد شہید کی تحریک جہاد، خلافت کی تحریک ہو یا آزادی وطن وحصول پاکستان کی جدوجہد، ان سب میں انہی مدارس کے فارغ التحصیل علماء کا ہاتھ کام کرتا نظر آئے گا۔ ان کی آتش بیانی نے ایسے خطرناک موقعوں پر عوام کے دلوں کو گرمایا جب کہ بڑے بڑے امیروں، سیاست دانوں اور مدبروں کے قدم ڈگمگانے لگے تھے۔

جیسوٹ مشن

اکبر کے دور کی ایک اور خصوصیت بھی قابل ذکر ہے۔ اس دور میں پہلی مرتبہ ہندوستان میں الاقوامی حیثیت اختیار کرتا ہے اور اکبر کی سرپرستی میں یورپ کے کچھ پادری اس کے دربار میں حاضر ہوتے ہیں۔ یہ جیسوٹ تھے جو تبلیغ مذہب کے شوق میں یہاں آئے تھے اکبر نے خود ان کو گوا سے دعوت دے کر اپنے ہاں طلب کیا۔ ان سے انجیل کے مطالب سمجھنے کی کوشش کی اور انھیں اجازت دی کہ وہ اگر چاہیں تو اپنے مدارس جاری کر سکتے ہیں۔ چنانچہ لاہور میں انھوں نے اپنا ایک مدرسہ جاری کیا۔ یہ پادری ۱۵۹۱ء میں لاہور آئے۔ اکبر نے ان کی بڑی تعظیم و تکریم کی۔ انھیں لاہور کے شاہی قلعہ میں رہنے کے لیے جگہ دی اور سامان خورد و نوش سے بے نیاز کر دیا۔

ان پادریوں نے یہاں مدرسہ جاری کیا جس میں امرا کے بچے تعلیم کے لیے آتے۔ ان میں اکبر کا اپنا بیٹا اور پوتا بھی تھے۔ یہ پادری نہ صرف ان بچوں کو عام تعلیم دیتے بلکہ پرتگالی زبان بھی سکھاتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اکبر اور اس کا دربار عیسائیت قبول کر لیگا مگر ان کا یہ خیال غلط ثابت ہوا اور وہ مایوس ہو کر گوا جانے کی تیاریاں کرنے لگے مگر ۱۵۹۴ء میں پادریوں کا ایک دوسرا گروہ یہاں وارد ہوا اور اس نے اس کام کو جاری رکھا۔ کچھ لوگ عیسائیت کے حلقہ بگوش ہوئے۔ حلب کے ایک عیسائی میرزا سکندر نے اپنی کچھ جائداد اور چھ سو روپے نقد اس مشن کو دیئے تاکہ وہ عیسائیوں کے قبرستان کے لیے جگہ خرید سکیں۔ چنانچہ ۱۰۲۱ھ/۱۶۱۲ء میں موضع ہری پھلواری مہر نگ میں بارہ بیگھے زمین مزروعہ ایک پختہ چاہ کے ساتھ خریدی گئی۔ اس زمین پر آجکل کتھیڈرل سکول اور اس کا ملحقہ گرجا ہے یہ قطعہ زمین ریگل سینما کے سامنے واقع ہے۔

۱۰۲۲ھ/۱۶۱۳ء میں جہانگیر ان سے ناراض ہوگیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ پرتگالیوں کی ایک جماعت نے چار جہازوں پر ڈاکہ ڈالا جو مکہ مکرمہ سے حاجیوں کو لے کر واپس آ رہے تھے۔ یہ ایک لمبی داستان ہے جس سے پادریوں اور پرتگالیوں کی چیرہ دستیوں کا ثبوت ملتا ہے جو انھوں نے مذہب کے نام پر روا رکھیں۔ ان حرکتوں کی بنا پر کبھی گرجے بند ہوتے اور کبھی شاہانہ مہربانی اور رواداری کی بنا پر واگذار کئے جاتے رہے۔ آخری مرتبہ "متعصب اورنگ زیب" نے اپنے جلوس کے چودھویں سال ایک فرمان کے ذریعے اسے واگذار کیا۔ یہ فرمان یوں ہے:۔

"فدا خان غلام عالمگیر بادشاہ سنہ ۱۰۸۱ھ/سنہ ۱۶۶۶ء ... متصدیان حال و استقبال مہمات ہری پھلواری متعلقہ صوبہ دار السلطنت لاہور بدانند کہ چون دوازدہ بیگھہ زمین زرعی بایک چاہ پختہ و چند درخت از موضع جماعہ مہرنگ ہری پھلواری مذکور حسب ربط پادری یوسف وغیرہ پادریان فرنگی واقع است وبموجب فرمان در وجہ انعام آنہا برائے مقابر وغیرہ مقرر شد۔ قدغن می رود کہ اراضی مذکورہ را بدستور پیشین بر طبق

فرمانِ مسلم دانستہ احدے مزاحم و متعرض نہ گردد و تغییر و تبدیل بآں راہ ندہد۔ دریں باب موجب/معین دانستہ تخلف و انحراف جائز ندارند/ تحریر آ فی التاریخ ششم ذی الحجہ ۱۰۰۴ھ"

جیسوٹ پادریوں نے جو مدرسہ لاہور میں جاری کیا تھا اس کے محل وقوع کے بارے میں عام واقعہ نگاروں اور مؤرخوں کا خیال ہے کہ اورینٹل کالج کے مشرق کی جانب انارکلی بازار میں موجودہ رام روڈ کے سامنے واقع تھا۔ اس کے ساتھ ایک گرجا بھی تھا۔ آج اس کی جگہ سینٹ فرانسس ہائی سکول اور کیتھولک چرچ واقع ہیں۔

پادریوں کی بدولت اس وقت کے نظامِ تعلیم میں معقولات کی گرتی ہوئی عمارت کو ایک مرتبہ پھر سہارا مل گیا۔ مگر یہ کچھ زیادہ دیرپا ثابت نہ ہوا۔ نہ ہی اس سے کچھ عمدہ نتائج مترتب ہوئے کیونکہ اس وقت یورپ کا عام اندازِ تعلیم مذہب کی بالادستی پر مبنی تھا اور تعلیم کا سارا دارومدار عیسائیت پر منحصر تھا۔

اکبر وقتاً فوقتاً سیاسی اور ملکی ضروریات کے ماتحت لاہور آیا جایا کرتا تھا مگر سولھویں صدی عیسوی کے آخری ربع میں جب وسط ایشیا، افغانستان اور ایران کے باعث سلطنت تیموریہ کے سرحدی حالات کچھ ابتر ہو گئے تو اکبر نے پندرہ برس تک لاہور میں مسلسل اور مستقل قیام کیا تاکہ وہ یہاں رہ کر اپنے ہمسایہ ملکوں کے سیاسی حالات کی کڑی نگرانی کر سکے۔ یہ زمانہ درحقیقت لاہور کی تعمیر اور ترقی کا زمانہ ہے۔ دربار، دربار کے متعلقین، فوجی سردار، بڑے بڑے جاگیردار اور علما و فضلا سب کے سب آگرہ اور فتح پور سیکری کی سکونت ترک کر کے لاہور میں آباد ہو گئے۔

اکبر نے شہر کو آباد کیا۔ اس کے گرد فصیل بنوائی جسے حصار کہتے تھے۔ باغات لگوائے اور ہر قسم کے علوم و فنون کی مربیانہ سرپرستی کی۔ اسی دور میں لاہور میں بڑے بڑے مدارس قائم ہوئے اور نزدیک و دور سے طلبہ جوق در جوق تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے یہاں آنے جانے لگے۔ چنانچہ اس شہر کی رونق بڑھ گئی۔ ہر عالم اور ہر شاعر جو ہندوستان آتا، اس کی پہلی منزل لاہور ہوتی۔ ملا عبدالنبی کہتا ہے کہ "یہ بات دُنیا والوں کے درمیان شہرت رکھتی ہے کہ جو شخص ایک مرتبہ ہندوستان آئے جب وہ یہاں سے واپس جائے گا تو اس کے دل میں یہ تمنا باقی رہے گی کہ وہ ایک مرتبہ پھر اسے دیکھے۔" ایک اور مقام پر وہ کہتا ہے کہ "جن ایام میں میں مشہد مقدس میں مقیم تھا، ہر طرف سے مسافر اور تاجر آتے تھے، ان کی زبان پر دارالامان ہند کی تعریف اور توصیف ہوتی تھی۔"
(میخانہ ص ۵۰۱)

جب ملا عبدالنبی ایران سے لاہور پہنچا تو وہ یہاں کے حالات سے بہت متاثر ہوا۔ وہ لکھتا ہے :۔

"عجب ملکے بہ نظر این حقیر در آمد۔ ارزانی و فراوانی"

اسی طرح صاحب ہفت اقلیم امین الدین رازی لکھتا ہے :۔

"لاہور میں فضلا اور علما کی اتنی بڑی تعداد آباد ہے کہ وہ گنتی اور شمار میں نہیں آ سکتے۔"

(ہفت اقلیم خطی نسخہ ورق ۱۳۳ الف)

ملا عبدالباقی نہاوندی خان خاناں کے دربار کی علمی، ادبی اور شعری دلچسپیوں کا ذکر کرتا ہوا کہتا ہے کہ :۔

"بدراں وقت دار السلطنت لاہور دار الشعراء گردید"
(مآثر رحیمی جلد سوم)

ان اقتباسات سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ لاہور اکبر کے وقت میں ایک بہت بڑا علمی اور ثقافتی مرکز بن چکا تھا۔ اس میں اکبر کی خاندانی روایات کو بہت دخل حاصل تھا۔ اس کے علاوہ ایران میں جو حالات صفوی خاندان کی بدولت پیدا ہو چکے تھے وہ بھی اس کے بہت حد تک ذمہ دار تھے۔ نیز علوم و فنون کی سرپرستی میں دونوں ملکوں کے درمیان ایک مقابلہ اور مسابقہ سا ہو رہا تھا۔ ہر خاندان یہی کوشش کرتا تھا کہ وہ معارف نوازی، ادب پروری اور ثقافتی سرگرمیوں میں دوسرے سے بازی لے جائے۔ اس مسابقت میں خاندان تیموریہ ایران کو شکست دینے میں کامیاب ہوا۔ ایران کے چوٹی کے علماء، فضلاء، شعراء اور ادباء خود بخود ہندوستان کی طرف کھنچے چلے آئے۔

مشرق میں شاہی دربار ہر قسم کی سرگرمیوں کا مرکز ہوتا ہے۔ اگر عوام کے مزاج اور طبعی رجحانات کا اندازہ لگانا ہو تو دربار کی سرگرمیوں کا تجزیہ کر لیا جائے۔ اس واسطے کہ بادشاہ کے مذاق کے ساتھ ساتھ دربار اور عوام کا مذاق بھی بدلتا رہتا ہے۔ چنانچہ اکبر کے امرا نے بادشاہ کی تقلید میں اپنا دست کرم بڑھایا۔ جن علماء کو سرکاری سرپرستی حاصل نہ ہو سکی، انھیں اپنے دربار میں جگہ دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر امیر کا دربار اسی رنگ میں رنگا گیا اور ہر طرف علم اور ادب کے چرچے ہونے لگے۔ معارف نوازی اور ادب پروری امارت کے لوازمات تھے۔ اس دور میں عبدالرحیم خان خاناں، مرزا عزیز کوکلتاش، اغان زمان علی قلی خان سیستانی، حکیم ابوالفتح گیلانی، ابوالفضل، فیضی اور دوسرے امرا کے علمی کارنامے ایک علیحدہ تفصیل کے متقاضی ہیں۔

اکبر کے زمانے میں لاہور میں ایک تازہ رونق پیدا ہوئی۔ اس کا سبب امن و امان اور سکون و طمانیت کی وہ دولت تھی جو ایک مدت کے بعد یہاں کے بسنے والوں کو نصیب ہوئی۔ اب علماء نے درس و تدریس کی مسند بچھائی اور علم کا نور سینوں میں بھر دیا۔ ان میں سے بعض کا ذکر ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

شیخ سعداللہ بنی اسرائیلی

لاہور میں جہاں آج کل لنڈا بازار، شہید گنج، محلہ دارا شکوہ اور سلطان کی سرائے واقع ہیں، اکبر کے زمانے میں یہ علاقہ نخاس کہلاتا تھا۔ یہاں ایک بزرگ شیخ سعداللہ بنی اسرائیلی درس دیا کرتے تھے۔ آپ کا احترام لاہور کا بچہ بچہ کرتا تھا۔ ملا بدایونی کے قول کے مطابق لوگ آپ کو اپنے وقت کا ولی سمجھتے تھے۔ بنی اسرائیل ہندوستان کے نومسلموں کی ایک غیر معروف جماعت ہے، یہ جماعت عام طور پر کول (علی گڑھ) میرٹھ اور سنبھل وغیرہ شہروں میں آباد ہے۔ بعض مورخوں کو بنی اسرائیل سے یہ غلط فہمی ہوئی کہ وہ یہودی ہیں۔ مگر یہ غلط ہے۔ قرین قیاس یہ بات ہو سکتی ہے کہ ان کے آباؤ اجداد میں کوئی بزرگ اسرائیل کے نام سے ہوا ہوگا۔ اسی نسبت سے یہ اپنے آپ کو بنی اسرائیلی کہنے لگے۔ بعضوں نے لکھا ہے کہ یہ قرونہ ترکوں (تغلق) کے دورِ حکومت میں یہاں آباد ہوئے مگر یہ بات بھی بے بنیاد ہے۔ تاریخ کی مستند کتابوں میں ان کا تذکرہ اکبر کے زمانے میں ملتا ہے۔ بنی اسرائیل تعلیم و تعلم، علوم و فنون، تصوف و سلوک کے علاوہ خطاطی و نساخی میں بھی شہرت رکھتے ہیں۔ ان میں بڑے بڑے نامور عالم پیدا ہوئے جن میں سب سے زیادہ شہرت شیخ سعداللہ بنی اسرائیلی کو ہوئی۔

شیخ سعداللہ بنی اسرائیلی کے والد مولانا فتح اللہ دانشمند تھے۔ آپ نے اکثر علوم اپنے والد سے حاصل کئے۔ جب وہ

فوت ہو گئے تو علم کا شوق کشاں کشاں آپ کو دیبال پور لے گیا جہاں آپ شیخ بایزید کے درس میں شریک ہوئے۔ جب آپ نے وہاں سے سندِ فضیلت حاصل کر لی تو آپ لاہور واپس آ گئے۔ اور درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا۔ اسی دوران آپ نے شیخ اسحاق کاکو کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کی توجہ سے سلوک کی منازل طے کیں، بختاور خاں صاحب مرآۃ العالم لکھتے ہیں :-

" بسا اوقات ایسا ہوتا کہ آپ کتب سلوک کا درس دیتے ہوتے تو آپ پر حالت طاری
ہو جاتی اور آپ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے۔ دو دو تین تین دن یہی حالت طاری رہتی،
کھانا پینا حتیٰ کہ نماز تک چھوٹ جاتی۔ جب آپ حالت صحو میں آتے تو خادم سے قضا
شدہ نمازوں کی تعداد پوچھتے۔ انھیں ادا کرتے اور درس و تدریس کے محبوب مشغلے میں
محو ہو جاتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ آپ پر روحانی غلبہ کی حالت میں ایک کیفیت طاری
ہوتی۔ آپ چپ چاپ آباؤ اجداد کی قبروں کی طرف نکل جاتے۔ کسی ٹوٹی پھوٹی قبر میں
لیٹ کر کپڑا اوڑھ لیتے" [1]

جب ایام میں اکبر نے اجتہاد کا دعوےٰ کیا، اس نے دیگر علماء کے ساتھ آپ کو بھی اپنے حضور طلب کیا۔ آپ پالکی میں سوار ہو کر وہاں پہنچے۔ ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد بعض موضوعات پر گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔ اکبر نے آپ سے پوچھا "انسان واصل بحق کیسے ہوتا ہے؟" آپ نے جواب دیا "جیسے میں آپ کی خدمت میں پہنچ گیا" بادشاہ نے کہا۔ یہ جواب بڑا مبہم ہے۔ اس کی وضاحت فرمائیے۔ آپ نے جواب دیا۔ آپ کے اور بندے کے درمیان طبقۂ امراء ایک طرح سے وسیلہ ہیں۔ میں نے وسیلہ تلاش کرنے کی کوشش کی مگر آپ تک نہ پہنچ سکا۔ اب آپ نے خود بلا لیا اور میں بغیر کسی وسیلے کے آپ سے واصل ہو گیا۔ اسی طرح انسان لاکھ کوشش کرے کہ واصل بحق ہو جائے لیکن جب تک حق تعالےٰ نہ چاہے وہ کامیاب نہیں ہو سکتا، اور جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے طلب ہو تو وہ مقصد کو پا لیتا ہے اور واصل بحق ہو جاتا ہے۔ بادشاہ نے بڑے اعزاز و احترام سے آپ کو رخصت کیا۔

جب آپ چلے گئے تو بادشاہ نے اپنے مقربین سے کہا کہ اس مردِ حق سے سلفِ صالحین کی بو آتی ہے [2]۔

شیخ اسرائیل نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ درس و تدریس اور تقویٰ و طہارت میں بسر کیا۔ لیکن جوانی کی پاکبازی اور کہولت کی متقیانہ زندگی کو بڑھاپے کے عالم میں ایک سخت حادثہ پیش آیا جس سے آپ کے وابستگان و امن کو سخت کوفت اور پریشانی ہوئی جب آپ عالم پیری کی طرف بڑھے، کالے بال بھیگ گئے، داڑھی پر سفیدی کا نور نمایاں ہوا تو طبیعت نے ایک دم پلٹا کھایا اور آپ کسی مطربہ پر عاشق ہو گئے اور درس و تدریس کا سلسلہ ختم کر کے رندانہ زندگی اختیار کر لی۔ اس میں آپ اس حد تک بڑھ گئے کہ شراب جیسی ناپاک چیز سے بھی پرہیز نہ رہا۔ شیخ کے بے شمار شاگرد تھے۔ انھیں سخت صدمہ ہوا۔ جس طرح شیخ صنعان ایک ترسا زادی کے عشق میں دیوانہ ہو گئے تھے اور ان کے شاگردوں نے اپنے استاد کی اصلاح کے لیے کوشش کی تھی، اسی طرح شیخ سعد اللہ کی اصلاح کے لیے بھی سب لوگ آمادہ ہوئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ شہر کا محتسب بھی ان لوگوں میں شریک ہو گیا۔ ملا بدایونی لکھتے ہیں:-

---

[1] [2] مرآۃ العالم ورق ۴۸۷ -

"ایک دن آپ اس مُطرِبہ کے ساتھ شراب پی رہے تھے کہ محتسب اور طلبہ کی جماعت اکٹھی ہوئی اور دیوار پھاند کر اس مکان میں داخل ہوگئی جہاں یہ محفلِ نائو نوش جاری تھی۔ انھوں نے تمام آلات ضرب توڑ دیئے۔ وہ شیخ سعداللہ بنی اسرائیلی کو گرفتار کرنے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ شیخ نے کہا۔ اگر میں نے ایک غیر شرعی فعل کا ارتکاب کیا ہے تو تم تین افعال کے مرتکب ہوئے ہو۔ اوّل تو بغیر اجازت دیوار پھاند کر اندر داخل ہوئے ہو۔ دوسرے تم نے اس سلسلے میں تجسّس سے کام لیا ہے جس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ تیسرے دروازے کو کھٹکھٹائے بغیر یہاں چلے آئے ہو۔ تم میری نسبت سزا کے زیادہ مستحق ہو۔"

(منتخب التواریخ جلد سوم صـ۵۳)

وہ جماعت شرمندہ ہوکر واپس چلی گئی۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے توبہ کی توفیق دی۔ ایک مرتبہ پھر آپ حلقۂ درس میں آئے اور طلبہ میں علم کی دولت لٹانے لگے اب آپ نے امام غزالی کی مشہور کتاب احیاء العلوم کو اپنا دستورِ حیات بنایا۔ درس کے بعد چند اوقات سجادہ عبادت اور ریاضت میں بسر کرتے۔

آپ بہت سی تصانیف کے مالک بھی ہیں۔ جن میں امام غزالی کی مشہور کتاب جواہر القرآن کی شرح خاص طور پر مشہور ہے۔ اکبر بھی آپ کی علمی شہرت سے متاثر تھا۔ اس نے ایک مرتبہ خلوت میں آپ کو باریابی کا شرف بخشا۔ مجملہ اور باتوں کے اس نے آپ سے یہ بھی سوال کیا کہ آپ کس قوم سے ہیں۔ شیخ نے بڑی بے تکلفی سے فرمایا کہ

"جماعت نویسندہ ہا"

جنھیں ہندی زبان میں کا ئستھ کہتے ہیں۔ اکبر کو آپ کی یہ بے تکلفی بہت پسند آئی۔ ملّا بدایونی کہتے ہیں:۔

"مجھے آپ سے پہلی مرتبہ لاہور ہی میں ملنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے آپ سے ملتان کی ویرانی لاہور کی آبادی، ملتان کے سلاطین لنگاہ خاص کر سلطان حسین کے بارے میں کچھ سوالات پوچھے۔ آپ نے ان سوالوں کا جواب بڑی فصاحت و بلاغت سے دیا۔ مجھ پر ان باتوں کا بڑا اثر ہوا۔"

(منتخب التواریخ جلد سوم صـ۵۴)

شیخ سعداللہ ہاتھ کے سخی اور دل کے نرم تھے۔ کبھی کوئی سائل آپ کے در سے خالی نہیں گیا۔ تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ آپ معاش کے تمام ظاہری اسباب سے محروم تھے بادشاہ نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ آپ مدد معاش قبول کریں مگر آپ نے ہر بار انکار کردیا۔ بدایونی کے قول کے مطابق آپ تقریباً اسّی برس کی عمر میں فوت ہوئے۔ مگر صاحب مراۃ العالم کا بیان ہے کہ لفظ ذاکر یعنی ۹۲۱ھ (۱۵۱۵ء) آپ کی تاریخ ولادت اور لفظ حکیم یعنی ۷۸ برس آپ کی عمر تھی۔ اس حساب سے آپ ۹۹۹ھ/۱۵۹۰ء یا ۱۰۰۰ھ/۱۵۹۱ء میں فوت ہوئے۔ شہر کے چھوٹے بڑے، ہر فرقہ اور ہر خیال کے لوگ آپ کے جنازے میں شریک تھے۔

شیخ اسحاق کاکو آپ کے استاد شیخ اسحاق کاکو المتوفی ۹۹۶ھ/۱۵۸۸ء اپنے وقت کے بہت بڑے فاضل تھے۔ آپ بڑے متوکل اور متورع تھے۔ تمام عمر درس میں گزاری، تمام علوم و فنون کے جامع تھے۔ بڑے صوفی مشرب

بزرگ تھے، خود حق گو تھے اور حق گوئی کے حامی۔ آپ کا قاعدہ تھا کہ جب کوئی سوال پوچھتا تو جواب دیتے ورنہ خاموش رہتے۔ ساری عمر کسی امیر یا وزیر کے گھر نہیں گئے نہ کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کیا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آپ کہیں جا رہے تھے۔ ایک شخص نے آپ کو مزدور خیال کرتے ہوئے کہا۔ دودھ اور چاول کی یہ دیگچہ اُٹھا لو اور میرے ساتھ ساتھ چلے آؤ۔ آپ نے چپ چاپ اسے اُٹھا لیا۔ نہ زبان پر انکار تھا نہ دل میں نفرت، اس شخص کے پیچھے پیچھے اس کے مکان پر آئے اور دیگچہ اس کے حوالے کیا۔ آپ فرماتے ہیں کہ اس فعل سے میرا دل آئینے کی طرح صاف ہو گیا۔ بدی اور برائی کے داغ دھبے دھل گئے۔ آپ نے سو برس سے زیادہ عمر پائی۔ مرنے کے بعد آپ کا مزار نخاس ہی میں بنایا گیا جسے ۱۹۳۵ء میں سکھوں نے شہید کر دیا۔

شیخ اسحاق کاکو جوانی میں شکار کے بہت دلدادہ تھے۔ وہ اس میں مصروف ہو کر بہت خوش ہوتے۔ جب بھی آپ کو درس سے فرصت ملتی تو باز، کتے اور دوسرے شکاری جانور لے کر شکار کو نکل جاتے۔ اکثر شکار آپ پیادہ پا ہی کھیلتے تھے، کاکو آپ کے والد بزرگوار کا نام ہے۔ اہلِ لاہور آپ کی ولایت کے قائل تھے۔

ملا جمال تلوی

دورِ اکبری میں تلہ ایک بہت مشہور محلہ ہوا کرتا تھا۔ یہ محلہ وہاں واقع تھا جہاں آجکل دیوان رتن چند داڑھی والے کی سرائے اور باغ، چوبارہ چجو بھگت، میو ہسپتال زنانہ و مردانہ، بھارت بلڈنگ اور گاندھی سکوئر واقع ہیں۔ اسی جگہ شیخ جمال تلوی کی درس گاہ تھی۔ آپ ہر قسم کے علوم و فنون میں کامل تھے۔ علم تفسیر و حدیث میں ماہر اور فقر و سلوک میں بھی خدائی رکھتے تھے۔ کہتے ہیں کہ آپ کو شیخ علی ہجویری عرف داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ سے بے حد عقیدت تھی۔ چنانچہ پورے بارہ برس تک آپ ہر روز مزارِ اقدس پر فاتحہ خوانی کے لیے حاضر ہوتے رہے خواہ طوفان ہو یا بارش، اس معمول میں ناغہ نہیں ہوتا تھا۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ آپ کو طعام میسر نہ آیا۔ اس پر کچھ دن گزر گئے۔ بھوک کے مارے آپ کی طبیعت پریشان اور دل مضطرب ہو رہا تھا۔ آپ اسی عالم میں خان خاناں کے باغ کی طرف چلے گئے اور ایک توت کے درخت کے نیچے شاخ کو ہاتھ میں پکڑ کر کھڑے ہو گئے۔ توت کا موسم دو مہینے پہلے ختم ہو چکا تھا۔ اچانک درخت کی شاخوں میں سرسراہٹ سی ہوئی اور ایک نورانی وضع کا بزرگ درخت کی شاخ پر بیٹھا نظر آیا۔ جمال نے اس بزرگ کی جانب دیکھا۔ اس نے بڑے لطف اور مہربانی سے فرمایا۔

"جمال! کیا توت کھاؤ گے؟"

شیخ جمال نے جواب دیا۔

"ہاں!"

اس بزرگ نے شاخ کو جھاڑا۔ توت زمین پر گرے اور شیخ جمال نے انہیں چن چن کر کھانا شروع کیا۔ اس بزرگ نے ایک مرتبہ پھر شاخ کو ہلایا۔ توت اور گرے۔ مولانا جمال نے انہیں اٹھا کر پھر کھایا حتیٰ کہ ان کی بھوک جاتی رہی۔ شیخ جمال کہتے ہیں کہ وہ حضرت شیخ علی ہجویری تھے۔ آپ نے فرمایا کہ تم نے ہماری بہت خدمت کی ہے۔ پانچ روپے تمہارا یومیہ مقرر کیا جاتا ہے۔ یہ کہہ کر آپ غائب ہو گئے۔ مولانا جمال تلوی فرماتے ہیں:۔

"از آں روز مردم از امراء و شاگرداں وغیرہ ہم ہدایہ می فرستند حساب می کنم

روزی پنج روپیہ شود [1]

آپ مشہور صاحب دل بزرگ حاجی مہدی کے قرابت داروں میں سے تھے۔ مولانا نے اوچ کے مشہور عالم ملا اسماعیل سے علوم و فنون حاصل کیے۔ ملا بدایونی کہتے ہیں [2] کہ "اس وقت وہ اپنے وقت کے اعلم العلماء ہیں اور سب سے مشہور مدرس۔ آپ کا درس نزدیک و دور شہرت رکھتا ہے۔ آپ نے آٹھ برس کی عمر سے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور اب (۱۰۰۴ھ/۱۵۹۵ء میں) آپ کی عمر پچاس اور ساٹھ کے بیچ میں ہے۔ آپ بڑے خوش تقریر اور منقح گو ہیں اور معقولات و منقولات کی باریکیوں کو بڑی آسانی سے شاگردوں کے ذہن نشین کر دیتے ہیں۔ بڑے شفیق استاد ہیں، قرآن پاک کے حافظ، صاحب تقویٰ و طہارت اور صلاح و فلاح ہونے کے علاوہ اخلاق حسنہ کے مجسم پیکر ہیں۔ فیضی کی مشہور تفسیر سواطع الالہام کی اصلاح اکثر مقامات پر آپ ہی نے کی ہے۔"

ملا بدایونی آپ کی تعریف ایک شعر میں یوں فرماتے ہیں ؎

چیست بحث علم اگر تا فرق فرقدی رود
ذکر مولانا جمال الدین محمد می رود

شیخ منصور لاہوری

شیخ منصور لاہوری اکبری دور کے ایک امیر کبیر تھے۔ انھوں نے مختلف حیثیتوں سے زندگی بسر کی۔ ایک مدت تک وہ مالوہ کے قاضی رہے۔ وہاں سے تبدیل ہو کر پنجاب میں بجوارہ اور حدودِ دامن کوہ کے نظم و نسق پر متعین ہوئے۔ جہاں انھیں خاطر خواہ کامیابی ہوئی اور وہ ترقی پا کر ادھر اُدھر مختلف عہدوں پر فائز ہوئے۔ اکبر نے انھیں ایک بہت بڑی جاگیر عطا کی۔ ان کا علمی پایہ اس قدر بلند تھا کہ ملا بدایونی فرماتے ہیں:۔

"ہندوستان میں جس قدر عقلی علوم رائج ہیں وہ ان کے ماہر تھے اور یہ علوم ان کے دماغ میں حاضر رہتے تھے۔ وہ خوش طبع، سلیم الفہم اور کشادہ دست تھے۔ امرا اور سرداروں سے بہت صحبت رکھتے تھے۔"

سرکاری خدمات کی وجہ سے انھیں اس قدر وقت نہیں ملتا تھا کہ وہ اپنے علمی ذوق کی تسکین کے لیے درس و تدریس کا سلسلہ قائم رکھ سکیں۔

مولانا علاؤ الدین

شیخ منصور کے ایک صاحبزادے مولانا علاؤ الدین تھے۔ افتادِ طبیعت کے لحاظ سے وہ اپنے باپ کی ضد تھے۔ وہ سرکاری ملازمت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے اور اس سے پرہیز کرتے تھے۔ اکبر نے انھیں ہر چند منصب پیش کیا مگر انھوں نے قبول نہ کیا۔ وہ درس و افادہ ہی میں مشغول رہے اور ساری عمر اسی شغل میں گزار دی۔ شاگردوں سے ان کا سلوک یہ تھا کہ جو کچھ جاگیر سے آتا سب طلبہ کی ضروریات پر صرف کر دیتے۔ بدایونی لکھتا ہے کہ،

"از جملہ ملایان در ہند بعد از پیر محمد خان شیروانی و ملا نور محمد ہیچ کس دیگر بہ بذل و کرم و نثار و ایثار ضرب المثل نہ شد" (بدایونی جلد سوم ص ۱۵۶)

---

[1] مراۃ العالم ورق ۴۹۰ - [2] بدایونی جلد ۳ ص ۱۰۵ -

شیخ منور لاهوری آپ شیخ سعد اللہ بنی اسرائیلی کے بھانجے اور شاگرد تھے قرآن کریم کے حافظ اور ہفت قرأت کے ماہر تھے۔ بیس سال میں تحصیل علوم سے فارغ ہو گئے۔ اس کے بعد مسند درس بچھائی اور تدریس علوم میں مشغول ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں بلا کا حافظہ عطا کیا تھا۔ آپ اکثر تفسیر کا درس دیا کرتے اور اس درس میں حافظے کی مدد سے تمام متداول اور مشہور تفسیروں کے حوالے پیش کرتے جو دوسروں کے لیے کرامت سے کم نہ تھا۔ آپ کی شہرت لاہور کی چار دیواری سے نکل کر ہندوستان گیر ہوئی اور اکبر کے کانوں تک بھی پہنچی۔ اس نے آپ کو ملازمت کی دعوت دی مگر توکل و استغنا کے اس بادشاہ نے اسے قبول نہ کیا، درس و تدریس کے سلسلے کو اپنے لیے کافی سمجھا۔

جب ملک میں مذہبی اختلافات شروع ہوئے اور دربار اکبری علمائے سوء کی بدولت ہر قسم کی بدعتوں کا مرکز بن گیا تو آپ نے دوسرے علمائے حق کے ساتھ مل کر صدائے احتجاج بلند کی۔ چنانچہ انھیں مغلوں کے کالے پانی یعنی گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا گیا جہاں آپ ۱۰۱۱ھ / ۱۶۰۲ء میں دنیا کی گیر و دار سے آزاد ہو گئے۔

آپ بہت سی تصانیف کے مالک ہیں۔ حدیث میں آپ نے مشہور کتاب مشارق الانوار کی شرح لکھی۔ اس کے علاوہ شرح بدیع البیان، شرح ارشاد قاضی بھی آپ کی تصانیف ہیں۔ آپ نے اکبر کے حکم سے معجم البلدان کا ترجمہ سلیس اور آسان فارسی میں کیا۔ اس ترجمہ میں ملا احمد ٹھٹھوی اور قاسم بیگ بھی آپ کے شریک کار تھے۔ یہ کتاب ملکوں اور شہروں کے حالات پر عربی زبان میں تالیف ہوئی تھی۔[1]

شیخ مبارک ناگوری ناگور راجپوتانے میں ہمارے علوم و فنون کا بہت بڑا مرکز رہا ہے۔ اب ایک گمنام سا قصبہ ہے اور اس کی شہرت وہاں کے بیلوں کی وجہ سے ہے۔ شیخ مبارک اسی جگہ ۹۱۱ھ / ۱۵۰۵ء میں پیدا ہوئے۔ گھر سے تعلیم حاصل کر کے احمد آباد گجرات کا رخ کیا کیونکہ ان دنوں بڑے بڑے جید عالم اس جگہ درس و تدریس میں مشغول تھے۔ تکمیل تعلیم کے بعد ۶ محرم ۹۵۰ھ (۱۵۴۳ء) کو آگرہ پہنچے اور ایک مجذوب کے ایما پر وہاں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور پورے پینتالیس برس مسند درس پر بیٹھ کر لوگوں کو مستفیض کرتے رہے۔ یہیں ۹۵۴ھ میں فیضی اور ۹۵۸ھ / ۱۵۵۱ء میں ابوالفضل پیدا ہوئے۔

سلیم شاہ سوری کے زمانے میں مخدوم الملک کو بے حد اقتدار حاصل ہوا۔ اس نے پوری قوت سے بدعتیوں، مہدویوں اور دوسرے بدعقیدہ لوگوں کا استیصال کرنا شروع کیا۔ شیخ مبارک آزاد خیال اور آزاد مشرب تھے ان کا سینہ تعصب کے داغ دھبوں سے بالکل پاک تھا۔ وہ سب سے ملتے۔ گرم جوشی اور خندہ پیشانی سے ملاقاتیں کرتے، یہ بات مخدوم الملک کو بری طرح کھٹکتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ شیخ مبارک بھی اس کا ہمنوا ہو جائے۔ اس مقصد کے لیے اس نے کئی طریقے اختیار کیے مگر شیخ نے اپنی وضع نہ بدلی۔ جب سید محمد مہدی کے خلفا میں سے شیخ علائی کو دربار میں حاضر کیا گیا۔ اور ان کے قتل کا فتویٰ علما سے حاصل کرنے کی کوشش کی گئی تو شیخ مبارک نے اس فتویٰ پر دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ سلیم شاہ دل سے اس بات کا معترف تھا کہ شیخ علائی بالکل بے گناہ ہے مگر مخدوم الملک کے سامنے دم نہیں مار سکتا تھا، اس نے بات ٹالنے کے لیے معاملہ شیخ بڈھا بہاری

---

[1] مرآۃ العالم از بختاور خاں ورق ۴۸۸ - تذکرہ علمائے لاہور از منشی محمد الدین فوق ص ۲۲

کے پاس بھیج دیا۔ اس پُر آشوب زمانے میں سلیم شاہ سوری، مخدوم الملک، شیخ بڈھا اور شیخ علائی محض چار شخصیتیں ہی نہ تھیں بلکہ یہ چار عناصر تھے۔ چار تحریکیں تھیں۔ چار رجحانات تھے جنھوں نے آگے چل کر ہندوستان کے معاشرہ اور دینی ماحول کو بنانے اور بگاڑنے کا کام سر انجام دیا۔

شیخ مبارک کی مخالفت کا اثر یہ ہوا کہ مخدوم الملک ان کے درپے آزار ہو گیا اور مخالفت کا یہ طوفان اکبر کے ابتدائی ایام حکومت تک برپا رہا۔ اس سے جس قدر ہو سکا اس نے شیخ مبارک کو ستایا۔ اذیتیں پہنچائیں اور پریشان کیا۔ آخر خان اعظم میرزا عزیز کوکلتاش آڑے آیا اور شیخ کو پناہ ملی۔ اب مصیبتوں کا طوفان چھٹ گیا۔ دربار شاہی سے شیخ کا تعلق قائم ہو گیا۔ انھوں نے ایک مرتبہ پھر اطمینان قلب کے ساتھ پڑھنا پڑھانا شروع کیا۔

۹۹۵ھ (۱۵۸۷ء) میں کشمیر اور اس سے زیادہ قبائلی علاقے میں گڑبڑ ہوئی۔ اکبر لاہور آیا۔ یہاں اسے ایک طویل عرصے تک پھر قیام کرنا پڑا۔ شیخ ابوالفضل بھی ساتھ تھا۔ اسے باپ کی جدائی گوارا نہ تھی۔ اس نے ایک عریضہ کے ذریعے باپ سے گذارش کی کہ وہ لاہور تشریف لے آئیں چنانچہ ۲ رجب ۹۹۵ھ (۱۵۸۷ء) کو آپ لاہور تشریف لائے۔ ابوالفضل کے آباد کئے ہوئے علاقے فضل آباد میں قیام کیا اور درس و تدریس کے محبوب مشغلے میں مشغول ہو گئے۔ ابوالفضل کہتا ہے کہ

> "اب آپ علوم ظاہری پر کم گفتگو کرتے تھے۔ درس و گفتگو کا موضوع توحید باری تعالیٰ اور ذات و صفات باری تعالے ہوتا تھا۔ لاہور کے اکثر طالبان علم اور متلاشیان حق آپ کے درس میں شریک ہوتے تھے۔" (خاتمہ آئین اکبری جلد سوم)

انھیں ایام میں شیخ مبارک بینائی سے محروم ہو گئے۔ دل کی بصیرت قائم تھی۔ آپ نے اپنی مشہور تفسیر منبع نفائس العیون یہیں لاہور میں مکمل کی۔ یہ تفسیر کبیر کی طرز پر ہے اور چار جلدوں میں ہے۔ ملا بدایونی کہتا ہے:-

> "جن دنوں شیخ یہ تفسیر لکھ رہے تھے آپ وظیفے کے طور پر ابن فارض کا قصیدہ تائیہ جو سات سو اشعار پر مشتمل ہے اور قصیدہ بردہ اور قصیدہ کعب ابن زہیر اور دیگر وظائف پڑھا کرتے تھے۔" (بدایونی جلد سوم صـ۷۴)

یہ سب نعتیہ قصائد ہیں۔ اس سے شیخ کے مذہبی عقائد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت کا پتہ چلتا ہے۔ یہ تفسیر آج ناپید ہے۔

آخری عمر میں شیخ کی گردن پر پھوڑا نکلا۔ گیارہ روز بیمار رہ کر، ۱۷ ذی قعدہ ۱۰۰۱ھ (۱۵۹۳ء) کو اس دار فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کر گئے۔ ملا بدایونی لکھتا ہے:-

> "ملاے بایں جامعیت بہ نظر نیامدہ" (ایضاً صـ۷۴)

شیخ معقولات اور منقولات، ریاضی، منطق، فلسفہ، تفسیر، حدیث، فقہ، علم شعر و معمّا اور علوم قرآنی میں اپنا عدیل و سہیم نہ رکھتے تھے۔ موسیقی میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا۔ ایک دفعہ اکبر سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی۔ بادشاہ نے کہا کہ اس فن لطیف کے سلسلے میں ہم سے جو سامان بہم پہنچا ہے وہ کسی اور جگہ نہیں ہے۔ کسی دن ہم دکھائیں گے۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد شیخ مخو،

الزام حب جاہ کا ہے۔ شیخ بدایونی کے قول کے مطابق عمر بھر دربار سے دور دور رہے۔ حالانکہ اگر انھیں حب جاہ ہوتی تو مخصہ کے مرتب کرنے کے بعد صدر الصدور اور اس سے بڑا عہدہ بھی پا سکتے تھے۔ وہ امور دینی میں اس قدر متشدد تھے کہ ان کی محفل وعظ میں اگر کوئی سونے کی انگوٹھی یا حریر کا لباس، سرخ رنگ کا موزہ یا زرد و سرخ لباس پہن کر شریک ہوتا تو آپ اسے اپنی مجلس وعظ سے نکال دیتے اور اگر کسی کا تہ بند یا پاجامہ ٹخنوں سے نیچے ہوتا تو حکم دیتے کہ جتنا حصہ بڑھا ہوا ہے اسے کاٹ کر علیحدہ کر دیا جائے۔ (بدایونی جلد سوم ص ۷۳)

شیخ معین لاھوری

شیخ معین، ملا بدایونی کے قول کے مطابق انسانی لباس میں فرشتہ تھے۔ آپ مشہور واعظ اور مصنف مولانا معین کے پوتے تھے۔ مولانا معین واعظ مشہور کتاب مدارج النبوت کے مصنف اور دیوان معین کے مالک ہیں۔ یہ دیوان منشی نولکشور نے خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے شائع کیا ہے جو غلط ہے۔ یہ مولانا معین واعظ کے کلام کا مجموعہ ہے۔

شیخ معین کو اکبر نے کچھ عرصہ کے لیے لاہور کا قاضی مقرر کیا۔ آپ نے اس مدت میں دیانت اور امانت کے علاوہ اس معاملے میں بھی شہرت حاصل کی کہ جب کوئی قضیہ آپ کی عدالت میں پیش ہوتا تو آپ فریقین کی منت و زاری کر کے انھیں اس پر آمادہ کر لیتے کہ آپس میں مصالحت کر لیں اور ایسا کرتے ہوئے فرماتے۔

"میں چاہتا ہوں کہ مجھ سے غلط فیصلہ نہ ہو جائے تاکہ قیامت کے دن مجھے اس کا جوابدہ نہ ہونا پڑے۔"

جب کبھی کوئی عورت خاوند کے غائب ہو جانے کے باعث تنسیخ نکاح کا دعویٰ کرتی تو آپ اسے یہ کہتے کہ گزارہ مجھ سے لو اور خاوند کا انتظار کرو شاید وہ آ جائے۔ اور کچھ نہ کچھ رقم مدد معاش کے طور پر اپنے پاس سے مقرر کر دیتے۔ لیکن سب سے نمایاں پہلو جو ہمیں آپ کی زندگی میں نظر آتا ہے وہ اشاعت علوم و فنون ہے۔ فرصت کے اوقات میں خود درس دیتے اور مدد معاش کے طور پر جو کچھ ملتا اسے یوں صرف کرتے کہ کاتبوں کو نفیس اور نادر کتابیں نقل کرنے کا حکم دیتے پھر خود ان کا مقابلہ اصل کتب سے کرتے اور خوب اچھی جلد بندی کروا کر طالب علموں میں تقسیم کر دیتے۔ ایک مدت تک آپ کے یہی طور طریقے رہے اور آپ نے ہزارہا کتابیں طالب علموں میں تقسیم کیں۔ آپ ۹۹۵ھ / ۱۵۸۶ء میں فوت ہوئے۔ افسوس آپ کے دونوں لڑکے جوہر علم سے عاری رہے۔ ایک نے کبوتر بازی میں اور دوسرے نے کشتی گیری میں شہرت حاصل کی۔

شیخ موسےٰ حداد

آپ سنت کے عاشق تھے۔ خلاف سنت قدم اٹھانا پسند نہ کرتے تھے۔ امام ابوحنیفہؒ سے دلی عقیدت تھی۔ انہی کے مسلک پر چلتے تھے۔ اپنے وقت کے بہترین قاری تھے۔ قرآن کریم جب سوز و گداز سے پڑھتے تو اڑتے ہوئے پرندے بھی ٹھہر جاتے۔ سنگ دل سے سنگدل انسان کا دل موم کی طرح پگھل جاتا۔ آپ ولی کامل تھے، علوم ظاہری و باطنی میں اپنی مثال آپ تھے۔ آپ کے شاگردوں کی تعداد ان گنت تھی۔ بعض تذکرہ نویسوں نے آپ کو شیخ موسیٰ قاری بھی لکھا ہے اور کہا ہے کہ آپ علم تجوید میں کامل دستگاہ رکھتے تھے اور قرأت کے رموز و نکات خوب جانتے تھے۔ اکبر کے ابتدائی ایام حکومت میں فوت ہوئے۔

ملّا ہادی محمد

لاہور کے رہنے والے تھے۔ اسی جگہ پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم حاصل کی۔ انھیں ہمیشہ طالب علمی پہ ناز رہا۔ معقولات سے بچتے تھے البتہ علمِ دین سے خاص شغف تھا۔ فقہ میں کمال پیدا کیا۔ حدیث دلی شوق و ذوق سے پڑھی اور جہاں کہیں کسی محدّث کا پتہ سُنا وہاں پہنچ کر حدیث میں اس سے فیض حاصل کیا۔ دینی علوم کو خوب سمجھتے تھے اور ان پر کافی غور و خوض کرتے رہتے تھے۔ دل محبتِ الٰہی سے لبریز تھا۔ طبیعت میں سوز و گداز بھی تھا۔ اہل اللہ کی تلاش میں رہتے تھے۔ اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ اپنے مرشد کے حکم سے اپنے مکان کے سامنے مسجد بنائی۔ وہاں درس دینا شروع کیا۔ اسی مسجد میں نماز پنجگانہ بھی پڑھاتے تھے۔ اللہ تعالےٰ نے بڑی شہرت اور عظمت عطا کی۔ آپ ایک لمبی مدّت زندہ رہنے کے بعد ۱۰۱۵ھ (۱۶۰۶ء) میں فوت ہوئے۔ (طبقاتِ شاہ جہانی (قلمی))

مولانا محمد مفتی

اکبری دَور کے بڑے مشہور معلّم تھے۔ ان کا درس خاص طور پر مشہور تھا۔ علوم و فنون کی مختلف شاخوں میں پورا پورا درک رکھتے تھے۔ فقہ میں انھیں خاص مہارت حاصل تھی۔ اس شہرت کی بنا پر انھیں عدلیہ میں عہدہ پیش ہوا۔ حالات سے پتہ چلتا ہے کہ کچھ عرصہ انھوں نے مفتی کے فرائض بھی ادا کیے۔ دیانت اور تقویٰ ایک معلّم کے لیے لازمی چیزیں ہیں اور آپ کی طبیعت میں یہ دونوں باتیں موجود تھیں۔ اس لیے لوگ آپ کا احترام کرتے تھے اور حکومت کے عمال بھی بڑی عزت سے پیش آتے تھے۔

کچھ عرصہ کے بعد اس کام سے آپ کی طبیعت اچاٹ ہوگئی۔ آپ نے پھر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ اب فقہ کے ساتھ ساتھ آپ نے حدیث اور تفسیر پر بھی زور دینا شروع کیا۔ فنِ حدیث میں کمال پیدا کیا۔ ملّا بدایونی لکھتے ہیں کہ ہر بار جب آپ بخاری شریف اور ترمذی شریف ختم کرتے تو بہت بڑی دعوت کا بندوبست کرتے جس میں بڑے پُرتکلف کھانے اور حلوے ہوتے تھے۔ اس دعوت میں بغرا (کھانے کا نام) خاص طور پر تیار کیا جاتا۔ شہر کے تمام عالم اور فاضل اس موقع پر جمع ہوتے۔ ویسے بھی ہر صاحبِ علم آپ کی خدمت میں حاضر ہونا اور آپ سے استفادہ کرنا فخر سمجھتا تھا۔ ملا بدایونی لکھتے ہیں :۔

"جب میں اپنی کتاب لکھ رہا ہوں (یعنی ۱۰۰۴ھ / ۱۵۹۵ء میں) تو آپ کی عمر نوّے برس کی ہے۔ آپ بہت نحیف اور منحنی ہو گئے ہیں قویٰ میں ضعف آ گیا ہے۔ ان مجبوریوں کی بنا پر آپ نے درس بند کر دیا ہے مگر آپ کے فاضل بیٹے آپ کے درس کو چلا رہے ہیں۔ یہ بیٹے تمام کمالات اور فضائل میں اپنے باپ کے قائم مقام ہیں۔"

(بدایونی جلد سوم صفحہ ۱۵۴)

مولانا الہ داد لنگر خانی

لاہور کی بیرونی آبادی ہمایوں کے زمانے سے بڑھنی شروع ہوئی تھی سب سے پہلے گزر لنگر خاں آباد ہوا۔ لنگر خاں شاہ محمود لنگاہ والیٔ ملتان کا سپہ سالار تھا۔ جب بابر نے شاہ حسین ارغون والیٔ ٹھٹھہ کو ملتان کا علاقہ جاگیر میں دیا اور وہ اس پر قبضہ کرنے کے لیے آیا، تو اس نے بڑے زور شور سے بھکر کی گزرگاہ سے دریائے سندھ کو عبور کیا۔ سلطان محمود لنگاہ اس کے مقابلے کے لیے تیار ہوا۔ مگر اپنے آپ میں مقابلے کی قوت نہ پا کر اس نے گفت و شنید سے معاملہ طے کرنا چاہا۔ اور چند آدمیوں کو شاہ حسین ارغون کے پاس بھیجا۔ جب وہ واپس آئے

تو اسی رات سلطان محمود لنگاہ فوت ہو گیا۔ مشہور یہ کیا گیا کہ قولنج کے شدید حملے کی تاب نہ لا کر سلطان فوت ہوا ہے مگر اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ لنگر خاں ہی نے اسے زہر دے دیا۔ لنگر خاں اسی وقت سلطان حسین لنگاہ کو جو سلطان محمود کا جانشین تھا، چھوڑ کر سلطان حسین ارغون سے آملا۔ معمولی سے محاصرے کے بعد شہر پر سلطان ارغون کا قبضہ ہو گیا۔ اس نے خواجہ شمس الدین کو اپنا نائب مقرر کیا۔ اور لنگر خاں کو خواجہ کا مشیر۔

لنگر خاں نے خواجہ شمس الدین کو پریشان کر کے وہاں سے بھگا دیا اور خود ملتان پر قابض ہو گیا۔

بابر کے مرنے کے بعد ہمایوں نے ملتان پر لنگر خاں کی مدد سے قبضہ کیا۔ جب لاہور کی آبادی کی کوشش ہوئی تو ہمایوں نے لنگر خاں کو لاہور میں محل بنانے کی اجازت دی۔ اس نے محل کے گرد ایک محلہ آباد کیا۔ وہیں سکونت اختیار کی۔ وہاں پختہ حویلیاں اور مکانات تعمیر ہوئے۔ یہ علاقہ سر حاکمانِ لاہور کے زمانے تک آباد رہا۔ مزنگ کی موجودہ آبادی کے شمال مغرب میں گڑھ لنگر خاں واقع تھا جہاں آج کل مسجد شاہ چراغ، سٹیٹ بنک، اکاؤنٹنٹ جنرل کا دفتر اور ہائی کورٹ واقع ہیں۔

مولانا الہ داد اکبر کے زمانے میں یہاں درس دیا کرتے تھے۔ آپ فرشتہ سیرت اور بلند اخلاق معلّم تھے۔ سنّت کے عاشق اور شیفتہ تھے۔ اس سے سر مو تجاوز کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کا تقویٰ اور طہارت اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ لوگوں میں متقی کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔ انھیں تمام متداولہ علوم و فنون میں پوری پوری مہارت حاصل تھی۔ آپ درس و تدریس میں ہمیشہ مصروف رہتے اور بڑی قناعت سے زندگی بسر کرتے تھے۔ ارباب دنیا سے میل جول رکھنا یا کسی امیر کے گھر جانا انھیں گوارا نہ تھا۔ کئی دفعہ کوشش کی گئی کہ وہ مدد معاش قبول کر لیں مگر آپ نے ہمیشہ انکار ہی کیا۔

اکثر امرا و منصب دار حصول برکت کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے لیکن آپ ان کی پروا نہ کرتے بلکہ ان سے بہت کم میل ملاپ اور صحبت رکھتے۔ بختاور خاں کا بیان ہے کہ بعض امیر رات کے وقت ان کے گھر میں روپیہ وغیرہ پھینک جاتے۔ اس سے ان کی غرض و غایت آپ کی قناعت پسندی اور توکّل کی آزمائش تھی۔ علی الصبح آپ کے وابستگان وہ تمام ان رقوم کو آپ کی خدمت میں لے جاتے۔ آپ یہ رقم لے کر امیروں کے گھروں میں پھرتے اور جس کی رقم ہوتی اسے واپس کر کے دم لیتے۔ اس میں بڑی احتیاط اور تجسس سے کام لیتے تاکہ حق، حقدار کو پہنچ جائے۔

مولانا الہ داد اور ان کی آل اولاد کی بسر اوقات کا انحصار ان چند چکیوں کی اجرت پر تھا جو آپ نے اپنے گھر میں لگا رکھی تھیں۔ محلے کی عورتیں آتیں اور تھوڑی سی اجرت دے کر ان چکیوں سے آٹا پیس کر لے جاتیں۔ یہ اجرت آپ کا ذریعہ معاش ہوتی تھی۔ ملّا بدایونی کا بیان ہے کہ جب وہ اپنی تاریخ لکھ رہا تھا تو اس وقت آپ کی عمر اسّی برس کے قریب تھی۔ اس پیرانہ سالی میں بھی آپ برابر درس دیتے تھے۔ (بدایونی جلد سوم صفحہ ۱۵۴)

چند دیگر علماء

ان ایّام میں اور بھی بہت سے عالم لاہور میں درس دیا کرتے تھے۔ ان کے نام تو تاریخوں میں محفوظ ہیں مگر حالات پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ زیادہ سے زیادہ بعض مؤرخین نے ان کے کردار کو ایک آدھ فقرے میں نمایاں کیا ہے۔ ان علما میں قاضی صدر الدین لاہوری بڑے فاضل اور متقی تھے۔ عقلی اور نقلی علوم میں بڑے متبحر تھے۔ درس و تدریس کے علاوہ وہ کئی برس تک لاہور کے قاضی بھی رہے۔ (طبقات اکبری جلد دوم صفحہ ۴۵۳)

ملا ابوالفتح لاہوری کا درس بھی بہت مشہور تھا آپ تقویٰ اور دیانت میں اپنے تمام معاصرین سے ممتاز تھے۔ آپ کے بھائی ملّا عبدالجلیل شہر کے مفتی تھے۔ آپ کے متوسلین میں ملّا عبدالرحمٰن لاہوری بھی بڑے مشہور مدرّس تھے۔ انہی کے معاصر ملّا امام الدین لاہوری تھے جو ہمیشہ درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ عام علما کے مسلک کے خلاف وہ سرکار سے مدد معاش لیتے اور وظیفہ پایا کرتے تھے۔ ان کا درس عوام میں ہردلعزیز تھا۔ اکثر طلبہ کا ہجوم رہتا۔

ملا اسحاق کاکر لاہوری بھی زبردست فاضل اور متبحر عالم تھے۔ ملا نظام الدین ہروی طبقات اکبری میں لکھتا ہے کہ ان کے پائے کے عالم ہندوستان بھر میں بہت کم ہیں۔ وہ تقویٰ اور طہارت کے پیکر ہیں۔ فقر و غنا، توکل و قناعت ان کا شیوا ہے۔ کسی سے سوال کرنا وہ غیرت کے منافی سمجھتے ہیں۔ آپ نے بہت لمبی عمر پائی جس وقت ملا نظام الدین ہروی طبقاتِ اکبری مرتب کر رہے تھے اس وقت آپ کی عمر سو سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ اور آپ اس پیرانہ سالی میں بھی درس دیتے اور طلبہ بڑے ذوق و شوق سے اس میں شریک ہوتے تھے۔ (طبقاتِ اکبری جلد دوم صـــــ)

شیخ نعمت لاہوری، شیخ نورالدین کمبوہ لاہوری، ملا ہاشم کمبوہ، ملا شمس خان کمبوہ لاہوری، ملا بایزید لاہوری بھی اس دور کے فضلا میں شمار ہوتے تھے۔ طلبہ کا گروہِ کثیر ان سے مستفیض ہوتا تھا۔

مفتی اسماعیل بھی لاہور میں پیدا ہوئے، یہیں تکمیل تعلیم کی اور پھر درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔

قاضی نوراللہ شوستری اکبر کے زمانے میں ایران سے مہاجرت کر کے ہندوستان آئے۔ دیانت، امانت اور گوناگوں کمالات سے آراستہ تھے۔ اس بنا پر اکبر نے انھیں لاہور کا قاضی مقرر کیا۔ آپ فرصت کے اوقات میں طلبہ کو درس دیا کرتے تھے۔ مجالس المؤمنین کے نام سے آپ نے ایک تذکرہ بھی مرتب کیا تھا۔ علوم عقلی و نقلی میں یکساں مہارت رکھتے تھے۔

ملا حسام الدین لاہوری کی رنگت خوب سرخ و سفید تھی۔ اس لیے سُرخ کے لقب سے مشہور تھے۔ ملّا نظام الدین ہروی کہتا ہے کہ لاہور کے علمأ کے برخلاف آپ علوم عقلی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اور ان کو خوب جانتے تھے۔ اسی کے باعث آپ کو شروع شروع میں بہت شہرت حاصل ہوئی، بہت متقی اور پرہیزگار تھے دینیات میں بھی آپ کا مقام بہت بلند تھا فلسفہ پڑھانے میں خوب مہارت تھی۔ آپ ہمہ صفت موصوف تھے۔

ملّا عبدالقادر بدایونی اکبر کے دور کی علمی، ادبی، شعری اور عرفانی سرگرمیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ملک کے طول و عرض میں اس قدر ارباب کمال ہیں کہ وہ شمار میں نہیں آ سکتے۔

(منتخب التواریخ جلد سوم صفحہ ۱۵۸)

اس سے ایک بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ زمانہ تاریخ کا زرّیں زمانہ تھا۔ اس دور میں ملک نے نہ صرف اقتصادی اور معاشی ترقی کی بلکہ ہر قسم کے علوم و فنون کو اتنا فروغ حاصل ہوا کہ اس سے پہلے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اگر اکبر کا دورِ حکومت سیاسی طور پر بہت اہم ہے تو علمی و عرفانی نقطۂ نظر بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔ لاہور اکبر کے قیام کی وجہ سے دہلی اور آگرہ سے بازی لے گیا تھا۔ یہاں گھر گھر علمی چرچے تھے اور یہاں کا ہر آدمی شعر و ادب کی زبان میں بات کرتا تھا۔

عہد نور الدین جہانگیر ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء تا ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء

تیموریوں میں جہانگیر بڑا ممتاز مقام رکھتا ہے۔ زمانے نے جن لوگوں کو غلط بخشی سے کام لے کر صحیح مقام عطا نہیں کیا۔ ان میں ایک جہانگیر بھی ہے۔ وہ اگر شہنشاہ ہند کی بجائے شاعری اور ادب میں پڑ جاتا تو اس کا مقام اتنا بلند ہوتا کہ برعظیم ہند و پاکستان اس پر ناز کرتا۔ وہ اگر نیچرل سائنس کا محقق بننا چاہتا اور اس کے حوالے تحقیق کے سلسلے میں کوئی عجائب خانہ (میوزیم) کر دیا جاتا تو وہ ان علوم میں حیرت انگیز انکشافات کا موجد ہوتا۔ اگر وہ خطاطی اور مصوری کو پیشے کے طور پر اختیار کرتا تو بہت بڑا خطاط اور مصور ہوتا جو ان فنون لطیفہ کی باریکیوں پر بھی گہری نظر رکھتا مگر قدرت نے اسے ہندوستان کا تخت و تاج عطا کیا اور سلطنت عظیم کی بھاری ذمہ داریاں اس کو سونپ دیں جنھیں اس نے ذمہ داری کے پورے پورے احساس کے ساتھ ادا کیا، اور ہندوستان کے بادشاہوں میں اس نے نہ صرف ایک ممتاز مقام حاصل کیا بلکہ اپنی انفرادیت کو بہر صورت قائم رکھا۔

سلیم اس کا نام تھا اکبر پیار سے اسے شیخو بابا کہا کرتا تھا۔ وہ بادشاہ ہوا تو اس نے اپنے لیے نورالدین جہانگیر نام اور لقب اختیار کیا۔ چنانچہ وہ تزک میں لکھتا ہے:۔

"چوں پادشاہ شدم بخاطر رسید کہ نام خود را تغیر باید داد کہ این اسم محل اشتباہ است بنام قیاصرۂ روم، ملہم غیب بخاطرم انداخت کہ کار پادشاہاں جہانگیری است۔ خود را جہانگیر نام نہم و لقب خود را چوں جلوس در وقت طلوع حضرت نیر اعظم و نورانی گشتن عالم واقع شدہ نورالدین سازم۔" (تزک جہانگیری نولکشوری ص۳)

جہانگیر بڑی بڑی آرزوؤں اور دعاؤں کے بعد پیدا ہوا تھا اس لیے اس کی تعلیم و تربیت میں خاص اہتمام کیا گیا۔ خاندانی رسم و رواج کے مطابق جب اس کی عمر چار سال چار ماہ اور چار یوم کی ہوئی تو بڑی شان و شوکت کے ساتھ محلات میں رسم تسمیہ خوانی ادا ہوئی۔ دعوت کا اہتمام ہوا۔ خوشی کے شادیانے بجائے گئے اور انعامات تقسیم ہوئے[1]۔

مولانا میر کلاں جو اپنے وقت کے زبردست محدث اور عالم تھے اور تقویٰ و طہارت میں اپنی مثال آپ تھے شہزادہ کے پہلے اتالیق مقرر ہوئے۔ ملک الشعراء فیضی بھی اس کے استاد رہے۔ مولانا علی احمد نشانی بھی جو بڑے صاحب دل بزرگ، ہیئت، طبیعات، املا و انشا اور خطاطی میں بے نظیر و بے مثال تھے کچھ عرصہ تک اسے پڑھاتے رہے۔ چہل حدیث سید صدر جہاں نے پڑھائی۔ عبدالرحیم خان خاناں اور قطب الدین خاں انگہ بھی شہزادے کے اتالیق رہے۔ ان کی صحبت اور تربیت سے جہانگیر کی طبیعت میں بڑی شگفتگی پیدا ہوئی۔ علم و ادب کا ذوق، شاعری اور دیگر فنون لطیفہ کا صحیح صحیح مذاق پیدا ہو گیا۔ وہ ترکی زبان میں خوب ماہر تھا چنانچہ اس نے بابرنامہ جو چغتائی ترکی میں تھا اصل زبان میں مطالعہ کیا۔ جو نسخہ اس کے زیر مطالعہ آیا، اس کے آخری چار باب غائب تھے۔ وہ جہانگیر نے اپنے ہاتھ سے نقل کر کے اس میں شامل کیے۔

---

[1] اکبر نامہ جلد دوم ص۲۰۲۔ ص۲۰۳۔ طبقات اکبری جلد دوم۔ بدایونی جلد دوم۔

تو زک جہانگیری اس کا اپنا روزنامچہ ہے جس میں وہ اپنے حالات بلا کم و کاست بیان کرتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ وہ تاریخ اور جغرافیہ کا صحیح مذاق رکھتا ہے۔ وہ جہاں جاتا ہے وہاں کے تاریخی اور جغرافیائی حالات پوری پوری تفصیل کے ساتھ بیان کر دیتا ہے۔ علم حیوانات اور نباتات کے ساتھ بھی اسے طبعی لگاؤ ہے۔ توزک اس بارے میں ہمارے سامنے بیش بہا معلومات پیش کرتی ہے۔ وہ شعر و شاعری کا بڑا شستہ مذاق رکھتا ہے۔ توزک میں متعدد مقامات پر وہ مزے لے لے کر شعر و سخن کے تذکرے کرتا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ خان خاناں نے اپنے مشاعرے کے لیے مولانا جامی کا یہ مصرع طرح دیا۔ ع

بہر یک گل زحمت صد خار می باید کشید

جہانگیر نے فی البدیہہ اس پر مطلع کہا ؎

ساغرے بر رُخ گلزار می باید کشید
ابر بسیار است مے بسیار می باید کشید

جہانگیر کو جب معلوم ہوا طرحی مصرع مولانا جامی کا ہے اور بہت رواں ہے تو اس نے غزل نکلوا کر دیکھی۔ اس پر اپنی رائے کا اظہار کرتا ہوا کہتا ہے :۔

"غیر ازاں مصرع کہ بطریق مثل زبان زد روزگار شدہ دیگرے کلے نساختہ۔ نہایت سادہ و ہموار گفتہ" (توزک جہانگیری ص ۳۴۳ م کلمات الشعرا از سرخوش ص ۲۲)

اسی طرح ایک مرتبہ اس کے دربار میں امیر الامرا شریف خان فارسی کا یہ شعر پڑھا گیا ؎

بگذر مسیح از سر ما کشتگان عشق
یک زندہ کردن تو بصد خون برابر است

جہانگیر کے اشارے پر سب نے اس پر غزلیں کہیں۔ ملا احمد مہرکن کا شعر اسے پسند آیا ؎

اے محتسب بگو بہ پیر مغاں بترس
یک خم شکستن تو بہ صد خون برابر است

جہانگیر نے خود اس زمین میں یہ شعر کہا ؎

از من متاب رخ کہ نیم بے تو یک نفس
یک دل شکستن تو بہ صد خون برابر است

بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ نور جہاں نے جہانگیر کے اس شعر کے جواب میں یہ شعر کہا ؎

چون نام از تو رُخ کہ توئی قبلۂ مراد
رُخ تافتن ز قبلہ بہ صد خون برابر است

ایک دفعہ کسی شاعر نے ایک قصیدہ جہانگیر کی مدح میں لکھا اور سنانا شروع کیا۔ ابھی اس نے پہلا ہی مصرع پڑھا تھا

اے تاج دولت بر سرت از ابتدا تا انتہا

جہانگیر نے وہیں ٹوک دیا اور کہا۔ علم عروض جانتے ہو؟ اس نے نفی میں جواب دیا۔ جہانگیر نے کہا۔

"اگر عروض می بودی گہ دنت می زدم"

اور پھر تقطیع کر کے بتایا کہ مصرع کا دوسرا رکن "دنت بر سرت" آتا ہے جو انتہائی گستاخی ہے [1]

ایک شاعر جو کلال زادہ تھا اس کا واقعہ بھی سرخوش نے بیان کیا ہے۔ نور جہاں کی سفارش سے وہ باریاب ہوا۔ جہانگیر نے کہا ان لوگوں کا کام چاؤشی اور شاہی سواری کا انتظام ہے۔ شاعری سے انھیں کیا مناسبت ہو سکتی ہے مگر نور جہاں کے اصرار پر اس نے شعر پڑھنے کی اجازت دے دی۔ جب وہ اس شعر پر پہنچا ؎

مئی بگیر بہ سر سے وار دلے نصیحت گر
کنارہ گیر کہ امروز روز طوفان ست

جہانگیر نے ہنس کر کہا یہ ہے پیشے کی رعایت [2]

نور جہاں نے ایک مرتبہ پھر مئی کلال کی تقریب کرائی۔ بادشاہ نے شعر پڑھنے کا حکم دیا۔ حسن اتفاق سے اس نے پہلا شعر یہ پڑھا ؎

من می روم و برق زناں شعلہ آہم
اے ہمنفساں دور شوید از سر راہم

بادشاہ نے مسکرا کر کہا "بہ بینید بازپیشۂ خود را جلوہ دادہ و رعایت نمودہ" [3]

ان چند مثالوں سے جہانگیر کے ذوقِ سخن کا پتہ چل سکتا ہے۔ بادشاہ کے اس مذاق کا اثر تمام ملک پر ہوا، شعر و شاعری کے چرچے عام ہو گئے اور ادب کے ساتھ ایک خاص لگاؤ پیدا ہو گیا۔

جہانگیر نے تخت نشین ہونے کے بعد یہ حکم دیا کہ وہ مدارس جو کس مپرسی کی حالت میں پڑے ہیں ان کی مرمت کی جائے اور ان میں پھر سے تعلیم و تدریس کا بندوبست کیا جائے چنانچہ تاریخ جہان جہاں کا مصنف جو جہانگیر کا معاصر تھا لکھتا ہے کہ وہ مدرسے جو گذشتہ تیس برس سے درندوں اور پرندوں کے بسیرے بنے ہوئے تھے پھر سے آباد ہوئے۔ طلبہ جوق در جوق ان میں داخل ہونے شروع ہوئے اور جو لوگ پڑھنا اور پڑھانا مذہبی فریضہ سمجھتے تھے دنیا سے الگ تھلگ ہو کر وہاں بیٹھ گئے اور اطمینان کے ساتھ علوم و فنون کی اشاعت میں مشغول ہو گئے۔

پرانے مدرسوں کے ساتھ ساتھ نئے مدرسے بھی قائم ہوئے۔ محمد صفی دیوان گجرات نے جلیور میں ایک مدرسہ کی عمارت تعمیر کی۔ اور اس کے لیے معلم مقرر کئے۔ سیف خاں ناظم گجرات نے احمد آباد میں اپنے خرچ پر مدرسہ قائم کیا۔ جہانگیر نے یہ حکم نافذ کیا کہ جو شخص لاوارث مر جائے اس کی جائداد سرکاری تحویل میں لے کر اس کی آمدنی سے سرائیں، مدرسے، پل اور سرائیں تعمیر کی جائیں [4]

بادشاہ کی اس توجہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شخص جو تھوڑا سا بھی علم سے لگاؤ رکھتا تھا درس دینے میں فخر محسوس کرنے لگا۔

---

[1] کلمات الشعرا صفحہ ۲۲ [2] کلمات الشعرا صفحہ ۱۰۹ [3] کلمات الشعرا صفحہ ۱۰۹
[4] خوافی خاں جلد اول صفحہ ۲۴۹

حتیٰ کہ شاعر بھی اس میں مشغول ہو گئے۔ علی احمد سندیلوی اس بارے میں ایک دلچسپ واقعہ لکھتا ہے کہ ۲۹ ذی الحجہ ۱۰۲۳ھ میں بادشاہ کا کیمپ فتح پور میں تھا۔ طالب آملی بھی بادشاہ کے ہمراہ تھا۔ منشی فیروز کے دل میں طالب کی ملاقات کا شوق پیدا ہوا۔ طالب تالاب کے کنارے ایک خیمے میں مقیم تھا۔ دیوان کے اجزا اس کے سامنے پڑے تھے جب منشی فیروز وہاں پہنچا تو مصافحہ اور معانقہ کے بعد طالب نے اس سے پوچھا۔ کیسے تشریف لائے؟ اس نے کہا۔ آپ کے کچھ شعر سُنے تھے۔ ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا۔ اس لیے حاضر ہو گیا۔ طالب نے پوچھا آپ کو کونسے شعر پسند آئے۔ فیروز نے چند شعر سُنائے۔ جب وہ اس شعر پر پہنچا ؎

مردم ز رشک چند بہ بینم کہ جام مے
لب بر لبش گذارد و قالب تہی کند

طالب یہ شعر سن کر اچھل پڑا۔ اسے گلے لگایا اور اس کے ذوقِ ادب کی داد دی۔ کہا۔ کمر بند کھولیے اور آرام فرمایئے۔ آپ کی صحبت میں ایک دو دن بڑے لطف سے گذاریں گے۔

عین اس وقت ایک مغل دیوانِ خاقانی لیے وہاں آیا اور طالب سے پڑھنا چاہا۔ طالب نے معذرت کی۔ مگر مغل نہ مانا۔ دیوان کھولا اور ایک قصیدہ پڑھنا شروع کیا۔ جس کا پہلا مصرع یوں تھا۔ ؏

در پردۂ دل آمد دامن کشاں خیالش

طالب کی علمی استعداد کچھ ایسی زیادہ نہ تھی۔ اناپ شناپ باتیں کہنی شروع کیں۔ منشی فیروز ہنس پڑا۔ طالب نے جھنجھلا کر کہا۔ کہ ایسے اشعار تمہارے ہندوستان میں درس کے قابل سمجھے جاتے ہیں، میں ایسے شعر انگشت پا سے لکھ سکتا ہوں۔ منشی فیروز نے کہا شعر کہہ لینا اور بات ہے، سخن سنجی اور سخن فہمی اور چیز ہے۔ طالب افسردہ دل ہو کر چپ ہو گیا، منشی فیروز اپنی اس حرکت پر پشیمان ہوا اسے خوش کرنے کے لیے بولا۔ کل دربار میں لوگوں نے آپ کے کس شعر پر اعتراض کیا تھا۔ طالب نے یہ مصرع پڑھا۔

عنبر افسردہ ام در پردہ دارم بوئے خوش

اور کہا آصف خاں نے اس پر اعتراض کیا تھا کہ عنبر کو افسردہ نہیں کہہ سکتے۔ اوروں نے اس کی تصدیق کی تھی۔ منشی فیروز نے کہا خاقانی نے پتھر کو افسردہ کہا ہے تو پھر عنبر کا کیا قصور؟ خاقانی کا مصرع ہے

کز فیض او بسنگ فسردہ رسد نما

منشی فیروز اپنے زمانے کے زبردست فاضل، ادیب، نقاد اور شاعر تھے۔ انھیں اساتذہ کے ہزاروں شعر نوک بر زبان تھے چنانچہ اس بارے میں ایک بڑا دلچسپ واقعہ تذکروں میں درج ہے۔

ایک دن منشی فیروز کی قیام گاہ پر شعرا کا اجتماع ہوا۔ اس میں طالب آملی، ملا عطائی۔ انور لاہوری اور دوسرے شعرا شریک تھے۔ شعر خوانی ہو رہی تھی کہ شیدا اکبر آبادی بھی آ پہنچا۔ سب نے بڑی گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا اور اسے صدر مقام پر بٹھایا۔ اس سے فرمائش کی کہ اپنا تازہ کلام سُنایئں، اس نے یہ شعر پڑھا ؎

چیست دانی بادۂ گلگوں بصفا جوہرے
حسن را پروردگارے عشق را پیغمبرے

سب شاعر شیدا کی لاف و گذاف اور بے ہودہ گوئی سے تنگ آئے ہوئے تھے وہ چاہتے تھے کہ اس کی گوشمالی کی جائے۔ ملا فیروز ان سے واقف تھے۔ چنانچہ یہ شعر سن کر انہوں نے کہا۔ یہ تو رودکی کے شعر کا چربہ ہے اور اس کا یہ مصرع پڑھا ؎

عشق را پیمبر فرستکن، حسن را آفریدگار توئی

شیدا نے اپنا دوسرا شعر پڑھا ؎

زبس کہ کرد غمت بہ تدبیر جبگر ناخن
چو پشت ماہیم از پائے تا بسر ناخن

ملا فیروز نے کہا۔ یہ مطلع غیاثائی حلوائی کے اس شعر کا سرقہ ہے ؎

از بسکہ سینہ کندم ناخن درو نشست
چو پشت ماہیست سراپائے سینہ ام

شیدا اس پر بگڑا۔ مگر یہ شعر پڑھ کر داد چاہی ؎

بہ صحرا موفشانی دشت پر سنبل شود
در بدریا روبشوی خار ماہی گل شود

فیروز نے کہا کہ ملا کاتبی دو سو برس پہلے اس مضمون کو یوں باندھ چکا ہے ؎

گر بدریا افتند از عکس جمال او فروغ
خار ماہی آورد در قعر دریا بار گل

شیدا بگڑ کر ہرزہ سرائی پر اُتر آیا۔ اور کہا اگر آپ کو اپنی سخن فہمی پر ناز ہے تو اس نعتیہ شعر کے برابر کوئی شعر پڑھیے ؎

ذاتِ تو بود صحیفہ کون کہ کرد
از روی ادب مہر خدا بر پشتت

ملا فیروز نے بڑی بے تکلفی سے ہاتفی کا یہ شعر پڑھ دیا ؎

نبوت را توئی آں نامہ در مشت
کہ از تعظیمش آید مہر بر پشت

عاضرین کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ شیدا بہت خفیف ہوا اور فحش بکنے لگا۔ حاضرین نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور کلام سنانے پر اصرار کیا۔ بڑی رد و کد کے بعد اس نے اپنا یہ شعر پڑھا ؎

زلف او را رشتۂ جاں گفتم گشتم خجل
زانکہ ایں معنی چو زلفش پیش پا افتادہ است

ملا فیروز نے کہا کہ میں اپنے مہمان عزیز کی خاطر چپ رہنا چاہتا ہوں تاکہ اس کی دل آزاری نہ ہو۔ وگرنہ کسی استاد کا یہ شعر اس کا ہم معنی پہلے سے موجود ہے ؎

کس نیابد مصرع پیچیدۂ زلف کجت
گرچہ این مضمون ترا در پیش پا افتادہ است

شیدا خاموش ہو گیا۔ ہر چند حاضرین نے شعر خوانی کی خواہش کی مگر وہ اپنا سکوت بنا رہا۔ مجلس ختم ہوئی۔ شیدا چلا گیا۔ آئندہ کے لیے اس نے دستور بنا لیا کہ جس محفل میں ملا فیروز موجود ہوتا اس میں شعر نہ پڑھتا۔

ایک مدت کے بعد ملا شیدا منشی فیروز کے گھر حاضر ہوا، اس سے چھٹتے ہی سوال کیا کہ "از اشعار من ہیچ بیتے پسند خاطر عالی افتاد" ملا فیروز نے یہ شعر پڑھا ؎

اے بروے تو کردہ آئینہ داچشم نیاز
شانہ را دست دعا در شب زلف تو دراز

ملا شیدا نے کہا۔ "عمرت دراز باد کہ این ہم غنیمت است" [1]

شخصی حکومتوں میں شاہی دربار تہذیب و تمدن کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ وہیں سے تہذیب و ثقافت کی نہریں پھوٹتی ہیں اور عوام کے دل و دماغ کو سیراب کرتی ہیں۔ جب تخت و تاج کا وارث سخن شناس اور باذوق ہو اور علم و ادب سے دلی لگاؤ رکھے تو پھر ملک بھر میں علم و ادب کی محفلیں کیوں نہ برپا ہوں۔ جہانگیر جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں شعر کا دلدادہ، ادب کا شیفتہ اور فنون لطیفہ کا عاشق تھا۔ قدرت نے اسے نقد و نظر کا ملکہ بھی عطا کیا تھا۔ وہ باکمال ہستیوں کی دل کھول کر قدر دانی کرتا، انھیں مرتبہ نہ مرپرستی سے نوازتا مگر ایسا کرنے سے پہلے انھیں صحیح معیار پر پرکھتا۔ جب وہ اس معیار پر پورے اترتے تو پھر ان کے سر پر دست شفقت رکھتا اور موقعہ دیتا کہ وہ ہر قسم کے تفکرات سے آزاد ہو کر اپنے کام میں لگ جائیں۔ آرٹ اور علوم و فنون ایک تحریک۔ ایک رہنمائی اور ایک توجہ کے محتاج ہوتے ہیں، جہاں ان خوابیدہ نغموں کو چھیڑ گیا وہاں نغموں کا سیلاب اُمڈ آیا۔ اور تمام فضا ان سے متاثر ہو کر گونج اٹھی۔

جہانگیر اور اس کے دربار پر ایک نظر ڈالو۔ یہ بات روز روشن کی طرح حقیقت بن کر سب کے سامنے آجائے گی کہ قدرت نے انھیں اس مقصد کے لیے یکجا کیا کہ ان میں سے ہر ایک کا ہاتھ جب قبضۂ شمشیر سے ہٹے تو وہ قلم دان پر ہو۔ رزم آرائیوں اور جنگی معرکوں سے جب فرصت ملے تو بزم آرائی کا مشغلہ جاری ہو شعر و سخن کی محفلیں جمیں۔ ادب اور معارف کے جلسے گرم ہوں گویا کبھی تو وہ میدان جنگ میں داد شجاعت دیں اور کبھی بزم شعر و ادب میں خراج تحسین وصول کریں۔ ان کے علاوہ فرصت کا بیشتر حصہ علمی معرکے سر کرنے اور علوم و فنون کی اشاعت کرنے میں صرف کریں۔

اس وجہ سے سلطنت تیموریہ کا ہر حصہ اپنی جگہ پر ثقافت، تہذیب، معارف اور علوم و فنون کا مرکز تھا۔ لاہور کا بچہ بچہ شعر و ادب کا مذاق رکھتا، شعر و ادب کی زبان میں باتیں کرتا، وہ کسی پیشہ کسی حرفہ سے تعلق رکھے دست بکار و دل بیار کے مصداق کام بھی کرتا اور ادبی ذوق کی تسکین کا سامان بھی بہم پہنچاتا۔ وہ ہاتھوں سے ریشم رنگتے مگر اپنی محفل کو اپنی رنگین نوائی اور رنگین بیانی سے بہجوم کر دیتے۔ وہ گلکاری کا پیشہ اختیار کرتے مگر ساتھ ہی ساتھ شعر و ادب کے گلدستے سنوارتے۔ سپاہی میدان

---

[1] تذکرۂ حسینی صفحہ ۱۸۰-۱۸۳۔ مخزن الغرائب قلمی نسخہ ورق ۲۱۴، ۲۱۵

جنگ میں شمشیر زنی کرتا مگر محفل آرائیوں میں اس کی زبانِ تیغ سب کو مسخر کر لیتی۔ وہ توپ خانے میں میر آتش کے ماتحت آگ اور خون کا کھیل کھیلتا مگر بزم آرائی کے وقت اس کی آتش بیانی اور طبع کی روانی تمام محفل کو بسمل کی طرح تڑپا دیتی۔ تلچہ فروش نانبائی کو نازک خیالی سے کیا مناسبت ہو سکتی ہے مگر اس دور میں لاہور کے نان پز شعر گوئی میں کسی سے کم نہ تھے۔ حکاک، روغن گر، نیزہ گر، رفوگر بھی جذباتِ شعر میں ڈوب کر بات کرتے تھے، یہ باتیں ایک الگ صحبت کی محتاج ہیں۔ کسی وقت یہاں کی ادبی زندگی پر لکھنے کا اگر موقعہ ملا تو ان تمام پہلوؤں کو واضح کیا جائے گا۔

لاہور ثقافت کا مرکز تو اکبر کے زمانے ہی میں بن چکا تھا، جہانگیر کے زمانے میں اس کو اور زیادہ رونق نصیب ہوئی۔ جہانگیر کو لاہور سے ایک خاص لگاؤ تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا ؎

لاہور را بجان برابر خریدہ ایم
جان دادہ ایم و جنت دیگر خریدہ ایم

طالب آملی دلی، ملتان، سرہند اور لاہور میں گھومتا رہا مگر اسے سب سے بڑھ کر لاہور پسند آیا۔ اس کا دل یہیں لگا۔ اس کا ایک قصیدہ لاہور کی تعریف میں بھی ہے۔ چنانچہ وہ اس قصیدے میں کہتا ہے ؎

گمانم نیست کاندر ہفت کشور
بود شہرے چو آب و تاب لاہور
میان بکشا و خوش واکش کہ در ہند
فراغت نیست جز در خواب لاہور

یہاں اس نے شاہ ابوالمعالی کے ہاتھ پر بیعت کی چنانچہ ان کی منقبت میں کہتا ہے ؎

کنم زان رو مرید آسا شب و روز
کرامت ہا بیان در باب لاہور
کہ پیر و دستگیر و مرشدِ من
یکے قطب است از اقطاب لاہور

ایک اور قصیدے میں وہ لاہور کی تعریف کرتا ہے۔ یہ غالباً لاہور کے موسم برسات کا تذکرہ ہوگا ؎

نہ آگرہ تا بخیابان گلشن لاہور
رفیق بودم با ابرہائے بارانی

شاپور طہرانی اسی دور کا ایک مشہور شاعر تھا۔ وہ نور جہاں کے قرابت داروں میں تھا۔ وہ تاجر تھا اور اکثر مختلف شہروں میں آتا جاتا تھا۔ طالب اور شاپور میں دوستانہ مراسم قائم ہو گئے۔ طالب لاہور میں جا کر شاپور سے ملا۔ وہ اپنی ایک غزل میں اس واقعہ کا ذکر کرتا ہوا کہتا ہے۔ ؎

بحمد للہ کہ در ملک سخن دستور را دیدم
ہمان رشک عطارد شاعر مشہور را دیدم

خسرو دانستم بدیے زبانیے در سخن طالب
از دو در سوختم چوں صنعت شاپور را دیدم
چہ خوش حالم کہ بعد از مدتے یک سالہ مہجوری
خوش و خوش وقت اورا دیدم و لاہور را دیدم

ملا عبد النبی نے اپنے مشہور تذکرہ میخانہ میں لاہور کا جا بجا ذکر کیا ہے۔ وہ ہر جگہ اور ہر موقعہ پر لاہور کو ایک نئے خطاب سے نوازتا ہے۔ کبھی وہ اسے دار الامان کہتا ہے۔ کبھی دار الشعرا۔

ایک موقعہ پر وہ لاہور کو "خانۂ عافیت خردمنداں" کہتا ہے۔ اس سے لاہور کی علمی اور ثقافتی زندگی کا دھندلا سا تصور ہو سکتا ہے۔

جہانگیر نے اشاعتِ علوم و فنون کے سلسلے میں ایک کام یہ بھی کیا کہ جہاں کہیں وہ دورے پر جاتا منتخب اور نادر کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ اپنے ساتھ لے جاتا۔ وہاں کے علما سے ملاقاتیں کرتا، ان کے ساتھ علمی بحث پر گفتگو کرتا اور تحفتہً انھیں کتابیں پیش کرتا۔ جب وہ گجرات کے دورے پر گیا تو اس کے ساتھ کتابوں کا بہت بڑا مجموعہ تھا۔ احمد آباد گجرات میں علماء و مشائخ سے صحبت گرم کی اور رخصت کے وقت ان میں کتابیں بھی تقسیم کیں۔ ان میں ملا حسین الواعظ کاشفی کی تفسیر حسینی اور زمخشری کی تفسیر کشاف اور میر خواند کے روضۃ الصفا کا ذکر اس نے خاص طور پر اپنی توزک میں کیا ہے۔

اسی دورے میں جب وہ محمود آباد میں مقیم ہوا تو اس کی ملاقات حضرت شاہ عالمؒ کے نبیرہ سید محمد سے ہوئی۔ رخصت کے وقت جہانگیر نے یہ خواہش ظاہر کی کہ سید موصوف اس سے کچھ مانگیں مگر انھوں نے یہ کہہ کر کہ یہ امر ہمارے مسلک کے خلاف ہے انکار کر دیا۔ بادشاہ نے بہت اصرار کیا۔ آخر میں قرآن کریم کی قسم دی کہ وہ ضرور کچھ طلب فرمائیں۔ سید موصوف نے کہا اب کہ بادشاہ نے کلام پاک کی قسم دلائی ہے تو پھر وہ مجھے کلام مجید کا ایک نسخہ مرحمت فرمائیں۔ جہانگیر بہت خوش ہوا اس نے یاقوت المستعصمی کے ہاتھ کا لکھا ہوا کلام مجید جو شاہی کتب خانے کے نوادرات میں شمار ہوتا تھا منگوا کر سید محمد کے حوالے کیا۔ اپنے قلم سے اس کی پشت پر تاریخ اور مقام لکھا۔ بعد میں سید سے فرمائش کی کہ آپ کلام مجید کا

" بلغات ریختہ لفظ بلفظ فارسی "

ترجمہ کر کے اپنے فرزند سید جلال کے ہاتھ میرے پاس بھجوا دیں۔ جہانگیر کے الفاظ یہ ہیں :-

" بہ مشار الیہ فرمودیم کہ مصحف بعبارت سلیس خالی از تکلف و تصنع ترجمہ نماید و اصلاً بہ شرح و بسط و شان نزول آں مقید نہ شدہ بلغات ریختہ قرآن را لفظ بہ لفظ فارسی ترجمہ کند و یک حرف بر معنی تحت اللفظ نیفزاید و بعد از تمام آں مصحف مصحوب فرزند خویش جلال الدین سید روانہ درگاہ سازد۔" (توزک جہانگیری ص ۲۴۵)

اس عبارت کے نقل کرنے کی غایت یہ ہے کہ اس میں لفظ ریختہ اور لفظ بہ لفظ فارسی کے سمجھنے میں توزک کے ترجمہ کرنے والوں نے غلطی کھائی ہے۔ انگریزی ترجمہ میں بلغات ریختہ کا ترجمہ SIMPLE WORDS یعنی سادہ الفاظ میں کیا گیا ہے مگر

عبارت کا سیاق اس کی تائید نہیں کرتا۔ مولانا احمد علی سیماب جنھوں نے توزک کا اُردو ترجمہ کیا ہے انھوں نے اس کا ترجمہ زبان ریختہ کیا ہے جس سے مفہوم واضح نہیں ہوتا۔ اگر جہانگیر کو فارسی ترجمہ درکار ہوتا تو خود اس کے دربار میں ایرانی علما و فضلا کی کمی نہ تھی۔ وہ کسی سے فرمائش کر سکتا تھا، نیز اس سے پہلے قرآن پاک کے متعدد فارسی ترجمے ہو چکے تھے، نئے ترجمے کی ضرورت کیا تھی۔ گجراتی عالم سے ترجمہ کی فرمائش کرنا یہی معنی رکھتا ہے کہ ترجمہ زبان ریختہ میں ہو اور رسم الخط فارسی ہو۔ کیونکہ گجرات میں گجراتی رسم الخط اس زمانے میں اسی طرح رائج تھا جیسے آج بھی ہے۔ اس کے علاوہ اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ ان ایام میں علاقہ گجرات میں گجری یا گوجری اُردو میں کتابیں لکھی جاتی تھیں اور ریختہ کا لفظ اُردو زبان ہی کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

زبان کے سلسلے میں یہ نکتہ بھی واضح کرنا ضروری ہے کہ جہانگیر کے زمانے میں "لاہوری" پنجابی کے لیے مستعمل ہوتا تھا۔ چنانچہ پکھلی (ہزارہ) کے ایک قبیلے قارلغون کا ذکر کرتا ہوا جہانگیر کہتا ہے کہ امیر تیمور جب ہندوستان سے واپس ہوا تو وہ اس قبیلہ کے لوگوں کو یہ علاقہ دے گیا تھا۔ تب سے وہ یہیں آباد ہیں۔ اب تو بالکل پنجابی بن گئے ہیں اور "لاہوری" زبان بولتے ہیں۔ جہانگیر کے الفاظ ہیں :۔

"الحال خود لاہوری محض اند و بزبان چناں تکلم کنند" [1]

کتابوں کے سلسلے میں جہانگیر نے ایک نیا انداز اختیار کیا۔ وہ کتابوں کا بیحد شوقین تھا اور انھیں حسین و جمیل دیکھنا چاہتا تھا اس واسطے اس نے کتابیں مصوّر کرنے کے فن کو بے حد فروغ دیا۔ گو اس کی ابتدا اکبر نے کی تھی لیکن اس کے معراج کا زمانہ جہانگیری دور ہے۔ مسٹر مارٹن کہتا ہے کہ جہانگیر بڑی بڑی قیمت دے کر مصوّر کتابیں خریدتا اور اکثر کتابوں کو اپنی سرپرستی میں مصوّر کرایا کرتا تھا۔ [2]

جمعہ کی رات وہ علما کی صحبت میں بسر کرتا۔ علمی بحثیں ہوتیں۔ مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی۔ تاریخی، مذہبی، دینی اور فلسفیانہ مسائل زیر بحث آتے۔ وہ بڑی متانت اور دلچسپی سے علما کی باتیں سنتا اور جہاں ضرورت ہوتی خود بھی شریک بحث ہوتا۔ علما کی ان حوصلہ افزائیوں سے علوم و فنون کو فروغ حاصل کرنے کا بہت عمدہ موقعہ ملا۔ ہر شخص کی یہ کوشش ہوتی کہ وہ اس شریف پیشے کو اختیار کرے جس کی وجہ سے چھوٹے بڑے مکاتب اور مدارس جا بجا قائم ہو گئے۔ اور جو شخص جس جگہ اور جس وقت چاہتا تحصیل علوم میں مشغول ہو جاتا۔ نہ عمر کی قید ہوتی نہ ذرائع کا سوال پیدا ہوتا۔

ان علما کے بارے میں یہ کہہ دینا کافی ہو گا کہ ان کا ایک خاص مسلک تھا۔ اور وہ اس کی پابندی بڑی سختی کے ساتھ کرتے تھے وہ درس و تدریس کا مشغلہ اس واسطے اختیار نہ کرتے تھے کہ اس سے وہ مال و دولت کے انبار جمع کرنا چاہتے تھے بلکہ ان کے خیال میں یہ ایک مذہبی فریضہ تھا جسے بجا لانا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ نہ وہ کسی کی تحسین کے محتاج تھے اور نہ کسی کی نفرین کو خاطر میں لاتے تھے۔ اگر ان کا ضمیر مطمئن ہے تو وہ اسے آخری دم تک جاری رکھتے۔ اگر ان کو اطمینان قلب حاصل نہ ہوتا وہ درس و تدریس کی مسند کو خالی کر کے گوشۂ عزلت میں جا بیٹھتے اور ریاضت شاقہ میں مصروف ہو جاتے۔ وہ جہاں ایک دفعہ درس دینا شروع کرتے وہیں کے ہو جاتے۔ نقل مکانی یا ایک جگہ کو ترک کر کے دوسری جگہ چلے جانا ان کے نزدیک علم کے ساتھ بیوفائی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں بعض

---

[1] توزک جہانگیری ص ۲۰۹

[2] MINIATURE PAINING AND PAINTERS OF PERSIA, INDIA AND TURKEY, VOL. I, p. 58.

ایسے معلمین اور علماء کا ذکر ملتا ہے جنھوں نے ایک جگہ بیٹھ کر اسی اسی برس تک درس دیا۔

جہانگیری دور در حقیقت اکبری دور کا ضمیمہ تھا۔ لاہور میں مدارس جاری ہو چکے تھے۔ علماء نے درس کے لیے مقامات متعین کر لیے تھے اور ان کی محنت، ریاضت، شفقت، قابلیت کے باعث ان کی شہرت لاہور کی حدود کو پھاند کر نہ صرف تیموریوں کے ممالک محروسہ میں پھیل چکی تھی بلکہ ایران، توران اور روم تک پہنچ چکی تھی اور وہاں کے طالبان علم ان کے درس میں شریک ہونے کیلئے لمبی لمبی منزلیں طے کر کے چلے آتے تھے۔ ان سے استفادہ کرنے کے بعد بعض اپنے وطن مالوف کو واپس چلے جاتے اور بعض یہیں کے ہو رہتے۔ اکبر کے زمانے میں ایرانی علماء کی مہاجرت کا جو سلسلہ شروع ہوا۔ وہ ابھی تک جاری تھا اکبر فوت ہو گیا اور جہانگیر مسند آرائے سلطنت ہوا۔ اس کے تخت نشین ہونے ہی حالات میں سوا اس کے اور کوئی انقلاب پیدا نہ ہوا کہ وہ مذاق اور مزاج کے لحاظ سے اپنے باپ سے زیادہ ادب نواز، معارف پرور اور علم گستر تھا۔ وہ اکثر علوم و فنون میں ماہر فن کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس لیے علماء کو اکبر سے بڑھ کر جہانگیر سے قدر افزائی کی امید تھی۔ وہ ہر ممکن کوشش کرتے کہ شہنشاہ جہانگیر کے دربار میں بار یاب ہوں۔ اس کی سرپرستی حاصل کریں اور جو زیادہ متوکل، متقی اور پرہیزگار تھے وہ حکومت اور حکومت کی سرپرستی سے بے نیاز ہو کر اپنے فرائض میں مشغول تھے۔

ملا عبد السلام لاہوری

سب سے مشہور اور متبحر عالم جن کے درس کو جہانگیری دور میں سب سے اوّل شہرت حاصل ہوئی وہ ملا عبد السلام لاہوری تھے۔ انھوں نے ہر مشہور عالم سے استفادہ کیا اور اپنی علمی تشنگی بجھائی۔ سفر بھی کئے اور مقامی طور پر بھی تکمیل تعلیم کی۔ چنانچہ لاہور میں آپ شیخ اسحاق کاکو، شیخ سعد اللہ بنی اسرائیلی اور قاضی صدر الدین جالندھری کے درس میں شریک ہوتے اور ان سے کسب فیض کیا۔ فقہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ آپ نے اکبر کے وزیر مالیات امیر فتح اللہ شیرازی سے ریاضی اور تفسیر پڑھی۔ میر فتح اللہ اپنے وقت کا بہت بڑا مفسر تھا۔

ملا عبد السلام منقولات و معقولات میں کامل و اکمل تھے۔ پچاس برس مسند درس پر بیٹھ کر علوم و فنون کی اشاعت کی۔ عمر کے آخری حصے میں انھوں نے تفسیر بیضاوی پر نہایت برجستہ حواشی لکھے۔ جب آپ یہ حواشی لکھ رہے تھے تو بڑے افسوس کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ "میں اس سلسلے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ میں نے اسے اہل فضل کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے قبول کیا اور درست مانا۔ لیکن کثرت درس کی وجہ سے مجھے اتنی فرصت نہ ملی کہ میں اسے سینہ سے سفینہ میں منتقل کرتا اور قید تحریر میں لاتا۔ اب میری عمر نوّے کے لگ بھگ ہے۔ قویٰ ضعیف ہو گئے ہیں حافظہ کی قوت جواب دے گئی ہے۔ اکثر مطالب ذہن سے نکل گئے ہیں۔

(مرآۃ العالم بختاور خاں ورق ۴۹۱-الف)

ملا عبد السلام کے درس نے بڑے بڑے باکمال عالم و فاضل پیدا کئے جن میں ملا عبد السلام دہلوی اور میرک شیخ ہروی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مآثر الامراء کا مصنف لکھتا ہے کہ "ملا عبد السلام لاہوری نے پچاس برس تک پڑھایا۔ اس عرصے میں ان کے سپرد فتاویٰ نویسی بھی تھی۔ انھوں نے اس سے وقت بچا کر درس کا سلسلہ جاری رکھا۔"

ملا نظام الدین ہروی طبقات اکبری میں لکھتا ہے کہ "ملا عبد السلام لاہوری فحول علمائے لاہور بود۔"[1]

---

[1] طبقات اکبری جلد دوم صفحہ ۴۶۹

ملا عبدالسلام نوّے برس کی عمر پا کر ۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۷ء میں فوت ہوئے۔ یہ شاہجہانی حکومت کا پہلا سال تھا۔

مبارک شیخ ہروی

مبارک شیخ ہروی ایران سے لاہور آیا۔ وہ عہد جہانگیری کے مشہور فاضل اور قاضی محمد اسلم کا بھتیجا تھا۔ اس وقت ملا عبدالسلام کا درس معراجِ شباب پر تھا اور اس کی شہرت و عظمت کا سکہ چلتا تھا۔ اسی بنا پر مبارک شیخ اپنی فضیلت کے باوجود ان کے درس میں شریک ہوا اور جب یہاں سے فارغ ہوا۔ تو جہانگیر نے اسے پہلے دارا شکوہ اور بعد میں دوسرے شہزادوں کی تعلیم پر مامور کیا۔ شاہ جہان کے زمانے میں وہ دو ہزاری منصب دار تھا۔ عالمگیر نے اسے تمام مملکت کا صدر الصدور بنایا۔ مبارک شیخ ۱۰۷۱ھ / ۱۶۶۰ء میں فوت ہوا۔

سید سر

قرونِ وسطیٰ کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی آزاد حکومتوں میں دو پیشے بہت معزز سمجھے جاتے تھے اور اکثر لوگ انھیں ہی اختیار کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ایک سپہ گری اور دوسرا تعلیم و تعلّم۔ ان میں تعلیم و تعلّم کا پیشہ بڑا شریف اور بیحد معزّز سمجھا جاتا تھا۔ سپاہی زادے بھی اس کوشش میں رہتے تھے کہ وہ معلّمی کے پیشے کے ساتھ وابستہ ہوں۔ جن دنوں سکندر سور شوالک کے پہاڑوں میں مارا مارا پھر رہا تھا انہی دنوں کا ذکر ہے کہ ایک سید زادہ باہر سے آیا اور اس کی فوج میں بھرتی ہو گیا۔ یہ سید عبداللواسع تھا جو ایک گمنام سپاہی کی حیثیت سے جنگوں میں شریک ہو کر دادِ شجاعت دیتا رہا۔ آخر کار اکبر کے ابتدائی ایام حکومت میں سرہند کے قریب ایک جنگ میں مارا گیا۔

اس کا بیٹا ملّا سید عبدالخالق تھا جو عالم و فاضل، زاہد و متقی، عبادت گذار اور ریاضت کیش تھا۔ فقہ، اصول، حدیث، معانی، ادب، منطق اور قرآنی علوم کی ہر شاخ میں عالم متبحر تھا۔ باپ اگر سپاہی تھا تو بیٹا علم و عرفان کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکا۔ اس نے باپ کے خلاف دین اور علوم دین کی خدمت اور اشاعت کا بیڑا اٹھایا اور لاہور میں ایک مدرسہ جاری کیا۔ مدرسے کے پاس ایک تالاب بھی کھدوایا۔ آپ کی مناسبت سے یہ تالاب سید سر اور گردونواح کی آبادی گذر سید سر کے نام سے مشہور ہوئی۔ جہاں یہ مدرسہ، آبادی اور تالاب تھا وہاں اس وقت برٹش انسٹی ٹیوٹ اور ریلوے افسروں کی کوٹھیاں ہیں۔

مدرسہ جاری کرنے سے پہلے سید عبدالخالق ایک حجرے میں رہتے اور ریاضت اور نفس کشی کر کے تصوّف کی منازل طے کر رہے تھے۔ یکایک طبیعت میں انقلاب آیا اور آپ سعدیؔ کے ان اشعار پر عمل پیرا ہو گئے ؎

صاحبدلے بہ مدرسہ آمد زخانقاہ
بشکست عہدِ صحبت اہلِ طریق را
گفتم میانِ عالم و عابد چہ فرق بود
تا اختیار کردی ازاں ایں فریق را
گفت او گلیم خویش بدر می برد زموج
ویں جہد می کند کہ بگیرد غریق را

حجرہ نشینی ترک کی اور مسند درس پر قدم رکھا۔ قال اللہ و قال الرسول میں مشغول ہو گئے۔ چونکہ آپ کی ذات ظاہری اور باطنی علوم کا مجمع البحرین تھی اس لیے زبان میں تاثیر اور نگاہ میں جذب تھا۔ جو پڑھاتے وہ دل میں اتر جاتا اور جو کہتے اس کے ساتھ عمل کی

قوتیں بیدار ہو جائیں۔ طلباء استاد کا رنگ لے کر مدرسہ سے نکلتے۔ گویا اخلاقی تربیت اور تعمیرِ انسانیت آپ کے درس کے دو نمایاں پہلو تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کے درس کو بڑی ہر دلعزیزی حاصل ہوئی اور دنوں میں اس کی شہرت کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔

جن دنوں اکبر سیاسی مصالح اور ہمسایہ ملکوں کے سیاسی حالات کے مطالعہ کے لیے لاہور میں مقیم تھا اس کے کانوں تک آپ کی شہرت پہنچی۔ اس نے اس مدرسے کے نام ایک گاؤں اور دوسرے دو گاؤں میں سے نوّے بیگھے زمین وقف کی تاکہ مدرسے کی ضروریات پوری ہوتی رہیں اور تعلیم کا کام بے کھٹکے چلتا رہے۔ مولانا سید عبدالخالق ایک مدت تک اس مدرسے میں کام کرتے رہے۔ آپ کے فوت ہونے کے بعد آپ کے فرزند سید عبدالوہاب نے یہ مسند سنبھالی اور اپنے نامور باپ کے انداز میں درس دینا شروع کیا، مدرسے کی رونق روز بروز ترقی کرتی گئی۔ جب سید عبدالوہاب نے داعیِ حق کو لبیک کہا تو سید عبدالقادر ان کے جانشین ہوئے۔ سید عبدالقادر کے بعد سید عبداللہ نے یہ خاندانی فریضہ اپنے ذمہ لیا۔ درس نواب زکریا خاں کے زمانہ تک پوری رونق پر قائم رہا۔ یہاں تک کہ سکھوں کی تاخت و تاراج نے شہر کی بیرونی آبادی میں ہلچل مچادی۔ لوگ ان کی لوٹ مار سے خوف زدہ ہو کر ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔ آبادیاں ویران ہوگئیں درس بند ہو گئے جہاں کسی کے سینگ سمائے وہیں جا چھپے۔ مدرسہ سید سر بالکل برباد ہو گیا۔

سید عبدالخالق نے مدرسے کے ساتھ جو تالاب تعمیر کیا تھا اس کے بارے میں لوگوں میں عجیب و غریب باتیں مشہور تھیں۔ عوام میں یہ تالاب بڑا متبرک سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ لوگ پھوڑے پھنسی والے بچوں کو نہلاتے اور وہ شفایاب ہوتے۔ مولوی نور احمد چشتی لکھتے ہیں کہ جب میں اپنی کتاب تحقیقاتِ چشتی کے سلسلے میں وہاں گیا تو نہ وہاں مدرسہ تھا نہ تالاب اس کی بجائے ہرے بھرے کھیت تھے۔ مگر عقیدت مند وہاں سے مٹی اٹھا لے جاتے اور پانی میں بھگو کر پھوڑے پھنسی والے بچوں کے جسم پر ملتے اور وہ بچے اسی طرح شفا پاتے۔

مولوی محمد سعید اعجاز جہانگیری عہد میں مولوی محمد سعید اعجاز دہلی سے لاہور آئے اور چونکہ وہ اپنے اوقات کا بیشتر حصہ درس میں بسر کرتے تھے۔ اس لیے لاہور میں بھی انھوں نے یہ مشغلہ جاری کیا۔ محمد افضل سرخوش کلمات الشعرا میں لکھتا ہے کہ ان کی عمر کا بیشتر حصہ علوم معقول و منقول کی تحصیل میں بسر ہوا۔ انھوں نے ان کی بدولت اکتسابِ فضائل کیے۔ فارغ ہونے کے بعد زیادہ تر وقت علم دینی کے درس دینے میں صرف کیا اور ہمیشہ طلباء کے "افادت و افاضت" میں مصروف رہے (ص۔۔)۔ جب وہ لاہور آنے لگے تو انھوں نے یہ مطلع عارفانہ کہا ۔۔

کشیدہ ام ز جنوں ساغرے کہ ہوشش نماند
دگر معاملہ با پیرِ مے فروشش نماند

سرخوش نے جب یہ مطلع سُنا تو بہت متاثر ہوا اور اس کے جواب میں یہ مطلع کہا ۔۔

گداخت حیرتِ حسن تو ام خروشش نماند
چوں برگِ گل ز تنم جز لبِ خموشش نماند

مولانا محمد سعید اعجاز اپنے معاصرین میں ظاہری اور معنوی کمالات کی وجہ سے ممتاز تھے۔ وہ مکارم اخلاق کا پیکر تھے۔ شعر بھی کہتے تھے مگر ان سے ان کے علمی کمالات میں کسی قسم کا اضافہ نہیں ہوتا۔

ملا بابا یزید

نویں صدی ہجری کے وسط میں گیلان کا ایک سید گھرانا وہاں سے ہجرت کر کے ملتان میں آباد ہوا۔ یہ خانوادہ اپنے علاقے میں علمی شہرت رکھتا تھا۔ ادب سے اور مذہبی علوم سے بھی اسے لگاؤ تھا۔ اس لیے جب یہ ملتان پہنچا تو لوگ بڑی تعظیم و تکریم سے پیش آئے۔ اس خانوادے کے اکثر افراد نے اپنی آزادانہ روش کو قائم رکھنے کی خاطر پڑھنے پڑھانے کا شغل اختیار کیا۔ ملتان پہنچ کر اس خاندان کے جس بزرگ نے سب سے پہلے گمنامی سے نکل کر شہرت حاصل کی وہ سید نجم الدین تھے۔ بابر انھیں دہلی لے گیا۔ ان کے بعد ان کے بیٹے بابا یزید نے پھر آبائی پیشے کی طرف رجوع کیا۔ علوم و فنون پڑھے اور تصنیفات کی سند حاصل کی۔ دہلی سے لاہور آئے اور یہاں درس شروع کر دیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں آپ کی ذات اہل علم کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ علم کے پیاسے آپ کی خدمت میں آتے۔ فیضیاب ہوتے اور آپ کی توجہ سے صاحب درس بن کر نکلتے۔

مولوی عبدالحکیم گیلانی

ملا بابا یزید کے تین بیٹے تھے مگر ان تینوں میں سے سید عبدالحکیم کو سب سے بڑھ کر شہرت حاصل ہوئی۔ وہ جہانگیری دور حکومت میں جوان ہوئے۔ علوم و فنون میں کمال حاصل کیا اور باپ کی گدی سنبھالی۔ انھوں نے اس جوش و خروش سے کام کیا کہ تھوڑے ہی عرصے میں ہر جگہ ان کا نام گونجنے لگا۔ انھوں نے بڑی لمبی عمر پائی۔ مولوی نور احمد چشتی ایک زبانی روایت کے مطابق ان کی تاریخ وفات ۱۱۰۸ھ/ ۱۶۹۶ء قرار دیتے ہیں۔ ان کا مقبرہ شاہ شمس قادری کے مزار کے مغرب کی طرف اور گورنمنٹ ہاؤس کے جنوب رویہ واقع تھا جب سرکار انگریزی نے انارکلی سے میانمیر تک جدید سڑک (مال روڈ) بنانی چاہی تو مقبرہ سڑک کے اندر آ کر مسمار ہو گیا۔

مولوی عبدالحکیم بڑے متوکل اور قناعت پسند بزرگ تھے دربار شاہی میں حاضر ہونے کے لیے آپ کو بار بار دعوت دی گئی مگر آپ ہر بار ٹال گئے اور پوری دلجمعی کے ساتھ اپنے شغل میں لگے رہے۔ آپ اخلاق حسنہ کے پیکر تھے۔ جو کوئی آپ سے ملتا آپ کے خلق عظیم سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ شاگردوں کے لیے آپ کی ذات چشمۂ رحمت تھی۔

مدرسہ قلیچ خاں

انھی ایام میں قلیچ خاں اندجانی کا مدرسہ بھی بہت مشہور تھا۔ یہ مدرسہ اکبری دور میں قائم ہوا اور قلیچ خاں اس میں خود درس دیا کرتا تھا۔ قلیچ خاں اکبر کے نامی گرامی امیروں میں سے تھا۔ اس کی شخصیت عجیب و غریب تھی۔ وہ ایک بہادر سپاہی، سمجھدار سپہ سالار، نغز گو شاعر، متبحر عالم، زبردست فاضل، اور نہایت متقی اور پرہیزگار تھا۔ جن دنوں میں وہ لاہور کا گورنر تھا وہ اپنے فرائض منصبی کی بجا آوری کے بعد باقی وقت تعلیم و تدریس میں صرف کرتا تھا۔ وہ عام طور پر تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر منقولات میں درس دیا کرتا تھا۔ صاحب مآثرالامراء نے ذخیرۃ الخوانین کے حوالے سے قلیچ خاں کے متعلق ایک عجیب واقعہ لکھا ہے جس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

اس کا بیان ہے کہ سنہ ۱۰۰۰ھ/ ۱۵۹۱ء میں قلیچ خاں جون پور میں اپنا محل تعمیر کرانے کے لیے بنیادیں کھدوا رہا تھا۔ بنیاد کھودتے کھودتے اتفاقاً ایک گنبد کے نشان نظر آئے۔ قلیچ خاں کو اطلاع دی گئی۔ وہ موقعہ پر آیا اور دس دن تک بڑی احتیاط کے ساتھ اس گنبد کی کھدائی کراتا رہا۔ تمام امیر موقعہ پر جمع تھے۔ آخر ایک دروازہ نمودار ہوا جس پر تالا پڑا ہوا تھا۔ قلیچ خاں نے تالا توڑا اور ایک جم غفیر کے ساتھ گنبد میں داخل ہوا۔ اس نے دیکھا کہ ایک شخص جوگیوں کی طرح آسن جمائے بیٹھا ہے۔ جونہی اس نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی اور آدمیوں کی آہٹ پائی تو سر اٹھایا اور ہندی زبان میں پوچھا

"کیا رام چندر کا اوتار ہو چکا؟" جواب دیا گیا "ہاں" پھر اس نے کہا "آیا سیتا راون کے پنجے سے نکل کر رام چندر کو مل گئی؟" بتایا گیا "ہاں" پھر اس نے پوچھا "آیا کرشن کا اوتار متھرا میں ہو چکا؟"
کہا گیا کہ اس واقعہ پر چار ہزار برس گزر چکے ہیں۔ پھر اس نے دریافت کیا "خاتم الانبیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ظہور عرب میں ہو چکا؟"
سب نے جواب دیا کہ آپ کی وفات پر ایک ہزار برس بیت چکے ہیں اور آپ کے دین کی وجہ سے باقی تمام دین باطل ہو چکے ہیں۔
پھر اس نے پوچھا "کیا گنگا کا پانی جاری ہے؟"
جواب دیا گیا "ہاں! ابھی تک آبرو بخش عالم ہے" اس پر اس نے کہا "مجھے باہر نکالو۔"
سات خیمے ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر لگائے گئے۔ وہ ہر روز ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے خیمے میں جاتا اور اسی طرح آٹھویں دن باہر نکلا۔ وہ اہلِ اسلام کی طرح نماز پڑھتا۔ عام لوگوں کی طرح کھاتا پیتا تھا۔ وہ چھ مہینے زندہ رہا اور پھر فوت ہو گیا۔[1]

ملا یوسف اپنے وقت کے فاضل اجل تھے تحقیق اور تدقیق میں کمال رکھتے تھے۔ ہر مسئلہ کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے تھے کوئی بات بغیر سند اور حوالے کے پیش نہ کرتے۔ شروع شروع میں آپ نے مولانا جلال سے تحصیل علوم کی اور کچھ عرصہ تک ملا عبداللطیف کے درس میں بھی شریک ہوئے۔ جب تحصیلِ علوم سے فارغ ہوئے تو درس و تدریس شروع کیا۔ کچھ عرصہ بعد اس سے دل اچاٹ ہو گیا۔ اکبر کی طرف سے اشارہ ہوا۔ آپ نے شاہی ملازمت اختیار کر لی۔ مگر اس میں بھی دل نہ لگا۔ اسے ترک کر کے لاہور چلے آئے اور پھر پڑھنے پڑھانے میں لگ گئے۔ بختاور خاں کہتا ہے کہ "اب کی مرتبہ آپ بارہ برس تک مسند افادہ پر متمکن رہے" (مراۃ العالم ورق ۴۹۱)

عیدگاہ جہانگیری جہانگیر نے اپنے عہدِ حکومت میں ایک عظیم الشان مسجد بنوائی جسے بعد میں عیدگاہ کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ یہ مسجد بہت بڑی تھی۔ اس کے ساتھ ایک بہت بڑا بازار اور دوسری عمارتیں تھیں۔ ان تمام عمارتوں کی تعمیر پر بیس لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ مسجد کے ساتھ ایک بہت بڑا مدرسہ بھی تھا۔ مدرسے کی عمارت انگریزوں کے ابتدائی دورِ حکومت تک نہایت خستہ حالت میں قائم تھی۔ یہ عمارت لاہور اسٹیشن کے نزدیک امرتسر کو جانے والی سڑک کے دائیں طرف واقع تھی۔ تحقیقات چشتیہ کے فاضل مصنف نے اس عمارت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ان کا بیان ہے کہ یہ عمارت بہت خوبصورت اور جمالی دار تھی اور ریلوے افسروں کی رہائش کے کام آتی تھی جب اسٹیشن کو وسعت دی گئی تو یہ مسجد گرا دی گئی ہے۔[2]

شاہجہان کے وقت میں یہ مدرسہ پورے عروج پر تھا۔ عمارتوں اور بازار کی تمام جائداد اس کے نام وقف تھی۔ شروع شروع میں نورجہاں کے ایما پر مولوی عنایت حسین اس مدرسہ کے مہتمم اور صدر المدرسین بنے۔ حافظ حبیب مسجد کی امامت بھی کرتے تھے اور درس بھی دیتے تھے۔ سید مقبول حسین اس وقف کے امین تھے۔ ان کے علاوہ پچاس کے قریب مدرس، منشی اور دیگر کارندے وغیرہ تھے جو اس مدرسے کے ساتھ وابستہ تھے۔ یہ مدرسہ احمد شاہ ابدالی کے حملہ تک دن دگنی رات چوگنی ترقی کرتا رہا اور سکھ گردی میں بالکل تباہ و برباد ہو گیا۔

---

[1] مآثر الامرا جلد سوم صفحہ ۴۳۔
[2] سید محمد لطیف جج نے تاریخ پنجاب ۱۸۹۱ء میں تصنیف کی۔ وہ عیدگاہ جہانگیری کے متعلق لکھتے ہیں کہ "یہ قدیم عمارت اثنائے انطباع کتاب میں منہدم کر دی گئی۔" (دیکھو حاشیہ ص ۲۹۰) (قریشی)

عہد شہاب الدّین شاہجہان ۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۷ء تا ۱۰۶۸ھ / ۱۶۵۷ء

پیشتر اس کے کہ ہم عہد شاہجہانی میں لاہور کے مشہور مدارس اور علماء کا ذکر کریں ہم مجمل طور پر شاہجہان کے علمی مذاق اور تعلیم کے متعلق کچھ باتیں سپرد قلم کرنا چاہتے ہیں۔

اکبر جیسے دادا کی آغوش میں شاہجہان نے ابتدائی تعلیم و تربیت حاصل کی۔ اس کی تعلیم اس وقت کے بہترین فضلاء کے ہاتھوں مکمل ہوئی۔ اس کا پہلا استاد قاسم بیگ تبریزی تھا جو معقولات اور منقولات کے علاوہ ایک صاحب دل بزرگ بھی تھا اور سلوک میں کافی ریاضتیں کر چکا تھا۔ وہ مرزا جان تبریزی کا شاگرد رشید تھا۔ اس کے علاوہ شیخ مبارک کے خلف الصدق شیخ ابوالخیر نے بھی شہزادہ کو درس دیا۔ اہل تاریخ ملا سعید خطیب، قزوینی اور ملا محمد صالح شاہجہان کے اساتذہ میں حکیم دوانی کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ اکبری دور میں حکیم عین الملک شیرازی کو حکیم دوانی کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ وہ ملا عبدالقادر بدایونی کا دوست راست اور علامہ دوانی کی نسل سے تھا مگر اس کا انتقال ۱۰۰۳ھ میں ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ شہزادے کا استاد نہیں ہو سکتا۔ قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اعزاز حکیم عین الملک دوانی کے خواہر زادے حکیم علی گیلانی کو حاصل ہوا ہو گا کیونکہ بعد کے مورخ اسے بھی حکیم دوانی کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ شہزادگی کے ایام میں شاہجہان اکثر حکیم علی گیلانی ہی کی صحبت میں رہا اور اس کی صحبتوں نے شاہجہان کے دل پر گہرا اثر چھوڑا۔ حکیم علی گیلانی دور اکبری کی ایک جلیل القدر شخصیت ہے۔ طب کی دنیا نے شیخ الرئیس کے بعد اتنا بڑا طبیب پیدا نہیں کیا۔ اس کی عظمت پر شرح قانون شیخ گواہ ہے۔ اس کا دماغ اختراع پسند تھا۔ لاہور اور آگرہ میں اس نے ایک ایسا حوض تیار کیا جس کے نیچے چند کمروں کی بیٹھک تھی اور حوض کا پانی معلق رہتا اور چھت کا کام دیتا تھا۔ اکبر اور جہانگیر نے خود اس حوض کی سیر کی۔ حکیم علی گیلانی حدیث میں شیخ عبدالنبی کا شاگرد تھا، طب اور فلسفہ حکیم عین الملک شیرازی اور شیخ فتح اللہ گیلانی سے اکتساب کیے تھے۔ وہ یونانی فلسفہ کا ماہر تھا۔ اس نے شہزادے کے دل پر ایسا اثر چھوڑا جو مدت العمر قائم رہا۔ عمل صالح کے قول کے بموجب حکیم دوانی گیلانی ہی بادشاہ کا ایک استاد تھا جس کے حقوق دوسرے اساتذہ سے فائق تھے۔ شاہجہان کہا کرتا تھا کہ

"حکیم دوانی آموزگار ما ست۔ حق تعلیم او بر ما از استادان دیگر بیش است۔"[1]

تاتار خاں کو ترکی زبان سکھانے کے لیے مقرر کیا گیا مگر وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہوا۔ یہاں تک کہ جہانگیر کو کہنا پڑا کہ "اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ شہزادہ خورم میں کیا کمی ہے تو میں کہوں گا کہ وہ ترکی زبان نہیں جانتا"

مغل شہزادے محض کتابی کیڑے ہی نہیں ہوتے تھے۔ انھیں اس قسم کی تعلیم دی جاتی تھی کہ دماغ کے ساتھ ساتھ جسمانی تربیت بھی ہو۔ اکبر نے میر مراد جوینی کو تیر اندازی سکھانے کے لیے مقرر کیا چنانچہ ۱۵۹۷ء میں جب اکبر آخری مرتبہ کشمیر گیا تو اس نے خورم کو لاہور میں چھوڑا تاکہ میر مراد جوینی (جو اس زمانے میں لاہور کا بخشی تھا) اسے تیر اندازی کی مشق کرائے اور شہزادہ تعلیم پوری بجا لائے۔

دکن میں وہ دارا کے ہمراہ گیا۔ وہاں راجہ شال باہن کو شمشیر زنی اور تفنگ اندازی سکھانے کے لیے مقرر کیا گیا۔ اس تعلیم و تربیت

---

[1] عمل صالح جلد اوّل ص ۳۲

کا اثر یہ ہوا کہ شہزادہ جوان ہو کر شمشیر زنی، تیراندازی اور شہسواری کا شائق بن گیا۔

شاہجہان کی علمی قابلیت کے بارے میں تفصیلات پیش کرنا کچھ آسان بات نہیں۔ کیونکہ اس کی کوئی مستقل معنوی یادگار ہمارے پاس محفوظ نہیں۔ اس کے افسانہ ہائے حیات کا سرنامہ اس کی شوکت و جبروت ہے جو اس کی شاندار عمارات اور لطیف و نفیس یادگاروں سے ہویدا ہے۔ اس نے نہ تو اپنے باپ کی طرح کوئی علمی یادگار چھوڑی نہ بیٹے کی طرح اس کے مکاتیب کا کوئی مجموعہ موجود ہے۔ البتہ لال قلعہ دہلی جامع مسجد اور تاج محل کے در و دیوار اس کے حسن ذوق کے آئینہ دار ہیں مگر پھر بھی اس دور کی علمی تاریخ معارف نوازی کے افسانوں اور علمی و ادبی دلچسپیوں سے خالی نہیں۔ اس کا دربار ارباب علم و فضل کا بہت بڑا مرکز تھا۔

تاریخ کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہان موروثی خصوصیتوں سے کافی حد تک بہرہ اندوز تھا۔ اس کے دل میں علمی ذوق ہر وقت موجزن رہتا تھا۔ ملا لطف اللہ مہندس لاہوری نے جو دارا شکوہ کا مقرب خاص تھا، ایک خط میں دربار کی علمی زندگی کا مرقع اس طرح پیش کیا ہے:-

وحید دہر امانی بن مہابت خاں	دلے بشان زمانست شیرۂ دوراں
دگر یگانہ ظفر خاں تخلص احسن	ربودہ گوئے سخن از سخنوراں در فن
دگر وحید زمن آشنا عنایت خاں	بود بہ بحر سخن آشنا عنایت خاں
دگر وحید زمن شادمان غم پرور	بیان شادی و غم در کلام او مضمر
دگر سخنور کشمیر محسن فانی	بقائے نام وے از دولت سخندانی
سر سپہ سیادت یگانہ میر عماد	کہ بود در غزل و مدح و مثنوی استاد
لبیب از محمد حسین آشوب است	سخنورے کہ سخن ہاش جملہ مرغوب است
دگر وحید زمان است طالبائے کلیم	کہ شعر او ید بیضا است نزد طبع سلیم
دگر فرید جہاں قدسی محمد جان	بہ عہد شاہجہاں گوئے ربودہ از اقران
الٰہی ہمدانی ست در سخن استاد	سخنوریست کہ داد سخنوری می داد
لبیب از منزای نخواند ہیچ کتاب	ز فیض حق شدہ مفتوح بر رخش صد باب
دگر وحید زمن باقیا ترانہ او	خوش است ہمچو غزلہائے عاشقانۂ او

فصیح از منہ فتی کہ چوں غزل می گفت
چوں عندلیب غزلخواں در دگہر می سُفت

(اسپرنگر ص ۱۱۶)

یہ فقط شعراء کے نام ہیں۔ علماء اور فضلاء کی فہرستیں اس کے علاوہ ہیں۔

شاہجہان کی علمی قابلیت کا پتہ تاریخ کے بعض بعض واقعات سے بھی ملتا ہے جو مورخین نے کہیں کہیں قلمبند کر دیے ہیں۔ ایک مرتبہ جب شاہجہان کی سفارت عراق گئی تو سلطان کے وزیر نے ان سے دریافت کیا کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے تہافۃ الفلاسفہ میں قدم علم و نفی علم واجب تعالیٰ کے مسئلہ میں شیخ ابو نصر فارابی اور بو علی سینا کی تکفیر کی ہے۔ اس کا سبب کیا ہے؟ اہل سفارت نے یہ اطلاع بادشاہ کو پہنچائی۔ شاہجہان

نے اپنے وزیر علامہ نواب سعد اللہ خاں کو طلب کیا اور اسے حکم دیا کہ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کو لکھو کہ وہ ہفتہ عشرہ میں ایک رسالہ لکھ کر پیش کریں جسے سلطانِ عراق کے پاس ارسال کیا جائے۔ شاہجہان کا یہ فرمان پہلی مرتبہ رسالہ معارف اعظم گڈھ میں شائع ہوا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا گیا کہ:۔

"شاہجہان کی علمی قابلیت کا یہ نمونہ ہے کہ اس نے مسئلہ میں جن امور پر رسالہ لکھوانا چاہا۔ اس کو چند جملوں میں ادا کر دیا...... سعد اللہ خاں کی علمی استعداد تو مشہور ہے۔ لیکن شاہجہان کی علمی فضیلت بھی اس فرمان سے ظاہر ہوتی ہے کہ کچھ کم نہ تھی۔ جو شخص کسی علم و فن سے واقف نہ ہو وہ کیا اس کو سمجھ سکتا ہے۔" (معارف جلد ۱۰ نمبر ۴)

ایک مرتبہ شاہجہانی دربار پوری شان و شوکت سے منعقد ہوا۔ ہر ولایت کے دانشور اور فاضل اس میں موجود تھے۔ مختلف موضوعات پر گفتگو ہو رہی تھی اور ہر درباری اس گفتگو کو دلچسپی سے سن رہا تھا۔ حکیم مشرب اور حکمت پژوہ "شہنشاہ جو علمی ذوق اور تحقیق کا شوق بھی رکھتا تھا، ان مباحثوں میں دخل دے رہا تھا۔ ہوتے ہوتے سلسلۂ گفتگو کا رخ بادشاہوں کی طرف پلٹا۔ یمین الدولہ آصف خاں نے سکندر کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اس جلیل القدر اور عالی مرتبت بادشاہ کو فوت ہوئے صدیاں گزر چکی ہیں مگر اس کی عظمت کی یہ حالت ہے کہ کسی دانا اور حکیم نے اس راست گفتار اور درست کردار بادشاہ کے کسی قول اور فعل پر اعتراض نہیں کیا۔ بادشاہ نے یہ سنا تو فرمایا کہ چونکہ سکندر فیلقوس کی نبوت محل نظر ہے اور علمائے تاریخ سکندر ذوالقرنین کو اس سے الگ شخصیت قرار دیتے ہیں، مجھے اس پر دو اعتراض ہیں۔ اول یہ کہ جب دارا کا قاصد خراج لینے کے لیے اس کے پاس پہنچا اور خراج کا بقایا حساب اس طلائی بیضے کے ساتھ طلب کیا جو اس کا باپ ہر سالی دارا کے پاس بھیجا کرتا تھا تو سکندر نے اس کے جواب میں کہا ؎

شد آں مرغ کو خایہ زریں نہاد

اوّل باپ کی نسبت ایسا کہنا کمال سوء ادب ہے۔ دوسرے سکندر نے حزم اور احتیاط کو ترک کر کے نوشابہ کے دربار میں ایلچی کی حیثیت سے جانا گوارا کیا جو اتنے بڑے بادشاہ کے شایانِ شان نہ تھا کیونکہ دانا اس فعل کا ارتکاب نہیں کرتا جس کا انجام پشیمانی ہو اور جس کا علاج اس کے دست قدرت سے باہر ہو۔ تمام امرا اور فضلا نے بادشاہ کے کلام کی تائید کی۔[1]

۲۳ ذیقعدہ یا بقول عمل صالح ۲۹ ذیقعدہ ۱۰۴۶ھ (۱۶۳۶ء) کو دربار میں ملکی معاملات پر گفتگو ہو رہی تھی۔ دوران گفتگو کسی نے کہا کہ فلاں صوبہ کا دیوان جزرسی کے خیال سے خلق اللہ پر جبر اور تشدد روا رکھتا ہے۔ بادشاہ نے یہ سن کر فرمایا کہ اس کا یہ طرز عمل آئین کارگزاری کے سراسر خلاف ہے۔ کیونکہ "سخت گرفتن کارہا و تنگ کردن مساحت امور باعث آں می شود کہ سستی و فتور در اساس پیش رفت کارہا افتد و عرصہ ملک بر فتنہ و فتنہ گراں فراخ گردد"۔ دوسرے لفظوں میں شاہجہان کا مفہوم یہ تھا کہ دنیا کے معاملات مصالحت اور مسامحت کے بغیر طے نہیں پا سکتے۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بڑی بڑی ملکی مہمات اور عظیم الشان معاملات ترک مدارا اور عدم مواسا سے بگڑ جاتے ہیں جن کی وجہ سے ان معاملات سے متعلقوں کے دل و دماغ میں انتشار اور پراگندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ حافظ نے سچ کہا ہے ؎

سخت می گردد جہاں بر مردمانِ سخت کوش

---

[1] عمل صالح جلد اوّل ص ۴۱۴۔ منتخب اللباب جلد اوّل ص ۴۲۵۔ بادشاہنامہ جلد اول حصہ دوم

حضرت علی کرم اللہ وجہہ احکام دین اور امور شریعت میں حق پر تھے اور دوسروں کو بھی اسی راستے پر چلانا چاہتے تھے بلکہ بعض امور ایسے تھے جن میں اغماض ضروری تھا مگر آپ نہ فرماتے تھے۔ اس واسطے آپ کے ایام خلافت میں شورش عظیم برپا ہوئی جس کا ذکر کتابوں میں مذکور ہے۔

بادشاہ کی اس گفتگو پر سید جلال بخاری صدر الصدور نے عرض کیا کہ جناب امیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقولہ ہے کہ دنیا دو پاؤں پر قائم ہے۔ ایک حق، دوسرا باطل اور میں چاہتا ہوں کہ یہ حق پر ہی قائم ہو۔ صدر الصدور کی یہ بات نہ چلی۔ بادشاہ نے اس مقولے کی وضاحت کرتے ہوئے ایک فصیح و بلیغ تقریر کی جو معاصرین نے اپنے ہاں نقل کی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:۔

"اگر اس مقولے کی صحت پر یقین کر لیا جائے تو یہ بھی لازم آتا ہے کہ ہم یہ باور کریں کہ شیخین نے اپنی خلافت کے ایام میں باطل کا طریقہ اختیار کیا حالانکہ وہ ہر حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے طریقے کی پیروی کرتے رہے۔ یہی نہیں بلکہ ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اشرف موجودات اور اکرم مخلوقات صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایسا ہی کیا۔ لیکن حق گذار دیندار یہ کیسے قبول کر سکتا ہے کہ ان برگزیدہ خدا کے زمانۂ صدق نشان میں باطل رائج ہوا ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود گرامی کی وجہ سے صحابہ کے دلوں سے اختلاف کا رنگ دھل کر صاف ہو گیا تھا۔ ان کی طبیعتوں کے صفحات باہمی اختلافات سے یکسر خالی تھے۔ نبی اکرم کے قول و فعل لوگوں کے لیے مقاصد کے حصول کا سرمایہ تھے۔ اس لیے وہ انکی پیروی سے ذرہ بھر بھی ادھر ادھر نہیں ہوتے تھے۔ یہی حالت صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کے عہد خلافت میں تھی۔ جب ان نفوس قدسیہ کا زمانہ باسعادت گزر گیا اور رسول اللہ کے زمانہ سے دور ہٹ جانے کی وجہ سے عدل اور مساوات میں خلل پیدا ہوا تو لوگ صدق سے دور ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جناب ذوالنورینؓ کی شہادت کا حادثہ رونما ہوا جس کے ساتھ ایسی فتنہ انگیزی کا آغاز ہوا جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت کے زمانے میں برگ و بار لائی اور تمام مسلمانوں کو اپنی لپیٹ میں لے گئی۔" [1]

عالمگیر اپنے ایک رقعہ میں اپنے فرزند عزیز شہزادہ محمد اعظم کو لکھتا ہے:۔

"فرزند عالیجاہ! ہمارے عزیز اعلیٰ حضرت (شاہجہان) کی بیاض سے چند فقرے ہمیں پسند آئے جو ہم دلی محبت کی بنا پر تمہیں لکھتے ہیں کہ تم بھی اس سے لطف اندوز ہو۔

یہ چیزیں بہترین اعمال ہیں: بڑے آدمیوں کو سزا نہ لگانا، مقصد حل نہ ہونے کی صورت میں رنجیدہ نہ ہونا، نیک خصلت اور نیک نیت آدمیوں کو رنجیدہ نہ کرنا۔ آخرت میں سرخرو ہونے کیلئے نیک لوگوں کی صحبت میں بیٹھنا اور ایسے آدمیوں کی ٹوہ میں لگے رہنا جو اپنے اندر کام

[1] بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم ص ۲۵۳ ـ ۲۵۵ + عمل صالح جلد دوم صفحہ ۴۲۴

کی استعداد رکھتے ہوں۔ جاہل آدمیوں کو اپنے ہاں آنے کی اجازت نہ دینا مستحق لوگوں کو سوال کرنے سے پیشتر حسب توفیق کچھ نہ کچھ دینا۔ بزرگوں اور فاضل ہستیوں کی عزت کرنا طبیعت کو عدل و انصاف میں مصروف رکھنا۔ بدعقیدہ لوگوں کی طرف رجوع نہ کرنا جو لوگ اللہ تعالےٰ پر بھروسہ کر کے گوشوں اور زاویوں میں بیٹھے ہیں ان کے حالات سے غافل نہ ہونا سب لاگ اور حق گو لوگوں کے وجود کو غنیمت تصور کرنا اور اپنے حضور ایسے لوگوں کو جگہ دینا جو آخرت کے کاموں کو درست کرنے والے ہیں۔"

۱۰۴۲ھ میں شاہجہان کی خدمت میں ایک نہایت عجیب تحفہ لاہور میں پیش کیا گیا۔ یہ تحفہ تربیت خاں اپنے ہمراہ بلخ سے لایا تھا۔ تربیت خاں کو شاہجہان نے نذر محمد خاں والیٔ بلخ کے پاس سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ اسے قیام بلخ کے دوران قرآن پاک کا ایک ایسا نایاب و بیش بہا نسخہ ملا جو خاندان تیموریہ کی قدسی منش خاتون شاد ملک قاسم بنت سلطان محمد میرزا ابن جہانگیر میرزا ابن صاحبقران کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ یہ نسخہ خط ریحان میں کمال حسن و لطافت سے تحریر کیا گیا تھا۔ بسم اللہ کی باء سے تمت کی تا تک ایک ہی قلم سے تھا۔ اس کے خاتمہ پر بیگم نے اپنا نسب نامہ خط رقاع میں نہایت خوش خط لکھا تھا۔ بادشاہ کو یہ نسخہ بہت پسند آیا اور اسے شاہی کتب خانے میں داخل کیا۔

ان چند واقعات سے شاہجہان کے علمی مذاق اور طبیعت کے رجحان کا پتہ چل سکتا ہے۔ تمام مورخ کہتے ہیں کہ اس کا علمی ذوق دوسرے شہزادوں سے کم نہ تھا۔ وہ رات کو سونے سے پیشتر شیریں آواز پڑھنے والوں سے اکثر تاریخ کی کتابیں سنا کرتا تھا جن میں تزک بابری ظفر نامہ تیموری اور اکبر نامہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

شاہجہان کو خوش نویسی میں بھی اچھا خاصا درک حاصل تھا۔ وہ اس فن کا خاص طور پر دلدادہ تھا۔ دور شاہجہانی کی تعمیرات کے کتبے اس کے اس مذاق کا صحیح پتہ دیتے ہیں۔ نستعلیق کی ترقی کا زمانہ اسی کا زمانہ ہے۔ اس نے حکم دے رکھا تھا کہ جو شخص میر علی ہروی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کوئی چیز لائے اسے یک صدی کا عہدہ دے دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں خوش نویسی اور خطاطی کو خاطر خواہ ترقی ہوئی۔ عمل صالح کی مندرجہ ذیل عبارت سے شاہجہان کے عام علمی اور فنی رجحانات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے:۔

"ایں برینا مدکہ بہ تفصیل تحصیل فصول ابواب دانش مودہ در جمیع فنون و فضائل فائق نکتہ فہمی را باعلیٰ درجات کمال رسانیدہ و در عرض اندک مایہ مدتے بے آنکہ کار بطول کشد ہیولائے خط نیز صورت درست پذیرفتہ تختہ مشق از ریختہ قلم مشکیں رقم چوں صفحہ رخسار نوخطاں تحسین خط زینت گرفت"[1]

شاہجہان لاہور میں پیدا ہوا تھا اس لیے یہ شہر اسے خاص طور پر عزیز تھا۔ اس کے عہد میں لاہور نے گوناگوں ترقی کی۔ اس وقت ایران اور ہندوستان کے تعلقات بظاہر بڑے خوشگوار تھے دونوں سلطنتیں ایک دوسرے کی دوستی کا دم بھرتی تھیں مگر ایران شیعہ دنیا کا مرکز ہونے کی بنا پر ہندوستان کے لیے ایک مستقل خطرہ بنا ہوا تھا۔ دکن میں بیجاپور وغیرہ شیعہ سلطنتیں تھیں۔ ایرانی بادشاہ تیموریوں کے ساتھ

---

[1] عمل صالح جلد اول صفحہ ۳۱

دوستانہ تعلقات رکھنے کے باوجود خفیہ طور پر دکن کی ان شیعہ ریاستوں کو تیموریوں کے خلاف تخریب پر آمادہ کرتے رہتے تھے۔ قندھار کی وجہ سے یہ تعلقات اب بالکل خراب ہو رہے تھے۔ وسطِ ایشیا میں ازبک خاندان کا زور ٹوٹ چکا تھا مگر نذر محمد خاں والیٔ بلخ اور عبدالعزیز خاں وغیرہ تیموریوں سے ہمسری کا دعویٰ رکھتے تھے۔ یہ خطرات اکبر کے وقت سے اب تک بدستور قائم تھے۔ افغانستان میں کبھی کبھی امن و امان قائم ہو جاتا تھا مگر پھر فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھتی تھی۔ ان حالات میں مغل بادشاہوں کو اپنی توجہ زیادہ تر لاہور ہی پر رکھنی پڑتی تھی —— شاہجہان پہلی فرصت میں لاہور آنا اور بخارا اور قندھار کے بگڑے ہوئے حالات اور ایرانیوں کی سازشوں کا قلع قمع کرنا مگر خان جہاں لودھی کی بغاوت نے اسے ایسا کرنے کی مہلت نہ دی۔

اس وقت تک لاہور میں جہانگیر کی بیگمات موجود تھیں۔ شاہجہان چاہتا تھا کہ وہ بھی اکبر آباد چلی آئیں۔ چنانچہ محرم ۱۰۳۸ھ/۱۶۲۸ء میں اس نے حکم دیا کہ معتقد خاں سرہند سے روانہ ہو کر لاہور جائے اور تمام بیگمات اور ان کے نوکر چاکروں کو اکبر آباد لے آئے۔

شاہجہان کے زمانے میں لاہور ایک بہت بڑا علمی اور تمدنی مرکز تھا جو تمام ایشیا میں شہرت رکھتا تھا اور جہاں تعلیم حاصل کرنے کے لیے دُور دُور سے لوگ آتے تھے۔ بادشاہ نے اپنے آباؤ اجداد کے نقشِ قدم پر چل کر علوم و فنون کی دل کھول کر سرپرستی کی۔ اس کے عہد میں جابجا مدارس جاری ہوئے۔ علماء نے اپنے فیضان کو عام کیا۔ گلی گلی، کوچے کوچے مکتب کھل گئے اور تعلیم عام ہو گئی۔ محمد صادق طبقات شاہجہانی میں لکھتا ہے کہ اس وقت ہر گاؤں میں ایک مدرسہ موجود تھا۔ کوئی قصبہ تعلیمی چرچے سے خالی نہ تھا۔ پیلبرڈ لاولا اس کی تائید کرتا ہے۔ یہ تمام مدرسے بالکل آزاد تھے اور ان میں سے اکثر مقامی اوقاف اور نیک دل لوگوں کی سخاوت پر چلتے تھے۔ مولانا آزاد بلگرامی اپنی مشہور تصنیف مآثر الکرام میں شاہجہانی دور کی تعلیمی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

> "پانچ پانچ دس دس کوس پر شرفا کی آبادیاں تھیں جنھیں سلاطین وقت سے وظائف اور زمین مدد معاش کے طور پر ملی ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنے اپنے علاقوں میں مسجدیں، مدرسے اور خانقاہیں تعمیر کرائی ہوئی تھیں۔ اس زمانے کے مدرسوں نے ہر جگہ طالبعلموں کے لیے علم کے دروازے کھول رکھے تھے اور ان کا نعرہ تھا کہ "علم طلب کرنے والو ادھر آؤ" علم کے طالب گروہ در گروہ ایک شہر سے دوسرے شہر میں جاتے۔ جہاں کے حالات ان کو موافق آتے، وہیں تحصیل علم میں مشغول ہو جاتے۔ ہر آبادی کے صاحب توفیق لوگ طالب علموں کو اپنے ہاں ٹھہراتے اور اس جماعت کی خدمت کو سعادت عظمیٰ خیال کرتے۔"

یہ حالات عام تھے مگر اودھ اور الٰہ آباد کے صوبے میں یہ باتیں خاص طور پر پائی جاتی تھیں، پنجاب امن و امان کا گہوارہ تھا شاہجہان کئی مرتبہ یہاں دورے پر آیا۔ لاہور سے چار مرتبہ کشمیر اور متعدد بار کابل گیا۔ ان دوروں کی تفصیلات مجمل طور پر ہمعصر مورخین میں ملتی ہیں۔ ان سے مولانا آزاد بلگرامی کے بیان کی تائید و تصدیق ہوتی ہے۔

سب سے عجیب بات جو ہمیں اس سلسلے میں نظر آتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ تعلیم بالکل مفت ہوتی تھی۔ طلبہ کو نہ فیس کی فکر تھی۔ نہ بورڈنگ کے اخراجات کی۔ طعام و قیام اور دیگر ضروریات کی کفالت بھی مدرسہ کے ذمے ہوتی تھی۔ طلبہ جب چاہتے اور جس جگہ چاہتے تعلیم

حاصل کرنے کے لیے چلے جاتے، کمر ہمت باندھ کر تحصیل علم میں مشغول ہوتے اور فاضل بن کر درس گاہ سے نکلتے۔ پھر جو کچھ پڑھا ہوتا اس کا فیض دوسروں کو پہنچاتے۔ امرا کا طبقہ طلبہ کا سب سے بڑا مربی تھا۔ وہ حسب توفیق ان کی مدد کرنا اور تحصیل علم کے لیے سہولتیں بہم پہنچانا اپنی دینوی وجاہت کیلئے ضروری اور آخرت کے لیے توشہ خیال کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کوئی گاؤں کوئی قریہ، کوئی محلہ اور کوئی گلی درس و تدریس سے خالی نہ تھی۔ سب سے زیادہ اس بات کا چرچا جونپور، الٰہ آباد اور دوسرے مشرقی صوبوں میں تھا جس کی بنا پر شاہجہان کہا کرتا تھا کہ

"پورب شیراز ماست"

یہ سلسلہ بقول مولانا آزاد بلگرامی سنہ ۱۱۳۰ھ تک قائم رہا جب برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری محمد شاہ کے آغاز جلوس میں اودھ کا حاکم ہوا تو یہ بساط الٹ گئی۔[1] منوچی کہتا ہے کہ شاہجہان کے زمانے میں لاہور بڑے بڑے فضلا کا مرکز تھا اور ان کے گرد و پیش کثیر طلبہ رہتے تھے۔

دارا شکوہ ۱۰۴۹ھ میں اپنے باپ کے ساتھ کشمیر جاتے ہوئے لاہور آیا جب اس نے اپنا تذکرہ سفینۃ الاولیاء لکھا تو اس نے لاہور کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار یوں کیا :۔

"لاہور ایک نہایت معزز اور ممتاز شہر ہے۔ اس جیسا دوسرا کوئی اور شہر روئے زمین پر نہیں۔ آج وہ اولیائے صالحین اور علماء و فضلا کا مرکز بنا ہوا ہے۔ یہاں بہت سے مشائخ اور اولیاء اللہ کے مزار ہیں۔ ایک مشہور روایت ہے کہ شہر لاہور کے محلہ تلہ میں اس وبا سے قبل جو عہد جہانگیری میں پھیلی تھی۔ مرد و زن، صغیر و کبیر تین ہزار حفاظ تھے۔ اب بھی اس شہر میں ان گنت تعداد حفاظ ہے۔" (سفینۃ الاولیاء اردو ترجمہ ص ۱۹۸)

(〃 〃 فارسی ص ۱۶۵) مطبوعہ ۱۸۷۶ء)

مدرسہ دائی لاڈو

دائی لاڈو جو شاہجہان کی دایہ تھی، بہت مال دار اور پرہیزگار خاتون تھی۔ وہ شیخ سلیم چشتیؒ کی مریدہ تھی اور فریضہ حج بھی ادا کر چکی تھی۔ اس کے محلات لاہور کے محلہ زین خاں میں تھے۔ یہ محلہ کبھی "گذر تلہ" بھی کہلاتا تھا۔ شاہجہان کے زمانے میں "محلہ دائی لاڈو" کے نام سے مشہور ہوا۔ جہاں پہلے رتن باغ تھا اور اب "مون یونٹ ہسپتال بن گیا ہے"، بھارت بلڈنگ، جہاں سنگھ کا باغ، سنت روڈ اور گاندھی پارک واقع ہیں، وہیں یہ محلہ آباد تھا۔ دایۂ مذکور نے ۱۰۴۵ھ (۱۶۳۵ء) میں وہاں اپنی مسجد بنوائی جو اب تک موجود ہے۔ مسجد میں دائی لاڈو اور اس کے خاوند کی قبریں بھی ہیں۔

دائی لاڈو نے اس مسجد کے ساتھ ایک بہت بڑا مدرسہ تعمیر کرایا اور اپنی جائداد کا بہت سا حصہ اس مسجد اور مدرسہ کے اخراجات کے لیے وقف کیا۔ مدرسہ کے پہلے شیخ (پرنسپل) مولانا عصمت اللہ تھے۔ مولانا کی شہرت دور دور تک تھی۔ وہ بے حد پرہیزگار اور متقی تھے۔ معقولات اور منقولات میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔ مولانا کی کشش ہر طرف سے طلبہ کو وہاں کھینچ لائی اور تھوڑے ہی دنوں میں مدرسہ ایک زبردست تعلیمی مرکز بن گیا۔

دائی لاڈو ۵ محرم سنہ جلوس کو فوت ہوئی۔ اس کا خاوند اس کی وفات سے دس ماہ پہلے ہی فوت ہو چکا تھا۔ ان کے فرزند محمد شکور

---

[1] مآثر الکرام صفحہ ۲۲۱ – ۲۲۲

نے اس ادارے کو بدستور چلایا اور قائم رکھا۔ چونکہ وہ لاولد تھا اس نے اپنی تمام جائداد مدرسہ کے نام وقف کر دی۔

یہ مدرسہ نواب زکریا خان کے زمانے تک قائم رہا جب سکھ لاہور پر قابض ہوئے تو انھوں نے دیگر علمی اداروں کے ساتھ اسے بھی تباہ کر دیا۔ مدرسہ کی عمارت اور حویلیاں ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر بن گئیں۔ ۱۷۵۶ء میں جب رتن چند ڈاڑھی والا نے اپنا رتن باغ اور حویلی تعمیر کی تو انہیں کی عمارتوں کو کھدوا کر اینٹیں حاصل کیں۔ مسجد کے ایک طرف میاں سنگھ کا باغ ہے۔ ایسا معلوم ہے کہ جب یہ علاقہ اجڑا تو عیسائیوں نے اس پر قبضہ کر لیا اور وہاں اپنے ادارے قائم کیے۔ وہ جگہ بھی دائی لاڈو کی ملکیت تھی جس جگہ آج کل میڈیکل کالج کا نالاب گرا ؤنڈ اور ہوسٹل ہیں۔ وہاں کبھی سر بفلک عمارتیں ہوتی تھیں۔ چنانچہ جب نالاب کھدر رہا تھا تو اس کے نیچے سے پختہ اینٹوں کی بنیادیں نکلی تھیں۔

درس میاں وڈا یا مدرسہ تیل واڑہ

دوسرا اہم مدرسہ جو اس دور میں قائم ہوا، وہ آج کل درس میاں وڈا یا بڑے میاں کا درس کہلاتا ہے۔ اس مقام پر شاہجہان کے زمانے میں محلہ تیل واڑہ آباد تھا۔ اور یہ شہر کے سب سے متمول اور شاندار سول اسٹیشن مغلپورہ کا ایک حصہ تھا۔

اس درس کے بانی مولانا محمد اسمٰعیل سہروردی تھے۔ آپ ذات کے کھوکھر تھے۔ آبائی پیشہ زمینداری تھا۔ آپ کی ولادت ۹۹۵ھ مطابق ۱۵۸۶ء میں ترکراں علاقہ پوٹھوہار میں ہوئی۔ آپ کے والد فتح اللہ بن عبداللہ بن سرفراز تھے۔ ابتدا میں آپ شیخ عبدالکریم سہروردی کے شاگرد ہوئے۔ اس وقت آپ کی سکونت موضع لنگر میں تھی جو دریائے چناب کے کنارے ایک آباد گاؤں تھا۔ آپ کی طالب علمی کا ایک مشہور واقعہ مفتی غلام سرور لاہوری نے "خزینۃ الاصفیا" میں بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب آپ علوم دینی کی تحصیل میں ہمہ تن مصروف تھے تو آپ کی عمر بارہ برس تھی۔ مولانا عبدالکریم کے درس کے ساتھ لنگر بھی تھا جہاں سے طلبہ کو کھانا ملتا تھا۔ ہر طالب علم باہمی تعاون، خلوص، ایثار، نیک نیتی اور محبت و شفقت کے جذبہ سے کوئی نہ کوئی کام کرتا تھا۔ تمام طالب علم آپس میں بھائیوں بھائیوں کی طرح رہتے تھے جس سے یہ درس گاہ ایک برادری معلوم ہوتی تھی۔ حسد، کوتاہ بینی، غرور اور تنگ نظری جو آج کل کی درس گاہوں کا خاصا ہیں، یہاں بالکل معدوم تھے۔ میاں محمد اسمٰعیل کے سپرد لنگر کے لیے آٹا پیسنا تھا۔ وہ مدتوں یہ خدمت سرانجام دیتے رہے۔ چکی ان کے حجرے میں ہوتی تھی اور وہ وقت مقررہ پر آٹا لنگر میں پہنچا دیتے تھے۔

ایک دن ایسا ہوا کہ آٹا وقت پر نہ پہنچا۔ آپ کے ساتھیوں نے کچھ عرصہ انتظار کیا پھر وہ پریشان ہوئے کہ کہیں میاں محمد اسمٰعیل بیمار تو نہیں ہو گئے۔ آپ کا ایک ہم سبق آپ کے حجرے کی طرف آیا اور چپ چاپ اندر داخل ہوا۔ کیا دیکھتا ہے کہ میاں اسمٰعیل تو مراقبہ میں ہیں، چکی خود بخود چل رہی ہے اور آٹا پس رہا ہے۔ وہ دبے پاؤں واپس استاد کے پاس آیا۔ اسے واقعہ کی اطلاع دی۔ شیخ عبدالکریم کو اس بیان سے کچھ تعجب سا ہوا۔ وہ خود وہاں پہنچے اور جیسا سنا تھا ویسا ہی دیکھا۔ وہ شاگرد کی یہ کیفیت دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور دل ہی دل میں ان کی تعریف کرنے لگے۔

کچھ عرصہ بعد میاں اسمٰعیل کو ہوش آیا۔ وہ آٹا لے کر لنگر میں پہنچے۔ پھر استاد کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ تاخیر کی معافی مانگیں۔ استاد نے کہا "اے نور نظر! آج سے تم یہ تکلیف نہ کرنا۔ تمہارے مشاغل میں ہرج ہوتا ہے" میاں اسمٰعیل استاد کا یہ حکم سن کر ڈر گئے اور اس کا سبب دریافت کیا۔ استاد نے کہا کہ بعض تکلیف دینے سے ملائکہ کو تکلیف ہوتی ہے۔ میاں اسمٰعیل نے خدمت کے لیے اصرار کیا تو استاد نے فرمایا۔ اچھا، اگر تم ضروری کچھ نہ کچھ خدمت کرنا چاہتے ہو، تو پھر تمہاری یہ خدمت مقرر کی جاتی ہے کہ دن بھر مطالعہ میں مشغول رہو۔ فقط دو وقت

دودھ دوہ کر ہمارے ہاں پہنچا دیا کرو۔ آپ نے شفیق استاد کے ارشاد کی تعمیل دل و جان سے کی۔

کچھ عرصہ بعد مخدوم عبدالکریم کے پڑوسیوں نے میاں اسمٰعیل کو صالح اور متقی دیکھ کر یہ خواہش کی کہ ہمارا دودھ بھی تم ہی دوہ دیا کرو۔ آپ نے وعدہ کیا اور استاد کی خدمت کے ساتھ ساتھ مخلوق کی خدمت بھی شروع کر دی۔ آپ کی عادت تھی کہ دودھ کے تمام برتن ایک جگہ جمع کر کے سر کے اوپر اٹھا لیتے اور پھر گاؤں کا رُخ کرتے۔ ایک روز ایسا ہوا کہ مخدوم عبدالکریم اپنے مکان کی چھت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ میاں اسمٰعیل کے سر پہ جو برتن رکھے ہوئے ہیں وہ سر سے قدرے بلند ہیں اور آپ پر استغراق کا عالم طاری ہے۔ قدم خود بخود اٹھتے چلے جاتے ہیں۔ اس سے انھیں یقین کامل ہو گیا کہ آپ ولایت کے درجہ پر پہنچ چکے ہیں۔ اب ان کے مزید قیام کی ضرورت نہیں، مدرسہ کی پابندی سے آپ کو مزید تکلیف ہو گی۔ اب استادی اور شاگردی کے ظاہری تعلقات سے آپ بے نیاز ہیں۔ چنانچہ آپ نے میاں اسمٰعیل کو طلب کیا اور فرمایا ”اب آپ کے لیے یہی بہتر ہے کہ آپ کسی اور مقام کی جانب تشریف لے جائیں“۔ میاں اسمٰعیل نے حاضر باشی پر اصرار کیا مگر استاد نے انھیں سمجھایا کہ فرض کی بجا آوری میں اب مزید تساہل و تغافل کی ضرورت نہیں۔ وقت آ گیا ہے کہ آپ رشد و ہدایت پر متمکن ہوں اور خلق اللہ کی فلاح و بہبود کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیں۔“

میاں اسمٰعیل نے دریافت کیا کہ مجھے کہاں جانے کا حکم ہے؟ استاد نے دریائے چناب کی جانب اشارہ کیا۔ چنانچہ آپ استاد کی ہدایات کے بموجب وہاں سے روانہ ہوئے اور دس میل چلنے کے بعد دریائے چناب کے کنارے ایک شیشم کے درخت کے سائے میں بیٹھ کر یاد حق میں مصروف ہو گئے۔

چند یوم کے بعد کچھ طالب علم آنے شروع ہوئے اور رفتہ رفتہ ان کی تعداد ایک سو بیالیس تک پہنچ گئی۔ آپ نے ان کی تعلیم اور روحانی تربیت کی طرف توجہ دینی شروع کی۔ کچھ عرصہ بعد وہاں سخت قحط پڑا۔ کھانے کو روٹی کا ٹکڑا تک میسر نہ آتا تھا۔ ایک بڑھیا آپ کی خدمت میں ایک روٹی لے کر حاضر ہوئی۔ آپ نے وہ روٹی ایک طالب علم کو دی۔ اس نے دوسرے کو اور دوسرے نے تیسرے کو۔ اسی طرح وہ روٹی گھومتی پھرتی پھر آپ تک پہنچ گئی۔ طلبہ کی یہ باہمی ہمدردی، ایثار اور خلوص دیکھ کر آپ بہت خوش ہوئے۔ یہ منظر آپ کو بہت پسند آیا۔ آپ نے مسکرا کر فرمایا ”تمہارا یہ ایثار ظاہر کرتا ہے کہ تم دنیوی علائق سے بالکل پاک ہو گئے ہو اور روحانیت میں اس قدر آگے بڑھ گئے ہو کہ جسمانی تکلیف تمہارے لیے کوئی تکلیف نہیں رہی۔ اس حالت میں اگر تم چاہو تو طیور کی مانند اڑ سکتے ہو۔“

طالب علموں پر بار بار آپ کی نگاہ پڑتی تھی اور آپ کی حالت دگرگوں ہو رہی تھی۔ طبیعت میں کیف اور پھر کیف سے وجد پیدا ہوا۔ اسی وجد کی حالت میں آپ نے زبان حق ترجمان سے فرمایا ”تم سب اڑ جاؤ“۔ یہ سنتے ہی وہ سب پرندوں کی طرح اڑ گئے اور جو جو مقام شیخ نے ان کے لیے مقرر کیا تھا، وہاں پہنچ کر دعوت و تبلیغ میں مصروف ہو گئے۔ البتہ ایک طالب علم جس کا نام محمد فاضل تھا۔ آپ کے پاس رہ گیا۔ وہ جب اڑنے لگا تو آپ نے اپنی لاٹھی اس کی ٹانگ پر ماری اور کہا ”تو ہمارے پاس رہ“ وہ گر پڑا اور عصا کے صدمے سے لنگڑا ہو گیا۔ پنجابی میں لنگڑے کو لنگا کہتے ہیں۔ اس لیے وہ مقام جہاں وہ آپ کے ساتھ مقیم رہا موضع لنگے کے نام سے مشہور ہو گیا۔ محمد فاضل وہیں فوت ہوا اور اس کا مزار وہیں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

ایک دن میاں اسمٰعیل ریاضت میں مشغول تھے کہ ہاتف غیب سے اشارہ ہوا کہ آپ لاہور جائیں۔ اس وقت آپ کی عمر پینتالیس برس تھی۔ لاہور پہنچ کر محلہ ”نیل واڑہ“ میں آپ نے قیام کیا۔ یہ محلہ اسی جگہ تھا جہاں آپ کا درس اور مسجد واقع ہیں۔ آپ نے وہاں درس و تدریس

اور تعلیم و تلقین کا سلسلہ شروع کیا۔ اس نیک کام کو شروع کرنے سے پیشتر آپ نے حضرت شیخ علی ہجویری عرف داتا گنج بخشؒ کے مزار پُر انوار پر چلہ کشی کی۔ جب آپ چلہ کشی سے بعد واپس ہوئے تو طلبہ کی ایک بہت بڑی جماعت آپ کے حلقہ درس میں شامل ہو گئی۔

محلہ تیل واڑہ کے ساتھ ہی ایک اور محلہ آباد تھا جسے گنج پورہ کہتے ہیں۔ وہاں ایک قدیم مسجد تھی جس کی ظاہری حالت بگڑ رہی تھی۔ اور ایک ہندو جوگی نے زبردستی اس پر قبضہ جما رکھا تھا۔ وہ یوگ میں بہت کامل تھا۔ ارد گرد کے لوگ اس سے بہت ڈرتے تھے۔ کسی کو اس کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہ تھی مگر دل ہی دل میں سب کڑھتے تھے کہ مسجد اس سے خالی کرانی چاہیئے۔

ایک دن میاں اسمٰعیل کو باطنی اشارہ ہوا کہ اس جوگی کو مسجد سے نکالیں۔ آپ جوگی کے پاس تشریف لے گئے۔ اسے بڑی نرمی سے سمجھایا کہ یہ مسلمانوں کی عبادت گاہ ہے تم اسے خالی کر دو۔ وہ یہ سن کر مسکرایا اور استہزا کرنے لگا۔ کہا کہ اگر طاقت ہے تو خالی کرا لو۔ تم دیکھو گے کہ مسجد میرے ساتھ جائے گی۔ چنانچہ وہ اٹھ کھڑا ہوا مسجد کو اشارہ کیا اور اس میں کچھ حرکت پیدا ہوئی۔ آپ کے ہاتھ میں عصا تھا آپ نے وہی عصا مسجد کی دیوار کو مارا اور کہا کہ بس کھڑی رہ۔ کہتے ہیں کہ مسجد وہیں تھم گئی۔ جوگی نے آپ کے قدم پکڑ لیے اور آپ کی اجازت سے چپ چاپ وہاں سے چل دیا۔ اس دن سے آپ نے اسی مسجد میں قیام کرنا شروع کیا۔ شاہجہان کی ایک دایہ نے اس مسجد کو از سر نو تعمیر کرا دیا۔ یہ مسجد اب تک موجود ہے۔

میاں اسمٰعیل قرآن پاک، حدیث، فقہ، تفسیر اور علوم دینیہ کا درس دیا کرتے تھے۔ ہزاروں لوگ آپ کے درس سے فیضیاب ہوتے تھے۔ ایک مدت قلیل میں آپ کی شہرت دور دور پہنچ گئی۔ آپ کی زبان میں اللہ تعالےٰ نے عجیب تاثیر دی تھی۔ کتنا ہی غبی اور کند ذہن طالب علم آپ کے حلقہ درس میں شامل ہوتا، چند ہی ماہ میں حافظ قرآن ہو جاتا۔

ایک دفعہ ایک نوجوان آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور رو رو کر کہنے لگا کہ میری بیوی قرآن پاک کی حافظہ ہے ہماری شادی کو چند ہی یوم ہوئے ہیں۔ پہلی رات جب ہم اکٹھے ہوئے تو بیوی نے مجھ سے پوچھا۔ کیا تم حافظ قرآن ہو؟ میں نے کہا نہیں! اس نے کہا کہ جب تک تم قرآن پاک حفظ نہ کر لو اس وقت تک میرے پاس نہ آؤ۔ اب آپ ہی فرمائیں کہ میں کیا کروں! آپ نے فرمایا کہ تم چھ ماہ ہمارے پاس ٹھہر جاؤ۔ انشاء اللہ تعالےٰ تم حافظ قرآن ہو جاؤ گے۔ اس پر وہ زار زار رونے لگا اور کہنے لگا کہ میں تو ناظرہ قرآن مجید بھی نہیں پڑھ سکتا۔ پھر اتنی جلدی حفظ کیسے کر لوں گا اور اتنے عرصے کے لیے اپنی بیوی کی جدائی کیونکر گوارا کر سکوں گا؟ وہ روتا تھا اور بار بار سرد آہیں بھر کر آپ سے رحم کی درخواست کرتا تھا کہ آپ اگر آپ توجہ نہ فرمائیں گے تو میری زندگی تباہ ہو جائے گی۔ اس کے رونے پر آپ کو ترس آ گیا اور آپ نے فرمایا کہ اچھا۔ کل صبح فجر کی نماز کے وقت تم میرے دائیں ہاتھ ایسی جگہ کھڑے ہونا جہاں سلام پھیرتے وقت میری نظر پڑ سکے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ اور جب آپ نے سلام پھیرا تو آپ کی نظر کیمیا اثر سے دائیں جانب جتنے آدمی صف میں بیٹھے تھے حافظ قرآن ہو گئے۔ اور بائیں طرف والے ناظرہ خوان بن گئے۔ وہ نوجوان آپ کو دعائیں دیتا اور شکریہ ادا کرتا خوش خوش گھر آیا اور آپ کا مرید ہو گیا۔

آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "فیض قرآن بعد فوت از خاک قبر ما جاری خواہد ماند" چنانچہ یہ فیضان اب تک جاری ہے۔ آپ کے مدرسے میں اس وقت بھی بہت سے لوگ قرآن پڑھ رہے ہیں۔

آپ ۱۰۸۴ھ (۱۶۷۴ء) میں بمقام لاہور فوت ہوئے۔ آپ کی تاریخ وفات سید محمود نے جن کا مزار مدرسے کے مغرب میں واقع ہے یوں کہی ہے ؎

شنو تاریخ آں دریائے معنی ــــ کہ عمرش گشت در عشق خدا صرف
دل و جاں کرد قربان الٰہی ــــ کہ اسمٰعیل ثانی بود بے صرف
۱۰۸۵ھ

آپ کا مزار درس کے احاطے میں ہے اور آپ کی وصیت کے بموجب کچا ہے۔

آپ کی وفات کے بعد مولانا محمد صالح پچیس۲۵ برس تک اس مدرسہ کے مہتمم رہے۔ جن کی وفات کے بعد حافظ محمود یہاں درس دیتے رہے۔ ان کے بعد حافظ معز الدین اور ان کے بعد حافظ شرف الدین اس مدرسہ میں درس و تدریس کا کام کرتے رہے۔ حافظ شرف الدین ۱۲۷۲ھ ۱۸۵۵ء میں فوت ہوئے تو ان کے بیٹے حافظ احمد دین نے درس قرآن کا کام اپنے ذمہ لیا۔

جب سلطنت اسلامیہ کو زوال آیا اور پنجاب میں سکھ گردی شروع ہوئی تو دوسرے اسلامی اداروں کے ساتھ اس مدرسے کو بھی سکھوں کے ہاتھوں بہت سا نقصان پہنچا۔ سب سے زیادہ نقصان مہاراجہ دلیپ سنگھ کے عہد میں ہوا۔ اس وقت وزارت کے سلسلے میں سوچیت سنگھ ڈوگرہ اور راجہ دھیان سنگھ کے بیٹے ہیرا سنگھ کے درمیان سخت کشمکش ہو رہی تھی۔ سوچیت سنگھ یہ چاہتا تھا کہ وہ وزارت پر قبضہ کرے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ لاہور پہنچا اور جب وہ اس مدرسہ کے قریب آیا تو شام ہو چکی تھی۔ اس نے ارادہ کیا کہ رات مدرسہ میں بسر کرے۔ حافظ شرف الدین جو یہاں کے مہتمم تھے، سوچیت سنگھ کا یہ ارادہ دیکھ کر بہت ڈرے۔ آپ اس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ اگر آپ کی آمد کی اطلاع ہیرا سنگھ کو ہو گئی تو وہ فی الفور یہاں دھاوا بول دے گا۔ اس طرح فقیروں کی کٹیا تباہ ہو جائے گی۔ پاس ہی شالا مار باغ ہے۔ یہ ہمارے مدرسہ سے زیادہ محفوظ اور وسیع ہے۔ آپ اس میں چلے جائیں۔ راجہ سوچیت سنگھ نے کہا کہ اگر مدرسہ کو کسی قسم کا نقصان پہنچا تو میں ذمہ دار ہوں گا۔ مگر حافظ شرف الدین کی اس سے تسلی نہ ہوئی۔ انھوں نے یہی مناسب سمجھا کہ مدرسے کا سامان جس قدر ہو سکے یہاں سے نکال لینا چاہیے۔ چنانچہ آپ نے رات کی تاریکی میں کچھ اسباب اور اپنے اہل و عیال کو پاس ہی کسی محفوظ جگہ منتقل کر دیا۔

صبح ہوتے ہی ہیرا سنگھ توپ خانہ لے کر وہاں پہنچ گیا اور اس نے بڑے زور شور سے حملہ کیا۔ توپ خانہ حرکت میں آیا اور گولوں سے مدرسہ کو بہت نقصان پہنچا۔ کتب خانہ کو آگ لگ گئی اور وہ جل کر راکھ ہو گیا۔ سوچیت سنگھ مارا گیا۔ مدرسہ اور اس کی عمارت جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر بن گئی۔

انگریزی عہد کے آغاز میں میاں سلطان ٹھیکیدار نے اپنا حلوہ والا رکھ مدرسہ کے نام وقف کر دیا۔ مدرسہ اس کی آمدنی سے چلنے لگا اور اس میں ایک مرتبہ پھر رونق آ گئی۔

مدرسہ میانی صاحب

انہی ایام میں لاہور کے مغربی حصے میں ایک اور زبردست مدرسہ تھا جہاں درس و تدریس کا کام بڑے زور شور سے ہو رہا تھا۔ اس مدرسہ کے بانی شیخ محمد طاہر تھے جو سلسلۂ قادریہ نقشبندیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ شیخ محمد طاہر مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کے مریدوں میں سے تھے۔ آپ سرہند میں مرشد زادوں کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد آپ کو حکم ہوا کہ آپ لاہور تشریف لے جائیں اور وہاں درس و تدریس کا کام شروع کر دیں۔ چنانچہ آپ اپنے پیر کے حکم سے لاہور تشریف لائے۔ یہاں پہنچنے پر جو حالات پیش آئے اور جو خیالات آپ کے دل میں پیدا ہوئے، آپ انھیں اپنے ایک عریضہ میں اس طرح بیان کرتے ہیں :۔

"حضرت سلامت! احقر الخدمت محمد طاہر بعرض می رساند کہ چوں از آستانہ علیا متوجہ لاہور شدم، در ہر قدمے باخودمی گفتم کہ اے نادان! مقصود را در سرہند گذاشتہ کجا می روی۔ اما از غیب ندا شد کہ راہی شو و توقف مکن۔ آخر کشاں کشاں در لاہور آورند و بہ گوشہ مسجدے حیران و پریشان نشستم۔ ناگاہ روح پر فتوح حضرت خواجہ نقش بند ظاہر شد و باعث گشت کہ پکارے کہ مامور شدہ مشغول شو۔ امتثالاً لامرہم و امر کم چند کس را مشغول ساختم۔ حالا مجلس گرم است و ارواح مشائخ عظام فوج در فوج تشریف می آرند و التفات کثیرہ می فرمایند خصوصاً حضرت غوث الاعظم و خواجہ بزرگ نقش بند و حضرت گنج شکر در ذکر و نماز تشریف فرما می شوند۔ و جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہم با چند ہزار اصحاب نامدار تشریف آوردہ رونق افروز محفل می شوند۔ و نوازشہا می فرمایند و در عشرہ اعتکاف بہ خلوت خاص و نسبت تازہ سرافراز گردانند و حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا الطاف بسیار نمودہ بندہ را بتشریفات خاصہ بنواخت و قبل ازیں ہر یک از نسبت ثلاثہ یعنی نسبت نقش بندیہ و قادریہ و چشتیہ نوبت بہ نوبت روی داد۔ و گاہے مختلط ہم می شود و گاہے غالب مغلوب ہم می گردد۔ و یک نوبت چشتیہ غلبہ عظیم می کرد بہ حدے کہ از نسبت ہائے دیگر نا امید گشتم۔ در یں ضمن نسبت نقشبندیہ غلبہ کرد۔ و دیگر نسبت ہا را زیر نمودہ حالا ہر سہ نسبت یکے شدہ اند۔ در یں ایام سیر در نسبت مشائخ عظام کم است و در نسبت اصحاب نبویہ زیادہ تر است و سوائے نسبت خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اکثر اوقات بندہ در نسبت حضرت پیغمبر علیہ الصلوٰۃ الملک الاکرم می باشد و بسیار خوش می ماند و مطلوب فقیر ہم ہمیں است کہ ہمیں نسبت پیغمبری ترقی و زیادتی پذیرد والسلام"۔

آپ کے درس میں ہزارہا لوگ شامل ہوتے اور اعلیٰ مراتب پر پہنچتے۔ آپ تمام عمر کسی امیر کے پاس نہیں گئے نہ ان کو اپنے قریب آنے دیا۔ آپ کسب حلال سے روزی کماتے اور احادیث و تفاسیر کی کتابوں کی کتابت کر کے بسر اوقات کرتے۔ پھر رات رات بھر یاد الٰہی میں مشغول رہتے۔ کوئی سائل آپ کے در سے خالی نہ جاتا۔ آپ کی وفات جمعرات ۸ محرم سنہ ۱۰۴۰ھ / ۱۶۳۰ء کو ہوئی اور اپنے مدرسہ کے ایک گوشے میں دفن ہوئے۔

آپ کے بعد مولانا ابو محمد قادری اس مدرسہ کے مہتمم مقرر ہوئے۔ آہستہ آہستہ اس مدرسے کے گرد ایک زبردست محلہ آباد ہو گیا جو محلہ میانی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ان ایام میں "میاں" پڑھے لکھے اور فاضل آدمیوں کو کہتے تھے چونکہ اس محلہ میں لاہور کے بڑے بڑے فاضل اور عالم لوگ رہتے تھے اس لیے یہ محلہ میانی کے نام سے پکارا جانے لگا۔ سیالکوٹ میں میانہ پورہ اس محلہ کا نام ہے جس میں علامہ عبد الحکیم سیالکوٹی رہا کرتے تھے۔

اس مدرسہ کے ساتھ ایک زبردست کتب خانہ بھی تھا جو سلطنت اسلامیہ کے زوال تک قائم رہا۔ رائے بہادر کنہیا لعل تاریخ لاہور

میں لکھتے ہیں :---

"سکھوں نے اس محلہ کو لوٹتے وقت اس بیش بہا کتب خانہ کو بھی آگ لگادی۔ اس طرح ہزارہا نادر کتابیں جل کر راکھ ہو گئیں۔ سکھوں کے ایام حکومت میں یہ محلہ اور مدرسہ اجڑ گیا اور آبادی معدوم ہو گئی۔"

اس وقت یہ سارا علاقہ قبرستان کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔ غالباً اس سے بڑا قبرستان اور کہیں نہیں ملے گا۔ اس کے وسط میں شیخ محمد طاہر بندگی کا مزار ہے۔ اس مزار کے گرداگرد ایک چار دیواری تھی جو اب گر چکی ہے۔ مزار ایک بلند چبوترے پر واقع ہے۔ اس کے مشرق کی طرف مولانا ابو محمد اور سید خیر شاہ، جو کسی زمانہ میں اس مدرسہ کے مہتمم تھے، کی قبریں ہیں۔ مغرب کی جانب ایک قدیم مسجد ہے۔

مدرسہ خیر گڑھ

جس مقام پر آج کل شاہو کی گڑھی آباد ہے اس جگہ کو اکبر اعظم کے زمانے میں شیخو گڑھی کہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اکبر نے یہ مختصر سی بستی اپنے پیارے بیٹے شہزادہ سلیم کے نام پر بسائی تھی جسے وہ شیخ سلیم چشتیؒ کے احترام کی بنا پر شیخو بابا کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ شاہجہان کے ایام حکومت میں لبنداد سے ایک نہایت زبردست فاضل اور جید عالم مولانا ابوالخیر لاہور میں وارد ہوئے۔ ان کی شہرت تھوڑے ہی عرصہ میں پھیل گئی اور گھر گھر ان کے علم و فضل کے چرچے ہونے لگے چنانچہ حکومت کے ایما پر انھوں نے درس و تدریس کے لیے ایک مدرسہ شیخو کی گڑھی میں جاری کیا۔ آپ نے مدرسہ کے لیے ایک عالی شان عمارت تعمیر کی جس کے ساتھ ایک وسیع مسجد بھی تھی۔ طلبہ کے قیام کے لیے اعلیٰ قسم کے حجرے تھے۔ اس عالیشان مدرسے کی فصیل اور دیواریں قلعہ نما تھیں۔ مدرسہ کا تمام خرچ لاہور کے شاہی خزانے سے ادا ہوتا تھا۔ تشنگانِ علم دور دور سے یہاں کھنچے چلے آتے تھے۔ ایک طرح سے اس مدرسہ کو بین الاقوامی شہرت حاصل تھی۔

مولانا ابوالخیر نے بہت لمبی عمر پائی۔ مفتی غلام سرور لاہوری خزینۃ الاصفیا میں لکھتے ہیں کہ مولانا نے پوری ایک صدی درس و تدریس کے فرائض ادا کیے اور آپ کے حلقۂ تلامذہ میں شیخ جان محمد حضوری جیسے فلاسفر دہر نظر آتے ہیں۔ مولانا ابوالخیر ۱۱۳۴ھ/۱۷۲۲ء میں فوت ہوئے۔

آپ کے بعد اس مدرسہ کا انتظام آپ کے خلیفہ مولانا محمد نعیم کے ہاتھ آیا۔ انھوں نے اس فیض کو برابر جاری رکھا یہاں تک کہ سکھوں کی غارت گری شروع ہو گئی اور سارا لاہور ان کے مظالم کا تختۂ مشق بن گیا۔ لاہور کے دوسرے حصوں کی طرح یہ علاقہ بھی ویران ہو گیا اور مدرسہ کو بہت نقصان پہنچا۔ کچھ مدت تک یہ علاقہ کسمپرسی کی حالت میں پڑا رہا۔ مولوی نور احمد چشتی تحقیقات چشتی میں لکھتے ہیں کہ ۱۱۷۵ھ/۱۷۶۲ء میں ماچھے کا ایک تیلی شاہو نامی یہاں وارد ہوا۔ وہ دن کے وقت بکریاں چراتا اور رات کے وقت ڈاکے مارتا تھا۔ خدا کی شان ہے کہ جو علاقہ شیخو گڑھی سے خیر گڑھ بنا تھا وہ اب اس کے نام پر گڑھی شاہو کہلاتا ہے ؎

پردہ داری می کند بر قصرِ قیصر عنکبوت
بوم نوبت می زند بر گنبدِ افراسیاب

مولانا ابوالخیر کا مزار گڑھی کی چار دیواری کے اندر چند اور قبروں کے ساتھ بلند چبوترے پر واقع ہے اور آپ کی تعمیر کردہ عمارت اور مدرسہ کا نام و نشان تک مٹ چکا ہے۔

مدرسہ ابو الحسن خاں تربتی

یہ لاہور کا مشہور مدرسہ تھا اور سب سے خوبصورت اور امیر گنذر مغلپورہ میں واقع تھا۔ نواب ابو الحسن خاں دورِ جہانگیری کا ایک امیرِ کبیر تھا۔ اور وزارتِ عظمیٰ کے عہدے پر بھی فائز ہوا۔ اس کا لڑکا ظفر خاں احسن کشمیر کا گورنر تھا۔ اس نے کئی حویلیاں، محل، باغ اور دیگر عمارتیں بنوائیں۔ جب وہ ۱۰۴۲ھ (۱۶۳۳ء) میں فوت ہوا تو اس کی وصیت کے بموجب اسے ایک وسیع باغ میں دفن کیا گیا۔ مقبرہ کی عمارت دو منزلہ تھی اور یہ عمارت گرد و نواح کی تمام عمارتوں سے بلند تھی۔ کاشی کا خوبصورت کام دیکھنے والوں کے دلوں پر عجیب اثر کرتا تھا۔

نواب مرحوم کی بیگم مخدوم جہاں کہلاتی تھی۔ وہ مختلف اسلامی علوم و فنون میں اچھا خاصا درک رکھتی تھی اور ضروریاتِ زمانہ سے آشنا تھی۔ اس نے اپنے خاوند کی یادگار میں یہ مدرسہ جاری کیا اور ایک ہزار حافظ اس کام کے لیے مقرر کیے کہ وہ باری باری اس کے خاوند کے مزار پر قرآن کریم پڑھا کریں۔ یہ نیک خاتون بروز دوشنبہ ۱۷ شعبان ۱۰۶۷ھ (۱۶۵۷ء) کو فوت ہوئی اور اسی باغ میں ایک علیحدہ مقبرہ میں دفن کی گئی۔

مدرسہ کے معلمین میں سب سے نمایاں نام شیخ حامد قادری کا ہے جو ایک مدت تک اس کے صدر مدرس اور مہتمم رہے۔ مولانا حامد قادری نہایت فصیح البیان واعظ اور فاضل اجل تھے۔ دور دور سے لوگ آپ کے ہاں استفادہ کی غرض سے آیا کرتے تھے۔ آپ ۱۱۶۶ھ/۱۷۵۲ء میں فوت ہوئے اور مدرسہ کے ایک کونے میں دفن کیے گئے۔ آپ کی تصانیف میں دو کتابیں اچھی خاصی شہرت رکھتی ہیں۔ ایک تو آپ کے ملفوظات ہیں اور دوسری حرمتِ حقہ۔

آپ کی وفات کے بعد حافظ رحمت اللہ اس مدرسہ کے پرنسپل مقرر ہوئے مگر آپ کا زمانہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا کیونکہ لاہور ان ایام میں سکھ سرداروں کی جولاں گاہ بنا ہوا تھا۔ ہر جگہ بدامنی تھی۔ قتل و غارت کی گرم بازاری تھی۔ اس لیے اطمینانِ قلب اور امن جو تعلیم کے لیے ضروری ہیں بالکل مفقود تھے۔ یہ عالیشان مقبرہ اجڑ گیا اور سکھا شاہی میں ایک میگزین کا کام دینے لگا۔ اس وقت یہ ریلوے اسٹور کی چار دیواری میں گھرا ہوا ہے۔

مدرسہ شیخ بہلول

یہ مدرسہ بھی شاہجہان کے زمانے میں لاہور کی مشہور درسگاہوں میں شمار ہوتا تھا۔ "مآثر الامرا" کا مصنف کہتا ہے کہ شیخ بہلول ایک جیّد عالم اور زبردست فاضل تھے۔ ان کی شہرت کا آفتاب جہانگیر کے آخری ایام حکومت میں نصف النہار پر تھا۔ اس مدرسے میں قاضی محمد اسلم نے تعلیم پائی جو خواجہ کوہی کی اولاد سے تھے اور مشہور صاحب دل بزرگ ہوئے ہیں۔ جب وہ ہرات سے لاہور پہنچے تو تکمیل تعلیم کے لیے اس مدرسے میں داخل ہوئے۔ تکمیل تعلیم کے بعد آپ کا شمار ہندوستان کے مشاہیر علما میں ہوا۔

قاضی اسلم کے بیٹے میر زاہد نے بھی اسی مدرسے میں تعلیم پائی۔ وہ علم الکلام اور حکمت میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ انھوں نے "شرح مواقف" اور بہت سی دقیق کتابوں پر مفید حاشیے لکھے ہیں۔

مدرسہ ملّا فاضل قادری

یہ مدرسہ اس جگہ تھا جہاں آج کل جیل روڈ اور وارث روڈ کا اتصال ہوتا ہے۔ ملا فاضل قادری ایک نیک دل بزرگ تھے۔ حکومت انھیں مددِ معاش دیتی تھی جسے وہ مدرسے پر صرف کرتے تھے۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے شاگرد شاہ شرف نے اس کام کو جاری رکھا۔ استاد اور شاگرد دونوں کی قبریں ابھی تک مدرسہ کے محل وقوع

کا پتہ دیتی ہیں۔ صاحب تحقیقات چشتیہ کا بیان ہے کہ اس مدرسہ کے ساتھ ایک عالی شان مسجد تھی جو اب بالکل مٹ چکی ہے۔

مدرسہ ملا خواجہ بہاری

یہ مدرسہ دہلی دروازے کے اندر واقع تھا۔ بہت مشہور تھا۔ نواب سعد اللہ خاں اسی مدرسے کے فارغ التحصیل تھے۔ ملا خواجہ بہاری کا اصل وطن حاجی پور تھا جو قصبہ گودا پور (بہار) میں واقع تھا۔ آپ چھوٹی سی عمر میں علم حاصل کرنے کے لیے اپنے وطن سے نکلے۔ کچھ مدت تک قصبہ کورا میں شیخ جمال اولیاء کے پاس رہے۔ وہاں سے فیضان حاصل کر کے لاہور آئے اور ملا فاضل لاہوری سے ظاہری علوم کی تحصیل میں مشغول ہو گئے۔ ملا محمد فاضل اپنے ہونہار شاگرد سے بہت خوش رہتے اور انھیں اپنے گھر میں رکھتے تھے۔ ان ایام میں حضرت شیخ میاں میرؒ کا باطنی فیض عام تھا۔ آپ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے بیعت کی اور ان کی توجہ سے باطنی علوم میں بھی کامل ہو گئے۔

ملا خواجہ بہاری عالم علوم فقہ و حدیث و تفسیر تھے۔ تذکرہ "علمائے ہند" کا مصنف لکھتا ہے:۔

"ملا بہاری فقیہ محدث مفسر واقف اسرار حقانی بود۔"

حضرت میاں میرؒ کی وفات کے بعد آپ کو قبولیت عامہ حاصل ہوئی۔ خاص و عام گروہ در گروہ آپ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ دارا شکوہ سکینۃ الاولیاء میں لکھتا ہے کہ ایک مرتبہ جاڑوں کے موسم میں آپ ایک عرس پر تشریف لے گئے۔ وہاں توحید پر گفتگو شروع ہوئی۔ ہر شخص نے اپنی اپنی بساط کے مطابق اس بحث میں حصہ لیا۔ آپ پر وجد کی کیفیت طاری تھی۔ پاس ہی آگ جل رہی تھی۔ آپ اٹھے اور الاؤ میں بیٹھ گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد باہر نکلے تو دیکھا گیا کہ آگ نے آپ کی کسی چیز کو چھوا تک نہیں۔ آپ نے فرمایا "توحید یہ ہے کہ اس کے قائل پر کوئی چیز اپنا اثر نہیں کرتی۔"

آپ کے استغنا کی حالت یہ تھی کہ شاہجہان ایک دفعہ آپ کی ملاقات کے لیے آیا تو آپ یہ خبر سن کر وہاں سے چل دیئے۔ جب اس کا سبب دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ میں طمانیت قلب کھونا نہیں چاہتا۔ ایک فقیر کو بادشاہوں کی ملاقات سے کیا سروکار؟

دارا شکوہ لکھتا ہے کہ ایک دن آپ شالامار باغ کی سیر کو گئے۔ وہاں دو تین مرتبہ آپ نے فرمایا "مجھے طلب نہیں کرتے اور اگر وہ طلب کریں تو مرشد کی قبر کے پاس دفن کرنا۔ آپ کی وفات ۱۰۶۶ھ/۱۶۵۶ء میں واقع ہوئی۔ آپ کا مدرسہ بہت مشہور تھا۔ کسب علوم کے لیے دور دور سے لوگ آتے تھے۔

شیخ جان اللہ

لاہور کے علماء میں شیخ جان اللہ بھی بہت مشہور تھے۔ آپ شیخ نظام الدین بلخی کے مرید تھے اور ظاہری و باطنی علوم میں پوری پوری استعداد رکھتے تھے۔ وہ شروع شروع میں علم حاصل کرنے کے لیے لاہور تشریف لائے۔ فارغ ہونے کے بعد یہیں درس دینے لگے۔ مگر خدا کی لگن دل میں ایسی لگی کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تھانیسر چلے گئے۔ اور شیخ نظام الدین بلخی کے مرید ہو گئے۔ زہد و ریاضت اور عبادت میں ہمہ تن مستغرق رہنے لگے۔ پیر کے ساتھ حج کعبہ بھی کیا۔ ۱۰۳۹ھ/۱۶۲۹ء میں آپ کا وصال ہوا۔

شیخ عبدالکریم چشتی لاہوری

مخدوم الملک عبداللہ انصاری کے صاحبزادے تھے۔ آپ بھی شیخ نظام الدین بلخی کے مرید تھے۔ جب اکبر اعظم نے مخدوم الملک کو مجبور کر کے حج پر روانہ کیا تو آپ بھی باپ کے ہمراہ تھے اور جب مخدوم الملک واپس آئے تو آپ بھی ہندوستان پہنچے آئے۔ باپ کے مسموم ہونے کے بعد آپ لاہور پہنچے اور لوگوں

کو ہدایت و تلقین شروع کی خلقت کا ہجوم آپ کے گرد جمع رہتا تھا۔ آپ کی خانقاہ اور مدرسہ موضع نواں کوٹ میں افضل خاں علامی کے باغ کے نزدیک تھے۔ آپ عالم عامل اور فاضل کامل تھے۔ آپ کی مشہور تصنیف نصوص الحکم خاص و عام میں مشہور ہے۔ آپ کی ایک اور کتاب اسرار عجیبہ در بیان ذکر و شغل سلسلہ عالیہ چشتیہ بھی مشہور ہے۔ آپ سنہ ۱۱۴۲ھ میں فوت ہوئے اور آپ کا مزار موضع نواں کوٹ میں واقع ہے۔

شیخ جان محمد لاہوری

ایک اور فاضل جو اس زمانے میں لاہور کی رونق تھے شیخ جان محمد لاہوری تھے۔ وہ شریعت اور طریقت دونوں کے ماہر تھے۔ لاہور کے باہر جہاں آج کل کوٹ خواجہ سعید واقع ہے، وہاں ان ایام میں ایک محلہ آباد تھا جسے پرویز آباد کہتے تھے۔ آپ کی سکونت اسی محلے میں تھی۔ آپ زیرک اور ذہین تھے اور حضرت میاں صاحب کلاں کے خلیفہ شیخ عبدالحمید سے پڑھا کرتے تھے۔ ایک دن آپ کا استاد آپ کو لے کر حضرت میاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے اس بچے کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ اگر تم عالم ہو جاؤ تو ہمارے ساتھ تکرار حدیث کرنا۔ آپ فرط حیا سے خاموش رہے۔ استاد کے اشارہ پر عرض کیا کہ اگر حضور کی توجہ سے مجھے کامیابی حاصل ہو گئی تو ضرور آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر فیضان حاصل کروں گا۔ میاں صاحب نے ہاتھ اٹھائے، فاتحہ پڑھی اور دعائے خیر کی۔ چنانچہ جب آپ شیخ عبدالحمید سے فارغ ہو گئے تو آپ کو ایک اور فاضل شیخ تیمور لاہوری کے سپرد کیا گیا۔ وہاں سے بھی آپ کو جلد سند فراغت مل گئی۔

اس کے بعد آپ پھر میاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کی توجہ سے باطنی علوم میں بھی کامل ہو گئے۔ میاں صاحب نے ایک دن فرمایا، اب وقت آ گیا ہے کہ تم اپنا وعدہ پورا کرو۔ چنانچہ جب تک میاں صاحب زندہ رہے آپ دوشنبہ اور جمعہ کو تکرار حدیث کے لیے حاضر خدمت ہوتے رہے۔ آپ کا اکثر وقت درس و تدریس اور عبادات میں گزرتا تھا۔ آپ سنہ ۱۱۲۰ھ/۱۷۰۸ء میں فوت ہوئے اور پرویز آباد میں دفن ہوئے۔

آپ کی وفات کے چند سال بعد وہاں کے نمبردار نے خواب دیکھا کہ آپ فرماتے ہیں، ہماری نعش کو میاں صاحب کے مرقد کے متصل دفن کر دو۔ اور اگر ایسا نہ ہوا تو یہاں سخت بلاؤں کا نزول ہو گا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

مدرسہ شیخ جان محمد سہروردی

جس جگہ آج کل چوبچہ گرددام رائے اور گنبد نصرت جنگ واقع ہیں، ان کے درمیان ایک عظیم الشان مسجد اور مدرسہ واقع تھے۔ یہ مسجد قصاب خانہ کی مسجد کہلاتی تھی۔ یہاں آپ درس دیا کرتے تھے۔ آپ نہایت فاضل ظاہری اور باطنی کمالات کے جامع تھے اور میاں صاحب کلاں کے مرید باخلاص۔ آپ کے استغنا کی حالت یہ تھی کہ آپ سے ہزاروں آدمی پڑھتے مگر آپ کسی سے کچھ نہ مانگتے۔ کوئی کچھ پیش بھی کرتا تو آپ انکار کر دیتے۔ چکی پیس کر روٹی کماتے۔ درس کے علاوہ آپ مسجد کے امام بھی تھے۔ مفتی غلام سرور کا بیان ہے کہ جب میاں صاحب کا چرچا عام ہوا تو لوگوں نے التجا کی کہ آپ ہماری مسجد میں درس شروع کریں۔ آپ نے وہاں جانے سے انکار کر دیا مگر اپنے شاگرد اور مرید مولوی جان محمد سہروردی کو وہاں بھیج دیا۔ چنانچہ آپ بیک وقت امام، مدرس اور واعظ تھے۔ آپ سنہ ۱۱۵۲ھ میں فوت ہوئے۔ آپ کا مزار مسجد کے متصل بنایا گیا۔

مدرسہ وزیر خاں

یہ مدرسہ لاہور کا بہت مشہور مدرسہ تھا۔ اس کا بانی حکیم علیم الدین انصاری تھا جسے شاہجہان نے نواب وزیر خاں کا خطاب دے رکھا تھا۔ اس نے اپنی مسجد سنہ ۱۰۴۴ھ (۱۶۳۴ء) میں تعمیر کرنی شروع کی جیسا کہ مندرجہ ذیل کتبوں سے معلوم ہوتا ہے ؎

سال تاریخ بنائے مسجد عالی مقام
از خرد جستم بہ گفتا سجدہ گاہ اہل فضل
۱۰۴۴ھ

تاریخ ایں بنائے چوں پرسیدم از خرد
گفتا بگو کہ بانیٔ مسجد وزیر خاں
۱۰۴۴ھ

نواب وزیر خاں نے ۱۰۴۴ھ میں بہت سی جائداد اور املاک اس مسجد اور مدرسہ کے اخراجات کے لیے وقف کی۔ یہ وصیت نامہ شمس العلماء خان بہادر سید محمد لطیف جج اور مولوی نور احمد چشتی نے "تاریخ لاہور" اور "تحقیقات چشتی" میں نقل کیا ہے۔ اس وصیت کی رو سے مسجد اور مدرسہ کے بانی نے مسجد کے اندرونی دروازے کی دکانیں جلد سازوں، صحافوں وغیرہ کے استعمال کے لیے وقف کی ہیں اور حجروں میں طالب علم، جدول ساز، کاتب وغیرہ رہ سکتے ہیں۔ مولوی نور احمد چشتی کا بیان ہے کہ میں نے اس کا صحیح مصرف اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ جج محمد لطیف کا بیان ہے کہ مسجد کے قبضے میں بہت بڑی جائداد تھی جو دہلی دروازے سے لے کر پرانی کوتوالی کے چوک تک پھیلی ہوئی تھی۔

یہ مسجد اور مدرسہ خاص طور پر لاہور کے علمی حلقوں میں مشہور تھا۔ چندر بھان برہمن "چہار چمن" میں لکھتا ہے کہ "جمعہ کا دن عام تعطیل کا دن ہوتا تھا۔ اس دن لاہور کے ارباب فضل و کمال، فصحائے خوش بیان، شعرائے شیریں زبان اور دوسرے شوقین لوگ جو ایران، توران اور ہندوستان کے دیگر مقامات سے لاہور آئے ہوتے تھے، اس مسجد میں اکٹھے ہوتے، اور آپس میں مبادلۂ خیالات کرتے تھے۔" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کے اردگرد کتب فروش اپنی دکانیں رکھتے تھے اور نوشت و خواند کا تمام سامان یہاں فروخت ہوتا تھا۔ چندر بھان برہمن لکھتا ہے:۔

"کتب بے شمار از عربی و فارسی و دیگر نسخہائے معتبر از تواریخ و مثنوی و دواوین متقدمین و
متاخرین و منشآت و تذکرات و رقعات و قطعات و نوشتہ جات خوشنویسان روزگار و سائر
آلات و ادوات مشق از ہر قسم و ہر جنس بمعرض خرید و فروخت می آید چو آزادیٔ مکتب
نشینان مخصوص ایں روز است از ہر کوچہ و ہر کوئے جوانان نو رسیدہ بیاض در دست و
گل بر سر بمقتضائے عہد شباب خراماں خراماں بہ سیر بازار کتاب می آیند" [1]

یہ بازار دوپہر تک قائم رہتا۔ اس کے بعد لوگ نماز جمعہ کی تیاری میں مصروف ہو جاتے۔ اس بیان کی تائید بعض اور کتب سے بھی ہوتی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے حسان الہند مولانا آزاد بلگرامی کے زمانے تک بھی وزیر خاں کی مسجد کا صحن علمی اور ادبی اغراض کی خاطر استعمال ہوتا رہا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ شاہ آفریں لاہوری نے حاکم لاہوری سے ذکر کیا اور حاکم نے میرے سامنے بیان کیا کہ ایام سابق میں مسجد وزیر خاں کے صحن میں شعرا مجلس سخن آراستہ کیا کرتے تھے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ ملا محمد سعید اعجاز اکبر آبادی ایک محفل شامل ہوئے۔ جہاں ناصر علی سرہندی کا یہ شعر پڑھا گیا ؎

---

[1] چہار چمن قلمی ورق ۴۰؍۱

صریر خامہ می دانم کہ طبعت نمی سازد
دیدہ نامہ، دل صد پارہ شد، قاصد رسید ایں جا

اعجاز اکبر آبادی نے اس پر اعتراض کیا کہ "ہر گاہ صریر خامہ کہ عاشق از راہ دور و دراز مکتوب می نویسد باطبعش نمی سازد، صدائے دریدن نامہ کہ شوخ تر از صریر خامہ است چہ قسم بہ او ساخت۔" شاہ آفریں نے جواب دیا کہ "صریر خامہ خود معشوق باو نمی سازد۔" یہ سن کر اعجاز خاموش ہو گیا۔[1]

یہ بازار سکھوں کے زمانے تک بہت مشہور رہا اور لاہور میں سب سے بارونق بازار خیال کیا جاتا تھا جہاں نہ صرف سامان نوشت و خواند فروخت ہوتا تھا بلکہ بڑے بڑے مشہور خطاطوں کی وصلیاں اور نادر کتابیں بھی فروخت ہوتی تھیں، یہاں ہر وقت ایسے کاتب، مصور، صحاف، جدول ساز وغیرہ موجود رہتے تھے جن کا ذریعہ معاش مختلف کتابوں کی نقل اتارنا اور انھیں مصور کرنا ہوتا تھا۔ اس مدرسے کی پوری تاریخ اور اساتذہ کرام کے نام تو معلوم نہیں ہو سکے البتہ دو مشہور استادوں کا ذکر تاریخوں میں ملتا ہے ان میں ایک تو ملا محمد صدیق تھے اور دوسرے مولانا غلام محمد عرف استاد گامو۔

مولوی محمد صدیق لاہوری

آپ کے آباؤ اجداد کابل سے چل کر لاہور آئے اور یہاں آباد ہوئے۔ آپ کے دادا مولانا محمد حنیف اپنی علمی شہرت کی بنا پر مسجد وزیر خاں کے امام مقرر ہوئے۔ آپ کی والدہ قندھار کی رہنے والی تھیں۔ مولانا محمد صدیق دوشنبہ ۲۹ محرم ۱۱۲۸ھ / ۱۷۱۵ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ زمانے کے رسم و رواج کے مطابق بسم اللہ خوانی کی رسم پانچ برس کی عمر میں مولانا محمد عابد نے ادا کی۔ ملا محمد اسلام نے آپ کو قرآن پاک پڑھایا۔ بعد میں آپ کو قرآن پاک حفظ کرنے کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ عجیب اتفاق ہے کہ اس پر آشوب زمانے میں لاہور میں بڑے بڑے جید اور متبحر عالم موجود تھے۔ مولانا محمد صدیق نے ان سب سے فیض پایا۔ ان کے اساتذہ میں مولانا عابد، مولانا شہریار، مولانا حفیظ اللہ، مولانا نصر اللہ، مولانا ظہور اللہ خاص طور پر شہرت رکھتے ہیں۔ آپ نے حدیث کی خاطر حجاز کا سفر کیا اور اس کی سند شیخ یحییٰ بن صالح مکی سے حاصل کی، جو مسجد الحرام میں درس دیتے تھے۔ مدینہ منورہ میں پہنچ کر آپ نے شیخ ابو الحسن مدنی سے حدیث کا تکرار کیا اور ان سے بھی سند حاصل کی۔ شیخ ابو الحسن بڑے پایہ کے محدث تھے۔ یہاں سے فارغ ہو کر مولانا محمد صدیق لاہور واپس آئے اور اپنے باپ کی جگہ وزیر خاں کی مسجد کے امام مقرر ہوئے۔ امامت کے ساتھ ساتھ آپ نے پڑھنے پڑھانے کا مشغلہ بھی شروع کیا اور اس میں شہرت حاصل کی۔

ایک مرتبہ فتح پنجاب کے بعد احمد شاہ ابدالی نے آپ کے پیچھے نماز عید ادا کی۔ آپ زبردست عالم، فقیہہ، محدث، ادیب اور صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ آپ نے فیضی کے مشہور رسالہ موارد الکلم کے جواب میں بے نقط حروف میں ایک رسالہ لکھا۔ فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

بیا اے مومن سنی بہ بیت اللہ اندر شو — طہارت ساز از خون دل و یاقوت احمر شو
چو روآری بہ محراب عبادت شاد کن خنشر — گدازی از ریاضت نفس را و صاف چوں زر شو
فریضہ چوں ادا کردی بہ امر حضرت رحماں — یکاں بار از مزار سید آفاق انور شو
حصول علم از قرب چنیں کامل شو تارک — فدائے آل و اصحاب رسول اللہ کیسر شو

---

[1] خزانۂ عامرہ صفحہ ۲۹

مولانا محمد صدیق نے تیمور شاہ کے عہد حکومت ۱۱۹۳ھ/۱۷۷۹ء میں انتقال فرمایا۔

امام گاموں

آپ مولانا محمد صدیق کے خلف الرشید تھے۔ قرآن پاک کے حافظ اور رائج الوقت علوم و فنون کے ماہر تھے۔ آپ بھی مسجد وزیر خاں کے امام تھے۔ رنجیت سنگھ مہاراجہ پنجاب آپ کا دل سے احترام کرتا تھا مسجد وزیر خاں محض آپ ہی کی وجہ سے سکھوں کی دست برد سے محفوظ رہی۔ ورنہ شاہی مسجد، بیگم شاہی مسجد اور دوسری مساجد کی طرح یہ بھی سکھوں کے گھوڑوں کا اصطبل یا بارود خانہ بنتی۔ آپ بڑے نیک دل، نیک طینت اور نیک خیال بزرگ تھے۔ اہل اللہ کے بڑے دلدادہ اور درویشوں کے خدمت گزار تھے۔ زہد و تقویٰ کی بنا پر آپ قرآن پاک کی کتابت کرتے۔ اس سے جو میسر آتا اس میں سے کچھ حصہ اپنے اوپر صرف کرتے اور کچھ اہل علم اور درویشوں میں تقسیم کر دیتے۔ زبان میں اتنی تاثیر تھی کہ جب آپ وعظ کہتے تو سنگدل سے سنگدل انسان متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ آپ اپنے درس کے طالبعلموں کا بڑا خیال رکھتے ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے اور انھیں پریشان ہوتا نہ دیکھ سکتے۔ آپ نے ایک قصیدہ بجو المقلدین کے نام سے لکھا ہے۔ اس میں اپنے حسب نسب کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

این غریب ابن حافظ صدیق   از دل و جاں غلام این ہر چار
سنّی و قادری و حنفی ام   از روافض خوارجی بے زار

گر تو پرسی کہ اسم جسم چیست   تو غلام محمدم پندار
در تخلص غریب پنداری   گر بخوانی تو نظم من اے یار
بہ حقیقت اگر نظر بہ کنی   نہ تخلص نہ اسم و جسم شمار

خلفائے راشدین کی منقبت کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

ہم ابابکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ نیز   چارم آں شاہ حیدر کرارؓ

اس قصیدہ کے ابتدائی شعر یہ ہیں ؎

گنج مخفی ست در تو اے دلدار   بے خبر زاں نشستہ چوں مار
خبر شر ط است می کنم بشنو   پنبہ از گوش خویش بیروں آر
چیست آں پنبہ خواب غفلت تو   باش از یں خواب جان من بیدار
گر تو بیدار باشی اے جانم   پیش تو من عجب کنم گفتار

گوش جاں کن شنو حدیث از من
تا شوی ہمچو گل تو خوشبو دار

آپ طریقت میں شیخ عبداللہ بلوچ جھنگوی کے مرید تھے۔ آپ صاحب تصانیف کثیر ہیں جن میں کتاب شمس التوحید خاص طور پر قابل ذکر ہے یہ فارسی نثر میں ہے۔ اس میں توحید کا مسئلہ بڑی شرح و بسط سے بیان کیا گیا ہے۔ آپ شب شنبہ ۵ ذی الحج ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۷ء کو فوت ہوئے۔ آپ کا مقبرہ مسجد وزیر خاں کے احاطے کے باہر جنوب کی جانب ایک بلند گنبد کے نیچے ہے جہاں سالانہ آپ کا عرس منایا جاتا ہے۔

آپ کے خاندان میں مسجد وزیر خاں کی امامت بڑے عرصہ تک رہی۔ آپ کے پڑپوتے مولوی فرزند علی تھے۔ ان کی مسجد کے متولیوں سے مقدمہ بازی ہو گئی۔ جس سے یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

مولانا محمد فاضل بدخشی

آپ لاہور کے مشہور اساتذہ میں تھے۔ عمل صالح کا مصنف انھیں "بحر مواج فیض بخشی" کے لقب سے یاد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ عقلی اور نقلی علوم میں یگانۂ روزگار تھے۔ یہ علوم انھوں نے کابل، تہران اور شیراز کے فضلا سے حاصل کیے تھے۔ آپ تفسیر اور اصول میں ملا جمال لاہوری کے شاگرد تھے اور مشکل سے مشکل مسائل چٹکیوں میں حل کر دیتے تھے۔

جب جہانگیر سریر آرائے ہند ہوا تو آپ عین عالم شباب میں تھے۔ بادشاہ نے آپ کی شہرت سن کر قاضی اردو کا جلیل القدر عہدہ پیش کیا جسے آپ نے قبول کیا اور شاہجہان کے ۳ جلوس تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ جب آپ بوڑھے ہو گئے تو ملازمت سے استعفیٰ دے کر لاہور چلے آئے اور یہیں درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔

ملا عبدالسلام دیوی

ملا محمد فاضل بدخشی کے معاصرین میں ملا عبدالسلام دیوی بھی تھے۔ دیوہ ضلع بارہ بنکی میں ایک قصبہ ہے۔ آپ ملا عبدالکریم کے نواسے تھے۔ آپ کی تعلیم و تربیت اور نشو و نما کاکوری میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم آپ نے اپنے نانا سے حاصل کی۔ آپ صحیح النسب سید تھے۔ اپنے وقت کے بڑے فاضل اور کامل تھے۔ اکثر تذکرہ نگار آپ کو "ملائے اصولی" بھی کہتے ہیں۔ ایک مورخ آپ کا ذکر کرتا ہوا آپ کو "اعلم علمائے عصر و فخر کملائے دہر استاد اساتذہ زمان قدوۂ فضلائے دوراں" کے الفاظ سے یاد کرتا ہے۔ آپ جامع معقولات و منقولات ملا عبدالسلام لاہوری کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ تکمیل تعلیم کے بعد شاہجہان کے عہد میں آپ اپنے استاد کی جگہ مدرس بھی رہے۔ اکثر علمائے ہندوستان مثلاً ملا قطب الدین شہید سہالوی کے والد ملا عبدالحلیم۔ ملا دانیال چوراسی۔ ملا عبدالقادر فاروقی آپ کے شاگردوں میں تھے۔ مولانا شاہ تراب علی قلندر اپنی مشہور تصنیف کشف المتواری (قلمی) میں لکھتے ہیں کہ ملا عبدالسلام مرحوم مخدوم عبدالحکیم کے شاگرد اور انھیں کے تربیت یافتہ تھے۔ شاہجہان کے عہد حکومت میں ان کو شاہی لشکر میں مفتی کا عہدہ دیا گیا مگر لاہور کی آب و ہوا پھر انھیں کھینچ لائی اور وہ یہاں جم کر ایسے بیٹھے کہ پھر نہ اٹھے[1]۔ آپ اپنے وقت کے جید عالم تھے۔ انشراحات معالیہ آپ کی تصانیف میں سے ہے۔ آپ نے اپنے رہنے کے لیے قصبہ دیوہ میں ایک حویلی بھی بنوائی تھی جسے بعد میں آپ نے اپنی لڑکی کے نام ہبہ کر دیا۔

شیخ خیرالزمان صدیقی رسالہ باغ و بہار میں لکھتے ہیں :۔

"در عہد خویش نظیر نداشت۔ شاہجہاں بادشاہ بر سبب او ستادیش و تبحر علوم بسیار اکرام اومی کرد و نزد خود می نشاند۔ سند افتائے اردوئے معلی بنام ملا بود۔ تا عرصہ ممتد خدمت مذکور از و تعلق می داشت"[2]

شیخ مذکور آپ کی حریت کے متعلق ایک عجیب و غریب واقعہ بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ بادشاہ قلعہ شاہجہان آباد (جو اس وقت زیر تعمیر تھا) دیکھنے کے لیے گیا۔ بادشاہ قلعہ کی فصیل ملاحظہ کر رہا تھا کہ ملا عبدالسلام کو بھی ایک ضروری کام سے

---

[1] حیات شبلی ص ۱۷

[2] باغ و بہار (قلمی)

بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہونا پڑا وہ بھی فصیل پر چلنے لگے۔ چونکہ انھیں دیوار پر چلنے کا ربط نہ تھا۔ اس لیے ان کے پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ بادشاہ نے یہ دیکھ کر کہا:۔

"اے ملا! از مرگ این قدر می ترسی که بر دیوار رفتن نمی توانی"

آپ نے فرمایا:۔

"چگونه نه ترسم چرا که مثل من ہزار سال چرخ اگر چرخ زند دگر پیدا نه شود و مانند بادشاہ بسیار ممکن اند"

قدر دان بادشاہ پر ملا کے ان الفاظ کی تلخی گراں نہ گزری۔ بلکہ وہ مسکرایا اور چپ ہو رہا۔

شیخ جبر الزمان آپ کے متعلق ایک اور واقعہ بھی بیان کرتے ہیں جس سے آپ کی حاضر جوابی کا پتہ چلتا ہے۔ ایک مرتبہ دارا شکوہ نے بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ اعلیٰ حضرت ظل اللہ اور خلیفہ رسول اللہ ہیں۔ اس لیے خاص و عام اور ادنیٰ و اعلیٰ پر لازم ہے کہ "رتبہ بلحاظ داشتہ پایہ خود شناختہ باشند" آپ کے تمام وابستگان دامن اور رعایا اسی نقطۂ نظر سے آپ کا ادب اور احترام کرتی ہے مگر ملا عبدالسلام ہیں کہ دعویٰ قرآن فہمی اور حدیث بھی کرتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ آپ کا کما حقہٗ احترام نہیں کرتے۔ وہ قرآن پاک کی اس نص صریح یعنی "اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم" کے معانی بھی خوب سمجھتے ہیں مگر اس پر عمل نہیں کرتے۔

بادشاہ کچھ عرصہ خاموش رہا۔ جب دارا شکوہ نے دوبارہ یہی بات کہی تو بادشاہ نے فرمایا کہ جب ملا دربار میں آئے تو مذکورہ بالا آیت کے معنوں کے متعلق اس سے سوال کرنا اور اس کا صحیح مفہوم دریافت کرنا۔

جب ملا عبدالسلام بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دارا نے ان سے آیت کے معنی پوچھے۔ ملا نے کہا سیدھی سادھی آیت ہے اور اس کا مفہوم بھی بالکل صاف اور واضح ہے "یعنی اللہ اور اللہ کے رسول اور اس کے نائب کی اطاعت کرو"۔ دارا نے پوچھا:۔

"نائب عبارت از کدام شخص است"

ملا نے کہا:۔

"نائب رسول آں کس اند که خلق را براہ دین می آرند"

پھر فرمایا کہ ان معانی کے ہوتے ہوئے بادشاہ کے لیے لازم اور ضروری ہے کہ وہ ہمارے مطیع رہیں۔

دارا یہ جواب سن کر خاموش ہو گیا۔ بادشاہ نے مسکرا کر فرمایا "بابا شنیدی جواب ملا" [1]

ملا عبدالسلام دیوی کے کئی فرزند تھے۔ وہ بھی اپنے وقت کے مشاہیر میں شامل تھے۔ ان میں ملا نور الہدیٰ، ملا نظام الدین احمد ملا سید عبدالحفیظ، ملا عبدالباقی شارح مثنوی مولانا روم اور ملا عبدالصمد مفسر قرآن کے نام اکثر تذکروں میں ملتے ہیں۔ آپ کی مشہور تصنیف اشراحات معالیہ ہے۔ جسے آپ نے اپنے صاحبزادے شاہ ابوالمعالی کے لیے ان کے درس کے زمانے میں فن حکمت و منطق میں تصنیف کیا تھا۔ اس کے علاوہ تہذیب المنطق اور منار الاصول کی شرحیں بھی آپ نے لکھی ہیں۔

مولانا عبداللطیف سلطان پوری

انہی ایام میں مولانا عبداللطیف سلطانپوری کی ذات لاہور کی علمی سوسائٹی کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ آپ ایک زبردست ادیب عالم اور فاضل تھے۔ شاہجہان نے

---

[1] باغ و بہار (قلمی)

دارا شکوہ اور اورنگ زیب کی تعلیم آپ کے سپرد کی جس سے آپ کے علمی شکوہ کا پتہ چلتا ہے۔ آپ کو مطالعہ کا بے حد شوق تھا۔ کثرت مطالعہ کی وجہ سے آپ کی بینائی زائل ہو گئی تھی۔ اس لیے عمر کے آخری ایام آپ نے اپنے وطن میں بسر کیے۔ آپ فلسفہ کے زبردست ماہر تھے اور فلسفیانہ مسائل کی گتھیاں چٹکیوں میں سلجھا دیتے تھے۔ آپ ۱۰۳۶ھ؍۱۶۲۶ء میں فوت ہوئے "آفتاب علم را آمد کسوف" آپ کی تاریخ وفات ہے۔

ملا یعقوب لاہوری

آپ لاہور کی منفرد شخصیت اور عمل صالح کے مصنف ملا محمد صالح کے معاصرین میں سے تھے۔ اس نے آپ کا ذکر شاہجہانی دور کے علماء میں کیا ہے۔ آپ مختلف علوم و فنون میں باکمال تھے۔ فقہ، اصول فقہ و حدیث، تفسیر، منطق، معانی اور کلام میں آپ کی شہرت تمام ہندوستان میں تھی۔ اخلاق اور دیگر صفات انسانی میں آپ لاثانی و بے نظیر تھے۔ فرشتہ سیرت اور انسان صورت تھے۔ آپ کی ذات اس زمانے میں غنیمت سمجھی جاتی تھی۔ آپ کا وجود سرچشمۂ فیض اور منبع خیر تھا۔ آپ کے علمی کمالات اہل پنجاب کے لیے باعث فخر تھے۔ آپ نے ہندسہ اور علم ہیئت میں بھی اتنا کمال پیدا کیا کہ ان کی جزئیات تک سے واقف تھے۔ ملا محمد صالح کہتے ہیں کہ جب آپ منطق اور معانی پر گفتگو کرتے تو سننے والے مسحور ہو کر رہ جاتے۔ گویا جادو کو زبان لگ جاتی تھی۔ جب اپنے شاگردوں میں بیٹھ کر درس دیتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ عالم بالا سے علوم و فنون کی بارش آپ کے قلب پر ہو رہی ہے اور ملہم غیب آپ کی زبان سے بول رہا ہے۔ ان کمالات اور خوبیوں کو دیکھ کر ملا محمد صالح کہتا ہے کہ

"الیوم در ہمہ باب باہمہ حساب بر دیگر فضلا مزیت نمایاں دارد"

(عمل صالح جلد سوم صـ۲۹۲)

آپ کی درس گاہ کہاں تھی؟ اس بارے میں تحقیق کے باوجود کوئی پتہ نہیں چل سکا۔ شاید اپنے ڈیرے پر ہی درس دیتے ہوں۔

ملا جمال نیشاپوری

ملا کمال اور ملا جمال دو بھائی تھے۔ نیشاپور کے رہنے والے تھے۔ دونوں اکٹھے وطن سے نکلے اور لاہور پہنچے۔ مولانا کمال تو ۱۰۱۲ھ میں فوت ہو گئے مگر مولانا جمال نے اپنا مدرسہ جاری کیا اور ساری عمر درس و تدریس میں گزار دی۔ جب آپ بوڑھے ہو گئے تو آپ کے صاحبزادے مولانا یوسف نے باپ کی جگہ سنبھالی اور مدرسہ کو خوب فروغ دیا۔ یہ مدرسہ شاہجہان کے زمانے میں بہت مشہور تھا مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ کہاں واقع تھا۔

ملا یوسف لاہوری

آپ عالم باعمل تھے۔ لوگ آپ کے زہد و اتقا کی وجہ سے آپ کی بہت عزت کرتے تھے۔ آپ اکبری عہد کے مشہور فاضل ملا جمال تلوی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ اپنے باپ مولانا جمال کے علاوہ ان کی خدمت میں رہ کر کسب کمال کیا۔ آپ کی طبیعت کا رجحان زیادہ تر مذہبی علوم و فنون کی طرف تھا۔ تفسیر، حدیث، تاریخ اور دیگر منقولات و معقولات میں فضیلت حاصل کی۔ تفسیر پر زیادہ دل جمتا تھا۔ اسے خوب پڑھا، مطالعہ کیا اور اس میں کافی محنت و ریاضت کی۔ آخر اس میں یکتائے روزگار ہو گئے۔ تفسیر کے رموز و غوامض کو اتنے عمدہ اور اچھوتے انداز میں بیان کرتے تھے کہ دل میں اترتے چلے جاتے تھے۔ علوم فلسفہ و حکمت میں بھی اچھی خاصی مہارت تھی مگر ان کی شہرت کا محور قرآنی علوم ہی تھے۔ آپ ملا عبدالحمید لاہوری کے قول کے مطابق پچاس برس تک درس و تدریس میں مشغول رہے۔ بہت سے لوگ آپ سے بہرہ مند ہوئے اور درجۂ کمال تک پہنچے۔ آپ نے اسی برس کی عمر پائی۔ مولانا عبداللطیف سلطان پوری آپ کے درس میں شامل ہوتے رہے ہیں۔

---

[۱] بادشاہنامہ جلد اول حصہ دوم صفحہ ۳۴۲

ملا یوسف نے اکثر درسی کتابوں کی شرحیں اور حاشیے بھی لکھے۔ ان میں شرح دیوان حافظ خاص طور پر مشہور ہے۔ آپ نے کچھ عرصہ کے لیے سرکاری ملازمت بھی اختیار کی مگر اسے ترک کر کے پھر درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔[1]

ملا جامی لاہوری

بہت بڑے فاضل تھے۔ عمر کا اکثر حصہ درس و تدریس میں صرف کیا۔ آپ شاعر بھی تھے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

ہر کس کہ دل از مدار دنیا برداشت — عبرت ز شمار کار دنیا برداشت

گو بند زمین بر سر گاؤ است بلے — گاؤ است کسے کہ بار دنیا برداشت

آپ کا انتقال ۱۰۹۷ھ میں بعہد عالمگیر ہوا۔ آپ کی قبر احاطہ مقبرہ طاہر بندگی میں ہے اور اس کے ساتھ ایک مختصر سی مسجد بھی ہے۔

مفتی محمد باقر لاہوری

یہ بھی لاہور کے ممتاز اور معزز علماء میں شمار ہوتے تھے۔ آپ شہر کے ایک حصے کے مفتی بھی تھے۔ آپ کے نام پر چوہٹہ مفتی باقر اب تک موجود ہے۔ وہیں آپ کا مزار بھی ہے۔

ملا عبدالحمید لاہوری

ایک زندۂ جاوید مورخ تھے جن کا نام بادشاہ نامہ کی وجہ سے علمی دنیا میں خاصی شہرت رکھتا ہے۔ عمل صالح کے بیان کے مطابق آپ لاہور کے رہنے والے تھے اور ۱۰۶۵ھ میں فوت ہوئے۔

آپ علامہ ابوالفضل کے شاگرد رشید تھے اور طرز انشا میں اپنے استاد کی نقل اتار سکتے تھے۔ آپ کی شہرت کی ابتدا لاہور ہی سے ہوئی جہاں بہت عرصہ تک درس و تدریس میں مشغول رہے مگر حالات نے موافقت نہ کی۔ برگشتہ خاطر ہو کر ٹھٹھہ چلے گئے۔ ایلیٹ اور اس کے دوسرے مقلدین نے ٹھٹھہ کی جگہ پٹنہ لکھا ہے جو درست نہیں۔ شاہجہانی اور عالمگیری دور میں ٹھٹھہ علوم و فنون کا بہت بڑا مرکز تھا۔ پٹنہ علمی دنیا میں کوئی حیثیت نہ رکھتا تھا۔

ٹھٹھہ پہنچ کر ملا عبدالحمید لاہوری عزلت نشیں ہو گئے۔ مگر آپ کی علمی اور ادبی قابلیت کی شہرت بادشاہ کے کانوں تک پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ فرمان جاری ہوا کہ ملائے موصوف کو دربار میں پیش کیا جائے۔ ملا عبدالحمید جب بادشاہ کے حضور حاضر ہوئے تو بادشاہ نے خواہش ظاہر کی کہ اس کے عہد حکومت کے واقعات قلمبند کیے جائیں اور اس دور کی تاریخ ابوالفضل کے اکبر نامہ کی طرز پر لکھی جائے۔ ملا نے حامی بھری اور بادشاہ نامہ لکھنا شروع کیا۔ بیس سال تک کے واقعات نہایت رنگین عبارت میں تحریر کیے۔ بقیہ حالات پیری کی وجہ سے قلم بند نہ ہو سکے۔ اس دوران بادشاہ نے دو دفعہ آپ کو روپیہ میں تلوایا۔

بادشاہ نامہ تاریخ کی نہایت اہم کتاب ہے جس میں شاہجہان کے زمانہ کے سیاسی حالات کے ساتھ ساتھ تمدن، معاشرت اور تہذیب کے متعلق بھی کافی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

نواب سعد اللہ خاں

قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ دربار میں پہنچنے سے پہلے نواب سعد اللہ خاں بھی لاہور میں درس و تدریس کا کام کرتے تھے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ آپ اپنے استاد کے معاون کی حیثیت سے کام کرتے تھے یا آپ کا کوئی علیحدہ مدرسہ تھا۔

قرون وسطیٰ کی تاریخ میں یہ ایک ناخوشگوار حقیقت ہے کہ وہ شخصیتیں جن پر ملک و ملت کو ناز ہو سکتا ہے اور جنھیں ہم اپنے لیے باعث افتخار خیال کرتے ہیں۔ ان کے حالات قعر گمنامی میں گم ہیں۔ نواب سعد اللہ شاہجہانی دور کی سب سے بڑی شخصیت ہے۔ ان کی ذات پر

---

[1] مرآۃ العالم ورق ۱۹۱ ب

علم و فضل کو ناز ہے۔ تدبر و سیاست فخر کرتے ہیں۔ ان کی شہرت ہندوستان سے نکل کر ایران اور عراق تک پہنچی۔ وہ اپنے وقت کے بہترین دماغ اور ایسے نیک نام وزیر تھے جن کو رعایا اور رعایا دونوں کا اعتبار حاصل تھا۔ مگر آج ان کے حالات ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے۔

سعد اللہ خاں چنیوٹ کا رہنے والا تھا۔ ان کا باپ تھیم قبیلے سے تھا۔ یہ جاٹوں کی مشہور شاخ ہے۔ مورخوں نے ان کی قومیت کے متعلق طرح طرح کی موشگافیاں کی ہیں۔ خلیفہ محمد حسین صاحب سفرنامہ ہرمز کے ذیلی نوٹوں میں تحریر فرماتے ہیں:—

"سعد اللہ خاں کے زمانہ کے مورخوں نے اس کی قومیت کا کچھ ذکر نہیں لکھا۔ البتہ خافی خاں نے اسے شیخ سعد اللہ لکھا ہے جو ہندوستان میں اکثر نومسلم لوگوں کے لیے بولا اور لکھا جاتا ہے۔ مگر اس کے ہم وطنوں کا بیان ہے کہ وہ تھیم تھا جو ایک ایسی قوم ہے کہ وہاں کی مسجدوں اور مکتبوں کے ملا اکثر اسی ذات کے ہوتے ہیں۔ اگرچہ میرے نزدیک ظن غالب یہ ہے کہ یہ کوئی ہندو الاصل قوم ہے مگر چونکہ ان کے میراثی ان کے سلسلہ نسب میں کچھ عجیب و غریب نام بیان کر کے اور پھیر [illegible] کر کے ملک عرب تک پہنچا دیتے ہیں۔ اس لیے میرے دوست جو بالفعل خاص چنیوٹ کی منصفی کے عہدہ پر مامور ہیں اور جنہوں نے براہ مہربانی تکلیف فرما کر میری خواہشوں کے مطابق اس کی تحقیق کی تھی، یہ خیال کرتے ہیں کہ شاید یہ لفظ تمیم کی خرابی ہو جو عرب کے مشہور قبیلہ تمیم کے نام کا ایک جز ہے اور ان گنواروں نے اپنی جہالت اور بے علمی کی وجہ سے جو فی زمانہ ان اضلاع میں عموماً ہے بگاڑ کر تھیم کر لیا ہو۔"

صاحب مآثر الامرا میر عبدالرزاق صمصام الدولہ شاہنواز خاں خوافی اورنگ آبادی کا قول ہے کہ وہ قصبہ چنیوٹ متعلقہ صوبہ لاہور کے شیخ زادوں سے تھا اور اس کا سلسلہ قریش کے قبیلہ بنی تمیم سے ملتا ہے۔ اس کے اصل الفاظ یہ ہیں:—

"از شیخ زادہائے قصبہ چنیوٹ مضافات صوبہ لاہور۔ اصلش از بنی تمیم قریش"

ان کے علاوہ مراۃ العالم، طبقات شاہجہانی وغیرہ سے بھی اسے شیخ زادہ ہی لکھا ہے جو خافی خاں کے قول کے بموجب نومسلموں کا لقب تھا۔

علامہ سعد اللہ خاں کے ابتدائی حالات بہت کم ملتے ہیں۔ مولوی نور احمد چشتی نے تحقیقات چشتیہ میں لکھا ہے:—

"سعد اللہ خاں کے باپ کا نام امیر بخش تھا۔ ۱۰ صفر ۱۰۰۰ھ کو پنج شنبہ کے دن سعد اللہ پیدا ہوا۔ اسی شام کو ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ہر شخص یہی کہتا تھا کہ یہ لڑکا بڑا کم بخت پیدا ہوا کہ پیدا ہوتے ہی باپ کو کھا گیا۔ پانچ برس کی عمر میں والدہ کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ چنیوٹ وارد ہوئے اور بادیہ گردی کرتے ہوئے لاہور آ پہنچا اور اس طرح علم حاصل کرنا شروع کیا کہ رات کو گدائی کرتا اور دن کو پڑھتا تھا۔ دہلی دروازہ کے قریب اس مقام پر جہاں اب نواب وزیر خاں کی مشہور مسجد ہے، ایک مسجد تھی، اس میں رہا کرتے تھے۔"

تحقیقات چشتی کے اس بیان کے خلاف ایک مقامی روایت یہ بھی ہے کہ جب سعداللہ خاں کی والدہ حاملہ تھی تو ایک دن اس نے سیب کھانے کی خواہش ظاہر کی۔ سعداللہ کا باپ زمیندار تھا۔ ان دنوں سیب کا ملنا ممکن نہ تھا۔ اتفاق سے ایک قافلہ وہاں سے گزرا۔ سعداللہ کا باپ سالار کے پاس پہنچا اور سیب کی فرمائش کی۔ قافلہ سالار نے پوچھا کہ تمہیں سیب کس مقصد کے لیے درکار ہے۔ سعداللہ کے باپ نے سارا قصہ سنایا۔ قافلہ سالار نے پوچھا تمہارا ذریعہ معاش کیا ہے۔ اس نے جواب دیا۔ میں ایک معمولی زمیندار ہوں۔ اس نے سیب پیش کرتے ہوئے کہا۔ یقیناً جو بچہ پیدا ہوگا وہ غیر معمولی دل و دماغ کا مالک ہوگا۔ اگر اس کی صحیح تعلیم و تربیت ہوئی تو وہ اپنے زمانے کی منفرد شخصیت ہوگا۔

بختاور خاں مراۃ العالم میں نواب سعداللہ خاں کی ابتدائی زندگی کا ایک واقعہ اس طرح بیان کرتا ہے: —

"جس زمانے میں سعداللہ خاں افلاس کی وجہ سے پریشان اور مضطرب تھا اور لاہور میں تحصیل علوم و فنون میں مشغول تھا۔ وہ اکثر ملا خواجہ بہاری کے ہاں کسب علوم باطنی و تزکیۂ نفس کیلئے حاضر ہوا کرتا تھا۔ ملا خواجہ بہاری کو بھی آپ سے خاص اُنس ہو گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک دن حالت جذب میں آپ نے اپنے مریدوں سے کہا کہ وزیر شہنشاہ ہند کو بلاؤ۔ حاضرین ملا کے اس تعجب انگیز فقرے کو سن کر سخت متحیر ہوئے۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اشارہ کس کی طرف ہے اور کسے طلب کیا جا رہا ہے۔ نہایت ادب سے دریافت کیا گیا تو ملا نے کہا کہ سعداللہ کو بلاؤ"

آخر ملا خواجہ بہاری کی یہ پیشین گوئی درست ثابت ہوئی۔ اردو زبان کے سحر نگار انشاپرداز مولانا محمد حسین آزاد اپنی مشہور تصنیف آب حیات میں تحریر فرماتے ہیں: —

"سعداللہ خاں چنیوٹ اور عبدالحکیم سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ دونوں گمنام گھروں کے لڑکے تھے اور ساتھ ساتھ پڑھتے تھے۔ عبدالحکیم اگرچہ اوّل سبق میں پیش قدم تھے مگر قسمت کے سعداللہ خاں پیش قدم نکلے۔ یہاں تک کہ پڑھتے پڑھتے شاہجہان کے وزیر ہو گئے اور علامہ کا خطاب علم و فضل کی شہرت پر طرّہ ہوا"

شاہجہان کے دورِ حکومت کا چودھواں سال تھا۔ موسوی خاں صدارت پر فائز تھا کہ بادشاہ کو خبر پہنچی: —

"ملا سعداللہ خاں بحلیۂ فضائل و کمالات عقلی و نقلی و حفظ قرآن مجید و حسن تقریر و لطف تحریر متحلی است و در ذہن و ذکاوت و فکر نقاد و کثرت معلومات و بسطت مقدمات مشارق و مساہم ندارد"[1]

اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اس استعداد و قابلیت کا عالم ہو اور وہ ہماری معارف نواز سلطنت کی تربیت سے محروم رہے۔

---

[1] بادشاہ نامہ جلد دوم صفحہ ۲۱۹

اس لیے فوراً موسوی خاں کے نام فرمان جاری ہوا کہ وہ اسے حضور میں پیش کرے۔ ملا عبدالحمید لاہوری کہتا ہے :۔

"بموسوی خاں صدر حکم شد کہ آں حاوی فضائل را بسعادت بساط بوس مستعد گرداند"[1]

اس حکم کی فوراً تعمیل ہوئی۔ ۷ ارمضان ۱۰۵۰ھ کو سعداللہ خاں بادشاہ کے حضور میں پیش ہوا۔ بادشاہ کی مردم شناس نگاہوں نے ایک ہی نظر میں بھانپ لیا کہ یہ جوہر قابل کارگزاری اور معاملہ فہمی کی پوری پوری استعداد رکھتا ہے۔ اس لیے حکم دیا کہ اسے سرکاری ملازمت میں لے لیا جائے۔ چنانچہ اسے خلعت خاصہ کے علاوہ طویلہ خاص سے ایک گھوڑا بھی عطا ہوا اور عرض مکرر کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ "عرض مکرر" کا عہدہ بادشاہ کے خاص معتمد اور مقرب کو ملا کرتا تھا۔ بڑے بڑے امرا اس کی تمنا کیا کرتے تھے۔ سعداللہ خاں کا اس جلیل القدر عہدے پر فائز ہونا صاف بتاتا ہے کہ شاہجہان میں مردم شناسی کا جوہر کس حد تک پایا جاتا تھا۔ اس نے ایک ہی ملاقات میں اس کے جوہر بھانپ لیے اور طبیعت کی صلاحیتوں کو سمجھ لیا۔

خافی خاں نے اس موقعہ پر ایک اور بات بھی لکھی ہے جو چنداں وقیع تو معلوم نہیں ہوتی مگر اس نے اپنی طرف سے خوب نکتہ آفرینی کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس سے پہلے بھی سعداللہ ایک مرتبہ دربار میں پیش ہوا تھا۔ بادشاہ نے قاعدے کے بموجب اس کا روزینہ مقرر کرنا چاہا لیکن سعداللہ نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ خافی خاں نے یہ نہیں بتایا کہ اس انکار کی وجہ کیا تھی۔ وہ کب اور کس جگہ بادشاہ کے حضور پیش ہوا۔ اس کی تقریب دربار میں کس نے کرائی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خافی خاں نے یہ واقعہ ویسے ہی لکھ دیا ہے جسے اصلیت سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ تمام معاصرین اور قریب العہد مورخین اس پر متفق ہیں کہ جونہی خاں موصوف کی شہرت بادشاہ کے کانوں تک پہنچی، اسے دربار میں طلب کیا گیا اور منصب اور عہدہ دے دیا گیا۔[2]

ایک اور مورخ سعداللہ خاں کی دربار شاہجہانی میں رسائی کا واقعہ اس طرح بیان کرتا ہے :۔

"ایران کے بادشاہ نے صاحبقران ثانی شاہجہان کو لکھا کہ "جہان" بہت سے ملکوں کا مجموعہ ہے جن میں سے ایک ہندوستان بھی ہے۔ آپ ہندوستان کے بادشاہ ہیں۔ دنیا کے حکمران نہیں۔ پھر اپنا لقب "شاہ جہان" کیوں اختیار کر لیا ہے؟ اعتراض واقعی بڑا وزنی اور وقیع تھا۔ بادشاہ نے درباری علما اور فضلا کو حکم دیا کہ اس تحریر کا معقول جواب لکھیں۔ صاحب راحت مقال لکھتا ہے کہ ان ایام میں سعداللہ خاں، شیخ عبدالمومن سنبھلی کے لڑکوں کی تعلیم و تربیت پر مامور تھے۔ شیخ دربار میں دیوان تن تھا۔ اس نے اس واقعہ کا ذکر سعداللہ سے کیا۔ سعداللہ نے کہا کہ اگر میری رسائی دربار شاہی میں ہو تو میں اس معما کو چٹکیوں میں حل کر سکتا ہوں۔

دیوان نے موقعہ پا کر بادشاہ کے حضور عرض کیا۔ چنانچہ سعداللہ خاں کی طلبی کا فرمان جاری ہوا۔ وہ دربار میں پہنچا اور عرض کیا کہ ابجد کے حساب سے "جہان" اور "ہند" کے اعداد برابر ہیں۔ پس شاہ جہان دراصل شاہ ہند ہے۔ شاہ جہان کو یہ جواب بہت پسند آیا۔ سعداللہ کی قدر و منزلت بڑھنے لگی۔ اور اسے بادشاہ کا تقرب حاصل ہو گیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس واقعہ کا تعلق کلیم ہمدانی ملک الشعرائے دربار شاہجہانی کے ساتھ ہے۔ اس نے اس مفہوم کو اس شعر میں ادا کیا ہے ؎

۱؎ بادشاہ نامہ جلد دوم صفحہ ۲۱۹

۲؎ بادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری۔ عمل صالح۔ مراۃ العالم وغیرہ

ہند و جہاں زروئے عدد چوں برابر است
بر شہ خطاب شاہ جہاں زاں مقرر است

محمد افضل سرخوش کلمات الشعراء میں اس واقعہ کو معمولی سے اختلاف کے ساتھ یوں بیان کرتا ہے :-

"وقتے کہ خوندکار روم در تہنیت نامہ جلوس فی الاخر بر نوشتہ کہ شما خود را شاہ جہاں لقب کردہ اید۔ اگر ملک ما و ایران و توران وغیرہ داخل جہاں است شما بادشاہی آں جاندارید۔ بہترین نام ما نزد خدا عبداللہ۔ عبدالرحمٰن و عبدالرحیم است۔ ازیں اسما اختیار کنید۔ بادشاہ بعد مطالعہ در فکر شدہ بہ آصف خاں یمین الدولہ مصلحت کردند کہ باید ایں لقب خطاب را تغیر داد۔ کلیم خبر یافتہ قصیدہ در مدح گذرانید و ایں مضمون را بایں بیت جواب داد

ہند و جہاں ز روئے عدد چوں برابر است
بر شہ خطاب شاہ جہاں زاں مقرر است

بادشاہ خوش وقت شد۔ ہمیں بیت را در جواب نوشتند و کلیم را بزر سنجیدند"[1]

مولوی نور احمد چشتی فرماتے ہیں کہ لاہور سے فارغ ہو کر سعد اللہ خان دہلی پہنچا اور آصف خاں پسر اعتماد الدولہ کے لڑکوں کو پڑھانے پر بمشاہرہ چالیس روپیہ ماہوار اور کھانے پر ملازم ہوا اور یہ واقعہ وہیں پیش آیا۔

کلمات الشعراء کے بیان کے سامنے یہ بیان کچھ وقعت نہیں رکھتا کیونکہ سرخوش ایک معاصر کی حیثیت رکھتا ہے۔

۱۲ ربیع الثانی ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء کو بادشاہ کا جشن سالگرہ منعقد ہوا۔ حسب دستور بادشاہ کو سونے چاندی میں تولا گیا اور یہ سب اشیاء مستحق لوگوں میں تقسیم کر دی گئیں۔ تلاوان کی رسم کے بعد بادشاہ نے شاہی تخت پر جلوس کیا۔ شہزادوں اور امیروں نے نذریں پیش کیں۔ دریا دل بادشاہ نے درباری امیروں اور سلطنت کے کارندوں کو طرح طرح کی عنایات سے نوازا۔ ملا سعد اللہ خاں کو ایک ہاتھی فیل خانہ سرکار سے مرحمت ہوا اور اس کے منصب میں پانصد سوار کا اضافہ کیا گیا۔ ملا عبدالحمید لاہوری لکھتا ہے کہ ملا سعد اللہ خاں نے اپنی ذاتی قابلیت کی بنا پر تھوڑی سی مدت میں بہت ترقی کر لی اور ایک سال کے اندر اندر اسے "خانی" کا خطاب حاصل ہوا۔ ہزاری ذات اور دو سو سوار کا منصب بھی مل گیا۔ پہلے عہدے کے علاوہ دولت خانہ خاص کی داروغگی کا عہدہ بھی ملا۔ دولت خانہ خاص جسے اکبر کے ایام حکومت میں غسلخانہ کہتے تھے، مشکوئے معلی اور دیوان خانہ خاص و عام کے درمیان واقع تھا۔ بادشاہ دیوان عام سے اٹھ کر یہیں آتا۔ چونکہ اس کے متصل حمام تھا، اس واسطے اسے "غسلخانہ" کہتے تھے۔ بادشاہ وہاں خاص خاص امور کے متعلق اپنے معتمد امیروں سے مشورہ کرتا۔ وہاں فقط وہی امیر جا سکتا تھا جسے بادشاہ خود طلب کرتا۔ حتیٰ کہ شہزادے بھی بغیر اجازت وہاں داخل ہونے کے مجاز نہ تھے۔ شاہجہاں کے عہد حکومت میں "غسلخانہ" کی بجائے اسے "دولت خانہ خاص" کہتے تھے۔

"دولت خانہ خاص" کی داروغگی ایک بڑا اعزاز تھا جو راسخ الاخلاص امیروں کو وفا پرورانہ خدمات کے معاوضے میں بڑی بڑی

[1] کلمات الشعراء صفحہ ۹۵

امیدوں کے بعد حاصل ہوتا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مدت قلیل میں سعد اللہ خاں نے اپنی وفا، امانت، دیانت اور اخلاص کا کتنا گہرا اثر بادشاہ اور اہل دربار کے دل میں پیدا کر دیا تھا[1] سعد اللہ خاں نے اپنے جدید عہدے کے فرائض اتنی ذمہ داری اور تندہی سے ادا کیے کہ قدر شناس بادشاہ نے اسی سال ۸ رمضان کو خلعت خاصہ، دو ہزاری ذات اور پانچ سو سوار کا منصب عطا کرتے ہوئے میر سامان کا عہدہ بھی اسے دے دیا۔ میر سامان کا عہدہ وزارت کے لگ بھگ ہوتا تھا۔ اس عہدے کے فرائض اتنے زیادہ ہوتے تھے کہ دیگر مہمات کی طرف توجہ نہیں دی جا سکتی تھی۔ اس لیے داروغگی دولت خانۂ خاص باقی خاں کو، عوض مکرر کا عہدہ میرک شیخ کو دے دیا گیا[2]

۱۰۵۵ھ/۱۶۴۵ء میں سعد اللہ خاں دیوانی خالصہ شریفہ پر فائز ہوا اور شاہی فرمانوں کی اصلاح اس کے سپرد کرتے ہوئے اسے یہ اعزاز بخشا گیا کہ فرامین کی پشت پر دارا شکوہ کی مہر کے بعد اپنے دستخط بھی ثبت کر دیا کرے۔

۲۰ رجب ۱۰۵۵ھ/۱۶۴۵ء کو بادشاہ نے سعد اللہ خاں کو اچھابل (کشمیر) میں جسے اس وقت صاحب آباد کہتے تھے۔ وزارت کل کا خلعت عطا فرمایا۔ اب سعد اللہ خاں سلطنت کے سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ وزارت کل کے سلسلے میں صاحب مآثر الامرا ایک عجیب و غریب قصہ بیان کرتا ہے۔ خان دوراں صوبہ دار دکن کے انتقال کی خبر جب دربار میں پہنچی تو شاہ جہاں نے اسلام خاں مشہدی سے جو اس وقت وزیر اعظم تھا فرمایا کہ دکن کی صوبہ داری کے لیے تم کس کا نام تجویز کرتے ہو۔ اسلام خاں یہ سن کر اپنے ڈیرے پر آیا اور اپنے مشیروں سے صلاح لی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میں بادشاہ سے درخواست کروں گا کہ مجھے دکن کا صوبہ دار بنا دیا جائے۔ اس معاملے میں تمہاری کیا رائے ہے۔ انھوں نے کہا کہ وزارت عظمیٰ کو چھوڑ کر حکومت دکن پر جانا کہاں کی دانائی ہے۔ خان نے کہا، تم بالکل درست کہتے ہو۔ بادشاہ سعد اللہ خاں کا لوہا مان چکا ہے۔ اس کا دلی منشا یہ ہے کہ سعد اللہ خاں وزیر اعظم بنے اور میں خود اس کے لیے جگہ خالی کر کے دکن جانے کی خواہش ظاہر کروں۔ بہتر یہی ہے کہ میں ایسا ہی کروں۔ بادشاہ بھی خوش ہو جائے گا اور سعد اللہ خاں پر میرا احسان بھی رہے گا۔ چنانچہ اسلام خاں مشہدی اسی شام بادشاہ کے حضور حاضر ہوا اور عرض کی کہ دکن کی صوبہ داری کشاں کشاں مجھے یہاں سے آئی ہے۔ بادشاہ خوش ہو گیا۔ کہا اگر تم دکن جانا چاہتے ہو تو اپنی جگہ کس کے حوالے کرو گے؟ اس نے عرض کیا کہ میں اس عہدے کے لیے سعد اللہ خاں سے بہتر کسی کو نہیں پاتا۔ بادشاہ نے اس تجویز کو منظور کر لیا۔ اسلام خاں کو دکن بھیج دیا اور سعد اللہ خاں کو وکیل السلطنت کا عہدہ عطا کر دیا۔

سعد اللہ خاں نے اپنی وزارت کے ایام میں بہت سی فوجی خدمات بھی سرانجام دیں۔ اس کی وزارت کا زمانہ نہایت مبارک اور اعلیٰ دور تصور کیا جاتا ہے۔ اس سے پہلے یہ ایک عام قاعدہ تھا کہ کروڑیوں کو تحصیل زر کے معاوضے میں پانچ فیصدی مجرا دیا جاتا تھا۔ یعنی ایک کروڑی اگر سو روپیہ وصول کرے تو وہ پچانوے روپے شاہی خزانے میں داخل کرے باقی پانچ روپے اپنے معاوضے کے طور پر اپنے پاس رکھ لے۔ سعد اللہ خاں نے کفالت سرکار کے خیال سے یہ قاعدہ مقرر کیا کہ پانچ روپے حاصل کرنے کے لیے کروڑی ایک سے پانچ روپے رعایا سے وصول کرے۔ اسی معمولی سی ترمیم سے رعایا کو بہت سی پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ سعد اللہ خاں نے جب اس پر سوچ بچار کی تو وہ رعایا کی پریشانیوں کا خیال کر کے کانپ اٹھا اور اپنی اس ترمیم پر وہ عمر بھر نادم رہا۔ وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ کاش! اس دن

---

[1] بادشاہ نامہ جلد دوم صفحہ ۲۲۰

[2] بادشاہ نامہ جلد دوم صفحہ ۲۴۷

میرا ہاتھ سوکھ جاتا۔ میرا قلب ناکارہ ہو جاتا جب میں نے ایسا کرنے کا حکم دیا تھا۔

سعد اللہ خاں کو غریب رعایا کی پریشانیوں کا اس قدر احساس تھا کہ محالات خالصۂ شاہی کی بقایا یا مال گزاری کی فہرست اس کے سامنے رکھی گئی تو اس پر اس نے یہ حکم لکھا کہ "اس برف کے مینار کو آفتاب کے سامنے رکھو۔ سورج کی گرمی کے بعد جو باقی بچ رہے اسے وصول کرنے کی کوشش کرو۔" دوسرے لفظوں میں اس کا مفہوم یہ تھا کہ جن لوگوں میں بقایا ادا کرنے کی طاقت نہیں ان سے باقیات وصول کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔

۱۰۵۵ھ / ۱۶۴۵ء میں پنجاب میں بارش نہ ہوئی۔ فصلیں خشک ہو گئیں۔ شدید اور ہولناک قحط نمودار ہوا۔ رعایا پرور شہنشاہ نے حکم دیا کہ پنجاب کے مختلف مقامات پر دس لنگر خانے جاری کیے جائیں اور ہر ایک سے دو سو روپے روزانہ کی خوراک مسلمانوں کو پکی پکائی اور ہندوؤں کو جنس خام کی صورت میں تقسیم ہوا کرے اور پچاس ہزار روپیہ ان سفید پوش اور ضعیفوں میں تقسیم کیا جائے جو لنگر خانہ میں نہیں جا سکتے۔

۱۰۶۱ھ / ۱۶۵۰ء میں پھر یہی صورت پیدا ہوئی مگر اب کے حالات قدرے مختلف تھے۔ ابتدا میں پانی نہ برسا اور خریف کی تمام فصل خشک ہو گئی۔ آخر میں اس شدت سے مینہ برسا کہ بارش نے تھمنے کا نام ہی نہ لیا۔ یہاں تک کہ ربیع کی فصل بوئی نہ جا سکی۔ بادشاہ اس زمانے میں لاہور سے کشمیر جا رہا تھا۔ رعایا کی پریشانی دیکھ کر اس نے ان معاملات کے تصفیہ کے لیے نواب سعد اللہ خاں کو پنجاب میں چھوڑا۔ نواب سعد اللہ خاں نے صوبہ کا دورہ کر کے حالات پر قابو پایا۔ رعایا پر آسائش کے دروازے کھولے اور پھر کشمیر میں جا کر بادشاہ کی خدمت میں حاضری دی۔ کشمیر میں بھی ان دنوں کچھ ایسے ہی حالات پیدا ہو چکے تھے۔ نہ باغوں میں رونق تھی نہ سبزہ میں تر و تازگی۔ فصلیں تباہ اور رعایا پریشان تھی۔ بادشاہ نے یہاں کے حالات بھی نواب سعد اللہ کے سپرد کیے۔ نواب نے دو ماہ کے اندر اندر رعایا کا دل مٹھی میں لے لیا۔

سعد اللہ خاں نے مالگذاری کے سلسلے میں ایک بے حد مفید ترمیم کی۔ راجہ ٹوڈرمل نے یہ قاعدہ مقرر کیا تھا کہ عامل اور کروڑیوں کی سو سے کم فاضل رقم حساب میں مجرا نہ دی جائے۔ اگر رقم سو سے زیادہ ہو تو مجرا دی جائے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ دیوان اور متصدیوں نے عاملوں کے راستے میں رقموں کے مجرا دینے میں طرح طرح کی رکاوٹیں اور دقتیں عاید کر دیں۔ جب فرد محاسبہ نواب سعد اللہ خاں کے روبرو پیش ہوئی تو اس نے اس پر لکھا:۔

"اے مستوفی! مثل ہندی است۔ لینا لینا۔ دینا دینا"

جب سرکاری ضابطہ ایسا مقرر ہو چکا ہے کہ سو سے زیادہ فاضل مجرا ہو تو کس واسطے ہمارے لیے اور اپنے لیے بددعا اور عاقبت کی خرابی پر راضی ہوتے ہو؟

نواب سعد اللہ خاں نے جمادی الآخری ۱۰۶۶ھ / ۱۶۵۵ء کو وفات پائی۔ اسے قولنج کا عارضہ تھا۔ اب کے ایسا شدید دورہ پڑا کہ وہ جانبر نہ ہو سکا۔ شاہ جہان نے طبیبوں کو اس کے علاج کے لیے تاکید کی۔ انھیں بار بار بدل کر علاج کرایا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ بیماری کے دوران بادشاہ کئی مرتبہ اس کی عیادت کو گیا۔ کہتے ہیں جب اس کے انتقال کی خبر بادشاہ کو پہنچی تو جوئے اشک اس کی آنکھوں سے بہ نکلی۔

نواب کا بڑا بیٹا لطف اللہ خاں اس وقت پندرہ سال کا تھا۔ بادشاہ نے اسے اپنے منصب داروں میں شامل کر لیا۔

ایک مورخ کہتا ہے کہ نواب سعد اللہ خاں میں صوری و معنوی کمالات کے علاوہ بے شمار ذاتی خوبیاں بھی تھیں۔ وہ ملکی مہمات

کو کمال دیانت اور امانت سے ادا کرتا تھا۔ وزارت کے ایام میں ہرگز اس کا قدم بدعت اور مردم آزاری کے لیے نہیں اٹھا بلکہ وہ ان تمام مقدمات و محاسبات کو رفع دفع کرتا تھا جن میں عامل اور رعایا کا نقصان ہوتا تھا۔ صاحب مآثر الامرا لکھتا ہے:۔

"سعد اللہ خاں بحلیۂ علم بحسن خلق و تواضع و انصاف داشت۔ در انفصال معاملات متعلقہ
براستی و دیانت می کوشید۔ در اخذ وجوہ سرکار بادشاہی روا دار نہ بود کہ بر عمال و رعایا
حیف و حیلے رود۔ ہندوستان در وقت او رونق گرفت۔ باآنکہ مثل دارا شکوہ حریفش
بود اما شکایت او پیش نرفت۔ از ابتدائے ملازمت ہموارہ در ترقی گزرانید۔ القاب او
علامی فہامی جملۃ الملک مقرر گشت۔ بہ منتہائے مراتب فائز گشت۔ برحمت حق پیوست۔
نام نیکو یادگار گذاشت" [1]

الفنسٹن صاحب لکھتے ہیں کہ "وہ نہایت لائق، فائق اور عاقل و ہوشیار اور چال چلن کا نیک تھا۔ یہاں تک کہ ویسا وزیر ہندوستان کے وزیروں میں کوئی نہیں ہوا۔ شاہ جہان کے کاروبار میں اس وزیر باتدبیر کا ذکر بڑی عزت و شان سے ہوا ہے۔ تمام سلطنت کے کام اسی وزیر کے صلاح و مشورہ سے انجام پاتے تھے۔ اورنگ زیب نے جو خطوط اور فرمان اپنی طویل طویل حکومت میں لوگوں کے نام تحریر کیے ہیں ان میں بھی اس وزیر کی راہوں اور کاموں کو اس طرح بیان کیا ہے کہ سب لوگ اس کی پیروی کریں" [2]

حاجی محمد سعید

اپنے وقت کے بڑے فاضل۔ متورع اور عالی مشرب انسان تھے۔ زندگی فقر و فاقہ سے بسر کی۔ اور اس میں بھی علم کی آن کو قائم رکھا۔ یہاں تک کہ باپ کے ہاں سے بھی کھانا پسند نہ کرتے تھے۔

آپ یہ بات جانتے تھے کہ میرا باپ ملازم ہے اور سرکار سے تنخواہ پاتا ہے اور اپنے فرائض پوری دیانت داری سے ادا کرتا ہے۔ گویا وہ رزق حلال حاصل کرتا ہے۔ پھر بھی غیرت نے انھیں اجازت نہ دی کہ وہ اپنے باپ کے دست نگر ہوں۔ کیونکہ یہ فقر کے منافی تھا۔ آپ کی پوشاک بڑی سادہ ہوتی۔ چھوٹی سی پگڑی جسے ہم پھینٹا کہتے ہیں اور دو چادریں یہ ان کے لباس کی کل کائنات تھی۔ کبھی درویشوں کی طرح ان چادروں کی گدڑی مار لیتے۔ اس طرح آپ نے تحصیل علم کیا اور پھر جو کچھ پڑھا تھا۔ اس کا فیض دوسروں تک پہنچایا۔

جب آپ کا باپ فوت ہوا تو آپ باپ کی میراث کے مالک ہوئے۔ آپ نے اس پر قبضہ کیا اور اس کے ذریعے حج کا سامان کیا۔ حرمین کی زیارت کے بعد آپ واپس آئے اور مسند درس پر متمکن ہو گئے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں آپ کی شہرت شاہ جہان کے کانوں تک پہنچی۔ وہ اہل علم و فضل کا سچا قدردان تھا۔ اس نے انھیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دی مگر قناعت و توکل کے اس پیکر نے وہاں جانا پسند نہ کیا۔ بادشاہ نے پھر کوشش کی۔ اب کے علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی اور ملا سعد اللہ خاں کو آپ کی خدمت میں بھیجا۔ انھوں نے اپنا پورا اثر و رسوخ استعمال کیا اور آپ کو سرکاری ملازمت اختیار کرنے کی ترغیب دلائی۔ مگر آپ نے ملازمت کی پابندیوں میں گرفتار ہونا پسند نہ کیا، آزادانہ طور پر درس دیتے رہے اور دل اور دماغ کے مریضوں کی اصلاح کا فریضہ بھی ادا کرتے رہے آپ نے بیضاوی کے چند اجزا پر حاشیہ بھی لکھا ہے۔

---

[1] مآثر الامرا جلد دوم صفحہ ۴۴۹

[2] تاریخ ہندوستان از الفنسٹن

ملا عصمت اللہ اپنے وقت کے زبردست عالم تھے۔ علم کی ہر شاخ کو بڑی محنت و شفقت سے حاصل کیا اور اپنے لیے ایک مخصوص مقام پیدا کیا۔ آپ نے لاہور میں درس شروع کیا اور تھوڑے ہی عرصے میں آپ کی شہرت پر لگا کر سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔ طلبہ خاصی تعداد میں آپ کے درس میں شریک ہوتے تھے۔ آخری عمر میں بینائی جاتی رہی۔ اللہ تعالےٰ نے بصیرت کی دولت عنایت کی ہوئی تھی۔ اس لیے درس بند نہ کیا، پڑھانے کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔ آپ کب فوت ہوئے ؟ کسی تذکرے نے ذکر نہیں کیا۔ آپ کا ایک لڑکا محمد شریف نامی تھا۔ اس نے نوعمری میں بیضاوی پر حاشیہ لکھا جسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی — یہ لڑکا ۱۰۷۰ھ / ۱۶۵۹ء میں فوت ہوا۔

(طبقات شاہجہانی ورق ۳۴۷ ب)

عہد اورنگ زیب عالمگیر ۱۰۶۸ھ / ۱۶۵۷ء تا ۱۱۱۹ھ / ۱۷۰۷ء

اورنگ زیب شاہ جہان اور اس کی محبوب بیوی ممتاز محل کی چھٹی اولاد تھا۔ وہ ۱۵ ذیقعدہ ۱۰۲۷ھ / ۱۶۱۸ء کو دوحد کے مقام پر پیدا ہوا اس وقت جہانگیر نظام شاہیہ کے سپہ سالار ملک عنبر کو شکست دے کر آگرہ کی طرف واپس آ رہا تھا۔ شاہجہان نے شہنشاہ کے حضور میں ایک ہزار اشرفی کی نذر پیش کی۔ جہانگیر نے اسے قبول کیا اور بچے کا نام اورنگ زیب رکھا۔ جشن مولود اجین پہنچ کر منایا گیا۔ کیونکہ دوحد ایک معمولی گاؤں تھا جہاں اتنا عظیم الشان جشن منایا نہیں جا سکتا تھا۔ طالب، کلیم ہمدانی نے "آفتاب عالمتاب" سے تاریخ ولادت نکالی۔ ایک اور شاعر نے "گوہر تاج ملوک اورنگ زیب" سے تاریخ استخراج کی۔

اورنگ زیب کی ولادت کے کچھ عرصہ بعد جہانگیر اور شاہ جہان کے تعلقات اتنے کشیدہ ہو گئے کہ بیٹے نے تنگ آ کر باپ کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس کی باوفا بیوی ممتاز محل نے ایک سچی رفیقہ حیات کی طرح اس کا ساتھ دیا۔ اس طرح سارا خاندان دکن سے بنگال و بہار اور پھر وہاں سے دکن کی طرف مارا مارا پھرتا رہا۔ آخر ۱۰۳۶ھ / ۱۶۲۶ء میں باپ اور بیٹے کے درمیان صلح صفائی ہوئی اور شاہجہان کے دو بیٹے دارا شکوہ اور اورنگ زیب والدین کے سایۂ شفقت سے علیحدہ کر کے دادا کی خدمت میں بر غمال کے طور پر بھیج دیے گئے۔

اس افراتفری میں شہزادے کی تعلیم و تربیت کا کیا بندوبست ہو سکتا تھا۔ بہر حال شاہ جہان اور ممتاز محل اولاد کی ذمہ داریوں کو سمجھتے تھے۔ ان سے جو کچھ ہو سکا انھوں نے شہزادے کی تعلیم و تربیت کے لیے کیا۔ اورنگ زیب کے رقعات اور اس کے دور حکومت کے تمام تاریخی واقعات ہمارے سامنے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے اورنگ زیب کے تبحر علمی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس نے آخیر عمر تک مطالعہ کو جاری رکھا۔ اس سے اس میں وسعت نظر پیدا ہوئی۔ اس کے رقعات ادیبانہ سحر کاری کا بہترین مظہر ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کی تعلیم میں ادب اور شعر پر بھی اتنا ہی زور دیا گیا تھا جتنا دوسرے مضامین پر۔ وہ ترکی خوب جانتا تھا۔ عربی کا فاضل اجل تھا۔ فارسی اس کے گھر کی لونڈی تھی۔ یہ سب کچھ اس تعلیم کا اثر تھا جس کا بندوبست وقتاً فوقتاً اس کے لیے ہوتا رہا۔

ابتدائی تعلیم کے بعد پہلے استاد جن سے اس نے بہت کچھ سیکھا وہ مولانا عبداللہ سلطان پوری تھے۔ مولوی رحمان علی ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ آپ معقولات اور منقولات میں پوری پوری مہارت رکھتے اور اپنے وقت کے مشہور علما میں سے تھے جنھوں نے دارا شکوہ کو بھی پڑھایا تھا کثرت درس اور مطالعہ سے آخیر عمر میں آپ کی بصارت زائل ہو گئی۔ شاہجہان نے ان کی خدمات کی بنا پر گزارہ مقرر کر دیا اور انھیں اجازت دی کہ وہ اپنے وطن مالوف جا کر علوم دینیہ کا درس جاری رکھیں۔ چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا۔[1]

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۲۳

اورنگ زیب کے دوسرے استاد میر ہاشم گیلانی تھے۔ وہ علوم دینیہ اور عربی علم و ادب کے بڑے فاضل تھے۔ ہندوستان میں درسی فضیلت حاصل کرنے کے بعد آپ حجاز تشریف لے گئے۔ بارہ برس تک حرمین الشریفین میں مقیم رہے، منقولات شیخ محمد عربی محدث، شیخ عبدالرحیم حسانی اور ملا علی سے معقولات میر نصیر الدین حسین سے حاصل کئے جو میر غیاث الدین منصور کے پوتے تھے۔ ہندوستان میں آئے تو حکیم علی گیلانی کے درس میں شریک ہوئے، طب اور ریاضی اُن سے پڑھی۔ پھر احمد آباد گجرات تشریف لے گئے۔ وہاں مسند درس و تدریس بچھائی اور طالبان علم کی فیض رسانی میں مشغول ہو گئے۔ آپ کی فضیلت کی شہرت شاہجہان کے کانوں تک پہنچی۔ اس نے قدر افزائی کرتے ہوئے احمد آباد گجرات کی صدارت اور طبابت آپ کے سپرد کی۔ کچھ عرصہ بعد آپ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس نے اورنگ زیب کی تعلیم کے لیے آپ کو منتخب کیا، آپ نے اس فریضے کو بڑی ایمانداری کے ساتھ ادا کیا، آپ نے تفسیر بیضاوی پر حاشیہ بھی لکھا۔[۱]

ان اساتذہ کے علاوہ ملا موہن بہاری کا نام بھی اورنگ زیب کے اساتذہ کی فہرست میں ملتا ہے۔ ملا موہن بہاری ایک بجوبۂ روزگار ہستی تھے۔ انھوں نے سترہ برس کی عمر میں فاتحہ فراغت پڑھا اور دس برس کی عمر میں کلام اللہ حفظ کیا۔ کچھ عرصہ بہار میں درس دیتے رہے۔ آخر میں اورنگ زیب کی تعلیم ان کے سپرد ہوئی۔ آپ کا اصل نام محی الدین تھا۔ قصبہ بہار شریف میں پیدا ہوئے۔ وہیں پڑھا اور پڑھایا۔ چوراسی برس کی عمر پاکر ۱۰۷۵ھ میں فوت ہوئے۔[۲]

احکام عالمگیری سے پتہ چلتا ہے کہ اورنگ زیب نے علامی سعد اللہ خاں سے بھی استفادہ کیا تھا۔ چنانچہ حمید الدین لکھتا ہے :-

"حضرت عالمگیر سعد اللہ خاں را خطاب عصائے پیری وزیر با تدبیر داشت۔ نزد او درس خوانده شاگرد او مقرر بود۔"[۳]

مولانا سید محمد قنوجی ایک بلند پایہ فاضل اور صاحب دل بزرگ تھے۔ اورنگ زیب نے ان سے امام غزالی کی تصانیف پڑھی تھیں۔[۴]

ملا جیون سے بھی اورنگ زیب نے کسب فیض کیا تھا۔ وہ امیٹھی ضلع لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ مشہور مفسر اور محدث تھے۔ ان کی دو کتابیں تفسیر احمدی اور نور الانوار ہندوستان گیر شہرت کی مالک ہیں۔ اورنگ زیب کا ذوق قرآنی بہت حد تک آپ کی توجہ کا نتیجہ تھا۔

فرحت الناظرین کا مصنف مشہور امیر اور فاضل دانشمند خان کو بھی جو ڈاکٹر برنیر کا مربی تھا اورنگ زیب کا استاد بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ اورنگ زیب نے امام غزالی کی مشہور کتاب احیاء العلوم آپ سے پڑھی مگر کوئی اور ماخذ اس کی تائید نہیں کرتا۔ خود ڈاکٹر برنیر اس بارے میں خاموش ہے۔

یہ اورنگ زیب کے اساتذہ تھے جن کی توجہ سے اسے دینی اور دنیوی علوم حاصل ہوئے اور اس کے مذاق میں بعض ایسی باتیں رچ بس گئیں جن کی بدولت وہ اپنے خاندان اور اپنے معاصرین میں سب سے ممتاز نظر آتا ہے۔ وہ سعدی، حافظ، نظامی، نظیری،

---

[۱] بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم صفحہ ۲۵-۲۶

[۲] تحفۃ الکرام صفحہ ۴۳

[۳] احکام عالمگیری صفحہ ۴

[۴] تذکرہ علمائے ہند صفحہ ۸۳

صائب، ملا شاہ بدخشی، فانی کشمیری اور ملا بیدل کے دیوان اکثر اپنے مطالعہ میں رکھا کرتا تھا۔ صائب اسے خاص طور پر پسند تھا کیونکہ اس کا کلام اکثر معرفت اور تصوف میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ جس کثرت سے اس نے اپنے رقعات میں شعر لکھے ہیں۔ وہ ثابت کرتے ہیں کہ اسے شعر کا بڑا اچھا ذوق تھا۔ وہ زاہد خشک ہی نہ تھا بلکہ اگر کوئی اچھا شعر سنتا تو اس کی داد دیتا اور اپنی بیاض میں لکھ لیتا تھا۔ مخلص خاں نے ایک مرتبہ اسے دیوان صائب پیش کیا تو وہ بہت خوش ہوا۔ مآثر عالمگیری کا مصنف لکھتا ہے کہ :۔

"۱۱۱۶ھ میں وہ بیمار ہوا۔ نقاہت اور ضعف کی وجہ سے وہ صاحب فراش ہو گیا۔ اس حالت میں وہ نظامی کے مندرجہ ذیل شعر ترنم سے گنگنا رہا تھا ؎

بشتاد و نود چوں در رسیدی | بسا سختی کہ از دوراں کشیدی
دراں جا چوں بصد منزل رسانی | بود مرگے بصورت زندگانی

اس وقت امیر خاں بادشاہ کے ساتھ تھا۔ اس نے عرض کیا کہ مولانا نظامی کے یہ تمہیدی شعر ہیں جو اس شعر کی خاطر کہے گئے ہیں ؎

پس آں بہتر کہ خود را شاد داری
دراں شادی خدا را یاد داری

عالمگیر نے اس شعر کو بار بار سنا اور اپنی بیاض میں لکھ لیا۔"

عالمگیر کو دینی علوم سے طبعی لگاؤ تھا اور وہ اکثر مذہبی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ مستعد خاں ساقی مآثر عالمگیری میں لکھتا ہے :۔

"قبلۂ عالم کے کمالات کسبیہ کا عظیم الشان کارنامہ فقہ، حدیث اور تفسیر کی تحصیل ہے۔ جہاں پناہ حضرت امام غزالی کی تصانیف، شیخ شرف الدین یحیٰی منیری کے مکتوبات، شیخ زین الدین، شیخ قطب الدین، شیخ محی الدین شیرازی کے رسائل خاص شوق سے مطالعہ کرتے۔" (مآثر عالمگیری ص ۲۸۸)

اورنگ زیب کے معاصرین میں شیخ محب اللہ الہ آبادی ایک صاحب دل صوفی اور بزرگ درویش تھے، رسالہ تسویہ ان کی تصنیف ہے۔ اس رسالے میں شیخ موصوف نے جبریل اور وحی کی حقیقت عام مسلک سے ہٹ کر بیان کی ہے۔ جب یہ رسالہ عام ہوا اور علماء نے اس کے خلاف شور برپا کیا تو عالمگیر نے بھی یہ رسالہ پڑھا۔ اسے شیخ کا بیان کھٹکا۔ اس وقت شیخ محب اللہ کے دو مرید دہلی میں موجود تھے۔ ان میں میر سید محمد شاہی منصب دار تھے۔ اور دربار کے امراء میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ دوسرے شیخ محمدی درویش تھے جو کالپی کے رہنے والے تھے۔ وہ بڑے زاہد و عابد تھے۔ سب سے پہلے عالمگیر نے میر سید محمد سے تسویہ کی عبارت کی تشریح طلب کی۔ انھوں نے شیخ کی مریدی سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد شیخ محمدی سے کہا گیا کہ وہ شیخ کے بیان کو شریعت کے مطابق ثابت کریں ورنہ ان کی مریدی سے کنارہ کشی کا اعلان کریں، اور کتاب کو آگ میں ڈال دیں۔ شیخ نے جواب دیا کہ نہ تو مجھے ان کی مریدی سے انکار ہے نہ میں اس سے کنارہ کشی کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ البتہ میں اتنا ضرور کہوں گا کہ جس مقام سے شیخ نے گفتگو کی ہے مجھے وہاں تک ابھی رسائی نہیں ہوئی جس وقت میں اس مرتبے پر پہنچ جاؤں گا تو اعلیٰ حضرت کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اس کی شرح لکھ بھیجوں گا اور اگر بادشاہ نے اس کتاب کو جلانے کا فیصلہ ہی کر لیا ہے تو

اس کو اسے ، بیے تو اسے کہیں زیادہ بادشاہ کے باورچی خانے میں آگ موجود ہے حکم دیں کہ یہ رسالہ اور اس کی جس قدر نقلیں میسر آسکیں شاہی مطبخ میں سپرد آتش کردی جائیں ۔ عالمگیر اس جواب کو سن کر چپ ہو گیا۔[1]

اس واقعہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ...... جزئیات پر بھی ویسی ہی نظر تھی جیسی کلیات پر ۔ اس کے علاوہ علم جب عمل کی دولت سے مالا مال ہو جاتا ہے تو خدا تعالیٰ کے خوف کے سوا باقی ہر ایک کا خوف دل سے نکل جاتا ہے ۔ یہی اس وقت کی تعلیم کا مقصد تھا۔

اورنگ زیب کا سب سے بڑا کارنامہ فتاویٰ عالمگیری ہے ۔ کتاب و سنت کے احکام کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب نہایت لازمی ہے ۔ اورنگ زیب نے ملک کے ممتاز علماء سے فرمائش کی کہ فقہ کی تمام کتابوں سے مسائل کا انتخاب کر کے ایک کتاب مرتب کریں چنانچہ ملا محمد کاظم شیرازی عالمگیر نامہ میں لکھتا ہے :۔

"چونکہ بادشاہ سلامت کو اس کا خاص خیال ہے کہ مسلمان ان دینی مسائل پر عمل کریں جنھیں حنفی مذہب کے علماء عمل کے قابل سمجھتے ہیں لیکن یہ مسائل نہایت پریشان صورت میں ادھر ادھر کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں ۔ ان کا کسی ایک کتاب میں نہ ہونا اس امر کا متقاضی ہے کہ ایک مبسوط کتاب میں انھیں جمع کر دیا جائے ۔ اس بنا پر بادشاہ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ پایۂ تخت کے علماء کی ایک جماعت شاہی کتب خانے کی ان فقہی کتب کو جو ایک مدت سے اطراف و اکناف عالم سے جمع کی گئی ہیں سامنے رکھ کر بڑی تحقیق و تدقیق کے ساتھ ان مسائل کو ایک کتاب میں جمع کریں تاکہ ہر شخص اس کتاب کی مدد سے فقہی مسائل آسانی کے ساتھ معلوم کر سکے اور قاضی اور مفتی بہت سی کتابوں کو جمع کرنے اور پڑھنے سے بے نیاز ہو جائیں ۔ اس کام کی ذمہ داری شیخ نظام کو سونپی گئی ـــــ تمام علماء اور فضلاء کے معقول وظیفے مقرر کیے گئے اور وہ اس کام میں مشغول ہو گئے ۔ اس کام کے لیے جن کتابوں کی ضرورت تھی وہ شاہی کتب خانے سے ان کے حوالے کی گئیں ۔ یہ سالہا اس کام پر ایک بہت بڑی رقم خزانہ شاہی سے صرف کی جاتی ہے ۔ جب یہ کتاب مکمل ہو جائے گی تو دنیا تمام فقہی کتابوں سے بے نیاز ہو جائے گی اور اس کا ثواب بادشاہ کے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا ۔" (عالمگیر نامہ ص ۱۰۸۷)

آٹھ سال میں دو لاکھ روپیہ صرف کر کے یہ کتاب مکمل ہوئی ۔ اس میں جن ماخذات کا ذکر کیا گیا ہے ۔ ان کے نام اتنے زیادہ ہیں کہ ایک اچھا خاصا رسالہ مرتب کیا جا سکتا ہے ۔ یہ سب وہی کتابیں ہیں جو شاہی کتب خانے میں موجود تھیں ۔ گویا عالمگیر کا کتب خانہ مذہبی علوم و فنون کی کتابوں کا خزانہ تھا۔

فتاویٰ عالمگیری میں جن علماء نے کام کیا ان پر بڑی ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے ۔ ان میں بعض علماء خاص لاہور کے رہنے والے تھے۔

---

[1] مآثر الکرام ص ۲۴۸ ۔ مآثر الامراء جلد سوم ص ۶۰۶ ۔ مرآۃ الخیال شیر خاں لودھی ص ۱۶۶

عالمگیر کو اشاعتِ تعلیم سے بڑی دلچسپی تھی، وہ دل کھول کر اس سلسلے میں روپیہ صرف کرتا۔ اس کے اکثر فرمان ملتے ہیں جن میں اس نے صوبائی گورنروں کو بڑی تاکید کے ساتھ حکم دیا ہے کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں تعلیم کے لیے کوشش کریں، مدرسے بنائیں، دارالعلوم جاری کریں اور علماء کو مددِ معاش دیں تاکہ وہ دل جمعی کے ساتھ اپنے فرائض ادا کر سکیں۔

مراۃ احمدی کا مصنف لکھتا ہے کہ اورنگ زیب نے سرکاری خزانے پر یہ بوجھ ڈالا کہ ملک کے ہر طالب علم کو یومیہ دیا جائے اور تمام مملکت کے ہر حصے میں تعلیم پانے والوں کے نام اس علاقے کے سرکاری رجسٹروں میں درج ہوا کریں۔ چنانچہ ہر طالب علم کو اس کے درجے کے مطابق یومیہ ملتا۔ پہلے درجہ کے طالب علم کو ایک آنہ دوسرے درجے والے کو دو آنے اور آخری درجے میں پڑھنے والے کو آٹھ آنے ملا کرتے تھے۔ وہ طالب علم جو کسی خاص مضمون میں امتیاز حاصل کرنا چاہتا اسے دس آنے یومیہ مددِ معاش کے طور پر ملا کرتے تھے۔ مسٹر این این لا تاریخ فرح بخش کے حوالے سے اس کی مزید توضیح کرتا ہوا لکھتا ہے کہ :-

"اورنگ زیب میزان پڑھنے والے طلبہ کو ایک آنہ منشعب پڑھنے والے کو دو آنے شرح وقایہ اور فقہ پڑھنے والے کو آٹھ آنے روزینہ دیا کرتا تھا۔"[1]

صاحبِ مراۃ احمدی اس قسم کی مددِ معاش پر مزید روشنی ڈالتا ہوا لکھتا ہے :-

"مکرمت خاں دیوان صوبہ کے نام حکم صادر ہوا کہ چونکہ ممالک محروسہ کے تمام صوبوں میں یہ مقدس اور بلند فرمان نافذ ہو چکا ہے کہ ہر صوبہ میں مدرس مقرر کیے جائیں، میزان سے لے کر کشاف تک کے طلبہ کو صدر الصدور یا صدر صوبہ کے استصواب رائے اور مدرسوں کی تصدیق سے اس صوبے کے خزانچی کی تحویل سے وجہ معاش دی جائے۔ اس لیے اس وقت احمد آباد، پٹن اور سورت میں تین مدرس اور احمد آباد میں پینتالیس طلبہ کا اضافہ کیا گیا ہے۔"[2]

عالمگیر نے بوہروں کی تعلیم کا خاص بندوبست کیا اور اس سلسلے میں اس نے کسی مخالفت یا کسی رکاوٹ کی پروا نہ کی۔ یہ اندازہ لگانے کے لیے کہ تعلیم صحیح طور پر ہو رہی ہے۔ ان کے ماہانہ نتائج براہِ راست اس کے پاس بھیجے جاتے تھے۔[3]

عالمگیر کی ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ چھوٹے چھوٹے قصبے بھی علمی مرکز بن گئے۔ چنانچہ ۱۶۹۰ء میں جب کپتان الگزنڈر ہیملٹن خلیج فارس سے ہوتا ہوا ساحلِ ہند پر پہنچا اور وہاں سے وہ سندھ کی سیر کے لیے آیا تو ٹھٹھہ کے بارے میں اپنے تاثرات قلمبند کرتا ہوا لکھتا ہے :-

"یہ شہر علوم فقہ، فلسفہ، ریاضی اور دینیات کے لیے مشہور ہے۔ ان علوم میں لڑکوں کی تعلیم کے لیے یہاں تقریباً چار سو کالج ہیں۔"

(نیو اکاؤنٹ آف ایسٹ انڈیا کمپنی جلد اول ص ۱۲۷)

ایک انگریز مورخ عالمگیر کے رفاہی کارناموں کو سراہتا ہوا لکھتا ہے :-

---

[1] PROMOTION OF LEARNING BY N.N. LAW P.188

[2] مراۃ احمدی جلد اول صفحہ ۳۰۶   [3] مراۃ احمدی جلد اول صفحہ ۷۸-۲۷۷

"عالمگیر نے اپنی رعایا کے لیے بہت کچھ کیا۔ اس نے پھانسی کی سزا ختم کی۔ زراعت کو بے حد فروغ دیا۔ پل بنوائے، کنوئیں کھدوائے اور بے شمار سکول اور کالج جاری کئے۔"

(مغل ایمپائر از کین، ص ۲۳)

منشی سبحان رائے بھنڈاری نے سنہ ۴۰ جلوس عالمگیری میں اپنی مشہور کتاب "خلاصۃ التواریخ" لکھنی شروع کی۔ وہ اپنی کتاب میں لاہور عہد عالمگیری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے :۔

"بے شائبہ تکلف شہریست بزرگ و مصریست سترگ۔ در وسعت و آبادی و انبوہ مردم مانند ایں مصر کم نشاں دہند۔ گوناگوں ہنر پیشگان ہر دیار و ہر گونہ صنعت گران روزگار سکونت دارند و اجناس ہفت کشور و اشیائے بحر و بر بہ خرید و فروخت می رود ۔ ۔ ۔ ۔ در ہر کوچہ و بازار مساجد بسیار از بسیار است"[۱]

پنجاب میں عالمگیر کے دور حکومت میں ایک عجیب انقلاب پیدا ہوا۔ اب تک فقہ اور دینیات کی کتابیں جو عوام کے لیے فائدہ رسا تھیں سلیس فارسی میں لکھی جاتی تھیں۔ مگر اس دور میں فقہ اور دینیات کے لیے پنجابی زبان اختیار کی گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ان مضامین پر بے شمار کتابیں لکھی گئیں جن سے مذہبی اور روحانی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی رونما ہو گئی۔

عالمگیر کو تعلیم سے جو دلچسپی تھی اس کا اندازہ یوں بھی ہوتا ہے کہ اس نے اپنی اولاد کی تعلیم میں بڑی توجہ دی۔ ایک فرض شناس شفیق اور دور اندیش باپ کی طرح وہ اپنی اولاد اور بالخصوص لڑکوں کی تعلیم و تربیت میں ہمیشہ کوشاں رہتا تھا۔ اس کی غرض و غایت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس کی عظیم الشان سلطنت کا وارث، ایک لائق، فرض شناس اور ہوشیار شخص ہو۔ اس کے علاوہ وہ معاشرے میں ایسے افراد چاہتا تھا جو اس کو ہر قسم کے فتنہ و فساد سے محفوظ رکھ سکیں۔ وہ اپنے بیٹوں کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھتا اور معمولی سی معمولی لغزش پر بھی ٹوکتا، قدم قدم پہ تنبیہ کرتا۔ سفر ہو یا حضر، وہ دربار میں ہو یا دربار سے باہر، اس کی دور رس نگاہیں ان کی ہر نقل و حرکت کا مطالعہ کرتی رہتیں۔ چنانچہ ہمیں اس کے مکتوبات سے شہزادوں کی تعلیم و تربیت کے بارے میں معلومات کا بیش بہا ذخیرہ میسر آتا ہے جس سے اس کی فرض شناسی کا پتہ چلتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا بیٹا سلطان محمد تھا۔ اورنگ زیب کا خیال تھا کہ وہی اس کا جانشین ہو گا۔ اس نے اسے اپنی خاص توجہ کا مرکز بنایا اور اسے پورے طور پر تعلیم دینے کی کوشش کی مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ اس لیے عین عالم شباب میں وہ باپ کو داغ مفارقت دے گیا۔ مگر آنے والی نسلوں کے لیے تعلیم و تربیت اولاد کے سلسلے میں اورنگ کے کلک گوہر بار سے ایک بیش قیمت لائحہ عمل حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ ان رقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شہزادے کو سفر و حضر، سونے اور جاگنے، نہانے اور دھونے، کھانے پینے، ورد و وظائف، نماز و قرآن خوانی، شکار کھیلنے، دربار لگانے، دربار میں آنے، خویش و اقارب سے ملنے، امیروں سے ملنے، فوجوں کے معائنہ کرنے کے بارے میں اپنی طرف سے بڑی مفید ہدایات بھیجتا رہتا تھا۔ اس شہزادے کو تعلیم سے زیادہ شکار سے دلچسپی تھی جسے اورنگ زیب پسند نہ کرتا تھا اور بار بار اسے تاکید کرتا کہ وہ رغبت کے ساتھ پڑھے۔

اورنگ زیب فارسی میں نہایت شگفتہ انداز بیان کا مالک تھا۔ اس لیے وہ اپنے بیٹے کو بھی اسی رنگ میں رنگنا چاہتا تھا۔ اس نے

---

[۱] خلاصۃ التواریخ مطبوعہ دہلی صفحہ ۶۵

ایک خط میں اسے لکھا کہ وہ شیخ ابوالفضل کا اکبر نامہ ضرور پڑھا کرے۔ تاکہ اسے پاکیزہ فارسی لکھنے میں مہارت حاصل ہو جائے۔ شہزادے نے باپ کے حکم کی تعمیل کی اور اکبر نامہ کی تقلید کرتے ہوئے بسم اللہ کی بجائے اللہ اکبر اور جل جلالہ لکھا۔ اورنگ زیب نے اس پر بیٹے کو ٹوکا اور سرزنش کرتے ہوئے لکھا کہ

"مقصود از خواندا کبر نامہ شیخ ابوالفضل تتبع عبارت آں کتاب است نہ اتباع مذہب مصنف کہ
از روئے بدعت اسلوب مسنون را تغیر دادہ"

آج اگر اورنگ زیب زندہ ہوتا اور ہماری تحریروں کو دیکھتا تو خدا جانے وہ ان کے بارے میں کیا کہتا۔

ابوالفضل نے اپنی انشاپردازی کے زور میں بڑی عجیب و غریب اختراعات کی ہیں۔ وہ عریضہ کو "نشان والا" اور مہر کو "مہر خاص" لکھا کرتا تھا۔ شہزادے نے تقلیداً اپنے خط میں یہ الفاظ لکھے۔ اورنگ زیب نے اس پر فہمائش کی اور شہزادے کو سمجھایا کہ یہ الفاظ شاہی رقعہ اور مہر کے لیے خاص ہوتے ہیں۔ جب تم بادشاہ ہو گے تو انھیں استعمال کرنا۔

اسی طرح شہزادے نے لاپروائی سے کام لیتے ہوئے ایک ردی کاغذ اور بُرے سطر میں عریضہ لکھا۔ عالمگیر کو یہ بات بُری معلوم ہوئی۔ شہزادے کو ڈانٹا اور کہا کہ جب کبھی خط لکھو، اچھے کاغذ پر لکھو۔ بے پروائی سے حسن خط کو خراب نہ کرو۔

اسی طرح اورنگ زیب نے دوسرے شہزادوں کی تربیت کی۔ ان میں سے اکثر تعلیم میں فضیلت کے درجہ پر پہنچے۔ خاص کر شہزادہ معظم علوم دینی میں بڑا بلند پایہ رکھتا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ بادشاہ کے حضور میں علوم قرآن کے ضمن میں ایک فہرست پیش کی اور کہا کہ یہ اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے۔ اورنگ زیب نے اپنے ناظم کتب خانہ کو حکم دیا کہ اس فن پر پہلے جو کتابیں لکھی جا چکی ہیں وہ شہزادے کو دکھائے۔

اورنگ زیب کو امام غزالیؒ سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ اکثر ان کی تصنیفات کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے اپنے بیٹے شہزادہ محمد اعظم کو امام غزالیؒ کی مشہور کتاب تبر المسبوق پڑھنے کا حکم دیا۔ مگر اس کے بیٹوں میں کام بخش باپ کی توجہ سے علوم و فنون کی تحصیل میں اپنے تمام بھائیوں سے گوئے سبقت لے گیا۔ وہ خطوط کی مختلف اقسام کا ماہر تھا۔ بڑے بڑے خطاط اسے استاد زمانہ کہا کرتے تھے۔ اسے باپ کی طرح قرآن پاک حفظ کرنے کی توفیق بھی حاصل ہوئی۔ یہ سعادت اورنگ زیب کی بیٹی زیب النساء کو بھی میسر آئی جس سے خوش ہو کر باپ نے اسے تیس ہزار اشرفی انعام عطا کیا۔ وہ ایک عالم باپ کی عالم بیٹی تھی۔ بختاور خاں لکھتا ہے :۔

"از تحصیل علوم عربی و فارسی بہرۂ تمام اندوختہ"[1]

اورنگ زیب جہاں علوم و فنون کی اشاعت اور مدارس کی ترقی میں اتنی دلچسپی لیتا اور بے دریغ روپیہ خرچ کرتا تھا وہاں وہ ایک عظیم الشان سلطنت کے تخت و تاراج کا مالک ہونے کے باوجود بسر اوقات کے لیے ٹوپیاں کاڑھتا اور قرآن کی کتابت کرتا۔ چنانچہ اس نے شہزادگی کے عالم میں اپنے ہاتھ سے ایک قرآن پاک لکھا اور مکہ مکرمہ بھیجا۔ تخت نشین ہونے کے بعد قرآن پاک کی ایک اور جلد تیار کر کے مکہ مکرمہ بھجوائی۔ اس کے بعد اس نے قرآن کے دو نسخے اور تیار کیے۔ سات ہزار روپیہ ان کی جلد، لوح اور جدول پر صرف کیا۔ یہ دونوں نسخے مدینہ منورہ بھیج دیے۔[2]
اورنگ زیب کے لکھے ہوئے قرآن آج بھی ہندوپاکستان میں ملتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسے قرآن پاک سے کتنا لگاؤ

---

[1] مراۃ العالم (قلمی)

[2] مآثر عالمگیری صفحہ ۵۳۲

تھا۔ اس کی آخری وصیت سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے :۔

"چہار روپیہ و دو آنہ از وجہ کلاہ دوزی نزد وایہ بیگم محل دار است صرف کفن این بیچارہ نمایند و سہ صد و پنج روپیہ از وجہ کتابت قرآن در صرف خاص است روز وفات بہ فقرا دہند" [1]

عالمگیر کی تعلیمی دلچسپیوں کے بارے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس کے بعض معاندین اس پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ اس نے ہندوؤں کی تعلیمی درسگاہوں پر پابندیاں عائد کیں اور بعض کو بالکل بند کر دیا۔ مگر یہ بات حقیقت سے بہت دور ہے۔ اورنگ زیب نے مذہبی تعصب کی بنا پر یا ہندوؤں کو نقصان پہنچانے کے سبب ایسا نہیں کیا بلکہ ہندوؤں نے بعض ایسی حرکات کیں جن کی بنا پر اورنگ زیب کو اس بات کا جائزہ لینا پڑا کہ وہ ان کی چیرہ دستیوں کو روکے۔ انھوں نے شاہجہان کے زمانے ہی سے مساجد کو اپنی حویلیوں میں شامل کرنا اور مسلمانوں پر دباؤ ڈال کر ان کے بچوں کو اپنے مدارس میں لے کر مرتد کرنا شروع کر دیا تھا۔ شاہجہان نے اس کی روک تھام کی کشمیر سے واپس آتے ہوئے گجرات اور راجوری کے علاقے سے یہ شکایت موصول ہوئی کہ ہندو نہ صرف مساجد پر حملہ کر رہے ہیں بلکہ انھوں نے مسلمان عورتوں کو بھی اپنے گھروں میں ڈال کر بیویاں بنا لیا ہے۔ شاہجہان نے اس کے لیے تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا جس کی رپورٹ پر اسے موثر قدم اٹھانا پڑا۔ انہی دنوں چھبیلا رام نامی قانون گو ہی نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں دریدہ دہنی سے کام لیتے ہوئے سخت سست کہا۔ شاہجہان نے اس کے قتل کا حکم دیا مگر ہندو شرارت سے باز نہ آئے۔ اب ان شرارتوں کے مرکز ہندو مدارس تھے۔ ٹھٹھہ، ملتان اور بنارس اس کے بڑے بڑے مرکز تھے۔ مآثر عالمگیری کا مصنف لکھتا ہے کہ

"بعرض خداوند دین پرور رسید کہ در صوبہ ٹھٹھہ و ملتان خصوص بنارس ..... برہمنان نشان در مدارس مقرر بتدریس کتب باطلہ اشتغال دارند ..... و مسلمانان مسافت ہائے بعیدہ طے نمودہ جہت تحصیل علوم شوم نزد آں جماعہ گمراہ می آیند" [2]

ان وجوہ کی بنا پر عالمگیر نے ان مدارس پر پابندیاں عاید کیں۔ کشمیر اور دوسرے بہت سے علاقے اس قسم کی تعلیمات سے پاک تھے۔ اورنگ زیب کی سرپرستی میں وہاں کے مدارس کو خواہ وہ ہندوؤں کے ہوں یا مسلمانوں کے بڑا فروغ حاصل ہوا۔

مولوی نظام الدین

لاہور میں جو علمی رونق شاہجہان کے وقت میں قائم ہوئی تھی وہ بدستور جاری رہی۔ ان مدارس کے علاوہ جو موجود تھے عالمگیر کے وقت میں مولوی نظام عرف پیر مٹھا نے اپنا مدرسہ قائم کیا۔ اور پوری دلجمعی سے علوم ظاہری و باطنی کی اشاعت شروع کی۔ آپ کا فیضان دور دور پھیلا۔ صاحب تحقیقات چشتی مولوی نور احمد آپ کی پانچویں پشت سے تھے۔ آپ ۱۲ صفر ۱۱۴۲ھ میں فوت ہوئے آپ کا مزار علامہ اقبال روڈ پر ریلوے کالونی میں ہے۔ آپ کو پیر مٹھا اس واسطے کہتے ہیں کہ جن لوگوں کے جسم پر مٹکے (دمامے) نکلتے ہیں وہ آپ کے مزار پر حاضر ہو کر منت مانتے ہیں۔ جب یہ مٹکے جھڑ جاتے ہیں تو آپ کی قبر پر جاروب اور پھولوں کا سہرا چڑھاتے ہیں۔

شاہ رضا شطاری

انہی ایام میں شاہ رضا شطاری رشد و ہدایت کا سرچشمہ تھے۔ آپ زبردست فقیہہ تھے۔ آپ کا فتویٰ چلتا تھا۔ علم فقہ کے متلاشی دور دور سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور فیضیاب ہو کر واپس جاتے۔

---

[1] احکام عالمگیری صفحہ ۱۲-۱۴

[2] مآثر عالمگیری صفحہ ۸۱

ملا محمد اکرم ولد یحییٰ لاہوری اقلیم علم کا شہنشاہ تھا۔ درس سے بہت مشتاق تھا۔ کتب متداولہ پر کئی کئی مرتبہ درس دے چکا تھا۔ طبیعت میں حلم، بردباری، صلاح اور پرہیزگاری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ عالمگیر نے انھیں بلا کر اپنے سب سے چھوٹے بیٹے شہزادہ کام بخش کا اتالیق مقرر کیا۔ اور جب فتاویٰ عالمگیری کی تدوین کا سلسلہ شروع ہوا تو آپ کو بھی اس جماعت میں شریک کیا جو اس کام کے لیے منتخب ہوئی تھی۔ آپ نے فتاویٰ کا چوتھا حصہ مرتب کیا۔ بختاور خاں کی رائے ہے کہ ملا محمد اکرم انسانی لباس میں فرشتہ تھے۔ علامہ عبدالحکیم کہا کرتے تھے:۔ کہ

"لاہور میں ملا یحییٰ کے بیٹے کی علمی فضیلت کو کوئی نہیں پہنچا"

آپ کا انتقال ۱۰۹۴ھ میں ہوا۔

شیخ عبدالعزیز اکبر آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ عبدالرشید تھے جو اپنے وقت کے بڑے فاضل اور عالم تھے۔ انھوں نے کسب فیض اپنے والد سے کیا۔ جب جوانی کی منزل میں قدم رکھا تو درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ فاضل کامل تھے۔ درس بڑے جوش و خروش سے دیتے تھے چنانچہ ہمت خاں اور بختاور خاں نے کئی مرتبہ عالمگیر کی خدمت میں شیخ کے کمالات کا ذکر کیا . . . .

. . . اور کچھ رسالے جو آپ نے تصنیف فرمائے تھے۔ بادشاہ کی خدمت میں پیش کیے۔ بادشاہ جوہر شناس تھا۔ ان کی تربیت میں مصروف ہوا اور سرخوش کے قول کے مطابق

"می خواستند کہ بمرتبہ سعد اللہ خاں برسانند"

مگر زندگی نے وفا نہ کی۔ عالمگیر نے شروع شروع میں عرض مکرر کا عہدہ عطا کیا۔ جہاں سے شیخ ترقی کا قدم بڑی تیزی سے بڑھا کر بادشاہ کا مقرب بن گیا۔ ۱۸ جلوس عالمگیری کو بادشاہ حسن ابدال کے مقام پر مقیم تھا۔ شیخ نے رخصت طلب کی۔ بادشاہ نے منظور کر لی اور شیخ لاہور چلا آیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے بختاور خاں کو یہ غزل بھیجی۔ اس غزل میں اس نے بڑے موثر انداز میں دلی جذبات کا اظہار کیا ہے ؎

زدرد دل چہ نگارم کہ جوش بے تابست
زشوق جاں چہ نویسم کہ نامہ سیمابست

شب فراق چناں ریخت چشم خون دلم
کہ باز اشک گلابی و دیدہ عنابست

مگو نہ شرح دہم حال دل کہ بے تابم
زیاد تاب رخش دل کتاں ومہتابست

نشستہ ایم در بحر تا خدا چہ کند
نہ کشتی کہ زیک قطرہ آب گردابست

نماند صولت راز دلم نشان عزت
کہ دیدہ صفحہ تصویر رنگ بے خوابست

شاہ عنایت قادری شطاری

عالمگیر کے زمانے میں لاہور شریعت و طریقت کا مرکز تھا۔ اس عہد میں جن لوگوں نے بڑا نام پیدا کیا، ان میں شاہ چراغ اور شاہ عنایت خاص شہرت کے مالک ہیں۔ شاہ عنایت، رائیں قوم سے تھے۔ ان کا نام آج بھی بڑی عزت سے لیا جاتا ہے۔ خاندان علمی تھا اور درس و تدریس آبائی پیشہ۔ آپ کے والد مولوی پیر محمد لاہور چھوڑ کر قصور آباد ہو گئے۔ شاہ عنایت کی ولادت بھی قصور ہی میں ہوئی۔ یہ ۱۰۵۳ھ کا واقعہ ہے۔ جب آپ نے ہوش سنبھالا تو آپ کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ شروع ہوا۔ آپ بڑے ذہین اور ہوشیار تھے۔ اس لیے چھوٹی سی عمر میں آپ نے قرآن پاک حفظ کر لیا۔ بعضوں کا خیال ہے کہ اس وقت آپ پانچ برس کے تھے۔ بارہ برس کی عمر میں آپ نے سند فضیلت حاصل کی۔ یہ تو علوم ظاہری کی کیفیت تھی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آپ کے دل میں علوم باطنی کے حصول کا ولولہ پیدا ہوا اور کسی درویش کی تلاش میں گھر سے نکلے۔ گھومتے پھرتے لاہور پہنچے اور حضرت شاہ محمد رضا کے درس میں شریک ہو گئے۔ ان کی صحبت سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہی کے ہو گئے۔ ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کی سرپرستی میں سلوک کی منازل طے کیں۔ جب آپ نے منزل مقصود کو پا لیا تو آپ کے مرشد نے حکم دیا کہ آپ قصور واپس جائیں جہاں پنجابی زبان کے دو غیر فانی شاعر سید بلھے شاہ اور سید وارث شاہ آپ کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے۔ خلقت نے بڑی تیزی سے آپ کی طرف رجوع کیا اور ایک مدت قلیل میں آپ تقریباً تمام اہل قصور کی عقیدت کا مرکز بن گئے۔

حسین خاں افغان اس وقت قصور کا حاکم تھا، وہ یہ ہجوم دیکھ گھبرایا۔ اور اس میں وہ حق بجانب بھی تھا۔ کیونکہ حکومت میں آدمی اپنے سایہ سے بھی گھبراتا ہے۔ جس صورت میں کہ عوام دل و جان سے ایک درویش کے عقیدت مند ہو جائیں اور اس کے اشارہ چشم و ابرو پر اپنا سب کچھ قربان کرنے پر آمادہ رہیں تو پھر حاکم وقت کا خوف زدہ ہونا ایک لابدی امر ہے۔ اس نے طرح طرح کے حربے استعمال کئے کہ آپ پریشان ہو کر قصور چھوڑ جائیں۔ شروع شروع میں آپ نے پروا نہ کی اور چونکہ لاہور کی خاک پاک کی قسمت میں آپ کے قدم چومنا لکھا تھا اس واسطے ایک دن آپ نے اپنا دامن جھاڑا قصور کو خیرباد کہا اور لاہور چلے آئے۔ یہاں پہنچ کر آپ نے تدریس علوم ظاہری و باطنی جاری کی۔ دور دور سے لوگ حاضر خدمت ہوتے اور عالم و صوفی بن کر آپ کی درس گاہ سے نکلتے۔ آپ کے درس میں قرآن علوم و فنون، تفسیر اور حدیث اور فقہ کے علاوہ مثنوی مولانا روم، فصوص الحکم اور تصوف کی دوسری کتابوں کا درس بھی ہوتا تھا۔ کبھی کبھی محفل سماع بھی منعقد ہوتی۔ بڑے بلند پایہ قوال اس میں شریک ہوتے اور اکثر خواجہ حافظ، ملا محمد شیریں مغربی، احمد جام، فخر الدین عراقی، ملا شاہ بدخشی اور مولانا روم کے دیوان، شمس تبریز کی غزلیں گائی جاتیں۔

آپ بعض کتابوں کے مصنف بھی ہیں جن میں غایت الحواشی کی دو جلدیں اور کنز الدقائق کی شرح خاص طور پر مشہور ہے۔

آپ بچاسی برس کی عمر پا کر محمد شاہ کے زمانے میں ۱۱۴۱ھ (۱۷۲۸ء) میں فوت ہوئے۔ آپ کا مزار لاہور میں چڑیا گھر کے قریب ایک کوٹھی کے احاطے میں ایک اونچے چبوترہ پر واقع ہے۔

یہاں ہر سال ۱۲ ربیع الاوّل کو آپ کا عرس منایا جاتا ہے۔

آپ کی اولاد اب تک لاہور میں موجود ہے۔

۱۱۱۹ھ / ۱۷۰۷ء تا حال

عالمگیر کی وفات ایک بہت بڑے انقلاب کا پیش خیمہ تھی۔ مغلوں کی وہ عظیم الشان سلطنت جو ہمالیہ سے راس کماری تک اور بلخ و بدخشاں سے اراکان کی انتہائی حدود تک پھیلی ہوئی تھی، اس کا سنبھالنا اور اس کے نظم و نسق کو کامیابی سے چلانا بہادر شاہ کے بس کا روگ نہ تھا۔ عالمگیر نے اپنی زندگی میں ہر چند کوشش کی کہ وہ اپنے بعد کوئی لائق اور قابل جانشین چھوڑے مگر تخت و تاج کے تمام دعویدار عالمگیر کے مقابلہ میں کوئی ایسی صلاحیت نہ رکھتے تھے جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ وہ اس کے صحیح جانشین ثابت ہوں گے۔ جب یہ خیال آتا تو وہ مضطرب ہو کر رہ جاتا۔ شاہزادہ محمد سلطان البتہ کچھ صلاحیتیں رکھتا تھا۔ اورنگ زیب نے اس کی ہر نقل و حرکت پر نظر رکھی، اسے آدابِ شاہی سکھائے فنونِ سپہ گری میں طاق کیا مگر موت کے بے رحم ہاتھوں نے اسے عین عنفوانِ شباب میں باپ سے چھین لیا۔

بہادر شاہ

بہادر شاہ تخت کے دعویداروں کو شکست دے کر تختِ طاؤس کا وارث بنا۔ وہ عالم و فاضل ضرور تھا۔ حافظِ قرآن بھی تھا اور قرأت و تجوید کا ماہر بھی۔ مستعد خان ساقی لکھتا ہے کہ جب وہ قرآن کریم پڑھتا تو سامعین اثر میں ڈوب جاتے۔ علم حدیث میں وہ بڑے بڑے محدثوں سے بڑھا ہوا تھا۔ خوش نویسی میں بھی کچھ دسترس رکھتا تھا۔ عربی، فارسی، ترکی زبانوں میں خوب ماہر تھا۔ کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتا تھا۔ اس کی طبیعت کا رجحان شیعیت کی طرف تھا۔ چنانچہ اس نے جمعہ کے خطبہ میں حضرت علی کے نام کے آگے وصیٔ رسول اللہ کا لفظ بڑھانا چاہا۔ جس سے ملک کے تمام بڑے بڑے شہروں میں ہنگامے برپا ہو گئے۔ بہادر شاہ نے اس لفظ کی مخالفت کرنے والوں سے خود بحث مباحثہ کیا۔

جب وہ ۱۱۲۱ھ میں لاہور آیا تو یہاں بھی ہنگامہ برپا ہو چکا تھا۔ بہادر شاہ نے حکم دیا کہ خطیب جمعہ کے خطبے میں اس لفظ کو ضرور پڑھیں۔ اس وقت لاہور میں دو تین زبردست عالم تھے جو کلمۂ حق کہنے سے کبھی نہیں چوکتے تھے۔ درس و تدریس ان کا محبوب مشغلہ تھا اور اس شغلے کو وہ اپنی زندگی کا منتہائے مقصد سمجھتے تھے۔ ان میں حاجی یار محمد اور مولانا جان محمد بقول خافی خان "افضل الفضلائے لاہور" تھے۔ انھوں نے لاہور کے باقی علما کو اپنے ساتھ ملایا۔ ہجوم عام کے ساتھ شہر کے قاضی اور صدر کے گھر پہنچے۔ انھیں سمجھایا کہ وہ ایسا نہ کریں۔ مگر شاہی حکم سے وہ مجبور تھے۔ انھوں نے اس درخواست کو ٹالنا چاہا مگر عوام کے دباؤ سے انھوں نے اس کو ملتوی کر دیا۔ جب بہادر شاہ لاہور پہنچا تو اس نے اپنے اس حکم کی مخالفت کرنے والوں کو قلعۂ لاہور کے تسبیح خانہ میں طلب کیا۔ مولانا جان محمد، حاجی یار محمد، ملا محمد مراد تین چار اور فضلا کی معیت میں بادشاہ کے حضور میں پیش ہوئے۔ مزاج پرسی کے بعد بادشاہ نے انھیں بیٹھنے کا حکم دیا۔ عبدالقادر خان جو قاضی میر کا بھتیجا تھا دو چار اور فضلا کے ساتھ بادشاہ کے ہمراہ تھا۔ اس نے گفتگو کا سلسلہ چھیڑا اور بادشاہ کی حمایت کی۔ بادشاہ نے معتبر کتابوں اور حدیثوں کے علاوہ امام اعظم اور دوسرے امامانِ دین کی روایات وصی کے ثبوت میں پڑھیں بات بڑھتی گئی۔ حاجی یار محمد بڑی بے باکی سے بادشاہ کے ہر قول کی تردید کرتے جاتے تھے۔ سوال و جواب کا سلسلہ بڑھ گیا۔ بادشاہ طیش میں آیا۔ حاجی یار محمد نے اس طرح بادشاہ کے اقوال کے خلاف تقریر کی کہ اس سے گستاخی کا پہلو نکلتا تھا۔ بادشاہ نے بے قابو ہو کر کہا۔

"از غضب بادشاہاں نمی ترسی کہ چنیں خلاف آداب مجلس سلاطین کلام می نمائی"

حاجی یار محمد نے اس کا جواب بڑے اطمینان اور سکون سے دیا۔ اور کہا۔

"میں ہمیشہ خدا وند تعالیٰ سے چار چیزوں کے لیے دعا مانگا کرتا تھا۔ وہ مجھے علم کی دولت عطا کرے۔ کلام پاک حفظ کرنے کی توفیق دے۔ حج کی سعادت عطا فرمائے اور آخر میں شہادت کی نعمت بخشے۔ اس کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے پہلی تین نعمتیں مجھے عطا کر دی ہیں۔ ایک آرزو باقی ہے۔ مجھے امید ہے کہ عادل بادشاہ کی توجہ سے یہ بھی حاصل ہو جائے گی۔"

ان الفاظ نے بجلی کا کام کیا۔ بہادر شاہ خاموش ہو گیا۔ مجلس ختم ہوئی۔ گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ اس کے بعد کئی روز تک بحث و مباحثہ ہوتا رہا۔ لوگوں کا جوش بڑھتا گیا یہاں تک کہ ایک لاکھ کے قریب شہری حاجی یار محمد کے ساتھ مل گئے۔ بادشاہزادہ عظیم الشان بھی خفیہ خفیہ حاجی یار محمد کی مدد کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ شوال ۱۱۲۱ھ (۱۷۰۹ء) کے آخری دن آ گئے۔ صدر نے خطبہ کے بارے میں بادشاہ کے حضور میں عرضداشت پیش کی۔ بادشاہ نے اس پر لکھا کہ خطبہ جیسا عالمگیر کے وقت میں پڑھا جاتا تھا ویسا ہی پڑھا جائے۔ اس طرح یہ فتنہ فرو ہو گیا مگر شاہی غیض و غضب موقعہ اور وقت کی تلاش میں رہا۔ جب موقع پیدا ہوا تو حاجی یار محمد اور ان کے دونوں ساتھیوں کو کسی قلعہ میں نظر بند کر دیا گیا۔[1]

جہاندار شاہ، فرخ سیر اور محمد شاہ

بہادر شاہ مختصر سی حکومت کے بعد فوت ہوا تو پہلے جہاندار شاہ اور بعد میں فرخ سیر بادشاہ ہوئے۔ جہاندار شاہ نے اپنی ہوس پرستی اور فسق و فجور سے سلطنت کے وقار کو خاک میں ملا دیا۔ وہ ایک بازاری عورت لال کنور کے حسن پہ اتنا لٹو ہوا کہ وہ شراب پی کر اس کے ساتھ بہلی میں بیٹھ کر بازاروں میں گھومتا پھرتا۔ فرخ سیر، محمد شاہ، احمد شاہ، شاہ عالم ثانی، عالمگیر ثانی وغیرہ سب نام کے بادشاہ تھے۔ ان میں اسلاف کی کوئی خوبی نہ تھی۔ اور ویسے نادر شاہ کے حملے کے بعد پنجاب میں سکھوں کو غارت گری کرنے اور لوٹ مار مچانے کی پوری پوری آزادی حاصل ہو گئی تھی۔ ان حالات میں معارف نوازی، علم پروری اور درس و تدریس کا سلسلہ منقطع ہو جانا لازمی تھا۔ پھر بھی لاہور شہر کی چار دیواری میں قدرے امن و امان تھا۔ وہاں یہ جوت جلتی رہی۔ چنانچہ محمد شاہ کے دورِ حکومت میں مندرجہ ذیل عالم درس دیتے تھے۔

مولانا عابد لاہوری

آپ لاہور کے فخر تھے۔ بڑے عابد اور زاہد تھے۔ آپ کے بارے میں اکثر تذکروں میں لکھا ہے کہ آپ ہر رات نماز تہجد میں ساٹھ دفعہ سورۂ یٰسین پڑھا کرتے تھے۔ جب اسہال کی وجہ سے آپ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو اس معمول میں فرق آیا۔ آپ کی علمی مجلس میں تقریباً روزانہ دو سو عالم شریک ہوتے تھے۔ آپ نے بڑے ذوق و شوق سے پا پیادہ حج کیا۔ واپس آئے تو پھر اپنے معمولات میں مشغول ہو گئے۔ زہد۔ تقویٰ۔ علم و عمل میں آپ علمائے وقت سے گوئے سبقت لے گئے۔ آپ قرآن پاک کے مفسر تھے اور اپنے درس میں بڑے عجیب و غریب نکات پیدا کیا کرتے تھے۔ آپ نے ۱۱ رمضان ۱۱۶۰ھ (۱۷۴۷ء) کو وفات پائی۔ بہت سی کتابیں آپ کے نام پر منسوب ہیں جن میں بیضاوی کا حاشیہ، خلاصہ کیدانی کی

---

[1] منتخب اللباب جلد دوم واقعات ۱۱۲۱ھ

شرح رسالہ در وجود اعجاز قرآن اور شرح قصیدہ بانت سعاد اب بھی ملتی ہیں۔

مولانا شہر یار

جب احمد شاہ ابدالی نے میر منو کو شکست دے کر لاہور پر قبضہ کیا تو اس وقت ایک بڑے صاحب دل عالم مولانا شہر یار لاہور میں درس دیا کرتے تھے۔ ان کا مدرسہ چینیاں والی مسجد میں تھا نہ صرف پنجاب کے طالبانِ علم ان کے درس میں شریک ہوتے تھے بلکہ ہندوستان کی حدود سے باہر کے لوگ بھی ان کے درس میں شریک ہونا اپنی خوش قسمتی سمجھتے تھے۔

مولانا محمد صدیق

مولانا شہر یار کے ایک شاگرد مولانا محمد صدیق وزیر خاں کی مسجد میں درس دیا کرتے تھے۔ احمد شاہ نے خواہش ظاہر کی کہ وہ وزیر خاں کی مسجد میں عید کی نماز پڑھے گا۔ چنانچہ امرا اور وزرا کے علاوہ عوام جوق در جوق نماز میں شریک ہونے کے لیے مسجد میں جمع ہوئے۔ مولانا محمد صدیق نے نماز پڑھائی۔ جب انھوں نے خطبہ پڑھنا شروع کیا تو خطبہ کے دوران احمد شاہ ابدالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے سلطان العادل کہا۔ مولانا شہر یار ذرا دور بیٹھے تھے جب خطبہ ختم ہوا تو آپ آگے بڑھے کسی نے انھیں بتایا کہ آپ کے شاگرد نے محض خوشامد کی خاطر احمد شاہ کو سلطان العادل کہا ہے۔ حالانکہ افغانوں کے ظلم و ستم سے سارا شہر نالاں ہے۔ آپ امام کے قریب پہنچے۔ اس وقت احمد شاہ بھی وہاں کھڑا تھا۔ مولانا صدیق نے احتراماً اپنے استاد کے ہاتھ چومے۔ احمد شاہ نے پوچھا یہ کون ہیں؟ مولانا محمد صدیق نے کہا آپ مولانا شہر یار ہیں۔ احمد شاہ آپ کی شہرت سے واقف تھا۔ وہ بھی آداب و تسلیمات بجا لایا اور قدم بوسی کو جھکا مگر آپ نے روک دیا۔ اور فرمایا کہ شرعاً یہ جائز نہیں۔ پھر اپنے شاگرد کی طرف مخاطب ہوئے اور کہا:۔

"بیٹے! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ کونسا ظلم ہے جو پٹھانوں نے اہل شہر پر روا نہیں رکھا۔ انھوں نے جبر و تشدد کی انتہا کر دی ہے۔ کئی مرتبہ بادشاہ سے فریاد کی گئی مگر اس نے کوئی تدارک نہ کیا۔ نہ سپاہیوں کا ہاتھ روکا نہ مردادوں کو سرزنش کی۔

اسلام ایسے بادشاہ کو عادل کہنے کی اجازت نہیں دیتا۔"

مولانا کی اس تقریر سے گرد و پیش کھڑے ہوئے سب لوگ تھرا اٹھے۔ احمد شاہ نے آپ کو خاموش کرنا چاہا مگر آپ نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ آخر اس نے کہا۔

"حضرت! آپ کس کے بارے میں اور کس کے سامنے باتیں کر رہے ہیں؟"

مولانا شہر یار نے فرمایا۔

"میں خوب جانتا ہوں کہ میرا مخاطب احمد شاہ ابدالی ہے۔"

احمد شاہ نے کہا۔

"اس گفتگو کا انجام بھی آپ کو معلوم ہے؟"

مولانا شہر یار نے کہا۔

"ہاں۔ شہادت یا جلا وطنی مگر میں دونوں کے لیے تیار ہوں۔"

احمد شاہ نے طیش میں آکر آپ کی جلا وطنی کا حکم دیا۔ مولانا شہر بار ٹانڈہ ضلع ہوشیار پور میں جا کر آباد ہو گئے اور وہیں فوت ہوئے۔

رنجیت سنگھ

احمد شاہ ابدالی کے حملوں کے بعد پنجاب میں ہر طرف بدامنی کا دور دورہ تھا۔ اس کے بیٹوں اور پوتوں نے حالات پر قابو پانے کی کوشش کی مگر ان کے اپنے ملک میں اتنے فتنے پیدا ہو چکے تھے کہ وہ باہر کے معاملات کو سلجھا نہ سکے۔ چنانچہ سکھوں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور تمام پنجاب کو زیر و زبر کر دیا۔ آخر رنجیت سنگھ نے مہر مراد بخش کی مدد سے لاہور پر قبضہ کیا اور سکھوں کو منظم کر کے ایک زبردست طاقت بنا دیا۔ کھویا ہوا امن و امان ایک مرتبہ پھر بحال ہوا۔ اس نے شہر کے قاضی، مفتی اور دوسرے علماء وغیرہ کو بحال رہنے دیا۔ البتہ بعض مسجدوں کو اپنی تحویل میں لے کر بارود خانہ اور اصطبل بنا لیا۔ اس دور میں ایک مرتبہ پھر درس و تدریس میں تازہ بہار آئی اور پڑھنے پڑھانے کا مشغلہ جاری ہوا۔ علماء نے مسندِ درس پھر سے بچھائی اور طلبہ ادھر ادھر سے ان کے پاس آنے شروع ہوئے۔ مگر پہلی سی رونق اور پہلا سا جوش و ولولہ اور تحصیل علم کا ذوق و شوق پھر پیدا نہ ہوا۔ تاہم جن علماء نے اس کام کے لیے زندگیاں وقف کیں، ان میں سے چند یہ ہیں :۔

حافظ روح اللہ لاہوری

حافظ روح اللہ لاہور کی ایک نادرۂ روزگار ہستی تھے۔ ان کی زندہ کرامت یہ ہے کہ جب آپ نے حج کا ارادہ کیا اور اس نیت سے جہاز پر سوار ہوئے تو راستے میں رمضان شریف کا چاند نمودار ہوا۔ جس قدر ہمسفر تھے وہ آپ کے علم اور تقویٰ سے متاثر تھے۔ انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ آپ تراویح پڑھائیں۔ آپ نے ابھی تک قرآن پاک حفظ نہیں کیا تھا۔ مگر آپ نے ان سے وعدہ کر لیا۔ روزانہ ایک پارہ حفظ کرتے اور رات کو محراب سناتے۔ اس طرح تیس دن میں آپ نے قرآن پاک حفظ کیا۔

آپ ۱۱۷۱ھ / ۱۷۵۷ء میں دُنیا میں تشریف لائے۔ بچپن ہی سے آثارِ رشد و ہدایت آپ کے بشرے سے ہویدا تھے۔ تحصیل علم کا بڑا شوق تھا۔ مختلف درس گاہوں میں حاضر ہو کر صرف و نحو، منطق اور فلسفہ، معانی و بیان، حدیث و تفسیر میں کمال پیدا کیا۔ اپنے اساتذہ میں انھیں مولوی محمد سلیم لاہوری سے بہت عقیدت تھی۔ تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد آپ نے معلمی کا پیشہ اختیار کیا۔ یہ زمانہ بڑا پر آشوب تھا۔ سکھوں کی برچھاگردی کی وجہ سے تمام پنجاب فتنہ و فساد کا مرکز بنا ہوا تھا۔ کہیں بھی اطمینان و سکون میسر نہ تھا۔ ہر طرف بے اطمینانی اور پریشانی کے آثار تھے۔ سکھوں کے جتھے ہر طرف لوٹ مار مچائے ہوئے تھے۔ وہ جہاں جاتے مخلوقِ خدا کو قتل کرتے، کھیتوں کو لوٹ لیتے۔ گھروں کو آگ لگا دیتے اس سے کوئی شہر اور قریہ محفوظ نہ تھا۔ لاہور کے گلی کوچوں میں گھس کر لوٹ مار مچانے سے بھی سکھ دریغ نہ کرتے۔ اس پریشانی کے زمانے میں آپ نے بڑے اطمینان کے ساتھ اپنا درس جاری رکھا۔ شریعت کے آثار قائم کیے۔ جب رنجیت سنگھ کا قبضہ لاہور پر ہو گیا اور اس نے امن و امان اور نظم و نسق قائم کر لیا تو اس کے کانوں تک آپ کی شہرت پہنچی۔ اس نے آپ کو اپنے ہاں طلب کیا۔ آپ سے باتیں کیں اور بڑی عزت و احترام سے آپ کو رخصت کیا۔ جب تک آپ زندہ رہے مہاراجہ رنجیت سنگھ آپ کا احترام کرتا رہا۔ آپ نے حج کیا، مدینہ منورہ میں پہنچ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ پر حاضری دی تھوڑے قیام کیا۔ پھر وہاں سے لوٹے۔ یمن میں پہنچ کر ۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۸ء میں اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ آپ صاحبِ تصانیف ہیں۔[1]

---

[1] تذکرہ علمائے ہند صفحہ ۶۶۔

خلیفہ غلام رسول و غلام اللہ

رنجیت سنگھ کے زمانے میں یہ دونوں بھائی اچھی خاصی علمی شہرت رکھتے تھے۔ موراں طوائف، امرتسر والی مہاراجہ کی خاص منظورِ نظر تھی۔ مہاراجہ نے اسے خوش کرنے کے لیے روپیہ پیسہ پر اس کے نام کی ضرب لگائی۔ اس نے شاہ عالمی دروازے کے اندر سنہ ۱۲۲۴ھ / سنہ ۱۸۰۹ء میں ایک مسجد بنوائی۔ یہ مسجد بڑی خوبصورت اور دو منزلہ ہے۔ اس کے نیچے دوکانیں اوپر مسجد اور طلبہ کے رہنے کے لیے حجرے ہیں۔ موراں کو یہ شوق اس کی ماں بیگم جان سے ورثے میں ملا تھا۔ کیونکہ اس نے بھی باغبانپورہ میں ایک مسجد بنوائی تھی۔ موراں کو مسجد کی امامت اور درسگاہ کو چلانے کے لیے قابل اور فاضل آدمی کی ضرورت تھی۔ بہت تلاش کے بعد ان دونوں بھائیوں کے سپرد یہ کام کیا گیا۔ کہتے ہیں کہ خلیفہ غلام اللہ کا احترام مہاراجہ خود بھی کرتا تھا۔ جب آپ اس کے بیٹوں اور پوتوں کو پڑھانے جاتے تو مہاراجہ ان کی تعظیم کے لیے کھڑا ہو جاتا اور اس وقت تک کھڑا رہتا جب تک آپ چوکی پر نہ بیٹھ جاتے۔

ایک دفعہ شہزادہ شیر سنگھ کی ماں نے شکایت کی کہ خلیفہ غلام اللہ نے شہزادے کو بری مار دی ہے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے۔ مہاراجہ نے بڑے ٹھنڈے دل سے اس کی شکایت سنی اور آدمی بھیج کر آپ کو طلب کیا۔ جب آپ آگئے تو شہزادہ شیر سنگھ کو بلایا۔ جب وہ مہاراجہ کے روبرو آیا تو مہاراجہ نے خلیفہ صاحب کو ایک چابک دیا اور کہا کہ شہزادے کو خوب مارو۔ آپ ہچکچائے تو مہاراجہ نے ذرا تلخی سے ایسا کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ آپ نے شیر سنگھ کو چند بید لگائے۔ شہزادہ چیختا چلاتا جب وہاں سے چلا گیا تو مہاراجہ نے کہا اب کوئی آپ کی شکایت لینے کی جرأت نہیں کرے گا۔ ویسے آپ کو یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ہمارے بچے ذرا نازک اندام ہوتے ہیں۔ انہیں اتنی سختی سے سزا نہ دیا کیجیے۔ اس گفتگو کے بعد مہاراجہ نے آپ کو بڑی عزت اور آبرو سے رخصت کیا۔

مسجد موراں کا درس بڑا کامیاب رہا۔ ہندو مسلم سکھ ان کے درس میں شریک ہوتے تھے۔ یہ فارسی ادب کا درس ہوتا تھا۔ مسلمان نزدیک و دور سے منطق، معانی، صرف و نحو، حدیث اور تفسیر پڑھنے کے لیے یہاں آیا کرتے تھے۔ اس درس کی رونق مولانا غلام اللہ کے صاحبزادے خلیفہ حمید الدین کے وقت تک قائم رہی۔ مسجد اب بھی آباد ہے۔ درس ایک مدت ہوئی ختم ہو چکا ہے۔

مولوی غلام فرید

اپنے وقت کے علامہ تھے۔ ظاہری اور باطنی کمالات کے جامع، زاہد و عابد اور صوفی صافی تھے۔ دنیا سے متنفر اور دنیاداروں سے دور دور رہتے تھے۔ بہت سے دنیاداروں نے آپ سے تعلق پیدا کرنا چاہا مگر آپ بے تعلق ہی رہے۔ وقت کا بیشتر حصہ درس میں گزارتے اور باقی جتنا وقت بچتا اسے ذکر و فکر میں بسر کرتے۔

آپ کی وفات سنہ ۱۲۱۲ھ / سنہ ۱۷۹۷ء میں ہوئی۔

آپ کے صاحبزادے مولوی غلام رسول اپنے زمانے میں بڑی شہرت کے مالک تھے۔ بڑے تمکنت اور وقار کے ساتھ زندگی بسر کی۔ آپ اگر فلسفہ اور معقولات میں ید طولیٰ رکھتے تھے تو تفسیر حدیث اور دیگر منقولات میں یگانۂ روزگار تھے۔ علم کے طالب اور روحانیت کے متلاشی خود بخود آپ کی خدمت میں کھنچے چلے آتے تھے۔ صاحب حدائق الحنفیہ لکھتا ہے کہ:

"پنجاب میں کوئی علمائے وقت سے افادہ و افاضہ میں آپ کی ہمسری نہ کر سکتا

تھا۔ گویا خدا نے آپ کی ذات بابرکات کو دریائے فیض اور چشمۂ فضل پیدا کیا تھا۔"[1]

آپ نے ۱۲۵۰ھ / ۱۸۳۴ء میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

مولوی غلام فرید کے دوسرے صاحبزادے مولوی غلام اللہ بھی بڑے پایہ کے عالم تھے۔ آپ کی ذات میں دینی اور دنیوی دونوں علوم جمع تھے۔ سینکڑوں عالم آپ کے درس سے فاضل اجل بن کر نکلے۔ آپ کے درس میں فقہ، حدیث، تفسیر، ادب، منطق اور معانی پڑھانے کا خاص انتظام تھا۔ پنجاب میں علما کا شاید ہی کوئی خاندان ہو جو اس خاندان کا شاگرد نہ ہو۔ مولوی فقیر محمد جہلمی اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ "آپ تدریس و تعلیم میں متقدمین سے گوئے سبقت لے گئے تھے"۔[2]

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ آپ کس مسجد میں درس دیتے تھے۔

مولوی جان محمد لاہوری

مولوی جان محمد لاہوری عالم، فاضل اور بے نظیر واعظ تھے۔ علم کی ہر شاخ پر ان کی نظر تھی۔ بڑے متقی، پرہیزگار اور سنت کے سخت پابند تھے۔ بڑی مدت تک لاہور میں درس دیتے رہے۔ بہت سی کتابیں لکھیں جن میں سے اکثر آج ناپید ہیں۔ وعظ بڑا پر تاثیر ہوتا تھا۔ جو آپ کے وعظ میں شریک ہوتا تائب ہو کر اٹھتا، ہزاروں بے نمازی آپ کی توجہ سے صوم و صلوٰۃ کے پابند ہو گئے۔ آپ کے درس میں شریک ہونے والے اپنے وقت کے جید اور پاکیزہ بنے۔ علم اور عمل کے پیکر بن کر پنجاب کے ہر گوشے میں پھیل گئے۔ ان میں مولوی محمد عالم کھوڑی، مولوی کرامت اللہ، مولانا غلام محمد ملتانی، مولانا فخر الدین خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے پنجاب کے گوشے گوشے میں علم کا نور پھیلایا۔ یہ کہنا واقعات کے خلاف نہ ہوگا کہ پنجاب کا کوئی ضلع ایسا نہ تھا جو مولوی جان محمد لاہوری کے فیض سے محروم رہا ہو۔ آپ کا درس کشمیری بازار میں مسجد نور ایمان والا میں برسوں قائم رہا۔ آپ کی تصانیف میں زبدۃ التفاسیر، رسالہ اثبات خلافت امیر معاویہ، شرح قصیدہ بردہ، شرح قصیدہ امالی معراج نامہ، رسالہ حرمت تمباکو، رسالہ عدم فرضیت جمعہ وغیرہ مشہور ہیں۔

آپ ۱۱۹۳ھ / ۱۷۷۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۰ محرم ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۱ء) کو وفات پا گئے۔

مولوی غلام محی الدین بگوی

ضلع جہلم میں ایک گاؤں بگہ ہے۔ یہ کسی زمانے میں بہت بڑا علمی مرکز تھا۔ یہاں ایک خاندان آباد تھا جس میں پشت ہا پشت سے حفاظ چلے آتے تھے۔ اور ان میں سے اکثر صاحب تقویٰ و سجادہ ہوتے تھے۔ مولوی غلام محی الدین بگوی بھی اسی خاندان سے تھے۔ آپ کے والد حافظ نور حیات آپ کے دادا حافظ محمد شفا اور پردادا حافظ نور محمد بگوی تھے۔ آپ کے چھوٹے بھائی مولوی احمد دین بھی حافظ قرآن تھے۔ مولوی غلام محی الدین سوموار ماہ محرم ۱۲۰۳ھ (۱۷۸۸ء) میں پیدا ہوئے۔ حافظ حسن سے ناظرہ قرآن کریم پڑھا۔ قرآن کریم حفظ کرنے کا واقعہ بڑا عجیب و غریب ہے۔ صاحب حدائق الحنفیہ لکھتے ہیں:۔

"آپ نے تھوڑے عرصہ میں قرآن شریف ختم کر لیا تھا مگر حفظ نہیں کیا تھا۔ لیکن چونکہ آپ بڑے خوش آواز تھے اس لیے جب رمضان آیا تو لوگوں نے آپ کے والد ماجد

---

[1] حدائق الحنفیہ ص ۴۷۲ ۔ [2] حدائق الحنفیہ ص ۴۷۶

سے درخواست کی کہ اس رمضان میں غلام محی الدین سے قرآن سننا چاہیئے۔ اس پر آپ کے والد نے پوچھا کہ تم قرآن شریف سنا سکو گے۔ آپ نے کہا اگر آپ میرے ساتھ ایک پارہ روز دَور کر لیا کریں تو میں سناؤں گا۔ اس طرح سے آپ نے اسی رمضان میں قرآن شریف حفظ کر لیا اور سنا دیا۔ آپ سے پوچھا گیا کیا آپ تمام دن میں یاد کیا کرتے تھے۔ فرمایا نہیں صرف چاشت کے وقت تک ایک پارہ حفظ ہو جاتا تھا۔"[1]

آپ نے علمائے پنجاب سے پڑھنا شروع کیا۔ یہاں سے فارغ ہو کر آپ اپنے چھوٹے بھائی احمد دین کو ساتھ لے کر دہلی پہنچے اور بارہ برس تک تحصیل علم میں مصروف رہے۔ علم حدیث دونوں بھائیوں نے شاہ عبدالعزیز کے نواسے مولوی محمد اسحاق محدث دہلوی سے پڑھا۔ وہ آپ کی ذہانت سے متاثر ہو کر شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں لے گئے۔ انھوں نے حدیث کے بارے میں بہت سے سوالات کئے جن کا جواب آپ نے تسلی بخش دیا۔ شاہ صاحب بہت خوش ہوئے۔ آپ کے حق میں دعائے خیر کی اور سند حدیث بھی بخشی۔ جب آپ رخصت ہونے لگے تو نصیحت کی کہ " وطن جا کر کوئی ایسی بات نہ کرنا جس سے لوگوں میں تفرقہ پھیلے۔ جاؤ۔ لوگوں کو آپ سے بڑا فیض حاصل ہوگا۔"

آپ لاہور واپس آئے اور برابر تیس برس تک لالی مسجد میں درس دیتے رہے۔ آخر مرض استسقا میں مبتلا ہو کر بگہ واپس چلے گئے۔ چودہ برس تک بیمار رہے۔ اس حالت میں بھی درس کا سلسلہ جاری رکھا۔ سوموار کی رات ۲۹ یا ۳۰ شوال ۱۲۷۳ھ (۱۸۵۷ء) کو داعی اجل کو لبیک کہا۔[2] آپ کے دو بیٹے تھے۔ دونوں نے علوم و فنون کی بڑی خدمت کی۔ ان میں مولوی غلام محمد لاہور کی شاہی مسجد میں امامت کے فرائض ادا کرتے تھے اور مولوی عبدالعزیز بھیرہ کی جامع مسجد میں خطیب تھے۔ دونوں باپ کے سچے جانشین تھے۔

مولوی احمد دین بگوی آپ مولوی غلام محی الدین بگوی کے چھوٹے بھائی تھے۔ عجیب اتفاق ہے کہ آپ اپنے بھائی سے تیرہ برس چھوٹے تھے اور آپ کی وفات بھی بھائی کے تیرہ برس بعد ہوئی۔ آپ کی ولادت ۱۲۱۷ھ (۱۸۰۲ء) میں ہوئی۔ آپ نے مطول اور شرح وقایہ تک اپنے بھائی مولوی غلام محی الدین سے پڑھا۔ پھر بھائی کے ساتھ دہلی چلے گئے۔ وہاں چودہ برس رہے اور مختلف علوم و فنون حاصل کئے۔ حدیث آپ نے شاہ محمد اسحٰق محدث دہلوی سے پڑھی۔ اور انہی سے اجازت حاصل کی۔ آپ کی زندگی بڑے عجیب و غریب طریقے پر بسر ہوئی۔ یا تو آپ ذکر الٰہی میں مصروف رہتے یا چلتے پھرتے صحت و بیماری میں طالبانِ علم کو سبق پڑھاتے۔ مروت کا یہ عالم تھا کہ اگر آپ کا کوئی طالب علم بیمار ہو جاتا تو اس کے لیے اپنے ہاتھ سے دوا تیار کر کے اسے پلاتے اور جب تک وہ بیمار رہتا اس کی تیمار داری کرتے۔ آپ چھ مہینے بگہ میں درس دیتے اور چھ مہینے لاہور میں۔ درس میں آپ اپنے بھائی مولوی غلام محی الدین کے شریک رہے۔ ہزارہا عالم ان دونوں بھائیوں سے فیض یاب ہوئے۔ چونکہ آپ ہر وقت درس یا ذکر الٰہی میں مصروف رہتے اس لیے آپ نے بہت کم تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں۔ جو اس وقت موجود ہیں وہ بھی آپ کی نظر ثانی سے محروم ہیں۔ حاشیہ خیالی اور حاشیہ شرح ملا طبقہ علما میں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ آپ کا وصال ۱۰ شوال شنبہ ۱۲۸۶ھ (۱۸۷۰ء) کو ہوا۔ آپ کا مزار بگہ میں ہے۔

---

[1] حدائق الحنفیہ صفحہ ۴۷۷ - ۴۷۸ ۔ [2] تذکرہ علمائے ہند صفحہ ۳۷۰ ۔ حدائق الحنفیہ صفحہ ۴۷۷ ۔

مولوی غلام محمد بگوی

آپ مولوی غلام محی الدین بگوی کے فرزند اور جانشین تھے۔ باپ اور چچا کی طرح آپ نے بھی حضرت شاہ اسحٰق دہلوی سے تعلیم حاصل کی۔ قرآن و حدیث کے بہت بڑے فاضل اور لاہور کے سر برآوردہ علما میں شمار ہوتے تھے۔ کئی سال شاہی مسجد لاہور کے خطیب رہے۔ فتویٰ بھی چلتا تھا۔ آپ کے فتووں کا مجموعہ "فتاویٰ صابریہ" کے نام سے انجمن مستشار العلما نے شائع کیا تھا۔ ۱۹۰۰ء میں فوت ہوئے۔ ان کے انتقال کے بعد ۱۶ برس تک ان کے صاحبزادے مولوی محمد شفیق شاہی مسجد کے خطیب رہے [1]

حافظ ولی اللہ

پنجاب میں سکھ راج قائم ہو چکا تھا خطۂ کشمیر بھی سکھوں کے قبضہ میں آگیا تھا۔ کشمیر ان کے بے پایاں مظالم کے باعث تباہی کی حد تک آچکا تھا۔ اکثر کشمیری خانوادے سکھ گردی سے تنگ آکر کشمیر چھوڑ رہے تھے۔ ان میں مولوی حافظ ولی اللہ کا گھرانا بھی تھا۔ ان کے والد نے مع عیال کشمیر کو خیر باد کہا اور پسرور کے راستے لاہور پہنچے۔ حافظ ولی اللہ ان کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا جو ۱۲۵۱ھ / ۱۸۳۵ء میں پیدا ہوا۔ تین چار بھائی اور بھی تھے مگر سب ان پڑھ۔ ولی اللہ کو بچپن میں چیچک کا عارضہ لاحق ہوا اور ان کی بینائی زائل ہو گئی۔ باپ کے مرنے کے بعد وہ ایک بھائی کے پاس رہنے لگے مگر بھاوجہ کا سلوک ناروا تھا۔ اس سے تنگ آکر گھر سے بھاگ نکلے اور سیدھے مولوی غلام رسول قلعہ میہاں سنگھ والے کے پاس پہنچے۔ ان کے درس میں شریک ہوئے۔ علم دین پڑھنا شروع کیا۔ ان کے ہمدرس مشہور اہل حدیث مولوی محمد حسین بٹالوی تھے۔ اسی دوران مناظرے کا شوق پیدا ہوا۔ اس میں بھی کمال حاصل کیا۔ قرآن پاک حفظ کرنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ قلعہ میہاں سنگھ سے آپ لاہور آئے اور مولوی نور احمد اور مولوی احمد دین بگوی کے درس میں بھی شریک رہے۔ حافظہ بلا کا تھا۔ جو بات ایک مرتبہ سن لیتے پھر کیا مجال کہ وہ ذہن سے نکل جائے۔ کتابوں کے صفحے اور سطریں تک یاد تھیں۔ کوئی ملنے والا سالہا سال کی غیر حاضری کے بعد ملتا تو اس کی آواز سے اسے پہچان لیتے۔

۱۸۴۹ء میں پنجاب انگریزوں کے قبضے میں آیا۔ اس کے ساتھ ہی عیسائی پادریوں کو عیسائیت کی تبلیغ کے لیے کھلی چھٹی مل گئی۔ بڑے بڑے پادری لوگوں کے دین و ایمان پر ڈاکہ ڈالنے کے لیے پنجاب چلے آئے۔ پولیس ہر جگہ ان کی حفاظت کرتی۔ ان پادریوں میں ڈاکٹر فورمین، فنڈنر، پادری عماد الدین خاص شہرت اور خاص مقام کے مالک ہیں۔ حافظ ولی اللہ نے تحریری اور تقریری مناظروں میں ان سب کو شکست دی۔

آپ کے مشہور تلامذہ میں سے خان صاحب منشی سراج الدین میر منشی ریذیڈنسی کشمیر کے والد منشی محمد اسماعیل وکیل، میاں عبدالعزیز سابق صدر لاہور کارپوریشن کے والد مولوی الٰہی بخش، مولوی فتح محمد ہوشیار پوری، منشی عبدالکریم لاہوری اور مولوی اسماعیل پٹی والے تھے۔ آپ بڑے اثر و رسوخ کے مالک تھے۔ ایک مرتبہ آپ کے شاگرد محمد اسماعیل کا ہوشیار پور میں مناظرہ ہوا جس میں پادریوں کو قدم قدم پر شکست ہوئی۔ ان پے در پے شکستوں سے تنگ آکر پادریوں نے مولوی صاحب موصوف کو جھوٹے مقدموں میں پھنسانے کی کوشش کی۔ شاگرد نے حافظ ولی اللہ کو اطلاع دی۔ آپ فی الفور ہوشیار پور پہنچے۔ وہاں کے رہنے والوں کو جب آپ کی آمد کا پتہ چلا تو انھوں نے آپ کا پر جوش استقبال کیا۔ مولوی الٰہی بخش وکیل نے آپ کو اپنے ہاں

---

[1] تذکرہ مشائخ بگویہ صفحہ ۱۴۰۔

ٹھہرایا۔ آپ نے مقامی حضرات کو ساتھ لے کر شاگرد کے لیے کوشش شروع کی۔ آخر پادری فورمین نے مداخلت کی اور فریقین میں صلح صفائی ہو گئی۔

آپ کے معاصرین میں خلیفہ حمیدالدین، مولوی نور احمد مسجد نیلہ گنبد والے، مولوی حافظ سعدالدین مسجد کمان گراں بازار حویلی میاں خاں المتوفی ۱۸۸۱ء، مولوی حسام الدین ستھانوالے، مولوی غلام نادر بیگم شاہی مسجد والے، مولوی غلام محمد بگوی اور مولوی محمد دین آسمان علم و عرفان کے آفتاب و ماہتاب تھے مگر عوام میں جو اثر اور رسوخ آپ کو حاصل تھا وہ کسی اور کو حاصل نہیں ہوا۔ شرعی معاملات میں عوام اکثر آپ ہی کی طرف رجوع کیا کرتے تھے اور آپ کے فتاویٰ بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ عربی زبان پر آپ کو اتنا عبور تھا کہ لاہور میں اگر کوئی عرب آتا تو آپ گھنٹوں اس سے عربی میں گفتگو کرتے۔ آپ صاحب اولاد تھے مگر آپ کے سارے لڑکے آپ کی عین حیات میں فوت ہو گئے۔

آپ نے ۷۴ برس کی عمر میں جمعہ ۲۴ جمادی الاول ~~۱۲۹۶ھ~~ / ۱۸۷۹ء کو مرض اسہال سے وفات پائی۔ مزار آپ کا فلیمنگ روڈ پر قلعہ گوجر سنگھ کے قریب ہے۔ آپ کے نام پر محلہ شاہ ولی اللہ بھی مشہور ہے۔ کسی شاعر نے آپ کی تاریخ وفات یوں کہی ہے ؎

آں حافظ شیریں زباں داں واعظ خوش بیاں
شد روز آدینہ رواں زیں دار پر رنج و عنا
بود از جمادی اولیں تاریخ بست و چارمیں
پنہاں شدہ زیر زمیں آں صاحب فہم و ذکا
بلقیس پے سالش ورق بگذشت دل گفتش بسق
بنویس جاں دادہ بحق حافظ ولی اللہ ولی

شروع شروع میں آپ نے مسجد وزیر خاں میں درس دینا شروع کیا تھا مگر جب آپ کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تو ڈپٹی برکت علی شاہجہان پوری نے اس بات پر اصرار کیا کہ آپ شاہی مسجد کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنائیں اور وہیں درس دیا کریں۔ چنانچہ آپ نے ڈپٹی برکت علی کی درخواست کو قبول کرتے ہوئے شاہی مسجد میں درس شروع کیا اور زندگی کے آخری لمحوں تک وہیں درس دیتے رہے۔

مولوی حافظ غلام رسول چیٹ محلیا

آپ بڑے مشہور اور امیر کبیر گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس خاندان کا مورث اعلیٰ بابا حاجی نور محمد لکھیا ہے۔ ان کا محل سفید رنگ کا تھا۔ اس واسطے لوگ آپ کو چیٹ محلیا کہتے تھے۔ آپ اپنے وقت کے ملک التجار تھے۔ دولت گھر کی لونڈی تھی مگر آپ کے خاندان میں نسلاً بعد نسل حافظ قرآن ہوتے چلے آئے ہیں۔ آپ تجارت کے ساتھ ساتھ درس و تدریس اور وعظ و تذکیر کا سلسلہ بھی جاری رکھتے تھے۔ آپ محلہ پیر گیلانیاں کی مسجد میں عصر سے لے کر عشاء تک وعظ کہتے اور درس دیا کرتے تھے۔ بڑی لمبی عمر پا کر ۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۱ء میں فوت ہوئے۔

مولوی محمد دین فوقی

اسی خاندان سے ایک اور فاضلِ اجل بھی پیدا ہوئے۔ ان کا نام ابوالحسن محمد معروف بہ مولوی محمد دین فوقی تھا۔ آپ ۳ر جمادی الاول ۱۲۶۶ھ (۱۸۵۰ء) کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ سب سے پہلے قرآن پاک حفظ کیا پھر لاہور، کشمیر اور دیگر مقامات کے مشاہیر علماء سے استفادۂ علوم کیا۔ آپ کا وعظ بڑا پُر تاثیر ہوتا تھا۔ بڑی چھوٹی عمر میں آپ نے سندِ فضیلت حاصل کی۔ ابھی آپ بیس برس کے بھی نہ ہوئے تھے کہ صاحبِ درس ہو گئے۔ آپ اپنی مشہور تصنیف روضۃ الابرار میں لکھتے ہیں :-

"مسجد گیلانیاں واقعہ بلدہ لاہور میں، میں طلبہ کو درس دیتا تھا اور سلم العلوم جو علم منطق کی کتاب ہے پر طلبہ کے سامنے تقریر کر رہا تھا کہ میر عبدالقادر اندرابی معہ اپنے فرزند میر عبدالغنی اور اپنے برادر زادہ سید نور الدین کے موجود تھے۔ اسی وقت ایک خضر صورت مسجد میں آئے۔ میری تقریر سن کر بڑی مسرت ظاہر کی اور بزبانِ کشمیری میر اندرابی مرحوم سے کہا کہ اس لڑکے کی تقریر سے فضلائے کشمیر کی تقریر دل کی خوشبو آ رہی ہے۔ یہ نوجوان انشاء اللہ روز بروز ترقی کرے گا۔" [۱]

آپ نے بادشاہی مسجد میں بھی وعظ کیا جہاں لاہور کے نامی علماء اور رؤسا بھی موجود تھے۔ اسی جگہ آپ کا تعارف خان بہادر فقیر شمس الدین مرحوم سے ہوا جو آخری دم تک آپ کی قدر کرتے رہے۔ ڈاکٹر لائٹنر کے ایما پر آپ نے پنجاب یونیورسٹی کے بہت سے امتحانات پاس کئے۔ ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳ء) میں آپ اورینٹل کالج میں استاد لے لیے گئے۔ آپ عربی، فارسی کے علاوہ انگریزی بھی جانتے تھے، کئی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں روضۃ الابرار، روضۃ الادباء، تفسیر فتح العظیم، تبیان الصنائع، شرع محمدی، بستان محمدی، تاریخ کشمیر، رفیقی نامہ، رسالہ در علم منطق و فلسفہ و تاریخ، ایام الجاہلیہ وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اسلامی مدارس کا خاتمہ

۱۸۴۹ء میں پنجاب پر انگریزوں کا قبضہ ہوا۔ اس سے پہلے سکھ یہاں حکمران تھے ان کا دورِ حکومت خدا کا قہر تھا جو مسلمانوں پر نازل ہوا اور جس نے مسلمان کو خوابِ غفلت سے جھنجوڑ جھنجوڑ کر جگانے کی کوشش کی مگر نیند کے ماتے ایسے سوئے کہ انھیں خبر تک نہ ہوئی کہ ان کے مٹانے کے لیے کیا ہو رہا ہے۔ سکھوں کی چند روزہ حکومت میں اسلامی ثقافت، تمدن، معاشرت اور تہذیب کو ملیا میٹ کرنے، ان کے عرفانی نقوش مٹانے اور ان کے علوم و فنون کو تباہ و برباد کرنے کی بے حد کوشش ہوئی مگر اس کے مٹانے والے خود مٹ گئے۔

چنانچہ ۱۸۵۵ء میں مسٹر آرنلڈ ڈائرکٹر سررشتۂ پنجاب نے سب سے پہلی تعلیمی رپورٹ مرتب کی۔ اس میں اس نے لکھا :-

"معلمی کا میدان مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے مسلمان طلبہ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ہندو طالب علموں کو بھی مسلم اساتذہ پر بے حد اعتماد ہے۔ وہ اسلامی مدارس میں بڑی کثیر تعداد میں فارسی پڑھتے ہیں۔ اگر اس چیز کو اسی حالت میں چھوڑ دیا گیا تو حکومت کی تمام طاقت مسلمانوں کے ہاتھ آ جائے گی۔"

---

[۱] روضۃ الابرار صفحہ ۴۴

یہ ایک میلان ہے جسے بہت جلد روکنے کی ضرورت ہے۔"

برطانوی حکومت نے مسٹر آرنلڈ کی نصیحت پر عمل کیا چنانچہ اس کے چار برس بعد ۱۸۶۱ء میں کپتان فلر ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب و سرحد نے جب اپنی رپورٹ تیار کی تو اس میں لکھا :-

"مسلمان اساتذہ بکثرت ان درس گاہوں میں ٹریننگ حاصل کر رہے ہیں۔ ان کی اکثریت بالکل واضح ہے۔ محکمہ میں تین سو چونتیس استاد مسلمان ہیں۔ گیارہ ہندو اور چھ دوسرے فرقوں کے۔ کسی اس نسبت کو مساوی کرنے کا موقع نہیں ملا۔ حلقہ انبالہ کے سوا دیسی زبانوں کی تعلیم ہر جگہ مسلم اساتذہ کے ہاتھ میں ہے۔ جب تک یہ استاد ہر دلعزیز ہیں ہم ان کی جگہ دوسری قوموں کے استاد مقرر نہیں کر سکتے البتہ افسران ضلع رفتہ رفتہ راستہ صاف کر کے تبدیلی کے امکانات پیدا کر سکتے ہیں اور وہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ ہندوؤں کو ٹریننگ سکول میں جانے کا شوق دلائیں اور جو سکول مسلم استادوں کے تقرر پر زیادہ اصرار نہ کریں وہاں ہندو استاد تعین کئے جائیں۔"

کپتان فلر کی تجاویز پر فوراً ہی عمل درآمد شروع ہو گیا۔ مسلمان اساتذہ کی تعداد ہر طرح سے گھٹانے کی تجویزیں ہونے لگیں اس کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے شہروں اور صدر مقامات پر انگریزی مدارس بھی قائم کئے گئے جن کا سارا انتظام اور کام غیر مسلموں کے ہاتھ میں تھا چنانچہ تھوڑا ہی عرصہ بعد یہ معلوم ہوا کہ نئے جاری شدہ اسکولوں کے چھبیس ہیڈ ماسٹروں میں کل تین مسلمان ہیڈ ماسٹر ہیں۔ اس پالیسی پر عمل ہوتا رہا۔ واقعات و حالات میں تغیر اور انقلاب پیدا ہوا۔ پچیس سال کے عرصے میں ہوا کا رخ بالکل بدل گیا مسلمان اس میدان سے زبردستی نکال دیئے گئے۔ چنانچہ ۱۸۸۲ء کے بعد کی رپورٹوں کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت پورے طور پر سامنے آجاتی ہے کہ محکمہ تعلیم مسلمانوں سے یکسر خالی ہو گیا۔ اور اگر کہیں خال خال مسلم اساتذہ نظر آتے تھے تو وہ صوبہ سرحد تھا جو ان ایام میں سررشتہ تعلیم پنجاب سے وابستہ تھا اور ہندو اور غیر مسلم استاد وہاں جانے سے گھبراتے تھے۔

یہ تصویر کا ایک رخ تھا۔ دوسرا رخ اس سے بھی زیادہ خطرناک تھا۔ یہ عیسائی قوم کی اسلام پر یورش تھی چنانچہ انیسویں صدی کے ربع اول میں ایک مدبر نے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ اسلام کی جلالت و جبروت کا عنقریب خاتمہ ہونے والا ہے اور وہ زمانہ دور نہیں جب چاروں طرف مسیحیت کا غلبہ ہو گا۔

انجمن حمایت اسلام کا قیام

عیسائیوں نے جا بجا مشن اسکول جاری کیے، ہسپتال بنائے اور برطانیہ کی سنگینوں کے سائے میں عیسائیت کی تبلیغ شروع کی۔ مدرسوں میں انجیل کی تعلیم لازمی قرار دی۔ اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۸۴ء میں ایک بار توحید زاوی تثلیث کی آغوش میں کھینچ لی گئی۔ یہ اس وقت کے مسلمانوں کے لیے بہت بڑا چیلنج تھا۔ ان میں ہل چل پیدا ہوئی حتیٰ کہ اس طبیعتوں میں جوش حمیت طوفان بن کر اٹھا۔ عیسائیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لیے مدافعانہ اقدام کی ضرورت محسوس کی گئی اور انجمن حمایت اسلام وجود میں آئی۔ ابتدا میں اس انجمن کا دائرہ کار تبلیغ اسلام تک محدود تھا مگر اس نے عملی قدم اٹھا کر عیسائیت کے اس چیلنج کا منہ توڑ جواب دیا۔

مدرسۂ حمیدیہ انجمن نے تمام بڑے بڑے عالموں کو اپنے گرد جمع کیا اور ان کی مدد سے زنانہ و مردانہ اسلامی مدارس کے علاوہ ایک خالص دینی درس گاہ کی بنیاد بھی رکھی۔ یہ مدرسہ حمیدیہ تھا جو لاہور کے ایک بہت بڑے عالم اور مفتی قاضی حمید الدین کے نام پر قائم ہوا۔ قاضی حمید الدین انجمن حمایت اسلام کے بانیوں میں سے تھے خلیفہ شجاع الدین مرحوم انہی کے پوتے تھے۔ یہ مدرسہ بیسویں صدی کے پہلے عشرے تک بڑی آب و تاب سے کام کرتا رہا۔ بعد میں نامساعد حالات کی بنا پر بند ہو گیا۔ اس مدرسہ کے اساتذہ میں قاضی حمید الدین کے علاوہ مولانا غلام اللہ قصوری، مفتی محمد عبد اللہ ٹونکی، علامہ اصغر علی روحی، حکیم غلام مصطفٰے اور مولانا محمد ذاکر بگوی خاص طور پہ قابلِ ذکر ہیں۔

انجمن نعمانیہ انجمن کے دوش بدوش ایک اور انجمن قائم ہوئی جو اب تک موجود ہے۔ یہ انجمن نعمانیہ ہے۔ اس درسگاہ نے ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۷ء میں جنم لیا۔ اس کے بانیوں میں مولوی خلیفہ تاج الدین، علامہ حکیم سلیم اللہ، حافظ عمر الدین، ڈپٹی غلام حسین، مولوی محرم علی چشتی، منشی سراج الدین (جو بعد میں پوسٹ ماسٹر جنرل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے) تھے۔ یہ انجمن خالص مذہبی تعلیم کے لیے عالم وجود میں آئی۔ اس نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ وہ اپنے مقصد سے ہٹ کر ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارے حالانکہ ایسے بیسیوں مواقع پیدا ہوئے۔ اس انجمن نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ وہ اپنی درس گاہ کے لیے بہترین اساتذہ مہیا کرے جو راسخ العقیدہ حنفی ہوں۔ اس مقصد کے لیے اس نے تمام ہند و پاکستان کی وسعتوں سے جہاں بھی کوئی قابل، لائق، نیک دل عالم ملا، اس کی خدمات ہر قیمت پر حاصل کیں۔ انجمن کا دوسرا پہلو جو خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، وہ یہ ہے کہ وہ طلبہ کے طعام و قیام اور دیگر ضروریات کا بوجھ بھی اٹھاتی ہے۔ اس کے قبضے میں ایک عظیم الشان کتب خانہ بھی ہے جسے کئی بار بعض بے دردوں نے لوٹا اور چوری پر پردہ ڈالنے کے لیے آگ بھی لگائی۔ اس دست برد کے باوجود کسی اور دینی مدرسے کے پاس اتنا اچھا کتب خانہ نہیں۔ البتہ اسے از سرِ نو مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔

مدرسۂ نعمانیہ کے اساتذہ میں بعض بڑی نامور ہستیاں ہوئی ہیں جن میں شیخ الحدیث علامہ مفتی معین الدین اجمیری، سید محمد دیدار علی شاہ، مولانا عبد الحق سہارنپوری، مفتی محب النبی، مفتی محمد عبد اللہ ٹونکی، مولانا غلام مرشد اور قاضی سراج احمد ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ یہاں کے فارغ التحصیل حضرات میں سید حافظ پیر جماعت علی شاہ علی پوری، سید مہر علی شاہ گولڑوی، مفتی محمد شریف محدث کوٹلی لوہاراں (سیالکوٹ)، پروفیسر سید محمد طلحہ ٹونکی، مولانا نور الحق (ریٹائرڈ پروفیسر اورینٹل کالج) نے بڑی شہرت پائی ہے اور تمام عمر دین کی خدمت کرتے رہے ہیں۔ اب یہ مدرسہ کچھ ایسی قابلِ اطمینان حالت میں نہیں۔

ان کے علاوہ اچھرہ میں حاجی قمر الدین مرحوم کا درس، دہلی دروازہ میں حزب الاحناف کا دار العلوم، شیرانوالہ دروازہ میں انجمن خدام الدین کا مدرسہ قاسم العلوم، اہل حدیث کا جامعہ سلفیہ، فیروز پور روڈ پر مفتی محمد حسن مرحوم کا جامعہ اشرفیہ، مزنگ میں مدرسہ عزیزیہ اور جامع حنفیہ، گڑھی شاہو میں جامعہ نعیمیہ اور دیگر چھوٹے چھوٹے مدرسے قدیم علوم و فنون کی اشاعت میں مصروف ہیں۔

مساجد

[عہدِ غزنوی سے زمانۂ حال تک]

محمد عبداللہ قریشی

لاہور بہت پرانا شہر ہے۔ یہ دریائے راوی کے مغربی کنارے پر واقع ہے اس کے نام کو دہلی کے راجہ دیپ چند کے بھتیجے لہر چند یا راجہ رام چندر جی کے بیٹے لوہ یا لامے سے نسبت دے کر لوہر لوپر، لوہور، لہور، لہاوور، لہنور، لہانور وغیرہ بتلاتے ہیں مگر مسلمان جغرافیہ دان کی تصنیف "حدود العالم" سے پہلے ہندو ادب کی کسی کتاب میں، خواہ وہ افسانوی ہو یا مذہبی، اس کا ذکر تفصیل سے نہیں ملتا۔ یہ کتاب ۳۷۲ھ / ۹۸۲ء کی تصنیف ہے اور فارسی میں ہے۔ اس وقت لاہور کا علاقہ ملتان کے قریشی حاکم کے ماتحت تھا مگر لاہور میں مسلمانوں کی کوئی عبادت گاہ موجود نہ تھی کیونکہ تمام باشندے بت پرست تھے البتہ کھجور، بادام اور نارجیل کے درخت یہاں بکثرت پائے جاتے تھے۔

سلطان محمود غزنوی نے ۴۱۲ھ / ۱۰۲۱ء میں شمالی ہند کا علاقہ فتح کیا۔ اس میں لاہور بھی شامل تھا۔ اس فتح کی یادگار میں اس نے قلعہ میں ایک مینار تعمیر کیا اور شہر میں ایک مسجد بنوائی جسے "خشتی مسجد" کہتے ہیں[1]۔ یہ پہلی اسلامی عمارت تھی جو لاہور میں قائم ہوئی لیکن آج اس کے کوئی آثار موجود نہیں البتہ لاہور میں محمود کے پہلے باقاعدہ گورنر ملک ایاز کی قبر اب بھی رنگ محل کے چوک میں دیکھی جا سکتی ہے۔ وہ ۴۴۹ھ / ۱۰۵۷ء میں فوت ہو کر یہاں دفن ہوا۔ اس کی قبر کے مغرب میں ایک چھوٹی سی مسجد بھی ہے جس میں چند نمازی نماز پڑھ سکتے ہیں۔

غزنوی بادشاہوں نے لاہور کا نام ہی محمود پور رکھ دیا تھا۔ شالامار باغ کے قریب محمود بوٹی گاؤں بھی شاید اسی زمانے کی یادگار ہو۔ شیخ احمد زنجانی نے رسالہ تحفۃ الواصلین ۴۳۵ھ / ۱۰۴۳ء میں بعہد سلطان مسعود غزنوی لاہور میں بیٹھ کر لکھا۔ اس میں شہر کے علما و فضلا کے حالات مل جاتے ہیں۔

اسی زمانے میں آگے پیچھے سید اسمٰعیل غزنوی، شاہ حسین زنجانی، حضرت علی ہجویری اور شاہ یعقوب زنجانی صدر دیوان

---

[1] ڈاکٹر محمد باقر - DIGGING LAHORE TO DISCOVER ITS PAST

لاہور تشریف لائے اور انھوں نے یہاں اسلام کی تبلیغ کی۔

سید اسمٰعیل غزنوی ۴۴۸ھ/۱۰۵۶ء میں فوت ہوئے اور ہال روڈ پر ان کا مزار ہے۔[1] آپ لاہور کے پہلے واعظ تھے جو ۳۹۵ھ/۱۰۰۵ء میں بخارا سے لاہور آئے۔ جامع علوم ظاہری و باطنی تھے۔ آپ کی مجالس وعظ میں خلق کثرت سے جمع ہوتی تھی۔ ہندو ہزاروں کی تعداد میں آپ کے وعظ سن سن کر حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ یہ پتہ نہیں چل سکا کہ وہ کس مسجد میں وعظ فرماتے تھے۔ اور ان کی تبلیغ کا مرکز کونسا تھا۔ غالباً یہی علاقہ ہوگا جس جگہ آپ کا مزار واقع ہے۔

شاہ حسین زنجانی مصری شاہ سے آگے اونچی ٹیکری پر ایک خانقاہ میں آسودہ خواب ہیں۔ ان کی خانقاہ کے ساتھ بھی ایک مسجد اور کنواں ہے جس سے ارد گرد کا تمام علاقہ چاہ میراں (میراں دی کھوئی) کہلاتا ہے۔ مسجد کی حال ہی میں توسیع ہوئی ہے۔

سید علی ہجویری ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء میں فوت ہوئے۔ ان کا پُر رونق مزار "دربار داتا گنج بخش" کہلاتا ہے۔ اس مزار کے ساتھ بھی ایک مسجد ہے جسے ابتدا میں حضرت نے خود تعمیر کرایا تھا۔ دارا شکوہ نے سفینۃ الاولیاء میں لکھا ہے کہ "جو مسجد آپ نے تعمیر کرائی، اس کا محراب دوسری مساجد کی نسبت ذرا سے جنوب کی طرف مائل تھی۔ علمائے وقت نے اس پر اعتراض کیا کہ قبلہ صحیح نہیں۔ آپ نے علماء کو دعوت دی اور خود امام بن کر نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد آپ نے حاضرین سے فرمایا کہ اب دیکھو کعبہ کس سمت ہے؟ تمام حجابات درمیان سے اٹھ گئے اور کعبہ سامنے نظر آنے لگا۔ قبلہ کو اپنے سامنے بالمشافہ موجود پا کر تمام علماء معذرت خواہ ہوئے اور اس کرامت کی بدولت آپ کی شہرت نزدیک و دور سب جگہ پھیل گئی۔

اس قدیم مسجد کو پہلے گلزار شاہ سادھو (کشمیری) کے حسن سعی سے مرمت نصیب ہوئی۔ پھر جھنڈو چوب فروش نے اس کی مرمت کرائی۔ اب ہمارے عہد کے رئیس میاں غلام رسول کھٹر والا نے ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء میں اس کی توسیع کر کے از سر نو تعمیر کرایا۔ اب یہ مسجد بہت شاندار ہے۔ اس وقت مسجد کے صحن کا رقبہ دو ہزار آٹھ سو سولہ مربع فٹ اور مسجد کے دالان کا دو ہزار مربع فٹ ہے۔ صحن کے ایک کونے میں وضو کے لیے حوض بھی ہے۔ اوقاف کمیٹی نے مزار کا انتظام اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد مسجد کی مزید توسیع کا منصوبہ بنایا ہے۔ مسجد کے دروازے پر علامہ اقبال کا کہا ہوا یہ قطعۂ تاریخ کندہ ہے:

سال بنائے حرم مومناں	خواہ ز جبریل و ز ہاتف مجو
چشم بہ المسجد الاقصیٰ فگن (۴)	المسجد الاقصیٰ مبارکہ (۱۳) ہم بگو

شاہ یعقوب زنجانی صدر دیوان کا انتقال ۶۰۱ھ/۱۲۰۴ء میں ہوا۔ ان کا مزار میو ہسپتال کے پاس رتن چند کی سرائے کے مغرب میں واقع ہے۔ مزار کے ساتھ ایک قدیم مسجد بھی ہے۔ پہلے یہاں تین گنبدوں والی مسجد تھی جو شکستہ ہو جانے کی وجہ سے اب نئی بنا دی گئی ہے۔

---

[1] پنجاب میں اردو صفحہ ۴۴

میکلوڈ روڈ سے ذرا ہٹ کر حضرت عبد الجلیل چوہڑ شاہ بندگیؒ کے احاطے میں بھی مزار کی غربی سمت ایک چھوٹی سی پرانی مسجد موجود ہے جو سلطان بہلول لودھی کے زمانے میں شیخ عبد الجلیلؒ نے خود اپنی عین حیات میں بنوائی تھی۔ عمارت پہلے گنبد دار تھی۔ اب معمولی ہے وقتاً فوقتاً اس کی مرمت ہوتی رہی ہے۔ ۱۹۳۹ء میں پیر غلام دستگیر نامی نے اس کی مرمت کرائی اور مسجد کی شرقی دیوار پر یہ کتبہ نصب کرایا:۔

افضل الذکر لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

مسجد جلیلہ

تعمیر اول قبل سنہ ۹۱۰ھ / ۱۵۰۴ء از حضرت عبد الجلیلؒ

تعمیر ثانی در سنہ ۱۳۲۹ھ مطابق سنہ ۱۹۱۱ء

تجدید فرش وغیرہ در سنہ ۱۳۵۸ھ مطابق سنہ ۱۹۳۹ء

ابو الافضل نامی متولی اوقاف اشرف[1]

بی بی پاک دامناں کا قبرستان جو ایمپرس روڈ اور میو روڈ کے درمیان واقع ہے لاہور کا سب سے قدیم قبرستان ہے۔ اس کی قدیم عمارات میں سے ایک مسجد اب بھی موجود ہے جو مغل عہد میں تعمیر ہوئی تھی اور آج سے ایک صدی پیشتر میاں نور الٰہی والا نے اس کی مرمت کرائی تھی۔

کوٹ خواجہ سعید میں گنبد شہزادہ پرویز اور مزار احمد علی کے درمیان ایک بلند ٹیلے پر قبروں میں گھری ایک پرانی سی محراب نظر آتی ہے جسے سید محمد لطیف نے تاریخ لاہور (صفحہ ۱۶۱) میں حجرہ میر مہدی لکھا ہے۔ اس میں آدمی کھڑا ہو کر بآسانی نماز ادا کر سکتا ہے۔ اس پر نہایت اعلیٰ رنگ کاری اور نقاشی کی ہوئی ہے۔ محراب کی پیشانی پر ابھرے ہوئے حروف میں لکھا ہے:۔

اللھم صل علی محمد وعلی آل محمد بعدد من قعد وقام

اور اسی طرح محراب کے دونوں کونوں میں سورج مکھی پھول کے درمیان کلمہ طیبہ یوں کندہ ہے:۔

لا الٰہ الا اللہ

محمد رسول اللہ

ڈاکٹر عبد اللہ چغتائی کا خیال ہے کہ یہ کتبے خط طغرا میں ہیں جو مغلوں سے پہلے یہاں رائج تھا۔ اس لحاظ سے یہ محراب کسی ایسی عید گاہ کی ہے جس کی ساخت عہد سادات دہلی کی عمارات سے ملتی جلتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ۸۲۵ھ / ۱۴۲۱ء میں جب سید مبارک شاہ نے یہاں آکر لاہور کو از سر نو آباد کیا تو یہ عمارت اس نے بنوائی ہو[2] مگر محکمہ آثار قدیمہ کے

---

[1] تاریخ جلیلہ۔

[2] ڈاکٹر عبد اللہ چغتائی "لاہور کی چھ سو سال پرانی عید گاہ" مطبوعہ پاکستان ٹائمز لاہور۔

سپرنٹنڈنٹ محمد ولی اللہ خاں اپنی تحقیقات[1] میں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ محراب مغلوں کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتی ہے کیونکہ اس پر جو کلمہ اور درود لکھا ہے وہ خطِ طغرا میں نہیں بلکہ نسخ میں ہے جو سترھویں صدی عیسوی کے شروع میں مقبول ہوا۔ پھر اس پر جو مسالہ استعمال کیا گیا ہے وہ نہایت معمولی قسم کا ہے جو اس دور کی شاہی عمارات میں نہیں ملتا۔ ایسی حالت میں یہ محراب نہ کسی مسجد کی ہے نہ عیدگاہ کی بلکہ اکبری دور کی جنازگاہ کی ہے بہر حال کچھ بھی ہو اور کسی عہد کی ہو عمارت اس قابل ہے کہ اس کی حفاظت کی جائے۔

ایسی ہی ایک شکستہ محراب جس پر کاشی کے رنگین نقش و نگار کئے ہوئے ہیں، قبرستان میانی صاحب کی جنازگاہ کے قبروں کے درمیان سوگوار کھڑی ہے۔ یہ شاہجہانی عہد کی کسی عیدگاہ یا جنازگاہ کی نشانی معلوم ہوتی ہے مگر اب اس کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ اور اس کے نقش و نگار پر چونے کا پلستر کر دیا گیا ہے۔

لاہور کے مختلف گوشوں میں اور بھی کئی عیدگاہیں تھیں جو اب مٹ چکی ہیں یا بے توجہی کا شکار ہو گئی ہیں۔

مقصدِ بیان یہ ہے کہ لاہور میں بادشاہوں، بیگموں، رئیسوں، امیروں اور اہلِ ثروت لوگوں سے لے کر بے نوا فقیروں تک نے مسجدیں تعمیر کرائی ہیں۔ تقریباً تمام خانقاہوں، قبرستانوں اور تکیوں کے ساتھ مسجدیں ہیں اور بعض بزرگ تو مسجدوں کے گوشے آباد کئے بیٹھے ہیں تاکہ کوئی نمازی نماز پڑھنے آئے تو ان کی قبروں پر فاتحہ بھی پڑھ جائے۔ یہ تمام مسجدیں فنِ تعمیرات کے مختلف نمونے پیش کرتی ہیں اور ان سے بنانے والوں کے ذوق، ظرف، جذبات اور خلوص کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں چھوٹی سے چھوٹی بھی ہیں اور بڑی سے بڑی بھی۔ کئی مسجدیں زمین کی سطح سے بلند ہیں اور کئی نیچی، عالی شان و شکوہ والی بھی ہیں اور غریبانہ بھی جو زبانِ حال سے کہہ رہی ہیں ؎

غریب خانہ کے دیکھو تکلفات آ کر
کہ فرش خاک بھی ہے اس پہ بوریا بھی ہے

پھر اس کارِ خیر میں مردوں ہی نے نہیں عورتوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے اور بڑی نادر یادگاریں چھوڑ کر دین و مذہب سے اپنی شیفتگی کا ثبوت دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مسجدیں دیوؤں اور جنوں کے کارنامے معلوم ہوتے ہیں اور بعض پریوں کے شاہکار۔ بعض مساجد سے اسلام کی قوت و سطوت کا اظہار ہوتا ہے تو بعض سے مسلمانوں کی دولت و ثروت کا۔ بعض نقاشی، مصوری اور خطاطی کے لیے مشہور ہیں تو بعض فنِ تعمیر کی خوبیوں اور سنگ تراشی کے لیے۔ ؏

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

اب بعض مسجدیں تو انقلابِ زمانہ کے ہاتھوں مٹ چکی ہیں مگر بعض صدیوں سے حوادث کے تھپیڑے کھا رہی ہیں اور تاریخ کے اوراق ان کا نام کبھی نہ مٹا سکیں گے۔

اس طرح لاہور کے ہر گلی، کوچے، بازار، دفتر، باغ و راغ اور بستی میں کوئی نہ کوئی مسجد موجود ہے اور آئے دن ان میں

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھئے پاکستان ٹائمز لاہور بابت ۲۹ اگست ۱۹۵۵ء و ۳ فروری ۱۹۵۷ء۔

اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ تقسیم ملک سے پہلے جب ہندو اور سکھ یہاں ملی جلی آبادیوں میں رہتے تھے تو ایک وقت ایسا بھی آگیا تھا کہ مسلمانوں کے بہت سے مکان ہندو ساہوکاروں کے پاس قرضے میں چلے گئے تھے اور بعض محلوں سے تو مسلمانوں کا بالکل اخراج ہوگیا تھا۔ وہاں مسلمانوں کی مسجدیں بھی غیر آباد ہوگئی تھیں اور کوئی ان کا پرسان حال نہیں رہا تھا۔ ہندو جان بوجھ کر ان کی بے حرمتی کرتے تھے مگر حالات ایسے تھے کہ کوئی مسلمان ان کے محلوں میں جانے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ ہندوؤں اور سکھوں کے یہاں سے چلے جانے اور مسلمان مہاجرین کے یہاں آنے کے بعد وہ تمام مسجدیں پھر سے آباد ہوگئیں بلکہ بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر نا کافی سمجھی گئیں اور ضرورت کے مطابق کئی جگہ چھوٹی بڑی نئی مساجد تعمیر ہوگئیں۔ چند قدیم و جدید مساجد کا حال آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمایئے:

نیویں مسجد

یہ عجیب و غریب مسجد لوہاری اور شاہ عالمی دروازہ کے درمیان چوک متی کے نزدیک کوچہ ڈوگراں میں واقع ہے۔ مسجد کی عمارت بہت پرانی ہے۔ مسجد کا صحن، چاہ، غسل خانہ و حجرہ وغیرہ سطح زمین سے منزل دو منزل نیچے ہیں۔ یہ مسجد نواب ذوالفقار خان نامی ایک امیر نے بنوائی تھی جو لودھی سلطنت کا اہلکار اور بہیت خان صوبہ لاہور کے دربار میں سر دفتر تھا۔ چونکہ اونچی کرسی والی مسجدیں شہر میں بہت تھیں۔ اس نے یہ عجیب بات پیدا کی کہ مسجد کی زمین کو پہلے بقدر ایک منزل کے کھدوایا پھر اس پر عمارت کھڑی کی۔ اس مسجد کا پانی باہر کہیں نہیں جاتا بلکہ نالیوں کے ذریعے نیچے غرق ہوجاتا ہے۔ لوگ زینہ اتر کر مسجد میں جاتے ہیں۔ اس مسجد کی تین محرابیں ہیں اور تینوں گنبد نہایت پختہ بنے ہیں۔ مسجد اب تک آباد ہے اور اہل محلہ کی خبر گیری سے اچھی حالت میں ہے۔

مسجد نیلہ گنبد

نیلہ گنبد انارکلی بازار میں جو بلند گنبد نظر آتا ہے وہ اپنے نیلے رنگ کی وجہ سے "نیلہ گنبد" کہلاتا ہے۔ اس کے نیچے ایک وسیع مقبرہ ہے جس میں سات قبریں ہیں۔ کسی قبر پر نام درج نہیں۔ سب سے قدیم قبر ایک بزرگ شیخ عبدالرزاق مکیؒ کی ہے جو ہمایوں کے عہد میں لاہور آئے اور یہیں فوت ہوئے۔ مقبرہ کی جگہ ان کی خانقاہ تھی جہاں بیٹھ کر وہ یاد الٰہی میں مصروف رہا کرتے اور لوگوں کو فیض پہنچاتے تھے۔

آپ کے ارادت مندوں نے آپ کی قبر پر نہ صرف یہ گنبد تعمیر کرایا بلکہ ایک دلکش باغ اور وسیع مسجد بھی تعمیر کرائی۔ سکھوں کے عہد میں باغ تو برباد ہوگیا لیکن مقبرہ میں بارود کا ذخیرہ رکھا گیا اور مسجد کے حجروں سے توپ خانہ کے کوارٹروں کا کام لیا جانے لگا۔ مسجد کے ساتھ لوہاروں کے لیے چند مکان بنائے گئے جہاں وہ بندوق سازی کیا کرتے تھے۔

۱۸۴۹ء کے بعد انگریزوں نے مسجد اور مقبرہ کو صاف کرکے فوجی ہوٹل یعنی مسکوٹ بنا لیا۔ جہاں چھاؤنی انارکلی کے گورے کھانا کھایا کرتے تھے۔

جب چھاؤنی میاں میر میں منتقل ہوگئی تو منشی نجم الدین ٹھیکیدار ڈبل روٹی نے درخواست دے کر مسجد کو واگذار کرایا

اور اس کی مرمت کی۔ اب سے نصف صدی پیشتر شیخ محمد تقی مرحوم رئیس لاہور کی توجہ سے یہاں "مدرسہ رحیمیہ" جاری ہوا جس میں حدیث، فقہ، تفسیر، منطق اور فلسفہ کی تعلیم ہوتی ہے۔ اس مدرسے کے پہلے صدر المدرسین مولوی عبدالعزیز تھے، جو سنالوان ضلع مظفر گڑھ کے رہنے والے تھے۔ وہ دیوبند کے فاضل اور مولانا محمود الحسن اور مولانا انور شاہ مرحوم کے شاگردوں میں سے تھے۔ موجودہ خطیب مولانا گل محمد سے پہلے ان کے والد اس مسجد کے خطیب و امام تھے۔

اس مسجد کے ساتھ بہت سی دکانیں ہیں جن کا کرایہ اس کے مصارف کا کفیل ہے۔ آج کل یہ مسجد محکمہ اوقاف کے قبضے میں ہے۔

موتی مسجد

اکبر خود تو مذہبی رسوم کا زیادہ پابند نہ تھا۔ اس کے اکثر اہلِ غرض درباری بھی اس کے مریدانِ خاص میں شامل تھے، لیکن پھر بھی بعض ایسی نیک ہستیاں موجود تھیں جو خدا و ندِ مجازی کی فرماں برداری کے ساتھ خداوندِ حقیقی کی اطاعت کا دم بھرتی تھیں۔ انھی لوگوں کے لیے بادشاہ نے $\frac{\text{۱۰۰۷ھ}}{\text{۱۵۹۸ء}}$ میں قلعہ کے دیوانِ عام کے سامنے چبوترے پر ایک مختصر سی مسجد بنوائی۔ درباریوں میں حکیم مصری بڑے خوش مزاج، ظریف طبع، طبابت میں ماہر اور علوم عقلیہ و نقلیہ میں فرد و یگانہ تھے۔ شیخ فیضی سفارت دکن سے واپسی پر انھیں اپنے ہمراہ لایا تھا۔ انھوں نے تعمیر مسجد پر دو شعر کہے جن کے مختصر سے ترکش میں دوسرا شعر تیر و نشتر چھوڑ رہا ہے [۱]

شاہ کرد مسجدے بنیاد
ایہا المومنون مبارک باد
وندریں نیز مصلحت دارد
تا نمازاں گذار بشمارد

جہانگیر نے اپنے بارھویں سن جلوس میں بیگمات اور حرم کی خواتین کے لیے اس میں مناسب ترمیم کرائی۔ یہ کام اس کے میر عمارت عبدالکریم نے انجام دیا جس کا خطاب معمور خاں تھا۔ $\frac{\text{۱۰۵۵ھ}}{\text{۱۶۴۵ء}}$ میں شاہ جہان نے اپنی نفاست پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے اسے سنگِ مرمر کا لباس پہنایا اور اس کا نام موتی مسجد رکھا۔ اس مسجد کے صحن کا طول پچاس فٹ اور عرض ۳۴ فٹ ہے۔

قلعہ لاہور کی موتی مسجد فن تعمیر کا ایک دل پذیر نمونہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سنگ مرمر کے پہاڑ سے کنول کا پھول تراشا گیا ہے جسے دیکھ کر آنکھیں روشن ہوتیں اور قلب کو تسکین میسر آتی ہے۔ آگرہ اور دہلی کے قلعوں کی مسجدیں[۲] بھی خوبصورتی

---

[۱] دربارِ اکبری مولانا آزاد صفحہ ۶۱۔

[۲] آگرہ کی موتی مسجد ۱۶۵۴ء میں شاہجہان نے اور دہلی کی ۱۶۶۳ء میں اورنگ زیب نے بنوائی تھی۔

اور دلکشی میں یہ مسجد کسی طرح کم نہیں۔

رنجیت سنگھ نے موتی مسجد کا نام بدل کر موتی مندر رکھ دیا۔ بعد میں اس مسجد سے خزانے کا کام لیا جانے لگا اور اس کے گرد دیوار بنادی گئی۔ اس سے نقصان یہ ہوا کہ اس بڑے قفل سے جو دروازے پر ڈالا جاتا تھا، خاصا گڑھا پڑ گیا جو آج بھی نظر آتا ہے۔ سنہ ۱۹۰۳ء میں لارڈ کرزن نے اس مسجد کو بحال کروا دیا۔ لیکن سنہ ۱۹۴۷ء تک یہ مسجد صرف نمائشی رہی۔ قیام پاکستان کے بعد سے یہ آزاد ہے اور اس میں نماز ہوتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اب سے دو سو سال قبل اس میں قلعہ کی شاہی مخلوق نماز پڑھتی تھی۔ اب قلعہ کے اندر رہنے والے عام آدمی اور محلے کے لوگ سجدہ ریز ہوتے ہیں۔

بیگم شاہی مسجد

قدیم شاہی عمارات میں ایک عالی شان مسجد مستی دروازے کے متصل قلعہ لاہور کے شرق میں واقع ہے عمارت اس کی نہایت پختہ ہے۔ یہ شہنشاہ نورالدین محمد جہانگیر کی ماں مریم زمانی نے بنوائی تھی۔ اس کے شمالی دروازے پر مندرجہ ذیل قطعہ ثبت ہے ؎

منت ایزد کہ آخر گشت کار از ابتدائی
ہم بتوفیق خدا و حکم صاحب مسندی
حضرت مریم زمانی بانئے ہذا المکان
کز عنایات الٰہی ساختہ جائے ہدیٰ
از پئے تاریخ ختم ایں بنائے چوں بہشت
فکر می کردم کہ آخر یافتم "خوش مسجدی"

"خوش مسجدی" سے اس کی تاریخ تعمیر ۱۰۲۳ھ / ۱۶۱۴ء نکلتی ہے۔ مسجد کے مشرقی دروازے پر یہ شعر کندہ ہے ؎

شاہ عالمگیر نورالدین محمد بادشاہ
باد یارب در جہاں روشن چو نور مہر و ماہ

تمام عمارت قالبوتی ہے جس میں لکڑی استعمال نہیں کی گئی۔ حجرے صاف اور ہوا دار ہیں۔ صحن کے عین وسط میں ایک مربع حوض ہے جہاں نمازی وضو کرتے ہیں۔ عمارت کی وضع قطع میں ہندو مسلم فن تعمیر کی آمیزش نظر آتی ہے۔

جب مسلمانوں کی حکومت لاہور سے جاتی رہی اور سکھ گردی شروع ہو گئی تو یہ مسجد بے آباد ہو گئی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں اس مسجد پر سرکاری تسلط ہو گیا اور بارود بھر دی گئی جس سے یہ "بارود خانے والی مسجد" کے نام سے مشہور ہو گئی۔ انگریزی عملداری میں بارود دریا میں پھنکوا کر مسجد خالی کر دی گئی اور داروغہ نزول قاضی خفیہ الدین نے اس کو درج رجسٹر نزول کر دیا۔ مگر میجر میکریگر ڈپٹی کمشنر لاہور نے سنہ ۱۸۵۰ء میں مسجد مسلمانوں کے حوالے کر دی۔ ایک بیٹھک اور دکانیں جو متعلق مسجد تھیں، وہ بھی واگزار کر دیں۔ اب یہ مسجد آباد ہے اور اس کے ایک کونے میں مولوی غلام قادر بھیروی[1] اور بعض دوسرے لوگوں کی قبریں بھی ہیں۔

---

[1] تاریخ وصال ۱۹ ربیع الاول ۱۳۲۷ھ (۱۹۰۸ء)

جنھوں نے اپنے اپنے وقت میں اس مسجد کی خدمت کی ہے۔

اُونچی مسجد

یہ عالی شان مسجد بھاٹی دروازہ کے اندر بازار حکیماں میں واقع ہے اس کی کرسی اُونچی ہے اس لیے یہ اونچی مسجد کہلاتی ہے۔ اس کی عمارت پرانی ہے۔ محرابوں پر قرآن مجید کی آیات کے علاوہ ایک کتبہ نصب ہے جس سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ یہ اکبر کے ابتدائی عہد میں تعمیر ہوئی۔ شاہی عمارات کی طرح اس کی چھت پر کوئی باقاعدہ گنبد نہیں۔ نہ کوئی اور نشان ہی ایسا ہے جس سے اس کے بانی کا نام اور سنہ تعمیر معلوم ہو سکے۔ البتہ مقامی روایات یہ ہیں کہ یہ اس زمانے کے کسی سفیر (ماشکی) نے بنوائی تھی۔

مسجد اب تک آباد ہے۔ ۱۲۹۹ھ / ۱۸۸۱ء میں اس کی مرمت ہوئی تھی اور دروازہ نیا لگا تھا۔ آج کل اس کا انتظام اوقاف کمیٹی کے ہاتھ میں ہے۔

مسجد پکی دروازہ

یہ مسجد پولیس ہسپتال پکی دروازہ کے قریب حویلی غوث[1] کے سامنے اباغ کو جانے والے راستے پر واقع ہے اور سید نجف علی خاں صوبہ لاہور کے خزانچی نے اکبر بادشاہ کے عہد میں تعمیر کی تھی۔ مسجد کا اندرونی حصہ محلے کی عام سطح سے کسی قدر پست ہو گیا ہے۔ صحن بھرتی ڈال کر اونچا کر دیا گیا ہے۔ اصل عمارت خشتی رنگی ہے۔ اس پر چونہ کی استرکاری ہوئی ہے۔ گنبد نہایت مفلطح بنے ہوئے ہیں۔ صحن مسجد کے جنوب کی طرف پرانے وقت کی دو قبریں چار دیواری کے اندر بنی ہوئی ہیں۔

مسجد امیر خاں

یہ مسجد ریلوے اسٹیشن سے میانی کو جاتے ہوئے علامہ اقبال روڈ پر شیخاں والا مقبرہ کے جنوب میں واقع ہے اور محمد نگر کی آبادی میں آ گئی ہے۔ اسے امیر خاں نے بنوایا تھا جو اکبر کے زمانے میں ایک امیر تھا۔ امیر خاں کی اپنی قبر بھی اسی مسجد کے احاطے میں ہے[2]۔ اس کا ایک گنبد بڑا اور دو چھوٹے تھے۔ صحن وسیع ہے۔ شاہوکی گڑھی کے لوگ اسے عیدگاہ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ آج کل اس میں دینی مدرسہ قائم ہے جسے جامعہ نعیمیہ کہتے ہیں۔ جامعہ کے کارپردازوں نے مسجد میں بہت سے نئے کمرے بنوائے ہیں اور اس کی ہیئت میں بھی خاصی تبدیلی کر دی ہے۔

---

[1] یہ حویلی ایک صدی پیشتر منشی ہرسکھ رائے کے قبضے میں تھی جو اُردو کے سب سے پہلے ہفتہ وار اخبار کوہ نور کے مالک تھے۔

[2] لطیف۔ لاہور ص ۱۷۰

عیدگاہ جہانگیری

جہانگیر نے اپنے عہدِ حکومت میں ایک عظیم الشان مسجد شاہی انجینیئر خواجہ ایاز کی معرفت[۱] لاہور میں بنوائی تھی جس سے بعد میں عیدگاہ کا کام لیا جانے لگا۔ یہ مسجد بہت بڑی تھی۔ اس کے شمال، جنوب اور مغرب میں تین طرف بازار تھے جو ترپولیہ کہلاتے تھے۔ ہر بازار میں ستر دکانیں اور بالاخانے تھے جن کا کرایہ مسجد کے اخراجات کے لیے وقف تھا۔ عمارات کی تعمیر پر بیس لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا جو شاہی مسجد لاہور کی لاگت سے تین گنا ہے۔ مسجد کے ساتھ ایک بہت بڑا مدرسہ بھی تھا جس کے آثار انگریزوں کے ابتدائی دورِ حکومت تک نہایت خستہ حالت میں موجود تھے۔ یہ عمارت لاہور ریلوے اسٹیشن کے قریب شالامار باغ کو جانے والی سڑک کے دائیں طرف واقع تھی۔ تحقیقات چشتی کے فاضل مصنف مولوی نور احمد چشتی نے اس عمارت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ان کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ :-

"عین درمیان میں بہت بڑا گنبد ہے جو خشت و آہک سے تعمیر ہوا ہے۔ اس کا رنگ قدرے سیاہ پڑ گیا ہے۔ اس کے دائیں بائیں دو دو متقابلتہً چھوٹے گنبد ہیں۔ چاروں گوشوں پر چار ہشت پہلو مینار ہیں اور ان کے اوپر مدور گنبدیاں ہیں۔ مسجد کے شرق کی طرف آٹھ محرابی دروازے ہیں۔ درمیانی محراب بہت بڑی ہے۔ اس کی بغلوں میں تین تین در محرابی اگرچہ بہت بڑے ہیں مگر درمیانی سے قدرے کم ہیں۔ اس کے علاوہ شمال جنوب میں ایک اور بلند محرابی دروازہ ہے۔ ان کے اطراف میں اوپر جانے کے لیے زینے ہیں۔ درمیانی بلند دروازے کے اوپر دو گنبدیاں چار چار دروازوں والی ہیں جن میں سے شمالی گنبدی تو موجود ہے مگر جنوبی مسمار ہو چکی ہے مسجد کے اندر تین محراب ہیں جو سیڑھیاں دونوں اطراف سے اوپر جاتی ہیں ان کی تعداد تیس ہے۔ مینار ہشت پہلو ہیں اوپر جانے کے لیے ان میں بائیس زینے ہیں۔ اوپر دو درجے ہیں اوپر کا درجہ ہشت پہلو ہے۔ اس کے آٹھ دروازے ہیں۔ اور ہر دروازہ اڑھائی بالشت چوڑا اور قدِ آدم اونچا ہے۔ ان کے باہر اردگرد ہشت پہلو چھجہ ہے جو اتنا چوڑا ہے کہ چند آدمی اس پر بفراغت سو سکتے ہیں۔ تمام عمارت استرکاری اور منقش ہے۔ دیواروں پر خوبصورت گلکاری اور رنگ آمیزی کی گئی ہے۔"

۱؎ وقائع جہانگیری۔

شروع شروع میں نور جہاں کے ایما پر مولوی عنایت حسین اس مدرسے کے مہتمم اور صدر المدرسین تھے۔ حافظ حبیب اللہ مسجد کی امامت کرتے تھے۔ سید مقبول حسین اس سارے وقف کے امین تھے۔ ان کے علاوہ پچاس کے قریب دیگر مدرس منشی اور خادم اس مسجد اور مدرسے کے ساتھ وابستہ تھے۔

شاہ جہان کے عہد میں یہاں خوب رونق تھی۔ درس باقاعدہ ہوتا تھا۔ مدرسہ پورے عروج پر تھا۔

احمد شاہ ابدالی کے حملے تک اس کی دیکھ بھال ہوتی رہی اس کے بعد یہ عمارت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئی۔ انگریزوں کے ابتدائی عہد میں مسجد کا ایک حصہ ریلوے افسروں کی قیام گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ جب اسٹیشن کو وسعت دی گئی تو یہ مسجد شہید کر دی گئی۔ اب یہاں مالی گودام قائم ہے۔ سید محمد لطیف نے اپنی کتاب تاریخ پنجاب سنہ ۱۸۹۱ء میں تصنیف کی۔ وہ عید گاہ جہانگیری کے متعلق صفحہ ۴۹ کے حاشیے پر لکھتے ہیں کہ :-

" یہ قدیم عمارت اثنائے اتباع کتاب میں منہدم کر دی گئی "

دولت خان کا باغ اور سرائے بھی اس کے قرب و جوار ہی میں تھے مگر اب ان کا بھی کوئی نشان باقی نہیں۔

مسجد خراسیاں

لوہاری منڈی کے چوک میں سرِ راہ ایک اونچی سی مسجد نظر آتی ہے جسے مسجد خراسیاں کہتے ہیں۔ اس کی سیڑھیوں میں سرخ پتھر کی ایک سِل پر مندرجہ ذیل کتبہ خطِ نستعلیق میں کندہ ہے جس کے حروف ابھرے ہوئے ہیں ؎

اللہ اکبر

کریمی سیدی صدر جہانی ملجاء عالم

کہ در عہد جہانگیری شدہ ایں بقعہ را بانی

خلیل آسا بتوفیق خدا اندر مجسم کردہ

بناء خانۂ دیں بہر ترویج مسلمانی

چو شان کعبہ دارد مسجد او بہر تاریخش

مکن تعلیم اگر گویم بنا شد کعبۂ ثانی

یہ کتبہ عبداللہ الحسینی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے جس نے لاہور کے گورنر قلیچ خان کے لیے بہت سے قطعے لکھے تھے جن میں سے چند ایک فقیر سید مغیث الدین کے پاس اب بھی موجود ہیں۔ اس کتبے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسجد سنہ ۱۰۱۵ھ / ۱۶۰۶ء میں بزمانۂ جہانگیر صدر جہان نے بنوائی تھی۔ یہ وہی میراں صدر جہان ہیں جن سے شہزادگی کے زمانے میں جہانگیر نے چہل حدیث پڑھی تھی۔ بعد میں آپ کو صدارتِ کل کا عہدہ اور دو ہزاری منصب دیا تھا۔ بہت مخیّر تھے۔ ایک سو بیس سال کی عمر پا کر سنہ ۱۰۲۰ھ / ۱۶۱۱ء میں فوت ہوئے۔[1]

---

[1] مآثر الامراء

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انقلاب زمانہ سے یہ مسجد خستہ ہو گئی تھی اہل محلہ نے چندہ کر کے پرانی بنیادوں پر ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۴ء میں اس کی تجدید کی اور پرانا پتھر سیڑھیوں میں لگا دیا، مارشل لاء سے پہلے یہ مسجد انجمن خرابیاں کی تحویل میں تھی اور چوہدری مولا بخش اس کے نگران تھے اب یہ محکمہ اوقاف کے قبضے میں ہے۔ سکھوں کے عہد میں یہاں مدرسہ قائم تھا جس میں قرآن و حدیث کا درس ہوتا تھا۔

مسجد وزیر خاں

لاہور کی قدیم تاریخی عمارتوں میں مسجد وزیر خاں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ وسعت، پائیداری اور رنگا رنگ نقش و نگار کے باعث ماہرین فن تعمیر اس مسجد کو ایک خاص درجہ دیتے ہیں۔ یہ شہر کے ایک نہایت پُر رونق اور گنجان آبادی والے حصے میں واقع ہے اور اسلامی ثقافت کا بہت بڑا مرکز ہے۔

اس مسجد کے بانی حکیم علیم الدین انصاری الملقب بہ نواب وزیر خاں تھے جو چنیوٹ کے رہنے والے تھے۔ وہ عربی اور فلسفہ کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد طبابت کی جانب متوجہ ہوئے اور اس فن میں کمال حاصل کر کے شاہجہانی دربار میں پہنچے۔ جہاں سے ترقی کر کے پہلے دیوان بیوتات اور پھر نواب وزیر خاں کا لقب حاصل کر کے پنجاب کے گورنر مقرر ہو گئے۔ انھیں رفاہِ عام کے کاموں سے خاص دلچسپی تھی۔ چنانچہ لاہور میں ان کے حمام، بازار، محلات، مساجد، باغ، بارہ دری اور دکانیں سب اسی کارِ خیر کا نتیجہ ہیں۔ گو ان میں سے بہت سی چیزیں امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں نیست و نابود ہو چکی ہیں مگر اب بھی بہت سی عمارتیں ان کا نام زندہ رکھنے کو باقی ہیں۔ وزیر آباد بھی انھیں کا بسایا ہوا ہے۔

نواب وزیر خاں کی سب سے بڑی قابل ذکر یادگار مسجد وزیر خاں ہے۔ یہ رفیع الشان مسجد ہندی ایرانی طرزِ تعمیر کا بہترین نمونہ اور شہر لاہور کا زیور ہے۔ یہ دہلی دروازہ کے اندر چوک وزیر خاں میں واقع ہے۔ اس کی بنیاد ۱۰۴۴ھ/۱۶۳۴ء میں سید محمد اسحاق بن شہر یار گازرونی عرف میراں بادشاہؒ کے مزار پر رکھی گئی تھی۔ حضرت میراں بادشاہؒ فیروز تغلق کے عہد میں وارد لاہور ہوئے آپ کا وصال ۷۸۶ھ/۱۳۸۴ء میں ہوا۔ آپ کی وصیت کے مطابق قبر خام اور احاطہ پختہ خشتی بنایا گیا مگر آپ کی وفات کے قریباً اڑھائی سو سال بعد مسجد کی تعمیر کے وقت آپ کا مزار اس ترکیب سے پختہ کر دیا گیا کہ مسجد کے عین وسط میں حوض کے متصل آپ کی دوہری قبر تیار ہو گئی۔ اوپر نقلی مزار ہے لیکن مسجد کے فرش سے دس چھوٹی چھوٹی سیڑھیاں اتر کر اصلی قبر ایک بلند چبوترے پر دکھائی دیتی ہے۔

مسجد کی کرسی بازار کی عام سطح سے بہت اونچی ہے۔ اوپر چڑھنے کو سیڑھیاں بنی ہیں۔ ڈیوڑھی ڈاٹ دار چھت کے نیچے ہے اور اس میں شمال، جنوب اور مشرق تین طرف سے لوگ داخل ہو سکتے ہیں۔ چوتھی جانب پھر ایک دروازہ ہے جو مسجد کے بلند چبوترے پر کھلتا اور مسجد کی خوبصورت پیشانی اور وسیع صحن کی بہار دکھاتا ہے۔ اندر اور باہر تمام دیواروں پر کاشی کاری، نقاشی اور منبت کاری کی گئی ہے۔ بیرونی دیواروں اور ڈیوڑھی کے آثار اگرچہ اب کچھ کچھ ماند پڑ گئے ہیں لیکن نقش و نگار صاف کہے دیتے ہیں کہ یہ بہترین قلم کاری اور نقوش سے مزین ہوں گے۔

چوک کی طرف کے مشرقی دروازہ کلاں پر اُوپر سے نیچے تک کاشی چینی کا نہایت نفیس کام کیا گیا ہے۔ بہت سے کتبے منقوش ہیں جو مختلف رنگوں کی روغنی ٹائیلوں کو خاص شکل اور ترکیب سے جوڑ کر بنائے گئے ہیں۔ محققین کی رائے ہے کہ اس فن کی ابتدا چین میں ہوئی۔ وہاں سے یہ ایران ہوتا ہوا ہندوستان پہنچا۔ لفظ کاشی شہر کاشان سے نسبت رکھتا ہے جو فارس کا ایک مشہور شہر ہے۔ وہاں یہ ہنر زمانۂ وسطیٰ میں زوروں پر تھا۔ غالباً وہیں سے اس فن کے کاریگر شاہ جہان کے عہد میں ہندوستان لائے گئے۔
سب سے اُوپر فارسی رسم الخط میں "افضل الذکر لاالہ الا اللہ محمد الرسول اللہ" نہایت جلی قلم لکھا ہے۔ اس کے نیچے ڈاٹ کے دائیں بائیں اور کتبے ہیں۔ دوسرے کتبے میں یہ عبارت منقوش ہے :۔

" درعہد ابوالمظفر صاحب قران ثانی شاہ جہان بادشاہ
غازی اتمام یافت "

تیسرے کتبے میں یہ لکھا ہے :۔

" بانی بیت اللہ ثانی فدوی باخلاص مرید خاص الخاص
ندیم الخدمت وزیر خاں "

چوتھا کتبہ یوں ہے :۔

ھوالجامع

این خانہ کہ ہست چوں فلک مظہر فیض	دارد چوں حریم کعبہ سر در سوفیض
بر چہرۂ اہل قبلہ این در بمراد	تا حشر کشادہ باد ہمچوں در فیض

پانچویں کتبے میں یہ درج ہے :۔

سال تاریخ بنائے مسجد عالی مقام	از خرد جستم بگفتا "سجدہ گاہ اہل فضل" ۱۰۴۴ھ

چھٹے کتبے میں یہ شعر لکھا ہے :۔

تاریخ این بنائے چو پرسیدم از خرد	گفتا بگو کہ "بانی مسجد وزیر خاں" ۱۰۴۴ھ

اور سب سے نیچے یہ عبارت درج ہے :۔

دہقان درد دبحشر اے نیک سرشت
در مزرعہ جہاں ہر آں چیز کہ کشت
در باب عمل بنائے خیرے بگذار
کاخر ہمہ را ہست ازیں در بہشت

مسجد کی ڈیوڑھی میں ڈاٹ دار چھت کے نیچے چاروں کونوں پر چار چھوٹے چھوٹے شہ نشین اور گلی میں دونوں جانب حجرے ہیں جن میں کبھی صحاف، نقاش، کتاب فروش اور جلد ساز بیٹھتے تھے مگر کچھ عرصہ سے بزاز کپڑا بیچتے تھے۔ نئی سکیم کے ماتحت

کپڑے کی منڈی یہاں سے اٹھا دی گئی ہے۔ بزازوں کو جنرل اعظم خاں کلاتھ مارکیٹ میں جگہ مل گئی ہے اور دوکانیں خالی ہو گئی ہیں۔

مسجد کے وسیع صحن میں نمازیوں کے وضو کرنے کے لیے آب مصفا سے لبالب ایک سو مربع گز کا حوض ہے جس کے پاس ہی لکڑی کی محراب دار چھت کے نیچے ایک تہ خانہ اور تہ خانے میں حضرت میراں بادشاہ کا مزار ہے۔ سارے صحن میں خشتی فرش ہے اور تین طرف طالب علموں اور درویشوں کے لیے حجرے بنے ہیں جن میں سے ایک جلد ساز اور ایک نقاشوں کے پرانے خاندان کے قبضہ میں ہے۔ آج کل بابا میراں بخش نقاش کے فرزند میاں محمد حیات وہاں بیٹھ کر پرانے طرز کی نقاشی کا کام کرتے ہیں۔

صحن کے اختتام پر مسجد کی عمارت شروع ہوتی ہے جو پانچ محراب دار دروں اور گنبد دار چھت پر مشتمل ہے۔ درمیانی محراب بڑی اور دائیں بائیں کی دو دو محرابیں کسی قدر چھوٹی ہیں۔ محرابوں پر قرآن مجید کی بہت سی آیات اور احادیث نبوی لکھی ہیں جو نقاشی اور منبت کاری دکار رنگ کا بہترین نمونہ ہیں۔ درمیانی محراب پر کانسی کار کتبے میں آیت الکرسی بخط نسخ تحریر ہے باقی کتبوں میں صحابہ کبار کے نام درج ہیں۔ یہ حاجی یوسف کشمیری نے سنہ ۱۲۴۴ھ میں لکھے تھے۔

مسجد کے اندر نہایت عمدہ رنگین نقاشی کی گئی ہے اور بعض بعض جگہ منبت کاری بھی ہے۔

صحن کے چاروں کونوں پر چار خوبصورت ہشت پہلو بلند مینار ہیں جن پر موزوں چوکھٹوں میں کانسی کا نہایت خوبصورت کام ہے۔ سکھوں کے عہد میں ان میناروں کے اوپر کی برجیوں کے دو دو در بند کر دیئے گئے تھے۔ تاکہ کسی بھونچال کے صدمے سے انہیں ضعف نہ پہنچے۔ مگر اب برجیوں کے نیچے سرخ پتھر کے ستون کھڑے کر کے در کھول دیئے گئے ہیں۔

یہ مسجد اس قدر پختہ، اتنے اچھے مسالے اور ایسے نیک کاریگروں کے ہاتھوں سے بنی ہے کہ سوا تین سو سال سے آج تک کبھی کسی خاص مرمت کی منت کش نہیں ہوئی۔ اس کی وضع قطع اور نقش و نگار کے اعلیٰ و ارفع ہونے کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ پنجاب کی سب سے مشہور درس گاہ میو سکول آف آرٹس کے بالغ النظر لڑکوں کو اسی کے طاقچوں کے نمونے مشق کے لیے دیئے جاتے ہیں۔ مسٹر جے۔ ایل کپلنگ سابق پرنسپل سکول مذکور اپنی ایک سرکاری رپورٹ بابت سال سنہ ۱۸۸۹-۹۰ء میں تحریر فرماتے ہیں:

"یہ خوب صورت عمارت گویا ہے فن نقاشی کا بہترین سکول ہے۔ مگر افسوس ہے کہ لوگ اس کی صحیح نگہداشت نہیں کرتے۔ میں دیکھتا ہوں کہ لوگوں کا رجحان اس کی غور و پرداخت کی طرف بہت کم ہوتا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے نقش و نگار آہستہ آہستہ مٹتے جا رہے ہیں۔ اگر ان کی بے اعتنائی کا یہی عالم رہا تو اندیشہ ہے کہ یہ عدیم المثال نمونے آسیب روزگار اور امتداد زمانہ کے ہاتھوں بالکل تباہ ہو جائیں گے۔ ایسی حالت میں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے صحیح صحیح چربے اتار کر لاہور کے

عجائب گھر اور اسکولوں میں محفوظ کر دیئے جائیں۔ کیونکہ ہمارے نوجوان
مصوروں کے لیے اس سے بہتر کوئی تعلیم نہیں ہو سکتی ہے۔

اس مسجد کا انتظام بانیٔ مسجد کی وصیت کے مطابق متولیوں کے ہاتھ میں تھا۔ متولی اپنے آپ کو نواب وزیر خاں کی اولاد سے بیان کرتے تھے۔ ان کے پاس نواب وزیر خاں کا وصیت نامہ بھی موجود تھا۔ یہ وصیت نامہ سید محمد لطیف جج اور مولوی نور احمد نے تاریخ لاہور[1] اور تحقیقاتِ چشتی میں نقل کیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے واقف کی دلی خواہش اور مسجد کی حفاظت کے متعلق مجوزہ انتظامات کا پتہ چلتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بانیٔ مسجد ان تمام مکانوں اور دکانوں کا مالک تھا جو مسجد اور چوک وزیر خاں سے دہلی دروازہ تک بازار کے دونوں طرف چلے گئے ہیں۔ اس میں وہ کٹڑی بھی شامل تھی جس میں حضرت سید سربلند کا مزار واقع ہے اور اس تمام جائیداد کی آمدنی اس مسجد کی رونق و آبادی پر صرف کی جاتی تھی۔ اب ان دو کانوں کے سوا جو مسجد کے نیچے واقع ہیں باقی تمام جائیداد لوگوں کی ذاتی ملکیت بن گئی ہے۔ بلکہ جنوبی دیوار کے ساتھ ساتھ لوگوں نے اپنے مکانات تعمیر کر کے مسجد کا حلیہ بگاڑ دیا ہے۔

مسجد کی ملحقہ سرائے اور حمام جو دہلی دروازہ کے متصل واقع ہیں لاہور کارپوریشن کے قبضہ و تصرف میں ہیں اور لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ کی اسکیموں کے ماتحت انھیں گرانے کی تجویزیں ہو رہی ہیں۔ حمام ترکی ساخت کے تھے اور ان میں گرم اور سرد پانی کے تالاب بنے ہوئے تھے۔

مسجد کے ساتھ دو کنوئیں بھی تھے جن میں سے ایک پر نل لگا کر بجلی سے تالاب میں پانی پہنچایا جاتا ہے مگر دوسرا کنواں آبادی میں آگیا ہے اور مسجد سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہا۔

بانیٔ مسجد کی خواہش تھی کہ مشرقی دروازہ کے باہر کی دکانیں اور ان کے اوپر کے بالاخانے اسلامی کتب کے صحافوں کے لیے ہمیشہ بے کرایہ مخصوص رہیں۔ نیز یہ شرط کی تھی کہ مسجد میں ایک خطیب و امام، ایک مؤذن اور دینی علوم کی تدریس کے لیے دو مدرس اور چند خادم رکھے جائیں جن کو وقف کی آمدنی سے تنخواہ دی جائے۔ اس طرح کہ امام اور خطیب کو روزانہ ایک سے دو روپیہ تک، مؤذن کو چار آنہ یومیہ اور ہر ایک مدرس کو ایک روپیہ یومیہ اور جو شخص واقف کی اولاد سے وقف مذکورہ پر متصرف ہو وہ ہر مہینے میں اوقاف کی آمدن میں سے چھٹا حصہ اور جو شخص اقربا میں سے ہو، نواں حصہ لے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ اور جو کچھ عمارت اور ملازمین اور دیگر حاجات ضروریہ مثلاً محرر، روشنی کرنے والا، فرش بچھانے والا کے خرچ سے بچے وہ ان مستحقوں پر صرف کیا جائے جو اس مسجد میں رہتے ہوں اور تنگی کے وقت (جب آمدنی کم ہو جائے) صرف ملازموں پر صرف کیا جائے۔

یہ وصیت نامہ یکم رمضان المبارک سنہ ۱۰۵۱ھ (۱۶۴۱ء) کا لکھا ہوا ہے۔ اس پر قاضی یوسف (جو شاہ جہان کے عہد میں لاہور کے قاضی القضاۃ تھے) نواب وزیر خاں وصیت کنندہ، موسوی خاں صدر الصدور اور مولانا محمد فاضل ولد مولانا محمد شاہ کی مہریں لگی ہوئی ہیں۔ نواب وزیر خاں کی مہر حسب ذیل عبارت کی حامل ہے :-

---

[1] تاریخ لاہور مصنفہ جج محمد لطیف صفحہ ۲۱۵۔

ز لطف شاہ جہان بادشاہ بندہ نواز
وزیر خاں بہ جہاں جاوداں بود ممتاز

نماز پنجگانہ، جمعہ اور عیدین کے علاوہ شاہ جہان اور عالمگیر کے عہد میں یہ مسجد لاہور کا ایک بہت بڑا علمی مرکز تھی اور علمی حلقوں میں خاص شہرت رکھتی تھی، لاہور کے ارباب فضل و کمال فصحائے خوش بیان، شعرائے شیریں زبان اور دوسرے شوقین لوگ جو ایران، توران اور ہندوستان کے دوسرے مقامات سے لاہور آئے ہوتے تھے اس مسجد میں جمع ہو کر آپس میں مباذلۂ خیالات کرتے تھے اور اس طرح شعر و شاعری کی مجالس گرم ہو جاتی تھیں[1] حسان الہند مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کے زمانے تک مسجد وزیر خاں کا صحن علمی اور ادبی مجالس کے لیے استعمال ہوتا تھا[2] چنانچہ آپ اپنے تذکرہ خزانۂ عامرہ میں فرماتے ہیں :-

"شاہ آفرین[3] لاہوری نے حاکم لاہوری سے ذکر کیا اور حاکم نے میرے سامنے بیان کیا کہ پچھلے دنوں مسجد وزیر خاں کے صحن میں شعرا مجلس آراستہ کیا کرتے تھے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ ملا محمد سعید اعجاز اکبر آبادی جو ان دنوں لاہور آئے ہوئے تھے، ایک مجلس میں شریک ہوئے۔ وہاں ناصر علی سرہندی کا یہ شعر پڑھا گیا :-

صریر خامہ، می دانم کہ با طبعت نمی سازد
وزیدی نامہ، و دل صد پارہ شد، قاصد رسید اینجا

(ترجمہ) قلم کی آواز میں جانتا ہوں کہ تیری طبیعت کو موافق نہیں مگر تو نے خط پھاڑ ڈالا جس سے دل کے سو ٹکڑے ہو گئے اور قاصد پریشان ہو کر واپس آ گیا۔

"اعجاز نے اس پر اعتراض کیا کہ عاشق دور دراز سے جب خط لکھتا ہے تو قلم کی آواز معشوق کی طبیعت کو ناگوار گزرتی ہے۔ پھر خط پھاڑنے کی آواز جو قلم کی آواز سے زیادہ شور ہے اسے کس طرح پسند آ سکتی ہے؟
شاہ آفرین نے جواب دیا کہ معشوق کو اپنے قلم کی آواز گوارا نہیں۔ یہ سن کر اعجاز خاموش ہو گیا۔ اس پر فقیر مؤلف (آزاد بلگرامی) نے حاکم سے کہا

---

[1] چہار چمن مصنفہ چندر بھان برہمن (قلمی)
[2] خزانۂ عامرہ۔
[3] شاہ آفرین گوجر قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ ۷ رجب ۱۰۸۸ھ / ۱۶۷۷ء کو وارد لاہور ہوئے۔ ۱۱۵۴ھ / ۱۷۴۱ء میں انتقال فرمایا۔ شاہ عبد الحکیم حاکم لاہوری نے تاریخ وفات کہی "رفت بقا معنی از عالم" مثنوی ابیان معرفت ان کی یادگار ہے۔

کہ عاشق کا خط لکھنا معشوق کی طبع کے موافق نہیں۔ لیکن عاشق کے خط کو
پھاڑنا اس کی طبع کے موافق ہے۔ یعنی اس میں وہ خاص لذت محسوس کرتا
ہے۔ اس لیے عاشق کے قلم کی آواز اسے پسند نہ آئی اور خط پھاڑنے
کی آواز اسے پسند آگئی۔"

مسجد کے اندر اور باہر کتب فروشوں کی دکانیں ہوتی تھیں اور نوشت و خواند کا تمام سامان یہاں فروخت ہوتا تھا۔ چنانچہ چندر بھان برہمن اپنی کتاب "چہار چمن" میں لکھتا ہے :-

"کتب بے شمار از عربی و فارسی و دیگر نسخہ ہائے معتبر از تواریخ و مثنوی
و دواوین متقدمین و نوشتہ جات خوش نویسان روزگار و سائر آلات
و ادوات مشق از ہر قسم و ہر جنس بغرض خرید و فروخت می آید۔ چو
آزادیہ مکتب نشینان مخصوص ایں روز (جمعہ) است۔ از ہر
کوچہ و ہر کوئے جوانان نورسیدہ بیاض در دست و گل بر سر
بمقتضائے عہد شباب خراماں خراماں بہ سیر بازار کتاب می آیند۔"[1]

یہ بازار پہر تک قائم رہتا۔ اس کے بعد لوگ نماز جمعہ کی تیاری کرتے۔ اس بیان کی تصدیق و تائید بعض دیگر کتب سیر و تواریخ سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ لاہور کے ایک مشہور روحانی بزرگ شاہ بلاول قادریؒ کے حال میں لکھا ہے کہ جب وہ اپنے والد کی وفات کے بعد لکھنے پڑھنے کی طرف راغب ہوئے تو سامانِ نوشت و خواند خریدنے کے لیے اسی مسجد میں آئے۔ یہیں سے ایک شخص انھیں یہ کہہ کر لے گیا کہ آپ میرے ساتھ شاہدرہ چلیں تاکہ میں آپ کو سستی سیاہی بنانے کا نسخہ بتاؤں۔

یہ سلسلہ سکھوں کے عہد تک جاری رہا۔ مسجد میں نہ صرف سامانِ نوشت و خواند فروخت ہوتا تھا بلکہ مشہور خطاطوں کی وصلیاں اور نادر کتابیں بھی فروخت ہوتی تھیں۔ یہاں ہر وقت ایسے کاتب، مصوّر، صحاف، جدول ساز وغیرہ موجود رہتے تھے جن کا ذریعۂ معاش مختلف کتابوں کی نقل اٹھانا اور انھیں مصوّر و منقش کرنا ہوتا تھا۔

رنجیت سنگھ کے عہد میں مرزا اکرم بیگ ایک خاندانی فاضل مسجد وزیر خاں کی ڈیوڑھی میں رہتے تھے۔ شہر کے ہندو مسلم عمائد و اکابر کے فرزندان سے فارسی پڑھتے تھے۔ اس دور کے مشہور علم دوست بزرگ دیوان امرناتھ اکبری نے اپنی کتاب ظفر نامہ رنجیت سنگھ میں ان کے علم و فضل کی بے حد تعریف کی ہے اور انھیں اپنا استاد قرار دیا ہے۔[2]

مسجد میں وقتاً فوقتاً جو اساتذہ درس دیتے رہے ہیں ان کے نام تو معلوم نہیں ہو سکے البتہ دو خطیبوں اور اماموں کا ذکر بعض تاریخوں میں ملتا ہے۔ ان میں ایک تو ملا محمد صدیق تھے جو مولانا شہریار[3] کے شاگرد تھے اور جنھوں نے احمد شاہ ابدالی کی موجودگی میں فتح لاہور کے

---

[1] چہار چمن قلمی ورق ۴۰ ۔ [2] پیش لفظ دیوان قلندر شاہ لاہوری۔

[3] مولانا شہریار چینیاں والی مسجد کے امام تھے۔ انھوں نے احمد شاہ ابدالی کے منہ پر اسے ظالم کہا تھا۔ ابدالی نے انھیں شہر بدر کر دیا تھا۔ مدفن ان کا ٹانڈہ ضلع ہوشیار پور میں ہے۔

بعد ۱۱۴۷ھ میں یہاں عید کی نماز پڑھائی تھی، وہ عربی کی ایک کتاب سلک الدرر کے مصنف بھی تھے۔ ۲۹ محرم یوم دو شنبہ ۱۱۲۸ھ/۱۷۱۵ء
کو بعہد فرخ سیر لاہور میں پیدا ہوئے اور ۱۱۹۳ھ/۱۷۷۹ء میں بعہد تیمور شاہ درانی انتقال فرمایا[۱]
دوسرے خطیب مولانا غلام محمد قادری عرف امام گاموں تھے جو تصوف کی ایک منظوم کتاب گنج مخفی کے مصنف ہیں۔ وہ ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۸ء
میں فوت ہوئے۔ ان کا مزار مسجد کی جنوبی دیوار کے باہر کنوئیں کے پاس واقع ہے جس پر ایک گنبد بنا ہوا ہے۔

گذشتہ نصف صدی کے چند مشہور خطیبوں اور اماموں کے نام یہ ہیں۔ مولوی اکرام الدین بخاری۔ مولانا عبداللہ پشاوری،
مولوی عبدالحق۔ حافظ غلام نبی۔ قاری شمس الدین۔ مولوی سید دیدار علی شاہ۔ مولوی عبدالعزیز۔ مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد مرحوم۔

مسجد کے باہر مشرق کی طرف ایک وسیع سرائے یا خلوت خانہ ہے جسے "چوک وزیر خاں" کہتے ہیں۔ اس چوک کے ساتھ بھی بہت
سی روایات وابستہ ہیں۔ اس وقت اس چوک کے تین محرابی دروازے ہیں۔ ایک دروازہ مسجد کے محاذ میں مشرق کی طرف ہے جسے
"سفید دروازہ" یا چٹا دروازہ کہتے ہیں۔ دوسرا دروازہ چوک کے شمال میں راجہ دینا ناتھ کی حویلی سے ملحق ہے۔ تیسرا دروازہ مسجد کے شمالی
زینہ کے پاس ہے۔ ممکن ہے ابتدا میں چوتھا دروازہ بھی ہو مگر اب اس کے کوئی آثار نہیں۔

چوک میں دو گنبد بھی ہیں۔ ایک خانقاہ حضرت سید صوف کا اور دوسرا راجہ دینا ناتھ کے کنوئیں کا۔ اس کے قریب ہی
وزیر خاں کا کنواں اور حضرت سربلند کا مزار ہے۔ حضرت سید صوف اور سربلند دونوں بزرگ فیروز شاہ تغلق کے عہد میں فوت ہو کر یہاں
دفن ہوئے اور ان کے مزار مسجد کی تعمیر سے پہلے یہاں موجود تھے۔

۷۸۶ھ/۱۳۸۴ء میں جب حضرت سید صوف مغل حملہ آوروں سے لڑتے ہوئے شہید ہو کر یہاں دفن ہوئے۔ تو اس جگہ کو بڑا محلہ
کہتے تھے آپ کی قبر ایک معمولی سے چبوترے پر بنائی گئی جس پر کوئی چھت نہ تھی۔ لودھی بادشاہوں کے زمانے میں جب نادر خاں نام
ایک امیر نے اپنی حویلی بنوائی تو اس نے مزار کے گرد ایک خشتی حجرہ بنوا کر اس کو اپنی حویلی کے وسیع صحن میں لے لیا۔ وہ حویلی شاہ جہان
کے زمانے تک موجود تھی۔ نواب وزیر خاں نے اس کے وارثوں سے وہ حویلی خرید کر یہاں مسجد تعمیر کرائی اور مزار کو نئے سرے سے
بنوا دیا۔

سکھوں کے زمانے میں وزیر خاں کے چوک میں اکثر لوگوں نے اپنے مکانات تعمیر کر لیے جس سے مسجد کی زیب و زینت
میں فرق آگیا۔ راجہ دینا ناتھ کی حویلی اور کنواں بھی اسی عہد کی یادگار ہیں ۱۸۸۰ء میں سرکار انگریزی کے حکم سے چوک کے اندرونی مکانات
گرا دیئے گئے اور چوک کو پھر ایک وسیع میدان بنا دیا گیا۔

آج سے نصف صدی قبل اس چوک کا ماحول ایسی رفیع الشان مسجد کے شایان شان ہرگز نہیں تھا۔ بازار بہت تنگ تھا۔
سڑک کے کنارے کہیں نو دودھ دہی اور فالودہ بیچنے والوں کی کھپریل کی کچی دکانیں تھیں جہاں ہر وقت مکھیاں بھن بھناتی رہتی تھیں۔ کہیں
مچھیرے مچھلیاں لیے بیٹھے رہتے تھے جن کی بدبو سے دماغ پھٹ جاتا تھا۔ کسی جگہ طباخ ڈیرہ ڈالے پڑے تھے اور کہیں پکوڑے تلنے
والے تیل جلا جلا کر آنے جانے والوں کا دم ناک میں کرتے تھے۔ چوک میں جگہ جگہ ملبے کے ڈھیر لگے رہتے تھے جن پر دنبے چرتے اور

۱۔ روضۃ الاولیاء از مولوی محمد الدین مطبوعہ ۱۸۶۷ء صفحہ ۴۹ و تذکرہ علماء و المشائخ مؤلفہ منشی محمد الدین فوق مطبوعہ ۱۹۲۰ء
ص ۲۳

گدھے لوٹتے تھے۔

مسجد کے زیر سایہ "خرابات" کی حالت اس سے بھی بدتر تھی۔ چوک کی جانب نعل بندوں اور آہن گروں کی بھٹیوں نے دیواروں کا حلیہ یہاں تک بگاڑ رکھا تھا کہ جدھر نگاہ پڑتی تھی سیاہی ہی سیاہی دکھائی دیتی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مسجد مسلمانوں کی بے حسی اور بے حمیتی پر ماتم کرنے کے لیے سیاہ پوش ہو گئی ہے۔

مسجد کی تاریخی عظمت اور شان و شوکت کے پیش نظر ۱۹۳۰ء میں راقم الحروف نے اس وقت کے متولی آنریبل خان بہادر سر مرزا ظفر علی جج ہائی کورٹ لاہور کی خدمت میں گذارش کی کہ مسجد کا ماحول یکسر تبدیل کریں، بازار کشادہ کرائیں، دکانیں نئی وضع کی بنوائیں اور انہیں ایسے کرایہ داروں کے سپرد کریں جو ہر وقت انھیں صاف ستھرا رکھ سکیں تاکہ اسلام کی عظمت کا نقش ہر رہگذر کے دل پر بیٹھتا رہے۔

مسجد کے صدر دروازے کا منظر حسین بنانے کے لیے یہ تجویز پیش کی تھی کہ چوک صاف کرایا جائے، اس میں سرسبز و شاداب باغ لگایا جائے۔ اسے روشوں اور چمنوں سے آراستہ کیا جائے اس میں فوارے چھوڑے جائیں اور لوگوں کی نشست کے لیے جابجا قرینے سے بنچوں کا بندوبست کیا جائے۔ اس طرح مسجد کی خوبصورتی کو بھی چار چاند لگ جائیں گے اور اندرون شہر کی تفریح گاہوں میں بھی بیش بہا اضافہ ہوگا۔

یہ اور اسی قسم کی دیگر تجاویز ۸ راگست ۱۹۳۰ء کے انگریزی اخبار ٹریبیون، ۷ راگست کے مسلم آؤٹ لک ۲۲ راگست کے زمیندار۔ ۱۲ راگست کے ہفتہ وار اخبار کشمیری اور حمایت اسلام لاہور میں شائع ہوئیں لیکن اس وقت تو ان پر کسی نے خاص توجہ نہ دی البتہ مسجد کے صحن کا فرش جو خراب ہو چکا تھا متولی نے درست کرا دیا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ یہاں کپڑے کی دکانیں لگتی گئیں یہاں تک کہ سامنے چوک میں بزازی کی اچھی خاصی مارکیٹ قائم ہو گئی۔ لیکن تئیس سال گزرنے کے بعد ۱۹۵۳ء میں ہم نے اپنے خواب کی تعبیر یوں دیکھی کہ مارشل لاء کے حکام کی مدد سے لاہور امپروومنٹ ٹرسٹ کی نگرانی میں چوک صاف کرایا جا رہا ہے۔ جگہ جگہ پانچ پانچ چھ چھ فٹ کھدائی کرنے سے پرانے فرش کے آثار نظر آنے شروع ہو گئے ہیں دکانیں گرا دی گئی ہیں۔ باغ باغیچے اور روشوں کی داغ بیل ڈال دی گئی ہے۔ خیال تھا کہ سڑک وسیع کی جائے گی اور چوک مسجد کے شایان شان خوبصورت بنایا جائیگا۔ مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ، آج (۱۹۶۱ء میں) ہم دیکھتے ہیں کہ چوک میں سڑک کے ساتھ ساتھ پھر بزازی کی دکانیں قائم ہو گئی ہیں اور وہی گہما گہمی شروع ہو گئی ہے البتہ اب مسجد کا انتظام متولیوں کے ہاتھ سے نکل کر صوبائی اوقاف کمیٹی کے ہاتھ میں آگیا ہے۔

مسجد خورد نواب وزیر خاں

یہ قدیم طرز کی چھوٹی سی مسجد ٹکسالی دروازے کے جانب جنوب بازار سمیاں میں واقع ہے۔ اسی مقام پر نواب وزیر خاں صوبیدار لاہور نے شاہجہانی عہد میں اپنا زنانہ محل تعمیر کرایا تھا جو اب گر چکا ہے سکھوں کے وقت میں مدت تک اس محل کے آثار اور کھنڈر موجود تھے۔ انگریزوں نے اس زمین کو ہموار کرا دیا۔ یہ مسجد اسی محل سے متعلق تھی جہاں صوبہ لاہور کے گھر کی عورتیں نماز

پڑھا کرتی تھیں۔ راستہ محل کے اندر سے تھا۔ اب یہ مسجد آباد ہے اور مسلمان اس میں معبود حقیقی کی عبادت کرتے ہیں۔ عمارت اس مسجد کی نہایت عمدہ، پختہ، سادہ، بے گنبد ہے۔ دیواروں پر کانسی کا کام ابھی تک روشن ہے۔

مسجد پری محل

یہ مسجد نواب وزیر خاں صوبہ لاہور کی بنائی ہوئی شاہ عالمی دروازہ کے اندر سر بازار واقع ہے۔ اس کی تعمیر کا باعث یہ ہوا کہ جب نواب نے مردانہ محل تعمیر کر کے "پری محل" اس کا نام رکھا تو یہ چھوٹی سی مسجد بنی اور اپنے متوسلین کی سہولت کے لیے تعمیر کی۔ یہ مسجد اب تک آباد ہے بیگوسٹ ۱۳۱۷ھ / ۱۸۹۹ء میں لاہور کے مشہور رئیس میاں چراغ دین والی گمہ کی معرفت اس کی تجدید ہو چکی ہے۔ اب یہ لال مسجد کہلاتی ہے۔ اس کی کرسی زمین سے ایک منزل اونچی ہے۔ نیچے دکانیں ہیں۔ دروازے پر سنگ مرمر کا کتبہ نصب ہے جس پر کندہ ہے:۔

سال آغاز تعمیر

چو این مسجد لباس نو بپوشید ۔۔۔ چراغ دیں فروغ نو بہ بخشید
چو تاریخ بنائش جست فیضی ۔۔۔ "چراغ و مسجد" آمد سال تجدید
۱۳۱۷ھ

سال اختتام تعمیر

جَزَی اللّٰہُ بَانِیَہٗ دَارَ النَّعِیْم ۔۔۔ وَ یَھْدِیْہِ نَحْوَ صِرَاطٍ قَوِیْم
اَبُوالْفَیْضِ فِیْ عَامِ تَجْدِیْدِہٖ ۔۔۔ یَقُوْلُ۔ لِبَانِیْہِ نَفْعٌ عَظِیْم
۱۳۱۷ھ

مسجد چینگڑ محلہ

یہ قدیم زمانے کی مسجد دہلی دروازہ کے اندر محلہ چینگڑاں میں واقع ہے۔ عمارت نہایت مضبوط ہے۔ اندرونی حصہ کسی قدر پست ہے صحن بھرتی ڈال کر اونچا کیا گیا ہے۔ نواب وزیر خاں کی عمارات میں گھر جانے کی وجہ سے اسی کے نام سے مشہور ہے۔ مرمت کے بعد اس کی حالت بہت اچھی ہو گئی ہے۔ مولانا سید دیدار علی شاہ مرحوم اسی جگہ دفن ہیں۔ ان کے صاحبزادے مولانا سید ابوالبرکات نے بھی یہیں درس و تدریس کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے۔ بعض تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت میاں میرؒ کے مرید ملا خواجہ بہاری بھی اسی مسجد میں بیٹھ کر درس دیا کرتے تھے۔ چنانچہ سیر المتاخرین میں لکھا ہے کہ "جب شاہجہان دارا شکوہ سے ملنے گیا تو دہلی دروازہ کے راستے گیا جہاں ملا خواجہ کا مکان بھی تھا"۔ تحقیقات چشتی نے تو یہاں تک نشاندہی کی ہے کہ "یہ مسجد متصل مسجد نواب وزیر خاں تھی"۔ ممکن ہے نواب سعد اللہ خان وزیر شاہجہان بھی اسی مسجد میں پڑھتے رہے ہوں۔[1]

---

[1] تذکرہ علمائے لاہور صفحہ ۳۶۔

مسجد شاہ ابوالمعالی

یہ پختہ ریختہ کار مسجد شاہ خیرالدین المخاطب بہ شاہ ابوالمعالی قادری کے مقبرے کے غرب میں واقع ہے۔ اندر باہر فرش پختہ ہے۔ تین محرابیں قالبوتی عالی شان ہیں۔ سقف قالبوتی اس پر تین گنبد مدوّر مقطع ہیں۔ یہ مسجد شاہ ابوالمعالی (پیدائش دہم ماہ ذوالحج روز عید ۹۶۰ھ / ۱۵۵۲ء، وفات ۷، ربیع الاول ۱۰۲۵ھ / ۱۶۱۶ء بعہد شاہ جہاں) نے اپنی زندگی میں بنوائی تھی مگر سکھوں کے وقت غوث خاں جرنیل توپ خانہ نے اس مسجد کو دوبارہ بنوایا جو اب تک موجود ہے۔ اب اس میں اور بھی کئی قسم کی تبدیلیاں ہو گئی ہیں۔

مسجد سرائے شاہجہانی

مقبرہ جہانگیر کے غرب کی سمت دیوار بہ دیوار ایک عالی شان سرائے ہے جو شاہ جہاں بادشاہ نے ۱۰۵۲ھ / ۱۶۴۲ء میں تعمیر کرائی تھی۔ بعض لوگ اسے سرائے اکبری کہتے ہیں مگر اس میں اکبر کے دور کی کوئی خصوصیت نہیں۔ پھر ملّا عبدالحمید لاہوری نے بادشاہ نامہ میں اسے جلوخانہ روضہ لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقبرۂ جہانگیر کے ساتھ ہی تعمیر ہوئی تھی۔ اس سرائے کی عمارت نہایت پختہ ہے ۵۴۷ فٹ لمبے اور ۵۶۰ فٹ چوڑے باغیچہ نما صحن کے چاروں طرف بلند چبوترے پر ۱۸۰ حجرے ہیں۔ ہر حجرہ تقریباً ½۱ فٹ مربع ہے۔ حجروں کے آگے پختہ قالبوتی برآمدے ہیں۔ کبھی یہ حجرے مقبرے کے محافظوں، خادموں اور مسافروں کے استعمال میں آتے ہوں گے مگر اب مدت سے بے آباد پڑے ہیں۔ ۱۸۵۸ء سے پہلے یہ جگہ محکمہ ریل کے قبضے میں تھی اور یہاں انجنوں کے کل پرزے اور کوئلے کے ذخیرے پڑے رہتے تھے۔ ۱۸۹۵ء میں یہاں رستم ہند غلام پہلوان اور دیو ہند کیکر سنگھ کی مشہور کشتی ہوئی تھی جس میں ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں یہاں تک کہ بہار، بمبئی، مدراس، کلکتہ، دلّی، حیدرآباد دکن اور برابر سے بڑے بڑے شوقین رئیس اور جاگیردار شرکت کے لیے آئے تھے۔ اس موقعہ پر ریلوے نے شاہدرہ تک اسپیشل ٹرینیں چلائی تھیں۔ یہ غلام پہلوان وہی ہیں جنھیں پنڈت جواہر لال نہرو کے باپ پنڈت موتی لال نہرو ۱۹۱۰ء کی عالمگیر نمائش میں اپنے خرچ پر پیرس لے گئے تھے جہاں انھوں نے اپنے ملک کا نام روشن کیا تھا۔

اس سرائے کے تین دروازے ہیں۔ جنوبی دروازے کی ڈیوڑھی میں محکمہ آثار قدیمہ کا عملہ رہتا ہے۔ مشرقی دروازے سے مقبرہ جہانگیر میں داخل ہوتے ہیں۔ اس دروازے کے محاذ میں یعنی اس کے جواب میں سرائے کی غربی دیوار کے ساتھ ایک عالی شان مسجد پختہ گنبد دار تعمیر کی ہوئی اب تک موجود ہے۔ اس مسجد کے تین در ہیں۔ ایک کلاں اور دو خورد۔ صحن مسجد میں ایک عمدہ حوض ہے۔ یہ مسجد صرف دن کے وقت زائروں کی وجہ سے آباد رہتی ہے۔

ٹکسال والی مسجد

یہ مسجد ٹکسالی دروازے کے اندر سر بازار واقع ہے۔ اگرچہ تمام مسجد گر چکی ہے مگر اب بھی ایک حصّہ باقی ہے۔

اس کی دیواروں پر کاشی کا کام ہے اور اب تک روشن ہے۔ شاہ جہان بادشاہ نے اس کے پاس دارالضرب تعمیر کیا تھا جہاں روپیہ مضروب ہوتا تھا یہ مسجد اسی مکان سے متعلق تھی۔ اب دارالضرب کا تو نام و نشان باقی نہیں البتہ مسجد کا کسی قدر حصہ باقی ہے۔ اس مسجد کو اب مسلمانوں نے مرمت کر کے آباد کر لیا ہے۔ یہ مسجد فدائی خاں کوکہ کے نائب عبداللہ خاں نے بنوائی تھی۔

مسجد بازار طبیّ (حکیماں)

یہ مسجد بھی شاہجہانی دور کی بنی ہوئی ہے سکھوں کے وقت مہاراجہ کی بارود اس میں بھری رہتی تھی۔ انگریزی حکومت کی ابتدا میں یہ چند سال غیر آباد رہی۔ آخر مولوی غلام قادر نے سرکار میں درخواست کر کے اس مسجد کو آباد کرنے کا حکم لیا، اور امام بخش قصاب نے جس کے پاس گوروں کو گوشت پہنچانے کا ٹھیکہ تھا بہت سا روپیہ صرف کر کے اس کی مرمت کرائی۔ مولوی غلام قادر کی وفات کے بعد ان کا بھانجا مولوی نظام الدین اور ان کے مرنے کے بعد ان کے بیٹے مولوی عزیز الدین و علی الدین اس مسجد کی امامت کرتے رہے۔ بانی اس مسجد کا کوئی امیر تھا جس کا نام غلام مہدی خاں کتبہ میں لکھا ہوا ہے مگر سنہ پڑھا نہیں جاتا۔ یہ مسجد پرانی تحصیل کے پاس بازار طبی یا حکیماں میں ہے اور مدرسہ نعمانیہ سے ملحق۔ اس کی تعمیر میں دورِ شاہجہانی کی تمام فنی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔

مسجد محمد صالح کمبوہ

یہ چھوٹی سی مقطع خوبصورت مسجد موچی دروازے کے اندر واقع ہے۔ جب کوئی دروازے میں داخل ہوتا ہے تو سامنے ہی اس کی رنگین کاشی کار عمارت نظر آتی ہے۔ تینوں گنبد مدور صورت عمدہ شکل کے ہیں۔ مسجد کی تینوں محرابوں کے اوپر اور گوشوں کی دیواروں پر کاشی کا کام زرد رنگ میں اور اس میں حروف لاجوردی رنگ کے ہیں اکثر آیات قرآنی اور احادیث فارسی نسخ اور نستعلیق خط میں تحریر ہیں۔ مسجد کی عمارت $\frac{\text{۱۰۷۰ھ}}{\text{۱۶۵۹ء}}$ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی اور ملا محمد صالح کمبوہ نے اس کو تعمیر کیا۔ اس نے اپنی حویلی بھی اس کے قریب ہی مشرق کی جانب بنوائی۔ ملا محمد صالح صوبہ پنجاب کی دیوانی میں بڑا فاضل شخص تھا اس نے شاہجہانی دور کی تاریخ "عمل صالح" اسی کے نام سے لکھی ہے۔ اس مسجد کے دروازے پر تین طاقچے کاشی کار بنے ہوئے ہیں۔ دو میں لکھا ہے ــــ

بانیٔ ایں مسجد زیبا نگار   بندۂ آل محمد صالح است

تیسرے میں $\frac{\text{۱۰۷۰ھ}}{\text{۱۶۵۹ء}}$ لکھا ہے۔ اس مسجد کی کرسی اونچی ہے اور نیچے دکانیں ہیں مگر بازار کی سطح اونچی ہو جانے کے سبب سے دکانیں آدھی آدھی زمین میں غرق ہو گئی ہیں۔ دروازہ بھی چھوٹا سا رہ گیا ہے۔

مسجد چینیاں والی۔

یہ بھی زمانہ سلف کی عمارتوں کی یادگار ہے اور حصار شہر کے اندر محلہ چابک سواراں میں واقع ہے۔ اس کی ایک دیوار

حویلی نواب سعد اللہ خان المشہور میاں خان کے ساتھ لگتی ہے۔ مغلوں کے آخری دور میں اس مسجد کے قریب ہی نواب شاہ نواز خان پسر نواب ذکریا خان نے اپنا فیل خانہ اور نواب آدینہ بیگ نے اپنی حویلی بنوائی تھی مگر اب ان کا کوئی نشان باقی نہیں۔ مسجد نہایت وسیع صحن والی ہے۔ تینوں محرابیں اس کی مسجد وزیر خان کی محرابوں کی طرح کاشی کار منقش ہیں۔ مسجد کی نصف زمین مسقف ہے اور نصف بطور صحن کھلی چھوڑ دی گئی ہے۔ سقف پر تین گنبد بیٹھویں قطع کے بنے ہیں۔ بوقت تعمیر اس کی کرسی اونچی رکھی گئی تھی مگر اب کوچہ کی زمین اتنی بلند ہو گئی ہے کہ کرسی جاتی رہی ہے۔ مسجد کا شرقی دروازہ نہایت خوبصورت ابری کا بنا ہوا تھا اور ڈیوڑھی کا فرش سنگ مرمر کا تھا۔ سکھ حاکمان لاہور کے زمانے میں گوجر سنگھ نے اس کی سلیں اکھڑوا لیں اور دہلیز جو سنگ مرمر کی تھی سوبھا سنگھ نے اتروا لی۔ منہدمہ دروازے کی پیشانی پر یہ شعر لکھا ہوا تھا ؎

طرفہ معمار خرد تاریخ سال

گفت زیبا مسجد از افراز خان

اس مصرع سے ۱۰۸۲ھ/۱۶۷۱ء تاریخ نکلتی ہے حالانکہ اندر کی محراب پر ۱۰۸۰ھ تحریر ہے جس سے پایا جاتا ہے کہ اندر کی عمارت اور بیرونی دروازے کی تعمیر میں دو سال لگے۔

اس مسجد کی تین محرابیں عالی شان کاشی کار بنی ہوئی ہیں۔ ہر ایک محراب میں تین تین کتبے ہیں جن میں کلمہ و آیات قرآنی اور اشعار فارسی تحریر ہیں۔ نقش و نگار نہایت خوش رنگ ہیں۔ زمین بسنتی اور حروف لاجوردی ہیں۔ اندر کی دیواریں ریختہ کار پختہ ہیں۔ صحن میں پہلے حوض بھی تھا مگر اب اسے بند کر کے اس پر کمرے بنا لیے گئے ہیں۔

اس مسجد کے بانی کا نام سرفراز خان تھا جسے افراز خان بھی کہتے ہیں۔ عہد شاہجہانی و عالمگیری میں صوبہ لاہور کی فوجداری اس کے سپرد تھی۔ پانچ ہزاری منصب تھا۔

یہ مسجد اہل حدیث فرقہ کے قبضے میں ہے اور آباد ہے۔ بہت سا روپیہ صرف کر کے اس کی مرمت و توسیع کی گئی ہے اس کے ساتھ لڑکیوں کا مدرسہ قائم کیا گیا ہے جس کا نام "مدرسہ بنات المسلمین" ہے۔

اس سے قبل بھی اس مسجد میں ہمیشہ درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ ۱۷۴۷ء میں جب احمد شاہ ابدالی نے پنجاب پر پہلا حملہ کیا تو مولانا شہر یار اس مسجد کے امام تھے۔ وہ بڑے جیّد عالم تھے اور ان کا درس بہت مشہور تھا۔ انھوں نے حملہ آوروں کی لوٹ مار اور تشدد سے متأثر ہو کر احمد شاہ ابدالی کے منہ پر ادمیاں یعنی اے ظالم کہا (میاں ترکی زبان میں ظالم کو کہتے ہیں)۔ ابدالی نے ناراض ہو کر انھیں لاہور سے نکال دیا۔ آپ ٹانڈہ ضلع ہوشیار پور چلے گئے اور وہیں فوت ہوئے۔

مولوی عبد اللہ الغزنوی بھی کچھ عرصہ یہاں رہے ہیں۔ وہ نہایت نامور عالم اور متقی بزرگ تھے۔ سنہ ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۴ء میں بہادر خیل (نواح غزنی) میں پیدا ہوئے۔ ابتدا ہی سے علماً و مشائخ کا درجہ رکھتے تھے۔ حدیث و تفسیر اور کتاب و سنت کی اشاعت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ اس سلسلے میں بہت سی تکالیف بھی اٹھائیں۔ امیر دوست محمد خاں والیٔ کابل نے آپ کو جلا وطن کر دیا۔ آپ نے دہلی اور لاہور میں کچھ عرصہ رہ کر امرتسر میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ وہیں سنہ ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۰ء میں انتقال فرمایا۔ علامہ اقبال نے اپنے ۱۹ دسمبر سنہ ۱۹۲۲ء کے ایک مکتوب میں منشی محمد الدین فوق کو لکھا:۔

"مولوی عبداللہ غزنوی حدیث کا درس دے رہے تھے
کہ ان کو اپنے بیٹے کے قتل کئے جانے کی خبر ملی ایک
منٹ تامل کیا۔ پھر طلبہ کو مخاطب کر کے کہا۔
"ما برضائے او راضی ہستیم۔ بیا بیا کہ کار خود بکنیم"
یہ کہہ کر پھر درس میں مشغول ہو گئے۔ مخلص مسلمان اپنے
مصائب کو بھی خدا تعالےٰ کے قرب کا ذریعہ بنا لیتا ہے"[1]

مولوی عبداللہ غزنوی کے فرزند مولوی عبدالواحد غزنوی بھی جید عالم اور صالح بزرگ تھے۔ وہ ساری عمر مسجد چینیاں والی کے امام رہے۔ انھوں نے ۱۹۳۱ء کے اوائل میں انتقال فرمایا اور امرتسر میں دفن کئے گئے۔[2]
۱۹۳۱ء کے بعد سے آپ کے پوتے مولوی داؤد غزنوی خلف مولوی عبدالجبار اس مسجد میں دین و سیاست کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ملک کی متعدد تعلیمی، تنظیمی اور سیاسی تحریکات میں ان کا نمایاں حصہ ہے۔

مسجد دایہ لاڈو

شاہ عالمی دروازے کے باہر، ڈن پونٹ ہسپتال کے شرقی کی طرف، سڑک کا فاصلہ چھوڑ کر، یہ قدیم مسجد واقع ہے۔ آئے شاہزادہ سلیم یعنی جہانگیر بادشاہ کی دودھ پلانے والی دایہ لاڈو نے اپنی زندگی میں بنوایا تھا اور اپنی قبر بھی اس کے صحن میں تیار کرائی تھی۔ اس کے خاوند کا نام محمد اسمٰعیل تھا۔ دونوں میاں بیوی عابد شب زندہ دار تھے۔ اس محلے کو مغلوں کے وقت میں ٹبّا کہتے تھے۔ اس دایہ کی حویلیاں اور باغ بھی اسی محلے میں تھے۔ یہ دایہ ۱۱۱۹ھ میں فوت ہوئی اور محمد شکور اس کا بیٹا اس مسجد کا نگران رہا۔ اس کے وقت میں مولوی حشمت اللہ ایک فاضل یہاں درس دیتے تھے۔

جب سلطنت مغلیہ برباد ہوگئی تو باہر کے محلے سب اُجڑ گئے لوگ بھاگ کر شہر کے محفوظ مقامات میں چلے گئے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں ایک سنیاسی ہندو جوگی بسنت گر نام اس مسجد پر قابض ہوگیا۔ اس نے ایک طرف شوالہ اور دوسری طرف ٹھاکر دوارہ بنا کر قریب تیس سال اس میں قیام کیا۔ جب انگریزی دور دورہ شروع ہوا تو سائیں مہر شاہ قادری نے لاہور کے چند مسلمانوں کو ساتھ ملا کر زبردستی اس ہندو جوگی کو بے دخل کر دیا۔ مسجد پھر آباد ہوگئی اور گرد و نواح کی کوٹھیوں کے مسلمان وہاں نماز پڑھنے لگے۔ جب تک سائیں مہر شاہ زندہ رہا اس مسجد کے ایک کوٹھے میں مقیم رہ کر اس کی دیکھ بھال کرتا رہا۔ اس کے بعد یہ مسجد انجمن اسلامیہ کی تولیت میں چلی گئی اور اب اوقاف کمیٹی کے انتظام میں ہے۔
یہ مسجد پختہ چونہ کی عمارت ہے اور نہایت مضبوط بنی ہوئی ہے۔ تین محرابیں ہیں اور ایک گنبد عالی شان مسقف

---

[1] - نقوش مکاتیب نمبر صفحہ ۳۰۳
[2] - تاریخ حریت اسلام صفحہ ۳۹۳

قالبوتی ہے۔ صحن وسیع ہے۔ کنوآں اور حوض پُر کر دیا گیا ہے۔ صحن کے شرق کی طرف دایہ لاڈو کی قبر تھی۔ سائیں مہر شاہ کی قبر بھی تھی جو فرش کے ساتھ ہموار کر دی گئی ہے۔

مسجد دایہ انگا

یہ عالی شان مستحکم مسجد شاہ جہان بادشاہ کے عہد میں دایہ انگا نے ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء میں تعمیر کرائی تھی۔ دایہ انگا جہانگیر کے دولت خانہ میں رہتی تھی۔ نام اس کا زیب النساء بیگم اور انگا خطاب تھا۔ انگ جسم کو کہتے ہیں اور انگا اس دایہ کو جو شہزادوں کو دودھ پلاتی تھیں۔ دایہ انگا نے شاہجہان کو دودھ پلایا تھا اور اس کے خاوند کا نام مراد خاں تھا۔

یہ مسجد مغلیہ سلطنت کے وقت بہت رونق پر تھی۔ بہت سی جائداد بانیہ نے اس کے ساتھ وقف کی تھی۔ مگر زمانہ پلٹ گیا۔ شہر غارت گردوں نے لوٹ لیا۔ باہر کی آبادی ویران ہو گئی۔ یہ مسجد کس مپرسی کی حالت میں باقی رہ گئی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وقت اس سے بارود خانہ کا کام لیا جانے لگا۔ انگریزوں نے مسجد خالی کرا کے اسے نزول میں درج کر لیا۔ مسٹر ہنری کوپ مہتمم مطبع لاہور کرانیکل نے سرکار سے اجازت لے کر اس کو اپنی کوٹھی بنا لیا۔ چند سال بعد جب کارخانہ ریل جاری ہوا تو یہ مسجد ریل والوں نے بارہ ہزار روپے میں خرید لی اور اس میں ٹریفک سپرنٹنڈنٹ کا دفتر قائم کر دیا۔ منشی محمد الدین فوق مرحوم نے نومبر ۱۹۰۱ء میں جب اپنا اخبار "پنجہ فولاد" جاری کیا تو پہلے ہی پرچے میں اس مسجد کے ناجائز استعمال کے خلاف آواز اٹھائی آہستہ آہستہ باقی مسلم پریس نے ہمنوائی و تائید کی۔ آخر لارڈ کرزن نے ۱۹۰۳ء میں مسجد مسلمانوں کو واگذار کر دی۔

یہ مسجد لاہور ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر ا کی دیوار کے ساتھ باہر کی جانب ہے۔ اندر باہر سے کاشی کار ہے۔ محرابوں پر بسنتی رنگ کا نہایت عمدہ کام ہے جس پر قرآن پاک کی آیتیں اور درود شریف بخط نسخ تحریر ہیں۔ مسجد کی تین عالی شان محرابیں قالبوتی خوش قطع ہیں۔ دو چھوٹی اور ایک بڑی ہے۔ بڑی محراب کی پیشانی پر "اللہ، محمدؐ، ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، حسنؓ حسینؓ" تحریر ہیں۔ ایک کتبہ تاریخ کی نشاندہی کرتا ہے:۔

"باہتمام خود مقبول باتمام رسیدہ"
کتبہ ابراہیم ۱۰۴۵ھ"

تمام عمارت خشتی منقش ہے۔ اندر سے بھی مسجد کے تین درجے ہیں۔ سقف قالبوتی اور سقف کے اوپر تین گنبد مدور عالیشان بنے ہیں۔ پہلے اس کے چار مینار تین تین منزلہ تھے۔ اب اگلے دو مینار باقی رہ گئے ہیں۔ پچھلے گر گئے ہیں۔ ایک ایک منزل موجودہ میناروں کی بھی گر گئی ہے۔

اب یہ مسجد آباد ہے اور یہاں ریلوے دفاتر کے اہل کار اور اردگرد کی کوٹھیوں کے مکین نماز ادا کرتے ہیں۔

مسجد خواجہ ایاز

یہ قدیم طرز کی عمارت موضع باغبان پورہ میں خانقاہ مادھو لال حسین کے متصل واقع ہے۔ خواجہ ایاز ایک امیر کبیر اور

فن تعمیرات کا ماہر تھا۔ شاہ جہانی عہد میں نواب علی مردان خاں کے ماتحت کام کرتا تھا۔ جب شالامار باغ تعمیر ہوا تو خواجہ ایاز ہی میر عمارت تھا۔ اس نے اپنی یادگار یہ مسجد چھوڑی اور ایک باغ بھی اپنے نام سے شالامار باغ کے شرق میں احداث کرایا جواب تک مع چار دیواری پختہ و بارہ دری کے موجود ہے۔

اس مسجد کی تین محرابیں اور تین گنبد عالی شان پختہ ہیں۔ سقف قالبوتی ہے۔ مسجد کے چاروں طرف چار چار گز بلند دیواریں ہیں۔ درمیان میں ایک حوض دس گز مربع اور بیچ میں فوارہ ہے۔ خاص مسجد کی بیرونی دیوار کے دونوں گوشوں میں دو زینے اوپر جانے کے لیے بنے ہیں، درمیانی محراب پر ایک سل سنگ مرمر کی لگی ہے اور اس پر حدیث شریف عربی خط میں لکھی ہے۔ نیز بندہ درگاہ خواجہ محمد ایاز تحریر ہے۔ بیرونی دیوار کے مرغولوں اور بازوؤں پر رنگین پُر تکلف کتبہ ہے۔ زیر گنبد و اندرون مسجد بھی سب عمارت رنگین اور منقش ہے۔ زمین پر پختہ فرش ہے۔ جنوب کی طرف دو حجرے پختہ بنے ہیں، اس مسجد پر مہر مہنگا کی اولاد کا قبضہ ہے اور یہ اکثر بند رہتی ہے۔

مسجد ستارہ بیگم

میاں سلطان کی سرائے کے مشرق میں ٹیکنیکل سکول کے پاس ستارہ بیگم کی نہایت خوبصورت مسجد تھی۔ یہ ستارہ بیگم شہزادہ دارا شکوہ کی بیوی تھی جو قدسیہ بیگم کہلاتی تھی۔ مسجد فن تعمیر کا نہایت نفیس نمونہ تھی۔ عمارت دو منزلہ تھی جو آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے تک خستہ حالت میں موجود تھی۔ نچلی منزل کے دالان اور کمرے جو طلبہ، اساتذہ اور درویشوں کی رہائش کے لیے قالبوتی بنائے گئے تھے، نہایت مضبوط اور آرام دہ تھے۔ ان میں روشنی اور ہوا کا ایسا عمدہ انتظام تھا کہ ہر جگہ بفراغت تمام بیٹھ کر لکھا پڑھا جا سکتا تھا۔ حجروں کے درمیان ایک چاہ کلاں اور ساتھ سرد خانہ تھا۔ اور صحن کے ایک گوشے میں حوض اور حوض کے شمال جنوب میں بلند نشست گاہیں تھیں۔ سقف پر جانے کے لیے زینہ، چھت پر تین گنبد اور چاروں کونوں پر چار مینار تھے بقول نور احمد چشتی کسی مسجد کے نیچے ایسی عمارت دیکھنے میں نہیں آئی۔"[1]

انگریزوں کے ابتدائی دور حکومت میں اس جگہ مسٹر او۔ ولبی رہا کرتے تھے جو لاہور کرانیکل کے منیجر تھے۔ اس کے بعد یہ عمارت ریلوے کے کسی افسر کے قبضے میں چلی گئی جس نے میاں سلطان کے ہاتھ بیچ دی۔ میاں سلطان نے ما بنٹوں کے لالچ میں اس شاندار عمارت کا صفایا کر دیا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ میاں سلطان کا زوال اسی کے بعد شروع ہوا۔ اس پر خدا کا گھر ڈھانے کا یہ وبال پڑا کہ اس کا حال پتلا ہو گیا اور اس کے بعد وہ مالی پریشانیوں کا شکار ہو کر چل بسا

مسجد شہید گنج

لنڈا بازار میں جس جگہ کو اب شہید گنج کہتے ہیں وہاں مزار شاہ کاکو چشتی متوفی ۸۴۲ھ/۱۴۳۸ء مقبرہ میر معین الملک

---

[1] تحقیقات چشتی۔

عرف میر منو[1] (وفات ۱۱۶۶ھ/ ۱۷۵۲ء) اور ایک پختہ مسجد ہوتی تھی جس کے ساتھ حمام بھی تھے۔ مسجد کے تین گنبد اور تین محرابیں تھیں۔ یہ مسجد داراشکوہ کے خانساماں عبداللہ خاں[2] نے ۱۰۶۳ھ/ ۱۶۵۳ء میں بنوائی تھی۔ بعد میں وہ لاہور کا کوتوال ہو گیا تھا اور اسی مسجد کے قریب نخاس میں جلوس کیا کرتا تھا۔ سکھوں نے اپنے اقتدار کے زمانے میں اس مسجد اور مقبرہ کو گوردوارہ میں تبدیل کر کے شہید گنج نام دے دیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس جگہ مغلوں کے آخری گورنر نواب میر معین الملک عرف میر منو نے فرخ سیر بادشاہ کے زمانے میں سکھوں کو قتل کیا تھا اور وہ ان کی یاد باقی رکھنا چاہتے ہیں، انھوں نے میر منو کا مقبرہ جو بارہ دری کی صورت میں تھا اسی وقت مسمار کر کے اس کی لاش ضائع کر دی تھی مگر باقی اسلامی عمارتیں انگریزوں کے عہد تک کسی نہ کسی طرح برقرار تھیں۔ مسلمان ان کا مطالبہ کرتے تھے مگر سکھ نہیں مانتے تھے۔ آخر ۹ جولائی ۱۹۳۵ء کی رات کو ماسٹر تارا سنگھ کے مشورے سے اکالی جماعت نے انگریزی کمیونوں اور انگریزی پولیس اور فوج کی حفاظت میں اس مسجد اور مزار شاہ کاکو چشتی کو مسمار کر دیا۔

مسلمان اس واقعہ پر تلملا اٹھے۔ ان کی آنکھوں سے اشکوں کی بجائے خون برسنے لگا۔ وہ جتھے بنا بنا کر مسجد حاصل کرنے کی خاطر شہید گنج کی جانب روانہ ہوئے۔ حکومت نے انھیں روکنے کے لیے سڑک پر خاردار جنگلے لگا دیے۔ مولوی ظفر علی خاں، ملک لال خاں، مولانا سید حبیب اور اس تحریک کے دیگر پرجوش رہنماؤں کو نظر بند کر لیا اور ۱۹ - ۲۰ جولائی کو کئی سرفروش گولیوں کا نشانہ بنا کر شہید کر دیے۔ اس وقت ایمرسن صاحب پنجاب کے گورنر اور مسٹر ایس پرتاب ڈپٹی کمشنر لاہور تھے جو خود بھی سکھ قوم سے تعلق رکھتے تھے۔

اس واقعہ کے بعد سے تقسیم پاک و ہند تک پولیس کی خاص چوکیاں گوردوارہ شہید گنج اور سکھوں کی حفاظت کرتی تھیں۔ اب بھی یہ جگہ سکھوں کے لیے محفوظ ہے اور مسلمان سپاہی پہرا دیتے ہیں۔

---

۱ - میر منو نواب قمرالدین خاں وزیر محمد شاہ کا فرزند تھا۔ وہ بڑا بہادر اور دلیر تھا۔ سکھ اسے اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے۔ اس کا مزار ایک بارہ دری کی صورت میں تھا۔ راجہ شیر سنگھ کے عہد میں اس کی قبر اکھاڑ کر اس کی آرامگاہ مٹا دی گئی اور اس کی جگہ شراب کی دکان قائم کر دی گئی۔

۲ - "عبداللہ خاں دراصل سعید خاں بہادر ظفر جنگ کا چوتھا لڑکا تھا۔ اسے اپنے والد کی وفات پر جو شاہ جہان کے پچیسویں سال میں واقع ہوئی، منصب دو ہزاری سے سرفراز کیا گیا۔ وہ شہزادہ اورنگ زیب کے ہمراہ کابل گیا۔ اس کے بعد کابل کا والی بھی مقرر ہوا۔ آخر عہد شاہ جہانی میں شہزادہ سلطان شکوہ کے ساتھ رہا۔ جنگ تخت نشینی کی ابتدا میں سموگڑھ کے مقام پر وہ داراشکوہ کے ساتھ تھا۔ جب داراشکوہ لاہور آیا تو وہ اس کا ساتھ چھوڑ کر اورنگ زیب کے ہمراہ ہو گیا اور پھر وہیں رہا۔ ممکن ہے اس نے اپنے قیام لاہور کے دوران یہ مسجد تعمیر کی ہو۔"

(لاہور کے آثار قدیمہ۔ امروز لاہور ۲۸ نومبر ۱۹۵۵ء)

مسجد محمد صالح سندھی

یہ قدیم زمانے کی مسجد قلعہ گوجر سنگھ سے بجانب شرق نہایت مقطع گنبد دار بنی ہوئی ہے۔ محمد صالح سندھی صوبہ لاہور کے دیوان نے شاہ جہان کے عہد میں تعمیر کرائی تھی۔ سکھوں کے وقت میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حکم سے اس میں بارود بھری رہتی تھی۔ انگریزوں کے عہد میں یہ مسجد خالی ہوئی تو نواب علی رضا خاں نے اس کی مرمت کرائی۔ یہ مسجد اندر باہر سے پختہ ہے۔ اس کی تین محرابیں ہیں اور تین ہی عالی شان گنبد۔ صحن بھی ہے اور چاہ بھی۔ شہر کی بیرونی آبادی کے وقت یہاں محلہ حاجی سوائے آباد تھا اور شیخ محمد صالح حاجی سوائے کا برادر زادہ اور امیر کبیر تھا۔ اس نے اپنی امارت کے زمانے میں یہ مسجد تعمیر کی تھی۔ یہ مسجد اب نئے اب پبلس کے احاطے میں آگئی ہے۔

بادشاہی مسجد

یہ مسجد قلعہ لاہور کے اکبری دروازہ کے سامنے مغرب کی جانب ۱۵ فٹ بلند چبوترے پر واقع ہے۔ قلعہ اور مسجد کے درمیان حضوری باغ اور رنجیت سنگھ کی بارہ دری ہے جسے جلو خانہ بھی کہتے ہیں۔ مسجد کی تعمیر کے بعد یہ چار دیواری اورنگ زیب کی سرائے کہلاتی تھی۔ روشنائی دروازے کے دائیں بائیں کے حجروں میں شاہی محافظ دستے رہا کرتے تھے۔ جب بادشاہ نماز پڑھنے جاتا یا سواری کے لیے نکلتا تو یہ دستے گرز اور عصا اٹھا کر آگے آگے چلتے۔ بارہ دری اور باغ کی جگہ صرف ایک چبوترا تھا جو قلعہ اور مسجد کو آپس میں ملاتا تھا۔

مسجد کے صدر دروازہ میں داخل ہونے سے پیشتر بائیس سیڑھیاں چڑھنی پڑتی ہیں۔ سب سے نچلی سیڑھی کا طول ۱۲۶ فٹ ۱۶ انچ عرض ۹ فٹ ۴ انچ اور سب سے اوپر والی سیڑھی کوئی ۷۹ × ۴۴ × ۳ فٹ ہے۔ ان سیڑھیوں میں کابلی سنگ ابری استعمال کیا گیا تھا مگر اب تازہ مرمت کے وقت سنگ سرخ لگا دیا گیا ہے۔ سیڑھیوں کے دائیں بائیں حجروں کے آگے خالی چبوترے پر علامہ اقبال اور سر سکندر حیات خان کی قبریں ہیں۔

دروازہ اپنی شان و شوکت اور رفعت کے لحاظ سے بے عدیل ہے۔ یہ سنگ رخام اور سنگ مرمر سے بنا ہے۔ ڈیوڑھی تقریباً مربع ہے جس کی پیمائش ۶۶ فٹ ۷ انچ ضرب ۶۲ فٹ ۱۰ انچ ہے اوپر دو منزلہ عمارت ہے جس میں کبھی خطیب یا امام وغیرہ رہتے ہوں گے مگر اب تبرکات نمائش کے لیے رکھے ہوئے ہیں۔ دروازے کی محراب کے دونوں جانب نہایت خوب صورت کنگرے بنے ہیں جو سنگ سرخ اور سنگ مرمر کے ہیں۔ دروازے کے عین وسط میں محراب کی پیشانی پر سنگ مرمر کا ایک تختہ نصب ہے جس پر کلمہ طیبہ اور اس کے نیچے مندرجہ ذیل عبارت بخط طغرا کندہ ہے:-

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

"مسجد ابوالظفر محی الدین محمد عالمگیر بادشاہ غازی

سنہ ہزار و ہشتاد و چہار ہجری اتمام یافت

باہتمام کمترین خانہ زادان فدائی خاں کوکہ"

یہ مسجد عالمگیر کے حکم سے ۱۰۸۴ھ/۱۶۷۳ء میں تیار کی گئی تھی اور اس پر چھ لاکھ روپیہ سے زیادہ صرف ہوا تھا۔ مسجد کے اخراجات کے لیے ملتان کا خراج وقف تھا۔[1]

ڈیوڑھی سے گزرنے کے بعد وسیع صحن نظر آتا ہے جو تقریباً مربع ہے۔ اس کا طول شمالاً جنوباً ۵۲۸ فٹ ۱۰ انچ اور عرض شرقاً غرباً ۵۲۸ فٹ ۴ انچ ہے۔ اس کا فرش پہلے پختہ اینٹوں کا تھا اور نمازیوں کی سہولت کے لیے سنگ موسیٰ اور سنگ رخام سے مصلے بنے تھے مگر وہ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا اور اس میں کئی جگہ گڑھے پڑ گئے تھے۔ اب اینٹوں کی جگہ سنگِ سرخ کی سلیں لگا دی گئی ہیں۔

۱۹۱۱ء میں طرابلس کے مسلمانوں پر اٹلی کی یورش سے متاثر ہو کر علامہ اقبال نے ایک نظم کہی تھی جس کا عنوان ہے "حضور رسالت مآب میں"۔ یہ نظم مسلمانوں کے ایک اجتماع کے سامنے اسی صحن میں رو رو کر سنائی گئی تھی۔ نظم بانگِ درا کے حصہ سوم میں شامل ہے اور اس کا آخری بند یہ ہے ؎

حضور دہر میں آسودگی نہیں ملتی	تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں	وفا کی جس میں ہو بو وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں	جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو علامہ اقبال کی نماز جنازہ بھی اسی صحن میں ادا کی گئی تھی۔

اس صحن کے وسط میں مربع شکل کا ایک حوض ہے جس کا ہر ضلع ۵۰ فٹ ہے۔ حوض میں پانی ایک نل کے ذریعے اس قدیم کنویں سے لایا جاتا ہے جو مسجد کے جنوب مشرقی گوشے میں باہر کی طرف ہے۔ تازہ مرمت کے بعد حوض کے گرد جنگلہ لگا دیا گیا ہے اور وضو خانہ صدر دروازے کے دائیں بائیں جانب والے حجروں کے اوپر بنا دیا گیا ہے جہاں ۲۸ ٹونٹیوں کا انتظام ہے۔ پینے کے لیے پانی کے نل علیحدہ لگائے گئے ہیں۔

حوض سے گزر کر ایوان تک، دو زینے بلند، ایک چبوترا ۲۵۲ فٹ لمبا اور ۵۰ فٹ چوڑا ہے۔ اس سے آگے بڑھو تو مسجد کی عمارت شروع ہوتی ہے جسے درگاہ بھی کہتے ہیں۔ یہ بلند محرابوں اور تین سفید سنگ مرمر کے گنبدوں پر مشتمل ہے۔ جن کے سنہری کلس سورج کی روشنی میں خوب چمکتے ہیں۔ اس دالان کا طول ۲۲۵ فٹ اور عرض ۵۰ فٹ ہے۔ اس کی کرسی مسجد کے فرش سے کوئی چھ فٹ بلند ہے۔ چھت نہایت خوب صورت ہے دیواروں پر مختلف قسم کے پتھروں اور رنگوں سے نقاشی اور پچی کاری کی گئی ہے تمام عمارت قابوتی ہے۔ اس میں لکڑی استعمال نہیں کی گئی۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کا خیال ہے کہ "اس قسم کی پچی کاری یعنی پتھر پر پچی کاری کے نقوش بھرے گئے ہوں اور پھر ابھرے ہوئے ہوں دنیا بھر کی کسی عمارت میں نہیں ملتے"۔

---

[1] خلاصۃ التواریخ مصنفہ منشی سجان رائے بٹالوی۔

سب سے بڑے اور درمیانی گنبد کے نیچے سنگ مرمر کا بنا ہوا نہایت خوبصورت منبر ہے جس پر چڑھ کر خطیب جمعہ و عیدین کے خطبے پڑھتا ہے۔ مسجد کے اس حصے میں فرش پر مرمر کی سلیں استعمال کی گئی ہیں۔ دیواروں پر موٹی تہ کی استرکاری ہے جس میں سلیبی نقوش ابھرے ہوئے ہیں۔ ازارہ سنگ ابری کا ہے جس کا حاشیہ کالے اور زرد رنگ کے پتھر سے پچی کاری کیا ہوا ہے۔ ایوان کے منڈیروں پر کنگرے اور کونوں پر سنگ مرمر کی شرفہ دار برجیاں ہیں جو بہت خوبصورت معلوم ہوتی ہیں۔

مسجد کے چاروں کونوں پر چار نہایت بلند مینار کھڑے ہیں جو پوری سرخ پتھر سے بنے ہیں۔ یہ مینار اپنی ساخت اور بناوٹ کے لحاظ سے اگرچہ سادہ ہیں مگر میلوں سے نظر آتے ہیں اور مسجد کی عظمت اور خوبصورتی میں چار چاند لگاتے ہیں۔ ہر ایک مینار کی بلندی ۱۷۶ فٹ ۴ انچ اور سیڑھیاں تعداد میں ۲۰۴ ہیں۔ چوٹیوں پر سنگ مرمر کے گنبد بنے ہیں۔ چھتری والی منزل تنہا ۱۳ فٹ ۹ انچ بلند ہے اور آٹھ آٹھ ہشت پہلو ستونوں پر کھڑی ہے۔ یہ مینار مقبرہ جہانگیر کے میناروں سے کچھ عجیب نسبت رکھتے اور اس طرز پر بنائے گئے ہیں کہ اگر کسی بھی مینار پر چڑھ کر مقبرہ کے میناروں کو دیکھا جائے تو وہ چار کی بجائے تین نظر آتے ہیں۔ ایک اوجھل رہتا ہے۔ اسی طرح اگر مقبرہ کے کسی مینار پر چڑھ کر دیکھا جائے تو شاہی مسجد کے بھی تین ہی مینار نظر آتے ہیں۔ ان میناروں کی چار چار منزلیں ہیں۔ دَور باہر کی جانب سے ۶۷ فٹ اور اندر کی جانب سے ½۸ فٹ ہے۔ اوپر والی منزل جن پر گنبد دار چھت ہے سنہ ۱۸۴۰ء کے زلزلہ میں ناکارہ ہو گئی تھیں۔ اس لیے گرا دی گئی تھیں اور میناروں کی بلندی ۴۴ افٹ رہ گئی تھی۔ اب تازہ ترین مرمت کے بعد مینار اصلی حالت پر آ گئے ہیں اور ان پر روشنی کا خاص انتظام کیا گیا ہے۔

یہ مینار لاہور کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتے ہیں سنہ ۱۸۴۱ء میں جب شیر سنگھ نے قلعہ لاہور کے محاصرہ کے لیے اپنے آدمی متعین کیے تو انھوں نے انہی میناروں سے آتش باری کر کے مہارانی چند کور کی ڈوگرہ فوج کو شکست دی۔

شیر سنگھ اور دھیان سنگھ کے قتل کے بعد جب سردار ہیرا سنگھ سندھانوالیہ نے لاہور کا محاصرہ کیا تو اس نے بھی انہی میناروں پر زنبورہ توپیں نصب کیں اور قلعہ والوں کو شکست دے کر وزارت حاصل کی۔

سکھوں کے آخری دَور میں مسجد کے صحن سے اصطبل کا کام لیا جاتا تھا اور مسلمانوں پر اس کے دروازے بند تھے۔ انگریزوں کے آنے تک مسجد کی حالت نہایت خراب و خستہ ہو چکی تھی۔ سنہ ۱۸۵۶ء میں سرجان لارنس چیف کمشنر پنجاب کی سفارش پر حکومت ہند نے مسجد مسلمانوں کو واگذار کی اور اس میں ایک بار پھر خدا کا نام گونجنے لگا۔

اس پر لاہور کے شہری مسلمانوں نے اپنے جذبات تشکر و امتنان کا اظہار کرنے کے لیے ایک سپاسنامہ مرتب کیا جس پر ستر ممتاز اور سرکردہ شہریوں کے دستخط تھے۔ ان میں قاضی حفیظ الدین، نواب عبدالرحمٰن اور نواب احمد اللہ خاں کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اس سپاسنامے کے ذریعے مسجد کی بحالی پر حکومت کا شکریہ ادا کیا گیا اور یہ اطلاع بھی دی گئی کہ سید بزرگ شاہ بن قاضی غلام شاہ کو جن کے بزرگ شاہی وقتوں سے اس مسجد کے متولی چلے آ رہے تھے، ہر فرقہ و ہر خیال کے مسلمانوں نے متفقہ طور پر ایک بار پھر مسجد کا متولی مقرر کر دیا ہے۔ سید بزرگ شاہ کے خاندان میں شاہی فرمان اور پرانے دستاویزات اب تک موجود ہیں۔

مسجد کے شمال اور جنوب میں چھوٹے چھوٹے حجرے ہیں۔ ان حجروں میں وہ طالب علم رہا کرتے تھے جو دُور دراز علاقوں

سے تحصیل علم کی خاطر آتے تھے۔ مسجد کے نام پر جو جاگیریں وقف تھیں ان کی آمدنی ان طلبہ کے سامان خورد و نوش پر صرف کی جاتی تھی۔ ۱۸۸۷ء میں لارڈ ڈفرن وائسرائے ہند اس مسجد میں تشریف لائے انھوں نے طلبہ سے قرآن مجید سنا اور فارسی میں گفتگو بھی کی۔

مسجد کے شرقی دروازے کی ایک منزل میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام، حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضرت فاطمۃ الزہرا رضؓ اور حضرت غوث پاکؒ کی چند یادگاریں تبرکاً شیشوں میں محفوظ ہیں۔ ان تبرکات کی تاریخ نہایت دلچسپ ہے۔ سید محمد لطیف مرحوم اپنی کتاب تاریخ لاہور میں فقیر سید عزیزالدین کی زبانی بیان کرتے ہیں کہ ۲۳ جمادی الآخر ۸۰۳ھ/۱۴۰۱ء کو جب امیر تیمور نے دمشق فتح کیا تو وہاں کے عمائد سادات اس کی خدمت میں زر و جواہر کے ساتھ چند نایاب اور متبرک اشیاء لے کر حاضر ہوئے۔ امیر انھیں حاصل کر کے بہت خوش ہوا۔ پھر یکم ربیع الاول ۸۰۵ھ/۱۴۰۲ء کو جب اس نے سلطان بایزید یلدرم والئے روم کو شکست دی تو اس نے بھی چند تبرکات امیر کی خدمت میں پیش کئے۔ امیر یہ تمام تبرکات لے کر سمرقند واپس چلا آیا۔

امیر تیمور کی وفات کے بعد یہ تبرکات نسلاً بعد نسل اس کے وارثوں کے قبضے میں رہے۔ بابر انھیں اپنے ساتھ ہندوستان لایا۔ اس طرح یہ تبرکات یہاں پہنچے۔ جب احمد شاہ ابدالی کے بیٹے کی شادی مغلانی بیگم دختر ملکہ زمانی و محمد شاہ کے ساتھ ہوئی تو ملکہ زمانی اپنی لڑکی کی رخصتی اور محمد شاہ کی وفات کے بعد ان تمام تبرکات کو لے کر جموں چلی گئی۔ کچھ عرصہ کے بعد جب مغلانی بیگم فوت ہوگئی اور ملکہ زمانی کی خواہش کے مطابق اس کی لاش افغانستان سے جموں لائی گئی تو ملکہ زمانی کی مالی حالت نہایت مخدوش تھی۔ چنانچہ اس نے یہ تبرکات پیر محمد اور شاہ محمد رضا کے ہاتھ اسی ہزار روپے میں فروخت کر دئے۔ ان دونوں نے اپنی اپنی رقم کے بموجب یہ تبرکات آپس میں تقسیم کر لیے اور اپنے اپنے علاقوں میں چلے گئے۔ چنانچہ پیر محمد یہ تبرکات لے کر رسول نگر (موجودہ رام نگر) چلا گیا سمت ۱۸۰۲ بکرمی میں جب مہاراجہ رنجیت سنگھ کے والد سردار مہا سنگھ نے رسول نگر پر حملہ کیا تو دیگر مال و اسباب کے ساتھ یہ تبرکات بھی اس کے قبضے میں آئے۔ ۱۲۱۱ھ/۱۷۹۹ء میں جب شاہ زمان کے حملے کی افواہ ملک میں گرم ہوئی تو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنا تمام قیمتی سامان اور یہ تبرکات اپنی رانی مہتاب کور کے ہمراہ بکیریاں بھیج دیئے۔ یہ قلعہ اس وقت اس کی خوش دامن مائی سدا کور کے قبضے میں تھا۔

ایک دن اچانک اس قلعہ میں آگ لگ گئی۔ تمام مال و اسباب جل گیا مگر وہ کمرہ جس میں یہ تبرکات محفوظ تھے آگ کی لپیٹ سے محفوظ رہا۔ حالانکہ اس کی نچلی منزل میں آتش گیر مادہ جمع تھا۔ تمام مسلمان اور سکھ یہ واقعہ دیکھ کر دنگ رہ گئے اور اس دن سے ان کا احترام اور بھی زیادہ ہو گیا۔ جب شاہ زمان کابل چلا گیا تو مہاراجہ نے اپنا تمام مال و اسباب مائی سدا کور سے طلب کیا۔ اس نے ان تبرکات کے سوا سب کچھ لوٹا دیا۔

مائی سدا کور کی وفات کے بعد مہاراجہ شیر سنگھ ان کا وارث ہوا۔ وہ ان تبرکات کو چونڈہ کے قلعہ میں لے گیا جہاں وہ اسوج سمت ۱۹۰۰ بکرمی تک محفوظ رہے۔ جب مہاراجہ شیر سنگھ مارا گیا تو اس کی جائداد خالصہ سرکار کے قبضے میں آئی۔ سردار ہیرا سنگھ وزیر نے ان تبرکات کو اپنی حویلی میں منتقل کر لیا۔ اور جب راجہ ہیرا سنگھ بھی مقتول ہوا تو یہ تبرکات قلعہ لاہور میں آگئے سردار جواہر سنگھ وزیر نے اپنے ایک معتبر سائیس کو ان کا مہتمم مقرر کیا۔ آخر مہارانی جنداں کے حکم سے یہ تمام تبرکات شاہی توشہ خانہ میں جو قلعہ کی خواب گاہ میں تھا جمع کر دیئے گئے۔ حافظ بدرالدین وہاں ہر روز دیا جلا کر پھول چڑھایا کرتا تھا۔

فتح پنجاب کے بعد یہ تبرکات سرکار انگلشیہ کی معرفت مسلمانوں کو واگذار کئے گئے۔

تبرکات کا وہ حصّہ جو محمد رضا کے قبضہ میں تھا، فقیر سیّد نور الدین نے خرید کر مسلمانوں کے حق میں وقف کیا چنانچہ یہ تمام تبرکات اس دن سے شاہی مسجد کی ڈیوڑھی پر آج تک موجود ہیں۔

ان تبرکات میں جن کی مجموعی تعداد ۲۳ ہے، ایک تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا سبز عمامہ مع ٹوپی ہے۔ ایک سبز جبّہ، سفید پاجامہ، نعلین، نقش قدم مبارک، سفید علم جس پر قرآن پاک کی آیات منقوش ہیں، حضرت علیؓ کے قرآن پاک کا سیپارہ اوّل بخط کوفی، عمامہ مع کلاہ اور ایک تعویذ اور حضرت سیدۃ النساءؓ کا رومال، جائے نماز، امام حسینؓ کا صندلی عمامہ، کلاہ، علم اور رومال خون آلودہ۔ جناب غوث اعظمؒ کا عمامہ، لحاف اور جائے نماز۔ کربلائے معلّٰی کی سرخ مٹی اور خواجہ اویس قرنی کا شکستہ دانت اور دیگر بہت سے تبرکات بھی شامل ہیں۔

مسجد کا مہتمم عمارت جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، فدائی خان کوکہ تھا جس کا اصل نام مظفر حسین تھا اور وہ اورنگ زیب کا کوکلتاش (رضاعی بھائی) تھا۔ وہ ۱۳ سنہ جلوس میں لاہور کا گورنر مقرر ہوا۔ ۲۱ سنہ جلوس میں وہ بہار کی گورنری کے لیے نامزد ہوا مگر قضا نے آن گھیرا۔ چنانچہ وہ ۹ ربیع الآخر ۱۰۸۹ھ / ۱۶۷۸ء کو رحلت کر گیا۔ فدائی خان کو عمارات سے دلی شغف تھا۔ اس نے لاہور میں اپنے رہنے کے لیے نہایت عظیم الشان حویلی بنوائی تھی۔ اکثر ناظمان لاہور اسی میں قیام کیا کرتے تھے۔

مورخین نے اس مسجد کی تاریخ بناء کے متعلق عجیب عجیب قصّے بیان کیے ہیں۔ ایک مورخ لکھتا ہے کہ جس مقام پر یہ مسجد واقع ہے وہاں دراصل شہزادہ دارا شکوہ کا وہ کتب خانہ تھا جس میں زیادہ تر ویدانت اور سنسکرت کی کتابوں کا ذخیرہ تھا جب دارا شکوہ قتل ہوا تو اورنگ زیب نے ان کتابوں کو اکبر آباد طلب کر کے مختلف علما میں تقسیم کر دیا۔ اور کتب خانہ کی عمارت کو جو بالکل ایک شوالہ کی طرز پر بنی ہوئی تھی گرا دیا اور اس کا سامان لے کر یہ مسجد تعمیر کرائی۔ اس میں شک نہیں کہ دارا شکوہ کو سنسکرت اور علم ویدانت سے دلی لگاؤ تھا مگر اس کا قیام زیادہ تر دہلی یا آگرہ میں رہا کرتا تھا۔ لاہور وہ شاذ و نادر ہی آتا تھا۔ اس لیے یہ کہنا کہ اس کا کتب خانہ لاہور میں موجود تھا۔ تاریخی لحاظ سے غلط ہے۔

منشی محمد لطیف تاریخ لاہور میں لکھتے ہیں کہ دارا شکوہ نے اپنے روحانی پیشوا حضرت میاں میرؒ کے مزار کی عمارت کے لیے یہ پتھر جمع کیا تھا۔ جب اورنگ زیب سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس نے یہ پتھر مسجد کی عمارت میں صرف کر دیا اور ایک سادہ سی عمارت حضرت میاں میرؒ کے مزار پر بنا دی۔ یہ بیان بھی قابل تسلیم نہیں کیونکہ اگر دارا شکوہ کو حضرت میاں میرؒ سے دلی عقیدت تھی تو عالمگیر بھی آپ کے روحانی کمالات کا معترف تھا بلکہ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی عقیدت مندی کا ثبوت دیا کرتا تھا۔ پھر حضرت میاں میرؒ تیموریوں کی خانہ جنگی سے بہت عرصہ پہلے یعنی ۱۰۴۵ھ / ۱۶۳۵ء میں وفات پا چکے تھے اور آپ کے مزار کی عمارت شاہجہانی دور کی عمارتوں سے ملتی جلتی ہے۔ وہی نقش و نگار ہیں اور وہی رنگ آمیزیاں حالانکہ عالمگیری دور کی عمارات اس سے بالکل مختلف طرز کی ہیں اور یہ مسجد تو آپ کی وفات کے چالیس سال بعد ۱۰۸۴ھ / ۱۶۷۳ء میں تعمیر ہوئی۔

ایک اور تاریخ کا بیان ہے کہ دارا شکوہ نے اپنے محل سے لے کر حضرت میاں میرؒ کے مزار تک ایک سڑک سرخ پتھر کی تیار کرائی تھی۔ جب عالمگیر تخت پر بیٹھا تو اس نے سڑک کھدوا کر اسی پتھر سے یہ مسجد تیار کرائی۔ یہ بیان بھی یار لوگوں کا تراشا ہوا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عالمگیر نے خاص اس مسجد کے لیے تمام پتھر اجمیر اور جے پور سے خود منگوایا تھا اسے بڑے شوق سے بنوایا تھا اور اس میں نماز بھی ادا کی تھی۔

اس مسجد کی امامت و خطابت پر ہمیشہ حنفی عقیدہ کے نامور عالم مامور رہے ہیں۔ عالمگیر کے بیٹے بہادر شاہ ثانی کے عہد میں حاجی یار محمد اس کے خطیب تھے۔ وہ اپنے وقت کے بہت بڑے فاضل تھے۔ بہادر شاہ نے اپنے جلوس کے چوتھے سال ۱۱۲۱ھ/۱۷۱۰ء میں بعض امامیہ علماء کے ایماء سے حکم دیا کہ خطبے میں حضرت علیؓ کے نام کے ساتھ "علی ولی اللہ وصی رسول اللہ" کے الفاظ داخل کئے جائیں۔ اس حکم کی ہر جگہ مخالفت ہوئی۔ احمد آباد گجرات، دہلی، آگرہ، کشمیر اور لاہور میں حالات اتنے خراب ہوئے کہ سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

۱۷۱۱ء میں جب بہادر شاہ راجپوتوں اور سکھوں کی بغاوت فرو کر کے لاہور آیا تو اس نے اپنا مقصد حاصل کرنے کی خاطر حاجی یار محمد، محمد مراد اور چند دیگر علماء کو قلعہ لاہور کے تسبیح خانے میں طلب کیا۔ حاجی یار محمد نے نہایت بے باکی سے بادشاہ کے دلائل رد کیے۔ بادشاہ طیش میں آ گیا مگر حاجی یار محمد نے کہا:۔

"عالی جاہا! میں اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ چار چیزوں کی دعا کرتا رہا ہوں۔ اوّل یہ کہ وہ مجھے علم کی دولت عطا کرے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق بخشے۔ دوم وہ مجھے قرآن پاک حفظ کرنے کی سعادت نصیب کرے۔ سوم حج بیت اللہ اور زیارت روضۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف فرمائے اور چہارم یہ کہ مجھے شہادت کی موت مارے۔ خدا کا شکر ہے کہ میری پہلی تینوں آرزوئیں پوری ہو چکی ہیں۔ صرف ایک تمنا باقی رہ گئی ہے۔ خدا کرے کہ بادشاہ سلامت کے ہاتھوں یہ بھی پوری ہو جائے۔"

حاجی صاحب کی اس حق گوئی پر بادشاہ نے انھیں گرفتار کر کے آگرہ بھیج دیا۔

اسی گڑبڑ میں رمضان شریف کا مہینہ شروع ہو گیا۔ بادشاہ نے جمعہ کے روز شہزادہ عظیم الشان کو ایک خطیب کے ساتھ جامع مسجد بھیجا کہ جدید خطبہ وہاں پڑھا جائے مگر خطیب نے ابھی مسجد میں قدم ہی رکھا تھا کہ کسی نے اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔

اس کے ساتھ ہی بادشاہ نے اسلام خاں کو حکم دیا کہ وہ مسلح سپاہیوں کا ایک دستہ لے کر شہر جائے اور خطیبوں کو مجبور کرے کہ وہ خطبہ بادشاہ کی مرضی کے مطابق پڑھیں۔ لیکن یہاں بھی اسے کامیابی نہ ہوئی۔ ۲۲ اکتوبر ۱۷۱۱ء کو خطبہ اسی پرانے طریقے پر پڑھا گیا جس طرح عالمگیر کے زمانے میں پڑھا جاتا تھا۔ اس پر اس نے سات سرکردہ مولویوں کو گرفتار کر کے گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا، لوگ اور بھی مشتعل ہوئے یہاں تک کہ بادشاہ نے مجبور ہو کر بادل ناخواستہ رمضان شریف کے آخر میں اپنا حکم واپس لے لیا چنانچہ عید الفطر کا خطبہ پہلے کی طرح بڑی شان سے پڑھا گیا۔

سکھوں کی عملداری میں یہ مسجد ضبط سرکار ہو گئی تھی۔ انگریزوں نے جب اسے مسلمانوں کو واگذار کیا تو مولوی غلام محمد بگہ والے اس کے امام مقرر کئے گئے۔ وہ فقہ، حدیث، اصول اور معانی کا درس بھی دیتے تھے اور دور دور سے تشنگان علم سیراب ہونے کے لیے آتے تھے۔ مولوی صاحب بگہ (بھیرہ ضلع شاہ پور) کے رہنے والے تھے۔ آخری عمر میں اپنے وطن چلے گئے تھے۔ وہیں

انتقال ہوا۔ مولوی محمد ذاکر مرحوم جو اسلامیہ ہائی سکول لاہور میں مدرس اور بڑے زاہد و پرہیزگار تھے، انہی کے داماد تھے۔
ہمارے عہد میں مولوی معراج حسین رام پوری اور ان کے بھائی مولوی ریحان حسین بھی بہت نامور خطیب ہوئے ہیں۔ آجکل مولانا غلام مرشد خطابت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

سکھوں کے غلط استعمال کی وجہ سے مسجد کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ ۱۸۵۶ء میں جب انگریزوں نے اس کا قبضہ مسلمانوں کو سونپا تو یہ کافی مرمت طلب تھی۔ فرش نماز پڑھنے کے قابل نہ تھا۔ ۱۸۶۴ء میں لاہور کے مسلمانوں نے مسجد کی صفائی اور درستی کی طرف توجہ کی اور ۱۸۶۹ء میں خان بہادر برکت علی خاں مرحوم کی تحریک سے انجمن اسلامیہ قائم ہوئی جس نے مسجد کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے کر چندے کی اپیل کی۔ ۱۸۷۶ء میں ہزاروں روپے کے صرف سے فقط دروازہ درست ہو سکا۔ اگلے سال حکومت نے پانچ ہزار روپیہ اس شرط کے ساتھ مرحمت فرمانا منظور کیا کہ اس کا دو چند اس ملک کے لوگوں سے بطریق چندہ جمع کیا جائے۔ چندہ دینے والوں کی فہرست میں مسلمانوں کے علاوہ یہ نام بھی ملتے ہیں:-

"راجہ ہربنس سنگھ (ان کے چندے سے بڑھ کر کسی شخص واحد کا چندہ اس فہرست میں نہیں) پنڈت موتی لعل۔ پنڈت بدری ناتھ۔ منشی ہرسکھ رائے مالک اخبار کوہ نور۔ لالہ نہال چند وغیرہ"[1]

ایڈورڈ ہفتم جب شہزادگی کے زمانے میں یہاں تشریف لائے تو انھوں نے بائیس ہزار روپیہ مسجد کی مرمت کے لیے دیا۔ دس ہزار روپیہ ڈسٹرکٹ بورڈ کی طرف سے بھی ملا۔

لارڈ کرزن نے اپنے عہد حکومت (۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۵ء) میں جب محکمہ آثار قدیمہ قائم کر کے پرانی عمارتوں اور قدیم یادگاروں کی حفاظت و نگہداشت کا بیڑا اٹھایا تو تین لال ٹینیں اس مسجد کو اپنی طرف سے عنایت کیں جن میں سے بڑی اب تک مسجد کے صحن میں لگی ہوئی ہے۔ ۱۹۱۰ء میں حکومت نے چوراسی ہزار روپیہ بغرض مرمت پر صرف کیا۔ ۱۹۱۳ء میں بیگم صاحبہ بھوپال نے اس مسجد کو دیکھا اور چھ ہزار روپیہ مرمت فنڈ میں عطا کیا۔ عوام بھی حسب توفیق اس میں حصہ لیتے رہے۔ اور فرش کا کچھ کچھ حصہ درست ہوتا رہا مگر یہ فرش پرانے فرش کے مطابق پختہ اینٹوں سے بنایا جاتا تھا اور اس کی رفتار اتنی سست تھی کہ پانچ دس سال میں جتنا حصہ بنتا تھا موسمی تھپیڑوں سے اس سے زیادہ اور مرمت طلب ہو جاتا تھا۔ آخر ایک وقت آیا کہ بعض بعض میناروں کو خطرناک سمجھا جانے لگا اور ضرورت محسوس ہوئی کہ وسیع پیمانے پر مسجد کی مرمت کا بندوبست کیا جائے۔

۱۹۳۹ء میں مسجد کی خستہ حالی کے پیش نظر پنجاب کے اس وقت کے وزیر اعلیٰ سر سکندر حیات خاں نے سرکاری طور پر اس کی مرمت کا کام شروع کرایا جو اکیس برس کی لگاتار محنت کے بعد ۱۹۶۱ء کے آغاز میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ انھوں نے اس کے اخراجات پورے کرنے کے لیے مسلمان زمینداروں پر خاص ٹیکس عائد کیا۔ ابتدا میں یہ کام محکمہ آثار قدیمہ کو سونپا گیا لیکن بعد ازاں

---

[1] اقتباس از مضمون "اب سے آدھی صدی پہلے کے اردو اخبار" رقم زدہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی مطبوعہ رسالہ اردو بابت اپریل ۱۹۲۵ء۔

مرکزی محکمۂ تعمیرات عامہ کو منتقل کر دیا گیا۔ آزادی کے بعد یہ کام صوبائی محکمہ تعمیرات نے انجام دیا۔

اس طرح مسجد کی مرمت اور تزئین و آرائش، لاؤڈ اسپیکر اور روشنی کے جدید انتظامات، غسلخانوں اور وضو خانوں کی تعمیر، معمولی کنوؤں کی بجائے ٹیوب ویل سے پانی کی بہم رسانی اور دیگر مفید تبدیلیوں پر پچاس لاکھ روپے صرف ہوئے ہیں۔ یہ رقم مسجد کی تعمیر کی اصل لاگت سے دس گنا زیادہ ہے مگر اس سے مسجد کو ایک دفعہ پھر نئی زندگی نصیب ہو گئی ہے اور عمارت اپنی عمر سے زیادہ جوان دکھائی دیتی ہے۔

اس مسجد کی دیکھ بھال پہلے انجمن اسلامیہ پنجاب کرتی تھی۔ اب صوبائی محکمۂ اوقاف نے اس کا انتظام سنبھال لیا ہے اور مسجد کی ملحقہ املاک بھی اپنے قبضے میں کر لی ہے۔

لاہور کی بادشاہی مسجد وسعت کے لحاظ سے دنیا کی تمام مساجد سے بڑی ہے اس میں کم و بیش ستر پچہتر ہزار نمازی بیک وقت نماز باجماعت ادا کر سکتے ہیں۔ اس نے لاہور کو عیدگاہ کی ضرورت سے بھی بے نیاز کر دیا ہے۔

مسجد کہنہ قصاب خانہ والی

قصاب خانہ ایک بہت بڑا محلہ شہر کے باہر محلہ گنج دنبل پورہ کے شمال مغرب کی طرف آباد تھا جس کی حدود خانقاہ میاں وڈا سے ملتی تھیں۔ اب صرف یہ مسجد اس محلے کی یادگار باقی رہ گئی ہے۔ اس مسجد کے تین گنبد ہیں، ایک بہت بڑا ہے اور دائیں بائیں کے چھوٹے ہیں۔ سقف قالبوتی ہے اور تین دروازے محرابی مرغولی۔ اندر مسجد کے دیواروں پہ استرکاری ہے۔ فرش پختہ ہے۔ بیرونی مسجد کا صحن بہت وسیع تھا، حوض بھی تھا جس کی اینٹیں کرنیل گلاب سنگھ نے جو کورٹ والی پلٹنوں کا افسر تھا اکھڑوا کر اپنے مکان میں لگوا لیں اور مسجد میں بارود بھر دی۔ سکھی سلطنت کے بعد جب یہ مسجد خالی ہوئی تو میاں احمد دین سجادہ نشین دربار میاں وڈا نے اس پر قبضہ کر لیا اس بنا پر کہ میاں جان محمد جو اس مسجد میں درس پڑھاتے تھے وہ میاں وڈا کے مرید تھے۔ قبر اس کی بھی اس مسجد کے ایک طرف چار دیواری میں ہے۔ یہ جان محمد پرانے فضلا میں بہت مشہور تھے ۱۱۸۲ھ (۱۷۶۸ء) میں فوت ہوئے۔

مسجد شاہ چراغ

سیّد عبدالرزاق بن سیّد عبدالوہاب گیلانی نام کے ایک بزرگ جن کا خطاب شاہ چراغ تھا، قصبہ اُچ علاقہ ریاست بہاولپور سے آ کر قصبہ ستگھرہ ضلع منٹگمری میں اور وہاں سے لاہور میں آ کر سکونت پذیر ہوئے۔ چونکہ ان کا سلسلۂ نسب پیران پیر محی الدین سے ملتا تھا، لوگ ان کا بہت ادب کرتے تھے۔ اس موقعہ پر جہاں اب ان کا مقبرہ ہے، محلہ لنگر خان بلوچ واقع تھا۔ وہ ان کا مرید تھا۔ ۲۲ ذی قعدہ ۱۰۶۸ھ (۱۶۵۸ء) کو ان کی وفات کے بعد عالمگیر کے حکم سے یہیں ان کا مقبرہ تعمیر ہوا۔

خان بہادر زکریا خاں کی والدہ بھی اس خاندان کی مریدہ تھیں، انھوں نے مقبرے کے مغرب کی سمت یہ عالی شان مسجد بنوائی اور وصیت کی کہ میری قبر اس جگہ ہو اور میرے زیور سے مسجد کی تعمیر کی جائے۔ مسجد پختہ چونہ گچ تھی جس کی پانچ عالی شان محرابیں اور پانچ گنبد تھے۔ انگریزی عملداری سے قبل اس مسجد میں سکھوں نے میگزین ڈالا ہوا تھا۔ انگریزوں نے پہلے پہل اس

کوکوٹھی کے طور پر استعمال کیا اور ڈپٹی کمشنر یہاں رہتے رہے ۔ پھر اکاؤنٹنٹ جنرل کا دفتر قائم ہو گیا ۔ بعد میں سشن جج بھی یہاں بیٹھتے رہے ۔ جب مسجد شہید گنج کا قضیہ شروع ہوا تو حکومت نے مسلمانوں کی تالیف قلوب کی خاطر اس مسجد کو واگذار کر دیا ۔ اب یہ مسجد آباد ہے اور اس کی مرمت و توسیع بھی ہوئی ہے ۔

مسجد نقیباں

شاہی وقتوں کی یہ پرانی مسجد قلعہ گوجر سنگھ کے گرنہ شمالی مغرب میں موجود ہے ۔ اس کی تین محرابیں اور تین گنبد ہیں ۔ تینوں محرابیں قالبوتی منقش ہیں ۔ سقف بھی قالبوتی خشتی ہے ۔ درمیانہ محراب کے اوپر جو کتبہ ہے اس میں آیت الکرسی لکھی ہے ۔ صحن میں پختہ فرش ہے ۔ سکھوں کی عملداری میں اس مسجد میں بارود بھری رہتی تھی ۔ انگریزوں نے بارود نکال کر مسجد خالی کی تو صوبہ شاہ نقیب نے دعوےٰ کر کے مسجد واگذار کرا لی ۔

یہ مسجد عہد بہادر شاہ میں محمد واصل نام ایک امیر نے جو سہارنپور کا رہنے والا تھا اور دہلی سے شاہی خدمت کے لیے لاہور میں متعین تھا بنوائی تھی اس کے بعد اس کی اولاد صوبہ لاہور کے پاس نقابت پر مامور رہی ۔ اس سبب سے یہ مسجد نقیبوں کی مسجد کے نام سے مشہور ہو گئی ۔

مسجد نواب زکریا خاں

مادھو لال حسین کے مزار کے مغرب کی سمت نواب زکریا خاں صوبہ لاہور کی تعمیر کردہ یہ مسجد موجود ہے ۔ مسجد کے شرق میں چاہ کلاں چرخی دار اور غسل خانے ہیں ۔ صحن کا فرش پختہ ہے ۔ صحن کے گرد قد آدم دیوار ہے ۔ خاص مسجد کی تین محرابیں ہیں درمیانی محراب پر بخط ثلث کاشی کار آسمانی رنگ میں بسم اللہ و کلمہ شریف لکھا ہے ۔ شمالی محراب پر بھی ایک کتبہ کاشی کار ہے جس میں یہ اشعار لکھے ہیں ؎

خواست در دور شاہ ملک پناہ / شاہ ہندوستان محمد شاہ
عالم و عادل و سخی زماں / در صف معرکہ چو شیر ژیاں
زبدۂ بارگاہ او نواب / زکریا خان صوبۂ پنجاب
با خواہش اگرچہ جمشید است / لرزہ در تن فتادہ چوں بید است
نیک نام آنکہ نیک نامی او / ہمچو بوئے گل است در ہر سو
چاہ و مسجد ز خود بنا بکند / عالی و خوب و خوشنما بکند
محض بہر خدا کند ایں کار / تا نمازی شود نماز گزار

باز ہر چہ ثواب زاں آید
بسوئے بانیش شود عاید

جنوبی محراب پر بھی ویسا ہی خوشنما کاشی کار کتبہ ہے جس میں یہ اشعار ہیں :-

یارب از فضل خود نگاہش دار ۔۔۔ از شکستن تو در پناہش دار
کرد احداث مسجد محکم ۔۔۔ نیز خوش دو رچاہ مستحکم
نزد درگاہ صاحب عرفاں ۔۔۔ واقف سر حضرت رحماں
آنکہ معروف شد بہ لال حسین ۔۔۔ خاک نعلین اوست سرمہ عین

مسجد کی تاریخ بنا مندرجہ ذیل قطعہ سے برآمد ہوتی ہے :-

چو ایں سجدہ گہ از پئے خاص وعام ۔۔۔ بنا یافت از سرور نیک نام
ز تاریخ او ہر کہ جوید شمار ۔۔۔ بداند ہزار و صد و چہل وچہار
۱۱۴۴ھ (۱۷۳۱ء)

مسجد آباد ہے ۔

مسجد بیگم پورہ

لاہور سے شالا مار باغ کو جاتے ہوئے راستے میں انجنیئرنگ کالج کے قریب بیگم پورہ کی آبادی واقع ہے جس کے بہت سے چبوترے ، مقبرے اور مکانات اب تک موجود ہیں ۔ یہ سب خان بہادر زکریا خاں صوبہ لاہور کے خاندان کے ہیں ۔ نواب خان بہادر کی والدہ بیگم جان نے یہاں محلات اور باغ بنوائے اسی کے نام پر یہ بیگم پورہ مشہور ہے ۔

انھیں میں ایک عالی شان کاشی کار مسجد بھی ہے جس کے تین در محرابی مقطع خوبصورت بنے ہیں ۔ محرابوں پر کلمہ طیبہ کے علاوہ مندرجہ ذیل عبارت کندہ ہے :-

عجلوا بالصلوٰۃ قبل الموت ۔۔۔ عجلوا بالتوبۃ قبل الفوت

گوشہ جنوب مغرب میں پختہ زینہ مسجد کے اوپر جانے کے لیے ہے ۔ چاروں کونوں پر چار مینا کاشی کار ہرنگ سبز وسنہری ہیں اور مسجد کی سقف کے درمیان نہایت خوبصورت گنبد بنا ہوا ہے ۔ مسجد کا منبر سنگ مرمر کا تھا جو سکھوں نے لوٹ لیا ۔

سکھوں کے وقت اس آبادی پر بڑے بڑے صدمے آئے ۔ جو شخص قابض ہوا اور اس کی عمارات گرا کر اینٹ پتھر لے جاتا رہا ۔ سردار گوجر سنگھ نے یہاں کی عمارات گرا کر قلعہ گوجر سنگھ آباد کیا ۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وقت میں پہلے خزانہ نام افسر توپ خانہ اس پر قابض ہوا اور اس نے اس میں زمیندار آباد کر کے گاؤں کی صورت بنا دی ۔ چند سال بعد راجہ سنسار چند کانگڑہ سے لاہور آیا تو مہاراجہ نے یہ جگہ اسے رہنے کے لیے مرحمت کی ۔ وہ چند ماہ اس میں رہا اور جاتی دفعہ یہ جگہ اپنے برہمنوں کو بخش گیا ۔ انھوں نے بہت سی قبریں گرا دیں ۔ پتھر اتار لیے اور اینٹیں فروخت کر دیں ۔ اس کے بعد ولیسا سنگھ پسر لہنا سنگھ مجیٹھیہ نے یہ جگہ برہمنوں سے لے لی اور ان کو معاوضے میں دوسری جگہ دے دی ۔ انھی دنوں نواب غازی خاں جو خان بہادر زکریا خاں کا وارث تھا کابل سے آیا اور دعویدار ہوا مگر اس کی کوئی شنوائی نہ ہوئی ۔ سمت ۱۸۹۵ بکرمی میں جرنیل گلاب سنگھ بھوونڈیہ کی فوج کی چھاؤنی بیگم پورہ کے پاس مقرر ہوئی ۔ جرنیل گلاب سنگھ نے مسجد کو اپنا مسکن بنایا ۔ اور

ہزاروں روپیہ کی اینٹیں ان مکانات سے کھدوا کر چھاؤنی کی تعمیر میں لگائیں۔ اور مسجد کی چھت پر اپنے رہنے کے لیے کوٹھی بنائی۔ اتنے انقلابات اور لوٹ گھسوٹ کے باوجود مسجد کے تینوں دروں کے اوپر اور راست دلچسپ چوکا نسی کا کام ہے اب تک تازہ و خوش رنگ نظر آتا ہے۔ درمیانی محراب کی پیشانی پر ایک سل سنگ مرمر کی لگی ہے جس پر کلمہ شریف کندہ ہے اور جنوب و شمال کی دونوں محرابوں کے اندر دو دو حدیثیں لکھی ہیں۔ آج سے قریباً اسی برس قبل رائے کنہیا لعل مصنف تاریخ لاہور نے سرکار کی طرف سے اس مسجد کی مرمت کرائی تھی۔ مسجد اب تک آباد ہے۔ اس کے قریب دارا نفر خان کی عمارت بن گئی ہے جس کی وجہ سے مسجد میں اور بھی رونق ہو گئی ہے۔

سنہری مسجد

یہ مسجد لاہور کے نہایت پر رونق حصے ڈبی بازار اور کشمیری بازار کے وسط میں نہایت مقطع اور خوب صورت بنی ہوئی ہے۔ تینوں بڑے گنبد اور چھوٹی برجیاں طلائی ہیں اور سونا تانبے کے تختوں پر ایسی خوبصورتی اور مضبوطی سے چڑھایا گیا ہے کہ مدت مدید گزر جانے کے باوجود سونے میں ابھی تک وہی چمک دمک موجود ہے۔ مسجد کی خشتی عمارت نہایت مضبوط ایک منزل اونچی کرسی پر ہے۔ نیچے تین طرف دکانیں ہیں جن کی آمدن مسجد کے ضروری اخراجات میں صرف کی جاتی ہے۔ مسجد کے چاروں طرف بازار ہے اور درمیان میں اس کی عالی شان اور مطلا عمارت نہایت مطبوع و دل پسند کھڑی ہے۔

اس مسجد کا بانی نواب سید بھکاری خاں تھا جو محمد شاہ بادشاہ کے حکم سے میر معین الملک عرف میر منو کے ماتحت نائب صوبہ پنجاب و سرہند کے عہدے پر ممتاز تھا۔ یہ شخص نہایت دیندار، سخی، فقیر دوست، ناظم اور عالم و فاضل تھا۔ چشتیہ سلسلہ کے بزرگ میراں سید بھیک چشتی سے خاص ارادت تھی ۱۱۶۶ھ میں قتل کر دیا گیا۔

جس جگہ اس مسجد کا بیرونی زینہ اور دروازہ ہے وہاں ایک چھوٹی سی مسجد پہلے سے موجود تھی۔ علما کی مخالفت کے باعث نواب اسے گرانے کی جرأت نہ کر سکا۔ ناچار دو طرفہ راستہ مسجد کو چھوڑ کر دونوں طرف زینہ بنا دیا گیا جو نہایت ناموزوں تھا۔ انگریزی عملداری میں کپتان نسبٹ صاحب ڈپٹی کمشنر لاہور نے وہ پرانی مسجد جو بے آباد پڑی رہتی تھی گرا کر شرقی دروازہ مسجد کا بنوا دیا۔ زینہ بھی شرقی تجویز ہو گیا اور وہ دو حصہ قدیم زینہ گرا کر زمین اس کی صحن مسجد میں شامل کر دی۔ اس کارروائی سے مسجد کی زینت بہت بڑھ گئی۔ اب اس جدید دروازے کے ذریعے مسجد کی اندرونی محراب دور سے نظر آتی ہے۔

یہ مسجد ۱۱۶۳ھ میں تعمیر ہوئی۔ یہی سن بیرونی محراب مسجد پر آیت الکرسی کے نیچے لکھا ہے۔ مسجد میں سنگ مرمر کے اور بھی کئی کتبے نصب ہیں۔ دروازے پر جو کتبہ لگا ہے اس میں مندرجہ ذیل عبارت کندہ ہے:۔

"یادھیکہ مسجد قلبی و انت فیہ مقیم"

مسجد کی تینوں محرابیں اور تینوں گنبد مقطع و بلند ہیں۔ گوشوں پر چھوٹے چھوٹے مینار اندر باہر سے منقش استرکار ہیں۔ صحن کے اندر پختہ دروازہ۔ حوض سنگین، چاہ آبدار بنا ہوا ہے۔ اس مسجد کی آبادی سکھوں کے وقت میں بھی بدستور رہی۔ صرف تھوڑے عرصے کے لیے اس پر اکالیوں نے قبضہ کر کے گرنتھ رکھ دیا تھا اور اسے باؤلی کے مکان میں شامل کر لیا تھا لیکن بعد میں مسلمانوں کی عرضداشت

پر اسے واگذار کر دیا گیا۔ دکانیں پھر بھی انگریزوں کے وقت تک ضبط رہیں جو نواب نوازش علی خاں و خان بہادر محمد برکت علی خاں کی کوششوں سے ایچی سن صاحب لفٹیننٹ گورنر پنجاب نے واپس کیں۔ اب یہ مسجد نہایت آباد ہے۔ اس کا انتظام پہلے انجمن اسلامیہ کے ہاتھ میں تھا۔ اب اوقاف کمیٹی کرتی ہے۔ وہی دکانوں کے کرائے وصول کرتی ہے اور وہی مسجد کے خطیب مؤذن اور دوسرے خدمت گاروں کو تنخواہ دیتی اور دیگر ضروری انتظامات کرتی ہے۔

محمد امین کی مسجد

بی بی پاک دامناں کے مزار کے پچھواڑے ایک بہت بڑی مسجد ہے جو آج کل خستہ حالت میں ہے۔ اس کے تین گنبد ہیں ایک بڑا اور دو چھوٹے۔ دروازے کی ڈاٹ پر عربی اور فارسی کے کتبے ہیں جو زرد رنگ کی روغنی ٹائلوں پر نیلے رنگ سے نہایت خوبصورت لکھے ہوئے ہیں۔ اوپر کی منزل پر جانے کے لیے شمال اور جنوب میں پختہ سیڑھیاں بنی ہیں مسجد کا فرش بھی پختہ اینٹوں کا ہے۔ شمالی محراب پر جو کتبہ ہے اس میں یہ آیت لکھی ہے:۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ
ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ۔

درمیانی محراب پر یا فتاح، کلمہ طیبہ اور یہ حدیث شریف لکھی ہے:۔

عجلوا بالصلوٰۃ قبل الموت

جنوبی محراب پر یہ کتبہ ہے:۔

إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰهِ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ
وَالْيَوْمِ الْآخِرِ۔

یہ مسجد محمد امین بیگ نے بنوائی تھی جو نواب زکریا خاں صوبہ لاہور کے دربار میں ایک امیر تھا جس زمانے میں نواب بیگم پورہ والی مسجد بنوائی، اسی زمانے میں یہ مسجد تعمیر ہوئی اس مسجد کی ساخت اور روغنی کام کی بناوٹ بالکل بیگم پورہ والی مسجد سے ملتی جلتی ہے۔

مسجد کے مشرق میں محمد امین بیگ نے باغ بھی لگوایا تھا جس کا اب کوئی نشان نہیں۔ کچھ عرصہ پہلے وہاں کاشت ہوتی تھی۔ اب عمارتیں بن گئی ہیں۔ محمد امین بیگ کی اولاد موچی دروازہ کے اندر چوہٹہ میں آباد تھی۔[1]

مسجد موراں طوائف

یہ مسجد شاہ عالمی دروازے کے اندر بازار پاپڑمنڈی میں واقع ہے بانیہ اس کی موراں طوائف مہاراجہ رنجیت سنگھ کی محبوبہ تھی جس پر مہاراجہ اتنا مہربان تھا کہ اس کے نام کا سکہ جاری کیا۔ اس نے اپنے اقتدار و اختیار کے زمانے میں یہ مسجد ۱۲۲۴ھ / ۱۸۰۹ء

---

[1] سید محمد لطیف: تاریخ لاہور صفحہ ۲۱۲ - ۲۱۳۔

میں تعمیر کرائی۔ یہ رباعی اب تک مسجد کے بیرونی دروازے پر لکھی ہوئی موجود ہے۔

بفضلِ ایزدِ دارائے افلاک
چو موراں مسجدے آراست بر خاک
بتاریخ بنائش گفت ہاتف
شدہ تعمیر للّٰہ مسجد پاک
۱۲۴۴ھ

مسجد سر بازار بجانب شمال بنی ہے۔ دروازہ بھی اسی طرف ہے۔ کرسی بہت بلند ہے۔ زینہ اور دروازے کے شرق و غرب دونوں طرف دکانیں ہیں جن کا کرایہ مسجد پر صرف ہوتا ہے۔ دکانوں کے اوپر نشست گاہیں اور حجرے بنائے ہیں۔ صحن کشادہ ہے۔ ایک کونے میں چاہ و غسل خانہ و حجرہ ہے۔ عمارت پختہ چونہ گچ ہے۔ تین محرابیں اور قالبوتی چھت کے اوپر تین گنبد مدور منقطع بنے ہیں جن پر سبز رنگ کے کلس لگائے گئے ہیں۔

جب یہ مسجد بن کر تیار ہوئی تو مہاراجہ کے حکم سے امامت مولانا غلام رسول و غلام اللہ کے سپرد ہوئی کیونکہ اس وقت لاہور میں ان کی ٹکر کا کوئی مولوی اور مدرس نہ تھا، جب وہ دونوں اکابر اس مسجد میں قیام پذیر ہو کر درس دینے لگے تو مسجد کی بہت شہرت ہوئی۔ اور دور دور سے طالب علم یہاں آنے لگے۔ سکھوں کے زوال تک یہ مدرسہ جاری رہا۔ جب مولوی غلام رسول اور مولوی غلام اللہ فوت ہو گئے تو انگریزی عملداری میں یہ مدرسہ بند ہو گیا۔

مولوی غلام رسول کا انتقال ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء میں ہوا "ہادیٔ نیک نظر" مادہ تاریخ ہے[1]۔ ان کا ایک ہی بیٹا خلیفہ غلام یٰسین تھا جو نوجوانی میں فوت ہو گیا۔

مولوی غلام اللہ ۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء میں فوت ہوئے "مرجع الفضلا" ان کا مادہ تاریخ ہے[2]۔ ان کے پانچ صاحبزادوں میں سے خلیفہ احمد دین و خلیفہ حمید الدین نے سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ موخر الذکر بہت عالم اور فاضل تھے اور انجمن حمایت اسلام لاہور کے بانیوں میں سے تھے۔ خان بہادر خلیفہ عماد الدین انسپکٹر مدارس انہیں کے فرزند تھے جو ۱۱ اگست ۱۹۱۷ء کو لاہور میں فوت ہوئے۔ ہمارے عہد کے ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین ایم اے۔ ایل ایل ڈی بیرسٹر ایٹ لاء اس نامور خاندان کے ایک روشن ستارے تھے۔ وہ خلیفہ عماد الدین کے صاحبزادے، انجمن حمایت اسلام کے صدر اور پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے اسپیکر تھے۔ ان کا انتقال ۲۰ صفر ۱۳۷۵ھ مطابق ۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو ہوا اور اسلامیہ کالج لاہور میں دفن کیے گئے۔

دائی موراں کی مسجد کے قریب ہی اکالیوں کا ایک گوردوارہ تھا جہاں نہنگ سکھ رہا کرتے تھے مسجد میں پانچوں وقت اذان ہوتی تھی جو اکالیوں کو سخت ناگوار گزرتی تھی۔

---

[1] حدائق الحنفیہ صفحہ ۴۷۲
[2] تذکرہ علماء و المشائخ صفحہ ۹۰

ایک دن چند اکالی فریاد لے کر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ مسجد میں اذان ہونے سے ہماری نیند خراب ہوتی ہے۔ بلکہ ہمارے گیان دھیان اور نت نیم میں بھی فرق پڑتا ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو اذان دینے سے حکماً روک دیا جائے۔

مہاراجہ نے شہر کے قاضی اور مسجد کے امام کو بلایا اور یہ شکایت ان کو سنا کر دریافت کیا کہ تمہارا بانگ دینے سے مدعا کیا ہے۔ قاضی نے بتایا کہ بانگ دینے سے مدعا یہ ہوتا ہے کہ مؤذن کی بلند آواز سے اردگرد کے مسلمان مقررہ اوقات پر نماز کے لیے مسجد میں جمع ہو جایا کریں اور اپنے مذہبی فرائض ادا کر سکیں۔ اس میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہوتی جس سے کسی کا دل دکھے۔ صرف یہی کہا جاتا ہے کہ اللہ اکبر یعنی اللہ بڑا ہے۔ نیکی کی طرف آؤ۔ نماز پڑھو۔

قاضی صاحب کی بات سن کر مہاراجہ نے فرمایا کہ اچھا اگر اذان کا مطلب لوگوں کو نماز کے لیے بلانا ہی ہے تو اس کی تعمیل ہم کسی اور طریقے سے کرا دیتے ہیں۔ آپ محلہ کے مسلمانوں کے ناموں کی فہرست مرتب کر کے اکالیوں کو اس کا گورمکھی ترجمہ کرا دیں۔ وہ مسلمانوں کو نماز کے مقررہ اوقات پر مسجد میں جمع کر دیا کریں گے۔

کچھ تو اکالیوں کے ڈر کے مارے اور کچھ مذہبی جوش کی بنا پر مسلمان پہلے کی نسبت بہت زیادہ تعداد میں نماز کے لیے جمع ہونے لگے اور مسجد کی رونق بڑھ گئی۔

یہ انتظام کچھ دن چلتا رہا۔ آخر اکالی اس خدمت سے تنگ آ گئے۔ ہارے درجے پھر مہاراجہ کے پاس شکایت لے کر پہنچے۔ کہا۔ سرکار! پہلے تو اذان کی آواز سے ہماری نیند خراب ہوتی تھی۔ اب مسلمانوں کو پانچوں وقت نماز پڑھنے کے لیے سارا دن بلکہ صبح سے لے کر رات تک دردر پھرنا پڑتا ہے۔ اور کسی وقت آرام لینا نصیب نہیں ہوتا۔ ہمیں اس نوکری سے سبکدوش کیا جائے۔

مہاراجہ نے ہنس کر کہا۔ اگر تم اس تکلیف کو گوارا نہیں کر سکتے تو اذان بدستور جاری رہے گی۔ اکالیوں نے بادل ناخواستہ اس بات کو منظور کر لیا۔ مہاراجہ نے مسلمانوں کو اذان کہنے کی اجازت دے دی۔ اس طرح مہاراجہ کے حسن تدبیر سے دونوں قومیں خوش ہو گئیں اور اکالیوں نے پھر کبھی اذان کی بندش کا سوال نہ اٹھایا۔ مبادا نماز بخشوانے جائیں اور روزے گلے پڑیں۔

مسجد بوکن خاں

یہ عالی شان مسجد ۱۲۵۷ھ/۱۸۴۱ء میں بوکن خاں داروغہ اصطبل خاص مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ڈھل محلہ موچی دروازہ میں تعمیر کی۔ اس سے پہلے بھی اس جگہ ایک وسیع مسجد بنی ہوئی تھی جسے بوکن خاں نے گرا کر از سر نو بنوایا۔ دروازہ اس کا بجانب شمال ہے جس پر سنگِ مرمر کی اینٹ پر فرید شاعر لاہور کا یہ قطعہ تاریخ کندہ ہے:

چوں زبوکن خاں والا منزلت — شد بنا ایں مسجد ذی الاحترام
بہر تاریخش زہاتف شد ندا — کعبۂ ثانی بنا شد ایں مقام
۱۲۵۷ھ

دروازے کے اندر داخل ہوں تو ایک وسیع میدان آتا ہے۔ ابتدا میں یہ باغیچہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ جنوبی

ہیں درویشوں کے رہنے کے لیے چند حجرے بنے ہیں۔ چاہ و غسل خانہ و سقاوہ بھی ہے۔ خاص مسجد کی تین محرابیں عالی شان بنی ہیں۔ درمیانی محراب پر کلمہ شریف تحریر ہے۔ مسجد کی عمارت پختہ چونہ گچ منقش ہے۔ سقف چوبی رنگین ہیں۔ کچھ عرصہ سے مسجد میں انجمن کا مدرسہ بھی قائم ہے۔

۲۴ ستمبر ۱۸۸۴ء کو چہار شنبہ کے روز اسی مسجد کے صحن میں لاہور کے مسلمانوں نے جمع ہو کر انجمن حمایت اسلام لاہور کے اغراض و مقاصد کا باقاعدہ اعلان کیا تھا اور اسی تاریخ سے انجمن کی کارروائی ضبط تحریر میں آنی شروع ہوئی تھی۔ اب بھی دن انجمن کا یوم تاسیس خیال کیا جاتا ہے اور ہر سال ۲۴ ستمبر کو انجمن کے تمام اداروں میں تعطیل منائی جاتی ہے۔

مسجد کہنہ حمام والی

لوہاری دروازہ کے علاقے میں ایک محلہ ہے جسے چبلیہ کا حمام کہتے ہیں۔ اس میں ایک کہنہ مسجد شاہان سلف کے وقت کی ہے۔ عام طور پر اسے اکبری دور کی عمارت بتایا جاتا ہے۔ یہ مسجد نواب شیخ غلام محبوب سبحانی مرحوم کی حویلی کے دیوار بدیوار ہے۔ مسجد کی دیواروں کے آثار بہت چوڑے ہیں۔ سقف قالبوتی نہایت پختہ ہے۔ دیواروں کی عمارت خشتی ہے مگر اوپر استرکاری بہت موٹی ہے جو کئی جگہ سے اتر گئی ہے۔

مسجد شیخ نواب امام الدین خاں

یہ مسجد بھی محلہ چبلیہ کا حمام میں بنی ہوئی ہے۔ بہت عالی شان ہے۔ بانی مسجد نواب شیخ امام الدین رنجیت سنگھ کی طرف سے ناظم صوبہ کشمیر تھے۔ نواب امام الدین سے پہلے ان کا باپ شیخ غلام محی الدین کشمیر کی نظامت پر مامور تھا۔ انھوں نے وہیں وفات پائی۔ بعد میں ان کا بیٹا اسی خدمت پر مقرر ہوا اور اس وقت تک رہا جب تک انگریزوں نے لاہور فتح کر کے کشمیر کا علاقہ مہاراجہ گلاب سنگھ کے پاس فروخت نہ کر دیا۔

یہ مسجد ۱۲۶۶ھ / ۱۸۴۹ء میں تعمیر ہوئی۔ کرسی ایک منزل بلند ہے۔ زینہ چڑھ کر اوپر جاتے ہیں۔ صحن وسیع اور پختہ ہے شمال کی طرف ایک چوبی مکلف دالان ہے۔ خاص مسجد کی تین محرابیں ہیں۔ درمیانی محراب کے اوپر سنگ مرمر کی تختی پر کلمہ شریف کے نیچے یہ چار مصرعے کندہ ہیں ؎

امام الدین خاں نواب ذی جاہ
عمارت کرد مسجد حسب دلخواہ
چو تاریخش بجستم ہاتف غیب
بگفتا فی الحقیقت کعبۃ اللہ

۱۲۶۶ھ

مسجد کے اندر عمارت نہایت عمدہ منقش ہے۔ سقف قالبوتی ہے۔ چھت کے اوپر تین عالی شان گنبد اور دو مینار ہیں

درمیانی گنبد کے چاروں طرف چار شعر کا قطعہ لکھا ہے ؂

زہے نواب عالی شاں کہ از تائید یزدانی
موافق شد پئے تعمیر مسجد از خدا دانی

چہ مسجد قبلہ گاہِ عارفاں و معبد نیکاں
مقام فیض ربانی مکان لطف سبحانی

بنام ایزد از بیں تعمیر تسخیر دو عالم کرد
خریدہ دولت باقی عقبی از زر فانی

مرا عدا فگندہ گفت ہاتف سال تعمیرش
بدنیا از امام الدین بنا شد کعبۂ ثانی

۱۲۶۶ھ

صحن کے جنوبی دالان کی دیوار پر بھی چند اشعار تاریخی درج ہیں۔ بانیٔ مسجد[1] کا بیٹا نواب غلام محبوب سبحانی[2] رئیس لاہور جب تک زندہ رہا اس مسجد کی خبر گیری کرتا رہا۔ مسجد اب بھی آباد ہے۔

مسجد شاہ محمد غوث

حضرت شاہ محمد غوث قادری جو محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں پشاور سے چل کر سارے ہندوستان کی سیر کرتے ہوئے آخر ۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹ء میں لاہور آکر فوت ہوئے تھے دہلی دروازے اور اکبری دروازے کے درمیان باغ میں آسودۂ خواب ہیں اور ان کا مزار زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

---

[1] و [2] ۔ نواب شیخ امام الدین اور نواب غلام محبوب سبحانی دونوں علم دوست تھے اور حضرت علی ہجویری کے عقیدت مند۔ دونوں کی قبریں داتا گنج بخش کے احاطے میں ہیں۔ اول الذکر ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۸ء میں فوت ہوئے ان کے مقبرہ پر امام ویردی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مندرجہ ذیل کتبے سنگ مرمر پر کندہ ہیں ؂

چوں کہ نواب شیخ امام الدین
شد ز دنیا و رو بہ خلد نہاد

گفت ہاتف ز سال تاریخش
احمد مجتبیٰ شفیعش باد

۱۲۷۵ھ

چوں بہ خاکم بگذری دامن کشاں
از سر اخلاص الحمدی بخواں

از خانۂ عفو آں خداوند غفور
کز صنع وجود بشر از خاک سرشت

بر تربت نواب امام الدین خاں
آرام گہش "بہشت" تاریخ نوشت

نواب غلام محبوب سبحانی کا انتقال ۹ جنوری ۱۹۰۳ء کو دہلی میں ہوا جب وہ دربار میں شرکت کے لیے سرکاری مہمان کی حیثیت سے وہاں گئے ہوئے تھے۔ آپ فارسی کے نہایت اچھے شاعر تھے اور صاحب دیوان۔ (پنجہ فولاد ۱۴ جنوری ۱۹۰۳ء)

آپ کے مزار کے غرب کی سمت ایک پختہ مسجد گنبد دار بنی ہوئی ہے۔ یہ مسجد غلام نبی کوٹھی وار نے بنوائی تھی۔ فرش مسجد کا پختہ ہے اور عرض دہ در دہ عرض و طول کا ہمیشہ پر آب رہتا ہے۔ مسجد کے درمیانی طاق پر کلمہ شریف کے نیچے یہ دو شعر لکھے ہیں ؎

سال بنا گفت دل از رائے دین	مسجد زیبائے غلام نبی
پئے تعمیر مسجد گشت تاریخ	عبادت خانۂ زیبائے اعلیٰ

اس مسجد اور مزار کا انتظام پہلے متولیوں اور سجادہ نشینوں کے ہاتھ میں تھا اب محکمہ اوقاف نے اپنے ذمہ لے لیا ہے۔

مسجد امام شاہ والی

یہ مسجد ڈھل محلہ میں سر راہ بنی ہے۔ پہلے بھی یہاں مسجد تھی۔ ۱۲۹۴ھ / ۱۸۷۷ء میں نواب عبدالمجید خاں[1] رئیس لاہور نے موجودہ عمارت اپنی لاگت سے تعمیر کی۔ دروازہ اس مسجد کا شرق کی طرف ہے اندر جائیں تو وسیع صحن آتا ہے جس میں پختہ فرش بنایا گیا ہے۔ ایک گوشے میں چاہ و غسل خانہ و سقادہ بنا ہوا ہے۔ خاص مسجد کی تین محرابیں منقطع ہیں جن کے اندر لکڑی کے دروازے لگے ہیں۔ مسجد کے اندر کی عمارت بھی نہایت خوبصورت منقش ہے۔

مسجد مفتیاں

یہ مسجد حویلی میاں خاں کے قریب محلہ کوٹھی مفتیاں میں واقع ہے جسے کبھی محلہ غلاول دہانی بھی کہتے تھے۔ اسے سلطان بہلول لودھی کے زمانے میں مفتی کمال الدین نے تعمیر کیا تھا۔ مسجد کا صحن نہت فراخ اور حجرے بہت سے تھے۔ چھ پشت تک مفتی کمال الدین کی اولاد وہاں درس و تدریس دیتی رہی۔ سکھ گردی میں حجرے گر گئے اور لکڑیاں لوگ اٹھا کر لے گئے۔ صرف مسجد باقی رہ گئی۔ کنور نونہال سنگھ کے داروغہ اصطبل دلاور خاں نے مسجد کے صحن کی زمین پر زبردستی اپنی حویلی تعمیر کر لی۔ وارثان مسجد مفتی غلام رسول اور مفتی غلام محمد مہاراجہ کھڑک سنگھ کے پاس مستغیث ہوئے۔ مہاراجہ نے دلاور خاں کو سخت تنبیہہ کی اور کہا یہ نامہ زمین کا امام کے نام لکھوا دیا اس طرح مسجد چھوٹی رہ گئی مگر اپنی قدامت کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ ایک دفعہ برسات میں مسجد کی چھت بھی گر گئی تھی جسے نواب عبدالمجید خاں رئیس لاہور نے دوبارہ تعمیر کرایا تھا۔ مشہور مؤرخ مفتی غلام سرور لاہوری بھی اسی مسجد کے قریب میں رہا کرتے تھے۔ ان کا بڑا خستہ مکان اب تک وہاں موجود ہے۔

---

[1] نواب عبدالمجید خاں لاہور کے نامی رئیس ہی نہ تھے بلکہ علم طب اور علوم عربی و فارسی میں بھی اچھی خاصی شہرت رکھتے تھے۔ ان کا دادا نواب مظفر خاں ملتان کا والی تھا۔ وہ ۱۸۱۸ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ سے جنگ کرتا ہوا اپنے پانچ بیٹوں کے ساتھ شہید ہو گیا تھا۔ ان بیٹوں میں نواب عبدالمجید خاں کا باپ شہزادہ شاہ نواز خاں بھی تھا۔ نواب عبدالمجید خاں کا انتقال ۲۶ فروری ۱۹۰۲ء کو لاہور میں ہوا (تذکرہ علمائے لاہور صفحہ ۹۴)

مسجد تکیہ سادھواں

یہ مسجد ۱۲۶۶ھ/۱۸۴۹ء میں نور محمد سادھو نے تعمیر کرائی تھی۔ سادھو قوم کے لوگ سرحاکمان لاہور کے زمانے میں کشمیر سے آکر اس محلے میں آباد ہوئے جو اس وقت محلہ علاؤ الدین لوہانی کے نام سے مشہور تھا۔ مسجد کی جگہ پر پہلے ایک میدان تھا جسے گنج شہیداں کہتے تھے۔ سادھوؤں نے اپنی نشست کے لیے تکیہ بنایا اور ایک چھوٹی سی مسجد کی بنیاد رکھی۔ نور محمد نے اس مسجد کو گرا کر اور تکیہ کی زمین اس میں شامل کر کے یہ مسجد بنوائی جس میں بہت سا روپیہ برادری اور دوسرے لوگوں کا صرف ہوا۔ مسجد کی کرسی اونچی ہے۔ زینہ چڑھ کر اوپر جاتے ہیں۔

اب سے پہلے پیر عبدالغفار شاہ کے مدرسہ غوثیہ کی وجہ سے مسجد کو بہت شہرت حاصل تھی۔ اس میں فقہ اور تفسیر کی تعلیم دی جاتی تھی اور مثنوی مولانا روم شرح کے ساتھ پڑھائی جاتی تھی۔ تعلیم مفت اور عام تھی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے پیر اشرف شاہ نے ان کی گدی سنبھالی۔ حال ہی میں اس مسجد کی ایک چھت اور اضافہ کی گئی ہے۔ بلند مینار بھی بنا ہے۔ آبادی اور رونق روز افزوں ہے۔ لاؤڈ اسپیکر سے دور دور تک خدا کے نام کی گونج سنائی دیتی ہے۔

مسجد مرزا محمد عرف میرزا موٹا

یہ مسجد شاہ نواز کے طویلہ کے متصل واقع ہے اور بہت پرانی ہے پہلے ضابطہ خاں کی مسجد کہلاتی تھی جو ایک عابد و زاہد شخص اس مسجد میں رہتا تھا وہ ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء میں فوت ہو گیا۔ ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء میں اس مسجد کو گرا کر مرزا محمد نے از سر نو بنوایا۔ یہ شخص سکھی سلطنت کا ملازم تھا انگریزی عملداری میں خانہ نشین رہا مگر پیسہ والا اور دیندار تھا۔ اس نے بہت سا روپیہ صرف کر کے مسجد کی کرسی ایک منزل اونچی کی۔ شرق و جنوب کی طرف مسجد کے نیچے دکانیں بنوائیں جن کی آمدنی سے مسجد کو بہت فائدہ پہنچا۔ ایک نشست گاہ بھی مسجد کے متصل بنی جو امام کی رہائش کے لیے وقف ہے، دروازے پر سنگِ مرمر کا ایک تختہ لگا ہے جس پر یہ شعر کندہ ہیں ؎

چونکہ از مرزا محمد مسجدے — شد بنا و خوب با تدبیر شد

ہاتفم شمسا پئے تاریخ گفت — اے چہ احسن مسجدے تعمیر شد
(۱۲۷۹ھ)

صحن کے جنوب کی طرف چاہ ہے جو مسقف ہے۔ مسجد کے اوپر اگرچہ گنبد نہیں مگر دیوار کی منڈیروں کے تین حصے کر کے مدور بشکل گنبد بنا دیئے گئے ہیں۔ اس مسجد کی دیواریں چونہ گچ و منقش ہیں۔ اندر کی محرابوں پر اشعار لکھے ہیں اور باہر کی درمیانی محراب پر کلمہ شریف۔

مسجد امیر شاہ مشہد وردی مجیر

یہ پختہ قبول صورت سی مسجد مرزا محمد کی مسجد کے قریب سر راہ واقع ہے۔ پہلے بھی یہاں مسجد تھی مگر بہت چھوٹی۔ امیر شاہ نے اس کے ساتھ والا مکان خرید کر مسجد میں شامل کیا اور مسجد کو وسیع کر کے از سر نو ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء میں بنوایا۔ اگرچہ گنبد نہیں ہیں مگر وضع قطع

سنہری مسجد کی سی ہے۔ صحن بھی ہے مسجد کی تین محرابیں بھی مقطع بنی ہیں۔ سقاوہ اور چاہ بھی ہے اور امام کے لیے نشست گاہ بھی۔ بانی اس مسجد کا سید امیر شاہ تھا جو انگریزی فوج میں وردی میجر کا عہدہ رکھتا تھا۔ آدمی بہت نیک تھا۔

صوفی والی مسجد

یہ مسجد سر راہ کشمیری بازار میں واقع ہے۔ بہت پرانی مسجد ہے صوفی نام ایک ملا مدت تک اس میں امامت کرتا رہا۔ اسی کے نام سے مشہور ہو گئی۔ اس مسجد کی کرسی بہت بلند ہے۔ دروازہ شمال کی طرف کوچہ کوٹھی داراں میں ہے۔ بازار کی طرف دکانیں ہیں جن کا کرایہ مسجد پر صرف ہوتا ہے۔

مسجد میاں نور ایمان والا

یہ مسجد پرانی کوتوالی میں ہے۔ بانی اس کا ایک مجیّر تاجر نور محمد تھا جو گھوڑوں کی کاٹھیاں بیچا کرتا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس کی ایمانداری اور دیانت سے خوش ہو کر اسے "نور ایمان والا" کا خطاب دے رکھا تھا۔ یہ شخص سخاوت بھی کرتا تھا اور کارِ خیر میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے مسجد وزیر خاں کی مرمت پر ہزارہا روپے صرف کئے اور چاروں میناروں کے اوپر کی برجیوں کے آٹھ آٹھ دروں میں سے چار چار در بند کرا کے انھیں گرنے سے بچا لیا۔ کئی دیگر مسجدوں کی تعمیر میں بھی حصہ لیا اور بزرگوں کے روضے بھی بنوائے۔

یہ مسجد اس نے ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۳ء میں بنوائی تھی۔ عمارت نہایت مستحکم چونہ گچ ہے۔ کرسی ایک منزل بلند ہے۔ زینہ چڑھ کر اوپر جاتے ہیں۔ نیچے دکانیں ہیں جن کا کرایہ مسجد کے مصارف میں صرف ہوتا ہے۔ اوپر کنواں، سقاوہ، غسلخانہ بنا ہوا ہے۔ مسجد کا صحن وسیع ہے۔ تین محرابیں عالی شان بنی ہوئی ہیں۔ سقف قالبوتی ہے۔ اوپر تین گنبد مدور نہایت خوبصورت ہیں۔ مسجد کی میانہ محراب کے اوپر سنگ مرمر کی اینٹ پر یہ دو شعر لکھے ہیں:

نور محمد بعطائے کریم	ساختہ مسجد چو فلک مستقیم
جست چو تاریخ بنائش خرد	ہاتف گفتا ز ہے اجر عظیم ۱۲۳۹ھ

مسجد ثانی نور محمد ایمان والا

یہ مسجد کشمیری بازار میں سر راہ بنی ہے۔ اس کے شمال کی طرف ایک کوچہ میں نور ایمان والے کی حویلی تھی۔ جب مسجد تیار ہوئی تو مولوی جان محمد سکھی عہد کے ایک مشہور واعظ اس کے امام مقرر ہوئے۔ وہ نہایت متقی، صاحب تصنیف اور عالم باعمل تھے۔ ہر جمعہ کے روز وعظ کہتے تھے اور لوگ شوق سے سنتے تھے۔ ایک جمعہ کو نور ایمان والا خود بھی وعظ سننے آیا۔ وعظ ختم ہو چکا تو اس نے مولوی جان محمد کو زر نقد و خلعت کے علاوہ حویلی مسکونہ بھی بخش دی اور اپنے گھر والوں سے کہا کہ اسی وقت گھر سے نکل کر دوسرے مکان میں چلے جائیں اور جس قدر اسباب خانہ داری، ظروف و پارچات وغیرہ ہیں سب وہیں چھوڑ دیں۔ سوا ان کپڑوں کے جو پہن

رکھے ہیں کچھ ہمراہ نہ لے جا بیں۔ مولوی جان محمد جب تک زندہ رہے اسی حویلی میں رہے۔ ۱۰ محرم ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء کو ان کا انتقال ہوا ان کی وفات کے بعد یہ ان کی اولاد مولوی فضل حق وغیرہ کے قبضے میں چلی گئی۔ جنھوں نے مسجد میں کچھ تبدیلیاں بھی کیں۔

یہ مسجد اگرچہ چھوٹی سی ہے مگر نہایت مقطع اور کرسی دار ہے۔ نیچے دکانیں ہیں۔ مسجد کی جنوبی دیوار پر جانب بازار یہ شعر تحریر ہیں جو تجدید و ترمیم کا سال ظاہر کرتے ہیں :-

تو مسجد بکہ مظہر نور محمد است ۔۔۔ در وے ہنوز امامت جان محمد است

از فضل حق فرید چہ سال بناش گفت ۔۔۔ این سجدہ گاہ سلامت جان محمد است
۱۲۷۹ھ

ایضاً

مسجد نبوی بحکم فضل حق تعمیر کرد ۔۔۔ ہست بیت اللہ ثانی شد ملائک را مقام

جست عاشق لکھنوی چوں از سر ایجاد سالی ۔۔۔ گفت ہاتف سجدہ گاہ فضل حق بادا مدام
۱۲۹۷ھ

مسجد سردار خاں

احمد شاہ ابدالی کے پوتے زمان شاہ اور سہ حاکمان لاہور کے زمانے میں شیخ عبداللہ بلوچ لاہور کے نامور عالموں میں شمار ہوتے تھے۔ وہ پنجابی زبان کے نہایت اعلیٰ شاعر بھی تھے۔ حافظ غلام محمد عرف امام گاموں جو رنجیت سنگھ کے عہد میں مسجد وزیر خاں کے امام تھے، آپ ہی کے مرید تھے۔ شیخ عبداللہ ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء میں فوت ہوئے۔ مزنگ کا محلہ کوٹ عبداللہ آپ ہی کے نام پر آباد ہے۔

سردار خاں بلوچ نمبردار مزنگ نے ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۸ء میں جب آپ کا مقبرہ بنوانا شروع کیا تو اس کے ساتھ ایک بہت بڑی خوبصورت مسجد بھی تعمیر کرائی جو اس وقت یورپین بنگلوں میں گھری ہوئی تھی۔ وہ اس مسجد کا بلند مینار بھی بنوانا چاہتا تھا مگر موت نے مہلت نہ دی۔ ابھی مسجد پوری طرح مکمل نہ ہوئی تھی کہ اس کی عمر کا جام لبریز ہو گیا اور اس کے انتقال کے بعد باقی عمارت کی تکمیل ہوئی۔ مسجد پختہ ہے اور لاہور کے شایانِ شان۔

مسجد تاجے شاہ

تاجے شاہ لاہور میں ایک مجذوب فقیر تھا۔ بہت سے لوگ اسے کشف و کرامت والا بزرگ مانتے ہیں۔ اس نے ایک سو برس کی عمر پا کر روز دوشنبہ ہفتم ماہ بیساکھ سمت ۱۹۰۱ بکرمی مطابق ۱۲۶۱ھ کو انتقال کیا اور موچی دروازہ کے باہر چیمبرلین روڈ پر سبزی منڈی کے پاس اس جگہ دفن ہوا جہاں اب یہ مسجد واقع ہے۔ بقول مفتی غلام سرور لاہوری "نور شہید عالم" مادۂ تاریخ ہے۔

پہلے یہ مسجد چھوٹی سی تھی۔ باقی جگہ میں باغیچہ اور فقیروں کے رہنے کے مکانات تھے۔ اب یہ مسجد وسیع ہو گئی ہے۔ تکیہ کی ساری زمین صحن میں آ گئی ہے۔ بازار کی سمت دکانیں ہیں جن کی آمدنی مسجد پر صرف ہوتی ہے۔ سبزی منڈی اور اردگرد کی

آبادی کی وجہ سے مسجد میں ہمیشہ رونق رہتی ہے۔

مسجد پٹولیاں

یہ مسجد لوہاری منڈی میں واقع ہے۔ بہت پرانی ہے۔ ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۵ء میں میاں عمر دین سب اوورسیر محکمہ پارک ہاسٹری نے بہت سا روپیہ صرف کر کے اپنے والد کے نام پر اس کی تجدید کی۔ مسجد کرسی دار نہیں۔ سر بازار اس کا دروازہ ہے۔ چاہ، غسلخانہ اور سقاوہ کے علاوہ وسیع صحن اور تین محرابیں ہیں جن کی عمارت پختہ و منقش ہے۔ تینوں دروازوں میں چوبی چوکھٹیں اور دروازے لگے ہیں۔ مسجد کے اندر عمارت بھی منقش پختہ چونہ گچ ہے۔ اندر کی تینوں محرابوں پر کلمہ شریف اور اشعار لکھے ہیں۔ باہر کے درمیانی دروازے کے اوپر سنگ مرمر کی سل نصب ہے جس پر چار مصرعے اور ۱۲۶۲ھ کندہ ہے۔ یہ مسجد ہمیشہ آباد رہی ہے۔ اب اس کا انتظام اوقاف کمیٹی نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔

مسجد رنگ محل

یہ مسجد بازار رنگ محل متصل مشن ہائی اسکول واقع ہے۔ پہلے بھی یہاں مسجد تھی۔ حفیظ چابک سوار نے اس کو از سر نو تعمیر کیا اور بقدر ایک منزل کے کرسی اونچی رکھی۔ جنوبی و غربی سمت مسجد کے نیچے دکانیں ہیں جن کا کرایہ مسجد کے مصارف کے لیے وقف ہے۔ زینہ چڑھ کر اوپر جاتے ہیں۔ صحن وسیع ہے اور عمارت پختہ چونہ گچ منقش۔ تین محرابیں ہیں، درمیانی محراب کے اوپر سنگ مرمر کی سل پر کلمہ شریف کندہ ہے۔ مسجد کے اندر محرابوں پر بھی ابیات تحریر ہیں۔ سقف قالبوتی ہے۔ اوپر تین گنبد اور دو چھوٹے چھوٹے مینار ہیں۔

محمد حفیظ سرداران سندھانوالیہ کے گھر کا چابک سوار تھا۔ مہاراجہ شیر سنگھ کے عہد میں جب سرداران سندھانوالیہ لاہور سے بھاگ گئے تو محمد حفیظ لاہور میں رہا۔ مہاراجہ نے اس کے دونوں ہاتھ قطع کرا دیئے۔ اس روز سے یہ حفیظ ٹنڈہ مشہور ہو گیا۔ چابک سواری میں اس وقت اس کا کوئی ثانی نہ تھا، آخری عمر میں حفیظ کو مہاراجہ نیپال نے اپنے پاس بلا لیا اور یہ قریب دس سال وہاں رہا۔ بینائی جاتی رہی تو پھر لاہور واپس آ گیا۔ یہیں ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء میں فوت ہوا۔

مسجد کمان گراں

رنگ محل سے موچی دروازہ کو جاتے ہوئے حویلی میاں خاں کے متصل بازار کے دائیں طرف ایک خوبصورت سی چینی کار مسجد آتی ہے جسے مسجد کمان گراں کہتے ہیں۔ یہ مسجد بہت پرانی ہے۔ اس کے بنانے والے برادری کمان گراں کے بزرگ تھے جو اسی محلہ میں رہتے تھے۔ اب بھی انہی کی ذرّیت اس محلے میں آباد ہے۔

پہلے یہ مسجد چھوٹی اینٹوں کی تھی، ایک منزلہ تھی، نہایت سادہ تھی اور اس میں لکڑی کے خوب صورت ستون کھڑے کر کے چھت ڈالی گئی تھی۔ صحن میں امرود، شہتوت، کیلا اور آم کے پیڑ سایہ کیے رہتے تھے۔ ۱۹۳۲ء میں اس برادری کے ایک

فرو میاں احمد دین کے دل میں اس مسجد کی تجدید کا خیال پیدا ہوا۔ وہ خود بہترین نقشہ نویس، باکمال مصور و نقاش، ماہر تعمیرات اور جدت پسند و مخترع تھے۔ کمرشل آرٹ میں انھیں خاص مہارت حاصل تھی۔ لاہور کی مشہور فرم پیکو لمیٹڈ کی ابتدائی شہرت میں ان کا خاص حصہ ہے۔ پیکو لمیٹڈ کے رنگین عکسی قرآن مجید اور ہفت رنگ پنجسورے ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے وہ نہایت خوش اخلاق، خوش پوشاک، خوش گفتار، خوش کردار، خوش مزاج، ہر دلعزیز اور عبادت گزار تھے۔ انھیں تزئین و آرائش کا خاص شوق تھا۔ ان کی اپنی نشست گاہ بھی ایک چھوٹا سا عجائب خانہ ہوتا تھا جس میں دنیا بھر کی نادر و نایاب اشیا نہایت قرینے سے سجی رہتی تھیں وہ ۲۳ دسمبر ۱۹۴۵ء کو فوت ہو گئے۔

میاں احمد دین نے اپنے عزیزوں کے تعاون سے اس مسجد کا ڈھانچہ بدلا اور عمارت کو اڑھائی منزل بلند کر کے زیادہ سے زیادہ نمازیوں کے لیے گنجائش پیدا کی۔ ۲۷ نومبر ۱۹۳۲ء (۱۳۵۱ھ) کو حاجی سیٹھ بہاؤ الدین قریشی خلف حاجی عمر الدین قریشی کے زیر اہتمام عمارت تکمیل کو پہنچی۔ نچلی منزل میں فرش سے لے کر چھت تک تمام دیواروں پر جاپانی ٹائلیں لگی ہیں۔ ازارے کی ٹائلیں پھولدار ہیں باقی سفید جنھیں دیکھ کر آنکھیں روشن ہوتی ہیں۔ چھت سفید گچ کی ہے اور اس کے نیچے جو خوبصورت ڈاٹ بھی ٹائلوں کی ہے۔ فرش پر سنگِ مرمر کے مصلے بنے ہیں۔ تین محرابی دار دروازے صحن میں کھلتے ہیں۔ تینوں میں لوہے کے تہہ ہو جانے والے پھاٹک ہیں۔ روشنی، پانی اور ہوا کا معقول انتظام ہے۔ امام اور مؤذن کی نشست گاہ کے لیے حجرے موجود ہیں۔ کنویں غسلخانے اور وضو خانے کے اوپر نہایت کاری گری سے پختہ مکان بنا ہے۔ یہ حاجی عمر الدین قریشی مرحوم نے اپنے صرف سے بنوا کر مسجد کے ساتھ وقف کیا ہے۔ اس کے کرایہ کی آمدن سے مسجد کے مصارف کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے۔ باقی ضروریات چندے سے پوری کی جاتی ہیں۔ جمعہ اور جماعت باقاعدہ ہوتی ہے۔ صدر دروازے کا پتھر پر دیں رقم کا اور درگاہ کی پیشانی پر کلمہ طیبہ اور اللہ محمد کے نام حاجی دین محمد کے لکھے ہوئے ہیں۔ مسجد نفاست اور حسنِ مذاق کی آئینہ دار ہے اور اس کا انتظام محلہ کمیٹی کی طرف سے راقم الحروف کے ہاتھ میں ہے۔

مسجد ملا مجید

یہ مسجد موچی دروازہ کے اندر محلہ چلہ بیبیاں میں واقع ہے اسے ملا مجید ایک ولایتی تاجر نے پہلے ۱۲۴۵ھ (۱۸۲۹ء) میں اور پھر ۱۲۹۴ھ (۱۸۷۷ء) میں تعمیر کیا۔ بہت سا روپیہ سید حیدر شاہ سپروائزر محکمہ انہار نے بھی اس پر صرف کیا۔ یہ مسجد نہایت مقطع، خوبصورت اور پختہ بنی ہوئی ہے۔ بیرونی دروازہ نہایت عمدہ بنا ہوا ہے۔ مسجد کے اندر سب کی طرف چاہ و غسل خانہ دستاوہ ہے اس سے آگے بڑھ کر ایک وسیع حجرہ ہے جس میں کبھی مولوی محمد بخش درس پڑھایا کرتے تھے۔ اس کے جنوب کی طرف خاص مسجد ہے۔ صحن نہایت عمدہ ہے۔ تینوں محرابیں قالبوتی ہیں۔ درمیانی محراب پر دو کتبے ہیں۔ بالائی کتبہ پر جلی حروف میں کلمہ شریف۔ بانی مسجد کا نام اور ۱۲۴۵ھ سال تعمیر سابق و ۱۲۹۴ھ تعمیر حال تحریر ہے۔ مسجد کے اندر کی عمارت بھی نہایت اعلیٰ درجے کی ہے۔ چھت قالبوتی ہے۔ اور اوپر تین گنبد مدور منقطع بنے ہیں۔ کرسی اونچی ہے۔ اس میں ہمیشہ رونق رہتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی نادر والی شبیہ خواجگان نے رفیع الشان امام باڑہ تعمیر کیا ہے۔

مسجد کریم بخش

یہ خوبصورت سی مسجد میاں کریم بخش نے لنگے منڈی پانی والے تالاب کے قریب بنوائی تھی۔ میاں کریم بخش پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ کے ٹھیکیدار لاہور کے میونسپل کمشنر اور نہایت دیندار آدمی تھے[1]۔ باہر کے جنوبی دروازے پر سنگِ مرمر میں چند ابیات اور یہ اشعار کندہ ہیں ؎

کرد است کریم بخش زالطاف کریم
لالہ چنیں مسجد عالی تعمیر
ہر در بہ بنای سجدہ گاہ والا
دل گفت شد ایں مسجد عالی تعمیر

اندرونی دروازے پر :-

افضل الذکر لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

ایں بیت حق کہ کرد بنائش کریم بخش
روز جزا وسیلۂ غفران اولیس است
سال بنائش جستم و آمد ندا ز غیب
کایں بقعہ کریم مکان مقدس است
۱۳۰۳ھ (۱۸۸۵ء)

مسجد کی کرسی اونچی ہے نیچے دکانیں ہیں عمارت پختہ ہے۔

مسجد شہید

شاہ عالمی دروازے کے باہر سرکلر روڈ پر ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد سرخ پتھر کی بنی نظر آتی ہے۔ یہ دو منزلہ عمارت ہے۔ نیچے دو دکانیں اور اوپر مسجد ہے۔ اس مسجد کا پس منظر بڑا دلچسپ ہے۔ ابتدا میں یہاں ایک کچا سا چبوترہ تھا جس پر لوگ نماز پڑھا کرتے تھے۔ اس کے قریب ہی ہندوؤں کا ایک مندر تعمیر ہوا۔ مسلمانوں کو مسجد پختہ کرنے کا خیال آیا تو حکومت نے ہندو مسلم فساد کے پیشِ نظر اس کی اجازت نہ دی۔ مئی ۱۹۲۲ء میں ایک روز بعض پُرجوش نوجوانوں نے آپس میں مشورہ کر کے رات رات میں یہاں مسجد کھڑی کر دی۔ وہ عشاء کی نماز کے بعد کام پر لگے اور فجر کی نماز کے بعد فارغ ہو گئے۔ اقبال علیہ الرحمۃ نے یہ اشعار اسی واقعہ کی بنا پر کہے تھے ؎

---

[1] ان کا انتقال ۲۲ نومبر ۱۹۰۴ء کو اسی سال کی عمر میں ہوا۔

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا
تر آنکھیں تو ہو جاتی ہیں پر کیا لذت اس رونے میں
جب خونِ جگر کی آمیزش سے اشک پیازی بن نہ سکا
اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا

چونکہ یہ مسجد میونسپل کمیٹی کی اجازت کے بغیر زبردستی کھڑی کی گئی تھی اس لیے حکومت نے پولیس کی مدد سے زبردستی گرا دی ۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۴ء میں اسی جگہ منظوری کے ساتھ مسلمانوں کے چندے سے انجمن اسلامیہ نے یہ عمارت تعمیر کی جو آج بھی موجود ہے۔ اس کا ڈیزائن بہت ہی خوبصورت ہے اور انتظام دوسری مساجد کے ساتھ اوقاف کمیٹی کے ہاتھ میں چلا گیا ہے۔

مسلم مسجد

یہ عالی شان اور وسیع مسجد لوہاری دروازے کے باہر باغ میں واقع ہے۔ قیام پاکستان تک اس کی کل کائنات ڈیڑھ مرلہ زمین تھی جس میں چند بزرگوں کے مزار بھی تھے اور ایک کنواں بھی۔ ۱۹۲۵ء میں یہاں انجمن خادم المسلمین قائم ہوئی جس کی تبلیغی مساعی اور مولانا محمد بخش مسلم کی تقریروں کے فیض سے ہر جمعہ کو ہزارہا مسلمان جمع ہونے لگے۔ اسی وجہ سے یہ مسجد مسلم مسجد کے نام سے مشہور ہو گئی۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک یہ مسجد حصولِ پاکستان کی تحریک کا ایک زبردست مرکز تھی۔ مسجد کے منبر سے ہر جمعہ کو پاکستان کی تائید میں تقریریں کی جاتیں یہاں تک کہ ملک آزاد ہو گیا۔ غیر مسلم اجنبی تسلط ہمیشہ کے لیے ختم ہونے کے بعد طبیعتوں میں اسلامی جوش اور ولولہ اتنا بڑھا کہ یہ چھوٹی سی مسجد نمازیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ناکافی نظر آنے لگی چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ مسجد کی توسیع کے ساتھ ساتھ بزرگوں کے مزاروں کے اوپر ایک شاندار گنبد اور مینار تعمیر کیا جائے تاکہ مسلمانوں کے دورِ اعمال کی یاد تازہ ہو جائے۔

حضرت عبدالصمدؒ بانی سلسلہ صمدیہ نے ۹ رجون ۱۹۵۰ء بروز جمعہ اس مسجد کی پہلی اینٹ رکھی اور پونے دو لاکھ روپیہ کے صرف سے دس سال میں یہ حسین و جمیل مسجد اور اس کا بلند و عالی شان مینار بن کر تیار ہوا۔ اب یہ مسجد لاہور کی قابلِ دید عمارتوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس مسجد کا فنِ تعمیر آپ اپنی نظیر ہے۔ اس میں نمازیوں کی سہولت اور آرام کے لیے جو انتظامات کئے گئے ہیں وہ شاید اس سے بڑی مساجد میں بھی نہیں ہوں گے۔ یہاں دلوں کا علاج بھی کیا جاتا ہے۔ دماغ بھی منور ہوتے ہیں اور جسمانی شفا بھی ملتی ہے جنوری ۱۹۵۵ء میں یہاں مدرسہ کریمیہ کے شعبہ تجوید کا قیام عمل میں آیا۔ جہاں قرأت و تجوید کے علاوہ حفظ قرآن کا انتظام بھی ہے۔ پھر جامعہ مدینہ کے تعاون سے ایک اور دار العلوم قائم کیا گیا جہاں تفسیر، حدیث، فقہ اور علوم اسلامیہ کے علاوہ درجہ پرائمری کے مطابق مروجہ نصاب کی تعلیم دی جاتی اور بچیوں کو دستکاری سکھائی جاتی ہے۔

اس مسجد کی کرسی زمین سے ایک منزل بلند ہے، مسجد صحن اور حوض وغیرہ سب اوپر ہیں نیچے دکانوں کے علاوہ ایک پریس اور فری ہسپتال ہے جس کے مندرجہ ذیل تین شعبے خوب کام کر رہے ہیں :-

۱- فری ڈسپنسری

۲- فری ڈینٹل ہسپتال

۳- بہبود زچہ و بچہ -

کئی اور منصوبے زیر تجویز ہیں - سالانہ آمد و خرچ کا آڈٹ شدہ حساب باقاعدہ شائع کیا جاتا ہے -

چیفس کالج لاہور کی مسجد

چیفس کالج لاہور جسے کبھی راجکمار کالج بھی کہتے تھے، ہندو راجوں اور رئیس زادوں کے علاوہ مسلمان نوابوں اور رئیسوں کے لڑکوں کی تعلیم کا بہت بڑا مرکز تھا اور اب بھی ہے لیکن آج سے ساٹھ پینسٹھ برس قبل وہاں کوئی مسجد نہ تھی - بہاولپور کے نواب محمد بہاول خاں عباسی نے ایام طالب علمی میں اپنے اتالیق مولوی محمد عبدالرحمٰن خاں کی تحریک و ترغیب پر یہاں ایک مسجد کی بنیاد رکھی اور چودہ ہزار روپیہ صرف کر کے یہ خوب صورت عمارت تیار کی - مسجد میں داخل ہوتے ہی سامنے یہ شعر نظر پڑتے ہیں جن کے آخری مصرع سے ۱۳۱۸ھ / ۱۹۰۰ء نکلتی ہے جو مسجد کی تاریخ بنا ہے ؎

چو نواب مبارک سپے بہاول خاں عباسی

بنا کرد ست در عہد تعلم خوشنما مسجد

بگفتا ہاتف صادق بما لک سال تعمیرش

بکالج از بہاول خاں پنجم شد بنا مسجد

اس کے ارد گرد آیتیں وغیرہ نہایت خوش خط لکھی ہوئی ہیں - صحن بہت وسیع ہے - مسجد کے دروازے کے ایک پہلو میں وضو کرنے کی جگہ ہے اور دوسرے پہلو میں "محل درسگاہ قرآن" ہے - صحن سے گزر کر جب اندرونی محراب پر نظر جاتی ہے تو یہ اشعار دکھائی دیتے ہیں ؎

بندۂ پروردگارم اُمّتِ احمدؐ نبی

دوستدار چار یارم تابع اولاد علیؓ

مذہب حنفیہ دارم ملّتِ حضرت خلیلؑ

خاک پائے غوثِ اعظم زیر سایہ ہر ولی

اس کے مقابل مفصلہ ذیل اشعار جلی قلم سے لکھے ہوئے ہیں ؎

گر ترا معرفت بخشد یقیں

دوستی چار یاراں را گزیں

ہر یکے را با مراتب داں بزرگ

تا شوی مقبول عالم برگزیں

جنوبی دیوار پر یہ شعر مندرج ہے ؎

محمد عربی کابروئے ہر دو سرا ست
کہ خاک درش نیست خاک بر سر او

اور شمالی دیوار پر لکھا ہے ؎

محمد مدنی افتخار ارض و سما ست
کسے کہ طالب آن ست تاج بر سر او

اشعار کے علاوہ باری تعالیٰ کے نناوے نام اور اکثر آیتیں نہایت خوشخط حرفوں میں زیب دیوار اور زینت مسجد ہیں عمارت کی سادگی کو بیل بوٹوں اور نقش و نگار نے چار چاند لگا رکھے ہیں۔ اندر کے درون کا فرش اور منبر سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے۔

مسجد دا لگراں

محمد بخش ٹھیکیدار لاہور میں سب سے زیادہ کوٹھیوں کے مالک تھے۔ یہ مسجد ان کی والدہ زیب النساء نے ۱۳۲۵ھ (۱۹۰۷ء) میں تعمیر کرائی اور اس کے ساتھ ملحقہ جائداد وقف کی۔ اس وقف کی رجسٹری بموجب حکم عدالت عالیہ پنجاب ۱۹۲۰ء میں عمل میں آئی[1]۔ یہ مسجد شہر سے ریلوے اسٹیشن کو جاتے ہوئے برانڈرتھ روڈ اور ریلوے روڈ کے مقام اتصال پر دونوں سڑکوں کے درمیان واقع ہے۔ یہ امر موجب افسوس ہے کہ بانیہ کے بیٹے کے قرض میں ملحقہ جائداد قرق ہو گئی۔ مسجد آباد ہے اور اس میں جامعہ نعیمیہ مزید رونق کا باعث ہے جس میں حدیث و تفسیر کی تعلیم ہوتی ہے۔

آسٹریلیا مسجد

یہ مسجد لاہور کے بہت بڑے رئیس خواجہ محمد بخش دائیں، سوداگر آسٹریلیا والے نے میلا رام کے تالاب کے سامنے لاکھوں روپیہ کے صرف سے تعمیر کرائی تھی۔ خواجہ صاحب کے بزرگ سکھوں کے عہد میں بے سروسامانی کی حالت میں کشمیر سے لاہور آئے اور یہ خود معاش کی تلاش میں آسٹریلیا تک گئے۔ وہاں ادنیٰ مزدور کی حیثیت سے زندگی کا آغاز کیا مگر جب واپس آئے تو دولت ساتھ لائے۔ یہاں آکر انھوں نے لاکھوں روپیہ کی جائداد لاہور میں پیدا کی۔ آسٹریلیا بلڈنگ اور کشمیر بلڈنگ کے علاوہ ان کے لڑکوں خواجہ محمد رشید، خواجہ محمد امیر بخش اور خواجہ محمد بشیر نے آسٹریلیا بنک قائم کیا جس کی شاخیں دوسرے شہروں میں بھی پھیلی ہوئی ہیں۔

جس جگہ یہ مسجد کھڑی ہے، برادران وطن بانئ مسجد سے یہ قطعہ زمین منہ مانگی قیمت دے کر مندر تعمیر کرنے کے لیے لینا چاہتے تھے۔ خواجہ محمد بخش نے دل میں سوچا کہ جب یہ لوگ اپنا معبد بنانے کے لیے لاکھوں روپیہ صرف کرنے پر آمادہ ہیں

---

[1] تاریخ جلیلہ ص ۳۲

تو ہیں کیوں عبرت حاصل نہ کر دوں۔ خدا نے توفیق دی۔ مسجد تعمیر ہو گئی۔

بانی نے مسجد کی دیوار میں ایک کتبہ نصب کرایا ہے جس میں لکھا ہے :-

" وقف ہذا کی رجسٹری ۲۶ر اکتوبر کو اور انتقال کی تصدیق

۴ر اپریل ۱۹۲۵ء کو ہوئی "

پیمائش حسب ذیل دی ہے :-

" شمالی ۸ ۳ ۲ فٹ ۸ انچ۔ جنوب ۲۹۱ فٹ مشرق ۱۶۰ فٹ

مغرب ۱۰۰ فٹ۔ سڑک جانب مغرب ۲۰ فٹ "

لاہور ریلوے اسٹیشن کے قریب ہونے کی وجہ سے یہ مسجد ہر وقت آباد رہتی ہے۔ اس میں ہر طرح کی ضروریات مہیا کی گئی ہیں۔ برقی روشنی اور پنکھے لگے ہیں۔ پانی کی فراوانی ہے۔ جگہ خوب صاف ستھری ہے۔ خطیب و مؤذن مقرر ہیں۔ مسجد کے باہر بانی کی قبر ہے۔ سنگ مرمر کے تعویذ پر تاریخ وفات ۳ ذوالحجہ ۱۳۴۷ھ مطابق ۱۳ر مئی ۱۹۲۹ء کندہ ہے۔[1]

جامع اشرفیہ

آج سے نصف صدی پیشتر امرتسر میں مدرسہ نعمانیہ کی بنیاد رکھی گئی۔ ملک کے سب سے بڑے خطیب سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے استاد حدیث مفتی محمد حسن مرحوم یہیں پڑھتے اور بعد میں درس دیا کرتے تھے۔ اگست ۱۹۴۷ء میں امرتسر کے اجڑ جانے کے بعد مدرسہ نعمانیہ لاہور میں منتقل ہو گیا۔ مفتی محمد حسن[2] کی مساعی جمیلہ سے بازار نیلا گنبد سے پیوست ایک گلی کے موڑ پر ایک بلڈنگ الاٹ ہو گئی جہاں دسمبر ۱۹۴۷ء سے درسیات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چونکہ حضرت مفتی صاحب حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے دامنِ عقیدت سے وابستہ تھے اس لیے جامعہ نعمانیہ کا نام بدل کر جامعہ اشرفیہ رکھ دیا گیا اور اب جامعہ کی اپنی عمارت فیروز پور روڈ پر ایک انتظامیہ کی نگرانی میں تیار ہو چکی ہے جس کا کچھ حصہ ابھی زیرِ تکمیل ہے۔ اس عظیم الشان عمارت جس پر پچیس لاکھ روپیہ صرف ہو چکے ہیں عہد سلف کے فن تعمیر کی یاد دلاتی ہے۔

درس گاہ سے ہم رشتہ ایک عظیم الشان مسجد ہے یا یہ کہیے کہ اس جامع مسجد کے ہم رشتہ یہ درس گاہ ہے جو تقریباً پچاس کنال میں پھیلی ہوئی ہے۔ اسی میں دارالافتاء اور مدرسوں کے کوارٹر بھی ہیں۔ قاری عبیداللہ اس کے مہتمم اور مولانا ادریس کاندھلوی شیخ الحدیث ہیں۔ مسجد کا صدر دروازہ نہایت رفیع الشان ہے اندر بہت بڑا ہال اور دالان وسیع برآمدے ہیں۔ ہال کے سامنے پھر ایک وسیع و عریض برآمدہ ہے۔ بالائی حصے میں دونوں طرف مستورات کے لیے باپردہ گیلریاں ہیں۔

---

[1] تاریخ جلیلہ مؤلفہ پیر غلام دستگیر نامی ص ۸۰-۳۸۱۔

[2] یکم جون ۱۹۶۱ء کو مفتی صاحب کا انتقال کراچی میں ہوا۔

مسجد شیرانوالہ دروازہ

شیرانوالہ دروازہ میں داخل ہوتے ہی اسلامیہ ہائی اسکول کے سامنے سڑک کے دائیں طرف ایک وسیع و عریض اونچی سی مسجد نظر آتی ہے جو مولانا احمد علی[1] کے درس اور خطبوں کی مقبولیت کے سبب سے انہی کے نام سے مشہور ہے۔ پہلے یہ مسجد بہت چھوٹی سی تھی اور اس میں پولیس لائن کے ملازم نماز ادا کیا کرتے تھے اس بنا پر اسے مسجد لائن سبحان خاں کہتے تھے۔

۱۹۱۷ء میں جب مولانا احمد علی نظر بند کی حیثیت سے لاہور لائے گئے تو انھوں نے پہلے شیرانوالہ دروازہ کے باہر ایک چھوٹی سی مسجد میں قرآن مجید کا درس شروع کیا پھر جب وہاں لوگ زیادہ آنے لگے اور جگہ تنگ ہو گئی تو وہ اس مسجد میں اُٹھ آئے اور آپ کی تحریک سے لوگوں نے اس مسجد کی عمارت کو وسیع کر کے نہایت شاندار بنا دیا۔ اب مسجد کی درگاہ اور صحن اتنا ہے کہ اس میں ہزاروں نمازی سما سکتے ہیں۔

اسی مسجد میں درس کے دوران ۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۱ء میں انجمن خدام الدین کی بنیاد پڑی جس نے مدرسہ قاسم العلوم قائم کیا جو نہایت کامیابی سے چل رہا ہے۔ اس مدرسے کا افتتاح ۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۴ء میں شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی نے کیا تھا۔

جامع قاسمی

جامع قاسمی فیض باغ لاہور کی غالباً سب سے بڑی مسجد ہے۔ اس کی بنیاد ریلوے ورکشاپ مغلپورہ لاہور کے چند دیندار مزدوروں اور حضرت مولانا محمد مطیع الحق مرحوم و مغفور کی کوششوں سے رکھی گئی۔ ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ ان مزدوروں نے وفد کی صورت میں دروازے دروازے پھر کر چندہ اکٹھا کرنا شروع کیا اور دو تین سال میں اتنی رقم اکٹھی کر لی کہ زمین کا ایک قطعہ خرید کر مختصر سی عمارت تعمیر کر سکیں۔

حضرت مولانا مطیع الحق مرحوم انجمن حمایت الاسلام کے شیرانوالہ گیٹ ہائی اسکول میں بطور مدرس ملازم تھے، اس کے علاوہ تبلیغی اور اصلاحی کاموں میں بھی وقت دینا پڑتا تھا اس لیے آپ نے حافظ قاری شفاعت احمد صاحب کو دیوبند سے بلا کر اس مسجد کا امام اور مسجد سے متعلق مدرسہ مصباح العلوم کا مدرس مقرر فرمایا اور یہ انتخاب ایسا موزوں اور مفید ثابت ہوا کہ اب یہ مسجد فیوض و برکات کا گہوارہ ہے۔

---

[1] مولانا احمد علی ۲ رمضان ۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۶ء کو قصبہ جلال گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم جلال اور نوشہرہ کے سکول میں پائی قرآن مجید اپنی والدہ سے اور دینی تعلیم مولانا عبدالحق اور مولانا عبید اللہ سندھی سے حاصل کی۔ حضرت سندھی نے آپ کو اپنی فرزندی میں لیا اور اپنے ہمراہ دہلی لے گئے جہاں سندِ نیابت عطا کی۔ دہلی ہی سے مولانا احمد علی کو "ریشمیں خطوط" کی سازش میں گرفتار کر کے شملہ، جالندھر اور راہوں جیل میں رکھنے کے بعد ۱۹۱۷ء میں مستقل طور پر لاہور میں نظر بند کر دیا گیا جہاں سے انھوں نے ایک عظیم قرآنی تحریک جاری کی جو اب تک چل رہی ہے۔

حافظ صاحب قبلہ نے مدرسے اور مسجد کی ذمہ داریاں قبول فرمانے کے بعد اس کی توسیع اور استحکام کی مہم شروع کی اور ۱۹۴۶ء تک اس قابل ہو گئے۔ کہ مزید زمین خرید کر مسجد کی نئی عمارت کی داغ بیل ڈال سکیں۔

اب یہ مسجد ۲ کنال اور گیارہ مرلے زمین پر ایستادہ ہے۔ اور اپنی خوبصورتی، مضبوطی اور کشادگی کے لحاظ سے اس علاقے میں بے مثال ہے۔ اس کی اصل عمارت کی لمبائی پچاس فٹ چوڑائی ۱۹ فٹ اور اونچائی ۲۲ فٹ ہے۔ محراب اسپینی عربوں کے طرزِ تعمیر کا نمونہ ہے اور بے حد خوب صورت ہے۔ میناروں پر سفید سیمنٹ کا پلستر کیا گیا ہے جس سے انھیں خوب آب و تاب حاصل ہوئی ہے۔

مسجد کا صحن ۶۰ فٹ لمبا اور ۴۵ فٹ چوڑا ہے اور اس کے آخری حصے پر ۵۷ فٹ لمبا خوبصورت برآمدہ تعمیر کیا گیا ہے۔ اس برآمدے کے سامنے ہی وضو کے لیے سقاوہ اور غسل خانے ہیں۔ کنواں بھی انھی کے ساتھ ہے۔ مسجد کی عمارت کے ساتھ شمال کی طرف مدرسہ مصباح العلوم کے لیے پانچ کمرے تعمیر کیے گئے ہیں۔ جنوب کی جانب صدر دروازہ اور دو حجرے ہیں۔ ان میں سے ایک بطور اسٹور اور دوسرا نشست گاہ امام کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ان کے اوپر ایک رہائشی مکان تعمیر کیا گیا ہے جس کا کرایہ مسجد کے اخراجات کا بار ہلکا کرتا ہے، بالائی مکان کے علاوہ اس حصے میں باہر کی طرف دکانیں بنائی گئی ہیں جو کرائے پر چڑھی ہوئی ہیں۔

دروازے تین ہیں۔ ایک جنوبی (صدر دروازہ) دوسرا مشرقی اور تیسرا شمالی۔

مسجد کی موجودہ عمارت ۱۹۴۶ء سے شروع ہو کر ۱۹۵۳ء میں اختتام پذیر ہوئی۔ کیونکہ چندے کی رقوم سے کام ہوتا تھا اس لیے مختلف حصوں کی تعمیر میں تھوڑا تھوڑا وقفہ آیا۔

مدرسہ مصباح العلوم قاری شفاعت احمد صاحب قبلہ کی مساعی اور خلوص کی وجہ سے اس علاقے کے لیے ایک بہت بڑی برکت ثابت ہوا ہے۔ اب تک اس مدرسے سے ۸۷ حفاظ اور تقریباً تین ہزار ناظرہ خواں طلبہ فارغ التحصیل ہو چکے ہیں۔ قاری صاحب کے اس فیصلے نے درس کو اور مفید بنا دیا ہے کہ جو بچے قرآن شریف حفظ کریں انھیں اردو اور حساب وغیرہ کی تعلیم بھی دی جائے تاکہ جب وہ مدرسے سے فارغ ہوں تو کسی مڈل اسکول میں داخل ہو سکیں۔ پرائمری کی تعلیم کے چکر میں نہ پڑنا پڑے۔

جن لوگوں نے اس مسجد اور مدرسے کی تعمیر میں نمایاں طور پر حصہ لیا ہے میرے علم کے مطابق ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:۔

(۱) حضرت مولانا محمد مطیع الحق مرحوم (۲) بابا نور دین مرحوم (۳) حاجی شیخ محمد شفیع مرحوم۔ انھوں نے تقریباً بیس ہزار روپے کے عطیات سے امداد کی۔ (۴) مستری زبردین مرحوم۔ (۵) خلیفہ جی مرحوم۔ (۶) حافظ قاری شفاعت احمد صاحب امام و صدر مدرس (۷) مستری عبدالکریم صاحب (۸) مستری شمشیر خاں صاحب (۹) محمد الیاس صاحب۔ انھوں نے تقریباً پندرہ ہزار روپے دیے۔ مسجد کا کنواں بابا نور دین مرحوم نے بنوایا۔

جمعہ اور عیدین کی نماز کے لیے شامیانے اور لاؤڈ اسپیکر مسجد کی ملکیت ہیں۔ یہ دونوں چیزیں عمدہ کوالٹی کی خریدی گئی ہیں۔

نمازیوں کے لیے پانی اور روشنی کا انتظام بھی نہایت عمدہ ہے۔

مدرسے کے زنانہ حصے میں بچیوں کو کشیدہ کاری بھی سکھائی جاتی ہے۔

اس مسجد پر اندازاً ایک لاکھ روپے صرف ہو چکے ہیں۔

جامع مسجد فیض باغ لاہور

جامع قاسمی کے بعد فیض باغ کے علاقے کی یہ دوسری بڑی مسجد ہے۔ اگرچہ اس کا رقبہ زیادہ نہیں، اندازاً پندرہ بیس مرلہ زمین احاطہ ہوتی ہے لیکن اہلِ محلہ کی توجہ نے اسے کافی خوبصورت بنا دیا ہے، روشنی اور پانی کا نہایت اچھا انتظام ہے اور مدرسہ اسلامیہ فیض العلوم کے نام سے ایک دینی درسگاہ بھی قائم ہے۔

فیض باغ لاہور کی ان نواحی بستیوں میں سے ہے جو بیسویں صدی عیسوی کے آغاز کے ساتھ عالم وجود میں آئیں اور اس وقت سے اب تک برابر ترقی کر رہی ہیں۔ بستی کی آبادی زیادہ ہونے کے ساتھ ساتھ یہ مسجد بھی وسیع ہوئی ہے، بالکل ابتدا میں اس جگہ حاجی مہر دین کا کنواں تھا اور پنجاب کے عام دستور کے مطابق اس کنویں کے ساتھ نماز پڑھنے کے لیے چھوٹا سا چبوترا بھی بنا لیا گیا تھا۔

سہارن پور کی ریلوے ورکشاپ ٹوٹنے کے بعد جب ریلوے ملازمین کی کافی تعداد لاہور آئی اور اپنی سہولتوں کے مدِ نظر ان لوگوں نے اس محلے میں رہائش اختیار کی تو چبوترے کی جگہ چھوٹی سی مسجد تعمیر کر لی گئی۔ یہ کام اہلِ محلہ کے چندے سے ہوا اور اس میں مستری عبدالرحمٰن، حاجی قادر بخش، چودھری امیر علی، بابو اللہ بخش اور مستری اللہ بخش وغیرہ حضرات نے خاص طور سے حصہ لیا۔ سہارنپور کے ریلوے ملازمین نے بھی کافی دلچسپی لی۔ یہ ابتدائی عمارت اندازاً ۱۹۲۴ء یا ۱۹۲۵ء میں تعمیر ہوئی۔ اس کے بعد جب محلے کی آبادی اور زیادہ ہوئی تو آس پاس کی زمین حاصل کر کے موجودہ عمارت تیار کی گئی۔ یہ اضافہ غالباً ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ ہوا۔

جامع مسجد ماڈل ٹاؤن

لاہور کی آبادی جیسے جیسے بڑھتی گئی ارد گرد کی ہزاروں ایکڑ مزروعہ اراضی رہائشی مکانوں اور کوٹھیوں میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ گذشتہ نصف صدی میں ماڈل ٹاؤن، مسلم ٹاؤن، گارڈن ٹاؤن، سمن آباد، گلبرگ، کرشن نگر، سنت نگر، بھارت نگر، شام نگر، شادباغ، وسن پورہ، فیض باغ، فاروق گنج، حبیب گنج، عثمان گنج، بلال گنج، تاج پورہ، راج گڑھ، سعدی پارک، اور چوبرجی پارک وغیرہ کئی نئی آبادیاں بن گئی ہیں۔ مگر یہ سب کی سب آبادیاں کسی خاص منصوبہ بندی کے ماتحت عمل میں نہیں آئیں۔ گلبرگ، سمن آباد اور شادباغ تو جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیداوار ہیں۔ مگر سب سے اول جو قابلِ ذکر آبادی لاہور میں قائم ہوئی وہ ماڈل ٹاؤن ہے۔

لاہور میں اچھی طرز کی آبادی کا خیال سب سے پہلے دیوان کھیم چند کے ذہن میں آیا۔ انھوں نے اپنی تجویز ۱۹۱۹ء میں عوام کے سامنے پیش کی، جس کی پذیرائی ہوئی اور ۱۹۲۱ء میں ماڈل ٹاؤن کوآپریٹو سوسائٹی لاہور کی بنیاد رکھی گئی۔

۱۹۲۳ء میں اس سوسائٹی نے لاہور سے تین چار میل دور فیروز پور روڈ پر رکھ کوٹ لکھپت میں دو ہزار ایکڑ زمین حکومت سے خریدی۔ یہ زمین اس وقت ایک گھنا جنگل تھا جو جھاڑ جھنکار سے اٹا پڑا تھا اور درندوں کا مسکن بنا ہوا تھا۔ کوئی

شخص اکیلا دکیلا دن کے وقت بھی اس میں گھسنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ کسی کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ جگہ کبھی آباد ہوگی اور رانعول کا شہر بن جائے گی۔

سیکرٹری اور ڈائرکٹروں کی اَن تھک کوشش سے آہستہ آہستہ لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول ہوئی، جنگل صاف ہوگیا زمین ہموار کر دی گئی، دو دو چار چار چھ چھ کنال کے ٹکڑوں میں سینکڑوں کوٹھیاں بن گئیں۔ ہر کوٹھی کے ساتھ باغ یا غیچہ لازمی شرط تھی۔

اس قسم کا مثالی شہر اس وقت تک سارے ایشیا میں نہیں تھا جس کا اپنا کلب گھر، اپنا سکول، اپنا ہسپتال، اپنا ڈاک خانہ، اپنا تار گھر، اپنا واٹر ورکس، اپنا بجلی گھر، اپنی عبادت گاہیں اور اپنا ذریعہ آمد و رفت ہو۔ ان سہولتوں کے علاوہ ایک بہت بڑا پبلک باغ، کھیل کا میدان، مصنوعی پہاڑی اور درمیان میں خوب صورت جھیل بنانا بھی سوسائٹی کے پیش نظر تھا مگر انقلاب ۱۹۴۷ء نے یہ سارا منصوبہ خاک میں ملا دیا۔ اصل مکینوں کی جگہ مہاجر آ بسے جو اپنے اپنے مسائل کے چکر میں ایسے پھنسے کہ تعمیر و توسیع کی طرف کوئی توجہ ہی نہ دے سکے۔

جامع مسجد ماڈل ٹاؤن بھی اس آبادی کے شایان شان بنائی گئی ہے۔ اس کی تعمیر کے متعلق جو کچھ مولانا محمد بہاؤ الحق قاسمی خطیب جامع کے ذریعے معلوم ہو سکا وہ حسب ذیل ہے:۔

یہ مسجد ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۹۴۰ء میں اسلامک ٹرسٹ ماڈل ٹاؤن کی مساعی سے عالم وجود میں آئی۔ مسجد اور اس کے ملحقہ قطعات کا کل رقبہ آٹھ ایکڑ ہے۔ زمین ماڈل ٹاؤن کواپریٹو سوسائٹی نے باقاعدہ مسجد کے لیے ٹرسٹ کے حوالے کی اور تعمیر کے مصارف امدادی چندوں سے پورے ہوئے۔ چنانچہ ٹرسٹ کی پہلی ہی مجلس میں آٹھ ہزار روپے کے وعدے ہوئے۔ نقشہ اور ڈیزائن ایک مشہور ماہر تعمیرات، انگریز مسٹر بی برنیٹفور مقیم لاہور نے تیار کیا جسے ٹرسٹ نے منظور کر لیا اور سمت قبلہ کی تعین کے بعد مولانا احمد علی امیر انجمن خدام الدین کے دست مبارک سے مسجد کی بنیاد رکھوائی گئی۔ ٹرسٹ کی درخواست پر مقامی اور غیر مقامی مسلمانوں نے چندہ دیا۔ معطی حضرات کے نام سنگ مرمر کی سلوں پر کندہ ہیں جو مسجد کی ڈیوڑھی کی دیواروں میں نصب ہیں۔ ان میں نظام حیدر آباد کا نام بھی شامل ہے۔ سرمایہ کی فراہمی کے سلسلے میں حاجی تاج الدین مرحوم سپرنٹنڈنٹ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی۔ خان بہادر مغل باز خان مرحوم ممبر پبلک سروس کمیشن، کرنل مولوی ضیاء الدین مرحوم ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس سندھ۔ خان بہادر میاں نظام الدین مرحوم چیف انجنیئر ریلوے کا ذاتی اثر و رسوخ بہت کام آیا۔ چالیس ہزار روپے جمع ہوئے جو مسجد کی عمارت پلاٹوں کی ترتیب و تزئین، بیرونی چار دیواری اور آہنی پھاٹکوں کی تیاری اور حدود مسجد کی اندرونی سڑکوں کی تعمیر پر صرف ہو گئے۔ حاجی تاج الدین مرحوم تمام کاموں کو چھوڑ کر از اوّل تا آخر تعمیر کی نگرانی فرماتے رہے۔ شیخ محبوب عالم سوداگر نے بھی انتظامی امور میں سرگرم حصہ لیا۔ آپ بقید حیات ہیں اور مسجد کے زیر سایہ اپنی کوٹھی میں رہتے ہیں۔

مسجد کی خوب صورتی بلاشبہ قابل دید اور قابل داد ہے۔ لیکن ٹرسٹ کے ممبروں سے ایک چوک ہو گئی وہ یہ کہ مسجد کے ساتھ کوئی ایسی جائیداد وقف نہیں کی گئی جس سے ٹرسٹ اپنے آئندہ مستقل مصارف کے لیے چندوں کی فراہمی

سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ حسب فیصلہ ہر کوٹھی دار بجلی کے بل کے ساتھ ایک ایک روپیہ ماہوار اسلامک ٹرسٹ کی امداد کے لیے ماڈل ٹاؤن سوسائٹی کے دفتر میں جمع کراتا ہے اور ٹرسٹ کا محصل وہاں سے جمع شدہ رقوم وصول کر کے ٹرسٹ کے فنانشل سیکرٹری کے پاس جمع کرا دیتا ہے۔ بعض مخیر حضرات عطایات کی صورت میں بھی ٹرسٹ کی امداد فرماتے ہیں اور ان تمام جمع شدہ رقوم سے جامع مسجد مذکور کے علاوہ قبرستان اور مسجد عید گاہ جی بلاک کے مصارف پورے کیے جاتے ہیں۔ قبرستان اور عید گاہ کا انتظام بھی ٹرسٹ ہی کے ذمے ہے۔

جامع مسجد کی خطابت اور عیدین کی امامت مولانا محمد بہاؤ الحق قاسمی امرتسری کے سپرد ہے جو ۱۹۵۲ء سے یہ فرائض ادا کر رہے ہیں۔ مولانا موصوف تقسیم ملک سے پہلے انٹرمیڈیٹ ایم اے او کالج امرتسر میں بحیثیت استاد اسلامیات اور ایم اے او ہائی سکول میں بحیثیت صدر مدرس دینیات اٹھارہ بیس برس تک کام کرتے رہے ہیں۔ اس سے پہلے اڑھائی سال تک مرکزی جامع مسجد حنفیہ راولپنڈی کے خطیب رہ چکے ہیں۔ بعض اسلامی جرائد و رسائل مثلاً القاسم۔ الارشاد۔ ضیاء الاسلام امرتسر اور ماہنامہ شمس الاسلام بھیرہ ضلع سرگودھا کی ادارت کے فرائض بھی سرانجام دیتے رہے ہیں۔ متعدد دینی و مذہبی کتب و رسائل کے مصنف بھی ہیں۔ تقسیم کے بعد ۱۹۴۸ء سے ایم بی ہائی سکول وزیر آباد میں صدر مدرس دینیات تھے کہ ۱۹۵۲ء میں اسلامک ٹرسٹ کی دعوت پر اسے ترک کر کے ماڈل ٹاؤن کی مسجد میں چلے آئے اور اس وقت سے اب تک یہیں اپنے فرائض نہایت خلوص سے ادا کر رہے ہیں۔

جامع مسجد (عکس جمیل) سمن آباد

پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد نئی نئی آبادیوں کی داغ بیل پڑنے کی رسم سرعت کے ساتھ عمل میں آنے لگی۔ سمن آباد کی نو آبادی بھی اسی عمل کا نتیجہ ہے۔

لاہور امپروومنٹ ٹرسٹ نے جب سمن آباد کے تعمیری منصوبے کی تکمیل شروع کی اور لوگ یہاں آباد ہونے لگے، تو اللہ کے نیک بندوں نے اس امر کی ضرورت محسوس کی کہ یہاں اپنے گھروں کے علاوہ خدا کا بھی ایک گھر ہونا چاہیے لہٰذا پہلے پہل اللہ کی زمین پر معمولی حد بندی کر کے نماز پنجگانہ کی ادائیگی کا بندوبست کیا گیا۔ رفتہ رفتہ اس کی رونق میں اضافہ ہونے لگا اور اس قطعہ زمین پر جہاں یہ عالی شان مسجد کھڑی ہے ایک چھپر ڈال دیا گیا جس سے یہ مسجد چھپر والی مسجد کے نام سے پکاری جانے لگی۔

اب ضرورت اس بات کی محسوس ہوئی کہ کس طرح اس قطعہ اراضی کو امپروومنٹ ٹرسٹ سے مسجد کے لیے حاصل کیا جائے۔ چنانچہ بستی کے لوگوں نے ایک انجمن کی داغ بیل ڈالی جس کا نام سمن آباد ریذیڈنٹس ایسوسی ایشن رکھا گیا۔ اس انجمن کے فرائض میں جہاں ٹرسٹ سے اس بستی میں بسنے والوں کے لیے مراعات حاصل کرنا اور جائز شکایات پیش کر کے اپنے مطالبات منوانا تھا، وہاں اس مسجد کے لیے باقاعدہ زمین حاصل کرنا، چندہ فراہم کرنا اور اس کی تکمیل کا کام بھی تھا۔

ابتدا میں صرف دو قطعے اراضی امپروومنٹ ٹرسٹ نے دینے منظور کیے لیکن یہ رقبہ کافی نہ تھا۔ اس لیے مسلسل

کوششوں کے بعد موجودہ چاروں قطعات کا سرکاری طور پر قبضہ مل گیا اور ٹرسٹ کے پہلے چیئرمین جناب ظفر الاحسن نے یہ وعدہ بھی کیا کہ انجمن جس قدر روپیہ فراہم کرے گی، ٹرسٹ اسی قدر رقم اپنے پاس سے مسجد کی تعمیر میں لگا دے گا۔

جب دس ہزار روپیہ جمع ہو گیا تو یہ رقم ٹرسٹ میں جمع کرا دی گئی تاکہ ٹرسٹ حسب وعدہ اسی قدر رقم شامل کر کے مسجد کی تعمیر کا کام شروع کرے۔ مگر سرکاری کام بڑی سست رفتاری سے ہوتے ہیں۔ دن، مہینے اور سال لگ گئے لیکن یہ وعدہ شرمندۂ ایفا نہ ہوا۔ اسی اثناء میں چیئرمین صاحب تبدیل ہو گئے اور نئے چیئرمین نے سابقہ وعدے پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ آخر یہ طے پایا کہ اپنا ہی روپیہ نکلوا کر مسجد کی تعمیر کا کام شروع کر دیا جائے۔

کافی تگ و دو کے بعد یہ روپیہ واپس حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی۔ اس وقت انجمن مذکورہ نے ایک سب کمیٹی "مسجد کمیٹی" کے نام سے تشکیل کی اور اس کمیٹی کے سپرد مسجد کی تعمیر کا کام کیا۔ یہ مسجد کمیٹی پانچ عہدہ داروں اور پانچ ممبروں پر مشتمل تھی۔ اس نے مسجد کی تعمیر کے کام کا بیڑا اٹھایا اور لوگوں کے تعاون سے مسجد کا ایک عالی شان ہال، ایک دومنزلہ برآمدہ دو شاندار مینار، ایک وضو خانہ، ایک صدر دروازہ، تین غسل خانے، تین طہارت خانے، ایک فلش بیت الخلا، چار دکانیں اور ایک مکان برائے رہائش پیش امام کھڑا کر دیا۔ تقریباً ایک لاکھ پچیس ہزار روپے اس پر صرف ہو چکے ہیں۔ ابھی ایک بلند مینار، آٹھ دکانیں، دکانوں کے اوپر درس گاہ قرآنی، مسجد کے اندر چہار طرفہ برآمدہ، ایک مزید صدر دروازہ، صحن پختہ وغیرہ تعمیر ہونے باقی ہیں۔ اس بقیہ کام کے لیے مزید ایک لاکھ یا اس سے زائد رقم کی ضرورت ہو گی۔ جس رفتار سے چندہ جمع ہو رہا ہے اس سے ظاہر ہے کہ آئندہ پندرہ سال کے عرصے میں بھی یہ کام شاید مکمل نہ ہو سکے گا۔ تاوقتیکہ

"مردے از غیب بروں آید وکارے بکند"

مسجد میں درس گاہ قرآنیہ عرصہ قریباً تین سال سے جاری ہے جس کا انتظام درسگاہ سب کمیٹی کے سپرد ہے۔ اس درس گاہ میں قریباً ایک سو پچاس بچے اور بچیاں ناظرہ قرآن پڑھتے ہیں۔ چند بچے قرآن مجید حفظ بھی کر رہے ہیں۔ تین اچھے اور قابل قاری اس کام پر مقرر ہیں۔ اس وقت مسجد کی چار دکانوں اور ایک عارضی چھپر دکان سے مبلغ دو سو پچاس روپیہ ماہوار کی مستقل آمدنی ہے جو خطیب و امام کے وظیفے، خادم اور صفائی کرنے والے کی تنخواہ اور بجلی وغیرہ کے بل کی کفیل ہے۔

۳ گلبرگ، شاد باغ، وسن پورہ، چوبرجی کوارٹرز، قلعہ گجھمن سنگھ، جناح پارک، کرشن نگر اور دیگر نئی آبادیوں میں بھی نہایت شاندار مساجد تعمیر ہوئی ہیں جن کے حالات پھر کبھی لکھے جائیں گے۔

کتب خانے

نور الٰہی

(لائبریرین، پنجاب پبلک لائبریری، لاہور)

برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کا ہر طالب علم لاہور کی تاریخی و ثقافتی اہمیت سے آشنا ہے۔ یہ نہ صرف قدیم شہروں میں شمار ہوتا ہے، بلکہ ہر تاریخی دور میں علم و حکمت کا مرکز بھی رہا ہے۔ خصوصاً مسلمانوں کے عہد میں اس کی شہرت چار دانگ عالم میں تھی، جہاں تک تعلیمی ترقی کا تعلق تھا، وقت کے حکمرانوں کی بیشتر توجہ اس شہر کے فروغ پر مرکوز تھی۔ سلاطین دہلی اور مغل بادشاہوں کے آثارِ قدیمہ اس امر کی روشن دلیل ہیں۔ دورِ حاضر میں بھی یہ شہر ہماری تہذیبی اور تعلیمی زندگی میں شہ رگ کی حیثیت رکھتا ہے۔ پاکستان کی سب سے قدیم اور مشہور یونیورسٹی اسی شہر میں ہے۔ کالجوں اور اسکولوں کی تعداد بھی سب سے زیادہ اسی میں ہے، علمی دنیا میں اس کی مرکزی حیثیت کا انحصار اس امر پر ہے کہ یہاں کتب خانوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے، جہاں علوم و فنون کے ہر شعبہ پر بے شمار کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں۔ ان کتب خانوں کی اجمالی کیفیت اس مقالہ کا موضوع ہے۔

لاہور کے معتبر کتب خانوں کی نوعیت حسب ذیل ہے۔ ہر کتب خانے کا ذکر ہم اس کے عنوان کے تحت کریں گے۔

۱۔ عوامی کتب خانے

۱۔ پنجاب پبلک لائبریری لاہور
۲۔ دیال سنگھ پبلک لائبریری
۳۔ میونسپل لائبریری، شاہ محمد غوث
۴۔ ادارہ تعمیر نو (بی۔این۔آر) کا دار المطالعہ
۵۔ لاہور پبلک لائبریری، علامہ اقبال روڈ

۲۔ کلب لائبریری

۱۔ جم خانہ کلب لائبریری

۳۔ اداری کتب خانے

۱۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری

۲۔ بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن لائبریری

۴۔ کالجوں کے کتب خانے

ا۔ آرٹس کالج

۱۔ گورنمنٹ کالج لائبریری

۲۔ فورمین کرسچین کالج لائبریری

۳۔ اسلامیہ کالج لائبریری، سول لائنز

۴۔ ایم۔ اے۔ او، کالج لائبریری

۵۔ دیال سنگھ کالج لائبریری۔

۶۔ ایچیسن کالج لائبریری

۷۔ لاہور کالج فار ویمن لائبریری

۸۔ اسلامیہ کالج فار ویمن لائبریری

۹۔ کینیرڈ کالج لائبریری

ب۔ سائنس کالج (فنون مفیدہ کے کالج)

۱۔ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لائبریری

۲۔ فاطمہ جناح میڈیکل کالج لائبریری

۳۔ گورنمنٹ کالج آف اینمل ہسبنڈری لائبریری

۴۔ گورنمنٹ کالج آف انجنیئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی لائبریری

۵۔ ڈیپارٹمنٹ کالج آف ڈنٹسٹری لائبریری

۶۔ ہوم اینڈ سوشل سائنس کالج لائبریری

۷۔ نیشنل کالج آف آرٹس لائبریری۔

ج۔ یونیورسٹی کے قائم کردہ، دیگر علوم و فنون کے کالج

۱۔ ہیلی کالج آف کامرس لائبریری

۲۔ لاء کالج لائبریری

۳۔ اورینٹل کالج لائبریری۔

د۔ تعلیمی تربیتی کالجوں کے کتب خانے

۱۔ سنٹرل ٹریننگ کالج لائبریری

۲۔ لیڈی میکلیگن ٹریننگ کالج لائبریری۔

۵۔ ٹیکنیکل کتب خانے (مخصوص الاغراض کتب خانے)

۱۔ انسٹیٹیوٹ آف کیمسٹری لائبریری، پنجاب یونیورسٹی

۲۔ انسٹیٹیوٹ آف کیمیکل ٹیکنالوجی لائبریری، پنجاب یونیورسٹی

۳۔ ہائی ٹنشن اینڈ نکلیر ریسرچ لیبارٹری، گورنمنٹ کالج

۴۔ ویسٹ ریجنل لیبارٹریز لائبریری

۵۔ پاکستان ایسوسی ایشن فار دی اڈوانسمنٹ آف سائنس لائبریری

۶۔ اریگیشن ریسرچ انسٹیٹیوٹ لائبریری

۶۔ گورنمنٹ کی لائبریریاں (محکمانہ کتب خانے)

۱۔ اسمبلی لائبریری

۲۔ بورڈ آف اکنامک انکوائری، پنجاب، لائبریری

۳۔ پنجاب ایڈوائزری بورڈ فار کبس لائبریری

۴۔ پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ لائبریری۔

۵۔ ویسٹ پاکستان بیورو آف ایجوکیشن لائبریری

۶۔ ویسٹ پاکستان سول سیکرٹیریٹ لائبریری

۷۔ ڈائرکٹریٹ آف پبلک ہیلتھ لائبریری، ویسٹ پاکستان

۸۔ لائبریری محکمہ رجسٹرار کواپریٹو سوسائٹی، ویسٹ پاکستان

۹۔ آرکیولوجیکل ڈیپارٹمنٹ لائبریری

۱۰۔ ڈائرکٹریٹ آف انڈسٹریز لائبریری، ویسٹ پاکستان

۱۱۔ لاہور میوزیم لائبریری

۱۲۔ جی، ایم (جنرل منیجر) لائبریری، پی، ڈبلیو، آر، ہیڈ کوارٹرز

۷۔ عدالتی کتب خانے

۱۔ سپریم کورٹ لائبریری

۲۔ ویسٹ پاکستان ہائی کورٹ لائبریری

۳۔ بار ایسوسی ایشن لائبریری

۸۔ علمی و ادبی اداروں کے کتب خانے

۱۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لائبریری

۲۔ ادارہ مجلس ترقی ادب لائبریری۔

۹ - سفارتی اور غیر ملکی کتب خانے

۱ - یو۔ایس۔انفرمیشن سروس لائبریری
۲ - برٹش کونسل لائبریری ۔
۳ - پاکستان جرمن کلچرل سنٹر لائبریری ۔
۴ - خانہ فرہنگ ایران
۵ - عرب کلچرل سنٹر لائبریری
۶ - مڈل ایسٹ ریسرچ لائبریری
۷ - ٹیکنیکل ریفرنس لائبریری آف دی یونائٹیڈ سٹیٹ آپریشن مشن ٹو پاکستان ۔

مندرجہ ذیل اصطلاحات ہر لائبریری کے ذکر میں استعمال ہوئی ہیں جو فنی نقطہ نگاہ سے بہت اہم ہیں ، ان کی تشریح ہم نے مقالہ کے آخر میں کر دی ہے وہاں سے ملاحظہ فرمائیں :-

(۱) کھلی الماری OPEN SHELF
(۲) مقفل یا بند الماری CLOSE SHELF
(۳) کارڈ کٹیلاگ
(۴) ڈکشنری کٹیلاگ
(۵) کلاسیفائیڈ کٹیلاگ
(۶) ڈیوی ڈیسیمل کلاسیفکیشن DEWEY DECIMAL CLASSIFICATION

۱ - عوامی کتب خانے

۱ - پنجاب پبلک لائبریری ، لاہور پنجاب پبلک لائبریری اس وقت مملکت پاکستان کا بہترین کتب خانہ اور سب سے بڑا علمی سرمایہ تصور کیا جاتا ہے ۔ وہ عمارت جس میں لائبریری کی بنیاد رکھی گئی اور جو آجکل بھی لائبریری کا ایک حصہ ہے ، " بارہ دری نواب وزیر خاں " کہلاتی تھی ۔ یہ ایک بہت ہی خوبصورت اور دلکش عمارت ہے اس کے چاروں کونوں پر چار خوش وضع برجیاں اور اس کے اندر نہایت نفیس محرابیں ہیں ، یہ عمارت نواب وزیر خاں مرحوم نے بنائی تھی ، نواب صاحب موصوف عہد شاہجہانی کے مقتدر اور جلیل القدر امرا میں سے تھے ۔ ۱۶۳۴ء میں اس نے شاندار مسجد کی تکمیل کے بعد جسے آجکل مسجد وزیر خاں کہتے ہیں ۔ انھوں نے شہر سے باہر ایک وسیع و عریض باغ کی بنیاد ڈالی ، جس کے وسط میں یہ دلکش عمارت بھی تعمیر کی ، مورخین کا بیان ہے کہ اس باغ پر زر کثیر صرف ہوا ، اور یہ دلفریبی اور رعنائی میں اپنی مثال آپ تھا ، اس میں بہت سے کھجور کے درخت لگائے گئے تھے ، اس مناسبت سے اسے " نخلیہ " بھی کہتے تھے ، باغ تو دست برد روزگار کی نذر ہو گیا ، مگر بارہ دری حوادث زمانہ سے محفوظ رہی ، مختلف مواقع پر اس عمارت سے مختلف کام لیے گئے ۔ سکھوں کے عہد میں یہ چھاؤنی کا ایک حصہ تھی ، ۱۸۴۹ء میں جب پنجاب کا الحاق برٹش عملداری سے ہوا ، تو انگریزوں نے اپنے ابتدائی

دَور میں اسے فوجیوں کے کوارٹروں کے طور پر اور دیگر فوجی اغراض کے لیے استعمال کیا ، اس کے بعد اس میں محکمہ بندوبست کا دفتر بنادیا گیا ۔ کچھ عرصے کے لیے یہ عمارت تار گھر اور اس کے بعد عجائب گھر کے طور پر بھی استعمال ہوتی رہی ، اور آخر کار ۱۸۸۰ء میں اس عمارت کا قرعہ فال پنجاب پبلک لائبریری کے نام پڑا ، جہاں لائبریری قائم ہوئی ، اور بتدریج وسیع ہوتی رہی ۔

پنجاب پبلک لائبریری کا قیام ۱۸۸۴ء میں حکومت پنجاب کی خواہش اور اعانت سے ایک قرارداد کے بموجب عمل میں آیا ۔ قرارداد کا مفہوم یہ تھا " لفٹنٹ گورنر سر چارلس ایچیسن کی خواہش ہے ، کہ لاہور میں ایک پبلک لائبریری عوام کے لیے قائم کی جائے ، جس میں سرکاری تصانیف کے علاوہ ہر قسم کی علمی و ادبی کتابیں فراہم کی جائیں " چنانچہ ایک کمیٹی کا تقرر ہوا ، جس کا کام حکومت کو اس کام کی تکمیل میں اعانت اور اس سے کماحقہٗ عہدہ برآ ہونے میں مدد دینا تھا ، اس کمیٹی میں مسٹر ایس ڈبلیو ، ایڈیٹر سول اینڈ ملٹری گزٹ ۔ اور مسٹر جے ، لاک وڈ کپلنگ ، پرنسپل میو سکول آف آرٹس وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں ۔ موخر الذکر نامور انگریزی ادیب رڈ یارڈ کپلنگ کے والد بزرگوار تھے ۔

اس کمیٹی کی پہلی میٹنگ سول سیکریٹریٹ لاہور میں ۱۲ نومبر ۱۸۸۴ء میں ہوئی ۔ اور اس نے بڑی مستعدی اور تن دہی سے اپنا کام شروع کر دیا ۔ کمیٹی سب سے پہلے حکومت سے بارہ دری حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی ۔ اس وقت یہ خیال تھا کہ جب تک لائبریری کے لیے کوئی موزوں و مناسب عمارت تعمیر نہیں ہوتی ، اس عمارت کو عارضی طور پر استعمال میں لایا جائے ۔ مگر اس وقت کسے معلوم تھا کہ یہی عمارت لائبریری کی مستقل عمارت ہو جائے گی ۔ کمیٹی کے لیے کتابوں کی فراہمی دوسرا اہم کام تھا ۔ کمیٹی کی تجویز پر سرکاری محکموں اور شعبوں نے وہ تمام کتابیں لائبریری کو منتقل کر دیں ، جن کے استعمال کی انھیں فوری ضرورت نہ تھی ۔ خود چارلس ایچیسن نے ۵ ، کتابوں کا گراں قدر عطیہ لائبریری کو پیش کیا ۔ ان کی اس نیک مثال کی تقلید میں بڑے بڑے سرکاری عہدیداروں نے بھی قابلِ قدر تحائف کتاب کی صورت میں پیش کیے ۔ چنانچہ انہی تحائف سے لائبریری کی ابتدا کی گئی ۔ جب ایک سال کے عرصے میں لائبریری کے قیام کے ابتدائی مراحل طے پاگئے تو ۱۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کو لفٹنٹ گورنر سر چارلس ایچیسن نے دربارِ عام منعقد کر کے لائبریری کی رسمِ افتتاح ادا کی ۔

ان ضروری امور سے فارغ ہونے کے بعد کمیٹی نے بہت سے علم دوست اصحاب سے تعاون کی استدعا کی ۔ اور جن حضرات کے پاس ذاتی کتب خانے تھے ، ان سے بھی درخواست کی گئی ۔ کہ وہ اپنے عطیات سے لائبریری کو نوازیں ۔ مسٹر ٹی ، ڈبلیو ، ایچ ، ٹولبورٹ سول سروس کے آدمی تھے ، انھوں نے بڑی عرق ریزی سے کتابوں کا ذخیرہ جمع کر رکھا تھا ، حکومت کی اعانت سے یہ کتب خانہ لائبریری میں منتقل کر دیا گیا ۔ اس ذخیرے سے لائبریری کو کثیر تعداد میں ایسی قابلِ قدر کتابیں ہاتھ لگیں ، جو اور کسی جگہ سے میسر نہ آ سکتی تھیں ۔ اس کے بعد لفٹنٹ گورنر کی وساطت سے ریاست بہاول پور کے سردار عطر سنگھ کا خاندانی کتب خانہ لائبریری میں منتقل کیا گیا ۔ اس کتب خانے میں مشرقی علوم پر اردو اور فارسی میں بیش قیمت کتابیں تھیں ۔ ان کے ساتھ سردار عطر سنگھ نے بھی فارسی کے چند قلمی نسخے لائبریری کو بطور عطیہ پیش کیے ، مگر سب سے گراں قدر عطیہ جس نے نہ صرف لائبریری کی کتابوں میں اضافہ کیا ، بلکہ اس کی شہرت کو دوبالا کر دیا ، فقیر سید جمال الدین کا کتب خانہ تھا ۔ سید صاحب مرحوم لاہور کے فقیر خاندان کے چشم و چراغ تھے ، وہ بڑے علم پرور اور صاحبِ ذوق بزرگ تھے ، انھوں نے بڑی محنت اور صرفِ کثیر

سے کتابوں کا ذخیرہ فراہم کیا تھا۔ مرحوم نے وفات سے پیشتر علم و حکمت کے اس مخزن کو لائبریری کے لیے مرحمت فرمایا، اس کتب خانے میں عربی کی مطبوعہ مگر نایاب کتب کے علاوہ بہت سے قلمی نسخے بھی تھے، جن میں سے چند نسخے پرانے اور قیمتی ہیں۔

۱۸۸۵ء میں لکھنؤ کے مشہور کتب فروش منشی نولکشور نے اپنی طرف سے اُردو فارسی کی ۵۰۰ کتابیں لائبریری کو ہدیۃً دیں۔ ان نیک سیرت اصحاب کی مخلصانہ اور مربیانہ کوششوں سے لائبریری کی بنیاد مستحکم ہوتی چلی گئی۔

اس وقت یہ لائبریری تین وسیع عمارتوں میں پھیلی ہوئی ہے، پرانی عمارت یعنی بارہ دری (یا عشرت کدہ) کے ایک جانب ایک شاندار اور پختہ عمارت ہے جس میں لائبریری کا شعبہ انگریزی واقع ہے، دوسرے پہلو میں ایک اور نئی عمارت ہے جو علوم مشرقی کی کتابوں کا شعبہ (یعنی اورینٹل سیکشن) ہے۔

پنجاب پبلک لائبریری میں کتابوں کی مجموعی تعداد سوا لاکھ سے متجاوز ہے، اس میں ہر سال تقریباً ڈھائی ہزار کتابوں کا اضافہ ہوتا ہے، کتابوں کی خرید پر تقریباً ۲۵ ہزار روپے اور جرائد کی خریداری پر تین ہزار روپے سالانہ خرچ کیے جاتے ہیں۔

کتابوں کا انتخاب مینیجنگ کمیٹی کے سپرد ہے، جو ماہرین کے مشورے سے کتابوں کا ایک جچا تلا انتخاب کرتی ہے تقریباً تمام علوم و فنون کی کتابیں خریدی جاتی ہیں، فلسفہ، مذہب، سیاسیات، معاشیات، ادبیات اور تاریخ پر بعض ایسی بلند پایہ کتابیں موجود ہیں، جو علمی تحقیق کے لیے ناگزیر ہیں۔ پنجاب پبلک لائبریری سے طلبا اور اساتذہ کے علاوہ عوام اور پرائیویٹ ریسرچ سکالر (مصنفین و محققین علوم) بھی استفادہ کرتے ہیں۔ اس لائبریری میں سرکاری مطبوعات اور سرکاری رپورٹوں کا بہترین ذخیرہ ہے۔ بعض سرکاری مطبوعات اور رپورٹیں ایسی ہیں، جو پاکستان بھر میں کسی جگہ موجود نہیں۔ اکثر سرکاری حکام ضرورت کے وقت پنجاب پبلک لائبریری ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ لائبریری میں حکومت پاکستان کے PATENTS AND DESIGNS کا مکمل سیٹ موجود ہے، حکومتِ پاکستان نے پنجاب پبلک لائبریری کو ان دستاویزات کے ملاحظہ کے لیے مرکز مقرر کر رکھا ہے۔ عوام بآسانی لائبریری میں ان کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

کوئی بھی پبلک لائبریری اچھی لائبریری کہلانے کی مستحق نہیں، جب تک اس میں بچوں کے لیے علیحدہ شعبہ نہ ہو۔ ابتدا ہی سے بچوں میں کتب بینی کا شوق پیدا کرنا بہت ضروری ہے، پبلک لائبریری کا فرض ہے، کہ وہ ایسے ذرائع پیدا کرے جس سے بچوں میں لائبریری سے رغبت اور دلبستگی پیدا ہو، پنجاب پبلک لائبریری میں بچوں کے لیے اُردو اور انگریزی کے دو علیحدہ علیحدہ سیکشن ہیں۔ اُردو سیکشن میں بچوں کی خوب چہل پہل دیکھنے میں آتی ہے، کتابوں کے انتخاب کے وقت اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ جہاں ان کے لیے کہانیاں ضروری ہیں، وہاں اسلامی تاریخ اور سائنس کے متعلق بھی ضروری معلومات کی ابتدائی کتابیں فراہم ہوں۔ خواتین کے لیے لائبریری میں مطالعہ کا خاص انتظام ہے اورینٹل اور انگریزی دونوں شعبوں میں علیحدہ کمرے ان کے لیے مخصوص ہیں۔ جو ان کی ضروریات کے مطابق آراستہ ہیں۔

آج کل ایک کشادہ اور ساز و سامان سے آراستہ آڈیٹوریم پبلک لائبریری کا ایک لازمی جزو سمجھا جاتا ہے، اس میں پروجیکٹرز، ٹیپ ریکارڈر، اور ریڈیوگرام کا ایک سیکشن بھی ہونا چاہیئے، تاکہ لائبریری کا آڈیٹوریم کتابی نمائش، پبلک لیکچر اور سیمنار

کا انتظام کر سکے۔ اس قسم کے انتظامات لائبریری کو صحیح معنوں میں علمی روشنی کے پھیلانے کا مرکز بنا دیتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ پنجاب پبلک لائبریری میں آڈیٹوریم کا ابھی کوئی انتظام نہیں۔

قیام پاکستان کے بعد نئی انتظامیہ کمیٹی نے بدلے ہوئے کوائف و حالات کے پیش نظر لائبریری کی ضروریات کا جائزہ لیا۔ سب سے پہلے ان کی توجہ شعبہ اُردو، فارسی، عربی، کی طرف مبذول ہوئی۔ کیونکہ اس شعبے کی حالت فوری نقطۂ نظر سے غیر تسلی بخش تھی۔ اس شعبے کو اچھا اور مفید بنانا اور اس میں خوشگوار تبدیلیاں کرنا آغاز ہی سے ضروری تھا، چونکہ کتابوں کی فہرست کسی خاص سائنٹیفک اسکیم کے تحت تیار نہیں کی گئی تھی، اس لیے تلاش اور جستجو میں بہت دشواری پیش آتی تھی، اور لوگوں کا قیمتی وقت ضائع ہوتا تھا، فیصلہ کیا گیا، کہ عالمگیر اعشاری اسکیم کے مطابق کتابوں کی مضمون وار تقسیم کر کے کارڈ فہرست تیار کی جائے۔ چنانچہ اس کام کو مکمل کر لیا گیا۔

اس شعبے میں افسانے اور ناول پڑھنے والے اصحاب کی کثرت ہے، جہاں ان کی مانگ کا خیال رکھا جاتا ہے، وہاں ایسی کتابیں مہیا کرنے کی بھی کوشش کی جاتی ہے، جو مختلف علمی شعبوں کی تحقیق میں معاون ہو سکیں۔

عربی، فارسی، اور اُردو کے قلمی نسخوں کی تعداد تقریباً ایک ہزار ہے، اگرچہ یہ تعداد زیادہ نہیں، لیکن بعض قلمی کتابیں اپنی کمیابی، نایابی، افادیت اور تاریخی اہمیت کی بنا پر نہایت قابل قدر ہیں، عربی مخطوطات کی تفصیلی فہرست شائع ہو چکی ہے جس میں ہر مخطوطہ کی قدر و قیمت اور مصنفین کے سوانح حیات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ فارسی اور اُردو مخطوطات کی تفصیلی فہرست ابھی تک زیر طبع ہے۔ جو عنقریب شائع ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ لائبریری میں سنسکرت، ہندی اور گورمکھی مطبوعہ کتابوں کے علاوہ قلمی نسخے بھی موجود ہیں، جن میں بعض نہایت نادر الوجود اور قابل قدر ہیں۔

سابقہ حکومت پنجاب نے محکمہ اسلامیات کی چار ہزار کتابیں اس لائبریری میں منتقل کر دیں۔ بیگم محمد علی قصوری نے اپنے مرحوم خاوند کی اڑھائی ہزار کتابوں کی بیش قیمت لائبریری جو کہ اُردو، فارسی، عربی، انگریزی کتابوں پر مشتمل تھی، لائبریری کی نذر کر دی۔ ابھی حال ہی میں پروفیسر سید عبدالقادر مرحوم، سابق پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور کی لائبریری ان کے فرزند سید احسان الحق صاحب کی مساعی جمیلہ سے لائبریری کو ملی ہے، یہ لائبریری بھی اُردو، انگریزی اور قلمی کتب پر مشتمل ہے، ان جملہ عطیات سے لائبریری میں گرانقدر اضافہ ہوا ہے اور اسے بہت تقویت پہنچی ہے۔

پنجاب پبلک لائبریری کا خاص مقصد یہ ہے، کہ عوام میں مطالعہ کا شوق پیدا کیا جائے۔ اس لیے عوام کی ہر ممکن سہولت کا خیال رکھا جاتا ہے، سردیوں میں لائبریری تقریباً تمام دن کھلی رہتی ہے۔ گرمیوں میں بھی دن میں نو گھنٹے کھلتی ہے۔ اتوار کو بھی لائبریری صبح تین گھنٹے کے لیے کھلتی ہے، ہر مہینے کے آخری پیر کو لائبریری میں تعطیل ہوتی ہے۔ لائبریری کے ریڈنگ روم کو عوام بغیر کسی معاوضے کے استعمال کر سکتے ہیں، لیکن گھر میں کتابیں استعمال کرنے کے لیے لائبریری کا باقاعدہ ممبر بننا پڑتا ہے، یہ ممبر دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک لائف ممبر اور دوسرے سالانہ ممبر۔ لائف ممبر کو ۵۰ روپے کی یکمشت رقم ادا کرنی پڑتی ہے۔ سالانہ ممبروں کو آٹھ روپے چندہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ یہ چندہ سہ ماہی قسطوں کی صورت میں بھی ادا ہو سکتا ہے۔ چندہ کے ساتھ دس روپے یا بیس روپے ضمانت کے طور پر دینے پڑتے ہیں۔ دس روپے زر ضمانت پر ایک وقت دو کتابیں اور بیس روپے پر چار کتابیں جاری کر دی جاتی ہیں۔ ممبر ایک ماہ تک کتاب اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔

سال میں پچاس ہزار کتابیں بہ طور اوسط گھر میں پڑھنے کے لیے اشو ہوتی ہیں ۔ تین لاکھ بیس ہزار کتابیں جن میں جرائد اور روزنامہ اخبارات بھی شامل ہیں ، لائبریری میں پڑھی جاتی ہیں ۔ لائبریری میں روزانہ آنے والوں کی اوسط ۷۲۵ ہے ، اگرچہ اس لائبریری کے ممبر وہ حضرات بھی ہیں جو لاہور سے باہر رہتے ہیں ، پھر بھی لاہور جیسے شہر میں جو تعلیم کا مرکز ہے ، یہ اعداد تسلی بخش نہیں ۔

لائبریری کے ارباب بست و کشاد نے نابینا افراد کے لیے انگریزی میں بریل سسٹم کے مطابق تیار کردہ کتب انگلستان سے حاصل کیں ۔ مگر ان کتابوں کے پڑھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے ، ہمیں امید ہے کہ اردو بریل سسٹم جب رائج ہوگا ، تو اس سکشن کو بہت فروغ حاصل ہوگا ۔

لائبریری کا نظم و نسق ایک مینجنگ کمیٹی کے ماتحت ہے ، ڈائرکٹر تعلیم ، لاہور ریجن ۔ ڈپٹی کمشنر لاہور ، اس کمیٹی کے بحیثیت عہدہ دار ممبر ہیں ، چودہ ممبر لسٹو لیٹ پر یذیڈنٹ اور سیکرٹری حکومت نامزد کرتی ہے ۔ سیکرٹری کا انتخاب مینجنگ کمیٹی خود کرتی ہے ، صدر اور سیکرٹری انتظامی افسر ہیں ، لاہور سٹی کارپوریشن اور پنجاب یونیورسٹی بھی اپنا ایک ایک نمائندہ بھیجتی ہے ، لائف ممبر بھی اپنے دو نمائندے انتظامیہ کی مدد کے لیے انتخاب کرتے ہیں ۔ گورنمنٹ جو نمائندے نامزد کرتی ہے وہ ماہرانِ تعلیم اور سرکاری افسر ہوتے ہیں ۔

اورینٹل سیکشن میں ڈیوی ڈیسیمل سسٹم رائج ہے ۔ انگریزی سیکشن میں کتابوں کی کلاسیفکیشن ایک خود ساختہ "سکیم کے تحت ہوتی ہے ۔ کارڈ کیٹیلاگ ڈکشنری کی طرز پر ترتیب دیا جاتا ہے ۔ ۱۹۴۴ء تک کی کتابوں کی مطبوعہ فہرستیں بھی موجود ہیں ۔ ہر ماہ جو کتابیں خریدی جاتی ہیں ، ان کی ایک سائیکلوسٹائیلڈ فہرست بھی عوام کی واقفیت کے لیے تیار ہوتی ہے ، جو کہ لائبریری سے مل سکتی ہے ۔

دوسرے پنج سالہ گورنمنٹ منصوبہ کے تحت ایک ویسٹ پاکستان پراونشل لائبریری لاہور میں قائم ہو رہی ہے خیال ہے ۱۹۶۵ء تک اس کی عمارت مکمل ہو جائے گی ، اور یہ دونوں لائبریریاں یک جا کر دی جائیں گی ۔

۲۔ دیال سنگھ پبلک لائبریری

یہ لائبریری سردار دیال سنگھ مجیٹھیہ کا عطیہ ہے ۔ سردار صاحب موصوف ایک مخیر ، بے لوث اور فیض رساں انسان تھے ۔ انھوں نے اپنی جاگیر خدمتِ خلق کے لیے وقف کر دی ۔ دیال سنگھ ٹرسٹ قائم کیا گیا ۔ اس ٹرسٹ کے خرچ پر ایک اخبار جاری ہوا ، جو عرصہ تک ایک خاص فرقہ کی ترجمانی کرتا رہا ۔ دیال سنگھ کالج قائم کیا گیا ، اور دیال سنگھ پبلک لائبریری کی بنا ڈالی گئی ۔ لائبریری کی ابتدا ۱۹۰۸ء میں ایک ریڈنگ روم سے ہوئی ۔ ۱۹۱۲ء میں یہ ریڈنگ روم ایک اچھی خاصی لائبریری میں تبدیل ہو گیا ۔ ۱۹۲۰ء میں یہ لائبریری بھارت بلڈنگ میں منتقل ہو گئی ، اور ۱۹۲۸ء میں یہ اپنی موجودہ عمارت میں پہنچ گئی ۔ لائبریری کی یہ شاندار بلڈنگ دو لاکھ روپے میں تیار ہوئی تھی ۔ تقسیم سے پہلے اس میں تیس ہزار کتابیں ادبی ، علمی ، معاشرتی ، تاریخی اور مذہبی موضوعات پر تھیں ۔ یہ صوبہ کی اچھی لائبریریوں میں شمار ہوتی تھی ۔

قیامِ پاکستان کے وقت دیال سنگھ ٹرسٹ کے غیر مسلم ٹرسٹیوں کے بھارت چلے جانے کے بعد یہ لائبریری بند ہو گئی ۔ اور تیرہ برس تک بند رہی ۔ اس طرح لائبریری کے بند رہنے سے اسے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ، بہت سی کتابیں ضائع ہو گئیں ۔ جون ۱۹۵۵ء میں نئی ٹرسٹ کمیٹی کی تشکیل ہوئی ، مسٹر جسٹس محمد شریف اس کے چیرمین مقرر ہوئے ، نئے ٹرسٹیوں کی دو سال کی مسلسل کوششوں سے اس کے دروازے علم دوستوں پر دوبارہ کھول دیئے گئے ۔ ۱۵ ر فروری ۱۹۶۱ء کو امریکی قونصل جنرل ڈاکٹر

ایڈیٹر روکوری نے اس کا افتتاح کیا۔ علم دوست طبقے میں کتابوں کی مانگ مسلسل بڑھ رہی ہے، اس لیے دیال سنگھ لائبریری کے دوبارہ اجرا سے لاہور کے موجودہ کتب خانوں میں ایک مسرت بخش اضافہ ہوا ہے۔

جسٹس شریف نے اعلان فرمایا ہے، کہ ٹرسٹ فنڈ میں سے بیس ہزار روپیہ ان بہت سی کتابوں کی خرید کے لیے منظور کیا گیا ہے۔ جو کہ لائبریری کے بند رہنے کے دوران میں غائب یا تلف ہو گئی ہیں۔ ہر چند کہ یہ رقم بہت ہی ناکافی ہے مگر ٹرسٹ فی الحال اپنے محدود ذرائع آمدنی کے پیش نظر یہی کچھ کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ٹرسٹ نے بیس ہزار روپے کتب و جرائد کی خرید کے لیے سالانہ گرانٹ مقرر کی ہے۔

لائبریری کھلنے کے اوقات موسم سرما میں ایک بجے دن سے ۸ بجے شام تک ہیں۔ اور موسم گرما میں ۱۲ بجے دوپہر سے ۸ بجے شام تک ہیں۔ البتہ ریڈنگ روم ہر موسم میں دن کو بارہ گھنٹے کھلا رہتا ہے۔

اگر کوئی لائبریری میں بیٹھ کر مطالعہ کرے تو اس سے کوئی رقم وصول نہیں کی جاتی، البتہ گھر میں مطالعہ کے لیے کتابیں لے جانے کے لیے بیس روپے زر ضمانت اور چھ روپے سالانہ چندہ پیشگی ادا کرنا پڑتا ہے۔ لائف ممبری کی فیس پچاس روپے ہے۔ دو کتابیں چودہ دن کے لیے اشو کی جاتی ہیں۔ البتہ مفصل کے ممبروں کو دس دن زیادہ ملتے ہیں۔

ڈیوئی ڈیسیمل سکیم اور بند الماری کا طریق رائج ہے، کارڈ کیٹیلاگ ڈکشنری کی طرز پر ہے، ایک کیٹیلاگ کتابی صورت میں بھی ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا تھا۔ لائبریری کا انتظام لائبریری کمیٹی کے سپرد ہے جو بورڈ آف ٹرسٹیز کی قائم کردہ ہے۔

۳۔ میونسپل لائبریری، شاہ محمد غوث

یہ لائبریری لاہور شہر کے عین وسط میں بیرون دہلی دروازہ واقع ہے۔ اس لائبریری کی عمارت میں کسی زمانے میں شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد مرحوم کی لائبریری تھی، اور اخبار "آزاد" بھی یہیں سے نکلتا تھا۔ یہ عمارت دو منزلہ تھی جو منہدم ہو چکی ہے۔ یک منزلہ عمارت میں اب میونسپل لائبریری ہے۔ ۱۹۲۶ء میں میونسپل لائبریری کا آغاز ہوا۔ اس لائبریری میں پندرہ ہزار کتابیں ہیں، جو اردو، فارسی، ہندی، گورمکھی اور انگریزی زبانوں پر مشتمل ہیں۔ ۵۹ کے قریب رسائل و جرائد و اخبارات اس لائبریری میں آتے ہیں۔ لاہور کے شہری اور لاہور سٹی کارپوریشن کے ملازمین اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ سالانہ چندہ مبلغ تین روپے اور زر ضمانت مبلغ دس روپے ہیں مگر مستقل میونسپل ملازمین چندہ اور سیکورٹی سے مستثنیٰ ہیں، ممبران لائبریری قواعد کی رو سے دو کتابیں بیک وقت ایک ماہ کے لیے حاصل کر سکتے ہیں، اس لائبریری میں لیجر سسٹم رائج ہے۔ مستعار کتب اشو رجسٹر کے ذریعے جاری ہوتی ہیں۔ لائبریری کا کیٹیلاگ فہرستوں کی صورت میں مضمون وار مرتب ہے۔ کتابیں بند الماریوں میں مضمون وار رکھی گئی ہیں۔ صبح و شام دونوں وقت کھلتی ہے، سپرنٹنڈنٹ آف ایجوکیشن، لاہور سٹی کارپوریشن اس لائبریری کے انتظامیہ افسر ہیں۔ اس لائبریری کے زیر انصرام تقریباً چالیس لائبریریاں اور دارالمطالعے ہیں، جو کہ شہر کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مبلغ بارہ ہزار روپے کتب، جرائد اور اخبارات کی خرید پر خرچ ہوتے ہیں۔

۴۔ ادارہ تعمیر نو (بی۔ این۔ آر) کا دارالمطالعہ

دینا ناتھ مینشن میں ادارہ تعمیر نو کے زیر اہتمام یکم ستمبر ۱۹۶۰ء کو اس دارالمطالعہ کا قیام عمل میں لایا گیا، یہ اپنے دلکش ماحول

اور علمی سہولتوں کی بنا پر طالب علموں اور بچوں میں بہت جلد مقبولیت حاصل کر گیا ہے۔ اس کے قیام کا مقصد بھی طلبا اور عوام میں مطالعہ کے شوق کو فروغ دینا ہے، اسی نقطۂ نظر کے تحت یہاں ہر موضوع پر تقریباً تین ہزار کتابیں رکھی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ معقول تعداد میں رسائل و جرائد (انگریزی میں چالیس اور اردو میں ستائیس) بھی آتے ہیں۔ بچوں کے لیے ایک علیحدہ گوشہ کو مخصوص کر دیا گیا ہے، جہاں ان کی سہولت کے پیش نظر فرنیچر اور الماریاں بھی چھوٹے سائز کی ہیں۔ اب بچوں میں سماجی شعور کی ترویج اور مطالعہ سے دلچسپی میں اضافہ کے لیے "ینگ فوک لیگ" کا قیام بھی عمل میں لایا گیا ہے، جس کی انچارج ایک خاتون ہیں۔ لیگ کے ہفت روزہ اجلاس ہوا کرتے ہیں۔ دارالمطالعہ کے ساتھ ایک خوبصورت سا ہال بھی ملحق ہے، جو ادبی، تہذیبی اور ثقافتی تقریبات کے لیے پچیس روپے ضمانت (واجب الادا) پر لیا جا سکتا ہے۔ اس دارالمطالعہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، اس کے ماتحت لاہور کے مختلف علاقوں میں چالیس دیگر ایسے ہی مراکز کا قیام عمل میں لایا گیا ہے، ان میں سے سات خواتین کے لیے مخصوص کیے گئے ہیں۔

دارالمطالعہ میں کھلی الماری کا طریقہ مروج ہے، کیٹلاگ کارڈوں پر ہے مگر کتابوں کی ترتیب ڈیوئی ڈیسیمل اسکیم کے مطابق نہیں ہے۔

ادارہ تعمیر نو سے مختلف اوقات میں جو پمفلٹ شائع کیے جاتے ہیں، ان کی تقسیم بھی اسی دارالمطالعہ کے ذریعے عمل میں لائی جاتی ہے۔

ڈپٹی ڈائرکٹر ادارہ تعمیر نو اس کے افسر اعلیٰ ہیں، مگر ذیلی امور افسر تعلقات عامہ کے ذریعے طے پاتے ہیں۔

۵۔ لاہور پبلک لائبریری، علامہ اقبال روڈ | لاہور پبلک لائبریری اور ریڈنگ روم کا قیام ۱۹۵۳ء میں لاہور پبلک ایسوسی ایشن کے تحت عمل میں آیا تھا۔ ۱۹۵۵ء میں لاہور پبلک ایسوسی ایشن کا نام آل پاکستان سوشل سروس میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس آرگنائزیشن کے پچیس ارکان ہیں۔ جو اپنے ماتحت اداروں کو کنٹرول کرتے ہیں۔ یہی اصحاب لائبریری کی مجلس منتظمہ کے ارکان ہیں۔

اس لائبریری میں کتابوں کی تعداد چھ ہزار ہے، پچیس عدد رسائل اور چار عدد اخبارات باقاعدہ آتے ہیں، موضوعات کتب تاریخی، ادبی، اصلاحی، سماجی، رومانی، نفسیاتی اور معلوماتی ہیں۔

سٹی کارپوریشن آف لاہور چھ سو روپے سالانہ گرانٹ دیتی ہے۔ کچھ چندہ ممبروں سے جمع ہوتا ہے، عہدیدار دو روپے، عام ممبر ایک روپیہ، طالب علم پچاس پیسے ماہانہ چندہ دیتے ہیں، اور غریب طالب علموں سے کچھ نہیں لیا جاتا۔

لائبریری میں انگریزی اور اردو کتابیں ہیں۔ کیٹلاگ کتابی صورت میں موجود ہے۔ اوسطاً ڈیڑھ سو اشخاص روزانہ اس لائبریری سے استفادہ کرتے ہیں۔ لائبریری کھلنے کا وقت روزانہ ۴ بجے شام سے ۹ بجے شب تک ہے۔

۲۔ کلب لائبریری

۱۔ جم خانہ کلب لائبریری | جم خانہ کلب لائبریری کلب کے وسیع ہال کے مغربی گوشہ میں دوسری منزل پر واقع ہے،

یہاں کم و بیش پچیس ہزار کتابیں موجود ہیں۔ پندرہ کے قریب رسائل و جرائد منگوائے جاتے ہیں۔

یہ لائبریری صرف کلب کے اراکین کے لیے مخصوص ہے، ہر رکن کلب کی رکنیت اختیار کرتے وقت لائبریری کا بھی لازماً ممبر بنتا ہے۔ اور اس کو لائبریری کے لیے بارہ روپے سالانہ چندہ ادا کرنا پڑتا ہے، ہر ممبر کو بیک وقت چھ کتابیں مل سکتی ہیں۔ ممبروں کی ایک اور قسم بھی ہے، جسے "فیملی ممبر" کہتے ہیں۔ اس صورت میں تمام کنبے کے لیے ایک ہی کارڈ ملتا ہے جس پر آٹھ کتابیں اشو ہوتی ہیں۔

یہاں کھلی الماری کا طریقہ مروّج ہے، کیونکہ لائبریری سے کتابیں گم ہونے کے امکانات بہت کم ہیں۔ لائبریری کی قدامت کے پیش نظر یہاں بہت پرانی کتابیں بھی مل جاتی ہیں، افسانوی ادب، تاریخ اور سوانح کا حصہ بہت ممتاز حیثیت رکھتا ہے، پہلی اور دوسری جنگِ عظیم پر بھی کتابوں کی کئی الماریاں بھری پڑی ہیں۔

پہلے صرف انگریزی کتابیں ہی رکھی جاتی تھیں، مگر اب اردو کتابیں بھی منگوائی جاتی ہیں۔ مگر ان کی تعداد اتنی زیادہ نہیں ہے، بچوں کے لیے ایک علیحدہ شعبہ قائم کیا گیا ہے، جہاں ان کے ذوق کے مطابق کتابوں کا بندوبست ہے۔

اس کتب خانے میں کلاسیفکیشن کا کوئی سائنٹیفک طریقہ مروّج نہیں ہے۔ کتابوں کو مضمون وار مصنّفوں کے نام کے لحاظ سے رکھ دیا جاتا ہے، کارڈ کیٹلاگ کی جگہ رجسٹر رکھ دیا گیا ہے، جس میں تمام کتابوں کا اندراج مصنّف وار ہوتا ہے۔

۳۔ اداری کتب خانے

۱۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری

پنجاب یونیورسٹی لائبریری اگرچہ ۱۸۸۲ء میں قائم کی گئی تھی۔ مگر صحیح معنوں میں اس کی تنظیم ۱۹۱۲ء میں (جب اس کو نئی عمارت میسر آ گئی) عمل میں آئی۔ اس کی عمارت کا سنگِ بنیاد پنجاب یونیورسٹی کے اس زمانے کے چانسلر لفٹننٹ گورنر سر لوئی ڈین نے ۲ر فروری ۱۹۱۱ء کو رکھا تھا۔ ماہ اپریل ۱۹۱۲ء کو پہلے حصّے کا افتتاح بھی چانسلر موصوف ہی نے کیا۔ لائبریری کی عمارت کی تکمیل فروری ۱۹۱۷ء میں ہوئی، جس پر ایک لاکھ ساٹھ ہزار روپے صرف ہوئے۔

یونیورسٹی لائبریری کے سنگِ بنیاد رکھے جانے کے ایک ماہ بعد لائبریری کو ایک غیر متوقع ذریعے سے ایک بہت ہی بیش قیمت ذخیرہ مل گیا۔ مسٹر ایم۔ ایل۔ پرسیول، ایم اے، آئی، ای، ایس، پریذیڈنسی کالج کلکتہ میں انگریزی ادب کے پروفیسر تھے۔ مارچ ۱۹۱۱ء میں جب وہ ریٹائر ہوئے، تو انھوں نے اپنی چھ ہزار پانچ سو (۶۵۰۰) کتابوں کا ذخیرہ جو انھوں نے چھتیس ہزار روپے کے صرفِ کثیر سے اکٹھا کیا تھا، لائبریری کی نذر کر دیا، یہ ذخیرہ تب سے ایک علیحدہ سیکشن کی صورت میں لائبریری میں قائم ہے۔ اس مجموعہ میں فلسفہ، ادب اور شاعری پر بیش بہا اور قابلِ قدر تصانیف ہیں۔

دوسرا بیش قیمت ذخیرہ بھی میسر آ گیا۔ ۱۹۱۲ء میں آغا محمد ابراہیم نے اپنے جلیل القدر باپ شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد کی ۵۵۷ کتابوں اور ۳۸۹ مخطوطات کا مجموعہ ہدیۃً لائبریری کو منتقل کر دیا، یہ ذخیرہ زیادہ تر عربی ادب پر مشتمل تھا۔ سر ایڈورڈ میکلیگن جو ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۴ء تک یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے انھوں نے بھی ۳۸۹ بہت ہی بیش قیمت جرائد

لائبریری کو پیش کیے، کتابیں جو بتدریج جمع ہوتی گئیں، ان کی تنظیم و ترتیب ۱۹۱۶ء میں مسٹر اے سی ڈکنسن نے کی جو لائبریری سائنس میں ایک امریکی ماہر تھے، یہ ترتیب ڈیوی ڈیسیمل کلاسیفکیشن اسکیم کے مطابق کی گئی۔ انھوں نے لائبریری ٹریننگ کورس کا بھی اجرا کیا۔

مارچ ۱۹۲۹ء میں پیرزادہ محمد حسین نے ۸۰۹ کتابیں اور ۱۶۵ قلمی مسودات اور مئی ۱۹۳۴ء میں پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے ۵۹۷ کتب، اور ۱۲ قلمی کتابیں لائبریری کے سپرد کر دیں۔ اپریل ۱۹۴۴ء میں سر شہاب الدین کی ۴ ہزار کتب لائبریری کو ملیں، قیام پاکستان کے بعد یونیورسٹی لائبریری میں اور بھی اضافہ ہوا، کیونکہ بہت اچھے اچھے ذاتی کتب خانے مثلاً سر منوہر لال کے کتب خانے کی ۲۱۵۴ کتب اور پروفیسر برج نرائن کی ۲۳۸۰ کتب، یونیورسٹی لائبریری میں منتقل کر دی گئیں۔ اسی طرح سر گنگا رام کی ۵ ہزار کتب، مولوی محبوب عالم کی ۶۵۰۰ کتب، حکیم عبدالمجید عتیقی کی ۸۰۰ کتب، پروفیسر اقبال کی فلسفہ الٰہیات اور مذہب پر ۱۷۱۳ کتب، میاں احمد شفیع کی ۱۱۱۳ کتب، پروفیسر ایم، جی سنگھ کی ۲ ہزار کتب کے مجموعے اس لائبریری کو حاصل ہوئے، اور حافظ محمود شیرانی کی سترہ سو قلمی کتب کا نہایت ہی قابل قدر ذخیرہ بھی اس لائبریری میں منتقل ہو گیا، غرضیکہ یہ لائبریری جو پروفیسر سیوول اور سر شہاب الدین کے قیمتی عطیات سے پہلے ہی مالا مال تھی، اور بھی زیادہ دامن دراز ہوتی گئی۔

پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے انگلش سیکشن میں جملہ علوم و فنون کی کتابیں شامل ہیں، مثلاً سائنس، فنونِ لطیفہ، ادب، فلسفہ، مذہب، لسانیات، تاریخ، معاشیات، سیاسیات وغیرہ تمام علوم کی وہ کتابیں موجود ہیں، جو انگریزی زبان میں لکھی گئی ہیں۔ بعض فنی کتابیں مثلاً طب، قانون، اور انجنیئرنگ کی کتابوں کے ذخیرے اپنے متعلقہ کالجوں میں جمع ہیں۔ یونیورسٹی لائبریری میں کتابوں کی مجموعی تعداد ایک لاکھ نوّے ہزار ہے، انگلش سیکشن میں کم و بیش ایک لاکھ پندرہ ہزار کتابیں موجود ہیں، عربی، اُردو، فارسی کی مطبوعہ کتابوں کی تعداد پچیس ہزار ہے، کوئی سولہ ہزار کتابیں سنسکرت، ہندی اور پنجابی میں ہیں۔ مقتدر علمی رسائل کی تعداد ان کے علاوہ ہے، اس وقت ۴۳۲ رسالے پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں آتے ہیں۔ ان میں اُردو، فارسی، عربی، انگریزی، جرمن، فرنچ، سب زبانوں کے رسائل شامل ہیں۔

کتابوں کی خرید پر سالانہ تیس ہزار روپے کی رقم خرچ کی جاتی ہے۔

یونیورسٹی لائبریری کے انگلش سیکشن میں یوں تو جملہ علوم و فنون کے ہر شعبہ کی کتابیں مطالعہ کرنے والوں کا مرکز توجہ ہیں، لیکن سائنس، ادب انگریزی اور تاریخ و معاشیات اور سوانح حیات کے شعبے خصوصیت کے ساتھ اپنی افادی حیثیت میں ممتاز ہیں۔

یونیورسٹی کے مختلف تدریسی شعبوں کی سیمینار لائبریریاں موجود ہیں، یہ شعبے اپنی طرف سے بھی کتابیں ان سیمینار لائبریریوں کے لیے خریدتے ہیں۔

پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں عربی، فارسی، اُردو اور سنسکرت کے بیش بہا قلمی ذخائر موجود ہیں۔ عربی، فارسی اُردو کی کم و بیش ۹ ہزار قلمی کتابیں جمع ہیں۔ مخطوطات کا یہ نادر مجموعہ کئی سال کی مسلسل کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس کے

جمع کرنے والوں میں ڈاکٹر محمد شفیع سابق پرنسپل اورینٹل کالج لاہور کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس مجموعے میں بہت سی پرانی اور کمیاب کتابیں موجود ہیں۔ ایک پرانی کتاب "المدونہ" کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا، یہ کتاب مالکی فقہ کے متعلق ہے، اور ہرن کی کھال پر کوفی خط میں مرقوم ہے، اور ۲۱۳ھ کی کتابت شدہ ہے، یہ اس شعبے کی سب سے پرانی کتاب ہے اور اپنی گوناگوں خصوصیات کے سبب اس لائبریری کی بڑی قیمتی ملکیت ہے۔

پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا سنسکرت مخطوطات کا ذخیرہ بھی خاصا اہم ہے جس کی جمع آوری میں ڈاکٹر وولنر اور ڈاکٹر لکھشمی سروپ نے بڑا حصہ لیا۔ ڈاکٹر وولنر اس یونیورسٹی میں سنسکرت کے پروفیسر تھے، بعد میں وائس چانسلر بھی ہو گئے تھے، اس ذخیرے میں قلمی کتابوں کی تعداد کم و بیش ۸ ہزار ہے۔ ان میں بعض کتابیں درختوں کی چھال پر مرقوم ہیں۔

یہ لائبریری اعلیٰ مطالعہ و تحقیق کے تقاضوں اور ضرورتوں کو پورا کرتی ہے، اس میں ریسرچ کے لیے بہتر سے بہتر مواد اور طلبا و محققین کے لیے زیادہ سے زیادہ سہولتیں موجود ہیں۔ ہر لحاظ سے یہ لائبریری ایک علمی لائبریری کہلانے کی مستحق ہے۔

پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا لائبریری ٹریننگ اسکول بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے، یہ درسگاہ ۱۹۱۵ء میں قائم ہوئی، اور کافی عرصے تک فنی تعلیم اسی واحد درسگاہ سے ملتی رہی، بعد میں متحدہ ہندوستان میں پیشہ ورانہ تربیت کے اور مراکز بھی کھل گئے تقسیم کے بعد سے بھی یہ اسکول بدستور باقاعدگی سے چل رہا ہے، پاکستان میں اس اسکول کے تربیت یافتہ تقریباً سب لائبریریوں میں کام کر رہے ہیں۔

یونیورسٹی لائبریری کا انتظام یونیورسٹی کی مجلسِ حاکمہ یعنی سینیٹ اور سنڈیکیٹ کے ہاتھ میں ہے، اس کی عملی تنظیم ایک کمیٹی کے سپرد ہے، جو یونیورسٹی کے تدریسی شعبوں کے صدر صاحبان اور کالجوں کے مختلف پرنسپلوں پر مشتمل ہوتی ہے، اس سے فائدہ اٹھانے والے پبلک لائبریری کی طرح عام لوگ نہیں۔ بلکہ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اساتذہ، پوسٹ گریجوایٹ طلبا، اور تحقیق و مطالعہ کرنے والے وہ لوگ ہیں جن کو کمیٹی نے استفادہ کا مستحق سمجھ کر اجازت دے دی ہو۔ اسی سبب سے لائبریری کی رکنیت کا دائرہ نسبتاً محدود رہتا ہے تصنیفی یا تحقیقی مقاصد کے لیے پُرسکون ماحول کی سخت ضرورت ہے جو اس وقت میسر نہیں، لہٰذا امید واثق ہے کہ مستقبل قریب میں جو یونیورسٹی ٹاؤن آباد ہوگا، اس میں لائبریری کے لیے اس کے شایانِ شان ایک خوب صورت اور وسیع عمارت تعمیر کی جائے گی۔

سال میں ۷۵ ہزار کتابیں گھر میں پڑھنے کے لیے ایشو ہوتی ہیں۔ روزانہ لائبریری میں آنے والوں کی اوسط دو سو بیس ہے۔ کھلی الماری کا طریق رائج ہے، کتابیں ڈیوئی ڈیسیمل کلاسیفکیشن اسکیم کے مطابق مضمون وار رکھی ہیں۔ ڈکشنری کیٹلاگ کارڈوں پر تیار کیا گیا ہے۔

۲۔ بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن لائبریری

بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن ۱۹۵۴ء میں قائم ہوا۔ اور اس کی لائبریری ۱۹۵۸ء میں قائم کی گئی۔ اس لائبریری کا انتظام ایک لائبریری کمیٹی کے سپرد ہے۔ جو بڑی محنت اور توجہ سے لائبریری میں کتابوں کا اضافہ کر رہی ہے۔ نظم و نسق لائبریری کے بارے

کا آخری فیصلہ لائبریری کمیٹی کی سفارش پر بورڈ کی مجلس کے اختیار میں ہے۔

لائبریری میں اس وقت چھ ہزار کتابیں ہیں۔ تعلیم کے موضوع پر اچھا معیاری ذخیرہ ہے۔ بالعموم ثانوی تعلیم کے متعلق کتابیں خریدی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ کتابیں عام موضوعات پر ہیں۔ ریفرنس کی کتابیں خصوصیت کے ساتھ مہیا کی جا رہی ہیں۔ چودہ ہزار روپے ہر سال کتب و رسائل کی خرید پر خرچ ہوتے ہیں۔ اس وقت پچیس جرائد لائبریری میں باقاعدگی سے آتے ہیں۔ فی الحال اساتذہ، ریسرچ سکالر، جو کہ لاہور سٹی کارپوریشن کی حدود میں رہتے ہیں۔ ملازمین محکمہ تعلیم، دفتر انسپکٹر آف سکولز لاہور ڈویژن کے ملازمین، بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کے ممبر اور بورڈ کے دیگر ملازمین اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ ہنوز طلباء کی اس لائبریری تک رسائی نہیں۔ شاید یہ اس وقت ممکن ہو سکے گا جب کہ سیکنڈری بورڈ کے شایانِ شان لائبریری کی بلڈنگ تعمیر ہو۔

کتابیں بند الماریوں میں ہیں۔ ڈیوئی ڈیسیمل کلاسیفیکیشن اور ڈکشنری کارڈ کیٹیلاگ کارڈوں پر تیار کیا گیا ہے۔

۴۔ کالجوں کے کتب خانے

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے شہر لاہور علوم و فنون کا ایک بڑا مرکز ہے۔ اور اس میں متعدد کالج ہیں، اور ان میں سے ہر ایک کی جداگانہ لائبریریاں ہیں، جن کالجوں کا الحاق پنجاب یونیورسٹی سے ہے۔ ان کے کتب خانوں کی کیفیت مختصراً درج ذیل ہے۔

(ا) آرٹس کالج

۱۔ گورنمنٹ کالج لائبریری

اس لائبریری کا نام فضل حسین میموریل لائبریری بھی ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور پاکستان کے بہترین کالجوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ متحدہ ہندوستان میں بھی اس کی بہت شہرت تھی۔ اس کی بنیاد ۱۸۶۴ء میں رکھی گئی۔ جب کہ ڈاکٹر لائٹنر اس کے پرنسپل تھے، ایک طویل مدت تک لائبریری کلاسز کے چند کمروں کی زینت رہی۔ ۱۹۳۶ء میں سر فضل حسین نے وفات پائی۔ وہ سابقہ پنجاب کے سر برآوردہ اصحاب میں سے تھے، ۱۹۲۱ء سے وفات تک صوبائی وزیر نیز مرکزی حکومت کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن رہے۔ اس وقت کی برٹش گورنمنٹ میں بھی ان کو بڑا دخل تھا۔ مسلمانوں کی بھی انھوں نے بڑی خدمت انجام دی تھی۔ وفات کے وقت صوبہ کی (UNIONIST PARTY) یونینسٹ پارٹی (جو ہندو، مسلمان اور سکھ کی مخلوط پارٹی تھی) کے لیڈر تھے، میاں صاحب مرحوم گورنمنٹ کالج کے اولڈ طالب علم بھی تھے، ان کی وفات پر ایک یادگار قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ ڈاکٹر ایچ۔ بی۔ ڈنی کلف پرنسپل گورنمنٹ کالج نے یہ تجویز پیش کی کہ کالج کی موجودہ لائبریری کو وسیع کر کے اس کا نام فضل حسین میموریل لائبریری رکھا جائے۔ اور اس کے لیے مستقل عمارت بنائی جائے۔ چنانچہ اس خیال کو بہت سراہا گیا، ۴۷۸۵۰ روپے چندہ آنِ واحد میں جمع ہو گیا۔ راجے، مہاراجوں، نوابوں اور ملک کے سربرآوردہ لوگوں نے دل کھول کر چندہ دیا۔ پنجاب گورنمنٹ نے بھی اپنی طرف سے کوئی کمی نہ کی۔ چنانچہ بلڈنگ اور فرنیچر پر ایک لاکھ ۲۹ ہزار روپے خرچ ہوئے۔ یہ بلڈنگ بالکل تیار ہو گئی تو گورنر سر ہنری کریک نے ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو اس کا افتتاح کیا۔ یہ یادگار عمارت کالج کی عمارت سے ملحق ہے۔ اور بالکل کالج ہی کے نمونہ کی بنی ہوئی ہے۔ کالج کی بلڈنگ اور لائبریری میں امتیاز

کرنا مشکل ہے، اوپر کی منزل میں لائبریری ہے جس کے گرد ایک گیلری ہے، ایک کشادہ آراستہ ہال بھی ہے جس میں کہ ایک سو طالب علم بیک وقت بیٹھ کر مطالعہ کر سکتے ہیں۔ ہال کا ماحول مطالعہ کے لیے بہت سازگار ہے۔

اس لائبریری کے ماتحت ہم سکشنل (شعبہ جاتی) لائبریریاں بھی ہیں جو حسب ذیل چار شعبوں کے متعلق ہیں :-

(۱) ڈیپارٹمنٹ آف فلاسفی اینڈ سائیکولوجی۔

(۲) فزکس ڈیپارٹمنٹ

(۳) کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ

(۴) بائیلوجی اور باٹنی ڈیپارٹمنٹ۔

گورنمنٹ کالج لائبریری میں پچاس ہزار کتابیں ہیں۔ جو آرٹ اور سائنس کے مضامین پر ہیں۔ سو کے قریب رسائل و جرائد آتے ہیں۔ لائبریری کا نظم و نسق پرنسپل کے ہاتھ میں ہے۔ اساتذہ اور طلبا اس لائبریری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بند الماری کا طریق رائج ہے۔ ڈیوئی ڈیسیمل کلاسیفکیشن، کیٹلاگ ڈکشنری کی طرز پر کارڈوں پر تیار کیا گیا ہے۔

۲- فورمین کرسچین کالج لائبریری

ہر چند کہ یہ لائبریری اس نام سے مشہور ہے، لیکن اس کا اصل نام یوئنگ میموریل لائبریری ہے، کالج کی ابتدا ۱۸۶۴ء میں ہوئی۔ لائبریری بھی تب ہی سے قائم ہے۔ یہ لائبریری ۱۹۴۱ء میں اپنی موجودہ شاندار اور جدید سائنٹیفک اصول کے مطابق بنی ہوئی عمارت میں منتقل ہوئی۔

لائبریری میں ۵۳ ہزار کتابیں ہیں، اکاون ہزار انگریزی زبان میں، ایک ہزار اردو، فارسی، عربی میں اور ایک مختصر سا مجموعہ جرمن، فرانسیسی، اطالوی، ہسپانوی، لاطینی، یونانی اور ہندی زبانوں میں ہے، ان کے علاوہ پچاس مخطوطات اور ۳۴۵ نادر کتابیں ہیں۔ پانچ روزانہ اخبارات اور ۲۶ جرائد، ہفتہ وار، ماہانہ اور سہ ماہی باقاعدگی سے آتے ہیں۔

لائبریری میں اناجیل کے کثیر التعداد نسخے ہیں، عمومی موضوعات کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ ہے، پوسٹ گریجوایٹ طلبا کے لیے ایک ضمنی کتب خانہ یوئنگ ہال، نیلا گنبد میں بھی موجود ہے، بند الماری اور کھلی الماری دونوں کا انتظام ہے، جس سے اساتذہ اور طلبا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مبلغ چار ہزار روپے ہر سال کتب و جرائد کی خرید پر صرف ہوتے ہیں کتابیں اور رسالے ہدیۃً بھی موصول ہوتے ہیں۔ کالج کے پرنسپل اس کے سربراہ ہیں، ڈیوئی ڈیسیمل کلاسیفکیشن، کیٹلاگ ڈکشنری کی طرز پر کارڈوں پر تیار کیا گیا ہے، حال ہی میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ رنگین روشنی (FLORESCENT TUBES) کا انتظام کیا جائے اور لائبریری دن کے علاوہ شام کو بھی کھلی رہے۔

۳- اسلامیہ کالج لائبریری، سول لائنز

انجمن حمایت اسلام نے ۱۸۹۲ء میں اسلامیہ کالج قائم کیا اور تب ہی سے لائبریری کی بنیاد رکھی، ۱۹۵۸ء میں اسلامیہ کالج دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ریلوے روڈ پر ہائی سیکنڈری کلاس کی تعلیم کا انتظام ہے۔ بی اے اور ایم اے کی تعلیم سول لائنز میں دی جاتی ہے۔

اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں اب ۱۴ ہزار کتابوں کا ذخیرہ ہے جن میں ہر سال اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

متحدہ کالج میں ۳۵ ہزار کے قریب کتابیں تھیں اور رسائل و جرائد کی تعداد جو ہر سال منگوائے جاتے تھے ستر تھی۔
بٹوارہ کے بعد اب اس کالج میں ۲۱ ہزار کتابیں ہیں اور پچاس رسائل منگوائے جاتے ہیں۔ جن میں غیر ملکی رسالے بھی شامل ہیں۔
اردو، فارسی اور عربی کی بلند پایہ کتابوں کے ساتھ ساتھ تاریخ، انگریزی ادبیات فلسفہ اور نفسیات پر کتابوں کا بیش بہا ذخیرہ موجود ہے۔ بعض ایسی نادر کتابیں بھی موجود ہیں، جو اب دستیاب نہیں ہو سکتیں۔ چنانچہ ۱۹۰۰ء سے پہلے کی کتابیں عام حالات میں اشو نہیں کی جاتیں۔ اس لائبریری کی سالانہ گرانٹ دس ہزار روپیہ ہے۔ ۸ ہزار کتابوں کی خرید کے لیے اور دو ہزار جرائد کے لیے۔ لیکن اس مرتبہ ۵۰ ہزار روپے کی رقم خطیر گمشدہ کتابوں کی کمی کو پورا کرنے کے لیے منظور کی گئی ہے۔ اس رقم سے تمام جماعتوں کی درسی کتابیں بھی خریدی جائیں گی، اساتذہ اور طلبا اس لائبریری سے استفادہ کرتے ہیں، بند الماری کا طریقہ رائج ہے، ڈیوی ڈیسیمل کلاسیفکیشن کیٹلاگ ڈکشنری کی طرز پر کارڈوں پر تیار کیا گیا ہے۔

۴۔ ایم اے او، کالج لائبریری

ایم اے او کالج ۱۹۳۳ء میں امرتسر میں قائم ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم کے بعد دوبارہ اس کا قیام لاہور میں عمل میں آیا۔ اس لائبریری میں کم و بیش پندرہ ہزار کتابیں ہیں۔ جو عام موضوعات پر ہیں۔ انگریزی ادب اور اقتصادیات کے شعبے کافی اچھے ہیں، مبلغ ۴ ہزار روپے سالانہ کتب و جرائد کی خرید پر ہر سال صرف ہوتے ہیں۔ لائبریری سے طلبا، اساتذہ اور انجمن اسلامیہ کے ممبر استفادہ کرتے ہیں۔ لائبریری کا انتظام ایک مینجنگ کمیٹی کے ماتحت ہے، جس کے ارکان پرنسپل، فیکلٹیوں کے ممبر اور چند کالج کونسل کے ممبر ہیں۔
بند الماری کا طریق رائج ہے، ڈیوی ڈیسیمل اسکیم کے مطابق کتابوں کی ترتیب ہوتی ہے۔ ڈکشنری کیٹلاگ کتابوں کی صورت میں ہے۔

۵۔ دیال سنگھ کالج لائبریری

مشہور مخیر اور علم دوست سردار دیال سنگھ کے نام پر ۱۹۱۰ء میں اس کالج کی بنیاد رکھی گئی، اس کالج کے اخراجات کا کفیل بھی دیال سنگھ ٹرسٹ ہی ہے۔ لائبریری بھی کالج کے ساتھ ہی قائم کی گئی تھی۔
اس وقت اس میں کم و بیش ۳۴ ہزار کتابیں ہیں۔ اور ۴۰ کے قریب رسائل و جرائد خریدے جاتے ہیں۔ یہ لائبریری نہ صرف طلبا کی ضروریات کو پورا کرتی ہے، بلکہ اس میں بعض ایسی کتابیں بھی موجود ہیں، جو کسی بھی ریسرچ سکالر کے کام آسکتی ہیں۔ اسی طرح ریفرنس کے لیے بھی سب طرح کی سہولتیں موجود ہیں۔ انگریزی اور تاریخ کے شعبے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔
لائبریری کا انتظام ایک لائبریری کمیٹی کے ذمے ہے۔ اسے بہتر بنانے کے لیے مزید کوشش جاری ہے۔ گزشتہ سال تقریباً ۲ ہزار روپے کے صرف سے کتابوں میں اضافے کیے گئے۔ بند الماری، ڈیوی ڈیسیمل سسٹم، اور کارڈ کیٹلاگ رائج ہیں۔ کالج کے اوقات ہی لائبریری کے اوقات ہیں۔

۶۔ ایچیسن کالج لائبریری

ایچیسن کالج ۱۸۸۶ء میں قائم ہوا تھا۔ تعلیم ایف اے اور ہائر سینیئر کیمبرج تک دی جاتی ہے۔ لائبریری بھی کالج کے ساتھ ہی قائم ہوئی، مگر بڑے مختصر پیمانے پر۔ ۱۹۵۳ء میں یہ لائبریری نئے (WING) بازو میں منتقل ہوئی، لیکن صحیح معنوں میں اس کی تنظیم جون ۱۹۵۹ء سے شروع ہوئی۔ کتابوں کی تعداد ساڑھے گیارہ ہزار

ہے۔ جس میں انگریزی کتابوں کی تعداد آٹھ ہزار ہے۔ بقیہ اردو، فارسی، عربی کی کتابیں ہیں۔ ادب اور تاریخ اسلام پر بھی ایک اچھا خاصا ذخیرہ ہے۔ لائبریری کا بجٹ دس ہزار روپیہ ہے۔ اس میں خرید کتب کے علاوہ سٹیشنری، فرنیچر، اور جلد سازی کے اخراجات بھی شامل ہیں۔ کتابیں خریدنے میں طلباء کے تعلیمی معیار کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ لائبریری کے انتظام کے لیے ایک کمیٹی ہے جس کے صدر کالج کے پرنسپل اور سیکرٹری لائبریرین ہیں۔ دارالمطالعہ لائبریری سے بالکل الگ ہے جہاں تیس رسالے اور مقامی اخبارات آتے ہیں۔

کھلی الماری کا طریق رائج ہے۔ کتابوں کی ترتیب ڈیوی ڈیسیمل اسکیم کے مطابق ہے۔ کیٹلاگ ڈکشنری طرز پہ کارڈوں پر تیار کیا گیا ہے۔

۷ ۔ لاہور کالج فار وومن لائبریری

۱۹۲۲ء میں یہ کالج معرض وجود میں آیا۔ اس میں بارہ ہزار آٹھ سو مطبوعہ کتابیں ہیں۔ ایک درجن کے قریب رسائل آتے ہیں۔ کتابیں عام موضوعات پر ہیں۔ دو ہزار روپے ہر سال کتابوں کی خرید پر صرف ہوتے ہیں۔ استانیاں اور طالبات اس لائبریری سے استفادہ کرتی ہیں۔ ڈیوی ڈیسیمل سسٹم رائج ہے۔ کیٹلاگ ڈکشنری طرز پہ کارڈوں پر تیار کیا گیا ہے۔ اس لائبریری کی زمام انتظام کالج کی لیڈی پرنسپل کے ہاتھ میں ہے۔

۸ ۔ اسلامیہ کالج فار وومن لائبریری

یہ کالج ۱۹۳۹ء میں قائم ہوا۔ اس میں عام موضوعات پر تقریباً ساڑھے چھ ہزار کتابیں ہیں۔ چھتیس کے قریب رسائل آتے ہیں۔ ۴ ہزار روپے کتابوں اور ۱۵۰ روپے رسائل کی خرید پر صرف ہوتے ہیں۔ طالبات اور اساتذات اس کو استعمال کرتی ہیں۔ کھلی الماری اور ڈیوی ڈیسیمل سسٹم رائج ہیں۔ کلاسیفائیڈ کیٹلاگ کارڈوں پر تیار کیا گیا ہے۔ لیڈی پرنسپل لائبریری کی انتظامی افسر ہیں۔

۹ ۔ کینیرڈ کالج لائبریری

کینیرڈ کالج ۱۹۱۳ء میں قائم ہوا تھا۔ اور لائبریری بھی اس کے معاً بعد ہی معرض وجود میں آگئی تھی۔ اس سے صرف کالج کی اساتذات اور طالبات استفادہ کر سکتی ہیں۔ ادب کے علاوہ بیشتر کتابیں ان مضامین سے متعلق ہیں۔ جو کالج میں پڑھائے جاتے ہیں۔ مثلاً فلسفہ، سیاست، معاشیات، ریاضی جغرافیہ اور تاریخ وغیرہ۔

کتابیں ڈیوی کے اعشاری نظام کے تحت ترتیب دی گئی ہیں۔ یہ نظام تقریباً نو، دس سال قبل رائج کیا گیا تھا۔ بند الماری سسٹم رائج ہے۔

لائبریری کی ترقی و توسیع آہستہ آہستہ ہوتی رہی۔ سات سال قبل لائبریرین کی مدد کے لیے ایک کل وقتی اسسٹنٹ مقرر کیا گیا۔

گزشتہ سالوں میں ایشیا فاؤنڈیشن، برٹش کونسل، اور کولمبو پلان کی کتابوں کے عطیات سے لائبریری کو بہت فائدہ پہنچا ہے۔ کولمبو پلان کے تحت ۱۹۵۹ء کے آغاز میں سائنس کی کتابوں کا ایک بہت بڑا عطیہ موصول ہوا تھا۔ اس زمانے میں کالج کو سائنس کی کتابوں کی اشد ضرورت تھی۔ کالج میں بی۔ ایس۔ سی کلاسز ۱۹۵۷ء میں شروع ہوئی تھیں اور یونیورسٹی نے اس بات پر زور دیا تھا کہ کتابوں کی تعداد بڑھائی جائے۔ چنانچہ سہولت کے لیے سائنس لائبریری کو مرکزی لائبریری سے الگ کر کے سائنس بلڈنگ میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ اس وقت کالج کے شعبہ سائنس میں کتابوں کا کافی ذخیرہ ہے جس میں امریکہ اور برطانیہ کی تازہ ترین مطبوعات بھی موجود ہیں۔ سائنس کی اساتذات خود ہی اس شعبہ میں کتابیں جاری کرتی اور کتابوں کی نگرانی کرتی ہیں۔ اس کے متعلقہ انتظامی امور لائبریرین

کی ذمہ داریوں میں شامل ہیں۔

شعبہ انگریزی کے لیے ایک الگ مختصر سی لائبریری بھی ہے، جس میں انگریزی زبان اور ادب پر کتابیں موجود ہیں۔ شعبہ انگریزی کے اساتذہ اور لائبریرین باہمی تعاون سے مل کر اس لائبریری کا انتظام کرتے ہیں۔

کل کتابوں کی تعداد تیرہ چودہ ہزار کے درمیان ہے۔ زیادہ تر کتابیں انگریزی میں ہیں، اردو ادب کا بھی ایک حصہ ہے، فرانسیسی اور فارسی میں بھی کتابیں موجود ہیں۔

کالج میں طالبات کی ایک لائبریری کمیٹی بھی ہے، جس میں جماعت انٹرمیڈیٹ اور بی۔ اے کے نمائندے شامل ہیں۔ حال ہی میں اساتذات کی بھی ایک کمیٹی مقرر کی گئی ہے۔ جس کا کام بجٹ کی تقسیم کے سلسلے میں لائبریری کی امداد کرنا، نئی کتابوں کی سفارش کرنا اور شکایات کا تدارک کرنا ہے۔ ماضی میں لائبریری کے اوقات صبح آٹھ بجے سے تین بجے بعد دوپہر تک تھے، لیکن نئی تجویز کے بموجب اب لائبریری ساڑھے چار بجے تک کھلی رہا کرے گی، اور ہفتہ میں چار دن رات کو پونے آٹھ بجے سے پونے دس بجے تک بھی کھلی رہا کرے گی۔

ب۔ سائنس کالج۔ (فنون مفیدہ کے کالج)

۱۔ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لائبریری

کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج ۱۸۶۰ء میں طب جدید کی تعلیم کے لیے قائم ہوا۔ یہ کالج برصغیر پاک و ہند میں کلکتہ میڈیکل کالج کے بعد دوسری قدیم درسگاہ ہے۔ ۱۶ نومبر ۱۹۶۰ء کو اس کالج کی صد سالہ برسی بڑے تزک و احتشام سے منائی گئی۔ اس کو آج تمام مملکت پاکستان میں منفرد حیثیت حاصل ہے، اس میں پنجاب یونیورسٹی کے ایم، بی، بی، ایس کی ڈگری حاصل کرنے والے طلباء تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ پوسٹ گریجوایٹ ڈپلوموں۔ ڈی، ایم، آر، ای، ڈی او، ڈی، ایل، او کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ میڈیسن (علم الادویہ) اور سرجری (جراحی) کی کسی شاخ میں پنجاب یونیورسٹی کی ایم، ڈی، اور ایم، ایس کی ڈگری حاصل کرنے کی آسانیاں بھی مہیا ہیں۔ نیز بی، ڈی، ایس، اور بی، فارمیسی کے گریجوایٹوں کی تعلیم کا بھی انتظام ہے میو ہسپتال جس میں کہ ۱۰۵۰ بستروں کی گنجائش ہے کالج کے ساتھ مربوط ہے۔ جس میں میڈیسن اور سرجری کی تمام برانچوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ لیڈی ولنگڈن ہسپتال اور لیڈی ایچیسن ہسپتال میں دایہ گری اور امراض نسواں کی تعلیم کا انتظام ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کالج کی لائبریری میں طبی موضوعات پر کتابوں کا عظیم الشان ذخیرہ موجود ہے۔ جن کی مجموعی تعداد کم و بیش سترہ ہزار ہے، ۱۲۵ کے قریب رسائل و جرائد برطانیہ۔ امریکہ اور دیگر ممالک سے آتے ہیں۔ لائبریری کا انتظام ایک مینجنگ کمیٹی کے ذمے ہے، جس کے ارکان زیادہ تر مختلف شعبوں کے سربراہ ہیں۔ بند الماری اور ڈیوئی ڈیسیمل کلاسیفکیشن رائج ہے۔ کیٹلاگ ڈکشنری کی طرز پر کارڈوں پر تیار کیا گیا ہے۔

۲۔ فاطمہ جناح میڈیکل کالج لائبریری

فاطمہ جناح میڈیکل کالج ۱۹۴۸ء میں قائم کیا گیا۔ لائبریری کی بنیاد بھی اسی سال پڑی، یہ کالج صرف لڑکیوں کی طبی تعلیم کے لیے مخصوص ہے، اس لائبریری میں کم و بیش ڈھائی ہزار کتابیں ہیں جو زیادہ تر طب، سرجری، اور پبلک ہیلتھ کے موضوعات پر ہیں۔ ۴۵ رسائل و جرائد بھی لائبریری میں آتے ہیں جن سے کالج کی اساتذات اور طالبات فائدہ اٹھاتی ہیں۔ بند الماری اور ڈیوئی ڈیسیمل

کلاسیفکیشن رائج ہے۔ کیٹلاگ ڈکشنری کی طرز پر کارڈوں پر تیار کیا گیا ہے۔

۳ - گورنمنٹ کالج آف اینمل ہسبنڈری لائبریری[1]

ویٹرنری کالج لاہور ۱۸۸۲ء میں قائم ہوا تھا۔ حال ہی میں اس کا نام بدل کر گورنمنٹ کالج آف اینمل ہسبنڈری رکھ دیا گیا ہے۔ اس کالج کی لائبریری میں ۴ ہزار کتابیں ہیں۔ تیس کے قریب رسائل آتے ہیں۔ فن بیطاری کے متعلق کتابوں کا بڑا ذخیرہ ہے۔ یہ لائبریری کالج کے پرنسپل کے ماتحت ہے۔ کالج کے اساتذہ اور طلبا اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ بند الماری، ڈیوی ڈیسیمل کلاسیفکیشن رائج ہے۔ کیٹلاگ ڈکشنری کی طرز پر کارڈوں پر تیار کیا گیا ہے۔

۴ - گورنمنٹ کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی لائبریری

پنجاب کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی ۱۹۲۳ء میں قائم ہوا تھا۔ حال ہی میں اس کا نام تبدیل کرکے گورنمنٹ کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی رکھ دیا گیا ہے۔ اس کالج کی لائبریری کالج کی مرکزی عمارت کی پہلی منزل پر واقع ہے۔ اس میں انجینئرنگ سے متعلق پندرہ ہزار سے زیادہ کتابیں موجود ہیں۔ انجینئرنگ کے تقریباً بیس رسالے آتے ہیں۔ جو لوگ انجینئرنگ کی تعلیم کے لیے بیرونی ممالک میں جانا چاہتے ہیں، ان کی سہولت کے لیے امریکہ اور برطانیہ کی اکثر یونیورسٹیوں کے کیلنڈر بھی مہیا کیے گئے ہیں۔ حوالے کی بے شمار کتابیں موجود ہیں جن سے طلبا اور اساتذہ صرف لائبریری میں بیٹھ کر استفادہ کر سکتے ہیں۔ دیگر کتب حسب قاعدہ اشو ہوتی ہیں۔ لائبریری کا کچھ حصہ عام مطالعہ اور طلبا کے دیگر علمی مشاغل کے لیے وقف ہے۔ حصولِ آزادی کے بعد اس لائبریری میں تقریباً سات ہزار کتابوں کا اضافہ ہوا ہے۔ اب انجینئرنگ کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دیا گیا ہے۔ کالج کی لائبریری کو ایک بڑی اور علیحدہ عمارت میں منتقل کیا جائے گا اور کتابوں میں بھی بڑے پیمانہ پر اضافہ متوقع ہے۔

بند الماری اور ڈیوی ڈیسیمل کلاسیفکیشن کا طریق رائج ہے۔ کیٹلاگ ڈکشنری کی طرز پر کارڈوں پر تیار کیا گیا ہے۔ کالج کے طلبا اور اساتذہ اس سے استفادہ کرتے ہیں۔

۵ - ڈی مانٹمورنسی کالج آف ڈینٹسٹری لائبریری

۱۹۳۴ء میں کالج کے ساتھ ہی لائبریری کا بھی آغاز ہوا۔ اس وقت اس میں ۳۴۰۰ کتابیں ہیں جو دانتوں کی بیماریوں، ان کے علاج اور دندان سازی کے طریقوں پر مشتمل ہیں۔ اس میں سات میگزین بھی آتے ہیں۔ اساتذہ اور کالج کے طلبا اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ بیرونی اشخاص سے ۵ روپے زرِ ضمانت اور دس روپے سالانہ چندہ لیا جاتا ہے۔ گو اب تک اس میں کارڈ کیٹلاگ اور کلاسیفکیشن کا کوئی مناسب طریقہ نہ تھا۔ مگر اب کیٹلاگ کارڈ کی صورت میں تیار کرنے کے ساتھ ساتھ ڈیوی ڈیسیمل کلاسیفکیشن رائج کرنے کا منصوبہ بنا لیا گیا ہے۔ اس میں بند الماری کا طریقہ رائج ہے۔ لائبریری کا [illegible] ہے۔

۶ - ہوم اینڈ سوشل سائنس کالج لائبریری

لڑکیوں کے اس کالج کی عمر زیادہ نہیں ہے۔ اس کا قیام [illegible] میں عمل میں لایا گیا۔ کتابوں کے انتخاب میں پڑھانے والی خواتین

---

[1] GOVERNMENT COLLEGE OF ANIMAL HUSBANDRY

کو مدِنظر رکھا جاتا ہے ۔ یہاں غذا، خوراک، لباس، خانہ داری، بچوں کی نفسیات، موسیقی، فنونِ لطیفہ، گھریلو اقتصادیات، عمرانیات، اور اس کے متعلقہ علوم کی کتابیں ہیں۔ کتابوں اور رسالوں کی خرید کا بجٹ دو ہزار روپے سالانہ ہے، لیکن دو ایک مرتبہ پچاس پچاس ہزار روپے بطور سپیشل گرانٹ بھی منظور کئے گئے ہیں۔ ادارہ فورڈ فاؤنڈیشن سے بھی کتابیں بطور تحفہ ملتی رہی ہیں۔ اس وقت کتابوں کی کل تعداد ۵۰۰۶ (انگریزی ۴۹۳۴، اُردو ۷۲) ہے، ۳۵ جرائد منگوائے جاتے ہیں۔

دیگر کالجوں کی روایت کے برعکس یہاں کھلی الماری کا طریقہ مروّج ہے، لیکن طالبات میں ذمہ داری کا احساس پیدا کرنے کے لیے ان سے ۵۰ روپے بطور ضمانت لیے جاتے ہیں۔ دو روپے ماہوار لائبریری فنڈ لڑکیوں کو دینا پڑتا ہے۔

لائبریری کے انتظامی امور سرانجام دینے کے لیے اساتذات پر مشتمل ایک کمیٹی کی تشکیل کی گئی ہے۔

اس لائبریری میں ڈیوئی ڈیسیمل اسکیم رائج ہے، کارڈ کیٹیلاگ ڈکشنری کی طرز پر ہے، اوقات لائبریری صبح ۸ بجے سے شام ۴ بجے تک ہیں۔

ج ۔ یونیورسٹی کے قائم کردہ دیگر علوم و فنون کے کالج

۱ ۔ ہیلی کالج آف کامرس لائبریری ۔

ہیلی کالج آف کامرس ۱۹۲۷ء میں قائم ہوا تھا۔ اس کی لائبریری میں کم و بیش ۱۷ ہزار کتابیں ہیں۔ بیس کے قریب رسائل و جرائد آتے ہیں۔ کتابوں کا یہ مجموعہ اکنامکس (معاشیات) کامرس (تجارت) بزنس (کاروبار) انڈسٹری (صنعت) بینکنگ (بنکاری) اور فنانس (مالیات) کے موضوعات پر مشتمل ہے۔ طلبا اور اساتذہ اس لائبریری سے مستفید ہوتے ہیں۔ طلبائے قدیم کو بھی لائبریری استعمال کرنے کی اجازت ہے۔ ڈیوئی ڈیسیمل کلاسیفکیشن اور کھلی الماری کا طریق رائج ہے۔ کیٹیلاگ مضمون وار کارڈوں پر تیار کیا گیا ہے، ہر سال چار ہزار روپے خرید کتب، ڈیڑھ ہزار روپے رسائل و جرائد اور پانچ سو روپے دیگر متفرق ضروریات پر خرچ ہوتے ہیں۔ لائبریری روزانہ ۹½ گھنٹے کھلی رہتی ہے۔

۲ ۔ لاء کالج لائبریری

لاء کالج ۱۸۶۸ء میں معرضِ وجود میں آیا۔ اس کالج کی لائبریری میں قانون کی کم و بیش بارہ ہزار کتابیں اور بیس ہزار رپورٹ ہیں، لائبریری کے سربراہ پروفیسر انچارج اور کالج کے پرنسپل ہیں۔ کلاسیفکیشن کسی خاص اسکیم کے ماتحت نہیں ہے۔ کتابوں کو مضمون وار حروفِ ابجد کے لحاظ سے ترتیب دے کر چھپی ہوئی کتابی صورت میں ایک فہرست تیار کر دی گئی ہے۔ بند الماری کا طریقہ رائج ہے۔ ہر سال دس ہزار روپے کی کتابیں خریدی جاتی ہیں۔ اور لائبریری بارہ گھنٹے کھلی رہتی ہے۔ جس سے طلبا اور اساتذہ استفادہ کرتے ہیں۔ اس لائبریری کا ایک FRIENDS SERVICE SECTION (شعبہ خدمت رفقا) بھی ہے، جس سے نادار طلبا کو کورس کی کتابیں پورے سال کے لیے مہیا کی جاتی ہیں۔

۳ ۔ اورینٹل کالج لائبریری

ہر چند کہ اورینٹل کالج ۱۸۷۰ء میں قائم ہوا تھا، لیکن اس پر تعجب نہ ہونا چاہیئے کہ اس لائبریری کی عمر نسبتاً بہت کم ہے، کیونکہ اورینٹل کالج کے طلبا یونیورسٹی لائبریری سے استفادہ کرتے رہے۔

۱۹۵۲ء میں طلبا کی بڑھتی ہوئی ضروریات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اس کا قیام عمل میں آیا۔ اس میں زیادہ تر اُردو، فارسی، عربی، ادبیات ان کی تاریخ اور تاریخی و انتقادی ادب پر کتابیں ہیں۔ تنقید پر انگریزی کتابیں بھی موجود ہیں۔ کورس کی کتابیں کافی تعداد میں ہیں۔ مجموعی طور پر کتابوں کی تعداد ۵۳۰۰ کے قریب ہے۔ ایک سو کے قریب علمی و ادبی جرائد بھی آتے ہیں۔ لائبریری کے افسرِ اعلیٰ کالج کے پرنسپل ہیں۔ کھلی الماری اور ڈیوئی ڈیسیمل کلاسیفکیشن رائج ہیں۔ ڈکشنری کٹیلاگ کارڈوں پر تیار کیا گیا ہے۔

د۔ فنونِ لطیفہ کے کالجوں کے کتب خانے

۱۔ نیشنل کالج آف آرٹس لائبریری

۱۸۷۵ء میں میو سکول آف آرٹس کا قیام اس غرض سے عمل میں لایا گیا کہ عوام کو عملی فنون اور دستکاری کی تعلیم دی جاسکے۔ بلاشبہ ایک ایسے ادارے کی ضرورت تھی جس میں فن کارانہ ذوق رکھنے والے طلبا کی تعلیم کا بندوبست ہو۔ ابتدا میں یہاں ڈرائنگ، جیومیٹری، ماڈلنگ وغیرہ کی تعلیم دی جاتی رہی۔ بعد میں پیشہ ورانہ تربیت کا بھی اہتمام کیا گیا۔ اور لکڑی اور لوہے کے کام کی جماعتوں کا بھی اجرا ہوا۔

جب ۱۹۵۸ء میں اسے ایک باقاعدہ کالج کا درجہ دے دیا گیا تو طلبا اور اساتذہ کی بڑھتی ہوئی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اس کی لائبریری کی بھی تشکیلِ نو کی گئی۔ اس لائبریری میں تقریباً ۴ ہزار کتابیں ایک وسیع کمرہ میں رکھی گئی ہیں۔ پڑھائے جانے والے مضامین کی نوعیت کے اعتبار سے یہاں عمارت سازی، ڈیزائن، مجسمہ سازی، مصوری اور دیگر فنونِ لطیفہ کی کتابیں ہیں، ان کے علاوہ ادبیات پر بھی کافی کتابیں موجود ہیں، جن میں بعض بہت قیمتی اور نایاب ہیں۔ لائبریری میں بعض فارسی زبان کے مخطوطات اور قدیم ایرانی مصور کتابیں بھی ہیں۔ فنونِ لطیفہ پر تقریباً دو درجن رسائل و جرائد بھی خریدے جاتے ہیں۔

بند الماری، ڈیوئی ڈیسیمل سسٹم اور کارڈ کٹیلاگ رائج ہیں۔ کالج کے پرنسپل انتظامی امور کے سربراہ ہیں۔ کتابوں کے انتخاب میں بورڈ آف سٹڈیز کے مشوروں کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

ہ۔ تعلیمی تربیتی کالجوں کے کتب خانے

۱۔ سنٹرل ٹریننگ کالج لائبریری

۱۸۸۱ء میں اس کالج کو اساتذہ کی ٹریننگ کے لیے قائم کیا گیا۔ اس لیے اس میں عام دلچسپی کی کتابوں کے ساتھ ساتھ زیادہ تر درس و تدریس، طریقِ تعلیم، نفسیات اور بچوں کی تربیت پر کتابیں ہیں۔ اس وقت کتابوں کی تعداد ۲۴ ہزار ہے اور پچاس کے قریب رسائل و جرائد آتے ہیں۔ ان کے انتخاب میں تعلیمی مقاصد کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔ گو اس میں پہلے بند الماری کا طریقہ مروج تھا، مگر اب تجرباتی طور پر جزواً کھلی الماری کا طریقہ بھی اپنا لیا گیا ہے تاکہ طلبا میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہو سکے۔

دیگر کالجوں کی مانند یہ لائبریری بھی صرف طلبا اور اساتذہ کے لیے مخصوص ہے، ڈکشنری کارڈ کٹیلاگ اور ڈیوئی ڈیسیمل طریقہ رائج ہے۔ کالج کے اوقات ہی لائبریری کے اوقات ہیں۔ کالج کے پرنسپل لائبریری کے سربراہ ہیں۔

بچوں کے لیے ڈھائی ہزار کتابوں کا علیحدہ سیکشن ہے، جس کو زیر تربیت اساتذہ بچوں کی تعلیمی اغراض اور رہنمائی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

۴۔ لیڈی میکلیگن ٹریننگ کالج لائبریری

۱۹۳۳ء میں کالج کے ساتھ اس لائبریری کی بنیاد پڑی۔ اس لائبریری میں کم و بیش چھ ہزار کتابیں ہیں۔ چھ اخبارات اور دس جرائد باقاعدگی سے آتے ہیں۔ چار ہزار روپے کتابوں کی خرید پر اور چھ سو روپے اخبارات اور جرائد پر صرف ہوتے ہیں۔ بچوں کی کتابوں کا علیحدہ انتظام ہے جس سے تربیت حاصل کرنے والی اساتذات اپنا سبق تیار کرتی ہیں۔ کالج کی پرنسپل انتظامی امور کی نگران ہیں۔ اساتذات اور طالبات اس لائبریری سے استفادہ کرتی ہیں۔ بند الماری کا طریق رائج ہے۔ کتابوں کی ترتیب ڈیوی کی ڈیسیمل اسکیم کے مطابق ہے۔ کیٹلاگ ڈکشنری کی طرز پر کارڈوں پر تیار کیا گیا ہے۔

۵۔ ٹیکنیکل کتب خانے (مختص الاغراض کتب خانے)

۱۔ انسٹی ٹیوٹ آف کیمسٹری، پنجاب یونیورسٹی

یونیورسٹی کیمیکل لیبارٹری کی تعمیر ۱۹۲۳ء میں مکمل ہوئی ۱۹۲۴ء میں یونیورسٹی پروفیسر آف اِن اورگینک کیمسٹری مقرر کیا گیا۔ ۱۹۲۵ء میں ایک فزیکل کیمسٹری کا پروفیسر تعینات کیا گیا۔ جس کو کہ ڈائرکٹر آف لیبارٹریز بھی بنا دیا گیا ۱۹۲۵ء میں آنرز سکول اِن ٹیکنیکل کیمسٹری کا کورس شروع کیا گیا، جس کی تعلیم میں یونیورسٹی کیمیکل لیبارٹری کے رشاف مدد دیتے رہے ۱۹۳۵ء میں یونیورسٹی نے اورگینک کیمسٹری میں ایک ریڈر مقرر کیا۔ اور اس طرح یہ ایک اچھا خاصا کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ بن گیا۔ جس میں کہ فزیکل، آرگینک اِن اورگینک اور ٹیکنیکل کیمسٹری کی باقاعدہ تعلیم دی جانے لگی۔ پاکستان کے قیام کے بعد اس کا نام انسٹیٹیوٹ آف کیمسٹری میں تبدیل کر دیا گیا۔

کتابوں کی تعداد ۷½ ہزار ہے، جن میں تخمیناً ۲۰۰۰ جرائد بھی شامل ہیں، ۳۵ جرائد ہر ماہ باقاعدگی سے آتے ہیں۔ کتابوں کی خرید پر ہر سال پانچ ہزار روپے صرف ہوتے ہیں۔ کتابیں زیادہ تر جنرل، اِن اورگینک، آرگینک، فزیکل، ٹیکنیکل، انالیٹیکل، انڈسٹریل اور بائیو کیمسٹری کے موضوعات پر ہیں۔

کلاسیفکیشن ڈیوی ڈیسیمل سسٹم پر ہے۔ ڈکشنری کیٹلاگ کارڈوں پر تیار کیا گیا ہے، اور بند الماری کا طریق رائج ہے۔

لائبریری کے اوقات صبح ۷ بجے سے شام ۴ بجے تک ہیں۔

اساتذہ، متعلمین ایم۔ ایس۔ سی، پی۔ ایچ۔ ڈی کے طلبا اس لائبریری سے استفادہ کرتے ہیں، بیرونی احباب کو لائبریری کے استعمال کے لیے اجازت حاصل کرنی پڑتی ہے۔

۲۔ انسٹیٹیوٹ آف کیمیکل ٹیکنالوجی لائبریری

یہ ادارہ پنجاب یونیورسٹی نے انسٹیٹیوٹ آف کیمیکل ٹیکنالوجی کے نام سے اکتوبر ۱۹۴۸ء میں قائم کیا۔ چونکہ ملک میں صنعتی ترقی بہت تیزی کے ساتھ بڑے پیمانے پر ہو رہی ہے، اس لیے اس انسٹیٹیوٹ کی افادیت اور اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ یہاں کے گریجوایٹ طلبا

فارغ التحصیل ہونے کے بعد تمام ملک میں پرائیویٹ اور گورنمنٹ فیکٹریوں میں ذمہ دارانہ عہدوں پر کام کرتے ہیں۔

اس انسٹیٹیوٹ کی لائبریری میں کتابوں کی تعداد آٹھ ہزار ہے۔ چالیس کے قریب جرائد آتے ہیں۔ آٹھ ہزار روپیہ سالانہ کتب و جرائد کی خرید پر صرف ہوتا ہے۔ زیادہ تر کتابیں کیمیکل، انڈسٹریل، آرگینک، اِن آرگینک، اور جنرل انڈسٹریل کیمسٹری پر ہیں۔ ایم۔ ایس۔ سی ٹیکنیکل اور ایم۔ ایس۔ سی (ٹیکنیکل آنرز) کے طلباء اور اساتذہ اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ تدریسی کتب کے علاوہ اعلیٰ تحقیق و مطالعہ کا مواد بھی موجود ہے۔ لائبریری کا وقت صبح ۸ بجے سے شام کے چھ بجے تک ہے۔ لائبریری کا انتظام پروفیسر انچارج انسٹیٹیوٹ کے ڈائرکٹر کی حسب ہدایت کرتے ہیں۔ کلاسیفکیشن خود اپنی ایجاد کردہ ہے۔ کیٹلاگ کتابی صورت میں ہے جس کی ترتیب موضوعات کے لحاظ سے ہے۔ فنی تربیتی مقاصد کے لیے نہایت سودمند ادارہ ہے۔

۳۔ ہائی ٹنشن اینڈ نکلیر ریسرچ لیبارٹری، گورنمنٹ کالج لاہور[1]

یہ لیبارٹری گورنمنٹ کالج فزکس ڈیپارٹمنٹ (شعبہ طبیعات) کا حصہ ہے۔ ۱۹۵۵ء میں قائم ہوئی، ۱۹۵۹ء میں باقاعدہ طور پر اس کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔

گورنمنٹ کالج کا فزکس ڈیپارٹمنٹ دو حصوں میں منقسم ہے۔ کالج کی لیبارٹریز میں الیکٹرونکس (برقیات) کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ لیبارٹری نکلیر ریسرچ کے لیے مخصوص ہے۔ اس لیبارٹری سے ایم۔ ایس۔ سی کے طلباء، پوسٹ ایم۔ ایس۔ سی اسکالرز اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے طلباء استفادہ کرتے ہیں۔

لائبریری میں کتابوں کی تعداد پانچ سو کے قریب ہے۔ مگر ریسرچ لٹریچر (تحقیقی مواد) بہت زیادہ ہے جو کہ اس لائبریری کا اہم جزو ہے۔ اور جس پر تمام تر ریسرچ کا انحصار ہے۔ امریکہ، برطانیہ اور آسٹریلیا کے بیشتر فزکس کے جرائد اس لائبریری میں آتے ہیں۔ ان کے علاوہ برطانیہ کے گزشتہ دس سال کے فزکس جرائد کا مکمل اور نہایت قابل قدر سیٹ اس لائبریری میں موجود ہے۔ برٹش کونسل نے ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۱ء تک کے فزکس کے جرائد ہدیۃً لائبریری کو پیش کیے ہیں۔ فنی افادی حیثیت سے یہ کتب خانہ نہایت ہی اہم اور قابلِ قدر ادارہ ہے۔

۴۔ ویسٹ ریجنل لیبارٹریز لائبریری

۱۹۵۴ء میں ادارہ پاکستان کونسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کا قیام عمل میں آیا جس کا مرکزی دفتر کراچی میں ہے۔ کونسل کے قائم کرنے کی غرض یہ تھی۔ کہ جدید سائنسی اور صنعتی علوم کی تحقیق و تفتیش کے نتائج سے عوام کو روشناس کر کے اس باب میں ان کی رہنمائی کی جائے۔ "تاکہ ملک کی صنعت و حرفت کو فروغ حاصل ہو۔"

اس ادارہ کی شاخ لاہور کی لائبریری ۱۹۵۵ء میں قائم کی گئی۔ اس وقت اس میں پانچ ہزار کتابیں ہیں، جو سائنسی عمومی موضوعات بالخصوص کیمسٹری پر ہیں۔ ۱۵۰ رسائل و جرائد منگوائے جاتے ہیں۔ یہ تمام سائنٹیفک اور ٹیکنیکل رسالے ہیں۔ ان رسائل کے گذشتہ سالوں کے تمام سیٹ بھی فراہم کیے گئے ہیں، جو کہ جدید عہد کی فنی ترقیات کی تحقیق کے لیے بہت ضروری ہیں۔

---

[1] HIGH TENSION & NUCLEAR RESEARCH LABORATORY.
(کتب خانہ تحقیقات فوق کشش و مدار)

۲۵ ہزار سے ۴۰ ہزار روپے سالانہ تک کتابوں کی خرید پر صرف ہوتے ہیں۔ کراچی کا مرکزی دفتر اس بات کا ذمہ دار ہے کہ وہ غیر ملکی فنی جرائد لائبریری کو مہیا کرے۔

اس لائبریری سے بالعموم ریسرچ سٹاف (تحقیقاتی عملہ) مستفید ہوتا ہے۔ ریسرچ سٹاف کے ارکان بیشتر ایم ایس سی اور پی، ایچ، ڈی ہوتے ہیں۔ بیرونی حضرات بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔ کونسل کی اپنی گورننگ باڈی (ہیئت منتظمہ) ہے۔ جو کہ لائبریری کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ لائبریری صبح آٹھ بجے سے شام ۴ بجے تک کھلی رہتی ہے۔

کھلی الماری کا طریق رائج ہے۔ کتابیں اور جرائد ڈیوی ڈیسیمل کلاسیفکیشن اسکیم کے مطابق مضمون وار رکھی ہیں۔ ڈکشنری کیٹلاگ کارڈوں پر تیار کیا گیا ہے۔

۵۔ پاکستان ایسوسی ایشن فار دی اڈوانسمنٹ آف سائنس لائبریری[1]

ایسوسی ایشن کا دفتر ویسٹ پاکستان ریجنل لیبارٹریز واقع فیروز پور روڈ لاہور ہے۔ جس کے ساتھ یہ لائبریری بھی وہاں موجود ہے۔ ۱۹۴۷ء میں قائم ہوئی۔ ایسوسی ایشن کے جنرل سیکرٹری اس لائبریری کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ اس میں تین ہزار مطبوعہ کتابیں ہیں اور ڈھائی سو جرائد ان کے علاوہ ہیں۔ یہ کتابیں سائنٹیفک ٹیکنیکل اور صنعتی موضوعات پر ہیں۔ ایسوسی ایشن کے ممبران کتابوں سے استفادہ کرتے ہیں۔ بند الماری کا طریق رائج ہے۔ ڈیوی ڈیسیمل کلاسیفکیشن کے مطابق کتابوں کی ترتیب دی گئی ہے۔ کیٹلاگ کارڈوں پر تیار کیا گیا ہے۔

۶۔ اریگیشن ریسرچ انسٹیٹیوٹ[2]

اریگیشن ریسرچ یا ادارہ نہری تحقیقات کی لائبریری ۱۹۲۴ء میں قائم کی گئی تھی۔ نہری ادارے کو جن مسائل پر تحقیق کرنا تھی، ان سے متعلق بہت سے رسالے فراہم کیے گئے تھے۔ اس انسٹیٹیوٹ کی اپنی مطبوعات بھی اس لائبریری میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ وہ تمام مواد بھی موجود ہے، جو بیرونی ممالک سے ان مطبوعات کے عوض حاصل کیا گیا ہے۔

۱۹۴۴ء میں انسٹیٹیوٹ کے ایک ڈائرکٹر نے اس لائبریری کو سیکرٹریٹ کی پی، ڈبلیو، ڈی لائبریری میں مدغم کر دیا۔ لیکن یہ تبدیلی مفید ثابت ہونے کی بجائے نقصان دہ اور تحقیقی مقاصد میں دشواری کا موجب ثابت ہوئی، لہذا جلد ہی پرانا طریقہ پھر رائج کر دیا گیا۔ اور انسٹیٹیوٹ کے لیے ایک الگ لائبریری کی بنیاد رکھ دی گئی۔ جس کے بعد کام میں زیادہ سرگرمی پیدا ہوئی اور اس میں تازہ ترین کتابیں، رسالے، اور انسٹیٹیوٹ کی مطبوعات جمع کی گئیں۔ اس وقت اس لائبریری میں ۱۵۶۲ کتابیں موجود ہیں، ۱۴ رسالے آتے ہیں۔ اور اس کے علاوہ بہت سی بیرونی مطبوعات انسٹیٹیوٹ کی مطبوعات کے تبادلے میں آتی ہیں۔

ہر سال کتابوں کی خرید پر ۱۵۰۰ روپے خرچ ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ رسالوں پر ۵۰۰ روپے کا زرمبادلہ صرف ہوتا ہے۔

---

[1] PAKISTAN ASSOCIATION FOR THE ADVANCEMENT OF SCIENCE LIBRARY (کتب خانہ ادارہ ترقی علوم طبیعیہ)

[2] IRRIGATION RESEARCH INSTITUTE.

اس لائبریری میں جو کتابیں خریدی جاتی ہیں، وہ بہت بلند معیار کی ہوتی ہیں۔ ہائی ڈرالکس (ہزقابیات) فزکس (خواص مادہ) اور سوائیل میکینکس (ترابیات) پر بہت بلند پایہ کتابیں موجود ہیں۔

محکمہ انہار کے حکام اس لائبریری سے استفادہ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ واپڈا کے افسران بھی اس سے مستفید ہوتے ہیں۔
ڈیوئی ڈیسیمل سسٹم رائج ہے۔ کیٹیلاگ رجسٹر کی صورت میں ہے جس پر مضمون وار کتابیں مندرج ہیں۔

۶۔ گورنمنٹ کی لائبریریاں (محکمانہ کتب خانے)

۱۔ اسمبلی لائبریری

اسمبلی لائبریری ۱۹۲۲ء میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل لائبریری کے نام سے قائم ہوئی۔ ۱۹۳۷ء میں یہ پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی لائبریری (کتب خانہ مجلس آئین ساز، پنجاب) کہلانے لگی۔ وحدت مغربی پاکستان کے بعد اسے مغربی پاکستان صوبائی اسمبلی لائبریری کہا جانے لگا۔ مختلف محکموں، کمیشنوں، کمیٹیوں، اور بورڈوں کی رسمی اور غیر رسمی مجالس کی روددادوں کے علاوہ اس میں تقریباً دس ہزار کتابیں موجود ہیں۔ ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۵۸ء تک برطانوی دارالعوام کی کارروائی کا مکمل سٹ بھی موجود ہے۔

لائبریری کی زیادہ تر کتابیں حوالہ جات، قانون، دستور، معاشرت، ادب اور تاریخ سے متعلق ہیں۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء کے انقلاب سے قبل صوبائی اسمبلی کے ارکان اور اس کا عملہ لائبریری سے استفادہ کرتے تھے۔ اسمبلی ٹوٹ جانے کے بعد سے مارشل لا ایڈمنسٹریشن اور ون یونٹ کے عہدہ داران اس سے استفادہ کرتے رہے ہیں۔ دستور کمیشن اور صوبائی ایڈ کمیشن کے اراکین بھی اس سے مستفید ہوتے رہے ہیں۔ یہ لائبریری حکومت مغربی پاکستان کے ماتحت ہے اور مغربی پاکستان کی ترقیاتی مشاورتی کونسل WEST PAKISTAN DEVELOPMENT ADVISORY COUNCIL کے سیکرٹری اس کے منتظم ہیں۔ کتابوں کو ڈیوئی کے اعشاری نظام کے تحت ترتیب دیا گیا ہے۔ لائبریری صبح ساڑھے سات بجے سے دوپہر ڈیڑھ بجے تک کھلی رہتی ہے۔

۲۔ بورڈ آف اکنومک انکوائری، پنجاب، لائبریری[1]

بورڈ آف اکنومک انکوائری، پنجاب، ایک تحقیقاتی ادارہ ہے۔ جو اقتصادی امور کی تحقیقات کرتا ہے اور اپنی رپورٹیں شائع کرتا ہے۔ . . . . اس کی ایک ڈیپارٹمنٹل لائبریری ہے جو عرصہ سے قائم ہے۔ اس لائبریری میں چار ہزار سے زائد کتابیں ہیں۔ جو خریدی بھی گئیں اور ہدیۃً بھی موصول ہوئیں۔ اس کے تعلقات مختلف قومی اور بین الاقوامی ایجنسیوں سے ہیں۔ جن میں باہمی تبادلہ کتب ہوتا رہتا ہے۔ ان میں سے زیادہ اہم ایجنسیاں یو۔ این۔ او۔ ڈبلیو۔ ایچ۔ او۔ آئی۔ ایل۔ او۔ آئی۔ ایم۔ ایف۔ اور بعض امریکہ، برطانیہ، اور یورپ کی یونیورسٹیاں اور تحقیقی ادارے ہیں۔ لائبریری سے استفادہ زیادہ تر بورڈ کا ریسرچ سٹاف ہی کرتا ہے۔ سرکاری افسروں اور یونیورسٹی کے ریسرچ سکالرز کو بھی لائبریری میں بیٹھ کر کام کرنے کی اجازت ہے۔ تیس کے قریب رسائل و جرائد بھی اس لائبریری میں آتے ہیں۔ کتابیں زیادہ تر

---

[1] BOARD OF ECONOMIC ENQUIRY PUNJAB, LIBRARY.
(ادارہ اقتصادی معلومات کا کتب خانہ)

اقتصادیات، تجارت، صنعت و حرفت اور زراعتی اقتصادیات کے مضامین پر ہیں۔

بند الماری کا طریقہ رائج ہے۔ آتھر کیٹلاگ کتابی صورت میں ہے۔ اور مضمون وار ترتیب دیا گیا ہے۔

۳۔ پنجاب ایڈوائزری بورڈ فار بکس لائبریری

محکمہ تعلیم کی مرکزی لائبریری ۱۸۹۰ء میں قائم ہوئی تھی۔ جس کے تحت اس وقت دو لائبریریاں کام کر رہی ہیں ایک ایڈوائزری بورڈ فار بکس لائبریری (تالیفات کی مشاورتی مجلس کا کتب خانہ) ہے، اور دوسری پبلیکیشنز سیکشن کی ٹیکسٹ بک لائبریری (شعبہ مطبوعات کتب نصاب کا کتب خانہ) ہے دونوں لاہور کے علاقائی محکمہ تعلیم سے متعلق اور سیکرٹریٹ مغربی پاکستان کے ماتحت ہیں۔

دونوں لائبریریاں خاص نوعیت کی حامل ہیں۔ ان میں تعلیم اور دوسرے مضامین کی کتابیں جمع کی جاتی ہیں، اس وقت ان میں تخمیناً بیس ہزار کتابیں موجود ہیں جن کے منجملہ تقریباً تین چوتھائی شعبہ انگریزی میں اور بقایا مشرقی زبانوں کے شعبے میں ہیں۔ پچاس کے قریب ملکی اور غیر ملکی رسائل بھی آتے ہیں۔ سابق پنجاب کے منظور شدہ تعلیمی اداروں کے اساتذہ ان لائبریریوں کے ممبر بن سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ زیر تربیت اساتذہ اور ہیڈ کوارٹر ڈائرکٹوریٹ (صدر دفتر محکمہ تعلیم) کے ملازمین بھی ممبر بن سکتے ہیں۔

ڈیوئی ڈیسیمل اسکیم، ڈکشنری کارڈ کیٹلاگ، اور بند الماری سسٹم رائج ہیں۔

۴۔ پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ لائبریری (کتب خانہ محکمہ تعمیرات عامہ)

اس لائبریری میں ٹیکنیکل کتابیں ہیں، جن کی تعداد تیرہ ہزار کے قریب ہے۔ یہ لائبریری محکمہ انہار اور عمارت اور سڑک کے محکمہ تعمیرات کے لیے ہے۔ افسران محکمہ انہار و بی اینڈ آر اس کی کتابوں سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ انجنیئرنگ (فن تعمیرات) ایک ایسا علم ہے، جس کے فارمولے (اصول) آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔ اور جدید تحقیقات اور تجربات ہوتے رہتے ہیں۔ ان تجربوں اور تحقیقات کی بنا پر نئی نئی کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ اور ہر سال جدید کتب خریدنی پڑتی ہیں۔ لائبریری کا سالانہ بجٹ پانچ ہزار روپے ہے۔ اس کا انتظام محکمہ انہار کے سپرد ہے، اس لائبریری میں تعمیرات کے متعلق کم و بیش بیس رسالے اور جرائد باقاعدہ آتے ہیں۔

۵۔ ویسٹ پاکستان بیورو آف ایجوکیشن لائبریری

مغربی پاکستان بیورو آف ایجوکیشن اکتوبر ۱۹۵۸ء میں قائم کی گئی۔ اس بیورو کے مقاصد مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ مغربی پاکستان میں تعلیم کے بارے میں ہر سطح پر اعداد و شمار اور دیگر معلومات فراہم کرنا۔

۲۔ جہاں تک تعلیمی مواد کا تعلق ہے، اس کے حصول میں ڈوکومینٹیشن سنٹر (مرکز استناد) کا فرض ادا کرنا۔

۳۔ مطلوبہ تعلیمی موضوعات کا خود یا دوسرے قابل اداروں کی شرکت میں جائزہ لینا۔

۴۔ رپورٹ، بلیٹن، جرائد۔ اور کلاس روم مواد وغیرہ شائع کرنا۔

۵۔ ہر قسم کی تعلیمی اطلاع مرکزی حکومت، سرکاری محکموں، ماہرانِ تعلیم، بیرونی حکومتوں، ادارات اور تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے مہیا کرنا۔

اس وقت بیورو کی لائبریری ——— میں ۵۴۴ کتابیں اور پمفلٹ ہیں، ساٹھ رسائل وجرائد ملکی اور غیر ملکی اس میں آتے ہیں۔

کتابیں زیادہ تر تعلیم اور اس کے متعلقہ مضامین پر ہیں، چونکہ لائبریری ڈوکومنٹیشن سنٹر کا حصہ ہے، اس لیے ڈوکومنٹیشن اور لائبریری سائنس (فن کتابداری) کے متعلق مواد بھی مہیا کیا جا رہا ہے۔

حکومتِ مغربی پاکستان اس ادارے اور لائبریری کی سربراہ ہے۔

ہر سالی پانچ ہزار روپے کتابوں کی خرید پر خرچ ہوتے ہیں۔ آئندہ پنج سالہ منصوبے میں اس کے لیے ۲۵ ہزار روپے مزید رقم رکھی گئی ہے۔

یہ ایک ریفرنس (حوالہ جاتی) لائبریری ہے۔ اور اس کا کیٹلاگ کلاسیفائیڈ ہے۔ ڈیوی ڈیسیمل کلاسیفکیشن اسکیم رائج ہے۔

اس لائبریری کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تعلیمی امور کے متعلق سرکردہ اخبارات میں جو مواد شائع ہوتا ہے، ان کے تراشے باقاعدگی سے رکھے جاتے ہیں۔

۶۔ ویسٹ پاکستان سول سیکرٹریٹ لائبریری

یہ لائبریری ۱۸۵۵ء میں قائم ہوئی تھی، اور ویسٹ پاکستان گورنمنٹ کی ملکیت ہے۔ اس میں کم وبیش اکسٹھ ہزار کتابیں ہیں۔ پندرہ کے قریب جرائد باقاعدگی سے آتے ہیں۔ کتابیں عام موضوعات پر ہیں۔ گورنمنٹ رپورٹوں کا خاصا ذخیرہ ہے، چار ہزار روپے ہر سال کتابوں کی خرید پر صرف ہوتے ہیں۔ ویسٹ پاکستان گورنمنٹ کے محکمے اس لائبریری سے استفادہ کرتے ہیں۔ یہاں بند الماری کا طریقہ رائج ہے، کتابوں کو مضمون وار ترتیب دیا گیا ہے، اور کارڈ کیٹلاگ ڈکشنری کی طرز پر تیار کیا گیا ہے۔

۷۔ ڈائریکٹریٹ آف پبلک ہیلتھ لائبریری، برڈ وڈ روڈ

اس لائبریری میں طب، جراحی، اور صحتِ عامہ پر آٹھ سو مطبوعہ کتابیں ہیں۔ ڈائرکٹر آف ہیلتھ اس کے سربراہ ہیں۔ دس جرائد باقاعدگی سے لائبریری میں آتے ہیں۔ ڈائرکٹریٹ آف پبلک ہیلتھ کے افسر اور سٹاف اس لائبریری سے استفادہ کرتے ہیں۔ بند الماری کا طریقہ رائج ہے۔ مضمون وار کتابوں کو ترتیب دیا گیا ہے، اور کتابیں ایک رجسٹر میں درج ہیں۔ دفتری اوقات کے ساتھ لائبریری کھلی رہتی ہے۔

۸۔ لائبریری محکمہ رجسٹرار کواپریٹو سوسائٹی، ویسٹ پاکستان گورنمنٹ

اس لائبریری میں اقتصادیات زراعت تعلیم اور قانون پر ۵۰۰ مطبوعہ کتابیں ہیں، ۵ جرائد آتے ہیں۔ بند الماری کا طریق رائج ہے۔ کیٹلاگ چھپا ہوا ہے اور مضمون وار ترتیب

دیا گیا ہے۔ محکمہ کے افسر اور عملہ کے لوگ اس سے استفادہ کرتے ہیں۔

۹۔ آرکیولوجیکل ڈیپارٹمنٹ لائبریری، قلعہ لاہور (کتب خانہ محکمہ آثار قدیمہ)

یہ لائبریری ۱۹۴۷ء میں قائم ہوئی۔ سپرنٹنڈنٹ آف آرکیولوجی اس کے سربراہ ہیں۔ اس لائبریری میں چار ہزار مطبوعہ کتابیں ہیں۔ جو تاریخ، آثار قدیمہ، فن تعمیرات اور سیاحت پر ہیں۔ یہ ایک ریفرنس (حوالہ جاتی) لائبریری ہے۔ اس میں سے کتابیں اشو نہیں ہوتیں۔ کتابوں کو مضمون وار ترتیب دیا گیا ہے۔

۱۰۔ ڈائرکٹر آف انڈسٹریز لائبریری، ویسٹ پاکستان (محکمہ صنعت و حرفت، مغربی پاکستان کی لائبریری)

انڈسٹریز ڈیپارٹمنٹ (محکمہ صنعت و حرفت) مغربی پاکستان کے ساتھ اس لائبریری کا قیام بھی عمل میں لایا گیا۔ اس لیے اس محکمہ کے ساتھ ساتھ مختلف اوقات میں یہ لائبریری بھی مختلف عمارتوں میں منتقل ہوتی رہی۔ اور بالآخر ملتان روڈ پر واقع محکمہ کی عمارت کے ساتھ اس کے لیے بھی ایک جگہ مخصوص کر دی گئی۔ بڑھتی ہوئی ضروریات کے پیش نظر اب اس میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔

۱۵ ہزار کتابوں پر مشتمل اس لائبریری میں ٹیکنیکل (صناعی) کمرشل (تجارتی) موضوعات پر بہت کارآمد اور مفید تالیفات موجود ہیں۔ اس کے علاوہ معاشیات، تاریخ اور آرٹ پر بھی کافی کتابیں ہیں۔ اگرچہ کتابوں کا انتخاب محکمہ کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا جاتا ہے۔ تاہم عام دلچسپی کے موضوعات کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ ڈیڑھ ہزار کے قریب پرانی گورنمنٹ رپورٹس (سابقہ حکومتوں کی روداد صنعت و حرفت) اور گزیٹیر بھی موجود ہیں۔ حوالہ جات کے انسائیکلوپیڈیا، ٹریڈ ڈائرکٹری، ٹیکنیکل ڈکشنری (کاروباری اور پیشہ ورانہ کتب لغات) نیز امریکہ اور پاکستان کے STNDARD SPECIFICATIONS. بھی مہیا کیے گئے ہیں۔ رسائل کی تعداد ۵۰ ہے، جس میں فنی اور کمرشل جرائد اور عام دلچسپی کے پرچے بھی شامل ہیں، گو یہ لائبریری صرف محکمانہ ضروریات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے قائم کی گئی ہے، لیکن محکمہ کے افسروں اور عملے کے علاوہ بیرونی اصحاب سے بھی تعاون کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اب ایسے لوگوں کو اہم اور قیمتی کتابیں بیٹھنے کی بجائے PHOTOHSTAT کرانے کا انتظام بھی کیا جا رہا ہے۔

ڈائرکٹر آف انڈسٹریز کی لائبریری کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ کیونکہ محکمہ صنعت و حرفت کے دیگر اداروں اور علاقائی دفاتر کے تمام کتب خانے اس لائبریری کے ساتھ ملحق ہیں۔ اب ان تمام لائبریریوں کی ایک یونین کیٹیلاگ (مشترکہ فہرست) مرتب کرنے کا پروگرام بنا لیا گیا ہے۔ تاکہ ایک دوسرے کی کتابوں سے استفادہ میں آسانی رہے۔

لائبریری میں بند الماری کا طریق مروج ہے۔ لیکن اب بتدریج کھلی الماری کی طرف قدم بڑھایا جا رہا ہے اور غالباً جلد ہی مکمل طور سے کھلی الماری کے طریق کار کو اپنا لیا جائے گا۔

پہلے یہاں مطبوعہ کیٹیلاگ ہوتی تھیں۔ بعد میں مضمون وار فہرستیں ٹائپ کرا کر رکھی گئیں۔ لیکن اب کارڈ کیٹیلاگ بنانے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ ڈیوئی ڈیسیمل سسٹم رائج ہے۔

انتظامی امور کو سرانجام دینے کے لیے ۹ افسران کلاس I پر مشتمل ایک ایڈوائزری بورڈ کی تشکیل کی گئی ہے جس کے

صدر جائنٹ ڈائرکٹر ہیں۔ لائبریرین بطور اسسٹنٹ سیکرٹری کام کرتا ہے، لیکن اختیارات ڈائرکٹر کے ہاتھ میں ہیں۔

کتابوں اور رسالوں کی خرید پر تقریباً ۵ ہزار روپے سالانہ خرچ ہوتے ہیں۔ اس کے لیے کوئی بجٹ مخصوص نہیں ہے، ضروریات کے مطابق رقم حاصل کی جاتی ہے۔

۱۱ - لاہور میوزیم لائبریری (عجائب خانہ لاہور کی لائبریری)

۱۸۶۵ء میں میوزیم کے ساتھ ہی اس لائبریری کا قیام عمل میں آیا۔ اس میں تقریباً ۴ ہزار کتابیں موجود ہیں، جو فنونِ لطیفہ، آثارِ قدیمہ، سکہ سازی، کتبہ گری اور تاریخ کے موضوعات پر مشتمل ہیں۔ اس میں برصغیر پاک و ہند کی تاریخ اور فنونِ لطیفہ کے بارے میں بعض بیش بہا کتابیں ہیں۔ آثارِ قدیمہ کے بارے میں بعض سرکاری رپورٹوں کے مکمل سیٹ موجود ہیں۔ اگرچہ لائبریری سرکاری نوعیت کی ہے، لیکن ایم اے تاریخ اور فنونِ لطیفہ کے طلبا، طالبات اور ریسرچ سکالر بھی اس سے استفادہ کرتے ہیں۔

یہاں کوئی تربیت یافتہ لائبریرین نہیں ہے، اس لیے کتابوں کی ترتیب اور فہرست کی تیاری کسی فنی اصول پر نہیں ہو سکی، اس وقت بند الماری کا طریقہ رائج ہے۔ کتابوں کی خرید پر سالانہ دو ہزار روپے صرف ہوتے ہیں۔

۱۲ - جی، ایم (جنرل مینجر) لائبریری، پی، ڈبلیو، آر (ہیڈ کوارٹرز)

یہ لائبریری مغربی پاکستان ریلوے (پی ڈبلیو آر) کی دفتری ضروریات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے قائم کی گئی ہے، جو دفتر کے ساتھ ہی معرضِ وجود میں آئی۔ کتابوں کی تعداد ساڑھے تین ہزار کے قریب ہے۔ یہ کتابیں انجینئرنگ، ریلوے ایڈمنسٹریشن (نظامِ محکمۂ ریل)، مواصلات، اشتہارات، قانون، تاریخ اور فنانس (مالیات ریلوے) وغیرہ مضامین پر مشتمل ہیں۔ کتابوں کے انتخاب میں محکمانہ ضروریات کو ملحوظ رکھا جاتا ہے، اور صرف محکمے کے افسروں کے استعمال کے لیے ہے، اس کی حیثیت ایک ریفرنس لائبریری کی ہے۔

یہاں ۱۲ جرائد منگوائے جاتے ہیں۔ جن میں سے نصف صرف ریلوے کے مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ باقی عام نوعیت کے ہیں۔ لیکن ان رسائل کو لائبریری میں محفوظ رکھنے کی بجائے متعلقہ شعبہ جات کو بھیج دیا جاتا ہے۔

لائبریری میں ریلوے تنظیم کے متعلق بعض قدیم اور نایاب رپورٹیں، نیز بیرونی اور ملکی ٹیکنیکل اور فنی اداروں کی کارروائیوں کی روداد یں موجود ہیں، کتابوں کے انتخاب میں دفتری ضروریات کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔

کیٹلاگ مضمون وار کتابی صورت میں حروفِ تہجی کے اعتبار سے تیار کیا گیا ہے، بند الماری کا طریقہ مروج ہے، اختیار جنرل مینجر کے ہاتھ میں ہے۔

کچھ عرصہ قبل اس لائبریری کی تقریباً ایک ہزار کتابوں کو علیحدہ کر کے ایک جداگانہ فنی لائبریری قائم کی گئی جس کا نام "پی اینڈ ڈی" لائبریری ہے۔ اس میں ڈرائنگ، ڈرافٹنگ اور سروے کے متعلق کتابیں ہیں۔ اور محکمہ کے بھی شعبے ان سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

۷ - عدالتی کتب خانے

سپریم کورٹ لائبریری ۱۹۴۷ء میں سپریم کورٹ کے ساتھ ہی اس لائبریری کا قیام عمل میں لایا گیا۔ تقسیم ملک کے وقت تقریباً ڈیڑھ ہزار کتابیں کورٹ کی ملکیت تھیں۔ لیکن تقسیم کتب کے وقت اس لائبریری کے حصہ میں صرف سو کتابیں آئیں۔ اور وہ بھی نہ ہونے کے برابر۔ کیونکہ یہ کتابیں بازخستہ حالت میں تھیں اور یا بالکل ہی ناکارہ ہو گئی تھیں۔ لائبریری کی ابتدا ان ہی سو کتابوں سے ہوئی لیکن آج یہاں دس ہزار کتابوں کا ایک ایسا قابلِ قدر ذخیرہ موجود ہے جو عدالتِ عالیہ کے جج صاحبان کی تمام ضروریات کی کفالت کر سکتا ہے۔

کیونکہ انقلاب سے پہلے عدالت آئینی مسائل کا جائزہ لیا کرتی تھی، اس لیے اُس وقت اس کی تمام کتابیں اسی نقطۂ نظر سے فراہم کی جاتی تھیں، اور گو بعد میں سول لا پر بھی کتابوں کی خرید شروع کر دی گئی، لیکن اس کا اہم ترین حصہ اب بھی CONSTITUTIONAL LAW (آئین دستور سازی) پر مشتمل ہے۔

یہاں نہ صرف پاک و ہند کی عدالتہائے عالیہ کی رپورٹس یا فیصلے موجود ہیں۔ بلکہ دولتِ مشترکہ کے تمام ممالک کے عدالتی فیصلوں کے بارے میں بھی مکمل رپورٹس موجود ہیں۔ برطانوی عدالت ہائے عالیہ کے ۱۸۶۰ء سے لے کر اب تک کے تمام فیصلوں کی نقول اور امریکہ میں جب سے سپریم کورٹ نے کام شروع کیا، اُس وقت سے اب تک کی تمام رپورٹوں کے مکمل سیٹ فراہم کر لیے گئے ہیں۔

یہ لائبریری صرف عدالتِ عالیہ کے ججوں کے لیے مخصوص ہے۔

اس میں ڈیوئی ڈیسیمل سسٹم رائج ہے، البتہ کیٹلاگ رجسٹر کی صورت میں ہے جو مضمون وار ہونے کے ساتھ ساتھ مصنف وار بھی ہے۔ دس ہزار روپے سالانہ خریدِ کتب پر خرچ کیا جاتا ہے۔

۲ - ویسٹ پاکستان ہائی کورٹ لائبریری یہ لائبریری چیف کورٹ کے قیام کے وقت سے قائم ہے چیف کورٹ کو بعد میں ہائی کورٹ کا درجہ دیا گیا جو مغربی پاکستان کی وحدت کے بعد ویسٹ پاکستان ہائی کورٹ کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں تیس ہزار کتابیں ہیں جو ہائی کورٹ کے جج صاحبان کے لیے مخصوص ہیں، وکلا بھی ان سے استفادہ کرتے ہیں۔

یہاں کلاسیفکیشن کا کوئی سائنٹیفک طریقہ مروّج نہیں۔ کیٹلاگ ایک رجسٹر کی صورت میں ہے، کتابوں کی خرید پر پندرہ ہزار روپیہ سالانہ خرچ کیا جاتا ہے۔

۳ - بار ایسوسی ایشن لائبریری یہ لائبریری بھی ہائی کورٹ کی عمارت میں واقع ہے، اور اس وقت سے قائم ہے جبکہ یہاں چیف کورٹ کا قیام عمل میں لایا گیا، اس کے قیام کا مقصد ایڈووکیٹوں (وکلا) کے لیے مطالعہ، تحقیق اور حوالہ جات کی فراہمی کے لیے سہولتیں بہم پہنچانا تھا، اس سے صرف بار ایسوسی ایشن (جمعیت وکلا) کے اراکین ہی استفادہ کر سکتے ہیں۔ اراکین کو مطالعہ کی سہولتیں پہنچانے کے لیے ایک علیحدہ ریڈنگ روم موجود ہے۔ قانون پیشہ اصحاب یہاں عدالت کے ہنگامہ پرور ماحول سے جدا ہو کر سکون سے کتابوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

کتابوں کی تعداد ۳۵ ہزار ہے اور پاک و ہند کی عدالت ہائے عالیہ کی مکمل رپورٹیں موجود ہیں۔
کلاسیفکیشن سائنٹیفک اصول پر نہیں ہے۔ کیٹیلاگ مطبوعہ صورت میں موجود ہے، چنانچہ اسے مکمل رکھنے کے لیے ہر سال اس کے نئے اڈیشن طبع کرائے جاتے ہیں۔
کتابوں کی خرید پر سالانہ دس ہزار روپے صرف ہوتے ہیں۔

۸ - علمی و ادبی اداروں کے کتب خانے

قیام پاکستان کے بعد مندرجہ ذیل ثقافتی مراکز لاہور میں قائم ہوئے جن کے ساتھ ان کے اپنے کتب خانے بھی ہیں مطالعہ اور علمی تحقیق کی بہت سی سہولتیں ان کتب خانوں میں موجود ہیں۔

۱ - ادارہ ثقافت اسلامیہ یہ ادارہ ۱۹۵۰ء میں قائم ہوا، گورنمنٹ اس کو مالی امداد دیتی ہے۔ اس ادارے کا مقصد دینِ اسلام کی روشنی میں حیاتِ جدیدہ کی تشکیل ہے تصنیف و تالیف و ترجمہ کا کام اس ادارے کے ذمے ہے۔ اب تک متعدد کتابیں اس ادارے سے شائع ہو چکی ہیں جن میں سے اکثر بہت مقبول ہوئی ہیں۔ ایک ماہنامہ بنام "ثقافت" بھی باقاعدہ نکل رہا ہے۔

اس ادارے کے کتب خانے میں اردو، فارسی، عربی اور انگریزی زبانوں کی ۵۵۰۰ کتابیں ہیں، کتابیں تقریباً ہر موضوع پر موجود ہیں۔ تیس کے قریب رسائل آتے ہیں۔ جو زیادہ تر مذہبی اور ثقافتی موضوعات پر ہیں۔ بالعموم وہ حضرات جو ادارے سے وابستہ ہیں اس سے استفادہ کر سکتے ہیں، لیکن اگر کوئی تحقیق کا شیدائی بھی اس سے فائدہ اٹھانا چاہے، تو اس کو بھی محروم نہیں کیا جاتا، کتابوں کی تقسیم ڈیوئی ڈیسیمل سسٹم کے مطابق ہے، کیٹیلاگ کارڈوں کی صورت میں ہے۔

۲ - ادارہ مجلس ترقی ادب یہ ادارہ بھی ۱۹۵۰ء میں قائم ہوا۔ حکومت مغربی پاکستان کا سرکاری ادارہ ہے، اس کا مقصد اُردو کے ذریعے اہل پاکستان کو جدید فکری رجحان سے روشناس کرانا ہے اس ادارے نے اب تک کئی قابلِ قدر کتابیں شائع کی ہیں، عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن کے شعبہ دار الترجمہ کی طرح دوسری زبانوں کی بہت سی کتابوں کے تراجم اُردو میں شائع کیے ہیں۔

اس ادارے سے ملحق لائبریری میں دو ہزار کتابیں ہیں۔ تقریباً ایک درجن جرائد آتے ہیں۔ اُردو، فارسی، عربی اور انگریزی زبانوں میں کتابیں موجود ہیں۔ انگریزی زبان میں کتابوں کی تعداد نسبتاً کم ہے، مجلسِ ترقی ادب کے اراکین لائبریری سے استفادہ کرتے ہیں۔ کتابوں کی فہرست کتابی شکل میں ہے، اس ادارے کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے پیش نظر اب اس لائبریری کو مزید وسعت دینے کا منصوبہ ہے۔ چنانچہ اس سال ۵ ہزار روپیہ فراہمی کتب کے لیے مختص کر دیا گیا ہے۔

۹ - سفارتی اور غیر ملکی کتب خانے

ان کتب خانوں کے علاوہ بیرونی سفارت خانوں کی نگرانی میں درس و مطالعہ کے چند اہم مراکز بھی قائم ہو چکے ہیں،

ان میں امریکی، برطانوی، جرمنی، ایرانی اور متحدہ جمہوریہ عربیہ کے ادارے خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں، ان کی بنیادی غرض غایت کچھ بھی ہو، مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے وجود نے لاہور کی علمی اور تہذیبی سرگرمیوں میں گوناگوں و بوقلموں اضافہ کر دیا ہے۔ علم و مطالعہ کے شیدائی سینکڑوں کی تعداد میں اپنی فکری و ذہنی تشنگی دور کرنے کے لیے یہاں آتے ہیں۔ ان اداروں کی تاسیس کا فائدہ ایک طرف تو یہ ہے کہ ان ممالک کے ساتھ پاکستان کے علمی، تعلیمی اور ثقافتی تعلقات و روابط استوار ہوتے ہیں۔ دوسری طرف علوم و فنون کے بین الاقوامی ذخائر سے افادہ و استفادہ کے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ ایسے سفارتی کتب خانوں کی مختصر کیفیت حسب ذیل ہے۔

۱۔ یو، ایس انفرمیشن سروس لائبریری
(کتب خانہ شعبہ اطلاعات ریاست ہائے متحدہ امریکہ)

دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں امریکی جنگی اطلاعات کے محکمے نے ایک ریفرنس (حوالہ جاتی) لائبریری لندن میں قائم کی، جو کہ امریکی مفاد کی اشاعت میں اس قدر موثر ثابت ہوئی، کہ اس قسم کی اور لائبریریاں ملبورن، سڈنی، ولنگٹن، جوہنز برگ، قاہرہ، سٹاک ہالم، لزبن اور میڈرڈ میں کھول دی گئیں۔

یہ سمندر پار لائبریریاں خبر رسانی کا ایک ایسا کارگر ذریعہ ثابت ہوئیں، کہ ۱۹۴۶ء میں یو، ایس کانگرس نے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کو اس قدر رقم عطا کی۔ کہ وہ موجودہ لائبریریوں کے اخراجات کو باقاعدگی سے چلا سکیں۔ اور دوسرے ممالک میں بھی ایسی لائبریریاں کھولیں، تاکہ امریکہ کی کہانی آزاد دنیا کے لوگوں تک پہنچے۔ چنانچہ آج ایسی ۱۶۵ لائبریریاں یورپ، لاطینی امریکہ، افریقہ، مشرقِ قریب اور مشرقِ بعید کے ۶۵ ممالک میں قائم ہیں۔ یہ ادارے امریکی شعبہ اطلاعات کے پروگرام کا ایک حصہ ہیں۔ اور ان کا خاص مقصد حکومت امریکہ کے اغراض و مقاصد کی تشریح کرنا، امریکی کلچر اور امریکی طرزِ زندگی سے دنیا کو روشناس کرانا ہے۔

امریکی شعبہ اطلاعات ایجنسی اپنے کتابی پروگرام کو ایک وسیع پیمانہ کی تعلیمی مہم تصور کرتی ہے اور محسوس کرتی ہے کہ سمندر پار امریکہ کے بارے میں اچھی رائے اور پائیدار دوستانہ مراسم قائم کرنے کے لیے ایسی کتابوں کی ترویج و اشاعت ناگزیر ہے۔ کیونکہ انہی مطبوعات کے ذریعہ تمام روئے زمین کے لوگ امریکی اقتصادیات، عمرانیات، اور ملک کی سیاسی اہمیت کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔

ادارہ یو، ایس، آئی، ایس لاہور کے کتب خانے میں اس وقت بارہ ہزار کتابیں انگریزی زبان کی اور دو سو کتابیں اردو زبان کی موجود ہیں۔ ان کے علاوہ انگریزی زبان کے ۲۰۲ جرائد باقاعدہ آتے ہیں۔ ممبران کی تعداد پانچ ہزار کے قریب ہے۔ اوسطاً ۶۵۰ اشخاص روزانہ لائبریری میں آتے ہیں۔ کتابیں دو سو سے ۲۵۰ تک روزانہ اشو کی جاتی ہیں۔ سال میں اوسطاً کوئی ۲۸۰۰ استفسارات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ گرمیوں میں لائبریری ۸½ بجے صبح سے ایک بجے تک اور شام کو ۴½ بجے سے ۷ بجے تک کھلتی ہے۔ سردیوں میں ۹½ بجے صبح سے ۴½ بجے شام تک کھلی رہتی ہے۔

گشتی کتب خانے ۔ امریکی شعبہ اطلاعات کے افسروں کو پاکستانیوں کی طرف سے بہت سے خطوط موصول ہوئے، جس میں انھوں نے پاکستان میں گشتی کتب خانے چلانے کی تجویز پیش کی، ان مراسلات میں یہ تجویز کی گئی تھی کہ دور افتادہ علاقوں میں رہنے والوں کو مطالعہ کتب سے مستفید ہونے کی سہولت مہیا کی جائے۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۵۶ء میں اس گشتی

کتب خانہ کا افتتاح کیا گیا، اور دو گشتی کتب خانے قائم کئے گئے۔ ہر گشتی کتب خانے میں ۱۲۰۰ کتابیں تقریباً ہر مضمون کی ہوتی ہیں۔ ان کے عنوانات افسانوں سے لے کر انجنیئرنگ تک اور بچوں کی مصور کتابوں اور رسالوں سے لے کر فلسفہ تک تعلق رکھتے ہیں۔ کتابیں اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں کی ہوتی ہیں۔

ان گشتی کتب خانوں کا مقصد صرف اسکولوں اور کالجوں کے طلبا اور اساتذہ کی ضروریات کو پورا کرنا نہیں ہے، بلکہ ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے اصحاب کی خدمت کرنا ہے، بیرونجات کے رہنے والے تمام اشخاص اس کے ممبر بن سکتے ہیں۔

ہر ممبر کو ایک ماہ کے لیے ایک کتاب اشو کی جاتی ہے۔ سروس فری ہے، ٹریولنگ لائبریری سروس تین ماہ گرمیوں میں گرمی کی شدت، اسکولوں اور کالجوں کے بند ہونے اور بارشوں اور سیلاب کی وجہ سے بند رہتی ہے، ٹریولنگ لائبریری لاہور سے سوات تک کا دورہ کرتی ہے۔

گشتی کتب خانے میں کتابوں کی تعداد ۹۹۷۳ ہے۔ جن کے منجملہ ۷۱۲۲، انگریزی اور ۲۸۵۱ اُردو زبان میں ہیں۔ ۹ ماہ میں تینتیس ہزار کتابیں اشو ہوتی ہیں۔ ممبروں کی تعداد ۲۷۰۰ ہے، ۴۵ شہروں میں یہ کتب خانے جاتے ہیں جسب ذیل ۱۲۲، ادارے اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں:

لڑکوں کے کالج	۱۵
لڑکیوں کے کالج	۳
لڑکوں کے اسکول	۳۷
لڑکیوں کے اسکول	۱۹
میونسپل لائبریریاں	۱۵
فیکٹری، کلب اور گورنمنٹ دفاتر	۳۳

۲۔ برٹش کونسل لائبریری

برٹش کونسل کا ثقافتی ادارہ آج سے ۲۵ سال پیشتر برٹش گورنمنٹ کی طرف سے قائم کیا گیا تھا۔ اس کی غرض و غایت سیاسی اور کاروباری تعلقات کے علاوہ دوسرے ملکوں کے ساتھ علمی، تعلیمی اور ثقافتی روابط قائم کرنا تھی، یہ ادارہ کرۂ ارض کے ۷۰ ممالک میں کام کر رہا ہے۔ جس میں ایسے ممالک بھی شامل ہیں جو کامن ویلتھ (دول مشترکہ برطانیہ) کے رکن نہیں ہیں۔ کونسل کے ذمے جہاں بہت سے دوسرے کام ہیں، وہاں سب سے اہم اور ضروری کام ان ممالک میں سو ایسی لائبریریوں کا انتظام کرنا ہے، جہاں سے حوالے جاتی کتابیں مستعار لی جا سکیں، چنانچہ ان لائبریریوں سے ہر سال ۱۱ لاکھ کتابیں مستعار لی جاتی ہیں۔

لاہور میں برٹش کونسل لائبریری ۱۹۴۹ء میں قائم ہوئی۔ اس میں کتابوں کی مجموعی تعداد ۲۲۱۶۲ ہے ۱۶۲۰۷ کتابیں عام قسم کی اور ۵۹۵۵ کتابیں نصاب کی ہیں۔ اس لائبریری کی یہ خصوصیت ہے کہ طلبا کے لیے انگلستان کی مطبوعہ نصابی کتابیں مہیا کرتی ہے۔ کالج کے طلبا کو اس سے بہت فائدہ اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ یہ نصابی کتب گھر میں مطالعہ کے لیے

بھی دی جاتی ہیں۔ یہ کتابیں زیادہ تعداد میں لائبریری کے لیے مہیا کی جا رہی ہیں۔ اُمید ہے اس سال کے آخر تک یہ تعداد دس ہزار تک ہو جائے گی۔

لائبریری کے کھلنے کے اوقات ۹ بجے صبح سے شام کے ۷ بجے تک ہیں۔ جمعہ کے روز لائبریری ½۱۲ بجے سے ½۲ بجے دن تک بند رہتی ہے، اتوار کو تعطیل ہوتی ہے۔

۱۰۴ رسائل انگریزی زبان میں مختلف موضوعات پر موصول ہوتے ہیں۔ اس لائبریری میں مطالعہ کرنے والوں کی اوسط تعداد روزانہ دو سو پچاس ہے۔

ہر شخص ممبر بن سکتا ہے، مگر اسے کسی معروف شخص کی تعارفی چٹھی لانی ضروری ہوتی ہے۔ اگر کتاب کے واپس کرنے میں زیادہ تاخیر ہو جائے تو ان صاحب کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔

ممبری کی فیس صرف پانچ روپے سالانہ ہے۔

۳۔ پاکستان جرمن کلچرل سنٹر لائبریری

جرمن ریڈنگ روم ۱۵ اگست ۱۹۵۸ء کو معرضِ وجود میں آیا۔ سنٹر کے افتتاح کی سادہ رسم (CENTRAL BANK) سنٹرل بینک بلڈنگ کی دوسری منزل میں ادا کی گئی۔ قرآن پاک کی تلاوت کی سعادت ایک جرمن مسلمان مسٹر محمد امان ہوبوم کو نصیب ہوئی۔

یہ ریڈنگ روم آہستہ آہستہ ثقافتی مرکز میں تبدیل ہو گیا۔ اس مرکز کا مقصد پاکستانیوں کو نہ صرف جرمن ثقافت سے روشناس کرانا ہے، بلکہ جرمنوں نے پاکستان کلچر کے بارے میں جو معلومات حاصل کی ہیں، ان سے پاکستانی عوام کو آگاہ کرنا اور اسی طرح جرمن کلچر کے بارے میں پاکستانی علماء کی معلومات سے دوسروں کو واقف کرانا بھی ہے، تاکہ پاکستان اور جرمنی کے درمیان باہمی ثقافتی اور دوستانہ تعلقات زیادہ استوار ہو سکیں۔

پاکستان میں جرمن کلچرل سنٹر کی لائبریری کے قیام سے پاکستانی عوام کو جرمنی مطبوعات، کتابیں، رسالے، اخبارات اور معلوماتی مواد کے حصول میں بڑی سہولت حاصل ہوئی ہے۔

پاکستانی مطالعہ کرنے والے جو لائبریری میں آتے ہیں۔ انھیں نہ صرف فیڈرل پبلک جرمنی کے بارے میں اساسی معلومات مہیا کی جاتی ہیں، بلکہ یورپ کے ان ممالک کے بارے میں بھی جو جرمن زبان بولتے ہیں، اور ان میں جو مختلف علوم ترقی پذیر ہیں یا ہو رہے ہیں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اس طرح ان کو یہ بھی اندازہ ہو سکے گا کہ مشرق خصوصاً اسلامی مشرق اور یورپ کے جرمن زبان بولنے والے علاقوں نے باہمی ذہنی اور عقلی مساعی میں کہاں تک کامیابی حاصل کی ہے۔

اس لائبریری میں دو ہزار کتابیں ہیں، جن کو ۲۴ شعبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ کتابیں جرمن، انگریزی، اور اردو زبانوں میں ہیں، موضوعات عام نوعیت کے ہیں، میکس پلانک کی مشہور کتاب تھیوریٹیکل فزکس سے لے کر لڈوگ ارہارڈٹ (ARHARDT) کی کتاب اکنومک ریکوری آف فیڈرل ریپبلک جرمنی تک یہاں موجود ہیں۔ گوئٹے کا فاؤسٹ، لڈوگ کرٹیس (CURTIUS) کا یوروپین لٹریچر اینڈ لیٹن مڈل ایجز (LATIN MIDDLE AGES)

تمام انگریزی میں ہیں۔ بہت سی جرمن سے ترجمہ شدہ کتابیں اُردو میں ہیں۔ لائبریری میں ڈاکٹر محمد اقبال کی کتابیں اور ان پر لکھی ہوئی کتابیں بھی موجود ہیں۔

لائبریری کے ساتھ ایک اخبارات اور رسائل کا شعبہ بھی ہے جس میں پاکستان اور جرمنی کے روزنامے، میگزین اور رسالے مصوّر اور غیر مصوّر باقاعدگی سے آتے ہیں۔

اس لائبریری کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک انفرمیشن سیکشن ہے جس میں جرمنی کے بارے میں ہر قسم کی اطلاع ملتی رہتی ہے۔

یہاں جرمن زبان پڑھانے کے لیے ایک کلاس بھی جاری ہے۔

۴۔ خانۂ فرہنگ ایران (ایرانی کلچرل سنٹر)

خانہ فرہنگ ایران، لاہور کا افتتاح ۱۹۵۵ء میں ہوا۔ لاہور سے پہلے اس طرح کا ایک ادارہ کراچی میں ایرانی سفارت کے زیر اہتمام کام کر رہا تھا۔ اس کا تعلق براہِ راست ایرانی کلچرل کا نسلر (مشیر ثقافت) کے ہاتھ میں تھا، اور اس کے مربی امیر کبیر ایران ہیں۔ یہ دونوں ادارے ایران کی وزارت فرہنگ (تعلیم) کے قائم کردہ ہیں۔ اور انہیں وہیں سے مالی اعانت ملتی ہے۔

خانہ فرہنگ لاہور میں ایک کتاب خانہ اور ایک قرات خانہ (دارالمطالعہ) ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ جدید فارسی کی کلاس ہوتی ہے، جو دوسرے ثقافتی مرکزوں میں موجود نہیں۔

کتاب خانے میں فی الحال کتابوں کی تعداد زیادہ نہیں۔ کتابیں دو نوع کی ہیں۔ درسی اور علمی و ادبی۔ درسی کتابیں جو وزارت فرہنگ ایران مہیا کرتی ہے، ایران کے محکمہ تعلیم کے حکم کے مطابق طلبا کو مفت دی جاتی ہیں۔ نصابی کتابوں کے سینکڑوں نسخے موجود ہوتے ہیں۔ تاکہ نئے طلبا کو کوئی دقت نہ ہو۔

علمی کتابوں میں سردست ایسی کتابیں زیادہ ہیں جو سائنسی مضامین پر مشتمل ہیں، اور بالعموم یورپین زبانوں کا ترجمہ ہیں۔ ادبی کتابوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اس کتب خانے کو کوئی چار ہزار کتابیں جلد موصول ہونے والی ہیں۔

اخبارات و رسائل میں تقریباً تمام اہم چیزیں ایران سے ہر ہفتے اور ہر مہینے پہنچتی ہیں۔ جن میں چند قابلِ ذکر حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ ادبی مجلات

- الف۔ یغما۔ ماہنامہ
- ب۔ سخن
- ج۔ مجلہ ادبیات تہران
- د۔ مجلہ ادبیات تبریز

۲۔ فنی مجلات

- الف۔ مجلہ موسیقی

ب ۔ مجلہ رادیو ایران

۳ ۔ بچوں اور عورتوں کے رسالے

۴ ۔ ہفتہ وار اخبارات

ا ۔ اطلاعات

ب ۔ روشنفکر

۵ ۔ کچھ روزانہ اخبارات بھی بذریعہ ہوائی ڈاک آتے ہیں ۔

یہ تمام رسالے اور اخبار فارسی میں ہیں ۔ ان کے علاوہ سرکاری اداروں کے کچھ رسالے یا سالانہ روداد یں بھی باقاعدہ پہنچتی رہتی ہیں ۔

کتابوں کی کمی کے باعث ابھی تک ممبر شپ کا سلسلہ جاری نہیں کیا گیا ۔ البتہ لوگ دارالمطالعہ (قرأت خانہ) میں جو کتاب چاہیں بیٹھ کر پڑھ سکتے ہیں ۔

کلاسیں شام کو ہوتی ہیں ۔ تاکہ ہر شخص فرصت کے اوقات میں شریک ہو سکے ۔ ایک کلاس ابتدائی ہوتی ہے ، اور ایک اس سے اونچی ۔ جس میں زیادہ تر اسکولوں اور کالجوں کے طلباء ہوتے ہیں ۔ یا وہ حضرات جو پہلے سے فارسی جانتے ہیں ۔ اور فقط اپنا لہجہ درست کرنے اور فارسی بول چال کی مہارت پیدا کرنا چاہتے ہیں ۔

خانہ فرہنگ صبح ۸ بجے سے ۱۲ بجے دوپہر تک اور پھر شام کو ۴ بجے سے ½۷ بجے تک کھلا رہتا ہے ۔ ان اوقات میں موسم کے مطابق وقتاً فوقتاً تبدیلیاں بھی ہوتی ہیں ۔

۵ ۔ عرب کلچرل سنٹر | مرکز الثقافی العربی کی اصل غرض و غایت علوم ثقافتی کی توسیع و اشاعت ہے ۔ اور اس طرح علوم عربیہ کی اشاعت کی غرض یہ ہے ، کہ متحدہ جمہوریہ عربیہ کی عمرانی ، ثقافتی اور ادبی ترقیات سے پاکستانی عوام کو روشناس کرایا جائے ۔ اور عربی زبان کی تعلیم و تدریس بھی ہو سکے ، چنانچہ عربی زبان میں کلاسوں کا باقاعدہ اہتمام کیا گیا ہے ۔

کتب خانے کی کتابیں ہنوز موصول نہیں ہوئیں ۔ لیکن اُمید کی جاتی ہے کہ جلد ہی کتابوں کی تعداد دس ہزار سے زیادہ ہو جائے گی ، جو علوم اسلامی ، لغتِ عربی ، ادب ، تاریخ ، فلسفہ ، جغرافیہ اور اقتصادیات پر مشتمل ہوں گی ، یہ کتابیں عربی میں بھی ہوں گی اور انگریزی میں بھی ، عربی اخبارات و رسائل کے علاوہ پاکستان کے عربی مجلے بھی منگوائے جائیں گے ۔

بچوں اور عورتوں کے لیے بھی علیحدہ شعبے قائم کیے جائیں گے ۔ ایک چھوٹا سا ہال بھی لائبریری سے ملحق ہو گا ، جہاں مختلف موضوعات پر تقریریں کرائی جائیں گی ، اس کی رکنیت کے لیے کوئی پابندی نہیں ہو گی ۔ خواہشمند اصحاب بلا تکلف اس لائبریری کے رکن بن سکیں گے ۔

۶ ۔ مڈل ایسٹ ریسرچ لائبریری | ادارہ امریکن فرینڈز آف دی مڈل ایسٹ ۱۹۵۸ء میں کراچی میں قائم ہوا ۔ اس ادارہ کے قیام کا مقصد شمالی افریقہ سے افغانستان اور پاکستان

ملک کے رہنے والوں میں باہمی شناسائی پیدا کرنا، اور آپس میں معاشرتی، اقتصادی، اور ملکی روابط کا استوار کرنا ہے، نیز ریاستہائے متحدہ امریکہ کے لوگوں کو مشرقِ وسطیٰ کے تاریخی واقعات و حقائق اور بدلتے ہوئے حالات سے آگاہ کرنا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کے جو طلباء امریکی یونیورسٹیوں میں داخلہ لینا چاہتے ہیں، ان کی مدد کرنا، اور ان طلباء کو امریکی ماحول سے روشناس کرانا بھی، اس کے اغراض میں داخل ہے۔

اس ادارہ کے تحت ایک لائبریری بنام مڈل ایسٹ ریسرچ لائبریری ۱۹۵۸ء ہی میں قائم کی گئی۔ ماہِ اگست ۱۹۶۱ء میں یہ ادارہ اور لائبریری کراچی سے منتقل ہو کر سر دست حبیب اللہ روڈ، جو ڈیوس روڈ لاہور کی ایک شاخ ہے، میں آ گئے ہیں۔ لیکن اس ادارہ اور لائبریری کے لیے ایک موزوں اور مناسب عمارت کی تلاش جاری ہے۔

اس لائبریری میں اڑھائی ہزار مطبوعہ کتابیں ہیں۔ ۷ جرائد باقاعدگی سے آتے ہیں۔ یہ کتابیں ممالک مشرقِ وسطیٰ اور وسطی ایشیا کے معلوماتی اور تحقیقی مواد پر مشتمل ہیں۔ کیونکہ لائبریری در اصل ایک تحقیقی لائبریری ہے۔ اس لائبریری سے زیادہ تر استفادہ محققین ہی کرتے ہیں۔ ہر وہ شخص جس کو مشرقِ وسطیٰ کے معاملات سے دلچسپی ہے اس کا ممبر بن سکتا ہے۔

اس لائبریری کے لاہور میں منتقل ہو جانے سے لاہور کی لائبریریوں میں قابلِ قدر اضافہ ہوا ہے۔

کتابوں کی ترتیب ڈیوئی ڈیسیمل سسٹم کے مطابق ہے۔ ڈکشنری اور کلاسیفائیڈ دونوں طرح کے کیٹلاگ موجود ہیں۔ جو کارڈوں پر تیار کئے گئے ہیں۔ دن کے ایک بجے سے شام ۷ بجے تک روزانہ کھلی رہتی ہے۔

۷۔ ٹیکنیکل ریفرنس لائبریری آف دی یونائیٹڈ سٹیٹ آپریشن مشن ٹو پاکستان[۱]

یہ لائبریری ریاست ہائے متحدہ کے پاکستانی تجارتی مشن لاہور نے اپنے دفتر واقع لاہور میں قائم کی ہے۔

اس لائبریری کے قیام کی غرض امریکی سامان اور مصنوعات کے متعلق کاروباری اور تجارتی معاملات کے سلسلے میں مفید معلومات اور طریق کار سے آگاہی حاصل کرنا ہے۔ اس کے دائرۂ کار میں زراعت، پرورشِ حیوانات، اور دوسرے صنعتی اور اقتصادی امور داخل ہیں۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے امریکی صنعت کاروں کی فہرست، ان کے دستور نامے، سامان کی جانچ پڑتال کے موضوعات پر مشتمل بہت بڑا ذخیرہ معلومات اس لائبریری میں موجود ہے۔ جس سے درآمد کنندگان کو بڑی مدد ملتی ہے، پاکستان میں ہمہ نوعی کاروباری ادارہ چالو کرنے اور مختلف صنعتی و تجارتی انتظامات کے اجرا کے لیے جن اعداد و شمار، تجاویز اور تخمینوں کے فراہمی کی ضرورت پڑتی ہے یہاں کا ضخیم کتب خانہ ان سب امور کے متعلق معلومات مہیا کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اور اگر ضروری ہو تو فہرست سامان مطلوبہ کی فرمائشوں کی ترتیب میں مدد دیتا ہے۔

امریکی تجارتی مشن کا یہ کتب خانہ صرف اہلِ تجارت ہی کے لیے سہولت کار کا ذریعہ نہیں ہے۔ بلکہ دوسرے اقتصادی اور معاشرتی ذرائع ترقی کے لیے بھی سود مند ہے۔

۱۔ TECHNICAL REFERENCE LIBRARY OF THE UNITED STATES OPERATION MISSION TO PAKISTAN. (امریکی امور تجارت کی معلوماتی لائبریری)

چند اصطلاحات کی تشریح

(۱) کھلی الماری OPEN SHELF اور مقفل یا بند الماری CLOSE SHELF یہ دو اصطلاحیں کتب خانے کی کتابوں سے مستفید ہونے کے دو مختلف طریقوں کے نام ہیں۔ مقفل یا بند الماریوں کا طریقہ یہ ہے، کہ عام حالت میں پڑھنے والوں کو اس بات کی اجازت نہیں دی جاتی کہ وہ خود الماریوں سے مطالبہ کتاب انتخاب کر سکیں۔ اگر انھیں کسی کتاب کی ضرورت ہو، تو وہ ایک پرچہ پر کتاب کا نمبر لکھتے ہیں جسے لائبریری کے کارندے شلف پر سے لا کر انھیں دے دیتے ہیں، کھلی الماریوں کے طریق کار میں پڑھنے والوں کو عام اجازت ہوتی ہے، کہ وہ لائبریری میں آزادی سے گھومیں، سیدھے شلف پر جائیں اور کتابوں کا انتخاب وہیں کریں۔

مقفل یا بند الماری کو آج رجعتی اور قدیمی طریق تصور کیا جاتا ہے۔ اور کھلی الماری کو ترقی پذیر اور آگے بڑھتا ہوا قدم خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے، کہ اب تک ہمارے بیشتر کتب خانوں میں بند الماری کا طریقہ رائج ہے، کیونکہ باوجود آزاد ہونے کے ہم میں ابھی تک قومی شعور پیدا نہیں ہوا، اور اندیشہ ہے، کہ اگر کھلی الماری رکھی جاتے تو بہت زیادہ کتابیں گم ہوں، اور لائبریری کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے۔

(۲) فہرست کتب کی تیاری کے دو طریقے ہیں۔ ایک کتابی صورت میں، دوسرے کارڈوں کے اوپر، کتابی کیٹلاگ کے جہاں فائدے ہیں۔ ان میں ایک کمی یہ ہے کہ ایک بار فہرست کتب کے کتابی صورت میں چھپ جانے کے بعد پھر اس کے ضمیمے شائع کرنے پڑتے ہیں، تا اشاعت ضمیمہ کیٹلاگ نامکمل رہتا ہے۔ اگر کسی بڑی لائبریری میں بہت سے ضمیمے چھپے ہوتے ہوں۔ تو قاری کو مطلوبہ کتب کی دریافت کے لیے متعدد فہرستوں کو دیکھنا پڑتا ہے۔ جس سے بعض اوقات طالب کتاب گھبرا جاتا ہے۔ اور کافی وقت ضائع ہوتا ہے۔ یہ پرانا طریقہ ہے، جدید طریقہ یہ ہے، کہ کارڈوں پر کیٹلاگ تیار کیا جاتا ہے، ہر کتاب کے کئی کارڈ بنائے جاتے ہیں۔ اور پھر فوراً ہی انھیں کارڈوں کے ڈبے میں اپنے مقام پر منسلک کر دیا جاتا ہے۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ کیٹلاگ ہر وقت مکمل رہتا ہے۔ وقت کی بچت ہو جاتی ہے، اور فی الفور کتاب کے بارے میں معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔

پھر ان فہرستوں کی دو قسمیں ہیں، ایک تو ڈکشنری کیٹلاگ (الفبائی فہرست) اور دوسرا کلاسیفائیڈ کیٹلاگ (مضمون وار فہرست کتب)۔ ڈکشنری کیٹلاگ کو عام ڈکشنری کی طرز پر ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کی ترتیب حروف ابجد کے لحاظ سے ہوتی ہے، کلاسیفائیڈ کیٹلاگ کی ترتیب مضمون وار ہوتی ہے، بیشتر لائبریریوں میں ڈکشنری کیٹلاگ تیار کیا جاتا ہے۔

(۳) ڈیوئی ڈیسیمل کلاسیفکیشن (ڈیوئی کی اعشاری تقسیم) یہ ایک امریکی تقسیم ہے، جس کے ذریعے علم کے مختلف شعبوں کی مربوط طریق سے درجہ بندی کی گئی ہے، جس میں ہر موضوع کی فطری ترتیب کا خیال رکھا گیا ہے۔ یہ ایک بہت عام فہم اور ہر دلعزیز اسکیم ہے، جو دنیا کی بہت سی لائبریریوں میں رائج ہے، پاکستان کی تقریباً سب ہی لائبریریوں نے اسی اسکیم کو اختیار کیا ہے۔

شاہی قلعہ

پروفیسر یوسف جمال انصاری

قلعۂ لاہور مغلوں کے فنِ تعمیر کا ایک بے نظیر شاہکار ہے۔ فنِ تعمیر کو دوسرے فنونِ لطیفہ کے مقابلے میں ہمیشہ ایک عظمت حاصل رہی ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے فنِ تعمیر ہی ایک ایسا فن ہے جس پر علمائے مذہب نے کوئی گرفت نہیں کی ورنہ موسیقی، رقص حتیٰ کہ مصوری اور شاعری تک بعض علماء کے نزدیک قابلِ اعتراض رہی ہیں لیکن جہاں تک فنِ تعمیر کا تعلق ہے اسے روحِ اسلام کا پیکر کہنا درست ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اس فن نے اسلامی دور میں دوسرے فنونِ لطیفہ کے مقابلے پر زیادہ ترقی کی ہے۔ جہاں جہاں اسلامی تہذیب پھیلی مسلمانوں نے نادر و پائدار عمارات بنائیں جن میں سے بعض بجا طور پر دنیا کی بہترین عمارتیں قرار دی گئی ہیں۔ اس میں مشرق و مغرب کی تخصیص نہیں، برِّعظیم پاک و ہند میں مغلوں کا دور اسلامی تاریخ کا سنہری دور تھا۔ چنانچہ قلعۂ لاہور، قلعۂ دہلی، قلعۂ اکبرآباد، جامع مسجد دہلی، شاہی مسجد لاہور، تاج محل آگرہ اسلامی فنِ تعمیر کے نوادرات کی حیثیت رکھتے ہیں۔

فنِ تعمیر کسی قوم کے تہذیبی مزاج کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اگر آپ کو کسی قوم کا کردار معلوم کرنا ہو تو آپ اس قوم کی بنائی ہوئی عمارتیں دیکھیں۔ اگر وہ قوم جنگجو اور عبادت گزار ہے تو وہ قلعے اور عبادت گاہیں تعمیر کرے گی۔ اگر وہ قوم عیش پسند ہے تو کلب گھر اور شراب خانے بنائے گی اور جمہوریت پرست ہے تو اس کے شہر کھلے ہوئے اور وسیع ہوں گے۔ انھیں شہر پناہ کی ضرورت نہ ہوگی۔ ایوان اور محل بنانے کی بجائے وہ اسمبلی ہال اور پارلیمنٹ چیمبر اور ٹاؤن ہال تعمیر کرے گی۔ بصورتِ دیگر وہاں اونچے اونچے ایوان اور عشرت کدے بنانے کا رواج پایا جائے گا۔ اسی طرح فنِ تعمیر ادوار زمانہ کی عکاسی کرتا ہے۔ ہر دور کے اپنے معاشرتی اور تہذیبی سانچے ہوتے ہیں۔ بارود کی ایجاد سے پہلے جب جنگ تلواروں اور نیزوں سے ہوتی تھی ضرورت تھی کہ ہر شہر کے گرد شہر پناہ ہو اور ہر شہر پناہ کے متصل ایک مضبوط قلعہ جس کی دیواریں محاصرہ کرنے والوں پر خندہ زن ہوں، اُدھر حملے کی خبر آئی اِدھر شہر پناہ کے دروازے مقفل کر لیے گئے، قلعے کا پھاٹک بند ہو گیا، اب محاصرہ کرنے والے ہیں کہ تیر پہ تیر چلا رہے ہیں اور اہلِ قلعہ و اہلِ شہر ہیں کہ اندر مطمئن بیٹھے ہیں لیکن بارود کی ایجاد نے ثابت کر دیا کہ مضبوط سے مضبوط قلعہ بھی سر کیا جا سکتا ہے۔ ٹینک بنائے گئے تو بم ایجاد ہوئے اور آخر میں ہوائی جہازوں سے حملے کیے جانے لگے۔ اس کے بعد مضبوط قلعہ اور شہر پناہ چنداں اہم نہ رہے۔ ٹینک تو خود ہی چلتا پھرتا قلعہ ہے اور توپوں کی زد پر کیسی ہی مضبوط عمارت کیوں نہ ہو تودۂ خاک سے زیادہ وقیع نہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے دور میں کھلے شہر اتنے ہی محفوظ یا غیر محفوظ ہوں گے جتنے کہ وہ مقامات جن کے گرد بھاری بھرکم دیواریں ہوں۔ اسی لیے موجودہ زمانے میں کھلے شہر بسائے جاتے ہیں۔ صنعتی ترقی کے دور میں کارخانوں، ملوں اور دفتروں کی تعمیر پر زور ہے۔

قرونِ وسطیٰ کا زمانہ یورپ میں بارھویں صدی سے سولھویں صدی تک کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ مشرق میں یہ دور اٹھارویں صدی تک ہے۔ جب انگریز یہاں پہلے پہل آئے اس وقت بھی برصغیر پاک و ہند میں وہ خصوصیات ختم نہ ہوئی تھیں جو قرونِ وسطیٰ سے مخصوص ہیں۔ وہی جاگیردارانہ نظام تھا۔ وہی امرا کے محل اور قلعے، وہی تلواریں، نیزے اور زیادہ سے زیادہ ٹوپی دار بندوقیں یا پرانی وضع کی توپوں سے جنگ کرنے کا طریقہ رائج تھا۔ مغلوں کے دور میں اگرچہ بارود کا استعمال شروع ہی سے پایا جاتا ہے اور مغل بادشاہ بابر کا ابراہیم لودھی پر کامیاب ہونا بارود کی فوقیت کا بین ثبوت ہے تاہم بابر کا دور مشرقی تہذیب کے اعتبار سے قرونِ وسطیٰ ہی کا دور تھا اور بابر سے اورنگ زیب تک بلکہ اس کے کچھ عرصے بعد بھی قرونِ وسطیٰ کا تسلسل قائم رہتا ہے۔ قرونِ وسطیٰ کی نمائندہ تعمیریں دو ہیں۔ قلعہ اور عبادت گاہ، چنانچہ یورپ میں اس دور میں عظیم الشان قلعے اور عظیم الشان گرجا گھر تعمیر ہوئے۔ اس اندازِ تعمیر کا نام گوتھک (GOTHIC) ہے۔ عمارات کا رُخ آسمان کی جانب ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت انسان آسمان تک پہنچنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ گرجا گھر کے مینار اپنی بلندی کے ذریعے توحید و تثلیث کی علامت تصور کیے جاتے ہیں۔ اس قسم کی عمارات سطح زمین پر وسیع ہوتی ہے اور جتنی بلند ہوتی جاتی ہے اتنی ہی اس کی چوڑائی کم ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ ایک باریک نقطے پر ختم ہو جاتی ہے۔ اسلامی طرزِ تعمیر میں گرجا کی جگہ مسجد نے لے لی۔ چنانچہ مغلوں کی بنائی ہوئی مساجد میں وہی امتیازی خصوصیات ہیں جو قرونِ وسطیٰ کے کلیساؤں کی شانِ امتیاز ہیں۔ مغل مساجد عظمتِ الٰہی کی علامت ہیں۔ قرونِ وسطیٰ میں عظمت و رفعت کا تصور مقبول تھا۔ خواہ اسلامی مسجد ہو، خواہ مسیحی کلیسا، مغربی وضع کا قلعہ ہو یا ہندوستانی طرز کا قلعہ، عظمت و رفعت کا تصور دلائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مسجد کے دونوں جانب ایک ایک مینار اور درمیان میں ایک سب سے اونچا مینار یہ تصور پیش کرتا ہے کہ لامحدود عظمت کو محدود کر کے اس کا رشتہ خدائے واحد کی عظمت سے منسلک کیا جائے۔ درمیانی مینار گویا اس منبع عظمت کی جانب اشارہ کر رہا ہے جو سرچشمۂ توحید ہے۔ مسجد کے علاوہ قرونِ وسطیٰ میں عظیم و پائدار قلعے تعمیر ہوئے، جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے قلعہ اس دور کی اہم ترین ضرورت تھی۔ مسجد کا تعلق عوام کی روحانی زندگی سے ہے اور قلعے کا تعلق اس خاص دور میں عوام کی مادی زندگی سے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مغلوں نے عظیم و پائدار قلعے تعمیر کیے۔ یہ قلعے آج بھی ہمیں اسلامی سطوت کی یاد دلاتے ہیں۔ لاہور کا قلعہ دہلی اور آگرے کے قلعوں کی طرح مغلوں کی عظمت کا آئینہ دار ہے۔

قلعۂ لاہور کے لیے جو جگہ منتخب کی گئی وہ ایک اونچا ٹیلہ تھا جس کی سطح شہر لاہور کی سطح سے بلند تر تھی۔ مغل قلعوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے۔ قلعوں کو ٹیلوں پر تعمیر کرنا فنِ حرب سے آگاہی پر دلیل ہے اس لیے کہ بلند مقام سے محاصرہ کرنے والی فوج کے خلاف آسانی کے ساتھ جنگی کارروائی کی جا سکتی ہے اور خود قلعے کی مدافعت میں بھی آسانی رہتی ہے۔ چنانچہ لاہور کی شاہی مسجد اور لاہور کا قلعہ ایک سطح مرتفع پر واقع ہیں۔ ۱۹۵۹ء میں قلعۂ لاہور کے گرد و پیش جو کھدائی ہوئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لاہور ایک پرانا شہر ہے۔ قدیم لاہور کے آثار جو اس کھدائی سے ظاہر ہوئے ہیں وہ اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ جس ٹیلے پر قلعہ لاہور واقع ہے وہ پرانی تہذیبوں کا مدفن ہے۔ پرانی تہذیبوں کی مختلف تہیں ایک پر ایک جمی ہوئی ہیں۔ سب سے نیچے اینٹوں کی بنی ہوئی مورتیاں برآمد ہوئی ہیں جو اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ کبھی اس مقام پر ایک بت پرست قوم آباد تھی۔ پھر اسلامی تہذیب کے آثار ملتے ہیں۔ پرانے سکے جو اس کھدائی کے بعد دستیاب ہوئے ہیں ان میں محمود غزنوی کا طلائی سکہ بھی موجود ہے۔ بہرحال جب شہنشاہ اکبر نے یہ مقام قلعے کے لیے منتخب کیا ہوگا اس وقت یہ ٹیلہ مٹی کا ایک ڈھیر ہوگا جس کے نیچے خواہ کتنے ہی تہذیبی خزانے محفوظ ہوں اوپر مٹی ہی مٹی ہوگی۔ یہ قلعہ شہر لاہور کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ اس کے بعد غالباً کوئی آبادی نہ تھی

اور یہاں آکر قدیم شہر ختم ہوجاتا تھا۔ شمال کی جانب سے آنے والے حملہ آور دریائے راوی پار کرنے کے بعد جب شہر لاہور پر حملہ کرنا چاہتے تو یہ قلعہ ان کی راہ میں حائل ہو سکتا تھا۔ اس لحاظ سے لاہور کی مدافعت کے لیے اس سے بہتر جگہ ممکن نہ تھی۔

بنا بریں ہم اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ موجودہ قلعۂ لاہور سے پہلے بھی اگر کوئی قلعہ یہاں ہوگا جو امتداد زمانہ سے نابود ہوگیا تو وہ یہیں کہیں ہوگا جہاں اب قلعہ لاہور واقع ہے۔ تاریخ کے معلم البیرونی کے زمانے سے قلعہ لاہور کا ذکر سنتے چلے آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ البیرونی سے لے کر ابوالفضل تک جن مورخین نے قلعۂ لاہور کا ذکر کیا ہے ان کی نظر میں مختلف قلعے ہوں گے جو مختلف زمانوں میں تعمیر ہوئے ہوں گے اور پھر رفتہ رفتہ معدوم ہوگئے ہوں گے۔ اس امر پہ جملہ مورخین متفق ہیں کہ ہر قلعہ شہر لاہور سے متصل ہی تھا اور یہ بھی کہ ہر قلعہ شمال سے آنے والے حملہ آوروں کی مدافعت کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔ مثال کے طور پر محمد سام کے حملۂ لاہور (۱۱۸۶ء) کے موقع پر یہاں ایک قلعہ موجود تھا۔ منگول حملہ آوروں نے ۱۲۴۱ء میں ایک قلعے کو منہدم کردیا۔ بلبن نے ۱۲۶۷ء میں ایک قلعہ تعمیر کیا۔ جب تیمور ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو اس نے لاہور کا قلعہ ۱۳۹۸ء میں مسمار کردیا۔ مسمار قلعے کا کہیں نشان نہیں ملتا۔ غالباً وہ قلعہ بھی وہیں واقع تھا جہاں موجودہ قلعہ واقع ہے۔ ہم آسانی سے اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ اسلامی عہد سے پہلے اور اسلامی عہد میں جتنے قلعے تعمیر ہوئے وہ سب محلِ وقوع کے اعتبار سے ایک ہی مقام پر تعمیر ہوئے۔ یہ محلِ وقوع وہی ہے جہاں اب قلعۂ لاہور واقع ہے۔ اکبر اعظم کے متعلق آئینِ اکبری سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے موجودہ قلعہ تعمیر کرنے سے پہلے ایک پرانے قلعے کو منہدم کرایا جو کچا تھا اور مٹی سے بنا ہوا تھا۔ یہ غالباً وہی قلعہ تھا جو سلطان مبارک شاہ نے ۱۴۲۱ء میں تعمیر کیا تھا۔

قلعۂ لاہور کی تعمیر کس سنہ میں شروع ہوئی اور کب تکمیل کو پہنچی اس کے متعلق ابھی تک ہمارے پاس کوئی حتمی شہادت موجود نہیں ہے۔ آئینِ اکبری سے یہ توقع رکھنی بجا ہو سکتی تھی لیکن آئینِ اکبری حیرت انگیز طور پر اس باب میں خاموش ہے تاہم یقین کیا جاسکتا ہے کہ ۱۵۶۶ء میں یہ قلعہ تعمیر ہوچکا تھا۔ ۱۵۶۶ء میں مرزا محمد حکیم نے شاہنشاہ اکبر کے خلاف بغاوت کی۔ اس سلسلے میں آئینِ اکبری میں قلعۂ لاہور کا ذکر آتا ہے جس سے نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ قلعۂ لاہور ۱۵۶۶ء میں موجود تھا لہٰذا اس کی تعمیر کئی سال پہلے سے ہو رہی ہوگی۔ لاہور قدیم و جدید (PAST AND PRESENT) مصنفہ ڈاکٹر محمد باقر میں شہنشاہ اکبر کے ۱۲ سنہ جلوس کو قلعے کی تاریخ تعمیر بتایا گیا ہے۔ اکبر ۱۵۵۶ء میں تخت نشین ہوا تھا۔ اس طرح لاہور کا قلعہ ۱۵۶۸ء میں تعمیر ہونا چاہیے لیکن آئینِ اکبری سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرزا محمد حکیم کی بغاوت کے وقت یعنی ۱۵۶۶ء میں یہ قلعہ موجود تھا البتہ اس قلعے میں دورِ اکبری سے دورِ شاہجہانی تک تعمیر کا سلسلہ جاری رہا یعنی اندرونِ قلعہ میں عمارات کی توسیع ہوتی رہی اور نئی عمارتیں بھی بنائی جاتی رہیں۔ یہ صورت سکھ دور میں اور انگریزی عمل داری میں بھی رہی۔ ان دونوں زمانوں میں قلعے کے اندر تبدیلیاں واقع ہوئیں جن کا مفصل حال آئندہ آئے گا۔ تاہم یہ نتیجہ نکالنا قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے کہ قلعے کی چار دیواری ۱۵۶۶ء میں تکمیل کو پہنچ چکی تھی اور تاریخ میں قلعۂ لاہور کا نام اکبری قلعہ کے نام سے رواج پاچکا تھا۔

قلعۂ لاہور چار منزلوں میں تعمیر ہوا ہے۔ کچھ عمارات وہ ہیں جو بانی قلعہ شہنشاہ اکبر نے اپنے دور کے مختلف اوقات میں بنوائیں۔

دیوان خانۂ عام دورِ اکبری ہی کی تعمیر ہے۔ چنانچہ بدایونی نے جو اکبر کا ہم عصر تھا دیوانِ عام کا نقشہ اپنی تاریخ میں کھینچا ہے۔ تعمیر کے وقت سے اب تک دیوانِ عام کی عمارت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ ۲۲ ربیع الثانی ۹۹۶ھ مطابق ۲۹ دسمبر ۱۵۸۷ء (سالِ جلوس ۳۲ سنہ یا ۳۳ سنہ) میں اکبر نے دولت خانۂ عام میں نوروز کا دربار منعقد کیا تھا۔ اکبر شاہی عمارتیں اس دیوانِ عام کے علاوہ کون کون سی ہیں؟ یہ وثوق کے ساتھ

نہیں کہا جا سکتا ممکن ہے کہ بعض عمارات میں جہانگیر اور شاہجہان نے توسیع کی ہو اور اب یہ کہنا ممکن نہیں کہ اصل عمارت کی صورت کیا تھی، البتہ یہ ظاہر ہے کہ قلعے کے صحن میں کتنے ہی محل اور ایوان ہوں گے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ شمال کی جانب جو محل تعمیر کیے گئے ان کی سطح نسبتاً نیچی ہونی چاہیے تھی اس لیے ان کے نیچے تہ خانے تعمیر کیے گئے تاکہ عمارات کی سطح اونچی رہے۔ اکبر کے دور کی عمارات شمال مشرق میں واقع ہوں گی جو اب انقلاب زمانہ سے مٹ چکی ہیں۔ ان میں سے بعض کو دانستہ بھی گرایا گیا ہو گا تاکہ ضروریات کے مطابق نئی عمارات بنائی جائیں۔ دولت خانہ جہانگیری اور دیوان عام شاہجہانی (۱۶۲۸ء) تعمیر کرتے وقت اکبری عہد کی عمارات کو گرانا پڑا ہو گا یا ان میں سے بعض کو نئی عمارتوں میں ضم کر لیا گیا ہو گا۔

قلعہ لاہور کی دوسری منزل وہ ہے جہاں شہنشاہ جہانگیر نے اپنا محل تعمیر کرایا جو جہانگیری محل کے نام سے مشہور ہے۔ یہ محل ۱۶۱۷ء میں بن کر تیار ہوا اور تزک جہانگیری میں درج ہے کہ معمور خان نے اس کی تعمیر اور نگرانی میں حصہ لیا۔ جہانگیر نے اس محل کو دولت خانہ کہہ کر پکارا ہے ۱۶۱۹ء میں شاہجہان نے (جو اس وقت شہزادہ تھا) لاہور آ کر اس نو تعمیر محل کی سیر کی اور اگلے سال خود شہنشاہ جہانگیر نے اس محل میں قدم رنجہ فرمایا۔

قلعہ لاہور کی تیسری منزل وہ تعمیرات ہیں جو دور شاہجہانی میں مکمل ہوئیں۔ ہاتھی پول یعنی وہ دروازہ خاص جو شاہجہان کے حکم سے بنایا گیا، ۱۰۴۱ھ مطابق ۳۲-۱۶۳۱ء میں تیار ہوا۔ دولت خانہ خاص و عام کی تعمیر شاہجہان کے حکم سے ۱۶۲۸ء میں عمل میں آئی اور ۱۶۳۱ء میں شاہ برج تعمیر ہوا۔ یہ وہی عمارت ہے جو شیش محل کے نام سے مشہور زمانہ ہے۔ ڈاکٹر باقر نے اپنی کتاب میں ایک عام غلطی کا ازالہ کیا ہے۔ شاہ برج کی بعض عمارات کو جہانگیر سے اور نولکھے کو اورنگ زیب سے منسوب کر کے عام مورخین نے غلطی کی ہے۔ ڈاکٹر باقر نے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ عمارات شاہجہان کی تعمیر کردہ ہیں۔ شاہجہان نے اور بھی کئی عمارتیں قلعے میں تعمیر کیں۔

قلعہ لاہور کی چوتھی منزل وہ عمارات ہیں جو شہنشاہ اورنگ زیب نے تعمیر کرائیں۔ قلعے کا مغربی دروازہ عالمگیری دروازہ کہلاتا ہے اور حضوری باغ کے متصل ہے۔ اس دروازے کے بالکل سامنے شاہی مسجد کا صدر دروازہ ہے۔ اورنگ زیب نے موتی گاہ کے نام سے ایک عمارت امرا کے لیے تعمیر کروائی۔ مختصر یہ کہ قلعہ لاہور کی تعمیر ان چار منزلوں پر ہوئی۔

آیئے اب ہم قلعہ لاہور کی سیر کریں۔ اس قلعے کی سیر کو ایک خلقت جاتی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد دنیا کی مشہور شخصیتیں جنہوں نے اس قلعے کی سیر کی اگر شمار کی جائیں تو ان کی تعداد کے لیے کئی صفحے درکار ہوں گے۔ ان میں سے چیدہ چیدہ یہ ہیں:

۱۔ شہنشاہ ایران محمد رضا شاہ پہلوی (۱۰ مارچ ۱۹۵۰ء)

۲۔ شہزادۂ عراق عبداللہ مرحوم (۱۹ مارچ ۱۹۵۴ء)

۳۔ شاہ عراق فیصل دوم مرحوم (۱۹ مارچ ۱۹۵۴ء)

۴۔ صدر جمہوریہ ترکی جلال بایار (۲۳ فروری ۱۹۵۵ء)

مادام بایار (" ")

۵۔ شاہ حسین اول شاہ اردن مع ملکہ زین اشرف مادر شاہ (۱۰ مارچ ۱۹۵۵ء)

۶۔ عدنان مندریس مرحوم وزیر جمہوریہ ترکیہ (۲۰ مارچ ۱۹۵۶ء)

۷۔ سکندر مرزا سابق صدر جمہوریہ پاکستان (۲ اپریل ۱۹۵۶ء)

۸ - چو این لائی وزیر اعظم چین (۲۹ر دسمبر ۱۹۵۶ء)

۹ - ڈیوک آف ایڈن برا (۱۰ر فروری ۱۹۵۹ء)

۱۰ - ملکہ الزبتھ ثانی ملکۂ انگلستان (۱۹۶۰ء)

سیر بینی کے نقطۂ نظر سے قلعۂ لاہور کی عمارات کو چھ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) اکبر کی تعمیرات (۲) جہانگیر کی تعمیرات (۳) موتی مسجد (۴) شاہجہان کی تعمیرات (۵) خلوت خانہ (۶) شیش محل

اکبر کے سلسلۂ تعمیرات کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے اس لیے کہ اس سلسلے میں کوئی قابلِ ذکر عمارت اب موجود نہیں۔ باقی پانچ سلسلۂ عمارات میں سے چند عمارتیں اس قابل ہیں کہ ان پر تفصیل کے ساتھ نظر ڈالی جا سکتی ہے۔

مستی گیٹ جو مسجدی دروازہ یا مسجدی گیٹ کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ ۱۵۶۶ء میں اکبر نے تعمیر کرایا تھا۔ مستی غالباً مسیت (پنجابی زبان میں مسجد) کی ایک صورت ہے۔ مستی گیٹ اس مسجد کے نام پر ہے جو اب بھی اس دروازے کے بالمقابل موجود ہے اور جسے شاہنشاہ اکبر کی چہیتی ملکہ مریم زمانی نے ۱۶۱۴ء میں تعمیر کرایا تھا۔ ان دنوں قلعۂ لاہور کے صرف دو دروازے تھے۔ مشرق میں مستی گیٹ اور دوسرا جو عالمگیر نے ۷۴-۱۶۷۳ء میں از سرِ نو تعمیر کرایا اور اب عالمگیری دروازہ کہلاتا ہے۔ مستی گیٹ ایک بلند اور مضبوط عمارت ہے۔ فوجی نقطۂ نظر سے یہ بہت اہم ہے۔ اس میں دو مثمن برج ہیں اور مدافعت کے لیے دندانے دار فصیل ہے۔ اس قسم کی سوراخ دار فصیل قلعۂ لاہور میں اس مقام کے علاوہ اور کہیں نہیں ہے۔ دیوانِ عام شاہجہانی جسے شاہجہان نے تخت نشینی کے اگلے سال ۱۶۲۸ء میں تعمیر کرانے کا حکم دیا۔ تین برس میں بن کر تیار ہوا۔ ۱۶۳۱ء میں دیوانِ عام آصف خان کی نگرانی میں تکمیل کو پہنچا۔ اس میں چالیس ستون ہیں، یہ قلعے کے بیچوں بیچ واقع ہیں اور اس کے جنوب میں صحن خانہ ہے۔ سکھ دور میں رنجیت سنگھ کی بیوہ مہارانی چند کور کے خلاف جب شیر سنگھ نے شاہی مسجد کے میناروں سے گولہ باری کی تو دیوانِ عام کا بڑا حصہ مجروح ہو گیا جس کو ۱۸۴۶ء میں انگریزوں نے قلعۂ لاہور پر تسلط کرنے کے فوراً بعد ہی دوبارہ تعمیر کر دیا۔ یہ نئی تعمیر انگریزی طرزِ تعمیر کے مطابق ہے اس طرح اس عمارت کی مغلئی ہیئت تبدیل ہو گئی۔ چبوترے کے گرد سرخ پتھر کی جھالر اکبر کے عہد کی ہے۔ دراصل دیوانِ عام "جھروکہ" کے متصل بنایا گیا تھا۔ جھروکے کی تعمیر سنگِ مرمر کے ایک بالاخانے اور سرخ مسالے کے چار ستونوں پر مشتمل ہے اور دیوانِ عام کی پچھلی طرف واقع ہے۔ یہیں قریب ہی ایک چار گوشہ عمارت اکبری محل کے نام سے مشہور ہے۔ اگرچہ وہ غالباً جہانگیر کے دور میں تعمیر ہوئی بہر حال جھروکہ عوامی روایت کے مطابق اکبر سے منسوب کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ۱۵۶۶ء میں جب اکبر نے دولت خانۂ خاص و عام تعمیر کروایا تو جھروکہ بھی بنوایا۔ یہ دیوانِ عام سنگِ مرمر کی بنی ہوئی موجودہ عمارتوں میں غالباً سب سے پہلے کی تعمیر ہے۔ دولت خانۂ جہانگیری اکبر کے دور میں تعمیر ہونا شروع ہوا تھا لیکن جہانگیر کے عہد میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس کا سنہ تکمیل ۱۰۲۷ھ ہے جو ۱۹-۱۶۱۷ء کے مطابق ہے۔ اس پر سات لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا۔ سامنے کا حصہ سرخ مسالے کا ہے جس پر ہندو طرزِ تعمیر کا اثر دکھائی دیتا ہے۔ اصل عمارت جہانگیر کے آرام کرنے کے لیے خواب گاہ کے طور پر استعمال ہوتی تھی چنانچہ اس کا نام "خواب گاہ" پڑ گیا ہے اگرچہ انگریزی عہد میں اس کو "عجائب خانہ" میں تبدیل کر دیا۔ یہ عجائب خانہ اسلحہ جات ہے اور یہاں سکھوں کے زمانے کے وہ جنگی ہتھیار موجود ہیں جو قلعہ پر قبضہ کرنے کے بعد انگریزوں کے ہاتھ لگے تھے۔ فتح کابل کے بعد انگریزی فوجیں جو اسلحہ اپنے ساتھ لائیں۔ ان میں سے کچھ توپیں اس عجائب خانے میں ملتی ہیں۔ پرانے زمانے کے پستول، زرہ بکتر، خود، سینہ پوش، مختلف قسم کی بندوقیں اور گولہ بارود، تلواریں، خنجر، تیر کمانیں اور ملبوسات یہاں سجائے گئے ہیں۔

سکھ دور اور انگریزوں کے ابتدائی زمانۂ حکومت کی چند تصاویر بھی ایک کمرے میں آویزاں ہیں۔ برآمدے میں امیر شیر علی شاہ افغانستان کے دور کی اٹھائیس ۲۸ توپیں ہیں جو کابل کی ڈھلی ہوئی ہیں۔ اونٹوں کی توپیں اور پہاڑی توپیں اور لمبی نالی والی بندوقیں مشرقی برآمدے میں رکھی ہوئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا پوتا کنور دلیپ سنگھ جو بعد کو عیسائی ہو گیا تھا۔ اسی عمارت میں پیدا ہوا تھا۔

جہانگیر کی بنوائی ہوئی ایک عمارت "مکاتب خانہ" کہلاتی ہے جو معمور خان کے زیر اہتمام ۱۸-۱۶۱۷ء میں تیار ہوئی۔ یہ ان محرروں کے بیٹھنے کے کام میں آتی رہی ہے جو قلعے میں آنے والے سیاحوں کے ناموں کا اندراج کرتے تھے۔ اس کے مشرق میں مائی جنداں کا محل ہے۔ نیچے کی منزل جہانگیر کے محل کا ایک حصہ ہے اور اوپر کی منزل سکھوں کے دور میں تعمیر ہوئی ہے۔ مکاتب خانہ موتی مسجد کے متصل ہے۔ موتی مسجد ۱۶۴۵ء میں شہنشاہ شاہجہان نے تعمیر کرائی۔ مغل بادشاہوں نے تین موتی مسجدیں بنوائی تھیں۔ ان میں سب سے پہلی قلعۂ لاہور کی موتی مسجد ہے، دوسری قلعۂ اکبرآباد کی موتی مسجد جو شاہجہان ہی نے ۱۶۵۴ء میں بنوائی۔ تیسری قلعۂ دہلی کی موتی مسجد ۱۶۶۲ء میں اورنگ زیب نے تعمیر کروائی۔ لاہور کی موتی مسجد خوبصورتی میں آپ اپنی مثال ہے۔ اس کی چھت سنگ مرمر کی ہے۔ اس کی محرابیں خصوصیت کے ساتھ دلکش ہیں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس کا نام بدل کر موتی مندر کر دیا تھا۔ رنجیت سنگھ کے زمانے میں اور انگریزی دور میں بھی یہ مسجد خزانے کے طور پر استعمال ہوتی رہی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد پھر اس میں نماز ادا کی جانے لگی ہے۔

شیش محل کی تعمیر ۱۰۴۱ھ مطابق ۳۲-۱۶۳۱ء میں شاہجہان کے حکم سے ہوئی۔ ممتاز محل جب لاہور آتی تو یہیں قیام کرتی تھی۔ شیش محل کا اصلی نام شاہ برج ہے۔ اس کے دروازے پر حسب ذیل فارسی اشعار کندہ ہیں۔

شاہ جم جاہ سلیماں قدر گردوں بارگاہ — کز سپہر و مہر برتر بردہ رایات جلال

ثانی صاحبقراں شاہ جہاں کز عدل و جود — بخشش نوشیرواں مانند را فرمودہ زوال

شاہ برجے حکم کرد احداث کز خاطر علو — ہست بیروں ز آنچہ عرش اعظمش زیبد مثال

در صفا و رفعت و لطف و ہوا ایچ چنیں — از جہاں چرخ نہ دیدست و نخواہد دید مثال

بندۂ یک دل مرید معتقد عبدالکریم — بعد اتمام عمارت یافت ایں تاریخ و سال

دائما چوں دولت ایں بادشاہ جم سپاہ

ایں ہمایوں برج عالی باد از آفت بے زوال — ۱۰۴۱ھ

ملا عبدالحمید لاہوری مصنف بادشاہ نامہ کا بیان ہے کہ شاہ برج جھروکے کے بالمقابل تعمیر ہوا۔ شاہ برج کے شمال مغربی جانب مثمن برج بنایا گیا۔ ہاتھی پاؤں یعنی شاہ جہانی دروازہ اسی مقصد سے بنایا گیا تھا کہ اس میں داخل ہو کر مثمن برج اور شاہ برج تک آسانی کے ساتھ پہنچا جا سکتا تھا۔ اس لحاظ سے شاہ برج شاہجہان کے زمانے میں سارے قلعے میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ اپنی خوبصورتی کے اعتبار سے بھی یہ عمارت عجیب و غریب بلکہ بے مثال حیثیت رکھتی ہے۔ آئینہ کاری، منبت کاری، پچی کاری، محرابوں اور جالیوں کے سلسلے جن پر قلعی، نقش کاری اور گلکاری کے نمونے سجاوٹ کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔ جالیاں سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہیں۔ ایک خوبصورت آبشار اور ایک چھوٹا سا حوض درمیان میں ہے۔ سنگ مرمر کے ساتھ ساتھ سنگ ابری، سنگ مرمر، سنگ سیاہ، سنگ زرد، سنگ موسیٰ اور دوسری قسم کے قیمتی پتھر استعمال کرنے سے تنوع کا احساس پیدا کیا گیا ہے۔ اس آبشار پر نظر ڈالیں تو یہ احساس ہوتا ہے کہ

پڑ رہی ہیں شیش محل کے اندر ایک عمارت ہے جسے بنگلہ کہتے ہیں اور جو اس لحاظ سے "نولکھا" کہلاتی ہے کہ اس کی تعمیر پر نولاکھ روپے خرچ ہوئے تھے سنگِ مرمر کے کام کا ایک نہایت ہی پاکیزہ اور نازک نمونہ ہے۔ اس میں قیمتی پتھروں اور جواہرات کا استعمال اس فراوانی اور چابکدستی سے ہوا ہے کہ خود شاہ جہاں کی دوسری تعمیرات میں بھی نہیں ہوا۔ اس لحاظ سے یہ فنِ تعمیر کا ایک بے مثال شاہکار ہے۔ ایرانی مصوری کا چربہ پتھر کی عمارت میں اتار دیا ہے اور جا بجا گل کاری کے نظر افروز نمونے آنکھوں کو طراوت بخشتے ہیں۔ غرض یہ بنگلہ یعنی "نولکھا" مغل آرٹ کا ایک نادر شاہکار ہے۔ بہ اعتبارِ صورت یہ ایک شاہی خیمے کا تصور پیش کرتا ہے۔ مثمن برج کے متعلق سید محمد لطیف کے بیان سے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ یہ کوئی علیحدہ مینار تھا جو شاہ برج کے ساتھ ساتھ جھروکے کے بالمقابل تعمیر کیا گیا تھا۔ اس غلطی کی طرف ڈاکٹر محمد باقر نے توجہ دلائی ہے۔ چنانچہ جس مینار کے متعلق سید لطیف نے بادشاہ نامہ سے ایک عبارت نقل کرتے ہوئے قطعۂ ذیل نقل کیا ہے ؎

باپشتِ گاؤ و ماہی در اصل ہم قریں	با برج گاؤ و ماہی دو فرع ہمقراں
بتواں از و مشاہدہ کردن بچشمِ سر	کیفیت کواکب و اشکال آسماں

——— غالباً یہ کوئی الگ مینار نہ تھا جو اب استدادِ زمانہ کی نذر ہو چکا ہے بلکہ بادشاہ نامے کے مصنف کا اشارہ مثمن برج کی جانب معلوم ہوتا ہے یہ ایک سر بہ فلک عمارت ہے جو شاہ برج کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ برج مثمن کا تفصیلی نقشہ بادشاہ نامے کے مصنف نے اپنی کتاب میں کھینچا ہے۔ اگرچہ اس نے اسے برج مثمن کہہ کر نہیں پکارا ہے۔ کنہیا لال نے اپنی کتاب تاریخ لاہور میں بتایا ہے کہ مثمن برج کے تہ خانے میں سرکاری شراب کا ذخیرہ ہے اور یہ شراب گوروں کو دی جاتی ہے۔ سرکاری میگزین کا ذخیرہ بھی مثمن برج ہی میں رہتا ہے۔ ہاتھی پول جسے ہاتھی پیلا دروجس کو کنہیا لال نے ہاتھی پوڑ کہا ہے۔ بادشاہی عہد میں یہ دروازہ بند رہتا تھا اور رنجیت سنگھ کے وقت بھی بند تھا لیکن انگریزی عہد میں جب مشرقی اور مغربی دروازے بند کر دیے گئے تو ہاتھی پوڑ کا دروازہ آمدورفت کے لیے کھول دیا گیا' اس پر گوروں کا پہرہ رہتا تھا۔ اس علاقے کی بے شمار شاہی عمارتیں گرا کر گوروں کے رہنے کے لیے بارکیں بنا دی گئیں۔ شمالی دروازے کا نام روشنائی دروازہ بھی ہے۔ بقول کنہیا لال اس کو شہر کا ایک دروازہ کہنا چاہیے۔ جنوب کی سمت جو دروازہ ہے وہ قلعے کی حدود کو شہر کی حدود سے الگ کرتا ہے۔

دیوانِ خاص شاہجہان کے حکم سے ۱۶۴۵ء میں تعمیر ہوا۔ یہ خالص سنگِ مرمر کا بنا ہوا ہے اور نقش و نگار اور اقلیدسی نمونوں سے اس کی سجاوٹ کی گئی ہے۔ ۱۹۰۴ء میں مغل فنِ تعمیر کا یہ شاہکار فوجی گرجا گھر میں تبدیل کیا گیا اور اس طرح اس کے ایک بڑے حصے کی از سرِ نو تعمیر ہوئی۔ اس کے شمال مغرب میں لال برج ہے جو ۱۶۳۱ء میں مکمل کیا گیا تھا۔ لال برج کا اندرونی حصہ سکھ دور کی نقاشی سے مزین ہے۔ عمارت کا فرش غالباً سنگِ مرمر کا تھا لیکن اب اینٹوں کا ہے۔ یہ عمارت سہ منزلہ ہے۔ پہلی دو منزلیں جہانگیر اور شاہجہان کی بنوائی ہوئی ہیں اور تیسری منزل کا اضافہ سکھ دور میں کیا گیا ہے' اسے لال برج کا نام بھی سکھ دور ہی میں دیا گیا ہے۔ اس عمارت کی ابتدا ۱۶۱۷ء میں اور تکمیل ۱۶۳۱ء میں ہوئی تھی۔

حمام شاہی شاہ جہاں کے عہد میں ۱۰۴۲ھ میں تعمیر ہوا اور شاہ جہاں کی خوابگاہ کے متصل ہے۔ اب یہ عمارت بوسیدہ ہو چکی ہے۔ یہ ترکی حماموں کے نمونے پر بنائی گئی تھی۔ اس میں نیم گرم اور گرم پانی کے حمام ہیں۔ مغرب کی طرف شاہی بیت الخلا ہے۔ درمیان

میں ایک چھوٹا سا حوض ہے جس میں مختلف رنگ کے قیمتی پتھر لگے ہوئے ہیں۔ یہ یقین کرنے کی وجوہ موجود ہیں کہ شاہی حمام کا فرش سنگِ مرمر کا تھا، جسے سکھ دور میں اکھاڑ کر حضوری باغ کی بارہ دری میں لگا دیا گیا۔ ۱۶۳۳ء میں شاہ جہاں نے ایک غسل خانہ تعمیر کرایا جسے خلوت خانہ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس کا ایک حصہ پائیں باغ شہزادیوں اور شاہی خواتین کے استعمال کے لیے مخصوص تھا۔ شمالی حصے میں مغل بادشاہ اقامت پذیر ہوتے تھے لیکن حرم سرا کے طور پر جو حصہ استعمال ہوتا تھا وہ شاہی اقامت گاہ سے الگ تھا۔ خلوت خانے کے آس پاس اور بھی کئی عمارتیں تھیں جو اب نیست و نابود ہو چکی ہیں۔ جنوب مغرب میں ایک چھوٹی سی مسجد ہے جو سنگِ مرمر اور سرخ مسالے سے بنی ہوئی تھی اور جس میں شاہی خواتین نماز ادا کرتی تھیں۔ پائیں باغ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہاں پردے کے لیے قناتیں تنی رہتی تھیں۔ صبح اور شام کو شاہی خواتین اس باغ میں سیر کرتی تھیں۔ یہاں کے درخت سایہ دار اور پھولوں اور پھلوں سے لدے ہوئے تھے۔ درمیان میں ایک مربع چبوترہ تھا جس پر ایک حوض تھا۔ ہاتھی پول سے پائیں باغ تک محل سرا کی خواتین ہاتھیوں پر بیٹھ کر سیر کیا کرتی تھیں۔

کالا برج جو ۱۶۱۷ء سے ۱۶۳۱ء تک رفتہ رفتہ تعمیر ہوتا رہا۔ لال برج سے مشابہت رکھتا ہے اور خلوت خانے کے شمال مغربی جانب واقع ہے۔ اس کی سب سے اونچی منزل سکھ دور میں تعمیر ہوئی اور اس کی مرمت اور اس میں رد و بدل انگریزی عہد میں ہوا۔ یہاں انگریزی راج میں شراب کا ذخیرہ تھا اور شراب پینے کا انتظام بھی تھا۔ اس کا نام کالا برج سکھوں کے زمانے میں پڑا۔ "اٹھ درہ" رنجیت سنگھ کی تعمیر ہے جو اس نے مغل عمارات کے ملبے سے بنایا۔ اٹھ درہ رنجیت سنگھ کی کچہری کا کام دیتا تھا۔ رنجیت سنگھ کے دربار میں جو فن کار ملازم تھے انھوں نے کرشن لیلا سے خیالات مستعار لے کر اس عمارت میں تصاویر بنائی ہیں۔ ان فن کاروں کا تعلق لغاشی کے کانگڑہ سکول سے تھا۔

عالمگیری دروازہ اورنگ زیب نے غالباً شاہی مسجد کے ساتھ ساتھ تعمیر کرایا۔ اس میں عالمگیر کے کردار کی فوجی خصوصیت جھلکتی ہے۔ اس میں لطافت اور حسن کا امتزاج ہے۔ یہ دروازہ غالباً ۱۶۷۳ء میں تعمیر ہوا۔ عالمگیری دروازہ جسے انگریزوں نے اینٹوں سے چن دیا تھا ۱۸ نومبر ۱۹۴۹ء کو سردار عبدالرب نشتر نے دوبارہ کھول دیا۔ یہ تقریب شان و شوکت سے منائی گئی۔ اس وقت سردار نشتر نے کہا کہ یہ مسلمانوں کی تاریخ میں ایک نئے باب کے مترادف ہے۔

یہ ہے لاہور کا شاہی قلعہ جس کا ایک مختصر اور ادھورا سا خاکہ سطورِ بالا میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ قلعہ شہر لاہور کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ قلعے کی دیوار سرخ پختہ اینٹوں کی بنی ہوئی ہے۔ اس لحاظ سے آگرے اور دہلی کے قلعوں کی طرح قلعہ لاہور بھی اپنے سرخ رنگ کی مناسبت سے لال قلعہ کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ اس کی چار دیواری مستحکم پختہ اور بلند ہے اور بقول کنہیا لال چوڑی اس قدر کہ توپ اس پر چل سکتی ہے۔ اس کی لمبائی پانچ سو گز اور چوڑائی تقریباً چار سو گز ہے۔ اس کی شکل مستطیل ہے مگر مکمل طور پر مستطیل نہیں، کیونکہ مغربی فصیل کا شمالی دروازہ باہر کو نکلا ہوا ہے۔ دیواروں میں بندوقچیوں کے لیے سوراخ ہیں جن میں سے وہ محاصرہ کرنے والی فوج پر گولیاں برسا سکتے تھے۔ جب راوی نے اپنا راستہ تبدیل کر لیا تو شمال کی طرف قلعے کی دیوار کے پیچھے رنجیت سنگھ کے عہد میں خندقیں کھودی گئیں۔ یہ قلعے کے استحکام میں ایک مزید اضافے کی صورت تھی۔ سکھ اور انگریزی دورِ حکومت میں قلعے کے اندر چند در چند تبدیلیاں کی گئیں۔ مائی جنداں کی حویلی اور کھڑک سنگھ کا محل سکھ دور کی تعمیرات ہیں۔ ۱۸۴۶ء میں اس قلعے پر انگریزوں کا قبضہ ہوا چنانچہ ۱۹۲۷ء تک یہ انگریزی فوج کے تسلط میں رہا۔ ۱۹۲۷ء میں حکومتِ وقت نے اس کو محکمہ آثارِ قدیمہ کی حفاظت میں دے دیا لیکن قلعے کی فوجی نوعیت ختم کرنے کے لیے

انگریزی حکومت نے اندرونِ قلعہ کی کئی عمارتیں منہدم کر دیں۔ ۱۸۴۶ء سے ۱۹۲۷ء تک یعنی انگریزی فوج کے تسلط کے زمانے میں قلعے کے اندر جدید وضع کی کئی نئی عمارتیں بنائی گئیں اور شاہی عمارات میں خاصا ردّ و بدل کیا گیا تاکہ ان کو بارکوں، ہسپتالوں، کوارٹروں، گوداموں، گرجا گھروں اور شراب خانوں کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔ دیوانِ عام کے سامنے جہاں اب سرسبز کھلا ہوا میدان ہے فوجی دور میں بارکیں اور کوارٹر تھے۔ دیوانِ عام خود ہسپتال کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اور اس میں ایک وسیع برآمدے کا اضافہ کر دیا گیا تھا۔ جہانگیری سلسلۂ عمارات میں بھی کئی تغیرات کیے گئے۔ ایک بڑے حوض کو پاٹ کر اس کے اوپر ٹینس کا لان بنایا گیا۔ دیوانِ خاص کو گرجا گھر میں تبدیل کر دیا گیا۔ شاہی حمام کو باورچی خانے اور لال برج کو شراب خانے کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ محکمۂ آثارِ قدیمہ نے فوجی دور کی یادگاروں کو جہاں تک ممکن تھا زمین کے ساتھ ہموار کر دیا ہے۔ اب بھی قلعے کی سیڑھیوں اور عالمگیری دروازے کے درمیان کا حصہ حکومت کے قبضے میں ہے اور یہاں پولیس کے دفتر قائم ہیں۔ جس دروازے سے ہو کر سیاح قلعے میں داخل ہوتا ہے وہ انگریزوں کی تعمیر ہے اور یہیں سے ٹکٹ بھی دستیاب ہوتے ہیں۔

قلعۂ لاہور کی سیر کرنا کوئی آسان کام نہیں اس کے لیے ایک رہنما کی ضرورت ہے۔ آئیے ہم آپ کی رہنمائی کی کوشش کریں جب آپ ٹکٹ خرید کر قلعے میں داخل ہوں تو اوّل شاہ برج کے دروازے پر نظر ڈالتے ہوئے ہاتھی پَیر کے دروازے سے شیش محل کی طرف روانہ ہوں شیش محل، نولکھا، کالا برج، لال برج، دیوانِ خاص، شاہی حمام، خلوت خانہ، جہانگیری محل، عجائب خانہ، دیوانِ عام، مکاتیب خانہ اور موتی مسجد کی سیر کریں۔ اگر آپ کے پاس وقت باقی ہو تو نہ مانے دیکھیں اور ان عمارتوں پر بھی توجہ دیں جو ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔

عجائب گھر

ملک شمس

فنونِ لطیفہ، آثارِ قدیمہ، سکہ سازی اور تاریخ کے بعض اہم نوادر و عجائبات کے ذخیروں کے لحاظ سے لاہور کا عجائب گھر پاکستان بھر میں سب سے قدیم اور عظیم عجائب گھر ہے۔ اس کا آغاز ۱۸۶۴ء میں ایک صنعتی نمائش (پنجاب ایگزیبیشن) سے ہوا جو گوشت اور سبزی والی مارکیٹ کی عمارت میں ۲۰ جنوری ۱۸۶۴ء سے اپریل کے پہلے ہفتے تک منعقد رہی۔

اس نمائش کا مقصد پنجاب کی قدرتی پیداوار، صناعی اور ہنرمندی کے اعلیٰ اور حسین نمونے پیش کر کے لوگوں کو دعوت نظارہ دینا تھا۔

اس اہم کام کے لیے مقامی، صوبائی اور مرکزی حکومت کا ہزارہا روپیہ صرف ہوا۔ بڑی بڑی ریاستوں، رئیسوں، پنجاب کے امیروں، سرداروں اور جاگیرداروں سے طرح طرح کی عجیب چیزیں، قسم قسم کے زیورات، قیمتی مرصع و مطلا ریشمی، مخملی اور سوتی ملبوسات، شال، دوشالے، پشمینہ، قالین اور کشمیر کی دیگر مصنوعات، پرانے خوشنویسوں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابیں، وصلیاں اور قطعات اور مشہور مصوروں کی نقاشی کے دلکش نمونے اس عجائب گاہ میں رکھے گئے۔ ہر قسم کے اناج، ادویات، جڑی بوٹیاں، اوزار، ہتھیار، تلواریں جن کے قبضوں پر مرصع کام تھا، برچھے، نیزے، خنجر، زرہ بکتر، تبر، سپر، تیر، کمان، قرابین، بندوق وغیرہ نیز پارچات انواع و اقسام ساخت ملتان و جھنگ از قسم لنگی دلاچہ و کھیس و پارچات از قسم سوسی شہر بٹالہ، مخمل، دریائی و پاپوش ساخت لاہور، راولپنڈی، بھیرہ، خوشاب و مصنوعات چوبی، ہاتھی دانت، عاج و آہن در طلا و نقرہ، صندوقچی ہائے عجیبہ و قلمدان ہائے نفیسہ و اقسام مصنوعات چرمی از قسم حقہ و ظروف، برنجی و مسی و نقرئی، قسم قسم کے پتھر، طرح طرح کے نمک، رنگ رنگ کے قیمتی جواہرات اور جانور طیور و حشرات از قسم سانپ و مگرمچھ وغیرہ۔ یہ جانور مردہ تھے مگر اس ترکیب سے آئینہ دار بکسوں میں رکھے گئے تھے کہ سب زندہ معلوم ہوتے تھے۔ ہر قیمتی چیز زیورات، جواہرات، ملبوسات وغیرہ آئینہ دار بکسوں میں رکھ کر لوگوں کو دکھائی گئی۔ اس طرح موجودہ مارکیٹ میں (جس کا نام ٹولنٹن مارکیٹ ہے) لاہور کے عجائب گھر کی داغ بیل ڈالی گئی۔

نمائش کے اختتام پر دستکاریوں کے چیدہ چیدہ نمونے مستقل نمائش کے لیے رکھ لیے گئے۔ جس کی عمارت مارکیٹ کے قریب ہی بعد میں تعمیر ہوئی۔ ۱۸۷۲ء میں جب اس عجائب خانے کا سنگ بنیاد رکھا گیا تو یزدان امر ناتھ اکبری نے اس کی تاریخ اس طرح کہی ہے

چو تعمیر عجائب خانہ گردید | بحکم حاکم فرخندہ القاب
فراہم شد دراں اشیائے ہر ملک | عیاں گردید صنع حق ز ہر باب

بناشد برزمین چوں او مکانے ۔۔۔ نہ بیند ثانئے آں چرخ در خواب
زبخت بیشتر از بخت فیروز ۔۔۔ بزینت خوب تر از دُرِّ نایاب
رقم زد اکبری تاریخ سالش
عجب ایں خانہ اعظم بہ پنجاب

۱۸۶۳

یہ نمائش بے حد کامیاب رہی۔ ہزار ہا لوگ دیکھنے کے لیے آئے۔ یہاں تک کہ نمائش کے بعد آہستہ آہستہ صناعی کے نمونوں کے علاوہ قدیم مجسمے، پرانے وقتوں کے سکے اور دیگر پرانی اشیاء بھی فراہم ہونے لگیں۔ حتیٰ کہ تیس سال کے عرصے میں قدیم و جدید اشیاء کا اس قدر وسیع ذخیرہ ہو گیا کہ کسی دوسری عمارت کی ضرورت لاحق ہوئی۔ لہٰذا ۱۸۹۴ء میں لاہور عجائب گھر کی موجودہ عمارت کی بنیاد اس چندے سے رکھی گئی جو ملکہ وکٹوریہ کی گولڈن جوبلی کے سلسلے میں فراہم کیا گیا تھا۔

تکمیل عمارت پر عجائب گھر کی اشیاء اپنی اس عمارت میں منتقل ہوئیں اور اس کے ذخیروں میں برابر اضافہ ہوتا چلا گیا۔ پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر لاہور عجائب گھر کے ذخیرے اور نوادر ان شعبہ جات پر مشتمل تھے:۔

صنعت و حرفت کے نمونے، ازمنہ قدیم کے آثار، پرانے سکے، پتھروں اور معدنی اشیاء کے نمونے، اسلحہ، فن مصوری اور نقش نگاری کے نمونے، مسودات، محکمہ جنگلات، محکمہ زراعت اور محکمہ اصلاح دیہات سے متعلق اشیاء اور ماڈل، نباتاتی نمونے اور مردہ حیوانات کا ذخیرہ، کتبات وغیرہ۔

لیکن آہستہ آہستہ لاہور عجائب گھر کا دائرہ محدود کیا جاتا رہا اور یکے بعد دیگرے کئی شعبے یہاں سے ہٹا دیے گئے۔ مثلاً مردہ حیوانات کا شعبہ یہاں سے گورنمنٹ کالج لاہور منتقل کیا گیا۔ وہاں اس کا ایک الگ عجائب خانہ قائم ہوا۔ اب لاہور کا عجائب گھر صرف فنون لطیفہ اور آثار قدیمہ تک محدود کر دیا گیا ہے تاکہ یہ ایسے مخصوص شعبوں سے متعلقہ اشیاء کو فراہم اور محفوظ کرے اور ان سے متعلقہ علم کی تحقیق اور نشر و اشاعت کرے۔ چنانچہ لاہور کا عجائب خانہ پاکستان میں اپنی نوعیت کا سب سے عظیم ادارہ ہے جس کی چار دیواری کے اندر مختلف قوموں اور زمانوں کی تہذیبوں اور ثقافتوں کے عروج و زوال کی داستانیں ہماری بصارت و بصیرت کو دعوت دیتی ہیں۔

اس عجائب گھر میں انسانی تہذیب کے کہنہ ترین نشانات ہزارہا برس پہلے کے پتھر کے ہتھیار ہیں جنھیں انسان کی اولین صنعت کہا جا سکتا ہے۔ پتھر کے ان ترشے، رگڑے اور گھسے ہوئے مدوّر اور نوکدار ٹکڑوں میں ہمارے ازمنہ قبل تاریخ کے مورثوں کی داستان کے وہ ابواب مضمر ہیں جنھیں قدیم و جدید حجری زمانوں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ آج سے کوئی پانچ چھ ہزار سال قبل انسان نے بڑی بڑی اہم ایجادات کیں جن کی بدولت ہم تہذیب کے بام بلند پر پہنچے ہیں۔ اسی نوع کی پانچ ہزار سالہ کہنہ تہذیب کے آثار موئن جو دڑو واقع سندھ اور ہڑپہ پنجاب سے بے نقاب ہوئے ہیں جو ہمارے عجائب گھر کی ایک چھوٹی سی گیلری میں پڑے زبان حال سے ہمیں اپنے وارثوں کے معاشرے، ان کے مذہب، ان کی صنعت و حرفت، ان کے علوم و فنون اور افکار کا پتہ دیتے ہیں۔

موئن جو دڑو اور ہڑپہ کے آثار جس تمدن کے مظہر ہیں، وہ وادیٔ سندھ کی تہذیب کہلاتی ہے۔ یہ اپنے عروج کے زمانے میں تمام

مغربی پاکستان میں اور اس سے پرے بہار اشٹر تک پھیلی ہوئی تھی۔ وادیٔ سندھ کی تہذیب کے حامل تانبہ اور ٹین ملا کر کانسی کے ہتھیار اور ظروف بناتے تھے۔ وہ سونے چاندی کے زیورات بناتے اور انھیں دور دراز ممالک سے تجارت کے ذریعے حاصل شدہ جواہرات سے مرصع کرتے۔ ان کی خوراک کاشت سے حاصل کیے ہوئے گیہوں پر مشتمل تھی۔ وہ مچھلی کا شکار کانٹے سے کرتے تھے۔ دنیا میں سب سے پہلے کپاس بونے اور اس سے کات کر سوتی کپڑا بننے کا سہرا انہی کے سر ہے۔ دو پہیوں والی گاڑی کا استعمال بھی ان کے ہاں تھا۔ وہ مجسمہ سازی کا فن بھی جانتے تھے۔ ظروف کو نقش و نگار سے آراستہ کرتے تھے۔ فطرت کی دیوی یعنی ماتا دیوی کی پوجا کرتے تھے۔ ان کے یہاں فن تحریر بھی رائج تھا جو تصویروں کے ذریعے اظہار مطلب اور حروف تہجی کے بین بین تھا مگر ان کی تحریروں کو، جو یقیناً بیش قیمت معلومات کی حامل ہیں، ابھی تک پڑھا نہیں جا سکا۔ ان کے رہائشی مکانوں اور مذہبی تعمیرات، شہروں کی فراخ اور سیدھی سڑکوں اور چوکوں اور شہری صفائی کے انتظامات سے ہر کوئی حیرت زدہ ہوتا ہے۔ لیکن اس بات پر بہت تعجب ہوتا ہے کہ ان کے پالتو جانوروں میں گھوڑے کا نشان نہیں ملتا اور نہ وہ لوہے جیسی دھات سے آشنا تھے۔

مغربی پاکستان کی یہ عظیم الشان تہذیب آریا حملہ آوروں کے ہاتھوں کوئی سنہ ۱۵۰۰ ق م کے لگ بھگ تہ و بالا ہوئی مگر ساتھ ہی اس تہذیب نے آریاؤں کی طرز معاشرت اور ان کے مذہبی تصورات پر گہرا اثر ڈالا۔ عجائب گھر لاہور کے گندھاری بت بے حد تاریخی، فنی اور ثقافتی اہمیت رکھتے ہیں۔ انھیں گوتم بدھ کے پیروکار پہلی صدی قبل مسیح سے شروع ہو کر چوتھی صدی قبل مسیح تک تراشتے رہے۔ ان مجسموں کا مسکن وہ علاقہ ہے جسے ویدوں کے زمانے سے گندھارا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور جو وسط افغانستان سے لے کر راولپنڈی کے قرب و جوار تک پھیلا ہوا ہے۔ اس علاقائی نسبت کی وجہ سے ان کو گندھارا کے بت کہا جاتا ہے۔

گندھارا کے بت بیشتر گوتم بدھ کی زندگی سے متعلق ہیں۔ جن میں تقریباً اس کی زندگی کے تمام واقعات تراشے گئے ہیں۔ ان بتوں کے عروج کا زمانہ کشان شہنشاہوں کا دور تھا بالخصوص شہنشاہ کنشک کا زمانہ گندھارا کے صنم سازوں نے ہی سب سے پہلے گوتم کی وفات کے کوئی پانچ سو سال بعد اس کی مورتی تراشنے کی جرأت کی۔ گندھارا کے بت بدھ مت کے اندر ایک عظیم انقلاب کے مظہر ہیں جبکہ مہایان فرقہ وجود میں آیا۔ گندھارا کی بت طرازی کی ایک نمایاں خصوصیت یونانی، رومی عناصر ہیں۔ یہ ان اثرات کو ظاہر کرتے ہیں جن کا تعلق یونان کی ہیلنی دور کی تہذیب سے ہے۔ یعنی وہ تہذیب جو اسکندر اعظم کی مشرقی فتوحات کے بعد اس کے جانشینوں کے عہد میں ظہور پذیر ہوئی۔

گندھارا کے بتوں میں ہیلنی اثرات ایشیائے کوچک اور شام کے رومی علاقوں سے کوشانیوں کے عہد میں آئے جن کا رومنوں سے گہرا تجارتی تعلق اور ثقافتی رشتہ تھا اور جو رومی ہیلنی تہذیب و ثقافت کے علمبردار تھے چنانچہ گندھارا کے بتوں میں یونانی تناسب اعضا اور یونانی نقوش جا بجا نظر آتے ہیں۔ کہیں بدھ کے روپ میں اپالو کے خدوخال ہیں، کہیں رعد کا دیوتا زیس گوتم کے پیچھے پیچھے جا رہا ہے، کہیں محبت کا دیوتا ایروس سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ کہیں مشہور یونانی دیوی منروا جلوہ گر ہے، کہیں اٹلس دنیا کو سر پر اٹھائے کھڑا ہے، کہیں بیکس کی مے خواری کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ بحیثیت مجموعی جمالیاتی اعتبار سے گندھارا کی مورتیوں کا مقام اتنا زیادہ بلند نہیں مگر ان کی تاریخی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ تبت، چین، منگولیا، کوریا، ترکستان اور جاپان تک بدھ دھرم گندھارا ہی کے راستے اور ذریعے سے پھیلا چنانچہ گندھارا کے آرٹ نے بھی مشرق بعید کے ایشیا کے بدھوی آرٹ پر اثر ڈالا۔

قطع نظر فن کے، گندھارا کی مورتیاں اس چار سو سالہ بدھوی تمدن کی بھی آئینہ دار ہیں جن کا امتزاج متعدد ملکی و غیر ملکی عناصر سے ہوا اور جو بالآخر پانچویں صدی عیسوی میں ہن وحشی قوموں کے ہاتھوں تباہ ہوئی۔

لاہور کے عجائب گھر میں کچھ مورتیاں عہد گپت کی بھی ہیں جو قرون وسطیٰ کی ہند و ثقافت کا زرین زمانہ کہلاتا ہے۔ ان میں سے ایک عورت کا دھڑ گپتا آرٹ کا بلند ترین شاہکار ہے جس میں نسوانی اعضاء کا تناسب مثالی طور پر حسین ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ کالیداس کے نسوانی حسن و جمال کے تخیل کو پتھر کی ایک مورتی میں ہمیشہ کے لیے منتقل کر دیا گیا ہے۔

لاہور کے عجائب گھر کا ایک مایہ ناز ذخیرہ سکہ جات ہیں۔ ان میں باختری، یونانی، ستھین، پارتھی اور کوشان فرمانرواؤں کے سکوں کو ممتاز درجہ حاصل ہے۔ اگر یہ سکے نہ ملتے تو شمال مغربی پاکستان کی تاریخ کا ایک اہم قدیم باب جو تقریباً دو سو سالوں پر مشتمل ہے، ناپید ہو جاتا۔ ان سکوں ہی کے مطالعہ سے سکندر اعظم کے ان یونانی جانشینوں کی تاریخ کو مرتب کیا گیا ہے جو موریا سلطنت کے زوال پذیر ہونے پر باختر سے اٹھ کر شمالی مغربی پاکستان پر حملہ آور ہوئے اور جن کی بدولت اس خطے میں عرصہ دراز تک ہیلنی آرٹ اور تمدن کا دور دورہ رہا۔ باختریوں کے یہ سکے آرٹ کے بھی بلند پایہ نمونے ہیں جنھیں دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ شاید دنیا میں اس سے پیشتر اور اس کے بعد اتنے حسین سکے مضروب نہیں کیے گئے۔ ان سکوں کے ذریعے ہماری تاریخ کا ایک اور اہم عقدہ بھی حل ہوا ہے۔ انھی کی مدد سے خروشتی زبان جو مردہ ہو چکی تھی، پڑھی گئی ہے اور اس سے ہمیں قیمتی تاریخی معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ سلاطین غزنہ و دہلی کے سکوں کا بھی ایک بے نظیر مجموعہ ہے جس کے مطالعہ سے اس دور کی اسلامی تاریخ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ مغل شہنشاہوں کے سکے بھی ایک لاثانی مجموعے کی شکل میں فراہم ہیں۔ ان سے ہمیں بے شمار و عجیب معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ پاک و ہند کی سات سو سالہ اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے لیے لاہور عجائب گھر کے ان سکوں سے کافی مدد ملتی ہے۔

اس عجائب گھر کے تصویر خانے کی زینت وہ حسین تصویریں ہیں جنھیں پہاڑی تصویریں کہنا چاہیے۔ یہ تصویریں اٹھارویں صدی عیسوی میں کانگڑہ کے چھوٹے چھوٹے راجپوت راجاؤں کی سرپرستی میں بنائی گئیں۔ اگرچہ یہ تصویریں مغل مصوری کے فنی تاثرات ہی کا نتیجہ ہیں، ان کی تکنیک مغل مصوری ہی کی تکنیک ہے مگر ان کی روح مغل تصویروں سے جدا ہے اور ان کے اسلوب کی جاذبیت الگ نوعیت رکھتی ہے۔ ان تصویروں میں ایک تغزل کا سا حسن ہے اور رعنائی سی کشش ہے۔ ایک دلفریب رومانیت اور دلآویز ڈرامائیت ان کی فضا اور موحول افسانوی حسن و جمال کی دنیا میں ڈوبا ہوا ہے۔ ان پہاڑی تصویروں کا مقصد انسانوں کے حقیقی اور اصلی خد و خال کی نقش کشی نہیں بلکہ جذبات نگاری ہے۔ یہ عشقیہ تصویریں ہیں جن کا محبوب ترین موضوع حسن و عشق کی رنگین داستانیں ہیں۔ ان میں وہی جذبات ہیں جو ماہیوں اور ڈھولوں میں ظاہر کیے جاتے ہیں۔ پیا سے جدائی، ساجن کا انتظار کرنا، اس سے ملنا اور روٹھنا، غرض ان میں پریت کی وارداتوں کی نقش کشی ہے جو یہ تصویریں اپنے دل لبھانے والے انداز میں کرتی ہیں۔ آئیے ذرا ایک تصویر پر پچھلی ہوئی نظر ڈالیں جس میں اپنے محبوب سے بچھڑی ہوئی عورت کی دلی کیفیات کو مصورانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ساون کا مہینہ ہے۔ پروا چل رہی ہے۔ یکایک آسمان پر گھنگھور گھٹائیں چھا گئیں اور بوندا باندی شروع ہو گئی۔ ادھر موروں نے شور مچانا شروع کر دیا، بادل بھی گرجنے لگے اور کالی کالی بدلیوں سے بجلی بھی چمکنے لگی۔ برکھا رت کی اس ولولہ انگیز فضا میں ایک پُر شباب لڑکی لب بام کھڑی اپنے پردیس گئے ہوئے پیتم کی راہ تک رہی ہے جس کا خیال اس کے دل میں بے اختیار چٹکیاں لے رہا ہے۔

عجائب گھر کی یہ چند جھلکیاں ظاہر کرتی ہیں کہ اس کے بوسیدہ پتھر اور ٹھیکریاں، اس کے شکستہ بت، اس کے پرانے وقتوں کے سکے اور اس کی تصویریں، تاریخ و تمدن کے وہ اوراق ہیں جن سے چشم بینا بہت کچھ پڑھ سکتی ہے۔

چڑیا گھر

پروفیسر یوسف جمال انصاری

لاہور کا چڑیا گھر برصغیر پاک و ہند کے بہترین چڑیا گھروں میں شمار کیا جاتا رہا ہے۔ غیر منقسم ہندوستان میں اگرچہ کئی مشہور چڑیا گھر تھے۔ لیکن ان میں لاہور، لکھنؤ اور کلکتہ کے چڑیا گھر سر فہرست ہیں۔ پاکستان میں لاہور کا چڑیا گھر سب سے بڑا ہے۔ یہ چڑیا گھر عوامی تفریح گاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ نوعمر لوگ خصوصیت کے ساتھ بڑی تعداد میں روزمرہ چڑیا گھر کی سیر کو جاتے ہیں۔ تعطیل کے ایام میں، اور بھی زیادہ بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے۔ چڑیا گھر کی سیر زندہ دلانِ پنجاب، کا محبوب مشغلہ ہے۔

چڑیا گھر سے مراد حیوانات کی نمائش گاہ ہے۔ برصغیر ہند و پاک ہی سے مخصوص نہیں تمام متمدن ممالک میں اس قسم کے چڑیا گھر (نمائش گاہِ حیوانات) قائم ہیں۔ یہ نمائش گاہیں باغات میں واقع ہوتی ہیں۔ جیسے لاہور کا چڑیا گھر باغِ جناح میں۔ اس قسم کی نمائش گاہوں کے قیام کے اسباب پر نظر ڈالی جائے، تو کم از کم تین اسباب ایسے ہیں جن کی وجہ سے اس طرح کی نمائش گاہیں دُنیا بھر میں قائم ہیں۔ پہلا سبق تفریحی ہے۔ انسان کو ہمیشہ سے دوسرے حیوانات کے وجود سے گہری دلچسپی رہی ہے۔ اور یہ ایک نفسیاتی امر ہے۔ غیر شعوری طور پر ہم دوسرے حیوانات کے وجود سے اپنے کو مربوط کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ کچھ نوعمروں ہی سے مخصوص نہیں کہ وہ باغوں میں جائیں۔ اور چرندوں درندوں اور دوسرے حیوانات کو دیکھ کر خوش ہوں۔ دوسرا سبق فنی اور سائنسی ہے۔ زمین اور پانی کی مخلوقات، کا مطالعہ علم الحیوانات کا ایک اہم شعبہ ہے۔ طلبا کو محض کتابوں کے ذریعہ یہ سمجھانا کہ کونسا حیوان کس وضع و قطع کا ہے۔ یا اس حیوان کی تصویر دکھا دینا کافی نہیں۔ اس لحاظ سے علم الحیوانات کے طلبا کے لیے چڑیا گھر کی حیثیت درسگاہ کی سی ہے۔ تیسرا سبق جو نہایت اہم ہے۔ یہ ہے کہ ارتقائے عالم کے ساتھ ساتھ بعض حیوانی نسلیں کم یاب بلکہ نایاب ہوتی جاتی ہیں جن کے نمونوں کو محفوظ رکھنا از بس ضروری ہے۔ ورنہ ایک دن آئے گا جب وہ قطعاً نابود ہو جائیں گی۔ اس حیثیت سے چڑیا گھر بعض اقسام کے حیوانات کا حفاظت خانہ ہے۔ پُرانی تاریخوں اور قصّے کہانی کی کتابوں میں ایسے حیوانات کا تذکرہ ملتا ہے۔ جو اَب کہیں نہیں پائے جاتے۔ لیکن جو زمانہ ماقبلِ تاریخ میں یا تاریخ انسانی کے ابتدائی ادوار میں موجود تھے۔ ہمارے چڑیا گھر ان حیوانوں سے خالی ہیں۔ یہ بھی ممکن نہیں کہ ہم ان کو فرضی داستانوں کی زینت قرار دے کر خارج از بحث کر دیں۔ اس لیے کہ زمین کی کھدائی کے دوران عجیب الخلقت جانوروں کا دریافت کیا جانا ایک تاریخی حقیقت ہے۔ اور ہم آئے دن سُنتے ہیں کہ اس قسم کے ڈھانچے کھدائی کرنے پر برآمد ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ کمیاب قسم کے حیوانات کی حفاظت انسان کا ایک اہم فرض بن گئی ہے۔ ارتقا کے دو پہلو

ہیں - ایک مثبت اور دوسرا منفی - نمائش گاہ حیوانات میں یہ دونوں پہلو نظر آتے ہیں - منفی پہلو یہ ہے - کہ جو حیوانات ارتقا کی دوڑ کا ساتھ نہیں دے سکتے وہ معدوم ہوتے جاتے ہیں - اور ان کے نمونوں کا قائم رکھنا نہایت ضروری ہے ورنہ وہ بھی مستقبل میں فرضی داستانیں بن کر رہ جائیں گے - ایسے حیوانات چڑیا گھروں میں اب بھی موجود ہیں - مثبت پہلو یہ ہے کہ رفتہ رفتہ جانوروں کے ڈھانچے بدلتے جاتے ہیں - عجائب گھر میں پہاڑی بکرے جنگلی گھوڑے اور اس قسم کے دوسرے جانور موجود ہوتے ہیں جو پالتو ہو جانے کے بعد اپنی ہیئت بدل چکے ہیں - اور پہاڑوں پر جنگلوں میں اپنی اصلی ہیئت میں اب بھی موجود ہیں - اس طرح ان حیوانات کے ارتقا کی تاریخ نظر کے سامنے آجاتی ہے -

جنگلی درندے، خواہ ان کی ہیئت تبدیل نہ بھی ہوتی ہو - جنگل میں کچھ اور ہی آن بان رکھتے ہیں - اور چڑیا گھر کے پنجرے میں ان کی شان دوسری ہوتی ہے - شیر جب چڑیا گھر میں بولتا ہے - تو اس کی آواز جنگل والے دھاڑنے والے شیر سے مختلف ہوتی ہے - ہاتھی جب جنگل میں چنگھاڑتا ہے تو اس کی ہیبت دلوں پر بیٹھ جاتی ہے - مگر چڑیا گھر میں اس کی آواز خوفناک معلوم نہیں ہوتی - کہتے ہیں کہ اپنی گلی میں کتا بھی شیر ہوتا ہے - اور وہ بلی چوہوں سے بھی کان کترواتی ہے - یہ مثل حیوانات پر صادق آتی ہے - پنجرے کے اندر شیر بھی بکری کی طرح سیدھا سادا اور بے ضرر نظر آتا ہے - لیکن یہی شیر جنگل میں ہو تو جنگل کا بادشاہ کہلاتا ہے - افریقہ کا شیر اتنا طاقتور ہوتا ہے کہ جنگلی بھینسے کو جو طاقت میں مست ہاتھی سے کسی طرح کم نہیں ہوتا آن کی آن میں چیر پھاڑ کر رکھ دیتا ہے - یہی افریقہ کا شیر لاہور کے چڑیا گھر میں دیکھیے تیجے معصوم بچے تک اس سے نہیں ڈرتے - یہی حال جنگلی ہاتھی کا ہے - ہاتھی ایک نہایت ہی خوفناک اور طاقتور حیوان ہے - جو لوگ ہاتھی کا شکار ہاتھی دانت حاصل کرنے کے لیے بنگال اور برما کے جنگلوں میں کرتے آئے ہیں - انھوں نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے کہ یہ حیوان کتنا خوفناک اور کیسا طاقت ور ہے - لاہور کے چڑیا گھر میں یہی ہاتھی بالکل گائے معلوم ہوتا ہے - عورتیں اور بچے اس پر سوار ہو کر چڑیا گھر کی پہاڑی کے گرد دن بھر چکر لگاتے ہیں - اور یہ ہاتھی کان تک نہیں ہلاتا - غرضیکہ چڑیا گھر بھی ایک درس گاہ ہے جہاں جا کر معلوم ہوتا ہے - کہ جنگلی حیوانات کیونکر اپنی عادتیں تبدیل کر لیتے ہیں - اور حضرت انسان جو اشرف المخلوقات ہیں کس طرح حیوانات کی تربیت کرتے ہیں -

ضمناً چڑیا گھر کا ایک اور فائدہ بھی ہے - دیہاتی یوں تو عالم فطرت سے قریب تر ہیں - اور شہریوں کی نسبت ان کو حیوانات کے دیکھنے کا زیادہ اتفاق ہوتا ہے - مغربی پاکستان کے دیہات میں جو حیوانات پائے جاتے ہیں - مثلاً گیدڑ، لومڑی، بھیڑیا وہ دیہاتیوں کے لیے کوئی نئی چیز نہیں - بعض مقامات پر چیتے - بلکہ شیر تک بھی موجود ہیں - لیکن وہ قسم قسم کے حیوانات اور حیوانات کی وہ اقسام جو غیر ملکی ہیں - اگر دیکھ سکتے ہیں تو وہ کسی چڑیا گھر ہی میں دیکھ سکتے ہیں - اس لیے لاہور کے چڑیا گھر میں روزانہ ایک بڑی تعداد ان دیہاتیوں کی ہوتی ہے - جو سیر کرنے لاہور آئے ہوتے ہیں - انارکلی بازار اور مال روڈ اور عجائب گھر ہی ان لوگوں کے دامنِ دل کو نہیں کھینچتے - چڑیا گھر بھی انھیں دعوتِ نظارہ دیتا ہے -

نمائش گاہ حیوانات خواہ وہ لاہور میں ہو یا کراچی - کلکتہ میں ہو یا لکھنؤ میں اگر قائم کی جاتی ہے - تو شہروں ہی میں قائم کی جاتی ہے - یہاں دیہاتیوں سے زیادہ شہری اور پختہ عمروں سے زیادہ نو عمر سیر بین جمع ہوتے ہیں - جب دیکھیے ایک میلہ لگا ہوا

ہوتا ہے۔ چھٹی کے دن تو وہ ریل پیل ہوتی ہے کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ لاہور کو مغربی پاکستان میں جو حیثیت حاصل ہے۔ اس کے پیش نظر یہاں کے چڑیا گھر میں سیر بینوں کا اژدہام آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو یہ چڑیا گھر بھی پاکستان میں ایک منفرد حیثیت کا مالک ہے۔ یہ کچھ آج سے قائم نہیں۔ یہ پچھلے نوّے برس سے قائم ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ اب اس کو قائم ہوئے سو برس ہونے کو آتے ہیں۔ نہ صرف لاہور کے شہریوں کو بلکہ دُور دراز کے دیہاتیوں تک کو چڑیا گھر کی سیر کا چسکا پڑ گیا ہے۔

لاہور کا چڑیا گھر مال روڈ کے کنارے اسمبلی چیمبر کے قریب گورنر ہاؤس کے سامنے لارنس گارڈن (باغ جناح) کے ایک گوشے میں قائم ہے۔ یہ ۱۸۷۲ء کی بات ہے۔ جب سر رابرٹ ڈیویز (DAVIES) پنجاب کا لفٹنٹ گورنر تھا سر رابرٹ ڈیویز ۱۸۷۱ء سے ۱۸۷۷ء تک لفٹیننٹ گورنر پنجاب کی حیثیت سے گورنمنٹ ہاؤس میں متمکن رہا۔ اسی کے زمانے میں لاہور کا چڑیا گھر قائم ہوا۔ اُس وقت چڑیا گھر کی صورت اب سے بہت مختلف تھی۔ یہ تھوڑے سے رقبے میں قائم ہوا تھا۔ بعد کو چڑیا گھر کی توسیع اور ترقی ہوتے ہوتے ۱۹۴۲ء میں یہ اس صورت کو پہنچا جس میں ہم اس کو آج دیکھتے ہیں۔ گویا ۱۹۴۲ء سے چڑیا گھر کا دَورِ ثانی شروع ہوتا ہے۔ یہ زمانہ سر بیٹرم گلانسی (BETRAM GLANCY) کی گورنری کا تھا۔ پہلا دَور یعنی ۱۸۷۲ء چڑیا گھر کا ابتدائی دَور تھا۔ موجودہ زمانے میں چڑیا گھر بیس ایکڑ زمین پر پھیلا ہوا ہے۔ اگرچہ یہ توسیع شدہ رقبہ بھی کچھ زیادہ دل خوش کن نہیں۔ اس لیے کہ چڑیا گھر کے لیے کم از کم چھتیز ایکڑ کا رقبہ درکار ہوتا ہے۔ اور ہمارا چڑیا گھر اس لحاظ سے تقریباً ایک چوتھائی رقبے میں ہے۔ مگر اس بیس ایکڑ کے احاطے میں عجیب و غریب حیوانات کا وہ انبوہ کثیر ہے۔ جو دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے۔

آئیے اب چڑیا گھر کی سیر کریں۔ احاطے کے باہر محرابی شکل میں "چڑیا گھر" اُردو میں اور انگریزی میں ZOOLOGICAL GARDENS) لکھا ہوا ہے۔ پھاٹک کے دہنی جانب ٹکٹ ملتا ہے۔ ٹکٹ خرید کر سیر کرنے والے اندر داخل ہوتے ہیں۔ اندر ایک وسیع کھلا ہوا میدان ہے۔ جس میں ایک چھوٹی سی پہاڑی بھی ہے۔ اس وسیع میدان کو کئی حصوں میں حسب ضرورت تقسیم کیا گیا ہے۔ جا بجا حیوانات کے لیے عمارتیں ہیں۔ عمارت کا سلسلہ ختم ہونے پر تھوڑا سا کھلا ہوا میدان آجاتا ہے۔ اس کے بعد پھر سلسلۂ عمارات اور پھر کھلا میدان ہے۔ غرضکہ عمارتوں اور کھلے میدانوں کا ایک تسلسل ہے۔ یہ عمارتیں زندہ دلان پنجاب کی زندہ دلی کا بیّن ثبوت ہیں۔ پہلے ہی بلاک پر کرنل سر عمر حیات خان ٹوانہ کے نام کا کتبہ لگا ہوا ہے۔ عمارتوں کے اس بلاک کی تعمیر کرنل ٹوانہ نے جون ۱۹۲۳ء میں کرائی تھی۔ اسی طرح مختلف اوقات میں مختلف بلاک بنتے رہے یا پہلے کی بنی ہوئی عمارات کی توسیع ہوتی رہی۔ چھان بین کی جاتے تو معلوم ہوگا کہ رؤسائے پنجاب کو چڑیا گھر سے کس قدر دلچسپی رہی ہے۔ عمارت کے بلاک اور حیوانات کے عطیے اہل مقدرت کی فراخ دلی کی شہادت دیتے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کی تقسیم سے پہلے پنجاب کے راجے مہاراجے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر اس چڑیا گھر کی خدمت میں حصّہ لیتے تھے۔ انگریز حکام اور مسلمان رئیسا بھی اس معاملے میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔

چڑیا گھر میں ہر نسل کے حیوانات کے لیے مناسب و موزوں انتظام ہے۔ وحشی درندوں شیر، چیتے اور بھیڑیوں کے لیے جو عمارتیں مخصوص ہیں۔ ان کے دروازوں میں آہنی سلاخیں لگی ہوئی ہیں۔ اور ان کے لیے جو صحن ہیں ان کے گرد اُونچی سلاخیں نصب ہیں کہ چھلانگ لگا کر یہ خونخوار درندے باہر نہ نکل آئیں۔ بارہ سنگھے اور ہرن اس قدر شدید حفاظت میں نہیں

رکھے جاتے۔ ان کے لیے سرسبز کھلے ہوئے احاطے ہیں۔ گویا مصنوعی طور پر ایک جنگل اگایا گیا ہے جس میں یہ جنگل کے باسی بظاہر آزاد گھومتے پھرتے ہیں۔ اگرچہ حقیقت میں ان کے گرد بھی ایک جالی دار حصار کھچا ہوا ہے۔ جسے توڑ کر یہ باہر نہیں آسکتے۔ جنگلی پرندے کشادہ احاطوں میں جن پر جالی کا خول ہے۔ آزادانہ چہکتے اور اڑتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ آبی مخلوقات کا کچھ اور بھی انتظام ہے۔ ان کی خاطر ایک لمبی سی مصنوعی جھیل بنائی گئی ہے۔ اود بلاؤ مگرمچھ وغیرہ الگ اپنے اپنے مختصر کمروں میں رہتے ہیں جن کے گرد جالی لگی ہوئی ہے۔ نیچے پانی ہے۔ کیونکہ خشکی ان کو مرغوب نہیں۔ لیکن آبی پرندے مصنوعی جھیل میں بالکل آزاد ہیں۔ ان میں طرح طرح کی مرغابیاں ہیں اور قسم قسم کے لبلخ اور مچھلیوں کے لیے الگ انتظام ہے۔ بندروں کے لیے آہنی کٹہرے کے اندر درخت ہیں۔ جن میں وہ اچھلتے کودتے اور جھولتے رہتے ہیں۔ ریچھوں کے لیے مصنوعی غار ہیں۔ جو کمروں کے اندر بنائے گئے ہیں۔ کمروں کے باہر مضبوط آہنی جنگلا لگا ہوا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ حیوانات اپنے فطری گرد و پیش میں رہ کر چڑیا گھر میں اپنے کو قیدی یا اجنبی نہ محسوس کریں۔ ہر قبیل کے حیوانات کے لیے مطابق فطرت انتظام موجود ہے۔

چڑیا گھر میں سب سے پرکشش شخصیت جنگل کے بادشاہ کی ہے۔ سب سے زیادہ ہجوم اس کے چاروں طرف ہوتا ہے۔ شہری تو ایک طرف اگر دیہاتی بھی سن پائیں کہ شیر آگیا تو سہم کر رہ جائیں۔ اور گھر کے دروازے بند لیں۔ لیکن چڑیا گھر میں بے پناہ خلقت شیر دیکھنے کو آتی ہے۔ اس جانور میں اپنے قد و قامت سے ہزاروں گنا زیادہ طاقت ہوتی ہے۔ چستی اور پھرتی میں بھی اس کی مثال نہیں۔ آدمی تو آدمی جنگل کے درندے بھی اس کی قوت کو تسلیم کرتے ہیں۔ جرأت و ہمت کا یہ عالم ہے کہ جری سے جری اور بہادر سے بہادر انسان کو شیر سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ چڑیا گھر میں دو قسم کے شیر ہیں۔ ایک تو شیر ببر یعنی افریقی نسل کا شیر اور دوسرا ٹائیگر (TIGER) جسے عرف عام میں شیر کہتے ہیں۔ اگرچہ وہ شیر ببر سے مختلف ہے۔ اور شیر ببر کے مقابلے میں فضیلت نہیں رکھتا۔ ہمارے چڑیا گھر میں پانچ ببر شیر ہیں جن میں تین مادہ اور دو نر ہیں۔ ان میں ایک جوڑا پاکستانی ہے جو سنہ ۱۹۴۱-۴۲ء میں اسی چڑیا گھر میں پیدا ہوا۔ سنہ ۱۹۴۴ء میں ایک عجیب سانحہ ہوا۔ کہ رکھوالوں کی غفلت سے ایک شیر کے جنگلے کا دروازہ کھلا رہ گیا۔ شیر نے باہر نکل کر ایک آدمی کو ہلاک کر دیا۔ اس واقعے سے کھلبلی مچ گئی آخر ڈپٹی کمشنر مسٹر کے ایچ ہینڈرسن کے حکم سے اُسے گولی سے مار دیا گیا۔ ان ببر شیروں کے علاوہ دو ٹائیگر (TIGER) یا عام شیر ہیں ان میں سے نر ڈھاکے سے آیا ہے اور مادہ اسی چڑیا گھر میں سنہ ۱۹۳۹ء میں پیدا ہوئی۔ یہاں آٹھ چیتے ہیں۔ ان میں سے دو کالے چیتے ایسے ہیں جو ابھی پاکستان میں نووارد ہیں یہ اسی سال سنگاپور سے آئے ہیں۔ چھ چیتے یہیں کے ہیں ان میں ایک ڈھاکہ سے آیا ہے۔ اور دو جناب فاروق و فرخ صاحبزادگان آغا احمد رضا خاں ڈپٹی کمشنر کا عطیہ ہیں۔ ایک چیتا سنہ ۱۹۵۲ء میں اسی چڑیا گھر میں پیدا ہوا۔ ان شیر چیتوں کی خوراک جنگل میں تو خدا جانے کیا کچھ ہوگی۔ چڑیا گھر میں شیروں کو فی کس دس سیر گوشت اور چیتوں کو فی کس چار سیر گوشت روزانہ کھلایا جاتا ہے۔

چڑیا گھر میں دو ہاتھی ہیں جو ڈھاکہ سے آئے ہوئے ہیں۔ عورتوں اور بچوں کے لیے یہ ہاتھی سامانِ تفریح ہیں۔ جب بھی چڑیا گھر جائیے یہی دیکھنے میں آئیگا کہ عورتیں اور بچے ہاتھی پر سوار پہاڑی کا چکر لگا رہے ہیں۔ ہاتھی پر بیٹھنے کا الگ

ٹکٹ ہے۔ تماشائی ٹکٹ لے کر کٹہرے ہاتھی پر سیڑھی کے ذریعے چڑھ جاتے ہیں۔ یہ ہاتھی دوسرے تمام حیوانات کے مقابلے میں زیادہ مقبول ہیں۔ اس لیے کہ یہ تماشائیوں سے بے حد مانوس ہیں۔ یہ کوئی شیر تو ہیں نہیں کہ ان کو دیکھ کر کوئی ڈر جاتے یہ تو سواری کے ہاتھی ہیں۔ اشارہ پایا اور چل دیئے۔ چکر ختم ہوا تو ٹھہر گئے۔ پھر جب تک دوبارہ ٹکٹ نہ لیجیے یہ چلنے والے نہیں غرض کہ ان ہاتھیوں کی بدولت بڑی رونق رہتی ہے۔ مگر وہ جو مثل مشہور ہے کہ اپنے گھر ہاتھی باندھنا آسان نہیں۔ وہ یہاں بھی صادق آتی ہے۔ اس لیے کہ یہ ہاتھی روزانہ پانچ من گنے کھاتے ہیں۔

ہر دل عزیز ہونے میں ہاتھیوں کا مقابلہ اگر کوئی کرسکتا ہے۔ تو وہ چڑیا گھر کے بندر ہیں۔ یوں تو بندروں کی شوخیاں ضرب المثل ہیں۔ لیکن چڑیا گھر کے بندر کمال درجے کے شوخ ہیں۔ چھوٹے بچوں میں تو بندر ہاتھی سے بھی زیادہ مقبول ہیں۔ چڑیا گھر میں داخل ہونے سے پہلے بچے بالعموم بندروں کے لیے کھا جا خریدتے ہیں۔ ان کو چنے کھلانے کا رواج بہت عام ہے۔ بعض بچے شیرینی اور پھل انھیں کھلاتے ہیں اور بندر شکریہ کے طور پر طرح طرح کے منہ بناتے ہیں۔ قسم قسم کے ناچ ناچتے ہیں اور اپنے حرکات سے بچوں کو خوب ہنساتے ہیں۔ شریر بچے بڑوں کی آنکھ بچا کر بندروں کی تواضع کنکروں سے بھی کرتے ہیں۔ موقع پایا اور چپکے سے کنکر یا ڈھیلا دے مارا۔ ہزار نگرانی کرنے کے باوجود بچے باز نہیں آتے۔ بندر بھی اس کا بدلہ لینے کے درپے رہتے ہیں۔ دو ایک بندر تو ایسے شریر ہیں کہ اور کچھ نہ ملے تو دھول ہی اٹھا کر تماشائیوں کی آنکھوں میں جھونکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چڑیا گھر میں کئی قسم کے بندر ہیں۔ لنگور۔ بن مانس۔ عام بندر وغیرہ۔

چڑیا گھر میں سات ریچھ ہیں۔ سر ہربرٹ ایمرسن (۱۹۳۲-۳۸ء) گورنر پنجاب کے لڑکے ایمرسن نے ایک ریچھ چڑیا گھر کے لیے نوشہرہ سے بھیجا تھا۔ دو ریچھ والیٔ سوات کا عطیہ ہیں اور دو گلگت سے اسی سال آئے ہیں۔ ریچھ اور انسان کی دوستی مشہور ہے۔ اس کا ایک نمونہ گلی کوچوں میں نظر آتا رہتا ہے۔ شہر شہر اور گاؤں گاؤں مداری ریچھوں کو لیے پھرتے ہیں جہاں ٹھہر گئے وہیں ڈگڈگی بجا کر ریچھ کو نچانے لگے۔ آخر میں ریچھ لیٹ کر اپنا پیٹ دکھاتا ہے یعنی کھانے کو مانگتا ہے۔ اس بہانے مداری تماشائیوں سے پیسے جمع کرنا شروع کر دیتا ہے۔ غرضکہ ریچھ کو سدھانا کچھ ایسا مشکل نہیں کہنے کو تو ریچھ ایک خوفناک درندہ ہے مگر اس کی خوراک نباتیاتی ہے۔ یہ گوشت خور جانور نہیں البتہ شیر اور ریچھ کی آپس میں نہیں بنتی۔ شیر جنگل کا بادشاہ سہی ریچھ اس کا مقابلہ کرنے پر تیار رہتا ہے۔ چڑیا گھر میں ریچھوں کے پنجرے شیروں کے پنجروں سے تھوڑے ہی فاصلہ پر ہیں مگر چڑیا گھر میں آکر حیوانات کی آپس کی دشمنی بالکل ختم ہوگئی ہے۔ نہ کوئی کسی سے ڈرتا ہے نہ کسی کو ڈراتا ہے۔

ان وحشی درندوں کے علاوہ یہاں بھانت بھانت کے جانور ہیں کئی قسم کے ہرن، بارہ سنگھے، گھڑیال نیل گائے۔ پہاڑی بکرے یہاں نظر آتے ہیں۔ بارہ سنگھوں کی تو کئی اقسام ہیں۔ اور ان کے سینگ مختلف شکلوں کے ہوتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر جنگل کی فضا یاد آجاتی ہے اور چڑیا گھر میں ان کے رہنے کا جو انتظام ہے وہ جنگل کی فضا سے بڑی حد تک مشابہت رکھتا ہے۔

یہاں انواع و اقسام کے پرند بھی ہیں۔ کچھ ان میں صحرائی ہیں اور کچھ آبی۔ دس قسم کے کبوتر ہیں۔ ان میں مقدس کبوتر۔ سفید لکے۔ نیلے رنگ کے۔ ایرانی شیرازی۔ پیغامبر۔ جیکوبن۔ کلغی دار سبھی شامل ہیں۔ طوطے بھی کئی قسم کے ہیں ان میں ہالینڈ آسٹریلیا۔ افریقہ۔ انڈونیشیا کے ولایتی طوطے بھی ہیں۔ اور رنگ برنگ دیسی طوطے بھی۔ ان میں نیلہ اور زرد مسکاؤ بھی ہے جو

جنوبی امریکہ میں پایا جاتا ہے۔ نام سے پراگ ڈینے تک پایا جاتا ہے۔ اس قسم کا ولائتی طوطا نواب صاحب و بیگم صاحبہ بہاولپور کا عطیہ ہے جو انھوں نے ۱۹۵۲ء میں چڑیا گھر کو مرحمت کیا۔ زرد رنگ کا ایک مکاؤ جو شمالی امریکہ میں پایا جاتا ہے۔ اسی چڑیا گھر میں ۱۹۵۹ء میں پیدا ہوا۔ ہر قسم کے مور یہاں موجود ہیں۔ سفید مور تو بے حد خوبصورت ہیں۔ دھاری دار مور والا بک جس کا سر سفید ہوتا ہے اور دو نعلی کی شکل کی سیاہی مائل دھاریاں سر اور گردن کی پچھلی طرف ہوتی ہیں۔ گردن کی دونوں طرف لمبائی میں سفید دھاریاں ہوتی ہیں۔ اوپر کے پر کچھ زردی لیے بھورے رنگ کے ہوتے ہیں اور پیٹ سفید ہوتا ہے۔ بے حد جاذب نظر ہیں۔ یہ ملک برما اور وسط ایشیا کا پرندہ ہے۔ ایسے ہی جانے کتنے پرندے اور ہیں جن کی فہرست یہاں دینا طوالت سے خالی نہ ہوگا۔

آبی مخلوق کے بھی یہاں بہت سے نمونے ہیں۔ ان میں سات لودھڑ ہیں جن میں سے دو والئے سوات کا عطیہ ہیں۔ یہ وضع قطع میں نیولے سے مشابہ ہیں اور پانی میں رہتے ہیں۔ یہاں ایک مگر مچھ بھی ہے۔ جب اس کا جی پانی سے گھبراتا ہے تو خشک گھاس پر کروٹ بدلنے کے لیے باہر آ جاتا ہے۔ آٹھ سفید اور سات سیاہ بطخیں بھی ہیں جو بڑی نسل کی ہیں۔ چند کلنگ ہیں۔ کچھ چھوٹی نسل کی بطخیں بھی ہیں۔ مچھلیاں اور اود بلاؤ بھی ہیں۔ آبی مخلوق دوسرے تمام حیوانات پر اپنی قدامت کی وجہ سے فوقیت رکھتی ہے۔ اور تخلیق کائنات کے اس دور کی یادو لاتی ہے۔ جب ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ اور انسان اور دوسرے چلنے پھرنے والے حیوان موجود نہ تھے۔

اب ہم حیوانات کی اس مختصر سی دنیا کی سیر کر چکے یہاں ہم نے بہت کچھ دیکھا۔ جس کا ہلکا سا نقش سطور بالا میں پیش کیا جا چکا ہے۔ چرند و پرند کی مختلف اقسام پر نظر ڈالی۔ جن کی فہرست اگر مکمل طور پہ قلمبند کی جائے۔ اور ان میں سے ہر ایک کی خصوصیات گنوائی جائیں تو چڑیا گھر کا یہ خاکہ ایک دفتر ہو جائے۔ لیکن یہ ہمارا مقصد نہیں۔ لاہور کا چڑیا گھر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ محض بیان کرنے کی چیز نہیں۔

چڑیا گھر کی سیر سے چند اثرات مرتب ہوتے ہیں اور چند تجاویز ذہن میں آتی ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ دوسرے متمدن مقامات کی نمائش گاہ حیوانات کی طرح لاہور کے چڑیا گھر کے لیے بھی چند ماہر مقرر کیے جائیں۔ جو پرورش حیوانات کا کام جانتے ہوں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ اس چڑیا گھر کے لیے موزوں گائیڈ بکس لکھوائی جائیں۔ جن میں مکمل معلومات متعلقہ موجود ہوں۔ دوسرے ملکوں کی طرح یہاں بھی بین الاقوامی قانون کے مطابق کم از کم پچھتر ایکڑ زمین کا رقبہ چڑیا گھر کے لیے مختص ہونا چاہیے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ پاکستان کے پنج سالہ منصوبے میں چڑیا گھر کے لیے ستر ہزار روپیہ منظور کیا گیا ہے۔ یہ نیا دور چڑیا گھر کی ترقی کا تیسرا دور ہوگا۔ اور امید ہے کہ اب جو کچھ کمی سیر بینوں کی نگاہ میں کھٹکتی ہے۔ وہ مستقبل قریب میں پوری ہو جائیگی۔ آج بھی دیکھ بھال پر ایک کثیر رقم خرچ کی جاتی ہے۔ جو تخمیناً ساڑھے چار ہزار روپیہ ماہانہ ہے۔ اس میں سے کوئی تین سو روپیہ روزانہ حیوانات کی خوراک پر صرف کیا جاتا ہے۔

———

دروازے

حافظ عباد اللہ فاروقی

سید محمد لطیف ہسٹری آف لاہور میں لکھتے ہیں کہ شہنشاہ اکبر نے شہر لاہور کے گرد اگرد ۳۰ فٹ اونچی فصیل بنوائی۔ تاکہ شہر کو بیرونی حملہ آوروں کی ترکتازی سے بچائے رکھے۔ یہ فصیل شروع میں نہایت پختہ تھی لیکن امتدادِ زمانہ سے اس میں شگاف پڑ گئے چنانچہ سنہ ۱۸۱۲ء میں رنجیت سنگھ کے عہد میں مرمت طلب ہو گئی۔ رنجیت سنگھ نے نہ صرف اس کی شکست و ریخت کو بند کروایا بلکہ حفظانِ صحت کے اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس فصیل کی اونچائی بجائے ۳۰ کے ۱۵ فٹ کرا دی۔ فصیل کے باہر اس نے خندقیں بھی کھدوائیں۔ لیکن مرورِ ایام سے ان خندقوں کا نام و نشان مٹ چکا ہے۔ جہاں خندقیں تھیں وہاں اب باغات بن گئے ہیں۔ فصیل کے آثار بھی مفقود ہو چکے ہیں۔ البتہ کشمیری دروازہ اور شیرانوالہ دروازہ کے درمیان اب بھی اس فصیل کے آثار ملتے ہیں۔ لالہ کنہیا لال تاریخ لاہور کے صفحہ ۵۰ پر یوں رقمطراز ہیں:

> "اکبر بادشاہ نے اس کے (لاہور) کے گرد پختہ حصار بنوایا فصیل کی دیوار بہت بلند اور چوڑی تعمیر کی۔ ایک ایک دروازہ کے درمیان دس دس برج کلاں بنوائے دروازے پختہ تعمیر کئے۔ قلعہ بھی پختہ بنوایا۔ وہ فصیل اخیر سلطنت سکھی تک قائم رہی۔ انگریزی عہد میں اس قدر بلند فصیل فضول تصور ہو کر پہلے بقدر نصف کے گرائی گئی۔ دوسری دفعہ باقی ماندہ گرا دینے کا حکم مل گیا اور اس کی جگہ ایک مختصر دیوار پختہ بنوا دی گئی۔"

اس شہر کے بارہ دروازے ہیں (اور ایک چھوٹا دروازہ بھی ہے جسے موری دروازہ کہتے ہیں)۔

۱۔ دہلی دروازہ چونکہ یہ دروازہ دہلی کی جانب ہے اس لیے دہلی دروازہ کہلایا۔ یہ لاہور کے مشرق کی سمت واقع ہے۔ لاہور ریلوے سٹیشن اس کے پاس ہی ہے۔ جو لوگ باہر سے آتے ہیں زیادہ تر اسی دروازے سے شہر کے اندر داخل ہوتے ہیں۔ اسی دروازے کے اندر سے سیدھی سڑک قلعہ کو جاتی ہے مسجد وزیر خاں بھی دہلی دروازے کے اندر واقع ہے۔ لالہ کنہیا لال تاریخ لاہور میں لکھتے ہیں کہ سرائے وزیر خاں و حمام وزیر خاں جو مسجد

کے اوقاف میں سے شمار ہوتے ہیں اسی دروازے کے اندر ہیں۔ پرانی عمارت اکبری اس دروازے کی انگریزی عہد تک موجود تھی۔ مگر نہایت بوسیدہ و خراب اور دروازہ پست و زمین دوز ہو چکا تھا۔ یہاں تک کہ ہاتھی کا مع عماری گزرنا محال تھا۔ سرکار انگریزی نے بنظر رفع اس تکلیف کے پہلے دروازے کو گرا دیا۔ اور محمد سلطان ٹھیکہ دار کی معرفت عمارت موجودہ حال بنوائی۔ یہ دروازہ محمد سلطان ٹھیکیدار نے دوبارہ اپنی گرہ سے تعمیر کروایا تھا۔ یہ دروازہ دومنزلہ نہایت مقطع بنایا گیا ہے۔ دونوں طرف دروازے کے دومنزلہ عالیشان عمارت ہے۔ اور وسط میں دروازہ ہے۔ نیچے کے دو طرفہ مکانات میں پولیس کے سپاہی رہتے ہیں اور اوپر کی منزل میں ایک طرف تو مکان نشست و کچہری صاحبان آنریری مجسٹریٹان و میونسپل کمیٹی کے ممبروں کے اجلاس کے لیے مکلف و مصفا بنا ہے جس میں کچہری ہوتی ہے۔ اور دوسری طرف پولیس کے افسر رہتے ہیں جن کی تعیناتی دروازے کی حفاظت پر ہوتی ہے۔ مصنف تاریخ لاہور نے لکڑی کے طاقوں کا ذکر نہیں کیا جو نہایت وزنی اور مضبوط ہونے کی وجہ سے کسی آہنی دیوار سے کم نہیں اس میں جا بجا لوہے کی میخیں لگی ہوئی ہیں۔ یہ اس زمانے کی یادگار ہے جبکہ ہاتھیوں کے ذریعے دروازوں کو توڑا جاتا تھا۔

۲۔ اکبری دروازہ

یہ دروازہ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کے نام سے موسوم کیا گیا۔ شہنشاہ اکبر نے اس کے ساتھ غلہ منڈی بھی بنوائی۔ جو اسی کے نام سے موسوم ہے۔ اکبری منڈی اب بھی موجود ہے۔ لیکن اکبری دروازہ ڈھے چکا ہے۔ سرکار انگریزی کے عہد میں قدیمی طرز پر از سرِ نو بنایا گیا تھا لیکن پاکستان بننے کے بعد یہ دروازہ گرا دیا گیا ہے۔ اس دروازے کے ساتھ ایک سرائے بھی تھی جس میں اب پولیس کا تھانہ قائم ہے۔

۳۔ موتی دروازہ (موچی دروازہ)

یہ دروازہ جنوب کی طرف واقع ہے۔ اکبری عہد کے ایک ہندو جمعدار کے نام سے موسوم ہے۔ جو تمام عمر اس دروازے کی حفاظت پر تعینات رہا۔ سکھی عہد میں موتی دروازہ کی بجائے موچی دروازہ مشہور ہوا۔ اب بھی اس نام سے موسوم چلا آتا ہے۔ انگریزی عہد میں یہ دروازہ مع دونوں برجوں کے گرا دیا گیا تھا۔ اور اس کی اینٹیں فروخت کر دی گئی تھیں۔ اس دروازے کی دونوں جانب مساجد بنی ہوئی ہیں۔ دائیں جانب ملا محمد صالح کی شاہجہانی عہد کی مسجد ہے۔ بائیں طرف بالائی منزل پر مسجد ہے نیچے دکانیں ہیں۔ ملا محمد صالح کی مسجد کے نقش و نگار زبانِ حال سے داستانِ ماضی سنا رہے ہیں۔ دہلی دروازے کی طرح بیرون موچی گیٹ میں مسلمانانِ لاہور کے اکثر جلسے اور تقاریر ہوتی رہی ہیں۔

۴۔ شاہ عالمی دروازہ

یہ دروازہ اورنگ زیب عالمگیر کے بیٹے اور جانشین محمد معظم شاہ عالم بہادر کے نام سے موسوم ہے۔ جو ۲۸ فروری ۱۷۱۲ء کو بمقام لاہور فوت ہوا۔ پہلے اس کا نام کچھ اور تھا۔ بعد میں شاہ عالمی دروازہ پکارا جانے لگا۔ یہ دروازہ بھی انگریزی عہد میں دوبارہ پہلے دروازے کی قطع پر تعمیر ہوا تھا۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد اسے گرا دیا گیا۔ دروازہ چھوٹی اینٹوں کا تھا۔ اوپر کی منزل میں پولیس کی نشست گاہ تھی۔ اب فقط نام رہ گیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے یہ دروازہ دیکھا ہے۔ وہ یہاں سے گزرتے ہوئے اس کے آثار ڈھونڈھنے کے لیے

کچھ عرصہ ضرور ٹھہر جاتے ہیں بلکہ ان کے پاؤں خود بخود یہاں رک جاتے ہیں ؎

پایم بہ پیش از سر آں کو نمی رود
یاراں خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہ کیست

اندرون شاہ عالم گیٹ مشہور عمارات یہ ہیں۔ پری محل۔ لال مسجد۔ رنگ محل۔ مقبرہ ایاز۔ حویلی میاں خان وغیرہ۔ قیام پاکستان کے بعد ہندوؤں کی جلی ہوئی عمارات گرا کر یہاں سر بفلک نئی عمارتیں بنا دی گئی ہیں۔ جو طرز اور ہیئت میں امریکی وضع کی عمارات کے مشابہ ہیں۔

۵۔ لوہاری دروازہ اس کا اصلی نام لاہوری دروازہ ہے غلط العام لوہاری دروازہ مشہور ہے لالہ کنہیا لال تاریخ لاہور میں لکھتے ہیں کہ جب سلطان محمود غزنوی نے چاہا کہ راجہ جے پال بن انگپال کو لاہور سے بیدخل کر کے پنجاب کا علاقہ اپنے ماتحت کرے۔ تو راجہ جے پال چند ماہ تک اس شہر میں محصور ہو کر لڑتا رہا آخر بھاگ گیا۔ محمود نے شہر کو آگ لگا دی رعایا کو قتل کیا۔ جس سے شہر بالکل ویران و برباد ہو گیا۔ رعایا کے لوگ کچھ قتل ہوئے کچھ بھاگ گئے۔ چند سال یہ شہر غیر آباد رہا۔ آخر جب ملک ایاز پنجاب کے انتظام کے لیے مامور ہوا تو اس نے شہر کو دوبارہ آباد کرنا چاہا سب سے اول آبادی شہر کی اسی محلہ سے شروع ہوئی جس کو لاہوری منڈی کہتے ہیں اور سب سے اول یہی دروازہ تعمیر ہوا جس کا نام لاہوری دروازہ رکھا گیا۔ اس دروازے کی سابقہ عمارت نہایت بوسیدہ اور خستہ تھی۔ انگریزی عہد میں قدیمی قطع وضع پر اس کو از سر نو بنوایا گیا۔ اس کا بھی لکڑی کا بنا ہوا مضبوط دروازہ موجود ہے اور دروازے کے اوپر رہائشی کمرے بھی ہیں۔

۶۔ موری دروازہ یہ شہر کے تمام دروازوں سے چھوٹا دروازہ ہے۔ اس کا محل وقوع لوہاری اور بھاٹی دروازہ کے درمیان ہے۔ انگریزی عہد میں اس دروازے کو کشادہ کیا گیا تھا۔ آج کل اس کا دروازہ مفقود ہو چکا ہے۔ موری دروازہ بھی ملک ایاز کے عہد کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ کیونکہ جب ملک ایاز نے شہر لاہور کو دوبارہ آباد کیا تھا تو فتح کی یادگار کے طور پر اس جگہ دروازہ قائم کر دیا تھا۔ لیکن اس کی وجہ تسمیہ معلوم نہیں ہو سکی۔ لالہ کنہیا لال تاریخ لاہور میں لکھتے ہیں "کہ یہ دروازہ بھی موری دروازے کے نام سے بعہد ملک ایاز موسوم ہوا۔ اس واسطے کہ جن دنوں میں بعہد راجگی راجہ جے پال سلطان محمود نے شہر کو محصور کیا ہوا تھا۔ راجہ تو شہر سے بے خبر بھاگ گیا۔ مگر شہر کے لوگ بدستور لڑتے رہے۔ سلطان نے چاہا کہ شہر میں داخل ہو کر شہر والوں کو سزا دیوے مگر کسی راستہ سے داخلہ نہ ملا۔ آخر اس مقام سے دیوار میں کو گرا کر داخل شہر ہوا۔" اب سوال یہ ہے کہ کیا محمود غزنوی کا اس چھوٹے سے راستہ سے شہر کے اندر داخل ہونے کی وجہ سے اس کا نام موری دروازہ قرار پایا؟ یا اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ سکھوں کے عہد میں اس دروازہ سے شہر کا کوڑا کرکٹ باہر نکالا جاتا تھا؟ میرے خیال میں یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ اس راہ سے شہر کا کوڑا کرکٹ باہر پھینکا جاتا ہوگا۔ اور لفظ موری بمعنی بدرو کے استعمال ہوتا ہوگا۔ ملک ایاز کے زمانہ میں لفظ موری کا بدرو کے معنوں میں استعمال ہونا متصور نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اس دروازہ سے کوڑا کرکٹ کا باہر پھینکنا قیاس کیا جا سکتا ہے جبکہ تمام شہر نذر آتش ہو چکا تھا اور اس کا کچھ حصہ لاہوری دروازہ کے پاس نیا تعمیر ہوا تھا۔

۷۔ بھاٹی دروازہ ۔ یہ دروازہ لاہور کے مغرب کی جانب ہے۔ یہاں سے سیدھا راستہ شاہی مسجد کو جاتا ہے۔ یہ دروازہ

بھاٹ قوم سے منسوب ہے۔ جو بعد آبادی لاہور کے اس دروازہ کے اندر یکجا آباد ہوئے تھے۔ اس کا قدیم دروازہ شکستہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ انگریزوں نے اپنے عہد حکومت میں اس کو گرا کر انگریزی قطع کا دروازہ بنوا دیا تھا۔ جو اب تک موجود ہے۔ اس دروازے کی محراب قدیم دروازوں کی محرابوں سے بالکل مختلف ہے نیز بخلاف قدیم عہد کے دروازوں کے اس کے اوپر پہرہ داروں کے لیے کمرے ہیں نہ نیچے چوکیداروں کی قیام گاہیں ہیں۔ دروازے کے ساتھ ہی تھانہ ٹھاٹی گیٹ ہے۔ اس دروازے کے طاق بھی نہیں کیونکہ یہ جس عہد میں دوبارہ بنا۔ اس عہد میں شہر بندی کی رسم نہ تھی۔ اور عین ممکن ہے شہر کی فصیل بھی اس وقت موجود نہ ہو۔ بھاٹی دروازہ کے اندر بازار حکیماں ہے۔ جہاں بڑے بڑے نامور طبیب رہا کرتے تھے۔ اونچی مسجد، اور ہندو، دونوں سکھوں اور مسلمانوں کی بڑی بڑی حویلیاں موجود ہیں جو تقریباً سکھ عہد کی یادگار ہیں۔ سکھوں کے عہد کا کوچہ فقیر خانہ بھی موجود ہے۔ جہاں فقیر خاندان کے لوگ رہائش پذیر ہیں۔ فقیر سید مغیث خلف الرشید فقیر سید جلال الدین مرحوم اسی بازار میں رہتے ہیں۔ اسی دروازہ کے اندر بازار جج محمد لطیف بھی ہے جو ہسٹری آف لاہور کے مصنف ہیں۔ تحصیل بازار بھی اسی کے اندر ہے۔ اور مدرسہ نعمانیہ بھی اس کے آخر میں واقع ہے۔

۸۔ ٹکسالی دروازہ

یہ دروازہ لاہور کی غربی جانب ہے۔ شاہان سلف کے عہد میں اس دروازہ کے اندر دارالضرب شاہی ایک عالیشان مکان کی صورت میں تھا جہاں سکے مسکوک و مضروب ہوتے تھے۔ اس ٹکسال کے سبب سے اس کا نام ٹکسالی دروازہ مشہور ہوا۔ اگرچہ ٹکسال کے آثار اب باقی نہیں رہے۔ البتہ مسجد ٹکسال باقی ہے جس کے دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی زمانہ میں کاشی کار عمدہ مسجد بنی ہو گی۔ آج کل اس دروازے کے اندر رنڈیوں کا چکلہ ہے جسے شاہی بازار یا ہیرا منڈی کہتے ہیں۔ جہاں جعلی سروداگری میں روپے کی جھنکار قدیم ٹکسال کے سکوں کی آواز بازگشت معلوم ہوتی ہے۔

۹۔ روشنائی دروازہ

یہ دروازہ مسجد بادشاہی اور قلعہ لاہور کے واقع ہے۔ کسی زمانہ میں یہاں امرا و رؤسا کے مکانات ہوا کرتے تھے جہاں بڑے بڑے چراغ روشن کیے جاتے۔ ان چراغوں کی روشنی کی وجہ سے یہ دروازہ روشنائی دروازہ کہلایا۔ اس دروازہ کی اگرچہ آجکل بھی بڑی شان ہے۔ لیکن وہ چراغاں اور ضیا پاشی نہیں جس کے باعث چاروں طرف سے روشنی کی کرنیں پھوٹتیں۔ سید محمد لطیف کا یہ بیان لالہ کنہیا لال مصنف تاریخ لاہور کے بیان سے قدرے مختلف ہے۔ لالہ کنہیا لال روشنائی دروازہ کی وجہ یہ بتلاتے ہیں کہ بسبب مسجد شاہی اور دروازہ غربی قلعہ لاہور چونکہ ملازمان شاہی کی آمد و رفت یہاں زیادہ رہتی تھی اس سبب سے اس دروازہ کے اندرونی میدان اور باہر روزمرہ بادشاہی حکم سے روشنی ہوا کرتی تھی۔ اس مناسبت سے اس کا نام روشنائی دروازہ رکھا گیا۔ اور اب تک اسی نام سے مشہور ہے۔ یہ دروازہ اصل میں قلعہ کا دروازہ ہے۔ مگر بسبب اس کے کہ قلعہ کی غربی دیوار کے باہر اور فصیل شہر کے اندر تھا۔ شہر کا دروازہ شمار ہونے لگا۔ یہ دروازہ اپنی ہیئت کے اعتبار سے قدیم ترین دروازہ ہے۔

۱۰۔ مستی دروازہ

اس دروازے کا اصل نام بقول سید محمد لطیف مصنف ہسٹری آف لاہور مسجدی دروازہ ہے۔ اس دروازے کے پاس شہنشاہ اکبر کی والدہ مریم مکانی کی مسجد ہے اس مناسبت سے یہ دروازہ مسجدی دروازہ کہلایا۔ بعد میں اس کا نام مستی دروازہ مشہور ہوا۔ لالہ کنہیا لال نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ "یہ دروازہ بھی ایک شاہی

دروازہ کے نام سے مشہور ہے جس کا نام مستی بلوچ تھا۔ دروازہ کی حفاظت اُس کی بادشاہ کے حکم سے اس کے سپرد تھی۔ وہ مدت العمر اسی خدمت پر مامور رہا۔ اس کی قدامت اور نیک نیتی کا یہ نتیجہ ہوا کہ شاہی حکم سے یہ دروازہ اس کے نام سے منسوب کیا گیا تاکہ اس کا نام تاقیام دروازہ زندہ رہے۔ پرانا دروازہ اب بحکم حکام انگریز گرا دیا گیا ہے اور مختصر سا برج اس کی جگہ بنا دیا گیا ہے۔ معلوم نہیں مذکورہ بالا بیان کس حد تک درست ہے البتہ چونکہ اب وہاں نہیں رہا نہ اس کے کوئی آثار وہاں پائے جاتے ہیں۔

۱۱۔ **کشمیری دروازہ** چونکہ اس دروازے کا رُخ کشمیر کی طرف ہے اس لیے یہ کشمیری دروازہ کہلایا۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی سکھ عہد کی ایک حویلی آتی ہے جہاں آج کل لڑکیوں کا ہائی سکول ہے۔ یہ دروازہ نہایت خستہ اور بوسیدہ ہو چکا تھا اس لیے سرکار انگریزی نے انگریزی وضع قطع پر بھاٹی گیٹ کی طرح اسے بھی از سر نو تعمیر کر دیا۔ اس دروازے کے باہر دریائے راوی کی گذرگاہ تھی۔ دروازے کے پاس جو ڈھلوان ہے وہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ فصیل اور دروازوں کے باہر دریا یہاں سے گزرتا تھا۔

۱۲۔ **شیرانوالہ یا خضری دروازہ** اس دروازے کا اصل نام خضری دروازہ ہے جس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ زمانہ سلف میں دریائے راوی شہر کے بہت نزدیک بہتا تھا۔ خصوصاً اس دروازہ کے آگے کشتی پڑی رہتی تھی۔ چونکہ خواجہ خضر کو دریاؤں اور سمندروں کے ساتھ خاص نسبت ہے۔ اس لیے اس دروازہ کا نام خضری دروازہ رکھا گیا۔ لیکن مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں اس دروازہ کا نام شیرانوالہ دروازہ تبدیل ہو گیا۔ اس زمانہ میں دو شیروں کے پنجرے اس دروازہ کے اندر رکھے رہتے تھے۔ جو لوگ دروازوں کی حفاظت کرتے تھے وہی شیروں کی بھی محافظت کرتے تھے۔ انگریزی عہد میں وہ پنجرے اٹھوا لیے گئے مگر دروازے کا نام شیرانوالہ دروازہ بحال رہا۔ اب اس دروازے کے اوپر دائیں اور بائیں طرف دو شیروں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ جو سکھ عہد کے شیروں کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ خضری دروازہ کا نام اگرچہ بدل گیا ہے۔ تاہم اس دروازے کے پاس ہی خضری محلہ موجود ہے۔ جو خضری دروازہ کی نشاندہی کر رہا ہے۔

۱۳۔ **ذکی دروازہ (زکی دروازہ)** یہ دروازہ پیر ذکی شہید کے نام سے مشہور ہے جن کی دو قبریں ہیں۔ ایک دروازے کے اندر ہے جہاں ان کا سر دفن ہے۔ دوسری قبر باقی حصہ جسم کی ہے جو دروازے کے ساتھ ایک ٹیلہ میں ہے۔ عقیدت مند لوگ دونوں قبروں پر فاتحہ پڑھتے ہیں۔ یہ بزرگ مغلیہ محاصرے کے وقت اس دروازے کے محافظ تھے جب شہر فتح ہوا اور رعایا کا قتل عام ہوا تو یہ بھی دشمن کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ مشہور یوں ہے کہ پیر ذکی کا سر گردن سے جدا ہو گیا۔ تو باقی جسم اس مقام تک دشمنوں سے لڑتا چلا گیا جہاں اب اس کی قبر ہے۔ یہ دروازہ بہ سبب کہنہ اور بوسیدہ ہونے کے انگریزی عہد میں گرا دیا گیا تھا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ تک شہر کی فصیل اور دروازے اچھی حالت میں تھے۔ فصیل کے باہر خندق تھی اور دمدمے اور دروازے تھے۔ غرض غنیم کبھی شہر پر حملہ آور نہیں ہو سکتا تھا۔ جب انگریزوں کا زمانہ آیا تو خندقیں مٹی سے بھروا دی گئیں اور اس زمین پر باغیچے لگا دیے گئے۔

انگریزی دَور کی چند تعمیرات

پروفیسر یوسف جمال انصاری

فنِ تعمیر کا ارتقاء اس طور پر ہوا ہے کہ دورِ جدید میں اس کا بنیادی فلسفہ سہولت، رفاہِ عامہ اور سائنس کی ترقیوں سے ہم آہنگی ہے۔ شخصی حکومت کا دور گزر چکا۔ جاگیردارانہ نظام ایک مدت ہوئی پارہ پارہ ہو گیا۔ موجودہ زمانے کی تعمیرات عوام کی بھلائی کو مدِ نظر رکھ کر کی جاتی ہیں۔ اس لیے کہ ہمارا دور عوامی دور ہے۔ عوام کی سہولت ہر طور دوسرے مقاصد پر فوقیت رکھتی ہے۔ اس لیے آج کل کی تعمیرات سڑکیں، پل، ہسپتال، دفاتر، ہوٹل، مدرسے، فیکٹریاں، مل اور بنک ہیں۔ سائنس کے دور میں ہماری تعمیرات کا سائنس کی رو سے ہم آہنگ ہونا لازمی ہے۔ وہ دن گئے کہ عظمت اور رفعت فنِ تعمیر کی امتیازی خصوصیات تھیں۔ آج عظمت اور رفعت کی جگہ افادیت اور سہولت نے لے لی ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی اپنے ساتھ چند مخصوص مسائل لے کر آئی ہے جن سے عہدہ برآ ہونا فنِ تعمیر کے سپرد ہے۔ آج کے مکانات نہ پہلے کی طرح وسیع اور کشادہ ہو سکتے ہیں نہ غیر ضروری طور پر خوبصورت اور مرصّع۔ معماروں اور انجینیروں کا اوّلین فرض یہ ہے کہ بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ حل کریں۔ اور دوسرا فرض یہ ہے کہ عوام کو زیادہ سے زیادہ آسائش کم سے کم جگہ میں مہیا کریں۔ اب مکانات محض نمائش نہیں ہوتے۔ موسموں کا لحاظ، حوادث (مثلاً زلزلہ، طوفان) بیماریوں اور اسی قسم کے ارضی و سماوی حالات کا لحاظ معمار کے پیشِ نظر رہتا ہے۔ دفاتر، مل اور فیکٹریاں فلک بوس عمارات میں واقع ہوتی ہیں۔ امریکہ اور انگلستان اور اب تو پاکستان اور ہندوستان میں بھی ایک عام رجحان یہ ہے کہ کئی کئی منزل کی عمارتیں تعمیر کی جائیں۔ جن تک پہنچنے کے لیے صنعتی وسائل لفٹ وغیرہ استعمال کیے جاتے ہیں۔ غرضیکہ موجودہ فنِ تعمیر کی علامت قلعہ اور عبادت گاہ نہیں۔ دفتر، ہسپتال اور فیکٹری ہے کیونکہ یہ عوامی صنعتی اور سائنسی دور ہے۔

لاہور کی شہر پناہ اب موجود نہیں۔ اب لاہور کا شہر اتنا وسیع ہو گیا ہے کہ شہر پناہ میں رہنے والوں کا قدیم لاہور، شہر لاہور کے ایک گوشے کی حیثیت رکھتا ہے۔ رفتہ رفتہ آس پاس کے چھوٹے چھوٹے گاؤں شہر لاہور میں ضم ہو چکے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب مزنگ، اچھرہ، شیخوپورہ، دھرم پورہ وغیرہ اپنی الگ الگ حیثیت رکھتے تھے۔ اور شہر لاہور کے چاروں طرف قصبے اور گاؤں کی صورت میں پھیلے ہوئے تھے۔ آج یہ بستیاں شہر لاہور کے مختلف محلوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ چھاؤنی میاں میر میں قائم ہونے کے بعد لاہور کینٹ، شہر لاہور کا ایک جدید حصہ ہے۔ جس میں انگریزی دور کی بے شمار تعمیرات موجود ہیں۔ جو فوجی ضرورت کے لحاظ سے بنائی گئی ہیں۔ مال روڈ انگریزوں کے عہد کی اہم ترین شاہراہ ہے۔ جو چھاؤنی کو شہر سے ملاتی ہے۔ لاہور کی جدید عمارات بیشتر مال روڈ کے کنارے واقع ہیں۔ ان میں سے بعض اس قدر اہم ہیں کہ ان کا تذکرہ کیے بغیر لاہور کی عمارات کا کوئی بیان مکمل نہیں ہو سکتا۔ انگریزی دور میں جو تعمیرات ہوئیں۔ ان کا سرِ فہرست گورنمنٹ ہاؤس ہے۔

گورنمنٹ ہاؤس

انگریزی دور میں گورنمنٹ ہاؤس انگریز گورنر کی اقامت گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ جس جگہ پر گورنمنٹ ہاؤس

واقع ہے۔ وہاں ایک بزرگ کا مزار تھا جس کو گنبد کشتی والا کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ بقول بعض یہ مزار سید بدالدین گیلانی کا ہے۔ جن کے نام سے قریب ہی ایک محلہ بھی آباد تھا۔ لیکن اکثر مورخین کا خیال ہے کہ یہ مزار مہدی قاسم خاں کا تھا جو شہنشاہ اکبر کے امرا میں شمار ہوتا تھا۔ سکھ دور میں یہ مقام بعض سکھ سرداروں کے ہاتھ آیا جن سے سرکار انگریزی نے اس کو خرید کر دیا۔ اور یہ جگہ گورنمنٹ ہاؤس کی تعمیر کے لیے تجویز ہوئی۔ ان دنوں اس کی صورت ایک کوٹھی کی سی تھی۔ جس کے چاروں طرف باغ تھا۔ مارچ ۱۸۴۹ء میں فتح پنجاب کے بعد اس کوٹھی کے مالک راجا تیج سنگھ سے یہ کوٹھی انگریزوں نے خریدی۔ اور اسے لیفٹیننٹ گورنر کی قیام گاہ قرار دیا۔ اس حیثیت سے اس پر کرنل سر ہنری لارنس کا قبضہ ہو گیا۔ رفتہ رفتہ اس عمارت میں اضافے ہوتے رہے اور پرانی کوٹھی جس میں سکھ سردار رہا کرتا تھا، اس وقت کسی صورت میں بھی موجود نہیں۔ البتہ گورنمنٹ ہاؤس کے وسیع کھانے کے کمرے میں اس قدیم مقبرے کے نشانات موجود ہیں جس پر اس عمارت کی تعمیر ہوئی ہے۔ عمارت کے وسط میں ساڑھے تینتیس فٹ لمبا چوڑا مربع ہال ہے۔ جس کی اونچائی ۳۲ فٹ ہے۔ ہال کے اطراف میں کمرے ہیں۔ جو ملاقاتیوں کی نشست گاہ اور دوسری ضروریات کے کام آتے ہیں۔ برآمدے وسیع ہیں۔ جا بجا نقش و نگار ہیں۔ عمارت کے چاروں طرف ایک خوبصورت باغ ہے۔ باغ میں ساٹھ فٹ لمبا اور تیس فٹ چوڑا اور تیرہ فٹ گہرا زیرہ دار حوض ہے۔ گورنمنٹ ہاؤس میں ملازمین کے کوارٹر، اصطبل، گودام وغیرہ بھی ہیں۔

۱۸۴۹ء سے ۱۹۲۱ء تک گورنمنٹ ہاؤس لیفٹیننٹ گورنروں کی اقامت گاہ رہا۔ ۱۹۲۱ء کے بعد لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کا عہدہ گورنر پنجاب قرار پایا اس لحاظ سے ۱۹۲۱ء کے بعد سے اس عمارت میں گورنر پنجاب رہتے چلے آئے ہیں۔ پہلا لیفٹیننٹ گورنر سر ہنری لارنس تھا۔ جو ۱۸۴۹ء میں گورنمنٹ ہاؤس میں فروکش ہوا تھا۔ آخری لیفٹیننٹ گورنر سر ای۔ ڈی میکلیگن ۱۹۱۹ء میں گورنمنٹ ہاؤس میں آباد ہوا۔ اسی کے زمانے میں لیفٹیننٹ گورنری کا عہدہ ختم ہو گیا۔ اور سر میکلیگن جنوری ۱۹۲۱ء میں پنجاب کا پہلا گورنر قرار پایا۔ جو اپنے عہدے کی بنا پر گورنمنٹ ہاؤس میں اقامت پذیر ہوا۔ موجودہ گورنر نواب امیر محمد خان نواب آف کالا باغ ہیں۔ بڑی بڑی بین الاقوامی شخصیتیں جب حکومت پاکستان کی مہمان ہوتی اور لاہور آتی ہیں تو انھیں گورنمنٹ ہاؤس ہی میں ٹھہرایا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ عمارت سرکاری مہمان خانہ بھی ہے۔

لارنس و منٹگمری ہال

سر جان لارنس پنجاب کے پہلے لیفٹیننٹ گورنر (۱۸۵۹ء) اور سر رابرٹ منٹگمری پنجاب کے دوسرے لیفٹیننٹ گورنر (۱۸۵۹-۶۵ء) کی یادگار میں یہ دو وسیع ہال انگریز حکام اور مخیر حضرات و رؤسا کے چندے سے مال روڈ اور لارنس گارڈن کے سنگم پر تعمیر کیے گئے۔ سر جان لارنس کا تعلق لاہور کے ساتھ لارنس گارڈن، لارنس ہال اور مجسمہ لارنس کے وجود سے ثابت ہوتا ہے۔ یہ پنجاب کا پہلا لیفٹیننٹ گورنر تھا۔ جس کا تقرر ۱۸۵۹ء میں عمل میں آیا۔ لیکن جو اپنی علالت کی بنا پر اسی سال واپس انگلستان چلا گیا۔ بعد کو سر جان لارنس لارڈ لارنس کے نام سے وائسرائے ہند مقرر ہوا۔ اور ۱۸۶۳ء سے ۱۸۶۹ء تک اس عہدے پر مامور رہا۔ لارنس کے بعد سر رابرٹ منٹگمری جو پنجاب کا دوسرا لیفٹیننٹ گورنر تھا۔ ۱۸۵۹ء سے ۱۸۶۵ء تک اس عہدے پر قائم رہا۔ چنانچہ منٹگمری ہال اور منٹگمری روڈ لاہور کے ساتھ اس تعلق کو ثابت کرتی ہیں۔

لارنس ہال و منٹگمری ہال دو الگ الگ یادگاریں ہیں۔ جنھیں ایک درمیانی تعمیر کے ذریعے آپس میں ملا دیا گیا ہے۔ لارنس ہال ۱۸۶۱-۶۲ء میں سر جان لارنس کی یادگار کے طور پر تعمیر کیا گیا۔ اس عمارت کا خاکہ مسٹر سٹون (STONE) سول انجینئر نے تیار کیا تھا۔ اس میں ایک بڑا کمرہ ساڑھے تینتیس فٹ لمبا، ساڑھے تیس فٹ چوڑا اور تینتیس فٹ اونچا ہے۔ اس کا فرش لکڑی کا ہے۔ اس کے مشرق اور مغرب میں ایک ایک چھوٹا کمرہ ہے۔ پوری عمارت کی لمبائی ۲۰۵ فٹ ہے۔ تینوں کمروں کی چھت ایک ہی ہے۔ لارنس ہال کو جلسہ گاہ کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ پہلے زمانے

میں یہاں ڈرامے بھی اسٹیج کیے جاتے تھے۔ اس عمارت کی تعمیر پر ۰۰۰ ۴۳۲ روپیہ صرف ہوا تھا جس کا بیشتر حصہ یورپین صاحبان اقتدار کے چندہ سے فراہم ہوا تھا۔ لیفٹیننٹ کرنل نیول کی گائیڈ بک متعلقہ لاہور میں ایک عجیب غلطی کا ازالہ کرنل گولڈنگ نے اپنی کتاب قدیم لاہور میں کیا ہے۔ نیول نے لارنس ہال کو "سرخ اینٹوں" کی بنی ہوئی ایک خوبصورت عمارت بتایا ہے۔ حقیقت میں یہ "سرخ اینٹوں" کی بنی ہوئی عمارت نہیں ہے۔

منٹگمری ہال وسعت میں لارنس ہال سے بھی بڑا ہے۔ منٹگمری ہال کی تعمیر ۱۸۶۶ء میں عمل میں آئی۔ عمارت کا خاکہ مسٹر گرڈن (GURDON) سول انجینئر نے تیار کیا۔ رؤسائے پنجاب نے اس ہال کی تعمیر کے لیے دل کھول کر چندہ دیا۔ اس عمارت پر ایک لاکھ چوہتر ہزار روپیہ صرف ہوا۔ جس میں چھیاسٹھ ہزار روپیہ مرمت کی مد میں شامل ہے۔ اصل عمارت ایک لاکھ آٹھ ہزار روپیہ میں تیار ہوئی تھی۔ لیکن اس کی چھت بعد کو ناقص ثابت ہوئی۔ اور بڑے پیمانے پر مرمت کرانی پڑی۔ یہ مرمت رائے بہادر کنہیا لال مصنف تاریخ لاہور دا گزیکٹو انجینئر کے زیر نگرانی ۱۸۷۵ء میں ہوئی۔ منٹگمری ہال کا بڑا کمرہ ایک سو چھ فٹ لمبا، چھیالیس فٹ چوڑا، اور بائیس فٹ اونچا ہے۔ اس کا فرش بھی لارنس ہال کے فرش کی طرح دیودار کا ہے۔ اس ہال کے چار گوشوں پر چار دو منزلہ کمرے ہیں۔ ستونوں پر اعلیٰ درجہ کا ماہی پشت کا کام ہے۔ لارنس ہال و منٹگمری ہال کی دیواریں اور چھتیں رنگی ہیں۔ برآمدے میں ایک دارالمطالعہ ہے اور یہیں کہیں جم خانہ بھی واقع ہے۔ لارنس ہال کی طرح منٹگمری ہال بھی پبلک اور سرکاری تقاریب کے کام آتا ہے۔ یہاں مشہور انگریز حکام کی تصاویر بھی آویزاں ہیں۔ منٹگمری ہال کا فرش مغربی رقص کے لیے مناسب ہے۔

اسمبلی چیمبر گول میز کانفرنس کے نتیجے کے طور پر ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے بموجب برصغیر پاک و ہند کے صوبوں کو حکومت خود اختیاری قائم کرنے کا جو حق ملا۔ اسے کام میں لاتے ہوئے اپریل ۱۹۳۷ء میں صوبہ پنجاب کی قانون ساز اسمبلی قائم ہوئی۔ چوہدری سر شہاب الدین پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے پہلے اسپیکر مقرر ہوئے اور سر سکندر حیات خاں سب سے پہلے وزیر اعظم بنے۔ اب یہ ضروری ہوا کہ قانون ساز اسمبلی کے لیے ایک مستقل اور موزوں عمارت ہو۔ جس میں اس کے اجلاس منعقد ہو سکیں۔ عمارت کے لیے شاندار ہونا لازمی تھا۔ کیونکہ اس عمارت کی تقریباً وہی حیثیت ہونی تھی جو انگلستان میں پارلیمنٹ ہاؤس کی ہے۔ اس عمارت میں صوبہ پنجاب کے سیاسی نمائندوں کو یکجا ہو کر ملک اور قوم کے لیے قانون بنانے تھے۔ جمہوری نظام کی روشنی میں قومی نمائندوں کا قانون ساز ایوان وہی حیثیت رکھتا ہے۔ جو مطلق العنانی کے دور میں شاہی محل۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء میں اس قومی ایوان کا سنگ بنیاد سر جوگندر سنگھ نے رکھا۔ اور ۱۹۳۸ء میں یہ تکمیل کو پہنچی۔ چنانچہ اس کا پہلا اجلاس ۱۹۳۹ء میں ہوا۔

اسمبلی چیمبر انگریزی دور کی عمارات میں اہم ترین عمارت ہے۔ نہ صرف اپنے مقصد کے اعتبار سے یہ عمارت دوسری عمارتوں پر فوقیت رکھتی ہے۔ بلکہ یہ فن تعمیر کا ایک شاہکار بھی ہے۔ اس کا محل وقوع بھی نہایت مناسب ہے۔ اس کی وسعت اس کی پختگی اس کا ڈیزائن۔ اس کی کاریگری لائق ستائش ہیں۔ سرکاری انجینئر مسٹر سیلمن کے زیر نگرانی یہ عمارت بننی شروع ہوئی تھی۔ مگر وہ اس کی تکمیل سے پہلے ہی ریٹائرڈ ہو کر واپس انگلستان چلے گئے۔ اور مسٹر پی۔ ایل ورما کی نگرانی میں یہ اختتام کو پہنچی۔ اس پر اندازاً ستہ لاکھ روپیہ صرف ہوا۔

اسمبلی چیمبر مال روڈ پر لارنس گارڈن کے بالمقابل گورنمنٹ ہاؤس کے قریب واقع ہے۔ اس کے سامنے وکٹوریا کا مجسمہ تھا جس کو اب وہاں سے ہٹا دیا گیا ہے۔ اب صرف سنگ مرمر کا بنا ہوا ایک گنبد نما کٹہرہ موجود ہے۔ اور مجسمے کا وجود نہیں لیکن اس گنبد کو اب بھی ملکہ کا بت کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اسمبلی چیمبر ایک ہشت پہلو عمارت ہے۔ جس میں پچاس کمرے ہیں۔ یہ ایک سہ منزلہ عمارت ہے جس کے نیچے تہ خانے ہیں۔ بالائی منزل میں اسمبلی کے ممبروں کے لیے ایک عظیم الشان ہال ہے۔ جس میں کم و بیش تین سو اشخاص بیک وقت بیٹھ کر مشاورت اور بحث و تمحیص کر سکتے

ہیں۔ گیلری میں تماشائیوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ چھوٹی کمیٹیوں کے اجلاس کے لیے چھ کمیٹی روم مختص ہیں۔ دو کمروں میں لائبریری قائم ہے جس میں ضروری مسائل پر لٹریچر ہے۔ ایک چائے خانہ ہے۔ متعلقہ اہل کاروں کے لیے کمرے بھی ہیں۔ یہ ایک جدید وضع کی عمارت ہے۔ پوری عمارت ایئر کنڈیشنڈ ہے۔ طرز تعمیر کے اعتبار سے یہ عمارت مغربی وضع کی ہے۔ اور اس پر کسی مغربی ملک کے ایوانِ نمائندگان کا گمان ہوتا ہے۔ مغربی وضع کی جو عمارتیں لاہور میں ہیں۔ اسمبلی چیمبر ان میں بہترین ہے۔

ہائی کورٹ

ہائی کورٹ کی عمارت ہند عربی وضع کی ایک عالیشان عمارت ہے۔ جو مال روڈ کے کنارے مزار شاہ چراغ کے متصل اور جنرل پوسٹ آفس کے قریب واقع ہے۔ پہلے اس عمارت میں پنجاب چیف کورٹ کا اجلاس ہوتا تھا۔ چنانچہ اب بھی پرانے لوگوں کی زبان پر اس عمارت کے لیے ہائی کورٹ کی بجائے چیف کورٹ کا لفظ ہی آتا ہے۔ یہ عمارت ۱۸۸۹ء میں تعمیر ہوئی۔ اس کا ڈیزائن ایک ماہر فن تعمیر مسٹر بروسنگٹن (BROSSINGTON) نے تیار کیا۔ اور اس کی تعمیر مسٹر ہلٹن (HILTON) اگزیکٹو انجنیئر کے زیر نگرانی ہوئی۔ اس پر تین لاکھ اکاسی ہزار آٹھ سو سینتیس روپیہ صرف ہوا۔ ۱۹۱۹ء میں اس عمارت میں ہائی کورٹ قائم ہوا۔ اور قیام پاکستان کے بعد سے اس میں سپریم کورٹ بھی قائم ہے۔

لاہور کی قدامت، لاہور کی اسلامی تہذیب و ثقافت اور لاہور کی عام فضا کے ساتھ ہائی کورٹ کی یہ ہند عربی وضع کی عمارت مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔ قومی اور سرکاری تقاریب پر جب چراغاں ہوتا ہے تو اس عمارت کی پیشانی پر جو میزان عدل کا نقش ہے وہ اور بھی اجاگر ہو جاتا ہے۔ اور پوری تابانی کے ساتھ چمکنے لگتا ہے۔ اس لیے کہ یہ عمارت پاکستانی عدلیہ کی علامت (SYMBOL) ہے۔ اسلامی حکومت کے زوال کے بعد عدل کا تصور واضح طور پر موجود ہی نہ رہا تھا۔ انگریزی دور میں یہ تصور ابھرا اور قیام پاکستان کے بعد عدل کے تصور میں اسلامی رنگ پیدا ہو گیا۔ یہ عمارت جس میں سپریم کورٹ بھی شامل ہے۔ عدلیہ کے مختلف مدارج پر حاوی ہے۔ اور اس حیثیت سے لاہور کی عمارات میں امتیازی شان رکھتی ہے۔

یہ ایک وسیع عمارت ہے۔ جس کے صحن میں رنگ مرمر کا ایک فوارہ ہے اور اطراف میں چھوٹے چھوٹے خیابان ہیں۔ جو اس کے حسن میں اضافہ کر رہے ہیں۔ اصل عمارت چہار گوشہ ہے اور پختہ اینٹوں کی بنی ہوئی ہے جس پر چونے کے مسالے کا کام ہے۔ جا بجا محرابیں اور کارنس ہیں جن پر آرائشی کام ہے اور بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں۔ پتھر میں جالی کا کام نہایت دیدہ زیب ہے۔ ایک خصوصیت اس عمارت کی یہ ہے کہ اس میں ثابت اینٹیں استعمال ہوئی ہیں۔ چاروں گوشوں کے جانب چاروں طرف وسیع برآمدے ہیں۔ اس عمارت پر دہلی کے قطب مینار کی وضع کے دو مینار ہیں۔ جن کی طرز تعمیر اسلامی ہے۔ کونوں پر دو برجیاں ہیں۔ میناروں کی بلندی پچانوے فٹ اور برجیوں کی بلندی بہتر فٹ ہے۔ سامنے کے رخ والے برآمدوں میں شہد کے چھتے کے نمونے کی قدیم عربی وضع کی کارنسیں ہیں۔

عمارت کے بڑے ہال کا فرش رنگ مرمر کا ہے۔ اور دوسرے کمروں کا فرش ہشت پہلو چوکوں کا ہے۔ شہتیر دیودار کے ہیں۔ اس عمارت میں جا بجا توشہرے کا سنگ مرمر صرف ہوا ہے۔ ولایتی سیمنٹ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ بڑا ہال پچپن فٹ لمبا اور پینتیس فٹ چوڑا ہے۔ اس کے دونوں رخ دو دو وسیع کمرے ہیں۔ جو ماتحت عدالتوں کے کام آتے ہیں۔ اطراف میں ججوں کے لیے چار کمرے ہیں۔ اس عمارت میں رجسٹرار کا کمرہ، لائبریری، کمیٹی روم، انگریزی اور فارسی مسودات کا ریکارڈ روم، شعبہ ترجمہ کا کمرہ اور دوسری قانونی ضروریات کے لیے مناسب انتظام ہے۔ وکیل اور بیرسٹر صاحبان کے لیے بار روم بھی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب بار روم ضلع کچہری کے قریب کورٹ اسٹریٹ میں تھا چنانچہ اب تک متعدد وکیل صاحبان کورٹ اسٹریٹ ہی میں رہتے ہیں۔

مرکزی تار گھر

دفتر اکونٹنٹ جنرل کے نزدیک اور جنرل پوسٹ آفس کے بالمقابل ایک جدید وضع کی وسیع و عریض عمارت مرکزی تار گھر کے نام سے موسوم ہے۔ ۱۸۸۰ء میں بہ نگرانی رائے بہادر کنہیا لال ایگزیکٹو انجینئر و مصنف "تاریخ لاہور" یہ عمارت بننی شروع ہوئی۔ اور مارچ ۱۸۸۱ء میں تکمیل کو پہنچی۔ اس کی تعمیر پر تقریباً چتالیس ہزار روپے خرچ ہوئے۔ بقول سید محمد لطیف اس پر بیالیس ہزار دو سو روپیہ خرچ آیا۔ یہ عمارت انگریزی وضع کی ہے۔ اور پختہ چونے اور انگریزی وضع کی بڑی اینٹ سے بنائی گئی ہے۔ اس کا طول ایک سو پچیس فٹ ۶ انچ اور عرض اڑسٹھ فٹ چھ انچ ہے۔ اصل عمارت تیرہ کمروں ایک ہال دو غسل خانوں اور ایک ڈیوڑھی پر مشتمل ہے۔ بڑے ہال کا فرش سرخ پتھر کا اور باقی کمروں میں پختہ چوکوں کا ہے۔ بیرونی برآمدے میں بارہ در محرابی ہیں۔ اور ڈیوڑھی میں تین چھوٹے در محرابی اور دو بڑے در ہیں۔ یہ عمارت کوئی دس بارہ ایکڑ کے رقبے میں پھیلی ہوئی ہے۔

جس علاقے میں اب تار گھر واقع ہے وہ ایک بزرگ کے مزار کا علاقہ ہے۔ یہ بزرگ حاجی محمد سعید تھے اور ان کا مزار اب بھی ہینک سکوائر میں موجود ہے۔ جس زمانے میں انارکلی میں انگریزی فوج کی بارکیں تھیں اور چھاؤنی تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ ان دنوں تار گھر کی عمارت میں گرجا قائم تھا۔ چنانچہ تار گھر کی موجودہ عمارت اس گرجا کی عمارت کی ہیئت کو تبدیل کر کے بنائی گئی ہے۔ جب ہم تار گھر کے وسیع صحن میں داخل ہوتے ہیں تو اس کے درمیان ایک خوبصورت فوارہ نظر آتا ہے۔ فوارے کے دونوں جانب دو چھوٹے چھوٹے چمن ہیں۔ اس کے بعد اصل عمارت ہے۔ باہر ڈیوڑھی ہے۔ اندر ایک وسیع ہال کو مختلف حصوں میں حسب ضرورت تقسیم کیا گیا ہے۔ اور ان کے اندر لکڑی کا کٹہرہ ہے جس میں کھڑکیاں لگی ہوئی ہیں۔ اہلِ ضرورت کھڑکیوں کے باہر سے اہل کاران محکمہ کو تار کے فارم دیتے ہیں۔ محکمے کا عملہ کٹہرے کی دوسری جانب مصروف کار رہتا ہے۔

مواصلات کی کئی شکلیں ہیں۔ کوئی پیغام کہیں بھیجنا ہو تو ڈاک تار ٹیلیفون وائرلیس غرض کہ کئی طریقے اس متمدن زمانے میں رائج ہیں۔ ان میں تار کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ جہاں کہیں بجلی کی لائن موجود ہو وہاں تار بھیجنے کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ ٹیلیفون کے مقابلے میں تار یعنی ٹیلیگرام کم خرچ اور محفوظ تر ہے۔ ٹیلیفون اگر ایک شہر سے دوسرے شہر بھیجا جائے اور اس طرح ٹیلیفون کا بین المملکتی نظام رائج ہو تو اس پر ایک کثیر رقم خرچ ہو گی پھر بھی الفاظ کے سننے میں غلطی کا احتمال موجود رہے گا۔ لیکن ٹیلیگرام یعنی تار میں نہ تو اتنا روپیہ صرف ہوتا ہے اور نہ پیغام کے غلط وصول ہونے کا کوئی خطرہ ہے۔ شرط صرف اتنی ہے کہ بجلی کا سلسلہ موجود ہو۔ پیغام بھیجنے والا اس شہر کے تار گھر میں بیٹھ کر کنجی (KEY) کو دباتا ہے اور دوسرے شہر میں تار گھر کے اندر نصب ساؤنڈر (SOUNDER) یعنی ساؤنڈ بکس اس کا پیغام وصول کرتا ہے۔ یہ پیغام چھوٹی اور لمبی آوازوں کے ذریعہ دیا جاتا ہے۔ جن کی مثال نقطہ اور لکیر سے دی جا سکتی ہے۔ انگریزی کے جملہ حروف کو ان چھوٹی بڑی آوازوں کے ذریعے ظاہر کیا جاتا ہے۔ بڑی خوبی اس نظام مواصلات میں یہ ہے کہ پیغام بھیجنے اور وصول کرنے میں کم از کم وقت صرف ہوتا ہے۔ لاہور کا تار گھر پاکستان بھر میں سب سے بڑا تار گھر ہے۔

جنرل پوسٹ آفس

ریل گاڑی یا ہوائی جہاز کے ذریعے پیغام رسانی کا طریقہ جدید زمانے کی پیداوار ہے۔ اگرچہ مقامی نوعیت کے پیغام ٹیلیفون کے ذریعے بھیجنے کا رواج بھی کچھ عرصے سے رائج ہے۔ بلکہ بعض اوقات ایک شہر سے دوسرے شہر کو بھی ٹیلیفون کے ذریعے ہی پیغام بھیجے جاتے ہیں۔ تاہم ٹیلیفون ڈاک کا بدل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ ٹیلیفون عام لوگوں کی رسائی سے ابھی تک بالا ہے۔ اسی طرح صرف ضروری اور مختصر نوعیت کے پیغام تار کے ذریعے بھیجنے کا رواج بھی ہو چکا ہے لیکن تار صرف

مخصوص حالات ہی میں بھیجا جاتا ہے۔ اس متمدن دور میں بھی اگر کسی کے نام تار آئے تو اس کا پہلا ردِعمل یہ ہوتا ہے کہ خدا جانے کیا افتاد پڑی ہے جو یہ تار بھیجا گیا ہے۔ اس کے برخلاف ڈاک کے ذریعے خط و کتابت اس قدر عام ہے کہ اسے مطابقِ فطرت کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

قدیم زمانے میں جب نہ ریل گاڑی تھی نہ ہوائی جہاز، پیغام رسانی کا سلسلہ مختلف طریقوں سے رائج تھا۔ سب سے آسان تو یہ تھا کہ زبانی پیغام دے کر کسی قاصد یا ہرکارے کو دوڑا دیا جاتا تھا۔ آج بھی دیہات میں شادی اور غمی کے مواقع پر پیغام رسانی کا کام نائی انجام دیتے ہیں۔ اگر ڈاک کے ذریعے خط بھیجا جائے تو لوگ اس کو ذاتی دعوت خیال نہیں کرتے۔ اور تقریب میں شمولیت سے گریز کرتے ہیں۔ جب تعلیم ذرا عام ہوئی۔ تو نائی کا کام یہ ٹھہرا کہ رقعہ لے کر چلا جائے اور دعوت دے آئے۔ شاید اسی مناسبت سے رقعے کا نام خط ٹھہرا۔ خط آنا یعنی چہرے پر سبزہ آغاز ہونا۔ خط بنانا یعنی داڑھی مونڈھنا اور خط لے کر جانا یعنی پیغام رسانی کرنا۔ ان تینوں حالات میں کام خط ہی سے پڑتا ہے۔ اس لیے نائی کا تعلق خط کے ساتھ حجامت کے طور پر بھی ظاہر ہے۔ اور پیغام رسانی کے لحاظ سے بھی واضح ہے۔ سترھویں اور اٹھارویں صدی میں ڈاک کے لیے گھوڑے گاڑیاں استعمال ہونے لگیں۔ نہ صرف برصغیر پاک و ہند میں بلکہ مغربی دنیا میں بھی ڈاک گاڑی سے مراد وہ گھوڑا گاڑی تھی جس میں مسافروں کے علاوہ خطوط بھی ہوتے تھے۔ ڈاک عموماً ایسی گھوڑا گاڑی میں بھیجی جاتی تھی جس کے گھوڑے حد درجہ تیز رفتار ہوتے تھے۔ ہر منزل پر گھوڑے تبدیل کیے جاتے تھے۔ ہرکاروں کا استعمال بھی متروک نہ تھا۔ جو مقامات دور افتادہ ہوتے تھے۔ اور سڑک سے فاصلے پر واقع ہوتے تھے۔ وہاں ہرکارے ہی خط لے کر جاتے تھے۔ اردو شاعری قاصد کا کام کبوتر کو سپرد کرتی چلی آئی ہے۔ یہ محض شاعری ہی نہیں حقیقت ہے۔ کہ قدیم زمانے میں قاصد کبوتروں کو خاص طور پر سدھایا جاتا تھا اور ان سے پیغام رسانی کا کام لیا جاتا تھا۔ موجودہ زمانے میں بھی کبوتر یہ کام انجام دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ کے زمانے میں کبوتروں کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ جنگ کے دوران کبوتروں کے علاوہ پیغام رسانی کا کوئی محفوظ طریقہ موجود نہیں تاہم دورِ حاضر میں پیغام رسانی کا عوامی طریقہ ڈاکخانے کے ذریعے خط بھیجنا ہے۔

ڈاک خانے کا موجودہ نظام انگریزی دور کی پیداوار ہے۔ جب انگریز اس برصغیر پر قابض ہوئے۔ اور انھوں نے اہم مقامات کو سڑکوں اور ریلوں سے ملا دیا۔ تو ڈاکخانے کے ذریعے پیغام رسانی کا کام آسان ہو گیا۔ یوں تو ڈاک تین ذرائع سے بھیجی جاتی ہے یعنی سمندر کے ذریعے، ریل گاڑی اور موٹر کے ذریعے اور ہوائی جہاز کے ذریعے۔ لیکن بحری مواصلات سے ہمارا کوئی خاص تعلق نہیں۔ ہوائی ڈاک پچھلے دو تین برس پہلے تک عام نہ تھی۔ البتہ موٹروں اور ریل گاڑیوں کے ذریعے خطوط کی مواصلت اس ملک میں ہمیشہ سے عام رہی ہے۔ ریل گاڑی اگر تیز رفتار ہو تو وہ ڈاک گاڑی یعنی میل ٹرین کہلاتی ہے۔ اس لیے کہ خطوط کم رفتار ریل گاڑی کے ذریعے نہیں بھیجے جاتے۔ تیز رفتار میل ٹرین یا ڈاک گاڑی ہی کے ذریعے ارسال ہوتے ہیں۔ چنانچہ عوام کی زبان میں ڈاک کا تعلق تیز رفتاری سے ہے۔ اب کچھ عرصے سے ریل گاڑی اور موٹر کے علاوہ ہوائی جہاز بھی ترسیلِ خطوط کا ایک عام طریقہ بنتا جا رہا ہے۔ لیکن قباحت یہ ہے کہ ہوائی جہاز شہر شہر قصبے قصبے اور گاؤں گاؤں ترسیل خطوط نہیں کر سکتا۔ اس لیے ریل گاڑی کی اہمیت میں فی الحال کسی خاص کمی کا خطرہ نہیں۔ جہاں ریل کا گزر نہیں لیکن پکی سڑک موجود ہے۔ وہاں موٹریں اور لاریاں ڈاک لاتی لے جاتی ہیں۔

انگریزی دور میں جنرل پوسٹ آفس انارکلی کے علاقے میں عجائب گھر کے قریب ۱۸۴۹ء میں تعمیر ہوا۔ یہ ایک بارک نما عمارت تھی۔ اس کے قریب ہی پوسٹ ماسٹر کا بنگلہ تھا۔ ۱۹۱۲ء میں موجودہ خوشنما، جدید وضع کی عمارت تعمیر ہوئی جو اب جنرل پوسٹ آفس کے نام سے پکاری

جاتی ہے۔ اس کا انتظام محکمۂ ٹیلیگراف کے سپرد تھا چنانچہ ڈائریکٹر محکمۂ ٹیلیگراف کی نگرانی میں یہ جنرل پوسٹ آفس تعمیر کیا گیا۔ تقریباً مدوّر عمارت ہے۔ جو اس قدر وسیع ہے کہ نیچے کی منزل میں پینتیس کمرے اور بالائی منزل میں اکیس کمرے ہیں۔ اس میں ایک کشادہ میدان ہے جو عملے کی تفریح اور کھیل کود کے لیے مخصوص ہے۔ اسی کے احاطے میں عملے کے لیے ایک ہسپتال اور ایک مسجد بھی ہے۔ یہ ایک جدید وضع کی عمارت ہے جس میں ایک کلاک ٹاور اور چار برجیاں ہیں۔ کلاک ٹاور کی گھڑی دُور سے نظر آتی ہے اور راہگیروں کو وقت بتاتی ہے۔ اس میں مختلف شعبے اور دفاتر ہیں۔ مثلاً سارٹنگ۔ رجسٹریشن۔ منی آرڈر۔ ریڈیو لائسنس۔ ملٹری پنشن۔ سیونگ بنک۔ خزانہ۔ ہوائی ڈاک۔ غیر ملکی ڈاک۔ یہاں ایک محکمے سے متعلق تربیت گاہ (TRAINING CENTRE) ہے۔ اور شبینہ ڈاک خانہ بھی ہے۔ جو نو بجے شام سے دس بجے رات تک کھلا رہتا ہے۔

ایک پریس نوٹ کے ذریعے معلوم ہوا ہے کہ اب ڈاک اور تار کے محکمے اتنے وسیع ہو گئے ہیں کہ حکومت پاکستان نے ان کو الگ الگ کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ ان کی کارکردگی میں اضافہ ہو۔ ورنہ ابھی تک یہ دونوں محکمے ایک ہی ڈائریکٹر کی نگرانی میں تھے۔

ٹولنٹن مارکیٹ و کمرشیل بلڈنگ

انارکلی کے علاقے میں یونیورسٹی کے بالمقابل عجائب گھر کے متصل مال روڈ پر ایک خوبصورت عمارت ہے جو ٹولنٹن مارکیٹ کہلاتی ہے۔ ایک زمانے میں اسے میونسپل مارکیٹ بھی کہا کرتے تھے۔ یہاں سے گول باغ تک جو سڑک جاتی ہے۔ وہ نمائش روڈ کے نام سے مشہور تھی۔ اس کی وجہ تسمیہ ۱۸۶۴ء میں منعقد ہونے والی نمائش ہے۔ یہ نمائش ٹولنٹن مارکیٹ کی عمارت ہی میں ہوئی تھی۔ گول باغ میں ان دنوں ہفتے میں دو بار فوجی بینڈ بجا کرتا تھا۔ اس بنا پر گول باغ کا نام بینڈ اسٹینڈ گارڈن (BAND STAND) پڑ گیا۔ ۱۸۶۴ء والی نمائش پنجاب کی تاریخ میں امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ نمائش جنوری سے اپریل ۱۸۶۴ء تک رہی۔ اور اس میں قدیم ہندو اور مسلم زمانوں کے عجائبات منظر عام پر لائے گئے۔ ٹولنٹن مارکیٹ کی عمارت خاص اس نمائش کے لیے تعمیر ہوئی تھی۔ یہی تاریخی نوادر بعد کو موجودہ عجائب گھر میں منتقل کر دیے گئے۔ اس لحاظ سے ایک مختصر عرصے کے لیے اس ٹولنٹن مارکیٹ کی حیثیت عجائب گھر کی سی رہی۔ اب اس عمارت میں الحمرا اسٹور۔ پنجاب سٹور۔ مٹن مارکیٹ۔ فش مارکیٹ وغیرہ قائم ہیں اور روزمرہ کے استعمال کی چیزیں یہاں فروخت ہوتی ہیں۔

کمرشیل بلڈنگ ایک وسیع سلسلۂ عمارات ہے۔ جو ٹولنٹن مارکیٹ اور جنرل پوسٹ آفس کے درمیان مال روڈ پر واقع ہے اور انارکلی کے علاقے میں ہے۔ یہ سلسلۂ عمارات دوکانوں کی ایک خوشنما قطار ہے۔ اوپر کی منزل میں مکانات ہیں۔ نیچے کی منزل میں دوکانیں ہیں۔ انگریزی ہوٹل کی کئی دوکانیں یہاں ہیں۔ یہاں کئی دارالّلباس ہیں۔ دو تین دوکانیں جوہریوں کی ہیں۔ عام سامان کے سٹور بھی ہیں۔ یہ دوکانیں شہر لاہور کے سب سے بارونق اور چلتے جاگتے حصے میں واقع ہیں۔ اس لیے خوشحال طبقے کی توجہات کا مرکز ہیں۔

آج جہاں کمرشیل بلڈنگ ہے۔ ایک زمانے میں یہاں دھوبی منڈی تھی۔ جس کی شمالی دیوار کو توڑ کر اب دوکانیں تعمیر کر دی گئی ہیں۔ پشت کی جانب آج بھی دھوبیوں کی آبادی ہے۔ پہلے یہ دھوبی منڈی اتنی وسیع تھی کہ اس کی جنوبی دیوار کپورتھلہ ہاؤس تک پہنچتی تھی۔ اس جنوبی دیوار میں ایک بڑا پھاٹک تھا۔ جس سے دھوبی منڈی تک پہنچنے کا راستہ تھا۔ لیکن اب نہ وہ شمالی دیوار ہے اور نہ یہ جنوبی دیوار۔ جنوب کی طرف بھی دفاتر اور مکانات بن چکے ہیں۔ اور شمال کی جانب کمرشیل بلڈنگ کی دوکانوں کا سلسلہ ہے۔

یونیورسٹی سینٹ ہال

یونیورسٹی ہال ۱۸۷۶ء میں تعمیر ہوا۔ یہ ہال پنجاب یونیورسٹی کے اعلیٰ ارکان کے اجلاس کے لیے تعمیر کیا گیا ہے۔ یونیورسٹی سے متعلق اعلیٰ مقصد کے جلسے یہاں منعقد ہوتے ہیں۔ جب ۱۸۶۹ء میں لاہور یونیورسٹی کالج کی توسیع ہوئی۔ اور اس کا دائرۂ عمل صرف لاہور تک محدود نہ رہا بلکہ تمام صوبۂ پنجاب کا تعلیمی نظام اس کے تحت لایا گیا تو یہاں پنجاب یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۴ اکتوبر ۱۸۸۲ء کو پنجاب یونیورسٹی پہلی مرتبہ باقاعدگی کے ساتھ قانونی طور پر تسلیم کی گئی۔ اور ایک مجلس انتظامیہ قائم ہوئی جسے سینٹ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ سینٹ ہال کی عمارت جو ۱۸۷۶ء میں تعمیر ہوئی تھی ۱۸۸۲ء سے سینٹ کے اجلاس کے لیے مخصوص کر دی گئی۔ علوم مشرقی، علوم مغربی، سائنس، قانون اور دوسرے شعبہ ہائے تعلیم اس سینٹ کے زیر نگرانی ہیں۔

سینٹ ہال کی تعمیر تاریخ لاہور کے مصنف رائے بہادر کنہیا لال اگزیکٹو انجینئر کے اہتمام سے ہوئی۔ اس عمارت پر چونتیس ہزار روپیہ صرف ہوا۔ سینٹ ہال پر ہز ہائی نس نواب صاحب بہاولپور کا نام کندہ ہے۔ اس لیے کہ یہ عمارت نواب صاحب بہاولپور کا عطیہ ہے اور انھیں کے روپیہ سے یہ عمارت بنی ہے۔ عمارت کا محل وقوع انارکلی کے علاقے میں ہے۔ اس کے قریب ہی سرکاری محکمہ تعلیم کا دفتر واقع ہے۔

عمارت پختہ اینٹوں سے بنی ہوئی ہے اور بقول کنہیا لال اس کا طول ۱۲۸ فٹ اور عرض ۸۰ فٹ ہے۔ ستونوں اور محرابوں میں بڑی اینٹیں استعمال کی گئی ہیں۔ اور باقی حصوں میں معمولی سائز کی اینٹیں لگائی گئی ہیں۔ باہر سے اس ہال کا رنگ سرخ ہے۔ اندر سفید پلستر ہے چھت کے اوپر سلیٹ کا پتھر لگا ہے۔ شہتیر و بوزارے ہیں۔ سینٹ کا بڑا کمرہ ۷۱ فٹ لمبا اور ۴۲ فٹ چوڑا ہے اور دوسرا کمرہ مغربی سمت ۴۹ فٹ چوڑا۔ اور ۷۰ فٹ لمبا ہے۔ ان سے ملحق اور بھی کئی چھوٹے بڑے کمرے ہیں۔ جن میں سے تین کمرے رجسٹرار کے دفتر کے لیے مخصوص ہیں سینٹ ہال کے برآمدے وسیع ہیں۔ یہ عمارت جس مقصد کے لیے تعمیر ہوئی ہے اس کے لیے نہایت موزوں ہے۔ سینٹ کے جلسوں کے علاوہ یہاں علمی اور ادبی جلسے اور مشاعرے بھی ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ ہال نہایت کشادہ ہے۔ اور محل وقوع کے اعتبار سے بھی بہت موزوں ہے۔

ٹاؤن ہال

۱۸۸۷ء میں سر چارلس ایچی سن (AITHISON) لیفٹیننٹ گورنر پنجاب نے ٹاؤن ہال کی بنیاد رکھی۔ یہ سال ملکہ وکٹوریہ کی پنجاہ سالہ جوبلی کا سال تھا۔ کیونکہ ملکہ وکٹوریہ ۱۸۳۷ء میں پورے حقوق کے ساتھ سریر آرائے حکومت ہوئی تھیں۔ چنانچہ اس عمارت کا نام وکٹوریہ جوبلی ٹاؤن ہال قرار پایا۔ فروری ۱۸۹۰ء میں اس عمارت کا رسمی طور پر افتتاح ڈیوک آف کلارنس نے کیا۔ یہ عمارت مسٹر بل (BULL) کے زیر نگرانی تیار ہوئی تھی۔ اور اس پر ساٹھ ہزار روپیہ صرف ہوا تھا۔ عمارت کا ڈیزائن مسٹر پاگ سن (PDGSON) نے تیار کیا تھا۔ جس پر انھیں پانچ سو روپیہ انعام دیا گیا تھا۔

یہ ایک بلند و عظیم الشان عمارت ہے۔ دوسری منزل پر ایک وسیع ہال ہے جس کی لمبائی ۸۰ فٹ اور چوڑائی ۴۰ فٹ ہے۔ اس کے محراب خاص طور پر خوبصورت ہیں۔ جن کی زمین زرد ہے۔ اور اس پر سفید استر کاری ہے۔ نقش و نگار سرخ رنگ کے ہیں اور فرش مضبوط لکڑی کا بنا ہوا ہے جیسا ناچ گھروں کا ہوتا ہے۔ اس بلند عمارت کی چھت سے آس پاس کے علاقوں کی سیر کی جا سکتی ہے۔ ٹاؤن ہال کے باہر ایک دلکش فوارہ ہے جو سبز رنگ کا ہے۔ یہ ایک قطعہ میں واقع ہے۔ جس کے چاروں طرف خوشنما درخت ہیں۔ یہ فوارہ راجہ ہرنبس سنگھ کا عطیہ ہے۔ غرض کہ یہ عمارت موجودہ زمانے کی حسین ترین عمارتوں میں شمار کی جاتی ہے۔

ٹاؤن ہال کا مقصد جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے شہری حقوق کے نمائندوں کے لیے مل بیٹھنے اور اہالیانِ شہر کے اجتماعی

مفادات پر غور و فکر کرنے کے لیے ایک موزوں جگہ فراہم کرنا ہے۔ لاہور میونسپلٹی کی بنیاد ۱۸۶۲ء میں رکھی گئی۔ ان دنوں لاہور میونسپلٹی کا دفتر بھاٹی دروازے کے باہر پولیس چوکی کے نزدیک ایک بنگلے میں تھا۔ ۱۸۶۲ء سے جب "میونسپلٹی" قائم ہوئی سن ۱۸۹۰ء تک جب "ٹاؤن ہال" کا افتتاح ہوا اٹھائیس سال کی مدت میں میونسپلٹی کے اجلاس اس بنگلے میں ہوا کرتے تھے۔

سن ۱۸۹۰ء سے آج تک ٹاؤن ہال کی عمارت نمائندگان شہر کی باہمی مشاورت کے کام آتی ہے۔ مختصر پیمانے پر لاہور کے ٹاؤن ہال کی حیثیت پارلیمنٹ ہاؤس کی سی ہے۔ سیاسی اور معاشرتی امور پر "بزرگان شہر" یہاں بحث و تمحیص کر کے عوامی بھلائی کی تجویزوں کے لائحہ عمل پیش کرتے ہیں۔

لاہور کا ٹاؤن ہال قدیم و جدید شہر کا سنگم ہے اور ایک مرکزی مقام پر واقع ہے۔ یہاں مال روڈ ختم ہوتی ہے۔ اس کے ایک طرف گول باغ ہے اور دوسری طرف عجائب گھر اور یونیورسٹی ہال۔ سامنے ایک چبوترے پر زمزمہ ہے۔

ریلوے اسٹیشن

لاہور کا اسٹیشن ایک قلعہ نما عمارت ہے۔ جا بجا مینار تعمیر کیے گئے ہیں۔ جن سے اس عمارت کا بجا طور پر ہنگامی حالات میں فوجی نقطۂ نظر سے کیا جا سکتا ہے۔ جب انگریزوں نے افغانستان پر فوج کشی کی تو اس وسیع اسٹیشن پر چوبیس گھنٹے کے مختصر عرصہ میں چھتر ریل گاڑیاں گزرنے کا انتظام تھا۔ اس سے ریلوے اسٹیشن کی وسعت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ریلوے اسٹیشن کا سنگِ بنیاد سر جان لارنس لیفٹیننٹ گورنر پنجاب نے ۱۸۴۹ء میں رکھا۔ سن ۱۸۶۰ء[1] میں اس اسٹیشن پر پہلی ریل گاڑی چلائی گئی۔ جو لاہور سے امرتسر گئی۔ لاہور اسٹیشن کی تعمیر پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے مشہور ٹھیکیدار محمد سلطان کے ہاتھوں ہوئی۔ اس عمارت کا نقشہ مسٹر برٹن (BURTON) انجینئر نے تیار کیا تھا۔ اس اسٹیشن کے آٹھ پلیٹ فارم ہیں۔ مسافروں کی آسائش کے لیے متعدد انتظار گاہ ہیں۔ اس اسٹیشن کے پانچ پل ہیں جن میں سے تین ریلوے مسافروں کے لیے خاص پلیٹ فارم پر ہیں۔ چوتھا پل ریلوے ملازمین کو ورکشاپ لے جاتا ہے۔ اور پانچواں پل گڑھی شاہو کی سڑک اور گرینڈ ٹرنک روڈ کو ملاتا ہے۔ ریلوے اسٹیشن پر متعدد دفاتر ہیں۔ جو محکمہ ریلوے سے متعلق ہیں۔ تار گھر اور ڈاک خانہ بھی ہے۔ مسافروں کی آسائش کے لیے یورپین اور پاکستانی وضع کے کھانے کے کمرے ہیں۔ غرض کہ مسافروں کی جملہ ضروریات کے مطابق انتظام موجود ہے۔ ہر پلیٹ فارم پر ایک بڑی گھڑی نصب ہے۔ لیکن سب سے بڑی گھڑی لاہور اسٹیشن کی ڈیوڑھی کے اوپر لگی ہوئی ہے۔ جو دور سے گزرنے والوں کو بھی وقت بتاتی ہے۔

---

[1] ریلوے اسٹیشن کی بنیاد کے متعلق کنہیا لال اور لطیف کا دعویٰ ہے کہ ۱۸۴۹ء میں پڑی اور پہلی ریل گاڑی سن ۱۸۶۰ء میں چلائی گئی لیکن سرور لاہوری کی تاریخ مخزن پنجاب میں بنیاد ۱۸۵۵ء اور پہلی ریل گاڑی کا اجرا ۱۸۶۲ء درج ہے (ص ۱۵۷)

خواجہ محمد حسن شعری کاشمیری ایک مشہور فارسی شاعر تھے۔ جن کا دیوان مرآۃ الخیال چھپ چکا ہے۔ ۱۸۶۱ء میں جب پنجاب میں پہلے پہل ریل جاری ہوئی تو وہ امرتسر میں موجود تھے۔ انھوں نے ذیل کے قطعہ میں ان کی تاریخ کہی ہے

مبارک باد جشنِ عام ہر دم پیر و برنا را ‏ ‏ ‏ کہ شد بر خشک و تر جاری رسوم خیرِ دنیا را

سوار ریل چوں باشد تعجب نیست در یکدم ‏ ‏ ‏ بحرام روز اگر خواہد بگیرد شام فردا را

چو شد پاسے عدد تاریخ سالش زد رقم شعری

کہ بنمودہ مسخر شاہ ما از ریل دنیا را

۱۸۶۱ء

لاہور ریلوے اسٹیشن پاکستان کا سب سے بڑا ریلوے اسٹیشن ہے۔ اس کی عمارت نہ صرف خوبصورت بلکہ پائدار بھی ہے۔ وسعت کے اعتبار سے بھی یہ پاکستان کا سب سے بڑا جنکشن ہے۔ یہاں ریلوے لائنوں کا ایک وسیع جال بچھا ہوا ہے۔ اسٹیشن کی عمارت پر تقریباً پانچ لاکھ روپیہ بوقت تعمیر صرف ہوا تھا۔ لاہور چونکہ پاکستان کی تقریباً سب سے بڑی تجارتی منڈی ہے۔ اس لیے لاہور اسٹیشن تجارتی اشیا کی درآمد اور برآمد کا ایک نہایت اہم مرکز ہے۔

لاہور مغربی پاکستان ریلوے کا ہیڈ کوارٹر بھی ہے۔ یہاں کا ریلوے ورکشاپ ایک سو چھبیس ایکڑ زمین پر پھیلا ہوا ہے جس میں بڑا ایما عملہ ملازم ہیں۔ یورپین، غیر ملکی اور ملکی انجینئر اور مکینک ان مزدوروں کے کام کی نگرانی کرتے ہیں۔ ریلوے ورکشاپ سنہ ۱۸۶۵ء میں قائم ہوا۔ اور اس کی عہد بہ عہد ترقی ہوتی رہی ہے۔ اس میں ریلوے انجنوں اور ڈبوں کی مرمت ہوتی ہے۔ جدید سے جدید مشینری اور نئے سے نئے نمونے یورپین ممالک سے حاصل کئے جاتے ہیں۔ غرض کہ لاہور کی ریلوے ورکشاپ ایک نہایت ترقی یافتہ ورکشاپ ہے۔ یہاں کیرج شاپ لوکو موٹو شاپ مرمت گھر وغیرہ کی اپنی اپنی الگ الگ عمارتیں ہیں۔ اور الگ تربیت یافتہ عملہ ہے۔ جو مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہیں اور وہ دن دور نہیں کہ ہم غیر ممالک سے مشینیں، ڈبے اور انجن منگوانے کے محتاج نہ رہیں گے۔ لاہور کی ریلوے ورکشاپ برصغیر پاک و ہند کی تقسیم سے پہلے بھی ہندوستان کی عظیم ترین ورکشاپوں میں شمار ہوتی تھی۔ اور پاکستان قائم ہونے کے بعد اس نے دن دونی رات چوگنی ترقی کی ہے۔

قومی تہواروں اور مخصوص تقاریب کے موقعوں پر لاہور اسٹیشن کو دلہن کی طرح سجایا جاتا ہے۔ اسٹیشن کے باہر عالیشان ڈیوڑھی کے سامنے ایک مختصر سا دلکش پارک ہے۔ جس کی سرسبزی ایسے مواقع پر رنگا رنگ روشنیوں میں اور بھی بہار دکھاتی ہے۔ ایسے مواقع پر ریلوے اسٹیشن پر رنگ برنگ کی روشنی کی جاتی ہے۔ جسے دیکھنے لاہور کے شہری جوق در جوق آتے ہیں۔ اور آدمی پر آدمی ٹوٹ پڑتا ہے۔ غرض یہ اسٹیشن قابل دید ہے۔

کوتوالی

لاہور میں اندرون دہلی دروازہ ایک مقام پرانی کوتوالی کے نام سے مشہور ہے۔ اس جگہ سکھوں کے زمانے میں ایک مختصر سی کوٹھڑی تھی۔ جس میں حوالاتی بند رکھے جاتے تھے۔ کچھ فاصلے پر ایک درخت تھا۔ جس سے مجرموں کو باندھ دیا جاتا تھا۔ اور انھیں عبرت ناک سزائیں دی جاتی تھیں۔ ان دنوں حوالاتیوں کو سرکار کی طرف سے کھانا نہیں ملتا تھا۔ سات سات قیدی ایک ایک سپاہی کے ذمہ ہوتے تھے۔ سپاہی قیدیوں کو لے کر بازار بازار گھومتا تھا اور قیدی دکانداروں اور آنے جانے والوں سے اپنا حال زار بنا کر فقیروں کی طرح سوال کرتے تھے۔ لوگ رحم کھا کر کچھ نہ کچھ انھیں دے دیتے تھے۔ اس رقم سے انھیں کھانا فراہم کیا جاتا تھا۔ اسی طرح سکھوں کے دور میں سزائیں بھی عبرت ناک دی جاتی تھیں۔ ناک، کان اور ہاتھ کاٹنے کا رواج تھا۔ کوتوالی کے سامنے جو درخت تھا۔ اس سے باندھ کر مجرموں کو مارا پیٹا جاتا تھا۔ اور بعض کے ہاتھ، کان اور ناک کو قطع کیا جاتا تھا۔ انگریزی دور میں اس عمارت میں توسیع ہوئی۔ اور کوٹھڑی سے لے کر درخت تک جو رقبہ واقع تھا۔ اس میں ایک دو منزلہ عمارت تعمیر کی گئی۔ جو کوتوالی کہلاتی تھی۔

سنہ ۱۸۵۰ء میں پرانی کوتوالی تعمیر کی گئی۔ شمال کی جانب حوالات کا دروازہ رکھا گیا۔ مشرق کی طرف کوتوال شہر کے دفتر کا کمرہ تھا۔ آنریری مجسٹریٹوں کے لیے ایک کمرہ تھا جس میں اجلاس ہوتا تھا۔ غرض کہ یہ عمارت طویل و عریض تھی۔ لیکن اب صرف اس کا نام باقی رہ گیا ہے البتہ اندرون دہلی دروازہ ایک علاقہ آج بھی پرانی کوتوالی کے نام سے موسوم ہے۔

موجودہ کوتوالی دہلی دروازے کے باہر واقع ہے۔ یہ ایک شاندار قلعہ نما عمارت ہے۔ اس عمارت پر ایک نظر ڈالنے سے یہ معلوم

ہوتا ہے کہ گویا شاہی وضع کی عمارت ہے۔ جو آس پاس کی عمارتوں سے مختلف اور ممتاز ہے۔ پولیس کا دفتر اس عمارت میں قائم ہے۔ ضرورت کے مطابق اس عمارت میں بے شمار کمرے اور برآمدے ہیں۔ یہ عمارت نہایت مضبوط اور مستحکم ہے۔ پرانی کوتوالی موجودہ ضروریات کے مطابق نہ تھی۔ لاہور کی بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر موجودہ کوتوالی کی عمارت پرانی کوتوالی کی نسبت کہیں زیادہ طویل و عریض ہے۔ اور محل وقوع کے اعتبار سے بھی اندرون دہلی دروازہ کی بجائے اسے دہلی دروازے کے باہر بنانا زیادہ موزوں تھا۔ موجودہ کوتوالی مسٹر ہیر سکاٹ (HARE SCOTT) سپرنٹنڈنٹ پولیس لاہور کے دور میں قائم ہوئی۔ اس تعمیر کی اصل تجویز کرنے والے (مسٹر گلاس کاک) تھے۔

پنجاب پولیس کا نظام برٹش پولیس کے نظام سے مشتق ہے۔ انگریزوں نے سب سے پہلے بنگال میں اس قسم کا نظام رائج کیا تھا۔ اس کے بعد مدراس میں اور پھر جہاں جہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری قائم ہوئی ہیں۔ اس قسم کا نظام قائم ہوا۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ اسلامی دور میں کوئی ایسا نظام موجود نہیں تھا۔ قطب الدین ایبک کے زمانے سے اسلامی ہند میں محکمۂ پولیس قائم تھا۔ اور خلجیوں کے دور میں تو اس کو بہت ترقی ہوئی۔ ویسے قدیم ہندوستان میں بھی پولیس موجود تھی۔ اشوک کے زمانے سے پولیس کا محکمہ ہندوستان میں موجود تھا۔ اور ہر طبقے کی نفسیات کے پیش نظر اہل کاران پولیس کو مختلف قسم کی تربیت دی جاتی تھی۔ تاکہ جرائم کی بیخ کنی کی جا سکے۔ پولیس کا مقصد بحیثیتہ سے امن و قانون کی حفاظت کرنا ہے۔ پاکستانی پولیس اور خصوصاً پنجاب کی پولیس اپنی کارکردگی کے سبب سے بجا طور پر قابل فخر ہے۔

راوی کا پُل

راوی کا ریلوے پل لاہور کو شاہدرہ سے ملاتا ہے۔ ضلع لاہور اور ضلع شیخوپورہ کو آپس میں ملانے کا ذریعہ بھی یہی پل ہے۔ یہ پل اگر کام میں نہ لایا جائے۔ تو لاہور شمال مغربی پاکستان سے کٹ جائے گا۔ اس طرح اس پل کی دوہری اہمیت ہے۔ اس لیے کہ فوجی نقطۂ نظر سے بھی اس پل پر شمال مغربی پاکستان کی حفاظت کا انحصار ہے۔

یہ پل نہایت مستحکم اور مضبوط ہے۔ ابتدا میں انگریزی حکومت یہ چاہتی تھی۔ کہ لاہور سے پشاور تک چھوٹی لائن کی گاڑیاں چلائی جائیں۔ چنانچہ اس پل کا عرض اسی لحاظ سے رکھا گیا تھا۔ لیکن بعد کو یہ طے ہوا کہ بڑی لائن کی گاڑیاں چلائی جائیں اس لیے پل کی چوڑائی میں اضافہ کیا گیا۔ کنہیا لال نے اپنی کتاب تاریخ لاہور میں اس پل کی تعمیر کو یوں بیان کیا ہے:۔

> "دریا کے بہاؤ کے اندر کوٹھیاں گلا کر پختہ پائے چونے کے خشتی بنائے گئے ہیں پینتیس
> پائے اور چھتیں در پانی کے بہاؤ کے واسطے رکھے گئے ہیں۔ ہر ایک در ایک سو فٹ مقدار
> میں ہے۔ اور کل پل تین ہزار تین سو فٹ لمبا ہے۔ اور زیرین راستہ چھ فٹ چوڑا لوگوں کی
> آمد و رفت کے واسطے رکھا گیا ہے۔ اس کے اوپر راست و چپ آہنی تختیاں ڈال کر
> دوسری چھت آہنی ڈال گئی ہے جس پر ریل چلتی ہے۔"

یہ زیرین راستہ اب استعمال نہیں کیا جاتا۔ اور ایک مدت سے بند ہے۔ اس زیرین راستے کے متعلق مصنف مذکور نے یوں اظہار رائے کیا ہے:۔

> "نیچے کے راستے سے گھوڑا۔ ٹٹو۔ پیادہ۔ آدمی۔ گائے۔ بیل وغیرہ دریا کے وار پار آتے جاتے
> ہیں۔ اونٹ اور گھوڑا مع سوار آ جا نہیں سکتا۔ کہ بالائی سقف بہت اونچی نہیں۔"

یہ ریلوے پل ۱۸۶۲ء میں تعمیر کیا گیا۔

اس وقت کو رفع کرنے کے لیے ریلوے پُل سے کچھ فاصلے پر کامران کی بارہ دری کے پاس کشتیوں کا ایک پُل بنایا گیا جس پر پیدل، سوار، گھوڑے گاڑیاں اور بیل گاڑیاں بھی گزرتی تھیں۔ ہر مسافر و گھوڑی وغیرہ سے محصول لیا جاتا تھا۔ پُل کے عملے کا دفتر کامران کی بارہ دری میں تھا۔ پختہ پُل کی تعمیر کے بعد یہ پُل منہدم کر دیا گیا۔

آنے جانے والوں کی سہولت کے لیے اب ایک نیا اور وسیع پُل تعمیر کیا گیا ہے جس سے وہ دشواریاں جاتی رہی ہیں جن کا ذکر قدیم مصنفین مثلاً کنہیا لال اور سید محمد لطیف نے کیا ہے۔ یہ پُل جو ۱۰ اپریل ۱۹۱۵ء کو کھولا گیا ریلوے پُل کے متوازی ہے اور لمبائی میں بھی اس کے برابر ہے، مگر عرض میں اتنا کشادہ ہے کہ دو بسیں یا لاریاں بیک وقت گزر سکتی ہیں۔ لیفٹیننٹ گورنر سر میکل فرانسیس او ڈائر کے زمانے میں یہ پُل بہ اہتمام مسٹر کرسٹائن سپرنٹنڈنگ چیف انجینئر اور مسٹر ڈی میک نارلین اگزیکٹو انجینئر تیار ہوا۔ غرض کہ اب ایک کی جگہ راوی کے دو پُل ہیں۔ ایک پر سے ریل گزرتی ہے اور دوسرے پر سے لاریاں، بسیں، گاڑیاں، پیدل آنے جانے والے اور ڈھور ڈنگر گزرتے ہیں۔ یہ دونوں پُل انجینئرنگ کے اعلیٰ ترین کارناموں میں شمار کیے جانے کے لائق ہیں۔ لاہور ہمیشہ سے دریائے راوی کے سیلاب کی زد پر رہا ہے، لیکن یہ پُل ابھی تک کسی سیلاب سے بھی متاثر نہیں ہوئے۔ دو ایک مرتبہ یہ خبر ضرور پھیلی ہے کہ ان پلوں کو سیلاب کی شدت سے خطرہ لاحق ہو گیا۔ ستمبر ۱۹۵۵ء میں راوی کا سیلاب اتنا شدید تھا کہ ریلوں کی آمد و رفت معطل کرنا پڑی تھی۔ ستمبر ۱۹۵۹ء میں بھی سیلاب کی شدت غیر معمولی تھی۔ تاہم راوی کے پُل اپنی جگہ قائم رہے۔

جیل خانے اس متمدن دور میں جیل خانے کی حیثیت محض قید خانے کی سی نہیں رہی۔ پرانے زمانے میں مجرموں کو قیدی بنا کر رکھا جاتا تھا اور زمانہ اسیری میں انھیں طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائی جاتی اور سزائیں دی جاتی تھیں۔ اس کے برعکس آج کل مجرموں کو اچھے شہری بننے کی تربیت دینا ہر متمدن حکومت کا فرض اولین ہے۔ آج کل کے جیل خانے تربیت گاہوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قیدیوں کو ان کی صلاحیت اور رجحان کے مطابق اس قسم کی تعلیم و تربیت دی جاتی ہے کہ جیل سے نکل کر وہ کارآمد شہریوں کی طرح زندگی بسر کر سکیں۔ اکثر مجرم ارتکابِ جرم اس لیے کرتے ہیں کہ انھیں کوئی مفید کام کرنا نہیں آتا۔ اگر ان کے پاس روزی کمانے کے دیانت دارانہ ذرائع موجود ہوں تو وہ ارتکابِ جرم پر کبھی مائل نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل ہر جیل خانہ ایک صنعتی ادارہ ہوتا ہے۔ لاہور کے جیل خانے اس لحاظ سے تربیت گاہیں اور صنعتی ادارے ہیں۔ جیلوں میں جو چیزیں تیار ہوتی ہیں ان میں کاریگری کا معیار اتنا اعلیٰ ہوتا ہے کہ وہ چیزیں نہ صرف اندرونِ ملک فروخت کی جاتی ہیں بلکہ غیر ممالک کو بھی برآمد کی جاتی ہیں۔

لاہور میں چار جیل خانے ہیں۔ سب سے بڑا جیل خانہ سنٹرل جیل ہے۔ دوسرا ڈسٹرکٹ جیل، تیسرا زنانہ جیل اور چوتھا بورسٹل جیل ہے۔ سنٹرل جیل ان سب میں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ زیادہ مدت کے قیدی یا سیاسی مجرم سنٹرل جیل ہی میں رکھے جاتے ہیں۔ یہ جیل مختلف ادوار میں تعمیر ہوئی ہے۔ چار دیواری اور مختلف عمارتیں جن میں ہسپتال، گودام وغیرہ شامل ہیں، ۱۸۵۰ء سے بننی شروع ہوئیں اور ۱۸۵۳ء میں تکمیل کو پہنچی تھیں۔ بیرونی دیوار کا احاطہ ایک ہزار چھ سو سو فٹ لمبا اور نو سو چون فٹ چوڑا ہے۔ دیوار کی اونچائی اٹھارہ فٹ ہے۔ جیل کا بڑا دروازہ شمال کی جانب ہے۔ آگے چل کر ایک اندرونی پھاٹک ہے۔ مغربی سمت سپرنٹنڈنٹ جیل کا بنگلہ اور ملازمین کے کوارٹر ہیں۔ مشرق جانب بھی افسرانِ جیل اور سپاہیوں کے کوارٹر ہیں۔ جیل کا خاص دروازہ پختہ محرابی ڈاٹ دار عالیشان اور مضبوط ہے۔ اس جیل کا احاطہ (۴۲) ایکڑ زمین پر پھیلا ہوا ہے۔ جس حصے کا بیان مذکورہ بالا میں ہے اُسے سرکل نمبر ا کہا جاتا ہے۔ سرکل نمبر ۲ ۱۸۶۲ء میں تعمیر ہوا۔ یہ دونوں سرکل ہشت پہلو ہیں۔ اندر آٹھ احاطے ہیں۔ درمیان میں ایک مینار ہے۔ قیدیوں کے لیے آٹھ بارکیں ہیں جن کا مجموعی طول ۲۰۴ فٹ اور عرض ۲۲ فٹ ہے۔

ان کی اونچائی ۲۱ فٹ ہے۔ ہر بارک اندر سے چار حصوں میں منقسم ہے۔ اس جیل کی تعمیر پر دو لاکھ روپیہ کی رقم صرف ہوئی۔ اس جیل میں تقریباً دو ہزار قیدیوں کے رہنے کا انتظام ہے۔ اس میں دس یورپین قیدیوں کے رہنے کا مخصوص انتظام بھی ہے۔ یورپین قیدیوں کے رہنے کے لیے ایک کشادہ بنگلہ ۶۵ فٹ لمبا ۶۳ فٹ چوڑا اور ۲۴ فٹ اونچا ہے۔ اس کے قریب ہی ایک چھوٹا مکان یورپین قیدیوں کے لیے ہے۔

سنٹرل جیل سے ملحق کم عمر لڑکوں کا قید خانہ بورسٹل جیل کہلاتا ہے۔ جس میں چھاپہ خانہ بھی ہے۔ بورسٹل جیل سنٹرل جیل کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔ کم عمر لڑکوں کو عادی مجرموں اور پختہ عمر کے قیدیوں سے بچانے کے لیے تمام متمدن ممالک میں بورسٹل جیل قائم ہیں اسی قسم کی ایک جیل یہ ہے۔ بورسٹل جیل کو قید خانے کی بہ نسبت مدرسہ کہنا موزوں تر ہو گا۔ لڑکوں کو نہ صرف چھاپے کا کام سکھایا جاتا ہے۔ بلکہ مختلف قسم کی صنعت و حرفت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اور ان کی صحت خوراک ورزش وغیرہ کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ جیل میں ان کے لیے کھیل کے میدان بھی ہیں۔ مقررہ اوقات میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد یہ نو عمر لڑکے کھیلتے کودتے ہیں۔ یہاں تک کہ گاتے اور ناچتے بھی ہیں۔

زنانہ جیل خانہ جو عرف عام میں بڈھی خانہ کہلاتا ہے۔ سنٹرل جیل کے متصل ہے۔ سنٹرل جیل کی طرح زنانہ جیل خانے کے بھی دو سرکل ہیں۔ یہ جیل خانہ ایک مربع احاطے میں واقع ہے۔ جو سات سو ستر فٹ لمبا اور اتنا ہی چوڑا ہے۔ بیرونی احاطے کی چار دیواری سے پچاس فٹ کا فاصلہ چھوڑ کر اصل قید خانے کی دیوار بنائی گئی ہے۔ جس کا دروازہ مغربی جانب ہے۔ اصل قید خانے کی عمارت دائرے کی شکل میں ہے۔ اصل قید خانے اور چار دیواری کے درمیان ۱۸ فٹ چوڑا راستہ ہے۔ اس عمارت میں تقریباً دو سو پچاس قیدی عورتوں کا انتظام ہے۔ جنوب مغرب کی جانب چار یورپین قیدی عورتوں کا انتظام ہے۔ ضرورت پڑنے پر دو سو چھیاسٹھ عورتیں اس عمارت میں رکھی جا سکتی ہیں۔ زنانہ جیل خانے میں سپرنٹنڈنٹ اور دوسرے زنانہ عملے کے لیے کوارٹر بھی موجود ہیں۔ طبی سہولت کی خاطر لیڈی ڈاکٹر اور نرسیں بھی یہاں رہتی ہیں۔ اس جیل خانے کے اندر گودام اور کارخانے بھی ہیں۔ یہ عمارت ایک لاکھ اکیس ہزار تین سو اکسٹھ روپیہ کے صرف سے رائے بہادر کنہیا لال کے زیر نگرانی ۱۸۷۱ء میں بنی تھی۔ قیدی عورتوں کو زنانہ دستکاری اور سینے پرونے کی تعلیم دینے کا انتظام بھی موجود ہے۔

ڈسٹرکٹ جیل کی تعمیر ۱۸۷۵ء میں ہوئی۔ یہ عمارت سنٹرل جیل کے مغرب میں ہے۔ اور پرانی گولہ والا سرائے کی جگہ بنائی گئی ہے۔ اس میں ضلع لاہور کے مرد قیدی رکھے جاتے ہیں۔ جن کی قید کی میعاد عموماً مختصر ہوتی ہے۔ یہاں ایسے چھ سو چھہتر قیدیوں کا انتظام ہے۔ اس جیل کا دروازہ مغربی جانب ہے اور پختہ بنا ہوا ہے۔ قریب ہی دارو غہ جیل کا کوارٹر ہے۔ ڈسٹرکٹ جیل ۷۰۰ فٹ لمبی ۶۵۰ فٹ چوڑی اور ۱۴ فٹ اونچی دیوار سے گھری ہوئی ہے۔ اندرونی میدان دو احاطوں میں منقسم ہے۔ پہلا احاطہ دوسرے احاطے سے چار سو سات فٹ زیادہ چوڑا ہے اس میں اسپتال، گودام، ڈاکٹر کا کوارٹر، بیمار قیدیوں کے لیے وارڈ وغیرہ موجود ہیں۔ سپاہیوں کے رہنے کے لیے کوٹھریاں بھی ہیں۔ یہاں دو سنگین بارکیں ہیں۔ جن میں قیدی رکھے جاتے ہیں۔ ان بارکوں کا طول ۲۶۴ فٹ عرض ۲۰ فٹ اور اونچائی ۱۸ فٹ ہے۔ یہاں چار ورکشاپ ہیں۔ جن میں قیدی کام کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض خشت سازی کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ لاہور کے جیلوں میں بھی قیدیوں کو کار آمد شہری بنایا جاتا ہے۔ چنانچہ ان جیلوں میں مختلف صنعتیں قائم ہیں۔ کمبل، قالین اور قالین سازی، کپڑے بننے کی صنعت، کاغذ بنانا، چٹائیاں بنانا، دریاں بنانا، چھاپے کا کام، جلد سازی، طشتریاں بنانا، خشت سازی، دستکاری، کاڑھنے، سینے اور بننے کا کام، جیلوں کی صنعتوں کے چند اہم شعبے ہیں۔ فن کاری اور کاریگری کا جو معیار لاہور کی جیلوں

میں رہنے والے قیدیوں نے قائم کیا ہے۔ وہ اتنا بلند ہے کہ جیل کی صنعتوں کی قدر بیرونی ممالک میں بھی کی جاتی ہے۔ لاہور کی جیلوں میں متعدد کانگرسی، مسلم لیگی اور انقلابی رہنما سرکاری مہمان رہ چکے ہیں۔

میو ہسپتال

یونانیوں کی حکمت جب وراثت میں مسلمانوں کے حصے میں آئی۔ تو طب یونانی نے حیرت انگیز ترقی کی۔ فن طب جسے یونانی طریقۂ علاج کہا جاتا ہے۔ آج بھی مسلمانوں کے پاس ہے۔ یہاں تک کہ آج طب یونانی اور طب اسلامی ہم معنی سمجھے جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے یونانی طریقۂ علاج جب مغرب میں پہنچا تو اس میں ایک تدریجی ارتقا ہوا۔ اور آج وہ اپنی ترقی یافتہ صورت میں میڈیکل سائنس کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ غرض یہ کہ اسلامی طریقۂ علاج ایک فن بن کر رہ گیا۔ دراں حالیکہ مغربی طریقۂ علاج ایک جیتی جاگتی روز افزوں ترقی کرنے والی سائنس ہے۔ فن اور سائنس میں ایک بنیادی فرق ہے۔ آرٹ یا فن میں درجۂ کمال تو حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن تدریجی ترقی ہونا ممکن نہیں۔ دوسری جانب سائنس جب تک اس میں تدریجی ترقی نہ ہو۔ سائنس نہیں کہلائی جا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ رفتہ رفتہ برصغیر پاک و ہند کے رہنے والوں میں میڈیکل سائنس اتنی اہم ہو گئی کہ یونانی اطبا اپنے کمالات کے باوجود گوشہ نشین ہو گئے اور ان کا حلقۂ اثر محدود ہو کر رہ گیا۔ اس کے برخلاف انگریزی حکومت کی سرپرستی میں برصغیر کے ہر گوشے میں ہسپتال قائم ہوئے۔ جن میں طب مغرب کے سند یافتہ ڈاکٹر عوام کی خدمت کرتے ہیں۔

انسانی خدمت کا وہ جذبہ جو بیماروں کی جان بچانے اور انھیں تکلیف سے نجات دینے کا محرک ہے۔ ایک ایسا جذبہ ہے جسے انسانی خدمت کا بلند ترین جذبہ کہنا چاہیے۔ اس جذبے کی بنیاد خدا ترسی اور انسان دوستی پر ہے۔ مغربی ممالک میں اطبا اور ڈاکٹروں کو ایسی ہی تکریم کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ جیسے روحانی پیشواؤں اور مذہبی رہنماؤں کو۔ اہل مغرب کے نزدیک حضرت مسیح خود ایک بہت بڑے طبیب تھے۔ جو نہ صرف روحانی بیماروں کا علاج کرتے تھے۔ اور انھیں حق و صداقت کا راستہ دکھاتے تھے۔ بلکہ جو جسمانی امراض دور کرنے میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے اور جن کا معجزہ یہ تھا کہ ان کی آواز سے ایک طرف مردہ زندہ ہو جاتا تھا اور دوسری طرف اندھے کو آنکھیں مل جاتی تھیں۔ غرض کہ ہسپتالوں کا قائم کرنا اہل مغرب کے نزدیک انسانی خدمت بھی ہے اور مذہبی فرض بھی۔ بیمار انسانیت کو جسمانی عوارض سے نجات دینے کا جذبہ خلق خدا کی خدمت ہے۔ یہ صرف مسیحیوں سے مخصوص نہیں۔ اسلام کی تعلیم بھی بعینہٖ یہی ہے۔ چنانچہ انگریزی دور میں جو ہسپتال پاکستان کے طول و عرض میں قائم ہوئے۔ وہ اب روز افزوں ترقی کر رہے ہیں اور نئے نئے ہسپتال جگہ جگہ قائم کیے جا رہے ہیں۔ ایک لاہور ہی کو لیجیے تو معلوم ہو گا کہ یہاں چھوٹے بڑے بے شمار ہسپتال موجود ہیں۔ جن میں مردوں، عورتوں اور بچوں کا علاج معالجہ باقاعدگی کے ساتھ ہوتا ہے اور سینکڑوں مریض شفایاب ہو کر اپنے گھروں کو واپس جاتے ہیں۔

لاہور کے ہسپتالوں میں سب سے بڑا ہسپتال میو ہسپتال ہے۔ بلکہ یہ کہنا بجا ہو گا کہ یہ پاکستان کا سب سے بڑا اور سب سے ترقی یافتہ ہسپتال ہے۔ یہ ہسپتال سرائے رتن چند اور انارکلی بازار کے درمیان واقع ہے۔ اس سے ملحق کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج ہے۔ جس کے طلبا و طالبات میو ہسپتال ہی میں تربیت پاتے ہیں۔ میو ہسپتال کے ساتھ اگر میڈیکل کالج کی عمارت کو بھی ملا لیا جائے تو میو ہسپتال کی حد نیلا گنبد تک پہنچتی ہے۔ میو ہسپتال کی عمارت رائے بہادر کنہیا لال کی زیر نگرانی سنہ ۱۸۷۱ء میں بن کر تیار ہوئی اور اس پر ایک لاکھ پچپن ہزار روپیہ صرف ہوا۔ اصل عمارت ایک دو منزلہ مکان ہے۔ جو پختہ اینٹ سے بنایا گیا ہے اور جس کا طول چار سو اٹھائیس فٹ، عرض ساڑھے اکاون فٹ اور بلندی پینتالیس فٹ ہے۔ اس کے چار چھوٹے مینار ہیں۔ جو چاروں کونوں پر ہیں اور درمیان میں ایک بلند مینار ہے۔ جو ایک سو دس فٹ اونچا ہے

اور دُور سے نظر آتا ہے۔ اس پر گھڑی لگی ہے۔ اس لیے اس کو کلاک ٹاور کہتے ہیں۔ اور جو کمرہ اس کے پیچھے واقع ہے وہ ہال ٹاور یعنی بڑے مینار کے پیچھے والا ہال کہلاتا ہے۔ چاروں گوشوں پر واقع چھوٹے مینار ستر بہتر فٹ بلند ہیں۔ اس عمارت میں دس کمرے ہیں۔ وہ بڑے کمرے جن کی لمبائی ایک سو بیس فٹ اور چوڑائی بائیس فٹ ہے۔ ہال کے مشرق اور مغرب میں واقع ہیں۔ ایک کونے میں زینہ ہے جس پر سے بالائی منزل میں جاتے ہیں یہیں لارڈ میو کا مجسمہ بھی ہے۔ اوپر کی منزل میں بھی مشرق و مغرب کی سمت اتنے ہی طویل و عریض کمرے بنے ہوئے ہیں جتنے نیچے۔ اس عمارت کے بڑے مینار کی چار منزلیں گنبد کے علاوہ ہیں۔ جنوب کی طرف جو دو چھوٹے مینار ہیں، ان کی زیریں منزل میں بیماروں کے نہانے کے لیے حوض ہیں۔ غرض کہ یہ ایک وسیع عمارت ہے جو ہسپتال کے لیے مناسب و موزوں ہے۔ اس کا احاطہ بہت بڑا ہے جس میں اتنی گنجائش ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ نئی نئی عمارتوں کا اضافہ ہوتا رہا ہے لیکن اب بھی مزید اضافے کی گنجائش موجود ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ میو ہسپتال کے وسیع احاطے میں کئی بنگلے تھے اور ان میں سے ایک بنگلہ حیوانات کے ہسپتال کے لیے مخصوص تھا۔ بعد میں حیوانات کا ہسپتال ضلع کچہری کے قریب ایک موزوں عمارت میں قائم کیا گیا۔ میو ہسپتال کی عمارت جہاں تعمیر کی گئی ہے یہ جگہ وہی ہے جہاں ہری سنگھ کا پختہ باغ تھا۔ یہاں ہسپتال بن جانے کے بعد سے اب تک بے شمار چھوٹی بڑی عمارتیں ہسپتال سے متعلق تعمیر کی جا چکی ہیں۔ ان میں اکثر مریضوں کے وارڈ ہیں یا ہسپتال کے مختلف شعبے ہیں۔ یہ وارڈ پنجاب کے راجہ مہاراجہ اور رؤسا و اہل ثروت کے بنوائے ہوئے ہیں۔ جن میں سے بعض کے نام مختلف عمارات پر تحریر ہیں۔ یہاں مردانہ و زنانہ ٹی بی وارڈ، فیملی وارڈ، خوشحال طبقے کے لیے پرائیویٹ گورا وارڈ، گلے، ناک اور کان کی بیماریوں کا وارڈ، دل کے امراض کا وارڈ، زچہ و بچہ وارڈ، بخار کا وارڈ، پیشاب پاخانے اور خون کے امتحان کا وارڈ، اور اسی قسم کے دوسرے وارڈ ہیں۔ کوئی وارڈ جالندھر وارڈ کہلاتا ہے۔ کوئی امرتسر وارڈ ہے کوئی لائل پور وارڈ، کوئی سیالکوٹ وارڈ اور کوئی لاہور وارڈ۔ یہاں ریڈیم اور بجلی کے ذریعے سے بھی علاج کیا جاتا ہے۔ یہاں ایک بلڈ بینک قائم ہے جس میں خون کی ایک کثیر مقدار جمع رہتی ہے جو ان مریضوں کے کام آتی ہے جنھیں خون کی ضرورت لاحق ہو۔ یہاں ایک (CASUALTY) وارڈ ہے اور ایک مردہ خانہ ہے۔ میو ہسپتال ایک ایسا عظیم الشان ادارہ ہے کہ اس کے مختلف شعبوں کے نام اور کام بتانے کے لیے ایک دفتر درکار ہوگا۔ اس میں جدید ترین آلات، بہترین ماہرین فن اور تمام امکانی وسائل و ذرائع یکجا ہیں۔

میو ہسپتال کے آس پاس کئی دوسرے ہسپتال بھی ہیں۔ جن میں سے ایک لیڈی ایچی سن ہسپتال ہے جس میں عورتوں کا علاج ہوتا ہے۔ یہ ہسپتال لیڈی ایچی سن کے نام سے منسوب ہے جو سر چارلس ایچی سن لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کی اہلیہ تھیں۔ اسی قسم کے دوسرے زنانہ ہسپتال اور بھی ہیں مثلاً لیڈی ولنگڈن ہسپتال، گلاب دیوی ہسپتال، جانکی دیوی ہسپتال۔ لاہور میں دانتوں کا ایک بڑا ہسپتال بھی ہے۔ جو مونٹ مورنسی ڈینٹل ہسپتال کہلاتا ہے۔ سر گنگا رام کا بنوایا ہوا ایک عظیم الشان ہسپتال جس کا نام گنگا رام ہسپتال ہے۔ میو ہسپتال کے بعد لاہور کا سب سے بڑا ہسپتال ہے۔ گنگا رام ہسپتال کے بالمقابل فاطمہ جناح میڈیکل کالج ہے۔ جس میں لڑکیوں کو ڈاکٹری کی تعلیم دی جاتی ہے۔ دماغی امراض کے لیے ایک بہت بڑا ہسپتال ہے جو پاگل خانہ کہلاتا ہے۔ یہ گلبرگ میں واقع ہے۔ یہ ایک بے مثال ادارہ ہے جو روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔ اس کی اصل عمارت سکھوں کے زمانے کی ہے جو پہلے لہنا سنگھ کی چھاؤنی کے نام سے مشہور تھی۔ جب انگریزوں کا دور دورہ ہوا تو اوّل پنجاب یونیورسٹی کے احاطے میں ایک پرانی بارک کے اندر دماغی ہسپتال کھولا گیا۔ لیکن بعد کو یہ ہسپتال لہنا سنگھ کی چھاؤنی میں منتقل کر دیا گیا۔ اس کے بعد سے اب تک اس میں تدریجی ترقی ہوتی رہی ہے۔ اتنے ہسپتالوں کے باوجود لاہور جیسے بڑے شہر کے لیے ابھی مزید ہسپتالوں کی ضرورت ہے۔ موجودہ انتظامات بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے ناکافی ہیں۔

منڈر

رفدا حسین اسیر

چاندرات ہم چاندرات منڈر کے بارے کچھ لکھنے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ راجہ جنک کی راجدھانی صوبہ بہار کے جس علاقہ کو تر ہت کہتے ہیں وہ پراچین زمانہ میں مہتلا کے نام سے مشہور تھا۔ اس میں در بھنگہ کے پاس ہی جنک پور نامی ایک شہر تھا۔ موجودہ نیپال کی شمالی حدود تک ان کی سلطنت کی حدود کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ مہاراجہ رامچندر جی کی شادی اسی جنک کی بیٹی کے ساتھ ہوئی تھی۔ وہ جب بن باس کا زمانہ کاٹ کر اپنی راجدھانی میں واپس آئے۔ تو سُونی اور تاریک بستی ایک دم قہقہوں، گھما گھمی اور چراغاں کی روپہلی روشنی سے جلوہ گر ہو گئی۔ امن کا دور دورہ شروع ہوا۔ رامچندر جی اکثر رات کی تنہائیوں میں لباس و وضع تبدیل کر کے شہر کا گشت کرتے۔ رعایا کے اندرونی حالات انصاف کی روشن آنکھ سے دیکھتے اور اس کا علاج حسن کارکردگی سے کرتے۔

ایک دفعہ رات کے تین پہر گزر جانے کے بعد ایسا اتفاق ہوا کہ ایک دھوبی کی بیوی رات بھر گھر سے غیر حاضر رہنے کے بعد جب اپنے گھر پہنچی تو دھوبی نے اُسے دروازے پر ہی روک دیا اور کہا کہ جہاں تم نے گناہ کی سیج پر آبرو کو بھینٹ چڑھایا ہے۔ وہیں اسی وقت رات کی خاموشیوں میں اپنی منحوس صورت لیے ہوئے چلی جاؤ تمہارے لیے یہی بہتر ہے۔ میں رام نہیں ہوں کہ تمہیں پھر گھر میں بسا لوں گا۔ یہ کہا اور..... اسی وقت اس عورت پر اپنے رحم و کرم کا دروازہ بند کر دیا۔

دھوبی کی یہ بات رام کے دل میں کھٹکی۔ گھر آئے۔ سیتا اس وقت رات کی خاموشیوں میں نیند کے مزے لے رہی تھی۔ رام نے بے چینی اور کشمکش میں رات کا بقیہ حصّہ گزارا۔ صبح نے اپنی روپہلی روشنی ہر طرف بکھیری تو سیتا حسب دستور اٹھی۔ اس نے دیکھا کہ رام کھڑکی سے باہر کسی نظارے میں محو ہیں۔ چند لمحے توقف کے بعد اس نے رام کے پاؤں کو چھونا چاہا۔ مگر رام نے اپنے پاؤں کھینچ لیے۔ سیتا پریشانیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب کر رہ گئی۔ جب محویت کی نقاب سر کی تو رام وہاں موجود نہ تھے۔

رام سیدھے اپنے بھائی لچھمن کے پاس آئے اور اُسے حکم دیا کہ سیتا کو گاڑی میں بٹھا کر کہیں دور جنگل میں چھوڑ آؤ۔ اگرچہ بھائی کا اخلاق مانع تھا مگر اپنے بھائی کے امر کو اپنا اوّلین فرض جانتے ہوئے اس نے سیتا کو گاڑی میں بٹھایا۔ اور اراوی جسے اب دریلے راوی کہتے ہیں کے کنارے پر سیتا کو گاڑی سے اتار دیا۔ یہاں اس دور میں ایک گھنا جنگل تھا۔ سیتا بالمک رشی کے بھون میں آ گئی۔ اس رشی کا مکان جہاں سیتا رہتی تھی۔ قدیم کتب سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک موجود ہے۔

جب لچھمن سیتا کو چھوڑ کر واپس ہوئے تو ایک برگد کے سایہ میں آرام کرنے کے لیے بیٹھ گئے۔ شام کا وقت ہو چکا تھا۔ وہیں رات بسر کی

صبح کو چند لوگ وہاں آئے انھوں نے لچھمن کی زیارت کی۔ لچھمن نے حاضرین کو طویل نصیحت کی اور اجودھیا لوٹ گئے۔ لوگوں نے اس جگہ کو متبرک جان کر اُسے پوجا پاٹ کا ایک مرکز بنا لیا۔

کئی برس گذر گئے متذکرہ جگہ کے ارد گرد ویرانے آبادیوں کی صورت میں نظر آنے لگے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ جہاں ایک عورت کو محض تکالیف کی زندگی بسر کرنے کے لیے بن باس دیا گیا تھا۔ ایک دن امن حاصل کرنے کے لیے شہر کی صورت میں نظر آئے گی۔ تاریخ اپنے گذشتہ واقعات اکثر دہراتی رہتی ہے اور دھندلے نقوش روشن ہو کر دنیا کے سامنے پیش ہو جایا کرتے ہیں جنھیں چشم بینا دیکھ لیتی ہے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ سیتا کے بیٹے لَو نے اپنی ماں کی یاد میں اسی جگہ قدیم و بے ترتیب آبادی کو لاہور شہر کی صورت میں ظاہر کیا۔ مگر کہیں کہیں ہندوؤں کی کتب میں یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ رام کے تین بیٹے تھے۔ لَو۔ کسو اور اچھو۔ لَو نے لاہور۔ کسو نے قصور اور اچھو نے اچھرہ آباد کیا۔ چاند رات مندر اسی اچھرہ کی سرزمین سے تعلق رکھتا ہے۔

یہ جگہ اچھرہ کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔ اور چاند رات کے نام سے مشہور ہے۔ ہر ماہ کی آخری رات کو لاہور اور اس کے گرد و نواح کے ہندو یہاں آیا کرتے۔ ماتھا ٹیکتے اور عقیدت کے پھول چڑھایا کرتے تھے۔ چونکہ یہ جگہ رام چندر کے بھائی لچھمن کی جائے نشست تھی اس لیے پُرانے وقتوں میں یہاں صرف ایک تھڑا تھا۔ اس کے بعد یہاں ایک کچی مڑھی بنی جس میں ماہ کے آخری ایام میں چراغاں ہوا کرتا تھا۔

کافی عرصہ گزر جانے کے بعد اس مندر کو پختہ کیا گیا اور جابجا مندر کی دیواروں پر گنیش۔ ہنومان۔ بھیرو۔ کشن مہاراج۔ واسشٹ بھوجی دیوی۔ راجہ رسالو۔ راجہ ہوڈی۔ ہیر رانجھا۔ گورو نانک۔ گورکھ ناتھ۔ مچھندر ناتھ جوگی وغیرہ کی تصاویر نقش کی گئیں۔

پیپل اور بڑ کے دو دیو قامت درختوں کے نیچے تھڑے اور گرد چار دیواری اندر سے سات فٹ اور باہر سے بارہ فٹ مرتفع تھی چونہ گچ کی سفید پٹڑی بیس گز طویل اور چودہ گز عریض تھی۔ شمال کی طرف داخل ہونے کا ایک دروازہ جس کے پانچ زینے اور زینہ کے ہر دو طرف پختہ دالان تھے۔ مشرق کی طرف ایک پختہ و مکمل درہ جنوبی درہ شکستہ و بوسیدہ۔ احاطہ کے اندر ایک کنواں جاری ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور چرخی دار کنواں ہے۔ جس کے شمال میں تین سمادھیں ہیں۔ یہ سمادھیں قدیم ہیں۔ ان کی غربی جانب ایک اور مکان اور چار دیواری ہے جس کا طول تیس گز اور عرض چوبیس گز ہے۔ ایک سہ درہ دالان ہے۔ جس کے احاطہ میں مڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ یہ بدھ ناتھ۔ مہری ناتھ۔ بھیوت ناتھ۔ سدھ ناتھ۔ سیس ناتھ پھول ناتھ۔ اوگھڑ ناتھ وغیرہ جوگیوں کی ہیں۔

بھیرو کا مندر

عہد شاہجہانی میں گودر نامی ایک شخص شہر بنارس میں دارا شکوہ کا ملازم تھا۔ حساب میں کمی بیشی کرنے کے باعث اس کے ذمہ کچھ شاہی رقم نکلی۔ دارا شکوہ نے اس کو پھانسی کی سزا کا حکم دے دیا۔ تحقیقات چشتی کے حوالہ سے معلوم ہوا کہ وہ معتوب شخص بھیرو کا پجاری تھا۔ جس روز صبح اس کو پھانسی ملنی تھی اسی رات بھیرو انسانی روپ میں اس جگہ آ پہنچی اور اسے قید و بند کی تکالیف سے نجات دلا کر باہر لے آئی۔ اور کہا کہ آنکھیں بند کر۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ آنکھیں کھولیں تو وہ لاہور شہر میں تھا اور اتوار کا دن تھا۔ اونچی سوا نے صرف اتنا ہی کہا کہ میں بھیرو ہوں۔ اور اسی جگہ اچھرہ میں جہاں اب یہ مندر ہے روپوش ہو گئی۔

گودر یہ معاملہ دیکھ کر حیران ہو گیا۔ اور یادداشت کے لیے اسی جگہ ایک کچی مڑھی بطور نشان کے بنا دی۔ اور خود لاہور میں شاہ عالمی دروازہ کے اندر پری محل کے سامنے آ کر رہنے لگا۔ وقت گذرتا رہا اور حالات بدلتے رہے۔ ایک روز اس نے اچھرہ کے ہندو مالکوں کو بلا کر کہا کہ یہ بھیرو جی کا استھان ہے اس پر تم ہمیشہ چراغاں کیا کرو۔ جو کچھ مجھ سے ہو سکے گا میں بھی تمہاری خدمت کیا کروں گا۔

گودڑ نے اپنا یہ معمول بنا لیا کہ وہ تا زندگی ہر اتوار کو وہاں جاتا اور عقیدت کے پھول چڑھاتا۔ جب ۱۸ اسوج ۱۰۹۱ بکرمی کو وہ مر گیا۔ تو اس کے بعد اس کا بیٹا وسنی رام اس کام پر مامور رہا۔ اس نے یہاں ایک خشتی چبوترہ بنوایا اور گنبد کے شمال میں ایک کنواں جاری کیا۔ ۱۱۵۰ بکرمی میں وسنی رام بھی مر گیا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے نے چند اور کچے مکان بنوا لئے۔

اسی دوران مہاراجہ رنجیت سنگھ کی منظور نظر موراں طوائف کی ماں کو جن کا سایہ ہوا۔ اس وقت جوالا ناتھ بن وسنی رام لاہور میں مشہور جادوگر تھا۔ سکھوں کے عہد میں صرف اس کی دکان پر دال تلی جاتی تھی۔ اگر کوئی اور شخص طمع کے لالچ میں اس کاروبار میں ہاتھ ڈالتا اور دکان نکال لیتا تو جوالا ناتھ جادو کے زور سے اس کی دکان جلا دیتا۔ لوگ اس سے بہت خائف تھے۔

ایک دن موراں طوائف نے جوالا ناتھ کو بلوایا اور کہا کہ میری والدہ سے اس نحس سایہ کو دُور کرو۔ اس نے جواباً کہا کہ یہ تو ابھی دُور ہو جائے گا۔ مگر مجھ سے ایک اقرار کرو کہ جب تمہاری ماں روبصحت ہو جائے گی تو جتنے گاؤں اس کے تصرف میں ہیں ان سے ایک ایک گاڑی اینٹوں کی دینی ہو گی۔ بات معمولی تھی۔ موراں نے فوراً قبول کر لی۔ چنانچہ تندرست ہونے پر ایک سو مواضع جات سے ایک سو گاڑی اینٹوں کی منگوا دی۔ اور کافی زر نقد بھی دیا۔ جوالا ناتھ نے ان اینٹوں سے وہاں عمارت بنوا دی اور ایک ہزار چار سو روپیہ کی رقم لگا کر ایک بارہ دری بھی بنوائی جوالا ناتھ کا اس پر کافی مدت قبضہ رہا۔ ایک دن اس نے ایک شخص کا بہنا مصر نامی کو وہاں بٹھا دیا۔

وقت کے ساتھ ساتھ دنیا بھی اپنے رنگ ڈھنگ بدلتی رہتی ہے۔ ویرانے آباد اور آبادیاں ویرانیوں میں تبدیل ہو جایا کرتی ہیں۔ سانول مل کے بھتیجے رام چند نے اس عمارت کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا اور اس کی جگہ نئے روپ میں موجودہ مندر بنوایا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں راجہ لال سنگھ نے بھی کچھ عمارتیں چار دیواری کے اندر بنوائیں۔

۱۸۸۰ بکرمی میں باوا دھنی ناتھ خورد سالی میں یہاں آیا۔ جوالا ناتھ نے اس کو جوگی سمجھ کر لاہور میں اپنے مکان میں رکھا۔ اس جوگی کی ملاقات ایک معزز سردار و گیانی بھائی گوربخش سنگھ سے ہو گئی۔ دھنی ناتھ اس کی بہت خاطر داری کیا کرتا تھا۔

جوالا ناتھ بھی بھائی گوربخش سنگھ کے پاس آیا جایا کرتا تھا۔ ایک روز بھائی گوربخش سنگھ نے جوالا ناتھ سے کہا کہ اگر تم باوا دھنی ناتھ کو بھیرو کے مندر میں رہنے کے لیے جگہ دے دو۔ تو یہ بہت فائدہ مند ثابت ہو گا اور اس جگہ کی خوب دیکھ بھال کیا کرے گا۔ اپنے رہنے کے لیے خود اپنی گرہ سے کوئی مکان بھی بنا لے گا۔ جوالا ناتھ نے قبول کر کے اسے حکم دے دیا اور دھنی ناتھ نے اپنے رہنے کے لیے وہاں ایک کچا مکان بنا لیا۔

دھنی ناتھ مقبول ہوتا گیا۔ اور اس کے گیان دھیان کی دُور دُور تک شہرت ہو گئی۔ وقت نے کروٹ لی اور اس نے چیلے بنانے شروع کر دیے۔ پہلے اس نے ایک شخص نہند دناہی کے کان کاٹے اور اس کے بعد رام ناتھ کے۔ پھر اس کا یہ معمول ہو گیا کہ لاہور کی طرف جاتا اور گدائی میں کافی مال و زر اکٹھا کر کے واپس چلا آتا اور وہیں رہتا۔

ایک دن دھنی ناتھ کے چیلے نہندونا تھ نے کاہنا مصر سے جو جوالا ناتھ کا بٹھایا ہوا تھا کہا کہ اگر تم میرے بھلے ہوئے یہاں بیٹھنا پسند کرو تو بہتر ہے ورنہ فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ اس نے کہا کہ میں قدیم سے یہاں بیٹھا ہوا ہوں تم کون ہو؟ اس تلخ نوائی پر جوگیوں نے اسے تنگ کرنا شروع کر دیا اور وہ اپنا مال متاع سمیٹ کر مندر کو خیرباد کہہ لاہور چلا آیا۔ اتفاقاً دو روز کے بعد اتوار کو وہاں میلہ تھا۔ باوا دھنی ناتھ شہر کے سرداروں کو ساتھ لے کر جوالا ناتھ کی دکان پر آیا۔ اور کہنے لگا کہ تو میرے گودڑ کی جگہ ہے۔ وہاں چل کر رات کی عبادت میں مشغول ہو جوالا ناتھ

نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ تم میرے مکان کے غاصب ہو۔ باوا دھنی ناتھ نے اس شرط پر اس سے راضی نامہ کر لیا کہ چڑھاوے کی آمدنی سے پچاس فیصد روپیہ سالانہ مجھ سے لیا کرو۔ یہ بات تحریری صورت میں ہوئی۔ چنانچہ جب باوا دھنی ناتھ مر گیا تو رام ناتھ گدی نشین ہوا۔ ۱۸۹۰ بکرمی میں جوالا ناتھ المشہور جوالا سہائے بھی مر گیا اور اس کے بعد اس کا بیٹا بدری ناتھ وہ رقم لیتا رہا۔

رفتہ رفتہ جب رام ناتھ ہر دلعزیز ہو گیا تو اس نے اُن دالگروں کو صاف جواب دے دیا۔ بدری ناتھ نے محکمہ بندوبست میں جناب پنڈت من پھول صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے حضور نالش کی۔ رام ناتھ نے اپنے بیان میں لکھوایا کہ یہ مکان بانیوں کا ضرور ہے لیکن ہم پچیس برس سے یہاں قابض ہیں۔ پنڈت صاحب خود وہاں موقعہ پر گئے اور تحقیقات کی۔ بدری داس کا بیان تھا کہ لوگوں نے محض رام ناتھ کی خاطر بے ایمانی سے کام لیا؛ اور حق بات کو بھول گئے۔ سب نے مل کر یہی چاہا کہ اصل مالک بدری سب بے دخل رہے۔ اس بنا پر وہ مقدمہ خارج ہو گیا۔

لاہور سے شمال مغرب میں فیروز پور روڈ پر تین میل کے فاصلہ پر ہندوؤں کی عبادت گاہ ہے۔ اس کا صدر دروازہ جنوبی دیوار میں ہے۔ دروازہ بہت بڑا ہے۔ دروازہ کے آگے ایک ڈیوڑھی ہے جس کا عرض تین گز اور طول تیرہ گز ہے۔ قالبوتی چھت ہے۔ مشرقی اور مغربی طرف لوگوں کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنی ہوئی ہے۔ جنوب کی طرف سے جہاں داخل ہونے کا راستہ ہے۔ بغیر چھت کے ایک کھلا مکان بنا ہوا ہے جو سترہ گز لمبا اور گیارہ گز چوڑا ہے۔ ڈیوڑھی راجہ لعل سنگھ نے بنوائی تھی۔ ایک بلند دیوار میں ایک لوہے کی زنجیر لٹکی رہتی تھی۔ مغربی دیوار کے سامنے ایک لنگر خانہ بنا ہوا ہے۔ جہاں سے زائرین کو کھانا ملتا تھا۔ مشرق کی طرف ایک مکان ہے۔ جہاں ہر روز رات کو چراغاں ہوتا تھا۔ اس سے آگے مندر کا صحن ہے جو تمام خشتی بنا ہوا ہے۔ جنوبی کونے میں آٹھ پہلو خشتی چبوترہ بنا ہوا ہے۔ ساتھ ہی ایک کنواں ہے جس پر دو چرخیاں تھیں۔ یہ باوا لہر ناتھ نے ۱۸۲۵ بکرمی میں بنوایا تھا۔

اس کنوئیں کے جنوب میں بھیرو کا مندر تقریباً آٹھ گز اونچا چار گز چوڑا پختہ تھڑہ پر بنا ہوا ہے۔ مندر کے نیچے بارہ پہلو خشتی تھڑا ہے۔ مندر بہت بڑا آٹھ پہلو ہے۔ اس کے تمام پہلوؤں میں باہر کی طرف محرابیں ہیں جن کے سروں پر تین تین گنبد تھے۔

مشرقی دیوار کے ساتھ ہی اس مندر سے کم سطح پر ایک اور چار دیواری ہے۔ مندر سے اس طرف آنے کے لیے دو دروازے ہیں۔ اس کی دیواریں تین گز لمبی اور فرش اینٹوں کا ہے۔ اس کے درمیان ایک پختہ آٹھ پہلو تھڑہ ہے۔ اس پر آٹھ پہلو سمادھ تین دروازوں والی ہے جس کی کرسی تھڑہ سے نصف گز اونچی ہے۔ یہ سمادھ ۱۸۹۰ بکرمی میں ٹھنڈی ناتھ نے بنوائی۔ اس کے ساتھ ہی باہر سے سیاہ اور اندر سے سفید ایک تھڑہ پر باوا دھنی ناتھ کی سمادھ ہے۔

بیکنٹھ داس کا ٹھاکر دوارہ

یہ قدیمی ٹھاکر دوارہ چوک چکلے کے سرے پر واقع ہے۔ ہندوؤں کے عقائد کی بنا پر ہزاروں سال پرانا مندر ہے۔ لیکن عمارت دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم عمارات کا اب کوئی نشان موجود نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ زمانہ کی دستبرد سے یہ بھی نہ بچ سکا ہو اور بعد میں نئی طرز تعمیر سے پھر وجود میں آیا ہو۔ پرانی کتب سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ عمارت بیکنٹھ داس نے بنوائی تھی۔ جس میں بہت سے لوگوں نے چندہ دیا تھا۔ مندر حویلی نما صورت میں ہے۔ اندر اور باہر سے چونہ گچ اور منقش عمارت تھی۔ مکان کی ایک منزل سطح زمین کے نیچے اور دو منزلیں اوپر ہیں۔ ہر منزل میں کوٹھڑیاں اور خوبصورت دالان ہیں۔ درمیانی منزل میں ایک دالان اور اس کا طاق نہایت خوبصورت بنا ہوا تھا۔ جو زمانہ کی دستبرد سے نہ بچ سکا۔ اسی میں ایک پتھر کی مورتی کرشن مہاراج کی تھی اور دوسری مورتی رادھیکا کی تھی۔ دالان میں ہنومان کا بت ایک خشتی عمارت میں بنا ہوا تھا۔ چڑھاوے کی آمدنی پر مندر کا خرچ چلتا تھا۔

شوالہ ٹبی والا | یہ مندر محلہ ٹبی کے ساتھ سوچیت سنگھ کی حویلی کے شرقی طرف جہاں پرانی تحصیل تھی واقع ہے۔ یہ قدیم شوالا شہر لاہور کی آبادی کے وقت تعمیر ہوا تھا۔ اس کی بناوٹ بتاتی ہے کہ جب یہ مندر بنایا گیا ہوگا تو اس کی کرسی سطح زمین سے اونچی ہوگی مگر اب اس مندر کی سطح زمین سے ڈیڑھ منزل نیچے ایک... تہہ خانہ میں ہے۔ سیڑھیوں سے اتر کر وہاں جانا پڑتا ہے۔ ہزاروں برس گذرنے کے بعد سطح زمین اونچی ہوتی گئی اور مندر کی سطح ڈیڑھ منزل نیچی ہو گئی۔

سکھوں کی عملداری میں اس کا بالائی گنبد زمین کے برابر تھا۔ راجہ دینا ناتھ نے وہ گنبد اتروا کر ایک اور عالیشان گنبد اونچا کر کے بنوایا۔ باوجودیکہ روشندان باہر کی سطح زمین سے گز بھر اونچے ہیں۔ پھر بھی مندر میں اندھیرا ہی رہتا ہے۔ تمام دن چراغ جلتے رہتے تھے۔ اس مندر کا بیرونی دروازہ جنوب کی طرف کوچہ کے اندر ہے۔ جب اندر داخل ہوں تو ایک ڈیوڑھی آتی ہے۔ دوسرا دروازہ مشرقی طرف کھلا رہتا تھا۔ اس سے گزریں تو ایک وسیع صحن آتا ہے۔ اس صحن کے تینوں طرف پختہ محرابدار دالان اور پختہ خشتی فرش ہے۔ صحن کے درمیان دو گنبد والی پختہ سمادھیں قدیم مہنتوں کی ہیں۔ بڑ اور پیپل کے دو درخت تمام صحن کو گھیرے ہوئے ہیں۔ جنوبی طرف بھی ایک دالان ہے۔ اس دالان کے اندر مندر کا پتھریلا دروازہ ہے۔ دروازہ سے گذریں تو سرخ پتھر کی سیڑھیاں شروع ہوتی ہیں۔ اندازاً بیس سیڑھیاں اتر کر تہہ خانہ کے صحن میں پہنچنا پڑتا ہے۔ مندر کی زمین پر بھی سرخ پتھر کا فرش ہے اور دیواریں بھی سرخ پتھر کی ہیں۔ اوپر قالبوتی چھت اور عالیشان کلس دار گنبد ہے۔ مندر کے درمیان سرخ پتھر کا عالیشان چبوترہ ہے۔ اس پر شیوجی رکھے ہوئے تھے۔ ایک بہت بڑا گھنٹہ چھت کے ساتھ لٹکا رہتا تھا۔ بہت دور دور کے ارادت مند لوگ اس مندر کی پوجا کے لیے آتے تھے۔

چڑھاوا بہت چڑھتا تھا جس پر مہنتوں اور پجاریوں کی گذر اوقات ہوتی تھی۔ اسی تہہ خانہ میں ایک قدیمی کنواں بطور عرقی بنا ہوا ہے اور شیوجی پر جس قدر پانی مسی گاگر سے شب و روز ٹپکتا رہتا تھا۔ وہ اسی عرقی میں غرق ہوتا تھا۔

شوالہ پنڈت رادھا کشن | یہ مندر گمٹی بازار کے قریب اس راستے پر بجانب جنوب واقع ہے جو محلہ سید مٹھا کو جاتا ہے۔ مکان اگرچہ چھوٹا ہے مگر عمارت پختہ و عالیشان بنی ہوئی ہے۔ شمال کی طرف اس کا دروازہ ہے۔ دروازہ سے داخل ہوتے ہی ایک چھوٹا سا طولانی صحن ہے جس کے جنوبی حصہ میں یہ عالیشان مندر بنا ہوا ہے۔ مندر کے اندر ایک چھوٹا چبوترہ سنگ سرخ کا ہے جس پر شیوجی کی مورتی ہے۔ سر پر جلہری اور اس پر مسی گاگر رکھی ہے۔ دیواریں مندر کی پختہ ریختہ کار اور چھت قالبوتی ہے۔ چھت کے اوپر طولانی گنبد ہے۔ اس گنبد کی بالائی منزل سنہری ہے۔ اور بجائے کلس کے ہنومان کی مورتی بیٹھائی ہوئی ہے جو سر سے پاؤں تک طلائی ملمع کا ہے۔ یہ شوالہ سمت ۱۸۷۰ بکرمی میں پنڈت رادھا کشن لم داٹر یا (دربار لیش) نے بنوایا تھا۔

مندر کالی دیوی | یہ مندر گمٹی بازار کے کوچہ کالی ماتا میں ہے۔ کوچے کے سر راہ بجانب غرب پختہ دو منزلہ بنا ہوا ہے۔ دونوں طرف زینے دار دروازے ہیں۔ ایک دروازہ نشست گاہ سے شمال کی طرف ہے اور دوسرا جنوب کی طرف۔ دونوں طرف سیڑھیاں اوپر کی منزل میں جانے کے لیے بنی ہوئی ہیں۔ سیڑھیوں کے آگے چھت والی ڈیوڑھیاں ہیں۔ جنوبی دروازہ اکثر بند رہا کرتا تھا۔ اور شمالی دروازہ سے آمد و رفت ہوا کرتی تھی۔ جنوبی سیڑھیاں پڑھ کر اوپر جائیں تو مربع صورت کی ڈیوڑھی آتی ہے۔ اس کے آگے شمالی طرف ایک اور دروازہ آتا ہے۔ یہ دروازہ اس نشست گاہ کا ہے جس کے مغربی حصہ میں دیوی کا مندر ہے۔ نشست گاہ کے تین در پنجے کوچہ کی طرف ہیں۔ صحن مسقف ہے۔ مغربی حصہ علیحدہ کیا ہوا ہے۔ اس میں ایک پختہ سنگین چبوترہ ہے۔ اس پر چھوٹا سا مندر ہے جس پر کالی ماتا کی سیاہ پتھر کی بنی ہوئی

مورتی تھی، مگر اب نہیں ہے۔ اس کے اوپر چھوٹا سا سنہری گنبد بنا ہوا ہے۔ ایک چھوٹا سا سنہری چھتر دیوی کے سر پر بنا ہوا تھا۔ دوسرا بڑا چھتر گنبد کے اوپر ہے۔ یہ مندر لاہور کے مشہور مندروں میں سے ہے۔

ٹھاکر دوارہ پنڈت رادھا کشن

یہ ٹھاکر دوارہ محلہ سید مٹھا میں ہے۔ جب اس مکان کے اندر داخل ہوں تو ایک کھلا صحن آتا ہے جس کے چاروں طرف عالیشان عمارت ہے۔ شمالی حصہ میں یہ ٹھاکر دوارہ بنا ہوا ہے۔ چند زینے چڑھ کر جب اوپر جائیں تو اس ٹھاکر دوارہ میں داخل ہوتے ہیں۔ خاص مندر کے آگے صحن مسقف ہے جس کی چار دیواری پختہ منقش بنی ہوئی ہے۔ اس صحن کے غربی حصہ میں مندر بنا ہوا ہے جس کا عالیشان سنگین دروازہ ہے۔ تمام دیواریں سنہری منقش ہیں۔ چھت قالبوتی ہے اور اس پر بہت بلند طولانی گنبد بنا ہوا ہے۔ کلس سنہری ہے۔ مندر کے اندر پتھر کی دو مورتیاں سری کرشن اور رادھا کی نفیس جواب نہیں ہیں۔

یہ ٹھاکر دوارہ سمت ۱۸۹۰ بکرمی میں تعمیر ہوا۔ پنڈت رادھا کشن بانی مندر ہذا کی موت کے بعد پنڈت رکھی کیش اس مندر کا سرپرست تھا۔ یہ آنریری مجسٹریٹ بھی تھا۔

سیتلا مندر

یہ مندر لوہاری اور شاہ عالمی کے درمیان نویں بازار کے سامنے بر سر راہ واقع ہے۔ اس کو سیتلا دیوی کا استھان بھی کہتے ہیں۔ کبھی اس مندر میں بہت چہل پہل رہتی تھی۔ ہندوؤں کو اس جگہ سے بہت عقیدت تھی۔ مگر جب چیچک کی بیماری کا زور ہوتا۔ تو ہزاروں وہ لوگ جن کے بچے اس موذی مرض سے نجات پاکر دولت صحت پاتے وہ بڑی خوشی سے یہاں آکر پوجا کرتے۔ اور نذر اسے بھی چڑھاتے۔ یہ مندر ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کا مرجع تھا۔ کئی جاہل مسلمان بھی اپنے بچوں کو ماتا کی بیماری سے شفا پانے کے بعد یہاں لاتے اور مٹھائی وغیرہ چڑھاتے۔

سکھی دور سے پہلے ایک مختصر سا چبوترہ بنا ہوا تھا۔ سکھی دور میں بہت بڑا مکان بن گیا۔ اور بہت سی لاوارث زمین جو مہنت نے اپنے قبضہ میں کی ہوئی تھی، وہ بھی اسی مندر کی ملکیت میں شامل ہو گئی۔ اس کا تمام کرایہ مہنت وصول کیا کرتا تھا۔ چڑھاوے کی آمدنی بہت زیادہ تھی۔

اس مندر کا احاطہ بہت بڑا بنا ہوا ہے اور چار دیواری پختہ ہے۔ مندر کا صدر دروازہ شمال کی طرف ہے۔ دروازہ کے دونوں طرف شرقاً غرباً پختہ دکانیں ہیں جو کرایہ پر چڑھی رہتی ہیں۔ دروازہ مکان کا پختہ بنا ہوا تھا۔ ڈیوڑھی کے اوپر بھی ایک چوبارہ تھا۔ ڈیوڑھی سے آگے ایک وسیع میدان آتا ہے جس کا غربی حصہ بلند ہے۔ اس پر زینہ سے چڑھ کر جاتے ہیں۔ اس چبوترہ پر چند درخت پیپل اور جنڈ کے ہیں۔ جن کو لوگ پوجتے تھے اگر چیچک کی کوئی پھنسی پک جائے تو اسی درخت کے پتوں کا سفوف اس پر ڈالتے تھے۔ جس سے بیمار اچھا ہو جاتا تھا۔

اس بلند چبوترے کے غربی حصہ میں چند کوٹھڑیاں بنی ہیں جن میں مہنت رہا کرتا تھا۔ اسی چبوترہ پر ایک چرخی دار کنواں بھی ہے۔ کنویں کے مشرق کی طرف خاص مندر سری دیوی کا پختہ چونے گچ بنا ہوا تھا۔ اس مندر کا دروازہ شمال کی طرف ہے۔ دروازہ کے آگے ایک برآمدہ ہے۔ مندر کے اندر کی عمارت بھی پختہ چونہ گچ اور منقش تھی۔ دروازہ کی دیوار میں ایک طاق ہے جس میں سنگین مورت سری دیوی کی رکھی ہوئی تھی۔ اسی کو ہندو لوگ ماتھا ٹیکتے اور پوجا کرتے تھے۔ مندر کے باہر برآمدہ کے اندر ایک پتھر کا شیر ایک چبوترے پر رکھا ہوا تھا۔ اس کی بھی پوجا ہوتی تھی۔ مندر کی چھت قالبوتی ہے اور اوپر خوشنما گنبد بنا ہوا ہے۔ مندر کے ایک طرف بہت سے مکان اور کوٹھڑیاں بنی ہوئی ہیں جن میں سادھو لوگ رہتے تھے یا مہنت کے گائے بیل بندھے رہتے تھے۔ مندر کے دروازہ سے باہر کے دروازہ تک سیدھی سڑک بنی ہوئی ہے۔ سڑک سے غرب کی سمت کو وہ اونچا چبوترہ ہے جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ مشرق کی طرف چرخی دار کنواں اور چند پختہ سمادھیں ہیں۔ یہ پہلے مہنتوں کی ہیں۔

ایک مندر شوالہ پختہ چونہ گچ گنبد والا بنا ہوا ہے اس کے اندر شو جی رکھے ہوئے تھے۔ جو لوگ دیوی کی پوجا کے لیے آتے تھے وہ یہاں بھی حاضر ہو کر شو جی کی پرستش کرتے تھے۔ احاطہ کے اندر اور بھی بہت سے مکانات ہیں ایک دروازہ احاطہ کی جنوبی دیوار میں بھی ہے جس کے ذریعے سے اس طرف آمد و رفت ہوتی ہے اس طرف بھی دیوار کے باہر بہت سی زمین متعلقہ مندر ہے۔ زمین کا کچھ حصہ انگریزی حکومت نے ہسپتال کے لیے سیدھی سڑک نکالنے پر اُن سے خرید لیا تھا۔ اور زمین کے عوض زمین بھی دی تھی۔

رانی پچھی کا ٹھاکر دوارہ

یہ ٹھاکر دوارہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی بیوی رانی پچھی نے بنوایا تھا۔ یہ مندر رپ بٹ موجودہ اقبال پارک کے نالہ دریا راوی کے پار کنارے پر بنا ہوا ہے۔ اس کی عمارت بڑی پختہ چونہ گچ بنی ہوئی ہے۔ اس کا دروازہ جنوب کی طرف ہے۔ دروازہ کے آگے ایک عالیشان برآمدہ بطور نشست گاہ بنا ہوا ہے جس کی چند سیڑھیاں ہیں۔ برآمدہ کا یہ دروازہ مندر کا بیرونی دروازہ ہے۔ ہر جگہ پختہ فرش ہے اور دیواریں بھی پختہ ہیں چھت قالبوتی ہے۔ اس سے آگے مندر کا دوسرا دروازہ آتا ہے۔ اس دروازہ کی چوکھٹ پتھر کی ہے۔ اندر مکان کی تمام دیواریں پختہ منقش چونہ گچ ہیں۔ شمالی دیوار میں دو طاق بنے ہوئے تھے جو ضائع ہو گئے ہیں۔ ان میں سنگین مورتیاں سری کرشن، رادھا، رامچندر، سیتا، لچھمن وغیرہ کی تھیں مگر اب نہیں ہیں۔ مندر کے باہر چاروں طرف نہایت سرسبز باغیچہ تھا۔ اس میں ہر قسم کے پھلدار درخت تھے ایک رہٹ بھی جاری تھا۔ تقریباً دس گھماؤں زرعی زمین اس مندر کے ساتھ شامل تھی۔ جس میں کاشت وغیرہ ہوتی تھی۔ اس مندر کے علاوہ صرف ایک سمادھ پختہ چونہ گچ باوا لچھمن داس بیراگی کی بنی ہوئی ہے۔ کسی زمانے میں رام داس بیراگی اس مندر کا پجاری تھا۔ اب یہ مندر بالکل خستہ و تباہ حال ہے۔

مندر باوا جھنگر شاہ المشہور "ستھرا"

یہ مندر لاہور کے نامی گرامی مندروں میں سے ہے۔ جھنگر شاہ حضرت عالمگیر اورنگ زیب کے عہد میں ہوا ہے۔ ہندو اسے صاحب کمال مانتے تھے۔ اس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ ستھرے شاہی فقیر اب بھی بہت گدائی کرتے پھرتے ہیں۔ جھنگر شاہ ستھرے کی ہزاروں تمثیلیں اور کہانیاں۔ اس کی صاف گوئی اور بے ریائی کی اب بھی ہزاروں لوگوں کی زبان سے سننے میں آتی ہیں۔ ستھرا پنجابی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنے پاک و صاف کے ہیں۔ اسی لیے اُسے ستھرا کہتے تھے کہ حق گوئی بغیر کسی جھجک کے کہہ دیتا تھا۔

یہ مکان شاہی قلعہ لاہور کی شمالی دیوار کے ساتھ ہے۔ جھنگر شاہ ستھرا گورو ہر رائے کا چیلہ تھا۔ حضرت عالمگیر بادشاہ کے حکم سے ہر ایک شہر میں سالانہ ایک پیسہ فی دکان اس کا مقرر تھا۔ اصلی وطن اس کا لاہوری تھا۔ آخر اسی جگہ وہ فوت ہوا۔ یہاں ہی جلایا گیا جس جگہ اب اس کی سمادھ بنی ہوئی ہے۔

احاطہ مکان پختہ بنا ہوا ہے۔ لمبا زیادہ اور چوڑا کم ہے۔ مکان کا دروازہ مشرق کی طرف ہے۔ جب دروازہ سے صحن میں داخل ہوں تو صحن کے شمال و جنوب میں فقرا کے رہنے کے لیے مکانات بنے ہوئے ہیں۔ بڑ کا ایک دیو قامت درخت کھڑا ہے۔ جس کا سایہ صحن اور دو طرف دالانوں پر ہے۔

جب اس سے آگے بڑھیں تو پختہ فرش اور کنواں آتا ہے۔ اس کنواں کے جنوب کی طرف ایک نشست گاہ کنوئیں کے چبوترے کے برابر اونچی کرسی پر بنی ہوئی ہے اس نشست گاہ کی عمارت پختہ چونہ گچ منقش ہے۔ کنوئیں کے شمال کی طرف بھی ایک اچھی نشست گاہ بنی ہوئی ہے جس پر زینہ چڑھ کر جاتے ہیں۔ اس کے اندر زمین دریچے بطرف میدان پریٹ موجودہ اقبال پارک رکھے گئے ہیں۔ جس میں بیٹھ کر اقبال پارک کے سبزہ زار سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اس بیٹھک سے آگے بڑھ کر ایک اور مکان چونہ گچ بنا ہوا ہے۔ اس میں گرنتھ رکھا رہتا تھا۔ اس سلسلہ کے فقرا اس کو بہت شوق سے پڑھا کرتے تھے۔

اس مکان سے جنوب کی طرف قلعہ لاہور کی دیوار کے ساتھ مکان سمادھ جھنگر شاہ ستھرا کا پختہ گنبددار عالیشان بنا ہوا ہے۔ اس کا دروازہ شمال کی طرف ہے۔ مندر کے اندر کی عمارت چونہ گچ اور منقش ہے۔ دیواروں پر گوروؤں کی تصاویر منقش ہیں۔ چھت قالبوتی ہے۔ اور اس کے اوپر عالیشان گنبد

بنا ہوا ہے۔ مندر کے درمیان اصل سمادھ جھنگر شاہ کی سنگِ مرمر کے ایک چبوترہ پر ہے یہ چبوترہ نہایت خوبصورت بنا ہوا ہے۔ سنگِ مرمر کے اندر بیل بوٹے عقیق اور سلیمانی وغیرہ پتھروں کے رنگا رنگ بنائے گئے ہیں ـــــ اس کے اوپر چھوٹی سی سمادھ سنگِ مرمر کی ہے چبوترے کے چاروں کناروں پر چار سنگین ستون قائم کر کے ایک خوبصورت گنبدی بنائی گئی ہے۔

ٹھاکر دوارہ چور مور والا

یہ مندر دائی بھولی کے کوچہ میں ہے۔ اڑھائی منزلہ عمارت نہایت پختہ چونہ گچ اور منقش ہے۔ اس مندر کی بنیاد مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں رکھی گئی تھی۔ کنہیا لعل کی ماں نے اپنے ذاتی روپے سے اس کو تعمیر کروایا۔ اور ایک خدا پرست سادہ مہنت بلرام داس کی تحویل میں دے دیا۔ مہنت کچھ عرصہ کے بعد ہی ہر دلعزیز ہو گیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ بھی اکثر اسکی زیارت کو آیا کرتا تھا۔ اس وجہ سے اس مندر کی اور بھی شہرت ہو گئی۔ ایک دفعہ مہنت نے چور اور مور کی ایک کتھا مہاراجہ رنجیت سنگھ کو سنائی۔ مہاراجہ سن کر بہت خوش ہوا۔ اور چور مور کا سادھ کو خطاب دلایا۔ پھر تو تمام لوگ اسے چور مور والا سادھ کہنے لگے حتیٰ کہ چند برسوں میں یہ ٹھاکر دوارہ بھی چور مور والا مشہور ہو گیا۔ وہ مہنت تادم زیست اس ٹھاکر دوارہ میں رہا۔ اس کے بعد رام داس مہنت ہوا پھر بھگوان داس۔

یہ ٹھاکر دوارہ بطور حویلی کے بنا ہوا ہے جس کی اڑھائی منزلیں ہیں۔ چاروں طرف پختہ چونہ گچ دالان اور کوٹھڑیاں بنی ہوئی ہیں۔ مندر ایک حجرہ کی شکل میں ہے۔ جس پر تمام سنہرا کام کیا ہوا تھا۔ اس حجرے کے اندر چند سنگین مورتیاں دیوتاؤں اور اوتاروں کی طاقچوں میں رکھی ہوئی تھیں۔ سب سے بڑی مورتی سری رامچندر کی تھی۔ دوسری لچھمن کی رام چندر کے بائیں طرف اور دائیں طرف سیتا کی مورتی تھی۔ چوتھی مورتی رگھناتھ کی تھی۔ اس کے علاوہ بھی اور بہت سے بت تھے۔ مندر کی دیواروں پر شیشہ کاری کا کام کیا ہوا تھا۔

شوالہ تر پولیہ

یہ مندر بھی لاہور کے مشہور قدیم مندروں میں سے ہے۔ زمانہ سلف سے اس کی وقتاً فوقتاً مرمت ہوتی رہی۔ سکھی دور میں اس کی تمام عمارت بالکل نئے انداز میں بن گئی۔ پریم ناتھ جوگی کافی عمر تک اس مندر میں قیام پذیر رہا۔ اس لیے یہ پریم ناتھ کے شوالہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔

تر پولیہ بازار کے سر راہ مشرق کی طرف یہ مندر واقع ہے۔ مکان کا دروازہ مغرب کی طرف ہے۔ دروازہ کے آگے بازار مسقف کر کے ایک مکان بنا ہوا تھا جس کے دونوں طرف در تھے۔ انگریزی عملداری میں وہ مسمار کر دیا گیا۔ دروازہ کی طرف ایک دریچہ سے برہمن لوگوں کو پانی پلایا کرتا تھا۔ دروازہ سے داخل ہوں تو ایک صحن آتا ہے۔ اس کے شمال کی طرف چرخی دار کنواں ہے۔ اس سے آگے مشرق کو جائیں تو ایک کشادہ صحن آتا ہے۔ اس کے ایک گوشہ میں ایک چبوترے پر مندر بنا ہوا ہے۔ مندر کا دروازہ شمال کی طرف ہے۔ اور ایک دریچہ غربی سمت صحن کی طرف کھلتا ہے۔ دریچہ میں سنگِ مرمر کا پنجرا لگا ہوا تھا۔ مندر کے اندر درمیان میں ایک اور چھوٹا چبوترہ ہے۔ جس پر شو جی کی مورتی تھی۔ مگر اب نہیں ہے۔ مندر کی دیواریں اندر سے پختہ چونہ گچ ہیں۔ چھت قالبوتی ہے۔ اس پر کلس دار گنبد ہے۔ مندر کے سامنے باہر صحن میں ایک درخت پیپل کا ہے۔ شمالی اور جنوبی دالانوں میں پہلے مہنتوں کی سمادھیں ہیں۔ صحن کی ملحقہ عمارتیں چاروں طرف بہت بلند دو منزلہ و سہ منزلہ بنی ہوئی ہیں۔ جن میں مندر کے جوگی اور پجاری رہا کرتے تھے۔ شمالی عمارت خاص کر بہت بلند ہے جو غرب و شمال کی طرف بازار میں دکانیں ہیں وہ بھی مندر کی ملکیت ہیں۔ ان سب کا کرایہ مہنت لیتا تھا۔ یاد رہے کہ سر یا تو الہ بازار سے ایک راستہ سادھوؤں کے تکیہ کی طرف جاتا ہے اور بائیں طرف یہ بازار کشمیری بازار میں جا نکلتا ہے اس کو تر پولیہ بازار کہتے ہیں۔

گرجے

سردار خاں

دین ومذہب کے معاملہ میں اکبر کی متجسس طبیعت نے گوا سے رومن کیتھولک مشنریوں کو ۱۵۹۴ء میں اپنے دربار میں آنے کی دعوت دی۔ اس وقت تک جنوبی ہند میں بھی مدراس اور گوا کے علاوہ کوئی باقاعدہ مسیحی ادارہ موجود نہ تھا اور شمالی ہند تو غیر ملکی عیسائیوں کی آمد و رفت سے بھی بالکل خالی تھا مگر ۱۵۹۵ء میں جبکہ اکبر لاہور میں مقیم تھا ۵ رمئی سنہ مذکور کو تین مسیحی علماء اس شہر میں پہنچے۔ یہ لوگ ۳ر دسمبر ۱۵۹۴ء کو گوا سے روانہ ہوئے تھے اور اکبری فرمان کے مطابق جس میں ان کی جان اور مال کی حفاظت کا وعدہ کیا گیا تھا چھ ماہ کی مدت میں راستہ طے کر کے لاہور پہنچے تھے۔

ان علماء کے نام یہ تھے: (۱) فادر جیروم زیویئر (۲) فادر عمانوایل پنیرو (۳) برادر بینیڈکٹ ڈے گوس۔

رومن کیتھولک مؤرخین کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ شہنشاہ اکبر نے ان علماء کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا۔ مشرقی طرز پر ان کی مہمان نوازی اور خاطر و مدارات کی گئی۔ انھیں قیام کے لیے ایک آرام دہ مکان دیا گیا اور انھیں عبادت خانہ تعمیر کرنے کی اجازت بھی دی چنانچہ انھوں نے ۱۵۹۷ء میں لاہور میں ایک گرجا تعمیر کیا جس کا خرچ حکومت نے برداشت کیا۔

جب اس گرجا کی رسم تقدیس ادا کی گئی تو شہنشاہ کشمیر کی سیر کے لیے گئے تھے اس لیے لاہور کا گورنر اس رسم میں بذاتِ خود شریک ہوا۔ افسوس ہے کہ رومن کیتھولک مؤرخ اس موقع پر لاہور کے گورنر کا نام نہیں لکھتا۔ آگے چل کر مؤرخ یوں رقم طراز ہے کہ اس سال اس گرجے میں بڑا دن بڑی دھوم دھام سے منایا گیا تھا اور برادر بینیڈکٹ ڈے گوس نے ایک انتہائی خوبصورت چرنی تیار کی تھی جسے اہلِ شہر بڑی کثرت سے دیکھنے آتے تھے اور ایک مہینہ تک لوگ اس کی زیارت کرتے رہے۔ اس چرنی کے لیے شاہی خاندان کے ایک شہزادے نے بڑی بڑی قندیلیں عطا کی تھیں اور اس دن شاہی خاندان کے افراد نے غرباء کو خیرات تقسیم کی۔ شہزادہ سلیم کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ان مسیحی علماء سے دوستانہ تعلقات رکھتا تھا اور درباری امراء بھی اس گرجے میں آتے تھے۔ لیکن اب اس گرجے کا کوئی نشان باقی نہیں، نہ کوئی یہ بتا سکتا ہے کہ وہ کہاں بنا تھا۔

اس کے بعد گو اسے مغل دربار میں مسیحی علماء کی آمد و رفت جاری رہی مگر عالمگیر کے زمانہ میں یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

انگریزی اقتدار کی تاریخ کے ساتھ شمالی ہند میں پھر عیسائی پادری نظر آنے لگے یہ پادری صاحبان انگریزی فوجوں کے ساتھ ۱۸۴۰ء سے رہتے تھے مگر ان کا دائرہ خدمت صرف چھاؤنیوں تک ہی محدود تھا اور تبلیغ مذہب سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا، مگر

رومن کیتھولک مشن کا دعویٰ ہے کہ ۱۸۳۰ء میں چند فادر بہ عہد مہاراجہ رنجیت سنگھ بغرض تبلیغ دین لاہور آئے تھے جن کی مہاراجہ نے بہت عزت و تکریم کی۔ اس کے بعد ۱۸۴۷ء میں ایک مشنری مسمی فادر کیفرل آگرہ سے لاہور آیا اور مقامی عیسائیوں کی مدد سے اس نے ایک گرجا تعمیر کیا جس کا طول ۵۷ فیٹ اور عرض ۳۹ فیٹ تھا اور اس کی رسم تقدیس ۱۸۴۷ء میں ہی ادا ہوئی مگر اب اس گرجے کا بھی پتہ نہیں کہ کہاں تھا۔

البتہ ایک قدیم گرجا گورنمنٹ کالج کی پشت پر موجود ہے یہ عمارت اس وقت جمنیزیم کہلاتی ہے اور اس پر سنہ تعمیر ۱۸۵۸ء تحریر ہے۔ اس عمارت کی طرز تعمیر رومن ہے۔ ممکن ہے کہ یہ وہی گرجا ہو جو فادر کیفرل نے تعمیر کیا تھا البتہ اس کے طول و عرض کی پیمائش کرنی ضرور ہے۔

۱۸۵۱ء میں انگریزی حکومت نے لاہور کی رومن کیتھولک مشنریوں کی امداد کے لیے چھ ہزار آٹھ سو چھیانوے (۶۸۹۶) روپے کی رقم منظور کی۔ اس کے علاوہ انگریزی فوج کے سپاہیوں نے بھی چندہ دیا اور بیس ہزار روپے کی لاگت سے انارکلی کا رومن کیتھولک گرجا تعمیر ہوا۔ ۱۸۶۱ء میں اس کی تعمیر ختم ہوئی۔ اس گرجے میں چار سو آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔ اسی گرجے سے متعلق ایک زنانہ اسکول بھی ۱۸۷۵ء میں قائم کیا گیا تھا جو ۱۹۱۶ء میں جیزس اینڈ میری اسکول بن گیا اور اب ڈیورنڈ روڈ پر موجود ہے۔ انارکلی کے گرجے کا پہلا بشپ ڈاکٹر ریمن فورس مو آرد تھا۔

اب تک لاہور، سیالکوٹ اور فیروزپور میں رومن کیتھولک مشنری ہی کام کر رہے تھے جو پرتگال، اسپین اور اٹلی کے رہنے والے تھے۔ امریکن پروٹسٹنٹ مشنریوں کا ابھی ادھر گزر نہ ہوا تھا مگر ۱۲ نومبر ۱۸۴۹ء کو دو جوان مشنری مسٹر جان نیوٹن اور مسٹر چارلس فورمین لاہور میں آئے۔ ان دونوں کے لاہور میں آنے کا منشا انگریزی تعلیم کو عام کرنا تھا۔ اس زمانہ میں غیر ملکی لوگوں کو رہنے کے لیے مناسب مکان ملنا مشکل تھا۔ بہت تلاش کے بعد ان دونوں جوانوں کو ہیرا منڈی میں ایک مکان مل گیا۔ اس وقت یہ محلہ موجودہ غلاظت سے پاک تھا۔ یہاں ڈاکٹر فورمین نے ۱۹ دسمبر ۱۸۴۹ء کو ایک سکول کھولا جس میں صرف تین طالب علم تھے، دو ہندو اور ایک مسلمان، ان طالب علموں کو فی کس دو پیسہ یومیہ وظیفہ دیا تھا۔ یہی سکول آج ترقی کر کے رنگ محل مشن ہائی سکول بن گیا ہے جس میں ڈھائی ہزار طلباء تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ رنگ محل کی عمارت ۹ فروری ۱۸۹۹ء کو چار سو روپے میں خریدی گئی تھی۔

انگریزی حکومت نے وہ جگہ جہاں آج کل اسٹیشن بنا ہوا ہے اور اس کے جنوب کا تمام علاقہ جو ۱۳ بیگھہ اور ۵ مرلے زمین تھی مبلغ ۸۰۰ روپے میں ۱۸۶۰ء میں ڈاکٹر فورمین کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ جب اس جگہ اسٹیشن تعمیر ہونے لگا تو وہ جگہ جہاں آج کل نولکھا گرجا اور مشنری صاحبان کی کوٹھیاں ہیں تبادلہ میں دے دی گئی تھی۔ اس کے علاوہ ۱۸ بیگھہ ۲ کنال اور ۱۲ مرلے زمین مشن کو حکومت نے عطیہ دے دیا تھا۔

ڈاکٹر فورمین نے جو پہلا گرجا ۱۸۶۱ء میں تعمیر کرایا تھا وہ میکلوڈ روڈ پر دفتر زمیندار کے بالمقابل تھا اب اس کا کوئی نشان موجود نہیں البتہ جہاں آج کل نولکھا گرجا موجود ہے یہاں ایک عمارت بعد میں بنائی گئی تھی جو ۱۹۳۵ء تک موجود تھی۔ ۱۹۳۶ء میں اس قدیم عمارت کو گرا کے موجودہ نئی عمارت امریکن طرز پر تعمیر کی گئی ہے۔ یہ گرجا نولکھا گرجا کہلاتا ہے

اسٹیشن کے جنوب میں ایمپرس روڈ پر جہاں اب اومنی بس کا اسٹیشن ہے یہاں ایک کوٹھی تھی جو مسٹر جان نیوٹن نے تعمیر کرائی تھی اس کا نام نیوٹن ولا تھا۔ موجودہ پلکھن کا درخت نیوٹن صاحب ہی کا لگایا ہوا ہے جو ایک سو سال سے زیادہ کا ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر فورمین نے ۱۸۹۸ء میں نیلے گنبد کے مشرق میں ۱۶ ایکڑ ۴ کنال زمین کالج کے لیے خریدی تھی۔ اب کالج مسمار کر دیا گیا ہے اور وہ زمین فروخت کر دی گئی ہے صرف ایک بورڈنگ ہال باقی ہے جو موجودہ پرنسپل ایف سی کالج کے والد صاحب کے نام پر بطور یادگار رہنے دیا گیا تھا۔

ان پروٹسٹنٹ پادریوں کی یادگار ایک گرجا انارکلی میں بھی موجود ہے جو ۱۸۹۸ء میں تعمیر ہوا تھا۔

مال روڈ پر سی ایم ایس مشن کا کیتھیڈرل نہایت عظمت و شان کے ساتھ کھڑا ہے۔ اس عمارت کا سنگِ بنیاد ۲۵ جنوری ۱۸۸۷ء کو رکھا گیا تھا۔ اس کا طرزِ تعمیر انگریزی ہے۔ اس کا نقشہ مسٹر سکاٹ نامی ایک انجینئر نے تیار کیا تھا اور تعمیر کا کام کلکتہ کی ایک فرم میسرز برن اینڈ کمپنی کے زیرِ انتظام ہوا تھا۔ اس گرجے میں جتنا کام پتھر کا ہے اس کے اخراجات کمپنی مذکور نے خود برداشت کیے تھے۔ اس گرجے سے متعلق ایک کتب خانہ بھی ہے جس میں دینِ مسیحی کے متعلق وہ کتابیں موجود ہیں جو پروٹسٹنٹ مذہب کے نقطۂ نگاہ سے لکھی گئی ہیں۔ جب یہ عمارت بن کر تیار ہوئی تو مع فرنیچر اس پر چار لاکھ آٹھ ہزار روپیہ خرچ ہوا تھا۔ اس عمارت کا طرزِ تعمیر ایسا ہے کہ گرمیوں میں اندر سے ٹھنڈی رہتی ہے۔ جب تک مذکورہ مشن کے لیے یہ عمارت تعمیر نہ ہوئی تھی تو انارکلی کا مقبرہ بطور عبادت گاہ استعمال ہوتا تھا۔

لاہور کی قدیم مسیحی تعمیرات میں سے ایک سینٹ جان ہوسٹل بھی قابلِ ذکر ہے۔ اس ہوسٹل کا پرانا نام ڈی وی نٹی اسکول (مدرسۂ الٰہیات) ہے۔ یہ ہوسٹل مشن روڈ پر مہاسنگھ باغ میں واقع ہے۔ قریباً ۱۸۶۰ء میں یہ باغ ایک مشنری مسمی ٹی۔ وی فرنچ نے جو چرچ مشنری سوسائٹی کے ممبر تھے مہاسنگھ کے بیٹے سوایا سنگھ سے خرید لیا تھا۔ لاہور کے پہلے بشپ نے ۱۸۷۰ء میں یہاں مقامی عیسائیوں کے لیے ایک دینی تربیت گاہ قائم کی۔ اب تو یہ مقام ویران ہے اور اس کا نصف حصہ فروخت کر دیا گیا ہے جہاں اب ایک سینما اور لوگوں نے مسکونہ مکانات تعمیر کر لیے ہیں ورنہ ۱۸۷۰ء میں یہ پُررونق مقام تھا۔

اس وقت یہاں متعدد کلاس روم، کتب خانہ، استادوں کے رہنے کے لیے مکانات اور پرنسپل کے لیے قیام گاہ بنائی گئی تھی۔ اب کتب خانہ کی عمارت اور استادوں کے مکانات تو منہدم ہو چکے ہیں البتہ پرنسپل کی اقامت گاہ اور گرجا اپنی حالتِ قدیم پر قائم ہے۔ گرجا اچھی حالت میں ہے۔ یہ گرجا گھر اسی مدرسہ الٰہیات کے استاد مسٹر جی ایم گارڈن کی یادگار میں تعمیر ہوا تھا۔ اس کا طرزِ تعمیر شمالی اٹلی کے طرز کا نمونہ ہے۔ جو کمرے باقی رہ گئے ہیں ان میں لاہور کے مختلف اداروں میں پڑھنے والے مسیحی طالب علم رہتے ہیں۔

ریگل سینما کے محاذ میں ٹمپل روڈ اور لارنس روڈ کے چوک پر رومن کیتھولک کیتھیڈرل کی فلک بوس عمارت کھڑی ہے۔ اس عمارت کا سنگِ بنیاد ۱۹۰۴ء میں بشپ ڈاکٹر گاڈفری نے رکھا تھا اور وہی اس کے بانی تھے۔ ڈاکٹر موصوف نے اسی سنہ میں انتقال کیا اور انھیں اس کی تکمیل دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔

اس گرجا کی عمارت رومن طرزِ تعمیر کا نمونہ ہے۔ اس میں ایک بلند مینار، ایک وسیع گنبد اور چند چھوٹے چھوٹے مینار ہیں۔ بڑے مینار کی بلندی ۱۶۵ فیٹ ہے اور گنبد ۱۲۰ فیٹ بلند ہے۔ یہ گرجا درحقیقت اپنی عظمت و شان کے لحاظ سے روم کے بعض گرجوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

اس کے ستونوں کے لیے آگرہ سے سنگِ سفید منگوایا گیا تھا۔ دروازے اور کھڑکیاں اور نشستیں ساگوان کی لکڑی کی ہیں۔ تمام گرجا کا طول دو سو فیٹ ہے اور تالار کا عرض ۶۸ فیٹ ہے اور بغلی تالار کا طول ۱۲۵ فیٹ ہے۔

اس کی کھڑکیوں کے شیشوں پر مسیحی مقدسین کی تصویریں بنی ہوئی ہیں جنھیں بلجیم کے ایک مشہور فنکار نے تیار کیا تھا۔ تالاریں دو بڑے خوش قطع مجسمے رکھے ہیں۔ ایک جناب مسیح کا اور ایک حضرت مریم صدیقہ کا۔

اس عمارت کا نقشہ شہراتی ٹورپ (بلجیم) کے ایک ماہر عمارت نے تیار کیا تھا۔ غرض یہ عمارت ۱۹۰۷ء میں بن کر مکمل ہوئی۔

موجودہ سٹیٹ بنک کے قریب ایک گرجا گھر ہے جو اپنی قدامت کے لحاظ سے قابل ذکر ہے۔ اس کے علاوہ نکلسن روڈ پر برگد والے چوک کے قریب ایک گرجا ہے اور وارث روڈ پر ایک میتھوڈسٹ گرجا موجود ہے مگر یہ دونوں عبادت گاہیں نسبتاً نئی ہیں۔

الغرض لاہور میں یوں تو عیسائی مشنریوں کی آمد بہ عہد اکبری ۱۵۹۵ء سے شروع ہو گئی تھی لیکن اس عہد کی کوئی تعمیری یادگار موجود نہیں ہے۔ ترتیب زمانی کے لحاظ سے سب سے قدیم عمارت گورنمنٹ کالج کی پشت پر چنبر لین کی ہے اور جدید ترین عمارت نولکھا گرجے کی ہے جو پادری ٹھاکر داس صاحب کی کوشش سے تعمیر ہوا ہے۔

کالج

وحید الحسن ہاشمی

متعدد مؤرخین نے لاہور کے متعلق مختلف موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے۔ لاہور ایک قدیم شہر ہے اور اس کی تاریخ کی قدامت بہ لحاظ نکات اپنے سینے میں پنہاں کیے ہوئے ہے۔ یہاں کے باغات، مزارات اور نوادرات ابتدائی زمانہ کی تصویر لیے ہوئے ہیں۔ یہاں کی مساجد مسلمانوں کے زرّیں عہدِ گزشتہ کی یادگار ہیں۔ یہاں کا قلعہ، شالا مار باغ، جہانگیر کا مقبرہ مغل دورِ حکومت کی یاد دلاتا ہے۔ حضرت داتا گنج بخشؒ اور میاں میرؒ کے مقابر مسلمانوں کی روحانیت کے علمبردار ہیں۔ یہاں کے کالج تعلیم و تدریس کی ایک ایسی شمع روشن کیے ہوئے ہیں جس کی روشنی سے سارا پاکستان جگمگا رہا ہے۔

لاہور کے کالجوں کی تاریخ ایک ایسا دلآویز موضوع ہے جو لاہور کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

اسلام سے قبل لاہور میں تعلیم کا کیا حال تھا۔ اسلامی عہدِ حکومت خصوصاً شاہانِ مغلیہ کے وقت میں یہاں تعلیم کا کیا معیار تھا۔ تعلیم و تدریس کے ذرائع کیا تھے۔ عوام اس نعمت سے کس حد تک مستفیض ہوتے تھے۔ یہاں کتنے مدرسے تھے۔ طریقۂ تعلیم کیا تھا۔ اس زمانے کے طلبا کی ذہنی استعداد کیا تھی۔ یہ اور اسی قبیل کے تمام موضوعات ہماری اس بحث سے خارج ہیں فقط انگریزی دور اور پاکستان بننے کے بعد جو کالج یہاں قائم ہوئے ان کا ذکر ذیل کے مضمون میں کیا جا رہا ہے۔

ہم نے کوشش کی ہے کہ لاہور کے تمام کالجوں کا تذکرہ اس مضمون میں آ جائے۔ ان کا تعلیمی معیار، تعلیم کے متعلق اساتذہ کی سرگرم کوششیں، طلبا کی تعلیمی دلچسپیاں، کھیل کے میدان میں ان کے کارنامے، جدید طریقۂ تدریس کے نتائج، سیکنڈری بورڈ لاہور اور یونیورسٹی کے امتحانات کے نتائج، غرض تعلیم کے متعلق ہر قسم کی معلومات اس مضمون میں شامل کر دی گئی ہیں۔

لاہور کے کالجوں کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ یہ کالجوں کا شہر ہے۔ یہ شہر اعلیٰ تعلیمی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ یہی سبب ہے کہ یہاں سے چھپنے والے اخبارات اور رسائل کی تعداد پاکستان اور ہندوستان کے ہر بڑے شہر کے مقابلے میں زیادہ ہے۔

ذیل کے مضمون میں ہم نے فقط ان کالجوں کا ذکر کیا ہے جن کی شہرت تسلیم شدہ ہے اور ان کالجوں کو نظر انداز کر دیا ہے جو پرائیویٹ طور پر چلائے جا رہے ہیں۔ ان کالجوں کو بھی چھوڑ دیا گیا ہے جن کے کارکنان نے باوجود خطوط روانہ کرنے، ٹیلیفون کرنے اور ذاتی اثر و رسوخ استعمال کرنے کے ہم سے تعاون نہیں کیا بلکہ ہم سے وعدے بھی کیے لیکن وہ شرمندۂ ایفا نہ ہوئے۔

گورنمنٹ کالج لاہور، قیام: ۱۸۶۴ء
تعداد طلبہ: ۲۰۰۰

اہلِ ہند کو مکمل غلامی کے طوق میں جکڑنے اور لارڈ میکالے کی مذموم اور متعصبانہ پالیسی پر عمل کرنے کے لیے ۱۸۶۴ء میں لاہور کالج جاری کیا گیا اور اس کا نصاب وہی متعین ہوا جو کلکتہ یونیورسٹی کا تھا گویا بنگال کی تاریخ کو پنجاب میں دہرانے کا ایک اور عزم کیا گیا۔ اسی سال ڈاکٹر لیٹنر کو جو کنگز کالج لندن میں عربی کے پروفیسر تھے گورنمنٹ کالج کا پرنسپل بنایا گیا۔ شروع شروع میں یہ کالج راجہ دھیان سنگھ کی حویلی کے ایک حصے میں کھولا گیا۔ یہاں کھولنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ضلع اسکول کے ہیڈ ماسٹر مسٹر بیدی سے کالج کے قیام میں امداد ملتی رہے۔

پہلے سال کالج میں طلبا کی تعداد ۹ تھی۔ پہلے سال کا نتیجہ سو فی صد تھا بلکہ ہر طالب علم کو دس سے پندرہ روپے ماہوار کے حساب سے وظیفہ بھی ملا۔ چند سالوں کے بعد یہ رقم ۲۰ روپے ماہوار کر دی گئی۔ ۱۸۶۵ء میں اس کالج سے ایف اے کا امتحان دینے کے لیے چند طلبا کلکتہ بھیجے گئے جن میں سے ۵ پاس ہوئے، اسی سال عربی پڑھانے کے لیے مسٹر علمدار حسین کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔ طلبا میں جرأت اور ہمت پیدا کرنے کے لیے ایک DEBATING SOCIETY بنائی گئی۔ چونکہ کلکتہ یونیورسٹی کا نصاب پنجابی جوانوں کے مزاج کے مطابق نہ تھا اس لیے ڈاکٹر لیٹنر نے اس نصابِ تعلیم کی سختی سے مخالفت کی۔ ۱۸۶۶ء میں میجر فلر کی جگہ پر کرنل ہالرائڈ کا تقرر ہوا۔ ۱۸۶۸ء میں اس کالج سے سائیں دتہ بی اے کیا انھیں بعد میں رائے صاحب کا خطاب بھی ملا۔ چونکہ امتحان دینے کے لیے کلکتہ جانا پڑتا تھا جس میں وقت کے ساتھ ساتھ کافی روپیہ بھی خرچ ہوتا تھا اس لیے پنجاب یونیورسٹی کی تحریک شروع کی گئی۔ ۱۸۷۰ء میں پنجاب یونیورسٹی کالج قائم ہوا۔ ۱۸۷۱ء میں اس کالج کو انارکلی کے قریب ایک بلڈنگ میں منتقل کیا گیا۔ اس وقت تک طلبہ کی تعداد ۵۴ ہو چکی تھی۔ تین سال کے بعد مولانا محمد حسین آزاد کا تقرر عمل میں لایا گیا جنھوں نے کالج کے نام کو آسمانِ شہرت پر پہنچا دیا۔ انھوں نے انجمن ہال میں مشاعرے کرائے، تنقیدی جلسے منعقد کرائے اور مغربی خیالات سے اُردو زبان کو مالا مال کر دیا۔ ۱۸۷۶ء میں یہ کالج اپنی موجودہ عمارت میں آ گیا۔ یہ عمارت تقریباً ۴ لاکھ روپے سے بنائی گئی تھی، پرنسپل کی رہائش کے لیے ٹرنٹال پر ایک بنگلہ تھا۔ ۱۸۸۰ء میں خان بہادر شیخ انعام علی مرحوم نے اس کالج میں داخلہ لیا۔ مرحوم وہی شخص ہیں جنھوں نے ۱۸۸۴ء میں انجمن حمایتِ اسلام کی بنیاد رکھی اور مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی طرف راغب کیا۔ ۱۸۸۷ء میں طلبا کے لیے مزنگ میں ایک بورڈنگ ہاؤس کھولا گیا لیکن یہ جگہ کالج سے قدرے دور تھی اس لیے طالب علموں نے اس میں رہنے سے انکار کر دیا۔ ۱۸۹۷ء میں ایک نیا بورڈنگ ہاؤس کالج ہی کے قریب بنایا گیا۔ اسی سال کالج میں ایک ڈرامیٹک کلب قائم کی گئی جس نے شیکسپیئر کے اکثر ڈرامے اسٹیج کیے۔ یہ کلب اب بھی بڑی شان و شوکت سے ڈرامے منعقد کرتی ہے۔ ۱۹۰۲ء میں علامہ اقبال کو صرف ۶ ماہ کے لیے انگریزی کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔ ۱۹۰۵ء میں مرحوم انگلینڈ چلے گئے اور ان کی جگہ پر مسٹر نور الٰہی ایم اے کا تقرر ہوا۔ ۱۸۹۰ء سے قبل کالج میں لائبریری تو تھی مگر لائبریرین نہ تھا اسی سال ایک لائبریرین کا تقرر عمل میں لایا گیا۔ ۱۸۹۹ء میں اس کالج کی سالانہ گرانٹ چار سو روپے تھی۔ ۱۹۰۰ء میں اس کالج کی طرف سے ایک میگزین "راوی" کے نام سے جاری کیا گیا جو اب تک بڑی باقاعدگی سے نکلتا ہے۔ اس میگزین کی اپنی پالیسی کوئی نہیں، بلکہ پرنسپل صاحبان کے نظریے کے مطابق اس کا معیار گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ ۱۹۰۵ء میں اس کالج کی کلب کے لیے لیک روڈ اور ملتان روڈ کے درمیان ایک میدان لیا گیا جو آج یونیورسٹی گراؤنڈ کہلاتا ہے۔ ۱۹۰۷ء میں مسٹر کھوسلا ایم اے کا تقرر ہوا، ۱۹۱۰ء میں لالہ آتما رام ایم اے اس کالج کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۱ء میں ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اس کالج سے استعفیٰ دے دیا۔ ۱۹۱۴ء میں اس کالج کے طلبہ کی تعداد ۹۰۰ کے لگ بھگ تھی اور تین سو طلبا کی درخواستیں نامنظور کی گئیں۔ چونکہ طلباء دور دور سے کھنچ کھنچ کر آ رہے تھے اس لیے ۱۹۲۲ء میں ایک اور بورڈنگ ہاؤس

تعمیر کیا گیا۔ قیام پاکستان سے قبل اس کالج کے پرنسپل سید احمد شاہ بخاری تھے۔ پاکستان بننے کے بعد طلباء کی تعداد گھٹ کر ۱۰۰ رہ گئی اور یہ اندیشہ کیا جانے لگا کہ کہیں کالج ہی نہ ٹوٹ جائے لیکن ۱۹۵۴ء تک یہ تعداد ۱۲۰۰ اور اب ۲۰۰۰ کے قریب پہنچ گئی ہے۔ بخاری مرحوم تھوڑا ہی عرصہ پرنسپل رہے اور بعد میں پاکستان کی طرف سے یو۔این۔او میں مستقل مندوب کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ ۱۹۵۶ء میں حکومت کے ایک آرڈر سے طلباء کا داخلہ میٹرک کے امتحان کے نمبروں کے معیار سے ہونے لگا لیکن اس طریقۂ کار کے نتائج اچھے نہ نکلے کیونکہ اس طرح ہر وہ نقال طالب علم یا رٹو طوطا جو زیادہ نمبر حاصل کر لیتا تھا ذہین سمجھا جاتا تھا اور داخلہ کا مستحق ہو جاتا تھا۔ اگلے سال اس طریقے میں تبدیلی ہوئی یعنی ۷۰ فی صد امتحان کے نمبروں پر اور ۳۰ فی صد کالج کے اساتذہ کی صوابدید پر۔ ۱۹۵۸ء میں اس کالج کا نتیجہ بے حد خراب نکلا اور یہ یقین کر لیا گیا کہ محض نمبروں پر داخلہ فعل عبث ہے۔

عام طور سے اس کالج کو ٹوڈی کالج کہا جاتا ہے صرف اس لیے کہ اس کالج کے بہت سے فارغ التحصیل طلبہ بڑے لوگوں کے بچے ہوتے تھے مگر آج کل اس کالج میں غریب طلبا کی تعداد بہت ہے۔

۱۹۴۷ء میں کالج کے اسٹاف ممبر تقریباً ۴۰ تھے لیکن نئے مضامین کی وجہ سے یہ تعداد بڑھتی گئی اور اب ۱۰۰ کے قریب پہنچ گئی ہے۔ اس تعداد میں سے ۳۳ فی صد ایسے اساتذہ ہیں جن کے پاس فارن ڈگریاں ہیں۔ قیام پاکستان سے قبل کے اساتذہ میں اب صرف ڈاکٹر نذیر ہی رہ گئے ہیں جو پرنسپل ہیں۔

اس کالج میں بہت سی انجمنیں ہیں لیکن سب سے بڑی اور اہم COLLEGE UNION ہے جس کے تمام عہدے دار منتخب ہوتے ہیں۔ الکشن کے موقع پر بڑا ہنگامہ ہوتا ہے، وعدے وعید ہوتے ہیں، ووٹ توڑے جاتے ہیں، رشوتیں دی جاتی ہیں، نئی دوستی کے عہد استوار ہوتے ہیں، پرانی دوستی کے ٹوٹنے کی جھنکاریں آتی ہیں، کبھی کبھی اصول کے نام پر ووٹ مانگے جاتے ہیں اور کبھی برادری کے نام پر۔ لیکن اس تمام ہنگامے میں اساتذہ خاموش رہتے ہیں۔ ان کا مقولہ ہے "WE SEE NOT WE HEAR NOT" اس یونین کے تحت بڑے بڑے مباحثے ہوتے ہیں۔ مغربی پاکستان کی ۳۰ ٹرافیاں اس کالج کے حصے میں آ چکی ہیں۔ کالج میں ایک مجلس اقبال بھی ہے جو ہر جمعرات کو ۳ بجے شام کالج کے ایک مخصوص کمرے میں اپنا اجلاس کرتی ہے۔ اگرچہ اس مجلس کی رونق لاہور کی بڑی بڑی ادبی ہستیاں ہوتی ہیں لیکن طلباء میں یہ مجلس جمعراتی کلب کے نام سے مشہور ہے ——— فائن آرٹ سوسائٹی تصویروں کی نمائش کا انتظام کرتی ہے۔ ڈرامیٹک کلب سال میں دو ڈرامے اسٹیج کرتی ہے اور کبھی کبھی تو ایسے کردار سامنے آتے ہیں جن پر رشک کیا جا سکتا ہے۔ جاگرافیکل سوسائٹی ملک کا سروے کرتی ہے۔ بزم فارسی کے ممبران ایران تک پہنچ گئے۔ ہسٹاریکل سوسائٹی کے طلبہ کاغان، سوات، کشمیر، کراچی کی سیر کرتے پھرتے ہیں۔

کھیل کے میدان میں یہاں کے طلبہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ BOXING کے علاوہ ہر کھیل کھیلا جاتا ہے۔ باکسنگ اس لیے بند کر دیا گیا کہ کچھ عرصہ پہلے اسی سلسلے میں ایک طالب علم کی جان چلی گئی تھی۔ کرکٹ اس کالج کا روایتی کھیل ہے۔ خصوصیت سے گورنمنٹ کالج اور اسلامیہ کالج کا میچ دیکھنے کے لیے یونیورسٹی گراؤنڈ بھری ہوتی ہے۔ میچ کے درمیان آوازے کسے جاتے ہیں، جملہ بازیاں ہوتی ہیں لیکن بعد میں دونوں پارٹیاں ہنسی خوشی چائے پیتی ہیں۔

اس کالج کی اہم پاکستانی شخصیتوں میں بخاری مرحوم کا نام سرفہرست ہے۔ انھیں معلومات کا انسائیکلو پیڈیا کہا جاتا تھا۔ بے تکان

گفتگو کرتے تھے اور مزاح کے شیدائی تھے۔ انشاپردازی ان کا فن تھا۔ یو۔ این او میں انھوں نے اپنی حاضر جوابی سے لوگوں کے دلوں پر اپنی قابلیت کا سکہ بٹھا دیا تھا۔ مسٹر پیر کرامت جو کسی زمانے میں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی تھے اسی کالج میں پروفیسر تھے چونکہ مغرب میں تعلیم پائی تھی مغربیت میں نہا گئے۔ قاضی محمد اسلم متوازن طبیعت کے انسان اور فلسفہ کے ایم۔ اے تھے۔ لوگوں سے تعلقات بڑھانے میں کمال رکھتے تھے۔ پروفیسر سراج صاحب تعمیرات کے بے حد شوقین ہیں ان کے دورِ اقتدار میں روز گارڈن بنا، بارہ دری بنی اور بلڈنگ میں بھی توسیع ہوئی۔ ہر طالب علم سے اس کے مزاج اور مذاق کے مطابق گفتگو کرتے ہیں۔ خواجہ منظور احمد وضع قطع کم سخن فاضل اور اُردو کے بہترین ادیب ہیں کسی زمانے میں گورنمنٹ کالج اور ٹریننگ کالج کے پرنسپل رہ چکے ہیں۔ ڈاکٹر محمد صادق انگریزی کے پروفیسر اور اردو کے نامور ادیب آہنی ڈسپلن کے مالک آج کل دیال سنگھ کالج میں پروفیسر ہیں۔ سید کرامت حسین جعفری فلسفے کے استاد ہیں۔ نفسیات کی ابتدائی کتابیں لکھ کر بڑا نام پیدا کیا۔ ان کتابوں کا ترجمہ ہندی زبان میں بھی ہوا ہے۔ آج کل لائل پور میں پرنسپل ہیں۔ کسی زمانے میں شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر آثر بھی تھے۔ علامہ اقبال پر بے جھجک تنقید کرتے تھے۔ سُنا ہے کہ جب لاہور آتے تھے تو سب سے پہلے مزارِ اقبال کی زیارت کو جاتے تھے۔ پروفیسر سلطان نباتیات کے پروفیسر ہیں اور بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ ڈاکٹر اے حمید تاریخ اور پولیٹیکل سائنس کے استاد ہیں دل میں جذبۂ حریت اور دماغ میں قومی شعور کا احساس رچا بسا ہے تقریباً ڈیڑھ سال تک ملک کے باہر رہے۔ جب تک کسی مسئلے پر عبور نہ ہو اس کے متعلق گفتگو نہیں کرتے۔ خود پرنسپل صاحب حیوانیات کے پروفیسر ہیں۔ سادہ مسکین طبیعت قومی روایات سے گہری وابستگی ہے۔ سائنسی اصطلاحات کو اُردو میں منتقل کرنے کے زبردست حامی۔ اُردو کے انشاپرداز اور مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے حامی۔

اورینٹل کالج لاہور (قیام ۱۸۷۲ء)

اگرچہ لارڈ ولیم بنٹنگ کے زمانے میں اہلِ ہندوپاک کو ایک مخصوص نظامِ تعلیم میں منسلک کرنے کا انتظام کر لیا گیا تھا لیکن اس نظام کو تدریجاً ایک ایک صوبے میں پھیلایا گیا۔ ۱۸۴۹ء میں انگریزوں کے پاؤں سرزمینِ پنجاب میں گڑنے لگے۔ ۱۸۵۴ء میں پنجاب میں ایک تعلیمی محکمہ کھولنے کی سفارش بھی کی گئی اور ۱۸۵۶ء میں یہ محکمہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ کام کرنے لگا۔

ڈاکٹر لیٹنر کی آمد سے پنجاب کے ادبی حلقوں میں ایک جان سی پڑ گئی۔ ڈاکٹر لیٹنر علومِ مشرقیہ کے رسیا تھے۔ ادبی تاریخ کا ذوق ازل سے لے کر آئے تھے۔ پنجاب آکر انھیں یہاں کے عربی اور فارسی دان حضرات سے ملنے کا موقع ملا ان کا یہ خیال تھا کہ اگر مشرقی زبانوں کا پودا اس سرزمین پر لگایا گیا تو چند ہی برسوں میں اس کے پھل پھول لانے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے اسی سلسلے میں ایک مجلس "انجمن پنجاب" کے نام سے تشکیل کی۔ ان کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مشرقی زبانوں کے رس کو انگریزی زبان میں گھول دیا جائے۔ ان کا تیسرا مقصد یہ تھا کہ ہر قوم کو اسی کی قومی زبان میں تعلیم دی جائے فلسفۂ عمرانیات کا ایک زریں اصول ہے۔ ان کے خیال میں انگریزی کی نشوونما مشرقی زبانوں کے ساتھ وابستہ ہے الگ نہیں۔ ۱۸۶۹ء میں پنجاب یونیورسٹی کالج کا اعلان ہوا۔ انجمن پنجاب نے چند اور ادارے بھی اپنی تحویل میں لے رکھے تھے جنھیں بعد میں صرف اس لیے بند کر دینا پڑا کہ جس فنڈ سے یہ ادارے چلائے جا رہے تھے اس کا تعلق یونیورسٹی کالج سے تھا۔ ۱۸۷۰ء میں لوگوں کو علومِ مشرقی سے روشناس کرانے کے لیے اورینٹل کالج کھولا گیا اور ۱۸۸۲ء میں اس کا الحاق پنجاب یونیورسٹی سے کر دیا گیا۔ چونکہ اس کالج کے پاس اپنی کوئی عمارت نہ تھی اس لیے اسے گورنمنٹ کالج لاہور کی عمارت میں کچھ عرصے

کے لیے رہنا پڑا، اس وقت اس کے بنیادی مقاصد مندرجہ ذیل تھے :-

۱۔ مشرقی علوم و فنون کی ترقی
۲۔ دیسی زبانوں کی حوصلہ افزائی
۳۔ اسلامی تہذیب و تمدن کی حفاظت

یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اگر اورینٹل کالج اور مشرقی زبانوں کا بیچ میں واسطہ نہ ہوتا تو یونیورسٹی کو وہ امداد جو پنجاب کے ہر چھوٹے بڑے نے دی نہ مل سکتی۔ کچھ عرصے تک اس کالج میں طب یونانی اور آریہ ویدک کی جماعتیں بھی ہوتی رہیں لیکن یہ پروگرام کچھ مدت کے بعد بند کر دیا گیا ۱۹۱۹ء کے بعد عربی، سنسکرت اور فارسی کی ایم۔ اے جماعتیں بھی اسی کالج سے متعلق کر دی گئیں۔ ۱۹۲۸ء میں اُردو، ہندی اور پنجابی کے لیے لکچرار مقرر کیے گئے۔ پاکستان کے قیام سے پہلے یہ ادارہ اپنے تحقیقی عمل، تنقیدی کام اور تدریسی مشاغل کی وجہ سے شمالی ہندوستان کا سب سے بہتر ادارہ متصور ہوتا تھا لیکن قیامِ پاکستان کے بعد اس کی بساط الٹ گئی ہندی، سنسکرت اور پنجابی کے اکثر پروفیسر ہندوستان چلے گئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ملک کی زبان اُردو قرار پائی اس لیے ۱۹۴۸ء میں اُردو ایم۔ اے، ادیب عالم اور ادیب فاضل کی کلاسیں کھولی گئیں۔ کچھ عرصہ کے بعد ہسپانوی، رومی، فرنچ اور جرمنی زبانوں کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ خیال ہے کہ آئندہ ترکی، پشتو اور پنجابی کی بھی باقاعدہ تدریس شروع کر دی جائے گی۔

اپنے زمانہ قیام سے آج تک اس کالج نے قوم سے جو وعدے کیے تھے انھیں پورا کیا۔ آج بھی کلاسیکی ادب پر ضخیم ضخیم کتابیں اسی ادارے سے شائع ہو رہی ہیں۔ کسی زمانے میں اس کالج کے طلباء سے کوئی فیس وصول نہیں کی جاتی تھی جس کا بہت بڑا فائدہ یہ تھا کہ لوگ اپنے علمی ورثے کو بخوشی حاصل کرتے تھے۔ چونکہ علم کی پیاس میں شدّت تھی، خلوص بھی تھا اس لیے بہتر سے بہتر ماہرینِ فن اس ادارے سے منسلک رہے اور اعلیٰ سے اعلیٰ کتابیں اور جریدے یہاں سے نکلتے رہے جن میں سے چند کا ذکر یہاں کرنا ضروری ہے۔

۱۔ ڈاکٹر لائٹنر کی کتاب سنینِ اسلام جدید اسلامی رنگ کی پہلی کتاب ہے۔
۲۔ سر ارل سٹائن آثارِ قدیمہ کے ماہر تھے اور اس فن پر کافی مواد جمع کر گئے ہیں۔
۳۔ ڈاکٹر وولنر نے پراکرتوں پر محققانہ کام کیا ہے۔
۴۔ مولوی فیض الحسن کی شرح معلقات دنیائے ادب میں ایک اعلیٰ مقام رکھتی ہے۔
۵۔ مولانا عبدالعزیز میمن کی ابوالعلاء المعرّی کے متعلق تصنیف مصر و عرب کے علماء سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے۔
۶۔ پروفیسر شیرانی کی کتاب 'پنجاب میں اُردو' ہمارے ادبی ذخیرے کا ایک گراں بہا حصّہ ہے۔
۷۔ ڈاکٹر محمد شفیع نے لاہور کی تاریخ پر اتنا مواد جمع کر دیا اور فنِ خطاطی پر اتنے مقالے تحریر کیے ہیں کہ طلباء ان سے بے انتہا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔
۸۔ پروفیسر اقبال کی آئینہ دانش اور مولوی انعام علی کی "مخزن الحکمت" نایاب کتابیں ہیں ——— اس کے علاوہ موجودہ اساتذہ نے بھی کئی کام کی کتابیں لکھی ہیں۔

۱۹۲۶ء میں ڈاکٹر شفیع کی کوششوں سے ایک ریسرچ جرنل بھی جاری ہوا تھا جو تا دمِ تحریر نکل رہا ہے۔ اس کالج سے ایک

سہ ماہی رسالہ "یونیورسٹی کالج میگزین" بھی نکلتا ہے جو پاکستان و ہندوستان میں تحقیقی اور تنقیدی مضامین کی لاج رکھے ہوئے ہے۔
پاکستان بننے کے بعد ڈاکٹر برکت علی قریشی اس کالج کے پرنسپل ہوئے۔ ۱۹۵۴ء میں ڈاکٹر عبداللہ نے اس کالج کی ذمہ داری سنبھالی اور آج تک اسی آن بان سے اپنے فرض منصبی کو سرانجام دے رہے ہیں۔
موجودہ اسٹاف نہایت قابل اور بڑی علم پروفیسروں پر مشتمل ہے اور تعلیم کے ہر میدان میں نمایاں مقام حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ سہل انگاری کے مقابلے میں دشوار پسندی کے قائل ہیں۔ ان کی طبیعت میں تحقیق اور تنقید کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے لیکن زمانے کی موجودہ روش اور خصوصیت سے پاکستان کا ادبی ماحول ہر فن مولائیت کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے یہی سبب ہے کہ پنجاب یونیورسٹی میں بعض حضرات ڈاکٹر صاحب کی اس "دشوار سلیقہ پسندی" کے قائل نہیں۔
اس کالج میں طلبا کی تنقیدی مجالس ہوتی رہتی ہیں جن کا معیار بہت پست ہے، غالباً سبب یہ ہے کہ اساتذہ کے مشاغل اتنے زیادہ ہیں کہ وہ طلبا ء کے ان مسائل پر غور و فکر کرنے کی مہلت ہی نہیں پاتے۔ گاہے ماہے اس کالج میں عظیم اجلاس بھی ہوتے رہتے ہیں جن میں اکثر کا مقصد قومی زبان کی نشو و نما اور مشرقی علوم کا ارتقاء ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو اردو زبان کو اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ اس میں علمی اور سائنسی تعلیم دی جا سکے ان کا صحیح اور معقول جواب اس کالج نے سائنسی علوم پر اردو میں تقریریں کرا کے مہیا کر دیا ہے، اور درس و تدریس کے سلسلے میں دسمبر ۱۹۶۱ء کے آخر میں ایک سہ روزہ کانفرنس بلائی گئی جس میں اس بات کا فیصلہ کیا گیا کہ اردو کا صحیح مقام کیا ہے اور تدریس اردو کے ذرائع اور طریقے کیا ہونے چاہئیں۔

سنٹرل ٹریننگ کالج

قیام : ۱۸۸۰ء
تعداد طلبہ : ۳۸۰

اگرچہ انگریزی زبان کی درس و تدریس ۱۸۵۷ء سے قبل شروع ہو چکی تھی لیکن پنجاب میں ۱۸۶۰ء سے پہلے اس اسکیم پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔ گورنمنٹ کالج کے قیام کے بعد اچھے استادوں کا مسئلہ حکومت کے زیر غور رہا کیونکہ اچھے طالب علم کے لیے اچھا اور تربیت یافتہ استاد بھی ضروری ہے۔ پرائمری جماعتوں کے لیے ایک نارمل اسکول کھل چکا تھا لیکن انگریزی طرز کا کوئی کالج نہ تھا جس میں باقاعدہ تعلیم و تعلم کے مسائل حل کیے جائیں۔
ایک ٹریننگ کالج کے قیام کی وجہ طلبا کی روز افزوں تعداد بھی تھی۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ تعلم کا فن ابھی ابتدائی مراحل میں تھا کہ ۱۸۸۰ء میں سنٹرل ٹریننگ کالج کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور پروفیسر ڈوک کو جو گورنمنٹ کالج میں انگریزی کے پروفیسر تھے، پرنسپل کے عہدے پر مامور کیا گیا۔
اس کالج کی اپنی کوئی عمارت نہ تھی اس لیے شروع شروع میں حضوری باغ کے ایک حصے میں رہا، بعد میں گورنمنٹ کالج کی عمارت میں منتقل ہو گیا۔ چونکہ ابتدائی دور کے طلبا کو گورنمنٹ کالج میں بھی وظیفہ ملتا تھا اور اس کالج میں بھی اس لیے اکثر ایسا ہوتا کہ ایک ہی طالب علم ہر دو مقام پر وظیفے لے لیتا تھا۔ اس دو عملی کو بند اور ٹریننگ کالج کی اپنی فضا پیدا کرنے کے لیے ۱۸۸۸ء میں یہ کالج اپنی موجودہ عمارت میں منتقل ہوا۔ ابھی تک اس کالج میں بی۔ ٹی کی کلاسیں نہ تھیں بلکہ نارمل اسکول کی تعلیم کا معیار پیش نظر تھا۔ پروفیسر ڈوک کے بعد ہیڈن کوپ اس کالج کے پرنسپل ہوئے اور ۵ سال تک اس عہدے پر رہے۔ انھوں نے کالج کی عمارت میں توسیع کی اور اپنا زیادہ کام اپنے جانشین ایچ۔ ٹی نائٹ کے سپرد کر دیا۔ پروفیسر نائٹ وہ فاضل اور قابل ایڈمنسٹریٹر ہیں جنھوں نے کالج کو کالج بنا دیا اور آج جو سرگرمیاں ہمیں اس کالج میں نظر آتی ہیں وہ انھی کے ذوق عمل کی رہین منت ہیں۔ ۱۸۹۲ء میں وہ اس عہدے پر آئے اور ۱۹۱۹ء تک اسی کالج میں بطور پرنسپل کام کرتے رہے گویا اپنی ساری عمر اسی کالج پر قربان کر دی۔ انھوں نے اس کالج کو ماڈرن لائنز پر چلانے کا تہیہ کیا اور جدید نفسیات سے کام لیتے ہوئے پہلی بار تعلیمی نفسیات کا ایک مضمون اور نصاب بنایا گیا

یہ خیال تھا کہ اگر استاد تعلیمی نفسیات کا ماہر نہیں تو کلاس روم میں اپنے طلبہ سے کام نہیں لے سکتا۔ استاد کا فرض ہے کہ وہ محض سلیبس کی کتابوں کا مطالعہ نہ کرے بلکہ بچوں کو اپنے تجربے، اپنے علم اور اپنے مشاہدے سے ایسی ایسی متعلقہ باتیں بتادے جو سلیبس کی کتابوں میں عام طور پر نہیں ہوتیں اور یہ کام اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک استاد کا اپنا مطالعہ وسیع اور اپنی نظر کشادہ نہ ہو۔ اساتذہ میں کشادگی نظر پیدا کرنے کے لیے انھوں نے کالج کے انتظامی ڈھانچے کو از سر نو ترتیب دیا اور ایک قاعدہ کی رو سے طلبہ کو یہ حکم دیا کہ وہ کلاس میں جانے سے پہلے اسباق کی تیاری کر لیں۔ الفاظ و محاورات کے مقاصد سمجھ لیں اور ذہنی طور پر تیاری کرنے کے بعد اسے صفحۂ قرطاس پر بھی آجانا چاہیے، گویا LESSON NOTES کا موجودہ قاعدہ سٹرٹن کے دماغ کی اختراع ہے۔ وہ عمل کے رسیا اور حرکت کے پجاری تھے محض نظریاتی تعلیم کو وہ افلاطونی تعلیم سمجھتے تھے اس لیے عملی تعلیم پر بہت زور دیتے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں انھوں نے بی۔ ٹی کی پہلی کلاس جاری کی۔ ان کے زمانے میں بی۔ ٹی، ایس، اے وی، جے اے وی، کلریکل کمرشل سرٹیفکیٹ کلاس سینئر ورناکیولر کلاس اور ڈرائنگ ماسٹرز کلاسیں تھیں۔ زیر تربیت اساتذہ کے لیے ایک ماڈل اسکول ضروری تھا اس لیے انہی کے دور میں ایک سنٹرل ماڈل اسکول اس کالج سے منسلک کر دیا گیا۔ تیاری کے لیے زیر تربیت اساتذہ کو ایک کتاب دے دی جاتی تھی۔ وہ دو ایک دن پہلے اس کتاب کے جملہ محاسن کو دیکھ بھال لیتا تھا اور جب اسے کلاس روم میں بھیجا جاتا تھا تو دیگر اساتذہ کو اس پر تنقید کرنے کے لیے روانہ کر دیا جاتا تھا۔ دوسرے اساتذہ چار گروہوں میں تقسیم ہو جاتے تھے ایک گروہ موادِ سبق کی جانچ کرتا تھا، دوسرا تلفظ زبان کی، تیسرا ادائے مطالب یا طریقۂ بیان کی، چوتھا تنقیدی معیار پیش نظر رکھتا تھا۔ یہ چاروں گروہ تمام محاسن و معائب اپنی اپنی کاپیوں پر لکھتے جاتے تھے تاکہ اس زیر تربیت استاد کی اصلاح ہو جائے۔ اس سے ایک طرف تو اصلاح حال ہوتی تھی تو دوسری طرف مقابلے اور "COMPETION" کا شوق ابھرتا جاتا تھا۔ یہ طریقۂ تعلیم اگرچہ آج بھی رائج ہے لیکن ترمیم کے ساتھ بلیک بورڈ کا سب سے پہلے استعمال انہی کے دور میں ہوا تاکہ بچے اندرونِ نظر کے علاوہ ظاہری نظروں سے بھی کام لیں اور اسباق کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ اس کالج کا پنجاب یونیورسٹی سے باقاعدہ الحاق ۱۹۰۴ء میں ہوا اور ۱۹۰۶ء میں پہلا بی۔ ٹی کا امتحان ہوا۔ اس سے پہلے ایس اے وی اس کالج کی اعلیٰ جماعت تھی۔ انہی کے زمانے میں کالج کی بعض سرگرمیوں میں اضافہ ہوا۔ کالج میگزین اسی وقت سے نکلنا شروع ہوا۔ کالج میں شیکسپیئر سوسائٹی قائم ہوئی۔ ہسٹاریکل اور جیاگرافیکل سوسائٹیز بنائی گئیں۔ کالج میں ڈسپلن کا خاص خیال رکھا جانے لگا۔ ٹائم ٹیبل از سر نو مرتب ہوا۔ نصاب میں وسعت دی گئی اور پڑھائی کے ساتھ ساتھ ان زیر تربیت اساتذہ کے کھیل کا بھی بندوبست کیا گیا۔ کالج سے متصل ایک کرکٹ گراؤنڈ بنائی گئی اور ہفتہ میں دو بار کھیل ضروری کر دیا گیا تاکہ جسمانی ورزش ہوتی رہے۔ شروع شروع میں بی ٹی کا دو سالہ کورس تھا لیکن بعد میں ایک سال کر دیا گیا۔ یہاں کے پاس شدہ S.A.VS مڈل اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر ہو سکتے تھے۔ J.A.VS پرائمری اسکولز میں ہیڈ ماسٹر بن سکتے تھے۔ ایس۔ وی صرف ورناکیولر اسکولوں میں کام کر سکتے تھے۔ ۱۸۹۶ء میں ڈرائنگ کی تعلیم ضروری ہو گئی تھی اس دور میں ٹیکنیکل تعلیم کا زور ہوا۔ سخت ڈسپلن اور فوجی پریڈ کی سختی کی وجہ سے چونکہ طلبا اسے سنٹرل جیل کہتے تھے اس لیے طلبا کی تعداد میں اضافہ نہ ہو سکا۔ ۱۹۰۶ء میں یہ وظیفہ اور بڑھا دیا گیا۔ طریقۂ تعلیم میں یوں تو تبدیلیاں ہوتی رہتی تھیں لیکن اسی زمانے سے ڈائرکٹ میتھڈ شروع کیا گیا۔ ایس وی کے لیے شام کی کلاسیں بھی جاری کر دی گئیں اور MANUAL WORK ضروری قرار دیا گیا۔ ۱۹۱۲ء میں مقابلہ سخت ہو گیا۔ اب ایم اے بھی آنے لگے اور "UNTRAINED" اساتذہ بھی کثرت سے داخلہ لینے لگے۔ ۱۹۱۹ء میں مسٹر وائٹ پرنسپل بنے۔ ۱۹۲۱ء میں WOOD WORK بھی شروع کر دیا گیا۔ ۱۹۲۱ء میں اس کالج میں صرف بی۔ ٹی، ایس۔ اے۔ وی اور

کے نام سے اردو میں ایک کتاب شائع کی۔ فضل محمد نے "ثانوی مدارس کا نظم و نسق" کے نام سے ایک کتاب تحریر کی۔ ۱۹۵۰ء میں عملی اردو کو ضروری قرار دیا گیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد بی۔ ٹی کے طلبہ کو ۵۰ روپے اور سی۔ ٹی کے طلبا کو ۲۰ روپے وظائف ملنے لگے۔ سی۔ ٹی کلاسیں ۱۹۴۹ء میں کھلی تھیں اور ۱۹۶۰ء میں بند کر دی گئیں۔ ۱۹۵۵ء میں مخدومی صاحب پرنسپل بنے۔ آپ دینیات کمیٹی کے سیکرٹری بھی تھے۔ آپ کے عہد میں امریکہ یونیورسٹی سے ڈاکٹر شیورنگ نصابِ تعلیم کا درس دینے کے لیے تشریف لاتے۔ آپ ہی کے دور میں کالج کا ایک نیا ہوسٹل بنا اور طلبا کی تعداد ۱۵۰ سے تجاوز کر گئی۔ ۱۹۵۹ء میں نامدار خاں صاحب پرنسپل بنے۔ ان کے عہد میں نصابِ تعلیم پھر بدلا۔ ہر شعبہ جات میں تصورِ پاکستان کی جھلکیاں نظر آنے لگیں۔ اختیاری مضامین میں اضافہ ہو گیا۔ ایک جنرل سائنس کا پرچہ مزید بڑھا دیا گیا۔ یوں تو سمعی بصری امداد ہر دور میں ضروری سمجھی گئی لیکن اس زمانے میں اس بات پر بڑی توجہ دی گئی۔ ۱۹۶۰ء میں نامدار صاحب ڈائرکٹر آف ایجوکیشن حیدر آباد بنا دیے گئے اور ان کی جگہ پر اسی کالج کے دیرینہ طالب علم پروفیسر خواجہ عبدالحمید پرنسپل بن کر آئے۔ آپ کے آنے سے شاہی رعب و دبدبہ کی فضا کا خاتمہ ہوا اور عوام دوستی کا دور دورہ شروع ہوا۔ آپ کی کوشش ہے کہ اس کالج کو ایک مثالی کالج بنا دیا جائے۔ چونکہ موجودہ اسٹاف اسکولوں کے پرانے اساتذہ پر مشتمل ہے اور باہر کی دنیا کا کوئی شخص یہاں نہیں آسکتا اس لیے معیارِ تعلیم میں روز بروز انحطاط آتا جا رہا ہے۔ ضرورت تھی کہ اچھے آدمی جہاں سے ملتے اس کالج کی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دینے کے لیے یہاں ملازم رکھ لیے جاتے اور پھر اندازہ ہوتا کہ صحیح اور موزوں ترین اساتذہ اس کالج کو کہاں سے مل سکتے ہیں۔ اس کالج میں تعلیمی کانفرنسیں اور سیمینار ہوتے رہتے ہیں۔ ایک ادبی مجلس بھی ہے لیکن بے عمل۔ طلبہ تفریح کے لیے دوسرے صوبوں میں جاتے رہتے ہیں اور اس مد پر کثیر رقم خرچ کی جاتی ہے۔ موجودہ پرنسپل صاحب جو پرنسپل کم ہیں اور طالب علم زیادہ، چاہتے ہیں کہ اس کالج کو یونیورسٹی کا ہم پلہ بنا دیا جائے اور یہاں تحقیقی اور تنقیدی کام ہوتا کہ دوسرے ممالک میں پاکستان کی کوئی اہمیت ہو۔ اساتذہ کی بڑی تعداد فارن ڈگریوں کی مالک ہے۔ اس وقت تعداد طلبا ۸۰۰ ہے لیکن جگہ کی قلت ہے۔ سنا گیا ہے کہ یہ کالج وحدت کالونی کے قریب اپنی نئی بلڈنگ میں منتقل ہو رہا ہے اور گورنمنٹ کالج کی ایف۔ اے کلاس یہاں آ رہی ہے۔

فورمن کرسچین کالج (ایف سی کالج)

قیام: ۱۸۸۶ء
تعداد طلبہ: ۱۰۰۰

حکومت برطانیہ کی ہمیشہ سے یہ پالیسی رہی ہے کہ کسی کے مذہب میں ڈائرکٹ کوئی دخل نہ دیا جائے۔ انگلینڈ ہو یا ہندوستان و پاکستان انگریزوں نے کبھی کھل کر کسی مذہب پر چوٹ نہیں کی۔ ہندوستان میں لارڈ ولیم بینٹنگ کے زمانے میں فارسی اور عربی زبانوں کے بجائے انگریزی زبان پر زور دیا جانے لگا۔ اس زبان کی کماحقہٗ ترویج کے لیے انگریز مشنریوں کی ضرورت تھی یہی سبب ہے کہ جن جن علاقوں میں ان مشنریوں کو بھیجا گیا انھوں نے انگریزی تعلیم و تعلم میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے کچھ دنوں کے لیے مشنریوں کی تبلیغ کی کمر توڑ دی لیکن چند ہی سالوں میں مشنریوں کا ایک قافلہ پھر اس غرض سے ہندوستان روانہ کیا گیا کہ وہ آہستہ آہستہ تبلیغ مذہب و زبان کریں۔ پنجاب میں جو تین پادری اس اہم مقصد کے لیے آئے تھے ان میں چارلس ڈبلو فورمین کا نام نامی سرِ فہرست ہے۔ یہی وہ ہستی ہے جس کے نام پر آج بھی ایف سی کالج فخر کرتا ہے۔

اس کالج کا درحقیقت نام مشن کالج تھا جو آج بھی مشن اسکول کے نام سے رنگ محل میں موجود ہے۔ اس کالج کو ۱۸۶۴ء میں کھولا گیا تھا لیکن تین سال کے بعد اسے بند کر دیا گیا اور پھر ۱۸۸۶ء میں فورمین کرسچین کالج کے نام سے جاری کیا گیا۔

ڈاکٹر فورمین حقیقت میں ایک ولی تھے۔ ان کا دل ریا سے پاک اور دردِ انسانیت سے لبریز تھا۔ خلقِ خدا کی خدمت ان کا نصب العین، غرض ان کا مرنا جینا خود ان کے لیے نہیں بلکہ لاہوریوں کے لیے تھا۔ وہ خود کہتے تھے کہ "میرے لیے خاکِ لاہور کا ہر ذرہ دیوتا ہے۔" انھوں نے ایف سی کالج بنا کر قوم کی وہ خدمت کی ہے کہ آج بھی ہندوستان و پاکستان کے لوگ ان پر فخر کرتے ہیں اور یہاں کے طلباء اپنے کو فارمن ائٹ کہلاتے ہوئے جھجکتے نہیں فخر محسوس کرتے ہیں۔

انیسویں صدی کے آخر تک اس کالج میں طلبہ کی تعداد ۱۰۰ سے زائد نہ ہو سکی۔ مسلمانوں نے اس کالج کے خلاف فتوے دیے اور اس کی ٹکر میں اسلامیہ اسکول اور اسلامیہ کالج کھولنے کی فکر میں مشغول ہو گئے۔ ہندوؤں اور سکھوں نے اس اندازِ فکر سے فائدہ اٹھایا اور دھڑا دھڑ انگریزی سیکھنے کے لیے اس کالج میں داخل ہو گئے۔ مسلمانوں کو ہوش آیا لیکن بعد میں۔ ہندوؤں میں سوامی رام تیرتھ جنھیں راوی کی موجیں بہا لے گئیں بڑی عزت و احترام کے مالک تھے اور مسلمانوں میں پروفیسر سراج الدین بڑی روحانیت کے حامل تھے لیکن تبدیلیٔ مذہب نے ان کے وقار پر ٹھیس لگائی۔

ڈاکٹر فورمین کے بعد اس کالج کے سب سے بڑے شہسوار ڈاکٹر جیمس ایونگ ہیں۔ انھوں نے اس کالج کو زمین سے اٹھا کر آسمانِ شہرت پر پہنچا دیا۔ خود سات سال تک پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے اور عرصہ دراز تک امریکہ میں بورڈ آف فارن مشن کے صدر بھی رہے۔ ان کے بارے میں یہ بجا طور پر کہا جاتا ہے کہ اگر امریکہ میں ہوتے تو امریکی سینیٹ کے صدر بنتے۔ انہی کی یاد میں نیلے گنبد کے قریب ایک ایونگ ہال تعمیر کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر ایونگ کے بعد ڈاکٹر لوکاز (LOCAS) آئے اور ۱۹۴۶ء تک اس کالج سے وابستہ رہے۔ وہ رسوم و قیود کے خلاف اور اپنی دھن کے پکے انسان تھے یہ انہی کی ذات تھی کہ موجودہ عمارت میں کالج دکھائی دے رہا ہے۔ خوشنما باغات، دلفریب روشیں اور شاندار ہوسٹل ڈاکٹر لوکاز کے ادنیٰ کارنامے ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد اس کالج کے موجودہ پرنسپل ڈاکٹر آر ایم ایونگ ہیں انھوں نے کالج کا وقار بلند کیا۔ پاکستان بننے سے قبل اس کالج میں ۸۰۰ ہندو، ۳۰۰ سکھ اور ۲۰۰ مسلمان تھے۔ تقسیم کے بعد اس کالج کے طلباء کی تعداد ۲۵۰ رہ گئی مگر موجودہ تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ ہو گئی ہے۔ یہ موجودہ پرنسپل کی دور اندیشی اور لیاقت ہے کہ یہ کالج اب پورے ایشیا کا سب سے بہتر کالج ہے۔ پاکستان بننے کے بعد یہ تجویز تھی کہ اس کالج کو بیروت کی طرز پر امریکن یونیورسٹی میں تبدیل کر دیا جائے لیکن یہ تجویز نامکمل رہی اور اب کالج اسی آن بان سے پاکستانی طلباء کی ضرورتوں کو پورا کر رہا ہے۔ سردست کالج کا اسٹاف ۷۰ اساتذہ پر مشتمل ہے۔ کالج کی گراؤنڈ سے متصل ایک یونائیٹڈ کرسچین ہسپتال بھی ہے جسے قیامِ پاکستان کے موقع پر مہاجرین کے لیے وقف کر دیا گیا تھا جہاں رات دن کی سروس ہوتی تھی تاکہ مجروحین اور دیگر مریضوں کو علاج سے محروم نہ ہونا پڑے۔ یہ اسپتال ڈاکٹر بیٹس نے جاری کیا تھا۔

کالج کے وسیع باغ میں ایک مسجد رضوان ہے جسے صدر شعبۂ تاریخ پروفیسر بھٹی نے تعمیر کرایا۔ اس مسجد کو امریکہ کی زیر مسجد بھی کہتے ہیں۔ یہ اپنی خوبصورتی اور بچپن کی بنا پر تاریخی اہمیت رکھتی ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس مسجد کی تعمیر میں کالج کے کارکنوں نے بھی دل کھول کر حصہ لیا۔

اس کالج کے طلباء زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں حصہ لیتے رہے اور اب بھی کوئی محکمہ ایسا نہیں جہاں اعلیٰ عہدے پر کوئی نہ کوئی

فارمنائٹ نہ ہو اس لیے پرنسپل صاحب کا یہ کہنا کہ اس وقت ہندوستان اور پاکستان کی حکومتیں فارمنائٹ چلا رہے ہیں، مبالغہ نہیں کیونکہ دونوں طرف اعلیٰ عہدوں پر اسی کالج کے قدیم طلبا فائز ہیں۔

پروفیسر بھٹی نے جو اسی کالج کے قدیم طالب علم اور قدیم استاد ہیں بتایا کہ کسی ضلع میں ایک مقدمہ ایسا پیش ہوا جس میں جج، وکیل، مدعی، مدعا علیہ اور گواہ سب کے سب فارمنائٹ تھے۔ جب جج کو اس صورت حال کا علم ہوا تو اس نے کہا کہ یہ ہمارے گھر کا معاملہ ہے اسے گھر ہی میں طے ہو جانا چاہیے اور یہ مقدمہ عدالت کے باہر باحسن وخوبی طے پا گیا۔

پاکستان ایجوکیشن کمیشن کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر موصوف نے کہا کہ یہ دراصل ایچی سن کالج سب کمیٹی کی رپورٹ ہے کیونکہ اس کمیشن کے ۱۱ ممبروں میں سے ۷ فارمنائٹ ہیں۔

اہمیت:۔ کالج کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر موصوف نے کہا کہ اس کالج میں

۱۔ ڈسپلن لاہور کے تمام کالجوں سے بہتر ہے۔

۲۔ سب سے پہلے کو ایجوکیشن یہاں شروع ہوئی۔

۳۔ سب سے پہلے یونین کا تصور پیش کیا گیا۔

۴۔ سب سے پہلے ٹیکنیکل ٹریننگ کی طرف توجہ دی گئی۔

۵۔ سب سے پہلے سوشیالوجی کی کلاسیں جاری ہوئیں۔

۶۔ سب سے پہلے تعلیم کے ساتھ ساتھ جسمانی تربیت کا خیال پیدا ہوا۔

۷۔ سب سے پہلے پریکٹیکل کی تعلیم شروع ہوئی۔

۸۔ اور جس طرح سکندر نے کہا تھا کہ روئے زمین پر اب کوئی علاقہ ایسا نہیں جس پر ہمارا قبضہ نہ ہوا اسی طرح کرکٹ کے میدان میں کوئی ٹیم ایسی نہیں جو ایچی سن کالج ٹیم سے ہار نہ چکی ہو۔

ایچی سن کالج قیام: ۱۸۸۶ء تعداد طلباء: ۶۰۰

انیسویں صدی کے آخری ربع میں برطانوی ہند نے میدانِ تعلیم میں سرعت سے ترقی کرنا شروع کی۔ حالات میں ایک نمایاں تبدیلی رونما ہوئی۔ تعلیمی رجحانات بدل گئے اور پرانی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید تعلیم کا آغاز ہوا۔ مغربی علوم نے اثر و رسوخ بڑھایا اور عوام کے لیے اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں قائم ہو گئیں لیکن نوابوں اور راجاؤں کے بیٹوں کی تعلیم کا ابھی کوئی خاص انتظام نہ ہو سکا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت کے ماحول کے مطابق شاہزادوں کا عام مدارس میں تعلیم پانا ممکن نہ تھا اس لیے یہ فکر لاحق ہوئی کہ قوم اور ملک کے ان سربراہوں اور امراء و رؤساء کے ان صاحبزادوں کو بھی پرانے طریقہ تعلیم سے ہٹا کر اور گھریلو اتالیقوں کی تعلیم سے نکال کر اسکولوں میں بھیجا جاتے جہاں یہ اپنے ہم مرتبہ شاہزادوں کے ساتھ مل کر تعلیم حاصل کریں اور راجدھانی زندگی کے وہ طور طریقے سیکھیں جو صرف اتالیقوں کی تعلیم سے حاصل ہونا ممکن نہ تھے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر اس برصغیر میں اجمیر، لاہور، راج کوٹ، اندور اور راجپوتانہ کے مقامات پر پانچ چیفس کالج قائم کیے گئے۔ اس سلسلے میں اس وقت کے پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر "سر چارلس ایچی سن" نے شمالی ہند کے شاہزادوں اور یہاں کے حکمرانوں کی اولاد کے لیے لاہور میں ایک کالج قائم کیا اور اس کالج کے لیے انگلستان کا ایٹن کالج بطور نمونہ سامنے رکھا گیا لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ یہاں کا ماحول اس طرح کا بنایا جائے کہ باوجود مغربی تعلیم حاصل کرنے کے

شہزادے مغرب زدہ نہ ہو جائیں اور یہ کہ یہاں پر ایچی سن کالج کی صرف انہی باتوں پر عمل کیا جائے جو ہمارے ماحول کے لیے مناسب اور منفعت بخش ہوں اور اس نظریہ کے تحت اردو، فارسی اور دینیات کی تعلیم کا خاص خیال رکھا گیا اور آخر ۱۸۸۶ء میں یہ کالج تعمیر ہو گیا۔

شروع شروع میں کاہل انگاری کے عادی شہزادے اور آرام پسند رئیس زادے کالج کی سپاہیانہ زندگی کے لیے تیار نہ ہوئے مگر کب تک؟ آخر اس کالج کی افادیت کو محسوس کیا گیا اور نوابوں اور راجاؤں اور رؤسا نے اپنے بچے یہاں بھیجنا شروع کر دیے۔ "مسٹر ریا بلسن" پہلے پرنسپل مقرر ہوئے اور ان کے بعد مسٹر گاڈلے کالج کے انتظامی امور کے لیے جنرل ملیکب کو منتخب کیا گیا۔

جوں جوں زمانہ بدلتا گیا اس کالج نے بھی زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو تبدیل کر دیا اور اس کے دروازے عوام کے لیے کھلتے گئے حصولِ آزادی کے بعد ہندو اور سکھ اس کالج سے رخصت ہو گئے اور کالج نے ایک اور کروٹ لی اور یہ ایک قومی ادارہ بن گیا۔ آج اس کے دروازے ہر ایک بچے کے لیے کھلے ہوئے ہیں جو تعلیم کی اہلیت رکھتا ہو، جس کے والدین اخراجات کے کفیل ہو سکتے ہوں اور جن کو وظیفے تو پہلے بھی ملتے تھے اور موجودہ حکومت نے بھی سات وظیفے سالانہ مقرر کیے ہیں جن کی وجہ سے درمیانہ طبقہ کے مستحق طلبہ کے لیے بھی آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں۔

اس کالج کی سالانہ فیس اقامت گاہ میں رہنے والے طلباء (BOARDERS) کے لیے گیارہ سو روپے سے لے کر دو ہزار دو سو پچاس تک اور باہر سے آنے والوں کے لیے نو سو روپے سے لے کر ایک ہزار تین سو بیس تک ہے۔ حال ہی میں اس کالج کی ایک نئی مجلس انتظامیہ تشکیل دی گئی ہے جس کے صدر مغربی پاکستان کے گورنر ہیں۔

اس وقت تقریباً چھ سو طلباء زیرِ تعلیم ہیں جن کی عمر تقریباً پانچ سال سے لے کر اٹھارہ سال تک ہے۔ تعلیم کے علاوہ تمام کھیلوں کا بہت عمدہ اور مستقل انتظام ہے کھیلوں کے لیے بڑے بڑے عمدہ میدان ہیں۔ دینیات کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام ہے۔ مغرب کی نماز کالج میں مقیم تمام طلباء کے لیے مسجد میں باجماعت ادا کرنا ضروری ہے۔ مشرقی زبانوں، خاص طور پر قومی زبان اردو کی تعلیم پر خاص توجہ دی جاتی ہے بچوں میں ادبی شوق پیدا کرنے کے لیے مجلس اقبالیات اور بزمِ ادب کی انجمن قائم ہیں جن کے باقاعدہ اجلاس منعقد کیے جاتے ہیں کالج میں ایک نمایاں مقام پر ایک تختہ سیاہ آویزاں ہے جس پر اقبال کے شعر اور ان کی آسان تشریح لکھی جاتی ہے اور اس طرح انہیں قومی روح سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ جمعہ وار تقریری مقابلے اور مباحثے منعقد ہوتے ہیں۔ طلبہ باہر کے بین الجامعی مباحثوں اور مذاکروں میں بڑی کامیابی سے حصہ لیتے ہیں۔ ان باتوں کے علاوہ اور بھی مشاغل یہاں کے طلباء کے لیے رکھے ہیں جو خاص طور پر اساتذہ کی نگرانی میں انہیں تعلیم کیے جاتے ہیں۔

کالج کے اساتذہ شب و روز اپنی طاقت اور وقت کا تمام تر حصہ طلبہ کی تعلیم و تربیت میں صرف کرتے ہیں۔ کالج کا مقصد تعمیرِ ملک کے لیے مسالہ فراہم کرنا ہے اور اس کا منشا قوم کی خدمت ہے۔ کالج ایک عرصہ سے اس کوشش میں ہے اور میرے خیال میں تعمیرِ قوم میں منہمک ہے۔ اس کا مقصد ایسے نوجوانوں کو پیدا کرنا ہے جو نہ صرف تعلیم حاصل کریں بلکہ ایسے احساسات لے کر جائیں جو انہیں نیک نیتی اور پاک دلی سے اپنے ملک اور قوم کی خدمت کرنے پر مجبور کریں۔ کالج کا مقصد اپنے طلباء کو ایسی تعلیم دینا ہے اور وہ تربیت مہیا کرنا ہے جو ہر وقت ان کے پاس رہے اور ان کے کام آئے جب وہ اسکول اور کالج کے نصاب کی پڑھی ہوئی کتابوں کے سبق بھول جائیں۔ اور یہ مقصد انہیں بلند آہنگی اور استقلال کی تعلیم دیتا ہے۔

کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج قیام ۱۸۶۰ء

۱۸۵۷ء کے بعد اگرچہ سرزمین ہند پر انگریزی اقتدار کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے لیکن حکومت کا ہر فرد اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ اہلِ ہند کو ذہنی طور پر غلام بنا دیا جائے۔ اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے یہ صورت نکالی گئی کہ انگریزی تعلیم جلد از جلد عام اور سستی کر دی جائے چنانچہ ۱۸۵۴ء میں ہندوستان کے ہر صوبے میں ایک محکمۂ تعلیم کھولا گیا۔ پنجاب میں اس عمل کا نفاذ ۱۸۵۶ء میں ہوا اور چار ہی سال کے بعد ۱۸۶۰ء میں میڈیکل اسکول کی بنیاد پڑی۔ اس اسکول سے قبل صرف کلکتہ میں ایک میڈیکل کالج تھا لیکن تریاق کو عراق سے لانے کے لیے کوئی تیار نہ ہوتا تھا۔ شمال مغربی صوبوں کے لوگ چاہتے تھے کہ ان کے صوبے میں ایک میڈیکل کالج قائم ہو اور وہ اسی کالج سے فارغ التحصیل ہو کر اپنے وطن میں رہیں۔ ۱۸۶۰ء ان کی امیدوں کا سال تھا۔ میڈیکل اسکول تو انارکلی کے قریب کھولا گیا لیکن اسپتال انارکلی سے ایک میل دور، ٹبی پولیس اسٹیشن کے قریب رہا۔ اس زمانے میں اس میڈیکل اسکول کے پرنسپل ڈاکٹر اسکریون تھے جو کلکتہ کالج سے یہاں تبدیل ہو کر آئے تھے۔

شروع شروع میں انگریزی کلاس میں پانچ اور ہندوستانی کلاس میں چالیس طلباء تھے۔ انگریزی کلاس کا نصاب پانچ سال کا تھا اور ہندوستانی کلاس کا تین سال کا۔ اوّل الذکر کا مقصد اسسٹنٹ سرجنوں کی آسامیاں پُر کرنا اور ایم بی ایس کی تیاری کرنا تھا، ثانی الذکر حکمت اور ایم بی ایل کے لیے طلباء کو تیار کرتا تھا۔

کھلنے کو تو یہ اسکول کھل گیا لیکن مصائب اور تکالیف کے بادل گھر گھر کر آنے لگے۔ نہ تو اسکول کی عمارت خاطر خواہ تھی نہ اسپتال کی، ایک طرف صحیح اور موزوں اساتذہ کا قحط تھا تو دوسری طرف اس قدر رقم نہ تھی کہ مقصد براری میں مدد و معاون ہوتی۔ ڈاکٹر اسکریون کے لیے یہ نہایت سخت گھڑی تھی لیکن انھوں نے ان دقتوں کو در خورِ اعتنا نہ سمجھ کر کم کرنے کی کوشش کی۔ مقدر اچھا تھا رفیق کار اچھے مل گئے۔ ڈاکٹر میز اسمتھ، ڈاکٹر برٹن براؤن، ڈاکٹر رحیم خاں اور ڈاکٹر محمد حسین خاں کی کوششوں سے یہ لڑکھڑاتا ہوا بچہ خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو گیا۔ دس سال تک ڈاکٹر اسکریون اس فضا پر چھانے کے بعد انگلینڈ چلے گئے اور ان کی جگہ پر ڈاکٹر برٹن براؤن پرنسپل ہوئے۔ ان کے عہد میں ہیرا منڈی میں واقع اسپتال موجودہ میو اسپتال میں آ گیا۔ اس اسپتال کا نام ارل میو وائسرائے ہند کے نام پر میو اسپتال اسی زمانے میں پڑا۔ اگلے سال اسکول بھی انارکلی سے میو اسپتال میں منتقل ہو گیا۔ کالج کی اپنی عمارت ۱۸۸۲ء میں بنائی گئی اور ۵ نومبر ۱۸۸۶ء کو کالج کا یومِ تاسیس منایا گیا۔

ڈاکٹر برٹن براؤن اس کالج میں تقریباً ۲۹ سال رہے۔ اس عرصے میں انھوں نے خدمت اور محنت کے زرّیں اصول اپنائے اور کالج کو وہ مقام عطا کیا کہ ایشیائی ممالک کے طلباء یہاں تدریس و تعلّم کے لیے آنے لگے۔ ۱۸۸۹ء میں ان کے ریٹائر ہونے پر کرنل براؤن پرنسپل ہوئے۔ ان کے زمانے میں یہ درسگاہ دو شعبوں میں منقسم ہو گئی۔ ایک کالج جو یونیورسٹی کے امتحانات کی تیاری کراتا تھا، دوسرا اسکول جس میں حکیموں اور ہیلتھ اسسٹنٹوں کا نصاب پڑھایا جاتا تھا۔ ۱۹۰۲ء میں کرنل براؤن تبدیل ہو کر بنگال گئے اور ان کی جگہ پر کرنل ہیری تشریف لائے۔ ان کے عہد میں ایل۔ ایم۔ ایس کی پرانی ڈگری ایم بی ایس میں تبدیل کر دی گئی اور ایم بی ایس کے لیے کئی طلباء کا پہلا جتھا ۱۹۰۶ء میں داخل ہو کر ۱۹۱۱ء میں کامیاب ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ یہ کالج تمام شمالی ہندوستان، جنوبی ہندوستان اور برما کی اہم ضرورتوں کو پورا کر رہا تھا۔ آج جس حالت میں ہم کالج کا ناک نقشہ اور رنگ روپ دیکھ رہے ہیں، اس کی کامیابی کا سہرا کرنل سدرلینڈ کے سر ہے۔ انھوں نے نئے نئے شعبے کھولے۔ معیارِ قابلیت کو بلند کیا اور انہی کے زمانے میں اسکول کا شعبہ کالج سے علیحدہ

کیا گیا۔ گویا اس کالج کے صحیح معنوں میں معمار کرنل سدرلینڈ تھے۔ انھوں نے کنگ ایڈورڈ میموریل اسکیم کے تحت حکومت کی امداد قبول کی اور انہی کے زمانے میں اس کالج کا نام بھی کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج رکھا گیا۔

جنگِ عظیم اوّل اپنے ساتھ تباہیوں کی ایک دنیا لائی۔ کچھ پروفیسر تو محاذِ جنگ پر چلے گئے اور کچھ کالج کے اندرونی خلفشار کے شکار ہو کر بیٹھ رہے لیکن ہندوستانی سپوتوں نے اس آڑے وقت میں کالج کا ساتھ دیا۔ رائے بہادر بال کشن کول، ڈاکٹر یار محمد خاں، ترلوک چند نندا، رام ناتھ شرما اور اسی پائے کے دوسرے پروفیسر کالج میں آ گئے۔ جنگ کے خاتمے پر کالج کے وقار کو بڑھانے کی کوششیں پھر سے شروع ہوئیں۔ ۱۹۲۰ء میں اس کالج میں نہ صرف ایشیائی بلکہ یورپی ممالک کے طلبا بھی تعلیم کے لیے آنے لگے۔ ۱۹۳۰ء میں راوی روڈ پر لیڈی ولنگڈن اسپتال کھولا گیا جو نہ صرف لاہور بلکہ پنجاب کے باسیوں کی امیدوں کا مرکز بن گیا۔ اسی سال کرنل ہارپر کالج کے پرنسپل بنے۔ انھوں نے کالج کے رفاہی کاموں کی طرف توجہ دی۔ کالج کے طلبہ کے لیے ہوسٹل اور گراؤنڈ انہی کے زمانے میں تیار ہوئے۔ بعد میں آنے والوں نے تحقیقی اور معلوماتی مضامین پر اپنی پوری کوششیں صرف کر دیں لیکن کالج کی یہ رفتارِ ترقی زمانے کو ایک آنکھ نہ بھائی اور جنگِ عظیم دوئم کے سبب بیشتر میڈیکل آفیسر انڈین میڈیکل کور میں بلا لیے گئے جہاں پہنچ کر انھوں نے دشمنوں سے بھی دادِ شجاعت اور دادِ خدمت حاصل کی۔

جنگ کے خاتمہ پر کالج کے چہرے پر جوانی کا نکھار آیا۔ اس دور میں ڈاکٹر صدیقی نے اناٹومی عجائب گھر بنا کر دنیا سے خراجِ تحسین وصول کیا اسی طرح کرنل ہیز نے لیڈی ولنگڈن اسپتال کو ایشیا کا سب سے بہترین اسپتال بنا دیا۔ قیامِ پاکستان تک کرنل فرائی اس کالج کے پرنسپل رہے۔

تقسیمِ ہند کے بعد اس کالج کا ہندو عملہ بھارت چلا گیا اور کرنل الٰہی بخش کالج کے پرنسپل بنائے گئے۔ آپ جالندھر کے رہنے والے تھے اور کسی زمانے میں جاپانیوں کی قید بھی کاٹ چکے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں قائدِ اعظم کے طبیبِ خاص کی حیثیت سے کوئٹہ گئے اور ستمبر ۱۹۵۹ء میں ریٹائر ہو کر اگلے سال لاہور میں انتقال کر گئے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ تقسیم کی وجہ سے کالج جن آفتوں اور بلاؤں سے دوچار ہو گیا تھا، کرنل الٰہی بخش مرحوم نے اسے بچایا اور ایک نئی راہ پر لگا دیا جس راہ میں ترقیوں اور بلندیوں کے خزینے ہیں۔ یہ ایک حیرت انگیز بات ہے کہ کرنل مرحوم نے درس و تدریس اور انتظامی معاملات میں مشغول ہونے کے باوجود ۷۵۴۳ صفحوں کی ایک کتاب MODERN MEDICAL TREATMENT تحریر کی ہے جسے اپنے دور کی سب سے بہتر کتاب تسلیم کیا گیا۔

قیامِ پاکستان سے اب تک جن جن شعبوں میں بتدریج ترقی ہوئی ہے اس کا خاکہ درج ذیل ہے:۔

اسٹاف:۔ ہندوؤں کے چلے جانے کے بعد اب تک سات عہدوں پر پاکستانی پروفیسروں کا تقرر کیا جا چکا ہے۔

شعبے:۔ ۱۹۴۷ء سے اب تک پانچ نئے شعبے کھول دیے گئے ہیں اور ہر ایک شعبے کا انچارج ایک پاکستانی پروفیسر ہے۔

ہوسٹل:۔ تین نئے بلاک بنوائے گئے ہیں جن میں سے دو طلبا کے لیے اور ایک طالبات کے لیے ہے۔

ہسپتال:۔ (اے) ایک بچوں کا اسپتال کھولا گیا ہے جس میں پچاس بستروں کی گنجائش ہے۔

(بی) رتن باغ کے علاقے میں ایک نیا بلاک مریضوں کے لیے بنایا گیا ہے۔

(سی) بنیس پرائیویٹ مریضوں کے لیے ایک الگ عمارت کا حصہ بنایا گیا ہے۔

(ڈی) کوٹ لکھپت میں ۵۰۰ بستروں پر مشتمل ایک لاہور جنرل اسپتال کھولا گیا ہے۔

(ای) رتن باغ کے علاقے میں ایک "RADIUM INSTITUTE" کھولا گیا ہے۔

تحقیقی کام ۔ پاکستان بننے کے بعد طلباء کی تعداد یک بیک بڑھ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تحقیقی کاموں کی طرف توجہ نہ دی جا سکی لیکن ۱۹۴۷ء سے اب تک کوئی ۱۲۴ اشاعتیں اس کالج کی نکل چکی ہیں جن میں سے اکثر اشاعتوں کو انگلینڈ اور امریکہ میں بھی سراہا گیا ہے۔

پوسٹ گریجویٹ :۔ اس کالج سے پاکستان بننے کے بعد جو طلباء ڈگریاں اور ڈپلومے لے کر نکلے ان کی تعداد درج ذیل ہے:۔

ایم ایس	۳۲
ایم ڈی	۲۹
ڈی ایم آر ای	۴۳
ٹی ڈی ڈی	۴۰
ڈی ایل او	۱۱
ڈی او	۳

۱۹۵۸ء کے انقلاب کے بعد نئی حکومت نے تعلیمی اور انتظامی امور کو الگ الگ کر دیا۔ میڈیکل کمیشن کی رپورٹ کے بعد یہ توقع کی جاتی ہے کہ اس کالج کو پھر وہی رتبہ نصیب ہو جائے گا جو اسے پہلے حاصل تھا۔

اسلامیہ کالج سول لائنز قیام ۱۸۹۲ء / ۱۹۵۵ء تعداد طلباء ۱۵۰۰

۱۸۴۹ء میں انگریزوں نے پنجاب کو اپنے زیر نگیں کیا اور اسی زمانے سے عیسائی مشنریوں کا اس سرزمین پر آنا جانا شروع ہوا۔ بنگال میں تبلیغ مذہب کی کامیابی اور کامرانی یہاں کے حوصلے بہت بڑھ گئے۔ پنجاب میں بھی ان کی سرگرمیوں کا مرکز یہی لاہور قرار پایا ہندوؤں نے اس تحریکِ عیسائیت کے خلاف آریہ سماج کی تحریک چلائی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ دونوں تحریکیں ایک دوسرے کی ضد تھیں لیکن دونوں اسلام کے خلاف تھیں۔ اُدھر سر سید احمد خاں نے مسلمان قوم کی بجھتی ہوئی آگ کو ہوا دی اِدھر پنجاب کے چند اہلِ دل مسلمانوں نے دینِ اسلام کی تبلیغ اور مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم کا بیڑا اٹھایا۔ ۱۸۸۴ء میں انجمن حمایتِ اسلام کی بنیاد پڑی۔ ۱۸۸۶ء میں انجمن نے ایک کرایے کے مکان میں مدرسۃ المسلمین قائم کیا۔ دو سال کے بعد یہ مدرسہ مڈل اور ۱۸۸۹ء میں ہائی سکول بن گیا۔ ۱۸۹۲ء میں اسے کالج کے درجے تک تعلیم دینے کی اجازت مل گئی۔ شروع شروع میں اس کالج کے لیے شیرانوالہ سکول سے دو کمرے لیے گئے۔ ۱۹۰۰ء میں اس کالج کے قبضہ میں ایک کمرہ اور آگیا۔ ۱۹۰۱ء میں ان تینوں کمروں کے اوپر بالائی منزل تیار کی گئی۔ ۱۹۰۷ء تک یہ کالج اسی عمارت میں روشنی بن کر چمکتا رہا۔ ۱۹۰۵ء میں انجمن نے ریلوے روڈ پر پچاس کنال اراضی خریدی، اور ۱۹۰۷ء ہی میں امیر حبیب اللہ خاں مرحوم کے ہاتھوں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کی موجودہ عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا گیا اور اسی سال ریواز ہوسٹل کی تعمیر شروع ہوئی۔ ۱۹۰۸ء میں اسی ہوسٹل میں کالج کی جماعتیں لائی گئیں۔ یہ عمارت ۱۹۱۳ء میں مکمل ہوئی اور اس پر تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپیہ خرچ ہوا۔ ۱۹۴۰ء میں ایک لائبریری اور ایک ریڈنگ روم تعمیر کیا گیا لیکن چونکہ کھیل کا کوئی میدان نہ تھا اس لیے اس عمارت کو گرا دیا گیا۔ اسی سال کالج کی جمناسٹک کے لیے ایک اور عمارت تعمیر کی گئی۔ اس عمارت کا نقشہ میاں محمد عبداللہ مرحوم کا بنایا ہوا ہے

اس کالج میں ایم۔ اے تک کی جماعتیں رہیں، تقریباً بیس سال تک اسی کالج میں جے' اے وی تک کی کلاسیں رہیں۔ ۱۹۲۷ء میں ان جماعتوں کو بند کر دیا گیا۔ اس کالج کے ساتھ تین ہوسٹل بنائے گئے۔

۱۔ ریلوائز ہوسٹل کالج کے احاطے میں ہے۔

۲۔ دوسرا ہوسٹل کریسنٹ ہوسٹل کے نام سے مشہور ہے۔ انجمن نے ۱۹۲۱ء میں ایک کوٹھی خریدی تھی اور بعد میں مسمار کر کے اسے زنانہ اسلامیہ کالج کو دے دیا گیا۔

۳۔ تیسرا ہوسٹل ہیلی ہوسٹل تھا۔ یہ عمارت ۱۹۲۶ء میں سینتالیس ہزار روپے میں خریدی گئی اس عمارت میں انجمن کا وطن اسلامیہ ہائی سکول کام کر رہا ہے۔ شروع شروع میں، اس کالج میں تیس طلباء تھے لیکن اب پندرہ سو بتیس ۱۵۳۲ طالب علم تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد اس کالج پر طلباء کی زبردست یلغار ہوئی آخر کار ۱۹۵۵ء میں ڈگری کلاسیں ٹوی۔ اے وی کالج کی متروکہ عمارت میں منتقل ہو گئیں چونکہ یہ عمارت یونیورسٹی سے قریب ہے اس لیے اسے ڈگری کالج بنا دیا گیا۔ متروکہ عمارت ہونے کی وجہ سے یہ عمارت مرمت طلب ہے۔ اس عمارت میں کچھ نئی عمارتوں کا بھی اضافہ ہوا ہے، خصوصیت سے سائنس کی تعلیم کے لیے ایک نیا بلاک بنانے کی تجویز ہے۔

کالج کے اندر متعدد علمی اور ادبی مجلسیں قائم ہیں۔ بزم فروغ اردو ڈاکٹر تاثیر مرحوم نے ۱۹۳۴ء میں قائم کی تھی۔ یہ بزم اسی آن بان کے ساتھ کام کر رہی ہے انگریزی کے STUDY CIRCLE نے بہت سے جلسوں کا بندوبست کیا جس میں برطانوی اور امریکی ارباب علم نے مقالات پڑھے۔

اس کالج میں ۶۵ اساتذہ ہیں جن میں چند ایک چوٹی کے نقاد اور بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ پروفیسر مرزا عبدالحمید بیگ وہی شخص ہیں جنھوں نے پاکستان اور ہندوستان کے اکثر پہاڑوں کو زیر نگیں کیا ہے اور MOUNTAINEERING کا فن آپ کے دم سے زندہ ہے۔

کالج کا اپنا ایک میگزین فاران کے نام سے نکلتا ہے۔ یہ میگزین اپنے اسٹینڈرڈ کے لحاظ سے بہت بلند ہے۔ اس میں کالج کے طلباء اور اساتذہ مل کر مضامین لکھتے ہیں دوسرے کالجوں کی طرح اس کالج کا مطمح نظر یہی ہے کہ اپنا اچھا برا کام ملک کے صاحبانِ علم کے سامنے پیش کیا جائے لیکن موجودہ دور میں یہ نظریہ بہت پرانا ہے اس بات کا خیال ضرور رکھنا چاہیے کہ اگر کالج سے باہر کے ان میگزینوں میں بیرونی حضرات بھی لکھتے رہیں تو معیار بلند سے بلند تر ہو سکتا ہے کیونکہ مقصود تشہیر فن ہے نہ کہ ذات۔

اسلامیہ کالج ریلوے روڈ

قیام: ۱۸۹۲ء
تعداد طلبا: ۲۳۰۰

یہ وہی ادارہ ہے جو شیرانوالہ دروازے سے منتقل ہو کر ۱۹۰۸ء میں اس عمارت میں آیا تھا۔ اس کالج کو ملک میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ پاکستان میں یہ اوّلین کالج تھا جس نے اسلامی علوم وفنون کو مغربی علوم کے ساتھ پیوند کیا۔ اسی کالج نے مسلمان قوم کی پسماندگی کی طرف سب سے پہلے توجہ دی کیونکہ امرا اور نواب زادے تو گورنمنٹ اور ایف سی کالج میں چلے جاتے تھے اور اوسط درجے کے لوگوں کے بچے اس کالج میں قدم رکھتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کالج کے اولڈ بوائز کی فہرست طویل ہے آج تقریباً ہر محکمہ، ہر کالج، ہر مقام پر اس کالج کے طالب علم موجود ہیں۔ موجودہ پرنسپل کا یہ کہنا کہ اگر اسلامیہ کالج کی خدمات کو نظر انداز کر دیا جائے تو پاکستان کا سماجی اور تعلیمی ڈھانچہ

ناقابلِ یقین حد تک بدل جائے گا۔ کوئی مبالغہ نہیں یہ وہی کالج ہے جس کے اسٹیج پر سر سید، مولوی نذیر احمد، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا شبلی، علامہ اقبال نے اپنا پیغام پیش کیا۔ ۱۹۴۶ء میں اسی کالج میں قائد اعظم نے اپنی سرگرمیوں کا مفصل ذکر کیا۔ مسٹر لیاقت علی خاں مرحوم بھی کئی بار اس کالج میں آئے۔ غرض ملک کی اعلیٰ اور مادی ہستیاں اس کالج سے وابستہ رہیں۔ ۱۹۴۶ء میں تو یہ کالج سول نافرمانی کا مرکز بن گیا۔ حصولِ پاکستان کے اس عظیم الشان مقصد کی آخری جدوجہد میں اساتذہ اور طلباء نے اپنی جان و مال کی بازی لگا دی اور خضر منسٹری کے چھیتھڑے اڑانے والے یہی کے طلباء اور اساتذہ تھے۔ علامہ علاؤ الدین صدیقی اور پروفیسر یوسف جمال انصاری اسی زمانے میں قید ہوئے۔ ۱۹۶۰ء میں اس کالج کے طلباء کی تعداد ۲۳۰۸ تھی۔ اتنی بڑی تعداد کے لیے کم سے کم موجودہ عمارت بالکل ناکافی ہے۔ اکثر جماعتوں میں طلبہ کی تعداد سو سے زائد ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی جماعت میں انفرادی توجہ کیا دی جا سکتی ہے مگر نتائج دیکھ کر مایوسی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ ایک کے سوا تمام مضامین میں اس کالج سے کامیاب ہونے والے طلباء کا فی صد تناسب سیکنڈری ایجوکیشن بورڈ کے تناسب سے زیادہ ہے۔ ایک ایسے ادارہ سے جس کا دارومدار قومی چندوں پر ہو اور کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

کالج کے تدریسی شعبوں کے اعداد و شمار کے ضمن میں شعبہ انگریزی کو بھاری ذمہ داری سے عہدہ برا ہونا پڑتا ہے تمام طلباء کو ۴۵ گروپ میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر گروپ میں ۸۰ طلباء ہیں۔ خیال ہے کہ اس کالج میں ڈبل شفٹ کا انتظام کر دیا جائے گا۔

اسی کالج میں پروفیسر علم الدین سالک بطور صدر شعبہ اُردو و فارسی خدمات انجام دے رہے ہیں جو ایک بہترین مورخ، آتش بیاں مقرر اور بے مثال ادیب ہیں۔ ان کی سرپرستی میں اس کالج کی علمی اور ادبی سرگرمیاں اپنی روایاتِ سابقہ کو زندہ کیے ہوئے ہیں۔ کالج میں ایک بزم عروجِ ادب ہے جس کی ہفتہ وار مجلس ہوتی رہتی ہے سیکرٹری مجلس پوری کوشش سے کام کر رہے ہیں۔ مشاہیر شعراء کو اس کے اجلاس میں دعوت دی جاتی ہے۔ مقالے پڑھے جاتے ہیں، شاعری ہوتی ہے۔ یہ مجلس عام طلباء میں ادبی دلچسپی پیدا کرتی رہتی ہے، جو قابلِ تحسین ہے۔ کالج میں ایک سالانہ مشاعرہ بھی ہوتا ہے۔ پچھلے سال کے مشاعرے کی صدارت جسٹس جمیل حسن رضوی نے کی۔ مشاعرے کا معیار طلباء کے ادبی ذوق کا آئینہ دار تھا۔ غزلوں کے رنگ میں قدیم و جدید شاعری کی قدریں سامعین کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھیں۔

اس کالج میں اسلامیات کا درس بڑی باقاعدگی سے ہو رہا ہے۔ خواجہ عبدالحئی فاروقی صاحب اس خدمت کو بخوبی سرانجام دے رہے ہیں۔ پچھلے سال مراکش کے سید محمد، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بارکر، مولانا محمد بخش مسلم، خواجہ محمد شفیع اور علامہ علاؤ الدین صدیقی صاحب نے اسلامیات کے متعدد مضامین پر تقاریر کیں۔

سائنس ایسوسی ایشن اس کالج کی زندہ اور فعال مجلس ہے۔ پچھلے سال ڈاکٹر اے جی چودھری ہیڈ شعبہ طبیعات پنجاب یونیورسٹی نے "خلائی سفر" کے موضوع پر ایک دلچسپ تقریر کی۔ دوسرا مقالہ پاکستان میں شکر سازی کے فن پر مسٹر اے کے تنویر انجینئرنگ کالج نے پڑھا۔ تیسرا مقالہ وائرلیس کی خدمت پر مسٹر ایم شاہ نے سنایا۔ آپ بھی انجینئرنگ کالج کے پروفیسر ہیں۔

کھیلوں میں بھی اس کالج کو بہت بڑا مقام حاصل ہے۔ لاہور میں اسلامیہ کالج اور گورنمنٹ کالج کا میچ حقیقت میں ایک میلے کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ پرانے کھلاڑیوں میں امتیاز، فضل محمود، نثار، ڈاکٹر جہانگیر، میاں نذیر، کاردار، نذر محمد، خان محمد، سعید، شجاع الدین بڑی شہرت کے مالک ہیں۔

اس کالج کے قدیم طلباء ہندوستان اور پاکستان بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ خواجہ دل محمد مرحوم جن کی ریاضی دانی کا اعتراف یورپ والوں

نے بھی کیا، اسی کالج کے طالب علم تھے۔ ہندوستان میں آزادیٔ کشمیر کے رہنما شیخ محمد عبداللہ بھی اسی کالج کے پرانے طالب علم ہیں۔ پاکستان میں آزادیٔ کشمیر کے روحِ رواں سردار ابراہیم کا بھی اسی کالج سے تعلق ہے۔ اساتذہ میں علامہ عبداللہ یوسف علی اپنی وجاہت اور قابلیت میں ایک عالم میں انتخاب تھے۔ ڈاکٹر تاثیر مرحوم شعر گوئی اور تنقید میں شہسوارِ زمانہ تھے۔ شمع تاثیر کے طرحی مشاعرے اگرچہ اسلامیہ کالج سول لائنز میں منعقد ہوتے ہیں لیکن اپنی افادیت کے لحاظ سے بہت اہم ہیں۔ مسٹر شریف جو فلسفہ کے پروفیسر تھے بڑی خوبیوں کے مالک تھے، آج کل ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے صدر ہیں۔ آخری پرنسپل کرنل محمد اسلم مرحوم تھے جن کا ۱۱ نومبر ۱۹۶۳ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔ مرحوم اپنی تنظیمی قابلیت کے لیے مشہور تھے۔ انھوں نے کالج کے لیے اپنا تن من دھن ایک کر کے لٹا دیا۔ ان کے نظم و ضبط کی بہترین مثال اس موقع پر ملتی ہے جب قائدِ تحریک خاکسار نے یومِ جبلپور کے موقع پر دفعہ ۱۴۴ لگا دی اور دیگر کالجوں کے طلباء نے اس دفعہ کو توڑنے کی ٹھہرائی۔ کرنل مرحوم کے کہنے سے اس کالج کا کوئی طالب علم اس ہنگامے میں شریک نہ ہوا۔ ۱۹۴۶ء میں مسلمانوں کے لیے جان دینے والے طلباء اگر منع کر دیے جائیں تو مسلمانوں کے لیے قدم روک بھی سکتے ہیں۔

دیال سنگھ کالج

قیام : ۱۹۱۰ء
تعدادِ طلباء : ۱۵۰۰

سردار دیال سنگھ ہندو سوسائٹی کے ایک ممتاز رکن تھے۔ ان کے دل میں قومی درد کی کسک اور ملی تڑپ کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ چونکہ لاولد تھے اس لیے ان کی ہمیشہ خواہش یہ رہی کہ ملک کے نوجوانوں کے لیے ایک قومی ادارہ یا قومی مدرسہ اس طرز کا قائم کر دیا جائے جس سے ملکی خصوصیات وابستہ ہوں۔ پنجاب کے امیروں اور نواب زادوں کے لیے گورنمنٹ کالج اور ایف سی کالج آغوش پھیلائے ہوئے تھے۔ غریب عوام کے بچے تعلیم کے لیے مارے مارے پھرتے تھے۔ یہ حال دیکھ کر انھوں نے ایک مثالی کالج کھولنے کا پختہ ارادہ کر لیا لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور ۱۸۹۸ء میں ایک وصیت نامہ چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ وصیت نامے میں اپنی بیوی کی جائداد کے علاوہ تین ٹرسٹ قائم کرنے کی تجویز تھی۔

۱۔ دیال سنگھ کالج ٹرسٹ

۲۔ دیال سنگھ پبلک لائبریری ٹرسٹ

۳۔ ٹربیون اخبار ٹرسٹ

کالج کے سلسلے میں یہ توضیح کی گئی تھی کہ اس کالج میں صرف موحدین کی اولاد ہی تعلیم حاصل کر سکتی ہے اور اساتذہ بھی موحد ہوں۔ یہ بھی تحریر تھا کہ یہ کالج کسی رنگ و نسل کی تفریق کے بغیر سارے فرقوں کے لیے کھولا جائے گا۔ ان کی موت کے ۱۲ برس بعد ۱۹۱۰ء میں یہ کالج کام کرنے لگا۔

سردار دیال سنگھ مجیٹھہ امرت سر کے ایک گاؤں مجیٹھہ میں پیدا ہوئے تھے اسی نسبت سے انھیں مجیٹھیا کہا جاتا تھا۔ عجیب بات ہے کہ بعض لوگوں نے انھیں تلاوت قرآن پاک کرتے ہوئے دیکھا تھا اور یہ خبر بھی تھی کہ وہ مسلمان ہوتے جا رہے ہیں لیکن ان کی موت نے ان کا پردہ رکھ لیا۔ اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مسلمان مرے یا ہندو بہر حال یہ سچ ہے کہ وہ سکھ نہیں مرے جیسا کہ عام طور پر معروف و مشہور رہے۔

یہ کالج شروع ہی سے آزادیٔ افکار اور قومی تقاضوں کا سمبل بن گیا۔ راجہ رام موہن رائے کی برہمو سماج تحریک کے کچھ نقوش اس کالج میں ابھرنے لگے اور شاید اسی تحریک کا اثر تھا کہ کالج سے متصل ایک رام موہن رائے ہوسٹل تعمیر کیا گیا۔ ان کی اہلیہ نے ٹرسٹ کی طبیعت بھی

آمدنی کو دیکھ کر ٹرسٹ پر مقدمہ دائر کر دیا لیکن اس مقدمے میں انھیں غلط فہمی ہوئی تھی اس لیے شکست کھانی پڑی۔ یہ کالج وقت کے ساتھ ساتھ سیاسی تحریکات کی آماجگاہ بھی بنتا گیا۔ کوئی بھی سیاسی لیڈر ایسا نہیں جو لاہور آتے اور دیال سنگھ کالج میں اس کی ضیافت نہ ہو۔ ۱۹۴۶ء تک یہی کیفیت رہی۔ ۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان کے بعد کالج اسٹاف میں پروفیسر عابد علی عابد اور پروفیسر عاشق محمد ہی رہ گئے بقیہ تمام ہندو اور سکھ اساتذہ ہندوستان چلے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کام کے ساتھ ساتھ کالج کی ساکھ ٹوٹ گئی۔ اس وقت اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے صدر شیخ عبدالحق سابق لیگی رکن اسمبلی تھے۔ انھوں نے پروفیسر عابد علی عابد کو ٹرسٹ کا منیجر بنا دیا اور خود مختار نامہ حاصل کر کے ٹرسٹ کے سیکرٹری بن گئے۔ اس وقت کے ٹرسٹیوں میں ڈاکٹر ریاض علی شاہ، ملک عبدالقیوم مرحوم سابق پرنسپل لاء کالج، ڈاکٹر محمد شفیع، برکت علی قریشی اور شیخ نسیم حسن سابق ایڈووکیٹ جنرل حکومت پنجاب کے والد ماجد شیخ محمد حسن تھے۔

شروع زمانے سے لے کر اس دور تک اس کالج میں کو ایجوکیشن تھی ——— پروفیسر عابد علی عابد نے تعلیم کے اس پہلو پر بہت کچھ کام کیا لیکن سیکرٹری ٹرسٹ سے منیجر ٹرسٹ کی ٹھنی اور آج تک یہ کالج سیاسی گٹھ جوڑ کا اکھاڑا بنا ہوا ہے۔

قیامِ پاکستان سے قبل اس ٹرسٹ کی بہت سی جائداد ایسٹ پنجاب میں تھی لیکن پاکستان بن جانے کے بعد اس کالج کو خسارہ پر کام کرنا پڑا۔ ۱۹۵۴ء میں پروفیسر عابد علی عابد علیحدہ کئے گئے اور ان کے بعد پروفیسر سعادت علی خاں بطور پرنسپل کام کرنے لگے۔ ۱۹۵۵ء میں پروفیسر غلام عباس نے کالج کی عنان سنبھالی اور تین سال تک کالج کی خدمت کر کے علیحدہ ہو گئے آپ کے ہٹانے میں سید جمیل حسین رضوی پیش پیش تھے۔ ۱۹۵۸ء میں اسلامیہ کالج کے ڈاکٹر رفیق صاحب جو رضوی صاحب کے علی گڑھ میں استاد بھی رہ چکے تھے بطور پرنسپل آئے اور اس وقت تک دیال سنگھ کالج کے تمام سیاہ و سپید کے مالک وہی ہیں۔ نئے ٹرسٹ میں جسٹس شریف وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی چیئرمین ہیں۔ جسٹس چنگیز اور جسٹس جمیل حسین رضوی اس کے ممبر ہیں۔ حکومت اس ادارہ کو پچیس ہزار روپے گرانٹ دیتی ہے۔ طلباء کی تعداد تقریباً ۱۵۰۰ ہے اور اسٹاف چالیس ممبران پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر محمد صادق جو انگریزی کے ایم اے ہیں شعبۂ انگریزی کے صدر ہیں۔ پروفیسر عاشق محمد (ایم اے اُردو، ایم اے فارسی، ایم اے انگریزی) شعبۂ فارسی کے صدر ہیں۔ یہ وہی عاشق صاحب ہیں جو پاکستان کے بہترین پیرو ڈیسٹ ہیں۔ پروفیسر شجاع تاریخ کے شعبہ کے صدر ہیں اور صادق قریشی صاحب ایم اے سماجی تحریکات کے انچارج ہیں۔

اس کالج کے دو ہوسٹل ہیں۔ ایک رام موہن رائے ہوسٹل دوسرا مجیٹھیہ ہوسٹل، دونوں میں طلباء کی تعداد تقریباً دو سو کے قریب ہے۔ عمارت پرانی اور بوسیدہ ہے۔ ٹیٹوریل گروپ کے لیے اساتذہ کو جو کمرے ملے ہیں انھیں جیل کی کوٹھڑیوں سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے۔

کالج کے طلباء کی ایک یونین ہے جو کالج کے حسنِ انتظام میں امداد کرتی ہے۔ اسی یونین کے تحت مجلسِ ادب اور دیگر جلسے ہوتے رہتے ہیں۔

"دیال سنگھ کالج میگزین" اس کالج کا سہ ماہی جریدہ ہے۔ اگرچہ اس جریدے کے سرپرست خود پرنسپل صاحب ہیں اور یہ رسالہ ایک پروفیسر صاحب کی نگرانی میں نکلتا ہے۔

کینئرڈ کالج لاہور (قیام: ۱۹۱۲ء تعداد طالبات: ۳۵۰) | انگریز اور امریکن مشنریوں کی امداد سے طلباء کے کئی کالج اس

سرزمین پنجاب پر کھل چکے تھے جہاں سے وہ فیضیاب ہو کر ملکی نظم و نسق میں برابر کے شریک ہو رہے تھے لیکن طالبات کے لیے سارے صوبے میں کوئی اسکول نہ تھا۔ اس کمی کو دور کرنے کے لیے مسز کینیرڈ نے ریلوے اسٹیشن کے قریب چرچ کے نزدیک ایک اسکول کھولا جسے کینیرڈ ہائی اسکول کہا جاتا ہے۔ ۱۹۱۲ء میں اس مدرسے میں ایک کالج بھی کھول دیا گیا جو ۱۴ سال تک اسی مقام پر کام کرتا رہا۔ ۱۹۱۴ء میں پہلی انٹرمیڈیٹ کلاس امتحان میں شریک ہوئی اور ۱۹۱۹ء میں بی اے کی کلاس کا آغاز ہوا۔ کچھ عرصہ تک یہ کالج لیک روڈ پر چرچ کے نزدیک بھی رہا لیکن رائے صاحب سوہن لال نے جب اس بلڈنگ کو خرید لیا تو ۱۹۲۸ء میں یہ اپنی موجودہ بلڈنگ میں آ گیا۔ یہ بلڈنگ کسی ایک ادارے کی نہیں بلکہ ایف سی کالج لاہور، مرے کالج سیالکوٹ، گورڈن کالج راولپنڈی اور زنانہ بائبل اینڈ میڈیکل مشن کے ممبروں پر مشتمل ایک کمیٹی نے اس کالج کے قیام میں بڑی مدد کی۔ اس کالج کی سب سے پہلی پرنسپل مس جان میکڈانلڈ تھیں جنھوں نے ریٹائر ہونے کے بعد سول سکریٹریٹ کے قریب اپنا ایک پرائیویٹ ادارہ خود کھول لیا تھا اور آج تک برقرار ہے۔

ابتدائی دور کا ذکر کرتے ہوئے پرنسپل صاحبہ نے بتایا کہ شروع شروع میں اس کالج میں طالبات کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ تعلیم نسواں کا اس ملک میں کوئی خیال ہی نہیں رکھا جاتا تھا چنانچہ اس زمانے کی پرنسپل نے میٹرک میں پاس ہونے والی طالبات کو خطوط لکھے اور اس طرح بہ مشکل سات یا آٹھ طالبات سے کالج کی ابتدا ہوئی۔ پرنسپل نے بتایا کہ اگر یہ کالج نہ ہوتا تو حکومت کے تعلیم نسواں کے بارے میں خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اسی کالج کی طالبات نے ملک کے دوسرے حصوں میں عورتوں کی تعلیم کو عام کیا۔ بیگم فدا حسن جن کی سماجی کوششوں سے عورتوں میں شعورِ زندگی پیدا ہوا اسی کالج کی قدیم طالبہ ہیں۔ مس انوری محمد جو ان دنوں لاہور کالج فار ویمن کی پرنسپل ہیں اسی کالج کی فارغ التحصیل ہیں۔ ڈاکٹر عذرا رحمان جنھیں اسلامیہ کالج کی پرنسپل ہونے کا شرف حاصل ہے اسی کالج کی طالبہ ہیں۔ ماڈرن سیکنڈری اسکول گلبرگ کی پرنسپل اور لائل پور کالج کی مس نعیمہ عبداللہ اسی کالج سے تعلق رکھتی ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد مس میکنیر اس کالج کی پرنسپل ہوئیں۔ ۱۹۵۰ء سے اب تک مس سنگت رائے اس عہدہ پر فائز ہیں۔ کالج میں کل طالبات کی تعداد ۵۰۳ ہے اور تقریباً ۴۰ اساتذہ پر مشتمل اسٹاف ہے۔ پرنسپل نے بتایا کہ طالبات کی تعداد اس لیے کم رکھی جاتی ہے کہ تعلیم کا معیار بلند کیا جا سکے۔ انھوں نے پچھلے سال کے امتحانات کے نتائج مندرجہ ذیل بتائے:

انٹر آرٹس	۹۴ فی صد
انٹر سائنس	۸۹ فی صد
بی اے	۹۰ فی صد
بی ایس سی	۸۰ فی صد

اس کالج کے چار ہوسٹل ہیں جن میں ۱۴۰ طالبات مقیم ہیں ایک بہت بڑی لائبریری ہے جس میں ہزاروں کتابیں ہیں ایک سائنس ہوسٹل کی تعمیر زیرِ غور ہے۔ حکومت کی طرف سے ۲۵ ہزار روپے کی گرانٹ ملی ہے لیکن یہ رقم ناکافی ہے۔ پرنسپل نے بتایا کہ گورنمنٹ کالج کے مقابلے میں ہماری استانیاں بہت کم تنخواہ پر کام کر رہی ہیں۔ ان میں سے اکثر کی تنخواہ مشن کی طرف سے دی جاتی ہے۔ ان کا یہ جذبہ سراہنے کے قابل ہے۔

اس کالج کا سب سے بڑا کارنامہ نرسنگ کی تعلیم ہے۔ اس غرض کے لیے لندن سے ایک سند یافتہ استانی تشریف

لائی ہیں اور نرسنگ کلاس میں ۲۲ طالبات تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ چونکہ یہ کالج مشنری طرز پر چلایا جا رہا ہے اس لیے کرسچین طالبات کو مسلمان بچیوں کے مقابلے میں زیادہ رعایتیں حاصل ہیں۔

کالج کی طرف سے کرسچین طالبات کو تقریباً ۲۸ ہزار کی رقم بطور امداد دی جاتی ہے اور مسلمان طالبات پر تقریباً ۱۵ ہزار خرچ کیا جاتا ہے۔

طالبات کی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے پرنسپل نے بتایا کہ اس کالج میں ہر سال دو چار ڈرامے غریبوں کی امداد کے لیے ہوتے رہتے ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں بنگال کے مظلوم مسلمانوں کے لیے اس کالج نے ایک کثیر رقم روانہ کی۔ راجگڑھ کی نادار آبادی میں کالج نے بچوں کے لیے سوکھا دودھ سپلائی کیا۔ اس کالج کی طالبات دوسرے ممالک کی سیر بھی کرنے جاتی ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں ایس سی ایم کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے مس شمیم ہال کو فرانس بھیجا گیا۔

کالج میں کئی سوسائٹیاں کام کر رہی ہیں۔ مس شمیم انور DEBATE SOCIETY کی انچارج ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں اسی کالج کی طالبہ نیلوفر نے روچی رام سہنی مقابلہ بیان میں اول انعام حاصل کیا۔ بی این آر کے مباحثے میں اسی کالج کی طالبات نے ٹرافی جیتی۔ فورمن کالج مباحثے میں ٹرافی اسی کالج کو ملی۔ گورنمنٹ کالج مباحثے میں ٹرافی اسی کالج نے جیتی۔

کھیل کود کے میدان میں بھی اس کالج نے خاطر خواہ کامیابی حاصل کی ہے اور سکنڈری بورڈ کے کئی ایک ریکارڈ اسی کالج کی طالبات نے بہتر کیے۔

طالبات کی علمی پیاس بجھانے کے لیے کئی ایک مجلسیں بنی ہوئی ہیں جن میں علمی مباحث زیر غور آتے رہتے ہیں۔ پروفیسر حمید اللہ اور مسٹر مقصود اس مجلس کے انچارج ہیں۔ اسی کالج کی مس ڈل کو پچھلے سال ایران بھیجا گیا تھا وہاں انھوں نے اپنا بہترین مقالہ پڑھ کر داد حاصل کی۔ مس شیلا کی کتاب PAKISTAN AND THE WESD لاہور سے شائع ہو چکی ہے۔ ۱۹۶۰ء میں مس کپن نے فلاسفی کانفرنس کراچی میں اپنا یادگار مقالہ پڑھا۔

بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ موجودہ پرنسپل مس منگت رائے کے والد پنجابی اور والدہ بنگالی ہیں۔ اس لحاظ سے آپ پوری پاکستانی پرنسپل ہیں جن سے ملک کے دونوں حصے بجا طور پر بہتری کی توقعات رکھ سکتے ہیں۔

لاہور کالج برائے مستورات (قیام ۱۹۲۲ء)

انگریزی حکومت نے تعلیم نسواں کی طرف ایک عرصے تک کوئی توجہ نہ دی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مشرقی طرز تمدن میں حاکمیت محض مردوں کی تسلیم کی گئی ہے۔ لڑکیوں کو تعلیم دلانا اور انھیں اس قابل بنانا کہ وہ ملک اور قوم کی خدمت کر سکیں، ایشیا والوں کے لیے بہت دور کی بات تھی۔ لاہور میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے اگرچہ کینرڈ اسکول اور کالج کھل چکے تھے لیکن ان میں بھی صرف فارورڈ گھرانوں کی لڑکیاں تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ ۱۹۲۲ء میں لاہور کالج برائے مستورات کا قیام عمل میں لایا گیا۔ شروع شروع میں اسے انٹرمیڈیٹ کالج رکھا گیا لیکن تین سال کے بعد ڈگری کالج بنا دیا گیا اور پھر اکیس سال کے بعد ۱۹۴۶ء میں اس کالج میں ایم۔ اے کی کلاسیں جاری کی گئیں۔ اس کالج کی دو خصوصیات بہت اہم ہیں۔

۱۔ یہ گورنمنٹ کا کالج ہے اور محض طالبات کی تعلیمی اور تمدنی زندگی کو سنوارنے کے لیے جاری کیا گیا ہے۔

۲۔ اس کالج میں پردے کا عام رواج ہے اور قیام پاکستان کے بعد اس کی چار دیواری بہت مستحکم کر دی گئی ہے۔

یہ کالج جیل روڈ سنٹرل جیل کے سامنے قیام پذیر ہے اور اس کا الحاق ۱۹۲۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ہو چکا ہے بوجوہ دورِ کی تمام مروجہ تعلیم اس کالج میں دی جاتی ہے۔ کالج کا اسٹاف پچاس استانیوں پر مشتمل ہے اور کالج کی پرنسپل ڈاکٹر مس علی محمد صاحبہ ہیں استانیوں میں اکثر فارن یونیورسٹی کی ڈگریاں رکھتی ہیں۔

کالج میں مختلف مجلسیں ہیں جن میں سے مندرجہ ذیل سرگرمی سے کام کر رہی ہیں۔

۱۔ اقبال فلاسفیکل سوسائٹی

۲۔ بزم ادب

۳۔ ڈرامیٹک سوسائٹی

۴۔ ڈیبیٹنگ سوسائٹی

کالج کے پاس اپنی گراؤنڈ ہے جس میں ٹینس، فٹ بال، ہاکی اور والی بال کھیلے جاتے ہیں۔

طبیہ کالج لاہور

قیام: ۱۹۲۶ء
تعداد طلبہ: ۱۵۰

طبیہ کلاسوں کا اجرا پنجاب یونیورسٹی کے ہاتھوں ۱۸۷۶ء میں اورینٹل کالج میں عمل میں لایا گیا تھا، پھر ان کو میڈیکل اسکول میں منتقل کر دیا گیا۔ ۱۸۹۶ء میں قلتِ گنجائش کے باعث ان جماعتوں کو انجمن حمایت اسلام لاہور کے سپرد کر دیا گیا اور تعلیم اسلامیہ کالج بلڈنگ میں ہوتی رہی۔ ۱۹۰۷ء میں پنجاب یونیورسٹی نے جزوی اخراجات کے لیے ۲۰ روپے کی سالانہ گرانٹ منظور کی۔ اس وقت صرف ایک لکچرار تھا جو ہفتہ میں دو تین مرتبہ شام کے وقت دو ایک گھنٹے لکچر دیا کرتا تھا۔ چونکہ انجمن بھی اپنی حیات کی ابتدائی منزل پر تھی اس لیے بیشتر توجہ ادبی تعلیم پر رہی اور اس طرف کما حقہٗ دھیان نہ دیا جا سکا۔ ۱۹۲۰ء تک یہ جماعتیں پرنسپل اسلامیہ کالج کے ماتحت ایک سپرنٹنڈنٹ کے زیر اہتمام رہیں۔ اب انجمن نے ادھر بھی توجہ دی چنانچہ کالج کمیٹی نے طبی تعلیم کے لیے ایک سب کمیٹی بنائی، اسٹاف میں اضافہ کیا گیا اور چند ضروری انتظامات بھی کیے گئے۔

۱۹۲۶ء میں ان جماعتوں کے انتظام کے لیے انجمن کی جنرل کونسل نے اس کالج کو اسلامیہ کالج سے علیحدہ کر دیا اور علمِ طب کی تعلیم باقاعدہ کالج کی صورت میں شروع ہوئی۔ بجائے دو گھنٹہ صبح کے شام کے ۲½ گھنٹے اور صبح کو عملی تعلیم کے لیے دو گھنٹے مقرر ہوئے۔ ایک مکمل کیمیاوی لیبارٹری ایک یونانی اور ایک ڈاکٹری شفاخانے الگ الگ قائم کیے گئے۔ پروفیسروں کی تعداد ۵ کر دی گئی، پنجاب کے مشہور و معروف حکیم محمد حسن صاحب قرشی کی خدمات حاصل کی گئیں اور انھیں پرنسپل بنا دیا گیا۔ یونانی شفاخانہ ریاست بہاولپور کے سابق طبیب پروفیسر حکیم محمد زکریا صاحب کی تحویل میں دیا گیا۔ ایک میوزیم اور ایک دار الادویہ بھی قائم کیا گیا۔ ۱۹۲۹ء میں تشریح کی تعلیم کے لیے MODELS اور DIAGRAMS مہیا کیے گئے۔ لائبریری میں بہت سی کتابوں کا اضافہ کیا گیا۔ ۱۹۳۱ء میں ایک بورڈنگ ہاؤس کا انتظام کیا گیا۔ ۱۹۳۲ء میں اوقاتِ تعلیم میں ایک گھنٹہ اور بڑھا دیا گیا۔ اسی سال فرسٹ ایڈ اور ویکسی نیشن کی تعلیم کا بھی بندوبست کیا گیا۔ ۱۹۳۴ء میں زبدۃ الحکماء کی جماعتوں کو پوسٹ گریجویٹ کلاس بنا دیا گیا اور تعلیم کے لیے انجمن نے برانڈرتھ روڈ کے کنارے اپنی دکانوں کے اوپر متعدد کمرے بنا کر طبیہ کالج کے سپرد کر دیے جہاں اب باقاعدہ دن کے وقت

مسلسل ۵ گھنٹے تعلیم دی جاتی ہے۔ پروفیسران کی تعداد سات کر دی گئی اور ان کے سالانہ اخراجات کے لیے ۱۰ ہزار روپے منظور ہوئے۔ اس ادارے کے دروازے غیر مسلموں کے لیے بھی کھلے تھے۔ ۱۹۵۴ء میں ایک مرکزی دواخانہ کھولا گیا جس میں مفرد اور مرکب یونانی دوائیں تیار ہوتی تھیں۔ اس دواخانے میں کالج کے طلبہ کو مفرد ادویہ کی شناخت اور مرکبات کی تیاری کی عملی تعلیم دی جاتی تھی اور عوام صاف اور اچھی دوائیں حاصل کر سکتے تھے۔

۱۹۳۸ء میں اس کے جملہ شعبہ جات میں توسیع ہوئی۔ حکیم حاذق کا کورس بجائے دو کے تین سال مقرر ہوا۔ اس وقت سے اب تک یہ کالج برابر ترقی کر رہا ہے۔

یونانی شفاخانہ (خیراتی) طلبائے طبیہ کالج کی عملی تعلیم کے لیے قائم ہے۔ جو کچھ انھیں طبیہ کالج میں تعلیم دی جاتی ہے یہاں اس پر عمل ہوتا ہے۔ یہاں مریضوں کو مفت دوائیں اور مفت مشورے دیے جاتے ہیں۔ موجودہ اسٹاف ایک طبیب انچارج، ایک دواساز اور ایک خاکروب پر مشتمل ہے۔ مریضوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے اور ۱۹۶۰ء میں یہ تعداد ۵۹۴۴ تک پہنچ گئی۔ اس کالج میں طلباء کی تعداد تقریباً ۱۵۰ ہے اور اب کالج کی پرنسپلی کے فرائض حکیم فضل الٰہی صاحب انجام دے رہے ہیں۔

اس کالج کے فارغ التحصیل طلباء ملک کے ہر حصے میں قوم کی طبی خدمات کامیابی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ شہر کے مختلف محلوں میں شفاخانے کی طرف سے کیمپ لگا کر عوام کی خدمت کی جاتی ہے اور مستحقین کو طبی سہولتیں دی جاتی ہیں۔

ہوسٹل کے لیے کھلی فضا میں عمارت نہ ملنے کی وجہ سے سردست اکبری دروازے کے اندر لاہور کی تاریخی بلڈنگ "آزاد منزل" میں طلباء کو ٹھہرایا گیا ہے۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ کوئی موزوں عمارت مل جائے تاکہ تمام BOARDERS ایک جگہ ہو جائیں۔

۱۹۶۰ء میں نتائج مندرجہ ذیل ہوئے:۔

حکیم حاذق	۸۰ فی صد
زبدۃ الحکماء	سو فی صد

اس کالج کو چلانے اور اس کے انتظام کو درست کرنے کے لیے کالج کی ایک انتظامیہ کمیٹی بنی ہوئی ہے جس کے چیئرمین حکیم محمد حسن صاحب قرشی ہیں۔ انتظامیہ میں حکیم نیر واسطی، حکیم مرزا یحییٰ، ڈاکٹر صادق صاحب ایم بی بی ایس، حکیم چودھری عبداللطیف اور حکیم محمد طالب صاحب ہیں۔ انجمن کی طرف سے شیخ مقبول احمد صاحب ریٹائرڈ سیشن جج اس کالج کے انچارج ہیں۔

ہیلی کالج لاہور قیام: ۱۹۲۷ء — تعداد طلبہ: ۶۰۰

پنجاب کا صوبہ شاہانِ دہلی کے زمانے سے شمشیر زن رہا ہے۔ مسلمانوں نے زرحساب کتاب کی باتیں قیامت پر اٹھا رکھی تھیں لیکن انگریز قوم کے وجود سے صنعت و حرفت اور تجارت میں مہارت پیدا ہوئی۔ انھوں نے ہندوستان اور پاکستان میں تجارت اور بینکنگ کے اصول وضع کیے اور اسی غرض کے لیے ۱۹۲۷ء میں ہیلی کالج آف کامرس کی بنیاد رکھی۔ دراصل اس کالج کو یونیورسٹی پنجاب کا ایک شعبہ کہنا زیادہ مناسب ہے۔ کالج آجکل جس عمارت میں ہے یہ سر گنگا رام نے عطا کی تھی۔ اس عمارت کے ساتھ ساتھ ایک ہوسٹل بھی تھا جس میں طلباء کی رہائش کا بڑا معقول انتظام تھا۔ یونیورسٹی کے اربابِ حل و عقد نے ایک ہال، دو کمرے، ایک ٹک شاپ اور ایک نیا ہوسٹل اور تعمیر کیا۔ اس کالج کا سارا انتظام یونیورسٹی کے تحت ہے۔ انتظامیہ میں ایسے ایسے حضرات شامل ہیں جو ملک میں صنعتی اور تجارتی ترقیوں کے موجب ہیں۔

۱۹۵۳ء تک اس کالج میں B.COM تعلیم کی آخری منزل تھی لیکن ۱۹۵۴ء میں چند امریکی پروفیسروں کی آمد سے M.COM کی ایک سالہ کلاس بھی جاری کر دی گئی۔ واشنگٹن اسٹیٹ یونیورسٹی نے ایم کام کے لیے پروفیسروں کے علاوہ سینکڑوں کتابیں بھی دیں اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے اس کالج کے دو پروفیسروں کو مدعو کیا۔ پروفیسر میتھیز اور ڈاکٹر کینجی (KENJI) نے مل کر اس کالج کی دو برس تک خدمت کی اور پاکستانی طلبا میں اکاؤنٹنسی اور بینکنگ کا ذوق پیدا کیا۔ اس کالج کے طلباء کو درس دینے کے لیے لاہور کے دوسرے کالج کے پروفیسر حضرات بھی تشریف لاتے ہیں۔

اس وقت کالج میں تقریباً ۶۰۰ طلباء زیر تعلیم ہیں اور ربیس حضرات اسٹاف میں شامل ہیں۔ پرنسپل صاحب کا اسم گرامی محمد حسن ہے اور ابھی حال ہی میں اکاؤنٹنسی کی انڈین سوسائٹی نے موصوف کو لائف فیلو شپ کا اعزاز دیا ہے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ پچھلے چھ برس سے اس کالج میں سہ سالہ ڈگری کورس کی رسم چل رہی تھی جسے حکومت نے اب تمام ملک کے لیے مفید سمجھا اور جاری کر دیا۔ اس سال بی کام کا سالانہ نتیجہ ۵۱ فی صد اور ایم کام کا ۹۳ فی صد رہا۔ اس سال سے کالج میں چارٹرڈ اکاؤنٹینسی کی جماعتیں بھی جاری کر دی جائیں گی۔

اس کالج میں ایک بہت بڑی لائبریری ہے جس میں تقریباً ۱۷ ہزار کتابیں ہیں۔ ان کتابوں میں بینکنگ، معاشیات، اقتصادیات اور دوسرے مضامین کی کتب شامل ہیں۔

اس کالج کے میگزین کا نام "الاقتصاد" ہے۔ یہ سال میں صرف ۲ مرتبہ شائع ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میگزین سے طلباء کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

کالج میں طلباء کے آرام کے لیے اور تجارتی سرگرمیوں میں عملی حصہ لینے کے لیے ایک کواپریٹو سوسائٹی بنی ہوئی ہے پچھلے سال اندازاً آٹھ ہزار کا سامان فروخت ہوا جس میں ساڑھے آٹھ سو روپے کا منافع ہوا۔ اس سوسائٹی کے صدر نصیر صاحب ہیں۔

ایم۔ اے۔ او کالج

قیام: ۱۹۳۳ء
تعداد طلباء: ۱۲۰۰

اگر آپ سول سکریٹریٹ لاہور سے چوبرجی کی طرف چلیں تو چند قدم پر کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے سامنے ایک بوسیدہ سی عمارت نظر آئے گی جسے ہر ہر رنگ سے خوش وضع بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہی عمارت محمڈن اینگلو اورینٹل کالج ہے جسے عرفِ عام میں ایم اے او کالج کہتے ہیں۔

یہ کالج انجمن اسلامیہ امرتسر کی تحویل میں کام کر رہا ہے جس کا دائرۂ عمل محض مسلمانوں کی تعلیمی اور اخلاقی جدوجہد تک محدود ہے۔ انجمن اسلامیہ کو جس کا نام مجلس اسلامیہ امرتسر تھا یہ فخر حاصل ہے کہ مسلمانوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے پنجاب میں علم و عمل کا چرچا اس نے شروع کیا۔ سر سید کے جس مشن کو حضراتِ اودھ نے سینے سے لگایا اسے اہلِ امرتسر نے سب سے پہلے اپنا کر ۱۸۷۲ء میں ایک مجلس کی بنیاد ڈالی۔ دو سال کے بعد ۱۸۷۴ء میں یہ درخت بارور ہوا۔ خان بہادر آغا کلب عابد مرحوم اسسٹنٹ کمشنر امرتسر اور خان بہادر منشی محمد مہدی خاں مرحوم سابق وزیر اعظم ریاست بہاولپور نے اپنے لہو سے اس انجمن کو سینچا اور دیکھتے ہی دیکھتے ۱۸۸۵ء میں اسی انجمن کے تحت ایک ہائی اسکول کام کرنے لگا۔ یہی ہائی اسکول ایم اے او ہائی اسکول کہلایا اور ۱۹۳۳ء میں ایم اے او کالج بن گیا۔ انجمن کی اس کوشش کو اس لیے سراہا گیا کہ ہندوؤں کے ۳۲ دانتوں میں مسلمانوں کی ایک زبان تھی۔ ایک طرف سرسید کے مشن کے تحت طلباء انگریزی کے دلدادہ ہوتے جا رہے تھے تو دوسری طرف علماء کے زیر اثر دینیات کی تعلیم کا تقاضا روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔

اس کالج کے اغراض و مقاصد کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کارکنانِ انجمن کو دینی تعلیم کا احساس بے حد تھا۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے اس کالج کے اغراض میں خدا اور رسولؐ کی اطاعت خاص طور پر رکھی حالانکہ مسلمانوں کا اوّلین ایمان اطاعتِ خدا و رسولؐ ہے۔

تحریکِ پاکستان میں اس کالج کے طلبا نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ دیہاتی مسلمانوں کے شعور کو بیدار کیا۔ شہروں میں سیاسی سوجھ بوجھ کے آثار رونما ہو چکے تھے ضرورت تھی کہ یہاں اور آس پاس رہنمائی کی جاتی۔ قائداعظم کی نرم مگر دل ہلا دینے والی آواز نے کالج کے نوجوانوں میں ایک تڑپ ایک ہلچل اور ایک بے چینی پیدا کر دی۔ انھوں نے آزادی کے لیے سر اور دھڑ کی بازی لگا دی اور خون سے ہولی کھیلتے ہوئے پاکستان کے جھنڈے کو بلند رکھا۔ اس دور میں کالج کے پرنسپل مسٹر دلاور حسین ایم اے علیگ تھے۔

۱۹۴۷ء میں کسی کو کسی کی خبر نہ تھی۔ انجمن اسلامیہ کے ممبران جمع ہوئے اور موجودہ متروکہ عمارت پر قبضہ کر کے کالج کا سنگِ بنیاد پھر سے رکھا گیا۔ کالج کے لیے ایک سب کمیٹی بنا دی گئی جس میں سراج الدین پال ایڈووکیٹ اور چودھری محمد یامین کے اسمائے گرامی سرِفہرست ہیں۔ اغراض و مقاصد میں چند ترمیمیں ہوئیں پاکستان سے وفاداری اور اسلامی سیاست کا شعور طلبا کی زندگی کا جزو بنانا۔ مسٹر دلاور حسین ہی پرنسپل منتخب ہوئے اور آج تک اس کالج کو بڑی حسن و خوبی سے چلائے جا رہے ہیں۔

چونکہ اس کالج کے انتظام میں انجمن کے کارکنوں کا دخل بہت زیادہ ہے اس لیے انجمن کی سیاست کے ساتھ ساتھ کالج کی بھی سیاست بدلتی رہتی ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ شیخ غلام صادق صاحب جو شیخ صادق حسن صاحب مرحوم سابق ایڈووکیٹ جنرل حکومت پنجاب کے والد تھے صدر کی مسند پر تھے۔ ان کا انتقال ۱۹۲۱ء میں ہوا۔ ان کی وفات کے ۳۰ سال بعد انجمن کی صدارت اب پھر اسی گھر میں واپس آئی ہے اور اب جناب شیخ مسعود صادق صاحب سابق وزیر مالیات پنجاب جو شیخ غلام صادق صاحب مرحوم کے پوتے ہیں صدر منتخب ہوئے ہیں۔

اس کالج کی امتیازی شان کا ذکر کرتے ہوئے جناب پرنسپل صاحب نے بتایا کہ اس انجمن یا اس کالج نے آج تک کسی کے آگے اپنا ہاتھ نہیں پھیلایا۔ سرچندہ بازی اس درس گاہ کے طلباء کا شعار رہا گیا۔ خیال تو یہ تھا کہ پاکستان بن جانے کے بعد حکومت اس کالج کی سرپرستی کرتی لیکن ہوا تو یہ ہوا کہ انجمن کے اکثر کلیم بھی منظور نہ ہوئے اور کالج کو خسارہ برداشت کرنا پڑا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج تک کالج اپنی عمارت کو مکمل نہ کر سکا۔ حکومت کی طرف سے کالج کو ۲۰ ہزار روپے کی سالانہ گرانٹ ملتی ہے۔

کالج کی علمی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے پرنسپل صاحب نے بتایا کہ قوم کے اکثر طلباء جب کسی کالج میں داخلہ نہیں پاتے تو یہی کالج ان کی دستگیری کرتا ہے پھر بھی اس سال بی اے میں کا نتیجہ گورنمنٹ کالج کے بعد سب سے اچھا رہا۔ اسٹاف ۳۰ ممبران پر مشتمل ہے جن میں اچھی قابلیت اور وسیع تجربے کے اساتذہ شامل ہیں۔ طلباء کی کل تعداد ۱۴۰۰ کے لگ بھگ ہے۔ اس کالج میں دو ہوسٹل ہیں جن میں کئی سو طلباء رہائش پذیر ہیں۔

کالج کا انتظام ایک کالج کونسل کرتی ہے جس کے ذمہ مندرجہ ذیل امور ہیں:۔

۱۔ جملہ انتظامی امور

۲۔ مالیات کا کنٹرول

۳۔ ہوسٹل کا نظام

کالج کا ایک میگزین بھی ہے جس کا نام شفق ہے لیکن دیکھنے میں کم آتا ہے۔

اسلامیہ کالج برائے مستورات

قیام: ۱۹۳۹ء
تعداد طالبات: ۱۲۳۰

دلّی میں مولوی نذیر احمد اور پنجاب میں خلیفہ عماد الدین، حاجی شمس الدین اور بابائے انجمن حمایتِ اسلام منشی نجم الدین کو لڑکیوں کی تعلیم کا بے حد خیال تھا لیکن ان کے عہدِ حیات میں ان کی تمنائیں پوری نہ ہو سکیں۔ ہاں ان کی آرزو ۱۹۳۹ء میں اس طرح پوری ہوئی کہ انجمن نے کوپر روڈ پر ۱۹۳۲ء میں ایک کوٹھی خریدی تھی اور اسے مسمار کر کے زنانہ کالج کے لیے ایک عالیشان عمارت بنا دی۔ اس کالج کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ نوجوان مسلم طالبات کو اسلامی روایات کے سانچے میں ڈھالا جائے۔ ڈگریاں حاصل کرنے کے لیے لاہور میں بہت سے اسکول تھے جن میں "کو ایجوکیشن" ہو رہی تھی اور ہماری بہت سی بہنیں اور بیٹیاں زمانے کی نیرنگیوں کا ساتھ دینے کے لیے تعلیم حاصل کر رہی تھیں لیکن ترقی پسند مسلم سوسائٹی کے لیے اعلیٰ اور مفید ممبر فراہم کرنا ایک اہم فریضہ تھا۔ بدلتے ہوئے ماحول کے ساتھ ساتھ چلنا اور اپنی قومی روایات کو مجروح نہ ہونے دینا یہی اس کالج کی وجہِ بنیاد تھا۔ مسلسل اکیس سال سے یہ کالج مسلمان لڑکیوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کر رہا ہے اور آج اس کالج میں طالبات کی کل تعداد ۱۲۳۰ ہے۔

اچھی تعلیم کے لیے مناسب عمارت اور وافر جگہ کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ کچھ عرصہ قبل اس کالج میں شجاع الدین ہال کی تعمیر ہوئی ہے اور کچھ حصے پر کمرے بھی تعمیر ہوئے ہیں لیکن تعلیم کا مسئلہ وہیں کا وہیں رہا۔ ۱۹۶۰ء میں سائنس بلاک بن کر تیار ہو گیا اور اب اس کالج میں ایک بہترین لیبارٹری پورے آلات سے مزیّن موجود ہے۔ ابھی تک کالج کے کمروں ہی میں دفتر قائم تھا لیکن اب دفتر کی بلڈنگ علیحدہ تعمیر ہو گئی ہے اس لیے دفتر کے کمرے بھی طالبات استعمال کر سکیں گی۔ انجمن نے تین کمروں کے بنانے کی اور اجازت دے دی ہے اور آئندہ یہ کمرے بی کلاس کے لیے استعمال ہو سکیں گے۔

طالبات کی تعداد میں اضافہ ہونے کی وجہ سے ہوسٹل میں بھی تعداد طالبات بڑھنے لگی اس لیے طے پایا کہ مزید پانچ کمرے تعمیر کر کے اس کمی کو پورا کیا جائے۔

حکومت کی طرف سے اس کالج کو ۲۵ ہزار روپے سالانہ کی گرانٹ ملتی ہے یہ رقم کالج کے کل اخراجات کا ۹ فی صد ہے ظاہر ہے کہ بقیہ رقم چندے سے حاصل ہوتی ہے اور ایسے اداروں میں جہاں آمدنی کا کوئی تخمینہ نہ ہو حالات صحیح اور مناسب نہیں رہ سکتے۔ ایسے نازک وقت میں حکومت کا اوّلین فرض ہے کہ نادار کالجوں کی ہمت افزائی کرے ورنہ واقعات اور حالات کی رو اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ جلد یا بدیر ایسے کالجوں کو بند کرنا پڑے گا۔

ایجوکیشن کمیشن نے کالجوں پر جو بوجھ ڈالا ہے یہ کالج اسے بحسن و خوبی پورا کر رہا ہے۔ سہ سالہ ڈگری کورس کی ابتدا ہو چکی ہے لیکن آئندہ کے لیے تنگیٔ جا کا کھٹکا ابھی سے پریشان کر رہا ہے۔ دوسرے ممالک میں پبلک اداروں کو چلانے کے لیے اعزازی پروفیسر امداد کرتے ہیں لیکن پاکستان میں اس قسم کا تصوّر بھی حرام سمجھا جاتا ہے۔ غنیمت ہے کہ اس کالج میں کچھ اعزازی پروفیسر کام کرتے ہیں مگر تابکے؟ آئندہ سال میں مزید لکچراروں کی ضرورت ہے اور کارکنانِ انجمن ابھی سے متفکر ہیں۔

اس کالج کی لائبریری کی عمارت بہت بوسیدہ ہو چکی ہے اور ضرورت ہے اسے مسمار کر کے دوسری عمارت بنائی جائے یہی سبب ہے کہ لائبریری کو ایک کلاس روم میں منتقل کر دیا گیا ہے اس وقت لائبریری میں تقریباً سات ہزار کتابیں ہیں لیکن مزید کتابوں کی ضرورت ہے۔ یہ کالج ہر سال ایک مینا بازار لگاتا ہے اور اس سے ہزار ڈیڑھ ہزار روپیہ جمع کر کے کبھی کالج ہال کبھی کمرے اور کبھی لائبریری روم

تیار ہوتا ہے۔

اس کالج کا معیار تعلیم بلند ہے۔ ۱۹۶۰ء میں ایف اے کا نتیجہ ۷۶ر۶۷ رہا جبکہ بورڈ کا نتیجہ ۳۲ فی صد تھا۔ اس کالج کا بی اے کا نتیجہ ۳ر۴۶ تھا جبکہ یونیورسٹی کا نتیجہ ۳۲ فی صد تھا۔

یہ کالج اپنی پسماندگی کے باوجود ۳۴۲ طالبات کو وظیفہ دیتا ہے جس میں انجمن کی طرف سے فیسوں کی رعایت بھی شامل ہے۔ مجموعی رقم جو طالبات کو ادا کی جاتی ہے ۴۹۰ ۲۹ روپے ہے یعنی حکومت کی سالانہ گرانٹ سے ۹۰ ۴ روپے زائد۔ ایسے حالات میں اگر مخیر حضرات بھی اپنا ہاتھ روک لیں (جیسا کہ اکثر ہوتا ہے) تو یہ کسی ایک انجمن کا نقصان نہیں ہوگا بلکہ کل قوم کا عظیم نقصان متصور ہوگا۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ کھیلوں کے میدان میں بھی اس کالج نے نام پیدا کیا ہے۔ سکنڈری ایجوکیشن بورڈ کے ۱۹۶۰ء میں ہونے والے انٹر کالج اسپورٹس میں، پچاس اور سو اور دو سو میٹر فلیٹ ریس میں اسی کالج کی طالبہ جمیلہ اوّل آئیں۔ ریلے ریس میں بھی اس کالج کو اوّل انعام ملا۔

تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اس کالج میں ادبی سرگرمیوں کا بھی زور ہے۔ ہر سال ایک کل پاکستان مشاعرہ منعقد کیا جاتا ہے جس میں کراچی، پشاور اور ڈھاکہ سے شاعرات تشریف لاتی ہیں۔ اس مشاعرے کی آمدنی بھی ہال فنڈ میں جمع ہو جاتی ہے۔ پچھلے سال اس کالج کی طالبات روشن آراء اور نزہت نے انٹر کالج گلبرگ، کی ٹرافی جیتی۔

اس کالج کی طالبات کے ذوق کی تسکین کے لیے ایک کالج میگزین بھی نکلتا ہے جس میں اُردو اور انگریزی مضامین شامل ہوتے ہیں۔ مجلّہ کا معیار ایک اعلیٰ کالج کے معیار کے مطابق نہیں ہے۔

انٹرمیڈیٹ کالج گلبرگ

قیام : ۱۹۵۷ء
تعداد طلباء : ۴۰۰

لاہور میں تعلیم کی بڑھتی ہوئی رفتار اور مقامی کالجوں میں الٹی ہوئی "نو ایڈمیشن" کی تختیوں کو دیکھ کر حکومت پنجاب نے گلبرگ میں ایک نیا کالج ۱۹۵۷ء میں اس لیے کھولا کہ قوم کے نوجوانوں کو علم کی پیاس بجھانے کے مواقع میسر آ جائیں۔ اس کالج کے لیے حکومت کے پاس کوئی عمارت نہ تھی اس لیے گلبرگ میں ۴۰۰ اروپے ماہوار کرایہ پر ایک کوٹھی جس میں محض چند کمرے ہیں کچھ عرصے کے لیے لے لی گئی۔

اس کالج کی اپنی عمارت سمن آباد میں دس لاکھ روپے کی لاگت سے تیار ہو رہی ہے۔ جس وقت کالج شروع کیا گیا نہ طلباء تھے نہ اساتذہ مجبور ہو کر کچھ فیل شدہ طلباء کو لے کر کلاسیں شروع کی گئیں۔ ڈاکٹر اُپل اس کالج کے پرنسپل بنائے گئے اور طلباء کی تعداد آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔ اُپل صاحب کے بعد سید رضا حسین صاحب ڈپٹی سیکرٹری تعلیم نے پرنسپل کے فرائض ادا کیے۔ کچھ ہی عرصے کے بعد چودھری محمد اسلم صاحب نے اس کشتی کی ناخدائی کی۔ چودھری صاحب کے بعد پروفیسر شبیر احمد نے اس کالج کے انتظامات کو سنبھالا لیکن آپ جھنگ میں پرنسپل ہو کر چلے گئے اور آج کل ایم آر طوسی صاحب پرنسپل ہیں گویا ۴ سال میں پانچ پرنسپل آئے۔ ان تمام حضرات نے اس کالج کی خاطر کیا کچھ کیا ہوگا اس کے بتانے کی بالکل ضرورت نہیں۔ موجودہ پرنسپل صاحب اپنے تجربہ کے لحاظ سے بہت سینئر آفیسر ہیں لیکن اس تم ظریفی کا کیا علاج کہ کالج تو گلبرگ میں ہے لیکن گلبرگ کے تمام طلباء یا تو ایف سی کالج میں زیر تعلیم ہیں یا گورنمنٹ کالج میں نتیجہ یہ ہے کہ لاہور (سٹی) کے طلبہ کی اچھی خاصی تعداد اس کالج میں موجود ہے جن کی حیثیت خراب اور حالت خستہ ہے۔

جب کالج کی اپنی کوئی عمارت نہیں تو ہوسٹل کا سوال ہی بیکار ہے۔ سُنا گیا ہے کہ ہوسٹل کے لیے حکومت کی مشینری کو بارہا تکلیف دی گئی ہے

لیکن نتائج وہی ڈھاک کے تین پات رہے۔ اس کالج میں کئی انجمنیں ہیں جن میں کالج یونین بڑی مستعد ہے۔ چونکہ طلباء اور اساتذہ دور دراز سے یہاں تشریف لاتے ہیں اس لیے تین بجتے ہی روانگی کی فکر کرنے لگتے ہیں یہی وجہ ہے کہ یونین کا اجلاس ہفتہ کو کالج ٹائم ہی میں کر دیا جاتا ہے تاکہ طلباء کم سے کم شریک ہو کر یونین کے احساس وجود سے تو واقف ہو جائیں۔

کالج میں ایک لائبریری ہے۔ لائبریری کی کتابوں کے لیے حکومت نے ۶۰۰۰ روپوں کی گرانٹ دی ہے کتابیں فورڈ فاونڈیشن والوں نے عطا کی ہیں۔ طلباء کے مذاق کی کتابیں مفقود ہیں۔

ایف اے میں اُردو لازمی ہو جانے کے بعد ضروری تھا کہ ۵۰ طلباء کے لیے کم سے کم تین لکچرار رکھے جاتے لیکن سر دست فرسٹ ایئر اور سیکنڈ ایئر کے لیے صرف ایک ہی اُردو کے لکچرار ہیں اور وہی شعبہ اردو کے صدر بھی ہیں۔ پرنسپل صاحب نے اپنے حسن انتظام سے طلباء کی ضرورت کو بہر حال کسی حد تک پورا کر دیا ہے اور وہ اس طرح کہ کچھ پیریڈ لائبریرین صاحب کو دے دیے جاتے ہیں جو اس کالج میں اپنا ڈویژن IMPROVE کرنے کے لیے رکھے گئے ہیں۔ باقی اوقات فلسفے کے استاد کو مل گئے ہیں جنھوں نے اس بار کو بخوشی منظور کر لیا ہے۔

اس کالج کا نتیجہ خراب ہے اور جب تک حکومت اس کالج پر توجہ نہ دے گی یہ خرابی بدستور رہے گی۔

نیو مسلم کالج قیام: ۱۹۶۱ء طلبہ: ۴۰

مسلمان طلباء اور طالبات کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے دیگر اسلامی انجمنوں کی طرح احمدیہ انجمن اشاعتِ اسلام نے بھی شہر لاہور میں دو ہائی اسکول اور ایک کالج "تعلیم الاسلام کالج" جاری کیا تھا۔ تعلیم الاسلام کالج ۱۹۵۵ء میں ربوہ میں منتقل ہو گیا اور اس کی بلڈنگ میں اس وقت اسلامیہ کالج سول لائنز کام کر رہا ہے۔ انجمن اس بات کو بڑی شدت سے محسوس کر رہی تھی کہ لاہور میں اسی انجمن کے تحت ایک کالج قائم کیا جائے چنانچہ اسی سال مسلم اسکول نمبر ا کی عمارت میں نیو مسلم کالج کے نام سے ایک کالج قائم کر دیا گیا اور اس کے پرنسپل جناب محمد شفیع صاحب بھٹی مقرر ہوئے ہیں۔ بھٹی صاحب وہی شخص ہیں جنھیں ایف سی کالج نے تادم حیات پروفیسر کی اعزازی ڈگری عطا کی ہے۔ یہ پہلا اعزاز ہے جو کسی پاکستانی کو پاکستان میں ملا ہے۔

پرنسپل موصوف نے بتایا کہ سکنڈری بورڈ نے اس کالج کی منظوری کے لیے احکام صادر کر دیے ہیں۔ سر دست اس کالج میں صرف بارہ اساتذہ ہیں اور ۴۰ کے لگ بھگ طلباء ہیں لیکن اس کالج کے اغراض و مقاصد کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کالج میں ۴۰۰ طلباء تک کی تعداد اور بھی جائے گی

پرنسپل موصوف نے اپنے کالج کی چار خصوصیات کا تذکرہ اپنے دستور العمل میں کیا ہے۔

(۱) خدمتِ خلق (۲) حب الوطنی (۳) پابندیٔ وقت (۴) فرض شناسی

آپ نے وعدہ کیا ہے کہ اس کالج کے طلباء انشاءاللہ ان اصولوں کے پابند رہیں گے۔ پرنسپل صاحب نے بتایا کہ جس عمارت میں یہ کالج کھولا گیا ہے وہ اسکول کے قبضے میں ہے اور عمارت کے ½ حصے پر کچھ اور لوگوں کا زبردستی قبضہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم انھیں نکال کر حکومت کے لیے پریشانی کا موجب تو نہیں بننا چاہتے مگر جب ہمارے پاس بیٹھنے کی جگہ نہ ہو تو آخر ہم بھی کیا کریں۔ اس عمارت میں ایک تالاب بھی ہے جس کی حالت اچھی نہیں۔

موسیقار

سراج نظامی

اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ جس طرح لاہور تعلیم، شعر و شاعری، ادب، صحافت، مصوری اور پہلوانی میں مغربی پاکستان کا مرکز ہے اسی طرح موسیقی کا بھی مرکز ہے۔ اگر اسے اقبال، ظفر علی خان، سر عبدالقادر، عبدالرحمن چغتائی، استاد اللہ بخش اور گاماں پہلوان پر فخر ہے تو اُسے کالے خان، علی بخش خاں، غلام علی خاں، ماسٹر غلام حیدر، ماسٹر غلام احمد چشتی، فیروز نظامی اور خواجہ خورشید انور جیسے موسیقاروں پر بھی بجا ناز ہے۔

تقسیم ہندوستان اور قیام پاکستان کے بعد لاہور کے موسیقاروں میں اتنا اضافہ ہو گیا ہے کہ اس چھوٹے سے مضمون میں سب کے حالات بیان نہیں کیے جا سکتے، ہم یہاں صرف مشہور و معروف موسیقاروں کے حالات پر اکتفا کریں گے۔

ہم نے لاہور کے موسیقاروں کو بارہ قسموں میں تقسیم کیا ہے :-

(۱) گویّے (۲) ہلکی پھلکی موسیقی گانے والے (۳) گانے والیاں (۴) سارنگی نواز
(۵) طبلہ نواز (۶) ستار نواز (۷) قوال (۸) میوزک ڈائریکٹر
(۹) کلارنٹ نواز (۱۰) پیانو نواز (۱۱) نے نواز (۱۲) سرود نواز

۱- گویّے

۱- کالے خان آپ پنجاب کے مردم خیز شہر قصور کے مطربوں کے کلاونت خاندان کے چشم و چراغ تھے، آپ کے آبا ؤ اجداد کابل کے افغان سرداروں کے ساتھ پنجاب میں وارد ہوئے اور قصور میں مقیم ہو گئے، جب آپ نے ہوش سنبھالا تو آپ کو اس عہد کے مشہور موسیقار استاد فتح علی خان پٹیالوی کے سپرد کیا گیا جنھوں نے کمال تندہی سے آپ کو استادی موسیقی کی تعلیم دی، اور بہت جلد آپ کا شمار پنجاب کے چوٹی کے موسیقاروں میں ہونے لگا۔ آپ کا رنگ بہت سیاہ تھا، آنکھیں بڑی بڑی، تن و توش پہلوانوں کا سا تھا، اور چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں تھیں، جن سے آپ کا چہرہ بڑا بارعب لگتا تھا، جنھوں استاد بڑے غلام علی خاں کو دیکھا ہے وہ کالے خان کے جسم کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ طبیعت عجیب پائی تھی، ہمیشہ کھوئے کھوئے سے رہتے تھے، اسی لیے عوام میں کالے خان شوری کے نام سے مشہور تھے، عام لوگوں میں اس بات کا چرچا ہے کہ ایک مرتبہ اپنے استاد

فتح علی خان کے ساتھ ل کر گانے لگے، تو مقابلہ پر اُتر آئے۔ فتح علی خاں نے کہا "جا رے پگلے"، بس اسی دن سے ان کی طبیعت میں ایک جنون کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ آپ نے پنجاب اور ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں اپنے کمال فن کا مظاہرہ کیا اور استادوں سے داد تحسین حاصل کی، جب آپ خیال یا ترانہ گاتے اور تانیں مارتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے کوئی شیر دھاڑتا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ کالے خان اور بھائی ارودڑہ دربار داتا گنج بخش میں گا رہے تھے، میں اُن دنوں اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ میں پڑھتا تھا، مجھے اُن کی تانوں کی آواز سکول کی گراؤنڈ میں صاف سنائی دے رہی تھی، اس سے آپ ان کی آواز کا اندازہ لگا لیں۔

آپ کے متعلق عجیب و غریب حکایات مشہور ہیں۔ آپ حویلی میاں خاں کے سامنے کٹڑہ نادر شاہ میں رہا کرتے تھے۔ ایک دن آپ نے خوب گھی اور مسالے ڈال کر گوشت بھونا، اور دیگچی کو الماری میں رکھ دیا، اتفاق سے پولیس کسی چوری کے سلسلہ میں آپ کے محلہ میں آگئی، اُنھوں نے جو دیکھا کہ ایک کوٹھڑی میں ایک کالا کلوٹا پہلوان لنگوٹ باندھے بیٹھا ہے، تو اُنھوں نے شبہ میں آپ کی کوٹھڑی کی بھی تلاشی لینا چاہی۔ آپ اُچھل کر کھڑے ہو گئے، اور الماری کے ساتھ پشت لگا کر کہنے لگے، کہ الماری کے سوا ہر جگہ کی تلاشی لے لیں۔ پولیس والوں کا شبہ اور قوی ہو گیا، اور وہ الماری کی تلاشی لینے پر مصر ہو گئے، لیکن جب تلاشی لی گئی، تو اُس میں سے دیگچی کے سوا کچھ نہ نکلا، پولیس والے ہنسنے لگے، کالے خاں بولے: "اب اس گوشت کو تم ہی لے لو، میں نہیں کھاؤں گا، اسے نظر لگ گئی ہے"!

آپ کا معمول تھا کہ ہر روز گوشت بھونتے، دیسی شراب کا ایک پوا لیتے، اور تیل، صابن اور لنگوٹ ان تمام اشیا کو ایک چھتری میں ڈال لیتے، اور ٹکسالی دروازہ کے باہر کارپوریشن باغ میں پہنچ جاتے، چھتری زمین میں گاڑ دیتے، لنگوٹ کستے تیل ملتے اور پھر دونوں ہاتھوں کے نیچے دو اینٹیں رکھ کر ڈنڈ پیلتے، اور ساتھ ساتھ تانیں بھی مارتے جاتے، اور یوں موسیقی کی ریاضت کرتے، کسرت کے بعد نہر میں نہاتے، کپڑے پہنتے، گوشت کھاتے، شراب پیتے اور وہاں سے سیدھا تکیہ اور ہیرا منڈی کو ہو لیتے، ایک مرتبہ آپ اسی حالت میں چلے آ رہے تھے کہ کسی نے آپ کو اپنے ہاں بٹھا لیا اور پردیپکی راگ سنانے کی فرمائش کی، آپ کہنے لگے "وہ کونسا راگ ہے، مجھے تو نہیں آتا" لیکن چند منٹ کے بعد کہنے لگے "لو بھئی پردیپکی آگیا!" پھر جو گاتے تو یوں معلوم ہونے لگا جیسے فضا میں پردیپکی کا ہی تسلط ہے۔

ایک دفعہ لاہور کے ایک مشہور ڈیرہ دار نے موسیقی کی محفل منعقد کی، اور کالے خان کو گانے کی دعوت دی، قصور کے ایک مشہور سارنگی نواز غلام محمد سے ان دنوں ان کی بول چال نہ تھی، لوگوں نے خواہش کی کہ کالے خان گائیں اور اُن کے ساتھ غلام محمد قصوری سارنگی پر سنگت کریں، جن لوگوں نے یہ محفل دیکھی ہے اور کالے خان کا گانا اور غلام محمد کی سارنگی سنی ہے وہ آج بھی سر دھنتے ہیں، دونوں فنکاروں نے اپنا پورا زور لگا دیا، آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ دونوں رونے لگے اور بغلگیر ہو گئے، اور یوں دونوں کی رنجش جاتی رہی۔

مرنے سے کچھ دن پہلے کا واقعہ ہے کہ آپ نے لکھنؤ میں گانا سنایا، جہاں سے کافی انعام ملا، آپ نے شراب پی، دریائے گومتی کے کنارے پہنچے اور پچاس روپے گومتی میں پھینک کر کہا "لے خواجہ خضر، یہ تیری نذر ہیں!" پھر اصغر علی محمد علی

عطر والوں کی دوکان پہ پہنچے اور اچھی خاصی رقم کا عطر خریدا، تھوڑا سا کپڑوں پر لگایا اور باقی سارا اپنی بڑی بڑی مونچھوں پر مل لیا۔ عطر والوں نے حیران ہو کر پوچھا: "خان صاحب یہ کیا کیا آپ نے؟" کہنے لگے: "بھیا یہ کپڑے تو یہیں رہ جائیں گے مگر کم بخت مونچھیں تو قبر میں ساتھ جائیں گی!"

اس کے چند دن بعد آپ کا انتقال ہو گیا، حقیقت یہ ہے کہ کالے خان کی جگہ ابھی تک کسی موسیقار نے پر نہیں کی۔

۲۔ علی بخش خاں

آپ کالے خاں کے سگے بھائی تھے، اور خیال، ترانہ، ٹھمری گانے اور سرگم کرنے میں بے عدیل تھے۔ پہلے پہل آپ دلربا بجایا کرتے تھے، ایک مرتبہ غالباً کانپور میں ایک طوائف کے مکان پر محفل موسیقی منعقد ہوئی، کالے خاں گانے کے لیے بیٹھے، اور علی بخش خان سے کہنے لگے کہ ذرا طنبورہ چھیڑ کر میرے ساتھ آواز لگاتے جاؤ۔ علی بخش آواز لگانے لگے مگر کہاں کالے خان کی آواز اور کہاں علی بخش خان کا گلا، مصیبت میں پھنس گئے، خیر جوں توں کر کے وقت نبھایا لیکن غیرت جو آئی تو سیدھا کلکتہ جا پہنچے؛ وہاں ہندوستان کی مشہور مغنیہ گوہر جان کی سفارش پر بھیندر ناتھ جی کے شاگرد ہو گئے، اور چند برسوں میں سرگم کے استاد بن گئے، اب جو واپس آ کر اپنے بھائی کالے خان کو گانا سنایا تو وہ بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ ہاں اب تو میرا حقیقی بھائی ہے، اس کے بعد جس محفل میں دونوں بھائی گاتے، کالے خان تان کہتے اور علی بخش خان اس تان کی سرگم کرتے تو ہر طرف سے واہ واہ کے ڈونگرے برسنے لگتے۔

کالے خان کی وفات کے بعد علی بخش خان تنہا گاتے رہے اور بڑی بڑی ریاستوں سے انعام و اکرام حاصل کیا۔ آپ کی وفات لاہور ہی میں ہوئی۔ کالے خان کے مقابلے میں علی بخش خاں نہایت ہی خوب رو تھے۔

۳۔ بڑے غلام علی خاں

آپ کالے خاں کے بھتیجے اور علی بخش خان کے صاحبزادے ہیں۔ آپ کا شمار پاکستان اور ہندوستان کے چوٹی کے موسیقاروں میں ہوتا ہے۔ آپ نے موسیقی کی تعلیم کالے خاں اور علی بخش خاں سے حاصل کی، اور جن لوگوں نے آپ کا گانا سنا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ چچا اور والد دونوں کا رنگ آپ کے گانے میں نمایاں ہے، جب آپ تانیں مارتے ہیں تو کالے خاں دکھائی دیتے ہیں اور جب تانوں کی سرگم پر آتے ہیں تو علی بخش خاں نظر آتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ آواز اتنی پاٹ دار اور رسیلی ہے کہ معلوم ہوتا ہے سرسوتی دیوی گا رہی ہے اور کانوں میں رس گھول رہی ہے۔

گانے کے علاوہ آپ سارنگی بھی بجاتے رہے ہیں۔ ریاستوں اور موسیقی کی نجی محفلوں اور کانفرنسوں میں آپ نے کافی حصہ لیا ہے، اور اپنا لوہا منوایا ہے، مہاتما گاندھی جی بھی آپ کے گانے سے محظوظ ہوتے تھے جشن استقلال میں ہر سال دربار کابل میں گاتے ہیں۔

آپ نے کچھ عرصہ استاد عبدالوحید خان کیرانوی سے بھی گانا سیکھا، مگر زیادہ تر آپ پٹیالہ کے مکتب موسیقی کی نمائندگی کرتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد ناقدری زمانہ کے باعث آپ بمبئی چلے گئے، اور ہندوستانی قومیت اختیار کر لی، آجکل آپ وہیں مقیم ہیں، فالج کے حملے نے کمزور کر دیا ہے۔

۴۔ مبارک علی خاں علی بخش خاں کے فرزند اور بڑے غلام علی خاں کے چھوٹے بھائی تھے، آپ نے موسیقی اپنے والد اور بھائی سے سیکھی، اور بہت اچھا گانے لگے۔ خیال اور ٹھمری بہت عمدہ گاتے تھے، کچھ عرصہ آپ نے فلمی اداکاری بھی کی، آخری عمر میں آپ نے ایک میوزک سکول بھی کھولا، مگر افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی، اور یہ جوان سال مغنی داغِ مفارقت دے گیا۔

۵۔ امانت علی خاں آپ بھی بڑے غلام علی خاں کے چھوٹے بھائی ہیں۔ اور گانے اور آواز کے رسیلے پن میں خاندانی روایات کے حامل ہیں۔ ابھی نوجوان ہیں، قرائن بتا رہے ہیں کہ اگر آپ اسی طرح گاتے رہے تو باپ دادا کا نام روشن کریں گے۔

۶۔ چھوٹے غلام علی خاں قصور کے مطربوں کے نقیب خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، موسیقی کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، ابھی چھوٹے ہی تھے کہ موسیقی کی محفلوں میں گانے لگے اور اپنی خداداد قابلیت کے باعث اچھے گانے والوں میں شمار ہونے لگے۔ نہایت خوبصورت اور خوش خلق ہیں۔ خیال، ترانہ۔ ٹھمری۔ دادرا اور غزل گانے میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ ریڈیو پاکستان سے اکثر استادی موسیقی نشر کرتے ہیں۔ نجی محفلوں میں بھی گاتے ہیں۔ محرم الحرام میں سوز خوانی بھی کرتے ہیں اور حق تو یہ ہے کہ خوب کرتے ہیں۔ خلوص کا پیکر ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان کی اکثر بڑی بڑی میوزک کانفرنسوں میں شریک ہو کر اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔

۷۔ اختر حسین خاں آپ پٹیالہ کے مشہور گھرانے کے فرد، مشہور موسیقار علی بخش خاں عرف جرنیل صاحب کے فرزند ارجمند، اور فتح علی خاں کے بھتیجے ہیں۔ فتح علی خاں اور علی بخش خاں اپنے وقت کے استاد مانے جاتے تھے، مہاراجہ پٹیالہ کے درباری موسیقار رہے، انھوں نے ان کے فن کی داد دیتے ہوئے فتح علی خاں کو کرنیل اور علی بخش خاں کو جرنیل کہا، اور وہ اسی عرف عام سے مشہور ہو گئے۔ روایت ہے کہ جب ان دونوں موسیقاروں کے والد نے انھیں استادی موسیقی کی کما حقہٗ تعلیم دے دی، تو انھیں ساتھ لے کر ہندوستان کے دورے پر نکلے اور اکثر مقامات پر لوگوں کو ان کا گانا سنایا اور داد لی، اسی اثنا میں ایک ریاست میں پہنچے جس کے دربار میں استاد مرچ نامی ایک سارنگی نواز ملازم تھا اور کسی گویے کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ اسی دربار میں فتح علی خاں اور علی بخش خاں جرنیل گئے اور مرچ خاں نے سارنگی پر سنگت کی، دونوں طرف سے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا گیا، آخر مرچ خاں ہار گیا اور اس نے سارنگی زمین پر پھینک کر کہا: "کم بخت ہاتھ کا ساز تھا نا، گلے کا ساتھ نہ دے سکا" اور اسی غم میں خودکشی کر لی۔

اختر حسین خاں نے انہی جرنیل صاحب یعنی اپنے والد سے تعلیم حاصل کی، انھوں نے انھیں استادی موسیقی کی ہر صنف کی تعلیم دی، اور آپ نے لاہور کی کئی محفلوں میں کمال فن کا مظاہرہ کر کے داد لی، اس وقت پٹیالہ کے گھرانے کے خلیفہ آپ ہی ہیں۔

۸۔ امانت علی خاں فتح علی خاں یہ دونوں جوان سال موسیقار اختر حسین خاں کے بیٹے اور جرنیل صاحب پٹیالوی کے پوتے ہیں۔ دونوں نے موسیقی کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، اور تھوڑے

عرصہ میں اچھے موسیقاروں کی فہرست میں شمار ہونے لگے ، سچی بات تو یہ ہے کہ پٹیالہ کی گائیکی کی صحیح نمائندگی کرتے ہیں۔ فن موسیقی کے واقف کاروں کا کہنا ہے کہ فتح علی خاں میں اپنے دادا جرنیل صاحب کی ساری صفات اور صلاحیتیں موجود ہیں اور اگر یہ اسی طرح ریاضت کرتے رہے تو اُن کا نام زندہ رکھیں گے ۔

۹ - عاشق علی خاں آپ پٹیالہ کے مشہور موسیقار فتح علی خاں کے فرزند ارجمند تھے ۔ ابھی بچہ ہی تھے کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا ، اور آپ لاہور چلے آئے ، یہاں کس مپرسی کی حالت میں رہنے لگے ، کہنے کو تو لاہور کے سارے موسیقار فتح علی خاں کی شاگردی پر فخر کرتے ہیں ، مگر اُن کے یتیم فرزند کا ہاتھ کسی نے نہ پکڑا ۔ اگر سردار بائی کا دم نہ ہوتا تو پتہ نہیں اس ڈیڑھ نا باپ کا کیا حال ہوتا ۔ بچپن ہی سے طبیعت میں لا اُبالی پن تھا ، عرصہ تک بھنگ اور چرس کے رسیا رہے ۔ جب نشہ میں آتے اور گاتے تو عجیب لطف آتا ۔ آپ کی آواز میں عجیب رس تھا ، کچھ عرصہ بعد یکایک کایا پلٹی اور آپ نے اپنے ماموں سے گانے کی تعلیم حاصل کرنی شروع کر دی اور دیکھتے دیکھتے عاشق علی خاں اپنے وقت کے تمام گویوں پر چھا گئے ، ہندوستان میں جس طرف بھی گئے اپنے فن کا لوہا منوا کر ہی آئے ۔ ایک مرتبہ کلکتہ میں ایک میوزک کانفرنس میں استاد احمد جان تھرکوا ان کے ساتھ طبلہ بجانے بیٹھے اور پوچھنے لگے کہ کونسا تال بجاؤں ، آپ نے کہا جونسا آپ کا جی چاہے ، پھر جو تانیں اڑائی اور گٹکری پکڑنا شروع کیا تو سامعین کا یہ حال تھا کہ تالیاں بجاتے اور کرسیوں سے اُچھلتے تھے ۔ لاہور میں بھی آپ نے سینکڑوں مرتبہ اپنے فن کا مظاہرہ کیا ، آپ کے بے شمار شاگرد ہیں ، جن میں سے زیادہ مشہور امرتسر کی مختار بیگم اور فریدہ خانم ہیں ۔

آپ لاہور ہی میں فوت ہوئے اور تکیہ مراثیاں چیمبرلین روڈ میں دفن ہوئے ۔

۱۰ - پیارے خاں آپ جنڈیالہ گورو ضلع امرتسر کے باشندے تھے اور مشہور موسیقار بنے خاں کے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے ۔ موسیقی آپ نے پٹیالہ کے جرنیل صاحب سے سیکھی ، اور چند برسوں کی ریاضت کے بعد چوٹی کے موسیقاروں میں شمار ہونے لگے ، آپ ہندوستان کے اچھے اچھے گویوں کے ساتھ گائے ۔ زیادہ تر علاقہ سندھ میں رہے ، اونچے لمبے کڑیل جوان تھے ، جب لمبے لمبے ہاتھ ہلا کر گاتے تھے تو سماں بندھ جاتا تھا ۔ گوردوارہ چھمن شاہ ضلع منٹگمری کے صاحب ذوق مہنت آپ کے قدردانوں میں سے تھے ۔ مرحوم نواب خیرپور بھی آپ کے مداحوں میں سے تھا ۔ آپ عرصہ تک اس دربار سے منسلک رہے ۔ طبیعت بڑی خوش باش تھی ، آپ لاہور میں فوت ہوئے اور یہیں دفن ہوئے ۔

۱۱ - امید علی خاں پیارے خاں صاحب کے بڑے فرزند ہیں ۔ اور پاکستان کے اچھے موسیقاروں میں شمار کیے جاتے ہیں آپ نے موسیقی اپنے والد سے سیکھی ، اور بہت جلد اس میں نام پیدا کر لیا ۔ اہلِ لاہور کو وہ محفلیں اچھی طرح یاد رہیں گی جن میں بڑے غلام علی خاں ، عاشق علی خاں اور امید علی خاں نے اپنے اپنے کمال کا مظاہرہ کیا اور سامعین سے داد لی آپ بھی والد کی طرح سندھ میں رہے ۔ پاکستان ریڈیو پر اکثر استادی موسیقی نشر کرتے ہیں ۔ خیال ، ترانہ ، دھرپد ، ٹھمری ، سندھی کافی نہایت مہارت سے گاتے ہیں ۔

۱۲ - غلام رسول خاں - آپ امید علی خاں کے چھوٹے بھائی ہیں ، اور نوجوان موسیقاروں میں اچھے مانے جاتے ہیں جب

گاتے ہیں خوب چمک کر گاتے ہیں۔

۱۳۔ مچھر خاں آپ کا اصلی نام جمالی خاں تھا۔ ہنگ تیز تان اور گانے کے انداز کے سبب لوگوں میں مچھر خاں کے نام سے مشہور تھے، خیال اور کافی خوب جم کر گاتے تھے، اور جب تیز تان مار کر سم پر آتے تھے تو لوگ بے اختیار واہ واہ پکار اٹھتے تھے۔

۱۴۔ مراد علی خاں آپ امید علی خاں کے رشتہ دار ہیں۔ پہلے گوروبازار و کھمن شاہ کے مہنت کے منشی تھے، چونکہ استادی موسیقی کا چرچا خاندان میں تھا، اور خود بھی اس میں سدھ بدھ رکھتے تھے اس لیے قیام پاکستان کے بعد گانا شروع کر دیا، اور سچ پوچھئے تو اس عمر میں اتنا اچھا گا لینا واقعی قابلِ داد ہے۔ آپ ریڈیو پاکستان لاہور سے اکثر استادی موسیقی اور کافیاں نشر کرتے ہیں۔

۱۵۔ نزاکت علی خاں سلامت علی خاں غیر منقسم ہندوستان میں ضلع ہوشیار پور کے قصبہ شام چوراسی میں ایک گھرانا تھا جو شام چوراسی والوں کا گھرانا کہلاتا تھا، اس گھرانے کا طرۂ امتیاز ہندوستانی موسیقی کی قدیم اور مشکل صنف دھرپد تھا۔ نزاکت علی خاں سلامت علی خاں دونوں سگے بھائی ہیں اور اسی گھرانے کے ایک فرد ولایت خاں کے فرزند ہیں۔ ولایت خاں کے آباؤ اجداد میں چاند خاں سورج خاں دو زبردست گویئے گزرے ہیں، جنھوں نے شہنشاہ اکبر کے دربار میں میاں تان سین کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور ان سے داد لی، نزاکت علی سلامت علی نے موسیقی اپنے والد سے سیکھی، اور ابھی چھوٹے سے تھے کہ محفلوں میں گانے لگے، اور داد تحسین حاصل کرنے لگے، جب دونوں بھائی گاتے ہیں تو سننے والوں کو ان کی استادی موسیقی کی پختگی پر حیرت ہوتی ہے، دونوں بھائی متعدد بار بھارت جا کر اپنے فن کی داد لے چکے ہیں۔ ریڈیو پاکستان سے اکثر استادی موسیقی نشر کرتے ہیں، یقین ہے کہ دونوں بھائی ابھی اور بہترین فن کا مظاہرہ کریں گے۔

۱۶۔ عبدالوحید خاں آپ ضلع مظفر نگر کے قصبہ کیرانہ کے باشندے تھے۔ آپ کا گھرانا استادی موسیقی کا مشہور گھرانا مانا جاتا ہے، اور اس میں بڑے بڑے مشہور موسیقار گزرے ہیں جن میں بندے علی خاں بینکار، حیدر بخش، عبدالغفور خاں، عبدالشکور خاں، عبدالکریم خاں اور عبداللطیف خاں بہت ہی مشہور ہیں۔ آپ نے علم موسیقی اپنے ماموں حیدر بخش خاں سے حاصل کیا، اور تھوڑے ہی عرصہ میں ہندوستان کے مشہور و معروف مغنیوں میں شمار ہونے لگے، آپ کانوں سے قدرے بہرے تھے، اس لیے بعض انھیں بہرے خاں بھی کہتے تھے، استادی کا یہ عالم تھا کہ جب کبھی ان کی بات ہوتی تو لوگ کان پکڑ لیتے اور کہتے "ہاں وہ بہرا؟" آپ نے بڑی بڑی ریاستوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور داد پائی، حقیقت یہ ہے کہ جتنا صحیح راگ وہ گاتے تھے، اور کوئی نہ گاتا تھا۔ ان کی اپنی خاص روش تھی، اور کرشن مرت گاتے تھے، خود کہا کرتے تھے کہ میرے بعد صرف کوہاپور والے میاں اللہ دتا کی موسیقی کا لطف آ سکتا ہے۔ آپ لاہور میں مقیم ہو گئے تھے، کیونکہ وہ ایک بزرگ فقیر عالم صاحب کے مرید ہو گئے تھے اور ان کی محبت زنجیر پا بن گئی تھی، پیر پرست اتنے تھے کہ مرشد کے جیتے جی ان کا مزار باغبانپورہ کے پاس بنا دیا تھا، اور جب وہ فوت ہوئے تو ان کو وہیں دفن کیا، اور پھر اپنے وطن چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔

آپ بمبئی میں بھی کافی عرصہ رہے اور وہاں بھی اپنی مہارت کا سکہ جمایا، آل انڈیا ریڈیو کے مختلف سٹیشنوں سے استادی

موسیقی نشر کی، آپ کا دستور تھا کہ جب گانے لگتے تو "یا اللہ" الاپ کر رنگ شروع کرتے۔ آل انڈیا والوں نے اعتراض بھی کیا مگر آپ نے اپنی عادت نہ بدلی۔

آپ کے شاگردوں میں فیروز نظامی، بھائی لال، وحیدہ خانم، ہیرا بائی بڑودکر، منی بائی، اختری بائی فیض آبادی بہت مشہور و معروف ہیں۔

۱۷۔ سردار خاں آپ امراؤ خاں صاحب دہلوی کے فرزند ارجمند ہیں۔ وہ ہندوستان کے شاہی موسیقار میاں تان رس خاں کے پوتے ہیں۔ ان کا بھی اپنا گھرانا ہے، اور اس گھرانے کی موسیقی کی بھی اپنی خاص روش ہے۔ آپ نے علم موسیقی اپنے والد سے سیکھا، اور بہت جلد ہی اس میں مہارت تامہ حاصل کر لی۔ آپ کو اپنے گھرانے کی خاص چیزیں یاد ہیں، اور جب کبھی آپ انھیں پیش کرتے ہیں تو عجیب لطف آتا ہے۔ آپ کے شاگردوں کی تعداد بلا مبالغہ ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں آپ کا خاندان بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ آپ اکثر میوزک کانفرنسوں اور ریڈیو پاکستان لاہور سے استادی موسیقی نشر کرتے ہیں۔

۱۸۔ فیروز نظامی آپ لاہور کے شوقیہ گانے والوں میں سے ہیں۔ اسلامیہ کالج لاہور کے گریجوایٹ ہیں۔ بچپن ہی سے استادی موسیقی سیکھنے کا شوق تھا۔ اس لیے تعلیم کے ساتھ ساتھ گانے کی مشق بھی جاری رکھی، جب استاد عبدالوحید خاں کیرانوی لاہور میں وارد ہوئے تو اُن کی گائیکی نے آپ کو مسحور کر لیا، اور آپ نے باقاعدہ اُن کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، اور استادی موسیقی حاصل کی، وحید خاں صاحب کہا کرتے تھے کہ فیروز نظامی میرا بلاٹنگ پیپر ہے، جو بتاتا ہوں فوراً جذب کر لیتا ہے۔ چنانچہ آپ نے بہت جلد استادی موسیقی میں مہارت حاصل کر لی، اور سب سے پہلے اپنے فن کا مظاہرہ ایس۔ پی۔ ایس کے ہال میں کیا اور عوام و خواص سے داد و تحسین حاصل کی، پھر آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت اختیار کر کے لاہور، دہلی اور لکھنؤ کے سٹیشنوں پر مختلف عہدوں پر کام کرتے رہے اور اس عرصہ میں ملک کے اچھے اچھے موسیقاروں سے داد حاصل کی، پھر استعفیٰ دے کر بمبئی چلے گئے، اور وہاں بھی فن کا مظاہرہ کیا، پھر میوزک ڈائرکٹر بن گئے اور مشہور فلم جگنو اور نیک پروین کے گانوں کی دھنیں بنائیں تقسیم ہند کے وقت اپنے وطن لاہور آ گئے اور چن وے، دوپٹہ وغیرہ فلموں کی دھنیں بنائیں۔ آپ نے موسیقی پر دو قابل قدر کتابیں اسرار موسیقی اور رموز موسیقی بھی تصنیف کیں، ریڈیو پاکستان کے مختلف سٹیشنوں سے آپ استادی موسیقی نشر کرتے ہیں، اور موسیقی پر تقاریر بھی کرتے ہیں جو علمی حلقوں میں بہت پسند کی جاتی ہیں۔ آپ الحمرا میں موسیقی کے نگران بھی ہیں۔

۱۹۔ بھائی اروڑہ لاہور کے مشہور ربابی خاندان کے فرد تھے، اور استادی موسیقی کے ماہر تھے۔ آپ فتح علی خاں پٹیالوی کے شاگرد تھے، آپ نے اچھی اچھی محفلوں میں استادی موسیقی پیش کر کے داد لی۔ ایک مرتبہ کالے خاں مرحوم کے ساتھ بھی گاتے تھے۔ آپ شام کے وقت عموماً مخمور رہا کرتے تھے۔

۲۰۔ بھائی لال آپ امرتسر کے رباب خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ اور استادی موسیقی میں بمبئی کے مشہور موسیقار پنڈت بھاسکر راؤ کے شاگرد رشید ہیں۔ آپ نے ہندوستان اور پاکستان کی کئی کانفرنسوں اور نجی محفلوں میں استادی موسیقی گا کر داد حاصل کی ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے آپ نے چوک مرچن سنگھ لاہور میں ایک میوزک سکول بھی کھولا جہاں بہت سے

نوجوانوں نے آپ کے علم سے فیض حاصل کیا، آجکل آپ ریڈیو پاکستان لاہور میں ملازم ہیں۔

۲۱ - غلام حسن شگن بھائی لال کے صاحبزادے ہیں اور انھیں سے آپ نے تعلیم حاصل کی ہے۔ استادی موسیقی میں اچھی خاصی مہارت رکھتے ہیں۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، اگر ریاضت کرتے رہے تو بہت اچھے ہو جائیں گے۔

۲۲ - میاں علم الدین والد کا نام میاں محمد بخش تھا، شوقیہ گانے والوں میں سے تھے، جب آپ جوان ہوئے تو آپ کو استاد محمد بوٹا کھنے والے کے سپرد کر دیا گیا، جنھوں نے کمال تندہی سے آپ کو ابتدائی تعلیم دی، پھر آپ پٹیالہ کے مشہور موسیقار میاں جان اور احمد جان کے والد بابا نبی بخش کے شاگرد ہوئے، اور نہایت اچھا گانے لگے، بعد ازاں آپ کئی تھیٹریکل کمپنیوں میں بطور اداکار اور میوزک ڈائرکٹر ملازم رہے، آپ نے کئی نجی محفلوں اور مہاراجہ سکیت کے دربار میں اپنے گانے کا کمال دکھایا اور داد وصول کی۔ آپ نے لاہور کے کئی معزز گھرانوں کے بچوں کو ہلکی پھلکی اور استادی موسیقی کی تعلیم دی، مثلاً خان بہادر میاں دین محمد، سید بشیر حیدر پی۔ سی۔ ایس۔ مسٹر جی۔ احمد انڈین پولیس اور فقیر سید نجم الدین، فقیر صاحب نے خود بھی آپ سے دلربا بجانا سیکھا، سلیم اقبال جو شیخ چلی، گھر جوائی، کرتار سنگھ اور دروازہ کے میوزک ڈائرکٹر ہیں آپ ہی کے فرزند ہیں۔

۲۳ - خواجہ خورشید انور لاہور کے شہرہ آفاق بیرسٹر خواجہ فیروز الدین احمد مرحوم کے صاحبزادہ ہیں اور شوقیہ موسیقاروں میں ہیں۔ گورنمنٹ کالج میں تعلیم حاصل کی اور ایم۔ اے کی ڈگری لی۔ بچپن ہی سے موسیقی سے لگاؤ تھا، کالج کی زندگی ہی میں گانے لگے تھے، آپ بمبئی چلے گئے اور وہاں کئی فلموں کی دھنیں بنائیں۔ تقسیم ہند کے بعد لاہور آگئے اور اب یہاں میوزک ڈائرکٹر ہیں۔ کڑمائی، پروانہ، انتظار، جھومر اور کوئل کی دھنیں آپ نے ہی تیار کی ہیں جو بہت مقبول ہوئیں۔

۲۴ - رفیق غزنوی راولپنڈی کے باشندے ہیں، اور گریجوایٹ ہیں۔ بچپن ہی سے گانے کا شوق تھا، خوب ریاضت کی اور دنوں میں چمک اٹھے، آپ نے ہندوستان کی بہت سی نجی محفلوں اور کانفرنسوں میں اپنے کمال فن کا اظہار کیا۔ اور خوب داد لی، کچھ عرصہ آپ فلمی اداکاری بھی کرتے رہے، پھر میوزک ڈائرکٹر بن گئے، اور بمبئی میں کئی فلموں کی دھنیں تیار کیں، آل انڈیا ریڈیو دہلی سے بھی منسلک رہے اور استادی موسیقی اور ٹھمریاں نشر کرتے رہے، آپ کی آواز میں ایک خاص رس ہے، اور ٹھمری میں تو ایک خاص انداز کے مالک ہیں، آجکل غالباً آپ کراچی میں ہیں۔

۲۵ - عبداللطیف خاں آپ پٹیالہ کے مشہور و معروف موسیقار عبدالعزیز خاں صاحب کے فرزند ہیں جو وچتر دینا بجاتے ہیں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ جب وہ دینا کی تاروں کو چھیڑتے تھے تو سامعین وجد میں آجاتے تھے۔ عبداللطیف خاں نے موسیقی کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور بہت جلد اس میں نام پیدا کر لیا، آپ سارنگی بھی بہت اچھی بجاتے ہیں۔

۲۶ - چھوٹے عاشق علی خاں علی بخش میرو دالی کے فرزند ہیں۔ آپ نے موسیقی کی تعلیم بڑے عاشق علی خاں سے حاصل کی اور تال اور ضیا میاں فقیر حسین پشاوری سے سیکھی، دس بارہ سال کی ریاضت کے بعد

آپ اچھے گانے والوں میں شمار ہونے لگے، آپ نے کئی کانفرنسوں میں حصہ لیا اور داد وصول کی۔ ریڈیو پر بھی آپ خیال اور ٹھمریاں نشر کرتے ہیں۔

۲۔ ہلکی پھلکی موسیقی گانے والے

۱۔ برکت علی خاں علی بخش خاں قصوری کے فرزند اور بڑے غلام علی خاں کے چھوٹے بھائی ہیں۔ آپ نے موسیقی کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، آواز میں اتنا درد، لوچ، لچک اور رسیلا پن ہے کہ سننے والے وجد میں آجاتے ہیں۔ ٹھمری، دادرا، غزل، گیت گاتے میں اپنا جواب نہیں رکھتے، اچھے اچھے شعرا کا کلام اور کافیاں آپ کو یاد ہیں، کئی نجی محفلوں اور کانفرنسوں میں شریک ہو چکے اور داد تحسین حاصل کر چکے ہیں، آل انڈیا ریڈیو اور ریڈیو پاکستان کے سٹیشنوں سے ہلکی پھلکی موسیقی نشر کرتے ہیں۔

۲۔ علی بخش قصوری یہ جوانا مرگ موسیقار بھی قصور کے سردی خاندان کا فرد تھا، والد کا نام حیدر بخش ہے جو مشہور طبلہ نواز ہیں، جوانی ہی میں ہلکی پھلکی موسیقی میں نام پیدا کیا، اور ٹھمری اور گیت گانے میں کمال حاصل کیا، آپ لاہور ریڈیو سٹیشن سے اکثر گانے نشر کیا کرتے تھے، اگر موت مہلت دیتی تو اور چمکتے۔

۳۔ نیاز حسین شامی آپ ضلع ہوشیار پور کے شام چوراسی کے مشہور گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور اسی نسبت سے شامی کہلاتے ہیں، خیال، دھرپد، ٹھمری، گیت، غزل غرضیکہ موسیقی کی ہر صنف پر آپ کو قدرت حاصل ہے، آواز میں درد ہے، آجکل آپ ریڈیو پاکستان لاہور سے منسلک ہیں جہاں سے آپ ہلکی پھلکی موسیقی نشر کرتے ہیں اور دھنیں بھی تیار کرتے ہیں۔

۴۔ بشیر ماھی آپ شیر علی قصوری کے فرزند اور کالے خاں کے نواسے ہیں۔ ہلکے پھلکے گانے گاتے ہیں، اور حق تو یہ ہے کہ خوب گاتے ہیں، ریڈیو سٹیشن لاہور سے اکثر گانے نشر کرتے ہیں۔ اور نجی محفلوں میں بھی گاتے ہیں۔ آواز اپنے بھائی علی بخش کی طرح رسیلی اور لوچدار ہے۔

۵۔ علی بخش ظہور استاد برکت علی گونٹے والے کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں، ہلکی پھلکی موسیقی گانے میں جواب نہیں رکھتے۔ ٹھمری، غزل، گیت، کافیاں، سلطان باہو کے ابیات نہایت خوش اسلوبی سے گاتے ہیں۔ ریڈیو پاکستان لاہور سے اکثر گانے نشر کرتے ہیں۔

۶۔ شریف غزنوی شوقیہ موسیقار ہیں، ٹھمری، غزل، گیت، کافی گاتے ہیں، مگر وارث شاہ کی ہیر ترنم سے پڑھنے میں بے مثال ہیں، جو مزہ ہیر کے ابیات کا ان سے سن کر آتا ہے اور کسی سے نہیں آتا، بہت سی محفلوں اور کانفرنسوں میں ہیر سنا کر داد حاصل کر چکے ہیں۔

۷۔ نذیر امرتسری آپ امرتسر کے مطربوں کے مشہور گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ آواز نہایت پیاری اور رسیلی پائی ہے اور اس میں اتنا درد ہے کہ سننے والا وجد میں آجاتا ہے۔ ریڈیو پاکستان لاہور سے گانے نشر

کرتے ہیں۔

۸۔ حامد علی بیلا لاہور کے مشہور ربابی خاندان کے فرد ہیں اور ہلکے پھلکے گیت اور لوک گیت گانے میں مہارت رکھتے ہیں۔ ریڈیو پر اکثر گاتے نشر کرتے ہیں۔

۹۔ عبدالشکور بیدل آپ گورنمنٹ کالج لاہور کے گریجوایٹ ہیں، اور ہلکی پھلکی موسیقی گانے میں مہارت تامہ رکھتے ہیں، ٹھمری غزل، گیت، کافی گانے میں مشہور ہیں۔ سلطان باہو کے ابیات تو اس طرح ترنم سے ادا کرتے ہیں کہ سامعین جھوم جھوم جاتے ہیں، آجکل ریڈیو پاکستان سے منسلک ہیں۔

۱۰۔ مہدی حسن ہلکے پھلکے گیت اور ٹھمری گانے میں مشہور ہیں، سر منڈل بجا کر گاتے ہیں، ہندوستان کے موسیقار افضل حسین نگینہ والے کی طرح ان کا بھی اپنا رنگ ہے، اور دوسرے گانے والوں سے الگ روش پر گاتے ہیں۔ آواز میں لوچ اور رسیلا پن موجود ہے۔

۱۱۔ سائیں اختر امرتسر کے ربابی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہلکے پھلکے گیت، اور مرزا صاحباں کے دوہے گانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے، آواز بہت بلند اور پاٹ دار ہے، اور جب گاتے ہیں تو ایک سماں باندھ دیتے ہیں، سوز خوانی اور نوحہ خوانی بھی کرتے ہیں، اور اس درد اور عقیدت سے کرتے ہیں کہ سامعین کو رلا دیتے ہیں۔

۱۲۔ عنایت حسین بھٹی لاہور کے مشہور موسیقار ہیں، آواز نہایت رسیلی ہے۔ ریڈیو پاکستان لاہور سے ہلکے پھلکے گیت اور لوک گیت نشر کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں فلموں میں پلے بیک گانے بھی گاتے ہیں، لاہور کے اکثر فلموں کے گانے آپ نے گائے ہیں۔

۱۳۔ سلیم رضا لاہور کے پلے بیک موسیقاروں میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں، اور متعدد فلموں میں گانے گا چکے ہیں، آپ کی آواز مائیک کے لیے نہایت موزوں ہے۔ فلم سات لاکھ میں آپ کا "یارو مجھے معاف رکھو میں نشے میں ہوں" کافی مقبول ہوا ہے، ریڈیو پاکستان لاہور سے بھی ہلکی پھلکی موسیقی نشر کرتے ہیں، اگر ریاضت جاری رکھی تو مستقبل میں اور چمکیں گے۔

۱۴۔ فضل حسین آپ بھی پلے بیک گانوں میں مہارت تامہ رکھتے ہیں، آواز میں لوچ رس اور لچک موجود ہے، آپ لاہور کی مشہور فلموں میں پلے بیک گانے گا چکے ہیں، ریڈیو پاکستان لاہور سے بھی گانے نشر کرتے ہیں، موسیقار ہونے کے علاوہ آپ ایک اچھے اداکار بھی ہیں۔

۱۵۔ امداد حسین لاہور کے مشہور ربابی خاندان کے چشم و چراغ ہیں، کچھ عرصہ آپ لاہور ریڈیو سٹیشن سے منسلک رہے اور وہاں سے ہلکے پھلکے گانے اور لوک گیت نشر کرتے رہے، پنجابی دیہاتی بولیاں گانے میں بھی مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ آپ نے ریڈیائی ڈراموں اور فیچروں میں اداکاری کے جوہر بھی دکھائے ہیں، آجکل آپ فلموں میں اداکاری کرتے ہیں اور پلے بیک گانے بھی گاتے ہیں، طبیعت میں مزاح اور بذلہ سنجی کوٹ کوٹ کر بھری ہے، جب کسی محفل میں باتیں کرتے ہیں تو اُسے زعفران زار بنا دیتے ہیں۔

۱۶ - منیر حسین :- آپ بھی لاہور کے پلے بکیہ موسیقار وں میں ہیں اور متعدد فلموں میں پلے بیک گانے گا چکے ہیں۔

۱۷ - برکت علی گوٹے والے آپ شوقیہ گانے والوں میں تھے ، اور ٹھمری اس انداز سے گاتے تھے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا تھا - اس بات میں آپ انفرادی حیثیت کے مالک تھے، آجکل ٹھمری گانے میں آپ ہی کی روش کی پیروی کی جاتی ہے، آپ کے شاگردوں میں علی بخش ظہور زیادہ مشہور ہیں -

۱۸ - ظریف لاہور کے مشہور مزاحیہ اداکار تھے، آپ نے کئی فلموں میں مزاحیہ کردار ادا کیا ہے - اس کے علاوہ آپ ہلکی پھلکی موسیقی بھی گاتے تھے، ریڈیو پاکستان لاہور سے اکثر گانے نشر کرتے تھے، اور ڈراموں اور فیچروں میں بھی حصہ لیتے تھے ۔

۳ - گانے والیاں

۱ - سردار بائی آپ پٹیالہ کے اُستاد فتح علی خاں کی شاگرد تھیں، اور اُستادی موسیقی میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں - آپ نے کئی نجی محفلوں، مہاراجوں اور نوابوں کے درباروں میں استادی موسیقی سنا کر لوگوں کو مسحور کیا، اور داد تحسین حاصل کی -

۲ - زیب النساء آپ نے استادی موسیقی کی تعلیم پٹیالہ کے گھرانے سے حاصل کی ، اور بہت جلد اس میں مہارت حاصل کی - رقص کی تعلیم آپ نے جے پور کے مشہور و معروف کتھک پنڈت گوپال سے حاصل کی، خیال، ترانہ، ٹھمری، کافی، غزل گانے اور ساتھ نرت کر کے بتانے میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں ، لاہور کی نجی محفلوں میں استادی موسیقی کے قدر دانوں سے داد تحسین حاصل کی اور کئی ریاستوں میں بھی کمال فن کا مظاہرہ کیا ، آپ چھوٹی عمر میں ہی فوت ہو گئیں -

۳ - انور بائی آپ عرف عام میں انور بائی ڈباری منڈی والی کہلاتی تھیں، اور اپنے زمانہ کی مشہور و معروف مغنیہ تھیں - استادی موسیقی کے علاوہ آپ ناچ اور نرت میں جے پور کے کتھک پنڈت گوپال کی شاگرد تھیں عورتوں میں پنڈت جی کی شاگرد آپ سے اچھی کوئی نہ تھی - پنڈت گوپال ہندوستانی رقص کی جملہ اصناف پر قدرت رکھتے تھے ، بوڑھا سا قد تھا، اور جسم میں اتنا لوچ ، اتنی لچک تھی کہ جب کسی ٹھمری کے بول یا غزل کے شعر کو نرت کر کے بتاتے تھے تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی نازک اندام معشوقہ نرت کر رہی ہے - استاد کی یہ جملہ صفات انور بائی میں بدرجہ اتم موجود تھیں ، ٹھمری اور غزل کے ساتھ جب نرت کرتیں تو دیکھنے والے عش عش کر اُٹھتے تھے - ایک دفعہ ایک نجی محفل میں ایک غزل گائی جس کا ایک شعر تھا ؎

عذر اُن کی زباں سے نکلا
تیر گویا کماں سے نکلا

مصرع ثانی پر انھوں نے بایاں گھٹنا زمین پر ٹیک دیا اور تیر کو کمان کھینچ کر جو چھوڑا تو سامنے بیٹھے ہوئے سامعین ڈر گئے - یہ کیفیت تو رقص اور نرت کے کمالات کی تھی ، جب گاتیں تو لوگ داد تحسین دیتے نہ تھکتے تھے ، اُن ٹھک اتنی کہ ساری رات گا رہی

ہیں لیکن نہ آپ تھکتی ہیں اور نہ آواز ہی بیٹھتی ہے۔ آپ لاہور ہی میں فوت ہوئیں۔

۴۔ شمشاد بیگم آپ بھی لوہاری منڈی کی رہنے والی ہیں۔ ہلکی پھلکی موسیقی گانے میں اپنا جواب نہیں رکھتیں تقسیم ہندوستان سے پہلے آل انڈیا ریڈیو کے متعدد سٹیشنوں سے موسیقی کے دلربا نغمات ہوا میں بکھیرتی رہیں۔ فلمی موسیقی میں تو وہ کمال حاصل ہے کہ بڑی بڑی گانے والیاں آپ کے سامنے نہیں ٹھہر سکتیں۔ آج لتا کی بڑی دھوم ہے لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ جس فلم میں ان دونوں نے گیت گائے شمشاد بیگم نے اپنی انفرادیت برقرار رکھی۔ آپ نے ریڈیائی ڈراموں، فیچروں اور غنائیوں میں بھی حصہ لیا ہے، ایک دفعہ میں نے فضل شاہ کی سوہنی مہینوال میں سے ایک غنائیہ ریڈیو پر پیش کیا۔ جس میں شمشاد بیگم نے سوہنی کا کردار ادا کیا، میں نے کہا "شمشاد بیگم تب جانوں کہ مجھے رلا دو" میں قسمیہ کہتا ہوں کہ جب سوہنی کے چناب میں غرق ہونے کا منظر آیا، اور آپ نے فضل شاہ کے اشعار گائے تو میں بے اختیار رو دیا۔ آجکل آپ بمبئی میں مقیم ہیں اور پلے بیک سنگر ہیں۔ ہندوستان کے متعدد فلموں میں پلے بیک گانے گا چکی ہیں۔

۵۔ عیدن بائی اکھیاں والی آپ لاہور کی مشہور مغنیہ تھیں، چونکہ آپ کی آنکھیں بہت ہی خوبصورت تھیں اس لیے اکھیاں والی کہلاتی تھیں، آپ اپنے عہد کی ممتاز گانے والیوں میں شمار ہوتی تھیں۔ ٹھمری، غزل، نعت، پنجابی گیت گانے میں بے مثال تھیں، آواز اتنی لوچدار اور رسیلی تھی کہ سامعین سن کر مسحور ہو جاتے تھے آپ نے سینکڑوں نجی محفلوں اور مہاراجوں، نوابوں کے درباروں میں اپنے فن کا کامیاب مظاہرہ کیا، اور داد تحسین حاصل کی، آپ نے لاہور میں وفات پائی اور یہیں دفن ہوئیں۔

۶۔ بہار بخش یہ بھی اپنے زمانے کی مشہور مغنیہ تھی۔ بھرد قد، جسم بھرا ہوا، آواز نہایت ہاٹ دلدار اور سریلی تھی۔ نجی محفلوں میں لوگ اس کے گانے کو بہت پسند کرتے تھے۔ غزل، ٹھمری اور پنجابی گیت خوب گاتی تھی۔ ان تھک گانے والی تھی۔ لوگ اسے بہار دشمن کہتے تھے۔

۷۔ عیدن بائی ہسیاں والی آپ بھی اپنے زمانہ کی ایک مشہور و معروف مغنیہ تھیں، آپ قصور کے چھوٹے کالے خاں سارنگی نواز کی شاگرد تھیں، ٹھمری، غزل، گیت، دادرا، کافی اس پیار سے انداز سے گاتی تھیں کہ سامعین داد دیئے بغیر نہ رہ سکتے تھے، کئی نجی محفلوں اور ریاستوں کے درباروں میں گائیں اور داد وصول کی افغانستان کے جشنِ استقلال کے موقعہ پر تقریباً ہر سال کابل تشریف لے جاتیں اور وہاں اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کرتیں، آپ کا اردو، فارسی، پنجابی اور پشتو کا تلفظ حیرت انگیز تھا۔ آپ ایک خاص رنگ سے گاتی تھیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان کے بعد کوئی مغنیہ اس رنگ سے مجرا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ آپ حج حرمین سے بھی مشرف ہوئیں، اور آپ نے دو مسجدیں بھی تعمیر کرائیں، آپ کی وفات کو تقریباً آٹھ نو سال ہو چکے ہیں۔

۸۔ خورشید بائی آپ لاہور کی ممتاز گانے والیوں کے زمرہ میں ہیں، آپ نے موسیقی کی تعلیم مشہور سارنگی نواز غلام محمد سرودی قصوری سے حاصل کی، اور آپ نے اس تندہی سے آپ کو خیال، ترانہ اور دیگر استادی موسیقی کی تعلیم دی کہ آپ اوائل عمر ہی میں اچھی گانے والیوں میں شمار ہونے لگیں، آپ نے لاہور کی نجی محفلوں اور ہندوستان

کی مشہور ریاستوں اندور، بڑودہ، راودھن پور، کشمیر، بہاولپور، خیرپور، نابھ، اسکیٹ اور منڈی کے درباروں میں اپنے کمال کا مظاہرہ کیا اور داد وصول کی۔ آل انڈیا ریڈیو کے متعدد سٹیشنوں سے استادی موسیقی، ٹھمریاں اور غزلیات خصوصاً کلامِ غالب و اقبال نشر کیا۔ اور پشاور کی بزمِ غالب اور لاہور کی بزمِ اقبال سے مرصع طلائی تمغے حاصل کیے۔

۹۔ عنایت بائی ڈھیروالی آپ لاہور کی عظیم موسیقار ہیں۔ اللہ نے آواز ایسی سریلی عطا فرمائی ہے کہ کوئل بھی رشک کرتی ہے۔ آپ نے موسیقی کی تعلیم بڑے غلام علی خاں اور آن کے خسر سے حاصل کی۔ اور بہت جلد اس میں مہارت تامہ حاصل کر لی، ٹھمری، راگ، غزل، سندھی کافی گانے میں اپنا جواب نہیں رکھتیں، مدتوں آپ ریڈیو پر اپنے رسیلے اور سریلے نغمے بکھیرتی رہی ہیں۔ پنجاب، صوبہ سرحد اور سندھ کا کوئی علاقہ ہوگا جہاں آپ نے اپنے فن کا کمال نہ دکھایا ہو۔ کلامِ اقبال ترنم سے نہایت اچھا گاتی ہیں، آج بھی جبکہ قدیم موسیقی دم توڑ رہی ہے لاہور میں آپ کا دم غنیمت ہے۔

۱۰۔ روشن آرا بیگم آپ کا اصلی نام وحید النسا بیگم تھا، مگر ایک بزرگ کے ارشاد کے مطابق روشن آرا بیگم کر دیا گیا۔ آپ کی پیدائش کلکتہ میں ہوئی۔ قرآن مجید، اردو، فارسی اور انگریزی کی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ پہلے آپ لڈن خاں صاحب کی شاگرد ہوئیں، بعد ازاں بمبئی جاکر استاد عبدالکریم خاں سے استادی موسیقی سیکھی، استاد نے پورے پانچ برس تک تعلیم دی، اور اپنی ساری صفات اپنی اس لائق شاگرد میں جمع کر دیں۔ استادی موسیقی کی کونسی باریکی اور خوبی ہے جو اس مغنیہ کے نورانی گلے میں نہیں، کوئی راگ ڈیڑھ دو گھنٹے سے کم نہیں گاتیں، جنھوں نے استاد عبدالکریم کی ٹھمری "پیا بن ناہیں آوت چین" سنی ہے، اور انھوں نے روشن آرا بیگم سے بھی یہی ٹھمری سنی ہے۔ وہ ذرا دونوں میں فرق تو پیدا کر کے دکھا دیں، ذرہ بھر بھی فرق نہیں۔ یہی حال استادی موسیقی میں بھی ہے، یہی معلوم ہوتا ہے کہ روشن آرا نہیں عبدالکریم خاں گا رہے ہیں۔ اس وقت ہندوستان اور پاکستان میں کیرانہ کی گائیکی کی آپ بہترین نمائندہ ہیں، بمبئی، دہلی، لکھنؤ اور لاہور کے ریڈیو سٹیشنوں کے سامعین اکثر ان کے دلنواز نغمات سے محظوظ و مسحور ہوتے ہیں۔ مدت ہوئی ایک مرتبہ آپ لاہور تشریف لائیں اور گرو شہباز میں وحیدہ خانم کے ہاں ایک محفل میں گائیں، جہاں عبدالوحید خاں کیرانوی، بڑے غلام علی خاں اور برکت عاشق علی خاں بھی موجود تھے، ان عظیم فن کاروں کے سامنے روشن آرا نے ملتانی راگ چھیڑا۔ ان کے ساتھ مشہور سارنگی نواز عبدالشکور خاں کیرانوی نے سنگت کی، گانے والی اور ساتھ سنگت کرنے والے دونوں کیرانہ کی گائیکی کے ماہر تھے اس لیے وہ لطف آیا کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ روشن آرا جو تان گلے سے ادا کرتیں عبدالشکور وہی سارنگی میں سے نکالتے۔ دونوں چہک اٹھے، اور اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے لگے، عبدالوحید خاں نے شکور خاں کو منع کیا، مگر روشن آرا نے کہا، "استاد جی انھیں منع نہ کریں، بجانے دیں۔ مجھے لطف آ رہا ہے"! یہ بات ایک ماہر اور عظیم فن کار کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔ ہم تو آج بھی اس محفل کو یاد کر کے لطف اٹھاتے ہیں۔ آجکل آپ لالہ موسے میں مقیم ہیں اور ریڈیو سٹیشن لاہور اور دیگر کانفرنسوں میں شریک ہوتی ہیں۔ ابھی ابھی آپ کو حکومتِ پاکستان نے انعام سے نوازا ہے۔ اور آپ حقیقت میں مستحق بھی ہیں۔ آپ نے فلموں میں بھی پلے بیک گانے گائے ہیں اور اپنی سدا انتی شان کو ان میں بھی برقرار رکھا ہے۔

۱۱۔ مختار بیگم امرتسری آپ کی پیدائش امرتسر میں ہوئی۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد آپ لاہور میں مقیم ہوگئیں، آپ کلکتہ میں بھی رہیں اور آغا حشر کاشمیری مرحوم کی صحبت سے فیض یاب ہوئیں۔ استادی موسیقی آپ نے مشہور موسیقار عاشق علی خاں پٹیالوی سے حاصل کی، اور پنجاب کی مشہور گانے والیوں میں شمار ہونے لگیں ہندوستان کی وہ کونسی ریاست ہے جس میں آپ نے اپنے فن کا مظاہرہ نہ کیا ہو۔ استادی موسیقی اور ٹھمری گانے میں آپ اتنی ماہر ہیں کہ اب خود بھی اس کی تعلیم دیتی ہیں۔ آپ کی مشہور شاگردوں میں نسیم بیگم امرتسری ہیں۔ آجکل غالباً آپ کراچی میں ہیں۔

۱۲۔ فریدہ خانم آپ مختار بیگم امرتسری کی چھوٹی ہمشیرہ ہیں۔ آپ نے استادی اور ہلکی پھلکی موسیقی کی تعلیم عاشق علی خاں پٹیالوی اور مختار بیگم سے حاصل کی اور بہت جلد اچھا گانے لگیں۔ لاہور ریڈیو سٹیشن سے اکثر آپ راگ، ٹھمری، غزلیات وغیرہ نشر کرتی ہیں۔

۱۳۔ نورجہاں ان کا خاندان قصور سے آکر لاہور میں آباد ہوا۔ آپ لاہور میں پیدا ہوئیں۔ ماسٹر غلام محمد قصوری سے تعلیم موسیقی حاصل کی، اور ۹ سال کی عمر میں ہی گانے میں مشہور ہوگئیں۔ آپ کی آواز میں خداداد رس اور کشش ہے، آپ اس وقت ملکۂ ترنم کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ نے فلمی اداکاری شروع کی اور اس میں بھی نام پیدا کیا اور اپنی اداکاری اور گلوکاری کا بہترین مظاہرہ کیا، آجکل آپ فلموں میں پلے بیک گانے گاتی ہیں۔

۱۴۔ شمشاد کوثر آپ نے استادی موسیقی کی تعلیم مشہور موسیقار امید علی خاں سے حاصل کی اور چند سالوں کی محنت اور ریاضت کے بعد نہایت اچھا گانے لگیں، آپ کے گانے میں اپنے استاد کی گائیکی کی دلآویز خوشبو آتی ہے، آپ ریڈیو پر بھی استادی موسیقی اور سندھی کافیاں نشر کرتی رہی ہیں۔

۱۵۔ زاہدہ پروین آپ کا شمار مغربی پاکستان کی نہایت اچھا گانے والیوں میں ہوتا ہے۔ استادی موسیقی سندھی کافی اور گیت گانے میں مہارت تامہ رکھتی ہیں، کئی نجی محفلوں اور کانفرنسوں میں اپنے فن کا کامیاب مظاہرہ کر چکی ہیں۔ لاہور ریڈیو سٹیشن سے اکثر آپ نغمات بکھیرتی، اور سامعین کو اپنے دل نواز انداز اور سُریلی آواز سے محظوظ کرتی ہیں۔

۱۶۔ نسیم بیگم امرتسری آپ قیام پاکستان کے بعد سے لاہور میں مقیم ہیں، استادی موسیقی میں مختار بیگم امرتسری کی شاگرد ہیں، پکے راگ خوب گاتی ہیں اور ہلکی پھلکی موسیقی میں بھی مہارت رکھتی ہیں، لاہور ریڈیو سٹیشن سے موسیقی کے پروگرام میں حصہ لیتی ہیں، آپ کی سریلی آواز پر اکثر نورجہاں کا دھوکا ہوتا ہے۔ آپ نے متعدد فلموں میں پلے بیک گانے بھی گائے ہیں۔

۱۷۔ اقبال بانو آپ دراصل رہتک کی رہنے والی ہیں لیکن پاکستان بنتے ہی آپ لاہور تشریف لے آئیں اور گنپت روڈ لاہور پر رہنے لگیں۔ آپ میٹرک پاس ہیں اور اُردو، فارسی اور انگریزی میں دستگاہ رکھتی ہیں۔ آپ کو استادی موسیقی اور ہلکی پھلکی موسیقی پر یکساں قدرت حاصل ہے، اور نہایت اچھا گاتی ہیں، ریڈیو سٹیشن لاہور، دہلی وغیرہ سے نغمات نشر کر چکی ہیں اور اب بھی کرتی ہیں، کئی کانفرنسوں میں اپنے فن کا کامیاب مظاہرہ کر چکی ہیں، کئی فلموں

ہیں پلے بیک گانے گا چکی ہیں، آجکل آپ ملتان میں رہتی ہیں۔

۱۸۔ وحیدہ خانم لاہور کی مشہور مغنیہ ہیں، گو آجکل راولپنڈی ریڈیو سٹیشن سے گانے نشر کرتی ہیں، مگر زندگی کا کافی حصّہ لاہور ہی میں گزارا ہے۔ آپ نے استادی موسیقی استاد عبدالوحید خان کیرانوی سے حاصل کی اور تھوڑے ہی عرصہ میں اچھا گانے لگیں، خیال، ترانہ وغیرہ بہت اچھا گاتی ہیں۔

۱۹۔ زینت بیگم وحیدہ خانم کی ہمشیرہ ہیں، اور ہلکے پھلکے گیت گانے میں مہارت رکھتی ہیں، آپ نے فلمی اور ... کے بیشتر فلموں میں پلے بیک گانے گائے ہیں، آپ کی آواز نہایت میٹھی اور رسیلی ہے۔

۲۰۔ آشا پوسلے لاہور کی مشہور اداکارہ ہیں، ہلکی پھلکی موسیقی نہایت اچھی گاتی ہیں۔ لاہور ریڈیو سٹیشن کے اکثر ... اور فیچروں میں بھی حصّہ لیتی ہیں، آواز نہایت سریلی ہے۔

۲۱۔ کوثر پروین نذیر جعفری کی شاگرد ہیں اور ہلکے پھلکے گانوں میں کافی مشہور ہیں۔ آپ آشا پوسلے کی ہمشیرہ ... اور لاہور کی متعدد فلموں میں پلے بیک گانے گا چکی ہیں آپ ایک مقبول اور ہر دلعزیز فنکار ...

۲۲۔ آئرن پروین ریڈیو پاکستان لاہور سے ہلکے پھلکے گانے نشر کرتی ہیں، اور فلموں میں پلے بیک گانے گا ... ہیں، اور کامیاب فنکارہ ہیں۔

۲۳۔ زبیدہ خانم امرتسر میں پیدا ہوئیں، مشہور فلم ڈائرکٹر نذیر انھیں فلمی صنعت میں لے آئے اور آپ پلے بیک ... گانے دینے لگیں، ریڈیو پر بھی ہلکی پھلکی موسیقی پیش کی۔ لاہور کی متعدد فلموں میں آپ کے گانے گا... ہیں، نہایت اچھا گاتی ہیں۔

۲۴۔ منوّر سلطانہ آپ لدھیانہ کی رہنے والی ہیں، اور ہلکی پھلکی موسیقی گانے میں کافی مشہور ہیں، اُردو اور فارسی غزلیات بھی ... مہارت سے گاتی ہیں، ریڈیو سٹیشن لاہور کے کئی غنائیہ فیچروں میں حصّہ لے چکی ہیں اور گانے بھی نشر کر... علاوہ ازیں آپ ایک کامیاب پلے بیک مغنیہ بھی ہیں۔

۲۵۔ نورجہاں جونیئر آپ بھی ایک اچھی مغنیہ ہیں، استادی موسیقی میں سردار خاں دہلوی کی شاگرد ہیں۔ ریڈیو سٹیشن لاہور ... سے گانے نشر کرتی ہیں اور فلموں میں پلے بیک گانے گاتی ہیں۔

۲۶۔ امتہ الرشید لاہور ریڈیو کی مشہور فنکارہ ہیں۔ ہلکی پھلکی موسیقی نہایت خوش اسلوبی سے پیش کرتی ہیں، آواز ... قدرتی سوز موجود ہے۔ آپ بینائی کی دولت سے محروم ہیں۔

۴۔ سارنگی نواز

۱۔ بڈھے خاں قصوری اپنے عہد کے مشہور و معروف سارنگی نواز تھے، آپ قصور کے مطربوں کے مردودی خاندان کے چشم و چراغ تھے، پہلے اپنے گھر والوں سے سارنگی سیکھی پھر علم کا شوق آپ کو ہندوستان لے گیا، ... آپ ریاست ریوا کے مشہور اُستاد میاں دلاور علی خاں کے شاگرد ہو گئے اور کئی سال تک استاد کی خدمت میں رہ کر کسب فیض کیا۔

اور سارنگی نوازی میں مہارت تامہ حاصل کر کے لاہور آ گئے۔ یہاں آپ نے کئی محفلوں میں بڑے استادوں کے ساتھ سارنگی پر سنگت کی اور داد حاصل کی۔ ریاضت کا یہ عالم تھا کہ رسیت کی پوٹلیاں ہاتھوں سے باندھ کر ریاضت کیا کرتے تھے۔ جن لوگوں نے اُن کی سارنگی سنی ہے وہ آج بھی یاد کر کے سر دھنتے ہیں۔ یوں تو آپ نے بہت سے شاگرد بنائے مگر زیادہ تر مشہور غلام محمد سرودی قصوری ہیں جنھوں نے اپنے استاد کے نام کو زندہ رکھا۔

۲۔ **غلام محمد قصوری** آپ قصور کے سرودی خاندان کے نورِ نظر تھے اور حاجی امیر بخش سارنگی نواز کے فرزندِ ارجمند تھے۔ آپ نے استادی موسیقی اور سارنگی نوازی کی تعلیم مشہور سارنگی نواز بڈھے خاں سے حاصل کی اور بہت جلد اچھے سازندوں میں شمار ہونے لگے۔ لاہور کی بہت سی نجی محفلوں میں اچھے اچھے گویوں کے ساتھ سارنگی پر سنگت کی۔ ایک دفعہ کالے خاں مرحوم کے ساتھ سنگت کر کے سامعین سے دادِ تحسین حاصل کی۔ آپ کی شاگردوں میں خورشید بائی بہت مشہور ہیں جن کے ساتھ آپ نے ہندوستان کی متعدد ریاستوں میں سارنگی بجائی اور مہاراجگان سے انعام و اکرام حاصل کیا۔

۳۔ **حیدر بخش فلوسا** یہ بھی خطۂ قصور کے مطربوں سے تعلق رکھتے تھے اور نہایت ماہر سارنگی نواز تھے۔ آپ نے کچھ عرصہ تھیٹر اور گراموفون کمپنیوں میں کام کیا۔ پھر عنایت بائی ڈھیرو والی کے ساتھ سنگت کرنے لگے۔ فلموں میں بھی سارنگی بجائی۔ آخر میں ریڈیو پاکستان لاہور سے منسلک ہو گئے اور یہیں سے نغمات بکھیرتے رہے۔ بے حد شریف، کم زبان اور مرنجاں مرنج انسان تھے۔ سانولا رنگ، عظیم و ضخیم جسم، دراز قد، موٹے موٹے نقش، ململ کا کھلی آستینوں کا کرتہ، نیچے سفید تہمد باندھ کر بڑے خراماں خراماں چلتے اور پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے۔ ساڑھے تین من کی لاش تھی۔ اچھے خاصے پہلوان معلوم ہوتے تھے۔ کوئی ناواقف ان کو دیکھ کر خیال بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ راگ و ودیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ کھاتے بھی بہت تھے۔ ان کی بسیار خوری کے متعلق ایک لطیفہ بہت مشہور ہے۔ موری دروازہ کے باہر چنگڑ محلہ کے شروع میں ایک ہندو ہوٹل تھا۔ ہوٹل والے کی شامت جو آئی تو انھوں نے ایک بورڈ پر لکھ دیا :

"سالن لیجئے۔ چپاتیاں مفت"

ایک دن استاد فلوسا وہاں جا پہنچے۔ دو تین قسموں کے سالن کا آرڈر دیا اور کھانے بیٹھ گئے۔ چپاتیاں آنے لگیں، دو، چار، چھ، آٹھ۔ جب بھی ہوٹل کا بیرا پوچھتا، ادھر سے ہل من مزید کی صدا آتی۔ ہوٹل والے اعلان سے مجبور تھے۔ چپاتیاں دیتے گئے۔ یہاں تک کہ گندھا ہوا آٹا ختم ہو گیا۔ چند دنوں کے بعد فلوسا کی طبیعت پھر لہرائی۔ یہ پھر وہاں جا دھمکے۔ لیکن بہت مایوس ہوئے۔ کیونکہ اب ہوٹل والوں نے اپنا وہ بورڈ اتار لیا تھا۔

اس تن و توش کے باوصف استاد فلوسا دل کے بہت کمزور اور نازک مزاج تھے۔ ایک دفعہ بیمار ہوئے۔ بیوی نے ڈاکٹر سے مشورہ کرنے کو کہا۔ ڈاکٹر رضا مرزا کا مطب پاس ہی تھا مگر جانے کا حوصلہ نہ پڑا۔ کہا ڈاکٹر صاحب کو یہیں بلا لو۔ ڈاکٹر صاحب تشریف لائے۔ انھوں نے اچھی طرح معائنہ کر کے کوئی ٹیکہ تجویز کیا۔ یہ بہت گھبرائے۔ نہایت لجاجت سے درخواست کی۔ کوئی اور دوا تجویز فرمائیے۔ انھوں نے کہا۔ ٹیکے میں کونسی قباحت ہے۔ جلد صحت ہو جائے گی مگر استاد نے انجکشن کی سوئی جسم میں داخل ہونے کا تصور کر کے کہا "ڈاکٹر صاحب مجھے ٹیکہ نہ لگائیے۔ میں مر جاؤں گا"۔ ڈاکٹر صاحب نے

شی آن شی کر کے ٹیکے کا سامان درست کرنا شروع کیا۔ استاد نے نہایت حسرت بھری نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا اور کہا: "کیا مجھے اپنے سامنے ہی مروا دو گی۔ مجھ سے یہ تکلیف برداشت نہیں ہو سکے گی۔ یہی مر جاؤں گا" اتنے میں ڈاکٹر صاحب نے ٹیکہ لگا دیا۔ مگر یہ پھر بھی چیختے رہے کہ ڈاکٹر صاحب ٹیکہ نہ لگانا۔ میں مر جاؤں گا۔ ڈاکٹر صاحب بہت ہنسے فرمایا "بھئی میں تو ٹیکہ کبھی کا لگا بھی چکا۔ تم تو خواہ مخواہ مرے جا رہے ہو"

ریڈیو والوں نے ایک دفعہ ان سے انٹرویو لیا۔ اور پوچھا۔ استاد جی! آپ کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟ استاد فلوسا نے جواب دیا۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ "اللہ دے اور بندہ کھائے"

استاد فلوسا اولاد کی نعمت سے محروم رہے۔ لاہور میں انتقال کیا۔

۴۔ چھوٹے کالے خاں

آپ بھی قصور کے مطربوں میں سے تھے اور سارنگی خوب بجاتے تھے۔ استادی موسیقی بھی نہایت اچھی طرح گاتے تھے۔ آواز کوئل سے زیادہ سریلی تھی۔ جب گاتے تھے تو سریلے نغمے فضا میں بکھر جاتے تھے۔ آپ کی چوٹی کی شاگردوں میں عیدن بائی ہسپتال والی بہت مشہور مغنیہ گزری ہیں۔ آپ حویلی میاں خاں کے سامنے کوچہ نادر شاہ میں رہتے تھے۔ یہیں فوت ہوئے۔

۵۔ بابا علی بخش

آپ ہوشیار پور کے ضلع ہوشیارپور کے رہنے والے تھے۔ سارنگی نوازی کے رموز اپنے بزرگوں سے حاصل کیے نوجوانی میں لاہور چلے آئے۔ کوچہ لیشمارا اندرون موچی دروازہ میں رہائش اختیار کی۔ سانولا رنگ دراز قامت، تیز نقش، داڑھی مہندی سے رنگی ہوئی ہوتی تھی۔ شاگردوں کو گھر پر بھی تعلیم دیتے تھے۔ بڑے بڑے استادوں کے ساتھ سنگت کی۔ آخری عمر میں مذہب کی طرف زیادہ توجہ ہو گئی تھی۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ زیارات عراق و عرب، نجف اشرف اور کربلائے معلیٰ سے مشرف ہونے کے بعد صرف مجالس میں سوز خوانی کرتے تھے۔ فن کے دیگر مشاغل ترک کر دیئے تھے۔ عمر کے آخری ایام میں موچی دروازہ کے اندر گانے کی ایک محفل میں تشریف لائے جس میں استاد عاشق علی خاں گا رہے تھے۔ کہنے لگے "برسوں کے بعد گانا سن رہا ہوں۔ وہ بھی صرف اس لیے کہ دیکھوں فتح علی کا لڑکا کتنے پانی میں ہے۔ واقعی عاشق علی خاں فن کے لحاظ سے اپنے بزرگوں کا صحیح جانشین ہے۔"

قیام پاکستان سے کچھ پہلے ایک سو پانچ برس کی عمر پا کر داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور قبرستان مومن پورہ لاہور میں دفن ہوئے۔

۶۔ بلّے خاں

آپ لاہور کے مطربوں میں سے تھے، گورا چٹا رنگ، جسم متناسب، آنکھیں بلّیوں کی طرح نیلی، اس لیے آپ کو بلّے خاں کہنے لگے۔ اصل نام مہراں بخش تھا، آپ نے پٹیالہ کے فتح علی خاں سے علم موسیقی حاصل کیا۔ اور بہت جلد سارنگی نوازی اور گانے میں نام پیدا کیا، آپ نے لاہور کے مشہور موسیقاروں کے ساتھ سارنگی بجائی اور ممتاز گانے والیوں کے ساتھ سارنگی پر سنگت کی۔ جن میں بہار بخش، خورشید بائی، انور بائی، زیب النساء زیادہ مشہور ہیں۔ ایک مرتبہ مطربان لاہور نے ایک تھیٹریکل کمپنی بنائی جس نے گلرو زرینہ ڈرامہ شاہ عالمی دروازے کے تھیٹر میں سٹیج کیا۔ استاد بلّے خاں نے بادشاہ کا پارٹ کیا اور اپنے سریلے گانوں سے ڈرامے کو چار چاند لگا دیئے۔ آپ اپنی شاگردوں کے ساتھ کوئٹہ چلے گئے، جہاں آپ بھونچال کا

شکار ہو کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔

۷۔ **برکت علی** بلے خاں مرحوم کے صاحبزادہ ہیں اور نوجوان سارنگی نوازوں میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ آپ سارنگی، استادی موسیقی اور ہلکی پھلکی موسیقی پیش کرنے پر یکساں قادر ہیں۔ سارنگی نوازی کے ساتھ ساتھ گانے میں بھی ماہر ہیں۔

۸۔ **چنوں خاں** آپ بھی لاہور کے مطربوں میں سے ہیں پہلے سارنگی نوازی کرتے تھے، پھر استادی موسیقی اور ہلکی پھلکی موسیقی گانے لگے۔ اللہ نے آپ کو بڑی درد بھری اور رسیلی آواز دی ہے۔ آپ نے کئی محفلوں اور کانفرنسوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کر کے داد حاصل کی ہے۔

۹۔ **نتھو خاں** آپ امرتسر کے مطربوں میں سے ہیں اور سارنگی نوازی میں جواب نہیں رکھتے۔ آپ نے کئی محفلوں اور کانفرنسوں میں سارنگی نوازی کا مظاہرہ کر کے لوگوں سے کماحقہٗ داد حاصل کی ہے، ریڈیو پر بھی آپ سارنگی سے نغمات نشر کرتے ہیں۔

۱۰۔ **پھتو خاں** امرتسر کے مطربوں کے ایک مشہور گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ راگ ودیا نہایت اچھی طرح جانتے ہیں، اور سینکڑوں خیالوں کی استھائیوں کے مالک اور حافظ ہیں۔ سارنگی نوازی بھی کرتے ہیں، اور استادی موسیقی کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ پٹیالوی گائیکی کے کامیاب نمائندہ ہیں۔

۱۱۔ **نبی داد خاں** جالندھر کے مشہور مطرب اور سارنگی نواز تھے، آپ نے کئی سال لاہور میں مشہور گانے والیوں کے ساتھ سارنگی پر سنگت کی، نہایت اچھی سارنگی بجاتے تھے۔ آپ کی مشہور شاگرد گلزار بیگم عرف گِگ تھیں، جو اپنے زمانے کی مشہور مغنیہ تھیں۔

۱۲۔ **جھنڈو خاں** آپ بھی جالندھر کے مطرب اور مشہور سارنگی نواز ہیں۔ جن لوگوں نے میڈن تھیٹر کے فلموں میں آپ کی سارنگی کے دلکش سریلے نغمات سنے ہیں وہ آج بھی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

۱۳۔ **فضل الٰہی** آپ جالندھر کے مطربوں اور سارنگی نوازوں میں ممتاز درجہ کے مالک ہیں، سارنگی نوازی کے ساتھ ساتھ آپ استادی موسیقی کے بھی ماہر ہیں، اور اپنے شاگردوں کو اس کی تعلیم دیتے ہیں، نہایت سریلا گاتے ہیں۔

۱۴۔ **گل محمد عرف گلو** آپ پٹیالہ والے نبی بخش خاں صاحب کے شاگرد تھے، اور سارنگی بجاتے تھے، استادی موسیقی میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے اور نہایت عمدگی سے گاتے تھے، آپ نے لاہور میں کئی مرتبہ اپنے فن کا مظاہرہ کر کے داد وصول کی، آپ کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

۱۵۔ **حسین بخش** آپ گل محمد کے فرزند ہیں اور سارنگی بجاتے ہیں۔ اپنے والد کی طرح استادی موسیقی میں بھی استاد ہیں۔ آپ کو ہندوستانی موسیقی کے راگوں کی بے شمار استھائیاں یاد ہیں۔ آپ کے شاگرد بھی بے شمار ہیں۔

۱۶۔ **مہر دین خورشید** آپ کے دادا کا نام محمد بوٹا ہے۔ آپ کھتے والے کہلاتے ہیں، سارنگی کی تعلیم میاں اللہ دتا جوڑے موری والے سے حاصل کی۔ استادی موسیقی امام الدین خاں سیالکوٹی سے سیکھی اور تال اور لے نقیر بخش پشاوری سے سیکھی۔ آپ بمبئی تشریف لے گئے اور سروج فلم کمپنی، رنجیت فلم کمپنی اور پھر لاہور میں پنچولی

اور شوری پکچرز میں سارنگی نوازی کا کمال دکھایا۔ کولمبیا گراموفون کمپنی میں ماسٹر غلام حیدر کے زیر ہدایت کام کیا۔ اور لاہور کی مشہور گانے والیوں مثلاً خورشید بائی، عیدن بائی علی پوری، عنایت بائی ڈھیرو والی اور ملکہ مہر نگار رجبوں والی کے ساتھ سنگت کرتے رہے۔

۵۔ طبلہ نواز

۱۔ قادر بخش آپ میاں فقیر بخش پکھاوجی کے فرزند ارجمند تھے، پکھاوج اور طبلہ نوازی میں آپ کا خاندان قدیم زمانے سے مشہور چلا آتا تھا۔ آپ کے گھرانے کے شاگردوں کی تعداد بلا مبالغہ ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ آپ نے والد کی وفات کے بعد کئی برسوں تک طبلہ نوازی کی ریاضت کی، اور آخر کار استادی کے درجہ پر فائز ہوئے، لاہور میں سینکڑوں مرتبہ آپ نے نجی محفلوں میں اپنے فن کی نمائش کی، کئی کانفرنسوں میں بھی طبلہ بجایا، اور ہندوستان کی متعدد ریاستوں کے والیان سے تمغے اور انعام و اکرام حاصل کیا، پکھاوج، قاعدہ، گت توڑا، ریلا غرضیکہ اس فن کی ہر صنف اور باریکی پر پوری طرح حاوی تھے، جب طبلہ بجاتے تھے تو اس میں غرق ہو جاتے تھے اور چھوڑنے کا نام نہ لیتے تھے، گو ادھیڑ عمر کے ہو چکے تھے مگر طبلہ نوازی کی روزانہ مشق باقاعدگی سے کرتے تھے۔

۲۔ اُستاد بڈھے خاں ان کا تعلق قصور کے خاندان سے تھا۔ موچی دروازہ میں رہتے تھے۔ دہلی والے کالے خاں کے شاگرد تھے۔ اپنے فن کے ماہر تھے۔ بڑے وضعدار اور باذوق تھے۔ لاہور کے مشہور رئیس رائے صاحب سرن داس کے گھرانے میں ان کی بڑی عزت تھی۔ بے حد خوش عقیدہ تھے۔ محرم کا چاند دیکھتے ہی جوتی اور پگڑی اتار دیتے اور امام حسینؑ کے سوئم کے بعد پھر پہنتے۔ نویں محرم کو ہر سال باقاعدگی سے نیاز دیتے۔ ان کا انتقال ۱۹۴۱ء میں ہوا اور میانی صاحب کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔ ان کے بیسیوں شاگرد ہیں۔ جن میں منظور خاں ان کے بیٹے اور علی بخش بہت مقبول طبلہ نواز ہیں۔

۳۔ فقیر بخش پشاوری آپ پشاور کے رہنے والے تھے، بڑے موٹے تازے تھے، رنگ سیاہ تھا چہرے پر چیچک کے داغ، چپٹی ناک، بڑے بڑے موٹے ہاتھ تھے، آپ قادر بخش کے والد میاں فقیر بخش کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ آپ نے کئی سال تک ان سے طبلہ بجانا سیکھا۔ بعد میں آپ نے ہندوستان کے مشہور طبلہ نواز استاد علی قدر سے بھی فیض حاصل کیا۔ ان کے موٹے موٹے ڈگ ہاتھوں کو دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ آپ طبلہ بجاتے ہوں گے، لیکن جب دایاں بایاں چھیڑتے اور گت شروع کرتے تو آپ کے ہاتھوں کی لوچ اور نزاکت کو دیکھ کر انسان ورطۂ حیرت میں گم ہو جاتا تھا حقیقت یہ ہے کہ طبلہ کا دایاں بایاں آپ کے ہاتھوں کے نیچے باتیں کرتا تھا۔ میرے نزدیک یہ کمال آج تک کسی کے ہاتھوں کو نصیب نہیں ہوا۔ میں نے خود اپنے کانوں سے کلیر شریف کی ایک محفل سرود میں اُستاد شبیر خاں مراد آبادی کو آپ کے طبلہ کی تال پر جھومتے دیکھا ہے۔ جب انھوں نے واہ واہ کہی تو فقیر بخش کہنے لگے: "حضرت میں کیا اور میری بساط کیا!" تو استاد شبیر خاں بولے: "ارے فقیرو، طبلہ بجانے والے تو بہت ہیں لیکن واللہ جو کیوڑہ تیرے ہاتھوں میں ہے وہ کسی کے نصیب میں نہیں" اس سے بہترین داد اور کیا ہو سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج انھیں فوت ہوئے کافی عرصہ ہو چکا ہے اور اس میں بھی شک نہیں

کہ طبلہ بجانے والے بھی بہت سے ہیں لیکن جو کیوڑہ فقیر بخش کے ہاتھوں میں تھا وہ ابھی تک کسی اور کو نصیب نہیں ہوا۔ آپ نے بہت سے چوٹی کے موسیقاروں کے ساتھ طبلہ پر سنگت کی جن میں فتح علی خاں پٹیالوی، سردار بائی، گلزار بائی، بہار بخش خورشید بائی، نظیر بائی وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ آپ کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، جن میں سے حاجی فدا حسین، استاد نیاز علی اور خادم حسین قابل ذکر ہیں۔

۴۔ حاجی فدا حسین آپ مزنگ کے استاد علی بخش کے فرزند ارجمند تھے۔ بچپن میں آپ تھیٹریکل کمپنی سے منسلک ہو گئے، بعد میں آپ فقیر بخش پشاوری سے طبلہ سیکھنے لگے۔ اور اس میں شہرت حاصل کی، یوں تو فقیر بخش کے سینکڑوں شاگرد اس وقت موجود ہیں، لیکن استاد کی خوشبو اگر کسی سے آئی تو وہ صرف حاجی فدا حسین ہی تھے، یوں معلوم ہوتا تھا کہ فقیر بخش ہی بجا رہے ہیں۔ گویئے کے ساتھ سنگت کرنے میں آپ کو ید طولےٰ حاصل تھا۔ ایک مرتبہ مشہور مغنیہ جدن بائی لاہور میں آئیں، ایک محفل موسیقی میں گانے لگیں، طبلہ نواز ان کے ساتھ نہ تھا، حاجی صاحب نے اُن کے ساتھ سنگت کی اور اس خوبی سے کی کہ محفل کے اختتام پر جدن بائی نے انھیں نذر پیش کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے اس خوبی سے سنگت کی ہے کہ مجھے ایک لمحہ کے لیے بھی معلوم نہیں ہوا کہ میں کسی غیر کے ساتھ گا رہی ہوں۔ آپ نے لاہور کی مشہور گانے والیوں مثلاً انور بائی، زیب النساء، اقبال بیگم اور خورشید بیگم کے ساتھ سنگت کی۔ طبلہ نوازی کے علاوہ آپ نے نرت کاری اور رقص کی تعلیم جے پور کے کتھک پنڈت گوپال سے حاصل کی، وہ اس فن میں بھی اپنے استاد کی جملہ خصوصیات کے حامل تھے۔

۵۔ خادم حسین حاجی فدا حسین کے چھوٹے بھائی ہیں، آپ نے بھی طبلہ استاد فقیر بخش پشاوری سے سیکھا۔ آپ کو بھی سنگت کرنے میں مہارت ہے، اور ٹھیکہ کے ساتھ گت توڑے نکالنے میں تو جواب نہیں رکھتے۔

۶۔ الطاف حسین خادم حسین کے فرزند ہیں، اور استاد قادر بخش مرحوم کے شاگرد، ابھی کم عمر ہیں، لیکن اس عمر ہی میں اچھی اچھی محفلوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔ یقین ہے کہ مستقبل قریب میں طبلہ نوازی میں نام پیدا کریں گے۔

۷۔ عنایتی خاں آپ امرتسر کے باشندہ ہیں، طبلہ نوازی میں استاد قادر بخش کے شاگرد ہیں، اور بہت اچھا طبلہ بجاتے ہیں۔ آپ نے بہت سی محفلوں میں اور ریڈیو اور کانفرنسوں میں طبلہ نوازی کا کمال دکھا کر داد تحسین وصول کی ہے۔

۸۔ شوکت حسین آپ نوجوان طبلہ نوازوں میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں، آجکل آپ لاہور ریڈیو سے منسلک ہیں۔ اس کے علاوہ کئی محفلوں اور کانفرنسوں میں طبلہ بجا کر نام پیدا کر چکے ہیں۔

۹۔ طفیل علی آپ بھی نوجوان طبلہ نواز ہیں، اور اپنے فن میں صاحب کمال ہیں، کئی محفلوں اور کانفرنسوں میں طبلہ بجا چکے ہیں آج کل آپ ریڈیو سے منسلک ہیں۔

۱۰۔ کرم الٰہی قصوری۔ آپ قصور کے سرودی مطربوں میں سے تھے اور مشہور طبلہ نواز استاد فتح دین کے شاگرد۔ آپ نے

طبلہ نوازی میں کمال حاصل کیا، بڑے بڑے استادانِ فن آپ کو مانتے تھے، آپ نے کئی مہاراجوں کے درباروں میں طبلہ بجا کر تمغے اور انعام حاصل کیا، آپ کے شاگرد بہت سے ہیں، جن میں حیدر بخش لفا رچی، محمد بخش قصوری، امام الدین گجر اور فضل حسین قصوری بہت زیادہ مشہور ہیں۔

۱۱۔ فضل حسین قصوری آپ مشہور سارنگی نواز غلام محمد قصوری کے فرزند اور استاد کرم الٰہی طبلہ نواز کے شاگرد رشید ہیں۔ ابھی آپ نوجوان ہیں لیکن طبلہ نوازی میں پختہ کار ہیں اور لاہور کی کئی محفلوں میں اپنے کمال کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔

۱۲۔ نبی بخش کالریا آپ استاد فتح دین قصوری کے شاگرد تھے اور طبلہ نوازی کے فن میں ماہر ترین استاد مانے جاتے تھے۔ آپ نے بڑی بڑی محفلوں میں طبلہ نوازی کے کمال کا مظاہرہ کر کے داد وصول کی، آپ کے شاگردوں میں حبیب خاں اور کریم بخش پیرنا بہت مشہور ہیں۔

۱۳۔ میراں بخش گل والیہ آپ ضلع گوجرانوالہ کے موضع گل وال کے باشندہ تھے، والد کا نام مولا بخش تھا۔ استاد فتح دین قصوری کے شاگرد تھے، بعد میں بابا غلام صابر خاں دہلوی اور مظفر شاہ پٹیالی سے بھی کسبِ فیض کیا، اور چند ہی سالوں کی ریاضت کے بعد اپنے فن میں یکتا شمار ہونے لگے۔ آپ نے کئی محفلوں اور ریاستوں میں طبلہ بجایا، اور ہر جگہ داد حاصل کی، آپ نواب خیرپور کے درباری طبلہ نواز تھے۔ آپ کے شاگرد بے شمار ہیں۔

۱۴۔ کریم بخش آپ میراں بخش گل والیہ کے فرزند تھے، آپ نے طبلہ نوازی پہلے اپنے والد سے سیکھی پھر نبی بخش کالریا کے شاگرد ہوئے، اور تھوڑے ہی عرصہ میں اپنے فن میں مشہور ہو گئے۔ آپ نے کئی محفلوں اور کانفرنسوں میں طبلہ بجا کر داد حاصل کی، ابھی جوان ہی تھے کہ ایک ناگہانی حادثہ کا شکار ہو کر فوت ہو گئے۔

۱۵۔ استاد نیاز علی آپ گوجرانوالہ کے رہنے والے ہیں، پہلے میاں فقیر بخش پشاوری سے طبلہ نوازی کی تعلیم حاصل کی، پھر استاد قادر بخش کے شاگرد ہو گئے۔ آپ کو طبلہ نوازی کے جملہ اصناف پر قدرت حاصل ہے۔ تین تال بجانے اور اُس کے سولہ لگاؤ، خالی بھری دکھانے، نغمہ کے ساتھ پھرت، اور خالی سے خالی سم سے سم تک بجانے میں ید طولیٰ حاصل ہے، سادھرہ تال بھی خوب بجاتے ہیں، لاہور کی کئی محفلوں میں بڑی کامیابی سے طبلہ بجا چکے ہیں، اُنھوں نے ہمیشہ داد لی ہے۔ عنایت بائی ڈھیرو والی کے ساتھ سنگت کرتے ہیں۔

۱۶۔ صادق حسین دھانی دھاڑا آپ فیروز چیلوں والے کے شاگرد ہیں۔ اور خوب طبلہ بجاتے ہیں۔ چونکہ آپ دھانی دھاڑا کی گت بڑی تیزی اور خوش اسلوبی سے بجاتے ہیں اس لیے آپ کا نام "دھانی دھاڑا" پڑ گیا ہے۔ نوجوان طبلہ نوازوں میں اچھے مانے جاتے ہیں۔

۱۷۔ فتح دین گُلدم آپ کا تعلق قصبہ دھونکل کے مطربوں سے ہے، آپ تھیٹروں میں اداکاری بھی کرتے رہے، گُلدم کا پارٹ خوش اسلوبی سے ادا کرنے پر "گُلدم" معروف ہو گیا۔ تھیٹریکل طبلہ اور استادی طبلہ بجانے میں ماہر تھے اور تال ادھیا اور سے کو نہایت اچھی طرح سمجھتے تھے۔

۸۔ **ارشاد علی** آپ فتح دین گلدم کے صاحبزادے اور فقیر بخش مرالی والے کے شاگرد ہیں۔ گت توڑا اور قاعدہ بہت اچھا بجاتے ہیں، فلموں میں فلمی موسیقی کے ساتھ طبلہ، ڈھولک، تال اور اونگا بونگا بجانے میں یکتا تسلیم کئے جاتے ہیں۔

۶۔ ستار نواز

۱۔ **محمد شریف پونچھ والے** آپ کے والد کا نام میاں رحیم بخش ہے، ابتدا میں آپ نے ستار نوازی اپنے والد ہی سے سیکھی بعد میں عنایت خاں کلکتہ والے کے شاگرد ہوئے، اور وہاں خوب ریاضت کی، سب سے پہلے آل انڈیا میوزک کانفرنس میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور داد تحسین وصول کی۔ مہاراجہ پٹیالہ نے بھی اپنے دربار میں بلا کر ان کا کمال دیکھا اور داد دی۔ آپ آج تک کئی محفلوں اور کانفرنسوں میں ستار بجا کر اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔

۲۔ **فتح علی خاں پٹیالوی** آپ پٹیالہ کے رہنے والے ہیں، اور ستار نوازی میں صاحبِ کمال ہیں، کئی کانفرنسوں میں ستار نوازی کا کمال دکھا چکے ہیں۔ ریڈیو پاکستان لاہور سے اکثر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں اور فلموں میں بھی بجاتے ہیں۔

۳۔ **سراج احمد قریشی** سب سے پہلے جے پور والے استاد حیدر حسین خاں سے تعلیم حاصل کی، بعد میں کئی اور استادوں سے بھی فیض پایا۔ ۱۹۳۷ء سے محکمہ ریڈیو میں ہیں۔ ۱۹۵۲ء میں آپ نے ایک نیا ساز ایجاد کیا جو ستار کی طرح مضراب سے بجتا ہے۔ اور اس کا نام فردوس بہار رکھا۔ آپ اکثر ستار اور فردوس بہار کا مظاہرہ ریڈیو پر کرتے رہتے ہیں۔

۷۔ قوال

۱۔ **علی بخش خاں** آپ لاہور کے پرانے قوالوں میں سے تھے، سانولا رنگ، بھاری جسم، ساری عمر داتا گنج بخش کے مزار پر قوالی میں گزار دی۔ اردو، فارسی، پنجابی کلام بڑی خوش اسلوبی سے سناتے تھے، قوالی کے ساتھ طبلہ و ستار بجاتے۔ طبیعت بڑی شگفتہ تھی، اور بذلہ سنجی میں بے مثال تھے۔ ایک مرتبہ قلعہ گوجر سنگھ کی ایک محفل میں قوالی کرنے گئے، وہاں ایک پیر صاحب جو پہلے امین آباد کے قصائی تھے بیٹھے تھے، انھیں حال آ گیا، اور وہ پوچھنے لگے "یہ کیا ہو رہا ہے؟" علی بخش خاں نے جواب دیا "قوالی" پیر نے پوچھا "تم کون ہو؟" جواب دیا "داتا کا قوال ہوں" پیر نے کڑک کر پوچھا "میں کون ہوں؟" علی بخش خاں نے ہنس کر جواب دیا "امین آباد کا قصائی!" یہ سنتے ہی پیر صاحب کا حال اتر گیا اور محفل زعفران زار بن گئی۔ آپ استادی موسیقی کے بھی ماہر تھے اور اچھی اچھی محفلوں میں گاتے تھے۔

۲۔ **مبارک علی خاں، فتح علی خاں** جالندھر کے مشہور قوالوں میں سے ہیں، اور ہندوستان اور پاکستان بھر میں مشہور ہیں۔ جب یہ دونوں فن کار اور ان کے ہمنوا قوالی کرتے ہیں، تو لوگ وجد میں آ جاتے ہیں۔ تلفظ اتنا صحیح ہوتا ہے کہ ان پر اہلِ زبان کا گمان ہوتا ہے۔ قوالی کے فن سے کما حقہٗ واقف ہیں۔ قول، قلبانہ جو بہت کم لوگوں کو یاد ہے

نہایت خوش اسلوبی سے پیش کرتے ہیں۔ کلامِ اقبال خاص طور پر گاتے ہیں، اور بلا مبالغہ ان بھائیوں کو ہزارہا اشعار از بر ہیں۔ قوالی کے علاوہ آپ استادی موسیقی بھی نہایت اچھی طرح پیش کرتے ہیں، ریڈیو پاکستان سے اکثر قوالیاں نشر کرتے ہیں۔

۳۔ محمد بوٹا بیگم کوٹی لاہور کے قریب ایک موضع بیگم کوٹ ہے جس میں ایک پنجابی قوال الٰہی بخش رہتے تھے، یہ واحد قوال تھے جن کا پیری مریدی کا سلسلہ جاری تھا، اور لوگوں میں یہ قطب قوال کے نام سے مشہور تھے، محمد بوٹا انہی الٰہی بخش کے فرزند تھے، آپ نے سارنگی اور استادی موسیقی کی تعلیم گل محمد خاں سے حاصل کی، لیکن پھر قوالی کرنے لگے۔ ہم نے آج تک ایسی شیریں اور رسیلی آواز والا قوال کہیں نہیں سُنا۔ آخری چہار شنبہ کی رات جب آپ داتا گنج بخشؒ کے مزار پر "اچھا سہرا خوب بنایا" گاتے تھے تو وہ کونسی آنکھ تھی جو آنسو نہ بہاتی تھی، مگر افسوس کہ قضا نے ہم سے ایک اچھے فن کار کو جوانی ہی میں چھین لیا۔

۴۔ بسنتو خاں نہایت اچھے قوال ہیں، آپ نے بھی نہایت شیریں آواز پائی ہے، آپ کی قوالی بھی وجد آور ہوتی ہے، مجھے قوالی کی ایک محفل یاد ہے، جس میں آپ نے "توں تاں میرا یار نہ ملیا میں کیہہ جاناں تیری خدائی" کچھ اس انداز سے گایا کہ سُننے والے سر دُھننے لگے، آپ مزارات کے علاوہ ریڈیو پاکستان سے بھی قوالیاں نشر کرتے ہیں۔

۵۔ بشیر احمد فریدی یہ امرتسر کے راجپوت خاندان کے فرد ہیں۔ ان کے دادا میاں تایا اپنے وقت کے بڑے اچھے قوال تھے، بشیر احمد نے پہلے بھائی لال امرتسری سے استادی موسیقی سیکھی، پھر آپ مبارک علی فتح علی خاں کے شاگرد ہوئے اور اُن سے قوالی سیکھی، اور حق یہ ہے کہ شاگردی کا حق ادا کر دیا، آپ اس وقت بڑے باکمال قوالوں میں شمار ہوتے ہیں۔

۶۔ رشید احمد آپ امرتسر کے بشیر احمد فریدی کے سگے بھائی ہیں۔ آپ نے بھی مبارک علی خاں فتح علی خاں کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا اور قوالی کا فن سیکھ کر اس میں کمال پیدا کیا، آپ پاکستان کے ہر دلعزیز قوالوں میں شمار ہوتے ہیں۔

۷۔ محمد علی فریدی آپ بھی پاکستان کے ممتاز قوالوں میں سے ہیں، اور بڑے مؤثر انداز سے قوالی کرتے ہیں، بابا فرید گنج شکرؒ کے دربار سے وابستہ ہیں، اور اسی نسبت سے فریدی کہلاتے ہیں۔

۸۔ حافظ عطا محمد حافظ قرآن ہیں، اُردو، فارسی، پنجابی گیت، غزلیات اور نعتیں گانے میں جواب نہیں رکھتے، آواز نہایت رس بھری ہے، اور گلے پر پورا قابو حاصل ہے، آواز جہاں چاہے لے جاسکتے ہیں، قوالی کے علاوہ آپ کے راگ، ٹھمریاں اور ہلکی پھلکی موسیقی میں بھی ماہر ہیں۔

۹۔ بھائی بوڑا لاہور کے مشہور ربابی خاندان کے چشم و چراغ تھے، اور قدیم قوالوں میں شمار کیے جاتے تھے، اُردو، فارسی اور پنجابی کلام نہایت ولآویز ترنم سے پیش کرتے تھے، بعض دفعہ منہ سے گھنگھروؤں کی آواز پیدا کرکے محفل میں سماں باندھ دیتے تھے۔ صوفیائے کرام کا کلام یاد تھا، اور تلفظ بھی بہت عمدہ تھا جس محفل میں قوالی کی، داد لیے بغیر نہ رہے، آپ یادگارِ زمانہ انسانوں میں سے تھے۔

۸۔ میوزک ڈائریکٹر

۱۔ ماسٹر غلام حیدر ۔ لاہور کے مشہور ربابی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اوائل زندگی میں تھیٹریکل کمپنیوں میں اداکاری کی،

پھر لاہور کی کولمبیا کمپنی کی ریکارڈنگ کرتے رہے، بعد ازاں لاہور اور بمبئی کی مختلف فلم کمپنیوں کے فلموں کی دُھنیں تیار کیں، اور ہندوستان کے مشہور ترین میوزک ڈائریکٹروں میں شمار کئے جانے لگے، موجودہ فلمی موسیقی آپ ہی کے کمالات کی مرہونِ منت ہے، اگر آپ کچھ عرصہ اور زندہ رہتے تو فلمی موسیقی کو چار چاند لگا دیتے۔

۲ - **ماسٹر غلام احمد چشتی** آپ بھی ہندو پاکستان کے ممتاز ترین میوزک ڈائریکٹر ہیں اور اس کے ساتھ ہی طبع اتنی موزوں ہے کہ اُردو اور پنجابی شعر کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ فلمی دُھنیں بنانے کی مشین ہیں، آپ نے ہندوستان اور پاکستان کے متعدد فلموں کی کامیاب دُھنیں بنائی ہیں جو بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ مرنجاں مرنج انسان ہیں، اور طبیعت میں تکلف نام کو بھی نہیں، بذلہ سنجی میں بھی جواب نہیں رکھتے۔ ایک دن چوک کشمی میں بیٹھے بڑے گوشت کے تکے نہایت مزے سے کھا رہے تھے، سلیم اقبال میوزک ڈائریکٹر اُدھر سے گزرے تو اُنھیں بُلا کر کہنے لگے: "دیکھو لوگ بڑے سے بڑا گناہ چھپ کر کرتے ہیں لیکن چشتی بڑا گوشت علیٰ الاعلان کھا رہا ہے۔" پاکستان کی فلمی موسیقی کے مستقبل کی بہت سی امیدیں آپ کی ذات سے وابستہ ہیں۔

۳ - **ماسٹر عنایت حسین** پاکستان کے نوجوان موسیقار اور میوزک ڈائریکٹر ہیں۔ آپ نے استادی موسیقی کی تعلیم بڑے غلام علی خاں سے حاصل کی اور بہت جلد اچھا گانے لگے، پھر اپنی خداداد قابلیت کی وجہ سے کولمبیا گراموفون کمپنی میں ڈائریکٹر مقرر ہو گئے، بعد ازاں فلمی دنیا میں شامل ہوئے اور فلموں کی دُھنیں تیار کرنے لگے، آپ اس وقت پاکستان کے بہترین میوزک ڈائریکٹروں میں شمار کئے جاتے ہیں، قاتل، گمنام، انارکلی اور شمی وغیرہ فلموں میں آپ نے بڑی اچھی موسیقی ترتیب دی ہے۔

۴ - **رشید عطرے** آپ امرتسر میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۱ء میں فلمی دنیا میں شریک ہو کر میوزک ڈائریکٹر بن گئے۔ آپ اس وقت تک سات لاکھ، نیند وغیرہ متعدد فلموں کی موسیقی ترتیب دے چکے ہیں۔ آپ بھی پاکستان کے بہترین میوزک ڈائریکٹر ہیں۔

۵ - **تصدق حسین** پاکستان کی فلمی دنیا کے اچھے میوزک ڈائریکٹر ہیں اور اس وقت تک کئی اچھی فلموں کی دُھنیں تیار کر چکے ہیں جن میں روپ متی باز بہادر، غالب، وغیرہ بہت مقبول ہیں۔

۶ - **صفدر حسین** ناگن، ہیر، حمیدہ وغیرہ کی موسیقی ترتیب دے چکے ہیں، اور ایک کامیاب میوزک ڈائریکٹر ہیں، ابھی اور فلموں میں بھی موسیقی ترتیب دے رہے ہیں۔

۷ - **طفیل فاروقی** پہلے پہل آپ آل انڈیا ریڈیو لاہور سے منسلک رہے اور وہاں سے گانے، ہلکی پھلکی موسیقی نشر کرتے رہے، اور ڈراموں اور فیچروں میں حصہ لیتے رہے۔ اُستادی موسیقی میں آپ فیروز نظامی کے شاگرد ہیں۔ آپ بمبئی جا کر فلمی دُنیا میں شامل ہو گئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد لاہور چلے آئے۔ آپ اچھے میوزک ڈائریکٹر ہیں اور اس وقت تک بہروپیا، وحشی، برکھا وغیرہ فلموں کی موسیقی ترتیب دے چکے ہیں۔

۸ - **سلیم اقبال** - لاہور کے مشہور شوقیہ موسیقار میاں علم الدین مرحوم کے صاحبزادے ہیں۔ پہلے استادی موسیقی کی تعلیم اپنے

والد سے حاصل کی پھر فیروز نظامی کے شاگرد ہو گئے۔ کامیاب میوزک ڈائریکٹروں میں شمار ہوتے ہیں۔ اس وقت تک شیخ چلی، گھر جوائی، کرتار سنگھ اور دروازہ کی موسیقی ترتیب دے چکے۔ ان کی دھنیں مقبول ہو کر زبان زد عوام ہیں۔

۹۔ شہر یار استادی موسیقی میں فیروز نظامی کے شاگرد ہیں، اچھے میوزک ڈائریکٹر ہیں اور اس وقت تک بے گناہ، ممتاز، تین تال میں اچھی موسیقی ترتیب دے چکے ہیں۔

۱۰۔ اختر حسین آپ ماسٹر عنایت حسین میوزک ڈائریکٹر کے شاگرد ہیں اور کئی فلموں کی موسیقی ترتیب دے چکے ہیں جن میں سے پاٹے خاں کی دھنیں بہت مقبول ہوئی ہیں۔

۱۱۔ عاشق حسین آپ بھی ماسٹر عنایت حسین کے شاگرد ہیں، بہت ہونہار میوزک ڈائریکٹر ہیں۔ جبرو کی موسیقی آپ ہی نے ترتیب دی ہے۔

۱۲۔ مصلح الدین آپ بنگال کے رہنے والے ہیں، اور اس وقت تک کئی فلموں کی دھنیں تیار کر چکے ہیں" زمانہ کیا کہے گا" کی موسیقی آپ ہی نے ترتیب دی ہے۔

۹۔ کلارنٹ نواز

۱۔ ماسٹر سوہنی لاہور میں پیدا ہوئے۔ موسیقی کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ دس برس کی عمر میں اللہ دتا نقارچی کی شاگردی اختیار کی، اُن سے لَے اور تال کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے بھائی محمد دین سے کلارنٹ سیکھی پھر میاں علم دین مرحوم اور توکل خاں صاحب سے استادی موسیقی حاصل کی، اور پھر ماسٹرس وائس گرامو فون کمپنی میں ملازم ہو گئے، اس کے علاوہ متعدد فلموں میں کلارنٹ بجائی، کئی کانفرنسوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور داد حاصل کی، لاہور میں آپ کا براس بینڈ مشہور ہے۔ جب آپ عالم رنگ و بو میں پکے راگ اور فلمی دھنیں بجاتے ہیں تو فضا سریلے نغمات سے لبریز ہو جاتی ہے۔

۲۔ ماسٹر عالمگیر امرتسر کے مشہور براس بینڈ کے مالک جہانگیر مرحوم کے صاحبزادے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور آ گئے۔ کلارنٹ میں پکے راگ بڑی خوش اسلوبی سے بجاتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی استاد گویا گا رہا اور تانیں مار رہا ہے، فلمی دھنیں بھی بجاتے تھے، افسوس اس فن کار کو بھی قضا نے ہم سے چھین لیا۔

۳۔ صادق علی مانڈو لاہور کے اچھے کلارنٹ نواز ہیں، مدت سے ریڈیو لاہور سے منسلک ہیں اور وہیں سے پکے راگ اور ہلکی پھلکی موسیقی نشر کرتے ہیں، کئی کانفرنسوں میں بھی اپنا کمال دکھا چکے ہیں۔

۴۔ فیروز الدین لاہور کے کہنہ مشق کلارنٹ نواز ہیں پہلے بینڈ میں شریک تھے، پھر لاہور ریڈیو سے منسلک ہو گئے، آپ اکثر وہاں استادی موسیقی اور ہلکی پھلکی موسیقی نشر کرتے رہتے ہیں۔

۱۰۔ بیانو نواز

۱۔ ماسٹر اللہ دیا — میاں فتح دین کے صاحبزادہ ہیں، موسیقی کی تعلیم انہیں سے حاصل کی۔ پھر این۔ ڈبلیو۔ آر میں

ملازمت اختیار کی، شوقیہ پیانو بجانے تھے اور ایسا بجاتے تھے کہ سامعین عش عش کر اٹھتے۔ آج سے چالیس سال پہلے جب کہ ٹاکیز فلموں کا رواج نہ تھا آپ گیٹی تھیٹر لاہور (حال نادلٹی سینما) میں فلم کے ساتھ حسب موقع پیانو بجاتے تھے اور اس میں کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔

۲۔ ماسٹر عنایت حسین ماسٹر اللہ دیا کے صاحبزادہ ہیں، آپ ایک بہتر مصور بھی ہیں اور عبدالرحمٰن چغتائی کے شاگرد ہیں۔ پیانو آپ نے اپنے والد سے سیکھا، نہایت عمدگی سے بجاتے ہیں۔ اپنے والد کی ساری خوبیاں آپ کی انگلیوں میں موجود ہیں۔

۳۔ ماسٹر صادق علی میاں امام الدین دھونکل والے کے صاحبزادہ ہیں۔ مادر زاد نابینا ہیں۔ لیکن اللہ نے دماغ ایسا دیا ہے کہ جس فن میں چاہتے ہیں کمال حاصل کر لیتے ہیں، پہلے طبلہ نوازی شروع کی، تو اس میں بھی نام پیدا کیا، اب پیانو اور اکارڈین بجاتے ہیں، اور اتنے رسیلے اور سریلے انداز سے بجاتے ہیں کہ سامعین پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ انگلیاں بجلی کی سی تیزی سے سروں پر دوڑتی ہیں۔ اس وقت تک آپ کئی فلموں میں پیانو نوازی کا کمال دکھا چکے ہیں، اور کئی کانفرنسوں میں بھی پیانو بجا کر داد حاصل کر چکے ہیں۔

۱۱۔ نے نواز

۱۔ سائیں اللہ دتا پاکستان کے ممتاز نے نوازوں میں سے ہیں، جب آپ بانسری سے استادی موسیقی یا ہلکی پھلکی موسیقی بجاتے ہیں تو عجیب سماں باندھ دیتے ہیں۔ آپ نے کئی بھی محفلوں اور کانفرنسوں میں بانسری بجائی اور داد حاصل کی، ریڈیو پاکستان لاہور سے بھی آپ نغمات نشر کرتے ہیں، اور فلموں میں بھی بجاتے ہیں۔

۲۔ بابو خاں یو۔پی کے باشندہ ہیں، لیکن مدت سے ریڈیو پاکستان لاہور سے منسلک ہیں، نہایت اچھی بانسری بجاتے ہیں۔ آپ متعدد فلموں میں اپنے فن کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔

۳۔ حاجی عمر حیات آپ ہر فن مولا فنکار ہیں۔ پہلے ہارمونیم سیکھا، پھر کلارنٹ بجانے لگے اور خوب بجایا، اب بانسری بجاتے ہیں، کئی بھی محفلوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔ سانس کا یہ عالم ہے کہ ٹوٹتا ہی نہیں، آجکل آپ ایک نئی قسم کی بانسری کی ایجاد میں غرق ہیں، اس کے لیے گزشتہ دو تین سال سے محنت کر رہے ہیں، اور بلا مبالغہ ہزاروں بانسریاں بنا کر توڑ چکے ہیں، ابھی انھیں اپنی ایجاد میں کامیابی نصیب نہیں ہوئی، مگر آپ "پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ" پر کاربند ہیں۔

۱۲۔ سرود نواز

۱۔ بھائی مہر لاہور کے مشہور ربابی خاندان سے ہیں، اور سرود بجانے میں مشہور ہیں۔ پہلے آپ کولمبیا ریکارڈنگ کمپنی سے منسلک رہے، ریڈیو پاکستان لاہور سے بھی سرود کے نغمات نشر کرتے رہے، اور کئی محفلوں اور کانفرنسوں میں سرود نوازی کا کمال دکھایا اور داد وصول کی۔

۲۔ فیض فرید آپ بھی ربابی خاندان کے فرد ہیں، اور سرود نوازی خوب کرتے ہیں، مدت سے لاہور ریڈیو سے منسلک ہیں اور سرود پر نغمے نشر کرتے ہیں، علاوہ ازیں آپ نے کئی کانفرنسوں میں بھی سرود بجا کر داد لی ہے۔

اکھاڑے

سراج نظامی

قرآن مجید نے جناب طالوت کا قصہ بیان فرما کر قوموں کے ضعف و قوت، اور فتح و شکست کے متعلق ایک ٹھوس حقیقت کا انکشاف کیا ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ایک اور نبی کو بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے مبعوث کیا گیا تو بنی اسرائیل نے ان سے کہا کہ ہمیں جنگوں کے لیے ایک سپہ سالار کی ضرورت ہے، نبی نے کہا کہ اللہ نے طالوت کو تمھارا سپہ سالار منتخب کیا ہے تو وہ حیران رہ گئے، کیونکہ طالوت امرا کے طبقہ سے نہ تھے، اور بنی اسرائیل کے نزدیک ہر بات کا معیار سرمایہ داری تھا۔ اس لیے انھوں نے اعتراض کیا کہ ہم اس غریب شخص کو سپہ سالار کس طرح تسلیم کر لیں۔ نبی نے جو جواب دیا وہ قرآن کی سورہ بقرہ کی ۲۴۷ ویں آیت میں موجود ہے ارشاد ہے:

قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَ زَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ

"کہا بے شک اللہ نے اسے تم پر برگزیدگی عطا فرمائی ہے اور علم کی فراوانی اور جسم کی طاقت میں وسعت دی ہے۔"

قرآن مجید نے مختصر الفاظ میں جسمانی قوت کی فضیلت کو نہایت بلیغ انداز میں بیان فرما دیا ہے۔ حکیم الامت علامہ اقبال نے بھی اس ٹھوس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے ؎

اہلِ حق را زندگی از قوت است
قوت ہر ملت از جمعیت است

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ یونان، روما، اسپارٹا، قرطاجنہ، مصر، عرب، ایران اور ہندوستان میں جسمانی ورزش پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ اور اسی کا نتیجہ تھا کہ وہاں کے روئیں تن پہلوانوں اور سپہ سالاروں مثلاً ہرکلیز، ہنی بال، حمزہؓ، علیؑ، معدی کربؓ، رستم، سہراب، اسفندیار، افراسیاب، بھیم اور ارجن نے چار وانگ عالم میں شہرت حاصل کی، اور تاریخ عالم میں اپنے نام سنہری حروف میں لکھا گئے۔ یہی وجہ تھی کہ بادشاہ، مہاراجگان اور امرا و رؤسا شہ زور پہلوانوں کی سرپرستی کرتے اور انھیں خلعتوں اور انعام اکرام سے نوازتے تھے۔ ہندوستان میں بھی پہلوانی اور کشتی کا فن زمانۂ قدیم سے چلا آتا تھا۔ اور ہر جگہ بڑے بڑے اکھاڑے قائم تھے، جن میں بہترین استادوں کی زیر نگرانی جوانوں کو کشتی کے فن کی تربیت دی جاتی تھی۔ ان اکھاڑوں نے عظیم الشان پہلوان پیدا کیے جنھوں

نے اپنے کارناموں سے اس شریف فن کا نام زندہ رکھا۔

لاہور ایک قدیم تاریخی شہر ہے، نا ممکن تھا کہ یہاں یہ فن رائج نہ ہوتا۔ تاریخ کے مطالعہ سے عیاں ہوتا ہے کہ اس شہر نے بھی بڑے بڑے مشہور پہلوان پیدا کئے، جنھوں نے ہندوستان اور بیرون ہندوستان عظیم الشان دنگلوں میں فتح پائی اور لاہور کا نام بلند کیا۔ اس فن کی ہر دلعزیزی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ لاہور میں بیسیوں اکھاڑے ہیں جن میں پہلوان ورزش کرتے تھے اور اب بھی کرتے ہیں۔

لاہور میں پہلوانوں کے تین گروہ ہیں۔ ہر گروہ کے چیلا چیلیوں کو دف وار کہتے ہیں:۔

۱۔ **کالو والے** ۔ اس گروہ کے بانی استاد کالو مرحوم تھے۔

۲۔ **نورے والے** ۔ اس گروہ کے بانی استاد نورا مرحوم تھے۔

۳۔ **کوٹ والے** ۔ کوٹ پنجابی میں فصیل کو کہتے ہیں، چونکہ اس گروہ کے بانی الٰہی بخش پہلوان بھاٹی دروازہ کے باہر ماموں بھانجے کے پیپل کے نیچے فصیل (کوٹ) کے پاس ایک اکھاڑے میں ورزش کرتے تھے، اس لیے یہ کوٹ والے کہلاتے تھے۔

شروع شروع میں کوٹ والے اور کالو والے آپس میں کشتیاں نہیں لڑتے تھے بلکہ یہ دونوں نورے والوں سے لڑتے تھے، تقریباً بتیس سال کا عرصہ ہوا کہ بھاٹی دروازہ کے حاجی بلاّ نے کوشش کر کے اور ہزار ہا روپے صرف کر کے امام بخش پہلوان اور گونگا پہلوان کا دنگل کرا دیا، اس دنگل کی عظمت کا اندازہ اس بات سے لگا لیں کہ سارے منٹو پارک میں شہتیروں سے ایک گول پنڈال بنا دیا گیا تھا۔ اور ہندوستان کے ہر شہر سے لوگ یہ دنگل دیکھنے آئے تھے۔ امام بخش کوٹ والے تھے اور گونگا کالو والے، اس لیے اس دن سے آج تک ان تینوں اکھاڑوں کے پہلوان ایک دوسرے سے کشتیاں لڑتے ہیں، آجکل کوٹ والوں کے بڑے خلیفہ سردار محمد پہلوان ولد خلیفہ لوٹی مرحوم ہیں۔ کالو والوں کے خلیفہ عبداللہ اور نورے والوں کے مشہور پہلوان خلیفہ غلام محی الدین ہیں۔

اس مختصر سے مضمون میں کوشش کی گئی ہے کہ قارئین کو مشہور اکھاڑوں کی جملہ تفاصیل سے کما حقہٗ آگاہ کر دیا جائے۔

کالو والے

اکھاڑہ خلیفہ بوٹا | اس اکھاڑے کو کھائی والا اکھاڑہ بھی کہتے ہیں، کالو والے اکھاڑوں میں یہ سب سے بڑا اکھاڑہ ہے۔ یہ شاہی قلعہ کے جنوب کی طرف لیلا پارک میں بجلی گھر کے قریب واقع ہے، اس اکھاڑے نے ہندوستان کے بہترین شہ زور پہلوان پیدا کئے ہیں، جن میں سے مندرجہ ذیل بہت مشہور ہیں:۔

۱۔ **بوٹا پہلوان مرحوم** ۔ آپ لاہور کے نامی پہلوان تھے، جسم نہایت سڈول اور خوبصورت تھا، یوں بھی بہت حسین تھے، دیدہ زیب لباس پہنا کرتے تھے، آپ نے پنجاب کے اکثر نامی گرامی پہلوانوں سے مقابلہ کیا اور انھیں گرایا، علاوہ ازیں آپ نے ہندوستان کی کئی ریاستوں میں ریاستی پہلوانوں کو پچھاڑا اور انعام و اکرام حاصل کیا، امرتسری دیو ہیکل پہلوان رحمی کا

کو بھی آپ نے چاروں شانے چت گرا دیا تھا۔

[آپ کو رستمِ ہند کہا جاتا تھا۔ ہندوستانی ریاستوں میں آپ کی بڑی عزت تھی۔ رئیس قدر کرتے تھے کہ آپ کی پشت نے کبھی زمین نہیں دیکھی، دنگل میں کسی سے ہار نہیں مانی، بڑے بڑے پہلوان آپ کی شہ زوری کا لوہا مانتے اور استادی کے قائل تھے۔ ریاست بڑودہ سے آپ کو جاگیر کے علاوہ معقول وظیفہ ملتا تھا۔ مہاراجہ جسونت سنگھ والیٔ جودھ پور نے آپ کو پاؤں کے طلائی کڑے عطا کیے تھے جو خاص مصاحبوں، اعلیٰ جاگیرداروں اور بھائی بندوں کے سوا کسی کو نہ ملتے تھے۔ آپ ایک ریاست کی طرف سے راجہ کے ہمراہ یورپ بھی گئے تھے۔ ۱۴ر مارچ ۱۹۰۴ء کو کیکر سنگھ اور کلو پہلوان کی کشتی میں آپ کو ایمپائر (جج) مقرر کیا گیا۔ ۸ر اپریل کو اپنے وطن لاہور میں انتقال کیا اور میانی صاحب کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔ چونکہ قومی کاموں میں بہت دلچسپی لیتے اور بے دریغ روپیہ صرف کرتے تھے اس لیے منشی محمد الدین فوقؔ مرحوم کی تحریک پر فصیح الملک بہادر مرزا داغؔ دہلوی، نواب فصاحت جنگ بہادر سید جلیل حسن جلیلؔ مانکپوری، منشی وجاہت حسین صاحب وجاہتؔ جھنجھانوی اور دیگر کئی شعرا نے قطعات تاریخ کہے۔ جن میں سے چند ایک بطور یادگار یہاں درج کیے جاتے ہیں ـــــ ادارہ]

داغؔ دہلوی ؎

وہ دلاور اور وہ شہ زور دنیا سے گیا
جس کی شہ زوری سے تھا شیرِ نیستاں منفعل

داغؔ نے یہ مصرعِ تاریخ برجستہ کہا
رستمِ ہند آہ اٹھا پہلوان دیو دل
۱۳ ۵ ۲۲

جلیلؔ مانکپوری ؎

یوں تو مرنا سب کو ہے لیکن ستم ہے اس کی موت
جو کسی فن میں ہو وجہِ افتخارِ روزگار

مٹ گیا اے وائے اٹھا پہلواں کا بھی وجود
کیا بساطِ زندگی کیا اعتبارِ روزگار

زور و طاقت میں یگانہ تھا فنِ کشتی میں فرد
معرکہ آرائیوں میں یادگارِ روزگار

زالِ دنیا رو رہی ہے اس تہمتن کے لیے
کہہ رہی ہے ہائے ہائے اسفندیارِ روزگار

فوقؔ نے لکھا مجھے تاریخ کہنے کے لیے
خلق جن کا ہے بہارِ سبزہ زارِ روزگار

ان کے لکھنے سے کہی تاریخ میں نے اے جلیلؔ
رستمِ ہند آہ اٹھا نامدارِ روزگار

وجاہتؔ جھنجھانوی ؎

چل دیئے ملکِ عدم کو اب میاں بوٹا بھی آہ
جن کے دم سے پہلوانی کا گلستاں تھا نہال

رستمِ ہندوستاں تھا وہ جوانِ پنجاب کا
فنِ کشتی میں سمجھتے تھے اسے سب باکمال

جس کی شہرت تھی مسلمانوں کی عزت کا سبب
موت اس کی ہو نہ کیونکر باعثِ رنج و ملال

غیر ممکن گو نہ ہو، اس میں مگر کچھ شک نہیں
اب نظر آئے گی مشکل سے کوئی ایسی مثال

کس کی ہو گی ایسی عزت ایسی قدر و منزلت
ہند میں اب کون پا سکتا ہے یہ جاہ و جلال

اپنے مخلص کا بھلا میں حکم کب سکتا تھا ٹال   کی تھی فرمائش جناب فوقؔ نے تاریخ کی

یہ لکھا میں نے وجاہت مصرع سال وفات

کر گیا عالم سے جب اب رستم ہند انتقال

۱۹۰۷

۲۔ چوہا پہلوان مرحوم ۔ آپ بوٹا پہلوان کے بھائی تھے، اور کشتی کے فن کے ماہر، آپ نے بھی متعدد کشتیاں لڑیں اور اُن میں کامیاب رہے، آپ نے ریاستوں کے دنگلوں میں بھی کافی نام پیدا کیا۔

۳۔ مہنی پہلوان ریتی والا مرحوم ۔ یہ جواں سال پہلوان اگر کچھ عرصہ زندہ رہتا تو بڑا نام آور ہوتا، آپ نے چھوٹی سی عمر میں عظیم الشان دنگلوں میں کامیابی حاصل کی، بڑے دل گردے کے مالک تھے، اور شیر کی طرح اپنے حریف پر جھپٹتے تھے، آپ نے رحیم پہلوان سلطانی والا، کلو پہلوان امرتسری، حسن بخش ملتانی اور کالا پرنانا پہلوان سے کشتی لڑی اور اُن کو چاروں شانے چت گرایا۔ آپ نے آخری کشتی میں اتنا زور لگایا کہ گھر آکر آپ کی موت واقع ہو گئی۔

۴۔ گاموں پہلوان بالی والا مرحوم ۔ آپ بوٹا پہلوان رستم ہند کے شاگرد تھے، نہایت خوبصورت جسم کے مالک تھے، داؤ پیچ اور لڑنت میں جواب نہیں رکھتے تھے، آپ نے پنجاب اور ہندوستان کے بیشتر شہ زور پہلوانوں سے مقابلہ کیا، اور انھیں گرایا، نانی والا پہلوان ملتانی اور رحیم پہلوان سلطانی والا کو گرایا، مشہور و معروف گونگا پہلوان آپ ہی کے فرزند ارجمند تھے، آخری کشتی بدو برہمن سے لڑے اور ہار گئے۔

۵۔ گونگا پہلوان مرحوم ۔ یہ وہ پہلوان تھے جن پر پاکستان کو ہمیشہ فخر رہے گا۔ آپ گاموں بالی والے کے سب سے بڑے فرزند تھے، نام فیروز الدین تھا، بچپن میں تپ محرقہ کے باعث گونگے ہو گئے، اس لیے گونگا کے نام سے مشہور ہوگئے، آپ شہ زوری اور فن کشتی میں نہایت ماہر تھے، آپ نے کئی دنگلوں میں ہندوستان کے نامی گرامی پہلوانوں کو اپنی خداداد مہارت سے چاروں شانے چت گرایا، یوں تو آپ نے کئی کشتیاں لڑیں، مگر جو کشتی آپ نے امام بخش پہلوان رستم ہند سے لڑی وہ رہتی دنیا تک یاد رہے گی، ایسا دنگل اور ایسا وسیع پنڈال آج تک نظروں سے نہیں گزرا، تقریباً ساری منٹو پارک ہی پنڈال بن گئی تھی، ہم اس کشتی میں اکھاڑے کے بالکل قریب بیٹھے تھے، اور ہمارے پیچھے اُس عہد کے دو نامی گرامی پہلوان بیٹھے تھے یعنی کلو پہلوان امرتسری اور رحیم پہلوان سلطانی والا، یہ دونوں پہلوان اکھاڑے میں اُترنے والے ہر پہلوان کے متعلق باتیں کرتے اور رائے دیتے تھے۔ جب امام بخش اور گونگا اکھاڑے میں آمنے سامنے ہوئے، اور دونوں نے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالی کہ کشتی شروع کی تو رحیم سلطانی والا کہنے لگا: ”پہلوان گونگا امام بخش کے رعب میں نہیں آ رہا ہے“ تھوڑی دیر بعد کلو پہلوان نے دونوں پہلوانوں کی طاقت کا اندازہ لگا لیا، اُنھیں معلوم ہو گیا کہ امام بخش طاقت میں گونگے سے کم ہیں، آپ نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے اور کہا ”خدایا میرے بھتیجے کی خیر!“ اشارہ امام بخش کی طرف تھا۔ اس کے بعد چشم زدن میں امام بخش اوپر تھے اور گونگا نیچے، لیکن دوسرے لمحہ گونگا کھڑا ہو گیا، دونوں پہلوان لڑتے ہوئے کھائی میں جا گرے۔ نواب محمد علی قزلباش مرحوم اور خان بہادر شیخ محمد نقی مرحوم منصفان تھے، دونوں نے فیصلہ گونگے کے حق میں دے دیا مگر امام بخش اس فیصلہ سے متفق نہ ہوئے اور کشتی دوبارہ ہوئی، لاہور کے ڈپٹی کمشنر بھی موقعہ پر آن پہنچے اور گونگا پہلوان نے پھر امام بخش کو گرا لیا۔

اس کے علاوہ گونگا سنے نانی والا پہلوان غلام نبی، حیدر پہلوان امرتسری، افضل پہلوان جالندھری، گاماں کلو والا امرتسری، حمیدہ پہلوان امرتسری، بگا سنگھ پہلوان، گنگا سنگھ پہلوان، رحیم بخش پہلوان سلطانی والا اور طاہر پہلوان سے کشتی لڑی اور ان میں سے اکثر کو چار دن شانے چت گرا دیا۔

دو مرتبہ امام بخش پہلوان سے شکست کھائی۔ ایک مرتبہ پٹیالہ میں اور دوسری مرتبہ لاہور میں۔ قیام پاکستان کے بعد آپ دنگل دیکھنے لاہور آ رہے تھے کہ لاری کے حادثے کا شکار ہو کر فوت ہو گئے۔

ان نامی پہلوانوں کے علاوہ اس اکھاڑے نے اور بھی پہلوان پیدا کئے، جن میں سے جانی جتی والا، جانی ڈنگر، ساجا گھگھو ساجا کبابی، کالا خراسیہ، برکت ناگاں والا، صدرو، محمد حسین، شیدا پہلوان بہت مشہور ہیں۔

اس اکھاڑے کے موجودہ خلیفہ ساجا پہلوان کبابی ہیں۔

۲۔ اکھاڑہ تکیہ تاجے شاہ

یہ اکھاڑہ تکیہ تاجے شاہ، بیرون ٹکسالی گیٹ روڈ میں واقع ہے۔ اس کے مشہور خلیفہ مہتا خراسی اپنے فن کے بہت ماہر مانے جاتے ہیں۔ اس اکھاڑے کے مشہور پہلوانوں میں بجے شاہ بہت اچھے پہلوان ہیں، بدن نہایت خوبصورت ہے، اور فن میں ماہر ہیں۔ آجکل اس اکھاڑے کے خلیفہ بھی آپ ہی ہیں۔ غنی پہلوان ربنی والا بھی کبھی یہاں ورزش کیا کرتا تھا۔

۳۔ اکھاڑہ چنن قصائی

یہ اکھاڑہ لنڈا بازار عقب لاہور ہوٹل کوتوالی میں واقع ہے۔ یہ اکھاڑہ بھی لاہور کے اکھاڑوں میں ممتاز مقام رکھتا ہے۔ اس میں اچھے اچھے شہ زور پہلوان ورزش کرتے رہے ہیں۔

مندرجہ ذیل بہت زیادہ مشہور ہیں:۔

۱۔ **چنن پہلوان قصائی ستارۂ ہند مرحوم۔** بڑے گرانڈیل پہلوان تھے، اور فن کشتی کے ماہر مانے جاتے تھے۔ آپ نے پنجاب اور ہندوستان کے نامی پہلوانوں سے کشتی لڑی اور بیشتر کو شکست دی، اسی لیے آپ ستارۂ ہند کہلائے۔

۲۔ **ننھا چنگڑ پہلوان۔** آپ نے کئی دنگلوں میں اپنے کمال فن کا مظاہرہ کیا، اور اپنے فن داؤں سے داد حاصل کی۔ بڑے حیالے پہلوان ہیں، حریف پر چیتے کی طرح حملہ کرتے اور داؤ پیچ کے کمال دکھاتے ہیں۔ آپ نے بھی کئی مشہور پہلوانوں کو شکست دی، ننھا پہلوان، نور الدین گوجر کو گرایا، طاہا پہلوان بانی والا اور گاماں کلو والے کے ساتھ کشتی برابر رہی۔ مگر افسوس کہ ہندو مسلم فسادات کے سلسلہ میں آپ کو عمر بھر دریائے شور کی سزا ہو گئی اور آپ انڈمان بھیج دیئے گئے۔ جب آپ واپس آئے تو طاقت جواب دے چکی تھی، پہلوانی سے دل اچاٹ ہو گیا۔ آج کل آپ اللہ کی یاد میں مشغول رہتے ہیں۔

۳۔ **جمال چنگڑ پہلوان۔** آپ ننھا چنگڑ پہلوان کے چھوٹے بھائی ہیں، طویل القامت ہیں، قوی جثہ کے مالک ہیں، فن داؤ پیچ میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ آپ نے بھی کئی قابل ذکر دنگلوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ اہالیان لاہور ان کشتیوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے جو جمال پہلوان اور جہاں پہلوان جوڑ اگر کے درمیان ہوئیں۔ جب یہ دونوں نامی پہلوان کشتی لڑتے تو لوگ عش عش کرتے۔

اس اکھاڑے کے موجودہ خلیفہ کا نام حبیبہ دادا ہے۔

۴۔ اکھاڑہ اُستاد شیش گر | یہ اکھاڑہ مستی دروازہ لاہور کی تاریخی مسجد بیگم شاہی کے عقب میں واقع تھا۔ یہ جگہ وہاں موٹروں کی مرمت کی دکانیں بن گئی ہیں، موجودہ خلیفہ استاد شیش گر کے صاحبزادہ ہیں۔

۵۔ اکھاڑہ نزد پُل مصری شاہ | یہ اکھاڑہ مصری شاہ کے پُل کے باہر نئی میوہ منڈی کے پاس واقع ہے، ایک چھوٹا سا مزار بھی وہاں موجود ہے۔ اس اکھاڑے کے مشہور پہلوانوں میں جلال الدین کوٹلوں والا بہت نامی پہلوان گزرا ہے۔ اس نے کئی دنگلوں میں اپنے فن کی داد وصول کی، اور بہت سی کشتیاں کامیابی سے لڑیں۔

کوٹ والے

اکھاڑہ ویام شالہ | لاہور کا نیا اکھاڑہ ہے، اور ٹکسالی دروازہ کے باہر موہنی روڈ کے شروع میں واقع ہے، پہلے یہ لاہور کے ہندو پہلوانوں کا اکھاڑہ تھا، اور یہاں اُن کے دنگل ہُوا کرتے تھے، قیام پاکستان کے بعد جب امرتسر کے مشہور پہلوان گاماں کلّو والا لاہور آ گئے، تو انھوں نے یہاں اکھاڑہ بنا لیا، اس اکھاڑہ میں پاکستان کے نامی گرامی پہلوان ورزش کرتے ہیں، مندرجہ ذیل عالمگیر شہرت کے مالک ہیں :۔

۱۔ **بھولو پہلوان رستم ہند**۔ رستم زماں گاماں پہلوان کے بھتیجے اور رستم ہند امام بخش پہلوان کے سب سے بڑے صاحبزادے ہیں۔ بڑے گرانڈیل جوان ہیں، ریاضت کا یہ عالم ہے کہ لنگوٹ کس کر جب اکھاڑے میں آتے ہیں تو بیسیوں پہلوانوں کو ورزش کرا دیتے ہیں۔ ابھی آپ کی عمر کچھ زیادہ نہیں لیکن آپ پاکستان اور ہندوستان کے بیشتر نامور پہلوانوں کو پچھاڑ چکے ہیں، حقیقت میں آج کوئی پہلوان اُن کے جوڑ کا موجود نہیں اور اگر کوئی اُٹھتا بھی ہے تو آپ کے چھوٹے بھائی اس کا کس بل نکال دیتے ہیں۔

۲۔ اسلم پہلوان عرف اچھا۔ ۳۔ اکرم پہلوان عرف اکی۔ ۴۔ گوگا پہلوان ۵۔ اعظم پہلوان۔
یہ چاروں جواں سال پہلوان بھی امام بخش پہلوان رستم ہند کے صاحبزادے اور بھولو پہلوان کے چھوٹے بھائی ہیں، قدیم کشتی اور جدید فری سٹائل کشتی کے فن میں پوری طرح ماہر ہیں، کم عمری میں ہی کئی دنگلوں میں کشتی لڑ کر کامیابی حاصل کر چکے ہیں، پاکستان، ہندوستان اور بیرون پاکستان کے کئی مشہور پہلوانوں کو چاروں شانے چت گرا چکے ہیں، پاکستان کو اس خاندان پر ناز ہے۔

۶۔ اکھاڑہ بھورے شاہ | کبھی نامی اکھاڑہ تھا، اور تکیہ بھورے سائیں بیرون ٹکسالی دروازہ میں واقع تھا۔ اس اکھاڑے نے بھی اچھے اچھے پہلوان پیدا کئے تھے، جن میں مندرجہ ذیل بہت مشہور ہیں :۔

۱۔ **کریم بخش پہلوان پوپلی والا مرحوم**۔ اپنے وقت کے بہت مشہور پہلوان تھے، اور اچھے اچھے پہلوانوں کے ساتھ مقابلہ کر کے انھیں شکست دی تھی۔ آپ مہاراجہ جودھ پور کے درباری پہلوان تھے۔

۲۔ **یوسف پہلوان پپاں والا**۔ بڑے گرانڈیل پہلوان ہیں اور لاہور اور بیرون لاہور کے کئی نامی پہلوانوں سے کشتی لڑ چکے ہیں۔ آپ نے ہندوستان کی کئی ریاستوں کے دنگلوں میں بھی اپنی شجاعت کا مظاہرہ کیا ہے اور داد وصول کی ہے آپ کریم بخش پہلوان پوپلی والے کے شاگرد ہیں۔

۳۔ **لال پہلوان پیلیجہ**۔ استاد کریم بخش پہلوان پوپلی والے کے شاگرد اور اچھے پٹھوں میں ہیں، داؤ پیچ اور طاقت

تو خوب جانتے ہیں، لاہور والے ان کی کشتیوں کو ابھی تک یاد کرتے ہیں۔

۴۔ عاشق پہلوان پوٹی والا۔ آپ سردار محمد پہلوان کے فرزند اور مشہور خلیفہ پوٹی مرحوم کے نواسے ہیں آپ نے بھی کئی دنگلوں میں فن کا مظاہرہ کر کے داد لی ہے۔ آپ اچھا پہلوان ہونے کے ساتھ ایک کامیاب جراح بھی ہیں اور ہڈیوں کے جوڑنے میں ماہر ہیں۔

۵۔ غلام ہنوں والا۔ ۶۔ دین پہلوان۔ ۷۔ امام دین اراعیں۔ ۸۔ جیجا پہلوان۔ یہ سارے پہلوان اپنے زمانے کے بہترین پٹھوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ اور انھوں نے لاہور کے کئی دنگلوں میں اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا اور لوگوں سے داد لی تھی۔

اب اس اکھاڑے کا نام و نشان موجود نہیں، کیونکہ تکیہ موجود نہیں۔

۳۔ اکھاڑہ تکیہ شبیر علی یہ اکھاڑہ تکیہ شبیر علی بیرون ٹکسالی دروازہ میں واقع تھا، اور اس میں تقریباً وہی جوان ورزش کیا کرتے تھے، جو اکھاڑہ تکیہ بھورے شاہ میں کرتے تھے، اب یہاں کوئی اکھاڑہ موجود نہیں۔

۴۔ اکھاڑہ پیر مکی راوی روڈ پر گورروں کے قبرستان کے پاس مشہور مصور عبدالرحمٰن چغتائی کا مکان ہے، یہ اکھاڑہ اس مکان کے عقب میں واقع ہے، اس اکھاڑے نے بھی اچھے اچھے پہلوان پیدا کئے ہیں، مثلاً علمان زاج، دجیهان پہلوان، ننھا پہلوان، عاشق پہلوان دھوبی، جو کئی دنگلوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔

۵۔ اکھاڑہ تکیہ پیر از غیب دربار داتا گنج بخش رح کے سرہانے کی طرف ایک تکیہ ہے جسے پیر از غیب کہتے ہیں اسی تکیہ میں کبھی یہ اکھاڑہ ہوا کرتا تھا، اس اکھاڑے میں بھی کافی پہلوان ورزش کیا کرتے تھے، بالا جھبورا اسی اکھاڑے کا مشہور پہلوان تھا۔ اب قبریں بننے کی وجہ سے یہ اکھاڑہ یہاں سے ہٹ گیا ہے۔

۶۔ اکھاڑہ خلیفہ بخشی یہ بالکل نیا اکھاڑہ ہے، اور لوہاری دروازہ کے باہر مسکین سائیں کے تکیہ میں واقع ہے، اس اکھاڑے کے خلیفہ بخشی ہیں، خالد پہلوان آپ ہی کے شاگرد ہیں، اور آجکل کے نامی گرامی پٹھوں میں ہیں، اور کئی دنگلوں میں کشتی لڑ کر اچھے اچھے پہلوانوں کو پچھاڑ چکے ہیں۔

۷۔ اکھاڑہ جانی پہلوان یہ اکھاڑہ جانی پہلوان پسر الٰہی بخش نے بادشاہی مسجد کے پاس بنایا تھا، اور اس میں جانی پہلوان، ساجا گھگھو پہلوان وغیرہ ورزش کرتے تھے، جب شاہی مسجد کی مرمت شروع کی گئی اور باغات بنائے گئے تو اس اکھاڑے کو یہاں سے ہٹا دیا گیا۔

۸۔ اکھاڑہ گھدو شاہ اسے بھائیوں کا اکھاڑہ بھی کہتے ہیں، کیونکہ اس کے خلیفوں میں حکیم بھائی گلاب سنگھ اور حکیم مادھو سنگھ بڑے مشہور گزرے ہیں، یہ سرکلر روڈ پر لوہاری دروازہ اور موری دروازہ کے درمیان تکیہ گھدو شاہ میں واقع ہے، جس طرح کھائی والا اکھاڑہ کالو والوں کا سب سے بڑا اکھاڑہ ہے، اسی طرح یہ اکھاڑہ کوٹ والوں کا سب سے ممتاز اکھاڑہ ہے، اس میں ہندوستان اور پاکستان کے مشہور و معروف پہلوان ورزش کرتے رہے ہیں۔ جن میں سے مندرجہ ذیل بہت مشہور رہیں :-

۱۔ رستم زماں گاماں پہلوان مرحوم - آپ نون پہلوان کے خاندان کے فرد تھے، دس سال کی عمر میں آپ نے پہلی کشتی لڑی اور حریف کو پچھاڑ دیا۔ اس کے بعد مرنے تک دنیا کے کسی پہلوان نے آپ کی پیٹھ نہیں لگائی، جسم لوہے کی طرح سخت تھا اور طاقت و شجاعت میں بے مثال تھے۔ عالم شباب (۱۹۱۱ء) میں ایک غیر ملکی آپ کو اور امام بخش کو اپنے ساتھ یورپ لے گیا، اٹلی اور فرانس میں کوئی پہلوان آپ کے مقابلہ میں نہ آیا پھر لندن پہنچے، ان دنوں لندن میں دنیا بھر کے شہ زور پہلوان جمع تھے۔ مثلاً ترکی کا رستم محمود، امریکی پہلوان رولینڈ، اطالوی رستم جان لیمپ، انگلستان کا رستم پاک سمتھ، روسی ویو زبسکو۔ جب گاماں پہلوان نے چیلنج کیا تو ان پہلوانوں نے کہا کہ پہلے تم چھوٹے پٹھوں سے کشتی لڑو۔ گاماں پہلوان نے اعلان کر دیا کہ جو پہلوان مجھ سے ۵ منٹ تک کشتی لڑے گا اس کو پانچ پاؤنڈ انعام ملے گا، چنانچہ گلاسگو، لورپول، مانچسٹر وغیرہ میں چالیس کشتیاں ہوئیں لیکن کوئی مائی کا لال آپ کو پچھاڑ نہ سکا، بعد میں آپ نے امریکی رستم رولینڈ سے کشتی لڑی اور چند منٹوں میں اسے گرا لیا۔ باقی پہلوان کنی کاٹ گئے، البتہ روسی ویو زبسکو آپ سے نبرد آزما ہوا۔ تین گھنٹے کشتی ہوئی، ایک گھنٹہ تک دونوں شہ زور کھڑے کھڑے زور آزمائی کرتے رہے، پھر گاماں نے زبسکو کو نیچے گرا کر دو گھنٹوں تک خوب رگیدا، جب زبسکو نے کہا کہ میں تھک گیا ہوں اور ایک ہفتہ بعد لڑوں گا تو کشتی چھڑا دی گئی، لیکن وقت موعودہ پر زبسکو نہ آیا، اور آپ کو رستم زماں کی طلائی پیٹی اور گرز دے دیا گیا۔ ان کشتیوں کو انگلستان میں لاکھوں انسانوں نے دیکھا، اور گاماں کی شجاعت اور طاقت کی دھاک بیٹھ گئی۔ کئی سال بعد پٹیالہ میں زبسکو پھر گاماں سے نبرد آزما ہوا، لیکن دو ہی منٹوں میں گاماں نے اسے پچھاڑ دیا، اس فتح کی خوشی میں مہاراجہ پٹیالہ نے بہت سے قیدی رہا کئے اور بے شمار لوگوں کو کھانا کھلایا۔ کیونکہ انگلستان سے واپسی کے بعد آپ مہاراجہ پٹیالہ کے درباری پہلوان بن گئے تھے اور قیام پاکستان تک اسی دربار سے منسلک رہے، ان کشتیوں کے علاوہ آپ نے ہندوستان کے مندرجہ ذیل پہلوانوں کو عظیم الشان دنگلوں میں نہایت خوش اسلوبی سے پچھاڑا :۔

۱۔ دھکڑ سنگھ پہلوان کو ریاست ٹیکم گڑھ میں۔

۲۔ رحیم پہلوان سلطانی والا سے چار بار کشتی ہوئی۔ جونا گڑھ، اندور، لاہور کی کشتیاں برابر رہیں۔ البتہ الہ آباد میں آپ نے اسے چاروں شانے چت گرایا۔

۳۔ خلیفہ غلام محی الدین سے ریاست دتیہ اور لاہور میں دو دفعہ کشتی ہوئی۔ ایک دفعہ تو انہیں دتیہ سے ایک لاکھ پچاس ہزار روپے انعام ملے تھے۔

۴۔ علی سائیں پہلوان کو ریاست اندور میں۔

۵۔ گاموں پہلوان بالیوالہ کو ریاست اندور میں۔

۶۔ حسن بخش پہلوان ملتانی کو کلکتہ اور لکھنؤ میں۔

۷۔ فرانس کے مشہور پہلوان پیٹرسن کو پٹیالہ میں۔

ان کشتیوں میں کامیابی حاصل کرنے پر آپ کو متعدد تمغے اور گرز انعام میں ملے جو آج بھی آپ کے خاندان میں محفوظ ہیں، پاکستان بننے پر آپ لاہور میں مقیم ہو گئے یہاں انہیں ایک زہریلے سانپ نے کاٹ لیا مگر وہ اپنی غیر معمولی صحت

کی وجہ سے اس حادثے سے تو بچ گئے، لیکن ناقدری زمانہ کے باعث تنگ دستی کی حالت میں ۲۳ مئی ۱۹۶۰ء کو فوت ہو گئے آپ کا مزار قبرستان پیر مکی میں ہے۔ وفات کے وقت آپ کی عمر اسی برس تھی۔

۲۔ امام بخش پہلوان رستم ہند :- آپ رستم زماں گاماں پہلوان کے چھوٹے بھائی ہیں۔ آپ بھی چھوٹی سنی عمر میں کشتی لڑنے لگے تھے، اور اپنے بھائی کے ساتھ یورپ کے دورے پر گئے تھے۔ لندن میں آپ نے اطالوی رستم جان لیمپ کو تین منٹ میں چار زون شانے چت گرا دیا۔ آپ دیو ہیکل پہلوان ہیں، اور چہرہ اتنا رعب دار ہے کہ بڑے بڑے پہلوان کشتی لڑنے سے پہلے آپ کے چہرے کی ہیبت سے لرزاں ہو جایا کرتے تھے۔ آپ نے حسن بخش ملتانی، رحیم پہلوان سلطانی والا کو گرایا۔ آپ نے پنجاب اور ہندوستانی ریاستوں کے تقریباً تمام پہلوانوں سے مقابلہ کیا، اور اپنے کمال فن کا مظاہرہ کر کے فتح پائی اور بہت انعام و اکرام حاصل کیا، گونگا پہلوان سے تین مرتبہ کشتی ہوئی، پہلی مرتبہ لاہور میں گر پڑے، لیکن دوسری اور تیسری مرتبہ لاہور اور پٹیالے میں بڑی چابکدستی سے گونگے کو پچھاڑ دیا، آپ بھی گاماں پہلوان کی طرح قیام پاکستان تک دربار پٹیالہ سے منسلک رہے، نہایت شریف طبع اور مرنجاں مرنج انسان ہیں، اور آپ میں ایک بہادر کی تمام خصوصیات موجود ہیں، بہادر ہمیشہ اپنے بہادر حریف کی تعریف کرتا ہے، گونگا پہلوان آپ کا حریف تھا، تین مرتبہ آپ سے کشتی لڑ چکا تھا، اور ایک مرتبہ آپ کو گرا بھی چکا تھا، لیکن جب بھی کسی نے آپ سے گونگے کے متعلق پوچھا آپ نے ہمیشہ اس کی شہ زوری کی تعریف ہی کی۔ ایک مرتبہ ہم گونگے اور بلونت کی کشتی دیکھ رہے تھے، آپ اور حمیدہ پہلوان مرحوم بالکل ہمارے پیچھے کھڑے تھے، جب کشتی شروع ہوئی، تو امام بخش کے منہ سے بے اختیار نکلا "جیو میرے پہلوان جیو"۔ از تے حمیدہ دیکھ گونگا پہلوان کیا کر رہا ہے؟ اس سے آپ کے قلب و ذہن کا اندازہ ہو سکتا ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھولو، اچھا، اکی، گوگا اور اعظم جیسے دلیر پہلوان فرزند عطا کئے ہیں، جو اپنی شہ زوری اور مسلسل کامیابیوں کے باعث اس خاندان کا نام روشن کر رہے ہیں۔

۳۔ بچا پہلوان کشمیری والا مرحوم :- گاماں پہلوان کے شاگرد رشید تھے، اور شبیر کا سا دل رکھتے تھے، یوں بھی بڑے حسین پہلوان تھے، بڑے دل گردے سے کشتی لڑتے تھے، دنوں میں آسمان شہرت پر جا پہنچے۔ اور آپ نے غوثہ پہلوان، لالو پہلوان، کریم پہلوان اور کئی دوسرے اچھے اچھے پٹھوں کو پچھاڑ دیا۔ آپ نے کئی ریاستوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور مہاراجگان سے انعام و اکرام پایا۔ افسوس کہ آپ عین عالم شباب ہی میں اپنے قدردانوں کو داغ مفارقت دے گئے۔

۴۔ یحییٰ لونڈی۔ ۵۔ بالا جھیور۔ ۶۔ غلام محی الدین۔ ۷۔ جانی پہلوان۔ ۸۔ خدا بخش ہاتھی والا۔ ۹۔ عاشق پہلوان :- اس اکھاڑے کے نہایت شہ زور پٹھے ہیں۔ گاماں پہلوان کے شاگرد ہیں، اور بڑے بڑے دنگلوں میں اچھے اچھے نامی پہلوانوں سے کشتی لڑ کر اس اکھاڑے کا نام روشن کر چکے ہیں۔

نور ے والے

۱۔ اکھاڑہ بندر شاہ | یہ اکھاڑہ بندر شاہ کے تکیے میں واقع تھا۔ جو موچی دروازہ کے باہر احاطہ نواب صاحب کے قریب تھا، آج وہاں مکان بن گیا ہے، صرف قبر باقی رہ گئی ہے۔ اس اکھاڑے میں بھی اچھے

اچھے پہلوان ورزش کیا کرتے تھے۔ جن میں سے چراغ عالی والا بہت مشہور گزرے ہیں۔

چراغ پہلوان عالی والا۔ بہت نامور پہلوان تھے، مہاراجہ جودھ پور کے پاس ملازم تھے۔ آپ نے کئی کشتیاں لڑیں، جن کی وجہ سے آپ نے نام پیدا کیا، امرتسر کے مشہور پہلوان غلام کی کشتی آپ کے ساتھ ریاست جودھ پور میں ہوئی، اس زمانہ میں چراغ پہلوان عالی والا عمر کے آخری حصے میں تھے، اور غلام پہلوان بھرپور جوان تھے، اس کے باوجود چراغ پہلوان نہایت جا بکدستی سے لڑا، اور کشتی برابر رہی۔ ان کے شاگردوں میں خلیفہ معراج اور خلیفہ حسن علی عرف بچھو پہلوان بہت مشہور رہیں۔

۲۔ اکھاڑہ خلیفہ حسینا یہ اکھاڑہ دل محمد روڈ پر واقع تھا۔ اب وہاں چشتی فونڈری بن گئی ہے۔ اس نے بھی کئی نامی گرامی شہ زور پہلوان پیدا کئے ہیں، جن میں مندرجہ ذیل بہت مشہور ہیں :۔

۱۔ خلیفہ معراج پہلوان مرحوم۔ آپ پاکستان کے مشہور و معروف پہلوان خلیفہ غلام محی الدین کے بڑے بھائی تھے۔ بدن کی تیاری کا یہ عالم تھا کہ ان کے متعلق آج تک مشہور ہے کہ سانزیں دن جانگیہ تبدیل کر دیا کرتے تھے۔ آپ چراغ پہلوان کے شاگرد تھے، اور ریاست جوناگڑھ کے درباری پہلوان تھے۔ آپ نے کئی پہلوانوں کو پچھاڑا۔ اکبری دروازہ کے باہر جہاں اب پولیس چوکی ہے، یہاں سرائے تھی، اسی سرائے میں آپ نے ایک دنگل میں اس عہد کے مشہور پہلوان گاموں بالی والے کے ساتھ کشتی لڑی جن کو آپ نے دو منٹوں کے اندر چاروں شانے چت گرا دیا۔

۲۔ خلیفہ غلام محی الدین۔ آپ نورے والے اکھاڑے کے بانی خلیفہ نورا مرحوم کے قرابت دار ہیں، اور اس اکھاڑے کے سب سے بڑے خلیفہ ہیں۔ آجکل جب کہ کشتی کا قدیم فن دم توڑ رہا ہے آپ کا دم غنیمت ہے۔ آپ اس فن کے ماہر ترین استاد مانے جاتے ہیں، اور تینوں اکھاڑوں کے پہلوان آپ کی خداداد قابلیت کے معترف ہیں، اچھے اچھے پہلوان آپ کے شاگرد ہیں، مشہور رستم ہند پہلوان بلھڑ کولہا پوری بھی آپ ہی کا شاگرد ہے۔ آپ کے پاس تقریباً تمام بڑے بڑے پہلوانوں کی تصاویر اور ان کی کشتیوں کی یادداشتیں محفوظ ہیں۔ آپ کے پاس رمزی پہلوان کی صدری اور اسی قسم کے دیگر نوادرات بھی موجود ہیں۔

آپ اپنے زمانہ کے شہ زور پہلوان تسلیم کئے جاتے ہیں، آپ مہاراجہ دتیہ، نواب جوناگڑھ اور مہاراجہ کولہا پور کے درباروں سے منسلک رہے ہیں، دربار کولہا پور سے آج بھی آپ کو پنشن ملتی ہے۔ آپ نے مہاراجہ کولہا پور کی ملازمت باون برس کی ہے۔ اس عرصہ میں آپ نے کئی کشتیاں لڑیں اور نامی پہلوانوں کو پچھاڑا، جن میں سے چند کے نام یہ ہیں :۔

(۱) گھماں ملتانی ۔ ۲۔ امامی والا ۔ ۳۔ بدھو ڈالی والا ۔ ۴۔ خلیل ٹم ٹم والا ۔ ۵۔ دھکڑ سنگھ۔

ان کے علاوہ آپ نے رستم زماں گاماں، رستم ہند امام بخش اور رحیم سلطانی والا سے بھی کشتی لڑی جو برابر رہی۔

آپ نے یورپ کی سیاحت بھی کی، لندن کی نمائش میں تین کشتیوں میں فتح پائی، فرانس میں بورڈو میں ایک مشہور فرانسیسی پہلوان کو چاروں شانے چت گرایا۔

اس اکھاڑے کے مندرجہ ذیل پہلوان بھی کافی مشہور رہیں :-

۱ - رمضان بٹ	۲ - وہاب پہلوان
۳ - للو پہلوان	۴ - نبو پہلوان
۵ - جیجا گڈیاں والا	۶ - سردار گڈیاں والا
۷ - گاماں چاولوں والا	۸ - بگو تیلی گر (سنہ ۱۹۶۱ء میں فالج کا شکار ہو کر فوت ہوا)

۳ - اکھاڑہ تکیہ ننھے شاہ اسے گوندی والا اکھاڑہ بھی کہتے ہیں - بالکل نیا اکھاڑہ ہے - اسے فرید پینٹر پہلوان نے قائم کیا ہے - اس میں بڑے بڑے اچھے پہلوان ورزش کرتے ہیں اور کئی معرکے کے دنگلوں میں اپنے حریفوں کو پچھاڑ چکے ہیں - ان پہلوانوں میں شیر پنجاب کالا پہلوان ، عاشق راج ، شیدا نواں بازار والا بہت مشہور ہیں - کالا پہلوان نے اچھا گوجرانوالیہ ، اکی پہلوان پسر امام بخش اور غلام محی الدین پہلوان کو چاروں شانے چت گرایا -

۴ - اکھاڑہ تکیہ کھوتیاں والا یہ بھی بہت پرانا اکھاڑہ ہے - اور میکلوڈ روڈ پر واقع ہے - اس میں بھی اچھے شہ زور پہلوان ورزش کرتے تھے ، جن میں سے گلو پہلوان ، صدیق پہلوان اور للو ہا بخی پہلوان بہت زیادہ مشہور ہیں ، انھوں نے کئی دنگلوں میں کشتی لڑ کر داد تحسین حاصل کی ہے -

۵ - اکھاڑہ چوک برف خانہ یہ اکھاڑہ ریلوے روڈ لاہور پر واقع ہے ، اس میں بھی نامی پہلوان ورزش کرتے ہیں - جن میں مندرجہ ذیل زیادہ مشہور ہیں :-

۱ - بدو پہلوان برہمن - آپ ہندوؤں کے بہت بڑے پہلوان تھے ، برہمن تھے ، لیکن بڑے جیالے ، گورا چٹا بدن ، اور جسم پتھر کی طرح سخت تھا ، آپ نے پنجاب اور ہندوستانی ریاستوں کے بڑے بڑے پہلوانوں سے کشتی کا مقابلہ کیا اور فتح پائی ، گاموں پہلوان ، جو پنجاب کے شہ زور پہلوان اور گونگا پہلوان کے والد تھے ، کو بھی آپ نے پچھاڑ دیا تھا -

۲ - مہاجا بلاقی والا - اپنے زمانہ کے بہترین پہلوانوں میں شمار ہوتے تھے اور شجاعت ، لڑنت اور داؤ پیچ میں یکتا مانے جاتے تھے - آپ نے بھی اچھے اچھے حریفوں کو پچھاڑا تھا - کچھ عرصہ بعد آپ اکھاڑہ بنو پہلوان بیرون شاہ عالمی دروازہ میں ورزش کرنے لگے تھے -

۶ - اکھاڑہ گھیا سائیں رام گلی یہ اکھاڑہ نورے والوں کا مشہور اکھاڑہ ہے ، اس میں بھی نامی پہلوان ورزش کرتے رہے ہیں ، پرانے پہلوانوں میں سلطان شو خا مشہور ہیں ، آج کل اس اکھاڑے نے دو شہ زور پٹھے پیدا کئے ہیں ، ایک کا نام اسلم مہنی والا اور دوسرے کا افضل مہنی والا ہے ، دونوں کشتی کے فن میں تاک ہیں ، اور خوب لڑتے ہیں ، دونوں نے کئی دنگلوں میں اپنا کمال دکھا کر نام پیدا کیا ہے - یقین ہے کہ ابھی اور چمکیں گے -

۷ - اکھاڑہ چنن کبابی مصری شاہ مصری شاہ میں سفید مسجد کے پاس واقع ہے ، چنن پہلوان کبابی اس اکھاڑہ کے مشہور و معروف پہلوان گزرے ہیں ، جیجا گھیئے والا مرحوم بھی کچھ عرصہ یہیں

ورزش کرتے رہے تھے

۸۔ اکھاڑہ بوٹا مل نور سے والوں کا سب سے ممتاز ترین اکھاڑہ ہے، یہ اکبری دروازہ کے باہر واقع ہے۔ یہی وہ اکھاڑہ ہے جس کے شہ زور پہلوانوں نے کالو اور کوٹ والوں کے نامی گرامی پہلوانوں کے ساتھ مقابلے کئے ہیں، اور نور سے والوں کا نام روشن رکھا ہے، پنجاب کے اکثر مشہور پہلوان اس اکھاڑے میں ورزش کرتے رہے ہیں، جن میں مندرجہ ذیل بہت مشہور ہیں:-

۱۔ **کریم بخش پہلوان پہلیڑے والا مرحوم** - آپ پہلیڑے پہلوان کے فرزند ارجمند تھے، ڈیل ڈول، شکل صورت اور جسم نہایت خوبصورت اور متناسب تھا، آپ تعلیم یافتہ پہلوان تھے، پہلوانی کے فن میں ماہر اور اس کی فنی باریکیوں سے کماحقہ واقف تھے، نور سے والوں کے اکثر پٹھے آپ ہی کے شاگرد ہیں۔ آپ نے پنجاب کے نامی گرامی پہلوانوں سے کشتیاں لڑی ہیں۔ آپ نے جیون پہلوان قصاب، نگاموں پہلوان بالیوالہ اور غلام پہلوان امرتسری کو پچھاڑا، ہندوستانی ریاستوں کے دنگلوں میں اپنے حریفوں کو گرا گرا کر نقد انعامات حاصل کئے، اور پھر خود اپنی مرضی سے کشتی لڑنا ترک کر دیا، پیشہ ور پہلوانوں کے علاوہ دیوان بہادر میاں محمد شفیع مرحوم بھی آپ کے شاگردوں میں سے تھے مرحوم پہلوانی کے بڑے دلدادہ تھے، اینگلو انڈین ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر بی۔ ٹی آپ کے فن کا بڑا مداح تھا۔

۲۔ **بستا پہلوان** - آپ بھی اس اکھاڑے کے نامی پہلوان ہیں، تن و توش اور شجاعت میں جواب نہیں رکھتے۔ عالم شباب میں نہایت قوی ہیکل پہلوان تھے، آپ نے پنجاب اور ریاستوں کے کئی پہلوانوں سے کشتی لڑی ہے۔ اور اپنے اکھاڑے کا نام بلند کیا ہے۔

۳۔ **غلام محمد قلفی گر** } یہ پہلوان بھی بڑے اچھے پٹھوں میں سے تھے، اور انہوں نے بھی کئی کشتیاں لڑی ہیں، اور اپنے فن کے کمال کا مظاہرہ کر کے عوام سے داد لی۔ بڈھا ساؤن والا نے جیون پہلوان قصاب کو پچھاڑا تھا۔

۴۔ **بڈھا ساؤن والا** }

۵۔ **اللہ بخش سائیں والا** - بڑے نامی پہلوان تھے، پہلے گامان پہلوان کے شاگرد تھے، پھر کریم بخش پہلیڑے والے کے شاگرد ہو گئے، آپ نے پنجاب اور ریاستوں کے اچھے اچھے پٹھوں کو چاروں شانے چت گرایا ہے، ابھی جوان ہی تھے کہ اس فن سے کنارہ کش ہو گئے۔ اب سنا ہے کہ آپ فقیر بن گئے ہیں۔

۶۔ **بھولا پہلوان چوڑ سنگھ** - اس اکھاڑے کو اس بے مثال پہلوان پر جتنا بھی ناز ہو بجا ہے۔ آپ نہایت مضبوط اور خوبصورت جسم رکھتے ہیں، پنجاب اور ریاستوں کے کئی نامی گرامی پٹھوں سے کشتی لڑ کر انہیں گرا چکے ہیں۔ لوگ آپ کے از حد قدردان ہیں۔ پروفیسر رام مورتی جو خود بھی اچھے پہلوان تھے، بھولا پہلوان کے بڑے قدردان تھے، آپ نے زندگی کا بیشتر حصہ لاہور سے باہر ریاستوں میں بسر کیا اور نام پیدا کیا ہے، اہلِ لاہور آج بھی کشتی کے ان مقابلوں کو یاد کرتے ہیں جو بھولا پہلوان اور جمال جنگلہ پہلوان کے درمیان ہوئے۔ اکھاڑہ تھے شاہ کے خلیفہ جیون کے انتقال کے بعد ۲۹ دسمبر ۱۹۶۱ء کو بھولا پہلوان کو ان کا جانشین مقرر کیا گیا اور دستار بندی کی رسم ادا کی گئی۔

۷۔ لالہ راج پری پیسک۔ آپ بھی اس اکھاڑے کے ممتاز پہلوان ہیں، جسم کی رعنائی کی وجہ سے پری پیکر کہلاتے ہیں، داؤ پیچ میں مہارت حاصل تھی، اور ملتانی داؤ تو خوب چلاتے تھے اور حریف کو چشم زدن میں پچھاڑ دیتے تھے، اب آپ نے عین عالم شباب میں کشتی لڑنا ترک کر دی ہے۔

۹۔ اکھاڑہ لالو سائیں یہ اکھاڑہ مستی دروازہ اور کشمیری دروازہ کے درمیان تکیہ لالو سائیں میں واقع ہے، غونتہ پہلوان اسی اکھاڑے میں ورزش کرتے رہے ہیں۔ آپ نے پنجاب اور دیاستوں میں اچھے اچھے دنگلوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔

۱۰۔ اکھاڑہ خلیفہ بخشی شاہ عالمی دروازہ کے باہر لاریوں کے اڈے کے قریب واقع تھا۔ نتو پہلوان اس اکھاڑے کے مشہور پہلوان ہوئے ہیں۔

مندرجہ بالا اکھاڑوں کے علاوہ بالمیکیوں کے بھی چند اکھاڑے ہیں۔ جن میں سے دو زیادہ مشہور ہیں، یہ اپنے آپ کو کالو والوں میں شمار کرتے ہیں۔

۱۔ اکھاڑہ بالمیکیاں بیرون ٹکسالی دروازہ خلیفہ ڈنا، خلیفہ ہازی، چراغ مکھن والا اس اکھاڑے کے مشہور خلیفہ تھے، موجودہ خلیفہ کا نام چودھری گاماں ہے، مندرجہ ذیل پہلوان قابل ذکر ہیں:-

۱۔ چراغ مکھن والا۔ ۲۔ لال پہلوان۔ ۳۔ کالو پہلوان۔ ۴۔ بکھا پہلوان۔ ۵۔ حیاتا پہلوان۔ ۶۔ چانغو پہلوان لمبر والا۔ ان بالمیکی شہ زوروں نے کئی دنگلوں میں اچھے اچھے پہلوانوں سے کشتی لڑی ہے، مثلاً چراغ مکھن والا نے بھجی ڈنڈطی سے، لال پہلوان نے کھیڑی پہلوان سے، کالو پہلوان نے ملکی پہلوان سے، بکھا پہلوان نے خلیفہ شہاب سے، حیاتا پہلوان نے نانک پہلوان امرتسری سے، چانغو پہلوان نے آتو پہلوان سے۔

۲۔ اکھاڑہ بالمیکیاں بیرون بھاٹی دروازہ اس اکھاڑہ کے پہلے خلیفہ بودی تھے، اب خلیفہ تجہ ہیں، مندرجہ ذیل پہلوان مشہور ہیں، اور کشتی لڑنے میں نام پیدا کر چکے ہیں:-

۱۔ لبھا پہلوان۔ ۲۔ ڈنا پہلوان۔ ۳۔ دین پہلوان۔ ۴۔ پیرا نند پہلوان۔ لبھا پہلوان سوئی دھاگہ پہلوان سے کشتی لڑ چکا ہے اور ڈنا پہلوان نانک امرتسری سے، دین پہلوان مولا پہلوان سے اور پیرا نند پہلوان چراغ بنیٹر سے۔

تکیے

مسعود نظامی

مدت ہوئی ایک غیر ملکی سیاح لاہور میں وارد ہوا۔ اور جب اس نے اس میں سرسبز و شاداب باغات دیکھے تو کہنے لگا "LAHORE IS THE CITY OF GARDENS." (لاہور باغات کا شہر ہے) ۔ لیکن اس نے لاہور کے تکیے نہ دیکھے۔ اگر وہ تکیوں کی تعداد کو دیکھ لیتا تو بے اختیار پکار اٹھتا: "LAHORE IS THE CITY OF TAKIAS." (لاہور تکیوں کا شہر ہے)

قدیم لاہور، ایک مضبوط فصیل کے اندر گھرا تھا۔ اس کے تیرہ (۱۳) دروازے تھے جن کے نام یہ ہیں: ٹکسالی دروازہ، بھاٹی دروازہ، موری دروازہ، لوہاری دروازہ، شاہ عالمی دروازہ، موچی دروازہ، اکبری دروازہ، دہلی دروازہ، یکی دروازہ، شیرانوالہ دروازہ، کشمیری دروازہ، مستی دروازہ اور روشنائی دروازہ۔ ان میں سے شاید ہی کوئی دروازہ ایسا ہوگا جس کے باہر ایک یا ایک سے زیادہ تکیے موجود نہ ہوں۔

تکیہ فارسی زبان کا لفظ ہے، اور اس کے معنی ہیں: وہ چیز جس پر سہارا لگایا جائے، جس کے ساتھ پیٹھ لگا کر بیٹھا جائے، آرام کرنے کی جگہ، فقیر کے رہنے کی جگہ، دیہات میں تکیہ کو دارا، دائرہ اور چوپال کہتے ہیں۔ ان معانی سے تکیہ کا مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے۔

پرانے زمانے میں ان تکیوں کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ دستور تھا کہ شام کے بعد شہر پناہ کے تمام دروازے بند کر دیے جاتے تھے اس لیے جو مسافر رات کے وقت آتے وہ شہر میں داخل نہ ہو سکتے، بلکہ انہی تکیوں میں رات بسر کرتے، جہاں تکیہ کا فقیر ان کی ہر طرح خدمت کیا کرتا۔ جب دن چڑھتا اور شہر کے دروازے کھلتے تو یہ مسافر شہر میں داخل ہو جاتے۔ علاوہ ازیں ایک نو وارد جس کا شہر میں کوئی رشتہ دار نہ ہوتا انہی تکیوں میں رہتا تھا۔ اس لیے پرانے وقتوں میں یہ تکیے REST HOUSES کا کام دیتے تھے۔

دن کے اوقات میں مختلف علاقوں کے بوڑھے اور نوجوان اپنی فرصت کے لمحات انہیں تکیوں میں گزارتے۔ ہر تکیہ میں کنواں اور اس کے ساتھ غسلخانے موجود تھے۔ یہیں لوگ غسل کرتے اور چٹائیوں پر بیٹھ کر چوسر، شطرنج اور تاش کھیل کر دل بہلاتے۔ اور یوں یہ تکیے کلبوں کا کام دیتے تھے۔ شادی اور غمی کی تقریبات یہیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ برادریوں کے تنازعات کے فیصلوں کے لیے پنچائتیں یہیں لگا کرتی تھیں۔ تقریباً ہر تکیہ میں ورزش کرنے کے لیے ایک اکھاڑہ تھا، جہاں لوگ ورزش کرتے اور کشتی کا فن سیکھتے۔ جدید اصطلاح میں یہ تکیے HEALTH CLUBS ہیلتھ کلبیں تھے۔

رفتہ رفتہ زمانہ نے رنگ بدلا، اور اس کے ساتھ ان تکیوں کا نقشہ بھی بدل گیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ان پر بھنگ پینے والوں، چرس کا دم لگانے والوں اور چنڈو بازوں کا قبضہ ہو گیا، معززین نے تکیوں میں جا کر بیٹھنا ترک کر دیا۔ اب یہ حالت ہے کہ جو شخص تکیہ میں جائے اسے اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔

آیئے آپ کو لاہور کے مشہور تکیوں کی سیر کرائیں:۔

تکیہ صابر شاہؒ

یہ تکیہ روشنائی دروازہ کے باہر شاہی مسجد کے عقب میں واقع ہے۔ اور لاہور کے خوبصورت تکیوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس میں دو بزرگوں کے مزار بھی ہیں۔ ایک کا اسم گرامی حضرت صابر شاہؒ ہے۔ جو احمد شاہ ابدالی کے ہمراہ لاہور میں وارد ہوئے اور دوسرے سائیں گھنگھرو کے نام سے موسوم ہیں۔ تکیہ میں بڑھ اور گوندنی کے درختوں کی بھرمار ہے اور لوگ ان کی چھاؤں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہاں ایک ہیلتھ کلب بھی ہے جس میں نوجوانوں کو باکسنگ کی تربیت دی جاتی ہے۔ جمعرات کو یہاں اچھی رونق ہوتی ہے۔ کبھی یہاں مشہور طوائفیں چوکی دینے آیا کرتی تھیں۔ لیکن اب یہ دستور نہیں رہا۔ تکیہ میں ایک مسجد بھی ہے جو مولوی محرم علی چشتی نے تعمیر کرائی تھی۔ حضرت صابر شاہ کے مزار کے موجودہ متولی مشہور فلم اسٹار و ہدایت کار سید آصف جاہ صاحب ہیں۔ اور گھنگھرو سائیں کے مزار کے متولی سائیں بنا صاحب ہیں جو ایک اچھے گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔

تکیہ بھورے سائیں

ٹکسالی دروازہ سے جو سڑک باغ منشی لدھا کی آبادی کو جاتی ہے۔ اس کے شروع ہی میں بائیں ہاتھ یہ تکیہ واقع تھا۔ لیکن اب وہاں چند دکانوں، قبروں اور کھجور کے درخت کے سوا کچھ موجود نہیں۔ کبھی یہ ایک پُرفضا تکیہ تھا۔ بازار حکیماں، ٹھٹھی ملاحاں اور ہتی بازار کے باشندے عموماً اپنے فرصت کے اوقات یہیں گزارتے تھے۔ پاس ہی ایک کنواں تھا جو لاہور میں "ٹھنڈا کھوہ" کے نام سے مشہور تھا۔ موسم گرما میں یہ کنواں ایک نعمت تھا۔ لوگ دُور دُور سے آکر یہاں نہاتے اور بھورے سائیں کے تکیہ کے درختوں کی چھاؤں تلے آرام کرتے تھے۔ پنجابی کے مشہور شاعر لالہ ملکھی رام نے اسی کنوئیں پر ایک نظم بنام "ٹھنڈے کھوہ دی چڑیل" لکھی تھی۔ یہاں ایک اکھاڑہ بھی تھا۔ جس میں کریم بخش پوپی والا اور محمد یوسف پناں والا جیسے مشہور پہلوان ورزش کیا کرتے تھے۔

تکیہ شبیر علی

ٹکسالی دروازہ کے باہر میاں مبارک دین اینڈ سنز کی دوکان کے ساتھ واقع ہے۔ اس تکیہ کے باہر ٹمبر مرچنٹس کی دوکانیں ہیں۔ اور کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ یہ تکیہ ہے۔ لیکن ایک زمانہ تھا کہ یہ ایک پُررونق تکیہ تھا۔ اور یہاں بھی لوگوں کا میلہ لگا رہتا تھا۔ قوالیاں ہوتی تھیں اور عرس ہوتا تھا۔ یہاں ایک اکھاڑہ بھی تھا۔ جس کے مشہور پہلوان لال پنجہ اور مہا جا سائیں تھے۔ یہاں شبیر علی صاحب کا مزار بھی ہے کٹڑہ ولی شاہ چوہٹہ مفتی باقر کے سادات کا قبرستان بھی یہیں ہے۔

تکیہ بالمیکیاں

یہ تکیہ ٹکسالی دروازہ کے باہر موہنی روڈ کے شروع ہی میں بدررو کے کنارے بائیں ہاتھ واقع ہے۔ یہ بھی لاہور کے پرانے تکیوں میں سے ہے اور بالمیکی برادری کے افراد یہیں اپنے فرصت کے اوقات کاٹتے ہیں۔ ایک اکھاڑہ بھی موجود ہے اور مہارشی بالمیک جی کا مندر بھی ہے۔ جہاں بالمیکی پوجا پاٹھ کرتے ہیں۔

تکیہ پیر مکی

ٹکسالی دروازہ اور بھاٹی دروازہ کے درمیان راوی روڈ پر پاکستان کے مایہ ناز مصور عبدالرحمٰن چغتائی کے دولت کدہ کے بالکل پیچھے ایک بہت بڑا تکیہ ہے۔ گو یہاں پیر مکیؒ کا مزار موجود نہیں۔ لیکن یہ مشہور اسی نام سے ہے۔ تکیہ میں کنواں، اکھاڑہ اور مسجد بھی ہے۔ جس کی مرمت اب ہو رہی ہے۔ مشہور و معروف پہلوان اس تکیہ کے اکھاڑہ میں ورزش کرتے رہے ہیں۔ اب بھی نور محلہ، چوہالہ، بازار حکیماں وغیرہ کے مکین یہیں آکر اپنے اوقات گزارتے ہیں۔

تکیہ ذیلداراں

بھاٹی دروازہ کے باہر اسلامیہ ہائی سکول کے دائیں طرف ذیلدار روڈ کے شروع میں واقع تھا۔ بڑا خوبصورت تکیہ تھا۔ بھاٹی دروازہ کی ارائیں برادری کے افراد یہیں اٹھتے بیٹھتے تھے۔ لاہور کے ذیلدار میاں خدا بخش کی محفل یہیں

لگا کرتی تھی۔ اب تکیہ کا نام و نشان باقی نہیں رہا۔ اس جگہ اب عالیشان مکانات بن چکے ہیں۔

تکیہ سید شاہ موہنی روڈ پر الراعی بلڈنگس کے پاس واقع ہے اور لاہور کے قدیم تکیوں میں سے ہے۔ کبھی یہ بہت پُر فضا مقام تھا۔ لیکن اب تکیہ کے اردگرد مکانات تعمیر ہو چکے ہیں اور تکیہ ان کے درمیان گھر کر رہ گیا۔ مزار، مسجد اور کنواں باقی رہ گیا ہے۔ جمعرات کو زائرین اور قوالی کی وجہ سے کچھ رونق ہو جاتی ہے۔ کبھی یہاں بٹیر بازی، تیتر بازی اور مرغ بازی کی پالیاں لگا کرتی تھیں۔

تکیہ گوندی پیر داتا گنج بخشؒ کے عقب میں قطب روڈ پر کباڑیوں کی دوکانوں کے درمیان واقع ہے۔ گوندی پیر کی قبر پر گوندنی کے بے شمار درخت اُگے ہیں۔ اب اس تکیہ کی کوئی اہمیت نہیں۔ اردگرد گھوڑوں کے اصطبلوں کی وجہ سے لید کی بدبو سے دماغ پھٹ جاتا ہے اور ٹھہرنے کو جی نہیں چاہتا۔

تکیہ کھڑکی پیر لاہور کے خوبصورت تکیوں میں سے ہے۔ داتا گنج بخشؒ کے عقب میں قطب روڈ کے شروع میں کھیتوں کے درمیان واقع ہے۔ بیری اور نیم کے درخت اتنے گھنے ہیں کہ کھڑکی پیر کا مزار نظر نہیں آتا۔ جمعرات کو قوالی اور زائرین کی وجہ سے اچھی خاصی رونق ہوتی ہے۔ چشیش اور چرس کے متوالوں کا خاص مقام ہے۔ سالانہ عرس بھی ہوتا ہے۔ اور لاہور کے خوش باش افراد اچھی خاصی تعداد میں یہاں جمع ہو جاتے ہیں۔

تکیہ قطب شاہ لاہور کے قدیم ترین تکیوں میں شمار ہوتا ہے۔ دربار کے عقب میں قطب روڈ پر واقع ہے۔ جو اسی بزرگ کے نام پر قطب روڈ کہلاتی ہے۔ مزار، کنواں اور چھوٹی سی مسجد بھی موجود ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ یہ تکیہ لاہور کے وسیع ترین تکیوں میں شمار ہوتا تھا۔ لیکن اب یہاں چھوٹے چھوٹے کوارٹرز بن گئے ہیں۔ صابون سازی کے کارخانے ہیں۔ چوڑی گروں کی جھونپڑیاں ہیں۔ جن میں چوڑیاں تیار کی جاتی ہیں۔ جمعرات کو قوالی ہوتی ہے۔ زمانہ قدیم سے آج تک محرم الحرام میں جو تعزیئے نکالے جاتے ہیں وہ دسویں محرم کی شام یہیں ٹھنڈے کئے جاتے ہیں۔

تکیہ سردار شاہ یہ تکیہ بھی داتا گنج بخشؒ کے عقب میں ذیلدار روڈ کے قریب واقع ہے۔ کبھی بڑا وسیع تکیہ ہوتا تھا۔ مگر اب سڑک نکلنے کی وجہ سے گھٹ کر رہ گیا ہے۔ شاہ صاحب کا مزار موجود ہے۔ اس کے آگے ایک چھوٹا سا صحن ہے۔ اور صحن سے ملحق ایک کوٹھی نما مکان ہے۔ جمعرات کو قوالوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ اور حال کھیلنے والے بھی آ دھمکتے ہیں۔ بعض کو بڑ کے درخت سے الٹا لٹکا دیا جاتا ہے اور وہ اسی حالت میں حال کھیلتے ہیں۔ مردوں سے زیادہ عورتوں کی تعداد ہوتی ہے۔ اور دل پھینک نوجوانوں کی بھی کمی نہیں ہوتی۔

تکیہ پیر از غائب داتا گنج بخشؒ کے مزار کے سرہانے یہ تکیہ بھی پرانے تکیوں میں سے ہے۔ کبھی یہاں بڑ کے بڑے بڑے درختوں کی چھاؤں بڑی پُر لطف ہوتی تھی۔ اور جمعرات کو یہاں قوالی کے باعث بڑی رونق ہوتی تھی۔ ایک اکھاڑہ بھی تھا جس میں اچھے اچھے پہلوان ورزش کیا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ مجاور صاحبان کا لالچ رنگ لایا۔ اور انھوں نے لوگوں سے روپیہ وصول کر کے یہاں قبریں بنانی شروع کر دیں۔ اب اس تکیہ کے باہر کباڑیوں کی دوکانیں ہیں اور صحن میں قبریں۔ مشکل سے لوگوں کے گزرنے کے لیے ایک چھوٹا سا راستہ چھوڑ دیا گیا ہے۔ تاکہ لوگ داتا گنج بخشؒ کے سرہانے کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھ سکیں۔

تکیہ بالمیکیاں بالمیکی بھنگیوں کا دوسرا تکیہ ہے۔ جو بھاٹی دروازہ کے باہر پیراماونٹ ٹاکیز کے بالکل ساتھ واقع ہے۔ کبھی یہ تکیہ بڑا

وسیع ہوتا تھا اور برگد کے درخت عجیب بہار دیتے تھے، مگر اب یہ تکیہ کھوکھوں سے بنے ہوئے ہوٹلوں اور ددکانوں میں گھر کر رہ گیا ہے۔ رشی بالمیک جی کا مندر یہاں بھی موجود ہے۔ جہاں بالمیکی پوجا کرتے اور مذہبی رسومات ادا کرتے ہیں۔

تکیہ گھدو شاہ

بھاٹی دروازہ اور موری دروازہ کے عین درمیان سرکلر روڈ کے کنارے لاہور کے پرانے تکیوں میں سے ہے کبھی بڑا پُرفضا اور پُررونق تھا اور نیم کے درختوں کی چھاؤں عجیب بہار دکھاتی تھی۔ بھاٹی دروازہ اور موری دروازہ کے اصحاب یہیں محفل جمانے تھے۔ شاہ صاحب کا مزار بھی موجود ہے۔ جن کا اصلی نام غالباً عبدالقدوس شاہ تھا۔ بگڑ کر قدوس شاہ اور پھر گھدو شاہ رہ گیا۔ بھائیوں کا مشہور اکھاڑہ یہیں ہے۔ اور یہ وہ مایہ ناز اکھاڑہ ہے جس نے رستم زماں گاماں اور رستم ہند امام بخش جیسے پہلوان پیدا کیے۔ درختوں میں سے اب صرف بڑ کا ایک درخت باقی رہ گیا ہے۔ تکیہ کے ایک طرف ایک بڑی خوبصورت مسجد تعمیر کر دی گئی ہے۔ جہاں جمعہ بھی ہوتا ہے سرکلر روڈ والی طرف ایک سنیاسی نے اپنی ادویات کے پٹارے پھیلا رکھے ہیں اور جاہل مریض آآ کر اس سے علاج کرواتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ اس تکیہ میں پنجابی مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ مگر اب مشاعروں کے بجائے تکیہ سے ملحقہ کارپوریشن باغ میں بوڑھے اور نوجوان دوپہر کے وقت اکٹھے ہوتے ہیں اور ہیر وارث شاہ، سسی پنوں فضل شاہ اور نادل سن سن کر محظوظ ہوتے ہیں۔

تکیہ مسکین سائیں

یہ نیا تکیہ ہے۔ اور موری دروازہ اور لوہاری دروازہ کے درمیان کارپوریشن باغ میں واقع ہے۔ دوپہر کو یہاں ہیر پڑھنے والوں اور چوسر کھیلنے والوں کے باعث اچھی رونق ہو جاتی ہے۔ مسکین سائیں کے مزار کے پاس لاہور کے مشہور خلیفہ بخشی کا اکھاڑہ ہے۔ مشہور پہلوان خالو اسی اکھاڑے سے تعلق رکھتا ہے۔

تکیہ راملی والا

لاہور کے قدیم ترین تکیوں میں سے ہے۔ کبھی بڑا وسیع اور پُرفضا تھا۔ مگر اب جھونپڑیوں میں گھر کر اس کی وہ شان نہیں رہی، یہ موری دروازہ کے باہر چنگڑ محلہ میں واقع ہے۔ کبھی یہاں سادات گیلانی کی قبریں تھیں جن پر سنگ مرمر لگا تھا جو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اتروا لیا۔ پیر نظام الدین بودیا لوالہ کے وقت تک یہاں قوالی کی محفلیں جمتی تھیں۔ شاید اب بھی جمعرات کو رونق ہو جاتی ہو۔

تکیہ تاجے شاہ

چیمبرلین روڈ پر میوہ منڈی کے پاس واقع ہے۔ قدیم ترین تکیوں میں سے ہے کبھی بڑا بارونق تکیہ تھا۔ بٹیر بازی کی بڑی بڑی پالیاں یہیں لگتی تھیں۔ مگر ایک مرتبہ تھانہ گوالمنڈی کے تھانیدار مسٹر مہتہ نے چھاپہ مار کر بہت سے بٹیر بازوں کو پکڑ لیا جن میں لاہور کے معززین بھی شامل تھے اس واقعہ کے بعد پھر بٹیروں کی پالی یہاں غالباً نہیں لگی۔ اب ایک نہایت خوبصورت مسجد یہاں بنا دی گئی ہے۔ ایک اکھاڑہ بھی ہے جس نے اچھے اچھے نامی گرامی پہلوان پیدا کیے ہیں۔

تکیہ مراثیاں

بہت پرانا تکیہ ہے۔ اور یہ بھی تکیہ تاجے شاہ کے قریب موچی دروازہ کے باہر چیمبرلین روڈ پر واقع ہے۔ یہ تکیہ دراصل لاہور اور قصور کے مطربان کا ہے۔ کافی وسیع ہے۔ اس میں ایک مسجد، کنواں، غسلخانے اور اکھاڑہ بھی ہے۔ مطرب حضرات جن میں لاہور اور قصور کے علاوہ اب مہاجرین بھی شامل ہیں۔ فرصت کے اوقات یہیں بسر کرتے ہیں اور جن لوگوں کو یہاں بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ جب یہ حضرات آپس میں فن موسیقی اور سُر پر بحث کرتے ہیں اور پرانے گویوں کے حالات سناتے ہیں تو لطف آ جاتا ہے اور جب جگت بازی اور مزاح پر اترتے ہیں تو ساری محفل زعفران زار بن جاتی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کا کوئی مشہور موسیقار ہو گا جس نے اس تکیہ میں اپنے فن کا مظاہرہ نہ کیا ہو۔ یہی وہ تکیہ ہے جس کی بدولت اہالیان لاہور فتح علی خاں، جرنیل صاحب، احمد جان خان، کالے خان، علی بخش خاں،

غلام علی خاں، چھوٹے غلام علی خاں، امید علی خان، امراؤ خان، قادر بخش، پیارے خان وغیرہم جیسے موسیقاروں کے فن سے لطف اندوز ہوتے، اور بعض محفلیں تو یہاں ایسی منعقد ہوئیں کہ رہتی دنیا تک یاد رہیں گی۔ محرم الحرام کی ساتویں تاریخ کو حضرت امام قاسم کی مہندی یہیں سے نکالی جاتی ہے۔ پٹیالہ کے عاشق علی خاں نے آخری عمر میں اپنے فن کا مظاہرہ یہیں کیا اور یہیں دفن ہوئے۔

تکیہ کھوئیاں والا

یہ تکیہ بل روڈ پر واقع ہے اور پرانے تکیوں میں سے ہے۔ یہاں ایک اکھاڑہ بھی ہے جس نے لاہور کے مشہور پہلوان پیدا کئے ہیں۔

تکیہ لالو سائیں

یہ تکیہ کشمیری دروازہ کے باہر سرکلر روڈ پر واقع ہے۔ اور پرانا تکیہ ہے۔ کافی وسیع اور خوبصورت تکیہ ہے۔ اس میں حضرت کمال شاہ صاحبؒ قادری نوشاہی بھیاری کا مزار ہے۔ مزار کے پاس ہی لالو سائیں کی چھوٹی سی قبر ہے؛ اسی لالو سائیں کے نام پر یہ تکیہ لالو سائیں کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں ایک اکھاڑہ بھی ہے۔ جس میں گونگا جیسے مشہور پہلوان ورزش کرتے رہے ہیں، اب یہ تکیہ محکمہ اوقاف کی تحویل میں ہے۔

تکیہ کبوتر شاہ

کشمیری دروازہ میں داخل ہو کر گھاٹی چڑھیں تو بائیں ہاتھ چوک چونہ منڈی میں اس قدیم و مشہور تکیہ کا دروازہ دکھائی دیتا ہے۔ اندر داخل ہوتے ہی کبوتر شاہ صاحب کے مزار پر نظر بعد میں پڑتی ہے پہلے دائیں بائیں لوہے کے بڑے بڑے کڑاہے دکھائی دیتے ہیں، جن میں رنگریز کپڑے کے تھان رنگتے ہیں۔ اب سے چند سال پہلے یہ تکیہ بہت بارونق تکیوں میں شمار ہوتا تھا، جہاں مختلف محلوں کے باشندوں کی محفلیں جمتی تھیں۔ بٹیروں کی پالی لگتی تھی، اور چونکہ لاہور کے چند مشہور مطرب اور ربابی حضرات کے مکانات بھی پاس ہی تھے۔ اس لیے موسیقی کی محفلیں بھی اس کی رونق کو دوبالا کرتی تھیں۔ پاکستان کے مشہور طبلہ نواز استاد قادر بخش مرحوم نے اس تکیہ میں کئی مرتبہ طبلہ بجا کر سامعین سے داد تحسین حاصل کی۔ کبوتر شاہ صاحب کی ایک کرامت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ اگر کسی شخص کو جے باری یعنی تیجے کا بخار چڑھتا ہو آپ کے مزار پر سے ایک کنکر اٹھا کر اپنے بازو سے باندھ لے تو اُس کا بخار اتر جاتا ہے۔ یہ بھی اُن تکیوں میں سے ہے جو امتداد زمانہ کے ہاتھوں اپنی شان و شوکت کھو بیٹھے ہیں۔

تکیہ گڈی سائیں

یہ تکیہ بالکل نیا ہے اور ہمارے سامنے تعمیر ہوا ہے۔ یہ مستی دروازہ کی مشہور و معروف بیگم شاہی مسجد کے عقب میں ہے۔ جس میں گڈی سائیں صاحب کا چھوٹا سا مزار ہے۔ یہ سائیں صاحب مجذوب تھے۔ لمبا سا چغہ پہنتے اور ہر وقت گڈی دکنکوے اور ڈور سے دل بہلاتے تھے۔ اسی وجہ سے آپ گڈی سائیں کے نام سے مشہور ہو گئے۔ لاہور کے خوش اعتقاد لوگ ان سے سٹے کا نمبر دریافت کیا کرتے تھے۔ اس لیے ان کی وفات کے بعد ان کے معتقدین نے انھیں بصد احترام یہاں دفن کر دیا جمعرات کو یہاں رونق ہو جاتی ہے۔ قوالی بھی ہوتی ہے اور طوائفوں کی چوکیاں بھی۔

تکیہ شیر شاہ ولیؒ

لاہور کے قدیم ترین اور خوبصورت ترین تکیوں میں شمار ہوتا ہے۔ درختوں کی کثرت اور بیل بوٹوں کی سجاوٹ متولیوں کے ذوقِ سلیم کا پتہ دیتی ہے۔ لاہور کے تقریباً سب محلوں کے لوگ یہاں آ کر لطف اندوز ہوتے ہیں، یہ قلعہ لاہور کے شمال کی طرف قلعہ کی دیوار کے بالکل نیچے واقع ہے۔ یہاں حضرت شیر شاہ صاحبؒ کا مزار ہے، جو صاحب کرامت بزرگ بیان کئے جاتے ہیں۔ عام لوگوں میں مشہور ہے کہ کبھی کبھی رات کے وقت ایک شیر آ کر یہاں جاروب کشی کرتا ہے۔ جمعرات کے دن عورتوں اور مردوں کا تانتا بندھ جاتا ہے۔ قوالیاں بھی ہوتی ہیں۔ طوائفوں کی چوکیاں مجرے ہوتے ہیں، سالانہ عرس بڑے ٹھاٹھ سے منایا

جاتا ہے اور دو تین دن خوب رونق رہتی ہے۔ تکیہ کے متولیوں میں سے بابا چراغ شاہ اور سائیں جلا بہت مشہور گزرے ہیں۔ کئی حضرات کا خیال ہے کہ اکبری دور کا مشہور فارسی شاعر جمال الدین عرفی شیرازی یہیں دفن ہوا تھا اور بعد میں کوئی درویش کسی اور بزرگ کے دھوکے میں اس کی ہڈیاں قبر سے نکال کر نجف اشرف لے گیا تھا۔ اس طرح اس کی اپنی پیشین گوئی پوری ہوئی ؎

بکاوش مژہ از گور تا نجف بروم
اگر بہ ہند ہلاکم کنند و گر بہ تتار

تکیہ جھنگی

یہ بھی پرانا تکیہ ہے۔ اور منٹو پارک میں واقع ہے۔ اور درختوں کی کثرت کی وجہ سے جھنگی کہلاتا ہے یہ بھی اُن مشہور تکیوں میں سے ہے جس میں لاہور کے تقریباً سب محلوں کے لوگ آکر بیٹھتے ہیں۔ اس میں ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد اور کنواں اور ایک مزار بھی ہے۔ جو سید علی شاہ المتوفی ۱۲۲۷ھ کا ہے۔ اور بھی چند قبریں ہیں۔ اسی جگہ چودھری محمد حسین مرحوم جو علامہ اقبالؒ کے رفیق تھے مدفون ہیں۔ پاکستان کے قیام سے پہلے جب ہندوؤں نے موہنی روڈ پر ایک پختہ و بام شالہ تعمیر کی تو مسلمانوں نے بھی اس تکیہ میں ایک مدور اکھاڑہ تعمیر کیا۔ جس میں مسلمان پہلوانوں کے کئی ناقابل فراموش دنگل ہوتے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ لاہور کے تعلیم یافتہ حضرات نے یہاں ایک کلب بھی بنایا ہے جس کا نام مسلم ہیلتھ کلب ہے۔ یہ کلب نوجوانوں کو ورزش اور فری سٹائل کشتی کی تربیت دیتا ہے۔ چنانچہ صبح و شام بہت سے نوجوان یہاں مختلف قسم کی ورزشیں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں قدیم طرز کا اکھاڑہ بھی ہے۔

تکیہ ننھے شاہ

یہ تکیہ قلعہ لاہور کے پاس لیلا پارک میں واقع ہے اور بہت پُر فضا تکیہ ہے۔ گوندنی، نیم اور برگد کے درخت عجیب بہار دیتے ہیں اور لوگ گرمیوں میں ان کی چھاؤں میں آرام کرتے ہیں۔ ننھے شاہ صاحب کا مزار بھی یہیں ہے۔ یہاں ایک اکھاڑہ بھی ہے جس میں بھیاں چوڑی گر اور کالا پہلوان ورزش کرتے رہے ہیں۔

تکیہ کھائی والا

مشہور تکیہ ہے۔ اور تکیہ ننھے شاہ کے بالکل قریب واقع ہے۔ اس میں وہ مشہور اکھاڑہ ہے جس نے رستم ہند بوٹا پہلوان، مہنی ریتی والا، چوہا پہلوان، اگا مومن پہلوان بالی والا، گونگا پہلوان اور کالا خراسیا پہلوان پیدا کئے جنھوں نے ملک سے اپنی قوت کا لوہا منوایا۔

تکیہ سر مہ سائیں

یہ تکیہ شاہی محلہ کی طرف شاہی مسجد کے باغ میں واقع ہے۔ سید چراغ شاہ اور سرمہ سائیں دونوں ایک ہی بزرگ کے مرید تھے۔ جب چراغ شاہ تکیہ شیر شاہ ولی کے متولی بنے تو سرمہ سائیں نے یہاں ایک قبر پر قبضہ جما کر درخت وغیرہ لگا دیئے اور ایک جھونپڑی بنالی۔ رفتہ رفتہ اس نے تکیہ کی صورت اختیار کر لی۔ بعدازاں سرمہ سائیں نے تکیہ کو اور وسیع کرنا چاہا اور ایک کنواں کھدوایا مگر انجمن اسلامیہ پنجاب نے مداخلت کر کے روک دیا۔ سرمہ سائیں فوت ہو گئے، جھونپڑی مسمار ہو گئی۔ جب محکمہ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی نے شاہی مسجد کی مرمت کی تو قبر کو بھی مسمار کر دیا۔ اور اس کی جگہ سنگ مرمر کا ایک تختہ نصب کر کے اس پر کلمہ طیبہ کندہ کرا دیا۔

تکیہ سبز پیر

لاہور کا مشہور تکیہ ہے اور کوچہ پیر سبز میں نخاس ٹبی کے بالکل عقب میں واقع ہے۔ اس میں ایک کنواں ہے جس کا پانی بہت شیریں اور ٹھنڈا ہے۔ مسجد بھی ہے اور مزار بھی، صاحب مزار کا اصل نام سید بدرالدین شاہ عالم بخاری تھا چونکہ سبز پیراہن پہنتے تھے اس لیے سبز پیر کے نام سے مشہور ہوئے، کبھی یہ تکیہ بھی بہت وسیع اور پُر فضا تھا۔ پیپل اور نیم کے درختوں کی چھاؤں عجیب بہار دیتی تھی، دُور دُور سے لوگ آکر یہاں دل بہلاتے تھے۔ چونکہ ٹبی اور ہیرا منڈی کے بالکل قریب تھا۔ اس لیے جمعرات کو یہاں طوائفیں

مجرا کیا کرتی تھیں اور بڑے بڑے فنکار فن موسیقی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ آج بھی جمعرات کو زائرین کے دم سے رونق ہو جاتی ہے۔ لیکن تکیہ کی رونق کھوکھوں کی دوکانوں نے چھین لی ہے اور اب تکیہ کباڑیوں کا اڈہ معلوم ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ اس بزرگ کا سالانہ عرس بڑے تزک و احتشام سے منایا جاتا تھا مگر اب وہ پہلی سی بات نہیں رہی۔

تکیہ چیت رام

یہ تکیہ پنجاب ڈینٹل ہسپتال کے قریب موجودہ چیت رام روڈ پر واقع تھا۔ یہ ایک ہندو فقیر جو چیت رام کے نام پر قائم کیا گیا تھا جو ضلع لاہور کے موضع بھچو کے کا باشندہ تھا۔ چیت رام سید محبوب چشتی جلالی کا مرید تھا۔ جب سید محبوب شاہ فوت ہو گیا تو چیت رام اس کی قبر کے ساتھ چمٹ کر سو گیا۔ اُسے خواب میں حضرت مسیح کی زیارت ہوئی۔ اور وہ مسیح کا بھی قائل ہو گیا اور اس نے چیت رامی فرقہ کی بنیاد رکھی۔ وہ دو تثلیثوں کا قائل تھا۔ پہلی خدا، مسیح اور روح القدس اور دوسری اللہ، پرمیشور اور خدا۔ چنانچہ جب یہ تکیہ قائم کیا گیا تو یہاں مسجد کے ساتھ ساتھ ایک کوٹھری پر ایک چھوٹی سی صلیب نصب کر دی گئی۔ گو وہاں گرجا نہ بنا، لیکن صلیب مدت تک گڑی رہی۔ اس فرقہ میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اور اچھوت ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔ چونکہ تکیہ مسلم آبادی میں واقع تھا۔ اس لیے یہاں چیت رامیوں کو فروغ حاصل نہ ہو سکا۔ جب موجودہ چیت رام روڈ نکالی گئی تو گورنمنٹ نے تکیہ کی آدھی سے زیادہ زمین حاصل کر لی اور تکیہ جو بہت ہی وسیع اور پُر فضا تھا، چند کوٹھڑیوں پر مشتمل ہو گیا۔ بعد میں اس کی تولیت پر تنازعات پیدا ہو گئے اور آخر سید محبوب شاہ کے ورثا نے اس پر قبضہ کر لیا اور مسجد، گرجا اور امام باڑہ سب کو مٹا کر رہائشی مکان کی شکل دے دی۔ اب علَم تو موجود ہے۔ مگر دراصل اب وہاں ایک تنور ایک صابون کا کارخانہ بنا دیا گیا ہے جس سے باقاعدہ کرایہ وصول کیا جاتا ہے۔

تکیہ سادھواں

لاہور کا یہ مشہور و معروف تکیہ شہر کے اندر محلہ پیر گیلانیاں اور کوچہ چابک سواراں کے درمیان جینیاں والی مسجد کے قریب واقع ہے۔ گو اب یہاں تکیہ کے کوئی نشانات نہیں۔ لیکن بزرگوں سے سُنا ہے کہ یہاں کشمیری سادھو برادری کا تکیہ ہوا کرتا تھا۔ یہ لوگ تجارت کرتے یا لوگوں کا علاج معالجہ کیا کرتے تھے۔ اور ان کے گھوڑے اسی تکیے میں باندھے جاتے تھے۔ نور محمد سادھو نے ۱۲۶۶ھ میں یہاں ایک مسجد تعمیر کر دی اور اسی مسجد میں لاہور کے ایک بزرگ پیر غفار شاہؒ کا مزار بنایا گیا۔ بعد میں اُن کے صاحبزادہ پیر اشرف شاہ صاحب نے اُن کا جسدِ مبارک یہاں سے میانی صاحب کے قبرستان میں منتقل کر دیا۔ اب ان کا مزار گل بیگم کے باغ کے پاس ہے۔ جہاں سالانہ عرس ہوتا ہے۔ اب سادھو برادری نے اس مسجد کو اور حسین تر بنا دیا ہے۔ صبح سویرے اس کے بلند مینار سے لاؤڈ سپیکر پر لحن عربی میں اذان کی صدا نہایت بھلی معلوم ہوتی ہے۔

ہم نے لاہور کے تقریباً تمام مشہور تکیوں کے حالات لکھ دیے ہیں۔ اگر ان تکیوں کو بھی شمار کیا جائے جو مال روڈ، اچھرہ، مزنگ، نواں کوٹ، باغبانپورہ، کوٹ خواجہ سعید وغیرہ میں ہیں۔ تو ان کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ ہم نے وہی تکیے لیے ہیں جو قدیم لاہور کے قرب و جوار میں موجود تھے یا ہیں۔

کیا ہی اچھا ہو اگر ہم زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دیں اور کوشش کریں کہ ان تکیوں کو غلط عناصر سے پاک کر کے ہر تکیہ کو ہیلتھ کلب اور ریسٹ ہاؤس میں تبدیل کر دیں، مسلم ہیلتھ کلب کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ یہ کام کٹھن ضرور ہے۔ مگر اس کے لیے ایک منظم تحریک کی ضرورت ہے۔

میلے

مسعود نظامی

میں ابھی بچہ ہی تھا جب ہمارے محلہ میں دو ڈھنڈورچی آیا کرتے تھے، ایک کا نام سائیں فیروز تھا، سفید داڑھی سرخ رنگ پہلوانوں کا سا جسم، عام طور پر سرکاری اعلانات اور عظیم الشان دنگلوں کی منادی کیا کرتا تھا، جب کبھی وہ ڈھول کی لے کے ساتھ گھنٹی بجا چوک میں کھڑا ہوتا تو لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے اور جب وہ اپنی گرجدار آواز میں منادی کرتا تو عجیب سماں باندھ دیتا۔ دوسرا ڈھنڈورچی ایک کشمیری نوجوان تھا جو غالباً موچی دروازہ کا رہنے والا تھا، سرخ و سفید رنگ تھا اور ایک آنکھ گل تھی۔ یہ عام طور پر بزرگان دین کے مزارات پر ہونے والے عرسوں کی منادی کیا کرتا تھا۔ جب یہ منادی کرنے آتا تو اس کے سر پر چھوٹا سا سبز پٹکا، ایک ہاتھ میں گھنٹی اور دوسرے میں چھوٹا سا سبز جھنڈا ہوتا، وہ اپنی منادی کو ہمیشہ ان الفاظ سے شروع کیا کرتا:—

سجنو! ایہہ لاہور اے
ست دن تے اٹھ میلے
گھر جاواں کہیڑے ویلے

(دوستو! یہ لاہور ہے، جہاں ہفتہ کے سات دنوں میں آٹھ میلے ہوتے ہیں۔ اب میں گھر کس وقت جاؤں)

میں ان کے اس فقرہ پر حیران ہوا کرتا تھا لیکن جب میں نے بچپن کی حدود پھاندیں اور محلہ کے حصار سے باہر نکلا تو اُن کے اس فقرے کی حقیقت بالکل واضح ہو گئی، اور یہ ثابت ہو گیا کہ یہ سولہ آنے سچائی پر مبنی ہے۔ میں جس دن بھی گشت کے لیے باہر نکلا تو یہی دیکھا کہ کہیں کسی مزار پر میلہ لگا ہے۔ کسی بزرگ کا عرس ہے، قوالی ہو رہی ہے، تبرک تقسیم ہو رہا ہے، کشتیاں ہو رہی ہیں، اور دوست احباب مل کر رنگ رلیاں منا رہے ہیں، کہیں بٹیر بازی کی پالی لگی ہے، کہیں تیتر لڑ رہے ہیں، کہیں مرغ بازی ہو رہی ہے کہیں مینڈھوں کی ٹکریں ہو رہی ہیں، کہیں کسی اکھاڑے میں ایک مشہور پہلوان کو کشتی کی ریاضت کرتے دیکھنے کے لیے لوگوں کا جمگھٹا لگا ہے۔ غرض صبح سے شام تک میں ان میلوں کی دلچسپیوں میں کھویا رہا اور گھر لوٹنے کی سدھ بدھ نہ رہی، اور یوں معلوم ہو گیا کہ لاہور شہر میں ہفتہ کے دنوں سے میلوں کی تعداد زیادہ ہے۔

اگر ان تمام میلوں کے جو سال بھر میں ہوتے ہیں، حالات تحریر کیے جائیں، تو ان کے لیے ایک دفتر درکار ہو گا، اس لیے اس مضمون میں صرف اُن میلوں کا حال لکھا جائے گا جو زیادہ مشہور و معروف ہیں۔

میلہ چراغاں | لاہور کے میلوں میں سب سے بڑا میلہ ہے جو ہر سال مارچ کے آخری ہفتہ اتوار کو مغلوں کے حسین ترین

باغ شالامار میں لگتا ہے، لیکن اگر رمضان ہو تو اس کی تاریخ تبدیل کر دی جاتی ہے اور پھر رمضان کے بعد لگتا ہے۔ موسم بہار کا یہ میلہ اپنی شان و شوکت میں بے مثال ہے۔ ہفتہ کی شام کو درگاہ حضرت مادھو لعل حسین میں، جو شالامار سے چوتھائی میل کے فاصلہ پر باغبانپورہ کے قریب واقع ہے۔ بے شمار چراغ جلائے جاتے ہیں۔ جس سے یہ درگاہ اور اس کے گرد و نواح کا منظر بقعہ نور بن جاتا ہے۔ زائرین اور میلہ میں شریک ہونے والے شوقین اس درگاہ پر بھی ٹھہرتے ہیں اور شالامار میں بھی، چراغاں گو درگاہ مادھو لعل حسین پر ہوتا ہے، مگر میلہ شالامار ہی میں لگتا ہے۔ اسی چراغاں کی وجہ سے اسے میلہ چراغاں کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ میلہ کے دنوں میں باغات کا منظر بہت دلکش اور دل آویز ہوتا ہے، تالاب اور حوض پانی سے لبالب بھرے ہوتے ہیں، فوارے چھوٹتے ہیں، سنگ مرمر کی آبشار سے جب پانی گرتا ہے تو "سرا بسنگ می زنی و می گریستی" کا سماں بندھ جاتا ہے۔ درختوں اور گل بوٹوں، اور لوگوں کے رنگا رنگ لباسوں کی بوقلمونی سے مغل شہنشاہ شاہجہان کا یہ باغ پرستان کا منظر پیش کرتا ہے۔

پاکستان بننے سے پہلے گوجرانوالہ، سیالکوٹ، گجرات، شیخوپورہ، امرتسر، جالندھر، فیروزپور اور ملتان سے لوگ یہ میلہ دیکھنے آتے تھے، شہریوں کے علاوہ دیہاتیوں کی کثیر تعداد بھی میلہ میں شریک ہوا کرتی تھی، ہندو، مسلم اور سکھ دیہاتیوں کی ٹولیاں ساری رات اور سارا دن میلہ میں بولیاں اور لوک گیت گا کر لطف اٹھاتی تھیں اور دیکھنے والوں کے لیے بھی سامان تفریح مہیا کرتی تھیں۔

اب سے چالیس سال پہلے ہفتہ کی رات جب چراغاں ہوتا تو شالامار میں عجیب چہل پہل ہوتی تھی، امرا اور رؤسا کے شاندار خیموں میں موسیقی کی محفلیں سجائی جاتیں، جن میں لاہور کی مشہور گانے والیوں کے مجرے ہوتے، بھانڈوں کی نقلیں ہوتیں، ہیر رانجھا کے سوانگ بھرے جاتے تھے، اور رات انھیں رنگ رلیوں میں بسر ہو جایا کرتی تھی۔

باغ کے اندر دوکانیں لگتی تھیں، جہاں سے ہر چیز دستیاب ہو جاتی تھی۔ ہفتہ کی رات اور اتوار کے دن لوگوں کا تانتا بندھا رہتا دیہاتی رات بھر لوک گیتوں اور بولیوں سے میلہ کی رونق میں اضافہ کرتے۔ پچھلے سال کی بعض ٹولیوں کی بولیاں مجھے یاد رہ گئی ہیں، آپ بھی سنیں: —

۱۔ کھٹن چلیا تے کیہہ کھٹ لیاندا
کھٹ کے لیاندے پیڑے
تیویاں بنان والیا
تیرے وچ جناں دے ڈیرے

۲۔ گوری نہا کے چھپڑ و چوں نکلی
سلفے دی لاٹ ورگی

۳۔ بیریاں نوں بیر لگ گئے تینوں کجھ نہ لگا بیبارے

۴۔ کاہنوں ڈھائیے گلی دسے وچ چرخہ
ہتیاں دسے خون ہون گے

اب دو سال سے حکومت نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ میلہ شالامار کے اندر نہ لگے بلکہ باہر لگے، تاکہ باغ خراب نہ ہو۔

بسنت کا میلہ بسنت کا میلہ بھی لاہور کا مشہور میلہ ہے۔ عام طور پر جنوری یا فروری میں لگتا ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے یہ میلہ باغبانپورہ میں درگاہ حضرت مادھو لال حسین پر لگا کرتا تھا۔ لوگ دور دور سے آکر میلہ کی رونق کو دوبالا کرتے تھے۔ مسلمان اس درگاہ پر نذرانے چڑھا کر اظہار عقیدت کرتے تھے۔ حضرت لال حسین کا مشہور شعر ہے ؎

رُت آئی بسنت بہار دی
سالوں سِک ہے مادھو یار دی

سکھ حضرات گوردوارہ گورو مانگٹ صاحب میں حاضر ہو کر بسنت کا میلہ مناتے تھے، اور وہاں کنکوے اڑاتے تھے۔ ہندو صاحبان حقیقت رائے کی سمادھ پر میلہ مناتے تھے۔ یہ سمادھ بھی باغبانپورہ کے قریب ہے۔ ہندو اور سکھ حضرات سروں پر بسنتی (زرد) پگڑیاں باندھتے اور بیبیاں زرد کپڑوں اور ساڑھیوں میں ملبوس ہوتیں۔ ارد گرد سرسوں کے کھیت ہوتے اور سرسوں کے بسنتی پھولوں کے درمیان زرد پگڑیاں اور زرد سوٹ عجیب منظر پیش کرتے۔

اندرون شہر کوٹھوں پر نوجوانوں کی ٹولیاں کنکوے بازی میں مشغول ہوتیں۔ اور صبح سے شام تک لاکھوں روپے کنکوے بازی پر خرچ ہو جاتے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد حکومت میں بھی یہ میلہ بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ مہاراجہ اور اس کے درباری زرد لباس زیب تن کرتے اور جب ان کا جلوس قلعہ لاہور سے شالامار کی طرف روانہ ہوتا تو سرسوں کے کھیتوں کے زرد زرد پھولوں کے درمیان سے اس زرد پوش جلوس کا منظر بہت دلفریب ہوتا۔ لیفٹیننٹ الیگزینڈر برنز، جو اس زمانے میں لاہور آیا اس نے بسنت کا آنکھوں دیکھا منظر یوں کھینچا ہے:۔

> "بسنت کا تیوہار جو بہار کا تیوہار ہے۔ ۶ فروری کو بڑی شان و شوکت سے منایا گیا۔ رنجیت سنگھ نے ہمیں اس تقریب میں مدعو کیا اور ہم اس کے ہمراہ ہاتھیوں پر سوار ہو کر اس میلہ کی بہار دیکھنے چلے جو بہار کا خیر مقدم کرنے کے لیے منایا جاتا ہے۔ لاہور سے میلہ تک دو رویہ مہاراجہ کی فوج کھڑی ہوتی ہے۔ مہاراجہ گزرتے ہوئے اپنی فوج کی سلامی لیتا ہے، میلہ میں مہاراجہ کا شاہی خیمہ نصب تھا جس پر زرد رنگ کی ریشمی دھاریاں تھیں خیمہ کے درمیان ایک شامیانہ تھا، جس کی مالیت ایک لاکھ روپیہ تھی۔ جس سے موتیوں اور جواہرات کی لڑیاں آویزاں تھیں۔ اس شامیانہ سے شاندار چیز کوئی نہیں ہو سکتی۔ مہاراجہ نے بیٹھ کر پہلے گرنتھ صاحب کا پاٹھ سنا۔ پھر گرنتھی کو تحائف دیئے۔ اور مقدس کتاب کو دس جزدانوں میں بند کر دیا گیا، سب سے اوپر والا جزدان بسنتی مخمل کا تھا۔ اس کے بعد مہاراجہ کی خدمت میں پھل اور پھول پیش کیے گئے اور سہرہ بوٹی جس کا رنگ زرد تھا۔ بعد ازیں امراء، وزراء اور افسران آئے جنھوں نے زرد لباس پہن رکھے تھے انھوں نے نذریں پیش کیں ـــ اس کے بعد طوائفوں کے مجرے ہوئے اور مہاراجہ نے دل کھول کر انھیں انعامات عطا کیے۔"

قیام پاکستان کے بعد بھی بسنت کا میلہ ہر سال درگاہ حضرت مادھو لال حسین پر منایا جاتا ہے۔ کوٹھوں پر کھڑے ہو کر کنکوے بازی کے مقابلے ہوتے ہیں، زبان سے " وہ کاٹا " کے نعرے لگانے کے بجائے لاؤڈ سپیکروں سے کام لیا جاتا ہے۔ اور فلمی گانوں کے ریکارڈ اس شور و غوغا میں مزید اضافہ کرتے ہیں۔

قدموں کا میلہ | روضۂ رسول پاکؐ کے مجاوروں میں سے ایک بزرگ زین العابدین نام سلطان ناصر الدین محمود بن سلطان شمس الدین التمش کے زمانے میں ہندوستان آئے اور ملتان سے ۱۲ میل مشرق کی جانب قصبہ شاہ کوٹ میں اقامت گزیں ہوئے۔ یہاں ان کے ہاں دو فرزند پیدا ہوئے جن میں چھوٹے کا نام سیدی احمد تھا۔ وہ بچپن ہی سے ذہین تھے۔ علم حاصل کرنے کے لیے لاہور پہنچے اور ایک عرصہ تک یہاں کے علماء و صلحا کی خدمت میں رہ کر علوم ظاہری و باطنی میں کمال حاصل کیا۔ لاہور میں ان کا حجرہ اب تک شاہ عالمی دروازہ کے باہر ایک مکان کے نیچے موجود ہے۔ ان کی بخشش و سخاوت کی بنا پر لوگ انھیں سخی سرور لکھ داتا کہتے ہیں۔

لاہور سے وہ سیر و سیاحت کے شوق میں شہر بہ شہر اور قریہ بہ قریہ پھرے اور بغداد تک پہنچے۔ وزیر آباد کے قریب قصبہ دھونکل میں آپ سے بہت سی کرامتیں ظاہر ہوئیں۔ وہاں آپ کی یادگار ایک مسجد، چشمہ اور تالاب اب تک قائم ہے۔ مزار آپ کا ڈیرہ غازی خاں سے بجانب غرب کوہ سلیمان کے دامن میں واقع ہے۔ وہ جگہ آپ ہی کے نام سے سخی سرور کہلاتی ہے۔ اس کے قریب ہی درہ سخی سرور ہے جو کبھی قندھار اور ڈیرہ غازی خاں کے درمیان ایک تجارتی ذریعہ تھا۔

قدموں کا میلہ انہی بزرگ کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ میلے کے اصلی دن چار ہیں یعنی ۱۰ اپریل سے ۱۳ اپریل تک۔ لیکن آپ کے عقیدت مندوں کے گروہ جن کو سنگ کہتے ہیں فروری مارچ ہی میں بوریا بستر باندھ کر سفر کی تیاریاں شروع کر دیتے ہیں۔ وہ گوجرانوالہ، سیالکوٹ، جھنگ، لائلپور اور دیگر اضلاع سے دھونکل اور دھونکل سے نکل کر لاہور آتے ہیں جہاں ان کے آستانے سے لے کر پرانی انارکلی تک میلہ لگ جاتا ہے۔ [سید محمد لطیف نے ہسٹری آف لاہور میں درست نہیں لکھا کہ آپ کا مزار انارکلی میں ہے ۔۔۔ ادارہ]

ڈھول بجانے والے دیہاتی جن کو عرف عام میں شیخ کہتے ہیں اس آستانے پر بڑی عقیدت سے حاضر ہوتے ہیں اور زور زور سے ڈھول بجا کر اس کے ساتھ ناچتے اور "بھمیاں" کا رقص پیش کرتے ہیں۔ مشہور ہے کہ سخی سرورؒ کو معصوم اور چھوٹے بچوں سے محبت تھی، اور وہ اُن کے مربی مانے جاتے ہیں، عورتیں اپنے بچوں کو لے آتی ہیں اور یہ شیخ ان بچوں کو گود میں لے کر عجیب انداز سے ناچتے ہیں اور ساتھ ساتھ گاتے بھی جاتے ہیں ؎

لوری لال نوں دیواں نکے بال نوں دیواں

لال وسے لے لے لوری

درگاہ کے علاوہ یہ میلہ موری دروازہ اور دہلی دروازہ کے باہر بھی لگتا ہے۔ جہاں یہی شیخ بچوں کو لوریاں دیتے ہیں اور ناچتے ہیں، حلوائیوں اور کھلونوں کی دوکانیں لگتی ہیں، جھولے ڈالے جاتے ہیں، جن میں بچے بڑے شوق سے چڑھتے ہیں۔ اس میلہ کی سب سے بڑی سوغات تیل کے تھلے اور مٹی کے برتن ہیں۔

گذشتہ چند سالوں سے اس میلہ کی رونق کم ہو گئی ہے۔

چھڑیوں کا میلہ | کبھی یہ لاہور کا مشہور میلہ تھا۔ جو گرمیوں میں مستی دروازے کے باہر لگا کرتا تھا۔ دراصل یہ میلہ ایک بزرگ شاہ مدار کی یاد میں ہندوستان بھر میں منایا جاتا ہے اس میں لمبی لمبی چھڑیوں کے کمالات کا مظاہرہ کیا جاتا تھا۔ لمبے لمبے بانسوں کو ایک

دوسرے کے ساتھ مضبوطی سے کس کر باندھا جاتا۔ جو سہ منزلہ مکان جتنے اونچے ہو جاتے۔ پھر ان کے ساتھ رنگ برنگے کپڑے باندھ دیتے۔ ماہر چھڑی باز ان چھڑیوں کو ہر حالت میں سیدھا کھڑا رکھنے میں اپنی مہارت کا ثبوت دیتے۔ کبھی وہ اس چھڑی کو ٹھوڑی پر کھڑا کرتے۔ کبھی پیشانی پر، کبھی ہاتھ پر نچاتے اور کبھی صرف انگوٹھے پر۔ کمال فن یہ تھا کہ چھڑی متوازن رہے اور گرنے نہ پائے۔ اس کے ساتھ ڈھول بجا کر گایا بھی جاتا تھا۔ افسوس کہ امتداد زمانہ سے یہ فن مٹ گیا۔ اب صرف چوہٹہ مفتی باقر میں چھڑی بازوں کا خاندان ہے مگر وہ اس فن کو ترک کر چکے ہیں۔ اب یہ میلہ بھی نہیں ہوتا۔

اس میلہ میں کبھی کبھی لاہوری سورماؤں کی جھڑپیں بھی ہو جایا کرتی تھیں۔ اس میلہ کی ایک لڑائی آج تک بڑے بوڑھوں میں مشہور ہے جو موچی دروازہ کے نصرو پہلوان اور استاد نور دین کا بڑا کی پارٹی اور بھاٹی دروازہ کے حاجی بلا کی پارٹی کے درمیان ہوئی تھی، جس میں خوب چاقو چلے تھے اور یہی لڑائی اس میلہ کے زوال کا باعث بنی۔

پارہ کا میلہ یہ میلہ دریائے راوی کے پار مغل شہنشاہ جہانگیر کے مقبرہ میں لگتا ہے، اسی لیے پارہ کا میلہ کہلاتا ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے جب ہندو مسلم تعلقات میں کشیدگی نہ تھی۔ یہ میلہ بھی میلہ چراغاں کی طرح بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ رات کو مقبرہ پر چراغاں ہوتا۔ لوگ مختلف ٹولیوں میں بٹ کر ساری ساری رات مقبرہ میں رنگ رلیاں مناتے۔ پکوان پکتے۔ کشتیاں ہوتیں۔ کبڈی کے مقابلے ہوتے۔ بھانڈوں کی نقلیں ہوتیں، بازی گروں کے تماشے ہوتے۔ مشہور طوائفوں کے مجرے ہوتے۔ غرض کہ یہ میلہ بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا۔

کچھ عرصہ بعد لاہور کے خوش باش لوگوں نے اس میں ایک عجیب جدت پیدا کی، شاہدرہ میں کوٹھے کرایہ پر لیے جاتے اور ساری رات خوب جوا ہوتا جس میں ہزاروں روپے کی ہار جیت ہو جاتی۔ رفتہ رفتہ یہ وبا مقبرہ میں بھی آ دھمکی۔ اور وہاں بھی رات بھر جوئے بازی ہوتی۔ حتیٰ کہ مقبرہ کے مینار بھی اس لعنت سے نہ بچے۔ پولیس کے ساتھ جھڑپیں بھی ہوتیں۔ ایک مرتبہ ایک پولیس والے کو مینار پر سے دھکا دے دیا گیا۔ حکومت نے جوئے پر کڑی نگرانی کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب اس میلہ میں وہ چہل پہل نہیں رہی جو آج سے بیس سال پہلے تھی۔

عرس داتا گنج بخش رح لاہور کا یہ مشہور و معروف میلہ حضرت علی ہجویریؒ عرف داتا گنج بخشؒ کے مزار مقدس پر لگتا ہے۔ حضرت داتا گنج بخشؒ غزنی کے رہنے والے تھے۔ آپ شیخ ابو الفضل بن حسنؒ کے مرید تھے۔ آپ محمود غزنوی کے فرزند مسعود کے لشکر کے ساتھ لاہور میں وارد ہوئے اور سنہ ۴۳۱ھ میں لاہور میں ہی مقیم ہو گئے جہاں ۳۴ سال تک آپ خدمت دین میں مصروف رہے۔ ہزارہا لوگ آپ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے اور بہت سے اولیا کرام آپ سے فیضیاب ہوئے۔ آپ کی وفات ۴۶۵ھ میں ہوئی۔

آپ کا سالانہ عرس ہر سال ۲۰ ماہ صفر کو منعقد ہوتا ہے۔ اس عرس پر عظیم الشان میلہ لگتا ہے۔ مختلف شہروں سے زائرین ہزاروں کی تعداد میں شریک ہوتے ہیں۔ اور عقیدت کے پھول نچھاور کرتے ہیں۔ بجلی کے قمقموں کی روشنی سے سارا مزار بقعہ نور بن جاتا ہے۔ قوالی کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں۔ جن میں ملک کے مشہور قوال حصہ لیتے ہیں۔ ہزارہا دوکانیں لگتی ہیں۔ جہاں سے ہر قسم کی اشیا دستیاب ہوتی ہیں۔ ٹکسالی دروازہ سے مزار تک اور مزار سے بھاٹی دروازہ تک خلقت کے ہجوم کا یہ عالم ہوتا ہے کہ انسان کو راستہ بنانا مشکل ہو جاتا ہے۔ دو دن تک میلہ میں رونق رہتی ہے۔

اب یہ مزار حکومت کے محکمہ اوقاف کی تحویل میں ہے۔ اور وہی اس میلہ کا انتظام کرتا ہے، قدیم مجاوروں کا اب اس میں کوئی عمل دخل نہیں رہا۔

میاں میرؒ صاحب کا میلہ حضرت میاں میرؒ صاحب کا میلہ آپ کے مزار پر سالانہ عرس کے موقعہ پر لگتا ہے اور داتا گنج بخشؒ کے عرس کی طرح بڑی رونق والا میلہ ہے۔ حضرت میاں میرؒ سیستان میں ۹۵۷ھ میں پیدا ہوئے

اور بعمر ۸۰ سال لاہور میں ۱۰۴۵ھ میں فوت ہوئے۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت فاروق اعظمؓ سے ملتا ہے۔ آپ زہد و تقویٰ اور پرہیزگاری میں یگانہ تھے اور ہزار ہا لوگوں نے آپ سے کسب فیض کیا۔ آپ کے معتقدین میں بڑے بڑے بادشاہ اور امراء شامل ہیں۔ شہزادہ دارا شکوہ آپ کا بہت ہی معتقد تھا۔

جب یہ میلہ لگتا ہے تو لاہور سے میاں میر تک تانگوں، موٹروں، سائیکلوں اور گدھوں کا تانتا بندھ جاتا ہے۔ سینکڑوں زائرین پا پیادہ چل کر میلہ میں شریک ہوتے ہیں۔ درگاہ کے تبرک کے علاوہ لاہور اور مضافات کی مختلف برادریاں اپنی طرف سے دیگیں پکا کر لوگوں میں تبرک تقسیم کرتی ہیں۔ مزار پر چراغاں ہوتا ہے۔ قوالیاں ہوتی ہیں۔ دوکانیں لگتی ہیں۔ اور دو دنوں تک میلہ میں خوب رونق رہتی ہے۔

بھدر کالی کا میلہ

لاہور سے سات میل دور موضع نیاز بیگ کے پاس ہندوؤں کی مشہور دیوی بھدر کالی کا استھان تھا۔ یہ میلہ جون کے مہینے میں اسی استھان میں لگا کرتا تھا۔ پاکستان کے قیام سے بہت پہلے جب ہندو مسلم تعلقات میں کشیدگی نہ تھی۔ دونوں فرقوں کے لوگ اس میلہ کی رونق کو دوبالا کرتے تھے۔ اس استھان میں ایک بڑا سا تالاب اور گھنا باغ تھا۔ اور یہ دونوں چیزیں جون کے مہینہ کی شدید گرمی میں نعمت تھیں۔ لوگ تالاب میں اشنان کرتے اور سایہ دار درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر میلہ سے لطف اندوز ہوتے۔ بعد ازاں اس میلہ میں صرف ہندو صاحبان ہی حصہ لیتے تھے۔ اب اس استھان کی وہ رونق باقی نہیں رہی۔

بیساکھی کا میلہ

یہ میلہ ماہ بیساکھ کی یکم تاریخ کو لگتا تھا۔ اور ہزارہا ہندو، مسلمان اور سکھ مرد و زن دریائے راوی پر پہنچ جاتے تھے اور دریا میں اشنان کرتے تھے۔ دیہاتی ڈھول کی سنگت کے ساتھ پاؤں میں گھنگرو باندھ کر گاتے اور بھنگڑا ڈالتے تھے۔ بعد میں جب ہندو مسلم تعلقات خراب ہو گئے تو مسلمانوں نے اس میلہ میں شریک ہونا چھوڑ دیا۔ اس کے باوجود قیام پاکستان تک اس میلہ کی رونق جوں کی توں رہی۔

جوڑ کا میلہ

لاہور کے شاہی قلعہ کے سامنے سمادھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ساتھ ایک گوردوارہ ہے جو گوردوارہ ارجن دیو کے نام سے مشہور ہے اور اپنے سنہری کلس کی وجہ سے بہت شاندار معلوم ہوتا ہے۔ یہ میلہ اسی گوردوارہ میں گورو ارجن دیو کی یادگار میں منایا جاتا تھا جس میں دور دور سے سکھ یاتری آیا کرتے تھے۔ سکھوں کی گوردوارہ تحریک سے قبل ہندو بھی اس میں شریک ہوا کرتے تھے۔ بعد ازاں انھوں نے اس میں حصہ لینا چھوڑ دیا۔ جب یہ میلہ لگتا تو چوک ہیرا منڈی سے لے کر گوردوارہ تک سڑک کے دو رویہ دوکانیں لگتیں۔ بعض حضرات ٹھنڈے پانی، دودھ، لسی اور شکر کے شربت کی سبیلیں لگاتے تھے۔ گوردوارہ میں ملک کے مشہور راگی کیرتن کرتے، اور زائرین ہزاروں روپے کے چڑھاوے چڑھاتے تھے۔ اب بھی سکھ حضرات بھارت سے آکر ہر سال یہ میلہ مناتے ہیں۔

دسہرا اور دیوالی کا میلہ

اگر ہندوستان میں لکھنؤ کا محرم الحرام مشہور تھا تو پنجاب میں لاہور کا دسہرہ اور دیوالی بھی بے مثال تھے۔ دسہرہ کا میلہ دس دن تک سری رامچندر جی کی یاد میں منایا جاتا تھا۔ واقع لنگے منڈی کے پاس ایک میدان میں ہر روز شام کو رام لیلا رچائی جاتی تھی جس میں نوجوان رامچندر، لچھمن، سیتا، ہنومان اور راون کا سوانگ بھر کر رامائن کا ڈرامہ پیش کرتے۔ بعد میں راون کے ایک قد آدم کاغذی بت کو آگ لگا کر جلا دیتے۔ دسویں دن سری رامچندر کا جلوس نکالا جاتا جس میں سینکڑوں گاڑیوں پر لوگ رامچندر وغیرہ کا سوانگ بھر کر بیٹھے ہوتے۔ یہ جلوس ہیرا منڈی میں سے گزرتا ہوا منٹو پارک میں اس مقام پر پہنچ جاتا جہاں آج کل نمائش ہو رہی ہے۔ یہ سارا میدان لاکھوں مردوں اور عورتوں سے بھرا ہوتا جو رنگین لباس زیب تن کئے بال بچوں سمیت میلہ میں شریک ہوتے۔ سب سے پہلے ہنومان جی لنکا کو جو بانسوں اور کاغذ سے بنائی جاتی، آگ لگاتے۔ بعد میں راون کے متعدد بتوں کو جو شاہی مسجد کے مینار کی ایک منزل سے اونچے ہوتے آگ لگا دی جاتی۔ ان بتوں میں گولے

چٹاخے بھرے ہوتے۔ جب انھیں آگ لگتی اور ان میں سے آتش بازی چھوٹتی تو عجیب لطف آتا۔

دسہرا کے میلے کے چند دن بعد ہندو دیوالی کا میلہ مناتے اور جس طرح چودہ سال کے بن باس کے بعد راجپندر کی واپسی پر اجودھیا میں چراغاں کیا گیا تھا۔ اسی طرح اپنے مکانوں پر چراغاں کرتے۔ انار کلی بازار کے ہندو دوکاندار اپنی دوکانوں کو بجلی کے قمقموں سے روشن کرتے۔ اور رات کے وقت انار کلی میں بھیڑ کا یہ عالم ہوتا کہ چلنا مشکل ہو جاتا۔ کالج کے لڑکوں کے نصیب جاگ اٹھتے اور وہ زرق برق پوشاکوں میں ملبوس ہندو دیویوں کو اتنا تنگ کرتے کہ توبہ ہی بھلی۔

پتنگ بازوں کا میلہ

شاہی محلہ میں جس جگہ اب مکانات بن گئے ہیں اور ڈینٹل ہسپتال تعمیر ہو چکا ہے۔ یہ تمام علاقہ ایک کھلا میدان تھا۔ جس میں بڑ کے بڑے بڑے تناور درخت تھے۔ دن کے وقت ان کی چھاؤں میں گوجر اپنے مویشی ٹھہراتے اور سہ پہر کے وقت لاہور کے مختلف علاقوں کے پتنگ باز یہاں جمع ہو جاتے اور پتنگوں کے پیچ لڑاتے۔ جن کو وہ پنجابی میں "مندیں" کہتے تھے۔ میرے بچپن میں یہ میلہ تقریباً ہر روز لگتا تھا۔ جب شاہی محلہ آباد ہو گیا تو یہ "مندیں" منٹو پارک میں ہونے لگیں۔ اب یہ میلہ ہفتہ میں دو بار جمعہ اور اتوار کو آج تک منٹو پارک میں ہوتا ہے جہاں سینکڑوں روپے ان پتنگوں کے پیچوں پر صرف ہو جاتے ہیں۔ ان میلوں میں بلا مبالغہ سینکڑوں نوجوان، بوڑھے اور بچے شریک ہوتے ہیں۔ زمانے کے انداز بدل گئے ہیں جہاں کبڈی، گلی ڈنڈے کے ٹورنامنٹ ہوتے ہیں وہاں اب پتنگ بازی کے ٹورنامنٹ بھی ہونے لگے ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے سچ فرمایا تھا ؎

زمانے کے انداز بدلے گئے نیا راگ ہے ساز بدلے گئے

اس میں کوئی شک نہیں کہ انداز بدلے گئے ہیں مگر لاہور کے میلوں کا انداز وہی ہے۔ گو اب بٹیر بازی، مرغ بازی اور مینڈھوں کی ٹکریں نہیں ہوتیں لیکن آج بھی آپ کو ایک دن میں کئی میلے لگے ملیں گے۔ کہیں کرکٹ میچ ہو رہا ہے کہیں سافٹ بال کا مقابلہ ہے، کہیں کسی مزار پر عرس ہو رہا ہے اور سینماؤں کے باہر میلہ لگا ہے۔ میں جب بھی یہ مناظر دیکھتا ہوں تو اپنے دوستوں کے سامنے اس کشمیری ڈھنڈورچی کے یہ الفاظ دہرایا کرتا ہوں:۔

سجنو! ایہہ لاہور اے
ست دن تے اٹھ میلے
گھر جاداں کیہڑے ویلے

ڈراما اور تھیٹر

عشرت رحمانی

ابتدا اُردو ڈراما اور تھیٹر کی تاریخ پر تفصیلی نظر ڈالنے سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس برِّصغیر میں ہمارے تھیٹر نے جس ماحول میں جنم لیا اور اس کی تعمیر میں جن بنیادی خامیوں کو دخل تھا وہ اپنے اسی ابتدائی دور سے متاثر رہیں۔

۱۸۵۲ء کا ہندوستان تھا۔ ملک کی عام انحطاطی معاشرت و تہذیب ادبار کے بادلوں میں سیاہ رنگ ہو رہی تھی۔ جو محفلیں جہاں جہاں جس رنگ میں آراستہ تھیں وہ محض بادۂ شبانہ کی سرمستیوں کی یاد ہی منا رہی تھیں۔ فراغت و اطمینان کی بزم آرائیوں کا زمانہ گزر چکا تھا۔ ملکی فضا تیرہ و تار تھی اور اس گھٹا ٹوپ میں یہ رنگ رلیاں بجلی کی چمک کا درجہ رکھتی تھیں جہاں بادل کی گرج دلوں کو دہلا کر ہر آن کسی آنے والے طوفان کا پتہ دے رہی تھی۔

اس دور میں سلطان واجد علی شاہ والیِ اودھ کے قیصر باغ میں رقص و نغمہ اور شاہی تمثیلی مجالس بھی نظر آتی تھیں جن کی حیثیت یہ "عشرتِ رفتہ فتنہ بکرز" کی تھی۔ عوام جن کا گزر شاہی محفلوں میں نہ ہو سکتا تھا حسبِ مقدور اُجڑی اُجڑی بزمِ طرب کے نقشے جمانے پر اکتفا کرتے تھے۔ تعلیمی اور اقتصادی بدحالی عام تھی۔ مشرق و مغرب کا تصادم بھی درپیش تھا۔ تہذیب و معاشرت میں ثقاہت کی جگہ عامیانہ پن بڑھتا جا رہا تھا جو دورِ زوال کا خاصہ تھا۔ فنونِ لطیفہ کی ترقی اپنے عہدِ عروج کا سنبھالا لے رہی تھی۔ شاعری ہر مرض کی دوا سمجھی جا رہی تھی اور مشاعروں کی محفلیں ہمہ وقت آراستہ ہوتی رہتیں۔ چنانچہ اس دور میں امانت لکھنوی کی "اندر سبھا" نے جنم لیا اور اُردو کی پہلی تمثیل قرار پائی۔ اس کا پس منظر وہی تھا جو اس عہد کی مسخ شدہ تہذیب اور فنی روایات کا تقاضا تھا۔ امانت لکھنوی کا یہ تخلیقی کارنامہ بجائے خود قابلِ ستائش اور فنی کاریگری کی معقول مثال ہے لیکن ناساز گار فضا کی یادگار بن کے رہ گئی۔ اگر اپنی تہذیب، اپنا فن، اپنا ادب اور اپنے علمی و لسانی تقاضے ہموار و محفوظ ہوتے تو اس تمثیل کا آغاز کسی اور ہی انداز میں ہوتا۔ سکون و اطمینان اور فارغ البالی کے دور میں اس تمثیلی افتتاح میں صحت و سلامتی کی شان ہوتی اور اس پہلے ناٹک پر دانش و حکمت کی مہر ثبت ہوتی۔

لیکن ایسا ہونا بہ وجوہ ممکن نہ تھا اس لیے اس ناٹک پر اپنے انحطاطی دور کے راگ رنگ اور شاعری کا رنگ غالب رہا اور نقشِ اوّل کے بعد ملک کے اطراف و جوانب میں جتنے نقوش بھی بنائے گئے وہ بہتر ہونے کے بجائے "نقل مطابق اصل" ہی رہے اور اس لیے ہمارے ڈرامے، اسٹیج اور تھیٹر کی تعمیر ناپختہ بنیادوں پر استوار ہوئی — اور آخر عہد تک ہر ترقی میں بنیادی کجی کے ناخوشگوار و ناپائدار اثرات موجود رہے۔

ستم بالائے ستم ــ ملکی حالات بد سے بدتر ہی ہوتے گئے حتیٰ کہ ملک و قوم نے غلامی کا طوق پہن لیا۔ چپہ چپہ اور شعبہ شعبہ پر غلامی کی چھاپ لگ گئی۔ ہر ترقی پذیر تنزل کے آثار اور ہر بناؤ میں بگاڑ کے انداز ہونا قدرتی تھا۔

بجائے اس کے اگر دوسرے آزاد ممالک کی طرح ہمارے اسٹیج اور ڈراما کا آغاز بھی آزادی و فراغت کے ساتھ ہوتا اور ہمیں اپنی روایات کو حسبِ منشا کھلے بندوں ترقی و عروج کے مواقع اور سامان میسر آ سکتے تو یقیناً ہم بھی آج اس فن میں دوسرے فنون کی طرح ہر ترقی یافتہ ملک کے مقابلے پر نقشے جما سکتے لیکن ہمارے دوسرے فنونِ لطیفہ کی ترقی تو دیر آزادی ہی میں ہو چکی تھی اور چونکہ مسلم سلاطین تمثیل گری کو قابلِ اعتنا نہ سمجھتے تھے اس لیے آخری اودھ شاہی دور سے پہلے اس کی جانب توجہ ہی نہ کی گئی۔ یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ سلطان واجد علی شاہ اپنے عہد کا سب سے بڑا ترقی پسند حکمران تھا جس نے علم و فن اور ملکی اصلاح و تعمیر کی ترقی کے لیے ہر ممکن قدم اٹھایا لیکن غیر ملکی تسلط نے آ دبوچا اور اس کی روشنئ طبع ہی بلا ثابت ہوئی۔ سلطان کا آزادی و عروج کا خواب بھیانک تعبیر کی صورت میں ظاہر ہوا مگر فطرتِ آزاد و طبعِ خداداد کے جوہر کہیں یوں بھی دبتے ہیں۔ مٹیا برج کی چار دیواری میں اسیرِ فرنگ بن کر بھی سلطان کی جدت طرازیاں اپنے رنگ جماتے رہیں اور فنونِ لطیفہ کے نت نئے نقوش کھلاتی رہیں تاہم قومی ترقی کے امکانات مفقود اور تہذیب و ثقافت کے انداز بدلے بدلے نظر آنے لگے۔ غرض ہمارے اسٹیج کی ترقی میں بھی تنزل کے آثار تھے تاہم ہمارے اربابِ بست و کشاد (معدودے چند) نے اپنی سی بہت کچھ کی اور محدود ذرائع کے باوجود اپنے غیر ملکی معاصرین کے مقابلہ میں بھی اپنی بے بضاعتی کے جوہر دکھا کر داد و ستائش حاصل کر ہی لی لیکن زمانہ کی ناسازگاری نے فکر و نظر کے جوہر آشکار نہ ہونے دیے۔

اس برصغیر کا اسٹیج جس عہد میں ختم ہوا ہے اس پر وہی آثار و ادبار طاری تھے جو انگلستان میں سولھویں صدی عیسوی کے الزبتھین عہد کے اوائل میں نظر آتے تھے لیکن وہاں آزادی و فراغت نے ترقی کے ہر ممکن اسباب فراہم کیے اور منزل بہ منزل عروج حاصل ہوتا رہا۔ اس کے برعکس ہم ہر پہلو جلتے رہے۔

ہمارے قومی انحطاط اور غلامی کی بے سر و سامانی، تہذیبی و تعلیمی پستی نے بھی ہمارے تھیٹر کو پنپنے کا موقع نہ دیا۔ ہمارے ڈراما نگاروں اور کارپردازوں کی (بلا استثنائے چند) عمومی حالت و حیثیت پست و ادنیٰ درجہ کی تھی۔ خواص نے اس طرف کوئی توجہ نہ کی۔ اعلیٰ ادیبوں نے کوئی سہارا نہ دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اردو ڈراما اور تھیٹر کو فکر و تخیل کی بلندی نصیب نہ ہو سکی۔

جناب مہدی حسن احسن لکھنوی نے جو ملک کے خوش فکر شاعر اور بلند پایہ ڈراما نگار تھے اردو اسٹیج کی نسبت اظہارِ خیال کرتے ہوئے بجا طور پر فرمایا ہے:۔

> "ڈراما نویس اپنے چال چلن کی وجہ سے بدنام ہیں۔ ان کی شخصیت میں کوئی ایسا وزن نہیں ہے جو اپنے افعالِ قبیح کا کفارہ ادا کر سکے۔ ڈراما نگاروں میں ایک اور طبقہ ہے جس نے اپنی عمر کا ابتدائی حصہ ادنیٰ پیشوں میں صرف کیا اور آخر میں ڈراما کی دنیا میں خروج کیا۔ وہ غیر معتمد اور مشتبہ لوگ ہیں جو مالِ مسروقہ کی حیثیت بگاڑ کر خود مالک بن بیٹھے۔ پھر تماشا یہ تھا کہ موضوعِ شاعری پر جب بڑے بڑے اہلِ قلم کے مضامین شائع ہو رہے تھے تو وہ لوگ ہندوستان میں ڈراما کی کمی کی شکایت کرتے تھے مگر چراغ تلے اندھیرا ان کے نقدس

> ان کے زہد و ورع نے کبھی اسٹیج پر تشریف لانے کی تکلیف نہ کی۔ وہ بزرگوار مرگئے مثلاً جناب نشتی یا جناب معالی محمد اعزازی زحمت کرے۔ وہ اسٹیج کو شرمناک مذبح اور ڈراما کو پاپ کا قصہ سمجھتے رہے۔ نیز نظارہ ان کے جیسے باعث تحسین ڈراما نویس ان کے نزدیک عاصی و گنہگار۔ مجھے معلوم نہ ہوا کہ وہ کیا چاہتے تھے اور وہ ڈراما کس چیز کو سمجھتے ہوئے تھے کہ ان کی آنکھوں کے سامنے ایک منظر پیش تھا اور وہ منہ پھیرتے رہے۔ ہمارا فرض ایک لمبے اثر کا حامل تھا کہ کسی کے کان تک نہ پہنچا۔ ایک بیہودہ زیادتی تھی کہ کسی نے نہ سنی۔ دل خون ہو گیا اور اپنی محنت پر رونا پڑا۔ اتنا ہی غنیمت تھا کہ تھیٹر ہال کے محدود دائرہ میں ایک وقتی ہمہمہ ہو جاتا تھا۔ اس سے ڈراما نویس کی ہمت میں بالیدگی پیدا ہو جاتی تھی اور تعریف ناشناس ہی مرہم زخم جگر ہو جاتی تھی۔"

حقیقت یہ ہے کہ اردو ڈراما کے ترقی آثار دور میں بھی فکر و فن کے وہ حیات آمیز اور بصیرت افروز نمونے نظر نہ آسکے جن سے تھیٹر اور اسٹیج میں جان پڑتی اور روح میں بالیدگی پیدا ہو سکتی۔ گو پارسی سیٹھوں نے جن میں سے بعض فن کے قدر دان اور اہل دل بھی تھے اردو تھیٹر کو سہارا دینے کی بڑی کوشش کی لیکن تنِ مردہ میں جان ڈالنا کس کے بس کا تھا۔ لہٰذا ساز و سامان میسر ہی ڈراما میں زندگی کے آثار سرے سے ناپید تھے چنانچہ ترقی کا نشان ایک حد سے آگے نہ بڑھ سکا اور زوال شروع ہو گیا۔

میرے مضمون کا موضوع "لاہور میں ڈراما اور تھیٹر" ہے لیکن لاہور ہو یا کوئی اور مقام ابتدائی پس منظر سامنے لائے بغیر ہم اس موضوع کی مختصر تاریخ کا جائزہ نہیں لے سکتے اس لیے اجمالی طور پر یہ تفصیل از بس ضروری تھی۔

قدیم اسٹیج کا آغاز اور انجام

لاہور اپنی گوناگوں خصوصیات اور حیات آفریں ماحول کے ساتھ ہمیشہ سے علم و فن کا مرکز رہا ہے زندہ دلانِ لاہور ہر شعبۂ حیات میں پیش پیش رہے ہیں۔ ثقافتی سرگرمیوں میں ہر عہد میں وافر حصہ لیا۔ بیشتر تھیٹر کا آغاز لکھنؤ اور ڈھاکہ سے بیک وقت ہوا بعد ازاں پارسی اسٹیج بمبئی میں آراستہ ہو گیا لیکن ترقی کے سامان شروع ہوتے ہی لاہور کے ارباب ذہن و اہل فکر نے اس طرف توجہ کی۔ سب سے پہلے تو پارسی اسٹیج کے ترقی یافتہ دور کی کوئی بڑی یا چھوٹی کمپنی ایسی نہ تھی جو لاہور آئی ہو اور اس نے اہلِ لاہور سے فراخدلانہ داد نہ حاصل کی ہو۔ انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں اور بیسویں صدی کے آغاز سے لاہور بھی دوسرے بڑے شہروں کی طرح تھیٹر کی قدردانی کا مرکز بنا رہا۔ گو بمبئی کی طرح یہاں ابتدا میں کوئی بڑی تھیٹریکل کمپنی قائم نہ ہوئی تھی لیکن لاہور سے خصوصاً اور سابق صوبہ پنجاب کے کل اضلاع سے عموماً متعدد فنکار بمبئی کی اعلیٰ کمپنیوں میں داخل ہونے لگے تھے اور اپنے کمالات کے جوہر دکھانے لگے تھے۔ تھیٹر کے اکثر مشاہیرِ فن لاہور کے باشندے تھے جن میں بعض باقیات الصالحات کے طور پر موجود ہیں۔ تھیٹر کے نامی گرامی نغمہ کار اور مغنی نیز مشہور و مقبول ایکٹر اور ایکٹریسیں اکثر اسی سرزمین سے تعلق رکھتے تھے۔

لاہور میں تھیٹر کے مرکزی اسٹیج میکلوڈ روڈ کا بریڈلا ہال، بھاٹی دروازے کے ہال جو اب سینما گھر ہیں اور میکلوڈ روڈ کے چند ہال بنے ہوئے تھے یا کہیں میدان میں منڈوے بنا لیے جاتے تھے۔

دورِ متوسطہ میں کئی تھیٹر کمپنیاں بھی قائم ہوئیں اور رفتہ رفتہ بمبئی کی طرح لاہور نے بھی مرکزیت کا مقام حاصل کر لیا لیکن دوسرے

ورجہ پر چھوٹی کمپنیوں کا تو ذکر ہی کیا مشہور کمپنیوں میں البرٹ تھیٹریکل کمپنی، گلوب تھیٹر، پریم پرچارنی، ناٹک منڈلی، جمعدار تھیٹر اور پنجاب ریفارمنگ تھیٹریکل کمپنی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جنھوں نے لاہور سے ابتدا کی اور ملک بھر میں اپنے فنی کمالات کی دھوم مچائی۔ ڈائرکٹروں میں ماسٹر رحمت علی رحمت نے اپنی اس عہد کی اداکاری اور نغمہ نوازی کی بدولت ملک گیر مقبولیت و شہرت حاصل کی۔ آغا رحمت علی جنھوں نے پنجاب ریفارمنگ تھیٹریکل کمپنی اپنی ملکیت میں قائم کی تھی بڑے باذوق اور سجیلے فنکار تھے۔ ان کے علاوہ علی اطہر، عباس اور نانک چند نے بھی اپنے اپنے زمانے میں دھومیں مچائیں۔ ڈراما نگاروں میں منشی عباس علی، ماسٹر رحمت، ماسٹر قمر، میر غلام عباس، سید دلاور شاہ، ابراہیم محشر، محمد اسمٰعیل، محمد شاہ اور حکیم احمد شجاع خاص تھے۔ یہ حضرات ان مشاہیر میں ہیں جنھوں نے تھیٹر کے قدیم رنگ اور اسلوب کے مطابق اس دور کے خاصے کامیاب ڈرامے لکھے۔ حکیم احمد شجاع نے آخری دور میں قدیم ڈرامے کی بدذوقی کو اپنے اصلاحی رنگ سے بدلنے کی خاصی سعی کی۔ وہ اپنے کو آغا حشر کاشمیری کے خاص تلامذہ میں شمار کرتے ہیں اور ان کے طرزِ نگارش میں حشر کی رنگ آمیزی و تقلید کی جھلک بھی پائی جاتی ہے۔ آغا حشر نے اپنی عمر کا خاصا حصہ لاہور میں بسر کیا۔ تھیٹر کمپنیوں کے ساتھ کئی بار آئے۔ خود اپنی انڈین شیکسپیئر تھیٹریکل کمپنی لے کر سب سے پہلے لاہور پہنچے۔ علاوہ ازیں متعدد بار یہاں آکر مہینوں قیام کیا حتیٰ کہ ان کی محبوب اہلیہ کی وفات یہیں ہوئی اور یہیں دفن ہوئیں۔ آخر خود بھی لاہور ہی میں وفات پائی اور ربانی صاحب کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔ لاہور کی سرزمین سے انھیں والہانہ محبت تھی۔ لاہور کے اور بھی کئی ارباب قلم ڈراما نگاری کی جانب ذوق و شوق سے مائل ہوئے لیکن ان میں سے اکثر کے ڈرامے بوجوہ اسٹیج کی زینت نہ بن سکے۔ کسی کو ناٹک کمپنی نے تجارتی مصلحت کے خلاف کہہ کر اسے کھیلنے سے پہلوتہی کی اور کوئی کھیلا گیا لیکن مقبول نہ ہو سکا۔ ان حضرات میں قابلِ ذکر ہیں (۱) خان احمد حسین خاں (ایڈیٹر شباب اُردو لاہور) مصنف ڈراما "بازار حُسن" (۲) امراؤ علی مصنف ڈراما "جہانگیر" (ترجمہ ہیملٹ) اور "البرٹ بل" (سیاسی) (۳) سید امتیاز علی تاج مصنف ڈراما "انار کلی" (۴) منشی دوارکا پرشاد اُفق مصنف "سری رام ناٹک" (۵) لالہ کنور سین مصنف "بہا نڈ ناٹک" (۶) پنڈت سدرشن مصنف "قوم پرست" "محبت کا انتقام" "عورت کی محبت" وغیرہ۔ دورِ وسطیٰ کے ڈراما نگاروں میں (۱) منشی عباس علی مصنف "گل رو زرینہ" "جامِ جم" (۲) ماسٹر قمر مصنف "شیریں فرہاد" (۳) میر غلام عباس، عباس جنھوں نے تقریباً پچاس ڈرامے لکھے اور ان میں سے اکثر اسٹیج ہو کر مقبولیت اور شہرت کے آسمان پر چمکے۔ ان کے ڈراموں میں اسلامی اور تاریخی و نیم سیاسی رنگ کے ڈرامے سب سے زیادہ مقبول ہوئے خصوصاً (۱) نورجہان (۲) جہاں آرا (۳) نویدِ اسلام (۴) شانِ رحمت (۵) دارا سلام (۶) پنجاب میل (۷) شرمیلی مجری (۸) لیڈی ٹائپسٹ (۹) موہنی بی اے (۱۰) شاہی فرمان ——

(۷) ماسٹر رحمت علی رحمت۔ ان کے ڈرامے زیادہ تر ان کی اپنی اداکاری اور نغمہ نوازی کی بدولت قبولیتِ عام کے مالک ہوئے۔ ان میں خصوصیت سے (۱) دردِ جگر (۲) باوفا قاتل (۳) تصویرِ رحمت زیادہ مشہور ہیں۔ حکیم احمد شجاع نے متعدد ڈرامے لکھے لیکن ان میں سب سے زیادہ مشہور "باپ کا گناہ" ہوا۔ تھیٹریکل کمپنیوں کے علاوہ گورنمنٹ کالج لاہور کے لیے تین بنگالی ڈراموں کے ترجمے بھی پیش کیے (۱) مینا (۲) منتوش (۳) نادرا۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے زندہ دلانِ لاہور کا ذوقِ فنونِ لطیفہ کے سلسلہ میں مسلّم ہے چنانچہ یہاں ابتدائی دور سے آخر تک جہاں اچھی کمپنیوں کو ان کے کمالِ فن کی معقول داد ملی وہاں اکثر معمولی درجہ کی کمپنیاں ذوقِ بلند کی تاب نہ لا کر یہیں دفن بھی ہو گئیں۔ آخری

دور میں کلکتہ کی اسٹیج و فلم کی مشہور فنکار جہاں آرا کجن اپنی ذاتی تھیٹر کمپنی "جہاں آرا تھیٹریکل کمپنی" کے نام سے لاہور میں لے کر آئیں اور بڑے اہتمام سے پہلی بار اس جدت کو ملحوظ رکھ کر قدیم ڈرامے اسٹیج کیے کہ ان کی طوالت و قدامت کو کم کر کے صرف دو گھنٹے میں کھیلے جائیں۔ اس کمپنی پر زر کثیر صرف ہوا۔ انتہائی محنت و کاوش کی گئی لیکن اداکاری کے فرسودہ و روایتی انداز کو لاہور کے ارباب ذوق نے قبول نہ کیا۔ آخر اس کمپنی کا جنازہ ہی نکلا ــــ یہی حشر اور کئی ادنیٰ کمپنیوں کا ہوا لیکن اس سے پہلے میرٹھ کی بیاکل بھارت تھیٹریکل کمپنی نے روایتی ڈرامے قدیم انداز ہی میں پیش کیے اور چونکہ ڈرامے اور اداکاری کا انداز معیاری تھا اس کمپنی کے ہر کھیل نے لاہور کے عوام و خواص ہر طبقہ میں بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔ ان میں مقبول و کامیاب ترین ڈرامے تھے (۱) چندر گپت (۲) نیغ ستم (۳) گوتم بدھ۔

آخر کار جب رفتہ رفتہ قدیم تھیٹر کا انداز پامال و فرسودہ سمجھا جانے لگا اس دور میں بھاٹی دروازے کے باہر کئی ناٹک منڈلیاں ادنیٰ ساز و سامان اور گھٹیا اداکاروں کے ساتھ پرانے ڈرامے دکھاتی رہیں لیکن ان کا رنگ نہ جما۔ ملک کے دیگر مقامات کی طرح لاہور میں بھی تھیٹر سے بددلی پیدا ہونے لگی اور اسٹیج کی رونق ماند پڑ گئی۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۵ء کے دوران لاہور میں پرانے تھیٹر نے اپنی آخری بہاریں دکھا کر اسٹیج کے چراغ کو گل کر دیا۔ اب ان کی جگہ فلم سازی نے لے لی اور تمام فن کار و باذوق ادیب فلم نگاری کی طرف مائل ہو گئے۔ یکے بعد دیگرے متعدد فلم کمپنیاں بنیں اور بگڑیں لیکن ان میں مشہور و مقبول ترین فلمی ادارہ سیٹھ دل سکھ پنچولی آنجہانی کا تھا جن کے بلند اخلاق، خوش ذوقی اور معاملہ فہمی نے تمام فلم کاروں اور فلم نگاروں کو ایک مرکز "پنچولی آرٹ پکچرز" میں جمع کر لیا۔

اور یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ بمبئی کی فلمی مرکزیت کی سالمیت اور اعلیٰ کامیابی کو برقرار رکھنے کے ضامن زیادہ تر خاص لاہور اور اس کے مضافات کے فن کار اور اداکار ہی ہوتے۔ چونکہ میرے زیر بحث مضمون کا موضوع صرف تھیٹر ہے اس لیے فلمی سرگرمیوں کی تفصیل نظر انداز کر دینا ہی مناسب ہے۔ فلمی ہنگامہ آرائی کے دور میں ایک بار سیٹھ پنچولی نے بعض ارباب ذوق کے مشورہ سے لاہور میں تھیٹر کے احیاء کی بھی کوشش کی اور کثیر رقم صرف کر کے دہلی کی ایک تھیٹر کمپنی مع ساز و سامان اور اہل عملہ کے خرید لائے۔ اس کمپنی کا ایک مشہور و کامیاب کھیل "لیلیٰ مجنوں" بھی تھا جس میں ماسٹر دہلی اور کو خاص مقبولیت حاصل تھی لیکن لاہور کے معیار پر پورا نہ اترسکا اور ہر ممکن سعی و نقصانِ کثیر کے باوجود تھیٹر کے قیام میں ناکامی ہوئی۔ گو اب بھی لاہور کی کئی ناٹک منڈلیاں عامیانہ انداز میں پرانی شراب کو نئے پیمانوں میں پیش کر رہی ہیں جن کے نام تک سے باذوق حضرات واقف نہیں اور ان کا کام تھیٹر کے حیلہ سے فلمی گانے اور منتخب قدیم ڈراموں کے مکالمے پیش کر کے منڈیاں (میلے) کمانا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۳۵ء کے بعد روایتی تھیٹر اور ڈرامے کا ڈراپ سین ہو چکا ہے۔

کالجوں میں

جس زمانہ میں روایتی تھیٹر کی دھوم دھام تھی اس وقت بھی لاہور کے تمام کالجوں بلکہ سکولوں میں منتخب اُردو و انگریزی ڈرامے اسٹیج ہوا کرتے تھے۔ کالجوں کے ڈراموں میں سب سے زیادہ کامیاب گورنمنٹ کالج لاہور کا اسٹیج مانا جاتا تھا اور اس کالج کا سنہری دور وہ تھا جبکہ پروفیسر سوندی پرنسپل کالج، حکیم احمد شجاع، پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس) اور ان کے رفقاء کار ڈرامائی کاریگری میں مصروف تھے۔ ان کے اداکاروں میں سیّد امتیاز علی تاج جیسے فن کار شامل تھے۔ اسٹیج کے نت نئے تجربے کیے جاتے۔ شان و اہتمام سے ڈرامے چھپتے اور لکھے جاتے۔ ان ڈراموں میں انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں کے تراجم کے ساتھ آغا حشر کاشمیری کے چند منتخب ڈرامے بھی شامل ہوتے۔ پروفیسر غلام مصطفےٰ تبسم اور رفیع پیرزادہ بھی ان کارپردازوں میں نمایاں تھے۔

اس کے بعد دیال سنگھ کالج اور کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے مدارج بھی قابلِ ذکر تھے۔ پروفیسر خادم محی الدین کا نام بھی ہدایت کاری و ڈراما نگاری میں لائقِ فراموش نہیں۔ پروفیسر سوندی کے ڈرامائی کارناموں میں ایک زندہ یادگار لارنس باغ (باغ جناح) کا اوپن ایئر تھیٹر ہے جس کی تعمیر میں ان کی تجویز و سعی بلیغ خاص طور پر شامل تھی۔ جی چاہتا ہے کہ اس عہد کی اسٹیجی سرگرمیوں کا تذکرہ شرح و بسط سے کیا جائے لیکن تنگیِ دامانی سے معذور ہوں۔ افسوس کہ رفتہ رفتہ گورنمنٹ کالج اور دوسرے کالجوں کی ڈرامائی سرگرمیوں کا عروج بھی زوال پذیر ہوتا گیا اور ایک زمانہ وہ آیا کہ لاہور میں اہلِ لاہور تھیٹر اور اسٹیج کے نام کو ترسنے لگے اور پرانی یادوں کے سہارے اس عہد کے چرچوں ہی پر اکتفا کرنے پر مجبور ہوئے۔ جب کسی محفل میں ڈراما اور تھیٹر کے رسیا جمع ہو جاتے تو قدیم اسٹیج کی ہنگامہ آرائیوں کو یاد کر کے چٹخارے لیتے یا پھر گورنمنٹ کالج کی بزم آرائیوں کا مزے لے لے کر ذکر کرتے۔

پاکستان ـ جدید دور

درحقیقت آغا حشر مرحوم کے ساتھ قدیم تھیٹر تو دفن ہی ہو چکا تھا۔ پروفیسر پطرس کے محکمۂ نشریات کی نظامت سنبھالنے کے بعد گورنمنٹ کالج کی ڈرامائی سرگرمیوں میں وہ جوش و ولولہ نہ رہا۔ گو ان کے ساتھیوں نے بعد میں اس سلسلہ کو جاری رکھا لیکن ان میں سے اکثر حضرات اپنی ذاتی مصروفیات کے سبب اور کچھ کالج سے فراغت حاصل کر کے سبکدوش ہو چکے تھے اس لیے ایک مدت تک لاہور کی دنیائے تیاتر میں سکوت و جمود رہا۔ کچھ سیاسی سرگرمیوں کی شدت نے بھی ڈرامے کا بازار سرد کر رکھا تھا البتہ آل انڈیا ریڈیو کے قیام کے بعد نشری ڈراموں کا نیا سلسلہ شروع ہوا اور ریڈیو کے ذریعہ ہوائی لہروں پر ایک نیا اسٹیج جو کلیتاً سماعی و قیاسی تھا وجود میں آیا۔ اس سے کم از کم ڈرامے کا نام لوگوں کی زبان پر پھر آنے لگا۔ لاہور ریڈیو کے اربابِ بست و کشاد میں گورنمنٹ کالج کے بعض ذی ہوش فارغ التحصیل طلبائے قدیم اور چند نئے اساتذہ شریک تھے اور پھر مرکزی قیادت پطرس بخاری کے ہاتھ میں تھی۔ یار لوگوں نے ہر مقامی اسٹیشن کو ڈرامائی سرگرمیوں کا مرکز بنا دیا۔ لاہور میں آغا بشیر احمد (موجودہ ریجنل ڈائرکٹر) ڈراما انچارج تھے۔ انھوں نے سیّد امتیاز علی تاج، رفیع پیرزادہ اور سیّد عابد علی عابد و دیگر اہلِ ادب و فن کی اعانت حاصل کر لی۔ نئے نئے خیالات اور نشری تجربات سے انھیں آکسایا۔ نشری محفل گرم ہوئی، ڈرامے کا جال بچھ گیا لیکن "مولوی مدن" کی سی بات کہاں! اسٹیج سونا ہی رہا۔ نشری ڈرامے کے تقاضے اسٹیج سے مختلف تھے۔ یہ ایکانکی ڈرامے کی ایک مخصوص قسم سمجھا جا ہیے جسے آنکھوں سے سنا اور کانوں سے دیکھا جاتا ہے۔

بہر حال ڈراما تو شروع ہوا اور لاہور اسٹیشن کو یکے بعد دیگرے اراکین میں ڈرامے کے اربابِ فن میسر آتے رہے جن میں خصوصیت سے ملک حسیب احمد، محمود نظامی مرحوم، حفیظ جاوید، میاں لطیف الرحمٰن، ایس اے حمید، ابوسعید قریشی، ملک نسیم الظفر اور شوکت تھانوی و اشفاق احمد وغیرہ شامل تھے۔ میرا تعلق بھی ۱۹۴۰ء سے تا حال کبھی نہ کسی حیثیت سے رہا، گو تبادلہ کی کشاکش کے سبب دوسرے مقامات پر جاتا رہا لیکن پھر پھر کر لاہور دوسرے تیسرے سال ضرور آیا اور کئی کئی سال رہا اور لاہور کے ڈرامائی ہنگاموں میں شریک رہا۔ کتابی ڈراما ادبی رسائل نے محفوظ رکھنے کی کوشش کی جن میں سے اکثر اسکولوں اور کالجوں میں سالانہ اسٹیج ہوتے رہے۔ قیامِ پاکستان کے ابتدائی چند سال نو قومی و ملکی تشکیل کے جدید مسائل و مشکلات سے دوچار رہے اس لیے اربابِ فکر اسٹیج کی طرف متوجہ ہونے کے باوجود اس کے احیا کی باکار تدبیر نہ کر سکے۔ چند اربابِ علم و ادب نے پاکستان آرٹ کونسل قائم کی۔ اس کے بانیوں میں آغا بشیر احمد، فیض احمد فیض، خان بہادر عبدالرحمٰن چغتائی، سیّد امتیاز علی تاج، ڈاکٹر تصدق حسین خالد وغیرہم تھے اور صدارت جسٹس ایس اے رحمان کے سپرد تھی جو اب تک قائم ہے۔ سیّد امتیاز علی تاج کونسل کے جنرل سیکرٹری تھے اور آفس سیکرٹری خلیل صحافی مقرر ہوئے جنھوں نے دوسری فنی سرگرمیوں کے ساتھ

اسٹیج کو از سرِ نو زندہ کرنے کی سعیِ بلیغ کی لیکن حالات نے پوری طرح ساتھ نہ دیا۔ ہم خلیل صحافی اپنی سی بہت کچھ کرتے رہے اور دوسری ثقافتی مجالس کے ساتھ کبھی کبھی مفت کا ڈراما بھی دیکھنے میں آتا رہا ——— میں نے ملک حسیب احمد اور سید امتیاز علی تاج و شوکت تھانوی وغیرہ احباب کے ساتھ مل کر تھیٹر گروپ قائم کرنے کی کوشش کی۔ لائحہ عمل مرتب ہوا۔ لاہور کے تمام تھیٹر ہال سینما گھر بن چکے تھے کوئی اسٹیج موجود نہ تھا۔ ڈراما کھیلیں تو کہاں؟ تاج صاحب نے ڈرامے کے فقدان کا حل تو اس طرح تلاش کر دیا کہ آغا حشر کے چند مشہور اور جاندار ڈراموں میں ترمیم و تنسیخ کر کے انھیں جدید لوازمات کے ساتھ پیش کیا جائے۔ اسٹیج کی تلاش میں محکمۂ بحالیات سے رجوع کیا گیا۔ شہر کے قدیم مشہور تھیٹر بریڈلا ہال کی طرف نظریں دوڑائی گئیں۔ حکومت کے ذمہ دار اراکین کو آمادہ کر لیا گیا کہ یہ ہال جدید ڈرامائی سرگرمیوں کے لیے خالی کرا دیا جائے۔ محکمۂ بحالیات کے حکام نے ہمدردانہ غور کے بعد میکلوڈ روڈ کا سٹی اسٹوڈیو (جو شوری اسٹوڈیو کے نام سے بھی مشہور ہے) اس کام کے لیے الاٹ کرنے کا وعدہ کر لیا۔ میں اور تاج صاحب دوڑے دوڑے گئے قفل کھلوایا اور اس ہال کا جائزہ لیا گیا لیکن بات بنتی نظر نہ آئی۔ بریڈلا ہال کا معاملہ بھی کچھ ہمارے تذبذب اور کچھ دیگر وجوہ کی بنا پر التوا میں پڑ گیا اور تھیٹر گروپ کی تجویز عملی صورت اختیار نہ کر سکی اس دوران میں نفیس خلیل نے ایک گروپ بنا کر اسلامی ڈراما "بت شکن" کھیلا جس میں قدیم اسٹیج کے کارکنوں کے علاوہ چند نئے اداکار بھی شامل تھے جن میں آج کل کی مشہور فلم اسٹار صبیحہ خانم پہلی بار اسٹیج پر نمودار ہوئیں اس کے بعد میں نے آغا حشر کے ڈراما "رستم و سہراب" کی جدید مختصر تشکیل کی اور صبیحہ خانم، ایوب رومانی، اقبال شیخ، غلام محمد مرحوم، آغا میر جان، سلطان علی کھوسٹ اور دوسرے فنکاروں کے ساتھ اسے کھیلنے کی تیاری شروع کی۔ اسی زمانہ میں (ریہرسل مکمل نہ ہونے پائی تھی) میرا تبادلہ کراچی ہو گیا اور یہ سلسلہ آگے نہ چل سکا۔ اس دوران میں ریڈیو کے فنکاروں نے مل جل کر یکے بعد دیگرے کئی ڈرامائی پروگرام پیش کیے۔ ان میں قابلِ ذکر "مرزا غالب کی بیوی" "کیا کرے گا قاضی" "نوکروں کا جلسہ" وغیرہ ڈرامے تھے اوّل الذکر ڈراما لاہور کی مجلس خواتین (اپوا) کے زیرِ اہتمام کھیلا گیا جس میں مرزا غالب کا کردار شوکت تھانوی نے ادا کیا اور بیوی کا کردار شمیم بیگم کے سپرد تھا۔ دوسرا ڈراما راجہ فاروق علی خاں (ریڈیو کے بھائی جان) کی ایک نثری تمثیل تھی جو انہی کی زیرِ ہدایت اسٹیج ہوئی۔ اس کے نمایاں کرداروں میں مشہور فلم اسٹار بیگم پروین اور قدیم اسٹیج فلم و ریڈیو کے مقبول فنکار محمد حسین مرحوم تھے خلیل صحافی پاکستان الحمرا آرٹ کونسل کو زندہ رکھنے کی خاطر کبھی کبھار کسی گروپ کو جمع کر کے کوئی کھیل کرا دیتے یا گورنمنٹ کالج میں سال کے سال دوسرے کالجوں کی طرح کی انگریزی تمثیل کا ترجمہ پیش کر دیا جاتا۔ اس عرصہ میں اسکولوں اور کالجوں کے ڈرامائی پروگراموں میں زیادہ تر نثری تمثیلات کھیلی جانے لگیں جنھیں اسٹیج کی ضروریات کے پیشِ نظر قطع و برید کر کے کھیل لیا جاتا۔ قابلِ ذکر ڈراموں میں دیال سنگھ کالج کے اسٹیج پر ایوب رومانی کی نگرانی میں سید عابد علی عابد کا ڈراما "روپ متی باز بہادر" بھی تھا جس میں "روپ متی" کا کردار ریڈیو کی مقبول و مشہور فنکارہ موہنی حمید نے ادا کیا۔ گورنمنٹ کالج میں انگریزی اور اردو کے ملے جلے ڈرامائی پروگرام سال کے سال جاری رہے، ان میں صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کا "ساون رین کا سپنا" (شیکسپیئر کے "MID SUMMER NIGHT DREAM" کا ترجمہ) سید امتیاز علی تاج کے چند یک بابی ڈرامے اور "گورنمنٹ انسپکٹر" خاص تھے۔ ان کے علاوہ چند انگریزی کھیل انگریزی ڈرامیٹک گروپ نے کھیلے۔ ان اردو و انگریزی سب ڈراموں کے اداکاروں میں صفدر میر، اسکندر شاہین، صوفی وقار، مسیح احمد، خالد سعید بٹ، افضل لال، شاہد عزیز، نعیم طاہر، صبیحہ عزیز، ماہ جبیں، اسکندر اقبال، انور عظیم خاص تھے۔

۱۹۵۴ء تک لاہور کے مختلف تھیٹر گروپ بنتے بگڑتے رہے۔ ریلوے اسٹاف کے کارکنان اور گورنمنٹ پریس کے

اہلکاران نے علیحدہ علیحدہ تھیٹر کلب قائم کر کے اپنے اپنے اسٹیج پر چھوٹے بڑے کئی ڈرامے کھیلے۔ گورنمنٹ پریس کے ڈراما کلب کی روحِ رواں علی امام صاحب تھے اور ان کی سرکردگی میں اس کلب نے کئی طبعزاد اور ترجمے خاصے پیش کیے لیکن اداکاری اور ہدایت میں دقیانوسی انداز نمایاں تھا۔

الحمرا آرٹ کونسل نے اپنی نئی تنظیم کی اور علیحدہ علیحدہ چند سب کمیٹیاں بنا کر ثقافتی سرگرمیوں کا سلسلہ شروع کرنے کا پروگرام مرتب کیا۔ صفدر میر کی زیرِ ہدایت سید امتیاز علی تاج کا ایک قدیم نشری ڈراما "میری جان کس نے لی" (ترجمہ "WHO KILLED ME") "میرا قاتل" کے نام سے اور ایک انگریزی کومیڈی "بوکس اینڈ کوکس" کی اُردو تشکیل کھیلے گئے۔ پھر علی احمد نے ایک انگریزی کھیل کا چربہ "ذات شریف" پیش کیا۔ اظہار کاظمی نے جے بی پریسٹلے کے ڈرامے "این انسپکٹر کالز" کو "مجرم کون؟" کے نام سے اُردو میں منتقل کر کے الحمرا تھیٹر گروپ کی شرکت سے کھیلا۔ تینوں کھیل اپنی اپنی جگہ خاصے تھے لیکن "مجرم کون" اظہار صاحب کی محنت و جانفشانی اور ہوشمند تدبیر کاری کا زیادہ کامیاب نمونہ تھا اس لیے اس نے تماشائیوں کو اپنی طرف خاص طور پر متوجہ کیا اور اس نے خاصا رش لیا۔ متذکرہ بالا ڈراموں میں کام کرنے والوں میں الحمرا ڈراما گروپ کے فنکاروں نے کام کیا جن میں صفدر میر، یاسمین امتیاز علی، سکندر شاہین، وقار صوفی، اظہار کاظمی، خورشید شاہد، خالد بٹ، کامیدار، نعیم طاہر وغیرہ نمایاں رہے۔ علی احمد کا اپنا ڈراما گروپ تھیٹر آرٹ سنٹر کے نام سے تھا اس میں محسن رضوی، نذیر ضیغم، شاہد عزیز، کامیدار وغیرہ نمائندہ فن کار تھے۔ اب تک کوئی تھیٹر گروپ اس لحاظ سے باضابطہ طور پر منظم نہیں ہو سکا تھا جس نے تھیٹر کے احیاء کا بیڑا اٹھایا ہو۔ کئی گروپ غیر منظم طور پر اپنی اپنی جگہ چند نئے شوقیہ اور قدیم فنکاروں کو اکٹھا کر کے انگریزی کھیلوں کے تراجم پیش کرتے رہے تاہم کئی منچلے اداکاروں نے پورے حوصلہ و ہمت سے کام کیا۔

اسی دوران میں ۱۹۵۵ء میں فلم، ریڈیو اور اسٹیج کے چند فنکاروں نے ایک باقاعدہ ادارے کی تنظیم کا بیڑا اٹھایا اور میری نگرانی میں اسٹار تھیٹر اکاڈمی قائم کی جس نے رجسٹرڈ تھیٹر گروپ کی حیثیت سے تشکیل پائی۔ اس کے اراکین میں محمود نظامی مرحوم، چودھری صفدر علی، سعید نقوی، اقبال شیخ، محمد حسین مرحوم، ناصرہ خانم، سلمیٰ ممتاز، سمیعہ ناز، آغا حامد رضا، نذیر حسین، قمر چودھری، عطیہ کوثر، نجمی، اسلم چودھری وغیرہ شامل تھے۔ پہلا ڈراما آغا حشر کاشمیری کا "رستم و سہراب" نئی تشکیل سے میری ہدایات کے ساتھ وائی ایم سی اے ہال میں کھیلا گیا جس نے اسٹیج کی تنگ دامانی کے باوجود اپنی استادانہ تدبیر کاری اور رفتار و رانہ عمل و حرکت کے سبب نمایاں کامیابی حاصل کی اور دو ہفتے تک عوام و خواص ذوق و شوق سے دیکھتے رہے مگر وائی ایم سی اے کی اپنی سرگرمیوں کے سبب ہال چھوڑنا پڑا اور شائقین کی مانگ پوری نہ کی جا سکی۔ اسی دوران میں روسی اکابرین کا ایک وفد لاہور میں آیا ہوا تھا۔ محکمہ تعلقات عامہ کی درخواست پر وفد کے تمام اراکین نے یہ ڈراما دیکھا اور زبان سمجھے بغیر اداکاری سے متاثر ہو کر بے حد سراہا۔ اس ادارہ نے دوسرا کھیل آغا حشر کا "اچھوتا دامن" نئے انداز میں پیش کیا جسے سنٹرل ماڈل ہائی اسکول کے اسٹیج پر کھیلا گیا۔ اس نے بھی خاصی مقبولیت حاصل کی۔

تھیٹر کے احیاء کے سلسلہ میں اہلِ لاہور کو سب سے بڑی دشواری اسٹیج کی ناپیدگی ہے۔ الحمرا آرٹ کونسل کو (مختصر و محدود ہال ہونے کے باوجود) کم سے کم اس دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ باقی دوسرے ادارے جو ڈرامائی سرگرمیوں میں مصروف ہیں ان کی راہ میں سب سے بڑی مشکل یہی ہے کہ مانگے کے اسٹیج سے کام چلائیں ——— اور چونکہ کوئی باقاعدہ تھیٹر ہال شہر بھر میں موجود نہیں۔ لے دے کے وائی ایم سی اے یا ریلوے برٹ انسٹی ٹیوٹ چند دنوں کے لیے عاریتاً حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ان دونوں مقامات کو حاصل کرنا بھی دشوار امر ہے۔ پھر حصول کے بعد ان کی اپنی مصروفیات کے پیشِ نظر ریہرسلوں وغیرہ میں بھی آسانیاں میسر نہیں۔ چنانچہ کئی اور ادارے ایلمی تھیٹر، راوی آرٹ سرکل وغیرہ قائم ہوئے۔ انھوں نے الحمرا آرٹ کونسل کے اسٹیج پر کچھ بعد دیگرے کئی کھیل کھیلے۔ تھیٹر کی ہمت افزائی کے لیے تاج صاحب، اور سابق آفس سیکرٹری خلیل صحافی صاحب نے ہر ممکن سہولت فراہم کرنے کی کوشش کی لیکن بات نہ بن سکی اور یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ آخر یہ ادارے اپنی مساعی میں ناکام ہو گئے۔ علی احمد اپنے تھیٹر سنٹر کا نام لے کر کراچی سدھارے اور وہاں پاکستان آرٹ کونسل کے تعاون سے اپنے پرانے اور نئے کھیل کرنے میں یہاں سے زیادہ کامیاب ہوئے اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ اسٹار تھیٹر کو بھی اسٹیج کی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ الحمرا آرٹ کونسل کے اسٹیج پر بیک وقت اس ادارہ نے تین طبعزاد نئے کھیل جدید اور مختصر انداز میں پیش کیے۔ ان میں سعادت حسن منٹو مرحوم کا مزاحیہ کھیل "خودکشی" — مرزا ادیب کا "جمیلہ" (الجزائری) اور میرا ایک غنائیہ عمر خیام "شامل تھے۔ آرٹ کونسل کی نئی تنظیم درپیش تھی، ہال بے حال ہو رہا تھا۔ سخت دشواری سے اسٹیج حاصل ہوا۔ ریہرسلوں میں مشکلات حائل رہیں لیکن یہ تینوں کھیل اداکاری اور فنی خصوصیات کے لحاظ سے عوام و خواص میں مقبول ہوئے اور اسٹار تھیٹر نے روایتی ڈرامے سے شروع کر کے جدید انداز کا آغاز کر دیا۔ بعض جانب دار حضرات نے حقائق سے چشم پوشی کرتے ہوئے نہایت بیباکی مگر ناانصافی کے انداز میں اپنے دو ایک مضامین میں جہاں خودستائی کا طور اختیار کیا وہاں اسٹار تھیٹر کا ذکر اس طریقہ سے کیا ہے کہ جیسے ان کی غیر حاضری یا بے خبری سے فائدہ اٹھا کر اس ادارہ نے پوشیدہ طور پر دو ایک کھیل کھیل ڈالے اور اس طرح گویا ان کی حق تلفی ہوئی ورنہ اس میدان کے واحد اجارہ دار تو وہی ہیں اور شاید اسی نفسا نفسی کے سبب لاہور میں اب تک باضابطہ منظم طور پر تھیٹر کا احیاء و عروج ممکن نہ ہو سکا حالانکہ فن کسی ذاتِ واحد یا کسی ایک ادارے کی ملکیت نہیں ہو سکتا۔ یہ قومی فرض ہے اور ہر اہلِ فکر و فن کا اس کی ادائیگی پر مساوی حق ہے۔ پاکستان میں تھیٹر کا وجود نہ تھا ضرورت تھی کہ اربابِ فن سر جوڑ کر اس کے احیاء اور ترقی کے لیے لائحہ عمل تیار کرتے اور غور و خوض کے بعد مشترکہ طور پر عملی قدم اٹھاتے ابتدا میں ہر کام میں خامیاں اور کمیاں ہوتی ہیں۔ انھیں نظر انداز کر کے صرف ہمت اور کام کی داد دی جاتی ہے۔ اسی طرح لاہور میں جو نئے نوجوان ڈراما اور تھیٹر کی توسیع و اشاعت کے لیے کوشاں ہوئے یا ہیں ان کو ماہرینِ فن سے رجوع کر کے سیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے تھی اور ماہرینِ فن کو ان کی ہر ممکن حوصلہ افزائی —

دوسروں کے کام پر چلتے کاٹھنے اور تخریبی پہلو نکالنے میں جو بے جا غور و فکر اور وقت کا اصراف ہوتا ہے اگر اسے صرف تعمیر ہی میں صرف کیا جاتا رہے تو یقیناً نتائج بہتر نکلیں — لیکن ابتدا سے نئے شوقیہ کام کرنے والوں کا عام رجحان یہ رہا ہے کہ تعمیر سے زیادہ اپنی تعریف میں رطب اللسان رہے اور "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" کے مصداق اپنوں اپنوں کے چھوٹے سے کام کا بھی بڑا نام جتانے کی کوشش کرتے اور دوسروں کی اچھائی میں بھی انھیں خواہ مخواہ برائی کے پہلو نظر آتے غالباً اس لیے کہ ان کی اجارہ داری میں فرق نہ آ جائے — مظفر علی سید نے اپنے ایک مقالہ میں "لاہور کے ڈراموں" کا ذکر کرتے ہوئے معقول بات کہی کہ "لاہور ترجموں کا مخزن بن گیا۔ بڑے بڑے جغادری اہلِ فن ڈراما نگار ہونے کے باوجود یہاں مدت سے کوئی طبعزاد ڈراما پیش نہ کیا جا سکا۔" مگر صرف الحمرا آرٹ کونسل کے ڈراموں پر اس امر کا اطلاق ہوتا ہے جہاں صرف ایک ہی نمونے کے لینڈے کے تراجم پیش کیے گئے۔ برخلاف اس کے دیگر اداروں کے کھیلوں میں طبعزاد اور ترجمے دونوں قسم کے موجود ہیں

اور ان میں رنگا رنگی اور تنوع بھی پایا جاتا ہے۔ خصوصاً اسٹار تھیٹر کے ڈراموں میں مختصر مدت میں قدیم و جدید دونوں رنگ کے ڈرامے اسٹیج کیے گئے۔ اس کے علاوہ ان میں ٹریجیڈی، کومیڈی، غنائیہ ہر نوع کی چیزیں شامل رہیں اور کئی نئے تجربے کیے گئے۔ علی احمد گروپ نے بھی تنوع کو مدِنظر رکھا۔ نوجوان فنکاروں میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر ضیا محی الدین کی کوشش ہے جنھوں نے اپنے قیام لاہور کے دوران چند ڈرامے پیش کیے لیکن چونکہ ان کے کام میں خلوص اور فنی مہارت کو پورا دخل تھا۔ ان کی سنجیدہ مساعی قابلِ قدر ثابت ہوئیں۔ ان کی سب سے پہلی پیش کش "لال قلعے سے لالو کھیت تک" تھی جسے کراچی آرٹسٹ کی ٹیم کے ساتھ لے کر آئے اور پاکستان آرٹ کونسل کراچی کی طرف سے لاہور کے برٹ انسٹی ٹیوٹ میں اسٹیج کیا۔ گو ڈرامائی چابکدستی اور تدبیر کاری کا کوئی اچھا نمونہ نہ تھا لیکن ہدایت کار ضیا نے حرکت و عمل اور موزوں و مناسب روشنی کے امتزاج سے کامیاب بنایا۔ پاکستان میں یہ پہلا ڈرامائی تجربہ تھا جو موسیقی اور زنانہ کردار کے بغیر پیش کیا گیا اور اس کی اداکاری کی مضبوط گرفت نے شائقین کو خاصا متاثر کیا۔ کچھ عرصہ بعد ضیا نے گورنمنٹ کالج لاہور کے اسٹیج پر شیکسپیئر کے انگریزی ڈراما "جولیس سیزر" کا کامیاب اُردو ترجمہ پیش کیا۔ یہ ترجمہ حفیظ جاوید کی اعلیٰ سعی و کاوش کا نتیجہ تھا اور اداکاروں میں ضیا، حفیظ جہاں، خورشید شاہد و دوسرے فنکار شریک تھے۔ اس ڈرامے میں کمال احمد رضوی پہلی بار اسٹیج پر اداکار کے روپ میں نمودار ہوئے۔ ضیا محی الدین نے اس کے بعد الحمراء آرٹ کونسل اور گورنمنٹ کالج میں دو انگریزی کھیل گورنمنٹ کالج کے ہونہار طلباء کی اداکاری میں خوبی سے پیش کیے اور انھیں بعد میں کراچی بھی لے جا کر اسٹیج کیا جنھوں نے دونوں جگہ مقبولیت حاصل کی۔ الحمراء کے اسٹیج پر کمال احمد رضوی نے الحمراء آرٹ کونسل کے چند احباب کے ساتھ کئی مختصر ایکانکی کھیل اسٹیج کیے۔ ان میں سعادت حسن منٹو کے افسانہ کی ڈرامائی تشکیل "ایک دن کی بادشاہت" اوپندر ناتھ اشک کا کھیل "صبح و شام" اور اصغر بٹ کا "چھوٹے میاں" شامل تھے۔ افسوس کہ ہمارے ماہرینِ فن حضرات نے ڈرامائی پیشکش میں کوئی قابلِ ذکر عملی حصہ نہ لیا۔ سب سے زیادہ توقعات حکیم احمد شجاع، رفیع پیرزادہ اور سید امتیاز علی تاج حضرات سے وابستہ تھیں۔ رفیع پیرزادہ نے کسی حد تک سرگرمی دکھائی اور چند تجربہ کار فنکاروں کی شرکت سے اپنا نشری ڈرامہ "عقبیٰ کا میزبان" اپنی ماہرانہ خوبیوں کے ساتھ پیش کیا۔ اس میں پیرزادہ صاحب نے خود بھی کام کیا اور صفدر میر اور دوسرے ماہر فنکاروں اور نئے اداکاروں نے قابلِ تعریف کام کیا۔ ضرورت تھی کہ پیر صاحب اپنی نگرانی میں چند معقول ڈرامے سنجیدگی سے اسٹیج کرتے ورنہ نئے شوقیہ اداکاروں کو ان سے کچھ سیکھنے کا موقع ملتا۔ شاید ان کے لیے اسٹیج کی دشواری حائل رہی، اور اسی کام کی توقع سید امتیاز علی تاج سے بھی کی جاتی ہے۔

رفتہ رفتہ پاکستان اور خصوصاً لاہور میں ڈرامائی ذوق کی تربیت ہوتی رہی۔ الحمراء آرٹ کونسل کی جدید تنظیم عمل میں آئی اور فیض احمد فیض اس کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ انھوں نے اپنے ماتحت ثقافتی سرگرمیوں کے لیے کئی سب کمیٹیاں بنائیں۔ اس میں (۱) ڈراما کمیٹی (۲) میوزک کمیٹی (۳) فلم کمیٹی (۴) لٹریری کمیٹی، اور (۵) آرٹ پینٹنگ کمیٹی خاص تھیں۔ لٹریری کمیٹی تو برائے نام ہی رہی باقی کمیٹیوں کو اپنے اپنے حلقۂ اثر میں مخصوص انداز سے کام کرنے کا موقع ملتا رہا اور آرٹ کونسل پہلے سے کہیں زیادہ سرگرمیوں کا مرکز بن گئی۔ پیرزادہ صاحب اور کمال رضوی کے علاوہ صفدر میر کی زیرِ ہدایت "گڑیا کا کھیل" نہایت عمدگی اور صفائی سے اسٹیج کیا گیا۔ نعیم طاہر جو اپنی طالب علمی کے زمانہ میں گورنمنٹ کالج میں اداکاری کا تجربہ حاصل کرتے رہے تھے اور ریڈیائی ڈراموں میں بھی حصہ لیتے رہے تھے آرٹ کونسل میں ایک ڈراما گروپ مرتب کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس گروپ میں نعیم طاہر،

سکندر شاہین، شعیب ہاشمی، یاسمین امتیاز علی، وقار صوفی، پیرزادہ خورشید شاہد، طارق حمید، کمال احمد رضوی، میمونہ ایوب خاص اداکار تھے۔
نعیم طاہر نے اپنی زیر ہدایت انگریزی کھیل "SHE STOOPED TO CONQUERE" کا ترجمہ "آداب عرض" کے نام سے کیا جو یاسمین امتیاز علی اور نعیم طاہر کی مشترکہ کوشش کا نتیجہ تھا۔ الحمرا کا مختصر ہال تماشائیوں سے کئی راتیں بھرا نظر آتا رہا اور لوگوں نے ذوق و شوق سے دیکھا۔ نعیم طاہر ہونہار محنتی نوجوان ہیں اور طالب علمی کے زمانہ سے ڈرامائی سرگرمیوں سے دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ اسی طرح سکندر شاہین اور شعیب ہاشمی ذوق و شوق سے مصروفِ عمل رہے ہیں۔ ان کی سعی و کوشش میں فنکارانہ خلوص اور حوصلہ و ہمت ہے۔ نعیم طاہر کو ہدایتکاری کا جو موقع ملا خوش قسمتی سے انھیں مخلص فنکاروں کی اعانت میسر آ گئی۔ یاسمین امتیاز علی کے قلمی و عملی اشتراک اور تاج صاحب کی ماہرانہ سرپرستی اور فنی مشاورت نے ان کی صلاحیتوں کو جلا دی۔ اگر وہ صرف فنی خلوص سے کام میں مصروف رہتے تو یقیناً سنجیدہ نتائج پیش کرتے۔ لیکن زعمِ باطل نے انھیں معاندانہ الجھنوں میں پھنسا دیا ہے تاہم ان سے توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں اگر وہ عمل میں خلوص پیدا کریں۔

اسی زمانہ میں محکمۂ تعمیر نو کی امداد سے حمید واثق نے اپنے تھیٹر گلڈ کی جانب سے اوپن ایئر تھیٹر میں "تین تین نو" کے عنوان سے تین مختصر ایکانکی کھیل پیش کیے۔ حمید واثق اپنے جدید ڈرامائی مطالعہ اور پُر خلوص فنی وقوف کی بنا پر ایک خاص نظریہ رکھتے ہیں اور کراچی میں تھیٹر گلڈ قائم کر کے کئی اُردو و انگریزی ڈرامے کامیابی سے پیش کر چکے ہیں۔ اس پیشکش میں حصہ لینے والے نذیر ضیغم، سکندر شاہین، شاہد، نسرین، فرخ بسمل، صبیحہ ناز، کمال احمد رضوی تھے اور سب سے زیادہ داد اصغر بٹ کے مزاحیہ کھیل "نتھو خیری" کو ملی "تین تین نو" نے اوپن ایئر تھیٹر کے وسیع میدان میں خاصا رش لیا اور تین راتیں چلا۔

اس کے بعد حمید شیخ نے اپنے مخصوص ڈرامائی ذوق کی رعایت سے سرکاری امداد کے ساتھ "لاہور پلے ہاؤس" کا اوپن ایئر تھیٹر میں اجرا کیا اور مختلف اداکاروں کی ٹیم کے علاوہ تین چار ہدایت کار بھی شریک کیے ——— پہلا ڈراما اسکروائلڈ کا شاہکار "سلومی" منتخب ہوا جسے اُردو میں کمال احمد رضوی نے ترجمہ کیا۔ اس ڈرامے کا ترجمہ "دخترِ بابل" کے نام سے محمود نظامی مرحوم بھی کر چکے تھے اور آل انڈیا ریڈیو و ریڈیو پاکستان کے متعدد اسٹیشنوں سے بار بار نشر کیا جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر تاثیر مرحوم اور رشید انصار ناصری کے ترجمے بھی موجود ہیں۔ رضوی صاحب کا ترجمہ ان سے کچھ زیادہ مختلف تھا نہ بہتر۔ اس ڈرامے کی ہدایات پہلے صفیہ ڈین کے سپرد ہوئیں۔ چند روز بعد کمال احمد ریہرسل کراتے رہے اور آخر میں حمید واثق کی نگرانی میں آیا۔ اداکاروں میں خورشید شاہد، حمید واثق، شعیب ہاشمی، کمال احمد، صبیحہ ناز وغیرہ شامل تھے لیکن اسی زمانہ میں نعیم طاہر نے یاسمین امتیاز علی کے اشتراک سے "ویسٹ اینڈ" کا ایک ترجمہ "سوئے کہاں" کے نام سے اور تیار کیا اور اس کی ریہرسل شروع کی۔ شعیب ہاشمی اور خورشید شاہد ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ الحمرا تھیٹر گروپ نے اپنی کاسٹ میں کچھ تبدیلیاں کیں۔ سکندر شاہین اور کمال احمد کا تعلق اس گروپ سے منقطع ہو گیا۔ سلومی اداکاروں کے بکھر جانے سے ادھورا رہ گیا اور اس گروپ کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ "سوئے کہاں" کئی ہفتوں کی مسلسل محنت و کوشش سے تیار ہوتا رہا۔ اس کے اداکاروں میں یاسمین، سلیمہ فیض، نعیم طاہر، شعیب ہاشمی، خورشید شاہد، طارق حمید وغیرہ کام کر رہے تھے۔

اس ڈرامے میں اصل سے قطع نظر پلاٹ میں چند تبدیلیاں بھی کی گئیں جس میں ایک "مولانا" کا کردار اخلاقیات کے طالب علم کی حیثیت سے نہایت مضحکہ خیز انداز میں پیش کیا گیا۔ "مولانا" کو نہایت بیوقوف قسم کا آدمی دکھایا گیا جو اخلاق کے پردے میں اخلاق سے گری ہوئی حرکتیں کرتا ہے اور عوام کو بے سوچے خواہ مخواہ ہنسنے کا بہانہ ملتا ہے۔ یہ کردار نعیم طاہر نے خوبی سے ادا کیا۔ غالباً انھوں نے

یہ رول اپنے ہی لیے لکھا تھا۔ باقی ڈرامے میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ تذبذب اور عروج کے بغیر سپاٹ سا کھیل تھا جو آخر میں غیر متوقع طور پر یونہی ختم ہو جاتا ہے لیکن سلیمہ فیض نے بوڑھی اور موٹی عورت کا کردار اس خوبی اور کامیابی سے ادا کیا جو سب پر فوقیت رکھتا تھا۔ لیکن اصل مسودے میں اس کی کمزوری اور ہدایت کی خامی نے پوری طرح اُبھرنے نہ دیا ورنہ اگر اس کردار کو معقولیت سے اُبھارا جاتا تو ڈرامے کی جان ہوتا اور کلائمکس میں اس سے بڑی مدد ملتی ——— تاہم بحالتِ موجودہ اس ننھی اداکارہ نے مختصر مدت اور محدود دائرہ میں بہت کچھ کر دکھایا۔

اگست ۱۹۶۱ء میں لاہور پلے ہاؤس (اوپن ائیر) کی نئی تنظیم کا از سرِ نو منصوبہ تیار کیا گیا۔ خلیل صحافی سابق سیکرٹری الحمراء آرٹ کونسل نے شہر کے مختلف تھیٹر گروپ اور اربابِ فن کو جمع کر کے ایک نمائندہ مرکز بنانے کی تجویز پیش کی۔ چنانچہ غور و فکر کے بعد ایک لائحہ عمل تیار ہو گیا ——— میں نے اسٹار تھیٹر اکاڈمی کے اراکین کو اس تجویز پر متوجہ کیا اور ہم چند دیوانوں نے مل کر اس تنظیم کی تکمیل کے سامان کیے۔ میرا ایک قدیم مسودہ ("براندن تھامس" کے شہرۂ آفاق کومیڈی "چارلیز آنٹ" کا ترجمہ) آغازِ کار کے لیے چُنا گیا جسے میں نے از سرِ نو جدید ضروریات اور تقاضوں کے ماتحت مرتب کیا اور ریہرسل شروع کر دی۔ اداکاروں میں صبیحہ ناز، ہلا آٹھا، چاندنی، حمید واثق، کمال احمد رضوی، نذیر حسینی، قمر چودھری، کامیدار پرویز اسلم نیازی شامل تھے۔ میری زیرِ ہدایت ۱۲ اکتوبر کو اوپن ائیر تھیٹر میں یہ ڈراما "ہنسی ہنسی میں" کے نام سے کھیلا گیا اور تکلف برطرف ڈرامے کی مضبوط تدبیر کاری، سنجیدہ مزاح اور اداکاروں کی جانفشانی و کاریگری کے سبب اس ڈرامے نے بے پناہ رش لیا۔ ارادہ تھا صرف تین روز کھیلا جائے گا کیونکہ اوپن ائیر کی سیڑھیوں پر دو ہزار سے تین ہزار تک شائقین بیٹھ سکتے ہیں مگر مسلسل ۲۱ اکتوبر تک ڈراما اپنی بے مثال مقبولیت کے سبب چلتا رہا اور مجمع کا یہ عالم تھا کہ بیٹھنے کو جگہ نہ ملے تو کھڑے ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ بیک وقت تین ہزار شائقین نے روزانہ اس ڈرامے کو ملاحظہ کیا ہے اور جاری رکھنے کا اصرار جاری تھا لیکن اوپن ائیر میں ایک دوسری تقریب الحمراء آرٹ کونسل کی جانب سے ۲۲ اکتوبر سے ہونے والی تھی اس لیے کھیل روکنا پڑا۔ دور دور سے اربابِ ذوق نے آ کر ملاحظہ کیا۔ مقتدر اخبارات نے قابلِ قدر تبصرے اور تعریفیں چھاپیں۔ راولپنڈی، منگلا ڈیم، کراچی اور حیدرآباد سے چند ذمہ دار اداروں نے لاہور پلے ہاؤس کو ڈرامے کی غیر معمولی مقبولیت و شہرت سن کر مدعو کیا کہ ان مقامات پر جا کر کھیلا جائے۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۶۱ء کو پاکستان پولیس کے صد سالہ جشن کی تقریبات کے موقع پر (جس میں اکثر بیرونی ممالک کے معزز مہمان شرکت کے لیے آئے تھے) محکمہ کی خاص فرمائش پر اس ڈرامے کو ضلع پولیس لائن کے وسیع میدان میں شامیانے اور قناتوں کا عظیم ہال و اسٹیج تعمیر کر کے پھر کھیلا گیا۔ اداکاروں میں نذیر ضیغم بھی شریک تھے۔ بیک وقت پانچ ہزار سرکاری و غیر سرکاری مہمان اس ہال میں موجود تھے۔ اسٹیج پر کئی مائیکروفون اور ہال میں لاؤڈ اسپیکر نصب کرنے کا خاص اہتمام کیا گیا۔ ڈراما پہلے سے بھی زیادہ کامیاب ہوا۔ اکتوبر کے اوائل میں الحمراء آرٹ کونسل میں ایک انگریزی ڈراما اور کئی مختصر ڈرامے دوسرے کالجوں اسکولوں میں بھی کھیلے گئے۔ انگریزی ڈرامے کے ہدایت کار سلطان پیرزادہ لاہور کے ہونہار نوجوان فنکار ہیں۔ انھیں ان کے والد بزرگوار رفیع پیرزادہ کی فن میں خاص تعلیم و تربیت حاصل ہے۔ خوش ذوق اور محنتی ہیں۔ ہدایت اور اداکاری کے علاوہ اسٹیج ڈیزائن کرنے کا بھی ذوق رکھتے ہیں۔ ان کا یہ ڈراما "DO YOUREMEMBER" مسلسل دس راتیں چلتا رہا اور ہر لحاظ سے کامیاب رہا۔ اہلِ ذوق نے خوب داد دی۔ نعیم طاہر انہی دنوں حسبِ معمول الحمراء گروپ کے لیے یاسمین امتیاز علی کی شرکت میں فلپ کنگ کے ایک خاص فارس ———

"SEE HOW THEY RUN" کو اُردو میں تیار کر رہے تھے۔ شب و روز کی محنت اور لگاتار ریہرسلوں کے بعد یہ کھیل جسے انگریزی میں "FARCICAL FARCE" اور شاید اُردو میں بھی بالکل کہنا مناسب ہو گا، نومبر کے اواخر میں اسٹیج کیا گیا اور غالباً ایک مہینہ کے قریب چلایا گیا۔ اس طرح راتوں کا ریکارڈ قائم ہو گیا گویا تقریباً ۳۰ راتیں چلتا رہا اور اس حساب سے دیکھنے والوں کی مجموعی تعداد کا اندازہ ہال کی کل نشستوں کے لحاظ سے ساری مدت میں زیادہ سے زیادہ ساڑھے چار ہزار کیا جا سکتا ہے۔ یہ ڈراما کراچی میں پاکستان آرٹ کونسل کے اشتراک سے بھی کئی روز اسی گروپ نے کھیلا اور مقبولیتِ عام حاصل کر کے آیا لیکن اس فارس کو خواہ عوام سے کتنی ہی مقبولیت حاصل ہوئی ہو اور خواص کے منتخب طبقہ نے بھی پسند کیوں نہ کیا ہو منصفانہ طور پر یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس قسم کے عامیانہ اور مبتذل کھیل نہ تو ہمارے جدید ترقی یافتہ اسٹیج کے لیے قطعی موزوں اور مناسب نہیں خصوصاً پاکستان آرٹ کونسل کے شایانِ شان نہیں۔ فلپ کنگ کا اندازِ تحریر دوسرے مختلف زبانوں کے ڈراما نگاروں کی طرح ایک خاص مزاج کا حامل ہے اور اس فارس میں اس نے اپنے ماحول اور مقامی فضا کو پیشِ نظر رکھ کر جو کچھ لکھا اور اپنے کرداروں کا جو مزاج بنایا وہ یقیناً ہمارے لیے نامانوس اور اجنبی ہے۔ ڈرامے کا تمام تر ماحول اسی اجنبیت کا اظہار کرتا ہے اور ہماری معاشرت کو یہ باتیں ہرگز زیب نہیں دیتیں جن کی اس میں کھلم کھلا نمائش کی گئی ہے۔ تماشائیوں کو اگر ہنسی آتی ہے تو تمام کرداروں کی غیر مانوس بدحواسی اور فضول بوکھلاہٹ دیکھ کر، جن کے عمل و حرکت میں کوئی توازن ہے اور نہ معقول تدبیر گری، ہر کردار ایک دوسرے کو بیوقوف سمجھتا یا بناتا ہے اور ایک دوسرے کے تعاقب میں بے مقصد دوڑ لگاتا نظر آتا ہے۔ یہ صرف اس لیے ہے کہ تماشائیوں کو یہ دکھانا ہے کہ "دیکھئے! وہ کیسے دوڑتے ہیں"۔ مکالموں کی زبان ابتدا میں تو بڑی حد تک رکیک اور مبتذل تھی۔ چند روز بعد اس میں تبدیلی کی گئی۔ غرض اس ڈراما کا انفرادی اور مجموعی تاثر دونوں سستی تفریح سے آگے نہ بڑھ سکے۔ تفصیلی طور پر فنی خامیوں اور بے ڈھنگے پن کو بیان کرنا طولِ امل ہے۔ کہانی کا عنصر سرے سے مفقود ہے اس لیے اس سے بحث ہی بے کار ہے۔ واقعات کا تانا بانا بے جوڑ حماقت آمیز حد تک عجیب ہے شاید انھیں حماقتوں پر لوگوں کو بے اختیار ہنسی آتی ہے اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ حد سے زیادہ کھلے تفنن کے طور پر دیکھنے کی چیز تھی باقی ڈرامائی کیفیت کشمکش اور تذبذب یا نقطۂ عروج کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ صورتِ حال یہ ہے کہ افغانی قیدی کی گرفتاری (جو بجائے خود مہمل بات ہے) کے لیے پشاور یونیورسٹی کے ذمہ دار حکام وائس چانسلر، کالج کے پروفیسر، وائس پرنسپل اور دوسری یونیورسٹیوں کے پروفیسر آنکھ مچولی کھیلتے پھرتے ہیں اور رات بھر برانڈی کے نشہ آور ماحول اور حماقتوں کے فضول ہنگامہ زار میں بے سوچے سمجھے بے چارے دوڑائے جاتے ہیں۔ اگر اس کھیل کا لکھنے والا کوئی غریب پرانے اسٹیج کا ڈراما نگار ہوتا تو اسی گروپ کے ہدایت کار اور سرپرستوں کی صلواتیں سُنتا۔ لیکن اس دور کی جدید فارس سمجھ کر اسے بزعمِ خود سراہا جا رہا ہے البتہ بعض فنکاروں نے اپنی ذہانت کے بل بوتے پر قابلِ تعریف اداکاری کے جوہر دکھائے ہیں۔ ان میں سلیمہ فیض اور شعیب ہاشمی پیش پیش رہے۔ ان کے بعد یاسمین اور میمونہ بیگم کے کام خوب ہیں۔

کاش نعیم طاہر اپنی صلاحیتوں کو سنجیدگی سے اُجاگر کریں اور ان کی تربیت کا لحاظ رکھیں۔ انھیں تاج صاحب جیسے فن دان ادیب کی مشفقانہ سرپرستی اور ہدایات میسر ہیں۔ اگر ان کے مفید مشوروں سے وہ اور یاسمین اور ان کے گروپ کے فنکار سنجیدہ اور مقصدی ڈراموں کی طرف شایانِ شان توجہ اور معقول محنت کریں تو الحمرا آرٹ کونسل اور فن کے لیے مفید ہو سکیں ورنہ ہنسی کا

گول گپّا عرف بھان متی کا پٹارا یا چوں چوں کا مربّہ تو بھاٹی کے باہر ہوتا ہی رہتا ہے۔ اس پیشکش کے آغاز سے کچھ پہلے ۲۷ اکتوبر کو الحمرا میں راوی آرٹس سرکل کے اراکین نے بھی آغا بابر کا ایک کھیل "بڑا صاحب" پیش کیا تھا جو "انسپکٹر جنرل" ڈرامے کا مسخ شدہ چربہ ہے۔ یہ کھیل بھی کئی روز چلتا رہا۔ اداکاروں میں اس سرکل کے چند افراد اور فلمی فنکار (اکسٹرا) شریک تھے جو چنداں قابلِ ذکر نہیں۔

دسمبر میں اُردو تدریس کانفرنس کا انعقاد ہوا اور اس کے مختلف تعلیمی پروگراموں میں ڈراما بھی شامل کیا گیا۔ اس کی نگرانی میرے سپرد تھی اور لاہور پلے ہاؤس کا تعاون حاصل کیا گیا۔ چنانچہ پلے ہاؤس کے فنکاروں کے ساتھ میں نے دو ایکانکی کھیل گورنمنٹ سنٹرل ماڈل اسکول کے اسٹیج پر پیش کیے۔ ان میں ایک تعلیمی سنجیدہ ڈراما "رات کے بعد" تھا مرزا مقبول بیگ بدخشانی کا تحریر کردہ اور دوسرا اصغر بٹ کی مختصر کومیڈی "آپ کون" (انگریزی سے ماخوذ) شامل تھے۔ اوّل الذکر ڈراما مغلیہ دور کے اصلاحی پلاٹ پر مبنی تھا جو ملبوساتی زیب و زینت اور موزوں ترتیب، روشنی کے مناسب امتزاج اور صوتی اثرات کے ساتھ بعض اداکاروں خصوصاً انور سجاد اور نذیر حسینی کے اثرانگیز کام کے سبب بہت پسند کیا گیا۔ دوسرے مزاحیہ کھیل میں حمید داؤد، سکندر شاہین اور قمر چودھری کامیاب رہے۔ مقررہ پروگرام میں صرف ۲۸ دسمبر کو کیا جانا تھا لیکن ۳۰ دسمبر کو خاص فرمائش پر پھر پیش کرنا پڑا۔ اداکاروں میں متذکرہ بالا فنکاروں کے علاوہ ہلا آنٹی، آغا حامد رضا، جمشید اقبال، مسعود اختر اور شاہد حسین شریک تھے جنھوں نے محنت سے اپنے اپنے کردار ادا کیے۔

یہ تھیں لاہور میں ڈراموں کی سرگرمیاں جو اس مختصر مضمون کے لکھنے تک دیکھنے میں آئیں۔ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے سینئر گروپ اس انور سجاد، شمشاد حسین اور دوسرے طلبا انور سجاد کا ڈراما ۲۶ جنوری سے پیش کر رہے ہیں۔

یہاں اس سلسلے میں لاہور پلے ہاؤس کے حالیہ اعلان کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جو ڈراما و تھیٹر کے خوش آئند مستقبل کی خبر دیتا ہے۔ اس اعلان سے معلوم ہوا ہے کہ لاہور پلے ہاؤس کے زیر اہتمام "ڈراما اکیڈمی" کا قیام عمل میں لایا جا رہا ہے جس کے ذریعہ فنی تربیت کا انتظام کیا جائے گا۔ نیز ماہ اپریل ۱۹۶۲ء میں "جشنِ تمثیل" کا شاندار پروگرام بھی مرتب ہوا ہے۔ الحمرا آرٹس کونسل کی جانب سے بھی آئندہ سہ ماہی میں ایک دو نئی تمثیلیں پیش کرنے کا بھی اعلان کیا گیا ہے۔ نیز لاہور پلے ہاؤس اپنا مقبول مزاحیہ کھیل "ہنسی ہنسی میں" فرمائشوں کی تعمیل میں دوبارہ پیش کرنے کی تیاری اور نئی تنظیم میں مصروف ہے۔ توقع ہے کہ اس دوران میں نیشنل تھیٹر کی تعمیر کا منصوبہ بھی مکمل ہو سکے گا اور مستقبل قریب میں ہم اپنے عالیشان قومی تھیٹر کو آراستہ پیراستہ دیکھ سکیں گے اور پاکستان میں ڈراما اور تھیٹر کی بنیادیں مضبوط و مستحکم ہوں گی۔

اختتامیہ آخر میں لاہور کی جدید فنی مساعی پر کسی قدر تفصیل سے نظر ڈالتے ہیں۔ جو کچھ آج کل ہو رہا ہے ناظرین اس سے تو واقف ہیں اس لیے اس کے ابتدائی دور پر اجمالی نظر ڈالنا دلچسپی میں مزید اضافہ کا باعث ہوگا۔

۱۹۵۶ء کے بعد لاہور میں ڈراما اور تھیٹر کی سرگرمیاں کچھ تیز ہو گئیں۔ گورنمنٹ کالج، الحمرا آرٹس کونسل اور سٹار تھیٹر اکیڈمی یہ تین ادارے پہلو بہ پہلو نئے نئے ڈرامے اسٹیج کرتے نظر آئے۔ اوّل الذکر ہر دو مقامات پر زیادہ تر غیر ملکی زبانوں کے تراجم یا ملخصات پیش کیے گئے۔ ضمناً یہاں ان چند ڈراموں کی پیش کش پر وہ آزاد رائیں درج کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ان میں سے اکثر ڈراموں کا ذکر پہلے آ چکا ہے اب ان کی مختصر روئداد ملاحظہ کیجیے۔

الحمرا گروپ کے ڈرامے "باکس اور کاکس" کی نسبت ہفتہ وار "لیل و نہار" رقمطراز ہے :۔

"باکس اور کاکس" یہ طربیہ کھیل سید امتیاز علی تاج نے انگریزی سے ترجمہ کر کے پیش کیا تھا۔ صاف شستہ با محاورہ اور رواں۔ یہ اور بات ہے کہ اداکار ٹھیک طور پر انھیں نبھا نہ سکے ــــــ خود اس کھیل کے پیش کار (سید امتیاز علی تاج) نے کھیل شروع ہونے سے پہلے اسٹیج پر آ کر سامعین سے اس امر کی معذرت چاہی تھی کہ "بعض مجبوریوں اور مشکلوں کے سبب ہم پورے طور پر تیار نہیں ہو سکے "۔

اسی دوران گورنمنٹ کالج میں مولیئر کی کومیڈی "بخیل" کا ترجمہ کالج کے اوپن ائیر تھیٹر کے اسٹیج پر کھیلا گیا۔ اس کی نسبت "لیل و نہار" رقمطراز ہے کہ :۔

"سکندر شاہین نے حاجی (عبد القدوس) کا پارٹ بڑی کامیابی سے ادا کیا ہے۔ سکندر میں اسٹیج ایکٹنگ کی صلاحیتیں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ رقیہ حسن نے بدلطیفن کا مشاطگی کا رول بڑے سلیقے سے نبھایا۔ ان کی اداکاری سب سے زیادہ پختہ، بے ساختہ اور منجھی ہوئی تھی۔ عزالہ (کوکب) اداکاری کے فن سے بالکل نابلد معلوم ہوتی ہیں۔ ان کا لہجہ اور تلفظ بھی ناقص تھا۔ خالد سعید کھلنڈرے نوجوان (شاہد) کے روپ میں بہت کامیاب رہے البتہ نعیم طاہر (ارشد) کی اداکاری بالکل بے جان اور سپاٹ تھی "۔

اسی سال الحمرا میں دو مختصر ڈراموں کا پروگرام ہوا۔ ان میں ایک تھا "یوجین اونیل" کے ڈراما "دی روپ" (THE ROOP) کا اُردو ترجمہ جو اظہار کاظمی نے کیا اور دوسرا "گونگی جورو" انگریزی کے ڈرامے (THE DUMB WIFE) کا ترجمہ۔ اس پر رائے زنی کرتے ہوئے "لیل و نہار" لکھتا ہے :۔

"یہ ڈراما اس سے پہلے ریڈیو سے بھی متعدد مرتبہ نشر ہو چکا ہے اور سید امتیاز علی تاج نے اسے اُردو کا جامہ پہنایا ہے لیکن فاضل مترجم نے نہ اب اور نہ پہلے یہ اقرار کیا ہے کہ یہ ڈراما کسی دوسری زبان سے ماخوذ ہے۔ ڈرامے کا ترجمہ اتنا خوبصورت اور رواں ہے کہ جن لوگوں نے اصل ڈراما نہیں پڑھا انھیں اس کے ماخذ ہونے کا شبہ تک نہیں ہو سکتا۔ ڈرامے میں سب سے مشکل اور اہم کردار گونگی بیوی کا ہے جسے ندرت الطاف نے بڑی کامیابی سے ادا کیا ہے۔ ڈرامے کے دوسرے کردار (جج) خالد سعید بٹ (جج کا دوست) سکندر شاہین (ملازم) نسیم محمود اور (ڈاکٹر) فاروق ضمیر اپنی

جگہ پر بہت کامیاب نظر آتے ہیں۔ ہدایت کاری کے فرائض صوفی وقار احمد نے
انجام دیے ہیں۔"

"پپیہا" کی نسبت رائے تھی کہ :۔

"ڈرامے کا سسپنس (تذبذب) شروع سے آخر تک قائم رہتا ہے۔ کامیدار نے
بڈھے کا کردار ادا کر کے اسٹیج پر اپنا ایک مقام پیدا کر لیا ہے۔ کنول حمید نے کمسن
زرینہ کا کردار جس فطری بھولپن سے نبھایا ہے اسے دیکھ کر یہ گمان نہیں ہوتا کہ بچی ڈرامے
میں ایکٹنگ کر رہی ہے۔ مرجانہ کا کردار نفیس بانو نے ادا کیا ہے اور اس لحاظ سے
کامیاب ہیں کہ یہ ان کا پہلا موقع ہے لیکن یہ سوال حل طلب ہے کہ مرجانہ کی پلکیں تک
کس طرح سفید ہو سکتی ہیں جبکہ اس کی عمر صرف ۳۵ سال ہے۔"

الحمراء کے ڈرامے "مجرم کون" کے بارے میں "پاکستان ٹائمز" نے اظہارِ رائے کیا تھا کہ :۔

"اگر سماعی طور پر اس ڈرامے کی خوبی کا اندازہ لگایا جائے تو یقیناً کامیاب کہا جائے گا
لیکن حُسنِ نظر کے لیے اس پیشکش نے کوئی قابلِ اطمینان تاثر قائم نہ کیا، خصوصاً ڈرامائی
قطار بندی بے ربط اور بے جوڑ تھی۔ لب و لہجہ کا اتار چڑھاؤ ناقص اور انسپکٹر کا رول
بے جان رہا۔ اس ڈرامے میں صرف ایک کردار بیٹے کا تھا جو سکندر شاہین نے نہایت
موزوں طریقہ اور بڑی کامیابی سے ادا کیا۔"

یہاں ہمیں یہ اندازہ کرنے کا موقع ملتا ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد جب سے لاہور میں جدید اسٹیج منصۂ شہود پر آیا جس انداز اور جس درجے سے بھی تھا ان میں الحمراء اور گورنمنٹ کالج کے اسٹیج پر نمایاں فنکاروں میں سکندر شاہین اور خالد سعید پیش پیش رہے۔ سکندر شاہین شوقیہ اداکاروں میں یقیناً بڑی صلاحیتوں کے مالک ہیں اور جدید ڈرامے کی اٹھان اور نئے شوقیہ تھیٹر میں ابتدا سے آج تک ان کا بڑا حصہ ہے۔ وہ بڑے ذوق و شوق اور مخلصانہ جانفشانی سے جدید ڈرامے کی ترقی کے لیے تن من دھن سے مصروفِ کار ہیں۔ اگر ان کے اس والہانہ پن میں یہی خلوص کارفرما رہا تو جدید تھیٹر کے لیے بہت مفید ثابت ہوں گے۔

اسٹار تھیٹر کے افتتاحی پروگرام "رستم و سہراب" کو "پاکستان ٹائمز"، "سول ملٹری" اور دوسرے اردو اخبارات نے پُرزور الفاظ میں سراہا اور جب اس ادارہ نے قدیم و جدید تھیٹر کے امتزاج سے جو ایک نیا آغاز کیا تھا ۱۹۵۸ء میں ترقی کا ایک قدم آگے رکھا اور جدید ڈرامے پیش کرنے لگا چنانچہ جولائی میں الحمراء آرٹ کونسل میں اس سلسلہ کا پہلا پروگرام "جمیلہ"، "عمر خیام" اور "خودکشی" پیش کیے گئے تو دوسرے اخبارات کے علاوہ محکمہ تعلقاتِ عامہ کے سرکاری آرگن LAHORE AFFAIRS میں ادارۂ ہٰذا کی خدمات کا ان الفاظ میں ذکر کیا گیا۔

"لاہور اپنی علمی، ادبی اور ثقافتی روایات کے لیے ہمیشہ سے مشہور ہے لیکن دورِ جدید
میں ادبی سرگرمیوں کی ہمہ ہمی تو دیکھنے میں آتی ہے لیکن ابھی تک باقاعدہ اسٹیج کی رونق
ماند ہے۔ ڈرامے کے باقاعدہ احیاء اور صحیح معنوں میں ایک مکمل ہال کی موجودگی کے

بغیر اس کی تکمیل دشوار ہے۔ چند مقامی کالجوں کے طلبا نے کچھ عرصہ سے کسی حد تک باقاعدگی سے ڈرامے پیش کرنا شروع کیے ہیں لیکن ان کے کاموں میں تو مشقی نظر آتی ہے جو صرف شائقین کو ہی اپنی طرف بخوبی متوجہ کرنے میں ناکام نہیں رہی ہے بلکہ صحیح معنوں میں اسٹیج کی کمی کو پورا کرنے میں اس کوشش کا کوئی دخل نہیں ہو سکتا البتہ کچھ عرصہ سے اسٹار تھیٹرز نے اس کام کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا ہے اور اس کے اراکین میں اسٹیج اور تھیٹر کے درجہ اول کے فنکار و اہلِ ذوق موجود ہیں۔ چنانچہ ان کے افتتاحیہ کھیل آغا حشر کے "رستم و سہراب" کی پیش کش نے ہی نہ صرف اسٹیج کے احیاء کے امکان پیدا کر دیے بلکہ ان کی منظم مساعی سے تکملہ کی خاص توقعات وابستہ ہو گئی ہیں۔ ان کا دوسرا کھیل آغا حشر کا "اچھوتا دامن" تھا اور اب الحمرا آرٹ کونسل میں جو جدید ڈرامائی پیشکش عمل میں لائی جا رہی ہے وہ ان کے تجرباتی پروگرام کی جدید کڑی اور عملی تکمیل کی طرف ایک مبارک فنی اقدام ہے جسے عشرت رحمانی کی زیرِ ہدایت پیش کیا جا رہا ہے۔"

اور پروگرام کی نسبت اظہارِ رائے کرتے ہوئے علیحدہ علیحدہ تفصیل سے اسے قابلِ داد کہا اور ڈراما "جمیلہ" کے سلسلہ میں بجا طور پر اظہارِ خیال کیا کہ "الحمرا اسٹیج اس قسم کے ڈراموں اور عملی و فنی پیش کش کے لیے بہت محدود ہے۔ اسٹار تھیٹر کے کام کے لیے اس اسٹیج کا دامن بہت تنگ ہے۔"

چونکہ اس ادارہ سے میں بھی متعلق تھا اس لیے تفصیلی تبصرے اور تعریفوں کی سندیں یہاں پیش کرنا مناسب نہیں سمجھا مختصر یہ کہ حالیہ ادارہ لاہور پلے ہاؤس نے جب لاہور کے مختلف تھیٹر گروپ اور فنکاروں کو ایک مرکز پر جمع کرنے کی سعی کی اس وقت اس مبارک آغاز میں سب سے پہلے اسٹار تھیٹر نے لبیک کہا اور اس کے تمام فنکار عملی اشتراک پر آمادہ ہو گئے۔ اس وقت سب سے زیادہ توقع لاہور پلے ہاؤس سے ہے جو اپنی جدید عملی تنظیم کی تکمیل میں مصروفِ کار ہے۔ الحمرا آرٹ کونسل سے بھی اس کے ذرائع کے لحاظ سے بڑی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں بشرطیکہ سنجیدہ غور و تدبر سے کام لیا جائے اور ان کی ڈرامائی مساعی لاہور پلے ہاؤس کے نقشِ قدم پر قومی افادیت اور تعمیری منصوبوں کی جانب بھی توجہ کریں۔ کیونکہ تھیٹر سے صرف ادنیٰ تفریح و تفنن کا کام ہی نہیں لینا ہوتا بلکہ اصلاحِ معاشرت اور قومی کردار کی تعمیر میں اس فن کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔

فلم

احمد سعید

تاریخ شاہد ہے کہ ہندوستان پر جو حملہ آور قابض ہوتا وہ لاہور پہ اپنا پرچم گاڑتا ہوا دلی کو ہی اپنا پایۂ تخت بناتا۔
اس لیے کہ درۂ خیبر نہایت دشوار گذار ہونے کے باوجود ہر اولو العزم اور جنگ جو فاتح کے لیے ہر وقت کھلا رہتا۔ اس کے باعث لاہور کی تاریخ کی ابتدا ایک پُر اسرار دھند میں گم ہو جاتی ہے۔ اور لو اور کُش۔ اس کے بانیوں کی LEGEND بن کر رہ جاتی ہے۔ حال ہی میں حویلی دھیان سنگھ اندرون شاہی قلعہ میں جو کھدائی ہوئی ہے اُس سے اس شہر کی ما قبل تاریخ منکشف ہونے کا امکان ہے۔ لیکن لاہور کی با قاعدہ تاریخ عہد غزنوی ہی سے شروع ہوتی ہے۔

لاہور کی فلمی تاریخ اور بحیثیت فلم نگر بھی قدرے یہی عالم نظر آتا ہے۔ کیونکہ لاہور کے موجودہ نگار خانے اس کے عہدِ جدید سے تعلق رکھتے ہیں۔ شیش محل کی طرح، جس کے اندر زندگی کی عکاسی کی جاتی ہے اور ہو رہی ہے، جن میں مترنم قہقہوں، رقص و سرود، زندگی کے زیر و بم کو فلم میں مقید کیا جاتا ہے، ان کے نام، بلکہ وجود تک سے نوئی پود بھی واقف ہے۔ لیکن یہاں کے چند ایک نگار خانے ایسے ہیں اور تھے جو داستانِ پارینہ ہو گئے ہیں اور اب کھنڈر کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جن کے کھنڈر تک مٹ چکے ہیں اور کچھ ایسے جن کی یاد ان چند گنے چنے فلمی تاریخی کرداروں کے سینوں میں مدفون ہے جنہیں نہ صرف زمانے نے بھلا دیا ہے بلکہ جن کے اپنے بھی پرائے ہو گئے ہیں۔ جب درخت سوکھ جاتا ہے تو اس کی لکڑی کام میں لائی جاتی ہے لیکن فلمی دنیا رگوں میں خون دوڑنے پھرنے کی ہی قائل ہے۔ بقول لاہور کی ایک زندہ تاریخ ہسپانوی بل فائٹنگ لڑنے والے دیوتا ڈور) کی طرح جب اس کے ایک ہیرو کا بیل خون کر دیتا ہے تو ابھی یہ سوکھ بھی نہیں پاتا کہ ناظرین اکھاڑے میں اُترتے ہوئے نئے فاتح ہیرو کی تحسین میں تالیاں پیٹنا اور نعرے لگانا شروع کر دیتے ہیں ــــ پرانے ہیرو کا نہ جنازہ اُٹھتا ہے، نہ مزار بنتا ہے۔ تماشائیوں کو تو فقط کھیل سے دلچسپی ہوتی ہے ــــ کھیل جسے کسی طور بند نہیں ہونا چاہیئے۔ لاہور کی فلم نگری میں بھی ایسے کئی "ہیرو" نے جنم لیا کئی پیوندِ خاک ہوئے، بہتوں کی ہڈیاں راوی بہا کر لے گیا لیکن بہت سے سپوتوں نے ہندوستان کے دیگر فلم نگروں کو فتح کیا اور مدتوں ان پر راج کیا اور بعض اب تک یا تو خود اس کے سنگھاسن پہ براجمان ہیں یا ان کی نسل اب تک وہاں حکمران ہے۔ دِلّی کی طرح ہر مرکز، لاہور بھی کئی دفعہ بسا اور اُجڑا اور یہاں کے پنچھی بکھیرو نے بمبئی اور کلکتہ جیسے دائمی گلستانوں کا رُخ کیا جہاں کے گل چیں انھیں طرح طرح سے سجا سجا کر، مختلف روپ میں ہندوستان بھر میں پیش کرتے رہے حتیٰ کہ وہاں کی تاریخ میں بھی حصول

آزادی کے ساتھ ایک ایسا طوفان آیا کہ کئی پنچھی وہاں سے اڑ کر لاہور آ گئے اور انھوں نے اس گلستان کو پھر آباد کیا۔ اس کے "شبستان محلوں" میں پھر شمعیں جلانی شروع کیں۔ لیکن لاہور کے فلمی نشاۃ الثانیہ کے احیا کا حال بتانے کے لیے ہمارے لیے اس کی ابتدا اور ارتقا کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

۳۶ برس قبل لاہور نے تین چار منچلے فاتحین کو جنم دیا جن میں دو تین کا طوطی بعد ازاں ہندوستان بھر میں بولنے لگا۔ ۱۹۲۴ء میں عبدالرشید کاردار (بعد ازاں جو اے۔ آر۔ کاردار کے نام سے مشہور ہوئے) اور محمد اسماعیل (ایم۔ اسماعیل) نے فلم میں اداکاری اور ہدایت کاری کے شوق کے تحت بمبئی ہندوستانی ہالی وڈ میں قسمت آزمائی کرنے کے لیے اس کا رخ کیا۔ انھی دنوں روپ۔ کے۔ شوری (روپ۔ ایل شوری) کے والد امریکہ فوٹوگرافی میں تربیت حاصل کرنے کے لیے گئے ہوئے تھے لیکن ایم اسماعیل اور کاردار کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ اس کی تکمیل کے لیے انھیں وطن واپس لوٹنا پڑا۔ یعنی لاہور۔ یہاں وہ کچھ عرصہ تک تو اکٹھے مل کر اپنے پرانے مرغوب مشغلہ پوسٹر بنانے سے دل بہلاتے رہے لیکن فلمی عشق انھیں کہاں چین سے بیٹھنے دیتا تھا۔۔۔ چنانچہ عبدالرشید کاردار نے نہ صرف تن من بلکہ دھن بھی لٹا کر نہ صرف ایک سائن کیمرہ خریدا بلکہ اپنی فلم کمپنی بھی قائم کر لی۔۔۔ اس کے کیمرہ مین ایک امریکی تربیت یافتہ صاحب جے۔ کے ہمنز تھے۔ انھوں نے اپنی مختصر سی لیبارٹری بھی قائم کر رکھی تھی جو ایک چھوٹے سے ٹینک پر مشتمل تھی۔ موصوف غالباً میٹرو نیوز کا بھی کام کرتے تھے لیکن ان دنوں بیشتر فلمیں آؤٹ ڈور میں بنتی تھیں۔ ان خاموش فلموں کے لیے فقط ایک کیمرہ اور چند ری فلیکٹرز درکار ہوتے۔ ان کے سٹ بھی باہر لگتے، اگر ان دنوں بھی آجکل کی طرح دن کو سورج کی مطلوبہ روشنی میں مخصوص اوقات میں بھی شوٹنگ ہو سکتی۔ چنانچہ ۱۹۲۵ء کے لگ بھگ لاہور میں پہلا کھلا (OPEN) سٹوڈیو بریڈلا ہال کے سامنے قائم ہوا۔ اس میں PREMUM FILM CO کے جھنڈے تلے لاہور یعنی پنجاب کی پہلی مکمل فلم DAUGHTERS OF TODAY تیار ہوئی۔ اس میں دو اداکاروں ایم اسماعیل اور وجے کمار نے بعد میں ملک بھر میں شہرت حاصل کی۔ مذکورہ سٹوڈیو میں چند ایک فلمیں اور بھی بنیں لیکن انھیں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

۱۹۲۷ء میں آر۔ کے۔ شوری نے امریکہ سے واپسی کے بعد لئے۔ آر۔ کاردار سے مل کر ایک سٹوڈیو نا کمپنی قائم کی لیکن یہ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکی۔ حتیٰ کہ موخر الذکر نے ۱۹۲۸ء میں UNITED PLAYERS کے نام سے ایک ایسا ادارہ قائم کیا اور اس کے جھنڈے تلے یکے بعد دیگرے سات آٹھ کامیاب فلمیں جو بڑی سپرہٹ ثابت ہوئیں۔ ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔ MYSTERIOUS EAGLE، صفدر جنگ BRAVE HEART GOLDEN DAGGER KING SHEIKH وغیرہ۔ WANDERING DANCER اور SWEET HEART نامکمل رہ گئیں۔ اس عرصہ میں آر۔ کے شوری اور چند دیگر پروڈیوسروں نے بھی اکا دکا فلمیں بنائیں جو سطح آب پر گاہے گاہے خفیف لہروں کے پیدا ہونے کے برابر ایک نامعلوم مظہر تھا۔ بہر نوع اس فن اور کاروبار نے شہر کی چند ممتاز ہستیوں کی توجہ اپنی طرف ضرور مبذول کر لی۔ اس کے نتیجے کے طور پر بہت جلد نہایت وسیع پیمانے پر لاہور میں سٹوڈیوز قائم کرنے کے پروگرام مرتب ہوئے۔ اس دوران فلمسازی کے مختلف شعبوں میں تربیت حاصل کرنے کے لیے چند نوجوان جرمن اور دیگر ممالک بھی گئے۔ ان میں جے۔ کے نندا اور ملہوترا کا نام قابل ذکر ہے موخر الذکر سے بعد ازاں اے۔ آر کاردار نے بمبئی پہنچ کر اشتراک بھی کرنا چاہا لیکن یہ شرمندہ تعبیر نہ ہوا۔

اس عرصہ میں متکلم فلموں کی ایجاد کے باعث جہاں عالمی فلمی دنیا میں انقلاب پیدا ہوا وہاں ہندوستانی صنعت بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ چنانچہ جب لاہور کا مرکز قدرے منظم ہو رہا تھا ہندوستان میں پہلی متکلم فلم "عالم آرا" ۱۹۳۱ء میں تیار ہوئی ۱۹۳۹ء میں لاہور میں پنجاب فلم کمپنی کے نام سے ایک اور سٹوڈیو قائم کیا گیا۔ اس نے دو مشہور فلمیں "خیبر" اور "ابلا" اور "نئی روشنی" (متکلم) بنائیں۔ اس سال PLAYAR-PHOTOTONE کے نام سے اے۔ آر۔ کاردار اور حکیم رام پرشاد نے مشترکہ طور پر ایک کمپنی قائم کی اور اس کے تحت موجودہ ریجنٹ سینما کے عقب میں ایک سٹوڈیو قائم کیا۔ اس یونٹ کے پرانے ارکان نے جن میں ایم اسماعیل بھی شامل تھے، اس کے "گرڈر" اپنے کندھوں پر "اٹھا اٹھا کر" اسے استوار کیا۔ اس میں اے۔ آر۔ کاردار نے ہیر رانجھا اور گوپی چند تیار کیں۔ ہیر رانجھا میں جہاں ایم اسماعیل نے یکتا کردار نگاری کا مظاہرہ کیا وہاں رفیق غزنوی کو موسیقار کی حیثیت میں فلمی دنیا سے روشناس کرایا گیا۔ لیکن متکلم فلم بنانے کا تجربہ نہ ہونے کے باعث کاردار کی یہ دونوں فلمیں کامیاب نہ ہو سکیں ــــ لیکن اب لاہور کا فلمی مرکز باہر کے فلمسازوں کی توجہ کا مرکز بننے لگا۔ یہاں ایک فلم ایسی بنائی گئی جو غیر ممالک میں بھی دکھائی گئی۔ اور جس نے ہندوستان کے فلمی مرکز بمبئی سے دو چار نام اور متعارف کرائے۔ یہ فلم LOVES OF A MOGHAL PRINCE تھی۔ جو کئی برس بعد بمبئی ٹاکیز کے بانی ہمانسو رائے آنجہانی نے LIGHT OF ASIA کے بعد بنائی۔

اس فلم میں امتیاز علی تاج اور دیوان شرر اور غالباً رفیع پیرزادہ نے بھی کام کیا۔

ہیر رانجھا اور گوپی چند کی ناکامی کے باوجود اے۔ آر۔ کاردار اور ان کے یونٹ کی دھوم کلکتہ اور بمبئی تک پہنچ گئی اس لیے انھیں وہاں سے کئی پیش کش ہوئیں۔ اس کے نتیجہ میں موصوف تو کلکتہ چلے گئے جہاں انھوں نے ایسٹ انڈیا فلم کمپنی کے جھنڈے تلے متعدد کامیاب فلمیں بنائیں۔ آب حیات، عورت کا پیار، زرینہ، ملاپ، چندر گپت، باغی سپاہی۔ اور غالباً ایک انڈی پن ڈینٹ۔ سمندر۔ ان میں زرینہ، عورت کا پیار اور باغی سپاہی کو بے پناہ مقبولیت ہوئی۔ یہ ان کی کارہا تجربہ تھی۔ فنی اعتبار سے چندر گپت ایک بلند پایہ فلم تھی۔ اس میں نذیر نے چانک کا اہم رول ادا کر کے اپنے لیے ہندوستانی فلمسازی میں اونچا مقام پیدا کر لیا۔ کلکتہ کے بعد موصوف بمبئی چلے گئے جہاں انھوں نے پے در پے کئی کامیاب فلمیں بنائیں اور آخر کاردار کا اپنا سٹوڈیو قائم کیا۔ فلمسازی کے ہر شعبہ میں بے پناہ کمال رکھنے کے باعث وہ ملک کے چوٹی کے ٹیکنیشنوں اور ہدایت کاروں میں شمار ہونے لگے۔ انھوں نے ہندوستانی فلموں میں ایک اور طرح جو ڈالی وہ چربہ سازی تھی جس کے باعث نہ صرف دوسروں نے ان کے نقش قدم پر چلنا شروع کیا بلکہ بالآخر خود ہی اس کا مہلک شکار ہو کر رہ گئے۔

یہاں ان کے دو ایک بعد ازاں ممتاز شاگردوں کا ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا ...... ایم صادق اور ایس۔ یوسفی۔ یہ دونوں لاہور ہی سے ان کے ہمراہ بحیثیت مصنف اور نائب ہدایت کار کلکتہ اور بمبئی گئے اور ایک دن ایسا آیا جب انھوں نے رتن اور میلہ وغیرہ جیسی کامیاب فلمیں دے کر ہندوستانی فلمسازی میں بلند مقام حاصل کر لیا۔

لیکن ایک پہاڑ سے کئی چشمے اور کئی دریا نکلتے ہیں۔ کچھ تو راستے کی گرمیوں یا ریگستانوں ہی میں گم ہو جاتے ہیں۔ کئی انہی جگہوں کو پار کر کے ان کو سیراب کرتے ہوئے سمندر میں جا گرتے ہیں۔ لاہور سے ایسے ہی کئی جوہر نکلے اور

جوہر شناسوں کی تلاش میں کلکتہ اور بمبئی پہنچ گئے جنھوں نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس وقت جگدیش سیٹھی، پرتھوی راج، غلام محمد (مرحوم) اور کئی اداکار ہندوستانی سکرین پر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ موسیقی میں ماسٹر غلام حیدر (مرحوم) نے اپنے لیے کلکتہ سٹیج پہ پہلے ہی بہت بلند مقام حاصل کر لیا تھا جو بعد ازاں فلموں میں موسیقی دینے کے باعث چتر لیکھا میں لافانی موسیقی دے کر لازوال ہو گئے۔

۳۲-۱۹۳۱ء میں لاہور میں غالباً پنجاب فلم کمپنی کے نام سے ڈاکٹر دولت رام نے گاف روڈ پر ایک عظیم الشان سٹوڈیو قائم کیا۔ اس کے لیے ایک وسیع کوٹھی کو سٹوڈیو میں منتقل کیا گیا تھا۔ یہ اتنے ساز و سامان سے لیس تھا کہ آدمی جتنا جھوٹ بولے کم ہے۔ اور تو اور بقول راوی اس کے ٹیکنیشن بھی اس کی کئی چیزوں کا استعمال کرنا نہیں جانتے تھے۔ یہاں غالباً دو فلمیں ہی بنیں۔ سورگ کی سیڑھی اور سہاگ کا دان۔ اول الذکر بندر (ہیرو) اور مرضیا بیگم کی وجہ سے ہی یاد رہی۔ دوسری فلم غالباً سید امتیاز علی تاج نے لکھی اور جے۔ کے نندہ نے ڈائرکٹ کی۔ لیکن یہ بھی ناکام رہی۔

اس عرصہ میں یہاں ایک نیا ساؤنڈ سسٹم — قیصی ساؤنڈ سسٹم — بھی ایجاد ہوا لیکن یہ ناکارہ ثابت ہوا۔ ادھر پنجاب فلم کمپنی کے سٹوڈیو کا بھی شیرازہ بکھر گیا۔ اور لاہور کے فلمی پنچھیوں نے کلکتہ اور بمبئی کے چمنستانوں میں جا بسیرا کیا۔ کاردار کے بعد روپ کے شوری اور روپ۔ ایل شوری ہی باقاعدہ لیکن اکا دکا فلم بناتے رہے۔ وہ بھی بیشتر کلکتہ میں، گو یا لاہور ہی کے اداکاروں اور عملے قبیلے کے ساتھ۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہاں لاہور کے فنکاروں کو بمبئی سے بھی زیادہ ترقی کرنے اور پروان چڑھنے کے امکانات اور آسان راستہ ملتا تھا۔ کلکتہ تھیٹر کا گھر تھا، حتیٰ کہ متکلم فلم کے آغاز نے اسے تہس نہس کر دیا اور سٹیج کے مالکان نے اسی عملے قبیلے سے آلٹی سیدھی فلمیں بنانا شروع کر دیں۔ کلکتہ دراصل فلمی فنکاروں کے لیے اُن کی منزلِ مقصود — بمبئی — ان کے خواب تک پہنچنے کا آسان ترین راستہ تھا۔ یہیں سے پرتھوی راج کپور۔ جگدیش سیٹھی۔ کاردار۔ سہگل (آغا جانی) ماسٹر جھنڈے خان نجم الحسن۔ کیدار ناتھ شرما وغیرہ نے اتنی شہرت حاصل کی کہ انھیں منہ مانگی قیمت پہ بمبئی نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ حیرت کا مقام ہے کہ ان میں سے کئی فن کاروں کو بمبئی چھوڑ کر کلکتہ آنا پڑا اور بعد میں پھر بمبئی واپس لوٹنا پڑا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض کو کلکتہ کی آب و ہوا ہی راس آئی۔ مثلاً شوری باپ بیٹے۔ مبارک ڈائرکٹر جشتی۔ کیمرہ مین جی سنگھ۔ یو۔ پی کے سبطین فضلی جو پہلے نیو تھیٹرز میں بطور اسسٹنٹ ڈائرکٹر تربیت لیتے رہے۔ اور بعد ازاں چورنگی، معصوم اور قیدی جیسی فلمیں بنا کر بمبئی ہجرت کر گئے۔ شوکت حسین رضوی جو فلم کارپوریشن میں ایڈیٹر تھے۔ جی سنگھ کیمرہ مین اور سی۔ ایم لطیف ایڈیٹر۔ داؤد چاند ڈائرکٹر کلکتہ ہی میں رہے۔

اس عرصہ میں لاہور کا فلم نگر اُجڑ گیا اور کلکتہ منتقل ہو گیا اور پنڈ دی کڑی۔ ہیر سیال جیسی پنجابی فلمیں وہیں سے بن کر آئیں۔ ان میں سے ہیر سیال کو حیرت انگیز کامیابی حاصل ہوئی۔ گو فنی اعتبار سے یہ نہایت کمزور اور خام فلم تھی لیکن اس میں ایم اسماعیل نے کیدو کا کردار اتنا ڈوب کر کیا کہ یہ ہندوستان کے چوٹی کے اداکاروں میں شمار ہونے لگے۔ لاہور میں اپنی فلموں کی کامیابی دیکھ کر نیو تھیٹرز کلکتہ نے یہاں ۱۹۳۴ء میں نیو انڈیا فلمز کے نام پر نشاط سینما کے قاضی خورشید حسن کے اشتراک سے ایک سٹوڈیو قائم کیا۔ اس نے اپنے یونٹ سے یہاں دو فلمیں "کاروانِ حیات" اور "جوشِ انتقام" بنائیں۔ لیکن انھیں چنداں کامیابی

حاصل نہ ہوئی چونکہ کلکتہ سے لاہور کا کام سنبھالنا ناممکن تھا نتیجہ یہ ہوا یہ سٹوڈیو بند کر دیا گیا۔ اسے بعد ازاں روپ شوری نے اپنی تحویل میں لے لیا اور یہاں کلکتہ کے ہی سرمایہ دار فلمساز سیٹھ سمپت لال کرنانی سے مل کر فلمیں بنانا شروع کیں۔

اس اثنا میں دیوان سرداری لال (آنجہانی) نے ۱۹۳۴ء میں اپرمال پر چنیوں کی ایک فیکٹری کو اشتراک میں سٹوڈیو میں منتقل کروا دیا اور اس کا نام SUPER SOUND STUDIO رکھا۔ یہی سٹوڈیو بعد ازاں پنچولی سٹوڈیو کی بنیاد ثابت ہوا۔ ڈی۔ ایم۔ پنچولی۔ آر۔ سی۔ بی اے اور آر۔ کے۔ او ریڈیو کے مشہور تقسیم کار ادارے سے منسلک تھے۔ ان کا ہیڈ آفس کلکتہ ہی میں تھا۔ انھوں نے وہاں ایک آدھ پنجابی فلمیں اشتراک میں بنائی تھیں۔ اس لیے انھوں نے لاہور میں مذکورہ سٹوڈیو میں پنجابی کی ایک اور فلم گل بکاؤلی بنا کر لاہور کو ایک مستحکم فلمی مرکز بنانے کی طرف سرعت سے ایک جرأت مندانہ قدم بڑھایا۔

اس فلم میں موسیقی کی دنیا میں ایک ستارہ طلوع ہوا جس نے بعد میں سارے ہندوستان کو چکا چوند کر دیا جس نے اپنی آواز سے ایسا جادو جگا دیا کہ بڑے بڑے استاد دانتوں میں انگلی داب کر رہ گئے اور جس نے لاہور کو بمبئی کے مقابلے میں لا کھڑا کیا ـــــ یہ بے بی نور جہاں تھی! جو بعد میں نور جہاں ہو کر چمکی اور اپنے ساتھ شوکت حسین رضوی کو ایک ایڈیٹر کی حیثیت سے کلکتہ سے لے آئی اور اسے بھی چند سالوں میں ملک کے نامور ڈائرکٹروں میں لا کھڑا کر دیا۔ نور جہاں نے بھی کلکتہ میں سٹیج پر سہیلیوں کے ساتھ نمودار ہو کر اور رہبر سہگال میں گا کر خراجِ تحسین حاصل کیا تھا۔ جوہری شناس شوکت حسین رضوی اور دوشکہ ایم پنچولی کی نگاہِ انتخاب ان پر پہلے ہی پڑ چکی تھی کہ یہ رسیلی کرن ایک روز ضرور دنیا کو مسحور اور منور کرے گی۔ یہاں غلام حیدر مرحوم کا ذکر کرنا بھی بے جا نہ ہوگا۔ موصوف کلکتہ سے ہی واپس لاہور لائے گئے۔ انھوں نے یہاں یملا جٹ اور خزانچی میں حیرت انگیز موسیقی مرتب کر کے فلمی موسیقی میں ایک انقلاب پیدا کیا۔ لتا منگیشکر بھی انھی کی دریافت ہیں۔

گو "گل بکاؤلی" انتہائی محدود فنی وسائل سے بنائی گئی لیکن اسے اتنی کامیابی حاصل ہوئی کہ ڈی۔ ایم پنچولی نے اب لاہور میں فلمسازی کا باقاعدہ کام شروع کر دیا۔ انھوں نے ڈاکٹر دولت رام کی چنیوں کی منتقل شدہ فیکٹری میں یکے بعد دیگرے یملا جٹ (پنجابی) اور خزانچی (اردو) جیسی ایسی فلمیں بنائیں جنھوں نے باکس آفس کے ریکارڈ نہ صرف توڑ دیے بلکہ لاہور کو ہندوستان کے فلمی مراکز میں لا کھڑا کیا۔ نہایت مختصر ہونے کے باوجود پنچولی سٹوڈیوز میں فلم فیکٹری کے پیمانے پر کام کیا گیا۔ یہ ڈی۔ ایم۔ پنچولی کی غیر معمولی قوتِ انتظامیہ اور کاروباری شعور کا نتیجہ تھا۔ پنچولی کمپنی میں کلکتہ اور لاہور کے بیشتر لاہوری فن کار ہی مجتمع کیے گئے۔ کیمرہ مین بدری پرشاد (آنجہانی) برکت مہرہ (آنجہانی) (سابق ساؤنڈ ریکارڈسٹ اور ڈائرکٹر) نور جہاں۔ ایم اسماعیل۔ ماسٹر غلام حیدر۔ اجمل (نئی دریافت) پران۔ وغیرہ ان میں غیر لاہوری کلکتہ کی گمنام لیکن نہایت اعلیٰ اداکارہ رمولا اور بمبئی کے ڈائرکٹر موتی۔ بی۔ گڈوانی تھے۔ موخرالذکر نے خاموش فلموں میں کافی نام پیدا کیا تھا اور چند متکلم فلمیں بھی بنا چکے تھے۔

اس عرصہ میں سابق نیو انڈیا سٹوڈیو، جو بعد ازاں کملا مووی ٹون سٹوڈیو میں منتقل کر دیا گیا، کے قریب ہی ایک اور سٹوڈیو بنام نادرن انڈیا سٹوڈیو قائم کیا گیا۔ اس کی اپنی تو ایک ہی فلم سہتی مراد بن پائی۔ یہ بھی خاصی کامیاب ہوئی۔ اس نے ہندوستان کی صنعتِ فلمسازی کو ایک اور نیا چہرے سے تعارف کرایا ـــــ راگنی! اس کی موسیقی کا بھی خاصا چرچا ہوا۔ اور بہت جلد غلام حیدر کے نام کے علاوہ اس میدان میں دو تین نام اور چمک اٹھے۔ حسن لال، بھگت رام اور شیام سندر وغیرہ

پلے بیک میں بھی چند تہلکہ انگیز آوازیں لاہور سے اُٹھیں اور بنگال اور بمبئی کے دلوں کو گرمانے لگیں۔ یہ منور سلطانہ۔ زینت اور شمشاد تھیں۔ روپ کے شوری نے بھی اس اثنا میں دیگر پروڈیوسروں کی سہتی مراد، راوی پار جیسی کامیاب فلموں کے علاوہ ایک نہایت کامیاب فلم منگتی بنا کر لاہور کے فلمی مرکز کو خاصی تقویت پہنچائی اور بمبئی کو ایک نیا چہرہ ممتاز شانتی پیش کیا۔ تاہم ڈی۔ ایم۔ پنچولی کی بے پناہ تنظیمی اور تجارتی قابلیت نے ہی لاہور کے فلمی مرکز کو استحکام بخشا۔ انھوں نے اب وسیع پیمانے پر فلمیں بنانے کے لیے پردھان پکچرز کی اساس ڈالی اور اس کے تحت نہ صرف "منڈوکہ" نیو اور ناردرن انڈیا کی بکنگ اپنے پاس کر لینے پر ہی کامیابی حاصل کرنے بلکہ اوپر تلے دو اتنی کامیاب تصاویر بنائیں جن کے باعث لاہور کی فلمی حیثیت ہندوستان بھر میں مشہور ہو گئی اور یہاں کی تصاویر کلکتہ اور بمبئی کی فلموں کا کاروباری اعتبار سے مقابلہ کرنے لگیں۔ مذکورہ فلمیں چودھری اور خاندان تھیں۔ چودھری نے جہاں نورجہاں کو مکمل ہیروئن کے روپ میں پیش کیا اور سحر انگیز پنجابی گانوں کے ذریعے نئے ریکارڈ کامیاب کیے وہاں خاندان نے لاہور مرکز کے نئے امکانات کو بھی کلکتہ اور بمبئی پر فیصلہ کن انداز میں اجاگر کر دیا۔ بلکہ بمبئی کی صنعت فلمسازی کا رخ بدل دیا۔ یہ نہ صرف مسلم سوشل پکچر بنانے کا خوف دُور کرتا بلکہ ان میں کاروباری اور فنی اعتبار سے غیر معمولی کامیابی حاصل کرنے پر مشتمل تھا محبوب کی "نجمہ" اور مظہر خاں (مرحوم) کی "پہلی نظر" اسی عالی حوصلگی کے نتائج تھے جس کا ڈی۔ ایم پنچولی نے پہلے پہل مظاہرہ کیا بلکہ اس اعتبار سے ایک بہت بڑا "ہوا" بھی دور کیا۔

خاندان اور چودھری کی کامیابی کا سہرا دراصل تین فن کاروں کے سر تھا۔ کلکتہ کے نوجوان فلم ایڈیٹر شوکت حسین رضوی جو مشہور و معروف ہالی وڈ کے تربیت یافتہ ایڈیٹر۔ ڈائرکٹر عذرا میر کے شاگرد رشید تھے۔ شوکت کو پنچولی کی ہر نئی فلم کی تدوین کے لیے کلکتہ سے بلوایا جاتا۔ چودھری (پنجابی) کی ہدایت کاری کا بیشتر کام بھی انھیں اپنے کندھوں پر اٹھانا پڑا گو ٹائٹل پر فخر بخش کا ہی نام دیا گیا جنھوں نے اسے شروع کیا تھا۔ شوکت، نورجہاں اور غلام حیدر نے مل کر امتیاز علی تاج کے تصنیف کردہ فلم کو اتنا کامیاب کیا کہ موخر الذکر کی کسی اور فلم کو اتنی شہرت نصیب نہ ہوئی۔

اس وقت "ہندوستان" پر جنوبی ہند سے ایک اور خطرناک حملہ جاری تھا۔ یہ حملہ اس کے بے شمار بہادروں نے اکا دکا طور پر نہیں کیا تھا بلکہ اس کے نئے تعمیر شدہ قلعے سے ہوا تھا — لاہور کے نئے فلم نگر سے اس کا مقابلہ کرنے کے لیے بمبئی، جو ہندوستانی فلموں کا سب سے بڑا فلمی مرکز ہونے کے باعث لاہور سے دبنے لگا تھا، اس کے سپاہی اور سردار منہ مانگی قیمت پر اپنے ہاں بھرتی کرنے لگا۔ چنانچہ اداکاروں میں پنجاب سے نہ صرف نئے نکور چہرے بلکہ اس کے ابھرتے ستارے بھی اس کے اپنے آسمان کو چمکانے کے لیے اڑائے جانے لگے۔ وینا۔ ممتاز شانتی۔ شمیم۔ ثریا اور کئی "مغویہ" چہروں کے علاوہ نورجہاں کو بھی اب شوکت حسین رضوی اور غلام حیدر کے ساتھ اس پائے سلطنت کا دربار سجانے کے لیے بمبئی لایا گیا۔ بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ یہ ہر فنکار کا خواب تھا!

بمبئی کی جوہر شناس نگاہیں پنجاب۔ لاہور کے ہیروں کی قدر و قیمت جانتی تھیں۔ اس کے باوجود پنچولی نے ایک آدھ اور ریکارڈ توڑ فلم داسی بنائی۔ یہ تصویر نہ صرف موسیقی بلکہ کہانی اور اداکاری اور فنی اعتبار سے بھی بڑی کامیاب ہوئی لیکن بمبئی نے آخری دفعہ پنچولی کے تمام حربے بے کار کر دیئے۔ راگنی اب بمبئی کے آسمان پر چمکنے لگی اور اس کا بنگالی ڈائرکٹر ہیرن بوس

ناقدری کا شکار ہو کر کلکتہ واپس چلا گیا۔ وہ بھی در اصل پنچولی کی نگاہِ انتخاب اور عالی حوصلگی اور تجرباتی رجحان کا مرہونِ منت تھا۔

واسی کے بعد پنچولی نے جتنی تصاویر بنائیں وہ سب کی سب مجموعی طور پر ناکام رہیں۔ لیکن آنجہانی نے لاہور کو اس مقام پر لا کھڑا کیا کہ اب بمبئی تک کے فن کار ان کی تصاویر میں کام کرنے کے خواہشمند ہو گئے۔ اس لیے جاگیردار جیسے عظیم فن کار اور شانتا آپٹے جیسی مشہور مغنیہ اور ستارہ کے علاوہ مینا جیسی کفر توڑ ہیروئن، کسم دیش پانڈے جیسی سیماب پا رقاصہ، الناصر اور نجم الحسن جیسے البیلے ہیرو (جن میں سے بیشتر لاہور ہی کی پیداوار تھے) شیکسپیئر میں جمنا داس صوبیدار جیسا بند پنچولی کی مختلف تصاویر کے لیے بمبئی سے بلائے گئے لیکن زمیندار شہر سے دور۔ پگڈنڈی۔ کسی سے نہ کہنا حتیٰ کہ پنچولی کی بیش بہا لاگت کی ملبوساتی فلم، شیریں فرہاد بھی پنچولی کے نام پر ہی چل پائیں۔ پنچولی کے زوال کی سب سے بڑی وجہ آن کی تجربہ سازی کی عادت تھی۔ غیر ملکی، بالخصوص ہالی وڈ کی کامیاب فلموں کے پلاٹ، مناظر اور سائٹس تک اڑانے اور ان کا ملغوبہ بنانے کے لیے ماہرین کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ اس کی بدترین صورت بعد ازاں پاکستان میں ہندوستانی فلموں کی نقالی کی کے وہاں کی صنعت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا نا تھی۔

قیامِ پاکستان سے پہلے پنچولی سٹوڈیوز کے علاوہ شوری اور اپرا انڈیا سٹوڈیوز بھی قائم کیے گئے۔ پنچولی کے قریب ایک فلور پر مشتمل گرووہ بہار سٹوڈیو بھی قائم کیا گیا۔ اس کی فلورز، ناروورن انڈیا کی فلور کے لگ بھگ تھی۔ شوری سٹوڈیو نئے ساز و سامان سے بھی لیس کیا گیا لیکن اس میں بنائی ہوئی نہ تو کوئی فلم کامیاب ہوئی نہ ہی اس سٹوڈیو کو کوئی ذرہ بھر خوش اسلوبی سے چلا سکا۔ شوری فلمسازی کا تجربہ رکھنے کے باوجود بمبئی سے چندر موہن اور بیگم پارہ منگا کر ان سے "شالیمار" کامیاب نہ کرا سکا۔ یہ تصویر اس تاریخی سٹوڈیو واقع عقب ریجنٹ سینما میں بنائی گئی جہاں ناطق فلموں کے آغاز میں اے۔ آر۔ کاردار نے حکیم رام پرشاد سے مل کر دو فلمیں ہیر رانجھا اور گوپی ناتھ بنائی تھیں جو نئی ایجاد کے باعث کامیاب نہ ہو سکیں۔

ایک حکمران کی بنیادی کمزوری کے باعث جیسے اس کی آئندہ نسلوں کا مستقبل بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے پنچولی کی تجربہ سازی اور نئی دریافتوں۔ کے بمبئی ہجرت کر جانے کے بعد لاہور کا فلمی مرکز قیامِ پاکستان سے پہلے پھر لڑکھڑانے لگا۔ فسادات کے دوران اس میں ایک ایسا خوفناک زلزلہ آیا کہ اس سے اس کی بنیادیں ہل گئیں۔ ملک بھر میں پھیلی ہوئی آتشِ سیال نے یہاں کے ایک سٹوڈیو "اپرا انڈیا" کو تو جلا کر خس و خاشاک اور ایک کو خاصا چاٹ کر رکھ دیا۔ یہ شوری سٹوڈیو تھا۔ سکرین پر آتشزدگی اور لوٹ کھسوٹ دکھانے والے خود اس ہیبت ناک ڈرامے کے شکار ہو گئے جو ہندوستان کے طول و عرض میں خیبر سے لے کر راس کماری تک کھیلا جا رہا تھا۔ فقط پنچولی سٹوڈیوز واقعہ مسلم ٹاؤن ہی اس کی دست برد سے کسی حد تک بچا رہا۔ اس کی غیر منقولہ لیبارٹری کے علاوہ شوری سٹوڈیو کی طرح اس کے کیمرے وغیرہ بارڈر پار پہنچا دیئے گئے اور اس کا گھریلو استعمال کے قابل ساز و سامان اس کے محافظوں کے ہاں نظر آنے لگا۔

ایک سال بعد حالات قدرے معمول پر آنے کے بعد اس سٹوڈیو کا تالا کھولا گیا۔ لیکن اس وقت اس میں کام کرنے والوں کو ایک اور دھچکا لگا کہ یہاں دو ایک سابق اسسٹنٹ کیمرہ مین اور ساؤنڈ ریکارڈسٹوں اور آرٹ ڈائرکشن کے شعبہ سے متعلق چند آدمیوں کے علاوہ کوئی مکمل طور پر تربیت یافتہ ٹیکنیشن ایک مسلمان صناع بھی نہ ملتا تھا۔ البتہ مدراس کے

بینگ اپر انڈیا میں ضرور ساؤنڈ ریکارڈسٹ تھے تب یہ حقیقت وا ہوئی کہ غیر مسلم فلمساز مسلمانوں کو نہ صرف مذہبی تعصب کی بنا پر اور پسماندہ رکھنے کے لیے انھیں فلم سازی کا کام سیکھنے کا کم موقع دیتے تھے۔ بلکہ مسلمان خود بھی اس سے گریز کرتے تھے۔ یہ کلیہ ہندوستان کے دیگر فلمی مراکز پر بھی صادق آتا تھا کیونکہ اُن دنوں ہندوستان میں صرف تین مکمل تربیت یافتہ اور تجربہ کار کیمرہ مین کام کر رہے تھے۔ کلکتہ میں یوسف مولجی، پونہ میں عزیز، بمبئی میں احمد اللہ اجمیری۔ صدا بندی میں روشن۔ جیلانی اور دو ایک اور کہیں چھوٹی موٹی فلمیں ریکارڈ کر لیتے۔ فقط شیراز علی پا بانی نے بی۔ ٹی میں اعلیٰ مقام حاصل کر لیا تھا۔ آرٹ ڈائرکشن میں تو کوئی ایک مشہور تھے۔ اس میدان میں شیخ فتح لال کا نام ہمیشہ سر فہرست آتا رہا۔ لاہور کے این۔ ایم خواجہ نے جو مہاجر ہو کر لاہور واپس آ گئے بمبئی میں اپنے لیے قابلِ احترام جگہ پیدا کر لی تھی۔

لیکن ہندوستان میں مسلمان فن کاروں، ہدایت کاروں اور اداکاروں اور مصنفین اور گیت نگاروں کے مقابلے میں لاہور کی حیثیت پاسنگ برابر بھی نہ تھی۔ قیامِ پاکستان کے وقت ڈائرکٹروں میں شوکت حسین رضوی۔ سبطین فضلی۔ نذیر اور ڈبلیو۔ زیڈ احمد اداکاروں میں نور جہاں، سورن لتا، مینا۔ گیت نگاروں میں تنویر نقوی، میوزک ڈائرکٹرز میں غلام حیدر (مرحوم) رفیق غزنوی اور فیروز نظامی۔ سرمایہ دار اور فلمسازوں میں سیٹھ شیراز علی، حکیم جیسی ممتاز شخصیتیں بڑے شہانے خواب اور درخشاں نصب العین لے کر پاکستان آئیں۔ ان میں سے ارباب اقتدار نے کس کو "ففٹی ففٹی" کی بنا پر مدد دینے کا وعدہ کیا اور ان میں سے کون اپنا سا منہ لے کر رہ گیا اس کا ذکر بے سود ہے۔ آزاد ملک میں فلم کے لیے کسی نے بھی کوئی جگہ پیدا نہیں کی تھی نہ ہی ان کے ذہن میں قومی تعمیر اور صحت مند سامانِ تفریح کے لیے اس موثر ترین ذریعے کو استعمال کرنے کا پہلے تصور ہی آیا تھا۔

چنانچہ ڈیڑھ ایک برس تک تو متذکرہ مہاجرین کراچی اور لاہور کے درمیان شٹل بنے رہے۔ قرعہ فال آخرکار لاہور کے نام ہی نکلا۔ اس کا فلمی نشیمن ہی انھیں جائے پناہ دے سکتا تھا۔ ان کی حیثیت اس وقت ایک ایسے سپاہی کی تھی جس نے گولہ بارود خود ہی بنا کر اس سے لڑنا ہو۔ وہ بھی اپنا گھر جلا کر! اس وقت نہ ہی تو سرمایہ میسر آتا، نہ ہی ڈھب کے صناع ہاتھ لگتے۔ جنھیں فلم بنانے کا تجربہ تھا، انھیں تو ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھنا پڑا۔ شروع شروع میں ناکندہ تراشوں اور عطائیوں نے ڈو کیو نیٹرہ اور ایک ایک دو دو یا تین تین ریل کی فلمیں بنائیں۔ اور یوں پنچولی سٹوڈیو کا تالا کھلنے پر پاکستانی فلمسازی کے پرانے، اکلوتے مرکز کو وہی دورِ گذشتہ دیکھنا پڑا جس کے باعث یہ کبھی ہندوستانی فلمسازی میں رشک کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ اب تو بمبئی کا ہر فلمی چوبدار اور نامور ہستیوں کا خوشہ چین یا حواری بھی خاندانِ مغلیہ کا سچا چشم و چراغ بن کر اترانے لگا اور فلمی تخت پر بیٹھنے لگا۔

اس وقت فقط ڈائرکٹر پروڈیوسر نذیر ہی جراُت رندانہ لے کر پہلے میدان میں اترے۔ انھوں نے ٹوٹے پھوٹے سازوسامان کے ساتھ پہلے "پھیرے" (پنجابی) بنائی۔ یہ پکچر سلور جوبلی ہٹ ثابت ہوئی اور ایک لحاظ سے پاکستانی صنعتِ فلمسازی کی سنگِ بنیاد پڑی۔ موصوف نے حوصلہ شکن اور غیر یقینی حالات کی پروا نہ کرتے ہوئے یکے بعد دیگرے سُرعت سے فلمیں بنا بنا کر اور چلا چلا کر اپنے اُن مہاجر ساتھیوں کا حوصلہ بندھایا جن میں سے بیشتر اب تک ساحل پر کھڑے یا تو طوفان کا نظارہ کر رہے تھے یا ایک ایسی کشتی کی تلاش میں تھے جو ان کی جان بہر صورت بچانے کی گارنٹی دے!

ان دنوں شوکت حسین رضوی کی تازہ ترین بمبئی کی فلم جگنو ہر جگہ کامیابی کے جھنڈے گاڑنے کے باوجود انھیں آسانی سے سرمایہ فراہم نہ کرواسکی۔ بہرنوع دونوں، میاں اور بیوی (نورجہاں) نے مل کر شوری سٹوڈیو الاٹ کروا کر اس میں شاہ نور سٹوڈیو کی داغ بیل ڈالی اور یہاں اپنی ذاتی فلم "چن وے" بنائی۔ اس کی موسیقی جگنو ہی کی شہرت یافتہ لاہور کے مہاجر میوزک ڈائرکٹر فیروز نظامی نے ترتیب دی۔ یہ پکچر خاصی چلی۔

اس دوران میں شہزادہ مزاج سبطین فضلی نے بھی "دوپٹہ" بنانے کا عمل شروع کیا جو دو اڑھائی برس میں پایۂ تکمیل تک پہنچ گئی۔ اس میں نورجہاں اور فیروز نظامی کے علاوہ ایک ایسا مقامی آرٹسٹ بطور ہیرو پیش کیا گیا جو بعد ازاں پاکستان کے مقبول ترین آرٹسٹوں میں شمار ہونے لگا۔ یہ سدھیر (شاہ زمان) تھا۔

ڈبلیو۔ زیڈ احمد پہلے کی طرح پرشکوہ، وسیع پیمانے پر کام کرنے کے منصوبے تیار کرتے رہے حتیٰ کہ وہ حکومت سے نو دس لاکھ روپیہ لینے میں کامیاب ہوگئے۔ اس سے انھوں نے فلم کو آپریٹو کی بنا ڈالی۔ اس میں انھوں نے اپنے سابق اسسٹنٹ مسعود پرویز کو بطور ڈائرکٹر، مشہور میوزک ڈائرکٹر خورشید انور جنھوں نے "کڑمائی" "پروانہ" اور "اشارہ" میں خاصی شہرت حاصل کی تھی اپنی ٹیم میں شامل کر لیا۔ اس میں لاہور کے ایک اور خوب رو فن کار نجم الحسن شامل تھے۔ جنھیں دیویکا رانی کے ساتھ "جوانی کی ہوا" میں کام کرنے کا شرف حاصل ہوا تھا اور جو بعد ازاں کلکتہ اور لاہور کی چند فلموں میں ہیرو کا کام کر چکے تھے۔ قبل از پاکستان انھوں نے ایک فلم نہ صرف تصنیف کی بلکہ ڈائرکٹ بھی کی۔ نیلما۔ بیگم ڈبلیو۔ زیڈ احمد کو بھی کمپنی کا ایک اہم شعبہ بطور انچارج سونپا گیا۔ فلم کو آپریٹو نے اپر مال والا پنچولی سٹوڈیو الاٹ کروا کر سال میں بارہ تصاویر بنا کر دینے کا اعلان کر دیا۔ لیکن ان میں سے صرف ایک ہی پردہ سیمیں پر ظہور پذیر ہوئی۔ ادھر سکرین اینڈ ساؤنڈ سٹوڈیوز کے نام سے ایک اور نیم سرکاری ادارہ قائم کیا گیا۔ اسے بھی حکومت نے مدد کے طور پر نو لاکھ کے قریب روپیہ دیا لیکن یہ بھی لاہور کی قدیم اور فلمسازی کی مہلک ترین بیماری۔ عیش و عشرت۔ اور ناتجربہ کار اور بےخود غلط لوگوں کی نذر ہو گیا۔

اس عرصہ میں "شاردا" اور "مجبور" جیسی کامیاب فلموں کے مصنف، نذیر اجمیری بھی بمبئی سے یہاں چلے آئے۔ منشی دل پہلے ہی سے یہاں موجود تھے۔ اول الذکر نے بعد ازاں کئی فلمیں بنائیں لیکن ان میں سے بدقسمتی سے کوئی بھی کامیاب نہ ہوئی۔ البتہ منشی دل کے پاؤں بمبئی کی طرح پھر جم گئے۔ ان کی پہلی پنجابی فلم ہی خاصی کامیاب ہوئی۔

سبطین فضلی اور شوکت رضوی اپنی مخصوص طبائع حالات اور کاروبار کی نوعیت کے باعث پہلے کی طرح فلمیں بنانے سے قاصر تھے۔ پرانی پود میں سے کلکتہ کے داؤد چاند ہی سے اپنی قسم کی کامیاب فلمیں بنانے کی توقعات وابستہ تھیں یا انھوں نے بعد ازاں چند کامیاب فلمیں بنا کر پاکستانی صنعت فلمسازی کے استحکام میں کسی حد تک حصہ بھی لیا۔

شروع شروع میں بمبئی کے ہونہار "مشترکہ" ہدایت کار لقمان نے "شاہدہ" بنا کر انور کمال پاشا کا فلمی دنیا سے تعارف کرایا۔

اس جگہ چند مشہور ادیبوں اور فلم نویسوں کا ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا چونکہ لاہور میں جہاں فلمی صناعوں کا بے طرح کا فقدان تھا وہاں تربیت یافتہ فلم نویسوں کی کمی بھی بری طرح محسوس ہو رہی تھی۔ اس میں شک نہیں کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک

بندی وغیرہ یہاں واپس نہ آ سکے۔ یہ بیسیوں ایسے لاہور ہی فن کاروں کی طرح تھے جو یا تو سیاسی مجبوریوں کے تحت لاہور واپس نہیں آ سکتے تھے یا اپنی کے لیے بمبئی کی فضا زیادہ موزوں پاتے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو پاکستان فلمسازی کو مستحکم ہوتے اور اس کے پھلنے پھولنے کے امکانات کو دیکھ کر ہی یہاں آنے کے لیے پر تولنا چاہتے تھے۔ ایسے مصنفین میں سعادت حسن منٹو، تنویر نقوی اور کسی حد تک قدیر اجمیری ہی ایسے لوگ تھے جنہیں بمبئی چھوڑ کر لاہور آنا پڑا۔ ملکی صنعت فلمسازی کی زبوں حالی، ناتجربہ کار، غیر مستقبل اور فلمسازوں کے گھٹیا وطیروں اور ہتھکنڈوں، حکومت کی سرد مہری سے یہ سب نالاں تھے۔ اگر ان کا بس چلتا تو شاید واپس چلے جاتے۔

اگر ایک طرف ناتجربہ کار صناعوں کا گلہ تھا تو دوسری طرف سرمایہ کی کمی کی شکایت۔ اس صورت میں ملکی صنعت کی جس کا منبع و مرکز لاہور تھا (چونکہ یہاں کے علاوہ ملک بھر میں کہیں اور فلمیں نہیں بنتی تھیں) سب سے بڑا حریف، ہندوستانی فلموں کی بلا روک ٹوک ملک میں آمد اور نمائش تھی۔ اس حالت میں مجموعی طور پر چیونٹی کو ہاتھی سے ٹکرانا تھا۔ چنانچہ لاہور میں ۱۹۵۳ء تک سال میں اوسطاً چھ سات فلمیں ہی بن پائیں۔ مقابلتاً نہایت وسیع وسائل سے تیار شدہ ایسی فلموں کا پاکستانی فلموں کو پچھاڑ دینا یا زیادہ کامیاب ہونا عین فطرتی تھا۔ اس لیے ان کی کھلی درآمد پہ کسی نہ کسی طرح پابندی لگانے کے لیے پہلے تو حکومت سے اپیل کی گئی۔ اس کے بعد ہندوستانی فلموں کا پاکستانی فلموں سے شرح تبادلہ کرنے کے فارمولے وضع کئے گئے۔ ہندوستانی فلمساز حیران تھے کہ انہی کے آزمودہ اور شہرت یافتہ ہدایت کاروں اور فن کاروں کو پاکستان (لاہور) آ کر کیا ہو گیا تھا کہ اب وہ پہلی سی اعلیٰ فلمیں نہیں بنا سکتے تھے۔ اس کا جواب محدود وسائل، سرمایہ کی کمی اور محدود مارکیٹ تھا۔

جون ۱۹۵۴ء میں ہندوستانی فلمیں بند کروانے کے لیے بمبئی کی ایک فلم "جال" پر لاہور کی صنعت نے ہندوستانی فلموں کے بائیکاٹ کے طور پر اس کے خلاف ہڑتال شروع کر دی۔ یہ لہر ملک کے بڑے بڑے شہروں تک پہنچ گئی۔ وہاں بھی ہمدردی کے طور پر اس تصویر کے خلاف پبلک نے مظاہرے کیے۔ لاہور میں اس تحریک نے اتنا زور پکڑا کہ چند سرمایہ دار اور بارسوخ تقسیم کاروں کی مخالفت کے باوجود اس کے کارکنان اور رضاکاران نے اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے گرفتاریاں دینی شروع کر دیں۔ اس کے نتیجے میں دو تین ہفتوں تک نگارخانوں میں تالے پڑ گئے اور کئی فنکاروں کی ہمت جواب دینے لگی۔ اس تحریک کی قیادت بمبئی ہی کے مہاجرین نے کی۔ ان کے سربراہ کی غداری کے باوجود حکومت نے پانچ برس کے لیے ملکی صنعت کے تحفظ کے لیے، اسے فروغ دینے کی خاطر ہندوستانی فلموں پہ پابندی لگا دی کہ ایک پاکستانی فلم کے عوض میں ایک ہندوستانی فلم کو درآمد کرنے کی اجازت دی جائیگی۔ یعنی جب تک ایک پاکستانی فلم ہندوستان برآمد نہ کی جائے تب تک کوئی شخص وہاں سے فلم لا کر ملک میں نہیں چلا سکتا۔ اس کے ساتھ ایک اور شرط عائد کر دی گئی کہ ایسے کاروبار کے لیے فلمساز ہونا ضروری ہے۔ یعنی کوئی غیر فلمساز (تقسیم کار) پاکستانی فلم خرید کر اس کے عوض ہندوستان سے اس کے تبادلے میں فلم نہیں لا سکتا۔

اس کے نتیجے میں پاکستانی صنعت فلم سازی میں ایک نیا دور شروع ہوا ——— قریباً ہر تقسیم کار فلمسازی کے میدان میں کود پڑا۔ اس نے یا تو پیش کار کا یا فلمساز کا روپ دھار لیا۔ اور تو اور بعض نمائش کنندوں نے بھی فلمسازی کی طرف بلاواسطہ یا بالواسطہ رجوع کیا اور دیکھتے دیکھتے سال میں پہلے کی چھ یا سات فلموں کے برعکس چالیس کے لگ بھگ فلمیں بننے لگیں۔ آئے دن نئی فلموں کے مہورت ہونے اور پرانی فلمیں ختم ہونے لگیں۔ حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آیا جب کہ شہر کے چاروں سٹوڈیوز میں (جن میں ایک نیا

ایورنیو سٹوڈیو کا بعد ازاں اضافہ ہو گیا) شوٹنگ کے لیے مہینوں جگہ نہ مل سکتی۔ صنعت کے علاوہ باہر سے بھی سرمایہ بڑی آسانی سے ملنے لگا۔ دو تین برس تو پچاس فیصدی سے زیادہ فلمیں کامیاب بھی ثابت ہوئیں۔ انہی کامیاب کہ بظاہر انھوں نے ملکی صنعت میں ایک زرّیں باب کھول دیا۔

اس کامیابی کی ذمہ داری ہندوستانی فلموں پر کڑی پابندی اور دیگر عوامی تفریح کے ذرائع کی عدم موجودگی تھی۔ لیکن سب نگار خانوں سے ایک ہی قسم کی آواز آتی۔ (ملکہ سٹوڈیوز (سابق پنجولی ۱ـ اپر مال) شاہ نور (سابق شوری) اور پنجاب آرٹ (سابق پنجولی نمبر ۲۔ مسلم ٹاون) اور ایورنیو، جنھیں نئے سامان سے بھی لیس کیا گیا اور جن میں مزید توسیع بھی کی گئی) ..... بیٹھیے کی آواز ہر جگہ جیسے آغا حشر فلمایا جا رہا ہو۔ ایسی چند فلموں کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہونے کے باعث سو فیصدی متکلم اور گرجدار فلمیں بنانے کی ریت پڑ گئی۔ آغا حشر کے ڈراموں کو مختلف صورتوں میں پیش کیا جاتا۔ اس کے مکالمے مختلف جگہ تھوڑی بہت رد و بدل کر کے فٹ کیے جاتے یا دہی خاکے نیچے رکھ کر انھی پر کاربن پیپر کے ذریعے دوسرے کاغذ پر اتار لیے جاتے۔ حکیم احمد شجاع کے لڑکے انور کمال پاشا اس تجدید کے بانی تھے۔ ان کی پانچ چھ تصاویر دو آنسو، غلام، گمنام، قاتل، سرفروش وغیرہ نے اسی وجہ سے حیرت انگیز کامیابی کی اور اس کٹھن دور میں نذیر کے بعد ملکی صنعت کو خاصا سنبھالا دیا۔ اسی مدرسۂ فکر کے ایک ممتاز نمائندے، کہنہ مشق اور آزمودہ کار مصنّف شاطر غزنوی نے اس احیا میں نمایاں رول ادا کیا۔ اس عام روش میں، بلکہ پروڈیوسر اور ڈائرکٹر کے مطالبے کے سامنے ہر مصنّف کو اپنی بقا کے لیے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ اس قسم کی غیر فلمی فلموں نے اتنا زور پکڑا کہ ان میں نئے رجحانات کو پہنچنے کا تو کیا کہنا ابھرنے تک کا موقعہ نہ ملا۔ تین چار برس میں یہ نسخہ بھی بے کار ہو گیا۔ چونکہ چند فلمساز، ہدایت کاروں کے علاوہ جن میں شوکت حسین رضوی، سبطین فضلی اور ڈبلیو۔ زیڈ احمد شامل تھے، نا کندہ تراشی اور خود ساختہ ہدایت کاروں بلکہ ملکی صنعت کے لیے فلمسازی کی کوئی روایت موجود نہ تھی۔ نہ ہی ملک میں کوئی تربیت گاہ تھی جس میں فلم کے مختلف شعبوں میں تعلیم و تربیت دینے کے لیے انتظام ہوتا۔ اس لیے لاہور کو ـــــ پاکستان کی فلم سازی کو ـــــ تھیٹریکل فلموں کا ہی سہارا لینا پڑا۔ ان کی نظر میں آغا حشر اس کا بہترین نمائندہ تھا۔

ڈبلیو۔ زیڈ احمد کی روحی اور اشفاق ملک رسلے۔ آر کاردار کے بھانجے اور شاگرد ہونے ڈگر سے ہٹ کر پہلے پہل دو فلمیں ضرور بنائیں۔ روحی میں ایک ناقص ماحول کی پیداوار لڑکی کی داستان تھی۔ اس کا پس منظر غریب مہاجر تھے! اشفاق ملک کی پرواز ایک غریب لڑکے کی ترقی کرنے کے متعلق ایک نفسیاتی فلم تھی۔ روحی کی ناکامی کا سبب اس کی ڈاکیومنٹری طرز اور پروپیگنڈا کا انداز تھا۔ اس کے مکالمے اور موسیقی بھی خاصے کمزور تھے۔ اس کے برعکس پرواز گو کہ پہلے پلیس ان دی سن سے متاثر ہو کر بنائی گئی، سینریو، ٹریٹمنٹ، ٹیکنگ، ایڈیٹنگ اور ہدایت کاری کے اعتبار سے انتہائی اچھوتی فلم ہونے کے باوجود نفسیاتی مطالعہ ہونے کے باعث کاروباری نقطۂ نگاہ سے ناکام ثابت ہوئی۔ اسی موضوع کو قاتل میں تھیٹریکل انداز میں کاروباری اعتبار سے بڑی کامیابی سے پیش کیا گیا۔

اس اثنا میں "سہتی" نے ایک اور طرح ڈالی۔ یہ فارمولہ اور علاقائی فلم تھی۔ رومان، مار دھاڑ، ڈرامہ، کامیڈی، ناچ گانے وغیرہ کا ایک ورائٹی شو بنانا بھی مقبول ہوتا چلا گیا۔ دلّا بھٹی اور سردار اس کی معراج تھے۔

ان کی ایک ترقی یافتہ صورت قد بہ سے صحت مند ایکشن پکچر تھی۔ ان کا خالق کردار مکتبۂ فکر کا پاکستانی نمائندہ اشفاق ملک ثابت ہُوا۔ پرواز جیسے دقیق اور نازک موضوع کی ناکامی کے بعد انھوں نے مجبوراً کامیاب مغربی فلموں کے پاکستانی چربے نہایت محنت و کاوش اور دلآویز انداز میں یکے بعد دیگرے "باغی" اور "آخری نشان" میں پیش کیے۔ اس کے بعد انھوں نے یکلخت اپنا انداز بدل کر اپنے ماموں کی انتہائی کامیاب فلم "شاردا" کو دوبارہ اتنی ہی کامیابی سے پاکستانی قالب میں ڈھالا۔ لیکن اب وہ پھر ایکشن پکچر کی طرف اپنی نئی فلم "اجنبی" میں مراجعت کر رہے ہیں۔ باکس آفس کے ڈر نے اُنھیں اچھوتے موضوعات پر فلم بنانے سے روک دیا ہے اور غالباً "تقسیم کار" بھی اب ان کو ایکشن پکچر بنانے کا ماہر سمجھنے لگے ہیں۔ بہر حال اب بھی اشفاق ملک سے پاکستانی فلمسازی کی بہت سی اُمیدیں وابستہ ہیں۔

پچھلے تین چار برس سے اس صنعت میں جو بحران شروع ہُوا اُس کی سب سے بڑی وجہ وہ شرمناک سوقیانہ پنجابی فلمیں تھیں جن پر اب ان کے بنانے والے خود بھی نادم نظر آتے ہیں۔ یہ فلمیں "ماہی منڈا" اور "یکے والی" تھیں۔ ان میں جہاں کئی شوخ و چنچل بنانے اور سنوارنے کا موقعہ دیا گیا وہاں انھیں لغو اور ذو معنی مذاق کا مرقع بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا گیا۔ ایسی تصاویر نے ردحی۔ پرواز۔ قسمت۔ گلنار۔ وعدہ وغیرہ جیسی چند صاف ستھری فلموں کی قسم کو بننے سے روک دیا۔ مذکورہ پنجابی فلموں کی بے پناہ مقبولیت کے بعد فلم شدہ سٹوڈیو مندروں کی بجائے بھنگڑ خانوں اور فلم کمپنیاں عشرت گاہوں کا نقشہ پیش کرنے لگے۔ اور ہر فحش بیان کو بڑھ چڑھ کر فلمیں بنانے کا کسی نہ کسی صورت میں موقعہ ملنے لگا۔ ان سے ملکی صنعت فلم سازی پر کلنک کا ٹیکہ لگ گیا۔ اس کے باعث سوسائٹی میں اس کی رہی سہی عزت بھی جاتی رہی۔ فلمی پریس نے ایسے لوگوں کو جہاں بے نقاب کیا وہاں اس کا دامن خود بھی اس کے باعث داغدار ہو گیا۔ جب یہ حکومت کی توجہ اس زبوں حالی کی طرف مبذول کروانے کی کوشش کرتا تو وہ اس کی مدد کرنے کی بجائے اس سے متنفر ہوتی چلی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ یہاں کچھ اور اسباب بھی کارفرما تھے۔

یہ راز اب انکشاف طلب نہیں رہا۔

بہر نوع موجودہ بحران کے باوجود ملکی صنعت فلمسازی کا مستقبل تاریک نہیں۔ اگر اسے گذشتہ سیاسی بحران کا پَرتو اور انھی حالات و اسباب کی پیداوار کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ کوئی پودا ہوا میں نہیں اُگ سکتا۔ چنانچہ ملکی صنعت فلمسازی کی حالت بھی ایسی ہی تھی۔ اسے زمین کی ضرورت تھی۔

جو دریا خشک ہو چکے ہوں وہ مرغزاروں کی آبیاری کیا کریں گے۔ ہمارے پرانے فلمساز بھی اب زندگی کے اس موڑ پر پہنچ گئے ہیں کہ وہ نئے معرکے نہیں مار سکتے۔ نئے موضوعات پر نئے ڈھنگ اور نئی موج سے فلم بنانے کے لیے نئے دماغوں کی ضرورت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بزرگوں کے تجربات سے اس ضمن میں بھی فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ نہایت افسوس کا مقام ہے کہ بیشتر جدید فنکار بزعم خود غلط اور خود پسند لوگ دانشوری کا نقاب پہن کر اس حقیقت کو بھی فراموش کر گئے ہیں کہ انھیں چند بنیادی اصول سیکھنے کے لیے اب بھی اپنے فلمی بزرگ اساتذہ کی ضرورت ہے۔ دِیا دِیے سے جلتا ہے اور جب تک دِیے کا نعم البدل تلاش نہ کر لیا جائے پُرانی شمعوں کو بجھا دینا خود کو تاریکی میں دھکیل دینا ہے۔ ہمیں کبھی کبھی اس قسم کی

روشنی کی مدھم سی کرن دکھائی دے جاتی ہے۔ چند مذکورہ بالا فلموں کے علاوہ ہمیں کالا آدمی، وعدہ، زہرِ عشق، کوئل، فرشتہ اور سہیلی وغیرہ میں ایسی جھلکیاں ملتی ہیں۔ نئی پود میں سے بعض کو خاصی شدت سے احساس ہوتا جا رہا ہے کہ ہمیں اپنی فلموں میں جدت پیدا کرنی چاہیے۔ اشفاق ملک۔ ڈبلیو زیڈ احمد۔ خورشید انور۔ مسعود پرویز۔ ایس۔ ایم یوسف اور بعض دیگر گنے چنے ہدایت کاروں سے ملکی صنعت کو دوبارہ منظم کرنے کے لیے خاصی مدد مل سکتی ہے۔ فلم ڈیولپمنٹ کارپوریشن کو حقیقت کا جامہ پہنانے کے لیے اور اس سے حتی الامکان فائدہ اٹھانے کے لیے پاکستان فلم گلڈ اور پاکستان فلم پروڈیوسرز ایسوسی ایشن کے سرکردگان جب تک مخلصانہ طور پر ایڑی چوٹی کا زور نہیں لگا دیتے ملکی صنعت کا استحکام حاصل کرنا دیوانے کا خواب بن کر رہ جائے گا۔ حکومت سے مدد مانگنے سے پہلے ان کے طلبگاروں کو دیانت داری سے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھنا ہوگا کہ وہ اس کے کس حد تک مستحق ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد بھی لاہور نے صبیحہ جیسی بلند پایہ فنکارہ پیدا کی ہے، شمیم آرا اور نیر سلطانہ۔ علاؤالدین اور طالش جیسے آرٹسٹ کو جلا بخشی ہے۔ ماسٹر عنایت اور مصلح الدین وغیرہ میوزک ڈائرکٹر، سیف الدین سیف، منیر نیازی، فیض احمد فیض اور دیگر فنکاروں کو پنپنے کا موقعہ دیا ہے۔ لاہور میں اس وقت رضا میر۔ نبی احمد جیسے کیمرہ مینوں کے قابلِ فخر کارنامے دیکھے ہیں۔ یہیں پچھلے سال پریذیڈنٹس فلم ایوارڈ کے سلسلے میں قائم شدہ فلمی میلے کا آغاز ہوا (اکیس برس پہلے یہیں غالباً پی۔ سی بروا کی صدارت میں ایک فلم کانفرنس منعقد ہوئی تھی) اور سہیلی کو سال کی بہترین فلم قرار دے کر انعام دیا گیا۔ یہ فلم فنی اعتبار سے خواہ مطلوب حد تک بلند پایہ نہ ہو لیکن اسے ہندوستانی فلم فیسٹیول کے تحت ہندوستان میں بڑے بڑے شہروں میں ریلیز کرنے کے بعد اسے جتنی شاندار کامیابی ہوئی اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں جوہر کی اتنی کمی نہیں جتنی ہم سمجھتے ہیں۔ صرف ایسے نگینوں کو تلاش کرکے تراشنے کی ہے جو بیکار سمجھ کر ایک طرف پھینک دیئے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ ان سے بہتر کئی اور تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ ایسے ہی ہمارے ہی کئی بتوں کی روشنی ہمیں اب ہندوستانی فلموں میں خیرہ کئے دیتی ہے۔

ضرورت صرف تنظیم، شعور اور صنعت کو فروغ دینے کے لیے متحدہ جدوجہد اور جرأت رندانہ کی ہے — دراصل لاہور کی صنعت فلم سازی کا نشاۃ الثانیہ اب شروع ہوا ہے۔ آندھی اور جھکڑ چلنے کے بعد ہی گنگناتی ہوئی بارش ہوتی ہے اور اس کے بعد آسمان میں سات رنگا جھولا پڑ جاتا ہے!

اطبّاء

(عہدِ مغلیہ سے دورِ حاضر تک)

حکیم محمد موسیٰ

اس تاریخی مضمون کو جیسا کہ ناظرین ملاحظہ فرمائیں گے میں نے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ حصہ اول عہدِ مغلیہ سے پہلے کے اطباء، حصہ دوم عہدِ مغلیہ اور سکھوں کے عہد کے اطباء، حصہ سوم انگریزی عہد کے اطباء، حصہ چہارم موجودہ عہد کے زندہ اطباء۔

۱۔ عہدِ مغلیہ سے پہلے کے اطباء

ضیاء الدین عبدالرافع | یہ غزنوی خاندان کے آخری سلطان خسرو ملک بن خسرو شاہ کے عہدِ حکومت (۵۵۵ھ/۱۱۶۰ء تا ۵۸۲ھ/۱۱۸۶ء) میں لاہور میں موجود تھے۔ اس عہد کے تذکرہ نویس "محمد عوفی" نے لباب الالباب میں ان کا حال لکھا ہے جو بحوالہ "مآثرِ لاہور" درج ذیل ہے:-

"طب میں ماہر کامل اور پہلے دربار خسرو ملک میں معزز و محترم تھا۔ ایک رسالہ "جلالیہ" نامی بادشاہ سے معنون کیا تھا۔ نہایت قادر الکلام شاعر مانا گیا ہے۔ ایک قصیدہ مدح امتحان کے طرح پر بقول عوفی ایسا لکھا کہ کسی اور سے بن نہ پڑا۔"[1]

مطلع ہے ؎

جاناں بپوش بر گلِ رخسار آستیں   ورنہ خوں مرا مخواہ چو گلنار آستیں

خسرو ملک کے زوال کے بعد ضیاء الدین عبدالرافع کو معز الدین غوری معروف بہ شہاب الدین کے عہد میں بہت زیادہ فروغ نصیب ہوا۔[2]

---

[1] مآثر لاہور ص۱۹۹ بحوالہ لباب الالباب ج ۲ ص۲۲۳

[2] بحوالہ مذکور

رائے گھمن عرف سلودہرہ

"تذکرہ قطبیہ" (فارسی) حضرت عبدالجلیل قطب العالمؒ کے حالات و کرامات پر مشتمل ہے۔ اس کے مؤلف شیخ جمال الدین ابوبکرؒ برادرِ قطب العالمؒ ہیں۔ اس تذکرے میں حکیم رائے گھمن کا ذکر یوں ہوا ہے کہ حضرت موصوف بیمار ہو گئے اور آپ کے مرید حکیم صاحب مذکور کو جو مسیحائے زماں تھے، علاج کے لیے لے آئے۔ انھوں نے یہ قاطع بلغم نسخہ تجویز کیا۔ زنجبیل خشک، زنجبیل تر، چراشتہ، قرنفل، تربد[1]۔

حضرت عبدالجلیل چوہڑ شاہ بندگیؒ سلطان بہلول لودھی کے عہد میں لاہور وارد ہوئے اور سلطان سکندر لودھی کے دورِ حکومت میں ۹۱۰ھ میں فوت ہوئے لہٰذا رائے گھمن کو سلاطینِ لودھی کے عہد کا طبیب سمجھنا چاہیے۔

۲۔ مغلوں اور سکھوں کے عہد کے اطبّاء

نجیب الدین ہمام

حکیم ہمام، حکیم ابوالفتح گیلانی متوفی ۹۹۷ھ کے برادرِ خورد تھے۔ بڑے تجربہ کار اور فاضل طبیب تھے۔ ان کو دربارِ اکبری میں خاص مقام حاصل تھا، دربار کی مجلسِ مقننہ کے ممبر تھے، منصب حاصل تھا۔ تزک میں جہانگیر نے ان کا ذکر بہت اچھے لفظوں میں کیا ہے۔ حکیم ہمام نے دو ماہ بعارضہ دق بیمار رہ کر ۶ ربیع الاوّل ۱۰۰۴ھ کو بمقام لاہور انتقال کیا اور اپنے بھائی حکیم ابوالفتح کے پاس "حسن ابدال" میں مدفون ہوئے۔ ان کے لڑکے حکیم حاذق اور حکیم خوشحال تھے۔

جلال الدین مظفر اُردستانی

یہ اُردستان قسمت اصفہان میں پیدا ہوئے، نو عمری میں شاہ طہماسپ کے طبیب مقرر ہو گئے۔ جالینوسِ دوراں ہونے کے مدعی تھے۔ طب کے حصۂ عملی میں آپ کو بہت زیادہ ملکہ حاصل تھا، نہایت خوبصورت تھے، جب شاہ طہماسپ کے دربار میں پہنچے تو ابھی داڑھی نہ نکلی تھی، شاہِ موصوف نے آپ کو دیکھتے ہی یہ کہا ع

"خوش طبیبے است بیا تا ہمہ بیمار شویم"

حکیم مظفر زمانہ شباب ہی میں ہندوستان آ گئے تھے۔ عہدِ اکبری میں دو صدی منصب حاصل تھا۔ شہنشاہ جہانگیر نے "تزک" میں اس طبیب کی لیاقت و حذاقت کا حال یوں بیان کیا ہے:۔

> "اس کا معاصر حکیم یادعلی علم و فضیلت میں اس سے بڑھ کر تھا۔ معالجہ، مبارک قدمی، صحیح مشورہ
> اور عادات و اطوار کی پاکیزگی میں حکیم جلال الدین مظفر اُردستانی حکیم یادعلی سے بڑھ کر تھا اور
> اس بات میں دنیا کے دوسرے اطباء و حکماء کو بھی حکیم مظفر سے کوئی مناسبت نہیں تھی۔
> اچھا طبیب ہونے کے علاوہ اس میں بہت سی اور خوبیاں تھیں۔ مجھ سے اخلاص رکھتا تھا[2]"

حکیم موصوف نے جب لاہور میں اپنا رہائشی مکان بنایا تھا تو آپ کی درخواست پر جہانگیر بادشاہ آپ کے مکان پر تشریف لائے تھے۔ تزکِ جہانگیری میں مسطور ہے:۔

> "اس نے لاہور میں گھر بنایا تھا تو مجھ سے درخواست کی تھی کہ اس کے گھر جانے کا شرف

---

[1] تذکرۂ قطبیہ مطبوعہ لاہور ص۴۳ [2] ترجمہ تزکِ جہانگیری مطبوعہ لاہور ص۱۴۶

اسے بخشوں۔ میں نے اس سے گہرا ربط خاطر رکھنے کی وجہ سے اس کی درخواست قبول کر لی تھی۔[1]

حکیم جلال الدین مظفر سِل کے عارضہ میں بیس سال مبتلا رہے۔ آخر یہی مرض ان کی موت کا سبب بنا۔ چونکہ کثرتِ جریانِ خون کے سبب فوت ہوئے تھے اس لیے شبہ ہوا کہ شاید کسی نے زہر دے دیا ہے۔ قلیج خاں حاکمِ لاہور کو اس سے مطلع کیا گیا تو اس نے اس امر کی پوری پوری تحقیقات کی جس کے بعد ان کو سپردِ خاک کیا گیا۔[2] تاریخ وفات ۲۲ جمادی الاولیٰ ۱۰۱۵ھ ہے ——— ان حکیم صاحب نے کوئی قابل اولاد اپنے پیچھے نہیں چھوڑی۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حکیم مظفر آج سے پونے تین سو سال قبل فصد کا سخت مخالف تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صاحبِ رائے اور نابغہ تھا۔

علی گیلانی یہ گیلان کے رہنے والے تھے؛ انھوں نے طب اپنے ماموں حکیم الملک شمس الدین اور حکیم فتح اللہ شیرازی سے پڑھی تھی نکبت و افلاس کے مارے واردِ ہند ہوئے مگر آتے ہی شاہی ملازمت مل گئی جس کے سبب باقی تمام عمر آرام و آسائش سے بسر ہوئی۔ نہایت ذہین، تجربہ کار اور فاضل یگانہ طبیب تھے۔ دورِ مغلیہ میں اس مقام کا ذہین طبیب و علامہ کوئی نہیں ہوا۔ لکھا ہے :۔

> "شروع شروع میں جب وہ دربار میں آیا ہے تو بادشاہ کے حکم سے اس کی فراست و تجربہ کاری کے امتحان کی غرض سے مختلف قسم کے قارورے اس کو دکھائے گئے جن میں تندرست اور مریض آدمی اور گائے نیز گدھے کا قارورہ بھی تھا۔ حکیم نے قارورے دیکھ کر سب کے صحیح صحیح حالات بیان کر دیے۔ اس وقت سے بادشاہ کی نگاہ میں اس کی بہت وقعت ہو گئی۔"[3]

حکیم علی گیلانی، اکبر کے عہدِ حکومت میں لاہور میں رہے تھے اور انھوں نے یہاں اپنے مکان میں ایک عجیب و غریب حوض بنایا تھا جس کو دیکھنے کے لیے اکبر بادشاہ بھی گئے تھے۔ یہ حوض ۳۹ جلوس مطابق ۱۰۰۲ھ میں تعمیر کیا تھا، اس کا عرض و طول ۲۰ × ۲۰ تھا اور گہرائی تین گز تھی۔ حوض کے اندر ایک مختصر سا کمرہ تھا جس میں دس بارہ آدمی بخوبی بیٹھ سکتے تھے، کمرہ خوب روشن تھا لیکن ہوا کا رُخ اس طرح قائم کیا تھا کہ پانی کا ایک قطرہ بھی کمرے کے اندر نہ جا سکتا تھا۔ کمرہ ضروری ساز و سامان سے آراستہ رہتا تھا۔ "مآثر الامرا" میں حوض اور اکبر کے سیر کرنے کا حال یوں لکھا ہے :۔

> "در کنج حوض سرے بہ آب فرو بردہ دو سہ زینہ پائیں رفتہ بداں خانہ در آمد بسیار بہ تکلف آراستہ در غایت روشنی جائے دہ، دوازدہ کس نشست، فرش خواب و رخت پوشش مہیا و حاضری طعام موجود، چند جلد کتاب در طاق ہا گذاشتہ، ہوائی گذاشت کہ یک قطرہ آب اندرون در آید و چوں بادشاہ لختے درنگ فرمود عجب حالتے بر مردم بیروں رو آورد۔"[4]

لاہور والے اس حوض کا ذکر جہانگیر نے "تزک" میں بھی کیا ہے۔ اسی طرح کا ایک حوض حکیم علی نے اکبر آباد (آگرہ) میں بھی تیار کیا تھا جس کو دیکھنے شہنشاہ جہانگیر گئے تھے، یہ بھی اپنے والد کی طرح حوض میں سے ہو کر کمرے میں گئے اور کچھ دیر ٹھہر کر باہر آئے اور حکیم صاحب کو دو ہزاری کا منصب عطا کیا۔[5]

---

[1] توزک صفحہ ۱۴۶ [2] توزک صفحہ ۱۴۷ [3] اطبائے عہدِ مغلیہ صفحہ ۱۳۵ [4] مآثر الامرا جلد اوّل صفحہ ۵۷۵ [5] توزک جہانگیری صفحہ ۱۴۷

حکیم علی نے عہدِ اکبری میں شیخ ابنِ سینا کی کتاب "القانون" کی شرح لکھی تھی۔ اس کے مطالعہ سے بے اختیار ان کی فضیلتِ علمی کا قائل ہونا پڑتا ہے ـــــ آپ کا مذہب اثنا عشری تھا۔ آسمانِ علم کا یہ ماہِ کامل ۵ محرم ۱۰۱۸ھ جمعہ کے دن ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گیا۔[1] راقم السطور کو معلوم ہوا ہے کہ حکیم علی کا دورانِ گرامی لکھرٹی پورہ تحصیل کولگام ضلع اننت ناگ (مقبوضہ کشمیر) میں اب بھی موجود ہے۔

بلینا

آپ نے معالجات پر "مجرباتِ حکیم بلینا لاہوری" کے نام سے ۹۹۶ھ میں ایک کتاب تالیف کی۔[2] ـــــ مختلف تذکروں اور تاریخوں میں عہدِ اکبری کے اطبّا میں حکیم بلینا سرہندی کا ذکر مرقوم ہے جن کے فرزند نواب مقرب خاں بڑے لائق طبیب اور جرّاح تھے۔ ان پر جہانگیر بہت مہربان تھا۔ اس نے ان کو کیرانہ میں جاگیر دی تھی۔ حکیم مقرب خاں نے امراضِ چشم پر ایک رسالہ بنام "انیس الکحال" لکھا تھا جس کا اردو ترجمہ حکیم شہزادہ احمد اختر کیرانوی نے کیا جو ۱۸۹۹ء میں دہلی سے شائع ہوا۔

کتاب "مجرباتِ حکیم بلینا لاہوری" بھی عہدِ اکبری کی تصنیف ہے۔ اس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ حکیم بلینا سرہندی کا مولد لاہور ہو گا بعد میں سرہند جا بسے ہوں گے ـــــ ہمدردِ صحت کراچی میں اس کتاب کا ایک سطری تعارف لکھنے والے صاحب کا ماخذ غالباً پیرس کے قومی کتب خانے کے فارسی مخطوطات کی فہرست ہے۔ اگر اصل کتاب صاحبِ مضمون کے سامنے ہوتی تو ضرور مزید روشنی ڈالتے جس سے کسی نتیجے پر پہنچ کر یقین کے ساتھ کہا جا سکتا کہ حکیم بلینا سرہندی ہی لاہور کے رہنے والے تھے۔

عبدالوہاب

یہ حکیم علی گیلانی کے بیٹے تھے۔ تزکِ جہانگیری میں لکھا ہے کہ انھوں نے لاہور کے سادات پر دعویٰ کیا تھا کہ میرے والد حکیم علی نے ان کے پاس اسّی ہزار روپے بطور امانت رکھے تھے مگر اب یہ دینے سے انکاری ہیں۔ سادات نے سختی سے الزام سے انکار کیا اور قاضی القضاۃ کے ذریعے بادشاہ تک خبر پہنچی تو اس نے آصف خاں کو اس معاملہ کی تحقیقات پر مامور کیا اور یہ ہدایت کی کہ

> "جھگڑے کی تہ تک پہنچنے کے لیے اس قدر کوشش اور باریک بینی سے کام لے کہ صحیح صورتِ حال معلوم کرنے میں قطعاً کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہ رہے۔"

پھر لکھا ہے:

> "اگر وہ امرِ واقعہ کو پوست کندہ طریقے سے معلوم نہ کر سکے گا تو ہم اپنے حضور میں تحقیقات کرائیں گے۔ حکیم زادہ نے یہ بات سنی تو گھبرا کر اپنے کچھ دوستوں کو مصالحت کرانے کے لیے کہا اور خواہش ظاہر کی کہ وہ سادات سے کہیں کہ تحقیقات میں آصف خاں سے تعاون نہ کریں میں دعویٰ سے دست برداری اور اپنے حق سے درگزر کرنے کی تحریر لکھ دیتا ہوں۔ آصف خاں اس کی طلبی کے لیے آدمی بھیجتا رہا لیکن وہ جھوٹا ہونے کی وجہ سے خائف ہو کر مختلف بہانوں سے حاضر ہونے سے کتراتا رہا۔"[3]

آخر کار آصف خاں نے جبراً طلب کیا اور پوچھ گچھ کی تو اس نے اپنی جعل سازی کا اعتراف کر لیا۔ آصف خاں نے اس کا تحریری بیان بادشاہ کو بھیج دیا تو بادشاہ نے اس کو اپنی نگاہوں سے گرا دیا اور اس کے منصب اور جاگیر میں تبدیلی کر دی ـــــ حکیم عبدالوہاب کے اس سے

---

[1] تزک صفحہ ۱۶۷ [2] ہمدردِ صحت کراچی جون ۱۹۶۰ء صفحہ ۷ [3] تزکِ جہانگیری صفحہ ۶۲۹

زیادہ حالات نہیں مل سکے۔ ماثرالامرا میں بھی اتنا ہی لکھا ہے۔

علیم الدین انصاری (وزیر خاں)

یہ چنیوٹ کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد کا نام عبداللطیف اور دادا کا اسم گرامی حسام الدین تھا۔ عربی اور فلسفہ کی تکمیل کے بعد اس وقت کے مشہور طبیب حکیم داوی سے علم طب پڑھا اور تکمیل فن کے بعد بیس[۲] برس کی عمر میں لاہور آ گئے۔ اس وقت جہانگیر کا عہد حکومت تھا۔

حکیم علیم الدین کچھ عرصہ لاہور قیام کرنے کے بعد دہلی چلے گئے مگر جب وہاں بھی روزگار کا کوئی بندوبست نہ ہو سکا تو آگرے روانہ ہو گئے اور وہاں تھوڑے عرصے ہی میں آپ کا مطب بہت مشہور و مقبول ہو گیا۔ شہزادہ خرم (شاہ جہاں) کی ملازمت مل گئی۔ رفتہ رفتہ آپ بادشاہ، شہزادگان اور تمام بیگمات کے معالج بن گئے اور اس درجہ رسوخ حاصل ہوا کہ "دیوان بیوتات" پھر "میر ساماں" کے مراتب حاصل کیے اور بعد میں "دیوان" کے بلند پایہ عہدے پر فائز ہوئے۔ شہزادہ خرم آپ کی بے حد عزت کرتا تھا اور حکیم صاحب بھی اس کے بڑے وفادار تھے حتیٰ کہ جب جہانگیر اور شاہجہان کی مخالفت ہوئی تو آپ نے شاہجہان ہی کا ساتھ دیا۔

دراصل حکیم علیم الدین کو مکمل عروج اس وقت حاصل ہوا جبکہ ان کے علاج سے ملکہ نورجہاں صحت یاب ہوئی۔ اس معالجے کا مختصر حال یہ ہے کہ نورجہاں کو "عرق النسا" کا مرض لاحق ہوا جو کسی طبیب کے علاج سے ٹھیک نہ ہوتا تھا۔ اس سلسلہ میں حکیم علیم الدین کو بھی علاج کے لیے طلب کیا گیا لہٰذا انھوں نے شافی برحق کے حضور میں ملکہ کی شفایابی کے لیے دعا کی اور یہ منت مانی کہ اگر میرے علاج سے نورجہاں شفایاب ہو جائے تو انعام و اکرام کے طور پر جو دولت مجھے ملے گی اس سے ایک مسجد تعمیر کراؤں گا۔

عرق النسا یعنی "رینگن باد" کے درد کا بہترین علاج رگ عرق النسا کی فصد ہے چنانچہ حکیم صاحب نے کمال ہوشیاری کے ساتھ ملکہ کو بالکل بے خبر رکھ کر فصد کیا، تھوڑا سا خون بہتے ہی ملکہ کو صحت ہونی شروع ہو گئی۔ نورجہاں نے لاہور آ کر غسل صحت کیا تو حکیم صاحب کو ایک لاکھ روپے کا خلعت مرحمت کیا اور سات لاکھ روپے نقد عطا فرمائے نیز اپنا زیور بھی اتار کر حکیم صاحب کو دے دیا۔ اس پر حرم کی بیگمات اور کنیزوں نے اپنے زیورات اتار کر ملکہ پر نچھاور کر دیے۔ ملکہ نورجہاں نے یہ تمام زیورات بھی حکیم صاحب کو بخش دیے۔ ان سب انعام و اکرام کو جمع کر کے قیمت لگائی گئی تو بائیس لاکھ روپے ہوئے۔ حکیم علیم الدین وزیر خاں نے منت پوری کرنے کے لیے اس رقم سے لاہور میں مسجد وزیر خاں تعمیر کرائی، جو مغلیہ فن تعمیر کا بہترین اور شاندار نمونہ ہے۔

۱۰۳۷ھ میں جب شاہجہان سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس نے حکیم صاحب کی خدمات جلیلہ کے پیش نظر خلعت فاخرہ اور خنجر مرصع مرحمت فرمایا۔ ایک گھوڑا با زین مطلا، ایک اونٹ، ایک علم، ایک نقارہ اور ایک لاکھ روپے نقد انعام دیے اور پانچ ہزار ذات و تین ہزار سوار کے منصب جلیلہ و عظیمہ پر سرفراز فرمایا[۱]۔

پنجم سال جلوس میں جب فتح خاں دولت آبادی نے خراج ادا کرنا بند کر دیا تو شاہجہان نے حکیم صاحب کے سواروں میں اضافہ کر کے ان کا منصب پنج ہزاری ذات و پنج ہزار سوار کر کے دولت آباد کی تسخیر اور فتح خاں کی سرکوبی کے لیے دس ہزار سواروں کے ساتھ برہان پور سے روانہ کیا۔ فتح خاں کو حکیم صاحب کی روانگی کا علم ہوا تو ڈر گیا اور اپنے بڑے بیٹے کے ہاتھ بہت سے تحائف

---

[۱] بادشاہ نامہ جلد اول حصہ اول ص ۱۱۷

دے کر دربار میں بھیج دیا۔ اس پر حکیم صاحب کو لوٹ آنے کا حکم ملا۔ بادشاہ نے ان کی اس مبارک قدمی پر خوش ہو کر "وزیر خاں" کا خطاب دیا اور صوبہ لاہور کا ناظم مقرر کر کے لاہور بھیج دیا۔ حکیم علیم الدین انصاری المخاطب بہ وزیر خاں متواتر سات برس اس عہدے پر مامور رہے۔

۱۰۵۰ھ کو جب شاہجہان لاہور سے گزر رہا تھا تو حکیم صاحب نے نہایت قیمتی تحفے اس کی خدمت میں نذر کیے۔ بادشاہ نے اسی وقت ایک خلعت خاصہ، ایک گھوڑا مع طلائی سامان کے اور ایک ہاتھی انھیں عنایت فرما کر "صفدر خاں" کی جگہ آگرے کا صوبیدار مقرر کر دیا۔

حکیم صاحب کو آگرے میں حکومت کرتے تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ بعارضہ قولنج بیمار ہو کر ۱۲ رجادی الاولی ۱۰۵۱ھ کو اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے[1] نواب وزیر خاں کے دو بیٹے تھے۔ سعید خاں اور صلاح الدین خاں میر توزک۔

وزیر خاں کا نام اکثر کتابوں میں علم الدین اور بعض میں علیم الدین دیکھنے میں آیا ہے۔ علیم الدین چونکہ زیادہ موزوں اور بامعنی ہے اس لیے میں نے یہی لکھا ہے۔ حضرت مولانا سید ابوالحسنات محمد احمد قادری خطیب مسجد وزیر خاں کا خیال تھا کہ وزیر خاں کے نام کو علیم الدین پڑھنا چاہیے۔

ستی النساء یہ خاتون ملک الشعرا طالب آملی متوفی ۱۰۳۶ھ کی بہن اور حکیم رکنا کاشی متوفی ۱۰۶۶ھ کی بھاوج تھی۔ اس کی شادی "نصیرائی کاشی" سے ہوئی تھی جو "مسیح کاشی" کا بھائی اور مرزا صائب متوفی ۱۰۸۰ھ کا استاد تھا۔ ستی النساء جہانگیر کے زمانے میں طالب آملی کو ملنے کے لیے ہندوستان آئی تھی۔ اس کا وطن "آمل" تھا جو "مازندران" کا ایک شہر ہے نصیرائی کاشی کی وفات کے بعد ستی النساء ممتاز محل زوجہ شاہجہان کی پیش خدمت مقرر ہو گئی۔ "ممتاز محل" نے اس کی لیاقت اور فنِ طب کی مہارت سے متاثر ہو کر اس کو "مہرداری" کی خدمت تفویض کر دی۔ اس کو قرآن مجید زبانی حفظ تھا، فنِ قرأت اور فارسی ادب سے خوب واقف تھی لہٰذا جہاں آرا بیگم دختر شاہجہان کی معلمہ مقرر کی گئی۔ ممتاز محل کے انتقال کے بعد شاہجہان نے اس کو حرمِ شاہی کا صدرِ کل یعنی مدار المہام بنا دیا۔ ستی النساء وفات سے قبل لاہور میں قلعہ کے باہر اپنی قیام گاہ میں مقیم تھی۔ ۲۶ اور ۲۷ ذی الحجہ ۱۰۵۶ھ کی درمیانی شب کو اس کی طبیعت بگڑ گئی۔ حکیم مسیح الزماں اور رحمت خاں نے علاج شروع کیا مگر چند ساعت ہی میں اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

شاہجہان ستی النساء کا بے حد احترام کرتا تھا، اس کی وفات سے بہت دلگیر ہوا۔ دس ہزار روپے اس کی تجہیز و تکفین کے لیے خزانۂ عامرہ سے خرچ کرنے کا حکم دیا۔ لاہور میں بطور امانت دفن کیا گیا۔ تیس ہزار روپے کی لاگت سے اس کا مقبرہ آگرے میں ممتاز محل کی قبر سے مغرب کی طرف جلوخانہ کے قریب بنا کر، ایک سال بعد اس کی لاش کو لاہور سے لے جا کر وہاں دفن کیا گیا[2]

مسیح الزماں صدرا مسیح اللہی یہ فخر الدین شیرازی حکیم کے فرزند تھے، ان کا سلسلہ نسب حارث بن کلدہ ثقفی سے ملتا ہے[3] حارث عرب کے مشہور طبیب تھے اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف بھی ہوئے تھے۔ حکیم صدرا ۱۰۱۱ھ میں ہندوستان آئے اور حکیم علی گیلانی سے رشتہ تلمذ قائم کیا، نہایت ذہین و فطین تھے۔ آپ کی فنی قابلیت "بادشاہ نامہ" کی حسب ذیل عبارت سے خوب واضح ہوتی ہے:-

---

[1] شاہجہان نامہ جلد دوم ص۲۶۳ [2] اطبائے عہد مغلیہ ص۱۰۵ [3] شاہجہان نامہ جلد سوم ص۲۸۶

"و علم طب از حکیم محمد باقر پسر حکیم عماد الدین محمود در ایران اندوختہ بہ ہندوستان آمدہ و دریں جا نیز پیش حکیم علی گیلانی کہ سرآمد اطبائے عہد دولت مہد حضرت عرش آشیانی بود تلمذ نمودہ۔"

شہنشاہ جہانگیر نے ۱۰۱۸ھ میں حکیم صدرا کو پانصدی ذات و سی سوار کے منصب پر فائز کر کے "مسیح الزماں" کا خطاب عنایت کیا۔[1] پھر تین ہزاری منصب حاصل کر لیا جسے شاہجہان نے بحال رکھا۔[2] حکیم صدرا شعر بھی خوب کہتے تھے۔ جہانگیر کی فرمائش پر ایک رباعی کہی جس کے صلے میں ایک ہزار طلائی مہریں جہانگیر نے عنایت کیں وہو ہذا ؎

داریم اگرچہ شغل شاہی در پیش	ہر لحظہ کنیم یاد درویشاں بیش
گر شاد شود ز ما دل یک درویش	آں را شمریم حاصل شاہی خویش

آپ کا تخلص "مسیح الملی" تھا۔ مذہب امامیہ رکھتے تھے اور اپنے ہم مذہبوں میں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ آخر عمر میں شاہی ملازمت چھوڑ کر لاہور میں مقیم ہو گئے تھے۔ موسم گرما میں کشمیر چلے جاتے اور سرما میں لاہور رہتے۔ جب کسی ضرورت کے تحت دربار میں بلائے جاتے تو چلے جاتے۔ اٹھارھویں جلوس شاہجہانی میں بیگم صاحبہ کے علاج میں کوشاں رہے تو سالیانہ میں دس ہزار کا اضافہ کر کے پچاس ہزار کر دیا گیا اور دس ہزار روپے انعام میں دیے گئے۔ ۱۰۶۱ھ مطابق ۲۴ سنہ جلوس بمقام کشمیر فوت ہوئے۔

احمد بن عبد اللہ لاہوری

شیخ فاضل احمد بن عبد اللہ بن علی محمد بن علامہ جلال الدین محمد بن اسعد صدیقی دوانی اپنے وقت کے سرآوردہ علمائے فنون حکمیہ میں سے ایک تھے۔ اصل وطن ان کا "دوان" تھا۔ ان کے والد نے پشاور آ کر سکونت اختیار کر لی تھی۔ حکیم احمد پشاور میں پیدا ہوئے اور وہیں تحصیل علوم کی خصوصاً طب میں کمال پیدا کیا۔ پھر ناجیہ علاقہ سیالکوٹ میں چلے گئے اور وہاں درس و تدریس میں مشغول رہے۔ مریضوں کا علاج پوری توجہ سے کرتے تھے اور امرا کو غربا پر ترجیح نہیں دیتے تھے۔ سالِ وفات ۱۰۷۰ھ ہے۔[3] لاہور میں ان کے قیام کا زمانہ نہیں بتایا، صرف نام کے ساتھ لاہوری لکھا ہوا ہے۔

انتون مسیح فرنگی

یہ نواب امانت خاں میرک معین الدین ناظم لاہور کے عہد میں بڑے مقبولِ خاص و عام تھے۔ حکیم نور محمد والدِ حکیم محمد اسحاق نے ان سے طب کی تحصیل کی تھی۔[4] قریباً ۱۰۸۶ھ میں امانت خاں لاہور میں مقرر ہوئے تھے۔

نکولاس منوچی

یہ "وینس" اٹلی کا باشندہ تھا، سیاحت کرتا ہوا براہِ "اصفہان" ۱۶۵۵ء میں "سندھ" پہنچا۔ پھر "سورت" گیا اور وہاں سے آگرے اور یہاں سے دہلی آ گیا۔ اس نے لکھا ہے کہ "میں نے اپنی عمر کا بہترین حصہ ہندوستان میں اور وہ بھی مغلیہ دربار میں بسر کیا ہے۔"

نکولاس منوچی نے ہندوستان سے واپس جانے کے بعد اپنی عمر کے آخری ایام میں اپنے سفر اور قیام ہند کے حالات اور واقعات بنام "سٹوریا ڈو موگر" لکھے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ ملک راج شرما نے "ہندوستان عہدِ مغلیہ میں" کے نام سے کیا جو پانچ حصوں میں لاہور سے

---

[1] تزک جہانگیری ص ۱۷۷ [2] شاہجہان نامہ جلد دوم ص ۳۲۲ [3] نزہت الخواطر عربی جلد ۵ ص ۵۵ بحوالہ تذکرۃ العلماء
[4] رجز فغفوری ص ۱۳۷ و ص ۱۴۵

شائع ہوا۔ اس سفرنامے میں "نکولاس" نے جابجا اپنی طبابت کے واقعات بھی لکھے ہیں۔ اس کا بیان ہے کہ میں شہزادہ شاہ عالم کا طبیب خاص رہا ہوں مگر یہ شخص بہت زیادہ فسانہ طراز اور کاذب تھا؛ در اس سفرنامے کے اکثر مقامات مؤلف کے متعصب اور فاسد ذہن کی عکاسی کرتے ہیں۔ اسی لیے متعصب ہندو ملک راج شرما نے اس کا ترجمہ کرنے کی زحمت اٹھائی۔

ڈاکٹر نکولاس نے لکھا ہے کہ جن دنوں محمد امین خاں لاہور کا حاکم تھا، میں لاہور آیا اور "برق انداز خان" والا مکان کرایہ پر لے کر رہنے لگا اور اپنے ملازموں کو کہہ دیا کہ جو شخص میری بابت پوچھے اسے کہہ دیا کرو کہ "یہ ایک فرنگی طبیب ہیں" ـــــ اس کے مطب کی ابتدا یہیں سے ہوئی مگر یہ شخص طب با قاعدہ پڑھا ہوا نہ تھا، صرف چند ٹوٹکے اس کا سرمایہ افتخار رکھتے۔ یہ اپنی رطب البیانی اور طلاقت لسانی کے ذریعے عوام کو اپنی حذاقت کا قائل کر لیتا تھا۔ اتفاق سے اس کو لاہور کے قاضی کی اہلیہ کا علاج کرنے کا موقع مل گیا جو اس کے معالجہ سے شفایاب ہو گئی اس سے خوب مشہور ہو گیا۔ لوگ جوق در جوق اس کے پاس آنے لگے[1] ـــــ یہ لاہور ہی میں تھا کہ "فدائی خان" نے ایک زبردست باغی کا سر قلم کرایا، جو لمبے صد فربہ اندام تھا، نکولاس نے فدائی خاں سے درخواست کی کہ یہ لاش میرے حوالے کر دی جائے کیونکہ میں اس کی چربی حاصل کرنا چاہتا ہوں فدائی خاں نے لاہور کے کوتوال کو لکھ دیا کہ مقتول کی لاش نکولاس کو دے دی جائے تاکہ یہ اس سے چربی نکال لے۔ چنانچہ نکولاس نے اس میں سے اٹھارہ سیر صفی چربی نکالی جس کو یہ مرہم بنانے میں استعمال کرنا چاہتا تھا۔ لاش کی اس بے حرمتی پر علماء اور عوام نے بہت احتجاج کیا جس سے اس کی شہرت میں اور بھی اضافہ ہو گیا[2]۔

نکولاس کئی سال لاہور میں رہا اور اس عرصے میں اس نے خوب دولت کمائی۔ پھر اس کو اپنے ہم مذہبوں میں رہائش اختیار کرنے کا خیال پیدا ہوا تو لاہور سے "سورت" چلا گیا اور وہاں سے "بندورا" جا پہنچا مگر یہاں پہنچتے ہی لٹ گیا اور بے نیل مرام پھر دہلی آ گیا۔ یہاں ۱۶۷۸ء میں شاہزادہ شاہ عالم بن اورنگ زیب غازی علیہ الرحمۃ کی خدمت میں بطور طبیب کے رہنے لگا۔ شاہ عالم نے تین سو روپے ماہوار اس کی تنخواہ مقرر کر دی اور "منصب دار" کا خطاب دیا[3]۔

نور محمد

لاہور میں بھاٹی دروازہ کے اندر جو "بازار حکیماں" ہے وہ پہلے "محلہ کھاری کھوئی" کے حدود میں شامل تھا جس کا ذکر "تذکرہ قطبیہ" میں ملتا ہے[4]۔ اس محلے میں شیخ سادھا، خلیفہ حضرت عبدالجلیل کا مزار اب تک موجود ہے۔ حضرت مراد شاہ لاہوری متوفی ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۰ء نے "مثنوی مراد المحبین" (قصہ چار درویش) منظومہ ۱۲۱۲ھ میں اس محلے کا ذکر یوں ہوا ہے ؎

محلہ جو آبا و اجداد سے ۔۔۔ وراثت میں ہے اپنی اسناد سے

گزر چوک مانک سندیں ہے نام[5] ۔۔۔ ولے چاہ کھاری ہے مشہور عام

اس محلے میں آپ کے بزرگوں کی حویلی، دیوان خانہ اور کھاری کھوئی تھی جو اب تک موجود اور خاکروبوں کے قبضے میں ہے۔

اسی محلے میں حکیم نور محمد کی اولاد و احفاد کا قیام چلا آ رہا ہے۔ ان مقبول انام و مرجع خلائق اطباء کی سکونت کے باعث اس محلے کا

---

[1] ہندوستان عہد مغلیہ میں، حصہ دوم صفحہ ۱۶۵ [2] حوالہ مذکور صفحہ ۲۰۰ [3] ہندوستان عہد مغلیہ میں حصہ دوم صفحہ ۲۱۸
[4] تذکرہ قطبیہ مطبوعہ لاہور صفحہ ۸۷ [5] گزر چوک مانک کی وسعت سید مٹھا سے دروازہ ٹکسالی کی فصیل اور شاہ برج تک تھی۔
(اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۴۳ء)

نام تبدیل ہوکر "بازار حکیماں" ہوگیا۔ یہ نام سن ۱۹ء کے ابتدا میں پڑا۔ پیر مراد شاہ کے وقت تک یہ نام نہیں تھا۔

حکیم نور محمد کے والد شیخ عبدالحمید بن شیخ محمد ملتانی لاہور آئے تھے[1]۔ شیخ عبدالحمید کو بادشاہوں کی طرف سے جاگیریں بھی ملی تھیں ——— حکیم نور محمد کے مستند اور تفصیلی حالات نہیں مل سکے۔ "رجز فغفوری" میں آپ کے حالات کے سلسلے میں متضاد تحریریں ملتی ہیں مثلاً مصنف "رجز فغفوری" کا بیان ہے:-

"یہ حضرت بخدمت ماہرو صاحب سجادہ نشین حضرت داؤد بندگی[2] صاحبؒ بزمرہ مقربان ملازم رہے اور با جازت ماہرو صاحب لاہور میں آکر حکیم انتون مسیح عیسائی اور حکیم علی گیلانی سے جو اپنے وقت کے مسیحا خیال کیے گئے تھے ان سے علم طب حاصل کیا۔" ص ۱۳۴

اگلے صفحہ پر لکھا ہے:-

"خلیفہ نور محمد صاحب سرکار ماہرو کی جانب سے جو حضرت داؤد بندگی صاحبؒ کے سجادہ نشین تھے وکالتاً صوبہ لاہور میں یعنی نواب امانت خاں صوبہ دار لاہور کے پاس کاروبار کرتے تھے اور روپیہ ماہیانہ وغیرہ اسی دفتر سے ملتا تھا۔" ص ۱۳۵

حکیم شجاع الدین مرحوم مصنف "رجز فغفوری" نے کسی اپنے سے متقدم کی ایک فارسی تحریر نقل کی ہے۔ اس میں حکیم نور محمد کے متعلق مرقوم ہے:-

"حسب الایمائے نواب صاحب موصوف (امانت خاں) از حکیم انتون مسیح فرنگی علم طب تحصیل نمودہ در اندک زماں تجربہ کامل بہم رسانیدہ جہت حصول علم طب یونانی بخدمت حکیم علی گیلانی کہ امیر کبیر دربار سلاطین چغتائی بود رسید، بعد تحصیل علم از جملہ حکمائے زماں بردہ بعمدۃ الحکما از پیش گاہ سلاطین ملقب گردیدند چنانچہ فن طبابت از حکیم صاحب موصوف باین خاندان سلسلہ وار می آید۔" (رجز فغفوری ص ۱۲۵)

حکیم علی گیلانی سے حکیم نور محمد کا پڑھنا کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ حکیم علی سنہ ۱۰۰۰ھ میں لاہور میں مقیم تھے اور اس کے بعد وہ یہاں سے چلے گئے۔ سنہ ۱۰۱۸ھ میں آگرے میں ان کا انتقال ہو گیا ——— حکیم نور محمد کی تاریخ پیدائش تو معلوم نہیں مگر یہ لکھا ہے کہ ان کے دوسرے فرزند حکیم محمد اسحاق انصاری سنہ ۱۰۸۰ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ گویا اس وقت تک ان کا زندہ ہونا ثابت ہے مگر اس وقت ان کی عمر ہرگز سو برس کی نہ ہوگی کیونکہ بچے پیدا کر رہے تھے۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میرک معین الدین احمد المخاطب "امانت خاں" کا عہد بھی بہت بعد کا ہے۔ میرک معین الدین عہد شاہجہانی میں سنہ ۱۰۵۰ھ میں ملازم ہو کر صوبہ اجمیر میں واقعہ نویسی پر مامور ہوئے اور عہد عالمگیری میں انہیں "امانت خاں" کا خطاب ملا اور پھر

---

[1] رجز فغفوری ص ۱۳۴

[2] حضرت داؤد بندگیؒ کا مزار شیر گڑھ ضلع منٹگمری میں ہے۔ آپ اکبر کے عہد میں تھے اور اکبر کی ملحدانہ روش کے سخت مخالف رہے۔

اٹھارھویں (۱۸) سال جلوس عالمگیری قریباً ۱۰۸۶ھ میں ان کو لاہور کی قلعہ داری نیز دیوانی صوبہ کے عہدے تفویض ہوئے[1] اور بائیسویں سال جلوس میں صوبجات دکن کی دیوانی پر مامور کر دیے گئے اور ۱۰۹۵ھ میں فوت ہوئے مادۂ سالِ وفات "سید بہشتی شد" ہے۔

ممکن ہے حکیم نور محمد نے حکیم عبدالوہاب ابن حکیم علی گیلانی سے طب پڑھی ہو جن کا قیام لاہور میں تھا۔

حکیم نور محمد کے دو بیٹے مشہور طبیب ہوئے جن کے نام حکیم محمد حیات اور حکیم محمد اسحاق ہیں۔ لاہور کے اس خاندانِ حکیماں میں طبابت سلسلہ وار چلی آ رہی ہے۔ لاہور میں ایسا اور کوئی طبی خاندان نہیں جس میں اتنے عرصے سے طبابت چلی آنے کے علاوہ اس کثرت سے طبیب پیدا ہوئے ہوں۔ ہمارے عہد کے مشہور راہب خان بہادر حکیم احمد شجاع اسی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ نے کبھی بھی طبابت نہیں کی مگر خاندانی اعزاز لفظ "حکیم" ان کے نام کا جز ہے۔ آپ کا معزز خاندان لاہور میں "خاندانِ حکیماں" کے نام سے مشہور ہے۔ اس خاندان کے دیگر اطباء کے حالات اپنے اپنے موقع پر درج ہوں گے۔

محمد اسحاق | بن حکیم نور محمد بن شیخ عبدالمجید ۱۰۸۰ھ میں پیدا ہوئے، تاریخی نام "شیخ اسحاق" ہے۔ آپ نے علمِ طب اپنے والد حکیم نور محمد اور بڑے بھائی حکیم محمد حیات سے پڑھا اور بہ حیثیت طبیب زبردست شہرت حاصل کی۔ نواب زکریا خاں ناظم لاہور نے آپ کو "ملک الحکما" کا خطاب دیا تھا۔ "تذکرۃ الاسحاقیہ" فارسی زبان میں آپ کی مبسوط طبی تالیف ہے۔ اس مسیحا نفس طبیب نے ایک سو گیارہ برس کی عمر پا کر ۱۱۹۱ھ میں اس جہانِ فانی سے رحلت کی[2]۔ آپ کے تین صاحبزادے حکیم عبداللہ، حکیم غلام محمد اور حکیم خدا بخش تھے۔

علیم اللہ ارشاد | یہ حکیم محمد حیات برادرِ اکبر حکیم محمد اسحاق مذکور کے فرزند اور پیر مراد شاہ لاہوری کے شاگرد تھے۔ مطب آپ کا محلہ کھاری کھوئی حال بازار حکیماں میں تھا۔ ان کا ذکر مراد شاہ نے "مثنوی مراد المحبین" میں اس طرح کیا ہے[3]

محبوں میں اپنے ستودہ صفات	علیم اللہ ابن محمد حیات
حکیم اور ہیں اپنے مخلص قدیم	ہمیشہ محلّے کے اپنے مقیم
اگرچہ وہ ہیں صاحبِ علم و فن	اس احقر سے کرتے ہیں مشقِ سخن
تخلص میں ارشاد معروف ہیں	غرض ہر صفت بیچ موصوف ہیں

حکیم علیم اللہ کے استاد حضرت مراد شاہ نے آپ کو "ابن محمد حیات" لکھا ہے مگر حکیم شجاع الدین مرحوم انصاری نے رموزِ فغفوری مطبوعہ ۱۸۸۸ء میں "حکیم علیم اللہ بن حکیم حبیب اللہ بن حکیم محمد حیات" لکھا ہے۔ معاصر کی روایت کو زیادہ صحیح سمجھنا چاہیے۔ قصہ چار درویش (مثنوی مراد المحبین) بزبانِ اردو انہی حکیم علیم اللہ کی فرمائش پر حضرت مراد شاہ نے نظم کیا تھا۔ یہ قصہ ڈاکٹر باقر صاحب نے دیباچہ لکھ کر رسالہ "اردو دہلی" اکتوبر ۱۹۴۲ء میں شائع کرایا تھا۔

خدا بخش | یہ حکیم محمد اسحاق انصاری متوفی ۱۱۹۱ھ کے دوسرے فرزند تھے، ایسے عالم و فاضل تھے کہ قانون بوعلی آپ کو حفظ تھا۔ یہ اپنی لیاقت اور علمی فضیلت کے باعث نواب زکریا خاں ناظم لاہور اور نواب ادینہ بیگ خاں سے خطاب و زارت

---

[1] ماثر الامراء جلد اوّل صفحہ ۲۶۴ [2] رموزِ فغفوری صفحہ ۴۵

وفرزند خانی و ملک الحکماء سے ملقب تھے۔ حکومت کی طرف سے حکیم صاحب کی بیوگان اور متعلقان کو بطور معافی موضع اچھرہ میں زمین دی گئی تھی۔ زمین کا معافی نامہ ۱۱۸۰ھ میں لکھا گیا' اس سے ظاہر ہے کہ حکیم خدا بخش اپنے والد کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے تھے نقل معافی نامہ "رجز فغفوری" میں درج ہے۔[1]

عبداللہ انصاری یہ حکیم محمد اسحاق کے بیٹے تھے' والد کی زندگی ہی میں بڑے باعزت اور بامرتبہ ہو گئے تھے احمد شاہ ابدالی کے عہد میں کشمیر کے عدالتی رہے اور ملقب بہ القاب "حکیم بادشاہی" ہوئے۔ قبر ان کی باغیچہ اندرون ٹکسالی دروازہ میں ہے۔[2]

مفتی رحمت اللہ قریشی یہ اپنے وقت کے فاضل اجل بزرگ تھے' ہزاروں طالبان علم ان سے فیض یاب ہوئے خصوصاً علم طب میں بھی ان کو کمال حاصل تھا۔ دور و نزدیک سے لوگ معالجہ کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ مفتی غلام سرور مرحوم کے اجداد میں سے تھے۔ مفتی صاحب لکھتے ہیں:۔

"بندہ غلام سرور مؤلف کتاب کا نسب نامہ اس بزرگ کے ساتھ اس طرح ملتا ہے کہ غلام سرور بن مفتی غلام محمد بن مخدوم مفتی رحیم اللہ بن حکیم رحمت اللہ۔"[3]

جب مجھے مفتی رحمت اللہ قریشی کی تاریخ وفات کسی کتاب سے معلوم نہ ہو سکی تو حکیم مفتی محمود عالم صاحب ہاشمی (جو مفتی غلام سرور مرحوم کے نواسہ ہیں) کی طرف رجوع کیا' انھوں نے لکھا:۔

"حضرت مولانا رحیم اللہ جو آپ کے فرزند تھے ان کی تاریخ وفات ۱۲۳۵ھ خزینۃ الاصفیا میں درج ہے۔ حضرت مولانا مفتی رحمت اللہ کے والد ماجد مولانا حافظ محمد تقی ۱۱۵۳ھ میں فوت ہوئے۔ قیاس ہے کہ مفتی رحمت اللہ کا عہد گیارھویں صدی ہجری کا آخری اور بارھویں ہجری کا ابتدائی حصہ ہوگا۔ قطعی طور پر تعین نہیں کیا جا سکتا۔"

عیسٰی (مصنف "خیر منکھ") "خیر منکھ" منظوم پنجابی رسالہ' پنجاب کے دیہاتی اطبا میں بہت مقبول ہے مصنف کا پورا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ "عیسٰی" بطور تخلص نظم میں کئی جگہ مسطور ہے۔ حکیم عیسٰی کا لاہور میں قیام ثابت ہے رسالہ کے حصہ معالجات کے خاتمہ پر لکھا ہے ؎

نام میں ایس کتاب دا دھریا "خیر منکھ" — وارد کریں جے ایس تھیں رب کریسی سکھ
باراں[1197] سو ستانویں ہجرت باجھ تمام — آہی سال رسول دے کیتی ختم کلام
اکیہویں[21] ماہ رمضان دے ساعت جمعہ سعید — کیتی وچ لاہور دے ہوئی خوشی مزید

میرے پیش نظر ۱۲۹۴ھ کا مطبوعہ رسالہ خیر منکھ ہے۔ جدید المطبع بعض نسخوں میں "باراں" کے بجائے "باراں"[2] لکھا گیا ہے جو بالکل غلط ہے کیونکہ اگر یہ کتاب ۱۲۹۷ھ میں تصنیف ہوا تو ۱۲۹۴ھ میں زمانہ تالیف سے تین سال پہلے کیسے شائع ہو گیا؟

---

[1] رجز فغفوری ص۱۴۷ [2] رجز فغفوری ص۱۴۱ [3] مخزن حکمت مؤلفہ مفتی غلام سرور ص۱۴

فقیر غلام محی الدین شاہ

آپ کے والد کا نام "غلام شاہ" تھا۔ فقیر صاحب چونیاں سے لاہور آئے تھے۔ آپ کے تین فرزند، حکیم فقیر عزیز الدین آزاد، فقیر امام الدین، حکیم فقیر نور الدین مشہور بڑے ذہین و فطین تھے۔ پیر مراد شاہ لاہوری نے ایک منظوم خط جو اپنے چھوٹے بھائی پیر فرخ بخش فرحت مؤلف "اذکار قلندری" کو ۱۲۰۰ھ میں لکھا تھا، اس میں فقیر غلام محی الدین شاہ حکیم کا ذکر یوں فرماتے ہیں :-

افتخار دوستان بے ریا	آں غلام شاہ محی الدین ما
عارف باللہ حکیم حاذقے	دوستے در دوستی ہا صادقے
ہم سرش ہرگز نبود کسے در ہمسراں	مثل و ثانی نیست او را در جہاں
میرساند ہم سلام و ہم دعا	می کنم بہر تو ہر صبح و مسا
می رساند ہم عزیز الدین سلام	بس عزیز است از عزیزاں تمام
ہم امام الدین و نور الدین دگر	نیز صدر الدین فرخندہ سیر
بندگی ہا می رسانند از نیاز	یا الٰہی عمر شان بادا دراز[1]

یہ خط اس وقت کا ہے جبکہ فقیر صاحب کے لڑکے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ہاں وزارت پر مامور نہیں ہوئے تھے اور بازار حکیماں کا نام بھی "بازار حکیماں" نہ تھا۔ رنجیت سنگھ کا لاہور میں آغاز حکومت تھا کہ پیر مراد شاہ فوت ہو گئے۔

فقیر غلام محی الدین شاہ نے شروع میں امراء و رؤسائے لاہور اور سکھ حاکموں سے تعلقات پیدا کر لیے تھے مگر فقیر امانت شاہ قادری کے مرید ہو کر حقیقی معنوں میں "فقیر" کو اپنا لیا اور گوشہ نشین ہو کر عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گئے اور اپنے نام کے ساتھ لفظ "فقیر" ایزاد کر لیا جو آج تک آپ کی اولاد میں بطور اعزاز قائم ہے۔

فقیر صاحب اور ان کے افرادِ خاندان کی قبور اندرون بھاٹی گیٹ "فقیر خانہ" کے بالمقابل گلی میں ایک چار دیواری کے اندر بڑے کمرے میں ہیں۔ اس کمرے کے دروازے پر ایک پتھر نصب ہے جس پر یہ کندہ ہے "مزار حضرت فقیر الی اللہ سید غلام محی الدین شاہ صاحب بخاری قادری، نوشاہی الملقب بہ نوشاہ ثانی نور اللہ مرقدہٗ" — ناصبِ سنگ کا نام "میجر سید فقیر مغیث الدین" لکھا ہے۔

آپ کی تاریخ رحلت کتابوں سے نہیں مل سکی۔ سنگِ لوحِ مزار جو کسی وجہ سے ٹوٹ کر علیحدہ ہو کر ایک کونے میں پڑا ہے اس سے سالِ وفات ۱۲۲۹ھ پڑھا جا سکتا ہے۔

نور محمد

بن حکیم خدا بخش بن حکیم محمد اسحاق بن حکیم نور محمد، بڑے صاحبِ علم و حلم اور عالم اجل طبیب گزرے ہیں۔ تمام لاہور کے باشندے آپ کا احترام کرتے تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں بھی رسائی تھی۔ انھوں نے ایک کتاب بنام "نہایت الطبیب" عربی میں تالیف کی تھی۔ ان کا انتقال ۱۲۳۷ھ میں ہوا۔ حکیم نور محمد کے بیٹے حکیم گل محمد بھی بڑے لائق طبیب تھے[2]۔

---

[1] تاریخ جلیلہ مؤلفہ پیر غلام دستگیر نامی صاحب صفحہ ۲۴۹

[2] رجز صفدری صفحہ ۱۵۲

لالہ حاکم رائے

یہ لاہور کے اعلیٰ طبیب تھے، حکیم فقیر غلام محی الدین شاہؒ کے ہم عصر اور ان کے فرزند حکیم فقیر عزیز الدین کے استاد تھے اور ان ہی کے ذریعے فقیر عزیز الدین کی مہاراجہ تک رسائی ہوئی تھی۔ ۱۷۹۹ء میں رنجیت سنگھ کو آنکھوں کا مرض ہوا تو لالہ حاکم رائے حکیم کو دربار میں طلب کیا گیا مگر انھوں نے اپنے شاگرد فقیر عزیز الدین کو بھیج دیا۔ فقیر صاحب کے معالجہ سے مہاراجہ کو صحت ہوگئی اور وہ ان کی حذاقت کا قائل ہوگیا[1] ——— کے ایل رلیا رام نے لکھا ہے کہ "سدا کور" جو کہ مہاراجہ کی ساس تھی، اس کے مشورے پر لالہ حاکم رائے کو طلب کیا گیا۔ چونکہ لالہ صاحب شفا کے متعلق زیادہ پُرامید نہ تھے اس لیے انھوں نے اپنے ہونہار شاگرد عزیز الدین کو بھیجنا ہی مناسب سمجھا[2]۔ ہوسکتا ہے کہ لالہ صاحب نے رنجیت سنگھ کو بھی ان سے پہلے سکھ حاکموں جیسا غیر مدبر سمجھ کر خود دربار میں جانے سے پہلو تہی کی ہو کیونکہ اس وقت تک رنجیت سنگھ کے متعلق بھی ویسا ہی گمان ہوسکتا تھا۔

مولوی حافظ نور اللہؒ

یہ ۱۱۷۱ھ میں پیدا ہوئے، بڑے فاضل بزرگ تھے۔ صرف، نحو، منطق، معانی حدیث و تفسیر اور طب میں ان کا ثانی نہ تھا۔ مولانا حافظ محمد سلیم لاہوری کے شاگرد رشید تھے۔ حکام عہد مثل رنجیت سنگھ وغیرہ ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ ان کا فتویٰ تمام ممالک میں جاری تھا اور علم میں کوئی ان کی برابری کا دم نہ بھرتا تھا۔ جب مکہ معظمہ گئے تو وہاں صرف تیس دن میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ واپسی پر بمبئی میں ۱۲۴۲ھ میں فوت ہوئے۔ ان کی تصانیف بہت ہیں[3]۔

فقیر عزیز الدین آزاد

یہ حکیم فقیر غلام محی الدین شاہؒ کے فرزند اکبر تھے، انھوں نے علوم مروجہ کی تحصیل کے بعد طب لالہ حاکم رائے حکیم لاہوری سے پڑھی اور رخیر پور جا کر حکیم محمد یار سے طب کے علاوہ دیگر علوم پڑھے[4]۔ ڈاکٹر مارٹن سے فن جراحی اور کیمیاگری سیکھی[5]۔ ۱۷۹۹ء میں یہ رنجیت سنگھ کے دربار میں معالج کی حیثیت سے پہنچے اور اپنی لیاقت و حذاقت کے باعث مہاراجہ کو گرویدہ کر لیا۔ رنجیت سنگھ کو آپ پر بے حد اعتماد تھا۔ چنانچہ اس نے آپ کو وزیر خارجہ بھی بنا دیا تھا۔ آپ کی سیاسی خدمات بہت زیادہ ہیں، جن کا بیان موجب طوالت ہوگا۔ فقیر عزیز الدین بڑے باذوق، سخن شناس اور سخنور بھی تھے۔ ہم عصر اہل علم سے آپ کے گہرے مراسم رہے، حضرت قلندر شاہ، پیر مراد شاہ اور پیر سکندر شاہ سے آپ کی منظوم خط و کتابت رہتی تھی۔ حضرت پیر غلام دستگیر نامی صاحب نے دو تین خط بطور نمونہ "تاریخ جلیلہ" میں درج کیے ہیں۔ فقیر عزیز الدین کا تخلص آزاد تھا۔ فارسی میں شعر خوب کہتے تھے۔ کتاب "رئیسانِ پنجاب" سے تین شعر درج ذیل ہیں:

چوں سایۂ درخت ندارد جہاں قرار ——— اے دل اگر نگاہ نمائی بہ اعتبار

در عالم خیال ترا اضطراب چیست ——— در کارہائے خویش نداری چو اختیار

بگذار کار خود بخداوند کار خویش ——— خود را بہ پرورندۂ خود ہم ز دل سپار

ایک روایت ہے کہ دیوانِ آزاد قلمی آپ کے خاندان میں محفوظ ہے ——— مفتی غلام سرور مرحوم نے آپ کی وفات کی تاریخ یہ کہی تھی ؎

شد عزیز الدیں چو با عزت بخلد ——— بہر سالِ آں عزیز مومنیں

پرتو افگن شد ز دل "خورشید علم" ——— از خرد شد جلوہ گر "منظور دیں"

۱۲۶۰ھ ——— ۱۲۶۰ھ

---

[1] رئیسانِ پنجاب مؤلفہ سر لیپل، ایچ گریفن مترجمہ سوتی لعل کا چھو صفحہ ۲۵۰ [2] "لاہور کے ایک فقیر کے گھر میں پوشیدہ خزانہ" (انگریزی) صہ۲ [3] گنج تاریخ صہ۲۰۸

[4] رموز الاطباء جلد دوم صفحہ ۲۵ [5] رسالہ الطبیب لاہور نومبر ۱۹۴۲ء صہ۱۰

۱۲۶۱ھ کے مطابق ۱۸۴۴ء ہے مگر رئیسان پنجاب میں آپ کی وفات کا سال ۱۸۴۵ء درج ہے۔ مفتی صاحب کے سامنے فقیر صاحب کا انتقال ہوا تھا اس لیے میرے خیال میں ان کی روایت کو صحیح سمجھنا مناسب ہوگا۔

سید عنایت شاہ قادری

یہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے درباری اطباء میں سے تھے۔ مہاراجہ آپ کا بے حد احترام کرتا تھا۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت امام موسیٰ کاظم سے ملتا ہے۔ حکیم صاحب شاعر بھی تھے۔ عنایت تخلص تھا حضرت محمد باقر معروف بہ "چھٹانگی شاہ" قادری کے مرید صادق تھے۔ ان چھٹانگی شاہ کا مزار کوچہ چھٹانگی پیر عصری شاہ لاہور میں ہے۔ چھٹانگی شاہ عہد رنجیت سنگھ کے آخری حصے میں فوت ہوئے تھے۔ حکیم صاحب نے اپنے مرشد کی تعریف و توصیف میں تین چھٹانگی نامی منظوم تصنیف کیے دو اُردو اور ایک فارسی میں ہے۔ یہ چھٹانگی نامے مع دیگر اوراد و وظائف یکجا مجلد قلمی حکیم صاحب کی نواسی کے صاحبزادے سید واجد علی شاہ ایڈووکیٹ محلہ چلہ بی بیاں لاہور کے پاس محفوظ ہیں۔

حکیم صاحب کی آخری آرام گاہ ان کی نشست گاہ واقع بازار چیاراں مابین کوچہ حکیم عنایت شاہ معروف و کوچہ "رڑا نیلیاں" ہے آپ کے مسقف مزار پر جو کتبہ نصب ہے اس پر آپ کی تاریخ وفات ۲۲ ذی الحجہ ۱۲۶۱ھ مطابق ۴ جنوری ۱۸۴۵ء بروز جمعہ لکھی ہے۔

حکیم صاحب اولاد نرینہ سے محروم تھے صرف ایک صاحبزادی تھی جس کے بطن سے حکیم سید مراتب علی شاہ اور حکیم سید نوازش علی شاہ میونسپل کمشنر تھے۔

"تاریخ لاہور" مؤلفہ رائے بہادر کنہیا لال میں لکھا ہے کہ مخدوش و حکیم عنایت شاہ کے اجداد میں سے تھے جن کی تصانیف "تبصرۃ الاطبا" و "مراۃ الشفاء" ہیں اور حکیم محمد شاہ، حکیم بہادر شاہ و حکیم بزرگ شاہ حکیم عنایت شاہ کے بھانجے تھے۔

فقیر نورالدین منور

یہ فقیر عزیزالدین آزاد وزیر خارجہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے چھوٹے بھائی تھے۔ رنجیت سنگھ کے سرکاری دواخانہ کے نگران تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر مارٹن سے انگریزی دواسازی سیکھی تھی۔ شعر کہتے تھے اور منور تخلص تھا۔ سنا ہے کہ ان کا دیوان "منور" ان کی اولاد کے پاس محفوظ ہے۔ حکیم صاحب کے متعلق مفتی غلام سرور مرحوم نے لکھا ہے:۔

"از اعاظم امرائے لاہور بود۔ صاحب علم و حلم و سخاوت و لطف و کرم بود۔ در علم طب ید بیضا داشت و مہاراجہ رنجیت سنگھ او را بسیار محترم داشتے۔" (گنج تاریخ)

حکیم صاحب ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۲ء فوت ہوئے۔ "گنج تاریخ" میں یہ قطعہ تاریخ لکھا ہوا ہے:۔

پر توافگن گشت بر اوج بہشت — چوں جناب نوردیں نور یقیں

شد "چراغ دیں" بسالش جلوہ گر — ہم بخواں "نورا لکرامت نوردیں"

۱۲۶۸ھ — ۱۲۶۸ھ

بینٹ (BENET)

یہ ڈاکٹر ایک اچھے معالج اور ماہر یورپین سرجن تھے اور ۱۸۳۸ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں تین سو روپے پر فوجی ڈاکٹر رہے۔[1]

---

[1] مہاراجہ رنجیت سنگھ مصنفہ پروفیسر سیتا رام صفحہ ۲۵۱

ہاروے — یہ ڈاکٹر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں ملازم تھے۔ ان کی تنخواہ سات سو روپیہ ماہوار تھی[1]۔ اس زمانہ کے سات سو روپیہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہت لائق ڈاکٹر ہوں گے جبھی ان کو اتنی معقول تنخواہ ملتی تھی۔

مارٹن — ڈاکٹر مارٹن کو سیاحت کا بے حد شوق تھا۔ اس کی عمر کا اکثر حصہ سیاحی میں صرف ہوا۔ اس کا پورا نام "جان مارٹن ہانگ برگز" تھا۔ یہ ۱۷۹۵ء میں ہنگری کے ایک شہر میں پیدا ہوا۔ وطن میں طبی تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۱۵ء میں جبکہ اس کی عمر بیس برس کی تھی گھر سے چل کھڑا ہوا۔ ۱۸۲۲ء میں قاہرہ پہنچا اور وہاں مطب کرتا رہا۔ قاہرہ سے دمشق گیا اور یہاں سے بغداد پہنچ گیا۔ بغداد میں اس نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی تعریف سُنی تو مسلمانوں کے بھیس میں ہندوستان چل کھڑا ہوا۔ یہ عربی، فارسی اور ترکی خوب بولتا تھا۔ اکثر مسلمانوں کے بھیس میں سفر کرتا اور دکھاوے کی نماز بھی پڑھ لیتا۔

لاہور میں آتے ہی مہاراجہ رنجیت سنگھ کا ملازم ہو گیا۔ یہ ۱۸۳۳ء میں لاہور آیا تھا۔ تین برس یہاں رہ کر وطن چلا گیا لیکن ۱۸۳۶ء میں سکندریہ سے ہوتا ہوا دوبارہ لاہور میں وارد ہوا۔ اس وقت رنجیت سنگھ فالج کا شکار ہو چکا تھا۔ مارٹن نے علاج شروع کیا تو مہاراجہ کو افاقہ ہوا۔ ۱۸۳۹ء میں مہاراجہ کی وفات کے بعد یہ لاہور ہی میں مقیم رہا۔ راجہ دلیپ سنگھ کا بھی معالج تھا۔ اس کو نو سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملا کرتی تھی۔

پنجاب میں انگریزوں کا تسلط ہو جانے پر "مارٹن" انگریزوں کا ملازم ہو کر سپرنٹنڈنٹ جیل کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ ڈاکٹر "میک گریگر" سے مخالفت ہو جانے کی وجہ سے مستعفی ہو کر کشمیر چلا گیا۔ وہاں زراعت کا کام شروع کیا مگر ناکام ہو کر پھر لاہور آنا پڑا اور یہاں ایک کشمیری خاتون سے شادی کی جس کے بطن سے دو بیٹیاں پیدا ہوئیں جن کو "مسوری" کے ایک انگریزی سکول میں تعلیم دلانے کے لیے داخل کیا ——— ڈاکٹر مارٹن ۱۸۵۰ء میں اپنے وطن چلا گیا ——— مارٹن نے اپنے سفر کے حالات کتابی شکل میں شائع کیے تھے۔ اس سفرنامے کا نام "مشرق میں پینتیس سال" ہے جو ۱۸۵۲ء میں شائع ہوا تھا[2]۔

سید خیر شاہ — یہ حکیم اعلیٰ کے شاگرد تھے۔ مولوی سید رجب علی نے لکھا ہے کہ میں نے قریباً ۱۸۱۸ء میں لاہور آ کر علوم طبیہ کو سید خیر شاہ تلمیذ حکیم اعلیٰ سے حاصل کیا[3]۔ ان کے فرزند حکیم حاکم شاہ بڑے نامی گرامی طبیب تھے[4]۔ حکیم سید منیر علی خاں آشفتہ میرٹھی نے مسئلہ بحران پر حاکم شاہ سے مباحثہ بھی کیا تھا[5]۔ حکیم حاکم شاہ کے بیٹے عادل شاہ "تحقیقات چشتی" کی تصنیف کے وقت ۱۲۸۴ھ میں زندہ تھے۔ ان کی جائداد چوک جھنڈا میں تھی اور گورستان حکیم حاکم شاہ شمالی رویہ مزار حضرت حسو تیلی ہے۔

حاکم شاہ نامی ایک طبیب کا ذکر تاریخ لاہور مصنفہ کنہیا لال میں بھی ہوا ہے جن کو حکیم سید عنایت شاہ کی ہمشیرہ کا نواسہ لکھا ہے ان کے لڑکوں کے نام عباس علی و دلاور علی لکھے ہیں[6]۔

حیدر علی شاہ — یہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے طبیب خاص تھے۔ فتح گڑھ میں آپ کو بہت سی زمین اور ایک کنواں دربار سے ملا تھا جو اب تک "چاہ سیّداں" کے نام سے موسوم ہے[7]۔

---

[1] مہاراجہ رنجیت سنگھ صفحہ ۲۵۲ [2] اطبائے عہد مغلیہ مؤلفہ حکیم کوثر چاندپوری صفحہ ۱۶۸ [3] تحقیقات چشتی صفحہ ۱۱۸
[4] تحقیقات چشتی صفحہ ۱۳۵ [5] رموز الاطباء جلد اوّل صفحہ ۳۴۵ [6] تاریخ لاہور صفحہ ۶۰
[7] رموز الاطباء صفحہ ۷۶۳

مفتی غلام محمد آپ مفتی غلام سرور مصنف خزینۃ الاصفیا کے والد ماجد تھے۔ سلسلۂ نسب آپ کا حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی سے ملتا ہے۔ آپ ہمیشہ درس و تدریس، طبابت اور کتابت قرآن میں مشغول رہتے تھے۔ مسجد بلوچاں موضع مزنگ کے امام تھے اور اسی موضع میں حویلی تیار کی[1]۔ اشراق کی نماز پڑھ کر بیماروں کو دیکھنا شروع کرتے تھے ان سے فارغ ہو کر کتابت قرآن میں مشغول ہو جاتے کیونکہ آپ اسی سے قوت حلال حاصل کرتے تھے۔ آپ ۹ ربیع الثانی ۱۲۷۶ھ کو فوت ہوئے[2]۔ مفتی غلام سرور نے "گنج تاریخ" میں یہ قطعہ تاریخ لکھا ہے ؎

مفتی دیں غلام محمد چو از جہاں!	پدر و در گشت و یافت بملک جناں وصال
گو "مظہر سلام" بتاریخ رحلتش!	"جانِ جہاں غلام محمد" بجناں وصال
۱۲۷۶ھ	۱۲ھ ۷۶

حیدر علی خاں یہ دہلی کے شاہی اطباء کی اولاد میں سے تھے[3]۔ ۱۲۴۰ھ میں لاہور چلے آئے اور سلک حکمائے مہاراجہ رنجیت سنگھ میں منسلک ہو گئے۔ سکھوں کے زوال کے بعد گوشہ نشیں ہو کر تالیف و تصنیف میں مصروف ہو گئے[4]۔ "تسہیل العلاج" فارسی اور "مجمع البحرین" جس میں یونانی و انگریزی طریق علاج کو یکجا بیان کیا گیا ہے، تصنیف کیں۔ تسہیل العلاج پہلی بار مصنف کی زندگی میں ۱۸۶۸ء مطابق ۱۲۸۵ھ طبع ہوئی اور دوسری بار مصنف کی وفات کے بعد ۱۸۹۲ء مطابق ۱۳۰۹ھ میں حکیم سید غلام مصطفیٰ کی نظرِ ثانی کے بعد زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔ مجمع البحرین ۱۸۷۴ء میں لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی ——— رائے بہادر کنہیا لال نے لکھا ہے کہ امرائے دربار، خاندانِ راجہ دینا ناتھ و دیوان گنگا رام کے خاندانی معالج تھے اور ان کے بھائی حکیم منور علی خاں کو پنشن مل رہی ہے۔ حکیم حیدر علی قریباً ۱۸۸۰ء میں فوت ہوئے۔

سیّد ولی شاہ حکیم صاحب کے اجداد میں سے مولوی سیّد نور محمد وارد لاہور ہوئے تھے جن کو اورنگ زیب بادشاہ نے شاہی مسجد لاہور کا امام مقرر کیا تھا اور غالباً یہ مولوی صاحب اس مسجد کے سب سے پہلے امام تھے۔ مولوی نور محمد کے لڑکے سیّد عتیق اللہ تھے۔ ان کو محمد شاہ بادشاہ نے "داور خاں" کا خطاب دیا تھا اور احمد شاہ ابدالی نے "داور خاں" کو پنجاب کا نائب السلطنت مقرر کیا تھا[5]۔ اس تقرری کا فرمان موجود ہے جس پر احمد شاہ کی مہر اور دستخط ثبت ہیں۔ اس نادر فرمان کے علاوہ اور بھی بہت سے تاریخی کاغذات اس کے خاندان کے ایک فرد سیّد ناصر علی شاہ کے پاس محفوظ ہیں اور راقم نے ان کو دیکھا ہے۔

حکیم سیّد ولی شاہ گرد نری مہاراجہ گلاب سنگھ اور اس کے بیٹے مہاراجہ رنبیر سنگھ والیٔ کشمیر کے طبیبِ خاص تھے اور تین ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے تھے[6]۔ مہاراجہ شیر سنگھ پسر مہاراجہ رنجیت سنگھ بھی آپ سے علاج کراتا رہا اور اس نے حکیم صاحب کو علاقہ ستانده میں زمین بھی عطا کی تھی۔ انگریزی عہد میں بھی حکیم سیّد ولی شاہ کی بڑی قدر و منزلت رہی۔ گورنمنٹ انگلشیہ نے ۱۸ اپریل ۱۸۵۰ء کو آپ کی چھ سو روپیہ پنشن مقرر کی۔ ۱۸۵۶ء میں لاہور میں ہیضہ کی وبا پھیلی۔ حکیم صاحب کے علاج سے دنیا کو بہت فائدہ ہوا تو کمشنر لاہور نے آپ کو

---

[1] "تاریخ لاہور" صفحہ ۸۴ [2] خزینۃ الاصفیا جلد دوم صفحہ ۲۹۳ [3] "تاریخ لاہور" صفحہ ۱۹۱ [4] تسہیل العلاج صـ۲
[5] اس بیان کی تصدیق کتب تاریخ سے میں نہیں کر سکا (مرتب) [6] رموز الاطباء جلد اول صفحہ ۲۸۹

ایک سرٹیفکیٹ عطا کیا جس میں آپ کی حذاقت کا اعتراف کیا۔ یہ سرٹیفکیٹ دس اکتوبر ۱۸۵۶ء کا محررہ ہے۔

حکیم صاحب ۱۸۶۸ء مطابق ۱۲۸۵ھ میں بمقام جموں فوت ہوئے اور وہیں آپ کا مزار بنا۔ آپ کے بیٹے حکیم رست علی شاہ بڑے لائق طبیب تھے جو کشمیر میں راجہ کے ملازم تھے۔ حکیم ولی شاہ کی اولاد کٹڑہ حکیم ولی شاہ موصوف اندرون موچی گیٹ لاہور میں رہ رہی ہے۔

راقم الحروف نے حکیم ولی شاہ اور ان کے بھانجے حکیم بزرگ شاہ متولی شاہی مسجد لاہور کے حالات سید ناصر علی شاہ ساکن محلہ کٹڑہ ولی شاہ سے معلوم کیے اور ان کے پاس جو نادر کاغذات ہیں ان سے اخذ کیے ہیں۔ سید ناصر علی صاحب کا کہنا ہے کہ ہم گردیزی سید ہیں اور ہمارے آباؤ اجداد افغانستان سے ہندوستان میں آئے تھے۔

غلام دستگیر

آپ سکھ عہد کے بلند پایہ اطباء میں سے تھے، علم و فضل میں بھی یگانۂ روزگار تھے۔ سکھوں کے دربار میں آپ کی بڑی عزت تھی۔ آپ کا بیٹا غلام محمد المعروف گاما نوجوان ہی فوت ہو گیا تھا۔[1] حکیم صاحب کے شاگردوں میں سے حکیم علاؤ الدین المعروف الہ دین، حکیم سید چراغ شاہ اور حکیم الہ یار انگریزی عہد کے اطباء میں سے بہت مشہور ہوئے ہیں۔ مولوی حکیم نور الدین صاحب بھیروی شاہی طبیب ریاست جموں و کشمیر نے لکھا ہے کہ میں ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۳ء) کے قریب لاہور آ کر بعارضہ خناق بیمار ہو گیا تو میرے بھائی مجھے سید مٹھا بازار میں حکیم غلام دستگیر کے پاس لے جا کر علاج کراتے رہے۔[2] حکیم غلام دستگیر انگریزی عہد میں چند سال گزار کر فوت ہو گئے۔

(۴) انگریزی عہد کے اطبّا

اس حصے میں انگریزوں کے ابتدائی دور سے لے کر مئی ۱۹۶۱ء تک کے مرحوم اطباء کا ذکر ہے۔ ان میں چند ایسے بھی ہیں جنھوں نے پاکستان میں کئی سال گزارنے کے بعد سفرِ آخرت اختیار کیا۔ گو ان لوگوں کی کام کی زندگی کا غالب حصہ اسی عہد میں گزرا اس لیے عنوانِ بالا ہی کے تحت ان کا ذکر ہونا چاہیے تھا۔

سلطان محمود

آپ شمس الاطباء حکیم ڈاکٹر غلام جیلانی مصنف "مخزنِ حکمت" اور حکیم مولوی غلام محی الدین کے والد ماجد تھے۔ اپنے وقت میں ان کی حذاقت کا بڑا شہرہ تھا۔ عربی و فارسی کے ماہر تھے۔ سینکڑوں طلباء نے ان سے علمِ طب پڑھا۔ قریباً ۱۸۸۰ء میں اس دارِ فنا سے دارِ بقا میں رحلت کر گئے۔[3]

سید چراغ علی شاہ سبزواری

یہ حکیم غلام دستگیر کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔[4] نسباً سید سبزواری اور مشرباً چشتی قادری تھے۔ ان کے بزرگوں میں بڑے بڑے فاضل علماء ہو گزرے ہیں۔ حکیم صاحب خود بڑے اوصاف کے مالک تھے۔

لاہور کے مشاہیر کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نور احمد چشتی ان کے متعلق اپنی مشہورِ عالم کتاب "تحقیقاتِ چشتی" میں تحریر

---

[1] تاریخ لاہور صفحہ ۱۶۱ [2] بیاض نور الدین مطبوعہ قادیان صفحہ ۱ [3] ماہنامہ شمس الاطباء ستمبر ۱۹۴۳ء [4] تاریخ لاہور ص [illegible]

فرماتے ہیں ——

"تلقین طلبا و علاجِ بیماراں میں مصروف رہتے ہیں اور خلقِ محمدی کا یہ حال ہے کہ جو بیمار آتا ہے آپ کے جمالِ باکمال کو دیکھ کر اور کلامِ شیریں سن کر نصف مرض اس کا دور ہو جاتا ہے"۔[1]

حکیم صاحب کے تین فرزند تھے (۱) سید حاکم علی شاہ (۲) سید بہادر علی شاہ جو ادیب و شاعر بھی تھے (۳) سید نادر علی شاہ

حکیم چراغ علی شاہ نے ایک تکیہ و باغیچہ متعلقہ خطہ گورستانِ میانی ۱۸۵۷ء میں تعمیر کرایا تھا۔ آپ ۱۸۸۲ء میں تاریخ لاہور کی تدوین کے زمانہ تک زندہ تھے کیونکہ رائے بہادر کنہیا لال نے ان کو اپنے وقت میں موجود بیان کیا ہے۔

کریم بخش

یہ باغبان پورہ لاہور کی رائیں برادری کے بڑے ممتاز فرد تھے۔ نہایت خوش اخلاق اور پسندیدہ خصائل بزرگ تھے۔[2] ان کے بڑے بھائی مولوی قادر بخش کا مقام بھی بہت بلند تھا جنھوں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ایما پر جنرل کورٹ لینڈ فرانسیسی افسر فوج سے توپ خانہ اور بندوق سازی کا فن سیکھا اور اس فن میں بزبانِ فارسی "مفتاح القلعہ" کتاب لکھی۔ مولوی قادر بخش کے صاحبزادے کا نام مولوی نظام الدین تھا اور ان کے فرزند تھے آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین مرحوم۔[3]

سید محمد شاہ

تجربہ کار اجلۂ اطبائے لاہور میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ علم و عمل طبابت میں ید بیضا رکھتے تھے۔ "توحید وجودی" کے قائل تھے اور اس خیال کے فقرا سے آپ کے بڑے تعلقات تھے اور تا دمِ آخر اسی عقیدے پر بڑی مضبوطی سے قائم رہے۔ آپ شیعہ و سنی عقائد کے پابند نہ تھے۔[4] حکیم سید عنایت شاہ طبیب مہاراجہ رنجیت سنگھ آپ کے ماموں تھے۔[5]

حکیم سید محمد شاہ کے چھوٹے بھائی حکیم سید بہادر شاہ اور حکیم سید بزرگ شاہ لاہور میں نامی طبیب ہوئے ہیں اور آپ کے فرزند حکیم سید عالم شاہ تو تمام متحدہ پنجاب میں معروف تھے۔ آپ ۱۲۹۱ھ (۱۸۷۴ء) میں فوت ہوئے اور مفتی غلام سرور نے یہ تاریخ کہی ؎

رفت از دنیائے فانی در بہشتِ جاوداں	چوں محمد شاہ والا منزلت اہلِ وقار
سالِ تاریخش بسرور شد ندا از آسماں	گو "حبیب جاں محمد شاہ عالی اقتدار"

۱۲ ھ ۹۱

محمد بخش

یہ انیسویں صدی کے نامور اطبا میں سے تھے۔ فنِ طب میں حکیم غلام محمد والدِ مفتی غلام سرور کے شاگرد تھے۔ بڑے بڑے فضلائے دہر نے ان سے طب پڑھی تھی جن میں سے حکیم احمد الدین شارح موجز، مفتی حکیم سلیم اللہ خاں اور حکیم مولوی غلام مصطفےٰ ایم او ایل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ حکیم صاحب ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۶ء واصل بحق ہوئے۔[6]

مفتی غلام سرور صاحب مرحوم نے یہ تاریخ کہی ؎

چوں بتقدیر ایزد متعال	رخت بست از جہاں محمد بخش
سرورا سالِ انتقالِ او	کن رقم "مہرباں محمد بخش"

۱۲ ھ ۹۲

---

[1] تحقیقاتِ چشتی ص ۱۸۲ [2] سلیم التواریخ ص ۹۵،۹۴ [3] سلیم التواریخ ص ۵۰۵ [4] گنج تاریخ ص ۲۱۲ [5] تاریخ لاہور ص ۲۰ [6] گنج تاریخ از مفتی سرور صاحب، ص ۱۱۳

مہتاب الدین آپ حکیم گل محمد متوفی ۱۲۷۵ھ کے بڑے صاحبزادے تھے۔ پہلے دلیپ سنگھ کے ماموں جواہر سنگھ کے پاس بطور طبیب ملازم تھے۔ پھر نواب صاحب ممدوٹ کے پاس رہے۔ آخر میں مہاراجہ کشمیر کے ملازم ہو گئے تھے ۱۲۹۵ھ میں فوت ہوئے[1]۔ آپ کے دو بیٹے تھے حکیم ضیاء الدین و حکیم شہباز الدین۔

بزرگ شاہ گردیزی یہ حکیم سید ولی شاہ کے بھانجے تھے۔ لاہور کے سربرآوردہ اطباء اور معزز لوگوں میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ سکھوں کے عہد میں لاہور میں مطب کرتے تھے۔ آخر عمر میں حکیم ولی شاہ کے ہمراہ جموں میں ریاست کے ملازم ہو گئے تھے۔ آپ کے خاندان کے ایک فرد سید ناصر علی کے پاس اس خاندان کے بزرگوں کے نام فرمانات شاہی و دیگر اہم کاغذات محفوظ ہیں جن کے مطالعہ سے معلوم ہوا ہے کہ حکیم بزرگ شاہ کو انگریزوں نے بادشاہی مسجد کا متولی مقرر کیا تھا۔ مسجد کو واگزار کرنے کا حکم جو ۲ اپریل ۱۸۵۶ء کو کمشنر کے دستخط سے گورنر کے ایماء پر جاری ہوا۔ اس میں بھی لکھا ہے کہ بزرگ شاہ کو مسجد کا متولی مقرر کیا جاتا ہے۔ حکیم صاحب کٹڑہ حکیم ولی شاہ میں مطب کیا کرتے تھے۔ ۱۸۶۸ء میں فوت ہوئے اور تکیہ سردار علی میں آپ کی آخری آرام گاہ بنی۔

گل محمد بن حکیم نور محمد بن حکیم خدا بخش بن حکیم محمد اسحاق انصاری (متوفی ۱۱۹۱ھ) بڑے نامور اور حاذق طبیب گزرے ہیں۔ علم ہیئت، نجوم کے علاوہ سنسکرت کے بھی زبردست عالم تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی آخری زندگی میں ان کے معالجوں میں رہے اور مہاراجہ کی وفات کے بعد جاگیر کی آمدنی اور مطب پر کفایت کرتے رہے۔ آپ ۱۲۷۵ھ میں اس جہان فانی سے رحلت کر گئے[2]۔

ان کے چار لڑکے تھے حکیم مہتاب الدین، حکیم حسام الدین، حکیم وجیہہ الدین جو ۱۲۹۶ھ میں لاولد فوت ہو گئے تھے اور شجاع الدین جن کے بیٹے حکیم احمد شجاع صاحب ہیں۔ حکیم حسام الدین راقم الحروف کے مولد امرتسر میں مطب کرتے تھے۔ آج تک امرتسریوں کو ان کی حذاقت کی سکہ نہیں بھولے ہیں۔

علاؤ الدین معروف بہ الہ دین یہ حکیم شمس الدین کے فرزند تھے۔ انھوں نے طب حکیم غلام دستگیر سے پڑھی تھی۔ ان کا شمار لاہور کے مقتدر اطباء میں ہوتا تھا۔ بڑے بڑے فاضل اطباء نے ان کے خرمن فیض سے خوشہ چینی کی تھی۔ مولوی حکیم نور الدین صاحب بھیروی طبیب مہاراجہ جموں و کشمیر نے بھی آپ سے کسی قدر طب پڑھی تھی۔ آپ لکھتے ہیں:۔

"حکیم الہ دین صاحب لاہوری مقیم گمٹی بازار میرے استاد مقرر ہوئے اور مجھے موجز پڑھاتے تھے عربی عبارت نہایت صحیح پڑھاتا اور تلفظ میں بڑی احتیاط کرنا یہ ان کو ہمیشہ مدنظر تھا۔

حکیم نور الدین صاحب ۱۸۵۸ء میں آپ سے پڑھنے لگے تھے[3]۔

حکیم علاؤ الدین کثیر الاولاد تھے مگر آپ کی وفات کے وقت صرف تین لڑکے زندہ تھے۔ ایک حکیم احمد الدین شارح موجز، دوسرے حکیم چراغ دین، تیسرے حکیم فیروز الدین جو ماہنامہ "رفیق الاطباء" اور ماہنامہ "الحکیم" کے ایڈیٹر تھے[4]۔ حکیم صاحب اسّی برس کی عمر پاکر قریباً ۱۸۸۴ء میں فوت ہوئے۔

"جواہر خمسہ" اور "مرغوب الاطباء" کے نام سے آپ نے ضخیم کتابیں تالیف کیں جو زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکیں۔

---

[1] بیاض غفوری ص ۱۵۲ [2] بیاض غفوری ص ۱۵۳ [3] بیاض نور الدین مطبوعہ قادیان ص ۳ [4] الحکیم لاہور جولائی ۱۹۵۱ء ص ۱۰

پنڈت کنہیا وید و حکیم — یہ ویدک اور یونانی طب کے فاضل تھے۔ ۱۸۸۲ء میں ان کا مطب بڑا کامیاب تھا۔[۱]

جیون جان — لاہور کے بلند پایہ اطباء میں ان کا شمار ہوتا تھا، بڑے شیریں زبان، خوش خلق اور ہمدردِ خلائق تھے۔[۲] ۱۸۸۲ء میں آپ کا مطب مرجع انام تھا۔

شرف علی — بن احمد علی، لاہور کے نامی گرامی اطباء میں سے تھے۔ علم و فضل میں بھی یکتا تھے۔[۳] ۱۸۸۲ء میں آپ کا مطب لاہور میں شفا بخش مریضاں تھا۔

بالک رام — یہ لاہور کے بڑے مشہور طبیب تھے، مطب آپ کا مرجع انام تھا۔ ۲۰ اگست ۱۸۹۹ء کو فوت ہوئے۔[۴]

شجاع الدین — بن حکیم گل محمد بن حکیم نور محمد بن حکیم خدا بخش بن حکیم محمد اسحاق انصاری متوفی ۱۱۹۱ھ بن حکیم شیخ نور محمد، لاہور کے جلیل القدر اطباء میں سے تھے۔ رائے بہادر کنہیا لال تاریخ لاہور میں لکھتے ہیں:

> "حکیم شجاع الدین لاہور میں قیام پذیر ہے یہ شخص عالم، فاضل و طبیب ہے۔ بہت رسالے علوم متنوع میں لکھے ہیں۔ نظم فارسی، عربی عمدہ لکھتا ہے، طبابت بھی کرتا ہے اور سرکاری ملازموں میں بھی ہے۔"[۵]

"رجز غضنفری فی تردید اطلاع ضروری" بھی آپ ہی کی تالیف ہے۔ آپ کے خاندانِ حکیماں ساکنانِ اندرون بھاٹی گیٹ کے حالات راقم نے اسی کتاب سے لیے ہیں۔ حکیم احمد شجاع صاحب انہی حکیم شجاع الدین مرحوم کے فرزندِ ارجمند ہیں جن کا وجود جملہ خاندانِ حکیماں کے لیے باعثِ فخر ہے۔

پنڈت خوشحال — آپ ویدک اور یونانی طب کے ماہر تھے۔ لاہور میں آپ کی بڑی شہرت تھی۔[۶] ۱۸۸۲ء میں تاریخ لاہور کی تدوین کے وقت زندہ موجود تھے۔

بہادر شاہ — یہ حکیم بزرگ شاہ متوفی ۱۹۰۶ء کے بڑے بھائی تھے۔ تمام پنجاب میں ان کی حذاقت کا شہرہ تھا۔ ان کے جسم کا نچلا دھڑ مفلوج تھا مگر اس کے باوجود پلنگ پر پڑے پڑے مریضوں کو دیکھتے رہتے تھے ان کے ہاں مریضوں کا اس قدر ہجوم ہوتا تھا کہ بہ مشکل تمام ایک دو بجے دوپہر تک ان کو فرصت ہوتی تھی۔ ۱۸۹۹ء میں فوت ہوئے۔

محمد اکبر بیگ — یہ محمد اعظم بیگ اسسٹنٹ کمشنر لاہور کے فرزند تھے، اسلامبول ترکی کے مکتب طبی شاہی میں تعلیم پائی۔ انھوں نے ترکی میں بیٹھ کر "صحت نامۂ ازدواج" نامی کتاب بزبانِ اردو تصنیف کی جس کو حکومت ترکی کی اجازت سے عمدہ کاغذ پر اعلیٰ ٹائپ میں مطبع محمود بک قسطنطنیہ سے ۱۳۰۱ھ میں طبع کرایا اور اس قیمتی علمی کتاب کو ہم وطنوں کی خدمت میں پیش کرنے کا فخر

۱۔ تاریخ لاہور ص ۵۹ ۲۔ تاریخ لاہور ص ۶۲ ۳۔ تاریخ لاہور ص ۶۱ ۴۔ بزرگانِ ہنود (قلمی) ص ۱۵۷ ۵۔ تاریخ لاہور ص ۵۹
۶۔ تاریخ لاہور کنہیا لال ص ۵۹

حاصل کیا[1]۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر حاوی ہے۔ ڈاکٹر اکبر بیگ انگریزی اور یونانی طب کے اعلیٰ درجہ کے واقف اور ماہر تھے۔

پنڈت جنار دھن | یہ ویدک اور طب یونانی دونوں کے فاضل تھے، ہندی طریق پر معالجہ کرتے اور پنجاب یونیورسٹی میں ویدک پڑھاتے تھے[2]۔ ایک عرصہ تک میونسپل کمیٹی لاہور کی جنرل کمیٹی کے رکن رہے[3]۔ لاہور کے معززین میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ انگریزی حکومت نے آپ کو "رائے بہادر" کا خطاب بھی دیا ہوا تھا۔

پنڈت جی بے حد دولت مند اور سخی تھے۔ رفاہِ عام کے کاموں پر لاکھوں روپے خرچ کر گئے۔ آپ نے "نیا شالا مار باغ" کے نام سے ایک بڑی نفیس سیرگاہ بنوائی تھی جو ملتان روڈ پر "لواں کوٹ" کے پیچھے متصل موضع "نو ناریاں" واقع ہے۔ یہ سیرگاہ ۱۹۴۷ء تک عوام کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔ تقسیم ملک کے بعد اس کی خوبصورت اور قیمتی عمارات کو لوگوں نے برباد کر دیا۔ آج اگر یہ باغ اصلی حالت میں ہوتا تو واقعی لاہور کے اعلیٰ ترین باغوں میں شمار ہوتا۔ آپ نے اندرون شاہ عالمی ایک "جنج گھر" بھی بنایا تھا جس کو شادی بیاہ کی ضرورتوں کے لیے ہر مذہب کے لوگ استعمال کرتے تھے۔ یہ جنج گھر بھی تقسیم ملک کی تباہ کاریوں کی نذر ہو گیا۔

پنڈت جنار دھن نے ایک طبی رسالہ بھی لکھا تھا جس کا نام "رسالہ امراضِ چیچک" ہے جو بڑے سائز کے ۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ کاغذ، کتابت اور طباعت نہایت عمدہ ہے۔ یہ رسالہ ۱۸۷۹ء میں ڈبلیو بال پنجاب پرنٹنگ پریس لاہور میں زیور طبع سے مزین ہوا تھا۔ اس رسالہ پر مؤلف کا نام یوں تحریر ہے :-

"پنڈت جنار دھن جی ولد پنڈت سرپت سرب سکھ جی مہاراج بن پنڈت سری مہاراج دھرتی دھر جی ساکن امرت سر۔"

اس سے معلوم ہوا کہ آپ کے والد یا آپ خود امرت سر سے لاہور آئے تھے۔ "رشی بھون" نامی وسیع ترین کوٹھی واقع بانڈرتھ روڈ لاہور میں آپ کی رہائش تھی اور رشی بھون کے گرد و نواح میں کئی مکانات آپ ہی کے تھے۔ نیز ایک کوٹھی شالا مار باغ کے پاس بھی تھی۔ تقسیم کے بعد آپ کی اولاد دہلی جا بسی۔

پنڈت جی کا سال وفات معلوم نہیں ہو سکا۔ تاریخ لاہور ۱۸۸۲ء میں تصنیف ہوئی تھی اور اس وقت آپ کا طوطی لاہور میں بول رہا تھا۔ لاہور کے ایک بزرگ کہن سال کی روایت ہے کہ سنہ ۱۹۰۰ء کے قریب آپ فوت ہوئے۔

محمد الہ یار | یہ حکیم غلام دستگیر کے شاگرد تھے، وطن قاضی کوٹ ضلع گوجرانوالہ تھا۔ قریباً ۱۸۷۵ء میں لاہور میں مطب جاری کیا۔ آنکھوں کے بہت اچھے معالج تھے۔ ان کا دواخانہ بھی تھا۔ مریضوں کو اپنے پاس سے تیار شدہ دوائیں دیتے تھے[4]۔

بزرگ شاہ | انیسویں صدی میں لاہور میں جو نامی گرامی اطباء ہوئے ان میں سرفہرست حکیم سید محمد شاہ، حکیم سید بہادر شاہ اور حکیم سید بزرگ شاہ کے نام آتے ہیں۔ یہ تینوں سگے بھائی تھے۔ ان کو حکیم سید عنایت شاہ طبیب مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بھانجے ہونے کا شرف بھی حاصل تھا ——— حکیم بزرگ شاہ کا مکان "رتّا نیلیاں" میں بر عقب مکان حکیم سید عنایت اب بھی موجود ہے۔ آپ بڑے صاحب ثروت و دولت تھے۔ جب فوت ہوئے لاہور کی بہترین عمارت "بزرگ محل" اور دیگر بہت سی جائیداد کے علاوہ نقد ایک لاکھ روپے چھوڑ گئے۔

---

[1] "مقدر سمت نامۂ ازدواج" ص ہ [2] تاریخ لاہور ص ۵۹ [3] تاریخ لاہور ص ۹۸ [4] تاریخ لاہور از کنہیا لال ص ۶۱

آپ کا انتقال ۱۳۲۴ھ مطابق ۱۹۰۶ء میں ہوا۔ آخری آرام گاہ قبرستان شیعاں میکلوڈ روڈ لاہور میں ہے۔ قبر ٹوٹ پھوٹ چکی ہے لوحِ مزار ایک طرف گری پڑی ہے۔ تاریخ وفات اسی لوح سے ملی ہے۔ حکیم صاحب کے پوتے تمام جائداد اور بزرگ محل کر فروخت کرکے کراچی جا چکے ہیں ؎

مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے

لاہوری مل سہگل

ان کے والد لالہ برکت رام سہگل سکھوں کے عہد میں "چونڈہ" ضلع امرت سر سے لاہور آ گئے تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے پائی پھر حکیم قاسم بیگ صاحب ہیڈ ماسٹر مشن سکول لاہور سے اسکول ٹائم کے بعد ان کے گھر جا کر طب پڑھتے رہے اور ساتھ ہی "وید سوامی کیول نند گرجی" سے آیورویدک کی تحصیل کرتے رہے، ۱۸۶۵ء میں سنٹرل میوزیم یعنی عجائب گھر لاہور میں ملازم ہو گئے۔ اس کے بعد ریلوے میں ملازمت کر لی مگر چند سال بعد ان نوکریوں کے خیال کو خیرباد کہہ کر طبابت کرنے لگے اور بڑے کامیاب معالج ثابت ہوئے[1] ۱۹۱۱ء میں آپ کی عمر ۶۸ سال کے قریب تھی۔ اس کے بعد ہی کسی سال میں وفات پائی۔

غلام نبی ایڈیٹر "حافظِ صحت"

یہ موضع اعوان تحصیل اجنالہ ضلع امرت سر میں پیدا ہوئے، والد کا نام خلیفہ ولی محمد تھا اعوان قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ نے عربی اور فارسی کی تعلیم گاؤں ہی میں پائی، اس کے بعد امرت سر کے جید علماء سے تحصیل علم کی جن میں سے مولانا مفتی غلام رسول قاسمی کشمیری ثم امرت سری متوفی ۱۹۰۲ء (۱۳۲۰ھ) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ پھر لاہور چلے آئے یہاں حکیم حاذق و زبدۃ الحکما کے امتحانات پاس کیے اور یہیں مطب شروع کیا۔ ایک طبی رسالہ جاری کیا جس کا نام "حافظِ صحت" رکھا۔ یہ رسالہ تا حال نکل رہا ہے مگر حکیم صاحب کے زمانے والی بات نہیں۔

زبدۃ الحکما حکیم غلام نبی بڑے بارسوخ اور ذہین انسان تھے، لاہور کے معززین سے آپ کے بڑے گہرے مراسم تھے۔ صوفیا سے بھی بڑی ملاقاتیں رہتیں۔ حضرت پیر جماعت علی شاہؒ حضرت مولانا شاہ سلمان پھلواری جن کے فرزند مشہور مجدد مولانا جعفر پھلواروی ہیں اور مولوی محرم علی صاحب چشتی لاہوری آپ کے بڑے تعلقات تھے۔

حکیم صاحب مہاراجہ نابھہ کے علاج کے لیے تشریف لے گئے تھے، مہاراجہ نے شفایاب ہو کر نقد روپے دینے کے علاوہ طلائی کڑے بھی دیئے۔ جنوری ۱۹۰۹ء کو سر فیض محمد خاں والی خیرپور کے علاج کے لیے گئے۔ پیر صاحب پگارو بھی آپ سے معالجہ کراتے تھے۔

آپ کی تالیفات چالیس کے قریب ہیں۔ ان میں سے اکثر وقتی حیثیت رکھتی تھیں مگر بعض کی قدر و قیمت اب بھی بہت زیادہ ہے۔

حکیم صاحب ۲ اگست ۱۹۱۶ء کو وفات پا گئے۔ بر لب بہاولپور روڈ قبرستان میانی میں مقبور ہوئے شمس الدین شائق مؤلف منظوم ترجمۂ قرآن نے تاریخ ذیل کہی جو لوح مزار پر کندہ ہے :-

غلام نبی آں حکیمِ یگانہ — الٰہی بجنات مسرور بادا
بوقتِ وفاتش ز افکارِ شائق — بشد سال تاریخ "مغفور بادا"
۱۳۳۴ھ

---

[1] رموز الاطباء جلد اول ص ۲۵۰

مولوی غلام محی الدین انصاری

۲۶ نومبر ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے۔ شمس الاطبا ڈاکٹر حکیم غلام جیلانی کے برادر بزرگ تھے۔ انھوں نے عربی، فارسی اور طب کی تعلیم اپنے والد حکیم مولوی سلطان محمود انصاری سے حاصل کی، نیز علامہ عصر مولوی فیض الحسن سہارن پوری سے بھی مستفید ہوئے۔ فن کتابت میں منشی ممتاز علی "نزہت رقم" دہلوی کے شاگرد تھے اور خود کو "زینت رقم" لکھتے تھے۔ حکیم صاحب عرصہ تک گوالیار اور بمبئی میں رہے۔ "انڈیا گزٹ بمبئی" نام سے ایک مشتہر وار پرچہ بھی نکالا تھا۔ ۱۹۰۲ء میں بغرض ملاقات احباب لاہور آئے مگر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ گمٹی بازار میں آپ کا مطب تھا۔ آپ حضرت علی حسین شاہ کچھوچھوی سے بیعت تھے۔

حکیم صاحب نے بنام "ارمغان قادری" ایک کتاب لکھی جس میں شریعت و طریقت کے مسائل کو معتبر کتب سے اخذ کر کے جمع کر دیا ہوا ہے۔ ایک حمائل شریف اپنے ہاتھ سے لکھ کر شائع کی تھی جس میں یہ ندرت ہے کہ اگر ایک صفحہ کی پہلی سطر الف سے شروع ہوتی تو اس صفحہ کی آخری سطر کا ابتدائی حرف بھی الف ہے۔ اسی طرح اوپر کی دوسری سطر کے مقابلے میں نیچے سے اوپر کی دوسری سطر ایک ہی لفظ یا حرف سے شروع ہوتی ہے علیٰ ہذا القیاس ـــ اور دوسری صنعت یہ ہے کہ صفحہ اول کی درمیانی سطر جس حرف سے شروع ہوگی اس کے سامنے والے صفحہ کی درمیانی سطر کا پہلا لفظ بھی وہی ہوگا۔ اس صنعتی حمائل کے متعلق یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ حکیم صاحب مرحوم کو اس صنعت کا موجد نہیں سمجھنا چاہیے کیونکہ بالکل اسی صنعت کا ایک قلمی نسخہ حافظ محمود شیرانی مرحوم کے کتب خانہ میں تھا۔ حافظ صاحب نے محترم پیر غلام دستگیر نامی صاحب کو یہ نادر مخطوطہ دکھایا تھا۔ ممکن ہے کہ کسی ایسے قدیم نسخہ سے انھوں نے نقل کی ہو اور توارد کا بھی سو فی صدی امکان ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حکیم مولوی غلام محی الدین ۱۱ ذی الحجہ بروز اتوار ۱۳۳۶ھ کو اس دار فنا سے رحلت کر گئے۔ قبر آپ کی حضرت طاہر بندگی کے جوار میں جانب شرق ہے۔ لوح مزار پر "زینت در جنت" مادہ سال وفات کندہ ہے اور ان کے ساتھ ہی شمس الاطبا حکیم غلام جیلانی مدفون ہیں مگر ان کی قبر پر کوئی کتبہ نہیں۔

عبدالعزیز کامل

انھوں نے عربی، فارسی اور فقہ وغیرہ کی کتابیں اپنے والد ماجد مولانا پیر حاجی عبدالکریم لاہوری سے پڑھیں اور علم طب کی تحصیل مختلف اساتذہ سے کی جن میں سے حکیم مولوی محمد ابراہیم جالندھری ثم لاہوری تم امرتسری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حضرت کامل نہایت ذہین و فطین تھے بہت تھوڑے عرصے میں آپ کی قابلیت کی شہرت تمام ہندوستان میں ہو گئی تھی۔ آپ نے ۱۹۰۴ء میں لاہور سے ایک ادبی رسالہ بنام "کامل" جاری کیا۔ ۱۹۰۷ء میں اخبار "حکمت" کی ادارت کی ذمہ داری آپ نے اپنے ہاتھ میں لے لی اور "حکمت" کو بام عروج پر پہنچایا۔ "کاشف رموز کیمیا" و دیگر کئی کتابیں تصنیف کیں جن کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ کامل صاحب صرف ۳۷ سال عمر پا کر ۲ مئی ۱۹۱۹ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ آپ لاولد تھے۔ محترم جناب حکیم حاجی عبدالمجید صاحب عتیقی آپ کے برادر خورد ہیں۔

سید عبدالقدیر

آپ کے والد ماجد حکیم سید محمد اسد اللہ بن مولانا حکیم سید فیض علی شاگرد حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی ۱۸۴۵ء میں قصبہ ہاپوڑ ضلع میرٹھ سے نقل مکانی کر کے امرتسر آ گئے تھے۔ حکیم عبدالقدیر صاحب نے وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ طب اپنے والد سے پڑھی اور مولانا غلام علی قصوری مشہور اہل حدیث عالم اور مولانا حبیب اللہ خاں پشاوری سے بھی تحصیل علوم کی۔

سیاحت کے شوقین تھے، امرتسر کو چھوڑ کر اطراف و اکنافِ ہند میں گھومتے رہے، پھر ریاست لوہارو میں افسر الاطباء کے عہدہ پر مامور ہو گئے، اور نواب صاحب کے معالج خصوصی بھی رہے مگر جلد ہی مستعفی ہو گئے[1]۔ ۱۸۹۲ء کے قریب لاہور آ گئے اور یہاں مطلب جاری کیا۔ ۱۹۱۱ء میں آپ لاہور میں زندہ تھے اور عمر قریباً پچاس سال تھی۔

چراغ دین | آپ حکیم علاؤالدین معروف بہ الہ دین کے فرزند اور لاہور کے معروف طبیبوں میں سے تھے۔ ریاست فرید کوٹ سے آپ کا خاص تعلق تھا۔ آپ کے صاحبزادے حکیم فضل الدین بھی لاہور میں مشہور طبیب ہوئے جو عین عالم شباب میں فوت ہو گئے تھے[2]۔

مولوی احمد الدین | یہ حکیم مولوی علاؤالدین کے منجھلے صاحبزادے تھے۔ حکیم فیروزالدین ایڈیٹر "رفیق الاطباء" و "الحکیم" لاہور آپ کے چھوٹے بھائی اور شاگرد تھے۔ حکیم مولوی احمد الدین نے مروجہ علوم کی کتابیں مولانا غلام محمد بگوی خطیب بادشاہی مسجد اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے پڑھیں۔ طب کی تحصیل اپنے والد سے کی۔ آپ کچھ عرصہ مہاراجہ فرید کوٹ کے معالج خصوصی کی حیثیت سے فرید کوٹ میں رہے۔ چھ سات کتابیں آپ نے تالیف کیں جن میں سے شرح موجز خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ سالِ وفات معلوم نہیں ہوا آپ کے وارث بھی بے خبر ہیں۔

فیروزالدین | یہ لاہور کے مشہور و معتدد طبی جرائد "رفیق الاطباء" و "الحکیم" کے ایڈیٹر تھے۔ ان کے والد حکیم علاؤالدین معروف بہ الہ دین لاہور کے اعاظم اطباء میں سے تھے۔ حکیم فیروزالدین نے کئی کتابیں تصنیف کیں جن میں سے "رموز الاطباء" کو بڑی شہرت حاصل ہے۔ حکیم فیروزالدین مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب دہلوی مغفور و مبرور کی طبی تحریکوں کے ہمیشہ نہایت سرگرم کارکن رہے۔ بڑے صاحب ہمت اور باحمیت تھے۔ ۱۹۲۶ء آپ کا سنہ وفات ہے۔

مفتی محمد انور قریشی | یہ مفتی غلام سرور مؤلف "خزینۃ الاصفیا" کے فرزند تھے۔ آپ نے طب کی ابتدائی کتابیں اپنے والد ماجد سے پڑھیں۔ پھر حکیم سید نجف علی شاہ سے جو لاہور کے مشہور طبیب تھے فیض یاب ہوئے اور ڈاکٹر حاکم دین مرحوم سے انگریزی طب پڑھی۔ آپ بڑے حاذق طبیب تھے۔ فاضل اجل پیر مہر علی شاہ گولڑوی اور نواب صاحب لوہارو کے معالج خصوصی ہونے کا آپ کو شرف حاصل تھا۔ آپ نے "مجرباتِ انوری" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جو طبع نہیں ہو سکی[3]۔ ۲۰ رنومبر ۱۹۲۳ء کو راہی ملک بقا ہوئے۔ آپ کا مطب کوچہ مفتیاں لاہور میں تھا۔

محمد ابراہیم | آپ "بستی غناں" جالندھر میں مولوی حکیم محمد بخش کے ہاں رجب ۱۲۴۲ھ میں پیدا ہوئے[4]۔ عربی، فارسی کے فاضل اور طب کے بہت بڑے ماہر تھے۔ حکیم امام الدین پاک پٹنی مصنف "مخزنِ اکسیر" و طبیب شاہی ریاست کپورتھلہ سے طب کی تحصیل کی تھی۔ آپ نے ایک عرصہ تک لاہور میں مطب کیا اور سینکڑوں کو طب پڑھائی۔ ۱۸۹۶ء کے قریب آپ امرتسر جا کر مطب کرنے لگے اور تین چار سال وہاں گزار کر پھر لاہور آ گئے مگر یہاں دل نہ لگا اور واپس امرتسر چلے گئے۔ مطب آپ کا ہر جگہ مرجع خلائق رہا۔ حکیم حافظ محمد اجمل خاں مرحوم دہلوی آپ کی بڑی قدر کرتے تھے۔ حکیم صاحب ابراہیم کے منجھلے صاحبزادے حکیم حاجی غلام جیلانی امرتسری مصنف کتب کثیرہ کی فنی شہرت

---

[1] رموز الاطباء جلد اول ص ۴۲۴ [2] رموز الاطباء جلد اول ص ۱۲۷ [3] رموز الاطباء جلد اوّل ص ۹۲۴ [4] رموز الاطباء جلد اوّل ص ۲۹۶

تمام ہندوپاک میں ہے۔ راقم الحروف کے والد فخر الاطبا حکیم فقیر محمد چشتی امرتسری مرحوم کو بھی حکیم ابراہیم صاحب سے تلمذ تھا۔ آپ کا سالِ وفات ۱۳۲۳ھ ہے۔[۱]

مولوی غلام مصطفیٰ ایم، او، ایل

ابن حکیم مولوی فضل الدین ابن حکیم قطب الدین ابن حکیم کریم بخش ابن قدوۃ العارفین حکیم محمد عظیم ساکن گوجرانوالہ، لاہور کے مشہور فاضل طبیب حکیم مولوی محمد بخش کے شاگرد رشید تھے۔ طب کے علاوہ دیگر کئی علوم و فنون کے بھی بہت بڑے فاضل تھے۔ ۱۸۸۳ء تک آپ نے مولوی عالم، مولوی فاضل، منشی فاضل، انٹرنس، ایف، او، ایل، بی، او، ایل، ایم، او، ایل کے امتحانات پاس کر لیے تھے۔ پھر حکیم حاذق اور زبدۃ الحکماء کی سندات بھی حاصل کیں۔ ۱۸۸۶ء سے ۱۸۸۹ء تک اورینٹل کالج میں طبِ یونانی کے مدرس رہے۔ ۱۸۸۹ء میں آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں مولانا محمد حسین آزاد کے قائم مقام عربی و فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر لائٹنر نے ۱۸۹۱ء میں معقول مشاہرے پر آپ کو لندن طلب کیا مگر آپ نہ گئے۔ ۱۸۹۸ء میں مستقل طور پر گورنمنٹ کالج میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ طبیہ کالج انجمن حمایت اسلام میں آخر زندگی تک پڑھاتے رہے۔[۲]

حکیم صاحب نے کئی کتابیں تصنیف فرمائیں جن کے نام یہ ہیں:۔۔۔ "حل جبر و مقابلہ" "حل علم مثلث" (غیر مطبوعہ) "تاریخ التقدیم" اس میں ابتدائے دنیا سے پانچ سو سال بعد مسیح کی تاریخ ہے۔ "قرابادین مصطفائی" "خلاصۃ الرشیدیہ" (عربی) "رسالۃ التوحید المسمیٰ با حسن العقائد اسلام" "رسالۃ الناد رہ فی تشریح الشرائین والاوردہ" اور "تشریح الابدان"۔ ڈاکٹر لائٹنر پرنسپل اورینٹل کالج کی تصنیف "سنین اسلام" میں مولوی فیض الحسن مرحوم اور حکیم غلام مصطفیٰ کا تعاون مصنف کے شاملِ حال رہا۔[۳]

حکیم صاحب اونچی مالی مسجد چوک نواب اندرون موچی گیٹ کے قریب رہتے تھے۔ اب بھی ان کی اولاد اسی مکان میں رہ رہی ہے۔ حکیم صاحب کے صاحبزادے فیروزالدین زبدۃ الحکماء بھی فوت ہو چکے ہیں۔ آپ کے سالِ وفات کا صحیح علم ان کی ورثا کو بھی نہیں ہے۔ اندازہ ہے کہ ۱۹۲۴ء میں فوت ہوئے ہوں گے کیونکہ جب "تشریح الابدان" ۱۹۲۵ء میں دوسری بار شائع ہوئی تو اس سے پہلے آپ وفات پا چکے تھے۔

مولوی غلام مصطفیٰ ایم، او، ایل مخدومی حضرت مولانا محمد عالم آسی امرتسری متوفی ۱۳۶۳ھ کے نانا کے رشتہ دار تھے اس لیے حضرت آسی کے ساتھ ان کے تعلقات بہت گہرے تھے۔

مفتی سلیم اللہ خاں

یہ ۱۸۴۸ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مفتی عظیم اللہ خاں پشاوری تھا۔ مفتی صاحب نے منطق، فلسفہ، حدیث اور فقہ کی کتابیں لاہور کے مشہور فاضل بزرگ خلیفہ حمید الدین سے پڑھیں۔ طبی تعلیم حکیم الٰہی بخش اور حکیم مولوی محمد بخش سے حاصل کی۔ مفتی سلیم اللہ خاں کی تمام زندگی پڑھنے پڑھانے میں گزری۔ کتابیں پڑھنے میں آپ کو ایسا ملکہ حاصل تھا کہ اپنے وقت آپ کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ہزارہا طالبانِ علمِ طب آپ سے فیض یاب ہوئے۔ ہندوپاک کے علاوہ بلخ، بخارا، افغانستان اور ایران تک کے طلبا آپ سے پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ بڑے بڑے طبیہ کالجوں کے مقابلے میں اکیلے آپ کی تدریسی خدمات بہت زیادہ ہیں۔ انجمن اطبا لاہور اور انجمن نعمانیہ لاہور کے صدر رہے۔ مدرسہ نعمانیہ کی ترقی کے لیے آپ ہمیشہ کوشاں رہے۔ بعارضہ فالج ۱۹۲۵ء میں واصل بحق ہوئے اور احاطہ مزار حضرت

---

[۱] مجربات فخر الاطبا، ص ۷ [۲] رموز الاطبا، جلد اول ص ۴۵۱ [۳] اس زمانہ کے بعض ادیبوں کا قول ہے کہ سنین اسلام، ڈاکٹر لائٹنر نے مولوی محمد حسین آزاد سے لکھوائی تھی اور اپنے نام سے شائع کی۔

شاہ ابوالمعالی علیہ الرحمۃ میں دفن کیے گئے۔

شمس الاطباء غلام جیلانی

آپ ۵ مئی ۱۸۶۳ء میں بمقام لاہور پیدا ہوئے، والد کا نام حکیم سلطان محمود انصاری تھا۔ شمس الاطباء نے عربی اور فارسی پڑھنے کے بعد میڈیکل کالج لاہور سے تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۹۵ء میں ایل ایم ایس کا ڈپلومہ حاصل کیا اور اسی سال سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ ایران میں برٹش ایجنٹ مقرر ہوئے۔ دولتِ ایران نے آپ کو شاہی مجلسِ حفظِ صحت کا ممبر منتخب کیا۔ ۱۹۰۶ء میں ملازمت ترک کر کے لاہور چلے آئے اور تالیف و تصنیف کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس کام میں آپ کو بے حد کامیابی نصیب ہوئی آپ کی تصانیف اطراف و اکناف ہند میں مقبول و مروج ہوئیں۔ کل ۸ کتابیں آپ کی زیر ہدایت تصنیف ہوئیں اور بار بار زیور طباعت سے آراستہ ہوتی رہیں مگر مخزنِ حکمت کو بہت زیادہ مقبولیت نصیب ہوئی۔ اس کے اٹھارہ ایڈیشن حکیم صاحب کی زندگی میں نکل چکے تھے۔ یہاں یہ لکھ دینا بھی ضروری ہے کہ یہ کتابیں صرف شمس الاطباء کی محنت و کاوش کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ ان کی تدوین میں بہت سے مصنفین کا حصہ ہے۔ رسالہ شمس الاطبا "جیلانی نمبر" میں لکھا ہے:۔

> "تالیف و تصنیف کے زمانہ میں ہندوستان کے اکثر مشہور و معروف طبیب اور ڈاکٹر صاحبان مرحوم کی زیر ہدایت کام کرتے رہے جن میں سے حکیم مولوی کبیر الدین صاحب مدیر المسیح دہلی ڈاکٹر و حکیم مرزا امام الدین صاحب مدیر حامی الصحت، ڈاکٹر سعید الدین صاحب، حکیم خورشید حسن صاحب مدیر مصباح الحکمت، ڈاکٹر نظام الدین صاحب، حکیم مستجاب حسن صاحب مرحوم، حکیم فیروز الدین صاحب طغرائی مرحوم، حکیم قاضی عظیم اللہ صاحب وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔"[1]

حکیم صاحب طبیہ کالج لاہور کے محسن تھے۔ انگریزوں نے آپ کو "خانصاحب" کا خطاب بھی دیا ہوا تھا۔ اس مجددِ فن نے ۲۲ فروری ۱۹۲۶ء کو وفات پائی اور حضرت طاہر بندگیؒ کے جوار میں اپنے برادرِ بزرگ حکیم غلام محی الدین کے قرب میں دفن کیا گیا۔ شمس الاطباء کے چھوٹے صاحبزادے ڈاکٹر محمد محمود انصاری کتب خانہ شمس العلماء کو چلا رہے ہیں اور چھوٹے صاحبزادے ایم مسعود سی۔ ایس۔ پی اس وقت حکومت پاکستان کے ایک محکمہ کے کمشنر ہیں۔

آغا علی

اِن کے والد مہدی علی خاں تھے اور اُن کے والد کا نام نواب امیر علی خاں تھا جو نواب بہادر علی خاں والیٔ ریاست بہادر گڑھ متصل دہلی کے بھائی تھے۔ بہادر گڑھ روڈ دہلی میں اب بھی مشہور شارع ہے۔ اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ ہمایوں بادشاہ کے ہمراہ ہندوستان آئے تھے۔

نواب بہادر علی خاں لاولد تھے اس لیے ان کے جانشین نواب امیر علی قرار پائے۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں نواب صاحب نے انگریزوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا، اس جرم میں ریاست چھن گئی اور مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ حکیم آغا علی خاں کے والد نواب مہدی علی خاں لاہور چلے آئے۔ انگریزی حکومت نے ان کی پولیٹیکل پنشن مقرر کر دی تھی۔

---

[1] ماہنامہ شمس الاطباء ستمبر ۱۹۳۲ء

حکیم صاحب نے طب کی تحصیل حکیم بہادر شاہ لاہوری سے کی، بڑے ذہین و فطین تھے، بہت جلد آپ کا مطب مرجع انام بن گیا۔ پنجابی کے شاعر تھے، آغا تخلص تھا۔ محمد افضل خاں ابن گشتہ امرتسری مرحوم، استاد گام اور دیگر کئی نامور پنجابی شعراء آپ سے اصلاح سخن لیتے رہے۔ پولیٹیکل پنشن آپ کو برابر ملتی رہی۔ تقریباً ۸۰ برس کی عمر پا کر ۸ جنوری ۱۹۲۷ء کو انتقال کیا۔ آپ کے صاحبزادے حکیم اعظم علی اچھے طبیب اور باعزت شخص ہیں ——— [1]

عالم شاہ

یہ لاہور کے مشہور طبیب سید محمد شاہ کے صاحبزادے تھے، ان کا مطب واقع نورگلی نزد طویلہ نواب صاحب اندرون موچی گیٹ لاہور مرجع انام تھا۔ اطبائے سلف کا نمونہ تھے۔ حکیم صاحب فنِ کتابت کے بھی ماہر تھے۔ غرضیکہ بڑے اوصاف سے اللہ نے انہیں نوازا تھا۔ عزت، عظمت اور دولت آپ کی خانہ زاد تھیں۔ آپ کے دستِ شفا کی حکایتیں آج تک زبان زدِ عوام ہیں۔ نرینہ اولاد سے محروم تھے۔ اپریل ۱۹۲۹ء میں انتقال کر گئے اور کربلا گامے شاہ میں مولانا محمد حسین آزاد کی مسقف قبر کے ساتھ جانبِ شرق مدفون ہوئے۔ قبر آپ کی بھی مسقف ہے مگر قبر پر کوئی کتبہ لگا ہوا نہیں ہے جس سے صاحبِ قبر کا نام معلوم ہو سکے۔

سید ظفر یاب علی

یہ نگینہ ضلع بجنور میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں پائی، پھر دیوبند اور مدرسہ عالیہ رام پور سے اکتساب علم کیا۔ طبی تعلیم مدرسہ طبیہ دہلی سے حاصل کی اور ایک عرصہ تک مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں مرحوم کے پیش کار رہے۔ مسیح الملک کے ارشاد کے مطابق ہی لاہور میں مطب شروع کیا۔ یہاں آپ کا مطب مرجع انام تھا۔ ۱۹۲۹ء میں بعارضہ ذیابیطس فوت ہوئے۔ اس وقت آپ کے فرزند حکیم ظفر عسکری صاحب لاہور کے ایک کامیاب طبیب ہیں۔

سید مراتب علی شاہ موسوی

بن سید بہادر شاہ ۵ مئی ۱۸۶۵ء مطابق ۱۲۸۱ھ کو پیدا ہوئے۔ ان کے نانا حکیم سید عنایت شاہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے اطباء میں سے تھے۔ ۲۰ مئی ۱۹۲۹ء کو فوت ہو کر اپنے نانا کے قرب میں مدفون ہوئے۔ ان کے چھوٹے بھائی حکیم نوازش علی شاہ میونسپل کمشنر لاہور بڑے بااثر شخص تھے۔ حکیم صاحب مرحوم کے صاحبزادے سے استفسار پر معلوم ہوا کہ ان کا سلسلہ نسب حضرت امام موسیٰ کاظمؑ سے ملتا ہے اسی لیے موسوی کہلاتے ہیں۔

کویراج ہیراج وید

یہ لاہور کے ایک بزاز کے گھر ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوئے۔ پہلے والد کے ساتھ دوکان پر کام کرتے رہے پھر علم کا شوق تو اس کے حصول میں لگ گئے۔ اُردو اور سنسکرت پڑھنے کے بعد اورینٹل کالج میں داخل ہو گئے اور "پراجینیہ" کا امتحان پاس کر کے وظیفہ حاصل کیا۔ ۱۸۹۵ء میں "وشارد" اور ۱۸۹۹ء میں "شاستری" کا امتحان پاس کیا۔ میڈیکل کالج میں اناٹمی پڑھی۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی امتحان پاس کیے ہوئے تھے۔ اخبار "بھارت مگھتی پتر" کو ۱۹۱۱ء تک ایڈٹ کرتے رہے۔ لاہور میں ان کا مطب بہت کامیاب تھا۔[1] اس کے جلد بعد ہی فوت ہو گئے تھے۔

احمد علی خاں

یہ چنیوٹ ضلع جھنگ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام منشی نواب خاں تھا۔ مولانا نور احمد سکنہ چنیوٹ سے تحصیلِ علم کی۔ طبی تعلیم حاصل کرنے کے لیے لاہور چلے آئے اور یہاں کے مختلف اساتذہ فن سے فیض یاب ہو کر "زبدۃ الحکما" کا امتحان پاس کیا۔ کچھ عرصہ میڈیکل کالج میں بھی پڑھتے[2]۔ بارہ کے قریب آپ کی تصانیف ہیں۔ تکمیل البحرین ۷ جلد، قرابادین احمدیہ ۴ جلد، معمولاتِ احمدیہ ۲ جلد۔

---

[1] رموز الاطباء جلد اوّل ص ۴۳۴ [2] رموز الاطباء جلد اوّل ص ۱۷۵

مشیر النساء، مشیر الاطفال وغیرہ طب میں تصنیف کیں۔ اسرارِ تصوف دو حصہ اور تفسیر القرآن پارۂ اوّل بھی لکھی۔ رسالہ "تکمیل الحکمت" بھی جاری کیا جو غالباً ۱۸۸۰ء میں نکالنا شروع کیا تھا۔ آپ ایک سو پندرہ برس کی طویل عمر پا کر ۱۵ ر فروری ۱۹۳۰ء کو اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ آپ کے صاحبزادے حکیم محمد علی خاں عقب مسجد وزیر خاں میں رہتے ہیں۔ رموز الاطباء میں حکیم احمد علی خاں کی عمر غلط درج ہے۔ حکیم محمد علی صاحب نے بھی اس کی تکذیب کی ہے۔

فیروز الدین فیروز طغرائی

علامہ طغرائی ۱۸۸۲ء میں امرت سر کے ایک معزز کشمیری گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ نے طب مولانا حکیم غلام رسول اور تفسیر قرآن مولانا علامہ غلام رسول قاسمی کشمیری المعروف رسول بابا متوفی ۱۹۰۲ء سے پڑھی۔ عربی ادب کی بعض کتابیں مولانا محمد عالم آسی متوفی ۱۹۴۴ء (۱۳۶۳ھ) سے پڑھیں۔ طغرائی صاحب کو طب، عروض، فارسی اور عربی کے علاوہ دینیات میں بھی عبور حاصل تھا۔ غایت درجہ کے ذہین و فطین تھے۔ سبعہ معلقہ، متنبی، عرفی، نظیری اور بیدل کے کلام کا اکثر حصہ آپ کو ازبر تھا۔

جناب طغرائی خود بہت بلند پایہ شاعر تھے۔ آپ کے اُردو، فارسی اور عربی کلام میں یکساں روانی پائی جاتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ گرامی کے بعد پنجاب نے اقبال اور طغرائی جیسے فارسی شعراء پیدا نہیں کیے تو یہ بے جا نہ ہوگا۔ آپ کا کلام بلاغت نظام بنام "کلیاتِ طغرائی" بہ سعی صوفی غلام مصطفےٰ تبسم لاہور سے شائع ہو چکا ہے۔

حکیم صاحب "وکیل امرت سر" ——— تہذیب الاخلاق امرت سر ——— مسیحا امرت سر ——— ایشیا امرت سر ——— کے ایڈیٹر رہے۔ قریباً ۱۹۱۵ء میں لاہور آ کر شمس الاطباء ڈاکٹر غلام جیلانی کے ساتھ مل کر تالیف و ترجمہ کا کام کرتے رہے۔ "علاج بالمفردات" کی تکمیل میں زیادہ تر آپ ہی کا حصہ ہے۔ "مخزن حکمت" کے حصہ یونانی علاج بھی آپ ہی کی کاوش کا نتیجہ ہے ——— ماہنامہ "رفیق الاطباء" لاہور میں بھی کام کرتے رہے۔ آپ کئی سال لاہور میں گزارنے کے بعد ۱۹۱۳ء میں امرت سر چلے گئے اور ۱۹۲۹ء میں دوبارہ لاہور چلے آئے اور یہاں انجمن حمایت اسلام کے شعبۂ تالیف و اشاعت میں مصحح کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ سال ڈیڑھ سال بعد بیمار ہو کر پھر امرتسر چلے گئے اور وہاں ۸ ر فروری ۱۹۳۱ء بروز ہفتہ فوت ہوئے۔ "مغفور خدا" مادہ تاریخ ارتحال ہے[1]۔ آپ کے تلامذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم آپ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں اور علامہ حکیم محمد حسین عرشی امرتسری کو آپ کا شاگردِ خاص ہونے کے علاوہ جانشینی کا شرف بھی حاصل ہے۔ حکیم صاحب جہاں بھی رہے مطب ضرور کرتے رہے اور طلباء کو طب بھی پڑھاتے رہے۔

مرزا امام الدین

آپ ۱۸۷۹ء میں بمقام لاہور پیدا ہوئے۔ والد ماجد کا نام حکیم حسین بخش تھا۔ میڈیکل کالج لاہور سے ڈاکٹری کا امتحان پاس کیا اور طبیہ کالج لاہور سے یونانی طب کی تحصیل کی۔ ۱۹۱۶ء میں سرکاری ملازمت اختیار کر لی بعدۂ امیر حبیب اللہ خاں والیٔ افغانستان کی حرم سرا کے شاہی طبیب مقرر ہوئے۔ محمد نادر خاں کے زمانہ میں "شفاخانہ مرکزی عسکری" کابل کے انچارج بن گئے۔ ۱۹۳۵ء میں بمقام ہرات حرکتِ قلب بند ہونے سے انتقال کیا۔ آپ نے لاہور میں بھی کچھ عرصہ مطب کیا تھا

[1] کلیاتِ طغرائی ص ۱۶۔

اور یہاں سے "حامی الصحت" نامی رسالہ بھی جاری کیا تھا۔ آپ کے فرزند حکیم مرزا محمد مجتبیٰ اس وقت لاہور میں مطب کر رہے ہیں۔[1]

کرنل بھولا ناتھ آئی، ایم، ایس

ان کے والد جالندھر سے آکر لاہور مقیم ہو گئے تھے۔ کرنل صاحب کو عربی، فارسی اور اردو سے کافی واقفیت ہونے کے علاوہ پنجابی ادب میں بھی کمال حاصل تھا اور انگریزی لیاقت بھی بہت اعلیٰ درجہ کی رکھتے تھے۔ آپ نے تمام زندگی سرکاری ملازمت میں گزاری۔ صوبجات متحدہ کے انسپکٹر جنرل رہے، آپ پہلے ہندوستانی تھے جن کو یہ اعزاز نصیب ہوا۔ کرنل صاحب اور خان بہادر حکیم رفیع الدین دہلوی متوفی ۱۹۱۶ء شہنشاہ جارج پنجم کے آنریری فزیشن کے اعزاز سے بھی ممتاز ہوئے تھے۔

ڈاکٹر بھولا ناتھ انگریزی طب کے ماہر ہونے کے علاوہ طب یونانی پر بھی اچھا عبور رکھتے تھے لیکن یونانی طب سے انھیں کچھ بیر سا ہو گیا تھا۔ اردو، فارسی اور پنجابی کے شاعر بھی تھے۔ "علم و عمل طب" آپ کی قابلِ قدر تصنیف ہے۔ علاوہ ازیں "جنسی امراض اور ان کا علاج" اور "تاریخ شہر لاہور" پنجابی بھی قابلِ تعریف ہیں مگر "تاریخ لاہور" میں صفحہ ۲۱۷ تا ۲۲۲ پر مسئلہ "وحدت الوجود" کے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل خلافِ حقیقت ہے۔ علاوہ ازیں اور بھی کئی مقامات محلِ نظر ہیں مگر یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں اور نہ ہی موضوع سے ان باتوں کا کچھ تعلق ہے۔ کرنل صاحب ۳۱ جنوری ۱۹۳۶ء کو دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔[2]

فقیر محمد چشتی

ان کا مولد "جگراؤں" ضلع لدھیانہ (مشرقی پنجاب) ہے۔ عربی، فارسی وغیرہ کی تحصیل کے بعد انھوں نے "مدرسہ طبیہ دہلی" میں داخل ہو کر طب پڑھی۔ حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں مرحوم آپ پر بڑے مہربان تھے۔ ۱۹۰۹ء میں لاہور آکر مطب جاری کیا اور تھوڑے عرصے ہی میں آپ کی حذاقت کا شہرہ دور دور تک پھیل گیا۔ غربا اور امرا سب ہی یکساں آپ سے فیض یاب ہوتے رہے۔

سر سکندر حیات خاں وزیرِ اعلیٰ پنجاب کو گردے کا عارضہ لاحق ہوا۔ ہندوستان کے سربرآوردہ ڈاکٹر آپ کے علاج سے عاجز آگئے تو ڈاکٹروں نے یہ مشورہ دیا کہ اب آپ یورپ جا کر علاج کرائیں۔ اس پر سر سکندر، شفاء الملک کی خدمت میں بغرض علاج حاضر ہوئے اور ان کے علاج سے بہت جلد شفایاب ہو گئے۔ اس معالجہ نے حکیم صاحب کو بہت زیادہ مشہور و معروف کر دیا۔ غالباً اسی معالجہ کے بعد آپ کو سرکاری طور پر "شفاء الملک" کا خطاب ملا تھا۔

شفاء الملک ایک اعلیٰ طبیب ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھے ادیب، خوش نویس اور بلند پایہ مصوّر بھی تھے ——
پنجاب پراونشل طبّی کانفرنس کا اجلاس اوّل جو ۱۹۲۶ء میں برکت علی ہال لاہور میں منعقد ہوا تھا اس میں شفاء الملک مرحوم کی بنائی ہوئی جالینوس کی تصویر آویزاں تھی جس کو اہلِ ذوق حضرات نے بہت زیادہ پسند کیا۔ فنِ کتابت میں آپ کے کمال کا اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ لاہور کے مشہور خوش نویس جناب منشی عبدالمجید پروین رقم مرحوم جو اپنے فن میں اجتہاد و امامت کا درجہ رکھتے تھے وہ حکیم صاحب سے ہمیشہ مشورے لیتے رہے اور اکثر فرماتے تھے کہ میری لکھائی میں خیال حکیم صاحب کا اور قلم میرا ہوتا ہے۔
حکیم صاحب بڑے بذلہ سنج اور شگفتہ مزاج تھے۔ دوستوں پر جان فدا کرتے تھے۔ انھوں نے شاعری نہیں کی مگر اس کی پوری

---

[1] حیات کانفرنس مطبوعہ لاہور ص ۱۷۳ [2] الحکیم مارچ ۱۹۳۶ء

صلاحیت رکھتے تھے ۔ غرضیکہ قدرت نے بے شمار خوبیاں آپ کو ودیعت کی تھیں ۔ بے اولاد تھے اس لیے اپنا رہائشی مکان "شفا منزل" طبیہ کالج دہلی کے نام وقف کر دیا تھا ۔ طبِ یونانی کا یہ آفتاب ۱۶ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو غروب ہو گیا ۔ وقتِ رحلت آپ کی عمر ۶۷ برس کی تھی ۔ قبرستان بیانی میں مدفون ہوئے ۔

احمد دین (موجد طبِ جدید)

آپ نے مختلف اساتذہ فن سے طبی کتابیں سبقاً سبقاً پڑھیں ۔ ویدک ایلوپیتھک ہومیو پیتھک مسمرازم ہپناٹزم اور نیچرو پیتھی کی کتابوں کا بہت گہرا مطالعہ کیا ۔ آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ تمام مروج طریق علاج نامکمل اور ناقص ہیں ۔ چنانچہ آپ نے تمام طبوں میں سے اپنے خیال کے مطابق اچھائیاں لے کر ایک نئے طریق علاج کی بنیاد رکھی جس کو "طبِ جدید" کے نام سے موسوم کیا ۔ آپ نے ان خیالات کی اشاعت کے لیے انجمن خادم الحکمت شاہدرہ لاہور قائم کی "تبصرۃ الاطبا" نامی رسالہ جاری کیا جس کے ایڈیٹر مختلف زمانوں میں مختلف لوگ رہے لیکن نگرانی حکیم صاحب کی رہی ۔ اس کے علاوہ ماہنامہ "طبِ جدید" اور "استاذ الاطبا" بھی آپ نے نکالے اور مختلف طبی کتابیں تصنیف کیں جن میں سے "کلیاتِ طبِ جدید" مشہور ہے ۔ شاہدرہ میں طبِ جدید کی تعلیم کے لیے ایک درسگاہ بھی قائم کی ۔ حکیم صاحب اپریل ۱۸۶۶ء میں بمقام شاہدرہ پیدا ہوئے تھے اور ۲۲ دسمبر ۱۹۳۶ء کو راہگیرِ ملکِ بقا ہوئے ۔

محمد افضل

یہ ۱۸۸۴ء میں بمقام گوجرانوالہ پیدا ہوئے ، لاہور آ کر تعلیم حاصل کی ۔ منشی فاضل ، ادیب فاضل ، بی ۔ اے اور زبدۃ الحکما کے امتحانات پاس کیے ۔ ہومیو پیتھی کے بھی اچھے ماہر تھے ۔ مفتی سلیم اللہ خاں سے طب پڑھی تھی ۔ عملی طبابت سے زیادہ سیاسیاتِ طب کے ماہر تھے ۔ مدتوں پنجاب طبی کانفرنس کے جنرل سیکرٹری رہے ۔ صاحبِ تصانیف تھے ۔ "حیات کانفرنس" اور "قانونِ علاج" و دیگر کئی کتب تالیف کیں ۔ غالباً ۱۹۴۵ء میں فوت ہوئے ۔

محمد زکریا

آپ ضلع مظفر نگر یو ۔ پی کے رہنے والے تھے ، تعلیم دہلی میں پائی ۔ ریاست بھوپال میں طبیب رہے ۔ ۱۹۲۳ء میں لاہور آ کر "طبیہ کالج لاہور" میں پروفیسر ہو گئے ۔ نبض و قارورہ دیکھنے کی خاص مہارت رکھتے تھے ۔ اس سلسلہ میں "تشریح النبض" اور "تشریح البول" کے نام سے مفصل کتابیں بھی تصنیف کیں ۔ شروع ۱۹۴۷ء میں راہگیرِ ملکِ بقا ہوئے ۔

شہزادہ غلام محمد

ان کے والد ماجد حکیم شہزادہ سلطان محمود پشاور کے جاگیردار تھے ۔ ان کا سلسلہ نسب احمد شاہ ابدالی سے ملتا ہے ۔ حکیم غلام محمد صاحب پشاور میں پیدا ہوئے ، طب اپنے والد اور حکیم عبد المجید دہلوی مرحوم و مغفور سے پڑھی ۔ پھر دھونے والا (جے پور) ، ڈیرہ غازی خاں اور پشاور میں مدت تک مطب کیا ۔ ۱۹۰۵ء میں حکومت برطانیہ نے آپ کو سرگودھے میں مربعے دیے تو سرگودھے میں رہنے لگے ۔ مہاراجہ کشمیر آپ کی حذاقت سے مستفید ہوا کرتے تھے ۔ علاوہ ان کے اور کئی ریاستوں کے والی بھی آپ سے علاج معالجہ کراتے رہتے تھے ۔

۱۹۳۵ء میں لاہور چلے آئے اور یہاں مصری شاہ میں مطب جاری کیا ۔ موسم گرما کشمیر میں گزارتے تھے ۔ تقسیم ہند کے وقت آپ کا قیام کشمیر ہی میں تھا اور ایک عرصہ تک وہیں رکے رہے ۔ جب مقبوضہ کشمیر پر قبائلیوں نے حملہ کیا اس وقت سرینگر سے بہ دقت نکل کر پشاور چلے گئے اور وہیں فروکش رہے ۔ آپ ۱۹۵۰ء میں راہگیرِ ملکِ بقا ہوئے اور حضرت شاہ محمد غوث لاہوری کے والد حضرت سید حسن بادشاہ پشاوری کے جوار میں سپردِ خاک کیے گئے ۔

شہزادہ صاحب کے نبیرہ حکیم سید احمد حسن شاہ آپ کے مطب واقع محلہ شاہ میں طبابت کر رہے ہیں جو حضرت شاہ محمد غوثؒ کی اولاد میں سے ہیں۔

فقیر محمد چشتی امرتسری

آپ بلند پایہ طبیب اور شب زندہ دار نا بردوزاہد بزرگ تھے، راقم الحروف کے والد ماجد تھے۔ مولد و منشا آپ کا امرتسر تھا۔ فارسی و عربی کی تحصیل کے بعد حصولِ طب کی طرف متوجہ ہوئے تو ابتدائی طبی کتابیں گھر ہی پر پڑھیں۔ پھر حکیم مولوی محمد ابراہیم جالندھری ثم امرتسری تلمیذ حکیم امام الدین پاک پٹنی اور مولانا حکیم حیدر علی صاحب گجوہری سے طب کی بلند پایہ کتابیں پڑھیں۔ مولانا علامہ محمد عالم آسی امرتسری سے بھی مستفید ہوئے۔ ہندی بھی باقاعدہ پڑھی تھی۔

طریقت میں حضرت الحاج میاں علی محمد صاحب چشتی نظامی ہوشیار پوری مدظلہ سے بیعت تھے۔ آپ نے سنہ ۱۹۰۰ء میں امرتسر میں مطب شروع کیا تھا جو ہمیشہ مرجع انام رہا اور تمام زندگی دنیا کی نعمتوں سے سرفراز رہے۔ تقسیم ہند و پاک پر لاہور منتقل ہو گئے تھے۔ آپ کے مجربات و افادات عالیہ "مجربات فخر الاطبا" کے نام سے زیور طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ آپ کے حالات زندگی کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس کتاب کے شروع میں مسطور ہیں جو آپ کے شاگرد مولانا حکیم معین الدین کے مرقومہ ہیں۔ فخر الاطبا حکیم فقیر محمدؒ ۲۲ اپریل سنہ ۱۹۵۲ء مطابق سنہ ۱۳۷۱ھ بعمر ۸۶ سال اس دارِ فانی سے رحلت کر گئے اور حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کے جوار میں مدفون ہوئے۔ قبر پختہ ہے۔ لوحِ مزار پر جو قطعہ تاریخ کندہ ہے اس کا تاریخی شعر یہ ہے:-

تاریخ رحلتش بہ دل ناجی حسنین ——— "فوت حبیب اور شب معراج" آمد

۱۳

مولانا سلطان محمدؒ

آپ شیخ نور الدین صدیقی کے فرزند تھے۔ تحصیل علوم کے بعد آپ نے پرنٹنگ کا کام سیکھا اور ایک پریس میں ملازمت کر لی۔ پھر اسی سلسلے میں نوشہرہ چھاؤنی چلے گئے تو یہاں کے مسلمانوں کی حالتِ زار دیکھ کر آپ کا دل نہایت رنجیدہ ہوا اور اسی وقت سے انگریز کے خلاف جذبۂ نفرت آپ کے دل میں پیدا ہو گیا۔ چنانچہ آپ نے ملازمت ترک کر کے اپنا پریس لگایا اور اس میں جعلی نوٹ بھی بنانے شروع کیے۔ اس آمدنی سے مسلمانوں کی بے حد مالی امداد کی اور کئی مدرسے قائم کیے۔ آزاد قبائل کی وہ جماعت جو حکومت کے خلاف نبرد آزما تھی اس کی نقدی اور راشن کی صورت میں امداد کرتے رہے۔ اس کے راوی خود امیر المجاہدین مولانا فضل الٰہیؒ ہیں۔ مولانا سلطان محمد صاحب انگریز کو نقصان پہنچانے اور مسلمانوں کی بہبودی کی خاطر ایسا کرنا جائز سمجھتے تھے۔ آپ نے لاہور کے اکثر مسلمانوں کو دوکانیں کرائیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ کئی عالیشان فرمیں آج بھی ایسی چل رہی ہیں جن کا قیام حکیم صاحب کی اعانت سے ہوا تھا۔ آخر ایک مستقل امداد حاصل کرنے والے کی مخبری سے حکومت نے گرفتار کر لیا اور جرم ثابت ہونے پر چودہ سال کی سزا ہوئی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ مولانا نے جعلی نوٹوں میں سے اپنی ذات پر کبھی ایک پائی تک خرچ نہیں کی تھی۔ نوشہرہ سے واپس آ کر آپ نے لاہور میں مطب کرنا شروع کر دیا تھا۔ گرفتار بھی لاہور سے ہوئے تھے۔ شیرانوالہ گیٹ میں آپ کا مطب تھا۔ حضرت شاہ محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد میں خطبۂ جمعہ دیتے تھے۔ اچھے طبیب اور بے باک خطیب تھے۔ صوفیا سے آپ کا تعلق ہمیشہ رہا۔ حضرت سلطان نور احمد سجادہ نشین حضرت سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ "تذکرہ سلطانی" اور "احکام اسلام" آپ کی تصانیف ہیں۔ "مدرسہ تعلیم الاسلام" نوشہرہ اور "مدرسۃ القرآن جامعہ قادریہ سلطانیہ" واقع ہرنس پورہ لاہور آپ نے قائم کیے تھے جو تا حال تعلیمی و دینی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ قریباً ۸۰ برس کی عمر میں ۱۷ جنوری سنہ ۱۹۵۳ء مطابق ۱ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۷۲ھ کو آپ نے جان جان آفریں کے حوالے کی

اور حضرت شاہ محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ کے احاطہ مزار کے اندر مدفون ہوئے۔

محمد حسین مرہم عیسیٰ قریباً ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوئے۔ مولانا رحیم اللہ سے قرآن پڑھا۔ طب حکیم ضیاء الدین، حکیم مفتی سلیم اللہ خاں اور مولوی حکیم نورالدین بھیروی سے پڑھی۔ حکیم صاحب بڑے عالم و فاضل تھے۔ مذہباً نہ صرف احمدی بلکہ مبلغ احمدیت تھے اور اس سلسلے میں مناظرے بھی کیا کرتے تھے۔ بیرون دہلی گیٹ لنڈا بازار میں آپ کا رہائشی مکان اور مطلب تھا۔ رسالہ "حکیم حاذق" ایک عرصہ تک نکالتے رہے۔ آپ کے مجربات "طبی مائدہ عامل" کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ آپ قریباً ۹۵ سال کی عمر میں ۲۸ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو فوت ہوئے۔ مرہم عیسیٰ کے نام سے اس لیے مشہور تھے کہ طبی کتابوں میں جس "مرہم عیسیٰ" کا نسخہ مسطور ہے اسے بنا کر فروخت کرتے تھے اور ان کا یہ خیال تھا کہ یہ مرہم حضرت مسیح کے زخموں کے لیے بنایا گیا تھا۔

ٹھاکر دت ملتانی یہ لاہور کے مشہور وید تھے۔ شاہدرہ میں ان کی بہت سی زمین تھی جس میں جڑی بوٹیاں کاشت کراتے تھے اور تمام ملک میں ان کو سپلائی کرتے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد دہلی چلے گئے اور وہیں فوت ہوئے۔ انھوں نے دہلی پہنچ کر کناٹ پیلس میں "ملتانی آیور ویدک فارمیسی" دوبارہ قائم کی تھی جو تا حال موجود ہے۔

ابوالمعالی تاج الدین تاج عرفانی آپ کے والد کا نام ملا محمد بخش تھا جو بالکل ان پڑھ ہونے کے باوجود اخبار و رسائل نکالتے رہے۔ ملا صاحب نے لاہور میں تاج الہند پریس قائم کیا۔ ہفتہ وار اخبار "جعفر زٹلی" اور ماہنامہ "ہنٹر" جاری کیے۔ ملا محمد بخش متوفی ۱۹۲۳ء کے والد محمد عبداللہ پال کشمیر سے ہجرت کر کے آئے تھے۔

حکیم تاج صاحب ۱۸۸۳ء میں پیدا ہوئے۔ آپ بڑے اعلیٰ شاعر اور بلند پایہ اخبار نویس تھے۔ "ہنٹر" کے ایڈیٹر رہے۔ پنجابی میں بھی شعر کہتے تھے[1]۔ حضرت پیر جماعت علی شاہ علی پوری سے آپ بیعت تھے۔ طبابت کے علاوہ کئی طبی رسائل کو بھی ایڈٹ کرتے رہے۔ مزاج کے بڑے متشدد تھے، علامہ اقبالؒ کی شاعری اور مولانا ظفر علی کے عقائد ہمیشہ تاج صاحب کے ہدف تنقید رہے۔ مومن خاں مومن کے بے حد مداح تھے۔ ان کے تتبع میں بہت غزلیں لکھیں۔ مزاج کی تیزی اور گوناگوں مصروفیات کے باعث آپ فن طب کی کوئی خاص خدمت سرانجام نہ دے سکے۔ جناب فدا حسین فدا آپ کے شاعری میں شاگرد ہیں۔ تاج صاحب ۱۳ مئی ۱۹۵۹ء مطابق ۱۳۷۸ھ کو فوت ہوئے۔

نوازش علی شاہ بخاری یہ چونیاں ضلع لاہور میں پیدا ہوئے، والد کا نام مرعلی شاہ تھا۔ بغرض حصول تعلیم لاہور آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ حکیم حاذق اور زبدۃ الحکماء تھے۔ مفتی سلیم اللہ خانؒ سے بھی مستفید ہوئے تھے۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۵۹ء کو قریباً ۶۶ برس کی عمر میں آپ کا انتقال ہوا۔ مچھ ہٹہ منڈی لاہور میں آپ کا مطب تھا۔ بڑے لائق معالج تھے۔

شیخ فضل حق آپ بٹالہ میں ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام شیخ نور محمد تھا۔ آپ نے مروجہ علوم کی تحصیل کے بعد طب حکیم نورالدین صاحب بھیروی ثم قادیانی سے پڑھی اور بٹالہ ہی میں مطب شروع کیا۔ تقسیم ملک کے بعد لاہور چلے آئے۔ یہاں مزنگ روڈ پر مطب جاری کیا۔ حکیم صاحب قریباً ستر سال کی عمر میں ۱۹۵۵ء میں فوت ہوئے اور حسب وصیت ربوہ میں دفن کیے گئے۔ آپ کے لڑکے شیخ افتخار الحق بار ایٹ لا ہیں۔ حکیم صاحب کے چھوٹے بھائی شیخ ظفر الحق اے، ڈی، ایم تھے جو ۱۹۵۹ء میں فوت ہوئے۔

---

[1] تاریخ اقوام کشمیر ص ۴۸۴

حکیم فضل حق کے شاگردِ خاص حکیم مفتی سردار احمد بٹالوی قادری آرام گلی (رام گلی) میں مطب کر رہے ہیں۔ یہ بڑے نیک صفت انسان ہیں۔ مفتی صاحب کے خاندان میں کئی پشت سے طبابت چلی آرہی ہے۔

عبدالقادر دہلوی یہ حکیم نابینا مرحوم کے فرزند تھے۔ تعلیم کا بیشتر حصہ اپنے والد مرحوم سے حاصل کیا۔ کچھ دن بنارس میں مطب کیا، پھر پٹیالہ میں چند ماہ طبیب ریاست رہے۔ وہاں سے غالباً ۱۹۲۹ء میں لاہور چلے آئے اور نیلا گنبد میں مطب کا آغاز کیا۔ آپ بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ غربا کو دوائیں مفت دیتے اور اُمرا سے بھاری رقمیں وصول کرتے مثلاً غریب کو جو دوا بلا قیمت دیتے امیر سے اسی کے سو روپے لیتے تھے۔ قریباً ساٹھ برس کی عمر میں ۴ / دسمبر ۱۹۵۹ء کو آپ نے انتقال کیا۔

حافظ جلیل احمد انصاری آپ ۱۹۰۶ء میں بمقام قصبہ "بھوکہ ہیڑی" ضلع مظفر گڑھ (یو۔پی) پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر پائی پھر دارالعلوم دیوبند، طبیہ کالج دہلی اور تکمیل الطب کالج لکھنؤ سے علوم دینیہ اور طب یونانی کی تکمیل کی۔ شفاء الملک حکیم عبدالمجید مرحوم سے خاص طور پر مستفید ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں تکمیل الطب کالج لکھنؤ کے وائس پرنسپل ہو گئے۔ دسمبر ۱۹۳۹ء میں آپ لاہور چلے آئے اور یہاں طبیہ کالج انجمن حمایتِ اسلام میں شیخ المعالجات مقرر ہو گئے۔ ۱۹۴۷ء میں اسی کالج کے وائس پرنسپل اور ۱۹۴۹ء میں پرنسپل ہو گئے۔ آپ کو طبی کتابیں پڑھنے پڑھانے سے حفظ ہو چکی تھیں۔ شعر و ادب سے آپ کو بڑی مناسبت تھی۔ شاعری میں بیخود دہلوی سے شرف تلمذ تھا۔ کئی قابلِ قدر طبی تصانیف آپ نے اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ آپ میں بے شمار خوبیاں تھیں۔ بہترین مدرس، بلند پایہ معالج اور اعلیٰ درجے کے مصنف ہونے کے علاوہ نہایت حلیم و خلیق تھے۔ ۵ / اگست ۱۹۶۰ء مطابق ۱۳۸۰ھ بروز جمعہ جاں بحق ہوئے[1]۔

عبدالمجید سیفی آپ سدا کبوہ متصل بھیرہ ضلع شاہ پور میں پیدا ہوئے۔ طب حکیم مولوی عبدالرسول صاحب بھکروی سے پڑھی۔ حضرت مولانا عبداللہ صاحبؒ خانقاہ سراجیہ کندیاں ضلع میانوالی کے خلیفہ تھے۔ سیفی صاحب نے سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کی کئی کتابیں بڑے اہتمام سے شائع کرائیں۔ مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو بلاکوں سے چھپوانے کے لیے ان کی کتابت کروا رہے تھے کہ پیغامِ اجل آپہنچا اور یہ عظیم کام غالباً ہمیشہ کے لیے ہی معرضِ التوا میں پڑ گیا۔ آپ نے ۹ / ستمبر ۱۹۶۰ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور راقم نے "سیفی شدہ در بہشت" تاریخ کہی۔

محمد شریف یہ لاہور کے ایک پرانے طبی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اپنی جوانی میں ایک کامیاب قانون دان تھے۔ طب کی طرف طبعی رجحان کی وجہ سے آپ نے وکالت کو ترک کر کے طبابت کو اپنا لیا تھا۔ حکیم فیروز الدین ایڈیٹر الحکیم کی رحلت کے بعد "الحکیم" کی ادارت کے فرائض کئی سال تک آپ ہی سرانجام دیتے رہے۔ پھر "الطبیب" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جو ایک عرصہ تک بڑی کامیابی کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔ طب کی کئی کتابیں تصنیف کیں جن میں سے "مصباح الحکمت" بڑی جامع ہے۔ آپ کو طب کے علمی حصے پر بہت زیادہ عبور تھا۔

۱۲ / دسمبر ۱۹۶۰ء مطابق ۱۳۸۰ھ آپ داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ راقم نے "شریف فوت شد" تاریخ کہی۔ آپ کے فرزند حکیم محمد انور بابری آپ کے جانشین ہیں۔

۱۳۸۰ھ

---

[1] مجلہ طبیہ لاہور جلیل نمبر اگست سن ۱۹۶۰ء

نوازش علی شاہ موسوی ولد سید بہادر شاہ موسوی، لاہور کے بڑے بارسوخ آدمی تھے۔ ایک عرصہ تک میونسپل کمشنر رہے۔ حکیم سید عنایت شاہ طبیب مہاراجہ رنجیت سنگھ آپ کے نانا تھے۔ آپ ہی نے حکیم عنایت شاہ کے مزار پر کتبہ نصب کرایا تھا۔ بازار حکیماں میں اپنے نانا والے مکان میں رہتے تھے۔ مذہباً اثنا عشری تھے۔ ۴ جنوری ۱۹۶۱ء کو فوت ہوئے۔

شیخ محمد مودود ان کا آبائی وطن "سجان پور" ہے جو ضلع گورداسپور میں واقع ہے مگر پیدا لکھنؤ میں ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ ۱۹۲۴ء میں طبیہ کالج علی گڑھ میں داخل ہوئے مگر یہاں صرف چند ماہ زیر تعلیم رہ کر طبیہ کالج دہلی میں منتقل ہو گئے اور یہیں سے تکمیل فن کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد لاہور آکر مطب جاری کیا جو کامیاب رہا۔ حکیم صاحب ابتدائی زندگی میں بڑے رنگین طبع و شگفتہ مزاج واقع ہوئے تھے مگر جلد ہی ان کی طبیعت کا رُخ تصوف کی طرف ہو گیا جس کی وجہ سے دنیا سے جاتے وقت آپ نہ صرف طبیب بلکہ صوفی بھی تھے۔ بوقت رحلت ان کی عمر تقریباً ۵۴ برس تھی ـــــ ۱۹ مئی ۱۹۶۱ء مطابق ۱۳۸۰ھ کو جان جاں آفریں کے حوالے کی۔

مولانا غلام محمد ترنم امرتسر کے ایک غریب کشمیری گھرانے میں تقریباً ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ علامہ طغرائی مرحوم، مفتی عبدالصمد کشمیری اور مولانا محمد عالم آسی سے تحصیل علوم کی۔ مولانا ترنم بہت اعلیٰ خطیب اور اچھے طبیب تھے۔ امرتسر میں ان کا بڑا اثر تھا۔ مولانا ظفر علی خاں نے کہا تھا ؎

ترنم چاند ہے اس شہر میں علم اور حکمت کا
درخشاں اس کے ہالے ہیں مسلمانانِ امرتسر

تقسیم ہندوپاک پر آپ لاہور منتقل ہو گئے۔ یہاں سول سیکرٹریٹ کی مسجد کے خطیب تھے۔ امرت دھارا بلڈنگ میں آپ کا مطب تھا۔ پنجاب یونیورسٹی کے فیلو تھے۔ جمعیت العلماء پاکستان کے نائب صدر اور آل پاکستان آیورویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس کے روح رواں تھے۔ ۱۷ محرم ۱۳۷۹ھ بروز جمعہ مطابق ۲۴ جولائی ۱۹۵۹ء فوت ہوئے۔ راقم نے آپ کی وفات حسرت آیات کی تاریخیں "فاضل حکمت" اور "ترنم داخل خلد" کہیں۔ حضرت ترنم کی آخری آرام گاہ گورستان میانی بہاولپور روڈ کے کنارے واقع ہے۔ ۱۳۷۹ھ ۱۹۵۹ء

(۴) موجودہ عہد کے زندہ اطباء

اس حصے میں لاہور کے ان اطبائے نامدار کا ذکر جمیل ہے جو لاہور یا اس سے باہر زندہ موجود ہیں۔ چونکہ یہ باب تاریخ سے زیادہ تذکرہ ہے اس لیے ان حضرات کے ناموں کو حروف تہجی کے لحاظ سے درج کیا ہے اور یہاں اوپر والی ترتیب قائم نہیں رکھی جا سکی تھی۔

اعظم علی خاں آپ حکیم آغا علی خاں مرحوم کے فرزند، ۱۹۰۲ء میں بمقام لاہور پیدا ہوئے، ۱۹۲۳ء میں بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۲۵ء میں حکیم حاذق کے امتحان میں اوّل آئے۔ والد ماجد کی وفات کے بعد آپ کو پولیٹیکل پنشن مل رہی ہے۔ مطب آپ کا مشہور ہے۔ حکیم صاحب کے اعزہ و اقربا آپ کو اب بھی "نواب صاحب" کہہ کر پکارتے ہیں مگر آپ اتنے سادہ مزاج ہیں کہ اپنے نام کے ساتھ "خاں" لکھنا بھی پسند نہیں کرتے۔

اندرون موچی گیٹ بالمقابل حویلی میاں خاں آپ کا مطب ہے۔

ٹھاکر دت شرما

یہ ۱۸۸۲ء میں بمقام موضع فتح وال ضلع امرتسر پیدا ہوئے۔ ڈی۔اے۔وی کالج لاہور میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد مختلف اساتذہ سے ویدک پڑھی۔ بڑے ذہین تھے، بہت جلد کامیابی کی منازل طے کر کے آسمانِ شہرت پر پہنچ گئے۔ ۱۹۰۴ء میں ایک طبی ہفتہ وار اخبار نکالا جس کا نام "دیش اپکارک" تھا۔ یہ عرصہ دراز تک نکلتا رہا۔ "امرت دھارا" بنا کر اس سے لاکھوں روپے کمائے۔ امرت دھارا بلڈنگ ریلوے روڈ، امرت پریس لاہور میں آپ کی یادگاریں ہیں۔ انھوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں اور بہت سی انگریزی اور ہندی کتابوں کے ترجمے کیے۔ ان تراجم و تالیفات کی تعداد قریباً اسّی ہے۔ یورپ کی سیاحت کے لیے بھی گئے تھے واپسی پر اس سفر کے حالات بنام "سیرِ یورپ" دو حصوں میں شائع کیے۔ تقسیم ہند پر پنڈت جی اپنی لاکھوں روپے کی جائداد اور بیش قیمت دواخانہ بصد حسرت و یاس چھوڑ کر بھارت چلے گئے۔ آج کل "ڈیرہ دون" میں صاحبِ فراش ہیں۔ راقم کو آپ کے صاحبزادے کا خط ملا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف چند دن کے مہمان ہیں۔ ممکن ہے اس مضمون کے شائع ہونے کے وقت آنجہانی ہو چکے ہوں۔ حالت ایسی ہی نازک تھی۔ ان کے صاحبزادے نے لکھا تھا کہ "پتا جی نہ بول سکتے ہیں، نہ ہل جل سکتے ہیں، نہ چل پھر سکتے ہیں۔"

حبیب اشعر

نام حبیب احمد اور اشعر تخلص ہے۔ یکم جنوری ۱۹۱۹ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ خاندان شریفی سے تعلق رکھتے ہیں تقسیم ملک پر لاہور چلے آئے۔ یہاں شاہی محلہ میں مقیم ہیں اور ان کا "حاذق دواخانہ" بھی یہیں ہے۔ عربی کے بہت اچھے مترجم ہیں۔ آپ کے تراجم بڑے مقبول ہیں۔ گزشتہ سال سے آپ کی ادارت میں ایک طبی رسالہ نکل رہا ہے جس کا نام "حاذق" ہے تصنیف و تالیف کی طرف آپ کی طبیعت کا میلان بہت زیادہ ہے اس لیے طبیب سے زیادہ ادیب مانے جاتے ہیں۔

کویراج خزان چند بی۔ اے

آپ یکم اپریل ۱۹۰۷ء کو امرت سر میں پیدا ہوئے۔ بی۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ملازم ہو گئے۔ ۱۹۳۰ء میں ملازمت کو خیر آباد کہہ کر دیانند آیورویدک کالج لاہور میں داخل ہو گئے۔ یہاں دو سال زیرِ تعلیم رہ کر کویراج کا ڈپلومہ حاصل کر لیا۔ نیز آپ کی قابلیت کے پیشِ نظر ڈی۔ اے۔ وی کالج کی مینجنگ کمیٹی نے آپ کو طلائی تمغا بھی عطا کیا۔

کویراج خزان چند ماہرِ جنسیات تھے۔ آپ نے اس موضوع پر بہت سی کتابیں لکھیں۔ آپ جنسی امراض کی تشخیص میں پوری مہارت رکھتے تھے[1]۔

خورشید حسن خورشید

آپ کے والد کا نام مولوی محمد صدیق تھا۔ سلسلہ نسب آپ کا حضرت سید قیس سادھوروی سے ملتا ہے جو پیرانِ سادھورا کے نام سے مشہور ہیں۔ حکیم خورشید صاحب قریباً ۱۲۹۷ھ میں بمقام سہارن پور پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم پائی۔ پھر کئی ریاستوں میں بطور طبیب ملازم رہنے کے بعد لاہور میں سکونت اختیار کر لی اور یہاں بہت سے علمی کارنامے انجام دیے رفیق الاطبا کے سب ایڈیٹر رہے۔ ماہنامہ "مصباح الحکمت" جاری کیا اور اس دنیا میں یونانی طب کی سب سے پہلی کتاب "فصولِ بقراط" کا منظوم ترجمہ و شرح کی جو قابلِ قدر طبی کارنامہ ہے۔

حکیم صاحب اس وقت الکاس میں مقیم ہیں۔

---

[1] دی پنجاب ہو از ہو (انگریزی) صفحہ ۱۵۲

آغا دوست محمد خاں

آپ شہر "چودھواں" ضلع ڈیرہ غازیخاں میں ۲۷ رمضان ۱۳۲۸ھ کو پیدا ہوئے۔ طبی تعلیم تکمیل الطب کالج "لکھنؤ" سے حاصل کی۔ اچھے طبیب اور باعزت شہری ہیں۔ مطب آپ کا مرجع انام ہے۔

دینا ناتھ کوہلی

آپ ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے، طب یونانی میں مہارت حاصل کرنے کے بعد ۱۹۰۶ء میں بمقام موضع "بوزالہ" ضلع امرتسر مطب کا آغاز کیا اور ۱۹۲۸ء میں لاہور چلے آئے۔ یہاں چیمبرلین روڈ پر آپ کا دواخانہ اور مطب تھا۔ آپ نے کئی طبی کتابیں تالیف کیں[1]۔ کوہلی صاحب قابلِ رشک صحت کے مالک تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد بھارت منتقل ہو گئے۔

پنڈت رام گوپال شاستری

آپ ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۴ء میں سنسکرت کی سب سے اعلیٰ ڈگری حاصل کی اور ۱۹۱۵ء میں ڈی۔ اے۔ وی سکول لاہور میں مدرس مقرر ہو گئے۔ ۱۹۱۹ء میں ملازمت چھوڑ کر "کانگریس" میں شامل ہو گئے۔ سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ آیورویدک کی تعلیم بھی حاصل کرتے رہے۔ ۱۹۲۰ء میں سول نافرمانی کی تحریک کے سلسلے میں ایک سال کے لیے جیل بھیج دیے گئے۔

جیل سے آزاد ہونے کے بعد مطب شروع کیا اور بہت سی کتابیں تصنیف کیں جن میں سے کرشن نیتی، بدھ ویدک، چھترپتی سیواجی، ستیا اور اہنسا اور وید مائی آیوروید (AED MAI AYUR VED) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ آپ ڈی۔ اے۔ وی کالج میں آیورویدک کے ممتحن اور آل انڈیا آیورویدک کانفرنس کے بھی ممتحن تھے[2]۔

"وید رتن" پنڈت شو شرما آیورویدک اچاریہ

یہ لاہور کے بڑے نامی گرامی وید تھے، مطب ان کا ریلوے روڈ پر تھا۔ بی۔ اے تھے اور "وید رتن" کا امتحان بھی پاس کیے ہوئے تھے۔ ایک خیراتی شفاخانہ بھی کھولا ہوا تھا۔ آل انڈیا آیورویدک منڈل کے صدر تھے۔ اب بہارستان بومن جی روڈ کیلا لال بمبئی میں مطب کر رہے ہیں۔

عبد المجید عتیقی

عتیقی صاحب ۱۹۰۱ء میں بمقام لاہور پیدا ہوئے۔ اُردو، انگریزی اور فارسی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ نے طب حکیم مفتی سلیم اللہ خاں اور مولوی حکیم محمد ابراہیم جالندھری ثم امرتسری سے پڑھی۔ شاعری میں حضرت بیدل شاہجہانپوری سے شرفِ تلمذ ہے۔ ذہانت و فطانت کے مجسمہ ہیں، زمانے کی مختلف سیاسی و غیر سیاسی تحریکوں میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ آٹھ مرتبہ قید و بند کے مصائب برداشت کیے، زندگی کا بہترین حصہ جیل یا ریل میں گزارا۔ سیاسی، فنی، ادبی اور اصلاحی تحریکات میں صفِ اوّل میں آپ کا نام رہا۔ ایک عرصہ تک ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی لاہور کے صدر رہے۔ عین عالمِ شباب میں بینائی سے محروم ہو گئے مگر آپ کی فعال زندگی میں کسی قسم کا فرق نہ پڑا۔ مطب اور دیگر مشاغل کے ساتھ ساتھ تالیف و تصنیف کا سلسلہ برابر جاری رکھا، چھوٹی بڑی ساٹھ کے قریب آپ کی تصانیف ہیں، جن میں سے "جامع الفوائد" اور "ارکانِ احرار" مشہور و مقبول ہیں اور یہ ضیاعِ بصارت کے بعد کی تصنیف کردہ ہیں۔ اس وقت فنِ طب کے بقا اور تحفظ کے لیے کوشاں ہیں۔ پاکستان طبی کانفرنس جو ملک کی سب سے مقتدر طبی جماعت ہے، اس کے جنرل سیکرٹری ہیں۔ آپ نے اپنی ذاتی لائبریری کی کئی ہزار کتابیں "یونیورسٹی لائبریری لاہور" کو دے دی ہیں جہاں "عتیقی سیکشن" علیحدہ ہے۔ حکیم عبدالعزیز کامل مرحوم عتیقی صاحب کے بڑے بھائی تھے۔

---

[1] دی پنجاب ہو از ہو انگریزی صفحہ ۲۴۳، [2] دی پنجاب ہو از ہو (انگریزی) صفحہ ۱۴۲

www.taemeernews.com

عبدالوہاب عمر

آپ مولوی حکیم نورالدین صاحب بھیروی کے صاحبزادے ہیں۔ ۱۸ رفروری ۱۹۰۵ء کو بمقام قادیان ضلع گورداسپور پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے تعلیم حاصل کی پھر طبیہ کالج دہلی سے طب کی تحصیل کی۔ آپ کا دواخانہ و مطب قادیاں میں تھا۔ تقسیم ہند و پاک پر لاہور چلے آئے۔ آپ کی اہلیہ امۃ اللطیف صاحبہ بھی طبیہ کالج دہلی کی فارغ التحصیل ہیں اور باقاعدہ مطب کرتی ہیں حکیم صاحب نے قادیاں سے ایک رسالہ جاری کیا تھا جس کا نام "شمع نور" تھا۔ لاہور آ کر بھی یہ رسالہ جاری رہا۔ اس کے علاوہ کئی کتابوں کے مصنف اور مؤلف ہیں۔ رتن باغ کے سامنے جودھامل بلڈنگ میں مطب کرتے ہیں اور "دواخانہ نورالدین" کے مالک ہیں۔

چودھری عبداللطیف شاوائی

آپ ۲۶ رجنوری ۱۹۰۲ء کو بمقام دسوہہ ضلع ہوشیارپور پیدا ہوئے۔ آپ کی عام تعلیم بی۔ اے تک ہے اور طب کی تحصیل طبیہ کالج دہلی سے کی اور مطب دسوہہ میں شروع کیا۔ تقسیم ملک پر لاہور چلے آئے۔ یہاں مطب آپ کا کامیاب ہے۔ مغربی پاکستان یونانی طبی کانفرنس کے جنرل سیکرٹری ہیں۔

قاضی عظیم اللہ

آپ مئی ۱۹۰۱ء میں شیخ احمد صاحب کے ہاں بمقام گوجرانوالہ پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۵ء میں طبیہ کالج دہلی سے کامل الطب و الجراحت کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۶ء میں لاہور آ کر طبیہ کالج انجمن حمایت اسلام مسلمہ و معاونہ حکومت پاکستان کے پروفیسر مقرر ہو گئے اور تاحال اسی کالج سے منسلک ہیں۔ آپ کئی طبی اور غیر طبی کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ نے لاہور سے "مسیلۃ مسیح" نامی رسالہ بھی نکالا تھا۔[1]

سیّد علی احمد نیّر واسطی

نام علی احمد اور تخلص نیّر ہے۔ ۱۹۰۰ء میں یو۔ پی کے ایک قصبہ "نہٹور" ضلع بجنور کے واسطی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سیّد مظفر حسین نگینہ ضلع بجنور کے ممتاز وکیل تھے۔ نیّر صاحب نے فارسی اور عربی کی تحصیل مولانا امتیاز حسین اور مولانا حامد حسن گنگوہی سے کی۔ ازاں بعد دہلی اور لکھنؤ کے اساتذہ سے بھی مستفید ہوئے۔

شعر و سخن کا شوق آپ کو بچپن ہی سے تھا۔ بارہ سال کے تھے کہ شعر کہنے لگے۔ ابتدا میں سیّد نقی حیدر سے استفادہ کیا اس کے بعد دہلی پہنچ کر نواب سراج الدین سائل، مولانا وحید الدین بیخود اور مولانا ناصر الدین فراق سے مستفید و مستفیض ہوئے۔

حکیم صاحب ۱۹۲۴ء میں لاہور آئے اور یہاں مطب کا آغاز کیا جو بہت جلد مرجع عوام بن گیا۔ طبیہ کالج لاہور میں پروفیسر بھی ہے۔

آپ کی علمی زندگی کا اصل موضوع تاریخ طب ہے اور اس سلسلے کی کئی زبانوں کی کتابیں آپ کے مطالعہ سے گزر چکی ہیں۔ طب اور تاریخ طب کے مطالعہ کے لیے آپ نے مشرقِ وسطیٰ اور یورپ کے اکثر ملکوں کا دورہ بھی کیا۔

استنبول یونیورسٹی کے ادارہ تاریخ طب نے آپ کو ادارہ کا اعزازی ممبر منتخب کیا اور پروفیسر آف ہسٹری آف میڈیسن کے اعزازی ڈپلوما مرحمت فرمایا۔ اپریل ۱۹۵۹ء کے پہلے ہفتے میں آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے ترکی زبان کا امتحان اعلیٰ نمبروں سے پاس کیا۔ ۱۹۶۰ء میں "جمعیت اخوان پاکستان و ترکیہ" کے صدر منتخب ہوئے اور اسی سال سرکار دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس کی زیارت اور حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔ ۲۳ رمارچ ۱۹۶۱ء کو یوم جمہوریہ پاکستان کی تقریب پر حکومت پاکستان نے آپ کی طبی خدمات کے پیشِ نظر "ستارۂ خدمت" کا اعزاز عطا کیا۔ اسی سال آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے فرانسیسی زبان کا امتحان فسٹ ڈویژن میں پاس کیا ——— نیّر صاحب نے نظم و نثر میں کئی کتابیں لکھی ہیں مثلاً "ریکدہ" آپ کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ "اختر و سلمیٰ" اس میں اختر شیرانی کی حیاتِ معاشقہ ہے۔ "شعر و حکمت" آپ کے کلام کا مجموعہ ہے

---

[1] حیات کانفرنس ص ۳۸۱

"طب العرب" یہ مشہور مستشرق براؤن کی کتاب "اریبین میڈیسن" کا اردو ترجمہ ہے اور اس پر آپ کی تشریحات اور تنقیدات نہایت قابل قدر ہیں۔ "ترکی نظام طب کی تاریخ" ایک ترکی کتاب کا ترجمہ ہے۔ نہایت بااخلاق، علم دوست اور خوش مزاج بزرگ ہیں۔

"امام طب" فرید احمد عباسی

بن مولانا سید علی محمد عباسی وکیل، سادات بنی عباس سے ہیں۔ آپ ۱۲ شوال ۱۲۸۵ھ کو بمقام امروہہ پیدا ہوئے۔ فن طب میں حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں خلد آشیاں دہلوی کے شاگرد ارشد ہیں اور جناب حکیم واصل خاں و مسیح الملک حکیم اجمل خاں سے مستفید ہوئے۔ علم طب کے علاوہ دینیات کے بھی ماہر ہیں۔ آپ عرصہ تک نواب صاحب بھیکم پور کے پاس معالج خصوصی کی حیثیت سے رہے۔ حکیم اجمل خاں صاحب کے ایما پر نواب صاحب کی ملازمت چھوڑ کر طبیہ کالج دہلی میں معالجات کے پروفیسر لگ گئے۔ پھر وائس پرنسپل کے عہدہ پر ممتاز ہوئے۔

آپ بڑے اعلیٰ مضمون نگار اور بلند پایہ مصنف ہیں۔ ایک زمانہ تک آپ کے قیمتی طبی مضامین "مجلہ طبیہ" دہلی میں باقاعدگی سے شائع ہوتے رہے جو بے حد مقبول ہوئے اور "سیرۃ العباس"، "سیرۃ آل عباس" —— اور "مدار اعظم" جو سید بدیع الزماں قطب مدار کی سوانح عمری ہے، آپ کی قابل قدر تصانیف ہیں۔ "سیرۃ آل عباس" اور "مدار اعظم" کی اہمیت کے پیش نظر نواب صاحب حیدر آباد دکن نے حکیم صاحب کو ان تصانیف پر پانچ پانچ سو روپے انعام دیے۔

عباسی صاحب ایک عرصہ تک حضرت حاذق الملک کے زیر دستی نسخہ نویسی کرتے رہے اور دہلی میں طبیہ کالج کے فری شفاخانہ کے انچارج بھی رہے۔ آپ کی یہ خصوصیت ہے کہ خالص یونانی طریق علاج پر نسخہ نویسی کرتے ہیں اور علاج بالمفردات کے ماہر ہیں۔ کوڑیوں کی دواؤں سے وہ کام لے لیتے ہیں جو دوسرے اطباء سینکڑوں روپے کی دواؤں سے نہیں لے سکتے۔

تقسیم ہند پر آپ لاہور چلے آئے۔ اس وقت ماڈل ٹاؤن لاہور میں مقیم ہیں۔ اس پیرانہ سالی میں بھی اپنی حذاقت کے جوہر دکھاتے رہتے ہیں۔ آپ اس وقت عمر، تجربہ اور علم کے لحاظ سے منفرد ہیں، تمام اطباء آپ کا احترام کرتے ہیں۔ آپ کا تمام خاندان علم و فضل سے بہرہ مند ہے۔ آپ کے صاحبزادے بڑے لائق ہیں۔ محمود احمد عباسی مؤلف "خلافت معاویہ و یزید" حکیم صاحب کے چھوٹے بھائی ہیں۔

زبدۃ الحکماء فضل الٰہی پرنسپل طبیہ کالج لاہور

آپ طبیہ کالج لاہور میں ایک زمانہ سے تدریسی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں کالج کے کلینیکل شعبہ میں اسسٹنٹ مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں پروفیسر ہو گئے اور ۱۹۴۹ء میں وائس پرنسپل کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ حکیم حافظ جلیل احمد انصاری پرنسپل شپ سے سبکدوش ہوئے تو ۲ جنوری ۱۹۵۹ء سے آپ بطور قائم مقام پرنسپل کالج کی خدمات سرانجام دے رہے ہیں اور عنقریب آپ کے پرنسپل ہو جانے کی قوی امید ہے۔ اس موقع پر اگر لاہور کے اس واحد طبیہ کالج کی مختصر تاریخ بھی بیان کر دی جائے تو شاید غیر موزوں نہ ہو۔ ۱۸۶۵ء میں لاہور میں انجمن اطبائے پنجاب کے نام سے ایک مجلس کا قیام عمل میں آیا تھا جس کا مقصد وحید پنجاب میں مشرقی علوم کی ایک یونیورسٹی قائم کرنا تھا اور حکیموں، ویدوں کے علوم میں اضافہ کرنا نیز ان کے حقوق کی نگہداشت اس انجمن کے لائحہ عمل میں شامل تھی۔ اس انجمن کے قریباً دو سو ممبر تھے۔ اس انجمن کی کوششوں سے یونیورسٹی میں حکیموں اور ویدوں کے امتحان ہونے لگے۔ یونانی طب کے امتحان پاس کرنے والوں کو عمدۃ الحکماء اور زبدۃ الحکماء کی سندیں ملتی تھیں۔ وید کے امتحان پاس کرنے والوں کو "بھیاکر" اور "جیا بھیاکر" کے ڈپلومے ملتے تھے۔

۱۸۷۲ء سے پہلے جو اطباء باقاعدہ مطب کر رہے تھے ان کو مناسب ثبوت بہم پہنچانے پر زبدۃ الحکماء کی اعزازی سندیں دی گئی تھیں

چنانچہ ۱۸۶۲ء، ۱۸۶۳ء میں حکیموں اور ویدوں کی تعداد علی الترتیب ۳۲ اور ۲۰ تھی۔

۱۸۶۷ء میں بیس حکیموں اور ویدوں نے میڈیکل سکول لاہور میں ڈاکٹری کی تعلیم بھی باقاعدہ حاصل کی جن کا امتحان ۱۸۷۲ء میں پنجاب یونیورسٹی نے لیا تھا۔

۱۸۸۶ء میں یونیورسٹی کی طرف سے طبیہ کلاسز کا باقاعدہ قیام عمل میں آیا۔ ابتداً میں ان کلاسز کو اورینٹل کالج لاہور میں جگہ دی گئی، پھر ان کو میڈیکل سکول میں منتقل کر دیا گیا۔

۱۸۹۷ء میں میڈیکل سکول میں قلتِ گنجائش کا عذر پیش کر کے یونیورسٹی نے طبیہ کلاسز کو انجمن حمایت اسلام لاہور کے اسلامیہ کالج اور دیدک کالج کو ڈی۔ اے۔ وی کالج لاہور کے سپرد کر کے ان کالجوں سے ملحق کر دیا۔ طبیہ کلاسز کے اخراجات پورے کرنے کے لیے پنجاب یونیورسٹی ان دونوں کالجوں کو باقاعدہ گرانٹ دیتی رہی ـــــ مگر حقیقت یہ ہے کہ انگریزی حکومت نے ان فنون سے اپنی سرپرستی ختم کرنے کے لیے یہ پہلا قدم اٹھایا تھا ـــــ!

۱۹۲۰ء تک طبیہ کلاسز صرف ایک سپرنٹنڈنٹ کے زیرِ اہتمام تھیں۔ اس کے بعد انجمن حمایتِ اسلام نے ان کلاسز کی ترقی کے لیے مزید قدم اٹھایا چنانچہ ان کے انتظام کے لیے ایک باقاعدہ کمیٹی بنا دی گئی جس میں انجمن کے معزز ممبروں کے علاوہ پبلک کے مشہور ارباب فن کو بھی شریک کیا گیا۔

۱۹۳۶ء میں انجمن نے اس کو باقاعدہ کالج بنا دیا اور اس کے اسٹاف میں مزید اضافہ کر دیا چنانچہ آج تک اس کالج میں برابر ترقی ہوتی چلی آ رہی ہے۔ اس وقت کالج کی شاندار عمارت علیحدہ ہے اس کے طلبہ کی عملی تعلیم کا مکمل انتظام ہے۔ کالج میں میوزیم اور لیبارٹری بھی ہے اور ایک شاندار لائبریری ہے جس میں ہر سال کتابوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

طبیہ کالج لاہور کو حکومت نے تسلیم کیا ہوا ہے۔ حکومت مغربی پاکستان کالج کو اور لاہور کارپوریشن اس کے یونانی شفا خانے کو سالانہ گرانٹ دیتی ہے۔ حکومت نے نوٹیفکیشن ۱۸۸۲-۲۷ مورخہ ۲۷ ستمبر کے ذریعے اس کالج کے سند یافتہ اطباء کو ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپل کمیٹیوں میں ملازمت کے حقوق عطا کیے ہوئے ہیں اور اس وقت کالج ہٰذا کی ڈگریاں کے نام حکیم حاذق اور زبدۃ الحکما بموجب گورنمنٹ ایکٹ نمبر ۱۶ ۱۹۰۸ء رجسٹری شدہ ہیں ـــــ لاہور میں صرف یہی ایک طبیہ کالج ہے جس میں باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے اور صرف اسی کالج کے سند یافتہ ہی مستند طبیب کہلانے کے حق دار ہیں۔

علامہ کبیر الدین

ان کا وطن شیخ پورہ ضلع مونگیر (بہار) ہے۔ تقریباً ۱۸۹۳ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر پائی۔ پھر کان پور، لکھنؤ، دہلی اور لاہور کے فضلائے باکمال سے علوم و فنون کی تحصیل کی۔ عربی ادب کی انتہائی کتابیں "مدرسہ نعمانیہ" لاہور میں داخل ہو کر پڑھیں۔ ۱۹۱۴ء میں طبیہ کالج لاہور سے زبدۃ الحکماء کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ اس کے بعد شمس الاطبا حکیم غلام جیلانی کے پاس ترجمہ و تالیف کا کام کرتے رہے۔ کچھ عرصہ بعد یہاں سے سبکدوش ہو کر لاہور میں مطب کرنے لگے اور "شرح اسباب" کو سلیس اردو کا جامہ پہنا کر شائع کیا جو بے حد مقبول ہوئی، کئی سال لاہور میں رہتے گزر گئے تھے کہ حکیم اجمل خاں دہلوی نے ان کو طبیہ کالج دہلی کے دارالتصنیف میں کام کرنے کے لیے بلا لیا اور کالج میں پروفیسر ہو گئے۔ علامہ کبیر الدین نے دہلی میں کئی قابلِ قدر کتابیں تصنیف کیں جن کی بدولت ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ کرنل بھولا ناتھ صاحب نے طبِ یونانی پر جو اعتراضات کیے تھے علامہ کبیر نے ان کے جوابات پر مشتمل "برہان" نامی

کتاب لکھی جو حکمت لقی۔ اسی کتاب سے متاثر ہو کر نظامِ دکن نے ان کو آصفیہ طبیہ کالج دکن میں بلا لیا اور آج تک حیدر آباد ہی میں مقیم ہیں۔ حکیم صاحب کا بے مثال کتب خانہ جو قرول باغ دہلی میں تھا جو ہندوؤں نے جلا کر راکھ کر دیا۔

صوفی لچھمن پرشاد

یہ ۱۸۸۶ء میں ضلع فیروزپور کے ایک موضع میں پیدا ہوئے، والد کا نام لالہ جوالا پرشاد تھا۔ صوفی صاحب نے ایف اے، سی کا امتحان پاس کرنے کے بعد آیورویدک اور یونانی طب پڑھی۔ اس کے بعد لاہور آ کر مطب کرنے لگے اور ۱۹۱۱ء میں رسالہ "مستانہ جوگی" جاری کیا جو باقاعدگی کے ساتھ لاہور سے ۱۹۴۷ء تک شائع ہوتا رہا۔ یہ ماہنامہ بڑا مقبول تھا اور اسی کے ذریعے صوفی لچھمن پرشاد نے شہرتِ عام حاصل کی۔ آپ نے کتابیں بھی متعدد تصنیف کیں جن کے نام یہ ہیں (۱) سائنس کی روشنی میں ہندوستانی جڑی بوٹیاں (۲) مخزن الجواہرات (۳) تجرباتِ طب قدیم و جدید (۴) ہماری سفرنامے ہر چہار جلد۔ آپ تقسیم ملک کے بعد دہلی چلے گئے، وہاں جنگ پورہ میں مقیم ہیں اور رسالہ "مستانہ جوگی" نکال رہے ہیں۔ حالہ فارمیسی بھی قائم کی ہوئی ہے۔

شفاء الملک محمد حسن قرشی

آپ ۱۸۹۶ء میں بمقام گجرات (پنجاب) پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد لاہور آ گئے اور یہاں اس وقت کی عظیم درس گاہ "مدرسہ نعمانیہ" میں داخل ہو کر پڑھتے رہے، یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر پنجاب یونیورسٹی سے بھی اسناد حاصل کیں، پھر حکیم حاذق اور زبدۃ الحکماء کے امتحانات پاس کیے، طبیہ کالج دہلی سے بھی مستفید ہوئے اور اسی کالج میں پروفیسر رہے۔ ازاں بعد بمبئی چلے گئے اور وہاں کچھ عرصہ مطب کرنے کے بعد ۱۹۲۰ء میں لاہور چلے آئے۔ یہاں مطب جاری کیا اور طبیہ کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہو گئے۔ قرشی صاحب اردو، عربی، فارسی اور انگریزی کے ماہر ہیں۔ آپ کا ادبی ذوق نہایت اعلیٰ ہے۔ وقت کے بلند پایہ اہلِ علم سے آپ کے مراسم رہے جن میں سے علامہ اقبال مرحوم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ شفاء الملک علامہ قرشی صاحب نے بہت سی طبی کتابیں تصنیف کیں جن میں سے "جامع الحکمت" بہت مشہور و مقبول ہے۔ کئی عربی کتابوں کے ترجمے بھی کیے۔ آپ کی طبی خدمات کی بنا پر حکومت برطانیہ نے آپ کو "شفاء الملک" کے خطاب سے ممتاز کیا۔ سیاسیاتِ طب میں آپ کی حیثیت ہمیشہ قائدانہ رہی۔ اس وقت آل پاکستان طبی کانفرنس کے صدر ہیں۔ غرضیکہ آپ بڑی خوبیوں کے مالک ہیں۔ طبیب، ادیب، خطیب، مصنف اور مفکر ہیں۔ آپ کے صاحبزادے زبدۃ الحکما آفتاب احمد قرشی بھی بڑے شریف النفس انسان ہیں۔ ماہنامہ "مشیر الاطباء" آپ کی زیرِ ادارت شائع ہوتا ہے۔

قرشی صاحب حج بھی کر آئے ہیں۔ حجازِ مقدس میں آپ شاہ سعود کے مہمانِ خاص کی حیثیت سے رہے۔ بے شمار خوبیوں کے علاوہ آپ میں ایک خوبی یہ ہے کہ طب یونانی کی ترقی و تحفظ کے لیے دل سے کوشاں رہے ہیں اور آپ کی ان مساعی پر حضرت حکیم اجمل خاں دہلوی علیہ الرحمۃ ہمیشہ مطمئن رہے اور پاکستان کے ننانوے فی صد اطباء آپ کو اپنا قائد تسلیم کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

محمد نبی جمال سویدا

بن مسیح الملک حکیم محمد جمیل خاں بن مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں دہلوی، ۱۱ نومبر ۱۹۲۰ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ نے وقت کے فضلائے باکمال سے مروجہ علوم کی تحصیل کی۔ طب آپ کے گھر کی لونڈی ہے۔ ذہانت و فطانت آپ کا خاندانی ورثہ ہے۔

حکیم صاحب تقسیم ہند کے بعد لاہور چلے آئے اور یہاں "دواخانہ حکیم اجمل خاں" امرت دھارا بلڈنگ ریلوے روڈ پر

قائم کیا جس کی بڑی شہرت ہے مگر خود جمالؔ صاحب دوا خانہ اور مطب میں بہت کم تشریف لاتے ہیں۔

آپ شعر و ادب کے دلدادہ ہیں۔ ابتدا میں سوید اؔ تخلص کرتے تھے پھر اجملؔ اور جمیلؔ کی مناسبت سے جمالؔ تخلص اختیار کر لیا۔ آپ کے پاس مختلف علوم و فنون کے نادر و نایاب مخطوطات کا بیش بہا ذخیرہ ہے۔

بابائے نیچرو پیتھی مہر الدین

آپ قریباً ۱۸۸۰ء میں بمقام امرتسر پیدا ہوئے۔ علوم مروجہ کی تحصیل کے بعد طب یونانی مولانا حکیم مریدا احمد خاں امرتسری سے پڑھی۔ علامہ محمد عالم آسی امرتسری اور حکیم طغرائی سے بھی مستفید ہوئے۔ ہومیو پیتھی کے، سی، ہنیتی ہومیو پیتھک کالج لاہور میں داخل ہو کر پڑھی۔ ۱۹۰۷ء میں ڈاکٹر "لوئی کوہنی" جرمن کی کتابیں دیکھیں تو آپ ان کے نظریہ علاج کے حامی ہو گئے اور "نیچرو پیتھی" کے اصولوں کے مطابق باقاعدگی کے ساتھ معالجہ بیماراں کرنے لگے ——— "لوئی کارنورو" باشندۂ وینس کی تصنیف "ہاؤ ٹو لیو لونگ" جو قریباً آج سے تین سو پچاس سال پہلے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی تھی آپ نے اس کا اردو ترجمہ کیا جو "درازیٔ عمر کا راز" نام سے شائع ہوا تھا۔

حکیم مہر الدین صاحب تقسیم ملک پر لاہور چلے آئے۔ اس وقت سمن آباد میں مقیم ہیں۔

کویراج ہرنام داس بی۔ اے

تقسیم سے پہلے ان کا مطب بیرون لوہاری گیٹ سرکلر روڈ پر تھا۔ تقسیم کے بعد یہ دہلی چلے گئے۔ بڑے سمجھدار انسان ہیں۔ ان کی تصانیف ہدایت نامہ خاوند ——— ہدایت نامہ بیوی ——— اور ——— ہدایت نامہ غذا بڑی مقبول ہیں۔ دہلی پہنچ کر انھوں نے وہاں اپنا مطب دوبارہ جاری کیا جو اب تک چل رہا ہے۔

کتابیات

اس مضمون کی تیاری میں خاص طور پر جن کتابوں اور رسالوں سے مدد ملی وہ یہ ہیں:۔

عمل صالح (شاہجہان نامہ)۔ مآثر الامرا۔ بادشاہ نامہ۔ توزک جہانگیری۔ تذکرۂ قطبیہ۔ خزینۃ الاصفیا۔ گنج تاریخ۔ نزہت الخواطر (عربی) مطبوعہ حیدر آباد دکن)۔ تاریخ جلیلہ۔ تاریخ لاہور از کنھیا لال۔ تحقیقات چشتی۔ مخزن حکمت از مفتی سرور۔ قاموس المشاہیر دو جلد۔ فرہنگ میر کبیر مطبوعہ ایران۔ سلیم التواریخ۔ مجربات کانفرنس۔ حیات کانفرنس۔ رموز الاطبا۔ اسرار الاطبا۔ رجز تعفوری۔ رئیسان پنجاب۔ آثار لاہور از سید ہاشمی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ از سیتا رام کوہلی۔ اطبائے عہد مغلیہ از کوثر چاند پوری۔ رسالہ الحکیم لاہور۔ رسالہ ہمدرد صحت کراچی۔ مجلہ طبیہ لاہور (بزرگان ہنود قلمی)

علاوہ ازیں اور بھی بہت سی کتابوں اور رسائل سے استفادہ کیا۔ میں ان سب کا نہایت درجہ شکر گزار ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کے علمی کارناموں کو زندگی جاوید بخشے۔ آمین!

اُردو صحافت

(۱۸۵۱ء سے ۱۹۶۲ء تک)

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

۱۸۴۹ء میں لاہور انگریزوں کے زیرِ نگیں آیا اور ڈیڑھ برس کے اندر اندر وہ تحریک شروع ہوئی جس نے پنجابی اور فارسی کی بساط اُلٹ دی اور اُردو کو مسند پر لا بٹھایا۔ پنجابی زبان عوامی زبان تھی۔ اسے صحیح معنوں میں شاہی سرپرستی کبھی حاصل نہیں ہوئی۔ سکھوں کے عہد میں یہ رانی بنی لیکن کچھ بات نہ بنی۔ اسے راج پاٹ حاصل تھا۔ حکمران اسی زبان میں گفتگو کرتے تھے لیکن عالی نسب نہ ہونے کے سبب سے وہ حیثیت حاصل نہ ہوئی جس کی یہ مستحق تھی۔ اسی طرح جیسے امیر لوگ ادنیٰ ذات کی دوشیزہ سے معاشقہ تو فرما لیتے ہیں لیکن اس سے نکاح نہیں کرتے۔ سکھوں کے عہد میں بھی پنجابی زبان صرف زبان تک محدود رہی۔ جہاں قلم آیا پنجابی گوشہ نشین ہو جاتی اور عالی خاندان، عالی نسب فارسی پردھان بن جاتی۔ سکھوں کے دورِ حکومت میں تمام فرامین فارسی میں لکھے جاتے تھے بلکہ سرکاری وقائع نگار اور اخبار نویس مرکز کو دور دور کے علاقوں کی خبریں مہیا کرنے کی غرض سے جو قلمی اخبارات مرتب کرتے وہ بھی فارسی میں ہوتے تھے۔ انگریز آئے تو انھوں نے پنجابی کو تو اسی پرانے مقام پر لا بٹھایا جہاں وہ صدیوں سے پڑی تھی اور فارسی کو منظم طور پر ختم کر کے اُردو کو سرکاری دفاتر کی رانی بنا دیا۔

برِ عظیم پاک و ہند میں اُردو انگریزوں کی سرپرستی میں پھلی پھولی اس لیے نہیں کہ انگریزوں کو اس زبان سے عشق تھا بلکہ اس لیے کہ حکمران طبقہ فارسی کو ختم کرنا چاہتا تھا تاکہ مسلمانوں کے اقتدار کی بچی کھچی نشانی ختم ہو جائے اور کہیں فارسی انھیں یہ یاد نہ دلائے کہ کبھی حکومت ان کے ہاتھ میں تھی۔ گویا نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ چونکہ سنسکرت مُردہ تھی اور ہندی بے اثر، اس لیے انگریزوں کے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ وہ اُردو کی سرپرستی کریں۔ پہلے فورٹ ولیم کالج کے زیرِ اہتمام اُردو کو فروغ ملا، پھر اسے ہندوستان بھر میں عدالتی زبان بننے کا شرف حاصل ہوا۔ اس کے بعد آگرہ میں حکومت کی نگرانی میں مختلف موضوعات پر اُردو کتابیں چھاپی گئیں۔ اُردو اخبار نکالے گئے اور جب پنجاب کا الحاق ہوا تو یہاں سے بھی فارسی زبان کو دیس نکالا ملا اور ہر طرف اُردو زبان کا طوطی بولنے لگا۔

لاہور میں اس تحریک کا آغاز "کوہِ نور" سے ہوا جو ۱۸۵۱ء کے آغاز میں نکلا۔ اس اخبار کو منشی ہرسکھ رائے نے جاری کیا جو سکندر آباد (یو۔پی) کے ایک کائستھ خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور انگریزوں کے ممدوح تھے اور انگریز ان پر بے حد اعتماد کرتے تھے بلکہ الحاقِ پنجاب کے فوراً بعد بجائے اس کے کہ انگریز کسی مقامی شخصیت کو اعتماد میں لیتے اور اخبار جاری کرنے میں اس کی مدد کرتے، انھوں نے سکندر آباد سے منشی ہرسکھ رائے کو بلا بھیجا۔ انھیں چھاپہ خانہ بنانے میں مالی امداد دی۔ چھپائی کا سارا سرکاری کام ان کے سپرد کیا

اور "کوہِ نور" جاری ہوا تو اس کے بیلے خریدار بھی رہے۔ "کوہِ نور" اُردو میں نکلتا تھا اور اُردو زبان کا بڑا حامی تھا۔ وہ فارسی کے مقابلے پہ اُردو کے حق میں وہی دلائل دیا کرتا تھا جو آج ہم انگریزی کے مقابلے پر اُردو کے حق میں دیتے ہیں۔ ۸ ر اپریل ۱۸۵۶ء کے شمارے میں ایک مقالہ نگار لکھتے ہیں :۔

"حتی الامکان اپنی زبان میں اگر تعلیم علوم کی ہووے تو دوسری زبان کی نسبت جلد حاصل ہوتی ہے۔ خیال کیجئے کہ اگر اُردو میں سب علوم کی کتابیں بن جاویں تو وہی علوم جلد تر عوام کو حاصل ہوں گے۔ عربی، فارسی، خواہ سنسکرت والوں کو اس قدر جلد حاصل ہوں گے، کیا معنی؟ پہلے تو زبان ہے۔ سیکھتے سیکھتے اون کے چھ سات برس گزر جائیں گے۔ غرض اس بارہ میں صواب آرائے مہتمم کوہِ نور بہت درست ہے بلکہ جیسے انگریزوں نے زبان ہائے یونانی و سنسکرت سے اپنی بھاکہ میں سب علوم ترجمہ کر ڈالے ویسے ہی اُردو و فارسی و انگریزی و سنسکرتی والوں کو چاہیے کہ ہر علوم کو ہر ایک زبان سے لے کر اُردو میں ترجمہ کیا کریں۔"

"کوہِ نور" میں مقامی خبریں نہایت باقاعدگی سے چھپتی تھیں۔ جرائم کا حال، موسم کی کیفیت، تہواروں اور میلوں کی اطلاعات، اہم عدالتی فیصلے، افسروں کی نقل و حرکت کی خبریں —— غرض سب کچھ دیا جاتا تھا لیکن خبروں کی تلخیص اس حد تک ہو جاتی تھی کہ قارئین تشنگی ضرور محسوس کرتے ہوں گے۔ غیر ملکی خبریں بھی چھاپی جاتی تھیں جن میں افغانستان اور ایران کی خبروں کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ خبروں کے حصول کا عام طریقہ اس زمانے کے اُردو، فارسی اور انگریزی اخبارات کے سلسلے میں ایک ہی ڈھب کا تھا۔ خبر رساں ایجنسیاں ابھی معرضِ وجود میں نہیں آئی تھیں۔ ہر اخبار کے اعزازی نامہ نگار مختلف مقامات پر مقرر تھے جو مختلف قسم کی خبریں بھیج دیا کرتے تھے۔ حکومت بھی بعض خبریں مہیا کر دیتی تھی۔ اس کے علاوہ اخبارات کا عام رواج یہ تھا کہ وہ ایک دوسرے کی حاصل کی ہوئی خصوصی خبریں باقاعدہ حوالہ دے کر نقل کر لیتے تھے۔ (بغیر حوالے کے خبروں اور مضامین کو نقل کرنے کی رسم اُردو صحافت کی "ترقی" کے ساتھ ساتھ بڑھی) اس طرح گویا اخبارات کے درمیان خبروں کے رضا کارانہ تبادلے کی رسم قائم تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہر اخبار تقریباً تمام ضروری خبریں اپنے قارئین تک پہنچا دیتا تھا۔ اس زمانے میں اخبارات پرانی خبر چھاپنے سے شرماتے نہیں تھے کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ تمام اہم خبریں ریکارڈ ضرور ہو جائیں۔ یہ امر جدید صحافت کا طرۂ امتیاز ہے کہ اگر ادارے کی غلطی سے کوئی نہایت اہم خبر درج ہونے سے رہ جائے تو اس سے قارئین کو بالکل ہی محروم کر دیا جائے تاکہ ایسا نہ ہو کہ کوئی قاری یہ کہہ دے کہ اس اخبار سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔

"کوہِ نور" کے بارے میں یہ صحیح کہا جاتا ہے کہ یہ اخبار سرکار دولت مدار کا فرزند دلبند تھا اور انگریز کی خوشامد کرتا تھا لیکن کبھی کبھی دستنِ ترا کے بھاگنے کی سعی بھی کرتا تھا چنانچہ ایسے مواقع آتے کہ اس نے تلخ لہجے میں سرکار کو ٹوکا۔ مثلاً ایک مرتبہ ضلع کے نظم و نسق پر شدید نکتہ چینی کی۔ اخبارات پہ پابندی لگانے کی تحریک چھپی تو "کوہِ نور" نے "آزادگی مطابع" کے عنوان سے یہ اداریہ چھاپا۔

"اخبار نویسان و وقائع نگاران ملک ہند و مہتممان اور مالکانِ مطابع کو واضح ہووے کہ دریں ولا مجلس لیجسلیٹو کونسل ہند میں یہ تجویز ہوئی ہے کہ ایک قانون ایسا اجرا پاوے

جس سے چھاپہ والوں کو اختیارات چھاپنے پر مضامین کے نہ رہیں اور سرکار کی طرف سے مزاحمت اور مداخلت ہووے۔ پس سب کو لازم ہے کہ یک دل اور یک رائے ہو کر بہ کمال مستعدی پیروی اس امر کی کریں کہ ایسا قانون جاری نہ ہووے ورنہ سب کو ضرر ہے اور پھر اخبار اور چھاپہ کی کچھ ہستی نہ رہے گی مگر قیاس نہیں چاہتا کہ سرکار جس نے یہ اختیارات دیے ہیں بلا وجہ اس میں مداخلت کرے۔"

(۲۹ اپریل ۱۸۵۶ء)

اودھ کے الحاق کے بارے میں جتنی خبریں درج کی گئیں ان میں بار بار یہ اشارہ کیا گیا کہ لوگ انگریزوں کے آنے سے ناخوش ہیں۔ ۲۶ فروری ۱۸۵۶ء کے شمارے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"اب اودھ کے لوگ ضبطیٔ ملک سے ناخوش ہیں۔ ہزارہا امیدواران نوکری شور و غل مچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سرکار کو سوائے ملک اودھ کے غیر مقامات کے آدمیوں کو نوکر رکھنا بعید از انصاف ہے۔ بادشاہ کے قدیمی ملازمین بجز چند آدمیوں کے، سب برخاست ہو گئے۔ ان سے کہا گیا ہے کہ تمہارے حقوق کا لحاظ کیا جاوے گا۔ اب بادشاہ کی حالت پر سب کو رحم آتا ہے۔ بادشاہ نے جو ہر معاملے میں سرکار کی اطاعت کی یہ بہت اچھی تجویز ہوئی۔ لیکن لوگ اس بات سے ناراض بھی ہوئے اور ایک زمیندار مفسد نے یہاں تک کیا کہ پوشاک زنانی بھیج کر پیغام دیا کہ تم کو یہ لباس زیب ہے کیونکہ اس طرح سے بلا تکرار ملک میں دخل دے دینا اسی لائق ہے کہ عورت کا لباس پہن کر بیٹھو۔ جب سے ۵۲ رجمنٹ شاہی اور توپ خانہ پیدل شہر میں آیا ہے، باشندگانِ شہر کی نظر میں انگریزوں کی اہانت ہوئی۔ گورہ لوگوں نے بہ حالتِ مستی شراب کے شہر میں جا کر بہت نامعقول حرکات کیں اور جبر کیے۔ بعض لوگوں کو تو حیرت ہے کہ انگریز اور گورہ میں کیا فرق ہے؟"

۱۱ مارچ کے شمارے میں یہ خبر دی گئی:۔

"ہم بہ افسوس بیان کرتے ہیں کہ اب کے ہفتے میں اس مطبع پر ایک صدمۂ عظیم عائد ہو گیا یعنی منشی ہرسکھ رائے ایڈیٹر کوہ نور کو صاحبِ ضلع نے تین سال کو قید کر دیا۔ اس لیے اب کی دفعہ اخبار کے پرچے میں توقف پڑا ...."

سوال یہ ہے کہ منشی ہرسکھ رائے کیوں پکڑے گئے اور وہ کون سا سنگین جرم تھا جس کی پاداش میں حکومت نے اپنے فرزند دلبند کو تین سال کے لیے پس دیوار زنداں بٹھا دیا؟ اس کا جواب نہ "کوہ نور" دیتا ہے نہ کوئی اور ذریعہ۔ ممکن ہے سرکار نے منشی ہرسکھ رائے کی وہ بے تکلفی پسند نہ فرمائی ہو جو انھوں نے اپنے آقایانِ نامدار سے برتی اور یہ بھی ممکن ہے کہ منشی صاحب نے کسی افسر کے خلاف کچھ لکھ دیا ہو۔

کیونکہ اس کے تین مہینے بعد "ریاضِ نور" (ملتان) کے مدیر محمد مہدی حسین خان کو تحصیلدار صاحب بہادر کی شان میں گستاخی پر ایک سو دو اکٹھے سات سال قید بامشقت کا حکم سنا دیا گیا۔ بہر حال "کوہِ نور" اور اس کا مطبع برابر قائم رہے اور منشی ہرسُکھ رائے رہائی کے بعد پھر سرکار کے محبوب بنے رہے اور "کوہِ نور" کو جملہ مراعات حاصل رہیں۔ منشی موصوف بلدیہ لاہور کے رکن نامزد ہوئے اور ان کا شمار رؤسائے لاہور میں ہوتا رہا۔

"کوہِ نور" اردو صحافت کی تاریخ میں بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ ہر لحاظ سے ایک اچھا اخبار تھا۔ اس میں نہ صرف تمام ضروری خبریں درج ہوتی تھیں بلکہ اعلیٰ پایے کے علمی مضامین بھی چھپتے تھے اور شعراء کا کلام بھی درج کیا جاتا تھا۔ دوسرے یہ برِ عظیم کا سب سے کثیر الاشاعت اخبار تھا۔ گارساں دتاسی کے بیان کے مطابق ۱۸۵۴ء میں اس کی اشاعت ۳۵۰ (تین سو پچاس) تھی۔ اس زمانے میں عام طور پر اردو اخباروں کی اشاعت پچاس اور سَو کے درمیان ہوتی تھی۔ جن اخباروں کی سرپرستی حکومت کرتی تھی ان کی اشاعتیں دو سو تک بھی پہنچ جاتی تھیں۔ یہ فخر صرف "کوہِ نور" کو حاصل تھا کہ اس کی اشاعت ۳۵۰ تک پہنچ گئی۔ یہ درست ہے کہ حکومت نے بھی اسے خرید اور دیے تھے لیکن ان کی تعداد سو ڈیڑھ سو سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ "کوہِ نور" کی تیسری بڑی خصوصیت یہ تھی کہ یہ نصف صدی سے زیادہ عرصے تک جاری رہا اور یہ امتیاز شاید "اودھ اخبار" کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہوا اور چوتھی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ "کوہِ نور" ایک "سکول آف جرنلزم" کی حیثیت رکھتا تھا۔ جن اخبار نویسوں نے یہاں کام کیا اور صحافتی تجربہ حاصل کیا انھوں نے بعد میں اپنے اخبار جاری کیے مثلاً نادر علی شیفتی، منشی نثار علی شہرت، مولوی سیف الحق ادیب، مولوی محمد دین فوق اور منشی محرم علی چشتی۔ بعض حضرات کا بیان ہے کہ منشی نولکشور بھی "کوہِ نور" سے منسلک رہے۔ میری تحقیق کے مطابق یہ بیان غیر صحیح ہے۔ جس زمانے میں انھیں "کوہِ نور" سے وابستہ بتایا جاتا ہے اس زمانے میں وہ آگرہ سے "سفیرِ آگرہ" نکالتے تھے اور ان میں ایسے روحانی کمالات موجود نہیں تھے کہ آگرہ اور لاہور میں بیک وقت دو اخباروں کی ادارت کا فرض سرانجام دیتے۔

لاہور میں یوں تو سب اخباروں میں علمی مضامین چھپتے تھے اور ایک آدھ پندرہ روزہ اخبار خاص اشاعتِ علم کے لیے جاری ہوا لیکن لاہور کا پہلا علمی ماہنامہ "خورشیدِ پنجاب" تھا جو جنوری ۱۸۵۶ء میں مطبع کوہِ نور کے اہتمام میں جاری ہوا۔ اس کے پہلے تین پرچے پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہیں جن سے اس کے خدوخال کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کا سائز وہی تھا جو آج کے علمی اور ادبی رسائل کا ہے۔ اڑتالیس صفحات ہوتے تھے اور سرورق الگ ہوتا تھا۔ پہلے پرچے میں جو "تمہید" درج کی گئی اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے:

"واجب یہ ہے کہ سب سے پہلے سببِ طلوع اور وجہِ شیوع اس "خورشیدِ پنجاب"
کا ظاہر کیا جاوے جس سے دقیقہ سنجانِ حقیقت آگاہ کو واضح ہو کہ شیوع اس خورشید
سے کیا مقصود ہے اور طلوع اس مہرِ منیر سے کیا فائدہ متصور ہے سو گزارش کیا جاتا
ہے کہ غرض اصلی اجرائے اس نسخۂ دلپذیر بہتر از اکسیر سے یہ ہے کہ پنجاب میں جو زبان
اُردو کا ربط ابھی اچھی طرح نہیں ہوا ہے اور بہ سبب اس کے کہ تی زبانا زبان اُردو
کو بدرجہ غایت اقتدار ہے۔ دفاترِ سرکاری میں بھی اسی کا رواج ہے بشعر و سخن میں بھی اس
کو لطیف کہتے ہیں۔ بول چال میں بھی اس کی فصاحت پر توجہ فرماتے ہیں اور دفاترِ سرکاری

کے عملگان بعض ایسے ہیں کہ تنگیٔ معاش کے باعث مکتب سے اٹھتے ہی تلاشِ نوکری
میں مصروف ہو گئے اور نوکری بہم پہنچا کر تحصیلِ آئندہ سے محروم ہو رہے ہیں یا اکثر لوگ
ایسے ہیں کہ مشاہرہ کمی سے کتب قیمتی قوانین سرکار اور دیگر علوم و فنون کو خرید نہیں
سکتے اور اسی باعث سے ترقیٔ آئندہ سے مجبور رہتے ہیں سو اس میں اکثر ایسے مضامین
درج ہوا کریں گے کہ جن سے زبانِ اُردو کی ماہیت بوجہ احسن واضح ہو گی اور اس زبان
کے شائقوں کو تفریح خاطر خواہ بہ آئین بہین حاصل ہو گا اور عملگان کچہریٔ سرکاری کو اس
کے مطالعہ سے ترقیٔ علوم و فنون و ہم کا رسر رشتہ ہو گی۔ آئین اور قوانین سے واقفیت
بہم پہنچے گی اور ان کی طبیعت علوم کی طرف متوجہ ہو گی۔"

اس کے بعد علم کے فضائل بیان کیے گئے۔ مواصلات اور حمل و نقل کے مشینی ذرائع کا ذکر کیا گیا اور بتایا گیا کہ "خورشید پنجاب" میں تہذیب، اخلاق، نظامِ تعلیم، تہذیبِ رسم و عاداتِ نیک، بحثِ علمی، بحثِ قانونی، علمِ طبعی، تجارت اور پیداوارِ ملک، عمارات و انہار، جغرافیہ، تاریخ اور طلسمات کے موضوع پر مقالے چھپا کریں گے۔ "بحثِ علمی" کے عنوان سے ایک مقالہ تین اقساط میں چھپا جس میں بتایا گیا کہ برطانیہ کے عہد میں اشاعتِ علوم کا جو سلسلہ شروع ہو رہا ہے اس سے ایک ایسا انقلاب آئے گا کہ صورت و سیرت دونوں بدل جائیں گی۔ پھر حفظِ علم کے بیان میں بتایا گیا ہے کہ مختلف علوم کے مطالعہ سے کیا کیا فائدے ہوتے ہیں۔ ایک مقالہ "اخلاق" پر ہے، ایک نظامِ تعلیم پر جس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ ذریعہ تعلیم اُردو ہو اور نظامِ تعلیم اور طریقِ تعلیم ایسا ہو کہ اس میں کم از کم تضیعِ اوقات ہو۔ "سراج العلم" کے عنوان سے ایک مفصل مقالے میں مختلف علوم کا تھوڑا تھوڑا حال بیان کیا گیا ہے۔ سائنسی موضوعات پر چند اچھے مضامین چھاپے گئے ہیں۔ زبان سادہ اور عام فہم ہے اور کوئی ایسی گمبھیر سائنسی اصطلاح نہیں ملتی جس کی سمجھ نہ آئے۔ افسوس اپریل سالہ بہت جلد بند ہو گیا۔

ہم بتا چکے ہیں کہ ۱۸۵۱ء میں "کوہِ نور" جاری ہوا۔ چند ماہ بعد اس کا ایک حریف میدان میں داخل ہوا۔ اس کا نام "دریائے نور" تھا۔ اسے فقیر سراج الدین کی سرپرستی حاصل تھی اور ادارت پر شہسوار الدین فائز تھے۔ یہ اخبار سرکاری امداد سے محروم تھا۔ نظم و نسق کی خرابیوں پہ لے دے کرتا تھا۔ پولیس والوں کو ان کی بدعنوانیوں پر ٹوکتا تھا۔ عام لوگوں میں مقبول تھا لیکن اشاعت ایک سے کچھ اوپر تھی۔ چونکہ "کوہ نور" کا حریف تھا اس لیے دونوں میں صحافتی جھگڑوں کا سلسلہ بھی جاری ہوا لیکن یہ نوک جھونک زیادہ عرصہ نہ رہی کیونکہ "دریائے نور" کو نقصان اٹھا کر بند ہونا پڑا۔

چند سال بعد ایک اخبار "لاہور گزٹ" جاری ہوا۔ اس نے بھی "کوہ نور" پر یورش کی اور آؤ پر سے اس کے مہتمم کو "علم سے بے بہرہ" قرار دیا گیا۔ اخبار کے ساتھ ایک مطبع بھی تھا جس کے کارکنوں کو چھ سات مہینے تنخواہ نہ ملی تو انھوں نے ہڑتال کر دی۔ یہ ۱۸۵۷ء کا ذکر ہے اور یہ ہڑتال لاہور میں کارکنوں کی پہلی ہڑتال تھی۔

غدر کے دوران "کوہ نور" سنسر ہونے لگا اور سنسر شپ کا سلسلہ اس کے سات آٹھ سال بعد تک رہا اور اس دوران میں جتنے اخبار نکلے سب پر سنسر شپ عائد تھا۔ غدر کے دوران انگریزوں کو احساس ہوا کہ اس بغاوت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ حکومت کی

سرگرمیوں کی مناسب نشر و اشاعت کا بندوبست موجود نہیں تھا چنانچہ غدر کے بعد جب حالات معمول پر آئے تو یکم مئی ۱۸۵۸ء کو حکومت نے "سرکاری اخبار" کے نام سے اپنا اخبار جاری کیا جس کے مدیر پنڈت اجودھیا پرشاد تھے۔ غالباً مولانا محمد حسین آزاد بھی کچھ عرصہ اس سے منسلک رہے۔ آغا محمد باقر نبیرۂ آزاد کی وساطت سے مجھے اس کا ایک شمارہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ ۴ ر فروری ۱۸۶۹ء کا ہے۔ کتابت اور طباعت اعلیٰ درجے کی ہے۔ $\frac{22 \times 18}{4}$ کے سائز کے آٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ لدھیانہ، ریواڑی، بھوانی اور ڈیرہ غازی خان کی خبریں درج ہیں۔ ایک مضمون ہندوستان میں ریلوے کے نظام پر ہے۔ ایک کا عنوان ہے "حیدر آباد دکن میں شفاخانوں کا انتظام" اور ایک مقالہ مولانا محمد حسین آزاد نے غالب کی وفات پر لکھا ہے جس کے آخر میں چار تواریخ وفات درج ہیں۔ صفحہ اوّل پر لکھا ہے:۔

> "یہ اخبار ہفتہ وار بدھ کے دن چھپ کر ناظرین کی خدمت میں بھیجا جاتا ہے۔ خبریں نئی اور معتبر ہوتی ہیں۔ ریاستوں کی خبریں گورنمنٹ سے عنایت ہوتی ہیں۔ مضامین سررشتہ تعلیم کے اعلیٰ افسر تحریر کرتے ہیں قیمت رفاہ عام کی غرض سے دو روپے سال مقرر کی ہے۔"

یاد رہے کہ پہلے اس کا چندہ سالانہ صرف بارہ آنے تھا۔ پھر ایک روپیہ ہوا اور سائز بڑا کرنے پر دو روپیہ کر دیا گیا۔

"سرکاری اخبار" "کوہ نور" کے ہم عصروں میں ممتاز ترین تھا۔ اس کی اہمیت کی وجوہ یہ تھیں کہ اوّل اس کی اشاعت عام اخبارات کے مقابلے پر کہیں زیادہ تھی۔ پہلا شمارہ ۱۶۱۳ (ایک ہزار چھ سو تیرہ) کی تعداد میں چھپا اور اشاعت برابر بڑھتی چلی گئی۔ دوسرے یہ پہلا اخبار تھا جس کی قیمت بے حد کم یعنی ایک پیسہ تھی اور اخراجات پورے کرنے کے لیے حکومت نے مالیے پر ایک فی صدی CESS لگایا تھا۔

"کوہ نور" کا دوسرا اہم ہم عصر اخبار "پنجابی اخبار" تھا۔ یہ بھی اردو میں نکلتا تھا۔ بقول انور قریشی "پنجابی اخبار" ایک سنجیدہ مذاق کی ترجمانی کرتا تھا۔ اس کی پالیسی مذہب اور ذاتیات سے بالا تھی۔ یہ اخبار اپنے نامہ نگاروں کے خطوط کو نمایاں مقام پر چھاپتا تھا۔ اس میں نیم سیاسی مضامین، انگریزی اخبارات کے ترجمے، مقامی اور بیرونی خبریں، تار کی خبریں، موسمی حالات، غرضیکہ سب ہی کچھ ہوتا تھا۔ یہ اخبار منشی محمد عظیم نے جاری کیا جو لاہور کے سب سے پہلے انگریزی اخبار "لاہور کرانیکل" کے بانی تھے۔ وہاں سے بے دخل ہو کر انھوں نے "دی پنجابی" کے نام سے ایک اور انگریزی اخبار نکالا۔ ان کے فرزند سید محمد لطیف مشہور مؤرخ تھے جنھوں نے لاہور اور پنجاب کی تاریخیں مرتب کیں۔

۱۸۶۴ء کا ذکر ہے۔ لاہور میں علوم مشرقی کے مشہور ہمدرد ڈاکٹر لائٹنر (LEITNER) کی صدارت میں "انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب" قائم ہوئی۔ اس میں تمام مذاہب کے لوگ شامل تھے۔ یہی وہ انجمن تھی جس نے پنجاب یونیورسٹی کالج بنایا اور اسی کالج نے چند سال کے اندر اندر پنجاب یونیورسٹی کی صورت اختیار کر لی۔ انجمن کے مقاصد یہ تھے:۔

۱۔ قدیم مشرقی علوم کا احیاء

۲۔ دیسی زبانوں کے وسیلے سے عام علمی ترقی

۳۔ حکومت کو رائے عامہ سے آگاہ کرنے کے لیے علمی ترقی، معاشرتی مسائل اور نظم و نسق کے مسائل پر تبادلۂ خیالات۔

۴۔ پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے ممالک کے درمیان تعلقات استوار کرنا۔

۵۔ ملک کی عام ترقی اور شہری نظم و نسق کی درستی کے لیے کوشاں رہنا۔

۶۔ حاکم و محکوم میں رابطۂ اتحاد و موانست کا ترقی دینا۔

۱۸۶۵ء میں اس انجمن نے ایک ماہنامہ جاری کیا جسے "رسالہ انجمن پنجاب" کا نام دیا گیا۔ اس کی ادارت مولانا محمد حسین آزاد کے سپرد تھی جو اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر تھے۔ یہ رسالہ ۱۸۷۰ء کے آغاز تک جاری رہا۔ اس میں علم و ادب، سائنس، جغرافیہ، معاشیات اور معاشرتی مسائل نیز تاریخی واقعات پر مضامین درج ہوتے تھے۔ چند مضامین کے عنوان یہ ہیں: "اہلِ ہند کو اپنی سود و بہبود میں آپ ہمت کرنی لازمی ہے"، "محصول کتب معاف کیا جائے"، "نہر سویز"، "غبارے"، "بچوں کی تربیت"، "علم ہوا کا"، "قوسِ قزح"، "تہذیبِ اخلاق" وغیرہ۔ اس رسالے میں انجمن کے تمام اجلاسوں کی مفصل رُوداد چھپا کرتی تھی۔ انگریزی اور ہندی میں بھی کبھی کبھار ایک آدھ مضمون دیا جاتا تھا۔ مولانا آزاد کے علاوہ مضمون نگاروں میں پنڈت من پھول، مولوی علمدار حسین، سید ہادی حسین، منشی نوبین چندر رائے، منشی دیوان چند، برکت علی خان اور پنڈت رادھا کشن شامل تھے۔

یکم اپریل ۱۸۷۰ء کو "رسالہ" کی جگہ انجمن پنجاب کے زیرِ اہتمام "ہمارے پنجاب" کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری ہوا۔ مصنف "اختر شہنشاہی" کا یہ بیان غلط ہے کہ پنڈت گوپی ناتھ اس کے مدیر مقرر ہوئے۔ اس کی ادارت حقیقت میں پہلے مولانا محمد حسین آزاد پھر محمد لطیف کے سپرد ہوئی۔ ایک سال بعد "ہمارے پنجاب" بند کر کے اس کی جگہ "اخبار انجمن پنجاب" جاری ہوا۔ معلوم ہوتا ہے اس کے ابتدائی دور میں مولانا آزاد ہی ایڈیٹر تھے۔ "آبِ حیات" کا مواد مضامین کی صورت میں اسی اخبار میں چھپتا رہا۔ نیچرل شاعری کا پہلا مشاعرہ جو مولانا آزاد نے کرایا تھا۔ اس کی رُوداد جون ۱۸۷۴ء کے ضمیمے میں چھپی۔ موضوع "زمستان" تھا اور اس پر شاہ انور حسین ہما، میرزا اشرف بیگ خان اشرف، مولوی علاؤالدین محمد کاشمیری، مولوی الٰہی بخش رفیق، مولوی محمد حسین آزاد، مولوی محمد مقرب علی زائر، مولوی امو جان ولی، مولوی قادر بخش اور مولوی عطاء اللہ نے نظمیں پڑھیں۔ ۲۰ اپریل ۱۸۷۷ء کے شمارے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مناظمہ "صبح کی سیر" پر ہوا اور اگلے مہینے کے لیے "شبِ مہتاب" موضوع قرار پایا۔

"اخبار انجمن پنجاب" اعلیٰ پایے کے علمی مضامین دیتا تھا۔ خبریں بھی چھاپتا تھا۔ غیر ملکی خبریں ملک کے انگریزی اخبارات اور استنبول کے عربی اور فارسی اخبارات سے ترجمہ کی جاتی تھیں۔ ملکی خبروں کے بارے میں اس پرچے میں یہ مختلف بات دیکھی گئی ہے کہ یہ اپنے ہم عصر اُردو اخبارات سے خبریں نقل نہیں کرتا تھا البتہ مضامین حوالے دے کر کبھی کبھی شائع کر دیتا تھا۔ خبروں پر عنوان شاذ ہی دیے جاتے تھے۔ عام دستور یہی تھا کہ جس شہر سے خبر آتی اس شہر کا نام عنوان کے طور پر دے دیا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ اخبار نیم سرکاری تھا اس کے باوجود یہ نظم و نسق پر نکتہ چینی کرتا تھا اور بعض اوقات انگریزی عہدِ حکومت پر بڑے کھلے انداز میں تنقید سے بھی گریز نہیں کرتا تھا۔ اس سلسلے میں ایک اداریے کا اقتباس ملاحظہ ہو جس میں برطانوی حکومت اور اس سے پہلے کے نظامِ حکومت کا موازنہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے:۔

> "...... یہ عہدِ سابق دیسی ارکان کے کام اور انتظام کا یہ نتیجہ تھا کہ سرحدیں مستحکم تھیں، رعایا خوشحال تھی اور صرف تیس کروڑ آمدنی ملک میں تھی۔ دس لاکھ فوج تھی اور اس پر شاہی خزانہ اور کارخانہ معمور رہتے تھے۔ عجب ہے کہ اب ترپن کروڑ میں صرف دو لاکھ ساٹھ ہزار فوج اور سرکار پر باوجود اجرائے نوٹ کے از حد قرض ہے۔
>
> بہ بیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بہ کجا
>
> سالانہ بجٹ خوب بنتا ہے لیکن جب بچت نہیں تو محض لفافہ ہے۔ بارک ماسٹری اور

کسرپٹ اور مہم وغیرہ میں کروڑوں پر پانی پھر جاتا ہے جس کا حال سن کر حیرت ہوتی ہے۔ سرکار ایسی ٹھگ لُٹ ہے کہ پنڈارہ کی لوٹ بھی اس صیغہ نے مات کر دی۔"

(۲۴ نومبر ۱۸۷۶ء)

۱۸۷۸ء میں منشی نثار علی شہرت اس اخبار کی ادارت پر فائز ہوئے۔ موصوف دہلی کے رہنے والے تھے۔ شاعر بھی تھے اور صحافی بھی۔ پہلے "کوہ نور" "پنجاب پنچ" اور "خیر خواہ عالم" (دہلی) میں کام کرتے رہے۔ اس کے علاوہ جے پور، میرٹھ اور ریاست جموں کشمیر میں ملازمت بھی کی۔

جس سال اخبار "انجمن پنجاب" جاری ہوا، اسی سال ۱۸۷۱ء میں "اخبار عام" منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا۔ پہلے ہفت روزہ تھا، پھر ہفتے میں تین بار نکلنے لگا اور صدی کے آخر میں روزانہ ہو گیا۔ اس کے مالک پنڈت مکند رام اور ایڈیٹر پنڈت گوپی ناتھ تھے۔ میں نے اس کا ۱۸۸۳ء کا فائل دیکھا ہے۔ اس زمانے میں یہ سہ روزہ تھا، ماہانہ چندہ صرف چار آنے تھا، تقطیع ۶½ × ۱۰ انچ تھی اور آٹھ صفحوں پر مشتمل تھا۔ ان دنوں اس کی اشاعت دو ہزار سے زائد تھی۔ اس اخبار کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ خبریں اختصار سے دی جاتی تھیں اور بہت بڑی تعداد میں۔ اداریے مختصر ہوتے تھے۔ تحریر کا انداز سادہ، واضح اور کسی قدر شوخ ہوتا تھا۔ غیر اخباری مضامین درج نہیں ہوتے تھے۔ یہی حال غزلیات کا تھا البتہ پولیٹیکل غزلیں اور نظمیں بالالتزام چھاپی جاتی تھیں۔ گویا یہ صحیح معنوں میں "اخبار" تھا۔ اس کا ایک اداریہ ملاحظہ ہو جس میں البرٹ بل کا ذکر کیا گیا ہے جو اس زمانے میں انگریزوں کو اس لیے ناپسند تھا کہ اس کی رو سے انگریز ملزموں کو بھی ہندوستانی عدالتوں میں پیش ہونا تھا:-

> "لارڈ لٹن صاحب ہندوستان کے انگریزوں کے ساتھ اس امر میں متفق الرائے ہیں کہ البرٹ بل پاس ہونے سے ان انگریزوں کو سخت بے عزتی، شرم، مصیبت اور بربادی برداشت کرنی پڑے گی لیکن ہم لوگ ان سے ہاتھ جوڑ کر، ٹوپی اتار کر، اپنے گالوں میں تھپڑ مار کر، اپنا سر پیٹ کر، اپنا گلا پھاڑ کر عرض کرتے ہیں کہ یہ آپ کا سراسر خیالِ خام ہے کیونکہ انگریز لوگ کئی مقامات اور علاقہ جات میں ہندوستانیوں کے ماتحت ہیں، انگریز لوگوں کے کل دیوانی مقدمات ہندوستانی فیصل کرتے ہیں۔ انگریز لوگ برابر ہندوستانی حاکموں کے اجلاس میں کام پڑنے پر ٹوپی اتار کر جاتے ہیں۔ انگریز لوگ کتنے ہی راجہ مہاراجوں کے یہاں نوکر ہیں۔ انگریز کتنے ہی بڑے آدمیوں کے پہرہ دار کوچبان ہیں۔ انگریز لوگ لاکھوں روپے کے ہندوستانیوں کے قرضدار ہیں۔ انگریز لوگ دو دو آنے میں ہندوستانی لوگوں کو تماشے دکھاتے ہیں۔ ان باتوں میں انگریز لوگ بے عزت نہیں ہوتے۔ وہ بے عزتی اب فقط عدالت میں ہندوستانی حاکموں کے جسم میں جا چھپی ہے۔ ہندوستانی کالے جنگلی، دھوکا باز، جاہل سب ہیں اور انگریز گورے، سولائیزڈ، بہتر باہر سے ایک سے، انصاف کے،

ایمان کے، خود خدا کے اوتار سبھی لیکن عدالت تو دونوں کے ماننے لائق ہے...
ہاں اگر انگریز لوگ عدالتوں میں جانے کو ہی بے عزتی سمجھتے ہیں تو ہم انھیں صلاح دیتے
ہیں کہ آج سے کبھی ایسا کام مت کرو جو عدالت میں جانا پڑے۔ ہندوستان میں بھی ایسے
بھلے آدمی بہت سے ہیں جو مر جانے پر بھی عدالت میں جانا منظور نہیں کریں گے۔
کیا ایسی صاف باطنی اور پاکیزہ مزاجی انگریز لوگوں میں نہیں ہو سکتی؟"

(۱۲ / مئی ۱۸۸۳ء)

جدید اُردو صحافت کا آغاز دو اخباروں سے ہوا۔ اوّل "اخبارِ عام" دوم "پیسہ اخبار"۔ مؤخر الذکر کے بانی مولوی محبوب عالم تھے۔ ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوئے اور اپنے گاؤں فیروزوالہ (گوجرانوالہ) میں بیس سال کی عمر میں مطبع خادم التعلیم قائم کیا۔ پہلے "زمیندار" کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا۔ پھر ہفت روزہ اخبار "ہمت" نکالا اور ۱۸۸۷ء میں "پیسہ اخبار" کا آغاز کیا۔ یہ ہر ہفتے آٹھ چھوٹے چھوٹے صفحوں پر نکلتا تھا۔ سالانہ چندہ صرف بارہ آنے تھا البتہ ڈاک خرچ کے لیے تیرہ آنے اس پر مستزاد تھے۔ ابتدائی زندگی افلاس میں گزری۔ اخبار جاری کیا تو خود ہی بیک وقت مدیر، مینجر، کاتب، سنگساز اور کلرک تھے اور ذاتی محنت سے کام کیا کہ چند سال کے اندر اندر وہ لاہور میں اخبارات و رسائل کے ایک عظیم "ذخیرہ" کے مالک بنے۔ ایک پریس قائم کیا جس میں سترہ مشینیں نصب تھیں۔ ایک پبلشنگ ہاؤس بنایا جس سے سات سو کے قریب کتابیں شائع ہوئیں۔ "ذخیرہ" کا سب سے بڑا اخبار "پیسہ اخبار" تھا جو صدی کے آخر میں روزنامہ بنا اور اس کی ہر دلعزیزی اتنی بڑھی کہ وہ اپنے اہم ترین ہم عصر "اخبارِ عام" سے بازی لے گیا اور جب تک "زمیندار" منظرِ عام پر نہ آیا صحافت کی دنیا میں اسی کا چرچا رہا۔ "پیسہ اخبار" کا ایک ہفت روزہ ایڈیشن نکلتا تھا۔ "انتخابِ لاجواب" کے نام سے لطائف و معلومات و اقتباسات پر مشتمل ایک ہفت روزہ جاری تھا۔ عورتوں کے لیے "شریف بی بی"، بچوں کے لیے "بچوں کا اخبار" زمینداروں کے لیے "باغبان" اور طلباء کے لیے "کلیدِ امتحان" نکلتے تھے۔ ۱۹۰۰ء میں مولوی محبوب عالم انگلستان گئے۔ وہاں کے مشہور اخبار "ٹٹ بٹس" (TIT-BITS) کو دیکھ کر یہاں سے "انتخابِ لاجواب" جاری کیا۔

اُردو صحافت کی ترقی میں "پیسہ اخبار" سنگِ میل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ "کوہِ نور" کے بعد یہ پہلا اخبار تھا جہاں مستقبل کے کئی صحافیوں نے اوّلین تربیت حاصل کی یا اس میں نمایاں کام کیا مثلاً لالہ دینا ناتھ جنھوں نے بعد میں "ہندوستان" جاری کیا۔ حکیم غلام نبی جو بعد میں "الحکماء" کے مدیر ہوئے۔ منشی احمد دین جنھوں نے "عجائبِ عالم" جاری کیا۔ منشی محمد الدین فوق جنھوں نے "کشمیری میگزین" نکالا اور بے شمار اچھی کتابیں تصنیف کیں اور مولوی شجاع اللہ جنھوں نے بعد میں "ملت" کی ادارت سنبھالی۔ ان سب سے نمایاں شخصیت میر جالب دہلوی کی تھی جو "پیسہ اخبار" کے مدیر رہے بقول والدِ مرحوم مولانا عبدالمجید سالک "اس زمانے میں پیسہ اخبار کے افتتاحیے نہایت پُرمغز ہوتے تھے کیونکہ میر صاحب کی معلومات اور ان کا بے نظیر حافظہ سطر سطر میں نظر آتا"۔ "پیسہ اخبار" سے نکل کر مرحوم "ہمدرد" اور "ہمدم" میں کام کرتے رہے۔

"پیسہ اخبار" کی دوسری خصوصیت اس کی متانت اور سنجیدگی تھی۔ اس پر سرسید کی صحافت کا پرتو تھا اس لیے تبصروں میں توازن ہمیشہ نمایاں تھا۔ "اخبارِ عام" یوں تو غیر فرقہ دار اخبار تھا لیکن کبھی کبھی ہندوؤں کے حق میں لکھ جاتا تھا۔ اس کے مقابلے پر "پیسہ اخبار"

اسلامی اخبار تھا اور اسلامی حقوق کا علمبردار تھا۔ اُردو صحافت کی پرانی روایت کے برعکس اس پر "اخباریت" غالب تھی اور مضامین اور اداریے ان موضوعات پر لکھے جاتے تھے جن کا لوگوں کی روزمرہ زندگی کے مسائل سے تعلق تھا۔ "پیسہ اخبار" تجارتی اصولوں پر نکالا گیا۔ قیمت کم تھی اور اشتہارات کی فراہمی پر زور دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں بے شمار اور اخبار سسک سسک کر جان بار گئے وہاں یہ اخبار نصف صدی سے زیادہ عرصہ زندہ رہا۔

اور آخری بڑی خصوصیت اس اخبار کی اشاعت تھی۔ ۱۸۹۷ء میں ہفت روزہ "پیسہ اخبار" کی اشاعت گیارہ ہزار تھی اور پانچ چھ ہزار تو ایک عرصے تک رہی۔ روزانہ اخبار کی اشاعت البتہ دو ہزار کے قریب رہی لیکن یہ اعزاز بھی کسی اور روزنامے کو اس صدی کے آغاز تک نصیب نہ ہوا۔ تقریباً بیس سال ہوئے "پیسہ اخبار" کے زخیرہ کا کوئی اخبار باقی نہیں رہا اور آج صرف پیسہ اخبار سٹریٹ مولوی محبوب عالم کے عظیم صحافتی کارنامے کی یاد دلاتی ہے۔

پچھلی صدی میں جو دوسرے اخبار نکلے ان میں ایک "رہبرِ ہند" تھا جس کی ادارت سید نادر علی سیفی کے سپرد تھی۔ یہ اخبار ۱۸۸۵ء میں روزانہ بھی ہوا۔ اسی سال خواجہ احمد حسن نے "روزنامچہ پنجاب" کے نام سے ایک روزانہ اخبار نکالا جو بہت جلد بند ہو گیا۔ ۱۸۸۷ء میں مولوی سیف الحق ادیب نے "شفیقِ ہند" جاری کیا اور دو روزنامے جاری کیے۔ ایک صبح کے وقت نکلتا تھا اس کا نام "نسیمِ صبح" تھا، دوسرا شام کو نکلتا تھا اسے "شامِ وصال" کا نام دیا گیا۔ ۱۸۸۴ء ہی میں مولوی محرم علی چشتی نے "رفیقِ ہند" نکالا جو اعلیٰ پایے کا ہفت روزہ تھا۔ پہلے سرسید احمد خاں کا بڑا حامی تھا، پھر مخالفت پر آیا تو سرسید اور مولوی نذیر احمد پر بڑے رکیک حملے کیے۔ مقدمہ بازی تک نوبت پہنچی اور ۱۹۰۴ء میں بند ہو گیا۔

اس سے پیشتر کہ ہم بیسویں صدی کی صحافت کا ذکر کریں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان رسائل کا ذکر کر دیا جائے جو بیسویں صدی کے آغاز میں نکلے۔ ان میں سرِفہرست "مخزن" تھا۔ یہ اعلیٰ پایے کا ادبی رسالہ شیخ عبدالقادر مرحوم (بعد میں "سر" کا خطاب پایا) نے جاری کیا۔ اس کی ادارت وقتاً فوقتاً مختلف حضرات کے ہاتھ میں رہی لیکن روحِ رواں شیخ صاحب مرحوم ہی تھے۔ "مخزن" حقیقت میں ایک ادبی رسالہ ہی نہیں ایک ادبی تحریک کی حیثیت بھی رکھتا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ انگریزی پڑھے لکھے لوگ بھی اُردو ادب کی ترقی میں حصّہ لیں اور اُردو ادب کو نئے تصورات اور نئے تجربات سے آشنا کریں۔ چنانچہ پہلے ربع صدی میں اُردو کے جتنے ادیب پیدا ہوئے ان کی نگارشات پہلے پہل "مخزن" ہی میں شائع ہوئیں۔ "مخزن" کی تحریک اتنی ہمہ گیر تھی کہ اس مختصر سے مقالے میں اس کا احاطہ کرنا ممکن نظر نہیں آتا۔ اسی دور میں سید ممتاز علی مرحوم (بعد میں شمس العلماء بنے) نے دو اعلیٰ پایے کے ہفت روزہ اخبار جاری کیے۔ ایک عورتوں کے لیے جس کا نام "تہذیبِ النسواں" تھا۔ دوسرا بچوں کے لیے جس کا نام "پھول" تھا۔ ان دونوں کے عملے میں مولانا عبدالمجید سالک، مولانا چراغ حسن حسرت، غلام عباس (جو آج کل "آہنگ" کے مدیر ہیں) پنڈت ہری چند اختر، حفیظ ہوشیارپوری، احمد ندیم قاسمی جیسے حضرات شامل رہے۔ سید ممتاز علی مرحوم کے صاحبزادے جناب سید امتیاز علی تاج بھی ان رسالوں کی ادارت کرتے رہے۔ بیسویں صدی کے نصف اوّل میں جو ادیب پیدا ہوئے۔ ان سب نے ان دو رسالوں میں ضرور مضمون لکھے۔ جنگِ عظیم کے بعد سید امتیاز علی تاج نے "کہکشاں" کے نام سے ایک نہایت اعلیٰ درجے کا ادبی رسالہ نکالا۔ تاج اس کے مدیر تھے اور مولانا سالک ان کی معاونت کرتے تھے۔ اس رسالے میں خواجہ حسن نظامی، سجاد حیدر یلدرم، قاضی عبدالغفار اور برِ عظیم کے تقریباً تمام ممتاز ادیب لکھتے رہے۔ افسوس! دو سال بعد اس رسالے کو بند کرنا پڑا۔

اسی دور میں خان احمد حسین خان کا "شباب اُردو" جاری ہوا۔ اس میں بھی بڑے بڑے ادیب لکھتے تھے لیکن اس کا پایہ اتنا بلند نہیں تھا۔

صدی کے آغاز میں اُردو میں سیاسی صحافت زیادہ نمایاں ہوئی۔ مولوی انشاء اللہ خاں نے ۱۹۰۲ء میں "وطن" جاری کیا ۱۹۰۷ء میں یہ روزنامہ ہوا اور اس کی اشاعت خاصی ہوگئی۔ "زمیندار" کا ریلا آیا تو "وطن" کچھ عرصہ بعد پھر ہفت روزہ بن گیا۔ مولوی انشاء اللہ خان ۱۹۳۰ء میں انتقال کر گئے اور پانچ سال بعد "وطن" بند ہوگیا۔ ۱۹۰۴ء میں لالہ دینا ناتھ اور رام بھج دت نے "ہندوستان" جاری کیا یہ ہفت روزہ آہستہ آہستہ اتنا ہر دلعزیز ہوا کہ اس کی اشاعت دس ہزار تک پہنچ گئی۔ ۱۹۱۵ء میں اس کے زیر اہتمام "دیپک" کے نام سے ایک روزنامہ جاری ہوا جو جلد بند ہوگیا۔ خود "ہندوستان" ۱۹۱۹ء میں ختم ہوگیا۔ لالہ دینا ناتھ نے "ہندوستان" سے الگ ہوکر "دیش" کے نام سے ایک اور اخبار نکال لیا۔ یہ چند سال جاری رہنے کے بعد ۱۹۲۴ء میں بند ہوگیا۔ انہی کی ادارت میں "ہمالہ" بھی کچھ عرصہ نکلتا رہا۔

۱۹۰۳ء میں مولوی سراج الدین احمد خان نے لاہور سے ہفت روزہ "زمیندار" جاری کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ زمینداروں، کسانوں اور کاشتکاروں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کیا جائے۔ کچھ عرصہ بعد یہ اخبار کرم آباد منتقل ہوگیا۔ اس نرم رو اخبار کی زندگی میں پہلا طوفان اس وقت آیا جب نہری نو آبادیوں میں آباد کسانوں پر حکومت نے کچھ پابندیاں لگا دیں اور چودھری شہاب الدین (جو بعد میں ایک عرصے تک پنجاب کونسل اور پنجاب اسمبلی کے اسپیکر رہے) نے "پگڑی سنبھال او جٹا" کے عنوان سے "زمیندار" کے لیے ایک "ہاڑا" لکھا۔ یہ سکھ نو آبادکاروں میں بہت ہر دلعزیز ہوا۔ "سول" اور "پائنیر" نے اس کے تراجم چھاپے۔ اس تحریک میں لالہ لاجپت رائے مانڈلے میں نظر بند کر دیے گئے۔ آخر حکومت جھک گئی۔ پابندیاں اٹھائی گئیں اور "زمیندار" نے اسے اپنی جیت سے تعبیر کیا۔ اس وقت اس کی اشاعت صرف دو ہزار تھی۔ ۱۹۰۹ء میں مولوی سراج الدین احمد کا انتقال ہوا۔ مولانا ظفر علی خان نے اخبار کی ادارت سنبھالی اور اسے لاہور لے آئے۔

اس کے بعد مسلمانانِ ہند کے لیے ابتلا کا ایک دور آیا۔ تقسیم بنگال منسوخ ہوئی۔ مسجد کانپور کی تحریک میں مسلمانوں کا شدید جانی ضیاع ہوا، بیرونِ ملک بھی مسلمانوں کی حالت خراب تھی۔ مغربی طاقتوں نے خلافتِ عثمانیہ کے خلاف ایک نئی مہم جاری کر رکھی تھی۔ اٹلی نے طرابلس کی سرزمین کو شہداء کے خون سے لالہ رنگ کر رکھا تھا۔ جنگِ بلقان میں ترکوں سے کئی علاقے چھن گئے اور پہلی جنگِ عظیم میں جرمن کے ساتھ ترکیہ کے اتحاد نے برِعظیم کے مسلمانوں کو ایک اور بڑی آزمائش میں ڈال دیا۔ اس دوران میں "زمیندار" روزنامہ ہوکر مسلمانوں کے جذبات و احساسات کا ترجمان بن گیا۔ چونکہ اس کا لہجہ تُرش تھا، انداز خطیبانہ تھا، خبروں کی بہم رسانی کا اعلیٰ انتظام موجود تھا اس لیے یہ جلد اپنے معاصرین پر چھا گیا۔ یہاں تک کہ پورے برِعظیم میں یہی اخبار مسلمانوں میں مقبول تھا۔ حکومت نے اس سے کئی ضمانتیں طلب کیں۔ چھاپہ خانے ضبط کیے۔ دورانِ جنگ میں مولانا ظفر علی خان نظر بند ہو گئے اور "زمیندار" بند ہوگیا۔ ۱۹۱۷ء میں مولانا ظفر علی خان نے سر مائیکل اوڈوائر کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کی کہ انھیں پابندیوں سے آزاد کر دیا جائے اور انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ سیاست میں حصہ نہیں لیں گے اور "ستارۂ صبح" کے نام سے ایک غیر سیاسی ہفت روزہ چلائیں گے۔ یہ عرضداشت قبول ہوئی تو "ستارۂ صبح" نکلا اور جنگ کے بعد "زمیندار" کا احیاء ہوا۔ یہ اخبار ۱۹۲۷ء تک نیشنلسٹ اور کانگرسی رہا اور اسے پہلے کا سا عروج نصیب نہ ہوا۔ ۱۹۳ء

سے "زمیندار" مسلم لیگ کی حمایت کرنے لگا اور پاکستان بننے کے بعد اس کی اشاعت کو زبردست عروج حاصل ہوا۔ ختمِ نبوت کی تحریک میں بند ہوا تو اس کے بعد کھوئی ہوئی اشاعت حاصل نہ ہو سکی۔ آج کل اس کی اشاعت اتنی کم ہے کہ یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ "زمیندار" ابھی زندہ ہے۔

"زمیندار" کی اہمیت کے بارے میں چند موٹی موٹی باتیں یہ ہیں :۔

۱۔ "زمیندار" نے اس صدی کے پہلے رُبع میں عوام میں اخبار بینی کا ذوق پیدا کیا اور ان میں سیاسی بیداری پیدا کی۔ یہ سیاسی بیداری کسی واضح نصب العین کے لیے نہیں تھی لیکن اس سے آنے والی سیاسی تحریکوں کو بہت فائدہ ہوا۔

۲۔ "زمیندار" پہلا مسلم روزنامہ تھا جس نے ۱۹۱۳ء میں رائٹر اور دوسری خبر رساں ایجنسیوں کی سروس حاصل کی، اور جنگِ عظیم کے بعد پہلی مرتبہ بڑی تقطیع سے اُردو صحافت کو روشناس کیا۔

۳۔ "زمیندار" نے پہلی مرتبہ مستقل روزانہ مزاحیہ کالم شروع کیا۔ اس کا نام "افکار و حوادث" تھا اور اسے مولانا سالک مرحوم لکھا کرتے تھے۔

۴۔ "زمیندار" میں اُردو کے بڑے بڑے ادیبوں اور اخبار نویسوں نے کام کیا مثلاً نیاز فتح پوری، وحید الدین سلیم پانی پتی، عبداللہ العمادی، عبدالمجید سالکؔ، غلام رسول مہرؔ، مرتضیٰ احمد خاں میکشؔ، چراغ حسن حسرتؔ، نصر اللہ خاں عزیزؔ، خدا بخش اظہرؔ، حاجی لق لق۔

۵۔ "زمیندار" نے آزادیٔ صحافت اور حریتِ خیال کی حفاظت میں عدیم المثال قربانیاں دیں۔ اس کے تقریباً تمام ایڈیٹر گرفتار ہوئے۔ اس نے ایک لاکھ روپیہ سے زیادہ رقم ضمانتوں کی صورت میں حکومت کو ادا کی، چھاپہ خانے ضبط کرائے اور یہ خصوصیت بھی "زمیندار" کو حاصل ہے کہ اس کی ساری ضمانتیں قوم نے چندہ جمع کر کے مہیا کیں۔

۶۔ اُردو صحافت میں سیاسی شاعری نے "زمیندار" میں عروج پایا جس کے واحد سزاوار مولانا ظفر علی خان تھے۔

"زمیندار" سے اُردو صحافت کو جو نقصان پہنچا اس کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔ اس صدی کے آغاز تک اُردو صحافت کا انداز بے حد سنجیدہ تھا اور دلیل اسلوب پر حاوی تھی۔ مولانا ظفر علی خان نے یہ سنجیدگی ختم کر دی، سنسنی خیزی کو فروغ دیا اور حالت یہ ہوئی کہ اُردو اخباروں کے قارئین جہاں سنسنی اور چٹ پٹا پن نہ دیکھتے انھیں مزا ہی نہ آتا۔ چنانچہ عوام کا مزاج ایسا بگڑا کہ اس کے آثار اب بھی موجود ہیں اور غالباً اب انھیں پھر فروغ مل رہا ہے۔ دوسرا نقصان یہ کہ "زمیندار" کی زبان اگرچہ بہت فصیح و بلیغ تھی لیکن وہ عوام کی سمجھ سے باہر تھی اور ایک عرصہ دراز تک ہماری صحافت "مشکل پسند" رہی۔

۱۹۱۹ء میں مولانا سید حبیب نے "سیاست" نکالا۔ یہ ۱۹۴۷ء تک باقاعدہ نکلتا رہا لیکن اس میں جان نہیں تھی۔ نہ مقالے اچھے تھے نہ اداریے اور نہ خبر رساں ایجنسیوں کی سروس کا اہتمام تھا۔ بہر حال مولانا سید حبیب مسلمانوں کی سیاسی تحریکوں میں حصہ لیتے رہے اور "سیاست" کے آخری دور میں سر سکندر حیات سے جنگ مول لینے میں انھوں نے خاصی جرأت سے کام لیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس جنگ میں کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد ہندوؤں کے بڑے بڑے اخبار نکلے۔ سب سے نمایاں "پرتاب" تھا جسے مہاشے کرشن نے جاری کیا۔ یہ اخبار آج کل دہلی اور حیدرآباد دکن سے نکلتا ہے اور اب بھی مہاشے کرشن ہی اسے ایڈٹ کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کے فرزندان کی

مدد کر رہے ہیں۔ مہاشے کرشن سلجھے ہوئے دماغ کے صحافی ہیں۔ ان کے اداریوں میں بڑی جان ہوتی ہے اور ان کا انداز بیان ہمیشہ سے مدلل رہا ہے۔ پنجاب کا سب سے بڑا ہندو اخبار "ملاپ" تھا (یہ بھی دہلی اور حیدرآباد دکن سے نکل رہا ہے) اس کے مدیر مہاشہ خوشحال چند خورسند تھے جو اب سنیاس اختیار کر چکے ہیں اور ملاپ کی ادارت ان کے فرزند مہاشہ رنبیر کے سپرد ہے۔ مہاشہ خورسند بھی اچھے اخبار نویس تھے لیکن مہاشے کرشن کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ یہ دونوں اخبار آریہ سماجیوں کے تھے۔ ان کے مقابلے پر سناتن دھرمی ہندوؤں نے گوسوامی گنیش دت کی رہنمائی میں "ویر بھارت" جاری کیا۔ ۱۹۲۰ء میں لالہ لاجپت رائے نے ایک مشترکہ سرمایے کی کمپنی قائم کر کے "بندے ماترم" جاری کیا۔ پہلے اس کی اشاعت خاصی تھی لیکن آہستہ آہستہ کم ہونے لگی۔ یہ اخبار دو تین بار بند ہو کر دوبارہ نکلا۔ اس کے مدیروں میں پنڈت میلا رام وفا بھی شامل رہے۔ لالہ شام لال کپور نے ۱۹۲۱ء میں روزنامہ "کیسری" جاری کیا۔ اسے بھی دو ایک بار بند ہو کر دوبارہ نکلنا پڑا اور پھر ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ تقسیم سے چند سال پہلے لالہ نانک چند ناز نے "پربھات" جاری کیا۔ بھائی پرمانند نے "ہندو" نکالا۔ سکھوں نے "اجیت" جاری کیا جس کی ادارت سادھو سنگھ ہمدرد کے ہاتھ میں تھی اور جاٹوں نے "رہبر ہند" نکالا۔

۱۹۲۷ء میں مولانا عبدالمجید سالک اور مولانا غلام رسول مہر نے "زمیندار" سے الگ ہو کر "انقلاب" جاری کیا۔ اول الذکر اپنے مزاحیہ کالم "افکار و حوادث" کے لیے اور موخر الذکر اپنے پُرمغز اداریوں کے لیے مشہور تھے۔ ان دونوں نے چالیس دوستوں سے ایک ایک سو روپیہ قرض حسنہ یا "چندہ خریداری برائے زندگی" کے طور پر لے کر چار ہزار روپے کے سرمایے سے اخبار نکالا اور یہ اتنا کامیاب رہا کہ ۱۹۴۹ء تک جاری رہا۔ فنی لحاظ سے یہ اعلیٰ پایے کا اخبار تھا۔ خبروں کی بہم رسانی اور ترتیب، حالاتِ حاضرہ پر اچھے مقالوں کی اشاعت، ٹھوس اداریوں اور مزاحیہ کالم کی اشاعت ـــ اس کی نمایاں خصوصیات تھیں لیکن "انقلاب" کی سب سے بڑی اہمیت یہ تھی کہ یہ اخبار سنجیدہ اور مدلل صحافت کا علمبردار تھا۔ اس کی اشاعت محدود تھی۔ زیادہ سے زیادہ سات ہزار اور کم از کم تین ہزار رہی لیکن اس کا حلقۂ اشاعت مؤثر تھا اور اسے تعلیم یافتہ اور علم دوست طبقے میں قدر کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ یہ اخبار اس دور میں معرضِ وجود میں آیا جب مسلمان حقوق کی جنگ لڑ رہے تھے۔ ایسے میں مدلل اور ٹھوس قسم کی صحافت درکار تھی اور "انقلاب" نے یہ ضرورت بوجہ احسن پوری کی۔ وہ علیحدگی کی سیاست کا ترجمان تھا۔ سائمن کمیشن کی آمد پر اس نے اسلامی سیاست کا زاویۂ نگاہ پیش کیا۔ جب کانگرس نے ہندوستان کے آئندہ آئین کے بارے نہرو رپورٹ منظور کی اور حکومت کو چیلنج دیا کہ وہ اسے قبول کر لے، ورنہ سول نافرمانی ہوگی تو "انقلاب" نے نہرو رپورٹ کو مسلمانوں کے مفاد کے منافی قرار دیا اور مسلمان عوام کو کانگرس کے طلسم سے بچایا اور مسلمان من حیث القوم کانگرس سے الگ رہے۔ "انقلاب" نے مسٹر محمد علی جناح اور سر محمد شفیع کی متوازی مسلم لیگوں کو متحد ہونے میں مدد دی۔ گول میز کانفرنس کے موقع پر "انقلاب" نے پھر اسلامی نقطۂ نگاہ کی مدلل ترجمانی کی۔ جب سر شفیع نے بعض شرائط پر مخلوط انتخاب قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی تو ان کی شدید مخالفت کی۔ "انقلاب" نے کمیونل ایوارڈ کو غیر تسلی بخش لیکن اس زمانے کے حالات کے پیشِ نظر قابلِ قبول قرار دیا۔ صوبائی خود مختاری کے آغاز پر "انقلاب" کی پالیسی یہ تھی کہ صوبائی اسمبلی میں مسلمانوں کی غالب اکثریت کو یکجا رکھ مشترکہ مفاد کے لیے ان ہندو عناصر سے تعاون کیا جائے جو کاشتکاروں کی بہتری کے لیے کام پر آمادہ ہوں چنانچہ اس نے اتحاد پارٹی کی حمایت کی۔ آل انڈیا سطح پر وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے موقف کی بڑے زور و شور سے تائید کرتا رہا۔ ۱۹۲۸ء میں "انقلاب" نے "ہندی مسلمانوں کے لیے الگ وطن" کے عنوان سے مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش کے چار مقالے چھاپے اور ۱۹۲۷ء سے اس اخبار

میں پاکستان کے حق میں مضامین کا تانتا بندھ گیا۔ جب آل انڈیا مسلم لیگ نے وزارتی مشن کی تجاویز قبول کر لیں تو "انقلاب" نے اسے قراردادِ لاہور اور اسلامی مفاد کے منافی قرار دیا اور اس وقت تک چین نہ لیا، جب تک مسلم لیگ نے یہ تجاویز مسترد کر کے حسبِ سابق قراردادِ پاکستان پر زور دینا شروع کیا۔ یہ اخبار مسلم لیگ کی صوبائی قیادت کا مخالف تھا اس لیے تقسیم سے کچھ عرصہ پہلے اس کی ہر دلعزیزی میں نمایاں فرق آ گیا۔

"انقلاب" کے اجراء کے بعد کئی اور مسلمان اخبار جاری ہوئے مثلاً آزاد، جمہور، پاسبان اور تریاق۔ لیکن سب بند ہو گئے صرف "احسان" باقی رہا جسے ملک نور الٰہی صاحب نے صوبائی خود مختاری کے آغاز سے قبل جاری کیا۔ اس کے مدیر مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش تھے۔ آپ اس سے پہلے "زمیندار" اور "انقلاب" میں کام کر چکے تھے بلکہ فارسی زبان کے ایک ہفت روزہ "افغانستان" کی ادارت بھی کرتے رہے تھے۔ آپ ایک مشاق اخبار نویس اور اچھے افتتاحیہ نگار تھے۔ ان کے نائب مولانا چراغ حسن حسرت تھے۔ انھوں نے اپنی صحافت کا آغاز کلکتہ کے اخبار "آفتاب" سے کیا جس میں وہ "نئی دنیا" کے نام سے ایک مزاحیہ کالم لکھتے تھے اور قلمی نام "کولمبس" تھا۔ وہاں سے لاہور آئے اور "زمیندار" میں "فکاہات" لکھتے رہے۔ "احسان" میں آئے تو "مطائبات" ان کے سپرد ہوئے اور انھوں نے خوب نام پیدا کیا۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ مزاحیہ کالم نویسی میں سالک و حسرت نے جو کمال پیدا کیا وہ کسی اور کے حصے میں نہ آیا۔ میکش و حسرت کے علاوہ اس اخبار میں باری علیگ کام کرتے تھے جو "انقلابِ فرانس" اور "کمپنی کی حکومت" کی وجہ سے نوجوان طبقے میں مقبول تھے۔ مولانا انعام اللہ خان ناصر اور اشرف عطا بھی اسی اخبار میں کام کرتے رہے۔ "احسان" بھی سوائے چند مستثنیات کے علیحدگی کی تحریک کا حامی رہا۔ اتحاد پارٹی سے اس نے بھی تعاون کیا لیکن آخری سالوں میں مسلم لیگ سے مکمل طور پر وابستہ ہو گیا۔ یہ اخبار بھی فنی لحاظ سے اعلیٰ پایے کا تھا۔

اس کے بعد میکش، حسرت اور باری "احسان" سے الگ ہو گئے اور روزنامہ "شہباز" نکال لیا۔ یہ ایک جاندار، پُررونق اور اچھا اخبار تھا اور اس کی پالیسی "انقلاب" اور "احسان" سے ملتی جلتی تھی۔ جب پرچے کی مالی حالت سقیم ہوئی تو یونینسٹ پارٹی کے ایک لیڈر سید امجد علی شاہ (فرزند سر سید مراتب علی شاہ) نے اسے خرید لیا۔ سردار شوکت حیات کی وزارت سے اختلاف رائے کی وجہ سے حسرت، میکش اور باری نے اسے چھوڑ دیا اور مولانا وقار انبالوی ایڈیٹر بن گئے۔ وقار انبالوی پہلے "احسان" میں اور اس سے پہلے بعض ہندو اخبارات میں کام کرتے رہے تھے۔ موصوف بڑے چابکدست اخبار نویس رہے ہیں اور جہاں گئے ہیں اپنا رنگ خوب جمایا ہے۔

اس کے بعد "نوائے وقت" آتا ہے۔ اسے جناب حمید نظامی نے ۲۳ مارچ ۴۰ء کو ایک چھوٹے سے پندرہ روزہ اخبار کی حیثیت سے نکالا اور ۴۴ء میں مکمل روزنامہ بنا دیا۔ جناب حمید نظامی انگریزی کے ایم۔ اے ہیں۔ پہلے ایک سیاسی رسالے "ساربان" کے مدیر معاون تھے۔ ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا میں رپورٹنگ سیکھی۔ مسلمانوں کی خبر رساں ایجنسی اورینٹ پریس آف انڈیا کے مینجر رہے۔ تحریر و تقریر دونوں میں نمایاں تھے، آج کل صرف تحریر میں نمایاں ہیں۔ تحریر کا آغاز مزاح نویسی سے کیا۔ لیکن اب مزاح نویسی بہت کم کرتے ہیں اور اداریہ نویسی میں کمال حاصل کر چکے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آج پاکستان بھر کی اُردو صحافت میں بہترین اداریہ نویس وہی ہیں۔ "نوائے وقت" کی پالیسی شروع سے مسلم لیگ اور پاکستان کے حق میں رہی ہے لیکن اس

اخبار کا مزید ذکر ہم تقسیم کے بعد اُردو صحافت کے پیرایے میں بیان کریں گے۔

تقسیم سے پہلے اُردو صحافت دو قسموں میں تقسیم کی جا سکتی ہے یعنی خبر صحافت اور سنجیدہ صحافت یعنی خبر صحافت کی نمائندگی تمام ہندو اخبار (سوائے بھائی پرمانند کے اخبار "ہندو" کے) اور "زمیندار" کرتے تھے۔ "زمیندار" کی اشاعت تو خاص نہ بڑھی لیکن ہندو اخباروں کی اشاعتیں بہت زیادہ تھیں یعنی یہی دس اور پندرہ ہزار کے درمیان۔ ان اخباروں کی زبان سادہ تھی عوام کو چٹپٹی اور مسالے دار اور ہر قسم کی جھوٹی سچی خبریں مہیا کرتے تھے۔ نظموں کا معیار پست تھا لیکن وہ عوام پسند ضرور تھیں۔ مزاحیہ کالم بعض اچھے بھی ہوتے تھے لیکن ان میں بھی صرف ایک ہی بات کا خیال رکھا جاتا تھا کہ عام لوگ انھیں پسند کریں۔ چنانچہ اگرچہ یہ سب اخبار مسلمانوں کو بُرا بھلا کہتے تھے، مسلمان لیڈروں کو گالیاں دیتے تھے لیکن اس کے باوجود بہت سے مسلمان انھیں خریدتے تھے سنجیدہ اور مدلل صحافت کی نمائندگی "انقلاب"، "احسان"، "شہباز" (دورِ اول میں) اور "نوائے وقت" کرتے تھے۔ "نوائے وقت" کی اشاعت آخری سالوں میں کافی بڑھ گئی لیکن سنجیدگی کی وجہ سے نہیں بلکہ مسلم لیگ کی ہر دلعزیزی کی وجہ سے۔ ہندو اخباروں کے پاس سرمایہ زیادہ تھا اس لیے وہ خبر رسانی کے زیادہ ذرائع حاصل کر سکتے تھے نیز سنڈے ایڈیشنوں پر زیادہ روپیہ صرف کر سکتے تھے مسلمان اخبار سرمایے سے محروم تھے اس لیے ان کے سنڈے ایڈیشن اُتنے دلچسپ نہیں ہوتے تھے۔

تقسیم سے پہلے اُردو کی ہفت روزہ صحافت نہ ہونے کے برابر تھی البتہ "شیرازہ" اس کلیے سے مستثنیٰ تھا۔ یہ مزاحیہ ہفت روزہ مولانا چراغ حسن حسرت نے نکالا اور اس میں ملک کے تمام نامور مزاح نگار لکھتے تھے۔ مولانا سالک ایک عرصے تک اس میں "حوادث و افکار" لکھتے رہے۔ غیر مزاحیہ ہفت روزہ جرائد میں "خیام" نمایاں تھا جسے شبلی بی کام مرتب کرتے تھے۔

اُردو رسائل کی دنیا خوب پُر رونق رہی۔ جنگِ عظیم کے بعد "نیرنگِ خیال" اور "عالمگیر" کا ایک عرصے تک غلغلہ رہا۔ ان دونوں رسائل میں ملک کے مشہور ادیب اپنی نگارشات بھیجتے تھے۔ ان دونوں کے سالنامے اور عید نمبر اور دوسرے خاص نمبر بہت شاندار ہوتے تھے اور ان میں ملک بھر کے ادیبوں کی تازہ ترین تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ ان میں تصاویر بھی ہوتی تھیں۔ عام طور پر استاد اللہ بخش اور عبدالرحمٰن چغتائی کے شاہکار اِنھی رسالوں میں آتے تھے۔ "نیرنگِ خیال" کے مدیر حکیم یوسف حسن تھے مگر ہیں۔ کیونکہ یہ رسالہ ابھی تک جاری ہے اور "عالمگیر" کے حافظ محمد عالم۔

"نیرنگِ خیال" اور "عالمگیر" کے بعد "ہمایوں" اور "ادبی دنیا" نمایاں ہوتے۔ "ہمایوں" کے مدیر میاں بشیر احمد بی اے آکسن کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ یہ نہایت ہی شائستہ قسم کا ادبی رسالہ تھا جس کے ادارہ تحریر سے مولانا حامد علی خاں، حفیظ ہوشیارپوری اور ابتدا میں مولانا تاجور نجیب آبادی منسلک رہے تھے۔ اس رسالے میں ایک عکسی تصویر ہوتی تھی "جہاں نما" کے زیرِ عنوان مہینے بھر کی خبروں کا اختصار دیا جاتا تھا۔ حالاتِ حاضرہ پر چند شذرے دیے جاتے تھے۔ چند افسانے، چند علمی مضامین، غزلیں اور نظمیں اور تراجم اور کتابوں پر تبصرے۔ یہ رسالہ چند سال ہوئے بند ہو گیا۔ "ادبی دنیا" مولانا تاجور نجیب آبادی نے جہانگیر سائز پر نکالا۔ اس کے بعد اسے منصور احمد مرحوم اور مولانا صلاح الدین احمد نے خرید لیا۔ یہ رسالہ نہایت خوبصورت تھا۔ اس میں بھی ہر مہینے ایک اعلیٰ درجے کی عکسی تصویر دی جاتی تھی۔ حالاتِ حاضرہ پر مقالے درج ہوتے تھے۔ آخر میں ہم عصر رسائل سے اقتباس دیے جاتے تھے اور ان کے علاوہ وہ سب کچھ ہوتا تھا جو ایک ادبی رسالے کے لیے ضروری ہے یعنی

عالمی جنگ نے اس کی صورت بگاڑ کر رکھ دی۔ اگرچہ مواد کا معیار بدستور بلند رہا اور پاکستان بننے کے بعد اب یہ رسالہ سہ ماہی ہو گیا ہے اور حسنِ ادارت، اور مواد کی پاکیزگی اور بلند معیاری پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ مولانا صلاح الدین احمد کا ذوق بدستور جوان ہے۔

جب ترقی پسند ادب کی تحریک شروع ہوئی تو "ادبِ لطیف" اور "سویرا" نمایاں ہوئے۔ ان دونوں رسالوں میں ملک بھر کے ترقی پسند ادیب لکھتے رہے اور اب بھی لکھتے ہیں۔ تکنیکی اعتبار سے "سویرا" نے ایک نیا راستہ پیدا کیا۔ "ادبِ لطیف" کی ادارت پہلے جناب احمد ندیم قاسمی کرتے تھے، آج کل میرزا ادیب ایڈیٹر ہیں۔ ان دونوں رسائل نے نئے انداز کی افسانہ نگاری شاعری اور تنقید کو فروغ دینے میں بڑی مدد دی ہے۔

تقسیم کے بعد اُردو صحافت

جب پاکستان بنا تو لاہور کے تمام غیر مسلم اخبار یہاں سے نقل مکانی کر گئے اور یہاں صرف چار اُردو اخبار رہ گئے۔ "زمیندار"، "انقلاب"، "احسان" اور "نوائے وقت" ان میں "زمیندار" سب سے کثیر الاشاعت تھا اور اس کی یہ حیثیت ۱۹۵۳ء تک رہی۔ "نوائے وقت" اشاعت میں اس کے بعد تھا لیکن یہ بڑا صاحبِ اقتدار اور با اثر اخبار تھا۔ "احسان" کی اشاعت درمیانہ درجے کی تھی لیکن اپنی غیر ہر دلعزیز پالیسی کی وجہ سے ایسا گرا کہ پھر نہ سنبھلا اور اب محض "ڈمی" کے طور پر جاری ہے۔ "انقلاب" کی اشاعت ڈھائی تین ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ اس نے "اپوزیشن" کی صورت اختیار کی لیکن حالات نامساعد تھے، حکومت مغربی پنجاب نے اس کے اشتہار بند کر دیے بلکہ کاغذ کا کوٹا دینا بھی بند کر دیا۔ حکومت سرحد نے قیوم وزارت پر نکتہ چینی کی وجہ سے سرحد میں اس کا داخلہ بند کر دیا۔ اُدھر ہندوستان نے بھی اس کا داخلہ ممنوع کر دیا۔ ایک طرف یہ مصائب تھے۔ دوسری طرف سرمایے کی کمی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نومبر ۱۹۴۹ء میں یہ بند ہو گیا اور اُردو صحافت کے قارئین سالک کے افکار و حوادث اور مہر کے اداریوں سے محروم ہو گئے۔

پاکستان بنتے ہی لاہور میں ضمیموں کی وبا شروع ہوئی۔ جس کے پاس پچاس ساٹھ روپے کا اثاثہ ہوتا تھا، وہ ایک ضمیمہ نکال لیتا تھا جس میں چند چھوٹی سچی سنسنی خیز خبریں، دو ایک سستے سے اشتہار اور ایک آدھ لچر سا افتتاحیہ ہوتا اور بس۔ مہاجر آ رہے تھے اور ان کی دلخراش داستانیں سننے کو ہر شخص کا جی چاہتا تھا اور ان ضمیموں نے جھوٹی سچی داستانیں چھاپیں اور اشاعتیں بڑھائیں لیکن ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی بے شمار ضمیمے نکل آئے اور مقابلہ اتنا سخت ہوا کہ تقریباً سب ختم ہو گئے۔

کئی نئے اخبار وجود میں آئے مثلاً "آغاز" جسے ملک احسان الٰہی نے شروع کیا۔ "طاقت" جس کے مالک علی محمد برق تھے۔ وقار انبالوی نے "سفینہ" جاری کیا۔ شہید حسین سہروردی نے بڑی سج دھج سے "مغربی پاکستان" نکالا۔ احرار کے اخبار "آزاد" کا احیاء ہوا۔ جماعتِ اسلامی کی طرف سے "قاصد" اور "تسنیم" نکلے جن کی ادارت مولانا نصر اللہ خان عزیز کرتے تھے۔ موصوف پہلے "مدینہ" (بجنور) کے مدیر تھے، یہاں آکر پہلے "زمزم" جاری کیا اور اس کے بعد "قاصد" و "تسنیم" ——— "نوائے پاکستان" کو مولانا مرتضیٰ احمد خان ایڈٹ کرنے لگے۔ روزنامہ "خاتون" برِ اعظم میں عورتوں کا واحد روزنامہ تھا جس کی ادارت مشہور قومی کارکن فاطمہ بیگم (منشی فاضل) کرتی تھیں۔

لاہور کے گنے چنے اور اہم اخبارات میں "امروز" کا نام سرِ فہرست ہے۔ یہ اخبار پروگریسیو پیپرز لمیٹڈ نے مولانا چراغ حسن حسرت کی ادارت میں نکالا۔ محمد سرور (جامعی) اور ایوب کرمانی ان کے معاون تھے۔ ان تین حضرات کے علاوہ "امروز" کے تمام

کارکن صحافی تعلیم یافتہ نوجوان لیکن نومشق صحافی تھے۔ انھیں حسرت کی تربیت میسر آئی اور حسرت جدید انداز صحافت کے علمبردار تھے۔ چنانچہ یہ اخبار ظاہری گیٹ اپ کے لحاظ سے ایک واقعی نیا اور مختلف اخبار معلوم ہوتا تھا۔ ایک عرصے تک "امروز" کی اشاعت محدود رہی۔ "پاکستان ٹائمز" کی اشاعتی تشہیری کی مدد کے باوجود اس کی اشاعت بڑھنے نہ پائی۔ غالباً چھ ہزار ہی رہی۔ اس کے بعد حسرت صاحب نے استعفیٰ دیا۔ مرزا حبیب پہلے نکل چکے تھے اور جناب احمد ندیم قاسمی ایڈیٹر بن گئے۔ اتنے میں ختم نبوت کی تحریک کے رہنماؤں کی تصاویر چھاپ کر "زمیندار" کی اشاعت خود حاصل کر لی۔ یہیں سے اس کی وسیع اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ جب پروگریسیو پیپرز پر حکومت نے قبضہ کر لیا تو احمد ندیم قاسمی مستعفی ہو گئے اور مدیر معاون جناب ظہیر بابر اس کے مدیر بن گئے۔

"آفاق" بھی اس دور کا ایک اچھا روزنامہ تھا۔ اس کے مدیر محمد سرور تھے اور عملے میں اچھے اچھے کارکن صحافی موجود تھے۔ جن دنوں "آفاق" نکلا، "نوائے وقت" دولتانہ وزارت سے برسرپیکار اور اس کے زیر عتاب تھا۔ "نوائے وقت" سے ضمانت طلب ہوئی۔ ایک تکنیکی غلطی کی بنا پر دولتانہ وزارت نے اس کا ڈیکلریشن منسوخ کر دیا اور ایک بڑی زیادتی یہ کی کہ "نوائے وقت" کا ڈیکلریشن کسی اور صاحب کو دے دیا۔ یہ ایک ایسی زیادتی تھی جس کی مثال تاریخ صحافت میں نہیں ملتی۔ "نوائے وقت" نے "جہاد" کے نام سے ایک اور اخبار نکال لیا۔ اس پر چھاپہ خانہ والوں پر دباؤ ڈالا گیا اور انھوں نے چھاپنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد نوائے وقت پبلی کیشنز نے "نوائے پاکستان" کا ڈیکلریشن استعمال کیا۔ آخر حکومت کو عقل آئی اور "نوائے وقت" کا ڈیکلریشن لوٹا دیا گیا۔ "نوائے وقت" کی یہ طویل ابتلا "آفاق" کے آڑے آئی۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا چنانچہ "آفاق" کی اشاعت بڑھ گئی لیکن جب "نوائے وقت" دوبارہ نکل آیا تو اس نے اپنی کھوئی ہوئی اشاعت دوبارہ حاصل کر لی اور "آفاق" کی اشاعت مختصر ہو کر رہ گئی۔ سرور صاحب یہاں سے نکل گئے اور "آفاق" کی شہرت کو اس بات سے سخت نقصان پہنچا کہ دولتانہ وزارت نے ختم نبوت کی تحریک کے دوران اس کی ضرورت سے زیادہ سرپرستی کی اور آخر اس مرتے ہوئے اخبار کو مشہور صنعت کار سعید سہگل نے سہارا دیا۔ میر نور احمد مینجنگ ایڈیٹر اور مولانا غلام رسول مہر ایڈیٹر مقرر ہوئے لیکن مولانا مہر کو اس کی فضا راس نہ آئی اس لیے وہ الگ ہو گئے۔ بہرحال اس پرچے کی اشاعت محدود رہی۔ آخر سعید سہگل اس سے اتنا تنگ آ گئے کہ انھوں نے یہ پرچہ کارکن صحافیوں کی خدمت میں تحفے کے طور پر پیش کر دیا۔ انھوں نے کمپنی بنائی۔ پھر میر نور احمد صاحب نے اپنے حصے بیچ دیے اور حصہ داروں میں جھگڑوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ پرچہ ہی بند ہو گیا۔ بہرحال چند روز تک اس کا اجرا ہونے والا ہے۔

جن دنوں "سول اینڈ ملٹری گزٹ" خواجہ نذیر احمد صاحب کی ملکیت تھا۔ اس کے اہتمام میں "ملت" کے نام سے ایک اور روزنامہ جاری ہوا۔ جس طرح "امروز" نے اردو صحافت کی تکنیک میں بعض خوبیاں پیدا کیں، اسی طرح "ملت" نے بھی تکنیکی پہلو سے اردو صحافت کو آگے بڑھایا۔ یہ اخبار کافی عرصہ قسمت علمی و ادبی کو "آف سیٹ" پر چھاپتا رہا۔ نیز اردو اخبارات میں اس لحاظ سے اولیت حاصل ہو گئی کہ اس نے اخباری تصاویر کو مستقل فیچر بنا دیا۔ بہرحال یہ اخبار بھی نہ چل سکا اور اسے بند کرنا پڑا۔

پچھلے چند سال میں لاہور کی اردو صحافت میں نمایاں ترین اضافہ "کوہستان" کا ہوا۔ یہ اخبار پہلے راولپنڈی سے جاری ہوا۔ اس کے مدیر اعلیٰ مشہور ناول نگار جناب نسیم حجازی ہیں۔ موصوف پہلے "تعمیر" (راولپنڈی) کے مدیر تھے، وہاں سے الگ ہوتے تو "کوہستان" نکال لیا اور پھر "کوہستان" کا لاہور ایڈیشن شروع کیا جس نے تھوڑے ہی عرصے میں لاہور کی صحافت کا رنگ ہی بدل ڈالا۔ اس کے آنے سے پہلے لاہور میں "نوائے وقت" اور "امروز" کثیر الاشاعت اخبار تھے اور دونوں اپنی اشاعت ایک دوسرے سے زیادہ بتاتے تھے بہرحال

دونوں نہایت متین اور سنجیدہ اخبار تھے اور دونوں میں سے کسی نے اشاعت بڑھانے کے مقابلے میں سنسنی خیزی کو اختیار نہ کیا۔ "کوہستان" نے ایک طرف اسلامی اقدار سے وابستگی اختیار کی اور اتوار کی قسمتِ علمی و ادبی کے علاوہ ایک "اشاعتِ ملّی" کا اضافہ کیا۔ دوسری طرف جرائم کی خبروں کو بڑھا چڑھا کر دینا شروع کیا۔ اس لیے اس کی اشاعت بڑھنے لگی۔ پہلے تو "نوائے وقت" اور "امروز" نے اس مقابلے کو سنجیدہ مقابلہ نہ سمجھا لیکن جب "کوہستان" نے آٹھ صفحے کر دیے تو اس سے ان دونوں اخباروں کی اشاعت پر اثر پڑا۔ چنانچہ "امروز" نے باوجود بڑی تقطیع کے آٹھ صفحے کر دیے۔ اُدھر "نوائے وقت" نے بھی ایسا ہی کیا۔ پھر کوہستان نے پہلے دو اور پھر چار صفحے ویب ڈاٹک سسٹم پر چھاپنے شروع کیے جس میں ایک تو چھپائی زیادہ خوبصورت اور صاف ہوتی ہے' دوسرے تصاویر کے لیے ڈبل پرنٹنگ (دوسری چھپائی) کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس پر "امروز" نے دو صفحے "آف سیٹ" پر چھاپنے شروع کر دیے۔ اس طریق طباعت میں اور بھی زیادہ حُسن ہوتا ہے نیز کھیلوں اور تجارت کے لیے انگریزی اخباروں کی طرح الگ صفحے مخصوص کر دیے اور ہفتہ وار اشاعت میں دو صفحے تصاویر کے دینے شروع کر دیے۔ "نوائے وقت" کو اگرچہ اپنے مستقل گاہکوں کی پائیدار وابستگی پر پورا بھروسہ تھا لیکن اسے مقابلے میں پیچھے رہنا منظور نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے ہفتے میں دو مرتبہ خاص اشاعتیں چھاپنی شروع کیں اور ان میں "آف سیٹ" کا طریق طباعت اختیار کیا اور تصاویر بھی چھاپنی شروع کر دیں اگرچہ انھیں اخباری تصاویر نہیں کہا جا سکتا۔ اخباری تصاویر میں اصل مقابلہ "کوہستان" اور "امروز" ہی کے درمیان ہے۔ اب "کوہستان" نے ایک اور قدم آگے (یا پیچھے) بڑھایا۔ اس نے جرائم کی خبریں زیادہ تفصیل سے اور زیادہ چٹپٹے انداز میں دینی شروع کر دیں اور ملزموں مجرموں' تھانیداروں' وکیلوں اور عدالت کے اہلکاروں تک کی تصاویر چھاپنے لگا۔ یہاں "امروز" پیچھے رہ گیا کیونکہ وہ اس مزاج کا اخبار نہیں ہے اور "نوائے وقت" تو شاید کبھی ایسی حرکت نہ کرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ "کوہستان" اشاعت کی دوڑ میں بازی لے گیا۔ بہرحال اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ باقی دونوں سے بہتر اخبار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لاہور کے اُردو اخباروں میں اسی قسم کا مقابلہ شروع ہے جو اس صدی کے پہلے رُبع میں لندن کے قومی اخباروں میں ہوا تھا۔ وہاں نتیجہ یہ نکلا تھا کہ اخبارات دو حصوں میں بٹ گئے۔ "پُر وقار" اخبار اور "ہردلعزیز" اخبار۔ "پُر وقار" اخباروں کی اشاعتیں محدود رہیں کیونکہ ان کا معیار اعلیٰ ہے' وہ سنجیدگی پسند کرتے ہیں اور انھیں تعلیم یافتہ اور ہوشمند اور ذہین طبقہ پڑھتا ہے اور ظاہر ہے ایسے طبقے کی تعداد کم ہوتی ہے۔ بہرحال ان کی قوتِ خرید زیادہ ہوتی ہے اس لیے اشتہاروں کے معاملے میں یہ اخبار گھاٹے میں نہیں رہتے۔ ان کے مقابلے پر "ہردلعزیز" اخبار ہیں۔ ان کا معیار عام پسند ہوتا ہے' انھیں سنجیدگی سے کوئی خاص واسطہ نہیں ہوتا اور یہ خبریں ایسی پیش کرتے ہیں جنھیں پڑھ کر نیم تعلیم یافتہ لوگ مزا لیتے ہیں۔ بین الاقوامی خبریں "پاپولر" انداز میں اور اختصار سے دیتے ہیں۔ گویا نیم تعلیم یافتہ لوگوں کی ضرورت کے مطابق۔ ان اخباروں کی اشاعتیں بے انتہا ہیں یعنی تیس لاکھ اور پچاس لاکھ کے درمیان۔ ان کے قارئین کی قوتِ خرید کم ہوتی ہے لیکن چونکہ اشاعتیں زیادہ ہوتی ہیں اس لیے انھیں بھی اشتہاروں سے بہت آمدنی ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں یہ تقسیم اتنی واضح نہیں کیونکہ نہ "کوہستان" مکمل طور پر "ہردلعزیز" اخبار بنا ہے نہ "امروز" اور "نوائے وقت" کاملاً "پُر وقار" اخبار بنے ہیں۔ بہرحال رجحان واضح ہے۔

فنی لحاظ سے لاہور کی اُردو صحافت کا تقسیم سے پہلے کی صحافت سے مقابلہ کریں تو چند نمایاں حقیقتیں اُبھرتی ہیں جو مختصر طور پر یہ ہیں ——

۱۔ خبروں کی بہم رسانی کا معیار بہت بلند ہو گیا ہے۔ تمام اچھے اخبار زیادہ سے زیادہ ملکی اور غیر ملکی ایجنسیوں کی سروس لیتے ہیں

ہر اخبار کے چند مقامی نامہ نگار اور فیچر نگار ضرور ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے شہروں اور قصبات میں اور بعض حالات میں غیر ممالک میں بھی اُردو اخباروں کے نامہ نگار مقرر ہیں۔

۲۔ تقسیم سے پہلے خبروں کے صفحات کا میک اپ بدصورت ہوتا تھا۔ نئے میک اپ کا آغاز قومی آواز (لکھنؤ) سے شروع ہوا تقسیم کے بعد "انقلاب" نے اسے اختیار کیا، پھر "امروز" نے اسے رواج دیا اور بہت جلد تمام اُردو اخبارات نے نیا انداز قبول کر لیا۔

۳۔ تقسیم سے پہلے اُردو اخبار عموماً سیاسی مباحث پر اداریے چھاپا کرتے تھے اب ہر قسم کے موضوع پر لکھے جاتے ہیں۔

۴۔ تقسیم سے پہلے اُردو صحافت پر ایسے اخبار نویس چھائے ہوئے تھے جو بیک وقت ادیب اور صحافی تھے اس لیے صحتِ زبان کی طرف زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ اب صحافیوں کی غالب تعداد ایسے افراد پر مشتمل ہے جو ادیب نہیں محض اخبار نویس ہیں اس لیے صحتِ زبان کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی ہے البتہ "خبریت" ضرور بڑھ گئی ہے۔

۵۔ اداریہ نگاری میں ترقی اور تنزل دونوں کے آثار ملتے ہیں۔ ترقی اس لحاظ سے کہ موضوعات متنوع ہو گئے ہیں اور اداریے مختصر انداز میں لکھے جاتے ہیں اور تنزل اس لحاظ سے کہ سوائے ایک آدھا استثنا کے اداریے پرمغز نہیں ہوتے۔

۶۔ اخبارات اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ خبروں، ان کے پس منظر اور اداریوں اور خصوصی مضامین کے علاوہ بچوں، عورتوں، طلباء، دیہاتیوں، فلمی شائقین، ثقافت کے دلدادہ اور دین سے خصوصی دلچسپی رکھنے والوں سب کی دلچسپی کی چیزیں چھاپتے ہیں۔ اس کا فائدہ بھی ہے اور نقصان بھی لیکن اس مقالے کی تنگ دامانی اس کی تشریح کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

۷۔ اخباری تصاویر یعنی وہ تصویریں جو خبروں کے ساتھ ساتھ چھپیں تقسیم سے پہلے نہیں ہوتی تھیں لیکن اس کا نقصان یہ ہوا ہے کہ پڑھنے والوں کا مواد کم ہو رہا ہے۔

۸۔ مزاحیہ کالم نویسی کی رسم جاری ہے۔ بعض کالم نگار اچھا لکھتے ہیں لیکن سالک، حسرت والی بات نہیں۔ نئی صحافت نے کوئی خاص طور پر نمایاں مزاحیہ کالم نویس پیدا نہیں کیا۔

صحافت کی دنیا میں چند اور اہم تبدیلیاں بھی مختصراً یوں پیش کرتا ہوں:-

۱۔ اخبارات کے "زنجیرے" (CHAINS) معرضِ وجود میں آ رہے ہیں مثلاً پاکستان ٹائمز، امروز (جو لاہور اور ملتان سے بیک وقت شائع ہوتا ہے) لیل و نہار، سپورٹس ٹائمز اور ایشیا میگزین ایک ہی ملکیت میں ہیں۔ نوائے وقت لاہور، راولپنڈی اور ملتان اور قندیل کا الگ زنجیرہ ہے۔ کوہستان لاہور، راولپنڈی اور ملتان بھی زنجیرے کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲۔ اخبارات انفرادی ملکیت سے نکل کر جائنٹ سٹاک کمپنیوں کی ملکیت میں آ رہے ہیں مثلاً مطبوعات نوائے وقت، پروگریسو پیپرز، آفاق، سول، کوہستان۔

۳۔ صحافت میں اُردو ٹائپ کے رواج کا امکان اب ختم ہو چکا ہے کیونکہ لیتھو کی جگہ آفسٹ طباعت لے رہی ہے اور اسی کا مستقبل روشن ہے۔

۴۔ صحافتی بورڈ کے ایوارڈ نے اُردو اخباروں میں کام کرنے والے صحافیوں کو انگریزی صحافیوں کے برابر حیثیت دلا دی ہے۔ اگر اس ایوارڈ پر پورا عمل ہو تو اگرچہ اخبارات کی تعداد گھٹ جائے گی لیکن اُردو صحافیوں کا مجموعی طور پر ضرور بھلا ہو گا۔

تقسیم سے پہلے لاہور سے صرف ایک ہفت روزہ اخبار "خیام" نکلتا تھا جسے قابلِ ذکر قرار دیا جا سکتا ہے اب ہفت روزہ صحافت نے بھی ترقی کی ہے اور چٹان، اقدام، قندیل، لاہور اور لیل و نہار اچھے ہفت روزے ہیں۔ ان میں چٹان، اقدام اور لاہور شخصی ہر دلعزیزی کی بناء پر چل رہے ہیں۔ ان اخباروں میں بالترتیب شورش کاشمیری، م ش اور ثاقب زیروی کو الگ کر دیجئے تو باقی کچھ بھی نہیں رہے گا۔ "قندیل" سکولوں اور کالجوں کے طلباء اور طالبات اور دوسرے معمولی پڑھے لکھے لوگوں کے لیے نہایت اچھا اخبار ہے لیکن "لیل و نہار" اس پر بھاری ہے۔ یہ نیوز میگزین بھی ہے اور ادبی ہفت روزہ بھی اور تصاویر اور طباعت کے لحاظ سے دنیا کے اچھے اچھے ہفت روزہ جرائد کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

ادبی رسائل کی دنیا میں "نقوش" نمایاں اور بیش قیمت اضافہ ہے۔ اسے پہلے احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور مرتب کرتے تھے۔ پھر وقار عظیم آئے اور اس کے بعد محمد طفیل صاحب کے زمانے میں اس نے اپنے عظیم اور شاہکار نمبر پیش کیے لیکن۔ شاید "نقوش" کے بارے میں اس سے زیادہ اسی رسالے میں لکھنا موزوں نہ ہو اور شاید طفیل صاحب اسے پسند نہ کریں۔ رسائل کی دنیا میں ایک اور رسالے "اُردو ڈائجسٹ" کا ذکر ضرور کروں گا کیونکہ یہ پرانی ڈگر سے الگ ہے اور ہر قسم کی معلومات پیش کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ رسالہ کامیاب ہے۔ ہمارے ادبی رسائل میں ایک کمی مجھے بہت کھٹکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ان رسائل میں صرف "ادب" موجود ہوتا ہے حالانکہ ایک رسالے میں مصوری، موسیقی، عکاسی، سنگتراشی اور دوسرے فنونِ لطیفہ پر مضامین بھی آنے چاہئیں بلکہ حالاتِ حاضرہ پر اور معاشرتی علوم اور عمرانیات پر مقالے بھی آئیں تو بہتر ہے کیونکہ ان موضوعات پر الگ رسالے موجود نہیں ہیں۔

یہ ہے ایک مختصر سا جائزہ لاہور میں اُردو صحافت کے ۱۱۲ سالوں کا۔ مجھے ہرگز یہ دعوےٰ نہیں کہ یہ جامعیت کا حامل ہے کیونکہ ایک مقالے کے اندر اُردو صحافت کے اتنے طویل عرصے کی داستان قلمبند کرنا ممکن نہیں۔ بہر حال میں نے چند نمایاں نقوش پیش کر دیے ہیں۔

فارسی گو شعرأ

خواجہ عبدالحمید یزدانی ایم اے

پانچویں صدی ہجری کی ابتدا سے برصغیر پاک و ہند میں فارسی زبان و ادب کا دور دورہ ہوتا ہے۔ یوں تو اس سے بھی پہلے اس برصغیر اور ایران کے درمیان تعلقات قائم تھے، لیکن وہ محض تجارتی تھے۔ البتہ محمود غزنوی کے حملے، ایران و ہند کے ثقافتی و ادبی تعلقات کے آغاز کا سبب بنے۔ بعض ایرانی شعرأ سلطان محمود کے ہمراہ یہاں آئے، اور اس کا ذکر انھوں نے اپنے کلام میں کیا ہے۔ اس کے بعد جب پنجاب غزنوی قلمرو کا حصہ ہو گیا، تو یہ روابط اور بھی زیادہ استوار ہو گئے۔ بعض ایرانی سپاہی یہاں آباد ہوئے۔ صوفیائے کرام کی آمد شروع ہو گئی۔ اور شعر و سخن کی مجلسیں قائم ہوئیں۔ لاہور چونکہ اُن دنوں پایۂ تخت تھا، اس لیے غزنوی سلاطین کی علم دوستی اور داد و دہش کے باعث یہاں وہی غزنی کی سی علمی و ادبی فضا قائم ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ، بقول جناب سعید نفیسی، لاہور ان دنوں "غزنیِ خورد" کے نام سے مشہور تھا۔ (لاہور کو ایک اور بہت بڑا فخر یہ بھی ہے کہ برصغیر پاک و ہند کی سب سے پہلی نثری تصنیف، کشف المحجوب از حضرت علی ہجویری یہیں لکھی گئی)۔ اس دور میں دو ایک چوٹی کے فارسی گو شاعر یہاں پیدا ہوئے۔ اور اگرچہ غزنوی عہد کے بعد بھی فارسی شعر و ادب اس برصغیر میں خوب پھلا پھولا، لیکن اس دوران جتنے خاندان برسرِ اقتدار آئے اُن سب نے لاہور سے ہٹ کر ملتان اور دہلی وغیرہ کو اپنا پایۂ تخت بنایا، اس لیے زیادہ تر انہی علاقوں میں فارسی شعر کو فروغ ہوا۔ اور لاہور اپنی مرکزیت کھونے کے سبب فارسی کا کوئی اچھا شاعر پیدا نہ کر سکا۔ اور اگر اس بہت بڑی مدت میں (خاتمۂ عہدِ غزنوی سے آغازِ دورِ اکبری تک) یہاں کوئی ایسا شاعر پیدا ہوا بھی ہوگا، تو اس بارے میں معلومات دستیاب نہیں۔ ہاں اکبری دور میں آکر ہمیں پھر لاہور کے بعض اچھے شعرائے فارسی کا پتہ چلتا ہے اور اس کے بعد تو یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔

اس مقالہ میں ایسے ہی شعرأ کا تذکرہ مقصود ہے۔ ان شعرأ میں اکثر وہ ہیں جو یہیں لاہور میں پیدا ہوئے اور یہیں ان کی شاعری پھلی پھولی۔ کچھ ایسے ہیں جو باہر سے آکر یہاں بس گئے اور جنھوں نے یہاں کی محافل کو اپنی شاعری سے گرمایا۔ اور چند ایک وہ ہیں جو کچھ عرصہ یہاں رہے، یا جن کا کسی نہ کسی طریقے سے لاہور سے کچھ نہ کچھ تعلق رہا۔

روزبہ نکتی

سدید الدین محمود عوفی نے لباب الالباب میں اس کا نام ابوعبداللہ لکھا ہے۔ اس کے قول کے مطابق یہ لاہور کے فارسی گو شعرأ میں سب سے قدیم شاعر ہے۔ روزبہ نکتی سلطان مسعود بن محمود غزنوی (۴۲۱ھ تا ۴۳۲ھ)

کے مداحوں میں سے تھا۔ اس لحاظ سے جیسا کہ ذبیح اللہ صفا نے لکھا ہے، یہ پانچویں صدی ہجری کے نصف اول میں حیات تھا۔ نمونۂ کلام ؎

به نرگس بنگری چون جام زرّین　　بزیر جام زرّین چشمه چشمه
تو گویی چشم معشوق است مخمور　　ز ناز و نیکوی گشته کرشمه

ایک قصیدے کی تشبیب کے چند اشعار:۔

زدی آن ترک نه زو گیست و بر او نه بر ست
که برین نار بنا رست و بر آن گل بنر ست
بطرازی قد و خمه خیزی زلفین و دراز
رستخیز همه خوبان طراز و خزرست
ور بجای مه و خورشید بود یار مرا
اندرین معنی هم جای حدیث و نظر ست
ماه کے سرو قد و سیم تن و لاله رخست
ماه کے نوش لب و ناز بر و جعد ورست

ابوالفرج رُونی

عوفی نے اسے "العمید الاجل الکامل" وغیرہ القاب سے یاد کیا ہے۔ بقول اس کے رُونی کا مولد و منشاء "خطہ لوہور" تھا۔ اسی طرح صاحب ہفت اقلیم نے بھی اس کا مولد لاہور ہی کو قرار دیا ہے لیکن تاریخ گزیدہ، آتشکدہ اور مجمع الفصحا کے مؤلفین کا کہنا ہے۔ کہ رُونہ خراسان یا اعمال نیشاپور سے تھا۔ ذبیح اللہ صفا نے اس قول کو درست مانا ہے اور ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ رونی کی اصل رُونہ ہی سے سہی لیکن مسعود سعد سلمان کی مانند اس کا مولد و منشأ لاہور ہی ہے۔

مسعود اور رونی کی آپس میں گہری چھنتی تھی۔ بعض تذکرہ نویسوں نے مسعود کے ایک قطعہ سے جس میں یہ شعر آیا ہے:

بوالفرج شرم نایدت کا ز خبث
در چنین حبس و بند م افگندی

یہ اندازہ لگایا ہے کہ مسعود کے زندانی ہونے کا ذمہ دار یہی ابوالفرج رونی ہے لیکن اس سلسلے میں صفا نے یہ لکھا ہے کہ رونی اس قدر اعلیٰ سرکاری عہدہ پر نہ تھا جو اسے قید کروا سکتا، بلکہ یہ تو دوسرا شخص ابوالفرج نصر بن رستم تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی صفا نے مسعود کے حالات میں خود اپنے اس قول کی تردید یوں کی ہے کہ اصولاً یہ بات بعید نہیں کہ رونی ان پرانے تعلقات کو ایک طرف رکھ کر مسعود کے زورمند دشمنوں سے مل گیا ہو۔ بہر حال رشید یاسمی مرحوم مرتب دیوان مسعود نے کسی اور شخص کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔

ارمغان پاک میں اس کا سنہ وفات ۴۸۴ھ[1] دیا ہے۔ جناب ڈاکٹر غلام مصطفٰی نے ۴۹۲ھ[2] کے بعد اور صفا

[1] ارمغان پاک مطبوعہ تہران ص۱۔ [2] اے ہسٹری آف بہرام شاہ آف غزنی حاشیہ ص۲۸

نے مسلماً ۴۹۲ھ کے بعد لکھا ہے۔ رونی کا ایک مختصر سا دیوان روسی مستشرق چایکین نے شائع کیا ہے۔

رونی کی شاعری کا شہرہ ابراہیم بن مسعود (۴۵۱ھ۔ ۴۹۲ھ) کے دربار سے متعلق ہونے پر ہوا۔ یہ اپنے دور کا بہت بڑا شاعر مانا گیا ہے۔ انوری جیسا بلند پایہ شاعر بھی اس کی شاعری کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکا۔ وہ ایک جگہ اپنے ممدوح کی مدح میں کہتا ہے:

ازمتانت خیل اقبالت چو شعر بوالفرج

وز عذوبت مشرب عیشت چو نظم فرخی

عوفی کا کہنا ہے کہ انوری نے اس کا تتبع بھی کیا ہے۔ اس نے شاعری میں ایک نیا طرز اختیار کیا۔ بقول صفا اس کے کلام میں عربی الفاظ نسبتاً زیادہ ہیں۔ اصطلاحات و افکار علمی اور نئی نئی تراکیب و استعارات و تشبیہات استعمال میں لاتا ہے۔ اس کے علاوہ دقتِ خیالات اور مشکل ردیفیں بھی اس کے یہاں بہت ہیں۔ نمونۂ کلام:

بادبان برکشید بادِ صبا	معتدل گشت باز طبع ہوا
خاک و بیا شدست پرصورت	جانور گشتہ صورت دیبا
شاخ چون کرم پیلہ گوہر خویش	بہ تند گرد تن ہمی عمدا
سبزہ اندر حمایت شبنم	سر ز پستی کشید زی بالا
ابر بی شرط مہر و عقد نکاح	گشت حاصل بلؤ لؤ لالا
ابنک از شرم آن ہمی فگند	لؤلؤ نارسیدہ بر صحرا
چشمہا برگشادہ غنچۂ گل	تا ببیند جمال خسرو ما

زدی چون حاصل نکو کاران	زلف چون نامۂ گنہکاران
غمزہ مانند آرزوی مضر	در کمینگاہ طبع بیماران
خیرہ اندر کرشمۂ چشمش	ذوق مستان و ہوش ہشیاران

مسعود اس کے باپ کا نام سعد بن سلمان تھا۔ عوفی اسے "العمید الاجل سعد الدولۃ والدین" کے الفاظ سے یاد کرتا ہے، اور یہ کہ وہ "از نوادر ایام و افاضل انام بود"۔ مسعود ایک مہاجر ایرانی خاندان سے تھا۔ اگرچہ عوفی اور تقی الدین کاشی نے اس کا مولد ہمدان بتایا ہے، لیکن شفق کا کہنا ہے کہ اصل اس کی ہمدان سے اور مولد لاہور ہے۔ اسی طرح صفا نے بھی لاہور ہی کو اس کی جائے ولادت قرار دیا ہے۔ کیونکہ مسعود نے اپنے اشعار میں خود کو اس شہر کا "فرزند عزیز" کہا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے لاہور کا جہاں بھی ذکر کیا ہے وہاں اس سے اپنی بے پناہ محبت کا اظہار کیا ہے (ایسے اشعار اسی مضمون کے دوسرے حصے میں آئیں گے)۔ ہاں اتنا ہے کہ اس کے اب وجد کی اصل ہمدان سے تھی۔ اس کا باپ سعد خاندانِ غزنوی کے دورِ اول میں بہت بڑے عہدے پر مامور تھا۔ ۴۲۷ھ میں جب مجدود بن مسعود

ہندوستان آیا، تو سعد اسی کے ساتھ چلا آیا۔ اور پھر یہاں لاہور میں مسعود پیدا ہوا۔ محمد قزوینی مرحوم نے اس کی تاریخ پیدائش ۴۳۸ھ اور ۴۴۰ھ کے درمیان نکالی ہے۔

مسعود کی شاعری کا آغاز بھی سلطان ابراہیم غزنوی ہی کے عہد میں ہوا۔ جب سیف الدولہ محمود بن ابراہیم ۴۶۹ھ میں والیِ ہند ہوا، تو مسعود اس کے ندیموں کے ساتھ ہندوستان چلا گیا۔ جہاں اسے خاصی شہرت اور عزت حاصل ہوئی۔ لیکن کچھ عرصہ بعد سیف الدولہ کو بقول شفق، کسی سوءظن کی بنا پر والد کے حکم سے گرفتار کر لیا گیا اور اس کے ساتھ اس کے ندیموں کو بھی دھر لیا گیا۔ ادھر مسعود کو جو انہی دنوں بعض حکام کے ظلموں کے خلاف شکایت کرنے غزنی گیا ہوا تھا، بعض حاسدوں کی لگائی بجھائی کے باعث زنداں میں ڈال دیا گیا۔ چنانچہ سات سال تک سو اور دہک کے قلعوں میں اور تین سال تک قلعۂ نای میں محبوس رہا۔ اسی کا ذکر اس کے اکثر اشعار میں ملتا ہے۔ رشید یاسمی کا کہنا ہے کہ جو شخص اس کے قید ہونے کا باعث بنا وہ ایک شاعر رشیدی تھا۔ بہرحال اس دس سال کے عرصے میں مسعود نے سلطان ابراہیم کے کئی ایک قصیدے لکھے۔ آخر سلطان کے ایک مقرب عمید الملک کی سفارش پر اس کی رہائی ہوئی۔ رہائی کے بعد یہ اپنے باپ کی جاگیر پر چلا گیا۔ کچھ عرصہ بعد بونصر پارسی وزیر امیر عضد الدولہ بن مسعود غزنوی نے اسے جالندھر کی حکومت عطا کی۔ لیکن تھوڑی ہی مدت بعد بونصر محبوس و معتوب ہوا۔ اور اس کے ساتھ مسعود کو بھی معزول کر کے مرنج میں قید کر دیا گیا۔ جہاں سے ۵۰۰ھ میں ایک امیر کی سفارش پر اس کی رہائی ہوئی۔ یہاں آٹھ سال قید کاٹی۔ ۵۱۵ھ میں بعمر اسی سال وفات پائی۔

مسعود درجۂ اول کے قصیدہ گویوں میں سے تھا۔ عوفی نے اس کے تین دیوانوں عربی، ہندی اور فارسی کا ذکر کیا ہے۔ فارسی کا دیوان رشید یاسمی مرحوم نے مرتب کر کے تہران سے شائع کیا۔ نظامی عروضی سمرقندی نے اپنی مشہور تصنیف مجمع النوادر (چہار مقالہ) میں مسعود کے حبسیات کی بے حد تعریف کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اکثر حبسیات بہت بلند اور بڑی فصاحت میں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ میں اس کے اشعار پڑھتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور آنسو آنکھوں میں مچلنے لگتے ہیں۔ دولت شاہ کا کہنا ہے کہ مسعود کا دیوان عراق و طبرستان میں بڑی شہرت رکھتا ہے۔ اس کے کلام میں بقول صفا نئی نئی تراکیب و تشبیہات ملتی ہیں۔ نمونۂ اشعار:

چرا نگرید چشم و چرا ننالد تن — کزین برفت نشاط و ازآن برفت وسن
چنان بگریم کم دشمنان بہ بخشایند — چو یاد م آید از دوستان و اہل وطن
سحر شوم زغم و پیرہن بتن بدرم — زبہر آنکہ نشان تنست پیراہن
زرنج و ضعف بدان جایگہ رسید تنم — کہ راست ناید اگر در خطاب گویم من
صبور گشتم و دل در بر آہنین کردم — بخاست آتش ازین دل چو آتش از آہن
نبود یارم از شرم دوستان گریان — نکرد یارم از بیم دشمنان شیون
ز درد و اندہ ہجران گذشت بر من دوش — شبی سیاہ تر از روی و رای اہرمن
نخفتہ ام ہمہ شب دوش بودہ ام نالان — خیال دوست گدای منست و نجم پرن

نشستہ بودم کآمد خیال او ناگاہ
چو ماہ روی و چو گل عارض و چو سیم ذقن

مرا بیافت چو یک قطرہ خون جوشان دل
مرا بیافت چو یک تار موی نالان تن

ز لبس کہ کند دو زلف و زلبس کہ راندم اشک
یکی چو گوہر ثمین و یکی چو مشک ختن

مرا و او را از چشم و زلف گرد آمد
ز مشک و لؤلؤ یک آستین و یک دامن

بنا زگفت کہ از دیدہ بیش اشک مریز
بمہر گفتم کز زلف بیش مشک مکن

درین مناظرہ بودیم کز سپہر کبود
ز دوّدہ طلعت بنمود چشمۂ روشن

در ماہ چہ روشنی کہ در روی تو نیست
در خلد چہ خرمی کہ در کوی تو نیست

مشک ختنی چو زلف خوشبوی تو نیست
یکسر ہنری، عیب تو جز خوی تو نیست

ای می لعل، راحت جان باش
طبع آزادہ را بفرمان باش

روزگارم بخست ، مرہم شو
درد مندم ز چرخ ، درمان باش

بیتو بیجان تنیست جام بلور
تن پاکیزہ جام را جان باش

دلم از قحط مہر خشک شدست
بر دلم سودمند باران باش

اندیشہ مکن بکارہا در بسیار
کاندیشۂ بسیار بپیچاند کار

کاری کہ برایت آید آسان مگذار
در نتوانی بکار دانان بسپار

حمید الدین مسعود بن سعد شالی کوب | عوفی نے اس کے متعلق صرف یہ اطلاع بہم پہنچائی ہے کہ وہ احرارِ خطۂ لاہور میں سے اور طبعِ ذکی رکھتا تھا۔ شاعری میں وہ عنصری اور رودکی کا ہم پلہ ہے۔ پھر کہتا ہے کہ میں نے لاہور میں ایک بزرگ سے سنا کہ شالی کوب نے قلم کی صفت میں ایک قطعہ کہا جو "الحق لطیف و مشہور است"۔ وہ قطعہ یہ ہے :

جندا ملک[1] ہمایون تو کآب چشمش
بی گمان دارد خاصیت آب حیوان

ہست اسرار نہان در دل او بسیاری
تا نبری سرش پیدا نکند ہیچ نہان

دو زبان باشد نمام و درین نیست شکی
نیست نمام چہ گر ہست مر او را دو زبان

گہ گہی زار شود گرید چون ابر بہار
از غم آنکہ تنی دارد چون برگ خزان

بخورد مشک پس از دیدہ فرو بارد دُر
مشک خوارے نبدیدم کہ بود دُر باران

نکند ہرگز در فضل و ہنر یک دعوی
بیک بنماید از فضل و ہنر عد برہان

---

[1] لباب الالباب مطبوعہ لیڈن جلد دوم ص۴۱۱ ۔ دراصل یہ لفظ کلک ہونا چاہیئے ۔

خطیر الدین محمد بن عبدالملک عوفی نے اس کے فضل و براعت اور زہد و اتقا کی بے حد تعریف کی ہے اور اسے اپنے وقت کا بوعبید شبلی اور جنید کہا ہے۔ لاہور کے مشائخ اور "افاضلِ اماثلِ جمہور" میں سے تھا۔ احوالِ روزگار کے متعلق اس کے یہ اشعار مشہور ہیں :-

گردش روزگار پر عبرست ۔۔۔ نیک داند کسی کہ معتبرست
چرخ پر شعبدست و پر نیرنگ ۔۔۔ ہمہ نیرنگہاش کارگرست
ہست حمالِ آبِ دریا، ابر ۔۔۔ خاک را حقہ ہای پر دُر است
اندرین روزگار ناساماں ۔۔۔ ہر کہ با عاقبت (؟) باہنرست
ہمچو روباہ ہست کشتہ دم ۔۔۔ ہمچو طاؤس مبتلاء پر است
اختر و آخشیج بی مہر مند ۔۔۔ اگر این مادرست و آن پدرست
از چنین مادر و پدر چہ عجب ۔۔۔ گر مرا ابد ماندہ دربدرست

ابن منہاج لاہوری اگرچہ جائے ولادت اس کی لاہور ہی ہے لیکن "منشا او سمرقند بود" عوفی اسے ملک الکلام اور فصیح العجم کے القاب سے یاد کرتا ہے۔ وہ چمن محاورہ میں عندلیب فصاحت تھا۔ اور جب "در نوا آمدے حسان پیش کلماتِ حسانِ او بی نوا آمدی"۔ اس کے اشعار اپنے دور میں بڑے مشہور تھے۔ اس نے اپنے منشآت میں اپنی کئی ایک رباعیاں بھی درج کی ہیں، جن میں چند ایک یہ ہیں :

آن دل کہ ز ہجر درد ناکش کردی ۔۔۔ وز ہر شادی کہ بود پاکش کردی
از خوی تو آگہم کہ ناگہ ناگہ ۔۔۔ آواز در آفتد کہ ہلاکش کردی
دل را بہ رخِ خوب تو میلی افتادست ۔۔۔ جان دیدہ برامید لبت بگشادست
چشم آب زنِ خاک درت خواہد بود ۔۔۔ گر عمر وفا کند قرار این دادست

ابو جعفر عمر بن اسحاق لاہور کے ائمہ و علما میں سے تھا اور دانش و بزرگی اور فضل و کمال میں اسے خاصی شہرت حاصل تھی۔ اس کے اشعار میں بلاغت بہت ہے۔ عوفی لکھتا ہے کہ میں نے لاہور میں خواجہ ادیب شرف الدین احمد سے سُنا کہ جس وقت نجیب الملک شرف الخواص نے اس کا امتحان لینا چاہا تو اس سے ایسا قصیدہ لکھنے کو کہا جس کے ہر شعر میں چار جنسوں کا آنا لازم تھا۔ چنانچہ ابو جعفر نے ایسا قصیدہ کہا۔ اس کے چند اشعار یہ ہیں :-

ای پاک ہمچو آب[1] و چو خاک[2] بردبار ۔۔۔ قطعی مکن چو باد[3] و مسوز این تنم چو نار[4]
داری قبای رومی[1] و رو ی تو ششتری[2] بیت ۔۔۔ و اندام ترمذ[3] ز خز و بز[4] ہزار بار
چشمت بسان نرگس و عارض چو نسترن ۔۔۔ رخسار ہمچو لالہ و لب ہمچون گل انار

انتخاب اشعار :

دوش در سودای دلبر بودہ ام ۔۔۔ با لبِ خشک و رُخ تر بودہ ام

در خمارِ عہدِ مخمورِ او — دیدہ باز از غم چو مخمور بودہ ام
وز نمِ چشم و تفِ دل ہر زمان — گہ بی اندر آب و گہ آذر بودہ ام
ہمچو بحر و کان ز آب و خونِ اشک — پُر ز دُر و پُر ز گوہر بودہ ام

فیضی اکبری دَور کا گُلِ سرسبد فیضی پیدائش کے لحاظ سے اکبر آبادی ہے۔ لیکن اکبر سے وابستہ ہونے کے سبب کئی ایک سال لاہور میں بھی گزارے۔ اس کے علاوہ بقول عبدالغنی صاحب "میخانہ" اس کی وفات لاہور ہی میں ہوئی (بعد میں اس کی نعش آگرہ لے جاکر دفن کی گئی)۔ ۹۵۴ھ میں آگرہ میں پیدا ہوا۔ مشہور عالم شیخ مبارک کا بڑا بیٹا اور ابوالفضل کا بڑا بھائی تھا۔ تعلیم و تربیت والد ہی سے حاصل کی۔ ایک موقع پر دشمنوں کی لگائی بجھائی کے سبب ان باپ بیٹوں کو عتاب شاہی کے خوف سے مختلف علاقوں میں چھپنا پڑا۔ بعد میں جب فضا ہموار ہوئی تو ۹۷۴ھ میں اکبر نے بڑے احترام سے دربار میں بلایا۔ اور پھر اس کی خاصی عزت و تکریم ہوئی۔ وہ ایک مہم پر اسے جانے کا اتفاق ہوا۔ اور آخر ۱۰۰۴ھ میں وفات پائی۔ اکبر اسے شیخ جیو کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ بقول بدایونی مختلف فنون مثلاً شعر، معما، عروض و قافیہ، تاریخ، لغت، طب اور انشا وغیرہ میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔

خمسۂ نظامی کا جواب لکھنا چاہتا تھا۔ اس کا ذکر خود ایک خط میں اس نے کیا ہے۔ لیکن وہ ایک ہی مثنویاں مکمل کر پایا، باقی یا تو نامکمل رہیں یا صرف ان کے نام کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے علاوہ نثر میں موارد الکلم، سواطع الالہام (بے نقط تفسیر) وغیرہ اس کی تصنیفات ہیں۔ شاعری میں بھی اس کا درجہ بہت بلند ہے۔ نمونہ کلام:

ای ہمنفسان محفل ما — رفتید ولی نہ از دل ما
مادست زغم نہادہ بر سر — غم پای فشردہ در گل ما
دریای غمیم و گوہر اشک — کشتی کشتی بساحل ما

آن گران خواب را بخلوت راز — چہ خبر از خروش "یارب ما"
ای فلک سوی او زہم بنگای — ورنہ آتش تو نم بکو کجا
درای غنچہ صدا مید ہد ببانگ بلند — کہ کاروان چمن در کمینگہ تلف است

چہ شد کہ چشمۂ خورشید بر نمی خیزد — ز صبح عیش نفسہای سرد می خیزد
ہزار غوطہ فلک را بخون زدیم و ہنوز — غبار از ین صدف لاجورد می خیزد
فی ریخت بدامان من از غایت مستی — گر خون من دلشدہ می ریخت بجا بود
دور جہان تمام شد وعدہ ہنوز ہمچنان — وہ چہ دراز کردہ ای سلسلۂ ہنوز را
بچشم عزیزان مرا خوار دارد — بہ پیرانہ سالی غم خرد سالان

انسی قندھاری بابر کے ساتھ وارد ہند ہوا۔ واقعہ نویس تھا۔ بعد میں ہمایوں کے پاس بھی مختلف مناصب پر رہا۔ ۹۶۳ھ میں لاہور میں وفات پائی۔

مرشکم رفتہ رفتہ بی دریا نشد تماشا کن — بیا در کشتی چشمم نشین و سیر دریا کن

خنجر بمیان تیغ بکف چین بجبین باش — خونریز جفا پیشہ کن و بر سر کین باش

مُلّا شیری

بدایونی نے لکھا ہے کہ پنجاب کے ایک قصبہ کوکووال کا رہنے والا تھا۔ لیکن صاحب طبقاتِ اکبری نے اسے لاہوری لکھا ہے۔ اس کا باپ بقول بدایونی ایک مشہور اور بڑے قبیلے "ماجیان" میں سے تھا۔ والدہ سیدزادی تھی۔

مولانا یحییٰ کی خدمت میں تحصیل علم کی تھی۔ ملا نظام اور بدایونی دونوں نے لکھا ہے کہ اگرچہ "عامی" تھا۔ لیکن بڑا عالی فطرت اور وضع ہموار کا مالک تھا۔ بقول ابوالفضل شاعری میں درک اکبر ہی کے سبب ہوئی۔ شعر گوئی میں پوری پوری مہارت تھی۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ اس نے یہ دعویٰ کیا کہ میں نے ایک رات میں تیس غزلیں کہیں۔ ملا نظام لکھتے ہیں "حدتِ طبعش بحدّے بود کہ در اندک زمانے قصیدہ ترتیب داد"۔ بدایونی نے اس کی شاعری کی بڑی تعریف کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ معاصر شعرا میں سے کوئی بھی "شکوبات" گوئی میں اس سے بہتر نہ تھا۔ اور قصیدہ و قطعہ گوئی میں تو معاصرین میں سب سے آگے تھا اور "دستِ فصاحتِ دیگران را بستہ، مہرِ سکوت بر دہانِ ناطقۂ ایشان نہادہ"۔ صاحب مآثر رحیمی کا کہنا ہے اس کا کلام ہندوستان میں بہت مشہور ہے۔ طبقاتِ اکبری میں ہے کہ اس نے "نیرِ اعظم" کی مدح میں ایک ہزار اشعار کہے اور اس کا نام "شمع جہاں افروز" رکھا۔ اس نے ۹۹۴ھ میں "کوہستان یوسفزئی" میں وفات پائی۔ نمونہ کلام:

درآن دلی کہ توئی باد دیگری کردن — درون کعبہ پرستیدنست عزی را

ہجوم نازچنان گرد و پیش ناز گرفت — کہ راہ نیست درآن تنگنا تمنا را

بکف تیغ ستم از بہر قتلم نیز می آید — ز بیداد آنچہ می گویدا زان خونریز می آید

چرا ای اشک در چشم از وداع باز میگردی — کجا بودی کہ اکنون مانع دیدار میگردی

سراپا جانی ای باد صبا و رفالب شوقم
سرت گردم مگر در کوی او بسیار میگردی

ایک قصیدہ سوال و جواب کے چند اشعار:

گفتم ایدل ز چہ اوضاع جہان گشت بدل — گفت خاموش کہ در مغز فلک رفتہ خلل

گفتم از چاہ امید آب تمنا نرسد — گفت کوتہ بود از وی رسنِ طولِ امل

گفتم آسایش اگر ہست بگو ہید کجاست — گفت در خواب نما بیند لیں از خواب اجل

گفتم آیا نفسی شاد توان بود بسر — گفت قولیست کہ ہرگز نہ در آید بعمل

گفتم آن یار چرا ابروی پر چین دارد — گفت با صاحب بدخو نتوان کرد جدل

گفتم آئینہ دانش ہمہ جا زنگ گرفت — گفت کو مصقلہ جود کہ گیرد صیقل

گفتم اہلِ سخن آرایش مجلس باشند — گفت اینہا نتوان گفت بارباب دول

گفتم افسوس ازین مردم دور از معنی — گفت فریاد ازین قوم جفا جوی دغل
گفتم از بخت بتفصیل شکایت دارم
گفت با بدشہنشاہ بگوی مجمل

عرفی

محمد جمال الدین عرفی اکبری دور کا ایک عظیم شاعر ہے۔ یوں تو اسے خود برصغیر ہند و پاک میں صرف چند سال گزارنے کا موقع ملا، لیکن اس کی زندگی کے آخری چند ایام لاہور میں گزرے اور یہیں اس نے وفات پائی، اس لیے یہاں اس کا تذکرہ کرنا کچھ مناسب ٹھہرا۔

عرفی کی پیدائش (۹۶۳ھ) اور تعلیم و تربیت شیراز میں ہوئی۔ شروع ہی سے شاعری کی طرف رغبت تھی۔ سب سے پہلے ۹۸۹ھ میں اس نے مشاعروں میں حصہ لینا شروع کیا۔ ایران کے دورِ قیام میں اس نے کوئی چھ ہزار اشعار کہے جو ضائع ہو گئے۔ ۹۹۴ھ میں واردِ ہند ہوا۔ شروع میں فیضی سے تعلق رہا۔ جلد ہی حکیم ابو الفتح سے منسلک ہو گیا، لیکن کچھ عرصہ بعد اس کی وفات پر عبدالرحیم خان خاناں کے پاس آ گیا۔ لیکن یہ تعلق مبارک ثابت نہ ہوا کیونکہ جلد ہی، یعنی ۹۹۹ھ میں موت کے ظالم ہاتھوں نے اسے عین شباب میں آ لیا۔ بقول والہ داغستانی لاہور میں مدفون ہوا۔ اور چند روز کے بعد کوئی درویش کسی اور بزرگ کے دھوکے میں اس کی ہڈیاں قبر سے نکال کر نجف میں لے گیا اور دفن کر دیں۔

صاحبِ طرز شاعر تھا۔ تمام تذکرہ نویس، خصوصاً صاحب مآثر رحیمی اور ملا بدایونی، اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ بدایونی لکھتے ہیں کہ عرفی کا دیوان گلی کوچوں میں لوگ بیچتے پھرتے ہیں اور عراق اور ہندوستان کے لوگ اسے تبرکاً خریدتے ہیں۔ انتخاب:

کلید میکدہ ہا را بمن دہید کہ من — نہ آن کسم کہ باندازِ مست میگردم
فغان ز غمزۂ شوخی کہ وقت تنہائی — بہانہ جوید و آغاز کردہ در جنگ است
طفیلیانِ ناز بین کہ جگر گوشۂ خلیل — در زیر تیغ رفت و شہیدش نمیکنند
ز بخت نہ گوشۂ چشمے نہ چین ابروئے — بحیرتم کہ دل برہمن ز کف چون شد
ای آنکہ رفتہ است عنانِ دلت از دست — یک لحظہ تماشائی آن دست و عنان باش

بیا ای عشق رسوای جہانم کن کہ یکچندے
نصیحت ہای بیدردان شنیدن آرزو دارم

رفت آن آفت جان از بزم اے ہوش بیا
تا ببینم کہ چہا بر سر ایمان رفتہ ست

خواجہ حسین ثنائی مشہدی

خواجہ حسین نام، ثنائی تخلص، مشہد کا رہنے والا تھا۔ ایران میں سلطان ابراہیم میرزا وغیرہ کی مدح میں کئی ایک قصائد لکھے۔ بقول بدایونی اسکے واردِ ہند ہونے سے پہلے ہی اس کے کلام سے یہاں کی محافل آراستہ ہوتی تھیں اور اس کے اشعار یہاں تبرکاً پڑھے جایا کرتے تھے۔ لیکن جب یہ

یہاں آیا تو " آنہمہ شوق از حسد بفسردگی مبدل شد و درگوشۂ مجہولی افتادہ نشانۂ صد تیر اعراض بودہ " بہر حال اکبر نے اس کی خاطر خواہ پذیرائی کی۔ اور اسی سبب سے ثنائی تا آخر عمر شاہی عنایت و نوازشات سے مستفید ہوتا رہا۔ تا آنکہ بقول صاحب میخانہ اس نے ۹۹۵ھ میں لاہور میں وفات پائی۔ لیکن اس کی نعش بطور امانت کے دفن کی گئی اور بعد میں اس کے عزیز و اقارب نے اس کی ہڈیاں مشہد میں لے جا کر دفن کر دیں۔

اس کی شاعری کی تعریف سب تذکرہ نویسوں نے کی ہے۔ بدایونی کا کہنا ہے۔ کہ اس کا دیوان بہت مشہور ہے اور وہ غیر از توحید و موعظت وغیرہ کے تمام اقسام شعر میں طرفہ دستگاہ کا مالک ہے۔ عبد النبی لکھتا ہے: " فصیحی نادرہ گو، سخنوری پر رنگ و پوست۔ اشعار آبدار آن سخن آفرین لعایت رنگین و واردات پر کار آن معنی گزین بی نہایت متین است۔ "
اسی طرح صاحب طبقات اکبری نے لکھا ہے کہ وہ اقسام شعر کو خوب اور استادانہ کہتا ہے۔ لیکن بدایونی نے تعریف کے بعد آخر میں لکھا ہے " قصیدہ ہای بلند دارد اما عبارت پست و ہمان مثل ست کہ :

خانہا شان بلند و ہمت پست

یارب این ہر دو را برابر کن

بقول صاحب میخانہ اس کے اشعار کا مجموعہ تین ہزار اشعار پر مشتمل تھا۔ (تذکرہ حسینی میں " پانچ ہزار اشعار " لکھا ہے) اس کے علاوہ ایک مثنوی سکندر نامہ جو مثنوی (رومی) کی بحر میں تھی۔ اس نے ایک ساقی نامہ بھی لکھا تھا۔ جس کا ایک خاصا انتخاب " میخانہ " میں مندرج ہے۔

ثنائی نے خانخاناں کی مدح میں بڑے طویل قصائد لکھے۔

نمونۂ کلام :

قاصد شوق دگر قطرہ زنان می آید ۔۔۔ کہ بدل شوق کسی از پی جان مبا آید
شرط عشقست کہ ہم باز بدل بسپارند ۔۔۔ سخن دوست کہ از دل بزبان می آید
ور حوصلۂ نہ فلک از عشق نگنجید ۔۔۔ ہر ذرہ کہ از خاک ثنائی بہ ہوا رفت

تذکرہ حسینی میں اس کا یہ انتخاب درج ہے :

روزیکہ وقف روی تو کردم نظارہ را ۔۔۔ دیدم بدامن این جگر پارہ پارہ را
خوشا خجلت آن عاشقی کہ در شب ہجر ۔۔۔ بخوابش آئی و از شرمسار بر خیزد
نام قیامت مبر حرف ز محشر مگو ۔۔۔ گردش بالین من در شب ہجران او

رباعی

آزار گرت بدر شہوار رسد ۔۔۔ کی از ستم چرخ جفا کار رسد
تنگست دہان تو، از تنگی جامی ۔۔۔ ناچار بسا کنانش آزار رسد

احسن | احسن اللہ خاں نام، ظفر خاں خطاب اور احسن تخلص۔ اسے بقول خان آرزو شاہجہانی دور کا رحیم خاں خانخاناں کہنا چاہیئے۔ مآثر الامرا کے مطابق اس کا باپ خواجہ ابوالحسن تربتی اکبری عہد میں خراسان سے وارد ہند ہوا۔ اور اکبر اور جہانگیر کے زمانے میں مختلف مناصب پر فائز رہا۔ شاہجہان کے عہد میں شش ہزاری و شش ہزار سوار

کے منصب کے علاوہ اسے کشمیر کا علاقہ بھی ملا۔ اس کی وفات پر احسن مراحم خسروانہ سے مستفیض ہوا۔ ویسے وہ جہانگیر ہی کے دور میں ظفر خان کے خطاب اور کابل کی گورنری سے نوازا گیا تھا۔ اس کے بعد شاہجہان نے اسے ابوالحسن کی زندگی ہی میں کشمیر کا گورنر بنا دیا تھا۔ کچھ مدت یہ ٹھٹھہ کا حاکم بھی رہا۔ بقول آزاد اس کی آخری عمر لاہور میں گذری۔ اور بقول صاحب مآثر الامرا لاہور ہی میں اس نے ۱۰۷۳ھ میں وفات پائی اور اپنے باپ کے مقبرے میں دفن ہوا۔

اس کا قد بہت چھوٹا تھا۔ چنانچہ اس کے متعلق مآثر الامرا میں ایک لطیفہ درج ہے اور وہ یہ کہ ایک دن بادشاہ کے حضور میں یہ مذکور ہوا کہ خواجہ ابوالحسن سارے دن میں ایک مرتبہ پانی پیتا ہے۔ ملا حنفی حاضر تھے انھوں نے عرض کی کہ "قد قصیر ظفر خان ازین سبب تخم نزدہ آبی ست"

احسن و رستی تدبیر اور رسائی دانش میں یکتا ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھا۔ اس نے شعرا کی بھی بے حد قدردانی کی۔ چنانچہ مآثر الامرا میں ہے کہ اس کی اسی قدردانی اور فیاضی کے سبب "سخنوران صاحب استعداد دل از اوطان برداشتہ روی امید بدرگاہش می گذاشتند"۔ صائب سے وہ مشق سخن کرتا۔ اور پھر وہ وقت بھی آیا کہ خود صائب جیسا بلند پایہ شاعر اس کی شاعری کا مداح ہو گیا۔ اس کے علاوہ ظفر خاں نے جب کبھی صائب کے کلام میں کوئی خردہ گیری کی تو خود صائب نے اس کی داد دی۔ اس کے ذوق شاعری کا یہ عالم تھا کہ اس نے ایک بیاض تیار کروائی جس میں اپنے عہد کے تمام شعرا کا کلام انہی کے ہاتھوں سے لکھوایا اور ساتھ ہر ایک کی تصویر منسلک کی۔ خود بھی صاحب دیوان تھا۔ دو مثنویاں میخانہ راز، اور لاہور، پنجاب وغیرہ کی تعریف میں بھی لکھیں۔

انتخاب کلام از سرو آزاد:-

در گوشۂ میخانہ ہمین گفت و شنید ست — باران برسانید دماغ شب عید است

گر تشنۂ چشمی اگر ساقی بما دارد بجاست — عمرہا در گوشۂ میخانہ خدمت کردہ ام

شادم بدل شکستگی خود کہ پیش من
قدر دل شکستہ چو زلف شکستہ است

دلم بکوی تو امیدوار می آید — نگاہ دار کہ روزی بکار می آید

انتخاب کلام از کلمات الشعرا:-

بہ تیغ بی نیازی ناتوانی قطع ہستی کن
فلک تا افگند از پا ترا خود پیش دستی کن

از سبزۂ تیغ بر کمر گل بہار بست — گر تو بہ خضر وقت شوی جان نمی برد

نہ بہر مستیم کی کار با جام شراب افتد
مرا از گفتگوی بادہ سرخوش میتوان کردن

آشنا میرزا محمد طاہر المتخلص بہ آشنا ظفر خاں احسن کا بیٹا تھا۔ اس کی ماں بزرگ خانم ممتاز محل کی بڑی بہن کی بیٹی تھی۔ ابھی سات سال ہی کا تھا جب شاہجہان نے اسے منصب سے نوازا۔ اس کے بعد ہزار و پانصدی کے منصب سے سرفراز ہوا۔ اور ساتھ ہی "داروغہ حضور" کا عہدہ، جو صرف خاندان کے معتبر اراکین کے لیے مخصوص تھا، پایا۔ شاہجہان نے ہمیشہ اسے اپنا ندیم خاص بنائے رکھا۔ دورِ شاہجہانی کے آخر میں کتب خانۂ شاہی کا داروغہ مقرر ہوا۔ اگرچہ آخری عمر کشمیر میں گزاری لیکن لاہور سے بھی اس کا خاصا تعلق رہا ہے۔ عالمگیر کے دور میں اس کے لیے چوبیس ہزار روپیہ سالانہ کا وظیفہ مقرر تھا۔ بقول آزاد ۱۰۸۱ھ میں فوت ہوا۔

شاہنواز خاں کے علاوہ دوسرے تذکرہ نویسوں نے بھی اس کی شاعری کی تعریف کی ہے۔ شاہنواز لکھتا ہے کہ معنی بندی اور سخن سنجی میں استاد ہے۔ تذکرہ نصر آبادی میں ہے کہ شاعری میں اسے بڑی قدرت تھی۔ سرخوش نے اس کی انشاپردازی کی بھی تعریف کی ہے۔

بڑا شوخ طبع تھا۔ چنانچہ صاحب تذکرہ نصر آبادی نے لکھا ہے کہ وہ اپنے دوستوں، کلیم اصفہانی اور دوسرے شعرا کو گھر میں دعوت پر بلاتا اور کھانے کی چیزوں میں کوئی نہ کوئی نشہ آور شے ملا دیتا۔

بقول آزاد بلگرامی اس کا دیوان قصائد، غزلیات، مثنویات اور دیگر اقسام شعر پر مشتمل ہے۔ اور چھوٹی چھوٹی مثنویاں اس نے متعدد لکھی ہیں۔ اس کے علاوہ اس نے شاہجہان کے تیس سالہ واقعات بھی قلمبند کیے، جو سرخوش کے لفظوں میں "از مُلّا حمید وغیرہ فصیح تر نوشتہ۔ اما بہ اعتقادِ فقیر از منطوقۂ "خیر الکلام ما قلّ و دلّ"! این نیز بہرہ نداشت"۔ انتخاب: ساقی نامہ کا ایک شعر:-

حکیمانہ ساقی بہ مجلس نشست — چو انبض مینا نگیرد بدست

ہردم نوید لطف دگر می دہد مرا — دل می برد ز دست و جگر می دہد مرا

کشتیِ بدست آور دقت کشت مہتاب است

مدعای میخواران سبز عالم آب ست

گر پوستم چو نافہ کشد آسمان بجاست

مو شد سفید و تیرگیِ دل ہمان بجاست

ناقصان ہم بدرش چشم طمع دوختہ اند — کو رہ پیوستہ نظر جانب بالا دارد

چشم آن لحظہ کہ در ہجر تو بیدار شود — خار پشت مژہ ام غیرت گلزار شود

عقل ناچار کشد زحمت آلایش نفس — دایہ پرہیز کند طفل چو بیمار شود

ما بزندانِ غمت خو بانشستن کردہ ایم — گاہ گاہی نالۂ زنجیر ما از زنجیر ما

لقمۂ چرب خوشامد نکند رام مرا — دلِ من از سگ کوی تو وفادار ترست

از بسکہ دستِ من ز تعلق بریدہ است — رنگ گرفتہ را بہ حنا باز می دہد

ہر کجا بود مرا نسبتہ صفت باخود داشت   ہر گزم می نتوانست کہ بیخود سازد

چشم بسان آئینہ در عیب خلق نیست
پیوستہ ہمچو عکس خودم در کمین خویش

منیر لاہوری | ابو البرکات نام منیر تخلص۔ ۱۲ رمضان المبارک ۱۰۱۹ھ کو بمقام لاہور پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید آزاد بن عبدالمجید ملتانی لکھا ہے لیکن محمد صالح کنبوہ نے عبدالجلیل ابن حافظ ابو اسحٰق لکھا ہے۔ جو درست ہے۔ منیر پانچ سال کی عمر میں مکتب میں بٹھائے گئے۔ بچپن ہی میں طبیعت شعر و سخن کی طرف مائل تھی۔ حافظہ بلا کا پایا تھا۔ چودہ سال کی عمر سے خود شعر کہنے لگے۔ فغانی، ثنائی اور انوری کی پیروی کی۔ شروع کا کلام چونکہ خامیوں سے پُر تھا اس لیے کوئی پندرہ ہزار اشعار کے قریب ضائع کر دیئے۔ ان کا موجودہ کلیات پچاس ہزار کے قریب اشعار پر مشتمل ہے۔

۱۰۴۵ھ میں منیر اکبر آباد گئے اور سیف خاں کے ہاں ملازم ہو گئے اور دو سو بیس[220] روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ سیف خاں نے ان کی بہت قدردانی کی۔ اور ان کا زمانہ سیف کی صحبت میں نہایت مسرت و فارغ البالی سے گزرا۔ سیف جب بنگال گیا تو منیر بھی اس کے ساتھ تھے۔ اور وہیں اپنی "مثنوی در صفت بنگالہ" لکھی۔ ۱۰۴۹ھ میں سیف خاں فوت ہو گئے تو یہ پٹنہ آ گئے۔ وہاں سے الہ آباد آئے پھر اعتقاد خاں نے انھیں جونپور بلوا لیا۔ جہاں چار روپیہ روزانہ مشاہرہ مقرر ہوا۔ لیکن جلد ہی یہاں سے دل اُچاٹ ہو گیا۔ پھر اعتقاد خاں نے بھی اچھا سلوک نہ کیا۔ اور تنخواہ کم کر دی۔ آخر وہاں سے آگرہ چلے آئے۔ یہاں وہ دربار شاہی کے شعرا میں داخل ہو گئے۔ ۱۰۵۰ھ میں اپنے رقعات کا مجموعہ شائع کیا۔ ۱۰۵۲ھ میں شعرائے ہند کے حالات میں ایک تذکرہ لکھا۔ اس میں کچھ خامیاں رہ گئی تھیں۔ ان کی اصلاح کسی اور موقع پر اُٹھا رکھی۔ ۱۰۵۴ھ میں اصلاحیں کی گئیں۔ دیباچہ باقی تھا جسے محمد صالح نے ۱۰۵۶ھ میں پورا کر دیا۔ یہ تذکرہ، بقول حافظ محمود شیرانی مرحوم بالکل مفقود ہے۔

منیر نے عین عالم شباب میں بعمر ۳۶ سال ۱۰۵۴ھ میں بمقام اکبر آباد وفات پائی۔ (آزاد نے ۱۰۵۸ھ لکھا ہے)۔ بقول آزاد بلگرامی نعش وہاں سے لا کر لاہور میں دفن کی گئی۔

ان کی شاعری کے بارے میں صالح لکھتا ہے کہ اگرچہ یہ لاہور میں پیدا ہوا لیکن اس کا کوکب بخت دقیقہ سنجی معانی میں اہل ایران سے بھی ہزار درجہ ارتقا پذیر ہوا۔ تذکرہ حسینی میں مرقوم ہے کہ عالمگیر کی تخت نشینی پر دوسرے شعرا کی مانند اس نے بھی سکہ کہا جو بہت پسند کیا گیا۔

سکہ زد در جہاں چو بدر منیر
شاہ اورنگ زیب عالمگیر

اشرفی کی خاطر لفظ "بدر" کی بجائے "مہر" داخل کیا۔ عالمگیر جب اس سے محظوظ ہوا تو منیر کو انعام کی توقع ہوئی۔ لیکن اس نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اس کو غنیمت نہیں سمجھتے کہ میرے سکے میں تم نے اپنا نام داخل کر لیا۔

منیر کی انشا بہت مشہور ہے اس کے علاوہ شاعری میں بھی اسے خاصی شہرت حاصل تھی۔ چنانچہ صالح لکھتا ہے:

"طبعش مانند ماہ چاردہ[14] درست و روشن، در انگیزش معانی و پردازش خیالات

بی انبار، و در ابداع عبارات بدیعه و مضامین عالیه از سایر نکته وران ممتاز۔"

اسی طرح صاحب "تذکرہ حسینی" نے اسے "شاعر ماہر و منشی دلپذیر" لکھا ہے۔ (اس کی مثنوی در صفت بنگالہ، ادارہ مطبوعات حکومت پاکستان نے شائع کی ہے)۔

بشارت بادای دل، دلنوازی کرده ام پیدا — نگاری شوخ چشمی عشوه سازی کرده ام پیدا
سرم وارد ہوای سجدهٔ کوی پری رو بی — ز طوف کعبه و دیر احترازی کرده ام پیدا

باز وقت آمد که از کیفیت فیض ہوا — ابر گردد تر دماغ و گل شود رنگین ادا
مسطرش از رشتهٔ باران کند ابر بہار — چون نگارد وصف گل بر کاغذ ابری ہوا
از تماشای چمن نظاره رنگین می شود — میتوان بستن کنون بر پنجهٔ مژگان حنا

کشتهٔ آن شوخ بیباکم که در محشر منیر — ہر نگاه تازهٔ او خونبهای دیگر است

امشب نگاه گرم تو "گرم آشنای" کیست — رخسار دلفروز تو شمع سرای کیست
رفتار دلکشت رہ ہوش که می زند — بالای تو بجلوه فروشی بلای کیست
بی تو گشته دیدهٔ آئینه بی رخت — اکنون خیال روی تو حیرت فزای کیست
ما خود به نیم ناز تو کردیم جان فدا — چین جبین و عقدهٔ ابرو برای کیست
صد دل شہید تیغ ادای تو گشته اند — ناز و کرشمهٔ تو، بگو، خونبهای کیست

پیش از کرشمهٔ تو ستم در جهان نبود — "تا او نبود عربده جو در جهان نبود

رخت بدامن صبح آفتاب می ریزد — لبت بجام تبسم شراب می ریزد
بہار حسن ترا نازم ای بہشتی رو — که دسته دسته گل اندر نقاب می ریزد

من از آتش محبت تو و آتش جوانی — من و عشق جاودانه تو و حسن جاودانی
نه مرا زبان شکوه نه ترا دہان خنده — من و رنج بی زبانی تو و قید بی دہانی

چو نسیم نوبہاری چو ہوای صبحگاہی — سخنم بتازه روئی نفسم بگل فشانی
ز متانت و جزالت ہمه لفظ و معنی من — چو خرد بکہنه سالی چو ہوس بنو جوانی
چو روم سوی گلستان غزل مرا سرایند — ہمه بلبلان گلشن زده مزاج دانی

بیخود ملا محمد جانی تخلص بیخود۔ سرخوش نے اسے لاہوری لکھا ہے۔ بقول صاحب "تذکرہ حسینی" نامدار خان سے وابستہ تھا۔ اسی وجہ سے سرخوش نے اسے نامدار خانی لکھا ہے۔ صاحب دیوان اور شاعر غرّا تھا۔ اس کے قطعات و قصائد بقول سرخوش بڑے دلچسپ اور رسا ہیں۔ تاریخ گوئی میں اسے بڑی مہارت تھی۔ چنانچہ عمدۃ الملک امیر الامرا اسد خاں کے بیٹے کے تولد پر یہ تاریخ کہی:

" ز برج اسد زد نمود آفتاب "

کامگار خاں کے بیٹے یار خاں کی ولادت پر تاریخ ذیل کہی:

"شرف یارِ کامگار"

ایک امیر کے بیٹے کی ولادت پر تاریخ کہی۔ جب وہاں سے کچھ نہ ملا تو ایک فحش قطعہ لکھ کر کسی دوسرے مرقع پر پیش کیا۔ نامدار خاں کے نام پر ایک مثنوی حسن و دل لکھی جس میں سرخوش کے مطابق، داد سخنوری دی ہے۔ اس مثنوی کا تاریخی نام "حسنِ نامدار خانی" رکھا۔ بقول دوست سنبھلی اس نے ۱۱۰۸ھ میں وفات پائی۔ سرخوش نے اس کے اپنے کہے ہوئے مصرع

"جامی از جام ہمہ بیخود شد"

سے تاریخ وفات نکالی۔

جب وہ نواب جعفر خاں کے پاس نوکر ہوا تو مجلس میں بیٹھنے کے لیے اس نے ایک قطعہ گزرانا جس کے دو شعر یہ ہیں:

بود طاعت فرض ہمچو نمازم	بفرمائی بندہ از جا نشیند
ہمیں طاعت حق نماز است و روی	گہی بندہ ایستد گہ از پا نشیند

اور اس طرح بیٹھنے کی اجازت اور مصاحبت حاصل کر لی۔ نمونۂ کلام:

ہر کس کہ دل از مدار دنیا برداشت	عبرت ز شمار کار دنیا برداشت
گہ بند زمین بر سر گاو است، بلی	گاو است کسی کہ بار دنیا برداشت

مُلّا شاہ

مُلّا شاہ حضرت میاں میر رح لاہوری کے خلفا میں سے اور دارا شکوہ کے مرشد تھے۔ بقول صاحب عمل صالح بدخشاں کے رہنے والے تھے۔ والدین کی زندگی میں طلب علوم میں مشغول رہے۔ علوم رسمی اور فنون عقلی و نقلی کے حصول کے بعد درد طلب دامنگیر ہوا تو وطن سے نکل کھڑے ہوئے اور بقول صاحب مفتاح التواریخ، وہاں سے کابل پہنچے اور ایک تاجر کے ہمراہ کابل سے لاہور آ گئے جہاں میاں میر رح کے ہاتھ پر بیعت کی۔ (صالح نے لکھا ہے کہ ۱۰۲۳ھ میں یہاں آئے) یہاں انھوں نے بہت ریاضت کی۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ آپ مسلسل تیس سال تک بالکل نہیں سوتے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ صالح کا کہنا ہے کہ مرشد کے کہنے پر کشمیر گئے۔ لیکن بیل (BEALE) لکھتا ہے کہ میاں میر رح کی وفات کے بعد گئے۔ بہرحال بعد میں انھوں نے گرمیوں کا موسم کشمیر میں اور سردیوں کا موسم لاہور میں گزارنا شروع کیا۔

شاہجہان، دارا شکوہ اور کئی ایک امرا کو ان پر بہت اعتقاد تھا۔ چنانچہ بقول مؤلف ظفر نامہ رنجیت سنگھ جب دارا شکوہ اورنگ زیب کے خوف سے ان کے پاس آیا تو انھوں نے اسے کہا "ترا دولت مغروری است۔ چشم بر بند" اور جب اس نے آنکھ بند کی تو عالمگیر کو بادشاہ بنے اور خود کو جنت میں دیکھا۔ بقول بیل شاہجہان کہا کرتا تھا کہ ہندوستان میں دو شاہ ہیں ایک شاہجہان اور دوسرا مُلّا شاہ۔ مگر بعد میں شاہجہان کے محبوس ہونے اور دارا شکوہ کے قتل کے بعد الحاد سے متہم ہوئے۔ اورنگزیب نے جبراً انھیں کشمیر سے طلب کیا۔ مجبور ہو کر لاہور پہنچے۔ اثنائے راہ میں عالمگیر کی تخت نشینی کی تاریخ

کہہ کر دہلی بھجوائی :-

صبح دل من چون گل خورشید شگفت	حق ظاہر شد و غبار باطل را رُفت
تاریخ جلوس شاہ اورنگ مرا	ظل الحق گفت الحق این راحق گفت

بادشاہ نے جب رباعی پڑھی تو دربار میں حاضر ہونے سے معاف کر دیا اور حکم دیا کہ وہیں لاہور میں رہیں۔ مرآۃ جہاں نما میں ہے کہ سنہ ۱۰۷۰ھ میں بمقام لاہور وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔ مخبر الواصلین میں سنہ ۱۰۶۹ھ اور عمل صالح میں سنہ ۱۰۷۲ھ سن وفات دیا ہے۔ (موخر الذکر زیادہ مستند ہے)

ملا شاہ نے تقریباً ہر صنفِ سخن مثلاً قصیدہ، غزل، رباعی اور مثنوی وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے۔ بقول صالح ان کے اشعار بڑے آبدار ہیں۔ اور بقول تفاسس ولیم بیل عارفانہ اور موحدانہ اشعار کہتے تھے۔ (ملا شاہ کی مثنویات اور رباعیات کے مخطوطہ جات پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہیں) ۔ انتخاب :-

از شش جہتم روی نمودی آخر	از ہر طرفی دام ربودی آخر
بیرون و درون جلوہ گری می دیدم	بر تحقیق آمدم تو بودی آخر
ای بند بپای و قفل بر دل ہشدار	وی دوختہ چشم پای ور گل ہشدار
عزم سفرِ مغرب و رُو بہ مشرق	ای راہرو پشت بمنزل ہشدار
مشکل کہ شود ز عقل یک مشکل حل	حالی است کہ دست دفع امراض وعلل
بے حال محال حق شناسی از عقل	روشن نشود جہان ز نور مشعل
ای دوست مگر ز درد پابی درمان	وز گرمی آگہی تگہ با سر دان
آگاہی حق شریعت مردانست	غفلت نام شریعت نامردان

برہمن

رائے چندر بھان نام اور برہمن تخلص۔ باپ کا نام پنڈت دھرم داس تھا۔ برہمن لاہور میں پیدا ہوا اور یہیں پرورش پائی۔ اس نے اپنی ایک تصنیف "چہار چمن" کے تیسرے چمن میں اپنے کچھ سوانحی حالات دیئے ہیں وہ لکھتا ہے "میں پنجاب کا برہمن ہوں۔ میرا باپ دھرم داس منشی گری کا کام کرتا تھا۔ اور شاہی منصبداروں کے ذیل میں صاحبِ امتیاز تھا۔ بعد میں وہ ترکِ ملازمت کر کے گوشہ نشین ہو گیا۔ میرے دو بھائی اور تھے، رائے بھان اور اودے بھان۔ میں نے اور رائے بھان نے تجرد اختیار کیا۔ کیونکہ ہمارے سر میں آزادی کی ہوس تھی۔ اودے بھان عاقل خان رازی کے یہاں ملازم ہو گیا۔ اس کی وفات کے بعد رائے بھان بھی ملازم ہو گیا۔ اور آخر مجھے بھی عاقل خاں کی وساطت سے ملازمت مل گئی۔ خانِ مذکور نے مجھے ایک ہاتھی دے رکھا تھا تاکہ سواری کے وقت اس کا ہم کلام رہ سکوں۔ مجھے عبدالحکیم سیالکوٹی سے تلمذ حاصل ہے۔"

دراصل برہمن تعلیم سے فارغ ہو کر میر عمارات لاہور و اکبرآباد امیر عبدالکریم سے وابستہ ہوا۔ اس کے بعد افضل خاں (امیر ملا عبدالشکور شیرازی) جو وزیر الکل تھا، کے سیکرٹری کی حیثیت سے خدمت سرانجام دیتا رہا۔ اور قیام اس کا لاہور ہی میں رہا۔ افضل خاں کی وفات (۱۰۴۹ھ) کے کچھ عرصہ بعد جب شاہجہان لاہور آیا تو اس نے اسے اپنی خدمت کے لیے

منتخب کیا۔ اور پھر ترقی کرتے کرتے وقائع نویس حضور ہو گیا۔ جس کے سبب وہ دربار میں حاضر رہتا اور ہر روز کے واقعات لکھتا۔
دارا شکوہ کو اس سے خاص رغبت تھی۔ چنانچہ اس نے شاہجہان سے کہہ کر اس کی خدمات حاصل کیں اور اسے اپنا میر منشی بنایا۔ جب علامہ سعد اللہ فوت ہوتے تو شاہجہان نے اسے واپس اپنے پاس بُلا لیا۔ اور ساتھ ہی اسے رائے کے خطاب سے بھی نوازا۔ جب دارا شکوہ قتل ہوا تو یہ بھی شاہی ملازمت سے سبکدوش ہو گیا۔ اور بقول مؤلفین بہارستان سخن و مراۃ الخیال سبکدوشی کے بعد بنارس میں جا کر گوشہ نشینی کی زندگی بسر کی۔ اور وہیں وفات پائی۔ بقول صاحبانِ بہارستان سخن اور مراۃ الخیال سنہ ۷۳ھ اور مراۃ جہان نما کے مطابق سنہ ۶ھ میں فوت ہوا۔ تذکرہ شمع انجمن میں سنہ وفات سنہ ۱۰۹۲ھ دیا ہے۔ لیکن اوّل الذکر دونوں تذکروں کی روایت زیادہ صحیح ہے۔

برہمن طبعاً مذہبی آدمی تھا۔ اسے مذہبی امور سے خاصی دلچسپی تھی۔ اسے اپنے ہندو ہونے پر فخر تھا۔ فنِ خطاطی میں بھی کمال حاصل تھا۔ چنانچہ تذکرہ خوش نویسان میں بطور خوش نویس کے اس کا ذکر درج ہے۔

میر عظمت اللہ بیخبر نے سفینہ میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ شاہجہان نے اسے چند شعر سنانے کے لیے کہا۔ جس پر برہمن نے یہ شعر پڑھا:۔

مرا دلیست بکفر آشنا کہ چندیں بار
بکعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

بادشاہ کی طبیعت اس سے منغض ہو گئی۔ لیکن افضل خاں نے سعدی کا یہ شعر

خر عیسےٰ اگر بمکہ رود　　　　چوں بیاید ہنوز خر باشد

پڑھ کر زمین ہموار کر دی۔

ذیل کا مشہور شعر بھی اس سے منسوب کیا جاتا ہے:۔

ببیں کرامت بتخانۂ مرا اے شیخ　　　　کہ چوں خراب شود خانۂ خدا گردد

لیکن شفیق کا کہنا ہے کہ یہ شعر اس کا نہیں ہے۔ سرخوش لکھتا ہے کہ تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ شعر کسی اور ہندو کا ہے اور یہ کہ ایک دن مرزا محمد علی ماہر نے اس سے پوچھا کہ یہ شعر تمہارا ہے۔ کہنے لگا "شاید میں نے ہی کہا ہو مجھے یاد نہیں"

دیوان کے علاوہ، جس میں بقول حسرت موہانی کے شاید ہی کوئی غزل پانچ اشعار سے زیادہ کی ہو، اس کی دیگر تصنیفات یہ ہیں:

(۱) چہار چمن - (۲) سوال و جواب لعل داس و دارا شکوہ (۳) انشائے برہمن (۴) تحفۃ الانوار (۵) گلدستہ (۶) نگارخانہ (۷) تحفۃ الفصحا اور (۸) مجموعۃ الفقرا۔

محمد صالح کنبوہ نے اسے شاہجہانی دور کے ممتاز شعراء میں شمار کیا ہے۔ سرخوش کے مطابق وہ "طبع درست" کا مالک اور قدما کی طرح صاف و شستہ شعر کہتا تھا۔ اور "در ہندوان غنیمت بود"۔ نمونۂ کلام:

ہر نفس تو بوی محبت آید از گفتار ما　　　　می تواں فہمید از گفتار ما کردار ما

عشرت آن بود کہ در عالم نادانی بود ــــ خواہم از ژندہ انجام بہ آغاز افتم
ای برتر از تصور و وہم و گمان ما ــــ ای در میان ما و برون از میان ما
در جہان باش و لیکن ز جہان فارغ باش ــــ ہر کہ فارغ ز جہانست جہانی با اوست
گذشت عمر و درین فکر و من ندانستم ــــ کہ جرم کفر کدام و ثواب ایمان چیست
چو ہر دو را نظری بر بہار رحمت اوست ــــ بہم نزاع دل کافر و مسلمان چیست
فکر بیہودہ غمہای جہان نتوان کرد ــــ خویش را در گرد سود و زیان نتوان کرد
بحر دنیاست در او سیل حوادث بسیار ــــ تکیہ بر رہگذر آب روان نتوان کرد
صورت حال گواہ دل غمگین کافیست ــــ شرح این راز بتقریر و بیان نتوان کرد
راز عشق است کہ در سینہ نہان باید داشت ــــ با کسی مصلحت راز نہان نتوان کرد

برہمن جز رہ تسلیم سپردن نتوان
سعی در پردہ تقدیر توان ؟ نتوان کرد

رباعی | تا چند ز جور فلک آزردہ شوی ــــ وز گردش روزگار افسردہ شوی
چون غنچہ بہ جمعیت خود راضی باش ــــ زان بیش کہ چون گل شوی پژمردہ شوی

برہمن | اس کا نام جگت رائے اور تخلص برہمن تھا۔ بقول شفیق اورنگ آبادی لاہور کا باشندہ تھا اور "قشقۂ قبول بر جبین داشت"۔ فارسی اور عربی میں اس نے خاصی مہارت بہم پہنچائی تھی۔ میرزا محمد طاہر نصر آبادی نے اپنے تذکرے میں اس کے متعلق لکھا ہے کہ سات سال ہونے کو آئے ہیں کہ وہ لاہور سے آکر یزد میں مقیم ہے "بسبب این کہ سودا با مردم داشت"۔ یزد کے عمال نے اس پر کچھ ظلم کیا جس کے باعث اس کا مال ضائع ہو گیا۔ سنہ ۱۰۹۱ھ میں طاہر اس سے یزد میں ملا۔ اس کا کہنا ہے کہ "شعر را بد نمی گوید"۔ حضرت ائمہ کی شان میں اس نے بہت سے شعر کہے ہیں۔ غرض کہ عجیب و غریب اطوار کا مالک ہے "اگرچہ قواعد ہنود را دارد اما شیعہ است"۔ انتخاب:

گر کشاید مطلع حسن تو از فکرم نقاب ــــ دعوی روشن دلیہا می کنم با آفتاب
خواب می دیدم کہ سرسبز مرادم کردہ اند ــــ می خورد کشت تمنایم ز ابر رحمت آفتاب
با مسیحا دعوی بالانشینی می کنم ــــ محضری در دست خود دارم بہ مہر آفتاب
چون شدم بیدار امیدا این چنین تعبیر کرد ــــ کز ثنای مرشد کامل شود دل کامیاب
مہر اوج کامگاری شہ سلیمان آنکہ ہست ــــ خاکساران را معین و سرفرازان را مآب
جذبۂ امرت بہ مردم گر کند نہی خطا ــــ تا قیامت کاتب اعمال بنویسد ثواب

بر سر ہر کس گذارد دست قدر تو کلاہ
می نشیند بگسرد گردن بلند از آفتاب

مخلص ابنائے واس نام اور مخلص تخلص۔ لاہور کا رہنے والا اور قوم دورہ بھنڈرہ میں سے تھا۔ خوشگو نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ ایک خلیق، شفیق اور بڑا گرم جوش" جوان ہے۔ لوگوں کے دلوں میں اس نے جگہ کر رکھی ہے۔ استعداد و قابلیت کے لباس سے آراستہ ہے انشا میں اسے مہارت حاصل ہے۔ خط شکستہ درستی سے لکھتا اور معاملہ فہمی و کاردانی میں یگانہ ہے۔

مخلص کچھ عرصہ نواب ابوالبرکات خاں صوفی عامل بٹالہ کے پاس منشی گری کی خدمت پر مامور رہا۔ لوگوں کے کام سنوارنے میں بڑی کوشش کیا کرتا۔

قدیم رنگ میں طبع آزمائی کرتا تھا۔ ایک موقع پر نواب مذکور صوفی تخلص نے ایک غزل طرح کی۔ جس کے جواب میں مخلص نے ایک غزل کہی۔ جس کے دو شعر یہ ہیں :۔

خمیر لعل تو از شہد و شور ریختہ اند ——— دہان تنگ تو از چشم مور ریختہ اند
جنون ماست بجوش از بہار فیض ازل ——— گل مراد بجیبم ز دور ریختہ اند

قصیدہ کے چند اشعار :

دشمن از خوف نہنگ تیغ خون آشام او ——— بچو ماہی سقنقور از جہان نایاب شد
ذرہ کو سایۂ دست بلندت یافتہ ——— پنجہ تاب پنجۂ خورشید عالمتاب شد
دریا ز عکس روی تو شد کان آفتاب ——— آئینہ از رخ تو شبستان آفتاب
بالطف لفظ و معنی حسنت نمی رسد ——— گر بر فلک رود ہمہ دیوان آفتاب

زان پیشتر کہ ساقی جام اجل چشاند
از بادۂ انا الحق سرشار کن دل ما

آفریں لاہوری شاہ فقیر اللہ نام آفریں تخلص۔ بقول آرزو لاہور کا رہنے والا تھا۔ اصلی وطن معلوم نہیں۔ حاکم لاہوری نے اسے" لاہوری الاصل" لکھا ہے۔ سرو آزاد میں ہے کہ وہ" محلہ بخارای لاہور" میں سکونت پذیر تھا[1]

عنفوان شباب میں اس نے تحصیل علم و فضل کی۔ بڑا فاضل اور جید عالم تھا۔ علم رمل میں بھی مہارت تھی۔ ناظم صوبہ استاد حفظ اللہ خاں پسر سعد اللہ خاں وزیر کے یہاں ان دنوں علمی محافل برپا ہوا کرتی تھیں۔ جن میں آفریں بھی اپنا کلام سنایا کرتا۔ اور اس طرح اس کی خاصی شہرت ہوگئی۔ ایک مرتبہ اسی حفظ اللہ کی مجلس میں، جس میں شعرا تے وقت شرکت کے متمنی ہوتے اور بار نہیں پاتے تھے، آفریں نے یہ شعر پڑھا :۔

آفریں تا دل ما گرد تعلق افشاند ——— مشت خاکی بہ سر مردم دنیا کردیم

---

[1] یہ محلہ اس جگہ تھا جہاں آجکل سرائے رتن چند اور میو اسپتال وغیرہ واقع ہیں (ادارہ)

نواب نے یہ سن کر برا محسوس کیا اور کہا کہ تم بھی داخلِ دنیادار ہے ہو؟ آفریں نے کہا جس وقت ہمارے دل نے گردِ تعلق جھاڑ دی ہم دنیا سے باہر آ گئے۔ اس پر نواب خاموش ہو گیا۔

بقول حاکم صغر سنی میں آفریں اپنے والد کے ہمراہ ناصر علی سرہندی سے ملا۔ اس نے تبرک کے طور پر اپنی ایک مثنوی عنایت کی۔ اور کہا کہ جب کبھی تیری چشم ہوش کھلے، اس کا مطالعہ کرنا۔ میرزا بیدل غائبانہ طور پر اس کی بڑی تعریف توصیف کیا کرتا اور اس کا یہ شعر اکثر پڑھتا:

حجابِ عشقم نداد رخصت سوال بوس از دہان تنگش
از و نمی آید این مروت ز من نمی آید این تقاضا

ناصر علی کو اس کا شعر ذیل بہت پسند تھا:

نسیمی میکند نیلوفری صبح بنا گوشت　　فغان ہای شب ہجران شنیدن ہا چہ میدانی

آفریں علوم عربی میں بھی فارغ التحصیل تھا اور شعر و شاعری سے اسے بیحد رغبت تھی۔ مثنوی مولانا روم پر خاصا عبور تھا۔ اس کے علاوہ اساتذۂ قدیم کے بہت سے اشعار اسے زبانی یاد تھے۔ اس کمال کے باوجود خود کو حقیر جانتا تھا۔ غربا و فقرا سے انکسار اور تواضع سے پیش آتا۔ بقولِ خانِ آرزو بڑا خوش مشرب، آزاد، متوکل اور مرد آدمی تھا۔ دنیوی اغراض سے بے اعتنا تھا۔ اسی وجہ سے اغنیا کی مدح وغیرہ نہیں کی۔ لاہور کے صوبہ دار خصوصاً سیف الدولہ عبدالصمد خاں اور اس کا بیٹا زکریا خاں اس کی بہت تکریم و تعظیم کرتے تھے۔ خود یہ امرا وغیرہ سے بڑے استغنا اور کبر سے ملتا۔ حاکم لکھتا ہے نواب عبدالصمد خاں سیف الدولہ اس سے ملاقات کا بڑا خواہشمند رہتا لیکن اس نے ہمیشہ ملنے سے احتراز کیا۔ آخر کسی عزیز کے مجبور کرنے پر اس سے ملا۔ نواب نے بڑی تکریم کی، اپنی مسند پر بٹھایا اور ایک روپیہ یومیہ مقرر کیا۔ آفریں اسلاف کو ہمیشہ اچھے الفاظ سے یاد کرتا اور تمام کو اپنا استاد و مرشد سمجھتا۔ اور اسی وجہ سے اس نے کبھی کسی کے شعر پر اعتراض نہیں کیا۔

ان دنوں مسجد وزیر خاں کے صحن میں اکثر شعرائے معنی داں اکٹھے ہوا کرتے اور مشاعرہ منعقد ہوتا۔ آفریں بھی ان مشاعروں میں شرکت کرتا۔ چنانچہ ایک موقع پر جب ملا اعجاز نے ناصر علی کے ایک شعر پر اعتراض کیا تو آفریں نے اس کی اس طرح وضاحت کی کہ اعجاز خاموش ہو گیا۔

اسّی سال کی عمر میں ۱۱۵۴ھ میں بمقام لاہور وفات پائی۔ حاکم نے تاریخ کہی

"رفت نقادِ معنی از عالم"

پانچ چھ ہزار اشعار کا دیوان جس میں غزلیات و قصائد ہیں، اور تین مثنویاں ابجدِ فکر عہد عالمگیر میں، اور ایانِ معرفت بہادر شاہ کے زمانے میں اور ہیر رانجھا فرخ سیر کے دور میں، اس سے یادگار ہیں۔ (آزاد بلگرامی جب ۱۱۴۳ھ میں اس سے ملا ہے تو اس وقت ہیر رانجھا لکھنے میں مصروف تھا) موخر الذکر مثنوی امرتسر میں چھپ چکی ہے لیکن مطبع والوں نے غلطی سے اسے کسی اکبر علی شاہ پنجابی سے منسوب کیا ہے۔

آرزو اسے خوش زبان، تازہ خیال شاعر کہتا ہے۔ تذکرہ حسینی میں اس کی تعریف یوں آئی ہے "شاعر متین ... مسلم

شعر خوب میگفتہ و انواع لآلی معانی در سلک الفاظ می سفتہ" بقول حاکم، میرزا صائب اور ناصر علی کے رنگ میں شعر کہتا تھا۔ نمونہ کلام یہ ہے :-

خوشا دوری کہ در عالم ایازی بود و محمودی
وفا عنقا، محبت کیمیا شد در زمان ما

ما تنگ قسمتان ز دہانش بخط خوشیم
چون روزہ دار صبح امید ست شام ما

بپای نظرم عشق می خورد سوگند
خیال بندی تو کردن ہنوز بی ادبی ست

آفرین دستی کہ وا می کرد آن بند قبا
حلقہ امشب بر در چاک گریبان می زند

کجا رفتی کہ قربان گاہ کردی بزم عیشم را
ز جوش اشک خونین حلق بسمل آستینم شد

یکی ادا نشود با ہزار عمر ابد
اگر بقدر جفاہا وفا توانی کرد

شب کہ ابود بہر نخل تو کان سبب ذقن
گوی چوگان زدہ از گردش رنگست ہنوز

ای خداوند دل "درد گرفتارش" دہ
شبنم از خون جگر بہ گل رخسارش دہ

اولش مست جنون ہمچو من غمزدہ کن
بعد از ان رہ بہ پریخانہ دیدارش دہ

ہنوز دامن حسنت ز صبح پاکتر است
ہنوز ماہ تو ایمن ز داغ رسوائی است

نہال مہر و وفا تا چہ بار می بندد
بہار حسن ترا آفرین تماشائی است

واقف

نور العین واقف، بقول خان آرزو اس کے باپ دادا بٹالہ کے قاضی تھے۔ خود واقف بھی بٹالہ ہی کا تھا لیکن اس نے، جیسا کہ حاکم لاہوری نے لکھا ہے کہ واقف تیس سال سے مجھ سے آشنا ہے اور شاہ آفرین کے یہاں ہماری صحبتیں رہی ہیں، لاہور میں ایک خاصی عمر گزاری۔ غالباً اسی وجہ سے غنی فرخ آبادی نے "تذکرۃ الشعرا" میں اسے لاہوری لکھا ہے۔

آرزو لکھتے ہیں کہ واقف علوم سے بہرہ ور اور شعر خوب کہتا ہے۔ مجھ سے اس نے اصلاح لینا چاہی لیکن مجھے خود اپنی استادی کا گمان نہیں اس سلسلے میں نے چند بار احتراز کیا۔ آخر اس کے اصرار پر ایک آدھ اصلاح کر دی۔ مشق سخن میں وہ پختہ ہو گیا۔ اگر اسی طرح مشق جاری رہی تو میرا خیال ہے اعلیٰ پائے کو پہنچے گا۔

حاکم لاہوری نے اس کے اوصاف حمیدہ اور اخلاق وغیرہ کی تعریف کرنے کے بعد اس کی شاعری کی یہ خوبیاں گنوائی ہیں: "اس کے افکار آبدار، بڑے پُر تاثیر اور پُر درد ہیں۔ معانی بلند و پاکیزہ اور شستہ و روان الفاظ نے اس کے کلام کو تازگی بخشی ہے۔" اگرچہ آرزو نے شمس الدین فقیر کی بڑی تعریف کی ہے، لیکن سچ تو یہ ہے کہ واقف پنجاب کا شمس الدین ہے۔"

"چھ سات ہزار اشعار پر مشتمل ایک دیوان ترتیب دیا۔ قصائد بھی لکھے۔ ایک ترجیع بند بھی لکھا جو قدما میں بھی کم ہی کسی نے لکھا ہو گا۔ غزل کا عاشق اور رباعی خوب کہتا ہے۔ جو کچھ کہتا ہے سیدھا دل میں اترتا ہے۔ تلاش و لطف سے خالی نہیں۔ اس کے کلام سے اس کی استادی اور پختگی کا پتہ چلتا ہے۔

واقف نے سنہ ۱۱۹۰ھ میں وفات پائی۔

انتخاب :

یار تا پایدار را چہ کنم
عمر بی اعتبار را چہ کنم

دل اگر خوش کنم بوعدۂ وصل | کاہش انتظار را چہ کنم
نہ بوصل است سازشم نہ بہجر | طبع ناسازگار را چہ کنم
گر تو ام نا امید می سازی | دل امیدوار را چہ کنم
گر نہ دیوانگی کنم واقف | خود بفرما بہار را چہ کنم
ہر غنچہ بشگفت الّا دل من | ای داد دل من صد داد دل من
ویرانۂ عشق معمورۂ حسن | مجنون دل من لیلی دل من
مقبول دیر و مردود کعبہ | کافر دل من ترسا دل من
در کوی جانان جان داد آخر | بیکس دل من تنہا دل من
یارب چہ سازم با سنگ طفلان | نازک دل من مینا دل من

حاکم حکیم بیگ نام حاکم تخلص - بقول آرزو مغلیہ خاندان سے تھا - اس کے والد کو شادمان خان کا خطاب ملا تھا - دادی کی طرف سے سید - (دادی اس کی قاضی میر یوسف کی اولاد سے تھی جو ہرات کے معتبر سادات میں سے تھا) اور والد کی جانب سے اوزبک اور رخ تھا - خود بقول حاکم اس کا باپ عالمگیر کے عہد میں بلخ سے دکن میں آیا - پھر مراد آباد میں سکونت پذیر ہوا - جہاں ۱۱۲۰ھ میں حاکم پیدا ہوا - شادمان خان منصب ہفت صدی پنجاہ سوار پر سرافراز تھا - فرخ سیر کے دور میں سہ ہزاری اور محمد شاہ کے عہد میں پنج ہزاری کے عہدے سے نوازا گیا -

حاکم ابھی بچہ ہی تھا جب فرخ سیر کے اول سال جلوس میں یہ لوگ لاہور آکر مقیم ہو گئے - ۱۵ سال کا تھا جب محمد شاہ کے پنجم سال جلوس میں اس کا باپ فوت ہو گیا -

حاکم کو لڑکپن ہی سے کتب فارسی اور اشعار اساتذۂ قدیم کے مطالعہ کا بے حد شوق تھا - اور یہی شوق اسے شاہ فقیر اللہ آفریں کے پاس لے گیا جن کی اس نے باقاعدہ شاگردی اختیار کی -

ایک موقع پر پنجاب کے صوبہ دار نے اس پر ظلم کیا اور اس کی جاگیر ضبط کر لی جس کے سبب اسے لاہور سے دہلی جانا پڑا - ۱۱۶۷ھ میں رائے بریلی گیا - صفدر جنگ وزیر اور اعتماد اور عماد الملک کا ہنگامہ ختم ہونے کے بعد یہ صفدر جنگ کے ساتھ اودھ چلا گیا - اس کی وفات کے بعد واپس دہلی آگیا - پھر حج بھی کیا - بہرحال اس کی عمر کا بیشتر حصہ یہیں لاہور میں گذرا - جس کے باعث یہ لاہور ہی مشہور ہوا - چنانچہ غنی فرخ آبادی صاحب تذکرۂ الشعراء نے اس کا وطن لاہور ہی لکھا ہے - بقول غنی اس نے ۱۱۸۲ھ میں وفات پائی -

خان آرزو نے اس کی بڑی تعریف کی ہے - وہ لکھتا ہے - حاکم طبع ہموار اور سلامت مزاج کا مالک ہے - شعر میں اس نے خاصی مہارت بہم پہنچائی ہے - کلام میں معنیٔ تازہ کی تلاش رکھتا ہے - حسن اخلاق پاس آشنائی اور اخلاص میں یگانۂ روزگار ہے -

ایک دیوان کے علاوہ تذکرۂ مردم دیدہ ، جسے حال ہی میں جناب ڈاکٹر سید عبداللہ نے مرتب کر کے پنجابی اکادمی

کی طرف سے شائع کیا ہے، اس کی قلمی یادگار ہے۔ ذیل کے چند اشعار خانِ آرزو کے انتخاب کردہ اشعار میں سے لیے گئے ہیں:

درگلشنی کہ مدعی آنجا چو گل شگفت ۔۔۔ ہرگز مرا چو نخلِ "خزان دیدہ" بار نیست

نیست معلوم کہ جان داد بہ ما دلِ شدگان
این قدر ہست کہ در کوی تو غوغای ہست

چون غنچۂ فسردہ کہ نشگفت در بہار ۔۔۔ گفتم بوصلش ہم دل من وا شود، نشد
ہستند زان دلیر بخون ریختن بتان ۔۔۔ کز یک ادا ادای دو صد خونبہا کنند

نہ بدرد آشنائی نہ بہ عشق راہ دارد
بہ چکار آید این دل کہ کسی نگاہ دارد

ہلاک چشم تو با مسکرد نخجیر افگن ناز ۔۔۔ دہد بگوشۂ ابرو جواب در زنہ خاک

وجدان | میر معصوم وجدان بقولِ آرزو "عالی نسب خان" کے خطاب سے مخاطب اور میر محمد زمان راسخ کا بیٹا تھا۔ حاکم لاہوری کا کہنا ہے حضرت سید میر کلال سادات سرہند کی اولاد سے تھا۔ فرخ سیر کے زمانے میں میر جملہ کے ہمراہ لاہور آیا۔ کچھ عرصہ کے لیے دہلی چلا گیا لیکن جب وہاں کوئی سلسلہ نہ بنا تو واپس لاہور چلا آیا۔ یہاں سیف الدولہ عبد الصمد کے پاس ملازم ہو گیا۔ نواب مذکور شعر فہم اور شاعر نواز تھا۔ اس نے اس کی خاصی مدد کی۔ اور اپنا ہمدم بنا لیا۔ اور ہر روز عصر سے پہلے یہاں ایک مشاعرہ ہوتا جس میں یہ سرخیل شعرا ہوتا۔ نواب سیف الدولہ کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے زکریا خان کے پاس رہا۔ بقولِ آرزو اپنی فضول خرچی کے سبب ہمیشہ قرضدار رہتا تھا۔ بعارضہ فالج سنہ ۱۱۶۰ھ میں بمقام لاہور وفات پائی۔ کچھ اوپر ساٹھ سال کی عمر پائی۔

بقولِ حاکم قصائد و مثنوی کے علاوہ اس کا ایک ضخیم دیوان بھی ہے جو کوئی بیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ بہت صاحبِ قدرت و تلاش تھا۔ شوخی، رنگینی، مضامینِ تازہ، اور زمین ہائے سنگلاخ میں طبع آزمائی اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ انتخاب:

نالہ پر سوختہ، اشک آبلہ پا ۔۔۔ کہ برد نامۂ لختِ دل ما
بیا مدی و شب آمد ز بی خوابیہا ۔۔۔ گہی زمین نگرم گاہ آسمان تنہا
دلی بیار دہ میخانہ عاشقانہ درآ ۔۔۔ بگو کہ شیشہ فروشم باین بہانہ درآ

چرا از می پرستی باز دارم در چمن خود را
کنم شرمندۂ ابر و گل و نسرین و سمن خود را

گل کی دم ہمسری با او زند ۔۔۔ این شاخچہ بندی بہار است

خوش خرامی کہ ز دروازہ برون سیرش نیست
گاہ بیگاہ اگر جلوہ کند کبک دری نیست

میرزا ابوالحسن قابل خان میرزا کے آباؤ اجداد ایران کے تھے۔ خود یہ اس برصغیر میں پیدا ہوا۔ بہادر شاہ اوّل کے عہد میں وارد لاہور ہوا۔ منصب داران شاہی میں سے تھا۔ لاہور میں شاہ آفرین لاہوری سے صحبتیں رہیں۔ "پرتمکین اور "اکابر وضع" تھا۔ نواب دلیر جنگ اس کی عزت و توقیر کرتا تھا۔ صاحب دیوان شاعر تھا۔ قصائد کے علاوہ ایک مثنوی بھی لکھی۔ جو پختہ مشقی کی دلیل ہے۔ بقول شفیق، محمد شاہ کے عہد میں ۱۱۵۰ھ اور ۱۱۶۰ھ کے درمیان فوت ہوا۔

نمونہ کلام:

آتش عنان بتان فرنگ اند چون شرر — شوخند ہمچو شعلہ و سنگ اند چون شرر

دو گہ بہ فغان کردنم از بسکہ ہوس بود — ہر اشک کہ از چشم من افتاد جرس بود

باد ابا آمے کہ از ہستی نشانی داشتم — دہ ہوا چون صبح گرد استخوانی داشتم

در نمازم جنبش مژگان یار آمد بیاد — از طپیدن صد جماعت را بیک تکبیر زدیم

بیک حلب آئینہ گردیدہ از شوق رخت — از تو ہر چند امید نگہے نیست مرا

مقیمائی میرزا مقیمائی بخارا کا باشندہ تھا۔ تیس سال میرزا صائب کی خدمت میں گزار کر عہد عالمگیر میں وارد دکن ہوا۔ پھر فرخ سیر کے دور میں لاہور پہنچا اور عبد الصمد دلیر جنگ سے وابستہ ہوگیا۔ نواب مذکور نے اس کی خاص عزت و توقیر کی۔ قریب ایک سو سال کی عمر پا کر محمد شاہ کے اوائل عہد میں فوت ہوا:

پی سپردم چمن شوخی نیرنگش را
غنچہ گردیدم و گل گشتم و بو گردیدم

ہنر حاجی بیگ ہنر لاہور میں نواب دلیر جنگ کے بخشی سعید قلی خان کے بیٹے زکریا قلی خان کی رفاقت میں رہا بلکہ بقول شفیق اورنگ آبادی اس کا "صاحب مدار سرکار" تھا۔ ہر فن میں صاحب سلیقہ تھا۔ خصوصاً انشا اور تیر اندازی میں مہارت بہم پہنچائی تھی۔ شاہ آفرین لاہوری سے تلمذ تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں دیوان مرتب کیا۔ محمد شاہ کے اواخر عہد میں وفات پائی۔ نمونہ کلام:

از طرز خرام تو سراپا روش اعجاز
ہر گرد کہ برخاست زجا کبک دری بود

یتیم میرزا نصر اللہ خان یتیم: اس کا باپ منعم بیگ، لاہور کے صوبیدار زبردست خان کے ملازموں میں سے تھا۔ اس نے شاعری میں آفرین لاہوری کی شاگردی اختیار کی۔ بقول حاکم صاحب "تلاش اور خوش فکر نوجوان تھا۔ آخر میں دیوانہ ہوگیا۔ جنون یہاں تک بڑھا کہ گلی کوچوں میں ننگا پھرتا۔ دیوانگی کے کچھ عرصہ بعد وفات پائی۔ بڑے اچھے شعر کہتا تھا۔ حاکم لکھتا ہے کہ اگر یہ زندہ رہتا تو استادی کے درجے کو پہنچتا: انتخاب:

آزاد بس از مرگ دلم کے زغم اوست — خشت لحدم تختۂ مشق ستم اوست

بود یک برگ گل از گلشن عشق
کوہ کن، تیشہ کہ بر سر زدہ است

ملا عارف

ملّا عارف لاہوری ایک ماہر شاعر تھا۔ ہمت خاں جو اس پر بہت مہربان تھا۔ بقول سرخوش دیوان مرتب کیا اور ایک مثنوی مہر و ماہ لکھی، جس میں نئے نئے مضامین پیدا کیے تھے۔ نمونہ کلام :

بی برگی منعم بود از کثرت سامان　　　لب تشنگی بحر ز بسیاری آب است

تیزی مژگان خونریز ترا حاصل نکرد　　　تیغ ہای آہنین ہر چند سر بر سنگ زد

فائق

نام میر سید احمد تخلص فائق، اور میر جلال الدین سعادت کا بھائی تھا۔ لاہور میں منصب و خدمت خزانہ پر مامور تھا۔ شاعر خوش فکر تھا اور سرخوش کے لفظوں میں معنی کے نشتہ و کیفیت سے غافل نہ تھا۔ انتخاب :

از شرم چشم مست تو خوبان نهفته اند　　　در آستین چو غنچهٔ نرگس، پیاله را

فزون ز ریگ روان تشنه در بیابان سوخت　　　هنوز دام فریب سراب می بافند

تا از گست به بزم فسون نگه نشست　　　چشم بتان ز سرمه بخاک سیه نشست

فرخ لاهوری

ملا فرخ حسین لاہوری، بقول دوست حسین سنبھلی ایک معنی یاب اور خوش گو شاعر تھا۔ اس نے فرخ سیر کی مدح میں بھی کچھ شعر کہے۔ انتخاب :

شب که بی روی تو دل جز گریه دمسازی نداشت　　　ناله چون مرغ در آب افتاده پروازی نداشت

دل که هر شام از هوسها تازه سامان میشود　　　چون سرای رهروان هر صبح ویران میشود

باشد و سامان چنین بی اختیارم کرده اند

چون امام مجسم بیرون از مشام کرده اند

بیرنگ

میرزا محمد بیگ بیرنگ ایک فاضل حکیم اور شاعر تھا۔ لاہور میں زندگی بسر کی۔ عبد الصمد خاں بہادر دلیر جنگ کے یہاں ملازم تھا۔ اس سے پہلے "جرگہ منصبداران" میں سعادت قلی خاں کا سالقی تھا۔ دلیر جنگ نے اسے اپنا مصاحب بنا لیا۔ ایک موقع پر ایک قصیدہ نواب کی مدح میں کہہ کر گزرانا جس پر خلعت اور تحسین و آفرین سے سرافراز ہوا۔

بقول حاکم ایک دیوان، جو چار ہزار اشعار پر مشتمل ہے اور جس میں زیادہ تر نعت و منقبت ہیں، اور ایک مثنوی اس سے یادگار ہیں۔ اگرچہ اسے استادی کا درجہ حاصل تھا اور اس دور کے استاد شعرا کے ساتھ ہم مشق و ہم طرح تھا، لیکن اسے شہرت نصیب نہ ہوئی۔ جلال اسیر کے طرز کا شیدائی تھا۔ با تمکین اور صاحب علم و حلم تھا۔ کچھ اوپر ساٹھ کی عمر پائی اور لاہور کے قریب ہی ایک جگہ پر انتقال کیا۔

انتخاب :

قطره قطره می بارد ابر تا چه میخواهد　　　ساقی آمد کی در یاب کاین هوا چه میخواهد

این زندگی بلاست ز سر وا نمی شود　　　سر بارها به تیغ بریدیم بچو شمع

آشفتہ

میرزا محمد صالح آشفتہ کابل کے نجبا میں سے تھا۔ گردش زمانہ کے سبب اسے لاہور آنا پڑا۔ طبع آزاد رکھتا اور متوکلانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ کم آمیز تھا۔ ۱۱۶۲ھ میں وفات پائی۔ نمونۂ کلام

خدا نکرده اگر چهره پر نقاب کند　　　بگردشی نگهی عالمی خراب کند

می رود دل بسر کوی تو پنہان از من ۔ بدگمان گشتہ ندانم بچہ عنوان از من

سیادت

میر جلال الدین نام ، سیادت تخلص ، مشہور محدث میر جمال الدین کا بیٹا تھا ۔ سرخوش ، دوست سنبھلی اور غنی نے اس کا وطن لاہور لکھا ہے ۔ سرخوش لکھتا ہے "صاحب فکر معانی و تلاش بلند بود" لیکن میری طرح شہرت و قبولیت اس کے نصیبے میں نہ تھی ۔ دوست نے اسے خوش گو شاعر کہا ہے ۔

ما لذت حیات ز غفلت نیافتیم ۔ چون نشئہ شراب کہ در خواب بگذرد

خبر نہ زندہ دلی نیست اہل مدرسہ را ۔ کہ دل بسان مگس در کتاب می میرد

گر ستارۂ بختم شرار کاغذ بود

کہ تا فسوختہ مرا از سرم نگرد گذرد

فدا

شیخ خیر اللہ فدا ، شیخ عبداللہ امانت خانی کا بیٹا اور لاہور میں سکونت پذیر تھا ۔ خواجہ سنگین خان کی صحبت میں زیادہ وقت گزارا ۔ خواجہ مذکور کی وفات کے بعد گوشہ نشینی اختیار کی اور تمام عمر حیات توکل و قناعت سے وقت کاٹا ۔ میرزا محمدی بیرنگ سے تلمذ تھا ۔ بقول حاکم لاہوری مثنوی گوئی میں اس کا کوئی عدیل نہ تھا ۔ مثنویوں میں معنی ہائے بلند اور مضمون ہائے دلپسند باندھتا تھا ۔ الفاظ کی تلاش اور شوخی میں زلالی کا ثانی تھا ۔ سبعۂ سیارہ کا جواب لکھنا چاہتا تھا ، اور چار مثنویاں کہہ بھی ڈالی تھیں ، مگر باقی کے لیے فرصت نہ ملی ۔ لاہور میں اپنے دور کا بے مثال شاعر تھا ۔ اور اس کے اشعار استادانہ ہوتے تھے ۔

چند اشعار حاکم لاہوری کی تعریف میں کہے جن میں سے دو تین یہ ہیں :-

می شدہ در ملک تمدیم سخن ۔ حاکم با اقتدار حکیم سخن

نبض شناس نگہ ناتوان ۔ محرم بیماری چشم بتان

درد دلم را کہ دوا می کنی ۔ کار بقا نوزہ شفا می کنی

مکتبی از مکتب تو درس خوان ۔ لیلی و مجنون بسواد روان

قلندر شاہ

قلندر شاہ لاہوری ایک صوفی بزرگ اور حضرت عبدالجلیل چوہڑ شاہ بندگی کے احفاد میں سے تھے ۔ ۱۱۷۱ھ میں بمقام لاہور پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد کے چچا پیر خدا بخش سے پائی ۔ انہیں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں گھومنے کا خاصا موقع ملا ۔ بریلی میں بدر الدین رہتکی کی بیعت کی ۔ ۱۱۹۷ھ میں واپس لاہور آ گئے ۔ ۱۲۳۲ھ میں بعہد رنجیت سنگھ لاہور ہی میں وفات پائی اور اپنی زمین موضع رتہ میں مدفون ہوئے ۔ یہ موضع انہی کی وجہ سے رتہ پیراں کے نام سے مشہور ہے ۔ ان کا فارسی دیوان ، جو ادبی اور تاریخی خصوصیات کا حامل ہے ، جناب غلام دستگیر نامی نے شائع کر دیا ہے ۔ سارا کلام متصوفانہ رنگ لیے ہوئے ہے ۔ نمونۂ کلام :

چو در چشم تو کحل ناز کردند ۔ در فتنہ بعالم باز کردند

دل سودا زدہ با زلف تو ربطے پیدا کرد ۔ بُرد دیوانہ دلیکن ہنرے پیدا کرد

سالہا سیر چمن خواہد و پروانہ چند ۔ در قفس بلبل من بال و پرے پیدا کرد

تاب دیدار تو بے پردہ تمنا دارد ... عاشق دلشدہ جان دگرے پیدا کرد
از لب بام سحر جلوہ چو خورشید نمود ... گریہ و زاری شبہا اثرے پیدا کرد

مائیم و کوئے عشق و ہزاران ملامتے
یارب درین مقام و رہی استقامتے

برق عالم سوز یارب یا کہ آہ ماست این ... یا شرر یا شعلہ یا آتش موسیٰ ست این
ارغوان باغ غم یا لالۂ داغ جنون ... یا کہ اشک لالہ گون عاشق شیدا ست این
یارب این گل یا سمن، یا ماہ یا مہر منیر ... یا کہ روی رشک ماہ دلبر زیبا ست این
یا کہ حرف قم باذنی ہست یا آب خضر ... یا کلام جان فزا یست یادم عیسیٰ ست این

بادشاہ و ملک حسن دیا گدائے کوی دوست
یا قلندر یا کہ رندے بے سر بے پاست این

میرزا اکرم بیگ چغتائی بقول صاحب ظفر نامہ رنجیت سنگھ یہ خاندان قاآنی میں سے اور "نواسہ زاد جنت مکانی" تھا۔ اس کا باپ عبدالکریم ایک بہت نیک آدمی تھا۔ والدہ اس کی مسجد وزیر خاں لاہور کے پیش نماز ملا صدیق کی لونڈی کے بطن سے تھی۔

میرزا اکرم کو لاہور کے کسی نعلبند کے لڑکے الٰہی بخش سے عشق ہو گیا۔ اور وہ لڑکا مدت تک اس کا محبوب و منظور نظر رہا۔ چنانچہ اسی کے غم ہجران اور سرور وصال میں اس نے ایک مثنوی "الٰہی بخش نامہ" لکھی۔ اس مثنوی سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے صرف و نحو، میزان و معانی، اور احادیث و تفاسیر وغیرہ کا علم حاصل کیا تھا۔ اور یہ کہ ایک رات میں تمام قرآن کریم پڑھ ڈالا۔

انتخاب مثنوی: (محبوب کی تعریف میں کہتا ہے):

از آن جملہ الٰہی بخش ما ہے ... بملک حسن و خوبی بادشاہے
مہ و مہر از رخش یا بندہ تابے ... تعالی اللہ بخوبی آفتابے
دو ابرویش دو محراب عبادت ... مقام سجدۂ اہل سعادت
خیال عارض آن ماہ تابان ... کنان سازد بدلہا جامۂ جان

دیوان امر ناتھ اکبری اس کے آباؤ اجداد کشمیری الاصل تھے جو شاہجہان کے عہد میں مختلف عہدوں پر مامور رہے محمد شاہ کے عہد میں اس کے بزرگ لاہور چلے آئے۔ اور یہاں اس کا باپ دینا ناتھ اچھے عہدے پر فائز رہا۔ اکبری بقول مرتب ظفر نامہ جناب سیتا رام کوہلی ۱۸۲۲ء میں پیدا ہوا۔ مولوی احمد بخش چشتی سے تعلیم حاصل کی۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کا منظور نظر تھا۔ بقول خود اس نے ۱۸۳۲ء (بعمر گیارہ سال) میں مہاراجہ کے حکم پر ظفر نامہ لکھنا شروع کیا۔ ظفر نامہ کے آخر میں اکبری نے اپنی مثنوی کے کچھ اشعار درج کیے ہیں جن میں تصوف کا رنگ چھایا ہوا ہے۔

اس مثنوی کے آخر میں مہاراجہ کی مدح کی ہے۔ انتخاب :

اے بخیالِ تو باورو نہا صفاست   جلوۂ ذاتِ تو بروں از ثناست

پرتوِ ذاتِ تو بود سینہ سوز   نورِ جہاں تابِ تو اختر فروز

کون و مکاں جلوۂ وحدت زِ تست   پرتوِ کثرت کسرت زِ تست

منزلِ جاں مظہرِ اسرارِ تست   منظرِ دل روزنِ دیدارِ تست

چشمِ خرد باید و بیدارِ دل   تا برسد بر سرِ اسرارِ دل

ذکرِ تو در سینۂ جانہا سرور   نامِ تو مشعلِ کشش نورِ ظہور

ماندہ قلم در رہ تو سرنگوں   بہرِ تو دل غنچہ صفت گشتہ خوں

اہلِ دلاں نورِ صفا از تو اند   مہبطِ الطاف و عطا بودہ اند

آتشِ سوزِ تو بجاں آمدہ   رازِ تو از پردہ عیاں آمدہ

نافۂ شوقم بزہ آرزو   شد لبِ صد نالۂ تو جرس در گلو

ہمچو جرس گریہ زنم زار زار   آبلہ در دل چو جرس پُر فگار

سوزِ تو در سینہ ام آتش زنیست   شوق بدلہا ز تو برق انگنیست

شورِ تو داغم نمک آلودہ کرد   حالِ مرا شوقِ تو فرسودہ کرد

دیدۂ حیرت ز تو گردید باز   عمر بسے کرنہ در راہت دراز

کوتہی ما بتہ آمد گواہ   در صفتت گشتہ زبان عذر خواہ

محبوب غلام محبوب سُبحانی، رئیسِ اعظم لاہور، ۱۸۴۲ء میں لاہور میں پیدا ہوا۔ نواب امام الدین خاں کا لڑکا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں اس کے بزرگ ہوشیار پور سے لاہور آ گئے تھے۔ اس کا دادا غلام محی الدین پہلے جالندھر دوآب کا گورنر تھا۔ پھر کشمیر آ گیا۔ اُس کے مرنے پر ۱۸۴۵ء میں محبوب کا باپ اپنے والد کا قائم مقام بنا۔ معاہدہ ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء کے وقت جس کے تحت لاہور دربار نے کشمیر مہاراجہ گلاب سنگھ کو سونپ دیا، نواب امام الدین کشمیر کا گورنر تھا۔ اسے بعد میں انگریزی حکومت سے خاصی جاگیر بھی عطا ہوئی۔ چنانچہ اسی جاگیر سے غلام محبوب سبحانی نے اپنا وقت کاٹا۔ آخر میں حکومت کی جانب سے آنریری مجسٹریٹ مقرر ہوا۔ لاہور میں بھاٹی دروازہ کے اندر جن مشاعروں میں حضرت علامہ اقبال اور ارشد گورگانی وغیرہم شامل ہوا کرتے تھے — وہ اسی کی سرپرستی میں ہوتے تھے۔ وفات دہلی میں دہلی دربار کے موقع پر ہوئی۔ نعش وہاں سے لا کر داتا گنج بخش رح کے مزار کے احاطہ میں دفن کی گئی۔

بقولِ لطیف، سبحانی عربی فارسی کا عالم تھا۔ لطیف نے اس کی شاعری کا ذکر نہیں کیا۔ بہرحال اگرچہ وہ کوئی بلند پایہ شاعر نہ تھا تاہم صاحبِ دیوان تھا۔ ۱۳۱۶ھ میں اس کا دیوان مطبع رفاہ عام لاہور نے بڑے سائز پر شائع کیا۔ جس کے سرورق پر اُسے انوری و خاقانی کا ہم مثل قرار دیا ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے :

ای رشک زردی تو گل یاسمنے را — خارے بدل از غیرت کو بت چمنے را

ہر جا کہ قدم رنجہ کنی گلبدنِ ما — برشکِ چمن خلد کنی انجمنے را

بزن آہستہ تر تیغم بوقت سر بریدنہا — فزیح عشقم و دارم بدل شوق طپیدنہا

تاب روی تو سوخت ہستیِ ما — در دچشمت فزود مستیِ ما

منزل عشق چون نشیمن ماست — برتر از اوج عرش پستیِ ما

با صنم یکدمے بموسم گل — بہ ز صد سالہ پارسائیہا

باز جوشش جنون بسر دارم — مژدہ باد ای برہنہ پائیہا

خواہیم بادۂ کہن دیار نوجوان

بیعت بدست پیر مغان کردہ ایم ما

فیض | مولانا فیض الحسن متخلص بہ فیض دخیال سہارنپور کے ایک زمیندار گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ والد کا نام خلیفہ علی بخش تھا۔ اس خاندان کے افراد اپنی علم دوستی کے باعث "خلیفہ" کے لقب سے لوگوں میں مشہور تھے۔

مولانا ۱۸۱۶ء میں پیدا ہوئے۔ شروع ہی سے بے حد ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ہی شرارتی تھے۔ لڑکپن کھیل کود اور کنکیے بازی میں کٹا۔ آغاز جوانی میں پہلوانی کا شوق چرایا۔ لیکن جلد ہی طبیعت اکتا گئی۔ اور آپ تحصیل علم کی طرف راغب ہوئے۔ فارسی کی کئی ایک کتب والد سے پڑھیں۔ بعد میں آپ کا ذوق اتنا بڑھا کہ بعمر ۲۰ سال فیض الحسن منطقی کے نام سے مشہور ہو گئے ادب سے لگاؤ کے سبب گھر بار چھوڑ کر دہلی چلے گئے۔ کچھ عرصہ مفتی صدر الدین آزردہ سے اکتساب فیض کیا۔ پھر اخون صاحب ولایتی سے حدیث کی سند حاصل کی۔ آخر میں مولانا فضل حق خیر آبادی سے معقولات اور ادب کی کتب پڑھیں۔ اور فلسفہ کی تکمیل کی۔ اب آپ فیض الحسن ادیب کے نام سے مشہور ہو گئے۔

دہلی کے علاوہ آپ نے رام پور اور لکھنؤ میں بھی جا کر علم کی خوشہ چینی کی۔ اس عرصہ میں آپ کی خاصی شہرت ہو چکی تھی۔ چنانچہ ۱۸۴۶ء میں سرسید احمد خاں مرحوم نے دہلی میں آپ سے مقامات حریری کے چند مقالے اور سبعہ معلقہ کے چند ایک قصائد پڑھے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں آپ سہارنپور واپس چلے آئے۔ کچھ عرصہ وہاں ایک رئیس کی ملازمت کی اور پھر علی گڑھ کا رخ کیا۔ جہاں آپ عربی کی بعض کتب کا ترجمہ کرنے پر مامور ہوئے۔ لیکن وہاں طبیعت نہ لگی۔ آخر موقع ہاتھ لگنے پر آپ ۱۸۷۰ء میں اورینٹل کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر ہو گئے۔ جب اس کالج سے عربی کا رسالہ "شفا الصدور" جاری ہوا تو اس کی ادارت بھی آپ کے سپرد ہوئی۔ اس رسالہ کے ذریعے مولانا نے کالج کے ماحول کو علمی رنگ میں رنگ دیا۔ اور اپنے شاگردوں میں عربی تحریر و انشاء کا ذوق پیدا کیا۔

لاہور میں آپ کوئی پندرہ سولہ برس تک علوم مشرقی کے استاد رہے۔ اور سینکڑوں شاگردوں نے آپ سے اکتساب فیض کیا۔ بقول صاحب "سیر المصنفین" مولانا اپنے عصر کے اصمعی اور ابو تمام سمجھے جاتے تھے۔ آپ کی ہندوستان گیر

شہرت یہیں لاہور سے شروع ہوئی، چنانچہ یہ عالم ہوا کہ بڑی بڑی دور سے شائقین علم و ادب کھنچ کر یہاں آنے لگے۔ چنانچہ علامہ شبلی مرحوم جیسے بلند پایہ عالم نے یہاں آکر آپ سے حماسہ کا درس لیا۔

کہتے ہیں کہ آپ کی علمی شہرت کے سبب، پنجاب یونیورسٹی کے ارباب بست و کشاد نے حکومت سے آپ کے لیے "شمس العلماء" کے خطاب کی سفارش کی۔ لیکن آپ نے اسے قبول نہ کیا، بلکہ یہ کہا کہ شمس العلماء تو میرے شاگرد ہیں میرے لیے اگر کوئی خطاب موزوں ہو سکتا ہے تو وہ "شمس شموس العلماء" ہے۔

آپ نے اکہتر برس کی عمر میں ۲۶ فروری ۱۸۷۸ء کو لاہور میں وفات پائی۔ وفات کے وقت سہارنپور کے مولوی ظہور الدین آپ کے پاس تھے۔ وصیت کے مطابق ان کی نعش سہارنپور لے جا کر دفن کی گئی۔

آپ فارسی، عربی اور اردو کے قادر الکلام شاعر اور باکمال ادیب تھے۔ آپ کی تصانیف کی تعداد بیس سے زیادہ ہے۔

آپ کا فارسی کلام چھپ چکا ہے جو ایک دیوان "نسیم فیض" اور دو مثنویوں "روضۂ فیض" اور "چشمۂ فیض" پر مشتمل ہے۔ بقول محمد عبداللہ قریشی صاحب آپ کے کلام میں بندش کی چستی، خیالات کی رنگینی، تراکیب کا تنوع، نفس مضمون کا دروبست اور الفاظ کا ترنم پوری طرح موجود ہے۔ اس کے علاوہ وہ صرف انہی خیالات کو شعری جامہ پہناتے، جو ان کے دل میں موجزن ہوتے تھے۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

امشب که دامنِ تست بدعا گذاشتم — بالِ هما بشهپرِ عنقا گذاشتم
چون پای خود بدامنِ راحت نمی‌کشم — آسودگی به نقشِ کفِ پا گذاشتم
شرم آمدم که شکوهٔ دردِ جگر کنم — دستِ طبیب بر پای مسیحا گذاشتم
کارم خراب بود که می‌کردم آرزو — خود را مشوش می که تمنا گذاشتم
بجز یک گنهم که نه دگر بر سرم نبود — وآن هم بحکمِ همتِ والا گذاشتم

از راستی فیض صحبت پیرِ مغان که باند
زهد و صلاح و توبه و تقوی گذاشتم

در خشنوانِ عیش درین خانه سوختیم — گاهی چو شمع و گاه چو پروانه سوختیم
ما خانهٔ بیگانه و بیگانه سوختیم — یعنی که خانقاه و صنم‌خانه سوختیم
سیماب پارهٔ ایست که قائم نمی‌شود — از اضطرابِ این دلِ دیوانه سوختیم
چون گل درین بهار شگفتیم چند روز — آخر بسانِ سبزهٔ بیگانه سوختیم

ای فیض ضبطِ آهِ شرربار تا بکی
آهی کشیده ایم که دیوانه سوختیم

چه تاب دست که دستِ ستم دراز کند — زبان به لرزه فتد از لفظِ بیداد

کرا مجال کہ سوئیش نظر کند بی باک ۔۔۔ کرا دماغ کہ پویش بدم کشد آزاد
حجاب عفت او مانع وصول نظر ۔۔۔ شکوہ مکنت او مبل و بدہ حساد
بحکم عصمت او کہ مناط عفت امت ۔۔۔ ببزم او نتوان غنچہ لب بخندہ کشاد

مثنوی چشمۂ فیض کا اختتام :-

الٰہی حسرت درد تو دارم ۔۔۔ بنہ سوز محبت در کنارم
منم مشتاق عشق آتش افروز ۔۔۔ منم در بند سودای خرد سوز
ندارم آرزوی گلشن و باغ ۔۔۔ ندارم جز تمنای گل و داغ
و ماغ لالہ و نسرین ندارم ۔۔۔ سر آن و ہوای این ندارم
الٰہی آتشی خواہم کہ یکلخت ۔۔۔ چو خار خشک سوزد خانہ و رخت
نمی خواہم کہ بر بستر نشینم ۔۔۔ مگر روزی بہ خاکستر نشینم

سرور مولانا حاجی حکیم مفتی غلام سرور لاہور کے با کمال اہل قلم اور "صد در یک" کی حیرت انگیز مثال تھے آپ حضرت بہاء الدین زکریا کی اولاد میں سے تھے۔ ۱۸۳۸ء مطابق ۱۲۴۴ھ لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد حکیم مفتی غلام محمد اپنے وقت کے ایک بلند پایہ عالم اور حاذق طبیب تھے۔

سرور نے ابتدائی تعلیم والد ہی سے حاصل کی۔ اس کے بعد تفسیر و حدیث، فقہ و تاریخ، صرف و نحو و معانی و منطق کا درس مولانا غلام اللہ فاضل لاہوری سے لیا۔ آخر میں اپنے والد سے علم طب پڑھا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد تصنیف و تالیف کا شغل اختیار کیا۔ ۱۸۸۲ء میں رائے بہادر کنہیا لال نے جو لاہور ڈویژن کے ایگزیکٹو انجنیئر اور آپ کے شاگرد تھے، اپنے محکمہ میں ملازمت دلا دی۔ لیکن آپ نے تھوڑی ہی مدت بعد استعفیٰ دے دیا۔ ۱۸۹۰ء میں آپ حج بیت اللہ شریف سے مشرف ہوئے۔ اگست ۱۸۹۰ء میں جب حج کر کے مدینہ منورہ جا رہے تھے تو راستہ میں مسافروں میں اچانک ہیضہ کی وبا پھوٹ پڑی۔ آپ بھی اس موذی وبا سے بچ نہ سکے۔ اور آخر ۲۷ ذی الحج ۱۳۰۷ھ کو آپ نے جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ بیر الاحسانی میں جو مضافات جنگ بدر میں سے ہے۔ دفن ہوئے۔ مولوی غلام دستگیر قصوری نے نماز جنازہ پڑھائی۔

آپ کی تصنیفات بیس کے قریب ہیں۔ جن میں خزینۃ الاصفیا، حدیقۃ الاولیا، گنجینۂ سروری، تاریخ مخزن پنجاب، دیوان نعت سرور، فارسی اور اردو نعتوں پر مشتمل، اور کلیات نعت سرور خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نعتیہ رنگ اس قسم کا ہے :

از لامکاں بلند مکان محمدؐ است ۔۔۔ بالا ز عرش عزت و شان محمدؐ است
مفتاح علم و فضل دہان محمدؐ است ۔۔۔ گنجینہ دار فیض زبان محمدؐ است
ناطق کلام حق بہ زبان محمدؐ است ۔۔۔ شرح بیان حق ز بیان محمدؐ است

نور محمدؐ است زہر نور جلوہ گر — از ہر نشان ظہور نشان محمدؐ است
لی مثل در بی بہاست بہ بازار معرفت — ہرگوہر یکہ گوہر کان محمدؐ است
شکر خدا کہ پیش خدا بہر مغفرت — در روز حشر ونشر ضمان محمدؐ است
با خاص و عام کرد عطا گنج معرفت — این فیض "دست فیض رسانِ" محمدؐ است
جسم نبیؐ است باعث ایجاد ہر وجود — مدح و درد زبان نتیجہ جان محمدؐ است

سرور مدار باک کہ انجام کار تو
در حفظ احمدی ودامان محمدؐ است"

ہندی رائے بہادر کنہیا لال تخلص ہندی، قوم سے کائستھ اور اصل وطن جلیسر تھا۔ اس کی پیدائش جیسا کہ خود اپنے فارسی دیوان مخزنِ توحید میں تصریح کی ہے، لاہور میں ہوئی۔ مفتی غلام سرور لاہوری سے تلمذ تھا۔

کنہیا لال لاہور میں ایگزیکٹو انجنیئر کے عہدہ پہ مامور تھا۔ اس نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں جن کا ذکر مخزنِ توحید کے شروع میں کیا ہے۔ ان میں ظفر نامہ رنجیت سنگھ، نگارین نامہ (فارسی مثنوی) تاریخ پنجاب، تاریخ لاہور اور مخزنِ توحید (دیوانِ فارسی) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ فارسی کلام معمولی درجے کا ہے۔ ویسے تمام کلام میں تصوف کا رنگ غالب نظر آتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کسی صوفی شاعر کا نتیجۂ فکر ہے۔

ہندی نے ۲۴ر فروری ۱۸۸۸ء کو بمقام لاہور وفات پائی۔

نمونۂ کلام:—

اگر تو مرد نکو کاری و نکو اندیش — زنشا ہراہ ہدایت قدم مکن پس و پیش
چرا بعیب دگر کس نظر کند نادان — بچشم غور نہ بیند چرا بحالت خویش
بہ پیش بندۂ وحدت پرست یکسانست — بہای کسوت شاہی و خرقۂ درویش

بفکر عاقبت کار باش ای ہندی
اگر تو صاحب عقلی و مرد دور اندیش

زِ جام عشق بنوشد ہر آنکہ پیمانہ — بود بدور زمانہ ہمیشہ مستانہ
خدا ز نور محبت درین سرای جہان — چو شمع کرد منور تمام کاشانہ

زحدِ خلق وادب پا برون مکش ہندی
مکن بوحدت حق گفتگو دلیرانہ

گلت چہرہ نما بد از گلستان — اگر تو عندلیب زار باشی
مسیحا خود قدم رنجہ نماید — اگر بیچارہ و بیمار باشی

غنیمت چون بہ پیشت ہی اختیار — در تلاشِ بال ہمای چہ دا
زغفلت آخر چرا از دنیای دون — در تلاش آب حیوانی چہ دا چ

حکیم الامت علامہ اقبال

علامہ مرحوم کے متعلق اب تک سینکڑوں کتب و مضامین لکھے جا چکے ہیں۔ پھر بھی اگر اس مضمون میں ان کا ذکر نہ کیا جائے تو یہ مضمون تشنہ رہے گا۔

علامہ شیخ محمد اقبال ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو سیالکوٹ کے ایک کاشمیری خاندان میں پیدا ہوئے۔ آباؤ اجداد کاشمیری برہمن تھے۔ جن کے بعض افراد نے کوئی اڑھائی سو سال پہلے اسلام قبول کیا تھا۔ آپ کے والد شیخ نور محمد بڑے دیندار اور عبادت گزار انسان تھے۔

مولانا سید میر حسن جیسے متبحر عالم سے تعلیم حاصل کی۔ اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے ایف اے کا امتحان پاس کیا۔ وہاں سے گورنمنٹ کالج لاہور میں آکر داخلہ لیا۔ یہاں انھیں پروفیسر آرنلڈ جیسے فاضل استاد مل گئے ۱۸۹۹ء میں یونیورسٹی پنجاب سے ایم اے فلسفہ کی ڈگری حاصل کی۔ اور کچھ عرصہ اورینٹل کالج لاہور میں فلسفہ و تاریخ مدن کے پروفیسر رہے۔ کچھ مدت گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی کے استاد رہے۔ ۱۹۰۵ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ چلے گئے۔ جہاں ٹرینٹی کالج کیمبرج سے فلسفہ و اخلاق کی ڈگری حاصل کی۔ یہاں سے جرمنی جا کر میونخ یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کی۔ انہی دنوں وہ بیرسٹر بھی ہو گئے اور عارضی طور پر استاد عربی کی حیثیت سے لندن یونیورسٹی میں ڈاکٹر آرنلڈ کے قائم مقام رہے۔ ۱۹۰۸ء میں ولایت سے واپس لاہور آ گئے۔ اور گورنمنٹ کالج کی ملازمت ترک کر کے وکالت شروع کر دی۔ ۱۹۲۲ء میں سرکار برطانیہ نے "سر" کا خطاب دیا۔ ۱۹۲۶ء میں پنجاب کی مجلس قانون ساز کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۱ء میں گول میز کانفرنس لندن میں شریک ہوئے۔ ۱۹۳۳ء میں سر راس مسعود اور مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے ہمراہ نادر شاہ کی دعوت پر کابل کے جشن استقلال میں شرکت کی۔ آخر ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو دنیائے اسلام و علم و ادب کا یہ مہر درخشندہ اسی لاہور کی سرزمین میں غروب ہو گیا۔ (گویا ان کی زندگی کا بیشتر حصہ لاہور ہی میں گزرا) آپ کی فارسی کی منظوم تصانیف یہ ہیں:۔

(۱) اسرار خودی (۲) رموز بیخودی (۳) پیام مشرق (۴) زبور عجم (۵) جاوید نامہ (۶) مثنوی پس چہ باید کرد۔ (۷) ارمغان حجاز۔

انتخاب:۔

انساں کہ رُخ ز غازۂ تہذیب بر فروخت
خاک سیاہ خویش چو آئینہ وا نمود

پوشید پنجہ را تہ دستانۂ حریر | افسونی قلم شد و تیغ از کمر کشود
این بوالہوس صنم کدۂ صلح عام ساخت | رقصید گرد او بنوا ہائے چنگ و عود
دیدم چو جنگ پردۂ ناموس او درید | جز "یسفک الدما" "خصیم مبین" نبود

———

از چشم ساقی مست شرابم | بے مے خرابم بی می خرابم
شوقم فزون تر از بی حجابی | بینم نہ بینم در پیچ و تابم
چون رشتۂ شمع آتش بگیرد | از زخمۂ من تار رُبابم

از من برون نیست منزل گہ من — من بی نصیبم راہی نیابم
تا آفتابے خیزد ز خاور — مانند انجم بستہ نخوابم

درون سینۂ ما سوز آرزو ز کجاست؟ — سبو ز ماست ولی بادہ در سبو ز کجاست
گرفتم این کہ جہان خاک و ما کف خاکیم — بہ ذرہ ذرۂ ما درد جستجو ز کجاست؟
نگاہ ما بگریبان کہکشان افتد
جنون ما ز کجا شور ہای و ہو ز کجاست؟

حلقہ بستند سر تربت من نوحہ گران — دلبران، زہرہ وشان، گلبدنان، سیم بران
در چمن قافلۂ لالہ و گل رخت گشود — از کجا آمدہ اند این ہمہ خونین جگران
ای کہ در مدرسہ جوئی ادب و دانش و ذوق — نخرد بادہ کس از کارگہ شیشہ گران
خرد افزود مرا درس حکیمان فرنگ — سینہ افروخت مرا صحبت صاحب نظران
برکش آن نغمہ کہ سرمایۂ آب و گل تست — ای ز خود رفتہ تہی شو ز نوای دگران
کس ندانست کہ من نیز بہائے دارم — آن متاعم کہ شود دست زد بی بصران

شمس مینائی

شیخ عبدالرحمٰن نام، ابوالمعالی کنیت، تخلص اردو میں شمس، اور فارسی میں مینائی۔ ولادت ۱۸۸۶ء میں بمقام امرتسر ہوئی۔ نامساعد حالات نے تعلیم میں مڈل سے آگے نہ بڑھنے دیا۔ حافظہ بلا کا پایا تھا۔ آبائی پیشہ پیتل تانبے کے برتنوں کی خرید و فروخت تھا۔ چنانچہ انھیں بھی تعلیم چھوڑ کر اپنے والد کے ساتھ یہ کام کرنا پڑا۔ ۱۸۹۶ء میں بمبئی چلے گئے۔ جہاں چاندی کے ظروف بنانے والے ایک کارخانہ میں ملازم ہو گئے۔

بمبئی ہی میں ایک مشاعرہ میں شرکت کرنے کے باعث شعر گوئی کا چسکا پڑا۔ کچھ عرصہ رسالہ خدنگ نظر لکھنؤ جس میں طرحی غزلیں ہوا کرتی تھیں، پڑھنے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ اپنے ایک دوست کی وساطت سے وہاں کے بعض شعراء حفیظ جونپوری وغیرہ سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا۔ ان سب باتوں نے مل کر آتشِ شوق کو اور تیز کیا۔ چنانچہ ایک آدھ مرتبہ غزل لکھ کر خدنگ نظر کو بھیجی جو شائع ہو گئی۔ یوں ذوقِ شعری بڑھتا گیا۔ اور پھر باقاعدہ مشاعروں میں شرکت شروع کر دی۔

۱۹۰۰ء میں واپس امرتسر چلے آئے۔ یہاں مسلسل مطالعہ اور ذہنی قابلیت کے سبب فارسی زبان میں خاصی مہارت بہم پہنچائی۔ لاہور میں انجمن حمایت اسلام کے بعض جلسوں میں بھی انھیں اپنی نظمیں پڑھنے کا موقع ملا۔

یوں تو پاکستان سے قبل بھی لاہور میں ان کا آنا جانا تھا۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد وہ لاہور ہی میں آباد ہو گئے۔ رام گلی میں قیام ہوا۔ آخری عمر میں نورِ بصارت سے محروم ہو گئے۔ یکم ستمبر ۱۹۵۴ء کو اس جہانِ فانی سے عالمِ بقا کو سدھارے۔

مینائی نے قدیم اور جدید دونوں طرزوں اور تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ۱۹۴۶-۴۷ء میں انھوں نے اپنا فارسی و اردو کا مجموعۂ کلام "جام مینائی" کے نام سے امرتسر میں چھپوایا تھا۔ جو بدقسمتی سے سوائے ایک کاپی کے، تمام کا تمام دہلی فسادات کی بھینٹ چڑھ گیا۔ مینائی کے کلام کے مطالعہ سے ان کی قادر الکلامی کا پتا چلتا ہے۔

انتخاب کلام:

طمع مدار ز نا امید و آرزو اے دل — خوش است آنکہ ز امید و آرزو پاک است
چگونہ راز غم عشق را نہان سازم — کہ رنگ چہرۂ من زرد و چشم نمناک است

مے دزدو در چمن صبا چہ کند — غنچہ را لب کند نہ وا چہ کند
عصر بے مہر و عالمے رنجور — یک دل درد آشنا چہ کند
چارہ ساز است ہر کسے - اما — چارۂ درد لا دوا چہ کند
در تپ سوز ہجر مینائی
نہ کند حشر گر بپا چہ کند

مرا مپرس ز داغی کہ در جگر دارم — ببین بچہرۂ من زرد و چشم تر دارم
مرا بہ عشق و محبت دگر چہ مے باید — کہ سینہ دارم و دل دارم و جگر دارم
گدائے گوشہ نشینم شہا کرم فرما — ز فرط لطف تو امید یک نظر دارم
مرا بہ گردش دور جہان چہ مینائی
نہ مست بادۂ پندارم نہ سر دارم

ہر کرا طاقت گفتار و کلام است اینجا — رہرو راہ سخن ہست و امام است اینجا
من بہ حیرانیم از فلسفۂ زاہد خشک — مے کہ در خلد حلال است حرام است اینجا
ساقیا دور مئے ناب نگیرد فرصت — وجہ جمعیت دل گردش جام است اینجا
تیرہ بختم چہ مرا سود دہد نور ازل — مطلع حسن تو صد ظلمت شام است اینجا
من گنہگارم و ہم منفعلم مینائی
آن کہ بے جرم خطا است کدام است اینجا

سالک

عبدالمجید خاں نام، سالک تخلص۔ ۱۳ دسمبر ۱۸۹۵ء کو بٹالہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد غلام قادر مرحوم پٹھانکوٹ میونسپل کمیٹی کے سیکرٹری تھے۔

سالک مرحوم کی ابتدائی تعلیم پٹھانکوٹ میں ہوئی۔ میٹرک بٹالہ میں کیا۔ کچھ عرصہ ملازمتوں کے چکر میں رہے لیکن ادبی ذوق زیادہ عرصہ ملازمت کرنے میں مانع آیا۔ چنانچہ ۱۹۱۲ء میں ملازمت ترک کرکے پٹھانکوٹ سے ایک ادبی رسالہ "فانوس خیال" نکالا۔ اس رسالہ کو صرف نو یا دس ماہ کی زندگی میسر آئی۔

۱۹۱۵ء میں لاہور چلے آئے۔ اور یہاں "تہذیب نسواں" اور "پھول" کے مدیر مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۰ء میں روزنامہ زمیندار سے وابستہ ہو گئے۔ ۴ نومبر ۱۹۲۱ء کو تحریک عدم تعاون کے سلسلہ میں گرفتار ہوئے۔ جیل ہی میں انہیں انگریزی کے مطالعہ کا خاصا موقع ہاتھ لگا۔ چنانچہ جب نومبر ۱۹۲۲ء میں رہا ہو کر پھر زمیندار سے منسلک ہوئے تو دوارت کے ساتھ ساتھ ایف اے اور بی اے کے امتحانات بھی پاس کئے۔ ۱۲ مارچ ۱۹۲۷ء کو جناب غلام رسول صاحب مہر سے مل کر روزنامہ انقلاب

جاری کیا، جو قیام پاکستان تک بدستور شائع ہوتا رہا۔ پاکستان بننے کے بعد ۱۹۵۰ء میں مرکزی محکمہ اطلاعات کراچی میں لے لیے گئے۔ دو تین سال کراچی میں رہ کر ۱۹۵۳ء میں واپس لاہور آ گئے۔ اور تالیف و تصنیف میں مشغول ہو گئے۔ آپ کو اپنی ایک کتاب "ہندوستان میں اسلامی تمدن" پر یونیسکو کی طرف سے ۴۸۰ ڈالر کا انعام ملا۔ حکومتِ پاکستان نے بھی آپ کی علمی خدمات کے صلے میں آپ کو پانچ سو روپیہ ماہانہ کا وظیفہ دینا شروع کیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد آپ ۷، ۴ ستمبر ۱۹۵۹ء کو حرکتِ قلب بند ہو جانے سے وفات پا گئے۔ آپ ایک بہت بڑے صحافی، شاعر، ادیب اور مزاح نگار تھے۔

سالک مرحوم نے اردو، فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ چونکہ زیادہ مدت آپ صحافت میں مصروف رہے اس لیے شعر و سخن کی طرف پوری طرح متوجہ نہیں ہوئے۔ اسی سبب سے شعری سرمایہ محدود ہے۔ حال ہی میں ان کے فرزند ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے ان کا مجموعۂ کلام "راہ و رسم منزلہا" شائع کیا ہے۔ انتخابِ کلام:۔

شبیرِ شہید

واعظِ شہر! چہ ترسانیم از خوف وعید — کہ منم عاشقِ دلدادۂ شبیرِ شہید

آن شہیدی کہ جہان دگران پاک بسوخت — آن شہیدی کہ جہان دگری را کاوید

پشت پا زد بوجودی کہ نہ ارزد بجوی — مژدہ پرواز حیاتِ ابدی را ورزید

ای بدا لحظہ کہ بر ریگ روان غلطان بود — ای خوشا لحظہ کہ در خلوتِ فردوس خزید

قطرۂ شبنم شاداب زِ بستانِ رسولؐ — کہ دمی بر گلِ اسلام درخشید و چکید

دامنِ عشقِ جوانانہ گرفت و نگذاشت — مصلحت دید و تقاضای خرد دید و ندید

لذت اندوزی آسانیِ منزل بفروخت — پای پر آبلہ و وادیِ پر خار خرید

میِ عرفان بجوانان سدا کارہ آورد — لای این بادہ بہ پیرانِ سحر خوان بخشید

انقلابی بدل اہلِ جہان برپا کرد — کس ندید آن روش دہر کہ چشمش دا دید

باغبانِ چمنِ دہر ہمیشہ دارد — شاخساری کہ ازان این گلِ نو بادہ دمید

سالک دل زدہ مداحِ حسین است ولی
از میِ حسنِ عمل آہ کہ جامی نکشید

غمِ فراقِ نگاری کہ داشتم دارم — بہ سینہ داغِ بہاری کہ داشتم دارم

بآن امید کہ دیگر جہان چنان گذری — نظر بہ راہ گذاری کہ داشتم دارم

چنان نہاد من از آتشی برآمدہ کہ بود — ز سوزِ عشق شراری کہ داشتم دارم

بلای الفتِ زلف و تصورِ گیسو — بہ کلبہ ام شبِ تاری کہ داشتم دارم

گدای میکدہ ام وز تفقدِ ساقی — بہ بزمِ بادہ و تاری کہ داشتم دارم

شدند ہم‌نفسان وقفِ کار و بارِ خود من جنون زدہ کاری کہ داشتم دارم

بہ باد رفت بہارِ دیارِ من سالک

غمِ بہارِ دیاری کہ داشتم دارم

بقولِ عبدالرشید صاحب تبسم، سالک مرحوم کو اپنا ذیل کا شعر بے حد پسند تھا اور وہ اسے اکثر گا گا کر سنایا کرتے تھے:

ندارد ہیچ جدت ریختن بر آشیان برقی

الٰہی آفرین برقی کہ بر دوی آشیان ریزد

ان شعراء کے علاوہ اس دور میں بھی بہت سے فارسی کے شعرا موجود ہیں۔ جن کا کلام فارسی و اردو کے موقر مجلات و جرائد میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں جنھوں نے ایرانیوں سے بھی خراجِ تحسین حاصل کیا ہے۔ ان موجودہ شعرا پر انشاءاللہ العزیز آیندہ فرصت میں لکھا جائے گا۔

---

(۲)

فارسی شاعری میں لاہور کا ذکر

لاہور ——— یہ "روشنیوں کا شہر" یکتا کے الفاظ میں "جلوہ‌گاہ نور"، یہ رشکِ جنان، باغوں اور روشوں کا شہر، یہ سرزمینِ عشق و محبت، یہ لالہ رخوں مہ جبینوں کا شہر ——— کچھ آج ہی اس سحر آگیں کشش کا حامل نہیں ہوا بلکہ شروع ہی سے بڑے بڑے جہاں بانوں، عاشقوں، خدا رسیدوں، شاعروں، سیاحوں غرض ہر قسم کے انسانوں کو اپنے عشق و حسن کا گرویدہ بنایا ہے۔ جس کا اظہار وہ اپنی تحریروں وغیرہ میں کئے بغیر نہ رہ سکے۔

یوں تو اس شہرِ نگاراں کا ذکر مختلف کتبِ تواریخ میں بکھرا پڑا ہے، لیکن اکثر فارسی شعرا نے اپنے اشعار میں اس کی تعریف و توصیف کی ہے۔ ان میں سے بعض تو ایسے ہیں جنھوں نے اپنے اشعار میں اس شہر سے اپنے والہانہ لگاؤ کا اظہار کیا ہے۔ اور بعض وہ ہیں جو اپنے تاریخی قصائد وغیرہ میں اس کا نام بہ سبیلِ تذکرہ لائے ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس مضمون میں اس قسم کے تمام اشعار آ گئے ہیں، تاہم جہاں تک ممکن ہو سکا ہے اسے مکمل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

لاہور کا ذکر سب سے پہلے ہمیں غزنوی دور میں ملتا ہے، جس کی وجہ محمود غزنوی کے حملہ ہائے ہندوستان کے دوران بعض فارسی شعرا کا اس کی ہمراہی میں یہاں آنا ہے۔ محمودی شعرا نے مدحیہ قصائد کے علاوہ کچھ ایسے طویل قصیدے بھی لکھے ہیں جن میں مدح کے علاوہ محمود کی بیشتر فتوحات کی تفاصیل بیان کی گئی ہیں۔ ان میں لاہور[1] کا تذکرہ ایک قدرتی امر تھا۔

---

[1] فارسی شاعری میں لفظ لاہور مختلف شکلوں میں نظر آتا ہے۔ کہیں یہ لہاوور ہے تو کہیں لوہاور، کہیں لہانور ہے تو کہیں لاہانور، لاہنور یا لاہور وغیرہ۔

ایسے قصائد میں عنصری اور فرخی کے قصائد خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

سید محمد لطیف نے اپنی تاریخ لاہور میں "خلاصۃ التواریخ" کے حوالے سے لکھا ہے کہ محمود کے حملۂ پنجاب کے دوران یہاں (لاہور میں) سخت قحط پڑا۔ محمود نے نئے سرے سے یہ شہر بسایا۔ مورخین نے اس کی تاریخ بنا ان اشعار میں نکالی :-

محمود بنا کرد چو لاہور بہ نور | در ہند یکی کعبۂ مقصود بنا کرد

اندیشہ چو کردم پئ تاریخ بنایش | فی الفور خرد گفت کہ "محمود بنا کرد"

(اس کے عدد ۳۷۵ھ بنتے ہیں لیکن لطیف نے "ک" کو ساقط ملا کر ۳۹۵ کے عدد گنے ہیں ملاحظہ ہو جدید ایڈیشن ص ۳۵۳)

غضایری رازی عراق کے بڑے شعرا اور امرائے دیلمی کے مداحوں میں سے تھا۔ محمود کی بھی مدح و ستائش اس نے کی ہے۔ بقول ذبیح اللہ صفا اس نے ۴۲۶ھ میں وفات پائی۔ اپنے ایک قصیدہ میں (یہ قصیدہ عنصری کے دیوان میں شامل ہے) جس کا مطلع ہے :

اگر کمال بجاہ اندرست و جاہ بمال

مرا ببین کہ ببینی کمال را بکمال

اپنے حاسدوں کا ذکر کر کے سلطان محمود کی مدح کی ہے۔ اسی میں ایک جگہ لاہور کا ذکر اس طرح کرتا ہے :

زہی ملک کہ حلال چنین بود دینار | بہ تیغ مالد و در خون خصم کرد سفال

خراج قیصر روم است و مہر گرد فغفور | بہار و ہند و لاہور با جیپال

بلای برہمنانست و آفت دجال | ہلاک اہرمنان است و آفت دجال

ابوالقاسم حسن عنصری بلخ کا رہنے والا اور محمود کا ملک الشعرا تھا (۴۳۱ھ میں اس نے وفات پائی۔ یوں تو اس نے اپنے بعض قصائد میں محمود کے ہندوستان پر حملوں کی تفصیل دی ہے۔ لیکن اس کے مختصر سے دیوان میں جو لکھنؤ میں چھپا ہے، لہٰذا ہر لاہور کا ذکر نہیں۔ البتہ یہاں کے حکمران جیپال کا تذکرہ اکثر مواقع پر ملتا ہے۔ اس طرح بالواسطہ اس وقت کے لاہور کی فوجی حالت وغیرہ کا نقشہ ان کے بعض اشعار میں آگیا ہے۔ مثلاً ایک قصیدے میں مختلف شہروں پر حملے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہتا ہے :

شنیدہ ای خبر شاہ ہندوان جیپال | کہ بر سپہر برینش ہمی بسود افسر

فزون ز لشکر او بر فلک ستارہ نبود | نہ بود بر روی زمین برہ نہ مدر

بدین صفت سپہی بود دست بستہ بخون | بدست ایشان شمشیرہا چو صبح سحر

۱؎ یہ لفظ دیوان عنصری مطبوعہ ایران بعہد ناصر الدین شاہ قاچار اور دیوان عنصری مطبوعہ لکھنؤ میں اسی طرح ہے۔ لیکن غالباً یہ سرگند ہے جس کے معنی عجز یہ کے ہیں۔ ممکن ہے شاعر نے ضرورت شعری کے لیے "ہ" زائد کی ہو جیسے یہ شعر ہی غلط چھپا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

چو دہ و تیرہ مرا او آتش زبانہ زبان | تو گفتی آنکہ پراگندہ شد بدشت سقر
ز بیم ایشان از مغز ہا رمیدہ خرد | ز ہول ایشان در چشمہا شمیدہ بصر

اسی قصیدہ میں ایک اور جگہ کہتا ہے :

شنیدہ ای کہ چہ کرد او در بزم جیپال | بکامش اندر زہر کشندہ کرد شکر
زمین و لشکر او موج و سپر دریا بود | ز گرد ایشان گیتی سیاہ و روز اغبر

فرخی سیستانی (متوفی ۴۲۹ھ) غزنوی دور کے شعرائے بزرگ میں شمار ہوتا ہے۔ بہت سے معرکوں میں یہ محمود کے ہمراہ رہا۔ اسی سلسلے میں اسے ہندوستان آنے کا بھی اتفاق ہوا۔ یہاں پر محمود کے حملے کی تفاصیل اس کے قصائد میں بہ نسبت دوسرے شعرا کے زیادہ بہتر رنگ میں ملتی ہیں۔ اپنے ایک قصیدہ "در ذکر مراجعت سلطان محمود از فتح ہندوستان و فتح ثانی" میں محمود کی مدح کرتے ہوئے لاہور کا ذکر یوں لایا ہے :

ابا شجاعت را نوک نیزۂ تو پناہ | ابا شریعت را تیغ تیز تو معیار
بسا بتا کہ تو بر داشتی ز بتکدہ ہا | چنان بتان کہ ز لاہور بہ گرفتی پار

(ممکن ہے اس کے کلام میں لاہور کا ذکر اور جگہوں پر بھی ہو، لیکن راقم کو اس کے "انتخاب" مطبوعہ لاہور میں صرف یہ شعر ملا)

جے پال کے متعلق لکھا ہے :

ز بہ جیپالی سپہ را بشب گذاشتہ بود | بہ پیش از آب و از آن شو گرفتہ راہ گذار
تو و ہیبت پیلان آہنین دندان | گشادہ بازوی مرغان آہنین منقار
سر ملوک عجم چون ہنر در کوہ رسیدند | صف سپاہ عدو دید با سکون و قرار

اسی لاہور کے ایک اور شاعر ابوالفرج رونی (متوفی بعد از ۴۹۲ھ) جسے بعض ایرانی تذکرہ نگار خراسان کا بتاتے ہیں لیکن عوفی نے لباب الالباب میں اس کا مولد و منشا خطۂ لاہور لکھا ہے، کے مختصر سے دیوان، مطبوعہ تہران میں لاہور کا ذکر چند ایک مواقع پر آیا ہے۔ مثلاً سلطان ابراہیم غزنوی کی مدح میں ایک جگہ کہتا ہے :

سپہر دولت و دین آفتاب ہفت اقلیم | ابوالمظفر شاہ مظفر ابراہیم
کشید رایت منصور سوی لوہاور | بطالعی کہ تو لا کند بدو تقویم

سلطان مسعود بن ابراہیم کی مدح میں :-

حضرتی شد بزرگ چون غزنین | لاہوار از قدوم شاہ زمین
پشت مسعودیان ملک مسعود | روی بازار آل ناصر دین

"در مدح سیف الدولہ محمود بن ابراہیم" :-

نظام ملک ولایت جمال تاج و کلاہ | سر محامد محمود شاہزادہ و شاہ

بلاهور در آمد میانِ موکبِ خویش   به زینتی که بر آید شبِ چهارده[14] ماه

قضا به روز همی رفت پیش او همه دشت   قدر بدیده همی رفت پیش او همه راه

اب ایک ایسے شاعر کے اشعار پیش کیے جاتے ہیں، جو اسی لاہور کا تھا اور جسے لاہور سے اس قدر محبت تھی کہ شاید کسی سچے عاشق کو اپنے محبوب سے بھی اتنی محبت نہ ہو۔ مسعود سعد سلمان، لاہور میں سنہ ۴۴۰ھ کے قریب پیدا ہوا۔ ایرانی تذکرہ نگاروں کا کہنا ہے کہ پیدائش تو اس کی لاہور ہی کی ہے، لیکن اصل اس کی ہمدان سے ہے۔ اس برصغیر کے غزنوی حکمران سلطان ابراہیم غزنوی وغیرہ کے دربار سے متعلق تھا۔ پھر محمود بن ابراہیم غزنوی سے وابستہ ہوا۔ اس بدنصیب شاعر کو بعض بدخواہوں کی لگائی بجھائی کے سبب کوئی بیس سال لاہور سے دور قید خانوں میں گزارنے پڑے۔ یہی سبب ہے کہ اس کے کلام میں جہاں کہیں لاہور کا ذکر آیا ہے، بڑا ہی پُر درد ہے۔ جیسے کوئی ہجر زدہ عاشق اپنے محبوب کے لیے بڑی طرح تڑپ رہا ہے: (۵۱۵ھ میں اس نے وفات پائی)

از زمانه نکرده ام گله ای   تا بدانسته ام که مجبور است

مر مرا گاه گاه رنج دهند   همه ام لوهور (لاہور زدہ) لهاوور است

ایک اور قصیدے میں لاہور کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ اس شہر میں اس کا محبوب اقامت گزیں ہے:

با دلِ پُر آتش و دو دیدهٔ پُر خون   رفتم از لاوهورِ خرّم بیرون

تا فتد از دشمنان و شیفته از دوست   سوخته از روزگار و خسته زِ گردون

گردان از عشقت ای بحُسن چو لیلی   گرد بیابان و کوه و دشت چو مجنون

باشد هرگز که باز بینم و بوسم   دو رُخ گلگون یار و دو لب میگون

دیگر:- مرا که گوید کای دوست عید فرخ باد   نگار من بلهاوور و من بنیشابور

ره دراز و غریبی و فرقتِ جانان   اگر بنالم، دارید مر مرا معذور

اور:- نه پایگاه من از حشمتش فزود شرف   نه ایستگاه من از خلقتش گرفت جمال

چه گویم آخر با مردمان لوهاور   چو باز گردم و از حال من کنند سوال

ایک جگہ شاہِ غزنی کی ایک مجلس عیش کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:

گرچه خرّم بود زمینِ لوهاور   باشد آن کس که میخورد معذور

منظر شاه خُلد را ماند   که بر او ابر گوهر افشاند

لاہور سے دوری کے غم نے جب اسے بہت ستایا تو یوں پکار اٹھا:

دانی تو که با بندِ گرانم یارب   دانی که ضعیف و ناتوانم یارب

شد در غم لوهور روانم یارب   یارب که در آرزوی آنم یارب

اس کا ذیل کا قصیدہ تو بہت ہی مشہور ہے۔ دیکھیے اس میں لاہور کو کس دلسوزی سے مخاطب کیا ہے:

ای لاوهور ویحک بی من چگونه ای — بی آفتاب تابان روشن چگونه ای
ای آنکه باغ طبع من آراسته ترا — بی لاله و بنفشه و سوسن چگونه ای
تو مرغزار بودی و من شیر مرغزار — با من چگونه بودی و بی من چگونه ای
ناگه عزیز فرزند از تو جدا شده است — با درد او به نوحه و شیون چگونه ای
نفرستی ام پیام و نگوئی بحسن عهد — کاندر حصار بسته چو بیژن چگونه ای
گر در حضیض بر کشدت واژگونه بخت — از اوج بر فراخته گردن چگونه ای
در هیچ حمله هرگز نفگنده ای سپر — با حملهٔ زمانهٔ توسن چگونه ای
باشد ترا ز دوست بکایک تهی کنار — با دشمن نهفته بدامن چگونه ای
از دوستان ناصح مشفق جدا شدی — با دشمنان ناکس ایمن چگونه ای
آباد جای نعمت نامه ترا بچشم — لعنت زده بویران معدن چگونه ای
ای حجره باز دست گذار شکار دوست — بسته میان تنگ نشیمن چگونه ای
برنائی دوست هرگز طاقت نداشتی — امروز با شماتت دشمن چگونه ای

ای دم گرفته زندان گشته مقام تو
بی در گشاده طارم و گلشن چگونه ای

لاہور کی برسات پر ایک نظم میں لاہور کا ذکر اس طرح کیا ہے:۔

جسته ابرهای پرنم تو — خرما سبزه های خرم تو
بسکه خرم شده است لوحاوور — باشد آن کس که می خورد معذور

سید اشرف الدین حسن غزنوی بہرام شاہ غزنوی کا درباری شاعر تھا۔ بقولِ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ بہرام کے حملہ ہائے ہندوستان میں یہ اس کے ہمرکاب تھا۔ ۵۵۶ھ میں اس نے وفات پائی۔ بسنہ ۵۱۳ھ میں جب بہرام نے محمد ابو حلیم وائسرائے ہند کی بغاوت فرو کی، تو اس وقت حسن نے ایک قصیدہ لکھا۔ جس میں ایک جگہ کہتا ہے:

زهی رونق ملک از سر گرفته — به یک تاختن هفت کشور گرفته
براند به به لاهور فال سعادت — بنام خدا دین پیغمبر گرفته

سنہ ۲۴ھ کے بعد محمد بن منصور تائینی وائسرائے ہند مقرر ہوا تو سید حسن نے اس کی مدح میں قصیدہ لکھا۔ جس میں لاہور کا تذکرہ کوئی دو ایک مرتبہ آ گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

عمرم مرا هوای لهاوور برده بود — همت بر آن سعادت مقصور بوده بود
نزدیک تر نبودی از جان به نزد من — زان پس که خود زمین چو دلم دور بوده بود
نزدیک زرنیک بدیع است و پس عجب — گوئی که آفتاب مگر دور بوده بود

نی نی چنین به دفع لطافت و دور کی بود ‏ ‏ ‏ این نکته بر ضمیر م مستور بوده بود
دیدم کنون که خاصیت نور آفتاب ‏ ‏ ‏ در همت محمد منصور بوده بود

فرید بشار ایک بہت بڑے ادیب اور فاضل کامل اپنے وقت کے تھے۔ فارسی نظم و نثر میں بھی، بقول عوفی، انھیں ایک مقام حاصل تھا۔ شیخ زکی، جو اپنے وقت کے ایک بڑے عالم تھے، جب حج کے ارادہ سے ہرات پہنچے تو وہاں کے علما فضلا وغیرہ نے ان کے بارے میں فارسی اور عربی میں کچھ نہ کچھ لکھا۔ چنانچہ اسی ضمن میں فرید بشار نے بھی چند اشعار کہے، جن میں لاہور کا ذکر اس طرح آیا ہے :

زہی ز خاطر تو لشکر سخن منصور ‏ ‏ ‏ خہی بہمت تو کشور ہنر معمور
سزد که خط غلامی ستاند از آفاق ‏ ‏ ‏ چو ہست مسکن تو خواجه خطهٔ لاہور
ز رزوح پاک تو شاہ زمانه می جوید ‏ ‏ ‏ چو آفتاب که از عرش دوام خواہد نور

امیر خسرو دہلوی (متوفی ۶۹۸ھ) کے نام نامی سے کون آگاہ نہیں۔ انھوں نے اپنی مثنوی قران السعدین میں ایک جگہ مغول کے ظلم و ستم کا ذکر کرتے ہوئے لاہور کا نام بر سبیل تذکرہ لیا ہے :

از قدم شوم مغل آن بلاد ‏ ‏ ‏ نام و نشانی ز عمارت نداد
از حد سامانه و تا لاهنور ‏ ‏ ‏ ہیچ عمارت نه مگر در قصور

طالب آملی، جہانگیر کا ملک الشعراء، آمل کا رہنے والا، لاہور کے حسنِ فسون کار سے نہ بچ سکا۔ اور اسے اس شہرِ محبوباں کا ذکر والہانہ انداز میں کرنا ہی پڑا۔ بیچارہ ۱۰۳۶ھ میں عین شباب میں چل بسا۔ ورنہ شاید اس سے بھی زیادہ لاہور کا ذکر کرتا۔ اس حسن خیز سرزمین نے ایک تو پہلے ہی اسے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہاں اس کے مرشد کی موجودگی بھی اس شہر سے اس کے زیادہ لگاؤ کا سبب بنی۔ اور اسے ایک پوری نظم اس کی توصیف میں لکھنا پڑی۔ اس کے خیال کے مطابق ہفت کشور میں کوئی بھی شہر، لاہور کی سی آب و تاب کا حامل نہیں ہے۔ یہاں کا خالص شہد ایسا میٹھا پانی آبِ حیات کا حکم رکھتا ہے۔ اگر ایک خضر آبِ حیات پر قابض ہیں تو یہاں کا پانی ہزاروں ہی خضر رکھتا ہے وغیرہ۔ ذرا شاعر ہی کے الفاظ میں یہ سب کچھ سنیئے۔

خوشا لاہور و فیضِ آبِ لاہور ‏ ‏ ‏ بطاعت میل شیخ و شاب لاہور
نیابی زاہلِ ہندستان گروہی ‏ ‏ ‏ بدل نزدیکی ارباب لاہور
گمانم نیست اندر ہفت کشور ‏ ‏ ‏ بود شہری بآب و تاب لاہور
سکندر گو که عمر خضر یابد ‏ ‏ ‏ ز آب ہمچو شہد نابِ لاہور
که گر یک خضر آب زندگی داشت ‏ ‏ ‏ ہزاران خضر دارد آبِ لاہور
بود لاہور شہری جمله آرام ‏ ‏ ‏ نیابی مضطرب سیمابِ لاہور
میان بگشا و خوش دا کش که در ہند ‏ ‏ ‏ فراغت نیست جز در خوابِ لاہور
بر سم کاسبان از صبح تا شام ‏ ‏ ‏ کتان باقی کند مہتاب لاہور

بچنگ زہرہ مشکین تار بندد — سر زلف بریشم تاب لاہور
بزخم سکہ پیشانی خراشد — نہد خورشید را مضراب لاہور
ز طاق ابروی زنار بابان پرس — نشان مسجد و محراب لاہور
قلم چون تیر سازم نقش گیرد — ہزاران فتنہ از انقاب لاہور
کنم ز آن مرد مرید آسا شب و روز — کرامت ہا بیان در باب لاہور
کہ پیر دستگیر و مرشد من — یکی قطب است از اقطاب لاہور

خدایا زندہ و جاوید دارش
بآب خضر یعنی آب لاہور

اس کے علاوہ بھی اس کی کئی ایک نظموں میں لاہور کا نام آیا ہے۔ مثلاً ہند سے قندھار جاتے ہوئے اس نے ایک قصیدہ لکھا۔ اس میں ایک جگہ کہتا ہے:

نگاران لاہور و خوبان دہلی — بدل کردہ بودند پیوند جانم
یکی چہرہ سودی بچشم رکابم — یکی بوسہ دادی بزلف عنانم
فشاندی یکی در بغل یاسمینم — ہنادی یکی در دہان برگ پانم

جب قندھار کے لیے آگرہ سے براستہ لاہور، ملتان پہنچا تو راستے میں شدید بارشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ ایک قصیدہ میں اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

ز آگرہ تا بخیابان گلشن لاہور — رفیق بودم با ابرہای بارانی
بعزم ملتان چون زورقی شدم چو ہلال — زدا ز سر شکم نیلاب کوش عمانی (دریا کا نام)

ایک موقع پر، بقول شبلی مرحوم، طالب آملی ایک مشہور شاعر شاپور طہرانی سے لاہور میں ملا۔ وہ نور جہاں کے والد کا چچا زاد بھائی تھا۔ طالب نے اس واقعہ کا ذکر ایک غزل میں کرتے ہوئے پھر لاہور کا "تذکرہ چھیڑا اور اس طرح اس سے اپنی دلبستگی کا اظہار کیا:

بحمد اللہ کہ در ملک سخن دستور را دیدم — ہمان رشک عطارد شاعر مشہور را دیدم
چہ خوشحالم کہ بعد از مدت یکسالہ مہجوری — خوش و خوش وقت او را دیدم و لاہور را دیدم

ابوالبرکات منیر لاہور کے ایک مشہور فارسی گو شاعر تھے۔ ان کی ایک مثنوی "مثنوی در صفت بنگالہ" خاصی مشہور ہے۔ انھوں نے ۱۰۵۵ھ میں وفات پائی۔ ایک غزل کے مقطع میں اپنی شاعری پر ناز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

آشنا گشتم بطرز تازہ چون عرفی منیر
بعض اشعار ترم لاہور را شیراز کرد

محمد جان قدسی، شاہجہان کا ملک الشعرا تھا۔ بقول صاحب شاہجہان نامہ مشہد مقدس کا رہنے والا تھا۔ آزاد بلگرامی مؤلف

سرو آزاد کے مطابق اس نے سنہ ۱۰۵۶ھ میں وفات پائی۔ اس کی ایک نعت جس کا مطلع ہے:

مرحبا سید مکی مدنی العربی

دل وجان باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

خاصی مشہور ہے۔ مطبع افغانی امرت سر میں سنہ ۱۳۲۲ھ میں اس کی ایک مثنوی چھپی جس میں ایک آدھ جگہ لاہور کا ذکر بر سبیل تذکرہ آگیا ہے۔ شاہجہان جب تخت نشین ہوا، تو دارا شکوہ، سلطان شجاع اور اورنگ زیب پنجاب سے اس جشن میں شرکت کے لیے روانہ ہوئے۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے قدسی نے لکھا:۔

سلیمان شکوہان والا جناب   روان آصف عہد شان در رکاب

ز لاہور کردند عزم سفر   سوی اکبر آباد با کر و فر

شاہزادہ دارا شکوہ، شاہجہان کا بڑا بیٹا جس نے سنہ ۱۰۶۹ھ میں وفات پائی۔ قادری تخلص اور صاحب دیوان شاعر تھا۔ ملا شاہ بدخشی کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ چونکہ دارا شکوہ کے مرشد لاہور میں مقیم تھے، اس لیے اس شہر سے اسے روحانی اور دلی لگاؤ تھا جس کا اظہار اس نے اپنے اکثر اشعار میں کیا ہے۔ مثلاً غزل ذیل میں اس شہر کے لیے مختلف دعائیں مانگی ہیں:۔

بود آباد دائم شہر لاہور   وبا و قحط ز ینجا دور دارد

بود فخرش بخاک حضرت پیر   کہ در خود ہیچو او مشہور دارد

ہمیشہ اولیا خیزد ازین ملک   خدا این قوم را منظور دارد

خطاب او خدا کردہ الہہ نور   مدام این شہر را پُر نور دارد

ہمیشہ شہر خرم باد و سیراب

بخوبی در جہان مشہور دارد

ملا شاہ بدخشی بقول محمد صالح کمبوہ سنہ ۱۰۲۳ھ میں وارد ہند ہوئے اور پھر لاہور آکر حضرت میاں میرؒ کے مرید ہوئے۔ سنہ ۱۰۷۲ھ میں وفات پائی۔ صاحب دیوان شاعر تھے۔ مثنویاں کثرت سے لکھی ہیں۔ کلیات کا قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ لاہور کا ذکر اکثر جگہ کیا ہے۔ مثلاً

کرد خورشید چونکہ عزم عبور   سرزد از سند جانب لاہور

کرد لاہور جای خود تعیین   آفتاب یقین محی الدین   (یعنی حضرت میاں میرؒ)

تربیت کرد خلق را آن ماہ   گشت روشن دل محمد شاہ

گل تحقیق شاہ برسر زد   آفتابی ز ماہ سر بر زد

ایک اور جگہ اپنے مرشد ہی کے ذکر میں کہتے ہیں:۔

بلاہور یا کہ در کشمیر   ہمہ بودند جمع پیش فقیر

اور:۔

روی شاہ ملوک را دیدم   بود شاہ ملوک توحیدم

گشت این شاہ فتح در لاہور | دائم آباد باد معدن نور
بود آن خانہ جای اللہ داد | ہشت جنت بروش باد کشاد

مشہور تمثیل گو شاعر صائب تبریزی، ظفر خاں کے دربار سے وابستہ تھا۔ کچھ عرصہ ہندوستان میں رہ کر واپس اپنے ملک میں چلا گیا، جہاں سنہ ۱۰۸۰ھ میں وفات پائی۔ اس کے یہاں بھی چند ایک مواقع پر لاہور کا ذکر ملتا ہے۔ بقول شبلی مرحوم ۱۰۳۹ھ میں شاہجہان نے دکن کا رخ کیا۔ ظفر خاں اس کے ہمرکاب اور صائب اس کی ہمراہی میں تھا۔ جب برہانپور پہنچے تو چونکہ یہاں کی زمین نہایت غبار انگیز تھی، صائب نے کہا :۔

تو تماشا نہ دغبار آگرہ لاہور را
چشم من تا خاک مالی گرد برہانپور خورد

ایک اور موقع پر جب کہ اس کا ستر سالہ باپ اسے لینے کے لیے ایران سے یہاں پہنچا تو اس نے ظفر خاں سے رخصت چاہی اور ایک مدحیہ قصیدہ لکھا جس میں لاہور کا ذکر اس طرح کیا :۔

شش سال بیش رفت کہ از اصفہان بہند | افتادہ است توسن عزم مرا گذار
ہفتاد سالہ والد پیریست بندہ را | کز تربیت بود بمنش حق بی شمار
آوردہ است جذبۂ گستاخ شوق من | از اصفہان بآگرہ ولاہورش اشکبار

سعیدائے گیلانی عہد شاہجہان کا مشہور شاعر اور زرگر تھا۔ تخت طاؤس جیسا عظیم صنعتی کارنامہ اسی کے ہاتھوں انجام پایا۔ سنہ ۱۰۴۴ھ میں شاہجہان کے آٹھویں جشن تخت نشینی پر ایک طویل قصیدہ لکھ کر گزرانا جس میں ایک جگہ کہتا ہے :۔

باکبرآباد از جہد کامران بسر برد | جلوس کرد زتا ئید عالم منان
ز کامرانی نوروز عزم کردہ نمود | سوی مدینۂ لاہور بہ جہان شادان
ہزار گونہ بود گل بجوہ ہر قدمش | ہزار چشمۂ دلی بہ زچشمہ حیوان

مشہور شاعر عبدالقادر بیدل سنہ ۱۰۹۳ھ میں اکبرآباد میں تھے۔ ایک موقع پر افسردگی کے عالم میں دہلی گئے لیکن وہاں پہنچ کر بھی ان کے دل کی افسردگی برقرار رہی۔ یکایک وہاں سے پنجاب جانے کا خیال پیدا ہوا اور اس سے کچھ تسکین ہوا اور طبیعت بھی فکر سے کھل گئی۔ چنانچہ اس موقع پر ایک تاریخ کہی جس میں لاہور کا ذکر بھی آیا ہے :

شوق را از عزیمت لاہور | تازگی ہای مژدہ شادیست
یعنی از دہ مگاہ افسردن | چند گاہم نوید آزادیست

سال تاریخ این عزیمت شوق
بی تکلف شنو "خیر آباد بیست"
۱۰۹۵ھ

نواب احمد یار خاں المتخلص بہ یکتا دور عالمگیر کے آخر میں تخلص کے شعرا پیدا رہتے۔ ان کے والد اللہ یار خاں لاہور، ٹھٹھہ اور ملتان کے صوبہ دار رہے۔ یکتا نے بقول صاحب سرو آزاد مختلف فنون میں مہارت بہم پہنچائی تھی۔ سنہ ۱۱۴۷ھ میں بمقام خوشاب وفات پائی۔

چونکہ یکتا ایک عرصہ لاہور بھی رہے اس لیے انھیں اس شہر سے خاصی محبت ہو گئی تھی۔ اس کا اظہار انھوں نے اپنی مثنوی "داستان ہیر و رانجھا" میں کیا ہے۔ پنجاب کی تعریف کرتے کرتے جب لاہور کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ان کا اشہبِ قلم یوں جولانیاں کرنے لگ جاتا ہے:

(پنجاب)

گرچہ ہر گوشہ اش طرب خیز است — از مئ شوق جام لبریز است
لیک لاہور مصرِ محبوبی است — یوسفستانِ عالمِ خوبی است
شہرتش داد آنقدر رفعت — کہ بشانش نمی رسد شوکت
از بلندی گذشت پایۂ او — نہ فلک پست زیرِ سایۂ او
از صفا درج سینۂ ابرار — صدف جنسِ دُکان ہر بازار
صبح صادق کہ مطلع نور است — یکی از کوچہ ہای لاہور است
آسمان گنبدِ نمودارش — کہکشان، رستۂ ز بازارش
از ہوائش کہ رنگ می بیزد — با غبارش فرنگ می ریزد
ہست ہر باغِ آن خجستہ دیار — دائم از جوشش گل ہمیشہ بہار
صبح و شامش ز رنگِ جلوہ گری — گردشِ چشمِ عشوہ ریز پری
خوب رویانِ آن بہشت اورنگ — ہمہ آدم فریب گندم رنگ
ہر طرف خیل خیل ماہ رویان — صندلی چہرۂ عنبرین مویان
ہر یکی نونہال سرو اندام — جلوہ بدمست موج نشہ خرام
غمزہ ہا برق ریز خرمن دل — مژہ ہا فوج دشنۂ قاتل
چشم و ابرو بکینہ ہمدستان — تیغ در کف صف سیہ مستان
شہرِ بستان و لالہ رویان گل — سنبل و سبزہ اش خط کاکل
از ہمین شہر جلوہ خانۂ نور — رستہ این شعلہ ہای آتش طور
حسن، آتش بہار جلوۂ ناز — عشق غمدیدہ ای بسوز و گداز
تا زمین شہر حسن بنیاد است — چمنِ محفلِ پریزاد است
تا سوادش ز دور کردہ نگاہ — از حسد بوی ہند گشتہ سیاہ

دیدۂ عالم است، مطلعِ نور
چشم بد زین سوادِ اعظم دور

ایک اور مثنوی "قصہ ہیر رانجھا" (مطبوعہ ۱۳۱۹ھ امرتسر) میں لاہور کا ذکر آیا ہے۔ یہ مثنوی کسی اکبر علی شاہ پنجابی کے نام سے شائع کی گئی ہے۔ لیکن دراصل یہ تصنیف شاہ فقیر اللہ آفریں لاہوری کی ہے۔ آفریں بقولِ صاحب "مجمع النفائس"

لاہور کا رہنے والا، ایک خوش مشرب، آزاد اور متوکل قسم کا اور عہد عالمگیر کے شعرا میں سے تھا۔ صاحب "مردم دیدہ" نے اس کی وفات ۱۱۵۱ھ میں بتائی ہے۔ مثنوی ہذا میں لاہور کی تعریف ان الفاظ سے کی گئی ہے:

در آن ملک (پنجاب) لاہور عین السرور | بہشتی ست لبریز حور و قصور
ز بس حافظ مصحف از ہر ہزار | ز دوران (کذا) شستہ آن خط غبار
ز ارباب فضل اندر و ہر طرف | چو اوراق مصحف سراسر شرف
چہ لاہور، از زینت گہ روم و چین | چہ بہی بود زیب روی زمین
بود محو حسن خدا داد خویش | زلیخاست بر یوسف ایجاد خویش
ز رعنا خرامان زرین کفش | چو قوس قزح داوہ سرخ بنفش
جواہر قسم ملک ہر کوچہ اش | مرصع بود مسلک ہر کوچہ اش
تہی از ریا چون دل صادقان | پُر از عشق چون سینۂ عاشقان
مسیحا ہوا ہاو دیرین اوست | خضر تشنۂ آب شیرین اوست
ز آئین بازار و برزن مپرس | بیان عمارت خود از من مپرس
پری خانہ ہا تنگ و پہلو بہم | ہمہ حلقہ چون زلف بر گردی ہم
بہ ہر پایۂ دیوار دیوانہ ای | بہ ہر سایۂ شمع پروانہ ای
جوان سیرت و پیر کامل ہمہ | کہن گشتہ و تازہ بسمل ہمہ
ز بس بادۂ رنگ ہر یکی کردہ خوش است | برات بہشت از مغیان اوست
ز خوبی دلان نیز ہم عالمیست | بہ ہر گوشہ بیمار عیسیٰ دمیست

بر آراستہ انجمن ہر کسی
با فسانہ ہیستہ در انجمن بسی

بارھویں صدی میں سسی پنوں کی داستان کو کسی اندرجیت منشی نے فارسی نظم کا جامہ پہنایا اور اس کا نام "نامۂ عشق" رکھا۔ (یہ مثنوی حال ہی میں ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے ایڈٹ کر کے شائع کی ہے)۔ اس میں شاعر اپنے سفر کا حال لکھتے ہوئے لاہور کا نام بھی ایک جگہ لے آیا ہے۔

سن ہجری ہزار و یک صد و چل | کہ از لاہور بستم محمل دل
بملتان آمدم ہمراہ نواب | دل خورسند و طبع شاد و شاداب

"ظفر نامہ رنجیت سنگھ" مؤلفہ دیوان امرناتھ میں بھی دو ایک جگہ لاہور کا ذکر آیا ہے۔ (یہ کتاب ۱۹۲۸ء میں دانشگاہ پنجاب کی جانب سے شائع کی گئی)۔ دیوان مذکور نے کسی معتبر بیلی رام کے حوالے سے لکھا ہے کہ استاد اکرم بیگ چغتائی قاآنی (مشہور ایرانی قصیدہ گو) کے خاندان میں سے اور نواسہ زادۂ جنت مکانی تھا۔ استاد مذکور کو نعلبندوں کے ایک لڑکے الٰہی بخش سے عشق ہو گیا۔ یہ لڑکا اس کا بہت

محبوب اور منظورِ نظر تھا۔ اس کے "غم ہجران" اور "سرورِ وصال" میں استاد نے ایک مثنوی "الٰہی بخش نامہ" لکھی جس کے چند اشعار ظفر نامہ میں "بطور تبرک" دیئے گئے ہیں۔ ان میں لاہور کا ذکر اس طرح آیا ہے۔

معشوق کے انساب کے ذیل میں کہتا ہے :

که در شهر مبارک شهر لاهور — بجز آلی محله جابی مشهور

شریف الذات مردی اشرفش نام — بفنِ نعلبندی مرجعِ عام

سه فرزندش گرامی چون مه و مهر — همه سیمین تن و زیبا و گلچهر

از آن جمله الهی بخش ماهی — بملکِ حسن و خوبی پادشاهی

مه و مهر از رخش یابنده تابی — تعالی الله بخوبی آفتابی

اپنے نام و نشان کے متعلق :-

بدار السلطنت یعنی که لاهور — الهی از سوادش چشم بد دور

میانِ مسجد جامع، که ثانی — ندارد، آفرین بر روح بانی

بزرگی، نامداری، کامگاری — بتدریسِ علومش کاروباری

کریم الطبع میرزا اکرمش نام — محبت ورزی او شهرهٔ عام

اگرچه بودی مشهور از افاضل — بعلمِ عشقبازی نیز فاضل

ولیکن پاکباز و پاک باز بود

بهر پاکیزه نردی در گرو بود

حکیم الامت علامہ اقبال مرحوم نے مثنوی اسرار و رموز میں ایک جگہ ایک نوجوان کی حکایت بیان کی ہے جو حضرت علی ہجویری کے پاس آتا ہے۔ اس میں چلتے چلتے لاہور کا بھی ذکر آ گیا ہے :

سید ہجویر مخدومِ امم — مرقد او پیر سنجر را حرم

بند ہای کوہسار آسان گسیخت — در زمین ہند تخم سجدہ ریخت

عہد فاروق از جمالش تازہ شد — حق ز حرف او بلند آوازہ شد

خاک پنجاب از دم او زندہ گشت — صبح ما از مہر او تابندہ گشت

نوجوانی قامتش بالا چو سرو — وارد لاہور شد از شہر مرو

رفت پیش سید والا جناب — تا رباید ظلمتش را آفتاب

گفت محصور صف اعدا ستم — در میان سنگہا مینا ستم

با من آموزای شہ گردون مکان

زندگی کردن میان دشمنان

ابوالاثر حفیظ جالندھری کے استادِ گرامی، غلام قادر گرامی مرحوم جالندھر کے رہنے والے اور نظام دکن کے شاعرِ خاص تھے۔ ۱۳۴۵ھ میں فوت ہوئے۔ اپنی ایک چھوٹی سی مثنوی میں، جو انجمن حمایت اسلام لاہور کے ایک جلسہ میں پڑھی گئی، لاہور کا ذکر یوں کرتے ہیں :-

نظمِ دلکش بخوان بلند بزد گر	مولدِ تست شہر جالندھر
ذرّہ ایش برستارہ چشمک ریز	خاکِ جالندھر ست مردم خیز
ای ملکہ کوبِ تربیتِ غرور	بی ادب طفلِ مکتبِ لاہور
من تو را می برم بانجمنی	انجمن نی کہ غیرتِ چمنی

ایک اور جگہ ایک شعر میں میاں عبدالعزیز بیرسٹر کو "یوسف" کہہ کر لاہور کو مصر سے تشبیہہ دی ہے :-

ازہوشیار پور بہ لاہور شد عزیز
یوسف بمصر رفت ز کنعان فتنہ خیز

محمد تقی بہار ملک الشعرائے ایران (متوفی ۱۹۵۱ء) کو اپنی زندگی کے آخری دنوں میں حکیم الامت اقبال کے کلام سے متاثر ہونے کے سبب پاکستان سے خاصی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس ضمن میں انھوں نے کئی ایک قصیدے بھی لکھے جن میں لاہور کا ذکر آیا ہے۔ ۱۹۵۰ء میں انھوں نے اپنے ایک قصیدہ "پاکستان نامہ یا پیام ملت ایران بہ ملت پاکستان" میں لاہور کو ان لفظوں سے خطاب کیا :

سزد کراچی و لاہور قبۃ الاسلام	کہ ہست باری اسلام کار پاکستان
سواد اعظم اسلام نام بخش اورا	کہ نیستمان دگری در شمار پاکستان
درود باد بہ روح مطہر اقبال	کہ بود حکمتش آموزگار پاکستان

صادق سرمد (متوفی ۱۹ جولائی ۱۹۶۰ء) ایران کے ملی شاعر تھے۔ مارچ ۱۹۵۰ء میں جب شاہِ ایران پہلی مرتبہ شاہی مہمان کی حیثیت سے پاکستان تشریف لائے تو سرمد مرحوم ان کے ہمراہ تھے۔ جب وہ لاہور آئے تو سرمد نے ۱۰ مارچ کو "ماہ پنجابی" کے عنوان سے ایک غزل کہی جس میں لاہور کو یوں خراج تحسین و عقیدت ادا کیا :-

چون قدم بر مقدم آن ماہ پنجابی زدم	سجدہ بر آن قبلۂ ابروی محرابی زدم
شہر لاہوری لاہورم بہشت آمد بچشم	وز صفایش راہ، رخ راہ و بیخوابی زدم
تا بجنش گرچہ در تابِ تب عشقم بسوخت	حاش للہ گر بہ یکدم دم ز بی تابی زدم
گردش ایام چون در کوی جانانم فگند	آفرین بر گردش این چرخ دولابی زدم

۱۹۵۰ء میں پہلی بار پاکستان کے سفارت خانے نے ایران میں بزم اقبال منایا، سرمد نے وہاں اپنے ایک قصیدے میں لاہور کا ذکر اس طرح کیا :-

درود باد بلاھور و خطۂ پنجاب	کہ زاد و پرورد این شاعر خجستہ خصال

برغم ہر چہ چمن زاد و ناز پروردہ است　　　ز خاک مُردہ دمید آیتِ جمال و جلال[1]

جولائی ۱۹۵۰ء میں پاکستان سے ایک علمی وفد ایران گیا، جس میں محترم ڈاکٹر محمد شفیع، صوفی تبسم اور عندلیب شادانی وغیرہم تھے۔ ان کے ورودِ ایران پر سرمد نے ایک قصیدہ "کاروان علم و ایمان" لکھا۔ اس میں پاکستان اور پاکستانیوں کی تعریف کرتے ہوئے لاہور کو یوں یاد کیا:

ہر کہ در پنجاب تو مہمان لاہور تو گردد　　　باغ شالیمار میآید بچشمش باغ رضوان

یاد ایامی کہ من مہمان لاہور تو بودم　　　شعرہا خواندم بتحسین و تحلیل فراوان

گرچہ پیشِ میزبانان نالہ از مہمان نزیبد　　　نالہ ہا کردم بیادِ نالۂ مسعودِ سلمان

یاد آن ایام شیرین میزبان مہمان ما شُد　　　مہمان شد میزبان یا میزبان گردید مہمان

اپریل ۱۹۵۷ء میں یونیورسٹی استانبول کے رئیسِ شعبۂ ادبیات زبان ترکی ڈاکٹر علی نہاد تارلان، اقبال اکاڈمی کی دعوت پر پاکستان آئے۔ ۲۳ اپریل کو لاہور تشریف لائے۔ یہاں جس گرم جوشی سے ان کی پذیرائی ہوئی اس سے وہ بے حد متاثر ہوئے اور انھوں نے فی البدیہہ چند اشعار "قونیہ دوم" کے عنوان سے لکھ کر مزارِ اقبال پر پڑھے۔ ان میں لاہور کو قونیہ دوم کے نام سے پکارا ہے:

بشنو از من ای بلندی را پناہ　　　چون فغان میکردم از بخت سیاہ

نالہا میکردم از دُوری تو　　　آہ زین دوری و مہجوری تو

تو کہ "مولانای" ما را پیروی　　　تو شنیدی این فغان معنوی

شکر و منت آن خدای پاک را　　　شکر و منت آن شہ لولاک را

کین کمینہ دید خاک درگہت　　　بوسہ زد و ر خاک پاک درگہت

تربت تو سجدہ گاہی شد مرا　　　روح پاکِ تو پناہی شد مرا

من کہ چون بوی وزیدم زان دیار　　　طی نمودہ بحر و دشت و کہسار

ہمرہ باد آمدم از کوی دوست　　　آوریدم نغمۂ ای از لوی دوست

بوی گل آوردم از "باغ مرام"　　　از بہار قونیۂ جنت مشام

تو کہ بوی بشنوی زان پیر ردم　　　پیر قدسی مرشد آن مرز و بوم

قونیہ دوم شدہ لاہور تو　　　از فیوض عشق نور از نور تو

آری اینجا ہست یک "باغ مرام"　　　باغ جنت "تربت اقبال" نام

---

[1] اس میں اقبال کے شعر ذیل کی طرف اشارہ ہے جس میں انھوں نے گوئٹے سے اپنا مقابلہ کیا ہے:

او چمن زاری چمن پروردہ ای　　　من دمیدہ از زمینِ مردہ ای

کعبۃ العشاق باشد این مقام　　ہر کہ اینجا ناقص آمد شد تمام

استادِ گرامی ڈاکٹر وحید قریشی نے چند سال پہلے ایک نظم "مسعود سعد سلمان — ایک خود کلامی" لکھی تھی۔ اس میں بھی ایک جگہ لاہور کا نام آگیا ہے:-

برای این کہ شود ختم کار دشمن من　　نگاہ دیدہ بہ ّا اشک کار پیکان کرد
بحکم آن شہ والا نشان بود کہ کنون　　ہمای اوج سعادت مرا سلیمان کرد
کسی نبود کہ دامن بدست خود گیرد　　خدا بحال من ناتوان چہ احسان کرد
ز مہر اوست کہ اکنون بسوی لہور شدم　　ز لطفِ اوست کہ دردم قرینِ درمان کرد
ثنا کنم بخدا و سخن کنم کوتہ
بنام او کہ مرا ہمنوای حسان کرد

مآخذ

اس مضمون کے لیے کتب و مجلاتِ ذیل سے استفادہ کیا گیا:-

لباب الالباب	سدید الدین محمد عوفی	مطبوعہ لیڈن
منتخب التواریخ	ملا عبدالقادر بدایونی	" لکھنؤ (۱۲۸۴ھ)
طبقات اکبری	نظام الدین احمد	" لکھنؤ
شاہجہان نامہ (عمل صالح) جلد سوم	محمد صالح کنبوہ	" لاہور
انشائے منیر لاہوری	ابوالبرکات منیر	" لکھنؤ
کلمات الشعرا	محمد افضل سرخوش	" لاہور
سرو آزاد	میر غلام علی آزاد بلگرامی	" لاہور
گل رعنا (تذکرہ شعرائے ہنود)	لچھمی نارائن شفیق	
تذکرہ مردم دیدہ	عبدالحکیم حاکم لاہوری	" لاہور
ظفر نامہ رنجیت سنگھ	دیوان امرناتھ اکبری	" لاہور
تذکرہ حسینی	میر حسین دوست سنبھلی	" لکھنؤ
مفتاح التواریخ	تھامس ولیم بیل	" لکھنؤ (۱۲۸۴ھ)
تذکرۃ الشعرا	محمد عبدالغنی غنی	" علیگڑھ
لاہور، اِٹس ہسٹری	خان بہادر محمد لطیف	" لاہور

کتاب	مصنف	مطبوعہ
سلطنت غزنویاں	استاد خلیلی	مطبوعہ کابل
ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ	ڈاکٹر سید عبداللہ	" دہلی
کلیات ملا شاہ	مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری	
بہرام شاہ آف غزنین	ڈاکٹر غلام مصطفیٰ	" لاہور
شعر العجم جلد ۳	مولانا شبلی نعمانی	" لاہور
تاریخ ادبیات در ایران	ذبیح اللہ صفا	" تہران
تاریخ ادبیات ایران	رضا زادہ شفق	" اصفہان
بزم مملوکیہ	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	" اعظم گڑھ
بزم تیموریہ	"	"
تذکرہ شعرائے جدید	ڈاکٹر عبدالوحید	" لاہور
دیوان عرفی	عرفی شیرازی	" لکھنؤ
دیوان واقف	واقف بٹالوی	" "
دیوان قلندر	قلندر شاہ لاہوری	" لاہور
دیوان محبوب	غلام محبوب سبحانی	" "
پیام مشرق	علامہ اقبال مرحوم	" "
مثنوی اسرار و رموز	"	" "
زبور عجم	"	" "
ارمغان پاک	شیخ محمد اکرام	" تہران (چاپ سوم)
اورینٹل کالج میگزین	شمارہ مئی ۳۲ء	" لاہور
مجلہ ہلال میگزین	شمارہ ۲ سلسل نمبر ۲۷، ۱۲، ۱۹/۲۲	" کراچی
مجلہ معارف	شمارہ مارچ ۲۷ء	
مجلہ سروش	شمارہ ۱۵ جولائی ۱۹۶۱ء	
مآثر الامرا جلد دوم	شاہنواز خان	" کلکتہ
میخانہ عبدالنبی	عبدالنبی فخرالزمانی	" لاہور
دیوان فیضی	فیضی فیاضی	" "
دیوان مخزن التوحید	کنہیا لال ہندی	" " (۱۸۸۵ء)
نیرنگ خیال	جون ۱۹۴۲ء	لاہور

کتاب	مصنف / مرتب		مقام
رسالہ نقوش لاہور	مئی ، اگست ، اکتوبر ۱۹۶۱ء	مطبوعہ	لاہور
دیوان عنصری		"	لکھنؤ
قصائد فرخی (انتخاب)		"	لاہور
دیوان استاد ابوالفرج رونی	مرتبہ پروفیسور چایکین	مطبع شوروی سنہ ۱۳۰۴ھ	
قران السعدین	از امیر خسرو	"	لکھنؤ
مثنوی قدسی	حاجی محمد قدسی	" مطبع افغانی	امرتسر
دیوان صائب		"	لکھنؤ
مثنوی یکتا	مرتبہ پروفیسر مولوی محمد باقر	"	لاہور
قصۂ ہیر رانجھا		"	امرتسر
نامۂ عشق	مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی	"	لاہور
دیوان گرامی		"	"
درای کاروان		"	تہران
انتخاب شعرائے معاصر ایران	ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی	"	لاہور
نیا ایرانی ادب	ڈاکٹر ظہور الدین احمد	"	"
رسالہ مخزن (گرامی نمبر)	اگست ۱۹۲۷ء	"	"
جام مینائی	شمس مینائی		لاہور

ادیب اور مصنّف

شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی

طفیل صاحب مدیر نقوش نے جب اس مضمون کے لیے مجھ سے کہا تو میں نے اسے بہت معمولی اور آسان کام سمجھا اور خوشی خوشی وعدہ کر لیا۔ میرا خیال تھا کہ زیادہ سے زیادہ بیس پچیس مشاہیر کے نام اور حالات لکھ دینے سے مضمون مکمل ہو جائے گا اور اس طرح میرا پیچھا آسانی سے چھوٹ جائے گا۔ مگر میرے حال پر ٹھیک وہی مثل صادق آئی کہ ؎

عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا

جب مضمون مرتب کرنے بیٹھا تو پتہ لگا کہ کام اتنا آسان اور سہل نہ تھا جتنا میں سمجھا تھا۔ ابھی تھوڑا سا کام کرنے پایا تھا کہ مجھ پر نمونیہ کا سخت حملہ ہوا اور میں بیکار محض ہو کر پلنگ پر پڑ گیا۔

اسی دوران میں میں نے سنا کہ "لاہور نمبر" کی کتابت زور شور سے ہو رہی ہے۔ اور عنقریب رسالہ شائع ہو جائیگا ناچار بیماری کا خیال نہ کیا اور مضمون تیار کرنے میں مصروف ہو گیا۔ چار دن مسلسل کام کیا اور دو راتیں تین تین بجے رات تک اس کے لیے وقف کیں۔ تب مار مار کر کے یہ مضمون تیار ہوا۔ خدا کرے طفیل صاحب کو اور ناظرین کرام کو پسند آئے۔ میں نے اپنی طرف سے اس مضمون کے مرتب کرنے میں تلاش اور جستجو کا کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا۔ لیکن کوئی انسانی کوشش کبھی مکمل نہیں ہو سکتی۔

میں نے اس مضمون میں صرف "مرحوم" ادیبوں کے حالات لکھے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ شاید زندوں کے اس لیے نہیں لکھے کہ اُن پر تنقید کرنے ہوئے ڈرتا ہوں۔ یہ بات تو نہیں مگر قصہ مختصر، آپ یہی سمجھ لیجیے۔

مرحوم ادیبوں میں میں نے اُن تمام اصحاب کو شامل کیا ہے جنھوں نے کسی نہ کسی رنگ میں ادب اور علم کی خدمت کی ہے۔ خواہ وہ شاعر ہیں خواہ نثر نگار۔ خواہ مضمون نویس ہیں خواہ انشا پرداز۔ خواہ ناول نویس ہیں خواہ افسانہ نگار۔ خواہ مؤلف ہیں خواہ مصنف۔ خواہ سوانح نگار ہیں خواہ مورّخ۔ میں نے اُن علمائے کرام کو بھی اس زمرے میں شامل کر لیا ہے جو صاحب تصنیف ہیں اور اُن محترم بزرگوں کے حالات بھی لکھے ہیں جنھوں نے اگرچہ کوئی کتاب نہیں لکھی مگر علمی انجمنوں۔ ادبی محفلوں اور تعلیمی کوششوں کی قدر دانی اور ہمت افزائی کی ہے اور اُن کی حتی الامکان شوق اور خلوص سے امداد اور اعانت کی ہے۔ چونکہ صحافت بھی ادب کا ایک ضروری حصّہ ہے اس لیے میں نے اس مضمون میں مرحوم مدیران جرائد کا بھی ذکر کیا ہے۔ اگرچہ مجھے اعتراف ہے کہ لاہور کے تمام اخبارات و رسائل کے مرحوم ایڈیٹروں کے حالات میں اس مضمون میں جمع نہیں کر سکا۔ اور صرف چند نام ہی لکھ سکا۔

یہ بات بھی ظاہر کر دوں کہ صرف اُردو کے ادیبوں کے حالات میں نے اس مضمون میں لکھے ہیں۔
چونکہ "لاہور کے اطبا" اور "لاہور کے مورخ" دو مضمون پہلے ہی "لاہور نمبر" میں شائع ہو رہے ہیں۔ اس لیے ایسے اصحاب جو ادیب ہونے کے ساتھ حکیم اور مورخ بھی تھے میں نے یہاں درج نہیں کیے۔
جن ادیبوں کے حالات میں نے اس مضمون میں لکھے ہیں وہ تین قسم کے ہیں:
(۱) وہ اصحاب جو لاہور ہی کے رہنے والے تھے اور ساری عمر یہیں رہے۔
(۲) وہ حضرات جو باہر سے آ کر لاہور میں رہے اور باقی عمر یہیں بسر کر دی۔
(۳) وہ اشخاص جو باہر سے آ کر عرصہ تک لاہور میں مقیم رہے اور پھر یہاں سے تشریف لے گئے لیکن بعد میں اکثر لاہور آتے رہے۔

سخت ناشکری ہو گی اگر تمہید کو ختم کرنے سے پہلے میں اپنے اُن محترم احباب کا شکریہ ادا نہ کروں جنھوں نے اس مضمون کے مرتب کرنے میں از راہ کرم میری مدد کی۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ شکر گذار میں مکرمی حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری کا ہوں، جنھوں نے حقیقت یہ ہے کہ بے انتہا خلوص کے ساتھ اس کام میں میرا ہاتھ بٹایا ہے۔ اور بہت سے لوگوں کے حالات لوگوں سے پوچھ کر۔ اُن کی اولاد کے پاس جا کر۔ اُن کی قبروں کے کتبے پڑھ کر۔ پرانی کتابوں کو تلاش کر کے۔ اخباروں کے فائلوں کو دیکھ کر میرے لیے فراہم کیے۔
محترمی پیر غلام دستگیر نامی مرحوم کا بھی بالواسطہ ممنون ہوں کہ اُن کی قلمی یادداشتوں سے مجھے بہت سے ادیبوں کی تاریخ ہائے وفات کا علم ہوا۔ ان یادداشتوں کو بھی حکیم محمد موسیٰ صاحب نے بڑی محنت سے مطالعہ کر کے ضروری تاریخوں کو میرے لیے نقل کیا۔ یہ اُن کا مجھ پر مزید احسان ہے۔
مشفقی مولوی محمد عبداللہ صاحب قریشی بی اے اور مجتبیٰ کسری صاحب نے بھی دو تین اصحاب کے حالات مجھے دیئے اُن کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔
بانی طفیل صاحب کو خود میرا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ میں نے اُن کے لیے یہ مضمون لکھا۔
میں نے یہ حالات بہت ہی مختصر لکھے ہیں۔ اگر مفصل لکھتا تو "لاہور نمبر" انھی سے بھر جاتا اور مزید مضامین کے لیے طفیل صاحب کو "دو لاہور نمبر" شائع کرنے پڑتے۔

مولانا ابوالحسنات[1] سید محمد احمد قادری المخاطب بہ مولانا ابوالحسنات مولانا دیدار علی کے فرزند اور لاہور کی مسجد وزیر خاں کے خطیب تھے۔ ۱۹۵۳ء میں ختم نبوت کا جو ہولناک طوفان مغربی پاکستان میں برپا ہوا، اس کا مرکز بھی مسجد وزیر خاں تھی اور مولانا "مجلس عمل" کے صدر رہے۔ اس سلسلہ میں قید و بند کی تکالیف بھی آپ کو بھگتنی پڑیں۔ عربی و فارسی کے اچھے عالم اور صاحب تصنیف شخص تھے۔ اُن کی بعض کتابوں کے نام یہ ہیں۔ صبح نور۔ النامح اوراق غم۔ رفیق السفر الیٰ بلد خیر البشر۔ مصنف ہونے کے ساتھ ہی آپ شاعر اور طبیب بھی تھے۔ ۲ جنوری ۱۹۶۱ء تاریخ

---

[1] میں نے اس مضمون کی ترتیب حروفِ تہجی کے لحاظ سے رکھی ہے تاکہ ہر شخص کا نام آسانی سے مل جائے۔

وہاں ہے۔ اور داتا گنج ؒ کا احاطۂ مزار آخری آرام گاہ۔

مجتہد العصر مولانا سید ابوالقاسم یہ ایک کشمیری الاصل فاضل اور شیعہ صاحبان کے مشہور مجتہد تھے۔ معقول و منقول پر کافی عبور رکھتے تھے۔ ممالک اسلامیہ کی بھی آپ نے سیاحت کی تھی اور ہر جگہ سے فیض حاصل کیا تھا۔ آپ نے لاہور میں شیعی طلبہ کے لیے مدرسہ امامیہ جاری کیا جو عرصہ تک بڑی کامیابی سے چلتا رہا۔ قرآن کریم کی ایک نہایت مفصل تفسیر آپ نے لکھنے کا ارادہ کیا تھا جس کے متعلق خیال تھا کہ ۳۰ جلدوں میں ختم ہوگی۔ مگر ابھی بارہ جلدیں لکھی گئی تھیں کہ پیغام اجل آگیا اور آپ نے ۱۴ محرم ۱۳۲۴ھ کو انتقال فرمایا۔ مولانا سید علی الحائری آپ ہی کے فرزند ارجمند تھے۔

سید ابوالقاسم دلاوری لاہور کے ایک صاحب قلم اور مشہور ادیب تھے جنھوں نے تاج کمپنی اور شیخ غلام علی اینڈ سنز وغیرہ کے لیے بعض مفید اور اعلیٰ پایہ کی اسلامی کتابیں لکھیں۔ مثلاً رکعات التراویح جس میں ۲۰ رکعت پڑھنے کے ثبوت دیے گئے ہیں۔ اہل حدیث آٹھ تراویح پڑھتے ہیں۔ اور اس پر اصرار کرتے ہیں۔ اُن کے جواب میں یہ کتاب سید صاحب نے لکھی تھی۔

"عماد الدین" فقہ حنفیہ کے مطابق نماز کے نہایت مفصل مسائل۔

"شمائل کبریٰ" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے دنیا میں تشریف لا کر کس قدر بے نظیر اخلاقی تعلیم دی۔ اس کی تشریح۔

"خلافت الٰہیہ"۔ "رئیس قادیان" اور "ائمہ تلبیس" کے علاوہ ان کی دو غیر مطبوعہ کتابیں "محسن اعظم" اور "توہمات فرہنگ" بھی ہیں جو عنقریب چھپنے والی ہیں۔

آپ نے مدرسہ نعمانیہ لاہور میں تعلیم پا کر علوم کی تحصیل کی تھی۔ ایک ماہنامہ موسوم بہ "درویش" کے بھی ایڈیٹر تھے۔ اوائل ۱۹۵۹ء میں انتقال کیا۔

احسن مارہروی نام سید علی احسن۔ وطن مارہرہ ضلع ایٹہ۔ پیدائش ۱۸۷۶ء مطابق ۱۲۹۳ھ۔ عربی اور فارسی کے فاضل، ماہر لسانیات اور اردو کے مستند ادیب تھے۔ فن شعر کا ذوق صغر سنی سے تھا۔ ۱۸۹۶ء میں وطن سے شعر و سخن کا ایک ماہوار گلدستہ ریاض سخن جاری کیا۔ جس کا نام بعد میں بدل کر ریاض خلیل کر دیا۔ مگر رسالہ چل نہ سکا اور احسن حیدر آباد تلاش معاش میں چلے گئے۔ ۱۹۰۳ء میں وہاں سے چلے آئے۔ اس کے بعد لاہور آئے اور یہاں لالہ سری رام ایم۔ اے کے پاس تیس روپیہ ماہوار پر ملازم ہو گئے۔ جو اُس زمانہ میں خمخانۂ جاوید لکھ رہے تھے۔ پھر یہاں سے نوکری چھوڑ کر مطبع مفید عام میں ملازم ہو گئے۔ لاہور کے زمانہ قیام میں فصیح الملک کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا۔ پھر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وطن چلے گئے اور وہیں ۳۰ اگست ۱۹۴۰ء کو انتقال کیا۔ فن شعر میں داغ کے شاگرد تھے۔ تصانیف میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔

فصیح اللغات۔ تاریخ نثر اردو۔ کارنامۂ غم۔ تحفۂ احسن۔ چپ کی فریاد۔ کسوف الشمسین۔ اردو نشکر۔ شاہکار عثمانی۔

اپنے اُستاد کے کلام کے دو مجموعے جلوۂ داغ اور منتخبات داغ کے نام سے شائع کیے۔ اُن کے خطوط کا مجموعہ بھی انشائے داغ کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا۔

خان احمد حسین خاں بی۔ اے آپ لاہور کے رئیس خان بہادر ڈاکٹر محمد حسین خاں آنریری مجسٹریٹ کے فرزند مشہور ادیب اور مصنف تھے اور احمد تخلص کرتے تھے۔ فن شعر میں مرزا ارشد گورگانی کے شاگرد تھے۔ ادب سے

خاص ذوق اور شغف تھا۔ اسی شوق کے باعث آپ نے لاہور سے ماہنامہ شباب اُردو جاری کیا۔ جو مدتوں اعلیٰ پایہ کے ادبی مضامین، دلکش نظمیں اور دلچسپ فسانے شائع کرتا رہا۔ تصنیف و تالیف کی کثرت کا یہ حال تھا کہ آپ نے ڈیڑھ سو کے قریب کتابیں لکھیں جن میں زیادہ ناول تھے۔ تعجب ہے کہ اتنے کثیر التصانیف ادیب کو لوگ بہت جلد بھول گئے اور ہمارے نوجوان ادیب اب اُن کے نام سے بھی واقف نہیں۔ اُن کی نظموں کا مجموعہ "آبِ بقا" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ ۱۸۶۹ء آپ کا سالِ پیدائش ہے۔ ۸۸ برس کی عمر میں، ۶۰ برس تک ادب، علم اور صحافت کی خدمت کرنے کے بعد یہ بوڑھا ادیب یکم جنوری ۱۹۵۷ء کو ہمیشہ کے لیے دُنیا سے رخصت ہو گیا۔ اُن کی بعض کتابوں کے نام یہ ہیں،

سیرتِ احمدی (آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری)۔ بعض ناول یہ ہیں: نکبیر بیگم۔ سوزِ حسرت۔ گیتی آرا۔ آہ۔ آپ بیتی۔ واہ۔ شمعِ سحر۔ پری بانو۔ آئینہ روزگار۔ نازنین مہ جبین۔ سادھو کی کرتوت۔ مکافاتِ عمل۔ پارہ دل۔ درد۔ شرحِ حروف۔ وہ عورت جس نے کر دکھایا۔ ابلیس و جمیلہ۔ اسرارِ امرتسر۔ کوہ شملہ۔ تصویرِ رسوائی۔

لالہ زار اُن کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔

مولوی احمد دین لاہور کے پرانے وکیل تھے۔ آپ کی وکالت خوب چلتی تھی اور آپ لاہور کے نہایت کامیاب اور نمایاں وکیلوں میں سے تھے۔ مسلمانوں کے بڑے خیر خواہ اور ہمدرد بزرگ تھے۔ انجمن حمایتِ اسلام اور انجمن کشمیری مسلمانانِ لاہور سے آخری دم تک تعلق رہا۔ اور آپ ہر طرح سے ان دونوں اداروں کی اعانت کرتے رہے۔ تصنیف و تالیف کا بہت اچھا ذوق تھا۔ چنانچہ (۱) عالمگیر (۲) اقبال اور (۳) سرگذشتِ الفاظ تین کتابیں آپ نے بڑی محنت سے لکھی ہیں۔ سرگذشتِ الفاظ پر انعام بھی ملا تھا۔

مولوی احمد بابا مخدومی ۱۵ رجون ۱۸۶۵ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے جوان ہو کر لاہور چلے آئے اور پھر ساری عمر یہیں گذار دی۔ شروع میں ریلوے کی ملازمت کی مگر مضمون نگاری کے شوق اور تصنیف و تالیف کے ذوق نے بہت جلد نوکری سے متنفر کر دیا اور مستعفی ہو کے ادب اور علم کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔ آپ انجمن حمایتِ اسلام کے ابتدائی معاونین میں تھے۔ اور آپ نے تمام عمر نہایت خلوص کے ساتھ انجمن کے مختلف عہدوں پر کام کیا۔ التنقیح فی ولادت مسیح اور آخری مضامین سر سید آپ کی تالیفات ہیں۔ ۶۳ برس کی عمر میں ۸ رجون ۱۹۲۷ء کو وفات پائی۔

انجمن کا "رسالہ حمایتِ اسلام" جب جاری ہوا تو اُس کے سب سے پہلے ایڈیٹر آپ ہی تھے۔ ابتدا میں یہ پرچہ ماہوار شائع ہوتا تھا۔

مولوی احمد بخش یکدل یہ بڑے فاضل اور عالم شخص مولوی نور احمد چشتی مؤلف تحقیقاتِ چشتی اور مولوی محرم علی چشتی ایڈیٹر رفیقِ ہند کے والد تھے۔ پہلے لاہور کی منڈی کے مدرسہ میں مدرس رہے۔ پھر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دیوان راجہ دینا ناتھ کے لڑکوں کے اتالیق مقرر ہوئے۔ جب آپ راجہ دینا ناتھ کے بھائی دیوان کدار ناتھ کی شادی میں دہلی گئے تو بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں حاضر ہونے پر وہاں سے فخر الشعرا کا خطاب سند۔ تیرہ پارچہ کا خلعت۔ دو رقم جواہر آپ کو ملا۔ لاہور کے بڑے بڑے معزز سکھوں، ہندوؤں اور مسلمانوں نے آپ سے اکتسابِ علم کیا ہے۔ مولوی صاحب کو فنِ تاریخ پر زبردست عبور حاصل تھا چنانچہ آپ نے ۱۸۱۹ء سے لے کر ۱۸۶۰ء تک کی مسلسل روزانہ واقعات کی مفصل ڈائری ۲۰ جلدوں میں مرتب

کی تھی جو ۱۹۱۳ء تک اُن کے وارثوں کے پاس غیر مطبوعہ حالت میں تھی۔ یہ پتہ نہیں کہ اب بھی ہے یا نہیں۔ (تحقیقات چشتی صد ۱۶
مہاراجہ رنجیت سنگھ مصنفہ کوہلی صد ۵)

احمد علی مولوی احمد علی شاہ اسلامیہ کالج لاہور میں عربی، فارسی اور دینیات کے پروفیسر، بڑے اور عالم انسان تھے۔ دس بارہ سال تک شاہی مسجد لاہور کے خطیب رہے۔ مدرسہ غوثیہ کے شیخ الحدیث بھی تھے۔ کتاب الشفا کے ترجمے پر آپ کا پورا نام اس طرح لکھا ہوا ہے "جناب مولانا مولوی حافظ احمد علی شاہ بٹالوی حنفی نقشبندی چشتی نظامی پروفیسر دینیات عربی اسلامیہ کالج لاہور"

آپ کی تالیفات میں ایک کتاب کا نام نور الشمعہ فی ظہر الجمعہ ہے اور دوسری کا نام سرور الخاطر الناظر فی ندا یا شیخ عبد القادر۔
آپ نے عربی و فارسی سے مندرجہ ذیل کتابوں کے ترجمے اُردو میں کئے:

۱۔ نفحات الانس از مولانا جامی
۲۔ تحفۃ القلوب و ہدیۃ الارواح (فارسی) مؤلفہ شیخ عثمان جالندھری۔
۳۔ مشکوٰۃ الانوار از امام غزالی۔
۴۔ بہجۃ الاسرار و معدن الانوار۔ از شیخ نور الدین ابی الحسن بن یوسف شافعی (مناقب غوث الاعظم)
۵۔ الشفا بحقوق المصطفیٰ از قاضی عیاض۔

آپ نے ۱۹۲۶ء میں وفات پائی۔

پنڈت ہری چند اختر لاہور کے ادیبوں اور شاعروں میں خاص حیثیت کے شخص تھے۔ لاہور کی تمام ادبی محفلوں اور تمام مشاعروں میں نہایت ذوق و شوق کے ساتھ شریک ہوا کرتے تھے۔ بہت اعلیٰ قابلیت کے انسان اور بہت اچھے ادیب تھے۔ رسالہ نیرنگ خیال لاہور میں انھوں نے بڑی نہایت دلچسپ مضمون نگاری میں لکھے ہیں۔ تقسیم ملک کے وقت تک لاہور میں مقیم رہے۔ پھر دہلی چلے گئے اور وہیں یکم جنوری ۱۹۵۸ء کو انتقال کیا۔ اپریل ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے تھے۔

اختر شیرانی فاضل اجل علامہ حافظ محمود شیرانی کے فرزند اور بہت اعلیٰ درجہ کے شاعر۔ اچھے ادیب اور مشہور انشا پرداز تھے۔ طبعاً بلند سیرت اور نیک طینت شخص تھے مگر شراب نوشی کی عادت نے اُن کے تمام محاسن اور اخلاق پر پردہ ڈال دیا تھا۔ فطرتاً کریم النفس نیک نہاد، خلیق، دوست نواز اور بڑے غیور تھے۔ ساری عمر قلندرانہ حالت میں گزاری۔
انھوں نے اپنی زندگی میں متعدد رسالے جاری کئے مگر کوئی بھی زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا۔ جو رسائل انھوں نے وقتاً فوقتاً نکالے اُن کے نام یہ ہیں: انتخاب۔ بہارستان۔ خیالستان۔ رومان اور مخزن۔

آپ کی نظموں کے سب ذیل مجموعے شائع ہوئے: صبح بہار۔ اختر ستان۔ لالۂ طور۔ طیور آوارہ۔ شہناز۔ شہرود۔ نغمہ حرم۔ پھولوں کے گیت۔

ان کے نثر کے مضامین کے مجموعہ کا نام دھڑکتے دل ہے جو شائع ہو چکا ہے۔ اس سے قبل "ضحاک" اور "آئینہ خانے" میں نثر کی دو مختصر کتابیں شائع ہوئیں۔ ان کے علاوہ آپ نے عوفی کی جوامع الحکایات کا فارسی سے دو جلدوں میں ترجمہ کیا۔ نیز

مجمع البحرین مطلع السعدین اور جامع اللغات ہر چہار جلد کی ترتیب و تدوین میں حصہ لیا۔ اس قابل اور لائق نوجوان کو صرف ۴۴ برس کی عمر میں شراب کھا گئی۔ اور یہ ادب اردو کا چہکتا ہوا بلبل ۹ ستمبر ۱۹۴۸ء کو ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ آپ ۴ مئی ۱۹۰۵ء کو ریاست ٹونک میں پیدا ہوئے تھے۔

مولوی سیف الحق ادیب مولوی شاہ عبدالحق محدث کی اولاد میں سے تھے اور ۱۸۴۶ء میں دہلی کے محلہ مفتی والان میں پیدا ہوئے۔ ذہن نہایت عمدہ اور طبیعت نہایت تیز پائی لہذا بہت چھوٹی عمر میں فارسی۔ عربی اور انگریزی کی اچھی خاصی استعداد حاصل کر لی۔ تحصیل علم کے بعد سرکاری نوکری کی اور عدالت منصفی میں نائب ناظر ہو گئے مگر طبیعت نوکری کے مناسب نہ تھی اس لیے تھوڑے دنوں بعد استعفیٰ دے کر اخباری لائن میں قدم رکھا اور میوگزٹ نامی ایک پرچہ جاری کیا جس میں بہت اچھے شاعرانہ مضامین اور غزلیں ہوتی تھیں۔ مگر جب وہ نہ چلا تو اسے بند کر کے مختلف اخباروں میں نظم و نثر مضامین لکھنے لگے۔ جس سے آن کی بڑی شہرت ہوئی۔ پھر انجمن قصور کے سیکرٹری ہو کر قصور چلے گئے اور "انجمن قصور" کے ماہوار رسالہ کو بھی ایڈٹ کرتے رہے۔ مگر جلد ہی یہاں سے جی اچاٹ ہو گیا اور آپ لاہور چلے آئے اور یہاں سررشتہ تعلیم میں ملازم ہو گئے پھر یہاں اطمینان سے بیٹھ کر نہایت کثرت سے اخباروں میں علمی مباحث پر طبع آزمائی کرنے لگے۔ ذرا کسی سے ناراضگی ہو گئی جھٹ اس کے خلاف ایک مضمون لکھ مارا اور جواب الجواب کا سلسلہ عرصہ تک چلتا رہا۔ اس کے بعد آپ اخبار کوہ نور کے ایڈیٹر ہو گئے اور مدتوں اس کو بڑی کامیابی سے ایڈٹ کرتے رہے۔ ازاں بعد مولوی محرم علی چشتی کے اخبار رفیق ہند کے توڑ پر ایک ہفتہ وار اخبار شفیق ہند نکالا اور بڑے زور کے معرکے دونوں اخباروں میں ہوتے رہے۔ شفیق ہند کے ساتھ اس کے دو ضمیمے بھی نکلتے تھے۔ نسیم صبح اور شام وصال۔ فن شعر میں غالب کے شاگرد تھے۔ تاریخ گوئی میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ پھر گورنمنٹ رپورٹر ہو کر حیدرآباد دکن چلے گئے۔ شراب کے بڑے عادی تھے۔ اور اسی عادت نے جان لی۔ اور دہلی میں ۱۸۹۱ء میں انتقال کیا۔

ارشد گورگانی شاہان مغلیہ کی یادگار مرزا عبدالغنی ارشد گورگانی عرصہ دراز تک لاہور میں رہے۔ اور یہاں سے جانے کے بعد بھی ہمیشہ یہاں آتے رہے۔ شاعری میں مرزا قادر بخش صابر کے شاگرد تھے۔ بہت نیک طینت اور شستہ و شائستہ شخص تھے۔ بہت اچھے ادیب اور نہایت اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے۔ شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی کی مشہور نظم شکوہ ہند پر آپ نے جو تضمین لکھی ہے وہ حسن بیان اور لطافت زبان کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتی۔ تضمین ارشد اسی کا نام تھا اور لاہور ہی سے چھپ کر شائع ہوئی تھی۔ طرز قدیم اور طرز جدید دونوں قسم کی نظمیں لکھنے میں انہیں بڑی مہارت تھی اور بڑی صفائی کے ساتھ اپنے خیالات کو نظم کر سکتے تھے۔ ملکہ وکٹوریا کی سوانح عمری انھوں نے نظم میں لکھی تھی جس کا نسخہ میں نے مولانا حالی کی لائبریری میں دیکھا تھا بڑی سلیس اور فصیح و بلیغ نظم تھی۔ ارشد، مولانا حالی کے خاص دوستوں میں سے تھے اور باہم بڑے گہرے تعلقات تھے۔ جب مولانا حالی لاہور میں مقیم تھے تو دونوں کی بڑی پرلطف صحبت رہتی تھی۔ دونوں انجمن پنجاب لاہور کے مشاعروں میں بھی نہایت شوق سے شامل ہوا کرتے تھے۔ ۱۸۵۰ء میں قلعہ معلیٰ دہلی میں پیدا ہوئے۔ اور غدر کے بعد پنجاب آکر محکمہ تعلیم میں ملازم ہو گئے اور پھر ساری عمر یہیں گذار دی۔ آخر ۲۱ فروری ۱۹۰۶ء کو ملتان میں انتقال کیا۔

مولانا حالی کو اپنے اس جگری دوست کی وفات کا سخت صدمہ ہوا تھا۔

پروفیسر آرنلڈ پروفیسر ٹی۔ ڈبلیو آرنلڈ کیمبرج کے گریجوایٹ بڑے مشہور مستشرق۔ نہایت بااخلاق۔ حد سے زیادہ غیر متعصب اور انگریزی۔ فرنچ۔ عربی اور فارسی کے زبردست عالم تھے۔ جنوری ۱۸۸۸ء میں مدرستہ العلوم مسلمانانِ علی گڑھ میں پروفیسر مقرر ہو کر لندن سے آئے۔ جس خیر خواہی۔ جس تندہی اور جس شوق کے ساتھ وہ علی گڑھ کالج میں طلبا کو تعلیم دیتے رہے۔ اس کی یاد ان لوگوں کے دلوں سے کبھی محو نہ ہو گی جنھوں نے ان سے پڑھا ہے۔ علی گڑھ پہنچنے پر انھوں نے اپنے یورپین لباس کو چھوڑ کر خالص ہندوستانی مولویوں جیسا لباس اختیار کر لیا۔ اسی وضع سے وہ کالج میں آتے اور اسی لباس میں اسلامی جلسوں میں شامل ہوتے تھے۔ اسی وجہ سے لوگ انھیں مولانا آرنلڈ کہتے تھے۔ علی گڑھ پہنچتے ہی انھوں نے طلبا کی دینی نگرانی کا کام بڑے خلوص کے ساتھ اپنے ذمہ لیا۔ وہ نمازوں کے اوقات میں مسجد میں پہنچ جاتے تھے اور جو طالب علم غیر حاضر ہوتا تھا خود اس کے کمرہ میں جا کر اس سے پوچھتے تھے کہ آج آپ نماز کے وقت مسجد میں نہیں آئے کیا کچھ طبیعت خراب ہے؟ اس طرح مارے شرم کے لڑکا پانی پانی ہو جاتا تھا۔ اس بے نظیر طرزِ سلوک کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے زمانے میں نمازوں میں طلبا کی حاضری سو فیصدی ہوا کرتی تھی۔ انھوں نے سرسید سے کہہ کر قرآن کریم کا درس کالج میں لازمی کرایا۔ مولانا شبلی درس دیا کرتے تھے اور آرنلڈ بھی اپنا قرآن لے کر درس میں شامل ہوا کرتے تھے۔ پرنسپل بھی درس میں شریک ہوتے تھے مجلس اخوان الصفا کے روحِ رواں وہی تھے۔ سرسید کے کہنے سے انھوں نے بڑی تحقیق اور تلاش سے کتاب پریچنگ آف اسلام لکھی۔ یہ ایسی بے نظیر کتاب ہے کہ ان کے نام کو ابد تک زندہ رکھے گی۔ اس میں ثابت کیا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا۔ اور تمام ممالک میں اسلام کی اشاعت کی تاریخ بیان کی ہے۔ مولوی عنایت اللہ دہلوی نے سرسید کی فرمائش پر اس کا اردو ترجمہ دعوتِ اسلام کے نام سے کیا۔ فروری ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ سے گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر ہو کر آ گئے پھر اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل ہو گئے۔ یہیں انھوں نے عربی کی مشہور لغت سواء السبیل الی معرفۃ المعرب والدخیل قاضی ظفر الدین احمد پروفیسر اورینٹل کالج لاہور کی مدد سے ۱۹۰۲ء میں لکھی۔ ۱۹۰۴ء میں وہ انڈیا آفس کے اسسٹنٹ لائبریرین ہو کر لندن چلے گئے۔ وہاں انھوں نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی ترتیب میں بھی زبردست امداد کی۔ ۱۹۲۰ء میں لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۹ر جون ۱۹۳۰ء کو انتقال کیا۔ مولانا شبلی اور ڈاکٹر اقبال ان کے شاگرد تھے۔

پنڈت راج نرائن ارمان آپ کا قدیمی وطن سری نگر ہے۔ مگر آپ نے اپنی عمر کا بہت کافی حصہ لاہور میں گذارا۔ اردو کے بہت اچھے شاعر اور ایک سو کے قریب فسانوی۔ تاریخی۔ صنعتی۔ تجارتی اور مذہبی کتابوں کے مصنف ہیں۔ فن شعر میں راسخ دہلوی اور مضطر خیر آبادی اور داغ دہلوی کے شاگرد ہیں۔ اخبار ظریف سہارن پور۔ رسالہ تصویرِ سخن سہارن پور۔ پٹیالہ اخبار پٹیالہ۔ پنجاب سماچار لاہور۔ ہنکاری لاہور۔ راجپوت گزٹ لاہور۔ برہمن گزٹ راولپنڈی کے ایڈیٹر رہے۔ مئی ۱۹۱۲ء میں اپنا اخبار ارمان جاری کیا۔ آپ کے کلام کا نمونہ خمخانہ جاوید جلد اول میں درج ہے۔ اکتوبر ۱۹۳۰ء میں انتقال کیا۔

ارمان سرحدی۔ اصلی نام امان اللہ خاں تھا۔ امید تھی کہ یہ پاکستان کے ادیبوں میں بہت جلد اپنا ایک خاص مقام پیدا

کر لیں گے اور خود اُن کو بھی اپنا مستقبل نہایت درخشاں نظر آتا تھا۔ مگر موت کے بے رحم ہاتھوں نے بہت جلد تمام آرزوؤں اور امنگوں کا خاتمہ کر کے رکھ دیا اور یہ نوجوان اور ہونہار ادیب صرف ۴۱ سال کی عمر میں دُنیا سے رخصت ہو گیا۔ اور صرف ڈیڑھ ماہ علیل رہ کر ۴ ہر اگست ۱۹۶۱ء کو اُنھوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

مرحوم بڑی عمدہ صلاحیتوں کے مالک اور بہت پاکیزہ اخلاق کے حامل تھے۔ بہت اچھے ادیب اور بہت اعلیٰ درجہ کے مترجم تھے۔ تحریر کی قابلیت اور انشا کی لیاقت ان میں بہت اچھی تھی۔ ابتدا میں فیروز سنز کے ہاں اُردو انسائیکلو پیڈیا کا کام کرتے رہے پھر شیخ غلام علی اینڈ سنز سے تعلق قائم ہو گیا جہاں اُنھوں نے بہت عمدہ عمدہ کتابیں لکھیں۔ مثلاً غوث اعظم۔ ترجمہ غنیۃ الطالبین ترجمہ فتوح الغیب۔ احسن الکلام۔ دُنیا کے ظالم حکمران۔ مشاہیر کے رومان اور جدید نفسیات وغیرہ۔

مولوی محمد حسین آزاد یہ دہلی کے رہنے والے مشہور ادیب اور انشا پرداز ہیں۔ ۱۸۵۷ء میں باپ کے مارے جانے اور گھر کے تباہ ہونے کے بعد بحال تباہ شہر سے نکلے اور پھرتے پھراتے ۱۸۶۴ء میں لاہور پہنچے اور یہیں کے ہو رہے۔ لاہور میں آپ گورنمنٹ کالج کے پروفیسر اور سرکاری رسالہ اتالیق پنجاب کے سب ایڈیٹر تھے۔ اس دوران میں کابل بخارا اور ایران کے سفر بھی کئے۔ ۱۸۸۷ء میں شمس العلما کا خطاب ملا۔ ۱۸۸۹ء میں جنون کی ابتدا ہوئی اور یہ مرض آخر تک رہا۔ ۱۹۱۰ء میں لاہور ہی میں وفات پائی اور امام باڑہ گامے شاہ میں دفن ہوئے۔ سخندانِ پارس۔ آبِ حیات۔ دربارِ اکبری وغیرہ آپ کی مہتم بالشان تصانیف ہیں۔ (خمخانۂ جاوید جلد اول صـ۳۶ صـ۳۷)

ازل ان کا نام ابوالاعجاز منشی عبدالمجید تھا۔ یہ صاحب اپنے وقت میں لاہور کے حلقہ میں کافی نمایاں حیثیت کے مالک تھے اور مشاعروں میں خوب غزلیں پڑھا کرتے تھے۔ بہت سے ناموروں کے ساتھ دنیا انھیں بھی بھول گئی۔ ان کی غزلوں کا دیوان ۱۳۳۳ھ میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا مجموعہ کلام بعد میں " ارمغانِ ازل " کے نام سے شائع ہوا۔ ایک دلچسپ نظم حضرت فاروق اعظمؓ کے ایمان لانے کی کیفیت کے بارہ میں بھی آپ نے لکھی تھی جسے لاہور کی انجمن دائرۃ الاصلاح نے شائع کیا تھا آج سے ۹ سال پہلے ۱۹۵۰ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ ازل لاہور کے قدیمی باشندے تھے اور فن شعر میں داغ کے شاگرد تھے۔ محکمہ انہار پنجاب لاہور میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز تھے۔

مرزا اشرف بیگ دہلی کے رہنے والے ایک نہایت قابل اور فاضل بزرگ تھے ۱۲۶۴ھ میں پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی علوم میں مفتی صدرالدین آزردہ کے اور فن شعر میں غالب کے شاگرد ہیں۔ اُردو کے علاوہ عربی اور فارسی کی بے نظیر قابلیت رکھتے تھے۔ مولانا حالی کے بہت گہرے دوستوں میں سے تھے۔ ۱۸۷۵ء میں لاہور آئے اور مولانا حالی کے بعد پنجاب بک ڈپو میں اسسٹنٹ ٹرانسلیٹر مقرر ہو گئے۔ جہاں آپ انگریزی سے اُردو میں طلبا و مدارس کے لیے کتابیں ترجمہ کیا کرتے تھے۔ بعد ازاں عربی و فارسی کے اعلیٰ امتحانوں کے ممتحن بھی مقرر ہو گئے تھے۔ عمر صرف ۳۷ سال کی ہوئی اور ۱۸۸۲ء میں انتقال کیا۔

اشک پانی پتی ان کا نام ضیاء الدین تھا۔ اور پانی پت کے رہنے والے تھے مشہور ادیب اور مورخ مولوی کریم الدین پانی پتی ان کے نانا تھے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے پاس کیا اور یہیں رہنے لگے مگر عین جوانی کے ایام

ہیں بعمر ۴۲ سال ۱۸۹۳ء میں لاہور ہی میں انتقال کیا۔ طبیعت بڑی موزوں پائی تھی اور رشک تخلص کرتے تھے۔ (خمخانہ جاوید جلد اول ص ۳۱۸)

رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب آپ دہلی کے ایک معزز رئیس تھے اور وہیں ۱۸۳۸ء میں پیدا ہوئے تھے۔ پرانے دہلی کالج کے تعلیم یافتہ اور بڑے شستہ مذاق کے آدمی تھے۔ غالب سے نہایت گہرے تعلقات تھے۔ تخلص آشوب تھا۔ ۱۸۶۸ء میں لاہور آئے اور سررشتہ تعلیم پنجاب کے کیوریٹر مقرر ہوئے اور اپنے فرائض کو پندرہ سولہ برس تک بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ ۱۸۸۴ء سے ۱۸۹۵ء تک دہلی اور جالندھر کے انسپکٹر مدارس رہے۔ اور اسی سنہ میں ریٹائر ہو کر دہلی چلے گئے اور وہیں ۱۹۱۴ء میں انتقال کیا۔ قصص ہند۔ رسوم ہند تاریخ انگلستان وغیرہ آپ کی تصانیف ہیں۔

سیّد امجد علی اشہری علوم مشرقی کے اچھے فاضل۔ اعلیٰ درجہ کے مضمون نگار اور مشہور ادیب اور مصنّف تھے ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوئے۔ آغاز شباب ہی سے شعر و شاعری کا چسکا پڑ گیا اور مضمون نویسی کا بھی۔ چنانچہ سر سید احمد خاں کے خلاف تیرھویں صدی اور آگرہ اخبار میں بڑے زور شور کے مضامین لکھے۔ ۱۸۸۱ء میں آپ نے بھوپال سے اخبار دبیر الملک جاری کیا۔ جہاں آپ بسلسلہ ملازمت مقیم تھے اور ۲۲ برس تک وہاں بڑے اطمینان سے رہے۔ دو مرتبہ حیدر آباد گئے اور وہاں سے دونوں مرتبہ پانچ پانچ سو روپے ملے۔ ۱۹۰۳ء میں لاہور آئے اور ۱۹۰۵ء تک دفتر پیسہ اخبار میں کام کرتے رہے۔ پھر دہلی چلے گئے اور وہیں ۲۸ مئی ۱۹۱۰ء کو انتقال کیا۔ صاحب تصنیف بھی تھے ان کی چند کتابوں کے نام لالہ سری رام نے خمخانہ جاوید میں یہ لکھے ہیں۔ حدیقہ شاہجہانی۔ گلدستہ سلطانی۔ ترانہ معرفت۔ ایشیائی شاعری۔ گلدستۂ اردو۔ دیہیم خسروی لغات الخواتین۔ مرقع تاجپوشی۔ حجاب نورجہاں۔ تاریخ اُردو۔

اصغر علی مولانا اصغر علی روحی ایم۔ او۔ ایل مولوی فاضل۔ منشی فاضل اسلامیہ کالج اور اورینٹل کالج لاہور کے پروفیسر رہے۔ بڑے فاضل اور قابل انسان تھے ۱۹۵۴ء میں وفات پائی۔ دبیر عجم۔ العروض والقوافی۔ مانی الاسلام وغیرہ محققانہ کتابوں کے مصنف تھے۔ ایک ماہوار دینی اور علمی رسالہ الہدیٰ بھی آپ نے لاہور سے ۱۹۰۳ء میں جاری کیا تھا جو عرصہ تک شائع ہوتا رہا۔ عربی فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے۔ دبیر عجم میں نمونۂ کلام موجود ہے۔

اصغر گونڈوی ان کا نام اصغر حسین تھا۔ اور یہ ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے تھے۔ فن شعر میں امیر اللہ تسلیم کے شاگرد ہیں۔ آپ کو نظم اور نثر دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ جیسی نظم لاجواب ہوتی تھی ویسی ہی نثر دلچسپ ہوتی تھی۔ کپور اینڈ سنز لاہور کی مشہور فرم نے ایک زبردست اشاعتی ادارہ "اردو مرکز" کے نام سے جاری کیا تھا۔ آپ اس کے نہایت سرگرم کارکن تھے۔ اُردو کے اس عاشق نے ۳۰ نومبر ۱۹۳۶ء کو انتقال کیا۔ نشاطِ روح اور سرودِ زندگی اُن کے کلام کے مجموعے ہیں۔

خدا بخش اظہر امرتسری لاہور کے مشہور اخبار نویس اور روزنامہ زمیندار کے ایڈیٹر تھے۔ اچھے شاعر اور کامیاب مصنّف اور ایک سلجھے ہوئے ادیب تھے۔ شروع میں کانگرس کے زبردست حامیوں اور کارکنوں میں سے تھے۔ مگر ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان کے پاس ہونے پر مسلم لیگ کے پُرجوش ممبر بن گئے۔ عمر کا آخری بہت سا حصّہ لاہور میں گذرا۔

ایک بہت دلچسپ کتاب "خونی تحریکیں" آپ ہی کی لکھی ہوئی ہے۔ ۹ دسمبر ۱۹۵۵ء کو حرکت قلب بند ہونے سے یک لخت انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت عمر صرف ۴۴ سال کی تھی۔

مرزا اعجاز حسین دہلوی آپ کے بزرگوں کا وطن دہلی تھا۔ مگر والد مرزا مرزا حسین نے غدر ۱۸۵۷ء میں دہلی سے نکل کر پنجاب کا رخ کیا اور بسلسلہ ملازمت مختلف اضلاع میں پھرتے رہے۔ شعر کا مذاق شروع ہی سے تھا اور نوجوانی میں بڑے معرکتہ الآرا مشاعروں میں شریک ہوئے۔ اعجاز تخلص تھا۔ ۱۲ برس کی عمر میں ۱۸۹۷ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ اور ۱۸۹۹ء کے شروع تک پنجاب چیف کورٹ میں بحیثیت مترجم کام کرتے رہے۔ قیام لاہور کے دوران میں آپ نے سوئمن کی تاریخ عالم اور لیڈ کی سائیکولاجی کا اردو میں ترجمہ کیا جس پر پنجاب یونیورسٹی نے ان کو انعام دیا۔ ۱۸۹۹ء میں لاہور سے انبالہ چلے گئے اور وہاں وکالت شروع کر دی۔ فن شعر میں میر مہدی مجروح کے شاگرد ہیں۔ ان کا کلام بڑی کثرت کے ساتھ اخبارات میں چھپا کرتا تھا۔ سال وفات معلوم نہ ہو سکا۔ (خمخانہ جاوید جلد اول صفحہ ۳۳۵)

منشی مہدی حسن افسر لاہور کے سب سے پہلے اور مشہور اخبار "کوہ نور" کے توڑ پر لاہور ہی سے اس زمانہ میں ایک صاحب نے اخبار "دریائے نور" کے نام سے جاری کیا۔ افسر صاحب اس کے ایڈیٹر تھے اور نہایت سختی کے ساتھ کوہ نور کے خلاف مضامین لکھا کرتے تھے۔ پھر ملتان جا کر اخبار "ریاض نور" نکالا جو ملتان کا سب سے پہلا اخبار تھا۔ ۱۸۵۶ء میں ان پر ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ قائم ہو گیا اور سات برس کے لیے جیل بھیج دیئے گئے۔ قید کاٹنے اور رہا ہونے کے بعد لکھنؤ چلے گئے اور اودھ اخبار میں ملازم ہو گئے اور کچھ عرصہ بعد وہیں انتقال کیا۔

چودھری افضل حق لاہور میں سابق مجلس احرار کے بہت بڑے لیڈر، بلند پایہ سیاست دان۔ گاندھی کے مرید۔ کانگرس کے حامی۔ اعلیٰ درجہ کے انشا پرداز اور زبردست خطیب تھے۔ ان کی زندگی کا آغاز پولیس کی سب انسپکٹری سے ہوا۔ تحریک عدم تعاون کے دوران میں انھوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اور باقی تمام عمر انگریز کی سخت مخالفت اور کانگرس کی حمایت میں گذار دی۔ اسی سلسلہ میں آٹھ نو برس قید بھی رہے۔ لیکن بہت جلد لوگ ان کو بھول گئے۔ بقول شورش وہ زندگی میں بھی مجلس کا چراغ تھے اور زندگی کے بعد بھی گمنام قبر ہیں۔ دنیا میں دوزخ۔ قید خانے کے کوائف۔ میرا افسانہ۔ جواہرات شعور۔ محبوب خدا۔ دین خدا۔ تاریخ احرار ان کی مشہور کتابیں ہیں مگر سب سے زیادہ شہرت ان کی اس کتاب کو حاصل ہوئی جس کا نام "زندگی" ہے۔ انتقال کی تاریخ ۸ جنوری ۱۹۴۲ء ہے۔

منشی دوارکا پرشاد افق منشی پورن چند کایستھ مالک مطبع ثنائی لکھنؤ کے فرزند اور فن شعر میں منشی شنکر دیال فرحت کے شاگرد ہیں۔ شعر گوئی کا شوق بچپن سے تھا۔ افق تخلص کرتے تھے۔ فارسی سنسکرت اور انگریزی سے خوب واقف تھے۔ لکھنؤ سے نظم اخبار نکالا مگر پھر اسے بند کر کے ۱۹۰۵ء میں لاہور چلے آئے اور پنجاب سماچار کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ بہت سی کتابیں آپ نے ترجمہ و تالیف کی ہیں مثلاً تاڈ راجستان۔ رامائن۔ مہا بھارت۔ افضل التواریخ۔ سرور سخن۔

اقبال شاعر مشرق علامہ اقبال کو کون نہیں جانتا کہ جن کے تعارف کی ضرورت ہو۔ اب تک ان کے متعلق بیسیوں کتابیں شائع ہو چکیں اور سینکڑوں مضامین لکھے گئے جن کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ کراچی اور لاہور میں ان کی یاد تازہ رکھنے اور

اُن کی تصنیفات اور کلام کو شائع کرنے کے لیے اقبال اکیڈمی اور مجلس اقبال قائم ہیں اور پرائیویٹ طور سے بھی اُن کے متعلق بے انتہا لٹریچر ہو گیا ہے۔ آپ اُردو کے مسلمہ شاعر اور فارسی کے بے نظیر ناظم مانے جاتے ہیں۔ آپ کی کتابوں کے تراجم انگریزی اور عربی اور ہندی میں بھی ہوئے اور آپ کی شہرت لاہور سے نکل کر یورپ اور امریکہ تک پہنچی۔ آپ کے حالاتِ زندگی ہر شخص کو معلوم ہیں اور آپ کے کلام سے ہر پڑھا لکھا بخوبی واقف ہے لہٰذا تفصیلات کی ضرورت نہیں مختصر یہ کہ آپ ۱۸۷۶ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے اور ایک نہایت کامیاب زندگی گذارنے کے بعد ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو لاہور میں انتقال کیا۔ آپ کا مزار شاہی مسجد لاہور کی سیڑھیوں سے نیچے مرجع خلائق ہے۔ آپ کے کلام اُردو و فارسی کے مختلف مجموعے چھپ چکے ہیں اور اُن کی شرحیں بھی شائع ہو چکی ہیں اور ہر جگہ ملتی ہیں۔

اکبر شاہ خاں نجیب آبادی

اُردو کے بلند پایہ ادیب۔ بہت سی اعلیٰ درجہ کی تاریخی اور تحقیقی کتب کے مؤلف۔ کئی اخباروں اور رسالوں کے ایڈیٹر اور ملک کے مشہور انشا پرداز تھے ۱۸۷۵ء میں نجیب آباد (یو۔پی) میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں نجیب آباد ہی میں سکول ماسٹری کی پھر اُسے چھوڑ کر قادیان چلے گئے یہاں مدتوں رہے یہیں انھوں نے اپنی سب سے پہلی کتاب مرقاۃ الیقین شائع کی جو اپنے پیر اور اُستاد حضرت مولانا حکیم نورالدین صاحب بھیروی کی بڑی ہی عجیب سوانح عمری ہے۔ پھر لاہور چلے آئے یہاں اخبار پیغامِ صلح کی عرصہ تک ایڈیٹری کرتے رہے۔ پھر زمیندار کے ایڈیٹر ہو گئے دیال سنگھ کالج کے پروفیسر بھی رہے۔ پھر وطن چلے گئے اور وہاں سے رسالہ عبرت جاری کیا۔ جو تاریخی واقعات کا بہترین مرقع ہوتا تھا۔ آپ کی کتابوں میں سب سے زیادہ شہرت تاریخ اسلام کو حاصل ہوئی جو تین ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی۔ آئینہ حقیقت نما آپ کی نہایت محققانہ کتاب ہے۔ اسلامی سپاہیانہ زندگی۔ مذہب اور تلوار۔ معیار العلماء۔ نظامِ سلطنت اور مقدمہ تاریخ ہند بھی آپ ہی کی تالیفات میں سے ہیں مگر افسوس یہ ہے کہ آپ کی کتابوں کی کماحقہٗ قدر نہیں ہوئی۔ اور آن کا نام بہت ہی جلد قعرِ گمنامی میں چھپ گیا۔ ۱۲ مئی ۱۹۳۸ء کو ہندو پاک کے اس بہت بڑے مورخ اور ادیب نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

دیوان امرناتھ اکبری

رنجیت سنگھ والیئے لاہور کے دیوان راجہ دینا ناتھ کا بیٹا، اور اپنے زمانہ کے نہایت فاضل شخص مولوی احمد بخش چشتی کا شاگرد تھا۔ اعلیٰ درجہ کا مورخ اور فارسی کا بہت اچھا ادیب تھا۔ مہاراجہ کی فرمائش پر اس کی زندگی کے حالات ۱۸۳۳ء سے ۱۸۳۶ء تک کے لکھے۔ جو نہایت مفصل اور مکمل ہیں۔ ۱۹۲۸ء میں اس کتاب کو پروفیسر سیتارام کوہلی نے اپنی شرح کے ساتھ ظفرنامہ رنجیت سنگھ کے نام سے شائع کیا۔ (مہاراجہ رنجیت سنگھ مصنفہ کوہلی ص۵)

سید اولاد علی

ایک بہت لائق اور قابل شخص تھے۔ عرصہ تک سرکاری نوکری کی۔ ریٹائر ہونے کے بعد دفتر اُردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام لاہور کے دفتر میں بحیثیت سکرٹری کام کرتے رہے۔ ۲۴ جنوری ۱۹۶۰ء کو وفات پائی آپ نے مرقع ملتان ایک بڑی محققانہ کتاب لکھی ہے جس میں ملتان کے تمام آثارِ قدیمہ۔ اس کے مقابر اور معابد اور اس کے تمام مشاہیر کا حال بڑی تفصیل سے اور نہایت تحقیق کے بعد درج کیا ہے۔ اچھی خاصی ضخیم کتاب ہے۔

باری علیگ

روزنامہ احسان لاہور کے ایڈیٹر اور بہت ذی علم اور مشہور ادیب تھے۔ لاہور کی علمی اور ادبی مجلسوں میں ان کی موجودگی بہت رونق کا باعث ہوتی تھی۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بی اے پاس کیا تھا۔ اور ترجمہ کی نہایت عمدہ قابلیت رکھتے تھے۔ رائٹ آنریبل سید امیر علی کی مشہورِ عالم کتاب "شارٹ ہسٹری آف دی سارا سنز" کا آپ ہی نے ترجمہ کیا تھا۔ اور اس پر

مفید حواشی مولانا علم الدین سالک نے لکھے تھے اور صوفی تبسم نے اس کی نظر ثانی کی تھی "تاریخ اسلام" کے نام سے اُردو اکیڈمی لاہور نے اسے مدت ہوئی شائع کیا تھا۔

میر باقر علی مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ کے ایک مشہور شاعر تھے۔ باقر تخلص کرتے تھے۔ مدت تک لاہور میں رہے۔ حکیم مومن خاں کے ہمعصر تھے۔ کلام بہت اچھا ہوتا تھا۔ (خمخانہ جاوید جلد اول ص ۵۳۳)

خان بہادر برکت علی خاں لاہور کے مشہور و معروف رئیس، اعلیٰ سرکاری عہدیدار، انجمن اسلامیہ کے بانی۔ لاہور میونسپلٹی کے وائس پریذیڈنٹ، پنجاب یونیورسٹی کے فیلو اور علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی تھے۔ ۱۸۸۲ء میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری سے ریٹائر ہونے کے بعد اپنی تمام سرگرمیاں مسلمانوں کی تعلیمی، معاشرتی اور اخلاقی حالت کو بہتر بنانے میں وقف کر دیں۔ سرسید کے بڑے زبردست معاونوں اور مددگاروں میں سے تھے۔ لوگ انھیں "پنجاب کا سرسید" کہا کرتے تھے لاہور میں سرکلر روڈ پر "برکت علی محمڈن ہال" اُنھی کی یادگار ہے۔ ۱۹۰۵ء میں وفات پائی اور درگاہ شاہ محمد غوث میں دفن ہوئے۔ اصل وطن شاہجہانپور (یو۔ پی) تھا۔

مولانا ابوسعید بزمی ایم۔اے سید ابوسعید بزمی ایم اے لاہور کے مشہور اخبار نویس اور بڑے اچھے ادیب اور مصنف تھے بھوپال وطن تھا۔ مگر عمر کا کافی حصہ لاہور میں گذارا۔ مطالعہ کا شوق بچپن سے تھا۔ ان کے نانا مولوی سراج الحق بھوپال کے "قاضی القضاۃ" اور ایک بڑے کتب خانہ کے مالک تھے۔ انھوں نے بڑے شوق سے بزمی کو عربی اور فارسی پڑھائی اور بزمی نے اُن کے کتب خانے سے بہت فائدہ اُٹھایا۔ والد کے انتقال کے باعث سولہ ہی برس کی عمر سے معاش کی فکروں میں مبتلا ہو گئے۔ مگر اسی حالت میں بڑے استقلال کے ساتھ ایم۔ اے پاس کر لیا۔ اُن کی مشہور کتاب "تاریخ انقلابات عالم" ہے جو دو جلدوں میں ۱۹۴۹ء میں شائع ہوئی۔ انتقال ۱۵ ستمبر ۱۹۵۱ء کو ہوا۔ آخر میں آپ روزنامہ احسان کے مدیر اعلیٰ تھے۔ اُن کی ایک دوسری کتاب بھی بہت مشہور ہے جس کا نام ہے "اور جب خون بہہ رہا تھا"

بیدل دہلوی منشی مرزا بیگ خاں بیدل دہلی کے رہنے والے تھے۔ مگر لاہور آکر سررشتہ تعلیم کے دفتر میں ملازم ہو گئے۔ یہاں اُن کا کام کتابوں کی تصحیح اور درستی تھا یہ کام وہ یہاں ۳۰ برس تک کرتے رہے۔ شاعر بھی تھے اور بیدل تخلص کرتے تھے۔ اکثر درسیہ کتب کی ترتیب میں بھی حصہ لیتے رہتے تھے۔ ۱۹۰۰ء میں ۵۶ سال کی عمر تھی۔ کلام کا کچھ نمونہ صاحب خمخانہ جاوید نے جلد اول میں دیا ہے۔ (خمخانہ جاوید جلد اول ص ۶۷۷)

منشی طالب علی پابند آپ لاہور کے مشہور اخبار نویس اور مصنف گذرے ہیں۔ عرصہ دراز تک ماسٹر جگت سنگھ مالک رسالہ رہنمائے تعلیم کے ہاں ملازم رہے اور رسالہ کو ایڈٹ کرتے رہے بلکہ ۱۹۲۴ء میں رہنمائے تعلیم سے علیحدہ ہو کر اپنا اخبار "تعلیم" کے نام سے ہفتہ وار جاری کیا۔ جو طلبہ اور مدرسین کے لیے نہایت مفید اور کارآمد پرچہ تھا۔ عام شائقین کے لیے بھی اس میں دلچسپی کی بہت سی چیزیں ہوتی تھیں۔ کثیر الاشاعت اور مقبول عام پرچہ تھا اور معقول حجم کے ساتھ شائع ہوتا تھا۔ اڈیٹری کے علاوہ آپ نے بہت سی تعلیمی کتب بھی لکھی ہیں جو سکولوں میں بڑی کثرت سے فروخت ہوتی تھیں۔ ۲۷ اگست ۱۹۴۵ء کو عید کی نماز پڑھنے شاہی مسجد میں گئے۔ واپسی کے وقت دروازہ مسجد میں، ہجوم کی کثرت کے باعث کچل کر

رہ گئے۔ اور سات آٹھ آدمیوں کا بھی یہی حشر ہوا۔ اس عظیم سانحہ کا اس وقت سارے شہر لاہور میں سخت ماتم کیا گیا۔ جب سے انتظام کچھ بہتر ہونے لگا ہے۔

آپ شاعر بھی تھے اور پابند تخلص کرتے تھے۔

پطرس آپ کا نام سید احمد شاہ بخاری تھا۔ اور نہایت اعلیٰ درجہ کے ادیب اور مشہور مزاح نویس تھے۔ یکم اکتوبر ۱۸۹۸ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور اور عمانیویل کالج کیمبرج میں تعلیم پائی۔ ازاں بعد سنٹرل ٹریننگ کالج اور گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر رہے۔ ۱۹۳۶ء میں آل انڈیا ریڈیو میں چلے گئے۔ ۱۹۴۷ء میں گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل بنے۔ ۱۹۵۰ء میں انجمن اقوام متحدہ میں پاکستان کے مستقل نمائندہ مقرر ہوئے اور وہیں ۵ دسمبر ۱۹۵۸ء کو آپ کا انتقال ہوا۔

"پطرس کے مضامین" آپ کے ادبی نوادرات کا مجموعہ ہے۔ نقوش نے آپ کی یاد میں پطرس نمبر شائع کیا ہے۔

پروفیسر محمد دین تاثیر ایم۔ اے لاہور کے نہایت باذوق۔ ذی علم۔ ادیب۔ انشاپرداز اور اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے۔ ۲۸ فروری ۱۹۰۲ء کو پیدا ہوئے۔ پہلے ایم۔ اے۔ او کالج امرتسر کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ پھر آزاد کشمیر چلے گئے آخر میں اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل ہو گئے تھے۔ شادی ایک یورپین خاتون سے کی تھی۔ جنہوں نے مسلمان ہو کر اپنا نام بلقیس تاثیر رکھا۔ نظم و نثر کا نہایت اعلیٰ مذاق رکھتے تھے۔ اُن کے کلام کا مجموعہ آتشکدہ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ نہایت با اخلاق۔ ملنسار۔ شریف الطبع اور بے ریا انسان تھے۔ رحمدلی اور ہمدردی اُن میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ۳۰ نومبر ۱۹۵۰ء کو لاہور ہی میں وفات پائی۔ "عزیزم کے نام" ان کے خطوط کا مجموعہ بہت دلچسپ ادبی شاہکار ہے جو ادارہ فروغ اردو لاہور نے شائع کیا ہے۔

تاج ابوالمعانی مولانا تاج الدین احمد تاج ملا محمد بخش مالک جعفر زٹلی کے فرزند اور اپنی اعلیٰ شاعرانہ قابلیتوں۔ مذہبی جوش و خروش۔ اپنی انشاپردازی اور اخباری تجربہ کے باعث لاہور کی نہایت ممتاز ہستیوں میں سے تھے۔ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۹ء تک آپ نے سات ماہوار۔ ہفتہ وار اور روزانہ رسائل و اخبارات جاری کئے۔ اردو کے علاوہ پنجابی میں شاعری کرتے تھے اور مشاعروں میں بڑے شوق سے شرکت کیا کرتے تھے۔ (تاریخ اقوام کشمیر صفحہ ۴۸۶)

آپ ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۲ مئی ۱۹۵۹ء کو لاہور میں انتقال کیا۔

تاجور نجیب آبادی شمس العلماء مولانا احسان اللہ خان تاجور نجیب آباد کے رہنے والے تھے۔ ۱۹۱۲ء میں لاہور چلے آئے تھے اور باقی زندگی یہیں گزار دی۔ ابتدا میں ہمایوں کے دفتر میں نہایت معمولی تنخواہ پر کام شروع کیا اور آہستہ آہستہ ترقی کرتے چلے گئے۔ لاہور کے مشہور ادیبوں اور شاعروں میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ مدتوں رسالہ شاہکار نکالتے رہے۔ جو بہت اعلیٰ پایہ کا علمی اور ادبی ماہنامہ تھا اور اتنے بڑے سائز پر شائع ہوتا تھا کہ آج تک کوئی ماہنامہ ایسی شان سے شائع نہیں ہوا۔ آپ کے شاگردوں کا حلقہ نہایت وسیع تھا۔ دیال سنگھ کالج کے پروفیسر رہے اور دیال سنگھ لائبریری کے سیکرٹری اور پنجاب یونیورسٹی کے فیلو تھے۔ متعدد کتابوں کے مؤلف اور مصنف ہیں۔ اردو مرکز کے مشہور سلسلہ کی کتابیں آپ ہی کے اہتمام سے شائع ہوئی تھیں۔ ۱۸۹۴ء میں نینی تال میں پیدا ہوئے اور ۳۰ جنوری ۱۹۵۱ء کو لاہور میں وفات پائی۔

تپش شیخ عبداللطیف تپش ایم اے منشی فاضل پاکستان کے نہایت فاضل علم دوست اور باخبر اصحاب میں سے تھے۔ ۲۹ راکتوبر ۱۸۹۵ء کو پسرور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم لاہور میں پائی۔ شعر گوئی کا نہایت اعلیٰ اور شستہ مذاق رکھتے تھے کلام میں شیرینی۔ پختہ پن اور اثر وجذب پایا جاتا ہے۔ سر شیخ عبدالقادر مرحوم آپ کے خسر تھے۔ گورنمنٹ کالج پسرور اور ایمرسن کالج ملتان میں السنہ شرقیہ کے پروفیسر رہے۔ ۱۹۴۲ء میں انتقال کیا۔

ترنم مولانا غلام محمد ترنم امرتسر کے رہنے والے تھے تقسیم ملک کے وقت لاہور چلے آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے اچھے شاعر اور زبردست خطیب تھے۔ فن طب سے بھی بڑا گہرا لگاؤ تھا۔ پنجاب یونیورسٹی کے فیلو تھے۔ ۲۴ رجون ۱۹۵۹ء تاریخ انتقال ہے۔

منشی محمد علی تشنہ ایک خوش فکر۔ خوش کلام شاعر دہلی کے رہنے والے تھے۔ ذوق اور طپش کے شاگرد تھے وضع دردلیشوں کی اور مزاج آزادوں کا رکھتے تھے۔ حافظہ اس بلا کا تھا کہ صدہا غزلیں اور نظمیں نوک زبان تھیں۔ ۱۲۸۲ھ میں لاہور آئے اور کچھ دنوں یہاں رہے۔ شراب بکثرت پیتے تھے اور اکثر بدمست رہتے تھے داغ انور اور ظہیر وغیرہ کے ہم مشق اور ہم صحبت تھے۔ ۱۲۸۶ھ میں وفات پائی۔

جالب اُردو کے نہایت قابل اور لائق انشا پرداز۔ اعلیٰ درجہ کے مضمون نگار بڑے مشہور اور چوٹی کے اخبار نویس اور مختلف علمی و تاریخی معلومات کا ایک سمندر تھے۔ نام سید بشارت علی تھا۔ ۱۸۶۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے تھے اُردو ادب میں حضرت شمس العلما مولانا حالی کے اور فن شعر میں مجروح و داغ کے شاگرد ہیں۔ مگر اپنی بڑھی ہوئی قابلیت اعلیٰ علمی لیاقت۔ طبیعت کی جودت۔ اور ذہن کی جولانی کے باوجود مالی لحاظ سے ہمیشہ تنگدست اور مفلس رہے۔ اور زندگی کے بیشتر ایام بالعموم عسرت تنگی اور تکلیف میں بسر ہوتے۔ ۱۸۹۰ء میں لاہور آئے اور پیسہ اخبار روزانہ میں جوائنٹ ایڈیٹر مقرر ہو گئے اور ۱۹۱۲ء تک اسی اخبار سے متعلق رہے۔ پیسہ اخبار کے علاوہ حسب ذیل اخبارات و رسائل کے بھی ایڈیٹر رہے۔ اکمل الاخبار دہلی۔ اودھ اخبار لکھنؤ۔ اخبار وکیل امرتسر۔ اخبار پنجاب امرتسر۔ اخبار شریف امرتسر۔ روزانہ اخبار دہلی۔ اخبار وطن لاہور۔ رسالہ مخزن لاہور۔ آخر عمر میں روزنامہ ہمدم لکھنؤ کے ایڈیٹر ہو گئے تھے۔ پھر وہاں سے چھوڑ کر اپنا پرچہ ہمت جاری کیا مگر نہ چلا آخر اسی کس مپرسی اور بیکسی کی حالت میں کئی دن تک لکھنؤ میں ہسپتال میں زیر علاج رہ کر ۲۵ رجولائی ۱۹۳۰ء کو انتقال کیا۔

منشی جنگ بہادر جنگ شہر میرٹھ کے رہنے والے خاندانی شخص تھے۔ عرصہ تک عدالت کلکٹر اور محکمہ بندوبست میں ناظر رہے۔ پھر سرکاری نوکری چھوڑ کر اخبار انیس ہند کے ایڈیٹر ہو گئے اور عرصہ تک بڑی لیاقت کے ساتھ اس کی ادارت کرتے رہے۔ صاحب تصنیف بھی تھے اور اچھے شاعر بھی۔ جنگ تخلص کرتے تھے۔ بڑے حاضر جواب اور سخن سنج تھے۔ آخر عمر میں لاہور چلے آئے تھے اور یہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ۶ راپریل ۱۹۰۷ء کو ۵۰ سال کی عمر میں یہیں دنیائے فانی کو خیرباد کہا۔ آپ کی تصانیف میں سے چمنستان دلچسپ۔ چمنستان معرفت اور چمنستان صحت شائع ہو چکی ہیں۔ کلام کا نمونہ خمخانہ جاوید جلد دوم صفحہ ۲۶۹ پر درج ہے۔

منشی اللہ یار جوگی ۔ ان کے والد میجر خان محمد خاں فوجی ملازمت کے باعث عرصہ تک دکن میں رہے۔ جوگی ۱۸۸۲ء میں

بمقام پونا پیدا ہوئے۔ مگر ہوش لاہور آکر سنبھالا اور لاہور کے اسلامیہ سکول میں انٹرنس تک تعلیم پائی۔ فن شعر میں آغا شاعر دہلوی کے شاگرد ہیں۔ گائے کی حفاظت اور ہندو پرستی کے نشہ میں سرشار ہو کر لاہور سے گئو ماتا کے نام سے ایک ماہوار رسالہ بھی نکالا۔ (خمخانہ جاوید جلد دوم ص ۲۹۴)

حالی خواجہ الطاف حسین نام۔ حالی تخلص اور شمس العلما خطاب ہے۔ پانی پت میں ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے مقامی اساتذہ سے عربی و فارسی کی تعلیم پانے کے بعد ۱۸۵۲ء میں دہلی گئے۔ اور وہاں مولوی نوازش علی وغیرہ علماء سے علوم کی تحصیل کرتے رہے۔ پھر حصار کے ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ملازم ہو گئے۔ غدر ۱۸۵۷ء میں گھر آکر بیٹھ رہے۔ اور تحصیل علم کرتے رہے۔ ۱۸۶۱ء میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ رئیس جہانگیر آباد کے ہاں ان کے مصاحب اور ان کے بچوں کے اتالیق کی حیثیت سے ملازم ہوئے اور آٹھ برس تک جہانگیر آباد میں رہے ۱۸۹۶ء میں نواب صاحب کے انتقال کے بعد دہلی چلے آئے کچھ دنوں کے بعد پنجاب کے محکمہ تعلیم میں ناظر ادبی ہو کر لاہور آگئے اور ۱۸۷۴ء تک یہاں رہے پھر دہلی میں اینگلو عربک سکول کے اوّل مدرس فارسی ہو کر چلے گئے ۱۸۸۹ء میں ایچیسن کالج کے طلباء کے اتالیق ہو کر پھر لاہور آئے مگر پھر واپس دہلی چلے گئے اس کے بعد استعفیٰ دے کر تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔ ۱۹۰۴ء میں آپ کو شمس العلما کا خطاب ملا۔ اور ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو پانی پت میں انتقال کیا۔ مقدمہ شعر و شاعری۔ دیوان حالی۔ حیاتِ سعدی۔ یادگار غالب اور حیاتِ جاوید آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔ مسدس حالی نے آپ کے نام کو حیات جاوید بخشی۔

پیر وزیر علی شاہ حامی داغ کے شاگرد اور بہت اچھے شعر گو اور صاحب دیوان شاعر تھے۔ حامی تخلص کرتے تھے۔ امرتسر میں بلڈنگ کلرک تھے۔ پھر نوکری چھوڑ کر لاہور چلے آئے اور باقی عمر یہیں گزار دی۔ ۲۰ صفر ۱۳۴۹ھ کو ۷۵ سال کی عمر میں بمرض فالج انتقال کیا۔ (تاریخ جلیلہ ص ۲۸۲)

ان کی ایک کتاب "نعتیہ کلام حامی" میں نے بھی دیکھی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف میں ۳۴ نعتوں کا مجموعہ ہے اور ۱۹۲۸ء میں کریمی پریس لاہور میں ۴۸ صفحات پر چھپا ہے۔

سید حبیب پنجاب کی سیاست اور صحافت میں ان کا نام مدتوں نہایت نمایاں حیثیت سے مشہور رہا۔ اپنے حریفوں اور ہمعصروں سے ان کی قلمی جنگ بڑے زور کی رہا کرتی تھی۔ روزنامہ سیاست ۱۹۰۹ء میں لاہور سے جاری کیا اور اُسے مدت تک چلاتے رہے۔ کئی مرتبہ قید و بند کی تکالیف بھی برداشت کیں۔ اعلیٰ درجہ کے اخبار نویس۔ بہت اچھے مقرر اور اسلامی تاریخ کے خوب واقف شخص تھے۔ شعر و شاعری سے بھی بہت اچھا لگاؤ تھا چنانچہ بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ آپ کی یادگار ہے۔ آخری عمر بہت افلاس، غربت اور بیکسی میں گذری۔ ۱۸۹۱ء میں بمقام جاول پور چٹان پیدا ہوئے اور فروری ۱۹۵۱ء میں بمقام لاہور وفات پائی۔

حسرت مولانا چراغ حسن حسرت لاہور کے ادیبوں میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتے تھے۔ نہایت زندہ دل، خوش فکر اور بذلہ سنج انسان تھے۔ اعلیٰ درجہ کے ادیب۔ بلند پایہ شاعر۔ بہترین مصنف، افکاہات اور مضحکات کے استاد۔ ہر ادبی محفل کی جان اور ہر علمی مجلس کی روح رواں تھے۔ صاف، سلیس اور صحیح اردو لکھنے میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ بہت سے اخباروں

کے ایڈیٹر اور بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں "پربت کی بیٹی" اُن کی انشا پردازی کا شاہکار ہے۔ ۱۹۰۲ء میں ریاست پونچھ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے اور ۲۶ رجون ۱۹۵۵ء کو لاہور میں وفات پائی۔ سندباد جہازی آپ کا قلمی نام تھا۔

منشی عبداللہ المتخلص بہ حسرتی ریاض الاخبار کے ایڈیٹر تھے اور بہت سے اخباروں کے نامہ نگار اور وقائع نگار۔ عرصہ تک لاہور کے مشہور رئیس پنڈت جنار دھن کے ہاں وظیفہ خوار رہے۔ کیفر کردار اور دو تین اور ناول ان کی یادگار ہیں۔ (خمخانہ جاوید جلد دوم صفحہ ۴۲۶)

آغا حشر اردو کے نہایت مشہور ڈراما نویس تھے۔ نام آغا محمد شاہ تھا۔ اپنے فن کی ابتدا بمبئی سے کی۔ پھر کلکتے چلے گئے۔ آپ نے نہایت کثرت سے ڈرامے لکھے ہیں۔ غزل گوئی میں بھی کمال رکھتے تھے۔ شاعر بھی بہت اعلیٰ درجہ کے تھے۔ آخر عمر میں لاہور چلے آئے تھے اور ۱۸۷۹ء میں بنارس میں پیدا ہوئے اور ۲۸ راپریل ۱۹۳۵ء کو لاہور میں انتقال کیا۔ شکریہ یورپ اُن کی نہایت مشہور نظم ہے جو انھوں نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں پڑھ کر سنائی تھی۔

غلام حسن المتخلص بہ خرم یہ شخص فارسی شعر و قصائد اور غزل و مثنوی میں لاہور میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ پنج گنج ایک بہت ہی بے نظیر کتاب اس نے فارسی میں لکھی تھی۔ جو نوادرات زمانہ کا عجیب نمونہ تھی۔ اس میں آنحضرتؐ اور چاروں خلفا کا حال بیان کیا گیا ہے۔ (تاریخ لاہور صفحہ ۵۰)

مولانا محمد یار خلیق آپ موضع جوڑہ کلاں (سرگودھا) میں پیدا ہوئے۔ علوم عربیہ و فارسیہ کی تحصیل مدرسہ علوم شرعیہ بھیرہ شریف (سرگودھا) سے کرنے کے بعد لاہور آگئے اور ۴۸ سال تک برابر سنہری مسجد کے خطیب رہے۔ عربی، فارسی اور اُردو میں اشعار بھی کہتے تھے اور خلیق تخلص کرتے تھے۔ مذہباً حنفی نقشبندی تھے۔ ایک سو بارہ برس کی طویل عمر پاکر ۲۴ رجون ۱۹۳۷ء کو لاہور میں وفات پائی۔ آپ نے جو کتابیں تصنیف فرمائیں اُن میں سے سراج الشہادتین، مجموعہ خطب خلیق اور نافع الصلوٰۃ بہت مشہور ہیں۔ (تاریخ جلیلہ طبع اول ۱۹۲۷ء عطا کردہ حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری)

مولوی خلیل الرحمن عربی اور انگریزی کے نہایت اعلیٰ پایہ کے مترجم۔ بڑے علم دوست۔ نہایت با اخلاق بہت شریف الطبع اور بڑے نیک مزاج بزرگ تھے۔ اسلامی تاریخ کو عربی اور انگریزی سے اُردو میں منتقل کرنے کی جو کامیاب کوشش انھوں نے اور اُن کے نہایت قابل اور فاضل فرزندوں نے کی وہ صد ہزار تحسین کی مستحق ہے اور کبھی بھلائی نہیں جا سکتی۔ سراوہ (ضلع میرٹھ) کے رہنے والے تھے۔ اور دہیں ۱۰ شوال ۱۲۸۷ھ کو پیدا ہوئے تھے۔ ۱۸۸۹ء میں لاہور آئے اور چیف کورٹ میں ملازم ہو گئے۔ اس کے بعد وہ فنانشل کمشنر... ایجنٹ نارتھ ویسٹرن ریلوے کے سپرنٹنڈنٹ ہو گئے اور تعجب ہے کہ ایسے غیر شاعرانہ عہدے پر فائز رہتے ہوئے انھوں نے ایسی اعلیٰ بے نظیر کتابیں لکھیں جن کی افادیت کبھی فراموش نہیں ہو سکتی۔ یورپ کے مشہور مصنف رائڈر ہیگرڈ کی عجیب و غریب کتاب شی کا آپ نے عذرا کے نام سے ترجمہ کیا۔ پھر مشہور امریکن مورخ ایس۔ پی سکاٹ کی بے نظیر تاریخ "ہسٹری آف دی مورش ایمپائر ان یورپ" کا تین نہایت ضخیم جلدوں میں اخبار الاندلس کے نام سے ترجمہ کیا۔ اسی مصنف کی دوسری کتاب کا جس میں اُس نے مسلمانان اندلس کی بربادی و تباہی کا نہایت دردناک حال لکھا ہے مولدین کے نام سے ترجمہ کیا۔ علامہ شہاب الدین ابو العباس کی مشہور عالم کتاب "نفح الطیب" اور جلال الدین سیوطی کی تاریخ الخلفا کو عربی سے اُردو میں منتقل کیا۔

۱۳ فروری ۱۹۳۹ء کو یہ آفتاب علم لاہور میں غروب ہو گیا۔ آپ نے نہایت لائق و فائق فرزند اپنی یادگار چھوڑے جن کے نام یہ ہیں ۔
جمیل الرحمٰن ۔ نعیم الرحمٰن ۔ محمد مقصود الٰہی الرحمٰن ۔ محمد بذل الرحمٰن ۔ مقتدر کلیم الرحمٰن ۔ معتز جلیل الرحمٰن ۔

خوش دل نام محمد ابراہیم اور تخلص خوش دل ہے ۔ لاہور کے مشہور علمی خاندان "چشتی" سے تعلق رکھتے ہیں ۔ ان کے والد قاضی ضیاء الحق ایران سے اس ملک میں آئے اور لاہور کے محلہ گڑھی شاہو میں اقامت اختیار کی ۔ علم و فضل میں یگانۂ روزگار تھے ۔ مولوی نور احمد چشتی مصنف تحقیقات چشتی ۔ مولانا خوش دل کے پڑپوتے ہیں ۔ مولانا نے ۱۳۰۲ھ میں انتقال کیا ۔ رضی اللہ عنہم ۱۳۰۲ھ ان کا مادۂ تاریخ ہے ۔ اردو کلام کا نمونہ پنجاب میں اردو کے صفحہ ۲۹۲ ، ۲۹۳ پر ملاحظہ فرمائیں ۔ (پنجاب میں اردو ص ۲۹۱)

پروفیسر تاج محمد خیال اردو زبان کے زبردست حامی ، تعلیم کو عام کرنے کے زبردست مبلغ ، مشرقی اقدار حیات کے نمائندے بہت بڑے ماہر تعلیم اور نہایت سادہ وضع کے بزرگ تھے ۔ خیالؔ تخلص کرتے تھے اور بہت اچھا ادبی مذاق رکھتے تھے ۔ ۱۹۰۸ء میں بمقام کپورتھلہ پیدا ہوئے ۔ رندھیر کالج کپورتھلہ میں انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد لاہور چلے آئے اور یہاں گورنمنٹ کالج سے نفسیات اور فلسفہ کے مضامین میں ایم اے کیا ۔ ۱۹۳۳ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں پروفیسر مقرر ہو گئے ۔ ۱۹۳۹ء میں گورنمنٹ سروس میں داخل ہوئے اور گورنمنٹ کالج ملتان میں پڑھانا شروع کیا اور ۱۹۴۳ء تک وہاں پروفیسر رہے ۔ اس دوران میں ایک سال تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بھی نفسیات کے پروفیسر رہے ۔ ۱۹۵۱ء میں گورنمنٹ کالج لائل پور کے پرنسپل مقرر ہوئے پھر پنجاب میں ثانوی تعلیم کی عبوری کمیٹی کے رکن بنائے گئے ۔ ازاں بعد محکمہ تعلیمات پنجاب کے ترقیاتی افسر کے عہدے پر کام کیا ۔ وحدت مغربی پاکستان کے قیام پر انھیں محکمہ تعلیم میں کالجوں کے شعبے کا اسسٹنٹ ڈائرکٹر مقرر کیا گیا ۔ ۱۹۵۸ء میں وہ حکومت مغربی پاکستان کے محکمہ تعلیم کے ڈپٹی سیکرٹری مقرر ہوئے فروری ۱۹۵۸ء میں ثانوی تعلیمی بورڈ کے چیرمین کا عہدہ سنبھالا ۱۹۶۱ء تک قومی تعلیمی کمیشن اور نصاب کمیٹی میں اہم تعلیمی فرائض انجام دیئے اور ۱۹۶۱ء ہی میں وہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنائے گئے ۔ اس معزز عہدے پر پانچ ماہ ہی کام کرنے پائے تھے کہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۶۱ء کو حرکت قلب بند ہونے کے باعث انتقال کر گئے ۔

(امروز لاہور ۱۵ ، ۱۶ ، اکتوبر ۱۹۶۱ء)

خواجہ دل محمد لاہور کے نہایت مشہور و معروف ادیب مصنف ۔ شاعر اور ماہر ریاضی گذرے ہیں ۔ اور مدتوں آپ کا نام تعلیمی دنیا میں بہت کافی مشہور رہا ہے ۔ حساب اور الجبرے کی بہت سی کتابیں آپ نے طلباء کے لیے لکھیں ان میں سے اکثر سرکاری طور پر نصاب میں داخل تھیں ۔ خواجہ صاحب لاہور کی شیخ برادری سے تعلق رکھتے تھے ۔ ابتدائی تعلیم شیرانوالہ کے اسلامیہ ہائی سکول میں پائی پھر اسلامیہ کالج سے ایم اے پاس کیا ۔ ازاں بعد اسی کالج میں پرنسپل مقرر ہوئے ۔ اور یہیں سے ریٹائر ہوئے ۔ بہت اچھا علمی مذاق رکھتے تھے ۔ پنجاب یونیورسٹی کے فیلو اور لاہور کارپوریشن کے ممبر تھے ۔ لاہور کی وہ سڑک جو چوک دالگراں سے بیڈن روڈ تک جاتی ہے ۔ آپ کے نام سے دل محمد روڈ کہلاتی ہے ۔ حساب اور الجبرے کی بہت سی کتب کے علاوہ بھی اکثر نظم و نثر کی کتابیں آپ نے لکھی ہیں جن میں صد پارۂ دل بہت مشہور ہے ۔ ۱۹۶۰ء میں آپ کا انتقال ہوا ۔ بھگوت گیتا کا بھی آپ نے منظوم ترجمہ کیا تھا ۔

مولانا دیدار علی لاہور کے ایک مشہور فاضل ، عالم ، مفسر قرآن اور محدث تھے اور مسجد وزیر خاں میں درس و تدریس کا سلسلہ آپ نے مدت تک جاری رکھا جس سے بہت سے لوگ فیض یاب ہوئے ۔ عقیدے کے لحاظ سے آپ حنفی مشرب تھے اور اسی سلسلہ

ہیں آپ نے یہاں انجمن حزب الاحناف کی بنیاد رکھی جس نے بعد میں ایک دارالعلوم کی شکل اختیار کر لی۔ آپ کی ساری زندگی دینی خدمات کے لیے وقف رہی۔ پہلے ریاست رام پور کے مدرسہ ارشاد العلوم میں مدرس اوّل رہے پھر بمبئی چلے گئے۔ ۱۹۱۰ء میں اپنے وطن میں واپس آ کر "قوت الاسلام" کے نام سے ایک دارالعلوم قائم کیا۔ پھر لاہور آ کر انجمن نعمانیہ میں درس و تدریس میں مشغول ہوئے۔ ۱۹۱۷ء میں آگرہ چلے گئے۔ ۱۹۲۲ء میں پھر لاہور آ گئے اور ہمیشہ کے لیے لاہور کے ہو کر رہ گئے۔ فن حدیث میں آپ کے اُستاد حضرت مولانا احمد علی محدث سہارن پوری ہیں۔ ۲۲ رجب ۱۳۵۵ھ کو لاہور میں وفات پائی۔ علامہ ابوالحسنات اور ابوالبرکات آپ ہی کے صاحبزادے ہیں۔ آپ کی بعض تصنیفات یہ ہیں: ہدایۃ الغوی۔ رسول الکلام۔ ہدایۃ الطریق الاستعانت۔ فارسی دیوان وغیرہ۔

منشی دین محمد آپ کی شہرت اخبار میونسپل گزٹ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے تھی۔ فن شعر کا بھی آپ بڑا ستھرا مذاق رکھتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۰۹ء میں آپ نے مشاعرہ کے نام سے ایک ماہوار گلدستہ بھی جاری کیا تھا جس میں مشہور شاعروں کی منتخب غزلیں چھپا کرتی تھیں۔ آپ ایک کامیاب ایڈیٹر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے مصنف بھی تھے۔ دربار تاج پوشی کی تاریخ ۱۹۰۳ء۔ ایک ناول "دوستی"۔ ۱۹۱۱ء کے دربار تاج پوشی کی تاریخ۔ آپ کی کتابیں ہیں۔ سیر و سیاحت بھی آپ نے خوب کی۔ اور بہت سی انجمنوں کے سکرٹری اور صدر رہے۔ ۱۸۶۸ء میں بمقام لاہور پیدا ہوئے۔ سنہ وفات معلوم نہیں۔

پنڈت رادھا کشن سکھوں کے زمانہ میں لاہور کا نہایت فاضل اور لائق پنڈت تھا۔ اپنے علم و فضل کے لحاظ سے یکتائے زمانہ تھا۔ اس کی تصانیف ہر علم اور فن میں موجود ہیں۔ انگریزوں کا زمانہ آیا تو اس کے علم و فضل کے باعث انگریزی گورنمنٹ نے اسے "چیف پنڈت" کا خطاب دیا۔ ۱۸۵۵ء سے پیشتر انتقال کیا۔ اس کا بیٹا پنڈت رکھی کیش بھی بڑا فاضل گزرا ہے۔ (تاریخ لاہور ص ۵۲)

لالہ رگھوناتھ سہائے ایک بہت ہی خلیق۔ نیکدل۔ متواضع۔ خاکسار اور مخلص بزرگ تھے۔ پانی پت میں پیدا ہوئے۔ جوان ہو کر لاہور چلے آئے اور تقسیم ملک تک لاہور میں مقیم رہے۔ ۲۳ اپریل ۱۹۲۳ء کو لاہور سے بچوں کا ایک ہفتہ وار اخبار گلدستہ کے نام سے جاری کیا اور ۱۹۴۷ء تک نہایت عمدگی کے ساتھ اُسے ایڈٹ کرتے رہے۔ معلمین اور اساتذہ کے لیے رفیق التعلیم ایک ماہنامہ نکالا اور اُسے نہایت کامیابی سے نکالتے رہے۔ کئی اخلاقی کتابیں بھی آپ نے لکھیں۔ دیال سنگھ ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر اور دیال سنگھ ٹرسٹ کے ٹرسٹی تھے۔ برہمو سماج سے تعلق رکھتے تھے اور تعصب کے زہر سے پاک تھے۔ تقسیم ملک کے وقت ہندوستان چلے گئے اور وہیں سولن میں آپ کا انتقال ہوا۔

سالک مولانا عبدالمجید سالک بی۔ اے لاہور کے مشہور ادیب۔ اعلیٰ پایہ کے شاعر۔ بہت بڑے اخبار نویس۔ بہت سی کتابوں کے مصنف۔ نہایت زندہ دل۔ بذلہ سنج اور اپنے دَور کے سب سے بڑے مزاح نویس تھے۔ زمیندار اور انقلاب کے "افکار و حوادث" اُن کی مزاح نویسی کے لازوال نمونے ہیں۔ علم و فضل کے ساتھ ساتھ نہایت با اخلاق بامروّت اور نہایت ہمدرد اور مخلص انسان تھے۔ دوسروں کا کام کر کے۔ دوسروں کی سفارش کر کے۔ دوسرے کی اعانت کر کے اُنھیں روحانی خوشی ہوتی تھی۔ حسنِ اخلاق اور شیریں کلامی میں پرانے بزرگوں کا بہت اچھا نمونہ تھے۔ بہت سی دلچسپ کتابوں کے مصنف۔ مؤلف اور مترجم ہیں جن کی فہرست خاصی طویل ہے۔ ۱۳ دسمبر ۱۸۹۴ء کو بٹالہ میں پیدا ہوئے اور ۲۷ ستمبر ۱۹۵۹ء کو مسلم ٹاؤن لاہور میں وفات پائی۔

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی اُن کے لائق فرزند ہیں۔

منشی سراج الدین کرم آباد ضلع گوجرانوالہ کے رئیس اور ایک نہایت صلح کل اور مرنج و مرنجان بزرگ اور بہت نیک اور صالح انسان تھے۔ ہمیشہ اپنے زمیندار بھائیوں کی فلاح اور بہبود میں مصروف رہے۔ اور انہی کی اصلاح اور ترقی کے لیے آپ نے ابتداً لاہور سے اخبار "زمیندار" جاری کیا۔ جو شروع میں ہفتہ وار تھا اور صرف زمیندار طبقہ کی بہبودی اور اُن کے حقوق کی نگہداشت کے لیے جاری کیا گیا تھا۔ بعد میں مولوی صاحب اسے اپنے وطن کرم آباد میں لے گئے اور آن کے انتقال کے وقت تک یہ اخبار کرم آباد ہی سے نکلتا رہا۔ آپ کا انتقال ۶ دسمبر ۱۹۰۹ء کو ہوا۔ آپ کے فرزندوں میں سے مولوی ظفر علی خاں نے آپ کے بعد زمیندار کو زبردست ترقی دی۔ ظفر علی خاں کے علاوہ آپ کے پانچ فرزند اور ہوئے۔ غلام حیدر خاں۔ محمد اکبر خاں۔ محمود احمد خاں۔ حامد علی خاں۔ حمید احمد خاں۔ محترمی حامد علی خاں رسالہ ہمایوں کے سابق ایڈیٹر اور ادارہ فرینکلن کے ڈائرکٹر ہیں۔ مکرمی حمید احمد خاں اسلامیہ کالج سول لائنز کے پرنسپل ہیں۔

لالہ سری رام دہلی کے باشندے مولانا حالی کے گہرے دوست رائے بہادر مدن گوپال ایم۔ اے بیرسٹرایٹ لا کے فرزند اور رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب کے بھتیجے تھے۔ ۴ دسمبر ۱۸۷۵ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ تعلیم دہلی اور لاہور دونوں جگہ ہوئی۔ ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد لاہور میں عرصہ دراز تک منصف رہے۔ ۱۹۰۰ء میں ملازمت سے استعفیٰ دے کر تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔ اُردو ادب سے نہایت گہری دلچسپی رکھتے تھے اور ساری عمر اُس کی ترویج و اشاعت میں بسر کر دی۔ آن کی بے نظیر اور لاثانی تصنیف "خمخانہ جاوید" اُردو شاعروں کی انسائیکلوپیڈیا ہے اور اس کی پہلی جلد ۱۹۰۸ء میں لاہور ہی سے شائع ہوئی تھی۔ عمر کے آخری ایام خانگی تنازعوں کے باعث نہایت رنج و غم میں بسر ہوئے۔ ۲۵ مارچ ۱۹۳۰ء کو وفات پائی۔

پیر سکندر شاہ لاہوری آپ حضرت کرم شاہ کے فرزند اور حضرت مراد شاہ مشہور شاعر و صوفی کے چھوٹے بھائی اور بڑے خوش گو شاعر تھے۔ امداد تخلص کرتے تھے۔ اُردو اور فارسی دونوں میں فکر سخن کرتے تھے۔ پروفیسر محمود شیرانی نے اپنی کتاب "پنجاب میں اُردو" میں اور مخدومی نامی صاحب نے اپنے رسالہ "تبرک کلام" میں ان کا اُردو اور فارسی کلام دیا ہے۔ دو اُردو شعر آپ بھی سن لیجئے ؎

شب میں احوال اُس کا کہہ نہ سکا
شیشہ ہر چند کہہ رہا تھا قل قل

قل قل صراحی میں سے پانی کے گرنے کی آواز کو بھی کہتے ہیں اور قل قل کے معنے یہ بھی ہیں کہ کہہ کہہ۔ اس ذومعنی لفظ نے شعر میں جان ڈال دی۔ دوسرے شعر میں کتنی صفائی۔ سادگی اور سلاست ہے۔ سنیئے ؎

دیکھ کر اُس پری کو ہوش و حواس
آہ پرواز کر گئے بالکل

سکھوں کی چیرہ دستیوں اور لوٹ مار سے تنگ آکر اپنے والد پیر کرم شاہ اور اپنے بھائی پیر مراد شاہ کے ہمراہ لاہور

سے نکل کر لکھنؤ چلے گئے اور وہاں سات سال رہنے کے بعد ۱۲۳۲ھ میں پیر مراد شاہ کے ساتھ واپس لاہور آئے۔ ہنگر وطن آئے ہوئے ابھی چند سال ہی ہوئے تھے کہ عین عنفوانِ شباب میں بعمر ۳۰ سال ۱۲۲۰ھ میں انتقال ہوگیا۔ (محمود شیرانی نے سنہ وفات ۱۲۱۴ھ لکھا ہے اور ناقی صاحب نے ۱۲۱۰ھ۔ تفصیلی حالات کے لیے دیکھیں۔ تبرک کلام ص ۳۶ ۔ پنجاب میں اردو ص ۳۰۱۔ تاریخ جلیلہ ص ۱۹ رسالہ تاریخ و تحقیق ص ۲۱۔

خان بہادر مرزا سلطان احمد جماعت احمدیہ کے بانی حضرت مرزا غلام احمد قادیانی کے نہایت لائق اور قابل فرزند اعلیٰ درجہ کے ادیب بہت بڑے انشا پرداز اور بہت سی اعلیٰ پایہ کی اخلاقی اور علمی کتابوں کے مصنف ہیں۔ عرصہ دراز تک لاہور میں بحیثیت سرکاری ملازم مقیم رہے۔ گوجرانوالہ کی ڈپٹی کمشنری سے ریٹائر ہونے کے بعد وہاں ہی بیٹھ کر تصنیف و تالیف میں مصروف ہوگئے۔ ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوئے اور ۲ جولائی ۱۹۳۱ء کو وفات پائی۔ آپ کے اُن فلسفیانہ اور علمی و اخلاقی مضامین کے ۲ مجموعے ربوہ کی مرکزی لائبریری میں محفوظ ہیں۔

مولوی سید وحید الدین سلیم مولانا سلیم ادبی قابلیت، علمی لیاقت کے لحاظ سے اپنے زمانہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ آپ اُردو کے اُن چند مشاہیر میں سے تھے جن پر ہماری زبان اور لٹریچر کو بجا طور پر فخر ہوسکتا ہے۔ اُردو میں جدید اصطلاحات کے وضع کرنے، نئے الفاظ کے بنانے اور زبان کی تحقیق میں اُردو کا کوئی بھی انشاپرداز سلیم کے مقابلے میں کھڑا نہیں ہوسکتا۔ سلیم کا کلام ظاہری حسن، باطنی خوبیوں اور اعلیٰ جدت طرازیوں سے مالا مال ہے۔ وہ عربی کے بہت بڑے فاضل، فارسی کے زبردست ادیب اور اُردو کے بلند پایہ انشاپرداز تھے۔ اعلیٰ درجہ کے خطیب اور مقرر بھی تھے۔ شعر ایسی سرعت اور روانی کے ساتھ تصنیف کرتے تھے کہ حیرت ہو جاتی تھی۔ بہت سی اعلیٰ اور عمدہ کتابوں کے بھی آپ مصنف، مؤلف اور مترجم ہیں۔ لیکن وہ سب آجکل ناپید اور نایاب ہیں۔ آپ سر سید کے لٹریری اسسٹنٹ، رسالہ معارف اور علی گڑھ انسٹیٹیوٹ کے مدیر اور مسلم گزٹ کانپور اور زمیندار لاہور کے عرصہ تک ایڈیٹر رہے۔ بعد ازاں عثمانیہ یونیورسٹی میں اُردو کے لیکچرار مقرر ہوگئے اور آخر وقت تک اسی عہدے پر رہے۔ اور سات ماہ کی نہایت تکلیف دہ بیماری کے بعد ۲۹ جولائی ۱۹۲۸ء کو ملیح آباد (لکھنؤ) میں فوت ہوئے۔ ۱۸۶۷ء یا ۱۸۶۹ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے تھے۔ عرصہ تک لاہور میں رہ کر مولوی فیض الحسن اور مولوی عبداللہ ٹونکی سے تحصیل علم کرتے رہے۔ اُن کے کلام کا مجموعہ "افکار سلیم" کے نام سے ہی ۱۹۳۸ء میں پانی پت سے شائع کیا تھا۔

سہا آپ کا نام سید ممتاز حسین مجددی تھا۔ اور آپ بلند شہر کے رہنے والے تھے۔ بلند شہر سے آپ بھوپال چلے گئے تھے اور بھوپال سے لاہور آگئے تھے۔ ۱۹۲۱ء میں جب حکیم احمد شجاع نے لاہور سے رسالہ ہزار داستان جاری کیا تو حصہ نثر کی ادارت اپنے ذمہ لی اور حصہ نظم کا مدیر سہا کو مقرر کیا۔ جو عرصہ تک اس کی ایڈیٹری کے فرائض انجام دیتے رہے۔ انھوں نے علی گڑھ کالج سے بی اے پاس کیا تھا اور شعر و سخن کا بہت اعلیٰ ذوق رکھتے تھے جس وقت مشاعروں میں غزل پڑھنے کھڑے ہوتے تو ایک سناٹا چھا جاتا تھا۔ لطف یہ کہ آپ کا قد صرف تین فٹ تھا۔ جسے دیکھ کر اکثر لوگ مذاق اُڑاتے لیکن جس وقت کلام سنتے تو حیران ہو جاتے۔ لاہور میں سہا مشاعروں کی بہت بڑی رونق تھے۔ اور ہر جگہ بڑے شوق سے بلائے جاتے تھے۔ کچھ عرصہ آپ

لاہور سے جے پور چلے گئے اور واپس نہیں آئے۔ اُن کے انتقال کی تاریخ معلوم نہیں ہو سکی۔

مولوی سید احمد اردو زبان کے مشہور ادیب۔ بہت سی عمدہ عمدہ کتابوں کے مصنف۔ اُردو کی مشہور و معروف لغت "فرہنگ آصفیہ" کے مؤلف اور نہایت با ذوق اور خوش طبع انسان تھے ۱۸۴۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ تصنیف و تالیف۔ لکھنے پڑھنے، مضمون نگاری اور شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ مسٹر فیلن کے ساتھ سات برس تک رہ کر اُن کو اُردو کی لغت لکھنے میں مدد دی۔ پھر مہاراجہ الور نے اپنا سفر نامہ مرتب کرنے کے لیے بلوا لیا۔ پھر لاہور آ کر گورنمنٹ بک ڈپو پنجاب میں نائب مترجم کے عہدے پر کام کرنے لگے اور عرصہ تک یہاں رہ کر انگریزی سے ترجمہ شدہ کتابوں کی اُردو عبارت محاورہ اور روزمرہ کے مطابق درست کرتے رہے۔ بعد میں گورنمنٹ نے خانصاحب کا خطاب دیا۔ آپ پنجاب یونیورسٹی کے فیلو اور ممتحن بھی رہے۔ ۱۹۱۹ء میں انتقال کیا۔ فرہنگ آصفیہ کی چار ضخیم جلدوں کی تالیف آپ کا نہایت اعلیٰ ادبی کارنامہ ہے جس کو آپ نے ۴۲ سال کی محنت میں انجام دیا۔ اس کے علاوہ بھی آپ نے ۵۲ کے قریب کتابیں لکھیں اُن میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔ انشاء ہادی النساء۔ لغات النساء۔ علم اللسان۔ رسوم دہلی۔ اُردو ضرب الامثال۔ قصہ مہر افروز بیگم۔ تسخیر شوہر وغیرہ۔

سیّد نادر علی سیفی اچھے قابل ادیب اور شاعر تھے۔ سیفی تخلص کرتے تھے۔ ہوشیار پور میں ضلع سکول کے مدرس تھے۔ وہاں سے چھوڑ کر لاہور چلے آئے اور اخبار کوہ نور کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ عرصہ دراز تک یہاں کام کرنے کے بعد "پٹیالہ اخبار" کے ایڈیٹر ہو کر پٹیالہ چلے گئے۔ پنجاب کی ابتدائی اخبار نویسی کے زمانہ میں بہت مشہور اہل قلم اور کامیاب مضمون نگار تھے۔ عربی کے ماہر اور فارسی کے فاضل تھے۔ شعر بھی بہت اچھے کہتے تھے۔ اُن کے کچھ اشعار مولانا امداد صابری نے اپنی کتاب تاریخ صحافت میں درج کیے ہیں۔ ملاحظہ ہو کتاب مذکور صـ۲۴۳۔

سیتا رام کوہلی ایم اے لاہور میں گورنمنٹ کالج کے پروفیسر اور انگریزی اور فارسی کے ماہر تھے۔ تاریخ سے خاص ذوق رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے ۱۹۱۵ء میں گورنمنٹ پنجاب نے ان کو مہاراجہ رنجیت سنگھ والیٔ لاہور کی حکومت کا ریکارڈ مرتب کرنے کے لیے مقرر کیا۔ یہ کام انھوں نے بڑی محنت و کاوش کے بعد ۱۹۱۹ء میں مرتب کیا۔ "خالصہ دربار ریکارڈ" کے نام سے یہ کتاب چھپ گئی ہے۔ دیوان امرناتھ کی کتاب ظفر نامہ رنجیت سنگھ (فارسی) کو بھی انھوں نے اپنی شرح کے ساتھ ۱۹۲۸ء میں شائع کیا۔

عرصہ دراز کی تحقیق و تلاش اور سینکڑوں کتابوں سے اخذ و انتخاب کے بعد انھوں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ایک مفصل سوانح عمری اُردو میں مرتب کی جو ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے ۱۹۳۳ء میں شائع کی۔ کتاب ۳۷۹ صفحے کی ہے۔ اور بڑی قابلیت سے مرتب کی گئی ہے۔

شمس الدین شائق لاہور کے ایک خوش گو شاعر تھے۔ مگر فضول نظموں کے کہنے اور بیکار غزلوں کے لکھنے میں انھوں نے اپنا وقت ضائع نہیں کیا بلکہ اپنی شعری قابلیت کو اسلام کی خدمت میں لگایا اور قرآن پاک کا نہایت سلیس اور عام فہم اردو نظم میں ترجمہ کیا۔ جو ایک پارہ کا چھپ بھی چکا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں لاہور میں آپ نے انتقال کیا۔ مشہور شاعر خواجہ دل محمد ایم اے نے تاریخ کہی ہے

آہ شمس الدین شائق چل بسے
دوستوں کو رنج بے پایاں ہوا
عرض کی دل نے یہ تاریخ وفات
انتقال ناظم قرآں ہوا
۱۹۳۹ء

مرحوم بہت اچھے شاعر ہونے کے علاوہ بہت اچھے تاریخ گو بھی تھے۔

شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی شعر العجم کے قابل مصنف اور سیرت نبویؐ کے فاضل مؤلف مولانا شبلی سے کون شخص واقف نہیں۔ لہٰذا اُن کے حالات زندگی کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ یہاں صرف یہ بیان کرنا ہے کہ حضرت مولانا بھی مدتوں لاہور میں رہ کر مولانا فیض الحسن سے تحصیل علم کرتے رہے ہیں۔ اُس زمانہ میں سفر آسان نہ تھا۔ بڑی مصیبت اور مشکلات کے ساتھ اعظم گڑھ سے لاہور پہنچے۔ ایک روپیہ ماہوار پر مکان کرایہ پر لیا۔ اور مولوی فیض الحسن صاحب سے درخواست کی کہ مجھے اپنے شاگردوں کے زمرہ میں شامل کر لیں۔ مولانا اورینٹل کالج میں پروفیسر تھے۔ وہاں کس طرح پڑھاتے۔ کالج کے اوقات کے بعد بھی بہت سے طلباء اُن سے پرائیویٹ طور پر پڑھا کرتے تھے اس لیے اُن کے پاس کوئی بھی فارغ وقت نہیں تھا آخر اُستاد شاگرد میں یہ طے ہوا کہ گھر سے کالج آنے کے دوران میں اور کالج سے گھر آنے کے وقت میں شبلی سبق پڑھ لیا کریں۔ مولانا شبلی نے نہایت صبر، نہایت مستعدی اور نہایت محنت کے ساتھ اس عجیب وغریب طریقہ سے لاہور میں رہ کر علم سیکھا۔ اور واپس چلے گئے۔ اُستاد کی لیاقت اور قابلیت کا شبلی کے دل پر ہمیشہ بڑا اثر رہا۔ اور وہ ہمیشہ اپنے شاگردوں سے نہایت درجہ تعریفی الفاظ میں مولانا فیض الحسن صاحب کی تعریف کرتے رہتے تھے۔ اُن کے انتقال پر بڑا پُر درد مرثیہ شبلی نے فارسی میں لکھا تھا۔ مولانا شبلی مئی ۱۸۵۷ء میں اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے اور ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو یہ علم کا آفتاب اُردو کا زبردست انشا پرداز۔ تاریخ اسلام کا بلند پایہ مؤرخ دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔

مولوی شجاع اللہ خاں مولوی انشاء اللہ خاں کے چھوٹے بھائی اور بہت قابل شخص تھے۔ آپ کو بچپن ہی سے مضمون نگاری اور مطالعہ کا بے حد شوق تھا۔ آپ کی صحافی زندگی کی ابتدا ۱۹۰۴ء سے ہوتی ہے جبکہ آپ نے گوجرانوالہ سے ایک انگریزی اور اُردو اخبار اینگلو ورنیکلر جاری کیا۔ پھر اُسے بند کر کے وکیل امرتسر کی ادارت کے فرائض انجام دیے مگر جلد ہی مستعفی ہو کر لاہور چلے آئے اور یہاں تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا۔ اور بہت سی کتابیں لکھیں ۱۹۰۹ء میں سول اینڈ ملٹری گزٹ کے ایڈیٹر ہو کر لدھیانہ چلے گئے مگر جلدی واپس آ کر ۱۹۱۰ء میں اپنا اخبار "ملت" جاری کیا جو عرصہ تک نکلتا رہا۔ آپ کے انتقال کی تاریخ معلوم نہیں ہو سکی تاریخ پیدائش ۱۸۷۸ء ہے اور مقام پیدائش لاہور۔

حاجی میر شمس الدین لاہور کے نہایت مقدس۔ محترم بزرگ اور مسلمانوں کے دلی خیر خواہ اور ہمدرد تھے مسلمانوں کی تعلیمی اور اخلاقی ترقی و فلاح میں اپنی زندگی وقف کر دی تھی اور ساری عمر قوم کی غم خواری اور اس کی اصلاح و فلاح میں گزار دی ۱۸۶۲ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد جمال میر کشمیر سے آ کر لاہور میں آباد ہوئے تھے ۱۸۸۴ء میں آپ نے شہر کے دوسرے ہمدرد بزرگوں سے مل کر انجمن حمایت اسلام کی بنیاد ڈالی اور ۴۰ سال تک بڑے خلوص کے ساتھ اس کی

خدمت کی۔ آپ انجمن مذکورہ کے لائف پریذیڈنٹ تھے۔ اور آپ کی اَن تھک اور پرخلوص کوشش اور سعی سے انجمن بڑی زبردست ترقی کی۔ اور آجکل تو اس کی عظمت و شان بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ مگر افسوس کوئی شمس الدین جیسا لائق اور پرخلوص کارکن انہیں نہیں ملا۔ بغرض مسلمانوں کی علمی۔ مذہبی۔ تعلیمی اور سیاسی خدمات۔ ۴۰ سال تک بڑے خلوص نہایت جوش کے ساتھ انجام دینے کے بعد ۱۵ فروری ۱۹۳۳ء کو آپ کا انتقال ہوگیا۔ (تاریخ اقوام کشمیر ص ۴۶۷)

شمس مینائی ان کا نام شیخ عبدالرحمٰن۔ کنیت ابوالمعانی۔ تخلص اُردو میں شمس اور فارسی میں مینائی تھا۔ ۱۸۷۶ء میں بمقام امرتسر پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۶ء میں بمبئی چلے گئے۔ وہیں شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ اور جلد ہی بہت اچھے شاعر بن گئے۔ آپ نے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں اپنی قادرالکلامی کے جوہر دکھائے اور اپنا مجموعۂ کلام "جامِ مینائی" کے نام سے شائع کیا۔ تقسیم ملک کے وقت امرتسر سے لاہور چلے آئے اور آخر وقت تک یہیں رہے۔ یکم ستمبر ۱۹۵۳ء کو وفات پائی۔

رائے بہادر پنڈت شیونرائن شمیم لاہور کے مشہور وکیل۔ بہت سی کتابوں کے مصنف۔ بڑے ادیب اور اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے۔ اُن کی نظمیں اکثر اُس زمانہ کے رسائل میں بڑے طمطراق سے چھپا کرتی تھیں۔ ۱۸۵۹ء میں لاہور میں پیدا ہوئے اور ۱۸۸۱ء میں لاہور ہی سے وکالت کی سند حاصل کی اور پنجاب کے بڑے قابل وکیلوں میں سے ہوئے۔ ۱۹۰۵ء تک جالندھر میں وکالت کرتے رہے۔ پھر لاہور چلے آئے۔ وکیل ہونے کے ساتھ ساتھ اُردو ادب سے بھی بڑا شوق رکھتے تھے۔ تاریخ سے بھی آپ کو بڑی دلچسپی تھی۔ اسی ذوق اور شوق کے باعث آپ پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی کے صدر مقرر ہوئے۔ آپ نے ہندو مذہب کو چھوڑ کر بدھ مت اختیار کر لیا تھا۔ اور پنجاب میں اس مذہب کے زبردست مبلغ تھے مجھے بھی انھوں نے پالی میں بدھ مذہب کے متعلق دو تین کتب تحفتہً بھیجی تھیں۔ جنوری ۱۹۳۱ء میں آپ بقیدِ حیات تھے۔ اس کے بعد کسی تاریخ میں وفات پائی۔

اُن کی تصنیفات میں سے بعض یہ ہیں: کشمیری پنڈت (کشمیری پنڈتوں کی سوشل اصلاح کے متعلق) تحفۂ شمیم (اصلاحی حکایات کا مجموعہ)۔ بدھ مت (بدھ کے حالات اور تعلیمات) وغیرہ۔ ۱۹۰۱ء میں آپ نے "شمیم ہند" کے نام سے ایک اخبار جالندھر سے جاری کیا تھا۔ جو ڈیڑھ دو سال بعد بند ہوگیا۔ آپ ہندو مسلمانوں کے جھگڑوں سے نہایت نفرت کا اظہار کرتے تھے اور دونوں کو ہمیشہ اتفاق اور اتحاد کی نصیحت کرتے رہتے تھے۔

میر نثار علی شہرت آپ انیسویں صدی کے مشہور ادیبوں شاعروں مصنفوں اور صحافیوں میں سے ایک نمایاں حیثیت کے مالک تھے اگرچہ آپ دہلی کے رہنے والے تھے مگر مدّت تک لاہور میں مقیم رہ کر علم و ادب اور صحافت کی خدمت کرتے رہے۔ لاہور کے زمانہ قیام میں آپ جن اخباروں کے ایڈیٹر رہے اُن کے نام یہ ہیں۔ اخبار کوہ نور۔ اخبار انجمن پنجاب اور پنجاب پنچ۔ فن شعر میں آپ حکیم مولا بخش قلق کے شاگرد تھے۔ ۱۹۳۰ء کے قریب لاہور میں انتقال کیا۔

ظفر علی خاں نہایت نامور صحافی۔ شعلہ بیان خطیب۔ بلند پایہ شاعر۔ مسلّمہ ادیب۔ اعلیٰ درجہ کے مترجم اور بہت بڑے سیاست دان تھے۔ لاہور اور پنجاب بلکہ تمام ہندوستان میں مدّت دراز تک ان کا طوطی بولتا رہا۔

روزنامہ زمیندار کے ایڈیٹر ہونے کے لحاظ سے ان کو زبردست شہرت اور عزت حاصل ہوئی۔ نہایت آزادی اور بیباکی کے ساتھ اس میں مضامین اور ایڈیٹوریل لکھتے تھے جس کے نتیجہ میں متعدد مرتبہ قید و بند کے مصائب بھی جھیلنے پڑے۔ کئی مرتبہ اخبار کی ضمانتیں ضبط ہوئیں اور ضمانتوں کے سلسلہ میں مولانا نے قوم سے چندہ کر کے قریباً دو لاکھ روپے گورنمنٹ انگریزی کے خزانے میں داخل کیے۔ زمیندار کے علاوہ دکن ریویو۔ پنجاب ریویو اور ستارۂ صبح کے بھی ایڈیٹر رہے۔ ملک کے متعدد ادیبوں نے زمیندار کے دفتر ہی میں رہ کر اخبار نویسی میں نام پیدا کیا۔ اپنے عروج کے زمانہ میں زمیندار اُردو کے تمام روزناموں میں سب سے زیادہ چھپتا تھا۔ اور بہت ہی ذوق و شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے اور مدت تک فالج میں مبتلا رہنے کے بعد نہایت لاچاری و مجبوری کی حالت میں، اور بہت بیکسی اور حسرت کے ساتھ ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء کو اپنے وطن کرم آباد میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ معرکۂ مذہب و سائنس اور خیابانِ فارس ان کے مشہور ترجمے ہیں۔ نظموں کے بھی تین چار مجموعے شائع ہوئے، غرض اپنے وقت میں زبردست شہرت کے مالک تھے۔ شمس العلما مولانا حالیؔ نے بھی ان کی تعریف میں ایک نظم لکھی تھی جسے انھوں نے بڑے فخر کے ساتھ بار بار شائع کیا۔

شیخ عبدالعلی ہروی الطہرانی شیعہ صاحبان کے ایک مشہور فاضل، عالم اور مجتہد تھے۔ مشہد مقدس میں ۱۲۷۰ھ میں پیدا ہوئے۔ اصل وطن ہرات تھا۔ تحصیلِ علم مشہد مقدس میں کی۔ پھر طہران چلے گئے، اُس وقت آپ کی عمر صرف ۳۰ برس کی تھی مگر آپ کی علمی شہرت آپ سے پہلے طہران پہنچ چکی تھی۔ جب طہران پہنچے تو شاہ ایران ناصر الدین قاچار نے آپ کی بڑی تعظیم و تکریم کی۔ وہاں جب بابیوں نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا تو آپ نے اُن کے قتل کا فتویٰ دیا، جس کے نتیجہ میں آٹھ ہزار بابی قتل ہوئے۔ اس کے بعد آپ کی وہاں سخت مخالفت شروع ہو گئی، جس کے نتیجہ میں ان کو طہران سے نکل کر روس جانا پڑا۔ زاں بعد آپ نے تمام یورپ۔ ٹرکی اور مصر اور عراق کی سیاحت کی اور وہاں کے اہلِ علم سے زبردست علمی مذاکرے رہے۔ پھر کراچی چلے آئے اور کراچی سے لاہور پہنچے اور عرصہ دراز تک یہاں قیام کیا۔ وقتاً فوقتاً پنجاب کے دوسرے شہروں کا دورہ بھی کرتے رہے اور ہر جگہ پہنچ کر محرم کی مجالس اور ذکرِ حسین کی محافل کو رونق بخشتے رہے۔ ایک رسالہ تجسم اعمال پر۔ ایک معاد جسمانی کے ثبوت پر، ایک رسالہ قضا و قدر پر آپ کی تالیفات ہیں۔ فارسی تو آن کی مادری زبان تھی۔ اس کے علاوہ عربی۔ ترکی۔ فرنچ۔ روسی۔ انگریزی۔ پشتو۔ پنجابی اور سندھی خوب جانتے تھے۔ اُردو میں بھی تقریر کر سکتے تھے۔ ۹۴ سال کی عمر پائی۔ جس میں سے ۲۱ سال اس ملک میں رہ کر گزارے۔ اور ۹ دسمبر ۱۹۲۲ء کو لاہور میں انتقال کیا۔ ان کے مواعظ کا مجموعہ چھپ گیا ہے۔

سر شیخ عبدالقادر ۱۸۷۴ء میں بمقام لدھیانہ پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم قصور میں پائی۔ بی۔ اے لاہور سے کیا۔ پھر منٹگمری کے ایک سکول میں مدرس ہو گئے۔ ۱۸۹۵ء میں پنجاب آبزرور کے ایڈیٹر ہوئے۔ ۱۹۰۱ء میں لاہور سے ماہنامہ "مخزن" جاری کیا۔ جو نہایت ہی اعلیٰ پایہ کا خالص ادبی پرچہ تھا۔ ان کی ادبی اور علمی شہرت اسی رسالہ کے ذریعہ ہوئی۔ ۱۹۰۴ء میں بیرسٹری کی تعلیم کے لیے لندن گئے اور ۱۹۰۷ء میں واپس آ کر دہلی میں پریکٹس شروع کی پھر لاہور چلے آئے۔ بعد ازاں لائل پور میں سرکاری وکیل مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۱ء میں لاہور ہائی کورٹ کے جج ہوئے اور ۱۹۲۵ء میں وزیرِ تعلیم پنجاب۔ ۱۹۲۷ء میں سر کا خطاب ملا۔ ۱۹۳۴ء میں وزیرِ ہند کی کونسل کے ممبر ہو کر لندن چلے گئے۔ جہاں سے ۱۹۳۹ء میں واپس آئے۔ ۱۹۴۲ء میں بہاولپور کے چیف جسٹس مقرر ہوئے۔ اور ۹ فروری ۱۹۵۰ء کو لاہور میں وفات پائی۔ نہایت بلند اخلاق اور نہایت بلند کیرکٹر کے مالک تھے۔ اُردو

کی ترقی و اشاعت میں نہایت نمایاں حصّہ لیا۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کے صدر رہے اور پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے بھی۔ لندن میں احمدیوں کی مسجد کا افتتاح کیا۔ آن کے لائق فرزند شیخ منظور قادر آجکل پاکستان کے وزیر خارجہ ہیں۔ ایسے علم دوست۔ ایسے با اخلاق۔ ایسے شگفتہ مزاج۔ ایسے با اصول اور ایسے وضعدار بزرگ کہیں صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

مولانا عبداللہ عمادی مشہور و معروف فاضل۔ زبردست ادیب اعلیٰ درجہ کے اخبار نویس اور بے نظیر قابلیت کے انسان تھے۔ عرصہ دراز تک لاہور میں زمیندار اور ستارۂ صبح کی ایڈیٹری کی۔ پہلے امرتسر میں وکیل اور تہذیب الاخلاق کو ایڈٹ کرتے رہے۔ بہت سی اعلیٰ پایہ کی کتابوں کے مصنّف اور مترجم ہیں۔ عرصہ تک دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن میں ترجمہ اور تالیف کی خدمت سرانجام دیتے رہے۔ اور آخر وہیں ۱۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کو انتقال کیا۔

علّامہ عبداللہ یوسف علی ۴ اپریل ۱۸۷۲ء کو پیدا ہوئے۔ بڑے مشہور اور فاضل بزرگ تھے۔ قرآن شریف کا آپ نے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ حیدر آباد میں محکمہ صنعت و حرفت کے وزیر رہے۔ لاہور میں اسلامیہ کالج کے پرنسپل تھے۔ نہایت شستہ اور شائستہ علمی مذاق رکھتے تھے۔ بہت با اخلاق اور نیکدل انسان تھے۔ اخبارات میں سینکڑوں مضامین لکھے ہیں۔ بعض کتابیں بھی تالیف کی ہیں۔ عربی۔ فارسی۔ انگریزی۔ مرہٹی اور کنڑی زبانوں کے فاضل تھے۔ ادب پر بہت اچھا عبور تھا۔ میر۔ غالب اور اقبال کے بکثرت شعر ہمیشہ پڑھتے رہتے تھے اردو بڑی صاف اور شستہ بولتے تھے۔ آخر عمر میں لندن چلے گئے تھے اور وہیں انتقال کیا۔ قرآن مجید کے انگریزی ترجمہ کے علاوہ آپ کی دو کتابیں اور بھی ہیں۔ ایک ہندوستان کے اقتصادی حالات اور دوسری انگریزی ہند میں ہندوستان کے عدل کی تاریخ۔

حکیم ابو تراب محمد عبدالحق امرتسری ۱۸۶۹ء میں خواص پور میں پیدا ہوئے جوان ہوتے تو طلب علم کے لیے گھر سے نکلے اور سہارن پور۔ کان پور۔ دہلی میں علم اور طب کی تحصیل کی ۱۹۱۵ء میں امرتسر سے اخبار اہل سنت والجماعت جاری کیا جو عرصہ دراز تک جاری رہا۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب میں لاہور آ گئے اور یہیں ۲۱ اگست ۱۹۵۱ء کو دنیا سے رخصت ہو گئے۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اعلیٰ درجہ کے فلسفی۔ بہت بڑے فاضل اور نہایت با اخلاق اور شریف الطبع بزرگ تھے۔ کشمیر کے ڈار خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۹۱۵ء میں فلسفہ میں بی۔ اے کا امتحان دیا اور پنجاب یونیورسٹی میں اوّل آئے۔ اسی طرح ایم۔ اے میں اوّل آئے۔ ۱۹۲۵ء میں لندن سے فلسفہ میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لے کر آئے اور عثمانیہ کالج حیدر آباد دکن میں فلسفہ کے اعلیٰ پروفیسر لگ گئے۔ فلسفہ آپ کا خاص مضمون تھا مگر شعر و شاعری کا بھی شوق تھا۔ تقسیم ملک کے بعد لاہور چلے آئے اور ادارہ ثقافت اسلامیہ کے قائم ہونے پر اس کے ڈائرکٹر بنا دیئے گئے۔ جہاں آخر وقت تک کام کرتے رہے۔ ۳۰ جنوری ۱۹۵۹ء کو انتقال کیا۔ آپ کی بعض کتابوں کے نام یہ ہیں: فکر اقبال۔ حکمت رومی۔ اسلام کا نظریہ حیات۔ تشبیہات رومی۔ اسلام کی بنیادی حقیقتیں۔ اقبال اور مُلّا وغیرہ۔

سید عبدالقادر ایم۔ اے آپ اسلامیہ کالج میں تاریخ کے پروفیسر تھے اور تاریخ اسلام پر بڑی وسیع نظر رکھتے تھے۔ ہندوستان کی تاریخ جو آپ نے انٹرنس کے طلباء کے لیے لکھی تھی۔ طلباء کے لیے جو تاریخیں

لکھی گئی تھیں اُن میں نہایت نمایاں کتاب تھی۔ اور بھی کئی کتابیں آپ نے لکھیں۔ آپ کا نہایت بیش قیمت کتب خانہ فسادات ۱۹۴۷ء میں جالندھر میں جلا کر خاک کر دیا گیا۔ پاکستان آکر جو کتابیں آپ نے جمع کیں وہ آن کی وفات کے بعد پنجاب پبلک لائبریری لاہور کو دے دی گئیں۔ ۱۹۵۵ء میں فوت ہوئے۔

مولوی علمدار حسین یہ صاحب لاہور کے مشہور اور فاضل اصحاب میں سے تھے۔ جب لاہور میں گورنمنٹ کالج قائم کیا گیا تو اُس میں عربی اور فارسی پڑھانے کے لیے جو پروفیسر سب سے پہلے مقرر کیا گیا وہ یہی مولوی علمدار حسین تھے آپ کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہوا۔ ان کی وفات کے بعد ان کی بجائے مولوی محمد حسین آزاد کا تقرر عمل میں آیا تھا۔

مولانا مفتی غلام احمد یہ فاضل اجل عالم دین موضع کوٹ اسحٰق ڈاک خانہ دینکے تارڑ تحصیل حافظ آباد ضلع گوجرانوالہ کے رہنے والے تھے۔ اپنے وقت کے جید علماء اور ادباء میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ قریباً ۴۰ سال تک لاہور کی مشہور دینی درس گاہ "مدرسہ نعمانیہ" میں صدر مدرس رہے اور قرآن و حدیث کا درس دیتے رہے۔ ہزاروں تشنگانِ علم آپ کے وجود سے سیراب ہوئے۔ تقریباً ۷۰ برس کی عمر پائی اور ۱۹۳۹ء میں انتقال کیا۔

مفتی غلام سرور لاہور کے مشہور عالم مفتی غلام محمد کے تیسرے لڑکے اُردو اور فارسی کے زبردست فاضل بہت سی فاضلانہ کتابوں کے مصنف اور اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے۔ ان کا سب سے بڑا، سب سے مفید، اور سب سے شاندار علمی کارنامہ فارسی کتاب خزینۃ الاصفیا کی تصنیف ہے جو اولیائے وقت۔ فضلائے زمانہ۔ اور صوفیائے کرام کے حالات کی گویا انسائیکلو پیڈیا ہے۔ اور بے انتہا محنت اور کاوش کے بعد جمع اور مرتب کی گئی ہے۔ دو مبسوط جلدوں میں سینکڑوں اولیائے کرام کے حالات ہیں۔ ہر ایک کی تاریخ وفات بحساب جمل مفتی صاحب نے نکالی ہے۔ کتاب کی عبارت بے حد سلیس اور عام فہم ہے۔ فارسی کا معمولی طالب علم بھی اسے بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ آجکل نایاب ہے۔ اشد ضرورت ہے کہ یہ مفید کتاب مع ترجمہ کے دوبارہ شائع ہو۔ مفتی صاحب کی دوسری نظم و نثر کتابیں یہ ہیں۔ گلدستۂ کرامت۔ گنجینۂ سروری۔ اخلاق سروری۔ مخزن حکمت۔ حدیقۃ الاولیا اور تحفۂ سروری۔ (تاریخ لاہور ص ۳۵۰)

۱۸۳۷ء میں بہ لاہور میں پیدا ہوئے اور ۴ اگست ۱۸۹۰ء کو مکہ اور مدینہ کے درمیان وفات پائی۔ جہاں آپ حج کے لیے گئے ہوئے تھے۔ آپ کے حالات اور آپ کی تصنیفات کے متعلق ایک مفصل مضمون اکتوبر ۱۹۶۱ء کے نقوش میں شائع ہوا ہے۔

مولانا غلام قادر مولانا غلام قادر بھیروی ایک یگانہ روزگار فاضل اور نہایت پابند مذہب بزرگ تھے۔ اورینٹل کالج لاہور میں عرصہ تک پروفیسر رہے۔ بیگم شاہی مسجد لاہور کے خطیب تھے صلوٰۃ حضوری اور اسلام کی گیارہ کتابیں آپ کی تالیفات ہیں۔ آپ نے ۱۹ ربیع الاول ۱۳۲۷ھ کو انتقال کیا۔

ملک غلام محمد آپ ملک محمد رمضان کے فرزند اور کشمیری الاصل تھے۔ فن زراعت اور باغبانی کے ماہر تھے۔ اور اسی فن کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے امریکہ گئے اور وہاں تین چار سال تک زراعتی تعلیم حاصل کرنے کے بعد لاہور واپس آئے اور ایک ماہوار پرچہ نکالا جس کا نام تھا "رسالہ مشیر باغبانی" یہ رسالہ بہت جلد مشہور و مقبول ہو گیا اور

زمیندار طبقہ میں بڑی رفعت سے دیکھا جانے لگا۔ (تاریخ اقوامِ کشمیر ص ۵۲۵)

فدوی لاہوری بقول پروفیسر محمود شیرانی فارسی اور اردو میں کامل تھے۔ ایران میں عرصہ تک رہے۔ تجارت ذریعہ معاش تھا۔ مشہور ہجو گو شاعر مرزا سودا سے بڑے زور کے معرکے ہوئے تھے۔ سودا نے ان کی بھی زبردست طریقہ سے ہجو کی ہے۔ ان کی مشہور تصنیف قصہ یوسف زلیخا فارسی کا اردو نظم میں ترجمہ ہے۔ اردو کلام کا نمونہ "پنجاب میں اردو" میں ملاحظہ فرمائیں۔ (پنجاب میں اردو ص ۹۴)

یہ پہلے ہندو تھے۔ ایک صاحب صابر علی شاہ صابر کی تبلیغ سے مسلمان ہوئے تھے۔ اور فنِ شعر میں انہی کے شاگرد تھے پچاس سال سے زائد عمر پاکر ۱۸۰۰ء میں وفات پائی۔

منشی غلام قادر فرخ ۱۶ر جولائی ۱۸۸۶ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ چند روز بعد ان کے والدین امرتسر چلے گئے۔ اور یہ وہیں رہنے لگے۔ بچپن ہی سے آپ کو شعر و سخن کا ذوق، مصنف بننے شوق اور ایڈیٹر ہونے کی آرزو تھی۔ قدرت نے ان کی تینوں امیدیں بہت عمدگی کے ساتھ پوری کیں۔ آپ نے اپنی نظموں کی ابتدا ٹمپرنس سوسائٹی کے لیے اخلاقی اور اصلاحی نظمیں لکھنے سے شروع کی۔ ۱۹۰۳ء میں رسالہ منزوا کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور اپریل ۱۹۱۲ء میں اپنا رسالہ انسان جاری کیا۔ اس کے علاوہ روزنامہ تنظیم۔ ہفتہ وار کشمیر۔ ٹمپرنس گائیڈ۔ ٹمپرنس میگزین۔ اتالیق اور گل خنداں کے بھی ایڈیٹر رہے۔ تقسیم ملک کے بعد ۱۹۴۷ء میں لاہور چلے آئے اور یہیں ۲۰ر دسمبر ۱۹۵۸ء کو انتقال کیا۔

مولوی فرید الدین فرید سکھوں کے عہد میں لاہور کا نہایت مشہور شاعر تھا اور اردو اور فارسی میں بہت اعلیٰ پایہ کے اشعار کہا کرتا تھا۔ تاریخ گوئی میں بھی کامل استعداد رکھتا تھا۔ ۱۸۴۲ء میں زندہ تھا۔ (تاریخ لاہور ص ۵۸)

فلک پیما میاں عبدالعزیز فلک پیما لاہور کے ایک بلند پایہ ادیب اور نثر نگاری میں طرزِ خاص کے مالک تھے۔ رسالہ ہمایوں میں ان کے بکثرت مضامین شائع ہوتے تھے اور بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے۔ ان کے مضامین کا مجموعہ مضامین فلک پیما کے نام سے چھپ چکا ہے۔ تقسیم ملک سے پہلے ریاست کپورتھلہ کے وزیر اعظم تھے۔ تقسیم کے بعد سابق پنجاب میں فنانشل کمشنر کے عہدے پر ممتاز رہے۔ ۷۲ سال کی عمر میں حرکت قلب بند ہونے کے باعث ۷ر مئی ۱۹۵۱ء کو وفات پائی۔

فیروز الدین احمد فیروز طغرائی ۱۸۸۲ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے۔ بڑے ہو کر مختلف علوم و فنون اور طب میں زبردست مہارت پیدا کی۔ کئی اخبارات اور رسائل کے ایڈیٹر رہے۔ بہت سی کتابیں تالیف اور تصنیف کیں۔ عرصہ دراز تک مختلف اوقات میں لاہور میں آپ کا قیام رہا۔ جہاں آپ برابر علمی اور تصنیفی کاموں میں مصروف رہے شمس الاطبا حکیم غلام جیلانی کی کتابوں کے اکثر حصے آپ ہی نے مرتب کیے۔ ۱۹۲۹ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے شعبہ تصنیف و تالیف میں کام کیا۔ آپ کے اردو اور فارسی کلام کا مجموعہ کلیات طغرائی کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ آپ مختلف اوقات میں رسالہ مسیحا۔ ایشیا۔ تہذیب الاخلاق۔ حاذق۔ اخبار وکیل امرتسر کے ایڈیٹر رہے۔ ۸ر فروری ۱۹۳۱ء کو چھ ماہ کی مسلسل بیماری کے بعد آپ کا انتقال ہو گیا۔

مولوی فیض الحسن سہارن پور کے رہنے والے نہایت فاضل عالم۔ ادیب۔ شاعر اور مصنف تھے۔ کبھی فیض اور کبھی خیال تخلص کرتے تھے۔ عربی۔ فارسی اور اُردو کے باکمال ادیب اور قادر الکلام شاعر تھے۔ فن شعر میں مولانا صہبائی کے شاگرد تھے۔ موصوف نے اورینٹل کالج لاہور میں نہایت فاضلانہ طور پر طلبا کو درس دیتے رہے۔ بقول مولوی عبداللہ قریشی اُن کے دم قدم سے پنجاب میں اُردو کا باغ لہلہا رہا تھا۔ اُن کی موجودگی سے انجمن پنجاب کے مشاعروں میں بڑی رونق ہوتی تھی اور وہ اپنے لائق شاگردوں کے ساتھ اُس کے مشاعروں میں شریک ہو کر دادِ سخن دیتے تھے۔" اُنھوں نے عربی اور فارسی میں بکثرت تالیفات کی ہیں اُردو میں بھی تین کتابیں لکھی ہیں۔ مثنوی صبح عید۔ فیضیہ۔ اور گلزار فیض (اُردو دیوان)۔ سرسید مولانا شبلی۔ مولانا حالی۔ مولانا وحید الدین سلیم۔ مولوی عبداللہ ٹونکی اور مولوی محمد اسماعیل میرٹھی وغیرہ جیسے فاضل اور یگانۂ روزگار بزرگ اُن کے شاگرد تھے۔ اس سے اُستاد کی جلالت قدر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ آن کے اساتذہ میں ہم کو مفتی صدر الدین آزردہ اور مولانا فضل حق خیر آبادی جیسے بے نظیر فضلا کے نام ملتے ہیں۔ مولانا ۱۸۱۶ء میں پیدا ہوئے اور ۹ فروری ۱۸۸۷ء کو ۷۱ برس کی عمر پا کر لاہور میں انتقال کیا۔ مکرم دوست مولوی عبداللہ قریشی نے آپ کے متعلق عرصہ دراز کی ریسرچ کے بعد ایک بے نظیر اور محققانہ مضمون نقوش کے گذشتہ دو نمبروں میں بڑا مفصل شائع کیا ہے مفصل حالات شائقین رسالہ مذکور کے نمبر ۸۷، ۸۸ میں ملاحظہ فرمائیں۔

مفتی محمد صادق یہ صاحب اسلام کے بہت بڑے اور مشہور مبلغ بہت سی کتابوں کے مصنف۔ کئی اخباروں کے ایڈیٹر۔ آٹھ سات زبانوں کے ماہر۔ اور نہایت نیک نفس اور باکمال انسان تھے۔ صورت سے شرافت ٹپکتی تھی۔ اور بول چال اور گفتگو بڑی پُر وقار ہوتی تھی۔ مخالفین اسلام کے نہایت برجستہ اور فی البدیہہ جواب دینے کی ان میں حیرت انگیز قابلیت تھی۔ انگلستان۔ فرانس اور امریکہ میں سات سال تک اسلام کی تبلیغ کرتے رہے اور ایک ہزار کے قریب غیر مسلموں کو مسلمان بنایا۔ ۱۳ فروری ۱۸۷۲ء کو بھیرہ (ضلع شاہ پور) میں پیدا ہوئے۔ قرآن۔ حدیث اور تفسیر کا علم مولانا حکیم نور الدین شاہی طبیب مہاراجہ کشمیر سے حاصل کیا۔ انگریزی کی تعلیم سکول میں پائی۔ والد کے بے وقت انتقال کے باعث گھر کے اخراجات کا سارا بار ان پر آ پڑا۔ لہٰذا تعلیم چھوڑ کر بھیرہ کے سکول میں نوکری کر لی۔ پھر جموں چلے گئے ۱۸۹۰ء میں لاہور آ گئے اور انجمن حمایت اسلام کے ہائی سکول میں مدرس ہو گئے۔ ۱۸۹۶ء میں اس ملازمت کو چھوڑ کر اکاؤنٹنٹ جنرل لاہور کے دفتر میں آڈیٹر مقرر ہو گئے۔ جہاں عرصہ تک کام کیا اور پھر قادیان چلے گئے اور وہاں مدت تک اخبار البدر کی ایڈیٹری کی۔ ۱۹۱۳ء میں اس کے بند ہونے پر ماہنامہ صادق جاری کیا۔ ۱۹۱۷ء میں تبلیغ اسلام کے لیے انگلستان گئے اور انگلستان۔ فرانس اور امریکہ میں سات سال تک اسلام کی تبلیغ کرتے رہے۔ امریکہ سے آپ نے ایک تبلیغی رسالہ بھی جاری کیا تھا۔ پھر واپس چلے آئے اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں تبلیغ کرتے رہے۔ تقسیم ملک کے بعد لاہور میں آ کر عرصہ تک رہے۔ ۵ جنوری ۱۹۵۷ء کو انتقال کیا۔ ذکرِ حبیب۔ بائبل کی پیشگوئیاں آنحضرت کے متعلق۔ تحقیق قبر مسیح۔ تحفہ بنارس۔ صادق بمبئی وغیرہ آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔

مولانا محمد صالح ۔ آپ لاہور کے رہنے والے ایک نیک دل۔ پاکباز اور بہت صالح بزرگ تھے۔ عالم اور فاضل ہونے کے

ساتھ ہی تصنیف و تالیف کا بھی خاص ذوق رکھتے تھے۔ ان کی کئی کتابوں کے کئی کئی اڈیشن چھپے اور ہاتھوں ہاتھ نکل گئے۔ مثلاً پردہ اور اسلام۔ نماز حنفی دو جلد۔ آداب الرسول وغیرہ۔ وفات سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم غیب جاننے پر ایک بسوط اور ضخیم کتاب لکھی۔ اس کی کتابت کروا چکے تھے لیکن ابھی چھپنے کی نوبت نہ آئی تھی کہ پیغام اجل آ گیا اور قریباً ۸۵ سال کی عمر پا کر ۱۹۵۶ء میں عالم بقا کو سدھار گئے۔

محمد وارث کامل نجیب آباد کے رہنے والے ایک شیخ تھے۔ خاموش طبیعت۔ سنجیدہ مزاج اور فاضل بزرگ تھے۔ تقسیم ملک سے پہلے سہ روزہ مدینہ بجنور کو اڈیٹ کرتے رہے۔ تقسیم ملک کے بعد لاہور میں اخبار چٹان اور روزنامہ زمیندار کے دفتروں میں کام کیا۔ آخر عمر میں اپنا رسالہ "فروغ اسلام" کے نام سے جاری کیا تھا۔ کئی کتابوں کے مصنف اور مترجم ہیں۔ عبدالحمید زہراوی کی کتاب خدیجہ کا آپ نے ترجمہ کیا۔ محمد حسین ہیکل کی کتاب حیات محمدؐ کا بھی آپ نے نہایت سلیس اور با محاورہ ترجمہ کیا تھا جو ہنوز زیر اشاعت ہے۔ اساسِ اسلام کے نام سے بھی ایک کتاب ایف۔ اے کے اسلامیات کے طلبا کے لیے لکھی۔ اور بعض دیگر تالیفات بھی کیں۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۶۰ء کو صبح کے وقت لاہور میں انتقال کیا۔

مولوی کریم الدین آپ پانی پت کے رہنے والے انیسویں صدی عیسوی کے مشہور و معروف اہل قلم۔ ادیب مصنف۔ مؤرخ۔ سوانح نویس اور صحافی تھے۔ ۲۱ جون ۱۸۰۳ء کو پانی پت میں پیدا ہوئے۔ بڑے ہو کر تحصیل علم کے لیے دہلی آئے اور یہاں صرف و نحو۔ منطق۔ فلسفہ۔ طب۔ فقہ اور حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۴۲ء میں دہلی کالج میں داخل ہوئے اور یہاں ہندسہ۔ ہیئت۔ جبر و مقابلہ اور تاریخ ادب کی تعلیم پائی۔ آپ عربی و فارسی کے علاوہ انگریزی بھی خوب جانتے تھے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر آپ نے دہلی میں ایک مطبع جاری کیا جس میں آپ نے بہت اعلیٰ پایہ کی تاریخی کتابیں شائع کیں۔ کریم الاخبار اور گل رعنا دو ماہنامے بھی نکالے۔ ۱۸۵۷ء میں جب دہلی پر تباہی اور بربادی اور غارت گری کا طوفان آیا تو یہ وہاں سے نکل کر آگرہ پہنچے اور وہاں آگرہ کالج میں پروفیسر مقرر ہو گئے۔ ۱۸۶۲ء میں پنجاب چلے آئے اور حلقہ لاہور کے ڈپٹی انسپکٹر تعلیمات کے عہدے پر عرصہ دراز تک کام کیا۔ لاہور آ کر بہت سی کتابیں تالیف اور ترجمہ کیں جو لاہور کے سرکاری مطبع نے شائع کیں۔ ۱۸۷۹ء میں انتقال کیا۔ اُن کی بعض کتابوں کے نام یہ ہیں۔ ترجمہ تاریخ ابوالفدا۔ طبقات شعرائے ہند۔ تاریخ شعرائے عرب۔ واقعات ہند۔ مفتاح الارض وغیرہ۔ کریم اللغات اُن کی سب سے مشہور کتاب ہے جس کے اب تک بیسیوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

منشی مولا بخش کشتہ جولائی ۱۸۷۶ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں اُردو میں شعر کہتے تھے۔ بعد میں پنجابی شاعری میں نام پیدا کیا۔ ۱۹۰۵ء میں آپ نے امرتسر سے ضیاء الاسلام کے نام سے ایک مذہبی اور اسلامی ہفتہ وار جاری کیا۔ ۱۹۱۶ء میں ایک اور اخبار "اتحاد" شائع کرنا شروع کیا۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب میں لاہور آ گئے اور یہیں ۱۹۵۵ء میں وفات پائی۔ امرتسر کے قیام کے دوران میں آپ نے ایک ادبی اور تنقیدی ماہنامہ "مسیحا" کے نام سے بھی جاری کیا جو ۱۹۰۷ء میں بند ہو گیا۔

خواجہ کمال الدین۔ ووکنگ مشن لندن کے بانی اور امام اور نہایت پُرجوش مبلغ اسلام تھے۔ ساری عمر آپ نے اشاعت اسلام

کے کام میں وقف کر دی اور یورپ میں ہزار ہا لکچر اسلام کی حقانیت اور سچائی پر دیئے۔ بہت سی کتابیں اسلام کی تائید اور عیسائیت کی تردید میں لکھیں۔ ایک ماہوار رسالہ اشاعتِ اسلام کے بھی ایڈیٹر تھے جو لاہور سے مدتوں نکلتا رہا۔ ۲۸ دسمبر ۱۹۳۲ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔ ۱۸۷۰ء آپ کا سال پیدائش ہے۔ اُن کی بعض کتابوں کے نام یہ ہیں: براہین نیرہ۔ اُم الالسنہ۔ اُسوۂ حسنہ۔ اسلام اور دیگر مذاہب۔ لمعات انوار محمدیہ۔ ذراتِ عالم کا مذہب۔ مسیح کی الوہیت پر ایک نظر۔ اسلام اور علوم جدیدہ۔ اسلام میں کوئی فرقہ نہیں۔ رازِ حیات یا انجیلِ عمل۔ ضرورتِ الہام۔ توحید فی الاسلام۔ روحیا نیات فی الاسلام۔ مطالعہ اسلام۔ ہستی باری تعالیٰ۔ مذہبِ محبت۔ سیر افکار۔ لمعاتِ انوارِ محمدیہ۔ سلک مروارید۔ مقصد مذہب۔ پیام اسلام۔ سیرۃ نبوی۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان اردو کتابوں کے علاوہ آپ نے انگریزی میں بھی بہت سی کتابیں اسلام کی تائید اور عیسویت کی تردید میں لکھی ہیں آپ نے اشاعت کے لیے ایک انگریزی ماہنامہ اپنے لندنی مرکز مسجد ووکنگ سے ۱۹۱۳ء میں جاری کیا تھا جس کا نام اسلامک ریویو تھا جو آج بھی بہت شان کے ساتھ جاری ہے۔

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی اُردو کے بڑے زبردست ادیب۔ نہایت قادر الکلام شاعر۔ نہایت کامیاب مصنف اور بڑے جید انشا پرداز تھے۔ اگرچہ ہندو تھے مگر ساری عمر نہایت خلوص کے ساتھ اُردو کی خدمت میں گذار دی۔ فنِ شعر میں حضرت شمس العلماء مولانا خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی کے شاگرد تھے۔ اور بے انتہا عقیدت اور محبت کے ساتھ اپنے محترم اُستاد کا ذکر کیا کرتے تھے۔ ۱۳ دسمبر ۱۸۶۶ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ اُردو کے تو مسلم الثبوت انشاپرداز تھے ہی مگر اس کے علاوہ ہندی۔ عربی۔ فارسی اور انگریزی کے بھی فاضل تھے۔ عرصہ دراز تک لاہور میں مقیم رہے۔ جہاں اُن کالج کا انگریزی اخبار ٹریبیون کا ایڈیٹر تھا۔ یہاں آپ کا قیام ماڈل ٹاؤن میں رہا۔ اور زمانہ قیام لاہور میں آپ برابر ادب اور فن کی خدمت کرتے رہے۔ انجمن ترقی اُردو میں مولوی عبدالحق کے بعد آپ ہی کا درجہ تھا۔ پرانے بزرگوں کے اخلاق کا آپ ایک بہت ہی اچھا نمونہ تھے۔ گفتگو۔ تقریر اور تحریر نہایت شستہ اور شائستہ ہوتی تھی اور ہر شخص سے بحد اخلاق اور مروت سے پیش آتے تھے۔ تعصب کا آپ میں نام و نشان بھی نہ تھا اور نہایت صلح کل بزرگ تھے۔ یکم نومبر ۱۹۵۵ء کو سفر کرتے ہوئے قصبہ غازی آباد میں انتقال فرمایا۔ مسدس بھارت۔ ددپن۔ تزک قیصری۔ منشورات۔ کیفیہ۔ مراۃ خیال۔ چراغِ ہدایت۔ نہتا راجہ۔ راج دلاری۔ مراری داوا، آپ کی مشہور تصنیفات ہیں "واردات" کے نام سے مجموعہ کلام بھی چھپ گیا ہے۔

گرامی ملک الشعراء شیخ غلام قادر گرامی ۱۸۵۶ء میں بمقام جالندھر پیدا ہوئے۔ جوان ہو کر تحصیل علم کے لیے لاہور آئے۔ اور اورینٹل کالج میں داخل ہو کر منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ پھر یہیں رہ کر وکالت کا امتحان دیا۔ غرض کافی عرصہ آپ لاہور میں مقیم رہے جب وکالت نہ چلی تو امرت سر میں مدرس فارسی ہو گئے۔ پھر کپور تھلہ چلے گئے۔ اور پھر لدھیانہ میں مدرسی کی۔ کچھ دنوں پولیس کی نوکری بھی کی اور اس سلسلہ میں پٹیالہ۔ رام پور۔ مالیر کوٹلہ وغیرہ میں پھرتے رہے۔ اس کے بعد دکن چلے گئے۔ جہاں اُن کی قسمت کا ستارہ چمک اُٹھا۔ نظام حیدر آباد نے اپنا استاد بنا کر بڑے اعزاز و اکرام سے رکھا۔ اور ملک الشعراء کا خطاب دیا۔ ۳۵ سال دکن میں بڑے اعزاز اور اکرام سے گذارے۔ ۱۹۱۶ء میں بیمار ہو کر واپس پنجاب آ گئے۔ ذیابیطس کا

مرض تھا اور اسی مرض میں ۲۶ر مئی ۱۹۲۷ء کو انتقال کیا۔ فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے مگر اردو میں بھی کہتے تھے۔ اُن کے کچھ اردو اشعار تذکرہ شعرائے پنجاب کے صفحہ ۴۳۲ پر درج ہیں۔ اُن کا فارسی دیوان چھپ چکا ہے۔ اقبال اُن کے شاگردوں میں سے ایک تھے۔

لاجپت رائے ایک متعصب کانگرسی اور لاہور کے مشہور رئیس اور سیاسی کارکن تھے۔ لاہور سے روزنامہ بندے ماترم انہی کی سرپرستی میں جاری ہوا تھا۔ آپ اردو کی دو مشہور کتابوں کے مؤلف ہیں ایک راجہ اشوک کی مفصل سوانح عمری اور دوسری تاریخ ہند قدیم۔ موخر الذکر کتاب اگرچہ متعصبانہ ذہنیت کے ساتھ لکھی گئی ہے مگر ہندوستان کی قدیم تاریخ پر بہت اچھی روشنی ڈالتی ہے۔ ۱۷ر نومبر ۱۹۲۸ء کو لالہ لاجپت رائے کا لاہور میں انتقال ہوا۔

ڈاکٹر لائٹنر ڈاکٹر جی۔ ڈبلیو لائٹنر ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی پرنسپل گورنمنٹ کالج و اورینٹل کالج اور رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی ایک نہایت باذوق، ذی علم اور فاضل انسان تھے۔ ۱۸۴۰ء میں ہنگری (یورپ) میں پیدا ہوئے۔ آٹھ سال کی عمر میں قسطنطنیہ چلے آئے جہاں عربی اور ترکی سیکھی۔ ۱۸۵۵ء میں برطانیہ کی فوج میں مترجم کے طور پر ملازم ہو گئے۔ پھر نوکری چھوڑ کر پادری بنے۔ پھر اسے چھوڑ کر کالج میں اسلامی قانون پر لیکچر دینے لگے۔ نومبر ۱۸۶۴ء میں ہندوستان آکر گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ جہاں یہ طلبا کو عربی اور فارسی پڑھاتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب مختلف علوم اور مختلف فنون اور ۵۰ کے قریب مشرقی اور مغربی زبانوں کے فاضل تھے اور بعرصہ دراز تک اسلامی ملکوں کی سیاحت بھی انھوں نے کی تھی۔ جہاں انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور اپنا نام ملا عبدالرشید سیاح رکھا تھا۔ اور اپنے اسلام کی تصدیق میں بخارا اور سمرقند کے علما سے تصدیق نامے بھی حاصل کر لیے تھے۔ لاہور کے زمانۂ قیام میں انھوں نے ایک نہایت جامع اور مکمل تاریخ اسلام بھی اردو میں دو جلدوں میں لکھی تھی۔ جس کی جلد اول ۱۸۷۱ء میں شائع ہوئی اور جلد دوم ۱۸۷۶ء میں۔ آغا محمد اشرف نے اپنے ایک کتابچے میں قطعاً غلط لکھا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے یہ کتاب لاہور میں مولانا آزاد سے لکھوائی تھی۔ اس کتاب کا اسلوب بیان ہرگز آزاد کا نہیں۔ علاوہ ازیں کتاب کے سرورق پر صاف اور نمایاں حروف میں چھپا ہوا ہے کہ "بمدد مولوی کریم الدین ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس امرتسر" اگر مولانا آزاد نے یہ کتاب خود لکھ کر ڈاکٹر صاحب کو دی تھی تو انھوں نے مولوی کریم الدین کا نام کتاب پر کیوں لکھا اور جب مولوی کریم الدین کا نام کتاب پر شائع ہوا تھا تو مولانا آزاد نے اس کی تردید کیوں نہ کی۔ ڈاکٹر لائٹنر ۱۸۸۶ء میں لاہور سے چلے گئے۔ ووکنگ (لندن) کی مسجد انھوں ہی نے بنوائی تھی۔ ۲۲ر اپریل ۱۸۹۹ء کو ان کا جرمنی میں انتقال ہو گیا۔

حاجی لق لق یہ مشہور مزاح نگار اور صحافی آج سے ۹۴ برس پہلے پٹی تحصیل قصور ضلع لاہور میں پیدا ہوئے۔ اصل نام عطا محمد تھا۔ ۱۹۱۹ء میں فوج میں بھرتی ہوئے اور دس گیارہ سال تک مشرق وسطیٰ میں متعین رہے۔ ۱۹۳۰ء میں لاہور آ گئے اور روزنامہ زمیندار میں ملازم ہو گئے۔ جہاں بیس سال تک کام کرتے رہے۔ اس کے بعد احسان، شہباز، مساوات اور زمیندار وغیرہ روزناموں کی ادارت میں شامل رہے۔ علاوہ ازیں کئی دیگر ماہناموں اور ہفت روزہ جرائد کے ایڈیٹر بھی رہے۔ اپنا بھی ایک اخبار لقلقہ کے نام سے نکالا لیکن چلا نہیں سکے۔ اردو اور فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے۔ ان کی سنجیدہ نظمیں ابو العلا چشتی کے اور مزاحیہ نظمیں حاجی لق لق کے نام سے شائع ہوتی تھیں۔ "درانی" اُن کے فسانوں کا مجموعہ ہے اور "ماڈرن غزلیں" مزاحیہ کلام کا۔ علاوہ ازیں

آدم اللغات ۔ عالمی معلومات ۔ جناح اور پاکستان ۔ رفتارِ پاکستان اور دو درجن دیگر بھی اُن کی تصانیف ہیں ۔ مشہور اخبار نویس ۔ اعلیٰ مصنّف بہترین مزاح نگار اور بہت اچھے شاعر ہونے کے باوجود آخر عمر نہایت بیکسی تنگ دستی ۔ لاچاری اور افلاس میں کٹی ۔ اس غربت اور تنگ دستی نے بستر مرگ تک ساتھ نہ چھوڑا ۔ یہاں تک کہ ۲۶ اور ۲۷ ستمبر ۱۹۶۱ء کی درمیانی شب کو میو ہسپتال میں جان جانِ آفریں کو سپرد کر دی ۔

مجید لاہوری اردو کے مشہور شاعر اور مزاح نگار اور گوجرانوالہ کے رہنے والے تھے ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے بڑے ہو کر لاہور میں حصولِ معاش کے لیے چلے آئے اور عرصہ دراز تک یہاں رہنے کی وجہ سے مجید لاہوری کے نام سے مشہور ہو گئے ۔ پھر کراچی چلے گئے اور وہیں ۴۴ سال کی عمر میں ۲۶ جون ۱۹۵۷ء کو انتقال کیا ۔ اپنے اخبار نمک دان میں آپ نے اپنی ظرافت اور مزاح کے بہت دلچسپ نمونے چھوڑے ہیں ۔ موت حرکتِ قلب بند ہونے سے واقع ہوئی ۔

پنڈت لیکھرام آریہ مسافر یہ شخص آریہ سماج کا لیڈر ۔ بہت سی کتابوں کا مصنّف اور اپنے زمانہ میں بڑا مشہور آدمی تھا ۔ مگر ساتھ ہی نہایت درجہ متعصب ۔ دشمنِ اسلام اور دریدہ دہن تھا ۔ اپنی ہر کتاب میں خدا تعالیٰ ۔ قرآنِ کریم ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم ۔ اور اسلام کے متعلق ہرزہ سرائی کرتا رہتا تھا ۔ جب خدا و رسولؐ کے متعلق اس کی بدکلامیاں اور بدزبانیاں حد سے بڑھ گئیں تو بالآخر حضرت مرزا غلام احمد قادیانی نے ۲۰ فروری ۱۸۹۳ء کو اس کی ہلاکت کی پیشگوئی کی جس کے نتیجہ میں ۶ مارچ ۱۸۹۷ء کو لاہور میں اپنے مکان میں بیٹھے ہوئے دن کے وقت ایک آدمی کے ہاتھ سے مارا گیا ۔ قاتل گرفتار نہ ہو سکا اور بھاگ گیا ۔ آریہ سماجیوں نے بڑے زور سے دعویٰ کیا کہ " اس کا قاتل مرزا " ہے ۔ چنانچہ اُن کے مکان کی فوراً تلاشی لی گئی لیکن کوئی چیز برآمد نہ ہوئی ۔ پھر آریہ سماج نے فوراً اشتہار دیا کہ قاتل کے گرفتار کرنے والے کو دس ہزار روپیہ انعام دیا جائیگا مگر قاتل کا پتہ آج تک نہ لگا ۔

مولانا محمد دین فوقؔ نے لکھا ہے کہ " اپنے لیڈر کے قتل سے مشتعل ہو کر لاہور کے ہندو حلوائیوں نے بطور انتقام مسلمانوں کے بچوں کو مٹھائیوں میں زہر دے کر ہلاک کر دیا ۔ جس پر لاہور کے مسلمانوں نے ہوشیار ہو کر ہندوؤں سے مٹھائی خریدنی قطعاً بند کر دی اور یہی قتل اس امر کا باعث ہوا کہ شہر لاہور میں مسلمان حلوائیوں کی دکانیں بکثرت ہر محلہ میں کھل گئیں اور وہ دودھ ۔ دہی اور مٹھائیاں ہندوؤں سے خریدنے سے رُک گئے " پنڈت لیکھرام کی بعض تصانیف یہ ہیں : تکذیب براہین احمدیہ ۔ خبط احمدیہ ۔ کرسچن مت درپن ۔ صداقت اصول و تعلیم آریہ سماج ۔ جہادِ احمدی ۔ جنبِ اسلام ۔ تاریخ دنیا ۔ صداقت رگ وید ۔ آئینۂ انجیل ۔ عطر روحانی ۔ تعلیم نسواں ۔ مورتی پرکاش ۔ آریہ ہندو اور نستے کی تحقیقات ۔ اُس کی تمام چھوٹی بڑی کتابوں کا مجموعہ " کلیاتِ آریہ مسافر " کے نام سے چھپا تھا ۔

مولوی محبوب عالم جس طرح مولوی عبدالحق " بابائے اُردو " کہلاتے ہیں ۔ اسی طرح مولوی محبوب عالم " بابائے صحافت " کے لقب کے مستحق ہیں ۔ کیونکہ بہت سے نامور ادیبوں اور مشہور اخبار نویسوں میں جنھوں نے بعد میں اُردو صحافت میں بڑا نام پیدا کیا ۔ انھوں نے ابتدا میں مولوی محبوب عالم ہی کی زیرِ تربیت اور اُنہی کے اخبار کے دفتر میں رہ کر صحافت

کے فن کو سیکھا۔ اُردو صحافت میں اس لحاظ سے پیسہ اخبار کا نام ہمیشہ باقی رہے گا۔ یہ مشہور پرچہ جسے اپنے زمانہ میں بڑی زبردست شہرت حاصل ہوئی مولوی صاحب نے اپنے وطن فیروز والہ سے ۱۸۸۷ء میں نکالا تھا۔ پھر وہ اسے گوجرانوالہ لے آئے۔ اور اس کے بعد ۱۸۹۰ء میں لاہور آ گئے۔ لاہور ایسے آئے کہ پھر اسی شہر کو اپنا مستقر اور مرکز بنا لیا اور یہاں اُنھوں نے بڑی زبردست ترقی کی۔ اُن کے ہفت روزہ پیسہ اخبار نے جلد اتنی زبردست شہرت حاصل کی کہ مولانا اسے روزانہ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اور مولوی صاحب نے لاہور میں ایک بڑی عظیم الشان عمارت اسی پیسہ اخبار کی آمدنی سے تعمیر کرائی جو آج بھی موجود ہے۔ گورنمنٹ نے پیسہ اخبار کے نام سے ڈاک خانہ بھی جاری کر دیا اور کارپوریشن نے جس محلہ میں اس کا دفتر تھا اُس کا نام بھی پیسہ اخبار سٹریٹ رکھ دیا جو آج بھی لاہور کا ایک نہایت بارونق علاقہ ہے۔ پیسہ اخبار کے علاوہ مولوی صاحب نے اور بھی کئی رسالے اور اخبار جاری کئے اور سینکڑوں کتابیں اپنے مطبع میں مختلف علوم و فنون کی لوگوں سے لکھوا کر اور خود لکھ کر شائع کیں۔ ۲۷ مئی ۱۹۳۳ء کو ان کی وفات ہوئی۔ ڈاکٹر اقبال نے تاریخ کہی جو اُن کی قبر پر کندہ ہے۔

خان بہادر مولوی محرم علی چشتی ۱۱ اگست ۱۸۶۴ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ کانگرس کے زبردست حامی اور سر سید احمد خاں مرحوم کے شدید ترین مخالفوں میں سے تھے۔ ۱۸۸۴ء میں لاہور سے اخبار رفیقِ ہند جاری کیا جو عرصہ تک جاری رہا۔ ۱۹۰۱ء میں وکالت شروع کی۔ لاہور کے نہایت کامیاب وکیل اور مشہور اخبار نویس تھے۔ اپنے اخبار میں اپنے مخالفین پر بڑے سخت اور شدید حملے کرتے رہتے تھے جس میں مقدمہ بازی تک بھی نوبت پہنچ جاتی تھی۔ ۸ دسمبر ۱۹۳۴ء کو لاہور میں انتقال کیا۔ ان کی ایک مشہور کتاب کا نام ہے "اسلامی زندگی کا دنیوی پہلو"۔

ڈاکٹر میر محمد اسماعیل حضرت خواجہ میر درد رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں سے ایک نہایت ہی قابل اور لائق شخص تھے۔ اصلی یعنی آبائی وطن دہلی تھا۔ لاہور کے میڈیکل کالج میں عرصہ تک پڑھ کر ایم۔ بی۔ بی۔ ایس ہوئے۔ پھر کافی دنوں تک میو ہسپتال لاہور میں کام کرتے رہے۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۲۹ء تک پنجاب کے مختلف شہروں میں اسسٹنٹ سرجن رہے۔ ۱۹۲۹ء میں سول سرجن ہو کر مختلف اضلاع میں کام کیا۔ ۱۹۳۶ء میں گوجرانوالہ سے ریٹائر ہوئے اور ۱۸ جولائی ۱۹۴۷ء کو وفات پائی۔ عجیب اتفاق یہ ہے کہ اسی تاریخ کو ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اپنے وقت میں تمام پنجاب میں بہترین سرجن مانے جاتے تھے۔ آنکھوں کے آپریشن میں تمام ملک میں اُن کا نظیر نہ تھا۔ نہایت خوش مزاج، خوش طبع اور بذلہ سنج انسان تھے۔ اخلاق، ہمدردی اور رحم و مروت کا مادہ اُن میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اپنے فن کے ماہر ہونے کے علاوہ اعلیٰ درجہ کے صوفی، بہت پاکباز اور پرہیزگار اور متقی شخص تھے۔ بہت اچھے لکچرار۔ نہایت بلند پایہ ادیب۔ بڑے بے مثال شاعر اور بہترین فسانہ نگار۔ قرآنی معارف اور نکات بیان کرنے میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ جو شخص ایک مرتبہ ان سے مل لیتا تھا ہمیشہ کے لیے ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ مجھے ۱۹۱۴ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک ان سے تعلق رہا۔ میں نے مختلف قابلیتوں اور مختلف لیاقتوں کا ایسا بے نظیر شخص اور کوئی نہیں دیکھا۔ "بخارِ دل" اُن کی پاکیزہ نظموں کا اور "آپ بیتی" اُن کے فسانوں کا مجموعہ ہے۔ اخلاق کے متعلق "کر نہ کر" اُن کی لاجواب کتاب ہے "مقطعاتِ قرآنی" بڑی محققانہ کتاب انھوں نے لکھی ہے۔

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال۔ آپ اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل اور بہت صاحب ذوق اور ذی علم انسان تھے۔ تصنیفی قابلیت

نہایت اعلیٰ تھی۔ انگریزی سے نہایت عمدگی کے ساتھ ترجمہ کرتے تھے۔ چنانچہ انجمن ترقی اُردو کے لیے انھوں نے ایک بہت ہی بلند پایہ اور محققانہ ضخیم کتاب انگریزی سے اُردو میں بڑی سلاست اور روانی کے ساتھ ترجمہ کی تھی اُس کا نام تھا "ایران بعہد ساسانیاں" آپ نے ۱۹۴۳ء میں وفات پائی۔

شیخ محمد الدین بہت اعلیٰ درجہ کے شاعر اور مذاق سلیم کے مالک تھے۔ ناظر تخلص کرتے تھے۔ اگرچہ کم کہتے تھے مگر جب کہتے تھے تو خوب کہتے تھے۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں فکر شعر کیا کرتے تھے۔ آپ کشمیر کے وانچو خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ محمد حیات آپ کے دادا کا نام تھا۔ جو ہندو سے مسلمان ہو گئے۔ اور ۶۰ سال کی عمر میں ۱۸۴۵ء میں اُن کا انتقال ہو گیا۔ اُن کے لڑکے عبدالرحمٰن کو جب مسلمان ہونے کی وجہ سے سخت تکلیف دی گئی تو آپ مجبوراً کشمیر سے نکل کر ۱۸۴۹ء میں لاہور چلے آئے۔ اور یہاں آکر تجارت میں بڑا عروج حاصل کیا۔ محمد الدین انہی کے لڑکے ہیں جو ۱۸۵۸ء میں یہیں پیدا ہوئے۔ بڑے ہو کر نہایت اعلیٰ قابلیت کے مالک ہوئے اور چھوٹی عمر میں منشی فاضل کا امتحان پاس کر لیا۔ ڈاکٹر لائٹنر ڈائرکٹر تعلیمات نے آپ کی طبیعت کا رجحان دیکھ کر لاہور کے وٹرنری کالج میں داخل کرا دیا جہاں ہر امتحان میں اوّل آئے۔ کالج سے فراغت کے بعد آپ نے لاہور سے ایک ماہوار "بشیر" رسالہ طب حیوانات" کے نام سے جاری کیا۔ جو تمام پنجاب میں نہایت قبولیت کے ساتھ پڑھا جانے لگا۔ مگر تھوڑے ہی دنوں بعد آپ مہاراجہ شمشیر پرکاش والیٔ ریاست ناہن کے ہاں ملازم ہو کر چلے گئے۔ مگر تین سال کے بعد مستعفی ہو کر واپس لاہور آ گئے اور اپنا ذاتی مطب شروع کر دیا جو نہایت کامیابی سے چلایا۔ یہ ۱۸۸۹ء کی بات ہے۔ آپ کو شعر و سخن سے بھی نہایت ذوق تھا۔ آپ کے اشعار تاریخ اقوام کشمیر کے صفحہ ۵۵۵ پر ملاحظہ فرمائیں۔ آخر ۱۴ ار ۱۹۲۳ء کو رحلت فرمائی۔

سید محمد امین اندرابی قادری وکیل لاہور کے قدیمی باشندے اور اُردو۔ فارسی اور عربی کے فاضل تھے تصوّف سے بڑا لگاؤ اور صوفیا سے بڑا عشق تھا۔ ۱۳۸۱ھ/۱۹۶۱ء میں وفات پائی۔

تصنیفات یہ ہیں: انیس المشتاقین۔ القول المقبول۔ جذب الاصفیا فی حقوق المصطفیٰ۔

مولوی محمد انشاء اللہ خاں لاہور کے بہت مشہور ادیب۔ مؤرخ۔ مصنف اور اخبار نویس تھے۔ ۲۰ اپریل ۱۸۷۰ء کو گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۲۸ء میں لاہور میں انتقال کیا۔ ۱۸۹۵ء میں اخبار وکیل امرتسر کے ایڈیٹر ہوئے اور یہاں آپ نے سولہ سترہ کتابیں تالیف کیں جو نہایت مقبول ہوئیں۔ ۱۹۰۱ء میں آپ نے لاہور سے اپنا اخبار وطن جاری کیا۔ (محترمی مولانا محمد الدین صاحب فوق نے اپنی کتاب اخبار نویسوں کے حالات میں لکھا ہے کہ یہ اخبار ۱۹۰۲ء میں جاری ہوا) یہ اُن کا سہو ہے واقعہ یہی ہے کہ یہ اخبار ۴ جنوری ۱۹۰۱ء کو جاری ہوا اور اُردو زبان میں بیسویں صدی کا سب سے پہلا اخبار تھا۔ اس اخبار نے بہت جلد نہایت زبردست شہرت حاصل کی۔ اور روزانہ شائع ہونے لگا۔ اس کی روز افزوں کثیر اشاعت کے پیش نظر گورنمنٹ نے وطن پوسٹ آفس بھی جاری کر دیا۔ جو آج تک قائم ہے مگر اخبار ۱۹۳۰ء میں بند ہو گیا اس سے دو سال پہلے مولانا کا بھی ۱۹۲۸ء میں انتقال ہو گیا۔ جو کتابیں آپ نے لکھیں اُن میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔ بست سالہ عہد حکومت سلطان عبدالحمید خاں۔ تاریخ خاندان عثمانیہ۔ محاربات پلیونا۔ محاربات تھسلی۔ ٹرکی کی موجودہ حالت۔ مظالم آرمینیا۔

واقعات روم - تاریخ حجاز ریلوے - ترجمہ مقدمہ تاریخ ابن خلدون - میں نے مولانا کے متعلق ایک مفصل مضمون یکم جنوری ۱۹۶۱ء کے لیل و نہار لاہور میں لکھا تھا - زیادہ تفصیل کے شائقین اُسے ملاحظہ فرمائیں -

مُلا محمد بخش یہ شخص عجیب غیر معمولی قابلیت کا انسان تھا - حالانکہ بالکل اَن پڑھ اور جاہلِ محض تھا - مگر اس کے باوجود وہ ہفتہ وار اخباروں جعفر زٹلی اور پنچ کا ایڈیٹر اور پبلشر اور مالک تھا - ایک مطبع بھی تاج الہند پریس کے نام سے جاری کیا جس میں یہ دونوں اخبار چھپتے تھے - جعفر زٹلی ایک مزاحیہ اخبار تھا جو سر سید اور احمدیوں کا مذاق اُڑانے اور اُن پر پھبتیاں کسنے کے لیے وقف تھا - اور آخر وقت تک اسی نہج پر قائم رہا - ملا محمد بخش بمقام لاہور ۱۸۵۱ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۲۳ء میں یہیں اس کا انتقال ہوا - (تاریخ اقوام کشمیر ص ۴۸۶)

مفتی محمد حسن لاہور کے بہت بڑے فاضل - عالم اور دیندار بزرگ تھے - مدت تک امرتسر میں صدر مدرس رہے - امرتسر ہی میں بڑے بڑے فضلا سے آپ نے تعلیم پائی - تقسیم ملک کے وقت لاہور چلے آئے اور یہاں جامعہ اشرفیہ کی بنیاد ڈالی - جو ایک مثالی درسگاہ ہے - یکم جون ۱۹۶۱ء کو انتقال کیا -

چودھری محمد حسین ایم اے آپ علامہ اقبال کے نہایت گہرے دوستوں اور بڑے عقیدتمندوں میں سے تھے - اور بڑا اچھا ادبی مذاق رکھتے تھے - پریس برانچ مغربی پاکستان لاہور کے سپرنٹنڈنٹ تھے اس لیے بڑی گہری تنقیدی نظروں سے صوبہ میں شائع ہونے والے تمام اخبارات و رسائل اور مختلف موضوعات پر چھپنے والی کتب کا غور سے مطالعہ کیا کرتے تھے - جس کی وجہ سے اُن کی عام معلومات اور واقفیت میں زبردست اضافہ ہو گیا تھا - ۸ / مارچ ۱۸۹۴ء کو پیدا ہوئے اور ۱۶ / جولائی ۱۹۵۰ء کو انتقال کیا - حضرت نعمت اللہ ولی کی پیشگوئی کے متعلق ایک مناظرانہ رنگ کی کتاب کے بھی آپ مؤلف ہیں -

سید محمد سبطین قصبہ سرسی ضلع مراد آباد (یو - پی) میں پیدا ہوئے - منصبیہ کالج میرٹھ میں تعلیم پانے کے بعد لاہور چلے آئے اور ۱۹۰۸ء میں اورینٹل کالج سے عربی کی آخری سند حاصل کی - اور اس کے بعد مدت تک لاہور میں قیام کیا - یہیں آپ کی "ملاقات" سرکار علامہ شیخ عبد العلی ہروی الطہرانی سے ہوئی - اور آخر وقت تک اُنہی سے تعلقات قائم رہے -

ازاں بعد آپ گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں عربی کے پروفیسر مقرر ہو کر چلے گئے اور وہاں رسالہ البرہان کی ادارت بھی کرتے رہے - یہ رسالہ خالص شیعہ مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے لیے وقف تھا - اور سید صاحب کی وفات تک برابر شائع ہوتا رہا - آپ کے انتقال کی تاریخ ۱ / اگست ۱۹۴۷ء ہے - کربلائے معلیٰ میں فوت ہوئے اور وہیں دفن ہوئے -

حافظ محمد عالم عالمگیر ایک بہت اعلیٰ درجہ کا ادبی اور علمی ماہنامہ تھا - جو سید مٹھا بازار سے نکلا کرتا تھا - حافظ صاحب اُس کے مالک اور ایڈیٹر تھے - اور مدتوں بہت شان اور بہت عمدگی کے ساتھ وہ اُسے شائع کرتے رہے - اس رسالہ کے خاص نمبر بھی بہت اعلیٰ پیمانہ پر شائع ہوا کرتے تھے - حق یہ ہے کہ اس رسالہ کے ذریعہ حافظ صاحب نے اُردو کی خاص خدمات انجام دی ہیں - خاکسار راقم نے بھی ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۸ء میں کچھ عرصہ حافظ صاحب کے ماتحت اس رسالہ کی

ادارت کے فرائض انجام دیئے تھے۔ حافظ صاحب نے ایک برقی پریس بھی عالمگیر سٹیم پریس کے نام سے جاری کیا تھا۔ اور عالمگیر بک ڈپو کے نام سے ایک دارالاشاعت کا بھی اجرا کیا تھا۔ جس کے ذریعہ بہت اعلیٰ درجہ کی علمی اور ادبی کتابیں انھوں نے بکثرت شائع کیں۔

رسالہ کے علاوہ ایک ہفتہ وار اخبار بھی انھوں نے خیّام کے نام سے جاری کیا تھا۔ ۱۶ر جنوری ۱۹۵۱ء کو حافظ صاحب کا انتقال ہو گیا۔ افسوس اُن کا کوئی جانشین ایسا نہ ہوا جو اُن کے قائم کئے ہوئے اداروں کو چلاتا۔

مولوی محمد علی ایم۔اے آپ علوم اسلامیہ کے بہت بڑے فاضل۔ قرآن کریم کے انگریزی مترجم اور احادیث نبویؐ کے بے نظیر شارح تھے۔ اپنی ساری عمر علم کی تحصیل۔ دینی کتابوں کی تصنیف اور مذہبی امور کی تبلیغ میں گذار دی۔ اور آخر وقت تک اسی شغل میں مصروف رہے۔ دسمبر ۱۸۷۴ء میں کپورتھلہ کے ایک گاؤں مرار میں پیدا ہوئے۔ اور ایم۔اے تک اپنی تمام تعلیم لاہور میں رہ کر پوری کی۔ پھر اسلامیہ کالج لاہور میں پروفیسر لگ گئے۔ از اں بعد اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسر مقرر ہو گئے۔ پھر ملازمت چھوڑ کر وکالت کرنے کا ارادہ کیا۔ (کیونکہ ایم اے کے بعد آپ نے وکالت کا امتحان بھی پاس کر لیا تھا) لیکن جب مشورہ کرنے کے لیے قادیان گئے (آپ ۱۸۹۷ء میں حضرت مرزا صاحب کی بیعت کر چکے تھے) تو حضرت مرزا صاحب نے سب دھندا چھوڑ کر اُن کو اسلام کی خدمت کرنے کی ترغیب دی۔ چنانچہ اپنے امام کے حکم کی تعمیل میں وہ اپنی دنیوی ترقی اور عروج کے تمام ارمانوں کو خیر باد کہہ کر قادیان چلے گئے اور وہاں ریویو آف ریلیجنز کے ایڈیٹر کی حیثیت سے کام شروع کر دیا۔ پھر قرآن کریم کا انگریزی میں ترجمہ اور تفسیر کرنے کے لیے انجمن کی طرف سے مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۴ء میں وہ اُس ترجمہ اور تفسیر کو لے کر لاہور چلے آئے اور یہاں پہنچ کر اُسے مکمل کیا اس کے بعد آخر وقت تک لاہور ہی میں رہے۔ یہاں تک کہ طویل علالت کے بعد ۱۳ر اکتوبر ۱۹۵۱ء کو آپ کا انتقال ہو گیا۔ آپ کی بکثرت تصنیفات میں سے بعض یہ ہیں۔ تفسیر بیان القرآن ۳ جلد۔ ترجمہ صحیح بخاری دو جلد۔ سیرت خیر البشرؐ۔ جمع قرآن۔ مقام حدیث۔ تاریخ خلافت راشدہ۔ احادیث العمل۔ وغیرہ۔

حافظ محمود شیرانی اُردو زبان کے نامور محقق اور مانے ہوئے انشا پرداز تھے۔ ٹونک میں ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۵ء میں لاہور آکر سنٹرل ماڈل سکول میں داخل ہوئے پھر اُسے چھوڑ کر اورینٹل کالج لاہور میں چلے گئے اور ۱۸۹۹ء میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ کچھ عرصہ بعد اسی کالج میں پروفیسر ہو گئے اس سے پہلے کچھ دنوں اسلامیہ کالج میں بھی رہے۔ آپ کی ادبی شہرت کا باعث آپ کی کتاب "پنجاب میں اُردو" ہوئی۔ آپ کی دوسری کتاب تنقید شعر العجم بھی اہل علم کے طبقہ میں نہایت عزت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ آپ کے محققانہ مضامین کا مجموعہ مقالات شیرانی کے نام سے چھپ چکا ہے۔ ۱۹۴۶ء میں انتقال کیا۔ اختر شیرانی آپ ہی کے فرزند تھے۔

مراد شاہ لاھوری حضرت پیر مراد شاہ لاہور کے ایک صوفی بزرگ تھے۔ جن کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ آپ ہی نے سب سے پہلے لفظ "اُردو" کو زبان کے معنوں میں استعمال کیا۔ آپ اُردو کے اولین شعرا میں سے ہیں۔ اُردو کے متعلق آپ کا مشہور شعر ہے ؎

وہ اُردو کیا ہے یہ ہندی زباں ہے
کہ جس کا قائل اب سارا جہاں ہے

اُردو کی تعریف میں آپ کا یہ شعر خاص طور پر اکثر پیش کیا جاتا ہے ۔

پسندِ طبعِ وزرا و شہاں ہے
غرض جو کچھ ہے اب اُردو زباں ہے

آپ کی منظوم اُردو کتاب نامہ مراد کو نامی صاحب نے چھاپ کر مفت تقسیم کیا ۔ آپ کی ولادت سنہ ۱۸۷۰ء میں ہوئی اور صرف ۳۰ برس کی عمر میں ۳۰ مئی سنہ ۱۹۰۰ء کو آپ کا انتقال ہوا ۔ نامہ مراد کے علاوہ آپ کا دیوان بھی چھپ چکا ہے جو ۲۵۲ غزلوں اور ۲۴ رباعیوں پر مشتمل ہے ۔ مثنوی مراد المحبین یعنی قصہ چہار درویش بھی آپ کی تصنیف ہے جو آپ نے میر امن کی باغ و بہار سے پہلے نظم کیا تھا ۔ ان اُردو کتب کے علاوہ ایک فارسی مثنوی مراد العاشقین بھی آپ نے لکھی تھی جو نامی صاحب نے شائع کی ہے ۔

شمس العلما مولوی سید ممتاز علی ۲۷ ستمبر سنہ ۱۸۶۰ء کو دیوبند (ضلع سہارن پور) میں پیدا ہوئے ۔ مولوی محمد قاسم نانوتوی اور مولوی محمد یعقوب سے قرآن ، حدیث اور فقہ کی تعلیم پائی ۔ انگریزی کی تعلیم کچھ پرائیویٹ ۔ کچھ سکولوں میں پائی ۔ سنہ ۱۸۷۶ء میں لاہور چلے آئے ۔ اور ایسے آئے کہ یہیں کے ہو رہے ۔ سنہ ۱۸۸۳ء میں پنجاب ہائی کورٹ کے مترجم مقرر ہوئے اور سنہ ۱۸۹۱ء تک رہے پھر آپ نے لاہور میں رفاہ عام پریس قائم کیا ۔ جہاں سے نہایت بلند پایہ کتابیں بہترین طباعت اور کتابت کے ساتھ شائع ہوتی تھیں ۔ یکم جولائی سنہ ۱۸۹۸ء سے آپ نے عورتوں کے لیے ایک اعلیٰ پایہ کا ہفتہ وار اخبار تہذیب النسواں جاری کیا ۔ جو سنہ ۱۹۴۹ء تک جاری رہا ۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں بچوں کے لیے اخبار پھول کا اجرا کیا جو تقسیم ملک کے بعد تک نکلتا رہا ۔ گورنمنٹ نے ان کی علمی و ادبی خدمات کے صلہ میں شمس العلما کا خطاب دیا ۔ سر سید سے آپ کے گہرے تعلقات تھے ۔ اخلاق و مروّت کے لحاظ سے ایک بہترین انسان اور نہایت منکسر المزاج اور با اصول بزرگ تھے ۔ ۱۵ ر جون سنہ ۱۹۳۵ء کو لاہور میں انتقال کیا ۔ ان کے لائق فرزند سید امتیاز علی تاج آج کل انجمن ترقی ادب کے ڈائرکٹر ہیں ۔

سعادت حسن منٹو اُردو کا یہ مشہور و معروف فسانہ نگار ۱۱ مئی سنہ ۱۹۱۲ء کو سمرالہ ضلع ہوشیارپور میں پیدا ہوا امرتسر میں پرورش پائی ۔ تعلیم میٹرک تک تھی ۔ پہلے پہل روزنامہ مساوات امرتسر میں لکھنا شروع کیا ۔ پھر لاہور آ کر ہفت روزہ پارس میں مضمون نگاری کرتے رہے ۔ پھر بمبئی چلے گئے اور وہاں کے ہفتہ وار اخبار مصوّر کو ایڈٹ کرتے رہے ۔ بمبئی سے دِلّی ریڈیو اسٹیشن میں چلے آئے ۔ پھر بمبئی واپس چلے گئے ۔ اور فلم کے لیے کہانیاں لکھیں تقسیم ملک کے بعد پاکستان چلے آئے اور یہیں ۱۸ ر جنوری سنہ ۱۹۵۵ء کو انتقال کیا ۔ شراب نوشی اور عریاں نویسی آپ کی نمایاں خصوصیات تھیں ۔ انتقال کے بعد آپ کی یاد میں نقوش کا ایک منٹو نمبر بھی خاص شان سے شائع ہوا تھا جس میں منٹو کے مدّاحوں نے دل کھول کر منٹو کو خراج تحسین عطا کیا تھا ۔ اُن کی بعض کتابوں کے نام یہ ہیں ۔ منٹو کے افسانے ۔ منٹو کے ڈرامے ۔ تین عورتیں ۔ جنازے ۔

کروٹ ۔ چند ہمدرد کی خدائی ۔ خالی بوتلیں خالی ڈبے ۔ آپ کی کتاب "ٹھنڈا گوشت" کو خاص شہرت حاصل ہوئی جس پر فحش نویسی کے سلسلہ میں آپ پر مقدمہ بھی چلا۔

منشی سورج نرائن مہر آپ دہلی کے کائستھ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ جب وہ ۱۸۸۲ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے تو اسی وقت سے اُن کو شعر و سخن کا شوق پیدا ہو گیا۔ اُن کے اشعار نہایت صاف ستھرے اور بہت اعلیٰ درجے کے ہوتے تھے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔اے پاس کرنے کے بعد وہ سررشتہ تعلیم پنجاب میں ملازم ہو گئے اور عرصہ تک راولپنڈی اور دہلی کے انسپکٹر مدارس رہے۔ کرنیل ہالرائڈ کے زمانہ میں آپ لاہور میں ریڈر ان بکس کے عہدے پر عرصہ تک کام کرتے رہے۔ بچوں کے لیے آپ نے نہایت دلچسپ اور دلآویز نظمیں لکھی ہیں اور آپ کے کلام کا مجموعہ کلام مہر کے نام سے دو جلدوں میں چھپا تھا۔ آپ کو انگریزی۔ فارسی۔ اُردو۔ سنسکرت اور ہندی پر پورا عبور حاصل تھا۔ آپ کا طرز بیان صاف ستھرا اور کلام خلوص کا آئینہ ہے۔ ۱۳ر نومبر ۱۸۵۹ء کو پیدا ہوئے اور ۱۰ر مئی ۱۹۳۱ء کو انتقال کیا۔

میراجی اصلی نام ثناء اللہ تھا۔ سابق پنجاب کے مشہور نوجوان شاعر اور نقاد تھے۔ حلقہ ارباب ذوق کے رکن تھے۔ ادبی دنیا کے سابق ایڈیٹر رہے۔ آپ کی نظمیں نہایت سلیس اور شگفتہ ہوتی تھیں۔ فسانے اور ادبی مضامین بھی بہت دلچسپ لکھتے تھے۔ ان کی نظموں اور فسانوں کے مجموعے چھپ گئے ہیں۔ اور عام طور سے بازار میں ملتے ہیں۔ شراب کے بڑے رسیا تھے اور اسی کم بخت ام الخبائث کے باعث زندگی بڑی تلخ گذری۔ آخر عالم کس مپرسی میں بمبئی کے ایک ہسپتال میں چند روز بیمار رہ کر ۳ر نومبر ۱۹۴۹ء کو فوت ہو گئے۔ ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی تصانیف "میراجی کی نظمیں۔ میراجی کے گیت اور نگار خانہ" ہیں۔

مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش ۱۹۰۴ء میں ضلع جالندھر کے ایک گاؤں پردم میں پیدا ہوئے۔ ابھی پڑھتے ہی تھے کہ تحریک ہجرت کے سلسلے میں افغانستان چلے گئے۔ مگر وہاں سے نہایت ذلت و خواری کے ساتھ واپس آئے اور ۱۹۲۳ء میں زمیندار کے عملے میں شامل ہو گئے۔ اس کے بعد انقلاب میں کام کیا۔ پھر ایک فارسی اخبار "افغانستان" نکالا جس کے ایک مضمون پر گرفتاری عمل میں آئی کر سزایاب ہوئے۔ واپس آ کر احسان اور شہباز میں کام کیا۔ پھر اپنا روزنامہ انصاف نکالا۔ اس کو بند کر کے نوائے پاکستان اور مغربی پاکستان میں کام کرتے رہے۔ اپنے زمانہ میں لاہور کی صحافت میں ان کا طوطی بولتا تھا۔ آخری ایام بڑی عسرت اور تکلیف میں گذرے۔ آخر اسی حالت میں ۲۷ر جولائی ۱۹۵۹ء کو قلب کی حرکت بند ہو گئی۔ تاریخ اقوام عالم اُن کی مشہور کتاب ہے جو دو مبسوط جلدوں میں ہے اور اس کے علاوہ اور بھی کئی کتابیں انھوں نے لکھی ہیں۔

پیر غلام دستگیر نامی جب نقوش کے اس "لاہور نمبر" کی کاپیاں نہایت سرعت سے لکھی جا رہی تھیں اور چھ سو صفحے لکھے جا چکے تھے تو اچانک لاہور کے اس مشہور و معروف ادیب، شاعر اور مصنف کا ۱۶ر دسمبر کو دن کے دس بجے انتقال ہو گیا۔ اُن کی عمر ۸۰ برس سے زیادہ ہوئی اور وہ مشرقی تہذیب کا بہت اچھا نمونہ تھے۔ تاریخ گوئی میں کمال رکھتے تھے اسلامی وراثت کے قوانین سے لاہور بھر میں اُن سے زیادہ واقفیت کسی کو نہ تھی۔ ۸۰ کے قریب چھوٹی موٹی اسلامی، تاریخی اور اخلاقی کتابوں کے مصنف تھے اور ۳۰ کے قریب اُنھوں نے ضخیم تصانیف شائع کیں جو سب کی سب چھپوا کر بلا قیمت تقسیم کرتے تھے۔ اُن کی

آخری مطبوعہ کتاب تاریخ جلیلہ کا دوسرا ایڈیشن ہے جو بڑی تقطیع کے ۴۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور جو بالکل مفت تقسیم ہوئی تاریخ بزرگانِ لاہور اُن کی بے مثل کتاب ہے جسے افسوس ہے وہ اپنی زندگی میں چھپوا نہ سکے۔ مگر کتاب کو مکمل کر گئے۔ دوسری کتاب شیخ سعدی کی آپ بیتی ہے۔ یہ زیر طبع ہے۔ اُن کی میّت کو اُن کے ورثا اپنے آبائی گاؤں موضع رتہ پیراں ضلع شیخوپورہ میں دفن کرنے کے لیے لے گئے۔ جہاں دوسرے دن ۱۷ دسمبر کو اُن کی تدفین عمل میں آئی۔

علاوہ کتابوں کے انھوں نے ہزاروں مضامین بھی مختلف اوقات میں مختلف اخباروں اور رسالوں میں لکھے۔ یہ سلسلہ برابر جاری تھا یہاں تک کہ اُن کی موت نے اس سلسلہ کو بند کر دیا۔ اُن کی یادداشتوں کے تین چار رجسٹر محفوظ ہیں جن میں ہر قسم کی ہزاروں علمی۔ ادبی۔ تاریخی یادداشتیں نامی صاحب کی لکھی ہوئی ہیں۔ پچاس برس سے زیادہ کی علمی کاوشوں اور علمی تحریکوں۔ اور سیاسی حالات کا یہ رجسٹر نہایت عجیب اور بہترین مجموعہ ہے۔

جن ایّام میں خاکسار راقم لاہور کے مصنّفین اور ادیبوں کا یہ تذکرہ مرتب کر رہا تھا تو ایک روز نامی صاحب مجھ سے فرمانے لگے کہ ہمارے حالات زندگی بھی اس میں لکھ دو۔ میں نے ہنس کر کہا کہ حضرت پیر صاحب آپ مرجائیے میں فوراً آپ کا ذکر اس تذکرہ میں کر دونگا۔ کیونکہ میں اس مضمون میں صرف مرحوم مصنفین لاہور کا ذکر کرونگا۔ کیا خبر تھی کہ اتنی جلد نامی صاحب مرحوم ہوجائیں گے اور مجھے اُن کا تذکرہ لکھنا پڑے گا۔

نامی صاحب کی وفات پر جو تاریخیں مختلف اصحاب نے کہی ہیں وہ اخبارات میں چھپ چکی ہیں۔ مگر میرے مکرم دوست حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری نے جو تاریخ کہی ہے اور جو ابھی تک کہیں نہیں چھپی میرے نزدیک نہایت ہی عمدہ اور موزوں ہے وہ تاریخ یہ ہے:

بجھا آج ہائے چراغ علوم
۱۳۸۱ھ

مولوی نبی بخش حلوائی

اگرچہ آپ مٹھائی بنانے اور دودھ بیچنے کا کام کرتے تھے۔ اور اسی لیے حلوائی کہلاتے تھے مگر اس غیر شاعرانہ پیشے کے باوجود حیرت ہے کہ اُردو۔ فارسی۔ عربی اور پنجابی کے فاضل اور صاحبِ تصانیف بزرگ تھے۔ لوگ جب اُن کو دکان پر حلوا پوری بیچتے دیکھتے اور آپ کو مسجد میں قرآن اور حدیث کا درس دیتے ہوئے دیکھتے تو تعجب کرتے۔ اور جب آپ کی تصانیف پڑھتے تو حیران ہو جاتے۔ آپ مولانا غلام قادر بھیروی کے شاگرد اور علامہ غلام دستگیر قصوری اور جماعت علی شاہ علی پوری کے مرید تھے۔ والد کا نام محمد وارث تھا۔ ارائیں قوم سے تعلق رکھتے تھے اور لاہور کی اکبری منڈی میں رہتے تھے۔ کوتوالی کے متصل مسجد آپ ہی کی بنوائی ہوئی ہے۔ اور آپ کی قبر بھی اسی مسجد میں ہے۔ آپ پنجابی کے اچھے شاعر اور اُردو کے بڑے ادیب تھے۔ آپ کا بڑا مذہبی کارنامہ تفسیر محمدی ہے جو پندرہ مبسوط جلدوں میں قرآن پاک کی منظوم تفسیر ہے اور پنجابی زبان میں لکھی گئی ہے۔ پنجابی میں اس بلند پایہ تفسیر کے علاوہ آپ نے اُردو نثر میں جو کتابیں تحریر فرمائیں اُن کے نام یہ ہیں۔ یہ سب کی سب خالص مذہبی اور دینی مسائل کے متعلق ہیں اور اہم مباحث پر مشتمل ہیں۔

(۱) النار الحامیہ لمن ذمّ المعاویہ رضؓ (۲) سبیل الرشاد فی حق الاستاد

(۳) تحصیل العرفان فی آداب المشائخ والاخوان (۴) اطلاع الناس فی طلاق الثلاث

(۵) احسان الاموات فی الصدقات والاسقاط (۶) جامع الشواہد
(۷) اظہار انکار المنکرین۔

قریباً ایک سو برس کی عمر میں آپ نے ۱۴ ذی قعدہ ۱۳۶۴ھ (۱۹۴۵ء) کو وفات پائی۔

مولوی نجم الدین آپ سیوہارہ (ضلع بجنور) کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوئے۔ عربی اور فارسی کے اچھے عالم تھے۔ مدرسہ دیوبند کے سند یافتہ تھے۔ بیسویں صدی کے شروع میں کئی برس تک سید ممتاز علی صاحب مرحوم کے مطبع رفاہ عام میں ملازم رہے۔ سیرۃ الشافعی اور رسوم جاہلیت آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔ شاعر بھی بہت اچھے تھے۔ (خمخانہ جاوید جلد دوم صـ۱۷۰)

مولوی سید ممتاز علی کی نہایت مشہور و معروف کتاب تفصیل البیان فی مقاصد القرآن کی تالیف و تدوین میں آپکا زبردست ہاتھ تھا۔ ۱۹۲۳ء کے قریب وفات پائی۔

نشتر سردار عبدالرب نشتر کو لوگ شاعر کے طور پہ کم اور سیاسی رہنما کی حیثیت سے زیادہ جانتے ہیں۔ ۱۳ جون ۱۸۹۹ء کو پشاور میں پیدا ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے گریجویٹ ہوئے۔ مسلم یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ اور پریکٹس کے ساتھ تحریک خلافت میں بھی سرگرم حصہ لینا شروع کیا۔ کانگرس میں بھی شامل رہے۔ اور زمانہ کی قید بھی بھگتی۔ پھر کانگرس کی مسلم کش پالیسی سے متنفر ہو کر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۴۹ء میں پنجاب کے گورنر مقرر ہوئے۔ پاکستان کے چوٹی کے رہنماؤں میں شمار ہوتے تھے۔ فارسی۔ اردو۔ پشتو اور انگریزی میں نہایت فصاحت کے ساتھ تقریر کر سکتے تھے۔ مذاق سخن نہایت صاف ستھرا تھا۔ فن شعر میں اکبر الٰہ آبادی سے تلمذ تھا۔ انتقال کی تاریخ ۱۴ فروری ۱۹۵۸ء ہے۔

مولانا خواجہ نور بخش گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر اور انجمن نعمانیہ کے "ناظم التعلیم" تھے۔ علی گڑھ سے ایم۔ اے پاس کیا تھا۔ اور بڑی ٹھوس قابلیت کے مالک تھے ۱۸۷۲ء میں موضع چک قاضیاں (ضلع لدھیانہ) میں پیدا ہوئے اور ۲۴ مارچ ۱۹۴۸ء کو لائل پور میں وفات پائی۔ تصنیفات یہ ہیں۔ تذکرہ مشائخ نقشبندیہ۔ حلیۃ النبیؐ۔ معجزات النبیؐ۔ غزوات النبیؐ۔ شرح قصیدہ بردہ۔ شرح ہدیہ یوسفیہ۔ اقوال الصبحہ۔ کتاب البرزخ۔ مقدمہ تفسیر القرآن۔ تفسیر سورہ بقرہ۔ صدائے حقانی در حقیقت محبوب سبحانی وغیرہ۔

سید غلام بھیک نیرنگ آپ انبالہ کے مشہور و معروف قومی کارکن بہت اچھے شاعر اور اعلیٰ درجہ کے ادیب تھے۔ ۱۹۰۹ء سے ۱۹۲۰ء تک انبالہ میں سرکاری وکیل بھی رہے اور بہت سی تعلیمی اصلاحی اور اسلامی انجمنوں کے صدر اور سکرٹری کے فرائض بھی انھوں نے انجام دیئے۔ بہت اچھا علمی مذاق رکھتے تھے۔ مذہب کا بھی آپکے دل میں خاصا ذوق تھا۔ چنانچہ تبلیغ اسلام کے نام سے ایک انجمن بھی قائم کی تھی۔ آپ کا شمار پنجاب کے شاعروں کے اُس گروہ سے ہوتا ہے جو مولانا حالی کے بعد سرسید سے متأثر ہوئے اور جنھوں نے اردو شاعری میں زندگی کے مسائل کو شامل کیا۔ آخر عمر میں لاہور چلے آئے تھے اور یہیں ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو وفات پا کر میانی صاحب کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ آپ کی نظموں کے مجموعے کلام نیرنگ اور غبار افق کے نام سے چھپ چکے ہیں۔

مولوی وجاہت حسین وجاہت جھنجھانوی آپ کا آبائی وطن جھنجھانہ (یو۔ پی) تھا مگر آپ کی والدہ کوچہ چھوبیاں (اندرون بھاٹی گیٹ) لاہور کی رہنے والی تھیں اور آپ یہیں ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کو شعروشاعری کا شوق اور مضمون نگاری کا ذوق بچپن سے تھا۔ شاعری میں آپ داغ کے شاگرد تھے۔ مضمون نگاری آپ نے ۱۶ سال کی عمر میں شروع کر دی تھی۔ ۱۸۹۹ء میں آپ کی پہلی کتاب فتوحِ عبدالحمید خاں شائع ہوئی جس میں جنگ روم و یونان کے حالات تھے۔ مختلف جگہ ملازمت کرنے کے بعد آپ ۳ مئی ۱۹۰۳ء کو مستقل طور پر لاہور آ گئے اور مولوی سید ممتاز علی صاحب کے اخبار تالیف و اشاعت کے مدیر مقرر ہو گئے۔ ۱۹۰۵ء میں آپ نے فصیح الملک نام ایک ماہوار رسالہ نکالا جس میں غزلیں اور نظمیں ہوتی تھیں۔ ۱۹۰۷ء میں اصلاحِ سخن جاری کیا۔ جو خالص ادبی پرچہ تھا۔ اقبال بھی اس میں اپنا کلام بھیجا کرتے تھے۔ اکتوبر ۱۹۱۱ء میں روزانہ زمیندار کے اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے اور آخر عمر تک اسی عہدے پر کام کرتے رہے۔ آپ کی مصنّفہ کتابوں میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔ قومی ماتم (مرثیہ جات سرسید) اختلاف اللسان۔ سفر نامہ بمبئی۔ اور نظم وجاہت جو آپ کی نظموں کا مجموعہ تھا اور جس کو آزادیٔ خیال کے باعث گورنمنٹ نے ضبط بھی کر لیا تھا۔ آپ کے انتقال کی تاریخ معلوم نہیں ہو سکی۔

کرنیل ہالرائڈ محکمہ تعلیم پنجاب میں شروع سے اب تک جس قدر ڈائرکٹر آئے اُن میں اُردو کی سرپرستی حمایت اور امداد کے لحاظ سے کرنیل ہالرائڈ کا نام غالباً سب سے زیادہ مشہور اور سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ یہ صاحب ۱۸۶۹ء سے ۱۸۹۰ء تک ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب رہے۔ ان کا نام اس لحاظ سے تاریخ ادبِ اُردو میں ہمیشہ یادگار رہے گا کہ اُردو کی جدید اخلاقی۔ اصلاحی اور نیچرل شاعری کا سنگِ بنیاد آپ ہی کے عہد میں۔ آپ ہی کی امداد سے اور آپ ہی کی زیرِ سرپرستی رکھا گیا۔ جس پر بعد میں قصرِ اُردو کی عظیم الشان عمارت تیار کی گئی۔ اس جدید اور سربفلک عمارت کے اوّلین معمار حضرت شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالیؔ اور شمس العلماء مولوی محمد حسین آزادؔ تھے۔ اور کرنیل ہالرائڈ کی مرضی و ایما سے اور ان کی سرپرستی اور انتظام کے ماتحت اس عمارت کی تعمیر شروع ہوئی۔ چنانچہ حضرت شمس العلماء مولانا حالیؔ مجموعہ نظم حالی کے دیباچہ کے شروع میں فرماتے ہیں:

> "۱۸۷۴ء میں جبکہ راقم پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو سے متعلق اور لاہور میں مقیم تھا مولوی محمد حسین آزاد کی تحریک اور کرنیل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب کی تائید سے انجمن پنجاب نے ایک مشاعرہ قائم کیا جو کہ مہینے میں ایک بار انجمن کے مکان میں منعقد ہوتا تھا۔ اس مشاعرہ کا مقصد یہ تھا کہ ایشیائی شاعری جو کہ دربست عشق اور مبالغہ کی جاگیر ہو گئی ہے اُس کو جہاں تک ممکن ہو وسعت دی جائے اور اس کی بنیاد حقائق اور واقعات پر رکھی جائے۔"

مولانا نے حسبِ عادت ازراہِ انکسار یہاں اپنا نام نہیں لکھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ ہی اس مشاعرہ کی روحِ رواں اور جدید اُردو شاعری کے مجدّدِ اعظم تھے۔

کرنیل ہالرائڈ کا عہد اس لحاظ سے بھی خاص طور پر بڑا اہم ہے کہ اُن کے زمانہ میں بہت سی کتابیں طلباء مدارس کے لیے

انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کی گئیں اور اُردو زبان کو تراجم کے لحاظ سے بڑی زبردست وسعت حاصل ہوئی۔ انہی کے عہد میں اور انہی کے ماتحت رہ کر مولوی محمد حسین آزاد نے نثر میں شاعری کی اور حضرت مولانا حالی نے شاعری میں اخلاق و موعظت کی بنیاد رکھی۔ یعنی نثر اور نظم کے یہ دونوں مجدد کرنیل ہالرائڈ ہی کے زمانہ میں ہوئے اس لحاظ سے ان کا عہد اُردو کی ترقی کے لیے بڑا مبارک ثابت ہوا اور اس لحاظ سے بلاشبہ کرنیل ہالرائڈ کا نام اُردو کے سرپرستوں اور حامیوں کی صف اوّل میں لیا جا سکتا ہے اور اسی مناسبت سے اس تذکرہ میں ان کا ذکرہ کیا گیا ہے۔

کرنیل ہالرائڈ کا عہد اس لحاظ سے اُردو زبان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا کہ آن کے زمانہ میں طلبا کیلیے بکثرت کتابیں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ ہوئیں۔ ان کتابوں کی زبان کو درست کرنے کے لیے کرنیل ہالرائڈ نے مولوی محمد حسین آزاد اور حضرت مولانا حالی جیسے یگانہ روزگار فاضلوں کو مقرر کیا تھا۔ چنانچہ سرسید اپنی تقریر میں جو انھوں نے ۱۸۸۴ء میں لاہور میں کی تھی فرماتے ہیں :

> "میرے نزدیک نہ صرف پنجاب میں بلکہ شمال و مغربی اضلاع اور اودھ کو بھی کرنیل ہالرائڈ صاحب کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ اُنھوں نے جس قدر کتابیں چھاپی ہیں میں اُن کے ایک ایک فقرہ کی تعریف کرتا ہوں۔ اُنھوں نے بڑا کام کیا ہے مگر جانتے ہو اُس کے کرنے والے کون ہیں؟ وہی ٹی والے (آزاد اور حالی) اگر تلوار ایک اناڑی کے ہاتھ میں ہو تو کچھ کام نہیں کرتی۔ یہ ہالرائڈ صاحب کے ہاتھ میں تھی جنھوں نے اُس سے اچھے اچھے کام لیے۔" (اخبار رسمر مور گزٹ ناہن مورخہ ۳۰ جنوری ۱۸۸۹ء صفحہ ۷، کالم ۲)

منشی ہرسکھ رائے یہ صاحب ذات کے بھٹ نگری کائستھ اور سکندر آباد ضلع بلند شہر (یو۔پی) کے رہنے والے تھے (تاریخ صحافت اردو میں غلط لکھا ہے کہ سکندر آباد مضافات دہلی میں واقع ہے دیکھو جامع اللغات تختی حرف س) جوان ہو کر یہ صاحب لاہور چلے آئے اور یہاں سے جنوری ۱۸۵۰ء میں کوہ نور کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار نکالا۔ جو لاہور کا سب سے پہلا اخبار تھا اور بعد کے زمانہ میں اس کو زبردست شہرت حاصل ہوئی۔ مہاراجہ کشمیر منشی ہرسکھ رائے کی اخبار کا مالک اور ایڈیٹر ہونے کی وجہ سے بڑی عزت اور آؤ بھگت کرتا تھا۔ اور جب یہ ریاست میں جایا کرتے تھے تو سرحد پر مہاراجہ کا ہاتھی انھیں لینے آیا کرتا تھا۔ اور منشی صاحب بڑے ٹھاٹھ سے بطور شاہی مہمان وہاں قیام کرتے تھے۔ واپسی پر خلعت اور گیارہ سو روپے رخصتانہ انھیں مہاراجہ کی طرف سے ملا کرتا تھا۔ منشی صاحب لاہور میں بھی بڑی شان سے رہا کرتے تھے۔ ان کے اخبار کوہ نور کی اس قدر عزت تھی کہ اُس وقت کے بڑے بڑے نامور اور مشہور ادیب اس کے ایڈیٹر رہے ہیں۔ منشی صاحب نے ۲ ستمبر ۱۸۹۰ء کو انتقال کیا۔ مگر کوہ نور بعد میں بھی جاری رہا اور ۱۹۰۴ء میں بند ہوا اس کے آخری ایڈیٹر مولوی محمد الدین فوق تھے۔ (یہ حالات میرے محترم دوست مولوی عبداللہ صاحب قریشی بی۔اے نے وکٹوریہ ہیپر سیالکوٹ کے ایک پرانے پرچے سے نقل کر کے مرحمت فرمائے ہیں)

ہمایوں : جسٹس میاں محمد شاہ دین ہائی کورٹ لاہور کے چیف جج ہونے کے علاوہ نہایت پاکیزہ ادبی ذوق رکھتے تھے۔

ہمایوں تخلص کرتے تھے اور اعلیٰ پائے کی اخلاقی اور اصلاحی نظمیں تصنیف کرتے تھے۔ اُردو اور انگریزی میں بہت فصیح و بلیغ تقریر بھی کر سکتے تھے۔ بلند اخلاق کے مالک اور پاکیزہ سیرت کے حامل تھے۔ سر سید احمد خاں کے نہایت زبردست حامیوں اور مددگاروں میں سے تھے۔ آپ کی زندگی ہمہ تن عمل تھی اور اصلاح قوم کے لیے وقف۔ مطالعہ آپ کا نہایت محبوب مشغلہ تھا۔ ۲ اپریل ۱۸۶۹ء کو باغبان پورہ میں پیدا ہوئے اور ۲ جولائی ۱۹۱۸ء کو انتقال کیا۔ جذبات ہمایوں آپ کی نظموں کا مجموعہ ہے آپ کے نہایت لائق اور قابل فرزند میاں بشیر احمد صاحب بیرسٹر ایٹ لا نے اپنے محترم والد کی یادگار میں ایک رسالہ ہمایوں کے نام سے جاری کیا۔ جس نے عرصہ دراز تک ادب۔ علم اور زبان کی نہایت قابل قدر خدمت انجام دی ہے۔ جب یہ ماہنامہ مکرمی و محترمی حامد علی خاں صاحب کی ادارت میں شائع ہوتا تھا تو سارے پنجاب میں ایک بھی پرچہ اس کے مقابلہ کا نہ تھا۔ یہ اعلیٰ پایہ کا رسالہ میاں بشیر احمد صاحب نے جنوری ۱۹۲۲ء میں جاری کیا تھا اور جنوری ۱۹۵۷ء تک یہ رسالہ جاری رہا۔

شیخ یعقوب علی یہ صاحب بہت عرصہ تک منشی محبوب عالم کے پیسہ اخبار میں بحیثیت نائب اڈیٹر کام کرتے رہے پھر امرتسر چلے گئے۔ اور وہاں سے ۸ راکتوبر ۱۸۹۷ء کو ایک ہفتہ وار اخبار الحکم کے نام سے جاری کیا۔ بہت سی اسلامی اور دینی کتابوں کے مصنف اور بہت اچھے شاعر تھے۔ پہلے تراب تخلص کرتے تھے۔ پھر عرفانی لکھنے لگے۔ یورپ کا سفر بھی کیا اور اپنا نہایت دلچسپ سفر نامہ "مشاہدات عرفانی" کے نام سے شائع کیا۔ اپریل ۱۹۳۲ء میں حیدر آباد دکن چلے گئے اور وہیں ۵ ر دسمبر ۱۹۵۷ء کو انتقال کیا۔ اُن کے لڑکے کراچی میں شہباز اور نونہال دو رسالوں کے اڈیٹر ہیں۔ عرفانی صاحب کی تحریر بہت پُر اثر اور دلچسپ ہوتی تھی۔ اُن کی بعض کتابوں کے نام یہ ہیں۔ اسماء الحسنیٰ حقیقت نماز۔ کتاب الادب احکام القرآن رحمۃ اللعالمین فی کتاب مبین۔ تاریخ القرآن۔ کتاب الاخلاق۔ اسماء القرآن فی القرآن۔ قرآنی دعاؤں کے اسرار البیان فی اسلوب القرآن۔ اعجاز القرآن ما یثبت القرآن۔ کتاب الزکوٰۃ۔ کتاب الحج۔ کتاب الصیام وغیرہ۔

شیخ محمد احمد پانی پتی (بیٹے کی سرگذشت باپ کی زبانی) میں نے بڑے شوق۔ نہایت تلاش اور بے حد کاوش کے بعد اپنے محترم دوست طفیل صاحب مدیر نقوش کی فرمائش پر لاہور کے مرحوم ادیبوں اور انشا پردازوں کا تذکرہ لکھا۔ مگر مجھ بدبخت اور بدنصیب کو کیا پتہ تھا کہ مجھے اپنے لخت جگر اور نور بصر محمد احمد کو بھی اس تذکرہ کی بھینٹ چڑھانا ہوگا جو اس تذکرہ کی ترتیب کے وقت زندہ سلامت اور بالکل نوجوان تھا۔ اور جس کے متعلق وہم بھی نہیں تھا کہ اس کی زندگی کا چراغ اس قدر جلد گل ہو جائے گا۔ اُس کی عمر صرف ۳۲ برس کی ہوئی مگر اس قلیل عرصہ میں اُس نے ادب۔ علم اور اسلام کی اس قدر کثیر خدمت کی کہ میں نے اپنی ۷۰ برس کی عمر میں اس کا دسواں حصّہ بھی نہیں کیا۔ وہ تقسیم ملک کے وقت ۵ ر نومبر ۱۹۴۷ء کو پانی پت سے لاہور پہنچا۔ اور ۹ ر جنوری ۱۹۶۲ء کی صبح کو میو ہسپتال لاہور میں ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا۔ وہ عربی زبان کا مشہور مترجم۔ بہترین ادیب اور بہت اعلیٰ درجہ کا انشا پرداز تھا۔ اُس کے قلم میں بڑی سلاست اور روانی تھی۔ اُس کے ترجمے نہایت فصیح و بلیغ ہوتے تھے۔ مترجمہ کتابوں پر عالمانہ اور محققانہ حواشی اور نوٹ لکھنے میں وہ اپنا نظیر نہ رکھتا تھا۔ ادبی۔ علمی سوانحی اور تاریخی اسلامی لٹریچر کا جو پاکیزہ ذخیرہ اُس نے یادگار چھوڑا ہے۔ وہ اُردو ادب میں ایک شاندار اضافہ ہے۔ مصر و شام اور لبنان کے مشہور و معروف اور چوٹی کے ادیبوں اور انشا پردازوں کی جن بہترین کتابوں کا اُس نے عربی سے اُردو میں ترجمہ کیا

اُن کے نام یہ ہیں :-

۱- نبی امی ۔ ۲- سید العرب ۔ ۳- خلفائے محمدؐ ۔ ۴- ابوبکر صدیق اکبرؓ ۔ ۵- خدیجہؓ ۔ ۶- عائشہؓ ۔ ۷- الزہراؓ ۔ ۸- الحسینؓ ۔ ۹- سوانح حیات حضرت بلالؓ ۔ ۱۰- خالدؓ سیف اللہ ۔ ۱۱- خالدؓ اور اُن کی شخصیت ۔ ۱۲- عمروؓ بن العاص ۔ ۱۳- فاتح مصر ۱۴- معاویہؓ ۔ ۱۵- الشیخانؓ ۔ ۱۶- آل محمدؐ کربلا میں ۔ ۱۷- علیؓ اور عائشہؓ ۔ ۱۸- المامون ۔ ۱۹- سلطان محمد فاتح ۔ ۲۰- عہد نبوی کی اسلامی سیاست ۔ ۲۱- اسلام کا نظام عدل ۔ ۲۲- جغرافیہ تاریخ اسلام ۔ ۲۳- اشک پیہم ۔ ۲۴- تاریخ ادب العربی ۔ ۲۵- اُس نے تمام قدیم سیر رجال کی عربی کتابوں سے اخذ و انتخاب کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے ۳۱۵ صحابہ کا مبسوط تذکرہ "غلامانِ محمدؐ" کے نام سے لکھا جو دنیا کی ظاہری نظر میں غلام تھے ۔ ۲۶- بچوں کے لیے جو "قاعدہ تعلیم القرآن" اُس نے لکھا وہ اپنی نظیر آپ ہے ۔ ۲۷- طلباؔ کے لیے "سیرۃ النبیؐ" نہایت آسان زبان میں لکھی ۔ ۲۸- مولانا حالی کے عربی خطوط کا ترجمہ کیا ۔ ۲۹- کتاب کلیلہ دمنہ کی تاریخ عربی سے ترجمہ کی ۔ ۳۰- محمد خضری کی مشہور عربی تاریخ سے ہارون الرشید کے سوانحی حالات ترجمہ کئے ۔ ۳۱- عبداللطیف شرارہ کی عربی کتاب حجاج بن یوسف کا ترجمہ شروع کیا ۔ ان کے علاوہ بہت سے نفیس اور اعلیٰ پایہ کے ادبی تحقیقی اور تاریخی و اسلامی مضامین مخزن نقوش ۔ صحیفہ ۔ قندیل ۔ لاہور ۔ زیب النساءؔ ۔ تشحیذ الاذہان ۔ خالد ۔ الفضل ۔ امروز اور لیل و نہار میں لکھے ۔ اس کی زندگی خالص طالبعلمانہ تھی اور اُس نے اپنی ساری عمر نہایت خاموشی کے ساتھ ادب کی خدمت میں گذار دی ۔ اور کسی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا ۔ نہ کبھی کسی کھیل تماشے میں شریک ہوا ۔ نہ لاہور میں رہتے ہوئے کبھی کوئی سینما دیکھا ۔ دن رات لکھنے پڑھنے اور تصنیف و تالیف سے کام تھا ۔ اور آخری وقت تک اس مشغلہ میں مشغول رہا ۔ ذاتی طور پر نہایت نیک ۔ صالح ۔ کم گو ۔ شریف طبیعت ۔ مہمان نواز اور ہمدرد نوجوان تھا ۔ دوستوں سے نہایت اخلاص سے ملتا اور ملنے والوں سے نہایت اخلاق سے پیش آتا کبھی اُس نے زبان یا ہاتھ یا قلم سے کسی کو تکلیف نہیں دی غرض ؎

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

مرحوم کو سانس کی تکلیف عرصہ سے تھی اور اس کے دورے مہینہ مہینہ دو دو مہینے بعد پڑتے تھے ۔ آخری دورہ اتنا شدید ہوا کہ اُس کو مجبوراً رات کے دس بجے میو ہسپتال میں داخل کرانا پڑا ۔ وہاں ڈاکٹروں نے اس کے علاج میں انتہائی کوشش کی مگر تقدیر کے آگے تدبیر ہمیشہ ناکام رہی ہے ۔ ؎

دلِ مجبور! راضی ہو رضا پہ
تیرا چاہا ۔ نہیں چاہا خدا نے

غمگین و پژمردہ اسماعیل پانی پتی

مورّخین لاہور

کسریٰ منہاس

ایک فلسفی کا قول ہے کہ تاریخ کا دوسرا نام ثقافت ہے۔ اس قول کی روشنی میں مورخین کا رتبہ ثقافت کے محافظوں کا سا ہو جاتا ہے۔ تہذیبیں پیدا ہوتی رہی ہیں، پروان چڑھتی رہی ہیں۔ اور مٹتی رہی ہیں۔ لیکن تاریخ میں ان کا نقش موجود ہے۔ لاہور ایک قدیم و عظیم شہر ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں اسے ایک اہم مقام حاصل رہا ہے۔ اس سرزمین نے انقلابات کے عجیب عجیب نظارے دیکھے ہیں۔ اور بڑے بڑے نامی گرامی مشاہیر جو اپنے فن اور علم میں یگانۂ روزگار تھے۔ یہاں پیدا ہوئے ہیں۔ جن کا مکمل اور مفصل تذکرہ اگر مرتب کیا جائے تو بلا مبالغہ کئی ضخیم جلدیں تیار ہو جائیں۔

تاریخ کا فلسفہ یہ ہے کہ ہر مورخ آنے والے مورخین کے لیے مواد مہیا کرتا ہے۔ اس اعتبار سے جن مصنفین نے عام اس سے کہ وہ شاعر ہوں، یا تذکرہ نگار یا تاریخ نویس۔ تاریخ لاہور لکھنے میں مدد کی ہے۔ ان کا مورخین لاہور پر بڑا احسان ہے۔ ہمیں ایک اشارہ کہیں سے اور ایک کہیں سے دستیاب ہوتا ہے۔ اور جب ان کو اکٹھا کیا جاتا ہے تو شہر لاہور کی پوری تاریخ ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ اس لحاظ سے ہم ان تمام مصنفین کو مورخینِ لاہور ہی میں شمار کریں گے۔ خواہ انھوں نے کوئی مستند تاریخ نہ لکھی ہو۔ اور صرف اپنے تذکروں، سفرناموں، روزنامچوں یا اشعار ہی میں اس شہر یا اس کے کسی واقعہ کا ذکر کیا ہو۔ اس شہر کی تاریخ سے متعلق جابجا مختلف کتابوں میں اتنے اشارے پائے جاتے ہیں کہ اگر کوئی محقق ان کو یکجا کرے تو بہت سے نئے نتائج برآمد ہوں گے۔ مثال کے طور پر لاہور کو تاریخ میں بیسیوں ناموں سے پکارا گیا ہے۔ الاہور۔ لہور۔ لوہاور۔ لوہور۔ لہانور۔ لوہاوور۔ لہاوور۔ لوہور۔ لہاور۔ لاہنور۔ لہاوار اور لاہور۔ یہ سب نام مختلف کتابوں، تذکروں اور شعرائے کرام کے کلام میں ملتے ہیں۔ جن سے مورخین لاہور کی ایک طویل فہرست ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

اس مضمون کا مقصد چند مورخین لاہور کی تصانیف اور حالاتِ زندگی کا قارئین کرام سے تعارف کرانا ہے۔ اس سے کم و بیش جو کچھ بھی کہا جا سکتا ہے۔ وہ ہمارے مضمون کی حدود سے خارج ہے۔ چنانچہ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ کس مورخ نے اپنی تصنیف میں کون کونسی غلطیاں کی ہیں۔ نہ ہم یہ گننا چاہتے ہیں کہ کس مورخ نے اپنا مواد کہاں سے حاصل کیا۔ اور حاصل کرنے کے بعد حوالہ تک نہ دیا۔ بعض مورخین نے سنین میں غلطیاں کی ہیں۔ ہم نے ان پر بھی قلم اٹھانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ بعض نے اپنی تحقیقات تاریخ کے مستند حقائق سے چشم پوشی کر کے برآمد کی ہیں۔ مثلاً کوئی عمارت یا کوئی مقبرہ جس کے وجود پر بیشتر مورخین متفق چلے آرہے ہیں۔ ان محققین نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ کوئی حقیقی وجود نہیں رکھتا۔ محض روایت کی بنا پر تاریخوں میں آگیا ہے۔ مگر ہم نے ان محققین سے نہ اتفاق کیا ہے نہ اختلاف۔ وہ اس لیے کہ ہمارا زاویۂ نظر اس مضمون میں تحقیقی نہیں بلکہ تعارفی ہے۔

بعض تصانیف ہمارے سامنے نہ آ سکیں۔ جن کی اس موقع پر ضرورت تھی۔ کچھ مورخین لاہور جن کا تاریخ لاہور پر بڑا احسان ہے۔ ان کے سوانح حیات دستیاب نہ ہو سکے۔ اس لیے ایسے بزرگانِ کرام کے حالات بوجہ مجبوری مرتب نہ ہو سکے۔ البتہ مضمون کے آخر میں ایک فہرست ان کتب اور ان مصنفین کی دے دی ہے۔ جنھوں نے لاہور کی تاریخ کے متعلق خدمات انجام دی ہیں۔ اور لاہور کی تاریخ کا مواد فراہم کیا ہے۔

مورخین لاہور کی طویل فہرست میں سے ہم نے سولہ مورخین کو نمائندہ قرار دیا ہے۔ ان میں کچھ مغلیہ دورِ حکومت کے نمائندے ہیں کچھ انگریزی دورِ حکومت کے نمائندے ہیں اور کچھ پاکستانی ہیں۔ ہم نے ان کی تصانیف اور مختصر سوانح حیات کا تعارف اس نقطہ نظر سے پیش کیا ہے کہ اسلامی۔ انگریزی اور پاکستانی دورِ حکومت میں لاہور کے مورخین کے کام کا اندازہ ہو سکے۔ یہ سوانحی کوائف مستند اور معتبر کتب سے پوری کد و کاوش سے اخذ و انتخاب کر کے پیش کیے گئے ہیں۔ مندرجہ ذیل تذکرہ میں بیشتر اصحاب تو ایسے ہیں جن کا وطن لاہور تھا۔ دو ایک ایسے بھی حضرات ہیں جو عرصہ دراز تک لاہور ہی میں مقیم رہے۔ اور اس لحاظ سے وہ "لاہوری" کہلانے کے مستحق ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ دو ایک ایسے بھی اشخاص ہیں جنھوں نے لاہور کے متعلق کتابیں تحریر فرمائی ہیں۔ مگر وہ لاہور کے رہنے والے نہ تھے۔

ملا عبدالحمید لاہوری (المتوفی ۱۰۶۵ھ / ۱۶۵۵ء)

عبدالحمید کا مولد و مسکن لاہور تھا۔ علامی ابوالفضل سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ محنتِ شاقہ سے مسجع طرزِ انشا میں مہارتِ تامہ حاصل کی لیکن زمانے کی ناسازگاری سے ٹھٹھ[1] میں آ کر گوشہ نشین ہو گیا۔ اس کے ادب و انشا اور دوسرے کمالات کے متعلق جب شاہ جہاں کو خبر ملی تو اُسے دربار میں طلب کر کے "اکبر نامہ" کی طرز پر عہد شاہجہانی کی تاریخ کی تدوین سپرد کی۔

عبدالحمید لاہوری کی انشاپردازی۔ صلاحیت۔ قابلیت۔ فن اور سخن طرازی کے متعلق عمل صالح[2] میں یہ ذکر ملتا ہے :-

"روشِ سخن پیرائی از کلام شیخ ابوالفضل فرا گرفتہ از فیض صحبت آں قدوۂ اہلِ فضل بہرۂ تمام اندوختہ۔ بجاں دستور قلم رانی می کند۔ و در جادۂ سخنوری پی بر پی آں پیش خرام ہنجار نکتہ دانی سے ہند و در فنِ انشا رکامل است و در نکتہ دانی سر آمد اقران و اماثل۔ شاخ قلمش از گلہائے سخن بہرہ ور است و بہر خروش با عصائے خامہ رہ سپر۔ چوں در ایام جوانی ہنجار مراتب علمی در نوردیدہ و فن انشا را بنیک برزیدہ بود اکنوں باوجود پیری در فن سخن طبعش جوان است و در ادراک معنی توانائی تمام دارد۔ اگرچہ از غایت ضعف مشت استخوانی بیش نیست امابقوت خرد بلند بہر دستِ سخن می رسد و بہنگام نگارش مطالب داد عبارت آرائی می دہد حسب الامر خاقان جہاں نواز بجمع و ترتیب بیست سالہ احوال آں حضرت پرداختہ و در ضمن عبارت آں قدرت طبع ارجمند بلطف ادا ہویدا ساختہ۔ در سال ہزار و شصت ہزاری دپنج ہجری بسبب کبر سن و ضعف قویٰ از کار باز ماندہ در ہماں ایام برحمت حق پیوست۔"

---

[1] ایلیٹ ٹھٹھ کی بجائے پٹنہ لکھتا ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی کے مطبوعہ نسخہ میں بھی پٹنہ لکھا ہوا ہے۔ لیکن اورینٹل لائبریری پٹنہ کے فاضل کیٹلاگر نے صاف طور پر بتایا ہے کہ پٹنہ نہیں ہے بلکہ ٹھٹھ ہے۔ پٹنہ کتابت کی غلطی ہے ملاحظہ ہو کیٹلاگ ج ۷ ص ۹۶ (بزم تیموریہ ص ۲۱۶)

[2] عمل صالح جلد سوم صفحہ (۴۲۷) مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور

عبدالحمید لاہوری سے پہلے بادشاہ نامہ کی ترتیب مرزا محمد امین بن ابوالحسن قزوینی کے سپرد تھی۔ قزوینی نے ۱۰۳۷ھ سے ۱۰۴۶ھ تک ده ساله واقعات سپرد قلم کیے ہیں۔ جس میں شاہجہان کی ولادت اور اس کا نسب نامہ جہانگیر سے امیر تیمور تک درج ہے۔ اس تاریخ میں دور اوّل کے دہ سالہ واقعات کے علاوہ مشاہیر عہد کا تذکرہ بھی شامل ہے۔ لیکن شاہجہان کے سی سالہ دورِ حکومت کی مفصّل تاریخ جو بادشاہ کے حکم سے لکھی گئی تھی۔ اس کا نام بھی بادشاہ نامہ ہے۔ یہ تاریخ تین جلدوں میں منقسم ہے۔ جلد اوّل میں ۱۰۳۷ھ سے ۱۰۴۷ھ تک۔ جلد دوم میں ۱۰۴۷ھ سے ۱۰۵۷ھ تک اور جلد سوم میں ۱۰۵۷ھ سے ۱۰۶۷ھ تک کے حالات نہایت تفصیل سے درج ہیں۔ پہلی دو جلدیں ملا عبدالحمید لاہوری کے اور تیسری جلد محمد وارث[1] کے ہاتھوں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

ملا عبدالحمید لاہوری چونکہ علامہ ابوالفضل کا شاگرد تھا۔ اس لیے اس کی عبارت آرائی میں علامہ موصوف کی تحریر کا رنگ جھلکتا ہے۔ اس کے ادب و انشاء کے اکثر نمونے ابوالفضل کی تحریر کے سانچے میں ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ وہی تشبیہیں، وہی استعارے، وہی مجاز، وہی مبالغہ، وہی پیچیدہ بیانی۔ لیکن اس کی مہارت اور مشق کا یہ عالم ہے کہ کہیں بیان کو ناہموار نہیں ہونے دیا۔ خیالات کو نہایت صفائی سے پیش کیا۔ دقیق معانی کو کچھ اس صفائی اور پختگی سے تحریر کیا ہے کہ اس کی استادی اور ہنرمندی کا لوہا ماننا پڑتا ہے۔ لیکن ابوالفضل کی تحریر میں شوکتِ الفاظ کا جو معیار قائم کیا گیا ہے۔ یہ تصنیف اس کے مقابلے میں پیش نہیں کی جا سکتی۔ مگر اس کی قدر و قیمت کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بقول صاحب عمل صالح شاہجہان اس کے خدمات سے اس قدر خوش تھا کہ اس نے اس کو دو مرتبہ روپے میں تلوا کر انعام دیا۔ یہ کتاب ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔ پہلی جلد ۱۸۶۷ء اور دوسری جلد ۱۸۶۸ء میں طبع ہوئی ہے۔

ملا عبدالحمید لاہوری کا بادشاہ نامہ ایک طرح کا شاہجہانی دور کا روزنامچہ ہے۔ ابتدا میں ابوالفضل کے انداز میں شاہجہان کا یومیہ پروگرام دیا ہوا ہے۔ جس سے دو باتیں خاص طور پر واضح ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ مغل بادشاہ کتنی مصروف زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ سفر میں ہوں یا حضر میں۔ ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ مصروفیت اور خدمتِ رعایا میں بسر ہوتا تھا۔ اس باب کی زبان پر ابوالفضل کے اندازِ بیان کا دھوکا ہوتا ہے۔ دوسرے بادشاہ نامے میں جابجا شاہی عمارات اور باغات کے بارے میں اہم تفصیلات ملتی ہیں۔ شاہجہان نے لاہور میں شالامار باغ بنوایا۔ باغ کی ساخت اس کے تختوں کی تقسیم۔ اس کی عمارات اور چمن آرائی کے بارے میں ایک نہایت مفصل اور واضح بیان ہے۔ جس سے اس باغ کی عظمت اور مغل باغات کی خصوصیات پیکرِ تصویر بن کر ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔

اس کے علاوہ ملا حمید نے شاہی قلعہ کی بعض عمارات کا ذکر بھی بڑے مزے لے لے کر بیان کیا ہے اور جو قلعے میں ترمیم و تنسیخ ہوتی رہی ہے اسے بھی زبانِ قلم سے بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ اس دور میں کچھ خانقاہیں اور مسجدیں بھی تعمیر ہوئیں جن کی تفصیل بادشاہ نامہ میں ملتی ہے۔

---

[1] ملا عبدالحمید جب ضعفِ پیری کے سبب آخری دہ سالہ واقعات لکھنے سے مجبور ہو گیا تو بادشاہ نے محمد وارث کو یہ سلسلہ جاری رکھنے کی ہدایت کی۔ محمد وارث کو وارث خاں کے لقب سے سرفراز کیا۔ اس نے دورِ سوم کے واقعات بڑی محنت اور قابلیت سے لکھے۔ جو بادشاہ نامہ کی تیسری جلد کے نام سے موسوم ہیں۔ یہ حصہ نواب سعداللہ خاں علامی اور علاء الملک تونی المخاطب بہ فاضل خاں کی اصلاح سے مزین ہے۔ وارث خاں نہایت ذہین اور فکر رسا رکھتا تھا۔ خط، علمی اور انشا میں اس کا شمار مشاہیر وقت میں ہوتا تھا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے عہدِ حکومت میں، ربیع الاوّل ۱۰۹۱ھ کو ایک طالب علم نے قلمتراش سے زخمی کر کے اس کو مار ڈالا۔ (مآثر عالمگیری ص ۱۹۲)

بادشاہ نامہ کا ایک اور دلچسپ حصہ کشمیر کے بارے میں ہے۔ شاہ جہان جب پہلی مرتبہ کشمیر گیا۔ اس نے وہاں جو کچھ دیکھا اور جو کچھ کیا، وہ سب بادشاہ نامے میں محفوظ ہے۔ مگر اس باب میں بھی سب سے دلکش حصہ کشمیری باغات کے متعلق ہے۔ ان کے باغات کے متعلق ملا عبدالحمید نے جزویات تک بیان کی ہیں۔ اس سلسلے میں وہ یہاں تک لکھ دیتا ہے کہ ایک درخت پر اتنے پھول ہیں۔ اسی طرح کابل کے باغات وہاں کی سیرگاہوں کا تذکرہ بھی بادشاہ نامے میں محفوظ ہے۔ بابر کے مزار کے بارے میں جتنا واضح بیان بادشاہ نامہ میں ملتا ہے۔ ایسا کسی اور تاریخ میں ہمیں دستیاب نہیں ہوتا۔

مغل حکومت ایک مہذب، ترقی یافتہ اور ادب نواز حکومت تھی، مختلف اوقات میں بادشاہ نے جن علماء و شعرا کی قدر دانی کی۔ ملا صاحب نے ان کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس کے آخر میں علما، صلحا، شعرا اور حکما کا ایک مختصر سا خاکہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ یہ بادشاہنامہ نہ صرف تاریخی واقعات کی کھتونی ہے۔ بلکہ وہ ایک ایسی تاریخ ہے۔ جس کی مدد سے ہم ایک ایسی تاریخ مرتب کر سکتے ہیں جو اس ملک کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہے اور یہ ایک بڑا اور شاندار علمی کارنامہ ہے۔

بادشاہ نامہ کی تلخیص "ملخص" کے نام سے کی گئی۔ ملخص کی ترتیب محمد طاہر آشنا المخاطب بہ عنایت خان نے کی ہے۔ یہ تاریخ ہر سہ بادشاہ نامہ (قزوینی، عبدالحمید لاہوری اور وارث) کی تلخیص ہے۔ اور اسی لیے اس کا نام ملخص رکھا گیا ہے۔ ملا طاہر آشنا نے پیچیدہ انداز بیان کی جگہ سادہ اسلوب نگارش اختیار کیا ہے۔ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مطلب بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور بادشاہ نامہ کو امکانی حد تک سہل بنا دیا ہے۔

ملا عبدالحمید کا بیان ہے کہ ہفتم ربیع الاول ۱۰۵۱ھ / ۱۶۴۱ء کو اسے سونے سے تولا گیا جس کی قیمت تین ہزار روپیہ بنی چہارم ذی الحجہ ۱۰۵۴ھ / ۱۶۴۵ء کو بادشاہ نے اسے ایک ہتھنی عطا کی۔ ۱۰۵۷ھ / ۱۶۴۷ء میں وہ بادشاہ کے ہمراہ لاہور آیا اور جشن نوروز کے موقعہ پر اسے چار ہزار روپے انعام ملے (بادشاہ نامہ جلد دوم)

شاہزادہ داراشکوہ (المتوفی ۱۰۶۹ھ / ۱۶۵۸ء)

داراشکوہ شاہنشاہ ہند شاہجہان کا فرزند تھا۔ ۲۹ صفر ۱۰۲۴ھ مطابق ۲۰ مارچ ۱۶۱۵ء کو اجمیر میں پیدا ہوا۔ بہترین اساتذہ وقت اس کی تعلیم و تربیت کے لیے مقرر کئے گئے جن میں مولانا عبداللطیف سلطان پوری، ملا میرک اور شیخ ہروی کے نام ملا عبدالحمید لاہوری نے بادشاہ نامہ میں بھی لکھے ہیں خطاطی کی تعلیم کے لیے عبدالرشید ایسا یگانۂ روزگار استاد اُسے نصیب ہوا۔ شعر و شاعری کا ذوق ورثے میں پایا تھا۔ چنانچہ علمی اعتبار سے تیموری شہزادوں میں اس کا جواب نہ تھا۔ یہ ایک باکمال مصنف، اعلیٰ درجے کا انشا پرداز، خوش فکر شاعر اور مشاق خطاط تھا۔ جس کے حسن خط کی دھوم تھی۔ اس کی تصانیف سے اس کے علم و فن اور دوسرے خصوصیات پر کافی روشنی پڑتی ہے جو حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ سفینۃ الاولیا: ۔صوفیائے کرام کے متعلق نفحات الانس، کشف المحجوب، تذکرۃ الاولیا اور طبقات سلطانی میں جس پیرائے میں حالات قلمبند کئے گئے تھے۔ داراشکوہ ان سے مطمئن نہ تھا۔ وہ ایک ایسے تذکرے کی تدوین کی ضرورت سمجھتا تھا جس میں ان بزرگوں کے حالات سلسلہ بہ سلسلہ علیحدہ علیحدہ لکھے جائیں۔ ان کی تاریخ پیدائش و وفات کی تفصیل بھی دی جائے اور دوسرے حالات جو ان کی سوانح حیات کا جزو ہیں ان کو ترتیب وار مندرج کیا جائے۔ چنانچہ اس نے ایک کتاب سفینۃ الاولیا لکھی یہ کتاب ۲۷ رمضان ۱۰۴۹ھ کو ختم ہوئی۔ جبکہ اس کی عمر پچیس ۲۵ سال تھی۔ اس کتاب میں ۴۱۱ بزرگان دین کے مختصر حالات قلمبند کئے ہیں۔ یہ کتاب دو فصلوں پر منقسم ہے۔ اس کتاب کے

شروع میں حضرت رسول مقبول صلعم کا ذکر مبارک ہے پھر خلفائے راشدین اور پھر حضرت امام حسن و امام حسین علیہ السلام اور اس کے بعد ائمہ کے مناقب مندرج ہیں۔ پھر قادریہ، نقشبندیہ، چشتیہ، کبرویہ اور سہروردیہ سلاسل کا ذکر خاص طور سے کیا ہے۔ کچھ حالات متفرق سلسلوں کے بھی لکھے ہیں۔ آخر میں ازواج مطہرات و بنات طاہرات آنحضرت صلعم کا بیان ہے۔ اور اس کے بعد ان خواتین کا بھی ذکر ہے جنھوں نے راہ سلوک میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ یہ کتاب مختلف مطبعوں میں زیور طبع سے آراستہ ہوتی رہی۔ اس کتاب میں اُس نے اپنے آپ کو حنفی المذہب کہا ہے اور تصوف میں سلسلۂ قادریہ سے متوسل قرار دیا ہے۔ آگرہ سے جو نسخہ مہر بیل کے اہتمام میں چھپا ہے اس کے صفحات کی تعداد لوم ۲۳۴ ہے۔

سکینۃ الاولیا :۔ یہ کتاب ۱۰۵۲ھ میں لکھی گئی جبکہ دارا کی عمر اٹھائیس[1] برس کی تھی۔ اس کتاب میں اس نے اپنے پیر ملا شاہ محمد بدخشانی کے مرشد حضرت میاں میرؒ (ملا جیو) کے حالات ملفوظات۔ کرامات اور ان کے خاندان اور خلفا کے احوال پوری تفصیل سے لکھے ہیں۔ اس نے اس کتاب کی وجہ تصنیف یہ لکھی ہے "کہ سکینۃ الاولیا ——— اور کتابوں کی طرح اولیائے حق کے معتقدوں اور مخلصوں کے لیے بطور یادگار رہے اور معلوم ہو جائے کہ کوئی زمانہ عالی گروہ سے خالی نہیں رہا۔ اور نیز یہ کہ اس زمانے میں جب ۱۰۵۲ھ ہے اس قسم کے لوگ ہیں اور رہتے ہیں"

دارا نے راہ سلوک کے منازل کیونکر طے کیے اس کے متعلق وہ لکھتا ہے:۔

> "جمعرات کے روز چوبیس[2] سال کی عمر میں خواب میں فرشتہ نے مجھے آواز دی۔ اور چار مرتبہ کہا۔ تجھے اللہ تعالیٰ ایسی چیز عنایت کرے گا۔ جو روئے زمین پر کسی بادشاہ کو نصیب نہیں ہوئی۔ نیند سے بیدار ہو کر میں نے دل میں سوچا کہ اس قسم کی سعادت البتہ عرفان ہو گی۔ اور بے شک اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل و کرم سے مجھے یہ دولت بخش دے گا۔ ان اللہ غفور الرحیم۔ میں ہمیشہ اس دولت عظمیٰ کا طالب رہا۔ یہاں تک کہ ۲۹ ذوالحجہ ۱۰۴۹ھ کو ایک عارف باللہ کی صحبت میں پہنچا۔ وہ مجھ پر نہایت مہربان ہوا۔ جو بات دوسرے لوگوں کو ایک مہینہ میں حاصل ہوتی تھی وہ مجھے پہلی رات میں مل گئی اور جو کچھ دوسرے ایک سال میں حاصل کرتے تھے مجھے ایک مہینہ میں حاصل ہو گئی جہاں اور کوئی طالب مجاہدوں۔ ریاضتوں سے پہنچا ہے میں محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بغیر ریاضت یکبارگی پہنچ گیا۔ دونوں جہاں کی محبت میرے دل سے اٹھ گئی اور فضل و رحمت کے دروازے میرے دل پر کھل گئے اور جو میں چاہتا تھا وہ مجھے مل گیا"[1]

دارا کو اپنے مرشد (ملا جیو) سے بے پناہ عقیدت تھی۔ وہ بھی اُس سے غیر معمولی شیفتگی کا اظہار کیا کرتے تھے۔ دارا نے اپنے مرشد کی کرامات کو تفصیلاً لکھا ہے۔ اور ان کی روحانی عظمت آشکار کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ آخر میں اپنے مرشد کی ہمشیرہ بی بی جمال خاتون کے احوال و کرامات بھی لکھے ہیں۔ حضرت میاں میر کے خلفا کا ذکر بھی اس کے بعد کر دیا ہے۔ حضرت میاں میر صاحب دن کے وقت جن جن مقامات اور باغات میں مصروف عبادت رہے۔ ان کا ذکر بھی اس میں درج ہے۔ ان میں سے بعض مقامات کی نشان دہی اس وقت کرنا مشکل ہے بہر حال ان سے لاہور کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے۔ کتاب میں اس فن کی مختلف کتابوں کے حوالے بھی دیے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کشف المحجوب

---

[1] سکینۃ الاولیا۔ صفحہ ۵ مطبوعہ قومی منزل نقشبندیہ۔ لاہور

نفحات الانس۔ تمنیۃ الطالبین۔ تفسیر عرائس۔ تفسیر قشیری۔ بحر الحقائق۔ معجم البلدان سے اس نے اکثر استفادہ کیا ہے۔ اور ان کتابوں کو غور سے مطالعہ کیا ہے۔

۳۔ رسالہ حق نما :۔ ۲۹ ذوالحجہ ۱۰۴۹ھ کو اس نے ملا شاہ بدخشی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس کے بعد رسالہ حق نما لکھا۔ یہ رسالہ واصل بحق ہونے کے مختلف مدارج کے بیان میں ہے۔ اور اس رسالہ میں اس امر کی بھی ہدایت کی ہے کہ اس رسالہ کا مطالعہ اس وقت کیا جائے جب مرشد موجود ہو۔ ایک اور بات بھی لکھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کشف رموز و حقائق کے کتنے سربستہ اسرار اس پر کھول دیے ہیں۔ ایک شہزادہ ہونے کے باوجود اور بغیر کسی کڑی ریاضت اور مشکل عبادت کے عرفان کے دروازے کس طرح اس پر کھل گئے۔

۴۔ حسنات العارفین یا شطحیات :۔ دارا نے اس تصنیف میں حضرت رسول مقبول صلعم، خلفائے راشدین رض، صوفیائے کرام و علمائے عظام کے ان اقوال کو اکٹھا کیا ہے جو اس کے خیال میں شطحیات کے ضمن میں پیش کیے جا سکتے ہیں (شطحیات عربی لفظ ہے جس کے معنی بے ہودہ باتیں۔ کلمات خلاف ظاہر شریعت زبان پر لانا) اس رسالہ میں اس نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ توحید و معرفت کے منازل اور مدارج طے کرتے ہوئے ایک ایسا مقام بھی آتا ہے۔ جہاں ایک سالک شریعت و طریقت۔ کفر و ایمان۔ خیر و شر سے بالکل بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اور اس کی زبان سے بے خودی کی حالت میں بعض کلمات ایسے بھی نکل جاتے ہیں۔ جو بظاہر مذہب و ایمان کے منافی ہوتے ہیں۔ لیکن ان کلمات کو قابل مواخذہ قرار نہیں دیا جاتا۔ وہ خود اس کتاب کی تمہید میں لکھتا ہے :۔ کہ

> "وجد و ذوق کی حالت میں اس کے منہ سے ایسے کلمات بلند حقائق نکل جاتے ہیں جن کو سن کر "پست فطرت" "دون ہمت" اور "زاہد خشک" نے اپنی کوتاہ بینی سے اس پر تکفیر کے فتوے دیے۔ اس تکفیر سے بچنے کے لیے اس نے یہ کتاب تالیف کی"

۵۔ مجمع البحرین :۔ یہ کتاب دارا شکوہ نے اپنی عمر کے بیالیسویں[۴۲] سال ۱۰۶۵ھ میں تصنیف کی تھی۔ اس میں اسلام اور ہندو دھرم کو ایک ہی دریائے معرفت کی دو نہریں بنایا ہے۔ اور ان دونوں مذاہب کو ایک ہی رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بھی بتایا ہے کہ اسلامی تصوف اور فلسفۂ ویدانت میں لفظی اختلاف کے سوا کوئی اور فرق نہیں۔ توحید کے متلاشی ان دونوں میں سے جس راستے پر چاہیں چلیں آخر حقانیت کی منزل تک پہنچ ہی جائیں گے[۱]۔ اس کتاب کو پروفیسر محفوظ الحق نے مرتب کر کے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے شائع کیا ہے۔

۶۔ سرِ اکبر :۔ دارا شکوہ نے بنارس کے پنڈتوں کی مدد سے ۱۰۶۷ھ میں اپنشد کے پچاس ابواب کا ترجمہ کیا۔ علمی حیثیت سے اس ترجمہ سے یہ فائدہ ہوا کہ اپنشد کا متن مکمل طور پر ہمارے سامنے آ گیا۔ بلکہ یورپ کی مختلف زبانوں میں اس کے تراجم دارا ہی کے اس ترجمے کی بدولت ہوئے۔ مولانا شبلی نے بھی اس کتاب کا ذکر مقالات شبلی جلد ہفتم صفحہ ۱۰۱ پر کیا ہے : "عالمگیر نے دارا شکوہ کے مقابلہ کا جب قصد کیا تو اس کا یہ سبب ظاہر کیا۔ کہ دارا شکوہ بدعقیدہ اور بے دین ہے۔ اس لیے اگر وہ ہندوستان کا فرمانروا ہوا تو ملک میں بد دینی پھیل جائے گی۔ عام مورخوں کا خیال ہے کہ یہ محض ایک فریب تھا۔ نہ دارا شکوہ بے دین تھا۔ اور نہ عالمگیر کی مخالفت کا یہ سبب تھا۔ دلوں کا حال خدا کو معلوم

---

[۱] یہ دارا شکوہ کا نہایت غلط خیال ہے خالص توحید اور خالص بت پرستی ایک کس طرح ہو سکتے ہیں۔

ہے۔ لیکن اس کتاب کے دیباچے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دارا شکوہ بالکل ہندو بن گیا تھا۔ اور کچھ شبہ نہیں کہ اگر وہ تخت شاہی پہ پہنچ سکن ہوتا تو اسلامی شعار اور خصوصیات بالکل مٹ جاتے۔"

۷۔ **بھگوت گیتا** :۔ اس کتاب کو بھی دارا شکوہ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کتاب کا جو نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں ہے۔ اس کے فہرست نگار نے اس نسخہ کے ترجمہ کو دارا شکوہ ہی کے نام سے مرقوم کیا ہے۔ اور یہ بھی واضح طور سے بتایا ہے کہ برٹش میوزیم کے نسخہ کو ابوالفضل کی طرف منسوب کرنا درست نہیں (انڈیا آفس کیٹلاگ جلد اول کالم ۱۰۸۹)

۸۔ **نادرالنکات** :۔ یہ کتاب بھی انڈیا آفس کے فہرست نگار نے دارا شکوہ کی طرف منسوب کی ہے۔ پروفیسر محفوظ الحق صاحب کا خیال ہے کہ یہ کتاب رسالہ حق نما یا مکالمہ بابالال و دارا شکوہ کا دوسرا نام ہے۔

۹۔ **دیوان** :۔ دارا صاحب دیوان بھی تھا اور قادری تخلص کرتا تھا۔ بعض کا خیال ہے کہ دارا کا کوئی دیوان نہیں۔ لیکن کلمات الشعرا میں محمد خوش اور طاہر نصیر آبادی نے اپنے تذکرہ میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ دارا صاحب دیوان تھا۔ ریاض العارفین میں رضا قلی ہدایت نے اس کی تائید کی ہے۔ مولانا علم الدین سالک نے "دارا شکوہ کا دیوان" کے عنوان سے ایک بصیرت افروز مقالہ نقوش کے ادب عالیہ نمبر (جولائی سنہ ۱۹۶۰ء) میں تحریر کیا ہے۔ اس دیوان کے متعلق ان کی رائے بڑی وقیع ہے:۔

> "دیوان قادری اپنے دور کی فارسی شاعری کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ زبان صاف شستہ اور سادہ ہے۔ خیالات صوفیانہ ہیں جنھیں دارا بڑی سادگی سے بیان کرتا ہے۔ انداز میں سرمستی پائی جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیالات اس کے رگ و پے میں سرایت کر چکے ہیں۔ یہی اس کی زندگی ہے اور یہی اس کی زندگی کا بڑا کارنامہ ہے۔ وہ انھیں بڑی بے تکلفی کے ساتھ نظم و نثر میں ادا کرتا ہے۔ یہ خیالات زیادہ تر تصوف کے نہایت اہم ترین مسائل ہمہ اوست اور فنا کے متعلق ہیں۔ چنانچہ وہ ایک مقام پر وحدت الوجود یا ہمہ اوست کے متعلق کہتا ہے ؎
>
> ہر سو کہ نظر کنی ہمہ اوست   وجہ اللہ عیاں ست رو بروا را
>
> خویشتن را جدا نمے دانم   لیک خود را خدا نمے دانم

چند اور کتابوں کے نام بھی مختلف فہرست نگاروں نے لکھے ہیں۔ جو دارا شکوہ سے منسوب کی جاتی ہیں۔ ان میں رسالہ معارف، دارا کی ایک فارسی مثنوی (مخزن ستمبر سنہ ۱۹۰۷ء) دارا کی ایک تزک (پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی جرنل جلد دوم نمبرا) اور نگارستان منیر کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن ان کتابوں پر تفصیلی نوٹ دستیاب نہیں ہوتے۔

کچھ کتابیں دارا شکوہ کی زیر سرپرستی لکھی گئیں۔ جن کے نام یہ ہیں:۔

۱۔ **مکالمہ دارا شکوہ و بابا لال** :۔ منشی چندر بھان برہمن کے قلم نے اسے محفوظ کیا ہے۔ اس مکالمہ کی روح اس خیال کی تائید میں ہے۔ کہ حق و صداقت کسی مذہب یا فرقہ کی میراث نہیں ہے۔

۲۔ **جوگ بشسٹ** :۔ یہ سنسکرت کی ایک کتاب "جوگ دری شسٹ" کا فارسی ترجمہ ہے۔ جو ایک درباری نے سنہ ۱۰۶۶ھ

میں دارا کے حکم سے کیا۔

۱۳۔ تاریخ شمشیر خانی: یہ کتاب شاہنامہ کی تلخیص ہے جو دارا کے حکم سے کی گئی۔

چند کتابیں اس کے نام سے بھی معنون کی گئیں۔ جن میں قصص الانبیاء، طب دارا شکوہی یا علاجات دارا شکوہی، اقوال واصلی کے نام کتابوں میں ملتے ہیں۔

دارا فن خطاطی میں بھی ید طولیٰ رکھتا تھا۔ نستعلیق اور نسخ دونوں میں اسے پوری مہارت تھی۔ پروفیسر محفوظ الحق نے مجمع البحرین کے دیباچہ میں اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ایک قرآن مجید کے نسخہ کی عزیز لائبریری حیدرآباد دکن میں نشان دہی کی ہے جس کے حروف شروع سے آخر تک سنہرے ہیں۔ ایک مطلا مجموعہ کا نسخہ بخط نسخ اور ایک "دہ پند ارسطو" کا نسخہ بخط نستعلیق وکٹوریہ میموریل ہال کلکتہ میں محفوظ ہے۔ رسالہ حکمت ارسطو۔ اور شرح دیوان حافظ، آصفیہ لائبریری حیدرآباد دکن میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی وصلیاں مختلف مقامات پر پائی جاتی ہیں۔ بعض کتابوں پر اس کے دستخط اور تحریریں بھی ملتی ہیں جو خطاطی کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ اور نادرات میں شمار ہوتی ہیں۔

یہ تیموری خاندان کا شہزادہ جو بہ صفت موصوف تھا، غازی اورنگ زیب کی سیاسی مصلحتوں کا شکار ہو گیا۔ اس باکمال انسان کو غلط طریقے سے پیش کیا گیا۔ اس دور کے مورخین نے بھی اس کے ساتھ انتہائی بے دردی کا سلوک کیا۔ بلکہ اس کے کردار اور افعال پر سراسر معاندانہ تنقیدیں کیں۔ آخر اسے ۲۱ ذوالحجہ ۱۰۶۹ھ مطابق ۳۰ اگست ۱۶۵۹ء کو قتل کر دیا گیا۔ کسی نے تاریخ کہی ؎

عقل پائے ادب گرفت وگفت

قتل دارا شکوہ سند تاریخ (۱۰۶۹ھ)

۱۰۶۷ + ۲

لیکن ـــ سامو گڑھ کا معرکہ سر کرنے والے اس کی علمی شہرت کو تباہ نہ کر سکے۔ اس دور کے شاہی پروردہ مورخ اس کی ذاتی عظمت نہ چھین سکے۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے، دارا شکوہ کی تصانیف کی وقعت پیش سے بیشتر ہوتی جا رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ صاحبان علم و فضل اس کی تصانیف کو ان کا کھویا ہوا مقام دلانے کی کوشش کریں۔ اگرچہ عالمگیری پروپیگنڈے اور تحریف کی لاتعداد تہیں ان پر چڑھی ہوئی ہیں، جن میں اس صوفی منش شہزادے کا کمال چھپ کر رہ گیا ہے اگر اب بھی ملک کے لائق مورخین نے اس کی طرف توجہ کی تو اس کے "فلسفہ ہمہ اوست" میں ارتداد کی بجائے حق پرستی معرفت الٰہی جھلکتی ہوئی نظر آئے گی۔ کیونکہ اس کے کلام کا بیشتر حصہ اسی موضوع سے متعلق ہے۔

چندر بھان برہمن (المتوفی ۱۰۷۳ھ)

منشی چندر بھان برہمن منشی دھرم داس لاہوری متصدی شاہی کا فرزند تھا۔ بلا کی طبیعت پائی تھی۔ اس وقت کے مشاہیر میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ نظم و نثر دونوں میں اس کی تصانیف دستیاب ہوتی ہیں۔ جس سے اس کی شاعرانہ عظمت اور عالمانہ استعداد کا کسی قدر اندازہ ہوتا ہے۔

فاضل اجل ملا عبد الحکیم سیالکوٹی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ فارسی زبان میں زبردست استعداد بہم پہنچائی۔ شروع میں امیر عبد الکریم میر عمارت لاہور کی ملازمت اختیار کی۔ پھر امیر الامرا افضل خاں علامی دیوان کل کے ساتھ بحیثیت دبیر وابستہ رہا۔ اس کے بعد اپنے بھائی اودے بھان کی وساطت سے امیر عاقل خاں کے ذریعے شاہجہان کے دربار تک رسائی حاصل کی اور خط شکستہ میں ایک رباعی لکھ کر شاہی

خدمت میں پیش کی ؎

شاہے کہ مطیع او دو عالم گردد　　ہر جا کہ سر بیت پیش او خم گردد
از بسکہ بدورش آدمی یافت شرف　　خواہد کہ شرف نیز آدم گردد

شاہجہان نے اس کو وقائع نویسی کے عہدہ جلیلہ پر مامور کیا۔ اس عہدہ پر برہمن ہمیشہ فخر کرتا تھا۔ کیونکہ وہ روزانہ بارگاہ شاہی میں حاضر ہو کر ہر روز کے واقعات اور حالات سے بادشاہ کو باخبر رکھتا تھا۔ شاہجہاں نے برہمن کو متعدد مرتبہ انعام و اکرام سے سرفراز کیا۔ ایک دفعہ فرائض منصبی سے خوش ہو کر ایک ہاتھی انعام عطا کیا۔ چند سیاسی اغراض کی تکمیل کے لیے ایک دفعہ رانا اودے پور کی خدمت میں بھی بھیجا گیا۔

دارا شکوہ برہمن کی نظم و نثر کا گرویدہ تھا۔ اس لیے اس کو اپنا میر منشی مقرر کیا۔ دارا جب قندھار کی مہم پر گیا تو برہمن بھی ہم رکاب تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ علامی سعد اللہ کی وفات کے بعد برہمن پھر دربار شاہی سے منسلک ہوا۔ اور دفتر شاہی میں میر منشی کے فرائض انجام دیتا رہا۔ اور رائے کے خطاب سے بھی سرفراز کیا گیا۔ عالمگیر جب تخت نشین ہوا۔ تو اس موقع پر اس نے یہ رباعی کہی ؎

شاہا عالم مطیع فرماں تو باد　　لبریز ادائے شکر احسان تو باد
چوں ذات تو خلق را نگہبان باشد　　ہر جا باشی خدا نگہبان تو باد

برہمن کیونکہ دارا کا حامی تھا۔ اس لیے ایک خط میں اورنگ زیب عالمگیر سے یہ شعر لکھ کر اپنے قصوروں کی معافی مانگی ؎

شدیم پیر بہ عصیاں و چشم آں دارم
کہ جرم ما بجوانان پارسا بخشد

عالمگیر کے دور حکومت میں وہ جہانگیر کے مقبرہ کی نگرانی کے لیے بھی مامور کیا گیا تھا۔

منشآت برہمن سے پتہ چلتا ہے کہ برہمن کے تین بھائی اور ایک بیٹا تھا۔ اودھے بھان عاقل خان ناظم شاہجہان آباد کی سرکار میں ملازم تھا۔ اور متصدی کے فرائض انجام دیتا تھا۔ اس کے دوسرے بھائی رائے بھان اور اندر بھان تارک الدنیا ہو کر درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ منشآت میں جو خطوط برہمن نے اپنے ان دونوں بھائیوں کو لکھے ہیں۔ ان سے اس کی برادرانہ محبت اور عقیدت ٹپکتی ہے۔ برہمن کو اپنے بیٹے تیج بھان سے بھی محبت تھی۔ ایک خط میں اُسے عربی و فارسی کی تحصیل کے لیے تلقین کی۔ اس ایک بیٹے کے سوا دوسری کسی اولاد کا حال معلوم نہیں۔

بیل صاحب نے لکھا ہے کہ برہمن نے آگرہ میں ایک اچھی رہائش گاہ بنوائی تھی جس کے آثار اب ناپید ہو گئے ہیں۔ "امرائے ہنود" میں ہے کہ اب تک آگرہ میں ایک باغ "باغ برہمن" کے نام سے مشہور چلا آرہا ہے۔ تفریح العمارات میں برہمن کی بہت سی عمارتوں کا ذکر ملتا ہے۔

اس کی سیرت کے متعلق تمام تذکرہ نویس متفق ہیں کہ برہمن سلیم الطبع۔ صوفی منش۔ مرنجان مرنج اور صلح کل مشرب کا دلدادہ تھا۔ عمل صالح میں لکھا ہے کہ "ہر چند بصورت بند دست۔ لیکن دم در اسلام مے زند" اپنی تحریروں میں وہ ہندوانہ مراسم کا ذکر نہایت تعظیم اور عزت سے کرتا ہے۔ صاحب مراۃ الخیال" نے اسے "زنادار" کہا ہے۔ وہ بھی اپنے لیے "زنادار" کہنا پسند کرتا تھا۔ چنانچہ اپنے ایک شعر میں اس نے اس حقیقت کی طرف واضح اشارہ کیا ہے ؎

مرا برشتۂ زنار الفتی خاص است　　بیادگار من از برہمن ہمیں دارم

وہ گداز طبیعت کا مالک تھا۔ دل میں انسانی ہمدردی کی شمع روشن تھی ضرورت مندوں کی خدمت کرنا اپنا فخر سمجھتا تھا۔ منشأت میں بے شمار سفارشی خطوط ملتے ہیں۔ جو وقتاً فوقتاً مختلف امراکو لکھے ہیں۔ اور مفلوک الحال ابنائے وطن کے لیے ان سے اعانت کی درخواست کی ہے۔

دارا شکوہ کی سرکار میں برہمن کا رتبہ بہت بلند تھا۔ دارا بھی اس کی نظم و نثر اور طرز بیان کا دلدادہ تھا۔ تذکروں میں آیا ہے کہ ایک دفعہ دارا کو برہمن کی ایک غزل بے حد پسند آئی اور خصوصاً غزل کا یہ شعر سُن کر سر دھننے لگا ؎

مرا دلیست بکفر آشنا کہ چندیں بار
بہ کعبہ بُردم و بازش برہمن آوردم

وہ برہمن کو لے کر شاہجہان کے حضور میں حاضر ہوا۔ اور غزل کی تعریف کی۔ فرمائش پر برہمن نے اپنی غزل سُنائی۔ جب مذکورہ شعر شاہجہان نے سُنا تو اس کی بے باکانہ جسارت پر آگ بگولا ہو گیا اور برہمن کی گردن مارنے کا حکم دیا۔ نواب سعد اللہ خان وزیر اعظم نے جو برہمن کے مربی اور قدر دان تھے ہاتھ باندھ کر عرض کیا کہ حضرت سعدی شیرازی بہت پہلے فرما گئے ہیں ؎

خرِ عیسےٰ اگر بہ مکہّ رود
چوں بیاید ہنوز خر باشد

اس شعر کے سننے سے بادشاہ کا غصہ فرو ہوا۔ اور غریب برہمن کی جان بچ گئی۔ اس روایت کی صحت میں کلام نہیں۔ لیکن یہ بھی مسلّم ہے کہ برہمن اپنے وقت کا آتش نوا شاعر تھا۔ اور دارا شکوہ کی سرکار میں اُسے خصوصیت حاصل تھی۔

مختلف تذکروں اور منشأت میں برہمن کی مندرجہ ذیل تصانیف کا پتہ چلتا ہے:۔

(۱) تحفۃ الفصحا (۲) گلدستہ (۳) تحفۃ الانوار (۴) نگارستانہ
(۵) مجموعۃ الفقرا (۶) منشأت (۷) دیوان (۸) چہار چمن
(۹) فارسی زبان کا ایک تذکرہ بھی برہمن کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔
(۱۰) برٹش میوزیم کی مطبوعہ کتابوں میں "نازک خیالات" کے نام سے "آتم بلاس" کسی سنسکرت کتاب کے ترجمے کا بھی ذکر ملتا ہے۔
(۱۱) خلاصۃ التواریخ از سجان رائے بٹالوی میں "مکالمات بابا لال" کو بھی برہمن کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

بابا لال بیراگی ذات کا کھتری اور قصور کا باشندہ تھا۔ لیکن اس کا استھان دھیان پور (بٹالہ) میں تھا۔ میاں جیو کا دوست تھا۔ اس لیے دارا شکوہ کو بھی اس سے عقیدت تھی۔ اپنی کتاب "شطحیات" میں بابا لال کے متعلق لکھتا ہے:۔

"بابا لال مندیہ کہ از کمال عرفاست و در ہنود بفرمان و متانت وے کسے دیدہ نشدہ مرا گفت۔ ہر قومے عارف و کامل مے باشد کہ حق سبحانہ تعالیٰ بہ برکت او آں قوم را نجات مے دہد و تو منکر ہیچ قومے مباش" (ص ۲۲ مجتبائی)

مجمع البحرین میں بابا لال بیراگی کا نام مسلمان صوفیۂ کرام کے ساتھ آیا ہے (ص ۲۶) دارا شکوہ ۱۰۶۲ھ میں قندھار کی مہم سے واپس آیا۔ تو لاہور میں بابا لال سے ملا۔ اور دونوں کی گفتگو سات مجلسوں میں ختم ہوئی۔ ان مکالموں کو دارا شکوہ کے حکم سے اس کے میر منشی چندربھان برہمن نے قلمبند کر لیا تھا۔

برہمن کی تصانیف میں۔ منشآت۔ دیوان اور چہار چمن بہت مشہور ہیں۔

برہمن کی نثر صاف اور سلیس ہے۔ لیکن اس کی فارسی پر ہندوستان کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ مثلاً لاہور کی عمارتوں کا حال اس طرح لکھا ہے:-

"عمارات منازل جنت مشاکل سرکار نواب نامدار کہ بمقتضائے حسن مکان و وسعت فضا و غایت صفا بانواع آرائش و آراستگی یاد از قطع بہشت مے داد۔ تماشا نمودہ در ہر مکان و ہر محل دعائے دولت نواب فرشتہ صفات را وردِ زبان ساختہ" (صنادید عجم صـــ۲۴۳)

نظم میں حلاوت و شیرینی ہے۔ سادہ بیانی اس کی شاعری کی جان ہے۔ اردو اور فارسی میں اس کا کلام ملتا ہے۔ اس کی ایک غزل اردو زبان میں لالہ سری رام نے خمخانۂ جاوید جلد اول صفحہ ۵۷۵ پر لکھی ہے جو ذیل میں درج کی جاتی ہے ؎

خدا نے کس شہر اندر ہمیں کو لائے ڈالا ہے / نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے

خوباں کی باغ میں رونق ہووے تو کس طرح یاراں / نہ دونا ہے نہ مروا ہے نہ سوسن ہے نہ لالا ہے

پیا کے ناؤں کی سمرن کیا چاہوں کروں کیسے ہیں / نہ تسبی ہے نہ سمرن ہے نہ کنٹھی ہے نہ مالا ہے

پیا کے نام عاشق کوں قتل بالعجب دیکھے ہوں / نہ برچھی ہے نہ کرچھے ہے نہ خنجر ہے نہ بھالا ہے

برہمن واسطے اشنان کے پھرتا ہے بگیا سین
نہ گنگا ہے نہ جمنا ہے نہ ندی ہے نہ نالا ہے

زبان کی قدامت سے قطع نظر مضامین کی نفاست اور سادگی ہر شعر میں جھلک رہی ہے۔

فارسی میں مضامین عالی نظم کئے ہیں۔ خصوصاً غزل میں ہر شعر ذوق سلیم کا شاہد ہے۔ برہمن کی مثنوی میں واقعات نہایت خوبی سے نظم ہوئے ہیں۔ مثلاً باغ کی تعریف کس لطیف انداز میں کرتا ہے ؎

دریں گلشن زگلہا دستہ دستہ / صبا در ہر طرف گلدستہ بستہ

ہوایش دلکشا و دل نشین است / طراوت خانہ زاد ایں زمین است

شگفتہ ہر طرف گلہائے لالہ / گرفتہ بر کف عشرت پیالہ

چو دیدم آب و رنگ بوستاں را / صلائے عیش دادم دوستاں را

زباں در وصف گل بے تاب گردید
سخن تا بر لب آمد آب گردید (صنادید عجم صفحہ ۲۴۴)

برہمن کی دوسری تصانیف بھی اہم ہیں لیکن چہار چمن ایک خاص قسم کی انشا ہے جس میں سادہ اور صاف انداز بیان میں شاہجہان کے زمانے کی کچھ بیش بہا معلومات یکجا کردی ہیں۔ عالمگیریات کے سب سے بڑے ماہر سر جدوناتھ سرکار نے اس کتاب کی بڑی تعریف کی ہے اور غالباً وہ پہلے مورخ ہیں جنھوں نے اس کتاب سے پورا پورا استفادہ حاصل کیا ہے۔ اور اس دور کی تاریخ کا بڑا اہم ماخذ قرار دیا ہے۔

چہار چمن میں شاہجہان اور اورنگ زیب کے امرا کے تفصیلی حالات بھی ملتے ہیں۔ اس میں شاہجہان کی روزمرہ زندگی کا پروگرام بھی درج ہے۔ اور ان واقعات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ جو چندر بھان برہمن کو شاہجہاں کے دربار میں پیش آئے۔ وہ مختلف اوقات میں شاہنشاہِ

کی خدمت میں پیش ہوتا رہا۔ اور اکثر موقعوں پر اس نے غزلیں بھی پیش کیں اور انعامات بھی حاصل کیے۔

اس کتاب کا ایک حصہ شہر لاہور کے باغات اور عمارت کے بارے میں بھی ہے۔ آخر میں کچھ خطوط ہیں۔ جن میں سے اکثر منشآت میں درج کر دیئے ہیں۔ ان میں ایک خط اس کے بیٹے شیخ بھان کے نام ہے۔ جس میں اس زمانے کی تعلیم اور تعلیم کے مقاصد پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ برہمن کے معاصرین میں سے ملا قوسی نے اس کے بارے میں یہ شعر کہا تھا ؎

چہار چمن ساختہ برہمن
مے زند از عالم دیگر سخن

یہ کتاب بھی اس کی دوسری تصانیف کی طرح غیر مطبوعہ ہے۔ اس کے قلمی نسخے زیادہ کثرت سے دستیاب نہیں ہوتے۔

یہ باکمال ہندو انشا پرداز شاعر و مورخ لاہور میں پیدا ہوا تھا۔ اور دارا شکوہ کے قتل کے بعد تارک الدنیا ہو گیا۔ دنیا کے بکھیڑوں سے یکسر کنارہ کشی اختیار کر لی اور یادِ خدا میں مشغول ہو گیا۔ آخری حالت میں ۱۰۷۳ھ میں بنارس میں انتقال کیا۔

محمد صالح کنبو (المتوفی ۱۰۸۵ھ / ۱۶۷۴ء)

شیخ عنایت اللہ لاہور کے کمبوؤں میں سے تھے۔ جنھوں نے اپنی خداداد قابلیت سے شاہجہان کے دربار میں میر منشی کے عہدہ جلیلہ تک رسائی حاصل کی۔ حضور شاہی میں ان کی باریابی کی تعریف بھی بغیر کسی سفارش کے عمل میں آئی۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ ایک مفلوک الحال اور پریشان روزگار برہمن نے ایکدفعہ شیخ صاحب سے شاہنشاہ کے نام اپنی لڑکیوں کی شادی کے لیے امداد حاصل کرنے کے واسطے ایک عرضداشت لکھوائی۔ شیخ موصوف نے اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے دو سطریں لکھ کر حوالہ کیں۔ درخواست کا مضمون یہ ہے :-

"جہاں پناہا! ایں عاجز بہ بار دو عاجزہ عاجز

؎ چوں عاجز رہانندہ دانم ترا — دریں عاجزی چوں نخوانم ترا

فدوی فلاں برہمن"

اس مختصر تحریر میں فصاحت و بلاغت سے قطع نظر صنعت ایجاز سے شیخ صاحب نے جس قابلیت سے کام لیا ہے وہ علم بیان و معانی جاننے والے حضرات سے پوشیدہ نہیں۔

شیخ عنایت نے عمر بھر منشی گری کی خدمات انجام دیں۔ اسی لیے الفاظ شستہ، فصیح اور ادبی فارسی لکھنے میں ایک خاص ملکہ تھا۔ بہار دانش ان کی تصنیفات میں ایک اہم اور مشہور کتاب ہے۔ اگرچہ یہ کتاب "تریا چرتر" یعنی عورتوں کے مکر و فریب کی داستانیں لیے ہوئے ہے۔ لیکن اس کی شستگی، عبارت آرائی اور فصاحت میں کلام نہیں۔ زبان فصیح ہے اور اعلیٰ انشا کے نمونے اس کتاب میں کثرت سے ملتے ہیں۔ یہ کتاب فارسی نثر کے گراں بہا آثار میں شمار ہوتی ہے۔ اگرچہ نفس مضمون شائستگی و تہذیب کے منافی ہے۔ لیکن بیان کی شستگی و برجستگی کے وافر نمونے اس میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔

ان کی ایک اور کتاب انشائے اشرف الصحائف کے نام سے ہے۔ اس میں دو رقعے ایسے ہیں۔ جن میں کوئی حرف منقوط نہیں آنے دیا۔ اسی طرح صنعت مہملہ میں بادشاہ کی تعریف میں ان کا قصیدہ بھی ہے جس کے دو شعر نمونے کے طور پر ذیل میں درج ہیں ؎

عماد عالم و عادل سوار عرصۂ ملک — اساس طارم اسلام و سرورِ عالم
ہم او و ہم دل و دارا عدل را معمار — ہم او و ہم حرم او و سائے ملک را مرہم

اس باکمال ادیب نے ۱۰۷۵ھ/۱۶۶۴ء میں وفات پائی۔ اور لاہور میں مدفون ہوئے۔ ان کی قبر پر محمد صالح کمبو نے جو مقبرہ بنوایا تھا، وہ آج تک موجود ہے۔

شیخ عنایت اللہ کی ادب نواز آغوش میں محمد صالح کمبو[1] کی تربیت ہوئی۔ کیونکہ شیخ مذکور کی رسائی دربار شاہی تک پہلے ہی سے تھی۔ اس لیے صالح کمبو کو اپنی قابلیت کے اظہار کے لیے چنداں دشواری پیش نہیں آئی۔ رفتہ رفتہ ان کی قابلیت کے جوہر کھلنے لگے۔ اور آخر وہ صوبۂ لاہور کے دیوان کی حیثیت سے خدمات انجام دینے لگے۔ اسی زمانہ میں انھوں نے ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۹ء میں ایک مسجد تعمیر کرائی۔ جو مسجد محمد صالح کے نام سے آج بھی اندرون موچی دروازہ موجود ہے۔ لالہ کنہیا لال مصنف تاریخ لاہور نے لکھا ہے:۔

"یہ عجیب و غریب مسجد موچی دروازے کے اندر ہے۔ جو کوئی موچی دروازے سے شہر میں داخل ہوتا ہے تو سامنے اسی مسجد کی عالیشان و رنگین عمارت نظر آتی ہے۔ چھوٹی سی مسجد نہایت مقطع و خوبصورت بنی ہوئی ہے۔ سب عمارت اس کی خشتی پختہ و پختہ کار بنی ہوئی ہے۔ تینوں گنبد مدوّر صورت عمدہ شکل کے ہیں۔ مسجد کے تینوں محرابوں کے اوپر اور گوشوں کی دیواروں پر کاشی کا کام زرد رنگ کا ہو رہا ہے۔ اور اسی میں حروف لاجوردی رنگ کے لکھے ہیں۔ اکثر آیات قرآنی و احادیث و عبارت فارسی اس میں تحریر ہیں۔ کاشی کا رنگ اب تک ایسا شوخ نظر آتا ہے۔ گویا آج ہی طاقچہ بنایا گیا ہے اور آج ہی نقش و حروف لکھے گئے ہیں۔ اس مسجد کی تعمیر سنہ ۱۰۷۰ھ میں ختم ہوئی اور منشی محمد صالح دیوان پنجاب نے اس کو تعمیر کیا۔"

یہ مسجد آج سے تقریباً تین سو[2] گیارہ سال قبل کی بنی ہوئی ہے۔ شاہی مسجد اور مسجد وزیر خان کے بعد نفاست میں اسی کا درجہ ہے۔ مسجد کے دروازے پر یہ شعر مرقوم ہے ؎

بانیٔ ایں مسجد زیبا نگار   بندۂ آلِ محمد صالح است[3]

مصنف کی حیثیت سے منشی محمد صالح کمبو کا درجہ بہت بلند ہے۔ عمل صالح ان کی ایک ایسی عظیم تصنیف ہے جس کی وجہ سے وہ رہتی دنیا میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ یہ تاریخ شاہجہان کی پیدائش سے لے کر قید و وفات تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ اور اس کی ۳۲ سالہ حکومت سے لیکر موت تک کے اہم ترین واقعات اس میں ملتے ہیں۔ شاہجہانی دور کی تاریخ کا یہ ایک ایسا ماخذ ہے جسے کوئی مورخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اکثر واقعات کو مصنف نے خود اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کیا ہے۔ اس لیے اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ وقائع کی نقل میں نہایت انصاف اور چھان بین سے کام لیا ہے اور حقیقت کا دامن کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اگرچہ ملخص مرتبہ محمد طاہر آشنا المخاطب بہ عنایت خان۔ شاہجہان نامہ مصنفہ منشی محمد صادق المخاطب بہ صادق خان۔ شاہجہان نامہ (نامکمل) مصنفہ مرزا جلال طباطبائی اصفہانی، شاہجہان نامہ مصنفہ علامی الملک توفی المخاطب بہ فاضل خان۔

---

[1] پروفیسر ڈوسن نے میر صالح کشفی کو عمل صالح کا مصنف سمجھا ہے جو غلط ہے کیونکہ کشفی نے سنہ ۱۰۶۱ھ میں وفات پائی اور عمل صالح سنہ ۱۰۷۰ھ میں تصنیف ہوئی۔ [2] اس کا مادۂ تاریخ لطیفۂ فیض الٰہی ہے۔ ۱۰۷۰ [3] اس مصرع سے مترشح ہوتا ہے کہ محمد صالح سادات میں سے نہ تھے نیز کوئی سید کمبو نہیں کہلاتا (کسری)

اقبال نامہ مصنفہ معتمد خان۔ بادشاہ نامہ مصنفہ محمد امین بن ابوالحسن قزوینی مرزا امین۔ بادشاہ نامہ مصنفہ عبدالحمید لاہوری اور بادشاہ نامہ مصنفہ محمد وارث سے شاہجہانی دور کے متعلق ہمیں واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ اور ان میں بھی واقعات کا بیان شاہجہانی نقطۂ خیال کی غمازی کرتا ہے۔ لیکن عمل صالح میں جس اہتمام کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس سے اس تاریخ کا درجہ بہت بڑھ جاتا ہے۔

فارسی نثر میں یہ کتاب شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ فارسی زبان کو مسجع عبارتوں میں بعض بعض جگہ ایسا مزین کیا گیا ہے کہ دل مستانہ وار جھومنے لگتا ہے۔ یہ کتاب متقدمین کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ اس دور کی اکثر شخصیتوں کے حالات اس میں آگئے ہیں۔ جن سے عام تذکرے خالی ہیں۔ شاہجہانی دور کے ایک اہم ماخذ کی حیثیت سے یہ تاریخ کبھی عمومی تاریخ سمجھ کر نظرانداز نہیں کی جائے گی۔ یہ کتاب ایشاٹک سوسائٹی بنگال نے شائع کی تھی۔ اب انجمن ترقی ادب لاہور نے بھی اسے شائع کر دیا ہے۔

ملا محمد صالح کمبو کی ایک اور نادر تصنیف بہار سخن ہے۔ مولانا شبلی نے اسے بہارستان سخن کہا ہے۔ لیکن دوسرے تذکرہ نویس اس کو بہار سخن ہی کا نام دیتے ہیں۔ یہ ملا صالح کی فارسی نثر نگاری کے بہترین نمونوں میں شمار ہوتی ہے۔

بہار سخن چار حصوں پر مشتمل ہے۔

پہلے حصے میں امرا و سلاطین کے خطوط ہیں۔

دوسرے حصے میں مؤلف کے ذاتی مکتوبات ہیں۔

تیسرے حصے میں شاہجہاں آباد۔ آگرہ اور لاہور کی عمارات کا تذکرہ ہے جو مسجع و مقفیٰ عبارت میں تحریر کیا گیا ہے۔

چوتھے حصے میں اس دور کی تصانیف پر تقاریظ لکھی ہیں۔ ان میں تیسرا اور چوتھا حصہ خاص طور پر اہم ہے۔ عمارات۔ فن تعمیر اور اس فن کی اصطلاحات کا ذکر خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ ملا صالح نے خود بھی کچھ عمارات بنوائیں۔ اور اس دور میں دوسرے امرا نے بھی لاہور کو عروس البلاد بنانے کی کوشش کی۔ یہ دور کاشی کاری کا بہترین دور تھا۔ کاشی کاری میں جس قدر بہترین نمونے ہمیں اس دور میں ملتے ہیں دوسرے دور ان سے یکسر خالی ہیں۔ ملا صالح نے اس فن کے بارے میں بہت سی معلومات یکجا کر دی ہیں۔ مگر اس کی رنگین نگاری کی وجہ سے بہت کم لوگوں نے اس سے کما حقہٗ استفادہ حاصل کیا ہے۔

چوتھے حصے میں ملا محمد صالح نے تقاریظ لکھتے وقت صاحب کتاب کے حالات اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر درج کیے ہیں۔ ان میں سے اکثر ایسے مصنف ہیں۔ جو ان کے عزیز اور قرابت دار تھے۔ بعضوں سے ان کے ذاتی مراسم تھے اور بعضوں سے انھیں ملنے کا اتفاق تھا۔ اس واسطے یہ حالات ہمیں اس زمانے کے تذکروں میں نہیں ملتے۔ اس دور کی ادبی تاریخ مرتب کرتے ہوئے ہم اس حصے کو نظرانداز نہیں کر سکتے۔ بلکہ اسے ایک نہایت اہم ماخذ قرار دیتے ہوئے مستفیض ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ کتاب اس زمانے کی فارسی نثر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ کیونکہ خیال بندی کا آغاز بھی اسی دور سے شروع ہوا تھا۔ اس لحاظ سے یہ کتاب اس موضوع پر سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب ابھی شائع نہیں ہوئی۔ پبلک لائبریری لاہور میں اس کتاب کا قلمی نسخہ موجود ہے۔ یہ کتاب[1] ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۹ء کی تصنیف ہے یا یہ کتاب[2] ۱۰۷۳ھ میں مرتب ہوئی۔

---

[1] مقدمہ رقعات عالمگیر صفحہ ۲۷ [2] مضمون محمد عبداللہ قریشی مطبوعہ عالمگیر تاریخ نمبر سالنامہ ۱۹۴۲ء صفحہ ۱۶۸

اس باکمال مؤرخ اور انشا پرداز کے حالاتِ زندگی ورطۂ گمنامی میں پڑے ہیں۔ اس جید عالم و فاضل نے جہاں ادب فارسی کی خدمت کی ہے۔ وہاں اپنی جنبش قلم سے ہزاروں باکمال شخصیتوں کو ہمیشہ کے لیے زندہ جاوید بھی کیا ہے۔ کسی تذکرہ نویس نے ان کے مکمل حالات زندگی لکھنے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ عمل صالح میں بس اسی قدر مرقوم ہے۔

"کمترین داعیان دولت ابد پیوند بود"

البتہ شیخ عنایت اللہ مصنف بہار دانش اور مولانا ابوالبرکات منیر کے احوال سے جو اس کتاب کے آخر میں مندرج ہیں۔ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ لاہور میں پیدا ہوئے۔ شیخ عنایت ہی سے تلمذ حاصل تھا۔ اور ان ہی کی زیر تربیت ترقی کے منازل طے کئے۔

ملا محمد صالح کمبو کا نام۔ شیخ عنایت سے ان کا رشتہ اور چند دوسری معلومات سے متعلق ایک پراز معلومات تحریر ماہنامہ عالمگیر لاہور کے تاریخ نمبر ۱۹۴۴ء میں میرے محترم دوست مولوی محمد عبداللہ قریشی صاحب نے پیش فرمائی ہے۔ جسے بجنسہٖ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

تاریخ ہند میں ایلیٹ صاحب نے میر محمد صالح خوشنویس[1] پسر میر عبداللہ مشکیں قلم جو فارسی میں کشفی تخلص کرتا تھا کے نام کیساتھ خلط ملط کر دیا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ

"اس میں شک نہیں کہ محمد صالح وہی آدمی ہے۔ جس نے اپنی کتاب میں اپنا نام خوشنویسوں کے زمرے میں لکھا ہے[2]۔"

حالانکہ خوش نویس مذکور کی وفات کا حال عمل صالح میں سنہ ۲۴ جلوس مطابق ۱۰۶۱ھ کے واقعات میں موجود ہے۔ صاحب موصوف کو یہ خیال غالباً کرنیل لیس کے اس قول سے پیدا ہوا۔ جو اس نے بادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری کے باب میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل (جلد سوم سلسلہ جدیدہ) میں شائع کرایا ہے۔ یعنی

"بادشاہ نامہ کی دوسری جلد کا وہ نسخہ جو طبع "ببلیو تھیکا انڈیکا" کی خاطر استعمال کیا گیا۔ بہترین قلمی نسخہ ہے جو میری نظر سے گزرا۔ یہ محمد صالح کمبو مصنف عمل صالح کے قلم سے لکھا ہوا ہے اور اس کے حاشیہ پر شاہجہان کے دستخط ثبت ہیں۔"

لیکن مولوی غلام یزدانی صاحب پروفیسر السنۂ شرقیہ گورنمنٹ کالج راجشاہی کا بیان ہے کہ

"میں نے اس بات کی تحقیق و تصدیق کے لیے اصل نسخہ کا بچشم خود ملاحظہ کیا۔ مگر اس پر محمد صالح الکاتب لکھا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کرنیل لیس نے اسے محمد صالح کمبو کس بنا پر قرار دیا۔

(دیباچہ عمل صالح مطبوعہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال)

اس عہد کی دیگر کتب تواریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ایک محمد صالح الکاتب یا میر محمد صالح خوشنویس میر عبداللہ مشکیں قلم کا

---

[1] خوشنویس مذکور کے حالات کے لیے بادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری کے صفحات ۱۴۴۔ ۵۵۵ اور ۶۷۹ ملاحظہ ہوں۔

[2] تاریخ ایلیٹ جلد ہفتم صفحہ ۱۲۳

فرزند تھا۔ جسے ۱۰۵۶ھ میں شاہی کتب خانہ کی داروغگی تفویض ہوئی تھی۔ چنانچہ مذکور ہے۔

"در سنہ ہزار و پنجاہ و شش ہجری خدمت داروغگی کتب خانۂ معلیٰ از تبدیل رشید ائے خوش نویس بار مفوض شدہ بود"

اور بہت ممکن ہے کہ اس حیثیت سے اس نے شاہی کتب خانے کے لیے کتابیں بھی نقل کی ہوں۔ اور دوسرا میر محمد صالح روشن قلم کا بھائی تھا۔ جسے بھائی کی وفات کے بعد فرمان نویسی کی خدمت سپرد ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے میر محمد صالح فرمان نویس اور میر محمد صالح خوشنویس داروغۂ کتب خانۂ معلیٰ دو جدا گانہ ہستیاں ہیں۔ اور عمل صالح میں دونوں کے مناصب الگ الگ مندرج ہیں۔ چنانچہ میر محمد صالح فرمان نویس پانصد بیست سوار کے منصب سے سرفراز تھا۔ اور میر محمد صالح داروغۂ کتب خانہ نصدی صد سوار کے منصب سے ممتاز تھا۔ میر محمد صالح فرمان نویس اور میر محمد صالح کمبو کو ایک ہستی تسلیم کرنا بھی قرین قیاس نہیں کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو شیخ عنایت اللہ کی طرح جسے کوئی خطاب نہ ملا تھا۔ اور جس کا ذکر دو تین بار نہایت شرح و بسط سے لکھا ہے۔ روشن قلم کا ذکر عمل صالح میں ضرور آتا۔ حالانکہ فرمان نویسی کی خدمت کا تذکرہ جو بادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری میں درج ہے۔ عمل صالح میں موجود ہے۔

عہدہ حاضرہ کے تمام مورخین شیخ عنایت اللہ کو (علیٰ حسب اختلاف الروایات) محمد صالح کمبو کا ہم زلف اور برادر حقیقی قرار دیتے ہیں۔ لیکن عمل صالح کے مطالعہ سے اس جماعت کا قول جو برادر حقیقی کا دعویدار ہے درست معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ محمد صالح نے اپنے نام کو ہر مقام پر "آل محمد" کے لقب سے زینت دی ہے اور یہ صرف سادات کے لیے جائز ہے۔ لیکن عنایت اللہ کو ہر جگہ شیخ عنایت اللہ لکھا ہے۔ ان مورخین کو یہ غلط فہمی غالباً "برادر کلاں" کے الفاظ سے پیدا ہوئی ہے جس سے محمد صالح نے شیخ موصوف کو ہر بار خطاب کیا ہے۔ لیکن فارسی زبان میں "برادر" کا خطاب عام ہے اور اس کا اطلاق برادر حقیقی، عم زادہ اور ہم زلف سب پر یکساں ہوتا ہے۔

ملا محمد صالح کی تاریخ پیدائش کے متعلق کوئی تحقیق نہیں ہو سکی اور وفات کے باب میں مختلف اور متضاد روایات بیان کی جاتی ہیں۔ چنانچہ سید محمد لطیف اپنی مشہور کتاب "تاریخ لاہور" کے صفحہ ۲۰۹ پر لکھتے ہیں کہ محمد صالح ۱۰۸۵ھ میں فوت ہوا اور صاحب تحقیقات چشتی اس کی وفات اس سے دس سال قبل بیان کرتے ہیں۔ لیکن تعجب انگیز یہ بات ہے کہ محمد صالح نے شیخ عنایت اللہ کی وفات کا ذکر جو ۱۰۸۲ھ میں واقع ہوئی تھی اپنی کتاب عمل صالح میں کیا ہے۔ ایسی صورت میں ۱۰۷۵ھ میں اس کا انتقال کر جانا کسی حالت میں بھی ممکن نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں عمل صالح کی وہ عبارت جو پبلک لائبریری لاہور کے قلمی نسخے کے اختتام پر مرقوم ہے۔ اور جو یہاں بجنسہٖ نقل کی جاتی ہے۔ اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ اس کا رشتۂ حیات ۱۱۲۰ھ تک منقطع نہیں ہوا تھا:۔

"ختم شد نسخۂ عمل صالح من تصنیف جامع الکمالات صوری و معنوی میاں محمد صالح سلم اللہ تعالیٰ روز یک شنبہ بتاریخ بست و ہفتم صفر سنہ ۲ جلوس والا مطابق سنہ ۱۱۲۰ھ"

یہ مورخ بھی اپنی وفات کے بعد اپنے آبائی مقبرہ میں شیخ عنایت اللہ کے پہلو میں دفن ہوا۔ یہ مقبرہ ایمپرس روڈ پر ریلوے کے جدید دفاتر کے متصل واقع ہے اور گنبد کمبواں کہلاتا ہے۔ یہ عمارت سنگ سرخ سے بنائی گئی تھی۔ اس کی شکل ہشت پہلو ہے۔ سکھوں کے دور حکومت میں اسے بارود خانہ میں تبدیل کیا گیا۔ انگریزی عہد میں یہ مقبرہ ایک کوٹھی ہو کر رہ گیا۔ چنانچہ ایک عرصہ تک یہ "سیمور" صاحب کی کوٹھی کہلاتا رہا۔ جس کے گنبد باورچی خانہ اور بگھی خانہ کے طور پر استعمال ہوتے رہے۔ اب اس کے ساتھ دو اور کمرے شامل کر کے اسے گرجے کے طور پر استعمال

کیا جا رہا ہے۔ آج کل یہ مقبرہ "سینٹ اینڈریوز پارش چرچ" کے نام سے موسوم ہے۔"

فاعتبروا یا اولی الابصار

گولڈنگ اور تھارن ٹن (۱۸۶۰ء — ۱۹۲۴ء)

کرنل ایچ۔ آر۔ گولڈنگ (H.R. GOULDING) کی کتاب قدیم لاہور (OLD LAHORE) ۱۹۲۴ء میں سول اینڈ ملٹری گزٹ پریس لاہور سے چھپ کر شائع ہوئی۔ یہ ان مضامین کا مجموعہ ہے۔ جو دو برس ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۳ء تک سول اینڈ ملٹری گزٹ میں مسلسل شائع ہوتے رہے تھے۔ مسٹر میکلیگن (MACLAGAN) نے اس کتاب کے پیش لفظ میں اس بات کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے کہ کرنل گولڈنگ نے یہ کتاب لکھ کر یورپین باشندوں کے متعلق جو معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ وہ قابلِ قدر ہیں۔ کرنل گولڈنگ کا تعلق لاہور کے ساتھ تقریباً نصف صدی تک رہا۔ لاہور اور اس کی عمارتوں سے کرنل گولڈنگ کو جو محبت تھی۔ یہ کتاب اس کا ایک ذریعۂ اظہار ہے۔ اس نے اس کتاب میں انارکلی کا مقبرہ۔ لارنس کا مجسمہ، بادشاہی مسجد اور بدھو کا آوا کے حالات شامل کئے ہیں۔ یہ کتاب قدیم لاہور، لاہور کی عمارات اور شاہراہوں وغیرہ وغیرہ کے حالات پر مشتمل ہے اور پچپن صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

کرنل گولڈنگ نے اپنی کتاب قدیم لاہور میں بطور ضمیمہ مسٹر جے۔ ایچ تھارن ٹن (J.H. THORNTON) سیکرٹری حکومت پنجاب کا ایک طویل مقالہ بھی شامل کیا ہے۔ یہ مقالہ ۱۸۶۰ء میں ایک (LAHORE) کے نام سے ایک محدود ایڈیشن کی صورت میں شائع ہوا تھا جو ایک مدت سے کمیاب تھا۔ ۱۹۲۴ء میں اسے مسٹر گولڈنگ نے اپنی کتاب میں بطور ضمیمہ دوبارہ شائع کر دیا۔

مسٹر تھارن ٹن کا مقالہ صفحہ ۵۶ سے شروع ہو کر صفحہ ۹۴ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ تاریخ لاہور کے متعلق ہے۔ یعنی لاہور کا نام اس کی تاریخ اور بنیاد۔ لاہور اسلامی دور سے پہلے۔ اسلامی دور میں اور سکھوں کی حکومت میں۔ یہ ایک تاریخی دستاویز ہے۔ دوسرا حصہ بیانیہ ہے۔ یعنی لاہور کا محل وقوع۔ رقبہ۔ مختلف ادوار میں شہر لاہور کی حالت۔ لاہور اسلامی دور سے قبل۔ اسلامی دور میں اور سکھوں کے زمانے میں۔

گولڈنگ ۱۹۲۴ء: کرنل گولڈنگ نے لاہور کا جو نقشہ اس کتاب میں پیش کیا ہے۔ وہ ہمارے زمانے میں بڑی حد تک بدل چکا ہے۔ بہت سے مقامات کے نام تبدیل ہو گئے ہیں۔ اور بہت سی عمارات کا نام و نشان تک مٹ چکا ہے۔ اگر قدیم لاہور کا یہ تذکرہ ہم تک نہ پہنچتا۔ تو بہت سی پرانی باتیں معلوم نہ ہو سکتیں۔ شہر لاہور کے متعلق تحقیق کرنے میں یہ کتاب نہایت کار آمد اور مفید ثابت ہو سکتی ہے مثلاً مقبرہ انارکلی کے سلسلے میں مصنف نے بتایا ہے کہ کس طرح اس عمارت کو گرجا کے طور پر مدتوں استعمال کیا جا چکا ہے۔ البتہ کرنل گولڈنگ کو مقبرۂ انارکلی کی اصلیت معلوم نہ تھی۔ اور اس افسانے کو حقیقت سمجھتا تھا کہ انارکلی شہنشاہ اکبر کی ایک کنیز تھی جسے ۱۵۹۹ء میں زندہ دفن کر دیا گیا تھا۔ اور شہنشاہ جہانگیر نے ۱۶۱۵ء میں یہ مقبرہ تیار کروایا تھا۔ برسبیل تذکرہ مصنف نے یہ نشان دہی بھی کی ہے۔ کہ بعض تاریخی عمارات میں سرکاری دفتر قائم رہے ہیں۔ اور بعض میں اہم شخصیتیں متمکن رہی ہیں۔ مثال کے طور پر ریلوے اسٹیشن کے قریب دائی انگہ کی مسجد میں لاہور کرانیکل کے ایڈیٹر مسٹر ہنری کوپ (HENRY COPE) ۱۸۵۰ء — ۱۸۶۰ء کے درمیانی عرصہ میں فروکش رہے تھے اور اس کے بعد یہ مسجد ریلوے ٹریفک مینجر کا دفتر بنی رہی تھی۔ اسی طرح محمد قاسم خاں جو شہنشاہ اکبر کا عزیز تھا۔ اس کے مقبرے کا حال ہے۔ محمد قاسم خان پہلوانوں کا مربی تھا چنانچہ اس کے مقبرے کو گنبد کشتی والا کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ سکھوں کے دور میں جمعدار خوشحال سنگھ نے اسے اپنے مکان کے طور پر استعمال کیا۔

حکومت پنجاب نے اس کو راجہ تیج سنگھ سے جائداد کے بدلے میں حاصل کیا۔ مارچ ۱۸۵۱ء سے ۱۸۵۲ء تک گورنمنٹ ہاؤس کی تعمیر جاری رہی۔ اب یہ مقبرہ گورنمنٹ ہاؤس میں شامل ہے۔ اور مسجد شاہ چراغ مدتوں اکونٹنٹ جنرل کا دفتر رہی ہے۔ اور جن دنوں مصنف نے یہ کتاب لکھی ہے۔ اس مسجد میں سشن کورٹ قائم تھی۔ جنرل پوسٹ آفس اب سے پہلے ایک پرانی بارک نما عمارت میں قائم تھا۔ یہ عمارت ۱۸۴۹ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ موجودہ جنرل پوسٹ آفس تعمیر کیا گیا جس کی عمارت بہت خوبصورت ہے جو بقول مصنف بیس برس پہلے تعمیر ہوئی۔ اس تمام علاقے میں فوجی عمارتیں گرا کر جنرل پوسٹ آفس، پبلک لائبریری اور سیکریٹریٹ تعمیر کیے گئے۔

اب جہاں گورنمنٹ کالج ہے، سکھوں کے عہد میں وہاں ایک فوجی بارک تھی۔ پرانی انارکلی میں فوجی بارکیں اور بنگلے تھے جن میں فوجی سپاہی اس وقت تک قیام پذیر رہے جب تک میاں میر کے قریب چھاؤنی کی تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ بہت سی پرانی بارکوں میں دفاتر وغیرہ قائم کیے گئے۔ انارکلی بازار اور گول باغ کے درمیان اس قسم کی دو رویہ بارکیں تھیں ان میں سے ایک میں لڑکوں کے لیے اور دوسری میں لڑکیوں کے لیے ہائی سکول قائم کیے گئے۔ انھیں بارکوں میں پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے دفاتر بھی تھے۔ ان بارکوں کو گرا کر پنجاب یونیورسٹی کی کیمیکل لیبارٹری تعمیر کی گئی۔ یہیں دن کے بارہ بجے توپ داغی جاتی تھی پیشتر اس کے کہ یہ توپ ٹیلیگراف دفتر لے جائی گئی۔ پھر وہاں سے لارنس گارڈن (جناح باغ) میں منتقل کر دی گئی۔

گورنمنٹ کالج کی عمارت ۱۸۷۷ء میں مکمل ہوئی۔ یہاں بھی پہلے ایک پرانی فوجی بارک تھی۔ گھوڑا اسپتال اور اس کے متعلق کالج جب تعمیر ہونے لگا، تو کرنل گولڈ نگ نے ہی اس کا محل وقوع تجویز کیا۔ اور سول اینڈ ملٹری گزٹ کے ذریعہ حکومت کو رائے دی کہ موجودہ محل وقوع ہی اس عمارت کے لیے موزوں ترین ہے۔ اس سے قبل گھوڑا اسپتال ایک پرانے بنگلے میں تھا۔ جو اب میو اسپتال میں ضم ہو گیا ہے۔

شالامار باغ کے متعلق مصنف نے بیان کیا ہے کہ ایک زمانے میں یورپین جوڑے ماہ عسل (ہنی مون) منانے کے لیے وہاں جایا کرتے تھے۔ ۱۸۴۶ء کی بات ہے۔ ان دنوں اہالیان لاہور کے لیے شالامار یا شاہدرہ تک کا سفر آسان نہ تھا، کیونکہ راستے اتنے محفوظ نہ تھے جتنے آج ہیں۔ وہاں تک جانے کے لیے خاص انتظامات کرنے پڑتے تھے۔ لاہور اور ان مقامات کے درمیان آبادی نہ تھی۔ شالامار کے متصل چبوترے کے دائیں جانب جو ڈاک بنگلہ تھا، وہ ہنی مون کے لیے اکثر استعمال کیا جاتا تھا۔ ہوا خوری کے لیے جو یورپین لاہور آتے تھے۔ وہ بھی یہاں ہی ٹھہرنا پسند کرتے تھے۔ آخر میں مصنف نے شالامار باغ کے آموں کے درخت گرائے جانے پر سخت احتجاج کیا ہے۔ یہ درخت اس لیے گرائے گئے تھے تاکہ ان کی جگہ گلاب کے پودے لگائے جائیں۔

شاہدرہ کی سیر ڈولیوں اور ڈاک گاڑیوں کے ذریعہ کی جاتی تھی۔ یہ سفر بقول مصنف کافی مہنگا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد جب شاہدرہ کا ریلوے اسٹیشن تعمیر ہوا۔ تو اسٹیشن سے ملحق رہائشی کوارٹر بھی بنائے گئے۔ جن میں یورپین افسر رہنے لگے۔ مقبرہ جہانگیر دریائے راوی کے کنارے واقع ہونے کی وجہ سے ہمیشہ سیلاب کے خطرے سے دوچار رہتا ہے۔ اس خطرے سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ۱۸۵۶ء میں چھ ہزار روپیہ کی رقم چیف کمشنر نے منظور کی تھی تاکہ مقبرے کو سیلاب کی زد سے محفوظ رکھا جا سکے۔ بارہ دری میں ۱۸۶۰ء کے بعد کچھ عرصے تک یورپین سپرنٹنڈنٹ کا قیام تھا۔ جس کے ماتحت راوی کا پل اور کشتیوں کا عملہ تھا۔ اس کے بعد یہ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کا رسٹ ہاؤس کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ چھوٹے راوی کا پل ۱۸۵۲-۵۴ء میں لفٹننٹ فیگن (FAGAN) انجینئر انچارج نے تعمیر کیا تھا۔ یہ اتنا ناقص تھا کہ اس کا نام فیگن کی حماقت پڑ گیا۔ کیونکہ جب سیلاب آتا تھا۔ تو چھوٹے راوی کا پانی پل کو پار کر کے قلعے کی دیوار تک پہنچ جاتا تھا۔ اس طرح اس پل کی تعمیر

محض بے کار ثابت ہوئی۔

لاہور ریلوے اسٹیشن سے شالامار جانے والی سڑک کے سیدھی جانب ایک مقام بدھو کا آوا کہلاتا ہے۔ بدھو کا آوا دراصل معدوم ہو چکا ہے۔ جہاں وہ واقع تھا، وہاں ریلوے اسٹیشن کا ورکشاپ اور گودام تعمیر ہو چکے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ایک زمانے میں بدھو کا آوا لاہور کا سب سے بڑا آوا تھا۔ اور اس کے ساتھ ایک افسانہ بھی مربوط ہے۔ مورخین کا خیال ہے کہ یہ آوا اصل میں بدھو کا نہیں تھا بلکہ سدھو کا آوا تھا۔ سدھو شاہی کمہار تھا۔ شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں شاہی عمارات، محلات اور امراء کے مکانات کے لیے پختہ اینٹوں کی فراہمی اس کے ذمہ تھی۔ سدھو کے متعدد آوے تھے۔ جس میں سب سے اہم آوے کا نام سدھو کے لڑکے کے نام پر بدھو کا آوا پڑ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ میاں میرؒ کے مرید عبدالحق درویش ایک روز ہاتھ تاپنے بدھو کے آوے پر گئے، لیکن بدھو کے ملازمین نے درویش کو وہاں سے بھگا دیا۔ اس پر انھوں نے بد دعا دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آوا بے کار ہو گیا۔ بدھو نے ہزار توبہ کی، معافی مانگی۔ لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج میں ایک فرانسیسی جنرل تھا جس نے بدھو کے آوے کے اوپر ایک خوبصورت مکان بنایا۔ جسے ۱۸۵۰ء میں اس لیے گرا دیا گیا کہ اس علاقے میں چھاؤنی تعمیر ہونا تھی۔ چنانچہ کرنل گولڈنگ نے اس حرکت کے خلاف شدید احتجاج کیا ہے۔ یہیں بدھو کے آوے کی بارہ دری بھی تھی۔ جس کی اینٹوں کو فوجی بارکیں بنانے کے کام میں لایا گیا۔ بدھو کی قبر یا چھتری اب شکستہ حالت میں ہے۔

کرنل گولڈنگ نے مال روڈ کی تعمیر کا حال تفصیل سے بیان کیا ہے۔ یہ سڑک برصغیر پاک و ہند کی بہترین سڑکوں میں شمار ہوتی ہے۔ لفٹننٹ کرنل نیپئر (NAPIER) نے جو ان دنوں سول انجینئر تھے۔ سنہ ۱۸۵۱ء میں اس سڑک کا منصوبہ تیار کیا۔ یہ سڑک انارکلی سے میاں میر تک جاتی ہے۔ کرنل نیپئر نے اس سڑک کی تعمیر پر دس ہزار چار سو اڑتالیس (۱۰۴۴۸) روپیہ خرچ ہونے کا تخمینہ لگایا۔ اس کی نیچے کی سطح پختہ اینٹوں اور اوپر کی سطح کنکر کی ہونا تھی۔ تاہم حکومت ہند کا اندازہ تھا کہ یہ سڑک شاہراہ عام ہو گی۔ اس لیے اس کو مضبوط بنانا فضول خرچی نہیں بلکہ کفایت شعاری ہو گی۔ یعنی اینٹوں کی بجائے اوپر اور نیچے کی سطحیں کنکری کی ہونا چاہئے۔ اس سڑک کا نام مال روڈ قرار پایا۔

انارکلی سے میاں میر جانے والی سڑک اپر مال کیوں کہلائی جانے لگی۔ اس کا علم نہیں۔ ابتدا میں صرف ایک ہی مال روڈ تھی جس کو اب لوئر مال روڈ کہا جاتا ہے۔ اور جو ڈپٹی کمشنر کی عدالت سے ملتان روڈ تک واقع ہے۔ ان دنوں لاہور قدیم کی معاشرتی زندگی کی آماجگاہ یہی سڑک تھی جو اب لوئر مال کہلاتی ہے۔ اور جو پہلے کی نسبت کسمپرسی کے عالم میں ہے۔ یہاں سے گول باغ بھی کچھ دور نہیں۔ جہاں ہفتے میں دو بار بینڈ بجا کرتا تھا۔ غرض کہ تاریخی مال روڈ وہ ہے۔ جو سیدھی انارکلی سے میاں میر جا رہی ہے۔ میاں میر سے آتے ہوئے نہر پار کرنے کے بعد سڑک کے دونوں طرف چٹیل میدان تھے۔ ایک دو منزلہ بنگلہ بھی تھا۔ جو بعد میں مہاراجہ پٹیالہ کی ملکیت قرار پایا۔ اور جس میں لاہور کا پادری (بشپ آف لاہور) رہا کرتا تھا۔ اور آگے چل کر اس سڑک پر لارنس گارڈن۔ لارنس ہال، منٹگمری ہال اور گورنمنٹ ہاؤس ہیں۔ پھر قدیم پنجاب کلب ہے۔ اس کے بعد میڈوز ہوٹل پھر چیرنگ کراس۔ لارنس کا مجسمہ، مسجد شاہ چراغ، جنرل پوسٹ آفس، ٹیلیگراف آفس، ایف۔ سی کالج، عجائب گھر، ٹولنٹن مارکیٹ (TOLLINTON MARKET) الحمرا اسٹورز واقع ہیں۔

غرض کہ مصنف نے ان تمام مشہور عمارات کا حال بیان کیا ہے۔ جو دور انگریزی میں تعمیر ہوئیں۔ جو سابقہ ادوار کی یادگاریں تھیں۔ لیکن ان کی شکل بدل گئی ہے۔ سب سے قیمتی معلومات وہ ہیں جو ان عمارات کے متعلق ہیں۔ جن کا نام و نشان اب نہیں ملتا۔ لیکن جو مصنف

کے زمانے تک کسی نہ کسی صورت میں موجود تھیں۔

پرانی تاریخی عمارات مثلاً شاہدرہ، شالامار باغ، بادشاہی مسجد، مٹی ہوئی یادگاریں، مثلاً بدھو کا آوا، سب کا حال اک یورپین مصنف کے نقطۂ نظر سے تحریر کیا گیا ہے۔

تھارن ٹن ۱۸۶۰ء: مسٹر جے۔ ایچ تھارن ٹن (J.H. THORNTON) نے اپنے مقالے کے تاریخی حصے میں شہر لاہور کی تاریخ بیان کی ہے۔ یہ مقالہ ۱۸۶۰ء میں لکھا گیا۔ ابتدا میں انھوں نے اپنے ماخذ پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے بیان کیا ہے کہ اسلامی دور سے پہلے لاہور کے متعلق کوئی مبسوط جائزہ نہیں ملتا۔ البتہ ادھر ادھر بکھرے ہوئے اشارات ضرور پائے جاتے ہیں، مثلاً راجپوتانہ اور کشمیر کے وقائع کے سلسلے میں لاہور کا ذکر بھی مل جاتا ہے۔ اسلامی زمانے میں شہر لاہور کی مسلسل تاریخ ہماری رہنمائی کرنے کے لیے موجود ہے۔ لیکن اس تاریخ کی نوعیت عمومی ہے۔ تاریخ فرشتہ، نظام الدین احمد اور عبدالقادر کی تاریخوں میں یا تاریخ الفی یا اقبال نامہ جہانگیری میں اس شہر کے مخصوص حالات پر روشنی نہیں ڈالی گئی۔ عبدالمجید لاہوری کی تصنیف یا سفینۃ الاولیا یا دوسری کتابیں جو مسلمان بزرگوں کے مقبروں سے متعلق بہت سی دلچسپ معلومات کو نظر انداز کرتی ہیں۔ اور غیر دلچسپ جزویات کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ لاہور کے متعلق جو جو افسانے اور روایات عوام کی زبانوں پر ہیں۔ وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے اتنی مبالغہ انگیز ہیں کہ نہ تو ان سے معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ اور نہ اُن میں کوئی لطف ہی موجود ہے۔ یہاں کے لوگ اپنی تاریخ سے بے پروا ہیں۔ ہندوؤں کی روایات لاہور کو شری رامچندر جی کے بیٹے لوہ سے منسلک کرتی ہیں۔ اس کے بعد ہندو راجاؤں کے عہد میں لاہور کو جنگ اور شجاعت کی روایات میں اہم مقام حاصل رہا ہے۔ ان روایات سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ لاہور کی بنیاد راجپوتوں نے ڈالی۔ لاہور راجپوت ریاستوں میں سے قدیم ترین ریاست کا دارالحکومت تھا۔ اور جب ساتویں صدی سے دسویں صدی عیسوی تک ہندوستان پر مسلمانوں کے حملے ہوئے۔ تو لاہور ہندو طاقت کا گڑھ تھا۔

لاہور کا نام تاریخ میں مختلف طریقوں سے آیا ہے۔ موجودہ شہر لاہور کے علاوہ بھی لاہور نام کے شہر پرانے زمانے میں موجود تھے۔ ایک لاہور افغانستان میں بھی تھا جہاں کسی زمانے میں راجپوتوں کی ایک نوآبادی تھی۔ دوسرا لاہور پشاور کے ضلع میں تھا۔ لوہآر کے نام سے ایک شہر راجپوتانے کی ریاست میواڑ میں تھا۔ مسلمان مصنفین نے لاہور۔ لوہآر۔ لوہور۔ لہاور۔ لھاور۔ لہاور۔ لہانور۔ لہاوآر کے نام سے لاہور کا ذکر کیا ہے۔ راجپوتانے کے وقائع میں لاہور کا نام لوہ کوٹ۔ لاوپور اور اس سے پہلے لوہاوآر آیا ہے جو غالباً لاہور کا صحیح ترین نام بھی ہے۔ البیرونی نے بھی (جو محمود غزنوی کا معاصر اور مصاحب تھا اور جو ہندوستان کے ادب میں مہارت رکھتا تھا) یہ نام استعمال کیا ہے۔ لوہاوار سے مطلب قلعۂ لوہ ہے اور لوہ کوٹ سے بھی یہی مراد ہے۔

لاہور کی بنیاد کب پڑی، یہ کہنا تقریباً ناممکن ہے۔ لیکن بہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کے اختتام سے پہلے لاہور ایک بڑی ریاست کا دارالحکومت تھا۔ اسی طرح یہ دعویٰ بھی کیا جا سکتا ہے کہ اگر پہلی صدی عیسوی میں لاہور موجود تھا۔ تو کم از کم اس کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی۔

لاہور نام کا کوئی شہر یونانی مورخین کے علم میں نہ تھا۔ اور نہ سکندر اعظم کے حملے کے سلسلے میں اس شہر کا کہیں نام آتا ہے۔ برنیز (BURNES) نے سانگلہ اور ایرین (ARRIAN) نے کتھوئی یا کتھری کے نام کے دو شہروں کا تذکرہ کیا ہے جو راوی کے کنارے اسی جگہ آباد تھے جہاں اب لاہور واقع ہے تاہم اس میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ سکندر اعظم نے راوی کو لاہور کے قریب سے

پار کیا ہوگا اور وہ وہیں سے گزرا ہوگا۔ جہاں اب لاہور جدید آباد ہے۔ قاہرہ کے رہنے والے یونانی الاصل جغرافیہ نویس تال می (PTOLEMY) نے جو ۱۵۰ء میں زندہ تھا۔ ایک شہر کا ذکر کیا ہے جو لابوکلہ (LABOKLA) کے نام سے مشہور تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ شہر لاہور سے پچیس میل کے فاصلے پر آباد ہوگا۔ اس لحاظ سے اسے لاہور قدیم کہا جا سکتا ہے۔

تھارن ٹن نے اسلامی دور میں لاہور کی تاریخ بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے۔ غزنویہ خاندان کا لاہور سے تعلق یوں ظاہر ہوتا ہے کہ مسعود ثانی نے ۱۰۹۸ء سے ۱۱۱۴ء تک لاہور کو اپنا پائے تخت بنایا۔ غوریوں اور خاندانِ غلاماں کے دور میں لاہور حکومت کے خلاف سازشوں کا مرکز تھا۔ ۱۲۴۱ء میں چنگیز خاں کی افواج نے لاہور کو فتح کیا اور خوب تاخت و تاراج کیا۔ ۱۲۸۵ء میں شہزادہ محمد جو سلطان غیاث الدین بلبن کا بیٹا تھا۔ منگولوں سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ اور راوی کے کنارے امیر خسرو کو منگولوں نے گرفتار کر لیا۔ خلجی اور تغلق خاندان کے زمانے میں لاہور کی کوئی سیاسی اہمیت نہ تھی۔ البتہ گکھڑوں نے اس کو لوٹا۔ اور مغل یہاں آباد ہو گئے۔ چنانچہ مغلوں کی آبادی اب تک مغلپورہ کے نام سے موجود ہے۔ ۱۳۹۸ء میں تیمور نے لاہور کو فتح کیا۔ لیکن لوٹ مار نہ کی۔ غالباً یہ شہر متمول نہ تھا۔ اس کے بعد لاہور کبھی شاہان دہلی کے تسلط میں آجاتا تھا۔ اور کبھی گکھڑوں کے ہاتھ میں چلا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اس پر لودھیوں کا قبضہ ہوا۔

اس کے بعد مغل دورِ حکومت شروع ہوتا ہے۔ ۱۵۲۴ء میں بابر نے لاہور کو فتح کیا۔ اگلے سال بابر نے دوبارہ فوج کشی کی۔ ہمایوں۔ اکبر۔ جہانگیر۔ شاہجہان اور اورنگ زیب کا دَور لاہور کی تاریخ کا سنہری دور ہے۔ یہ شہر شاہانِ وقت کی اقامت گاہ رہا۔ یہاں باغ لگائے گئے۔ مقبرے اور مسجدیں تعمیر ہوئیں۔ آبادی بڑھی۔ اور ابوالفضل کے الفاظ میں "یہ شہر تمام قوموں کی آماجگاہ بن گیا۔" آج بھی اس شہر میں مغل عمارات ادھر ادھر بکھری ہوئی ہیں۔ ہمایوں نے یہ شہر اپنے بھائی کامران کے حوالے کر دیا۔ شیر شاہ سوری اور ہمایوں کی طویل جنگ کے دوران لاہور مغلوں کا قلعہ تھا۔ جلاوطنی کے بعد ہمایوں جب ایران سے ہندوستان میں واپس آیا۔ تو اس نے ۱۵۵۴ء میں جشن منایا۔ ہمایوں کے مرنے پر یہ شہر اکبر کے بھائی مرزا حکیم کے قبضے میں آیا۔ جو ۱۵۶۳ء میں لاہور کا گورنر تھا۔ ۱۵۸۴ء سے ۱۵۹۸ء تک لاہور اکبر کا دارالحکومت رہا۔ اکبر نے شہر سے باہر دو عمارات بنوائیں۔ ایک کا نام خیر پور تھا۔ جو یہودیوں۔ آتش پرستوں اور مسلمانوں کے واسطے تعمیر ہوئی۔ اور دوسری عمارت کا نام دھرم پورہ تھا۔ جو ہندوؤں کے لیے وقف تھی۔ ہفتے وار جلسے ہوتے تھے۔ جس میں بیربل۔ فیضی۔ ابوالفضل اور دوسرے آزاد خیال علما و فضلا حصہ لیتے تھے۔ خیر پور کا ایک حصہ اب بھی امتدادِ زمانہ سے بچ رہا ہے۔ جو دارا نگر کے قریب میاں میر والی سڑک کے بائیں جانب موجود ہے۔ جہانگیر کو یہ شہر بہت عزیز تھا۔ جب جہانگیر تخت نشین ہوا۔ تو شہزادہ خسرو نے اس سے بغاوت کی اور لاہور پر قابض ہو گیا۔ جہانگیر کے حکم سے خسرو کے خلاف فوج کشی کی گئی۔ شہر لاہور سے سات سو قیدی باہر لائے گئے۔ اور ان کو قلعہ میں بند کیا گیا۔ جہانگیر کو یہ شہر اتنا عزیز تھا۔ کہ اس نے آرزو کی کہ وہ مرنے کے بعد بھی یہیں دفن کیا جائے۔ چنانچہ شاہدرہ میں جہانگیر کا پُرعظمت مقبرہ آج بھی موجود ہے اور نور جہاں بیگم کی بارہ دری جو اس کی آخری آرامگاہ ہے وہ بھی یہیں واقع ہے۔

شاہجہاں کے دور میں لاہور میں امن و امان رہا۔ اورنگ زیب کے برسرِ حکومت آنے پر لاہور میں دارا شکوہ کی ہمدردی کی ایک لہر پیدا ہوئی۔ دارا شکوہ لاہور میں رہتا تھا اور اہلِ لاہور میں بے حد مقبول تھا۔ دارا شکوہ مشہور بزرگ میاں میرؒ کا مرید تھا۔ اورنگ زیب نے دارا شکوہ کی جائداد ضبط کر کے اس کی دولت سے بادشاہی مسجد بنائی۔ دورِ مغلیہ کے انحطاط اور سکھوں کے عروج۔ نادر شاہ و احمد شاہ ابدالی۔ شاہ زمان کے حملوں کے دوران میں لاہور پر جو کچھ بیتی مصنف نے اس کا حال مفصل بیان کیا ہے۔

. . .

تھارن ٹن کے مقالے کا دوسرا حصہ بیانیہ ہے۔ مصنف نے سب سے پہلے لاہور کے رقبے پر نظر ڈالی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ لاہور کا رقبہ اس سے بہت بڑا ہے۔ جتنا آج شہر لاہور گھیرے ہوئے ہے۔ بعض مصنفین کا خیال ہے کہ لاہور کے مختلف حصے تاریخ کے مختلف ادوار میں اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ لیکن یہ وسیع رقبہ کسی ایک وقت میں پورے کا پورا آبادی سے معمور نہیں رہا ہے۔ تاہم یہ ظاہر ہے کہ لاہور کا رقبہ پہلے چھتیس ۳۶ قطعوں پر مشتمل تھا۔ ان کو گزر بھی کہتے تھے۔ جس میں سے جدید شہر لاہور میں صرف نو قطعے شامل ہیں۔ گویا یہ شہر سکڑ گیا ہے۔ بعض مصنفین کا خیال ہے کہ شہر لاہور اپنے موجودہ رقبے سے کبھی نہیں بڑھا۔ چنانچہ کھدائی کی جائے تو مقبروں اور باغ کی دیواروں کے نشان پائے جاتے ہیں جو اس بات کی روشن دلیل ہیں۔ کہ پرانا لاہور بھی اسی رقبے کے اندر آباد تھا۔ غالباً یہ شہر بہت گنجان تھا۔ امرتسر کی طرف جانے والی سڑک پر سیدھے ہاتھ کی جانب ایک ٹوٹی ہوئی مسجد ہے جو عیدگاہ کہلاتی ہے۔ چنانچہ یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ کہ یہ مسجد پرانے لاہور کے درمیان کہیں واقع ہو گی۔ اگرچہ یہ موجودہ لاہور سے تین میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اکبر کے زمانے کے ایک مصنف نے لاہور کے ایک قطعہ کے متعلق بیان کیا ہے کہ وہ لاہور کا سب سے آباد حصہ ہے۔ لیکن یہ قطعہ اب ویران ہے اور موجودہ شہر سے ایک میل کے فاصلے پر ہے۔ چنانچہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ شاہجہان کے دور میں جب یہ شہر اپنے عروج پر تھا۔ اس کا رقبہ سولہ سترہ میل ہو گا۔ قدیم لاہور کا وہ حصہ جو شہر پناہ کے باہر واقع ہے۔ کسی زمانے میں بڑا گنجان آباد تھا۔ جس میں لمبے لمبے بازار تھے۔ جو شہر پناہ کے دروازے تک پہنچے ہوئے تھے۔ شہر پناہ کے اندر اور باہر بسنے والی آبادی کے درمیان مقبرے۔ باغات اور مسجدیں تھیں۔ موتی محل کے آس پاس جو قدیم لاہور میں واقع ہے۔ اب بھی سونے چاندی کے سکے اور جواہرات تیز بارش کے بعد نکل آتے ہیں۔ لاہور کی عظمت کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ خصوصاً اس لیے کہ بہت کم ایسے شہر ہوں گے۔ جو لوٹ مار۔ بدنظمی کا اس قدر شکار رہے ہوں۔ جتنا لاہور انگریزی عملداری سے پیشتر ایک سو بیس برس تک رہا۔ آٹھ مرتبہ احمد شاہ درانی کی فوجیں لوٹ مار کرتی ہوئی یہاں سے گزریں۔ مرہٹوں اور سکھوں نے اس کی تباہی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ کچی اینٹوں کی بنی ہوئی عمارات خاص طور پر زیر زمین ہو گئیں۔ اس لیے کہ موسم کا مقابلہ کرنا اس قسم کی عمارات کے لیے مشکل تھا۔ ہندوؤں سے لے کر پٹھانوں تک کے زمانے تک اس شہر میں قابلِ ذکر عمارات تعمیر نہیں ہوئیں۔ صرف مغل دور میں اس قسم کی اہم عمارات بنائی گئیں۔ یہ عمارتیں مغل فن تعمیر اور کاریگری کا نمونہ ہیں۔

تھارن ٹن نے صناعوں اور کاریگروں کی بے حد تعریف کی ہے۔ ان کی کاریگری کے نمونوں کو بے حد سراہا ہے کہ انھوں نے رقبہ کی حد بندی میں کمال دکھایا ہے۔ تراشے ہوئے پتھر کے پائے اور ان میں تزئین و آرائش کا استعمال۔ ستونوں کے اندر لچکیلی کمانیں۔ کمانوں کی شکلوں پر مخصوص و دلچسپ تزئین۔ سنگ مرمر پر عقیق و فیروزہ اور دوسرے قیمتی پتھروں کے ٹکڑے جمانے کا کام۔ مورچہ بند منڈھیریں۔ طشتری نما گنبد۔ اندرونی گنبدوں میں بیل بوٹوں اور کتبوں کے شاہکار۔ سنگ مرمر کی کھودی ہوئی جالیوں کی بہار۔ پتھروں پر غیبت کاری۔ نگار خانوں میں نقش و نگار۔ محلات کے اندرون سقفی حصوں پر رنگین شیشوں کا حیرت انگیز کام اس دور کی سنگی تعمیر کاری کی ناقابلِ فراموش یادگاریں ہیں۔

مصنف نے مغل عمارات کے علاوہ اس دور میں جو صنعت و حرفت میں ترقیاں ہوئیں اس کا بھی حال لکھا ہے کہ لاہور کس طرح مشرق کی اہم ترین منڈی بن گیا۔ پھر اس کے بعد سکھوں کی حکومت میں لاہور کی عمارات کس طرح تباہ ہوئیں۔ ان حالات کے علاوہ آخر میں مغل اور سکھ فن تعمیر پر بھی اظہار خیال کیا ہے اور لاہور میں مغل اور سکھ عمارتوں کے جو نمونے پائے جاتے ہیں ان سے فن تعمیر کے متعلق اہم نتائج بھی اخذ کیے گئے ہیں۔ تھارن ٹن کی یہ کتاب LAHORE اس دور کی اہم ترین کتاب ہے۔ جو لاہور کی قدیم تاریخ پر ایک امٹ کارنامہ ہے بلکہ یہ مختصر تاریخ لاہور کے دوسرے مورخین کی ضخیم تاریخی کتابوں پر بھی بھاری ہے۔

نور احمد چشتیؒ (المتوفی ۱۲۸۴ھ / ۱۸۶۷ء)

مولوی نور احمد نام تخلص چشتی۔ آپ کے بزرگوں کا وطن ایران تھا۔ ان کے اجداد میں سے مولوی محمد عاقل ہمایوں بادشاہ کے ہمراہ ہندوستان آئے۔ اور مدت تک دکن میں بعہدہ ہائے جلیلہ سرفراز رہے۔ ۹۵۴ھ میں مولوی محمد عاقل صاحب کے صاحبزادے مولوی عنایت اللہ اور مولوی نظام الدین اپنے وطن ایران واپس چلے گئے اور وہاں اولاد شاہ طہماسپ کی اتالیقی کی خدمت انجام دیتے رہے۔ نادر شاہ کے عہد میں مولوی ضیاء الحق و بہاء الحق خلف مولوی عنایت اللہ دوبارہ ہندوستان تشریف لائے۔ اس وقت مولوی نظام الدین ان کے ہمراہ تھے۔ یہ خاندان اپنی علمی فضیلت کی وجہ سے مشہور رہا۔ اور اپنے علم کی وجہ سے ہمیشہ سرفراز رہا۔

چنانچہ مولوی احمد بخش یکدل (ابن غلام حسین ابن محمد ابراہیم ابن ضیاء الحق) جو مولوی نور احمد چشتی کے والد بزرگوار تھے ان کو دیوان دینا ناتھ کی سرکار میں خصوصیت حاصل تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دیوان امرناتھ کے اتالیق مقرر ہوئے۔ یکدل عربی، فارسی کے متبحر عالم تھے چنانچہ دیوان امرناتھ نے ان کے سایہ عاطفت میں خوب ترقی کی۔ اسی اثنا میں ملک سکندر خان وکیل نکیرہ لاہور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ملاقات کے لیے آئے تو انھوں نے ضمناً پوچھا کہ کیا لاہور میں کوئی مولوی بہاء الحق و ضیاء الحق کی اولاد میں سے ہے۔ انھوں نے مولوی احمد بخش یکدل کا نام لیا جن سے ملاقات کے بعد وہ بہت محظوظ ہوئے۔ اسی دوران میں ملتان فتح ہو گیا۔ اور اس فتح کی خبر سرکار لندن کو بھیجنے کے لیے مولوی احمد بخش ہی کے نام قرعہ پڑا۔ چنانچہ تاریخ میں اس مراسلہ کی نقل آج تک محفوظ ہے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی خواہش تھی کہ وہ مولوی یکدل کو سکھ سرکار میں عہدہ جلیلہ سے سرفراز کرے لیکن مولوی یکدل کی متوکلانہ طبیعت نے اپنے موروثی پیشہ معلمی کو ترجیح دی۔ لیکن اس پر بھی ایک چاہ موضع لیاڑا الہ شریف پور، تلوارہ اور کی تھتی اور ایک موضع جگ پوار۔ اور ایک ہوشیارپور اور ایک جالندھر میں عطا کیا۔ اس کے علاوہ موضع ساندہ میں ایک باغ جس کی زمین چالیس بیگھہ ہے عنایت کیا جس کی آمدنی چھ سو روپیہ سالانہ تھی۔

مولوی غلام حسین جو مولوی بہاء الحق کی اولاد میں سے تھے اور جن کی وساطت سے مولوی احمد بخش یکدل نے سرکار دیوان امرناتھ تک رسائی حاصل کی تھی۔ جب وہ کابل سے واپس آئے اور لاہور میں بدستور اس خاندان عالیشان کے اتالیق مقرر ہوئے تو پھر مہاراجہ نے وظیفہ میں اضافہ کر دیا۔ جو مولوی غلام حسین، مولوی احمد بخش یکدل و مولوی نور احمد چشتی کو سرکار انگریزی کے خزانے سے باقاعدہ ملتا رہا۔

مولوی غلام حسین جید عالم دین ہونے کے علاوہ عابد و زاہد مشہور تھے۔ آخری عمر میں تیس برس شب بیداری میں بسر کی۔ صحبت غربا و فقرا ان کو بہت پسند تھی۔ ملاقات امرا سے حتی الامکان احتراز کرتے تھے۔ اگر چار و ناچار کسی امیر کے ہاں جانا ہو گیا تو دیر تک وہاں اجلاس نہ فرماتے تھے۔ علائق دنیا سے پہلو تہی کرتے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ نماز عشا کے بعد نجف اشرف کی طرف رخ کر کے بیٹھ جاتے اور مولانا جامی کا یہ مناقب نہایت خشوع و خضوع سے پڑھتے ؎

علی شاہ مردان امام کبیر

کہ بعد از نبی شد بشیر و نذیر

اور نیم شب کے وقت حافظ شیرازی کے اس مناقب کو بصمیم قلب پڑھتے ؎

مہرم حسین است و حسن — آرام جان و جسم و تن

زبان میں اللہ تعالےٰ نے تاثیر بخشی تھی۔ تمام اہل محلہ بیدار اور سراپا گوش ہو کر یہ مناقب سنتے تھے۔

مولوی احمد بخش یکدل کو مولوی غلام حسین[1] سے ایک خاص لگاؤ تھا۔ اکثر ان کی خدمت میں حاضر رہتے اور ان کے فیض سے فیض یاب ہوتے۔ وہ مولوی یکدل صاحب کو ہمیشہ یہی تلقین کرتے۔ کہ اے احمد بخش یکدل تم دنیا دار ہو۔ اور مجھ کو سفر عاقبت درپیش ہے مجھے گھریلو معاملات میں تکلیف نہ دیا کرو۔ یہ بزرگ جن کی صحبت میں مولوی نور احمد چشتی اور اُن کے والد مولوی احمد بخش یکدل نے ایک مدت فیض حاصل کیا تھا۔ سنہ ۱۲۶۰ھ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ سرور لاہوری نے کیا خوب تاریخ وفات کہی ہے ؎

مولوی شیخ جنت اہل بہشت	مدح خوان علیؑ وصیٔ نبیؐ
سرور زار سال ترحیلش	گفت پاکیزہ دل غلام علی

۱۲۶۰ھ

نور احمد چشتی کے والد مولوی احمد بخش اپنے وقت کے مشاہیر ادبا میں شمار ہوتے تھے۔ شروع شروع میں لاہوری منڈی میں آپ ایک مدرس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ بعد ازاں راجہ دینا ناتھ کے خاندان کے اتالیق مقرر ہوئے۔ مدرسہ سرکار انگریزی میں بھی معلمی کے خدمات بجالاتے رہے۔ نظم و نثر میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ آخر عمر میں ایک مرتبہ راجہ دینا ناتھ کے ایما سے شاہجہان آباد میں دیوان کدار ناتھ کے صاحبزادے کی شادی کی تقریب میں گئے۔ اچانک بعارضہ فالج وہاں سنہ ۱۲۶۹ھ میں وفات پائی۔

مولوی نور احمد چشتی سنہ ۱۲۴۴ھ میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ اُن کی والدہ میاں محمد بخش صحاف کی صاحبزادی تھیں۔ ابھی چشتی کی عمر چھ سال کی تھی کہ والدہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اور والد کی سرپرستی میں علم و ادب کی تکمیل کی۔ دستور کے مطابق عربی و فارسی میں زبردست استعداد بہم پہنچائی۔ اور اس دور کے مشاہیر میں اُن کا شمار ہونے لگا۔ حسب معمول بزرگان مدرسے میں لڑکے پڑھانے پر مامور رہے۔ دیوان کرپا رام۔ بیلی رام۔ ہری سنگھ سائروالا۔ اور دیوان بھیم سین ان سے عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ سنہ ۱۸۴۹ء میں حسب ایما ڈاکٹر لوکن مدت تک فوجی افسران بھی اُن سے استفادہ کرتے رہے۔ اور انھوں نے بھی اپنے فرائض منصبی نہایت تندہی اور جانفشانی سے انجام دیے۔ اس درس تدریس کے دوران میں انھوں نے تحفۂ چشتیہ[1] شعر صرف و نحو اردو۔ فارسی و عربی تصنیف کی۔ یہ کتاب چار مرتبہ شائع ہوئی۔ دوسری کتاب یادگار چشتی[2] (حسب الحکم حکام انگلشیہ) جس میں دستور اہل اسلام پنجاب سے بحث کی گئی ہے شائع ہوئی۔ یہ کتاب مطبع کرانیکل میں طبع ہو کر لندن اور فرانس میں بھیجی گئی۔ پھر ایک کتاب عجائبات چشتی[3] صرف و نحو اور مصادر کی تشریح میں مرتب کی۔ اور ایک دوسری کتاب خیالات[4] دانش لطائف و ظرائف پر مشتمل شائع کی۔ یہ دونوں کتابیں فارسی میں تالیف ہوئی ہیں۔ اور اہل ذوق آج تک ان سے مستفید ہوتے ہیں۔

مسٹر ولیم کولڈ سٹریم اسسٹنٹ کمشنر لاہور کے حکم سے انھوں نے ایک اور کتاب تحقیقات چشتی[5] کے نام سے تالیف کی اس کتاب کی تاریخ اشاعت سرور لاہوری نے لکھی ؎

بالطف حق ہوئی جس دم تھی تیار	عجب یہ عمدہ تصنیفات چشتی
لکھی سرور نے تب تاریخ تالیف	کہ ہو مقبول تحقیقات چشتی

سمت ۱۹۲۱

---

[1] مولوی غلام حسین کا شروع میں نام غلام علی تھا حضرت فخر الدین مشہور بہ فخر عالم نے ان کا نام غلام حسین رکھا اور یہ بھی فرمایا کہ ہمارا آخری نام غلام حسین ہوگا۔ چنانچہ "غلام حسین" سے ان کی تاریخ وفات سنہ ۱۱۹۹ھ برآمد ہوتی ہے۔

عیسوی سال اس طرح لکھا ہے ؎

بسالِ عیسوی سرورؔ رقم کرد — کہ عالی جاہ تصنیفاتِ چشتی (۱۸۶۷ء)

سنہ ہجری یوں کہا ہے ؎

ہوا جو مطبوع جملہ عالم — یہ نسخہ بن کر کے سارا عالم
بسالِ تصنیف بولا سرورؔ — نئی[1] کتاب عجیب چشتی (۱۲۸۴ھ)

تحقیقاتِ چشتی اسسٹنٹ کمشنر لاہور کے ایما سے لکھی گئی۔ اس کتاب میں جناب چشتی نے عمارات، مزارات، مقابر، مساجد و نواح لاہور کا مفصل حال درج کیا ہے۔ اس کتاب کی تیاری میں چشتی صاحب نے بہت سی کتب سے استفادہ کیا ہے۔ چنانچہ تحقیقاتِ چشتی کے صفحہ (۱۰) پر لکھتے ہیں :—

"کتاب روضۃ الاحباب۔ معارج الولایت۔ تذکرۃ العارفین۔ حقیقۃ الفقرا۔ حقیقۃ الفواد۔ قصص الاولیا۔ محبوب الواصلین۔ تذکرۃ العاشقین۔ نفحات الانس۔ کتاب شیخ جوہر بندگی۔ مرات الہند۔ جام جم۔ سفینۃ الاولیا۔ سکینۃ الاولیا۔ حق نما۔ کیمیائے سعادت۔ دلیل العارفین۔ فوائد الفواد۔ حبیب السیر۔ شاہجہان نامہ۔ توزک جہانگیری۔ اکبر نامہ۔ تحفۃ الواصلین۔ مخبر الواصلین۔ حقیقۃ العرفان۔ حقیقۃ الحقائق۔ اکسیر ولایت۔ کتاب رضوانی۔ تذکرۃ المحبوبین۔ مناقب چشتیہ۔ مناقب سروریہ۔ اسرار الاولیا۔ مناقب مداریہ۔ مظہر الولایت۔ کشف المحجوب۔ تصدیق الکرامت۔ مصداق العاشقین۔ مفتاح السماع وغیرہ بکوشش تمام کچھ تو مستعار اور کچھ خرید کر کے یہ کتاب تحقیقاتِ چشتی ختم کی۔"

اس کتاب میں بزرگانِ اسلام جو لاہور میں مدفون ہیں، ان کا ذکر آیا ہے۔ لاہور کی تاریخی عمارات کے متعلق اس کتاب میں بہت کچھ ملتا ہے۔ معابد و مراسم اہلِ ہنود پر تبصرہ کیا ہے۔ روئے زمین کے اولیا رانشٔد اور حتی الامکان ہر ایک خانوادہ کا حال لکھا ہے۔ اس ترتیب میں مطبوعہ کتب کے علاوہ مسموع شواہد کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ جو باتیں خاص اشخاص کی زبانی معلوم ہوئی ہیں ان کو بھی درج کتاب کر دیا ہے۔ اگرچہ کتاب کا یہ پہلو محلِ نظر ہے۔ یہ کوشش بھی کی ہے کہ صاحبِ مقبرہ کب اور کس زمانہ میں کہاں تولد ہوئے۔ ان کی شہرت کا کیا باعث تھا۔ ان کی کرامات سے عوام نے کیا فیض حاصل کیا۔ آخر کب اور کہاں وفات پائی۔ صحیح تاریخ وفات کیا تھی۔ کون کون ان کے خلیفہ و مرید و معتقد ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے سجادہ نشین کون کون تھے۔ اب کون موجود ہے۔ وہ کس قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اب ان کی اولاد میں سے کون زندہ ہیں۔ اور کس مقام پر سکونت پذیر ہیں۔ کیا وہ مقبرہ رجسٹر نزول سرکاری میں درج ہے یا نہیں۔ اس مکان یا مقبرہ۔ یا شوالہ یا گوردوارہ یا ٹھاکر دوارہ وغیرہ کے ساتھ کیا کیا معافی ہے

---

[1] جناب سرورؔ نے نئی کے (۶۰) عدد لیے ہیں، حالانکہ نئی کے (۷۰) عدد ہوتے ہیں۔ جانشین امیر مینائی حضرت جلیلؔ کی ایک تاریخ ہے۔ فرماتے ہیں ؎

جلیلؔ مصرعِ تاریخ بے بدل نکلا — نئی بہار دکھاتی ہے شہر کی سالگرہ

اس تاریخ میں (نئی) کے ستر عدد محسوب ہوئے ہیں اور مصرع اولیٰ میں "بے بدل" کہہ کر (۴۸) کا تخرجہ کیا ہے۔ ثقات فن بھی نئی کے (۷۰) عدد لیتے ہیں (۶۰) نہیں۔ (دکسری)

زمین ہے۔ یا گاؤں۔ یا نقدی اور اس تقرر کا باعث کیا ہے۔ یہ معافی کس قدر ہے۔ اور کس کے حکم اور کس وجہ سے یہ پہلے پہل مقرر ہوئی۔ یہ جاگیر یا بخشش حین حیات سجادہ نشین ہی تک تھی۔ یا نسلاً بعد نسل سجادہ نشین کو عطا ہوئی ہے۔ اور سالانہ اس پر کیا خرچ ہوتا ہے۔ اور خرچ میں کتنی بتیاں ہیں۔ عرس وغیرہ کس تاریخ کو مقرر ہے۔ اور عرس پر کیا کیا تقسیم ہوتا ہے۔ عرس پر لوگ کس تعداد میں جمع ہوتے ہیں۔ خانقاہ میں کتنی قبور ہیں۔ اور کون کون بزرگ ان میں مدفون ہیں۔ عمارت یا مکان کس زمانے میں تعمیر ہوئے۔ ان کے بنانے والے کا کیا نام تھا۔ کس زمانے میں اس کا کچھ حصہ مسمار ہوا۔ اور پھر کس قدر عمارت ازاد کی گئی۔ نیز یہ بھی بتایا گیا ہے۔ اس خانقاہ میں کس قدر چار دیواریاں تھیں۔ کتنی کوٹھڑیاں۔ کتنے احاطۂ قبور اور کتنے دالان تھے۔ طول و عرض و ارتفاع اس عمارت کا نہایت کوشش سے پیش کیا ہے۔ اس قسم کی باتیں بھی مندرج ہیں کہ وارثان حال کیا وارث حقیقی ہیں یا غاصب ان کو کیونکر قبضہ حاصل ہوا۔ اور حقیقی وارث کس طرح بے دخل ہوئے۔

یہ کتاب لاہور کے متعلق ایک انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اس کتاب کی ضخامت (۷۸۶) صفحات پر مشتمل ہے۔ تاریخی نقطۂ نظر سے کتاب عیوب سے پاک نہیں۔ بعض سنین غلط ہیں۔ کہیں واقعات اصل حقائق سے ہٹ گئے ہیں۔ بعض سُنی سنائی باتیں جو مورخ کے نزدیک پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں درج کر دی گئی ہیں۔ تنقید نگار اور مورخ چاہے اس کتاب میں ہزار عیب نکالیں۔ لیکن لاہور کے متعلق ان کی کاوش و محنت ہرگز نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ آج مورخین نے جو صحیح حالات بعض واقعات کی تحقیق کے بعد لکھے ہیں۔ ان کی جستجو و کاوش میں تحقیقات چشتی نے آئینہ کا کام کیا ہے۔ اگر یہ کتاب ان کے سامنے نہ ہوتی تو شاید بہت سے واقعات کی پردہ کشائی ممکن نہ تھی۔ لاہور کا یہ مورخ جس نے معلمی سے اپنی زندگی شروع کی تھی۔ تحقیقات چشتی کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اور آنے والا مورخ ان کی اس سعی بلیغ کو ہمیشہ بنظر استحسان دیکھے گا۔ مولوی نور احمد چشتی موزوں طبع بھی تھے۔ فارسی اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ۲۲ فروری ۱۸۵۸ء کے اخبار کوہ نور لاہور سے پتہ چلتا ہے کہ مولوی نور احمد چشتی میلہ چراغاں احباب کے ساتھ منا رہے ہیں اور فی البدیہہ یہ اشعار فرما رہے ہیں ؎

وہ جو پہلو سے اٹھے درد دل ایسا اٹھا	ضبط کی تاب نہ باقی رہی چلا اٹھا
حالت عشق مری دیکھ کے وہ ہنستا تھا	کیوں رے ہاں اب تو بتا شور یہ کیسا اٹھا
اس کی الفت سے بھلا فائدہ کیا نکلا ہے	نام بدنام ہوا مفت میں پیسا اٹھا

عشق کی رمز و کنایہ کی سمجھ میں یارو
مجنوں مشہور تھا پر چشتی بھی ویسا اٹھا

یہ مورخ لاہور میں ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۸ء میں پیدا ہوا۔ ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۸ء میں وفات پائی۔ سرور لاہوری نے شاعر چشتی (۱۲۸۴ھ) سے مادہ تاریخ وفات حاصل کیا ہے۔

رائے بہادر لالہ کنہیا لال (ایم۔ ای۔ سی۔ ای)
(المتوفی ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۸ء)

لالہ کنہیا لال ذات کے کائستھ ماتھر اور ہندی تخلص کرتے تھے۔ ان کے والد کا نام لالہ ہرنارائن تھا۔ اصلی وطن جلیسر ضلع ایٹہ تھا۔ ملازمت کے سلسلے میں ان کی زندگی کا وافر حصہ لاہور میں گزرا۔ اسی سرزمین میں انھوں نے تالیف و تصنیف کی طرف رغبت کی۔ قدرت نے انھیں مفتی غلام سرور ایسے شفیق استاد سے کسب علم و فن کرنے کا موقع دیا۔ مفتی صاحب مرحوم اپنے وقت کے مشاہیر میں سے تھے۔ ان کی سرپرستی میں لالہ کنہیا لال ہندی کے

جوہر کمالات چمکنے لگے۔ اور ان کا فطری ذوق جلا پانے لگا۔

فارسی وار دو میں انھیں کامل دستگاہ تھی۔ ان دونوں زبانوں میں ان کی تصانیف ملتی ہیں۔ جس سے ان کے تبحر علم اور فطری ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ شعر و سخن کے بھی دلدادہ تھے۔ ان کے کلام میں مضمون آفرینی باریک اندیشی اور نازک خیالی کے نمونے ملتے ہیں۔ اخلاقیات پر بھی ان کو عبور کلی حاصل تھا۔ تصوف کے مسائل پر بھی ان کی نظر بہت گہری تھی۔ چنانچہ مناجات ہندی میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ ان کی چند دوسری تالیفات بھی وقیع ہیں۔ جن میں سے مندرجہ ذیل مشہور ہیں :۔

۱۔ **گلزار ہندی** :۔ یہ ایک منظوم گنجینہ فارسی زبان میں ہے۔ اس میں پند و نصائح کے مضامین قلمبند کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب چار بار چھپ کر شائع ہوئی۔

۲۔ **بندگی نامہ** :۔ اس مختصر کتاب میں دریا کو کوزے میں بھر دیا ہے۔ اس میں موحدانہ اشعار، تصوفانہ مضامین اور عاشقانہ خیالات کو نہایت موثر انداز میں پیش کیا ہے۔

۳۔ **ما مقیمان کوے دلدار یم** کی بحر میں ایک ترکیب بند نہایت شستہ زبان میں لکھا۔ اگرچہ اشعار کچھ زیادہ نہیں لیکن حلاوت زبان اور خوبیٔ بیان سے نہایت مطبوع ہے۔

۴۔ **یادگار ہندی** :۔ یہ کتاب بھی منظوم فارسی زبان میں ہے۔ جس کے چار حصے ہیں۔ پہلے حصے میں اوتاروں کا ذکر ہے۔ دوسرے حصے میں پیغمبروں کا حال درج ہے۔ تیسرے حصے میں حکما کے حالات قلمبند کیے ہیں اور چوتھے حصے میں نیک بادشاہوں کی طینت اور سیرت پر لکھا گیا ہے۔

۵۔ **مناجات ہندی** :۔ یہ دیوان اردو زبان میں ہے۔ حمد و ثنا کے مضامین کثرت سے اس میں نظم کیے گئے ہیں۔ صوفیانہ خیالات کو نہایت قابلیت سے پیش کیا ہے۔ کلام کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندی کی طبیعت میں سوز و گداز کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ فن شعر اور اشعار قدیم سے انھیں خاص دلچسپی ہے۔ عروض و قافیہ اور علم بیان و معانی کو خوب سمجھتے ہیں۔

مناجات کے چھ ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گئے۔ غزلوں کے علاوہ ترجیع بند، ترکیب بند، مخمس، مسدس، رباعیات اور قطعات اس میں موجود ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندی کو تمام اصناف سخن پر پوری قدرت حاصل تھی۔ مؤلف نے اپنی اس کتاب کے متعلق اپنی رائے کا اظہار اس طرح کیا ہے :۔

> "یہ مبارک کتاب اور ہر لعزیز دیوان ہر ایک چھاپے کے وقت بڑھ کر چھپا ہے۔ اگر اس کو بڑھتی دولت کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔"

۶۔ **مخزن التوحید** :۔ یہ دیوان فارسی میں ہے اور زبان سادہ اور سلیس ہے۔

۷۔ **اخلاق ہندی** :۔ یہ کتاب نظم اردو میں لکھی گئی ہے۔ اخلاقیات پر بڑی گرانمایہ تصنیف ہے۔ ہر بات کے آخر میں دلچسپی کو محفوظ رکھتے ہوئے ایک حکایت بھی درج کر دی ہے۔

۸۔ **ظفر نامہ رنجیت سنگھ المعروف بہ رنجیت نامہ** :۔ یہ نظم فارسی زبان میں سکندر نامۂ نظامی گنجوی کی طرز اور بحر میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے متعلق لکھی گئی ہے۔

۹۔ **تاریخِ پنجاب**:۔ یہ ریاست ہائے پنجاب کی ایک عام تاریخ ہے۔ اس میں بابا نانک کے وقت سے سکھوں کے دسوں گوروؤں کے جانشینوں کا مفصل حال اور سکھوں کی بارہ مثلوں کے ظہور کی مشرح تشریح کی گئی ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عروج کی کہانی اور زوال کی داستان بھی اس میں مندرج ہے۔ موجودہ جموں و کشمیر کی من وعن کیفیت بھی اس میں تحریر ہے۔ یہ کتاب دوبار طبع ہو چکی ہے۔ لالہ سیتا رام کوہلی رنجیت سنگھ کے دیباچہ میں اس کتاب پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ کتاب زیادہ تر EUROPEAN ADVENTURES IN NORTHEREN INDIA مصنفہ سی۔ جی۔ گرے کی کتاب پر مبنی ہے۔

۱۰۔ **انگاریں نامہ**:۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہیر رانجھا کے قصے کو لیے ہوئے ہے۔ اس عاشقانہ داستان کو ہندی نے بڑی قابلیت سے فارسی نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ یہ رنگین نظم ایک ہی بار طبع ہوئی۔

۱۱۔ **تاریخ لاہور**:۔ لالہ کنہیا لال کی منظوم اور منثور تصانیف میں تاریخ لاہور ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ یہ تاریخ ۱۸۸۴ء میں طبع ہوئی۔ مصنف نے خود اس کی طبع پر قطعاتِ تاریخ کہے ہیں۔ ان میں سے ایک قطعہ اُردو میں ہے اور دوسرا فارسی میں۔ دونوں قطعے نذرِ ناظرین ہیں۔

قطعۂ فارسی

بحمد اللہ کہ مطبوعِ جہاں گشت ۔۔۔ بالطافِ خدا تاریخِ لاہور
بجوشِ خلقی طرز خوش کلامی ۔۔۔ بچشمِ اہلِ بینش گشت منظور
مذاقِ تازہ شد حاصل زبان را ۔۔۔ ازیں نادر بیانِ تازہ مذکور
بہر صفحہ است ذکرِ تازہ مرقوم ۔۔۔ بہر سطر است حالِ تازہ مسطور
بہر خاطر ازاں جمعیت آمد ۔۔۔ بہر یک دیدۂ روشن از و نور
دلِ ہر اہلِ دل زو گشت خورسند ۔۔۔ طبیعت خورم و خوشحال و مسرور
مرتب گشت بعد از محنت و رنج ۔۔۔ کتابے بے بہا نور علیٰ نور
مؤلف کرد در انجام ایں کار ۔۔۔ عرق ریزی نہایت سعیٔ موفور
مگر بند مشقت بر میاں بست ۔۔۔ بہر کارے کہ از دل بود مامور

چو شد مطبوع ہندی سال طبعش
بگو۔ مطبوع شد تاریخ لاہور
۱۸۸۴ء

قطعۂ اُردو

یہ تاریخ لاہور اب چھپ چکی ۔۔۔ خدا نے مری سعی مشکور کی
خدا سے بر آیا مرا مدعا ۔۔۔ مری التجا حق نے منظور کی
مرے دل میں اس کام کے واسطے ۔۔۔ جو تھی بیقراری وہ سب دور کی
جہاں میں ہر ملک و شہر و دیار ۔۔۔ خدا نے یہ تاریخ مشہور کی
رقم کی یہ ہندی نے تاریخ طبع ۔۔۔ ہوئی شائع تاریخ لاہور کی
۱۸۸۴ء

اس کتاب کی ضخامت (۴۷۰) صفحے ہے۔ اور وکٹوریہ پریس لاہور میں طبع ہوئی تھی۔

تاریخ لاہور لالہ کنہیا لال نے اپنے چند مخصوص احباب کی فرمائش سے لکھی تھی۔ چنانچہ وہ اس کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

"بعض دوستانِ صداقت کیش و محبانِ محبت اندیش مکلف حال نیاز آگیں ہوئے اور فرمایا کہ تم بفضل ربانی و تفضلات سبحانی تیس برس سے افسر و سرپرست محکمہ پبلک ورکس ہو۔ مکانات قدیمہ و جدیدہ و شہر لاہور کا حال جیسا تم کو معلوم ہے کسی کو نہیں۔ بڑی بڑی عمارتیں سرکاری جو فی الحال باعث زیب و زینت و فخر و افتخار شہر لاہور ہیں۔ سب تمہارے ہاتھ سے تعمیر ہوئی ہیں۔ ایسی حالت میں نہایت ضروری ہے کہ ایک تاریخ خاص شہر لاہور کی جس میں مفصل حالات، مکانات قدیمہ و جدیدہ اندرونی و بیرونی شہر ہوں لکھی جائے تاکہ یہ تاریخ اور تالیف و تصانیف کی طرح تمہارے نام سے زمانہ ناپائدار میں یادگار رہے۔ پس راقم نے بتعمیل فرمان محبانِ محبت عنوان کمر ہمت کی چست باندھ کر اس کا مسودہ لکھنا شروع کیا۔" (تاریخ لاہور صفحہ ۵)

تاریخ لاہور لالہ کنہیا لال کی فکر و کاوش کا ایک ایسا مرقع ہے۔ جو رہتی دنیا تک قائم رہے گا۔ اردو زبان میں اس سے بہتر لاہور کے حالات لکھے ہی نہیں گئے۔ واقعات کی ترتیب اور تحقیق و جستجو میں انھوں نے بڑی محنت کی ہے۔ نتائج کے اخذ کرنے میں اپنی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لائے ہیں۔ ہر واقعے کی چھان پھٹک میں پوری ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے جس سے اس کتاب کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔ یہ کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے۔ جو مندرجہ ذیل ہیں۔

پہلے حصے میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ شہر لاہور کب آباد ہوا؟ اس کو کس نے آباد کیا۔ کس کس زمانے میں اس کی آبادی میں ترقی ہوئی؟ کس کس دور میں اس شہر نے غارت و انہدام کے صدمے برداشت کئے؟ اس وقت اس کی صورتِ حال کیا تھی؟ کون کون قومیں یہاں آباد تھیں؟ اس زمانے کے مشہور رؤسا، حکما۔ فضلا۔ علما۔ اطباء و شعرا کون تھے۔ اور کسب ہنر میں کون کون اشخاص صاحب اعزاز اور مشہور رہتے؟

دوسرے حصے میں یہ بتایا گیا ہے کہ مغلیہ دورِ حکومت میں جب شاہی قلعے کے باہر آبادی ہوئی تو اس آبادی کا رُخ کس کس سمت کو تھا؟ اس آبادی کے مشہور دروازے اور محلے کون کون تھے؟ اور ان محلوں میں نامور مکانات اور کٹڑے کہاں کہاں واقع تھے اور کس کس رئیس کی ملکیت تھے؟ کیا ان قدیم مکانات کا اب کوئی نشان باقی ہے کہ نہیں؟

تیسرے حصے میں شہر لاہور کے اندرون و بیرون ان مکانات کی تشریح کی گئی ہے جو زمانہ سلف یا حال میں تعمیر ہوئے اور اب تک موجود ہیں۔ ان میں عمارات۔ حویلی۔ باغیچہ۔ مقبرہ۔ مسجد۔ مندر وغیرہ سبھی شامل ہیں۔ اس حصے کو انھوں نے تین فصلوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلی فصل میں ان مکانات کا ذکر کیا ہے جو ہندوؤں کے مذہب سے متعلق ہیں۔ یعنی شوالہ۔ ٹھاکردوارہ و دیوی دوارہ وغیرہ۔ دوسری فصل میں ان مکانات کی تصریح کی ہے جن کا تعلق ملت اسلامیہ سے ہے۔ اس میں مساجد خانقاہ آگئے ہیں۔ تیسری منزل میں ان مکانات کی تشریح کی ہے جو کسی مذہب و ملت سے علاقہ نہیں رکھتے۔ اس میں حویلی۔ باغ اور کٹڑہ وغیرہ کا بیان ہے نیز تیسرے حصے کی تینوں فصلوں میں یہ التزام قائم رکھا ہے کہ شہر کے اندرونی مکانات کا ذکر علیحدہ بیان کیا ہے اور شہر کی بیرونی عمارات کا ذکر علیحدہ۔ جس سے ان دونوں اقسام کی جداگانہ حیثیت میں آج بھی امتیاز باقی ہے۔

چوتھے حصے میں ان تعمیرات کا ذکر کیا ہے۔ جو انگریزوں کے زمانہ میں تعمیر ہوئیں۔ ان میں کوتوالی، کچہری، عدالت ضلع، ہسپتال، کالج وغیرہ کے حالات درج ہیں۔ کیونکہ اس حصے کی بیشتر عمارات کی تعمیر ان کی زیر نگرانی انجام پذیر ہوئی ہے۔ اس لیے یہ حصہ زیادہ مکمل اور آنکھوں دیکھی معلومات پر مبنی ہے۔

لالہ کنہیا لال مدت مدید تک پارک ماسٹری کے محکمہ سے منسلک رہے۔ اور گورنمنٹ برطانیہ نے ان کو رائے بہادر کے معزز خطاب سے بھی سرفراز کیا تھا۔ یہ پہلے ہندوستانی ہیں جو اگزیکٹو انجینئر کے عہدۂ جلیلہ تک پہنچے اور پنشن یاب ہوئے۔ یہ میونسپل کمیٹی لاہور اور کالسنھ سبھا لاہور کے پریذیڈنٹ بھی تھے۔ آخر ۲۲ فروری ۱۸۸۸ء کو بمقام لاہور وفات پائی۔

لالہ کنہیا لال ہندی کی تصانیف میں جدید خیالات کی جھلک پائی جاتی ہے۔ ان کے جذبات تعصب سے سراسر خالی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر وہ ہمیشہ بڑی عقیدت سے کیا کرتے تھے۔ وحدت الوجود کے قائل تھے۔

ایک مورخ کی حیثیت سے ان کا درجہ بہت بلند ہے۔ ان کی کتاب تاریخ لاہور تاریخی دنیا میں ایک امٹ تالیف ہے۔ کیونکہ اس کا بیشتر مواد مؤلف کے ذاتی تجربات کا شاہد ہے۔ اپنے محکمے کی رعایت سے انھوں نے اکثر عمارات کا رقبہ تک درج کر دیا ہے۔ اور یہ ایسی خدمت ہے۔ جو دوسری تالیفات میں کہیں نظر نہیں آتی۔ اردو زبان میں یہ کتاب لاہور کے متعلق قابل قدر معلومات سے لبریز ہے۔ جس کی تعریف نہ کرنا حقیقت سے کھلا انکار ہے۔ اور یہی کتاب آج لالہ کنہیا لال کے نام کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ اگرچہ ان کی دوسری تالیفات بھی موجود ہیں۔ اور وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔

مفتی غلام سرور لاہوری (المتوفی ۱۳۰۷ھ / ۱۸۹۰ء)

مفتی غلام سرور ۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۸ء میں محلہ کوٹلی مفتیاں نزد حویلی میاں خان اندرون موچی دروازہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد بزرگوار کا نام مفتی غلام محمد تھا۔ جو حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی سہروردی کی اولاد سے تھے۔

ابتدائی تعلیم کے مدارج اپنے والد ماجد کی سرپرستی میں طے کیے۔ اور آخر ان ہی کی توجہ سے فن طب کی تکمیل کی۔ پھر مولانا غلام اللہ فاضل لاہوری کے درس میں شامل ہو کر جملہ علوم مروجہ میں زبردست استعداد بہم پہنچائی۔ اور فارغ التحصیل ہو کر تصنیف و تالیف میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ اور بہت سی تصانیف یادگار چھوڑیں۔

ان تصانیف کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تین تذکروں[1] میں اولیائے کرام کے حالات قلمبند کیے ہیں۔ دو کتابوں کا موضوع "تاریخ[2]" ہے۔ دو کتابوں میں مادہ ہائے[3] تاریخ جمع کیے ہیں۔ چار دواوین[4] یادگار چھوڑے ہیں۔ دو کتابیں "مناقب[5]" پر لکھی ہیں۔ ایک کتاب میں انشا[6] کا نمونہ دیا ہوا ہے۔ دو کتابیں پند و نصائح[7] سے مملو ہیں۔ تین کتابوں میں "اخلاقیات[8]" سے بحث کی ہے۔ اور دو کتابیں نعت[9] کے مضمون پر مشتمل ہیں۔

(۱) تذکرے

خزینۃ الاصفیا:۔ یہ تذکرہ فارسی زبان میں ہے۔ زبان نہایت سادہ اور فصیح ہے۔ اس میں متقدمین و متاخرین صوفیا، علما و شعرا

---

[1] تذکرہ بزرگان ہنود قلمی (صفحہ ۵۲۳)۔ مرتب کا نام درج نہیں۔ یہ قلمی مخطوطہ حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری کے کسی دوست کی ملکیت ہے۔

کے حالات نہایت تحقیق اور کوشش سے فراہم کیے ہیں۔ یہ ایک جامع تذکرہ ہے جس میں بہت سے ایسے بزرگوں کے حالات آگئے ہیں۔ جن سے دوسرے تذکرے خالی ہیں۔ یہ تذکرہ دو جلدوں میں ختم ہوا ہے۔ اس کی ضخامت (۱۱۸۰) صفحات ہے۔ یہ تذکرہ ۱۲۸۰ھ میں شروع ہو کر ۱۲۸۵ھ میں پانچ سال کی مدت میں مکمل ہوا۔ خزینۃ الابرار (۱۲۸۰) اس کا سال آغاز ہے اور خزینۃ الاصفیا (۱۲۸۵) سال اختتام۔ اس تذکرے میں سات مخزن ہیں جن کی ترتیب یہ ہے:-

مخزن اول میں رسول مقبول صلعم، خلفائے راشدین اور ائمہ دین کا ذکر ہے۔
مخزن دوم میں مشائخ خاندان قادریہ کا بیان ہے۔
مخزن سوم میں چشتیہ خاندان کے حالات ہیں۔
مخزن چہارم میں سلسلۂ نقشبندیہ کے کوائف مرقوم ہے۔
مخزن پنجم میں بزرگان سہروردیہ کا تعارف کرایا ہے۔
مخزن ششم میں متفرق خانوادوں کو پیش کیا ہے۔
مخزن ہفتم چار حصوں پر مشتمل ہے۔

پہلے حصے میں حضرت سرور کائنات کی ازواج مطہرات دوسرے حصے میں دختران آنجناب، تیسرے حصے میں عورات صالحات و عارفات جو اہل ولایت و کرامت تھیں۔ چوتھے حصے میں ماضی و حال کے مجانین و مجاذیب کے حالات دیے ہوئے ہیں۔

حدیقۃ الاولیا:- یہ تذکرہ اردو زبان میں ہے۔ اور فقط ان اولیائے کرام کے حالات پر مشتمل ہے جو پنجاب میں گزرے ہیں۔ اس میں سات چمن ہیں۔

پہلے چمن میں اولیائے خاندان قادریہ۔ دوسرے چمن میں اولیائے خاندان چشتیہ۔ تیسرے چمن میں اولیائے خاندان نقشبندیہ۔ چوتھے چمن میں اولیائے خاندان سہروردیہ۔ پانچویں چمن میں خانوادہ ہائے متفرقات۔ چھٹے چمن میں عورات صالحات و عارفات کا حال بیان کیا ہے۔ یہ تذکرہ ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۵ء میں طبع ہوا تھا۔

مدینۃ الاولیا:- یہ تذکرہ بھی اولیائے کرام کے حالات میں ہے۔ (۲۸۰) صفحات ہیں۔ یہ تذکرہ چار سال کی محنت کے بعد مکمل ہوا۔

(۲) تاریخ

بہارستان تاریخ:- اس کتاب کا دوسرا نام گلزار شاہی ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۵ء میں لاہور اور دوسری مرتبہ اضافہ و تصحیح کے ساتھ ۱۲۹۴ھ / ۱۸۷۹ء میں لکھنؤ سے طبع ہوئی۔ اس کتاب کے تین حصے ہیں۔

پہلے حصے میں مہاراجگان متقدمین و متاخرین کے حالات ہیں۔ اس میں دو چمن ہیں۔

دوسرے حصے میں مسلمان سلاطین کے حالات عہد حضرت رسالت مآب صلعم سے اپنے زمانہ تک ۳۵ چمنوں میں قلمبند کیے ہیں جس میں مسلمانوں کے معروف و غیر معروف تمام خاندانوں کا ذکر آگیا ہے۔ مسلمان ریاستوں کا ذکر بھی اس میں ملتا ہے۔

تیسرے حصے میں سلاطین انگریزی کے حالات ابتدائے سلطنت سے لے کر ملکۂ وکٹوریہ تک مختصر لیکن جامع مندرج ہیں۔

تاریخ مخزن پنجاب : مفتی غلام سرور لاہوری کی یہ تصنیف پنجاب کے متعلق ہر قسم کی معلومات سے مملو ہے۔ پنجاب کا رقبہ۔ دوآبے دریا۔ اضلاع۔ ریاستیں۔ مشہور قصبے اور بستیاں۔ مردم شماری۔ میدانی علاقے۔ کوہستانی سلسلے۔ آب و ہوا۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کی عبادت گاہیں۔ مزارات۔ باغات۔ مقابر۔ قلعے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مختلف قوموں۔ مذاہب۔ عقائد۔ یہاں تک کہ تجارت برآمد و درآمد کا مفصل حال اس کتاب میں درج ہے۔ اس کا وہ حصہ جو ضلع لاہور سے متعلق ہے بڑا اہم ہے۔ جس کا مختصر ذکر ہم ذیل میں کرتے ہیں۔

اس کتاب کے پانچ حصے ہیں۔ دوسرے حصے میں شہر لاہور کا ذکر ہے۔ اس کے نام نام لہاور۔ لہانور۔ لاہور وغیرہ سے بحث کی ہے۔ سرائے محمد سلطان۔ سرائے دیوان رتن چند۔ قلعہ لاہور۔ شالامار باغ۔ مقبرہ جہانگیر۔ سرائے شاہجہانی۔ مقبرہ آصف جاہ۔ مقبرہ نور جہان بیگم۔ گورنمنٹ ہاؤس۔ صدر کچہری ضلع لاہور۔ میو ہسپتال۔ نیو کالج۔ سینٹ ہال۔ سمادھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا حال تفصیل سے بیان کیا ہے۔ لاہور کے مضافات اچھرہ۔ کاہنہ۔ نیاز بیگ۔ خضر پور۔ بھسین۔ شاہدرہ وغیرہ کے حالات نہایت تحقیق سے لکھے ہیں۔

پانچویں حصے میں صوفیائے کرام کے مزارات کا حال دیا ہوا ہے۔ سید علی ہجویری گنج بخش کا نام سرِ فہرست ہے۔ اس کے بعد مادھو لال حسین۔ مقبرہ میراں محمد شاہ موج دریا۔ شاہ چراغ گیلانی۔ شاہ ابو اسحاق۔ موسیٰ سہروردی۔ عبدالجلیل چوہڑ قریشی سہروردی۔ ابوالمعالی۔ محمد غوث۔ شاہ بلاول۔ طاہر لاہوری۔ میاں میر۔ ملا شاہ قادری۔ بی بی پاکدامناں۔ حضرت ایشاں۔ گھوڑے شاہ۔ میاں وڈا۔ سید جان محمد حضوری کا حال درج ہے۔ مسجد وزیر خان۔ مسجد طلائی۔ بادشاہی مسجد کا ذکر ہے۔ زیارات عالیات قلعہ لاہور بھی دیئے ہوئے ہیں۔ فقیر خاندان کے زیارات عالیات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ غرضیکہ تمام کتاب کو بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

ہم نمونے کے طور پر فقیر خاندان کے زیارات کا ذکر ذرا تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ سرور لاہوری نے لکھا ہے کہ ان زیارات عالیات میں گیارہ زیارتیں حضرت خاتم الانبیا صلعم کے متعلق ہیں۔ اوّل موئے مبارک برنگ سیاہ۔ دوم جبہ مبارک۔ سوم نقش پنجہ دست مبارک کالے پتھر پر۔ چہارم تاج مبارک برنگ سیاہ۔ پنجم نعلِ چرمی۔ ایک پاؤں جس کے ساتھ کا دوسرا قلعہ کی زیارت میں ہے۔ ششم قدم مبارک پتھر پر۔ ہفتم موئے مبارک حنائی رنگ۔ ہشتم شانہ مبارک۔ نہم الفی۔ دہم مسواک۔ یازدہم پانی پینے کا جام۔ حضرت عمرؓ ابن خطاب خلیفہ سوم کی صرف ایک تسبیح ہے۔ حضرت علیؓ کے متعلق پانچ زیارات موجود ہیں۔ پہلا موئے مبارک۔ دوسرا جبہ مبارک۔ تیسرا تاج۔ چوتھا عصائے مبارک۔ پانچواں پنجہ مبارک پتھر پر۔ اور زیارت حضرت فاطمۃ الزہرا خاتون قیامت علیہا السلام صرف ایک روپائے مبارک ہے اور تبرکات متعلق حضرت امام حسن علیہ السلام سات ہیں۔ اوّل موئے مبارک۔ دوم کمر بند۔ سوم زلف۔ چہارم اوراق قرآن شریف حضرت کے دستخطی ہرن کے چمڑے پر۔ پنجم و ششم دو نوں زلفیں۔ ہفتم تمام و کمال قرآن شریف حضرت کے ہاتھ کا لکھا ہوا۔ سید الشہدا حضرت امام حسین علیہ السلام کے متعلق چار نادرات ہیں۔ پہلا کمر بند۔ دوسرا زلفیں مبارک۔ تیسرا قرآن شریف کے کچھ اوراق ہرن کے چمڑے پر لکھے ہوئے۔ چوتھا تسبیح۔ اور زیارات حضرت امام زین العابدین علیہ السلام دو ہیں۔ اوّل قرآن شریف کے اوراق حضرت کے ہاتھ کے لکھے ہوئے۔ دوم فرہ علم مبارک حضرت عباس کا۔ امام جعفر صادق علیہ السلام صرف ایک کتاب جامع جعفر حضرت کی لکھی ہوئی موجود ہے اور تبرک متعلق ہر دو امام حسن و حسین علیہما السلام دونوں حضرات کی دو زلفیں یکجا رکھی ہوئی ہیں۔ چند متفرق زیارتیں بھی ہیں۔ یہ تعداد میں سات ہیں۔ اوّل علم مبارک خاص کربلائے جنگ کا۔ دوم تسبیح خاک شفا۔ سوم ایک ڈبہ خاک کربلا سے بھرا ہوا۔ چہارم ایک مشجر کپڑا جس پر سورۂ فاتحہ لکھی ہے۔ پنجم بیت اللہ کا غلاف۔ ششم روضۂ غلاف عالیہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ہفتم غلاف روضۂ عالیہ امام حسن علیہ السلام۔ یہ تمام زیارات عالیات تبرکات اور نادرات بڑی حفاظت سے ایک عالیشان مکان میں رکھے ہوئے ہیں۔ فقیر کرم الدین مرحوم

نے بکمال محبت اور شوق بہت سا روپیہ صرف کر کے ان کو چاندی سونے کی ٹکیوں میں محفوظ کیا ہوا ہے۔ (ص ۵۲۱)
مصنف نے اس کتاب کے صفحہ (۲۲۰) پر نور پور شاہاں کا ذکر کیا ہے اور صفحہ (۵۲۴) پر مقبرہ شاہ لطیف بری قادری کے متعلق تحریر کیا ہے۔ نور پور شاہاں کی شہرت حضرت شاہ لطیف بری ہی کی وجہ سے ہے۔ یہ قصبہ پہلے چور پور کہلاتا تھا جب حضرت بری نے نزول اجلال فرمایا۔ تو یہ قصبہ چور پور سے نور پور شاہاں بن گیا اس کی طرف مصنف نے اشارہ نہیں کیا۔ نیز حضرت بری شاہ لطیف کو خدا معلوم انھوں نے سلسلہ قادریہ کے سلسلے میں کیونکر منسلک کر لیا ہے۔ سید شاہ لطیف امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ ان کا سلسلہ خانوادۂ قادریہ سے ہرگز منسلک نہیں۔ ان کے بزرگ (سید) ضلع راولپنڈی سے نقل مکانی کر کے (کرسال) ضلع جہلم میں چلے گئے تھے۔ اب تک ان کی اولاد میں سید ولایت حسین شاہ (المعروف باوا پیر ولایت) مشہور زمانہ بزرگ زندہ ہیں اور ان کا سلسلہ کشف و کرامات ائمہ طاہرینؑ سے منسلک ہے۔

(۳) مادہ ہائے تاریخ

گنجینۂ سروری: اس کتاب کا دوسرا نام گنج تاریخ ہے۔ اور گنج تاریخ ہی سے سال اشاعت بھی برآمد ہوتا ہے۔ اس کتاب میں کئی ہزار مادۂ تاریخ جمع کئے گئے ہیں۔ اسی طرح تذکروں میں بھی مفتی صاحب نے بے شمار مادۂ تاریخ کہہ کر پیش کئے۔

چمن بے نظیر: چمن بے نظیر (۹۴) صفحے پر ختم ہو جاتی ہے اس کے بعد گلشن مشاہیر (۹۵) صفحے سے (۱۰۰) تک ہے گلشن مشاہیر میں بھی مفتی صاحب کے کہے ہوئے بہت سے قطعات تاریخ شامل ہیں۔ یہ کتاب امرتسر سے نیاز علی خان تاجر کتب مالک مطبع افغانی امرتسر نے شائع کی تھی۔ اگرچہ یہ مجموعہ گنج تاریخ اور دوسرے تذکروں ہی سے مرتب کیا گیا ہے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ جانچنے کے بعد اس میں کچھ ایسے مادے بھی نکل آئیں جو گنج تاریخ اور تذکروں میں محفوظ نہیں۔

مفتی صاحب تاریخ گوئی کے استاد تھے۔ میں انشاء اللہ ان کی تاریخوں پر مستقبل قریب میں ایک مقالہ لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں اس مختصر مضمون میں ان کتابوں کے شایان شان تبصرہ کرنے کی گنجائش نہیں۔

(۴) دواوین

دیوان نعت سروری: یہ دیوان ۱۸۸۱ء میں طبع ہوا۔ یہ دیوان نعت میں ہے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کی گئی ہے۔

دیوان حمد ایزدی: یہ دیوان ۱۸۸۰ء میں شائع ہوا۔ حمد باری تعالیٰ میں سر نیاز خم کیا گیا ہے۔

دیوان سروری: حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی منقبت اس دیوان میں ہے۔ ۱۸۶۲ء میں طبع ہوا۔

کلیات نعت سروری: یہ دیوان بھی نعت میں ہے جس میں ان کا تمام نعتیہ کلام آ گیا ہے۔ ۱۸۸۱ء سے ۱۸۸۷ء تک ہزاروں کی تعداد میں اس کے نسخے چھپ کر مشہور ہوئے۔ ۱۸۹۰ء میں جب مفتی صاحب حج بیت اللہ کو تشریف لے گئے۔ تو ان کے فرزند مفتی غلام صفدر وکیل نے "دیوان وصال سرور" کے نام سے وہ تمام نعتیں شائع کر دیں۔ جو مفتی صاحب نے اثنائے سفر حج میں تصنیف کی تھیں۔ اس کے بعد دیوان وصال سرور بھی ان کے مطبوعہ نعتیہ دواوین میں شامل کر کے ان کے ورثا نے شائع کر دیا۔ اور کلیات نعت سروری اس کا نام رکھا۔

(۵) مناقب

مناقب غوثیہ: حضرت شیخ محمد صادق شیبانی کی فارسی کتاب کا سلیس اردو ترجمہ ہے۔

گلدستۂ کرامات: یہ کتاب اردو نظم و نثر میں ہے اور حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے مناقب اس میں درج ہیں۔

(۶) انشار

انشائے یادگارِ اصغری: یہ کتاب بھی اردو نظم و نثر میں ہے۔ جو مفتی صاحب نے اپنے چھوٹے بیٹے کے نام پر لکھی تھی۔

(۷) پند و نصائح

مخزنِ حکمت: یہ کتاب اردو نثر میں ہے اور پہلی مرتبہ ۱۲۸۰ھ میں اور پھر ۱۲۹۶ھ میں تصحیح اور اضافے کے بعد لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ اس میں حکمائے متقدمین و متاخرین کے حالات اختصار سے لکھے ہیں۔ نیز ان کے اقوال۔ افعال۔ اخلاق۔ آداب نکات۔ حکایات اور پند و نصائح جمع کئے ہیں۔ جو طلبہ کے لیے بہت مفید ہیں۔

تحفۃ الابرار: پند نامہ فریدالدین عطار کا منظوم ترجمہ ہے۔ یہ کتاب بھی پند و نصائح میں مفتی صاحب کی یادگار ہے طلبہ کے لیے بے حد کارآمد ہے۔

(۸) اخلاقیات

گلشنِ سروری: یہ ایک مثنوی ہے جو ۱۲۹۵ھ میں مکمل ہوئی۔ یہ کتاب مذہبی خیالات اور پند و نصائح پر مبنی ہے۔ اس کے ۲۶ باب ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں۔ عبادات خدا، خدمتِ استاد، مدد محتاج۔ قناعت پارسائی۔ خیرات وغیرہ خاص و عام دونوں کے لیے چراغِ ہدایت ہے۔

تحفۂ سروری: گلشنِ سروری کی طرح ایک مثنوی ہے۔ سات حصوں میں منقسم ہے۔ اس کتاب میں بھی اخلاقی مضامین ہیں۔

اخلاقِ سروری: یہ کتاب بھی علم اخلاق پر ایک نادر چیز ہے۔ اس میں اخلاق کی اصلاح اور دوسرے اخلاقی نکات سے روشناس کرایا گیا ہے۔ نثر اور نظم دونوں کی حامل ہے۔

(۹) لغات

لغاتِ سروری: اس لغت کا تاریخی نام زبدۃ اللغات ہے۔ پانچ برس کی محنتِ شاقہ کے بعد ۱۲۹۲ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اس لغت میں قدیم طرز و ترتیب حروف تہجی ملحوظ رکھی گئی ہے۔

جامع اللغات: یہ لغت ان کی آخری تصنیف ہے۔ جو ۱۸۹۰ء میں مکمل ہوئی۔ مفتی صاحب کو لغت نویسی میں بھی کمال حاصل تھا۔ ہزاروں ترکی۔ عربی۔ فارسی۔ الفاظ اس میں آ گئے ہیں۔ محاورات و اصطلاحات کے مطالب و معانی اردو میں نہایت قابلیت سے لکھے ہیں۔ لغت مبسوط اور جامع ہے۔

مفتی صاحب اُردو۔ فارسی۔ عربی کے بہت بڑے عالم تھے۔ تمام زندگی علم و ادب کی خدمت میں گزار دی۔ ان کی تمام تصانیف مفید اور کارآمد ہیں اور اہلِ علم ہمیشہ اُن سے استفادہ کرتے رہیں گے۔

آخری عمر میں مفتی صاحب مرحوم حج بیت اللہ کو تشریف لے گئے اور وہیں انتقال کیا۔ ۷، ۲ ذوالحجہ ۱۳۰۷ھ مطابق ۲۴ اگست ۱۸۹۰ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اور ان کی تاریخ وفات ان کا اپنا ہی کہا ہوا یہ مصرع ہے۔ ؎

ابھی سر درنے کی ہے سرور عالم کی پابوسی
۱۳۰۷ ہجری

شمس العلماء خان بہادر سید محمد لطیف جج (المتوفی ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء)

سید محمد لطیف دہلی کے باشندہ تھے۔ آپ کے جد بزرگوار مولانا محمد عرب صاحب شاہجہان کے دور حکومت میں مکہ معظمہ سے ہندوستان تشریف لائے اور محکمۂ اوقات کے افسر اعلیٰ کی حیثیت سے خدمات انجام دینے لگے۔ یہ عہدہ ان کی اولاد میں پشت با پشت تک قائم رہا۔

سید محمد لطیف ۱۸۴۶ء میں سید محمد عظیم[1] کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدا ہی سے وہ ذہین و فطین تھے۔ اردو فارسی، عربی اور انگریزی میں پوری دستگاہ رکھتے تھے۔ کلکتہ یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان ۱۸۶۲ء میں پاس کیا۔ ان کے والد ماجد سید محمد عظیم نے لاہور میں ۱۸۴۹ء میں ایک پریس قائم کیا۔ پنجاب میں یہ اوّلین پریس تھا۔ جس میں فارسی اور انگریزی کے شعبے علیحدہ علیحدہ تھے۔ یہ پریس ایک شاہی عمارت میں جو نولکھا کے نام سے مشہور تھی۔ قائم کیا گیا تھا۔ نولکھا کی یہ عظیم عمارت جہاں اب ریلوے سٹیشن ہے وہاں واقع تھی۔ نولکھا تھانہ آج بھی اس کے نام کی یاد کو تازہ کر رہا ہے۔ سید محمد عظیم نے یہیں سے اخبار "لاہور کرانیکل" انگریزی زبان میں جاری کیا۔ یہ اخبار سرکار انگلشیہ کی پالیسی کی زبان تھا۔ حکومت کی نظر میں اس کی وقعت تھی۔ ملکی خبروں کو بڑی احتیاط سے مرتب کیا جاتا تھا۔ کسی وجہ سے جب اس اخبار کے عملے میں پھوٹ پڑ گئی اور مقدمہ بازی تک نوبت پہنچی تو سید عظیم نے اس سے علیحدگی اختیار کی اور ایک دوسرا اخبار "پنجابی اخبار" کے نام سے نکالا۔ یہ پہلے انگریزی میں طبع ہوتا تھا۔ پھر اردو میں بھی چھپنے لگا۔

اسی علمی ماحول میں سید محمد لطیف کی پرورش ہوئی۔ اور اس کے مطابق ان کا مذاق ڈھلنے لگا۔ شروع جوانی ہی سے وہ اردو انگریزی اخبارات میں مضامین لکھنے لگے۔ جن سے ان کی استعداد اور شہرت میں چار چاند لگ گئے۔ وہ اردو و انگریزی دونوں زبانوں کے انشاپرداز تھے۔ ان کی زبان میں سادگی اور ندرت تھی۔ ملک بھر میں ان کی تحریروں کی دھوم تھی۔ اور خاص و عام میں ان کو زبردست شہرت و مقبولیت حاصل تھی۔

سید محمد لطیف صاحب نے لاہور میں بیٹھ کر پہلے تاریخ پنجاب ۱۸۸۹ء میں اردو زبان میں لکھی۔ اس کتاب کے متعلق سیتا رام کوہلی نے مہاراجہ رنجیت سنگھ" نامی کتاب کا دیباچہ لکھتے ہوئے لکھا ہے کہ کپتان مرے، میک۔ گریگر اور کننگھم نے ۱۸۳۴ء اور ۱۸۵۱ء کے درمیانی عرصہ میں جو کتابیں شائع کی ہیں۔ ان ہی کی بنیاد پر اس کے بعد سر لیپل گرفن اور سید محمد لطیف نے اپنی تصانیف مرتب کیں۔ سید محمد لطیف نے مہاراجہ کے زمانے کی لکھی ہوئی فارسی کتابوں سے بھی مدد لی ہے۔ جس سے کتاب کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔

"تاریخ پنجاب کی ترتیب" تدوین سے اہل ذوق نے ان کی قابلیت کا اندازہ لگایا چنانچہ ڈاکٹر لائٹنر پرنسپل گورنمنٹ کالج و رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی نے انھیں اخبار انجمن پنجاب کی ادارت سپرد کر دی۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد چیف کورٹ میں ہیڈ مترجم کی ضرورت پیش آئی ——— تو ڈاکٹر لائٹنر نے آپ کو ججوں کے سامنے پیش کیا۔ جنھوں نے ان کی قابلیت کا جائزہ لینے کے بعد ہیڈ مترجم کا عہدہ بھی انھیں تفویض کر دیا۔ حکومت پنجاب بنظر غائر ان کی لیاقت کا مطالعہ کرتی رہی۔ آخر ان کی وفاداری اور قابلیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے انھیں

---

[1] سید محمد عظیم نے ۲۷ جنوری ۱۸۸۵ء کو وفات پائی اور قبرستان میانی صاحب میں مدفون ہوئے۔ ان کے تین فرزند تھے سب سے بڑے سید محمد لطیف۔ منجھلے شمس الدین جو سب جج ہو کر ریٹائر ہوئے اور ۱۹۱۱ء میں وفات پائی سب سے چھوٹے سراج الدین تھے۔ جو بہاولپور میں چیف جج تھے۔ انھوں نے ۱۹۳۶ء یا ۱۹۲۶ء میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر مقرر کر دیا۔ اور ملتان تعیناتی کر دی۔ جہاں انھوں نے انگریزی زبان میں تاریخ ملتان ۱۸۸۹ء میں لکھی۔ پھر انگریزی زبان میں تاریخ پنجاب لکھی جو ایک ضخیم کتاب ہے۔ پھر تاریخ لاہور ۱۸۹۲ء میں لکھی اور آخر میں تاریخ آگرہ ۱۸۹۶ء میں تحریر کی۔

جس طرح تاریخ پنجاب، تاریخ ملتان اور تاریخ آگرہ میں انھوں نے بہت سے تاریخی مواد کو یکجا کر دیا تھا۔ اسی طرح تاریخ لاہور میں انھوں نے خوب داد تحقیق دی۔ یہ کتاب ایک مدت سے نایاب تھی۔ اب ۱۹۵۶ء میں دوبارہ شائع ہوئی ہے جس کے دیباچے سے بہت سی باتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ کتاب (۴۲۶) صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

لاہور اگرچہ تاریخی عمارات کے اعتبار سے دہلی یا آگرہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ پھر بھی یہاں بے شمار تاریخی یادگاریں موجود ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں کسی ایک شہر کو اتنے شاہی خاندانوں کا دارالحکومت رہنے کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ جتنا کہ لاہور کو حاصل رہا ہے آریوں کی افواج اور ویدک دھرم کے بھجن گانے والوں کا صدر مقام بھی یہی تھا۔ اس لیے کہ باہر سے آنے والے لاہور ہی سے گزر کر اندرونی ملک تک پہنچے۔ شمالی پنجاب بدھ مت کا گھر تھا۔ اور یہیں سے بدھ مت کی تبلیغ اور اشاعت دوسرے ممالک میں کی جاتی تھی۔ آج بھی بدھ دھرم کے نشانات اس علاقے میں موجود ہیں۔ سکندر اعظم کی فتوحات کے ہندو دھرم پر جو اثرات پڑے۔ اس کے نتائج ان قدیم مجسموں سے ظاہر ہوتے ہیں جو اس علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ چنانچہ سیاسی نقطۂ نظر سے پنجاب کو برصغیر پاک و ہند میں ایک مخصوص اہمیت حاصل ہے۔ اور اس برصغیر کے نیزے کا پھل اور قلعے کی دیوار ہے۔ چنانچہ یہ سرزمین بہادروں کی سرزمین ہے۔ اور اس برصغیر میں دستِ شمشیر زن کی حیثیت رکھتی ہے۔

شہر لاہور ہندو و مسلمان شاہان سلف کا دارالسلطنت رہا ہے۔ دو صدیاں اس پر ایسی گزری ہیں۔ جب یہ ہندو دھرم اور اسلام کی جنگ میں سب سے اہم چھاؤنی تھی۔ یہ دور سبکتگین اور محمود غزنوی کا دور ہے۔ آخر کار عرب کا مذہب اس خطے میں قائم ہو گیا۔ اس شہر میں اکبر اعظم شاہانہ دربار کرتا تھا۔ اس سرزمین میں جہانگیر اور نور جہاں کی محبت پروان چڑھی۔ یہیں شاہجہان پیدا ہوا۔ اور پھر یہیں پاک نفس گورو نانک نے وحدت کے گیت گائے اور انسانوں کی مادی اور روحانی تباہی سے بچانے کی کوشش کی۔ ان کو اور ان کے جانشینوں کو اپنے مذہبی خیالات پھیلانے کے کام میں اس شہر نے بڑا اہم حصہ لیا۔ اس لیے کہ جب خاندان تیموریہ کا زوال ہوا تو گورو کے چیلے جنگجو سپاہی بن گئے۔ اور ان کے ماننے والوں نے بھگتی بانڑی چھوڑ کر مذہبی جوش میں تلوار سنبھال لی۔ چنانچہ آخر کار لاہور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت کا صدر مقام بنا۔ اور اس کے بعد انگریزی دور میں اس صوبے کا پائے تخت ٹھہرا۔ جس کی سرحدیں بہترین آریہ بہادروں کے ورثا کا وطن تھیں۔ اس شاہانہ شہر کو ایک تاریخ کی ضرورت تھی۔ جس میں ماضی کے شاندار واقعات کا حال اور ان عظیم افراد کا تذکرہ ہو۔ جنھوں نے ملک کی تاریخ میں اہم کردار ادا کیا۔ ساتھ ہی تاریخی یادگاروں کا بیان بھی ہو۔ ایسی کوئی کتاب موجود نہ تھی۔ یوں کہنے کے لیے لاہور کی ایک مختصر تاریخ مسٹر تھارن ٹن (THORNTON) نے ۱۸۷۶ء میں شائع کی تھی۔ مگر یہ ایک مختصر کتاب تھی۔ جس میں بہت سی ضروری باتوں کو حذف کر دیا گیا تھا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے موجودہ کتاب LAHORE لکھی گئی۔ کیونکہ ایسی کوئی کتاب موجود نہ تھی جس میں اسلامی دور کے اہم واقعات کو یکجا کیا گیا ہو۔ زمانہ ماقبل اسلام کی تاریخ کے متعلق بہت کم معلومات پائی جاتی تھیں۔ اسی لیے قدیم عمارات اور عجائبات پر روشنی ڈالنا اور بھی مشکل تھا۔

خزینۃ الاولیا، سکینۃ الاولیا، طبقات اکبری، اقبال نامہ جہانگیری، منتخب التواریخ وغیرہ سے صوفیائے کرام اور حکمرانانِ وقت کے حالات جس مبالغہ آمیز بلکہ ناقابلِ فہم طریق سے ہم تک پہنچتے ہیں، وہ ان کتابوں سے پوری طرح استفادہ حاصل نہیں ہونے دیتے۔ شاہجہان نامہ ملا محمد صالح لاہوری، خلاصۃ التواریخ از سجان رائے بٹالوی، بادشاہ نامہ مصنفہ عبدالحمید لاہوری، تواریخ مجددیہ، تحفۃ الواصلین شیخ احمد ربانی۔

تاج المآثر حسن نظامی لاہوری۔ تاریخ داؤدی مصنفہ عبداللہ۔ تاریخ رشیدی مصنفہ حیدر مرزا۔ تاریخ چغتائی مصنفہ محمد ہادی۔ تاریخ اندرام مخلص۔ تاریخ احمد شاہی سے جستہ جستہ فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

عمارات لاہور کے سلسلے میں ہمیں ان عمارتوں سے حکم لگانا چاہیئے۔ جو آج موجود ہیں اور امتداد زمانہ سے بچ رہی ہیں۔ افغانوں اور سکھوں نے بڑی بے دردی کے ساتھ لاہور کی عمارات کو تباہ کیا۔ بہت سی بے مثال عمارتیں قطعاً منہدم ہو گئیں۔ اور اب ان کا کوئی نشان باقی نہیں رہا۔ بعض عمارات ایسی ہیں کہ شکست و ریخت کے بعد بھی ان کا ڈھانچہ باقی ہے۔ آج بھی یہ عمارتیں گزری ہوئی حکومتوں اور مٹی ہوئی تہذیبوں کی مرثیہ خواں ہیں۔ اور اپنے ساتھ ایک یادگار وابستہ کیے ہوئے ہیں۔ عمارات لاہور پر دو کتابیں موجود ہیں۔ مولوی نور احمد چشتی کی کتاب "تحقیقات چشتی" اور رائے بہادر لالہ کنہیا لال کی کتاب "تاریخ لاہور"۔ تحقیقات چشتی میں بہت سی سنی سنائی اور فرضی کہانیاں پائی جاتی ہیں۔ اور تاریخ لاہور میں کوئی نئی بات نہیں۔ چنانچہ مصنف کو اپنے کام کا مواد نہ مل سکا اور اس سے شہر کے پرانے باشندوں ارباب علم و فضل۔ بڑے بوڑھے اور دوسرے لوگوں کے پاس جا جا کر معلومات فراہم کرنا پڑی۔ پھر اس معلومات کو دوسری کتابوں اور حوالہ جات کی روشنی میں پرکھنا پڑا ——— ریاض الاحباب۔ تذکرۃ العارفین۔ قصص الاولیا۔ نفحات الانس۔ مراۃ الہند۔ حبیب السیر۔ کتاب رضوانی۔ کشف المحجوب۔ حقیقت الفقرا۔ دلیل العارفین وغیرہ اور ان کے علاوہ بھی بے شمار کتابوں سے فائدہ اٹھایا گیا۔ چنانچہ اسلامی دور کے خاتمے پر جن عمارتوں کو سرے ہی سے نیست و نابود کر دیا گیا۔ ان کے متعلق پوری تحقیق کی گئی ہے اور جو قدیم عمارتیں شہر لاہور کے اندر یا قریب واقع ہیں۔ ان کی جزئیات فراہم کی گئی ہیں۔

آخر میں مصنف نے انگریزی دور حکومت پر اظہار اطمینان کیا ہے کہ اس سے قبل کا دور مسلمانوں کے لیے کتنا تکلیف دہ تھا۔ اس کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے لاہور کی تمام مسجدوں میں گولہ بارود وغیرہ ذخیرہ کر رکھا تھا۔ اور بعض مساجد میں فوجیوں کے گھوڑے تک باندھے جاتے تھے۔ مصنف کا دعویٰ تو یہ ہے کہ خود اسلامی دور میں بھی جان و مال کی حفاظت ایسی نہ تھی۔ جتنی انگریزی عملداری میں ہے۔ یہاں تک کہ اکبر اعظم کے عہد زریں میں ایسی خوشحالی اور اطمینان اہلیان لاہور کو حاصل نہ تھا۔

یہ کتاب ۱۸۹۲ء میں طبع ہوئی۔ اس کے بعد اب تک اس کی بے حد مانگ رہی ہے۔ طبع ثانی ۵۷-۱۹۵۶ء میں منظر عام پر آئی۔ کتاب میں سو سے زائد صفحے اور شہر لاہور کا ایک نقشہ شامل ہے۔ بعد کے مورخین لاہور نے خواہ حوالہ دے کر خواہ حوالہ دیئے بغیر اسی کتاب سے اپنا مواد حاصل کیا۔ یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔

باب اوّل:۔ اس میں لاہور کا تاریخی حال ہے۔ لاہور کا نام اور بنا کی تاریخ۔ لاہور اسلامی دور حکومت سے پہلے غزنوی خاندان۔ غوری خاندان۔ خاندان غلاماں۔ خلجی۔ تغلق خاندان۔ لودھی خاندان۔ دور مغلیہ۔ ہمایوں۔ اکبر۔ جہانگیر۔ شاہجہان۔ اورنگ زیب اور جانشینان اورنگ زیب۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ اور ان کے جانشین۔ انگریزوں کی فتح پنجاب۔ اس دور میں لاہور پر کیا گزری۔ اور ان حکمرانوں کا اس شہر کے ساتھ کیا تعلق رہا؟

باب دوم:۔ یہ باب بیانیہ ہے۔ اس میں دریائے راوی۔ شہر پناہ۔ اور اس کے تیرہ دروازے (روشنائی دروازہ۔ کشمیری دروازہ۔ مستی دروازہ۔ خضری دروازہ۔ یکی دروازہ۔ دہلی دروازہ۔ اکبری دروازہ۔ موچی دروازہ۔ شاہ عالمی دروازہ۔ لوہاری دروازہ۔ موری دروازہ۔ بھاٹی دروازہ اور ٹکسالی دروازہ) مغلوں کے ابتدائی دور کا لاہور۔ لاہور کے مختلف محلے اور بازار۔ مہاراجہ رنجیت اور اس کے جانشینوں کے

زمانے میں۔ لاہور کی عمارتیں ہندو عہد حکومت۔ پٹھان دور حکومت۔ مغل اور سکھ ادوار حکومت۔ مختلف بادشاہوں اور شاہزادوں کے مزارات۔ مقبرہ جہانگیر۔ مزار نورجہاں۔ بارہ دری کامران۔ بادشاہی مسجد۔ مسجد وزیر خاں۔ سنہری مسجد۔ حضوری باغ۔ قلعہ۔ رنجیت سنگھ کی سمادھی۔ مسجد مریم زمانی۔ شالامار باغ۔ مقبرہ انارکلی۔ چوبرجی کا ذکر ہے۔

باب سوم:۔ یہ باب بھی بیانیہ ہے اور موجودہ زمانے سے متعلق ہے۔ اس میں انارکلی۔ میاں میر۔ لاہور کی آبادی۔ موسم۔ درخت۔ پھل۔ پھول۔ ترکاریاں۔ لوگوں کے رسومات۔ میلے ٹھیلے۔ جدید عمارتوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ نیشنل آرٹس کالج۔ اورینٹل کالج۔ ڈی اے وی کالج۔ ریلوے سٹیشن۔ میو ہسپتال۔ گورنمنٹ ہاؤس۔ تار گھر۔ سنٹرل جیل۔ جنرل پوسٹ آفس۔ سینٹ ہال۔ گورنمنٹ کالج۔ پنجاب یونیورسٹی۔ پنجاب ریلیجس سوسائٹی۔ مسجد کریم بخش۔ مسجد صفدر خاں۔ راوی کا پل۔ پنجاب پبلک لائبریری اور لاہور کے مشہور خاندانوں کا تذکرہ دیا ہوا ہے۔

باب چہارم:۔ اس میں لاہور کے عجائبات: سنٹرل میوزیم۔ بدھوں کے مجسمے۔ کوہ نور ہیرے کی تاریخ۔ زمزمہ (توپ) نواب علی مردان خاں کے بزرگوں کے حالات۔ پرانے سکہ جات کا حال اور ان کی ۱۱۲ تصاویر ہیں۔

سید لطیف ایک باکمال مورخ تھے۔ ان کی تحریر بہت سلجھی ہوئی ہے۔ تاریخی واقعات کو نہایت قابلیت سے پیش کیا ہے۔ ان کے انداز بیان میں ایک خاص روانی اور ندرت ہے جس سے ان کی تاریخ نویسی میں ادبی چاشنی بھی ہے۔ ایک مورخ کی حیثیت سے ان کا مقام بہت بلند ہے۔

اپنی ملازمت کے دوران میں آپ نے ڈسٹرکٹ جج اور ڈویژنل جج کا عہدہ بھی حاصل کیا۔ لیکن فرصت کا کوئی وقت بھی بے کار نہیں جانے دیا۔ مسٹر پلوڈن ریذیڈنٹ حیدرآباد (دکن) نے ایک مرتبہ آپ کو چیف جج کے لیے حیدرآباد بلایا اور باضابطہ آپ کا تقرر بھی منظور ہو گیا۔ مگر آپ کے مخلص احباب نے آپ کو وہاں نہ جانے دیا۔

چونکہ انھوں نے تحقیق و جستجو سے ایک اہم تاریخی کارنامہ انجام دیا تھا۔ اس لیے گورنمنٹ نے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے شمس العلماء اور خان بہادر[1] کے معزز خطابات سے ان کی عزت افزائی کی۔ وہ ایف۔ آر۔ اے۔ ایس، ایف۔ آر۔ جی۔ ایس تھے۔ ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج تھے۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے ممبر اور پنجاب یونیورسٹی کے فیلو بھی تھے۔ ان کے قلم کی جنبش نے ہزاروں تاریخی واقعات کو مٹنے سے بچایا۔ ہزاروں شخصیتوں کو گمنامی کے گوشے سے نکال کر زندہ کیا۔ تاریخ ان کی خدمات کا ہمیشہ اعتراف کرے گی۔ آخر یہ باکمال مورخ گوجرانوالہ میں جہاں وہ بطور جج خدمات انجام دے رہے تھے، ۲۴ فروری ۱۹۰۲ء میں انتقال کر گئے۔ ان کی نعش لاہور لائی گئی۔ اور قبرستان میانی صاحب میں دفن ہوئے۔ ان کی اہلیہ محترمہ سر سید احمد خان کے خاندان سے تھیں ان کا انتقال جون ۱۹۱۸ء میں ہوا ع

تو ہی باقی رہے گا یا باقی

کرنل بھولا ناتھ (المتوفی ۱۳۵۵ھ / ۱۹۳۶ء)

کرنل بھولا ناتھ ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک ذی عزت راجپوت خاندان سے تھا۔ مذہباً عیسائی تھے۔ ابتدائی تعلیم لاہور ہی میں ہوئی۔ پھر میڈیکل کالج سے ۱۸۸۸ء میں ڈاکٹری کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد انگلستان جا کر انڈین میڈیکل سروس میں داخل ہو گئے۔ ۱۹۲۰ء میں لیفٹیننٹ ہوئے۔

---

[1] خان بہادر کا خطاب ۱۸۹۰ء اور شمس العلماء کا خطاب ۱۸۹۸ء میں ملا۔

پھر کرنل ہو گئے۔ انگلستان سے واپسی پر بی بی بھگوتی دیوی سے شادی کی۔ وہ بھی شریف راجپوت گھرانے کی چشم و چراغ تھیں۔ دونوں زندگی بھر ایک دوسرے کے معاون صلاح کار اور غم گسار رہے۔ مسز بھولا ناتھ کی وفات کے چند روز بعد ۳۱ جنوری ۱۹۳۶ء کو کرنل صاحب خود بھی چل بسے ان کی وفات حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے واقع ہوئی۔

۳۰ سالہ فوجی اور سول ملازمت کے بعد ۱۹۲۲ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور پنشن لے کر لاہور ہی میں اقامت اختیار کی۔ اور خدمتِ خلق میں مصروف رہے۔ علمی و فنی مشاغل ان کی زندگی کا جزو تھے۔ سیر و سیاحت سے اکثر جی بہلایا کرتے تھے۔ اوائل عمر ہی سے شعر و سخن کے دلدادہ تھے۔ ادبی محفلوں میں اردو، فارسی اور پنجابی میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ وارث تخلص تھا۔ اچھے شاعروں میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔

تصنیف و تالیف کا بھی شوق تھا۔ انھوں نے اپنے پیشے کی رعایت سے دورانِ ملازمت میں ایک کتاب "علم و عمل طب" کے نام سے لکھی، یہ بڑی مستند کتاب ہے جس میں طبی معلومات کا ایک خزانہ جمع کر دیا ہے۔ ایک دوسری کتاب اپنی وفات سے ڈیڑھ دو سال قبل "جنسی امراض اور ان کا علاج" مرتب کی۔ یہ کتاب اُردو زبان میں ہے اور اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اس کے کئی ایڈیشن کتب خانہ لطف زندگی اندرون موچی دروازہ سے شائع ہو چکے ہیں۔

چونکہ وہ ایک ڈاکٹر تھے۔ ان کے نام کے ساتھ (آئی۔ ایم۔ ایس۔ سی۔ ایس۔ آئی سابق ڈائرکٹر میڈیکل سروس (الہ آباد) و جنرل انچارج برٹش فیلڈ ہسپتال عراق آنریری فزیشن ہز مجسٹی شہنشاہ جارج پنجم) لکھا جاتا تھا۔ فن طب میں یگانۂ روزگار تھے۔ ان کی فطری صلاحیت اور تجربے نے ان کی شہرت میں چار چاند لگا دیئے تھے۔

ایک ڈاکٹر ہوتے ہوئے بھی جہاں ان کا دل خدمتِ خلق کے جذبے سے مملو تھا۔ وہاں وہ ادبی ذوق کی نعمت سے بھی مالا مال تھے۔ انھوں نے اپنے فرائضِ منصبی کی ادائیگی کے علاوہ علمی و ادبی کام بھی کئے ہیں۔ اکثر مشاعروں میں شرکت کی۔ ادبی انجمنوں کی استدعا پر بعض اوقات صدارت کے فرائض بھی انجام دیئے۔ اور تقاریر بھی کیں۔ ابنائے وطن میں ادبی ذوق پیدا کرنے کے لیے ہمیشہ تگ و دو کی۔ اُردو ہی کی نہیں۔ بلکہ پنجابی کی بھی سرپرستی کی۔

پنجابی زبان میں ان کی ایک گراں قدر تصنیف تاریخ شہر لاہور ہے۔ یہ کتاب اردو رسم الخط میں ہے، پرو پرائٹر سارنگ آفس گنپت روڈ لاہور نے ۱۹۳۳ء میں شائع کی۔ کتاب کے ۳۵۷ صفحات ہیں۔ یہ کتاب انھوں نے اپنی اہلیہ محترمہ شریمتی بھگوتی بھولا ناتھ کے نام معنون کی ہے۔ اصل میں یہ کتاب ان مضامین کا مجموعہ ہے جو رسالہ سارنگ میں چھپتے رہے۔ انھوں نے اس کتاب کے صفحہ (۲۴۵) میں اس امر کا ذکر کیا ہے۔ کہ شہر لاہور کے مضمون ڈیڑھ سال تک رسالہ سارنگ میں چھپتے رہے۔ اس رسالہ کے ایڈیٹر مسٹر ایس۔ ایل۔ پراشر تھے۔ ان سے اجازت حاصل کر کے ان مضامین کا یہ مجموعہ ستمبر ۱۹۳۳ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔ یہ کتاب مہاراجہ رنجیت سنگھ کے راج کے وسط تک لکھ کر چھوڑ دی گئی۔ مہاراجہ کے زمانے سے لے کر ۱۸۸۹ء تک پچاس برس ہوتے ہیں۔ اس عرصہ میں بے شمار دلچسپ تاریخی واقعات پیش آئے جو کرنل بھولا ناتھ نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ ان پچاس ساٹھ برس کے حالات پر علیحدہ کتاب لکھیں گے۔ مگر زندگی نے وفا نہ کی۔ اور ان کے لکھنے کی نوبت نہ آئی۔

"شہر لاہور دی تاریخ" لکھتے وقت کرنل بھولا ناتھ نے یہ التزام قائم رکھا ہے کہ لاہور کے جس قدر قدیم نام ہیں ان کا شمار کیا ہے لوپور۔ لولوک۔ لوکلا (لولوک اور لوکلا کو کئی مورخ لاہور ہی سمجھتے ہیں)۔ لوہکوٹ۔ لہاور۔ لوپور۔ لوہار۔ لوہر۔ راہوار۔ یہ لاہور کے نام لکھے

کے بعد ابوریحان بیرونی کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ جب وہ محمود غزنوی کے ہمراہ لاہور آیا۔ تو اس وقت اس کو لاہور ہی کہتے تھے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ ہندوؤں کی پرانی متبرک کتابوں (وید۔ مہا بھارت۔ رامائن پران۔ راج ترنگنی) میں لاہور کا کہیں نام نہیں آیا۔ بدھ مت کی کتابوں میں بھی یہ نام نہیں ملتا۔ اگرچہ پرش پور (پشاور) ٹکسلا۔ قصور۔ جالندھر۔ سالکوٹ کے نام سیاحوں نے لکھے ہیں۔ لاہور کا ذکر ان میں بھی نہیں چینی سیاحوں نے ان تمام اقوام کا بھی ذکر کیا ہے۔ جو اس زمانے میں پنجاب میں مختلف مقامات پر قابض تھیں۔ لیکن انھوں نے بھی لاہور کا کہیں نام نہیں لیا۔ یہ بحث طویل ہے اور کرنل صاحب نے اسے نہایت قابلیت سے آسان پنجابی میں پیش کیا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کو اس زبان پر پوری دستگاہ حاصل ہے۔ آخر انھوں نے خلاصۃ التواریخ کا حوالہ دے کر یہ قطعہ تاریخ نقل کیا ہے ؎

محمود بنا کرد چو لاہور لسانور ۔۔۔ در ہند یکے کعبۂ مقصود بنا کر

اندیشہ چو کردم پے تاریخ بنائش ۔۔۔ فی الفور خرد گفت کہ محمود بنا کر

"محمود بنا کرد" کے ۲۹۵ عدد لئے ہیں (کہ کے بیس عدد لئے ہیں۔ کہ میں ہائے ہوز کو شمار نہیں کیا) جو ۲۹۵ھ سنہ کے مطابق بتایا گیا ہے۔ آگے چل کر اس پر بھی تنقید کی ہے کہ لاہور کی فتح کے متعلق تاریخ فرشتہ۔ طبقات اکبری اور سیر المتاخرین سے معلوم ہوتا ہے کہ لاہور ۴۱۲ھ میں فتح ہوا۔ اور محمود غزنوی نے لاہور کو محمود پور کا نام دیا۔ محمود پور کی کرنل بھولا ناتھ نے یہ حد بندی کی ہے۔ ایاز کی قبر کو ایک نشان مانا ہے دوسرا نشان داتا گنج بخش کا مزار ہے۔ اور تیسرا نشان شیش محل جو جواہرات کی خرید و فروخت کرنے والوں کا بازار تھا۔ یہ ضلع کچہری کے پاس تھا۔ محمود پور کی نشان دہی کے بعد پرانے لاہور کی جائے وقوع کے متعلق قیاس آرائی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شاہجہان آباد کے اجمیری دروازے کا منہ اجمیر کی طرف۔ کشمیری دروازے کا رخ کشمیر کی طرف اور دلی دروازے کا رخ پرانی دلی کی طرف تھا۔ اسی طرح پرانے بغداد کے چار دروازے تھے۔ باب شام۔ باب کوفہ۔ باب بصرہ و باب خراسان ان دروازوں کا رخ شام۔ کوفہ بصرہ اور خراساں کی طرف تھا۔ یہی حال لاہور کا ہے۔ دلی دروازے کا رخ دلی کی طرف۔ کشمیری دروازے کا رخ کشمیر کی طرف اور لاہوری دروازے کا رخ پرانے لاہور کی طرف تھا یعنی پرانا لاہور لاہوری دروازے کے باہر واقع ہونا چاہئے۔ یہ بحث طویل بھی ہے اور اس پر کافی نقد و تبصرہ کرنے کی گنجائش ہے۔

کرنل صاحب نے غزنوی۔ سلجوقی۔ غوری۔ ایبک۔ غلاماں۔ تغلق۔ لودھی۔ خلجی۔ یونانی اور مغلیہ خاندان کے حکمرانی کے زمانے میں لاہور کی جو حالت ہوتی رہی بیان کی ہے۔ مغلیہ دور کو خاص طور سے لکھا ہے اور داد تحقیق دی ہے۔ واقعات کے ذکر کے ساتھ مناسب فارسی اشعار بھی استعمال کئے ہیں۔ جو ان کے فارسی زبان سے شغف پر دال ہیں۔

اس کتاب میں کرنل صاحب نے ایک نہایت اہم عنوان قائم کیا ہے "پنجابی بولی اتے دھاندرے دا اثر" اس باب میں انھوں نے لکھا ہے کہ پنجاب کے خطے کی زبان پر مسلمانوں کے اثر سے کس قدر تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ برج بھاشا میں عربی اور فارسی الفاظ بغیر کسی تحریک کے داخل ہونے شروع ہوئے۔ اسلامی تمدن اور ہندو تہذیب کے ملاپ سے کتنے الفاظ عوام کی زبانوں میں بے تکلف داخل ہو گئے۔ فارسی زبان میں بھاشا کے الفاظ آہستہ آہستہ شامل ہونے لگے۔ یہ ملاپ کچھ اس طرح واقع ہوا کہ نئی زبان سانچے میں ڈھلنے لگی۔ لیکن اس کو جدا زبان نہیں کہا جاسکتا۔

(۱) اس ضمن میں انھوں نے چند ایسے عربی و فارسی الفاظ کا بھی ذکر کیا ہے۔ جو تغیر کے ساتھ پنجابی زبان میں شامل ہو گئے۔ مثلاً

فارسی عربی	پنجابی	فارسی عربی	پنجابی
مشعل	مشال	پلید	پلیت
سوز	سوج	مسجد	مسیت
تعویذ	تویت	تاریخ	تریک
بغل	بگل	فریب	پرپیچ
کاغذ	کاگت	زکوٰۃ	جکاتاں

(۲) ایک حرف آگے پیچھے کرکے چند الفاظ اس طرح رائج ہوگئے۔

محتاج	مہتاج	فتیلہ	پلیتہ
نفلی	تقلی	قفل کنجی	کلف کنجی

(۳) ایک حرف گھٹا کر نئے الفاظ بنائے گئے۔

بادام	بدام	فالودہ	پھلودہ
روزینہ	رجینہ	بازار	بجار

(۴) لفظ کو بالکل بدل دیا گیا۔

ذات الجنب	جاتل جم	چوزہ	چوچا
دہل	ڈھول	منفج	منجش

(۵) سے نئے پنجابی الفاظ ڈھالے گئے۔

مزاج	مجاجی	جراحت	جراحی
پلید	پلیتی	نماز	نماجی
پیغمبر	پیگمبری	موج	موجاں

(۶) بنے بنائے الفاظ پنجابی زبان میں شامل ہوگئے۔

فوج سے متعلق الفاظ: ۔قلعہ۔فیل۔برج۔خندق۔مینار۔قواعد۔پیادہ۔سوار۔توپ۔بندوق۔تیر کمان۔رکاب۔زین۔لگام۔نمدہ۔برق انداز۔گولہ انداز۔زرہ۔زنجیر۔بادشاہ۔حاکم۔وزیر۔تخت۔

پہننے کے کپڑوں وغیرہ کے الفاظ: ۔پجامہ۔جامہ۔سلوار۔کلاہ (کلاّ) لنگی۔کمربند۔ازاربند۔تہمت (تہ بند) لباس۔لحاف (لیف) رومال۔چغہ۔چادر

کھانا پکانے سے متعلق الفاظ: ۔حلوا۔پلاؤ۔قورمہ۔زردہ۔قیمہ۔کباب۔شکرپارہ۔شوربا۔نان۔خطائی۔باقرخانی۔خمیری۔برف۔شربت۔کلفی (قلفی)

دین و مذہب سے متعلق الفاظ: ۔اللہ۔خدا۔رب۔الٰہی۔رسول۔نبی۔پیغمبر۔مرشد۔فقیر۔پیر۔مرید۔حلال۔حرام۔موت۔حیات۔دوزخ

بہشت۔ قبر۔ مقبرہ۔ روضہ۔ جنازہ۔ کفن۔ نماز۔ روزہ۔ وضو۔ غسل۔ فرشتہ۔ بانگ۔ قرآن۔ پارہ۔ حافظ۔ مسجد۔ مولوی۔ قاضی۔ مفتی۔

گھر سے متعلق الفاظ:۔ دیوار۔ بالاخانہ۔ برانڈہ (برآمدہ) منزل۔ بارہ دری۔ دالان۔ صحن۔ شہ نشین۔ تہ خانہ۔ سرد خانہ۔ پاخانہ۔ میز۔ کرسی۔ دروازہ

رنگ کے متعلق الفاظ:۔ قرمچی (قرمزی) جمردقی (زمردی) عنابی۔ نافرمانی۔ گلابی۔ پیازی۔ سرمئی۔ جنگالی (زنگاری)

رشتوں کے متعلق الفاظ:۔ مرد۔ خاوند۔ بیوی۔ رشتہ داری۔ مالک۔ غلام۔ پردہ۔ برقع۔ داماد۔ شادی۔ نکاح۔ طلاق۔ حق مہر

باغ سے متعلق الفاظ:۔ باغ۔ باغیچہ۔ پھوارہ (فوارہ) تختہ۔ سرو۔ گل۔ بلبل۔ نرگس۔ عاشق۔ معشوق۔ نہر۔ دریا۔ لہر۔ زلف۔ رخسار۔ ابرو۔ بوسہ۔ شراب۔ ساقی۔ پیالہ۔ خمار۔ مستی۔ نشہ۔ بہار۔ ہوا۔ بارش۔ ہجر۔ وصل۔

اسی طرح حکومت سے متعلق۔ میوہ۔ سبزی کے متعلق۔ پیشے سے متعلق۔ پنجابی ناموں کے متعلق۔ طب سے متعلق الفاظ کی انھوں نے فہرست دی ہے۔ اور بتایا ہے کہ پنجابی زبان نے عربی اور فارسی سے قدم قدم پر مدد لی ہے۔ اور سینکڑوں الفاظ کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے۔

کرنل صاحب نے یہ تاریخ نہایت اہتمام سے لکھی ہے۔ بڑی محنت سے تنقید و تبصرہ کیا ہے۔ اپنے بیان میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے ضعیف روایات کا سہارا بھی لیا ہے۔ کیونکہ پنجابی زبان میں کوئی دوسری تاریخ مرتب نہیں ہوئی۔ اس لیے مورخ اسے وقعت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ انھوں نے نہایت اہم اور مفید باتیں اور تاریخی تفصیلات اس کتاب میں درج کر دی ہیں جو پڑھنے کے بعد سمجھنے اور سمجھنے کے بعد پرکھنے کی دعوت دیتی ہیں ——— اگر یہ کتاب تعصب کو بالائے طاق رکھ کر لکھی جاتی اور تنقید و تبصرہ میں دیانتدارانہ پہلو اختیار کیا جاتا تو اس کی اہمیت بہت بڑھ جاتی۔ پھر بھی کرنل صاحب کی یہ مساعی جمیلہ ہمیشہ مورخین سے خراج تحسین حاصل کرتی رہے گی۔ اگرچہ اس کتاب میں غیر جانبدارانہ تاریخ نویسی کا حق ادا نہیں کیا گیا۔

منشی محمد دین فوق (المتوفی ۱۳۶۴ھ/۱۹۴۵ء)

منشی محمد دین فروری ۱۸۷۷ء میں موضع کوٹلی ہرنارائن ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد کا نام مولوی لدھا خان تھا۔ جو ریاست پونچھ (کشمیر) میں سررشتہ داری کے عہدے پر فائز تھے۔ پہلے آپ شوق تخلص فرماتے تھے۔ لیکن جب انھوں نے اپنا کلام رسالہ "انتخاب" لکھنؤ میں برائے اشاعت بھیجا تو اس زمانے میں چونکہ شوق نیموی عظیم آبادی کا طوطی بول رہا تھا۔ اس لیے مدیر "انتخاب" نے ان کو لکھا کہ حضرت شوق کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے شوق کے کلام کی اشاعت کا امکان اس رسالہ میں نہیں۔ اور ساتھ ہی انھوں نے مشورہ دیا۔ کہ وہ اپنا کلام شوق کی بجائے فوق کے نام سے اگر ارسال کریں۔ تو وہ شائع کر دیا جائے گا۔ چنانچہ منشی صاحب مرحوم نے یہ تجویز پسند کی۔ اور فوق تخلص اختیار کر لیا۔

ابتدائی تعلیم جامکے (ضلع سیالکوٹ) سے شروع ہوئی۔ ۱۸۹۱ء سے ۱۸۹۴ء تک مڈل اسکول میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ علمی ذوق اور فطری مناسبت کی وجہ سے اپنے احباب میں عزت کی نظر سے دیکھے جانے لگے۔ زمانۂ طالب علمی میں حضرت نظیر اکبر آبادی کی مشہور نظم "کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے" کا فارسی میں منظوم ترجمہ کیا۔ اگرچہ اس وقت وہ علم عروض سے محض نابلد تھے لیکن طبیعت میں موزونیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس لیے ترجمہ میں کہیں عروضی سقم نہ تھا۔ اس کمال کو دیکھ کر ان کے اساتذہ اور احباب بہت خوش ہوئے جس سے ان کی قابلیت کی دھاک بیٹھ گئی۔ جامکے سے خالصہ ہائی سکول گوجرانوالہ اور اس کے بعد ایچی سن مڈل سکول لاہور میں بھی آپ نے تحصیل علم کی۔ ۱۸۹۵ء میں مڈل کا امتحان پاس کر کے سیالکوٹ میں پٹوار کا کام سیکھنا شروع کیا۔ وہاں ملازمت کی توقع پر جموں تشریف لے گئے۔ جموں سے ۱۸۹۶ء میں پھر لاہور کا رخ کیا۔

لاہور میں مشاعروں کا زور تھا۔ "انجمن اتحاد" جس کی بنیاد حکیم شجاع الدین محمد نے ۱۸۹۰ء میں ڈالی تھی خوب چمک رہی تھی اور ہفتہ وار مشاعرے اندرون بھاٹی دروازہ ہو رہے تھے۔ پہلے اس انجمن کے مشاعرے حکیم امین الدین بیرسٹر کے مکان پر ہوتے تھے۔ ۱۸۹۶ء میں حکیم شجاع الدین محمد کے انتقال کے بعد یہ مشاعرے نواب غلام محبوب سبحانی کی سرپرستی میں ہوتے رہے۔ خان احمد حسین خاں مدیر "شباب اردو" اس انجمن کی جان تھے۔ میرزا ارشد گورگانی دہلوی ان مشاعروں میں خاص طور سے شرکت کرتے تھے۔

شاعرانہ چشمک کی بنا پر انجمن دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ نئی انجمن نے بزم قیصری کے نام سے میر ناظر حسین ناظم لکھنوی کی سرپرستی میں علیحدہ مشاعرے کرنے شروع کیے۔ یہ مشاعرے حضوری باغ میں ہوتے تھے۔ خان احمد حسین خاں کی طرف سے "شور محشر" اور ناظم صاحب کی طرف سے "سخن" طرحی غزلوں کے گلدستے ماہوار شائع ہوتے تھے۔ "انجمن اتحاد" اور "بزم قیصری" دونوں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی پوری کوشش کرتی تھیں۔ ان دونوں مشاعروں کی گہما گہمی سے عوام میں صحیح شعری ذوق بیدار ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم زمانۂ طالب علمی میں نواب صاحب کے مشاعروں میں شریک ہو کر طرحی غزلیں پڑھا کرتے تھے۔ اسی زمانے کا یہ مقطع ہے ؎

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ اس پر نہیں نازاں
مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغ سخنداں کا

فوقؔ صاحب بھی ان مشاعروں میں شریک ہوتے۔ اور داد سخن دیتے۔ اسی زمین میں ان کا ایک شعر ہے ؎

بہائے آنکھ نے شرم گنہ سے اس قدر آنسو
کہ بہر اشک ندامت نے دکھایا جوش طوفاں کا

مشاعروں میں شرکت اور طرح پر غزلیں کہنے سے فوقؔ صاحب کی مشق سخن بڑھنے لگی۔ چنانچہ انھوں نے جہاں استاد حضرت داغؔ سے اصلاح کلام کی استدعا کی۔ چنانچہ ۱۸۹۵ء میں آپ حضرت فصیح الملک مرحوم کے باقاعدہ شاگرد ہو گئے۔ اور ان کا کلام حضرت داغؔ کے ملاحظے کے بعد روز بروز روشن تر ہونے لگا۔ استاد اور شاگرد میں والہانہ محبت تھی۔ استاد اپنے شاگرد کا دل بڑھاتے۔ شاگرد اپنے استاد کے فیض کے گن گاتا۔ اسی دور کا ایک شعر یادگار ہے ؎

داغؔ کا فیض اگر یونہی رہے گا اے فوقؔ
مان جائیں گے سخنور بھی فصاحت میری

چنانچہ داغؔ کے کمال کا رنگ شاگرد کے کلام میں جھلکنے لگا۔ ان کا کلام ماہوار گلدستوں میں چھپ کر خاص و عام سے خراج تحسین حاصل کرنے لگا۔ چنانچہ نظم میں انھوں نے تمام اصناف سخن پر یکساں داد سخن دی ہے۔ جس سے ان کی کہنہ مشقی آشکارا ہے۔

وہ ایک آتش بیان شاعر ہی نہ تھے۔ بلکہ ایک بہت بڑے صحافی بھی تھے۔ انھوں نے "پنجۂ فولاد" ۱۹۰۱ء میں جاری کیا۔ حضرت فصیح الملک نے قطعہ تاریخ کہا ؎

ہوا ہے پنجۂ فولاد جاری	خریدار و نیا اخبار دیکھو
جناب فوقؔ کی گلکاریوں سے	ہوا اخبار یہ گلزار دیکھو
نئی خبریں بہت سچی ملیں گی	جو ہو کر طالب بیدار دیکھو

نظر چڑھ جائے گر اہلِ نظر کی — پھر اس کی گرمیٔ بازار دیکھو
یہی پرچہ تو پرچاتا ہے دل کو — نہ ہوگا اس سے دل بیزار دیکھو
اٹھا و رکھو کے سو سو بار اس کو — اگر دیکھو تو سو سو بار دیکھو

سنا دو مصرعِ تاریخ اے داغ
یہ نو اخبار جوہر دار دیکھو
۱۳ھ ۱۹

یہ اخبار اس دور کے بہترین اخبارات میں شمار ہوتا تھا۔ لیکن ایک دوست نما دشمن کی مہربانی سے ۱۹۰۵ء میں بند ہو گیا۔ ۱۹۰۶ء میں انھوں نے "کشمیری میگزین" نام سے ایک ماہوار رسالے کا اجرا کیا جو ۱۹۱۳ء میں ترقی کرتے کرتے ہفتہ وار اخبار کی شکل اختیار کر گیا۔ تیس برس یہ اخبار نکلتا رہا جس نے علم و ادب کے ترویج کے علاوہ معاشرتی اور سماجی خدمات ایک مدت تک انجام دیئے۔ ۱۹۳۴ء میں آخر یہ اخبار بند ہو گیا۔ منشی صاحب مرحوم نے پیسہ اخبار اور پنجاب کے اوّلین اخبار "کوہ نور" کے بھی ادارتی فرائض انجام دیئے، جس سے ان کا شمار پنجاب کے اوّلین اخبار نویسوں میں ہوتا ہے۔

منشی صاحب ایک نغز گو شاعر اور کامیاب اخبار نویس ہی نہ تھے۔ بلکہ ایک مایۂ ناز مورخ اور صاحب نظر مصنف بھی تھے انھوں نے نظم و نثر میں بہت سی کتابیں لکھیں جن کے نام یہ ہیں:-

کشمیر کے متعلق

۱۔ تاریخ کشمیر جلد اوّل (راجگان قدیم)
۲۔ تاریخ کشمیر جلد دوم (شاہانِ اسلام)
۳۔ تاریخ کشمیر جلد سوم (سکھ اور ڈوگرہ راج)
۴۔ رہنمائے کشمیر (کشمیر گائیڈ)
۵۔ تاریخ اقوام کشمیر (تین جلد)
۶۔ شاہی سیر کشمیر
۷۔ سفرنامہ کشمیر
۸۔ غنی کاشمیری
۹۔ للہ عارفہ
۱۰۔ کشمیر کی رانیاں
۱۱۔ مشاہیر کشمیر
۱۲۔ خواتین کشمیر
۱۳۔ شباب کشمیر
۱۴۔ حکایات کشمیر
۱۵۔ کشمیری زمیندار
۱۶۔ تذکرہ سلطان زین العابدین
۱۷۔ تاریخ بڈشاہی (سوانح سلطان زین العابدین عرف بڈشاہ)۔ اس تصنیف پر مصنف کو حکومت کشمیر کی طرف سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا گیا۔
۱۸۔ تاریخ اقوام پونچھ (دو جلد)
۱۹۔ حکمت کے موتی (بارھویں صدی کے ایک کشمیری مورخ کے حالات مع نصائح)
۲۰۔ جغرافیہ پونچھ
۲۱۔ دربار جمبر

عام تاریخی کتابیں

۲۲۔ تاریخ حریت اسلام
۲۳۔ تاریخ کا روشن پہلو

۲۴۔ تاریخ شالامار باغ
۲۵۔ سوانحات ملک العلماء علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی مع تاریخ سیالکوٹ و مشاہیر سیالکوٹ
۲۶۔ تاریخ انگورہ
۲۷۔ تذکرہ خواتین دکن
۲۸۔ تذکرۃ العلماء والمشائخ لاہور
۲۹۔ جمال الدین افغانی
۳۰۔ مکمل سوانح عمری داتا گنج بخش رح
۳۱۔ حیات مولانا روم
۳۲۔ حالات شمس تبریز رح
۳۳۔ یاد رفتگان یا تذکرہ صوفیائے لاہور
۳۴۔ حیات فرشتہ (حیات مولف تاریخ فرشتہ)
۳۵۔ تذکرہ ابراہیم ادھم
۳۶۔ محب وطن خواتین ہند
۳۷۔ سعد زاغلول پاشا
۳۸۔ سیرت فریدیہ (سوانح نواب فریدالدین احمد وزیر شاہ دہلی)
۳۹۔ تذکرۃ الصالحین
۴۰۔ سوانح عمری ایڈورڈ ہفتم
۴۱۔ تان سین کے حالات
۴۲۔ فاتح ملتان
۴۳۔ راجہ بیربر
۴۴۔ حالات راجہ ٹوڈرمل
۴۵۔ حالات نورجہاں و جہانگیر
۴۶۔ ماتم پہلوانی (سوانح غلام پہلوان)
۴۷۔ حالات جہانتا بدھ
۴۸۔ آفتاب ہند جیل کھنڈ
۴۹۔ لاہور عہد مغلیہ میں
۵۰۔ بتان حرم (ان ہندو رانیوں کے حالات جو مسلمان بادشاہوں کے حرم میں داخل ہوئیں)
۵۱۔ محمد بن قاسم
۵۲۔ ہندوستانی وی سی (وکٹوریہ کراس حاصل کرنے والوں کے حالات)
۵۳۔ سر جگدیش چندر بوس
۵۴۔ الیا بابی
۵۵۔ اخبار نویسوں کے حالات
۵۶۔ آئینہ اخلاق (بانیان مذاہب اور رہنمایان اقوام کے حالات)

منظومات

۵۷۔ کلام فوق
۵۸۔ نغمہ دلگداز
۵۹۔ قومی ترانے
۶۰۔ سکاؤٹوں کے گیت
۶۱۔ روایات اسلامی
۶۲۔ اذان بت کدہ (ہندوؤں کا نعتیہ کلام)

ناول، قصے اور لطیفے

۶۳۔ عصمت آرا
۶۴۔ خانہ بربادی
۶۵۔ مسٹر بزآف امرتسر
۶۶۔ غنم نصیب
۶۷۔ انارکلی (جس کی داغ بیل پر بعد میں اردو، بنگالی، ہندی ڈرامے تصنیف ہوئے)
۶۸۔ مہذب ڈاکو
۶۹۔ محروم تمنا

۷۰۔ یتیم حکیم خطرۂ جان
۷۱۔ البسہ
۷۲۔ رام کہانی
۷۳۔ زنانہ حاضر جوابیاں
۷۴۔ استادوں اور شاگردوں کے لطیفے
۷۵۔ ڈاکٹروں اور مریضوں کے لطیفے
۷۶۔ سبق آموز کہانیاں
۷۷۔ دیوان حافظ کی تاریخی فالیں

متفرق تصانیف

۷۸۔ ناصح مشفق
۷۹۔ امتحان پاس کرنے کا گُر
۸۰۔ ہمدرد زمینداراں
۸۱۔ وجدانی نشتر (اس کا دوسرا نام سوز و گداز بھی ہے)

غیر مطبوعہ تصانیف

۸۲۔ تمدن کشمیر
۸۳۔ تذکرہ شیخ نور الدین ولی
۸۴۔ مزار الشعرائے کشمیر
۸۵۔ مہاراجہ گلاب سنگھ
۸۶۔ راجہ سکھ جیون مل
۸۷۔ کشمیر کا نادر شاہ (افغان گورنر آزاد خاں کے حالات)
۸۸۔ دیہات سدھار
۸۹۔ تذکرہ رہنمایانِ ہنود
۹۰۔ موجد اور ایجادیں
۹۱۔ چودہ حکائتیں
۹۲۔ مآثر لاہور (چار جلدوں میں)
۹۳۔ بے نشاں نامور
۹۴۔ سرگزشتِ فوق (خود نوشت حالاتِ زندگی)
۹۵۔ مضامین فوق

یہ فہرست کتب ان کے گوناگوں ذوق اور فطری رجحانات کا آئینہ ہے۔ انھوں نے جہاں کشمیر کی تاریخ کی تدوین میں کوشش کی، وہاں انھوں نے لاہور کے متعلق بھی بیش بہا معلومات فراہم کی ہیں۔ چنانچہ لاہور کے متعلق ان کی کتب بڑی وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔ موجودہ دور کے مورخ ان کی تحقیقات کو اپنی تصانیف میں بطور حوالہ پیش کرتے ہیں، جو ایک بڑی کامیابی ہے۔ ان کی تصانیف میں سے اکثر کتابیں حکومت نے لائبریریوں کے لیے منظور کی ہوئی ہیں۔ جس سے ان کے کام کی وقعت اور قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ لاہور کے متعلق ان کی چند مشہور تصانیف یہ ہیں:۔

(۱) یادِ رفتگاں :۔ یہ ہندو مسلمان صوفیائے لاہور کا ایک نادر تذکرہ ہے۔ مقدمہ میں کئی عنوانات قائم کرکے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ کیا راگ، سرود و سماع جائز ہے کہ نہیں۔ اگر جائز ہے تو اس کی کیا کیا صورتیں ہیں۔ راگ سننے اور سنانے والے کن کن خیالات کے حامل ہونے چاہئیں۔ گانا کس مضمون پر اور حاضرینِ محفل کے اخلاق و عادات کن اوصاف سے متصف ہوں۔

تصوف ایک مخصوص طریقت ہے اور مخصوص مذہبی عقائد کا مجموعہ ہے۔ اس موضوع میں بڑی وسعت ہے۔ ان عقائد کا اظہار منظوم اور منثور دونوں طرح سے بڑے زور شور سے ہوا ہے۔ اصلاحِ حال۔ خود پرستی چھوڑنے۔ صفائے قلب۔ بے غرض خدمتِ خلق۔ حق کی پیروی۔ ریاضت۔ سلوک۔ اعتکاف۔ سکوت۔ تربیتِ روح۔ تجرد۔ اعتزال۔ طریقت۔ ترکِ دنیا۔ ترکِ علائق۔ قناعت۔ اخلاصِ عبادات۔ ایثار۔ کسبِ معرفت یہ چند مخصوص عقائد ہیں۔ جن پر صوفیائے کرام پابند چلے آرہے ہیں۔

منشی صاحب مرحوم نے دیباچے میں نہایت خوبی سے صوفیائے کرام کے اقوال سے اپنے دلائل کو مضبوطی سے پیش کیا ہے۔ یہ حصہ هر پڑھنے اور پڑھنے کے بعد سمجھنے کی دعوت دیتا ہے۔

مقدمہ کے بعد لاہور کی گذشتہ اور موجودہ حالت کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد شاہ ابو المعالی، شاہ چراغ، موج دریا، گوروارجن، شاہ محمد غوث، شاہ جمال، ورس میاں وڈا، طاہر بندگی، شاہ بلاول، گھوڑے شاہ، پیر مکی، سید جان محمد حضوری، میراں بادشاہ، بھگو بھگت، گورو سری چند، حضرت ایشاں، حضرت لال حسین، حضرت شیخ مادھو، داتا گنج بخش اور حضرت میاں میر کا مختصر تذکرہ کیا ہے۔ صفحہ (۴۸) سے (۱۰۱) تک لاہور کے دوسرے (۴۲) مشہور صاحب کمال فقرا کا ذکر بھی اس کتاب میں شامل ہے۔ یہ کتاب بڑی مفید اور کار آمد ہے۔ اس میں بعض معلومات ایسی بھی ہیں جو دوسرے تذکروں میں دستیاب نہیں ہوتیں۔

(۲) شالامار باغ :۔ یہ کتاب سنہ ۱۹۰۱ء کی تصنیف ہے۔ لیکن بعد میں اضافہ کے ساتھ متعدد بار شائع ہوئی۔ اس وقت اس کے سلسلۂ جدید کا پہلا ایڈیشن ہمارے پیش نظر ہے۔ اس میں شالامار باغ اس کے شاہی ایوانات، محل سراؤں، سیر گاہوں کا حال درج ہے۔ انقلاب زمانہ کے ہاتھوں شالامار باغ پر کیا بیتی، یہ المناک داستان بھی ہمیں اس کتاب میں ملتی ہے۔ کشمیر، دہلی، پنجاب کے آٹھ اور باغات جو شالامار کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے حالات و کوائف بھی اس کتاب میں دیئے ہوئے ہیں۔ شالامار کے مختلف نام۔ اس کی وجہ تسمیہ۔ استاد جانی میر عمارت شالامار باغ کی لاگت و سال تعمیر۔ شالامار کے تین تختے (باغ فیض بخش۔ حیات بخش اور فرح بخش)۔ انگوری باغ۔ عنایت باغ۔ مہتابی باغ۔ گلابی باغ، شاہی حمام۔ سنگ یشب کا بیش قیمت حوض۔ بارہ دری کلاں۔ سرد خانہ، آبشار کلاں اور سنگ مرمر کا تخت۔ فوارے اور بارہ دریاں۔ ساون بھادوں کا نظارہ۔ میلہ شالامار کی رونق۔ شالامار باغ شاہان مغلیہ کے دور میں شالامار میں آتش بازی اور چراغاں۔ ان عنوانات پر بڑی عرق ریزی سے معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ اس کتاب کے متعلق ایک انگریز کیپٹن کرسول نے "انڈین آرکیالوجیکل" ماہ ستمبر سنہ ۱۹۲۲ء کے شمارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ جس میں انھوں نے اسلامی عمارات کے متعلق معتبر تاریخی اور روایتی معلومات بہم پہنچانے والی چند کتب کے مصنفین کا تذکرہ کیا ہے۔ ہندوستانی مصنفین میں فقط دو صاحبوں کا نام اور ان کی تصانیف کا ذکر ہے۔ اوّل سید محمد لطیف اور ان کی تاریخ لاہور اور دوسرے محمد الدین فوق اور ان کی تصنیف سیر شالامار باغ۔

شالامار باغ پر یہ کتاب اہم معلومات کا بیش بہا خزانہ ہے۔ منشی صاحب مرحوم نے بڑی محنت سے مواد فراہم کیا ہے۔ جس کی داد کچھ اہل نظر ہی دے سکتے ہیں۔

(۳) لاہور عہد مغلیہ میں :۔ منشی صاحب مرحوم کے چند مضامین شباب اُردو (لاہور) سنہ ۱۹۲۳ء و سنہ ۱۹۲۴ء اور صوفی (پنڈی بہاؤالدین) میں لاہور کے متعلق طبع ہوئے۔ شباب لاہور کے نام سے ایک مضمون "قوس و قزح" لاہور کے سالانہ نمبر سنہ ۱۹۲۶ء میں طبع ہوا۔ احباب کی تحریک سے ان مضامین کو یکجا کر دیا گیا۔ بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہان، عالمگیر کے عہد حکومت میں لاہور کی حالت کیا تھی۔ بارہ دری میرزا کامران کا حال۔ قلیچ خاں اندجانی گورنر لاہور کے زمانہ میں چند شاہی محلات و عمارات۔ مقبرہ جہانگیر، قلعہ لاہور کے مفصل حالات، لاہور شاہ عالم بہادر شاہ کے وقت میں رنجیت سنگھ اور اس کے جانشین۔ نور جہاں کی آخری آرامگاہ۔ بدھو کا آوا، مقبرہ آصف جاہ کا مقبرہ۔ عہد مغلیہ کے چند گورنر (شاہ ابوالمعالی حسین خان ٹکریہ۔ حاجی محمد خان سیستانی، مرزا حسین، قلیچ، قوام الدین خان اصفہانی، میر معین الدین احمد المخاطب بہ امانت خان اور نواب زکریا خان) انارکلی، باغ میابائی (چوبرجی) بیگم پورہ، ملکۂ لاہور (مراد بیگم) کا حال اس کتاب میں نہایت خوش اسلوبی سے درج ہے۔

(۴) **داتا گنج بخش** :۔ یہ کتاب حضرت علی مخدوم ہجویری جلابی کی سوانح عمری ہے۔ یہ کتاب پہلے اکتوبر ۱۹۱۴ء میں طبع ہوئی تھی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ستمبر ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب کی ترتیب میں انھوں نے تاریخ لاہور از کنہیا لال۔ ج لطیف۔ حدیقۃ الاولیا از سرور لاہوری۔ تحقیقات چشتی۔ سفینۃ الاولیا مصنفہ شہزادہ داراشکوہ۔ اذکار قلندری۔ کشف المحجوب۔ گنج تاریخ از سرور۔ نفحات الانس از مولانا جامی اور فرہنگ آصفیہ سے استفادہ کیا ہے۔ کتاب جامع ہے۔ جس میں حضرت داتا گنج بخش کی پیدائش سے لے کر وفات تک مکمل حالات درج ہیں۔ اس کتاب میں چند عنوانات صوفیائے کرام کے مشرب کے متعلق ہیں۔ صوفی کی تعریف۔ تصوف کی آٹھ قسمیں۔ فقرا اور صوفیا کے پاس لوگ کس غرض سے جاتے ہیں۔ درویش کو کیا چاہیے؟ حریص مرقع پوشوں کی جماعت۔ صوفیہ کے گروہ ملامتیہ کا طریق کیا ہے۔ اس فرقے کے متعلق داتا صاحب کے خیالات۔ نفس کی موافقت بندہ کی ہلاکت ہے۔ معجزہ اور کرامت میں کیا فرق ہے۔ جلالی اور جمالی توبہ اور صوفیوں کی اصطلاحات کا ذکر بڑا اہم ہے۔

(۵) **ماتم پہلوانی** :۔ یہ کتاب مشہور زمانہ غلام پہلوان کی سوانح حیات ہے جو رستم ہند کے لقب سے مشہور ہیں۔

(۶) **کلام فوق و نغمہ و گلزار** :۔ یہ دونوں مجموعے فوق کے منظوم کلام کو لیے ہوئے ہیں۔ منشی صاحب کو تمام اصناف سخن پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ ان کے مطالعہ سے اس زمانے کے لاہور کی علمی و ادبی صحبتوں کا تذکرہ اور مشاعروں کا حال ملتا ہے۔ بعض واقعات اور بعض شخصیات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

(۷) **انار کلی** :۔ یہ ایک ناول ہے۔ جس کی زبان بڑی پیاری ہے۔ اسی کی اشاعت کے بعد بنگالی اور اردو میں بہت سی گراں قدر کتابیں اس عنوان پر لکھی گئیں۔ لیکن اس کتاب کو اوّلیت کا فخر حاصل ہے۔

جب اس نامور مورخ اور ادیب نے ۱۴ ستمبر ۱۹۴۵ء کو وفات پائی تو ان کے ورثا میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جو ان کے ادھورے مسودات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی اہلیت رکھتا۔ چنانچہ مشہور محقق اور ادیب مولوی محمد عبد اللہ صاحب قریشی جو فوق صاحب کی زندگی ہی میں ان کے دستِ راست تھے اور جن کی خدمات کا اعتراف خود منشی صاحب نے تاریخ بڈشاہی کے دیباچے میں بھی کیا ہے نے بڑا کام کیا۔ انھوں نے تاریخ اقوام کشمیر کی تیسری جلد جو فوق صاحب ایک سو چالیس صفحات تک لکھ کر فوت ہو گئے تھے اس کی تکمیل کی اور اس کام کو اس قابلیت سے پورا کیا کہ جیسے یہ کام ایک ہی مصنف کے قلم کا مرہونِ منت ہے۔ کہیں بیان میں جھول نہیں۔ اور تاریخی واقعات اسی طرز پر مرتب کیے ہیں کہ اگر فوق مرحوم زندہ ہوتے تو وہ اس کتاب کی تکمیل اسی طرح کرتے جیسے جناب قریشی صاحب نے کی ہے۔ یہ کتاب اب (۴۴۳) صفحات پر محیط ہے۔ اور اس میں کشمیری ذاتوں اور گوتوں کا مبسوط تذکرہ ہے۔

اسی طرح مآثر لاہور کے مسودے میں بھی بعض مقامات نامکمل تھے۔ کہیں اہم واقعات کے سنین مندرج نہیں تھے۔ کہیں کوئی عنوان ہی لکھ دیا گیا تھا۔ اور اس کے متعلق کوئی واقفیت بہم نہیں پہنچائی گئی تھی۔ کوئی حصہ تھوڑا سا لکھا تھا۔ ابھی اس پر مزید تحقیقی روشنی ڈالنا تھی۔ اس قسم کی اور بہت سی معلومات ابھی توجہ طلب تھیں۔ جنھیں موت نے ان کو پورا کرنے کی مہلت نہ دی۔ اس ادھورے کام کی تکمیل ایک کٹھن مرحلہ تھا لیکن قریشی صاحب نے اسے پوری کوشش سے مکمل ہی نہیں کیا۔ بلکہ اس میں اضافے بھی کیے اور آج یہ مسودہ اشاعت کے قابل ہو گیا ہے۔

کرنل نیول (۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۱ء)

لاہور (پنجاب کا دار الخلافہ) مصنفہ لیفٹیننٹ کرنل ایچ۔ اے۔ نیول (H-A-NEWELL) آئی۔ اے۔ ایف۔ آر جی ایس جو ۱۹۲۱ء میں لندن سے شائع ہوئی۔ اسّی (۸۰) صفحات پر مشتمل ہے۔

کرنل نیول "گائیڈ بک" قسم کی کتابیں لکھنے میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ انھوں نے امرتسر، احمد آباد، بنارس، جے پور، مدورا، رامیشرم، جنگل پت اور کانجی ورم کے سات مندر، تنجور، ترچناپلی، لکھنؤ، انبالہ سے پشاور تک موٹر کار سے، تین دن دہلی میں، تین دن آگرہ میں، لاہور پنجاب کا دارالخلافہ، بمبئی، کلکتہ اور مدراس پر گائیڈ بکیں لکھی ہیں۔ خالص فوجی نوعیت کی ایک کتاب سپلائیز (SUPPLIES) ایس انڈین افسروں کے لیے گائیڈ کے طور پر تحریر کی۔ ایک نفسیاتی کتاب "آپ کے دستخط" کے عنوان سے تحریر کی روشنی میں کردار کے مطالعہ سے متعلق لکھی۔ ان کی بیشتر کتابیں یورپین سیاحوں اور انگریز افسروں کی رہنمائی کے لیے لکھی گئی معلوم ہوتی ہیں۔ یہ کتابیں ایک سیاح کے سفرنامے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کرنل نیول کو سیر و سیاحت کا ازحد شوق تھا چنانچہ تاریخی مقامات کی سیاحت جو انھوں نے کی۔ اسی کو گائیڈ بک کے نام سے قلمبند کر دیا۔ ان کی تحریر کی خوبی یہ ہے کہ کتاب محض گائیڈ بک یا سفرنامہ معلوم نہیں ہوتی۔ بلکہ فن تعمیر اور علم تاریخ کے ایک اچھے متعلم کے نقوش کا آئینہ معلوم ہوتی ہے۔ ہر قدم پر انھوں نے عمارتوں اور یادگاروں کے متعلق تحقیق کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ ان کی طرزِ تحریر بے حد دلکش ہے۔ وہ اپنی خوبی تحریر سے تاریخی بیان میں بھی فسانوی رنگ بھر دیتے ہیں۔

کتاب کے پیش لفظ کے طور پر کرنل نیول نے لاہور کی فوجی اہمیت پر نظر ڈالی ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ شمال کی طرف سے آنے والا ہر حملہ آور دریائے سندھ کو پار کر کے لاہور کا دروازہ کھٹکھٹاتا رہا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے شیر شاہ سوری کا ایک قول نقل کیا ہے۔ جو ۱۵۴۵ء میں قلعہ کالنجر میں موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھا تو اسے سب سے زیادہ افسوس اس بات کا تھا کہ اس نے لاہور شہر کو نیست و نابود کرنے سے کیوں چھوڑ دیا۔ "اتنا بڑا شہر جو ایک حملہ آور کے راستے میں پڑتا ہے، قائم نہیں رہنا چاہیے۔ جونہی وہ اس شہر پر قبضہ کرتا ہے۔ اس کے ہاتھ اتنے ذخائر آجاتے ہیں کہ وہ اپنے ذرائع کو مستحکم کر لیتا ہے۔" اس قول کی روشنی میں یہ یقین کرنے کی وجہ موجود ہے کہ اگر شیر شاہ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہو گیا ہوتا تو ٹیکسلا، قنوج اور سومنات کی طرح (جو اپنے اپنے دور میں کسی نہ کسی حکومت کے مرکزی مقامات رہ چکے تھے) پنجاب کا دارالخلافہ لاہور بھی زمین کے ساتھ ہموار ہو گیا ہوتا۔

کرنل نیول نے بتایا کہ کس طرح لاہور کی ابتدا ہندوؤں کے دور میں ہوئی۔ کس طرح وہ صدیوں تک یہ شہر مسلمان حملہ آوروں کا مقابلہ کرتا رہا، پھر کس طرح وہ محمود غزنوی کے ہاتھ میں آیا۔ اور یہ تاریخ میں پہلی مرتبہ ہندوستان میں اسلامی اسلحہ خانہ قرار پایا اور غیر شعوری طور پر آنے والی مغل حکومت کا سنگِ بنیاد بن گیا۔ کس طرح لاہور میں شیر شاہ کے حملے سے بھاگتے ہوئے ہمایوں نے حمیدہ بانو کو دیکھا۔ اور یہیں دونوں کی شادی ہوئی۔ پھر یہیں سلیم نے مہرالنسا کو دیکھا جس کی نسبت اکبر اعظم کے ایک فوجی جرنیل سے ہوئی۔ یہی مہرالنسا ہندوستان کی تاریخ میں نور جہاں بن کر جگمگائی اور آج جہانگیر اور نور جہاں دونوں کے مقبرے اس لاہور میں واقع ہیں۔ شاہجہاں بھی لاہور ہی میں پیدا ہوا۔ اور لاہور ہی میں اس نے شہریار کی آنکھیں نکلوائیں اور اسے موت کی سزا دی۔ آخر میں یہی لاہور مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل کر رنجیت سنگھ کے قبضے میں پہنچ گیا۔ اور سکھ حکومت کا مرکز بن گیا۔ غرض کہ لاہور ماضی کی یادگاروں سے گونجا ہوا ہے اور اس شہر کا چپہ چپہ تاریخی روایات سے معمور ہے۔

یہ کتاب اگرچہ ظاہر میں گائیڈ بک کے طور پر لکھی گئی ہے۔ لیکن اس سے ہمیں مصنف کی افتادِ طبع کا اندازہ ہوتا ہے۔ کرنل نیول غالباً تحقیق و تاریخ کا شیدائی تھا۔ کتاب کی ابتدا میں شہر لاہور کا عہد در عہد تذکرہ ملتا ہے۔ یہ ایک تاریخی جائزہ ہے۔ کرنل نیول نے یہ ثابت کیا ہے کہ لاہور کا شمار دنیا کے قدیم ترین شہروں میں ہونا چاہیے۔ اس شہر کی بنیاد "ست جگ" میں پڑی۔ جب دنیا میں نیکی اور خیر کا بول بالا تھا۔ مغربی مورخین کی تحقیق کی رُو سے رامائن کا زمانہ حضرت مسیح کی پیدائش سے چھ صدی سے لے کر سولہ صدی کا درمیانی زمانہ تھا۔ لاہور کی بنیاد اس زمانے میں کس وقت

ہی مقامی روایت کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ پرانا لاہور اچھرے سے تین میل مغرب میں واقع تھا۔ اس کی بنیاد سے قطع نظر موجودہ زمانے میں شہر لاہور دریائے راوی سے ایک میل کے فاصلے پر ایک اونچی سطح پر واقع ہے۔ دریائے راوی موجودہ دور سے پہلے قلعے کی دیوار کے نیچے بہتا تھا۔ شہر لاہور کو سترھویں صدی میں راوی کے سیلاب سے بہہ جانے کا خطرہ لاحق ہوا جس کے پیش نظر اورنگ زیب نے اپنے جلوس کے چوتھے سال میں ایک مضبوط دیوار چار میل کے فاصلے پر تعمیر کرائی تاکہ دریا کا رخ شہر کی جانب سے پھیر دیا جائے۔ اس دیوار کے سہارے ایک مضبوط بند بنایا گیا جسے "بند عالمگیر" سے پکارا جاتا ہے۔ بند بن کر تیار ہوا ہی تھا کہ دریائے راوی نے اپنا راستہ تبدیل کر دیا۔ اور شمال کی جانب بہنے لگا۔

معنوی طور پر پنجاب، پانچ دریاؤں کا علاقہ ہے۔ پنجاب کے زیریں علاقے میں یہ پانچوں دریا مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ اور کراچی کے قریب بحیرۂ عرب میں گرتے ہیں۔ راوی ان میں سب سے چھوٹا دریا ہے۔ یہ ابراوتی کا مخفف ہے۔ ابراوتی اس ہاتھی کا نام تھا جس کا مالک اندر دیوتا تھا۔ ہندوؤں کے شاستروں میں راوی کی وجہ تسمیہ یہی دی گئی ہے۔ یونانی مصنفین راوی کو ہائیڈروٹیز (HYDRAOTES) کہتے ہیں اور گیارھویں صدی کے مورخ البیرونی نے اسے اراوا (IRAWA) کے نام سے موسوم کیا۔

ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہمیشہ پنجاب کے ہاتھ رہا۔ یہیں آریہ لوگ دریائے سندھ پار کر کے پہلے پہل آباد ہوئے۔ پنجاب کے پہاڑ ہندوؤں کے مقدس دیدوں کے منتروں سے گونجے۔ یہیں ہندوؤں کی تہذیب قائم ہوئی۔ قبل از تاریخ آریہ تہذیب کے دور اور چوتھی صدی قبل مسیح کے درمیان (جب سکندر اعظم ہندوستان پر حملہ آور ہوا) کسی وقت آریہ راجا لویا لوہ نے لاہور کی بنیاد ڈالی۔ جب بدھ مت نے پنجاب کے شمال مغرب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس وقت بھی لاہور پر بدھ مت کا کوئی اثر نہ پڑا۔ تقریباً دس صدی بعد از مسیح تک لاہور راجپوتوں کا مرکز رہا۔ اور محمود غزنوی کے بعد سے اسلامی طاقت کا ایک مضبوط قلعہ بن گیا۔ مغلوں کے زمانے میں اس شہر کو سب سے زیادہ آب و تاب نصیب ہوئی۔ بابر نے یہاں سڑکیں بنائیں۔ درخت لگائے اور ایرانی پہیے کو رواج دیا۔ جو دراصل ایک چینی اختراع تھی۔ جسے چنگیز خاں کی بدولت رواج نصیب ہوا تھا۔ مصنف نے عہد مغلیہ کے لاہور کا تدریجی جائزہ لیا ہے۔

کتاب کے آخر میں کرنل نیول نے سرے سے شہر لاہور کی مفصل تاریخ بیان کی ہے۔ جس میں ہندو دور سے انگریزی عملداری تک شہر لاہور کی پوری تاریخ آگئی ہے۔ آخر میں اس نے لکھا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں لاہور منظم اور پُرسکون رہا۔ ۱۲ مئی ۱۸۵۷ء کو ایک فوجی فرمان شائع کیا گیا۔ جس کے ذریعے چھاؤنی میں مقیم سپاہیوں سے ہتھیار واپس لے لیے گئے۔ اس طرح قلعے پر قبضہ کرنے اور میگزین کو حاصل کرنے کی سازش ناکام بنادی گئی۔ جب سے اب تک لاہور بڑی ترقی کر رہا ہے۔

چوک دارا:۔ اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا اور تیسرا حصہ تاریخی ہے۔ اور دوسرا حصہ سفرنامہ یا گائیڈ بک۔ جس مقصد کے لیے یہ کتاب تالیف کی گئی ہے وہ دوسرے ہی حصے میں تکمیل کو پہنچتا ہے۔ اس حصے میں لاہور کی مختلف تاریخی یادگاروں، عمارتوں، مقبروں، باغوں اور محلوں کا تذکرہ ہے۔ تاریخی یادگاروں کا حال بھی ہے۔ مثلاً زمزمہ توپ کا مختصر تاریخی حال۔ محلوں کے تذکرے میں مصنف نے چوک دارا کو اہمیت دی ہے۔ یہ چوک داراشکوہ کے نام سے منسوب ہے۔ داراشکوہ شاہجہاں کا چہیتا بیٹا تخت و تاج کا وارث، حسین اور ہر دلعزیز مغل شہزادہ تھا۔ یہ محلہ دہلی دروازے کے باہر اس جگہ واقع تھا جہاں اب لنڈا بازار ہے۔ چوک دارا کا راستہ ایک عظیم الشان دروازے میں سے تھا۔ اس چوک میں دو در بہ دوکانیں تھیں۔ اور یہ لاہور کا کاروباری مرکز تھا۔ اس کے قریب ہی نخاس تھا۔ جہاں گھوڑوں کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ اس علاقے کا نام اب شہید گنج ہے۔ چوک دارا کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہاں دارا کا محل اور امرا کے دولت خانے تھے۔ داراشکوہ وارث تخت ہونے کی حیثیت سے بے شمار امرا کو اپنی

مصاحبت میں رکھتا تھا۔ جنھوں نے اس علاقے میں مکانات تعمیر کیے تھے۔ یہاں ایک خوبصورت مسجد بھی تھی۔ اس علاقے میں جواہر بازار کے نام سے جوہریوں کی دوکانوں کی ایک قطار تھی۔ سکھوں کے زمانے میں جوہری بازار تباہ ہو گیا۔ انگریزی عملداری ہونے کے فوراً بعد یہ علاقہ محمد سلطان نامی ایک مشہور ٹھیکیدار کو دے دیا گیا۔ جس نے دارا شکوہ کی خوبصورت مسجد کو اس لیے ڈھا دیا کہ اس کی اینٹوں سے لنڈا بازار کی دوکانیں تعمیر کی جائیں۔ سرائے سلطان اسی کی تعمیر اور اسی کے نام سے موسوم ہے۔

زمزمہ: غالباً دنیا کے کسی ہتھیار نے اتنے نشیب و فراز نہ دیکھے ہوں گے۔ جتنے کہ اس عظیم ساڑھے نو انچ دہانے کی توپ نے دیکھے ہیں۔ جو عجائب گھر کے بالمقابل یونیورسٹی ہال کے سامنے ایک پتھر کے چبوترے پر رکھی ہوئی ہے۔ یہ زمزمہ کہلاتی ہے۔ یعنی قلعوں کو فتح کرنے والی۔ اس کے نام کی دو طرح سے تاویل کی جاتی ہے۔ ایک معنی میں یہ شیر کی دہاڑ ہے اور دوسرے معنی میں تحسین و آفریں کہنے والی۔ یہ چودہ فٹ ساڑھے چار انچ لمبی ہے اور ہندوستان کی بنی ہوئی توپوں میں سب سے بڑی ہے۔ اس پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسے اژدہے کے سروں سے مرصع کیا گیا ہے اور اس پر متعدد اشعار و عبارات کندہ ہیں۔ جس میں اس کی تعریف کی گئی ہے۔

یہ دیوقامت توپ ۱۷۵۷ء میں احمد شاہ درانی کے حکم سے لاہور میں ڈھالی گئی۔ اس کے علاوہ اس قسم کی ایک اور توپ بھی احمد شاہ کے حکم سے ڈھالی گئی اور زمزمہ اور یہ دوسری توپ دونوں ۱۷۶۱ء میں پانی پت کی لڑائی میں استعمال کی گئیں۔ فتح حاصل کرنے کے بعد کابل جاتے ہوئے احمد شاہ لاہور میں مقیم ہوا تو زمزمہ کو لاہور ہی چھوڑ گیا۔ دوسری توپ اس کے ہمراہ تھی۔ جو چناب میں غرق ہو گئی۔

۱۷۶۲ء میں ہری سنگھ نے جو بھنگیوں کا سردار تھا لاہور پر حملہ کیا اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کیا۔ اس وقت زمزمہ اس کے ہاتھ آئی۔ اور اس نے اس کا نام "بھنگی کی توپ" رکھ دیا۔ دو برس یہ توپ قلعہ لاہور کے شاہ برج میں پڑی رہی۔ جب لہنا سنگھ اور گجر سنگھ نے لاہور پر حملہ کیا تو یہ توپ مال غنیمت کے طور پر ان کے ہاتھ آئی۔ وہاں سے یہ گوجرانوالہ لے جائی گئی اور اس پر قابض ہونے کی خاطر سکھ سرداروں میں بہت خون خرابہ ہوا۔ گوجرانوالہ سے یہ گجرات پہنچی۔ اور وہاں سے رام نگر لے جائی گئی۔ جہاں وہ ایک برس تک رہی۔ آخر یہ امرتسر پہنچی اور ۱۸۰۲ء تک بھنگی قلعے میں ایک باعزت جگہ پر رکھی گئی۔ اس وقت اس سے متعلق بہت سی روایتیں بلکہ اوہام منسوب ہو گئے۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہو گیا کہ اس توپ پر مہادیو کا سایہ ہے۔ یعنی شیو دیوتا کا۔ بلکہ بعض تو اس کو شیو جی کا اوتار تصور کرنے لگے۔ بہر حال ایک خیال جس پر سب متفق تھے یہ تھا کہ اس توپ میں طلسماتی قوت ہے اور فتح اسی کی ہو گی۔ جس کے قبضے میں یہ توپ ہے۔ ۱۸۰۲ء میں زمزمہ رنجیت سنگھ کے ہاتھ آئی اور اس نے اس توپ کو ڈسکہ، قصور، سجان پور، وزیر آباد اور ملتان کے معرکوں میں استعمال کیا۔ جنگ ملتان میں ایک حادثے کی وجہ سے یہ توپ بے کار ہو گئی۔ اور لاہور واپس لائی گئی جہاں اسے دہلی دروازے کے باہر نصب کر دیا گیا۔ ۱۸۶۰ء تک یہ وہیں رہی۔ جب ۱۸۷۰ء میں ہز رائل ہائی نس ڈیوک آف ایڈن برا نے لاہور کا دورہ کیا تو یہ توپ پرانے عجائب گھر کے سامنے رکھ دی گئی۔ اس کے بعد اسے موجودہ مقام پر لایا گیا۔ جہاں وہ ایک پتھر کے چبوترے پر یونیورسٹی ہال کے سامنے نصب ہے۔

پیر غلام دستگیر نامی (سال پیدائش ۱۸۸۲ء، ۱۳۰۰ھ)

غلام دستگیر نام تخلص نامی۔ آپ یکم مئی ۱۸۸۲ء (۱۳۰۰ھ) کو موضع مدرنہ پیراں "ضلع شیخوپورہ میں پیر حامد شاہ کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ نے ۱۹۰۲ء میں اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ گیٹ (لاہور) سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۰۵ء میں سرکاری ملازم ہو گئے۔ لیکن حصول تعلیم میں برابر کوشاں رہے۔ آپ ایک عرصہ تک سنٹرل ٹریننگ کالج میں خزانچی وغیرہ رہے اور وہیں سے ۱۹۳۸ء میں ریٹائرڈ ہوئے۔

نامی صاحب کو حضرت عبدالجلیل قطب عالم چوہڑ شاہ بندگیؒ لاہوری کے دامادِ سلطان بہلول لودھی کی اولاد سے ہونے کا فخر حاصل ہے۔ تبلیغ و اشاعت دین میں کوشش کرتے رہتے ہیں۔ ان کے بزرگوں میں سے حضرت قلندر شاہؒ، حضرت سکندر شاہؒ، پیر فرخ بخش فرحتؒ اور پیر مراد شاہؒ لاہوری صاحب کمالات بزرگ گزرے ہیں۔ ان کے مورثِ اعلیٰ حضرت عبدالجلیلؒ ہندوستان کے اوّلین مشائخ سہروردیہ میں سے تھے۔ جن کی تبلیغ سے ہزارہا لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے۔ میکلوڈ روڈ (لاہور) پر اس بزرگ کا مزار اب بھی مرجع خاص و عام ہے۔ نامی صاحب نے اپنے ماموں صاحب پیر محمد اشرف عالم شاہ جاگیردار "سرتہ پیراں" و "سریتاں" وغیرہ کو توجہ دلائی۔ جس سے اس خانقاہ کی آبادی اور عرسوں کے انتظام کے لیے بہت سی زمین وقف ہو چکی ہے۔ یہ زمین درگاہ سے ملحق ہے۔ اور اس کی قیمت کا اندازہ بیس لاکھ روپے ہے۔

پیر محمد اشرف عالم شاہ صاحب اپنے بعد نامی صاحب ہی کو خانقاہ و اوقاف کا متولّی مقرر کرنے کی وصیت کر گئے تھے۔ چنانچہ نامی صاحب اس درگاہ جلیلہ کا انتظام نہایت قابلیت اور خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں[1]۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے بزرگوں کی قلمی تالیفات مثلاً تذکرہ قطبیہ، تذکرہ حمیدیہ، اذکار قلندری، قصائد قلندری، دیوان قلندر شاہ اور نامۂ مراد وغیرہ شائع کر کے مفت تقسیم کیں۔ اس کے علاوہ تاریخ جلیلہ دو مرتبہ طبع کرائی۔ اور مفت اہل علم کی نذر کی۔ ایک سو کے قریب کتابیں اور رسائل آپ نے تصنیف کیے۔ جن میں سے صرف چند ایک ہی کے حقوق محفوظ رکھے ہیں۔

آپ کو مسائل میراث پر پوری دسترس حاصل ہے۔ ان مسائل پر آپ کو اتنا عبور ہے کہ بڑے بڑے علماء و فضلا مشکل مسائل میراث میں آپ سے مشورہ لیتے ہیں۔ اس موضوع پر آپ نے "انیس الوارثین" اور "اسلامی قانون وراثت" دو کتابیں لکھی ہیں۔ جو وراثت کے بہت سے اہم مسائل کا آخری حل بتاتی ہیں۔ یہ کتابیں متعدد مرتبہ شائع ہو چکی ہیں۔

نظم و نثر دونوں میں آپ نے طبع آزمائی کی ہے۔ آپ کو تاریخ گوئی سے بھی شغف ہے۔ سینکڑوں مادہ ہائے تاریخ آپ نے مختلف مواقع پر کہے ہیں۔ یہ مجموعہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ ملک کے اخبارات اور جرائد میں آپ کے علمی ادبی اور تاریخی مضامین اکثر چھپتے رہتے ہیں۔ جنھیں اہل ذوق دلچسپی سے مطالعہ کرتے ہیں۔

آپ کی تصانیف میں "تاریخ جلیلہ" بہت مشہور ہے۔ یہ تاریخ پہلی مرتبہ ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ اب دوسری مرتبہ ۱۹۶۶ء میں طبع ہوئی ہے۔ اس میں نامی صاحب نے حضرت قطب عالم شیخ عبدالجلیل چوہڑ شاہ بندگیؒ لاہوری اور ان کے دودمانِ کبریٰ و بزرگان خاندان، اولاد، خلفا اور مریدانِ عقیدت مند کے حالات نہایت جستجو و تلاش سے لکھے ہیں۔ نیز لاہور و بزرگانِ لاہور کی مختصر تاریخ بھی اس کتاب میں شامل ہے۔ اس کتاب کے (۱۹۴) صفحے پر لاہور کو آپ نے دیارِ جلیل کہا ہے۔ اس شہر میں مسلمانوں کی آمد کے متعلق ان کی تحقیق یہ ہے کہ مسلمان پہلے پہل عہد خلافت سوم و چہارم میں آئے۔ کیونکہ لاہور مستقل طور پر اسلامی حکومت کے ماتحت محمود غزنوی کے عہد میں آیا۔ اس لیے کتاب کے (۱۹۵) صفحے پر ایک نقشہ بھی دے دیا ہے۔ جو افادیت کے پیش نظر درج ذیل ہے۔

---

[1] حال میں اس درگاہ کا انتظام محکمہ اوقاف نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔

پنجاب کے حکمران

نام خاندان	سال آغاز حکومت (عیسوی)	(ہجری)	نام بادشاہ	نام خاندان	سال آغاز حکومت (عیسوی)	(ہجری)	نام بادشاہ
غزنوی	۱۰۰۱ء مطابق	۳۹۲ھ	محمود تا خسرو ملک	پٹھان	۱۴۵۰ء مطابق	۸۵۴ھ	بہلول تا ابراہیم
غوری	۱۱۸۸ء	۵۸۴	شہاب الدین غوری	مغل	۱۵۲۶	۹۳۲	بابر تا ہمایوں
غلام	۱۲۰۶	۶۰۲	قطب الدین ایبک تا کیقباد	پٹھان	۱۵۴۰	۹۴۷	شیر شاہ تا محمد شاہ
خلجی	۱۲۸۸	۶۸۷	جلال الدین فیروز تا مبارک شاہ	مغل	۱۵۵۳	۹۶۱	ہمایوں تا محمد شاہ
تغلق	۱۳۲۱	۷۲۱	غیاث الدین تغلق تا محمود شاہ	درانی	۱۷۴۸	۱۱۶۲	احمد شاہ
مغل	۱۳۹۸	۸۰۱	تیمور	سکھ	۱۷۶۴	۱۱۷۶	گوجر سنگھ وغیرہ تا راجہ دلیپ سنگھ
سید	۱۴۱۴	۸۱۶	خضر خاں تا علاؤالدین شاہ	برطانیہ	۱۸۴۹	۱۲۶۶	[۱]

لاہور کے عروج و زوال کی داستان بیان کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ اکبر اعظم کے عہد ۹۶۳ھ مطابق ۱۵۵۶ء سے پہلے لاہور کوئی عظیم شہر نہ تھا۔ اکبر، جہانگیر، شاہجہان کا عہد لاہور کی عظمت اور شوکت کا زمانہ ہے۔ باغات، مقابر، مساجد اور محلات جابجا تعمیر ہوئے۔ شاہجہان کے زمانہ میں یہ شہر سولہ سترہ میل کے دائرے میں بستا تھا۔ دیوار شہر کے باہر میلوں تک آبادی چلی گئی تھی۔ شہر سے سب طرف سڑکیں جاری تھیں، اور جو فاصلہ آبادی کے درمیان تھا۔ وہاں باغات اور مقبرے بنا دیے گئے تھے۔ اس کی وسعت میاں میر، اچھرہ اور شالامار تک تھی۔ عالمگیر کے عہد کے بعد بیرونی حملوں اور سکھ گردی سے یہ آبادی بہت گھٹ گئی تھی۔ شہر پناہ کے اندر لاہور ایک قصبہ ہو کر رہ گیا تھا۔ جس کے گرد کھنڈرات کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ گزر لنگر خان کے متمول باشندوں نے اپنے خوبصورت مکانات کو خیرباد کہہ کر شہر کی دیواروں کے اندر امن کی صورت اختیار کی۔ سوداگر امرتسر بھاگ گئے، صناع کابل یا ہندوستان کی طرف چلے گئے۔ ۲۴ مئی ۱۸۰۹ء مطابق ربیع الثانی ۱۲۲۴ھ کو ایک انگریز افسر نے شہر کی حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے "شہر عظمت پارینہ کی دلخراش یاد پیش کرتا ہے۔ رفیع الشان مساجد و مکانات جو پچاس سال پیشتر آسمان سے باتیں کر رہے تھے اور جو ایک کاروباری آبادی کے لیے باعث فخر تھے۔ اب خاک اور گرد و غبار سے اٹے پڑے ہیں۔ اگر یہی حالت بدستور رہی تو پچاس سال تک بالکل خاک بوس ہو جائیں گے۔ میں نے ویرانوں میں کوئی متنفس نہیں دیکھا، ہر سو ہُو کا منظر دکھائی دیتا ہے۔"

اس کے بعد ناقی صاحب نے مختصر مگر جامع الفاظ میں لاہور کی بربادی کی تاریخ لکھی ہے ۱۲۱۸ء مطابق ۶۱۵ھ میں جلال الدین خوارزم نے اس پر قبضہ کیا۔ اس کے تعاقب میں چنگیزی افواج جب پہنچیں تو لاہور، پشاور اور ملک پور کو خوب لوٹا۔ سلطانہ رضیہ کے بے رحمانہ قتل

---

[۱] برطانیہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کے دو حصے کر کے بھارت اور پاکستان کی حکومتوں کی بنیاد قائم کر کے رخصت ہوا۔ اب لاہور پر پرچم پاکستان لہرا رہا ہے۔

کے بعد مغل خراسان اور غزنی سے پھر داخل پنجاب ہوئے۔ دسمبر ۱۲۴۱ء مطابق جمادی الآخر ۶۳۹ھ قتل عام کا بازار خوب گرم رہا۔ پھر مغلوں کے برباد کردہ قلعے کو سلطان غیاث الدین نے اچھی طرح مرمت کرا دیا۔ تیمور نے ۱۲ ستمبر ۱۳۹۸ء کو دریائے راوی عبور کیا تو مبارک خاں صوبہ دار پنجاب مزاحم ہوا۔ تیموری افواج نے دہلی جانے سے پہلے پنجاب اور ملتان کو تاخت و تاراج کیا۔ دہلی سے واپسی پر خضر خاں کو لاہور کا صوبہ دار مقرر کیا جو بانی سلطنت سادات ہوا۔ سید حکمرانوں کے بعد لودھی برسر اقتدار آئے۔ ابراہیم لودھی کے عہد میں دولت خاں نے بابر کو بلایا جو لاہور تک بڑھتا چلا گیا۔ بہار خاں اور مبارک خان وغیرہ لودھی امرا نے سخت مقابلہ کے بعد شکست کھائی۔ بابر نے غصہ میں آکر شہر کو لوٹا اور بازاروں کو نذر آتش کر دیا۔ پھر عبدالعزیز کو گورنری سونپ کر واپس کابل چلا گیا۔ بابر نے پانچویں حملہ میں ۲۱ اپریل ۱۵۲۶ء کو پانی پت کے میدان میں لودھی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ جب شیر شاہ سوری نے ہمایوں کو شکست دی تو وہ لاہور میں پناہ گزیں ہوا۔ مگر شیر شاہ کی آمد کی خبر سن کر ۱۲ اکتوبر ۱۵۴۰ء کو راوی عبور کر کے جان بچا گیا۔ خواص خان گورنر مقرر ہوا۔ شیر شاہ کا خیال تھا کہ لاہور کو نقشے سے محو کر کے یکسر مٹا دیا جائے کیونکہ اتنے بڑے شہر کو سرحدی حملہ آوروں کے راستے میں نہیں ہونا چاہیے کیونکہ وہ اس شہر سے سامان فراہم کر کے مزید فتوحات کے لیے تیار ہو جاتے ہیں مگر اس کا یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ شیر شاہ کی وفات کے دس سال بعد ۱۵۵۵ء میں ہمایوں کو پھر لاہور پر قابض ہونے کا موقع ملا۔ جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد اس کے بیٹے خسرو نے بغاوت کی۔ جو ۱۶۰۶ء میں فرو ہوئی۔ عالمگیر کے بعد شاہ عالم بادشاہ ہوا۔ جو مائل بہ تشیع تھا اس نے حکم دیا کہ خطبہ میں حضرت علیؓ کے نام کے ساتھ ولی اللہ وصی رسول اللہ کہا جائے۔ اس سے اہل تسنن میں بڑا جوش پیدا ہوا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خطیب ابھی مذکورہ الفاظ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے اور خطبہ عہد عالمگیری کی طرح سے پڑھا جانے لگا۔ الغرض شاہنشاہ اورنگ زیب کے بعد اور انگریزی راج سے تقریباً سوا سو برس پہلے آٹھ دفعہ احمد شاہ درانی کی فوجیں لاہور سے گزریں اور رہٹوں اور سکھوں نے بھی اس کی بربادی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ ۱۷۵۹ء میں احمد شاہ ابدالی کے حملہ کے بعد سولیہ قحط پڑا۔ ۱۷۸۳ء میں دہ سیر قحط ۱۸۱۳ء میں ست سیرا قحط اور ۱۸۳۳ء کے مرکا نوالہ قحط نے اہل شہر کو بھوکوں مارا۔ موجودہ جنگ عظیم کے بعد جو سیرا قحط پڑا تھا۔ مگر روپیہ کی فراوانی کی وجہ سے لوگوں کو محسوس نہیں ہوا۔

ناؔمی صاحب نے حضرت قطب عالم شیخ جیو ہر شاہ بندگی سے پہلے جو بزرگ لاہور میں تشریف لائے تھے ان کا ذکر بھی کیا ہے۔ جن میں حضرت داتا گنج بخشؒ، بابا فرید شکر گنجؒ، شیخ مکی جنیدی، پیر بلھیؒ، حضرت سید مٹھا اور میراں بادشاہؒ کا مختصر حال ملتا ہے۔ نیز انھوں نے ان بزرگان دین کا بھی تذکرہ کیا ہے جو شیخ جلیلؒ کے بعد یہاں آئے۔ شیخ ابو اسحاقؒ، موج دریا بخاریؒ، شاہ ابوالمعالی قادریؒ، شیخ طاہر بندگیؒ، حضرت میاں میرؒ، حضرت ایشاں نقشبندی، شاہ چراغؒ، شیخ میاں وڈاؒ، شاہ محمد غوثؒ اور شیخ حامد قادریؒ کے نام اس ضمن میں تحریر کیے ہیں۔ کچھ درگاہوں کے چشم دید حالات بھی قلمبند کیے ہیں۔ جن میں درگاہ داتا گنج بخشؒ، درگاہ میاں میرؒ، درگاہ میاں وڈاؒ صاحب اور درگاہ موج دریا بخاری کا تذکرہ کیا ہے۔

لاہور کے دیگر مشہور مقابر و مساجد کا ایک نقشہ بھی دیا ہے۔ جس میں عمارت کا نام۔ بانی عمارت کا نام مع سال بنا اور محل وقوع نہایت تحقیق سے بتایا ہے۔ یہ مختصر نقشہ مختصر مفید کا حکم رکھتا ہے۔

ناؔمی صاحب کی یہ تصنیف حضرت قطب عالم شیخ جلیلؒ کی خاندانی تاریخ کے علاوہ لاہور کے ممتاز بزرگان دین کا ایک مختصر جامع تذکرہ بھی ہے۔ لاہور اور لاہور کے باغات و مزارات پر بھی انھوں نے تحقیق و تجسس سے قیمتی مواد فراہم کر دیا ہے۔ جس کا اندازہ پڑھنے کے بعد ہی

ہو سکتا ہے، آپ کا شمار زندہ مورخین لاہور میں ہوتا ہے۔ عمر کے تقاضے اور مختلف عوارض کے باعث آپ بہت کمزور اور نحیف ہو گئے مگر اس حالت میں بھی تصنیف و تالیف کا شغل جاری تھے۔ آپ کی تازہ تالیف ایک بہت ہی مفید کتاب ہے جس کا نام "بزرگانِ لاہور" آپ نے رکھا ہے۔ اس میں لاہور کے ان بزرگوں کے حالات علیحدہ علیحدہ چار حصوں میں قلمبند کئے گئے ہیں جو صوفیا کے چاروں سلسلوں چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ کتاب کے پانچویں حصہ میں لاہور کے متفرق خاندانوں کے اولیاء، علماء، مجذوبوں اور خواتین صالحات کا ذکر ہے۔ کتاب قریباً چار سو صفحات پر مشتمل ہے اور انشاء اللہ عنقریب زیورِ طبع سے آراستہ ہو گی۔ یہ کتاب ناقی صاحب نے عرصہ دراز کی محنت و کاوش اور تلاش و تحقیق کے بعد مرتب کی ہے اور طبع ہونے کے بعد تاریخ لاہور میں ایک نہایت شاندار اضافہ کا باعث ہو گی۔[1]

سید ہاشمی فرید آبادی (سال پیدائش ۱۳۰۶ھ/ ۱۸۸۹ء)

سید ہاشمی جنوری ۱۸۸۹ء میں بمقام فرید آباد (نزد دہلی) پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد میر احمد شریف صاحب بڑے نیک اور علم دوست بزرگ تھے۔ ہاشمی صاحب نے ۱۹۰۸ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خاطر ایم اے او کالج علی گڑھ میں داخل ہو گئے۔ ۱۹۱۲ء میں بی۔ اے کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ جنگ بلقان کے موقع پر ہاشمی صاحب نے چند نظمیں حکومت برطانیہ کے خلاف لکھیں، جن کی پاداش میں حکومت نے پرنسپل ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کو مجبور کیا کہ ان کو سرٹیفکیٹ دے کر کالج سے نکال دیا جائے کیونکہ ان کی موجودگی سے کالج کی فضا کے مکدر ہونے کا اندیشہ تھا چنانچہ مجبوراً ہاشمی صاحب کو علی گڑھ کی علمی و ادبی فضا کو خیرباد کہنا پڑا۔ ۱۹۱۷ء میں حیدر آباد دکن کا رُخ کیا۔ اور وہاں عثمانیہ یونیورسٹی میں مترجم کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا۔ پہلے حیدر آباد (دکن) اور پھر اسٹیٹ کے اسسٹنٹ سکرٹری کے عہدہ جلیلہ پر فائز رہے۔ ۱۹۳۹ء میں پنشن پر ریٹائرڈ ہوئے پھر انجمن ترقی اردو (ہند) میں جوائنٹ سیکرٹری کے طور پر کام کرتے رہے۔ تقسیم کے بعد ۱۹۵۰ء تک پاکستان میں انجمن کے جوائنٹ سیکرٹری کے فرائض نہایت قابلیت سے انجام دیتے رہے۔ آج کل "انسائیکلوپیڈیا آف اسلام" پر REVISION (نظرثانی) کا کام کر رہے ہیں۔

ہاشمی صاحب بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان تصانیف میں بعض انگریزی کتابوں کے ترجمے بھی شامل ہیں۔ کچھ علمی، ادبی اور تاریخی مقالات بھی مختلف جرائد میں لکھے ہیں۔ جس سے ان کے ادبی شغف اور وسعت مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے کام کی فہرست طویل ہے۔ جن میں سے چند ایک کا ہم ذیل میں ذکر کرتے ہیں۔

تصانیف

(۱) تاریخ یونان قدیم:۔ یہ یونان کی مفصل تاریخ ہے۔ جس پر ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری نے تبصرہ کیا تھا۔ اور اس کی بیحد تعریف کی تھی۔

(۲) دکن کی تاریخی کہانیاں

(۳) ہندوستان کی تاریخ:۔ مڈل اور میٹرک کے لیے ٹیکسٹ بکس۔

(۴) ہندوستان کی تاریخ:۔ (عثمانیہ یونیورسٹی کے لیے چار جلدوں میں)

---

[1] افسوس کہ ۱۶ اردسمبر ۱۹۶۱ء کو محلہ چابک سواراں لاہور میں ناقی صاحب کا انتقال ہو گیا اور ان کی میت ان کے آبائی قبرستان رتہ پیراں ضلع شیخوپورہ میں لے جا کر دفن کی گئی (ادارہ)

(۵) تاریخ فرشتہ پر نوٹس:۔ تاریخ فرشتہ پر نہایت قابلیت سے حاشیے لکھے۔ جس کو عثمانیہ یونیورسٹی کے کارکنان نے شائع کیا۔
(۶) تاریخ مسلمانان پاک و بھارت (دو جلدیں)
(۷) مآثر لاہور
(۸) ترقی اردو کے پچاس سال:۔ انجمن اُردو کی پچاس سالہ تاریخ۔ اس میں انجمن ترقی اُردو کے متعلق بیش بہا معلومات یکجا کی گئی ہیں۔
(۹) سہ نظم ہاشمی:۔ ہاشمی صاحب کی تین نظموں کا مجموعہ جو مولوی عبدالحق مرحوم نے انجمن کی طرف سے شائع کیا تھا۔
(۱۰) مشاہیر یونان و روما:۔ (PLUTARCH) کی تصنیف کا اُردو ترجمہ (چار جلدوں میں)
(۱۱) جغرافیۂ عالم:۔ (ترجمہ) دو جلدیں۔ مصنف (MARSDEN)
(۱۲) یورپ کا عہدِ حاضرہ (ترجمہ)۔ مصنف (FYFFE)
(۱۳) یونانِ قدیم ترجمہ۔ مصنف (J. BURY)
(۱۴) تاریخ سلطنت روما ترجمہ۔ مصنف (J. BURY)
(۱۵) تاریخ انگلستان (دو جلدیں)
(۱۶) تاریخ شاہانِ مغل (ترجمہ) مصنف (IRVING)
(۱۷) تاریخ معاشیات اکبر سے اورنگ زیب تک (دو جلدیں) ترجمہ۔ مصنف (MOORLAND)
(۱۸) اسلامی فنِ تعمیر (ترجمہ) مصنف (E. H. HANMUM)
(۱۹) اندرونِ ہند (ترجمہ) مصنفہ خالدہ ادیب خانم
(۲۰) سیاسیاتِ اسلامی (ترجمہ) مصنف سعید حلیم پاشا
(۲۱) تاریخ فلسفۂ عربی (ترجمہ) از فلپ حتی:۔ ایک جلد شائع ہو چکی ہے۔ دوسری جلد ابھی شائع نہیں ہوئی۔ دوسری جلد کا مسودہ انجمن ترقی اُردو کے پاس موجود ہے۔
(۲۲) غازیان تہذیب۔ ترجمہ و تالیف
(۲۳) قدیم علوم و جدید تہذیب:۔ جارج سارٹن کی تصنیف کو اردو کا جامہ پہنایا گیا ہے۔
(۲۴) سٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری کی ترتیب و تدوین میں بھی انھوں نے خاصا کام کیا ہے۔
(۲۵) انہوں نے چند مقالات انگریزی زبان میں بھی لکھے ہیں جو اسلامک کلچر حیدر آباد اور لندن کے جرائد میں شائع ہوئے ہیں۔
(۲۶) شعر گوئی سے فطری لگاؤ ہے۔ مجموعہ کلام منتشر حالت میں ہے۔ جملہ اصناف سخن پر قدرت رکھتے ہیں۔ تاریخ گوئی میں بھی کمال حاصل ہے۔ "سہ نظم ہاشمی" کے سوا ان کا کوئی دوسرا منظوم مجموعہ ابھی شائع نہیں ہوا۔

ہاشمی صاحب نے لاہور کی چند شخصیتوں پر تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ جن میں حضرت داتا گنج بخش۔ ابوالفرج۔ امیر ایاز (غلام محمود) اور لاہور کا پہلا حاکم قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے ایک تحقیقی مقالہ قطب الدین ایبک پر بھی لکھا ہے۔ یہ چاروں مقالے (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام) میں

شائع ہو رہے ہیں۔ ان کی ایک مستقل تصنیف "مآثر لاہور" ہے۔ جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔

ہاشمی صاحب نے مآثر لاہور کی وجہ اشاعت بیان کرتے ہوئے دیباچے میں تحریر کیا ہے کہ لاہور ایک قدیم شہر ہے۔ یہ پہلا شہر ہے جو تقریباً ایک ہزار سال قبل مسلمانوں کی جہاں بانی کا محور رہا ہے۔ مسلمانوں کے آنے سے برصغیر پاک و ہند میں بہت سے نئے شہر آباد ہو گئے۔ سندھ میں عرب بہادروں نے منصورہ۔ محفوظہ۔ بیضا وغیرہ کئی شہر آباد کیے جن کے نشانات امتداد زمانہ کی تصویر ہو کر رہ گئے۔ دلی۔ بدایوں۔ کڑہ۔ لکھنوتی۔ ٹھٹھہ۔ احمد آباد وغیرہ ایک عرصہ تک مسلمانوں کے زیر حکومت رہے۔ لیکن یہ لاہور کی قدامت کو نہیں پہنچتے۔

اگرچہ لاہور کی کئی تاریخیں انگریزی اور اردو زبان میں لکھی گئی ہیں۔ لیکن مسلم لاہور کا اوّلین دور قدرے تاریکی میں ہے۔ یہ دور مزید روشنی کا طلبگار ہے۔ "اس عہد کے تعمیری آثار کی طرح تحریری اخبار بھی بہت کچھ محو ہو گئے۔ ان پرانے کھنڈروں پر عمارت کھڑی کرنا اور منتشر تراشے چپکا کر کتاب جوڑنا شوق سے بڑھ کر محنت شاقہ کا طلبگار ہے۔"[1]

اس کتاب کے متعلق مصنف نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ انھوں نے کتاب کی ترتیب میں واقعات کی نسبت افراد اور سیاست سے زیادہ ثقافت کو ملحوظ رکھا ہے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب تاریخ کے بجائے ایک تذکرہ کی خصوصیات کی حامل ہے۔ اگرچہ افراد کے سوانح تاریخی واقعات ہی سے مرتب ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے اس کتاب میں تمام تاریخی الجھنوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ اکثر غلط فہمیاں یورپین مورخین کی لائی ہوئی ہیں۔ ان کا تجزیہ کیا ہے اور پوری چھان بین کرنے کے بعد انھیں لکھا ہے۔

مآثر لاہور کے دو حصے ہیں۔

حصّہ اوّل: ۔ اس حصے میں ارباب سیف و سیاست کا ذکر ہے۔ لاہور پر محمود غزنوی کی یلغار۔ غزنی سے لاہور کا الحاق۔ اس فتح کی اہمیت اور اس کی مجمل تاریخ سے بحث کی گئی ہے۔ پرانا لاہور کہاں آباد تھا۔ اس کی آبادی کیا تھی۔ کیا یہ شہر "لو" سری رام چندر جی کے بیٹے کے نام پر آباد کیا گیا تھا یا نہیں۔ کتاب الہند (بیرونی) زین الاخبار (گردیزی) تاریخ بیہقی اور خلاصۃ التواریخ کی روایات کو تاریخ کی کسوٹی پر پرکھا گیا ہے۔ مسلم لاہور کی نشان دہی حضرت داتا گنج بخش اور قطب الدین ایبک کے مزارات سے کی گئی ہے۔ اس شہر پہ مسلمانوں کی حکومت۔ لاہور کے سب سے پہلے صوبیدار عبداللہ قراتگین کے حسن انتظام۔ قاضی ابوالحسن۔ سپہ سالار اریارق۔ احمد نیالتگین وغیرہ کی انتظامی صلاحیتوں کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے۔

ابوالنجم ایاز کی عزت۔ منزلت۔ ذہانت۔ فطانت اور حسن خدمت کا حال نہایت دلکش پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ لاہور پر اس کی حکومت۔ ادبیات عالیہ میں اس کی شہرت اور تاریخ کے صفحات پر اس کی عظمت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

لاہور کا پہلا عروج۔ سلطان مودود اور اس کے دو بیٹوں کا حال۔ سیف الدولہ محمود ابن ابراہیم ابن مسعود کے متعلق کافی مواد فراہم کیا گیا ہے۔ تاریخ جہاں حالات کی تحقیق میں رہنمائی نہیں کرتی۔ وہاں اس دور کے شعرا (مسعود سعد لاہوری اور ابوالفرج مسعود رونی) کے قصائد سے کارآمد تاریخی معلومات فراہم کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ اس وقت کے لاہور کی وسعت۔ شہرت اور خوشحالی کا حال بیان کیا گیا ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ اس زمانے میں لاہور چھاؤنی میں چالیس ہزار چیدہ سواروں کا باقاعدہ لشکر موجود رہتا تھا جس میں غزنی، غور اور خراسان وغیرہ کے جوان شامل تھے۔ لاہور کے گرد و نواح میں چند بستیوں اور جاگیروں کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ شہر میں شاندار عمارات جو غزنوی عمائدین مسعود سعد سلمان۔ ابوالرشید رشید نے

---

[1] مآثر لاہور صفحہ ۶

بزوالی نقیں ان کا ذکر بھی کیا ہے۔ سیف الدولہ محمود کی افتاد اور علاء الدولہ مسعود کی سربلندی کے متعلق بھی لکھا ہے۔ چند عمائدین عصر جنھوں نے شہر لاہور کی توسیع و تزئین میں بڑا حصہ لیا تھا۔ ان کا حال بھی ملتا ہے۔ جن میں خواجہ عبد الحمید احمد عبد الصمد (اولاد حسن میمندی) بہروز منصور بن سعید بن احمد۔ طاہر ابن علی۔ ابو سعد بابو۔ ابوالنصر فارسی اور نصر بن رستم قابل ذکر ہیں۔ "بزم شیراز" ہی قدیم لاہور کے محافلِ نشاط کے اراکین کا ذکر مسعود سعد سلیمان کی مثنوی سے لیا ہے۔ اس بزم طرب کے اراکین و شرکاء کے سلسلے میں خواجہ بونصر پارسی۔ امیر بہمن۔ سید ابوالفضائل۔ امیر بابو۔ امیر کیکاؤس امیر شاہین۔ ابوالقاسم و بیر حسین طبیب وغیرہ کا ذکر ملتا ہے اور ارباب طرب میں محمد نے نواز۔ اسفندیار چنگی۔ زرور حسن بربطی۔ مطربہ پری و بانو اور ماہو رقاص کے نام بھی موجود ہیں۔ قدیم لاہور کے تمدن کی جھلک اور عہد سلاطین غوری و دہلی اور حملۂ مغول کا حال بھی درج ہے۔

حصہ دوم:۔ اس حصے میں صاحبانِ علم و قلم۔ بزرگانِ معرفت۔ شعرائے نامدار علما اور مصنفین کا مختصر تذکرہ ہے۔ بزرگان معرفت میں "بی بی پاکدامناں" شیخ محدث واعظ بخاری۔ داتا صاحبؒ۔ داتا صاحب کے بعد کے درویش۔ شیخ احمد۔ شیخ فخر الدین۔ شیخ حسین۔ سید یعقوب (یہ چاروں بزرگ زنجانی تھے۔ زنجان آذربائجان کا ایک ضلع ہے) سید احمد توختہ۔ شیخ عزیز الدین اور سید مٹھا کا بھی اس ضمن میں تذکرہ کیا ہے۔ کشف المحجوب جو تصوف میں داتا گنج بخشؒ کی ایک گراں بہا تالیف ہے۔ اس پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے۔ شعرائے نامدار میں استاد روتی۔ مسعود سعد سلمان اور چند اور شعرا کا ذکر بھی ہے۔ آخر میں چند علما مصنفین جن میں سراج الدین ابن منہاج نصر اللہ فرقدی۔ امام خطیب الدین زکی الدین احمد۔ امام حسن بن محمد صغانی کا حال بھی درج ہے۔ ارباب سیف و سیاست کی ایک فہرست بھی دی ہے۔ جنھوں نے لاہور پر ۴۱۲ھ/۱۰۲۱ء سے ۶۲۹ھ/۱۲۴۱ء تک حکومت کی۔ ان حکمرانوں کی تعداد چھبیس ۲۶ ہے جن میں پہلا سالار عبد اللہ قراتگین ہے اور آخری حکمران کا نام اختیار الدین قراقش ہے

مآثر لاہور کی تالیف میں فرید ہاشمی صاحب نے بڑی محنت کی ہے۔ انھوں نے لاہور سے متعلق مطبوعہ تاریخوں کے علاوہ اس زمانے کے شعرائے کرام کے تہنیتی قصائد سے اہم معلومات اخذ کی ہیں۔ پھر ان معلومات کو جس خوبی سے پیش کیا ہے۔ وہ انھیں کا حصہ ہے۔ کتاب میں جو زبان اختیار کی گئی ہے۔ یہ تاریخی واقعات کے بیان کے لیے موزوں نہیں۔ لیکن ان کی کہنہ مشقی کے جوہر سطر سطر میں اہل نظر سے خراج تحسین حاصل کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر محمد باقر (سال پیدائش ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء)

ڈاکٹر محمد باقر ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی مصنف لاہور کا ماضی اور حال (LAHORE PAST & PRESENT) کا شمار ماہرانِ علوم شرقیہ میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر محمد باقر ۱۳/اپریل ۱۹۱۰ء کو گجرات میں ملک حاکم دین کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کا امتحان ۱۹۳۲ء میں پاس کیا۔ ڈون پبلک سکول (ڈیرہ دون) میں ۱۹۳۶-۳۷ء میں مدرس مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء تک لنڈن یونیورسٹی میں السنۂ شرقیہ کے شعبے میں لکچرار رہے۔ اور اسی زمانے میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی تیاری کرتے رہے۔ ۱۹۳۹ء میں آپ نے لنڈن یونیورسٹی سے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی۔ ترکی، شام، عراق اور ایران میں آپ نے اس مقصد سے سفر کیے۔ تاکہ وہاں کے مسلمانوں کی ثقافتی۔ سیاسی اور مذہبی سرگرمیوں سے پوری واقفیت حاصل کی جائے۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد آپ شروع میں اسلامیہ کالج لاہور اور اس کے بعد ۱۹۴۰ء میں آپ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ فارسی سے منسلک ہوئے۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں آپ نے رائل انڈین ایرفورس میں خدمات انجام دیئے۔ جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد حکومت ہند نے آپ کی خدمات محکمہ تعلیم کو مستعار دے دیں۔ تقسیم ہند کے بعد رائل پاکستان ایرفورس نے آپ کو واپس بلالیا۔ جہاں سے آپ کو ۱۹۵۰ء میں سبکدوشی حاصل ہوئی۔ آپ ۱۹۵۰ء سے پنجاب یونیورسٹی کے صدر شعبۂ فارسی کے طور پر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

www.taemeernews.com

ڈاکٹر باقر نے مختلف موضوعات پر بے شمار مضامین لکھے۔ جن سے ان کی وسعتِ مطالعہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر باقر کا مزاج تنقیدی ہونے کے علاوہ تحقیقی بھی ہے۔ چنانچہ اردو و فارسی۔ انگریزی، پنجابی ادب پر آپ نے خاصا کام کیا ہے۔ ۱۹۲۲ء سے آپ کا تنقیدی و تحقیقی کام شروع ہوتا ہے۔ اس سنہ میں آپ نے نظامی گنجوی پر ایک مقالہ زمانہ کانپور میں لکھا۔ علاوہ ازیں علامہ اقبالؒ کی بال جبریل اور مولانا رومؒ کے تصوف پر بھی آپ کے مقالے موجود ہیں۔ ۱۹۴۱ء میں اردو سے قدیم پر آپ کا ایک مضمون اورینٹل کالج میگزین میں شائع ہوا۔ اردو کے جرمن شاعر فراسو (FARASU) پر آپ کا مقالہ اورینٹل کالج میگزین بابت ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا۔ پنجابی کے جن مشہور و معروف قصوں کو فارسی کا جامہ پہنایا جا چکا ہے۔ آپ نے ان کی تحقیق کی۔ ان پر مقالے لکھے۔ شہر لاہور کے نام اور اس کی بنیاد کی تاریخ پر آپ کا تحقیقی مقالہ اسلامک کلچر ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا۔ لاہور اسلامی حکومت سے قبل اسلامک کلچر ۱۹۴۷ء میں چھپا۔ شالامار باغ پر آپ کا مضمون ۱۹۵۲ء کے اورینٹل کالج میگزین میں نکلا۔ لاہور کے مورخوں اور سیاحوں پر پاکستان ریویو بابت ۱۹۵۵ء میں آپ کا مقالہ شائع ہوا۔ آپ کے مقالات کی تعداد بہت زیادہ ہے جو مختلف عنوانات پر بڑی تحقیق سے سپردِ قلم کیے گئے ہیں۔

آپ کی مستقل تصانیف کی تعداد پچیس ۲۵ کے قریب ہے۔ جن میں "مقبرہ زیب النسا"۔ "تاریخ کوہ نور"۔ "تذکرہ شعرائے پنجاب"۔ "تاریخ ساسانیہ"۔ "تہذیب امن"۔ "لاہور کا ماضی و حال" (LAHORE PAST AND PRESENT) اور ان کے علاوہ افسانوں اور خطوط کے مجموعے بھی ہیں۔

شہر لاہور کی قدیم تاریخ اور شالامار باغ پر مصنف نے زیادہ توجہ دی ہے۔ ہم نمونے کے طور پر شالامار کی تحقیق کا کچھ حصہ پیش کرتے ہیں تاکہ ان کے تحقیقی کام کا طریقہ اور مرتبہ سمجھنے میں آسانی ہو۔

شالامار باغ پر مصنف نے ایک تحقیقی نظر ڈالی ہے۔ اول تو انھوں نے تاریخی ماخذ کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ شالامار باغ شاہی خاندان کی تفریح کے لیے تعمیر کیا گیا۔ نام اور تاریخ تعمیر پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ شالامار بعضوں کے نزدیک "شہلا باغ" تھا۔ بعض کے نزدیک یہ شالا باغ ہے کہ شالا پنجابی زبان میں خدا کو کہتے ہیں۔ بعض کے نزدیک "شعلہ ماہ" یعنی چاند کا شعلہ اور بعض کے نزدیک سالہ ماہ کہ سالہ سنسکرت میں گھر کو کہتے ہیں۔ بعض کے نزدیک شالامار کشمیر کے ایک باغ کے نام سے مستعار ہے۔ کسی بادشاہ سلف نے کشمیر میں ایک باغ بنوانے کے لیے جگہ پسند کی وہاں ایک گیدڑ کو شکاری کتے نے پکڑ رکھا تھا۔ اس مناسبت سے اس باغ کا نام شالامار مشہور ہوا۔ کیونکہ کشمیری زبان میں گیدڑ کو شالا کہتے ہیں۔ اور مار ایک قسم شکاری کتے کی ہے۔ (تحقیقات چشتی) تھارن ٹن نے لکھا ہے کہ شالامار کے اصلی معنی کیا ہیں۔ یہ معلوم نہیں۔ قیاساً "شالِ مار" اور "شاہی امارت" کی بگڑی ہوئی صورت ہو سکتی ہے۔ سنسکرت میں شالامار مقام عشق کو بھی کہتے ہیں۔ مار سے مطلب خدا کی محبت اور شالا گھر کی ایک صورت ہے۔ ڈاکٹر نے اپنی تحقیق کے مطابق بیان کیا ہے کہ لاہور کے شالامار باغ کا سب سے پہلا تذکرہ سبحان رائے (معاصر عالمگیر) نے اپنی مشہور کتاب خلاصۃ التواریخ میں کیا ہے۔ سید محمد لطیف کا خیال ہے کہ شاہجہان کے چھٹے سال جلوس یعنی ۱۶۳۴ء میں شالامار باغ کی تیاری شروع ہوئی۔ اور وھیلر کی رائے میں ۱۰۴۷ھ/۱۶۳۷ء میں یہ باغ تکمیل کو پہنچا۔ رائے کنہیا لال نے اس کی تکمیل ۱۰۴۸ھ/۱۶۳۸ء میں بتائی ہے۔ وھیلر نے اپنی کتاب تاریخ پاکستان کے پانچ ہزار سال میں قطعۂ ذیل نقل کیا ہے ؎

چوں شاہجہان بادشہ حامئ دیں
آراستہ شالامار باطرز متین

تاریخ بنائے این ز رضواں جستم
گفتا کہ بگو نمونۂ خلد بریں

۱۰۴۷

یہ قطعہ وحیلہ سے پہلے شالامار باغ کے سلسلے میں بار بار نقل کیا گیا ہے رائے کنہیا لال، مولوی نور محمد چشتی اور جج لطیف نے بھی اس قطعے سے فائدہ اٹھایا ہے۔ لیکن ڈاکٹر باقر کے نزدیک یہ قطعہ تاریخ عہد شاہجہان کے بعد کسی گمنام شاعر نے کہا ہوگا۔ اس لیے کہ شاہجہان کے زمانے میں اس باغ کا نام شالامار نہ تھا۔ محمد صالح کنبوہ مصنف عمل صالح اور عبدالحمید لاہوری مصنف بادشاہ نامہ دونوں نے اس باغ کی تکمیل کی تاریخ شعبان ۱۰۵۲ھ میں بتائی ہے جو ۱۶۴۲ء کے مطابق ہے۔ شاہجہان نے سب سے پہلے ۷ شعبان ۱۰۵۲ھ مطابق ۱۳ اکتوبر ۱۶۴۲ء کو اس باغ میں قدم رنجہ فرمایا۔ اس باغ کی تکمیل میں ایک سال پانچ ماہ اور چار دن صرف ہوئے۔

لاہور کا ماضی و حال (LAHORE PAST AND PRESENT) میں ڈاکٹر باقر نے خوب داد تحقیق دی ہے۔ جو مورخین کو چھان بین کی دعوت دیتی ہے۔ یہ کتاب قدیم ماخذ پر مبنی ہے جس میں شہر لاہور کے حالات بیان کئے ہیں۔ اور پنجاب یونیورسٹی پریس میں ۱۹۵۲ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی ہے۔ تعداد صفحات (۵۶۲) ہے۔ ستائیس تصاویر اور ایک لاہور کا نقشہ شامل اشاعت ہے۔

شروع میں مصنف کا مختصر سا پیش لفظ ہے۔ جس میں آپ نے بتایا ہے کہ شہر لاہور کی یہ تاریخ اٹھاون بادشاہوں اور ایک سو تہتر حاکمان شہر کے حالات پر مبنی ہے جنھوں نے اس کی تاریخ کے ابتدا سے یعنی ۹۹۰ء سے ۱۹۵۲ء تک اس شہر پر حکومت کی مصنف نے دعویٰ کیا ہے کہ اس کتاب کی ترتیب میں انھوں نے کتب ہائے تاریخ کے علاوہ مستند روزنامچے، سوانح عمریوں، درباری شعرا کے منظومات، شاہی فرمانوں، ریکارڈ جات، کتبات اور دوسرے ماخذ سے کام لیا ہے۔ درباری مورخین میں یحییٰ بن احمد بن عبداللہ سرہندی مصنف تاریخ مبارک شاہی، مرزا حیدر مصنف تاریخ رشیدی، عبدالحمید لاہوری مصنف بادشاہ نامہ، تذکرۃ الواقعات مصنفہ جوہر آفتابچی، میر مبارک علی، ارادت خان مصنف تاریخ ارادت خان، لطیف، کنہیا لال چشتی اور ایسے بے شمار ذرائع سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ تاہم مصنف نے یہ احتیاط برتی ہے کہ ان سب پیش رو مورخین لاہور، جج لطیف، لالہ کنہیا لال اور نور احمد چشتی نے جن عمارات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے، ان کا حال درج کرنے سے اجتناب کیا ہے۔ اور اس طرح فرضی قصوں اور روایاتی تذکروں سے بھی پرہیز کیا ہے۔ آخر میں لاہور ڈائرکٹری کے زیر عنوان اہم معلومات کو یکجا کر دیا ہے۔ یہ کتاب پنجاب یونیورسٹی نے شائع کی اور انگریزی زبان میں ہے۔

کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں شہر لاہور کی تاریخ ہے۔ یہ حصہ بارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں لاہور کے نام اور اس کی ابتدائی تاریخ سے بحث ہے۔ دوسرے باب میں لاہور ہندو حکمرانوں کی حکومت کے ایام میں۔ تیسرے باب میں لاہور غزنوی دور حکومت میں۔ چوتھے باب میں لاہور غوری اور خاندان غلاماں کے دوران سلطنت میں۔ پانچویں باب میں خلجی اور تغلق فرمانرواؤں کے وقت میں۔ چھٹے باب میں سید، لودھی بادشاہوں کے زمانے میں بابر کے حملے تک۔ ساتویں باب میں مغلوں، افغانوں اور بعد کے مغل بادشاہوں کے عہد میں۔ آٹھویں باب میں اکبر، جہانگیر، شاہجہان اور عالمگیر کے دور میں۔ نویں باب میں عالمگیر کے جانشین مغل بادشاہوں کے وقت میں۔ دسویں میں سکھوں اور گیارھویں باب میں سرکار انگلشیہ اور بارھویں میں لاہور قیام پاکستان کے بعد کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ بارھویں باب میں پاکستان کے اکابر مثلاً قائد اعظم، سردار عبدالرب نشتر کا حال، مارچ ۱۹۵۰ء میں شہنشاہ ایران کی تشریف آوری، پنجاب یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھنا۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ وغیرہ درج ہے۔

کتاب کے دوسرے حصے میں شہر لاہور کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ چنانچہ تیرھویں باب میں لاہور کا رقبہ اور اس کی حدود وغیرہ، چودھویں باب میں تاریخی عمارات کا حال تحریر کیا گیا ہے۔ لاہور کی مساجد، باغات، محلات و دیگر اہم عمارات مثلاً قلعہ پر روشنی

ڈالی گئی ہے۔ اس باب میں ہندو راج۔ اسلامی، سکھ، برٹش دور حکومت اور پاکستانی عہد کی عمارات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ یہ حصہ خاص کر قابل قدر ہے۔

یہ حصہ (۲۳۰) صفحے سے (۴۲۲) صفحے تک پھیلا ہوا ہے۔ اور قدیم عمارات کی تشریح سے شروع ہو کر علامہ اقبالؒ کے مزار تک جا پہنچا ہے۔ اس کے قابل قدر ہونے کی خاص وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر باقر کو فن تعمیر سے ایک خاص دلچسپی ہے۔ عمارات کے حالات کا بیان تاریخی ادوار کے لحاظ سے کیا گیا ہے کہ کس دور میں کونسی عمارت تعمیر ہوئی۔ یہ جائزہ خاصا مبسوط ہے۔ مصنف نے جا بجا مورخین کی آرا نقل کی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی خود اپنی رائے بھی دے دی ہے۔ کیونکہ اس باب میں انھیں خاص دسترس حاصل ہے۔ عمارات کا حال بیان کرتے وقت انھوں نے ہر عمارت کی تاریخی اور تہذیبی اہمیت کو پیش نظر رکھا ہے۔ عمارات کی ساخت سے سال تعمیر کا تعین کرنا اور اس دور کی تہذیب تک پہنچنا ایک خاص فن ہے۔ جو ماہر تعمیرات ہی جانتے ہیں۔ اس سے تاریخ کی تدوین میں بہت مدد ملتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اگر لاہور کی عمارات کو دیکھا جائے تو جو معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ وہ زیادہ حقیقت پر مبنی ہوتی ہیں بہ نسبت ان معلومات کے جو صرف تاریخی ریکارڈ سے مرتب کی جائیں۔

مورخین لاہور میں ڈاکٹر محمد باقر کو اپنے پیشرووں پر اس لحاظ سے فضیلت حاصل ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے سامنے متقدمین کا پورا کام موجود تھا۔ جس سے انھوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ متاخرین میں لالہ کنہیا لال انجینئر اور سید محمد لطیف جج کی کتابوں کو بجا طور پر تاریخی کارنامہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ تاریخ لاہور مرتب کرنے میں ان دو مصنفین کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن یہاں بھی ڈاکٹر باقر کو یہ سہولت حاصل رہی ہے کہ ان کے سامنے لالہ کنہیا لال اور جج لطیف دونوں کی تحقیقات موجود تھیں۔ اس لیے یہ کتاب ان تصانیف کا بھی نچوڑ ہے۔ یہ کتاب ان کے مقابلے میں کافی ضخیم ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر باقر کو عمارات کے ساتھ مخصوص دلچسپی ہے اور تاریخی عمارات کی ساخت اس دور کی تاریخ مرتب کرنا اور تاریخی حالات کا اندازہ لگانا ان کا مشغلہ ہے۔ اس لحاظ سے عمارات لاہور پر جو کچھ انھوں نے لکھا ہے۔ اس سے کتاب کی افادی حیثیت بہت بڑھ گئی ہے۔ بہتر ہوتا اگر یہ کتاب قومی زبان میں تصنیف کی گئی ہوتی۔ کیونکہ انگریزی پر ہر ایک کو دسترس حاصل نہیں ہے یا اس کا وہ خود مستند اردو ترجمہ بھی پیش کر دیتے۔

آخر میں ایک قابل قدر ضمیمہ درج ہے جو سوا سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں ایک باب کتابیات کا ہے جو بڑی جانفشانی سے مرتب کیا گیا ہے۔ لاہور سے متعلق اتنی مکمل فہرست کتابیات اس سے پہلے کہیں دیکھنے میں نہیں آئی۔

کتابیات

ضمیمہ ۱

لاہور کا ذکر عربی و فارسی کتب میں

۱۔ بادشاہ نامہ — مصنف عبدالحمید لاہوری — مطبوعہ کلکتہ — جلد اول ۱۸۶۷ء جلد دوم ۱۸۶۸ء

۲۔ عمل صالح — ملا محمد صالح کنبو — کلکتہ ۱۹۲۷ء — لاہور ۱۹۔۔ء

۳۔ تزک جہانگیری — شہنشاہ نورالدین جہانگیر — علی گڑھ ۱۸۶۴ء

۴۔ اقبال نامہ جہانگیری — معتمد خان — (تین جلدوں میں) دو نایاب — جلد سوم کلکتہ ۱۸۶۵ء

۵۔ اقبال نامہ — معتمد خان — مسودہ امپیریل لائبریری کلکتہ و کتب خانہ خدا بخش خان پٹنہ

۶۔ مآثر عالمگیری — محمد ساقی مستعد خان — کلکتہ ۱۸۷۱ء

۷۔ خلاصۃ التواریخ	سجان رائے بھنڈاری	دہلی ۱۹۱۸ء
۸۔ مآثر الکرام	غلام علی آزاد بلگرامی	(دو جلدیں حیدر آباد دکن میں طبع ہوئیں)
۹۔ سفینۃ الاولیا	شہزادہ دارا شکوہ	آگرہ ۱۸۵۳ء
۱۰۔ سکینۃ الاولیا	" "	(فارسی نسخہ نایاب ہے)
۱۱۔ چہار چمن برہمن	منشی چندر بھان برہمن	قلمی (یونیورسٹی لائبریری لاہور)
۱۲۔ تاریخ احمدی	عبدالکریم علوی	کانپور ۱۸۴۹ء
۱۳۔ تاریخ پنجاب	منشی عبدالکریم	لاہور ۱۲۶۵ھ
۱۴۔ آئین اکبری	ابوالفضل	کلکتہ ۱۸۷۷ء
۱۵۔ اکبر نامہ	" (تین جلدوں میں)	کلکتہ ۱۸۷۷-۸۶ء
۱۶۔ فتوح البلدان	بلاذری	قسطنطنیہ ۱۹۰۱ء
۱۷۔ خزانۂ عامرہ	غلام علی آزاد بلگرامی	کانپور ۱۸۷۱ء
۱۸۔ سیر المتاخرین	غلام حسین خان	لکھنؤ ۱۸۹۷ء
۱۹۔ ہمایوں نامہ	شہزادی گلبدن بیگم	لندن ۱۹۰۲ء
۲۰۔ جہاں کشائے نادری	محمد مہدی	بمبئی ۱۲۰۹ھ
۲۱۔ عمدۃ التواریخ	سوہن لال	لاہور ۱۸۹۱ء
۲۲۔ تاریخ مبارک شاہی	یحییٰ بن احمد بن عبداللہ سرہندی	کلکتہ ۱۹۳۱ء
۲۳۔ قران السعدین	امیر خسرو	علی گڑھ ۱۹۱۸ء
۲۴۔ کشف المحجوب	حضرت علی ہجویریؒ (ترجمہ اردو)	لاہور ۱۹۴۵ء
۲۵۔ بہار سخن	ملا محمد صالح کنبو	قلمی
۲۶۔ گنجینۂ سروری	غلام سرور لاہوری	لکھنؤ ۱۸۸۹ء
۲۷۔ خزینۃ الاصفیا	" "	۱۲۸۵ء
۲۸۔ تواریخ پنجاب بوٹے شاہ	قلمی نسخہ	پنجاب یونیورسٹی لائبریری
۲۹۔ طبقات اکبری	نظام الدین احمد	کلکتہ ۱۹۲۷ء ۔ ۱۹۳۵ء
۳۰۔ منتخب التواریخ	عبدالقادر بدایونی (تین جلدوں میں)	کلکتہ ۱۸۶۸ء

ضمیمہ ۲

لاہور کا ذکر اردو کتب میں

۱۔ تحقیقات چشتی	نور احمد چشتی	لاہور ۱۸۶۴ء
۲۔ تاریخ لاہور	لالہ کنہیا لال	لاہور ۱۸۸۴ء

۲۔ تاریخ پنجاب — لالہ کنہیا لال — لاہور ۱۸۸۶ء
۴۔ یادِ رفتگاں — منشی محمد دین فوق — ۱۹۰۴ء
۵۔ تذکرۃ العلماء والمشائخ لاہور — منشی محمد دین فوق — لاہور ۱۹۲۳ء
۶۔ شالامار باغ — " — لاہور ۱۹۰۰ء، ۱۹۲۴ء
۷۔ لاہور عہدِ مغلیہ میں — " — لاہور ۱۹۲۶ء
۸۔ داتا گنج بخش — " — لاہور ۱۹۱۴ء، ۱۹۳۰ء
۹۔ تاریخ جلیلہ — پیر غلام دستگیر نامی — لاہور ۱۹۲۶ء، ۱۹۶۰ء
۱۰۔ مآثر لاہور — سید ہاشمی فرید آبادی — لاہور ۱۹۵۶ء
۱۱۔ بزمِ مملوکیہ — سید صباح الدین عبدالرحمٰن — اعظم گڑھ ۱۹۴۹ء
۱۲۔ بزمِ صوفیہ — " — "
۱۳۔ تاریخ مخزن پنجاب — مفتی غلام سرور لاہوری — لاہور ۱۲۸۵ھ
۱۴۔ حدیقۃ الاولیا — " — لاہور۔ لکھنؤ ۱۲۹۲ھ، ۱۸۷۵ء
۱۵۔ مدینۃ الاولیا — " — نولکشور۔ کانپور۔ لکھنؤ
۱۶۔ مقدمہ رقعاتِ عالمگیر — سید نجیب اشرف ندوی — اعظم گڑھ ۱۹۴۳ء
۱۷۔ بزمِ تیموریہ — سید صباح الدین عبدالرحمٰن — " ۱۹۴۸ء
۱۸۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ — پروفیسر سیتا رام کوہلی — الٰہ آباد ۱۹۲۳ء
۱۹۔ صنادید عجم — مہدی حسین ناصری — " ۱۳۴۲ھ، ۱۹۲۴ء
۲۰۔ قلعۂ لاہور — ولی اللہ — لاہور ۱۹۶۱ء
۲۱۔ بادشاہی مسجد — ڈاکٹر عبداللہ چغتائی — " ۱۹۵۵ء
۲۲۔ ہمارا پنجاب — عزت اللہ — " ۱۹۴۱ء
۲۳۔ حالات ضلع لاہور — مفتی تاج الدین — اورینٹل کالج میگزین ۱۹۴۲-۴۳ء
۲۴۔ مورخینِ ہند — شمس اللہ قادری — حیدر آباد
۲۵۔ سکینۃ الاولیا — دارا شکوہ (اردو ترجمہ) — لاہور
۲۶۔ شالامار باغ کی سرگزشت — مسعود اکرام کلیم — " ۱۹۵۰ء
۲۷۔ تاریخ پنجاب — غلام محی الدین
۲۸۔ لاہور کے ضلع کا جغرافیہ — ۱۸۷۷ء محکمہ تعلیم — لاہور ۱۹ء
۲۹۔ آثار الصنادید — سر سید احمد خان

۳۰۔ تاریخ ہند — مولانا ذکاء اللہ — کراچی ۱۹۶۰ء
۳۱۔ رہنمائے قلعہ لاہور — مولوی محمد حمید خاں

ضمیمہ ۳

لاہور کا ذکر پنجابی زبان میں

۱۔ شہر لاہور دی تاریخ — کرنل بھولا ناتھ — لاہور ۱۹۳۲ء
۲۔ پنجابی شاعراں دا تذکرہ — مولا بخش کشتہ — " ۱۹۶۰ء

ضمیمہ ۴

لاہور کا تذکرہ انگریزی کتب میں

۱۔ LAHORE — سید محمد لطیف — لاہور ۱۸۹۲ء، ۱۹۵۶ء
۲۔ LAHORE PAST AND PRESENT — ڈاکٹر محمد باقر — لاہور ۱۹۵۲ء
۳۔ اولڈ لاہور — کرنل ایچ۔ آر۔ گولڈنگ — لاہور ۱۹۲۴ء
۴۔ ANCIENT GEOGRAPHY OF INDIA — از کننگھم الگزنڈر — کلکتہ ۱۹۲۴ء
۵۔ PRINCIPALS REPORTS ON THE MAYO SCHOOL OF ARTS FOR (1889-90) — جے ایل کپلنگ — لاہور ۱۸۹۰ء
۶۔ ہسٹری آف دی پنجاب — سید محمد لطیف — کلکتہ ۱۸۹۱ء
۷۔ روئداد ہائے محکمہ آثار قدیمہ — ۴-۱۹۰۳ء، ۶-۱۹۰۵ء، ۴-۱۹۰۳ء
۸۔ لاہور عجائب گھر کے سکے — (ضرب لاہور)
۹۔ REVISED LIST OF OBJECTS OF ARCHAEOLOGICAL INTREST IN THE PUNJAB. — از RODGERS — لاہور
۱۰۔ THE LAND OF THE FIVERIVERS AND SINDH. — از DAVIDROSS — لندن ۱۸۸۳ء
۱۱۔ دیوان عام قلعۂ لاہور — از GORDEN SANDERSON — کلکتہ ۱۹۱۱ء
۱۲۔ آثار قدیمہ کی رپورٹ — (سنہ ۱۹۰۹ء) — کلکتہ ۱۹۱۱ء
۱۳۔ مغلوں کے باغات — از STUART — لندن ۱۹۱۳ء
۱۴۔ LAHORE — از J.H. THORNTON — لاہور ۱۸۶۰ء، ۱۹۲۴ء
۱۵۔ THE MASTER BUILDERS OF THE LAHORE PALACE. — از VOGEL
۱۶۔ پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی — جلد III — شمارہ: ۱ — کلکتہ ۱۹۱۴ء
۱۷۔ قلعۂ لاہور کی کاشی کاری — از VOGEL — کلکتہ ۱۹۲۰ء

۱۸۔ لاہور ڈسٹرکٹ گزٹ از WALKER لاہور ۱۹۱۹ء

۱۹۔ پاکستان کے پانچ ہزار سال از R.E.M. WHEELER لندن ۱۹۵۰ء

۲۰۔ لاہور پاکستان پبلشرز کراچی

۲۱۔ COMPARATIVE GEOGRAPHY OF INDIA. از F. WILFORD لندن ۱۸۵۱ء

۲۲۔ رچ مانڈ براڈ فٹ لاہور میں از مسٹر ظہیر الحسن

۲۳۔ ہنری لارنس روس نالتھ ۱۹۴۹ — ۱۸۴۹

۲۴۔ " " روشن لال ۱۹۵۲ — ۱۸۴۹

۲۵۔ جان لارنس بطور چیف کمشنر پنجاب پریم پرشاد ۱۸۵۸ — ۱۸۵۲

۲۶۔ سر فریڈرک کیوری ریذیڈنٹ پنجاب مس کارنوالس ۱۹۵۲ء

۲۷۔ تواریخ پنجاب ارشاٹن بیک (STEIN BACH)

۲۸۔ پنجاب کے ابتدائی انتظامات مس من چندا ۱۹۳۵ء

۲۹۔ پنجاب کی انتظامی ترقی منظور احمد ۱۸۶۴-۶۸ء

۳۰۔ عیسائی مشنری پنجاب میں مدن گوپال چوپڑہ ۱۸۸۵ء — ۱۸۲۵ء

۳۱۔ پنجاب چیف کمشنر کے ماتحت انوار ہاشمی ۱۸۵۲-۵۷ء

۳۲۔ پنجاب میں جان لارنس کی پالیسی ۱۸۵۲ء تک عبدالحفیظ ۱۹۲۶ء

۳۳۔ لاہور BLASCHECK

۳۴۔ لاہور گائیڈ ڈاکٹر خدیجہ فیروز الدین لاہور ۱۹۵۶ء

۳۵۔ لاہور محمد ولی اللہ خاں لاہور ۱۹۵۵ء

۳۶۔ لاہور اینڈ اٹس امپارٹنٹ مانومنٹس محمد ولی اللہ خاں لاہور ۱۹۵۵ء

۳۷۔ ہسٹاریکل نوٹس آف دی آرکیالوجی مانومنٹس ایٹ لاہور لاہور ۱۹۵۵ء

۳۸۔ لاہور ایکچیول لندن مطبوعہ ۱۹۲۱ء

ضمیمہ ۵

سفرناموں میں لاہور کا ذکر

۱۔ اکبر اور عیسائی از DE JARRIC

۲۔ جہانگیر اور عیسائی از GUERRIRO

۳۔ الکونٹ آف انڈیا از DE LEAT

۴۔ کمنٹری از MONSERRATE

۵۔ جہانگیرز انڈیا از PELSAERI

۶۔ ہسٹری آف دی مغل انڈیا از PELSAERI (اس کا DE LAET نے لاطینی میں ترجمہ کیا اور برج نارائن شنا نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا)

۷۔ EARLY TRAVELS IN INDIA. از FOSTER

۸۔ A VOYAGE TO EAST INDIA. از EAWARD TERRY

۹۔ TRAVELS IN INDIA. از JEAN BAPTIST

۱۰۔ سفرنامہ از PETER DELLAVALLE

۱۱۔ سفرنامہ از PETER MUNDY

۱۲۔ ACCOUNT OF HIS MISSION & TRAVELS. از MANRIQUE

۱۳۔ سفرنامہ از سر ٹامس ہربرٹ

۱۴۔ VOYAGE از MIDDLETON

۱۵۔ GENERAL DISCRIPTION OF INDIA از VAN TWIST

۱۶۔ ACCOUNT OF TRAVELS OF GEORGE 〃 ARDRIES

۱۷۔ (اس کا انگریزی ترجمہ ارون نے کیا) STORY OF MOGHAL INDIA 〃 MANUCCI

۱۸۔ سفرنامہ ہند از برنیر

۱۹۔ سفرنامہ از TAVERNIER

۲۰۔ سفرنامہ ،، ہملٹن

۲۲۔ سفرنامہ مورکرافٹ (جو مسٹر ولسن نے شائع کیا)

۲۳۔ سفرنامہ بیرن ہوگل (جرمن زبان میں) مسٹر جورس نے انگریزی میں ترجمہ کیا۔

۲۴۔ سفرنامہ ڈاکٹر مارٹن (DR MARTIN HONIGBERGER)

۲۵۔ سرسید کا سفرنامۂ پنجاب سید اقبال علی علی گڑھ ۱۸۸۴ء

ضمیمہ ۹

پنجاب یونیورسٹی میں لاہور کے متعلق تحقیقی مقالات

(۱۹۲۷ء)

۱۔ لارڈ ڈلہوزی کے زمانے میں پنجاب کے حکمرانی کی پالیسی از پریم نارائن بہان (BEHAN)

(۱۹۲۸ء)

۲۔ ۱۸۵۷ء کا غدر اور پنجاب از سرداری لال

۳۔ لاہور پریذیڈنسی ایجنسی ۱۸۴۶ء از نرین سنگھ

۴۔ پنجاب، سوہن لال کی عمدۃ التاریخ کی روشنی میں۔ از محمد اقبال

۵۔ پنجاب، اورنگ زیب کے عہد میں از رام کمار

۶- جنوری ۱۸۵۴ء سے ۱۸۵۷ء تک پنجاب کا انتظام — از محمد یونس

۷- ایک کتاب راجہ لال سنگھ کے عنوان سے — از نرندر سنگھ

۸- لاہور میونسپل کمیٹی ۱۹۲۱-۳۵ء — از اعجاز احمد

۹- سر رابرٹ منٹگمری پنجاب میں — از کیشو نارائن بھٹناگر

۱۰- دو سکھ لڑائیوں کے درمیان پنجاب کی حالت — از رام چندر اگروال

(۱۹۴۰ء)

۱۱- ۱۸۵۷ء کی بغاوت اور پنجاب — از سرداری لال

۱۲- لارڈ رپن کے وائسرائے ہونے کے زمانے تک پنجاب کی تعلیمی ترقی — از چرن جیت لال

۱۳- پنجاب انتظامات ۱۸۵۷-۱۸۵۲ — از محمد حسین

۱۴- پنجاب انتظامات کی تاریخ انگریزی قبضے سے لے کر صوبائی خود مختاری تک — از جگت سنگھ

۱۵- پنجاب کے بارے میں جی۔ آر۔ کلارک کی خط و کتابت

۱۶- عیسائی مشنریوں کا پنجاب میں سماجی اور تعلیمی کام — از شمس الدین

۱۷- لارڈ ڈلہوزی اور پنجاب — از افتخار احمد نسیم

۱۸- پنجاب میں انگریزی تعلیم کی تاریخ — از سعید مظفر

(۱۹۴۱ء)

۱۹- فقیر عزیز الدین — از الطاف حسین شوکت

۲۰- پنجاب کی سیاسی حالت ۱۸۴۲-۱۸۴۹ء — از بلونت سنگھ

۲۱- پنجاب جہانگیر اور شاہجہان کے زمانے — از اروڑ چند

۲۲- لاہور ریذیڈنسی — از لودھی پرشاد شگلو

۲۳- لاہور دربار ۱۸۹۲-۱۸۳۸ء — از بلونت سنگھ

۲۴- لاہور مٹکاف مشن — از امیر احمد صدیقی

۲۵- لاہور ایجنسی — از بلدیو راج کپور

(۱۹۴۴ء)

۲۶- مہاراجہ شیر سنگھ کی وفات سے لاہور کی سلطنت کا زوال — از موہن لال اہلووالیا

(۱۹۴۵ء)

۲۷- مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وزیر راجہ دھیان سنگھ کے متعلق — از شیام سندر

۲۸- پنجاب کا الحاق — از کلدیپ سنگھ نارنگ

۲۹- پنجاب میں تعلیم کی تاریخ ۱۹۱۹-۱۸۴۹ء — از مسز ایشور دیوی گپتا

(۶۰-۱۹۴۵ء)

۳۰- پنجاب میں ۱۸۸۷ء تک اردو صحافت کی تاریخ از انور قریشی (۱۹۵۷ء)

ضمیمہ ۷

رسائل و اخبارات میں لاہور کا تذکرہ

(جرنل آف دی پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی)

		جلد	شمارہ	سال
مقبرہ جہانگیر	جے۔ پی۔ تھامسن	۱	۱	۱۹۱۱
ابتدائی غیر ملکی سیاح	ای۔ ڈی میکلیگن	۱	۲	۱۹۱۲
لاہور عجائب گھر میں یونانی بدھی مجسمے	ووگل	۱	۲	۱۹۱۲
جے سوٹ (JESUIT) مشن لاہور میں	فادر فلیکس	۵	۲	۱۹۱۶
جنرل ونطورا	پنڈت شیو نارائن	۶	۲	۱۹۱۷
(جرنل آف دی پنجاب یونیورسٹی ہسٹاریکل سوسائٹی)				
پنجاب یونیورسٹی کی مختصر تاریخ	جے ایف بروس	۲	۲	۱۹۳۳
انارکلی کی کہانی	سی۔ گرے	۳	۱	۱۹۳۴
پنجاب کے دریاؤں کے قدیم راستے	گلشن رائے	۳	۱	۱۹۳۴
تاریخ پنجاب	محمد باقر ملک	۴	۲	۱۹۳۵
پنجاب کی سماجی حالت سکھوں کے زمانے میں	پی۔ این کھیڑا	۵	—	۱۹۳۸
عمدۃ التاریخ	لالہ سوہن لال سوری	۸	—	۱۹۴۴
ظفرنامہ	جنرل ونطورا	۸	—	۱۹۴۴
ظفرنامہ رنجیت سنگھ	دیوان امرناتھ	۸	—	۱۹۴۴
انارکلی	پروفیسر علم الدین سالک	سالنامہ (نیرنگ خیال لاہور)		۱۹۲۸
لاہور نمبر	نیرنگ خیال لاہور		جنوری	۱۹۲۷

عالمگیر، نیرنگ خیال، ہمایوں، ادبی دنیا، شاہکار، قوس و قزح، مخزن، شباب اردو، اورینٹل کالج میگزین، رہنمائے تعلیم، فردوس، یادگار، خیام، الفرقان کی فائلوں میں لاہور کا تذکرہ ملتا ہے۔

پاکستان ٹائمز، سول اینڈ ملٹری گزٹ، امروز، نوائے وقت، آفاق، کوہستان، لیل و نہار، قندیل میں مختلف مضمون نگاروں کے مضامین جن میں پروفیسر سید عبدالقادر، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، محمد عبداللہ قریشی، پروفیسر علم الدین سالک، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر محمد باقر، پروفیسر محمد شجاع الدین اور دوسرے مورخین کے مختلف موضوعات پر تاریخی مقالات لاہور کے متعلق ملتے ہیں۔

چند خونچکاں مناظر

سکھوں کی حکومت کا ابتدائی اور آخری دور

غلام رسول مہر

سلطنتوں کے انقلاب اور بادشاہوں کے تداول میں لوگوں کو جو نقصان پہنچتے رہے ان کے مفصل نقشے شاید ہی کبھی پیش ہوئے ہوں یا منظرِ عام پر آئے ہوں۔ مجھے بارہا خیال آیا کہ تاریخ کا یہ پہلو بھی خاص توجہ کا محتاج ہے لیکن ایک ایک انقلاب کے احوال کی تحقیق و تجسس کے بعد نقشے مرتب کرنا ایک فرد کا کام نہیں۔ ایک جماعت ہی اس کے سرانجام کا ذمہ اٹھا سکتی ہے۔

اس قسم کے انقلابات میں سب سے بڑھ کر صدمے ان مقامات کے باشندوں کو برداشت کرنے پڑے جو حکومت کے مرکزوں میں مقیم تھے مثلاً دہلی خدا جانے کتنی مرتبہ غارت گری کا ہدف بنا اور چند مرتبہ تو وہاں قتلِ عام کا سلسلہ بھی جاری ہوا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد انگریزوں نے قتل و غارت دونوں کا نہایت خوفناک مظاہرہ کیا تھا جس کی نظیریں ہر سرگزشت میں نہیں مل سکتیں۔

لاہور کو بھی ابتدا ہی سے مرکزی حیثیت حاصل رہی چنانچہ زد و کشت کی خونچکانیوں اور غارت گری کی بے دردیوں میں اس کا حصہ بھی خاصا ماتم خیز ہے۔ اس پر بھی انقباض و انبساط اور بست و کشاد کے کئی دور گزرے۔ کبھی یہ اتنا پھیلا کہ میلوں تک اس کی آبادی چلی گئی۔ دور دور تک بنگلوں اور باغوں اور سیرگاہوں کی قطاریں کھڑی ہو گئیں، پھر برباد ہونا شروع ہوا۔ ہر طرف ملبے کے انبار جمع ہوتے گئے اور شہر کی آبادی سمٹ کر فصیل کے اندر پہنچ گئی۔

آسمانی قہر

بعض اوقات ایسے گروہ برسرِ اقتدار آ جاتے ہیں جن کے نزدیک لوٹ مار کو ہر صنعت پر تقدم حاصل ہوتا ہے ان میں سے ایک بدترین گروہ وہ تھا جو تقریباً ۱۷۶۵ء سے ۱۷۹۹ء تک لاہور پر مسلط رہا اور جسے "حکومت سہ گانہ" کہتے ہیں یعنی تین آدمی لاہور نیز پنجاب کے مختلف حصوں پر قابض ہو گئے تھے۔ اوّل گوجر سنگھ، دوم لہنا سنگھ اور سوم سوبھا سنگھ۔ انھوں نے شہر کو تین حصوں میں بانٹ لیا تھا۔ اس دور کے متعلق نرم سے نرم لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ آسمانی قہر کی بجلیاں تھیں جو مسلسل چونتیس سال تک لاہور کی فضا میں کوندتی رہیں۔ آج کیونکر بتایا جا سکتا ہے کہ چونتیس سال کی اس مدت میں لاہور کے باشندوں نے زندگیاں کس حالت میں گزاریں؟ ہمیں صرف یہ تصور کر لینا چاہیے کہ یہاں کی فضا میں یکایک ایک مہیب تاریکی چھا گئی تھی۔ اس میں ہر وقت ہر طرف سے توپیں چھوٹتی تھیں، گولیاں چلتی تھیں، تلواریں برستی تھیں، گولے پھٹتے تھے، خون بہتے تھے، مال لٹتے تھے اور کسی کو کچھ پتہ نہ تھا کہ یہ تاریکی کب زائل ہوگی اور اس حالت میں کب تبدیلی آئے گی؟ بڑے ہی دردناک المیے کے آخری سین کا پردہ کب گرے گا؟

اور اس شبِ دیجور کی صبح کب دریچۂ افق سے آشکارا ہو گی؟ دوسری جنگ میں ہیروشیما اور ناگاساکی کے واقعات کو بے حد خوفناک مانا جاتا ہے، یقیناً وہ بڑے خوفناک تھے مگر وہاں کیا پیش آیا؟ ایک ایک بم گرا، چند لمحوں میں دور دور تک تباہی پھیل گئی اور معاملہ ختم ہو گیا مگر لاہور کے بیاہ نصیب باشندوں نے حکومت سہ گانہ کے تحت چونتیس سال کے لیل و نہار ویسی ہی تکلیفوں اور اذیتوں میں گھُٹ گھُٹ کر بسر کیے جیسی تکلیفیں اور اذیتیں ہیروشیما اور ناگاساکی پر نازل ہوئیں اور چشم زدن میں ختم بھی ہو گئیں۔

چند مناظر

اس کے بعد رنجیت سنگھ کا دور آیا جو کم و بیش چالیس برس جاری رہا۔ اس کی عمومی حیثیت خواہ کیسی ہی ہو مگر وہ ہراس، بدنظمی، غارت گری اور قزاقی کا دور نہ تھا۔ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد پھر بدامنی شروع ہو گئی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس دور کے بعض مناظر ان تاریخوں میں سے پیش کر دوں جن میں سے ایک کتاب ۱۸۴۷ء میں چھپ چکی تھی اور اس وقت تک انگریز لاہور پر مسلط نہیں ہوئے تھے بلکہ یہاں دلیپ سنگھ حکمران تھا۔ دوسری کتاب ۱۸۷۵ء میں مرتب ہوئی تھی۔ اس کا مصنف مختلف واقعات کا عینی شاہد ہو یا نہ ہو مگر اس نے جو کچھ بھی لکھا یا تو مختلف تحریری دستاویزوں کی بنا پر لکھا یا ان لوگوں سے سن کر لکھا جو تمام حالات اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ یہ کتابیں آج کل کمیاب ہیں اس وجہ سے ان کے اقتباسات پیش کرنا اس لحاظ سے بھی مناسب معلوم ہوا کہ ان کی مختلف معلومات خوانندگانِ کرام کے ملاحظہ سے گزر جائیں گی۔

واضح رہے کہ یہاں تمام واقعات کی چھان بین اور تحقیق مقصود نہیں، صرف مختلف واقعات کی وہ کیفیت پیش کر دینا منظور ہے جو ان واقعات کے عینی شاہدوں یا قریب العہد وقائع نگاروں نے پیش کی۔

بعض اہم کردار

یہاں یہ بیان کر دینا چاہیے کہ رنجیت سنگھ کے آخری عہد میں جموں کے ڈوگرہ خاندان نے بڑا اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ یہ تین بھائی تھے۔ دھیان سنگھ، گلاب سنگھ اور سچیت سنگھ۔ دھیان سنگھ بڑا مدبر شخص تھا۔ اسے دربار میں سب سے زیادہ اختیارات حاصل تھے۔ گلاب سنگھ وہی شخص ہے جس کے ساتھ انگریزوں نے ۱۸۴۶ء میں کشمیر کا سودا کیا تھا۔ سچیت سنگھ مارا گیا تھا جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہو گا۔

ایک نہایت اہم شخصیت دھیان سنگھ کے بیٹے ہیرا سنگھ کی تھی۔ رنجیت سنگھ اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا اور جلا پنڈت جس کا ذکر آگے آئے گا، رنجیت سنگھ ہی کے حکم سے ہیرا سنگھ کا اتالیق مقرر ہوا تھا۔

دربار میں ایک اہم فریق سندھان والوں کا تھا جو رنجیت سنگھ کے ہم جد اور رشتہ دار تھے۔ اس خاندان کے افراد نے بھی ان واقعات میں نمایاں حصہ لیا جو پیشِ نظر مضمون میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

کھڑک سنگھ اور دھیان سنگھ

رنجیت سنگھ کے بعد اس کا بڑا بیٹا کھڑک سنگھ ہی وارثِ مسند تھا۔ رانیوں میں سے دو ——— راج دئی اور ہردئی دختران راجہ سنسار چند والیِ کانگڑہ ——— ستی ہونے کو تیار ہو گئیں، دھیان سنگھ بھی رنجیت سنگھ کے ساتھ ہی جل مرنے پر تُل گیا تھا اور اس نے حکم دے دیا تھا کہ میرا کل مال نقد و جنس جمع کیا جائے تاکہ سب کچھ خیرات میں دے دیا جاتے۔ کھڑک سنگھ اور سب لوگ اسے روک رہے تھے۔ آخر ستی ہونے والی رانیوں نے حکم دے کر اسے روکا ——— گڈیا جی کو رنجیت سنگھ کی چھاتی پر رکھا اور دھیان سنگھ سے کہا کہ اب مہاراجہ کے جسم کو ہاتھ لگا کر گڈیا جی پر قسم کھاؤ کہ ملک کا انتظام خیر خواہی اور نمک حلالی سے کرو گے۔ دھیان سنگھ قسم کھا چکا تو رانیوں نے کھڑک سنگھ سے کہا، تم بھی اسی طرح قسم کھاؤ کہ دھیان سنگھ کو

مختار و مدارالمہام رکھے گئے۔ اس کے بعد دونوں رانیاں گیارہ کنیزوں کے ساتھ ستی ہو گئیں۔ کھڑک سنگھ مہاراجہ بن گیا۔ دھیان سنگھ معمول کے مطابق وزارت و مختاری کے فرائض انجام دینے لگا۔ (تاریخ پنجاب کنہیا لال ۳۷۹، ۳۸۰)

کشمکش کی ابتدا

یوں معاملات بظاہر روبراہ نظر آنے لگے مگر حقیقتاً حالت ایسی تھی جیسے آتش فشاں پہاڑ کا دہانہ تھوڑی دیر کے لیے سکون پذیر ہو گیا ہو اور اس کے اندر کا لاوا زیادہ شدت سے ابلنے کے لیے جمع ہو رہا ہو۔

چند روز کے بعد اختلافات بروئے کار آنے لگے۔ دھیان سنگھ کو رنجیت سنگھ کے وقت میں زنانے کے اندر آنے کی اجازت بھی حاصل تھی۔ کھڑک سنگھ نے اسے روک دیا نیز وہ اپنے ایک آدمی چیت سنگھ کو مدارالمہام بنانے پر آمادہ ہو گیا۔ دھیان سنگھ نے اس پر کھڑک سنگھ کے بیٹے کنور نونہال سنگھ اور اس کی والدہ رانی چند کور کو ساتھ ملا لیا۔ نونہال سنگھ کو پشاور سے بلایا گیا اور سمائتھ کے بیان کے مطابق اسے یقین دلا دیا گیا کہ چیت سنگھ اور کھڑک سنگھ انگریزوں کی حفاظت اور باجگذاری قبول کر لینے پر آمادہ ہیں۔ نونہال سنگھ ویسے بھی یہی چاہتا تھا کہ جس طرح پہلے سے انتظام کا سلسلہ دھیان سنگھ کے ماتحت چلا آرہا ہے بدستور جاری رہے اور کوئی نیا انتظام نہ کیا جائے۔ اس نے باپ (کھڑک سنگھ) کو سمجھایا مگر وہ نہ مانا۔ آخر فیصلہ کر لیا گیا کہ کھڑک سنگھ کی ذات کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر معاملات کی باگ ڈور اس کے ہاتھ سے نکال لی جائے۔ دربار کے تمام ارکان اور بڑے بڑے فوجی افسر اس پر متفق ہو گئے۔ چنانچہ چیت سنگھ کو:

"کنور نونہال سنگھ نے عین مکان مثمن برج (قلعہ) کے اندر قتل کر ڈالا۔ اس کے قتل ہونے سے مہاراجہ کھڑک سنگھ کمال ناراض ہوا اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ مہاراجہ قلعہ سے اٹھ کر اپنی قدیمی حویلی واقع لوہاری دروازہ میں آگیا اور انتظام سلطنت سے بالکل دست بردار ہو گیا۔"

(تاریخ پنجاب کنہیا لال ص ۳۸۳)

سمائتھ کا بیان

سمائتھ کا بیان زیادہ مفصل اور بعض جزئیات میں کنہیا لال سے مختلف ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ سازباز کی تکمیل کے بعد دھیان سنگھ اس کے دونوں بھائی، سردار ان سندھاں والے قلعے میں پہنچے۔ تڑکا تھا اور کھڑک سنگھ معمول کے مطابق عبادت میں مصروف ہو گیا تھا۔ دو سکھ بھائی ملے، انھیں بے تامل قتل کر دیا گیا۔ کھڑک سنگھ کے "گڈوتی" نے سرداروں کے ایک مجمع کو اندر آتے دیکھا تو دوڑ کر مہاراجہ کو خبردار کرنے کی کوشش کی۔ دھیان سنگھ کے ہاتھ میں انگریزی رائفل تھی فوراً "گڈوتی" کو گولی ماردی اور وہ گر گیا۔ گلاب سنگھ اس پر سخت ناراض ہوا اور کہا کہ ایسے موقع پر صرف تلوار سے کام لینا چاہیے تاکہ کم سے کم شور ہو۔

محافظ سپاہیوں نے روکنا چاہا۔ دھیان سنگھ آگے بڑھا اور اس کے اشارے پر سپاہی ایک طرف ہو گئے۔ کھڑک سنگھ کو نقصان پہنچانے کا کوئی سوال ہی نہ تھا، چیت سنگھ کی تلاش شروع ہوئی۔ وہ بھاگ کر ایک تاریک کمرے میں جا چھپا تھا۔ دیکھا تو ایک کونے میں کھڑا تھا دونوں ہاتھوں سے تلوار پکڑ رکھی تھی۔ سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا اور بچے کی طرح رو رو کر رحم کے لیے گڑگڑا رہا تھا۔ سپاہی اسے کھینچ کر دروازے میں لائے، دھیان سنگھ نے دیکھتے ہی تلوار دو مرتبہ اس کے جسم میں سے گزاری۔ وہ گر گیا تو سپاہیوں نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ کھڑک سنگھ کو قلعے ہی میں ایک مقام پر بند کر دیا گیا اور نونہال سنگھ اختیاراتِ حکومت کا مالک بن گیا۔ (لاہور کے حکمران خاندان کی سرگزشت ص ۳۰)[1]

---

[1] THE HISTRY OF THE REIGNING FAMILIES OF LAHORE BY SMYTHE

نونہال سنگھ کی وفات

رنجیت سنگھ کے بعد اس کے خاندان میں سے نونہال سنگھ کو بہترین فرد مانا جاتا تھا ــــ کنہیا لال نے لکھا ہے:۔

"کنور نونہال سنگھ اگرچہ اس وقت کم عمر نوجوان تھا مگر عقل خدا داد رہے" (۳۸۲)

سائنتھ کہتا ہے کہ اس کامیابی سے نونہال سنگھ کا طرۂ افتخار بہت بلند ہو گیا۔ برہمن، جوتشی اور فقیر آآ کر بشارت دینے لگے کہ مہاراج آپ کی سلطنت بڑی پائدار و استوار رہے گی۔ آپ کی فوج فتح مندیوں میں امتیازِ خصوصی حاصل کرے گی۔ آپ دہلی کو بھی مسخر کریں گے اور آپ کی حکمرانی کا دامن بنارس تک پھیل جائے گا۔

چنانچہ مختلف برہمنوں نے بنارس کے آس پاس جاگیروں کے پروانے پیشگی حاصل کر لیے جن پر عمل اس وقت ہوتا جب بنارس نونہال سنگھ کے زیرِ نگیں آجاتا۔ (ص ۳۱)

نونہال سنگھ ایسے ہی خیالوں میں مست رہا۔ دھیان سنگھ کی نگرانی میں انتظامی مشینری بخوبی چلتی رہی۔ بعض بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ دھیان سنگھ کے وسیع اختیارات کی بنا پر خود نونہال سنگھ کے دل میں بھی کدورت پیدا ہو چکی تھی۔ ۵ نومبر ۱۸۴۰ء کو کھڑک سنگھ نے وفات پائی اس کی نعش جل چکی تو نونہال سنگھ واپس ہوا۔ گلاب سنگھ کا بیٹا اودھم سنگھ ساتھ تھا۔ دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیے چل رہے تھے، قلعے سے سلامی کی توپیں سر ہو رہی تھیں جن کی آواز سے زمین کانپتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ قلعے کے دروازے میں پہنچے تو اچانک اوپر سے پتھر گرے! اودھم سنگھ تو ایک ہی لمحے میں ختم ہو گیا۔ نونہال سنگھ بے ہوش تھا، دھیان سنگھ نے خود اسے اٹھا کر پالکی میں لٹایا اور اندر لے چلا۔ لہنا سنگھ مجیٹھیہ ساتھ ساتھ چلا، دھیان سنگھ نے اسے روک دیا اور دروازے بند کرا دیے، یہاں تک کہ نونہال سنگھ کی والدہ کو بھی اندر آنے کی اجازت نہ دی۔ باہر جو سردار جمع تھے ان سے کہہ دیا گیا کہ نونہال سنگھ صرف زخمی ہوا ہے، اچھا ہو جائے گا۔ آخر دھیان سنگھ خود قلعے سے نکلا اور مہارانی چند کور والدۂ نونہال سنگھ سے مل کر بیٹے کے مرنے کی خبر دی۔ ساتھ ہی کہہ دیا کہ اس خبر کو فی الحال مخفی رکھے کیونکہ تخت کی حفاظت کا تقاضا یہی ہے۔

جانشینی کا مسئلہ

اب جانشینی کے معاملے نے نازک صورت اختیار کر لی۔ ایک فریق کا جس میں خود دھیان بھی شامل تھا فیصلہ یہ تھا کہ کنور شیر سنگھ (ابن رنجیت سنگھ) کو گدی پر بٹھایا جائے، دوسرا فریق جس کے سرخیل سندھاں والے تھے اس کے لیے تیار نہ تھا۔ انھوں نے رانی چند کور والدۂ نونہال سنگھ کو مسند نشین کرنا چاہا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح پوری سکھ سلطنت کی مختاری خود ان کے ہاتھ میں آجائے گی۔

چند کور نے دھیان سنگھ کے سامنے مندرجہ ذیل تجویز پیش کی:۔

۱۔ نونہال سنگھ کی بیوی حاملہ ہے، مناسب ہے کہ بالفعل اس کے بچہ پیدا ہونے تک میں نیابتہً حکومت کا کاروبار چلاؤں۔

۲۔ اگر میرے بیٹے کے گھر بیٹا ہوا تو وہ مہاراجہ ہو گا اور تم بدستور مدار المہام رہو گے۔

۳۔ اگر بیٹا نہ ہوا تو میں تمہارے فرزند ہیرا سنگھ کو گود میں لے کر اپنا بیٹا بنا لوں گی اور وہی مہاراجہ ہو گا۔ بڑے مہاراجہ (رنجیت سنگھ) بھی اسے فرزندی کہتے تھے۔

یہ سب سخن طرازی تھی جس کا مدعا یہ تھا کہ دھیان سنگھ چند کور کو مسند پر بٹھا دے۔ نہ نونہال سنگھ کی بیوی حاملہ تھی، نہ چند کور ہیرا سنگھ کو بیٹا بنانا چاہتی تھی اور نہ سکھ اس کے لیے تیار ہو سکتے تھے کہ اپنی حکومت ڈوگروں کے حوالے کر دیں۔ دھیان سنگھ بھی ان تمام حقیقتوں کو خوب

سمجھے بیٹھا تھا۔ اس نے شیر سنگھ کے پاس خاص قاصد خفیہ خفیہ بھیج دیے۔ خود پورا منصوبہ تیار کر کے جموں چلا گیا۔ اپنے بھائی گلاب سنگھ اور دوسرے رفیقوں کو منصوبے کے مطابق کام کرنے کی تاکید کر گیا۔

منصوبے کا مقصد یہ تھا کہ جب تک شیر سنگھ کی کامیابی ہر پہلو سے یقینی نہ ہو جائے اس وقت تک چند کور پر یہی ظاہر کیا جائے کہ مسند آپ کے لیے ہے اور آپ ہی اس کی حقدار ہیں۔ گلاب سنگھ نے یہ کام بڑے عمدہ طریقے پر انجام دیا۔

شیر سنگھ کی مسند نشینی

شیر سنگھ لاہور پہنچا۔ اس کے اور چند کور کے معاملے میں دھیان سنگھ اور اس کے بھائیوں نے کس طرح اپنے آپ کو ہر الزام سے بچائے رکھا اور کیونکر شیر سنگھ کو سلطنت ملی؟ یہ امور پیش نظر موضوع سے خارج ہیں البتہ کنہیا لال کا یہ بیان یہاں ضرور درج کر دینا چاہیے کہ:۔

> "شیر سنگھ..... بہ ارادۂ مسند نشینی لاہور آیا اور شام کے بعد دہلی دروازے سے قلعہ تک دو طرفہ بازار لوٹ لیا۔ چھتہ بازار میں جہاں جوتیاں بکتی ہیں آگ لگا دی اور آٹھ روز تک سکھوں نے منشیوں کو لوٹا اس عداوت سے کہ یہ منشی دفتر میں نوکر ہو کر ہماری تنخواہوں میں سے کاٹ کرتے ہیں۔ اچھے اچھے عزت دار منشی ملازمان دفتر ملکی و فوجی لٹ گئے بلکہ مولوی ملا اس جرم میں غارت ہوئے کہ یہ لوگ منشیوں کو پڑھاتے ہیں۔ ہلکان فوج کوچہ کوچہ منشیوں اور مولویوں کے گھروں کو تلاش کر کے لوٹتے رہے۔" (تاریخ لاہور ص ۳۵)

یہاں صرف چند خونچکاں مناظر پیش کرنے منظور ہیں اور پورے حالات تاریخی ترتیب سے لکھنے منظور نہیں۔

سندھاں والے اور چند کور

شیر سنگھ نے مسند نشین ہوتے ہی سندھاں والے سرداروں سے اچھا سلوک نہ کیا کیونکہ وہ چند کور کے طرف دار تھے۔ وہ ستلج پار انگریزی علاقہ میں چلے گئے۔ بڑے بڑے سرداروں نے کہہ سن کر صفائی کرائی اور انھیں واپسی کی اجازت مل گئی۔

چند کور کے لیے جاگیر مقرر ہو گئی لیکن شیر سنگھ اس کی طرف سے مطمئن نہ تھا چنانچہ اس نے چار کنیزوں کو جاگیر کا لالچ دے کر چند کور کے قتل پر آمادہ کیا اور خود وزیر آباد چلا گیا۔ کنیزوں نے چند کور کو پتھر مار مار کر ہلاک کر ڈالا۔ (سانحہ ص ۶۹) کنہیا لال کا بیان ہے کہ شیر سنگھ کے کہنے سے چند کور کی کنیزوں نے گلا گھونٹ کر اسے مار ڈالا۔ (۲۹۰) کنیزوں میں سے دو کے ہاتھ کاٹے گئے تیسری ایک فقیر کی سفارش پر چھوڑ دی گئی۔ چوتھی نے فدیے میں بہت بڑی رقم دے کر رہائی پائی۔ (سانحہ ۶۹)

شیر سنگھ اور پرتاب سنگھ کا قتل

اب سندھانوالے سرداروں نے اپنے سازباز کا سلسلہ شروع کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ دھیان سنگھ اور شیر سنگھ دونوں کو ختم کر کے خود تمام امور سنبھال لیں۔ انھوں نے ایک طرف مختلف تدبیروں سے کام لے کر شیر سنگھ سے دھیان سنگھ کے محضر قتل پر دستخط لے لیے اور دوسری طرف دھیان سنگھ کو سب کچھ بتا کر اس سے ایک پروانے پر دستخط لے لیے کہ شیر سنگھ کا قتل ضروری ہے۔ یہ طے کر لیا تھا کہ شیر سنگھ کے بعد رنجیت سنگھ کے چھوٹے بیٹے دلیپ سنگھ کو گدی پر بٹھایا جائے گا۔

۱۵ ستمبر ۱۸۴۳ء کو شیر سنگھ باغ شاہ بلاول میں ٹھہرا ہوا تھا، اجیت سنگھ سندھاں والا ایک عمدہ ولایتی قرابین لایا اور عرض

کی کہیں نے یہ جوڑہ سو روپے میں خریدی ہے اور اس لائق ہے کہ مہاراجہ اسے اپنے پاس رکھیں۔ شیر سنگھ نے قرابین کے لیے ہاتھ بڑھایا اجیت سنگھ نے لبلبی دبا دی، گولیاں شیر سنگھ کے جسم کو چھید گئیں۔ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا، صرف یہ الفاظ زبان سے نکلے "ایہہ کی دغا؟" (یہ کیا فریب کیا)

اس کا بیٹا پرتاب سنگھ غالباً تیرہ سال کا تھا۔ وہ باغ میں اپنے آپ کو غلے، چاندی اور سونے کے ساتھ تلوا رہا تھا۔ خیرات لینے والے لوگ جمع تھے، لہنا سنگھ سندھاں والا اچانک وہاں پہنچا۔ لوگ بھاگ گئے، پرتاب سنگھ نے لہنا سنگھ کی بہت منتیں کیں:

> پاؤں پر سر رکھا اور کہا کہ چچا! میں تمھارے گھوڑوں کی لید اٹھاؤں گا، تم مجھ کو قتل نہ کرو۔ (کنہیا لال ص ۳۹۳)

لہنا سنگھ سندھاں والا کے سامنے اپنے خاندان کا دائمی اقتدار تھا۔ وہ ایک بڑی رکاوٹ کو دور کر چکے تھے، اب ایک سیزدہ سالہ بچے کی رکاوٹ کو کیونکر علیٰ حال چھوڑ سکتے تھے بلکہ وہ رنجیت سنگھ کے ہم جد تھے، رنجیت سنگھ کی نسل ختم ہوتی تو سلطنت شرائط سندھاں والے خاندان کو پہنچتی تھی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ مسند کا راستہ صاف ہو رہا ہے، کوئی جھاڑی یا کوئی کانٹا کیوں باقی رکھا جائے انھوں نے جو مقصد چند کور کے ذریعے سے پورا کرنا چاہا تھا اور پورا نہیں ہوا تھا اس کی تکمیل کے اب بدرجہا بہتر مواقع سامنے آگئے تھے۔ جب انسان کے ضمیر پر ذاتی اغراض کی تیرگی چھا جاتی ہے تو انسانیت کا ہر شریفانہ احساس موت کے گھاٹ اتر جاتا ہے — لہنا سنگھ سندھاں والا کی کیفیت بھی اس وقت یہی تھی۔ مظلوم پرتاب سنگھ کی التجائے رحم صدا بہ صحرا رہی اور لہنا سنگھ کی تلوار نے اسے بھی باپ سے چند لمحے بعد موت کی آغوش میں سلا دیا۔

دھیان سنگھ کا قتل

اس خوفناک خونریزی کے بعد انھوں نے شاہ بلاول کے قلعے کا رخ کیا۔ راستہ میں دھیان سنگھ سے ملاقات ہوئی جو شاہ بلاول کی طرف جا رہا تھا۔ اسے سب کچھ بتا دیا اور ساتھ لے کر قلعے میں پہنچے احتیاط یہ کی کہ اپنے آدمی تو خاصی بڑی تعداد میں ساتھ رکھے مگر دھیان سنگھ کے تقریباً سب آدمی قلعے سے باہر ہی چھوڑ دیے۔ اب دھیان سنگھ کا مآل ان کے قبضے میں تھا۔ حکمران کو وہ راستے سے ہٹا چکے تھے۔ وزیر و مدار المہام کا وجود ختم ہو جاتا تو مسندِ حکومت یا اس کے اختیارات پر قبضے سے انھیں کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ بے باک ہو گئے۔

دھیان سنگھ کو بھی خطرے کا احساس ہو گیا جس کی زبردست گرفت میں وہ اچانک آگیا تھا۔ اس سلسلے میں کنہیا لال کا بیان یہ ہے کہ سندھاں والے سرداروں نے بہ آوازِ بلند دھیان سنگھ سے کہا کہ چلو اب دلیپ سنگھ کو تخت نشین کریں:

> ناظمانِ ملک اور افسرانِ فوج کے نام پروانے جاری کریں کہ اب سلطنت مہاراجہ دلیپ سنگھ کی ہو گئی ہے، ہر کوئی اپنے آپ کو نوکر مہاراجہ دلیپ سنگھ کا تصور کرے۔ یہ بات سن کر راجا دھیان سنگھ نے کچھ جواب نہ دیا اور ان کے ساتھ ہو لیا۔ دوسری ڈیوڑھی پر جا کر سردار لہنا سنگھ نے جو پیچھے آتا تھا حکم دے دیا کہ ڈوگرہ سپاہی کوئی آنے نہ پائے چنانچہ جس قدر تھوڑی بہت فوج اس وقت راجا دھیان سنگھ کے ساتھ تھی پیچھے رہ گئی اور راجا تنہا دشمنوں کے نرغے

میں آگیا۔ اس وقت سردار اجیت سنگھ نے پوچھا کہ شیر سنگھ نے رانی چند کور کو کس جگہ ہلاک
کرایا تھا؟ اس وقت راجا کو ثابت ہو گیا کہ یہ اب میرے بھی قتل کی فکر میں ہیں...... اس
وقت اجیت سنگھ نے قریب آکر دھیان سنگھ پر قرابین سر کی جس سے وہ نیتق و زیر
فی الفور جاں بحق تسلیم ہوا۔
(کنہیا لال ص ۳۹۳، ۳۹۴)

دوسرا بیان

سائتھ کا بیان اقرب الی الصواب معلوم ہوتا ہے یعنی قلعے کے بیرونی دروازے پر پہنچے تو پانچ چھ سو سپاہی ساتھ تھے۔ دوسرے دروازے پر پہنچے تو سندھانوالیے سرداروں کے بعض اشاروں پر دھیان سنگھ کے سپاہی چپ چاپ روک دیے گئے۔ اس وقت دھیان سنگھ کے دل میں شبہات پیدا ہوئے مگر اجیت سنگھ نے مختلف معاملات کے متعلق باتیں چھیڑ کر وزیر کی توجہ دوسری طرف منعطف کرنے کی کوشش کی تاہم اسے اجیت سنگھ کی عام روش اور انداز گفتگو سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتا تھا کہ خوف کے اظہار سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ جب دھیان سنگھ نے دیکھا کہ اجیت سنگھ کے آدمی جا بجا پہرے پر کھڑے ہیں تو پوچھا کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ جواب ملا کہ وہ سب اپنے آدمی ہیں۔

راجا انھی آدمیوں کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اجیت سنگھ نے انگلی کا اشارہ کیا اور پیچھے سے
ایک آدمی نے راجا کے گولی ماری، پھر ایک اور گولی ماری گئی۔ آخر تلواروں سے اسے
ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا گیا۔ درا صل وہ پہلی ہی گولی کھا کر مر چکا تھا۔ جو چند ملازم راجا کے
ساتھ رہ گئے تھے ان میں سے ایک مسلمان نے مزاحمت کی، اسے بھی فی الفور ختم کر دیا
گیا۔ اس کی اور اس کے آقا کی لاشیں کوڑے کرکٹ کے اس گڑھے میں ڈال دی گئیں
جو قلعے کے اندر توپوں کے کارخانے سے متعلق تھا۔
(ص ۷۷)

اس وقت لہنا سنگھ اور اس کے ساتھی بھی موقع پر پہنچ گئے۔ لہنا سنگھ اجیت سنگھ کی جلد بازی پر سخت خفا ہوا۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ دھیان سنگھ کے علاوہ ڈوگروں کے دوسرے سرداروں کو بھی قلعے میں بلا کر سب کو ایک دم ختم کیا جائے۔

سندھانوالوں کا خاتمہ

اب قلعے کے اندر سندھاں والوں کا عمل دخل تھا۔ باہر جو فوج تھی اسے کوئی بھی لیڈر اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکتا تھا۔ ہیرا سنگھ نے باپ کے قتل کی خبر سنی تو سکھ فوج کے سامنے ایک پرجوش تقریر کی جس کا مفاد یہ تھا کہ سندھانوالیے سردار ہندوستان میں تھے تو انھوں نے انگریزوں سے ساز باز کر لیا تھا۔ اب وہ انگریزوں کو اس ملک پر مسلط کر دیں گے۔ تم سے ہتھیار لے لیے جائیں گے، کھیتی باڑی کے سوا تمھارے لیے کوئی مشغلہ نہ رہے گا۔ مہاراج کے خزانے بھرے پڑے ہیں، مجھے ان کی ضرورت نہیں، میں اپنے باپ اور چچاؤں کی دولت سے ایک لاکھ فوج ملازم رکھ سکتا ہوں۔ میں سرکاری روپیہ سب تم پر خرچ کروں گا۔ سب کی تنخواہیں ڈیوڑھی کر دی جائیں گی۔ پیادوں کو فی کس بارہ روپے اور سواروں کو فی کس تیس روپے ماہوار ملیں گے۔

غرض اس طرح چالیس ہزار آدمی ہیرا سنگھ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ اب سندھاں والا سرداروں کو عرصہ حیات تنگ نظر آیا تو انھوں نے دھیان سنگھ کی لاش پالکی میں رکھی، اس پر عطر چھڑکا، کشمیری شال اُڑھایا اور قلعے سے باہر بھیج دیا اور ساتھ ہی یہ

یقین دلایا کہ دھیان سنگھ ایک اتفاقی حادثے میں مارا گیا، ہمارا اس میں کوئی ہاتھ نہیں۔
انتقام کے سیل کو کوئی تدبیر روک نہ سکی۔ کوئی ایک گھنٹے میں قلعہ فتح ہو گیا۔ اجیت سنگھ بچ نکلنے کی کوشش میں گرفتار ہوا اور اس کا سر کاٹ کر دھیان سنگھ کی لاش کے قدموں پر رکھ دیا گیا۔ لہنا سنگھ روپوش ہو گیا تھا مگر پکڑا گیا۔ اس کی ران کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی۔ وہ بھی مارا گیا۔ دلیپ سنگھ کے راج کا اعلان کر دیا گیا اور ہیرا سنگھ وزیر بن گیا۔ یہی زمانہ ہے جس میں ہیرا سنگھ کے اتالیق پنڈت جلا کا طوطی بولتا رہا۔ اتنا اور عرض کر دوں کہ کنہیا لال کے بیان کے مطابق اجیت سنگھ اور لہنا سنگھ نیز ان کے ایک مسلمان صاحب مہر گھسیٹا کی لاشوں کے پاؤں میں رسی ڈال کر شہر کے بازاروں میں گھسیٹتے رہے اور خوب مُردہ ان کا خراب کیا۔ (ص ۳۹۵)

مختلف قتل

میں اس داستان خونریزی کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتا اور صرف چند خاص مقتولوں کے اجمالی ذکر کے بعد آخر میں ہیرا سنگھ کے انجام پر اسے ختم کر دوں گا۔

۱۔ رنجیت سنگھ کے دو بیٹوں کشمیرا سنگھ اور پشورا سنگھ کو سیالکوٹ میں جاگیر دے دی گئی تھی۔ دلیپ سنگھ کو مسند پر بٹھایا گیا تو انھوں نے کہا کہ ہمارا حق دلیپ سنگھ سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ دونوں یکے بعد دیگرے مختلف مقامات پر مارے گئے۔

۲۔ بچیت سنگھ کو اس بات پر سخت غصہ آیا کہ بھتیجا (ہیرا سنگھ) وزیر بن گیا اور وہ خود چچا ہونے کے باوجود کچھ نہ بن سکا۔ وہ لاہور پہنچا اور میاں اسماعیل عرف میاں وڈا کی خانقاہ میں قدم جا کر بیٹھ گیا جہاں ایک سو درویش رہتے تھے۔ ان میں نابینا بھی شامل تھے میاں شرف الدین وہاں کا سجادہ نشین تھا۔ گولہ باری میں مسجد اور خانقاہ ویران ہوئی۔ نابینا درویش شہید ہوئے۔ بینا ادھر ادھر بھاگ گئے بچیت سنگھ بھی مارا گیا۔

۳۔ رانی جنداں کا بھائی جواہر سنگھ مختار کل بننا چاہتا تھا۔ وہ ہاتھی پر سوار ہو کر نکلا۔ اپنے بھانجے مہاراجہ دلیپ سنگھ کو گود میں بٹھا لیا تاکہ سکھ اس کا احترام کریں۔ سکھوں نے مہاراجہ کو الگ کیا اور جواہر سنگھ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

۴۔ عطر سنگھ سندھانوالا پہلے ہندوستان بھاگ گیا تھا، پھر دریائے ستلج کو عبور کر کے بھائی بیر سنگھ کے ڈیرے میں پہنچ گیا جسے سکھوں میں بڑے احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ بیر سنگھ نے اعلان کیا کہ دلیپ سنگھ خورد سال ہے اس کا وزیر اور مدار المہام سکھ ہونا چاہیے ہیرا سنگھ سکھ نہیں، اسے معزول کر کے عطر سنگھ کو یہ منصب دیا جائے۔ اس کے ڈیرے پر بھی گولہ باری ہوئی اور دوسرے آدمیوں کے علاوہ بھائی بیر سنگھ بھی مارا گیا۔

۵۔ اکابر میں سے مصر بیلی رام اور بھائی گورمکھ سنگھ الگ مارے گئے تھے۔

ہیرا سنگھ اور پنڈت جلا

میں نے یہ واقعات تاریخی ترتیب ملحوظ رکھے بغیر اجمالاً پیش کر دیے۔ اب صرف ہیرا سنگھ کا انجام بیان کروں گا۔

ہیرا سنگھ کے خلاف غیظ و غضب کی آگ بھڑکانے کا اصل ذمہ دار پنڈت جلا تھا جو عام روایات کے مطابق بڑا ہی بدزبان اور بے لگام تھا۔ حتیٰ کہ وہ مہارانی جنداں کے خلاف بھی ایسے ناشائستہ کلمات کہہ دیتا تھا جس سے تمام ارکانِ دربار کو سخت رنج ہوتا تھا۔ آخر مہارانی اور دوسرے لوگوں نے سکھوں کو خوب بھڑکایا۔ ہیرا سنگھ پنڈت جلا کو الگ کر دیتا تو غالباً محفوظ رہتا مگر اسے پنڈت جلا کی علیحدگی منظور نہ تھی لہٰذا حالات ناقابلِ برداشت ہو گئے۔ آخر ہیرا سنگھ نے فیصلہ کیا کہ لاہور سے چپ چاپ نکل جائے۔

اس نے جواہرات اشرفیاں قیمتی پارچات اور دوسری بیش بہا چیزیں سمیٹیں۔ ۲۱ دسمبر ۱۸۴۴ء کو رات کے وقت لاہور سے نکلا۔ پنڈت جلا، سوہن سنگھ (گلاب سنگھ کا بیٹا) اور دوسرے ڈوگرے ساتھ تھے۔ یہ لوگ دریائے راوی کے قریب پہنچے تو سکھوں کو اطلاع مل گئی چنانچہ لاہور سے پانچ میل پر سکھوں نے اسے جا گھیرا۔ پھر پانچ میل کا راستہ یوں طے کیا کہ سکھ قریب پہنچ جاتے تو ہیرا سنگھ اشرفیوں کی ایک تھیلی زمین پر پھینک دیتا، سکھ لوٹ میں مشغول ہو جاتے۔ آخر ہیرا سنگھ اور ساتھی مارے گئے، ساری دولت لٹ گئی۔

> بعد قتل و تاراج کے سکھوں نے چاروں (ہیرا سنگھ، جلا، سوہن سنگھ اور راجو سنگھ) کے سر کاٹ لیے اور فتح کا نقارہ بجاتے ہوئے لاہور میں داخل ہوئے …… ہیرا سنگھ اور پنڈت جلا کے سر کئی مہینے تک بازار کی موریوں اور نجاست گاہوں میں پڑے ہوئے لوگوں کو نظر آتے تھے …… غرض وہ حالت ان سروں کی ہوئی کہ خدا اپنے حفظ و امان میں رکھے آخر لاہور کی رعایا کے چند آدمیوں نے مل کر رات کے وقت ان سروں کو ایک پوشیدہ جگہ میں دفن کر دیا اور جسم ان پہلوانوں کے اسی مقام پر جہاں وہ قتل ہوئے تھے کئی روز تک میدان میں پڑے رہے سکھوں کے ڈر کے مارے کوئی انھیں نہ تو دفن کرتا اور نہ جلاتا آخر طعمۂ زاغ و زغن ہو گئے۔
>
> (کنہیا لال ص ۴۱۳ - ۴۱۴)

میں نے جن مقامات پر نقطے لگائے ہیں وہاں سے بعض عبارتیں نظر بہ تلخیص حذف کر دیں۔ بعض عبارتیں اس لیے حذف کرنی پڑیں کہ میرے نزدیک مُردوں سے بدسلوکی کے نہایت مکروہ مناظر کا لفظی اعادہ بھی مناسب نہ تھا۔ یہ مقالہ ہے تاریخ کے صفحات پر البتہ وہ سب کچھ درج کرنا پڑے گا جو پیش آیا اور جسے کنہیا لال نے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔

سیاسی تحریکیں

شورش کاشمیری

عنوان بالا کا احاطہ کرنا بظاہر آسان ہے لیکن عملاً دشوار بھی ہے اور محنت چاہتا ہے۔ لاہور کے بارے میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ اسے راجہ رام چندر کے بیٹے لَو نے بسایا تھا، یہ فیصلہ تو تاریخ دان ہی کر سکتے ہیں کہ تحقیق کیا کہتی ہے، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لاہور اس برِصغیر کا اتنا ہی پرانا شہر ہے جتنا کہ خود تاریخ یا ہندوستان کے تاریخی مآخذ اور ان کی بوقلمونی اگر ہم سیاسیات کے لفظ کو وسیع کر لیں تو زمانہ کے الٹ پھیر اور اتار چڑھاؤ کے زیرِ نظر یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ لاہور کا سیاسی کردار وقت کے مفہوم سے ہمیشہ ہی آشنا رہا ہے اور شاید ہی کوئی ممتاز و منفرد دور ایسا گزرا ہو گا جس میں لاہور نے حصہ نہ لیا ہو یا لاہور کو سیاسی اہمیت نہ دی گئی ہو۔ لاہور کے شرف کی بہت سی چیزیں ہیں مثلاً دورِ افتادہ ماضی میں حضرت داتا گنج بخش علیہ الرحمۃ نے لاہور ہی کو اپنے قدومِ میمنت لزوم سے مشرف فرمایا تھا۔ وہ غالباً دوسرے روحانی پیشوا تھے جنھوں نے اپنے وجودِ گرامی سے لاہور کو اسلام کی حقیقی روح سے متعارف کیا۔ ان کی وفات ۱۰۷۲ء میں ہوئی۔ آج تک ان کا مزار بندگانِ خدا کا مرجع ارادت ہے، ان سے پہلے لاہور میں جس روحانی پیشوا کا سراغ ملتا ہے وہ شیخ اسمٰعیل لاہوری ہیں۔ آپ بخاری سید تھے اور ۱۰۰۵ء میں لاہور وارد ہوئے ——

داتا گنج بخشؒ کے بعد جس بزرگ نے پنجاب میں خلعتِ کمال حاصل کیا وہ سید احمد المعروف سلطان سخی سرور ہیں۔ آپ نے لاہور میں مولوی محمد اسحٰق سے علومِ ظاہری کی تکمیل کی، وزیر آباد کے قریب موضع سوہدرہ میں دفن ہیں مگر لاہور میں آج تک ان کی یاد سے منسوب قدموں کا میلہ ہوتا ہے جس میں ڈھول بجا کر فقیروں کی ٹولیاں ناچتی اور بچوں کو لوریاں دیتی ہیں۔ شاید توختہ ترمذی، شاہ صدر دیوان زنجانی، پیر عزیز الدین مکی اور حضرت سید مٹھا اس پایے کے بزرگ تھے کہ لاہور کو مشرف بہ اسلام کرنے میں ان کے روحانی کمالات کا حصہ وافر ہے۔ اس ضمن میں کوئی سی تاریخ بھی ان کے تذکرے سے خالی نہیں گو لاہور کسی زمانے میں بھی بوجوہ ہندوستان کا دارالحکومت نہ بن سکا اور اب پاکستان بن جانے کے بعد بھی وہ اس شرف سے محروم رہا مگر ہمیشہ پنجاب کی راجدھانی رہا۔ اب صوبوں کے ادغام کے بعد مغربی پاکستان کا دارالحکومت ہے، غرض یہ امتیاز اس کو شروع سے حاصل ہے کہ وہ نہ صرف برِصغیر کے شمال مغربی حصے کا سب سے بڑا شہر رہا ہے بلکہ اس کی اہمیت سیاسی اور عسکری لحاظ سے دہلی کے بعد ہمیشہ مقدم تسلیم کی گئی ہے۔ سلطان محمود غزنوی کی فتحیابیوں کے بعد اس کے جانشینوں کی بدولت لاہور علم و فن کا گہوارہ بن گیا۔ ابراہیم غزنوی کے زمانہ حکومت میں (۱۰۵۹-۹۸ء) بہ الفاظ عوفی لاہور گویا علم و فضل کا مرکز تھا، لوگ اِدھر اُدھر کے ملکوں سے کھنچ کر یہاں جمع ہو گئے تھے ——

اس برصغیر میں نقشبندی سلسلے کے داعیِ اول خواجہ باقی باللہ شاہ بخارا سے فیض پا کر لوٹے تو سب سے پہلے لاہور ہی میں قیام فرمایا۔ یہاں سال بھر رہے پھر حضرت مجدد الف ثانی کو لاہور کے لیے نامزد کیا اور خود دہلی چلے گئے۔ آپ کے وصال تک حضرت مجدد الف ثانی نے لاہور ہی میں ارشاد و ہدایت کا فیض جاری رکھا جس سے بے شمار مخلوقِ خدا کو فائدہ پہنچا۔ اگر اس عہد کے اسلامی فکر کو مسلمانوں کے موجودہ سیاسی وجود کا جزو لاینفک قرار دیا جا سکتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس عمارت کی نیو اٹھانے میں ان بزرگانِ اسلاف کے ارشاد و ہدایت کا خاصا دخل ہے۔

لاہور کے اس شرف کو بھی آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ تاج محل آگرہ، لال قلعہ دہلی اور جامع مسجد دہلی کے معمار بھی لاہور ہی کے باشندے تھے۔ اس مہندس خاندان کے بارے میں سید سلیمان ندوی نے اپنے ایک تحقیقی مقالے میں بڑی وضاحت سے روشنی ڈالی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لاہور کا یہ انجینئر خاندان تاریخ کے طویل ادوار میں مرجع فن رہا۔

عبدالرحیم خانخاناں کی پیدائش کا شرف بھی لاہور ہی کو حاصل ہے اور فخر و ناز کا یہ تمغہ لاہور کی قبائے فضیلت سے کوئی شخص بھی اتار نہیں سکتا۔ خانخاناں ہی نے بیس سال کی عمر میں اکبر کے ایما پر گجرات کی مہم سر کی۔ سندھ کی فتوحات میں نام پیدا کیا اور دکن کے مورچوں پر کامیاب رہا۔ اگر اس کے اس کمال کو حذف کر دیا جائے تو بھی وہ ادب و شعر میں اتنا نام پیدا کر گیا ہے کہ صرف ہندی شاعری ہی میں صفِ اول کا شاعر شمار ہوتا ہے ۔۔۔ ہندی کے ایک شاعر گنگ کو قصیدہ لکھنے پر اس نے ۳۶ لاکھ روپے انعام دیے تھے۔ نظیری نے ایک مرتبہ کہا کہ اس نے کبھی یکمشت ایک لاکھ روپیہ نہیں دیکھا ہے۔ خانخاناں نے فوراً ایک لاکھ روپیہ منگوایا اور اس کی نذر کر دیا۔

۔۔۔ مغلوں کے عہدِ فرمانروائی کی واحد دانشور ملکہ نور جہاں اسی لاہور میں آسودۂ خاک ہے۔ ہندوستان کا پہلا مسلمان فرمانروا قطب الدین ایبک اسی لاہور میں ابدی نیند سو رہا ہے ۔۔۔ جہانگیر یہیں پڑا ہے۔ ممتاز محل کا والد آصف خان بھی یہیں محوِ خواب ہے۔ انارکلی کے واقعہ میں اگر کوئی سچائی ہے تو اس شہرت کی نازنین بھی لاہور ہی کی مٹی میں استراحت کر رہی ہے ۔۔۔ حتیٰ کہ مشرق کی نشاۃِ ثانیہ کے محرک اور پاکستان کے نقاش علامہ اقبال علیہ الرحمۃ بھی اسی خاک کے دامن میں سوئے ہوئے ہیں ۔۔۔ سکھوں کے پہلے اور آخری تاجدار مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادھی بھی لاہور ہی میں ہے۔

۔۔۔ اب اس پس منظر میں ہم اگر لاہور کی سیاسی نشوونما کا جائزہ لیں تو ہمیں تسلیم کرنا ہوگا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد علم و عمل اور فکر و نظر کے سانچوں میں سیاسیات کا جو خمیر پختہ ہو رہا تھا اس کے پیش نظر فخر و ناز کا یہ سرمایہ بھی لاہور ہی کے ہاتھ آتا ہے کہ روایتی اور رسمی شاعری کا جمود ٹوٹ گیا اور نظم و نثر کی جو نئی راہیں سامنے آئیں اس عہد کے دو نوں رہ نوردوں الطاف حسین حالی اور محمد حسین آزاد نے لاہور ہی میں اپنی مشعلیں روشن کی تھیں ۔۔۔ محمد حسین آزاد تو لاہور ہی میں دفن ہیں ۔۔۔

مجرد سیاست کا تصور جہاں تک تحریکوں اور تنظیموں کے قومی و اجتماعی ہونے کا تعلق ہے پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴-۱۸ء) کے نتائج سے پیدا ہوا اور پھر مختلف شاخوں میں بٹ کر پروان چڑھتا رہا لیکن لاہور اس سے بھی پہلے سیاسی طور پر میدان میں آ چکا تھا۔ کچھ نوجوانوں نے بنگال کی تقلید میں یہاں بھی ٹیررسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی۔ گو یہ ایک الگ اور طویل کہانی ہے مگر جہاں تک واقعات کا تعلق ہے یہ عجیب و غریب بات ہے کہ کلکتہ کے بعد ٹیررسٹ تحریک کے سب سے زیادہ مظاہر لاہور ہی میں ہوتے رہے اور لاہور

ہی کے کالجوں سے اس تحریک کے لیے انقلابیوں کو کھیپ ملتی رہی ہے، باغی لٹریچر بھی سب سے پہلے لاہور ہی میں چھپا اور تقسیم ہوا۔ لالہ پنڈی داس، لالہ جگل کشور اور لال چند اس مہم میں پیش پیش تھے، انھیں طویل سزائیں دی گئیں۔ یہ لوگ اعلانِ آزادی کے آخر تک لاہور ہی میں رہے —— جب ملک میں اجتماعی تحریک کی داغ بیل رکھی گئی تو انھوں نے خود اور اپنی اولاد سمیت اس میں حصہ لیا۔

—— بانگِ درا میں علامہ اقبال نور اللہ مرقدہٗ نے سوامی رام تیرتھ کو بڑے زوردار الفاظ میں خراج ادا کیا، ان کی تحریک اور شخصیت کے پس منظر میں قومی بیداری ہی کا سیاسی جذبہ کارفرما تھا۔

۱۹۰۷ء میں سردار اجیت سنگھ نے بھارت ماتا کے نام سے ایک سوسائٹی قائم کی اور اسی نام کا ایک پرچہ نکالا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ لاہور، سیاسی اعتبار سے پکڑ دھکڑ کا ایک شہر بن گیا۔ لالہ لاجپت رائے، سردار اجیت سنگھ اور صوفی امبا پرشاد وغیرہ کو ۱۸۱۸ء کے ریگولیشن کی بنا پر جلاوطن کر دیا گیا، لالہ لاجپت رائے تو کچھ عرصہ بعد واپس آ گئے اور کلکتہ کانگرس (۱۹۲۰ء) کے صدر بنے مگر صوفی امبا پرشاد جلاوطنی ہی میں انتقال کر گئے اور ایران میں غالباً دفن کیے گئے —— سردار اجیت سنگھ وغیرہ کو کانگرس کے برسرِ اقتدار آنے پر سالہا سال کی جلاوطنی کے بعد واپس آنے کی اجازت دی گئی۔ ریشمی رومال کی تحریک کے بانی مبانی اگرچہ علمائے دیوبند تھے اور سب سے زیادہ حضرت شیخ الہندؒ کا دماغ اس میں کارفرما تھا مگر جب نقشہ تیار ہو چکا تو یہ چیز بعض لوگوں کے لیے شاید نئی ہو کہ مجاہدین کی صف میں جن پندرہ انگریزی تعلیم یافتہ طلبا نے حصہ لیا وہ لاہور ہی کے طالب علم تھے۔ انھوں نے فروری ۱۹۱۵ء کو اپنی درسگاہوں سے علیحدگی اختیار کر لی اور یاغستانی علاقے میں انقلاب برپا کرنے کی غرض سے چلے گئے —— اس لحاظ سے یہ شرف بھی لاہور ہی کے سر رہا کہ طلبا کی پہلی تحریک اور اس کی قربانی اسی شہر کے طلبا کے حصہ میں آئی۔ کاماگاٹامارو ۲۹ ستمبر ۱۹۱۴ء کو بج بج کے کلکتہ والے گھاٹ پر پہنچا تو فوج اور پولیس نے نرغہ میں لے لیا کیونکہ مخبروں کی معرفت غدر پارٹی کا پورا حال معلوم ہو چکا تھا، تمام ملک میں گرفتاریوں کا تانتا بندھ گیا۔ کئی شہروں میں سازش کے مقدمات قائم کیے گئے، پھانسی پانے والے زیادہ تر مسلمان نوجوان تھے۔ لاہور میں بیک وقت آٹھ ہزار کے قریب گرفتاریاں ہوئیں اور مقدمات چلائے گئے، چھ نوجوانوں کو تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔

پہلی جنگِ عظیم کے صلہ میں ملک کو رولٹ ایکٹ ملا یا امرتسر کا جلیانوالہ باغ، ترکی کا تیا پانچا کر دیا گیا اس پر ملک بھر میں باقاعدہ سیاسی تحریکوں کا لاوا پھوٹا۔ اس سے پہلے سیاسی تنظیمیں قائم ہو چکی تھیں مگر ان پر معتدل رہنماؤں کا قبضہ تھا —— اب ملک کی لیڈرشپ گاندھی جی، محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد اور دوسرے نوجوان رہنماؤں کے ہاتھ میں آ گئی۔ پہلی لیڈرشپ کو گوشہ نشین ہونا پڑا۔ القصہ یہ وہ زمانہ تھا جب تنظیموں کی کوکھ سے تحریکوں نے جنم لیا۔ ۱۹۱۹ء سے پیشتر کانگرس کا سالانہ سیشن، پنڈت مدن موہن مالویہ کے زیرِ صدارت لاہور میں ہو چکا تھا لیکن ۱۹۱۹ء کے بعد لاہور سیاسی تحریکوں کا بعض اعتبارات سے سرچشمہ، ماخذ، رہنما اور داعی بن گیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو جن کی والدہ لاہور ہی کی باشندہ تھیں ۱۹۲۹ء میں کانگرس کے صدر بنے۔ اسی لاہور نے ان کی کُل ہند رہنمائی کا ناد پھونکا —— اور یہ شرف بھی لاہور ہی کو حاصل ہے کہ آل انڈیا کانگرس نے پہلی دفعہ درجۂ مستعمرات کا موقف اختیار کر کے کامل آزادی کا ریزولیوشن پاس کیا اور اس کو اپنا نصب العین بنایا —— جس سے کانگرس میں ایک نئی زندگی پیدا ہو گئی۔ نہرو رپورٹ کو بھی لاہور ہی میں غرقِ راوی کیا گیا —— خان عبدالغفار خان نے بھی پہلی دفعہ اپنی سرخپوش جماعت کے ساتھ لاہور کانگرس سیشن میں شرکت کی جس روز یعنی ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کو کامل آزادی کا نصب العین اختیار کیا گیا انھوں نے اپنے سرخپوش دستوں سمیت نئے سال کے سرِ آغاز

پھر رقص کیا اس رقص میں گاندھی جی اور مولانا آزاد کے سوا سبھی شریک تھے مولانا ظفر علی خاں مرحوم نے رقص کے فوراً بعد معرکے کی ایک
نظم کہی جو اگلے روز بچے بچے کی زبان پر تھی۔

ـــــ مسلم لیگ نے لاہور میں اپنا پہلا اجلاس ۱۹۲۴ء میں کیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس اجلاس کے صدر بھی قائداعظم
ہی تھے اور ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کا جو تاریخی اجلاس لاہور میں ہوا اس کی صدارت بھی قائد اعظم نے فرمائی۔ اسی اجلاس میں مسلم لیگ نے
"قرار دادِ پاکستان" پاس کی جو مسلمانوں کا ملی موقف قرار پایا ــــ گویا کانگرس کو کامل آزادی اور مسلم لیگ کو پاکستان کا نصب العین
دینے والا لاہور تھا ــــ اس لاہور نے جواہر لال کو ہندوستان کا فرزندِ جلیل اور محمد علی جناح کو قائد اعظم بنا دیا اور لاہور اس پر بجا طور پر
فخر کر سکتا ہے۔

علامہ اقبال کے فکر و نظر کی ساری عمر اسی لاہور میں بسر ہوئی۔ یہیں انھوں نے مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کا قصرِ رفیع تعمیر کیا۔ اُردو صحافت
کا بول بالا بھی لاہور ہی سے ہوا ــــ اگر جنگِ عظیم کے بعد کی اُردو صحافت، سیاست ہی کا حصّہ ہے تو بلاشبہ لاہور کا نام سرِ فہرست آتا
ہے۔ ایک وقت میں جتنے اُردو اخبار لاہور سے شائع ہوتے رہے ہیں اتنے دہلی اور لکھنؤ سے بھی شائع نہیں ہو سکے۔ اس زمانے
کے صحافی براہِ راست سیاسی رہنما بھی تھے اور سیاسی تحریکوں کے محرک بھی "الہلال" کلکتہ اور "ہمدرد" دہلی کے کردار سے قطع نظر واقعی
امر یہ ہے کہ مولانا ظفر علی خان اور "زمیندار" نے نصف صدی تک لاہور کی وساطت سے پورے اسلامی ہندوستان کی ذہنی آبیاری
کی ہے ــــ مولانا ظفر علی خان نے سیاسی لاہور کے تحریکی ذہن کو پیدا کرنے میں ایک تنہا انجمن کی طرح حصّہ لیا ہے۔ ان کی بدولت لاہور
کو نہ صرف سیاسی تحریکوں ہی سے آشنائی ہوئی ہے بلکہ انھوں نے اپنے دبستان میں سیاسی رہنماؤں، قومی کارکنوں اور مدیرانِ اخبار کی
ایک نامور کھیپ کو پروان چڑھایا ہے ــــ کانگرس سے وابستہ طلباء کی تحاریک کا سنگِ بنیاد بھی اوّل بار لاہور ہی میں رکھا گیا اور
مسلم لیگ کی ہم نوا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے بھی لاہور ہی میں زندگی کا پہلا سانس لیا، طلباء کی ان ہر دو انجمنوں نے جتنے نمایاں و معروف
نوجوان پیدا کیے ان کی بڑی تعداد لاہور ہی کے کالجوں کی تربیت یافتہ اور لاہور کے سیاسی آغوش کی پروردہ ہے۔

۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن ملک کے سیاسی مستقبل کا جائزہ لینے کے لیے ہندوستان وارد ہوا تو مختلف شہروں سے پھرتا پھراتا
لاہور پہنچا۔ تمام ملک کی طرح یہاں بھی مقاطعہ بازار گرم تھا ــــ لاجپت رائے، ظفر علی خاں، عطاء اللہ شاہ، افضل حق، ستیہ پال وغیرہ کی
قیادت میں لوگوں کا ایک بے پناہ ہجوم اسٹیشن پر مظاہرہ کرنے کے لیے موجود تھا ــــ پولیس نے لنڈا بازار کے نکڑ پر خار دار جنگلے لگا
دیے تھے ــــ قصہ کوتاہ پولیس اور مظاہرین میں تصادم ہو گیا۔ مسٹر سکاٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے عوام پر ڈنڈے برسوائے یہ ڈنڈے
لالہ لاجپت رائے کے سینے پر ضربات چھوڑ گئے، اسی شب ایک جلسۂ عام کو خطاب کرتے ہوئے لالہ جی نے نوجوانوں کو للکارا کہ
ان کے بڑھاپے کی بے عزتی کا بدلہ لینا اب ان کا فرض ہے، نتیجۃً نوجوان بھارت سبھا کے نوجوان جو لاہور نیشنل کالج کے فارغ التحصیل
طلباء میں سے تھے، بھڑک اُٹھے، صوبہ بھر میں ایکا ایکی دہشت پسندی کا دور دورہ ہو گیا۔ چنانچہ ۱۷ر نومبر ۱۹۲۸ء کو تین بجے سہ پہر
کے وقت دہشت پسند نوجوانوں نے مسٹر سکاٹ سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس لاہور کے دھوکے میں ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر
سانڈرس کو گولیوں سے ہلاک کر دیا۔ اس جرم کی پاداش میں بہت سے نوجوانوں پر مقدمہ چلا، آج کل جہاں ڈائرکٹر انڈسٹریز مغربی پاکستان کا
دفتر ہے وہاں بڑے دنوں تک مقدمہ چلتا رہا۔ بھگت سنگھ، سکھ دیو اور راج گرو ــــ ان تین نوجوانوں کو سزائے موت کا حکم ہوا۔

بی کے دت کو عمر قید اور کئی باقی نوجوانوں کو مختلف المیعاد سزائیں دی گئیں۔ جسٹس آغا حیدر سماعت کنندہ ٹریبونل کے رکن تھے ——— انھوں نے سرکاری گواہوں کو آڑے ہاتھوں لیا، پھر بھگت سنگھ کی اس اپیل پر کہ وہ اس تماشے میں شریک نہ ہوں، ٹریبونل سے الگ ہو گئے ——— اس مقدمہ سازش کے تمام ملزموں نے قیدیوں کی حالتِ زبوں کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے لاہور بورسٹل جیل میں بھوک ہڑتال کر دی۔ چونسٹھ دن کی بھوک ہڑتال کے بعد ایک نوجوان جتندر ناتھ داس گھل گھل کر جان ہار گیا۔ اس کے خونِ ناحق کا نتیجہ یہ نکلا کہ جیل خانوں کا نظام یکسر بدلنا پڑا اور "اے" اور "بی" کلاس کی بنیاد رکھی گئی۔

۲۳ مارچ ۱۹۳۱ء کو بھگت سنگھ اور اس کے دونوں ساتھیوں کو لاہور سنٹرل جیل میں ضابطے کے خلاف شام کے وقت پھانسی پر لٹکا دیا گیا ——— پھر ان کی لاشوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ستلج کے کنارے جلایا گیا ——— اور راکھ موجوں میں بہا دی گئی۔ اس واقعہ نے تمام ہندوستان کے نوجوانوں کو لرزا دیا اور وہ غصے سے بیتاب ہو کر دہشت پسندی پر اتر آئے، اواخر ۱۹۳۳ء تک بم پھینکنے اور گولی چلانے کے بہت سے واقعات ہوئے، دوسرا مقدمہ سازش بھی لاہور ہی میں چلا۔ تقریباً سبھی ملزموں کو عمر قید کی سزا ہوئی لیکن ۱۹۳۴ء کے بعد ملک میں ٹیررسٹ موومنٹ ختم کر دی گئی۔ ان انقلابی نوجوانوں کے لاہور سنٹرل جیل میں ایک "ٹیررسٹ وارڈ" بنایا گیا، جہاں انھوں نے عمریں گزار دیں ——— راقم الحروف کو بھی اسی وارڈ میں سیاسی قیدی کی حیثیت سے تقریباً تین سال رہنے کا موقع ملا ہے اب یہاں وحدت ہسپتال کی اضافی شاخیں بنائی جا رہی ہیں ——— بھگت سنگھ کے ساتھیوں میں بہت سے نوجوان مفرور ہو گئے تھے۔ انہی میں ایک چندر شیکھر آزاد تھے، دوسرے بھگوتی چرن۔ چندر شیکھر لاہور سے غائب ہو کر الہ آباد چلا گیا اور وہاں لڑتا بھڑتا گولیوں سے مارا گیا۔ بھگوتی چرن راوی کے کنارے واقع ذخیرے میں بم بناتے ہوئے اس بری طرح زخمی ہوا کہ اس کا ایک بازو اور جسم کا ایک حصہ بالکل ہی اڑ گیا ——— اس نے ساتھیوں سے کہا کہ یہاں سے بھاگ جاؤ اور خود رینگ رینگ کر راوی کی سرکش موجوں میں ڈوب گیا تاکہ پولیس اس کے جسم کو چھو بھی نہ سکے ——— اس کے الفاظ تھے میں اپنا جسم دشمن کے حوالہ کرنا نہیں چاہتا۔ انگریزوں کی زنجیروں سے راوی کی لہریں مجھے زیادہ عزیز ہیں۔

ادھر اس انقلابی لاہور کے پہلو بہ پہلو سرکار پرست لاہور بھی چمکتا اور دمکتا تھا۔ وقتاً فوقتاً اس کے مظاہرے بھی ہوتے رہتے تھے۔ خطاب یافتگانِ برطانیہ کی ایک پوری نسل یہاں آباد تھی۔ ہندوؤں میں تو خطاب یافتگانِ پیشین کا یہ گروہ شکست کھا چکا تھا اور اس کے ارکان صرف مجلسی زندگی کے تزئین ہو کر رہ گئے تھے مگر مسلمانوں میں ان کا رسوخ باقی تھا بلکہ آخر وقت تک رہا۔ مسلم لیگ نے دسمبر ۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن کے مقاطعہ کا اعلان کیا تو "جناح لیگ" کے مقابلہ میں سر محمد شفیع نے لاہور میں شفیع لیگ کی بنیاد رکھی اور کمیشن سے تعاون کا اعلان کیا۔ یونینسٹ پارٹی کا سنگِ بنیاد بھی لاہور ہی میں رکھا گیا جس کے پیشوائے اوّل سر میاں فضل حسین تھے، ان کی رحلت پر یہ تاج سردار سکندر حیات نے پہنا۔ پھر ملک خضر حیات نے دستار باندھی مگر ان کا طرہ چھوٹو رام کے ہاتھ رہا، آخر مسلم لیگ نے پاکستان کے موقف پر الیکشن جیت کر پاپ کی اس ناؤ کو ڈبو دیا ———

لاہور میں یہ بھی ہوتا رہا کہ بعض خاص لوگ جو وفاداری بشرطِ استواری کے تحت جی رہے تھے نہ صرف احتجاجی جلسوں اور قومی جلسوں کو اُجرت پر خراب کرتے رہے بلکہ ان میں بعض مکروہ چہرے ایسے بھی تھے جن کا کام اسکولوں اور کالجوں کی ابتدائی جماعتوں کے سیاسی طلباء کو اغوا کرنا اور ان سے گرہ لگانا تھا ——— چونکہ اس تذکرے میں چہروں اور سانحوں کی نقاب کشائی کر کے قارئین کے لطفِ مطالعہ کو

بدمزہ کرنا مقصود نہیں اس لیے ان سے صرفِ نظر ہی بہتر ہے اور نہ ابھی خاص قسم کے دماغوں کی فضا اس تلخ نوائی کو قبول کرنے کی متحمل ہے۔

۱۹۲۲ء میں چورا چوری کے واقعہ کی آڑ لے کر گاندھی جی نے تحریک ترکِ موالات کو ختم کر ڈالا جس سے ایک نئی صورتِ حال پیدا ہو گئی یعنی مسلمانوں اور ہندوؤں میں فسادات چھڑ گئے، لاہور نے بھی اس میں حصہ لیا۔ دونوں طرف کے اخبارات معرکہ آرا ہو گئے ——— ظاہر ہے کہ فسادات دیرپا نہیں ہوتے۔ دو چار دن ہنگامہ رہا پھر امن ہو گیا لیکن اختلافات پھیلتے ہی گئے حتیٰ کہ مسلمانوں کو اعلان کرنا پڑا کہ وہ ایک الگ قوم ہیں جن کا سراپا ہمسایہ قوم سے مختلف ہے۔

——— ان فسادات کا بیج تو لاہور سے نہیں پھوٹا تھا کیونکہ شُدھی کے کرتا دھرتا سوامی شردھانند دہلی میں تھے اور فساد کی اس فصل کا پہلا خوشہ کوہاٹ میں پھوٹا تھا مگر لاہور میں ہندوؤں کی جاندار صحافت نے جلتی پر تیل کا کام کیا ——— پرتاپ کے مہاشہ کرشن اور ملاپ کے مہاشہ خوشحال چند آریہ سماج کی دونوں شاخوں کے اپنی اپنی جگہ پر دھان منتری تھے، بھائی پرمانند۔ پہلے نیشنلسٹ ہندو تھے پھر عمر قید کی سزا پاتے ہی تائب ہو گئے اور باقی زندگی مہاسبھا کے لیے وقف کر دی۔ ان کا سماجوں پر خاصا اثر تھا غرض ان کی بدولت جو نہ ہونا چاہیے تھا وہ بھی ہوتا رہا، یہاں تک کہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے خلاف لاہور کے ایک پبلشر مہاشہ راجپال نے ——— رنگیلا رسول (خاکم بدہن) نامی کتاب شائع کی جس کا مصنف ایک پروفیسر چھوپتی تھا۔ اس ناقابلِ برداشت کتاب کا چھپنا تھا کہ مسلمانوں میں غم و غصہ کا ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔ حکومت نے پبلشر پر مقدمہ چلایا مگر عدالت نے ملزم کو بری کر دیا۔ آخر بازار سریانوالہ کے ایک نوجوان علم دین نے راجپال کو سرِ عام قتل کر ڈالا۔ علم دین میانوالی جیل میں پھانسی پا گیا اور وہیں اس کو دفن کر دیا گیا ——— لاہور کے مسلمانوں نے مطالبہ کیا کہ لاش لاہور آنی چاہیے، حکومت بضد ہو گئی، نوجوانوں نے کمرِ ہمت کس لی، آخر جب سرکار نے محسوس کیا کہ ناراضی پھیلے گی تو مسلمان سٹی مجسٹریٹ کی معرفت لاش کو لاہور لایا گیا ——— اتنا عظیم الشان جنازہ تھا کہ فی زمانہ شاذ ہی کسی عاشقِ رسول کو یہ اعزاز حاصل ہوتا ہے۔

علم دین کی لاش لاہور لانے کی تحریک کے رہنما ابتداً عبدالمجید قرشی، منور شیر ول، بیرسٹر غلام مصطفےٰ حیرت اور ملک لال دین قیصر وغیرہ تھے بعد میں اس کی عنان منقسم ہو کر دو گروہوں میں بٹ گئی۔ ایک گروہ کے سرخیل مولانا ظفر علی خاں اور چودھری افضل حق تھے دوسرے کے سرغنہ سر میاں محمد شفیع اور ان کے متبعین۔ علامہ اقبال نوجوانوں کی پشت پناہی کرتے اور ان کا جی بڑھاتے تھے ———

مولانا ظفر علی خاں نے ان حالات سے کچھ فاصلہ پر برطانوی سرکار کے مظالم کی مذمت میں زنّاٹے کی ایک نظم کہی تھی جس میں ایک مصرع تھا ——— ؏

خدا خدا نہ سہی رام رام کر لیں گے

اُدھر ابن سعود نے حجاز پر قبضہ کر کے بزرگوں کی قبروں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیے۔ ان واقعات نے پنجاب میں بالعموم اور لاہور میں کفر سازی کا بازار گرما دیا ——— جو لوگ سرکار کے ساتھ تھے وہ بریلوی عقاید کے علماء کی تنظیم میں داخل ہو گئے، ابن سعود کے "کفر" سے چھڑپیں ہونے لگیں۔ مولانا ظفر علی خان کی اس نظم کو بھی لپیٹ میں لے لیا گیا ——— انگریز ابن سعود کو کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ انھوں نے تحریکِ خلافت سے مسلمانوں کے داخلی جذبے کا اندازہ کر لیا تھا، اس سارے شیرازے کو منتشر کرنے کے لیے ان کے گماشتے کفر سازوں کے پشت پناہ ہو گئے ——— فتویٰ دیا گیا کہ مولانا ظفر علی خاں کافر ہیں اور جو "زمیندار" پڑھے گا اس کا نکاح ساقط ہو جائے گا، وغیرہ وغیرہ .... گھمسان کا رَن پڑا۔ مدت العمر انگریز دشمن رہنماؤں کے جلسوں میں خشت باری اور کلوخ اندازی ہوتی رہی، آخر یہ دور بھی نکل گیا ——— کیونکہ رفتہ رفتہ لوگوں

پروپیگنڈہ ہو رہا تھا کہ انگریز نہ صرف ابن سعود سے شریف مکہ کے عزل کا بالواسطہ انتقام لے رہا ہے بلکہ ان لوگوں کی عوامی طاقت کچل کر رکھ دینا چاہتا ہے جنہوں نے تحریکِ ترکِ موالات اور تحریکِ خلافت میں اس کے وقار کو ہلا دیا تھا اور جو پنجاب کی سرزمین میں اس کے لیے بہر وجوہ خطرناک ثابت ہو رہے تھے۔

ـــــ لاہور کانگریس کے قریبی وقتوں میں لالہ لال دین قیصر کے زیرِ قیادت پچپن فی صدی کی تحریک نے پرپرزے نکالے ـــ مطالبہ یہ تھا کہ مسلمان جب پنجاب میں پچپن فی صد بستے ہیں تو انہیں حقوق بھی اسی نسبت سے ملنے چاہئیں۔ اس تحریک کے رہنما میاں سر محمد شفیع وغیرہ تھے ـــ اور پیشِ منظر میں مدیرانِ "انقلاب"، کانگریس کا لاہور سیشن ختم ہوگیا تو اس تحریک کا جوش و خروش بھی ماند پڑ گیا بلکہ بالآخر لوگوں نے دفتر ہی بیٹھ دیا۔

۳۱-۱۹۳۰ء میں کانگریس کی سول نافرمانی نے خاصا رنگ باندھا۔ لاہور میں مولانا عبدالقادر قصوری، مولانا ظفر علی خاں، ڈاکٹر شیخ محمد عالم، ڈاکٹر ستیہ پال، ڈاکٹر گوپی چند بھارگو اور لالہ دنی چند بار ایٹ لاء نے بیک وقت نمک بنا کر اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کیا۔ اسی زمانے میں نوجوان بھارت سبھا بنی اور بال بھارت سبھا نے جنم لیا ـــ بال بھارت سبھا کا صدر ڈی۔ اے۔ وی ہائی سکول میں نویں یا دسویں جماعت کا طالب علم تھا اور انتہائی خوبصورت جیسے شہابی رنگ مکھن میں گھل مل گیا ہو ـــ اپنی تیز زبان کے باعث پولیس کے ہتھے چڑھ گیا اس سے سٹی کوتوالی میں تمام رات کنسٹیبل جفت ہوتے رہے آخر اس کی جان نکل گئی پھر اس کی لاش کو اٹھا کر گوالمنڈی سے قریب بانس بازار میں رتن چند کے تالاب کی نذر کر دیا گیا۔ اگلے روز اس کی لاش تیر کر سطح آب پر آ گئی، چہرہ کالا سیاہ ہو چکا تھا اور عام نظریں اسے پہچان بھی نہ سکی تھیں۔

گاندھی اردن سمجھوتے (۱۹۳۱ء) کے بعد گول میز کانفرنس کا چرچا رہا مگر بیل منڈھے نہ چڑھی۔ احرار نے کراچی کانگریس سے فارغ ہوتے ہی لاہور میں جماعت احرار کو عملاً قائم کیا۔ ۱۹۳۱ء میں ان کی پہلی کانفرنس حبیبیہ ہال میں منعقد ہوئی، آخری دن سب سے بڑا جلسہ اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ میں منعقد ہوا جس میں جداگانہ انتخاب کا ریزولیوشن پاس کیا گیا۔ مولوی مظہر علی اظہر استقبالیہ کے چیئرمین اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کانفرنس کے صدر تھے ـــ مجھے یاد ہے کہ میرے والد جو صبح بسلسلہ ملازمت لاہور آتے اور شام کو امرتسر چلے جاتے تھے مجھے اس کانفرنس میں اپنے ساتھ امرتسر سے لاہور لائے تھے۔ گو اس زمانے میں کوئی خاص سیاسی شعور نہ تھا لیکن اتنا اب تک یاد ہے کہ شاہ جی نے لوگوں پر جادو کر دیا تھا۔ ـــ ملک میں کوئی سا بڑا لیڈر ہوگا جس نے لاہور کو خطاب نہ کیا ہو، سر سید، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی، دادا بھائی نارو جی، پنڈت مالویہ، لاجپت رائے، قائداعظم، مولانا ابوالکلام، مولانا محمد علی، پنڈت موتی لال، گاندھی جی، ڈاکٹر انصاری، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، سروجنی نائیڈو، حسرت موہانی، محمود الحسن، سید انور شاہ، سید سلیمان ندوی، بہادر یار جنگ، جواہر لال نہرو، ڈاکٹر اقبال، سبھاش چندر بوس، سردار پٹیل، لیاقت علی خاں یہ سب لاہور میں گونج گرج چکے ہیں۔

یہ ایک مسلمہ شدہ امر ہے کہ جو تحریک لاہور میں کامیاب ہو جاتی ہے وہ برصغیر کے کسی گوشے میں بھی ناکام نہیں ہو سکتی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال کے دور اوّل میں حزب اللہ کی داغ بیل ڈالی تو سب سے پہلے انھوں نے لاہور کی شاہی مسجد ہی میں لوگوں سے امیرِ جماعت کے طور پر بیعت لی۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو بھی لاہور ہی میں سید انور شاہ کی تحریک پر پانچ سو علماء کے مجمع میں امیرِ شریعت چنا گیا۔ انھوں نے سب سے پہلے خود بیعت فرمائی ـــ قائداعظم کی قیادت میں اور پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں ...

کا ذکر اُوپر ہو چکا ہے کہ اس امتیاز میں بھی لاہور ہی کو فوقیت حاصل ہے۔ علامہ مشرقی نے اپنی تحریک کا آغاز لاہور ہی سے کیا۔ لیکن چھٹپنے سے لے کر بڑھاپے تک بلکہ گور کنارے پہنچنے تک ان کی تحریک لاہور سے وابستہ رہی اور لاہور ہی ان کے وجود و قیام کا مرکز رہا۔ یہیں انھوں نے ادارہ علیہ قائم رکھا۔ یہیں وہ نوجوانوں کے دل و دماغ پر چھا گئے۔ یہیں ان کا مارچ ۱۹۴۰ء میں سکندر وزارت سے خوفناک تصادم ہوا اور آخر کار یہیں تحریک کا حرفِ آخر ہو گیا۔

شہید گنج کی تحریک میں پیر جماعت علی شاہؒ امیر لاہور میں امیرِ ملت منتخب ہوئے۔ اس تحریک کا جو حشر و انجام ہوا، وہ بالکل دوسری بات ہے لیکن اس تحریک کا ایک نقش کبھی نہ بھولنے والا ہے کہ نوجوانوں نے دو روز تک دلی دروازے کے باہر ڈٹ کر گولیاں کھائیں ۱۷ ار اور ۱۸ ار جولائی ۱۹۳۵ء کو جس مردانگی، جاںنثاری، سرفروشی اور فداکاری کا ثبوت مسلمان نوجوانوں نے دیا اس کی مثال ڈھونڈے ہی سے مل سکتی ہے۔

ملک کی کوئی بڑی جماعت ایسی نہیں رہی جس نے اپنے سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد نہ کیے ہوں۔ انڈین نیشنل کانگریس کے دو اجلاسات (۱۹۱۹ء میں بہ صدارت پنڈت مدن موہن مالویہ اور ۱۹۲۹ء میں بہ صدارت پنڈت جواہر لال نہرو) کا ذکر پہلے آچکا ہے لیکن اس سے بھی پہلے ۱۸۹۳ء میں ایک اجلاس دادا بھائی نارو جی کی صدارت میں یہاں منعقد ہوا۔ دوسرا ۱۹۰۰ء میں این جی چندرورکار کے زیرِ صدارت۔ مرحوم خلافت کمیٹی کا سالانہ اجلاس ۱۹۲۹ء بھی یہیں ہوا، مولانا محمد علی جوہر صدر تھے۔ جمعیۃ العلماء ہند نے ۱۹۲۱ء میں مولانا ابو الکلام آزاد کی صدارت میں اپنا سالانہ اجلاس یہیں منعقد کیا۔ پھر ۱۹۴۲ء میں مولانا حسین احمد مدنی کے زیرِ صدارت آخری اجلاس ہوا۔ غرض لاہور اس میدان میں کبھی پیچھے نہیں رہا ہے۔

۱۹۳۱ء میں احرار کو کانگریس سے علیحدہ ہوتے ہی (پہلی کانفرنس کے فوراً بعد) مغلپورہ ایجی ٹیشن سے عہدہ برآ ہونا پڑا۔ قضیہ یہ تھا کہ مغلپورہ انجینئرنگ کالج کے پرنسپل مسٹر ہنگمر نے طلبہ کی روایت کے مطابق اسلام کے خلاف کلماتِ استخفاف کہہ دیے تھے طلبا اسے نکلوانے پر تلے بیٹھے تھے۔ احرار رضا کاروں نے اہلِ لاہور کی ہمراہی میں پکٹنگ کیا۔ پولیس نے لاٹھی چارج سے تواضع کی۔ دوسرے تیسرے روز مولانا ظفر علی خاں مدراس سے واپس آگئے ان کی مداخلت سے معاملہ طے پاگیا۔ ونگھمر نے معافی مانگ لی۔ طلباء کلاسوں میں چلے گئے۔ مولانا ظفر علی خاں نے ایک نظم کہی تھی۔ شعر اول تھا ؎

نتیجہ جاں نثارانِ پیمبر کا نکل آیا
حکومت جھک گئی پنجاب میں اسلام کے آگے

احرار کے سر پہ تحریک مدحِ صحابہ جاری تھی مگر انھوں نے بہ عجلت نپٹا دیا کیونکہ کشمیر کے مسلمان ڈوگرہ شاہی کے شکنجہ میں پھنس کر لاچار ہو رہے تھے، غرض کشمیر میں ایک طوفانِ قیامت برپا تھا۔ میرزا بشیر الدین محمود کی سیادت میں اس مقصد کے لیے ایک کشمیر کمیٹی بنائی گئی علامہ اقبال بھی اس میں شامل تھے۔ احرار نے سب سے پہلے قادیانیوں کو دیا۔ علامہ اقبال احرار کی حمایت میں کمیٹی سے مستعفی ہو گئے احرار نے پہلے تو ۱۹۳۱ء میں سری نگر ایک وفد بھیج کر جائزہ لیا، پھر ریاست کی ڈوگرہ شاہی پر چڑھ دوڑے۔ انگریزی سرکار کا اندازہ تھا کہ احرار زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار آدمی قید کرا سکیں گے لیکن حالت یہ ہوئی کہ گیارہ نوجوان ڈوگرہ فوج کے نیزوں کی انی سے شہید ہو گئے پینتالیس ہزار لوگ قید ہوئے جن میں پانچ ہزار کے لگ بھگ نوجوان دوسرے صوبوں ہی سے آئے تھے۔ اکیس افراد جیلوں میں

نمونیے سے ہلاک ہو گئے۔ اس ساری تحریک کا مرکز لاہور ہی رہا۔ مولانا مظہر علی اظہر لاہور ہی سے پہلا قافلہ لے کر کشمیر گئے اور پانچ سال کے لیے قید ہو گئے تھے۔ فی الجملہ لاہور نے وہ کام کر دکھایا جو ایک زمانہ میں بارڈولی نے کیا تھا۔ مسٹر شفیع نے گول میز کانفرنس میں احرار کی ان بے پناہ گرفتاریوں کا اعتراف کیا اور گاندھی جی کو مخاطب کرتے ہوئے مسلمانوں کے فعال ہونے کی دلیل قائم کی مگر جب احرار نے انگریزی حکومت سے ٹکر لی تو سرکاری لوگ اشارہ پاتے ہی تتر بتر ہو گئے۔ اس دوران میں احرار کے خلاف سرکاری حلقوں میں کسی سازش کا فرضی مقدمہ تیار ہونے لگا مگر چودھری افضل حق نے اطلاع ملتے ہی روزنامہ احرار میں انگریزی کے ایک صفحہ کا اضافہ کر دیا تاکہ اعلیٰ حکام محض سرکاری گماشتوں کی جھوٹی مخبریوں پر انحصار نہ کریں اور جماعت احرار کسی گروہ کے ذاتی انتقام کا شکار نہ ہو جائے۔

اس تحریک نے احرار کو بے حد چمکا دیا۔

جب کشمیر کے معاملات کا رخ پلٹا اور گلینسی کمیشن کے تقرر سے صورتِ حال کا ایک نیا رخ بنا تو قید و بند کا جوش مدھم پڑ گیا، اگرچہ احرار نے اس پھندے میں پھنسنے سے انکار کر دیا لیکن عوام کا رجحان ہوتا ہے وہ بگولے کی طرح اٹھتے، آندھی کی طرح چھا جاتے اور گرد کی طرح بیٹھ جاتے ہیں۔ احرار نے اس سے فارغ ہو کر قادیانیوں سے دو دو ہاتھ کرنے شروع کیے جس سے اس جماعت کو تبلیغ کے میدان میں سخت نقصان اٹھانا پڑا، حتیٰ کہ مسلمانوں نے اپنے تعلیمی اور مجلسی اداروں سے بھی انھیں نکال باہر کیا۔ پھر اس کے بعد مسلمانوں کی کسی سیاسی اور ملی تنظیم میں قادیانی ممتاز نہ ہو سکے۔

فروری ۱۹۳۲ء میں خاکسار تحریک کا لاہور میں سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ علامہ مشرقی اس وقت تک محکمۂ تعلیم میں ملازم تھے، غالباً گورنمنٹ ہائی سکول پشاور کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ ۷ر اکتوبر ۱۹۳۲ء کو خاکسار سپاہیوں کا پہلا دستہ لے کر پشاور پہنچے، سرحدی حکومت نے جائزہ لینا شروع کیا تو علامہ صاحب نے ۱۵ر اکتوبر ۱۹۳۲ء کو ملازمت سے استعفیٰ داغ دیا۔ خاکسار تحریک کے چوبیس اصول وضع کیے گئے۔ پہلا کتابچہ قولِ فیصل کے نام سے لکھا گیا جس میں یہ اصول اور تحریک کا مقصد درج تھا، ان اصولوں میں سے بعض اصول یہ تھے:۔

(۱) مجاہدانہ او سپاہیانہ قابلیتیں پیدا کرنا (۲) اپنے سالاروں کے احکام بلا چون و چرا بجا لانا (۳) روئے زمین کی بادشاہت اور اسلام کا غلبہ پیشِ نظر رکھنا (۴) فوج کی طرح مارچ اور سپاہیانہ قواعد کرنا (۵) خاکی وردی پہننا اور اس پر اخوت کا سرخ نشان لگانا (۶) آپس میں فوج کے طریق سے سلام کرنا (۷) صرف خاکساروں سے سودا لینا (۸) مسلمانوں کے سیاسی اور مذہبی عقاید سے بحث نہ کرنا، وغیرہ۔

بیلچہ خاکساروں کا ہتھیار قرار دیا گیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں خاکسار تحریک شباب پر آ گئی اور اس تیزی سے اس تحریک نے اپنے بال و پر پیدا کیے کہ حکومت نے کڑی نگرانی شروع کر دی۔ لاہور ہیڈ کوارٹر تھا۔ علامہ مشرقی نے اپنے مکان واقع اچھرہ میں ادارہ علیہ قائم کیا اور وہیں سے مختلف احکام جاری کرتے رہے۔ سب سے پہلے اس تحریک کا نوٹس سٹیٹسمین دہلی اور سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور نے لیا جو اس وقت حکومت انگریزی کے نقیب سمجھے جاتے تھے۔ علامہ مشرقی نے خاکساروں اور جانبازوں کو کھلم کھلا فوجی کیمپ لگا کر عسکری تعلیم دینی شروع کی۔ خاکساروں نے پہلی ٹکر سرحد میں خان وزارت سے لی۔ پھر سکندر حیات کی وزارت سے تصادم پیدا کیا لیکن پہلی دفعہ قضیہ مطالبات تک ہی محدود رہا۔ اُدھر لکھنؤ میں مدحِ صحابہ اور تبرا کا زور تھا۔ اس تحریک کو بہ جبر بند کرانے کے لیے علامہ ایک ہزار خاکساروں کی معیت میں لکھنؤ پہنچے۔ پنت کی وزارت نے گرفتار کر لیا؛ علامہ نے دستخطی رہائی حاصل کر لی اس پر خاکسار بھڑک اٹھے

پینٹ وزارت اور خاکساروں میں مقابلہ ہو گیا۔ بلند شہر میں کئی نوجوان شہید ہو گئے۔ ابھی یہ الاؤ روشن ہی تھا کہ حکومت پنجاب نے ۲۸ فروری
۱۹۴۰ء کو دوسری عالمگیر جنگ کے مضرات کا اندازہ کرتے ہوئے عسکری تنظیموں پر پابندی لگا دی۔ خاکساروں نے اسے اپنے خلاف
سمجھا۔ علامہ مشرقی ہدایات دے کر خود دہلی چلے گئے۔ خاکساروں نے ۱۹ مارچ کو جلوس نکالا نتیجۃً ہیرا منڈی کے چوک میں پولیس اور خاکساروں
میں ٹکراؤ ہو گیا۔ خاکساروں نے کھلم کھلا بیلچے استعمال کیے مسٹر بیٹی اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے تو وہیں دم توڑ دیا مسٹر پورن ڈپٹی کمشنر
کو زخم آئے۔ مسٹر گینفورڈ سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس کا چہرہ مسخ ہو گیا۔ پولیس نے جواب الجواب قتل عام شروع کر دیا۔ پچاس نوجوان شہید کیے
گئے۔ انتقام کا یہ عالم تھا کہ رنڈیوں کے مکانوں میں سے چھپے ہوئے خاکساروں کو چن چن کر نکالا جاتا اور دوسری یا تیسری منزل پر چڑھا کر نیچے
پھینک دیا جاتا۔ علامہ مشرقی کو دہلی سے گرفتار کر کے مدراس کی طرف ویلور جیل میں قید کر دیا گیا۔ خاکساروں نے لاہور کی مسجدوں میں مدت
تک مورچہ لگائے رکھا مگر بالآخر تھک ہار کر رہ گئے۔ علامہ ۱۸ جنوری ۱۹۴۲ء کو رہا کر دیے گئے مگر خاکساروں جیسی عظیم تحریک جس نے
بے شمار جاں نثار پیدا کیے تھے اپنے ہی لیڈر کے عاجلانہ فیصلوں کا شکار ہو کر پٹ گئی۔ پھر اس کے لیے عروج و قبول کا کوئی لمحہ بھی روشن نہ ہو سکا۔
——— اس سے پہلے جولائی ۱۹۳۵ء میں لاہور کے مسلمانوں نے مسجد شہید گنج کے انہدام کا مقابلہ کیا۔
تحریک کا بیڑا اٹھایا۔ مولانا محمد اسحاق مانسہروی، سید حبیب، ملک لال خان اور میاں فیروز الدین احمد ان کے دست و بازو تھے۔ جب یہ
رہنما مختلف شہروں میں نظر بند کر دیے گئے تو نوجوانوں نے از خود لیڈر شپ پیدا کر کے مسجد شہید گنج کی بازیابی کا نعرہ لگایا۔ دو روز تک
دہلی دروازے کے باہر گولی چلتی رہی۔ نوجوانوں نے بڑی بے جگری سے جانیں قربان کیں۔ مولانا اختر علی خان مدیر زمیندار کے ہاتھ جوڑنے
پر یہ مورچہ ختم ہو گیا۔ مقدمہ لڑا گیا، کانفرنسیں ہوئیں، امیر ملت منتخب کیے گئے۔ غرض بہت سے جتن ہوتے رہے لیکن تحریک کا نتیجہ انتخاب
پر ختم ہوا۔ مسجد نہ ملی البتہ احرار جو اس وقت تک مسلمانوں میں بے حد مقبول اور فعال گروہ سمجھے جاتے تھے اس تحریک میں حصہ نہ لے کر مسجد کے
ملبے تلے آ گئے اور اس بُری طرح مسلمانوں کے عتاب کا شکار ہوئے کہ مسلم لیگ کے زمانۂ شباب میں ان کا بڑھاپا خود بخود عود کر
آیا۔ مولانا ظفر علی خاں نے اس غرض سے مجلس اتحادِ ملت کی بنیاد رکھی جو آگے چل کر مسلم لیگ میں ضم ہو گئی۔ احرار نے دوسری جنگ عظیم
چھڑتے ہی فوج کی بھرتی کے خلاف نعرہ بلند کیا۔ سب سے پہلا فقید المثال جلسہ لاہور میں منعقد ہوا۔ شیخ حسام الدین، شورش کاشمیری، مظہر علی
اظہر، حبیب الرحمٰن، افضل حق اور سینکڑوں رہنما و رضا کار طویل عرصہ کے لیے قید کر دیے گئے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری پر بغاوت کا مقدمہ
قائم کیا گیا جو سرکاری رپورٹر لدھا رام کے پھر جانے سے لاہور ہائیکورٹ میں منتقل ہو گیا۔ شاہ جی مسلسل سماعت کے بعد رہا کر دیے گئے۔
چودھری افضل حق مرض الموت میں مبتلا تھے کہ انھیں چھوڑ دیا گیا۔ کچھ دنوں سنبھالا لیا پھر وفات پا گئے۔ غرض جنگ کے دنوں میں احرار کے بیشتر زعما
جیل ہی میں رہے۔

پاکستان کا نصب العین اختیار کرنے کے بعد مسلم لیگ نے مسلمانوں کے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا۔ قائد اعظم سوادِ اعظم
کے تنہا لیڈر بن گئے مسلمانوں کی دوسری جماعتیں اور شخصیتیں مقابلتاً متروک ہو گئیں۔ مسلم لیگ نے اپنی پہلی اور آخری آزمائشی جنگ ملک
خضر حیات سے لاہور میں لڑی۔ یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ دو الگ الگ جماعتیں بن گئیں۔ پھر جنگ کے فوراً بعد جنرل انتخابات میں
لیگ نے مخالفوں کو چاروں شانے چت کر دیا۔ اس سے پہلے سردار شوکت حیات کی وزارت سے سبکدوشی نے لیگ کو ایک نیا ولولہ
دیا تھا۔ ملک خضر حیات نے نئے انتخابات کے بعد کانگرس سے سمجھوتہ کر کے وزارت بنائی مگر وہ مستعفی ہونے تک سخت کشمکش میں رہے۔

آخر لیگ کی ساری تاریخ میں یہ شرف بھی لاہور ہی کو حاصل ہوا کہ لیگی رہنما جو جیلخانوں کے تصور سے نابلد تھے ملک خضر حیات کی وزارت سے ٹکر لے کر جیل گئے۔ لاہور میں زبردست جلوس نکالے گئے۔ مظاہروں پر مظاہرے ہونے لگے۔ ان دنوں لاہور کے مسلمانوں نے جس زندہ دلی اور حوصلہ مندی کا ثبوت دیا وہ بے شبہ اپنی نظیر آپ تھا۔ اسی تحریک میں پہلی دفعہ مسلمان عورتیں پردہ سے باہر آئیں اور خضر وزارت کے دانت کھٹے کر دیے۔ ایک طالبہ نے بڑھ کر سکریٹریٹ پر لیگ کا جھنڈا گاڑ دیا۔ تمام صوبہ تحریک کی پشت پناہ بن گیا۔ یونی نسٹ وزارت کے لیے کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ آخر ایک صبح کو لوگ سو کر اُٹھے تو انھیں اخبارات کی شہ سرخیوں سے پتہ چلا کہ ملک خضر حیات خان ٹوانہ وزارتِ عظمٰی سے مستعفی ہو گئے ہیں اور یونی نسٹ پارٹی مسلمانانِ لاہور کے اسی سیلابِ عظیم میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئی ہے۔

لاہور کی آزادی سے پہلے، یہ آخری سیاسی تحریک تھی جس نے عروج و کمال اور فتح و نصرت حاصل کی۔ اس کے بعد فسادات کا آتش فشاں پہاڑ پھٹ پڑا۔ ماسٹر تارا سنگھ اور ان کے ساتھیوں نے لاہور اسمبلی چیمبر کے باہر تلواریں اور کرپانیں لہرا لہرا کر اعلان کیا کہ وہ پاکستان نہیں بننے دیں گے مگر پاکستان بن کے رہا البتہ ان عریاں تلواروں کا نتیجہ یہ نکلا کہ لاہور کا آٹھواں حصہ جل گیا۔ ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کے آنچل اجنبی ہاتھوں میں آبروؤں اور عصمتوں کا کفن ہو گئے۔ غلام لاہور مر گیا، آزاد لاہور زندہ ہو گیا ـــــ

یہ ہے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء تک کی سیاسی تحریکوں کا افشردہ و حصارہ جس سے ایک طویل تاریخ کے گم شدہ خطوط ابھر کر سامنے آ جاتے اور کرب کراں راستوں کا پتہ دیتے ہیں جن کی کسک ہی دل میں باقی رہ گئی ہے۔

فقیر خاندان کے تاریخی نوادر

پروفیسر یوسف جمال انصاری

لاہور کے قدیم خاندانوں میں فقیر خاندان کو ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ اس خاندان سے علم و فن کی سرپرستی کی
جو روایات وابستہ ہیں ان کی مثال کسی دوسرے خاندان میں ملنا مشکل ہے۔ فقیر خاندان کی حویلی جو بھاٹی دروازے میں واقع ہے ایک
تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کو مخزنِ نوادر کہنا بجا ہوگا۔ سکھ دورِ حکومت میں اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ فقیر سید عزیزالدین اور
فقیر سید نورالدین نے جو اہم کردار ادا کیا اسے پنجاب کی تاریخ میں بھلایا نہیں جا سکتا۔ مشہور ہے کہ ۱۷۹۹ء میں مہاراجہ
رنجیت سنگھ آشوبِ چشم میں مبتلا ہوا۔ اور اس نے لالہ حاکم رائے کو علاج کی غرض سے طلب کیا۔ لالہ حاکم رائے ایک حاذق طبیب
تھے۔ انھوں نے اپنے شاگرد فقیر سید نورالدین کو مہاراجہ کے علاج کی خدمت تفویض کی۔ مہاراجہ حکیم نورالدین سے اس قدر متاثر
ہوا۔ کہ اس نے ان کو ایک جاگیر بخش دی اور مستقلاً اپنے عملے میں شامل کر لیا۔ حکیم نورالدین فقط طبیب ہی نہ تھے۔ وہ بڑی صلاحیتوں
کے مالک تھے۔ مہاراجہ سے ان کا تعلق مدت العمر رہا۔ انھوں نے اپنے بڑے بھائی فقیر سید عزیزالدین کو بھی مہاراجہ کی خدمت
میں پیش کیا۔ رفتہ رفتہ فقیر صاحبان مہاراجہ کے مزاج میں اتنے دخل انداز ہو گئے۔ کہ حکومت کا سیاہ و سفید انھیں کے ہاتھ میں آگیا۔
یہاں تک کہ مہاراجہ کے ذاتی اور خاندانی معاملات میں بھی انھی کی رائے چلنے لگی۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ان کو بیش بہا تحائف دیئے۔ جو آج فقیر خانے کی زینت ہیں۔ ان دنوں ہندوستان کے بڑے
حصے پر انگریزوں کا تسلط قائم ہو چکا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے ہندوستانی مقبوضات پر حکومت کرنے کے لیے جو
گورنر جنرل مقرر ہو کر آئے انھوں نے رنجیت سنگھ سے تعلقات قائم کیے۔ اس سلسلے میں دونوں جانب سے فقیر سید عزیزالدین کی خدمات
حاصل کی گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز گورنر جنرلوں نے بھی فقیر صاحب کو متعدد قیمتی تحفے دیئے۔ جو آج تک اس خاندان کے پاس ہیں
فقیر خاندان خود بھی تاریخی نوادر جمع کرنے کا شوق رکھتا تھا۔ تحائف سے قطع نظر اس خاندان کے سربراہوں نے اپنے حسنِ ذوق کی
بنا پر بہت سی ایسی چیزیں حاصل کیں جن کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا آسان نہیں۔ غرضکہ فقیر خانہ بجا طور پر نوادر کا خزانہ ہے
یوں تو پرانے خاندانوں میں نوادر کا پایا جانا ان خاندانوں کی عظمت کی دلیل ہے اور لاہور کے دوسرے قدیم گھرانوں میں بھی بیش بہا
فن پاروں کی کمی نہیں۔ لیکن اس باب میں فقیر خانے کو جو فضیلت حاصل ہے وہ کسی اور خاندان کے حصے میں نہیں آئی۔
تاریخی نوادر کی اہمیت اظہر من الشمس ہے۔ مال و دولت اور سونے چاندی کے انبار دیکھ کر دل میں حسد کا جذبہ

بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ زر اپنے خزانوں کو چھپا کر رکھتے ہیں مبادا دیکھنے والے کے دل میں حسد کی آگ مشتعل نہ ہو جائے اور اس کی نیت میں فساد نہ پیدا ہو جائے۔ لیکن علم و فن کے قیمتی شہ پاروں کا عالم دوسرا ہے۔ دیکھنے والے کے دل میں حسد یا لالچ نفسیاتی طور پر پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ علم و فن کے شہ پارے تہذیبِ نفس کا اعلیٰ ترین ذریعہ ہیں۔ ان پر ایک نظر ڈالنا شادابیِ خیال اور تسکینِ روح کا موجب ہوتا ہے۔ اور ہم بے ساختہ عش عش کرنے لگتے ہیں۔ وہ خاندان جو علمی اور فنی خزانوں کے مالک ہیں۔ اس لائق ہیں کہ ان کے ساتھ اظہارِ تشکر گزاری کیا جائے۔ کہ انھوں نے علم و فن کے ایسے نمونوں کو جمع کیا۔ محفوظ رکھا اور ہماری رسائی ان تک ہوئی۔ تاریخی نوادر کی علمی حیثیت یہ ہے۔ کہ ان میں سے بیشتر انسانی صنعت کے قابلِ قدر نمونے ہوتے ہیں۔ اور فنی شاہکار ہونے کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ ان نمونوں کے ساتھ دستکاری اور صناعی کی پوری تاریخ وابستہ ہوتی ہے۔ مثلاً کونسا نمونہ کس دور کی نمائندگی کرتا ہے۔ اور کس مکتبِ فکر سے متعلق ہے۔ گویا ہر نمونے میں ایک دور کی تاریخ کا نچوڑ ہوتا ہے۔ اور ہر نمونہ کسی فن کار کی بہترین کوششوں کا انفرادی نتیجہ بھی ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے فقیر خانے کے نوادر کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ کہ ہمارے زمانے میں یہ ذخیرہ تہذیب نفس کا ایک اعلیٰ ذریعہ ہے۔ محض تاریخی حیثیت سے بھی مورخ ان نوادر کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ ان سے سکھ دور میں سکھ مسلم تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ اور سکھ حکمرانوں کا مذاقِ طبع اور سکھ دورِ حکومت میں علم و فن کی سرپرستی کا حال بھی معلوم ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ہم اس نتیجے پر بھی پہنچتے ہیں۔ کہ اس خاندان کے سربراہوں کا فنی ذوق کتنا بلند تھا اور ہے کیونکہ ہر زمانے میں اس کے سربراہ اس ذخیرے میں اضافہ کرتے رہے ہیں چنانچہ فقیر سید جلال الدین مرحوم کے بعد اب میجر فقیر مغیث الدین اس خزانے کو بڑھا رہے ہیں۔

لاہور کے فقیر خانے کو "آرٹ میوزیم" کہنا مناسب ہوگا۔ اس میں نقاشی، مصوری، منبت کاری۔ قالین بافی ظروف سازی۔ خطاطی۔ چوبی نقش کاری، مجسمہ سازی وغیرہ بیش قیمت نمونوں کا ذخیرہ موجود ہے۔ جو مہاراجہ رنجیت سنگھ۔ ملکہ وکٹوریہ۔ لارڈ ایمہرسٹ۔ لارڈ آک لینڈ۔ لارڈ ایلن برا۔ لارڈ ہیسٹنگز۔ لارڈ ولیم بینٹنک۔ لارڈ ہارڈنگ اور دوسری عظیم شخصیتوں نے اس خاندان کے سربراہوں کو وقتاً فوقتاً تحفے میں دیئے۔ ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے جو سلسلہ تحائف اس خاندان کو موصول ہوا۔ اس میں ملکہ وکٹوریہ کی وہ قیمتی تصویر بھی شامل ہے جس کا فریم خالص سونے کا تھا۔ اور گھڑی بھی شامل ہے جو اندھیرے میں بھی وقت بتاتی تھی۔ ملکہ نے فقیر نور الدین کے لیے ایک گھوڑا گاڑی بھی بھیجی تھی۔ جو لاہور کی سڑکوں پر استعمال نہ کی جاسکی۔ اور اُسے فروخت کر دیا گیا۔ ملکہ کی طرف سے لارڈ منٹو نے جو ان دنوں گورنر جنرل تھے۔ فقیر نور الدین کو ایک توپ بھی تحفے میں دی۔ جس میں ایک دھوپ گھڑی لگی ہوئی ہے۔ دن کے بارہ بجے اور توپ خود بخود چل گئی۔ یہ توپ اس خاندان کے پاس اب بھی موجود ہے۔ غرضیکہ ملکہ کی تصویر، گھڑی اور خود کار توپ کا شمار نہ صرف نوادر میں ہوتا ہے۔ بلکہ انگریز حکمرانوں اور فقیر خاندان کے باہمی تعلقات کا بھی ایک بیّن ثبوت ہے۔ اسی طرح مہاراجہ رنجیت سنگھ کا پیش کردہ قرآن پاک کا ایک نسخہ بھی نوادر میں شامل ہے۔ ضلع سیالکوٹ کے ایک غریب خوش نویس نے اس کی کتابت کی تھی۔ اور عمر بھر کی عرق ریزی سے اس پر نقش و نگار بنائے تھے۔ تقطیع اور وزن کے اعتبار سے اس نسخے کا اٹھانا آسان نہ تھا۔ چنانچہ اپنے کام سے فارغ

ہونے کے بعد جب غریب خوش نویس ایک گاڑی میں رکھ کر یہ نسخہ ریاست ٹونک کے حکمران کے پاس لے جانے کی نیت سے روانہ ہوا۔ اور قلعۂ لاہور کے نیچے سے گزرا تو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی نظر اس پر پڑی۔ مہاراجہ نے خوش نویس کو جاگیر کے علاوہ گیارہ ہزار روپیہ نقد انعام دیا۔ اور یہ نسخہ فقیر نورالدین کو پیش کر دیا۔ مہاراجہ کے تحائف میں ایک بیش بہا مالا بھی شامل ہے جس کی قیمت دس ہزار روپیہ ہے۔ ایک بار فقیر نورالدین مہاراجہ رنجیت سنگھ کے محل میں بیٹھے تسبیح پڑھ رہے تھے۔ اس وقت مہاراجہ بھی مالا جپنے میں مصروف تھے۔ تسبیح پڑھنے کا اسلامی طریقہ چونکہ مالا جپنے سے مختلف ہے۔ تسبیح دائیں سے بائیں کو اور مالا بائیں سے دائیں کو پھیرتے ہیں۔ اس لیے اچانک مہاراجہ نے پوچھا۔ کہ فقیر صاحب! ان دونوں طریقوں میں سے کونسا درست اور مستحسن ہے۔ فقیر نورالدین بلا کے حاضر جواب تھے۔ انھوں نے کہا۔ کہ دونوں طریقے نہایت مناسب ہیں۔ مہاراج کا طریقہ وہ ہے کہ جس سے خدا اپنے بندوں کو مالا مال کرتا ہے۔ اور میرا طریقہ وہ ہے جس سے شیطان دور ہٹتا ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ اس جواب سے اتنے خوش ہوئے کہ اپنی قیمتی مالا گلے سے اتار کر فقیر صاحب کی گود میں ڈال دی۔ اب بات حاضر جوابی کی چل نکلی ہے۔ تو یہ واقعہ قلمبند کئے بغیر بھی رہا نہیں جاتا۔ ایک بار فقیر عزیزالدین کو (جو فقیر نورالدین کے بڑے بھائی تھے) مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ساتھ مقبوضہ ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ ولیم بینٹنک سے ملنے شملے جانا پڑا۔ لارڈ بینٹنک نے فقیر عزیزالدین سے نجی ملاقات میں پوچھا۔ کہ تمھارے مہاراجہ کی کونسی آنکھ خراب ہے۔ انھوں نے برجستہ جواب دیا "مہاراجہ کے چہرے پر آفتاب کا سا جلال ہے۔ مجھ میں اتنی تاب کہاں کہ نظر بھر کر دیکھ سکوں۔ اس لیے میں آپ کے سوال کا جواب دینے سے قاصر ہوں"۔ غرضکہ ایں خانہ تمام آفتاب است۔ قرآن پاک کا وہ نسخہ اور مہاراجہ کی مالا ایسے تحائف ہیں جن سے فقیر خاندان کے سکھ حکمرانوں کے ساتھ باہمی تعلقات پر تاریخی روشنی پڑتی ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے الطاف و عنایات کا سلسلہ اتنا طویل ہے کہ اس کے دیئے ہوئے تحفوں کی فہرست بنانا بھی مشکل ہے۔

فقیر خانے میں اسلامی نوادر کا ایک وقیع ذخیرہ ہے۔ قرآن مجید کے نادر نسخے ساٹھ کے قریب ہیں۔ ایک نسخہ تو جناب علیؓ کے ہاتھ کا ہے اسی طرح ایک نسخہ امام حسنؓ اور ایک امام حسینؓ کے ہاتھ کا ہے۔ اسی طرح دوسرے ائمۂ اطہار کے قلمی نسخے بھی موجود ہیں۔ ان نادر و نایاب قلمی نسخوں کی زیارت روحِ ایمان کو بالیدہ کرتی ہے۔ اور ثوابِ دارین کی مستوجب ہے علاوہ ازیں فقیر خانے میں مختلف زمانوں اور مختلف رسم الخط کے قرآن مجید ہیں۔ ثوابِ دارین کے علاوہ اسلامی خطاطی کے نقطۂ نظر سے بھی قرآنی نسخوں کا یہ ذخیرہ قابلِ لحاظ ہے۔ فقیر خانے کے ذخیرے میں کم و بیش چالیس تبرکات ایسے ہیں کہ نویں محرم کو ہر سال ان کی نمائش کی جاتی ہے۔ اور ان کی زیارت کے لیے دور و نزدیک سے لوگ آتے ہیں۔ یہ تبرکات بالکل نایاب ہیں۔ اور اپنی مثال آپ ہی ہیں۔ تبرکات سے قطع نظر کوئی چھ سو قلمی کتب اور ساڑھے چار سو قطعات ہیں۔ قلمی کتب کے ذیل میں ڈیڑھ سو کے قریب ایسی کتابیں آتی ہیں۔ جو بالکل غیر مطبوعہ اور نایاب ہیں۔ قطعات میں سرِ فہرست حضرت امام حسین علیہ السلام کے قلم مبارک کا لکھا ہوا ایک قطعہ بخط معقلی ہے۔ دوسرے قطعات عبدالرشید دیلمی۔ میر علی جگن ناتھ (اکبری)۔ عبداللہ الحسینی۔ یاقوت مستعصمی۔ میر عماد۔ ابوالبقاء الموسوی۔ حافظ نوراللہ۔ حافظ ابراہیم۔ میر علی۔ میر محمد امیر پنجہ کش۔ آغا مرزا۔ رحیم اللہ۔ محمد عاقل۔ امجد الحسینی۔ امام ویردی۔ محمد یعقوب۔ مرزا احمد علی۔ عباد اللہ۔

فتح علی ملتانی - میاں علی بخش - فضل الدین صحاف - عبدالمجید پروین رقم - خلیفہ سید احمد - خلیفہ نور احمد - تاج الدین زریں رقم،
شیخ احمد - ملک علی محمد وغیرہم کے ہیں اور دو سو نایاب تاریخی دستاویزات ہیں جو سکھ حکومت کے متعلق ہیں۔

تصاویر کے اعتبار سے فقیر خانہ گویا نگار خانہ ہے۔ ان کی تعداد چار سو سے کم نہ ہوگی۔ مغل اسکول - راجپوتانہ اسکول
دکن اسکول - کانگڑہ اسکول اور سکھ اسکول کی نایاب قلمی تصاویر سے فقیر خانہ مزین ہے۔ ان میں ایک قلمی تصویر مہاراجہ
رنجیت سنگھ کے رہوار لیلیٰ کی ہے۔ اس گھوڑے کو حاصل کرنے کی خاطر مہاراجہ کو پشاور کے گورنر سردار یار محمد خاں سے
جنگ آزمائی کرنا پڑی تھی۔ مغل تصاویر کے ساتھ سکھ حکمرانوں کا شغف سکھ مسلم تعلقات کے شگفتہ ہونے کی دلیل ہے۔ لکڑی
اور ہاتھی دانت پر کام کے بعض بہت اچھے نمونے یہاں نظر آتے ہیں۔ لکڑی پر منبت کاری اور ہاتھی دانت پر مرقع کاری کے
کوئی سو نمونے ہوں گے۔ ہاتھی دانت پر شاہ جہاں اور ممتاز محل کے دربار کا نقش ان میں خاصے کی چیز ہے۔ ریشم پر مصوری کے
کوئی ڈیڑھ سو نمونے ہوں گے جن میں سے بعض چینی اور جاپانی ہیں۔ چین، روس، جاپان اور ایران کے بنے ہوئے تقریباً تین سو
چینی کے ظروف ہیں۔ ایرانی اور ہندوستانی قالین سازی کے ساٹھ نمونے ہیں۔ ہندوستانی قالینوں میں وہ قالین بھی
شامل ہیں، جو خاص لاہور کے بنے ہوئے ہیں۔ ایرانی قالین ایران کے مختلف خطوں کی کاریگری کے شاہکار ہیں۔ پتھر اور انگشتری
پر خطاطی کے بے نظیر نمونے موجود ہیں۔ ایک انگشتری پر تو ہندوستان کا نقشہ بنا ہوا ہے۔ اس انگشتری کی بھی عجیب داستان ہے
خلیج بنگال پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ چڑھتے چاند کا زمانہ تھا۔ بادلوں کی شکل ہندوستان کے نقشے کی سی تھی۔ اس نظارے کا
عکس انگشتری پر اتار لیا گیا۔ یہ انگشتری کشمیر کے متعلق قدرت کی پیش گوئی کا نقش پیش کرتی ہے۔ ہندوستان کے اس نقشے
میں کشمیر کا حصہ شامل نہیں ہے۔ یوں بھی چڑھتا چاند پاکستان کا قومی نشان ہے۔ جب چاند چڑھے گا تو کشمیر ہمارا ہوگا۔ یہی
قدرت کو منظور ہے اور انگشتری کی پیشین گوئی بھی یہی ہے۔ پتھر اور مختلف دھاتوں کے مجسموں کی بھی فقیر خانے میں کمی نہیں۔
پتھر کے بت، گندھارا - قدیم ہندو طرز بت تراشی - چینی و اطالوی مجسمہ سازی غرض مختلف ادوار اور زمانوں کے مجسمے ہیں۔
برونس، کلازونی، پیتل اور تانبے کے پرانے برتن بھی ہیں۔ کوئی پچاس قدیم مہریں اور ایک ہزار ایرانی - یونانی - مغل اور سکھ
دور کے سکے ہیں۔ مختلف قیمتی پتھروں کی کوئی ستر تسبیح اور مالے ہیں۔ کشمیری شال - جامہ دار - سوزنیاں - چغے - میز کرسیاں
تپائیاں مینٹل پیس - ملا جلا کر سینکڑوں کی تعداد تک پہنچتے ہیں۔ قدیم اور نایاب اسلحہ کے نمونے بھی یہاں موجود ہیں۔ یعنی
تلوار - تبر - خنجر - خود وغیرہ۔

فقیر خانہ کیا ہے عجائب گھر ہے۔ کس کس چیز کو گنوایا جائے۔ اور کس کس کو بیان کیا جائے۔ اسی لیے ہم نے
اس مختصر سے تعارف پر قناعت کی ہے۔ ورنہ پورے بیان کے لیے دفتر کے دفتر درکار ہوتے۔

خوش نویس

ملک علی محمد

عروس البلاد لاہور اپنی ابتدا سے لے کر آج تک ہر علم و فن کے باکمالوں کا مرکز رہا ہے۔ اچھے اچھے خوش نویس بھی ہمیشہ یہاں موجود رہے ہیں۔ ان میں بعض تو یہاں کی مٹی سے اٹھے اور یہیں سما گئے اور بعض ایسے تھے جو ابتدائے عمر میں یہاں تحصیل علم و فن کے لیے آئے اور پھر یہاں سے لوٹ کر نہ جا سکے۔

جہاں تک فن خوش نویسی کا تعلق ہے، یہ ایران کی وساطت سے یہاں پہنچا اور پھلا پھولا۔ ہر شخص اس حقیقت کا معترف ہے۔

فن خطاطی سے دلچسپی رکھنے والے مورخین اور اہل علم حضرات نے اس فن کے کئی استادوں کا تذکرہ مختلف کتابوں میں کیا ہے مگر جن خوش نویس بزرگوں کا میں ذکر کر رہا ہوں، یہ ہمارے عہد سے بہت قریب کے لوگ ہیں اور ان کے حالات ابھی سینہ سے سفینہ تک منتقل نہیں ہوئے۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے وہ لوگ زندہ تھے جنھوں نے ان بزرگوں کی آنکھیں دیکھی تھیں اب بھی شاید کوئی موجود ہو۔ میری تحریر کی بنیاد انہی بزرگوں کی بتائی ہوئی معلومات ہیں۔

میں اس مضمون کی ابتدا میرزا امام ویردی جیسے باکمال استاد سے کرتا ہوں جنھوں نے یہاں کی خوش نویسی کو وہ جلا بخشی کہ اس سے پہلے کی خوش نویسی اس کے سامنے ماند پڑ گئی۔

میرزا امام ویردی آپ بڑے فاضل ادیب اور نہایت اعلیٰ درجہ کے خوش نویس تھے۔ آج سے سوا سو سال پیشتر کابل سے لاہور تشریف لائے اور پھر یہیں کے ہو گئے۔ ان کو لاہور کے خوش نویسوں کا امام کہنا چاہیے۔ کیونکہ ان سے بہتر کوئی خوش نویس اس وقت کیا آج بھی موجود نہیں۔ ان کے لکھے ہوئے قطعات لاہور میں عام ملتے ہیں۔ بعض مساجد اور قبروں کے کتبات بھی ان کے لکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ امرا ان کے بے حد قدر دان تھے۔ نواب شیخ امام الدین مرحوم گورنر کشمیر اور نوابان قزلباش سے ان کے روابط نہایت گہرے تھے۔ نواب شیخ امام الدین نے سوتر منڈی میں مسجد بنوائی تو اس کی دیواروں پر میرزا صاحب نے کتنے ہی اشعار لکھے جو مرمت کے دوران صاف ہو گئے۔ شاید اب بھی کوئی نشان باقی ہو۔ نواب امام الدین کی والدہ کی قبر مزار بی بی پاک دامناں کے احاطہ میں اور خود نواب صاحب کی قبر داتا گنج بخشؒ کے ایک دالان میں ہے۔ دونوں قبروں پر میرزا صاحب کے لکھے ہوئے کتبے آج بھی

موجود ہیں۔ اور دیکھے جا سکتے۔

نوابانِ قزلباش کے امام باڑہ واقع چوک نواب صاحب میں میرزا صاحب کے لکھے اور کندہ کئے ہوئے لکڑی کے بڑے بڑے قطعات بھی شائقین فن سے خراج تحسین وصول کر رہے ہیں۔ تقریباً ایک انچ موٹے قلم سے ہفت بند محتشم کاشی کے بیس پچیس اشعار لکھے گئے ہیں۔ آپ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی گلستان ایک نمائش میں نظر سے گزری تھی۔ یہ نمائش غالباً شاہ ایران کی پہلی دفعہ آمد پر میو سکول آف آرٹس میں لگائی گئی تھی۔ گلستان دیکھ کر آنکھیں روشن ہوتی تھیں۔ کوئی لفظ ایسا نہیں تھا جس کے کسی نقطے پر انگلی رکھی جا سکے۔ آپ لکھنے میں نہایت محتاط تھے۔ کوئی ناپسندیدہ حرف باقی نہ چھوڑتے۔ فوراً ضائع کر دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے قطعات بڑی قیمت پاتے تھے۔

میرزا صاحب کندہ کاری اور نقاشی میں بھی ماہر تھے۔ خود ہی لکھتے، خود ہی نقاشی کرتے اور خود ہی پتھر کھودتے۔

میاں علی بخش مرحوم فرماتے تھے کہ میرزا صاحب کو ابتدائے عمر ہی سے اس فن کا اتنا شوق تھا کہ کابل کی ایک مسجد میں جو سنگ مرمر سے بنی ہوئی تھی روزانہ قلم دوات لے کر چلے جاتے۔ پہلے اس کی دیواروں پر جہاں تک ہاتھ جاتا لکھتے۔ پھر فرش پر لکھتے اور نمازیوں کے آنے سے پہلے پہلے اسے دھو کر صاف کر دیتے۔ اس طرح انھیں اچھا لکھنے کی مشق ہو گئی۔

لاہور میں ان کے بیشمار شاگرد تھے۔ جن میں استاد محترم میاں علی محمد عرف میاں علی بخش خطاط اور مولوی شیخ احمد جوہر کانی بہت قابل ہوئے ہیں۔ ڈاٹر کٹری طرز لکھنے والوں میں آج بھی شاید ہی کوئی ایسا ہو جو بالواسطہ یا بلاواسطہ ان کا فیض یافتہ نہ ہو۔ رائے صاحب منشی گلاب سنگھ نے تو اپنے کاتبوں کے لیے پانچ روپیہ ماہوار کا وظیفہ مقرر کر رکھا تھا کہ وہ میرزا صاحب سے فن خوش نویسی کی اصلاح لیں اور ان کی روش اختیار کریں۔

میرزا صاحب کا انتقال ۱۸۸۰ء میں ہوا۔ چنانچہ ۱۹ فروری ۱۸۸۰ء کے اودھ اخبار لکھنؤ نے لکھا:۔

"پنجابی اخبار لاہور سے یکتائے زمانہ خوش نویس یگانہ امام ویردی مرحوم و مغفور کے انتقال کی خبر سن کر ہم کو نہایت افسوس ہوا۔ امام ویردی مرحوم خوشنویسی میں اپنے وقت کے امام اور میر پنجہ کش مرحوم دہلوی کے قائم مقام تھے۔"

میرزا صاحب کا خاندان آج بھی لاہور کے محلہ چونے منڈی میں آباد ہے۔ ان کے پڑپوتے میرزا کاظم صاحب زندہ و سلامت ہیں مگر وہ میرزا صاحب کے حالات اور مدفن کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ میرزا صاحب کو قبرستان مومن پورہ میکلوڈ روڈ میں دفن کیا گیا تھا مگر ان کی قبر کا نشان اب مٹ چکا ہے اور کوئی نہیں بتا سکتا کہ وہ باکمال جو اپنے ملنے والوں کے نام کا النقش فی الحجر کر کے انھیں ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیتا تھا آج کس مٹی میں مل گیا ہے۔ میاں علی بخش کے بھتیجے منشی معراج علی مرحوم نے ایک دفعہ راقم سے کہا تھا کہ وہ میرزا صاحب کی قبر کا نشان بتا دیں گے مگر پیشتر اس کے کہ وہ کچھ بتاتے خود ہی بے وقت موت کا شکار ہو کر بے نشان ہو گئے۔

شیخ احمد جوہر کانی چوہڑ کانہ ضلع شیخوپورہ میں پیدا ہوئے تھے۔ اسی نسبت سے قطعات کے نیچے اپنے نام کے ساتھ جوہر کانی لکھتے تھے۔ میرزا امام ویردی کے شاگرد تھے۔ مرتے سے موٹا قطعہ

بڑی بے تکلفی سے لکھ جانتے تھے۔ ان کے لکھے ہوئے قطعات آج بھی بہت سے لوگوں کے پاس ہیں۔ چنانچہ میاں محمد حیات نقاش مسجد وزیر خاں کے پاس شیخ احمد کے ہاتھ کا لکھا ہوا ۱۲۰۸ھ کا ایک قطعہ اب تک موجود ہے جس پر یہ شعر اتنے بچتہ خط میں لکھا ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے ؂

از تواضع میتواں کردن مسخر عالمے
خاتم دست سلیمانی ہمیں پشت دوتاست

موچی دروازہ کے اندر کوچہ مغل حویلی میں مرزا محمد علی مرحوم کا امام باڑہ نہایت عمدگی سے سجتا تھا۔ اس میں شیخ احمد جوہر کانی کے لکھے ہوئے بیسیوں قطعات تھے۔ ایک سے ایک اعلیٰ۔ مگر اس خاندان کے زوال کے بعد یہ قطعات آنکھوں سے اوجھل اور منتشر ہو گئے۔ آپ ابتدا میں محکمہ بندوبست کے رجسٹروں کے عنوانات لکھا کرتے تھے۔ اس سے اتنی مشق ہو گئی کہ اپنے وقت کے نامور خوش نویسوں میں شمار ہوئے۔ بھاٹی دروازہ کے اندر تحصیل بازار کے پیچھے ایک مسجد میں امامت کرتے تھے۔ وہیں فوت ہوئے۔

مولوی سید احمد امین آبادی آپ میرزا امام ویردی کے ہمعصر تھے اور محلہ چرخی ماراں اندرون لوہاری دروازہ میں رہا کرتے تھے۔ نشست ڈیرہ کاتباں چوک متی میں تھی۔ وہیں کتابت کرتے تھے۔ ڈیرہ کاتباں قیام پاکستان سے پہلے قریباً سو برس لاہور میں خوش نویسوں کا مرکز رہا اور وہاں سے بڑے اچھے اچھے کاتب تربیت پا کر نکلے۔ لاہور کے بے شمار خوش نویس مولوی سید احمد کے خاندان کے فیض یافتہ ہیں۔

مولوی سید احمد بڑے دیندار اور خوش پوش بزرگ تھے۔ گندمی رنگ، سرخ داڑھی، سفید عمامہ اور سفید غرارہ پہنتے تھے۔ بڑے باکمال تھے۔ آپ کی لکھی ہوئی وصلیاں آپ کے کمال فن کا پتہ دیتی ہیں۔ آپ لاہور میں پہلے کاتب تھے جن کا کام سرکاری پریس میں سب سے پہلے طبع ہوا۔ میرزا امام ویردی کی مطبوعہ اصلاحیں جو آج بھی بعض لوگوں کے پاس موجود ہیں، آپ ہی کی کوششوں سے لندن میں طبع ہوئی تھیں مگر یہ بات میرزا صاحب کو ناگوار گزری اور وہ مولوی سید احمد سے ناراض ہو گئے۔ مولوی سید احمد موضع بسانده کلاں کے قبرستان میں اپنے مرشد کے پہلو میں آسودۂ خواب ہیں۔

آپ کے دو فرزند خلیفہ نور احمد اور خلیفہ غلام محمد تھے۔ دونوں بہت اچھے خوش نویس تھے۔ آپ کے ہمعصروں میں مولوی فقیر محمد، پنڈت دیا رام، قاضی شمس الدین اور چراغ علی وغیرہ لائق تعریف خوش نویس تھے۔ جن کا ذکر منشی کنہیا لال بہادر نے تاریخ لاہور میں بھی کیا ہے۔

خلیفہ غلام محمد آپ مولوی سید احمد کے بڑے فرزند تھے۔ مولوی صاحب نے ان کو میرزا امام ویردی کا شاگرد کرایا اور ایک سو روپیہ نقد، پگڑی اور شیرینی پیش کی۔ میرزا صاحب ان کو مدت تک اصلاح دیتے رہے۔ آپ نے بڑی ترقی کی اور استادوں سے لگا کھانے لگے مگر افسوس کہ عین عالم شباب میں عازم دار البقا ہوئے۔ مولوی سید احمد کو اس قابل فرزند کی وفات سے سخت صدمہ پہنچا۔ خلیفہ غلام محمد کا سال وفات ۱۸۸۶ء

ہے۔ آپ میانی صاحب کے قبرستان میں مدفون ہیں۔

حافظ خلیفہ نور احمد آپ مولوی سید احمد کے چھوٹے فرزند اور انہی کے شاگرد تھے۔ خوش نویسی میں بے مثال تھے ورزشی جسم، چہرے پر چیچک کے داغ، ٹخنے گرہن کی وجہ سے مڑ گئے تھے، کسرت کے شوقین تھے۔ اپنے فن میں اتنے باکمال تھے کہ کچی کا پی کے دس بیس قلم ایک ہی جیسے علی الصبح تیار کر کے قلمدان میں رکھ لیتے اور لکھنا شروع کر دیتے۔ ایک قلم خراب ہو جاتا تو دوسرا اٹھا لیتے۔ باریک سے باریک لکھائی انہی سے کرتے۔ بڑے زود نویس اور بسیار نویس تھے۔ لکھائی اتنی تیز، عمدہ اور مضبوط تھی کہ آج لوہے کے قلم سے بھی اس جیسی لکھنی مشکل ہے۔ شہر بھر میں ان کی استادی کا چرچا تھا۔ آپ نے ایک ہفتہ وار اخبار بھی لاہور سے جاری کیا جس کا نام "شمشیر قلم" تھا۔ خود ہی اس کے ایڈیٹر تھے۔ آپ کا انتقال ۱۹۱۵ء میں ہوا اور میانی صاحب کے قبرستان میں پیوند زمین ہوئے۔

خلیفہ محمد حسن آپ خلیفہ غلام محمد کے صاحبزادے اور مولوی سید احمد کے پوتے تھے۔ خوش نویسی کا فن اپنے باکمال چچا خلیفہ نور احمد سے سیکھا اور اس میں بڑا نام پیدا کیا۔ پرانی طرز کے نہایت اعلیٰ لکھنے والوں میں تھے۔ سنگین سے سنگین کام نہایت عمدگی سے کرتے تھے۔ اپنے وقت کے بہترین خطاط تھے۔ مہاراجہ جموں و کشمیر نے آپ کو اپنی سرپرستی میں لے لیا تھا۔ کشمیر کے طبقۂ امرا و رؤسا میں بھی خاص عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ چونکہ آپ استادوں کے خاندان سے تھے اس لیے تمام خوش نویس آپ کا ادب اور احترام کرتے تھے۔ بڑے خوش باش، مرنجاں مرنج بزرگ تھے۔ خوش الحان بھی تھے۔ نعت خوب پڑھتے تھے۔ جب کوئی مسودہ لکھنے بیٹھتے تو بڑے بلند آواز سے لے کے ساتھ پڑھتے جاتے۔ خوش خور بھی تھے۔ تھوڑا مگر عمدہ اور لذیذ کھانا پسند فرماتے تھے۔

آپ زیادہ تر جموں و کشمیر میں رہتے تھے۔ کبھی کبھی چھٹی لے کر مہینے دو مہینے کے لیے لاہور آ جاتے اور ڈیرہ کاتباں میں قیام کرتے۔ آپ کے بے شمار شاگرد ہیں جن میں حکیم مراد بخش اس وقت لاہور میں معروف ہیں۔ راقم الحروف نے ان سے بھی فیض پایا ہے۔ آپ نے جموں میں بعارضہ تشنج ۷۵ سال کی عمر میں ۱۶ نومبر ۱۹۳۷ء کو انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے لاہور میں کاتبوں کی سٹرائیک کرا کے ان کی اجرتیں بڑھوائیں اور ان کی زندگی کا معیار بلند کیا۔ خلیفہ احمد حسن سہیل رقم جو مشہور خوش نویس، آرٹسٹ اور آرٹس کلاس کے لیکچرار ہیں، آپ ہی کے فرزند ہیں۔

منشی عبد الغنی نتھو عبد الغنی نام تھا مگر اپنے عرف "میاں نتھو" ہی سے زیادہ مشہور تھے۔ کوچہ چرغی ماراں اندرون لوہاری دروازہ میں رہتے اور مولوی سید احمد مرحوم کے شاگرد رشید تھے۔ درسی طرز پر ان کی لکھی ہوئی کتابیں اور اصلاحیں آج بھی مبتدیوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔ رائے صاحب منشی گلاب سنگھ کے مطبع مفید عام کی ابتدائی شہرت انہی کے دم سے تھی۔ ان کے شاگردوں میں منشی عبد الغنی، منشی فرزند علی اور منشی سیتا رام قابل ذکر ہیں۔ حاجی دین محمد صاحب بھی ان سے اصلاح لیتے رہے ہیں۔ اپنے وقت کے بہترین خوش نویس تھے۔ تاریخ انتقال معلوم نہیں ہو سکی۔

منشی سیتا رام میاں نتھو کے شاگرد تھے اور بہت عمدہ لکھتے تھے۔ میاں نتھو کے ساتھ رائے صاحب منشی گلاب سنگھ کے مطبع مفید عام میں کام کرتے تھے۔ آخر وقت تک نوک پلک درست رہی۔ انہوں نے اصلاح کے قلم سے

چند قطعات لکھے تھے جو طبع بھی ہوئے تھے اور نستعلیق کا اچھا نمونہ تھے۔ یہ قطعات میرے پاس بھی تھے مگر کہیں کھو گئے۔

مولوی فضل الدین صحاف سکھوں کے وقت میں میاں پیر بخش کوفت گر فارسی کے نہایت اچھے خوش نویس تھے جن کی عزت تمام امرائے دربار بلکہ خود مہاراجہ تک کرتا تھا۔ اکثر امیروں کے لڑکے اصلاح لینے کے لیے ان کے مکان پر جاتے۔ وہ سب کو مفت اصلاح دیتے اور کسی سے کچھ نہ لیتے۔ اپنی گزر بسر کوفت گری[1] کے کام سے کرتے۔ مہاراجہ نے بہت چاہا کہ نوکری قبول کر لیں مگر انھوں نے منظور نہ کیا۔ مولوی فضل دین صحاف انہی کے شاگرد تھے۔

آپ پیشہ مفتی باقر میں رہتے اور خط نسخ و نستعلیق کے ماہر تھے مگر ان کی زیادہ تر شہرت خط نسخ کی وجہ سے تھی۔ ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قطعات اور کتابوں کی بڑی قدر تھی۔ لوگ خوش ہو کر ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ مدت تک اخبار کوہ نور میں کتابت کرتے رہے۔ پھر محکمہ ڈائرکٹری میں ملازم ہو گئے۔ اپنے شاگردوں سے نہایت مہربانی سے پیش آتے۔ اگر کوئی راہ چلتے بھی فن کے متعلق بات پوچھتا تو بتانے میں دریغ نہ کرتے اور وہیں کھڑے کھڑے اس کو اصلاح دے دیتے۔ محکمہ میں ان کی بڑی عزت و توقیر تھی۔ آخری زمانہ میں مطبع سرکاری کے سپرنٹنڈنٹ ہو گئے تھے۔ ۱۸۸۸ء تک زندہ تھے۔ ہمارے عہد کے علامہ علاؤ الدین صدیقی آپ ہی کے پوتے ہیں۔

میرزا احمد علی کشمیری آپ سری نگر (کشمیر) کے رہنے والے اور اپنے والد میرزا صادق علی مرحوم کے شاگرد تھے۔ بڑے باکمال خوش نویس تھے۔ لاہور میں موچی دروازہ کے اندر ان کے عزیز رہتے تھے۔ یہ ان کے پاس اکثر آتے جاتے تھے۔ ایک دفعہ کافی عرصہ لاہور میں قیام کیا۔ اس دوران آپ نے بہت سے قطعے لکھے جن میں سے بعض آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ میجر فقیر مغیث الدین کے پاس بھی ان کے کچھ قطعات موجود ہیں۔ موچی دروازہ کے اندر جہاں اب زنانہ جدید ہے میرزا نیاز بیگ کا امام باڑہ تھا۔ اس میں میرزا احمد علی کے لکھے ہوئے سات قطعے تھے جو بہت بڑے بڑے تھے۔ چھ مصرعے چھ قطعات میں لکھے گئے تھے اور ایک طغرا تھا۔ یہ مصرعے فارسی کے تھے جن میں سے ایک یہ تھا۔ ع

گر گر یہ کنی بقدر بال نگلی

ہر مصرع کی لمبائی کوئی ۱۰۔۱۱ فٹ اور اونچائی $2\frac{1}{2}$ فٹ تھی۔ قلم $2\frac{1}{2}$ موٹا تھا۔ ہم نے یہ قطعات اپنے بچپن میں دیکھے جس وقت کچھ سمجھ نہ تھی۔ خطاط اعظم حاجی دین محمد صاحب کہتے ہیں کہ میں ان قطعات کو گھنٹوں دیکھتا رہتا تھا اور طبیعت سیر نہ ہوتی تھی۔ وہی قطعات میرے فن کی ترقی کا باعث ہوئے۔ افسوس کہ یہ قطعات بوسیدہ ہو جانے کے باعث ضائع ہو گئے اور آج کے خوش نویس ان کی زیارت سے محروم ہیں۔

حاجی دین محمد صاحب سنہ ۱۹[illegible]ء میں کشمیر گئے تو وہاں میرزا احمد علی مرحوم سے بھی ملے۔ انھوں نے کھانے کی دعوت دی اور اپنے قطعات بھی دکھائے۔ حاجی صاحب متواتر سات گھنٹے ان قطعات سے آنکھیں روشن کرتے رہے یہاں تک کہ کھانے کی سدھ بدھ ہی نہ رہی۔ حاجی دین محمد نے دو ایک موقعوں پر میرزا صاحب کو پھر لاہور بلانے کی کوشش کی مگر حالات چونکہ سازگار نہیں تھے اس لیے وہ نہ آ سکے۔ طبیعت قناعت پسند تھی۔ جو کچھ تھوڑا بہت وطن میں رہ کر مل جاتا تھا اسی پر ساری عمر گزار دی۔ آپ بڑے

---

[1] دھنے یا کسی دوسری دھات پر بیل بوٹے یا عبارت کھود کر اس میں سونا چاندی بھرنے کو کوفت گری کہتے ہیں۔

عابد اور زاہد بزرگ تھے۔ لاہور میں ان کے شاگردوں کی تعداد کم ہے۔ کیونکہ یہاں انھیں زیادہ عرصہ قیام کا موقع نہیں ملا۔ پھر بھی فتح علی ملتانی اور ملک صفدر علی قابلِ ذکر ہیں۔

فتح علی ملتانی آپ میرزا احمد علی کشمیری کے شاگردِ رشید اور بڑے کامل تھے۔ ابتدائے جوانی میں لاہور آئے یہاں سے فن کی تکمیل کے لیے میرزا صاحب کے پاس کشمیر چلے گئے اور برسوں ان کی خدمت میں رہ کر اصلاح لیتے رہے۔ فارغ ہونے کے بعد پھر لاہور آ گئے۔ یہ ان کے بڑے زور کا زمانہ تھا کہنے کی سیاہی سے قطعات لکھنے کا سودا سر میں سمایا ہوا تھا۔ کام صرف اتنا ہی کرتے تھے جس سے دال روٹی چل سکے۔ ان کی رہائش محلہ شیعاں میں تکیہ نتھے شاہ کے بالمقابل بازار میں تھی۔ لاہور میں ان کے بیسیوں قطعے آج بھی موجود ہیں جو ان کی استادی اور مشاقی کے گواہ ہیں۔ راقم الحروف کے پاس بھی ایک قطعہ جلی قلم میں موجود ہے جس میں لکھا ہے ؎

گر شیر در زمان بہار عدالت است
بینید رُخ غزالہ کہ از لالہ احمر است
وز ترس تب کند کہ مبادا گماں کنند
کیں سرخی از طپانچۂ ظلم غضنفر است

آپ چند روز کے لیے منشی عبدالمجید پرویں رقم مرحوم کی بیٹھک اندرون لوہاری دروازہ میں چلے گئے تھے وہیں پلیگ میں مبتلا ہو کر انتقال کیا۔ دوست اس غریب الوطن، بے کس کی لاش موچی دروازہ میں لے آئے اور غسل کفن کے بعد مومن پورہ کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا۔ سال وفات ۱۹۱۹ء ہے۔

میاں علی بخش میاں علی محمد عرف میاں علی بخش کربلائی لاہور میں پیدا ہوئے۔ دینی تعلیم کے بعد تیرہ چودہ برس کی عمر میں میرزا امام ویردی کی شاگردی اختیار کی اور اس قدر مشق کی کہ استاد مانے گئے۔ خطِ نستعلیق، نسخ، طغرا، ناخن، شکستہ میں ماہر تھے۔ خطِ معکوس میں جگت استاد مانے گئے۔ ابتدا میں کوہ نور پریس میں ملازم تھے وہاں خطِ معکوس کا نمونہ طبع کرکے اس برصغیر کے تمام معکوس نویسوں کو چیلنج کیا اور اپنا استادی کا لوہا منوایا۔ آج لاہور میں جتنے بھی معکوس نویس اور سنگ ساز ہیں ان کی شاگردی کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح میاں علی بخش تک پہنچتا ہے۔

کوہ نور پریس بند ہو گیا تو میاں علی بخش رائے صاحب منشی گلاب سنگھ کے مطبع مفید عام میں چلے آئے اور پھر ساری عمر وہیں عزت کے ساتھ رہے اور اعزاز کے ساتھ ریٹائر ہوئے۔ ان کے لکھے ہوئے بیسیوں قطعات لاہور کے امام باڑوں میں موجود ہیں۔ ان کے شاگردوں میں مشہور معکوس نویس منشی صفدر علی، منشی رکن الدین، منشی اشرف علی، منشی معراج علی وغیرہ تھے۔ راقم خود بھی ان کے شاگردوں میں سے ہے۔

مطبع مفید عام سے سبکدوش ہونے کے بعد میاں علی بخش نوابان قزلباش کے بچوں کے دینیات کے اتالیق مقرر ہو گئے تھے۔ ۱۶ر جنوری ۱۹۲۶ء کو ۸۲ برس کی عمر میں انتقال کیا اور قبرستان مومن پورہ میکلوڈ روڈ میں دفن ہوئے۔ ان کے وقت میں سنگ سازوں کی اجرت کے بارے میں کچھ شکایات پیدا ہو گئی تھیں اور انھوں نے کام بند کر دیا تھا، مگر رائے صاحب منشی

گلاب سنگھ نے میاں علی بخش کو بلا کر اختیار دے دیا کہ وہ اپنی اُجرتیں آپ مقرر کر لیں چنانچہ اُنھوں نے جو چاہا وہ ہو گیا۔

ملک صفدر علی آپ مرزا احمد علی کشمیری کے شاگرد تھے، عربی اور اُردو خوب لکھتے تھے۔ خطِ معکوس لکھنے میں کمال حاصل تھا۔ تمام عمر مفید عام پریس میں گزاری۔ کچھ عرصہ شمس العلما مولوی سید ممتاز علی کے رفاہ عام پریس میں بھی کام کیا۔ اس زمانے میں مولوی سید احمد دہلوی کی کتاب فرہنگ آصفیہ چھپ رہی تھی۔ اس دوران پتھر پر کتاب کی صحت میں قابلیت اور خوبی سے کی کہ مصنف نے اعتراف کے طور پر مندرجہ ذیل خط لکھا:۔

"حافظ صفدر علی صاحب مصحح سنگ رفاہ عام پریس لاہور نے میری کتاب فرہنگ آصفیہ کی جلد چہارم کے پتھر تقریباً نصف سے زیادہ بنائے۔ میرا خیال تھا کہ منشی علی بخش صاحب سے زیادہ اس کام میں دوسرا شخص مہارت نہیں رکھتا۔ کیونکہ اوّل تو وہ گورنمنٹ بک ڈپو میں میرے ماتحت ۱۸۸۰ء میں رہ کر ہمیشہ تحسین و آفرین کے مورد رہے۔ دوسرے یہ کہ حافظ صاحب کے اُستاد بھی رہے ہیں لیکن چونکہ منشی علی بخش صاحب نے تقاضائے عمر سے یہ کام بالکل چھوڑ دیا ہے، اس وجہ سے یہ کہنا بے جا نہیں کہ اس وقت حافظ صفدر علی صاحب سے بہتر لاہور میں کوئی سنگ ساز نہیں ہے۔ اُنھوں نے صفحے کے صفحے میری کتاب کے از سر نو پتھر پر لکھ کر اکثر اوقات خط سے خط ملا دیا۔ غلطیوں کو نہایت احتیاط اور درستی سے بنایا بلکہ املا میں کہیں غلطی نہیں کی۔ انگریزی اور ناگری کے الفاظ بھی خوب بنائے۔ پس اس سے زیادہ کیا لیاقت ہو سکتی ہے؟ میں نے خوش ہو کر ان کو کچھ پان کھانے کے واسطے بھی دیا۔ لیکن میں خوش جب ہوتا کہ اس وقت ان کی خدمت جیسا دل چاہتا تھا ویسی کر سکتا اور مجھ کو اس وقت عسرت مانع نہ آتی۔ فقط" سید احمد دہلوی بقلم خود۔ ۱۲ر جولائی ۱۹۰۱ء[1]

ملک صفدر نے ۱۹۲۲ء میں بعارضہ فالج انتقال کیا اور مومن پورہ میں دفن ہوئے۔ ان کے شاگردوں میں مولوی محمد دین سلیمان علی اور سید محمد شاہ بہت اچھے خوش نویس تھے۔ مگر سب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

منشی عبدالمجید پروین رقم آپ کے والد منشی عبدالعزیز اور دادا مولوی پیر بخش خوش نویس تھے جو امین آباد کے رہنے والے تھے۔ منشی عبدالمجید نے ابتدا میں خلیفہ نور احمد مرحوم سے اصلاح لی مگر بعد میں اپنے اکثر شاہکاروں پر اپنے نام کے ساتھ حکیم فقیر محمد چشتی کی شاگردی پر فخر کا اظہار کیا۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ آپ پیدائش ہی سے ایسا دماغ لے کر آئے تھے جو کسی اصلاح کا محتاج نہیں ہوتا۔ جو ہر گوشے سے متمتع ہوتا اور ہر خرمن سے خوشہ حاصل کر لیتا ہے۔

منشی عبدالمجید نے خدا داد ذہانت سے فن خوش نویسی میں ایک نئی طرز ایجاد کی جو ان کے پیش روؤں سے قدرے

---

[1] نقوش مکاتیب نمبر صفحہ ۲۴۱

مختلف اور خوب صورت ہے۔ آج کا ہر خوش نویس اسی کی پیروی کر رہا ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے کلام کی کتابت کے لیے انہی کو پسند کیا۔ آپ کے لکھے ہوئے قطعات دلکشی میں بے مثال ہیں اور بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔

منشی عبدالمجید لوہاری منڈی میں رہتے تھے۔ بڑے خوش پوش اور خوب صورت تھے۔ ہاتھوں کی انگلیاں بڑی نرم و نازک تھیں۔ یہی نزاکت ان کے فن میں بھی تھی۔ آخری عمر میں تصوف کے غلبے کی وجہ سے کام تھوڑا کرتے تھے۔ درود و وظائف میں زیادہ مصروف رہتے تھے۔ لباس فاخرہ بھی ترک کر دیا تھا۔ نہایت سادہ اور فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ بازار میں بھی نکلتے تو تسبیح ہاتھ میں ہوتی تھی۔ آخر یہ گوہر آبدار ۱۹۴۳ء میں قریباً ۷۵ برس کی عمر پا کر اور اپنے فن کا لوہا منوا کر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

آپ کے بے شمار شاگرد ہیں بلکہ یہ کہنا غلط نہیں کہ آج کا ہر خوش نویس طرز کے لحاظ سے انہی کا پیرو کار ہے۔ آپ کے صاحبزادے منشی محمد اقبال ہیں جنھوں نے مزار اقبال کے فارسی اشعار بڑی خوبی سے لکھے ہیں۔ شاہ ایران نے انھیں پسند فرما کر "خوش نویسی خوب است" کے جملے سے داد کمال دی ہے۔

منشی غلام محمد ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ ریلوے ٹیکنیکل اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد اپنے نامور باپ خطاط اعظم حاجی دین محمد سے خوشنویسی کی اصلاح لی۔ انھوں نے اپنی تمام خوبیاں اپنے اکلوتے بیٹے میں منتقل کر دیں۔ والد کے ساتھ کام شروع کیا۔ خوش نویسی۔ بورڈ نویسی، ڈرائنگ نقاشی بلکہ بڑھئی تک کا کام بھی کر لیتے تھے۔ خوش نویسی میں نسخ، نستعلیق اور طغرا وغیرہ یکساں مہارت اور تیزی سے لکھتے تھے۔ بڑی شہرت حاصل کی۔ ۱۹۳۹ء میں حاجی دین محمد صاحب حیدر آباد دکن گئے ہوئے تھے کہ یہ بیمار ہو کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔

منشی فضل الٰہی مرغوب رقم چوک متی میں ان کی بیٹھک تھی۔ خوب لکھتے تھے۔ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں مولانا حالی، مرزا ارشد گورگانی، میر ناظر حسین ناظم لکھنوی، خان احمد حسین خان، آغا حشر کاشمیری، میر غلام بھیک نیرنگ، خواجہ دل محمد اور دوسرے بلند پایہ شاعر جو نظمیں پڑھتے تھے، وہ پڑھنے سے پہلے طبع کرا لی جاتی تھیں۔ منشی مرغوب رقم ان سب کی کتابت کرتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کا نام بہت مشہور ہو گیا تھا۔ ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی نظمیں دیکھ کر آج بھی جی خوش ہوتا ہے۔

قاضی فضل حسین کوچہ قاضی خانہ میں رہتے تھے۔ بڑے اچھے خوش نویس تھے۔ دایاں ہاتھ کسی وجہ سے بیکار ہو گیا تھا۔ بائیں ہاتھ سے لکھتے تھے۔ آج سے چالیس سال پیشتر زندہ تھے۔ قطعات بھی لکھتے تھے جن کے نیچے نام یوں ہوتا تھا:۔

"کاتب الحروف فضل حسین بدست چپ"

ان کا ایک قطعہ فقیر سید مغیث الدین کے ذخیرۂ نوادرات میں موجود ہے۔

مولوی نور الدین، منشی عبد الحفیظ شاہ عالمی دروازہ کے اندر مسجد موراں کے بالمقابل کوچہ ٹھ ڈگراں کی طرف ایک اور مسجد ہے جس کے امام مولوی نور الدین نے خوش نویسی کو اپنا ذریعۂ معاش بنایا ہوا

تھا۔ وہ منشی گلاب سنگھ کے چھاپہ خانے میں ملازم تھے اور میاں نتھو کے ہونہار شاگرد تھے۔

مولوی نور الدین نے اپنے فرزند عبدالحفیظ کو مجتہدِ فن منشی عبدالمجید پروین رقم کا شاگرد کرایا اور وہ نہایت اچھا لکھنے لگا۔ خیال تھا کہ پختگی کی عمر کو پہنچ کر اُستادوں میں شمار ہوگا مگر یہ ہونہار خوش نویس عین جوانی میں اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ مرحوم منشی تاج الدین زرّیں رقم اور اس خاکسار کا ہم مکتب و ہم جماعت تھا۔ ہم تینوں اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ میں برسوں زیرِ تعلیم رہے۔ وفات کے وقت حفیظ مرحوم کی عمر بمشکل ۳۰ برس ہوگی۔

تاج الدین زرّیں رقم

منشی تاج الدین زرّیں رقم ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اسلامیہ ہائی اسکول بھاٹی دروازہ لاہور میں حاصل کی۔ اس کے بعد اپنے ماموں الحاج منشی نور احمد صاحب کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا اور برسوں مشق کرتے رہے۔ ابتدا میں بچوں کا ہفتہ وار اخبار نونہال لکھتے تھے۔ جو اُن دنوں جناب حکیم احمد شجاع صاحب کی ادارت میں نکلتا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۳۶ء میں "مرقع زرّیں" کے نام سے اپنی اصلاحیں اور سہ باعیات طبع کرائیں جو بڑی شہرت کا باعث ہوئیں۔ مرقع زرّیں، مبتدیوں سے لے کر صاحبِ فن حضرات تک رہبری کا باعث بنا۔ آپ کئی سال خوش نویس یونین کے صدر منتخب ہوئے۔ آپ نے خوش نویس یونین کی شاخیں قائم کرنے کے لیے ملک بھر کا کامیاب دورہ کیا۔ دلّی۔ بمبئی۔ حیدر آباد دکن۔ پشاور اور کراچی تک گئے۔ خوشنویسوں کو ایک باوقار مقام عطا کرنے کے لیے شب و روز کوشاں رہے۔ یہ آپ ہی کی اَن تھک مساعی کا نتیجہ تھا کہ اخبارات کے کاتبوں کی اُجرتیں دوگنا بلکہ چار گنا ہوگئیں۔ ان کی مساعی سے خوشنویس یونین اتنی مضبوط تھی کہ خوشنویسوں کے کسی ایک معاملہ میں ملاپ اور پرتاپ سے ٹھن گئی اور مالکانِ اخبار کسی طرح خوشنویسوں کے مطالبات ماننے کے لیے راضی نہ تھے۔ چنانچہ صدر کی حیثیت سے منشی صاحب نے مالکان سے کہہ دیا کہ یا تو ہمارے مطالبات مان لیجیے ورنہ فلاں تاریخ کو خوشنویس ہڑتال کر دیں گے اور آپ کے اخبارات شائع نہ ہوسکیں گے۔ مالکان نشے میں تھے۔ انھوں نے یہ جواب دیا کہ گورنمنٹ تو ہمارے اخبارات بند نہ کرا سکی۔ آپ کیا کرائیں گے (بعد میں پرتاپ سے کوئی سمجھوتہ ہوگیا تھا۔ اس لیے محاذ کا رُخ صرف ملاپ کی طرف رہا) ——— مگر صحافتی دنیا نے دیکھ لیا کہ مالکان کی ہزار جدوجہد کے باوجود ملاپ ایسا بڑا اخبار شائع نہ ہوسکا ——— غرض کہ جہاں کسی خوشنویس کو کوئی مشکل پیش آتی یہ وہاں اس کی امداد کو پہنچتے۔ فن اور فن کار کی جتنی خدمت انھوں نے کی۔ وہ کسی اور کے بس کی بات نہیں۔

آپ خفی و جلی، نسخ و نستعلیق اور ثلث وغیرہ نہایت عمدگی سے لکھتے تھے۔ بڑے بڑے بورڈ اور پوسٹروں کے عنوان آنکھ جھپکنے میں لکھ ڈالتے تھے۔ جلی لکھنے اور تیز لکھنے میں ان کا کوئی مثیل پیدا نہ ہوا۔

آپ نے ایک مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر بے شمار قطعات لکھے (تقریباً دو سو) آپ کا خیال اپنے شاہکاروں کی نمائش منعقد کرنے کا تھا۔ مگر یہ کام ان کی صحت کی خرابی کی وجہ سے رہ گیا۔ ضرورت ہے کہ اب کوئی انھیں یکجا کر کے ان کی نمائش اور اشاعت کا بندوبست کرے۔ سنا ہے کہ مرحوم کے ایک فرزند نے انھیں نہایت ہی قلیل اُجرت پر کسی کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے ——— ۴۵ برس کے سن میں ۱۳ جون ۱۹۵۵ء کو بعارضہ دباؤ خون وفالج انتقال کر گئے۔ آپ کے شاگردوں اور مداحوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جن میں۔ حافظ یوسف رصوفی، خورشید اور سید انور حسین نفیس رقم بڑی شہرت کے مالک ہیں۔

منشی اشرف علی آپ میاں علی بخش کے بھتیجے اور شاگرد تھے۔ عربی اردو دونوں خوب لکھتے تھے۔ عبارت کو پھول پتوں سے سجانا بھی جانتے تھے۔ خطِ معکوس میں بھی ماہر تھے۔ ان کے لکھے ہوئے قطعات ان کے عزیزوں کے پاس موجود ہیں۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں وفات پائی اور مومن پورہ میں دفن ہوئے۔

خلیفہ عزیز الدین شاہ عالمی دروازہ کے اندر مسجد موراں میں کتابت کرتے تھے۔ غالباً میاں نتھو کے شاگرد تھے۔ پہلے رائے صاحب منشی گلاب سنگھ کے مطبع مفید عام میں کام کرتے تھے۔ بعد میں لالہ عطر چند کپور کے درسی سلسلہ کی کتابت کرنے لگے۔ بڑی عزت کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ میانی صاحب کے قبرستان میں آسودۂ خواب ہیں۔

حکیم محمد چراغ حکیم غلام علی کے فرزند اور منشی عبدالغنی نتھو کے شاگرد تھے۔ چوہٹی کابلی مل ڈبی بازار میں رہتے تھے۔ تمام عمر مطبع مفید عام میں گزاری۔ قیامِ پاکستان کے بعد بتقاضائے سن کام چھوڑ دیا تھا اور صرف طبابت کرتے تھے۔ درسی کتب نہایت عمدگی سے لکھتے تھے۔ خطِ نسخ اور نستعلیق میں بڑے پختہ مشق تھے۔ مسطر کشی میں کمال حاصل تھا۔ سنہ ۱۹۵۲ء میں وفات پائی اور میانی صاحب میں دفن ہوئے۔

منشی اسد اللہ خاں یو۔پی کے رہنے والے تھے۔ ابتدائے جوانی میں لاہور آئے اور پھر ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو گئے۔ اپنی طرز کے واحد لکھنے والے تھے۔ ان کی لکھائی پر دہلی کا اثر غالب تھا۔ درسی کتب کی کتابت کرنے والوں میں ان کا درجہ بہت بلند تھا۔ قطعات بھی لکھتے تھے مگر رباعی کے قلم سے موٹا کم ہی لکھا ہے۔ دیوانِ غالب مرقع چغتائی کا مصور ایڈیشن آپ کے کمال فن کا شاہکار ہے۔ اس کے علاوہ انجیل وغیرہ کی کتابت بھی خوب محنت سے کی۔ نہایت با اخلاق اور شریف الطبع تھے۔ بازار سرباں والہ نزد کشمیری بازار میں رہتے تھے۔ ۸۴ سال کی عمر میں وفات پائی اور میانی صاحب کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

مولوی عبدالرشید عادلی ان کا لقب محبوب الرقم تھا۔ عربی فارسی کے اچھے فاضل اور بہت مشہور خطاط تھے۔ شعر و ادب کا مذاق بھی رکھتے تھے۔ سنہ ۱۸۶۵ء میں موضع عادل گڑھ (ضلع گوجرانوالہ) میں پیدا ہوئے۔ ۱۴ برس کی عمر میں عربی خط کی مشق شروع کی۔ زود نویسی کا یہ عالم تھا کہ اڑھائی مہینے میں پورا قرآن مجید لکھ لیا کرتے تھے۔ دس برس تک پشاور میں رہنے کے بعد لاہور آئے ۲۵ برس یہاں رہے۔ ساٹھ برس فن خطاطی کی خدمت کی۔ بینائی اتنی اچھی تھی کہ آخری عمر تک چشمہ استعمال نہیں کیا۔ ۸۵ برس کی عمر میں ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ اپنے گاؤں عادل گڑھ چلے گئے۔ جہاں تین برس تک بیمار رہنے کے بعد ۲۹ر نومبر سنہ ۱۹۶۱ء کو انتقال کیا۔ ان کے شاگردوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ مرحوم نسخ کی ایک خاص طرز کے مالک تھے جسے عادل گڑھی طرز کہتے ہیں۔

مولوی محمد عبداللہ وارث کوٹ ضلع گوجرانوالہ کے رہنے والے تھے۔ تمام عمر لاہور میں قرآن پاک کی کتابت کرتے رہے۔ بہت عمدہ لکھتے تھے۔ ان کی طرز عادل گڑھی طرز سے قدرے مختلف تھی۔ انھوں نے بیسیوں قرآن مجید لکھے۔ نستعلیق بھی لکھتے تھے مگر زیادہ تر نسخ ہی کی طرف توجہ رہی۔ لاہور ہی میں فوت ہوئے۔ ان کے فرزند عنایت اللہ نے انجمن خدام الدین کا قرآن مجید بڑی محنت سے لکھا ہے۔

میر فرزند علی آپ بھی میاں عبدالغنی نتھو کے شاگرد تھے۔ مدت العمر پھول اخبار اور دارالاشاعت لاہور کی کتابیں لکھتے رہے آپ کی لکھائی نہایت واضح ہوتی تھی۔ پیوند کھول کر لگاتے تاکہ بچے پڑھنے میں دقت محسوس نہ کریں۔ بڑے خوش وضع، خوش پوش، خوش خور اور مہمان نواز تھے۔ خط معکوس بھی جانتے تھے۔ ۵۸ برس کی عمر پا کر ۱۹۵۵ء میں بعارضۂ سرطان فوت ہوئے۔

سلیمان علی موچی دروازہ کے اندر رہتے تھے۔ دبلے پتلے آدمی تھے۔ درسی کتابیں نہایت عمدگی سے لکھتے تھے۔ بڑے محنتی تھے۔ سنگ سازی میں بھی ماہر تھے۔ ملک صفدر علی کے شاگرد تھے۔ ۱۹۴۲ء میں ۵۵ برس کی عمر پا کر بعارضۂ نمونیہ انتقال کیا۔

منشی محمد انور آپ غالباً خلیفہ نور احمد مرحوم کے شاگرد تھے۔ نہایت دبلے پتلے، قد چھوٹا، مگر کسی وجہ سے کبڑی ہو گئی تھی۔ چوک متی میں ان کی بیٹھک تھی۔ برسوں وہاں رہے۔ رسالہ ہمایوں کی کتابت کرتے تھے اور خوب لکھتے تھے۔ بڑے شگفتہ مزاج اور شوقین تھے۔ آخری عمر میں مصری شاہ جا رہے تھے۔ وہیں فوت ہوئے۔ ان کے دو بھائی منشی محمد فضل اور منشی محمد عالم بھی خوش نویس تھے جو ڈیرہ کاتباں میں کام کرتے تھے اور پنڈت ٹھاکر دت شرما موجد امرت دھارا کے خاص کاتب تھے۔

منشی رحمت علی موچی دروازہ میں رہتے اور ڈیرہ کاتباں چوک متی کے سردار محمد عالم کے شاگرد تھے۔ نہایت صاف ستھرا اور عمدہ خط تھا۔ آخری عمر میں دارالاشاعت لاہور میں سید امتیاز علی تاج کی کتابیں وغیرہ لکھتے تھے۔ ان کی لکھی ہوئی کتابیں نہایت صاف ستھری چھپتی تھیں۔ انارکلی، الحمرا اور لیلےٰ عرف محاصرۂ غرناطہ کی کتابت ایسی عمدگی سے کی کہ معلوم ہوتا ہے آفسٹ پر چھپی ہیں۔ ۱۹۲۵ء میں قریباً ۴۶ برس کی عمر میں انتقال کیا۔

منشی جمیل احمد لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ کھلتا ہوا رنگ، درمیانہ قد، چھوٹا سر، دبلا پتلا جسم، بے حد کم گو اور محنتی تھے۔ لڑکپن ہی میں لاہور آ گئے تھے۔ شیرانوالہ دروازہ سے جو راستہ پرانی کوتوالی کو آتا ہے اس میں ایک کان لے کر رہتے اور کتابت کرتے تھے۔ ان کے پاس ہی محمود حسین پینٹر کی دکان تھی جو خوش نویس بھی بڑے اچھے تھے اور حاجی دین محمد کے شاگرد تھے۔ اسی جگہ کریمی پریس بھی تھا جو اس زمانے میں حسنِ طباعت کی وجہ سے خاص شہرت رکھتا تھا۔

منشی جمیل احمد نے یہاں رہ کر بڑی ترقی کی۔ لکھنے کی طرز پنجابی تھی۔ پھول پتے بھی خوب بناتے اور اپنے کام کو زیادہ سے زیادہ آراستہ و پیراستہ کرتے تھے۔ رسالہ عالمگیر برسوں لکھتے رہے۔ ان کے پوسٹر بہت ہی دلکش ہوتے تھے اور بہت پسند کیے جاتے تھے۔ کریمی پریس کے یہاں سے اٹھ جانے کے بعد یہ بھی لاتن سبحان خاں میں مولوی احمد علی صاحب کی مسجد کے پاس ایک مکان لے کر رہنے لگے۔ قیام پاکستان سے قبل کثرت کار کے سبب دق کا شکار ہو گئے۔ عمر کچھ زیادہ نہ تھی۔

منشی فضل الٰہی کیمبل پور کے رہنے والے تھے۔ بچپن ہی میں لاہور آ گئے۔ منشی عبدالمجید پروین رقم کے شاگرد ہوئے اور بہت اچھا لکھنے لگے۔ ہر قسم کا کام بڑی عمدگی سے کرتے تھے۔ برسوں لاہور میں رہے مگر آخری عمر میں پھر کیمبل پور چلے گئے وہیں پچھلے برس انتقال کیا۔ میرے خیال میں ان کی عمر ۵۵ یا ۵۶ برس ہو گی۔ رنگ گورا، نقش تیکھے، قد لمبا، بڑے خوبصورت اور خوش پوش تھے۔ کانوں سے بہرے تھے۔ بات کرنے میں زبان رکتی تھی۔ آواز نہایت باریک تھی مگر تھے بڑے ذہین بات کرنے والے

کے لبوں کو ہلتا دیکھ کر مطلب سمجھ جاتے تھے یا اپنے ہاتھ کی ہتھیلی مخاطب کے آگے کر کے اس کو انگلی سے اپنا مطلب سمجھانے کو کہتے تھے۔ وہ انگلی سے لکھتا جاتا اور یہ جواب دیتے جاتے۔

صبی بن قوی مولانا قوی امروہی بڑے فاضل ادیب شاعر اور خوش نویس تھے۔ دہلی سے رسالہ سوز و ساز نکالتے تھے۔ کتابت اتنی باریک اور سنگین کرتے تھے کہ اس سے زیادہ ممکن نہ تھی۔ صبی ان کے فرزند تھے۔ خوش نویسی کا فن اپنے باکمال باپ سے سیکھا اور نوجوانی ہی میں لاہور چلے آئے۔ نہایت دبلے پتلے، لمبے تڑنگے، سانولے سلونے خوبرو نوجوان تھے۔ رسالہ ادب لطیف کی کتابت کرتے تھے۔ زیادہ تر باریک ہی لکھتے تھے۔ خط بڑا مضبوط اور سنگین تھا۔ جوانی ہی میں بعارضہ دق انتقال کیا۔

یہ لاہور کے چند باکمال خوش نویسوں کا مختصر سا تذکرہ ہے جو اس دنیا سے عالم بقا کو سدھار چکے ہیں۔ اور بھی کئی قابل ذکر شخصیتیں ہوں گی جن کے حالات تک ہماری رسائی نہیں ہو سکی۔ بہرحال اتنا تو ہو گیا کہ اس موضوع پر جو بھی قلم اٹھائے گا اسے تھوڑا بہت مواد اس مضمون سے حاصل ہو جائے گا۔

لاہور میں اب بھی خوش نویسوں کی کمی نہیں۔ بلکہ شاید پاکستان کے تمام شہروں سے زیادہ ہی ہوں گے۔ ایک سے ایک بہتر اور اپنے اپنے دائرۂ کار میں بے مثال۔ انھوں نے کتابوں اور اخباروں کی کتابت کا معیار جتنا بلند کر دیا ہے اس سے پہلے ایسا کبھی نہ تھا۔ آنے والی نسلیں ان پر فخر کریں گی اور ان کے کارناموں کا تذکرہ اسی طرح عزت اور احترام سے کریں گی جس طرح آج ہم اپنے بزرگوں کا کر رہے ہیں۔

دورِ حاضر کے چند بڑے خوشنویس یہ ہیں: حاجی دین محمد، محمد شریف ابن سلطان القلم منشی محمد حسین (شاہ)۔ انور حسین نفیس رقم۔ منشی محمد صدیق الماس رقم۔ حافظ محمد یوسف سدیدی۔ محمود اللہ صدیقی۔ صوفی خورشید عالم۔ محمد شریف عباسی۔ محمد اقبال عباسی۔ اقبال ابن پروین رقم۔ پیر عبدالمجید۔ مولوی محمد حسین عاصی۔ احمد حسین جمیل رقم۔ خوشی محمد خوش رقم۔ صوفی نور الحسن۔

"نقوش" کی کتابت کرنے والے خوش نویس: ـــــ محمد سرور صدیقی۔ حامد محمود۔ سیف اللہ سیف رقم۔

اور سنگساز ـــــــــــ منشی محمد حسین صاحب کپور آرٹ والے، محمد دین، محمد عمران۔

چند بڑے ادیب

سیّد عابد علی عابدؔ

اصل مضمون کو شروع کرنے سے پہلے کچھ باتوں کی توضیح مجھ پر واجب ہے۔ ایک تو یہ کہ "ادیب" میں نے اس کلمے کے وسیع ترین معانی میں استعمال کیا ہے۔ چنانچہ انشا پرداز، شاعر اور ادب کی سرحدوں کو چھونے والے صحافی بھی ان میں شامل ہیں۔ وہ انتقاد بھی تخلیقی ادب ہے۔ جو اپنے اسلوبِ نگارش اور رفعت و عظمتِ معانی کی مطابقت اور اعتبار سے تبصروں، تقریظوں، تمہیدوں اور دیباچوں سے بلند تر ہو جاتا ہے۔

دوسری بات جس کی صراحت لازم ہے وہ یہ ہے کہ کوشش یہی کی گئی ہے کہ تاریخی ترتیب قائم رہے۔ لیکن نقوش کے فاضل مدیر نے میرا دائرہ عمل یوں متعین کر دیا کہ جن لوگوں کا میں ذکر کروں۔ ان کا ادبی مقام متعین و مشخص کر دوں، مقصود فقط یہ ہے کہ جن ادیبوں کا میں ذکر کروں اردو ادب میں ان کے رتبے اور مقام کی نشاندہی کر دوں۔ ادبی مقام کا تعین اصول انتقاد کے مطابق کیا گیا ہے لیکن جزئیات میں اختلاف رائے ہمیشہ رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس لیے آپ کے پسندیدہ ادیب کا مقام میں نے آپ کی دانست میں صحیح متعین نہ کیا ہو تو خفا ہونے سے پہلے اس بات پر غور فرمائیے کہ یہ میری ذاتی رائے کا اظہار ہے (ہر چند کہ بنیادی امور میں اصول انتقاد کا پابند ہے) یہ بات میں نہایت تفصیل سے اپنی تالیف اصول انتقاد ادبیات میں کہہ چکا ہوں۔

تیسری بات یہ ہے کہ جن ادیبوں کا اس مضمون میں ذکر ہے۔ ان کی علمی اور ادبی زندگی یا اس کا کوئی پہلو لاہور سے مربوط ہے۔ لاہور نے ان سے فیض اٹھایا ہے اور وہ لاہور کے علمی ماحول سے متاثر ہوئے ہیں یا پھر وہ بکثرت لاہور آتے جاتے رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ ادیب بھی شامل ہیں جن کا وطن ہی لاہور ہے۔ کچھ ادیب ایسے ہیں کہ ملازمت میں برصغیر پاک ہند کے اس حصے سے لاہور آئے جسے اب بھارت کہتے ہیں۔ اور کچھ عرصہ یہاں رہ کر چلے گئے۔ لیکن لاہور کا سینہ ان کی یادوں کا خزینہ ہے۔ انھوں نے بھی لاہور کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ اور اپنی تحریروں میں کبھی محبت سے اور کبھی حسرت سے لاہور کا ذکر کرتے رہے۔ جو پرانے وقتوں سے علم و فضل کا مصدر و ماخذ رہا ہے۔ اور جہاں ادب نے نت نیا رنگ بدل کر بتایا ہے۔ کہ اس دیار کا علمی اور ادبی مزاج جامد و ساکت نہیں۔ متحرک اور تغیر پذیر ہے۔ یہی زندگی کی علامت ہے۔ غزنویوں کے زمانے سے لے کر جو آل سبکتگین کے فشار سے مجبور ہو کر پنجاب چلے آئے تھے۔ آج تک (کہ ۱۹۶۲ کا آغاز ہے) یہاں متنوع، متعدد اور مختلف و متضاد ادبی تحریکات پھلتی پھولتی اور پروان چڑھتی رہی ہیں اور ہمیشہ تمام مل کر ایک جزو کل ہو گئی ہیں۔ جو اپنے دامن میں ہر تنوع اور تغیر کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ شاید لاہور ہی کے لیے کسی نے کہا ہے۔ ؎

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار

شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد (ولادت [1] ۱۸۳۳ء)

ادب میں ان کا مقام متعین کرنے سے پہلے یہ حق بات بھی کہہ دینی چاہیے کہ پنجاب میں اردو کو جو فروغ حاصل ہوا ہے ۔ اس کے مختلف عوامل و محرکات میں آزاد کی بے چین اور بے قرار طبیعت بھی تھی ۔ جو ادب کے مختلف شعبوں میں کام کرتی ہوئی نظر آتی ہے ۔ مرزا محمد سعید (جو کبھی گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی ادبیات کے استاد تھے اور جن سے احمد شاہ بخاری مرحوم (پطرس) نے بہت فیض اٹھایا ہے) یہ کہتے ہیں کہ آزاد کے اسلوب نگارش کی انفرادیت مسلم ہے ۔ لیکن یہ انفرادیت ایسے مقام تک جا پہنچی ہے کہ کوئی ادیب ہزار کوشش کے باوصف اس کا تتبع نہیں کر سکتا ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا اسلوب ان کے ساتھ ہی پروان چڑھا اور ساتھ ہی اردو ادب کی تاریخ کا ایک حیرت انگیز کرشمہ بن کر نوادر میں شامل ہو گیا ۔

اگر ادب کے عجائبات نادری بھی متعین کیے جا سکتے ہوں ، تو آزاد کے اسلوب کو انہی عجائبات و طلسمات میں شمار کرنا پڑیگا ۔ مرزا صاحب کا یہ قول کہ آزاد کا تتبع نہیں کیا جا سکتا ۔ درست ہے لیکن ان کے کلام سے جو یہ تبادر ہوتا ہے کہ یہ اسلوب بے ثمر رہا کہ کوئی اس کی تقلید نہ کر سکا یہ بات محل نظر ہے ۔ آزاد کے اسلوب کا تجزیہ کرنے سے پہلے میں یہ بات بہ وضاحت کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اگر آزاد کا اسلوب نگارش ہمارے سامنے نہ ہوتا تو ہم یہ کبھی نہ جان سکتے کہ اندازِ تحریر ۔ اسلوب نگارش یا ابلاغ و اظہار کا طریق مخصوص جسے انگریزی میں STYLE (سٹائل) کہتے ہیں کیا چیز ہے ۔ انھوں نے یہ بات واضح کر دی کہ اسلوب کی انفرادیت کس مقام تک پہنچ سکتی ہے اور نقادوں کا یہ دعوے کہ بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ انتقادی فیصلہ صادر کیا جا سکتا ہے کہ فلاں تحریر فلاں ادیب کی ہے یا مجہول ہے ۔ بقطع و تیقن درست ٹھہرا ۔ یہ بڑی بات ہے کہ ہم نے گویا اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ صاحب طرز انشاپرداز کا رنگ ڈھنگ کیا ہوتا ہے ۔

میرے خیال میں (ان کے علمی اور ادبی کارناموں سے قطع نظر) آزاد کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اسلوب کی اہمیت ہم پر واضح کر دی اور طرز نگارش کی انفرادیت کو یہاں تک لے گئے کہ ان کی نثر دوسرے انشاپردازوں کی نثر سے بیک نظر جدا کی جا سکتی ہے ۔ اسلوب کی انفرادیت کا یہ نمونہ سامنے نہ ہوتا تو بیشتر ادیب اس نکتے سے بے خبر رہتے کہ تخلیقات ادبی میں اظہار ذات کی تکمیل تبھی ہوتی ہے کہ نگارش میں انفرادیت ہو ۔ اسلوب میں کچھ خصوصیات ہوں ۔ جو دوسروں کے اسلوب میں بیک وقت اس طرح نظر نہ آئیں ۔

اب رہا یہ سوال کہ ان کے اسلوب نگارش کے وہ اجزا کیا ہیں ۔ جن سے ان کی انفرادیت متعین ہوتی ہے تو میں یہ بات واضح کر دوں کہ نقاد کا زور بیان صرف اسلوب کی خصوصیات کی نشاندہی کر سکتا ہے ۔ یہ نہیں کر سکتا کہ اسلوب کا تجزیہ یوں کرے کہ آپ بھی انہی خصوصیات سے متصف ہو کر محمد حسین آزاد بن جائیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ سر سید احمد خاں نے جو یہ کوشش کی تھی کہ اردو ایک علمی زبان بن جائے اور ہر قسم کے مطالب و معانی کو بوجوہ احسن ادا کر سکے ۔ آزاد بھی اسی تحریک کے علمبرداروں میں سے ہیں ۔ لیکن ان موئوں ادیبوں کے نقطہ ہائے نظر میں زمین آسمان کا فرق ہے ۔ سر سید احمد خاں چاہتے ہیں کہ مطالب علمی و تحقیقی سلیس اور رواں زبان میں ادا ہو جائیں ۔ وہ اظہار معانی کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ اگر کہیں کہیں نثر سپاٹ ہو جائے تو اسے بھی گوارا کر لیتے ہیں کہ ابلاغ میں فرق نہ آئے ۔ گویا ان کا اسلوب نگارش پرانے مرصع اسلوب کی ضد ہے ۔ اس کے برخلاف آزاد کی روش یہ ہے کہ وہ زبان جو محض مرصع نگاری تھی اسی کو تمام مطالب کے اظہار ابلاغ کے لیے استعمال کیا جائے ۔ اس کوشش میں انھیں جو کامیابی ہوئی اس کے عوامل اور محرکات کا ڈھونڈھنا کچھ مشکل نہیں ۔ وہ ذوق کے شاگرد تھے جو زبان کا ماہر تھا ۔ اور اردو کے محاورات

---

[1] جدید شعرائے اردو

پر عبور تام رکھتا تھا شعری روایت کی تمام نزاکتوں اور دلالتوں سے باخبر تھا۔ اس کے باوصف اس کی زبان میں خاص گھلاوٹ تھی جیسے فراقؔ اُردو پن کہتے ہیں۔ یہ گھلاوٹ شیرینی اور رس ذوقؔ کے مقطعوں میں بہت نمایاں ہے۔ مثلاً

جس جگہ بیٹھے ہیں بادیدۂ نم اٹھے ہیں
آج کس شخص کا منہ دیکھ کے ہم اٹھے ہیں

بوسے کے مانگتے ہی پھیر نے چتون کو لگے
ایسے کیا لعل لب غیرت گلشن کو لگے

موت ہی سے کچھ علاج درد فرقت ہو تو ہو
غسل میت ہی ہمارا غسل صحت ہو تو ہو

داغؔ نے اسی گھلاوٹ اور اس کو تیکھا پن بخشا۔ اور اپنے لہجے میں وہ ڈرامائی اسلوب پیدا کیا۔ جو اس سے مخصوص ہے۔ آزادؔ نے داغؔ کی طرح گھلاوٹ۔ رس۔ شیرینی اور اُردو پن تو ذوقؔ سے لیا۔ لیکن انھوں نے کلاسیکی شاعری کے جتنے علائم و رموز تھے۔ پیش نظر رکھے۔ استعارات اور تشبیہات کو یوں اپنے کلام میں سمو دیا کہ گھلاوٹ اور رس میں ذرا بھی فرق نہ آیا۔ لیکن ایک منفرد اسلوب وجود میں آیا جس میں قدیم انشا پردازوں کی مرصع نگاری کے تمام اجزائے خوب و محبوب موجود تھے۔ لیکن جس میں تکلف نام کو بھی نہ تھا۔ واضح رہے کہ آزادؔ کے اسلوب کی بے تکلفی بظاہر بے تکلفی نظر آتی ہے۔ وہ اظہار مطلب و معانی کے لیے سر تا سر کھپاتے ہیں۔ انگریزی محاورے کے مطابق کہا جا سکتا ہے کہ "آدھی رات کو چراغ جلا کر اپنی تحریر سے فضا کو روشن کر دیتے ہیں۔" ان کی کوشش یہ تھی اور وہ اس میں بدرجہ اتم کامیاب ہوئے کہ نفس مضمون ادبی ہو یا علمی۔ تحقیقی ہو یا انتقادی پیرا اسلوب ایسا مرصع۔ دلکش اور دلپذیر رہے کہ پڑھنے والا اردو زبان کی ممکنات سے بوجہ احسن آگاہ ہو جائے۔ آزادؔ کو فارسی پر تو عبور تھا ہی۔ عربی کے استاد تھے۔ وہ الفاظ کے انتخاب میں ان کی نشست میں۔ پھر جملوں کی ترتیب میں اتنی جانکاہی سے کام لیتے ہیں کہ وہی شخص دراصل ان کے کمال سے واقف ہو سکتا ہے جو الفاظ کی تمام دلالتوں سے آگاہ ہو اور نفس مضمون سے کما حقہٗ آگاہ ہو۔

دوسری بات جو آزادؔ کے اسلوب کی ایک خصوصیت ہے یہ ہے کہ وہ تصویر نگاری میں پیکر تراشی میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ "آب حیات" ہو یا "قصص ہند" "نیرنگ خیال" ہو یا "دربار اکبری" جہاں وہ کسی کردار کو ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ دو تین فقروں میں ایسا کچھ کہہ جاتے ہیں کہ کردار جیتا جاگتا۔ روشن اور ہنستا بولتا نظر آتا ہے۔ آب حیات کی مقبولیت کا یہی راز ہے کہ اس تذکرے میں سیاسی اور معاشرتی فضا کا پس منظر ہمیں معلوم ہو یا نہ ہو کردار تمام زندہ ہیں۔ ان کی طلسم کاری کا ثبوت اس سلسلے میں اس سے زیادہ کیا ہوگا۔ کہ انھوں نے غلط بات بھی لکھ دی تو پتھر کی لکیر ہو گئی۔ ذوقؔ کو غالبؔ سے بلند تر مقام پر بٹھا دیا۔ اور ابھی تک بہت سے لوگ ایسے ہوں گے جو اسی فیصلے پر قائم ہیں۔ شہزادہ سلیم (جہانگیر) اور انارکلی کی داستان (کمبزوروں والا قصہ) مختصر سے لفظوں میں ایسی قلمبند کیں کہ اس افسانے کی تردید میں بعض محققوں کو صدہا صفحات لکھنا پڑے۔ پھر بھی اس افسانے کی فسوں طرازی قاری کو مبہوت کیے دیتی ہے۔

میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ آزادؔ کی بے قرار اور بے چین طبیعت ہر صنف ادب سے عہدہ برآ ہونا چاہتی ہے۔ حد یہ ہے کہ

نثری کارناموں کے علاوہ جدید نظم کی منظم تاسیس کا سہرا انہی کے سر باندھنا پڑتا ہے۔ یہ بڑی بات ہے کہ ایک شخص جو اصلاً نثر نگار ہو اور قدیم انشا پردازی کے ماحول میں پلا ہو بے قافیہ نظم بھی لکھے۔ ان کی تالیف نظم آزاد اردو میں ایک کارنامہ ہے۔ انھوں نے پہلی بار اس سلسلے میں اردو کی ممکنات کی وضاحت کی۔ جدید نسل آزاد کے فیض سے مستفید ہوئی ہے اور میرا خیال ہے کہ کوئی نسل ایسی نہ ہوگی جو آزاد کے کارناموں سے متاثر نہ ہو۔

ان کے اسلوب کی خصوصیات کا ذکر کرنے کے سلسلے میں ان کے مقام کی طرف بھی اشارہ کر چکا ہوں۔ لیکن اب بتصریح لکھتا ہوں کہ سرسید نے جو تحریک شروع کی تھی۔ اس کے علمبرداروں میں آزاد کو میں پہلا مقام دیتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی ہر تخلیق کو ادبیت کے مقام جلیل تک پہنچا دیا۔ ذرا غور فرمائیے لسانیات میں "سخندان فارس" تاریخ میں "دربار اکبری" تذکرے میں "آب حیات" مثالیہ[1] (ALLEGORY) میں "نیرنگ خیال" درسیات میں "قصص ہند" یہاں تک کہ گرامر میں جامع القواعد (فارسی زبان سے متعلق لیکن اردو میں لکھی ہوئی) ان سب کتابوں کا اسلوب ایسا ہے کہ تحقیق بھی اور انتقاد بھی تاریخ بھی اور تدریس بھی ادب کا پیرہن زرنگار پہن کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان کے اس تنوع کو دیکھیے تو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ آزاد انیسویں صدی کے اواخر کے یا بیسویں صدی کے اوائل کے سب سے بڑے انشا پرداز تھے کہ انھوں نے جو کچھ لکھا وہ ادبیت سے رنگین ہے۔ بے شک "آب حیات" پر اعتراضات ہوئے ہیں "قصص ہند" بھی اغلاط سے خالی نہیں۔ "دربار اکبری" میں بھی شخصی رجحان کا پہلو بہت نمایاں ہے۔ "سخندان فارس" میں جو ابواب خالص لسانیات سے متعلق ہیں۔ وہ اب زیادہ کام کے نہ رہے۔ لیکن ان باتوں کے باوجود ان تمام تصانیف کی ادبی حیثیت سے اور ان کے مقام جلیل سے انکار کرنا ناممکن ہے۔ انشا پردازی اس مقام تک تو پہنچی ہوئی ہو کہ مولف غلط لکھے اور پھر بھی پیارا ہو بلکہ ادب کی آنکھ کا تارا ہو۔ ان کے تنوع کو شررؔ نے اپنایا لیکن "مولوی مدن کی سی بات" پیدا نہ ہوئی۔ ان کا تذکرہ "آب حیات" حافظ محمود شیرانی کی تنقید کے باوصف ایسی کتاب ہے کہ اسے پڑھ کر اردو کے شعری سرمایے کا مزید مطالعہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔ فکری تنوع کی حد ہو گئی کہ ادھر آزاد نظم جدید کے موسس ہیں۔ ادھر اردو میں لسانیات پر پہلی تصنیف کے مولف ہیں۔ اور ساتھ ہی تعلیم و تدریس کے سلسلے میں توقیف[2] کے اصول مدون کرتے ہیں۔ آخر بات یہیں آکر ٹھہرتی ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر یا بیسویں صدی کے اوائل کا سب سے بڑا انشا پرداز صاحب طرز اور فسوں پرداز مولف آزاد ہے۔ اس کی تقلید ناممکن ہے اور اس کی تردید ممکن۔ لیکن جو شخص اس کی انشا پردازی کی فسوں گری سے متاثر نہیں ہوتا۔ وہ بے ذوق ہے۔ اقتباس دوں تو کس کتاب سے دوں کہ شاداب اور شگفتہ پھولوں کا ایک باغ ہے جو سامنے ہے۔ کسے توڑوں کسے چھوڑوں تاہم "آب حیات" جسے انتقاد کے سلسلے میں معمولی کتاب سمجھا جاتا ہے۔ اس میں سے سوداؔ کے متعلق جو انھوں نے لکھا ہے اس کا ایک حصہ نقل کرتا ہوں جس سے معلوم ہوگا کہ ان کا انتقادی شعور کتنا بلند اور ذوق سلیم کتنا صحیح تھا۔ لکھتے ہیں:۔

"زبان پر حاکمانہ قدرت رکھتے ہیں۔ کلام کا زور مضمون کی نزاکت سے ایسا دست و گریبان ہے

---

[1] مولوی عبدالحق نے ALLEGORY کا ترجمہ مثالیہ کیا ہے۔ یہ تسلی بخش نہیں۔ لیکن بکثرت استعمال کیا گیا تو اصل کلمے کی دلالتیں اس میں پیدا ہو جائیں گی۔ ترجمہ میں ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ قریب ترین لفظ کا انتخاب کیا جاتا ہے۔

[2] PUNCTUNATION (علامات اوقات کی تعیین)

جیسے آگ کے شعلہ میں گرمی اور روشنی۔ بندش کی چستی اور ترکیب کی درستی سے لفظوں کو اس دروبست کے ساتھ پہلو بہ پہلو جڑتے ہیں۔ گویا ولایتی طپنچہ کی جانپیں چڑھی ہوئی ہیں۔ اور یہ خاص ان کا حصہ ہے۔ چنانچہ جب ان کے شعر میں سے کچھ بھول جائیں تو جب تک وہی لفظ وہاں نہ رکھے جائیں شعر مزا ہی نہیں دیتا"

(بہ انتخاب)

ارباب نظر پر روشن ہے کہ آزاد سودا کے مشہور اوصاف کا ذکر کر رہے ہیں۔ لیکن ہم نے ان اوصاف کے اظہار کے لیے انتقادی زبان دوسری اختیار کی ہے۔ آج کل کی اصطلاح میں وہ یہ کہہ رہے ہیں:۔

(۱) سودا کے ہاں مطابقت الفاظ و معانی بوجہ احسن پائی جاتی ہے۔

(۲) سودا انتخاب الفاظ میں بہت محتاط اور کامیاب ہیں۔

(۳) وہ ابلاغ معانی کے لیے وہی الفاظ لاتے ہیں جو گویا روز ازل سے ان کے لیے مخصوص تھے۔

(۴) لفظوں کی ترتیب اور نشست کے آہنگ کا شعور کامل رکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ لفظوں کے ادھر اُدھر کرنے سے آہنگ اور لہجہ بدلتا ہے اور لفظوں کے بدل دینے سے معانی متغیر ہوتے ہیں۔

چند فقروں میں ایسا انتقاد کرنا آزاد جیسے انشا پردازی کا حصہ ہے کہ اختصار بھی قائم رہا جو جان کلام ہے اور بات بھی کاملاً کہہ دی گئی۔ یوں میں چاہوں تو جو اوصاف میں نے آج کی زبان میں گنوائے ہیں۔ انھیں کو پھیلا کر سودا پر ایک اعلیٰ درجے کا مضمون لکھ سکتا ہوں۔ گویا "آب حیات" مزید انتقاد کا خزینہ اور خیالات بکر اور نوادر فکر کا دفینہ ہے۔

مولانا گرامی جالندھری (ولادت ۱۸۵۶ء)

مولانا گرامی نے نہ تو کسی کالج میں تعلیم پائی نہ کہیں سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ جالندھر کے رہنے والے تھے۔ عمر کا بیشتر حصہ دکن اور جالندھر میں گزر گیا۔ کبھی ایران بھی تشریف نہیں لے گئے۔ لیکن فارسی شاعری کی روایات سے اور اس کے علائم و رموز سے ان کی آگاہی کا یہ عالم ہے کہ علامہ اقبال مرحوم شعر کے معاملے میں اُن سے مشورہ کیا کرتے تھے۔

گرامی نے ایران کے اساتذہ کا کلام گویا اپنی ذات میں جذب کر لیا تھا۔ فارسی محاورات، ضرب المثال، تشبیہات و استعارات، اشارات و کنایات سے وہ ایسے باخبر تھے کہ کوئی ایرانی شاعر کیا ہوگا۔ علامہ اقبال نے سالک مرحوم کے قول کے مطابق انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا کہ اگر عرفی و نظیری کے بعد فارسی زبان کا کوئی شاعر ہے تو گرامی ہے۔ آج گرامی کو سن لو۔ کل فخر کرو گے کہ تم نے گرامی کو سنا ہے۔ گرامی بھی علامہ مرحوم کے مقام بلند سے واقف تھے کہ اُن کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

در دیدۂ معنی نگہاں حضرت اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

یہ غالب کی مشہور زمین ہے اور اس کا یہ شعر حاصل غزل ہے ؎

آں راز کہ در سینہ نہان است نہ وعظ است
بردار تواں گفت و بہ منبر نتواں گفت

۱؎ نقوش شخصیات نمبر

جب گرامی کی غزلوں کی شہرت ہوئی اور لوگوں کو معلوم ہوا کہ جالندھر میں ایک نغمہ سرا ایسا ہے جو عرفی، نظیری، کلیم و طالب اور بیدل و غالب کی یاد تازہ کرتا ہے تو ہر طرف سے فرمائش ہونے لگی کہ وہ جلسوں میں اپنا کلام سنائیں۔ لیکن گرامی نہایت مستغنی المزاج، قلندر منش اور درویش صفت شاعر تھے۔ جی میں آیا تو چلے گئے نہیں تو جلسے والے آس لگائے بیٹھے رہے۔

ان کی مقبولیت کلام اور حسن سخن کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آخر میر محبوب علی خان نظام دکن نے انھیں اپنے دربار میں طلب کیا اور وہ استاد نظام قرار پائے۔ مولانا سالک کا بیان ہے کہ ابتدا میں علامہ اقبال مرحوم اپنے فارسی اشعار میں ان سے باقاعدہ مشورہ لیا کرتے تھے۔ یہ بات اقبال کی طبیعت سے مستبعد نہیں۔ انھوں نے جہاں چشمۂ فیض جاری دیکھا۔ وہاں سے آب زلال ضرور پیا۔ سید سلیمان سے بھی انھوں نے بنہایت انکسار طالب علمانہ وضع میں استفادہ کیا۔ ان کی نظر میں سنین عمر کے زیادہ یا کم ہونے سے استفادہ کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ عالم کی یہی شان ہے کہ استفادہ کرنا مقصود ہو تو چھوٹے سے بھی کرتا ہے، بڑے سے بھی کرتا ہے۔ بہر حال گرامی کا ذکر ہو رہا تھا۔ گرامی نے حیدر آباد میں خوب ٹھاٹھ سے زندگی بسر کی۔ ان دنوں فصیح الملک داغ دہلوی بھی وہاں موجود تھے۔ ان دونوں شعراء کے روابط بہت خوشگوار تھے۔

نوری نے داغ کے جو سوانح مرتب کیے ہیں، ان میں گرامی کی حیدر آباد کی زندگی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ گرامی کے کلام کی بلندی کا اندازہ نوازی سے ہو سکتا ہے کہ محض ذوق شعر کی بنا پر علامہ اقبال مرحوم سے ان کے خاص دوستانہ مراسم تھے۔ یوں تو گرامی نے بہت سے کلاسیکی ایرانی شعراء کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں، مثلاً چند است، پند است، امید بہ دیوارے، ہر مردے، دہر کارے۔ لیکن جو غزل علامہ اقبال مرحوم کی نظر میں ان کا کارنامہ تھی، پہلے اس کے کچھ شعر سن لیجیے ؎

شب ہائے وصل و گوشۂ چشمے عنایتے ۔۔۔ مائیم و زلف یار و مسلسل حکایتے[1]

عصیان ما و رحمت پروردگار ما ۔۔۔ آں را نہایتے نہ ایں را نہایتے[2]

ہاں وارثی بکتۂ مضمون باغ خلد ۔۔۔ خوانی اگر ز مصحف رخسار آیتے

تا چند امتحان تغافل نیستے ۔۔۔ دیرینہ بندہ ایست گرامی رعایتے

ایک شعر اور سن لیجیے کہ واقعی نظیری اور عرفی کی یاد تازہ کرتا ہے ؎

محبت ایں چنیں عاشق نوازی ایں چنیں باید
زدی، کشتی، شکستی، سوختنی، انداختی، رفتی

---

[1] زلف یار اور حکایت مسلسل کے ربط باہمی کو ملحوظ خاطر رکھیے گا۔

[2] علامہ مرحوم نے اس شعر کی بہت تعریف کی ہے۔ نیاز الدین خاں کے نام لکھتے ہیں "شعر مندرجہ عنوان کے اثر سے دل سوز و گداز سے معمور ہے۔ گرامی صاحب اپنے شعر کا اثر دیکھتے تو نہ صرف میری ولایت کے قائل ہو جاتے، بلکہ اپنی ولایت میں بھی انھیں شک نہ رہتا۔ اس شعر پر ایک لاکھ دفعہ اللہ اکبر پڑھنا چاہیے۔ مجھے یقین ہے فارسی لٹریچر میں اس پائے کا شعر کم نکلے گا۔ انسان کی بے نیازی کا ثبوت دیا ہے مگر اس انداز سے کہ موحد کی روح فدا ہو جائے۔ یہی ہے کمال شاعری جو الہام کے پہلو بہ پہلو ہے۔" (تلخیص اقبال نامہ جلد اول ۲۱۸-۱۹-۲۰ مقتبس از "شعر اقبال" تالیف راقم السطور مطبوعہ بزم اقبال لاہور)

اسی طرح ایک اور شعر بھی سن لیجئے۔ اس کا مضمون اور صنعت گری بے مثال ہے ؎

آں ہم بسر راہے ما ہم بسر راہے
دیوار بامیدے۔ امید بدیوارے

یوں کہنا چاہئے کہ برصغیر پاک و ہند میں فارسی کلاسیکی شاعری کا آخری ترجمان گرامی تھا۔ اس کے بعد تو چراغ ہی گل ہو گیا۔ اندھیرا تو ہر طرف ہے اب پگڑی غائب ہونے کی دیر ہے۔

شمس العلما مولانا شبلی نعمانی (ولادت ۱۸۵۷ء)

شبلی نعمانی بھی آزاد ہی کی طرح متنوع فکر کے اعتبار سے ایک بلند مقام رکھتے ہیں، لیکن ان کے ہاں اسلوب نگارش کی وہ دل نشینی اور فسوں آفرینی نہیں جو آزاد میں ہے۔ جب سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کے معاشرتی، سیاسی اور ملی احیاء کا لائحہ عمل مرتب کیا تو انھوں نے شبلی کو اس غرض کے لیے منتخب کیا کہ وہ مسلمانوں کو ان کی قدیم عظمت کی یاد دلائیں۔ مقصد یہ تھا کہ مغربی تہذیب تیزی سے عموماً پھیلتی ہوئی یہ شعور جو پیدا کرتی چلی جاتی ہے کہ مسلمان برباد ہی ہونے کے سزاوار تھے۔ اس کا سدِّباب کیا جائے، مسلمانوں کو یاد دلایا جائے کہ ان کے ہاں بھی بڑے بڑے فرمانروا، سیاست داں، ہنرپرور، سائنسدان، مورخ، فلسفی اور فقیہہ موجود ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ مسلمانوں نے یونان کے افکار کو اپنے قالب میں ڈھالا اور مغرب نے انہی افکار و تصورات سے جلا پائی۔ غنیؔ نے کیا خوب کہا ہے ؎

غنیؔ روزِ سیاہ پیرِ کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

مراد یہ ہے کہ عرب جہاں گئے وہاں انھوں نے اپنے افکار اور مقامی ثقافت کے امتزاج سے نئی تحریکات کو فروغ دیا۔ پھر صرف یہی نہیں کہ مسلمان خشک مزاج، مفکر، فلسفی یا فقیہہ ہی تھے۔ فنونِ لطیفہ کی طرف بھی انھوں نے توجہ کی۔ شرعی جواز سے بحث نہیں صرف اس قدر کا اظہار ہے کہ مسلمانوں نے موسیقی میں اتنی ترقی کی کہ دنیا ان کے نغموں سے گونج اٹھی۔ کتاب الاغانی جیسی ضخیم کتاب جو بے تکلف ہزاروں صفحات پر مشتمل ہے غنا ہی سے بحث کرتی ہے۔ ضمناً اور داستانیں بھی ہیں۔ لیکن اصلاً مغنیوں ہی کا تذکرہ مقصود ہے۔ مصوری میں یورش تاتار سے پہلے بھی ایران مشہور تھا۔ جب منگولوں نے چین فتح کر لیا۔ اور ایک نہایت بڑی شاہنشاہیت قائم کی تو ثقافتی تال میل زیادہ ہوا اور چین کی مصوری کے مختلف دبستان ایران اور دوسرے اسلامی ممالک میں مقبول ہوئے۔ آلِ تیمور نے خاص طور پر اس فن کی طرف توجہ دی۔ اور صفویوں کے زمانے میں بہزادؔ نے نقاشی کی کایا ہی پلٹ کر رکھ دی۔ مصوری اور موسیقی کے متعلق فقہی امتناع کے جھگڑے بھی تھے۔ لیکن جہاں تک فنِ تعمیر کا تعلق ہے، مسلمانوں نے اسے واقعتاً کمالِ عروج تک پہنچا دیا۔ مختصر یہ ہے کہ کیا علوم میں اور کیا فنون میں مسلمانوں نے ایسے کرشمے دکھائے کہ دنیا محوِ حیرت ہو گئی۔ صدیوں تک بوعلی سینا اور ابن رشد کی تصانیف مغرب کی دانشگاہوں میں پڑھائی جاتی رہیں۔ رازیؔ نے طب میں جو تجربے کیے تھے۔ ان سے بھی یورپ متاثر ہوا۔ عمرؔ خیام اور محقق طوسیؔ نے ریاضیات میں اور امام غزالیؔ نے منطق و روحانیات میں جو کام کیا ہے اس کی کیفیت یہ ہے کہ مستشرقین ان لوگوں کا ذکر کرتے ہیں تو یوں کرتے ہیں۔ گویا دیوزاد مفکروں کا ذکر کر رہے ہوں۔

جب اسلامی ممالک روبہ زوال ہوئے اور برصغیر پاک ہند میں بھی یہ زوال پذیری صاف نظر آنے لگی تو یہاں کے مسلمانوں نے دوسری قوموں کے ساتھ مل کر کوشش کی کہ اپنی ثقافت کے احیاء کے لیے پہلے سیاسی آزادی حاصل کریں۔ اس کا نتیجہ مختلف تحریکات کی

صورت میں رونما ہوا۔ مثلاً ریشمی رومال کی تحریک۔ وہ جنگ آزادی جسے انگریز غدر کہہ کر اپنا دل ٹھنڈا کرتے ہیں اور ٹیپو سلطان کی منظم معرکہ آرائیاں۔ جب اغیار کی حکومت نے سازش کے جال بچھا کر اور ٹیپو کے اقربا اور امراء کو لالچ کے ذریعے اپنا کر میسور کی سلطنت ہی ختم کر دی تو جنگ آزادی کا ناکام ہونا عملاً یقینی تھا۔ بہرحال یہ جنگ ناکام ہوئی اور اغیار نے بیشتر مسلمانوں ہی کو قصوروار قرار دے کر انھیں ملیا میٹ کر دینا چاہا۔ ان حالات میں سرسید نے یہ تحریک شروع کی (جسے علی گڑھ تحریک بھی کہتے ہیں) کہ اغیار کے اسلحہ سے کام لے کر ان کا مقابلہ کیا جائے۔ انگریزی تعلیم حاصل کی جائے، مغرب کے علوم و فنون پر عبور حاصل کیا جائے۔ لیکن اس طرح کہ حکومت کو یہ شبہ نہ ہو کہ ان تمام باتوں کا مقصد مسلمانوں کا سیاسی اور معاشرتی احیاء ہے۔

جب سرسید نے یہ کوشش شروع کی تو مخلص رفقائے کار کی ایک جماعت بھی اپنے ساتھ لی۔ اس جماعت کے ہر فرد کو مخصوص کام کرنے پر متعین کیا گیا۔ حالی کو مدوجزر اسلام یا مسدس لکھنے کی ترغیب دلائی گئی کہ مسلمانوں کے ماضی و حال کا تقابل کیا جا سکے۔ ڈپٹی نذیر احمد کو اس بات کی طرف مائل کیا گیا کہ عورتوں کی تعلیم و تربیت کی تبلیغ کریں۔ شبلی کو ان کے متعدد کمالات دیکھ کر اس بات کے لیے منتخب کیا گیا کہ مسلمانوں کی گذشتہ عظمت کی تصویر کشی کریں، خاص طور پر جہاں جہاں مستشرقین نے مسلمانوں پر اعتراضات کئے ہیں وہ رفع کریں اور ثابت کریں کہ مغرب کی ترقی مسلمانوں کی علم پروری کا نتیجہ ہے۔ شبلی نے یہ کام کاملاً تو نہیں لیکن جزواً ضرور سرانجام دیا۔ کیونکہ وہ طبعاً اور اصلاً ادیب تھے، مورخ نہ تھے۔ اس کے باوصف انھوں نے الفاروق، المامون، سیرت النعمان، الغزالی اور الکلام لکھ کر مسلمانوں کو بتایا کہ ان کے ماضی کی شاندار روایات کیا تھیں۔ ساتھ ہی انھوں نے خالص ادبی کام بھی کیا۔ شعر العجم لکھی کہ فارسی کا ذوق مٹنے نہ پائے۔ موازنہ انیس و دبیر سپرد قلم کیا۔ ایک طرح یہ دونوں کتابیں بھی مسلمانوں کی عظمت کی نشاندہی کرتی ہیں۔ اورنگ زیب عالمگیر لکھ کر انھوں نے وہ تمام اعتراضات کاملاً رفع کئے جو اس بامکنت بادشاہ پر کئے جاتے تھے لیکن ان کا جو کارنامہ سب سے زیادہ مقبول اور مشہور ہے، وہ سیرت النبی ہے۔ اس کی تالیف کی وجہ بھی یہی تھی کہ مستشرقین رسول پاک کی ذات پر رکیک اور ناروا حملے کرتے تھے۔ پادری اور دوسرے عیسائی مبلغ ایسی باتیں کرتے تھے کہ مسلمانوں کا ایمان متزلزل ہو جائے۔ اس سلسلے میں وہ ہمیشہ رسول پاک کو ہدف انتقاد بناتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر ان کی ذات گرامی میں خدانخواستہ عیوب نکل آئے تو اسلام مٹ کے رہے گا۔ سرسید نے اپنی تفسیر قرآن میں پرانی تفاسیر پر مستشرقین کے جو اعتراضات تھے ان کا جواب دینے کی کوشش کی۔ یہ اور بات ہے کہ ان کا طریق کار غلط تھا یا صحیح۔ شبلی نے سیرت النبی کی تالیف میں یہ مقصد پیش خاطر رکھا کہ رسول پاک کی ذات قدسی صفات کے تمام گوشے بے نقاب ہو جائیں، مغربی مصنفوں کے اعتراضات رفع ہو جائیں اور ایمان میں جو تزلزل پیدا ہونے کا امکان ہے، وہ رک جائے۔ وہ اس تالیف کی تکمیل نہ کر سکے۔ لیکن ان کے نقش قدم پر چل کر سید سلیمان ندوی مرحوم نے بقایا کام کی تکمیل کا بیڑہ اٹھایا اور عمر کا بیشتر حصہ اس مبارک کام میں صرف کر دیا۔

مقالات شبلی کی اشاعت کے بعد (جو کئی جلدوں میں شائع ہوئے ہیں) یہ بات واضح ہو گئی کہ مولانا نہایت غیرت مند اور دقت شناس مؤلف تھے، جہاں کسی نے اسلام کے کوائف پر اعتراض کیا، ان کے علم میں آیا تو انھوں نے فوراً جواب دیا۔

نقاد کی حیثیت سے شبلی کا مقام بہت بلند نہیں کہ شعر العجم میں وہ اکثر شعراء کے اوصاف یوں بیان کرتے ہیں کہ ایک کے دوسرے سے متمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کچھ خاص کلمات و تراکیب بھی وہ انتقاد میں تکرار تقریباً ہر شاعر کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً زور کلام، جوش بیان، جدت استعارات و تشبیہہ، مضمون آفرینی، خیال بندی وغیرہ وغیرہ۔ ان تراکیب اور کلمات کے معانی مبہم رہتے ہیں۔ البتہ انھوں نے جو

شعر منتخب کئے۔ وہ نہایت خیال افروز ہیں اور ان کے انتخاب سے خود ان کا ذوق سلیم نمایاں ہے۔ شعر العجم پڑھنے کے بعد فارسی شاعری کا مزید
مطالعہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔

موازنۂ انیس و دبیر میں انھوں نے دبیر سے کچھ زیادتی کی ہے۔ جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ اتنا کہنا کافی ہے کہ "المیزان" میں
اور "حیات دبیر" مؤلفہ ثابت لکھنوی میں شبلی کے ان اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو انھوں نے دبیر پر کئے ہیں اور حق یہ ہے کہ بہت اچھا جواب
دیا گیا ہے۔

شبلی کے اسلوب میں وہ بات نہیں جو آزاد کے ہاں ہے۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ ان کی نثر کبھی سپاٹ ہو جائے۔ ان کی تحریر میں ہمواری
ہے۔ کہیں کہیں البتہ وہ نہایت مرصع نثر لکھتے ہیں۔ اکثر و بیشتر ان کے انداز بیان سے خود رائی اور خود آرائی کا اظہار ہوتا ہے۔ حافظ محمود شیرانی
نے تنقید شعر العجم میں شبلی کی بہت سی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔ لیکن اس سے کتاب کی اہمیت کم نہیں ہوئی۔ کیونکہ شعر العجم کا قاری باوجود اس
انتقاد کے فارسی شعر کا مطالعہ کرے گا۔ یہی شبلی کی کامیابی ہے۔ اردو ادب میں ان کا مقام یہ ہے کہ آزاد سے قطع نظر کر لیجئے تو ان کے
معاصروں میں ان کی انشا پردازی کا کوئی حریف نہیں رہتا۔ انھوں نے سب سے پہلے اردو میں دلچسپ اور دلکش اسلوب میں علمی موضوعات پر مقالات
لکھے۔ یوں کہنا چاہیئے کہ ایک حد تک تحقیقی مقالے کی راہ انھیں نے کھولی۔ ان کے مقالات کے تنوع کو دیکھ کر آزاد کا فکری تنوع یاد آتا ہے۔ اگرچہ
وہ اصلاً مورخ اور سوانح نگار نہ تھے۔ لیکن اردو میں الفاروق اور المامون جیسی کتابیں پہلے موجود نہ تھیں۔ سوانح نگاری کا ڈھنگ اس کی وضع اور
سلیقہ بھی شبلی ہی نے متعین کیا۔ پھر انھوں نے مسلمانوں کی عظمت کی اس انداز سے نشاندہی کی کہ اس کے اثرات اب تک نمایاں ہیں۔ شرر کے
تاریخی ناول، شبلی کی تاریخی تالیفات کا منطقی نتیجہ ہیں۔ اور ہمارے آج کل کے نام نہاد تاریخی ناول بھی ایک طرح انھیں کی کاوشوں کے مرہون منت
ہیں۔ مولوی عبدالحق مرحوم نے شبلی پر انتقاد کرتے ہوئے کہا تھا کہ "ان کی کتابوں کو ابھی سے دیمک لگنی شروع ہو گئی ہے۔" مجھے یہ فیصلہ زیادتی پر مبنی
معلوم ہوتا ہے اور ان کی کتابوں کی بڑھتی ہوئی مقبولیت میرے دعوے کی دلیل ہے۔

شبلی نے بعض دفعہ قلمی ناموں کا نقاب اوڑھ کر سیاسی نظمیں بھی کہی ہیں۔ جو نہایت سلیس، شگفتہ اور رواں زبان میں لکھی گئی ہیں۔ ان کی
دوسری منظومات کا بھی یہی عالم ہے۔ لیکن یہ نظمیں شبلی کا کارنامہ نہیں۔ یہ گویا ان کی ضمنی فعالیت ہے تاہم ادبیات کی تاریخ میں ان نظموں کا ذکر ضرور آئیگا۔
کہ جن لوگوں نے سیاسی ماحول کو اپنے اشعار میں سمویا ہے اور اس عہد میں سمویا ہے جو شبلی سے مخصوص تھا۔ ان کی تعداد بہت کم ہے کہ حکومت کا احتساب
سخت گیر تھا۔ اور خوف سے گویا زبانوں پر پہرے لگے تھے۔ ان دنوں سیاسی نظمیں کہنا۔ اس اعتبار سے اہم ہے کہ نہ صرف عوام کے سیاسی شعور کو
مہمیز کرتا ہے بلکہ اس اعتبار سے بھی کہ عوام کے دلوں کو تقویت بخشتا ہے اور ان میں جرأت و بسالت کے جذبات پیدا کرتا ہے

شبلی نے فارسی میں غزل بھی کہی ہے اور ان کی غزل گوئی کے محرکات[1] بھی اب ہمیں معلوم ہیں۔ فارسی غزلوں میں ان کا لہجہ گرچہ بالکل
ایرانیوں کا سا نہیں۔ لیکن انھیں اس زبان کے محاورات پر اتنی قدرت ہے کہ ہر غزل سے اس کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کا ایک شعر جو نہایت لطیف
کیفیات سے لبریز ہے نقل کرتا ہوں ؎

من فدائے بت شوخے کہ بہ ہنگام وصال
بہ من آموخت خود آئین ہم آغوشی را

---

[1] دیکھئے "شبلی کی حیات معاشقہ" اور ادبی دنیا میں عطیہ بیگم فیضی کا متعلقہ خط

شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی (ولادت ۱۸۶۲ء)

سید صاحب بھی اُسی کاروانِ جلیل کے ایک نامور رکن ہیں۔ جو سر سید کی تحریک کے علمبردار کہلاتے تھے۔ انھوں نے عمر بھر دامے، درمے، سخنے اس بات کی کوشش کی کہ عورتوں کو وہ تمام حقوق حاصل ہو جائیں جو شرعاً انھیں حاصل ہونے چاہئیں۔ طلوعِ نیر اسلام سے پہلے عورت کا مقام معاشرے میں بہت پست تھا۔ استثنائی صورتوں سے قطع نظر وہ گویا مرد کی ملکیت سمجھی جاتی تھی اور دنیا کے بعض خطوں میں تو اسے کسی چیز کی ملکیت حاصل کرنے کا اختیار نہ تھا۔ مالِ غنیمت میں عورت کنیز بن کر ساغر دست گرداں بن جاتی تھی اور کبھی اس محفل کو اور کبھی اس مجلس کو گرماتی تھی۔ زمانہ ماقبل اسلام میں خود عرب یہ خیال کرتے تھے کہ کسی کے ہاں بیٹی کا پیدا ہو جانا گویا لعنت ہے۔ لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ اکثر و بیشتر عورت صرف ایک کھلونا تھی جو مردوں کی خواہشات کے مطابق حرکت کرتی تھی۔ ایسی صورت میں یہ توقع رکھنا کہ عصمت و عفت میں عورتیں ایک مقام بلند رکھیں گی، بیکار ہے۔

اسلام نے یہ تعلیم دی کہ مرد اور عورت کم و بیش مساوی حقوق اور فرائض کے حامل ہیں۔ عورت کسی کی ملکیت نہیں، وہ صحت مند معاشرے کا ایک ضروری جز ہے۔ اس کی آغوش میں قوم کے وہ سپوت پرورش پاتے ہیں جو اس کی ترقی کے ضامن ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی ممالک میں عورتوں نے بھی تحصیلِ علوم و فنون میں مردوں پر سبقت لے جانے کی کوشش کی۔ رابعہ بصری سے لے کر قرۃ العین زریں تاج تک اور زریں تاج سے لے کر قرۃ العین حیدر تک عورتوں نے روحانیات سے لے کر فنونِ لطیفہ تک زندگی کے ہر شعبے میں ایک نمایاں مقام حاصل کیا۔

جب اسلامی تہذیب کا شیرازہ منتشر ہو گیا اور اخلاقی اقدار کو گھن لگ گیا تو معاشرے میں عورت کا مقام پھر بتدریج گرنے لگا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے ذرا پہلے برصغیر پاک و ہند میں عفیف اور پاکباز عورتوں کی کمی نہ تھی (ہر چند شوق کی مثنویوں کے مطابق لکھنؤ میں ایسی عورتیں بھی پائی جاتی تھیں جو عیاش مردوں کو شرمات دیں) لیکن بہر حال اکثر و بیشتر وہ تعلیم سے عاری تھیں۔ یہ میرے ہوش کی بات ہے کہ لوگ کہتے تھے عورتوں کو پڑھانا ٹھیک نہیں کہ مردوں کو عاشقانہ خطوط لکھیں گی یا آزاد خیال ہو کر بے راہ ہو جائیں گی۔ اس سے اندازہ کر لینا چاہیے کہ انیسویں صدی کے وسط میں کیفیت کیا ہو گی۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، سر سید احمد خاں کی تحریک کا ایک ضروری اور لازمی جزو یہ تھا کہ عورتوں کو تعلیم دی جائے اور ان کی تربیت اس طرح کی جائے کہ وہ باشعور، ہوشمند، غیور و صبور بچوں کی پرورش کر سکیں۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اس سلسلے میں اپنے ناولوں کے ذریعے عورتوں کی تعلیم و تربیت کی ضرورت پر زور دیا۔ سید ممتاز علی کے کارناموں کو نذیر احمد کی کارگزاری کا منطقی نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ انھوں نے پنجاب میں بیٹھ کر لاہور کو اپنی کارگزاری کا مرکز بنا کر ساری عمر اس بات کے لیے وقف کر دی کہ عورتیں زیورِ تعلیم سے آراستہ ہوں اور حسنِ ترتیب سے پیراستہ کہ قوم کے نونہال انھیں کی گود میں پرورش پاتے ہیں۔ اپنے کام کی تکمیل کے لیے انھوں نے مشہور رسالہ "تہذیبِ نسواں" جاری کیا اور ہفتہ وار رسالہ "پھول" کی اشاعت کی بنیاد بھی رکھ دی۔ یہ دونوں رسالے گویا ایک دوسرے کا تکملہ تھے۔ "تہذیبِ نسواں" میں عورتوں کے مقامی اور آفاقی مسائل سے بحث ہوتی تھی اور "پھول" میں بچوں کی تربیت ملحوظِ خاطر رہتی تھی۔ یہ دونوں رسالے بہت مقبول ہوئے اور ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ بہت سی عورتوں نے پہلی بار "تہذیبِ نسواں" کی مدد سے لکھنے کا ڈھنگ سیکھا۔ سید صاحب کا مقصد بھی یہی تھا کہ عورتیں نہ صرف امورِ خانہ داری سے واقف ہوں بلکہ لکھنے پڑھنے کی طرف بھی مائل ہوں۔ نذر سجاد حیدر، یعنی سجاد حیدر یلدرم کی بیگم صاحبہ (قرۃ العین حیدر کی والدہ) "تہذیبِ نسواں" کے لیے لکھتی تھیں۔ اسی طرح اور ممتاز خواتین بھی اس رسالے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتی تھیں۔

دہلی میں راشد الخیری جو رسالہ "عصمت" کے ذریعے عورتوں کے حقوق کے لیے محاذ قائم کیے ہوئے تھے، سید صاحب سے دوستانہ مراسم رکھتے تھے، چنانچہ دارالاشاعت لاہور نے (یہ سید ممتاز علی کے اشاعتی ادارے کا نام ہے) ان کی تصانیف بھی شائع کیں جن میں بیشتر عورت کی مظلومیت اور بے کسی کی تصویر کشی کی جاتی تھی۔ سید صاحب کی اپنی متعدد تصانیف بھی دارالاشاعت نے شائع کیں۔ مثلاً شیخ حسن (ترجمہ) مولانا سالک مرحوم کے قول کے مطابق۔ ان کا کارنامہ بے نظیر کتاب تفسیر البیان (مطالب آیات القرآن) کے نام سے چھپ چکا ہے۔ یہ گویا قرآن مجید کی آیات کے مطالب کی ایک جامع و مانع فہرست ہے۔ اور ایک طرح دیکھیے تو قرآن مجید کا انڈکس یا اشاریہ ہے۔ ہر مسئلے کے متعلق قرآن مجید کی تمام آیات یکجا کر دی گئی ہیں اور آیات کا اردو ترجمہ بھی درج کر دیا گیا ہے۔ لیکن ان کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مردوں کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ عورتوں کے حقوق پہچانیں اور بہت سی عورتوں کو لکھنے کے ڈھنگ اور گُر سکھا دیئے۔ یوں عورتیں نسبتاً بے خوف ہو کر اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگیں اور ایک ایسی فضا پیدا ہو گئی کہ انشا پردازی مردوں کے لیے مخصوص نہ رہی۔ یہ شبہ کہ مرد لکھتے ہیں اور عورتوں کا نقاب اوڑھ لیتے ہیں، رفع ہو گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مغربی پاکستان میں (بالکل نئی نسل کے سوا) کم ہی عورتیں ہوں گی جو تالیف و تصنیف میں معروف رہی ہوں اور جنھوں نے "تہذیب" سے فائدہ نہ اٹھایا ہو۔ عورتوں کی یہ ذہنی بیداری، ان کے شعور کی پختگی، ان کا اصرار کہ ان کے جائز حقوق انھیں دیے جائیں، ان کی تصنیف و تالیف پر قدرت آخر کار اس بات پر منتج ہوئیں کہ مردوں نے آخر کار یہ پہچانا کہ عورت ہر حیثیت سے سزاوار احترام ہے۔ ماں ہو تو تربیت اس کے ذمے ہے، بیوی ہو تو زندگی کی رفیق ہے اور دکھ سکھ کی ساتھی، علاوہ ازیں مخلص ترین مشیر کار ہے۔ اس فضا کی تخلیق میں خود سید صاحب کی تحریروں نے بڑا حصہ لیا، وہ جو کچھ لکھتے تھے بہت سوچ کر لکھتے۔ بنہایت اختصار لکھتے تھے، مشکل سے مشکل مسائل کو نہایت سلیس اور رواں زبان میں بیان کرتے تھے۔ جب دارالاشاعت نے سید امتیاز علی تاج کی ادارت میں رسالہ "کہکشاں" کا اجرا کیا تو اس میں ڈارون کے نظریۂ ارتقاء اصل انواع کے متعلق سید صاحب کے کچھ مضمون شائع ہوئے جو میرے خیال میں اپنی نظیر آپ تھے۔ سائنس کے خشک اور ادق مسائل انھوں نے ایسی سلیس زبان میں بیان کیے تھے کہ ان کی قدرت کلام دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ ان کے کچھ مسودات تاج صاحب کے پاس محفوظ ہیں، ان کی زبانی معلوم ہوا کہ ان میں ایک لغت بھی ہے۔ اگر سید صاحب کے تمام مضامین یکجا شائع کر دیئے جائیں تو اردو ادب پر بڑا احسان ہوگا، بالخصوص سائنس کے متعلق ان کے جو مضامین تھے وہ ایک کارنامہ ہیں۔ تاریخ ادبیات اردو میں ان کا نام ہمیشہ احترام سے لیا جائے گا کہ انھوں نے عمر بھر اس نہج سے صنف نازک کا مقام بلند کرنے کے لیے کوشش کی کہ آخر ہزار مشکلوں کے باوجود وہ کامیاب ہوئے اور ایسی عورتیں سامنے آئیں جو انشا پردازی میں کسی طرح مردوں سے کم نہ تھیں۔ یوں کہنا چاہیئے کہ سید صاحب جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے ادیب گر تھے۔

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی (ولادت ۱۸۶۶ء)

یہ مسلّم ہے کہ کیفیؔ فارسی، اردو اور انگریزی پر قدرت تام رکھتے تھے (ان کا ایک لڑکا مشہور انگریزی اخبار ٹریبیون لاہور کا ایڈیٹر تھا جو عین عالم شباب میں فوت ہو گیا) عربی اور سنسکرت سے بھی واقف تھے۔ مؤلف جدید شعرائے اردو کے قول کے مطابق بندش کے کامل فن استادوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

پنڈت جی کشمیر میں بھی رہے۔ دہلی بھی رہے۔ لیکن تقسیم سے پہلے ان کا قیام زیادہ تر پنجاب ہی میں رہتا تھا۔ آپ انجمن ترقی اردو سے بھی متعلق رہے ہیں۔ یوں تو پنڈت جی نے کہنے کو غزلوں پر مولانا حالیؔ سے اصلاح لی ہے اور میر مہدی مجروحؔ کی آنکھیں دیکھی ہیں۔

لیکن سچ پوچھئے تو ان کا جوہر نظم میں نہیں بلکہ نثر میں کھلتا ہے۔ وہ متعدد زبانوں سے واقف تھے۔ اس لیے انتقاد میں بڑی نیرنگی اور بوقلمونی کا عالم ہوتا ہے۔ ان کی مطبوعہ تالیفات میں منشورات اور کیفیہ کا مقام بہت بلند ہے۔ اوّل الذکر کتاب میں "مبادیات فصاحت" اور "نئی شاعری کا پہلا مشاعرہ" ایسے مضامین ہیں، جن کے مطالعے سے اردو ادب کا کوئی طالب علم بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ مبادیات فصاحت میں انھوں نے معانی اور بیان کی پرانی کتابوں اور قدیم نظریات کو ہدف انتقاد بنایا ہے اور متعین کیا ہے کہ فصاحت کے صحیح معانی کیا ہیں۔

دوسرے مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ نظم جدید کے مؤسس شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد ہیں۔ "گل رعنا" کے مصنف نے یہ دعوےٰ کیا تھا کہ حقیقت حال کچھ مبہم سی ہے اور صاحب شعر الہند نے تو نظم جدید کی تاسیس کا سہرا حالی کے سر باندھ دیا۔ کیفی نے بدلائل قاطع یہ ثابت کیا ہے کہ یہ بیل آزاد نے منڈھے چڑھائی ہے تو چڑھی ہے۔ خود حالی اپنی تالیف مجموعہ حالی کے دیباچے میں لکھتے ہیں "جب راقم ——— لاہور میں مقیم تھا، مولوی محمد حسین آزاد کی تحریک اور کرنل ہالرائیڈ، ڈائرکٹر سر رشتہ تعلیم پنجاب کی تائید سے انجمن پنجاب نے ایک مشاعرہ کیا تھا جو ہر مہینے میں ایک بار انجمن کے مکان میں منعقد ہوتا تھا۔" اس شہادت کے بعد کسی کا موقف یہ نہیں ہو سکتا کہ حالی نظم جدید کے مؤسس ہیں۔ بہر حال کیفی نے اندرونی اور بیرونی شہادتوں کو کھنگال کر ثابت کر دیا ہے کہ یہ مشاعرہ جہاں نظمیں پڑھی جاتی تھیں، کس طرح آزاد کی تحریک پر منعقد ہوا۔

"کیفیہ" میں بقول مولف کے "اردو زبان کی مختصر تاریخ اور اس کی انشا اور املا وغیرہ کے متعلق ہر قسم کے ضروری اور اہم امور سے بحث" کی گئی ہے۔ یہ کتاب لاہور سے شائع ہوئی ہے اور مولف نے دعوےٰ کیا ہے کہ میں نے اس میں برسوں کی تحقیق کے نتیجے محفوظ کر دیے ہیں۔ کتاب کے عنوانوں سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوگا۔ (۱) اردو زبان کا تاریخی مطالعہ (۲) حروف تہجی (۳) لفظ (۴) اسم (۵) تذکیر و تانیث (۶) حروف (۷) مصدر (۸) فعل (۹) روزمرہ (۱۰) محاورہ (۱۱) کلام (۱۲) چند نکات (۱۳) اسلوب (۱۴) عروض (۱۵) مطائبات (۱۶) خط و کتابت (۱۷) املا (۱۸) نئے لفظ (ساتھ ہی ناموں کا انڈکس بھی ہے) اس کتاب کی اہمیت اس سے واضح ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کے مختلف امتحانوں میں جزو نصاب ہے۔ اردو زبان کا اور ادبیات کا کوئی طالب علم اس کا مطالعہ کیے بغیر اپنے علم کو کافی نہیں کہہ سکتا۔ یہ کتاب سوچنے کی نئی راہیں کھولتی ہے۔ نہایت سلیس، صاف اور واضح انداز میں لکھی گئی ہے۔ علمی تحقیق کا جو غیر جانبدارانہ انداز ہے، وہ اس کے مطالعے سے روشن ہوتا ہے۔ مباحث کی نزاکت کا اندازہ اسی سے کیجیے کہ مولف نے مترادف اور مرادف الفاظ میں امتیاز کرنا چاہا ہے۔ روزمرے اور محاورے میں فرق بتایا ہے۔ کلام کے نقائص سے نئے انداز میں بحث کی ہے۔ اسلوب کلام سے مختصراً تعرض کیا ہے۔ پندرھویں باب میں مطائبات کی تجزیہ بندی کی ہے۔ اور بتایا ہے کہ ظرافت، مزاح، ہزل، بذلہ، طنز اور پند میں کیا فرق ہے۔ واقعی یہ کتاب کیفی کی عمر بھر کی تحقیق کا نچوڑ ہے۔

کیفی نے ان تصانیف کے علاوہ ایک اور اہم کام بھی کیا ہے۔ مشہور تذکرہ "خمخانۂ جاوید" کی تالیف رک گئی تھی۔ انھوں نے جہاں تک ہو سکا اس کام کو آگے بڑھایا۔ میرے علم میں اگرچہ یہ کام مکمل نہیں ہوا۔ لیکن کیفی اس سلسلے میں خاصا کام کر گئے ہیں۔

علامہ اقبال (ولادت ۱۸۷۳ء)

علامہ اقبال قریباً ربع صدی تک لاہور کی علمی زندگی کے مصدر و ماخذ بنے رہے۔ انھیں کے دولتکدے سے مختلف فکری تحریکات کے سرچشمے پھوٹتے تھے۔ یہیں ممتاز انشا پرداز ادیب اور دانشور جمع ہوتے تھے۔ یہیں افلاطون کے فلسفے سے لیکر گاندھی جی کی سیاست تک ہر چیز معرض بحث میں آئی تھی۔ ان کے مقام کے تعین میں ان کی تحصیلات علمی کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔ تب معلوم ہوگا کہ ان کی تحقیقات فکر کے تنوع کا کیا عالم ہے۔ معلم ہوئے تو فلسفہ انھوں نے پڑھایا اور انگریزی اور عربی بھی انھیں نے پڑھائی۔ تحصیل دانش کی طرف مائل ہوئے تو ایران کے فلسفے کے اس شعبے پر مقالہ لکھا جو مابعد الطبیعیات

سے تعلق رکھتا ہے۔ شعر کہے تو اُردو اور فارسی میں یکساں کمال حاصل کیا۔ فلسفے میں تخصص کا مقام حاصل کیا تو یہ صورت پیدا ہوئی کہ خودی کے ایک نئے معانی متعین کیے۔ اور اس کے متعلق ایک نیا نظریہ بھی پیش کیا۔ اسلامی فکر کو اور مسلمان دانشوروں کے دقیق معانی کو آج کل کے فلسفے کی زبان بخشی۔ اور وہ کتاب لکھی (انگریزی میں) جسے اُردو میں "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" کہتے ہیں۔ "علم الاقتصاد" پر اُردو میں پہلی کتاب لکھی۔ جب برصغیر پاک ہند میں کچھ ایسی تحریکات ابھریں جو اسلام کی بنیادی اقدار سے متصادم ہوتی تھیں تو انھوں نے شدید علالت کے باوصف طویل مضمون لکھے۔ ملت۔ قوم اور وطن کی تشریح کرتے ہوئے ایک عالم دین کو بعض باتوں کا مسکت جواب دیا اور مضمون کے آخر میں لکھا۔

قلندر جز دو حرف، لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

ایک ممتاز سیاستدان اور منصب دار نے کچھ ناگوار سے الفاظ میں وظیفہ دینا چاہا تو مسترد کر دیا اور دنیا پہ واضح کر دیا کہ علم کی خودداری اور دانشوری کا احترام کیا چیز ہے۔

یوں ان کی طبیعت کے عجز و انکسار کا یہ عالم تھا کہ علمی معاملات میں بے تکلف ہر چشمہ فیض سے استفادہ کرتے تھے۔ یہ دیکھتے تھے کہ کسی بات سے کسی خاص طبقے کی دلآزاری ہوتی ہے تو قلم روک لیتے تھے۔ اسرار خودی کے پہلے اڈیشن میں حافظ کے متعلق جو اشعار تھے اور جن پر عام لوگوں کو اعتراض تھا۔ وہ انھوں نے دوسرے ایڈیشن میں حذف کر دیئے۔ یہ اس لیے ضروری تھا کہ محض ایک ضمنی مخالفت کی بنا پہ لوگ کتاب کے مطالعے سے نہ رُک جائیں اور ان کے افکار و تصورات کا اظہار و ابلاغ تام ہوتا رہے۔

جس شخص کو مشرق و مغرب کے دانشوروں نے خراج عقیدت پیش کیا ہو جس کی شہرت عالمگیر ہو اور جس کے علم کی حدود کا تعین مجھ جیسے عامی کے لیے ناممکن ہو۔ اس کا علمی مقام متعین کرنا بہت دشوار ہے۔ ادبی مقام کی تعیین میں البتہ مجھے سہولت حاصل ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جب تک ان کے علمی اور ادبی کمالات کو ملا کر ان کی تحقیقات کو نہ پرکھا جائے۔ ان کے مقام کی بلندی واضح نہیں ہوتی۔ بہر حال میں اپنی سی کوشش کرتا ہوں۔ نثر کی تصانیف سے قطع نظر جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اقبال کی شعری عظمت کی نشاندہی بھی لازمی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال مرحوم نے اُردو اور فارسی غزل کو ایک نیا لہجہ بخشا اور اظہار معانی کی ایک نئی قدرت عطا کی۔ انھوں نے اس وقت تہذیب مغرب کے خلاف احتجاج کرنا شروع کیا۔ جب اغیار کی حکومت نے زبانوں پر تالے ڈال رکھے تھے اور ذہنوں پہ اپنے تفوق کی مہریں لگا دی تھیں۔ اس احتجاج کی صورت انھوں نے یہ اختیار کی کہ غزل کے جو کلاسیکی علائم و رموز تھے۔ ان کو نئے معانی بخشے۔ علاوہ ازیں کچھ نئی علامتیں اور اشارے بھی مقرر و معین کیے۔ اور غزل کے پیرائے میں وہ باتیں کہنے لگے جو کوئی معمولی نظم یا نثر میں کہتا تو حکومت کے عتاب کا ہدف بنتا۔ ان علائم و رموز میں قلندر۔ لالہ۔ شاہین۔ پروانہ۔ جگنو۔ جوئے کہسار زیادہ اہم ہیں۔ لالہ امت محمدی سے عبارت ہے کہ شہادت اسلام میں بہت بڑی اخلاقی قدر ہے اور لالے کی سرخی خون شہیداں کی یاد دلاتی ہے۔ سویدائے دل لالہ۔ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ مسلمان کا دل سوز حیات سے لبریز ہے اور نور عشق و ایمان سے روشن۔ شاہین کے متعلق خود انھوں نے اپنے مکاتیب میں بہ تفصیل بحث کی ہے۔

پہلے علامہ مرحوم نے علامتوں۔ استعاروں اور کنایوں میں بات کی۔ لیکن جوں جوں مسلمانوں کا سیاسی شعور پختہ ہوتا چلا گیا۔ اور جرأت ایمانی کی حرارت سے دل زندہ ہو گئے انھوں نے واشگاف الفاظ میں تہذیب مغرب کے خنجر خون ریز و دو رُخ یعنی فلسفے سے مسلح ہو کر اس تہذیب پر مہلک وار کیے اور مسلمانوں کو اس بات کا شعور دلایا کہ مغربی تہذیب ہر طرح عربی تہذیب (مسلمانوں کی تہذیب) سے فروتر ہے۔

یہیں مذہب اور فقہ میں علم اور عمل میں اسی تہذیب کی طرف لوٹتا ہے۔ اپنے زورِ بازو سے پرواز کرتا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کہا ہے ؎

درچمن بال و پرِ خویش کشودن آموز — کہ پریدن نتواں با پر و بال دگراں

اے کہ نزدیک تر از جانی و پنہاں ز نگاہ — ہجرِ تو خوشتر م آید ز وصالِ دگراں

انھوں نے اُردو غزل کے افق کو اتنا وسیع کر دیا کہ اب فلسفیانہ تعقلات اور ادراکات جذبے میں سمو کر شعری قالب پہن سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر وجدان و کشف اور علم بالحواس کے درمیان جو تضاد ہے۔ وہ ان کی شعر گوئی کا ایک موضوع خاص ہے اور اس سلسلے میں انھوں نے بہت دلنشیں اور خوبصورت شعر کہے ہیں ؎

ہے نورِ تجلّی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل تو زرا صاحبِ ادراک نہیں ہے

نے مہرہ باقی نے مہرہ بازی — جیتا ہے رومی ہارا ہے رازی

وہ امام غزالی کی طرح اس بات کے قائل ہیں کہ محض علم بالحواس حقیقتِ مطلقہ کا ادراک نہیں کر سکتا۔ ضروری ہے کہ کشف و شہود اور الہام و القا کی قوتیں بھی برسرِ کار ہوں تب انسان حقیقت کی کلیت کا احاطہ کرتا ہے۔

ان کی تصانیف میں "پیامِ مشرق"، "زبورِ عجم"، "جاوید نامہ"، "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بیخودی" بہت اہم ہیں۔ جاوید نامے میں معراج کی سی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ اور اس سلسلے میں انھوں نے مشرق و مغرب کے دانشوروں سے استفادہ کیا ہے۔

نئی نسل کے تمام شاعر اقبال کے کلام سے متاثر ہیں۔ اور ان کا شعورِ ذات یقیناً علامہ مرحوم کی تصانیف کا فیضان ہے جو بتدریج کنایوں اور اشاروں سے تہذیبِ مغرب پر کھلے ڈُلے حملے تک جا پہنچے۔ ضربِ کلیم کا ذیلی عنوان ہی ہے۔ اعلانِ جنگ عصرِ حاضر کے خلاف۔ اقبال کی طویل نظموں میں شکوہ اور جواب شکوہ۔ شمع اور شاعر بہت مقبول ہیں۔ پہلی دونوں نظموں کے اسلوبِ کلام میں وہ گہرائی، خوداعتمادی اور تکمیلِ ذات کا شعور ہے جو بیسویں صدی کے اعلیٰ درجے کے ادب سے مخصوص ہے۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے۔ کیا شعر میں اور کیا علم و دانش میں اقبال کا فیضان نئی نسل کی تخلیقات پر بالکل نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ اپنی زندگی ہی میں کلاسیک ہو چکا تھا۔ اور یہ ادب کی تاریخ میں بہت بڑی بات ہے۔

سر شیخ عبدالقادر (ولادت ۱۸۷۴ء)

شیخ عبدالقادر کا وطن تو قصور ہے لیکن ان کے علمی کارنامے تمام لاہور سے مربوط ہیں۔ انھیں زندہ جاوید بنا دینے کے لیے یہی واقعہ کیا کم تھا کہ جب علامہ اقبال نے یورپ پہنچ کر ترکِ شعر گوئی کا عزم کر لیا تو شیخ عبدالقادر نے انھیں ترغیب دلائی کہ وہ اپنے جوہرِ خداداد کے فیضان سے اپنی قوم و ملت کو محروم نہ رکھیں۔ شیخ عبدالقادر کے سوا کسی شخص نے علامہ اقبال کے اُردو یا فارسی کلام پر دیباچہ نہیں لکھا۔ ان سے علامہ نے ایک نظم بھی منسوب کی ہے جس کا پہلا شعر ہے ؎

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افقِ خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں

اس نظم کا آخری شعر بھی شنیدنی ہے ؎

ہر چہ در دل گذرد وقفِ زباں دارد شمع — سوختن نیست خیالے کہ نہاں دارد شمع

یہ بھی کسی شخص کے لیے بڑا اعزاز ہے کہ وہ علامہ مرحوم کے کلام پر دیباچہ لکھے اور پہلی بار انھیں پڑھنے والوں سے متعارف کرائے۔

شیخ عبدالقادر پہلے پنجابی ادیب ہیں جن کی زبان اتنی صاف، سلیس اور رواں ہے کہ ان کے اہلِ زبان ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ سادگی کے ساتھ اظہارِ معانی پر کاملاً قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی نثر بے عیب اور بے داغ ہوتی ہے۔ ایسی نکھری نکھری اجلی اجلی نثر کہ پڑھنے والا گھنٹوں پڑھتا جائے اور طبیعت سیر نہ ہو۔

پنجاب میں صحافت کا مقام انھیں نے متعین کیا۔ وہ ایک مقامی کالج میں پروفیسر تھے۔ لیکن یہ ملازمت ترک کر کے اخبار "آبزرور" کے نائب مدیر ہو گئے۔ کچھ عرصے کے بعد اس کی ادارت کاملاً انھیں کے سپرد ہو گئی۔ انھوں نے عین اوائل جوانی میں لکھنے پڑھنے کا کام شروع کر دیا جو مرتے دم تک قائم رہا۔ ان کی پہلی تصنیف انگریزی زبان میں ہے۔ اُردو میں اس کے معنی ان کا ترجمہ یوں ہو سکتا ہے "اردو ادبیات کا دبستانِ جدید" اس کتاب میں انھوں نے علی گڑھ تحریک کی اہمیت کی نشاندہی کی تھی۔ اور سرسید کے معاصر اور رفقا کار انشا پردازوں کی خوبیاں اجاگر کی تھیں۔ یہ تالیف اب تک میوۂ تر کی طرح تازہ ہے۔ زبان بھی بہت پیاری، میٹھی اور بے عیب ہے۔

شیخ عبدالقادر نے بہت جلدی یہ حقیقت پالی تھی کہ مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کی زبان ایک ہو اور وہ اُردو ہو۔ اس مقصد کے پیش نظر انھوں نے لاہور میں ایک مجلس مشاعرہ قائم کی۔ کچھ عرصے کے بعد ہی ۱۹۰۱ء میں ان کی ادارت میں "مخزن" جاری ہوا۔ یہ وہی تاریخی ادبی پرچہ ہے جس کے مضمون نگاروں میں ابوالکلام آزاد، شاد، داغ، افضل علی، سجاد حیدر، مرزا سلطان احمد، غلام بھیک نیرنگ، ناصر نذیر فراق اور بیسیوں دیگر ادیب شامل تھے۔ جن کی تحریریں آج سرمۂ چشمِ بصیرت ہیں۔ مخزن کی ادارت سے بھی بڑے شگفتہ اور ادیب وابستہ رہے ہیں مثلاً شیخ عبدالقادر، میاں شاہ دین ہمایوں، پوری، تاجور نجیب آبادی اور حامد علی خاں۔ ان لوگوں نے ادب میں اپنے لیے جو مقام پیدا کیا اس کی وضاحت کرنا تحصیلِ حاصل ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ شیخ عبدالقادر پنجاب کے سب سے بڑے ادیب گزرے ہیں۔ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے صحافت کو ادب کی سرحد تک پہنچا دیا۔ ان خوبیوں کے علاوہ ان کی اُردو تحریریں بھی برجستہ، بے ساختہ، بے تکلف لیکن پُرمعنی زبان میں ہیں جو اپنی نظیر آپ ہے۔

مخزن کے لیے انھوں نے دنت سے اچھے مضمون لکھے۔ مقامِ خلافت کے نام سے قسطنطنیہ کا سفرنامہ لکھا جو اب نایاب ہے۔ انگلستان کی سیر کے مناظر قلم بند کیے۔ مقبول و مشہور ہوئے۔ مخزن ادب میں ان کے مضامین اور مقامِ خلافت کے بعض اجزا شائع کیے ہیں۔ یہ ادبی خدمت وقتی سزاوارِ تحسین ہے۔ شیخ عبدالقادر مرتے دم تک ادبی تحریکات سے وابستہ رہے۔ مناصبِ بلند پر پہنچے۔ لیکن ادیبوں کو اپنی برادری سمجھ کر ان کی سرپرستی کرتے رہے۔ ان کی پرورش اور ان کا خلاقِ کریمانہ ایسا تھا کہ دل خواہ مخواہ ان کی طرف کھنچتا تھا۔ پنجاب میں اردو جس طرح پروان چڑھی ہے اس میں بہت بڑا حصہ آزاد کا ہے اور دوسرا شیخ عبدالقادر کا۔

آغا حشر کاشمیری (ولادت [illegible])

آغا حشر کے متعلق بھی چراغ حسن حسرت مرحوم اور مولانا عبدالمجید سالک مرحوم نے کئی داستانیں، لطیفے اور کوائف بیان کیے۔ جس سے دل پر یہ اثر مرتب ہوتا تھا کہ وہ باغ و بہار انسان تھے۔ پُرشور، شگفتہ مزاج، جہاں بیٹھے لوگوں کو ہنساتے ہیں اور خود ہنستے رہتے ہیں۔ افسوس ہے کہ میں نے خود آغا حشر کا یہ رخ نہیں دیکھا۔ اپنی موت سے کچھ عرصہ پہلے وہ مستقلاً لاہور تشریف لے آئے تھے اور ایک فلم بنانا چاہتے تھے۔ بھی حکیم احمد شجاع سے ان کے مراسم بے تکلفانہ تھے۔ وہاں ان سے ملاقات ہوئی۔ اس کے علاوہ دو تین تقریبات پر ان سے ملنا ہوا۔ لیکن ان دنوں جب ۱۹۳۵ء میں خود

ان کے لفظوں میں ان کی صحت گرتی ہوئی دیوار بن چکی تھی۔ اس لیے وہ شگفتہ کلامی اور خوش مزاجی بھی کم نظر آتی تھی جس کی مجھے توقع تھی۔ بہرحال ان کی شعلہ نوائیاں اپنے کانوں سے نہیں سُنیں۔ لیکن ڈراموں کی سحر طرازیاں ضرور پڑھی ہیں اور میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ ان کی طبیعت میں کتنا جوش، ولولہ اور عزم ہو گا کہ زورِ بیان اور جوشِ کلام کے رنگ میں کیا نثر سے اور کیا نظم سے ٹپکا پڑتا ہے۔

آغا حشر بھی ادیبوں کے اسی دبستان کے نامور رکن تھے جو جامع الکمالات اصحاب پر مشتمل تھا۔ کسی کو مشکل ہی سے یقین آئے گا کہ آغا حشر نے پہلے اپنا زورِ طبع پادریوں کے مقابلے میں صرف کیا جو اسلام پر اعتراض کرتے تھے۔ پھر ناٹک کی کمپنیوں سے منسلک ہو گئے۔ کچھ طبعزاد ڈرامے لکھے۔ کچھ انگریزی کے کھیل اُردو کے قالب میں ڈھالے۔ بہرحال ڈرامے کی تحریر میں انھوں نے ایک نئے لہجے کا اضافہ کیا۔ پہلے مقفیٰ نثر لکھتے تھے۔ جگہ جگہ مرصع اشعار سے نثر کو تقویت پہنچاتے تھے۔ ایک ہی ڈرامے میں دو دو داستانیں بیک وقت چلاتے تھے لیکن رفتہ رفتہ وہ عوام کے مذاق کی سطح بلند کرنے میں کامیاب ہو گئے پھر اردو ڈراموں میں بھی اور خاص طور پر ہندی آمیز اردو ڈراموں میں انھوں نے ایسی زبان اختیار کی جو ڈرامائی صنعت گری کے علاوہ ہر تکلف سے پاک تھی۔

تعجب کی بات ہے کہ جہاں فطرت نے انھیں طبعاً تمثیل نگار بنایا تھا۔ وہاں شعر کا جوہر بھی ان کی فطرت میں پوشیدہ تھا جس طرح چقماق میں آگ ہوتی ہے۔ انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں انھوں نے "شکریہ یورپ" اور "موجِ زمزم" جیسی بلیغ نظمیں پڑھیں شکریہ یورپ میں طنز اور تیکھے پن کا یہ عالم تھا کہ حکومت کی نظروں میں یہ نظم خطرناک قرار پائی رچنانچہ عرصے تک مکمل نظم چھپ نہ سکی کہ جو شعر زیادہ تیز تھے ناشر انھیں حذف کر دیتے تھے۔ یا ممکن ہے حکومت کا محکمہ اخذ ناب ان کے حذف کرنے پر ناشروں کو مجبور کرتا ہو۔ بہرحال نعتیہ کلام میں "موجِ زمزم" اور طنز میں "شکریہ یورپ" اپنے عہد کی بے نظیر چیزیں تھیں۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، تمثیل نگاری کے ساتھ انھیں غزل کہنے کا ملکہ بھی فطرتاً حاصل تھا۔ جب ایک مشہور مغنیہ سے انھیں محبت ہوئی تو گویا سونے پر سہاگہ ہو گیا اور ان کی غزلوں میں ایک خاص بات پیدا ہو گئی۔ جو معاصر شعرا کے ہاں بالکل مفقود ہے مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیے ؎

غیر کی باتوں کا آخر اعتبار آ ہی گیا — میری جانب سے ترے دل میں غبار آ ہی گیا
جی میں تھا اے حشر اس سے اب نہ بولیں گے کبھی — بے وفا جب سامنے آیا تو پیار آ ہی گیا

غریبوں کا بھی کوئی آسرا ہوتا تو کیا ہوتا — بُت کافر ہمارا بھی خدا ہوتا تو کیا ہوتا
جب اُن کی بے وفائی پر اسے دل پیار کرتا ہے — جو یارب وہ ستمگر باوفا ہوتا تو کیا ہوتا

اور یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

نکھری ہوئی ہے رنگ شفق سے عروسِ شام
لائی کہاں سے تیرا دوپٹہ رنگا ہوا
جانانہ حشر مست نگاہوں کے سامنے
ظالم لیے ہوئے ہے طمنچہ بھرا ہوا

میں عرض کر چکا ہوں کہ اواخر عمر میں آغا حشر نے تصنع اور تکلف سے مبرا ہو کر بعض بہت اچھے ڈرامے لکھے جن میں واقعی کوئی معاشرتی الجھن کارفرما تھی، مثلاً "آنکھ کا نشہ" اوائل عمر کے ڈراموں میں تکلف، تصنع اور مرصع نگاری بہت ہے۔ لیکن بتدریج یہ باتیں کم ہوتی چلی جاتی ہیں۔ آغا حشر نے سٹیج کو ایک طلسماتی سی چیز بنا دیا تھا۔ ان کے بعد پنجاب میں کم از کم بلکہ یوں کہنا چاہیئے مغربی پاکستان کا کھیل پنپا نہیں۔ سینما نے رہی سہی کسر بھی ڈبو دی۔ حالانکہ غیر ملکوں میں سینما سٹیج کے کھیل سے متصادم نہیں ہوا۔

اگرچہ میری بات عام انتقادی فیصلوں کے برخلاف جاتی ہے۔ لیکن میں دیانتداری سے یہ سمجھتا ہوں کہ آغا حشر طبعاً اور اصلاً شاعر اور انشا پرداز تھے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں ایسے شعر بھی کہے ہیں، جن میں سے ایک ایک ان کے اوائل عمر کے کسی مکمل ڈرامے پر تفوق رکھتا ہے۔ ہاں تمثیل نگاری میں انھیں روپیہ زیادہ ملتا تھا۔ اس لیے وہ اپنی ذہانت کو لیے ہوئے ادھر چلے گئے اور اردو شاعری ایک ایسے شاعر کے کلام سے محروم ہو گئی جو مومن کی طرح محرکات کے بغیر شعر نہیں کہتا تھا۔ اور اس فن پر قدرت کامل رکھتا تھا۔ میں تین شعر نقل کرتا ہوں۔ ان پہ غور فرمایئے کہ معاصرین میں یا ان کے بعد کسی نے اس لب و لہجے میں شعر کہا ہے ؂

ناکامیٔ محبت و محرومیٔ وصال — پیدا ہوئی ہیں قسمتِ اہلِ وفا کے ساتھ

صرفِ کرم تھی وہ نگہِ ناز بزم میں — میں ہی نہ کہہ سکا غمِ دل التجا کے ساتھ

لڑتے ہیں اختلافِ عقائد پہ حشر کیوں

یہ تو ہے اک معاملہ دل کا خدا کے ساتھ

حافظ محمود شیرانی (ولادت: ۱۸۸۰ء)

حافظ محمود شیرانی جو اصلاً ٹونک کے رہنے والے تھے وہاں تعلیم سے فارغ ہوئے تو لاہور آئے، اورئینٹل کالج میں داخل ہوئے، منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ پھر انگلستان چلے گئے، وہاں قانون کی تعلیم حاصل کی، لوٹے تو بیرسٹری کی سند کے متعلق تو تحقیق نہیں ہو سکی البتہ ذوقِ تحقیق ضرور ساتھ لائے۔ انھوں نے کسی مضمون میں ایم۔ اے نہ کیا تھا، اس کے باوصف پہلے اسلامیہ کالج میں ادبیات فارسی کے استاد مقرر ہوئے، پھر پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں ان کا تقرر ہو گیا جہاں انھوں نے ایم۔ اے کی جماعتوں تک کو پڑھایا۔ غیر رسمی طور پر میں نے بھی ان سے درس لیا ہے اور یوں بھی ہوا ہے کہ جب میرا تقرر دیال سنگھ کالج میں ہو چکا تو بعض اشعار کی تفہیم کے سلسلے میں میں نے ان سے مشورہ لیا ہے۔ وہ ایم۔ اے کو فارسی پڑھاتے تھے اور فارسی شاعری کا پرچہ ان کے سپرد تھا۔ حسنِ اتفاق دیکھیے کہ شاگرد استاد کا جانشین ہوا، وہ ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو کچھ عرصے کے بعد ایم اے فارسی میں شعر فارسی کی تدریس میرے حوالے کی گئی ؎

قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

ان کے سبکدوش ہونے سے پہلے میں نے کچھ تحقیقی کام شروع کیا تو ان کی خدمت میں حاضر ہوا، بہت محبت سے پیش آئے اور تاکید کی کہ اب اس میدان میں اترے ہو تو تم لوگوں سے ملتے رہا کرو، ہر طرح مدد کی۔ ابھی "تنقید شعر العجم" مطبوعہ صورت میں سامنے نہیں آئی تھی کہ مجھے اس کی ضرورت ہوئی۔ حافظ صاحب نے اردو کے وہ تمام پرچے جن میں ان کی تنقید چھپی تھی، میرے حوالے کر دیے۔ پہلی بار میں نے تحقیق، تدقیق اور انتقاد کا یہ رنگ دیکھا کہ خارجی شہادتوں سے بھی کام لیا جا رہا ہے لیکن انحصار بیشتر اندرونی شہادتوں پر ہے اور انتقاد میں بھی یہی اندرونی شہادت ملحوظِ خاطر رہی ہے۔ شبلی کے ذکر میں عرض کر چکا ہوں کہ حافظ محمود شیرانی نے "تنقید شعر العجم" جیسی ضخیم کتاب لکھ کر شبلی کی تالیف کی

پہلی دو جلدوں پر انتقاد کیا اور ان کی اغلاط کی نشان دہی کی، ان کا طریق کار یہ تھا کہ بیشتر شاعر کے کلام سے استشہاد کرتے تھے، خارجی شہادتوں میں صرف مستند بیانات پر بھروسہ کرتے تھے "کہتے ہیں" اور "کہا گیا ہے" والا قصہ ان کی تحقیق میں بالکل نہ تھا۔ "تنقید شعر العجم" جب چھپ کر سامنے آئی تو لوگوں کو عموماً معلوم ہوا کہ حافظ محمود شیرانی تحقیق کی کن کٹھن منزلوں سے گزر کر آئے ہیں اور تدقیق کے کیسے جاں گسل مرحلوں سے نتائج مطلوبہ حاصل کیے ہیں!

"تنقید شعر العجم" کی زبان میں وہ غیر جانبدارانہ علمی شان ہے جو چوٹی کے نقادوں سے مخصوص ہوتی ہے، کہیں کہیں وہ طنز کا ہلکا سا چرکا دیتے ہیں لیکن ایسی انسانی کمزوری کس میں نہیں ہوتی۔ اعظم گڑھ والوں سے ان کی علمی جنگ چھڑ گئی تھی۔ وہ لوگ تو گویا شبلی کی پرستش کرتے تھے ادھر حافظ صاحب صرف ان نتائج پر اعتماد رکھتے تھے جو مستند بیانات پر مبنی ہوں اور منطقی طور پر صحیح مستخرج ہوئے ہوں۔ مختصر یہ ہے کہ یہ پالا حافظ صاحب نے مارا۔ انھوں نے جس جاں کاہی سے حوالوں پر حوالے دے کر شبلی کی اغلاط کی نشاندہی کی وہ اپنی نظیر آپ تھی۔ بعد میں کئی باتوں کے متعلق مستشرقین کی اور خود ایران والوں کی تحقیق شائع ہوئی تو معلوم ہوا کہ حافظ صاحب جن نتائج پر پہنچے ہیں وہ بالکل صحیح ہیں۔

حافظ صاحب کی طبیعت میں متضاد سے عناصر جمع تھے، وہ متحمل بھی تھے، بے چین اور بے قرار بھی۔ علمی تحقیق میں بہت صبر سے کام لیتے تھے لیکن کچھ زود رنج بھی تھے، بہرحال ادبیات کی تاریخ میں ان کا یہ کارنامہ ہمیشہ یادگار رہے گا کہ انھوں نے اُردو اور پنجابی کے باہمی ربط کی توضیح کی اور یہ دعویٰ کیا کہ دراصل اردو زبان کی صرف و نحو پنجابی پر مبنی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنی طبیعت کی اپج اور تحقیق صبر سے کام لے کر ایسے قوی دلائل دیے کہ اب تک ان کے دعوے کا تسلی بخش جواب کوئی نہیں دے سکا۔ مثلاً یہ کہ اُردو میں حروف اضافت "کا، کے، کی" بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ پنجابی سے ماخوذ ہیں، شہروں کے نام اس دعوے کی دلیل ہیں، مثلاً "کاموکے، سادھوکے، کالا شاہ کاکو" (اور پنجابی کلمات "پیکے، میکے")۔ اسی طرح "تھا" کے متعلق بڑی پتے کی بات کہی گئی ہے کہ اس کا اس کا سراغ سنسکرت اور متعلقہ پراکرتوں میں نہیں ملتا لیکن ملتانی زبان میں مصدر "تھیونا" موجود ہے جس سے ماضی مطلق "تھیا" برآمد ہوتا ہے، یہی "تھا" کا مادہ ہے۔

مختصر یہ ہے کہ پروفیسر شیرانی نے دو معرکے کی کتابیں شائع کی ہیں۔ یعنی "تنقید شعر العجم" اور "پنجاب میں اردو" اور دونوں ادبیات اُردو کی تاریخ کے اجزائے لازم ہیں۔

سیماب اکبر آبادی

جوانی کجائی کہ یادش بخیر

میں یا تو لا کالج میں پڑھتا تھا یا وکالت کا امتحان پاس کیا ہی تھا کہ فیروز سنز نے ایک تالیفی منصوبہ تیار کیا اور اس سلسلے میں سیماب کو لاہور بلوا لیا کہ کام کی نگرانی کریں، سیماب صاحب کے ساتھ ساتھ ساغر نظامی بھی آئے۔ یہ بڑے خوش وضع اور خوش مزاج نوجوان تھے۔ سیماب صاحب کا بدن دوہرا تھا اور قد چھوٹا، اسی لیے ان کا بھاری بھرکم ہونا اور زیادہ نمایاں معلوم ہوتا تھا۔ خاصے رعب داب کے اور وضع دار آدمی معلوم ہوتے تھے، باتیں بھی بہت نپی تُلی کرتے تھے، ممکن ہے اپنے ہم عمروں میں بیٹھ کر بے تکلفی برت لیتے ہوں لیکن میں نے تو ان کو جب دیکھا ثقاہت، سنجیدگی اور متانت کے پیراہن میں ملبوس دیکھا، یہ کوئی عیب کی بات نہیں لیکن طبعاً مجھ سے ان کے تعلقات زیادہ استوار نہیں ہوئے کہ میں ہنسوڑ پن کی طرف مائل تھا اور متانت ایک حد تک ہی برداشت کر سکتا تھا۔

سیماب صاحب کو میں نے مشاعروں میں بہت پڑھتے سُنا، خاص طور پر مجھے جموں کا وہ مشاعرہ خوب یاد ہے جہاں رام رجپال سنگھ شیدا

نے صدارت کی تھی، غالباً یہ پچیس چھبیس یا اس کے لگ بھگ کا واقعہ ہے لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا، بہرحال یہ خوب یاد ہے کہ شیدا صدر تھے، ان کی ایک غزل کا شعر مجھے اب تک نہیں بھولتا ؎

کہا بیمار فرقت جاں بہ لب ہے تم اگر سمجھو
کہا سمجھیں گے اور تم دیکھنا کیسا سمجھتے ہیں

اسی مشاعرے میں تاثیر، اللہ یار خاں جوگی، ہری چند اختر اور حفیظ جالندھری بھی شریک تھے۔ مشاعرہ طرحی تھا، ایک طرح تھی:۔ "کوئی امید بر نہیں آتی"۔ دوسری طرح کا مصرع یاد نہیں، وزن تھا — مفعول فاعلات مفاعیل فاعلات یا فاعلن — قافیہ تھا "دیوانہ، پروانہ" اور ردیف "چاہیئے" اس زمین میں تاثیر نے اور حفیظ نے بہت اچھے شعر نکالے ہیں۔ سیماب نے بھی غزل پڑھی اور ان کا یہ شعر میرے دل پر نقش ہے ؎

اے دل یہ پچھلی رات، یہ تسکین کائنات — اس وقت کوئی نعرۂ مستانہ چاہیئے

لگے ہاتھوں اس زمین میں تاثیر کا شعر بھی سنتے جایئے ؎

اُف وادیٔ جنوں کے وہ پُرپیچ راستے
دیوانگی کو بھی کوئی فرزانہ چاہیئے

حفیظ کا شعر تھا ؎

رندان مے پرست صبہ مست ہی سہی
اے شیخ گفتگو تو شریفانہ چاہیئے

اسی مشاعرے میں اللہ یار خاں جوگی نے مقطع پڑھ کر مشاعرہ لوٹ لیا تھا ؎

کیا طبیعت ہے میری جوگی جی — بن پیئے رنگ پر نہیں آتی

یہ تو ذاتی تاثرات تھے۔ سیماب پروفیسر مشرف انصاری کے قول کے مطابق آگرہ دبستان کے نہایت خوش فکر ترجمان تھے ان کی منظومات اور غزلیات کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ملک کی تقسیم کے بعد کراچی تشریف لے آئے تھے۔ توقع تھی کہ ان کے علم و فضل سے ملک کو مستفید ہونے کا موقع ملے گا کہ ناگہاں ۱۹۵۱ء میں وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

سیماب کی نظم ہو یا غزل اس پر پختگی اور کہنہ مشقی کی مہر ثبت ہوتی ہے لیکن خیال کی اپج اور افکار بلند کو جذبات میں سمو کر شعری قالب عطا کرنا میری دانست میں ان کے بس کا نہ تھا، ان کی غزلوں میں لحن کی ہمواری تو ملتی ہے لیکن یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کسی حقیقت کو نئے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کی غزل کے نمائندہ شعر اس طرح کے ہوتے ہیں ؎

غیرت نا آشنا ہیں، صبر سے بیگانہ ہم — انجمن میں ہیں شریک قسمت پروانہ ہم
وحدت و کثرت میں ہیں دو جلوہ گاہیں دست کی — اک تجلّی خانہ دنیا اک تجلی خانہ ہم

یاس یگانہ چنگیزی

مرزا واجد حسین یاس عظیم آباد میں پیدا ہوئے تھے اور شاد کے شاگرد بیتاب سے مشورۂ سخن کرتے تھے، پھر شاد نے انھیں اپنے حلقۂ تلامذہ میں شامل کر لیا۔ اتفاق سے یاس لکھنؤ پہنچے، یہاں کی فضا کچھ ایسی پسند

آئی کہ یہیں جم کر بیٹھ گئے اور یہیں ایک معزز گھرانے میں شادی بھی کر لی۔ جب لکھنؤ کے شعراء سے ان کی جھڑپیں ہونے لگیں کہ یاس کا لہجہ بالکل نیا تھا اور ان کے کلام کا اسلوب معاصروں سے بالکل جدا تھا تو انھوں نے اپنا دفاع یوں کیا کہ غالب پر نہایت سخت اعتراضات کیے اور اپنے مطلب کا اظہار یوں کیا کہ کلام رکیک معلوم ہونے لگا۔ مثلاً ان کی ایک رباعی کا مصرع ہے ۔ غالب میرے چچا ہیں، میں ان کا چچا۔

غالباً وہی چوبیس پچیس کا زمانہ تھا، میں لا کالج میں پڑھتا تھا، یا امتحان دے کر فارغ ہی ہوا تھا کہ میرا یاس سے تعارف ہوا۔ صورت یوں پیدا ہوئی کہ علامہ تاجور نجیب آبادی نے اعتر چند کپور کے تعاون سے لاہور میں اُردو مرکز قائم کیا کہ اُردو ادب کا صحت مند انتخاب شائع کیا جائے۔ اس سلسلے میں اصغر گونڈوی، جگر مراد آبادی اور یاس یگانہ لاہور تشریف لائے کہ مولانا تاجور کی معاونت کریں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یاس کی آواز اردو شعر میں بالکل نئی صدا تھی۔ اس کا لہجہ جدا تھا، لحن جدا تھا، آہنگ جدا تھا۔ نفس مضمون پر اس کا نقطہ نظر عام شعراء سے بالکل مختلف تھا۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ وہ لکھنؤ کے ہنگاموں سے متاثر ہو کر ایسی نفسیاتی الجھنوں میں گرفتار ہو چکے تھے کہ اچھے سے اچھے اور بڑے سے بڑے شاعر کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ داد دینے میں بخل سے کام لیتے تھے۔ غالب پر رکیک زبان میں اعتراضات کرتے تھے۔ ایسی حالت میں لوگ ان سے خواہ مخواہ الجھ پڑتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی نفسیاتی الجھنیں زیادہ پیچیدہ ہو گئیں اور وہ مخصوص کیفیت زیادہ شدید ہو گئی جس کے فشار کے ماتحت وہ غالب تک کو برا بھلا کہنے سے نہیں چوکتے تھے۔ ان الجھنوں میں یاس یگانہ (اب وہ اپنے آپ کو یگانہ چنگیزی بھی کہنے لگے تھے) کچھ اس طرح پھنسے کہ عمر بھر اس چکر سے نکلنا نصیب نہ ہوا۔ جن دنوں وہ اُردو مرکز میں کام کرتے تھے، میری ان کی اکثر ملاقات ہوا کرتی تھی اور میں اب اپنے آپ کو کوستا ہوں کہ میں جب وہ غالب پر اعتراض کرتے تھے تو جواب میں کسی بہت بڑے انگریزی نقاد کا نام لے کر کوئی دعویٰ اس سے منسوب کر دیتا تھا جس سے غالب کی عظمت ثابت ہو اور یاس کی تردید ہو جائے۔ اسی طرح جب وہ اپنا کوئی شعر سناتے تھے، جسے میں کسی اعتبار سے محل نظر سمجھتا تھا تو کہہ دیتا تھا کہ انگریزی انتقاد کے اصول کے مطابق یہ شعر بالکل لغو ہے۔ بیچارے بہت پریشان ہوتے تھے لیکن میں حاضر باش مصاحب تھا اس لیے میرے خلوص کو ہدف شکوک نہیں بنا سکتے تھے۔ سچ یہ ہے کہ ان دنوں یگانہ کی عظمت پوری طرح مجھ پر روشن نہ ہوئی، وہ جب لاہور سے چلے گئے اور میرا انتقادی شعور کچھ پختگی کی طرف مائل ہوا تو معلوم ہوا کہ یاس کی جلالت قدر کی کیا صورت تھی۔ انھوں نے غزلوں کی غزلیں ایسی کہی ہیں جن میں عشق یا مربوط کوائف کا اشارہ تک نہیں لیکن اس کے باوصف وہ تغزل کی روح سے لبریز ہیں۔ ان کو فطرت نے ایسی جودت طبع عطا کی تھی کہ ہمیشہ نئے انداز سے سوچتے تھے اور ظاہر ہے کہ جو نئے انداز میں سوچے گا وہ نئے انداز میں بات بھی کرے گا۔ ذیل کے شعر ملاحظہ ہوں:۔

پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے ‏ ‏ اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا

بلند ہو تو کھلے تجھ پہ زور پستی کا ‏ ‏ بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

———

مری بہار و خزاں جس کے اختیار میں تھی ‏ ‏ مزاج اس دلِ بے اختیار کا نہ ملا!

امید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر ‏ ‏ کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا

لاہور کے ایک مشاعرے میں انھوں نے یہ مطلع پڑھا ہی تھا کہ جیسے قیامت برپا ہو گئی! عوام الناس سے لے کر خواص تک چیخ چیخ کر داد دینے لگے، لوگ بے اختیار ہو کر جھومنے لگے، یہاں تک کہ جو معاصر شعرا اسٹیج پر بیٹھے تھے انھوں نے بھی ایک دوسرے آنکھوں میں آنکھیں

ڈال کر کہا کہ کیا شعر کہا ہے کم بخت نے: ؎

یکساں کبھی کسی کی نہ گزری زمانے میں — یادش بخیر بیٹھے تھے کل آشیانے میں

مجھے شخصاً یاس کا یہ مثلث بہت پیارا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی وضع داری، ان کی استقامت طبع اور ان کے حوصلے پر دلالت کرتا ہے اور ساتھ ہی نفسیاتی پیچیدگیوں کا سراغ بھی دیتا ہے: ؎

ناخدائے کم ہمت ہاتھ پاؤں مار آیا — تہہ کی کیا خبر لاتا جو سطح بھی ہار آیا
پار اتارنا کیسا، بار سر اتار آیا

کشتیٔ حیات اپنی بہہ رہی تھی دھارے پر — سنگ دل تماشائی ہنستے تھے کنارے پر
دل، وہی شکستہ دل، پھر بھی کار آیا

جگر مراد آبادی (ولادت ۱۸۹۰ء)

جگر سے میری پہلی ملاقات اصغر گونڈوی کے مکان پر ہوئی۔ یہ بھی وہی زمانہ ہے جب اُردو مرکز کا کام شروع تھا اور اصغر نگرانِ کار تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ جگر سے کس قسم کا کام لینا مطلوب تھا۔ واقعہ یہ ہوا کہ وہ آتے ہی ایسے دوستوں کے حلقہ میں گھر گئے جو انھیں شراب پینے کی شہ دیتے تھے اور ان سے عالم سرور و تواجد میں شعر سننا چاہتے تھے۔ میں ان دوستوں کی نشاندہی ضروری خیال نہیں کرتا، نہ یہ سمجھتا ہوں کہ ان کی نیتوں میں کوئی فتور تھا۔ لیکن اس میں قطعاً کوئی شک نہیں کہ ان دوست نما دشمنوں کی مہربانیوں نے جگر کو عملاً ناکارہ بنا دیا۔ وہ ہر وقت شراب پیتے رہتے یا ان پر خمار کی وہ کیفیت طاری رہتی جو مزید شراب کی طالب تھی۔ دونوں صورتوں میں ان سے کام لینا۔ اصغر گونڈوی سے ممکن نہ تھا، جن کا احترام جگر اس حد تک کرتے تھے کہ ان کے سامنے کبھی بلند آواز سے بات بھی نہیں کرتے تھے۔

لاہور میں جگر، یاس اور اصغر کے اجتماع سے ادبی ہلچل پیدا ہوئی اور جو ہنگامے برپا ہوئے ان کی تفصیلات بیان کرنے کا یہ موقعہ نہیں۔ اتنا اشارہ کر دینا کافی ہے کہ شعرا عملاً دو صفوں میں منقسم ہو گئے۔ ایک جماعت مولینا تاجور کی حمایت پر کمربستہ تھی اور دوسری جماعت کے ممتاز ارکان کا خیال یہ تھا کہ کام کم ہو رہا ہے اور روپیہ زیادہ ضائع ہو رہا ہے۔ علاوہ ازیں یہ گمان بھی کیا گیا کہ مولینا تاجور عمداً پنجابی شعرا کے مقابلہ میں جمنا پار کے شعرا کی ایک جماعت منظم کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے یہ صف بندیاں، معرکہ آرائیاں، سخن پردازیاں اور جگت طرازیاں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔ دونوں جماعتوں سے بہت قریب رہا ہوں اور میں دیانتداری سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ مولینا تاجور پنجابی اور غیر پنجابی کی تفریق کو اساس بنا کر کوئی منظم جماعت ایسی پیدا نہیں کرنا چاہتے تھے جس کی فعالیت پنجابی شعرا کے مفاد کو زک پہنچائے۔ تاہم مولینا تاجور کے متعلق جو بدگمانیاں پیدا ہو گئی تھیں وہ قائم رہیں اور مشاعروں میں کسی حد تک دھڑے بندی کے آثار بالبداہت نظر آنے لگے۔

ظاہر ہے کہ جگر ان تمام صف آرائیوں اور دھڑے بندیوں سے نفور تھے۔ وہ شراب و شعر میں اس طرح مستغرق تھے کہ انھیں اور کسی بات کا ہوش ہی نہ تھا۔ ان دنوں بھی جگر ایسے شعر کہتے تھے اور خوب پڑھتے تھے۔ حال ہی میں محمود علی خاں جامعی نے تذکرہ جگر کے عنوان سے جو کتاب مرتب کی ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جگر کا ابتدائی کلام مرزا احسان احمد کی نگرانی میں داغ جگر کے نام سے شائع ہوا۔ مولف کا قیاس ہے کہ یہ تالیف ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی۔ ادارہ فروغ اُردو نے شعلۂ طور کے نام سے جگر کے کلام کا مجموعہ شائع کیا ہے۔ اس داغ جگر کا انتخاب خود جگر ہی نے کیا اور یہ انتخاب منتخبات جگر دورِ اول کے عنوان سے صفحہ ۱۳ سے ۷۸ تک پھیلا ہوا ہے۔

ظاہر ہے کہ میں نے پہلی ملاقات میں اور لاہور کے قیام کے دوران میں جگر سے جو غزلیں اور اشعار سُنے ہیں وہ اسی دورِ اوّل سے تعلق رکھتے ہیں (یعنی آغازِ شعر گوئی سے لے کر ۱۹۲۸ء تک کا دور)۔ اس دور میں جسے جگر نے خود شعلیات کا نام دیا ہے بہت اچھے شعر بھی ملتے ہیں اور شاعر نے اپنے طبعی انکسار سے کام لے کر ان اشعار کو شقیات کا نام دیا ہے حالانکہ بعض اشعار کی پختگی اور جلالت قدر کا یہ عالم ہے کہ روزِ آخر کی غزلیں یاد آتی ہیں۔ مثلاً یہ شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

بغور دیکھ لو انداز میرے مٹنے کے ــــــ یہ سانحہ نہ کبھی پھر نظر سے گزرے گا
قریبِ سرحدِ حرماں جگر ٹھہر جاؤ ــــــ سُنا ہے قافلۂ غم ادھر سے گزرے گا

جس نے بنا دیا مجھے وحشی و خستہ حال سا ــــــ ہائے وہ شکل چاند سی، ہائے وہ قد نہال سا

ہر بڑے شاعر کی شخصیت کم و بیش صد لخت نہیں تو دولخت تو ضرور ہوتی ہے اور اس کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں میں تضاد کم و بیش قائم رہتا ہے۔ اس نفسیاتی حقیقت کی نزاکت صرف تخلیقی فن کار ہی جانتے ہیں۔ جگر کہتے ہیں ؎

بیٹھے ہی بیٹھے آ گیا کیا جانے کیا خیال ــــــ پہروں لپٹ کے روئے دلِ ناتواں سے ہم
پوچھیں گے سرگذشتِ مصیبت کی ابتدا ــــــ اب کے ملے اگر دلِ حسرت نشاں سے ہم

غالب کی مشہور زمین ہے — "دیدار بھی نہیں، تار بھی نہیں"۔ اس میں جگر نے اپنی کم مشقی اور نوعمری کے باوصف یہ دو شعر بھی کہے ہیں ؎

کچھ یہ کہ عرضِ شوق کی طاقت نہیں مجھے ــــــ اور کچھ یہ ہے کہ مصلحتِ یار بھی نہیں
وہ دل کہ جس پہ حرفِ تمنا بھی بار تھا ــــــ اب صرفِ شکوہ سنجیٔ اغیار بھی نہیں

یہ مطلع کتنا شگفتہ اور شاداب ہے ؎

شمیمِ عطر بیز آئی، نسیمِ خوشگوار آئی
تم آئے سامنے یا سو بہاروں کی بہار آئی

جب شعلیات جگر کا یہ عالم ہو تو دوسرے ادوار کی غزل گوئی کا معیار خود بخود سمجھ میں آجاتا ہے۔ بہر حال مجھے شخصاً ان کے یہ دو شعر بڑے پسند ہیں کہ ایک نہایت لطیف نفسیاتی کیفیت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ مسلم ہے کہ ہر انسان اپنے آئینہ دل میں ایک تمثالِ خیالی لیے پھرتا ہے۔ فن کار اسی معیاری پیکرِ جمال کی آرزو میں اپنی عمر گزار دیتا ہے۔ منزل نہ ملے، جستجو اور طلب کی لذت تو کہیں نہیں گئی۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ جو تمثالِ خیال دل میں نقش پرداز ہے اس سے ملتا جلتا کوئی جلوہ نظروں کے سامنے سے گزرتا ہے لیکن شعور مختلف وجوہ کی بنا پر اس پیکرِ جمال کو پہچاننے سے قاصر رہتا ہے جس میں معیاری تمثالِ خیال کے اوصاف موجود ہیں۔ اب وہ دو شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

نہیں جاتی مزید سوزِ نہانی نہیں جاتی ــــــ بجھا جاتا ہے دل چہرے کی تابانی نہیں جاتی
وہ یوں دل سے گزرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی ــــــ وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ایک جگہ کہا ہے کہ غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔ غزل کا احترام کرنا چاہیے۔ ہمارے عہد میں ہمارے ہی درمیان میں سے ایک شخص کو اس آبرو کا رازدار، ترجمان اور پاسبان بنا دیا گیا۔ جگر نے غزل کو واقعی اردو شاعری کی آبرو بنا کر رکھ دیا۔

یہ درست ہے کہ ان کے کلام میں فلسفیانہ تفکلات اور تصورات جذبہ میں سموئے ہوئے نہیں ملتے۔ وہ کوئی منظم نظریۂ حیات پیش نہیں کرتے، لیکن اس کے باوصف یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ صوفی کی طرح وہ فکر کی راہوں پر سفر کرتے ہیں اور حسن و جمال کی تمام اداؤں اور پہلوؤں کے رازدار ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ روپ کیا ہے، چھب کیا ہے، پھبن کیا ہے اور دلبری کی وہ مخصوص آن کیا ہے جو ماورائے خد و خال اور بیرونِ سرحدِ جمال ہوتی ہے۔ اسی حسن اصلاً اور اساساً دلنوازی اور دلبری کا خزینہ بنتا ہے، جب تک شاعر کو روپ کے تمام رنگ نظر نہ آئیں اور حسن کا وہ نکھار دکھائی نہ دے جو درحقیقت حسن سے علیحدہ سی ایک چیز ہوتا ہے، وہ کبھی حسن و جمال کی اداؤں کی تصویر کشی نہیں کر سکتا۔ جگر نے اکثر حسن کی اس پُر اسرار صفت، اس گریزپائی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ محسوس و مشہود تو ہوتی ہے لیکن نہ اس کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے، نہ اسے ارباب ذوق کے سوا اسے کوئی اور دیکھ سکتا ہے ؎

میری نظروں میں ہے اک جانِ وفا کا نقشہ	کس نے دیکھا ہے اس انداز و ادا کا نقشہ
تو نے دیکھا ہی نہیں تجھ سے کہوں کیا زاہد	ہائے ان شوخ نگاہوں میں حیا کا نقشہ
آج جھکتی نظر آتی ہے جبین کونین	دیکھنا یار کے نقشِ کفِ پا کا نقشہ

تاجور نجیب آبادی (ولادت ۱۸۹۴ء)

مولانا تاجور اوائل عمر ہی میں لاہور تشریف لے آئے تھے۔ فاضل دیوبند تو وہ تھے ہی۔ لاہور میں وہ السنۂ شرقیہ کے مختلف امتحانات میں (جہاں تک میرے علم کا تعلق ہے) بسہولت کامیاب ہوئے۔ پہلے دیال سنگھ اسکول میں استاد مقرر ہوئے، پھر کالج میں عربی۔ فارسی اور اردو کے استاد کی حیثیت سے ان کا تقرر ہو گیا۔ کالج میں میں نے ان کے ساتھ اکیس سال گزارے ہیں یعنی ۱۹۳۰ سے ۱۹۵۱ تک۔ اور اس سے سات آٹھ سال پہلے بھی ان سے منظم مراسم رہے ہیں۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، میں دیانتداری سے کہہ سکتا ہوں کہ انھوں نے کبھی پنجابی، غیر پنجابی کی تفریق کو اہمیت نہ دی۔ ان کی رائے میں پنجاب میں اردو تبھی مقبول ہو سکتی تھی کہ دوسری قومیں یعنی ہندو اور سکھ بھی اس زبان کے مطالعے کی طرف متوجہ ہوں۔ اور انھیں اس زبان کی ثقافت اور تہذیب سے اتنی ہمدردی پیدا ہو جائے کہ اس میں شعر کہنے کو جی چاہے۔ مولانا کے غیر مسلم شاگردوں میں پورن سنگھ ہنر، میلارام وفا۔ اودھے سنگھ شائق۔ کرپال سنگھ بیدار (اور غالباً جگن ناتھ آزاد بھی) بہت ممتاز و نمایاں تھے۔ وفا روزمرے اور محاورے پر بہت عبور رکھتے تھے، اور بہت طباع و ذہین سخن طراز تھے۔ ان کا ایک شعر جو میں صرف و نحو کی تدریس میں پڑھا کرتا ہوں۔ مجھے اب تک یاد ہے ؎

وہ سن کر حالِ فرقت ہو گا ہو گا کہتے جاتے ہیں
کہانی میری ماضی احتمالی ہوتی جاتی ہے

مولانا طبعاً مجلس ساز، انجمن طراز، محفل باز اور صحیفہ نواز تھے۔ انھوں نے لاہور میں انجمن ارباب علم قائم کی۔ جس کے اہتمام میں بڑے ٹھاٹھ کے مشاعرے ہوتے تھے۔ پھر اردو مرکز کا سنگ بنیاد رکھا۔ اصغر، جگر اور یاس کو لاہور بلوایا کہ ان کی معاونت کریں۔

رسالوں کی ادارت کا انھیں بہت وسیع تجربہ تھا۔ وہ برسوں میاں بشیر احمد کے ساتھ "ہمایوں" کے شریک مدیر رہے۔ "مخزن" کی ادارت ان کے سپرد رہی۔ "ادبی دنیا" جیسا وسیع و عریض اور ضخیم رسالہ انھوں نے شائع کیا۔ "شاہکار" (جو "ادبی دنیا" ہی کے ساتھ کا تھا)

کی بنیاد رکھی۔ ان صحیفوں میں بہت ممتاز اہل قلم بہ تسلسل لکھتے تھے۔ لیکن مولانا کی مصلحت اندیشی اس بات کی متقاضی تھی کہ وہ غیر قوم شعراء کو آگے بڑھائیں تاکہ اُردو اتنی مقبول ہو جائے کہ کوئی مقامی زبان یا لہجہ اس کی جگہ نہ لے سکے۔

انھیں محفل آرائی اور صحیفہ نگاری سے اتنی فرصت ہی نہ ملتی تھی کہ مستقلاً تصنیف و تالیف کے کام کی طرف متوجہ ہوں۔ نتیجتاً انھوں نے کالج میں اُردو ادب پر جو لیکچر دیے اور جو بعض شاگردوں کو منتقل ہیں یا تو انھیں مولانا کی علمی تحقیق تصور کرنا چاہیے یا پھر کچھ انتخابات ہیں جو انھوں نے شائع کیے تھے۔ اگر وہ محفل آرائی اور انجمن سازی سے فرصت پاتے تو اُردو ادب کی بہت ٹھوس خدمت کر سکتے تھے۔ اس کے باوصف انھوں نے نہایت اچھے رسالے شائع کیے اور نئے نئے مضمون نگاروں کو پڑھنے والوں سے متعارف کرایا۔ رسالوں کی اشاعت کے معاملوں میں وہ دھن کے اتنے پکے تھے کہ عملاً اپنا تمام ذاتی اثاثہ اسی سلسلے میں صرف کر دیا۔ ایک دن مرحوم نے مجھ سے کہا کہ بیگم مجھ سے خفا ہیں کہ میں نے ان کے زیورات فروخت کر کے ادبی رسالوں کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ حالانکہ اگر ان کے زیورات سونے کے تھے تو ادب میں تبدیل ہو کر وہ اب کندن ہو گئے۔ لیکن یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اس کا جواب خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا۔

محفل آرائی اور مجلس طرازی کے سلسلے میں مولانا کا دوسری شعرا کی جماعتوں سے تصادم بھی ہو جاتا تھا۔ مثلاً ایک ممتاز پنجابی شاعر سے ان کے تعلقات اسی لیے بگڑے کہ اس کے خیال میں وہ اسے اس مقام جلیل تک پہنچنے سے روکتے تھے جو اس کے لیے مقدر ہو چکا تھا۔ بہرحال مسرت کا مقام ہے کہ ان کی موت سے پہلے تمام رنجشیں اور کشیدگیاں دور ہو گئیں۔ معاصروں میں پھر دوستانہ روابط قائم ہو گئے۔ کم از کم ظاہراً تو کشیدگی کے آثار بالکل غائب ہو گئے۔ جہاں تک نیتوں کا تعلق ہے۔ ان پر حسن ظن رکھنا چاہیے۔

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ مولانا غیر مسلم سخن طرازوں کو آگے بڑھانے کے لیے خود غزلیں کہہ کر انھیں عطا کر دیتے تھے تاکہ عوام کی داد سے ان کا دل بڑھے اور وہ خود تخلیقی کام کی طرف متوجہ ہوں۔ میں رنگ محل مشن ہائی سکول لاہور میں نویں جماعت کا طالب علم تھا کہ میرا ایک ہندو دوست مجھے ان کے ہاں لے گیا۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ شعر پر ان سے اصلاح لوں۔ میں نے غزل ان کی خدمت میں پیش کی تو انھوں نے بغیر کسی توضیح کے چار پانچ شعر قلم زد کر دیے اور اسی وقت دو تین شعر کہہ کر مجھے عطا کر دیے۔ اصلاح کا یہ طریقہ مجھے آبرومندانہ معلوم نہ ہوا۔ چنانچہ اس کے بعد میں پھر کبھی اصلاح کے لیے ان کی خدمت میں حاضر نہ ہوا۔ البتہ مراسم قائم ہو گئے جو ان کی وفات تک قائم رہے۔ ملگا ہے گاہے جو شکر رنجی ہو جاتی تھی۔ اس کا کوئی علاج نہ تھا کہ آخر شکر رنجی بھی وہیں ہوتی ہے جہاں مراسم استوار ہوں۔

میں نے عرض کیا ہے کہ مولانا نے کوئی ٹھوس علمی تصنیف اپنی یادگار نہیں چھوڑی۔ البتہ رسائل میں ان کے اداریے اور نوٹ موجود ہیں کہ انشا پردازی کی جان ہیں۔ شعر وہ بہت بے تکلفانہ اور برجستہ کہتے تھے۔ کیا نظم اور کیا غزل دونوں صورتوں میں ان کی شگفتگی مزاج، جودت طبع اور قدرت کلام کا اظہار ہوتا تھا۔ میرا ایمان ہے کہ اگر وہ یکسر شعر کی طرف توجہ دیتے تو ان کا شمار چوٹی کے شعرا میں ہوتا۔ لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں۔ انھیں اتنی فرصت ہی نہ تھی۔ اس کے باوجود بعض غزلیں اور اشعار انھوں نے بہت بلند مقام سے کہے ہیں۔ ان کی غزل کی یہ خصوصیت تھی کہ محاورے کی چاشنی اور زبان کی مٹھاس رفعت مطالب سے گھل مل جاتی تھی۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

الفت ہے راز، راز کی حد تک ہے سرفراز — جب داستان بزم بنی خوار ہو گئی

خود داریٔ جنوں نے نہ جانے دیا وہاں — کم بخت راہِ دوست میں دیوار ہو گئی

———

نہ دل بدلا۔ نہ دل کی آرزو بدلی۔ نہ دہ بدلے ۔۔۔ میں کیسے اعتبارِ انقلابِ آسمان کر لوں
سبب ہر ایک مجھ سے پوچھتا ہے میرے رونے کا ۔۔۔ الٰہی ساری دنیا کو میں کیونکر رازداں کر لوں

وہ حیات بخش رسا کے شاگرد تھے اس لیے ان کے کلام میں تیکھی معاملہ بندی کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ انھوں نے خود مجھے اپنے دو اشعار سنائے تھے جو مجھے کسی انتخاب میں نہیں ملے:

تم نے لڑا لڑا کے نگاہیں چرائی آنکھ ۔۔۔ ہم نے ملا ملا کے نظر دل ملا دیا
دن رات ان کو کھیل یہ رہتا ہے تاجور ۔۔۔ مٹی پہ میرا نام لکھا اور مٹا دیا

تاجور مرحوم بہت باغ و بہار انسان تھے لیکن افسوس کہ ان سے اردو ادب کو جو توقعات تھیں وہ جزواً بھی پوری نہ ہوئیں۔ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ ان کے شاگردوں کی جماعت وہ خزینۂ علم ہے جو انھوں نے مستقبل کو عطا کیا ہے۔ لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ انھوں نے اپنی ذہانت۔ فطانت اور جودت و ندرتِ طبع سے کام لے کر اردو ادب کے سلسلے میں کوئی ایسا کام کیا ہو۔ جو واقعتاً ان کی عظمت پر دلالت کرے اور انھیں غیر فانی بنا دے۔

خلیفہ عبد الحکیم

ڈاکٹر عبد الحکیم ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ نہایت ذہین و فطین ادیب اور انشا پرداز، مفکر اور فلسفی تھے۔ جب لاہور میں ادارہ ثقافتِ اسلامیہ قائم ہوا اور خلیفہ صاحب اس کے ناظم مقرر کیے گئے تو بجا طور پر یہ امید بندھی کہ اب وہ اپنے علم و فضل سے جم کر کام لیں گے۔ یہ توقعات کاملاً پوری ہوئیں۔ ادارے کے قیام سے پہلے بھی وہ لکھتے پڑھتے رہتے تھے۔ رومی کے متخصصین میں سے تھے۔ اور اقبال کے فلسفیانہ کلام کی نزاکتوں کو خوب جانتے تھے۔ لیکن ادارے کے قیام کے بعد انھوں نے واقعی جم کر کام کرنا شروع کیا۔ وہ صحیح معانی میں جامع الکمالات بزرگ تھے۔ اردو فارسی پر انھیں عبور تھا۔ انگریزی زبان کے پیچ و خم سے کماحقہٗ باخبر تھے۔ شعر کہنے کا شوق تھا۔ فلسفے سے ذوق تھا۔ فنونِ لطیفہ سے شغف تھا اور اخلاق و روحانیات سے دلچسپی لیتے تھے۔ پھر یہ کہ ان کی صحت بہت اچھی تھی۔ لحیم شحیم گورے چٹے، شگفتہ مزاج انسان تھے کہ استثنائی صورتوں کے علاوہ تبسم کی لہر ہر وقت ان کے لبوں پر اپنی دھوپ چھاؤں دکھاتی تھی (یہ استعارہ کچھ پیچیدہ سا ہو گیا ہے۔ لیکن امید ہے کہ نقوش کے قارئین کرام جو تمام ہوشمند ہیں میری عرض پردازی کے مفہوم سے آشنا ہو جائیں گے)

ادارے کے لیے خلیفہ صاحب نے گویا اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ پڑھے لکھے آدمیوں کی ایک جماعت اپنے ساتھ لی جن میں مشرقی علوم کے ماہر تھے اور مغربی علوم و فنون سے باخبر لوگ بھی۔ خلیفہ صاحب کی کوشش یہ تھی کہ اسلام کی ان اقدار کو اجاگر کیا جائے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مذہب جامد نہیں بلکہ حرکی ہے اور زمانے کے تقاضوں کا ہمیشہ ساتھ دیتا رہا ہے اور ساتھ دیتا رہے گا۔ اس سلسلے میں انھوں نے ادارے کے لیے گوناگوں کام کیے۔ اسلامی اسلوبِ فکر و نظر و معیارِ قدر کے متعلق انگریزی میں ایک معرکے کی کتاب لکھی۔ "فکرِ اقبال" کے نام سے اقبال کے تصورات اور تعقلات کی پیچیدگیوں کو سلجھایا۔ کتاب کے آخر میں انھوں نے اسلام کی الٰہیات کی تشکیلِ جدید" (علامہ مرحوم کی انگریزی تصنیف) کا خلاصہ درج کیا۔ خودی اور اس کے تصور سے بہ تفصیل بحث کی۔

جو شخص اقبال سے شغف رکھے گا۔ وہ رومی کا مطالعہ ضرور کرے گا۔ اور خلیفہ صاحب کو اس بلند مرتبت شاعر کے افکار سے کماحقہٗ آگاہ تھے انھوں نے حکمتِ رومی کے نام سے ایک نہایت خیال افروز کتاب لکھی۔ جس میں رومی کے بنیادی تصورات سے بحث

کی گئی ہے۔ رقصا و قدر پر انھوں نے جو باب لکھا ہے وہ بہت بلند مرتبہ ہے۔ تشبیہات رومی پر بھی ان کی تصنیف ایک کارنامہ ہے۔ آپ کے ادارے کے لیے عبدالرشید تبسم نے رومی کے ملفوظات "فیہ ما فیہ" کا اردو ترجمہ بھی کیا۔ جو اگرچہ بوجوہ بعض مقامات پر الجھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جو بحیثیت مجموعی اصل کے مطالب کو بڑی دیانتداری سے اردو میں منتقل کرتا ہے۔

میری نظر میں خلیفہ صاحب کا تالیفی کارنامہ "افکارِ غالب" ہے۔ جس میں انھوں نے غالب کے منتخب حکیمانہ اشعار کی شرح کی ہے۔ یہ کتاب لاہور سے شائع ہوئی ہے (مکتبہ معین الادب اردو بازار لاہور) اور اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ صاحب غالب کی نزاکتِ خیال کی تہ تک پہنچ گئے تھے۔ بعض اشعار کی تشریح راقم السطور کی رائے میں محلِ نظر ہے۔ لیکن اس سے کتاب کی مجموعی اہمیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فہرستِ مطالب پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ انھوں نے متفرق اشعار اور منتخب رباعیات کی بھی شرح کی ہے۔ اس تشریح کا اسلوب فلسفیانہ زیادہ ہے اور ادبی کم۔ لیکن خلیفہ صاحب سے ایسی ہی تصنیف کی توقع کی جا سکتی تھی۔ بہرحال اس کتاب کی اشاعت سے "غالبیات" ایک اچھی تصنیف کا اضافہ ہوا۔

افسوس ہے کہ مرگِ ناگہاں نے انھیں ہم سے چھین لیا۔ ان کے سامنے کام کرنے کے اعلیٰ درجے کے منصوبے تھے اور وہ ان کی تکمیل کی خاطر اسباب و وسائل کی جستجو میں مستغرق رہتے تھے۔ اب ادارے کے ناظم پروفیسر محمد شریف ہیں۔ ان کا بھی مزاج فلسفیانہ ہے۔ ذوق بلاشبہ سلیم ہے۔ اس لیے ان کی تحریروں میں بھی فلسفیانہ تحریروں کی سی خشکی نہیں ہوتی۔ امید ہے کہ وہ خلیفہ صاحب ہی کی طرح ادارے کے لیے مفید تالیفات مرتب کریں گے۔

تاثیر

تاثیر مرحوم کی ذہانت اور بذلہ سنجی کے قائل ان کے دشمن بھی تھے اور ہیں۔ اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ ان کے دوستوں کے دل میں ان کی نوا پیرائی کا کیا مقام ہوگا۔ یہ درست ہے کہ اب تک تاثیر کی کوئی ایسی کتاب سامنے نہیں آئی جس کی بنا علمی تحقیق و تدقیق پر ہو۔ میرے علم میں ہے کہ ان کے مضامین علمی اور ان کے تھیسس یعنی پی۔ ایچ ڈی کے مقالے کی اشاعت کا انتظام ہو رہا تھا۔ معلوم نہیں وہ بات کس مرحلے تک پہنچی۔ اگر یہ تمام مضامین شائع ہو گئے تو تاثیر کا صحیح علمی مقام متعین ہو سکے گا (اور ادبی بھی) ورنہ صرف بے تکلف دوست جانتے ہیں کہ اسے مختلف علوم و فنون پر کیسی عالمانہ قدرت حاصل تھی۔ عربی وہ بقدرِ ضرورت جانتے تھے۔ فارسی کے نکات سے آگاہ تھے۔ انگریزی کے متخصص تھے، فنونِ لطیفہ میں مصوری اور مجسمہ سازی کے دقائق پر مطلع تھے۔ کلاسیکی موسیقی کی ودیا سے بھی آگاہ تھے۔

میں لا کالج میں تھا اور تاثیر ایم۔ اے میں کہ ہم دونوں کی ملاقات ہوئی۔ جگنوں کے اس مشہور مشاعرے میں ہم دونوں ہی موجود تھے جو غالباً ۱۹۲۴ء یا ۲۵ء میں ہوا تھا اور جس کی صدارت راجہ راجھپال سنگھ شیدا نے کی تھی۔ اس کا ذکر میں تفصیلاً اور جگہ کر آیا ہوں۔

جب تاثیر معلّمی کی طرف مائل ہوئے اور میں وکالت کی طرف جھکا تو ہمارے درمیان بعدِ مکانی اور بعدِ زمانی قائم ہوا۔ لیکن اس قیامِ بُعد سے پہلے ہم ایک دوسرے کے قریب آ چکے تھے۔ درمیانی کڑی حکیم یوسف حسن مدیر نیرنگِ خیال تھے جن کے لیے میں بھی لکھتا تھا اور تاثیر بھی۔ تاثیر کبھی اپنے نام سے لکھتے تھے اور کبھی قلمی نقاب اوڑھ لیتے تھے مثلاً نظامی قدیری ایم۔ اے اسی زمانے میں حسنِ اتفاق سے یاس۔ سیماب۔ ساغر۔ جگر اور اصغر بھی لاہور آ گئے اور نیرنگِ خیال میں خوب خوب قلمی معرکہ آرائیاں رہیں۔

عبدالرحمٰن چغتائی جو پاکستان کے مایۂ ناز مصور ہیں، پہلی بار تاثیر ہی کی وساطت سے عام طور لوگوں سے روشناس ہوئے۔

ان کی مستوری کے نمونے نیرنگ خیال میں شائع ہوئے اور تاثیر نے ان پر نوٹ لکھے۔ یہ نوٹ بڑے خیال انگیز تھے اور ظاہر کرتے تھے کہ تاثیر تمام رموز سے آشنا ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ مجی حفیظ کو یہ بات یاد ہو گی کہ نہیں کہ شملہ میں وہ تاثیر سے میری ہی وساطت سے ملے۔ وہاں بڑے زوروں کا مشاعرہ تھا اور حفیظ، تاثیر، نظیر لدھیانوی، تاجور، اختر شیرانی اور ان کے رفقا موجود تھے۔ ہم لوگ مسلم ہوٹل میں ٹھہرائے گئے۔ عندلیب شادانی پہلے ہی سے مقیم تھے۔ وہ مشاعرے سے ایک ماہ پہلے آ گئے تھے۔ ان کا اپنا شعر ہے ؎

آ ہی پہنچے زراہ نادانی حضرت عندلیب شادانی

یہیں تاثیر اور حفیظ کی ملاقات ہوئی اور یہیں گویا ذہناً طے ہوا کہ نیاز مندان لاہور علمی ادبی محاذ پر پنجاب کے شاعروں اور انشا پردازوں کی حمایت کرنے کے سلسلے میں حفیظ کو ملحوظ خاطر رکھیں گے۔ چنانچہ ان کے مجموعہ کلام پر مرحوم بخاری نے دیباچہ لکھا اور وہ جو حفیظ کے ذہن میں قدیم رنگ اور جدید رنگ کے متضاد رجحانات کی کشمکش تھی اس کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا "عاشق کہ نظر باز"

جب تاثیر اسلامیہ کالج میں آئے تو ان کا گھر لاہور کے ذہین ادیبوں، نئے لکھنے والوں اور انشا پردازوں کا ملجا و ماویٰ بن گیا۔ وہ ہر ایک کو ایسا مشورہ دیتے تھے اور ان کی اصابت رائے کی ایسی دھوم تھی کہ جو شخص وہاں جاتا تھا وہ ان کا معتقد اور مداح ہو کر آتا تھا۔

شعر وہ فارسی میں بھی کہتے تھے اور اردو میں بھی۔ اردو میں ان کی نظمیں "رس بھرے ہونٹ"، "ید بیضا"، "دیوداسی"، "اگلے وقتوں کے شاعران کرام" بہت مشہور ہیں۔ غزلوں میں آپ یہ غزل اکثر ریڈیو پر سنتے ہوں گے ؎

میری وفائیں یاد کرو گے روؤ گے فریاد کرو گے
محفل کی محفل ہے رنگیں کس کس کا دل شاد کرو گے
ختم ہوئی دشنام طرازی یا کچھ اور ارشاد کرو گے

ان کا یہ شعر بھی زبان زد خاص و عام ہے ؎

دل نے آنکھوں سے کہی، آنکھوں نے ان سے کہہ دی
بات چل نکلی ہے اب دیکھیں کہاں تک پہنچے

بات یہ ہے کہ اصلاً تاثیر غزل کے شاعر نہ تھے۔ یہ تو مشق سخن تھی۔ ان کی منظومات ان کی بقائے دوام کی ضامن ہیں۔ تاہم ایک غزل ایسی ہے جس نے اردو میں ایک نئی روایت کا دروازہ کھولا، اس غزل کا بنیادی خیال یہ ہے کہ بیسویں صدی میں ایسی عورت بھی ہے جو دلکش اور دلربا ہے چاہتی ہے کہ آپ اسے چاہیں مسکراتی بھی ہے لیکن آپ کو چاہتی نہیں۔ یعنی تاثیر نے بالفاظ دیگر یہ کہا کہ جس طرح میں عشق کرنے پر مجبور ہوں محبوبہ بھی اپنے افعال کی مختار ہے۔ ضروری نہیں کہ میں اس سے عشق کروں تو وہ بھی مجھ سے عشق کرے۔ یہ غزل طویل ہے میں اطناب سے بچنے کے لیے ایک شعر نقل کرتا ہوں ؎

یہ خوش دلی ہے میرے واسطے نہیں ہے[1] یہ دہن کہ ہے شگفتہ یہ جبیں کہ ہے کشادہ

---

[1] غالب کا مشہور شعر یاد کیجیے جو اس شعر کے قریب قریب ایک کیفیت کی ترجمانی کرتا ہے ؎

کشتۂ دل خویشتم کز ستمگران یکسر دید دلفریبی ہا گفت مہربانی ہاست

تاثیر کا مقام اُردو ادب میں تبھی متعین ہو سکتا ہے کہ اس کی تمام تحریرات ہمارے سامنے آئیں۔ آتشکدہ اور کنول کی اشاعت سے صرف اس بات کا سراغ ملتا ہے کہ اس کے ذہن کی جودت اور ندرت کی کیا کیفیت تھی، اگرچہ وہ انگریزی کا متخصص تھا لیکن جب یہ سوال پیدا ہوا کہ وہ اردو ایم اے کو تعلیم دے سکتا ہے کہ نہیں تو وائس چانسلر اور حکومت نے بطور خاص اپنی منظوری عطا فرمائی۔ بخاری اور راقم الحروف کے سلسلے میں بھی یہی ہوا۔ غالباً حمید احمد خاں صاحب کو بھی بطور خاص منظوری دی گئی۔

میں اور تاثیر ایک دوسرے کو اپنی غزلیں اور اپنے مضمون دکھا دیتے تھے اور خواہش کرتے تھے کہ ان پر کڑا انتقاد کیا جائے۔ باہمی استفادہ بھی جاری تھا۔ ان کی ذکاوتِ طبع اور ذہانت کی ایک عجیب و غریب مثال میرے ذہن میں ہے۔ میں غزل کہہ رہا تھا

حدِ افق تک پھیلا ہوا تھا ــــ دشتِ غمِ دل
رک رک کے مجھ کو چلنا پڑا تھا ــــ منزل بہ منزل

میں نے مصرع کا ٹکڑا کہا

تصویرِ لیلیٰ ہودج نشیں تھی ـــــ ؟

اور دوسرا مصرع کہا کہ

ذوقِ تماشا کیا جھانکتا تھا ــــ محمل بہ محمل

مجھے پہلے مصرع کا ٹکڑا کسی طرح نہ سوجھا۔ تاثیر کو شعر سنایا۔ اس نے کہا اس ٹکڑے کے الفاظ تو ازل سے معین اور مقدر ہیں یعنی ــ "لیلیٰ نہیں تھی" اب شعر کی یہ صورت نکلی ؎

تصویرِ لیلیٰ ہودج نشیں تھی ــ لیلیٰ نہیں تھی
ذوقِ تماشا کیا جھانکتا تھا ــ محمل بہ محمل

اس طرح کے کئی واقعات یاد ہیں لیکن یہ مختصر مضمون ان کا متحمل نہ ہو سکے گا۔ یہاں ختم کلام کرتا ہوں کہ تاثیر کا جو بلند ادبی مقام تھا اور اسے لاہور میں جو ادبی سرداری حاصل تھی اس کے پیش نظر یہ بات ضروری ہے کہ اس کے تمام مقالات مرتب و مدون کیے جائیں اور شائع ہوں۔ بیگم تاثیر کو فرصت نہیں لیکن آنکھیں آفتاب احمد، اعجاز حسین اور حمید شیخ کی طرف اٹھتی ہیں کہ وہ اپنے فرائض پہچانیں اور ادا کریں۔ مجھ سے جو کچھ بن پڑے گا اس سے کوتاہی نہ ہو گی۔ لاہور کے ادبی حلقوں کا جانشین اللہ کو پیارا ہو جائے اور اس کی تحریریں منظم نہ ہوں۔ کتنے افسوس کی بات ہے۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تاثیر کا ہر نوشتہ کتابی صورت میں شائع ہو۔ یہاں تک کہ چراغ حسن حسرت سے معرکہ آرائی بھی شائع ہو جائے۔ اس جنگ کی روداد میں نہایت حسین چیزیں ملیں گی۔ حسرت کی بھی اور تاثیر کی بھی۔ اگر ایسی ہی بات ہو جو بہت تیز ہو تو وہ شعر حذف کر دیے جائیں۔ اگرچہ میں شخصاً اس کے حق میں نہیں۔

پطرس بخاری مرحوم

سنہ ۲۴-۱۹۲۵ء کا واقعہ ہے کہ میں لا کالج میں پڑھتا تھا۔ پرنسپل چیٹرجی کا ایک ڈراما "اوما" نامی میں نے ترجمہ کیا اور لا کالج میں اس کی ریہرسلیں ہونے لگیں، یہ وہ زمانہ ہے کہ متین کنفکشنر اپنی بیوی کو قتل کرنے کے الزام میں اور پولیس کا باقاعدہ مقابلہ کرنے کے جرم میں مارا جاتا ہے۔ یوں اوما کے ریہرسلوں کا زمانہ بالکل متعین ہو جاتا ہے۔ انہی دنوں کالج میں دینا ناتھ زتشی بھی تشریف لاتے تھے جنھوں نے بعد میں ریڈیو پر اپنی آواز کے کمالات دکھائے۔

ان سے بخاری کے روابط تھے۔ غالباً وہی انھیں لا رکالج لے آئے اور میری ان سے سرسری سی ملاقات ہوئی۔ تاہم انھوں نے ڈرامے سے میری دلچسپی دیکھ کر مجھے برنارڈ شا کی کتاب آرمز اینڈ دی مین عطا فرمائی کہ اس کا مطالعہ کرنے کے بعد شا کے فن پر انتقاد کروں۔ انتقاد تو میں کیا کرتا۔ استفادہ ضرور کیا۔ اس کے بعد میں گجرات چلا گیا اور وہ لاہور ہی میں سرکاری ملازمت میں لے لیے گئے۔ جب میں گجرات سے واپس آیا اور دیال سنگھ کالج میں ملازم ہوا تو پھر دبی چنگاریاں سلگیں اور میں نے یک بابی ڈرامے کھیلنے کا پروگرام بنایا۔ ان میں بیری کا ڈراما دوست بھی تھا اور ٹیگور کا ڈراما ساوھو بھی۔ دوست میں پروفیسر گردر معلم ادبیات انگریزی دیال سنگھ کالج اور محمد قیوم نظر نے اپنی اداکاری کے جوہر دکھلائے۔ بخاری ان دنوں برابر ریہرسل دیکھنے آتے رہے۔ ایک دن وہ سوندھی کو بھی لے آئے جو گورنمنٹ کالج میں پروفیسر تھے۔ سوندھی نے سٹیج کرافٹ کے متعلق مجھے بہت مفید مشورے دیئے۔ سنگ مرمر کی ایک شہ نشین بہت سستے داموں سفیدے کی مدد سے تیار ہوئی۔ ایک کھڑکی میں کسی طرح نہیں دکھا سکتا تھا۔ بخاری اور سوندھی کی مجموعی ذہانت نے اس کھڑکی کا مقام متعین کیا، بخاری مرحوم کو کھیل سے اور اس کے لوازم سے دلچسپی نہیں عشق تھا۔ ان کے اپنے کالج سے تو شعلے بلند ہوتے تھے لیکن ان کی طفیل جب تک میں دیال سنگھ کالج میں رہا۔ دھواں وہاں سے بھی نکلتا دکھائی دیا اور سال کے سال کھیل کھیلنے کی روایت زندہ رہی۔

بخاری کی بذلہ سنجی، حاضر جوابی اور ظرافت کی یہ صورت تھی کہ یہ چیزیں فوارے کی طرح ان سے پھوٹی پڑتی تھیں۔ جن دنوں وہ میکلوڈ روڈ پر رہتے تھے ان کے خسر کا انتقال ہوا۔ بہت سے لوگ پہنچے۔ میں بھی حاضر ہوا۔ قاضی فضل حق مرحوم استاد فارسی میرے ساتھ موجود تھے۔ میں نے ان سے پڑھا ہے اس لیے ان کے سامنے بربنائے احترام بخاری سے کھل کر باتیں نہیں کر سکتا تھا۔ بخاری نے رمز شناسی سے کام لے کر اپنے چونچال پن کا اظہار شروع کیا۔ یہ گفتگو جو میں نقل کرتا ہوں۔ شاید روایت اور درایت کے تمام اصولوں پر پوری نہ اترے کہ لفظوں میں ضرور ہیر پھیر ہوگا۔ لیکن میرا حافظہ اچھا ہے اس لیے مجھے گمان ہے کہ تغیر لفظی بہت کم ہوگا۔ اب گفتگو ملاحظہ ہو۔ "ب" سے مراد بخاری ہے "ع" سے عابد اور "ف" سے قاضی فضل حق مرحوم۔

ب :- عابد صاحب! آپ ان سے واقف ہیں۔

ع :- جی یہ میرے استاد ہیں۔

ب :- خیر۔ میرے رفیق کار ہیں۔

ع :- ماشاء اللہ

ب :- لاحول ولا قوۃ الا باللہ

ع :- کیوں؟

ب :- آپ کو پتہ ہے ان کا لڑکا ہمارے کالج میں پڑھتا ہے۔

ع :- جی نہیں۔

ب :- تو آپ مطلع ہو جائیے۔ ایک دن وہ میرے پاس آیا تو میں نے شفیق استادوں کی طرح پوچھا۔ برخوردار کسی مضمون میں کمزور بھی ہو۔ یعنی انگریزی کے سوا۔ تو اس پر بولا۔ جی۔ فارسی میں کمزور ہوں۔ اس پہ میں نے کہا۔ فارسی نہ تمہارے باوا جان کو آئی نہ تمھیں آئے گی۔ اور آپ کو معلوم ہے۔ اس لڑکے نے کیا کیا۔ جا کے باپ سے کہہ دیا کہ بخاری کہتا ہے۔ آپ کو

فارسی نہیں آتی۔

ع :۔ پھر؟

ب :۔ پھر کیا۔ قاضی فضل حق صاحب میرے پاس آئے ان کو کہنا چاہیے تھا کہ بیٹے کے سامنے باپ کی نالائقی کا بھانڈا نہیں پھوڑنا چاہیے۔ لیکن پتہ ہے انھوں نے کہا کیا۔ فرمایا تم غلط کہتے ہو میں فارسی جانتا ہوں۔ عابد صاحب یہ سن کر میں ہکا بکا رہ گیا۔

ف :۔ عابد صاحب! آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ صرف داستان طرازی ہے۔

ب : لیکن یہ نہ بھولیے گا کہ اصل دعویٰ اسی طرح قائم ہے۔ جو شخص ان سے پڑھ کر فارسی پڑھائے گا وہ کیا پڑھائے گا؟

میں نے یہ گفتگو مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر پیش کی ہے ورنہ بخاری کی ہر بات بذلہ تھی۔ ان کا ہر سخن پُر مغز تھا۔ ان کے علمی تنوع کا یہ عالم تھا کہ ایم ایس سی طبیعات میں پڑھتے تھے۔ فیض صاحب کو مشورہ دیا گیا کہ انگریزی کا ایم۔اے کرو۔ اور سائنس کے اس طالب علم نے انگریزی پر ایسا عبور حاصل کیا اور اس کامیابی سے امتحان پاس کیا کہ صوبہ پنجاب (متحدہ) میں بلکہ غالباً برصغیر میں وہ پہلے ہندوستانی تھے جو انگریزی لسانیات اور اصوات کے استاد مقرر ہوئے۔ ورنہ اس سے پہلے یہ مضمون اگر کسی نے پڑھایا ہو گا تو وہ انگریز ہو گا۔

مرحوم اردو میں بھی شعر کہتے تھے فارسی میں بھی۔ ان کے کلام کا جو حصہ دست برد زمانہ سے محفوظ رہا وہ طفیل صاحب نے نقوش کے پطرس نمبر میں جمع کر دیا کہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آئے۔ اس پطرس نمبر کی اشاعت سے بڑے بڑے ادیبوں کے کارنامے روشنی میں آئے۔ اداکاری میں انھیں یہ کمال حاصل تھا کہ جب انھوں نے کارل چپیک (نوبل پرائز حاصل کرنے والا تمثیل نگار) کا ڈراما کھیلا اور خود مرکزی کردار ادا کیا تو دیکھنے والوں پر جیسے سحر کر دیا اور وہ طلسماتی کیفیت پیدا ہوئی جسے ڈراما کی اصطلاح میں "اداکاری کی زندہ شخصیت کا کرشمہ کہتے ہیں" مجی تاج نے اس کھیل میں حصہ لیا اور اپنے جوہر دکھائے لیکن سچ یہ ہے کہ اس سلسلے میں بخاری کا کوئی حریف نہ تھا۔ وہ اس نکتے سے بھی آگاہ تھے کہ اداکاری گویا اس سے پھوٹی پڑتی ہے۔ یعنی اس کی خاموشی کی وضع اور نوعیت سین کی فضا کے عین مطابق ہوتی ہے۔ سچ پوچھیے تو خاموش اداکاری ہی میں انسان کے جوہر کھلتے ہیں۔ ہاتھوں اور پاؤں کو اس طرح قابو میں رکھنا پڑتا ہے کہ تمسخر کا سامان نہ بنے بلکہ اثر میں اضافہ کرے۔

سینما کی مقبولیت کے بعد انھوں نے بہت اونچے درجے کی کتابیں پڑھیں کہ فلم کی تکنیک کے رموز ان پر روشن ہوں۔ ڈائرکٹروں میں پڈوکن کی بہت تعریف کرتے تھے جس نے اپنے کھیل "دس دن جن میں دنیا تہ و بالا ہو گئی"[لہ] میں کمال ذکاوت کا مظاہرہ کیا تھا۔

بہرحال یہ بھی ان کے ضمنی کمالات ہیں۔ تعلیم، تدریس، انتظامی صلاحیت، تقریر، خطابت، طنز، بذلہ سنجی۔ مختصر یہ کہ وہ کسی سے پیچھے نہ تھے۔ جب وہ آل انڈیا ریڈیو کے کنٹرولر مقرر ہوئے اور تاثیر بھی دہلی متعین ہوئے تو اس شہر میں ادبی گہما گہمی پیدا ہوئی۔ بخاری کے گھر قوالی اور سرود کی بڑی معرکے کی محفلیں منعقد ہوئیں۔ ان دنوں وہ برصغیر پاک و ہند کے چوٹی کے بذلہ سنج، طنز نگار اور ظریف سمجھے جاتے تھے۔ "مضامین پطرس" کی اشاعت کے بعد ان کی دھاک بیٹھ چکی تھی۔ جس بے تکلفی سے وہ طنز کرتے ہیں، جیسا بھرپور

لہ TEN DAYS THAT SHOOK THE WORLD.

وار کرتے ہیں۔ جس طرح معاشرے کے مفسدات کی نشاندہی کرتے ہیں وہ انہی کا حصہ ہے۔ رشید احمد صدیقی بھی طنز اور خالص ظرافت میں ان تک نہیں پہنچے۔ مضامین مختصر سا مجموعہ ہے لیکن اس میں مزاح کی ساری اصناف موجود ہیں۔ طنز (IRONY) بھی ہے۔ ظرافت (WIT) بھی۔ ہلکا پھلکا خالص مزاح (HUMOUR) بھی ہے۔ البتہ یہ مزے کی بات ہے کہ "بھل اور میں" جوتی کالک کا ترجمہ ہے۔ اس کے آخر میں انھوں نے اپنے مخزن و ماخذ کی نشاندہی نہیں کی۔ معلوم نہیں یہ سہو کاتب ہے یا سہو مصنف "میں ایک میاں ہوں" میں ہماری معاشرت کا ایک ایسا پہلو بے نقاب کیا گیا ہے جو ذہنوں میں پرفشاں ہوتا تھا۔ لیکن قرطاس پر نہیں آیا تھا۔ اس مختصر سے مضمون میں اقتباسات کا نقل کرنا ممکن نہیں۔ پھر یہ کہ پطرس نمبر شائع بھی ہو چکا ہے۔ ارباب ذوق اس سے رجوع کر سکتے ہیں۔ میں صرف یہ کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ یہ مجموعہ اپنی نظیر آپ ہے اور اس کی نظیر اردو ادب میں اب تک نہیں ملتی۔

انھوں نے گالزوردی کے ایک افسانے کا ترجمہ بھی کیا ہے یعنی "سیب کا درخت"۔ یہ ترجمہ ایسا شستہ، صاف، رواں اور مقامات کے اعتبار سے بے نظیر ہے کہ قاضی عبدالغفار خاں کی محنت رائیگاں جاتی نظر آتی ہے۔ بخاری کے ترجمے میں کردار مقامی فضا سے مخصوص زبان بولتے ہیں اور اپنے وقت کے اعتبار سے بہ کمال کارکردگی ہے۔ تاثیر کا اوپرا شاید سیب کے درخت کی طرح موثر نہ ہو لیکن اس میں بھی ان کی عدیم النظیر صلاحیت کارفرما نظر آتی ہے۔ وہ الفاظ کے انتخاب میں اتنے محتاط تھے کہ نثر بھی شعر کی طرح لکھتے تھے۔ ان کے خطوط اگرچہ غالب کے خطوط کی طرح سنگ میل کی حیثیت نہیں رکھتے لیکن تاہم شگفتگی، بذلہ سنجی، نکتہ طرازی قدم قدم پر قاری کا دامن کھینچتی ہے۔

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

اگر مجھ سے کہا جائے کہ مختصراً بخاری کی تحریروں پر انتقاد کروں اور غایت اختصار سے کام لوں تو میں کہوں گا کہ ان کی کوئی چیز پڑھیے، غزل ہو یا نظم۔ نثر میں خط ہو یا مقالہ، مضمون ہو یا ظرافت کا کارنامہ پڑھنے والا ایسا محو ہوتا ہے کہ اس دنیا کی تمام الجھنیں فراموش ہو جاتی ہیں۔ بخاری پڑھنے والے کو اپنے دام خیال میں اس طرح گرفتار کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک طلسمی فضا میں مبہوت لیکن خوش پاتا ہے۔ یہ طلسمی اثر ہمارے عہد کے انشا پردازوں اور مضمون میں خال خال نظر آتا ہے۔ حالانکہ یہی ادب کی جان ہے کہ پڑھنے والا کچھ عرصے کے لیے دنیا کے بکھیڑوں، دھندوں اور الجھنوں سے نجات حاصل کرے اور پڑھنے کے بعد اس پر وہ کیفیت طاری ہو جسے انگریزی میں SERENITY کہتے ہیں۔ اس کا ترجمہ دشوار ہے۔ اس سے مراد وہ سکون قلب اور استقامت خاطر ہے جو کلاسیکی ادب کے مطالعہ سے لازماً پیدا ہوتی ہے۔ آدمی کے گھاؤ بھر جاتے ہیں اور وہ جد و جہد حیات کے لیے اپنے آپ کو مستعد اور تیار پاتا ہے۔ اسی کیفیت کو نظیری نے یوں ادا کیا ہے۔ اگرچہ اسلوب عاشقانہ ہے ؎

دل شکستہ دراں کوچہ می کنند درست
چنانکہ خود نہ شناسی کہ از کجا بشکست

تاثیر کی طرح بخاری بھی ادبی حلقوں کے امام تھے۔ ان سے طالب علموں کے علاوہ بے شمار ادیبوں اور انشا پردازوں نے فیض اٹھایا ہے۔ راقم الحروف بھی ان میں شامل ہے کہ جب وہ ۱۹۲۶ء میں لاہور آئے تو ان کے حلقے کے ایک رکن کی حیثیت سے ان کی تمام محافل میں شرکت کرنا گویا میرا ایک فرض تھا۔ یہ محفلیں علمی، ادبی، تحقیقی ہر طرح کی ہوتی تھیں اور بخاری ان میں میر مجلس کی حیثیت سے جو کچھ کہتے تھے وہ بذلہ سنجی کے روپ میں عالمانہ گہرائی اور گیرائی کا پتہ دیتا تھا۔ اب وہ محفلیں بھی سونی ہو گئیں۔ سدا رہے نام اللہ کا۔

(۲)

احمد ندیم قاسمی

مولانا حالی

غالب کے بعد اگر مولانا حالی کا وجود نہ ہوتا تو یہ تصور تک لرزا دیتا ہے کہ اُردو شاعری کن نشیبوں میں اُتر چکی ہوتی۔ غالب کا فن اپنے دور سے یقیناً بہت آگے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعد کے شعراء غالب کا اثر قبول کرنے کی بجائے "ترقیِ معکوس" کے شکار ہو گئے اور غالب کو اُردو شاعری کی روایت سے خارج کر کے اس سے بھی نصف صدی پہلے کی شاعری کا تتبع کرنے لگے۔ یہ دراصل شعرِ غالب کا غیر شعوری ردِّ عمل ہی تھا جو داغ دہلوی اور امیر مینائی کی غزلوں کی صورت میں ہمارے سامنے آیا۔ اس دور میں اگر مولانا حالی ایسا فنی مجتہد پیدا نہ ہوتا تو یاد رکھئے کہ اقبال نے بھی داغ ہی سے اصلاح لینا شروع کی تھی اور عصرِ رواں کی اُردو شاعری نے اقبال ہی سے اکتسابِ فیض کیا ہے۔ یوں آج کا اُردو شعر داغ اور امیر کی غزلوں کا بے رنگ چربہ ہوتا اور اگر زمانے اور ماحول کے تقاضے اور مطالبے اس پر اثر انداز ہوتے بھی تو شاعروں کو کہنے کا ڈھب کہاں سے آتا۔ اُردو شاعری کی تاریخ میں متذکرہ حادثہ ممکن تھا۔ اس قسم کے امکان کی ایک مثال ہندی شاعری ہے جو آج بھی اظہار و بیان کے معاملے میں توتلے پن کی شکار ہے۔

شاعر کی عظمت کا یہ پیمانہ نہایت درجہ معتبر ہے کہ اگر اسے اور اس کے فن کو تاریخِ شعر میں سے خارج کر دیا جائے تو کیا اس کے بعد کی شاعری کو کچھ نقصان پہنچتا ہے یا اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ میر یا انیس، غالب، حالی یا اقبال میں سے کسی کے ساتھ یہ برتاؤ کر کے دیکھئے یکا یک ان کے بعد کی شاعری سپاٹ ہوتی نظر آئے گی۔ موضوع محدود اور اظہار و ابلاغ کے پیمانے تنگ ہوتے دکھائی دیں گے اور ایسا محسوس ہوگا جیسے شاعری فن کی اونچی چوٹی پر سے لڑھک کر کہیں نیچے جھاڑیوں میں اٹک کر رہ گئی ہے۔ پچھلے دنوں ایک نوجوان نقاد روایت سے بغاوت کے موجودہ (اور یقیناً عارضی) فیشن کے مطابق قلم کو لٹھ بنا کر مولانا حالی کے پیچھے پڑ گئے تھے اور اپنی بے اطمینانی کے اظہار کے لیے اپنے مضمون میں مولانا حالی کو مسلسل "مولوی حالی" لکھا تھا۔ میں نے اس وقت سوچا کہ اگر یہ صاحب مولانا حالی کو تاریخِ شعرِ اُردو میں سے خارج کر کے اقبال اور پھر شاعروں کی جدید ترین پود تک آتے تو کیا جب بھی وہ مولانا حالی کے کمالات اور خدمات سے انکار کرنے کا حوصلہ کرتے؟

یہ درست ہے کہ مولانا کی پند و نصائح سے بھری ہوئی شاعری کو بڑی شاعری میں شامل نہیں کیا جا سکتا لیکن یوں تو ہمیں اپنی سیاسی تاریخ میں سے سرسید کو بھی خارج کر دینا ہوگا اس لیے کہ انھوں نے اپنی تقریروں میں برِّصغیر پر ملکہ وکٹوریہ کے اقتدار کی غیر مشروط تعریفیں کی ہیں۔ مگر کیا سرسید کو اپنی سیاسی تاریخ سے خارج کر کے ہم ۱۸۵۷ء سے اب تک کی ایک صدی طے بھی کر سکیں گے؟ حکومتِ برطانیہ سے وفاداری کی تلقین کے باوصف سرسید کی خدمات سے انکار کرنا ایک باشعور اور باضمیر آدمی کے لیے ممکن نہیں ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کی نصف صدی

مسلمانانِ برِصغیر کی تاریخ کا اصلاحی دور ہے اور اگر مولانا حالی نے اپنی شاعری کی مدد سے اس اصلاحی مہم کو بامعنی بنایا ہے تو اس کا اعتراف لازمی ہے۔ ان نظموں کو ان کی شاعرانہ قوتوں کا اظہار نہ سمجھئے، سرسید کی اصلاحی کوششوں میں مولانا حالی کی عملی شرکت کا ثبوت کہہ لیجئے (اور فنی سے قطع نظر سیاسی لحاظ سے یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے) مگر مولانا حالی نے سچ مچ کی شاعری بھی تو کی ہے۔

مولانا حالی کی مسدس اور متعدد مثنویوں کے وہ اثرات بھی کچھ کم اہم نہیں جو زبان کی سلاست اور بیان کی بلاغت کی صورت میں ظاہر ہوئے مگر مولانا حالی کی غزلیں بھی اس دور کی غزلوں سے قطعی مختلف اور بہت اونچی ہیں جب اُردو دان دنیا میں داغ اور امیر کا طوطی بول رہا تھا۔ وہ براہِ راست غالب، مومن اور شیفتہ کے تغزل سے فیض یاب ہیں اور یہ اُردو شعر کی بدقسمتی ہے کہ مولانا حالی کی شاعرانہ عظمت کا جائزہ لینے والے ان کی غزلوں کی طرف کماحقہٗ متوجہ نہیں ہوئے بلکہ بعض نے تو کچھ ایسا انداز اختیار کیا ہے جیسے مولانا حالی مسدس نہ کہتے تو گمنام رہ جاتے۔

مولانا حالی ایک سے زیادہ حیثیتوں سے اُردو شعر و ادب کی متاع بے بہا ہیں۔ صاف ستھری اور خالص غزل کہنے کے علاوہ وہ بہت منجھے ہوئے نظم نگار بھی ہیں۔ پھر اُردو تنقید کو تذکرہ نگاری کے حصار میں سے نکال کر اسے بجائے خود ایک فن کی حیثیت بخشنا بھی انہی کا کام ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اُردو میں فنِ سوانح نگاری کے بھی امام ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ ان کے انتقال کے نصف صدی بعد بھی آج تک ان کی حیاتِ جاوید، حیاتِ سعدی اور یادگارِ غالب سے بہتر سوانح عمری اُردو زبان میں نہیں لکھی گئی۔ ایک ہی ذات میں اتنے متنوع کمالات شاذ ہی جمع ہوتے ہیں۔ لاہور کو فخر ہے کہ یہاں وہ مولانا حالی بھی مقیم رہ چکے ہیں جو اُردو شعر و ادب کی چند نمایاں ترین شخصیتوں میں شامل ہیں۔

مولانا ظفر علی خاں

اُردو میں قادر الکلامی کی صحیح مثال نظیر اکبر آبادی اور میر انیس کی شاعری ہے۔ ان کے بعد صرف دو شاعر ایسے ہیں جن کی شاعری کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ الفاظ ان کے سامنے صف باندھے کھڑے ہیں۔ کوئی مفہوم ایسا نہیں، اظہار کا کوئی پہلو ایسا نہیں۔ ابلاغ کا کوئی رُخ ایسا نہیں، جذبے کی کوئی پرت ایسی نہیں جس کے لیے ان کے پاس نو بہ نو الفاظ و تراکیب کا ایک بے پناہ خزانہ موجود نہ ہو۔ یہ دو شعرا جوش ملیح آبادی اور مولانا ظفر علی خاں ہیں۔

ہر شاعر کا ایک اپنا ذخیرۂ الفاظ ہوتا ہے۔ اس کی ایک اپنی "ڈکشن" ہوتی ہے۔ اسے چند الفاظ کے ساتھ خصوصیت سے پیار ہوتا ہے۔ انہی کے متنوع استعمال سے وہ اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ غالب کے اُردو کلام میں صرف "آئینہ" کا لفظ شاید ایک سو سے بھی زائد بار آیا ہوگا۔ اسی طرح میر اور اقبال کے ہاں بھی چند خاص الفاظ بار بار استعمال ہوئے ہیں (اور یقیناً بڑی خوبصورتی سے استعمال ہوئے ہیں) لیکن نظیر، انیس اور جوش کی طرح مولانا ظفر علی خاں بھی نو بہ نو الفاظ و تراکیب کا ایک سمندر ہیں (اور سمندر خشک نہیں ہوتے) دراصل مولانا کے موضوعاتِ سخن میں اتنا تنوع ہے کہ ایک منتخب ذخیرۂ الفاظ کو اپنے لیے خاص کر کے وہ تنوع کی بوقلمونی کو برقرار نہ رکھ سکتے اور بوجھل قسم کی تکرار کا شکار ہو جاتے۔ ان کا کلام مذہبی، سیاسی، معاشرتی، اخلاقی اور رومانی موضوعات سے بھرا ہوا ہے اور ہر موضوع پر انھوں نے اتنی روانی اور بے ساختگی کے ساتھ اور پھر ایسے بھرپور پن سے کہا ہے جیسے انھوں نے اس موضوع پر شاعری کی آخری حد قائم کر دی ہے۔ آخری حد کبھی قائم نہیں ہوتی اور نہ کبھی ہو سکے گی لیکن جب کسی کا کلام پڑھتے ہوئے اس قسم کا احساس پیدا ہونے لگے تو یہی احساس شاعر کی عظمت کا حتمی ثبوت بن جاتا ہے۔

مولانا ظفر علی خاں مذہبی رہنما بھی تھے، سیاسی لیڈر بھی تھے، آتش نوا خطیب بھی تھے، صحافی بھی تھے، طنز نگار بھی تھے، ادیب بھی تھے، مترجم بھی تھے، شاعر بھی تھے اور ان سب حیثیتوں میں انھوں نے برِصغیر پاکستان و ہند کو اتنا کچھ دیا ہے کہ اس کا منصفانہ جائزہ

کسی ایک فرد کے بس کی بات ہی نہیں ہے۔ ایسے کاموں کے لیے زندہ قومیں علیحدہ اکادمیاں قائم کرتی ہیں اور یہ جائزے کئی کئی جلدوں میں شائع ہوتے ہیں۔

مولانا ظفر علی خاں کو ان کے زمانے کے حالات اور ان کی اپنی بے قرار طبیعت نے شعر و ادب کا کام جم کر نہیں کرنے دیا، ورنہ اگر وہ اپنے آپ کو صرف عالمی شاہکاروں کے ترجمے ہی کے لیے وقف کر دیتے تو آج اردو زبان کو اس بے بضاعتی کا احساس نہ ہوتا کہ اس میں دنیا بھر کی زبانوں کے کلاسیکل لٹریچر کے معیاری تراجم موجود نہیں ہیں۔ انگریزی، فرانسیسی، روسی، جرمن اور اطالوی زبانیں اسی لیے بڑی ہیں کہ انھوں نے ایک دوسرے کے ادب کو باہم یوں منتقل کیا ہے کہ ایک ایک زبان پوری دنیا یا کم سے کم پوری مغربی دنیا کی ترجمان بن گئی ہے۔ مولانا ظفر علی خاں نے اردو کو بھی یہ حیثیت دینے کے لیے تراجم کا آغاز کیا تھا۔ ان کے تراجم آج بھی، جب اردو زبان میں خاصی وسعت پیدا ہو چکی ہے، لاجواب حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ سب ان کے نکھرے ستھرے ذوق اور اردو زبان پر ان کے بے پناہ عبور کا کارنامہ ہے۔

مولانا ظفر علی خاں کی شاعری کے سلسلے میں جب بھی کسی نے کچھ لکھا ہے، (حالانکہ بہت کم لکھا گیا ہے) اور جہاں بھی ان کا ذکر آیا ہے لوگوں نے یک زبان ہو کر کہا ہے کہ وہ قوافی کے بادشاہ تھے۔ قوافی کی بادشاہت کوئی ایسی قابلِ فخر چیز نہیں ہے۔ قوافی کے بادشاہ تو بے نظیر شاہ اور استاد ذوق بھی تھے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ شاعر قوافی کی گرفت میں آگیا ہے یا قوافی شاعر کے بس میں ہیں جن سے وہ صرف اتنی ہی مدد لیتا ہے جتنی ایک مصور اپنے برش سے۔ مولانا ظفر علی خاں کی شاعری کا مطالعہ کیجیے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنے خیالات و جذبات کی باگ قوافی کے ہاتھوں میں نہیں دے دی ہے بلکہ قوافی پر اس کی فکر کا سحر طاری ہے۔ اردو شاعری میں روانی اور بے ساختگی کی جو مثال مولانا ظفر علی خاں نے قائم کی ہے (جب کہ انھوں نے بیشتر نظمیں ارتجالاً کہی ہیں) اس کا جواب نظیر، انیس اور جوش کے سوا اردو میں اور کہیں نہیں مل سکے گا۔

مولانا ظفر علی خاں کی زندگی اور فن کو یوں تو برِ صغیر کی تاریخ کے ایک باب کی حیثیت حاصل ہے لیکن اگر ان کے سوانح مرتب کیے جائیں تو یہ کتاب خاص طور سے لاہور کی ایک چوتھائی صدی سے بھی زیادہ عرصے کی تہذیبی، فکری، فنی، سیاسی اور مذہبی تاریخ بن جائے گی۔

مولانا چراغ حسن حسرت

مولانا عبد المجید سالک اور مولانا چراغ حسن حسرت کی شخصیتوں میں بڑی نمایاں اور حیران کن مماثلتیں ہیں۔ البتہ مولانا حسرت اپنے ذاتی اخبار کے چکر میں کبھی نہیں پھنسے، نہ ان کی صحافتی زندگی میں مولانا سالک کا سا تسلسل رہا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے صحافت کے علاوہ بھی بہت کچھ کرنے کا وقت نکال لیا اور زبان و بیان میں ایسی نفاست پیدا کر لی کہ وہ لوگ بھی جو اردو بولنے والے گھرانوں میں پیدا ہوئے، اس کشمیری کی شستہ و رفتہ اردو پڑھ کر سناٹے میں آجاتے ہیں۔

ان اردو ادیبوں کے ساتھ جو ضرورتاً صحافی بن گئے یہ المیہ مسلسل وابستہ رہتا ہے کہ اگر وہ صحافت میں نہ پھنستے تو کتنے اونچے پائے کا شعر و ادب تخلیق کر جاتے۔ مولانا حسرت کو جب بھی فکرِ معاش سے فرصت ملی، شعر و ادب کی طرف متوجہ ہو گئے اس لیے وہ اپنی علمی اور فنی شہرت کے مقابلے میں خالی ہاتھ قطعی نہیں ہیں۔ اگر ان کی غزلوں کی مختصر تعداد کا مطالعہ کیا جائے تو ایک ایک مصرع سے ایک ایسا شاعر جھانکتا نظر آتا ہے جس نے اردو کے کلاسیکی ادب کو پڑھا اور برتا ہے اور جس نے روایات کو سنوارا اور سجایا ہے۔ یہ غزل جس،

شستگی اور شائستگی سے لبریز ہیں وہ بہت بڑے شاعروں ہی کے حصے میں آتی ہے مگر بُرا ہو آلامِ روزگار اور معیشی مجبوریوں کا کہ انھوں نے کتنے ہی بڑوں کو اپنی عظمت کے اظہار کا موقع ہی نہ دیا۔ مولانا چراغ حسن حسرت کی غزل پڑھ کر جہاں ذہن اس خوبصورت شاعری سے لطف اندوز ہوتا ہے وہاں اسے اس کرب کا سامنا بھی رہتا ہے کہ کاش اس شاعر کو شعر کہنے کا اور بھی وقت مل سکتا۔

مولانا حسرت کی ایک تصنیف ہے "پربت کی بیٹی"۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر وہ "پربت کی بیٹی" کے سوا کچھ اور نہ لکھتے تو جب بھی ان کا نام اُردو کے ان ادیبوں میں صدیوں تک شامل رہتا جنھوں نے علم الاصنام اور شاعری کو یکجا کر کے ایسی نثر پیش کیا جس کا جواب نظم ہی میں ہو سکتا ہے۔ اس تصنیف میں زبان و بیان کا جو حسن ہے وہ نیاز فتح پوری، قاضی عبدالغفار اور سید سجاد حیدر یلدرم کے باوجود لاجواب ہے۔ میں تو یہ تک کہوں گا کہ اُردو ادب میں اُردو اور ہندی کے اس خوبصورت امتزاج کی مثال فراق کی رباعیاں بھی نہیں ہیں۔ پھر ان داستانوں میں جو کہانی پن ہے اسے اساطیر میں ایک اضافے کی حیثیت حاصل ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک ایسا شخص جو اُردو اور فارسی کا عالم ہے ہندی اتنی بے تکلفی سے کیسے لکھ جاتا ہے اور اگر اسے ہندی پر اتنا عبور حاصل ہے تو خالص اُردو لکھتے ہوئے اس کا قلم کیوں نہیں رُکتا۔

مولانا حسرت نے کبھی کبھار تنقیدیں بھی لکھی ہیں اور طویل تبصرے بھی رقم کیے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے ان کے علمی تبحر اور نفاستِ ذوق کا پتہ چلتا ہے مگر تنقید ان کا میدان کبھی تھا ہی نہیں۔ ان کا اصل جوہر ان کے طنز و مزاح میں کھلتا ہے۔ میں نے یہاں صرف "مزاح" کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ خالص مزاح نگاری صرف پطرس، عظیم بیگ چغتائی اور مولانا سالک وغیرہ نے کی ہے۔ طنز و مزاح کے امتزاج کی دنیا بالکل دوسری ہے۔ اس صنف میں مزاح، طنز کا محتاج رہتا ہے اور طنز ایک ایسا فن ہے جو اس وقت تک مؤثر ثابت نہیں ہو سکتا جب تک لکھنے والا زبان و بیان کی نزاکتوں اور نفاستوں پر حاوی ہونے کے علاوہ انسانی معاشرے، انسانوں کے باہمی سیاسی، اخلاقی اور انفرادی رشتوں، ان کے محرکات اور ان کے نتائج سے پوری طرح باخبر نہ ہو۔ مولانا حسرت کے مزاح میں جو طنز چھپی ہوتی ہے وہ چلتی ہوئی چیز نہیں کہ ہنسے، مسکرائے اور قصہ ختم ہو گیا۔ یہ طنز کلیجے میں کانٹا بن کر بھی اٹک جاتی ہے اور بظاہر انسان ہنستا مگر اندر سے سوچتا رہ جاتا ہے۔

مولانا حسرت نے روزناموں کے فکاہی کالموں کے علاوہ فکاہی مضامین بھی لکھے ہیں مگر عجیب بات یہ ہے کہ جب بھی کوئی نقاد "باقاعدہ" مزاح نگاروں کا ذکر کرتا ہے، مولانا حسرت کا حوالہ دینا تک گوارا نہیں کرتا۔ اس کی وجہ محض اور محض یہ ہے کہ ہمارے ہاں اس تنقید کی بہت کمی ہے جو اپنے آپ کو ماضی کی تنقیدوں سے ملوث نہ ہونے دے۔ ہمارے ہاں لکیر کے فقیر تو بہت ہیں مگر نقاد اکا دُکا ہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج سے بیس پچیس سال پہلے جو ادیب اور شاعر بڑے ادیب اور شاعر کہلاتے وہی آج بھی بڑے ادیب اور شاعر کہلاتے ہیں۔ اپنے ذہن سے سوچتے ہوئے نقاد کو ایک "مسلمہ حقیقت" سے انحراف کرنے کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے اور یہ مقدس ارتکاب معمولی دل و دماغ کا کام نہیں ہے۔ یہی عالم مزاح نویسوں کا ہے اور اسی لیے مولانا حسرت اس سلوک کا زیادہ کے مستحق قرار پائے ہیں۔ بصورتِ دیگر حسرت کا طنز و مزاح درجنوں مانے ہوئے مزاح نویسوں پر بھاری ہے۔ صرف ان کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین اور کالموں کا مطالعہ شرط ہے۔

بہ حیثیت صحافی مولانا حسرت اس فہرست میں شامل ہیں جس میں (لاہور کی حد تک) مولانا ظفر علی خاں، مولانا سالک اور مولانا مہر

تک نام آتے ہیں۔ ایک معاملے میں مولانا حسرت ان سے آگے بھی ہیں اور وہ اُردو اخبارات کی گٹ اَپ کا معاملہ ہے اور آج پاکستان کے اُردو اخبارات کی جو صورت ہے وہ مولانا حسرت ہی کے حُسنِ ذوق اور سُوجھ بُوجھ کی رہینِ منت ہے۔

مولانا عبد المجید سالک

یہ شاید صرف اُردو زبان ہی کی بدنصیبی ہے کہ بعض ایسی شخصیتیں جنھیں قدرت نے اُردو ادب و فن میں اضافے کی بے پناہ قوتیں دے رکھی تھیں محض کاروبارِ حیات اور مکروہاتِ معاش کے سبب ایسا نہ کر سکیں۔ انھوں نے زبان و ادب کو جو کچھ دیا ہے وہ بھی بیش بہا ہے لیکن جو کچھ نہیں دے سکیں (حالانکہ دے سکتی تھیں) وہ نہ جانے کیا ہوتا اور اگر دے جاتیں تو ہمارے ادب و فن کی آسودگی کا معیار نہ جانے کتنا اونچا ہو چکا ہوتا۔

پطرس ہی کو دیکھیے کہ اگرچہ انھوں نے صرف چند مضامین لکھ کر اپنی دھاک بٹھا دی اور صرف ایک طویل انگریزی افسانے ——— سیب کا درخت ——— کو اُردو میں منتقل کر کے مترجمین کو دم بخود کر دیا لیکن کیا ہم شبہ بھی کر سکتے ہیں کہ اس ایک ترجمے اور ان چند مضامین کے بعد ان کی تخلیقی قوتیں دم توڑ بیٹھی تھیں؛ ظاہر ہے کہ وہ اپنی بے پناہ غیر ادبی مصروفیتوں کے باعث ایسا نہ کر سکے اور یہ کتنا بڑا ستم ہے۔ ایک اور مثال ڈاکٹر تاثیر کی ہے جن کی ذہانت نے ان کے دشمنوں کو بھی قائل کر دیا مگر اسی عدیم الفرصتی کے سبب نہ تو وہ اُردو تنقید کو کسی جاندار نہج پر چلا سکے اور نہ اُردو شاعری کے ذخائر میں کوئی چونکا دینے والا اضافہ کیا حالانکہ ان کی ذہانت اور علمی استعداد ایسا کرنے پر قادر تھی۔ سید امتیاز علی تاج بحمد اللہ ہمارے درمیان موجود ہیں اور خدا کرے ابھی برسوں تک موجود رہیں مگر حیرت ہے کہ "انار کلی" ایسا بے مثال ڈرامہ لکھنے کے بعد ان کے تخلیقی سوتے خشک ہو گئے ہیں اور اس ڈرامے کی اشاعت کے ایک چوتھائی صدی سے بھی زیادہ عرصہ بعد تک ان کے قلم سے کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں نکلی۔

مولانا سالک کی تخلیقات کا حجم اگرچہ پطرس، تاثیر اور تاج کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے مگر ان کی ہمہ گیر، ہمہ رنگ اور متنوع شخصیت سے اُردو کی قریب قریب تمام اصنافِ ادب کو بے شمار توقعات تھیں اور یہ ایک دردناک حقیقت ہے کہ یہ توقعات اس حد تک پوری نہیں ہوئیں جس حد تک ہونا چاہیے تھیں۔ وہ شاعر تھے، افسانہ نگار تھے، نقاد تھے، مزاح نویس تھے اور مترجم تھے مگر ان کی پانچوں حیثیتوں کو ان کی صحافتی سرگرمیوں نے لُوٹ لیا۔ "راہ و رسمِ منزلہا" ان کے کلام کا مجموعہ ہے جو ان کی قادر الکلامی کا واضح ثبوت ہے مگر کیا سالک ایسے عالی ذوق فنکار سے اُردو زبان کی اس سے زیادہ توقعات وابستہ نہیں تھیں؛ ظاہر ہے کہ ان کی شاعری پر صحافت کو فتح حاصل ہوئی۔ پھر ان کی افسانہ نگاری کو تو صحافت نے ابتدا ہی میں شکست دے دی تھی۔ ان کے اِکّا دُکّا تنقیدی مضامین بر سوں کے وقفوں کے بعد شائع ہوتے رہے۔ یہ مضامین اُردو تنقید میں توازن و اعتدال کی خوشگوار مثالیں تھے مگر ان کی تعداد اتنی کم ہے اور انھیں یکجا کر کے شائع کرانے کا کام اتنا طول کھینچ گیا ہے کہ ان کی تنقیدی صلاحیتوں کے بارے میں کچھ کہنا آج بھی قبل از وقت معلوم ہوتا ہے۔ "افکار و حوادث" کے کالموں کے علاوہ انھوں نے فکاہی مضامین بھی لکھے اور اگرچہ ان میں سے بیشتر ریڈیو کے لیے لکھے گئے مگر بہرحال ان کی بھی ایک اپنی حیثیت ہے اور وہ بھی اب تک یکجا نہیں ہو پائے۔ پھر انھوں نے اپنی ادبی زندگی کے شباب میں "چترا" کا ترجمہ کر کے اربابِ اُردو کو یہ خوشگوار احساس دلایا تھا کہ تراجم اجنبیت سے پاک بھی ہو سکتے ہیں اور اُردو کی اپنی چیز بھی معلوم ہو سکتے ہیں مگر چترا کے بعد مولانا سالک کی اس حیثیت پر بھی ایک چوتھائی صدی تک پردہ گر جاتا ہے البتہ صحافتی زندگی سے کنارہ کشی کے بعد انھوں نے متعدد انگریزی کتابوں کو جس خوبی، نفاست اور روانی کے ساتھ اُردو میں منتقل کیا وہ کچھ انھی کا حصّہ ہے اور یوں یہ خلا

بہت حد تک پُر ہو جاتی ہے۔ ان کی آخری حیثیت صحافی کی ہے۔ اس فن میں انھوں نے جو کام کیا ہے اسے اُردو صحافت کی تاریخ آسانی سے فراموش نہیں کر سکتی۔ میں ان کی خود نوشت سوانح عمری "سرگزشت" کو بھی ان کی صحافت ہی کا کارنامہ قرار دیتا ہوں ورنہ اگر وہ اپنے سوانح بہ حیثیت ادیب لکھتے تو سرگزشت کی حیثیت اور اہمیت کچھ سے کچھ ہو جاتی۔ ان کا فکاہی کالم "افکار و حوادث" بھی صحافت ہی سے متعلق ہے مگر ایک یہی صنف ایسی ہے جس کے دم سے ادب کے ساتھ مولانا سالک کا رشتہ قائم رہا۔ اگر ان کالموں کا انتخاب شائع ہو جائے تو یہ اُردو زبان اور ادب کی بڑی خوش نصیبی ہوگی اور اس طرح اُردو کے قارئین کو بھی اندازہ ہو سکے گا کہ مولانا سالک جن کا نام ادبی تذکروں میں بار بار سننے میں آتا ہے اس بار بار کے تذکرے کے کیوں مستحق ہیں اور شاید اس سے بھی زیادہ کے مستحق ہیں۔

فلک پیما فلک پیما بہت اونچے درجے کے طنز نگار تھے اور اسی "اونچائی" نے ان کے طنز کی اپیل کو محدود کیے رکھا۔ اوّل تو وہ جس طبقے کے نظریات و خیالات کو اپنی ذہانت کا نشانہ بناتے تھے وہ عام اُردو دانوں کے دائرۂ مشاہدہ سے قطعی باہر تھا۔ پھر وہ طنز کا تیر کچھ ایسے "انٹلکچوئل" انداز میں چلاتے تھے کہ اس تیر کی کاٹ کو صرف وہی اونچا طبقہ ہی سمجھ سکتا تھا۔ ادیبوں کی بات الگ ہے کہ ان کی نگاہ اگر ہمہ گیر نہ ہو تو وہ ڈھب کی بات ہی نہ کر سکیں۔ اسی لیے وہ تو فلک پیما کو جانتے اور پہچانتے ہیں مگر یہاں ذکر عام پڑھے لکھے لوگوں کا ہے اور عام پڑھے لکھے لوگ فلک پیما کے کمالِ طنز سے بے بہرہ نہیں تو کما حقہٗ باخبر بھی نہیں ہیں۔ اس میں کچھ قصور تو خود فلک پیما کا ہے اور کچھ اُردو ادب کے نقادوں کا۔

اُردو ادب کے نقادوں کے ہاتھوں جن بڑے بڑے لکھنے والوں کی مسلسل حق تلفی ہوتی ہے ان میں فلک پیما بھی شامل ہیں۔ چلتے سے ذکر اور اُچٹتی سی نظر کی بات نہیں کہ ان کے مستحق تو وہ ادیب بھی قرار پا جاتے ہیں جو عمر بھر کوئی اپنی بات کسی اپنے انداز میں نہ کر پائے ہیں۔ یہاں بات بھرپور تنقیدی جائزے کی ہو رہی ہے اور فلک پیما اس سے مسلسل محروم ہیں حالانکہ وہ اس مکمل محرومی کے مستحق نہیں ہیں۔ انھوں نے طنز کو یقیناً فلسفے کی سطح تک اٹھا دیا ہے اور ان کے طنز سے محظوظ ہونے کے لیے "درمیانے قد" کے قارئین کو پنجوں کے بل کھڑے ہونا پڑتا ہے لیکن نقاد کا یہ فرض بھی تو ہے کہ ادیب نے جو کچھ کہا ہے اسے بھی پرکھے، جس انداز یا جس رُخ سے کہا ہے اس کا جائزہ بھی یقیناً تنقید کا ایک حصہ ہے مگر پوری تنقید نہیں ہے۔

فلک پیما ایک مفکر قسم کے طنز نگار تھے۔ روزمرّہ کی زندگی کی صرف وہی تفصیلیں ان کی نگاہوں میں جچتی تھیں جو کسی نہ کسی پہلو سے فکر و فلسفہ کے ساتھ متعلق ہوتی تھیں۔ حد یہ ہے کہ عوامی زندگی کی بعض کمزوریوں کے ساتھ بھی وہ یہی سلوک کرتے تھے۔ پہلے ان کمزوریوں کا فلسفیانہ پس منظر تیار کرتے تھے اور اس کے بعد ہی ان کا ہاتھ ترکش کی طرف اٹھتا تھا۔ پھر وہ بڑے سلیقے سے تیر چلاتے تھے۔ یہی سلیقہ ان کا اسلوب ہے مگر اس سلیقے میں ایسا رکھ رکھاؤ ایسا لیے دیے رہنے کا سبھاؤ ہے جسے دیکھ کر خوشی بھی ہوتی ہے اور تشویش بھی۔ تشویش اس بات کی کہ ہم ایسے خاک نشینوں کی پسند اسے بیگانہ کر دے۔

اس سب کچھ کے باوجود فلک پیما اُردو کے چند گنے چنے طنز نگاروں میں شامل ہیں۔ مزاح نویسوں کا ذکر نہیں، میرا اشارہ صرف طنز نگاروں کی طرف ہے اور میرے اندازے کے مطابق اُردو میں طنز نگاروں کی تین قسمیں ہیں۔ کنہیا لال کپور، رشید احمد صدیقی اور فلک پیما ان تینوں اقسام کی نمایاں مثالیں ہیں۔ کپور کے طنز سے ارفع و ادنیٰ، خواص و عوام سب محظوظ ہو سکتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی کا طنز دانشور کا طنز ہے۔ اس کا وار بھرپور ہوتا ہے مگر یہ وار خاصے وقفے کے بعد پڑتا ہے۔ فلک پیما کا پورا مضمون پڑھ لینے کے بعد قاری اس کے

مجموعی تاثر ہی سے محظوظ ہوتا ہے اور یہ مجموعی تاثر بھی خاصے سوچ بچار کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ فلک پیما کے طنز کی اپیل کچھ اس قسم کی ہے جیسے کوئی شخص کسی بزم میں ایک لطیفہ سُنے مگر اس کی سمجھ میں نہ آئے۔ پھر جب وہ گھر میں آ کر اپنے بستر پر لیٹے تو یکایک اسے لطیفے کی لطافت کا سراغ ملے اور وہ تنہائی میں ہنسنے لگے۔ بظاہر نہایت بے موقع مگر دراصل نہایت جائز موقع پر۔

فلک پیما کی ذہانت بے پناہ ہے مگر نہ جانے یہ "خان بہادر میاں عبدالعزیز" کی شخصیت تھی جو انھیں کھل کر بات کہنے سے روکے رہی یا یہ ان کے سماجی طبقے کا مطالبہ تھا کہ چاہے کچھ بھی کرو مگر "سلیقے" سے کرو۔ بہرکیف فلک پیما نے اُردو کو وہ کچھ نہیں دیا جو انھیں اپنی ذہانت کے توسط سے دینا چاہیے تھا البتہ جو کچھ اس نے دیا ہے وہ فراموش کر دینے کے قابل نہیں ہے۔ وہ اپنے اسلوب کا آپ ہی موجد اور آپ ہی خاتم ہے اور یہ بھی اس کی جرأت اور عالی ظرفی ہے کہ وہ اپنے ہی طبقے پر یعنی اپنے آپ ہی پر ہنستا ہے، اور اپنے آپ پر ہنسنا معمولی کام نہیں ہے۔ اس مقصد کے لیے اپنی انا کا گلا گھونٹ دینا پڑتا ہے اور ہمارے بیشتر طنز نگاروں اور مزاح نویسوں کے پاس اپنی انا کے سوا اور رکھا ہی کیا ہے۔

اختر شیرانی

اُردو شاعری میں نظم کا آغاز اصلاحی اور منظری نظموں سے ہوا۔ حالی اور آزاد سے لے کر ایک عرصے تک نظم پر یہی کیفیت طاری رہی۔ اقبال نے آ کر نظم کو سیاسی اور مذہبی موضوعات مہیا کیے لیکن وہ جذبہ جس نے شاعری کو جنم دیا ہے وہ حُسنِ صورت اور حُسنِ خیال جن کے دم سے زندگی اپنی گوناگوں کلفتوں کے باوجود زندہ رہنے کے قابل رہتی ہے، عشق و محبت اور حُسن و جمال کا وہ احساسِ لطیف جو شاعر کو شاعر بناتا ہے، اقبال کے ابتدائی دور تک بھی صرف اُردو غزل کا موضوع رہا اور نظم صرف مسدسِ حالی کے معنوں میں نظم سمجھی جاتی رہی۔ اُردو پر یہ اختر شیرانی کا احسان ہے کہ اس نے نظم کو صرف جلسہ گاہوں کے لیے وقف ہونے سے بچا لیا اور حُسن و عشق کے موضوعات پر ایسی ایسی نظمیں لکھیں کہ اُردو شاعری کا دامن یکایک بے حد وسیع نظر آنے لگا۔ یقیناً بعد میں اقبال کی فکری نظموں اور اقبال سے بعد کے شاعروں کی ہمہ گیر اور ہمہ رنگ نظموں سے اُردو نظم کہیں سے کہیں جا پہنچی۔ اس کے باوجود اختر شیرانی کی خصوصیات اس وقت تک فراموش نہیں کی جا سکتیں جب تک اُردو نظم زندہ ہے۔

مشکل کام ہمیشہ کسی کام کا آغاز ہی ہوتا ہے۔ ولی نے جب فارسی غزل کی روایات سے اُردو غزل کو سجانے اور نکھارنے کا آغاز کیا تھا تو اسے اپنے معاصرین سے نہ جانے کیا کچھ سُننا پڑا ہوگا۔ غالب نے جب اُردو غزل کو قلبی واردات کے علاوہ ذہنی واردات کا بھی آئینہ بنانا چاہا تو اس کے ساتھ خود اس کے زمانے نے جو برتاؤ کیا اس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ حالی نے جب اعلان کیا کہ اُردو غزل ایک مرض میں مبتلا ہے مگر اسے اپنے مرض کا احساس ہی نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ روایتی غزل نگاروں نے اس کی مخالفت کی مگر یہ ولی، غالب، حالی اور ایسے ہی دوسرے شاعروں کی پامردی، عالی حوصلگی اور عظمت تھی کہ انھوں نے رسم، روایت اور فیشن کے برعکس ایک کام کا آغاز کیا اور اُردو شاعری کو وہ کچھ بنا گئے جو کچھ وہ اب ہے۔ اختر شیرانی کا شمار بھی ایسے ہی شاعروں میں ہونا چاہیے۔ اختر نے بھی اس دور میں جب اُردو نظم پند و موعظت کے حصار میں گھری جا رہی تھی اُردو شاعری کو ان موضوعات سے روشناس کرایا جو بظاہر اجنبی تھے مگر دراصل عام انسانوں کے دلوں کی دھڑکنوں، ان کے خوابوں، ان کی امیدوں اور تمناؤں کے ترجمان تھے۔

اپنے زمانے میں اختر شیرانی کی بے پناہ مقبولیت کی وجہ یہی تھی کہ اس نے پہلی بار جذبے اور احساس پر سے رسم و رواج کی چھتیاں اتاری تھیں۔ یاد رہے کہ اختر اس زمانے میں مقبول تھا جب علامہ اقبال کی شہرت نصف النہار پر تھی۔ اتنے عظیم شاعر کی موجودگی میں

اختر کا اس حد تک مقبول ہونا کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے شخصیت کا سایہ بڑے بڑوں کو غائب کر دیتا ہے۔ غالب کے سب معاصر شعراء نالائق نہیں تھے، ذوق بھی تھے، مومن بھی تھے، شیفتہ بھی تھے اور وہ بڑے شاعر تھے مگر انہیں عرصے تک غالب کی شخصیت کے سایے نے ڈھانپے رکھا ہے۔ ایک بہت بڑی شخصیت کی موجودگی میں اگر کوئی دوسری شخصیت اپنے وجود کا احساس دلانے میں کامیاب ہو جائے تو یہ دوسری شخصیت کی نمایاں انفرادیت ہے۔ انفرادیت جو فن کی دنیا میں "اسلوب" کہلاتی ہے۔

اختر شیرانی کو اُردو دان طبقہ بظاہر بھولتا جا رہا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج کی اُردو شاعری کے پس منظر میں اختر شیرانی کی نظمیں بہت سیدھی سادی معلوم ہوتی ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ دوسرے شاعروں کے مقابلے میں اختر کے ہاں فنی معیار کے نشیب و فراز بہت زیادہ ہیں لیکن ان باتوں سے اختر کی اہمیت کم نہیں ہو جاتی۔ کسی نتیجہ خیز کام کا آغاز کرنے والوں کی اہمیت کسی زمانے میں کم نہیں ہو سکتی۔ جیٹ طیاروں کے اس دور میں بھی رائٹ برادرز کو کوئی نہیں بھول سکتا جنہوں نے ہوا میں اُڑنے کے پرانے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کا آغاز کیا تھا۔ اب اگر کوئی انجینئر رائٹ برادرز کے بنائے ہوئے اس ڈھانچے کی نکتہ چینی شروع کر دے جس نے انسان کو اوّل اوّل ہوا میں اڑایا تھا تو اس سے رائٹ برادرز کی اہمیت کو کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا۔ اختر ایسے شاعر کے سلسلے میں انجینئروں کا ذکر نہایت بے محل معلوم ہو گا لیکن اختر کی اہمیت کی وضاحت کے لیے مجھے یہی مثال مؤثر نظر آتی۔

سعادت حسن منٹو

سعادت حسن منٹو نے اپنے فن کے لیے برصغیر پاکستان و ہند سے موضوعات اور زبان لی ہے مگر افسانہ لکھنے کا فن اس نے روس اور فرانس سے سیکھا ہے۔ منٹو کی ادبی زندگی کا آغاز روسی اور فرانسیسی افسانوں کے تراجم سے ہوتا ہے۔ پھر جب اس نے اپنے افسانے لکھنے شروع کیے تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ چیخوف، گورکی اور موپاسان وغیرہ سے بڑی شدت کے ساتھ متاثر ہے۔ اسی لیے منٹو کے افسانوں کا گہرا اور جامع مطالعہ کرنے کے لیے روسی اور فرانسیسی افسانہ نگاروں یا کم سے کم "ہمایوں" اور "عالمگیر" کے ان خاص نمبروں کا مطالعہ بے حد ضروری ہے جنہیں منٹو نے مرتب کیا تھا اور جن میں ان یورپی زبانوں کے متعدد ایسے افسانے شامل ہیں جنہیں خود منٹو نے اُردو میں منتقل کیا تھا۔ اس کے افسانوں کے پہلے مجموعے "منٹو کے افسانے" میں روس اور فرانس کی کہانیوں کے اثرات جگہ جگہ نمایاں ہیں۔ بعض افسانے تو ایسے بھی ہیں (مثلاً "مشغل") جن کی اشاعت کے بعد قارئین نے متعلقہ رسالوں کے مدیروں سے استفسار کیا کہ یہ کس یورپی افسانہ نگار کی تصنیف ہیں اور آپ یا مترجم آخر میں یہ حوالہ دینا کیوں بھول گئے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ منٹو کے اپنے افسانے تھے۔ اس نے افسانہ لکھنے کے روسی اور فرانسیسی انداز کو اپنے خون میں کھپا لیا تھا اور یہی نکتہ اس کے انوکھے اسلوب، اس کے گہرے مشاہدے، اس کی جذبات نگاری اور اس کی کردار آفرینی کی اصل بنیاد ہے اور اسی نے آخر تک اس کا ساتھ دیا ہے۔

منٹو کو جنس نگار قرار دیا جاتا ہے حالانکہ "منٹو کے افسانے" کے موضوعات میں جو دلکش تنوع ہے اس میں جنس کا عنصر صرف اتنا ہے جتنا ہر باشعور افسانہ نگار میں ہوتا ہے اور ہونا چاہیے۔ زندگی کی اتنی بڑی حقیقت کو تو عبدالحلیم شرر اور آج کے تاریخی داستان طراز تک فراموش نہیں کر سکے۔ ان کے شمشیر بدست ہیرو کسی نہ کسی طرح محبت میں ضرور مبتلا ہوتے ہیں اور یہ محبت متصوفانہ نہیں ہوتی۔ خالص جنسی یعنی جسم کی بھوک رہتی ہے۔ البتہ بعد میں جب منٹو کو انگلستان کے افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں (سومرسٹ ماہم اور ڈی۔ ایچ۔ لارنس وغیرہ) کے مطالعے کا موقع ملا تو جنس اس کی بیشتر کہانیوں کا محور قرار پا گئی۔ اس کے ساتھ ہی جنس کی طرف اس ہمہ گیر توجہ کا

ایک اور سبب بھی تھا اور جو لوگ منٹو کے مزاج کو جانتے ہیں انہیں یہ سبب بے جان معلوم نہیں ہوگا۔

ایک بار منٹو کو شوق چرایا کہ وہ اپنے فن کے بارے میں ہر اس شخص کی رائے معلوم کرے جو فنونِ لطیفہ کے ساتھ کسی نہ کسی حیثیت سے وابستہ ہو۔ اس سلسلے میں اس نے مصوروں، موسیقاروں، شاعروں، سازندوں، حد یہ کہ بعض ایسی طوائفوں تک کی آراء بھی جمع کر لیں جنہوں نے گانے ناچنے میں نام پیدا کیا تھا۔ وہ مطلوبہ شخص کے پاس جا کر اپنا قلم اس کے ہاتھ میں تھما دیتا تھا اور کہتا تھا کہ میرے فن کے بارے میں آپ کے ذہن میں فوری طور پر جو تاثر پیدا ہوتا ہے وہ فوراً لکھ دیجئے۔ ظاہر ہے کہ یہ آراء دو دو چار چار سطروں پر مشتمل تھیں۔ منٹو چاہتا تھا کہ ان آراء کو "چشمِ روزن" کے نام سے ایک مجموعے میں یکجا کر دے (نہ جانے وہ مسودہ کیا ہوا) اس سلسلے میں منٹو میرے پاس بھی آیا اور قلم تھما کر یہی فرمائش کی۔ میں نے کہا کہ مجھے کسی ایرے غیرے کے بارے میں نہیں منٹو ایسے فنکار کے بارے میں اپنا تاثر بیان کرنا ہے اس لیے سوچ سمجھ کر لکھوں گا۔ منٹو نے خفگی کا اظہار کیا مگر خدا نے مجھے ہمت دی اور میں مُصر رہا کہ میں شام تک چند سطریں لکھ کر بھجوا دوں گا۔ منٹو مان گیا اور میں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ دراصل مجھے معلوم تھا کہ اگر میں نے فوری طور سے وہی کچھ لکھ دیا جو میں منٹو کے بارے میں سوچتا ہوں تو وہ مجھ سے نہ صرف خفا ہو جائے گا بلکہ برس پڑے گا۔ ڈاک سے خط بھجوانے کی بات اور تھی۔ میں نے لکھا کہ منٹو کے مزاج میں بغاوت اور ہٹ کی بڑی شدت ہے اور حکومت نے غلطی کی کہ اس نے "کالی شلوار"، "دھواں" اور "ٹھنڈا گوشت" کے خلاف مقدمے چلائے۔ اگر حکومت میں فنی حس ہوتی تو وہ "نیا قانون"، "شغل" اور "نعرہ" کے خلاف مقدمات چلاتی۔ یوں منٹو ضد میں آ کر "نیا قانون" ایسے اور بھی افسانے لکھتا اور یوں اردو افسانے میں بڑے خوبصورت، بڑے جاندار اضافے ہوتے۔ اس نے "کالی شلوار" پر مقدمہ چلایا تو منٹو نے ضد میں آ کر "بو" لکھ دیا۔ اس نے "بو" کے خلاف مقدمہ دائر کیا تو منٹو نے "دھواں" لکھ دیا۔ اس نے "دھواں" کو قابلِ اعتراض قرار دیا تو منٹو نے "ٹھنڈا گوشت" لکھ دیا اور یوں جنس ہی اس کے بعد کے افسانوں کا تنہا موضوع قرار پا گئی"۔۔۔ سنا ہے کہ منٹو نے میرا یہ خط پڑھا تو غصے میں آ کر پھینک دیا مگر کچھ دیر کے بعد اٹھایا اور یہ کہہ کر رکھ دیا کہ "بکواس ہے مگر کچھ ایسی غلط بکواس نہیں ہے"۔

میرا اندازہ غلط ہو یا صحیح ہو، منٹو نے ضد میں آ کر جنسی افسانوں کا طومار باندھ دیا ہو یا اس کی افتادِ مزاج کا تقاضا ہی یہی ہو۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ منٹو نے جنس کو بھی۔۔۔ ننگی جنس کو بھی فن کا ایسا جامہ پہنایا ہے کہ فنِ افسانہ نگاری پر اس کے بے پناہ عبور کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ میں منٹو کے ان جذباتی مداحوں میں شامل نہیں ہوں جو منٹو کے افسانوں پر عریانی اور فحاشی کے الزام سے برافروختہ ہو جاتے ہیں۔ منٹو یقیناً جگہ جگہ عریاں نگاری کا شکار ہوا ہے۔ کہیں کہیں فحاشی بھی اس سے سرزد ہوئی ہے۔ فلابیئر نے موپساں سے بالکل درست کہا تھا کہ یہاں نہانے کے بعد عورت کے جسم پر رکے ہوئے پانی کے قطروں کا ذکر کرنا تھا تو یہ کیا ضرور تھا کہ تم ان قطروں کی رنگت بھی واضح کرتے اور کہتے کہ جسم کے رنگ کی وجہ سے پانی کے رکے ہوئے قطرے گلابی ہو رہے تھے۔ یہیں سے تو وہ لذتیت شروع ہوتی ہے جو سیدھی فحاشی تک لے جاتی ہے۔ منٹو سے یقیناً ایسی لغزشیں ہوئی ہیں۔ ان کے جواز پیش کرنا یا ان پر تاویلوں کے پردے گرانا ممکن ہے عقیدت بھی ہو اور نیک نیتی بھی ہو مگر یہ فنی خلوص کے منافی ہے۔

البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ محض اس وجہ سے منٹو کی اہمیت کم نہیں ہو جاتی۔ اس لیے کہ منٹو صرف جنس نگار نہیں تھا۔ "کھول دو" میں جو جنس ہے وہ بھی اگر جنس نگاری کے الزام سے مبرا نہیں ہے تو خدا اردو کے ہر افسانہ نگار کو جنس نگار بنا دے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں جنس لذت کے بجائے کرب بن جاتی ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں منٹو اُردو کے افسانہ نگاروں میں بے حد نمایاں نظر آتا ہے۔ افسانہ سُناتے ہوئے وہ جس بے تکلفی اور سادگی سے کام لیتا ہے وہ اُردو کے شاید ہی کسی افسانہ نگار کو نصیب ہوئی ہو۔ افسانے کی تعمیر بڑی بے ساختگی سے ہوتی چلی جاتی ہے اور جب کہانی مکمل ہوتی ہے تو پڑھنے والا سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ ارے! اس سادگی میں کتنی پُرکاری تھی اور اس بے تکلفی میں کتنی خوبصورتی تھی۔

میرا جی

اس نکتے کو کوئی ماہرِ نفسیات ہی حل کر سکتا ہے کہ میرا جی کی نظم میں اتنے اُلجھاؤ کیوں ہیں اور اس کی نثر اتنی سُلجھی ہوئی کیوں ہے۔ نظموں میں الفاظ اس کے خیالوں کی نقابیں بن جاتے ہیں اور نثر میں یہی الفاظ قندیلوں کا روپ دھار لیتے ہیں جن سے اس کا مفہوم جگمگا اٹھتا ہے۔ نثر میں اس نے بڑے سلیقے کا مظاہرہ کیا ہے مگر نہ جانے نظم میں یہ سلیقہ کہاں غائب ہو جاتا ہے۔ اندھی شخصیت پرستی کسی بحث یا دلیل سے قائل نہیں کی جا سکتی۔ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ یہ نظمیں میرا جی ایسے پڑھے لکھے اور باشعور فن کار کی ہیں، اس لیے ثابت ہوا کہ خوبصورت اور مکمل ہیں، مسئلہ صرف یہ ہے کہ میرا جی نے نظموں میں اپنے احساسات، جذبات اور مشاہدات کو جو لباس پہنایا ہے وہ غیر موزوں ہے اور وہ شاعری میں اپنی بات کہنے کی اُمنگ کے باوجود اپنی بات کو چھپائے رکھنے کی کوشش میں مصروف نظر آتا ہے۔

میرا جی کی شاعری کے بھی دو پہلو ہیں۔ نظموں میں وہ ایسے ابہام کا شکار رہے جس کا جواز ڈھونڈنا بیکار رہے مگر گیتوں میں وہ اتنا رواں اور مترنم ہے کہ شاعری اور موسیقی کے درمیان بہت کم فرق باقی رہ جاتا ہے۔ ممکن ہے نظموں میں اس نے اسی قسم کے جنسی مسائل کو موضوع بنایا ہو جن کے بارے میں کھل کر اور براہِ راست انداز میں بات کرنا بقائمی ہوش و حواس ناممکن ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی نظموں کا ابہام موضوع کی مجبوری کا نتیجہ ہو مگر نظمِ معریٰ کو بھی ایک روانی، ایک بہاؤ، لفظوں کے حسین دروبست کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرا جی کی نظمیں شاعری کے یہ اولین مطالبات (بعض ٹکڑوں سے قطع نظر) بہ حیثیت مجموعی پورے نہیں کرتیں البتہ گیتوں میں وہ سب کچھ ہے جو ستھری ستھری صاف شفاف شاعری میں ہونا چاہیے۔ پھر ان گیتوں کی زبان میں اُردو اور ہندی کا جو امتزاج ہے وہ بھی کچھ کم متوازن اور حسین نہیں ہے۔

میرا جی کی نثر اُردو تنقید میں بالکل نئی چیز ہے۔ تنقید، ادبیات و فنون سے متعلق ہونے کے باوجود ایک ٹیکنیکل چیز ہے اور ہر ٹیکنیکل موضوع کی خاص اصطلاحیں اور خاص ترکیبیں ہوتی ہیں۔ بیشتر نقاد ان اصطلاحوں سے قطع نظر کر کے اپنا مفہوم کما حقہٗ ادا نہیں کر سکتے۔ اسی لیے ہمارے ہاں کے تنقیدی مضامین کی اکثریت، زبان و بیان کے معاملے میں بے حد بھاری بھر کم ہوتی ہے سلیس زبان میں تنقیدی جائزے لکھنا صرف ان نقادوں کا کام ہے جو اوّل تو اس زبان پر پوری طرح حاوی ہوں جس میں وہ تنقید لکھ رہے ہیں، دوسرے ان کے ذہن صاف ہوں اور خود اپنے نظریات اور نتائج کے سلسلے میں وہ اُلجھے ہوئے نہ ہوں۔ یہی اُلجھاؤ تحریر کو بھی گنجلک بنا دیتا ہے اُردو میں سلیس تنقید نایاب تو خیر نہیں البتہ کم یاب ضرور ہے۔ مولوی عبدالحق اور فراق گورکھپوری کے تنقیدی جائزے اس سلاست اور روانی کی ایک مثال ہیں لیکن میرا جی کی تنقید، سلاست کے معاملے میں ان سے بھی آگے ہے۔ اگر ہمارے نقاد اس سلاست، اس دلپذیر اندازِ تحریر کو اپناتے تو تنقید کے قارئین کا حلقہ وسیع تر ہو سکتا تھا۔ یہ نہیں ہوا تھا تو خود میرا جی کے حلقۂ فکر کے نقادوں کا فرض تھا کہ وہ یہ رنگ اختیار کرتے مگر کچھ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرا جی کا اندازِ تنقید اسی کے ساتھ ختم ہو گیا ہے۔ "مشرق و مغرب

کے لفظ "اور" اس نظم میں "میراجی کے سلجھے ہوئے اندازِ تنقید کے ایسے نمونے ہیں جو اُردو زبان کے لیے قابلِ فخر ہیں اور میراجی بحیثیتِ نقاد کبھی نہیں مر سکتا۔

ان تنقیدی جائزوں نے بالواسطہ طور سے میراجی کی ایک اور خصوصیت کو بھی نمایاں کیا ہے اور وہ غیر زبانوں کی نظموں کے منظوم تراجم ہیں۔ نظم کا نظم میں ترجمہ خود نظم کی تخلیق کا سا کٹھن کام ہے۔ اس سلسلے میں اگر اُردو میں کسی شاعر نے کوئی قابلِ ذکر کام کیا ہے تو وہ نادر کاکوروی ہے۔ اس کے بعد کتنے بھی شاعروں نے منظوم ترجمے کی طرف توجہ کی ہے منہ کی کھائی ہے۔ غیر زبانوں کی متعدد نظمیں اُردو نظم میں منتقل ہو چکی ہیں۔ ممکن ہے مترجم نظم کے مفہوم کو بھی منتقل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہوں لیکن اگر ان نظموں کی ہیئت کو دیکھا جائے تو مترجم شاعر کا عجز نمایاں ہو جاتا ہے۔ ڈھیلے ڈھالے مصرعے، ٹھس قافیے، سپاٹ انداز، اصل نظم کے حُسن کو شدید نقصان پہنچایا ہے صرف میراجی ایسا شاعر ہے کہ اس نے نظم کو اُردو میں منتقل کرتے ہوئے اس کی ہیئت کے حُسن کو بھی برقرار رکھا ہے۔ یہ تراجم پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ نظمیں اگر اُردو میں تخلیق کی جاتیں تو ان کی ہیئت یہی ہوتی جو میراجی کے تراجم کی ہے۔ میراجی کے بعد ابنِ انشا نے چینی نظموں کے ایسے ہی نپے تلے اور حسین ترجمے کر کے اس روایت کو آگے بڑھایا ہے اور یوں میراجی کی محنت ضائع نہیں ہوئی۔

ادبی تحریکیں

شہرت بخاری

میں یہاں ان ادبی انجمنوں کا ذکر کروں گا جنھوں نے اردو ادب میں کسی نہ کسی طور کسی نہ کسی ادبی تحریک کو جنم دیا ہو یا ان کی تقویت کا سبب ہوئی ہوں۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ میری نگاہوں نے گزشتہ ایک صدی کے ورق الٹنے شروع کر دیے۔

ہرتے ہرتے میری نگاہیں ۹ راپریل ۱۸۷۴ء کی ایک سہانی شام پر جا کر رک گئیں ——— اور جبہ و دستار میں ایک ایسی شخصیت آنکھوں کے سامنے آگئی جس کے احسانوں کے بوجھ تلے اردو نثر و نظم دبی ہوئی ہے اور جس سے قد آور شخصیت اردو ادب نے نہ تو پیدا کی ہے نہ ایسا ہونے کا فی الحال امکان ہے ——— محمد حسین آزاد!

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی نے جب آخری شکست کی زنجیر پہن لی تو دلی کی وہ مسیحا نفس شخصیتیں جنھیں ڈیڑھ سو برس کے خونیں جھکڑ بجھا نہ سکے تھے ظلمتوں کے طاقوں میں ابدی سناٹوں کے گرد و غبار میں دب کر رہ گئیں ——— دلی اجڑ گئی ——— لکھنؤ سنسان ہو گیا ——— بعض طائرانِ خوش الحان رام پور کے گلزار کی رونق بنے۔ بعض حیدر آباد کی ——— کوئی کہیں۔ کوئی کہیں ——— اور جنھیں کہیں پناہ نہ ملی وہ ایک ایسے دیار میں آبسے جس کی روایت میں اردو زبان کا حصہ تو تھا مگر باقاعدہ اردو شعر یا نثر کی اکا دکا مثال کے سوا کوئی مسلسل کڑی نہیں ملتی ——— لاہور ——— جو گزشتہ نو سو برس سے فارسی شاعری کی بڑی بڑی دل کشا اور روح فزا محفلیں دیکھ چکا تھا ایک مدت سے کسی ایسے قافلے کا انتظار کر رہا تھا جس کی زادِ راہ دلی۔ شاہ حاتم۔ شاہ مبارک آبرو۔ سودا۔ درد۔ میر۔ مصحفی۔ انشا۔ میر حسن۔ جرأت۔ ناسخ۔ آتش۔ انیس۔ دبیر۔ ذوق۔ مومن۔ غالب اور شاہ ظفر کے تحائف پر مشتمل ہو۔

محمد حسین آزاد کہ نہ صرف ذوق کو بلکہ کسی اردو شاعر کو ایسا شاگرد مقدر نہ ہوا۔ لاہور کی اس صدیوں پرانی خواہش کی تکمیل کرتے ہوئے یہاں آ اترا۔ دنیوی لحاظ سے یہ بے سروسامان مسافر اپنے دل و دماغ میں ایسا ایسا لعل و گہر چھپائے ہوئے تھا کہ جب اس نے پیش کیا تو پشاور سے راس کماری تک بڑا بڑا سوداگر آنکھیں ملتا ہوا پایا گیا آزاد سے پہلے بھی کچھ بزرگ یہاں پہنچ چکے تھے مگر ان کی مثال اس پرندے کی سی تھی جسے کسی نے پنجرے میں ڈال دیا ہو ——— اور وہ صمٌ بکمٌ ——— یا تیلیوں سے سر ٹکراتا رہتا ہے مگر جونہی اسے گرفتار کرنے والا ایک دوسرے عادی قیدی پرندے کے پنجرے کو اس کے پنجرے کے سامنے لا رکھتا ہے اور یہ اس آنے والے کی غزل سرائی سنتا ہے تو بے اختیار ہو جاتا ہے اور کچھ دیر کو بھول جاتا ہے کہ وہ کہاں ہے ——— کچھ لوگ آزاد کے بعد یہاں پہنچے۔

آزاد ایک مدت تک فکرِ معاش میں سرگرداں رہے جب ذرا اطمینان حاصل ہوا تو وہ آگ جسے ۱۸۵۷ء کے طوفان نے

سرد کر دیا تھا دوبارہ دمک اٹھی ——— خاص طور سے جب محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر کرنل ہالرائڈ کو اپنا ہم نوا پایا تو اور بھی ہمت بندھی اور اب وہ کسی ایسے موقع کی تلاش میں شب و روز سرگرداں رہنے لگے جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ ان محفلوں کو دوبارہ رونق بخش سکیں۔ جن کا تصور بھی اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو چکا تھا ——— انجمن پنجاب کی بنیاد رکھی گئی . . . . . .

محمد حسین آزاد اور انجمن پنجاب ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں ——— اس انجمن کی حیثیت اردو شاعری کی تاریخ میں جس اہمیت کی حامل ہے وہ کسی اور کو نصیب نہ ہوئی۔ یہ اوّلین کوشش تھی کہ شاعری کو امرا کی محفلوں سے نکال کر اسے معاشرے میں ایک اہم مقام بخشا گیا۔ شاعری اور شاعری کے ذریعے زندگی بلکہ پوری کائنات کو ایک اجنبی رویّہ ATTITUDE دیا گیا۔ شاعری ذاتی واردات سے کٹ کر اجتماعی کوائف کی آئینہ دار تسلیم کی گئی۔ فرد کو اجتماع میں ضم کر دینے کی سعی کی گئی۔ بلکہ انسان کا رشتہ محض انسان تک محدود نہ سمجھا گیا۔ کوشش یہ سمجھنے کی کی گئی کہ انسان کا رشتہ کسی معاشرے سے کیا ہے۔ انسان کا رشتہ کائنات اور اس کے مظاہر سے کیا ہے۔ انسان اور فطرت ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ ان تمام فلسفیانہ نقطہ ہائے نظر سے قطع نظر شاعری کو ایک راستہ دکھایا گیا جس نے آگے چل کر جدید شاعری کا نام پایا اور آج ہم اس حیثیت میں ہیں کہ انجمن پنجاب سے پہلے اور انجمن پنجاب کے بعد کی شاعری میں ایک واضح تمیز کر لیتے ہیں ——— اس سے پہلے کی شاعری کو قدیم یا احتراماً کلاسیکی شاعری کا نام دینے پر مجبور ہیں۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ اس زمانے میں وہی شاعر نئی شاعری کے علمبردار ہوئے جو انجمن پنجاب کے مختلف مناظموں میں شریک ہو سکے۔

انجمن کی بنیاد پڑنے سے پہلے پنجاب میں اردو شاعری کی کوئی روایت نہ تھی۔ یہاں کوئی قابل ذکر اردو شاعر پیدا نہ ہوا تھا۔ یوں ہونے کو یقیناً چند نام مل جائیں گے مگر وہ محض نام ہی ہوں گے اور انجمن کے قیام کے بعد اردو شاعری جیسے پنجاب تک سمٹ کر رہ گئی ———

چند برس گزرے میں نے ایک مضمون لکھا تھا جس میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کی تھی کہ کیا ہم پنجاب کو بھی اردو کا کوئی دبستان کہنے کی جرأت کر سکتے ہیں۔ بعض حضرات نے میری اس کوشش کو صوبائی عصبیت اور پنجابیت کا مظہر جانا تھا۔ حالانکہ میں آج بھی اسی کشمکش میں ہوں کہ اگر کسی خاص رجحان یا رویّے کے سبب ہم دکن، دلّی اور لکھنؤ کو کوئی دبستان تصوّر کر لیتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ نظمیہ شاعری کو جس کی داغ بیل پنجاب میں پڑی اور جسے اس علاقے کی آب و ہوا یا مزاج نے پروان چڑھایا پنجاب کے دبستان کا نام نہ دیا جائے۔ بلکہ نظم سے گزر کر اس تحریک نے شاعری کو جو نیا انداز نظر اور بے تکلّف یا بے جھجک طرز بیان دیا تھا وہ غزل کو بھی متاثر کئے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ بھی انجمن پنجاب کا مرہونِ احسان ہے۔ انجمن پنجاب نے نہ صرف اردو شاعری کو ایک نیا اسلوب دیا۔ سوچنے اور محسوس کرنے کا ایک نیا زاویہ دیا۔ بلکہ اس سے بھی بڑا کام جو اس انجمن نے اور اس انجمن کے ذریعے محمد حسین آزاد نے کیا وہ یہ تھا کہ پنجاب میں اردو شاعری کا ذوق تربیت کیا گیا اور اردو شاعری کے ذریعے اہلِ پنجاب کو اردو سے وہ شیفتگی پیدا ہو گئی کہ آج پنجاب اور اردو دو چیزیں نہیں رہ گئیں۔ حکومت نے اٹک کے اس پار کی علاقائی زبان پشتو۔ سندھ کی زبان سندھی، بلوچستان کی زبان بلوچی اور بنگال کی زبان بنگالی تسلیم کی۔ مگر پنجاب کی علاقائی زبان بھی اردو ہی مانی جاتی ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد جتنی بڑی تعداد میں کتابیں، رسالے اور اخبارات اس علاقے سے شائع ہوئے یا ہو رہے ہیں اتنی تعداد میں ان علاقوں سے شائع نہیں ہوتے جہاں کے رہنے والے اردو کو اپنی مادری زبان خیال کرتے ہیں ——— اور یہ سب کچھ انجمن پنجاب ہی کا اعجاز ہے۔

۱۸۵۷ء کے قیامت خیز ہنگامے نے آزاد کو دلّی چھوڑنے پر مجبور تو کر دیا تھا۔ ان کی روح پژمردہ تھی مگر ابھی مری نہ تھی۔

لاہور میں قیام اختیار کر لینے کے بعد، جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، جب ان کو قدرے اطمینان حاصل ہوا تو ان کی بے قرار روح کو شعر و شاعری کے دامن میں پناہ تلاش کرنے کی ضرورت پیش آئی —— وہ غزلیہ شاعری سے دل برداشتہ تھے۔ وہ شاعری کو سکونِ روح ماننے کے لئے اب تیار نہ تھے، ان کا جی چاہتا تھا کہ شاعری محض سکون فراہم نہ کرے وہ کچھ کر کے دکھائے۔ انہیں احساس تھا کہ شاعری اور پیغمبری میں بس درجے ہی کا فرق ہے۔ جو معجزے ایک پیغمبر سے منسوب ہو سکتے ہیں وہ کسی شاعر سے بھی ہو سکتے ہیں۔ ان کی خواہش تھی کہ ہماری شاعری رات کو تارے گننا چھوڑ کر چڑھتے ہوئے سورج سے آنکھ ملانا سیکھے۔ انہیں اپنی زمین سے عشق تھا انہیں اپنی روایت سے جنون کی حد تک شیفتگی تھی ——

"اے خاکِ ہندوستان! اگر تجھ میں امراؤ القیس اور لبید نہیں تو کالیداس ہی نکال دے

اے ہندوستان کے صحرا و دشت فردوسی اور سعدی نہیں تو کوئی والمیک ہی پیدا کر دے۔"

بہرحال انجمن پنجاب کے زیرِ اہتمام جو مشاعرے یا مناظمے منعقد ہوئے اور جنہیں جدید اردو شاعری کی بنیاد یقین کرنا چاہئے۔ وہ کوئی اچانک چیز نہ تھی بلکہ آزاد اہلِ ملک کو اس مبارک مجلسِ مشاعرہ کے لئے ایک مدت سے تیار کر رہے تھے، چنانچہ اگست ۱۸۶۷ء میں منعقد ہونے والے ایک اجلاس میں انہوں نے ایک معرکۃ الآرا مقالہ پیش کیا جس کا عنوان تھا "نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات" —— جس میں انہوں نے بیان کیا کہ

"... شاعر اگر چاہے تو امورِ عاریہ کو بھی بالکل نیا کر دکھائے، بنجر کو گویا کر دے، درختانِ پا در گل کو رواں کر دے۔ ماضی کو حال، حال کو استقبال کر دے۔ دور کو نزدیک کر دے، زمین کو آسمان، خاک کو طلا، اندھیرے کو اُجالا کر دے۔"

آگے چل کر فرماتے ہیں ——

"... اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اکثر اشخاص علی العموم فنِ شعر کو گمراہی خیال کرتے ہیں اور فی الحقیقت حال ایسا ہی ہے ......"

"... ابتدا میں شعر گوئی حکما اور علمائے متبحر کے کمالات میں شمار ہوتی تھی۔ اور ان تصانیف میں اور حال کی تصانیف میں فرق بھی زمین و آسمان کا ہے ..."

"—— امید ہے کہ جہاں اور محاسن و قبائح کی ترویج و اصلاح پر نظر ہوگی۔ فنِ شعر کی اس قباحت پر بھی نظر رہے۔ گو آج نہیں مگر امید قوی ہے کہ انشاء اللہ کبھی نہ کبھی اس کا ثمرۂ نیک حاصل ہو۔

تمہاری سینہ فگاری کوئی تو دیکھے گا

نہ دیکھے اب تو نہ دیکھے کبھی تو دیکھے گا"

اور ہمیں معلوم ہے کہ ان کی اس خود اعتمادی اور امید کو ٹھیس نہیں لگی۔

بہرحال ۹ اپریل ۱۸۷۴ء کو شام کے چھ بجے انجمن پنجاب کے زیرِ اہتمام مکتا بھاکے مکان پر ایک عظیم الشان تاریخی اجلاس

منعقد ہوا جس میں ان کے ہم تاخلہ رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب ۔ مولوی سید احمد دہلوی مؤلف "فرہنگ آصفیہ"، مولوی کریم الدین۔ منشی درگا پرشاد نادر۔ پنڈت من پھول کے علاوہ کرنل ہالرائیڈ۔ مسٹر جسٹس بولنو جج چیف کورٹ۔ مسٹر تھارنٹن سیکرٹری پنجاب گورنمنٹ۔ کرنل مکلاگن۔ مسٹر ینگ کمشنر اور مسٹر نسبٹ ڈپٹی کمشنر لاہور اور چند خواص لاہور مثلاً نواب عبدالمجید خاں اور فقیر سید قمر الدین وغیرہ کے اسمائے مبارک قابلِ ذکر ہیں ۔ اس اجلاس کی صدارت مسٹر جسٹس بولنو نے کی ۔ اس جلسے میں آزاد نے ایک زبردست خطبہ دیا جس کے بعض حصے پیش کئے بغیر چارہ نہیں :

"——— اے گلشنِ فصاحت کے باغبانو! فصاحت اسے نہیں کہتے کہ مبالغہ اور
بلند پردازی کے بازوؤں سے اڑیے، قافیوں کے پروں سے فرفر کرنے گئے ۔ لفاظی
اور شوکتِ الفاظ کے زور سے آسمان پر چڑھتے گئے اور استعاروں کی تہ میں ڈوبے گئے
غائب ہو گئے ——— اب زمانہ کچھ اور ہے ۔ ذرا آنکھیں کھولیں گے تو دیکھیں گے کہ
فصاحت و بلاغت کا عجائب خانہ کھلا ہے جس میں یورپ کی زبانیں اپنی اپنی تصانیف
کے گلدستے ، ہار ، طرے ہاتھوں میں لئے کھڑی ہیں اور ہماری نظم خالی ہاتھ الگ کھڑی
منہ دیکھ رہی ہے ۔ لیکن اب وہ منتظر ہے کہ کوئی صاحب ہمت ہو جو میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھے ۔"

"کئی پرانی مورتیں جو باقی ہیں وہ چراغِ سحری ہیں ۔ انجام یہ کہ زبان ہماری ایک
دن نظم سے بالکل محروم ہو گی اور اردو میں نظم کا چراغ گل ہو گا ———"

اس طویل اور اردو شاعری کی تاریخ میں انوکھے خطبے کے بعد خود آزاد نے اپنی ایک نظم "شب قدر" کے عنوان سے پیش کی جس سے ان کی مراد یہ تھی کہ جو شاعر وہاں موجود ہیں یا جنہیں آئندہ مجوزہ مشاعرے میں نظم پڑھنا تھی ان کے سامنے کوئی نمونہ ہو ———

آخر میں کرنل ہالرائیڈ ۔ مسٹر تھارنٹن ۔ رائے مول سنگھ ۔ پنڈت بسنت رام اور صاحبِ صدر نے تقریریں کیں ۔ کرنل ہالرائیڈ نے اپنی تقریر میں کہا کہ ———

"اس وقت مولوی محمد حسین نے جو مضمون پڑھا اور رات کی حالت پر جو اشعار سنائے
وہ بہت تعریف کے قابل ہیں اور ہم سب کو مولوی صاحب کا بہت شکر گذار ہونا
چاہئے ۔ یہ نظم ایک عمدہ نمونہ ہے اس طرز کا جس کا رواج مطلوب ہے ———"

ان تقریروں کے بعد طے پایا کہ ۳۰ جون ۱۸۷۴ء کو ایک موضوعی مشاعرہ منعقد کیا جائے ۔ یہ مشاعرہ اپنی طرز کا بالکل نیا اور دلچسپ مشاعرہ تھا ۔ چنانچہ تاریخ مقررہ پر انجمن کے مکان ہی پر یہ مشاعرہ ہوا ۔ اس میں نو شاعروں نے اپنی نظمیں پیش کیں اور آئندہ مشاعرے کے لئے "امید" موضوع قرار پایا ۔ ان نو شاعروں کے نام یہ ہیں : شاہ انور حسین ہما ۔ مولوی میرزا اشرف بیگ خاں اشرف ، رئیس دہلی اسسٹنٹ مترجم محکمہ ڈائرکٹری پنجاب ۔ منشی الٰہی بخش رفیق ۔ مولوی محمد مقرب ، رئیس جگراؤں ۔ مولوی احمد جان ولی دہلوی شاگرد میرزا غالب ہیڈ ماسٹر ورنیکولر مڈل سکول فیروز پور جھرکا ۔ مولوی قادر بخش مدرس انبالہ ۔ مولوی عطاء اللہ ۔ مولوی علاء الدین محمد کاشمیری اور مولوی محمد حسین آزاد ۔

ان شاعروں نے "زمستان" کے عنوان سے اپنی اپنی نظمیں پڑھی تھیں ۔

اب اس قسم کے مشاعروں کا ہر ماہ اہتمام ہونے لگا ۔ مولانا حالی جن کا نام جدید شاعروں میں سرِ فہرست شمار کیا جاتا ہے اور

وہ چوتھے مشاعرے میں اوّلین مرتبہ شریک ہوئے۔ ان مشاعروں کا انعقاد ان کے ورود لاہور سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ حالی نے اپنی چار مثنویاں برکھا رت۔ نشاطِ امید۔ حب الوطن۔ مناظرہ اور رحم و انصاف، انہیں مشاعروں کے لئے لکھیں اور پڑھیں۔

یہ مشاعرے اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک طرح کی جدت بھی تھی اور بدعت بھی۔ اہلِ لکھنؤ نے دل کھول کر مخالفت کی ——— دہلی والے خاموش رہے مگر غالب کے ایک شاگرد مولوی سیف الحق ادیب دہلوی نے جس ذوق و شوق کا اظہار کیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ یعنی وہ دہلی سے لاہور ان مشاعروں میں شریک ہونے کی غرض سے آئے۔ پورے ملک میں اتنا حق و مخالفت میں کہا گیا اور لکھا گیا کہ اگر جمع کر لیا جائے تو ایک دفتر ہو جائے۔ موافقین آزاد کو داد و بیتے نہ تھکتے تھے اور مخالفین نے آزاد کو ذاتیات کی حد تک رگیدنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ——— یہاں ایک بات قابلِ ذکر ہے کہ اس زمانے کے تقریباً سبھی اخبارات نے اس تحریک کے متعلق مخالف یا موافق رائے کا اظہار کیا۔ لکھنؤ کا "سررشتہ تعلیم" بدترین مخالف تھا۔ مگر طرفدار اخبارات نے اپنا اپنا حق ادا کیا۔ قصور جیسے قصبے سے ایک انجمن مفید عام جاری ہوا تھا۔ اس کی ۱۸۷۴ء کی جلد اس موضوع پر محمد حسین آزاد کے تقریباً سبھی مضامین سے بھری ہوئی ہے۔ پنجاب میں تو خیر اس کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اس لئے کہ پنجاب کے خمیر میں یہ چیز داخل ہے کہ ہر نئی چیز پر اپنے دروازے کھلے رکھتا ہے۔ البتہ میرٹھ نے جس انداز میں اس تحریک کو لبیک کہا کسی اور قصبے یا شہر نے نہ کہا تھا۔ میرٹھ کے ہفتہ وار اخبار "لارنس گزٹ" کی ۲۰ اکتوبر ۱۸۷۴ء کی اشاعت میں ایک مفصل افتتاحیہ اسی موضوع پر درج ہے۔ اس افتتاحیہ کے لکھنے والے اردو شاعری کے ابتدائی ادوار کے تذکرے کے بعد اس وقت کی اردو شاعری کی قابلِ رحم حالت کا خاکہ اتارتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"۔۔۔ اردو شاعری اب مُردوں میں گنی جاتی تھی مگر آفریں ہے مولوی محمد حسین آزاد تخلص پروفیسر عربی گورنمنٹ کالج لاہور کی رائے صائب پر کہ انہوں نے اردو شاعری کی بے قدری کو نظر کر کے ایک انجمن قائم کی جس کے ممبر واقعی حالات کو شرح اور بسط کے ساتھ پورا پورا نظم میں موزوں کرتے ہیں۔ اگرچہ بعض شاعروں نے اس تجویز پر طعن آمیز مضمون اخباروں میں چھپوائے ہیں۔ جیسا ابتدائی قاعدہ ہر ایک عمدہ سے عمدہ تجویز کا ہوتا ہے کہ اول لوگ اس پر ہنسا کرتے ہیں پھر اس کے فائدے دیکھ کر خود بھی ادھر ہی متوجہ ہوتے ہیں۔ مگر سچ پوچھو تو حضرت آزاد نے آزادانہ اور بے باکانہ شاعری کو دوسرے قالب میں ڈھال دیا جس سے پرانا مردہ زندہ ہو گیا۔۔۔۔۔۔"

"۔۔۔ افسوس کہ میرٹھ میں صرف دو ہی جلسے نظم سوسائٹی میں ہونے پائے تھے کہ وبائی بیماری تپ و لرزہ نے لوگوں کو پراگندہ کر دیا۔ ورنہ وہ انجمن کی شاخ ہو جاتی۔۔۔۔"

میرٹھ کے چند شاعر لاہور کی انجمن میں مجوزہ عنوانوں پر نظمیں لکھنے لگے جن میں سید محمد مرتضیٰ بیان یزدانی رئیس میرٹھ کا نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ یہ بات بھی خاصی دلچسپ ہے کہ آزاد نے میرٹھ کا سفر شاید خاص طور سے اختیار کیا اور اپنی مثنوی "امید" ایک جلسے میں پڑھی۔ اس کا مطلب ہے کہ آزاد "نظم" کو شاعری میں ایک ملک گیر تحریک بنانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ مگر خود انجمن پنجاب دس سے زیادہ مشاعرے نہ کر سکی۔

مشاعرے بند ہوگئے مگر جو بیج ڈالا گیا تھا وہ ایک عظیم درخت بن کر رہا ۔

اس تحریک کا اثر نہایت دوررس اور داخلی قسم کا تھا کہ ہر چند اجتماعی کوشش اس مقصد کی نہ رہی مگر اکثر شاعر اس ڈگر پر چل چکے تھے اور لاہور کو مشاعروں کا لپکا پڑ ہی چکا تھا ۔ چنانچہ مختلف محلوں میں مختلف ارباب ذوق کی بیٹھکیں محافلِ مشاعرہ کے لئے وقف ہو گئیں ۔ ہر چند ان مشاعروں میں اکثر روایتی قسم کی غزلیں ہی پڑھی جاتی تھیں اور رجعت قہقہری ہی سمجھنا چاہیئے کہ موضوعات کی جگہ پھر طرح دی جانے لگی ۔ مگر ان مشاعروں سے ایک فائدہ خاص طور سے پہنچ رہا تھا کہ اہلِ لاہور نے اردو شاعری میں دلچسپی زیادہ سے زیادہ لینا شروع کر دی ۔ اور فارسی شاعری کا چرچا کم سے کم تر ہوتا چلا گیا ۔

لاہور کا ایک مشہور بازار چکیاں اس لحاظ سے خصوصاً تاریخی حیثیت رکھتا ہے کہ اس بازار کی ایک تنگ سی گلی کوچہ فقیر خانہ میں بڑے بڑے معرکے کے مشاعرے منعقد ہوئے جن کی شمع مرحوم قلعہ معلیٰ کے ایک چشم و چراغ نواب میرزا ارشد گورگانی تھے ۔ ان مشاعروں کی تفصیلات میں جانا میرے دائرے سے باہر ہے ۔ جیسا کہ میں نے شروع میں خود پر یہ پابندی عائد کر لی تھی کہ میں صرف ان انجمنوں یا مجلسوں کا ذکر کرنا چاہوں گا جن کا وجود کسی نہ کسی حیثیت میں اردو شاعری کی تاریخ میں ایک مقام رکھتا ہو ۔ کوچہ فقیر خانہ کے مشاعروں کا ذکر اس لئے ناگزیر ہو گیا کہ آزاد اور حالی کی "جدید شاعری" کے بعد جس "جدید شاعری" نے جنم لیا وہ جن شاعروں کی تخلیقات سے عبارت ہے ان میں سے اکثر شاعر انہیں مشاعروں کے ذریعے متعارف ہوئے ۔ اگر اوروں کا ذکر نہ بھی کیا جائے پھر بھی اقبال کا نام لینا ہی کافی ہے ——— اس لئے نہیں کہ اقبال نے اپنے ڈھب کی شاعری کے لئے ان محفلوں سے تربیت حاصل کی بلکہ اس لئے کہ ان محفلوں نے اس کے مذاقِ سخن کو سنوارا ، ان محفلوں نے اس کی حوصلہ افزائی کی ۔ یہ روایت کوئی معمولی نہیں کہ ایک نوجوان لڑکا ایک غزل پڑھ رہا ہے اور جب یہ شعر پڑھتا ہے کہ

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

تو اس محفل کا سب سے مستند انسان اٹھ کر اس نوجوان کو گلے لگا لیتا ہے ۔ ہم میں سے کبھی کو اس کا تجربہ ہوگا کہ اچھے سے اچھا شعر کسی بڑی سے بڑی محفل میں پڑھ جائیے ۔ زیادہ سے زیادہ "واہ" ——— اور بس ——— ورنہ مسکراہٹ پہ بات ختم ہو جاتی ہے ۔

فقیر خانے کے ان مشاعروں کی طرح انجمنِ حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں نے اقبال اور دوسرے شاعروں کی حوصلہ افزائی کی ..... اور بات آگے بڑھتی چلی گئی ۔

اقبال اپنی ذات میں خود ایک انجمن اور خود ایک تحریک تھے ۔ ایسی تحریک کہ اب پوری اردو شاعری اقبال کے پیغمبرانہ اور اس کے بعد آنے والے اس کے اثر سے اگر محفوظ رہ گئے تو ان کا معاملہ مشکوک ہو جاتا ہے ۔ اقبال نے اردو شاعری کو کیا کچھ دیا یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پہ بے شمار لکھا گیا اور جانے کب تک بے شمار لکھا جائے گا ۔ مگر اتنا یہاں کہنا ہی پڑتا ہے کہ اقبال کی انجمن ہو خود ان کی اپنی ذات بھی لاہور کے لئے اسی قدر محترم و متبرک ہے جس طرح میر یا غالب کی کہ وہ بھی کسی انجمن سے منسلک نہ تھے مگر انجمن تھے ——— آزاد کے بعد اقبال نے ——— ایک نے اپنی عظیم شخصیت اور ایک نے اپنی عظیم شاعری کے ساتھ جو تحریک اردو شاعری کو دی وہ جب تک زبان زندہ ہے زندہ رہے گی ۔

اقبال نے جب اپنے لئے ایک یقینی اور حتمی راہ طے کر لی تو مشاعرے ان کے کلام کو ان کی زبان سے سننے سے محروم ہو گئے۔ (سوائے انجمن حمایت اسلام کے جہاں وہ ہر سال اپنی ایک نئی نظم سے اہلِ لاہور کو نوازتے تھے۔)

مگر مشاعروں کا شوق اہلِ لاہور کو پڑ چکا تھا۔ مشاعرے منعقد ہوتے۔ کبھی کسی شاعر کے زیر اہتمام کبھی بعض ارباب ذوق کے۔ ہوتے ہوتے لاہور کے اکثر شاعر دو جماعتوں یا گروہوں میں بٹ گئے۔ اسی طرح سامعین بھی۔ ایک وہ جو قدیم روایت کے علمبردار تھے۔ اور دوسرے وہ جو انگریزی اثرات کو قبول کر کے شاعری میں نئی نئی راہیں تلاش کرنے کا شوق رکھتے تھے۔ پہلے گروہ کے سرپرست بلکہ رہنما شمس العلماء مولانا تاجور نجیب آبادی تھے اور دوسرے کے امام ڈاکٹر تاثیر تھے۔ ڈاکٹر تاثیر نے پروفیسر پطرس بخاری، عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت، حکیم احمد شجاع، ہری چند اختر، ابو الاثر حفیظ جالندھری اور پروفیسر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے ساتھ مل کر "زندہ دلانِ پنجاب" کے نام سے ایک انجمن قائم کی ——— مولانا تاجور نجیب آبادی بڑے باغ و بہار بزرگ تھے۔ عربی، فارسی اور اردو پر ان کی قدرت کمال کے درجے تک تھی۔ زبان دانی اور اسرار و رموزِ شعر ان کے ناخنوں میں تھے۔ فنِ شعر سے آگہی شاید ان سے زیادہ کسی کو نہ تھی۔ وہ خود غزل کے رسیا تھے۔ ہر چند بہت سی جدید قسم کی نظمیں بھی ان کی تخلیقات میں شامل ہیں۔ ان کے شاگردوں کی ایک طویل فہرست ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ تاجور مرحوم نے لاہور میں شاعری کا ذوق سنوارنے میں بڑا حصہ لیا۔ ان کے شاگردوں میں احسان دانش اور اختر شیرانی کا ذکر خاص طور سے کیا جا سکتا ہے۔ تاجور مشاعروں کے شائق تھے اور پرانے اساتذہ کی طرح اپنے شاگردوں کا ایک جمِ غفیر ساتھ لے کر مشاعرے میں شمولیت کیا کرتے تھے۔ انجمن اربابِ علم کے نام سے بڑے بڑے ٹھاٹھ سے مشاعرے منعقد کرتے تھے۔ اور اسی لاہور میں کل ہند قسم کے ایسے ایسے مشاعرے انہوں نے کرائے کہ پھر لاہور والوں نے اتنی بڑی تعداد چیدہ چیدہ شاعروں کی نہیں دیکھی۔ مولانا نے اپنی زندگی میں کئی انجمنوں کی بنیاد رکھی مگر کوئی انجمن کسی رویئے ATTITUDE کو جنم نہ دے سکی۔ ان کے مقابلے میں اس زمانے کے بالکل نوجوان جن کا ذکر اوپر آیا ہے اور جو خود کو اس غرض سے "زندہ دلانِ پنجاب" کہتے تھے کہ وہ سمجھتے تھے کہ تاجور مرحوم اہلِ پنجاب کو کور ذوق خیال کرتے ہیں اور یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ پنجاب والے اردو شعر کہہ سکتے ہیں اس لئے کہ انہیں اردو پر وہ قدرت حاصل نہیں ہو سکتی جو اہلِ زبان کو قدرتی طور سے حاصل ہے ——— یہ "زندہ دلانِ پنجاب" سب کے سب سوائے حفیظ جالندھری کے انگریزی ادبیات سے نہ صرف یہ کہ آشنا تھے بلکہ تاثیر اور بخاری تو اپنی انگریزی دانی میں مشہور تھے۔ یوں بھی یہ سب کے سب جدت و اختراع کا شوق حد سے سوا رکھتے تھے۔ اور پھر یہ بھی نہ تھا کہ فارسی اردو کے کوچوں سے نابلد ہوں۔ ظاہر ہے اس صورت میں نئی نسل کے لئے ان لوگوں میں زیادہ دلچسپی تھی ——— تاجور اور ان کے مقلدین اگر نظمیں بھی کہتے تھے تو ان میں بھی روایتی ہونے کا احساس ہوتا تھا۔ لیکن ان لوگوں کی آوازیں بالکل الگ سی معلوم ہوتی تھیں ——— زندہ دلانِ پنجاب نے اپنے مسلک کو فروغ دینے کا بھی وہی راستہ اختیار کیا جو تاجور نے کیا تھا۔ دونوں گروہ ایک دوسرے کے مقابلے میں مشاعرے منعقد کرتے۔ تاجور مرحوم مترنم مشاعروں پر زیادہ تکیہ کرتے تھے، ادھر ایک حفیظ تھے جو اپنے ترنم اور اپنی نئی قسم کی نظموں اور گیتوں کے سبب بے حد مقبول ہوئے۔

یہ ادبی اختلاف ذاتیات تک پہنچ گیا۔ ایک دوسرے کے مشاعروں میں گڑبڑ پیدا کرنے لگے۔ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے لگے۔ حسب نسب تک اُگھاڑا جانے لگا۔ غرض یہ کہ وہ اودھم مچا کہ مصحفی و انشا کا زمانہ یاد آ گیا۔ مشاعروں سے ہٹ کر یہ طوفان اخبارات و رسائل تک پہنچ گیا۔ آخرکار اپنی اپنی جگہ دونوں ہتھیار ڈال گئے۔ جو چند حضرات ان دونوں سے آشنائی رکھتے تھے اور

باطنی دونوں سے اختلاف رکھتے تھے ان میں سید عابد علی عابد کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

غرض یہ کہ نقیر خانے سے ایس پی ایس کے ہال (جواب سجادیہ میڈیکل ہال اور پولیس والوں کے قبضۂ قدرت میں عبرت کا منظر پیش کر رہا ہے) تک یعنی آزاد سے تاجور تک کا پورا عہد جسے ۱۹۳۶ء تک شمار کرنا چاہیے، خالص مشاعروں کا زمانہ تھا، سوائے اقبال کے جو بیسویں صدی کے بالکل شروع ہی میں ایک طرح سے گوشہ گیر ہو گئے تھے۔ تاثیر اور حفیظ کا کام (اقبال کے علاوہ) بڑا قابل قدر ہے۔ تاثیر نے ایک لحاظ سے شاید نئی نسل کو سب سے زیادہ متاثر کیا ——— زندہ دلانِ پنجاب نے مغربی شاعری اور تنقید کی روشنی میں اردو شاعری کو آگے بڑھانے کی کوشش کی اور یوں یہ انجمن ایک انداز میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

پہلی عالمی جنگ نے دنیا کو جن تباہیوں اور بربادیوں کی دوزخ میں جھونکا تھا۔ دنیا والے بظاہر اس سے جانبر ہو چکے تھے مگر طبقاتی نزاع روز بروز بڑھتی چلی گئی اور یہ زمانہ جو اطمینان کا زمانہ معلوم ہو رہا تھا۔ دراصل اپنی جلو میں ہزاروں نیا منیں لئے ہوئے تھا۔ دنیا کو سائنس، نفسیات اور اقتصادیات کے جدید ترین انکشافات اور علوم نے بالکل اجنبی راہوں پر لا ڈالا تھا۔ یہ علوم انسان کی فلاح کے مدعی تو تھے مگر حقیقت میں اس تبسم کے پردے میں آنسوؤں اور کراہوں کا ایک طوفان چھپا ہوا تھا ——— وہ تمام اقوام جو اس جنگ میں کچلی گئی تھیں ان طاقتوں پر اعتماد کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہی تھیں جنہوں نے اپنی اپنی ہوس ملک گیری کی تکمیل کی غرض سے انہیں چیونٹیوں کی طرح مسل کر رکھ دینا چاہا ——— لیکن ان کے پاس ان کے چنگل سے نکلنے کا کوئی چارہ نہ تھا ——— معاشی اور سیاسی کش مکش بڑی تیزی سے پوری دنیا کو اس آتش فشاں کے نزدیک لے آئی تھی جو ستمبر ۱۹۳۹ء میں پھٹ پڑا ...... اس کش مکش نے دنیا کے ادب کو بڑی شدت سے متاثر کیا۔ اور دنیائے ادب و شعر کو نئی عینکوں سے دیکھنا چاہا ——— اور عموماً وہ عینکیں ادب خالقوں اور ادب پسندوں کو حاصل ہوگئیں۔ ایک وہ جو ادب کو زندگی کے ارتقا میں ایک اہم عملی طاقت خیال کرتا تھا۔ اس کا نعرہ تھا کہ ادب اور زندگی دو چیزیں نہیں ——— اور زندگی اس وقت تک صحیح معنوں میں زندگی نہیں کہلائی جا سکتی، خواہ یہ زندگی فرد کی ہو یا اجتماع کی، جب تک کسی معاشرے میں طبقاتی نزاع اقتصادی لحاظ سے قائم رہتی ہے اس نقطۂ نظر کی تبلیغ کرنے والے روس کا حوالہ خاص طور سے دیتے تھے بلکہ روس کے ساتھ جذباتی اور ذہنی شیفتگی اس حد تک بڑھ گئی کہ اس کے لئے جو واضح علامتیں تراشی گئیں وہ بے دھڑک برتی جانے لگیں ——— دوسری طرف ایک اور دبستان وجود میں آیا۔ اس دبستان سے دلچسپی رکھنے والے انسان کے تمام دکھوں اور سکھوں کو نفسیات کے نہاں خانوں میں تلاش کرنا چاہتے تھے۔ اور زندگی کو کسی ایک مخصوص زاویئے سے دیکھنے یا تخلیق کرنے کے قائل نہ تھے ———

یورپ سے یہ آوازیں برصغیر کے ادیبوں کے کانوں تک بھی پہنچیں۔ اور یہاں لکھنؤ میں ایک کانفرنس بلائی گئی ——— شاید ہی کوئی ادیب یا شاعر نئی نسل کا ایسا ہو گا جس کو اس تحریک نے اپنی طرف متوجہ نہ کیا ہو اور نئے اور پرانے ادیبوں میں ایک باقاعدہ دیوار کھڑی ہو گئی ——— "انجمن ترقی پسند مصنفین" قائم ہوئی ——— اور جنگل کی آگ کی طرح پورے ملک میں پھیل گئی ——— مگر زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ چند ادیبوں اور شاعروں کو یہ محسوس ہوا کہ زندگی محض روٹی کا نام نہیں، زندگی محض سیاسی یا معاشی آئیڈیالوجی کی تبلیغ کا نام نہیں۔ روایت پر معاشرے کی جان ہے اس کو آگے بڑھانے کی کوشش قابل تحسین عزم رہے مگر اس کو زندگیوں سے خارج کر دینا ایک انسان کو وہ پتا بنا دیتی ہے جو شاخ سے ٹوٹ کر ہوا کے رحم و کرم پر سڑکوں پر رلتا پھرتا ہے اور آخر کار فنا ہو جاتا ہے ———

اس نقطۂ نظر کے جو ادیب لاہور میں تھے وہ ایک پلیٹ فارم حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور اجتماعی حیثیت کو حلقہ ارباب ذوق کا نام دیا گیا۔

انجمن ترقی پسند مصنفین ہندوستان کے صوبہ یو پی یا بمبئی میں خاص طور سے بہت کامیاب ہوئی۔ اس کی وجہ شاید وہاں کے جاگیرداری اور صنعتی و تجارتی نظام سے پیدا شدہ حالات تھے۔ پنجاب میں انجمن کا اثر اجتماعی لحاظ سے بہت دیر میں پہنچا ——— اسی لئے انجمن کی شاخ لاہور میں دیر سے قائم ہوئی۔ ہونے کو تو آزادی سے پہلے بھی یہاں جماعت قائم تھی مگر اس میں وہ گہما گہمی پیدا نہ ہو سکی تھی جو انجمن سے مخصوص رہی ہے۔ دراصل انجمن نے ۱۹۴۷ء کے بعد اپنی زندگی کا ثبوت دیا ——— عارف عبدالمتین، احمد راہی، ساحر لدھیانوی ——— ظہیر کاشمیری، عبدالمجید بھٹی اور باری علیگ کے نام اس سلسلے میں خاص طور سے قابل ذکر ہیں کہ انہی کی بھاگ دوڑ نے انجمن کو لاہور میں پاؤں جمانے کا موقع فراہم کیا۔ عبدالمجید بھٹی اور باری علیگ کچھ ہی مدت بعد انجمن سے علیحدہ ہو گئے۔ انہیں انجمن کی تنگ نظر پالیسی سے اختلاف تھا۔ انجمن کے شروع کے اجلاس دیال سنگھ پبلک لائبریری میں منعقد ہوتے رہے اور بہت ہی قلیل مدت میں اس کے جلسے بہت زور دار ہونے لگے۔ نظریاتی اتفاق رکھنے والے یا ہمدردی رکھنے والے ادیب و شاعر اکٹھے ہو گئے۔ تقسیم برصغیر کے سبب ہندوستان سے بھی بہت سے ادیب اور شاعر یہاں آ گئے تھے ——— احمد ندیم قاسمی ریڈیو کی ملازمت ختم کر کے لاہور آ گئے اور ہاجرہ مسرور اور محمد طفیل کے ساتھ مل کر "نقوش" کا اجرا کیا۔ احمد ندیم قاسمی کی ہمدردیاں انجمن کے ساتھ ضرور تھیں لیکن مرکزی انجمن ترقی پسند مصنفین (بمبئی) سے اختلاف رکھنے کے سبب وہ انجمن میں عملاً حصہ لینے سے گریز کرتے رہے مگر زیادہ مدت ایسا نہ کر سکے۔ اور جب انہیں منا لیا گیا تو ان کے ساتھ جو چند ادیب اور شاعر باہر رہ گئے تھے وہ بھی آنے لگے۔ پھر محمد صفدر میر بمبئی سے آ گئے۔ سقوط حیدرآباد کے بعد ابراہیم جلیس بھی یہیں آ گئے۔ سید سبط حسن بھی لاہور میں مستقل قیام اختیار کر چکے تھے۔ سجاد ظہیر بھی لاہور آ چکے تھے۔ فیض کی ہمدردیاں ضرور تھیں مگر عملاً وہ کبھی آگے نہیں آئے۔ بہرحال انجمن ترقی پسند مصنفین ایک زبردست فعال جماعت بن گئی۔ دیال سنگھ پبلک لائبریری کے بعد انجمن کے جلسے مظہر علی خاں کے مکان (واقع نکلسن روڈ) کے احاطے میں ہونے لگے۔

پاکستان آخر کار وجود میں آ گیا ——— نئی قوم کے نئے تقاضے سامنے آئے۔ اس قوم نے بے مثال جانی اور مالی قربانیاں اس آدرش کو حاصل کرنے میں پیش کی تھیں۔ اس کی چند امنگیں بھی تھیں۔ مگر صبح آزادی نے جو جانگسل منظر دکھایا تھا اس نے اکثر چہروں کو بجھا کر رکھ دیا تھا ——— جب انجمن ترقی پسند مصنفین کے اکثر ارکان یا اس سے متعلق اکثر ادیبوں اور شاعروں نے جو ایک طرح سے باقاعدہ عملی سیاست میں شامل تھے، جو تخلیقات پیش کیں وہ بہت سے پڑھنے والوں کے لئے دل شکن تھیں اور حکومت وقت نے انجمن کو سیاسی جماعت قرار دے کر اس کے ارکان پر اشتراکی ہونے کا الزام لگایا اور انجمن کو قانونی طور سے غیر قانونی قرار دے دیا ——— تو کچھ ہی مدت بعد انجمن سے متعلق نوجوانوں نے "انجمن آزاد خیال مصنفین" کے نام سے ایک اور پلیٹ فارم مہیا کیا۔ اس کے اجلاس وائی ایم سی اے کی عمارت ہی میں منعقد ہونے لگے۔ عارف عبدالمتین ایک طرح اس کے روح رواں تھے۔ ہر چند اس جماعت نے اپنے لئے جو لائحہ عمل تیار کیا اور جس کا اعلان کیا بلکہ جس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کی وہ بہت حد تک انجمن ترقی پسند مصنفین سے مختلف تھا تاہم حکومت نے اسے بھی تخریبی کارروائیوں کا مرتکب ٹھہرایا اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی طرح اسے بھی غیر قانونی قرار دیا ——— اور یوں ہوتے ہوتے لاہور جماعتی لحاظ سے ان جماعتوں سے محروم ہو گیا جو ادب کو ایک خاص نقطۂ نظر سے پرکھنے اور اپنے خیال کے مطابق آگے بڑھانے میں کوشاں تھیں۔

اس انجمن کے ذریعے جس تحریک نے جنم لیا یا جس تحریک نے اس انجمن کو وجود بخشا اس نے اردو ادب کے لئے اتنی ہی اہم اور دور رس

ثابت ہوئی تھی، انجمن پنجاب ہوئی تھی —— اس تحریک نے ایک طرح اردو ادب کی کایا پلٹ کر دی۔ اگر یہ کہا جائے کہ انجمن پنجاب نے اپنا دائرۂ عمل محض شاعری تک محدود رکھا اور انجمن ترقی پسند مصنفین نے شاعری کے علاوہ افسانہ، تنقید اور دیگر اصناف ادب کو ایک ہی شدت کے ساتھ متاثر کیا۔ اس تحریک نے اردو کو بالکل نیا خون بخشا اور سب سے بڑا کام یہ کیا کہ ادیبوں اور شاعروں کو جماعتی شعور بالکل اسی نہج پر دیا جس پر کسی سیاسی اور سماجی جماعت کو حاصل ہوتا ہے۔ اگر اس کے ارباب حل و عقد جماعتی نقطۂ نظر کے سلسلے میں تنگ نظری کا ثبوت نہ دیتے اور ادیب و محرر میں تمیز نہ اٹھا دیتے تو ممکن ہے یہ روز بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

۹ اپریل ۱۹۳۹ء کی ایک شام میکلوڈ روڈ پر سید نصیر احمد شاہ (برادر خورد سید نذیر نیازی) کے مکان پر چند ادیب جمع ہوئے اور ایک مختصر سی ادبی جماعت کی بنیاد رکھی جس کا نام "بزم داستان گویاں" منظور کیا گیا اور طے پایا کہ ہر ہفتے اس کے اجلاس منعقد کئے جایا کریں جس میں افسانے پڑھے جائیں اور ان پر جدید مغربی تنقید کی روشنی میں تنقید کی جایا کرے —— اس جماعت کو قائم کرنے والے حفیظ ہوشیارپوری، شیر محمد اختر، تابش صدیقی، محمد افضل (مدیر تعمیر راولپنڈی) اور سید نصیر احمد تھے ..... طے پایا کہ اس بزم کا کوئی مستقل صدر نہ ہوگا صرف سیکرٹری ہوگا یا ایک مجلس انتظامیہ۔ ہر اتوار کو باری باری ہر رکن کے گھر پر اجلاس ہوا کرے گا —— چنانچہ پہلے جلسے میں نسیم حجازی نے اپنا ایک افسانہ تنقید کے لئے پیش کیا اور حفیظ ہوشیارپوری صدر ہوئے ---- اس بزم کا تیسرا جلسہ محلہ فاروق گنج میں تابش صدیقی کے مکان پر ہوا اور پھر اکثر جلسے مصری شاہ اور فاروق گنج کے علاقوں ہی میں ہوتے رہے۔ افسانے پڑھے جاتے، ان پر تنقید ہوتی اور آخر میں شاعر ارکان اپنا اپنا کلام سناتے —— ایک جلسے میں قیوم نظر آئے۔ اس سے اگلے جلسے میں ان کے ساتھ میراجی اور یوسف ظفر بھی تھے۔ یوسف ظفر نے دو چار جلسوں کے بعد ہی یہ تجویز پیش کی کہ افسانوں کی طرح شاعری پر بھی تنقید ہونی چاہئے۔ جب یہ تجویز منظور کر لی گئی تو پھر یہ مسئلہ بھی زیر غور آیا کہ اس جماعت کا نام بھی بدل دیا جائے چنانچہ اب اس "بزم داستان گویاں" کا نام "حلقۂ ارباب ذوق" رکھا گیا —— یہ اکتوبر ۱۹۳۹ء کی بات ہے ---- ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو حلقۂ ارباب ذوق کا پہلا اجلاس ایبٹ روڈ پر (نشاط سینما کے بالمقابل) منیر محمد اختر کے مکان پر منعقد ہوا —— اور حیرت انگیز حد تک کم وقت میں لاہور کے تمام شاعر و ادیب اس کے جلسوں میں شریک ہونے لگے۔ ابھی تک لاہور میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ باقاعدہ کام نہیں کر رہی تھی۔ ایک اور بڑا سبب مختلف عقائد و نظریات کے حامل ادیبوں و شاعروں کا ایک مرکز پر جمع ہو جانے کا یہ تھا کہ اس جماعت نے اپنا مسلک یہ متعین کیا تھا کہ ادب کو اول و آخر ادب ہونا چاہئے۔ نقطۂ نظر یا عقیدے سے بحث بے معنی بات ہے۔ زندگی متنوع عوامل و کیفیات سے عبارت ہے۔ ہر شخص اپنی جگہ ایک اکائی بھی ہے۔ ہر فنکار زندگی اور اس سے متعلقات کے سلسلے میں جو رویہ طے کرتا ہے وہ اس کے ذاتی عوامل اور ماحول کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اور یوں جو ادیب کوئی ادب پارہ تخلیق کرتا ہے وہ اس کی شخصیت کا مظہر ہوتا ہے۔ اور چونکہ ہر ادیب اپنے معاشرے سے متعلق ہوتا ہے لہٰذا اگر وہ ادیب ہے تو اس کے معاشرے کے تقاضے تو اس کی تخلیقات میں بغیر کسی کوشش کے در آ سکتے ہیں۔ قصہ مختصر اس جماعت کے زیر اہتمام جو اجلاس ہوتے ان میں تنقید کا محور ادب ہی ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف ان لوگوں نے جو اس جماعت سے اختلاف رکھتے بلکہ خود اس کے اکثر ارکان نے "ادب برائے ادب" کو اپنا ادبی نقطۂ نظر تسلیم کیا۔ مگر یہ نقطۂ نظر کو جو نام دیا گیا تھا وہ محض بات کو سمجھنے کے لئے تھا ورنہ عملاً ایسی کوئی صورت نہ تھی اور یہ جماعت کسی قسم کے لیبل کو اپنانے کے لئے تیار نہیں تھی —— اس جماعت نے بالواسطہ ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ ادب کو پرکھنے کے لئے ہر جدید زاویہ اختیار کیا۔ جدید نظم، جدید افسانہ اور جدید تنقید کو خالص ادبی یا لسانیاتی نقطۂ نظر

کی کسوٹی پر پورا اتارنے کی کوشش کی جانے لگی۔ اور بے شمار ایسے ادیب و شاعر اسی جماعت کے ہفتہ وار جلسوں کے ذریعے متعارف ہوئے جو آج مسلم رتبے کے حامل ہیں۔ اکثر نے یہیں لکھنا شروع کیا اور اکثر ایسے تھے جو لکھ تو رہے تھے مگر سامنے نہیں آ سکے تھے۔ ایسے بھی ملیں گے جو سامنے بھی آ چکے تھے مگر ان کے مقام کا پتہ نہ چلتا تھا۔ اس مرحلے پر ضروری ہو گیا ہے کہ میں ایک ایسے شاعر کا نام لوں جس کے بغیر حلقے کا صحیح تصور واضح نہیں ہوتا۔ وہ ہے میراجی ـــ میراجی ـ تصدق حسین خالد، ن۔ م۔ راشد اور فیض احمد فیض کے بعد آتے ہیں۔ مگر اس لحاظ سے ان کا مقابلہ شاید پوری جدید نسل میں کوئی بھی نہ کر سکے۔ کہ میراجی وہ واحد ادیب، نثر نگار اور نقاد ہیں جو مغرب و مشرق دونوں سے مکمل طور پر آگاہ تھے۔ ان کی نظر زیادہ دور تک دیکھ سکتی تھی۔ ان کے سینے کی آگ انہیں جس طرح بے تاب رکھتی تھی اور جتنے کام ان سے ہے چکی ہے اسے زمانے کی ناقدری اور دوستوں کے تغافل نے ٹھنڈا کر دیا ـــ میراجی گرد و غبار میں گم ہو گئے ہیں مگر زمانہ سدا ایک سا نہیں رہتا۔ میراجی نے حلقے کو جو راستہ دکھایا تھا اور حلقے کے ارکان میں ادب کی جو لگن پیدا کی تھی وہ سراسر غیر مادی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حلقے کے ارکان نے خواہ وہ حفیظ ہوشیارپوری ہوں یا تابش صدیقی۔ ن۔ م۔ راشد ہوں کہ ڈاکٹر تصدق حسین خالد قیوم نظر ہوں کہ یوسف ظفر۔ اور مختار صدیقی۔ سید عابد علی عابد ہوں کہ ناصر کاظمی۔ کنہیا لال کپور، راجندر سنگھ بیدی، اپندر ناتھ اشک ہوں کہ اعجاز حسین بٹالوی۔ انتظار حسین اور سید امجد حسین، شیر محمد اختر ہوں کہ ریاض یا دوسرے حضرات، کسی نے بھی کبھی یہ تقاضا نہیں کیا کہ انہیں ادب سے انفرادی یا اجتماعی کوئی فائدہ یا منفعت مقصود ہے۔ اس جماعت نے بارہا ایسی مالی پیش کش کو منظور کرنے سے انکار کر دیا جو مختلف اوقات میں مختلف سرکاری و غیر سرکاری اداروں کی طرف سے ہوئی۔ سال بھر کا خرچ اس کے ارکان آپس میں مل جل کر جمع کر لیتے ہیں۔ ایک مدت تک سال کے سال "بہترین نظمیں" کے نام سے جدید مزاج اور ہیئت کی نظمیں انتخاب کر کے شائع کی جاتی رہیں ـــ یہ سلسلہ اس وقت تک قائم رہا جب تک حلقے کے ارکان نے حلقے کو غزل سے محفوظ رکھنے کی کوشش جاری رکھی۔

ترقی پسند اور حلقہ ارباب ذوق کے ارکان اس حد تک ایک دوسرے کے ساتھ اتفاق رکھتے تھے کہ غزل کو اردو شاعری سے نکال باہر کیا جائے۔ اس کے لئے جو جواز پیش کئے جاتے تھے وہ مختلف تھے۔ ترقی پسند ایک تو اس قدیم تر اور مقبول ترین صنف کو جاگیردارانہ عہد کی پیداوار خیال کرتے تھے دوسرے ان کی تحریک ایک عوامی تحریک تھی، وہ ادب کو ایک قسم کے آدرش کی تبلیغ کا آلہ بناتا تھی۔ اس لئے غزل ان کے راستے میں حائل ہوتی تھی۔ یوں بھی اس تحریک کا ایک مقصد، جیسا کہ اوپر کہیں بیان کیا گیا ہے اپنی تاریخ اور روایت سے قطع تعلق کرنا تھا کہ یہ چیزیں ترقی کے راستے میں پتھر ہیں۔ حلقہ ارباب ذوق والے روایت کے صرف اس حد تک قائل تھے کہ اس کی روشنی میں اپنا سفر جاری رکھا جائے مگر روایت کو ساتھ لے کر چلنا ان کے نزدیک قدامت پرستی تھی۔ پھر ان کا خیال تھا کہ غزل کی ہیئت خیالی اور جذبے کے اظہار کے رستے میں رکاوٹ بنتی ہے ـــ اور یوں ان دونوں دبستانوں نے غزل کو گویا اکھیڑ پھینکا اور غزل ندامت کی ایک علامت بن کر رہ گئی جس کا دائرہ اثر کسی حد تک مشاعروں تک تھا اور آخر میں تو یہ نوبت آ گئی تھی کہ جگر مرادآبادی مرحوم جیسے مشاعرے پڑھنے والے اپنے لحن داؤدی اور عام جذباتی غزل کے باعث ان نئے شاعروں کے مقابلے میں مشاعروں سے بھی اکھڑ گئے۔ کم از کم لاہور اور پنجاب کے دوسرے شہروں میں تو یہی حال تھا۔ نظم لاہور کی ایجاد تھی۔ لاہور نے اسے پروان چڑھانے میں بڑا حصہ لیا۔

۱۹۴۷ء کے قیامت خیز حادثات نے پورے معاشرے کو، اور معاشرے کی تمام قدروں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ۔۔۔۔ جب معاشرے کا نظام درہم برہم ہو جائے اور اس کی قدریں متزلزل ہو جائیں تو پھر وہ ہنگامے وہ تعصبات کیسے قائم رہ سکتے تھے جو ان سے

مربوط تھے۔ اب یہ بحث موضوع سے دور چلی جائے گی کہ کن عوامل نے غزل کی تجدید کی مگر ہوا یوں کہ حلقے میں چند بالکل نوجوان غزل گو داخل ہو گئے —— جن کی آواز کچھ ایسی سہانی لگی کہ اکثر پرانے پرانے غزل دشمن اپنے اپنے مقامات کو چھوڑ کر خود غزل گوئی میں محو ہو گئے —— اور اب حلقہ ارباب ذوق کا دامن تمام اصنافِ شعر سے پُر ہو گیا ——

حلقہ ارباب ذوق اپنی عمر کے لحاظ سے اب بیس منزلیں طے کرنے کو ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس طویل مدت میں ایک اتوار بھی ایسی نہیں آئی کہ اس کا اجلاس منعقد نہ ہوا ہو۔ حالانکہ بعض بعض موقع ایسے آئے کہ گھر سے باہر قدم نکالنا جان کی بازی لگانا تھا۔ حلقے کو قدرت نے جو دیوانے عطا کئے ہیں: نہیں کے سر پہ حلقہ آج تک زندہ ہے اور کسی کا شرمندۂ احسان نہیں۔

جب حلقہ ارباب ذوق ایبٹ روڈ پر منتقل ہوا اور ہر خیال اور ہر نظریئے کا ادیب و شاعر اس میں جمع ہو گیا تو ان میں بعض حضرات ایسے بھی تھے جو اس نئے ادب کو ادب ماننے کے لئے تیار نہ تھے ...... یہ اختلاف اتنا بڑھ گیا کہ ایک دو جلسوں میں بدمزگی سی پیدا ہو گئی۔ نتیجے کے طور پر ان حضرات نے حلقے کو خیر باد کہا اور ایک نئی جماعت کی بنیاد رکھی جس کا نام "حلقہ ارباب علم" رکھا گیا۔ اس کے بانیوں میں مشہور ریاضی دان خواجہ دل محمد اور آغا بیدار بخت خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ بہت مدت تک ان کے ہفتہ وار اجلاس آغا بیدار بخت کے "دار العلوم السنہ شرقیہ" باغ بیرون دہلی دروازہ میں ہوتے رہے۔ پھر جب حلقہ ارباب ذوق مستقل طور سے وائی ایم سی اے کی عمارت میں منتقل ہو گیا تو کچھ مدت بعد حلقہ ارباب علم نے بھی اسی عمارت کے ایک کمرے میں اتوار کو اسی وقت پر اپنے جلسے کرنے شروع کئے جس پر ارباب ذوق کے جلسے ہوتے تھے۔ پروگراموں کی نوعیت بھی وہی ہوتی جو ارباب ذوق کے پروگراموں کی ہوتی تھی۔ مگر شاید اس سبب سے کہ اس جماعت کو نیا، زندہ اور حقیقی خون نہیں ملا تھا چند برس بعد ختم ہو گئی اور اپنے پیچھے اپنا کوئی نقشِ قدم نہ چھوڑا۔

ان جماعتوں کے علاوہ جن کا ذکر حتی المقدور اختصار کے ساتھ کیا گیا ہے بے شمار جماعتیں وجود میں آتی رہیں لیکن چونکہ ان کے سامنے کوئی مقصد نہ ہوتا تھا اس لئے زیادہ عمر یا نام پائے بغیر مرتی چلی گئیں ...... ایسی جماعتیں کسی لحاظ سے بھی قابلِ اعتنا نہیں ہوتیں۔

مصوّری اور مصوّر

سیّد عابد علی عابد

شیر شاہ سوری نے جب ہمایوں کو شکست دی تو اس کے سیاسی نتائج اہم ہوں یا نہ ہوں لیکن اس واقعہ سے مربوط ثقافتی کوائف کی اہمیت کا یہ مقام ہے کہ تاریخ اسے فراموش نہیں کر سکتی۔ ہوا یہ کہ ہمایوں شکست کھا کر ایران پہنچا اور صفویوں سے مدد کا طالب ہوا تو انھوں نے مہمان کی پذیرائی کی بلکہ ایرانی ثقافت کے حسن و جمال کے کچھ نشان بھی واپسی کے وقت ہمایوں کے ساتھ کر دیئے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ صفوی عہد میں مصوّری جسے ایرانی نقاشی کہتے ہیں اپنے نقطۂ عروج پر تھی چنانچہ بہزاد جیسا مصوّر صفویوں ہی کے دربار سے منسلک تھا۔ یوں بھی یورش تاتار کے بعد ایرانی مصوّری میں مختلف دبستانوں کی آمیزش ہو گئی تھی، قراقرم، کاشغر اور چین سے لے کر ہندستان کی سرحد تک منگولوں کا جھنڈا لہراتا تھا اور مختلف ممالک کے مصوّر اپنی اپنی صنعت گری سے ایک دوسرے کو متاثر کرتے تھے چین کے خطوط کی نزاکت اور باریکی، ایران کی دلپذیر رنگ آمیزی اور تفصیل نگاری مانوی و لبنان کے نقاشوں کی تذہیب یہ تمام چیزیں اس طرح گھل مل گئی تھیں کہ بہزاد کی مصوّری ان اجزا سے مرکب بھی تھی اور منفرد بھی تھی۔ نقادوں کی رائے کے مطابق بہزاد نے مصوّری کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ اس نے مختلف رنگوں کی آمیزش، خطوط کی نفاست، افراد تصویر کے جذبات کے اظہار میں ایسی ہنرمندی اور چابکدستی سے کام لیا کہ وہ اب تک عدیم النظیر مصوّر تسلیم کیا جاتا ہے اور مانی کے ساتھ اس کا نام لیا جاتا ہے جو دراصل مصوّر نہیں تھا بلکہ ایران کا پیغمبر تھا۔ اس کی تصانیف کو نقوش سے آراستہ کرتے تھے اور یوں بھی اپنی نقاشی کے جوہر دکھاتے تھے، چنانچہ تورخان میں جو کھدائی ہوئی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ مانی کے معتقد مصوّر دیواری تصویریں بھی بناتے تھے (جس طرح اجنتا کی تصویریں) انھیں اصطلاح میں فرسکو (FRESCO) کہا جاتا ہے آرنلڈ کا خیال ہے (اسلام اور مصوّری[1]) کہ تذہیب یا سنہری کام جو صفویوں کے عہد میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے، مانوی نقاشوں کی ہنرمندی کا مرہون منت ہے۔ بالفاظ دیگر جو تحریک ایران قدیم میں نہ پنپ سکی وہ بیرون ایران میں پھلی پھولی اور پھر یورش تاتار کے بعد مختلف دبستانوں کے تال میل کے سلسلے میں ایرانی روایات نقاشی کا ایک اہم جزو بن گئی۔

میں عرض کر رہا تھا کہ جب ہمایوں ایران سے لوٹا تو وہ ایرانی مصوّر بھی ساتھ لایا جو ایران کے تمام دبستان ہائے مصوّری کے دقائق و رموز پر مطلع تھے۔ خود ہمایوں کو فنون لطیفہ سے شغف تھا لیکن موت نے اسے اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اس طرف پوری توجہ صرف کر سکتا

---

[1] PAINTING IN ISLAM.

تاہم اس کے عہد ہی میں ایران کے مہاجر مصوروں نے اس برصغیر کی مقامی مصوری کی روایات سے آگاہی حاصل کر لی۔ وہاں جب اکبر مسند آرائے جاہ و جلال ہوا تو اسے مصوروں کی تربیت کا موقع بھی ملا اور فرصت بھی۔ یہاں تک کہ مہابھارت اور رامائن کے مصور نسخے بھی تیار کئے گئے۔ شاہنامہ اور پنج گنج نظامی کے واقعات بھی تصویر کے روپ میں جلوہ افروز ہوئے جو اکبر اور جہانگیر کے عہد کی یادگار ہیں۔ یہ ان خانوں اور کتب خانوں کی زینت ہے۔

جہانگیر خود نہ صرف مصوری سے شغف رکھتا تھا بلکہ اس فن کے رموز سے اس حد تک باخبر تھا کہ مصوروں کی تخلیقات میں امتیاز کر لیتا تھا۔ اس کے عہد میں بلکہ اکبر ہی کے عہد میں راجپوت دبستان مصوری کی روایات کا ادغام ایرانی مصوری سے یوں ہوا کہ وہ دبستان وجود میں آیا جسے "مغلوں کا دبستان مصوری" بھی کہتے ہیں۔ اس دبستان میں درباری زندگی کے مرقعے بھی ہیں۔ افراد کی تصاویر یا (PORTRAITS) بھی ہیں۔ مختلف جانوروں کے پیکر بھی نہایت فن کاری سے پیش کئے گئے ہیں۔ آبشار، کہسار، طلوع بہار کے دلکش مناظر بھی ہیں۔ مختصر یہ کہ عام لوگوں کی زندگی کے سوا ہر چیز ملتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصوری دربار اور اس کے لوازمات سے مربوط تھی۔ عوام کی زندگی سے اسے دور کا بھی واسطہ نہ تھا اور یہ انقطاع ایسا کامل تھا کہ اس دبستان کی مصوری کے نمونے دیکھ کر بالکل یہ اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ لوگ کس طرح رہتے سہتے تھے اور عوامی زندگی کے مد و جزر کی کیا کیفیت تھی۔

مغلوں کے دبستان مصوری میں تہذیب یعنی منہری کام کا پس منظر، ملبوسات کی وضع قطع (اکثر افراد کے نقوش میں صاحب تصویر کے ہاتھ میں پھول یا گلدستہ ہوتا تھا) جزئیات کی نمائش یعنی تفصیل نگاری، رنگوں کی آمیزش، خطوط کی نزاکت اور دھوپ چھاؤں کی پُر اسرار کیفیت ایسی تھی کہ اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

جب مغلوں کا اقتدار گھٹنے لگا تو راجپوتوں کا دبستان مصوری اور کانگڑہ دبستان کا عہد صحیح معنی میں شروع ہوا۔ ظاہر ہے کہ راجپوت مصوری اور کانگڑہ دبستان میں بیشتر مناظر ہندو مذہب خاص طور پر رادھا اور کرشن کی زندگی کے واقعات اور متعلقہ باتوں سے مخصوص تھے۔ رنگ آمیزی مغلوں کے دبستان کی طرح کامل نہ تھی۔ البتہ راگ راگنیوں کی صورت کشی میں کانگڑہ دبستان کے مصوروں کو کمال حاصل تھا۔ لاہور کے عجائب گھر میں مغلوں کی مصوری، راجپوت اور کانگڑہ دبستان کی مصوری کے بہت اچھے نمونے ملتے ہیں۔ ایک تصویر کے متعلق یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ بہزاد کی ہے کہ اس کے دستخط سے مزین ہے۔ اس پر بعض نقادوں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ بہزاد کچھ تو اپنا نام اس طرح بطریق رمز مخفی رکھتا تھا کہ جب تک پہلے ہی یہ یقین نہ ہو کہ یہ بہزاد کی ہے اس کا نام پڑھا نہیں جا سکتا تھا۔ کانگڑہ دبستان میں جو راگ راگنیوں کی تصویریں مقبول تھیں ان کے کچھ بہت اچھے نمونے لاہور کے عجائب گھر میں موجود ہیں۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں ان نمونوں میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ ہندوستانی ناظروں کے خیال میں کسی راگ یا راگنی کی کیا شکل ہوتی تھی جو مغنی کے پیش نظر رہتی تھی۔ مراد یہ ہے کہ مغنی گاتے وقت وہ کیفیت پیدا کرنی چاہتا تھا جو بصری صورت میں کانگڑہ دبستان میں نظر آتی ہے۔ ان نمونوں میں لکھ دیئے ایک مالا لے کر نازنین تخت مسند اور نوانا شہزادے (راجپوت) کو شکیں قصر شاہی کے مختلف حصے، حسین کنیزوں کے جھرمٹ بڑی خوبی سے دکھائے جاتے تھے۔ مغرب کے نقاد ان نمونوں کو مصوری کی غنائی صورت کہتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ جس طرح اصناف شعر میں غزل اور گیت خاص لحن اور لہجہ رکھتے ہیں اسی طرح تصاویر میں بھی مختلف راگ راگنیوں کے بہ روپ ایک خاص مزاج رکھتے ہیں جسے نقاد غنائی یا (LYRICAL) کہتے ہیں۔ ان تصاویر میں نشاط و انبساط بھی ہے اور درد و اندوہ بھی لیکن خالصتاً بعض راگنیوں کے روپ میں نشاط و اندوہ اس طرح مل گئے ہیں جس طرح دھوپ چھاؤں کی آمیزش ہو۔

بنا بریں کانگڑہ دبستان بھی رو بہ انحطاط ہوا۔ لکھنؤ کے نوابی عہد میں مصوروں سے نقاشی کا جو کمال دکھایا اسے لکھنؤ قلم کہتے ہیں۔

یہ تلم بھی دراصل مغلوں کے زوال پذیر دبستاں کے باقیات میں سے ہے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد مصوری دربار سے اس طرح منقطع ہوگئی جس طرح پہلے عوام سے تھی۔ نتیجۃً ایسے مصور پیدا ہوئے جو اپنی مصوری کو عوام کے مزاج کے سانچے میں ڈھالتے تھے، گھونگھٹ پر پانی بھرتی سکھیاں اور ان کے خطوط بدن کا اظہار اور اس طرح کی تصاویر جن میں جنس ایک عنصر امتیازی کی طرح موجود ہو، فروغ پانے لگیں یعنی مصوری کا رشتہ براہ راست عوام سے قائم ہوگیا۔ موسیقی میں بتدریج دھرپد، خیال اور ٹھمری سے گزرتے ہوئے آخر مغنی مذاق عام کے مطابق ہوری، کجری اور رسا دلی تک پہنچے۔ اسی طرح مصور بھی درباری مرقعوں اور امرا کی محفلوں سے گزر کر اس سطح پر پہنچے جہاں عوام عکاسی کی سی ادا کو پسند کرتے تھے (فوٹو گرافک ریپریزنٹیشن) اس زوال پذیر عہد میں مصوروں نے نہ تو اپنا رُخ ایران کی طرف رکھا کہ بہزاد کی روایات قائم رہیں نہ اجنتا کی دیواری تصاویر کو ملحوظ خاطر رکھا جن میں اگرچہ صنف نازک کے بدن کے خطوط کی نمائش کی گئی ہے لیکن اس کے باوجود کوئی واقعہ، کوئی جذبہ یا کوئی خاص کیفیت مدنظر رہی ہے۔ اور خطوط بدن کی نمائش کی حیثیت ثانوی رہی۔ بقول شخصے اجنتا میں عورت سر تا پا پاؤں پر حنا کی لکیر سے لے کر آنکھوں میں سرمہ کی تحریر تک جمعیت مند عورت ہے جس کے بدن سے جوانی اور جنس شعلوں کی طرح لپکتے ہیں تاہم یہ عورتیں خود موضوع نقاشی نہیں بلکہ کسی واقعے یا کسی خاص کیفیت سے مربوط افراد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ علاوہ ازیں جو نمونہ یا ٹائپ عورتوں کے حسن و جمال کا اجنتا کی دیواری تصاویر میں پیش کیا گیا ہے اس کی جڑیں اس خطے میں پیوست ہیں جہاں اجنتا کی غاریں واقع ہیں اور آج بھی بمبئی، پونا، گجرات اور نواح میں وہ عورتیں دیکھی جاسکتی ہیں جن کے بدن کا لوچ، جن کے حسن کا گداز، جن کی آنکھوں کی سرشاری جن کی جنسی بے قراری اور بے اختیاری، جن کی افسردگی اور سپردگی ہم اجنتا میں دیکھتے ہیں۔

علامہ اقبال مرحوم نے فنون لطیفہ غلاماں سے بحث کرتے ہوئے مصوری کے زوال پذیر موضوعات کا ذکر کیا ہے۔ یہ وہ تصاویر ہیں جو عوام کی ذہنیت اور مذاق کے مطابق بنائی گئی ہیں مثلاً

کودکے بر گردن بابائے پیر

بنگال میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد مصوری نے ذرا پہلو بدلا اور انیسویں صدی کے اواخر میں رابندر ناتھ ٹیگور جیسا ذہین شخص بھی اپنے کوائف ذہنی کو رنگ و خطوط میں منتقل کرنے لگا (جس طرح چرچل نے اواخر عمر میں مصوری کی طرف توجہ کی)

مغلوں کے دربار سے جو مصور منسلک تھے ان میں سے کچھ بہت ممتاز مصور لاہور کے بھی تھے، صرف یہی نہیں بلکہ فن تعمیر میں بھی لاہور کے مصوروں، نقاشوں، مہندسوں اور معماروں نے ایسے کارنامے دکھائے کہ آج تک ہکسلے کی مذمت کے باوجود دنیا انگشت بدنداں ہے[1] استاد احمد لاہوری کے خاندان نے تاج کی تعمیر اور تزئین میں جو حصہ لیا اس سے ارباب علم و ذوق ناواقف نہیں، چنانچہ علامہ سید سلیمان ندوی اور ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے اس کا بہ تفصیل ذکر کیا ہے[2] بہر حال انیسویں صدی کے اواخر میں مصوری کی یہ کیفیت ہوئی کہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اب یہ فن نااہلوں کے ہاتھ میں چلا گیا ہے اور اب پنپ نہ سکے گا کہ لاہور میں اس شخص نے اپنی زندگی بسر کرنی شروع کی جسے آج ہم عبدالرحمٰن چغتائی کے نام سے پہچانتے ہیں۔ اس کی مصوری پر تفصیلی انتقاد کے لیے واقعاً ایک کتاب درکار ہے۔ میں محض اشارات سے کام لے کر اس کے فن

---

[1] دیکھئے جیسٹنگ پائیلٹ تالیف آلڈوس ہکسلے جو کہتا ہے کہ تاج کی شہرت کا کوئی فنی جواز نہیں اور یونہی اس عمارت کو بے بدل قرار دیا گیا ہے۔

[2] ادارۂ معارف اسلامیہ کے جلسوں کی روئداد شائع ہو چکی ہے اس میں لاہوری نقاشوں اور معماروں کا ذکر بھی موجود ہے۔

کے کچھ پہلوؤں سے تعرض کرتا ہوں۔ ابتدا میں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ چغتائی نے جب غالب کا مصور نسخہ شائع کیا تو علامہ اقبال نے اسے عصر حاضر کا وہ انقلاب آفریں مصور قرار دیا جو ان دیکھی دنیاؤں کے چہروں سے پردے اٹھاتا ہے جو فطرت اور اس کے مصالح کو بہ جبر و قہر مسخر کر کے اپنے افکار، تعقلات اور تصورات کو تصاویر کے سانچوں میں یوں ڈھالتا ہے کہ وہ دنیا جو اس کے ذہن میں موجود تھی خارجاً متشکل ہو جاتی ہے۔ اس کی رنگ آمیزی ایرانی مصوروں کی بہترین رنگ آمیزی کی یاد دلاتی ہے۔ تفصیلات اور جزئیات کے احصا میں وہ ایسی جانفشانی سے کام لیتا ہے کہ آنچل کی ہر شکن میں سینکڑوں خطوط موجود نظر آتے ہیں۔ افراد کی تصویر کشی میں وہ رمز اور علامت سے کام لیتا ہے۔ اس کے ہاں عکاسی کی طرح یہ کمال نہیں کہ چیز جیسے ہے ویسے نظر آئے اس کا منصب یہ ہے کہ یا تو وہ چیز کو اس طرح پیش کرے جیسے وہ اسے نظر آتی ہے یا جیسے اسے اپنے تمام امکانات کے ارتقا کے بعد ہونا چاہیے۔ بالفاظ دیگر وہ جسم و جان اور روح و ذہن کے امکانات کو پیش نظر رکھتا ہے اور اس ارتقا یافتہ دنیا کی تصویر پیش کرتا ہے جو خارجاً موجود نہیں لیکن جو اس کے ذہن میں آباد ہے اور جسے موجود ہونا چاہیے۔ کم نظروں کے یہ اعتراضات کہ عورت کی آنکھ ایسی نہیں ہوتی یا مرد کا ہاتھ ایسا نہیں ہوتا یا تناظر و تناسب کی یہ صورت صحیح نہیں ناواقفیت پر مبنی ہیں جس طرح غزل گو شاعر رموز و علائم سے کام لیتا ہے کہ بغایت اختصار اپنا مطلب بہ صحت تمام ادا کر سکے اسی طرح چغتائی بھی غیر ضروری تفصیلات کو نظر انداز کر کے علائم و رموز سے کام لے کر اپنا مفہوم دیکھنے والے تک یوں پہنچاتا ہے کہ ابلاغ و اظہار کامل ہو جاتا ہے۔ اس کے خطوط میں چینی مصوروں کی سی نفاست و نزاکت ہے۔ تناظر میں وہ مغرب کے مسلک کا پابند نہیں۔ مغلوں کے مسلک تناظر سے بھی کام لیتا ہے۔ پس منظر میں کبھی وہ چیزیں دکھاتا ہے جو اصل موضوع سے مطابقت رکھتی ہیں کہ اسے اصطلاح میں توافق کہتے ہیں۔ بعض اوقات پس منظر اصل موضوع کی ضد ہوتا ہے کہ جس کیفیت کی تصویر کشی مقصود ہے وہ زیادہ نمایاں ہو جائے۔ اسے اصطلاح میں تقابل کہتے ہیں۔ صرف یہی نہیں وہ اشعار کی ذہنی کیفیت کو بصری کیفیت میں اس طرح منتقل کرتا ہے کہ تاثیر بالکل شعر کا سا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر غالب کا شعر ؂

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اس کی تصویر کشی یوں کی گئی ہے کہ دریا میں یا سمندر میں ایک چراغ بہا چلا جا رہا ہے۔ ہوا کا ہر جھونکا اسے گل کر سکتا ہے اور پانی کی ہر لہر اسے ڈبو سکتی ہے۔ لیکن ان مزاحمتوں کے باوجود انسان خلیفۃ الارض ہے۔ جد و جہد حیات میں مصروف رہتا ہے اور کام کرنے میں اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ

موت کا ایک دن معین ہے

اور وہ کوئی دن ہو سکتا ہے۔ اس تصویر کی رنگ آمیزی اور اس کی علامتی اہمیت اتنی خوبصورت اور نمایاں ہے کہ عامی کو بھی جزواً اس کا مفہوم سمجھا دیا جائے تو وہ اس کے بہت سے اشارات کا احاطہ کر سکتا ہے۔ باقی رہے اہل نظر اور اہل ذوق تو وہ پہچان لیتے ہیں کہ علامتوں کا مجموعی مفہوم کیا ہے۔ شاید انیس کا یہ شعر بھی چغتائی کے ذہن میں پر فشاں ہو۔

؂ انیسؔ دم کا بھروسا نہیں ٹھہر جاؤ — چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

تو یہ تصویر دیکھ کر ذہن کئی اور اشعار کی طرف منتقل ہوتا ہے اور کئی چیزوں کا اسے ایسا شعور ہوتا ہے جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا بحر کی

بے ثباتی، کاوش ہائے انسانی کی بے ثمری سے مربوط خیالات ذہن میں آتے ہیں اور مختلف خیالات کا ایک سلسلہ افق ذہن پر ابھرنے لگتا ہے مثلاً ؎

کیا اعتبار زندگی مستعار کا
چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

صرف یہی نہیں بلکہ چراغ اور روشنی کے متعلق بھی مختلف المعانی شعر یاد آنے لگتے ہیں، مثلاً ؎

وہ آئے بزم میں اتنا تو سب نے دیکھا میرؔ
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

یہی فنون لطیفہ کا کمال ہے کہ فن کار علامتوں سے کام لے کر ایسے راستے کھولتا ہے۔ ایسی دنیائیں دکھاتا ہے۔ ایسے معانی کی طرف انگلی اٹھاتا ہے۔ ایسے مطالب کو ابھارتا ہے جو بظاہر اس کی تخلیق سے متبادر نہیں ہوتے۔ فن کا یہ کمال اصطلاح میں خیال آفرینی یا (SUGGESTION) کہلاتا ہے۔ آج کل چغتائی اقبال کا کلام مصور کر رہے ہیں۔ یہ کام پورا ہو گیا اور خدا کرے پورا ہو جائے تو بڑا کام ہو گا۔ در اصل یہ نزول برکات اور صدور حسنات ہے کہ ہم میں چغتائی جیسا فن کار موجود ہے جسے مغرب کے نقاد بھی چوٹی کا مصور تسلیم کرتے ہیں اور جن کی تصاویر کی نمائش یورپ کے بڑے بڑے شہروں میں ہو چکی ہے۔

لاہور ہی میں استاد اللہ بخش نے فنی تربیت حاصل کی جن کے نقوش و خطوط میں دیہات کا دل دھڑکتا ہے ان کے فن کی جڑیں اس خطے میں پیوست ہیں جس میں انھوں نے پرورش پائی۔ مغربی پاکستان کے صحت مند اور توانا دیہاتی جفاکش اور خوبصورت عورتیں، کھلنڈرے بچے۔ ناچ گِدھا۔ مختصر یہ کہ دیہات کی زندگی کا روپ، سروپ اور سوگ بروگ سب ان کی تصاویر میں ملتا ہے۔ اس خطے کی زندگی اصلاً دیہات کی زندگی ہے اور استاد اللہ بخش خوشۂ گندم سے لے کر رہٹ تک اور رہٹ کے بیلوں سے لے کر دیہاتیوں کے میلوں ٹھیلوں تک اس زندگی کے ہر پہلو کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ ان کے ہاں تجرید کم ہے۔ عکاسی کا عنصر زیادہ ہے۔ لیکن مصوری کی یہ شاخ بھی جس میں مناظر عکس کی طرح دکھائے جاتے ہوں نہ بھی چاہیے

تاکہ نقاشی محض خطوط کا امتیاز اور خود ساختہ علائم کی ترکیب پر مشتمل ہو کر نہ رہ جائے۔

جو مصوّر مغرب کی جدید تحریکات سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں ان میں شمزہ، زوبی، شاکر علی، حنیف رامے، مولکا احمد زیادہ نمایاں ہیں۔ حنیف رامے نے طلسم ہوشربا کے خلاصے کو مصوّر کیا ہے اور اس حیرت انگیز دنیا کی فضا قائم کی ہے جس کے کوائف طلسم ہوشربا میں بیان کیے گئے ہیں۔ ان تصاویر میں وہ بے حد کفایت شعاری سے کام لیتے ہیں۔ کم سے کم خطوط کا استعمال کرتے ہیں اور جزئیات سے قطع نظر کر کے ان بنیادی کوائف کو سامنے لاتے ہیں جن سے مطلوبہ تاثر خیال افروزی کے ذریعے پیدا ہو تاکہ وہ محض خطوط کی ترکیب و ترتیب سے بھی کام لیتے ہیں جن کی وضع ہندسی ہوتی ہے (ریاضیاتی اشکال سے مشابہ ہوتی ہے) ان سے بہت سی توقعات وابستہ ہیں اور امید کامل ہے کہ وہ اپنے علم کو فن میں استعمال کر کے جدید وضع کی مصوّری کو نیا رنگ بخشیں گے۔

زوبی اور شاکر علی بھی جدید تحریکات سے بہت متاثر ہیں۔ ان کی تجریدی وضع کے نقوش میں علائم و رموز کا ایک خزانہ مخفی ہوتا ہے۔ زوبی تمام غیر ضروری تفصیلات سے قطع نظر کر کے صرف وہ خطوط استعمال کرتا ہے جن سے موضوع تصویر کی طرف اشارہ ہو جائے۔ رنگوں کی شوخی، دھیمے پن اور گہرائی سے وہ بہت اثر آفریں کام لیتا ہے۔ شاکر علی کے ہاں بھی یہی کیفیت ہے۔ وہ بھی صرف مصوّر ہی نہیں بلکہ اپنے فن کے تمام نظریات سے آگاہی بھی رکھتے ہیں اور ان کا شعور ان کے ہر نقش سے نمایاں ہوتا ہے۔ وہ اس وقت شاگردوں کی تربیت میں مصروف ہیں اور ان سے فیض اٹھانے والے آخر کار پاکستان میں مصوّری کا احیاء کریں گے۔

شمزہ بھی نوجوان مصوّروں میں اپنی سوجھ بوجھ کی وجہ سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ ان کی ترکیب و ترتیب (COMPOSITION) میں بھی وہ خاص صفت ہوتی ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مصوّر اپنے فن پر پوری قدرت نہیں رکھتا اور نقالی ہی نہیں کر رہا بلکہ اپنے بلبوتے سے ایک نئی دنیا ابھار رہا ہے۔ ان کی تصاویر میں ایک اپج (ORIGINALITY) ہوتی ہے جو انہی سے خاص ہے۔

مولکا احمد بھی فن مصوّری کی معلمہ ہیں۔ انھیں مغرب کی تمام تحریکات سے کاملاً آگاہی حاصل ہے اور وہ ہر دبستان کے رموز سے واقف ہیں۔ اس لیے ان کی تصاویر میں بڑا تنوع اور اختلاف پایا جاتا ہے۔ وہ ایک مسلک کی پابند نہیں اپنے موڈ کے مطابق ہر دبستان کے اصول کے مطابق تصویر بنا سکتی ہیں۔

ان جدید تحریکات سے متاثر حضرات کے علاوہ لاہور میں ایسے مصوّر بھی تھے جو مسجد وزیر خاں کے نقش و نگار، پچی کاری اور تزئین (ARABESQUE) کی نقل اتارنے میں مہارت تام رکھتے تھے۔ میو سکول آف آرٹس کے طالب علم در و بام اور سقف و محراب کے نقش و نگار کی وضع قطع دیکھنے کے لیے یہاں آتے تھے، مصوّری کی مشق کرتے تھے اور ان استادوں سے فیض حاصل کرتے تھے۔ خط طامزین کی ترتیب میں ایک خالص اسلامی فن ہے جیسا کہ اس کا نام ظاہر کرتا ہے۔ یہ لوگ اپنے سب معاصروں پر سبقت رکھتے تھے۔ مجھے عبداللہ قریشی کی زبانی معلوم ہوا کہ ان لوگوں کے دبستان کے آخری نمائندے حاجی میاں محمد حیات ہیں جو اب تک مسجد ہی میں مقیم ہیں۔ بابا میراں بخش اور حاجی فیروز الدین بھی اسی دبستان سے تعلق رکھتے تھے۔ رفع اشتباہ کی خاطر یہ کہنا ضروری ہے کہ قدیم دبستان کے پیرو جو عکاسی کے قریب رہتے تھے ان میں ایک یہی فیروز الدین اور بھی تھے جو لکھنؤ کے لیے تصویریں بناتے تھے اور نہایت باریک کام کرتے تھے۔ تیسرے ماسٹر فیروز الدین تھے جو میو سکول آف آرٹس کے وائس پرنسپل تھے۔

عورتوں میں رضیہ فیروز الدین یقیناً لاہور ہی سے متعلق ہیں البتہ زبیدہ آغا کے متعلق یہ کہنا دشوار ہے کہ ان کی فنی تربیت لاہور میں

ہوئی یا کراچی میں۔ ان کی تصاویر میں ایسی زندگی، توانائی اور حرکت ہے جو کم مصوروں کی نقاشی میں نظر آتی ہے۔

الحمرا میں پرانے اور نئے مصوروں (پاکستانی) کی تصاویر کی نمائشیں بھی ہوتی ہیں اور مغربی مصوروں کی تصاویر بھی نظر آتی ہیں۔ اس طرح پاکستانی مصوروں کو دوسرے ملکوں کے جدید ترین مسالک نقاشی سے آگاہی حاصل ہوتی رہتی ہے۔ یہ مفید کام جاری رہے گا۔ ہمارے نوجوان مصوّر ان دیکھی دنیاؤں کی طرف رواں رہیں گے۔ کاروانِ حیات رو بہ سفر رہے گا اور میں وثوق سے یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ لاہور کے مصوّر پاکستان میں وہی مقام حاصل کریں گے جو یہاں کے ادیبوں، دانشوروں اور انشا پردازوں نے کیا ہے۔

لاہور وہ محیطِ فیض ہے جہاں ہر وقت فن کار حُسن کی تخلیق اور جمال کی تزئین میں مصروف اور محو کار نظر آتے ہیں۔ خدا ہمارے مصوروں کو وہ موقلم عطا کرے اور اس تخیل و تصور کی نعمت بخشے جن سے کام لے کر اس سے پہلے مصوروں نے ثقافت کی دنیا میں اپنے وطن کا نام بلند کر دیا ہے۔

لاہور

اس عنوان کے تحت بہت سی چیزیں (نظم بھی نثر بھی) اکٹھی کر دی گئی ہیں
تاکہ لاہور کے بارے میں ایک مجموعی سا تاثر سامنے آ جائے۔

قلمکار

حفیظ جالندھری
رشید احمد صدیقی
شوکت تھانوی
خواجہ احمد عباس
راجہ مہدی علی خاں
شیخ عبدالشکور
ڈاکٹر صفدر حسین
جسٹس کیانی
نیاز فتحپوری
شاہد احمد دہلوی
احسان دانش
نصیر انور
مصطفٰے زیدی
ہوش ترمذی

وہی لاہور ——— !

ابوالاثر حفیظ جالندھری

وہی لاہور ہے۔ وہی در و بام — وہی ہنگامۂ خواص و عوام

زلزلے۔ آگ۔ آندھیاں۔ سیلاب — لائے تشریف چل دیئے ناکام

عارضی سی شکست و ریخت کے ساتھ — چل رہا ہے وہی قدیم نظام

شجر و شاخ ہے کہ برگ و ثمر — اپنے معمول پر ہیں پختہ و خام

ہاں ادب کی ترقیٔ معکوس — اور بھی ہو گئی ہے تیز خرام

جلوتِ حسنِ فن و شعر و سخن — اب نہ خلوت میں ہے نہ برسرِ عام

موت دارو ہے جب سے فکر فروش — بن کے بیٹھے ہیں ناقدانِ کرام

علم شئے پر ہے جہلِ شئے غالب — ہر اناڑی ہے اپنے فن کا اِمام

اب نہیں ربط حرف و معنی میں — خبط سمجھا گیا وہ حسنِ کلام

اب لطافت ہے قہقہوں کی ہدف — اب کثافت کا ہے ثقافت نام

اب ٹھمکنے سے داد ملتی ہے — اب ٹھمکیے ہیں واجب الاکرام

اب مدارس میں رقص کی تعلیم — بن رہی ہے روایتِ اسلام

خامیاں پختہ ہوتی جاتی ہیں — دیرپا بنتے جاتے ہیں اَسقام

صورتوں پر جما لیا ہے رنگ — رہبروں کا سرا بسا ہے قوام

جو بھی ہاتھ آئے وہ حلال حلال — جس پہ قابو نہ ہو حرام حرام

فرش کو عرش کی نہیں پروا — پستیاں ہیں بہت بلند مقام

بہرِ تخریب پھر وہی تعمیر — خودکشی کی طرف نیا اقدام

گھٹ رہی ہے تسلیٔ محکوم — بڑھ رہی ہے تعلّیٔ حکّام

شور و ہنگامہ نفسی نفسی کا — زندگی ہے تو زندگی کو سلام!

وہی لاہور ہے وہی در و بام
وہی ہنگامۂ خواص و عوام

میرا لاہور

بچیف جسٹس محمد رستم کیانی

محمد طفیل نے تو کہا تھا، کہ اپنے لاہور کا نہ سہی، اُن کے لاہور کے متعلق کچھ لکھوں۔ مگر ایسے طفیلی لاہور کو لے کر آپ کیا کریں گے۔ اور، اس کو چھوڑ کر، مجھے یہ بھی تو معلوم نہیں، کہ وہ کس کس گلی میں، یا کس کی گلی میں پھرتے رہے ہیں۔ اپنی گلیاں تو ہر ایک کو معلوم ہوتی ہیں، اور یہ ضروری نہیں، کہ ساری گلیاں سب کو دکھائی جائیں۔ غالباً یہی لاہور کا شہر تھا جس کی کسی گلی میں قدرت اللہ شہاب کے برہنہ سر کو کسی نے اُوپر کی منزل سے دیکھ کر، اُگالدان سمجھ لیا تھا۔

پھر جب سوچنے لگا، کہ کیا لکھوں، تو کوئی اچھی بات ذہن میں نہ آئی۔ خیالات پراگندہ ہونے لگے۔ اس لیے میں نے ارادہ کیا، کہ دو رکعت نفل پڑھوں۔ کیونکہ نماز میں نماز کے مضمون کے علاوہ دل کی ساری کھوئی ہوئی باتیں واپس آجاتی ہیں۔ بہت سے مضمون دماغ میں آئے۔ یہ غلطی کی، کہ نماز نہیں توڑی۔ نماز کے بعد سب کچھ بھول گیا۔ البتہ یہ فائدہ ہوا، کہ شاہی مسجد اور وزیر خاں کی مسجد یاد آئیں۔ میں نے خود تو ان میں نماز نہیں پڑھی، مگر عید کے اگلے دن اخباروں میں شاہی مسجد سے لوگ نکلتے نظر آتے ہیں، اور ایک سال تو آٹھ دس نمازی لوگوں کے ہجوم میں کچل کر مر بھی گئے تھے۔ ویسے نماز کے لیے سیدھی صف بنا کر کھڑے ہوتے ہیں، لیکن جب باہر نکلتے ہیں، تو اس ترتیب کو جو نماز سکھاتی ہے، مسجد میں چھوڑ کر نکلتے ہیں۔ کچھ تو قصور ان گورنروں کا بھی ہے، جو عید کے دن لوگوں سے بغلگیری کا ووٹ لینا چاہتے ہیں۔ اور اُس وقت لوگ اظہارِ عقیدت میں کسی اور کو نہیں دیکھتے۔ کوئی اور ان کو نظر ہی نہیں آتا۔ اور پھر تین دفعہ بغلگیر ہوتے ہیں، پہلے سر دائیں طرف نکالتے ہیں۔ پھر بائیں طرف۔ اور تیسری دفعہ ناک کا ناک سے تصادم ہوتا ہے۔ ایک دفعہ کوئی شخص جنرل اعظم کو ملنے گیا، اور کہا کہ آپ بھول گئے ہیں، مگر ہم پہلے بھی ملے ہیں۔ جنرل اعظم نے کہا، کہ مجھے تو یاد نہیں۔ اس پر انھوں نے یاددہانی کی، کہ پچھلے سے پچھلے سال عید الفطر میں آپ سے مسجد وزیر خاں میں بغلگیر ہوا تھا۔ اب پہچانا؟

غالباً انہی مسجدوں میں سے ایک ہے، جس کے خطیب عیدوں اور جمعہ کے خطبوں پر اکتفا نہ کر کے نکاح کے موقع پر بھی آدھ گھنٹہ وعظ کرتے ہیں۔ لاہور والوں کو لادین کہیں، یا بے دین، وہ نکاح کے موقع پر بھی خاموشی سے، بلکہ مظلومانہ، یہ وعظ سُنتے ہیں۔ مگر پیرِ شو، بیاموز۔ لاہور اتنے برس رہ کر، اتنی شادیوں کی دعوتیں کھا کھا کر، یہ تجربہ حاصل کیا ہے کہ جب شادی کی دعوت آئے، تو پہلے پوچھتا ہوں، کہ نکاح کون پڑھے گا۔

شادی اور نکاح کے ذکر سے اب کچھ اور باتیں بھی یاد آنے لگی ہیں۔ لاہور میں شادی کے دو موسم ہوتے ہیں ایک گرمی کا، ایک سردی کا۔ اس کے علاوہ جس کو جلدی ہو، یا جس نے ولایت جانا ہو، تو جون کے مہینے میں بھی کر لیتا ہے۔ جتنے بڑے لوگ خصوصاً افسروں میں سے مل سکیں، ان کو بلایا جاتا ہے۔ جن دنوں مغربی پاکستان میں ایک سے زیادہ صوبے تھے، تو کوشش ہوتی تھی، کہ دو صوبوں کے گورنر موجود ہوں۔ میرے دو ایک دوست ایسے تھے، کہ وہ جب شادی کے مقام پر پہنچتے تو معمولی کرسیوں میں سے ایک فرلانگ کی مسافت کاٹتے ہوئے گورنر کے صوفے تک پہنچ جاتے تھے۔ دائیں بائیں دیکھتے ہی نہ تھے، تاکہ کوئی ان سے یہ نہ کہہ دے، کہ یہاں بیٹھئے۔ اگر گورنر کے قریب نشستیں سب بھری ہیں، تو بھی وہ ایسی ثابت قدمی سے

اُدھر کا رُخ کرتے تھے، کہ ان کو دیکھ کر پاس ادب سے کسی کو اپنی نشست خالی کرنی پڑتی تھی۔

لاہور کی شادی میں اگر مجھے کھانے کی بجائے چائے ملے تو پسند کرونگا۔ کھانا سارا ایک ہی قسم کا ہوتا ہے۔ جنوری میں کھائیں، تو خیال ہوتا ہے کہ وہی دسمبر کا کھانا دوبارہ گرم کر لیا ہے۔ وہی چاول سفید رنگ کے، جن میں پیلے چاول بھی ملا دیے جاتے ہیں۔ ان کو پلاؤ کہنا پلاؤ کی بے عزتی کرنی ہے۔ وہی نان سفید رنگ کے۔ بے ذائقہ ٹھنڈے۔ جو نہ پشاور کے نان ہیں، نہ کرامات کے مگر لوگوں کو کہا جاتا ہے، کہ یہ پشاوری ہیں۔ اور لوگ بھی ان پر مرے جاتے ہیں۔ کوئی نیم تنہا نانبائی مغلوں کا شجرۂ نسب لے کر یہاں پہنچ جاتا ہے، اور نانوں کے علاوہ سیخی کباب بھی بنانے لگتا ہے۔ ایک شاعر نے کہا تھا، کہ جی میں آتا ہے، کہ طور کو آگ لگا دوں۔ میرے جی میں آتا ہے، کہ نوکری چھوڑ کر لاہور میں نانبائی یا کبابی کی دکان کھول دوں۔ ملک کی حالت خراب ہو رہی ہے۔ ٹھنڈے کبابوں سے اور کچے نانوں سے بدنامی ہوتی ہے۔ لاہور کے لوگ قدر شناس ہوں، یا نہ ہوں، کباب شناس ضرور ہیں۔ آج کل نئی دکان کھولنی ہو، تو بھی رسم اشتہار ہوتی ہے۔ میں خود ہی اشتہار کرونگا۔ اور کہوں گا ــ "اے قوم! تو کیوں ٹھنڈے کباب پر بھی صابر و شاکر ہے؟"

میں بھی تو قدر دانی کی تلاش میں کہاں جا پہنچا۔ کیا کروں، ان باتوں کے تصور سے حب الوطنی کے جذبے کی جو تسکین ہوتی ہے، اور روپیہ پیسے کی بھی کوئی صورت نظر آنے لگتی ہے۔ مگر میں شادیوں کے کھانے کا ذکر کر رہا تھا۔ چند خاص گھروں کو چھوڑ کر باقی سب پر ایک ہی قسم کی چہر لگی ہوتی ہے۔ جیسے ایک ہی آدمی نے پکائے ہوں۔ جب میں گورنمنٹ کالج میں طالب علم تھا، اور نیو ہوسٹل میں رہتا تھا، تو ہمارا باورچی محمد دین بھی اسی قسم کی چہر لگاتا تھا۔ کھانا تو اچھا پکاتا تھا، مگر ذائقہ سب کھانوں کا ایک ہی قسم کا تھا۔ کسی نے پوچھا۔ محمد دین۔ کیا بات ہے۔ آلو بھی کھاتے ہیں تو وہی مزا، اور پالک ساگ بھی کھاتے ہیں۔ تو وہی مزا۔ اس نے خوش ہو کر جواب دیا۔ کہ سب میں محمد دین کا ہاتھ جو ہوا۔

"اے قوم! سب چیزوں میں محمد دین کا ہاتھ کیوں ہے؟"

اس کے بعد میں نے بہتیری کوشش کی، کہ لاہور کی کوئی اور بات بتاؤں، اور اپنے حافظے کو محمد طفیل کا واسطہ بھی دیا۔ مگر کچھ نہ بنا۔ بات یہ ہے، کہ ہر سطر میں کرامات میں لکھ رہا تھا، اس لیے بالآخر فیصلہ کیا، کہ کرامات لاہور سے کچھ کم نہیں۔ اور کئی لحاظ سے بہتر ہے۔ ایک ہی سڑک ہے، جس پر لوگ سیدھے چلتے ہیں۔ ایک ہی اکھاڑا ہے، جسے لوگ سرتا سر پڑھتے ہیں۔ ایک ہی خدا ہے جس کی ایک ہی طرح پرستش کرتے ہیں۔

"اے قوم! مگر تو نے اتنے خدا کیوں بنا رکھے ہیں؟"

لاہور — جب اور اب

شاہد احمد دہلوی

اب سے چودہ برس پہلے تک دلّی اور لاہور گھر آنگن تھے۔ رات کو کھانے والے سے فارغ ہو کر فرنٹیر میل میں جا سوئے اور صبح نور ظہور کے وقت لاہور پہنچ گئے۔ میرا تعلق لاہور سے چالیس سال کا ہے۔ دو چار، دس بیس نہیں سینکڑوں بار لاہور جانا ہوا، برسوں لاہور میں رہنا بھی ہوا۔ وہ یوں کہ جب میں نے دلّی سے میٹرک پاس کیا تو دادا مرحوم نے فرمایا کہ تم ڈاکٹری پڑھو۔ دلّی میں کوئی

میڈیکل کالج لڑکوں کے لیے نہیں تھا۔ سائنس پڑھانے کا انتظام کئی کالجوں میں تھا مگر دلی سے ایف، ایس سی یا بی، ایس سی کرنے کے بعد ہر سال صرف دو لڑکے لاہور میڈیکل کالج میں بھیجے جاتے تھے۔ اس جھگڑے سے بچنے کے لیے میں نے لاہور جا کر ایف ایس سی کالج میں داخلہ لے لیا۔ یہ ایک امریکی مشن کا شاندار کالج تھا وائی، ایم، سی، اے کے پہلو میں۔ بعد میں نہر پار نئی عمارت میں اٹھ گیا۔ کالج میں ہزار بارہ سو سے کم لڑکے نہیں تھے۔ مگر دلی والا صرف میں ہی ایک تھا۔ شروع شروع میں تو اس نئے دیس میں پہنچ کر طبیعت بہت اُلجھی کہ جسے دیکھو پنجابی بول رہا ہے۔ نامانوس زبان، نامانوس لہجہ۔ لڑکے مجھ سے باتیں کرتے تو میں اُن کا منہ دیکھا رہ جاتا وہ حیران ہوتے اور میں شرمندہ۔ اُردو میں اُن سے بات کرتا یا انگریزی میں۔ رفتہ رفتہ سب جان پہچان گئے تو اُردو ہی میں مجھ سے بولنے لگے۔ شائستگی سے پیش آتے اور محبت سے ملتے۔ خالی وقت میں بورڈنگ ہال یا نیوٹن ہال میں اپنے کمروں میں لے جاتے کھلاتے پلاتے اور اپنے کھیل تماشوں میں شریک کرتے۔ میں موچی دروازہ میں اپنے ایک قریبی عزیز ڈاکٹر اجمل حسین کے ساتھ رہتا تھا۔ محلے والوں کی ملنساری کی بھی یہی کیفیت دیکھی کہ دل کھول کر ملتے اور ذرا ذرا سی بات کا خیال رکھتے۔ غرض تھوڑے ہی دنوں میں ساری مغائرت دُور ہو گئی اور میں دلی سے زیادہ لاہور کا ہو گیا۔ اچھے اُستاد ملے، اچھے دوست ملے، اچھا ماحول اور اچھا معاشرہ ملا۔ تین سال ایف، سی کالج میں اور ایک سال میڈیکل کالج میں پڑھنے کے بعد جب مجھے بعض خاندانی مجبوریوں کے تحت لاہور کا تعلیمی سلسلہ منقطع کر کے دلی واپس جانا پڑا تو مجھے لاہور چھٹنے کا اتنا رنج ہوا کہ میں نے تقریباً ایک سال تک دلی کے کسی کالج میں داخلہ نہیں لیا۔

لاہور اُس زمانے میں ہندوستان کا پیرس کہلاتا تھا۔ ہر چند کہ دلی راجدھانی تھی اور بڑی رونق بھی مگر لاہور کئی حیثیتوں سے دلی پر فوقیت رکھتا تھا۔ سب سے پہلے تو یہ کہ لاہور تعلیمی اداروں کا شہر تھا۔ ہر طرف جونچال چہرے، پھولوں کی طرح کھلے ہوئے۔ آدھی سے زیادہ رونق تو انہی نوجوانوں کی ہوتی تھی۔ آئے دن کالجوں کی تقریبیں ہوتی رہتی تھیں۔ مقابلے، مباحثے، میچ، ڈرامے اچھے اور بُرے گانوں کے جلسے۔ بڑی زندگی تھی یہاں کے طلباً میں مگر شائستگی کے ساتھ، جو اب ہمارے طلبا میں مفقود ہو چکی ہے۔ اب تو نہ بڑے کا ادب ہے اور نہ چھوٹے کا لحاظ۔

لاہور دانشوروں کا شہر تھا۔ ہر علم اور فن کا منتہی لاہور میں موجود تھا۔ علوم و فنون کے چشمے اِس شہر سے جاری ہو کر پورے ہندوستان کو سیراب کرتے رہتے تھے۔ میں اِسے اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ میں نے وہ اگلی بہاریں دیکھیں اور اُنھیں ہمیشہ کے لیے اپنے دل میں رکھ لیا تاکہ ان کی یاد سے اپنی زندگی کو شاداب کرتا رہوں۔ اُسی عہدِ رفتہ کی چند جھلکیاں آپ کو دکھاتا ہوں۔

پُرانے لاہور کے گرد کبھی فصیل ہو گی جس کے چند دروازے ہی باقی رہ گئے ہیں۔ چالیس سال پہلے پُرانے شہر کے چاروں طرف پارک بنا ہوا تھا اور ایک پتلی سی نہر لاہور کا طواف کرتی رہتی تھی۔ اس کچی نہر کے کناروں پر عورتیں ہاتھ ہاتھ بھر کے ڈنڈے اور صابن لیے کپڑے کوٹتی رہتی تھیں۔ اسی نہر کے حاشیے پر سرخ بجری کی روش تھی۔ اور روش کے بعد پھر سبزہ شروع ہو جاتا تھا۔ باڑیں اور درخت بھی اس سبزہ زار میں کثرت سے تھے۔ گرمیوں میں لاہور تپ کر بھاڑ بن جاتا تو یہ پارک شہر والوں کے لیے دارالامان بن جاتے۔ شام کو ان میں دلی کے چوک کی طرح خوب چہل پہل ہو جاتی۔ ان میں بوعلی سینا اور جالینوس کے جانشین بھی

چمکی، دیکھا تو گونگا امام بخش کے سینے پر سوار تھا۔ کوئی چالیس پچاس ہزار تماشائی موجود تھے۔ سناٹا چھا گیا۔ گونگا بڑا تانا اور بھینسے کی طرح اتراتا اکھاڑے میں اچھلتا پھر رہا تھا۔ میر کشتی بھی دم بخود ہو کر رہ گئے تھے۔ جب اس غیر متوقع دھچکے سے سنبھلے تو میر کشتی نے اعلان کیا کہ کشتی نہیں ہوئی سارے مجمعے نے بھی ایک آواز ہو کر چیخنا شروع کر دیا "نہیں ہوئی۔ نہیں ہوئی"۔ گونگے کے باپ کو بتایا گیا کہ امام بخش کے کھوے زمین سے نہیں لگے۔ اس نے اپنے بیٹے کو اشاروں میں بتایا۔ گونگا اس اطلاع پر بالکل جز بز نہیں ہوا۔ دوبارہ خم ٹھونک کر سامنے آ گیا۔ کتنی نفرت تھی مجمعے میں گونگے کے لیے، مگر وہ سب سے بے نیاز دوبارہ لڑنے کے لیے تیار تھا۔ دوسری کشتی شروع ہوئی۔ دو منٹ تک دونوں ایک دوسرے کو ریلتے پیلتے رہے۔ ایلو، گونگا امام بخش کے سینے پر چڑھا بیٹھا ہے اور بار بار اس کے کھوؤں کو زمین سے لگا رہا ہے۔ میر کشتی نے گونگے کے جیت جانے کا اعلان کر دیا مگر وہ اب بھی امام بخش پر چڑھا بیٹھا ہے۔ اس کے باپ نے لپک کر اسے اٹھایا اور کھینچ کر الگ کیا۔ مجمع پٹے ہوئے کتے کی طرح دم دبا کر دنگل میں سے نکلنے لگا۔ کشتی بالکل صاف ہوئی تھی۔ کچھ کہنے سننے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ امام بخش کے پچھڑنے کا لاہوریوں نے بڑا سوگ منایا۔ چھ مہینے بعد پھر ان دونوں کی کشتی ہوئی۔ اب کے کشتی ترت پٹ نہیں ہوئی، بیس منٹ تک داؤ پیچ ہوتے رہے۔ گونگا اس کشتی میں بھی تگڑا پڑ رہا تھا۔ مگر کچھ اللہ کو اس خاندان کا وقار ہی رکھنا تھا جو امام بخش کا ایک داؤ چل گیا اور گونگا چت ہو گیا۔ مجمعے کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی۔ امام بخش پر دھن برس رہا تھا۔ لوگوں کی جیبیں خالی ہو گئیں تو انھوں نے اپنے صافے اتار اتار کر امام بخش پر ڈالنے شروع کر دیے۔ سینکڑوں صافوں کے انبار میں پہلوان دب کر رہ گیا۔ وہ جوش و خروش تھا کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ گونگا اپنے باپ کے ساتھ چپکے سے سٹک گیا تھا۔ اچھا ہی کیا اس نے، ورنہ یہ بپھرا ہوا مجمع اس کی تکا بوٹی کر دیتا۔ دنگل سے اونٹ پر امام بخش کا جلوس نکالا گیا۔ رنگ برنگے صافے اونٹ پر لٹکے ہوئے عجب بہار دکھا رہے تھے۔ کئی کئی ڈھول بج رہے تھے۔ کئی ہزار آدمی "ارے گونگا ڈھہ گیا" کا نعرہ ٹولیاں بنا کر کورس میں کہتے جاتے تھے۔ ہنڈوں کی روشنی میں یہ جلوس سارے شہر میں گھمایا گیا۔ بالاخانوں سے پہلوان پر پھول برسائے جا رہے تھے اور نچھاور ہو رہی تھی۔ اور پہلوان گجروں اور صافوں سے لدے پھندے دونوں ہاتھوں سے سلام کرتے چلے جا رہے تھے۔ اس کشتی کے بعد امام بخش مسلمہ طور پر رستم ہند ہو گئے اور پھر کوئی کشتی نہیں لڑے۔ خدا کے فضل سے اب بھی جیتے ہیں۔ اب ان کے لڑکے بھولو، اسلم، اعظم، اکرم اور گوگا اپنے خاندان کا نام روشن کر رہے ہیں۔

یوں تو پنجاب میں دو بڑے گھرانے قدامت سے مشہور چلے آتے ہیں۔ ایک تل ونڈی والے کہلاتے ہیں اور دوسرے شام چوراسی والے۔ یہ دونوں گھرانے دھرپدیوں کے ہیں۔ ان دونوں کے بزرگوں کا سلسلہ مغل دربار تک پہنچتا ہے۔ دھرپد گانے کا رواج محمد شاہ بادشاہ دہلی کے زمانے تک عام تھا۔ اس بادشاہ کے زمانے میں نغمے در و دیوار سے برستے تھے۔ بادشاہ اپنی رنگ رلیوں کی وجہ سے "رنگیلے" کہلاتے تھے۔ انہی کے دربار کے دو گویوں سدا رنگ اور ادا رنگ نے خیال کی گائیکی کو فروغ دیا، اور اتنا کہ دھرپد کا چراغ جھلملانے لگا۔ یہیں سے دھرپد کا زوال شروع ہوا اور دھرپدیے کم ہوتے ہوتے ہماری اس صدی کے ربع دوئم میں اشاذ کالمعدوم ہو گئے۔ لاہور تہذیب و شائستگی کا مرکز مغلوں کے اقتدار کے بعد بھی رہا۔ ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کے بعد شمالی ہند کی بعض ریاستوں کو عروج ہوا۔ ان میں پٹیالہ بھی تھا۔ لکھنؤ اور دلی کی بادشاہیوں کے

اُجڑنے کے بعد اہلِ ہنر اور فن کاروں نے ریاستوں کا رُخ کیا؟ اور جس کے جہاں سینگ سمائے اُدھر نکل گئے۔ لاہور والوں نے پٹیالہ سے اپنا ناتہ جوڑا۔ چار پشتوں تک اس ریاست نے اہلِ ہنر کی سرپرستی کی۔ یوں پٹیالے والوں کا بھی ایک گھرانا بنا اور مشہور ہوا، مگر حقیقت میں یہ لاہور والوں ہی کا گھرانا ہے۔ انہی میں سے دو گائیکوں نے بڑا نام پایا۔ ایک فتح علی اور دوسرے علی بخش۔ دراصل یہ گانے والوں کی ایک جوڑی تھی جسے ایک مغنیہ گوکھی بائی نے تیار کیا تھا۔ انھوں نے بیس بیس سال بھوڑے میں رہ کر ریاض کیا تھا، چنانچہ یہ جوڑی آفتاب و ماہتاب بن کر چمکی۔ مہاراجہ پٹیالہ نے انھیں جرنیل اور کرنیل کے خطاب دیے تھے، فوج کے جرنیل کرنیل نہیں، گانے کے جرنیل بہادر اور کرنیل بہادر۔ فتح علی جرنیل ریاست ٹونک میں بھی ایک زمانے میں ملازم تھے۔ نواب ابراہیم علی خاں گانے بجانے کے بڑے رسیا تھے۔ ایسے حکمرانوں کو خیال ٹھمریاں بنانے کا خبط بھی ہوتا ہے محمد شاہ کی چیزیں سدا رنگ بنایا کرتے تھے، ابراہیم علی خاں کی فتح علی خاں۔

فتح علی خاں کے لڑکے عاشق علی خاں تھے۔ یہ بھی پٹیالے کے ملازم تھے مگر لاہور میں زیادہ رہتے تھے۔ بدقوارہ اور بدگلو آدمی تھے۔ نہایت موٹی اور بھدی آواز تھی مگر ایسے کچھ ایسا سادھا تھا کہ کانوں میں رس گھولتی تھی۔ اور کسی بھاری آواز والے سے اتنی تیک تانیں نہیں سنیں جتنی عاشق علی خاں سے۔ دنیا کا کوئی نشہ ایسا نہیں تھا جو ان سے چھوٹا ہو مگر حیرانی کی بات یہ ہے کہ مرتے دم تک ان کی آواز ٹھیک رہی۔ عجیب وارفتہ مزاج آدمی تھا۔ لاکھوں روپے کمائے مگر کوڑی کفن کو نہیں لگا رکھی۔ شادی ساری عمر نہیں کی اور نہ روپے پیسے کا کبھی منہ کیا۔ متوکل بندوں کی طرح جو کچھ ملا سب لٹا دیا۔ خاں صاحب گھر سے نہایت عمدہ سوٹ پہن کر نکلے، تھوڑی دیر بعد ایک پھٹا ہوا تہمد لپیٹے واپس چلے آ رہے ہیں۔ ہم نے کہا صاحب، یہ کیا؟ بولے "پٹڑی پر ایک ننگا فقیر پڑا جاڑے میں ٹھٹھر رہا تھا۔" حضرت اُسے اپنا سوٹ دے آئے اور اُس کا تہمد لے آئے۔ اتنا بڑا گویا ہونے کے باوجود عاشق علی خاں میں غرور نام کو نہیں تھا۔ بچوں کی طرح بھولی بھولی باتیں کرتے تھے۔

لاہور ہی کو ایک اور بہت بڑے اُستادِ فن وحید خاں نے اپنا وطنِ ثانی بنا لیا تھا۔ کیرانے کے رہنے والے تھے اور اُستاد عبدالکریم خاں کے رشتے کے بھائی تھے۔ یہ وہی عبدالکریم خاں ہیں جو روشن آرا بیگم کے اُستاد تھے۔ عبدالوحید خاں بڑے کاملِ فن اور موسیقی کے صرفی و نحوی تھے۔ ان کا دماغ شاہانہ بھی تھا اور فقیرانہ بھی۔ تُرش اور بدلحاظ آدمی تھے۔ صورت شکل اور ڈیل ڈول کے اعتبار سے بھی گاماں پہلوان سے مشابہت رکھتے تھے۔ اُونچا سُنتے تھے اس لیے بہرے وحید خاں کہلاتے تھے۔ ان کی نامور شاگردوں میں ہیرا بائی بڑودکر اور اختری بائی فیض آبادی ہیں۔ عمر نہیں لاہور کے کسی بزرگ کے مرید ہو کر لاہور ہی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ پیر کے انتقال کے بعد اُنہی کے مزار کے مجاور بن گئے تھے۔ اپنے نام کے ساتھ چشتی صابری ضرور لکھتے تھے۔ علمی اور فنی لحاظ سے پورے ہندوستان میں کوئی اُن کا ہمسر نہیں تھا۔ اہلِ علم سے ان کی خوب گھٹتی تھی۔ چنانچہ لاہور کے بعض عالم، ادیب اور شاعر خاں صاحب کو گھیرے رہتے تھے۔ کسی گانے والے کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ حتیٰ کہ عبدالکریم خاں، فیاض خاں، رجب علی خاں اور عاشق علی خاں کو بھی نہیں پنپاتے تھے۔ اُن کی طرح جتا کر اور ٹوک کر راگ سنانے والا سوائے اُستاد بندو خاں سارنگی نواز کے میں نے اور کوئی نہیں دیکھا۔ جلال میں تو وہ اکثر رہتے ہی تھے جب

جمالؔ اُن پر وارد ہوتا تو وہ بڑی اچھی باتیں کرتے تھے اور اُن کے بے پناہ علم کا اندازہ بھی ایسی کیفیت میں ہوتا تھا۔ راگ اُن سے زیادہ صحیح اور کوئی نہیں گاتا تھا۔ اُن کے گانے کا انداز سب سے جدا تھا۔ گھنٹوں ایک ہی راگ کھیلتے رہتے تھے۔

لاہور میں ایک اور اچھے گانے والے غلام علی خاں تھے۔ بعد میں ایک اور غلام علی خاں بھی قصور سے آکر بس گئے تھے۔ اس لیے پہلے غلام علی خاں بڑے غلام علی خاں اور دوسرے چھوٹے غلام علی خاں کہلانے لگے۔ بڑے غلام علی خاں کی بڑی بڑی کالی مونچھیں تھیں۔ ڈیل ڈول سے پہلوان معلوم ہوتے تھے۔ ٹانگے کی ہیبت پر اکیلے ہی دھرے رہتے تھے۔ بڑے سنفرے، نیّار اور صاحبِ طرز گانے والے تھے۔ غیر منقسم ہندوستان میں اتنا خوش آواز گویا شاذونادر ہی سننے میں آتا تھا۔ سونے کے چند گھنٹوں کے علاوہ ہر وقت اپنا سُر منڈل لیے گاتے ہی رہتے تھے۔ خوش مذاق اور شائستہ آدمی تھے۔ لاہور سے باہر ہزار روپے روز پر جایا کرتے تھے۔ غریب شائقین شاہی محلہ میں ان کے بالاخانے پر چلے جاتے تو خاں صاحب تواضع بھی کرتے اور گھنٹوں گا تا سناتے رہتے۔ خاں صاحب نے بے شمار خیال بنائے ہیں جن میں ان کا تخلص "سب رنگ" ہے۔ ان کا خرچ ایک ہاتھی کا سا خرچ تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد ان کی آمدنی مسدود ہو گئی۔ ریڈیو لاہور سے انھیں دو پروگرام دو سو روپے کے ملتے تھے۔ اتنے کے تو چھینے ہیں وہ سگریٹ ہی پی جاتے تھے۔ کچھ عرصہ کراچی آکر بھی رہے۔ یہاں بھی تنگ دستی کا شکار رہے۔ پھر سنا کہ خاں صاحب بمبئی چلے گئے اور وہیں کے ہو رہے۔ انہی کے چھوٹے بھائی برکت علی خاں ہیں جنھوں نے ٹھمری، دادرا، اور غزل گانے میں کمال پیدا کیا ہے۔

اُس زمانے میں دو مصوروں نے بہت نام پیدا کیا۔ ایک اُستاد اللہ بخش اور دوسرے عبدالرحمٰن چغتائی۔ دونوں لاہور ہی میں رہتے تھے۔ چغتائی نے مرقعِ چغتائی شائع کرکے بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔ ان کی بنائی ہوئی تصویریں اچھی قیمت پہ فروخت ہوئی تھیں۔ حکومت نے ازراہِ سرفرازی انھیں خان بہادر کا خطاب دیا تھا۔ اللہ نے انھیں دولت بھی دی اور عزت بھی مگر ان کی نہ تو وضع میں کوئی فرق آیا اور نہ مزاج میں۔ ورنہ بالعموم دیکھنے میں آتا ہے کہ جہاں سیر کی ہنڈیا میں سوا سیر پڑا اور وہ اُبلی۔ چغتائی صاحب اِس کلیہ کی استثنا ہیں۔

سیاست سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ حکومت کے عمّال سے۔ تاہم مسلمانوں کے بیشتر سربرآوردہ لوگ یہیں تھے۔ سب سے زیادہ "سر" بھی لاہور ہی میں تھے۔ ان میں سے ایک بہت بڑے شاعر تھے اور ایک بہت بڑے ادیب میری مراد سر محمد اقبال اور سر عبدالقادر سے ہے۔ جب خطابات واپس کرنے کی تحریک ہوئی تو ان دونوں نے اپنے اپنے خطابات واپس کر دیئے تھے۔ مگر یہ دونوں بزرگ صرف شاعر اور ادیب ہی نہیں تھے۔ یہ ان کے علاوہ بھی بہت کچھ تھے۔ یہ کیا کم ہے کہ یہ دونوں بہت بڑے انسان بھی تھے، اور اسی انسانیت کی وجہ سے قوم پر اتنے احسانات کر گئے ہیں کہ ہم ان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ مشرق کے سب سے بڑے شاعر کی سادگیٔ مزاج دیکھنے کی چیز تھی۔ انھیں دیکھ کر پرانے فلسفیوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ علامہ اقبال کو کھرّی چارپائی پہ تہمد باندھے اور بنیان پہنے بیٹھا میں نے دیکھا ہے۔ ہر قسم کے لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور ان کے ارشادات سے مستفیض ہوتے تھے۔ سر عبدالقادر

کی قابلیت کا یہ حال تھا کہ ادیبوں اور شاعروں کے جلسوں سے لے کر سلوتریوں کے جلسوں تک کی صدارت کر دیتے تھے
ایک زمانے میں وہ "ریڈی میڈ" صدر کہلانے لگے تھے۔ ڈاکٹر اقبال پنجابی لہجے میں اُردو بولتے تھے، سر عبدالقادر دلّی والوں
کی طرح اُردو میں بات چیت کرتے تھے۔ ادیبوں اور شاعروں کا ذکر چھڑا ہے تو میں اُس زمانے کے چند اور حضرات کا
سرسری سا ذکر بھی کرنا چاہوں۔

اخباروں میں دو اخبار بہت چلتے تھے۔ ایک "پیسہ اخبار" اور دوسرا "زمیندار"۔ پیسہ اخبار تو غالباً کسی زمانے
میں ایک پیسے کا ہوتا ہوگا، یوں اس کا نام پیسہ اخبار رکھا گیا ہوگا مگر زمیندار کی وجہ تسمیہ سمجھ میں نہیں آئی۔ پیسہ اخبار کے
کے مالک اور ایڈیٹر منشی محبوب عالم تھے۔ ان سے میرے والد کے قدیمی مراسم تھے۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں اپنے والد کے ساتھ میں ان
کے دفتر میں گیا تھا۔ ساٹھ کے قریب عمر ہو گی، داڑھی مونچھیں سفید تھیں۔ اچھے کاٹھ کے آدمی تھے۔ ان کا بہت بڑا کاروبار تھا۔
نام کے ساتھ دولت بھی اچھی کمائی۔ ان کے بعد نہ تو ان کا نام چلانے والا کوئی رہا نہ اخبار۔ اب اس اخبار کے نام کا محلّہ لاہور
میں البتہ رہ گیا ہے۔

زمیندار کے ایڈیٹر مولانا ظفر علی خاں تھے۔ بڑی پہلودار شخصیت تھی ان کی۔ میں نے انھیں دیکھنے سے پہلے ان کی دو
کتابیں پڑھی تھیں "معرکۂ مذہب و سائنس" اور ایک ناول "سیرِ ظلمات"۔ یہ دونوں کتابیں ان کی تصنیف نہیں تھیں، ترجمہ تھیں،
مگر کیا مجال کہ کہیں سے بھی ترجمہ معلوم ہو جائیں۔ نثر عالمانہ لکھتے تھے اور شعر سے بھی علمیت ٹپکتی تھی۔ بڑے پُرگو تھے اور قافیے
کے تو بادشاہ تھے۔ آتش بیان مقرر تھے اور مسلمانوں کے بہت بڑے لیڈر تھے۔ قد میانہ، اکہرا ڈیل، کتابی چہرہ، گول چھوٹی
داڑھی۔ اکثر چغہ پہنے دکھائی دیتے تھے۔ سر عبدالقادر کی طرح لہجہ ان کا بھی بہت صاف تھا۔ ان کی زبان اور قلم دونوں
سے آگ برستی تھی۔ بڑے نڈر اور متوکل آدمی تھے۔ جیل جانے سے بالکل نہیں ڈرتے تھے۔ بار بار ضمانتیں ضبط ہوتی تھیں۔
لاکھوں روپے کا خسارہ اُٹھایا مگر اپنی روش نہیں بدلی۔ لاہور کے جتنے اور اُردو اخباروں کے ایڈیٹر تھے تقریباً سبھی مولانا
کی شاگردی کر چکے تھے۔ مولانا بڑے مذہبی خیال کے آدمی بھی تھے۔ سبحان اللہ! کیسی نعت کہی ہے کہ آج بھی ہم سب
کے وردِ زباں ہے۔ اِم

"وہ شمع اُجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں"

ایک طرحی مشاعرے میں ڈاکٹر تاثیر نے اچانک مولانا کے نام کا اعلان کر دیا۔ مولانا نہایت اطمینان سے اسٹیج پر گئے۔ جیب
میں سے کاغذ نکال کر غزل سُنانے لگے۔ حسبِ دستور مولانا کو ہر ہر شعر پر داد ملی۔ اُس وقت تاثیر اور اُن کے رفقا کے
چہرے دیکھنے کے لائق تھے۔ منہ کھلے ہوئے، آنکھیں پھٹی ہوئیں، حیرت سے مولانا کو تک رہے تھے۔ غزل پڑھ کر مولانا اسٹیج
سے نیچے اُتر آئے۔ اُن کے ہاتھ میں کورا کاغذ تھا۔

مولوی ممتاز علی عورتوں کا ہفتہ وار اخبار "تہذیبِ نسواں" شائع کرتے تھے۔ ریلوے روڈ پر رہتے تھے۔ میرے
والد ان کے مضمون نگار بھی تھے اور دوست بھی۔ والد ہی کے ساتھ میں نے مولوی صاحب کو تقریباً چالیس سال پہلے دیکھا تھا۔
نورانی چہرہ، سفید داڑھی، دُبلے پتلے سے آدمی تھے۔ زنانہ اخبار اور بچوں کا اخبار "پھول" دونوں خوب چلتے تھے۔ عورتوں

اور بچوں کے لیے بے شمار کتابیں چھاپی تھیں۔ تعلیم نسواں کے سلسلے میں مولوی صاحب کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اسی دفتر میں ان کے بڑے صاحبزادے سید حمید علی اور چھوٹے صاحبزادے سید امتیاز علی تاج کو دیکھا۔ حمید علی صاحب کا دماغ کاروبار میں خوب چلتا تھا۔ سارے کام کو انھوں ہی نے سنبھال رکھا تھا۔ ایک پاؤں میں کبھی بچپن میں ناسور ہو گیا تھا جس کی وجہ سے پیر میں نقص آ گیا تھا۔ ایک صاحب نے بتایا کہ مولانا شبلی کچھ دنوں کے لیے لاہور آئے تھے تو حمید علی تو ٹانگ کی شدید تکلیف میں مبتلا دیکھ کر مولوی صاحب کو نہایت خلوص سے مشورہ دیے گئے تھے کہ تم اس لڑکے کو گولی مار دو۔ خدا کی شان کہ آج غنی لمر پھر کھاتی وسے مری سب سبب اسی لڑکے کی بدولت ہے۔ دوسرے صاحبزادے سید امتیاز علی تاج کو مضامین لکھنے کا شوق تھا اور انھوں نے ایک ماہوار رسالہ ”کہکشاں“ بھی نکالا تھا جو زیادہ عرصہ نہ چل سکا۔ انہی کے جگری دوست سید احمد شاہ بخاری کو دیکھا جن کو ان کے ایک استاد نے پیار سے پطرس کا نام دیا تھا۔ یہ ایک بانکا اجلے رنگ کا خوبصورت جوان تھا جو ہنسنے ہنسانے کی باتیں کرتا رہتا تھا اور انگریزی بہت اچھی بولتا تھا۔ تاج اور پطرس ہم عمر اور ہم جماعت تھے۔ گورنمنٹ کالج کے ڈراموں میں حصہ لیتے تھے۔ تاج کو ڈرامے سے خاص شغف تھا۔ آگے چل کر انھوں نے ”انارکلی“ کا ڈرامہ لکھا جو ہمارے ڈرامائی ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی ”تہذیب نسواں“ اور ”پھول“ کے دفتر میں عبدالمجید سالک، غلام عباس اور چراغ حسن حسرت نے ایڈیٹری کی تربیت پائی۔ حفیظ جالندھری کو بھی اسی دفتر میں اکثر دیکھا۔ لاہور آنے کے بعد ہی ان سب کا ذوق ادب پروان چڑھا۔ لاہور کی فضا شعر و ادب سے رچی ہوئی تھی۔ حفیظ کے گیتوں نے اس فضا میں اور رس گھولا۔ ان کی دیکھا دیکھی اور کئی نئے شاعروں نے بھی گیت لکھنے شروع کر دیے۔ حفیظ کے گیتوں اور ترنم نے لاہور کو نغمہ زار بنا دیا۔ لاہور کے بعض منچلوں نے اس میں اتنا غلو کیا کہ مشاعروں میں باقاعدہ طرح موسیقی اور طبلے کے ساتھ اپنی غزلیں سنانی شروع کر دیں۔ بڑی زندہ دلی تھی ان دنوں لاہور میں۔

نوجوان شاعروں میں اختر شیرانی ابھر رہے تھے۔ انھیں نثر لکھنے کا بھی شوق تھا مگر اس زمانے میں ایک خاص قسم کی شاعرانہ نثر لکھنے کا عام رواج تھا۔ یہ طرز ٹیگور کی نظموں کے ترجمے سے چلی تھی۔ نیاز فتحپوری اور ان کے گروپ نے جنھوں نے اپنا نام ”یارانِ نجد“ رکھ لیا تھا، اس نثر کو خوب اچھالا۔ انھیں یہ کہتے ہیں آسکر وائلڈ کی نثر میں نظمیں بھی شامل تھیں۔ خلیفی دہلوی بھی اسی گروپ کے ادیب تھے اور اختر شیرانی کے ممدوح۔ جب اختر شیرانی نے بہارستان اور خیالستان اور رومان جیسے رسالے نکالنے شروع کیے تو ان میں بیشتر اسی نثر کے نمونے ہوتے تھے۔ خیر یہ نثر تو ایک نقلی چیز تھی اس لیے اپنی موت آپ ہی مر گئی مگر اختر شیرانی کی شاعری بڑی جاندار تھی اور اس میں ایک نیا پن بھی تھا۔ تقریباً پندرہ سال تک اختر نے داد شعر دی۔ اس عرصہ میں شراب خوری کی عادت بتدریج بڑھتی گئی اور صحت گرتی گئی۔ اختر کی شاعری ختم ہو گئی۔ کچھ عرصہ گمنامی میں گزرا اس کے بعد ان کی موت ہی سننے میں آئی۔ بڑی خوبیوں کا آدمی تھا، شراب نے اسے کھا لیا۔

باہر سے آ کر لاہور کو اپنا وطنِ ثانی بنانے والوں میں مولوی ممتاز علی کے بعد سب سے نمایاں شخصیت مولانا تاجور نجیب آبادی کی تھی۔ مولانا لاہور کے دیال سنگھ کالج میں پروفیسر تھے۔ چند سال پہلے مخزن کی ادارت کر چکے تھے۔ لاہور میں انھوں نے ”اردو مرکز“ قائم کیا تھا جس میں کام کرنے کے لیے انھوں نے چند مشہور شعرا کو بلا لیا تھا۔ اس ادارہ سے چند کتابیں شائع بھی ہوئیں مگر یہ ادارہ کچھ چلا نہیں۔ بچوں کے لیے ایک رسالہ ”پریم“ بھی نکالا اور اس کے بعد ”شاہکار“۔ عجیب بات ہے کہ اتنے وسیع تجربہ اور قابلیت

کے باوجود کوئی پرچہ کامیابی سے نہیں چلا سکے۔ مولانا کچھ ضرورت سے زیادہ اپنے رفقاء پر اعتماد کرنے لگتے تھے، اور وہ رفقاء انہیں ہمیشہ چرکا دیے جانتے تھے۔ "ادبی دنیا" کے ادارے میں ایک صاحب میلا رام وفا تھے۔ یہ طوطا رام بے وفا ثابت ہوئے، اور یہی اُن کا نام بھی پڑ گیا تھا۔ مولانا نے دوستوں کی وجہ سے بہت نقصان اُٹھائے۔ بعض مقامی شعراء نے باقاعدہ ان کے خلاف محاذ بنا لیا تھا مگر شاباش ہے ان کی ہمت کو، ناہورہی میں ڈٹے رہے اور جو کچھی لڑتے رہے۔ ان کے سینکڑوں شاگرد تھے جو ان کی بڑی عزت و تکریم کرتے تھے۔ مولانا کو علمی و ادبی خدمات کے صلہ میں حکومت نے شمس العلماء کا خطاب دیا تھا۔ بھاری بھرکم اور گول مٹول سے آدمی تھے۔ گفتگو بہت اچھی کرتے تھے۔ سنا ہے کہ اُستاد بھی اچھے تھے۔ دو جوان لڑکوں کی موت نے مولانا کا دھڑ توڑ دیا تھا۔ پھر خود بھی زیادہ نہیں جیئے۔ اچھے اور قابل اُستادوں میں اُس وقت اورینٹل کالج میں اولاد علی شادانؔ تھے، جن کے شاگرد استاد کی نسبت سے "شادانی" کا لاحقہ اپنے نام کے ساتھ لگانا باعث فخر سمجھتے ہیں۔ پروفیسر محمود شیرانی تھے جنھوں نے کتاب "پنجاب میں اُردو" لکھی اور شعرِ لعجم کے بخیے اُدھیڑے۔ بین الاقوامی شہرت رکھنے والے علامہ عبداللہ یوسف علی تھے جو اسلامیہ کالج کے پرنسپل تھے۔ یہ وہی ہیں جنھوں نے قرآن شریف کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے۔ اسی اسلامیہ کالج میں خواجہ دل محمد بھی تھے جو حسابیات کے پروفیسر تھے مگر بہت بڑے شاعر بھی تھے۔ پطرس اور تاثیر بہت بعد میں آئے۔ ان دونوں میں دوستی بھی تھی اور لاگ ڈانٹ بھی۔ قابل دونوں تھے اور دونوں انگریزی ادب کے فاضل تھے، اور دونوں معلّم تھے۔ لہٰذا ان کا ایک دوسرے سے کھٹکنا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ بظاہر اچھی طرح ملتے تھے مگر بباطن ایک دوسرے سے کاوش رکھتے تھے۔

لاہور کے ادبی رسالوں میں ایک رسالہ تھا "شباب اُردو"۔ اُس کے ایڈیٹر تھے خان احمد حسین خان مگر رسالے کے ٹائیٹل ہی پر کوئی ایک درجن وکیلوں کے نام بطور ادارہ چھپتے تھے۔ رسالے کا آغاز خان احمد حسین خان کی نظم سے ہوتا تھا اور خان احمد حسین خان کے افسانے پر اختتام ہوتا تھا۔ اس رسالے کا کوئی معیار نہیں تھا۔ سب کے ہر قسم مضامین اس میں چھپتے تھے۔ تین چار سال تک تو یہ پرچہ شائع ہوتا رہا مگر جب لاہور سے ہمایوں اور نیرنگ خیال اور عالمگیر شائع ہونے لگے تو "شباب اُردو" معدوم ہو گیا۔ ہمایوں بڑے شُستہ مذاق کا ماہنامہ تھا جسے میاں بشیر احمد نے اپنے والد مرحوم جسٹس شاہدین کی بطور یادگار شائع کرنا شروع کیا تھا۔ ابتدا میں میاں بشیر احمد اور تاجور نجیب آبادی اس کے ادارہ میں شامل تھے۔ تاجور کی علیحدگی کے بعد منصور احمد اور حامد علی خاں کے نام پڑنے لگے۔ منصور احمد نے بعد میں تاجور سے "ادبی دنیا" لے لیا تھا مگر منصور احمد کی جواں مرگی نے ادبی دنیا کو ایک اچھے ادیب سے محروم کر دیا۔ حامد علی خاں جب تک ہمایوں کے ایڈیٹر رہے ہمایوں کی تمام خوبیاں قائم رہیں۔ اُن کے علیحدہ ہو جانے کے بعد ہمایوں کو بعد کے ایڈیٹر نہ سنبھال سکے۔ یہ پرچہ برابر شائع ہوتا رہا مگر اپنی روایتی نفاست کھو بیٹھا۔ میاں بشیر احمد اپنی علالتِ مزاج کی وجہ سے توجہ نہ دے سکے، پرچے کا زوال شروع ہو گیا۔ کیا ٹھکانا ہے اس احتیاط کا کہ ہمایوں میں لفظِ بوسہ نہیں چھپ سکتا تھا۔ اس سے اندازہ لگائیے کس قدر ثقہ پرچہ تھا۔ عظیم بیگ چغتائی کا مشہور مضمون "کولتار" ہمایوں میں نہیں چھپ سکا۔ "الشذری" اور ایک آدھ اور مضمون ہی ہمایوں میں جگہ پا سکا۔ اس کے خاص لکھنے والے "فلک پیما" تھے جن کا سنجیدہ مزاح واقعی ایک خاصہ کی چیز ہوتا تھا۔ شاعروں میں آزاد انصاری، جوش اور اثر صہبائی بالالتزام ہر اشاعت میں شریک ہوتے تھے۔ میاں بشیر احمد کی نثر و نظم صرف ہمایوں ہی میں دیکھنے میں آتی تھی۔

"نیرنگِ خیال" ایسا نکلا کہ اس نے ہمارے ادبی رسالوں کی روش ہی بدل ڈالی۔ حکیم یوسف حسن صاحب نے ایک نئی بات یہ کی کہ پرچے کی ظاہری خوبیوں کی طرف بھی توجہ دی۔ "نیرنگِ خیال" سے پہلے رسالوں کے ٹائیٹل بالکل سیدھے سادے ہوتے تھے، رسالے کا نام اور ایڈیٹر کا نام، بس۔ حکیم صاحب نے طرح طرح کے ڈیزائن بنوا کر کئی کئی رنگ میں بلاک کی چھپائی شروع کی۔ مضامین لکھنے کے لیے انھیں لاہور کے چند اچھے لکھنے والے مستقلاً مل گئے تھے۔ یہی حضرات بعد میں "نیاز مندانِ لاہور" بن گئے تھے۔ سالک، امتیاز، پطرس، اور ہری چند اختر، تاثیر اور ایم اسلم کے مضامین نے "نیرنگِ خیال" کو ایک دم سے اُچھال دیا جب اس کی ساکھ بن گئی تو ہندوستان کے تمام اچھے لکھنے والوں کے مضامین بھی "نیرنگِ خیال" میں آنے لگے۔ دوسری تبدیلی حکیم صاحب نے یہ کی کہ "نیرنگِ خیال" کا سائز عام رسالوں سے بڑا کر دیا۔ تیسری اور سب سے بڑی تبدیلی جسے انقلاب کہنا چاہیے، یہ کی کہ "نیرنگِ خیال" کے خاص نمبر اور سالنامے شائع کرنے شروع کر دیئے۔ انہی کی دیکھا دیکھی دوسرے رسالوں نے بھی خاص نمبر چھاپنے شروع کر دیئے۔ عام روش سے بچنے کے لیے حکیم صاحب نے "نیرنگِ خیال" کے خاص نمبروں کا سائز بڑھانا شروع کر دیا، یہاں تک کہ اُن کا ایک خاص نمبر گز بھر لمبا بھی نکلا تھا۔ آسکر وائلڈ کی تمثیل "سلومی" کا ترجمہ، ڈاکٹر تاثیر کا کیا ہوا اسی خاص نمبر میں چھپا تھا۔ ان کے ہر خاص نمبر میں ایک نہ ایک معرکہ کا مضمون ضرور شائع ہوتا تھا۔ مثلاً ایک میں شوکت تھانوی کا مضمون "سودیشی ریل" چھپا۔ دوسرے میں عظیم بیگ چغتائی کا مزاحیہ افسانہ "انگوٹھی کی مصیبت" اور تیسرے میں قاضی عبدالغفار کے "لیلیٰ کے خطوط"۔ ان مضامین کی اشاعت سے "نیرنگِ خیال" کی شہرت ہوئی اور "نیرنگِ خیال" کے ذریعہ اِن مضمون نگاروں کو شہرت ملی۔ حکیم یوسف حسن صاحب کو ہماری برادری میں مجتہد کا درجہ حاصل ہے۔ مگر افسوس کہ ادب کے اتنے بڑے خدمتگزار اور محسن کو زمانے کی گردشوں نے ماضی کے دھندلکوں میں محو کر دیا اور ناقدری نے اس عالمِ ضعیفی میں ملازمت کرنے پر مجبور کر رکھا ہے۔ مگر اس ناداری میں بھی جفاکش کے حکیم صاحب "نیرنگِ خیال" شائع کر رہے ہیں۔ یہ اُنہی کی ہمت ہے ورنہ ہمایوں جیسے پرچے بھی دم توڑ چکے۔ "عالمگیر" اپنے ایڈیٹر حافظ محمد عالم کے ساتھ رخصت ہو گیا۔ "ادبی دنیا" بھی کئی جھکولے کھا چکا ہے مگر مولانا صلاح الدین احمد کی ناخدائی نے اسے بچا رکھا ہے۔

لاہور کے زندہ دلوں میں حکیم فقیر محمد چشتی ایک خاص مرتبہ کے بزرگ تھے۔ بارود خانہ میں میں نے انھیں چند بار دیکھا ہے اور ایک دفعہ ایم اسلم صاحب نے، جن کی حویلی بارود خانہ ہی میں ہے، حکیم صاحب سے مجھے ملوایا بھی تھا۔ حکیم صاحب ولی کے خاندانِ شریفی کے تربیت یافتہ تھے۔ طبیب تو وہ اچھے تھے ہی، اور کئی علوم میں بھی انھیں درک تھا، مثلاً خطاطی میں، ادب شعر سے بھی انھیں مناسبت طبعی تھی۔ قد آور اور رحیم شحیم آدمی تھے۔ گفتگو عالمانہ کرتے تھے مگر ظرافت اُبلی پڑتی تھی۔ پھبتی کسنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ آغا حشر پر "بنارس کا لنگڑا" کی پھبتی حکیم صاحب ہی نے کسی تھی۔ عبدالمجید سالک سے ان کی اچھی نمٹتی تھی۔ سالک صاحب بھی لطیفہ باز اور ہنسنے ہنسانے والے آدمی تھے۔ اپنے اخبار "انقلاب" کا مزاحیہ کالم "افکار و حوادث" روزانہ لکھتے تھے۔

حکیم صاحب اور سالک صاحب کے ساتھ آغا حشر کاشمیری یاد آگئے۔ فلم سازی کا مرکز بھی لاہور ہی تھا۔ کوئی تیس برس اُدھر آغا صاحب اپنا فلم بنانے لاہور آگئے تھے۔ یہیں اُن سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ آغا صاحب اگر کسی سے ڈرتے تھے

تو ایڈیٹروں سے۔ ایم اسلم صاحب کے ساتھ جب میں اُن سے ملنے گیا تو پرچہ اندر پہنچتے ہی آغا صاحب باہر نکل آئے اور بڑے تپاک کے ساتھ اندر لے گئے۔ آغا صاحب اپنی تصویر سے بالکل مختلف تھے۔ کھولت نے ان کی صورت شکل بھیانک کر دی تھی۔ آواز میں بڑا کڑاکا تھا۔ سبز چوخانے کا ریشمی تہمد باندھے ہوئے تھے۔ فوراً اپنے ملازم کو آواز دی۔ اُنہی کا ہم عمر ملازم آگیا۔ اُس سے چائے لانے کو کہا۔ وہ پلٹا تو اُس سے پوچھا "بیگم صاحب" کیا کر رہی ہیں؟ اُس نے بتایا کہ سو رہی ہیں۔ بس برس پڑے اُس پر اور وہ وہ گالیاں تراشتی ہیں کہ مزہ آگیا۔ وہ غریب چپکا کھڑا سنتا رہا۔ آغا صاحب کو جلال چڑھا ہوا تھا۔ گرجتے برستے رہے۔

اتنے میں بیگم صاحب آگئیں۔ یہ مختار بیگم تھیں جنھیں ہم ایک فلم میں دیکھ چکے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی آغا صاحب ایک دم سے موم ہو گئے۔ ہمارا تعارف کرایا۔ تھوڑی دیر میں چائے آگئی۔ مختار بیگم نے چائے بنائی اور چائے پینے کے بعد وہاں سے چلی گئیں۔ آغا صاحب نے نوکر کو آواز دی اور اُس سے الماری کھلوا کر تھیّ کی تھیّ مسودوں کی نکلوا کر اپنے سامنے میز پر رکھی۔ یہ اُن کے ڈراموں کے مسودے تھے جو اُن کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے۔ کہنے لگے " میں نے اُس وقت ڈرامے لکھنے شروع کیے جب ڈراموں میں لکھا جاتا تھا " چل میری پیاری، نرمل کی سواری "۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے کئی ڈراموں کے اقتباسات پڑھ کر سنائے۔ سبحان اللہ! کیا عبارت تھی اور کیا انداز تھا پڑھنے کا۔ پھر غالباً " بھیشم پرتگیا " کا کچھ حصہ سنایا۔ یہ ڈرامہ خاصی ثقیل ہندی میں لکھا ہوا تھا مگر تحریر اُردو کی تھی۔ آغا صاحب نے پڑھنا ختم کر کے کہا " مجھ پر ایک صاحب نے دعویٰ عدالت میں کر دیا ہے کہ مجھے نہ تو انگریزی آتی ہے اور نہ ہندی۔ بھلا بتایئے جو شخص ایسے ڈرامے لکھتا ہو اُس کے متعلق کیا کہا جائے گا؟ " میں نے کہا " یہی کہا جائے گا کہ نہایت دقیق ہندی جانتا ہے "۔ دراصل ہوا یہ تھا کہ ایک صاحب آغا صاحب سے ملنے گئے۔

آغا صاحب کسی قدر رکھائی سے پیش آئے۔ اُن صاحب کے باپ کا ایک پریس تھا جس میں اُردو کے کئی اخبار چھپتے تھے۔ انھوں نے آغا صاحب کی رکھائی کا بدلہ یوں لیا کہ کسی ایک اخبار میں آغا صاحب کے خلاف لکھنا شروع کر دیا۔ واقعہ بھی یہی تھا کہ آغا صاحب نہ تو جتنی انگریزی جاننی چاہیئے (شیکسپیئر وغیرہ کے ترجمے کرنے کے لیے) جانتے تھے اور نہ ہندی رسم الخط پڑھ سکتے تھے۔

تھوڑی بہت ہندی تو ہر اُردو جاننے والا سن کر سمجھ لیتا ہے۔ آغا صاحب کچھ زیادہ ادق ہندی بھی سمجھ لیتے تھے۔ تھے نہایت ذہین آدمی، اُردو رسم الخط میں ہندی بھی ایسی لکھی کہ ہندی لیکھکوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ جب ان کے خلاف اخبار میں لکھا گیا تو یار لوگوں کو دل لگی سوجھی۔ آغا صاحب کو مشورہ دیا کہ لکھنے والے پر دعویٰ کر دیجئے۔ اگر آپ خاموش رہے تو آپ کی ساری نیک نامی خاک میں مل جائے گی۔ آغا صاحب نے بھرّے میں آ کر دعویٰ کر دیا۔ اُس نے بھی جوابی دعویٰ کر دیا۔ ایک آدھ پیشی پر آغا صاحب گئے تو حریف نے ان کے آگے ہیملٹ رکھ دیا کہ کہیں سے بھی اس کی چند سطریں پڑھ دیں پھر ہندی کی کوئی کتاب پیش کی کہ اس میں سے کچھ پڑھ دیجئے۔ عدالت آغا صاحب کو جانتی تھی کہ ایک معزز اور نامور ہستی ہیں اور عدالت میں اُنھیں محض اس لیے کھینچا گیا ہے کہ اُنھیں بدنام و رُسوا کیا جائے۔ لہٰذا پہلی پیشی کے بعد آغا صاحب کے ساتھ جو احباب گئے تھے اُن سے کہا کہ فریقین کی صلح صفائی کرا کے راضی نامہ داخل کرا دیں۔ یار لوگوں نے اتنی ہی دل لگی کو کافی سمجھا اور بیچ میں پڑ کر مقدمہ ختم کرا دیا۔ دنوں اس مذاق کا چرچا رہا مگر حشر کو معلوم نہیں ہوا کہ یہ حرکت ان کے دوستوں ہی کی تھی۔ جبھی تو کسی نے کہا ہے " مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ "۔

ڈرامہ لکھنے کا شوق لاہور کے دو اور ادیبوں کو تھا۔ ایک حکیم احمد شجاع۔ دوسرے سید امتیاز علی تاج۔ حکیم صاحب نے دو ایک فلمی کہانیاں اور مکالمے لکھ کر ادب سے قطع تعلق کر لیا۔ سید صاحب کو یہ پڑا اور فلموں نے ایسا گھیرا کہ "انار کلی" کے بعد کوئی بڑا ڈرامہ نہیں لکھ سکے۔ ہمارے بعض بہت اچھے ادیبوں کو نوکریاں کھا گئیں۔ بعض چند مضامین لکھنے کے بعد جب تک جیتے یہی سوچتے رہے کہ کوئی بڑا ادبی کام کریں گے۔ بڑے بڑے سرکاری عہدوں کے چکر میں پڑ جانے کے بعد ادب، اور وہ بھی بیچارے اُردو ادب کو کون پوچھتا ہے؟ تاثیر اپنی تمام غیر معمولی ادبی صلاحیت کے باوجود کچھ نہیں کر گئے۔ چراغ حسن حسرت اگر پیسے کے پیچھے نہ بھاگتے تو شاید کچھ کام کر جاتے۔ اب تو یہ پوچھا جانے لگا ہے کہ کیا ان حضرات کو ادب کی سچی لگن تھی؟ یا انھوں نے ادب کو محض ایک ذریعہ بنایا حصولِ ملازمت اور حصولِ زر کا؟ کیا جواب دیا جائے۔ ع

گر بدولت برسی مست نہ گردی مردی

لاہور ادیبوں کا استھان اور ادب کی کان تھا۔ سینکڑوں نہیں ہزاروں ادیب و شاعر اس شہر میں بستے تھے۔ اُردو کے سب سے زیادہ اخبار اور رسالے اور کتابیں اسی شہر میں چھپ کر سارے ہندوستان میں، بلکہ ہندوستان سے باہر بھی جاتی تھیں۔ ہندو اور سکھ بھی اُردو میں لکھنا اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے اور اُردو میں اخبارات نکالتے تھے۔ ان کے دو بڑے اخبار "ملاپ" اور "پرتاپ" یہاں سے چلے جانے کے بعد بھی اُردو ہی میں اب تک شائع ہو رہے ہیں۔ اُردو سے اہلِ پنجاب کو بڑی محبت تھی، اور سچ تو یہ ہے کہ اہلِ پنجاب ہی نے اُردو کو اپنا کر بچا لیا ورنہ ہندی کی تاخت کیا اسے جینے دیتی؟ لاہور کے پبلشروں کی خدمات بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ لاہور کا چھپا ہوا پورا قرآن شریف آٹھ آنے میں ہدیہ ہوتا تھا۔

اُس زمانے میں لاہور میں وہی تمام بازار تھے جو اب ہیں، ہاں چور بازار نہیں تھا۔ ہر چیز اچھی اور سستی ملتی تھی۔ آٹا اٹھارہ سیر روپیہ کا۔ گھی ایک روپیہ سیر۔ دودھ دو آنے اور دہی تین آنے سیر۔ گوشت چار آنے سیر۔ ہری چھال کا کیلا ایک آنہ درجن۔ لٹھا ڈی ون کا پانچ آنے گز۔ ململ باریک چھ آنے گز۔ شکر روپے کی ساڑھے چار سیر۔ سائیکل بتیس روپے کی۔ لائف بوائے صابن چھ پیسے اور سن لائیٹ پانچ پیسے کا۔ کپڑے دھونے کا صابن روپے کا چھ سیر۔ اخباری کاغذ جو تیس روپے ریم تک چور بازار میں بک چکا ہے دو روپے ریم اور عمدہ سفید کاغذ جو آجکل ۲۷ - ۲۸ روپے ریم مل رہا ہے چار روپے چھ آنے ریم بکتا تھا۔ کہاں تک بھاؤ گنائے جائیں بیس سال میں قیمتیں چھ گنی سے دس گنی تک ہو گئی ہیں اور پھر اچھی چیز نہیں ملتی۔

لاہور میں اب بھی وہی رونق ہے۔ لاہور اب بھی ہماری ثقافت کا مرکز ہے۔ لاہور میں اب دلی قامت اہلِ ہنر نہیں ہیں، کہیں بھی نہیں ہیں۔ مگر مجھے جو خلوص لاہور میں ملتا ہے کسی اور شہر میں نہیں ملتا۔ جو اپنائیت لاہور میں دکھائی دیتی ہے کہیں اور نہیں دکھائی دیتی۔ چودہ سال کے بعد ایک ثقافتی وفد میں میں دلی گیا تھا۔ بیس بیس میل تک دلی پھیل گئی ہے مگر مجھے دلی کہیں نہیں ملی۔ دلی میں میرا دم گھٹنے لگا۔ جب لاہور واپس پہنچا تب یہ گھٹن دور ہوئی۔ اس شہر کی آغوش باہر سے آنے والوں کے لیے کھلی ہوئی ہے۔ میرے بڑوں کو اس شہر نے گلے لگایا۔ میری بہترین یادیں اس شہر سے وابستہ ہیں۔

لاہور زندہ باد

ادھوری داستان

نیاز فتحپوری

میں یو۔پی میں پیدا ہوا، یہیں میرا نشو و نما ہوا، یہیں میری تعلیم و تربیت ہوئی۔ لیکن زندگی جس چیز سے عبارت ہے، اس کا احساس سب سے پہلے پنجاب ہی میں ہوا ——— کس قدر عجیب بات ہے!

طفیل صاحب مجھ سے ان تاثرات کی تفصیل چاہتے ہیں جن کا تعلق صرف لاہور سے ہے، اس لیے داستان ذرا مختصر ہو گئی ورنہ سوال پورے پنجاب کا ہوتا تو بات زیادہ بڑھ جاتی گو دلچسپ رہتی، کیونکہ ریحان شباب، وہ خواب جسے میں نے اوّل اوّل لکھنؤ میں دیکھا تھا اس کی تعبیر مجھے پنجاب ہی میں ملی۔

اللہ اللہ، وہ سرزمین ہانسی کے ہدایائے حسن و شباب، وہ دوشیزگان اسکنرز (SKINNER) کی جلوہ سامانیاں کہ

جامہ گلگوں می شود بر پیکرش از رنگ خویش

اب بھی جب یاد آجاتی ہیں تو دل تڑپ اٹھتا ہے۔

دراں مقام کہ عرفی ز دل گذشت ہنوز
گہے کہ میگذرد اشکبار می گذرد

لیکن سوال لاہور کا ہے اس لیے کوئی اور ذکر یہاں مناسب نہیں۔ لاہور میں میرا قیام ایک بار چند ماہ سے زیادہ نہیں رہا۔ اس لیے میرا ذاتی تجربہ لاہور اور لاہوریات کے متعلق نہ ہونے کے برابر ہے۔ تاہم فرمائش طفیل صاحب کی ہے اس لیے امتثالِ امر ضروری ہے۔

اب سے پورے پچاس سال پہلے کی بات ہے ——— اُس زندگی کی نہیں جو ختم ہو چکی اور جسے اب پلٹ کر آنا نہیں، بلکہ اس زندگی کی جو نصف صدی قبل لاہور میں شروع ہوئی تھی اور اب تک بلائے جان بنی ہوئی ہے۔ یعنی سلسلۂ نوشت و خواند کہ اس کا آغاز لاہور ہی میں ہوا اور وہ اس طرح کہ سب سے پہلے منشی محبوب عالم کے "انتخاب در جواب" میں میرے مزخرفات کی اشاعت شروع ہوئی اور عرصہ تک اس کا سلسلہ جاری رہا۔ میرا قیام اس وقت ریاست باؤنی میں تھا۔

۱۹۰۹ء میں میں ایک زبردست معاشی انقلاب سے دوچار ہوا، وطن چلا آیا اور الہلال و زمیندار میں میرے افکار نظم و نثر شائع ہونے لگے۔ جب ۱۹۱۰ء میں کانپور کی مسجد کا دردناک واقعہ پیش آیا اور مسلمانوں کی طرف سے مجسٹریٹ کانپور کے خلاف مقدمہ چلایا گیا، اُس کی پیروی مسٹر مظہر الحق، سر سلیمان اور خواجہ عبد المجید کے سپرد ہوئی اور مولانا ظفر علی خاں نے مجھے نمائندہ زمیندار مقرر کر کے ہدایت کی کہ مقدمہ کی کارروائی روز کے روز بذریعہ تار انھیں بھیجتا رہوں۔ اس سے قبل جنگ بلقان کے سلسلہ میں میرا ایک طویل مضمون زمیندار میں اور ایک نظم الہلال میں شائع ہو چکی تھی اور اسی تعارف کی بنا پر مولانا ظفر علی خاں نے مجھے ادارۂ زمیندار میں کام کرنے کے لیے بلا لیا۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ مولانا وحید الدین سلیم مجھ سے پہلے لاہور پہنچ گئے تھے یا میرے بعد[1]۔ بہرحال وہ اور میں دونوں ادارۂ زمیندار میں یکجا ہو گئے۔ مولانا وجاہت جھنجھانوی

---

[1] مسلم گزٹ لکھنؤ جو مولانا سلیم کی ادارت میں نکلتا تھا بند ہو چکا تھا۔

پہلے ہی سے یہاں موجود تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب جنگ بلقان کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں میں زبردست ہیجان برپا تھا اور زمیندار نے ترکی افواج کی اعانت کے لیے بلقان فنڈ کھول رکھا تھا۔ یہ زمانہ زمیندار کے انتہائی عروج کا تھا۔ تیس ہزار کے قریب اس کی اشاعت تھی اور چاروں طرف سے روپیہ کی بارش ہو رہی تھی۔

اس وقت زمیندار کا دفتر بڑے ہنگامہ کی جگہ تھی اور مولانا سلیم کے ساتھ میں بھی اس ہنگامہ میں شامل ہو گیا لیکن فرق یہ تھا کہ مولانا سلیم ایک تجربہ کار صحافی ہونے کی حیثیت سے جو کچھ لکھنے تھے بہت ٹھنڈے دل سے لکھتے تھے اور میں جو کچھ لکھتا تھا اس میں نئے خون کا جوش و ولولہ بھی شامل تھا اور یہ مولانا ظفر علی خاں کو زیادہ پسند آتا تھا۔

میرا قیام وہاں ایک ایسی عمارت میں تھا جو بورڈنگ کی حیثیت رکھتی تھی اور میرے علاوہ چند نوجوان طلبہ بھی یہاں رہتے تھے۔ مولانا سلیم کا قیام کسی اور جگہ تھا۔

میں بہت صبح دفتر پہنچ جاتا، دوپہر کو جائے قیام پر واپس آتا کھانا کھا کر سہ پہر کو پھر چلا جاتا اور شام تک وہیں رہتا اس لیے بڑھی ہوئی مصروفیت کے پیش نظر مجھے لاہور دیکھنے کا بہت کم وقت ملا۔ جب کبھی فرصت ہوتی تو نہر کے کنارے جا کر بیٹھ جاتا اور مردوں، عورتوں اور بچوں کو وہاں آزادی سے نہاتے ہوئے دیکھ کر ان کی آزادی و بے حجابی پر حیرت بھی کرتا اور اس سے لطف بھی اٹھاتا۔

افسوس ہے کہ اپنی فطری عزلت پسندی اور مصروفیت کار کی وجہ سے میں یہاں کے اکابر علم و ادب سے نہ مل سکا۔ ڈاکٹر اقبال کے یہاں البتہ ایک دوبار حاضری دی، لیکن ان سے ملنے کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا کہ اقبال کو صرف پڑھنا چاہیے ان سے ملنا ضروری نہیں۔

چند ماہ کے بعد میں نے محسوس کیا کہ مولانا ظفر علی خاں مجھ سے کچھ کشیدہ سے رہنے لگے ہیں (جس کا سبب غالباً یہ تھا کہ کسی نے ان سے یہ کہہ دیا تھا کہ میں حکومت کا آدمی ہوں) لیکن اس کا اظہار انھوں نے کبھی نہیں کیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا سلیم اور میں دونوں وہاں سے چلے آئے۔ مولانا سلیم غالباً اپنے وطن چلے گئے اور مجھے مرزا اعجاز بیگ (جو اس وقت لاہور آئے ہوئے تھے) اپنے ساتھ ہانسی لے گئے۔

اس کے بائیس سال بعد جب ۳۴ء میں میں لکھنؤ سے پشاور گیا تو لاہور اسٹیشن پر اختر شیرانی، مولانا مہر اور رفیع اجمیری تشریف لائے اور وہیں ان سے سرسری ملاقات ہو گئی۔ پشاور سے لوٹتے ہوئے البتہ میں دو دن کے لیے ٹھہر گیا اور اختر شیرانی کا مہمان رہا۔ دسمبر کا زمانہ تھا اور بارش بھی ہو رہی تھی اس لیے باہر نکلنے کی ہمت نہ ہوئی اور یہاں کے اکابر و مشاہیر سے تبادلۂ خیال کا موقع نہ مل سکا۔

یہ ہے مختصر سی روئداد میری واقفیتِ لاہور کی جس کو نہ ضبطِ تحریر میں لانے کی ضرورت تھی اور نہ شائع کرنے کی۔ لیکن اگر میں اس بنا پر کچھ لکھنے سے انکار کر دیتا تو غالباً طفیل صاحب اسے نہ مانتے اس لیے ان چند سطروں کی حیثیت امتثالِ امر سے زیادہ نہیں۔ ہاں اگر وہ پورے پنجاب کو اس موضوع میں شامل کر دیتے اور لاہور کی تخصیص ہوتی

تو البتہ یہ داستان بڑی دلچسپ ہوتی۔

جنّتِ دیگر

شوکت تھانوی

اگر آپ مجھ کو آئینہ دکھانے کی کوشش نہ کریں اور "یہ منہ اور مسور کی دال" کی قسم کے طعنے نہ دیں تو میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مجھ میں اور ملکہ نور جہاں میں ایک عجیب و غریب قسم کی مماثلت موجود ہے۔ میں آپ سے پھر ایک مرتبہ یہ عرض کر دوں کہ اس موقع پر اگر آپ میری جگہ ہوتے اور میں آپ کی جگہ تو اس قسم کے دعوے کے سلسلہ میں یہ مصرع میں خود بھی پڑھتا کہ۔ ؎

چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

مگر آپ یہ مصرع پڑھنے سے پہلے براہ کرم یہ یقین کر لیں کہ میں ملکۂ نور جہاں کے حسن اور مرتبہ وغیرہ کے سلسلہ میں یہ بات نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ مماثلت صرف یہ ہے کہ کشتۂ لاہور وہ بھی تھیں اللہ بخشے اور میں بھی لاہور ہی کا دم بھر رہا ہوں اور اس وقت سے لاہور کا عشق مجھ پر طاری ہے جب اگر سچ پوچھئے تو میں لاہور کا نادیدہ عاشق تھا۔ ملکۂ نور جہاں نے تو لاہور کے متعلق صرف یہی کہا ہے کہ ؎

لاہور را بہ جان برابر خریدہ ایم
جان دادہ ایم و جنّتِ دیگر خریدہ ایم

مگر میں اس سے بہتر شعر لاہور کی شان میں کہنے کی کوشش کرنے کے لیے زندگی کی مہلتیں حاصل کرتا چلا جا رہا ہوں اور انشاء اللہ اس وقت تک نہ مروں گا جب تک اس سے بہتر شعر لاہور کی شان میں نہ کہہ لوں۔ امید ہے کہ اس بہانے مجھ کو عمرِ خضر حاصل ہو کر رہے گی یعنی "نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچیں گی" نہ اس سے بہتر شعر کہہ سکوں گا نہ مروں گا۔

لاہور سے یہ نادیدہ عشق مجھ کو اس وقت سے ہے جب میں نے اردو ٹٹولنا شروع کر دی تھی اور میرے نام اخبار پھول جاری کرایا گیا تھا جو لاہور سے نکلتا تھا۔ اس اخبار پھول کے علاوہ آپا جان کے نام ایک رسالہ بھی آتا تھا مخزن۔ وہ بھی لاہور ہی سے نکلتا تھا۔ امی جان کے نام ایک اخبار آتا تھا تہذیبِ نسواں وہ بھی لاہور ہی سے نکلتا تھا لہٰذا میں بچپن ہی سے بحکمِ الطرفین لاہور پرست چلا آ رہا ہوں اور بچپن ہی سے لاہور دیکھنے کی تمنا میرے دل میں کروٹیں لیتی رہی ہے۔ سمندِ شوق پہ ایک اور تازیانہ اس وقت ہوا جب میرے ایک خالہ زاد بھائی ڈاکٹری پاس کر کے گھر پہنچے اور مجھے یہ معلوم ہوا کہ یہ بھی لاہور ہی سے ڈاکٹری پاس کر کے آئے ہیں اور اس آؤ بھگت کے مستحق ثابت ہوئے ہیں جو ان کی ہو رہی ہے لہٰذا میں نے اب قطعی طور پر طے کر لیا کہ اس دنیا میں اگر کوئی شہر ہے تو صرف لاہور ہے اور یہ میری سب سے بڑی تمنا بن گئی کہ کسی طرح میں ایک نظر لاہور کو دیکھ تو لوں کہ آخر یہ لاہور جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی۔ عمر کے ساتھ ہی ساتھ یہ تمنا بھی پروان چڑھتی رہی یہاں تک یہ پھول پڑھنے والا مخزن پڑھنے لگا نیرنگِ خیال اور عالمگیر کے رسائل بھی اس کے نام آنے لگے جو سب کے سب لاہور ہی سے نکلتے تھے۔ عمر کی اس منزل پر پہنچ کر میں نے اپنے اکثر ساتھیوں کو دیکھا جو لندن۔ کلکتہ اور بمبئی جانے کے ارمان میں بیٹھے گھلا کرتے تھے مگر مجھ کو ان میں سے کسی گاؤں کو دیکھنے کا شوق نہ تھا بلکہ تعجب ہوتا تھا ان لوگوں پر جو لاہور کو چھوڑ کر ان مقامات کی سیاحت کے لیے مرے جاتے تھے میرے نزدیک ان تمام مقامات کا نام لاہور

کے بعد ہی آتا تھا اور میں نے سب سے پہلے لاہور دیکھنا اور لاہور جانا چاہتا تھا۔ میری یہ طلب صادق آخر کار ۱۹۲۸ء میں پوری ہوئی جب میری ایک عزیزہ نے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں ان کو ان کی سسرال پہنچا آؤں جو لاہور میں تھی۔ یہ سنتے ہی جی تو چاہا کہ میں ان کے قدموں پر گر کر جان دے دوں یا کم سے کم اس شریف زادی خاتون کو اپنے کندھوں پر بٹھا کر لاہور کی طرف روانہ ہو جاؤں مگر میں نے یہ مشکل تمام اپنے کو لئے دیئے رکھا البتہ خود اپنے کو شریک سفر بنانے کی افادیت پر دن میں کئی کئی مرتبہ اس وقت تک روشنی ڈالتا رہا جب تک کہ اس سفر پر روانہ نہیں ہوا کہ مبارک ہیں وہ جو میرے ساتھ سفر کرتے ہیں کہ میں ان کو ہر صعوبت سے محفوظ رکھتا ہوں پیاس لگنے سے پہلے ہی پانی لا کر دے دیتا ہوں۔ شریک سفر کو نیند آ جائے تو اپنی جگہ بھی اس کے لیے خالی کر کے خود کونے میں کھڑا ہو کر سیٹی بجاتا رہتا ہوں۔ بستر کھولنے، بچھانے اور پھر باندھنے میں تو چونکہ مجھ کو ملکہ حاصل ہے اس کا تو جواب ہی پیدا نہیں ہوا۔ قلیوں سے گفتگو کرنے کے جو آداب ہیں ان کا ہر ایک محرم نہیں ہوتا مگر یہ محض نیلی چھتری والے کی دین ہے کہ اس نے مجھ کو یہ توفیق عطا کر رکھی ہے۔ ریلوے ٹائم ٹیبل پڑھنے والے اس زمانہ میں بہت کم لوگ مل سکتے ہیں مگر میں نے اس فن پر بڑا ریاض کیا ہے ورنہ یہ بات آسانی سے ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آ سکتی کہ رات کے بارہ بجے چوبیس کیوں بجتے ہیں۔ "اپ" کس کو کہتے ہیں اور "ڈاؤن" کیا بلا ہے۔ خطرے کی زنجیر بغیر پچاس روپیہ جرمانہ ادا کئے کس وقت کھینچی جا سکتی ہے اس کا امتیاز بھی ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ع

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

مختصر یہ کہ وہ محترمہ میرے ان تجربات سے بے حد متاثر ہوئیں اور انھوں نے طے کر لیا کہ مجھ سے بہتر شریک سفر ان کو فی زمانہ ذرا مشکل ہی سے مل سکتا ہے نتیجہ یہ کہ وہ میرے ساتھ لاہور کے لیے روانہ ہو گئیں اور یہ واقعہ ہے کہ راستہ بھر میں نے بہت ہی ہوشمندی کا ثبوت دیا کہ ہر اسٹیشن کا نام ضرور پڑھ لیتا تھا تاکہ لاہور سمجھا پہنچ۔ اور بریلی وغیرہ بن کر گذر نہ جائے اور ہم ٹرین میں بیٹھے ہی رہ جائیں بلکہ میں نے تو لاہور پہنچ کر بھی جب تک تین چار مستند قلیوں سے تصدیق نہیں کر لی اس وقت تک لاہور کے پلیٹ فارم پر قدم ہی نہ رکھا۔

لاہور پہنچ کر ان عزیزہ کو تو پہنچا دیا ان کی سسرال اور اب چونکہ ان کی خوشامد اور دربارداری کی چنداں ضرورت نہ تھی لہذا ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ محترمہ میں ٹھہرا انشا پرداز آدمی یقین نہ آئے تو وہ رسائل اٹھا کر دیکھیے جن میں میرے مضامین چھپ چکے ہیں لہذا میرا تو آپ کی سسرال کے اس غیر ادبی ماحول میں دم ہی نکل جائے گا میں اپنی جان سے زیادہ آپ کو بھی عزیز نہیں سمجھتا اور خود اپنے کسی ادبی دوست کے یہاں قیام کرنا چاہتا ہوں۔ اور سیدھا پہنچا بارود خانہ میں جہاں میاں ایم اسلم رہتے تھے اور جن کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ مجھ سے خط و کتابت کی رسم نباہ رہے تھے۔ میاں ایم اسلم کا مہمان بن کر اور وہاں اپنا ٹھکانا بنا کر اب مجھ کو لاہور کے قابلِ دید مقامات کے دیکھنے کا شوق ہوا چنانچہ سب سے پہلے جس تاریخی مقام پر میں پہنچا وہ تھا دارالاشاعت جہاں سے پھول اور تہذیب نسواں شائع ہوتے تھے اور جہاں میں سید امتیاز علی تاج کو دیکھنا چاہتا تھا جن کا نام بچپن سے سنتا اور پڑھتا چلا آ رہا تھا۔ گول شیشوں کی عینک لگائے خالص لکھنوی ٹھپے کا بیل دار باریک کرتہ اور چست بلکہ پنڈلیوں میں پیوست چوڑی دار پاجامہ اور پیروں میں کامدار سلیم شاہی جوتا پہنے ایک جوان رعنا سید امتیاز علی تاج کی حیثیت سے ملے اور ان کے قریب ہی ایک صاحب چلم پینے کے انداز سے سگریٹ پیتے نظر آئے جن کے متعلق مجھے بتایا گیا کہ یہ مولانا چراغ حسن حسرت ہیں۔ چراغ تو خیر بجھا ہوا بھی ہو سکتا ہے

اور حسرت بھی ذرا سی کوشش سے انسان اپنے چہرے پر برسا سکتا ہے مگر اس پیکر میں مولانا ڈھونڈنا میرے لیے آسان نہ تھا مگر ظاہر ہے کہ سید امتیاز علی تاج نے غلط تھوڑی کہا ہوگا۔ اسی وقت ایک بیچ بچ کے مولانا سر پر صافہ باندھے اپنی نورانی سفید داڑھی کے ساتھ جو داخل ہوئے تو سب کے ساتھ مجھے بھی کھڑا ہونا پڑا معلوم ہوا کہ آپ ہیں شمس العلما مولوی سید ممتاز علی صاحب۔ یہ نام بھی میرے لیے نیا نہ تھا اور اس نام سے جو عقیدت تھی اس کے اظہار کا بھی موقع تھا مگر سوائے نہایت عقیدت اور سعادت مندی سے مصافحہ کرنے کے میں زبان سے ایک لفظ نہ کہہ سکا۔ مولوی صاحب کے جانے کے بعد جب ادھر ادھر کی باتیں شروع ہوئیں اور مولانا چراغ حسن حسرت نے خود مجھ کو مولانا کہنا شروع کیا اور وہ بھی نہایت چبا چبا کر تو معلوم ہوا کہ میں بھی ایک قسم کا پھنسا ہوا مولانا ہوں اور اب بجائے ان کے مجھ کو اپنے اندر چھپے ہوئے مولانا کی جستجو شروع ہوئی کہ اللہ اگر میں بھی مولانا ہو سکتا ہوں تو یہ مولانا آخر چیز کیا ہوتی ہے جس کا اپنے اندر خود مجھ کو آج تک احساس ہی نہیں ہوا۔ اس مختصر سی مجلس میں باتیں تو بہت سی ہوئیں مگر میں بے حد محتاط رہا کہ کہیں گفتگو میں املا کی کوئی غلطی نہ کر بیٹھوں۔ اسی رات میاں ایم اسلم کے گھر رات کے کھانے کے بعد ڈاکٹر تاثیر سے بھی ملاقات ہوئی اور تھوڑی ہی دیر کے بعد محسوس یہ ہوا کہ جیسے ڈاکٹر تاثیر سے آج پہلی مرتبہ نہیں ملا ہوں بلکہ نہ جانے کب کے نہایت بے تکلف قسم کے مراسم ہیں۔ دوسرے دن سر شیخ عبدالقادر سے ملنے جا پہنچا جن سے ملنے کے لیے دو وجوہ سے بیقرار تھا ایک یہ کہ ان کا مخزن پڑھ پڑھ کر بچپن سے لڑکپن اور لڑکپن سے جوانی تک پہنچا تھا دوسرے یہ کہ وہ میرے تایا شیخ حبیب احمد صاحب کے نہایت دیرینہ اور قریبی دوست تھے۔ یہ مجلس ایک طرف سے شفقت اور دوسری طرف سے سعادت اور عقیدت ہی تک محدود رہی ادبی گفتگو میں ان سے خاک کرتا وہ مجھ سے میرے تایا کی باتیں کرتے رہے اور میں ان کے ذریعے اپنے باپ کے بڑے بھائی سے متعارف ہوتا رہا۔ وہاں سے رخصت ہو کر جی چاہا کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال سے اگر نہ ملا تو واپسی میں کس منہ سے کہوں گا کہ میں لاہور گیا تھا۔ مگر اس بارگاہ میں جانے کی ہمت پیدا کرنا میرے لیے آسان نہ تھا نہ جانے کس طرح اپنے کو زبردستی کھینچتا ہوا وہاں تک پہنچا مگر دروازے پر پہنچ کر دل نے دھڑک کر کہا کہ "ایاز قدر خود شناسی" جی چاہا کہ بھاگ کھڑا ہوں۔ بس جہاں تک پہنچنے کے قابل تھا پہنچ چکا زیادہ حد ادب۔ مگر آخر کار ہمت کر کے دل کو سنبھالتا ہوا اس چارپائی تک جا ہی پہنچا جس پر ایک گاؤ تکیہ کا سہارا لیے ہوئے مشرق کا یہ عظیم شاعر حقے کے کش لے رہا تھا۔ میں نے جاتے ہی کپکپاتی ہوئی آواز میں کہہ دیا کہ میں لکھنؤ سے حاضر ہوا ہوں اور صرف یہ فخر حاصل کرنا چاہتا ہوں کہ میری رسائی یہاں تک ہو گئی۔ مگر علامہ اقبال نے نہایت شفقت سے اپنے قریب ہی مجھ کو جگہ دے کر اس بحث میں مجھ کو بھی شریک کر لیا جو میرے پہنچنے سے پہلے ان کی مجلس میں جاری تھی۔ اس بحث میں شرکت تو خیر میں کیا کرتا مولانا عبدالمجید سالک کی اور ان کی باتیں سن سن کر گرہ میں باندھتا رہا اور تھوڑی دیر کے بعد اجازت لے کر رخصت ہو گیا۔

یہ تھا میرا لاہور کا پہلا سفر جس سے واپسی پر اگر کسی نے جہانگیر کے مقبرے کی بات کی تو میں نے علامہ اقبال کی خدمت میں باریابی کی تفصیلات سنانا شروع کر دیں۔ اگر کسی نے شالامار باغ کی بات کی تو میں نے سید امتیاز علی تاج کی باغ و بہار شخصیت کا ذکر چھیڑ دیا۔ اگر کسی نے شاہی قلعے کے متعلق پوچھا تو میں سر شیخ عبدالقادر کے ذکر پر آ گیا۔ اس لیے کہ میں نے واقعی اپنے اس سفر میں وہ ہی کام کئے تھے یا ان اکابر سے ملا تھا یا میاں ایم اسلم کے افسانے سنے تھے۔ میری

بلا جانے کہ جہانگیر کا مقبرہ کیا ہے۔ شالامار باغ کیسا ہے اور شاہی قلعہ کس قسم کا ہوتا ہے۔ میں نے یہ مقامات نہ دیکھے نہ دیکھنا چاہیے مگر بغیر ان مقامات کو دیکھے میں لاہور پر کچھ اور بھی عاشق ہو کر واپس آگیا۔ لاہور سے وابستگی کچھ اور بڑھ گئی ایک مرتبہ لاہور کو دیکھ کر بار بار دیکھنے کی تڑپ لے کر لاہور سے رخصت ہو گیا۔

یہ طلب اس قدر صادق تھی کہ آخر کار لاہور میں ذرا تفصیلی قیام کا موقع ملا۔ پنچولی آرٹ پکچرز کی طرف سے یکایک ایک خط پہنچا کہ اگر تم فلمی کہانی نویس اور مکالمہ نگار کی حیثیت سے ہماری کمپنی میں آنا چاہو تو ہم سے آکر ملو۔ یہ تو پوچھنے کی بات ہی نہ تھی ایک تو فلم کمپنی دوسرے لاہور میں واقع فلم کمپنی۔ تنخواہ زیادہ۔ ماحول دلچسپ اور ترقی کے امکانات تیر کی طرح لاہور پہنچا اور سیٹھ دلسکھ پنچولی سے تمام معاملات طے کر کے لاہور ہی میں رہ گیا۔ جس لاہور کا بچپن سے شیدائی چلا آرہا تھا آخر کار اسی کی کشش نے مجھ کو کھینچ لیا۔ کچھ دن کے بعد ایک گزیٹڈ پوسٹ کی لالچ میں پھر لکھنؤ جا پہنچا مگر یہ درمیانی تین چار سال لکھنؤ میں بسر کر کے پھر لاہور آگیا اور اب کی مرتبہ جب تین چار سال لاہور میں رہ چکا تو میرے تلون کو دیکھتے ہوئے قدرت کو یہ انتظام کرنا پڑا کہ اس نے ہندوستان ہی کو تقسیم کر دیا اور مجھ کو بجائے ہندوستانی کے پاکستانی بنا کر لاہور ہی کو میرا مستقل وطن بنا دیا بچپن سے لاہور سے جو لگاؤ تھا اس نے آخر لاہور کو میرا اور مجھ کو لاہور کا بنا کر چھوڑا۔ اب میں خواہ کراچی میں رہوں یا بسلسلۂ ملازمت راولپنڈی میں مگر وطنی حیثیت لاہور ہی کو حاصل ہے اور اب میں بھی نہایت وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ؎

لاہور را بجاں برابر خریدہ ایم
جاں دادہ ایم و جنتِ دیگر خریدہ ایم

جی ہاں میں نے "جنتِ دیگر" لاہور ہی میں خریدی ہے۔ میری دوسری شادی لاہور ہی میں ہوئی ہے میں صحیح معنوں میں جنت نصیب بن چکا ہوں سسرال اور جنت میں جو فرق ہے وہ تو مرنے کے بعد ہی معلوم ہو سکتا ہے لیکن جیتے جی تو ایک متواضع سسرال ہی کو جنت کہا جا سکتا ہے۔

میری آرزو

رشید احمد صدیقی

مجبی۔ تسلیم۔ آپ نے ازراہِ محبت فرمائش کی ہے کہ نقوش کے لیے لاہور پر کچھ لکھ کر بھیج دوں۔ عزیزوں اور دوستوں کا کہنا بڑی مشکل سے ٹال سکتا ہوں۔ لیکن شوق اور ذمہ داری کے کاموں کو بہت کم کر دیا ہے۔ محض برائے نام اور بڑی مجبوری سے کبھی کبھی کرنا بھی پڑتا ہے۔ اپنی اس معذوری اور بے دلی کی بنا پر دوستوں اور عزیزوں سے اس کا متمنی رہتا ہوں کہ مجھے اس طرح کی فرمائشوں سے معاف رکھا کریں ـــــ یوں بھی لاہور سے کچھ زیادہ واقف نہیں ہوں۔ زندگی میں صرف دو بار وہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ پہلی بار علامہ اقبال سے شرفِ نیاز حاصل کرنے پھر کوئی بارہ تیرہ سال بعد مرحوم کی رحلت کی خبر سن کر دعائے مغفرت مانگنے حاضر ہوا تھا۔ دو ایک دوستوں سے ملا ایک آدھ تاریخی مقامات دیکھے اور بس۔ آپ ہی فرمائیں اس پر کیا لکھوں۔ البتہ یہ چاہتا ہوں کہ جس لاہور سے علامہ اقبال اٹھے جنھوں نے ہم کو آپ کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا اور نئی بصیرت اور نئے حوصلے دیئے وہیں سے ایک نئے سرسید اور نئی علی گڑھ تحریک کا ظہور ہو۔ ملت کے استحکام کے لیے

پھر اقبال کے بعد ایک سرسید کا آنا بہت ضروری ہے۔ مقدم و مؤخر سے قطع نظر، ہر قوم پستی سے بلندی کی طرف آنے کے لیے ایک اقبال اور ایک سرسید کی محتاج رہے گی۔ یہ اور بات ہے کہ ہر قوم اور ملک اپنی اپنی نہاد کے اعتبار سے اپنے اپنے اقبال اور سرسید اور علی گڑھ تحریک پیدا کرتی رہتی ہے: آپ سوچیں گے تو میری آرزو یا دعا کو بالکل بے سروپا نہ محسوس کریں گے دعا مانگنا بڑا آسان مشغلہ ہے بالخصوص جبکہ وہ "دعائے کہنہ سالان" ہو اس لیے بہت کم مقبول بھی ہوتی ہے آپ نوجوانوں سے درخواست ہے کہ دعا مجھے مانگنے دیں اور اس کے قبول ہونے کے امکان کو اپنی کوششوں سے بڑھائیں!

نورجہاں کے مزار پر

احسان دانش

شاہدرہ کی یہ زمیں یہ غم و عبرت کا دیار
ذرہ ذرہ ہے یہاں گردشِ دوراں کا شکار

خستگی لوٹتے خس و خار پہ ہے چھائی ہوئی
کہنگی بدلتے ماحول پہ منڈلائی ہوئی

خشک مٹی پہ یہ سوکھی ہوئی بوندوں کے نشاں
بیتتے وقت پہ دم توڑتے لمحوں کا گماں

نیلگوں دھند کے دریا میں یہ ٹھنڈک کا رچاؤ
یہ اندھیروں کے مضافات دھندلکوں کے پڑاؤ

یہ زبوں حال فضا، نورجہاں کا یہ مزار
جس کو ہر وقت سے گھیرے ہوئے راہوں کا غبار

بے ضیا شمعِ جہانگیر اسی خاک میں ہے
حسن کیا عشق کی تفسیر اسی خاک میں ہے

یہ ابابیلوں کا مسکن یہ خموشی کا مقام
وادیٔ خواب میں شبِ رنگ اجالوں کا قیام

لالہ و گل کا یہ مشہد یہ محبت کا حرم
یہ تجلی کے شوالے میں سیاہی کا صنم

جیسے اندوہ کی بستی غم و حرماں کا نگر
رات کو جیسے کٹی فصل کے خرمن پہ نظر

واب شاہی خس و خاشاک پہ مجبورِ نیاز
وقت کے غار میں یہ سنبل و ریحاں کا جہاز

رنگ دلہن کا یہ جزیرۂ غم و حرماں بکنار
یہ حوادث کی کمیں گاہ یہ زندانِ بہار

زمزموں کا یہ بسیرا یہ خموشی کا محل
سائے کی سطح پہ معصوم مصور کا عمل

سرد شعلوں کی گپھا، مردہ چراغوں کا وطن
دامنِ دشت میں مہتاب کا بھرپور گہن

اُف یہ ظلمات کا ٹیلا، یہ سیاہی کی چٹان
جیسے پانی سے جلے کھیت میں دہقاں کا مچان

ڈر سے سمٹی ہوئی راتوں کی سواری جیسے
شام کی پشت پہ کہرے کی عماری جیسے

دُور تہوار سے محروم بیٹھنے کی طرح ——— مینہہ کی بوچھاڑ میں بیٹھے ہوئے زینے کی طرح

جانے یہ جہل کا افسوں ہے کہ دولت کا فراغ

آج اس قبر پہ گل ہیں نہ محبا ور نہ چراغ

سبج سے جس کی سمٹتے تھے مہکتے ہوئے پھول ——— اب کوئی پوچھنے والا نہیں تعویذ کی دھول

اب مغنّی کے ترانے نہ کنیزوں کی صدا ——— سنسناتے ہوئے بے در و اندھیرے کے سوا

دُور بستی کے چراغوں کا سماں کیا کہیے ——— ننھے شعلوں پہ چتاؤں کا دھواں کیا کہیے

اژدہاؤں کی طرح راستے بل کھاتے ہوئے ——— شہر کی مہری ہر اک چاپ سے گھبراتے ہوئے

جس کو ہر صبح جگاتی تھی حسیں شہنائی

اس کی تربت پہ مسلّط ہے سیہ بینائی

ہر نفس پر دل مغموم یہ کرتا ہے سوال ——— یہ ہے شاہی کا نتیجہ یہ ہے انساں کا مآل

یہ سکوتِ ابدی اُس پہ اندھیرے کا جنوں

گم بیاباں میں محلّات کے نغموں کا فسوں

خاک پر ڈھیر یہاں شوکتِ سلطانی ہے

خواب ہیں خواب کے احساس کی ہمانی ہے

"اک معمّا ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا ——— زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا"

"لاہور ولا قوّہ"

خواجہ احمد عباس

"السلام علیکم"

"وعلیکم السلام"

"آپ کا وطن؟"

"لاہور"

"لاہور ولا قوّہ؟"

"جی؟ ——— آپ کا مطلب؟"

مطلب کچھ نہیں۔ صرف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں نو واردوں سے چھیڑ چھاڑ۔ یو۔ پی والوں اور پنجابیوں کی پرانی دوستانہ چشمک۔

میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ لاہور سے آئے ہوئے نوجوانوں کو اپنے شہر سے کس قدر محبت ہی نہیں عقیدت ہے۔ "لاہور ولاہور" کا نام آتے ہی چہرے کھل اٹھتے اور زبانیں چل پڑتی ہیں۔ مال روڈ۔ انارکلی۔ لارنس گارڈن۔ شالامار۔ ہر جگہ کا ذکر نہایت رومانی انداز میں کیا جاتا۔ اور ہم جو پنجابی نہیں تھے اور لاہور کبھی نہیں گئے تھے کھسیانے ہو کر کھمبا نوچنے لگتے یعنی خواہ مخواہ لاہور اور پنجاب کی ہجو کرنے لگتے۔

میں لاہور پہلی بار شاید ۱۹۳۴ء میں گیا تھا۔ ایک آل انڈیا ڈیبیٹ کے سلسلے میں۔ لیکن بچپن سے ہی یہ شہر میرے ذہن کے افق پر چمکتا رہا تھا۔

لاہور۔ جہاں سے ہر ہفتے "پھول" اخبار آتا تھا اور دارالاشاعت پنجاب لاہور کی شائع کی ہوئی دلچسپ کتابیں۔ لاہور جہاں سے ہماری بڑی بہنوں کے لیے "تہذیب نسواں" آتا تھا۔ اور نانا ابا کے لیے "پیسہ اخبار"۔

پھر جب ہم کالج میں پہنچے اور اردو ادب میں دلچسپی لینے لگے تو لاہور ہمارے لیے "نیرنگ خیال" بن گیا۔ "ہمایوں" اور پھر "ادب لطیف" بن گیا۔

پھر انقلابی سیاست کا زمانہ آیا۔ لاہور راوی کا وہ کنارہ بن گیا جہاں ایک اکتیس دسمبر کی رات کو جواہر لال نہرو نے مکمل آزادی کا پرچم بلند کیا تھا۔ لاہور ہمارے لیے بھگت سنگھ بن گیا۔ لاہور کی سنٹرل جیل میں بھگت سنگھ، سکھ دیو اور راج گرو کو پھانسی دی گئی تو علی گڑھ میں ہم بھوک ہڑتال کر کے دو دن تک روٹھے رہے۔

اور پھر میں پہلی بار لاہور گیا۔ اس پہلی "ملاقات" کو اب چوتھائی صدی گزر چکی ہے لیکن دل پر وہ نقش اب بھی تازہ ہے۔

لاہور۔ دسمبر کا مہینہ۔ ایک خوشگوار صحت بخش موسم۔ جب رات کو اوور کوٹ پہن کر مال روڈ پر گھومنے کو جی چاہتا تھا۔ اور دن کو دھوپ میں لارنس گارڈن کی ہری ہری گھاس پر لیٹنے کو جی چاہتا تھا۔ جب بھوک بے تحاشا لگتی تھی۔ جب بدن میں خون کی روانی تیز ہو جاتی تھی۔ بوڑھے اپنے آپ کو جوان اور جوان اپنے آپ کو بچہ محسوس کرتے تھے۔

لاہور۔ مال روڈ پر خوش پوش، جامہ زیب اور صحت مند لڑکوں اور لڑکیوں کے غول کے غول۔ لاپرواہی سے اڑتے ہوئے رنگین دوپٹے۔ چست قمیصیں۔ ہوا میں پھڑپھڑاتی ہوئی سلک کی شلواریں۔

لاہور۔ شالامار میں کھلتے ہوئے گلاب کے پھول۔

لاہور۔ "لاہور کا جغرافیہ" کے مصنف پطرس بخاری سے ملاقات۔ ایک بڑا پروفیسر جو طالب علموں سے دوستوں کی طرح ملتا تھا۔ جو انگریزی ادب کا عالم اور اردو ادب کا رسیا۔ جس کی گفتگو میں دنیا کا ہر موضوع سمایا ہوا تھا۔ ادب، تاریخ، سیاست، آرٹ۔ اور پھر اتنا شگفتہ مزاج اتنا دلچسپ انداز بیان کہ مسلسل سات گھنٹے باتیں کرنے کے بعد بھی جی نہیں بھرا۔

لاہور۔ نائٹ کلب اور کیبرے۔ علی گڑھ کے "خشک" ماحول سے آئے ہوئے نوجوانوں کے لیے زندگی کا ایک

نیا تجربہ۔ سنسنی خیز و ہیجان انگیز۔ ایک دلفریب خواب۔ ایک گھناؤنی حقیقت۔

لاہور۔ کافی ہاؤس میں ادیبوں اور شاعروں کے جمگھٹ۔ سیاسی ہنگامے اور ادبی مباحثے۔ تیز دماغ۔ تیز زبانیں۔ ترقی پسند رجحانات۔ مذہبی جوش اور فرقہ وارانہ تعصبات۔ مگر اجنبی کے لیے ہر وقت پریشانی کا سامنا۔ کون ہندو ہے؟ کون مسلمان ہے؟ ایک زبان۔ ایک لباس۔ ایک معاشرت۔ ایک تمدن۔ رام کے بیٹے لو کے نام پر بسائے ہوئے لاہور میں ہندو "رب رہا" اور "خدا" کی قسم کھاتے تھے۔ مسلمان بیساکھی کا تہوار مناتے تھے۔

میں ہفتے بھر کے بعد لاہور سے لوٹ آیا مگر چپکے سے لاہور کو اپنے دل میں سمیٹ لایا۔

اس کے بعد میں کئی بار لاہور گیا۔ ۱۹۴۶ء میں کئی مہینے وہاں رہا۔ ایک فلم بھی وہاں کے ایک اسٹوڈیو میں بنائی۔

اب میرے لیے لاہور ایک شہر نہیں ہے۔ ایک یاد ہے۔ شالامار میں کھلے ہوئے گلابوں کی اڑتی اڑتی سی خوشبو ہے۔ کلچے چھولے کا چٹخارہ ہے۔ رنگین آنچلوں کی ایک جھلک ہے۔ گرمیوں کی دوپہر میں مال پر دھول اڑاتی ہوا کا ایک بگولہ ہے۔ سردیوں کی رات میں اوورکوٹ کو بھی چیرتی ہوئی برفیلی سرد ہوا کا ایک جھونکا ہے۔

لاہور؟ میرے لیے لاہور "ادب لطیف" ہے "سویرا" ہے "نقوش" ہے۔ حلقۂ ارباب ذوق ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین ہے۔

لاہور۔ فیض احمد فیض ہے۔ راجندر سنگھ بیدی ہے۔ احمد ندیم قاسمی ہے، اوپندر ناتھ اشک ہے۔ لاہور کرشن چندر ہے۔ ظہیر کاشمیری ہے، قتیل شفائی اور امرتا پریتم ہے۔ لاہور ساحر لدھیانوی ہے، محمد طفیل ہے، راما نند ساگر ہے، چودھری نذیر احمد ہے، لاہور امتیاز علی تاج ہے، پنڈت سدرشن ہے، حکیم یوسف حسن ہے اندر سین جوہر ہے۔ لاہور سبط حسن ہے جو لاہور کا نہیں تھا مگر اب لاہوری نمک بن چکا ہے۔ اور ..... اور ..... میرے دل کے نقشے پر لاہور خواجہ حبیب علی ہے اور خواجہ محبوب علی ہے اور نجم الحسن نقوی ہے اور میری بہن محمد فاطمہ ہے ..... ہر وہ رشتے دار اور دوست اور ساتھی ہے جو پہلے لاہور میں نہیں تھا اور اب لاہور میں ہے۔ یہ لاہور میرے دل میں قید ہے اور وزیرا افسروں کی "نہیں" کے باوجود اس لاہور سے مجھے کوئی دور نہیں رکھ سکتا۔

میں دس بار لاہور گیا ہونگا یا لاہور سے گزرا ہونگا۔ مگر میں نے جہانگیر کا مقبرہ نہیں دیکھا۔ کبھی نور جہاں کی قبر پر فاتحہ نہیں پڑھی۔ نہ بادشاہی مسجد کے اندر گیا ہوں نہ رنجیت سنگھ کی سمادھی دیکھی ہے۔ مجھے مردہ عمارتوں سے زیادہ زندہ انسانوں میں دلچسپی ہے۔ میں نے صرف دولنگا ریستوران دیکھا ہے۔ کافی ہاؤس دیکھا ہے۔ مکتبۂ اردو کا دفتر دیکھا ہے۔ پنچولی اسٹوڈیو (جو ہوا کرتا تھا) دیکھا ہے۔ لارنس گارڈن کا اوپن ایئر تھیٹر دیکھا ہے۔

مجھے نور جہاں کا مزار یا انارکلی کا مقبرہ دیکھنے کی اب بھی کوئی تمنا نہیں ہے۔

منٹو کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کی آرزو ضرور ہے۔

مگر منٹو آج زندہ ہوتا تو ایک زوردار قہقہہ مار کر کہتا "بس اتنی سی حماقت کے لیے اتنی دور جاؤ گے۔ لاہور والا تو نہ ؟"

غالب مال روڈ لاہور پر

راجہ مہدی علی خاں

(۱)

ہزاروں لڑکیاں ایسی کہ ہر لڑکی پہ دم نکلے
بہت نکلے حسیں سڑکوں پہ لیکن پھر بھی کم نکلے

بھرم کھل جائے گا ان سب کی قامت کی درازی کا
جو ان کی "سیٹ شدہ" زلفوں کا کچھ بھی پیچ و خم نکلے

ملی آزاد نظموں کی طرح اِن کو بھی آزادی
وہ آزادی کہ جس کو دیکھ کر شاعر کا دم نکلے

کوئی ہے آ کے جو ان سب کے ایڈریس ہم کو لکھوا دے
ہوئی شام اور گھر سے جیب میں رکھ کر قلم نکلے

گھروں سے سب نکل آئی ہیں "ٹاٹا" کہہ کے پردے کو
کہ گر نکلے تو سب عشّاق کا سڑکوں پہ دم نکلے

گیا عہدِ کہن اور شاعروں کی آج بن آئی
جو "از راہِ ستم" "چھپتے تھے" "از راہِ کرم" نکلے

چلے آئے ادھر ہم بھی جوانی کا علَم لے کر
کہ جن سڑکوں پہ جیتے ہیں اُنھی سڑکوں پہ دم نکلے

(۲)

نکلنا نوکروں کا گھر سے سُنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر تیری کوٹھی سے ہم نکلے

تیرے کتے بھی سارے شہر میں اتراتے پھرتے ہیں
کبھی بھی تیری کوٹھی سے نہیں وہ "سر بہ خم" نکلے

کہاں مے خانے کا دروازہ غالب اور کہاں سلمیٰ
پر اتنا جانتا ہوں کل وہ آتی تھی کہ ہم نکلے

چائے خانے

ہوش ترمذی ایم اے

چائے اور قہوے کا تعلق شعر و ادب کے ساتھ کچھ اس دور کی پیداوار نہیں۔ یہ تعلق بہت قدیم ہے۔ تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو قہوہ خانے کا ادارہ جمہوریت کی ارتقاء کے ساتھ سترھویں صدی میں قائم ہوا۔ سترھویں صدی کے نصف آخر میں لندن میں جگہ جگہ قہوہ خانے کھل گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ترکی سے قہوہ برآمد کیا جانا شروع ہوا چنانچہ لندن کی تاریخ میں جس پہلے قہوہ خانے کا حال ہمیں ملتا ہے وہ ۱۶۵۹ء میں قائم ہوا تھا۔ انگلستان میں شاہی خاندان کی حکومت ۱۶۶۰ء میں دوبارہ قائم ہوئی تو جمہوری خیالات برطانوی قوم میں عام ہو چکے تھے اور جمہوری تقاضوں کے ماتحت اور تعلیم کے رواج پانے کے باعث مساوات کا جذبہ پھیلتا جا رہا تھا چنانچہ مختلف طبقوں اور مختلف پیشوں کے افراد آپس میں مل جل کر بیٹھنے لگے اور باہمی ملاقات کے مرکز قہوہ خانے قرار پائے۔ انگریزی ادب میں یہ دور کلاسیکی دور کہلاتا ہے۔ یہ دور ادبی آمریت کا دور تھا۔ چند بڑے بڑے ادیب و شاعر معاشرے میں ادبی آمر خیال کیے جاتے تھے اور ہر آمر کے گرد و پیش اس کے ماننے والوں کا ایک پورا حلقہ ہوتا تھا چنانچہ ہر آمر کا کوئی مخصوص قہوہ خانہ مقرر تھا جہاں وہ اپنے مداحوں کے ساتھ بیٹھتا تھا۔ اس طرح مختلف قہوہ خانے مختلف حلقوں کے لیے مخصوص ہو گئے۔ اس دور کا پہلا ادبی آمر ڈرائڈن (DRYDEN) تھا۔ اس کی نشست کے لیے ایک قہوہ خانہ مخصوص تھا۔ اسی طرح کانگریو (CONGREVE) ایڈیسن (ADDISON) اسٹیل (STEELE) پوپ (POPE) ڈاکٹر جانسن (JOHNSON) غرض کہ اس دور کے تمام نمایاں ادیب و شاعر اسی مسلک پر عمل پیرا تھے اور ان کے بیٹھنے کے لیے الگ الگ قہوہ خانے تھے۔

قہوہ خانوں میں ان انگریز ادیبوں اور شاعروں کا بیٹھنا محض وقت گزاری ہی کی خاطر نہ تھا۔ اس دور کے شعر و ادب میں مطالعۂ انسانیت کو اعلیٰ ترین مقام حاصل تھا۔ شعر و ادب کے دو مخصوص شعبے اخلاقی درس اور معاشرے کے خلاف طنز سے متعلق تھے چنانچہ شاعروں اور ادیبوں پر لازم آتا تھا کہ وہ انسانیت کا مشاہدہ اور مطالعہ کریں۔ اس کے لیے قہوہ خانے سے بہتر کوئی جگہ ان کی نظر میں نہ تھی۔ قہوہ خانوں میں تھوڑے سے وقت میں اتنا کچھ حاصل کر سکتے تھے کہ جتنا ضخیم کتابوں سے حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ گویا قہوہ خانے کی حیثیت دار المطالعہ کی سی تھی اور شاعر و ادیب کی حیثیت مطالعہ و مشاہدہ کرنے والے کی۔ ہر قسم اور ہر طبقے کے شوقین لوگ جو ان قہوہ خانوں میں جمع ہوتے تھے ادیب و شاعر کو دعوتِ فکر و مشاہدہ دیتے تھے۔ علاوہ ازیں مل جل کر بیٹھنے سے شاعر و ادیب آپس میں تبادلۂ خیالات کر سکتے تھے۔ جمہوری دور میں تبادلۂ خیالات کرنا ادیبوں اور شاعروں کے معمولات میں سے ہے لیکن پچھلے دور میں جس کو جاگیردارانہ دور کہا جاتا ہے ادیب یا تو اپنے اپنے گھر پڑے رہتے تھے یا محفل آرائی منظور ہوتی تو شراب خانوں کا رخ کرتے تھے۔ یہ دونوں صورتیں مریضانہ ذہنیت پیدا کرتی تھیں۔ شراب نوشی شاعروں اور ادیبوں کی صحت پر مضر اثرات ڈالنے کے علاوہ خاصی مہنگی بھی پڑتی تھی۔ برخلاف اس کے قہوے کی ایک پیالی دوستوں کے ساتھ پینا معمولی سے معمولی حیثیت کے لیے بھی مشکل نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قہوہ خانے ادیبوں کے معاشرے میں بہت جلد مقبول ہو گئے۔ اس دور کے ادب کو ہم چاہیں تو قہوہ خانوں کا مدرسۂ فکر کہہ کر پکار سکتے ہیں۔

انیسویں صدی کے نصف آخر تک چائے نے انگلستان میں قہوے کی جگہ لے لی تھی اور قہوہ خانوں کی بجائے چائے خانے قائم ہو چکے تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ انگریزوں کے قدم ہندوستان، لنکا اور چین میں جم چکے تھے اور چائے بڑے پیمانے پر مشرقی ممالک سے

انگلستان پہنچنے لگی تھی۔ رفتہ رفتہ چائے انگلستان کا قومی مشروب بن گئی اور انگریزوں کی برکت سے خود ہندوستان میں بھی چائے خانے قائم ہونے لگے۔ اگرچہ انگلستان میں چھوٹے پیمانے پر چائے نوشی اٹھارویں صدی سے قائم تھی لیکن یہ صرف مالدار گھرانوں تک محدود تھی ہندوستان میں چائے خانے اوّل اوّل ساحلی مقامات پر کھلے اور بتدریج بڑے شہروں میں قائم ہوئے لیکن پنجاب عرصے تک چائے کے اثرات سے محفوظ رہا۔ یہاں چائے نوشی بیسویں صدی کے ربع اوّل تک مقبول نہ ہوئی تھی۔

اور شہروں کا تو ذکر ہی کیا ہے خود لاہور میں بیسویں صدی کے ربع اوّل میں چائے خانے اتنے کم تھے کہ ان کا عدم وجود تقریباً یکساں تھا مثلاً پورے انارکلی بازار میں صرف ایک چائے خانہ تھا جو دہلی مسلم ہوٹل کہلاتا ہے۔ یہ چائے خانہ شفیع کی سرائے کے بالمقابل تھا جہاں اب باٹا کی بڑی دوکان ہے یعنی یہ پیسہ اخبار سٹریٹ کے سرے پر تھا۔ غرض کہ بیسویں صدی کے ربع اوّل میں نہ تو عرب ہوٹل تھا، نہ نگینہ بیکری تھی، نہ کافی ہاؤس اور نہ پاک ٹی ہاؤس۔ یہی وہ چند چائے خانے ہیں جو لاہور کے ادیبوں کی نشست کے لیے مشہور ہیں مگر وہ جو کہا جاتا ہے (TEA FOR TWO AND TWO FOR TEA) یعنی جب دو شخص جمع ہو جائیں تو چائے نوشی کی گنجائش ہے اور اگر چائے میز پر آ جائے تو کم از کم دو پینے والے ضرور ہوں۔ ان دنوں بھی چند ادیب و شاعر دہلی مسلم ہوٹل کے چائے خانے میں یا شفیع کی سرائے (دہلی مسلم ہوٹل کا مہمان خانہ) میں جمع ہو جاتے تھے۔ جب بیدل شاہجہان پوری "مخزن" کے مدیر ہوئے اور انھوں نے شفیع کی سرائے میں رہنا شروع کیا تو پطرس بخاری، مولانا عبدالمجید سالک، امتیاز علی تاج وغیرہ ان کے کمرے میں جمع ہو جاتے تھے اور چائے نوشی ہوتی تھی۔ یہ بات ۱۹۱۸-۲۰ء کی ہے۔ تاہم دہلی مسلم ہوٹل کو لاہور کے ادبی مراکز میں شامل نہیں کیا جا سکتا، اس لیے کہ اس کے ساتھ ادبی روایت مربوط نہیں ہے۔ البتہ جب ۱۹۲۶ء میں عرب ہوٹل اور نگینہ بیکری میں شاعر و ادیب جمع ہونے لگے تو ایک دور ایسا شروع ہوا جسے ادب میں چائے خانوں کا دور کہا جا سکتا ہے۔ یہ دور آج بھی جاری و ساری ہے۔ یوں تو ۱۹۲۵ء کے بعد سے چائے نوشی کا رواج اہلِ لاہور میں عام ہوا اور جگہ جگہ چائے خانے کھل گئے لیکن زیرِ نظر مقالے میں ہمارے سامنے وہ چند چائے خانے ہیں جو ادب کے مرکز کہلا سکتے ہیں اور جنھیں ادبی چائے خانے کہنا مناسب ہے۔ اس ذیل میں عرب ہوٹل، نگینہ بیکری، کافی ہاؤس اور پاک ٹی ہاؤس ادبی خصوصیت کے ساتھ آتے ہیں۔ ویسے جہاں بھی چند ادیب یکجا ہو جائیں محفل جم جاتی ہے۔ چائے پینے کے لیے جس طرح وقت کی قید نہیں اسی طرح ادیبوں کے مل بیٹھنے کے لیے ضروری نہیں کہ انہی چائے خانوں میں سے کوئی ہو۔

لاہور پنجاب کا دل ہے۔ وہ پنجابی مثل تو آپ نے سنی ہوگی کہ اگر کسی نے لاہور نہیں دیکھا تو وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ مغربی پاکستان کا صوبہ معرضِ وجود میں آنے کے بعد اب یہ کہنا بجا ہوگا کہ لاہور مغربی پاکستان کا دل ہے اس لیے کہ لاہور مغربی پاکستان کا مرکزی مقام ہے۔ یہ علاقہ اپنی تاریخی، عمرانی، صنعتی اور معاشی خصوصیات کے اعتبار سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس علاقے کی اپنی روایات و خصوصیات ہیں جن کا عکس شہر لاہور میں اپنی پوری رنگا رنگی کے ساتھ نظر آتا ہے۔ دراصل کسی مقام کی عظمت و اہمیت اس تہذیبی و ثقافتی روایت سے وابستہ ہوتی ہے جو وہاں کے رہنے والے قائم کرتے ہیں۔ تہذیب و ثقافت کوئی انفرادی عمل نہیں بلکہ ایک مجموعی طرزِ حیات کا نام ہے جو شعوری اور غیر شعوری طور پر اہلِ علم اور اہلِ فکر کے ہاتھوں تشکیل پاتا ہے۔ یہی وہ طبقہ ہے جو قبولِ عام اور شہرتِ دوام کی بلندیوں کو چھوتا ہے۔ تہذیب و ثقافت کے ورثے کی نمائندگی انہی لوگوں کے ذمے ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ معاشرے کے مؤثر افراد اگر کسی مقام کو اپنے اٹھنے بیٹھنے ملنے جلنے اور تبادلۂ خیالات کرنے کی جگہ مقرر کر لیں تو وہ جگہ بھی تاریخی حیثیت اختیار کر جائے گی۔ اس

اعتبار سے لاہور کے چند مخصوص چائے خانے ادب کے گہوارے ہیں یوں تو جب سے چائے کا رواج عام ہوا ہے۔ ہمارے ملک کی شہری آبادی کا ایک حصہ خوش وقتی کی خاطر اور کچھ دیر ہنسنے بولنے کے لیے چائے خانوں میں بیٹھنے لگا ہے چنانچہ مزدوروں سے لے کر معززین شہر تک ہر ایک اپنے وقت کا کچھ حصہ چائے خانوں کی نذر کرتا ہے۔ شام کا وقت ہوا اور لوگ کسی چائے خانے میں جا بیٹھے۔ لاہور میں بھی بلاشبہ سینکڑوں ہی چائے خانے ہیں جن میں بیٹھنے والے مختلف تہذیبی درجے کے لوگ ہوتے ہیں اسی طرح ان چائے خانوں کے معیار بھی الگ الگ ہیں لیکن ارباب علم و ادب کی محفلیں چند مخصوص چائے خانوں ہی میں جمتی رہی ہیں۔ شیزان، اگارڈینیا، کسینو، ہیکو، ڈل پوسٹے مال روڈ پر جگمگا رہے ہیں اور اہل زر کو دعوت عام دے رہے ہیں۔ یہاں آپ کو بڑے سے بڑے سرکاری افسر، تاجر اور رئیس نظر آئیں گے لیکن ادیب و شاعر شاید ان میں سے کوئی نہ ہو گا البتہ اسی مال روڈ پر چینیز لنچ ہوم، کافی ہاؤس، پاک ٹی ہاؤس، وائی۔ ایم سی اے ریسٹورنٹ پڑھے لکھے لوگوں، شاعروں، ادیبوں، طالب علموں، پروفیسروں اور درمیانی درجے کے سفید پوشوں کی توجہ اپنی طرف کھینچتے ہیں میکلوڈ روڈ پر جا نکلئے تو رائل پارک میں پاکیزیا اور ٹی لائٹ میں فلمی شاعروں، ادیبوں اور فلم کے شوقینوں کا مجمع نظر آئے گا۔ انارکلی بازار میں سے گزریئے تو سرے ہی پر نگینہ بیکری ہے۔ اب تو یہ اجڑی ہوئی سی نظر آتی ہے مگر کبھی اس پر بھی شباب تھا۔ ریلوے روڈ پر اسلامیہ کالج کے صدر دروازے کے سامنے عرب ہوٹل ہے جو ایک تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ نگینہ بیکری اور عرب ہوٹل ادیبوں اور شاعروں کی آماجگاہ رہ چکے ہیں اسی طرح چائے خانوں کی گنتی کی جائے تو اس کے لیے ایک دفتر درکار ہو گا لیکن ہمیں اس وقت صرف انہی چائے خانوں سے سروکار ہے جن میں شاعر اور ادیب بیٹھتے چلے آئے ہیں اور یہ تعداد کے اعتبار سے کچھ زیادہ نہیں۔

لاہور میں چائے خانوں کی زندگی اس قدر لذت بخش ہے کہ جسے وہاں بیٹھنے کا چسکا پڑ گیا وہ عدالت سے غیر حاضر ہو سکتا ہے، نوکری پر لات مار سکتا ہے مگر چائے خانے میں جانا نہیں چھوڑ سکتا۔ آپ کو متعدد حضرات لاہور کے چائے خانوں میں ایسے نظر آئیں گے جنھوں نے اپنی معاشی بہتری کے مواقع فقط اس سبب کھو دیے کہ انھیں لاہور سے باہر جانا پڑتا جہاں نہ ایسے چائے خانے ہیں، نہ ایسی پُرلطف زندگی۔ ان چائے خانوں میں آپ کو بعض ایسے لوگ ملیں گے جو بیس بیس سال بلکہ تیس تیس سال سے ریاضت کر رہے ہیں ان میں سے کوئی اپنے مخصوص چائے خانے کا جانا ترک نہیں کر سکتا۔ ان چائے خانوں میں سے بعض قیام پاکستان سے پہلے کے ہیں اور بعض بعد کی پیداوار ہیں۔ شوقین حضرات کا یہ عالم ہے کہ ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو کسی خاص چائے خانے میں اسی وقت سے نہ بیٹھ رہا ہو جب وہ چائے خانہ قائم ہوا تھا۔ ادیب، شاعر، مصنف، پبلشر، وکیل، تاجر، سیاسی کارکن، معاشرتی تحریکوں میں دلچسپی رکھنے والے غرضیکہ ہر طبقے میں ایسے نمائندے آسانی کے ساتھ مل جائیں گے جن پر شام کے وقت کسی نہ کسی چائے خانے میں بیٹھنا فرض ہو گیا ہے۔ مشاہیر لاہور میں سے بہت سے ایسے بھی ہیں جو اسی لاہور کی کوچہ گردی کے سند یافتہ اور انہی چائے خانوں کے پلے بڑھے ہوئے ہیں۔ معاشرہ اگرچہ ان لوگوں کو ان کی علمی و ادبی خدمات کی وجہ سے آنکھوں پر بٹھاتا ہے لیکن خود ان کے بیٹھنے کا مقام یہ چائے خانے ہیں۔ ان میں سے بعض کسی بنا پر کہیں اور چلے گئے ہیں یا اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں تو آج تک ان کے بیٹھنے کے گوشے، نشستیں، صحبتیں اور لطیفے ان چائے خانوں کی تاریخ میں زندہ اور باقی ہیں۔ آج بھی لوگ ایک دوسرے سے کہتے ہوئے سنے گئے ہیں کہ فلاں صاحب اس میز پر اس طرح بیٹھا کرتے تھے اور فلاں صاحب کے بیٹھنے کے لیے وہ گوشہ مخصوص تھا اور فلاں موقع پر انھوں نے یہ لطیفہ سنایا تھا۔ اسی طرح آج بھی ان چائے خانوں میں مستقل بیٹھنے والے اپنے بیٹھنے کا ایک مخصوص انداز رکھتے ہیں

اور ان کے آنے جانے کا وقت بھی مقرر ہے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہوں گے کہ چائے خانے کی صحبت آدمی کو کسی اور کام کا نہیں چھوڑتی بعض اس کو دفع الوقتی خیال کرتے ہوں گے لیکن اصل میں چائے خانے کی صحبتیں بڑی غنیمت ہیں۔ ان کا ایک مقصد تو اس پیاس کا بجھانا ہے جو انسان میں دوسرے انسان کے ساتھ ملنے اور بیٹھنے کی ہوتی ہے۔ دوسرے یہاں اربابِ علم و ادب کی باہمی گفتگو سے جو معلومات باتوں باتوں میں سننے والوں کو پہنچتی ہیں، وہ بھاری بھاری کتابوں کو پڑھنے کے بعد بھی مشکل ہی سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ زندگی کے کتنے ہی مسائل ہیں جنھیں آدمی تنہا نہیں سلجھا سکتا آپس کی بات چیت میں طے ہو جاتے ہیں۔ ایسی مثالیں بھی لاہور کی تاریخ میں مل جائیں گی جب علمی ادبی سیاسی اور معاشرتی تحریکیں چائے خانوں سے شروع ہوئیں۔

بعض ادبی تحریکوں کی داغ بیل ریلوے روڈ کے عرب ہوٹل میں پڑی۔ عرب ہوٹل لاہور کے ادب نواز چائے خانوں میں قدیم ترین ہے۔ یہ ہوٹل کویت کے ایک عرب نے ۱۹۲۶ء میں کھولا۔ اس ہوٹل کی زندگی اسلامیہ کالج کی مرہونِ منت ہے۔ یہ کالج علی گڑھ یونیورسٹی کے بعد برِ صغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی سب سے بڑی درس گاہ ہے۔ اسلامیہ کالج کے اساتذہ اور طلبا ایک مدت سے عرب ہوٹل کو نوازتے چلے آتے ہیں۔ لاہور کے بڑے بڑے اربابِ علم و ادب کی نشست یہاں رہی ہے۔ ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۶ء تک عرب ہوٹل لاہور کا ادبی مرکز تھا۔ خواجہ دل محمد، ڈاکٹر تاثیر، سید عابد علی عابد، ابوالاثر حفیظ جالندھری — چراغ حسن حسرت، فضل کریم خاں درانی، پروفیسر فیاض محمود اور باری علیگ، عبدالمجید بھٹی عرب ہوٹل کے جانے پہچانے بیٹھنے والوں میں سے ہیں۔ کبھی کبھی آنے والوں میں مولانا عبدالمجید سالک مرحوم اور جناب تہر اور دوسرے مشاہیر بھی شامل ہیں۔ جب چراغ حسن حسرت نے "شیرازہ" نکالا تو ان کے ملنے والے یہیں جمع ہوتے تھے۔ کتنے ہی علمی معرکے اور ادبی ہنگامے اس دور کی یادگار ہیں —— "نیا زمندانِ لاہور" یہاں باجماعت اٹھتے بیٹھتے تھے۔ پھر جب آزادی کی تحریک شروع ہوئی تو اسلامیہ کالج کے پرستارِ آزادی نے بھی عرب ہوٹل کو اپنا مرکز بنایا اور صحافی تو آزادی سے قبل بھی ادھر ہی کا رُخ کرتے تھے۔ شہر کی خبروں پر تبصرے اور خیال آرائی یہیں ہوتی تھی اور سیاسی حریفوں کے مضامین اور نظموں کا جواب یہیں بیٹھ کر تیار کیا جاتا تھا۔ آزادی کے بعد وہ مجمع منتشر ہو گیا اور وہ صحبتیں ختم ہو گئیں لیکن لاہور کی ادبی تاریخ میں عرب ہوٹل کا نام آج بھی زندہ ہے اور اسلامیہ کالج کے اساتذہ اور طلبا اب بھی یہاں بیٹھتے ہیں۔

مال روڈ سے انار کلی بازار میں داخل ہوتے ہی سرے پر ایک مشہور چائے خانہ ہے جو بمشکل دس گز لمبا اور تین گز چوڑا ہوگا۔ یہ نگینہ بیکری کہلاتا ہے اور ۲۶-۲۵ برس سے قائم ہے۔ دراصل یہ ایک چھوٹا سا کمرہ ہے لیکن تنگ و تاریک کمرے میں ایسے ایسے مشاہیر بیٹھتے رہے ہیں اور بعض تو اب تک بیٹھتے ہیں کہ اس مقام کو ایک اہم ادبی مرکز کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ آج بھی اگر آپ نگینہ بیکری میں جا کر دیکھیں تو ایک آدھ چلا چلتا شاعر دو چار سامعین کو شعر سناتا نظر آ جائے گا یا ڈاکٹر صابر علی ایم اے پی ایچ ڈی بیٹھے اخبار پڑھ رہے ہوں گے۔ یہاں کی رنگینی اب مدھم پڑ گئی ہے۔ ابتدا میں محکمہ تعلیم کے ارکان نے یہاں آنا جانا شروع کیا تھا اس لیے کہ محکمہ تعلیم کا دفتر یہاں سے بالکل قریب ہے۔ پھر یونیورسٹی کے پروفیسر اور شہر کے شاعر و ادیب ادھر متوجہ ہو گئے۔ رفتہ رفتہ نگینہ بیکری، فکر و فن کا مرکز بن گئی۔ مولانا تاجور نجیب آبادی، دیوان چند شرما، ڈاکٹر عنایت اللہ، ڈاکٹر صابر علی، ڈاکٹر سید عبداللہ، مولانا صلاح الدین احمد، پروفیسر علم الدین سالک، ڈاکٹر عاشق بٹالوی، محمد عبداللہ قریشی، آغا بیدار بخت، باری علیگ، شورش کاشمیری، مولوی

نذیر احمد، مولانا وارث کامل، گوپال متل جیسے حضرات نگینہ بیکری کے مستقل بیٹھنے والوں میں رہ چکے ہیں۔ جہاں ایسے حضرات جمع ہوتے ہوں وہاں نکتہ آفرینی اور سخن سنجی کا کونسا پہلو باقی رہ جاتا ہوگا۔ یہاں گفتگو کا مستقل موضوع علم و ادب تھا۔ "اُردو بولو، اُردو پڑھو اور اُردو لکھو" کی تحریک یہیں سے اُٹھی اور اُردو کانفرنس کی داغ بیل بھی یہیں پڑی۔ پنجاب نے اُردو زبان و ادب کی بڑی خدمت کی ہے۔ اس خدمت کے سرچشمے لاہور کے انہی چائے خانوں سے پھوٹے ہیں۔

دبستانِ لاہور کے قیام میں جن چائے خانوں نے اہم ترین خدمت سرانجام دی ہے ان میں کافی ہاؤس اور پاک ٹی ہاؤس شامل ہیں۔ کافی ہاؤس مال روڈ پر کمرشل بلڈنگ کے سامنے واقع ہے۔ پہلے یہ انڈین کافی ہاؤس کہلاتا تھا۔ آزادی کے بعد اسے زیلنس کافی ہاؤس کہا جانے لگا۔ یہاں کے آنے جانے والے متنوع طبیعت کے لوگ رہے ہیں۔ آزادی سے پہلے کنھیا لال کپور، دیوندر ستیارتھی، سید عابد علی عابد، عبداللہ بٹ، باری علیگ، شیخ حسام الدین اور دوسرے ادیب اور معاشرتی و سیاسی کارکن یہاں بیٹھتے تھے۔ وکلاء، یونیورسٹی کے طلباء اور اساتذہ یہاں کی زینت رہے ہیں۔ نگینہ بیکری سے اٹھ کر بیشتر ادیب کافی ہاؤس میں بیٹھنے لگے۔ ہندو معاصرین بھارت چلے گئے۔ ہندوستان کے ادیب ادھر آ گئے۔ اس طرح کافی ہاؤس کی زندگی میں آزادی کے بعد خاصی تبدیلی رونما ہوئی۔ سید سبط حسن، ناصر کاظمی، ریاض قادر، شاکر علی مصور، مشہور وکلاء اور مختلف ادیب و شاعر اب بھی یہاں بیٹھتے ہیں۔ آغا بیدار بخت، شورش کاشمیری، شیخ حسام الدین اور ملک اسلم حیات آتے جاتے رہتے ہیں۔ اب بھی یہاں یونیورسٹی اور کالجوں کے اساتذہ و طلباء کا ہجوم دکھائی دیتا ہے۔ اکثر حضرات کے بیٹھنے کی میزیں مخصوص ہیں۔ علمی، ادبی اور معاشرتی مسائل پر گفتگو ہوتی ہے لیکن کچھ عرصے سے کافی ہاؤس پر کاروباری اور تاجر پیشہ حضرات کی توجہ زیادہ ہے چنانچہ شاعروں اور ادیبوں کا مرکز بدلتا جا رہا ہے اور ان میں سے زیادہ تر پاک ٹی ہاؤس کی طرف متوجہ نظر آتے ہیں تاہم کافی ہاؤس آج بھی علم و ادب کا ایک مرکز ہے۔

شاعروں اور ادیبوں کے حلقے میں سب سے مقبول چائے خانہ پاک ٹی ہاؤس ہے جو مال روڈ اور نیلا گنبد والی سڑک کے مقامِ اتصال پر واقع ہے۔ پہلے یہ انڈیا ٹی ہاؤس کہلاتا تھا۔ یہاں ہمیشہ سے ادیبوں کی کثرت رہی ہے۔ کنھیا لال کپور، دیوندر ستیارتھی، سید عابد علی عابد، باری علیگ غرض کہ ہندو، مسلمان اور سکھ ادیب یہاں مل کر بیٹھتے تھے اور ادبی موضوعات پر تبادلۂ خیالات کرتے تھے۔ تقسیم کے بعد انڈیا ٹی ہاؤس کے سکھ مالک بھارت چلے گئے لیکن ان کی جگہ جو لوگ آئے وہ بھی شعر و ادب سے وابستگی رکھتے ہیں چنانچہ سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کے باوجود اس مقام کی ادبی روایت بدستور قائم ہے نام البتہ بدل گیا ہے اور اب یہ "پاک ٹی ہاؤس" ہے۔ جس طرح عرب ہوٹل کی شہرت اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کی مرہونِ منت ہے اسی طرح پاک ٹی ہاؤس کے استحکام میں حلقۂ اربابِ ذوق کا ہاتھ رہا ہے۔ یہ جماعت جو تقسیم سے پہلے سے قائم ہے اپنے جلسے وائی ایم سی اے کی عمارت میں منعقد کرتی ہے اور اس کے ارکان پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھتے ہیں۔ اتوار کے اتوار حلقۂ اربابِ ذوق میں دلچسپی رکھنے والوں کی خاصی بڑی تعداد پاک ٹی ہاؤس میں جمع ہوتی ہے۔ بعض تو جلسے کے وقت سے کافی پہلے ٹی ہاؤس میں آ بیٹھتے ہیں اور جلسے کے وقت کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ غرضیکہ اہلِ حلقہ پاک ٹی ہاؤس کے اسیر ہیں لیکن کسی جماعت پر کیا منحصر ہے۔ لاہور بھر کے شاعر و ادیب پاک ٹی ہاؤس کے مرکز میں سمٹ آتے ہیں اور جب دیکھیے یہاں اربابِ شعر و ادب کا ایک جمگھٹا ہوتا ہے ہندوستان کے ادیب و شاعر جب لاہور کا رُخ کرتے ہیں تو وہ بھی سیدھے پاک ٹی ہاؤس ہی میں آ کر دم لیتے ہیں۔ دو ایک

غیر ملکی محققین بھی کسی نہ کسی میز کے سہارے بیٹھے نظر آ جاتے ہیں۔ ملکوں ملکوں سے لاہور کے شاعروں اور ادیبوں کے نام اس چائے خانے کی معرفت خطوط اور پیغامات آتے ہیں۔ بعرضیکہ یہ چائے خانہ مختصر طور پر دبستانِ لاہور کی نمائندگی کرتا ہے۔ یوں تو وکیل، تاجر، ڈاکٹر سبھی قسم کے لوگ جو چائے کے شوقین ہوں پاک ٹی ہاؤس میں پائے جا سکتے ہیں لیکن شاعروں اور ادیبوں کے لیے رفتہ رفتہ یہ چائے خانہ ڈرائنگ روم بن کر رہ گیا ہے۔ یعنی شاعر اگر کسی دوست کو وقت دینا چاہے تو وہ یہی کہے گا کہ فلاں وقت یہ پاک ٹی ہاؤس میں مجھ سے مل لیجئے۔ بڑے شہروں میں متوسط درجے کے لوگوں کو اتنی آسائش کہاں میسر کہ اپنے ملنے والوں کو اپنے گھر پر بلائیں، ملنا جلنا چائے خانوں ہی میں ہوتا ہے چنانچہ شاعر و ادیب جب اپنے مہمانوں کو مدعو کرتے ہیں تو پاک ٹی ہاؤس ہی میں مدعو کرتے ہیں —
اہلِ ضرورت بھی یہ بات خوب جان گئے ہیں کہ شعراء اور ادیبوں کو تلاش کرنا ہو تو کہاں جانا چاہیے۔ وہ سیدھے پاک ٹی ہاؤس کا رُخ کرتے ہیں۔ ہم نے تو یہاں تک سُنا ہے کہ گھر کی بیٹھنے والی پردہ نشین خواتین جنھیں نہ اطراف و جوانب کی خبر ہے اور نہ محلّوں اور مقامات کی، بہرحال "پاک ٹی ہاؤس" کے نام سے پوری طرح واقف ہیں خصوصاً اس صورت میں کہ یہ خواتین ادیبوں اور شاعروں کے خاندان سے متعلق ہوں۔

پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھنے والوں کی فہرست کافی طویل ہے۔ احسان دانش، انتظار حسین، ناصر کاظمی، شہرت بخاری، انجم رومانی، قیوم نظر، یوسف جمال انصاری، سجاد باقر رضوی، اعجاز بٹالوی، شیر محمد اختر، ریاض احمد، منیر نیازی، عمر فیضی، شہزاد احمد، شاد امرتسری، عارف عبدالمتین اور خاکسار راقم الحروف یہاں کے مستقل بیٹھنے والوں میں سے محدودے چند ہیں۔ اکثر و بیشتر خصوصاً جس روز حلقے کا اجلاس ہو پُرانے لوگوں میں سے بھی بعض تشریف لے آتے ہیں۔ سیّد عابد علی عابد، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، پروفیسر حمید احمد خاں، ڈاکٹر سید عبداللہ، مولانا صلاح الدین احمد، ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر سعید اللہ، سیّد وقار عظیم، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر وزیر آغا، میاں بشیر احمد کبھی کبھار کے آنے والوں میں سے ہیں۔ بعض شعراء کے ساتھ ان کے احباب بھی چلے ہی آتے ہیں خواہ انھیں مستقل ٹی ہاؤس میں بیٹھنے کی بیماری نہ ہو۔ ان میں پروفیسر اختر اقبال کمالی، کسریٰ منہاس، محمد عبداللہ قریشی، جناب حامد علی خاں، پروفیسر علم الدین سالک اور اسی قبیل کے دوسرے اربابِ علم و ادب ہیں۔ یہاں اگرچہ بیٹھنے والوں کی نشستیں مخصوص نہیں ہیں تاہم گروپ ضرور ہیں۔ انتظار حسین، ناصر کاظمی، شہرت بخاری اور احمد مشتاق کی چوکڑی کسی پانچویں کو اپنے میں مستقلاً شامل کرنے پر راضی نہیں۔ احسان دانش، یوسف جمال انصاری، سجاد باقر رضوی، عمر فیضی، مشکور حسین یاد، محمد خلیل الرحمان اور راقم الحروف اپنے گروپ میں مگن رہتے ہیں۔ منیر نیازی، افتخار جالب، جیلانی کامران اور انیس ناگی الگ ہی بیٹھے شعر و ادب کو نئے معنی پہنانے اور روایتِ شعری پر رحم کھاتے ملیں گے۔ اسی طرح الگ الگ حلقے ہیں جن کی الگ الگ نشست ہوتی ہے لیکن گفتگو کا موضوع شعر و ادب ہی رہتا ہے۔ یہ محفل رات گئے تک گرم رہتی ہے۔

دبستانِ لاہور کی کوئی تاریخ ان ادب نواز چائے خانوں کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ مستقبل کا مورخ جب آج کل کی زندگی کا نقشہ کھینچے گا تو ان چائے خانوں کا حال اسے ضرور قلمبند کرنا پڑے گا۔ کون کون لوگ کون سے زمانے میں کس کس چائے خانے میں بیٹھتے تھے، اس کا جاننا انتہائی ضروری ہے۔ اس لیے کہ یہ چائے خانے اجتماعی تبادلۂ خیالات اور تخلیقی ادب کا گہوارہ رہے ہیں۔ اگر آج آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ لاہور کے ادیب کن مسائل میں اُلجھے ہوئے ہیں اور کس طرزِ فکر

کے مالک ہیں تو لازم ہے کہ آپ کسی ادبی چائے خانے میں تشریف لے جائیں۔

کعبہ

مصطفیٰ زیدی

سُلگتی راہوں سے، جلتے ہوئے مکانوں سے
میں اجنبی ترا مہمان بن کے آیا تھا
گھنے اندھیرے سے چمکائی تھی تری منزل
مشیتوں نے ترا راستہ دکھایا تھا

میں آ کے بیٹھ گیا یوں تو انجمن میں تری
بدن کے زخم دریدہ قبا سے چھُپ نہ سکے
اس اہتمام سے گھر میں ہوا تھا جشنِ بہار
لہو کے داغ جبینِ صبا سے چھُپ نہ سکے

اسی طرح سے کئی اور قافلے آئے
سیہ لکیر بنائے، لُٹے لُٹائے ہوئے
نظر میں عظمتِ آبا کے اطلس و کمخواب
سروں پہ گرد زدہ بوریے اٹھائے ہوئے

اگر یہ چھاؤں نہ ہوتی تو ہم کہاں جاتے
نئے وطن ترے دامن کی رحمتوں کو سلام
ہمارے مسلکِ رندی کے ناز اٹھاتا کون
نئے وطن تری مسجد کی عظمتوں کو سلام
مقامِ سجدہ نہیں صرف مرقدِ اقبال
نئے وطن ترے کوچوں کے پتھروں کو سلام
فقط انا رکلی ہی نہیں حریمِ نگاہ!
ازل کے عشقِ ابد کی محبتوں کو سلام

کچھ رواداری کی باتیں

شیخ عبدالشکور

لاہور میں حضرت داتا گنج بخش صاحب ہجویریؒ کا مزار مرجع خاص و عام ہے۔ تقسیم سے پہلے عرس کے موقع پر مسلمان زائرین کے علاوہ ہندو بھی حضرت کے مزار پر اکثر نذر چڑھانے آیا کرتے تھے۔ پھر علاقہ ماجھا کے سکھ حضرات بھی اپنی مستورات کو ہمراہ لیے کبھی کبھی آیا کرتے اور دعا مانگ کر نذر پیش کیا کرتے۔

مزار شریف کے بالمقابل "میلارام کا کارخانہ" اب بھی موجود ہے۔ رائے بہادر میلارام کے صاحبزادے رائے بہادر رام سرن داس متحدہ پنجاب کے ایک بہت بڑے متمول اور مرنجاں مرنج طبیعت کے رئیس تھے۔ وہ کارخانے کے سامنے والی 'لال کوٹھی' میں رہا کرتے تھے۔ خدا کے فضل سے ان کے تین صاحبزادے چیفس کالج کے تعلیم یافتہ تھے (ان کا ایک بیٹا فلائٹ لفٹیننٹ روپ چند

بھارت سرکار کی طرف سے افغانستان کا سفیر رہ چکا ہے) ان بیٹیوں کی شادیوں پر رائے بہادر نے لاکھوں روپے مہمان داری پر صرف کیے اور اس کے ساتھ ہی لاکھوں روپے پُن دان میں بھی دے دیے۔ ان کے ہاں ہندو مسلمان دوستوں کا ایسا دلفریب اجتماع رہا کرتا تھا کہ کیا عرض کیا جائے، شادی بیاہ کے موقعوں پر ان کے ہاں پندرہ پندرہ دن لگاتار دعوتیں رہا کرتیں اور کسی فرقہ کا امتیاز نہ ہوتا۔

۱۹۱۸ء میں انفلوئنزا کی وبا اس شدت سے پھیلی کہ الاماں! صرف تین چار مہینوں میں ہی دو کروڑ انسان لقمۂ اجل بن گئے۔ بدقسمتی سے رائے بہادر صاحب کے تینوں بیٹے بھی اس مرض میں مبتلا ہو گئے اور ان کے گھر سخت سراسیمگی پھیل گئی۔ کرنل بھولا ناتھ کرنل امیر چند اور کرنل سدرلینڈ (مہاراجہ رنجیت سنگھ کی پوتی بمبا دلیپ سنگھ کے خاوند کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے پرنسپل) جیسے یگانۂ روزگار ڈاکٹر علاج کے لیے صبح و شام آتے اور ہزار جتن کے باوجود ان کا درجۂ حرارت کسی صورت کم ہونے میں نہ آتا جس سے سب پریشان تھے۔

رائے بہادر کے ہندو مسلم دوست "لال کوٹھی" میں پروانہ وار جمع رہتے اور بارگاہِ ایزدی میں دعائیں مانگتے۔ خود رائے بہادر صاحب فقرا میں خیرات تقسیم کرتے اور ان سے دعا کے طلبگار ہوتے۔

اب خود رائے بہادر صاحب کی زبانی بات سُنیں:۔

"ایک رات ہم سوئے ہوئے تھے کہ کمرے میں کچھ آہٹ سی ہوئی اور میری آنکھ کھُل گئی۔ میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سفید ریش بزرگ، براق لباس پہنے، ایک ہاتھ میں عصا اور دوسرے میں تسبیح لیے، میرے بیٹے گوپال داس کے پلنگ کے پاس کھڑے کچھ پڑھ رہے ہیں۔ انھیں دیکھ کر میں سہم گیا اور چیخ کر کہا کہ آپ کون ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟ انھوں نے میری بات سُنی اَن سُنی کر دی اور دعا پڑھنے میں مشغول رہے پھر وہ بزرگ میرے دوسرے بیٹے رُوپ رام کی چارپائی کے پاس گئے اور وہاں بھی دعا مانگی۔ پھر تیسرے بیٹے کے پلنگ کے قریب جا کر بھی ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد وہ بزرگ مجھ سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے:۔

"میں تمہارا پڑوسی گنج بخش ہوں۔ مجھ سے تمھاری پریشانی دیکھی نہ گئی۔ اس لیے میں دُعا کرنے کے لیے خود آ گیا ہوں۔ اب گھبرانے کی کوئی بات نہیں اللہ تعالےٰ سب کو شفا دے گا۔"

اب کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ اس بزرگ کی دعا سے واقعی دوسرے دن بخار ہلکا ہو گیا اور وہ کچھ باتیں بھی کرنے لگے۔ جب ڈاکٹر صاحبان مریضوں کو دیکھنے کے لیے صبح آئے تو ان کی حالت اچھی دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کرنل امیر چند دون کی لینے لگے کہ رات میں ایسی مؤثر دوائی دے کر گیا تھا کہ اس کا اثر ہونا ہی چاہیے تھا۔ اس پر رائے بہادر صاحب ہنس پڑے اور گزشتہ رات کی تمام کیفیت بیان کی۔ سب حضرات اس قصہ کو سُن کر انگشت بدنداں ہو گئے اور دیر تک اس پر بحث و تمحیص کرتے رہے۔

اس ایٹم اور میزائل کے زمانے میں ایسی باتیں ناقابلِ قبول ہوں گی مگر خاصانِ خدا سے ایسی ایسی محیّر العقول باتیں اکثر ظہور پذیر

ہوا کرتی ہیں اور اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔

جب بیماروں کو مکمل شفا ہو گئی تو رائے بہادر نے دربار کے ایک سجادہ نشین کو اپنے ہاں بلا کر تمام واقعہ سنایا۔ اس کے بعد انھوں نے دریافت کیا کہ وہ کس انداز سے شکرانہ کی نذر پیش کریں۔ آیا کھانے کی چند دیگیں پکوا کر فقرا میں تقسیم کر دینا کافی ہوگا یا کہ نذر کسی اور صورت میں ہونی چاہیے۔ سجادہ نشین نے جواب دیا کہ کھانا تو آپ کی طرف سے ہر سال عرس کے موقع پر تقسیم ہوا ہی کرتا ہے اب تو کوئی ایسی بات ہونی چاہیے جس سے مستقل فیض جاری رہے۔ اس پر رائے بہادر نے دریافت کیا کہ کیا دربار میں بجلی موجود ہے؟ جب انھیں معلوم ہوا کہ ابھی تک وہاں بجلی کا کوئی انتظام نہیں تو انھوں نے بہت خوش ہو کر فرمایا کہ بجلی کے نصب ہونے کا انتظام فوراً ان کی طرف سے کیا جائے۔ چنانچہ ایک مہینہ کے اندر سب انتظام مکمل ہو گیا۔ پھر رائے بہادر نے حاضر دربار ہو کر پہلے نذر پیش کی اور بعد میں روشنی کا افتتاح کیا۔

رواداری کی یہ ایسی نفیس مثال ہے کہ دیکھنے سننے میں کم آئی ہوگی۔

رائے بہادر صاحب کی تین صاحبزادیاں بھی تھیں۔ ایک تو لالہ بانشی رام انجینئر سے، دوسری دیوان بدری ناتھ پرائیویٹ سیکرٹری مہاراجہ کشمیر سے بیاہی تھیں۔ تیسری صاحبزادی کسی رئیس کے گھر کی رونق تھیں۔ اس زمانے میں متمول ہندو گھرانوں میں فنِ موسیقی سیکھنے کا عام رواج تھا اور یہ صاحبزادیاں بھی اس فن میں تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ لاہور کے کوچہ شیعاں (موچی دروازہ) کے ایک فنکار میاں بڈھا انھیں راگ ودیا کے گر بتایا کرتے تھے۔ وہ ایک انگلی سے دونوں طبلوں پر تھاپ دینے کی بھی خوب مہارت رکھتے تھے۔ انھوں نے بڑے بڑے نوابوں اور رئیسوں کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ پھر وہ خود بھی بڑے عالی حوصلہ انسان تھے چنانچہ محرم کی آٹھویں تاریخ کو امام حسین علیہ السلام کی نذر بہت تکلف سے دیا کرتے تھے اور اپنے دوستوں کو مدعو کیا کرتے تھے۔ عوام کے علاوہ نواب محمد علی قزلباش، ڈپٹی غلام حسین، بیرسٹر سردار حسین خان بہادر، شیخ محمد تقی، ڈاکٹر نجم الدین جیسے رؤسا بھی شامل ہوا کرتے تھے۔ ان حضرات کے علاوہ رائے بہادر رام سرن داس بھی آیا کرتے اور اپنی طرف سے ایک سو روپے کی نذر پیش کیا کرتے تھے (آج کل کے حساب سے یہ رقم ایک ہزار کے برابر ہے)

ریلوے اسٹیشن کے قریب آسٹریلیا بلڈنگ کے عین سامنے "میلا رام کا تالاب" ہوا کرتا تھا۔ تالاب کے چاروں طرف چند کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں جو کرایہ پر اٹھ جاتی تھیں، رائے بہادر صاحب نے وہاں کی آمدنی میاں بڈھا کے نام کر دی تھی اور وہ تا زندگی اسے وصول کرتے رہے۔

وضعداری کی ایسی مثالیں اب کہاں ملیں گی؟

موجودہ نظام حیدر آباد (دکن) میر عثمان علی خان کے والد غفران مآب میر محبوب علی خان اپنے وقت کے حاتم تھے۔ کئی سال سریر آرائے سلطنت رہے اور ان کی فیاضی کے قصے ہندوستان اور دیگر اسلامی ممالک میں مشہور رہے ہیں۔ ان کے مرنے کے ساتھ ہی دنیا سے شاہی ٹھاٹھ اور بخشش کے قرینے بھی اٹھ گئے۔

میر محبوب علی خان کے عہدِ حکومت کے ابتدائی دور میں دیوان چند و لعل ریاست کے دیوان تھے۔ یہ صاحب دیوان ٹوڈر مل کے خاندان سے تھے اور ان کے بزرگ لاہور میں ہی بود و باش رکھتے تھے۔ علاقہ چونیاں میں ان کے خاندان کے لوگوں کی جائداد بھی تھی۔ دیوان صاحب اپنی ملازمت کے سلسلے میں حیدر آباد گئے اور اپنی فراست اور خوش بختی کے زور سے ریاست کے

دیوان ہوگئے۔ ان کے زمانہ وزارت میں کئی پنجابی بھی ملازمت کے لیے وہاں پہنچے اور وہیں کے ہو رہے۔ دیوان صاحب اپنی فیاضی اور کرم گستری کے باعث ایسے مشہور ہوئے کہ لوگ حیدر آباد کو "چندو لعل کا حیدر آباد" کہنے لگے۔

دیوان صاحب موصوف کے صاحبزادے مہاراجہ سر کرشن پرشاد بھی آخری دور میں نظام کے مدار المہام ہوگئے تھے۔ یہ صاحب بڑے عالی ظرف رئیس تھے اور ساتھ ہی شیریں کلام شاعر بھی، شاد تخلص کرتے تھے اور غزلیات و قصائد کے علاوہ وہ رسول کریم کی شان میں نعتیں بھی لکھا کرتے تھے۔ یہ نعتیں خواجہ حسن نظامی مرحوم کے رسالہ "نظام المشائخ" میں عموماً چھپا کرتی تھیں۔

یہ وہ زمانہ ہے جبکہ حضور نظام کے دربار میں داغ، گرامی اور ہوش بلگرامی جیسے قادر الکلام شاعر موجود تھے اور اس وجہ سے وہاں شعر و شاعری کا خوب چرچا رہا کرتا تھا۔ گرامی نہ صرف درباری شاعر تھے بلکہ ولی عہد سلطنت میر عثمان علی خان کے استاد بھی تھے اس لیے وہ "استاد گرامی" کے نام سے مشہور تھے۔ یہ صاحب جالندھر (پنجاب) کے رہنے والے تھے۔ بہت سادہ مزاج اور مستعلیق انسان تھے۔ اپنی علمیت اور شاعرانہ عظمت کے باعث امرائے دکن میں بہت ہر دلعزیز تھے۔ گرامی اپنے زور کلام سے ہر محفل میں چھا جایا کرتے تھے۔ ان کی ایک غزل کے دو تین شعر سنیئے ؎

ما خویش را بہ نیم نظر ارزاں فروختیم ۔۔۔ خود را فروختیم چہ ارزاں فروختیم

دیوانگی نبود بلا سنج امتیاز ۔۔۔ داماں بجیب و جیب بداماں فروختیم

قانون عقل، نسخۂ ایماں، کتاب ہوش ۔۔۔ در امتحانِ چشمِ سخنداں فروختیم

ایک دفعہ مہاراجہ کرشن پرشاد نے گرامی سے دوران گفتگو میں کہا کہ شعراء نے زلف، کمر اور دہن کے الفاظ کو شعروں میں یکجا باندھا ہے۔ آپ بھی کوئی ایسا شعر کہیں جس میں یہ الفاظ مستعمل ہوں۔ گرامی فی البدیہہ کہنے میں طاق تھے، معاً یہ شعر پڑھا ۔

دہانش تنگ چوں دستِ گرامی
کمر باریک چوں فکرِ نظامی

مہاراجہ بہادر نے اسی وقت خزانچی کو بلا کر ایک ہزار روپیہ انعام دینے کا حکم دیا جس پر گرامی جھک جھک کر آداب و کورنش بجا لاتے رہے (یہ ایک ہزار آج کے دس ہزار کے برابر ہے)

مہاراجہ صاحب موصوف خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے معتقدین میں سے تھے۔ ان کی شان میں کئی قصیدے بھی لکھے۔ اپنی حسنِ عقیدت کے باعث اپنے ایک فرزند کا نام "خواجہ پرشاد" رکھا تھا۔ ہر سال خواجہ اجمیری کے عرس مبارک پر لگ بھگ سو ایک من چاول کی دیگیں ان کے خرچ سے پک کر تقسیم ہوا کرتی تھی۔ پھر خاص خاص مجاوروں کے ماہانے بھی مقرر تھے۔ جب کبھی وہ خود اجمیر شریف آیا کرتے تو ایک نہایت مطلا و مذہب غلاف بھی مزار شریف کے لیے لایا کرتے تھے۔ پھر اس موقع پر جو جو کچھ داد و دہش ہوا کرتی تھی اس کا ذکر کیا کیا جائے؟ مہاراجہ بہادر خود تعلقدار تھے اور تعلقہ سے معقول آمدنی ہوتی تھی مگر فکر لُٹ ہونے کے باعث کبھی کبھی مقروض بھی ہو جایا کرتے ـــــ لیکن جب حضور نظام کو اس بات کا پتہ چلتا تو وہ ان کا سب قرض فوراً چکا دیا کرتے تھے۔

ایسی ایسی بخششوں اور وضعداریوں کی مثالیں اب کہاں ملیں گی؟

اقبال علیہ رحمۃ جب لندن سے بیرسٹری کی سند لے کر لاہور واپس تشریف لائے تو پہلے کچھ عرصہ اندرون بھاٹی دروازہ قیام پذیر رہے۔ پھر انارکلی میں "راجہ برادرز" کی دکان کے اوپر والے حصے میں آن ٹھہرے۔ جہاں وہ ۱۹۲۲ء تک مقیم رہے۔ علامہ کی مشہور تصنیفات "مثنوی اسرار خودی"، رموز بیخودی اور پیام مشرق یہیں سپرد قلم ہوئیں۔ ان تصنیفات سے ان کا نام اسلامی دنیا میں گونج اٹھا۔ پھر جب کچھ عرصہ کے بعد ان کی چند کتابوں کا ترجمہ انگریزی اور جرمن زبان میں ہوا اور علامہ کا کلام یورپ کے مستشرقین تک پہنچا تو سب نے انہیں بے دریغ خراج تحسین ادا کیا اور اس طرح انہیں شہرتِ دوام حاصل ہوئی۔

میں ۱۹۲۲ء میں پنجاب سکرٹریٹ میں ملازم تھا۔ دفتر سے واپسی پر انارکلی بازار میں سے گزرتے ہوئے اپنے مرحوم دوست شیخ عبداللطیف دندان ساز کی دکان پر اکثر ٹھہر جایا کرتا تھا۔ لطیف صاحب ہمارے بہت مخلص دوست تھے اور شام کو ہمارے لیے چائے پانی کا بندوبست کر رکھتے تھے۔ شیخ لطیف تپش (داماد سر عبدالقادر)۔ شیخ عبدالاحد (بعدازاں سپرنٹنڈنٹ پولیس) شیخ فضل حق (میجر) اور چند ایک دیگر احباب بھی وہاں پہنچ جایا کرتے اور وہاں خوب دھما چوکڑی مچا کرتی۔ ایک دن اسی طرح محفل ہاؤ ہو برپا تھی کہ علامہ مرحوم کے منشی شیخ طاہردین (دل روز مرہم ملنے) اُدھر سے گزرے اور ہمیں وہاں بیٹھے دیکھ کر رک گئے اور سب کی خیریت دریافت فرمائی۔ شیخ صاحب موصوف بھی لاہور کی نادر ہستیوں میں سے ایک تھے اور اپنے حسنِ کلام سے ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا لینے کے ماہر تھے۔ اُس زمانے میں لوگوں کو علامہ اقبال کی شاعری سے زیادہ اُن کی روزی کا فکر ہوا کرتا تھا کیونکہ تب وہ ہائی کورٹ میں پریکٹس کرتے تھے اور شاعری بھی ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ چنانچہ میں نے شیخ طاہردین صاحب سے برسبیل تذکرہ پوچھا "کہیئے جناب! آجکل ڈاکٹر صاحب کی پریکٹس کا کیا حال ہے"؟ اس پر وہ کچھ مسکرائے اور مجھے دکان سے باہر آنے کو کہا۔ جب میں دکان سے باہر نکل کر بازار میں کھڑا ہو گیا تو مجھے علامہ کے مکان کی طرف اشارہ کر کے کہا وہ دیکھیے کیا ہو رہا ہے؟ اب میں نے یہ دیکھا کہ سامنے والے مکان کے چھجے پر دو شخص کمبل اوڑھے آمنے سامنے بیٹھے مصروف گفتگو ہیں۔ شیخ طاہردین بولے "دیکھو یہ ایک تو آپ کے اقبال ہیں اور دوسرے گرامی ہیں۔ ان دونوں کو یہاں بیٹھے ہوئے آج تیسرا دن ہو چلا ہے۔ اگر اقبال شعر پڑھتا ہے تو گرامی داد دینے لگتا ہے اور جب گرامی کوئی شعر سناتا ہے تو اقبال سر دھننے لگتا ہے۔ گویا کہ تین دن سے دونوں کے سر ہی ہلتے نظر آتے ہیں۔ دونوں اسی جگہ کھانا کھاتے ہیں اور جب نیند آتی ہے تو سو بھی یہیں جاتے ہیں۔ اب تین دن سے تو یہ کیفیت ہے، ایسے میں بھلا خاک وکالت چلے گی؟ بس اللہ ہی مالک ہے"!

اللہ اللہ! کس تقویٰ کے لوگ تھے اور کیا شانِ قلندری تھی!!

۱۹۲۳ء میں انارکلی والے مکان کو چھوڑ کر علامہ مرحوم میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں اٹھ آئے اور کئی سال وہاں رہے۔

۱۹۳۳ء میں ان کو کسی دوست کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ میو روڈ پر زمین کا ایک ٹکڑا خالی پڑا ہے جو محکمہ نزول کی ملکیت ہے۔ جائے وقوع کے لحاظ سے یہ آئیڈیل جگہ تھی اس لیے علامہ کا ارادہ اُس کو خریدنے کا ہوا۔ اُن کے علاوہ کئی اور لوگ بھی اس زمین کو خریدنے کے خواہاں تھے۔ چنانچہ جب محکمہ نزول کی طرف سے زمین نیلام کرنے کا نوٹس جاری ہوا تو چند ایک مسلمان خریداروں کے علاوہ کچھ ہندو ساہوکار بھی نیلام کے وقت وہاں پہنچ گئے۔

لاہور کے ہندو روساء میں ایک صاحب رائے بہادر دیوی چند کھنہ لکڑی کے بہت بڑے تاجر تھے اور ریلوے روڈ

پر دارث دھارا بلڈنگ کے نزدیک) ان کا لکڑی تراشنے کا کارخانہ بھی تھا۔ یہ معلوم نہیں کہ رائے بہادر صاحب کس طرح علامہ کے گرویدہ تھے چنانچہ جب اُن کو پتہ چلا کہ وہ زمین نیلام ہونے لگی ہے اور علامہ اُس کو خریدنے کا خیال رکھتے ہیں تو رائے بہادر بھی نیلام کے وقت میو روڈ پہنچ گئے۔ یہ صاحب پہلے تو نیلام کا رُخ دیکھتے رہے لیکن جب قیمت بیس بائیس ہزار سے اوپر جانے لگی تو انھوں نے اپنے ہندو دوستوں سے یہ کہا کہ اقبال ہمارا دوست ہے اور ہم ان کی خدمت کرنا چاہتے ہیں لہذا آپ حضرات قیمت زیادہ بڑھانے کا قصد نہ کریں۔ پھر انھوں نے نوٹوں کا ایک بنڈل دکھا کر کہا کہ وہ خود بھی بہت سا روپیہ ہمراہ لیکر آئے ہیں۔ اگر کسی نے قیمت خرید بڑھانے کی کوشش کی تو پھر وہ یہ زمین خود خرید لیں گے۔ اس پر رائے بہادر کے دوست تو بولی دینے سے رُک گئے لیکن چند ایک دیگر خریداروں نے قیمت پانچ چار ہزار روپے اور بڑھا دی۔ ان میں سے ایک دو حضرات آنریری مجسٹریٹی کے امیدوار تھے اور مسٹر ابیس، پرتاپ ڈپٹی کمشنر کو خوش کر کے اُس سے یہ عہدہ حاصل کرنے کے خواہاں تھے۔ بہر حال قیمت پچیس چھبیس ہزار کے لگ بھگ رہی اور آخری بولی علامہ کے نام پر ختم ہو گئی۔ بعد ازاں زمین کا داخل خارج ان کے نام ہو گیا۔ اس زمین پر "جاوید منزل" تعمیر ہوئی اور علامہ مرحوم تادم مرگ اس میں مقیم رہے۔

یہ ظاہر ہے کہ اگر نیلام کی بولی بڑھتی رہتی تو عین ممکن تھا کہ زمین کی قیمت چالیس پچاس ہزار تک پہنچ جاتی کیونکہ چند ایک ہندو خریدار بہت متمول تھے اور اتنی قیمت دینے میں انھیں دریغ نہ ہوتا اور اس طرح علامہ زمین خریدنے سے محروم رہتے۔ لیکن رائے بہادر کے بروقت روک دینے سے قیمت زیادہ نہ بڑھنے پائی۔

رواداری کی یہ ایسی مثال ہے کہ جس پر جتنی داد دی جائے کم ہے۔ اس واقعہ پر بھی ظاہر ہے کہ علامہ مرحوم کے کئی ایک ایسے ہندو دوست بھی تھے جو کہ گمنام رہنا پسند کرتے تھے۔

انارکلی بازار میں میسرز عطر چند کپور کے نام سے ایک مشہور کتب فروش کی دکان تھی۔ محکمہ تعلیم کی مجوزہ کتابوں کے علاوہ دیگر مضامین کی کتابیں بھی ان کے مطبع میں چھپا کرتی تھیں۔ اور ان کا لاکھوں کا کاروبار تھا۔ اپنے مسلمان دوستوں سے ایسے برادرانہ تعلقات تھے کہ کئی ایک سے ان کی "بھاجی" تھی اور شادی بیاہ کے موقعوں پر انھیں اپنے رشتہ داروں جیسا ہی سمجھا کرتے تھے۔

لالہ عطر چند کی وفات کے بعد جب ان کے بیٹوں نے جائداد کو تقسیم کرنے کا ارادہ کیا تو وہ اپنا معاملہ کسی ہندو ثالث سے فیصلہ کرانے کی بجائے علامہ مرحوم کی خدمت میں لے گئے اور بخوشی انھیں اپنا ثالث مقرر کیا۔ چنانچہ تقسیم کے متعلق جو فیصلہ علامہ نے دیا اُسی پر وہ لوگ یعنی لالہ گوبردھن لال کپور اور لالہ رام چرا بال کپور کاربند ہو گئے۔ لالہ رام چرا بال نے کشمیر روڈ کے کونے پر ایک نہایت شاندار کوٹھی بنائی جہاں وہ ہر مذہب ملت کے دوستوں کی آئے دن دعوتیں کیا کرتے تھے۔ آجکل اُس کوٹھی میں سیٹلمنٹ والوں کا دفتر ہے۔

لاہور کو "پنجاب کا دل" کہا جاتا ہے۔ پنجاب کا دارالخلافہ اور تجارتی مرکز ہونے کے باعث ہمیشہ بہت بارونق شہر رہا ہے۔ موسم سرما میں تو اس کا جوبن شباب پر ہوتا ہے اور مختلف اضلاع کے شوقین مزاج سیر و تفریح کیلئے یہاں پہنچ جاتے ہیں تو ان کی شاندار موٹروں سے مال روڈ اور دیگر سڑکوں پر خوب گہما گہمی رہتی ہے۔ موسم بہار میں لارنس گارڈن اور گلستان فاطمہ میں رنگا رنگ پھولوں کے امتزاج سے قوس قزح کا گمان ہونے لگتا ہے۔ شام کو وہاں کا ماحول اتنا پرسکون اور ہوا اتنی عطر بیز ہوتی ہے کہ پہروں بیٹھ کر بھی سیری نہیں ہوتی۔

تقسیم ہند سے پچیس تیس سال پیشتر مال روڈ کی شاندار دکانوں میں یورپین اور امریکن منڈیوں کا مال بکثرت بکا کرتا تھا اور

واقع ہونے کے باعث سستا بھی خوب ہوتا تھا۔ موجودہ "فیروز سنز" والی جگہ پہ مشہور فرم "وہائٹ وے لیڈلا" کی دوکان ہوا کرتی تھی جس میں آرائش اور سنگھار نیز خانہ داری کی ہر چیز مل جایا کرتی تھی۔ منتخب بدر منیر قسم کی چھوکریاں وہاں سیل گرلز کا کام کرتی تھیں۔ قیاس کیجیے کہ خرید و فروخت کے وقت خریداروں کے دلوں پر کیا کچھ نہ گزرتی ہو گی۔ پھر سمتھ کمپنی اور ساتھ والی دکانوں پر بھی ایسی ہی کیفیت رہا کرتی تھی۔

سڑک کے دوسری طرف سٹفل اور لورینگ کے نہایت صاف اور شاندار ریسٹورنٹ ہوتے تھے جن پر اس قدر ہجوم رہا کرتا تھا کہ لحظہ بھر بیٹھ کر چائے پینے کو جگہ ملنی محال ہوا کرتی تھی۔ ان ہوٹلوں میں ہندو اور مسلمان بزنس مین ایک دوسرے کی تواضع کرتے اور لاکھوں کے سودے وہیں بیٹھے ہو جایا کرتے تھے۔

پیرینگ کراس پر تقریباً سب دکانوں کے مالک یا منیجر انگریز ہوتے تھے جو اپنی ذہانت اور خوش اخلاقی سے گاہکوں کا دل فوراً ہاتھ میں لے کر ان کی جیبوں سے روپیہ اگلوانے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ پھر ہیکن کی دکان کے منیجر مسٹر رچی کو لوگ "گورنر" کہا کرتے تھے۔ وہ راجاؤں اور نوابوں کو پھانسنے کے ہشیار گر جانتے تھے۔ وہ علاقہ بجا طور پر لاہور کا "بانڈ سٹریٹ" سمجھا جاتا تھا۔

لاہور کا دل تو انارکلی بازار ہے جس میں کرنال شاپ، راجہ برادرز، بھلہ شو کمپنی، شیخ عنایت اللہ اور رام کرشنا کی مشہور دکانیں ہوا کرتی تھیں۔ ان دکانوں کے مالک بھی فن مکالمہ کے خوب ماہر ہوا کرتے تھے اور رواداری کی یہ کیفیت کہ کرنال شاپ پر ہندو اور سکھ گاہکوں کا بے پناہ ہجوم رہا کرتا تھا اور اسی طرح سردار جگت سنگھ کواترا کی دکان پر مسلمانوں کی بھیڑ ہوا کرتی تھی پھر وضعداری کے یہ انداز کہ ہر گاہک اپنے پرانے واقف کار دکاندار کو چھوڑ کر کسی غیر کے ہاں جانا خلاف وضع سمجھا کرتا تھا۔

رام کرشنا کی دکان پر دنیا کی بہترین کتابیں دستیاب ہو جاتی تھیں۔ دکان کے مالک ایسی شاندار شخصیت اور بلند کردار کے مالک تھے کہ اُن سے باتیں کر کے انسان ایک قلبی سکون محسوس کرنے لگتا تھا۔ ان کی نگاہ میں ہر مذہب ملت کا انسان یکساں درجہ رکھتا تھا پھر وہ اپنے گاہکوں کے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے بھی ایک بہترین رہبر تھے کیونکہ خود اُن کا مطالعہ اور تجربہ بے پناہ تھا۔ ۱۹۱۲ء میں ہم نے سر آغا خاں کو اسی دکان پر کتابیں خریدتے دیکھا۔ وہ ان دنوں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کیلئے چندہ جمع کرنے کیلئے لاہور تشریف لائے ہوئے تھے اور نواب سر فتح علی خاں قزلباش (نواب مظفر علی خاں کے والد) کے ہاں بطور مہمان فروکش تھے۔ پھر "خواب ہستی" کے مصنف مرزا محمد سعید صاحب پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور اور ڈاکٹر دیزی بیگ پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور جیسے مشہور ادیبوں کو اسی دکان پر اپنی علمی تشنگی کو بجھاتے دیکھا۔

راجہ برادرز (موجودہ شوکت مارکیٹ) کی دوکان کے اوپر والے حصے میں علامہ اقبالؒ رہا کرتے تھے۔ آن دنوں ایران کے ایک مجتہد سرکار شیخ عبد العلی صاحب ہروی علامہ کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ یہ صاحب کبھی ایرانی پارلیمنٹ کے ممبر ہوا کرتے تھے مگر روسی حکومت کے خوف کے مارے ایران سے نکل آئے اور لاہور میں نواب محمد علی خان قزلباش کے ہاں مقیم تھے۔ اُن کے علمی تبحر کا کیا کہنا؟ آج سے چالیس سال پیشتر وہ "غزائی منزل" کوچہ شیعاں میں اپنے وعظوں سے مجالس عزا خوب گرمایا کرتے اور دوران وعظ قرآن مجید کی آیات کی تفسیر ایسے دلنشین پیرایہ میں بیان فرماتے کہ بڑے بڑے عالم دنگ رہ جاتے تھے۔ علامہ اقبال اکثر ان کی ملاقات کیلئے نواب صاحب موصوف کی ایمپرس روڈ والی کوٹھی پر تشریف لے جایا کرتے۔ ۱۹۱۳ء میں علامہ اپنی مشہور مثنوی اسرار خودی رقم کر رہے تھے اور وہ سرکار شیخ صاحب سے مختلف نکات پر اُن سے بحث و تمحیص کیا کرتے۔ قبلہ نواب صاحب مرحوم کے صاحبزادے میرے ہم جماعت تھے اور اکثر میرا پھیرا اُدھر رہتا تھا۔ اس طرح ہمیں کبھی کبھی اُن دو بڑے عالموں کی گفتگو سننے کا اتفاق ہو جاتا تھا۔ پھر سرکار شیخ بھی علامہ صاحب کی ملاقات کے لیے کبھی کبھی انارکلی آیا کرتے تو پہروں وہاں علمی گفتگو رہا کرتی تھی۔

نواب ذوالفقار علی خان (مالیر کوٹلہ) بھی گاہے گاہے اُن کے ہاں آیا کرتے تو سردار جوگندر سنگھ سابق وزیر پٹیالہ و پنجاب ان کی معیت میں ہوتے۔ نیز مرزا جلال الدین صاحب بیرسٹر (محمود نظامی مرحوم کے نانا) بھی ضرور ہمراہ ہوتے۔ خیال تو فرمائیں کہ اس چار یاری صحبت میں کیا کیا پُر لطف باتیں ہوتی ہونگی اور ان کی زبانوں سے کیسے کیسے پھول جھڑتے ہونگے۔ علیٰ ہذا القیاس راجہ نریندر ناتھ کمشنر لاہور اور پنڈت شیو نرائن شمیم سابق جج چیف کورٹ پنجاب بھی علامہ کے عزیز ترین دوستوں میں سے تھے اور یہ دونوں بزرگوار علامہ سے اور اپنے افغان دوستوں سے ہمیشہ فارسی میں ہی گفتگو کیا کرتے تھے۔ حضور! اُس زمانے میں تو کشمیری پنڈتوں کے گھروں میں فارسی ہی بولی جاتی تھی اور مسلمان گھرانوں کی طرح ان کے ہاں بھی پردے کا رواج تھا!

انارکلی بازار کے وسط میں ایک دکان میسرز نرائن داس بھگوان داس کیمسٹ کی ہوا کرتی تھی۔ لالہ نرائن داس کے بیٹے لالہ دوارکا داس کاروبار کے کرتا دھرتا تھے۔ وہ بہت خوش مذاق انسان تھے اور اپنی دکان کو دیدہ زیب آرائش سے بقعۂ نور بنائے رکھتے تھے۔ پھر وہ بہت خوبیوں کے مالک تھے۔ ہر مذہب و ملت کے مفلس شاعر اور مفلس عاشق ان کی دکان پر جمع ہوتے اور ان کے خوان کرم پر پلتے تھے۔ وہ خود بھی شاعر تھے اور شعلہ تخلص کرتے تھے۔ ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

خدا کی یاد میں زاہد نہ بھول دُنیا کو
کہیں کا بھی نہ رہے گا اگر خدا نہ ملا

شاعری کے علاوہ وہ راگ کے بھی خوب رسیا تھے۔ اجمیر شریف کے مشہور قوال عظیم پریم راگی کے گانے کی اس زمانے میں بڑی دھوم تھی۔ وہ جب بھی لاہور آتے تو قوالی کی ایک نشست ضرور شعلہ کے ہاں ہوا کرتی تھی۔ اس موقعہ پر وہ اپنے بے تکلف سخن فہم ہندو اور مسلمان دوستوں کو مدعو کیا کرتے اور پریم راگی دو تین گھنٹوں میں سینکڑوں دل مٹھی میں کر لے جایا کرتے تھے۔

ہمارے پرانے دوست پنڈت ہری چند اختر آنجہانی زیادہ تر شعلہ صاحب کے ہاں ہی وقت گزارتے اور ان کی محفلوں کو اپنے چٹکلوں سے کشتِ زعفران بنایا کرتے تھے۔ جب اختر نے رسول کریم ؐ کی شان میں ایک نعت لکھ کر حبیبیہ ہال میں پڑھی تو لاہور میں غلغلہ مچ گیا کہ ایک ہندو شاعر (اور وہ بھی پنڈت) نے ایسی شاندار نعت لکھی ہے کہ جواب نہیں۔ وہ نعت اس قدر مقبول ہوئی کہ مشاعروں میں لوگ اُن سے باصرار وہ نعت پڑھوایا کرتے اور داد کے ڈونگرے برسایا کرتے تھے۔ نعت شریف کے چند اشعار سنیئے ؎

کس نے ذرّوں کو اُٹھایا اور صحرا کر دیا
کس نے قطروں کو ملایا اور دریا کر دیا
زندہ ہو جاتے ہیں جو مرتے ہیں اُس کے نام پر
اللہ اللہ موت کو کس نے مسیحا کر دیا

شالامار

ڈاکٹر سید صفدر حسین ایم اے، پی ایچ ڈی

حریمِ حسن بنایا گیا ہے شالیمار
خبر ہے زیب دہِ تخت و تاج آتی ہے
بہ اہتمام ہے مہمان کی رعایت سے
اِدھر ہے رایتِ قومی اُدھر نشانِ فرنگ
گلاب و مشک سے دھوئے گئے ہیں جادہ و صحن
برس رہا ہے در و بام سے گلال، عبیر
جگہ جگہ پہ تراشے گئے ہیں تختۂ مرغ
جڑے ہوئے ہیں پرِ کاہ میں نگینۂ آب
روش روش پہ ہیں انبار لالہ و گُل کے
مہک رہی ہے فضا جسمِ نازنیں کی طرح

قدم قدم پہ تناسب کا وہ حسین احساس
کہ ہر نہال جوابِ نہال دیتا ہے

کہ جیسے رقص میں اُٹھیں سہیلیوں کے ہاتھ
جواب دیں کفِ دستِ اپنا آئینوں کی طرح

قطارِ سرو بہ اندازِ قامتِ محبوب
ہے صحنِ باغ میں موزونیت کی آخری حد

درخت آم کے ہیبت کی شان رکھتے ہیں
محاذِ جنگ پہ جس طرح ہاتھیوں کے غول

سیاہ فام ستونوں میں آہنی زنجیر
کہ جیسے زنگیوں نے لے لیے ہوں ہاتھ میں ہاتھ

حدودِ سبز پہ دیوارِ باغ کی بندش
حسین جسم پہ رنگین جیسے بندِ کمر

وہ حسن بارہ دری میں سمٹ کے آیا ہے
کہ جیسے برجِ فلک میں ہو آفتاب کا نور

مثالِ عارضِ محبوب ہے جلو خانہ
لطافتوں کو پلا دی ہے موتیوں کی آب

ہر ایک در کے ہے محراب سے وہ خم پیدا
کہ جیسے حور نے کھولا ہو شوق میں آغوش

جوابِ قصر کا رکھتا ہے سطحِ آب کا عکس
سفید برج بطے کی طرح تیرتے ہیں

کنارِ حوض چراغاں کا اہتمام جو ہے
تو آب میں بھی کواکب کی شمعیں روشن ہیں

لگی ہیں باغ میں سہ رنگ چھتریاں ہر سمت
انھیں کے سائے میں ہے آج اہتمامِ نشست

مری نظر نے ہٹایا جو حال کا پردہ
تو پیش بیں نظر آئی شکل ماضی کی

چہل پہل کے تصور نے قفل توڑ دیئے
ہر ایک سمت بکھرنے لگی شعاعِ خیال

چمن میں نور کے فوارے ایسے پھوٹ پڑے
کہ جن کو ذہن نے برسوں چھپا کے رکھا تھا

حرم سرا کا سماں یوں نظر پہ پھیل گیا
طلوعِ صبح میں کرنوں کے جیسے سیمیں پہ

روش روش پہ کنیزوں کے غول بڑھنے لگے
جبیں دمکنے لگی رنگِ رخ نکھرنے لگے

کھلا ہے ابر کئی دن برس کے ساون کا
فلک پہ چھائی ہے رنگینیوں کی قوسِ قزح

پڑے ہیں باغ میں ہر سمت ریشمی جھولے
حرم سرا کے غزالوں کو جن کی لائی امنگ

تنا ہوا ہے کہیں شامیانۂ زرّیں
قناتیں گھیر کے ہیں جمگھٹے حسینوں کے

سمٹ کے آگیا اس طرح سطحِ ارض کا حسن
کہ جیسے کھینچ لیا عطر خاص پھولوں کا

کسی کے چہرۂ نازک میں ارجمند کی شان
کسی کے نورِ جبیں میں ادائے نورجہاں

کسی کی مانگ سے شرمائے موتیوں کی لڑی بنی بنائی ہوئی ہے کوئی جہاں آرا
کسی حسیں نے دہ ملہار چھیڑ رکھا ہے پناہ مانگتا ہے آج تان سین کا فن
اُٹھی ہے رقص کو اک سمت اِک انار کلی یہ ڈر ہے جاگ نہ جائے کہیں سلیم کی رُوح
نگاہ بھیڑ سے اُٹھ کر جو ایک سمت مُڑی نورنگ و نور میں بے اختیار ڈوب گئی
کنارِ آب سے خوشبو کے ابر اُٹھے ہیں ہجومِ ناز میں زیب النساء چمکتی ہے
نگاہِ وجد میں کیفِ صبیح چہرے پر جبیں میں تاب جسے کہیئے آبروئے حرم
کنارِ حوض لٹکتے ہوئے گلابی پاؤں قبولِ عکس سے گلرنگ حوض کا پانی
بیاض ہاتھ میں فکرِ سخن میں کھوئی ہوئی جبینِ صاف پہ بکھری ہوئی ملال کی گرد
نظر بچھائے ہوئے فکرِ شعر کی تمثال اُبھرتے ڈوبتے تخیّل کے حسیں پیکر
نظر اُلجھتی ہوئی آنکھ مسکراتی ہوئی زباں پہ شعر ترنّم سے گنگناتی ہوئی
"بیا بیا کہ مرا تابِ انتظار نماند عنانِ دل ز کفم رفت و اختیار نماند"
کہا یہ میں نے کہ اے آفتابِ صبحِ جمال تری جبیں پہ بھی بکھری ہوئی ہے گردِ ملال
ترا بھی آئینۂ دل شکست سے نہ بچا تری نظر کو بھی مایوسیوں نے گھیر لیا

جواب داد کہ ایں مرضیٔ مشیّت بود کہ پیشِ شمعِ محبت تمام عالم سوخت
کدام دل کہ پئے فتنۂ نگہ نہ رود کدام دیدہ کہ آتش بخاکِ رہ نہ رود
ز داغِ دردِ جدائی دلِ فلک سوزد در آں زماں کہ دلے از دلے جدا گردد
نقودِ روشنیٔ دیدہ صرفِ دل کردم ہنوز بر سرِ دم آں بے وفا نمی آید
غمم زمانہ ندانم چہ مدعا دارد کہ روز و شب بہ تکاپو قفائے ما دارد
ز دردِ دل بکہ گویم شکایتِ کہ کنم کہ دشمنِ دل و جانم ہمیں نگاہِ من است
قسم بکعبۂ حاجات و احمدِ مرسل
کہ بے گناہیٔ من باعثِ گناہِ من است

یکی سے موچی تک

نصیر انور

"...... جو اجنبی صبح سویرے شہر کے دروازے میں داخل ہوگا، وہی ہمارا بادشاہ ہوگا......"

— لیکن لاہور کے تیرہ دروازوں میں کوئی بھی دروازہ ایسا نہ تھا جو صبح سویرے داخل ہونے والے کسی اجنبی کو تخت و تاج کا مالک بنا دے۔ بادشاہت قائم کرنے کے لئے جس کسی نے دروازے میں داخل ہونے کی کوشش کی تو اُسے سخت مقابلہ کرنا پڑا۔ شمال سے مغل حملہ آور ہوئے تو لاہور کے ایک بزرگ پیر زکی نے آزادی کے تحفظ کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ یکی دروازے کے باہر ہی حملہ آوروں نے اُن کا سر تن سے جدا کر دیا۔ مگر اُن کی روح برسرِ پیکار رہی۔ ان کی جانبازی کا ثبوت آج بھی زندہ ہے۔ اسی دروازے کے باہر ان کے دو مزار ہیں۔ ایک مزار ان کے سر کا اور دوسرا دھڑ کا ہے۔ انہیں اُسی جگہ دفن کیا گیا تھا جہاں وہ گرے تھے۔ اس زندہ ثبوت کو برقرار رکھنے کے لئے اس دروازے کا نام انہی کے نام پیر زکی دروازہ رکھا گیا۔

پھر یہی زکی دروازہ زبان کے الٹ پھیر سے یکی دروازہ کہلانے لگا اور اس کے ساتھ ساتھ زمانے نے بھی ایسا پلٹا کھایا کہ دروازے کے اندر رہنے والوں نے اجنبی حملہ آوروں کے لئے شہر کے دروازے تو بند رکھے لیکن اُن کے لئے اپنے دلوں کے دروازے کھول دئے۔ انہی دروازوں سے جھانک کر شیر شاہ سوری نے یہ کہا تھا کہ لاہور کو ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دیا جائے۔

شیر شاہ سوری کی یہ بات جذبے والوں نے بھی سن رکھی تھی اور جب اُن کا دور آیا تو پورا لاہور انگریزی راج کی برکتوں سے نیست و نابود ہو رہا تھا۔ یہ تباہی لاہور کے دروازوں کی نہیں تھی، عمارتوں کی نہیں تھی، جذبۂ آزادی کی تھی۔ اُس روح کی تھی جس کی یادگار یکی دروازے سے باہر تھی۔ وہ زندہ یادگار آنکھوں کے سامنے ہوتے ہوئے بھی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ تو سرفروشوں نے اپنے ہی آپ سے بیگانہ ہو کر غنڈوں کا روپ اختیار کر لیا۔ جرأت و جوانمردی کی جاندار تصویریں انگریز کے ہاتھوں گھناؤنی اور ڈراؤنی بنتی گئیں۔ یہ تصویریں اپنی ہی مسخ صورتیں تھیں، اپنے ہی لوگوں کی جنہیں دیکھ کر اپنے ہی لوگ دہل جاتے تھے۔ لاہور کے ہر گلی کوچے میں کوئی نہ کوئی غنڈہ ضرور ہوتا تھا۔ ایک محلے کا غنڈہ دوسرے محلے کے غنڈے کو نیچا دکھانے کے لئے ٹکراتا تھا۔ باہمی دنگا فساد معمول بن چکا تھا۔ مگر ایک بات تھی کہ ہر غنڈہ اپنے محلے کی عزت و ناموس کا محافظ ہوتا اور وقت پڑنے پر اپنی جان تک قربان کر دیتا۔

غنڈہ گردی کے اس دور میں وہ زمانہ بھی آیا جب استاد...... کی بادشاہت قائم ہو گئی۔ تو موچی دروازہ پورے ہندوستان میں بدنام ہو گیا۔ لاہور سے باہر کے لوگ یہی خیال کرتے کہ موچی دروازے کے رہنے والے سبھی غنڈے ہیں۔ ایسا نہیں تھا۔ غنڈہ فقط ایک تھا، اور وہ بھی غنڈہ کہاں تھا۔ وقت ہی ایسا بگڑ آگیا تھا کہ اس نے اپنی تمام خوبیوں کو برائیوں میں بدل دیا تھا۔ مگر محلے والے ان برائیوں سے محفوظ تھے۔ اس لئے کہ وہ اپنے محلے کا محافظ تھا۔ اُس کی بیٹھک اس کا دربار تھی جہاں وہ سینہ تان کر بڑے طمطراق سے یوں بیٹھتا جیسے سارا نظام اُسی کے دم سے چل رہا ہے، جیسے ساری خدائی اس کی مٹھی میں ہے۔ درمیانہ قد، گٹھا ہوا جسم، بارعب چہرہ، تیز اور چمکیلی آنکھیں، استاد سے کون آنکھ ملا سکتا تھا۔ بڑے دبدبے کا مالک تھا۔ اُس کے دربار میں بڑے جی دار لوگ شامل تھے۔ ایسے لوگ جو اپنی اپنی جگہ بڑے دہشت ناک تھے۔ مگر استاد کے سامنے دو زانوں ہو کر یوں بیٹھتے جیسے بھیڑ کے معصوم بچے ہوں۔ استاد نے ان لوگوں کو ذہن گرد ہول میں

تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک گروہ جیب تراشوں کا تھا۔ اس گروہ میں بڑے باکمال جیب تراش تھے۔ نو عمر آوارہ لڑکے بھی ان میں شامل تھے۔ لاہور کے بارونق علاقوں، منڈیوں، لاریوں کے اڈوں اور ریلوے سٹیشن پر جیبوں پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے سیدھے بیٹھک میں پہنچ جاتے۔ کسی کی یہ مجال نہیں تھی کہ وہ لوٹی ہوئی رقم میں سے کچھ نکال کر اپنی جیب میں رکھ لے۔ سب کا سب جوں کا توں پورا مال استاد کے سامنے پیش کر دیا جاتا تھا۔ اور استاد ہر ایک کو اس کے کارنامے کے مطابق معقول معاوضہ ادا کر دیا کرتا۔ دوسرا گروہ جوا خانہ چلانے والوں کا تھا۔ ان کے ذمے یہ کام تھا کہ جوا خانہ چلتا رہے۔ جواری نہیں آتے تو انہیں لایا جائے۔ اور حتی الوسع یہ کوشش کی جائے۔ کہ دولت مند لوگ آئیں اور جیت پر بھاری کمیشن وصول کرتے رہیں اور اس کمیشن کا حساب کتاب ٹھیک ٹھاک رکھیں۔ ان احکامات کی خلاف ورزی کی جرأت کسے تھی۔ جوا خانہ خوب چلتا رہا۔ تیسرا گروہ لڑنے مرنے والوں کا تھا۔ یہ دراصل استاد کی فوج تھی۔ جس میں وہی لوگ شامل تھے جنہیں استاد کے اشارے پر موت کا سامنا کرنا ہوتا۔ پولیس سے مقابلہ، مخالفین سے جھڑپیں، بزنس کے سارے معرکے سر کرنا انہیں لوگوں کے ذمے تھا۔ اور وہ اپنی ذمہ داری کو نبھانے میں ذرا سی بھی کوتاہی نہ کرتے۔ استاد جس سمت اشارہ کر دیتا، وہ بھوکے شیروں کی طرح اس طرف جھپٹ پڑتے مگر استاد خون خرابے کا قائل نہ تھا۔ لڑائی جھگڑوں سے پہلے وہ اپنے ان فوجیوں کو مار کٹائی کے خاص گر بتا دیا کرتا جس سے مار کھانے والا شدید زخمی ہو کر بھی اپنی جان سے محروم نہیں ہو سکتا۔ اسے مار کٹائی اس حد تک گوارا تھی کہ رعب داب قائم رہے اور کسی کو اس کے سامنے سر اٹھانے کی جرأت نہ رہے اور اس کا رعب لاہور کے تمام غنڈوں پر طاری تھا۔ استاد کا یہ حکم تھا کہ لاہور کے تمام جوئے خانوں سے تیسرا حصہ وصول کیا جائے۔ ان دنوں قریب قریب ہر محلے کے غنڈے نے اپنی بیٹھک کو جوا خانہ بنا رکھا تھا۔ ان جوا خانوں کے مالکوں نے استاد کے حکم پر اس کے جانباز سپاہیوں کے آنے سے پہلے ہی خود بخود، ایمانداری سے استاد کا حصہ پہنچانا شروع کر دیا اور اس طرح پورے لاہور میں استاد کی دھاک بیٹھ گئی اور اس کی بادشاہت قائم ہو گئی۔

اپنی بادشاہت قائم کرنے سے پہلے اس نے انگریزی پولیس سے گٹھ جوڑ کر لیا تھا۔ چنانچہ پولیس کے کئی سپاہیوں، تھانیداروں اور دوسرے کئی افسروں سے اس کا رابطہ تھا۔ اپنا نظام چلانے کے لئے اس نے سرکاری نظام چلانے والوں کو خرید لیا تھا۔ اکثر سپاہی، تھانیدار اور دوسرے افسر اس سے باقاعدہ تنخواہیں وصول کرتے تھے اور علاقے کا جو تھانیدار اس کا تنخواہ دار نہ بنتا، اسے وہ اپنے اثر و رسوخ سے کہیں اور تبدیل کرا دیتا۔

استاد بڑا زمانہ شناس تھا۔ ہر مسئلے کا حل اسے فوراً سوجھتا۔ ہر مہم میں کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی لیتا۔ بڑی سے بڑی الجھن کو فوراً سلجھا دیتا۔ دور کی کوڑی لانے میں تو اس کا جواب نہ تھا۔ ہر بات کی گہرائی تک پہنچ جاتا۔ استاد کو گرد و پیش کے ماحول کا پورا پورا احساس تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اب وہ جس زندگی کا مالک ہے، اسے کامیاب بنانے کے کون سے طریقے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ سزا یافتہ لوگوں کو کہیں بھی عزت کی نگاہ سے دیکھا نہیں جاتا اور ان پر ان کی باقی زندگی حرام ہو جاتی ہے۔ ایسے سزا یافتہ لوگوں کے لئے استاد نے اعلان کر رکھا تھا کہ جو قیدی لاہور جیل سے سزا پوری کر کے رہا ہو جائے۔ وہ سیدھا اس کے ڈیرے پر آئے۔ کھانا، کپڑا، رہنے سہنے کی جگہ اور جیب خرچ استاد کی طرف سے ملے گا۔ کئی قیدی رہائی کے بعد سیدھے اس کے پاس پہنچ جاتے۔ بہت سے اس کے گروہ میں شامل ہو جاتے اور جو واپس اپنے گھروں کو جانا چاہتے، استاد انہیں تحفے تحائف دے کر رخصت کرتا۔ اور منزل مقصود تک کا ٹکٹ دے کر ان سے کہتا تمہاری اچھی اور کامیاب زندگی کا متمنی ہوں۔" اور اگر دنیا نے اس زندگی کو بہتر اور کامیاب بننے میں رکاوٹیں پیدا کیں تو پھر میرے اس ڈیرے پر

چلے آنا۔ اس کے دروازے ہر وقت تمہارے لئے کھلے ہیں۔

استاد کے ڈیرے کے دروازے غنڈوں، بدمعاشوں اور سزا یافتہ مجرموں کے لئے ہی کھلے نہ تھے۔ یہ دروازے تو سب کے لئے کھلے تھے۔ حاجت مندوں یتیموں اور بیوہ عورتوں کے لئے بھی جنہیں وہ باقاعدہ ہر ماہ اُن کی ضرورت کے مطابق نقد روپے دیا کرتا تھا پھر یکایک ایسے تمام لوگوں کو اس نے ایک دن اپنے ہاں آنے سے روک دیا۔ لوگ حیران تھے کہ استاد کو کیا ہوا کہ جن ضرورت مندوں کی دعاؤں سے وہ مالا مال ہوا ہے۔ انہی غریبوں کو آنے سے روکتا ہے مگر استاد کے دل کی بات بعد میں دوسروں نے سمجھی۔ استاد کو یہ گوارا نہ ہوا کہ وہ خیرات کی نمائش کرے —— اس نے اپنے شاگردوں سے کہا "نیکی چھپ کے کرو اور گناہ سب کے سامنے" ۔ اپنے اسی قول کو پورا کرنے کے لئے گنہگار استاد خاموشی اور متانت سے نیکی کا سامان پیدا کرتا رہا۔

لاہور میں دنگل ہوتے تو باہر سے آنے والے کئی پہلوان استاد کے مہمان ہوتے۔ پہلوانوں سے کہا کرتا کہ تم لاہور آئے ہو۔ لاہور میں میں ہوں، اس لئے میرے پاس رہو"۔ اور رہنے والے جب تک اُس کے پاس رہتے وہ ان کی خاطر مدارت یوں کرتا جیسے کوئی نواب راجہ یا بادشاہ کرتا ہے۔ مگر وہ بادشاہوں سے بڑھ کر تھا۔ بادشاہ تو رسماً مہمان نوازی کا سکہ جماتے ہیں۔ بگا استاد بڑے خلوص اور انکساری سے مہمانوں کی خدمت کرتا۔ اس کا ایمان تھا کہ مہمانوں سے برکت ہوتی ہے اور وہ گھر بڑا برکت والا ہے جہاں مہمان آئیں۔

پھر وہ دن بھی آئے جب ـــ

مصطفیٰ پاک نال دے تیریاں دور بلائیاں
روندے ہمزادے بال دے کینے دیہاں لائیاں

فیروز الدین احمد جلوس کے آگے آگے ترکی کے لئے چندہ اکٹھا کر رہا تھا۔ پورے لاہور نے دل کھول کر چندہ دیا یہاں تک کہ عورتوں اور نئی نویلی دلہنوں نے بھی اپنے زیورات چندے کے لئے پھیلی ہوئی چادروں میں پھینک دئے تحریکِ خلافت کی کامیابی کے لئے لاہور میں سب سے پہلا جلوس موچی دروازے سے نکلا۔ فیروز احمد کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس پر مقدمہ چلا تو عدالت نے اسے بیس سال کی سزائے قید دی۔ آخر اس نے رہائی کی عجیب و غریب ترکیب نکالی۔ یوں تو کئی رضا کار بلکہ رہنما تک معافیاں مانگ کر رہا ہو چکے تھے۔ مگر اس نے یہی مناسب سمجھا کہ پاگل بن جاؤں۔ چنانچہ اس نے ایسی ایسی حرکتیں کیں جسے کوئی بھی فرزانہ اور ہوش مند کسی حال میں بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اس نے بیت الخلا کی غلاظت سے جیل کی دیواروں پر انٹ شنٹ لکھنا شروع کر دیا۔ جیل والوں نے زچ ہو کر قیدی کو مریض بنا کر پاگل خانے بھجوا دیا دیا۔ وہاں وہ کوئی نو ماہ تک رہا۔ اس کے بعد اس کے والد نے درخواست دی کہ میرا ایک ہی بیٹا ہے اور وہ بھی پاگل۔ اس کی سزا کوئی معنی نہیں رکھتی۔ جب کہ ہوش و حواس کا مالک ہی نہیں۔ اس لئے اس کے ساتھ انصاف کیا جائے۔ حکومت نے سزا منسوخ کر دی۔ چند دنوں کے بعد فیروز الدین احمد پاگل خانے سے بھی آ گیا۔ وہ دل ہی دل میں خوش تھا کہ اس نے پاگل بن کر سب کو پاگل بنا دیا۔

شیرانوالہ دروازہ جو مغلوں کے عہد میں خضری دروازہ کہلاتا تھا۔ یہی دروازہ جہاں کبھی راوی بہتا تھا۔ اور جس کی مناسبت سے اسے خضری دروازے کا نام دیا گیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ہاتھوں شیرانوالہ دروازہ بنا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنی ہیبت طاری کرنے کے لئے اس کے دونوں طرف اپنے دو پالتو شیر پنجروں میں رکھ دیئے تھے۔ اور اسی لئے لوگوں میں اس کا نام شیرانوالہ دروازہ مشہور ہو گیا اس دروازے کے رہنے والے بابو کے نام سے کون واقف نہیں۔ پورے ہندوستان میں وہ "کوکین کا بادشاہ" کے نام

سے مشہور تھے۔ ان کی زندگی سنسنی خیز واقعات سے بھرپور ہے۔ بیسیوں مرتبہ انہوں نے بڑی دلیری سے مسلح پولیس کا مقابلہ کیا۔ مگر ان تمام مقابلوں سے کہیں زیادہ انہیں اپنے اس مقابلے پر ناز ہے جو محلے کی عزت و ناموس کے لئے نام نہاد غنڈوں سے کیا تھا۔

بالو نے جوانی میں کوکین فروشی کا آغاز کیسے کیا، یہ اپنی جگہ ایک طویل کہانی ہے۔ یہ کہانی اپنے انجام تک سینکڑوں واقعات سے بھرپور ہے۔ کوکین فروشی کے باوجود پولیس اپنی انتہائی کوشش کے باوجود انہیں گرفتار نہ کر سکی۔ بالو ہمیشہ اپنی حکمت عملی سے بچتے رہے پولیس نے ہزاروں مرتبہ چھاپے مارے مگر ہمیشہ ناکام رہی۔ ایک بار پولیس کو مخبری ہوئی کہ بالو کوکین لئے کار میں راوی کے پل پر سے گزرنے والے ہیں۔ راوی کے پل پر راستہ روکنے کے لئے پولیس نے بیل گاڑیاں کھڑی کر رکھی تھیں۔ بالو مزے سے لاہور کی جانب آ رہے تھے۔ کہ یکایک راوی کے پل پر انہوں نے اپنی کار میں سے یہ سارا نقشہ دیکھ لیا۔ اس سے پہلے کہ پولیس ان کے قریب آئے، انہوں نے ساری کوکین دریا میں پھینک دی۔ پولیس سے تصادم ہوا۔ مگر کچھ نہ برآمد کر سکی پہلے کی طرح جعلی کیس رجسٹر کر لیا مگر کوکین کا بادشاہ صاف بری ہوا۔ کئی بار انہیں جھوٹے مقدموں میں ملوث کیا گیا۔ مگر وہ ہمیشہ صاف بری ہوتے رہے۔

یہاں کے غنڈوں کی ہر ٹولی، غنڈوں کی ٹولی نہیں تھی بھٹکی ہوئی بے پناہ قوت تھی جو غلامی کی زنجیریں توڑنے کے لئے قوت بازو نہ بن سکی۔ ان غنڈوں کے سینوں میں عزائم کی بجلیاں تھیں۔ مگر کوئی بجلی ایسی نہ تھی جو غیر ملکی حکومت کے ایوان پر گرتی۔ جب بھی گری تو اپنا ہی نشیمن خاکستر پایا۔

سوختہ سامانی کے دور میں وہ دن بھی آیا جب انگریزوں کو نکالنے کے لئے دہلی دروازے کے باغ میں عام جلسے ہونے لگے اور دہلی دروازے کے اندر چوہٹہ مفتی باقر میں دودھ سے حلوائی کی دکان کے سامنے معراج دین پنساری کی دکان پر سیاست کی بساط بچھنے لگی ہر کوئی اپنے خیال کے مطابق اپنی تحریک کے فیل و پیادہ کی چال پر تبصرہ کرتا۔ یہی تبصرے سینہ بہ سینہ دوسرے دروازے کے رہنے والوں تک پہنچتے۔ گلی کوچوں کی بٹی ہوئی آزادی نے سرگوشی کی تو زندگی نے ایک نئی کروٹ لی۔ حکمران کے خلاف عام نفرت پھیل گئی۔ بہت سے انتہا پسند انگریز سے اتنے متنفر ہوئے۔ کہ وہ انگریزی زبان، انگریزی لباس اور انگریزی اطوار کے بھی دشمن ہو گئے۔ ایسے لوگ بھلا سرکاری ملازمتوں میں کیوں کر رہ سکتے تھے، خود ہی الگ ہو گئے یا الگ کر دیئے گئے۔ تحریک خلافت کا یہ اثر تھا۔ کہ یہاں کے رہنے والوں کو ہر اسلامی ملک کا درد اپنا درد محسوس ہونے لگا مگر یہ احساس اپنے درد کا مداوا نہ بن سکا۔ بہت سی مسجدوں کے امام اور پیر حاکم وقت کی "مقدس نمائندگی" پر مامور کر دیئے گئے۔ سجدہ ریز ہو کر "ہم تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں، اور تیری ہی پرستش کرتے ہیں" کہنے کے باوجود وہ سرکاری فرشتوں سے صلہ لیتے رہے اور حاکم وقت کی پرستش کرتے رہے۔ آزادی کی تحریک نے فرقہ وارانہ رنگ اختیار کر لیا۔ مہاسبھائی ہندوؤں کے تعصب نے اس تحریک کا رخ اپنی طرف موڑ لیا اور جب ۱۲ جولائی ۱۹۳۱ء کو وادی کشمیر میں قرآن مجید کی توہین کی گئی اور غازی عبدالقدیر نے نعرۂ حق بلند کیا تو مجلس احرار نے لبیک کہی اور دہلی دروازے کے باہر دیگیں چڑھا دی گئیں جن میں کھولتے ہوئے پانی میں سرخ رنگ ملا دیا گیا تھا۔ لاہور کے تمام دروازوں کے مسلمان باشندوں نے انہی دیگوں میں اپنی قمیضیں ڈبو کر سرخ کر لیں۔ پورا لاہور احرار کی سرخ دیگ میں ڈوب کر فلک شگاف آواز میں پکار رہا تھا۔

اٹھو اٹھو مومنو رخ کرو کشمیر کا
راج کو تباہ کرو ڈوگرے بے پیر کا

لاہور کے ہر دروازے نے سرخ قمیضوں کا بھپرتا ہوا سیلاب دیکھا مجلسِ احرار کا یہ سرخ سیلاب وادیٔ کشمیر کے پہاڑوں سے ٹکرا کر واپس آیا تو مسجد شہید گنج سے دور مجلس احرار کے دفتر میں سمٹ گیا اور جب مسجد شہید گنج شہید کر دی گئی تو اس وقت مجلسِ احرار اسی کے ملبے کے نیچے ڈھیر ہو گئی ملبے کے اس ڈھیر پر نئی جماعت پیدا ہوئی۔ فضا میں ایک اور آواز گونجنے لگی۔

نہ مسلماناں نوں چھیڑو اسے دبی ہوئی نار اے

مولا بخش شہید گنج کی تحریک کا بانی تھا۔ اس نے اس تحریک کا آغاز کرتے ہوئے شاہی مسجد سے ایک جلوس نکالا تھا ٹھیں مارتا ہوا یہ جلوس دہلی دروازے سے پہنچا تو دہلی دروازے نے اپنے آغوش میں کئی مسلمانوں کو گولیوں کی مسلسل بوچھاڑ سے چھلنی ہوتے دیکھا۔ بوچھاڑ کے تھم جانے پر تھوڑے سے ہی دنوں میں اس تحریک نے بھی دم توڑ دیا جیسے مخلص اور معصوم انسانوں کا خون بہانا ہی مقصود تھا۔

معراج دین پنساری کی دکان پر اپنے پٹے ہوئے مہروں کو سمیٹتے ہوئے "گٹو کھٹی" کے ایک رکن نے کہا "دھبی یہ ہندو تو اپنے دشمن تھے ہی، اب سکھ بھی ہو گئے۔ واہ میاں سر فضل حسین، جواب نہیں تیری چال کا!!"

کچھ دنوں بعد دہلی دروازے کے باغ میں ایک نئی تحریک چھوٹی۔ اس تحریک کے بانی مولانا ظفر علی خاں مرحوم تھے اس کا نام انہوں نے "نیلی پوش تحریک" رکھا۔ شیرانوالہ اور دہلی دروازے کے درمیان محلہ ککے زیاں میں یہ تحریک نیلی جھنڈیوں کے ساتھ نمایاں ہوئی۔ پھر موچی دروازے کے اندر حویلی میاں خاں کے دروازے کے سامنے ہی ایک جلسے میں مولانا ظفر علی خاں نے کہا "ہمیں اس تحریک کو لاہور ہی میں نہیں پھیلانا وہ دن قریب آ رہا ہے جب یہ نیلی جھنڈیاں نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں لہراتی نظر آئیں گی۔

مگر اس وقت پوری دنیا تو ایک طرف لاہور کے کسی دروازے میں یہ جھنڈی دکھائی نہ دی۔ پلسیلوں تحریکوں میں سرگرمی سے حصہ لینے کے بعد لاہور کو جیسے قرار آ گیا تھا اور وہ حسبِ معمول اپنے حال میں مست رہا۔

"بلا مار کے بھاگ گئی دیوا تے اکھ نال گل کر گئی بھئی"

دلاری بائی کی بھینی کے ساتھ ساتھ بھائی چھیلا ٹیپا لہر والا کے گرامو فون ریکارڈ بھی عوام میں بے حد مقبول تھے۔

"مارو مار دے سہیلیوں ٹھنٹو سے نوں ۔ ۔ ۔ ۔"

"آہا ہا ہا ہا، بھنگ کا لوٹا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اور پھر یہ قصے بھی ہاتھوں ہاتھ بک رہے تھے۔

"یوسف پھل گلاب دا ڈھٹا میں چمن دے وچ"

"سولی چڑھ منصور پکارے رل دے عشق ہلارے نی"

"ڈھول جانی، ساڈی لگی آدیں تیری مہربانی"

"ڈھول ہیرا دے گھر بیٹھی دی لوڑ"

"بازار وکیندی ہرنی سا ہنوں لے دے نکی جئی جوڑی تے دکھاں دیاں پونیاں لے دے ڈھولا"

"ہے جا لو چھتے رل کے گلاں کیتیاں اد تھے سکھ والے پل تے"

"خصماں نوں کھا گیا گھر دے جل میلے تے چلئے"

"میں انگریزی پڑھ گئی آں انار کلی وچ وڑ گئی آں"

"فلیش اپیل رن دیاں کرتوتاں" "شلین دا سیاپا" "یوسف زلیخا" "مکھی دا بارہ ماہ پانی" اور ایسے ہی بیسیوں منظوم قصے جگہ جگہ بکتے تھے۔ بیچنے والے گا گا کر ان قصوں کو پیسے پیسے اور دو پیسے پیسے میں بیچتے پھرتے۔ گلی کوچوں سے باہر موچی دروازے کے باغ میں بڑے بوڑھے اور بے روزگار نوجوان "اصلی تے وڈی ہیر وارث شاہ" سننے میں محو ہوتے۔ لوہاری کے باغ میں "بہرام ڈاکو عرف قاتل حسینہ" اور "عجب عرف طلسمی تلوار" جیسے ناول سننے کے لئے صبح سے شام تک لوگوں کی محفل جمی رہتی۔ دوسری طرف شاہ محمد غوث کے باغ میں بہترین چوسر کھیلنے والے جمع ہو جاتے۔ اور شطرنج کے بہترین کھلاڑی بھاٹی کے باغ میں شطرنج کے چونسٹھ خانوں میں یوں گم ہوتے جیسے ان خانوں سے باہر دنیا میں اور کچھ بھی نہیں۔ اسی لئے لوگ کہتے یہ کھیل نہیں خانہ خراب تختہ ہے۔ اس پر جو آیا اسی کا تختہ ہوا۔ مگر اسی تختے پر چند لوگوں نے نام پیدا کیا اور اپنا خانہ بھی آباد رکھا۔ ان میں اکرم گھڑی ساز، شریف حسین سہروردی اور افضل دل نمایاں ہیں۔

ایک اور نامور بازار تیز ابیاں کا دنیا کفنی ہے مگر وہ شاطر نہیں، اپنے وقت کے بہترین پتنگ بازوں میں سے ایک ہے اپنے پتنگ خود بناتا کیونکہ پتنگ بازی کے لئے بنے بنائے کنکوے اور پتنگ خریدنا معیوب سمجھا جاتا ہے اس کی بیٹھک میں کئی پریاں اور دیو طلائی ہار پہنے دیوار پر آویزاں تھے۔ نیلم پری، لال پری، سبز پری، کالا دیو، نیلا دیو۔ اور وہ خود راجہ اندر بن کر ان سب کو بڑے فخر سے دیکھتا۔ ہر پتنگ اور ہر کنکوے کا اپنا نام اور اپنی تاریخ تھی۔ کب بنا، کس سے پیچ لڑے اور کتنے بو کاٹا کئے۔

دنیا کفنی چھ فٹ سے زیادہ قد، لحیم شحیم، ہنس مکھ، ملنسار، مزے لے لے کر دوستوں کو بڑے بڑے پتنگ بازوں کے قصے سناتا افضل خاں کا نام بڑے احترام سے لیتا۔ "افضل خاں شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ کپ بنانے میں اُسے کمال حاصل تھا۔ کپ یوں بناتا کہ پہلے تیلیاں تراش لیتا اور انہیں درمیان میں سے توڑ دیتا۔ پھر اس کے بعد بڑی کاری گری سے اُسے جوڑتا اور کاغذ منڈھتا۔ اس طرح جو کپ بنتا تھا وہ آج ناپید ہے۔ افضل خاں اپنا کپ کٹ جانے پر واپس لانے والے کو پانچ روپے انعام دیا کرتا تھا۔

لاہور کے باکمال پتنگ بازوں میں استاد ماموں، استاد جلال الدین، استاد پیر بخش اور چودھری بستا بڑے نامی گرامی ہیں۔ ان استادوں نے پتنگ بازی کو باقاعدہ فن کی صورت دی۔ ان استادوں کے بیسیوں شاگرد ہر جمعہ اور اتوار منٹو پارک میں پتنگ بازی کے جوہر دکھاتے اور یہ جاں باز استاد ریفری کے فرائض سرانجام دیتے کہ کوئی پتنگ باز اپنی جگہ سے غلط نہ ہلے اور کوئی غلط ہاتھ نہ مارے۔"

استادوں میں پیر بخش پتنگ بناتے اور پیچ میں اپنی مثال آپ تھے پیچ لڑاتے تھے اور اُن کے بارے میں یہ مشہور رہے کہ اُن کے پیچ دوسری سلطنتوں تک جا پہنچتے تھے۔ جب پتنگ نظروں سے اوجھل ہو جاتے تھے۔ "تودہ گھر" کے انداز سے پیچ لڑاتے تھے۔

استاد جلال تو اس فن کے عاشق تھے۔ انہوں نے اس عشق میں اپنی ساری جائیداد ہوا میں اڑا دی۔ وہ ڈھیل نہیں لڑاتے تھے۔ بلکہ کھینچ کے ماہر تھے۔ کپ اپنے ہاتھوں سے بناتے تھے۔ اور اس پر مختلف رنگوں کی چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں چسپاں کر دیا کرتے تھے اور اُن کا کپ آسمان پر یوں نظر آتا تھا جیسے کوئی فوجی جوان محاذ پر کھڑا ہے۔

استاد ماموں کا "ڈھیل" میں جواب نہیں تھا۔ محنت مزدوری سے اپنا پیٹ پالتا۔ مگر جب سردار دیال سنگھ پتنگ اڑانے کا فن سیکھنے کے لئے استاد ماموں کا شاگرد ——— ہوا تو پھر شاگرد ہی اپنے استاد کا سارا خرچ برداشت کرتا تھا۔ استاد ماموں کے

بنائے ہوئے پتنگوں کی خصوصیت یہ تھی کہ چوبیس پچیس میل تک پیچ جانے پر ڈور ڈھیلی نہیں پڑتی تھی۔

"چودھری بسا بھی بڑے استادوں میں شامل تھا۔ اس کے چھ بائی "پتنگ" مشہور رہیں۔ اس کے شاگردوں میں نامور شاگرد مہاراجہ سردار بکرم سنگھ امرتسر والے نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

پتنگ بازی کے زبردست معرکے استاد جلال اور استاد پیر کے درمیان ہوتے ہیں۔ استاد پیر اپنچیس[25] پچیس[25] گز کی گلابی رنگ کی پگڑی باندھتے تھے۔ استاد جلال پیر پرست تھے۔ اور وہ مقابلے کے وقت کسی نہ کسی پیر یا درویش کو اپنے ساتھ لاتے۔ ان دونوں استادوں کی رقابت اس حد تک بڑھی کہ دونوں تباہ ہو گئے۔ سارا اثاثہ پتنگ بازی میں سوا ہو گیا اور آخر لوگوں نے بیچ میں پڑ کر صلح کرا دی جیسے لوگ منتظر تھے۔ کہ وہ کب تباہ و برباد ہوں تو ہم دونوں کو گلے ملوا دیں۔

"پتنگ بازی بغیر ڈور کے ممکن نہیں۔ ڈور لگانا بھی ایک فن ہے اور اس فن کا سب سے بڑا استاد صوبہ ہے۔ استاد صوبہ ڈور لگانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ وہ موسم کے مطابق ڈور پہ مانجھا لگاتا . . . ."

دینے کفنی نے استاد صوبے کا ذکر جاری رکھتے ہوئے کہا "استاد صوبہ بہت بڑا استاد تھا۔ ایک بار کسی نے تلوار مار کہ ڈور استاد سے لگوائی۔ پتنگ کٹنے پر اتفاقاً وہ ڈور ایک میم کے گلے پر گری تو اس کی گردن تن سے جدا ہوتے رہ گئی لہولہان چیختی چلاتی غش کھا کر گر پڑی۔ اس کے بعد سے سرکار نے ایسی ڈور پر پابندی لگا دی۔

دینے کو کفنی کیوں کہتے ہیں یہ بتانا ضروری ہے۔ کفنی اس لئے نہیں کہتے کہ وہ سر پہ کفن باندھے کسی معرکے پہ گیا تھا۔ بلکہ ہوا یہ تھا کہ گرمیوں کی ایک دوپہر وہ بیٹھے بیٹھے مر گیا۔ مرنے والے کے ساتھ رونا دھونا سبھی کچھ ہوتا ہے۔ سبھی روتے دھوتے شام کے وقت اس کو دفن کرنے کے لئے میانی صاحب لے جا رہے تھے۔ جنازہ کندھوں پہ اٹھائے جب عزیز و اقارب' دوست احباب اور محلے والے ہائی کورٹ کے پاس سے فین روڈ پہ گزرے تو ایک شخص کندھا دینے کے لئے "کلمہ شہادت" کہتا آگے بڑھا تو یکا یک اس کے قدم رک گئے۔ اور وہ چیخ مار پیچھے ہٹ گیا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ مردہ حرکت میں ہے۔ جنازہ وہیں سڑک پہ رکھ دیا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دینا اٹھ بیٹھا اور کفن میں سے سر نکالتے ہوئے لوگوں سے کہنے لگا "اوئے مینوں کتھے لے جا رہے او، میرا حالی پیچ نہیں کٹیا گیا!!"

دینا اسی طرح زندہ سلامت کفن میں لپٹا ہوا واپس آیا تو چاروں طرف خوشخبری پھیل گئی کہ دینا مرا نہیں۔ اس پر سکتہ طاری تھا۔ کفن میں لپٹے ہوئے دینے کو دیکھ کر ایک شخص نے بے اختیار کہا "او دینا کفنی" -!

بس اس کا کہنا تھا کہ دینے کا نام دینا کفنی مشہور ہو گیا۔

بسنت منانے کی تیاری پورے لاہور میں بڑے زور شور سے ہوتی۔ مہینوں پہلے ڈوریں لگوا لی جائیں اور بسنت سے ایک روز پہلے مکان کی چھتوں پہ دف' ڈھول' بگل' کنستر' ہاؤ ہو کا پورا ساز و سامان ہوتا۔ ہندو مسلمان سکھ اور عیسائی سبھی جوش و خروش سے یہ موسمی تہوار مناتے۔ بسنت کی صبح لڑکے بالوں کی چھاؤں میں چھتوں پہ جا پہنچتے۔ اور منڈیروں' ممٹیوں پہ کھڑے ہو کر' بو کاٹا کے پر شور نعروں سے سورج کا استقبال کرتے۔ جو رنگ برنگی پتنگوں' کنکووں اور گڈیوں کے پیچھے سے ابھرتا ہوا دکھائی دیتا۔

ایک طرف لاہور کی ہر چھت پہ پتنگ بازی کا شغل چراغ جلے تک جاری رہتا اور دوسری طرف منٹو پارک کے علاوہ وضع دار پتنگ باز مادھو لال حسین کے مزار پر بسنت کے میلے میں اپنے ہاتھ دکھاتے۔ مادھو لال حسین کے مزار پہ پتنگوں کا میلہ لگنے کی ایک خاص وجہ

ہے۔ حسین، جہانگیر کے عہد میں ایک درویش تھے۔ وہ شاہدرہ کے ایک ہندو لڑکے مادھولال کو پیار کرتے تھے۔ اسی پیار نے دونوں کا نام ایک کر دیا۔ کہتے ہیں کہ مادھولال کو پتنگ اڑانے کا بے حد شوق تھا۔ ایک دفعہ مادھولال کے پاس کوئی پتنگ نہ رہا تو وہ دلگیر ہوگیا۔ حسین سے اپنے محبوب کی آزردگی نہ دیکھی گئی۔ وجہ پوچھی تو پتنگ کی فرمائش ہوئی۔ فقیر کے پاس پیسے کہاں تھے کہ فرمائش پوری کرتا۔ چنانچہ شہر میں اعلان کر دیا گیا کہ کوئی اولاد کا طالب ہو، فقیر کے در پہ ایک ٹکہ دے کر آئے اور بیٹا پائے۔ اس طرح جتنے پیسے اکٹھے ہوئے ان سے مادھولال کو پتنگ خرید دئے گئے۔ اسی یاد میں مادھولال حسین کے مزار پر بسنت کا میلہ لگتا ہے۔

مادھولال حسین کے مزار پہ بسنت کے تھوڑے عرصے بعد مارچ کے آخری اتوار میلہ چراغاں کی دھوم ہوتی۔ ہندو، مسلمان اور سکھ عقیدت کے نذرانے پیش کرتے، آرزوؤں کے چراغ روشن کرتے اور دوسری طرف میلے کے رسیا شالامار باغ میں زندگی سے بھرپور یادوں کے ساتھ یوں جمع ہوتے جیسے دونوں جہان کی خوشیاں ان کے چاروں طرف پھیل گئی ہیں۔ ان خوشیوں کا زیادہ احساس اُن کسانوں کو ہوتا جو فصلیں کاٹ کر جشنِ چراغاں میں دھوم دھڑکے سے شامل ہوتے۔ سکھ کسان شالیمار پہنچنے سے پہلے میٹھے مالٹے کی شراب روز کی بوتل میں ملا کر پی پلا کر نشے میں دُھت بولیاں بولتے، اُچھلتے کودتے، لکڑی کے چوہے نچاتے ہیرا منڈی سے ہو کر آتے۔

یہاں سے وہ سیدھے مادھولال حسین کے مزار پہ پہنچتے اور پھر اپنی تمام تر ہنگامہ آرائی کے ساتھ شالیمار میں قدم رکھتے جو زمین پہ ٹکتے نہیں تھے۔ شالامار میں نہ صرف ان کے لئے بلکہ سب کے لئے تمام دکانوں میں سے فقط ایک دکان باعثِ کشش ہوتی۔ اور وہ تھی بسم اللہ جان کی دکان۔ بسم اللہ جان پورے بناؤ سنگھار کے ساتھ اپنے شوہر کے سامنے بیٹھی پان بیچتی تھی۔ دکان اور رہائش نیلگنبد روڈ پر تھی اور اب بھی ہے۔ اس زمانے میں عرب ہوٹل میں بیٹھنے والے صحافی، ادیب اور شاعر بھی اسی سے پان کھاتے تھے۔ میلہ چراغاں پر وہ شالامار اپنی دکان لگاتی تو رنگا رنگ ماحول میں دیہات سے آنے والوں کی توجہ کا مرکز بنی رہتی۔

یوں تو مقبرۂ جہانگیر میں اس کے کچھ عرصے بعد بہار کا میلہ بھی لگتا مگر میلہ چراغاں ہی لاہور کا سب سے بڑا میلہ رہا۔ میلے کے رسیا رات بسر کرنے کے لئے قالین، دریاں، بستر اور چھولداریاں اپنے ساتھ لاتے۔ ایک طرف بریانی کی دیگیں چڑھی ہیں تو دوسری طرف تکے کباب مچھلی نان اور مرغ پلاؤ کی پلیٹیں خریدی جا رہی ہیں۔ کہیں طرح طرح کی مٹھائیوں کے مزے اڑائے جا رہے ہیں تو کہیں آلو چھولے، گول گپے، بھلے دہی چاٹ کے چٹخارے لئے جا رہے ہیں۔ چیتر کی شام کو سورج نہیں ڈوبتا تھا بلکہ روشن گیسوں میں منتقل ہو کر رات بھر میلے کو جگمگاتا رہتا۔ فضا زندگی کے نغموں سے معمور رہتی۔ ایک طرف گھڑے بجو پہ کافیاں اور گیت ہوتے اور دوسری طرف طبلے اور ہارمونیم پر غزلیں، گیت اور ٹھمریاں مگر ان سب پر چیٹے ڈھول اور چمٹے کی لے پر گونجتی ہوئی بولیاں چھا جاتیں:

بلے بلے بلے بلے ہو ——— !!

اوئے میرے سوہرے نوں پوا دیو گھنگھرو

ویہڑے وڑدا کھڑاک نہ کردا

نی بلیے روویں گی چیڑ کھا دیں گی

چپ کر کے گڈی وچ بہہ جا

بوگو دے پیر سلیپٹ کانے
تے گڈی وچوں لت ملکے

بلے بلے بلے بلے بوگڈی وچوں لت ملکے

اتوار کی رات تک یہ بولیاں رسمی تکلفات سے آزاد ہو کر انسانی جذبے کی ہر بات کھلم کھلا کہتی ہوئی کہیں دور دیہات کی فضاؤں میں گم ہو جاتیں اور پھر پیر کی صبح "پہلے پیر" کا میلہ شروع ہوتا — عورتوں کا میلہ' — جو ہر ماہ کے پہلے پیر شالامار میں منعقد ہوتا۔ اس میں سوائے عورتوں اور بچوں کے کوئی شریک نہ ہو سکتا تھا۔

عورتوں کے اس میلے کے علاوہ شہر میں بھی عورتوں کے دو میلے منعقد ہوا کرتے۔ ایک چلہ بی بیاں کا میلہ اور دوسرا پیر دیدبان والے کا۔ دونوں میلے لگاتار تین دن تک جاری رہتے۔ پہلا میلہ محلہ چلہ بی بیاں میں ہوتا اور عورتیں سید واجد علی شاہ کی حویلی میں جمع ہوتیں۔ دکانیں محلے میں لگتیں۔ مٹی کے کھلونے بیچنے والے ہندو ہوتے۔ تیل کے تیلے، آلو چھولے اور تکے کباب والے مسلمان ہی ہوتے۔ دوسرا میلہ محلہ پیر گیلانیاں میں ہوتا۔ پیر صاحب کی بیٹھک کے ساتھ ہی ان کی بہت بڑی حویلی میں عورتیں جمع ہوتیں۔ دکانیں، گلی کوچے میں لگتیں۔ پیر صاحب کی بیٹھک میں میلے کے دوران ہندوستان کے نامور گویّے حاضری دیتے اور گا کر ان سے دعائیں لیتے۔ دن کو گانے کی محفل بیٹھک میں اور شام کو اندر بڑے صحن میں۔

اس میلے کی گانے کی ایک محفل یادگار رہے گی۔ روشن آرا بیگم بمبئی سے آئی تھیں۔ اپنے مسحور کن گانے کے بعد پیر صاحب کی دعائیں لیں۔ ان کے بعد استاد بڑے غلام علی خاں نے اپنی 'مٹھاس' کا خاص رنگ جمایا۔ دعاؤں سے استاد کو بھی فیضیاب کیا گیا۔

پھر سب کی نگاہیں ننھی منّی سی دبلی لڑکی پر مرکوز ہو گئیں۔ دبلے سے گول چہرے پر چاہِ ذقن نمایاں تھا۔ اس نے اجازت پا کر ایک جگ اٹھایا، اسے اپنے کندھے پر رکھا اور پھر رقص میں آکر سریلی آواز میں گانا شروع کیا:

شالا جوانیاں مانے آکھا نہ موڑیں پی لے

یہ فلمی گانا ختم ہوا تو پیر صاحب سید اصغر علی شاہ صاحب نے فرمائش کی "کوئی اپنے دیس پنجاب دا گیت سُنا!"

ننھی مغنیہ فکرمند ہو گئی۔ کچھ دیر وہ یونہی کھوئی کھوئی سی کھڑی رہی۔ پھر یکایک اس کے چہرے پر رونق آگئی۔ اسے کوئی گیت یاد آگیا تھا۔ انتہائی خوشی میں لہک کر اس نے بیٹھی اور سُریلی آواز میں گانا شروع کیا:

ساڈا دیس پنجاب پیارا اے
ایہہ سب دا راج دلارا اے

آواز میں سُریلی گھنٹیاں سی بج رہی تھیں، ساری محفل جھوم اٹھی اور جب اس نے یہ انترہ ادا کیا:

ایدی گڈی اسمان تے چڑھ جاوے

تو سننے والوں کو یوں محسوس ہوا جیسے آواز کا ہر سُر سات آسمانوں کو چھو رہا ہے۔ اس جادو بھری آواز میں کچھ ایسا تاثر تھا کہ پیر صاحب نے بے ساختہ ننھی گانے والی سے کہا "جا تیری گڈی اسمان تے چڑھ گئی اے . . . !"

ننھی مغنیہ جذبات سے مغلوب ہو کر پیر صاحب کے قدموں میں گر پڑی۔ انھوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

وہ ننھی سی مغنیّہ اس وقت بے بی نور جہاں تھی۔

اور آج وہی نور جہاں اب بھی جادو بھری آواز کی ملکہ ہے۔

پیر صاحب کی بیٹھک سے چار قدم دور سے غلام احمد کا چھوٹا سا دواخانہ ہے جس کی نیپالی گولیاں "اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا!" کے اشتہار کی بدولت ہندوستان بھر میں بکتی رہیں۔ اسی محلے میں ایک صاحب "اسلام مورتی" گذرے ہیں۔ اسلام مورتی کے زمانے میں ہندوؤں میں ایک شخص رام مورتی تھے۔ کسرتی بدن، جسمانی طاقت کے ایسے مظاہرے کئے کہ شکتی کے اوتار مانے گئے۔ ان کے مقابلے میں اسلام مورتی خم ٹھونک کر آئے۔ جسم وجان میں رام مورتی سے زیادہ طاقت ور۔ اپنے سینے پر بڑے بڑے ہتھوڑوں کی ضربوں سے بڑے بڑے پتھر تڑواتے۔ دائیں بائیں، مخالف سمت کی جانب رسّہ کھینچنے والے چار چار آدمیوں کو درمیان میں رہ کر ایک ہی جھٹکے سے اپنی طرف کھینچ لیتے۔ بے پناہ طاقت کے ان مظاہروں کی کامیابی کے ساتھ ہی جانے کیا سوجھی کہ دوا فروشی کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ ہزاروں روپے کمائے اور پھر اس راہ پر چلنے والوں نے طاقت کے مظاہرے تو نہ کئے۔ البتہ "مجمع گیری" کو اپنا پیشہ بنا لیا۔ ان میں کوچہ سادھواں کے عبدالرحیم مرحوم اور محمد حسین مرحوم قابلِ ذکر ہیں۔

لاہور کے گلی کوچوں میں اکثر ان کی باتیں ہوتیں۔ تھڑے پر بیٹھے ہوتے لوگ دوا فروشوں سے لے کر ایمان فروش لیڈروں تک کا ذکر کرتے۔ کہیں فیض باغ کے 'رب' کا بھی ذکر ہوتا۔ جس نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا اور جس کے ہاں کئی حوریں اور غلمان بھی تھے اور آخر وہ 'رب' جعلی نوٹ چھاپنے کے جرم میں دھر لیا گیا۔ کہیں علّونٹ کے قصے بیان ہوتے کہ "واہ یار! اب کے اس نے کمال ہی کر دکھایا۔ علّونٹ شیطان بن کر ایک طرف کونے میں دبک کر بیٹھ رہا۔ سامنے بڑے تخت پر گز بھر لمبی داڑھی والا خدا بٹھایا جو غصے میں فرشتوں پر گرجتا اور برستا ہے۔ پوتھیاں کھلی ہیں۔ فرشتے پڑھتے اور ایک ایک نام گننے میں مصروف ہیں۔ مگر کہیں وہ نام نہیں ملتا جس کے خلاف خدا جلالی میں ہے۔ آخر غیض و غضب کے عالم میں خدا نے کہرام برپا کرتے ہوئے کہا "جب میں نے اس نبی کو نہیں بھیجا تو پھر کس نے بھیجا ہے ـــ کون ہے وہ ـــ ؟" ـــ اس پر علّونٹ شیطان کے روپ میں آگے بڑھا اور ہاتھ باندھ کر عرض کیا "اے خدا! تو نے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر دنیا میں بھیجے تو میں نے اف تک نہ کی۔ اور میں نے فقط ایک ہی بھیجا ہے تو تیری خدائی خطرے میں آ گئی!!" ـــ کسی اور محلے سے [illegible] شاہ کے فلک شگاف گانے چھدرٹ کر دوسرے محلے کے در و دیوار سے ٹکراتے تو سب کے سب وہیں پہنچ جاتے جہاں کسی دکان کے تھڑے پر موتی شاہ لوگوں کی فرمائش پوری کر رہا ہے۔ موتی شاہ درویش صفت حاضر جواب، ضلع جگت میں مراثی بھی اس کا دم بھرتے ہیں۔ گانے کے ساتھ ساتھ اپنی باتوں سے ہر محفل کو زعفران زار بناتا کہیں اور پہنچ جاتا۔

ہر محلے کا ہر تھڑا اپنے محلے کے گرم حمام کی طرح اپنے پورے محلے کی جیتی جاگتی منہ بولتی تصویر ہوتا۔ تھڑوں پر یا گرم حماموں میں ہنسی مذاق، دکھ سکھ، دنگل، الیکشن، مہنگائی، سودے، سیاست، سکینڈل، ہر قسم کی باتیں ہوتیں۔ ان باتوں میں چونے منڈی کے خلیفہ کے کباب اور مسجد وزیر خاں کی مچھلی کا بھی ذکر ہوتا۔ لوگ استاد گام کی شاعری پر بھی تبصرے کرتے۔ استاد عشق لہر اور استاد ہمدم سے کہیں زیادہ استاد گام عوام میں زیادہ مقبول تھا۔ ہمیشہ فی البدیہہ شعر کہتا اور اگر کسی نے مکرر کہہ دیا تو وہ سرے ہی سے شعر بھول جاتا۔ ان پڑھ تھا اور بازار سریانوالہ میں کباب کی دکان کرتا تھا۔ ایک مشاعرے میں سٹیج پر پہنچا تو لوگوں نے آوازے کسے۔

"کبا بیا اوتے، کبا بیا اوتے۔۔۔۔" مگر استاد بڑے اطمینان سے کھڑا رہا اور قدرے توقف کے بعد لوگوں سے یوں مخاطب ہوا:

کوئی دودھ ویچے، کوئی دہی ویچے
کوئی بیٹھ تندور تے نان ویچے
لوک کھندے نے گام کبابیا اے
اے کباب تے ویچے تے ٹن ویچے

ٹن کی آواز پر فضا میں قہقہے پھوٹ پڑے اور پھر کسی کو ٹوکنے یا آواز اکسنے کی جرأت نہ ہوئی۔

استاد گام کی دوستی تاجی ٹنگے کے ساتھ تھی۔ تاجی لنگڑا سا تھا۔ آواز میں درد تھا، چرس کے نشے میں ہارمونیم پہ کافیاں سناتا تو اس کی درد بھری آواز سے پورے ماحول پر افسردگی طاری ہو جاتی۔ لاہور کے کسی تکیئے میں چلے جایئے۔ کسی نہ کسی وقت تاجی دم لگا کر پرسوز ویرانیاں پھیلاتا ہوا ضرور دکھائی دیتا۔ تاجی کے علاوہ ان تکیوں میں دوسرے لوگ بھی ہیں۔ آیئے ذرا ان سے مل لیں ــــ

موت شگفے کی لاٹ میں دھواں بن کر ہڈیوں کے ڈھانچے میں پھیلتے ہی پھیپھڑوں میں سمٹ گئی تو گامی نے کھانستے ہوئے زور سے نعرہ لگایا "بل بل بلی، کل بلاٹلی!"

تکیئے میں بیٹھ کر گامی اور اس کے ساتھی اپنی بلاؤں کو اسی طرح ٹالتے ہیں، لیکن یہ بلائیں پھر بھی نہیں ٹلتیں۔ سستی، کاہلی، بے زاری اور مردنی سب پر طاری ہے۔ کسی کے جسم میں زندگی کی رمق، ہماہمی، جوش، خروش، جذبہ اور ولولہ نہیں۔ بھرے ہوئے چلم سے چرس کے ہر بھتے میں اپنے ہر غم کو دھواں بنا کر اڑانے کی مسلسل اور ناکام کوشش میں انہوں نے اپنی زندگی کو فقط ایک سانس کی نازک ڈوری بنا دیا ہے۔ یہی ڈوری تار بن جاتی ہے۔ اسی تار کو وہ یوں چھیڑتے ہیں کہ اداسیاں، مایوسیاں اور نامرادیاں سمٹ کر وہ نام بن جاتی ہیں جس سے تار ملانے کے لئے چرس کے بھتے اڑائے جاتے ہیں۔ ہر لمبے کش کے بعد سرخ آنکھیں نیلے آسمان پر مرکوز ہو جاتی ہیں اور تکیئے کی فضا میں یہ نعرہ گونج اٹھتا ہے "حق مولا، باقی سب رولا ای رولا!!"

تکیوں میں بیٹھ کر زندگی کو سوختہ بنانے والوں کو ہم چرسی کہتے ہیں مگر تکیے کی زبان میں انہیں 'عملی' کہا جاتا ہے۔ عملی لوگ آپس میں ملتے ہیں تو ایک دوسرے سے یہ نہیں پوچھتے کہ کس حال میں ہو؟ ــــ بال بچے کیسے ہیں؟ ــــ کچھ کھاؤ گے تو نہیں؟ ــــ وہ ان رسمی تکلفات سے قطعی محروم ہیں۔ فقط ایک بات ان کے دل میں ہوتی ہے جو دوسرے عملی کو دیکھتے ہی فوراً ان کی زبان پر آجاتی ہے ــــ "مولا، پھر لگے دم؟"

ــــ اور پھر دما دم مست قلندر کی لے پر زندگی دھوئیں میں تحلیل ہو کر ہر جاندار شے کو راکھ میں بدل دیتی ہے۔ زندگی سے بھاگے اور ٹھکرائے ہوئے ڈھانچے اسی راکھ کو کریدتے، زندگی کی حرارت تلاش کرتے کرتے اور دم لگا کر دم توڑتے توڑتے آخر ہمیشہ کے لئے ٹھنڈے ہو جاتے ہیں:

"وچ قبر دے مٹی ہونا مرنا ہیوں یاد اے!"

دم لگا کر تاجی گنگنا رہا ہے۔ تکیئے کے دوسرے عملی اس کی درد بھری آواز پر ٹھنڈی آہیں بھرتے ہوئے خلا میں گھورتے ہیں

کہ سامنے بیٹھا ہوا ملنگ بابا سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے "اوئے، یہ بات اپنے پلے باندھ لو . . . . ."

"ٹھہرو ملنگ بابیو، ذرا اپنا پلہ کھول لیں " جیرے نے مسکراتے ہوئے بات پیدا کی۔ ملنگ بابے کے گھٹنوں کو چھونے کے لئے آگے بڑھا تو دو چار عملی اس کے ساتھ ملنگ بابا تک پہنچ گئے۔ جیرا ملنگ بابا کا پروردہ ہے۔ وہ شاید اسی تکیے میں پیدا ہوا اور اسی تکیے کے کسی کونے میں ڈھیر بن جائے گا۔ پھوکٹ میں دم لگانے کے لئے ہر ایک کی خدمت کرتا ہے۔ ملنگ بابا کا خاص مرید ہے۔ ملنگ بابا بقول جیرے کے غم غلط کرنے کے لئے چرس نہیں پیتا بلکہ من مارنے، یکسوئی حاصل کرنے اور حق مولا تک پہنچنے کے لئے دمادم مست قلندر کے روپ میں مگن ہے۔

جیرے کے ساتھ دو چار عملی ملنگ کے قریب پہنچے تو ملنگ نے اُن سب کو مخاطب کیا "دیکھو، کسی کا دل نہ توڑو، دل توڑنا سب سے بڑا گناہ ہے۔"

جیرا یہ سنتے ہی ملنگ کے قدموں میں جا گرا۔ اٹھا اور پھر اس کے گھٹنے کو دباتے ہوئے کہنے لگا "ہائے، کئی وڈی گل کیتی جے، نال ایمان دے۔"

ایک عملی نے ملنگ بابا کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "بابیو، یہ چلم ذرا ادھر آجائے، ہم بھی ایک کش لگا لیں۔"

ملنگ بابے نے جھنک کر کہا "رہنے دو۔ ابھی تو ایک سوٹا لگا چکے ہو۔"

اس پر اس عملی نے ہاتھ لہراتے ہوئے شکستہ آواز میں کہا "میں نے کہا، تو پھر یہ کہنے کی باتیں ہیں کہ کسی کا دل نہ توڑا کرو؟"

ملنگ بابے کا دل اچھل کر اس کی ہتھیلی میں آگیا "اوئے، لا لا۔ یہ بات ہے ۔۔۔۔ لے پکڑ، لگا سوٹا ۔۔۔ دمادم، مٹے غم . . . . ."

باری باری سب نے دم لگایا تو ملنگ بابے نے کسی گہری سوچ میں ڈوب کر آگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک عملی سے پوچھا "یہ کیا ہے؟"

اس نے جواب دیا "اگ اے۔"

جیرے نے پتے کی بات کہی "اگ تے ساڈی جان دی رگ ہوئی۔"

ملنگ بابے نے جیرے کی طرف کوئی دھیان نہ دیا، تار ملائے وہ کہیں دور کھویا ہوا تھا۔ اس نے گھمبیر آواز میں پھر دوسرے عملی سے پوچھا "یہ آگ کس کو لگی ہے؟"

دوسرے نے کہا "لکڑی کو . . . . ."

پھر ملنگ بابے نے فلسفیانہ لہجے میں کہنا شروع کیا "یہ لکڑی کبھی کسی درخت کو لگی تھی۔ ہرے بھرے درخت کو جس کی گھنی اور ٹھنڈی چھاؤں میں ہیر رانجھا، سسی پنوں، سوہنی مہینوال، مرزا صاحباں، سستی مراد ۔۔۔ اور کتنے ہی نامراد اپنی اپنی بولیاں بول کر چلے گئے!"

یکایک جیرے نے ایک بار پھر ملنگ کے گھٹنے کو دباتے ہوئے کہا "ہائے صدقے جاواں، کئی وڈی گل کیتی جے نال ایمان دے۔"

دوسرے عملی جلتی ہوئی لکڑی کو دیکھ کر اردگرد پھیلی ہوئی راکھ میں اپنی نامرادی کا ساز و سامان حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے رہ گئے۔

ملنگ بابے نے زور کا ایک اور دم لگایا اور چوباش ہو کر سب سے کہنے لگا "دیکھو، قسم کھاؤ جھوٹ کبھی نہ بولو گے!"

ایک عملی نے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا "مجھے اپنی جان کی قسم . . . . ."

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ جیرے نے اس کو ٹوک دیا "تیری جان کا کیا بھروسہ، کوئی اور قسم کھا!"

عملی نے جیرے کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "لے، تیری جان کی قسم . . . . ."

جیرے نے بات کاٹتے ہوئے کہا "میری جان کے پیچھے کیوں پڑے ہو؟ کوئی اور قسم کھا۔"

اتنے میں ایک اور علی پنک سے چونکا" اوئے، یہ اکیلے اکیلے کیا کھا رہے ہو۔ لاؤ، ادھر بھی"
پھیرے نے فوراً اسے چپ کرا دیا" قسمیں کھا رہے ہیں اور کچھ نہیں۔۔۔"
ملنگ بابے نے مسکراتے ہوئے نئی راہ نکالی "اچھا، تو اپنے بچوں کی قسم کھالے"
علی نے ایسا ہی کیا" دیکھی، اگر میں جھوٹ بولوں تو میرے بچے مریں"
پھیرے نے خوش ہو کر کہا "ہاں، اب مزا آیا نا!"
——— مگر ملنگ بابا نے جوش میں آکر سب کو چونکا دیا" اوئے تیرے بچے تو پہلے سے مرکھپ چکے ہیں!"
علی نے اپنا سر یوں جھکا لیا جیسے گردن الگ ہو چکی ہو۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور سسکنے کی دبکی لاٹھ اس کی نگاہوں میں پانی کی بوند بن گئی۔ تاجی نے اس بوند کو اپنے دل میں سمو لیا اور پھر ابھری ہوئی آواز میں گنگنانے لگا:

دل دتا و لگیری سہڑی روح یتیم بنایا
او نیں مڑ دے واپس اللہ نے گئی موت جنہاں نوں۔

تاجی کی پرسوز آواز کا ذکر چیمبرلین روڈ پر واقع مراثیوں کے تکیوں میں بھی ہوتا۔ اس تکیے میں پیشہ ور گانے والے جمع ہوتے اور اپنی اپنی میراث کا سے سُر کے سہارے مظاہرہ کرتے۔ یہاں کی تین یادگار محفلیں اب بھی لوگوں کو یاد ہیں۔ پہلی محفل میں شریک ہونے والے بمبئی کے خادم حسین خاں، دلی کے تان رس خاں اور پٹیالے کے تان کپتان فتح علی تھے تینوں اپنے وقت کے بڑے استادوں میں شمار ہوتے تھے۔ دوسری محفل خان صاحب عاشق علی خاں، استاد علی بخش خاں۔ خاں صاحب مشتاق حسین خاں رام پور والے اور خان صاحب توکل حسین خاں کے گانے سے یادگار بنی اور تیسری محفل بڑے غلام علی خاں کی شکر کی محفل تھی جس میں خاں صاحب عاشق علی خاں نے شرکت کی اور ان کے ساتھ استاد قادر بخش پکھاوجی نے طبلے پر سنگت کی۔

اس تکیے کے علاوہ گانے والوں کی ایک اور بیٹھک مشہور تھی۔ اس میں زیادہ تر عطائی گویے شامل ہوتے جو سب کے سب کیرانہ گائیکی کے قائل تھے۔ یہ بیٹھک چوک سُرجن سنگھ سے ذرا آگے موتی بازار میں آباد تھی۔ بابو معراج دین کی بیٹھک کے نام سے یاد کی جاتی۔ مگر اس کا بانی کوئی اور تھا۔ اسے یہ بیٹھک قائم کرنے کا خیال یوں پیدا ہوا کہ اس کا بیٹا رنڈیوں سے بچ جائے۔ اس کے بیٹے کو گانے کا بہت شوق تھا۔ اس شوق کو معیاری انداز سے پورا کرنے اور رنڈیوں سے بچانے کے لئے یہ بیٹھک وجود میں آئی۔ اس میں بابو شاہ محمد، سردار محمد، حکیم دین محمد اور بابا عبد اللہ شامل تھے۔ بابا عبد اللہ دراز قد، درویش صفت طبلے پر سنگت کرتے۔ ان شوقیہ گانے والوں کا اتنا چرچا ہوا کہ اس محفل میں فیروز نظامی بھی آگئے۔ استاد عبد الوحید خاں بھی اس محفل میں شرکت کرنے لگے اور پھر ان کے ساتھ کئی اور شاگرد بھی اپنے فن کا مظاہرہ کرنے لگے۔ پنڈت جیون لعل مٹو بھی ہر شام یہاں آنے لگے۔ ان محفلوں کی شہرت اتنی بڑھی کہ سرو قد، موٹی آنکھوں والی سانولی سلونی جیواں مراثن بھی اپنی دلنواز تانوں سے محفل کو گرمانے لگی۔

شہر کے عام لوگ ان محفلوں سے دور رہتے۔ شہر کے گلی کوچوں میں عیدو بفیا والی، خورشید بائی ہجروالی اور عنایت بائی ڈھیرو والی کے گانے مقبول تھے۔ موسم گرما میں مختلف محلوں کے لوگ جہانگیر کے مقبرے سیر کو جاتے۔ رات وہیں گذارتے۔ مجرے کراتے جو طوائفوں کے دم سے سیر کے لطف کو دوبالا کرتے۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر استادوں کے گانے بہت کم ہوتے اور ان کے برعکس ہر کہیں رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوتیں۔ بڑے دھوم دھڑکے سے سوہنی یا بابو کے بینڈ کے ساتھ برات آتی۔ خاندانی وقار اور عزت کا یہ تقاضا تھا کہ زیادہ سے زیادہ جہیز کے ساتھ لڑکی کو رخصت کیا جائے۔ چنانچہ غریب اور امیر دونوں چھوٹے چھوٹے تختوں پر جہیز کا سازوسامان یوں لے جاتے کہ سرے والی ایک تختے پر اور سلائی دوسرے تختے پر۔ سج دھج کی یہ ترکیب کہاوت بن چکی ہے مگر اس کہاوت کو بازار سریانوالہ کے دلی قصائی نے یوں غلط ثابت کیا کہ اُس کا دیا ہوا جہیز آج بھی بہت سے لوگوں کو یاد ہے۔ رخصتی کوچہ چابک سواراں سے باہر بازار سریانوالہ سے ہوئی تھی۔ دولہا کا گھر محلہ فراویاں میں تھا۔ شام کو سامان اٹھوایا گیا تو کئی رات تک دولہا کے گھر پہنچتا رہا۔ راستے میں کہیں خالی جگہ نہ تھی۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک دلہن کے جہیز کی سینکڑوں چیزیں پوری آب و تاب سے کہہ رہی تھیں "جہیز اس کو کہتے ہیں!!"

وہ جہیز کا دور تھا۔ نام و نمود اور نمائش کے دن تھے۔ اسی لیے اکثر لوگ ناشتہ تک باہر حلوائیوں، دودھ والوں اور نان بائیوں کے ہاں کرتے تھے۔ حلوا پوری، قتلمہ، پیڑوں کی لسی اور سری پائے مزے مزے لے کر گھر سے باہر ہی اڑائے جاتے۔ موچی دروازے میں مہتاب حلوائی کی دکان پر ناشتے کے ساتھ ساتھ پہلوانوں کا ذکر بھی چھڑتا۔ مہتاب حلوائی عام طور پر دنگل کا منصف ہوتا۔ اس کی دکان پر لاہور کے نامی گرامی پہلوانوں کے بہت سے معرکے بیان کیے جاتے۔

کیکر سنگھ اور غلام پہلوان کی کشتی کا بڑا چرچا تھا۔ یہ کشتی شاہدرہ کی سرائے میں ہوئی تھی۔ لاہور سے باہر کے لوگ آٹھ روز پہلے ہی آنا شروع ہو گئے تھے۔ عام ٹکٹ سوا آٹھ روپے تھا۔ لاہور کی یہ پہلی کشتی تھی جس میں مسلم اور غیر مسلم کا سوال پیدا ہوا۔ ہندو مسلمان دونوں میں جوش و خروش تھا۔ کشتی کا منصف پولیس کا انگریز افسر بی ٹی صاحب تھا۔ دونوں پہلوان اکھاڑے میں آئے تو یوں لگتا تھا کہ ان میں کوئی بھی زندہ نہ بچے گا۔ دونوں آمنے سامنے ہوئے، ہاتھ ملائے تو غلام پہلوان نے پوری قوت سے کیکر سنگھ کو دھول ماری اور ابھی غلام پہلوان اپنا ہاتھ واپس لایا ہی تھا کہ کیکر سنگھ نے غلام پہلوان کے ٹھوڑی کے نیچے گردن پر زور کا ٹھوسّ مارا۔ ٹھوسّ لگتے ہی غلام پہلوان منہ کے بل زمین پر گرا۔ ٹھوسّ لگنے سے غلام پہلوان کے گلے کی کنٹھی اندر کو دھنس گئی تھی۔ سانس رک گیا تھا۔ آنکھیں باہر ابل رہی تھیں اور ابھی وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ کیکر سنگھ نے اس کی گردن پر گھٹنا رکھ کر اُسے اُلٹانا چاہا۔ اس سے غلام پہلوان کے گلے کی کنٹھی فوراً اپنی جگہ پر آ گئی تو وہ فوراً سنبھل گیا۔ سنبھلتے ہی وہ بجلی کی طرح آگے سے نکل کر کیکر سنگھ پر جھپٹا اور آن کی آن میں اُسے آگے رکھ لیا۔ کیکر سنگھ بھی آنکھ جھپکتے ہی نکل گیا۔ پھر دونوں میں بڑی زور آزمائی ہوئی۔ یوں لگتا تھا کہ دو دیو لڑ رہے ہیں۔ زمین پر گرتے تو زور کا دھما کا ہوتا اور آخر دونوں میں سے کوئی بھی کسی کو چاروں شانے چت نہ گرا سکا۔ کشتی برابر رہی تو پھر اگلے سال پر ملتوی ہو گئی۔ مگر اُس کا انجام بھی یہی رہا۔

——— مگر اسی کیکر سنگھ کو کریم بخش پیلڑے والے نے پب مار کے ایک سیکنڈ میں گرا لیا تھا۔ کریم بخش پیلڑے والا واحد پہلوان ہے جو آج تک کسی سے نہ گرا۔ پہلوانی کے فن اور اس کے رموز سے پوری طرح واقف تھا۔ کہتے ہیں کہ اُسے تین سو ساٹھ داؤ آتے تھے۔ پہلوانی اُسے ورثے میں نہیں ملی تھی بلکہ اُس نے قوتِ ارادی سے اس فن کو اپنایا تھا اور یہ ارادہ محض ایک طعنہ سُن کر دل میں پیدا ہوا۔ کریم بخش خوبصورت جوان تھا۔ میٹرک کا طالب علم تھا۔ کتابیں اٹھائے سکول جا رہا تھا۔ امرتسر کا کلا پہلوان کشتی کے سلسلے میں لاہور آیا

ہوا تھا۔ کریم بخش پر نظر پڑی تو اس نے طنزاً مسکراتے ہوئے کہا "لو بھئی، یہ پیلر ٹے والے کی طبل جا رہی ہے۔"

یہ سنتے ہی کریم بخش واپس گھر لوٹا۔ کتابوں کو آگ لگا دی اور اپنے والد سے کہا کہ مجھے پہلوان بننا ہے۔ بیٹے کے اصرار پر باپ کو اس کا مطالبہ پورا کرنا پڑا اور پھر وہ دن بھی آیا جب کریم بخش پیلر ٹے والے کی کشتی کلو پہلوان سے ہوئی تو کریم بخش نے مار مار کے اس کا بھرکس نکال دیا۔ اتنا گندہ کیا جیسے وہ پہلوان نہیں مرا ہوا چوہا ہے اور جب اُسے چاروں شانے چت گرا لیا تو کریم بخش نے اس کی چھاتی پر بیٹھ کر فقط اتنا کہا "یہ وہی پیلر ٹے والے کی طبل ہے۔"

کریم بخش کی ایک کشتی کا پورے لاہور کو انتظار تھا۔ وہ کشتی گاموں پہلوان بالی والا کے ساتھ تھی۔ گاموں پہلوان بالی والا گونگا پہلوان کا باپ تھا۔ یہ کشتی شاہدرہ سرائے میں ہوئی۔ دونوں پہلوان خم ٹھونک کر آمنے سامنے آئے۔ کریم بخش نے ہاتھ ملاتے ہی بڑی پھرتی سے نقال ماری۔ یہ داؤ یوں عمل میں آتا ہے کہ بازو پکڑ کر اپنا سر دوسرے کی بغل میں دے کر نیچے اپنی ٹانگ میں ڈال دینا۔ ٹانگ ڈالتے ہی گاموں پہلوان پہاڑ کا پہاڑ گر کر مٹی کا ڈھیر بن گیا۔

کریم بخش پیلر ٹے والا ایسی خوراک کا قائل نہ تھا جس سے توند بڑھے۔ آخری دم تک بوڑھا ہونے پر بھی وہ خوبصورت باوقار اور متین رہا۔ عقاب کا سینہ، چیتے کی کمر، پیٹ اندر کو دھنسا ہوا۔ بلا کی پھرتی۔ اس کی شہرت اور فن سے متاثر ہو کر مہاراجہ اندور اُسے اپنے ہاں لے آیا۔ بعد میں دوسرے کئی نوابوں اور مہاراجوں نے بڑے بڑے انعامات اور سہولتوں کی پیش کش کی مگر کریم بخش اصول اور وضع کا پابند تھا۔ اس نے مہاراجہ اندور سے علیحدگی اختیار نہ کی۔ لاہور میں اس کا ایک ہی دوست خان بہادر شیخ نقی تھا۔ دونوں دوست شام اکٹھے ہی گزارتے

گاماں پہلوان رستم زماں اور امام بخش لوہاری دروازے کے باشندے تھے۔ نام و نمود کے بعد امرتسر میں سکونت اختیار کر لی۔ لاہور میں امام بخش کی ایک کشتی کا ذکر آج بھی لوگوں کی زبان پر ہے۔ یہ کشتی گونگا پہلوان کے ساتھ منٹو پارک میں ہوئی تھی۔ دونوں پہلوانوں نے اکھاڑے میں قدم رکھا تو لوگوں کے دل زور سے دھڑکنے شروع ہو گئے۔ دونوں میں ایسے ایسے داؤ پیچ چلے کہ کوئی بھی کسی کے قابو میں نہ آتا تھا۔ آخر امام بخش نے جو گونگا پہلوان کے قد سے بڑا تھا، گونگے کی دونوں بغلوں میں ہاتھ ڈال کر کس لیں پھر لیں اور اپنا سارا وزن اُس پر ڈال کر اُس کے اوپر چڑھتا گیا۔ بے اختیار تماشائی اٹھ کھڑے ہوئے کہ اب گونگے کا بچنا ناممکن ہے لوگ دھڑکتے دل کے ساتھ دیکھ رہے تھے کہ امام بخش پوری قوت سے اپنی گرفت مضبوط کر کے اوپر چڑھ بیٹھا ہے اور اب گونگا چھپڑ نے کو ہے مگر دیکھتے ہی دیکھتے گونگا پہلوان اُسی طرح واپس آیا، اگرچہ اس کی کمر ایک کمان کی صورت بن گئی تھی۔ اس کا واپس آنا تھا کہ لوگوں نے بے اختیار تالیاں بجائیں۔ اپنے آپ کو چاروں شانے چت ہونے سے بچانے کا یہ ڈھنگ اتنا مشکل ہے کہ کوئی پہلوان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ گونگا پہلوان امام بخش کی گرفت سے آزاد ہو کر سامنے آیا تو تھوڑی ہی دیر میں اُس نے امام بخش کو نیچے دبا لیا۔ کانی مار کے بعد گونگے نے امام بخش کو ایک طرف اٹھایا — لوگوں نے بے ساختہ کہا "او مارا!"۔ گونگا پہلوان کے حواری اُسے فوراً اپنے کندھوں پر اٹھائے دنگل سے باہر لے آئے۔ دنگل میں ایک حشر برپا ہو گیا۔ کوئی کہے چھوڑ کر بھاگ گیا ہے گرایا نہیں۔ کوئی وثوق سے کہے کہ صاف گرایا ہے۔ گاماں پہلوان رستم زماں بھی نہ مانے تو دنگل کے منصف بی ٹی صاحب اُسی وقت گونگا پہلوان کو اس کے گھر سے لے آئے اور وہ دوبارہ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ کشتی شروع ہوئی تو لوگ پہلی کشتی کو بھول گئے۔ آمنے سامنے آتے ہی داؤ پیچ جو شروع ہوئے تو گونگا پہلوان نے امام بخش کو نیچے رکھ کر مارنا شروع کیا اور اتنا مارا کہ امام بخش نڈھال ہو گیا۔ گونگے نے "گھسا" مار کر امام بخش کو چاروں شانے چت گرا لیا اور چھاتی پر بیٹھ کر تماشائیوں کو دونوں ہاتھوں سے سلام کرتا رہا۔

اس کشتی سے ایک پہلوانی مثل مشہور ہو گئی جب کوئی پہلوان کسی دنگل میں پچھڑ جاتا تو لوگ اسے یہ کہہ کر تسلی دیتے کہ آخر ہوا کیا، امام بخش پہلوان جیسے پچھڑ گئے۔

دو سال کے بعد پھر اسی جگہ دونوں پہلوانوں کی کشتی ہوئی۔ تو امام بخش نے گونگے کو نیچے رکھ لیا اور اسی وقت چھوڑا جب وہ اس کی چھاتی پر بیٹھا حساب برابر کر رہا تھا۔

جب ہندوستان میں ولائتی بچہ آیا تو اس وقت منٹو پارک میں چار اتوار تک دنگل ہوتے رہے۔ پہلا دنگل گاموں پہلوان بالی والا اور کالا پہتا بہ پہلوان کے درمیان ہوا۔ گاموں پہلوان نے تقال مار کر دس منٹ میں گرا لیا تھا۔ دوسرا دنگل گاماں پہلوان رستم زماں اور حسن بخش غفانی کا تھا۔ گاماں پہلوان نے پانچ منٹ 'پٹشک' مار کر گرا لیا۔ تیسرا دنگل کلو پہلوان اور کیکر سنگھ کا تھا دونوں بڑے تیار تھے۔ آمنے سامنے ایک دوسرے کے ساتھ پوری قوت سے یوں لڑ رہے تھے جیسے دو سانڈ آپس میں ٹکرا رہے ہیں۔ لگاتار آدھ گھنٹے تک یہی حال رہا۔ دونوں میں سے کوئی بھی کسی پر غالب نہ آ سکا اور آخر کشتی برابر چھڑا دی گئی آخری دنگل جھنی رینی والا اور وڈا کالا پہتا بہ کا تھا۔ جھنی رینی والا دبلا پتلا تھا مگر اس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کی انگلیاں سریے کی تھیں اور اس کی کلائی لوہے کا ستون۔ کسی پر اس کی کلائی پڑ جاتی تو وہیں چت ہو جاتا۔ وڈا کالا پہتا بہ سے اس کی دس منٹ تک کشتی جاری رہی کہ موقعہ پاتے ہی اس نے کلائی سے بھرپور وار کیا اور پل کی پل میں وڈا کالا پہتا بہ زمین پر لیٹا آسمان کے تارے دیکھ رہا تھا۔

پہلوانوں کے قصے مہتاب حلوائی کی دکان پر ہی نہیں، ہر گلی کوچے میں لوگوں کی زبان پر ہوتے۔ جب بھی کوئی نیا دنگل ہوتا تو پرانی تمام کشتیوں کی یاد تازہ ہو جاتی۔

پھر وہ دور بھی آیا جب سیاسی دنگل ہونے لگے۔ دہلی اور لوہاری دروازے سیاسی تحریکوں کے دروازے بن چکے تھے باقی دروازوں کے اندر قریب قریب سارے گلی کوچے چپ راس کی پریڈ سے گونج رہے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ یہی پریڈ کچھ اس طرح ہوتی جیسے اسی تحریک کے بہانے ورزش ہو رہی ہے۔ چپ راس کرنے والوں کے سامنے کوئی منزل نہ تھی۔ پیر جماعت علی شاہ کی تحریک سے عام مسلمانوں نے ہندو دکانداروں سے سودا لینا ترک کر دیا۔ شہر کے اندر بازار سریانوالہ کے حاجی حلوائی نے اس تحریک کو خوب چلایا۔ مسجد وزیر خاں کے حجرے مسلم کلاتھ مارکیٹ بن گئے۔

اور پھر ایک دن موچی دروازے نے جس کا دروازہ نہیں! اپنی تعمیر کے لئے اپنے باغ میں ایک بہت بڑا جلسہ منعقد ہوتے دیکھا۔ یہ جلسہ مسلم لیگ کا تھا ؎

مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ

یہ آواز بڑھتی گئی، پھیلتی گئی۔ اور رفتہ رفتہ لاہور کے تمام دروازے موچی دروازے کے چوکھاٹ اور پٹ بن گئے۔ چوہٹہ مفتی باقر کے مقابلے میں چوک نواب صاحب اس تحریک کا مرکز بنا۔ تحریک نے اس قدر مقبولیت حاصل کی چوک نواب صاحب کا نام چوک پاکستان رکھا گیا۔ استاد نور دین کاٹھے کی دل کی تصویر میاں فیروز الدین احمد کے روپ میں اس تحریک میں سب سے زیادہ نمایاں تھی۔ میاں فیروز الدین احمد نے موچی دروازے کے باغ میں مسلم لیگ کی تحریک اور مسٹر محمد علی جناح کی شخصیت پر تقریر کرتے ہوئے کہا "میں دنیا کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسٹر محمد علی جناح مسلمانوں کے قائد اعظم ہیں!!"

لفظ "قائد اعظم" کا استعمال اتنے لگاؤ اور احترام سے ادا کیا گیا کہ یہی خطاب مسٹر جناح کی عظیم شخصیت کا ضامن ہو گیا۔ موچی دروازہ نازاں ہے کہ اس کے دل سے نکلا ہوا خطاب غیر فانی ہو گیا ہے۔

قائد اعظم کی ہر دلعزیزی اور مسلم لیگ کی مقبولیت کے بعد مولانا ظفر علی خاں مرحوم نے نیلی پوش تحریک کو ختم کرتے ہوئے اعلان کیا ع

"شہید گنج کے مقدمے کا حل ہے پاکستان"

اس اعلان کے بعد کئی چھوٹی موٹی جماعتیں ندی نالوں کی طرح مسلم لیگ کے دریا میں گرنے لگیں۔ البتہ چوہٹہ مفتی باقر کا بھنور اپنے محور کے گرد چکر کاٹتا رہا۔ موچی، شیرانوالہ اور کشمیری دروازے کے اندر کہیں کہیں خاکساروں کی چپ راس بھی ہوتی رہی۔ یہی چپ راس آخر رنگ لائی اور ٹکسالی دروازے کے اندر ہیرا منڈی میں ایک بار پھر مسلمانوں کو خاک و خون میں تڑپایا گیا۔

گولی چلنے کے دوسرے دن لاہور کے تمام دروازوں سے مسلمانوں کی ٹولیاں روشنائی دروازے کی طرف بڑھنے لگیں اور بڑھتے بڑھتے منٹو پارک کے وسیع میدان میں پہنچ گئیں۔ جہاں قائد اعظم نے قرارداد پاکستان پیش کی۔ وہی مطالبہ جو ہندوستان کے مسلمانوں کی اجتماعی جدوجہد سے تسلیم کر لیا گیا۔

قیام پاکستان سے پہلے ان دروازوں کے اندر ایک محلہ دوسرے محلے کا مخالف تھا۔ لیکن اب کئی دروازے دوسرے دروازوں کے خون کے پیاسے بن چکے تھے۔ مخالف دروازوں کے رہنے والے اسی نفرت میں کھو گئے اور جگہ جگہ خون کے فوارے چھوٹنے لگے۔ آگ کے شعلے بھڑکنے لگے۔ اور جب امرتسر کے مسلمانوں نے موچی دروازے کے مسلمانوں کو تحفے کے طور پر چوڑیوں کے ساتھ یہ پیغام بھی بھیجا کہ انہیں پہن کر گھر میں بیٹھ جاؤ تو جلتی پر تیل کا کام کیا اور پھر آن کی آن میں شاہ عالمی دروازہ اپنی دیرینہ کہانیوں اور بوسیدہ عمارتوں کے ساتھ خاکستر ہو گیا۔ وہی شاہ عالمی دروازہ جسے شہنشاہ اورنگ زیب کے بیٹے ولی عہد معظم شاہ عالم بہادر شاہ کی وفات کے بعد اس کے نام پر تعمیر کیا تھا۔

—— اور پھر آگ اور خون کے ہولناک مناظر کے بعد آزادی کی حسین صبح طلوع ہوئی اور سالہا سال کے بعد لاہور کے ان دروازوں نے یوں محسوس کیا جیسے ان کے در و دیوار سے غلامی کا زنگ اتر گیا ہے۔ غلامی کا زنگ اترنے کے بعد ان دروازوں نے اپنے رہنے والوں کے لئے بے پایاں مسرتوں کے نئے پٹ کھول دیئے اور گزرنے والوں نے دیکھا۔ کہ زندگی کی وہ راہیں جو بڑی محدود و مسدود تھیں اب کشادہ اور آزاد ہیں۔

—— مگر ان کشادہ راہوں پر آزادی سے قدم بڑھانے کا موقع بھی نہیں ملا تھا کہ برسر اقتدار جماعت نے اسی حکمت عملی کو اپنا لیا جو آزادی، خودداری اور خود اعتمادی کی دشمن تھی۔ اس دشمنی کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ہندو اور سکھ کی جگہ مسلمانوں کے باہمی فرقے ایک دوسرے سے ٹکرا دیئے گئے۔ اور ان دروازوں کے اندر رہنے والوں کو زندگی یوں محسوس ہونے لگی جیسے وہ ڈراؤنا خواب دیکھ رہے ہیں۔

—— پھر یہ خواب ٹوٹا اور ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو نئے دور کا آغاز ہوا۔

———

جناب

محمد طفیل کے دلکش اسکیچوں کا مجموعہ

اور

اس کے متعلق بڑے ادیبوں کی رائے

طفیل صاحب کی یہ کتاب معنوی حیثیت سے ایک قسم کی THREE DIMENTIONAL STUDY ہے۔ (جس میں طول و عرض تو دوسروں کا ہے اور عمق خود ان کا) اور مطالعہ کی حیثیت سے ایک ایسا تجربہ ہے جس سے لطف اٹھانا دوسروں پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

نیاز فتحپوری

ادیبوں اور اہلِ قلم میں سے ۱۷ مجمل اور ۵ کا مفصل تذکرہ۔ ہلکی پھلکی ادبی زبان میں، آغاز بابائے اردو کے نام سے ہوتا ہے اور بعض نام اس قسم کے ملتے ہیں قاضی عبدالغفار، شکیلہ اختر، پطرس بخاری، مجاز وغیرہ ——— فہرست میں نام زیادہ تر ترقی پسندوں ہی کے ہیں۔ لب و لہجہ کی شرافت قابلِ داد۔

مولانا عبدالماجد دریابادی

جناب کے پڑھنے کا بہترین وقت مجھے وہ نظر آیا جب اتوار کی صبح کو حجام حجامت میں مصروف ہو۔ ایک گونہ ہم آہنگی حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ بعض جگہ جناب نے بھی حجامت اُتاری ہے ——— اختر شیرانی اور مولوی عبدالحق کے نقشے خصوصاً مرغوب ہیں۔

جسٹس کیانی

طفیل صاحب طبعاً مزاح نگار ہیں۔ اس لیے ان کی چٹپٹی باتیں مزا دے جاتی ہیں۔ بڑے فقرے باز بھی ہیں اور ان کے فقروں کی برجستگی ہی ان کے شگفتہ اندازِ گفتگو (اور اندازِ تحریر کی جان ہے۔ (طفیل صاحب کی تحریر اور تقریر میں کوئی بیّن فرق نہیں ہے) جب وہ مخصوص بے تکلف انداز میں لکھتے ہیں تو بعض دفعہ اپنی روانی میں حفظِ مراتب کو بھی بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔

شاہد احمد دہلوی

کچھ باتیں، کچھ اشتہار

عنایت اللہ

ادارۂ فروغِ اُردو نے "نقوش" کے لاہور نمبر کے سلسلے میں ایک کام مجھے بھی سونپ دیا جو میں نے بڑی سادگی سے قبول کر لیا۔ خیال تھا یہ کام دنوں میں مکمل ہو جائے گا اور میں لاہور نمبر میں ایک باب کا اضافہ کر سکوں گا لیکن پورے پچیس دنوں کی کوچہ گردی اور سڑک نوردی کے بعد محسوس ہوا کہ جس کام کو میں نے چند دنوں میں ختم کر لینے کا بیڑا اٹھایا تھا اس کا تو آغاز بھی نہیں ہو سکا۔ اُدھر لاہور نمبر کی پروف کاپیاں نکل چکی تھیں اِدھر میرے آخری باب کی تمہید بھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ اس باب کا عنوان تھا "آج کے لاہور کا صنعتی جائزہ" یہ لاہور کی صنعتی تاریخ کا باب تھا۔

ہمارا منصوبہ یوں تھا کہ لاہور کی صنعت کے تمام شعبوں کو سامنے رکھ کر ایسے صنعتکاروں اور صنعتی اداروں کی فہرست مرتب کی جائے جو لاہور کی تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم نے طویل فہرست مرتب کی جس میں انشورنس کمپنیوں سے لیکر انجینئرنگ کمپنیاں تک شامل تھیں۔ ان میں دریاں بنانے والے بھی تھے، دوائیاں بنانے والے بھی، خیمہ ساز بھی، تاریخی لسی فروش اور کوکا کولا بھی، کباب فروش اور کیفے بھی، بیکو، ہیکو اور پیکو بھی۔ اور اس طرح ہم نے صنعت و ثقافت کے ہر شعبے کے چیدہ چیدہ ایک سو پچاس صنعتی اداروں کو بڑی چھان بین سے منتخب کیا اور ان کی طرف خطوط لکھے جن میں لاہور نمبر کی وضاحت کر کے ہم نے ان سے درخواست کی کہ آپ کی فرم کے تواریخی حقائق نوٹ کرنے کے لیے ہمارا نمائندہ آپ کے ہاں آئے گا، براہِ کرم اس سے تعاون فرمائیے گا۔

یاد نہیں وہ کون سی ساعت تھی جب اس نمائندگی کے فرائض میں نے اپنے سر لے لیے تھے۔

میں جب اپنے سائیکل پر پہلے روز پہلی فرم کے بارے میں معلومات ریکارڈ کرنے اس کے دفتر کی سمت روانہ ہوا تو سائیکل کے کل پرزے بانگِ بلند اپنی بائیس سالہ تاریخ دہرا رہے تھے۔ جنوری کے آغاز کی ہوائیں نخ بھی تھیں مخالف بھی۔ پاس سے گزرتی کاروں اور بسوں کی گرد کی اوٹ ہی اوٹ میں میں پہلی فرم کے دفتر میں داخل ہوا۔ مجھے فرموں کے مالکوں یا منیجروں سے ملنا تھا۔ اس سے کم درجے کے اہلکار مجھے مطلوبہ معلومات دینے سے قاصر تھے۔ میں اس فرم کے منیجر سے ملا، اپنا تعارف کرایا اور اپنے خط کا حوالہ دیا تو جواب ملا "آپ کے ادارہ کا خط ملا تھا لیکن ہم آپ کے پرچے میں اشتہار نہیں دیں گے۔"

اس کی بجائے اگر یہ صاحب مجھے کہہ دیتے کہ میرے دفتر سے نکل جاؤ تو شاید مجھے زیادہ کوفت نہ ہوتی۔ ہمارے خط میں اشتہار کا ذکر تک نہ تھا۔ نہ کوئی ایسا ارادہ تھا۔ تاہم میں نے چوٹ برداشت کرتے ہوئے وضاحت کی کہ میں اشتہار لینے نہیں آپ کی فرم کے بارے میں معلومات پوچھنے آیا ہوں۔ آپ نے کرسی پر کروٹ بدلی اور مجھے بیٹھ جانے کو کہے بغیر بولے "آپ آئندہ ہفتے کسی دن شام چار بجے کے بعد آئیے گا۔" چنانچہ ہم نے آئندہ ہفتے کے لیے ایک دن شام ساڑھے چار بجے کا وقت مقرر کیا جسے آپ نے ڈائری میں نوٹ کر لیا۔ جب میں اگلے ہفتے مقررہ دن اور وقت وہاں پہنچا تو

معلوم ہوا کہ منیجر صاحب "بن ٹھن" کر دیکھنے گئے ہوئے ہیں، اس کے بعد میں تین دن تک ان کے دفتر جاتا رہا اور آپ ہر بار مسکرا کر ٹال دیتے رہے۔ آخر میں نے تھک ہار کر لاہور کی اس بڑی فرم کا نام فہرست سے نکال دیا۔

اسی دوران اسی صنعت کی ایک اور بڑی فرم میں گیا۔ پہلے روز تو متعلقہ صاحب نہ مل سکے، تیسرے روز ملے۔ بولے "... لیکن ہم روزانہ اخباروں کے سوا کسی اور کو اشتہار نہیں دیتے۔" وہاں بھی میں نے وضاحت کی کہ میں پبلسٹی ایجنٹ نہیں ہوں۔ اگر آپ مجھے ایجنٹ ہی سمجھتے ہیں تو مجھے اپنی فرم کے متعلق چند باتیں لکھوا دیجیے، میں آپ کی پبلسٹی مفت کروں گا۔ آپ مسکرا کر بولے: "اس میں بھی آپ ہی کا کچھ فائدہ ہوگا ورنہ اخبار رسالوں والے مفت پبلسٹی کہاں کرتے ہیں۔" اس کے بعد آپ نے اپنے متعلق کچھ بتانے کے بجائے مجھ سے پوچھا کہ اس کام کی مجھے کتنی کمیشن ملتی ہے اور یہ بھی کہ میں اسی صنعت کی کون کون سی دوسری فرموں کے پاس گیا ہوں اور انھوں نے اپنے متعلق کیا کچھ لکھوایا ہے۔ پہلے وہ دکھائیے تاکہ ہم اس کے مطابق اپنی تاریخ "لکھوائیں" اور یہ بھی کہ کیا انھوں نے اشتہار دیے ہیں؟ اگر دیے ہیں تو ان کا مضمون ہمیں دکھائیے۔

جی میں آئی کہ جھوٹ بولوں اور انھیں جھوٹ موٹ کے اشتہار دکھا کر ان کی "رگِ مقابلہ" بھڑکا دوں اور یہ فرم ایک آدھ اشتہار اُگل دے لیکن میرے کردار نے گوارا نہ کیا اور میں اس فرم سے بھی اُٹھ آیا۔ مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ جس طرح صحافت کے میدان میں آکر اپنی انانیت کو قربان کرنا پڑتا ہے اسی طرح کاروباری میدان میں آکر انسان انسانی جذبات کو خیرباد کہہ دیتا ہے اور اس کی سوچ و فکر پر ہی نہیں اعصاب پر بھی کاروباری پن سوار ہو جاتا ہے۔ میں ان لوگوں کے بھلے کی سوچ رہا ہوں، چند اور جگہوں پر بھی مجھ پر طرح طرح کے ایسے ہی سوالات کی بوچھاڑ ہوتی اور مجھے پبلسٹی ایجنٹ سمجھ لیا گیا۔

ادارہ نے مجھے اشتہارات کی فراہمی کے متعلق کوئی ہدایت نہیں دی تھی نہ میرے دماغ میں کوئی ایسا خیال آیا تھا لیکن پہلی ہی دو چار فرموں نے میرے دماغ میں خیال پیدا کر دیا کہ یہاں صحافی خلوص محض بیکار جذبہ ہے کرنا ہے تو کاروبار کرو۔ چنانچہ میں نے ادارہ کے انتظامیہ کو مشورہ دیا کہ پرچے کے لیے اشتہار بھی فراہم کیے جا سکتے ہیں۔ ادارہ فروغ اُردو کی روایات میں شامل ہے کہ "نقوش" کے لیے اشتہارات کی فراہمی کے لیے شاذ ہی کبھی کوشش کی گئی ہو، نہ اس کام کے لیے کبھی کوئی ایجنٹ رکھا گیا۔ لاہور نمبر کے متعلق میں بڑی اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ نمبر سات آٹھ ہزار روپے کے نقصان پہ نکالا جا رہا ہے۔ میں نے اپنے طور پر سوچا کہ یہ نقصان اشتہارات کی وساطت سے پورا کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ادارہ نے مجھے کہا مصنفی جائزہ لینا تمہارا آدھا کام ہے اگر اشتہار مل سکتے ہیں تو "نقوش" کے وقار کا خیال رکھتے ہوئے کاروباری پہلو بھی تم ہی سنبھالو لیکن ایجنٹ کی حیثیت سے نہیں تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ تم اشتہار جمع کرتے پھر رہے ہو۔

میں اپنے مشن سے خوب آگاہ تھا لیکن میری جو گت بن رہی تھی میں اس سے بھی آگاہ تھا۔ میرے لیے مشکل یہ بنی آئی کہ میں ذات کا ادیب ہوں، کاروبار سے دور کا بھی واسطہ نہیں لیکن اس کا کیا علاج کہ کاروباری لوگ صحافی خلوص کو سمجھنے سے قاصر تھے، وہ صرف کاروباری زبان سمجھتے ہیں چنانچہ میں ایک روز گھر سے نکلنے لگا تو انانیت گھر پر ہی چھوڑ دی اور اپنے طور طریقے اور رویّے کو یکسر بدل ڈالا۔ میں جب ایک فرم کے دفتر میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ میرا کام آسان ہو گیا ہے۔ میں نے ادارہ کے خط کا حوالہ دے کر لاہور نمبر کے متعلق باتیں کیں اور بتایا کہ ہم آپ کی فرم کے بارے میں معلومات چاہتے ہیں۔ پیشتر اس کے کہ وہ مجھ پر "ایجنٹی" کا شبہ کرتے میں نے کہہ دیا "یہ تو آپ کی مفت پبلسٹی ہے۔ اگر آپ پرچے کے لیے اشتہار بھی دے دیں تو آپ کی پبلسٹی مکمل بھی ہو جائے گی اور پُر اثر بھی۔" اس رنگ میں بات کرتے مجھے کوفت تو بہت ہوتی لیکن اپنے باب کی تکمیل کے لیے اور کوئی راہ نہ تھی، خلوص کو کاروباری پن سے ملوث کرنا ہی پڑا۔

منیجر صاحب نے میری بات سُنی اور ہونٹوں پر کاروباری سی مسکراہٹ لا کر کہا: "آپ نے اشتہار جمع کرنے کا کس قدر خوبصورت طریقہ اختیار کیا ہے دوسرے رسالوں والے تو صرف اشتہار ہی مانگنے آتے ہیں، کیا آپ ہم پر مضمون بھی لکھیں گے؟" جی میں آئی انھیں سچ سچ بتا دوں کہ میرا مطلب یہ تو نہ تھا لیکن میں بھی مسکرا دیا اور یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے کہ میری مسکراہٹ بھی کاروباری تھی۔ جب دو کاروباری مسکراہٹوں کا تصادم ہوا تو اس میں سے ایک اشتہار نکل آیا۔

کاروباری میدان میں یہ میری پہلی کامیابی تھی۔ صحافی نقطۂ نگاہ سے میں اسے شکست ہی کہوں گا۔

اس پہلے اشتہار کے ساتھ ہی میرے لیے اس فرم کے گرد چکروں کا طویل سلسلہ شروع ہو گیا کیونکہ حکم ملا تھا "کل" اشتہار بھی لے جانا اور فرم کی ہسٹری بھی۔ مکمل سات "کل" کے بعد مجھے وہاں سے دونوں چیزیں ملیں اور کم و بیش ایک گھنٹہ فی "کل" ضائع ہوا۔ اگر مجھے پہلے ہی روز فرم کی ہسٹری مل جاتی تو شاید میں اشتہار کے لیے اس قدر وقت ضائع نہ کرتا۔

اس "کل" کے چکر کے دوران میں نے کم و بیش بیس صنعتی اداروں، فرموں اور فیکٹریوں کا دورہ کیا۔ ان میں ناشرین کتب اور ہوٹلوں کے مالک بھی تھے۔ شربت فولاد والے حکیم اور فولاد کے کارخانہ دار بھی تھے۔ مجھے توقع تھی کہ میں اپنے تاریخی سائیکل پر ہر روز دس بارہ پروپرائٹروں یا منیجروں سے انٹرویو لے سکا کروں گا لیکن جنوری کے وسط تک یہ حال تھا کہ ایک ایک پروپرائٹر یا منیجر کو ملنے کے لیے مجھے دس دس بارہ بارہ بار جانا پڑا اور جس نے اشتہار کا آرڈر دیا اس نے پھیروں کی اتنی ہی مقدار مزید کرائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں ہر روز تین سے نئی جگہ جانے سے معذور رہا۔ مجھے ملاقاتوں کے جو اوقات APPOINTMENTS ملتے تھے ان کی صرف ایک جھلک دکھاتا ہوں — گیارہ بجے راوی روڈ کے ایک "سوداگران چوب و عمارتی لکڑی ہر قسم" نے وقت دے رکھا ہے ابھی روز بارہ بجے گلبرگ کے انڈسٹریل ایریا کے ایک منیجر نے بلایا ہے۔ اسی روز ڈیڑھ بجے کشمیری بازار کے ایک ناشر سے ملنا ہے کیونکہ "میں اس سے پہلے یا بعد مل نہیں سکتا" اسی دن دو بجے فیروز پور روڈ کے ایک صنعتکار نے وقت دے رکھا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی خیال ہے کہ مال روڈ پر جن دو حضرات سے ملنا ہے وہ چار بجے کے بعد مل سکیں گے۔

میری بدقسمتی یہ کہ یہ سب حضرات موٹروں والے ہیں اور اپنے پاس نہ موٹر نہ سکوٹر نہ آٹو سائیکل، گھسا ہوا پرانا ایک سائیکل ہے جو بعض اوقات موڑ مڑتے خود تو نہیں مڑتا اس کا ہینڈل مڑ جاتا ہے۔ سب سے بڑی بدنصیبی یہ کہ ان صاحبان سے ملنا ضرور ہے۔ دوسری بدنصیبی یہ کہ "قانون انسداد بے رحمی جانوراں" اس سلسلے میں لاگو نہیں ہو سکتا کیونکہ نہ میں جانور ہوں نہ میرا سائیکل۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے (کیونکہ سائیکل کے ساتھ میل دکھانے والا میٹر نہیں ہوتا) کہ میرے سائیکل نے اوسطاً تیس میل روزانہ سفر طے کیا ہے۔

اس قدر سفر طے کرنے کے بعد کیا میں ہر روز منزل کو پا لیتا تھا؟ جی نہیں۔ اگرچہ منیجروں نے وقت دے رکھا ہے تو مقررہ وقت پر بمشکل دو سے ملاقات ہو سکتی تھی کیونکہ دو تین اگلے کمرے میں بیٹھے کرکٹ کی کومنٹری سن رہے ہوتے تھے بعض "ابھی ابھی" باہر نکل گئے ہوتے تھے اور دو ایک دفتروں کے اہلکاروں نے بتایا کہ "منیجر صاحب اس وقت تو دفتر آتے ہی نہیں، معلوم نہیں انھوں نے آپ کو یہ وقت کیوں دے دیا تھا۔"

ادھر طفیل صاحب پرچے کی پروف کا پہاں بھی دیکھ چکے تھے۔ اب صرف میرے باب کے منتظر تھے اور ہر شام یاد دہانی کرا دیتے تھے: "جلدی کرو نا بھئی، پرچہ لیٹ ہو رہا ہے۔" آپ یہ نمبر بہر صورت اور ہر طرح کے نقصان کے باوجود یکم فروری کو نکال دینے کا فیصلہ کر چکے تھے اور میرے کام کا بمشکل آغاز ختم ہوا تھا اور جنوری کا انجام شروع ہو چکا تھا۔ بیشتر صنعتکاروں کے رویے کو دیکھتے ہوئے یہ بھی سوچا گیا کہ اس باب کو ہی نظر انداز کر دیا جائے لیکن میری دُم بُری طرح پھنس چکی تھی کیونکہ چند ایک فرمیں اشتہار بھی دے چکی تھیں اور اپنی تواریخ بھی۔ ہم ان سے وعدہ خلافی بلکہ کاروباری بے اصولی کے مرتکب نہیں ہو سکتے تھے۔ میں نے طفیل صاحب کو کوائف اور قرائن کی روشنی میں بتایا کہ صنعتی تاریخ کا باب مکمل کرنا ہی ہے تو لاہور نمبر یکم اپریل سے پہلے نہ نکل سکے گا۔ ادارہ کو یہ بھی احساس تھا کہ (میرے محتاط اندازے کے مطابق) یکم فروری کو نمبر نکالنے کی صورت میں ادارہ کم و بیش دس ہزار روپے کے اشتہارات سے محروم رہ جائے گا۔ اس نقصان کے باوجود فیصلہ کیا گیا کہ ادارہ محض اشتہارات کی خاطر پرچے کو لیٹ نہ کرے گا۔

کام تو میرا اب بھی مکمل نہیں ہوا۔ اگر ادارہ مجھے پچھلے سال کی جنوری کے آغاز میں یہ کام دے دیتا تو اس سال کی جنوری کے آخر تک یقیناً مکمل ہو جاتا۔ میں معذرت خواہ ہوں (کیا معذرت خواہ صرف مجھی کو ہونا چاہیے؟) کہ لاہور کے صنعتی جائزے کا باب مکمل نہ ہو سکا اور لاہور نمبر اس کے

بغیر ہی آپ تک پہنچ رہا ہے لیکن اس مہم کے سلسلے میں میرے چند ایک مشاہدات ہیں جو یقیناً نامکمل نہیں۔ میں حیران ہوں کہ مجھے تو یہ ایک باب مکمل کرنے کے لیے اتنی دشواریاں پیش آئیں — آخر طفیل صاحب نے اتنا بڑا نمبر کیسے مرتب کر لیا۔

سب سے پہلے میں انجمن ادبی رسائل رسائل سے خصوصاً اور "ادبی" رسائل سے عموماً ایک نہایت ضروری گزارش کرنا چاہتا ہوں۔ جرائد کے لیے اشتہار فراہم کرنا اور کنویسنگ CONVASSING ایک باعزت پیشہ ہے اور باوقار فن۔ صرف لاہور میں ہی نصف درجن باقاعدہ پبلسٹی سروسیں ہیں جو بڑی بڑی فرموں کی پبلسٹی کرتی ہیں۔ ان کے علاوہ ایسے ایجنٹ ہیں جو کسی نہ کسی اخبار یا رسالے سے متعلق ہیں اور ان کے لیے اشتہار فراہم کر کے تنخواہ یا کمیشن لیتے ہیں اور بعض ایجنٹ آزادانہ کاروبار کرتے ہیں لیکن اس پیشے کو رسوا کرنے والی بھی ایک نسل ہے جس کی کارروائیاں زمیں دوز ہیں اور صحافتی نقطۂ نگاہ سے مجرمانہ!

اس کی وضاحت یوں ہے کہ میں نے جب چند ایک فرموں کو "نقوش" کے لیے اشتہار کے لیے کہا اور نرخ بتلائے تو وہ لوگ کھل کر ہنسے اور ایک ہی نے نہیں کئی ایک نے کہا "اردو رسالوں والے آپ ہی کی طرح ایک صفحے کے دو سو روپے بتاتے ہیں اور بیس روپے پر پورا صفحہ تک کر جاتے ہیں۔ آپ بھی سیدھی بات کیجیے کہ پندرہ لیں گے یا بیس" — بہت کوفت ہوئی۔ میں نے انھیں بتایا کہ میں ایجنٹ نہیں ہوں مجھے زیادہ سے زیادہ دلچسپی آپ کی فرم کی نوازش سے ہے۔ اشتہارات کی فراہمی میرا رسمی سا کام ہے۔ نہ بھی ہوا تو مجھے افسوس نہ ہوگا۔ میں نے ان پر واضح کیا کہ "نقوش" کا نرخنامہ چھپا ہوا ہے (جو میں نے انھیں دکھایا بھی) اور یہ بھی کہ ہمارے ہاں سودا بازی والا کاروبار نہیں ہوتا کیونکہ جہاں تک "نقوش" کا تعلق ہے یہ جریدہ کاروباری نہیں ہے ادبی ہے۔ یہ جریدہ کبھی اشتہارات کے پیچھے نہیں بھاگا۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے اس موضوع پر بے تحاشہ باتیں کرنا پڑیں۔ بعض قائل ہوئے بعض نہ ہو سکے۔ قائل ہوتے بھی کیوں؟ ان کا واسطہ ایسے ہی ایجنٹوں سے پڑتا رہا ہے جو دو سو روپے کا نرخ بتا کر بیس روپے پہ پورا صفحہ تک کر جاتے ہیں۔

کوئی ادبی رسالہ بغیر اشتہاروں کے جی نہیں سکتا۔ خریداری کی رفتار تو جاسوسی، جنسی، فلمی اور "اسلامی تاریخی" ناولوں رسالوں نے پہلے ہی ختم کر دی ہے۔ اس کے ساتھ اس قسم کے ایجنٹوں اور رسالوں نے پبلسٹی کے باعزت پیشہ کو اس حد تک رسوا کر دیا ہے کہ بااصول قسم کے ادبی پرچوں کو اشتہار ملتے ہی نہیں۔

اس کے علاوہ ایک اور شرمناک انکشاف ہوا۔ لاہور میں ایسے ہفت روزہ اور ماہانہ رسالوں کی تعداد معمولی نہیں جو نہ جانے کس گلی کوچے سے نکلتے ہیں اور جانے کس طرف نکل جاتے ہیں، کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ میں نے اکثر ایسے ہی رسالوں میں بڑی بڑی فرموں کے پورے پورے صفحے کے اشتہارات دیکھے ہیں اور سوچتا رہا ہوں کہ ایسے گمنام پرچوں کو اس قدر بڑی بڑی فرمیں کیونکر پبلسٹی دے دیتی ہیں۔ یہ راز مجھ پر میری مہم کے دوران کھلا۔ چند ایک فرموں سے مجھے پتہ چلا کہ ان کے ہاں رسالوں والے جاتے ہیں اور ان کے اشتہار مفت لے آتے ہیں۔ ان کے ڈیزائن اور بلاک بھی اپنے خرچ سے بنواتے ہیں۔ فرموں سے وہ صرف تحریری آرڈر لیا کرتے ہیں۔ اس طرح وہ چند ایک نامی گرامی فرموں کے اشتہارات مفت شائع کر کے رسالہ ایجنٹ کو دے دوسری فرموں کے پاس بھیجتے ہیں کہ "دیکھئے ہمارا رسالہ کس قدر مقبول ہے کہ اتنی بڑی بڑی فرمیں ہمیں اشتہار دیتی ہیں۔" نتیجۃً دو چار صنعت کار ایسے پرچے کو کاروباری پرچہ سمجھ کر ان کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں اور اچھے داموں اپنی پبلسٹی دے دیتے ہیں۔ اس طرح رسالہ

بکے نہ بکے، رسالے والوں کی دال روٹی چلتی رہتی ہے اور بیچھے رسالوں کا پیٹ کٹتا رہتا ہے۔

میں نے ایک ہفت روزہ میں نصف صفحے کا اشتہار دیکھا ہے جس کا نرخ اُن کے چھپے ہوئے نرخ نامہ کے مطابق ایک سو روپیہ ہے لیکن میں نے مشتہر کے پاس اس کا بل دیکھا جو صرف پچیس روپے کا تھا۔ اس مشتہر نے مجھے کہا "یہ اشتہار بھی آپ کے سامنے ہے اور بل بھی۔ کہیے آپ کو آپ کے نرخ پر میں کیسے اشتہار دے دوں؟"

میری نامکمل مہم کے دوران مجھے چند ایک نہایت دلچسپ شخصیتوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جن میں سے بعض تو اچھی قسم کی دلچسپ تھیں اور بعض دلچسپ ہی نہیں۔ بعض ایسے تاریخی انسانوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جنھیں میں تمام عمر نہ مل سکتا اور جن سے مل کے روح بھی تر و تازہ ہو گئی۔ چند ایسے "تاریخی انسانوں سے بھی ملاقات ہو گئی جو انسان تو واجبی سے ہیں "تاریخی" زیادہ تھا۔ اس سلسلے میں کچھ ادیب بھی مل گئے جو ادیب کم اور "کچھ" زیادہ ہیں۔ کوئی کسی فیکٹری میں پبلسٹی انچارج ہیں اور کوئی کسی فرم میں سیلزمین۔ میں ان کی فرموں میں گیا اور بتایا کہ میں ادارہ فروغ اُردو کا نمائندہ خصوصی ہوں اور "نقوش" کے "لاہور نمبر" کے لیے آپ کی فرم کے بارے میں معلومات لکھنے آیا ہوں تو وہ مجھ پر ٹوٹ ہی پڑے۔

ایک نے کہا "نقوش بھی کوئی رسالہ ہے؟ الف تا ے بکواس"

دوسرے نے کہا "طفیل بھی کوئی ایڈیٹر ہے؟ دو پیسے کا کلرک"

ایک کو میں ایک روز ملا تھا اور دوسرے کو کئی روز بعد۔ دونوں نے ہر پہلو سے "نقوش" کو "گھٹیا" رسالہ ثابت کیا۔ دونوں نے ایک ایک گھنٹہ صرف کر کے مجھے "نقوش" کی "ملازمت" چھوڑ دینے کے مشورے دیئے اور رشوت کے طور پر میرے افسانوں کی خوب تعریفیں کیں۔ میں نے آخر دونوں سے باری باری پوچھا کہ وہ اس قدر معیاری پرچے کے خلاف کیوں جلے بیٹھے ہیں؟ تو ایک نے کہا "معیاری کہتے ہیں آپ اسے؟ پار سال میں نے دو غزلیں بھیجی تھیں اور آپ کے طفیل صاحب نے صرف ایک شائع کی اور وہ بھی ایسی غیر نمایاں جگہ جیسے ہم شاعر ہی نہیں۔"

اور دوسرے نے افسانہ نمبر کے لیے ایک افسانہ بھیجا تھا جو مدیر "نقوش" نے قبول نہیں کیا تھا۔

ان دونوں فرموں سے نہ مجھے حالات ملے، نہ اشتہار لیکن میں مایوس نہیں ہوں۔ مجھے اپنے افسانوں کے لیے دو کردار مل گئے ہیں۔

چند ایسے انسانوں سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا جو "نقوش" کے قارئین ہی نہیں شائقین ہی نہیں، مداح تھے "نقوش" کے خاص نمبروں کا جھوم جھوم کر تذکرہ کرتے تھے۔ لاہور نمبر کے متعلق اُنھوں نے سینکڑوں ہی باتیں پوچھیں، بیسیوں ہی مشورے دیئے۔ ان صاحبان نے جس خلوص کا مظاہرہ کیا میں ادارہ کی طرف سے ان کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ "لاہور نمبر" ان صاحبان کی توقعات کے مطابق ہو گا۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ کاروبار میں آ کر انسان کے اعصاب پر اس حد تک کاروبار سوار ہو جاتا ہے کہ بعض تو اپنے مقام سے بہت ہی نیچے اُتر آتے ہیں۔ جہاں بعض نے ادارہ فروغ اُردو کی ترقی، شہرت، ساکھ اور شخصیات نمبر، غزل نمبر، مکاتیب نمبر، طنز و مزاح اور افسانہ نمبر کے بعد لاہور نمبر جیسے ضخیم نمبر نکالنے پر مسرت کا اظہار کیا وہاں دو تین کاروباری حضرات نے افسوس

کا اظہار بھی کیا ـــــ ادارہ فروغِ اُردو آج اس قدر ترقی کر گیا ہے ـــــ میں ایک ادارہ میں گیا اور جو نہی کہا کہ "نقوش" کا لاہور نمبر نکل رہا ہے تو صاحبِ ادارہ نے آہ سی لی پھر کرسی پہ بے چین سی کروٹ بدلی اور زیرِ لب بولے "ہاں بھئی! نقوش کے نمبر کیوں نہیں نکلیں گے ۔ طفیل ہے نا؟ ہاں! آپ نقوش کے نیچے ہیں طفیل کو ہم جانتے ہیں" اتنا کہہ کر آپ گہری سوچ میں غرق ہو گئے اور ان کے چہرے کے تاثرات ان کے دل کی بات بزبانِ خاموشی سنانے لگے ۔ میں نے چپ سادھ لی ۔ آپ یک لخت چونکے اور عتاب آلود لہجے میں بولے "میں آپ کو اشتہار نہیں دونگا ۔ آپ ہماری فرم کی تواریخ لکھ سکتے ہیں ہمیں کوئی اعتراض نہیں"

یہ پہلا موقع تھا کہ میں اپنے آپ میں نہ رہ سکا ۔ میں نے کہہ ہی دیا "مجھے معلوم نہیں کہ آپ کی صنعت کی فرموں میں سے آپ کو کیوں منتخب کر لیا تھا حالانکہ آپ سے کئی گنا بڑے اور پرانے ادارے لاہور میں موجود ہیں" میں دل پہ ناگوار سا بوجھ لے کے اٹھا اور ان کے کمرے سے نکل آیا ۔ یہ میری جھنجھلاہٹ تھی ۔

چند حضرات ایسے بھی ملے جو اپنی فرم کے متعلق کم اور اپنی ذات کے متعلق زیادہ لکھوانا چاہتے تھے ۔ وہ مجھے سٹینوگرافر سمجھ کر لمبے لمبے بیانات لکھوا لیتے اور ایک نے تو یہاں تک لکھوایا "...... اور مسٹر (وہ خود) نے بیان دیتے ہوئے فرمایا کہ پاکستان کی انڈسٹری ... " میں نے انہیں بتایا کہ میں شخصیات پہ نہیں آپ کی صنعتی ترقی، آپ کی فرم اور فرم کی ارتقائی منازل پر مضمون لکھنا چاہتا ہوں ۔ آپ خفا ہو گئے ۔ بولے "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی" لیکن میرے لیے ان کی بات کوئی بات نہ تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے ان کے اشتہارات کے آرڈر بھی منسوخ کر دیئے اور تاریخ تو انھوں نے لکھوائی ہی نہیں تھی ۔

اس کے برعکس ملاحظہ فرمایئے کہ مجھے ایسے حضرات بھی ملے جن کا لاہور کی ادبی، ثقافتی، سیاسی اور صنعتی تواریخ میں اونچا مقام تھا ۔ وہ آج کسی نہ کسی صنعت کار کے ساتھ کام کر رہے ہیں ۔ میں ان کی ذات پر بہت کچھ لکھنا چاہتا تھا ۔ میں نے انھیں اپنے ارادے سے آگاہ کیا تو، کردار کی بلندی دیکھئے، انھوں نے مجھے روک دیا ۔ ان میں دو حضرات ایسے تھے جن کی جوانی کی شامیں علامہ اقبال مرحوم کی محفل میں گذری ہیں ۔ وہ بڑی بڑی نامور شخصیتوں کے ہمجولی تھے ۔ مجھے معلوم نہ تھا ۔ میں نے بات لاہور نمبر کی چھیڑی تو "بات پہنچی تیری جوانی تک" انھوں نے یادِ رفتگاں کا باب کھول دیا ۔ علامہ اقبال مرحوم کی محفلوں کا قصہ چھیڑ دیا ۔ فضا کا رنگ ہی بدل گیا ۔ عمرِ رفتہ کو آواز دے لی اور میں عالمِ محویت میں بھول ہی گیا کہ میں صحافی ہوں اور چند صنعتی معلومات فراہم کرنے آیا ہوں ۔ ہم وقت و زمانہ کی پگڈنڈی پر بہت دور پیچھے نکل گئے ۔ بھولی بسری چند باتوں کو دہرایا گیا ۔ ان کی باتوں میں مجھے گردِ کارواں دکھائی دے رہی تھی ـــــ اس کارواں کی گرد جو دور بہت دور افق سے بھی پرے چلا گیا ہے مگر کس قدر حسیں، کس قدر دکھیاری یادیں پیچھے چھوڑ کر ۔

باتوں باتوں میں اُن شخصیتوں کا بھی ذکر ہوا جو آج ہم میں نہیں لیکن لاہور کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں آج جو رونق ہے وہ انہی کی کاوشوں کا حاصل ہے جیسے ان کی روحیں آج بھی ہم پہ سایہ کئے ہمیں آگے ہی آگے بڑھنے پر آمادہ کر رہی ہیں ۔

کسی وقت عرب ہوٹل میں محفلیں جما کرتی تھیں ۔ عرب ہوٹل کی دیواروں کو غور سے سنیئے تو آج بھی چراغ حسن حسرت کے لطیفے اور سامعین کے قہقہے سنائی دیں گے عرب ہوٹل میں اب بھی اجڑی محفل کے نشان ملتے ہیں ۔ گو اب وہاں وہ بات نہیں تاہم کوئی بات ضرور ہے کہ میں وہاں کبھی کبھار جاتا ہوں، چائے کی پیالی پیتا ہوں اور اس تاریخی مقام کے در و دیوار کو دیکھتا رہتا ہوں ۔

اب تو نت نئے ہوٹل کھل گئے ہیں جنھوں نے تھوڑے ہی عرصہ میں لاہور کی تواریخ میں اپنا مقام پیدا کر لیا ہے ۔

لاہور ہوٹل :- رائٹرز گلڈ کی پچھلی میٹنگ جو لاہور میں ہوئی تھی اس کے مہمانوں کو لاہور ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں اس ہوٹل میں گیا۔ عجیب گہما گہمی تھی۔ وہاں ہر رنگ اور ہر ڈیزائن کے ادیب ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان سے ملنے کو بہت سے مقامی اور "غیر مقامی" ادیب بھی آئے ہوئے تھے۔ ہر کمرے میں ادیبوں ہی کی ٹولیاں بیٹھی تھیں اور بعض ٹولیاں تو ان کی تھیں جو ادیب کم اور گلڈ زیادہ تھے۔ یہ رونق تو گلڈ کے اجلاس کے ساتھ ہی ختم ہو گئی تھی لیکن لاہور ہوٹل اب بھی بارونق جگہ ہے۔

لاہور ہوٹل ۱۶ فروری ۱۹۵۲ء کو ایک رجسٹرڈ حصہ داری کی فرم (ہوٹل اینڈ سٹیزنز رجسٹرڈ) نے کھولا تھا۔ بلڈنگ کو کشمیر بلڈنگ کہتے ہیں جو میکلوڈ روڈ کے فراخ اور خوبصورت علاقہ میں ایستادہ ہے۔ آغاز میں ہوٹل کے پاس کل پچاس کمرے تھے جن کی تعداد اب ایک سو پچیس ہو گئی ہے۔ اور معیار پہلے سے کہیں زیادہ بلند۔ وسیع ڈائننگ اور لنچ ہال اور بلیئرڈ سیلون بھی ہے۔ رات دیر سے آنے والوں کی سہولت کے لیے ایک "سینک بار" بھی ہے جو دس بجے رات سے دو بجے تک کھلی رہتی ہے۔ لاہور میں غالباً یہی ہوٹل ہے جہاں چوبیس گھنٹے بکنگ ہوتی رہتی ہے۔ ہوٹل کا اپنا ٹیلیفون ایکسچینج ہے اور بیشتر کمروں میں ٹیلیفون لگے ہوئے ہیں۔ کمروں کے ساتھ ہی ملحق انگلش سسٹم والے غسلخانے ہیں۔ حالانکہ اس ہوٹل میں پاکستانی کھانے پکتے ہیں تاہم غیر ملکی اس ہوٹل کو خاص طور پر پسند کرتے ہیں اور یہاں ٹھہرتے ہیں۔

اس ہوٹل کی مجھے دو چیزیں بہت ہی پسند آئیں۔ پہلی یہ کہ کوئی مہمان جلدی میں کوئی چیز (خواہ وہ ایک پیسے کی ہو یا بیش قیمت) کمرے میں یا میز پر بھول جائے تو اسے ہوٹل کے نگران شدہ اشیاء کے محکمے کے حوالے کر دیا جاتا ہے جو مالک کا سراغ لگانے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ اس کام کے لیے ہوٹل نے پوسٹ کارڈ چھپوا رکھے ہوتے ہیں جو متعلقہ آدمی کو بھیجے جاتے ہیں اگر وہ آدمی چھ مہینے تک چیز واپس لینے نہ آئے تو یہ چیز اسی ملازم کو دے دی جاتی ہے جسے ملی تھی۔ ہوٹل کے منیجر صاحب نے مجھے ایک فائل دکھائی جس میں اس قابل تعریف سلسلے کا ریکارڈ موجود تھا۔ کئی بیش قیمت اشیاء ان کے مالکان کو واپس کی گئی ہیں۔

دوسری چیز ہے بل کی فاضل وصولی۔ کوئی مہمان غلطی سے زیادہ دے جائے تو اس کا پتہ معلوم کر کے اسے اطلاع دی جاتی ہے، اور فاضل رقم واپس کر دی جاتی ہے۔ اگر ایک عرصہ تک رقم واپس نہ ہو سکے تو رقم اسی کلرک کو دے دی جاتی ہے جس نے وصول کی تھی۔ اس کا جواز یہ ہے کہ بعض اوقات کلرک غلطی سے کم رقم وصول کر لیتے ہیں جو انہیں اپنی جیب سے پوری کرنی پڑتی ہے۔

تیسری چیز جو مجھے اس ہوٹل میں پسند آئی وہ ہے ایک تاریخی شخصیت۔ غوری صاحب جو ہوٹل کے منیجر بھی ہیں اور اکاؤنٹنٹ بھی بڑی ہی دلنواز شخصیت ہیں۔ علامہ اقبال مرحوم، مولانا ظفر علی خاں، سر عبدالقادر اور اس پایہ کی شخصیتوں کے ساتھ آپ نے جو وقت گزارا وہ یاد رفتگاں کی ایک داستان ہے۔ آپ ادیب بھی ہیں۔

اورینٹ ہوٹل :- لاہور ہوٹل کے پاس ہی اورینٹ ہوٹل ہے جو فروری ۱۹۵۱ء میں ملک محمد اکرام الٰہی صاحب نے کھولا تھا۔ اس ہوٹل کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ۲۸ فروری ۱۹۵۱ء ہوٹل کھلا اور ۲۸ فروری ملکہ ایلزبتھ لاہور تشریف لائیں تو حکومت نے ڈپلومیٹس کے لیے اسی ہوٹل کو بک کیا۔ اس کے علاوہ غیر ملکی سفیر اور اس پایہ کے دیگر لوگ (V.I.Ps) اس ہوٹل میں آتے ہیں۔ اس وقت ہوٹل میں چالیس کمرے ہیں جو جدید طرز کے فرنیچر سے آراستہ ہیں۔ . . . . صاحب نے مجھے خاص طور پر کمرے دکھائے۔ ڈائننگ ہال ڈرائنگ روم بھی دکھایا۔ رہائشی کمروں کے ساتھ فلش سسٹم کے غسلخانے ملحق ہیں۔ گرم اور سرد پانی رواں ہے۔ . . .

کمروں کی تعداد زیادہ کی جا رہی ہے اور ایئر کنڈیشن کرنے کا بھی پروگرام ہے۔ اس کے علاوہ چوتھی منزل کی تعمیر کا منصوبہ بھی تیار ہو چکا ہے۔ جو مکمل ہوتے ہی لفٹ بھی لگا دی جائے گی۔

بالائی منزلوں کے سامنے برآمدے مجھے خاص طور پر پسند آئے۔ وہاں کا ماحول بڑا ہی پُرسکون ہے۔ سردیوں میں دھوپ لگتی ہے اور گرمیوں میں دھوپ کا رُخ پھر جاتا ہے اور ہوا لگتی ہے۔

ہوٹل میں مشرقی اور مغربی کھانے ملتے ہیں۔ دونوں کی روایات کو خوب برقرار رکھا گیا ہے۔ یہی ہوٹل کی سب سے بڑی خوبی ہے جو مشرقی وضعداروں کو پسند آتی ہے۔ ہوٹل کا صحن بڑا فراخ ہے جہاں کئی کاریں پارک کی جا سکتی ہیں۔

لاہور کی دوسری تاریخی صنعت پبلشنگ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ لاہور ملک کا ادبی مرکز ہے۔ اردو بازار، ریلوے روڈ اور کشمیری بازار لاہور کے تاریخی مقامات ہیں جو ناشرین اور کتب فروشی کی بدولت ہی دور دور تک مشہور رہیں۔

ملک سراج الدین اینڈ سنز پبلشرز:۔ ۱۹۳۲ء کا تاریخی واقعہ ہے کہ ایک ان پڑھ آدمی دل میں کتابیں چھاپنے کا ولولہ لیے میدان میں آیا۔ تعلیم سے بے بہرہ انسان نے تعلیم کی نشر و اشاعت کا کٹھن اور صبر آزما سفر اختیار کیا۔ وہ انسان آج بھی زندہ ہے۔ نام ملک سراج الدین ہے اور ان کے نام کا اشاعتی ادارہ صرف پاکستان میں ہی نہیں غیر ممالک میں بھی معروف ہے۔ کشمیری بازار میں ایک وسیع دوکان ہے جسے سیل ڈپو کہتے ہیں۔ اور قریب ہی ہیڈ آفس ہے جس کی انتظامیہ بےحد مصروف رہتی ہے۔ اس وقت اس پبلشنگ فرم میں سے ہی: عربی، فارسی، اردو، پشتو، انگریزی، بنگالی، پنجابی، ڈچ، جھنبانجا اور سواحلی (افریقی زبانیں) میں کتب چھپتی ہیں اور تقریباً تمام ممالک میں برآمد ہوتی ہیں۔ مانگ کی رفتار خاصی تیز ہے۔

یہاں درسی، تبلیغی اور مذہبی کتابیں چھپتی ہیں۔ تفسیر، حدیث اور قرآن مجید اس ادارہ کے خاص کارنامے ہیں۔ پریس اور جلد سازی کا اپنا شعبہ ہے۔ اس وقت یہ ادارہ انگریزی میں قرآن مجید چھاپ رہا ہے اور تھوڑے ہی عرصہ تک حدیث کی تفسیر کے عربی، اردو اور انگریزی میں تراجم بھی مکمل ہو جائیں گے۔ منصوبہ پر عمل شروع ہو چکا ہے، کچھ وقت لگے گا۔

ادارہ کا ایک ماہانہ رسالہ "گل خنداں" بھی نکلتا ہے جس کے لیے جانے پہچانے صفِ اوّل کے ادیب لکھتے ہیں۔ اس پرچے میں زندگی کے ہر شعبے پر مضامین اور افسانے ہوتے ہیں۔ ان میں طب اور نفسیات بھی شامل ہے۔

انتظامیہ کی کارکردگی اور تیز رفتاری سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ادارہ ترقی کے کئی اور مدارج بہت جلدی طے کرے گا۔ ملک سراج الدین صاحب کا حسنِ انتظام، سلیقہ اور استقلال دیکھنے والی چیز ہے اور جب خیال آتا ہے کہ آپ کی تعلیم کیا ہے؛ تو بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

مکتبۂ جدید:۔ اس جدید مکتبہ کا آغاز رشید احمد چوہدری صاحب نے ۱۹۴۲ء میں کیا۔ دو سال بعد آپ کے بڑے بھائی بشیر احمد چوہدری صاحب بھی آپ کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اور دو چھوٹے بھائی بھی ساتھ آن ملے۔

یہ مکتبہ سرمایہ سے نہیں تجربہ سے شروع ہوا جو کارپردازان نے اپنے بڑے بھائی چوہدری نذیر احمد صاحب (نیا ادارہ "سویرا") اور اپنے چچا چوہدری برکت علی مرحوم (پنجاب بک ڈپو) سے حاصل کیا۔ یہی تجربہ اور حُسنِ کارکردگی سرمایہ تھا جس کے بل بوتے پر اس ادارے کی بنیاد رکھی گئی جس نے آج پبلشنگ کے میدان میں نت نئے تجربوں سے سنگ ہائے میل قائم کیے ہیں۔ ابتدا ادبی کتابوں سے کی گئی۔ آج کے متعدد نامور

مصنفین کو اُردو دان طبقے سے روشناس کرانے کی ذمہ داری اسی ادارے پر ہے۔ کنہیا لال کپور، شفیق الرحمن، عزیز احمد، قرۃ العین حیدر، قدرت اللہ شہاب جیسے ادیبوں کی پہلی پہلی کتابیں اسی ادارہ نے شائع کیں۔ بعد میں ادارہ نے نفسیاتی اور تواریخی (سوانح) کی طرف توجہ دی۔ اس ضمن میں انگریزی اور عربی سے تراجم کو فروغ دیا گیا۔

اُردو زبان میں قابلِ تحسین قدم "میری لائبریری" کا سلسلہ ہے۔ اس پاکٹ بک سلسلہ کا آغاز اسی ادارہ نے کیا۔ یہ کام کسی وقت لکھنؤ کے ایک پبلشر نے شروع کیا تھا۔ انھیں بنیادوں پر مکتبہ جدید نے کام کوئی مہارت سے شروع کیا۔ اور آج یہ سلسلہ عوام میں مقبول ہے جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ قیمت واجبی ہے، جلد مضبوط، خوبصورت اور پائیدار "میری لائبریری" کے سلسلے میں پچاس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اب کتابیں خریدنا عوام کے بس کی بات ہو گئی ہے۔

ادارہ کا شو روم چوک انارکلی میں ہے اور دفتر میکلوڈ روڈ پر جواب منتقل ہو رہا ہے۔ مشہور جریدہ "نصرت" اسی ادارہ کا ہے جو پہلے ہفت روزہ تھا اب ماہانہ کر دیا گیا ہے۔ "نصرت" نے مختصر سی زندگی میں کئی خاص نمبر نکال کر اپنا ایک الگ مقام پیدا کر لیا ہے۔ اس کا تازہ خاص نمبر "ہمارے مسائل" ہے جس میں زندگی کے ہر شعبے پر نامور ادیبوں اور مفکروں نے لکھا ہے۔

تاج کمپنی لمیٹڈ:- کس قدر تکلیف دہ تھا وہ زمانہ جب قرآن ہندو اور سکھ چھاپا کرتے تھے۔ لاہور کے چند ایک ناشرین نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور یہ قومی فریضہ سنبھال لیا۔ ۱۹۲۹ء میں شیخ عنایت اللہ صاحب نے برانڈرتھ روڈ پر تاج کمپنی کا سنگِ بنیاد رکھا۔ آج شیخ صاحب اس معروف فرم کے منیجنگ ایجنٹ ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں ادارہ ریلوے روڈ (موجودہ جگہ) منتقل ہو گیا اور ۱۹۴۴ء میں یہ عمارت خرید لی گئی۔ ۱۹۴۷ء میں کراچی میں پہلی برانچ کھولی گئی۔ ۱۹۴۹ء میں کراچی میں سندھ انڈسٹریل اسٹیٹ میں پریس نصب کیا گیا جس کا افتتاح لیاقت علی خان مرحوم نے کیا تھا۔ ۱۹۵۱ء میں ایک برانچ ڈھاکہ کھولی گئی۔

تاج کمپنی لمیٹڈ کا ہیڈ آفس اور اس کی شاخیں اس قدر ترقی یافتہ اور مشہور ہوئیں کہ خضر حیات، سر سکندر (جنھوں نے آغاز میں کافی مدد کی دی تھی) سر فضل حق گورنر، گورمانی، قائدِ اعظم، لیاقت علی خان مرحوم، صدرِ پاکستان فیلڈ مارشل ایوب اور دیگر امراء، سفراء اور وزراء کے علاوہ حال ہی میں ملایا کے بادشاہ بھی اس فرم کو دیکھنے تشریف لائے۔ تاج کمپنی ایک تاریخی مقام بن چکا ہے۔ اس وقت سرمایہ پچاس لاکھ ہے اور تنخواہ دار ملازم چھ سو کے قریب ہیں۔ ادارہ پبلک لمیٹڈ ہے۔ کم سے کم حصہ بیس روپے ہے، جس سے عوام میں سرمایہ کاری کا رجحان پیدا ہو گیا ہے اور منافع تو تجارت کے خلاف زیادہ ادا کیا جاتا ہے۔

قرآن جو پہلے لیتھو میں چھپتے تھے، اس ادارہ نے عکسی بلاکس میں شائع کیے۔ اس ادارہ میں دوسری کتابیں بھی چھپتی ہیں لیکن یہ ادارہ قرآن کی اشاعت کے لیے مشہور ہے۔ یہاں سے قرآن کے چند نسخے دیکھے جو دیکھنے والی چیز ہے۔ یہ قرآن غیر ممالک میں برآمد کیے جاتے ہیں۔ تین سے زائد اقسام قرآن کی شائع ہوتی ہیں جن کا ہدیہ دو روپے سے تین سو روپے تک ہے۔ شاہ سعود نے ایک نسخے پر ادارہ کو ایک ہزار روپیہ انعام دیا تھا۔ شاہ فیصل (عراق) نے بھی قرآن کی بے حد تعریف کی تھی۔ ایک نسخہ حکومتِ پاکستان نے ملکہ برطانیہ شاہ ایران کو تحفۃً دیا تھا۔

اس کے علاوہ تفاسیر اور تراجم بھی چھپتے ہیں۔ کتابوں کے علاوہ تاج کا بنا ہوا مشہور تیل ہے اور کئی دوائیاں بھی تیار ہوتی ہیں۔

مکتبہ فرینکلن:- ایشیا اور افریقہ میں کتابوں کی نشر و اشاعت کی پسماندگی کو محسوس کرتے ہوئے امریکہ کے بعض ماہرینِ تعلیم اور ناشرین نے محسوس کیا کہ ان ملکوں کے ناشرین کو مدد پہنچائی جائے تو وہاں بھی نشر و اشاعت کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔

اس مہم میں نمایاں کام مسٹر ڈیس مجتھ کا ہے جو پرنسٹن یونیورسٹی پریس کے ڈائریکٹر تھے۔ آپ چھٹی لے کر ۱۹۵۴ء میں لاہور آئے اور یہاں مکتبہ فرینکلن کی داغ بیل ڈالی۔ حقیقی کام ۱۹۵۵ء میں شروع ہوا۔ اس سال کے آخر میں موجودہ ڈائریکٹر حامد علی خاں صاحب مقرر ہوئے۔ مقامی پبلشروں سے با عزت قسم کے اشتراک سے کتابیں چھاپی جاتی ہیں۔ براہ راست پبلشنگ کا کام نہیں ہوتا۔ یہ ادارہ (جیسا کہ مجھے بتایا گیا) مترجموں کے لیے نہیں نہ ہی پروپیگنڈہ کا ادارہ ہے۔ ڈاکٹر زیواگو کا ترجمہ اسی لیے نہیں شائع کیا گیا تھا کہ عام رائے کے مطابق اس شہرۂ آفاق کتاب پر پروپیگنڈے کا لیبل چپکا دیا گیا تھا۔

مکتبہ فرینکلن کے دفاتر دنیا میں کئی جگہ ہیں۔ سب سے پہلا قاہرہ میں کھولا گیا تھا اس کے بعد طہران میں اور پھر لاہور میں۔ صدر دفتر نیویارک میں ہے جو پبلشنگ ادارہ نہیں ہے محض دفتر ہے جس نے کبھی کوئی کتاب نہیں چھاپی۔ ان دفاتر کے علاوہ جکارتا، بیروت، بغداد، کوالا لمپور میں بھی ادارے ہیں جو تمام کے تمام اسلامی ممالک کے ہیں۔ طہران میں شاہِ ایران اور ان کی ہمشیرہ نے مکتبہ کو کثیر مالی امداد دی۔ عربی میں بے شمار کتابیں چھپ چکی ہیں۔

لاہور میں ہر موضوع پر کتابیں چھپتی ہیں لیکن حامد علی خاں صاحب سائنس پر زور دے رہے ہیں۔ اس لیے آپ ایسی کتابیں چھپوا رہے ہیں جو بچوں کے سلسلے میں والدین اور اساتذہ کے لیے ممد ثابت ہوتی ہیں۔ اس وقت ایک انسائیکلوپیڈیا لکھی جا رہی ہے جو عام پڑھنے والے کے لیے ہوگی۔

حامد علی خاں صاحب نے اپنے خلاف چند شکایات کے سلسلے میں مجھے بہت کچھ بتایا جو ایک طویل داستان ہے اور جگر کم۔ اس معاملے میں میری اپنی کوئی رائے نہیں نہ ہی مجھے ذاتی طور پر حامد علی خاں صاحب کے خلوص پر کسی قسم کا شبہ ہے۔

ملک دین محمد اینڈ سنز۔ ناشران قرآن مجید و تاجران کتب:۔ الحاج ملک دین محمد ۱۸۸۵ء میں لاہور میں تولد ہوئے۔ آپ کے والدِ ماجد ملک امام دین خان صاحب سکہ گوٹہ کا کام کرتے تھے اور آپ کے دادا مرحوم ہاتھ سے کلام پاک کی نقرئی و طلائی کتابت فرمایا کرتے تھے۔ دینی امور اور علوم مشرقی سے بزرگوں نے مالا مال کیا تھا۔ اسی تربیت کا نتیجہ ہے کہ عمر بھر با اصول زندگی بسر کی۔ دیانت اور حق گوئی آپ کا شیوہ تھا۔ ذرا غور فرمائیے کہ آپ نے تین روپے کے سرمائے سے نشر و اشاعت جیسا صبر آزما کام شروع کیا۔ ابتدا نصیحت آمیز اشعار، قرآنی آیات اور مجلسی آداب کے قطعوں سے کی۔ کاروبار بڑھا تو ۱۹۰۸ء میں اشاعت قرآن پاک اور تبلیغی علوم کی غرض سے کشمیری بازار میں چھوٹی سی دوکان لی جو آج نیک نامی اور حسن کارکردگی کی بدولت اپنے میں ہی نہیں بیرونی ممالک میں بھی جانی پہچانی جاتی ہے۔

اُس دور میں اپنے ہاں کوئی ادارہ اشاعتِ قرآن پاک کی طرف توجہ نہیں دے رہا تھا۔ بمبئی سے قرآن چھپ کر آتا تھا جو ہدیہ گراں ہونے کی وجہ سے عوام کی مانگ پورا نہ کر سکتا تھا۔ ملک صاحب نے یہ کارِ خیر بھی اپنے ذمہ لیا۔ آغاز کی مشکلات کو عبور کیا اور آج اس ادارہ سے معرّا، مترجم، سادہ، عکسی، رنگین، ہر خط اور ہر قامت کے قرآن دستیاب ہوتے ہیں جن کا ہدیہ خاصا کم ہے۔ اس کے علاوہ مختلف و مستند اسلامی کتب بھی ہر سال لاکھوں کی تعداد میں چھپ کر فروخت ہوتی ہیں۔ انگریزی، فارسی، عربی، سندھی، اردو، پنجابی، پشتو اور بنگالی زبان میں ہر موضوع پر کتابیں شائع کی جاتی ہیں جن کی برآمد غیر ممالک میں کی جاتی ہے۔

اسی فرم کے زیرِ اہتمام دین محمدی پریس کی لاہور اور کراچی میں اعلیٰ پیمانے پر شاخیں قائم ہیں جن کی پریس مشینری جدید ہے۔ مرکزی اور صوبائی حکومتیں اپنی اکثر مطبوعات انہی چھاپہ خانوں سے چھپواتی ہیں۔ مسٹر اے۔ کے بروہی کی معرکۃ الآراء کتاب .FUNDAMENTAL LAW OF PAKISTAN اسی ادارہ نے چھاپی اور انگریزی کا نامی گرامی ماہنامہ MIRROR اسی پریس میں طبع ہوتا ہے۔ یہ پریس تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ گورنر جنرل اور بعض وزراء دورے پر آتے رہے اور مشینری اور انتظامیہ کو سراہتے رہے۔

اس وقت الیمنار مارکیٹ اور کشمیری بازار میں اعلیٰ معیار کے کتب خانے موجود ہیں جو قدیم و جدید اور مستند کتابوں سے بھرپور ہیں۔ ملک محمد عارف صاحب مہتمم اعلیٰ ہیں۔

فیروز سنز:— سنگِ بنیاد الحاج مولوی فیروز الدین صاحب نے ۱۸۹۴ء میں رکھا۔ سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کے خلاف جہاد شروع کر رکھا تھا۔ مولوی صاحب نے بھی اس عظیم المرتبت قومی مصلح کی آواز پر لبیک کہی۔ آپ صحافی تھے "پنجاب پنچ" "پھر مشیرِ ہند" جاری کیا۔ ان اخباروں کے ذریعے سر سید مرحوم کی تحریک میں سرگرم حصہ لیا۔ اس دور میں اصلاحی، علمی اور ادبی کتب کی ضرورت شدید تھی۔ آپ نے "دربارِ اسلام" اور "تجرید بخاری" لکھی جنہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ آپ کے پیشِ نظر ملک و ملت کے بچے بھی تھے۔ آپ نے ابتدائی مدارس کے لیے درسی اور عام معلوماتی کتب کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ اخلاقی و مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ بچوں کی سوجھ بوجھ اور معلومات میں بتدریج اضافہ اس سلسلہ کتب کا طرۂ امتیاز ہے۔ مولوی صاحب نے ایک رسالہ "تعلیم و تربیت" بھی شائع کیا جسے ۱۹۴۱ء میں صرف بچوں کے لیے وقف کر دیا گیا۔ یہ رسالہ اب بچوں کے جرائد میں منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ آج کل فیروز سنز کا ایک انگریزی ماہنامہ "پاکستان ریویو" بھی چھپتا ہے۔ اس جریدہ نے تھوڑے ہی عرصہ میں اپنا مقام پیدا کر لیا ہے۔

مولوی صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ فیروز اللغات ہے جس نے اردو علم و ادب کی ایک نمایاں کمی پوری کی ہے۔ مولوی صاحب کے ایسے قومی کارناموں کی فہرست اور داستان طویل ہے۔ آپ نے زندگی کے آخری دور میں قرآن شریف کا بامحاورہ سلیس ترجمہ بھی کیا تھا جو تسہیل القرآن کے نام سے مشہور ہے۔ آپ نے عوام کی فلاح و بہبود کی خاطر ایک ٹرسٹ قائم کیا۔ اس ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام قرآن مجید کی ارزاں ترین اشاعت کے علاوہ دینی کتب بھی شائع کی جاتی ہیں۔ اسی ٹرسٹ کی زیرِ نگرانی لاہور، پشاور اور کراچی میں متعدد شفاخانے بھی قائم ہیں جن میں مفت علاج معالجہ ہوتا ہے۔

آج مولوی صاحبؒ حضرت خواجہ علی ہجویریؒ عرف داتا گنج بخشؒ کے پہلو میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ لیکن فیروز سنز ان کی ایسی یادگار ہے جو ہمیشہ زندہ رہے گی۔ فیروز سنز عظیم ترین نشر و اشاعت کا ادارہ ہے جس کے زیرِ اہتمام لاہور، کراچی اور پشاور ایسے مرکزی شہروں میں مطابع اور کتب خانے قائم ہیں۔

مولوی صاحب مرحوم و مغفور کی روایات کو آپ کے فرزند خان عبدالمجید خاں۔ خان عبدالحمید خاں اور ڈاکٹر عبدالوحید خاں پوری تن دہی، خلوص اور راست بازی سے زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

فیروز سنز لیبارٹریز لمیٹڈ (نوشہرہ) ادارے کی ترقی کا ایک اور سنگِ میل ہے۔ یہ دوا سازی کا کارخانہ ہے جہاں ملکی اور غیر ملکی

ماہرین فن کی زیرنگرانی ایلوپیتھک دوائیاں تیار ہوتی ہیں۔

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ:۔ جنوری ۱۹۶۱ء میں چند اہل علم و بصیرت کے تعاون اور رفاقت سے یہ ادارہ پانچ لاکھ کے سرمایہ سے شروع کیا گیا۔ یہ ایک لمٹڈ اشاعتی ادارہ ہے جو بلند پایہ کتابیں شائع کرنے کا عزم لے کر وجود میں آیا ہے۔ اس کے پیش نظر اہم ترین کام قرآنی تحقیق ہے۔ مفہوم القرآن اور لغات القرآن اس کی مشہور کتابیں ہیں۔ اس کے علاوہ معاشرت کے موضوع پر بھی کتابیں شائع کی گئی ہیں جن میں "سلیم کے نام خطوط"، "طاہرہ بیٹی کے نام" اور "ٹھکرائے ہوئے انسان" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ادارہ کا اپنا پریس ہے جس کی مشینری جدید ہے۔ اپنی مطبوعات کے علاوہ دوسرے ناشرین کی مطبوعات بھی مل سکتی ہیں۔

ادارہ کے موجودہ مہتمم میاں عبدالخالق سے میں ملا تو آپ نے ادارہ کے پروگرام کا طویل تذکرہ کیا۔ آپ نے بڑے وثوق سے بتایا کہ دین میں اس وقت جو غلط روی چل رہی ہے۔ اسے قرآن کی تحقیقی کتابوں کے ذریعے دور کرنا اس ادارہ کا نصب العین ہے۔ حدیث کے متعلق بھی تحقیقی لٹریچر شائع کیا گیا ہے۔ ادارہ کو غلام احمد پرویز جیسے مفکر کا تعاون حاصل ہے اور ادارہ بڑی تیز رفتاری سے اپنے پروگراموں پر عمل پیرا ہے۔

صدر دفتر اور شو روم 27/B شاہ عالم مارکیٹ میں ہے۔

دل روز آیئے! آپ کو ایک تاریخی چیز سے متعارف کراؤں جسے آپ یقیناً پہلے ہی جانتے ہوں گے۔ یہ ہے ایک دوائی۔ نام ہے "دل روز"۔

مولانا گرامی چالیس برس سے ناسور میں مبتلا تھے۔ سرجنوں نے اپریشن کئے ڈاکٹروں نے سیکڑوں انجکشن کروائے مگر ناسور تو جیسے آپ کے جسم کا جزو دین چکا تھا۔ مولانا اسے لاعلاج سمجھ بیٹھے تھے۔ آپ لاہور تشریف لائے اور علامہ اقبال مرحوم کے ہاں مہمان ہوئے۔ حکیم طاہرالدین مرحوم علامہ اقبال مرحوم کی محفل کے اہم رکن تھے۔ آپ نے گرامی کا ناسور دیکھا اور اللہ کو یاد کر کے "عرق دلروز" کا پھایا لگا دیا۔ لاہور میں گرامی نے دو ہفتے "دل روز" کا استعمال کیا اور ناسور ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہو گیا۔ مولانا نے ایک مصرع کہہ ڈالا ——

"اظہرم کرد طاہر از ناسور"

—— علامہ اقبال مرحوم نے مصرع ثانی لگا دیا —— "عرقش بہ ز مرہم کافور"

"دل روز" حکیم طاہرالدین مرحوم کی دریافت ہے جسے آپ نے ۱۹۰۲ء میں شبانہ روز تحقیق کے بعد چند جڑی بوٹیوں سے تیار کیا اور جلدی امراض کا پہلا کامیاب اور سستا علاج دریافت کیا۔ یہ دوائی حکیم صاحب کے الفاظ میں جنہیں صحت یافتہ مریضوں کی رائے کے مطابق تمام لاعلاج اور مزمن جلدی بیماریوں، ہر قسم کے پھوڑے پھنسی، لاہوری اور ملتانی پھوڑے، ناسور، بھگندر، بال توڑ، داد، چنبل، خارش، خنازیر، بال جھڑ، ماس خورہ، ورد، جلن، سوجن، چوٹ، نئے اور پرانے زخم اور زہریلے جانوروں کے کاٹے کا بے ضرر اور بے حد مفید علاج ہے۔

۱۹۱۴ء تک مرحوم اس قدر قیمتی دوا کو مفت تقسیم کرتے رہے۔ حالانکہ اس کی تجارتی مانگ عروج پر تھی۔ آج بھی شیخ بشیر احمد صاحب فرماتے ہیں کہ یہ دوا خاص مقدار میں مفت ہی دی جاتی ہے۔ ۱۹۲۰ء تک یہ دوا اس قدر مشہور ہو چکی

تھی اور مانگ اس قدر بڑھ چکی تھی کہ اسے جدید سائنسی طریقوں سے وسیع پیمانے پر تیار کیا جانے لگا اور فیروز پور روڈ پر آج انہیں ایک قسم کا کارخانہ تعمیر کرنا پڑا جو آج "دل روز والا" کے نام سے دور دور تک مشہور ہے۔

یوں تو بڑی بڑی تاریخی شخصیتوں نے اس دوا سے فائدہ اٹھایا ہے جن کی فہرست خاصی طویل ہے۔ میں صرف دو ایک کا ذکر کرتا ہوں۔ مسٹر بیزلے سیکرٹری گورنمنٹ آف پنجاب کے ہاتھ کا پھوڑا اسی دوا سے دور ہوا تھا۔ انہیں یہ دوائی استعمال کرنے کا مشورہ آنریبل خان بہادر شہاب الدین صدر پنجاب کونسل نے دیا تھا۔ سر ظفر اللہ خاں نے ۱۹۲۹ء میں "دل روز" کی کامیابی کا ذکر پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے ایک اجلاس میں کیا تھا اور سرکاری پشت پناہی کی سفارش کی تھی۔ یہ دستاویز قدرے طویل ہے۔ مختصراً یہ کہ یہ دستاویز "دل روز" کی ہمہ گیر صفات کی کھلی شہادت ہے۔

اس قدر شہرت، کامیابی اور مانگ کے باوجود شیخ بشیر احمد صاحب (موجودہ مہتمم) کے خلوص کا یہ عالم ہے کہ آپ نے دوائی کی قیمت واجبی سی رکھی ہوئی ہے اور دوائی کے معیار کو بال برابر گرنے نہیں دیا۔

لاہور

کی

سیاسی، ثقافتی، مذہبی

اور

علمی و ادبی تاریخ

ٹیلیفون نمبر ۳۵۲۵
رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۱۲

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

لاہور نمبر

عہدِ غزنوی سے دورِ حاضر تک کی تاریخ
سنہ ۱۰۱۴ء سے سنہ ۱۹۶۱ء تک

۹۲
فروری سنہ ۱۹۶۲ء

مدیر: محمد طفیل

ادارۂ فروغِ اُردو ۰ لاہور
قیمت پندرہ روپے
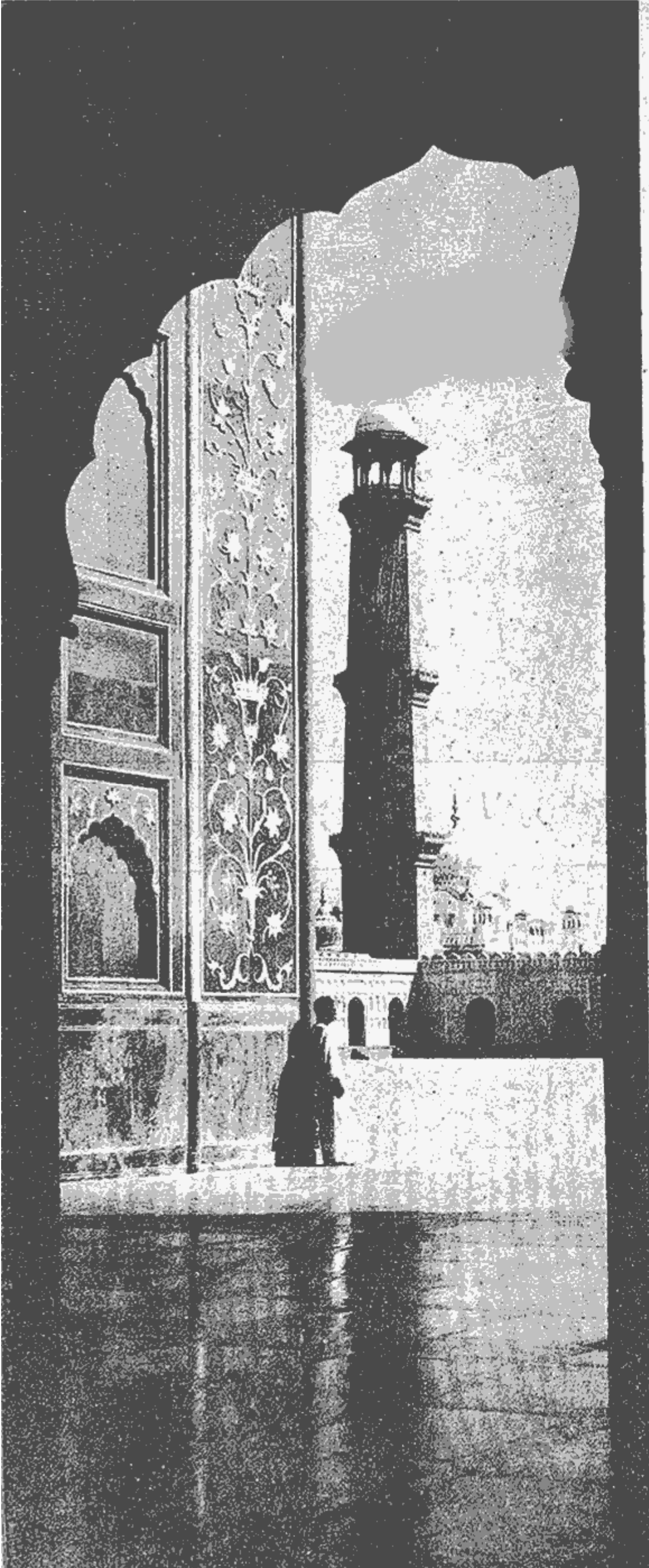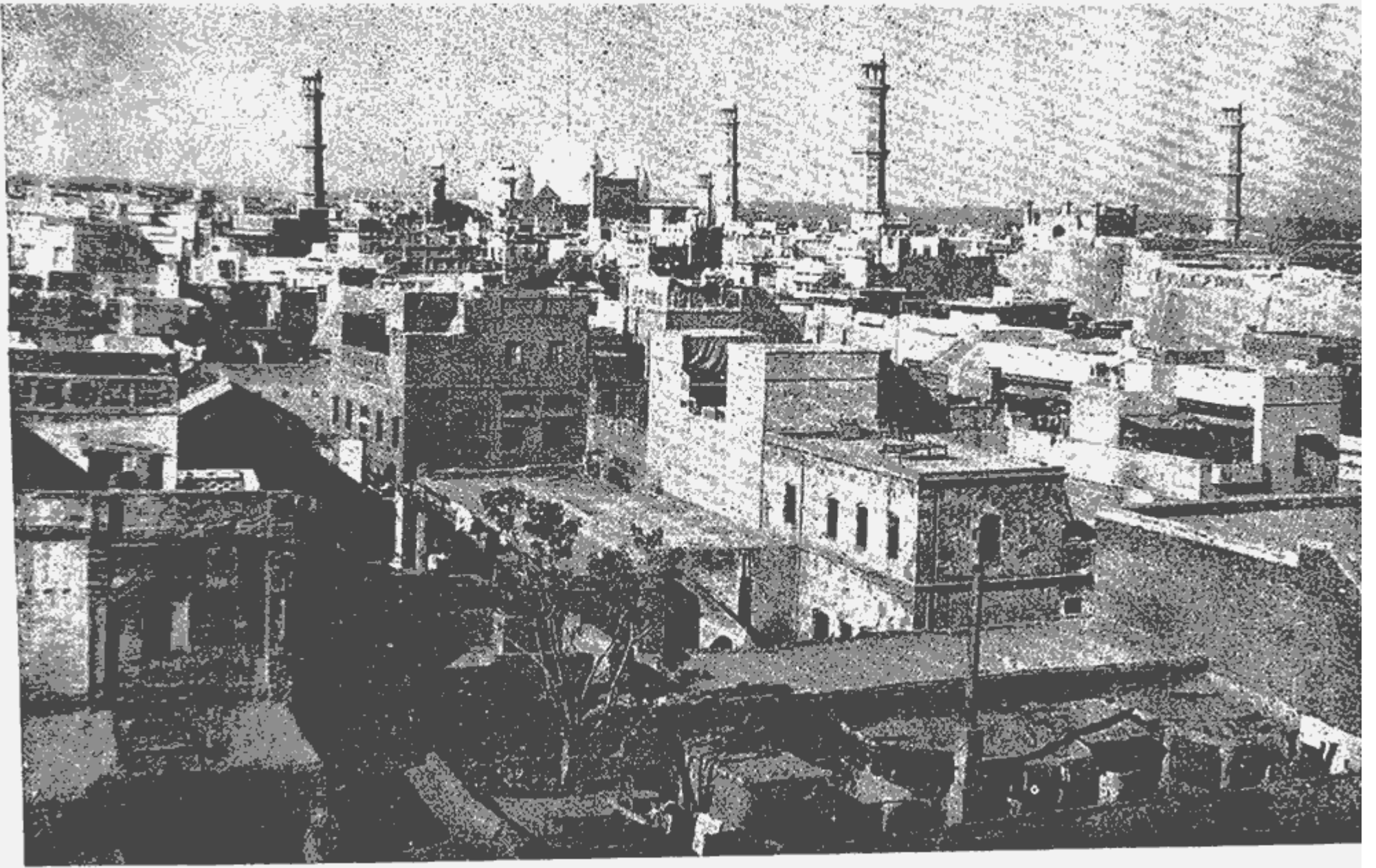
لاہور

شاہی مسجد

مقبرہ جہانگیر
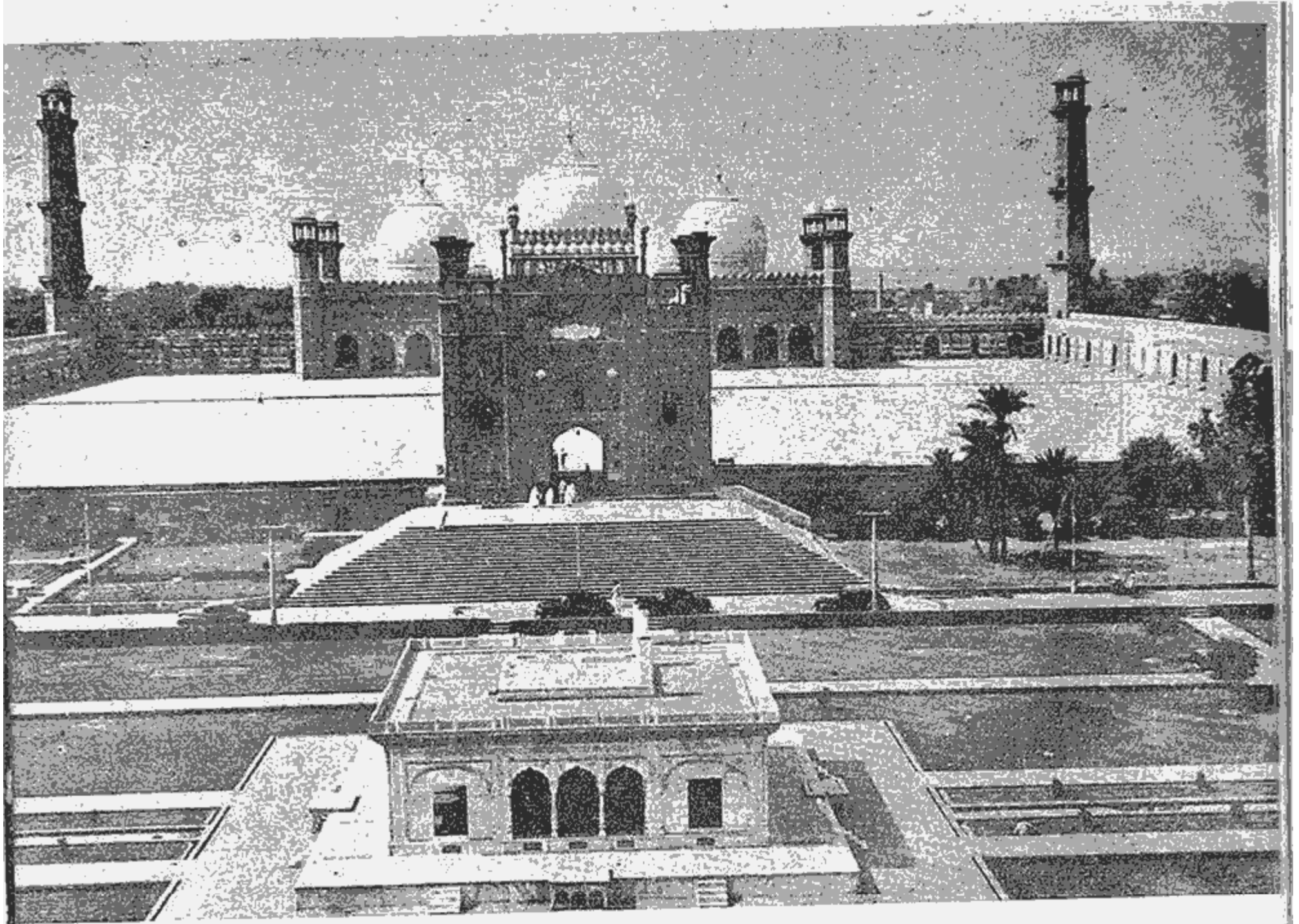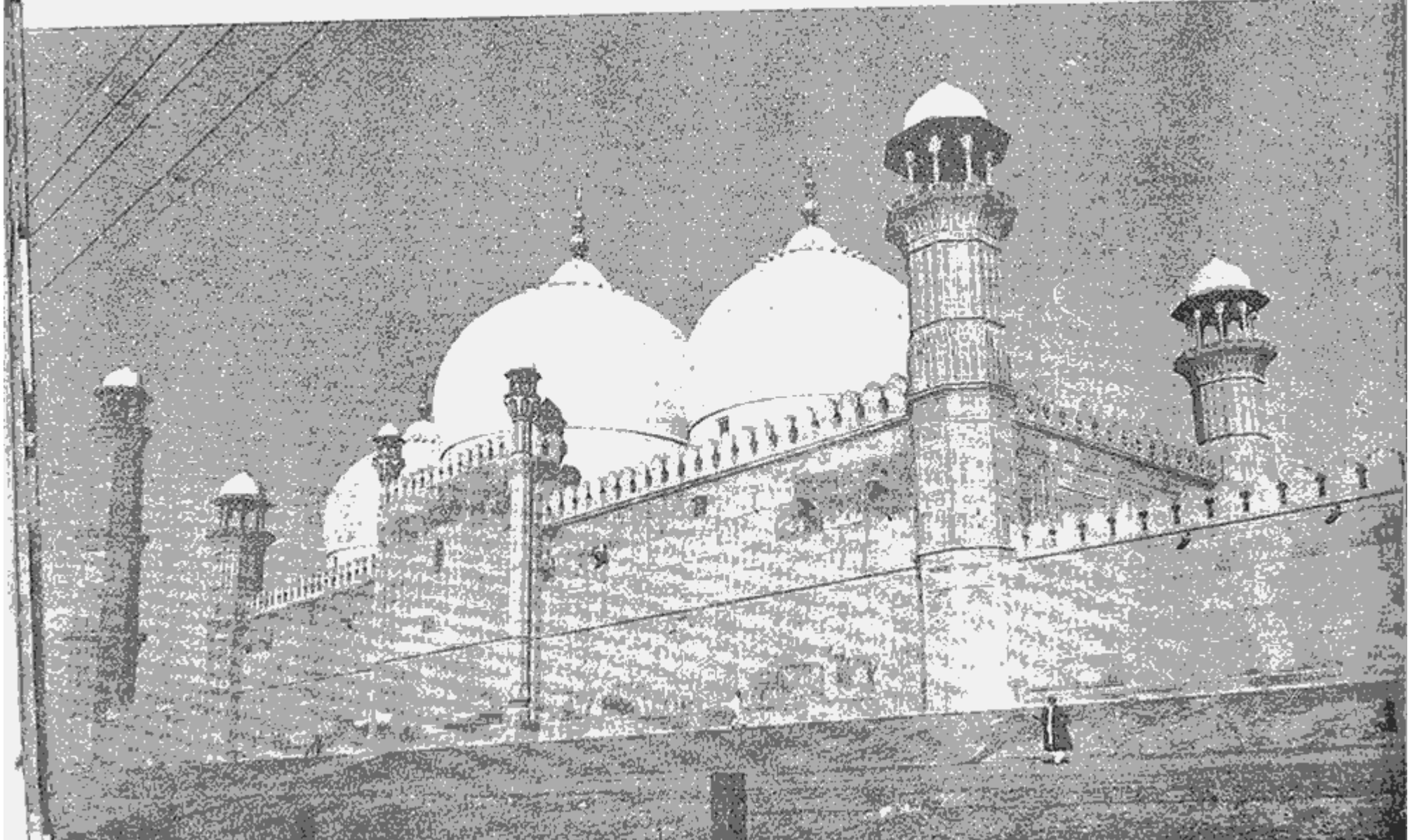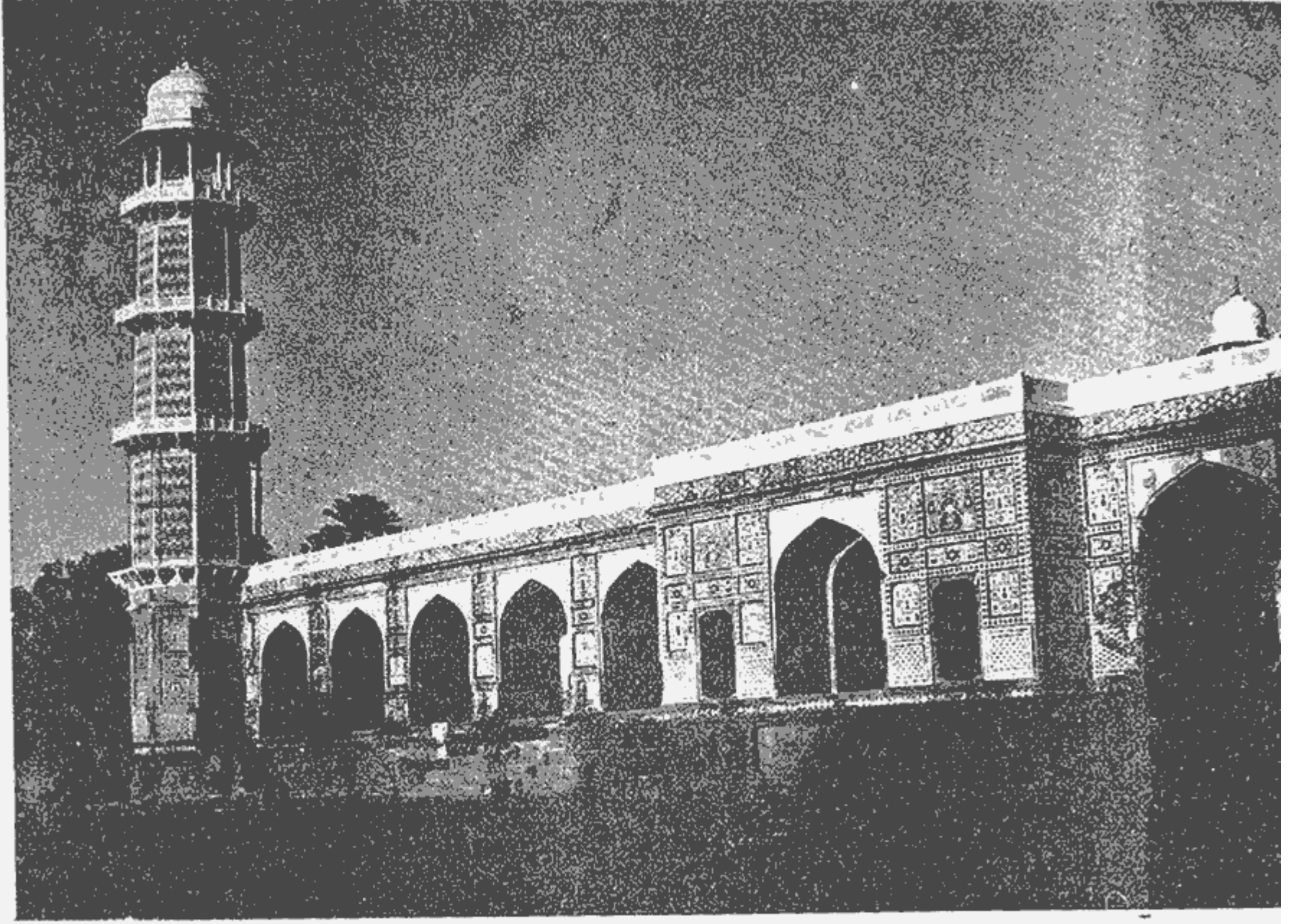
مقبرہ نورجہاں
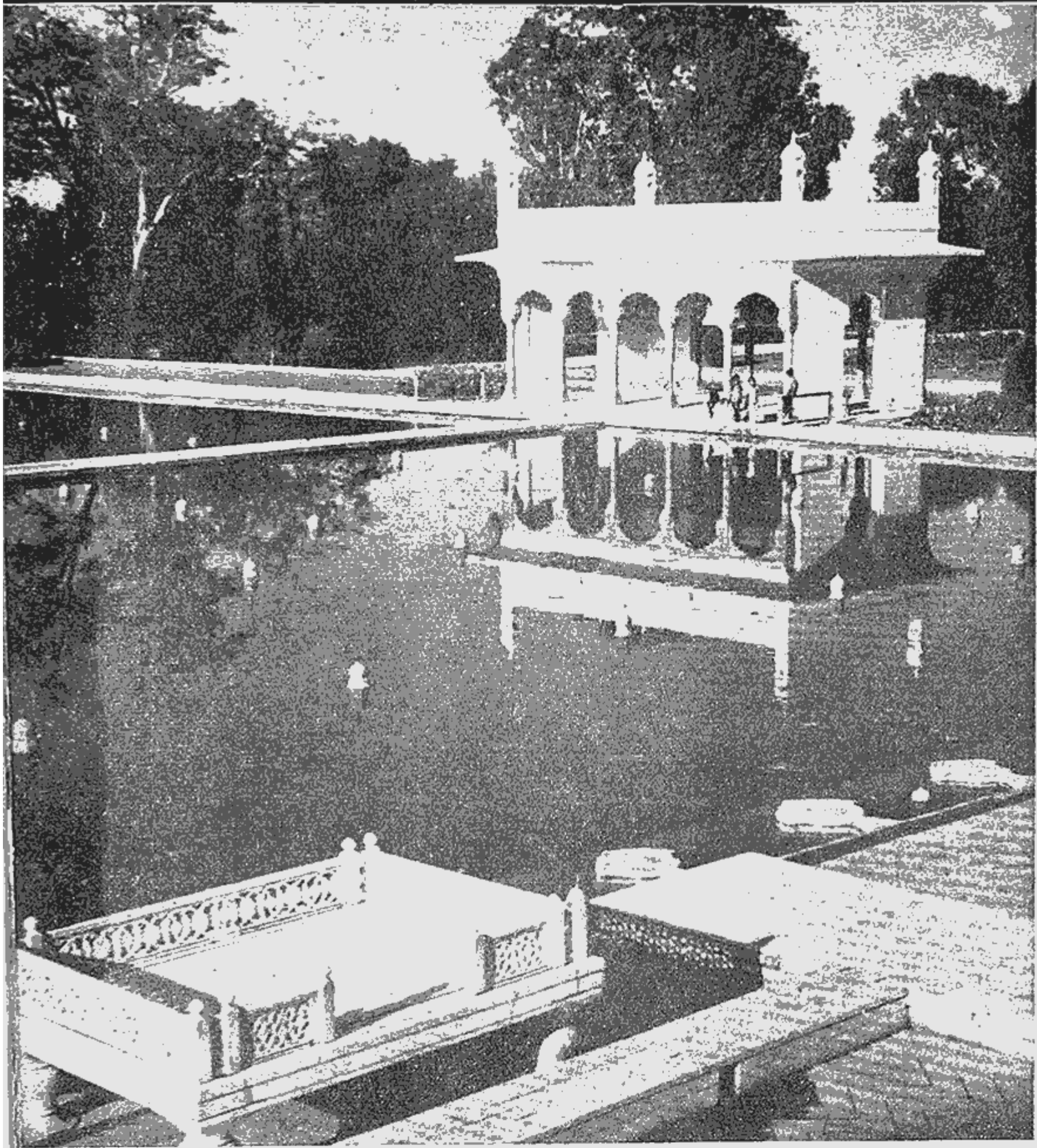
شالامار
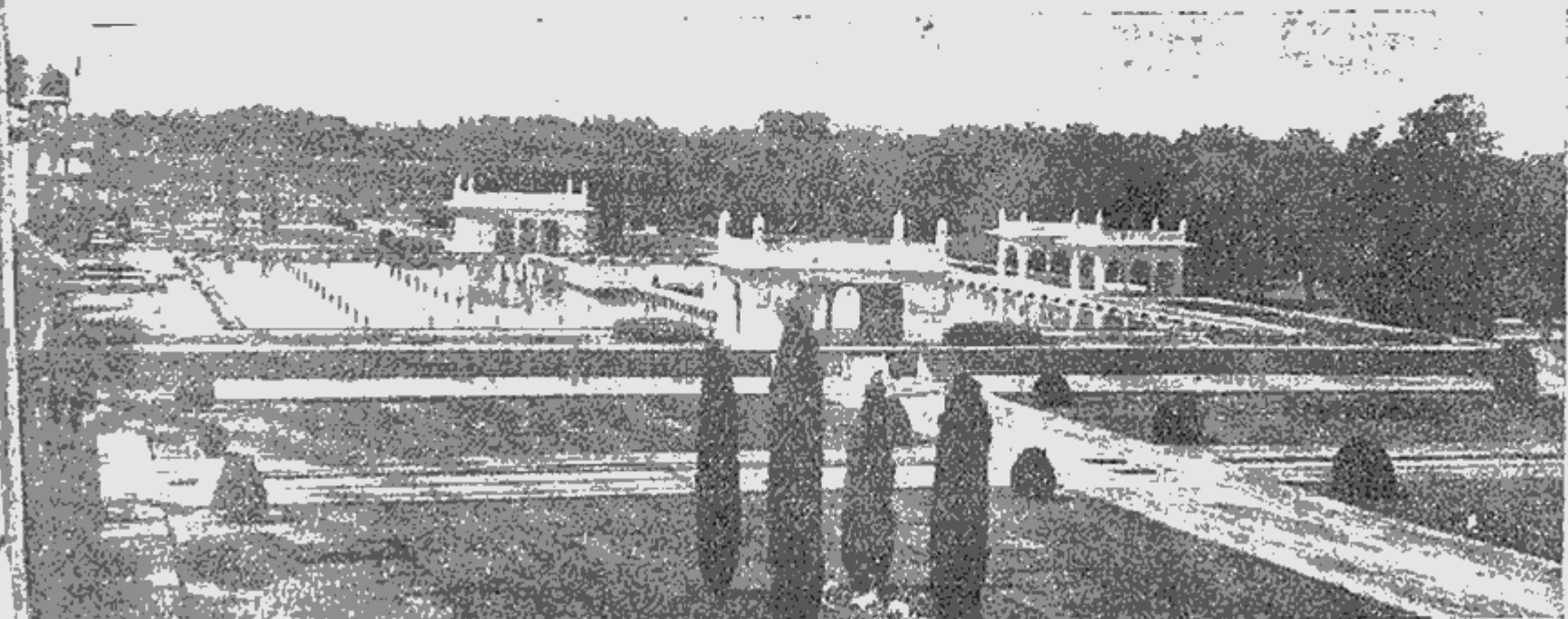
دربار
داتا گنج بخش
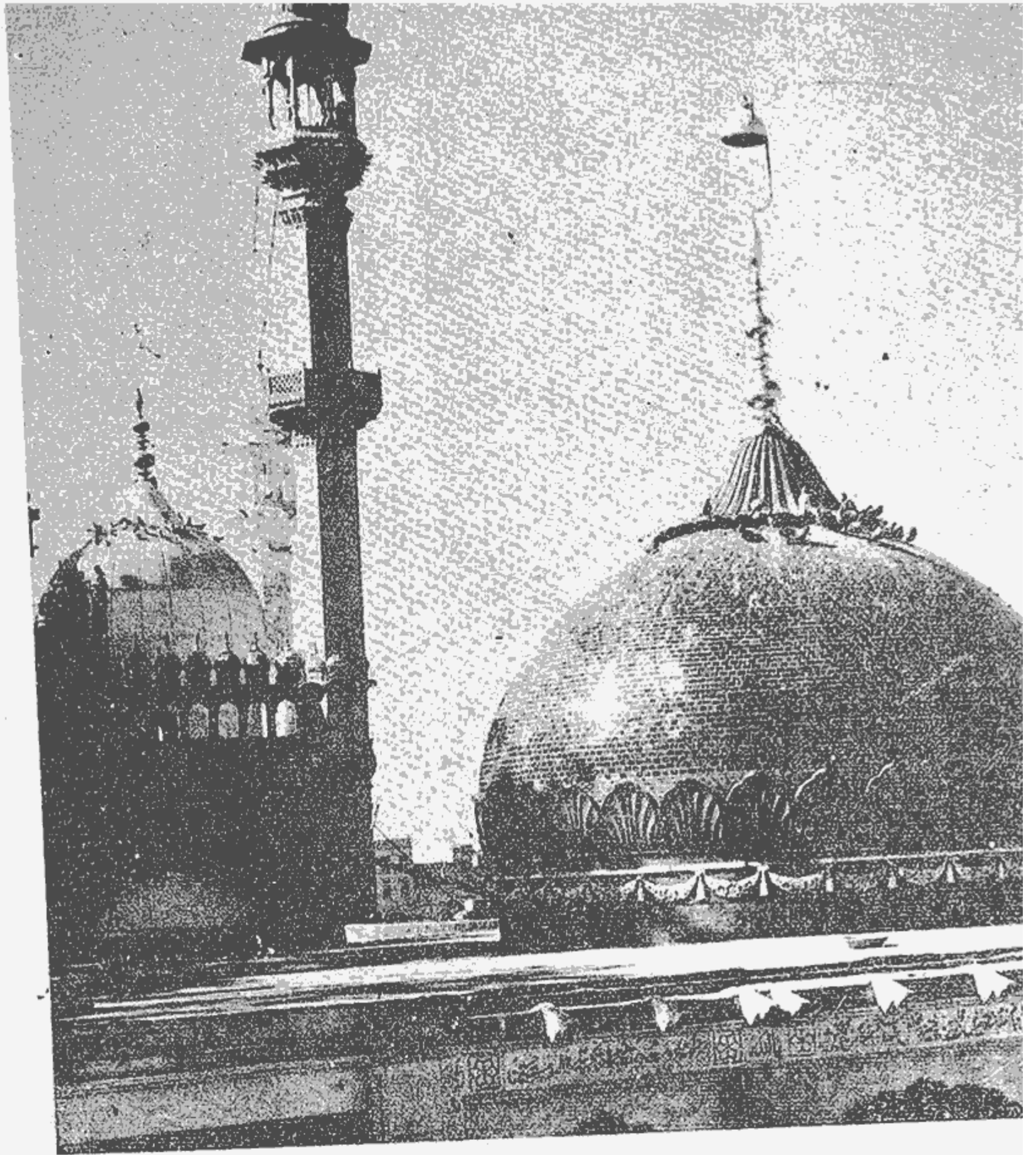
درگاہ
میاں میر صاحب

مسجد وزیر خاں

سنہری مسجد

مقبرہ آصف جاہ
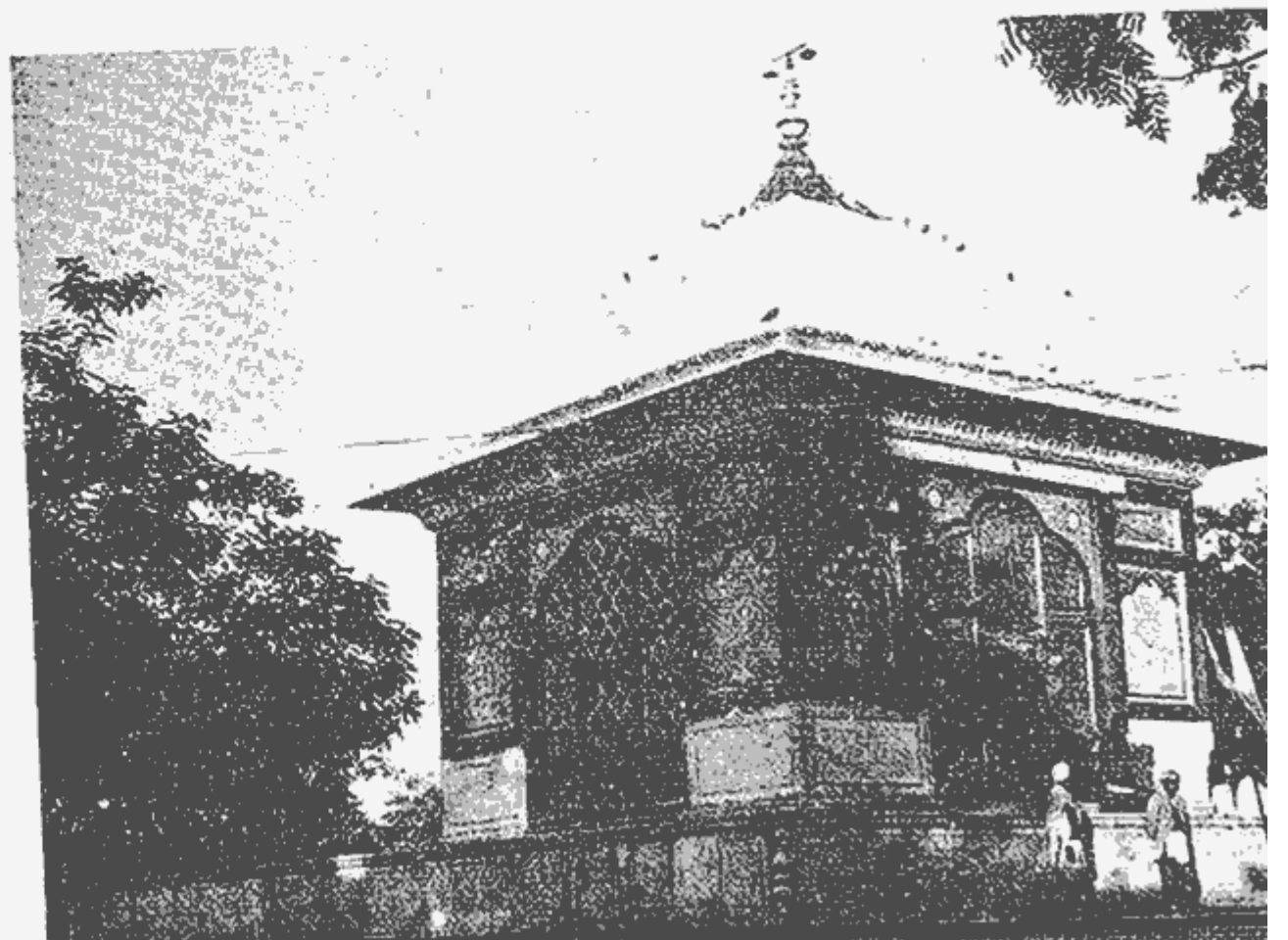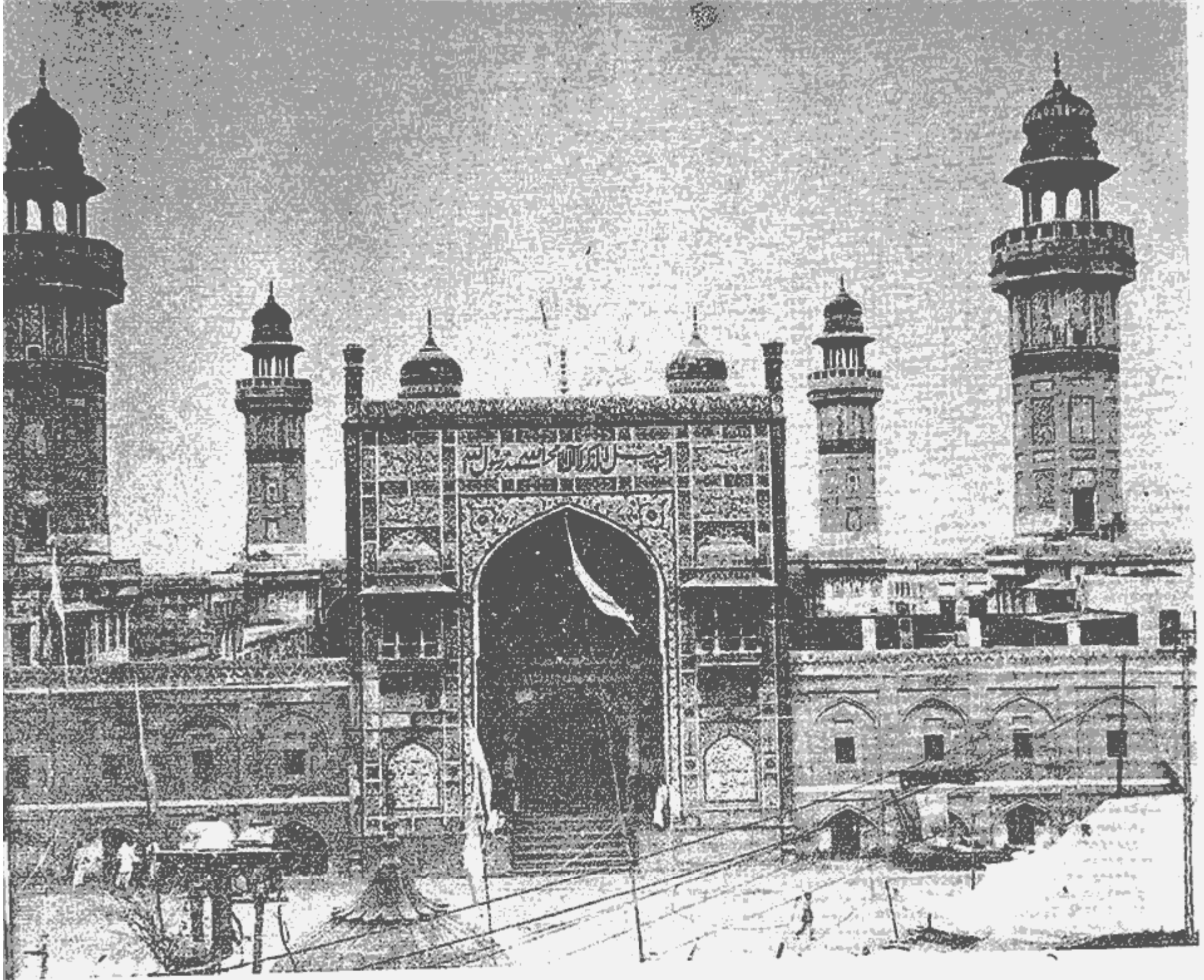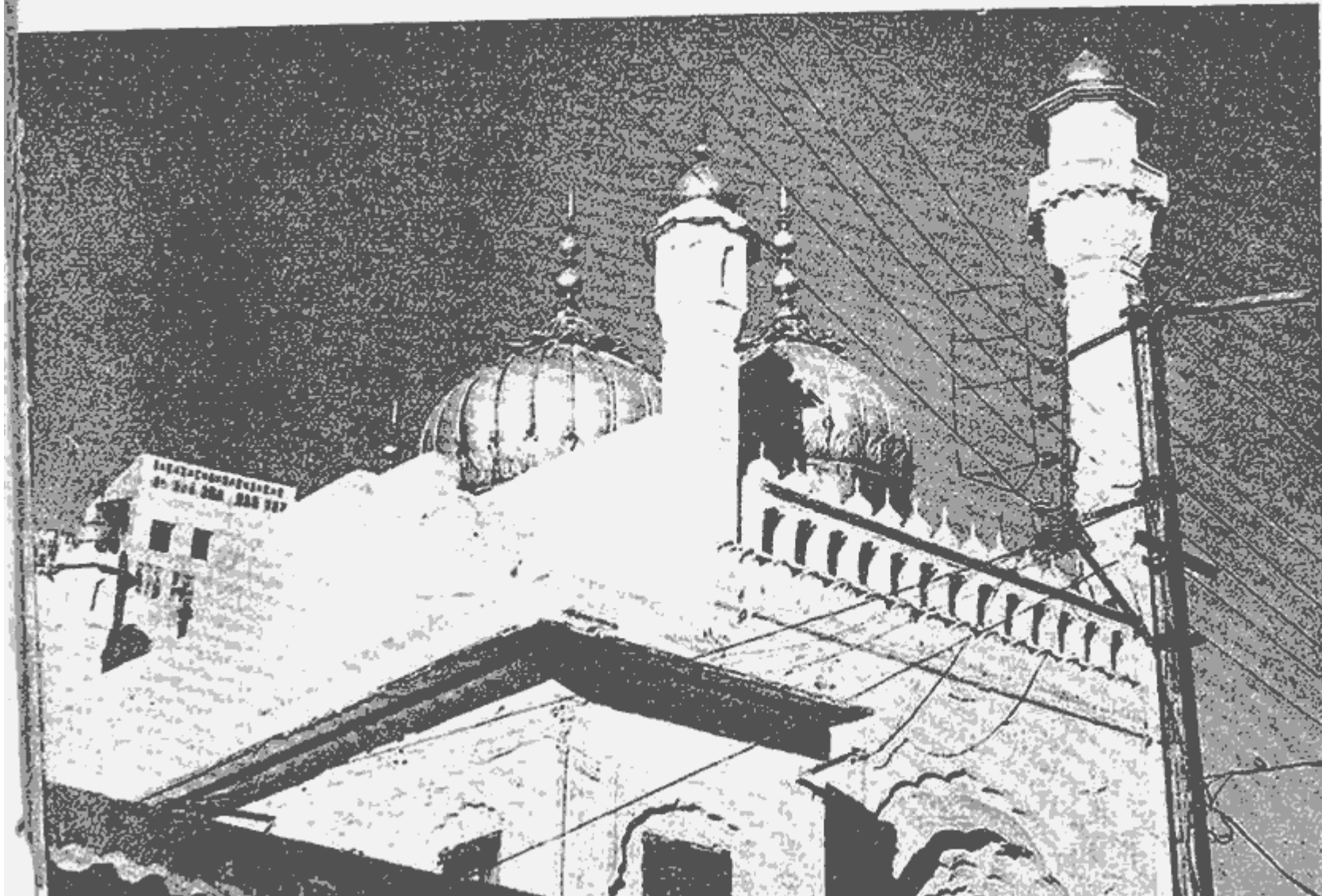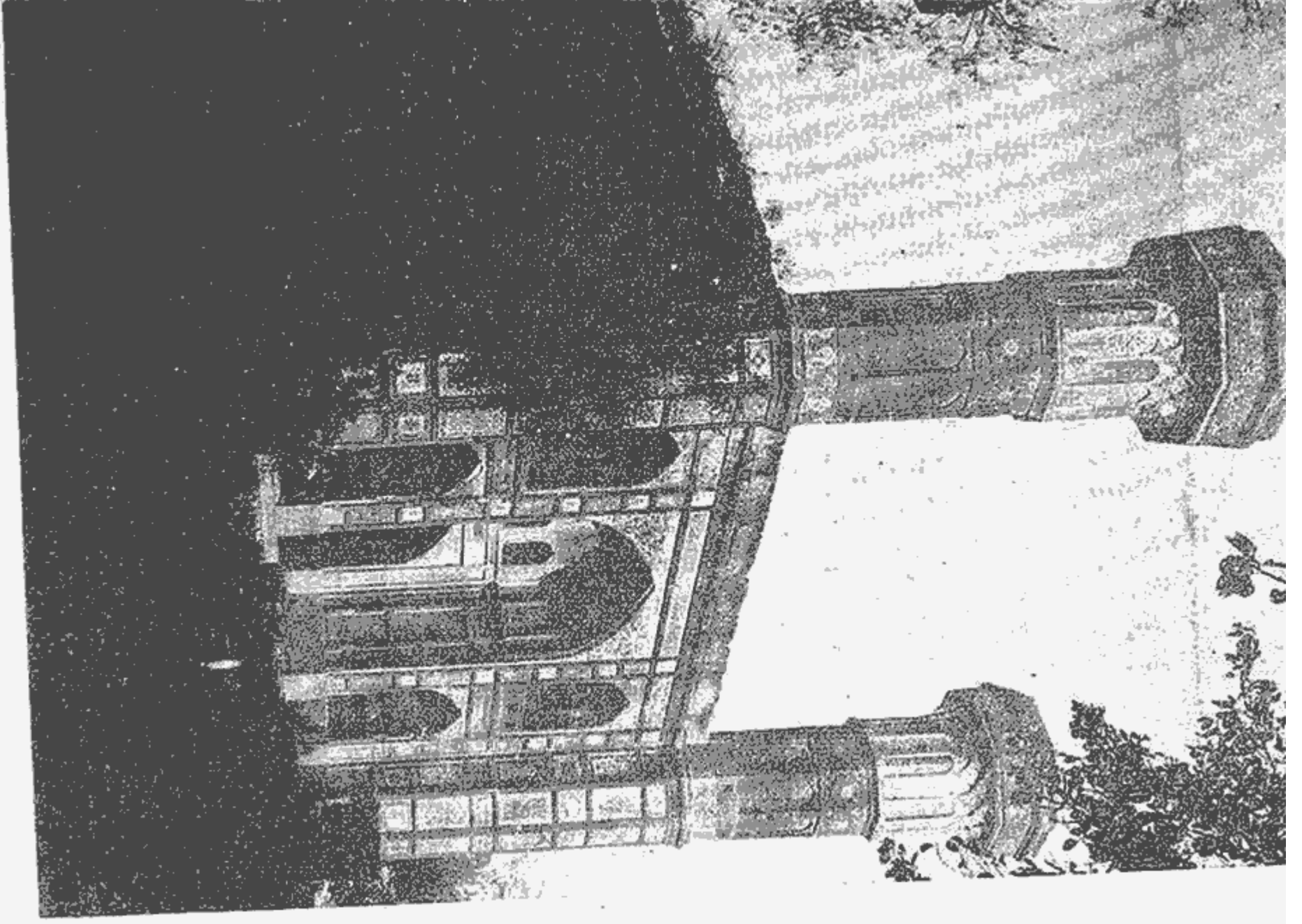
چوبرجی
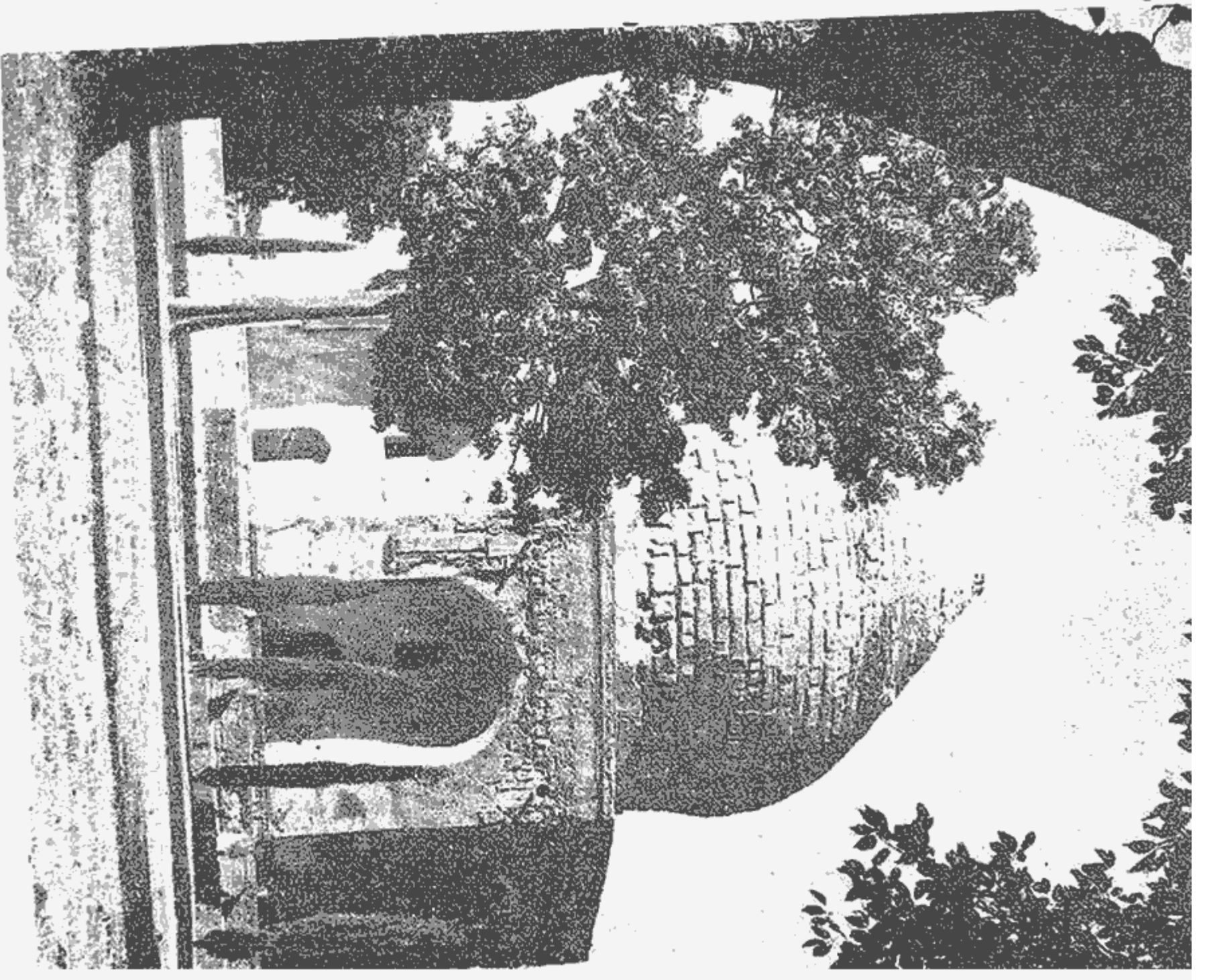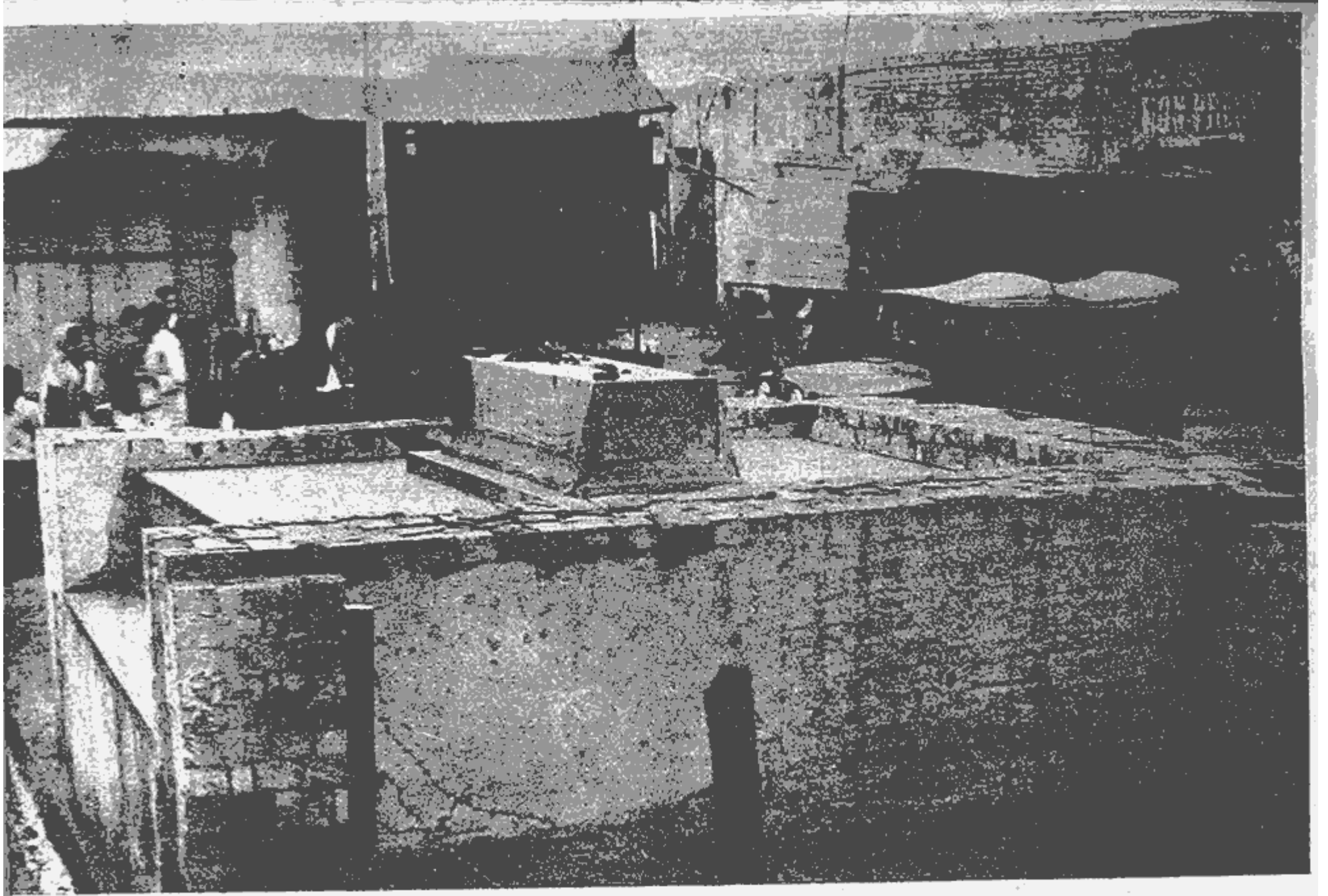
مزار قطب الدین ایبک

مقبرہ ایاز
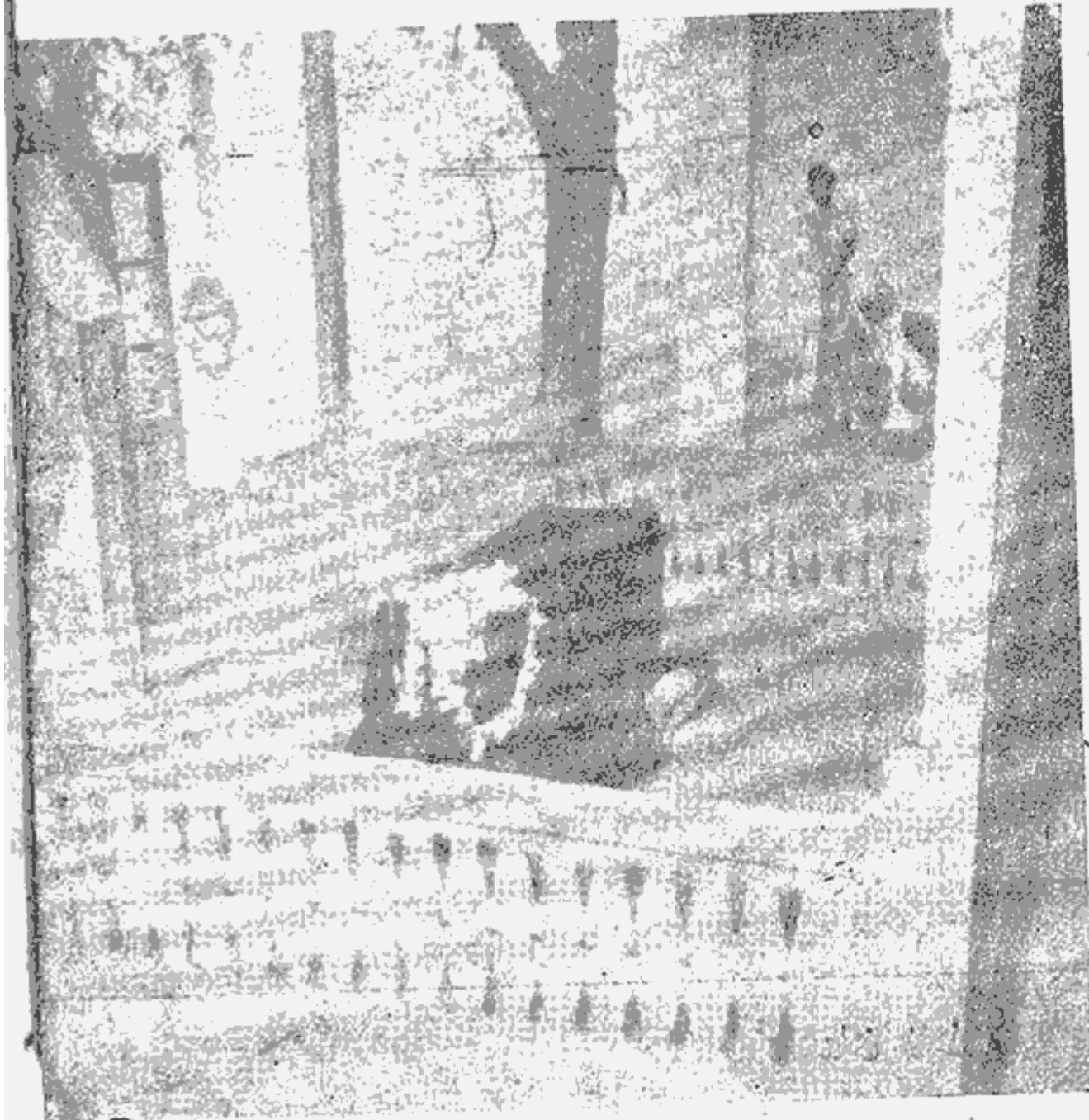
بارہ دری کامران
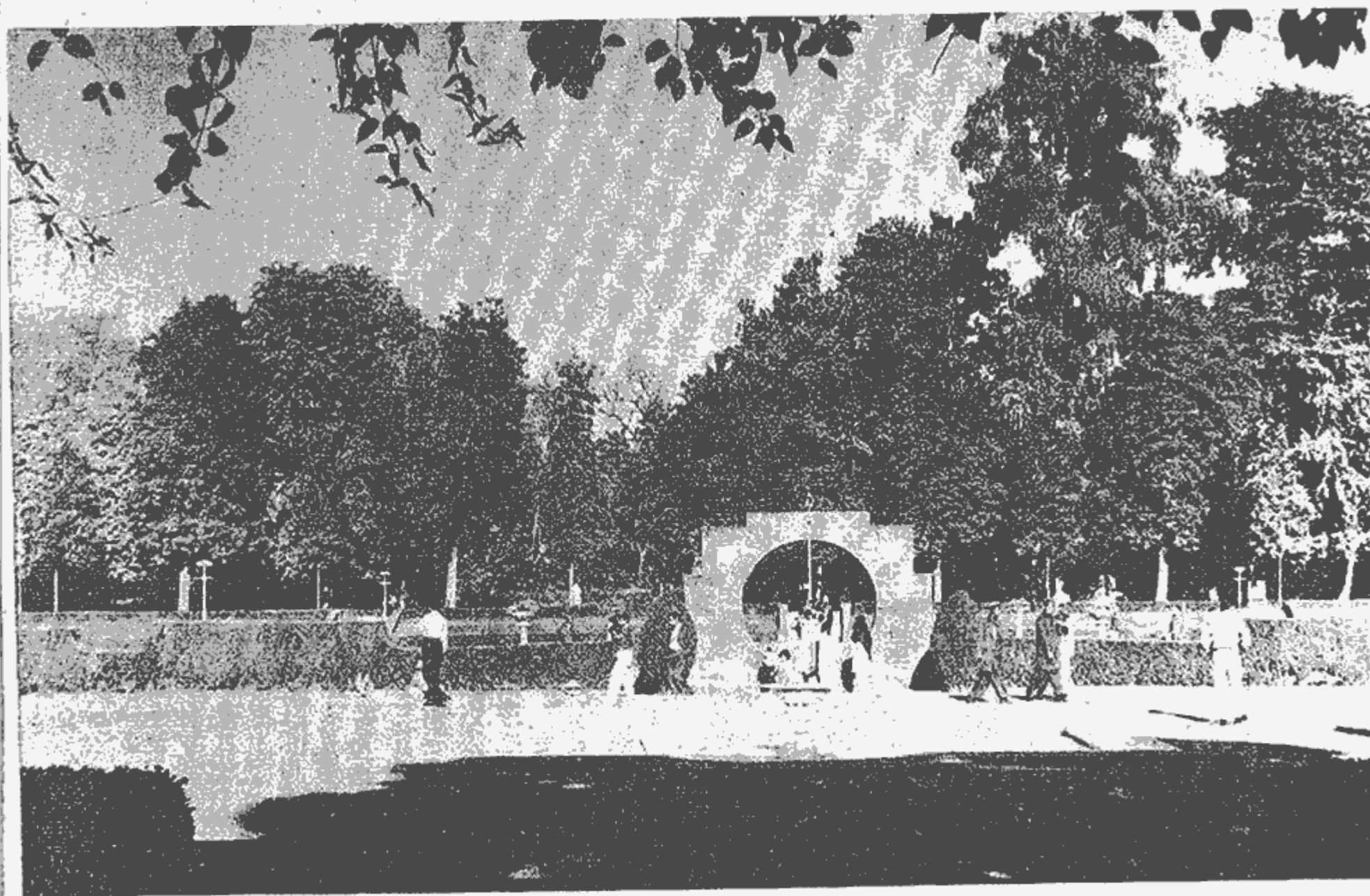
گلستان فاطمہ
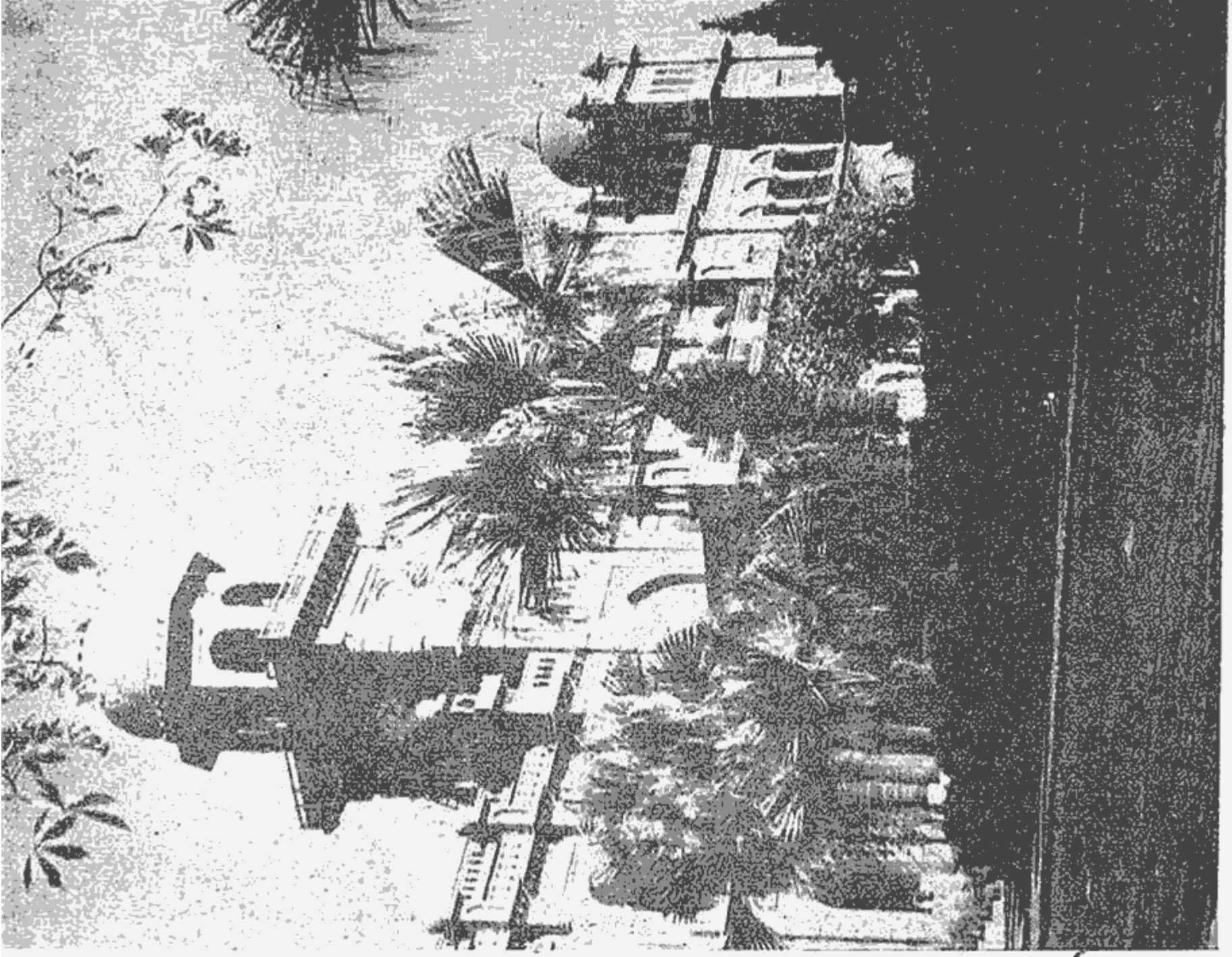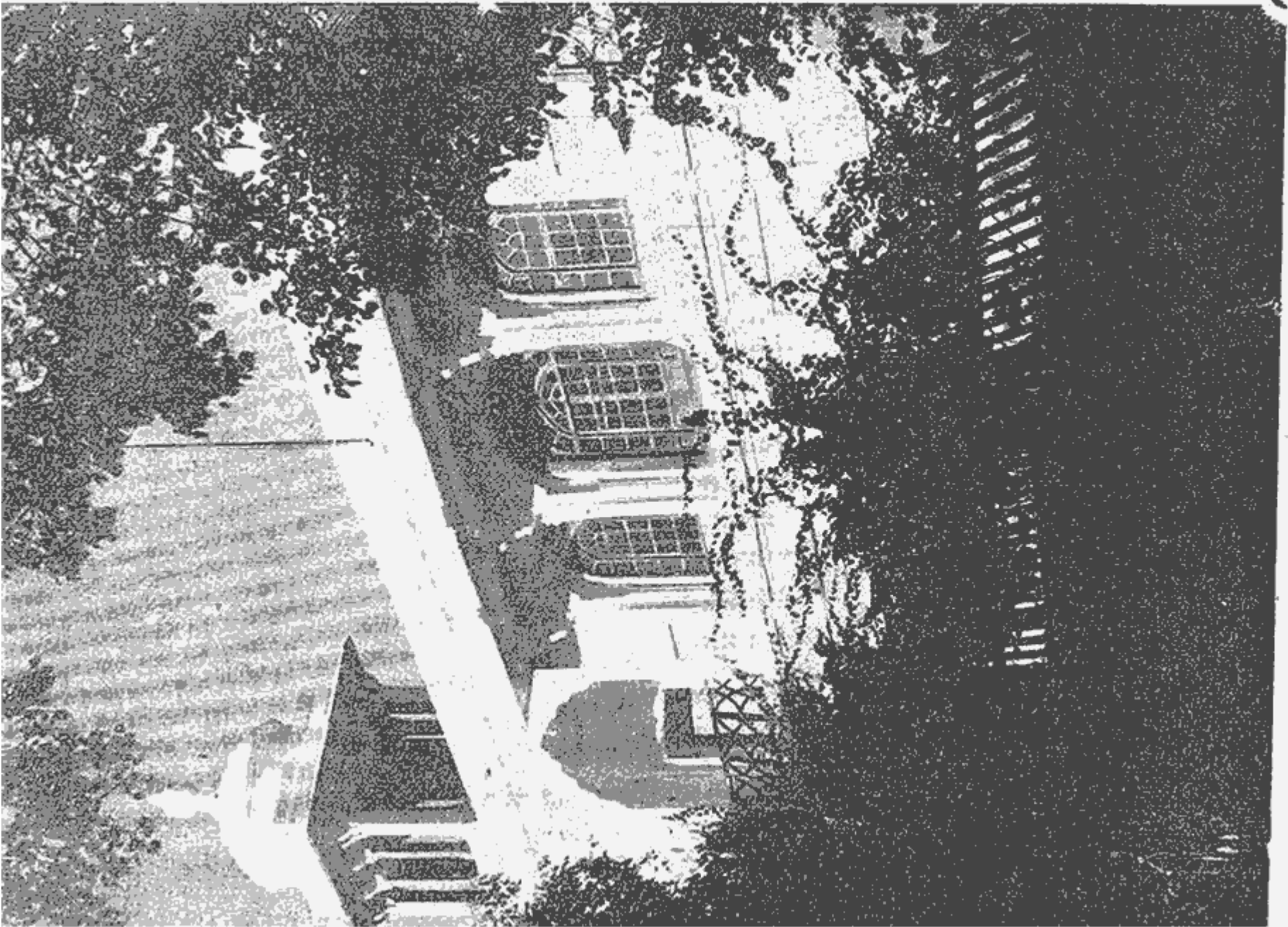
پنجاب یونیورسٹی

پنجاب پبلک لائبریری

گورنمنٹ کالج

اسلامیہ کالج

ریلوے اسٹیشن
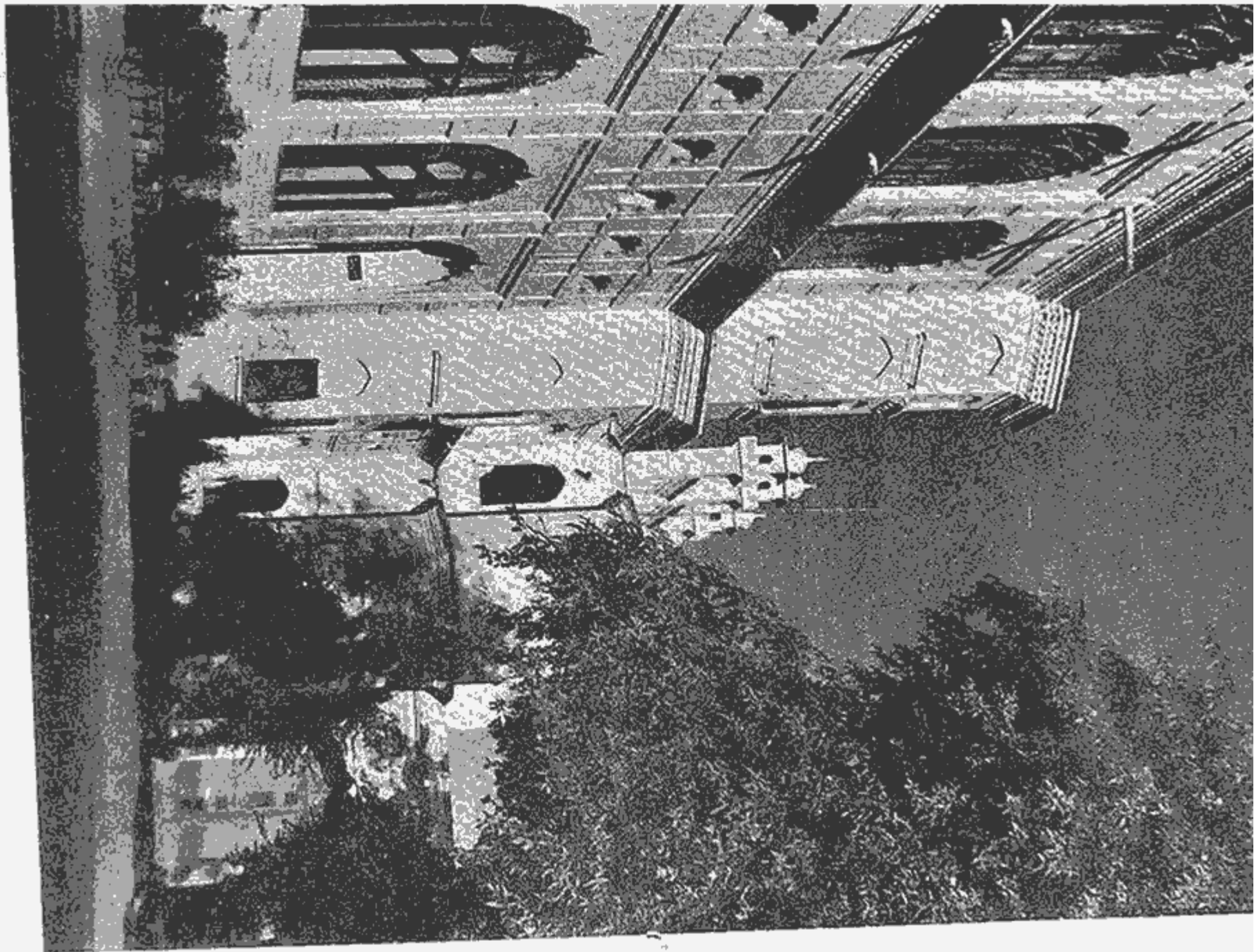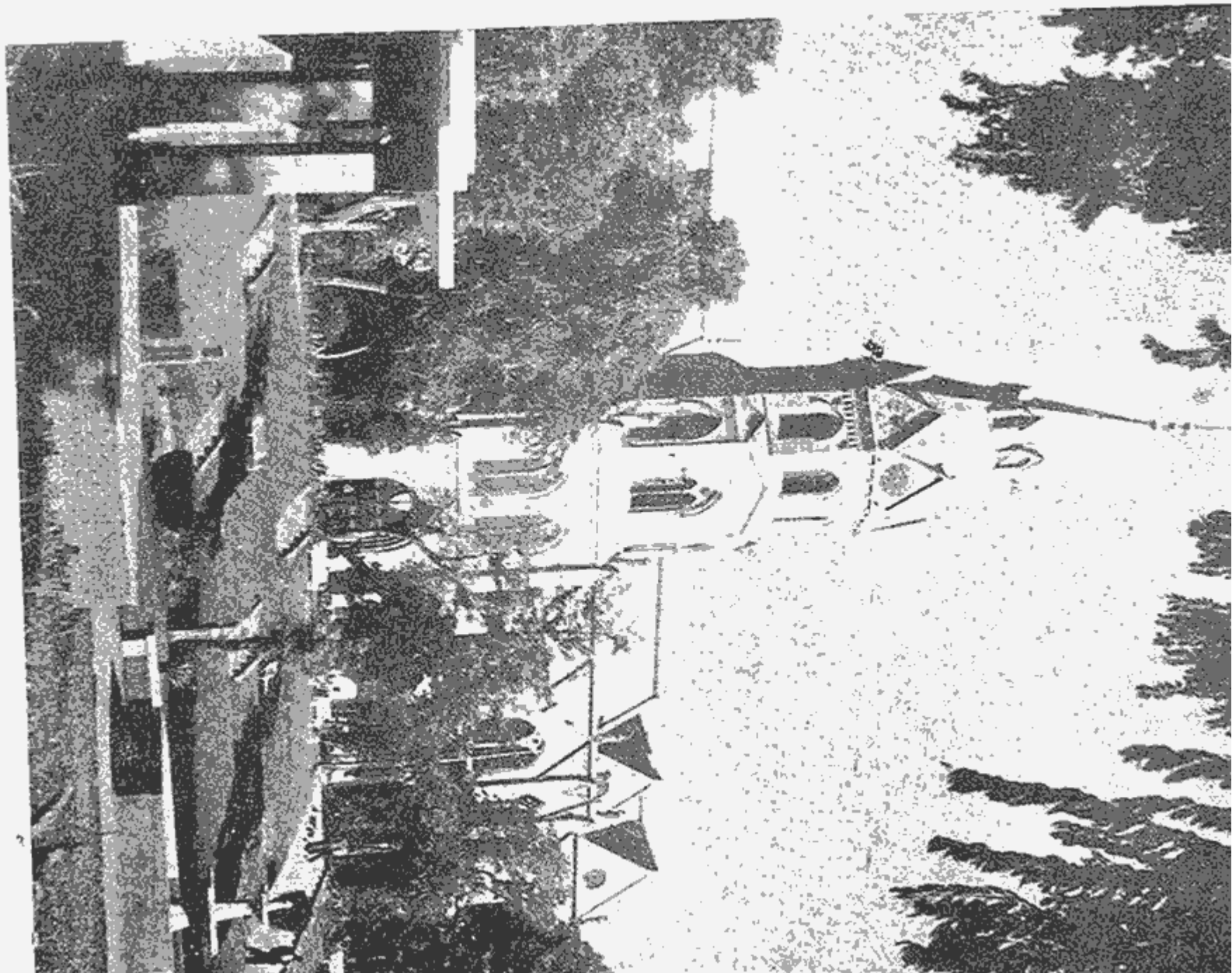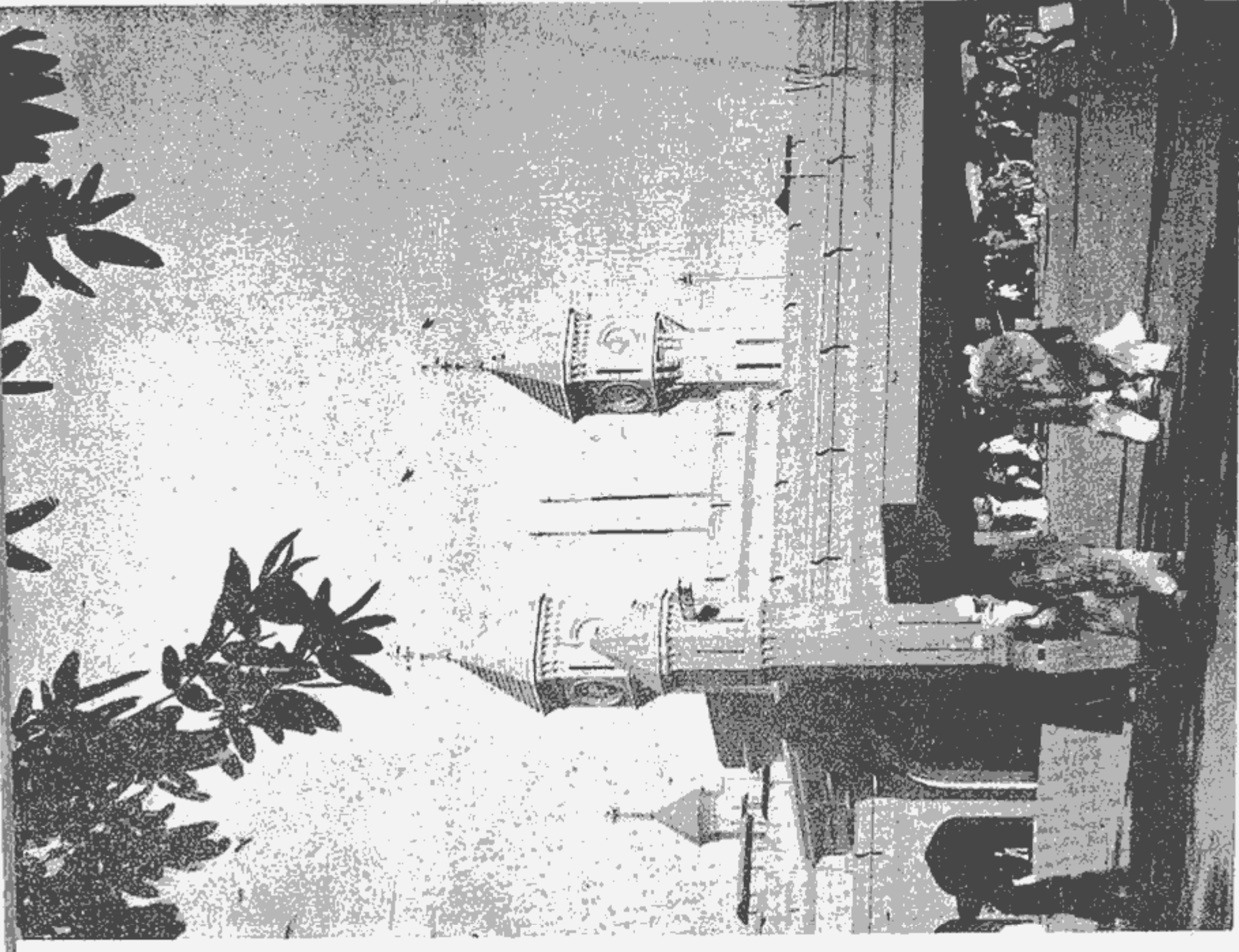
ٹاؤن ہال
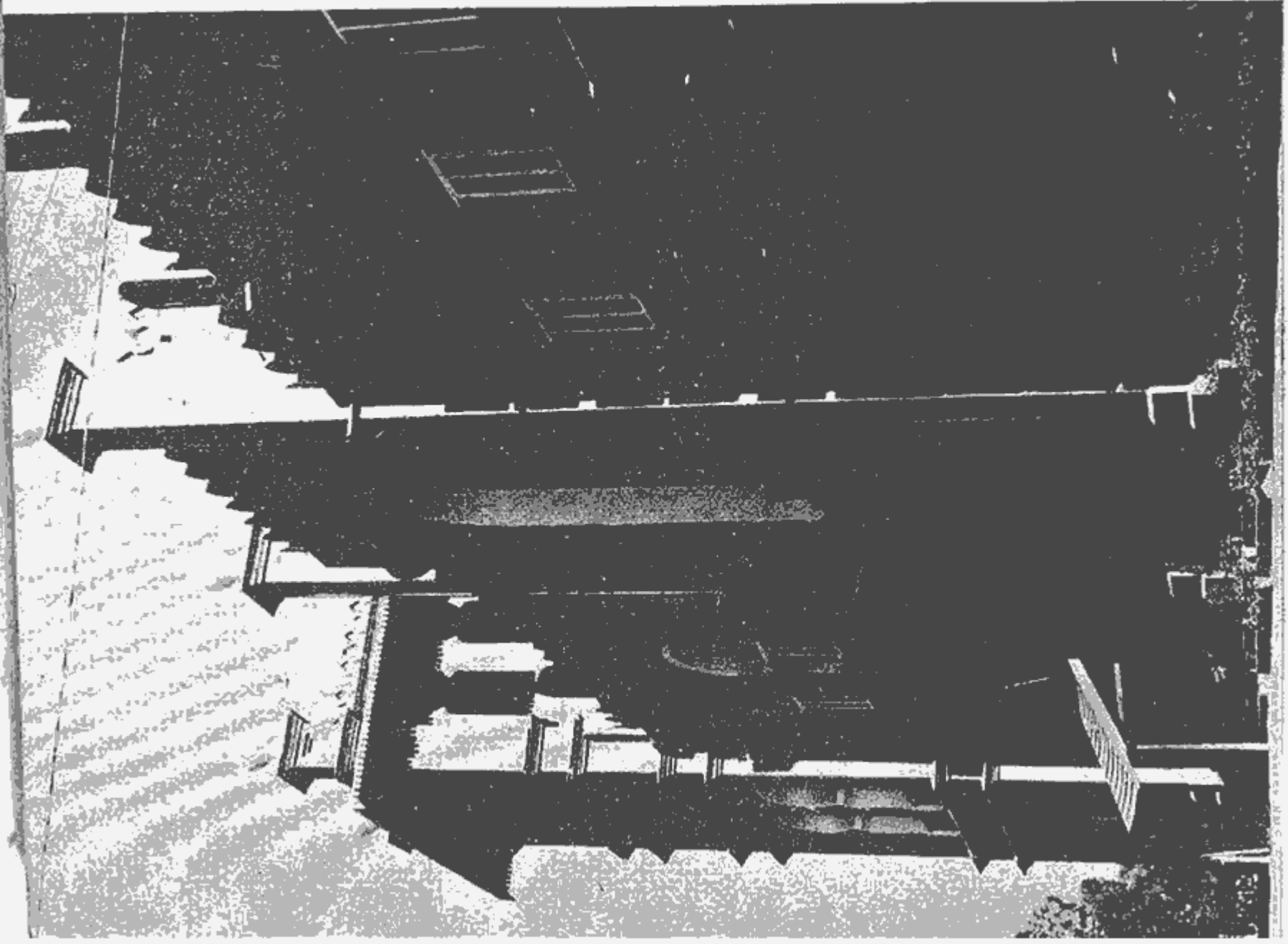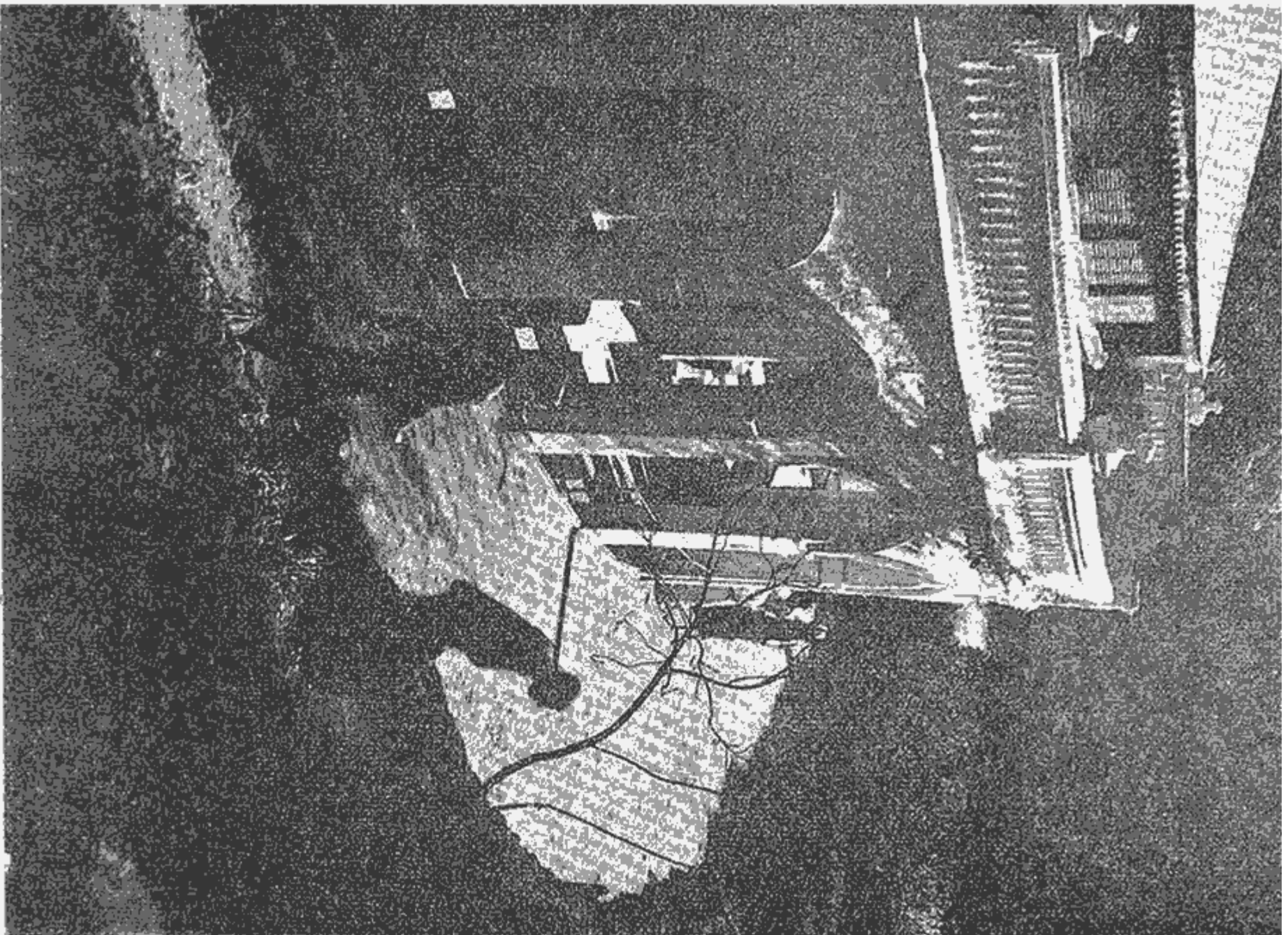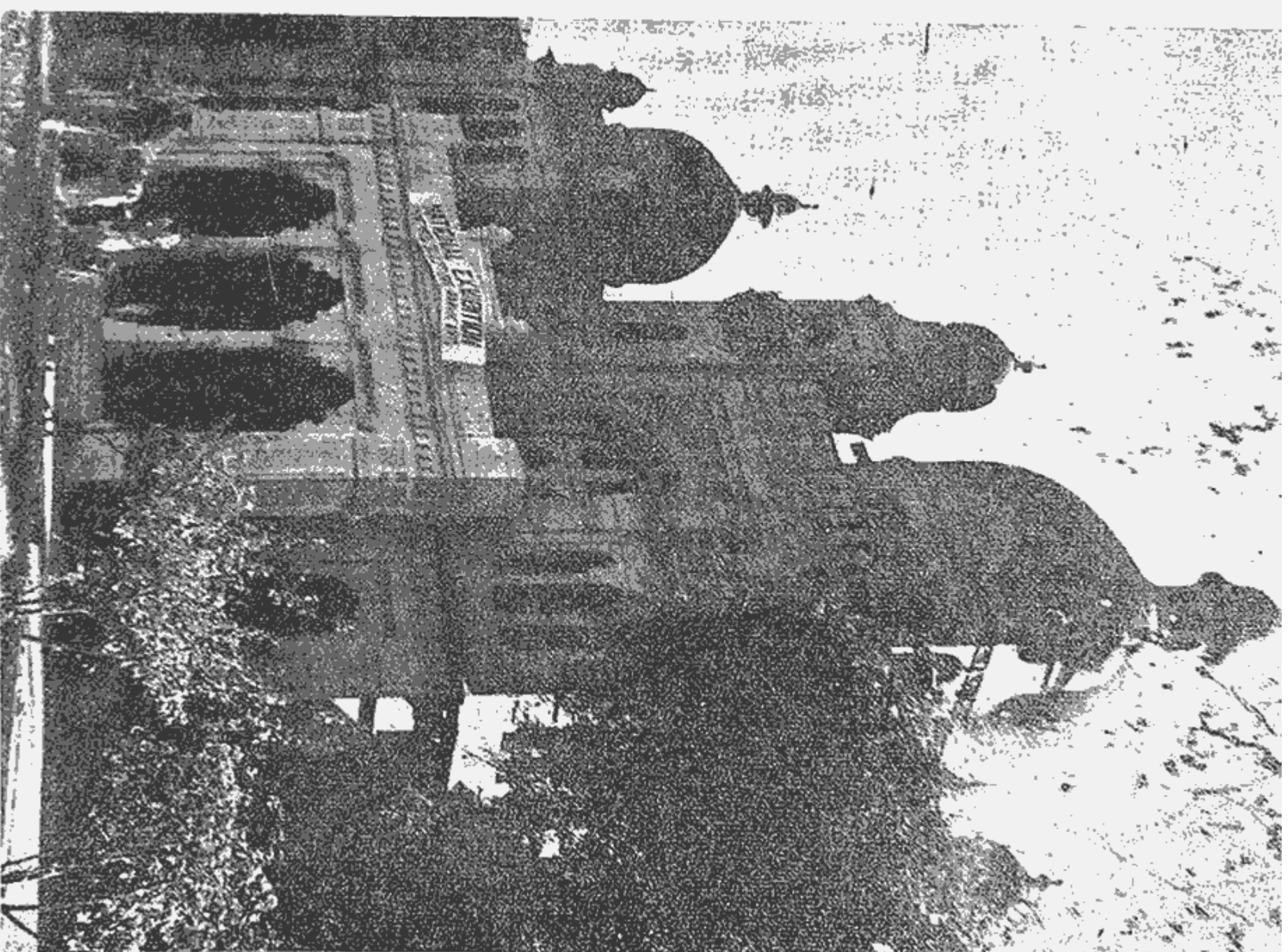
عجائب گھر

چڑیا گھر
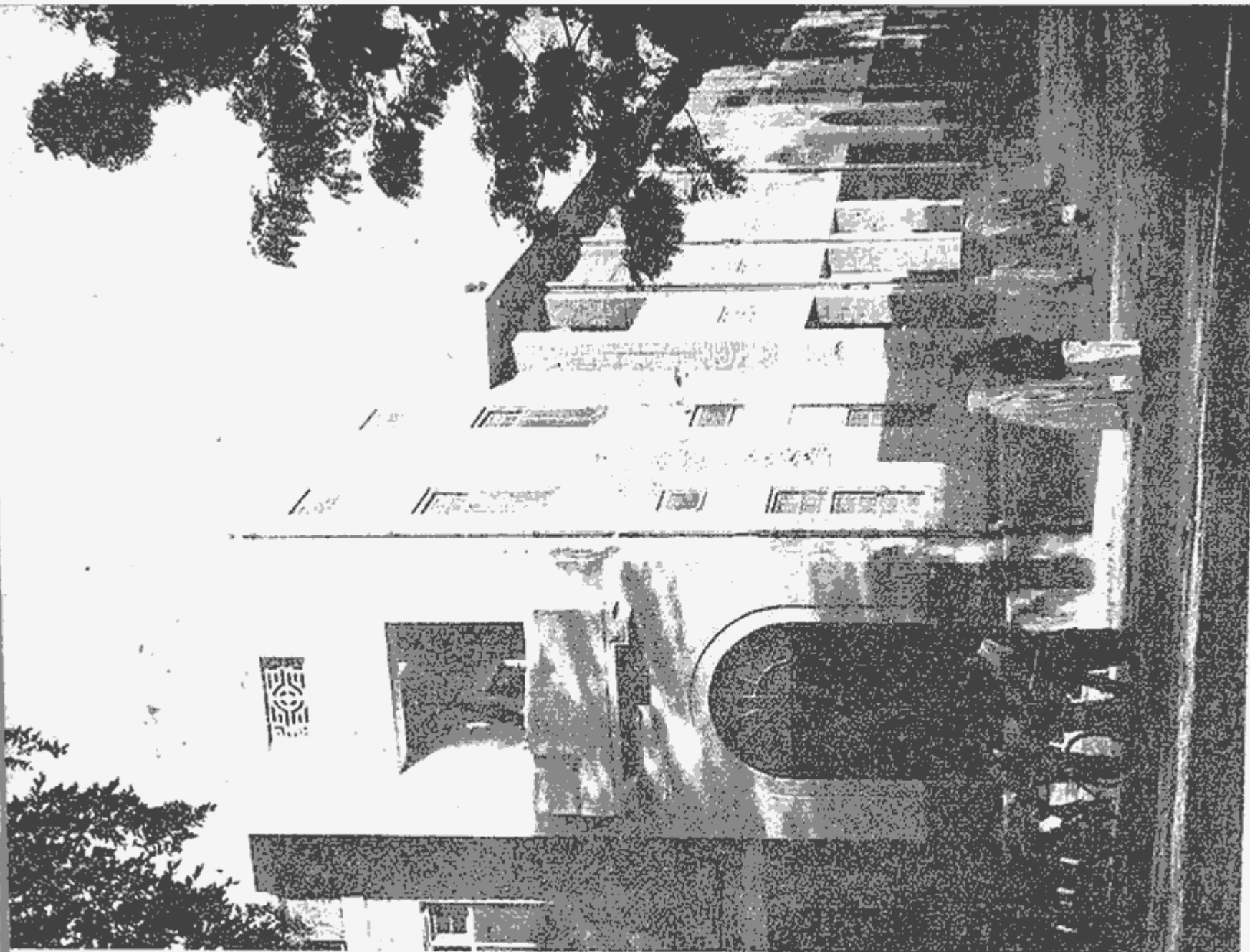
گنگارام ہسپتال
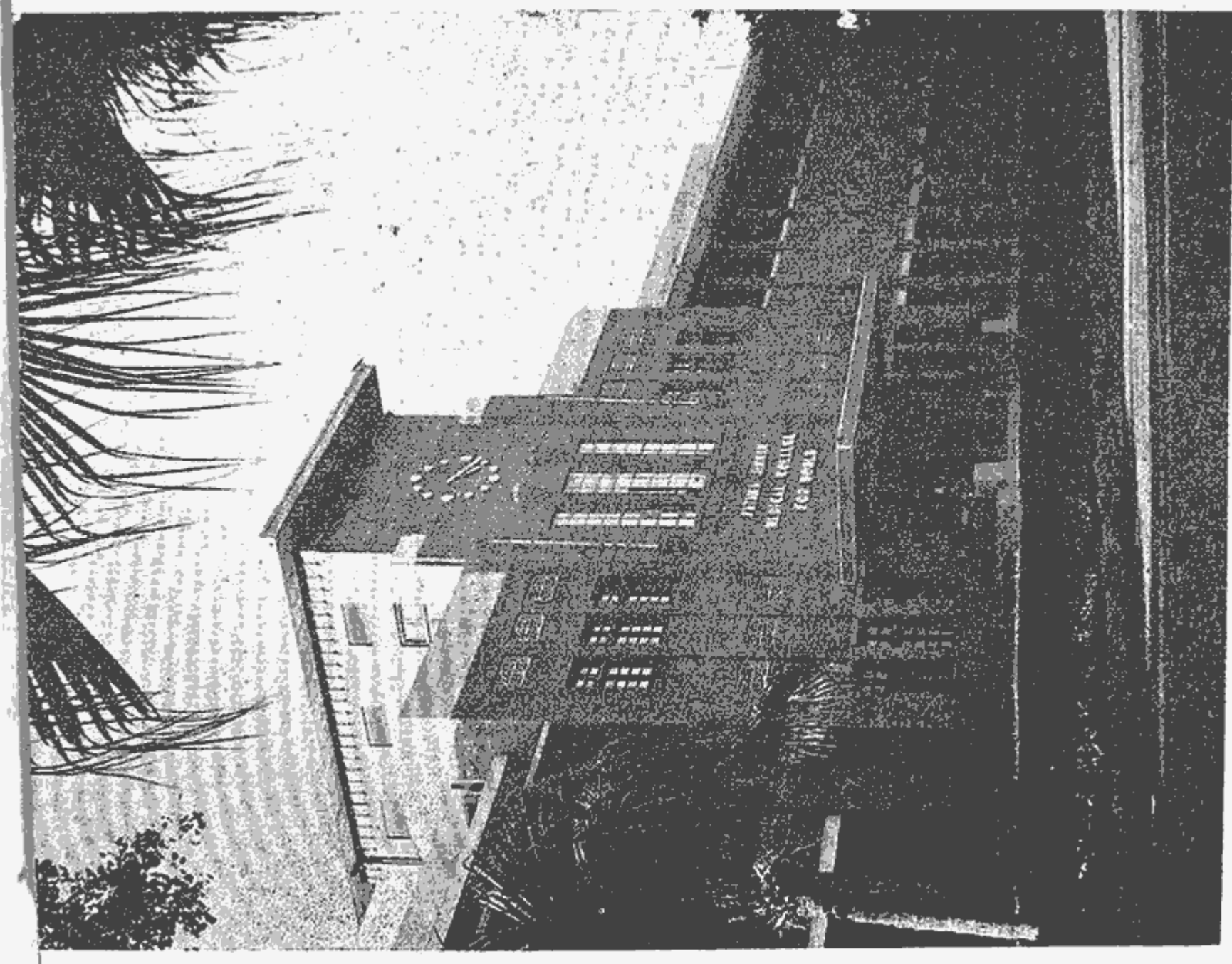
فاطمہ جناح میڈیکل کالج
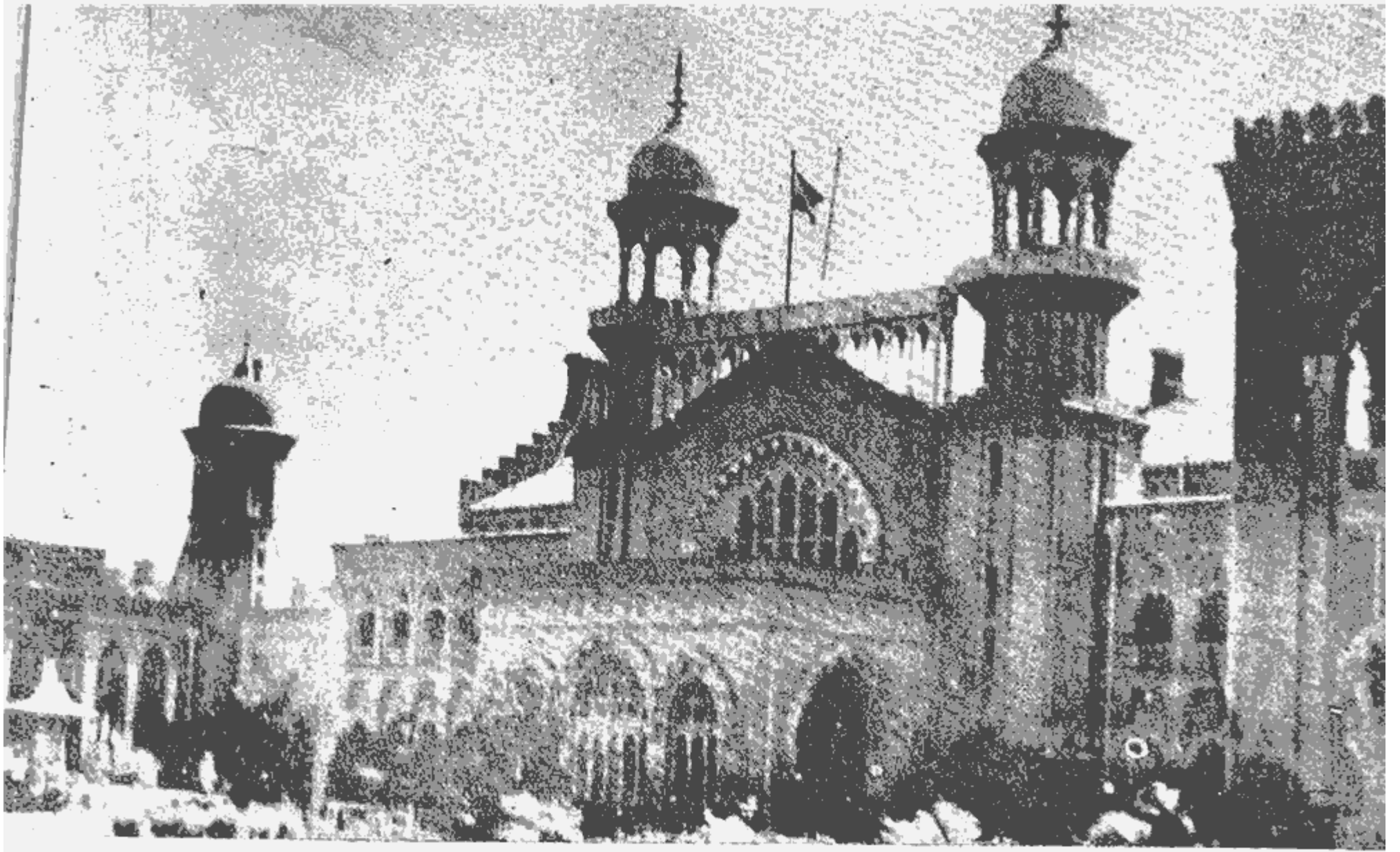
ہائی کورٹ
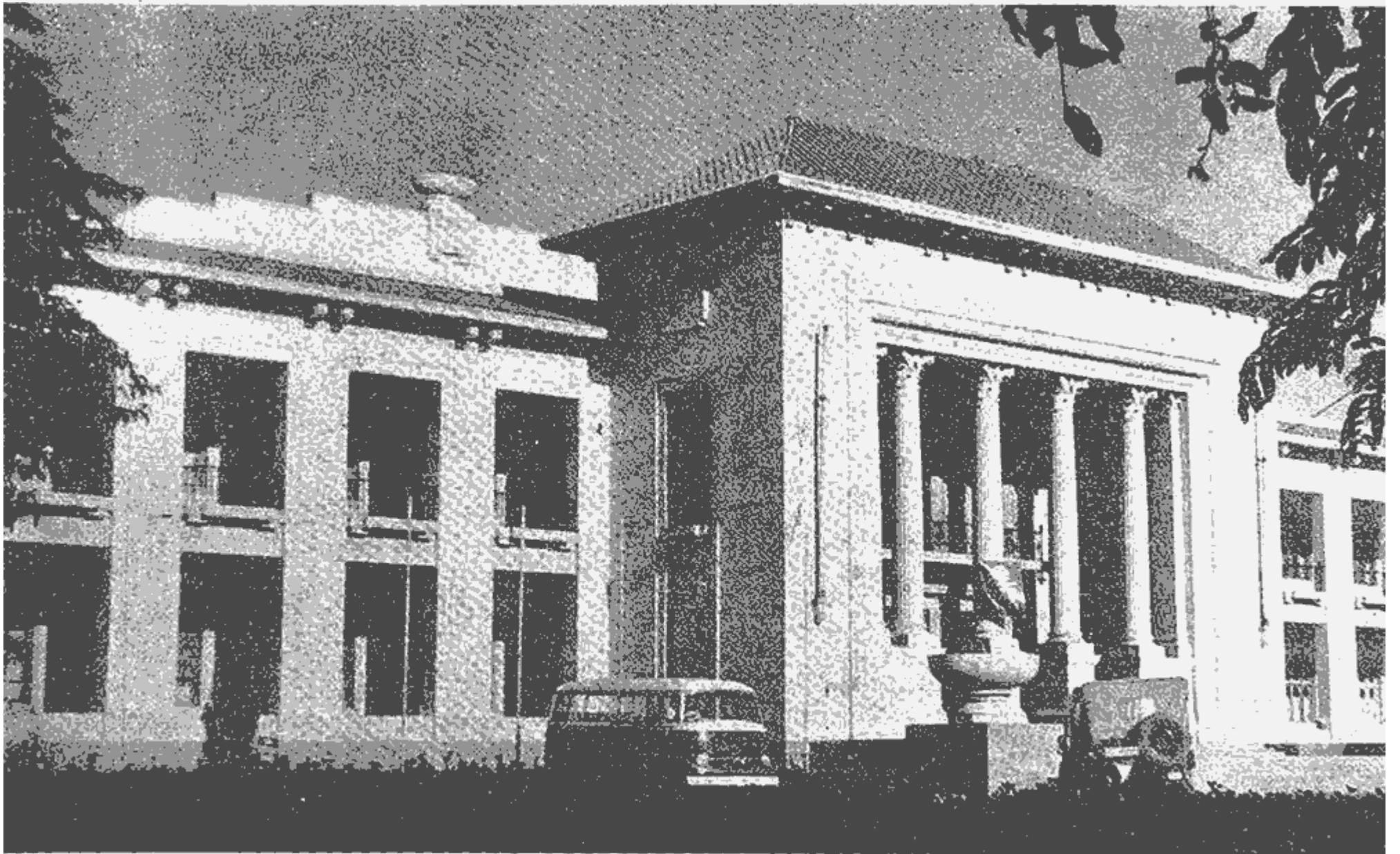
اسمبلی ہال
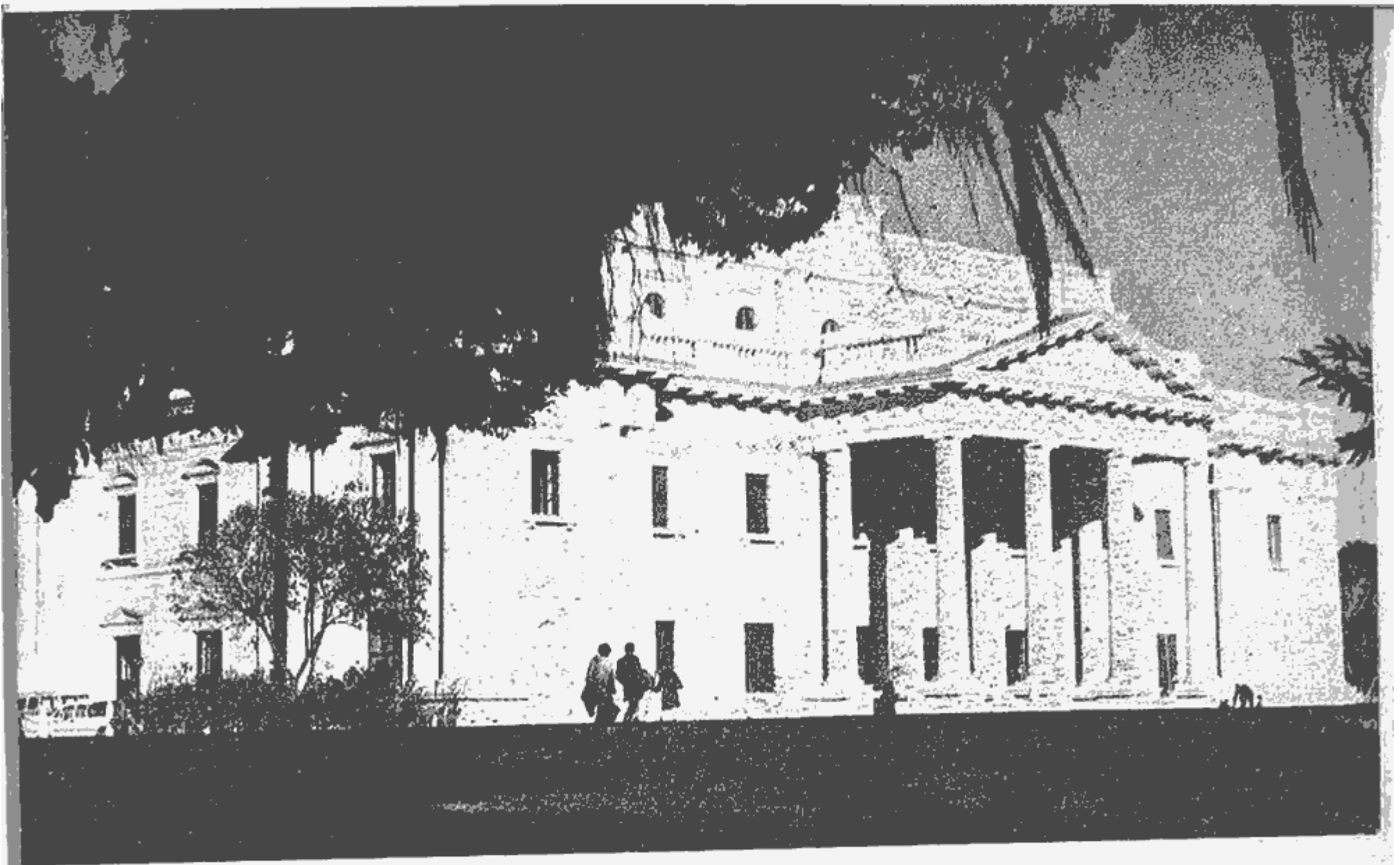
منٹگمری ہال
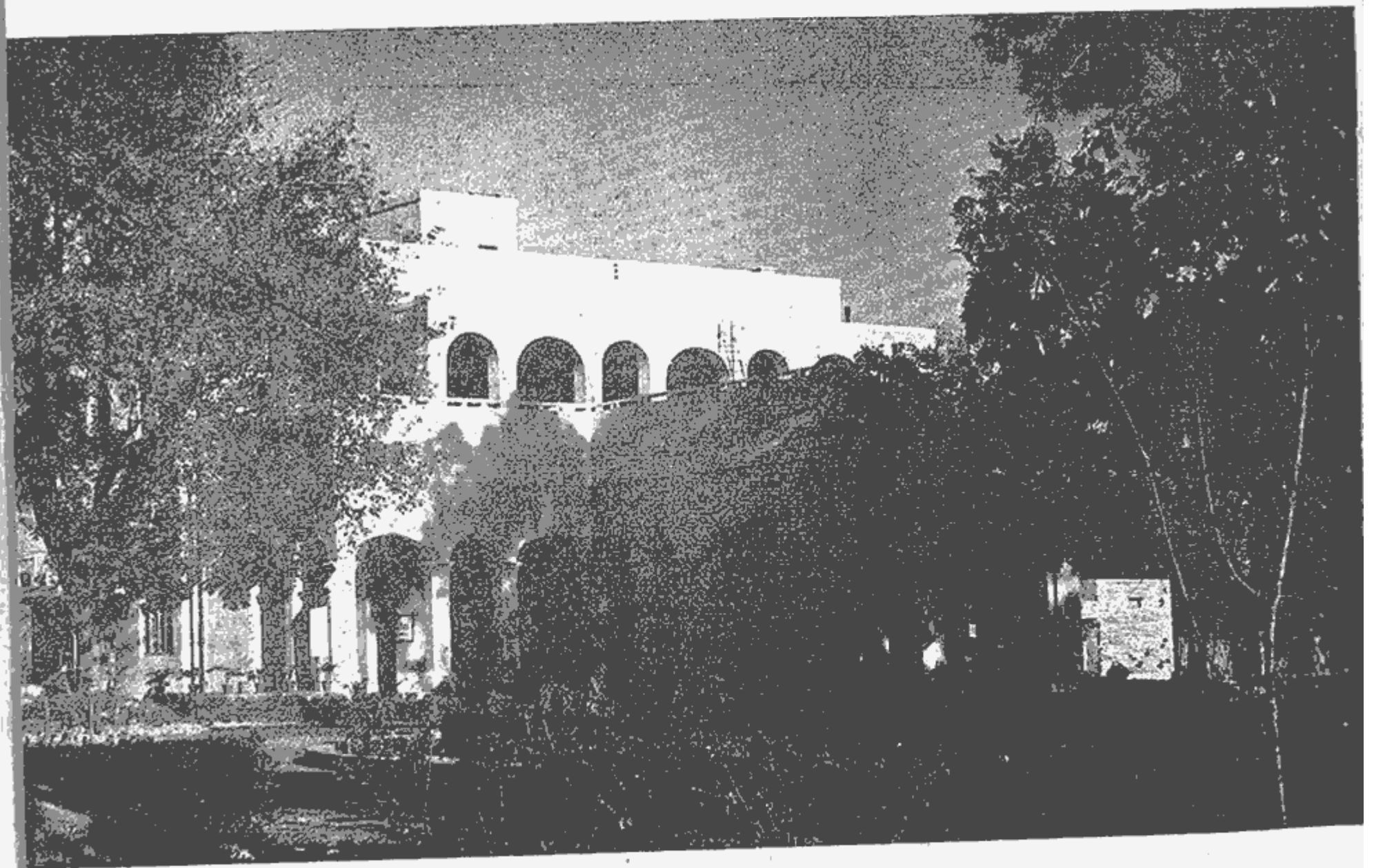
الحمرا
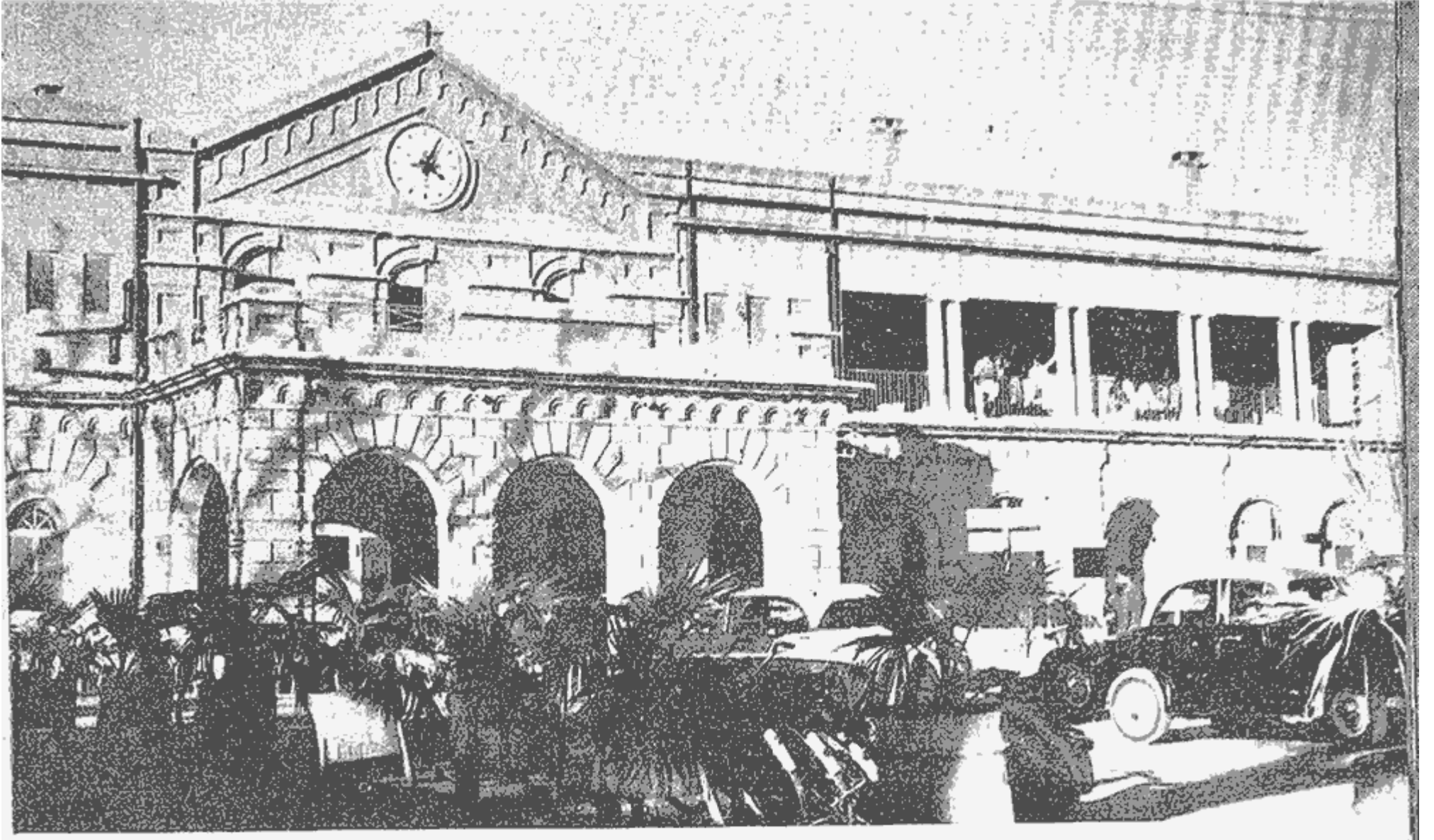
میو ہسپتال
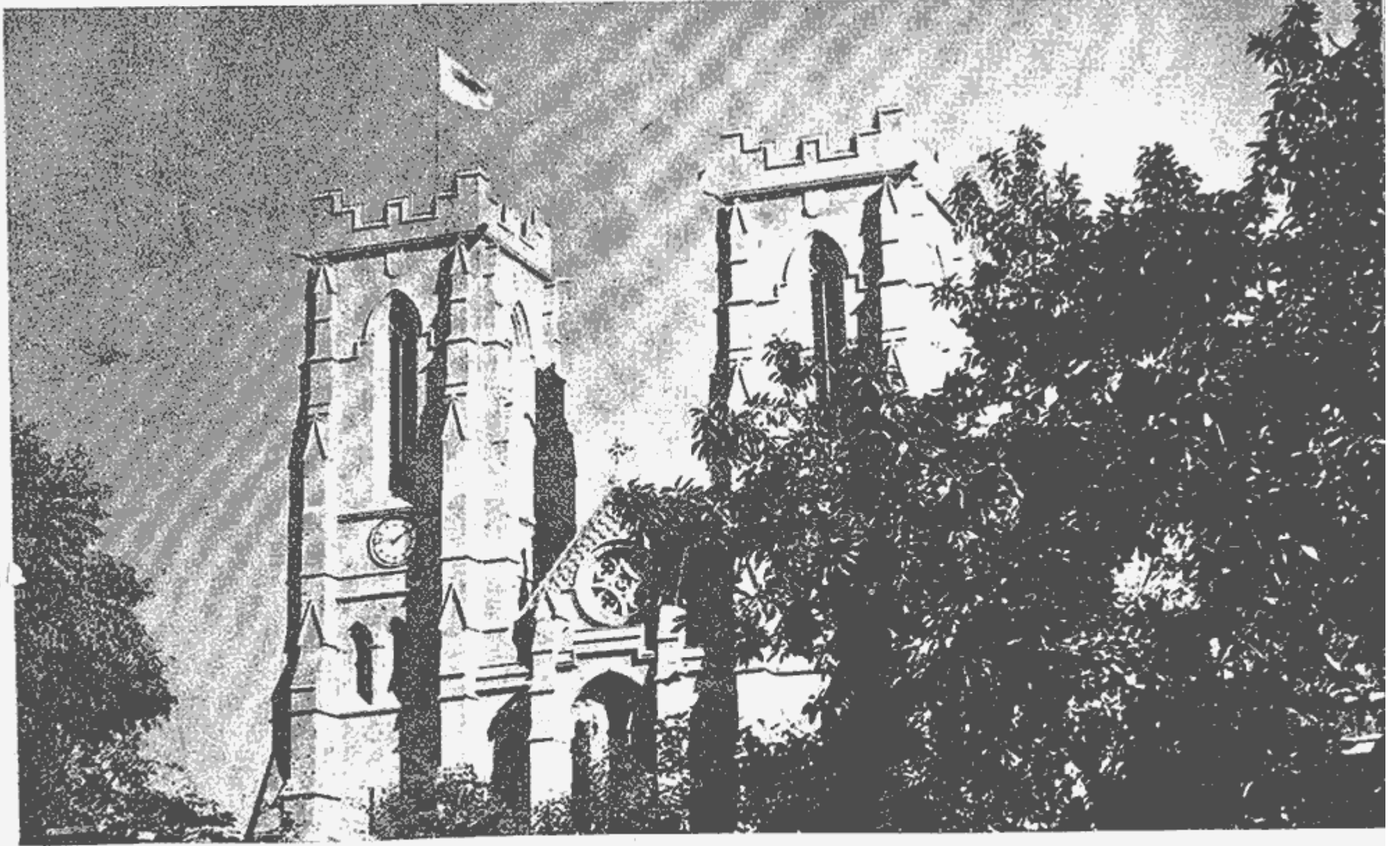
گرجا میکلوڈ روڈ

عجائب گھر کے چند نوادر

مجسمہ مہاتما بدھ

جہانگیر

سکہ سلطان محمد غوری

مزار علامہ اقبال